عُلماءِ ہند کا شاندار ماضی

مکمل چار جلد

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

محدث، فقیہ، مؤرخ، مجاہد فی سبیل اللہ، مؤلف کتب کثیرہ

عُلماءِ ہند کا شاندار ماضی

مکمل چار جلد

از

حضرت مولانا سیّد محمّد میاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ

محدّث، فقیہ، مؤرخ، مجاہد فی سبیل اللہ، مؤلف کتبِ کثیرہ

متصل مسجد پائلٹ ہائی سکول، وحدت روڈ، لاہور۔ فون: ۰۴۲-۵۴۲۷۹۰۱-۳

E-Mail: julpak@wol.net.pk URL: www.julpak.org.pk

Ulamae Hind Ka Shandar Mazi
By
Maulana Mohammad Mian

ISBN:969-8793- 45-1

ضابطہ

اشاعت جدید : اگست ۲۰۰۵ء
اشاعت ششم : اپریل ۲۰۱۰ء
ناشر : محمد ریاض درانی
سرورق : جمیل حسین
کمپوزنگ : جمعیۃ کمپوزنگ سنٹر رحمٰن پلازہ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
مطبع : اشتیاق اے مشتاق پرنٹنگ پریس لاہور
قیمت : -/600 روپے

نذر

ایک ناکارہ و سرگرداں نے دیدہ ریزی اور دل سوزی سے ہزار ہا اوراق کو پلٹ کر ایک مجموعہ مرتب کیا ہے۔ پورے عجز و انکسار اور اعتراف تقصیر کے ساتھ اس حقیر ہدیہ کو اُن اکابر ملت کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں جن کی سبق آموز اور مقدس سوانح حیات کے چند ذرات سے یہ مجموعہ مرکب ہے اور التجا ہے۔

آید بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

مقصد

ہم نے اپنے مقدس اکابر کو زہد، تقشف، چلہ کشی، شب بیداری، سحر خوانی، سجدہ ریزی کے چشمہ سے دیکھا تو بہت جلیل القدر اور عظیم الشان نظر آئے۔ آئیے اب مکہ کی مظلومیت، طائف کی مقہوریت، ہجرت وطن، ترک اقارب، غار ثور کی روپوشی، بدر کی نصرت، اُحد کی شہادت، فتح مکہ کی مسرت، حنین و ثقیف کی سطوت، تبوک کی شوکت وغیرہ وغیرہ سنن جہاد و سیاست کے چلن سے نظر ڈالیں کیسے نظر آتے ہیں۔

ہمارا حال ماضی کا ثمرہ ہے اور مستقبل کا سنگ بنیاد ہے...... آئیے

الداعی

محمد میاں عفی عنہ

۱۵ شوال ۱۳۵۸ھ

فہرست

عرضِ ناشر

مورخِ ملت مولانا سید محمد میاں علیہ الرحمہ نے حصہ تو سیاست میں بھی لیا اور پورے جوش اور سرگرمی کے ساتھ لیا، وہ رونق افزائے مسندِ درس و تدریس علم و فنون بھی رہے۔ وہ ایک عالم دین تھے۔ مفسر و محدث اور مفتی تھے اور خطیب و مقرر بھی تھے لیکن ان کا اصل میدان تصنیف و تالیف تھا۔ ان کی شخصیت کے اصل جوہر قلم و قرطاس کی صحبتوں ہی میں کھلے ہیں۔ وہ اپنی تمام حیثیتوں میں مصنف سب سے بڑے تھے۔ مختلف علوم و فنون میں ان کی تصنیفات ہیں۔ ان کی کوئی تصنیف اٹھا کر دیکھیے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذوق کو سب سے زیادہ مناسبت اسی فن سے ہے۔ تاریخ اسلام' تذکار بزرگانِ دین' تعلیم' تاریخ آزادی اور تحریکات سیاسی' دینی' سوانح و سیرت' نقہ و فتویٰ نویسی' تفسیر میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے افادات کی تالیف سے لے کر افسانہ نویسی تک بے شمار موضوعات پر اور مختلف فنون میں ان کی ضخیم تالیفات سے مختصر مقالات تک پچاسوں تحریرات یادگار ہیں اور ہر دائرۂ فن کی تحریرات میں انہوں نے مقاصد کی بلندی' خیالات کی اہمیت' مطالب کی افادیت' فکر کی جامعیت' معنی آفرینی' مطالعے کی وسعت' زبان کی سلاست اور بیان کی شگفتگی کا نقش ثبت کر دیا ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی سیاسی تالیفات و تحریرات اپنی کمیت اور کیفیت ہر دو لحاظ سے تاریخ سیاسیات ہند و پاکستان کے لٹریچر میں اپنی مثال نہیں رکھتیں۔ ان کی سیاسی تالیفات میں

☆ علمائے ہند کا شاندار ماضی (چار جلدیں)'

☆ علمائے حق اور ان کے مجاہدات کارنامے (دو جلدیں)'

☆ تحریک شیخ الہند عرف تحریک ریشمی رومال'

☆ اسیرانِ مالٹا اور

☆ جمعیت العلماء کیا ہے؟ (دو حصے) نیز

☆ جمعیت علمائے ہند کے نصب العین اور مقاصد و خدمات کے تعارف میں اور اس سے آگے اس کے مسلک اور مختلف سیاسی مسائل میں اس کے نقطۂ نظر کی ترجمانی اور مخالفین کے اعتراضات کے رد میں اور اس کے دفاع میں بلاشبہ ان کے بیسیوں مستقل رسائل' اخبارات میں تحریرات' مختلف مواقع میں بیانات اور بعض اہم فتاویٰ کی صورت میں تاریخی اہمیت کا نہایت موثر' فکر انگیز اور افادیت سے معمور ذخیرہ یادگار ہے۔ اتنا اور ایسا سرمایۂ ادب کسی ایک قلم سے ان کے عہد میں موجود نہیں۔

جمعیت پبلی کیشنز کے قیام کے وقت ہی سے مورخ ملت مولانا سید محمد میاں کی نہ صرف مستقل تالیفات کی اشاعت پیش نظر تھی بلکہ ان کی دیگر تحریرات کی فراہمی اور ان کی تدوین و اشاعت جمعیت پبلی کیشنز کے مقاصد میں شامل تھی اور یہ نہ صرف عزم تھا بلکہ سعی وعمل کا قدم بھی اٹھا دیا گیا تھا۔ تاریخ اسلام کے سلسلے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عہد زریں' اسیران مالٹا' تحریک ریشمی رومال اور علماء حق کے مجاہدانہ کارنامے، آنے والے انقلاب کی تصویر اسی سلسلے کے آغاز کی کڑیاں ہیں۔ اب توفیق الٰہی نے اس راہ میں ایک قدم اور بڑھانے کی ہمت عطا فرمائی ہے اور حضرت مورخ ملت رحمہ اللہ کی ایک اہم تالیف ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ حضرت مورخ نے یہ کتاب بھی بڑے ہنگامہ خیز دور اور نازک حالات کے ہجوم میں لکھی تھی۔ یہ دور جمعیت علمائے ہند کے لیے بڑی آزمائش کا تھا اور تمام رہنما بشمول حضرت مولف رحمہ اللہ خطرات میں گھرے ہوئے تھے۔

قارئین جانتے ہیں کہ یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے یہ تین جلدوں میں چھپتی رہی ہے جبکہ جمعیت پبلی کیشنز نے اسے بڑے سائز کی ایک ہی جلد میں شائع کردیا ہے تاکہ قارئین کو تمام مواد یکجا میسر آجائے۔ اُمید ہے کہ اس کتاب کی اشاعت تو سیاسی لٹریچر کا عام ذوق رکھنے والوں اور جمعیت علمائے اسلام کے کارکنوں میں خاص طور پر پسند کی جائے گی اور تحریک آزادی ہندو پاکستان کے تاریخی لٹریچر میں بلند مقام کی حامل ہوگی۔

محمد ریاض درانی

یکم اگست ۲۰۰۵ء

ڈائریکٹر جمعیت پبلی کیشنز پاکستان' لاہور

امام ربانی مجدد الف ثانی

سیدنا ابوالبرکات بدرالدین حضرت مولانا شیخ احمد صاحب فاروقی سرہندی قدس اللہ سرہٗ و برد مضجعہٗ

وطن اور خاندان

سرزمین پنجاب اب بھی موجود(1) ہے اور یہاں ایک قصبہ جس کا نام سرہند ہے اب بھی آباد ہے۔ چند صدی پیچھے لوٹیے، دسویں صدی ہجری پر نظر ڈالیے، یہاں آپ کو فاروقی شیوخ کا ایک خاندان ملے گا جس کے مورث ایک عرصہ پہلے کابل سے چل کر یہاں پہنچے تھے اور یہیں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔

اسی خاندان کے ایک بزرگ جناب مولانا شیخ عبدالاحد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز تھے۔ ظاہری و باطنی کمالات سے مزین، فیوض و برکات کا سرچشمہ، سیدنا حضرت شیخ عبدالقدوس صاحب گنگوہی کے خلیفہ، سلسلۂ چشتیہ میں بہت بڑے صاحب نسبت، اور طریقۂ قادریہ میں بھی آپ کو اجازت حاصل تھی۔

جس طرح فیوضِ باطنی سے اربابِ طریقت مریدین بہرہ ور ہوتے رہتے تھے اسی طرح علوم ظاہری "معقولات اور منقولات" کے طلبہ بھی اطراف و اکناف سے تشنہ لب حاضر ہوتے اور سیراب ہو کر دریا بداماں واپس ہوتے۔

ایک مبارک شب میں آپ مصروف استراحت ہیں، قلب مبارک ملاءِ اعلیٰ کی طرف متوجہ ہے، دفعتاً ایک خواب نظر آتا ہے:

تمام جہان میں تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ سؤر، بندر، ریچھ لوگوں کو ہلاک کر رہے ہیں۔ یکایک سینہ سے ایک نور نکلتا ہے جس میں ایک تخت نمودار ہوتا ہے۔ تخت پر ایک شخص تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ اس کے سامنے تمام ظالم، بے دین اور ملحد، بھیڑ بکری کی طرح ذبح کیے جا رہے ہیں، اور کوئی شخص بلند آواز سے کہہ رہا ہے:

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۝ حق آیا، باطل تو ہو گیا باطل اسی لئے ہے کہ فنا ہو۔

حضرت شیخ بیدار ہوئے تو آپ کو مسرت آمیز حیرت تھی۔ مزید تشفی اور اطمینان کے لئے آپ نے اس زمانے کے مرشد کامل قطب دوراں حضرت شاہ کمال صاحب کیتھلی(2) سے تعبیر دریافت کی۔ شاہ صاحب نے فرمایا: "تمہارے ایک لڑکا پیدا ہوگا جس سے الحاد اور بدعت کی ظلمت دور(3) ہوگی"۔

ولادت باسعادت

۱۴ شوال ۹۷۱ھ (نوسو اکہتر) روزِ جمعہ کی شب میں اس مبارک خواب کی تعبیر صادق ہوئی۔ صبح صادق سے پیشتر ہی افق جگمگا اٹھا۔ مشرق سعادت کی پیشانی منور ہوئی کیونکہ تجدد اور نور کا آفتاب طلوع ہوا۔ الف ثانی کی قسمت جاگی۔ علم و عرفان کی اُجڑی ہوئی بستی پھر آباد ہونے لگی۔ رشد و ہدیٰ کے خزاں زدہ گلشن نے فصل گل کی تیاری کی۔

اسم گرامی اور سلسلۂ نسب

نام مبارک "احمد" تجویز ہوا۔ نسب شریف "انتیس"[۲۹] واسطوں سے امیر المومنین فاروق اعظم عمر بن الخطابؓ تک پہنچتا ہے اس نسب اقدس پر خود آپ کو بھی ناز تھا۔ چنانچہ حیست وغیرت کے موقعہ پر اپنے مکتوبات میں بھی تحریر فرمایا کرتے تھے۔ (۴)

"بے اختیار رگ فاروقیم درحرکت آمد"

تحصیلِ علم

حفظ قرآن مجید کی فراغت کے بعد اکثر کتب درسیہ والد ماجد سے اور کچھ سرہند کے دوسرے علماء سے پڑھیں۔ عام درسیات اور کتب تصوف مثلاً تعرف، عوارف المعارف اور فصوص الحکم وغیرہ والد بزرگوار سے، کتب حدیث حضرت شیخ یعقوب صاحب کشمیری سے، امام واحدی کی تفسیر بسیط، نیز تفسیر "وسیط" اور اسباب النزول، تفسیر بیضاوی، منہاج الوصول، الغایۃ القصویٰ، صحیح بخاری شریف، الادب المفرد، ثلاثیات، مشکوٰۃ شریف، شمائل، ترمذی شریف، قصیدۂ بردہ وغیرہ حضرت مولانا قاضی بہلول صاحب بدخشانی سے، معقولات کی کتابیں آپ نے مولانا کمال صاحب کشمیری سے پڑھیں، جو اس زمانہ میں ماہر فن سمجھے جاتے تھے۔

تحصیلِ طریقت

ابتداءً آپ نے طریقۂ چشتیہ میں والد بزرگوار سے بیعت کی اور اس کا سلوک تمام کیا۔ پھر طریقۂ قادریہ پر راہ روی شروع کی۔ اس کے رہنما اور مرشد بھی والد بزرگوار ہی تھے۔ مگر خرقۂ خلافت حضرت شاہ سکندر (۵) نبیرہ حضرت شاہ کمال صاحب کیتھلیؒ سے حاصل ہوا۔

سترہ برس کی عمر میں جامع کمالات

الحتصر صرف سترہؔ سال کی عمر میں آپ ظاہری اور باطنی کمالات کے جامع اور ہادی بن کر اپنے والد صاحب کے سامنے ہی کتب درسیہ کی تعلیم اور طریقہ کی تلقین فرمانے لگے۔

طریقۂ کبرویہ کی تحصیل

اسی زمانہ میں سلسلۂ کبرویہ کے مشہور ولی حضرت مولانا یعقوب صاحب صرفی تھے۔ آپ سے مجدد صاحب نے طریقۂ کبرویہ بھی حاصل کیا۔

طریقۂ نقشبندیہ کا شوق اور بیعت

چشتیہ، قادریہ اور کبرویہ طریقوں سے مراحل معرفت طے فرما چکے تھے، مگر طریقۂ نقشبندیہ کا شوق اب بھی قلب اطہر میں باقی تھا جو بڑھتے بڑھتے عشق کی حد تک پہنچ گیا۔ حتیٰ کہ ۱۰۰۷ھ میں جب کہ آپ کے والد بزرگوار نے اس دارِ فانی سے رحلت فرمائی اور آپ بارادہ حج بیت اللہ اپنے وطن مبارک سے روانہ ہو کر دہلی پہنچے تو ملا حسن کشمیری سے ملاقات ہوئی جن سے غالباً پہلے سے شناسائی تھی۔ انہوں نے برسبیل تذکرہ حضرت خواجہ باقی باللہ نقشبندی احراری کا ذکر کیا۔ حضرت خواجہ باقی باللہ صاحب[۹] اطراف کابل کے باشندے تھے اور غیبی اشارات کی بنا پر ہندوستان تشریف لائے تھے، تاکہ یہاں سلسلۂ نقشبندیہ کی ترویج فرمائیں۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے:

ایں تخم پاک رااز سمرقند و بخارا	اس پاک تخم کو سمرقند و بخارا سے لائے
آوردیم و در زمین برکت آگین ہند	اور ہندوستان کی زمین برکت آگیں
کشتیم الحمد للہ کہ بعنایت الٰہی	میں بویا۔ الحمدللہ کہ خداوندِ عالم کی
شجرہ طیبہ اصلہا ثابت و فرعہا	عنایت سے ایسا درخت بن گیا جس کی جڑ
فی السماء ظاہر شد	زمین میں اور پھونگل آسمان میں

بہرحال ملا حسن کشمیری سے جیسے ہی سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک مرشد کامل کا تذکرہ سنا۔ زیارت کا وہی اشتیاق قلب مبارک میں پیدا ہوا جو سالہا سال کے آرزو مند اور مشتاق کو ہونا چاہئے تھا۔ آپ جلد سے جلد حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

خدا کے دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

یہ خداوندی انعام تھا کہ حضرت خواجہ صاحبؒ بھی اپنی عام عادت کے برخلاف مجدد صاحب سے بہت زیادہ ملاطفت اور بشاشت سے پیش آئے اور دو چار ہفتہ دہلی میں قیام کی ترغیب فرمائی۔ حضرت امام ربانی نے ڈھائی ماہ دہلی میں قیام فرمایا۔ جو قلب ابتدا ہی سے صیقل پا چکا تھا وہ اس ڈھائی ماہ کی صحبت میں کندن بن گیا، اور نسبت نقشبندیہ کامل طور پر حاصل ہوگئی۔ اس کے بعد مجدد صاحبؒ دو مرتبہ اور دہلی تشریف لائے اور خواجہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

پہلی مرتبہ حضرت خواجہ صاحبؒ نے خوش خبری سنائی کہ آپ کو نسبت نقشبندیہ کامل طور پر حاصل ہوگئی۔ اب قرب خداوندی میں روز افزوں ترقی کی امید ہے۔

دوسری حاضری میں خلعت عطا فرمائی گئی اور خاص اصحاب کو تعلیم کے لئے مجدد صاحب کے سپرد کیا گیا۔

تیسری بار حضرت خواجہ صاحب نے چند قدم چل کر استقبال فرمایا اور بڑی بڑی بشارتیں سنائیں اور بہت کچھ اعزاز و اکرام کیا۔

حضرت امام ربانی جب تیسری بار حضرت خواجہ صاحب سے رخصت ہونے لگے تو حضرت خواجہ صاحب قدس سرہ نے فرمایا کہ جب میں نے ہندوستان آنے کا ارادہ کیا تھا تو استخارہ کیا۔ مجھے استخارہ میں معلوم ہوا کہ ایک شیریں نغمہ خوبصورت طوطا میرے ہاتھ پر آکر بیٹھ گیا ہے میں اپنا لعاب دہن اس کے منہ میں ڈال رہا ہوں اور وہ اپنی چونچ سے میرے منہ میں شکر ڈال رہا ہے۔ میں نے اس استخارہ کو حضرت شیخ مرشد خواجہ امکنکی (۷) سے بیان کیا۔ فرمایا کہ: ہندوستان میں تمہاری تربیت سے کوئی ایسا شخص ہوگا جس سے ایک عالم منور ہوگا اور تم کو بھی اس سے حصہ ملے۔

مختصر یہ کہ اسی قسم کی بہت سی بشارتیں حضرت مجدد صاحب کو سنا کر رخصت کیا۔

حضرت مجدد صاحبؒ کا حلیہ شریف اور اوصاف و خصائل

حلیہ

قد مبارک متوسط، چہرہ انور باوجاہت، رنگ گندمی مائل بہ سفیدی، پیشانی کشادہ، داڑھی گھنی، آنکھیں بڑی بڑی، صورت اقدس انوار ولایت سے تاباں، خوبصورتی اور ملاحت کے ساتھ آثار رعب و ہیبت نمایاں، جو دیکھ لیتا بے اختیار یہی کہتا: فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ

اوصاف

نہایت حلیم، کریم النفس، مدبر، ذہین، ذکی، کلام نہایت شیریں اور شائستہ و شستہ، طبیعت نہایت غیور اور خود دار، استغناء کی یہ حالت کہ باوجودیکہ جہانگیر جیسا بادشاہ غلام بن گیا تھا، مگر کبھی کوئی مستقل ذریعہ آمدنی کا نہ پیدا ہوا، نہ پیدا کرنے کا خیال فرمایا۔

اتباع سنت

مندرجہ ذیل چند واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اتباع سنت اور بدعات سے اجتناب و احتیاط کس حد تک بڑھی ہوئی تھی۔

(الف) ایک مرتبہ کسی خادم سے فرمایا۔ فلاں جگہ کچھ لونگیں رکھی ہیں، جاؤ لے آؤ وہ گیا اور چھوارے نے

آیا۔ آپ نے اس کو تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

ہمارے صوفی کو اب تک یہ بھی خبر نہیں کہ جفت کے مقابلہ پر طاق کو بہتر قرار دیا گیا ہے۔ اسی کی رعایت مسنون ہے۔ اَللّٰہُ وِتْرٌ وَیُحِبُّ الْوِتْرَ۔

میں تو منہ دھوتے وقت خیال رکھتا ہوں کہ پہلے داہنے رخسار پر پانی پڑے۔ کیونکہ "تیامن" یعنی داہنی جانب کو مقدم رکھنا بھی مسنون ہے۔

(ب) مکتوب نمبر ۳۱۳ جلد اول ۴۵۲ مولانا محمد ہاشم صاحب کو اس سوال کے جواب میں کہ کرتے کا چاک گریبان سامنے سینہ پر ہونا مسنون ہے یا شانوں پر؟ لکھتے ہیں:

بداں کہ ماہم دریں باب تردداریم اہل عرب پیراہن پیش چاک می پوشند و آں راسنت می دانند و از بعضے کتب حنفیہ مفہوم می شود کہ پیراہن پیش چاک مرداں را نباید پوشیدہ کہ لباسِ زناں است۔

واضح ہو کہ اس بارہ میں ہمیں بھی تردد ہے۔ عرب والے سامنے سینہ پر گریبان رکھتے ہیں اور اسی کو مسنون قرار دیتے ہیں اور حنفیہ کی کچھ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کے کرتے میں سینہ پر گریبان نہ ہونا چاہیے، یہ عورتوں کی وضع ہے۔

اس کے بعد فقہ کی کتابوں کی عبارتیں نقل فرمائی ہیں اور اپنی تحقیق یہ بیان فرمائی ہے کہ چاک گریبان کے لئے کوئی خاص ہیئت مسنون نہیں ہے البتہ احادیث میں عورتوں سے مشابہ لباس پہننے سے منع فرمایا گیا ہے، لہذا جن مقامات میں عورتوں کے کرتوں میں گریبان سامنے رہتا ہو، وہاں مردوں کو شانوں پر چاک رکھنا چاہیے، جیسا کہ علماء ماوراء النہر اور علماء ہند کی وضع ہے (۸) چنانچہ حضرت کے کرتہ کا چاک بھی دونوں شانوں پر رہتا تھا۔

مختصر یہ کہ لباس، وضع قطع، رفتار و گفتار، خورد و نوش، آداب مجلس نشست و برخاست، رنج و راحت غرض ہر شعبۂ زندگی کے معمولی سے معمولی جزو میں بھی رسول اللہ ﷺ کی سنت کی تحقیق اور تفتیش پوری کاوش اور جدوجہد سے کرتے اور پھر اسی کی اتباع کرتے۔

مکتوب نمبر ۵۴ جلد دوم ص ۱۰۰ تا ۱۰۴ میں اتباع سنت کے سات درجے بیان فرماتے ہوئے چوتھے درجہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

یہ درجہ اس کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتا کہ انسان بدعت کے نام سے بھی نفرت اور پرہیز کرے حتیٰ کہ جن چیزوں کو بدعت حسنہ کہا جاتا ہے ان سے بھی اجتناب کرے۔

عبادت

جس کے لئے دنیا نے صرف مرشد یا قطب عالم کے خطاب پر قناعت نہ کی ہو بلکہ مجدد کا خطاب دیا ہو اور

پھر مجدد بھی ایک صدی کا نہیں بلکہ پورے ہزارہ کا مجدد تسلیم کیا ہو، اس کی عبادت میں کثرت ایک بدیہی چیز ہے۔

ہاں نوافل میں جن چیزوں کا خاص طور پر لحاظ کیا جاتا تھا ان کا بیان غیر موزوں نہ ہوگا۔ ابتداء میں نفل نمازوں میں سورۂ یٰسین پڑھا کرتے تھے جس کی تعداد اسی ۸۰ تک پہنچتی ہے۔ مگر آخر میں ختم قرآن معمول ہوگیا تھا۔ جو دعائیں خاص خاص اوقات کے لئے احادیث میں وارد ہوئی ہیں، ان دعاؤں کا التزام گویا فطری عمل ہوگیا تھا جو بلا قصد بھی صادر ہوجاتا تھا۔

رات دن کا نظام الاوقات

نصف شب سے تہجد کے لئے اٹھنے کا معمول تھا۔ اور ہر دو رکعت کے بعد توبہ، استغفار، درود شریف اور دعاؤں کے بعد مراقبہ فرماتے تھے۔ یہ سلسلہ فجر تک قائم رہتا تھا۔ فجر کی نماز جماعت سے پڑھنے کے بعد اشراق تک اپنے متوسلین کے ساتھ مراقبہ میں بیٹھتے تھے۔ اشراق کے بعد دیگر مشاغل میں مصروف ہوتے۔ اکثر متوسلین کا ہجوم رہتا۔ حتیٰ کہ چاشت کی نماز کا وقت ہوجاتا۔ نماز چاشت کے بعد کچھ غذا تناول فرماتے۔ جو فقراء حاضر خانقاہ ہوتے وہ بھی دسترخوان پر حاضر ہوتے، یا ان کو کھانا تقسیم کردیا جاتا۔ کھانے کے بعد قیلولہ فرماتے۔ پھر زوال کے بعد سنتیں اور اس کے بعد ظہر کی سنتیں اور فرض وغیرہ سے فراغت پاکر متوسلین باریاب ہوتے اور فیوض و برکات سے استفادہ کرتے۔ یہ سلسلہ نماز عصر تک جاری رہتا۔ اذان عصر کے بعد تحیۃ الوضو اور عصر کے نوافل پڑھتے۔ پھر جماعت سے فراغت پاکر تلقین کا سلسلہ جاری رہتا۔ نماز مغرب کے بعد نوافل کا طویل سلسلہ عشاء کے قریب تک جاری رہتا۔ نماز عشاء کے بعد آرام فرمانے کا وقت تھا۔ رات دن کے نوافل میں ایک قرآن شریف ختم کرلیا جاتا۔ اسی اثناء میں تصانیف، مکاتیب اور درس وتدریس، وعظ وتلقین کا سلسلہ جاری رہتا۔ سفر میں بھی معمولات پر پابندی کی کوشش کی جاتی۔

مجالس

مجالس میں ذکر خیر، احادیث اور قرآن پاک کی شرح وتفسیر کا سلسلہ اہم ترین مشغلہ تھا۔ بسا اوقات حفاظ سے اور نو وارد قراء سے بھی قرآن شریف پڑھوا کر سنا جاتا۔ قرآن پاک سے شغف اور محبت کے متعلق گویا آپ کا معمول جامی کا یہ شعر تھا:

مصلحت نیست مرا سیری ازاں آبِ حیات
ضَاعَفَ اللّٰہُ بِہٖ کُلَّ زَمَانٍ عَطَشِیْ

مہمان نوازی

ہر روز تقریباً ایک سو علماء اور صلحاء اور حفاظ آپ کے دسترخوان پر حاضر ہوتے تھے۔ رمضان المبارک میں یہ تعداد اور بھی بڑھ جاتی تھی۔

حقوق عباد

حقوق عباد کی ادائیگی ولایت کے لئے شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک مجدد حقوق عباد کی ادائیگی میں کس قدر مستعد ہوگا، اس کی توضیح کی ضرورت نہیں اسی طرح اولاد کی خبر گیری، اہل وعیال کی تعلیم وتربیت علوم شرعیہ کی زبانی اور کتابی تعلیم اور احکام ربانی پر عمل کرانے کی جدوجہد وغیرہ وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو ولی اللہ کی پاک زندگی میں کسی بیان کی محتاج نہیں۔

ماحول اور خدمات

عبادت، حسن معاشرت، ذکر وشغل، حسن اخلاق بے شک بیش بہا جواہر ہیں، انمول موتی ہیں۔ دین ودنیا کی سعادت عظمیٰ کا راس المال ہیں۔ مگر مجددیت کا اثبات ان چیزوں سے نہیں کیا جاتا۔

مجدد کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان رخنوں اور کوتاہیوں کو دور کرے جو اہل ملت کی افراط وتفریط کے باعث ملت میں پیدا ہوگئے ہیں۔

جبکہ رسول اللہؐ پر سلسلۂ نبوت ختم کر دیا گیا تو اہم سوال یہ تھا کہ انسانی طبقات کی فطری کجروی وشیطانی دسیسہ کاری جو بسا اوقات غیر دین کا رنگ دے کر یا ارکان دین کو غیر ضروری مان کر دجل اور آویزش سے ایوان دین کو متزلزل کر دیا کرے گی، اس کا تدارک کیا ہوگا؟ تو اس کے علاج کے لئے جیسا کہ بہت سی احادیث میں یہ مضمون ادا فرمایا گیا کہ:

''امت اسلامیہ کے پختہ کار ربانی علماء ہر زمانہ میں موجود رہیں گے جو راہ مستقیم پر جم کر متوطنین کو بھی سیدھی راہ بتاتے رہیں گے''۔(۹)

اسی طرح یہ ارشاد ہوا:

اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا۔	خداوند عالم اس امت کے لئے ہر سو ۱۰۰ سال پر ایک ایسا شخص پیدا کرتا رہے گا جو دین کو تازہ کرتا رہے گا۔

(ابوداؤد شریف، مستدرک حاکم، معجم اوسط طبرانی، بیہقی وغیرہ)

یہاں اہم سوال یہ ہے کہ وہ کونسی خدمات ہیں جن کی بنا پر امت نے آپ کو نہ صرف سو سال کا مجدد تسلیم کیا بلکہ پورے ہزارہ کا مجدد آپ کو تسلیم کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ تجدید اور مجددیت کا تعلق صرف کثرت عبادت وریاضت یا حسن طریقت نہیں رہ جاتا۔ یہاں اس کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔ چنانچہ خود حضرت مجدد صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''فرزندا! باوجود اس معاملہ کے جو میری پیدائش سے متعلق ہے ایک بڑا کارخانہ میرے حوالہ فرمایا گیا

ہے۔ پیری مریدی کے لئے مجھ کو نہیں لایا گیا اور میری پیدائش سے سالکین کی تربیت اور ارشادِ خلق بھی مقصود نہیں۔ ایک دوسرا معاملہ ہے اور ایک دوسرا کارخانہ۔ اس اثناء میں جو شخص مناسبت رکھے گا، فیض حاصل کرے گا ورنہ نہیں۔ میرے سپرد کردہ کارخانہ کے مقابلہ میں تکمیل و ارشاد کا معاملہ تو ایک ایسا معاملہ ہے جیسے راستہ کی کوئی پڑی ہوئی چیز ہو"۔ (۱۰)

کارخانہ سے اشارہ صباحت و ملاحت وغیرہ کے اُن وقیق اور غامض اسرار کی جانب ہے جو مکتوب کے پہلے حصہ میں بیان فرمائے گئے۔ مگر ہم جیسے کور باطن جو تاریخ کے اوراق کو سامنے رکھ کر واقعات کے اسباب اور دعووں کے دلائل تلاش کرنے کے عادی ہیں، کسی روحانی کارخانہ کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ہم حقیقت آفتاب سے واقف نہیں۔ ہم تو نورِ آفتاب دیکھ کر ہی کہہ دیا کرتے ہیں آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ لہٰذا معین طور پر یہ دعویٰ تو یقیناً بے محل ہوگا کہ مجددیت کی جو دلیل ہم تاریخ کی روشنی میں پیش کریں گے صرف وہی ایک دلیل ہے۔ البتہ یہ یقیناً کہیں گے کہ تاریخ بھی اپنے اوراق کے دامنوں میں کچھ ایسے واقعات چھپائے ہوئے ہے جن کے انجام دینے والے کو بلاتحاشہ مجدد ہی کہنا چاہیے۔ تاریخی حیثیت سے دلائلِ مجددیت پیش کرنے کی خاطر ہمیں سب سے پہلے اُس ماحول کا تعارف کرانا ضروری ہے جس میں حضرت مجدد صاحبؒ نے ظہور فرمایا اور اپنی مقدس حیات کے ۶۳ سال گزارے۔

فتنۂ اکبری

اکبری اور جہانگیری عہد

۹۶۳ھ سے لے کر ۱۰۱۴ھ تک پچاس سال سے بھی کچھ زائد جلال الدین اکبر ہندوستان کا بادشاہ رہا۔ اس کو آج بھی شہنشاہ اکبر کہا جاتا ہے۔ پھر ۱۰۱۴ھ سے جہانگیری عہد شروع ہوتا ہے جو ۲۲ سال کے بعد حضرت مجدد صاحب ؒ کی وفات کے ساتھ ساتھ ختم ہوا۔ حضرت مجدد صاحبؒ ۹۷۱ھ میں پیدا ہوئے جو عہد اکبری کا شباب تھا۔ سترہ اسال تعلیم و تربیت کے ختم کرکے اس فریضہ کی ادائگی میں مشغول ہو گئے جس کا نتیجہ مجددیت کا خطاب تھا۔ یعنی ۹۸۸ھ سے جو کہ عہد اکبری کا پر شوکت دور تھا آپ نے اصلاحی خدمات شروع کیں۔

کہہ سکتے ہو کہ مظہر اسلام سیاست ہے اور اسی لئے سیاسی خدمات کو اسلام میں سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ جب کوئی اس نظریہ کو لے کر اسلامی خدمات انجام دینا چاہے گا تو لامحالہ اس کا مقابلہ سب سے پہلے اُس زمانہ کی سیاست سے ہوگا۔ چونکہ شخصی حکومتوں میں بادشاہ کا طرز و طریق اور اس کے افعال و اطوار ہی سیاست ہوتے ہیں لہٰذا اکبری سیاست بیان کر دینا ہی حضرت مجدد صاحب کے سیاسی ماحول کا بیان ہوگا۔

مگر اکبری سیاست کی توضیح و تشریح سے پیشتر چند چیزیں پیش کرنی ضروری ہیں۔

آج جبکہ تاریخی موشگافیوں میں رگ گل پر بھی نشتر زنی سے نہیں چونکا جاتا اور شوق تحقیق میں چیونٹی کی آنکھوں کے پردے گننے کی بھی ہمت کی جاتی ہے تو اس معمہ کے حل کرنے میں کچھ زیادہ وقت نہ ہونی چاہیے کہ:

(الف) جلال الدین اکبر کو "اکبر دی گریٹ" کیوں کہا جاتا ہے؟

(ب) بیربل اور اکبر کی کہانیاں کیوں آج تک ہندوستان کے گلی کوچوں میں برادرانِ وطن کے بچے بچے کی زبان پر ہیں، اور اس کے نورتن کا تذکرہ آج تک دلچسپ اور............ بنا ہوا ہے؟

(ج) غریب عالمگیر کا کونسا جرم ہے کہ مذہبی تعصب، مذہبی دیوانہ اور لفظ عالمگیر کو مرادف بنالیا گیا؟ حتیٰ کہ بقول مولانا مناظر احسن گیلانیؒ: (۱۱)

کمپنی بہادر کے عہد میں سب سے پہلے جو ہندوستان کی تاریخ فارسی زبان میں مرتب ہوئی، وہ بہار جو بنگال کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کا سب سے پہلا اجارائی محروسہ ہے۔ اسی بہار کے ایک طباطبائی سید صاحب کے قلم سے یہ فقرہ ان کی کتاب سیر المتاخرین میں درج ہوا۔

"مذہب الٰہی جس میں خلق اللہ کے لئے بے شمار فائدے تھے جہانگیر کے زمانہ تک اس کا چرچا اور رواج رہا اور پھر شاہ جہاں کے زمانہ سے تعصب شروع ہوا اور عالمگیر کے عہد میں اس نے شدت اختیار کرلی"۔ (۱۲)

ہم یہاں ملا عبدالقادر صاحب بدایونی کی مشہور کتاب "منتخب التواریخ" کے اقتباسات کو مذکورہ بالا سوالات کے حل کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔

ملا صاحب موصوف عہد اکبری کے مؤرخ ہیں۔ درباری آدمی ہیں۔ حلفیہ شہادت (۱۳) کے ساتھ تمام واقعات کو قلمبند کرتے ہیں اور اس موقع پر ہم شکر گزار ہیں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ کے کہ آپ کے مضمون (۱۴) نے ہمیں ترتیب کی اُلجھن سے نجات دلادی۔ فللہ الحمد ولھم الشکر جزاھم اللہ احسن الجزاء۔

اکبر بادشاہ کی سیاست

اکبر بادشاہ ۱۵۴۲ء/۹۵۰ھ میں سندھ کے ریگستان میں "امرکوٹ" کے مقام پر اس وقت پیدا ہوا تھا جب اس کا باپ "ہمایوں" شیر شاہ افغانی کے ہاتھ سے بھاگتا پھر رہا تھا۔ ہمایوں کی جب وفات ہوئی تو اس کی عمر ۱۳ سال ۴ ماہ تھی۔ تخت سلطنت پر اکبر کو بٹھا دیا گیا۔ اور اس کے اتالیق "بیرم خاں" کے ہاتھ حکومت کی باگ ڈور دے دی گئی۔ اس وقت اس کو عادل شاہ اور سکندر سوری کی افغانی فوجوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ کچھ دنوں اکبر، بیرم خاں کی تربیت میں رہا، اور جب زمام حکومت مستقل طور پر اس نے اپنے ہاتھ میں لی تو اس کی سیاست تین

طاقتوں میں محصور تھی۔

(الف) افغان، جن سے اس کا باپ شکست کھا کر ہندوستان سے جلاوطن ہو چکا تھا اور پھر خود اکبر کو ان کے مقابلہ کے لئے تیار رہنا پڑتا تھا۔

(ب) شیعہ، جن کا مرکز ایران تھا اور جن کی بدولت ہمایوں کو دوبارہ دہلی کا تخت نصیب ہوا تھا۔

(ج) ہندو، جو اگرچہ ہندوستان میں ۹۵ فیصدی اکثریت میں تھے مگر شاہانِ گزشتہ کے رعب و شکوہ سے اس درجہ مقہور ہو چکے تھے کہ اب ان میں مقابلہ کی طاقت نہیں رہی تھی۔

اکبر اگر کسی ایک مذہب پر مستقل طور سے قائم رہتا تو اس کو دوسرے مذہبوں سے ٹکرانا پڑتا تھا۔ اور چونکہ افغان اس کے مقابل تھے۔ لہٰذا اکبر کے لئے شیعوں اور ہندوؤں کی دلداری کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے سیاست کو مذہب پر ترجیح دی اور سنیوں کے سوا ہر ایک کی دلداری میں مشغول ہو گیا۔ اپنے دربار میں ہر مذہب کے علماء کا اجتماع کرانا، مباحثے سننا، یہ اس کی سیاست تھی تاکہ ہر ایک مذہب کی توقعات اس سے وابستہ ہوں۔ کاش وہ مذہب کا عالم ہوتا، تو اسی دلداری میں اسلامی حکومت کا نقشہ بھی قائم کر دیتا۔ ورنہ کم از کم بد دینی نہ اختیار کرتا۔ مگر وہ دستخط کرنے بھی نہ جانتا تھا۔ اس نے اصلاح کے بجائے افساد کی طرف قدم بڑھایا، اور ایک نئے مذہب کی ترتیب شروع کر دی جس کا نام "دینِ الٰہی" تھا۔

منتخب التواریخ کے الفاظ میں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ کی ترتیب کے مطابق اس مذہب کی داستان ملاحظہ فرمایئے:

دینِ الٰہی کے عناصر

"آفتاب کی عبادت دن میں چار وقت یعنی صبح و شام، دوپہر اور آدھی رات میں لازمی طور پر کرتا تھا۔ اور ایک ہزار ایک آفتاب کے ہندی ناموں کو اپنا وظیفہ بنایا تھا۔ ٹھیک دوپہر کو آفتاب کی طرف متوجہ ہو کر حضورِ قلب کے ساتھ ان ناموں کو پڑھا کرتا تھا اور اپنے دونوں کانوں کو پکڑ کر بادشاہ ایک چرخ کھاتا اور کانوں کی لو پر مکے لگاتا اور اسی قسم کی دوسری حرکات بھی بہت سی بادشاہ سے صادر ہوتی تھیں۔ وہ قشقہ بھی لگاتا تھا اور آدھی رات کو ایک دفعہ، پھر طلوعِ آفتاب کے وقت دوسری بار روزانہ نوبت اور نقارہ بھی مقرر تھا"۔ (۱۵)

یہ قاعدہ مقرر تھا کہ جب آفتاب کا ذکر کیا جائے تو (نعوذ باللہ) جلت قدرتہ کہا جائے۔

"اسی طرح آگ، پانی، درخت اور تمام مظاہرِ فطرت حتیٰ کہ گائے اور گائے کے گوبر تک کو پوجتا تھا اور قشقہ اور جینو سے اپنے بدن کو آراستہ کرتا تھا، اور آفتاب کے مسخر کرنے کی دعا جس کی تعلیم ہندوؤں نے دی تھی "ورد" کے طور پر آدھی رات کو طلوعِ آفتاب کے وقت پڑھا کرتا تھا"۔ (۱۶)

اور صرف عبادت ہی نہیں کی جاتی تھی، بلکہ "ربوبیت" میں بھی اس کو شریک ٹھہرایا جاتا تھا:

''آفتاب نیر اعظم ہے اور سارے عالم کو وہ داد و دہش کرتا ہے۔ بادشاہوں کا مربی اور سرپرست سورج ہی ہے، اور سلاطین اس کو رواج دینے والے''۔ (۱۷)

کواکب پرستی میں غلو اس قدر بڑھ گیا تھا کہ:

''بادشاہ اپنے لباس کا رنگ سات ستاروں کے رنگ کے موافق رکھتے تھے۔ چونکہ ہر دن کسی ستارہ کے ساتھ منسوب ہے، اس لئے ہر دن کے لباس کا رنگ جداگانہ ستارہ کے رنگ کے مطابق ہوتا تھا''۔ (۱۸)

''خنزیر'' کے متعلق بھی ہندوؤں نے باور کرایا تھا کہ:

''خوک از اں مظہر است کہ حق تعالیٰ در آں حلول کردہ''۔ (نعوذ باللہ)

مبداء اور معاد پر مذاہب کی بنیاد قائم ہے۔ ان میں سے مبداء کے متعلق تو یہ عقیدہ قرار دیا گیا۔ رہا معاد یعنی ''بعد مردن'' اس کے متعلق جدید دین میں:

''تناسخ کے عقیدہ میں بڑی پختگی پیدا ہو گئی تھی''۔ (۱۹)

اعظم خان گورنر بنگال جب دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے کہا:

''ہم نے تناسخ کی صداقت پر قطعی دلائل حاصل کر لئے ہیں۔ شیخ ابوالفضل تمہارے ذہن نشین کرا دے گا''۔ (۲۰)

اس مسئلہ کے متعلق خوش اعتقادی یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ برہمنوں کے مشورہ سے بادشاہ صرف سر کے بیچ کے بال منڈوایا کرتے تھے اور چاروں کناروں کے بال چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ عقیدہ یہ تھا کہ چونکہ بادشاہ کی روح کامل ہو چکی ہے اور:

''کامل مکمل لوگوں کی روح کھوپری (تالو) کی راہ سے نکلا کرتی ہے جو (بدن کے سوراخوں میں سے) دسواں سوراخ ہے۔ جس وقت کاملوں کی روح کھوپری سے نکلتی ہے، اس وقت ایک کڑاکے کی آواز پیدا ہوتی ہے اور یہ آواز میت کی سعادت و نجات کی دلیل ہوتی ہے اور یہ کہ مردوں کو گناہوں سے نجات ہو گئی (جلنے کے وقت آخر میں جو مردوں کی کھوپڑی پھٹتی ہے، اس وقت ایک آواز قدرتی طور پر پیدا ہوتی ہے۔ شاید برہمنوں نے اسی کو نجات کی دلیل بنا لیا ہوگا) اور مذہب تناسخ کے بموجب اس بات کی علامت ہے کہ یہ روح کسی ذی شوکت، صاحب اقتدار اور مطلق العنان بادشاہ کے بدن میں جنم لے گی''۔ (۲۱)

گویا اس طریقہ سے بادشاہ کو یقین تھا کہ مرنے کے بعد پھر کسی دوسرے تخت پر اسی شان و شوکت کے ساتھ جلوہ گر ہوں گے۔ اگرچہ بعض برہمنوں نے تو یہ بھی باور کرا دیا تھا کہ اکبری عہد (الف ثانی) سے چونکہ بجائے قمر کے زحل کا عمل و دخل شروع ہو گیا ہے اس لئے عمر کی کمی جو دورۂ قمر کا نتیجہ تھی، اب نہ ہوگی۔ دورۂ زحل کے متعلق خیال تھا کہ ''مجدد اطوار و ادوار و موروث طول اعمار است''۔

الغرض پہلے تو موت ہی کے وجود کو ایک دور دراز زمانہ تک ملتوی کر دیا گیا اور اس کے بعد بھی یقین دلایا گیا کہ آئندہ بھی بادشاہ کی روح کسی ایسے بادشاہ کے جون میں حلول کرے گی جیسے کہ وہ خود تھا۔ ان باتوں نے تناسخ

پر اس کے قدم کو راسخ کر دیا تھا۔

ملا عبدالقادر لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ مہابھارت کے ترجمہ میں بے ساختہ ایک قصہ کے ذکر میں میرے قلم سے یہ مصرعہ نکل گیا تھا کہ ع

ہر عمل اجرے وہر کردہ جزائے دارد

بادشاہ نے جس وقت یہ مصرعہ سنا، بگڑ گیا۔

''بادشاہ نے منکر نکیر کے سوال، حشر ونشر، حساب ومیزان وغیرہ پر اس مصرعہ کو محمول کر کے اس کو اپنے عقیدہ تناسخ کے مخالف قرار دیا جس کے سوا وہ کسی چیز کا قائل نہیں تھا''۔ (۴۲)

ملا بیچارے کی خیر نہیں تھی۔ بارے ترجمہ کے حیلے رہائی ملی۔

عقائد کے یہی دو اہم جزو تھے اور اکبر کا اپنی میں یہ حال تھا۔ یہ تھے عقائد ''آبرو کی گریٹ'' کے۔ اور ستم ظریفی یہ تھی کہ۔ با ایں ہمہ شرک:

''توحید الٰہی کے نام سے اس مذہب کو موسوم کیا گیا تھا''۔ (۴۳)

مریدوں سے باضابطہ اس دین میں داخل ہونے کے متعلق بیعت لی جاتی تھی۔ سب سے پہلے جو کلمہ پڑھایا جاتا تھا جیسا کہ ملا صاحب لکھتے ہیں:

''طے کر دیا کہ مکلف کریں کہ کلمہ لا الہ الا اللہ کے ساتھ اعلانیہ طور پر ''اکبر خلیفۃ اللہ'' بھی کہیں''۔ (۴۴)

بلکہ اس قول سے تو معلوم ہوتا ہے کہ محض مریدوں ہی تک یہ بات محدود نہ تھی بلکہ عام رعایا کو بھی اس کے کہنے پر قانونی حیثیت سے مجبور کیا جاتا تھا۔

بہرحال جو لوگ اس دین میں باضابطہ داخل ہوتے تھے، ان کو مذکورہ بالا کلمہ کے ساتھ حسب ذیل عہد نامہ کا اقرار کرنا پڑتا تھا۔ ملا صاحب نے اس عہد نامہ کو بجنسہ نقل کر دیا ہے۔

''من کہ فلاں ابن فلاں ہوں۔ اپنی خواہش ورغبت اور دلی شوق کے ساتھ دین اسلام مجازی اور تقلیدی سے (جو باپ دادوں سے دیکھا اور سنا تھا) علیحدگی اور جدائی اختیار کرتا ہوں اور اکبر شاہی دین الٰہی میں داخل ہوتا ہوں۔ اور اس دین کے اخلاص کے چاروں مرتبوں یعنی ترک مال، ترک جان، ترک ناموس وعزت، ترک دین کو قبول کرتا ہوں''۔ (۴۵)

جو لوگ اس دین میں داخل ہوتے تھے اُن کو موافق اصطلاح جو گیاں:

''جس جماعت کو مرید کرتے تھے، ان کا نام الٰہی رکھتے تھے''۔ (۴۶)

ان لوگوں کے لئے یہ دستور ٹھیرایا گیا تھا کہ:

''اپنے خطوط کے سرناموں میں اللہ اکبر لکھا کریں''۔ (۴۷)

نیز بجائے سلام کے:

"مرید جب باہم ملتے جلتے تھے تو ان میں ایک "اللہ اکبر" اور دوسرا "جل جلالہ" کہتا"۔ (۲۸)

مرید کرنے کا طریقہ یہ تھا:

"بارہ بارہ آدمیوں کی ٹولیاں نوبت بنوبت بادشاہ سے مرید ہوتیں، اور مشرب و مذہب میں یہ لوگ موافقت اختیار کرتے"۔ (۲۹)

ان کو شجرہ بھی دیا جاتا تھا۔ لیکن وہ شجرہ کیا ہوتا تھا "حامیان تجدد" کے لئے باعث رشک ہے۔ ہائے ۔

حریفاں بادہا خوردند و رفتند   تہی خم خانہ ہا کردند و رفتند

"شجرہ کی جگہ بادشاہ کی ایک تصویر مریدوں کو دی جاتی تھی۔ اس تصویر کو اخلاص کی علامت، پختگی دولت و اقبال کا مقدمہ خیال کیا جاتا تھا۔ ایک مرصع جواہر نگار غلاف میں اس تصویر کو رکھ کر یہ لوگ اپنی دستاروں پر لگاتے تھے"۔ (۳۰)

علاوہ ان معبودوں کے جنہیں پیر پوجتا تھا، مریدوں کے لئے خود بادشاہ کی عبادت بھی "دین جدید" کے اہم ارکان میں شمار کی جاتی تھی۔ اس عبادت کا خاص طریقہ ملا صاحب لکھتے ہیں:

"ہر صبح اس وقت جبکہ بادشاہ جھروکہ میں آفتاب کی پوجا کرتا تھا، ان مریدوں کی جب تک بادشاہ کے مبارک چہرہ پر نظر نہ پڑتی، دتون کرنا اور کھانا پانی ان پر حرام رہتا۔ ہر ایک حاجت اور ضرورت والے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، عورت ہو یا مرد، تندرست ہو یا بیمار غرض سب ہی طرح کے لوگوں کو اس جگہ آنے کی عام اجازت تھی۔ جس کا نتیجہ کہ ایک بڑا ہنگامہ، ایک بڑا اسپیدہ روز لگ جاتا تھا۔ بادشاہ جونہی آفتاب کے ایک ہزار ایک نام کے وظیفہ سے فارغ ہو کر پردہ سے باہر آتا، سب کے سب ایک دفعہ سجدہ میں گر جاتے"۔ (۳۱)

الغرض بادشاہ تو ذرہ سے لے کر آفتاب تک ہر اس چیز کا پجاری بن گیا تھا، جس میں نفع و ضرر کا پہلو بھی نمایاں ہوتا اور بادشاہ کے مرید علاوہ ان معبودوں کے خود اپنے پیر کو بھی پوجتے تھے۔ اسی سجدہ کا نام "زمین بوس" رکھا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں تاج العارفین صاحب کا صوفیانہ اغوا بھی شریک تھا۔ یہ مولانا زکریا اجودھنی کے صاحبزادے تھے، اور نزہۃ الارواح جو تصوف کی مشہور کتاب ہے، اس پر شرح بھی لکھی تھی، آپ ہی نے بادشاہ کو "عین واجب" لا اقل عکس واجب قرار دے کر:

"بادشاہ کے لئے سجدہ کو واجب قرار دیا (اس کا نام "زمین بوس" رکھا) اور بادشاہ کے ادب کا خیال فرض عین قرار دے کر اس کے چہرہ کو قبلۂ حاجات، اور کعبۂ مرادات بتایا۔ اور بعض کمزور روایتوں اور ہندوستان کے بعض صوفیوں کے طرز عمل سے اس دعوے کو ثابت کیا"۔ (۳۲)

"زمین بوس" کا یہی طریقہ تھا جو بعد میں بھی جاری رہا۔ حضرت مجدد صاحبؒ کے دل کا زخم اس مسئلہ کے منہ سے بالآخر پھوٹ پڑا۔ جیسا کہ آئندہ ذکر آتا ہے۔ اکبری عہد میں عوام ہی نہیں بلکہ خواص علماء بھی اس مشرکانہ فعل کے مرتکب ہوتے تھے۔ ملا صاحب نے ایک عالم کی تصویر زمین بوس کے وقت کی کھینچی ہے۔ فرماتے ہیں

کہ یہ سوادی دربار میں جس وقت حاضر ہوا تو:

''گردن ٹیڑھی کر کے کورنش بجا لایا اور دیر تک ہاتھ اور آنکھیں بند کئے کھڑا رہا۔ دیر کے بعد جب اس کو بیٹھنے کا حکم ملا تو فوراً سجدہ میں چلا گیا اور بے کینڈے اونٹ کی مانند بیٹھ گیا''۔ (۳۳)

یہ حال عقائد و عبادات کا تھا۔ ان کے سوا اور جو باتیں اس ''دین'' کے رسوم و عادات میں تھیں۔ ان کا افسانہ طویل ہے تاہم خروار سے ایک ہی ''مشت'' پر کفایت کی جاتی ہے:

سود اور جوئے کی حلت

ملا صاحب لکھتے ہیں:

''سود اور جوا حلال کر دیا گیا تھا۔ اسی پر دوسری حرام چیزوں کو قیاس کر لینا چاہیے۔ ایک ''جوا گھر'' خاص دربار میں بنایا گیا تھا، اور جواریوں کو شاہی خزانہ سے سودی قرض دیا جاتا تھا۔ (۳۴)

شراب کی حلت

فتویٰ دیا گیا کہ:

''شراب اگر بدن کی اصلاح کے لئے طبی طور پر استعمال کی جائے اور اس کے پینے سے کوئی فتنہ و فساد پیدا نہ ہو، اس طرح شراب پینا جائز ہے۔ البتہ حد سے گزر رہا ہو انشہ اور اس کی وجہ سے لوگوں کا جمع ہو کر شور و غوغا مچانا بادشاہ کو اگر اس کی خبر ہو جاتی تھی، تو سخت دارو گیر کرتے تھے''۔ (۳۵)

اور جس طرح جوئے اور سود کی حلت کی عملی شکل اختیار کی گئی تھی۔ بادشاہ نے خود ہی:

''ایک دوکان شراب فروشی کی دربار ہی کے پاس دربان عورت جو شراب فروشوں کی نسل سے تھی، اس کے اہتمام میں قائم کی گئی تھی، اور اس کے نرخ بھی خود ہی مقرر کئے تھے''۔ (۳۶)

گویا محکمہ ''آب کاری'' کی ہندوستان میں یہ پہلی بنیاد تھی۔ شراب کے مسئلہ میں بادشاہ کو جس قدر غلو تھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ:

''نوروز کی مجلسوں میں اکثر علماء و صلحاء بلکہ قاضی و مفتی تک شراب نوشی کے میدان میں اتارے جاتے تھے''۔

''نشاط'' کی اس مجلس میں مختلف لوگوں کے نام سے جام تجویز کئے جاتے تھے۔ (۳۷)

ملا صاحب لکھتے ہیں کہ:

''ملک الشعراء (فیضی) فرمایا کرتے تھے کہ یہ پیالہ میں فقہاء کے ''اندھاپن'' کے نام سے پیتا ہوں''۔ (۳۸)

داڑھی کی درگت

شراب کی حلت کے بعد ''دین الٰہی'' میں سب سے زیادہ زور جس چیز پر دیا جاتا تھا وہ ریش تراشی کا مسئلہ

تھا۔ ملا صاحب کا بیان ہے کہ ابتداءً ڈاڑھی منڈانے کا خیال "دختران راجہائے عظیم" کی بدولت پیدا ہوا۔ پھر کیا تھا۔ اس خیال کی تائید میں عقلی و نقلی دونوں قسم کے دلائل کا دریا بہا دیا گیا۔ عقلی دلائل میں دلچسپ دلیل تو یہ تھی کہ:

"ڈاڑھی کے بال کی سیرابی چونکہ خصیتین سے ہوتی ہے، چنانچہ کسی خواجہ سرا کے ڈاڑھی نہیں ہوتی، اس کے رکھنے میں کیا ثواب ہوسکتا ہے"۔ (۳۹)

اور نقلی دلائل جو اس سلسلہ میں پیش کیے گئے، ان میں بعض سننے کے قابل ہیں۔ ان ہی سے دوسری دلیلوں کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے۔ فقہ کی کسی کتاب میں لکھا ہوا تھا کہ ڈاڑھی کو اس طرح نہیں تراشوانا چاہیے جس طرح عراق کے اوباش کرتے ہیں۔

اوباش کا ترجمہ عربی میں عصاۃ سے کیا گیا تھا۔ ہندو مسلمانوں کی صورت کو واحد نقطہ پر جمع کرنے کی کوشش میں ایک مولوی صاحب نے عین کو قاف بنا دیا اور شاہی دربار میں انہوں نے عبارت اس شکل میں پیش کی:

کما یفعله قضاة العراق۔ جس طرح عراق کے قاضی منڈایا کرتے ہیں۔

دلیل یہ تھی کہ جب عراق کے قاضی ڈاڑھی منڈاتے تھے تو ہندوستان کے کیوں نہ منڈائیں۔ ملا ابو سعید پانی پتی جو ملا امان کے بھیجے تھے، ان کے پرانے مسودوں سے ایک حدیث (۴۰) بھی بارگاہ شاہی میں گزرائی گئی جس کا ترجمہ ملا صاحب نے یہ درج کیا ہے:

ایک صحابی کے صاحبزادے ڈاڑھی منڈائے ہوئے آنحضرتؐ کے سامنے سے گزرے تو حضورؐ نے فرمایا کہ بہشت والوں کی یہی صورت ہوگی"۔ (۴۱)

آخر میں ریش تراشی کے معاملہ میں اکبر کا جنون اس حد کو بڑھ گیا تھا کہ "ریش تراشی بکاوش میکردند" بیچارے ملا صاحب نے اس کی تاریخ بھی لکھی۔

بگفتہ ریشہا بر باد داده مفسدے چند

دربار اکبری کے بڑے بڑے فضلاء و علماء روزمرہ اپنی اپنی ڈاڑھیاں بادشاہ کے قدموں پر نثار کرتے تھے۔

غسل جنابت

ایک مسئلہ اس "دین جدید" کا یہ بھی تھا:

"ناپاکی کی وجہ سے غسل کے فرض ہونے کا مسئلہ منسوخ کر دیا گیا۔ اس لئے کہ منی نیک لوگوں کی پیدائش کا تخم ہے۔ بلکہ مناسب یہ ہے کہ پہلے آدمی غسل کرے بعد اس کے ہمبستر ہو"۔ (۴۲)

قانون نکاح اور سارڈا ایکٹ

نکاح کے متعلق چند جدید قوانین نافذ کئے گئے ایک تو یہ کہ دختر عم و خال را نکاح نکنند کہ میل کم شود۔ اور اسی کے ساتھ یہ قانون بھی بنا دیا گیا کہ:

''سولہ سال سے پہلے لڑکوں اور چودہ سال سے پہلے لڑکیوں کا نکاح جائز نہ ہوگا اس لئے کہ بچے کمزور پیدا ہوتے ہیں''۔ (۴۳)

گویا ساردا کا نفاذ بھی اسی زمانہ میں ہوگیا تھا۔ ملا صاحب نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے حضرت صدیقہؓ کے نکاح کو عذر میں پیش کیا تھا۔ غنیمت ہے کہ اکبر نے صرف واقعہ کے انکار پر قناعت کی، جیسا کہ لکھتے ہیں:

آنحضرتؐ اور حضرت صدیقہؓ کی رخصتی کے بالکل منکر تھے (یعنی عمر کی مشہور مدت غلط ہے)۔ (۴۴)

نکاح ہی کے سلسلہ کا ایک قانون یہ بھی تھا کہ ''بیشتر از یک زن نکاح نکنند''۔ گویا تعدد ازدواج کا قصہ اسی وقت اُٹھ چکا تھا۔ دلیل میں کہا جاتا کہ ''خدا یکے وزن یکے''۔

یہ بھی حکم تھا کہ آئسہ عورت جس کے ایام بند ہوں، نکاح نہیں کر سکتی۔ اسی طرح ایسی عورت جو مرد سے بارہ سال بڑی ہو، مرد اس کے ساتھ ہمبستری نہیں کر سکتا۔ ایک حکم یہ بھی تھا کہ جب تک لڑکا اور لڑکی کا کوتوالی میں معائنہ نہ کرلیا جائے، اور عمر کا صداقت نامہ حاصل نہ کرلیا جائے ان کا نکاح نہیں ہوسکتا۔ اس کا جو نتیجہ ہوسکتا تھا، ظاہر ہے، بقول ملا صاحب:

''اس ذریعہ سے عہدہ داروں کو کمانے کا خوب موقع ملا۔ خصوصاً کوتوال اور خانوے کلال کے آدمیوں اور ان کے دوسرے مددگاروں اور ماتحتوں کو جو عموماً کمینے ہوتے ہیں، ان کو اس قانون سے جو نفع پہنچا اس کا اندازہ حد وہم وخیال سے باہر ہے''۔ (۴۵)

پردہ

ملا صاحب کی اس عبارت سے:

''جوان عورتیں جو کوچہ و بازار میں نکلتی ہیں، باہر نکلنے کے وقت چاہیے کہ چہرہ یا کھلا رکھیں یا چہرہ کو کھول دیا کریں''۔ (اگر برقعہ وغیرہ ہو)

معلوم ہوتا ہے کہ شاید قانوناً پردہ بھی اُٹھا دیا گیا تھا۔ (۴۶)

زنا کی تنظیم

نکاح کے قوانین میں ان ترمیموں کے سوا عہد اکبری میں بعض علماء نے فقہ حنفی کی رو سے ''جواز متعہ'' کا فتویٰ بھی صادر کیا تھا جس کا قصہ طویل ہے۔ بعضوں نے تو اکبر کے ''الحاد'' کا نقطۂ آغاز اسی مسئلہ کو قرار دیا ہے۔ بعض مولویوں نے بجائے چار کے اکبر کے کانوں تک یہ بھی پہنچا دیا کہ بعض مجتہدینؒ (نو) اور بعض اس سے بھی زیادہ بیویوں کے قائل ہوئے ہیں۔ لیکن یہ باتیں اُس وقت کی ہیں جب تک ان مولویوں کو ''فقیہ کور'' کا خطاب ملا تھا۔ ''دین الٰہی'' کی تدوین کے بعد تو آپ دیکھ چکے کہ ایک سے زائد تک کی حرمت کا قانون بن گیا تھا۔ البتہ بانجھ ہونے کی صورت میں دوسری بیوی کی اجازت تھی۔ ایک طرف تو یہ حال تھا۔ دوسری طرف بغیر نکاح ومتعہ

کے بھی اس فعل کی اجازت ہوگئی تھی۔ گویا قانوناً زنا حرام نہ تھا۔ صرف اس کو منظم کرنے کے لئے ایک دستور بنا دیا گیا تھا۔

ملا صاحب لکھتے ہیں:

''شہر سے باہر آبادی بنائی گئی اور اس کا نام ''شیطان پورہ'' رکھا گیا۔ وہاں باضابطہ محافظ، نگران، داروغہ مقرر تھے۔ تاکہ جوان سے......... یا گھر لے جانا چاہے، اپنا نام ونسب لکھوائے اور ان ملازموں کے اتفاق سے .... جو چاہے کرے''۔ (۴۷)

اس سے بھی پرلطف قانون کا یہ حصہ تھا کہ:

''اگر کسے خواہد کہ بکارت آنہا ببرد اگر خواستگار از مقربان نامی است، داروغہ بعرض رسانیدہ رخصت از درگاہ بگیرد والا نہ''۔

بادشاہ کو اس مسئلہ سے اتنی دلچسپی تھی کہ:

''پنہانی تحقیق می نمودند کہ بکارت آنہا کہ بردہ باشد''۔

بیربر کے متعلق اس سلسلہ میں بادشاہ تک یہ خبر پہنچائی گئی کہ ''از بنات ہم نمی گزشت'' مگر شدت محبت سے بادشاہ نے اس کے قصور کو معاف کر دیا۔

رسم ختنہ

حالانکہ ''دین جدید'' سے پہلے اکبر نے اپنے شاہزادوں کی خود ختنہ کرائی تھی۔ ملا صاحب نے اس کو بھی نقل کیا ہے۔ لیکن ''ہندو مسلم'' کے امتیازات کے اُٹھا دینے کا جب شوق پیدا ہوا تو اسلام کے ایسے اہم ''شعار'' کے متعلق یہ قانون نافذ کیا گیا کہ:

''بارہ سال سے پیشتر لڑکوں کا ختنہ نہ کرایا جائے۔ بارہ سال کی عمر کے بعد لڑکے کو اختیار ہوگا، چاہے کرے چاہے نہ کرے''۔ (۴۸)

میت

دین الٰہی میں داخل ہونے والوں کے لئے مرنے کے بعد یہ حکم دیا گیا کہ ''خام غلہ اور پکی اینٹیں مردہ کی گردن میں باندھ کر اس کو پانی میں ڈال دیا جائے، اور جس جگہ پانی نہ ہو جلا دیا جائے، یا چینیوں کی طرح سے کسی درخت سے مردہ کو باندھ دیا جائے''۔ (۴۹)

شاید ڈبونے یا جلانے لٹکانے کا حکم بعد کو ہوا۔ ورنہ اس سے پہلے جو حکم تھا اس میں دفن کی مخالفت نہیں کی گئی تھی، البتہ اتنی ترمیم اس میں بھی تھی کہ:

''مردہ کا سر مشرق کی جانب اور پاؤں مغرب کی جانب رکھ کر اس کو دفن کیا جائے''۔ (۵۰)

سلطان خواجہ کہ مریدان خاص الخاص میں سے تھا، جب مرا ہے تو اکبر نے علاوہ سمت مذکورہ بالا کے ایک حرکت یہ بھی کی تھی کہ اس کی قبر میں "آفتاب کے رخ پر ایک کھڑکی بنادی تھی تا کہ اس کی روشنی جو گناہوں سے پاک کرنے والی ہے ہر صبح اس کے چہرہ پر پڑتی رہے"۔ (۵۱)

ملا صاحب لکھتے ہیں کہ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ:

"اس کے منہ پر آگ کا انگارہ بھی لگادیا گیا تھا"۔ (۵۲)

یہ تھا وہ دین جس میں ہندوستان کے باشندوں کا تعلق بیرون ہند سے توڑ لیا گیا تھا۔ اور ٹھیک جس سمت کعبہ ہے مردہ کی ٹانگ اسی جانب رکھی جاتی تھی۔ ضد کی یہ حد تھی کہ: "اپنے سونے کے لئے بھی یہی ہیئت مقرر کی تھی۔ (یعنی ٹھیک قبلہ کی طرف پیر کر کے)"۔ (۵۳)

مردوں کے لئے سونا اور ریشم

ملا صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ مذکورہ بالا چیزوں کے، سونے اور ریشم کو مردوں کے لئے نہ صرف حلال، بلکہ قریب قریب وجوب کی حد تک پہنچادیا گیا تھا۔ عموماً اس زمانہ کے وہی علماء جنہوں نے اس "ہندی دین" کو قبول کر لیا تھا یا اس کے حامی تھے، وہ ریشمین کپڑے پہنتے تھے، اور خدا کے اس باغی کے حکم کی تعمیل کرتے تھے۔ اسی طرح سوٴر اور کتے کو پاک قرار دیا گیا تھا نہ صرف پاک:

خنزیر اور کتوں کا احترام

اسلام کے برخلاف سوٴر اور کتے کے ناپاک ہونے کا مسئلہ منسوخ قرار دیا گیا تھا، اور شاہی محل کے اندر اور باہر یہ دونوں ناپاک (جانور) رکھے جاتے تھے۔ صبح سویرے اس کے دیکھنے کو بادشاہ عبادت خیال کرتا تھا"۔ (۵۴)

اس سلسلہ میں اکبری عہد کے ایک عالم (فیضی) کا قصہ تو ملا صاحب نے یہاں تک نقل کیا ہے:

"چند کتوں کو سفر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے، اور ان ہی کتوں کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ بعض شاعر تو کتوں کی زبان بھی اپنے منہ میں لے لیتے تھے"۔ (۵۵)

شیوراتری

کس قدر عجیب ہے کہ اسلام اور اسلامی احکام کے سوا اور کسی مذہب کے کسی جزو کو ان لوگوں کی عقل نہ رد کرتی تھی، نہ اس میں خرابی نظر آتی تھی۔ مثلاً یہی عقلی بادشاہ تھا جو شیوراتری میں رات بھر جوگیوں کے ساتھ جاگتا تھا کہ "سہ چہار بار از عمر طبعی زیادہ باشد"۔

رکھشابندھن

نیز ۸ سنبلہ کو جو تیوہار پڑتا تھا، اہل ہند کی رسم کے مطابق بادشاہ قشقہ لگا کر برآمدے میں بیٹھتے تھے اور ایک

گنگا جس میں جواہرات پروئے ہوتے تھے اس کو برہمنوں کے ہاتھ سے لے کر بطور تبرک اپنے ہاتھ پر باندھتے تھے۔ (۵۶)

لحمی غذا

ایک طرف شیر اور بھیڑیئے کے گوشت کی حلت کا فتویٰ دیا جاتا تھا اور دوسری طرف حکم:

''گائے بھینس، گھوڑے، بھیڑ اور اونٹ کے گوشت کی حرمت کا تھا۔'' (۵۷)

اسی کے ساتھ یہ بھی ایک قانون تھا کہ:

''جو آدمی اس شخص کے ساتھ کھانا کھائے جس کا پیشہ ذبح کرنے کا ہے تو اس کے کھانے والے کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ حتی کہ اگر اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ کھائے تو کھاتے کی انگلیاں اس کی بھی تراش لی جائیں''۔ (۵۸)

کیا اس بائیکاٹ کا مقصد یہ نہ تھا کہ ہندوستان سے ''لحمی غذا'' ہمیشہ کے لئے ختم کر دی جائے؟

مسلمان ہونے سے ممانعت

''دین جدید'' کا ایک قانون یہ بھی تھا:

''کوئی ہندو عورت اگر کسی مسلمان مرد پر فریفتہ ہو کر مسلمانوں کا مذہب اختیار کرے تو اس عورت کو جبراً وقہراً اس کے گھر والوں کے سپرد کر دیا جائے''۔ (۵۹)

خیر یہ تو ملا صاحب کی شہادت ہے لیکن کیا کوئی اس شہادت کو بھی جھٹلا سکتا ہے۔

''ہندو بے تحاشہ مسجدوں کو ڈھاتے ہیں، اور ان کی جگہ اپنے مندر بناتے ہیں۔ اسی طرح ہندو علانیہ کفر کے رسوم انجام دیتے ہیں لیکن مسلمان اکثر احکامِ اسلام بجالانے سے مجبور ہیں'' (۶۰)

ہندوی علوم سے عقیدت

ملا صاحب اکبر کی زبانی نقل فرماتے ہیں 'ایک دن اس نے مجمع کو مخاطب کر کے اپنی رائے ظاہر کی:

''ہندی زبان کی کتابیں جو ہندوستان کے مرتاضی وعابد دانشمندوں کی تصنیفات ہیں، چونکہ یہ سب صحیح اور بالکل یقینی علوم پر حاوی ہیں اور اس گروہ (ہندوؤں) کے اعتقادات وعبادات کا سارا دارو مدار انہی کتابوں پر ہے لہٰذا ہم کیوں نہ ان کتابوں کے ترجمے ہندی سے فارسی زبان میں اپنے نام سے کرالیں۔ یہ غیر مکرر اور تازہ ہوگا۔ ان سے دینی اور دنیوی سعادت اور شوکت وحشمت بے زوال کے نتائج حاصل ہوں گے، اور کثرت مال واولاد کے لئے یہ ذریعہ ہوں گے''۔ (۶۱)

اس کے بعد دفتر قائم کر دیا گیا۔ علماء مقرر ہوئے جو ان کتابوں کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے فارسی زبان میں ان کو منتقل کر رہے تھے۔

عربی سے نفرت

علم جس زبان میں بھی ہو، اس کی قدر افزائی قابل اعتراض نہیں۔ اعتراض اس بے اعتدالی اور کج روی پر ہے کہ عربی پڑھنا، عربی جاننا عیب قرار دیا گیا۔ اور فقہ و تفسیر و حدیث کے پڑھنے والے مردود و مطعون ٹھہرائے گئے۔ (۶۲)

ان علوم کی جگہ نجوم، حکمت، طب، حساب، شعر، تاریخ اور افسانہ رائج، گویا مذہبی علوم اور دینیات کی سرپرستی اُٹھالی گئی۔ لیکن یہ بھی چند دنوں کی بات تھی۔ آخر فرمان وہی تھا جس کی توقع اس کے بعد ہونی چاہیے۔

ملا صاحب لکھتے ہیں:

''اسی سال فرمان صادر ہوا کہ ہر قوم علوم عربیہ کو چھوڑ کر علوم نادرہ و غریبہ یعنی نجوم، طب، حساب اور فلسفہ کے سوائے اور کچھ نہ پڑھیں''۔ (۶۳)

پھر اس کے بعد کیا ہوا۔ ملا صاحب بے چارے اسلامی علوم کے اس مقتل کو دیکھتے ہیں اور روتے ہیں۔

''مدرسے اور مسجدیں سب ویران ہوئے۔ اکثر اہل علم جلاوطن ہو گئے ان کی اولاد نا قابل جو اس ملک میں رہ گئی ہے ''پاجی گیری'' میں نام پیدا کر رہی ہے''۔ (۶۴)

آخر میں ان دو شعروں میں ان کا نوحہ ختم ہوتا ہے۔

مدارس از علماء آں چناں بود خالی	کہ ماہ روزہ ز مے خوار خانہ خمار
برند تختۂ لوح ادیب از پے نرد	کنند مصحف قاری گرو بجہ قمار (۶۵)

عربی حروف کی درگت

ملا صاحب فرماتے ہیں:

''ایسے حروف جو عربی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں، مثلاث، ح، ع، ص، ض، ط، ظ کو بول چال سے بادشاہ نے خارج کر دیا تھا۔ (۶۶)

اور اس پر عمل کرنے کی یہ صورت نکالی گئی تھی کہ:

عبداللہ کو ابداللہ، احدی کو ابدی اور از یں قبیل الفاظ کو بگاڑ کر بولتے تھے اور اچھا سمجھتے تھے''۔ (۶۷)

علماءِ عربی کی جاگیریں ضبط

اسلامی علوم کی بربادی کا ایک سامان تو یہ تھا۔ اسی کے ساتھ آہستہ آہستہ اس دور میں علماء و مشائخ، آئمہ و خطباء کے نام کی جو جاگیریں صدیوں سے چلی آتی تھیں اُن پر دست اندازی کی گئی۔ اور جیسا کہ ملا صاحب لکھتے ہیں کہ:

''ہدایہ جیسی ابتدائی کتابوں کے پڑھانے والوں کے لئے کم و بیش سو بیگہ کی جاگیر آخری حد تھی''۔ (۶۸)

قاضیوں کا تقرر بند

اور یہ تو ابتدائی زمانہ میں ملا عبدالنبی کے ہاتھ سے عمل میں آیا۔ آخر میں تو جیسا کہ خود حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے:

''اسلام کے منجملہ دوسرے شعاروں کے اسلامی آبادیوں میں قاضیوں کا تقرر ہے جو قرنِ سابق (عہد اکبری) میں مٹا دیا گیا تھا''۔ (۶۹)

اسلام کی بے چارگی

واقعہ ہے کہ اس انقلاب کے بعد بقول حضرت مجدد صاحبؒ:

''تقریباً ایک قرن سے اسلام کی بے چارگی اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ اہل کفر محض اس پر راضی نہیں ہیں کہ کفر کے احکام کا اعلانیہ اسلامی بلاد میں اجراء ہو جائے، بلکہ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی احکام بالکلیہ مٹا دیئے جائیں۔ اور اسلام و مسلمانوں کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔ بات یہاں تک پہنچائی گئی ہے کہ اگر کوئی مسلمان اسلام کے کسی شعار کا اظہار کرتا ہے تو اس کو قتل کے انجام تک پہنچا دیا جاتا ہے''۔ (۷۰)

علماءِ سوء کا فتنہ

کیا اکبر ابتداء سے زندیق تھا

نہایت افسوس کے ساتھ اس تلخ حقیقت کو ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ ''غریب اکبر'' دراصل ابتداء میں ''دین الٰہی'' والا اکبر نہیں تھا۔ یہی ملا عبدالقادر جن کے حوالہ سے اس مضمون کو مرتب کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''بادشاہ جو جوہر نفیس رکھتا تھا اور طالب حق تھا، مگر محض بلند خیالی، (ذاتی علم سے عاری)۔ (۷۱)

اس کی زندگی کے ابتدائی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ شدت کے ساتھ اسلامی عبادات کا پابند تھا۔ نماز تو بڑی چیز ہے، سفر و حضر میں جماعت بھی ترک نہیں ہوتی تھی۔ سات عالم امامت کے لئے مقرر تھے۔ جن میں سے ایک ہمارے ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ:

''پانچوں وقت بر سر دربار جماعت کے متعلق فرماتے تھے''۔ (۷۲)

سفر میں ایک خاص خیمہ نماز کا ہوتا تھا۔ جس میں بادشاہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا تھا۔ علم دین اور علماء دین کا احترام جس حد تک کرتا تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ شیخ عبدالنبی جو اکبر کے ابتدائی عہد حکومت میں ''صدر جہاں'' تھے ان کے ساتھ:

''انتہائی احترام و تعظیم کی وجہ سے بادشاہ کبھی کبھی ''علم حدیث'' سننے کے لئے ان کے گھر جاتا اور ایک دو

دفعہ تو جوتیاں بھی (شیخ کے) آگے بادشاہ نے رکھیں"۔ (۷۳)

علماء وصلحاء کی صحبت اس قدر مرغوب تھی کہ حضرت شیخ سلیم چشتی کے پڑوس میں رہنے ہی کی غرض سے اس نے فتح پور کو دارالسلطنت بنالیا تھا۔ اور مدتوں پا پیادہ اجمیر شریف حضرت خواجہؒ کی زیارت کو جایا کرتا تھا۔ فتح پور میں اُس نے "انوپ تلاؤ" کے نام سے تالاب بنوایا تھا اور اس کے اردگرد عمارتیں بنوائی گئیں جن کا نام "عبادت خانہ" رکھا گیا تھا۔ ملا عبدالقادر کا بیان ہے کہ جہاں پر یہ عمارت بنوائی گئی تھی، بادشاہ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں اسی مقام پر ایک پرانے حجرہ کے پتھر پر بیٹھ کر:

"آبادی سے دور مراقبہ میں مشغول رہتے تھے، اور وقت صبح کے فیض کو حاصل کرتے تھے"۔ (۷۴)

نماز جمعہ کے بعد اسی عمارت میں علماء کا اجتماع ہوتا تھا۔ بعد کو یہ شوق اتنا بڑھا کہ جمعہ کی پوری رات ان ہی علماء ومشائخ کی صحبت میں گزرتی تھی۔ خوشبوئیں جلائی جاتی تھیں۔

"اور دینی مسائل خواہ اُصول سے متعلق ہوں یا فروع سے ہمیشہ ان ہی کی تحقیق سے سروکار تھا"۔ (۷۵)

بادشاہ اس مجلس میں حسب استعداد ہر ایک کی معقول خدمت بھی کرتا تھا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ وسائل تلاش کرکر، علماء ومشائخ کی ایک کافی جماعت یہاں اکٹھی ہونے لگی۔ ملا صاحب کا اندازہ ہے کہ:

"بحث ومباحثہ ومناظرہ کرنے والے علماء خواہ محقق ہوں یا مقلد، ان کی تعداد سو آدمیوں سے متجاوز تھی"۔ (۷۶)

ظاہر ہے کہ جہاں اغراض پرست مولویوں کی اتنی بڑی تعداد جمع ہو جائے پھر کونسا فتنہ ہے جو وہاں رونما نہ ہوگا۔ اب فتنہ کی تدریجی رفتار ملاحظہ فرمائیے۔

شروع شروع میں پہلا جھگڑا نشست گاہ پر چلا۔ ہر ایک بادشاہ سے قریب ہونا چاہتا تھا۔ ملا صاحب لکھتے ہیں کہ:

بہت کچھ بے ہودگیاں اس گروہ سے ظاہر ہوئیں"۔ (۷۷)

اگرچہ اکبر نے اغماض سے کام لیا لیکن دل میں غیر شعوری طور پر ان کا وزن کم ہونے لگا۔ آخر ایک دن جب کہ "چشم بددور" دین کے ان ستونوں کا یہ حال تھا کہ:

"باہم ایک دوسرے پر زبان کی تلواریں نکالے ایک دوسرے کی نفی، تردید اور مقابلہ میں مصروف تھے۔ ان کے اختلافات اس حد کو پہنچے کہ ایک دوسرے کی تکفیر کرنے لگا، اور ایک دوسرے کو گمراہ کہنے لگا"۔ (۷۸)

اور شاہی دربار میں:

"ان مولویوں کی گردن کی رگیں پھول آئیں، اور شور ہونے لگا۔ سخت بلڑ مچ گیا"۔ (۷۹)

بادشاہ کے متاثر قلب پر ان کی حرکت ناگوار گزری"۔ برخاطر اشرف گراں آمد"۔

اس کے بعد ملا عبدالقادر کو حکم دیا گیا کہ:

"آئندہ سے جوان میں نامعقول ہوں، ان کو مجلس میں نہ آنے دینا"۔

یہ پہلی مخالفت تھی جو اس جماعت کو نصیب ہوئی، اور گو ان کی آمد و رفت باقی رہی، لیکن ایک ایسے بادشاہ کے دربار میں جو ان کی ہر گفتگو سے بجائے ایمانی قوت کے سوزنی میں روز بروز ترقی کر رہا تھا۔ یہ آمد کچھ خرابیاں ہی پیدا کرتی رہی۔ آخر اس فتوے بازی نے کہ ایک چیز کو ایک حلال کہتا تھا دوسرا حرام، علمی سرمایہ سے بھی دامن بادشاہ کو خود دین کے متعلق شک میں ڈال دیا اور اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا رہا۔ تا اینکہ جو مقصود تھا، وہی سامنے سے جاتا رہا۔'' (۸۰)

درباری علماء کا تعارف

اکبر کے دربار میں کس قسم کے علماء جمع تھے۔ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ ان میں ایک ملا عبداللہ سلطانپوری تھے جن کا عہدہ ''مخدوم الملک'' تھا۔ محض اس لئے کہ حج نہ کرنا پڑے۔ فریضہ حج کے اسقاط کا فتویٰ دے دیا تھا۔ زکوٰۃ کے متعلق بھی مشہور ہے کہ شاہی تقسیم کرنے والے حیلہ سے کام لیا کرتے تھے۔ اور آخر میں جب ہزار ہا ذلت وخواری کے بعد انتقال ہوا اور بادشاہی حکم سے ان کے مکان کا جو لاہور میں تھا، جائزہ لیا گیا۔ تو:

''اتنے خزانے اور دفینے ظاہر ہوئے کہ ان خزانوں کے تالوں کو وہم کی کنجیوں سے بھی کھولنا ناممکن تھا، منجملہ ان کے سونے سے بھرے ہوئے چند صندوق مخدوم الملک کے گورخانہ سے برآمد ہوئے، جنھیں مردوں کے بہانہ سے اس نے دفن کیا تھا''۔ (۸۱)

ادھر حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے پوتے مولانا عبدالنبی تھے، جو عہد اکبری کے سب سے بڑے محدث خیال کئے جاتے تھے۔ ان کی بادشاہ نے جوتیاں سیدھی کی تھیں، اور سارے ہندوستان کے ائمہ وخطباء وغیرہ کی جاگیروں کا اختیار ان کو دیا گیا تھا، لیکن علم کا یہ حال تھا کہ مشہور حدیث الحزم سوء الظن کو آپ ہمیشہ بجائے ؟ زاء معجمہ کے راء مہملہ سے تلفظ فرماتے تھے، اور جب صدارت کے اختیارات ملے تو اب کسی کو منہ ہی نہیں لگاتے تھے۔ سارے ہندوستان کے مذہبی جاگیرداروں کو دوڑاتے رہتے۔ آخر میں یہ حالت ہوئی کہ:

''لوگ شیخ کے وکیلوں، ان کے فراشوں، دربانوں، سائیسوں، حلال خوروں (مہتروں) تک کو رشوت دے دے کر اپنے اپنے کمل اس گرداب سے باہر نکالتے''۔ (۸۲)

مخدوم الملک اور ملا عبدالنبی دونوں میں رقیبانہ کشمکش جاری تھی۔ ہر ایک نے دوسرے کے متعلق رسالے لکھے۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ اس کو بواسیر ہے اس لئے اس کے پیچھے نماز ناجائز ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ تو اپنے باپ کا چونکہ عاق شدہ بیٹا ہے اس لئے تیرے پیچھے بھی نماز جائز نہیں۔ الغرض صبح وشام شاہی کیمپ علماء کے ان دینی ہنگاموں سے گونجتا رہتا تھا۔ اور بقول ملا عبدالقادر ایک بڑی مصیبت یہ بھی تھی کہ جاہل اکبر:

''اپنے زمانے کے علماء کو رازی اور غزالی سے بھی بہتر خیال کرتا تھا۔ پھر ان کے پیچھو رپن کو جب بادشاہ نے دیکھا تو سامنے والوں پر غائبوں کو قیاس کر کے سلف کا بھی منکر ہو گیا''۔ (۸۳)

آخر اس عہد کا رازی جب حزم کو حرم پڑھتا ہو اور اس زمانہ کے غزالی کے گھر سے طلائی اینٹوں کی قبریں برآمد ہوتی ہوں، تو گزشتہ زمانہ کے غزالیوں اور رازیوں کے متعلق کیا خیال کیا جا سکتا ہے۔ ازیں قبیل طرح طرح کے مشائخ بھی آتے اور اکبر کے سامنے جھوٹے دعوے کرتے۔ کبھی کہتے کہ آپ کی فلاں حرم کے لڑکا ہوگا۔ بدقسمتی سے لڑکی ہو جاتی۔ ایک بڑے با کرامت بزرگ لاہور سے تشریف لائے۔ جب اکبر نے تنہائی میں امتحان لیا اور کچھ چیش نہ چلی، تو پیٹ کا حیلہ ظاہر کرکے دم بخود ہو گئے۔ یقیناً علماء کا یہ فتنہ بھی بڑا فتنہ تھا اور بقول بدایونی:

"علماء کا یہ اختلاف کہ ایک ان میں سے ایک ہی فعل کو حرام کہتا تھا، دوسرا کسی حیلہ سے اس کو حلال ثابت کرتا تھا، بادشاہ کے انکار کا سبب بن گیا"۔ (۸۴)

لیکن اس سلسلہ کا سب سے زیادہ سیدہ "حلقہ" وہ ہے جو اگرچہ علماء ہی کا فتنہ تھا لیکن شدت تاثیر نے اکبری الحاد کا اس کو سب سے بڑا ذریعہ بنا دیا۔ یعنی ملا مبارک ناگوری اور اس کے شہرۂ آفاق صاحبزادے "ملا صاحب" جیسا کہ ان کی سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے، بڑے پایہ کے عالم تھے۔ علوم متداولہ میں ان کو ہر فن کا ایک مستقل متن زبانی یاد تھا جب تک ناگور میں رہے، زیادہ تر معقولات اور فقہ و اصول ان کا علمی سرمایہ تھا۔ پھر یہ احمد آباد پہنچے ہیں اس زمانہ میں ہندوستان کے ساحلی شہروں میں بجائے عقلیات کے دینی علوم کا زیادہ چرچا تھا۔ ملا مبارک کو احمد آباد میں اپنے دینی تبحر کا موقعہ ہاتھ آیا، لیکن دماغ میں فطرۃً شورش تھی۔ مذاہب اربعہ اور ان کے اختلافات سے واقف ہونے کے بعد یہ غیر مقلد ہو گئے جیسا کہ خود ابوالفضل لکھتا ہے کہ:

"مالک، شافعی، ابو حنیفہ، احمد بن حنبل اور (شیعوں کے فرقہ) امامیہ کے مذہب میں اصول و فروع کے متعلق ہر قسم کی واقفیت حاصل کر لی تھی، اور سخت دوڑ دھوپ کے بعد اجتہاد کا مرتبہ ظاہر ہو گیا تھا۔ اگرچہ بزرگانِ سلف کے تقاضائے بموجب ابو حنیفہ کے طریقہ کے ساتھ نسبت رکھتے تھے۔ لیکن ہمیشہ اپنے عمل کو ذاتی تحقیقات سے آراستہ کرتے تھے، اور تقلید سے علیحدہ رہ کر عبادت کرتے تھے"۔ (۸۵)

اس غیر مقلدی کے سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ شیراز کے ایک فلسفی ابوالفضل گازرونی کے حلقہ میں شریک ہو گئے اور اس درجہ خصوصیت حاصل کر لی کہ "ابوالفضل گازرونی بفرزندی برگرفت"۔ اس کے علاوہ:

"تجرید کے مراتب اور شفاء، اشارات اور تذکرہ مجسطی کی باریکیوں اور ان کی مشکلات کو ان سے حاصل کیا، اور گلشن حکمت کو اس سے بہت زیادہ تازگی حاصل ہوئی"۔ (۸۶)

اس پر طرہ یہ تھا کہ ملا صاحب کو تصوف کا بھی شوق ہو گیا۔

"تصوف و اشراق کے مختلف طریقوں کا بھی مطالعہ کیا، اور نظر و فکر اور خدا شناسی کی کتابیں بھی نظر سے گزریں"۔ (۸۷)

ظاہر ہے کہ شوریدہ مغزوں میں جب یہ ساری کرامتیں جمع ہو جاتی ہیں تو پھر ان سے بے محابا ایسی باتیں

صادر ہوتی ہیں جن سے جمہور میں برہمی پیدا ہوتی ہے۔ اگرچہ ملا صاحب پر مہدویت کا، کبھی شیعت کا الزام لگایا گیا۔ لیکن ابوالفضل کو اس سے انکار ہے۔ بہرحال عام علماء کو ان کے طرز و روش سے ضرور شکایت تھی، اور ان مولویوں نے چند سخت حملے بھی کئے۔ جواب باندازِ سوال کے بجائے ملا صاحب کو غرورِ علم نے ایک خطرناک اقدام پر آمادہ کیا۔ آپ زاویہ درس وارشاد سے نکل کر بیٹوں کی معیت میں ملک کی سیاست میں داخل ہوگئے۔ علم کا گھرانا تھا۔ ترقی کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ چند ہی دنوں میں دیکھا جاتا ہے کہ وہی ملا مبارک جن کے متعلق ابوالفضل لکھتا ہے کہ:

"شیر خاں (شیر شاہ) سلیم خاں (پسر شیر شاہ) اور دوسرے بزرگوں نے اصرار کیا کہ سلطانی وجوہ سے کچھ قبول کریں"۔ (۸۸)

لیکن "(۸۹) از انجا کہ ہمت بلند بود ونظر عالی داشت سرباز زد۔" (۹۰) اب یہی ملا مبارک یکا یک اکبر کے بارگاہ جلال میں اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ جلوہ فرما ہیں۔ اس میں شک نہیں ہے کہ مولویوں نے ان کو اور ان کے خاندان کو ضرور ستایا تھا، اور ملا صاحب کو ان کی وجہ سے کچھ دنوں پورے خاندان کے ساتھ در بدر مارا مارا پھرنا پڑا۔ لیکن کیا اس کا شریفانہ یہ تھا کہ بانسری کے بجنے کو روکنے کے لئے دنیا سے بانس کے جنگل ہی نابود کردیے جائیں؟ اور بافرضِ انتقام کے غصہ میں اگر یہی کرنا چاہتے تھے تو پھر جو چوٹ انہوں نے پہاڑ سے کھائی تھی، اس کا بدلہ یہ گھر کی سل سے کیوں لینے لگے۔

بہرحال تینوں باپ بیٹوں نے اپنے شخصی انتقام کا نشانہ ہندوستان کے سنی مولویوں ہی کو نہیں بلکہ اسلام ہی کو بنالیا۔ مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد جس وقت "اسلام کا ایوان" اپنے سارے متوسلین کے ساتھ جل رہا تھا، اس وقت ملا عبدالقادر کا بیان ہے کہ ابوالفضل کی زبان پر بسا اوقات حسب ذیل اشعار جاری ہوجاتے تھے۔

آتش بدودستِ خویش درخرمن خویش ۔۔۔ چوں خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش
کس دشمن من نیست و منم دشمن خویش ۔۔۔ اے وائے من و دستِ من و دامن خویش

الغرض اکبری دربار میں ابوالفضل وفیضی کا فتنہ بھی سچ پوچھو تو یہ علماء سوء ہی کا فتنہ تھا۔ ملا مبارک ناگوری کی برکت سے گمراہی وزندیقیت کا کس طرح سلسلہ شروع ہوا، اور کہاں جاکر ختم ہوا۔ اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

اجتہاد کا دعویٰ

اس سلسلہ میں سب سے نمایاں چیز جو شروع شروع میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ عہد اکبری کا وہ مشہور محضرنامہ ہے جسے بجنسہٖ ملا صاحب نے اپنی کتاب میں نقل کردیا ہے۔ اور یہی وہ محضرنامہ ہے جسے ملا مبارک ناگوری پدر ابوالفضل وفیضی نے مرتب کیا تھا۔ اور بعض علماء سے طوعاً بعض سے کرہاً اس پر دستخط کرائے گئے۔

ترجمہ (۹۱): مطلب ان امور کے درج کرنے سے یہ ہے کہ چونکہ بادشاہی عدل وانصاف اور سرپرستی کی

بدولت ہندوستان آج کل امن وامان کا مرکز بنا ہوا ہے، اور اس کی وجہ سے عوام وخواص، خصوصاً ان صاحب علم و فضل علماء کا یہاں ان دنوں اجتماع ہو گیا ہے جو نجات کی راہوں کے رہنما اور اوتوا العلم وانہ درجات کے مصداق ہیں۔ یہ لوگ عرب وعجم سے اس ملک میں تشریف لائے اور اسی کو اپنا وطن بنا لیا ہے۔ اور چونکہ جمہور علماء جو ہر قسم کے علوم میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں اور عقلی ونقلی فنون کے ماہر ہیں، اور ایمانداری اور انتہائی دیانت اور راستبازی کے ساتھ موصوف ہیں۔ قرآن کی آیت اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم (یعنی اطاعت کرو اللہ کی، اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں صاحبان امر ہیں) اور صحیح حدیثوں مثلاً یہ کہ خدا کے نزدیک قیامت کے دن سب سے زیادہ محبوب وہ امیر ہوگا جو عادل ہو۔ جس نے امیر کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی۔ ان کے سوا اور دوسرے دلائل عقلی ونقلی کی بنیاد پر یہ قرار دیتے ہیں اور فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ خدا کے نزدیک سلطان اول کا مرتبہ مجتہد کے مرتبہ سے زیادہ ہے۔ اور بادشاہ جلال الدین محمد اکبر غازی چونکہ بہت بڑے عادل، سب سے زیادہ عقل والے اور علم والے ہیں، اس بنیاد پر ایسے دینی مسائل میں جن میں مجتہدین باہم اختلاف رکھتے ہیں اگر وہ (یعنی اکبر بادشاہ) اپنے ذہن ثاقب اور رائے صائب کی روشنی میں بنی آدم کی معاشی سہولتوں اور دنیاوی انتظام کی آسانیوں کو مدنظر رکھ کر کسی ایک پہلو کو ترجیح دے کر اسی کو مسلک قرار دیں تو ایسی صورت میں بادشاہ کا یہ فیصلہ متفقہ سمجھا جائے گا اور عام مخلوق رعایا وبرایا کے لئے اس کی پابندی لازمی ولابدی ہوگی۔ اسی طرح اگر کوئی ایسی بات جو قطعی نصوص کی مخالف نہ ہو، اور دنیا والوں کو اس سے مدد ملتی ہو، بادشاہ اگر اس کے متعلق کوئی حکم صادر فرمائیں تو اس کا ماننا اور اس پر عمل کرنا بھی ہر شخص کے لئے لازم اور ضروری ہوگا اور اس کی مخالفت دینی ودنیوی بربادی اور اخروی مواخذہ کی مستوجب ہوگی۔'' (۹۲)

غالباً اس کے بعد وہ لطیفہ پیش آیا کہ بحیثیت مجتہد وامام عادل ہونے کے جمعہ میں خطبہ پڑھنے کا اکبر کو خیال آیا۔ فیضی نے فارسی اشعار میں خطبہ تیار کیا۔ لیکن میدان جنگ میں جس کی تلوار سروں کو اڑاتی تھی۔ وہ خطبہ کے لئے کھڑا ہوا تو تھرتھرانے لگا اور صرف دو شعر پڑھ کر منبر سے اتر گیا۔

یہ تھی وہ پہلی منزل جہاں تقلید سے کنارہ کش ہو کر اکبر کو اجتہاد کے درجہ پر پہنچا یا گیا۔ لیکن اس کے بعد پھر کیا ہوا؟ وہی جو ہمیشہ اس کے بعد ہوا ہے۔ تھوڑے دنوں کے بعد علانیہ ائمہ ومجتہدین کی توہین وتحقیر ہونے لگی۔ دین کا بھرم اٹھ گیا۔ ملا صاحب اپنے کانوں سنی بیان فرماتے ہیں کہ ابوالفضل کی جرأت اس حد کو پہنچ گئی تھی:

''اگر (۹۳) کسی بحث ومباحثہ کے درمیان ائمہ مجتہدین کی کوئی بات پیش کی جاتی تو ابوالفضل اس کے جواب میں کہتا۔ فلاں (۹۴) حلوائی فلاں کفش دوز اور فلاں چرم والے کے قول سے تم مجھ پر حجت قائم کرتے ہو؟

لیکن معاملہ ابھی صرف ائمہ مجتہدین تک پہنچا تھا۔ بدقسمتی سے ہمایوں کو چونکہ ایرانیوں کی امداد سے دوبارہ

تخت وتاج میسر آیا تھا۔ اس لئے بتقاضائے منت شناسی عراق، عجم اور ایران کے علماء وشعراء کو خود اس نے اپنے عہد میں اعزاز و اکرام سے سرفراز کیا، اور یہ دستور اکبر کے دربار میں بھی جاری رہا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایرانیوں اور عراقیوں کا اک سیلاب تھا جو عہد ہمایوں سے مسلسل اختتام دولت مغلیہ تک ان ممالک سے ہندوستان آتا رہا۔ یہ ٹڈیوں کا بھوکا دل تھا جو ہندوستان کی کشت زاروں کی طرف بے تحاشا چلا آرہا تھا اور دولت مغلیہ کی طرف سے قدر افزائی کا یہ عالم تھا کہ ہر ادنیٰ ہندوستان پہنچ کر اس درجہ عالی ہو جاتا کہ بالآخر لوگوں کو کہنا پڑا:

پار بودم قطبک و امسال قطب الدین شدم
گر بیایم سال دیگر قطب دین حیدر شوم

اگر معاملہ اقتصادی نفع اندوزی تک رہتا، تب بھی شکوہ نہیں تھا۔ مگر بدقسمتی سے یہ گروہ وہ تھا جو ائمہ دین و مجتہدین سے آگے بڑھ کر بے محابا شرف صحبت کے سعادت یافتوں (صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین) پر بھی حملہ کرنے میں قطعاً بے باک تھا۔ اکبر کو تاریخی واقعات کے سننے کا بے حد شوق تھا۔ حریفوں نے خصوصیت کے ساتھ اس کے سامنے ان ہی کتابوں کو اور کتابوں کے بھی خاص ان حصوں کو پیش کرنا شروع کیا، جن کا تعلق مشاجرات صحابہؓ سے تھا۔ ملا صاحب لکھتے ہیں:

''صحابہؓ کی شان میں سیر کی کتابوں کے پڑھنے میں جو الفاظ بادشاہ کی زبان سے نکلتے تھے، خصوصاً خلفاء ثلاثہ کی خلافت، قضیۂ فدک، جنگ صفین وغیرہ کے ذکر کے وقت جو کچھ کہا جاتا تھا، کان اگر ان کے سننے سے بہرے ہوتے تو بہتر تھا۔ میں اپنی زبان سے ان کو ادا بھی نہیں کرسکتا''۔ (۹۵)

مجتہدین اور ائمہ پہلے وار میں ختم ہوئے، اور اس دوسری ضرب نے تو اسلام کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کردی۔ جیسا کہ اس کے بعد ہونا چاہیے تھا وہی ہوا کہ اکبری دربار میں:

''تمام مذہب اسلام نامعقول اور (معاذ اللہ) اس کے مرتب اور مدون کرنے والے عرب کے وہ چند مفلس بدو قرار پائے جن میں سب کے سب مفسد اور راہزن تھے۔ اور شاہنامے کے وہ دو مشہور شعر جن کو فردوسی نے (امراء ایران کے قول کی نقل کے طور پر) بیان کیا ہے، بطور سند پیش کیے جاتے ہیں''۔ (۹۶)

ز شیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید است کار
که ملک عجم را کنند آرزو — تفو باد بر چرخ گردوں تفو! (۹۷)

''شجرۂ طیبۂ نبوت'' علیٰ صاحبہا الف الف سلام وتحیۃ کے ان ثمرہائے رسیدہ تک جس کی زبان پہنچ چکی تھی۔ وہ آخر کب تک پھلوں سے درخت تک نہ پہنچتا۔ العیاذ باللہ آخر وہ منحوس دن بھی سامنے آ ہی گیا کہ:

''ارکان دین کے ہر رکن اور اسلامی عقائد کے ہر عقیدہ کے متعلق خواہ ان کا تعلق اصول سے ہو یا فروع سے مثلاً نبوت، مسئلہ کلام، دیدار الٰہی، انسان کا مکلف ہونا، عالم کی تکوین، حشر ونشر وغیرہ

کے متعلق تمسخر اور ٹھٹھے کے ساتھ طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا کیے جانے لگے''۔

یہی نہیں کہ بادشاہ ہی صرف شک میں مبتلا ہو گیا تھا، بلکہ اہل دربار سے بھی ان مسائل کے متعلق بحث کرتا ۔اور سب کو اپنی ذہنی کیفیت کے قریب لانے کی کوشش کرتا۔ملا صاحب لکھتے ہیں کہ:

''بادشاہ عام مخلوق کو خلق قرآن کے مسئلہ کی تبلیغ کرتا، اور وحی کے محال ہونے پر اصرار وغلو سے کام لیتا۔ نبوت وامامت کے مسئلوں میں لوگوں کا امتحان لیتا، اور جن وفرشتے، اسی طرح ساری غیبی ہستیوں نیز معجزات اور کرامتوں کا کھلے لفظوں میں انکار کرتا۔ قرآن کے تواتر اور قرآن کے کلام خدا ہونے کو اور بدن کے فنا ہونے کے بعد روح کے باقی رہنے نیز ثواب وعقاب کو محال سمجھتا تھا۔ البتہ تناسخ کے طور پر عذاب وثواب کا قائل تھا''۔(۹۹)

اپنی اس تبلیغ میں غلو کی آخری حد یہ تھی کہ کبھی کبھی بھرے دربار میں اکبر سے خلاف وقار شاہی بعض بیہودہ حرکتیں بھی سرزد ہو جاتی تھیں۔ مثلاً بیٹھے بیٹھے یکا یک ایک ٹانگ پر کھڑا ہو جاتا اور اس کے بعد حسب ذیل تقریر کرتا۔

''آخر اس بات کو عقل کس طرح مان سکتی ہے کہ ایک شخص بھاری جسم رکھنے کے باوجود یکا یک نیند سے آسمانوں پر چلا جاتا ہے اور راز ونیاز کی نوے ہزار باتیں خدا سے کرتا ہے، لیکن اس کا بستر اس وقت تک گرم ہی رہتا ہے۔ تعجب ہے لوگ اس دعوی کو مان لیتے ہیں اور اسی طرح شق القمر وغیرہ جیسی باتوں کو بھی مان لیتے ہیں''۔(۱۰۰)

پھر اپنی اٹھی ہوئی ٹانگ کی طرف حاضرین کو مخاطب کر کے سوال کرتا:

''ناممکن ہے کہ جب تک دوسرا پاؤں زمین سے نہ لگا ہو، میں کھڑا رہ سکوں آخر یہ ہیں کیا قصے؟''(۱۰۱)

گویا خلاف عادت کے ناممکن ہونے کو اپنی اٹھی ہوئی ٹانگ سے ثابت کیا جاتا تھا۔ یہی رنگ تھا جو بالآخر گہرا ہوا، گہرا ہوا اور خوب گہرا ہوا، تا اینکہ نوبت باینجا رسید کہ اب اس کی زبان عیاذاً باللہ نبوت کبریٰ کی شان میں بھی دراز ہونے لگی:

''اوائل ہجرت میں قریش کے قافلہ پر حملہ، چودہ عورتوں سے نکاح اور بیویوں کی رضامندی کے لیے شہد کو حرام کرنا'' جیسے اہل فرنگی کے اعتراضات اس کی زبان پر آنے لگے۔ آخری کیفیت اکبر کے نفس کی یہ ہوئی کہ سن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔(۱۰۲)

ملا صاحب کا بیان ہے:

''احمد، محمد و مصطفی وغیرہ نام بیرونی کافروں اور اندرونی خواتین کی وجہ سے اس شخص پر گراں گزرنے لگے۔ آخر کچھ دن کے بعد اپنے چند خاص لوگوں کے نام اس نے بدل بھی ڈالے۔ مثلاً یار محمد اور محمد خاں کو وہ رحمت ہی کے نام سے پکارتا تھا اور لکھنے کے وقت بھی ان کو اسی نام سے موسوم کرتا''۔(۱۰۳)

اور غالباً یہی وجہ تھی کہ:

''علماء سو اپنی اپنی تصنیفوں میں خطبہ لکھنے سے بچنے لگے۔ صرف توحید اور بادشاہی القاب کے ذکر پر قناعت کرتے۔ ان کی مجال نہ تھی، کہ بے ایمان جھٹلانے والوں کے علی الرغم آنحضرتؐ کا اسم مبارک زبان قلم پر لاتے''۔ (۱۰۴)

یہاں تک کہ خود ملا صاحب کو جب مہابھارت کے ترجمہ کے شروع میں خطبہ لکھنے کی فرمائش بادشاہ نے کی تو محض اس وجہ سے انہوں نے اعراض کیا کہ بغیر نعت کے وہ خطبہ لکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ان ہی باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ بادشاہ تو بادشاہ ہر عامی کی جرأت بھی حد سے متجاوز ہونے لگی۔ ملا صاحب فرماتے ہیں کہ:

''چند ہندو و چند ہندو مزاج مسلمان، یہ بدنصیب آنحضرتؐ کی نبوت پر صراحۃً اعتراض کرتے تھے''۔ (۱۰۵)

لیکن ان کا کوئی روکنے والا، ٹوکنے والا نہ تھا۔ حد ہوگئی کہ جب اکبر کے دربار میں عیسائی مشنری کا وفد پہنچا ہے تو ان لوگوں نے جہاں اور باتیں دربار میں کیں، ان میں العیاذ باللہ ایک یہ بھی تھی کہ:

''دجال کے صفات بیان کر کے (استغفر اللہ) ان کو...... پر ڈالتے تھے''۔ (۱۰۶)

اللہ اکبر! اتنی بدبختانہ بے ہودگی کو سن کر بھی اکبر کی پیشانی پر بل تو کیا پڑتا۔ نہایت خندہ جبینی سے ان کا استقبال کرتا ہے اور خاص اپنے شہزادہ مراد کو حکم دیتا ہے:

''چند اسباق ان پادریوں سے تبرکاً پڑھ لو''۔ (۱۰۷)

عقائد میں جس شخص کا یہ حال ہو چکا تھا، اس کے اعمال کے متعلق سوال ہی فضول ہے۔ وہی نماز کبھی جس کے متعلق یہ حال تھا کہ:

''پانچوں وقت (نماز تو نماز) جماعت کے لئے بھرے دربار میں فرمایا کرتے تھے''۔ (۱۰۸)

اب ان ہی ملا صاحب کا بیان ہے کہ:

''دیوان خانہ میں کسی کی مجال نہ تھی کہ علانیہ نماز ادا کر سکے''۔ (۱۰۹)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''نماز، روزہ اور حج تو اس سے پہلے ہی ساقط ہو چکے تھے''۔ (۱۱۰)

اور معاملہ سقوط و اسقاط تک ہی ختم نہیں ہوا تھا بے دینوں نے شاہی اشارہ پا کر پھر اس کے بعد جو کچھ کیا، اس کے ذکر سے بھی دل ڈرتا ہے۔ غیر اسلامی خاندان کے آدمی نے نہیں بلکہ ایک مشہور ملا کے بیٹے نے جیسا کہ بدایونی کا بیان ہے:

''ملا مبارک کے بیٹے نے جو ابوالفضل کا شاگرد تھا، اسلامی عبادات کے متعلق اعتراض اور مسخر گی کے پیرایہ میں چند رسالے تصنیف کئے (شاہی جناب میں) ان کے ان رسالوں نے بڑی مقبولیت حاصل کی اور اس کی سر پرستی کا ذریعہ بھی رسالے بن گئے''۔ (۱۱۱)

دینی شعائر کی ہجو میں اشعار بنائے گئے اور کوچہ بازار میں وہی گائے جاتے تھے۔ جن میں کے بعض اشعار ملا صاحب نے بھی نقل کئے ہیں۔

یہ دکھانے کے لیے حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے مکتوبات میں "دین کی غربت" کا نوحہ جن دردناک پیرایوں میں کرتے ہیں، اس کے اسباب کیا تھے، ہم بھی چند شعر بطور "نقل کفر" نقل کرتے ہیں۔ مثلاً غالباً یہ فیضی کی فیاضی تھی:

از حقیقت بدست کورے چند مصحفے مانند کہنہ گورے چند
گور باکس سخن نمی گوید سر قرآں کسے نمی جوید

ایک مستزاد اس پر مستزاد ہے:

عید آمد و کار ہانکو خواہد شد چوں روئے عروس
ساقی مے ناب در سبو خواہد کرد چوں خون خروس

جزئیات کی تفصیل کہاں تک کی جائے۔ ملا صاحب کے الفاظ میں مختصر یہ ہے کہ:

"نماز روزہ اور وہ ساری چیزیں جن کا تعلق نبوت سے ہے ان کا نام "تقلیدات" رکھا گیا۔ یعنی یہ سب حماقت کی باتیں ٹھیرائی گئیں اور مذہب کی بنیاد عقل پر رکھی گئی نہ نقل پر"۔ (۱۱۲)

ایک اور موقعہ پر نقل کرتے ہیں کہ جب کسی شرعی مسئلہ کا ذکر ہوتا تو اس وقت بادشاہ یہ کہا کرتے تھے:

"اس کو ملاؤں سے پوچھو البتہ ایسی چیزیں جن کا تعلق عقل وحکمت سے ہو وہ مجھ سے دریافت کرو"۔ (۱۱۳)

لیکن عقل کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس "دین جدید" کے تمام اصول وفروع سب براہ راست عقل سے پیدا کئے جاتے تھے بلکہ صورت یہ اختیار کی گئی کہ پہلے تو "مساوات ادیان" کا دعویٰ کیا گیا گویا کسی دین کو دوسرے دین پر ترجیح نہ دی جائے۔ لیکن مذاہب میں جو تناقض وتضاد ہے، "نظریہ مساوات" پر اس کا نباہنا مشکل ہی نہیں بلکہ محال تھا۔ اس لئے ترجیح کے لئے "عقل" میزان ٹھیرائی گئی۔ تمام مذاہب کے علماء وماہرین کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہر ایک سے اس کے مذہب کے معلومات حاصل کئے جاتے۔ مسلمان اور ہندو تو دربار میں موجود ہی تھے، ان دو کے علاوہ اس وقت تک اس ملک میں "یورپین صلیبیوں" کی بھی آمد ورفت شروع ہو چکی تھی۔ جیسا کہ ملا صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ عموماً یہ لوگ ساحلی علاقوں میں بحری قزاقوں کی حیثیت سے منڈلاتے رہتے تھے۔ اور اندرون ملک میں ان کا داخلہ غالباً اس وقت بحیثیت بازی گروں کے ہوتا تھا۔ کیونکہ ملا صاحب نے اُن کا اپنی کتاب میں جہاں کہیں تذکرہ کیا ہے اس میں زیادہ تر یہی ہے کہ جشن نوروز میں فرنگیوں کی بھی ایک ٹولی آکر شریک ہوئی۔ اس نے ارغنون نامی باجا بجا کر لوگوں کو متحیر کیا (غالباً پیانو یا ہارمونیم تھا) کبھی بیلوں اُڑا کر تماشہ دکھاتے تھے۔ الغرض اکبری عہد تک ان کی حیثیت بظاہر بازی گروں ہی کی معلوم ہوتی ہے۔ بعد کو انہوں نے سوداگروں کا بھیس بدلا، اور آخر میں جو کچھ ہو کر رہا وہ تو سب کے سامنے ہی ہے۔ تفوٗ تفوٗ۔

الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ کی تحقیقی تفسیریں کتابوں میں نہیں بلکہ صحیفۂ فطرت کے اوراق میں ہمیشہ یوں لکھی جاتی ہیں۔ خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ قصہ یہ ہو رہا تھا کہ اکبری دربار میں مختلف ارباب مذاہب کی ٹولیاں یکے بعد دیگرے دھمکنے لگیں۔ ہر ایک اپنے اپنے مذہب کو دربار میں پیش کرتا، جن میں ایک:

''ملک فرنگ کے مرتاض دانشمندوں کا گروہ جن کو پادری کہتے ہیں اور ان کے بڑے مجتہد کا نام پاپا ہے۔ ان لوگوں نے انجیل پیش کی۔ اور ثالث ثلٰثہ کے متعلق دلائل پیش کئے اور نصرانیت کی حقانیت کو ثابت کیا''۔ (۱۱۴)

ابوالفضل کو حکم دیا گیا کہ انجیل کا ترجمہ ان پادریوں سے پوچھ پوچھ کر کریں۔ یہی ترجمہ تھا جس کا بجائے بسم اللہ کے ''ای نامتو ژژو کرستو'' سے آغاز کیا گیا ہے۔ اسی طرح:

''ولایت گجرات کے شہر نوساری سے آتش پرست بھی آئے۔ انہوں نے زردشت کے دین کی حقیقت ثابت کی۔ یہ لوگ آگ کی تعظیم کو بڑی عبادت خیال کرتے ہیں۔ انہوں نے بادشاہ کو اپنی جانب مائل کرنے کی کوشش کی، اور کیانی بادشاہوں کے رسم ورواج سے واقف کیا''۔ (۱۱۵)

چنانچہ:

''شاہان ایران کی طرح جن کی آگ ہمیشہ جلتی رہا کرتی تھی، شیخ ابوالفضل کی نگرانی میں حکم دیا گیا کہ ہمیشہ رات دن شاہی محل میں آگ روشن رکھنے کا انتظام کیا جائے''۔ (۱۱۶)

ان کے سوا اور جو تاریکیاں تھیں وہ چراغ ہی کے نیچے تھیں۔ ہندو مذہب کے تمام فرقے اور اسلام کے بھی مختلف العقائد گروہ دربار میں موجود تھے۔ ابتداء سب سے پوچھا جاتا تھا، اور ہر مذہب والے کی رائے دریافت کی جاتی تھی جیسا کہ ملا صاحب کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے:

''ہر ملک سے ہر قسم کے دانشمند اور مختلف مذاہب وادیان کے لوگ دربار میں جمع ہو کر بادشاہ کی ہمزبانی کا شرف حاصل کرتے تھے۔ تحقیق وتلاش میں (جس کے سوا بادشاہ کا رات دن کوئی مشغلہ نہ تھا) مشغول رہتے تھے''۔ (۱۱۷)

لیکن یہ ساری تعمیر جو ہو رہی تھی، ظاہر ہے کہ ایک ''مستقل مذہبی نظام'' کی تخریب وتکذیب کے بعد ہو رہی تھی۔ ممکن ہے کہ ابتداءً اس عمارت منہدمہ کی چیزوں سے بھی اس جدید عمارت کی تیاری میں کام لیا جاتا ہو۔ لیکن حالات نے بتدریج کروٹ لینا شروع کی اور نوبت آخر میں یہاں تک پہنچی کہ:

''اسلام کی ضد اور اس کے توڑ پر ہر وہ حکم جو کسی دوسرے مذہب کا ہوتا، اس کو بادشاہ نص قاطع و دلیل قطعی خیال کرتے تھے، بخلاف اسلامی ملت کے کہ اس کی ساری باتیں مہمل، نامعقول، نوپیدا اور عرب کے مفلسوں کی گھڑی ہوئی خیال کی جاتیں''۔ (۱۱۸)

اس لئے اب سلسلۂ تحقیقات میں ''اسلام'' کا نام تختہ سے کاٹ دیا گیا اور آخری طریقہ کار یہ رہ گیا کہ۔

مسلمانوں کے سوا جس شخص کی جو بات پسند آجاتی تھی، اس کا انتخاب کرلیا جاتا تھا۔ اور جو باتیں کہ ناپسندیدہ اور بادشاہ کی خواہش کے خلاف ہوتی تھیں اُن سے احتراز اور پرہیز کو ضروری خیال کرتے تھے"۔(۱۱۹)

اس معاملہ میں اکبر کی رفتار جس نقطہ پر پہنچ گئی تھی۔ ملا صاحب ہی اس کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

"پانچ چھ سال کے بعد اسلام کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا اور بات بالکل اُلٹ ہوگئی"۔(۱۲۰)

مختصر یہ کہ "مساوات مذہب" اور "ترجیح بلا مرجح" رواداری وانصاف کا سارا دعویٰ انتہائی تعصب کی شکل میں بدل گیا۔ ملا صاحب کی عینی شہادت ہے کہ رواداراکبر اور صلح کل والے اکبر کی ذہنیت کا آخری حال یہ تھا کہ:

"جس کسی کو اپنے اعتقاد کے موافق نہ پاتے تھے وہ بادشاہ کے نزدیک گشتنی مردود اور پھٹکارا ہوا شمار ہوتا تھا اور اس کا نام "فقیہ" رکھ دیا جاتا تھا"۔(۱۲۱)

خلاصہ یہ کہ اب یہ قاعدہ مقرر کردیا گیا کہ اسلام کے سوا تمام دوسرے مذاہب کے اصول وفروع کا مطالعہ کیا جائے اور ترجیح وعمل کا ذریعہ عقل کے فیصلہ کو ٹھیرایا جائے۔ جیسا کہ ملا صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ خود اکبر شب وروز اسی ادھیڑبن میں مصروف رہتا تھا۔ علاوہ ازیں مذہب کو ریزولیشنوں کی قرار داد پر چڑھانے کے لئے چالیس آدمیوں کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ اور:

"بادشاہ نے حکم صادر کیا کہ شاہی مقربین چالیس چالیس کے حساب سے ایک جگہ بیٹھا کریں اور جو شخص جو کچھ جانتا ہو، اس کا اظہار کرے۔ اور جس قسم کے سوالات کرنا چاہے کرے"۔(۱۲۲)

چہل تن کی اس مجلس میں مسائل پیش ہوتے تھے اور پھر عقل سے اس کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ اس کمیٹی کی ایک یہ خصوصیت بھی تھی کہ اسلامی عقائد واعمال کے متعلق:

"طرح طرح کے شبہے ہنسی مذاق کی شکل میں پیش کئے جاتے، اور اگر کوئی بیچارہ جواب دینے کا ارادہ کرتا تو جواب سے روک دیا جاتا"۔(۱۲۳)

آزاد کمیٹیوں کا یہ عارضہ گویا نیا عارضہ نہیں ہے۔ سب کچھ بول سکتے ہو اور کچھ نہیں بول سکتے۔ اسلامی عقائد واعمال پر تمسخر واستہزاء کرتے ہوئے دیگر مذہبوں سے جو لیا جاتا، وہ بھی ملاحظہ ہو:

"نصاریٰ سے گھنٹہ بجانے اور ثالثہ (باپ بیٹا روح القدس) کی صورت کا تماشا یعنی بلبلان جوان لوگوں کی خوش گاہ ہے اور ایسی ہی دوسری کھیل کود کی باتیں بادشاہ کے وظیفہ میں داخل ہوگئی تھیں"۔(۱۲۴)

واللہ اعلم بالصواب "بلبلان" کیا چیز ہے؟ "خوش گاہ ایشان است" سے جو تفسیر کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل (۱۲۵) لفظ بلبن ہے یعنی الغوزہ (اردو میں منہ چنگ یا بانسری)۔ اسی طرح ملا صاحب نے جہاں یہ لکھا ہے کہ "مدار دین بر عقل گذاشتند" اسی کے بعد اُن کا یہ فقرہ ہے:

"فرنگیوں کی آمد ورفت بھی شروع ہوگئی تھی اور بعض عقلی اعتقادات بادشاہ نے ان سے حاصل کئے"۔(۱۲۶)

شاید وحی و نبوت، معجزات و کرامات وغیرہ کے انکار کی بنیاد "آمد ورفت فرنگیان" پر ہی مبنی ہو۔ گویا ریشنلزم (عقلیت) جسے خود اب یورپ کے ایگناسٹک (ارتیابی) سراسر بدعقلی قرار دے چکے ہیں۔ ہندوستان کے لیے یورپ کا یہ تحفہ کوئی جدید تحفہ نہیں ہے۔ مغربی فلسفہ کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی زمانہ تھا کہ جب کیتھولک مظالم سے تنگ آکر کمزور اعصاب والوں کا غضب ناک گروہ یورپ میں پیدا ہو گیا تھا۔ جو سراسر مذہبی بنیادوں پر جا و بے جا طریقوں سے پیہم حملے کر رہا تھا۔ اور نادانی سے اس عہد کے لوگوں نے منافرت کی اس پیداوار کا نام "فلسفہ" رکھ دیا تھا۔

اسی طرح پارسیوں کی بھی بعض باتیں قبول کی گئی تھیں اور جیسا کہ گزر چکا شاہی محل میں انہیں کے مشورہ سے ایک "دوامی آتش کدہ" علامہ ابوالفضل کی نگرانی میں قائم کر دیا گیا تھا۔ ملا صاحب نے لکھا ہے کہ آگ "آیتے است از آیات خدا و نوریست از انوار وے"۔ قرار دی گئی تھی۔ اور ہون کی رسم جو پارسیوں سے پہلے بھی شاہی محل میں "دختران راجہائے ہند" کی وجہ سے انجام دی جاتی تھی، اس میں اس آتش کدہ کے قیام سے اور اضافہ ہو گیا۔ خود بادشاہ اعلانیہ آتش پرستی کرتا تھا۔ اور بادشاہ کے مقربین بھی شمع و چراغ کے روشن ہونے کے وقت قیام کرنا اپنے لیے فرض قرار دیئے ہوئے تھے۔ (۱۲۷)

یہ تھے وہ اجزاء جو نصرانیوں اور مجوسیوں کے دین سے اس جدید مذہب میں شریک کیے گئے تھے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ سب سے زیادہ اس دین پر جس مذہب کا اثر پڑا تھا وہ وہی مذہب تھا جس کو ہندی قومیت کی تعمیر کے سلسلے میں سب سے زیادہ اثر انداز ہونا قدرتی طور پر ضروری تھا، یوں تو اس مذہب کے علماء اور پیروں سے دربار بھرا پڑا تھا اور جیسا کہ ملا صاحب کا بیان ہے کہ:

"بادشاہ کو بچپن ہی سے ہندوستان کی مختلف قوموں مثلاً برہمنوں سے اور بھاٹوں سے اور از یں قبیل دوسری ہندی جماعتوں سے خاص ربط اور ان کی طرف فطری میلان تھا"۔ (۱۲۸)

سوا اس کے:

"ہندوستان کے بڑے راجواڑوں کی لڑکیاں جنہیں بادشاہ اپنے تصرف میں لا چکا تھا، ان عورتوں کو بھی بادشاہ کے مزاج میں خاصہ دخل ہو گیا تھا"۔ (۱۲۹)

اور اسی کے ساتھ کالپی کا ایک برہمن جس کا نام برہمداس تھا، اور جس کو پہلے "کب رائے" یعنی ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا اور بعد کو وہی "بیربل" (بہادر) کے نام سے مشہور ہوا، بادشاہ کے مزاج میں بہت دخیل ہو گیا تھا۔ اکبر و بیربل کے تعلقات اس درجہ پر پہنچے ہوئے تھے کہ آج تک اُن کے چرچے ہندوستان کے گلی کوچے معمور ہیں۔ ملا صاحب نے اگر اس کے متعلق یہ لکھا ہے کہ بادشاہ سے اس کا تعلق "لحمک لحمی و دمک دمی (۱۳۰)" کا سا ہو گیا تھا تو اس میں کیا تعجب ہے اور آخر میں اسی بیربل کی سفارش سے ایک بڑا فلسفی برہمن جس کا نام دیوی تھا، بادشاہ کے قرب سے معزز ہوا۔ بتدریج اس برہمن کا اثر اکبر پر یہاں تک پڑا کہ رات

کو بھی جب شاہی خواب گاہ میں چلا جاتا تھا، دیوی برہمن سے ملنے کے لئے بے چین رہتا تھا۔ معلوم نہیں کہ خاص اسی برہمن کے لئے یا کسی اور وجہ سے اکبر نے ایک لفٹ (جھولا) تیار کیا تھا جس پر بیٹھنے والا بیٹھ جاتا اور اوپر کھینچ لیا جاتا۔ ملا صاحب لکھتے ہیں:

''یک زمانہ تک دیوی برہمن جو مہابھارت کی کتھا کہنے والا تھا، اس کو چارپائی پر بٹھا کر اوپر کھینچ کر اس قصر کے پاس جس کو بادشاہ نے اپنی خواب گاہ بنایا تھا، اس کو معلق رکھا جاتا تھا اور اس سے ہندوستانی قصے اور ہندوستانی اسرار نیز بتوں، آفتاب اور آگ کے پوجنے کے طریقے، ستاروں کی تعظیم کے آداب، ہندوؤں کے جو بڑے لوگ گزرے ہیں، مثلاً برہما، مہادیو، بشن، کشن، مہامائی وغیرہ کے احترام کی صورتیں سنتا اور پھر ان کی جانب مائل ہوتا اور ان کو قبول کرتا۔'' (۱۳۱)

اسی طرح ''پرکھوتم'' نامی برہمن بھی بادشاہ سے بہت زیادہ ہل مل گیا تھا، ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ زیادہ تر دینِ اکبری میں ان ہی لوگوں کے عقائد و ایمانیات اور رسوم و طریقوں کو جگہ ملی۔

کلام طویل ہوگیا مگر جب تک تاریکی سامنے نہ ہو، نور کی قدر نہیں ہوتی۔ گزشتہ تحریر نے واضح کر دیا کہ عہدِ اکبری اگرچہ مغل شہنشاہیت کا زمانہ تھا، مگر ملتِ اسلامیہ کو چار فتنوں نے گھیر رکھا تھا۔

① علماءِ سوء کا فتنہ

② فتنۂ اکبری

③ روافض

④ ہندو یا عیسائی

فتنوں کی گنتی چار پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ''الف ثانی'' یعنی دوسرے ہزارہ کے متعلق بھی کچھ ایسی روایات پیدا ہوگئی تھیں جو بجائے خود مستقل فتنہ بن گئی تھیں، اور بہت ممکن ہے کہ لفظ مجدد کے ساتھ ''الف ثانی'' کا لفظ انہیں دجل آمیز روایات کی اصلاح کے لئے اضافہ کیا گیا ہو۔

اس سلسلہ میں ہم مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ کی تحریر پیش کرنا کافی سمجھتے ہیں۔

الف ثانی کا نظریہ اور دینِ الٰہی کی تدوین

عجیب بات ہے کہ تاریخوں میں اس نظریہ کا ذکر کنائے اشارے میں نہیں بلکہ کھلے کھلے لفظوں میں بکثرت کیا گیا ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ پچھلے مؤرخین نے اس کے ذکر میں تساہل سے کیوں کام لیا۔ حالانکہ حضرت مجددؒ کی تجدید کی اضافت جو ''الف ثانی'' یعنی اسلام کی مدتِ عمر کے دوسرے ہزار سال کی طرف ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے اور انشاء اللہ اس کی تفصیل آئندہ آتی ہے، اس کا زیادہ تر تعلق اکبر کے اسی نظریہ سے معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال میں واقعات درج کرتا ہوں نتیجہ تک ہر شخص خود بآسانی پہنچ سکتا

ہے۔ چونکہ التزاماً اس سلسلہ میں جو کچھ بھی لکھ رہا ہوں، ملا عبدالقادر ہی کی کتاب سے لکھ رہا ہوں اس لئے اس مسئلہ میں بھی میرا مواد ان ہی کی تاریخ تک محدود رہے گا۔

ملا صاحب فرماتے ہیں:

''بادشاہ نے یہ خیال پکایا کہ آنحضرتؐ کے دین کی مدت عمر کل ایک ہزار سال تھی جو پوری ہو گئی۔ بادشاہ کے دل میں اس کے بعد ان منصوبوں کے اظہار اور اعلان میں اب کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی، جو اپنے دل میں اس نے پکائے تھے۔ ادھر ایسے مشائخ اور علماء جن کا کچھ رعب وداب تھا، اُن سے بساط خالی ہو چکی تھی۔ لہٰذا فراغت کے ساتھ دل کھول کر احکام وارکان اسلام کے باطل کرنے میں لگ گئے؛ اور نت نئے ضوابط وقواعد کا بندوبست عمل میں آنے لگا''۔ (۱۳۲)

یہ تھا وہ نظریہ جس کا نام میں نے ''نظریۂ الف ثانی'' رکھا ہے اور صرف نظریہ پر قناعت نہیں کی گئی بلکہ اس کے اعلان عام کا ذریعہ یہ اختیار کیا گیا کہ سکہ کا نام ''سکۂ الفی'' رکھا گیا۔ اور اس پر ''الف'' ہی کی تاریخ ثبت کی گئی۔ ملا صاحب لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا تجویز کے بعد:

پہلا حکم یہ دیا گیا تھا کہ سکہ میں ''الف'' (ہزار) کی تاریخ لکھی جائے''۔ (۱۳۳)

پھر دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''سکوں اور اشرفیوں میں الف کی تاریخ لکھوائی گئی اور اس سے ادھر اشارہ کرنا مقصود تھا کہ محمدؐ کے دین متین کی عمر جو ہزار سال تھی وہ پوری ہو گئی''۔ (۱۳۴)

ظاہر ہے کہ سکہ ہی ایسی چیز ہوتی ہے جس کی ہر خاص وعام تک رسائی ناگزیر ہے۔ کتابوں، اخباروں، رسالوں وغیرہ وغیرہ سے زیادہ کارگر تدبیر اشتہار کی اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی تھی اور غالباً یہی وجہ تھی کہ پہلے سلاطین کے جتنے سکے تھے اور خود اپنے زمانہ کے دوسرے سکوں کو سخت ترین احکام وفرامین کے ذریعہ سے اکبر نے اُگلوا لیا تھا۔ صرف ایک ہی سکہ باقی رکھا تھا۔ لیکن ''بات اس پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ایک کتاب بھی ''تاریخ الفی'' کے نام سے اکبر نے تالیف کرائی جس کی ترتیب وتدوین کا کام چند علماء کے سپرد ہوا۔ ملا صاحب لکھتے ہیں:

''اسی سال یہ حکم ہوا کہ ہجرت سے چونکہ ہزار سال پورے ہو گئے اور لوگ ہر جگہ تاریخ ہجری لکھتے ہیں۔ اب مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسی تاریخ مرتب کی جائے جو ان تمام سلاطین کے حالات پر حاوی ہو جو ابتداء سے اب تک اسلام میں گزرے ہیں جو دوسری تمام تاریخوں کے لئے ناسخ کی حیثیت رکھتی ہو۔ اس تاریخ کا نام ''الفی'' رکھیں اور یہ بھی حکم دیا کہ سنون کے ذکر میں بجائے ہجرت کے رحلت کا لفظ لکھیں''۔ (۱۳۵)

مطلب یہ تھا کہ اپنے زمانہ کی حد تک تو سکہ کا طریقہ اشتہار کے لئے مفید تھا لیکن اس کے بعد پھر اس کی یاد دہانی کا ذریعہ کوئی اور ہونا چاہیے۔ اس کے لئے تاریخ الفی کا ذریعہ اختیار کیا گیا۔

اکبر تک یہ نظریہ کس طرح پہنچا؟ خود اس کے اپنے دماغ نے یہ ایجاد کی یا اس کے پیچھے جو ''قرنا'' لگائے

گئے تھے، یہ ان کی تسویل وتزویر تھی؟ صحیح طور پر اس کا پتہ نہیں چلا لیکن اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس نظریہ کی تائید میں دلائل کا ایک انبار جمع کر دیا تھا۔ ملا صاحب لکھتے ہیں:

''اسی سال چند رذیل اوئی درجہ کے لوگ جو عالم نما جاہل تھے، انہوں نے اس دعوے کے متعلق باطل دلیلوں کا پشتہ باندھ دیا کہ اس وقت حضرت والا ہی وہ صاحب زماں ہیں جو ہندو اور مسلمانوں کے بہتر ۷۲ فرقوں کے خلاف واختلاف کو اُٹھا دیں گے''۔ (حالانکہ بہتر ۷۲ فرقوں کا تذکرہ جس حدیث میں ہے اُس میں اُمتی کا لفظ بھی ہے یعنی یہ بہتر ۷۲ فرقے اُن کے ہوں گے جو اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں)۔ (۱۳۶)

ہندو مسلم اختلافات کو مٹادینا جب نظریۂ الف ثانی کا سنگ بنیاد ہوا اور اسلامی احکام وعقائد کے سوا جملہ ادیان و مذاہب اس صاحب زمان کو بہتر معلوم ہوں، تو کون ہوگا جو اس وارفتگی سے فائدہ نہ اُٹھائے۔ چنانچہ ملا صاحب کا بیان ہے:

''ہندوستان (۱۳۷) کے قدیم دانشمندوں کے نام سے (اس زمانہ) کے برہمن ہندی اشعار نقل کر کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتے تھے جن کا مضمون یہ ہوتا تھا کہ جہان کا فتح کرنے والا ایک بادشاہ ہندوستان میں پیدا ہوگا جو برہمنوں کی بڑی عزت کرے گا اور گائے کی حفاظت کرے گا، اور عالم کی نگرانی انصاف کے ساتھ کرے گا۔ پرانے کاغذات (۱۳۸) پر ان خرافات کو لکھ کر بادشاہ کو دکھایا کرتے تھے اور بادشاہ ان کو صحیح خیال کرتا تھا''۔

کوئی صاحب حاجی ابراہیم صاحب سرہندی تھے جن کا ذکر اس کتاب میں مختلف مواقع پر کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی آدمی تھے۔ اکبر کے زمانہ میں صوبہ گجرات کی صدارت پر سرفراز تھے۔ آپ نے گجرات سے جو تحفے بادشاہ کے پاس بھیجے، ان میں ایک تحفہ یہ بھی تھا:

''ایک جعلی عبارت حضرت شیخ ابن عربی قدس سرہ کی ایک پرانی کرم خوردہ کتاب میں نامانوس حروف میں نقل کر دی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ''صاحب زمان'' کے پاس بہت سی عورتیں ہوں گی اور وہ ڈاڑھ منڈا ہوگا۔ اسی طرح کے چند صفات جو ''خلیفۃ الزمان'' میں تھے اس میں درج تھے''۔ (۱۳۹)

مگر برہمنوں کی طرح ان کی بات نہ بن سکی۔ چنانچہ ملا صاحب لکھتے ہیں کہ:

''آں جعل والباس ظاہر شد''۔

ایک اور مولوی صاحب تھے جن کا ذکر ملا صاحب نے مولانائے خواجہ شیرازی کے لقب سے کیا ہے۔ ان مولانا صاحب کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''شرفاء کے پاس سے مکہ معظمہ سے ایک رسالہ لائے کہ صحیح حدیثوں میں ایام دنیا کی پوری مدت جو سات ہزار سال بتائی گئی ہے، وہ پوری ہو چکی ہے۔ پس یہی وقت اس مہدی کے ظہور کا ہے جس کا وعدہ کیا گیا ہے''۔ (۱۴۰)

خود ان مولانا کے خواجہ شیرازی صاحب نے بھی اس موضوع پر ایک رسالہ مرتب فرما کر پیش کردیا۔

ملا صاحب لکھتے ہیں کہ اس تحریک کی تائید میں صرف سنی علماء ہی کے افراد شریک نہیں ہوئے تھے بلکہ شیعی علماء کے بعض افراد بھی۔ چنانچہ ایک شیعہ عالم ملا عالم شریف آملی تھے۔ جو صاحب تالیف و تصنیف بھی۔ ملا صاحب نے ان کا ایک تذکرہ درج کیا ہے۔ انہوں نے محمود بسخوانی جو تیموری عہد کا ایک مشہور شطح نویس مصنف گزرا ہے۔ اس کی کتاب سے بھی یہ مضمون نکالا کہ:

''تو سو نوے ۹۹۰ ہجری میں باطل کا مٹانے والا ایک شخص پیدا ہوگا۔ صاحب دین حق کے تمام اوصاف (اکبر پر) منطبق کر دیئے جو جمل کے قاعدے سے بھی نو سو نوے ہوتے تھے''۔ (۱۴۱)

ان سب کے علاوہ ناصر خسرو کی دو رباعیاں بھی اسی نظریہ ''الف ثانی'' کی تائید میں پیش کی جاتی تھیں۔ پہلی رباعی یہ ہے:

در نہ صد و ہشتاد نہ از حکم قضا — آیند کواکب از جوانب یک جا
در سال اسد، ماہ اسد روز اسد — از پردہ بروں خرامد آں شیر خدا

اور ''آں شیر خدا'' سے مراد اکبر کی ذات تھی۔ دوسری رباعی یہ ہے:

در نہ صد و تسعین دو قرآں می بینم — وز مہدی و دجال نشاں می بینم
یا ملک بدل گردد یا گردد دین — سرے کہ نہاں است عیاں می بینم

بہر کیف اکبر کے زمانہ میں اتفاقاً اسلام کی عمر کے ہزار سال کا گزرنا ایک ایسا واقعہ بنالیا گیا جس پر ''الف ثانی'' کے نظریہ کی یادوں نے بڑی بڑی تعمیریں کھڑی کر دیں اور مستقل طور پر طے کر دیا گیا کہ ''محمدی اسلام'' کی عمر پوری ہوگئی۔ بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی اضافہ کر دیا گیا کہ بالفرض اگر نہ بھی پوری ہوئی (جیسا کہ ملا صاحب کا بیان ہے) جب بھی:

''ملا مبارک نے میرے سے بادشاہ کے سامنے خلوت میں مخاطب کرکے کہا کہ جس طرح تمہارے دین میں تحریفیں ہوئی ہیں، اسی طرح ہمارے مذہب میں بکثرت تحریفیں ہوئی ہیں۔ جن کی وجہ سے اب اس مذہب پر بھی اعتماد باقی نہیں رہا''۔ (۱۴۲)

ایک مقدمہ یہ ہوا۔ اور دوسرا اسی کے بعد:

''اور ہجرت سے اس وقت تک ایک ہزار سال کی مدت بھی پوری ہو چکی ہے''۔ (۱۴۳)

نتیجہ ظاہر ہے کہ اب کسی جدید آئین کی ضرورت ہے۔ لیکن جدید آئین کی بنیاد کیا ہونی چاہئے۔ گزر چکا کہ ''ہندو مسلم'' اختلاف کو رفع کرنا۔ اب سنیے کہ اس پر جدید حاشیہ آرائی کیا ہوئی:

''تمام مذاہب میں عقل مند موجود ہیں اور پائے جاتے ہیں، اسی طرح ریاضت و مجاہدہ کشف و کرامات والے بھی دنیا کے تمام لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور حق تمام مذاہب میں پایا جاتا

ہے۔ پھر ایک ہی دین وملت میں جو نیا پیدا ہوا ہے اور اس پر ہزار سال بھی نہیں گزرے، حق کے منحصر ہونے کی کیا ضرورت ہے، ایک کو ثابت کرنے اور دوسرے کی نفی کرنے کی ترجیح بلا مرجح کہاں سے جائز ہوئی"۔ (۱۴۴)

بہرحال آخر یہ طے کر لیا گیا کہ جدید ملت کی بنیاد رکھ دی جائے۔ ظاہر ہے کہ اکبر کی تخریبی رفتار اس وقت تک صرف دامان نبوت تک پہنچی تھی۔ الحاد کی آخری منزل تک نہیں پہنچا تھا۔ اس کے دماغ میں ابھی "الٰہ" کا تصور باقی تھا اور اسی لئے اس دین جدید کا نام "الٰہی مذہب" رکھا گیا تھا۔ الٰہی مذہب کے لئے عموماً الہام ووحی کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر کیا اکبر نے کوئی اس کا بھی سامان کیا تھا اور کتابوں میں تو شاید اس کا بھی کچھ سراغ ملتا ہے۔ لیکن ملا صاحب باوجودیکہ ایک موقع پر یہ لکھ گئے ہیں:

"یہی باتیں دعویٔ نبوت کا سبب ہوئیں۔ لیکن "نبوت" کے لفظ کے ساتھ نہیں بلکہ دوسرے لفظوں میں"۔ (۱۴۵)

اور ملا شیری نے بھی اپنے مشہور قصیدہ میں اکبر کی ان بے ہودہ کوششوں کا اس ایک شعر میں جواب دے کر کہ:

شورش مغزاست اگر در خاطر آرد جاہلی
کز خلائق مہر پیغمبر جدا خواہد شدن

آخر میں انہوں نے بھی کچھ "نبوت" ہی کی جانب ظریفانہ اشارہ کیا ہے:

بادشاہ امسال دعوائے نبوت کردہ است
گر خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن

لیکن بجز ایک واقعہ کے جس کا ذکر بدایونی نے بھی کیا ہے کہ نندانہ (پنجاب) سے لوٹتے ہوئے اکبر کو شیرد شکار کا شوق ہوا، اور قمرغہ (ہانکنے) کا فرمان دے کر شکار میں مصروف ہوا چار دن تک مسلسل شکار کھیلتا رہا۔ شکاروں کا انبار لگ گیا کہ اچانک ایک درخت کے نیچے:

"اچانک بادشاہ پر ایک عجیب حالت طاری ہوئی اور جذبہ عظیم وارد ہوا، حالت میں غیر معمولی تبدیلی رونما ہوئی۔ یہ ایک ایسی کیفیت تھی جس کی تعبیر ناممکن ہے۔ ہر شخص اپنے خیال کے مطابق ایک رائے قائم کرتا تھا"۔ (۱۴۶)

اکبر پر یہ کس قسم کا حال طاری ہوا؟ ملا صاحب تو "الغیب عند اللہ" کہہ کر نکل گئے لیکن آگے چل کر خود ہی لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے مشرقی علاقوں میں بادشاہ کی اس کیفیت کی خبر نے شہرت پائی، اور طرح طرح کی گپیں اور بیہودہ باتیں عوام کی زبانوں پر آ گئیں"۔ (۱۴۷)

بظاہر وحی وکتاب کے متعلق جو بعض خبریں مشہور ہیں۔ وہ ان ہی "اراجیف واکاذیب" پر مبنی ہیں۔ اتنا تو

ثابت ہے کہ اس درخت کو ''مقدس'' قرار دیا گیا ہے اور:

''بلند عمارت اور وسیع باغ کی بنیاد اس جگہ ڈال دی اور بہت سا سونا فقراء اور مساکین کو دیا'' (۱۴۸)

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سر کے بال کٹوائے''۔ (۱۴۹)

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کیا کے ''ہولی ٹری'' (Holly tree) کی نقل نہ تھی۔ کیا اکبر کو پیپل کے درخت کی خبر نہ تھی جس کے نیچے ہندوستان کے مشہور بانی مذہب ''بدھا'' کے ساتھ کچھ اسی قسم کا واقعہ پیش آیا تھا؟ لیکن باوجود عمارت عالی و باغ وسیع'' کے:

اے بس آرزو کہ خاک شدہ

عاشیری نے سچ کہا تھا:

شورش مغز است اگر در خاطر آرد جا ملے

کز خلائق مہر پیغمبر خدا خواہد شدن

بہرحال جہاں تک میری محدود معلومات کا تعلق ہے، اکبر نے نبوت کا صریح اور صاف دعویٰ کبھی نہیں کیا تھا۔ جس کی شہادت ملا صاحب بھی دیتے ہیں لیکن کوئی صاحب تاج العارفین تھے۔ وہ:

''انسان کامل سے خلیفۃ الزمان کی ذات مراد لیتے تھے۔ ''ذات اقدس'' اس کا خطاب مقرر کیا تھا۔ اور بااوقات بلا کم وکاست اس کو بجنسہٖ خدا قرار دیتے (۱۵۰) تھے''۔

لیکن پھر بھی جو بات ''نبی'' بننے میں حاصل ہوسکتی تھی، ''عین خدا'' بننے میں وہ لطف نہ تھا۔ بادشاہ تو خیر کوئی چیز بھی ہے۔ ہر فقیر ''انا الحق'' کا نعرہ لگا سکتا تھا۔ اس لئے اس کو کوئی اہمیت بھی نہیں دی گئی''۔

کریا

مریم مکانی (والدہ اکبر) کا انتقال ہوا۔ تو سوگ اور ماتم کے ساتھ یہ بھی تھا:

''سر، داڑھی اور مونچھیں منڈوا کر ماتمی لباس پہنا اور بادشاہ کی موافقت میں کئی ہزار امراء، منصب داروں اور شاگرد پیشہ لوگوں نے سروں، داڑھیوں اور مونچھوں کو منڈوا دیا''۔ (۱۵۱)

بدایونی کی تحریر سے اکبر کے خیالات و رجحانات کا کافی اندازہ ہوگیا۔ شیخ ابوالفضل اس کا بھائی فیضی اور باپ ملا مبارک ناگوری، اکبر کے مریدان خاص (۱۵۲) ہیں، جو دین الٰہی کی اصطلاح کے بموجب اخلاص کے چاروں مراتب (ترک مال، ترک جان، ترک ناموس، ترک دین) طے کر چکے تھے۔

اکبرنامہ اور آئین اکبری میں شیخ ابوالفضل نے بھی اکبر کا مذہب بیان کیا ہے۔ مشیر خاص ہمراز اور ہمنوا ہونے کی حیثیت سے اس کا فرض بھی تھا کہ وہ اکبر کی لامذہبی کی تاویل کرتا۔ چنانچہ اس نے اس فرض کو بخوبی انجام دیا ہے۔

جہانگیر ولی عہد اور جانشین ہونے کے ساتھ ایک واقعہ نگار بھی ہے۔ مگر وہ توزک میں جگہ جگہ اکبر کو خداء مجازی[۱۵۳] اور مرشدِ حقیقی لکھتا ہے۔ وہ اپنے مرشد کے کچھ اوصاف نمایاں کرتا ہے:

"میرے والد بزرگوار کے اوصاف حمیدہ تعریف وتوصیف کے حدود انداز سے خارج ہیں پدری و فرزندی کے مرتبہ سے قطع نظر حقیقت یہ ہے کہ ان کے اخلاق پسندیدہ کے متعلق اگر مستقل کتابیں لکھی جائیں تو ایک تھوڑا سا حصہ بھی احاطۂ تحریر میں نہ آئے۔ عظیم الشان سلطنت اور بے حد وحساب خزانوں اور دفینوں اور بے شمار ہاتھیوں اور عربی اور ترکی گھوڑوں کے باوجود درگاہ الٰہی میں عاجزی اور فروتنی کے درجہ سے ایک بال برابر بھی قدم باہر نہیں رکھا۔

خدا کی مخلوقات میں اپنے آپ کو ایک کم ترین مخلوق سمجھ کر یادِ حق سے ایک لحظہ کے لئے بھی غافل نہیں رہتے تھے۔[۱۵۴]

دائم ہمہ جا باکس درہمہ حال
میدار نہفتہ چشم دل جانب یار[۱۵۵]

(توزک جہانگیری)

اس مرید با اخلاص (جہانگیر) کی تردید کی ضرورت نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دین الٰہی کی بنیاد کا خیال بھی نہ آتا۔ مگر کیا اپنے اختراع اور ایجاد کے بموجب "نیر اعظم" (آفتاب) کی پرستش اور کسی خیالی خدا یا دیوتا کی یاد کرنا اور بروم اس کا مالا جپنا "دین محمدی" کی دشمنی کے مخالف ہے؟

یہی مرید صادق تحریر فرماتے ہیں:

"میرے باپ اکثر اوقات ہر ایک دین اور مذہب کے دانشمندوں اور ماہروں اور بالخصوص پنڈتوں اور دانایانِ ہند سے محبت رکھا کرتے تھے۔ اور باوجودیکہ اُمی (قطعاً ان پڑھ) تھے مگر دانا اور ارباب فضل کی کثرت مجالست اور رات دن کی صحبت کے باعث اُن کی گفتگو سے بظاہر کوئی شخص بھی معلوم نہ کر سکتا تھا کہ یہ اُمی (ان پڑھ) ہیں۔ نظم ونثر کی اُن باریکیوں تک پہنچ جاتے تھے کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں[۱۵۶] آ سکتا"۔ (توزک)

ان نمائشی اوصاف کے بعد مشیئانہ انداز سے اس کی لا مذہبی کی تاویل کر ڈالتا ہے۔

"شیعہ کے لئے ایران اور سنی کے لئے روم، ہندوستان اور توران کے سوا کہیں پناہ نہیں۔ مگر ممالک دنیا کے طرز وآئین کے برخلاف اس دولت بے نظیر کے وسیع ملک میں مختلف مذہبوں کے ماننے والوں کے لئے مساوی طور پر پناہ اور امن مہیا ہے"۔[۱۵۷]

جس طرح رحمت ایزدی کے وسیع الفضاء دائرہ میں تمام جماعتوں اور تمام مذہب والوں کے لئے گنجائش اور پناہ موجود ہے۔ پس اس بنا پر کہ[۱۵۸] سایہ کو چاہئے کہ ذات کا پرتو ہو۔ آپ کے ممالک محروسہ میں جس کی سرحد دریائے شور کے ساحل پر ختم ہوتی ہے، تمام مختلف ملتوں اور صحیح اور ناقص عقیدوں کے ماننے والوں کے لئے

پناہ تھی، اور ایک دوسرے کی ایذا رسانی کا راستہ بند تھا۔
سنی شیعہ کے ساتھ ایک مسجد میں، فرنگی یہودی کے ساتھ ایک کلیسا میں عبادت کے طریقے بجالاتے تھے۔
آپ کا مقررہ اصول صلح کل تھا۔

''ہر طائفہ اور ہر دین و آئین کے نیک اور بھلے آدمیوں کے ساتھ محبت رکھتے تھے حالت اور فہم کے بموجب ہر ایک کے ساتھ التفات فرماتے تھے۔ آپ کی راتیں بیداری میں گزرتی تھیں اور دن میں بہت کم سوتے تھے۔ چنانچہ رات دن میں سونے کی مدت ڈیڑھ پہر سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ بیداری شب کو عمر کی واپس شدہ دولت تصور کرتے تھے۔ (توزک جہانگیری ص ۱۸)

تنبیہ

اسلام سے بڑھ کر ''صلح کل'' کون ہو سکتا ہے جس کی تعلیم ہے:

لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ (سورہ انعام)

ان کو بے ہودہ بات نہ کہو جو خدا کے ماسوا کو پکارتے ہیں (معبود بناتے ہیں) کیونکہ پھر وہ نادانی سے آگے بڑھ کر خدا کی شان میں بے ہودگی کرنے لگیں گے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (سورہ بقرہ)

رسول اللہ اور تمام مسلمان اُس پر ایمان لائے، جو رسول اللہؐ پر اُن کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ اُن میں سے ہر ایک ایمان لایا اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، اس کی نازل فرمودہ کتابوں اور اُس کے تمام رسولوں پر اس عقیدہ کے ساتھ کہ ہم خدا کے تمام رسولوں کو مانتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو مانیں کسی کو نہ مانیں، یہ تفریق نہیں کرتے۔

اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ۔

ہر ایک امت میں کوئی نبی گزرا ہے۔

تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں اُس کا اصول یہ ہے:

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ (سورہ بقرہ)

دین کے بارے میں جبر واکراہ نہیں ہدایت اور گمراہی نکھر گئی۔

مگر مصیبت تو یہ تھی کہ ''صلح کل'' کا مطلب وہ لیا گیا، جس کی توضیح بدایونی نے کی۔ حتی کہ ایک نئے دین کی ضرورت محسوس ہونے لگی، اور خود جہانگیر کی تحریر کے بموجب ''مریم مکانی'' کے مرنے پر داڑھی اور مونچھیں مونڈوادی گئیں۔ انتہا یہ کہ ''جہانگیر جیسا شکار کا عاشق'' لکھتا ہے:

"جو ریاضتیں میرے والد نے کیں، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ "غذا حیوانی" کو ترک کر دیا تھا۔ تمام سال میں صرف تین مہینے گوشت کی طرف رغبت فرماتے تھے۔ باقی نو مہینے دوسری قسم کے "صوفیانہ کھانوں" پر قناعت کرتے تھے۔ اور جانوروں کے مارنے اور ذبح کرنے کو کبھی بھی پسند نہ کرتے تھے۔ اُن کے ایامِ فرخندہ فرجام (مبارک دور) میں بہت سے مہینوں اور دنوں میں حیوانات کا مارنا عام طور پر ممنوع تھا۔ جس کی تفصیل اکبر نامہ میں درج ہے۔ (توزک جہانگیری ص ۲۲)[۱۵۹]

بنیادی غلطی

جہانگیر اور اکبر دونوں ایک بنیادی غلطی میں مبتلا ہیں۔ اُن کے نزدیک اسلام وہ ہے جو اُن کو اچھا لگے۔ مگر درحقیقت یہ خدا پرستی نہیں خود پرستی ہے۔ اسلام اطاعت ہے۔ اطاعت میں اپنی عقل چلانا سرکشی اور تمرد ہے۔ یہ درست ہے کہ دانا اور مدبر حاکم کا کوئی حکم بھی مصلحت اور حکمت سے خالی نہ ہوگا۔ مگر محکوم کا پہلا کام یہ ہے کہ اپنی عقل پر نہیں بلکہ حاکم کے حکم پر اعتماد کرے۔

ایک سپاہی افسر کے اشارہ کا پابند ہوتا ہے اور اس کے حکم پر اپنی جان نثار کیا کرتا ہے۔ اگر فرمان کو پہلے اپنی عقل کی ترازو پر تولے اور پھر اطاعت کے لئے قدم بڑھائے تو وہ سپاہی نہیں ——— کلامِ الٰہی کا اعلان ہے:

وَمَا أُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيْلًا

تمہیں بہت ہی تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔

انسان کے سامنے جب یہ اعلانِ حق پڑھا جاتا ہے تو وہ ہمیشہ چیں بجبیں ہوا کرتا ہے۔ مگر مستقبل کی تاریخ ہمیشہ اس اعلان کی تصدیق کرتی رہتی ہے۔

اکبر کے زمانہ سے موجودہ دور تک کی ترقیات پر نظر ڈالو، تو وہ عقل[۱۶۰] دور اندیش جس پر اکبر اور اس کی پارٹی کو ناز تھا، آج جہالت سمجھی جا رہی ہے۔

آلِ تیمور کی سیادت کو محفوظ رکھنے کے لئے اُس نے ایک مذہب کی بنیاد ڈالنی چاہی کاش ایجادِ مذہب کے بجائے وہ دستورِ سلطنت میں اصلاح کرتا۔ پارلیمنٹری نظامِ حکومت قائم کر کے آلِ تیمور کے لئے شاہیت کو محفوظ کر دیتا تو زیادہ ممکن تھا کہ برطانوی شہنشاہیت کی طرح مغلیہ شہنشاہیت کو لازوال ورنہ دیرپا بنا دیتا لیکن وما اوتیتم من العلم الا قلیلا کا تاریخی مظاہرہ کس طرح ہوتا؟

کلام اللہ نے واضح کر دیا کہ انسان فطرتاً ظالم اور جاہل ہے۔ خالقِ فطرت نے قرآن حکیم کو اسی لئے نازل فرمایا کہ ظلم کے بدلے عدل، جہل کے عوض میں علم، فطرت[۱۶۱] انسان کو مرحمت ہو لہٰذا خلافِ شرع جو کچھ ہے ظلم و جہل ہے۔ عقل بلاشبہ بڑی دولت ہے۔ عقل اور علم کی خداداد دولتوں نے ہی انسان کے درجہ کو خدا کی تمام مخلوقات میں سب سے اعلیٰ اور بالا کیا، اور اسی لئے حکم ہے کہ علم و عقل کو کام میں لاؤ۔

فَاعْتَبِرُوْا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ (قرآن حکیم) اے عقل والو سبق حاصل کرو۔

مگر سب سے پہلے اپنی حقیقت، فطری لاچاری اور بے بسی، پھر خالق کے احسانات اور اس رابطہ اور تعلق کے تجسس میں اس کو صرف کرو، جو خالق اور مخلوق کے درمیان میں ہونا ضروری ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَاخَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (قرآن حکیم)

یقیناً آسمانوں زمینوں کی پیدائش اور لیل ونہار کی گردش میں اہل عقل کے لئے نشانیاں ہیں۔ وہ اہل عقل جو کھڑے بیٹھے اور لیٹ کر (ہر حالت) میں خدا کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش میں غور وفکر کرتے رہتے ہیں۔ (نتیجتاً کہتے ہیں) خداوندا تو نے اس (کائنات) کو بے کار نہیں پیدا کیا۔ تو تمام نقائص اور عیوب سے پاک ہے۔ ہمیں عذاب دوزخ سے محفوظ رکھ۔

ارسطو اور افلاطون، جالینوس اور بطلیموس جیسے عقل وفکر کے دیوتا دنیا میں آئے ہر ایک نے نوع انسان کے بہبود وفلاح کا راستہ دریافت کرنا چاہا، مگر کیا وہ کامیاب ہو گئے؟ (العظمۃ للہ)۔ کامیابی تو درکنار اُن کی نمائشی دانش وحکمت نے انبیا کی پاک تعلیم کو بھی مکدر کر دیا۔ اسی لئے فاطر ہستی نے آخری پیغام (قرآن حکیم) میں اعلان کر دیا:

"نہیں نہیں! تیرے رب کی قسم، وہ مومن نہیں، جب تک آپ کو (رسول اللہؐ) اُن تمام اُمور میں حکم (جج) نہ مان لیں جن کے بارے میں اُن کے آپس میں اختلاف ہو۔ پھر جو کچھ آپ کا فیصلہ ہو، اس کے متعلق اپنے دلوں میں قطعاً کوئی تنگی محسوس نہ کریں، اور اس کے سامنے پوری طرح سر تسلیم خم کر دیں (قرآن حکیم)(۱۶۲)

نیز اعلان فرمایا گیا:

"جو کچھ رسول تم کو دیں لے لو جس سے منع کریں رک جاؤ۔ (قرآن حکیم)(۱۶۳)

حکم ہے:

"حکم پر چلو(۱۶۴) اللہ کے اور حکم پر چلو رسول کے۔ اور ضائع مت کرو اپنے کئے ہوئے کام"۔(۱۶۵)

بہرحال جہانگیر کو تعجب ہے کہ اتنی شوکت وحشمت، اتنی دولت وثروت کے باوجود وہ ہر وقت خدا کو یاد کیا کرتا تھا۔ مگر کتاب اللہ کا فیصلہ یہ ہے:

"ہدایت کے واضح اور ظاہر ہو جانے کے بعد جو شخص بھی رسول کی مخالفت کرے گا، اور مسلمانوں کے راستہ کے سوا دوسری راہ پر چلے گا، تو ہم اس کو چلائے جائیں گے اُسی راستہ، جس پر وہ چلا ہے۔ پھر ہم اس کو دوزخ میں جھونک دیں گے اور وہ بری جگہ ہے۔ (قرآن حکیم)(۱۶۶)

خلاف پیمبر کسے راہ وزید   کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

موت اکبر
عیبش ہمہ گفتی ہنرش نیز بگو

خان بہادر شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب دہلوی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

اکبر نے ۱۰۱۳ھ میں وفات پائی اور ملا عبدالقادر کی تاریخ ۱۰۰۴ھ پر ختم ہو جاتی ہے۔

ابوالفضل نے ۱۰۱۱ھ میں وفات پائی، اور اکبر کے مرنے سے پہلے اس کی آئین اکبری اور اکبر نامہ ختم ہو گئے۔ پس اکبر کے مذہبی خیالات کے تغیرات کا ذکر آخر دس برس میں کسی مؤرخ نے نہیں لکھا۔

شہنشاہ اکبر کے خیالات مذہبی ہمیشہ بدلتے رہتے تھے۔ معلوم نہیں کہ اس آخر دس سال میں اُن میں کیا تغیر پیدا ہوا۔

جہانگیر کی توزک جہانگیری کا ترجمہ انگریزی زبان میں میجر پرائس صاحب نے کیا ہے۔ ترجمہ میں یہ فقرہ لکھا ہے:

''شہنشاہ اکبر نے سب سے بڑے مولوی کے ہاتھ پر توبہ کی اور کلمہ پڑھ کر جنتی مسلمانوں کی طرح دواس دنیا سے رخصت ہوا''۔

مگر اس مضمون کا کوئی فقرہ اس توزک جہانگیری میں نہیں ہے جو سر ڈاکٹر سید احمد خان بہادر نے ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) میں چھپوایا ہے۔ (تاریخ ہندوستان ج ۵ ص ۸۶۳ و ص ۸۶۴)۔

شمس العلماء موصوف نے جلد ششم میں تحریر فرمایا ہے:

''جہانگیر نے چھوٹی توزک میں باپ کے مرنے کا حال بہت دلچسپ لکھا ہے۔ روز سہ شنبہ ہشتم جمادی الاولیٰ کو میرے باپ و مرشد کا سانس تنگ ہوا، وروقت رحلت قریب آ گیا۔ فرمایا

بابا! کسی آدمی کو بھیج کر میرے کل امراء اور مقربوں کو بلا لو، تاکہ میں تجھ کو اُن کے سپرد کر دوں، اور اپنا کہا سنا اُن سے معاف کراؤں۔ انہوں نے برسوں میری ہمرکابی میں جانفشانی کی ہے''۔ (۱۹۷)

اُمراء حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے ان کی طرف منہ کر کے اپنا کہا سنا معاف کرایا اور چند فارسی اشعار پڑھے۔ مرنے کے وقت والد ماجد اور میرے مرشد نے فرمایا۔ ''میراں صدر جہاں'' کو بلاؤ کہ وہ کلمۂ شہادت پڑھے۔ میراں صدر جہاں حاضر ہوئے اور دو زانو ادب سے بیٹھ کر کلمۂ شہادت پڑھنا شروع کیا۔ بادشاہ نے خود اپنی زبان سے کلمۂ شہادت بلند آواز سے پڑھا۔ اور میراں صدر جہاں سے فرمایا کہ سرہانے بیٹھ کر سورۂ یٰسین اور دعاء عدیلہ پڑھیں۔ جب میراں صدر جہاں نے سورۂ یٰسین پڑھ کر دعاء عدیلہ ختم کی تو بادشاہ کی آنکھ سے آنسو نکلے، اور جان جاں آفریں کو جان سپرد کی۔ (خلاصہ ص ۳۸۱ تا ص ۳۸۶ جلد ششم تاریخ ہندوستان)۔

رویہ اکبر کا اثر عوام پر

انسان اقتدار پرست ہے۔ اسی لئے رسول اللہؐ کا ارشاد ہے، الناس علی دین ملو کھم (لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں) اکبر کے خیالات نے عوام پر کیا اثر کیا؟ اس کے لئے ملاحظہ ہو:

حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز تحریر فرماتے ہیں:

''کفار برملا اور بطریق غلبہ، دارالاسلام (ہندوستان) میں احکام کفر جاری کرتے ہیں، اور مسلمان احکام اسلام کے اظہار سے عاجز ہیں اور اگر کر بیٹھتے ہیں تو قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ واویلاہ، واحزناہ، وامصیبتاہ۔ محمد رسول اللہ کہ محبوب رب العالمین ہیں۔ آپ کی تصدیق کرنے والے ذلیل وخوار ہیں، اور آپ کے انکار کرنے والوں کی عزت ہوتی ہے۔ انہیں کا اعتبار ہے۔ مسلمان زخمی دلوں کے ساتھ اسلام کی تعزیت میں مشغول ہیں، اور کفار اُن کا مذاق اڑا کر اُن کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہیں''۔ (مکتوب نمبر ۴۷ ص ۶۵ ج ۱)۔

جراحت مسلم پر نمک پاشی ملاحظہ ہو:

''کفار[۱۶۸] ہند بے خوف وخطر مساجد کو شہید کرتے ہیں، اور اپنے مندر اُن کی جگہ بناتے ہیں۔ تھانیسر[۱۶۹] میں کرکھیت کے حوض میں ایک مسجد اور مقبرہ تھا۔ ایک[۱۷۰] عزیز نے اس کو منہدم کر کے ایک بہت بڑی چوٹی کا شوالہ بنایا ہے۔ نیز کفار کھلم کھلا کے مراسم ادا کرتے ہیں اور مسلمان اکثر احکام اسلام کے اجراء سے عاجز ہیں''۔ (مکتوب نمبر ۹۲ ج ۲ ص ۱۶۳)۔

پھر عاجزی بھی ملاحظہ ہو:

''ہندو کاوشی کے دن کھانا پینا چھوڑتے ہیں (برت رکھتے ہیں) یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ اس روز مسلمانوں کے شہروں میں کوئی مسلمان دن میں روٹی نہ پکائے۔ رمضان مبارک کے مہینہ میں کھلے بندوں روٹی اور کھانا پکاتے ہیں اور فروخت کرتے ہیں۔ اہل اسلام کی کمزوری اور پستی کے باعث کوئی منع نہیں کر سکتا۔ افسوس صد ہزار افسوس۔ (مکتوب ۹۲ ج ۲ ص ۱۶۳)[۱۷۱]

علماء سو کی فتنہ انگیزی

ضمنی طور پر اس طبقہ کے بھی کچھ حالات ملاحظہ فرما لئے جائیں، تا کہ حضرت مجدد صاحبؒ کے الفاظ میں ملا عبد القادر کے بیان پر روشنی پڑ سکے۔

''سارا عالم بدعت کے دریا میں ڈوبا ہوا ہے اور بدعت کے اندھیروں میں آرام لے رہا ہے۔ کسی کی مجال ہے کہ بدعت کی مخالفت میں دم مارے اور احیاء سنت کے لئے لب کشائی کرے۔ اس زمانہ کے اکثر علماء بدعت کو رواج دینے والے اور سنت کو مٹانے والے ہیں'' (مکتوب ۵۴ ج ۲ ص ۱۰۳)[۱۷۲] ''ایک عزیز نے شیطان لعین کو دیکھا کہ اطمینان سے بیٹھا ہے، اور اغواء اور گمراہ کرنے

سے خاطر جمع ہو گیا ہے۔ اس عزیز نے اس کا سبب دریافت کیا۔ شیطان لعین نے کہا کہ زمانہ کے علماء سوء خود ہی میری کافی مدد کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس مہم سے مجھ کو فارغ کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جو سستی اور بے آئینی کہ اس زمانہ میں مذہبی امور میں واقع ہے اور جو کمزوری کہ ملت اور دین کی ترویج میں نمایاں ہے وہ سب علماء سوء کی نحوست اور ان کی نیتوں کے فساد کے سبب سے ہے"۔ (مکتوب نمبر ۳۳ ج اص ۴۷)(۱۷۳)

علماء باطن اور ارباب طریقت دین کی پناہ گاہ ہیں۔ اسی لئے بارگاہِ ملت سے مرشد، ولی اللہ، قطب جیسے جلیل الشان خطابات سے ان کو نوازا جاتا ہے۔

مگر بہت سے خود پرست مغرور جاہ پرستی کے لئے ان خطابات کو تو حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن اہلیت سے عاری ہوتے ہیں، اور ان کی نفس پرستی، عیاشی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ ان خطابات کے مناسب ریاضت اور مجاہدہ کر سکیں۔

"سچے اللہ والے" عوام سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ مگر چونکہ اس قسم کے دھوکا بازوں کے سامنے ان کے ذاتی مقاصد ہوتے ہیں وہ عوام کو گرویدہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام بیشتر اسی قسم کے ہوا پرستوں کے دام میں اُلجھ جاتے ہیں اور سچے اللہ والوں تک رسائی کا موقعہ بہت کم میسر آتا ہے۔

اس قسم کے دھوکا باز فقیر اور اکبر جیسے مذہبی بازی گر بادشاہ کا نقطۂ نظر ایک ہوتا ہے۔ اس لئے ہر ایک کی جدوجہد دوسرے کے لئے لامحالہ ترقی کا ذریعہ ہوگی۔ اس قسم کے تن آسان، اغراض پرستوں کے لئے شریعت ایک طرح کی زنجیر ہوتی ہے۔ جب آسانی اور آزادی سے مطلب حاصل ہو سکے تو پھر کیا ضرورت کہ شریعت کی دار و گیر میں خود کو مبتلا کیا جائے۔ لہٰذا فیصلہ کر دیا گیا تھا اور اسی کی اشاعت کی جاتی تھی کہ "شریعت اور ہے طریقت اور"۔

"خدارسی کے لئے اتباع سنت کی حاجت نہیں۔ پابند شریعت حقیقت سے بے بہرہ ہوتا ہے"۔

مولانا رومی کا ایک مصرعہ ان کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

من استخواں پیش سگاں انداختم

اب علماء شریعت سے زیادہ بھونکنے والا کون ہو سکتا تھا۔ یہی لوگ اُن کی طمع زرگری کا بھانڈا پھوڑنے والے ہو سکتے تھے۔ اور بسا اوقات نمائشی خرقہ و تسبیح کی عظمت و جلالت کو نظر انداز کر کے شوالۂ دل کی مورتیوں کی نقاب کشائی کر دیا کرتے تھے۔ یہ گستاخ نہیں جانتے تھے:

بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید

لہٰذا یقینی طور پر ہڈی پر جھگڑنے والے کتے یہی پابند شریعت مولوی تھے۔

منصور نے کہہ دیا تھا انا الحق۔ بایزید بسطامی کی زبان سے نکل گیا سبحانی (یا مثلاً) لوائی ارفع من لواء محمد۔ لہٰذا ثابت ہو گیا تھا کہ "شریعت اور ہے، طریقت اور ہے"۔

اہلِ طریقت کو بسا اوقات دورانِ ریاضت میں عجیب و غریب مکاشفات ہو جایا کرتے ہیں۔ کچھ حضرات انہیں کو حصولِ مقصد اور منتہاءِ خدا پرستی سمجھ لیا کرتے تھے۔

اس قسم کے اوہام و خیالات نے نہ جانے کتنے ناکردہ تراش شعبدہ باز مکاروں کو قلندر بنا رکھا تھا۔ اور نہ صرف یہ کہ عوام کی بھیڑ گمراہی میں مبتلا ہو رہی تھی بلکہ سچے لوگوں کے بھی اس قسم کے خیالات اُن کے روحانی نشو ونما کو پژمردہ کر دیا کرتے تھے۔

جہانگیر بادشاہ

۱۷ ربیع الاوّل ۹۷۷ھ بروز چہارشنبہ بمقام قصبہ فتحپور سیکری ضلع آگرہ ولادت ہوئی۔ جب کہ اس کی والدہ "شیخ سلیم چشتی" کے مکان پر مقیم تھی۔ (۱۷۴)

پنجشنبہ ۸ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ بعمر ۳۸ سال بمقام آگرہ سریر آرائے دولت مغلیہ ہوا۔ اکبر اور شاہ جہاں کے درمیان جس طرح جہانگیر نسبتاً واسطہ تھا، اسی طرح مذہب اور سیاسی تبدیلیوں کے لحاظ سے بھی برزخ کی حیثیت رکھتا تھا۔ (۱۷۵)

خود غرض مورخ مسلمانوں کی تمام ہی حکومتوں کو برا کہتے ہیں تو جہانگیر کی تعریف کیا کرتے، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اتنا برا نہیں تھا جتنا بتایا جاتا ہے۔

قدرت نے فطری طور پر اس کو بہتر استعداد اور عمدہ صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں۔ وہ جس طرح اپنے ذاتی حقوق، منافع اور عیش وعشرت کی حفاظت چاہتا تھا، اسی طرح وہ رعایا کے راحت وآرام اور آسودگی کا بھی خواں تھا۔ (۱۷۶) رعایا کا درد اس کے دل میں تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ بادشاہ پر فرض ہے کہ وہ جنگل کے درندوں اور چرندوں اور ہوا کے پرندوں تک کی حفاظت کرے، اور اپنے تخت کے نیچے ان جانوروں کی بھی حق رسی کرے۔ (۱۷۷) چنانچہ وہ لکھتا ہے۔ (۱۷۸)

> "جلوس کے بعد سب سے پہلا حکم مجھ سے صادر ہوا کہ زنجیر (۱۷۹) عدل آویزاں کی جائے تا کہ اگر مہمات دارالعدالت کے کارپرداز ستم رسیدوں اور مظلوموں کی دادرسی میں سستی یا کوتاہی کریں، تو یہ مظلوم اس زنجیر تک پہنچ کر بذاتِ خود مجھ کو آگاہ کر سکیں"۔

"اس کے ساتھ ساتھ میں نے بارہ حکم صادر کیے تا کہ ان کو دستور العمل قرار دے کر تمام ممالک محروسہ میں اُن پر عمل کیا جائے"۔

(۱) تمغا اور میر بحری وغیرہ وہ تمام ٹیکس جو صوبوں اور کشنریوں کے جاگیرداروں نے اپنے نفع کے لئے مقرر کر رکھے تھے، ممنوع ہیں۔

(۲) جن راستوں میں چوری اور ڈکیتی زیادہ ہو اور راستے آبادیوں سے فاصلہ پر ہوں، اُن راستوں کے

اوپر مسجدیں، سرائے اور کنویں بنوائے جائیں تاکہ ان راستوں پر آبادی رہے۔ سوداگروں کو راستہ میں ان کی اجازت کے بغیر نہ کھولا جائے۔

(۳) کافر یا مسلمان جو بھی ممالک محروسہ میں رہتا ہو، اُس کے مرنے پر اُس کا مال اس کے ورثہ کو دیا جائے۔ کوئی شخص اس میں دست اندازی نہیں کرسکتا۔ اور اگر وارث نہ ہو تو اس ترکہ کی حفاظت کے لئے ایک تحویل دار مستقل طور پر متعین کیا جائے تاکہ اس کو مسجدوں، سرائے، شکستہ پلوں کی مرمت، تالابوں اور کنوؤں کے بنوانے میں یعنی اُن کاموں میں جن کو شریعت نے ایسے مال کا مصرف قرار دیا ہے، خرچ کرے۔

(۴) شراب وغیرہ یعنی وہ تمام مسکرات جو شرعاً ممنوع ہیں، نہ بنائی جائیں، نہ بیچی جائیں۔ میں خود اگرچہ شراب پیتا ہوں اور اٹھارہ سال کی عمر سے اس وقت تک کہ میری عمر ۳۸ سال ہے کبھی ناغہ نہیں ہوئی۔ اول اول میں شرابخوری کا حریص تھا کبھی کبھی دو آتشہ شراب کے بیس پیالے پی جایا کرتا تھا۔ جب اس نے رفتہ رفتہ میرے اعضاء اور قویٰ پر اثر ڈالنا شروع کیا تو میں اس کے کم کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ سات سال کے عرصہ میں پندرہ پیالے کے بجائے پانچ چھ پیالے کر دیئے جو مختلف اوقات میں پیا کرتا تھا۔ اس کے بعد صرف رات کا وقت مقرر کیا۔ اور اب میں مجبوراً صرف کھانا ہضم کرنے کے لئے پیتا ہوں۔

(۵) کسی کے مکان کو نزول[۱۸۰] نہ بنائیں۔

(۶) کوئی شخص کسی سزا میں کسی مجرم کے ناک، کان نہ کاٹے، اور میں بھی اپنے خدا کے سامنے عہد کرتا ہوں کہ کسی کو اس سزا سے معیوب نہ کروں گا۔

(۷) متصدیان خالصہ اور کوئی جاگیردار رعایا کی زمین کو لے کر خود کاشت نہ بنائے۔

(۸) شاہی جائداد کا کوئی حاکم یا کوئی جاگیردار کسی باشندہ کے ہاں سرکاری اجازت کے بغیر نکاح نہ کرے۔

(۹) شہروں میں اسپتال بنائے جائیں اور جو کچھ ان کے مصارف ہوں شاہی جاگیر سے ادا کئے جائیں۔

(۱۰) اپنے والد بزرگوار کے طریقہ کے بموجب میں بھی حکم کرتا ہوں کہ میری پیدائش کے دن یعنی ۱۷ ربیع الاول کو اور ہر ہفتہ میں دو روز یعنی جمعرات کو جو میرے جلوس کا دن ہے، اور اتوار کو جو میرے والد بزرگوار کی پیدائش کا دن ہے کوئی جانور ذبح نہ کیا جائے۔[۱۸۱]

والد بزرگوار اتوار کے دن کی تعظیم کیا کرتے تھے کیونکہ یہ دن ''حضرت نیر اعظم''[۱۸۲] کی طرف منسوب ہے۔ نیز اسی دن کو وہ ابتداء آفرینش کا دن سمجھتے تھے اور جن ایام میں کہ ممالک محروسہ میں ذبح کرنا ممنوع تھا، ان میں سے ایک دن یہ بھی تھا۔

(۱۱) والد بزرگوار کے زمانہ میں جن جن کے جو منصب، عہدے جو وظیفے مقرر تھے وہ بدستور باقی رکھے

جائیں، اور ممالک محروسہ کے اماموں کے متعلقین کے مددمعاش ان فرامین کے بموجب جوان کے پاس ہیں بدستور باقی رکھے جائیں۔ یہ لوگ لشکرِ دعا ہیں۔[۱۸۳] اور میراں صدرِ جہاں کو جو ہندوستان کے صحیح النسب سادات میں سے ہیں اور میرے والد کے زمانہ میں عرصہ دراز تک صدارت کے جلیل القدر مرتبہ پر فائز رہے ہیں، میں نے مامور کردیا کہ مستحق لوگوں کو روزانہ میرے سامنے پیش کرتے رہیں۔

(۱۲) تمام مجرم جو عرصہ سے قید خانوں میں پڑے ہوئے ہیں، رہا کردیے جائیں۔ ایک مبارک ساعت میں میں نے حکم کیا کہ سونے چاندی پر سکے لگ جائیں۔ اور ہر ایک سکہ کا علیحدہ نام مقرر کردیا۔[۱۸۴]

سونے کے سکے

(۱) سو تولہ کا سکہ نورشاہی (۲) پچاس تولہ کا نورسلطانی۔ (۳) بیس تولہ کا نوردولت۔ (۴) دس تولہ کا نورکرم۔ (۵) پانچ تولہ کا نورمہر۔ (۶) ایک تولہ کا نورجہانی۔ (۷) نصف تولہ کا نورانی (۸) چوتھائی تولہ کا رواجی

چاندی کے سکے

سو تولہ کا سکہ کوکب طالع۔ پچاس تولہ کا کوکب اقبال بیس تولہ کوکب مراد۔ دس تولہ کوکب سعد۔ ایک تولہ جہانگیری۔ نصف تولہ سلطانی۔ چوتھائی نثاری۔ اور ایک تولہ کا دسواں حصہ (ایک ماشہ و ڈیڑھ رتی تقریباً) خیر قبول[۱۸۵]

اصلاحی احکام

جہانگیر نے ایک حکم یہ دیا تھا کہ آئندہ خواجہ سرا نہ بنائے جائیں نہ بیچے جائیں۔ چنانچہ اس کے بعد اس جرم کے مجرموں کو حبس دوام کی سزا دی۔[۱۸۶] اسی طرح بچوں والی عورتوں کی ستی کو ممنوع قرار دیا۔[۱۸۷] اس کا عقیدہ تھا کہ جب تک بادشاہ کی نیت بخیر ہو، رعایا خوش حال رہتی ہے، محصولوں میں برکت ہوتی ہے۔

چو نیت بخیر ست خیرم دہی[۱۸۸]

عدلِ جہانگیری

بظاہر جہانگیر کو نورجہاں کی طرح عدل وانصاف سے بھی محبت تھی۔ اس کا یہ واقعہ مشہور ہے۔ جس کو علامہ شبلی نے منظوم کردیا۔

قصرِ شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گزر ایک دن نور جہاں بام پہ تھی جلوہ فگن

کوئی شامت زدہ رہ گیر ادھر آنکلا ۔۔۔ گرچہ تھی قصر میں ہر چہار طرف سے قدغن
غیرت حسن سے بیگم نے طپنچہ مارا ۔۔۔ خاک کا ڈھیر تھا ایک کشتۂ بے گور وکفن
ساتھ ہی شاہِ جہاں کو پہنچی جو خبر ۔۔۔ غیظ سے آگئی ابروئے عدالت پہ شکن
حکم بھیجا کہ کنیزانِ شبستانِ شہی ۔۔۔ جاکے پوچھ آئیں سچ یا کہ غلط ہے یہ سخن
نخوت حسن سے بیگم نے بصد ناز کہا ۔۔۔ میری جانب سے کرو عرض بہ آئین حسن
ہاں مجھے واقعۂ قتل سے انکار نہیں ۔۔۔ مجھ سے ناموس حیا نے یہ کہا تھا کہ بزن
اس کی گستاخ نگاہی نے کیا اس کو ہلاک ۔۔۔ کشورِ حسن میں جاری ہے یہی شرع کہن
مفتی دیں سے جہانگیر نے یہ فتویٰ پوچھا ۔۔۔ کہ شریعت میں کسی کو بھی کوئی جائے سخن
مفتی دیں نے بے خوف وخطر صاف کہا ۔۔۔ شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دو گردن
لوگ دربار میں اس حکم سے تھرا اٹھے ۔۔۔ پر جہانگیر کے ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن
ترکنوں کو یہ دیا حکم کہ اندر جاکر ۔۔۔ پہلے بیگم کو کریں بستۂ زنجیر و رسن
پھر اسی طرح سے اُسے کھینچ کے باہر لائیں ۔۔۔ اور جلاد کو دیں حکم کہ ہاں تیغ بزن
یہ وہی نورجہاں ہے کہ حقیقت میں یہی ۔۔۔ تھی جہانگیر کے پردہ میں شہنشاہِ زمن
اس کی پیشانیٔ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ ۔۔۔ جاکے بن جاتی تھی اوراقِ حکومت پہ شکن
اب نہ وہ نورجہاں ہے نہ وہ اندازِ غرور ۔۔۔ نہ وہ غمزے ہیں نہ وہ عربدۂ صبر شکن
اب وہی پاؤں ہر اک گام پہ تھراتے ہیں ۔۔۔ جن کی رفتار سے پامال تھے مرغانِ چمن
ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع ۔۔۔ ایک بیکس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن
خدمتِ شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام ۔۔۔ خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے ایک امر حسن
مفتی شرع سے پھر شاہ نے فتویٰ پوچھا ۔۔۔ بولے جائز ہے رضامند ہوں گر بچہ وزن
وارثوں کو دیئے لاکھ درہم بیگم نے ۔۔۔ سب نے دربار میں کی عرض کہ اے شاہ زمن

ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص
قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن

حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز مکتوب نمبر ۹۲ جلد دوم میں تحریر فرماتے ہیں:

حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ چنانچہ عالم را بنور عدل وعدالت بادشاہ وقت منور ساختہ است شریعت وملت محمدیہ را نیز بحسن اہتمام ایشان نصرت وعزت بخشد (مکتوب ۴۷ ص ۸۲ ج ۲)

''حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ نے جس طرح بادشاہ وقت کے عدل وانصاف کے نور سے عالم کو منور کیا ہے۔اسی طرح شریعت وملت محمدیہ کو بھی اُن کے حسن اہتمام سے نصرت وعزت بخشے۔''

مکتوب نمبر ۷۴ جلد سوم میں تحریر فرماتے ہیں جو خود جہانگیر بادشاہ کے نام ہے:

شکر نعمت امن و امانے کہ بدولت و اقبال بندگان شامل حال عوام وخواص است بجائی آرد۔

(ص ۸۲ جلد ۲ مکتوب ۴۷)

وہ امن و امان کہ بندگان بارگاہ کے دولت و اقبال کے باعث خواص و عوام کے شامل حال ہے، اس کا شکر یہ ادا کرتا ہوں۔

رفاہیتِ خلق

جب وہ احمد آباد میں پہنچا تو باوجودیکہ وہاں کی آب و ہوا موافق نہ آئی، اور اس وجہ سے وہ احمد آباد سے اتنا ناراض ہے کہ کہتا ہے۔ "اس سے پہلے احمد آباد کو گرد آباد کہا کرتا تھا۔ اب سوچتا ہوں کہ اس کا نام "سموستان" رکھوں یا "بیمارستان" یا "زقوم زار" کہوں۔ اور پھر اتفاق سے وہ بیمار ہو گیا، اور اس کا فرزند جان پیوند شاہجہان بھی۔ مگر بایں ہمہ کہتا ہے:

"چونکہ یہاں کے آدمی بہت کمزور دل اور عاجز ہیں۔ اس خیال سے کہ ممکن ہے لشکر کا کوئی سپاہی کسی غریب پر کوئی ظلم کردے اور قاضی اور میر عدل کسی وجہ سے اس کی فریاد رسی میں سستی کر جائیں۔ لہٰذا میں احتیاطاً روزانہ دوپہر کی عبادت سے فارغ ہونے کے بعد سخت گرمی اور لو کے باوجود دربار کی طرف کے جھروکہ میں بیٹھ جاتا ہوں تاکہ دروددیوار، سنتری اور چوب دار کی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ اور جو شخص مجھ تک پہنچنا چاہے آسانی سے پہنچ سکے۔ بیماری اور کمزوری کے زمانہ میں دردوالم کے باوجود مقررہ طریقہ کے بموجب میں جھروکہ میں بیٹھتا رہا، اور تن آسانی کو اپنے اوپر حرام قرار دیا"۔

بہر نگہبانی خلق خدا شب نکنم دیدہ بخواب آشنا
ز پئے آسودگی جملہ تن رنج پسندم بہ تن خویشتن

پھر لکھتا ہے:

خدا کے فضل و کرم سے عادت ایسی ہو گئی ہے کہ رات اور دن میں دو تین گھنٹہ سے زیادہ سرمایۂ وقت کو سونے میں غارت نہیں کرتا۔ اس سلسلہ میں دو فائدے مدنظر ہیں۔ ایک ملک کی حالت سے آگاہی دوم یادِ حق میں دل کی بیداری۔ افسوس یہ چند روزہ عمر غفلت میں گزر جائے جبکہ ایک خواب گراں در پیش ہے۔ اس بیداری کو جو بعد میں خواب میں بھی نہیں آسکتی غنیمت جان کر ایک لمحہ کے لئے بھی یادِ حق سے غافل نہیں رہنا چاہیے"۔

باش بیدار کہ خوابے عجبے درپیش است (توزک ص ۲۳۲)

سخاوت

داد و دہش اور سخاوت مشرقی (یا ایشیائی) بادشاہوں کا طرہ امتیاز ہے وہ اس میں بھی شاہانہ شان رکھتا تھا۔[۱۸۹] اس کی دی ہوئی بہت سی جاگیریں اب بھی موجود ہیں۔ جمعہ کے روز ایک ہزار سو مسکین کی دعوت اس کا معمول تھا۔[۱۹۰] بڑے بڑے شہروں میں اس کی جانب سے "غلور خانے" (خیرات خانے) قائم تھے جن میں فقراء اور مساکین کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔

اکبر کی طرح اس کے بھی مرید ہوا کرتے تھے مگر اس کی تلقین یہ ہوتی تھی:

> "اپنا وقت کسی مذہب کی دشمنی میں تاریک اور گندہ مت کرو۔ تمام مذہب والوں کے ساتھ "صلح کل کا طریقہ" ملحوظ رکھو۔ کسی جاندار کو اپنے ہاتھ سے مت مارو۔ لڑائی یا شکار کے سوا کسی وقت بھی سخت دل مت بنو"۔[۱۹۱]

مباش درپے بے جان نمودن جاندار
مگر بعرصۂ پیکار یا بوقت شکار

بے شک وہ عاشق مزاج تھا مگر وہ قدرت کی تمام ہی چیزوں کو محبت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ وہ شکار کا حریص بھی تھا مگر جانوروں سے انتہائی اُنس بھی رکھتا تھا۔[۱۹۲] وہ مناظر فطرت کی سیر و تفریح کا شیدائی تھا اور ہر چیز کو گہری نگاہ سے دیکھتا تھا۔ جو جانور یا جڑی بوٹی، پھول یا درخت اُس کے سامنے آتا تو وہ گہری نگاہ سے اس کے اوصاف و خواص معلوم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اپنی توزک میں اس کو درج کرتا تھا۔

لیکن اس کے عاشقانہ مزاج نے اُس کی شجاعت پر اثر نہیں ڈالا تھا۔ تیموری خون سے اُس کا ہر رگ و ریشہ سرشار تھا۔ وہ عیش و عشرت کو پسند کرتا تھا مگر ضرورت کے وقت سپاہیانہ جفاکشی بھی اس کو ناگوار نہ ہوتی تھی۔ اس کی شکار پسند خصلت بسا اوقات کمزوروں کے واسطے پناہ بن جاتی تھی۔ جس طرف وہ جاتا دیہات کے کمزور باشندے شیر یا کسی درندہ کی شکایت کرتے، وہ خود اس کے شکار کے لئے آمادہ ہوتا تھا۔ اور اس طرح سینکڑوں شیروں کا بذات خود شکار کیا تھا۔ ایک مرتبہ شیر اُچھل کر اُس کے ہاتھی کی عماری پر آبیٹھا۔ اُس نے بندوق کا کندا اُس کے سر پر اتنے زور سے مارا کہ چکر کھا کر شیر نیچے گرا۔ (توزک جہانگیری)

اُس نے نور جہاں کو بھی شیر کے شکار کا مشتاق بنا دیا تھا۔ حتی کہ ایک مرتبہ[۱۹۳] جب چار شیروں کو نور جہاں نے ایک لحظہ میں ختم کر دیا تو کسی شاعر نے کہا تھا ع

نور جہاں گرچہ بصورت زن ست
در صف مردان زن شیر افگن ست

وہ شراب خوار تھا۔ افیون بھی کھاتا تھا مگر ضبط و نظم سے غافل نہیں ہوتا تھا حتی کہ وہ شکاروں کی تعداد بھی لکھا

کرتا تھا۔ (۱۹۴)

اسی طرح اس کو اپنی ذات پر بھی پورا اعتماد تھا۔

"در کنکاش امور سلطنت ملک داری، اکثر آں ست کہ برای و فہمیدی خود عمل مے نمایم و از کنکاش ہائے دیگر کنکاش خود معتبر مے دانم"۔ (۱۹۵)

ایشیائی بادشاہوں کے طرز پر وہ عالی حوصلہ اور بلند ہمت واقع ہوا تھا۔ سخت سے سخت دشمنوں کو بھی بسا اوقات اس نے معاف کر دیا۔ اور پھر خلعت انعام واکرام سے نوازا۔ جس کی بہت سی مثالیں تزک میں درج ہیں۔

مذہب

اس کے دل میں مذہب کا کافی احترام تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو "نیازمندانِ درگاہِ الٰہی" (۱۹۶) لکھتا ہے اور تمنا کرتا ہے:

"امید کہ مدت حیات در مرضیات الٰہی صرف شود و نفسی بے یاد او نگزرد"۔ (۱۹۷)

جلوس کے پہلے سال بھی پنڈتوں سے مناظرہ کیا۔ جہانگیر کے چند عالمانہ سوالات پیش کرنے کے بعد جب وہ لایعنی عذر کرنے لگے اور لاجواب ہوگئے۔ تو جہانگیر نے کہا: (۱۹۸)

"یہ مورتیاں مقصود حقیقی "معبود" کی جانب کس طرح وسیلہ بن سکتی ہیں"۔

سکوں پر کلمہ شہادت نقش کرانا مذہب پرستی کی کافی دلیل ہے۔ شب جمعہ میں علماء اور صلحاء سے مصاحبت رکھتا تھا۔ (۱۹۹) عبادات میں رات گزارتا۔ شراب قطعاً نہ چھوتا۔ اکبر آفتاب کے ناموں کی تسبیح پڑھا کرتا تھا۔ مگر اس نے علماء سے حضرت حق جل مجدہ کے نام لکھوائے اور ان کا ورد رکھا کرتے تھے۔

آفتاب کو نیر اعظم ضرور لکھتا ہے۔ مگر عقیدہ یہ ہے کہ تارے (۲۰۰) جو نورِ الٰہی کے مظہر ہیں، درجہ کے بموجب ان کی تعظیم کرنی چاہیے اور تمام ادوار واطوار میں موثر حقیقی اور موجد صرف اللہ تعالیٰ کو جاننا چاہیے کہ خلوت وجلوت میں کسی وقت بھی دل اس کے فکر اور اس کے دھیان سے خالی نہ ہو۔ (۲۰۱)

اکبر نے دربار میں جماعت نماز ممنوع کر دی تھی اور صفیں بھی خارج کرا دی تھیں۔ مگر جہانگیر (۲۰۲) نے شکار خاصہ (۲۰۳) کے ہرنوں کی کھالوں کی جانمازیں بنوا کر دیوان خاص اور دیوان عام میں ڈلوادیں تاکہ ان پر نماز پڑھا کریں۔

"میر عدل اور قاضی جن پر امور سلطنت کا مدار ہے، حرمت شرع کے لحاظ سے اُن سے کہہ دیا کہ وہ زمین بوس نہ کیا کریں جو سجدہ کی صورت میں ہوتا ہے"۔ (۲۰۴)

ہندوؤں کے عقیدہ کے بموجب اکبر نے خنزیر کی تعظیم شروع کر دی تھی۔ مگر جہانگیر جب اجمیر شریف گیا

وہاں رانا شنکر کے مندر میں:

''ایک مورتی نظر سے گزری جو سنگ سیاہ سے تراشی گئی تھی، گردن سے اوپر خنزیر کی شکل اور نیچے آدمی کی شکل۔ اور عقیدہ ناقص ہنود کا یہ ہے کہ (معاذ اللہ) حکیم علیم نے کسی وقت کسی مصلحت سے اس صورت میں جلوہ فرمایا تھا۔ میں نے حکم کیا اس کریہہ صورت کو توڑ کر تالاب میں ڈال دیں''۔ (۲۰۵)

اسی موقع پر اسی طرح ایک اور محل کو مسمار کرنے کا حکم دیا۔ جس میں اسی قسم کی خرافات ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ حسب مراد ایک شکار بہ لطف اس کو مل گیا تو

''سر شکرانہ خداوند بندہ نواز بر زمین نیاز و فروتنی نہادہ و زبان بہ شکر گویا ساختم''۔

بیت: از دست و زبان کہ برآید کز عہدہ شکرش بدر آید۔ توزک ص ۵۹۔

مذہبی غیرت

اکبر برہمنوں کے ہاتھوں اپنی پیشانی پر قشقہ لگواتا تھا۔ مگر جہانگیر نے ایک گرو کو جس کا نام ''ارجن'' تھا اور گوبندوال مقام میں وہ عرصہ سے رہا کرتا تھا۔ اور اس کے باپ دادا بھی گرو تھے۔ جن سے اس اطراف کے ہندوؤں اور جاہل مسلمانوں کو بھی بہت زیادہ عقیدت تھی، اس بنا پر اس کو سزا دی اور اس کے گھر بار کو ضبط کرلیا کہ اس نے ''سلطان خسرو'' پسر جہانگیر کے ڈیرہ میں آکر اسی مصنوعی بزرگی کے گھمنڈ میں قشقہ لگایا تھا اور ہندو سادھوؤں کے طرز پر پیشین گوئی کی تھی۔ (۲۰۶)

سنہ پنجم جلوس کے واقعات میں لکھتا ہے:

''معلوم ہوا کہ کوکب پسر قمر خاں نے ایک سنیاسی سے آشنائی پیدا کرلی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنیاسی کی باتیں جو سراسر کفر اور زندقہ تھیں، جاہل کوکب کے دل میں جگہ کر گئیں۔ کوکب نے اپنے چچا زاد بھائی عبداللطیف اور شریف کو بھی اس ضلالت اور گمراہی میں اپنا شریک بنا لیا ہے''۔

''جب یہ بات ہمیں معلوم ہوئی۔ ان کو حضور میں طلب کیا گیا معمولی سی دھمکی میں انہوں نے اپنے وہ حیا سوز واقعات ذکر کردیئے، جن کے بیان کرنے سے بھی طبیعت شرماتی ہے۔ ان کی تادیب و تنبیہ کو ضروری سمجھا۔ کوکب و شریف کو جیل خانہ بھیج دیا اور عبداللطیف کے سو کوڑے اپنے سامنے لگوائے۔ یہ خاص تنبیہ حفظ شریعت کے لئے کی گئی تاکہ دوسرے جاہل اس قسم کی باتوں کی ہوس نہ کریں''۔ (توزک جہانگیری ص ۸۲)

کشمیر جاتے ہوئے معلوم ہوا کہ راجوری کے اطراف میں نومسلموں میں یہ رسم جاری ہے کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی زندہ قبر میں دفن کردیتے ہیں۔ غریب آدمی کے لڑکی ہوتی ہے تو وہ اس کو مار ڈالتا ہے۔ نیز ہندوؤں کو لڑکیاں دیتے ہیں۔

جہانگیر لکھتا ہے: (۲۰۷)

''لڑکیاں لینا تو بہتر ہے لیکن دینا نعوذ باللہ۔ فرمان صادر ہوا، کہ آئندہ ان کاموں کے پاس بھی نہ جائیں اور جو شخص اس قسم کی بدعتوں کا مرتکب ہو، اس کو سخت سزا دی جائے''۔

سنہ ۱۵ جلوس میں قلعہ کانگڑہ کی فتح کی خبر پہنچی تو کریم کارساز کی درگاہ میں سرنیاز جھکا کر نشاط و شادمانی کے نقارے بجوائے[۲۰۸] اگلے سال قلعہ کانگڑہ کی سیر کو گیا۔

''میں نے حکم کیا کہ قاضی اور میر عدل اور دوسرے علماء اسلام ہمرکاب رہ کر جملہ شعائر اسلام اور شرائط دین محمدی کو قلعہ مذکور میں ادا کریں۔ چنانچہ ایزد سبحان کی توفیق سے اذان، خطبہ، ذبح گاؤ وغیرہ جن سے یہ قلعہ ابتداء تعمیر سے آج تک نا آشنا تھا، خود اپنے سامنے ان پر عمل کرایا۔ خداوند عالم کی اس بہت بڑی بخشش پر (جس کی توفیق کسی بادشاہ کو نہ ہوئی تھی اور جدوجہد کے باوجود بڑے بڑے بادشاہ اس سے عاجز رہے تھے) شکر کی نفلیں پڑھیں اور حکم کیا کہ قلعہ کے اندر ایک بہت بڑی مسجد بنوا دیں''۔[۲۰۹]

توکل اور اعتماد علی اللہ

تو زک کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا پر بھروسہ کرنے کی ایک خاص شان اس کو حاصل تھی۔ جو بسا اوقات اس کی طبیعت پر وجد کی کیفیت طاری کر دیتی تھی۔

امیر الامراء بیمار ہوا۔ تمام ہندو مسلمان اطباء علاج سے عاجز ہو گئے اور زندگی سے مایوس ہو کر سب نے اس کی موت کا فیصلہ کر دیا۔ جہانگیر لکھتا ہے:

''اللہ تعالیٰ بفضل و کرم خود او را تشریف شفا ارزانی فرمود تا اسباب پرستان مشیت ناشناس را معلوم گردد کہ قادر بکمال ہر دردِ دشوار را کہ ''ظاہر بینان اسباب گزین'' دست از انہا برداشتہ باشند بمحض لطف و مرحمت ذاتی خویش علاج و درمانے مے تواند کرد''۔ (توزک ص ۶۳)

لکھتا ہے:

''امیر الامراء کو اپنا نگہبان جانتا ہوں۔ اگرچہ تمام بندوں کا اور بالخصوص بادشاہوں کا جن کا وجود سارے جہان کی خوش حالی کا سامان ہے محافظ اور نگہبان اللہ تعالیٰ ہے''۔

۱۰۲۴ھ میں ہندوستان میں پلیگ کی وبا پھیلی، جو کئی سال تک شدت سے پھیلی رہی۔ اس کے اسباب کے متعلق قیاس آرائیاں ہوئیں۔ جہانگیر کا مقولہ یہ تھا:

''تقدیرات الٰہی را گردن باید نہاد ع'' چہ کند بندہ کہ گردن نہ نہد فرمان را'' ص ۱۶۲ جلوس کے سولھویں سال بیمار ہوا۔ مرض ایسا تھا کہ اطبا علاج نہ کر سکے۔ ''تاگزیر دست از ہمہ باز داشتہ از تدبیرات ظاہری دل برکندہ خود را بحکیم علی الاطلاق سپردم''۔ (توزک ص ۳۴۰)

پھر نور جہاں نے کچھ پرہیز کرایا۔ شراب میں کمی کرائی اور مناسب دوائیں اور غذائیں دیں۔ حکیم حقیقی نے شفا خانہ غیب سے صحت کامل بخش دی۔

''جلوس کے تیرھویں سال ۲۲ رمضان المبارک کو جمعہ کا دن تھا۔ حکم کیا تمام مشائخ اور ارباب سعادت جو شہر میں قیام پذیر ہیں۔ میرے ساتھ روزہ افطار کریں۔ تین روز اسی طرح کرتا رہا۔ رات کو آخر مجلس تک کھڑا ہو کر زبان حال سے یہ کہتا تھا۔ (۲۱۰)

خداوند گارا توانگر توئی!	توانا و درویش پرور توئی
نہ کشور کشایم نہ فرماں دہم	یکے از گدایاں ایں درگہم
تو بر خیر و نیکی دہم دسترس	وگرنہ چہ خیر آید از من بکس
منم بندگاں را خداوندگار	خداوند را بندۂ حق گزار

جہانگیر اچھا تھا یا برا تھا...... اے کاش ہمیں جہانگیر ہی مل جاتا۔

مذہب جہانگیر پر نظر ثانی

مذہب اور اخلاق کے سلسلہ میں ایک طرف یہ خوبیاں تھیں جو صفحات سابق میں ذکر کی گئیں۔ اب مذہبی رجحانات کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

جہانگیر اکبر کا بیٹا بھی تھا اور مرید بھی۔ اکبر کے خیالات جہانگیر کی فطرت میں داخل تھے۔ جو بے اختیار موقع بے موقع رونما ہوجاتے تھے۔ وہ آفتاب کے لئے ہمیشہ اس قسم کے الفاظ لاتا تھا:

''حضرت نیر اعظم از برج حوت بشرف خانہ حمل نزول اجلال ارزانی داشت''۔ (۲۱۱)

نجومیوں کا معتقد ہے اور بڑے بڑے کام ان کے مشورہ اور تشخیص کے بموجب ساعت سعید میں شروع کرتا ہے۔ بارہ برجوں کے بموجب بارہ سکے بنوائے۔ جن کی ایک جانب میں ایک برج کی تصویر کندہ تھی۔ وہ تاروں کو اگرچہ مؤثر حقیقی نہیں مانتا مگر مؤثر ضرور مانتا ہے (۲۱۲) اور ان کو نور الٰہی کا مظہر قرار دیتا ہے، (۲۱۳) اور اسی لئے ان کی تعظیم ضروری سمجھتا ہے اور اس کی تلقین کرتا ہے۔ (۲۱۴)

مذہب میں عقل پرستی

پہلے عرض کیا گیا کہ مذہب میں خودرائی بغاوت ہے۔ مگر باپ کی طرح اس بغاوت کا عادی ہے۔ اگرچہ یہ بغاوت اس سے بہت کم سرزد ہوتی ہے۔

باپ کی طرح وہ بھی مرید کرتا ہے اور اس کی تلقین یہ ہوتی ہے۔ کسی مذہب کی دشمنی سے اپنے وقت کو گندہ مت کرو۔ تمام مذہب والوں کے ساتھ صلح کل کا طریقہ ملحوظ رکھو۔ کسی جاندار کو اپنے ہاتھ سے مت مارو مگر جنگ اور شکار میں۔ (۲۱۵)

مباش درپئے بے جان کُشودن جان دار
مگر بعرصۂ پیکار یا بوقت شکار

ستارے جو نورِ الٰہی کے مظہر ہیں۔ ان کی تعظیم ہر ایک کے درجہ کے بموجب کرو اور تمام واقعات اور حالات میں موثرِ حقیقی اللہ تعالیٰ کو جانو۔ بلکہ ہر ایک خلوت وجلوت میں تنہائی اور مجمع میں اسی کے دھیان میں رہو اور کوشش کرو کہ کوئی لحہ اور لحظہ اس کے خیال اور دھیان سے خالی نہ ہو۔

اس صلح کل کا اثر یہ تھا کہ جس طرح وہ مسلمان فقراء سے عقیدت سے ملتا تھا۔ ہندو سادھوؤں سے بھی عقیدت سے ملتا اور ان کا احترام کرتا تھا۔ آگ کے متعلق عقیدہ ہے۔

"آگ خدا کا نور ہے"۔ (۲۱۶)

یہی عقیدہ تھا جس کی بناء پر اکبر شمع پرستی کیا کرتا تھا۔

"دسہرہ، دیوالی وغیرہ ہندو تہواروں کے وقت جشن ہوتا تھا۔ ہندو برہمن کلائی پر راکھی بھی باندھ دیا کرتے تھے۔" (۲۱۷)

سیاست یہ بھی کہ ہندو اور مسلمانوں کے مشترک بادشاہوں کو دونوں قوموں کے مذہبی جذبات کا مظہر بننا چاہئے۔

اکبر تمام سال میں صرف تین مہینے گوشت کھاتا تھا۔ جہانگیر اتنا مرتاض تو نہیں۔ البتہ اپنے والد کی پیروی میں ہفتہ میں دو روز ذبح کی ممانعت ضرور کر دیتا تھا (ملاحظہ ہو دوازدہ احکام)

شراب نوشی اچھی نہیں مگر جس قدر مفید ہو، اس میں مضائقہ بھی نہیں حتی کہ ۱۰ جلوس کے واقعات میں لکھتا ہے: (۲۱۸)

"۲۵ ماہ (۲۱۹) آذر روز جمعہ کو شاہزادہ خرم "شاہجہاں" کا جشن وزن ہوا۔ اُس کی عمر چوبیس سال ہو چکی ہے۔ شادیاں ہو چکی ہیں۔ صاحب فرزند ہو گیا ہے، مگر اب تک خود کو شراب نوشی سے آلودہ نہیں کیا تھا۔ آج میں نے اُس سے کہا۔ بابا صاحب فرزند ہو گیا ہے۔ بادشاہوں اور بادشاہ زادوں نے شراب پی ہے۔ آج تیرے جشن وزن کا دن ہے میں تجھ کو شراب پلاتا ہوں اور اجازت دیتا ہوں کہ جشن کے ایام میں اور اسی طرح بڑی بڑی تقریبات کے موقعوں پر شراب پی لیا کرو۔ البتہ طریقۂ اعتدال ضرور ملحوظ رکھو، کیونکہ اتنی شراب پینی جو عقل کو زائل کر دے، عقلاء نے جائز نہیں قرار دی ہے۔ شراب نوشی سے نفع اور فائدہ پیش نظر رہنا چاہیے۔ بوعلی (بوعلی سینا) جو عقلاء اور اطباء کے طبقہ میں بہت وقعت رکھتا ہے۔ اُس نے یہ رباعی کہی ہے:

مے دشمن مست و دوست ہوشیار ست اندک تریاق و بیش زہر مار ست
در بسیار ش مضرت اندک نیست در اندک او منفعت بسیار ست

زعم عقل ملاحظہ ہو، کہ شیخ بوعلی سینا کے قول کے سامنے خداوند عالم کے احکام منسوخ ہیں اور طرہ یہ کہ علم و فضل سے نہ اکبر کو کوئی واسطہ تھا نہ جہانگیر کو۔

جہانگیر علم سے محروم

جہانگیر کے علم سے محرومی کا واقعہ ان پرستاران عقل کی عقلی درماندگی کا عجیب و غریب لطیفہ ہے۔ حضرت شیخ سلیم چشتی کی کرامات بیان کرتے ہوئے جہانگیر لکھتا ہے:

"ایک روز حضرت عرش آشیانی (اکبر بادشاہ) نے شیخ سے ان کی عمر کے متعلق سوال کیا۔ شیخ نے فرمایا۔ عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے لیکن اکبر اس جواب پر خاموش نہ ہوا، اصرار کرتا رہا۔ بہت زیادہ اصرار کے بعد شیخ نے فرمایا کہ جب شاہزادہ کسی معلم کی تعلیم سے یا کسی اور صورت سے کوئی شعر یاد کرلیں اور اُس کو پڑھیں، وہ میری وفات کی علامت ہوگی۔

آنحضرت نے (اکبر بادشاہ نے) شیخ کے ارشاد پر اعتقاد رکھتے ہوئے ان خدام کو جو میری خدمت کے لئے مقرر تھے، تاکید کردی کہ کوئی شخص شاہزادہ کو کوئی نظم یا نثر نہ سکھائے۔

دو سال سات ماہ اسی طرح گزر گئے۔

ایک روز ایک غریب عورت جو اس محلہ میں رہا کرتی تھی اور نظر بد کا علاج کرنے میں کمال رکھتی تھی، اور اسی بہانہ سے میرے محل میں آجاتی تھی مجھے تنہا پا کر یہ شعر سکھا گئی۔

الٰہی غنچۂ اُمید بکشا گلی از روضۂ جاوید بنما

میں نے یہ شعر حضرت شیخ کو جا کر سنا دیا۔ شیخ فوراً اُٹھے اور حضرت عرش آشیانی (اکبر بادشاہ) سے جا کر اس واقعہ کو بیان کیا۔

اتفاقاً اسی شب کو بخار ہو گیا۔

دوسرے روز تان سین" کو جو اس زمانے کے گویوں میں سے سب سے بہتر تھا اپنے پاس بلایا اور سماع شروع کروایا اور کسی کو حضرت عرش آشیانی (اکبر بادشاہ) کو بلانے کے لئے بھیج دیا۔ جب عرش آشیانی شیخ کے پاس پہنچے تو شیخ نے فرمایا کہ وقت وصال آگیا، اب میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں، اور اپنی دستار اپنے سر پر سے اُتار کر میرے (جہانگیر کے) سر پر رکھی اور فرمایا۔ ہم نے سلطان سلیم (جہانگیر) کو اپنا جانشین بنایا، اور اس کو خدائے حافظ و ناصر کے سپرد کیا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ مرض بڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ وفات ہوگئی۔

بوالعجبی ملاحظہ ہو۔ ایک طرف وہ پندار عقل دوسری طرف یہ درماندگی شریعت غرا کے احکام و عقائد، رسول اللہؐ کے ارشادات (معاذ اللہ) قابل مضحکہ اور شیخ سلیم کا ایک مجذوبانہ مقولہ اکبر کے نزدیک اس قدر واجب احترام کہ جہانگیر کو ہمیشہ کے لئے جاہل رکھا۔

مذہبیت جہانگیر کا سرچشمہ

نواب سید فرید، قلیج خان، لالہ بیگ وغیرہ جو زمانۂ شاہزادگی سے جہانگیر کے رفیق اور معتمد علیہ تھے، حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے متوسلین میں سے تھے، انہیں حضرات کی کوششوں نے جہانگیر کے رجحانات میں تبدیلی پیدا کی۔ مگر اس سے پہلے جہانگیر کا ماحول کیا تھا، اس کی کسی قدر تفصیل ملاحظہ ہو۔

(۱) جہانگیر نے حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی بہو کا دودھ پیا تھا، اور پھر اسی ماحول میں اس نے زمانۂ طفولیت ختم کیا۔ (۲۲۰)

حضرت سلیم چشتی قدس اللہ سرہ العزیز صاحب کرامات برگزیدہ بزرگ تھے۔ اُن کے اہل وعیال میں مذہبی جذبات تو ضرور ہونے چاہئیں، لیکن یہ لازمی نہیں کہ یہ مذہبی جذبات توہمات اور خلاف شرع رسوم وعادات سے بھی پاک صاف ہوں۔

شمس العلماء ذکاء اللہ خان صاحب کا خیال تو یہ ہے۔

''اس دایہ کی صحبت نے اور اُن حالات نے جو اس کے گرد لڑکپن میں تھے جہانگیر کو خود پرست اور توہمات میں مبتلا کر دیا اور دنیا سے بے خبر رکھا۔ (۲۲۱)

اکبر اور جہانگیر نے بزرگانِ چشت کو دیکھا تھا اور وہ اُن کے ہی معتقد تھے بالخصوص حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس اللہ سرہ العزیز کے متعلق اعتقاد تھا۔

''از برکات روح پر فتوح ایشان کشا کشہا بزرگ بایں دودمان والا رسیدہ''۔ (۲۲۲)

اکبر پیدائش جہانگیر کے شکریہ میں آگرہ سے اجمیر شریف تک پا پیادہ گیا تھا۔ جہانگیر سے اس قدر ایثار تو نہ ہوسکا۔ البتہ ۸ ؁ جلوس میں جب وہ اجمیر شریف گیا تو:

''جب قلعہ اور حضرت خواجہ بزرگوار کے روضہ کی عمارتیں نظر آنے لگیں، تو تقریباً ایک کوس کی راہ پا پیادہ طے کی''۔ (۲۲۳)

راستہ کے دونوں طرف فقراء کھڑے ہوئے جن پر سونے کی بارش کی جارہی تھی۔ اگلے دوسرے روز شہر کے تمام چھوٹے بڑوں کو مدعو کیا اور ہر ایک کو انعام دیا۔ پھر مزار مقدس کے لنگر کے لئے ایک دیگ جو آگرہ میں بنوائی تھی، اس کو نصب کروایا اور اس میں کھانا پکوایا۔

پانچ ہزار نفوس نے ایک مرتبہ کے پکے ہوئے کھانے سے شکم سیر ہوکر کھایا۔ جہانگیر نے خود موجود رہ کر کھانا کھلوایا۔ پھر جس جس نے کھانا کھایا تھا، جہانگیر نے اپنے ہاتھ سے اشرفیاں دیں۔ (۲۲۴)

۹ ؁ جلوس میں اجمیر شریف میں قیام تھا۔ اتفاقاً بخار ہوگیا۔ چند روز متواتر نور جہاں کے سوا کسی کو ناسازی مزاج پر آگاہ نہ ہونے دیا۔ سارے کام بدستور جاری رکھے۔ لیکن جب ضعف کے آثار زیادہ نمودار ہونے لگے

اور مرض میں تخفیف نہ ہوئی، تو حضرت خواجہ کے مزار پر حاضر ہو کر منت مانی خدا نے شفا بخشی۔

''اسی بیماری کے دوران میں دل میں طے کر چکا تھا کہ جب صحت کامل حاصل ہو جائے گی تو جیسے کہ باطن میں حضرت خواجہ کا حلقہ بگوش اور معتقد ہوں، اور ان کی توجہ کو اپنے وجود کا سبب جانتا ہوں۔ ظاہر میں بھی اپنے کانوں میں سوراخ کر کے اُن کے حلقہ بگوشوں کے جرگہ میں داخل ہو جاؤں گا''۔ (۲۲۵)

۱۲ شہر یور مطابق ماہ رجب اپنے کانوں میں سوراخ کر کے ہر کان میں مروارید آبدار کا ایک دانہ ڈال لیا۔ جب بندگان درگاہ اور مخلصان ہوا خواہ نے یہ دیکھا تو جو لوگ یہاں موجود تھے انہوں نے نیز اُن تمام نے جو سرحدی مقامات پر تھے، اپنے اپنے کانوں میں بڑے بڑے سوراخ کرا لئے۔

جواہر خانۂ خاص سے سچے موتی اُن کو مرحمت ہوتے رہے جو اُن کے حسن اخلاص کے لئے زینت بخش ہوئے۔ رفتہ رفتہ تمام ہی لشکریوں اور دوسرے لوگوں نے کان چھدوا دیئے (توزک ص ۱۳۲)

العظمۃ اللہ یہ ہے خدائے قادر وقہار کی قدرت، جو عقل و دانش کے پندار میں مبتلا ہوں، اُن سے وہ کام کرائے جاتے ہیں کہ دنیا کی تاریخ ان کا مذاق اُڑائے۔ شریعت مطہرہ نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا ہے مگر یہ پندار عقل بکریوں اور بچھوں کی طرح اس کے کان خود اس کے ہاتھ سے چھدواتا ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ

(۲) شیخ علاؤالدین اور شیخ بایزید، حضرت شیخ سلیمؒ کے پوتے تھے، (۲۲۶) جو جہانگیر کے رضاعی بھائی اور مخلص دوست تھے۔ اپنی توزک میں لکھتا ہے:

''شیخ بایزید جو پہلے دو ہزاری منصب رکھتے تھے، جلوس کے دن اُن کو سہ ہزاری منصب دیا۔ سب سے پہلے ان کی ماں نے مجھے دودھ پلایا تھا۔ (توزک ص ۱۵)

''شیخ علاؤالدین جو میرے سے بہت قوی تعلقات رکھتے ہیں جلوس کے دن اُن کو سہ ہزاری کے خطاب سے سربلند کیا۔ لڑکپن سے میرے ساتھ پلے، اور بڑھے۔ مجھ سے ایک سال چھوٹے ہیں، جوان مردوں کی طرح نیک ذات ہیں۔ ہر ایک حیثیت سے اپنی قوم اور قبیلہ میں امتیاز رکھتے ہیں۔ کبھی کوئی نشہ کی چیز نہیں کھائی، اور اُن کو مجھ سے اس درجہ اخلاص ہے کہ میں نے ''فرزندی'' کے خطاب سے سرفراز کیا۔ (توزک ۴۸،۱۳،۲)

شیخ کبیر بھی اسی سلسلہ سے متعلق تھے۔ جہانگیر کو ان سے بہت محبت تھی۔ لکھتا ہے ''شجاعت و مردانگی کے باعث شاہزادگی کے زمانہ میں ''شجاعت خانی'' کے خطاب سے سرفراز کیا۔ (توزک ص ۱۳)

(۳) افسون نور جہاں

ان سب تعلقات اور جذبات سے بالا وہ تعلق تھا جو جہانگیر کی زندگی میں سب سے زیادہ دلچسپ اور دلفریب ہے اور جس کی بنا پر جہانگیر تمام سلاطین مغلیہ میں ایک انوکھا اور نرالا امتیاز رکھتا ہے۔

یہ نور جہاں کا عشق ہے، جس نے اس آزاد بادشاہ کو عہد طفولیت ہی میں گرفتار کر لیا تھا۔

مہر النساء کا نکاح جب شیر افگن سے کر دیا گیا، تو اگرچہ جہانگیر نے دل پر پتھر رکھ کر دائمی مفارقت پر صبر کر لیا تھا، اور عتاب و رقابت کے بجائے شیر افگن کی حسن خدمت کی قدر کر کے اُس کو بنگالہ کا گورنر بنا دیا تھا، مگر جب اُس نے بغاوت[۲۲۷] کا قصد کیا، حتیٰ کہ جہانگیر کے فرستادہ قطب الدین خاں کو قتل کر کے اسی نبرد آزمائی میں قطب الدین خاں کے ہمراہیوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ مہر النساء کا سہاگ ختم ہو گیا، اور چار سال تک بیوگی کا زمانہ بھی ختم کر لیا تو پرانی اُلفت نے پھر جہانگیر کے دل میں گداز پیدا کیا۔ مہر النساء کی قسمت جاگی، حتیٰ کہ وہ نور محل اور پھر نور جہان بن گئی۔ اس وقت وہ واقعی جہانگیر کی آنکھوں کا نور اور اُس کے دل و دماغ کی مالک تھی۔

جہانگیر بھی کہتا تھا کہ نور جہاں میری مالک ہے۔ میرے عدل و انصاف کی مالک نہیں مگر جب دل کے جذبات اور دماغ کے تخیل پر بھی اپنا قبضہ نہ ہو تو عدل و انصاف کی پاسداری صرف رسمی اور ضابطہ کی چیز ہے۔ خوش قسمتی سے نور جہاں قابل باپ کی بیٹی[۲۲۸] اور مدبر بھائی کی بہن تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت جہانگیری کا انحصار اس طرح ہو گیا۔

دولت و پادشاہی من حالا در دست ایں سلسلہ است پدر دیوان کل پسر وکیل مطلق۔ دختر ہمراز و مصاحب۔

میری حکومت و سلطنت اس وقت اس سلسلہ کے ہاتھ میں ہے۔ باپ دیوان کل، بیٹا وکیل مطلق، لڑکی ہمراز و مصاحب۔

اور پھر یہ دائرہ بھی صرف ایک مرکز میں سمٹ آیا تھا۔ چنانچہ جہانگیر کے بخشی معتمد خان کا بیان ہے:

''رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ بادشاہت کا صرف نام رہ گیا اکثر فرمایا کرتے تھے میں نے سلطنت نور جہاں کو بخش دی۔ ایک سیر شراب اور آدھ سیر گوشت کے سوا کچھ نہیں چاہیے''۔[۲۲۹]

نور جہاں اگرچہ سنجیدہ، شریف طبع، قابل اور دانش مند عورت تھی۔ اس کے رحم و کرم اور دست فیض سے ہزاروں بے کس اور نادار عورتیں فیض یاب ہوئیں۔ سینکڑوں نادار لڑکیوں کے نکاح اور جہیز وغیرہ کا انتظام اُس کے خزانۂ خاص سے ہوا کرتا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اُس کے انہی اوصاف نے جہانگیر کی گرویدگی کو بندگی کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ لیکن وہ بسا اوقات اپنی ذاتی منشاء کو پورا کرنے کے لیے تباہ کن فتنہ بھی کھڑا کر دیا کرتی تھی۔

اُس کا یہی افسوں تھا جس کی بنا پر مہابت خاں جیسا مخلص اور وفادار سپہ سالار جہانگیر سے باغی ہوا۔

شاہزادہ خرم سے جہانگیر اتنا خوش تھا کہ عہد شاہزادگی میں ہی اس کو ''شاہجہاں'' کا خطاب دے کر چتر وغیرہ شاہانہ امتیازات (جو بادشاہوں کے ساتھ مخصوص تھے) اُس کو مرحمت کر دیے تھے۔

ایک مرتبہ شاہجہاں کی خدمت سے خوش ہو کر:

''اُس کے حق میں اتنی دعائیں کیں کہ اگر ایک فیصدی دعا بھی قبول ہو جائے تو اس کی آخرت اور اس کی

سلطنت کی بہرہ مندی اور کامیابی کے لئے کافی ہے''۔ (۲۳۰)

لیکن جب نور جہاں اس کی مخالف ہوئی تو اس فرزند عزیز سے زیادہ جہانگیر کو کسی سے نفرت نہیں تھی۔ شاہجہاں نے غلط فہمی کے ازالہ کے لئے اپنا وکیل بادشاہ کی خدمت میں بھیجا تو اس کو بات کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مجبوراً اس عزیز ترین فرزند کو اپنی جان بچانے کے لئے شاہی فوجوں سے مقابلہ کرنا پڑا، اور جہانگیر کی عمر کے آخری سال انہی خرخشوں کی نذر ہو گئے۔

باعث صرف یہ تھا کہ نور جہاں شاہزادہ شہریار کو جہانگیر کا جانشین بنانا چاہتی تھی کیونکہ شہریار سے شیر افگن کی لڑکی منسوب تھی (جو نور جہاں کے بطن سے تھی) شاہجہاں کی مشہور و مسلّم قابلیت کے مقابلہ میں شہر یار طفل مکتب تھا۔ مگر داماد کی محبت میں اس نے مفاد سلطنت حتیٰ کہ خاندانی مصلحت کا بھی خیال نہ کیا۔ پورے ملک میں ایک فتنہ برپا ہو گیا۔ جس میں آصف خاں (۲۳۱) (نور جہاں کا بھائی) نور جہاں کے مقابلہ پر تھا۔

نور جہاں کا مذہب

نور جہاں شیعہ تھی۔ خواجہ محمد شریف کی پوتی تھی، جو شاہ ایران ''طہماسپ صفوی'' کا وزیر تھا۔

ایران شیعیت کا مرکز رہا ہے اور اس زمانہ میں خصوصیت کے ساتھ شیعہ سنی جذبات پورے اشتعال پر تھے کیونکہ یہی زمانہ تھا جس میں آئے دن ترکوں سے جنگ رہتی تھی۔

خطبہ میں خلفاء راشدین کا تذکرہ وقت کا سب سے بڑا اختلافی مسئلہ تھا۔ ایران تو درکنار ہندوستان میں بھی جنوبی ہند کے عادل شاہی اور دیگر شیعہ سلاطین اس مسئلہ سے بہت گہری دلچسپی رکھتے تھے (ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ جلد سوم)۔

اسی زمانہ میں ایران میں سنیوں کو جبراً شیعہ کیا گیا (اکمال السادۃ)

بابر بادشاہ (بانی سلطنت مغلیہ) کی وصیت اگرچہ یہ تھی کہ شاہان مغلیہ کو اس اختلاف سے بالا رہ کر ہندوستان کی بسنے والی تمام قوموں کو ایک نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اور بدن کے مختلف عناصر کی طرح ان کو آپس میں ملا جلا رکھنا چاہیے۔ مگر کیا اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ سلطنت ایران کی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ ہندوستان کی سلطنت پر شاہان ایران کا سیاسی تسلط رہے تاکہ افغانوں کی طرف سے بے فکر ہو کر ترکوں کے ساتھ اطمینان سے جنگ میں مشغول رہ سکیں۔ نور جہاں جیسی فرزانہ عورت ہندوستان کی ملکہ ہو، اور شاہ ہندوستان کے دل و دماغ پر قابو حاصل کیے ہوئے ہو۔ یہ سلطنت ایران کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ کون نہیں جانتا کہ اس قسم کی ڈپلومیسی بڑے بڑے مقاصد میں وہ کامیابی پیدا کر دیتی ہے جو لاکھوں نفوس کی قربانیوں سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔

سلطنت مغلیہ میں فوجی قانون عموماً بادشاہوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ مگر دیوانی، فوجداری یا مذہبی حقوق کے عام معاملات عدالتوں میں طے پاتے تھے جن کے جج قاضی صاحبان ہوتے تھے۔ اب غور فرمایئے۔ محکمہ عدلیہ پر تسلط اور قبضہ کتنا بڑا اور کتنا اہم مقصد ہے لیکن نور جہاں کی ڈپلومیسی یا شیعہ اقتدار کا نتیجہ تھا کہ نور اللہ شوستری کو قاضی القضاۃ بنا دیا گیا۔

نور اللہ شوستری شیعوں کے نزدیک "شہید ثالث" ہے۔ مگر سنیوں کو ان سے اسی درجہ نفرت تھی جتنی ایک متعصب شیعہ سے ہونی چاہیے، جو کسی خاص پالیسی کے ماتحت قاضی القضاۃ بنا دیا گیا ہو۔

شیرازہ بندیٔ کلام

اکبر و جہانگیر کے حالات کافی تفصیل سے بیان کیے گئے تاکہ حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے مندرجہ ارشاد کی تاریخی تصدیق ناظرین کرام ملاحظہ فرما سکیں۔

"فرزندا! یہ وہ وقت ہے کہ پہلی اُمتوں میں اس جیسے پر ظلمت وقت میں کوئی اولوالعزم نبی مبعوث ہوتا تھا، اور نئی شریعت کی بنیاد رکھتا تھا۔ مگر یہ اُمت خیر الامم ہے اور اس کے نبی خاتم الرسل ہیں علیہ وعلی آلہ واصحابہ الصلوۃ والسلام۔ اس اُمت کے علماء کو انبیاء بنی اسرائیل کا مرتبہ دیا گیا ہے اور انبیاء کے بجائے ان علماء کے وجود کو ہی کافی سمجھا گیا ہے۔ لہٰذا ہر سو سال کے ختم پر اس اُمت کے علماء میں سے ایک مجدد مقرر کیا جاتا ہے جو شریعت مصطفویہ کا احیاء کرتا ہے۔ بالخصوص ایک ہزار کے بعد جو امم سابقہ میں کسی عظیم الشان رسول کی بعثت کا زمانہ ہوتا تھا، اور صرف نبی کے درجہ پر بھی اکتفا نہیں کیا جاتا تھا۔ اُمت محمدیہ میں ایک ایسے جلیل الشان عالم کی ضرورت ہے جو اولوالعزم نبی کے قائم مقام ہو سکے۔

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم کنند آنچہ مسیحا مے کرد (۲۴۲)

جہانگیر بادشاہ اور جذباتِ مجددی

یہی جہانگیر بادشاہ جس کے مذہبی ماحول کی یہ تفصیل تھی

حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز پر فرد جرم لگاتا ہے۔ (۲۴۳)

"شیخ احمد نامی مکار نے جو "سرہند" میں مکر و فریب کا جال بچھا کر بہت سے ظاہر پرستان بے معنی کو اپنا شکار کر چکا ہے، اور ہر شہر اور دیار میں اپنے مریدوں میں سے ایک ایک کو (جو دکان آرائی، معرفت فروشی اور مردم فریبی کے آئین میں دوسروں کی بہ نسبت بہت پختہ ہوتے ہیں) خلیفہ بنا کر بھیج دیا ہے، اور اپنے مریدوں اور معتقدوں کے نام بہت سی چکنی چوپڑی نمائشی باتیں لکھ لکھ کر ایک کتاب جمع کی ہے، جس کا نام مکتوبات رکھا ہے"۔

مکتوبات شریف میں اگرچہ تاریخیں درج نہیں ہیں، مگر یقیناً ہر جلد اول اور دوم اس واقعہ سے پہلے مرتب ہو چکی ہیں، اور جہانگیر کی مراد یہی جلدیں ہیں۔ کیونکہ تیسری جلد میں حضرت کے وہ مکاتیب ہیں جو جیل خانے سے ارسال فرمائے تھے۔ لامحالہ اس کی ترتیب جہانگیر کے اس فیصلہ کے بعد ہوئی ہے۔

ہم انہیں جلدوں کے مکاتیب میں سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ ان سے حضرت مجدد صاحب کے خیالات، آپ کی تعلیمات اور آپ کے مذہبی جذبات کا اندازہ کیجئے دوسری طرف جہانگیر کے عائد کردہ فرد جرم کو سامنے رکھئے، آپ کا فیصلہ یہی ہوگا:

برعکس نام نہند زنگی کافور

اتباع سنت اور رد بدعت

اصلاح و ارشاد کا مجددانہ طرز یہ ہے کہ ایک ایک بدعت کی تردید کے بجائے سنت رسول اللہؐ کی اتباع کا حکم فرماتے ہیں، اور صرف اسی کو ذریعہ فلاح و سعادت قرار دیتے ہیں۔ مثلاً ارشاد ہے:

"وظائف بندگی کو ادا کرنا، اور حضرت حق جل مجدہ کی جانب ہمیشہ اور ہر وقت متوجہ رہنا پیدائش انسان کا مقصود ہے یہ بات صرف اسی وقت پیدا ہوتی ہے کہ سنت سید الاولین والآخرینؐ کی ظاہراً و باطناً ہر طرح سے پوری پوری اتباع کی جائے"۔ [مکتوب نمبر ۰ ص ۳۲ جلد اوّل]

اخروی نجات اور ابدی فلاح سید الاولین والآخرینؐ کی اتباع سے وابستہ ہے۔ اسی لئے ایک مسلمان حضورؐ کی متابعت سے درجۂ محبوبیت پر فائز ہو جاتا ہے، اور آپ کی متابعت کے ذریعہ سے ہی مرتبۂ عبدیت پر مشرف ہو سکتا ہے جو تمام مراتب کمال سے بالا ہے، اور مقام محبوبیت کے حصول کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

جو حضرات رسول اللہؐ کی متابعت میں کامل تر ہوتے ہیں اُن کو انبیاء بنی اسرائیل سے تشبیہ دی گئی ہے۔

اولوالعزم انبیاء مرسلین بھی اتباع خاتم الانبیاءؐ کی تمنا کرتے رہے ہیں۔

بلاشبہ اگر حضورؐ کے عہد مبارک میں موسیٰؑ زندہ ہوتے تو اُن کو بھی رسول اللہؐ کی اتباع کرنی پڑتی۔

آپ کی اتباع کی افضلیت کے باعث ہی آپ کی اُمت تمام اُمتوں سے افضل اور بہتر ہے۔ اسی سبب سے تمام اُمتوں میں سب سے زیادہ اور سب سے پہلے یہ اُمت داخل جنت ہوگی اور خداوند عالم کی اعلیٰ ترین نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوگی۔ [مکتوب ص ۳۰۵ و ص ۳۶۸ جلد اوّل]

سنت اور بدعت کی قسمیں

سرور دو جہاںؐ کے عمل دو قسم پر ہوتے تھے۔ ایک بطریق عبادت، دوم بر سبیل عادت۔

(۱) رسول اللہؐ کے جو عمل عبادت کے طور پر ہوتے تھے اُن کے مخالف عمل کو بدعت منکر (واجب المنع) سمجھتا ہوں، اور اس کی ممانعت اور بندش میں بہت زیادہ جد و جہد کرتا ہوں کیونکہ دین میں ایجاد یہی ہے جو مردود ہے۔

(۲) رسول اللہؐ کے جو افعال بر سبیل عرف و عادت ہوتے تھے، اُن کے مخالف عمل کو بدعت منکر نہیں سمجھتا، اور نہ اُن کی ممانعت اور بندش میں ضرورت سے زیادہ جد و جہد کرتا ہوں۔ کیونکہ یہ عمل دین سے متعلق نہیں۔ ان کا وجود و عدم عرف کے سبب تھا، دین اور ملت کے سبب سے نہیں۔

اور عرف ورواج ایک شہر کا دوسرے شہر کے عرف ورواج سے مختلف ہوا کرتا ہے۔ اور ایک شہر میں بھی زمانوں کے تفاوت سے عرف وعادت میں تفاوت واقع ہوجایا کرتا ہے مگر اس کے باوجود اس قسم کی سنت کی پاسداری اور ایسی سنتوں پر عمل بھی بہترین نتیجہ پیدا کرتا ہے اور فتح سعادات ہے۔ [ص ۲۳۶ جلد دوم مکتوب ۲۳۵]

اتباعِ سنت کے بغیر ریاضت بیکار ہے

فرزندا! روزِ فردا (قیامت) میں کام آنے والی چیز اتباعِ رسولؐ ہے۔ صوفیا کے حال، وجد، علوم، معارف، رموز اور اشارات اگر اس متابعت اور اتباع کے موافق ہوں بہت بہتر، ورنہ سراسر خرابی اور عتابِ ربانی کا سرمایہ ہیں۔ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کو کسی شخص نے خواب میں دیکھا۔ اُن کی حالت دریافت کی۔

حضرت جنیدؒ نے جواب دیا:

"سارے رموز واشارات ختم ہوگئے۔ جملہ علوم ومعارف ہیچ ثابت ہوئے۔ صرف اُن چند رکعتوں نے کام دیا جو درمیانِ شب میں پڑھ لیا کرتا تھا"۔

لہٰذا رسول اللہؐ اور آپ کے خلفاء راشدینؓ کے نقشِ قدم پر چلنے کو ضروری سمجھو، کیونکہ یہ برکت اور سراسر برکت ہے۔ اور شریعت رسول اللہؐ کی مخالفت سے پوری پوری طرح احتیاط برتو۔ نہ قولاً مخالفت ہو، نہ عملاً نہ اعتقاداً۔ کیونکہ یہ مخالفت سراسر نحوست اور بربادی ہے [مکتوب ۱۸۴ ص ۱۸۵ ج ۱]۔

مدارِ فضیلت اتباعِ سنت ہے

اس مبارک اور پسندیدہ متابعت کا ایک ذرہ دنیا کی تمام لذتوں اور آخرت کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے۔ صرف رسول اللہؐ کی متابعت سے فضیلت حاصل ہوسکتی ہے، اور ہر ایک عظمت کی صرف یہی ایک صورت ہے۔(۲۳۳)

(مثلاً) قیلولہ (دوپہر کو آرام کرنا) جو متابعتِ رسول اللہؐ کی نیت سے ہو، اُن کروڑوں شب بیداریوں سے افضل ہے جو متابعت رسول اللہؐ سے محروم ہوں۔

عید الفطر کا افطار جس کا شریعت نے حکم فرمایا ہے، ابداً آباد روزے رکھنے سے افضل ہے۔

اہل ریاضت بہت کچھ مجاہدے کرتے ہیں لیکن اگر وہ شریعت مطہرہ کے مطابق نہ ہوں تو بے کار و بے سود۔ اگر ان اعمال شاقہ پر کوئی اجر مرتب بھی ہوتا ہے تو وہ صرف دنیاوی۔

دنیا کا کوئی نفع تو درکنار، ساری دنیا ہی بے حقیقت ہے ایسے لوگوں کی مثال مہتر (بھنگی) جیسی ہے۔ اس کی ریاضت اور محنت سب سے زیادہ مگر اس کی اُجرت سب سے کم۔ شریعت مطہرہ کے پیرو، گویا جوہری اور صراف ہیں۔ کام بہت کم نفع بہت زیادہ راز یہ ہے کہ جو فعل شریعت کے موافق ہوگا، وہ خداوند عالم کو پسند ہے جس کی سند

آپ کے پاس موجود ہے اور اس کے ماسوا ناپسند۔

ہر چہ گیرد علتی علت شود　　کفر گیرد کاملے ملت شود (۲۳۵)

مختصر یہ کہ تمام سعادتوں کا سرمایہ اتباع سنت ہے اور جملہ خرابیوں کا ہیولا مخالفت شریعت ہے۔
[ص ۱۳۵ جلد اول مکتوب ۱۱۴]

اتباع سنت ہی سلوک وطریقت ہے

جو اعمال باری تعالےٰ عزوجل کے قرب سے بہرہ ور کرتے ہیں وہ فرائض ہیں یا نوافل۔ فرائض کے مقابلہ میں نوافل کی کوئی حیثیت نہیں کسی فرض کو وقت میں ادا کر دینا ہزار سالہ نوافل سے بہتر ہے، خواہ نیت کتنی ہی خالص ہو۔

نماز، روزہ، ذکر، مراقبہ وغیرہ غرض جتنی نفلیں ہیں، اور میں تو کہتا ہوں کہ اداءِ فرض کے وقت سنن اور آداب کا لحاظ رکھنا بھی یہی حکم رکھتا ہے۔

منقول ہے کہ ایک روز امیر المؤمنین عمر فاروقؓ نے صبح کی نماز کے بعد حاضرین جماعت پر نظر ڈالی تو اپنے ایک دوست کو غیر حاضر پایا۔ دریافت کیا کہ وہ صاحب کیوں نہیں حاضر جماعت ہوئے۔ حاضرین نے عرض کیا۔ شب بیدار ہیں۔ خیال یہ ہے کہ اس وقت سو گئے۔

عمر فاروقؓ: اگر تمام رات سوتے رہتے، اور نماز صبح جماعت سے ادا کرتے، یہ بہتر تھا"۔

لہٰذا کسی فعل مستحب کا لحاظ رکھنا اور مکروہ تحریمی تو در کنار مکروہ تنزیہی سے احتیاط کرنا، ذکر، فکر اور مراقبہ سے بدرجہا بہتر ہے۔

ہاں بیشک ذکر وفکر وغیرہ اگر پابندی سنت اور پاسداری مستحبات کے ساتھ ہوں تو ایسا شخص یقیناً کامیاب ہے۔

اسی مکتوب میں آداب نماز کی فضیلت بیان فرماتے ہوئے تحریر ہے:

"امام اعظم کوفیؒ بواسطہ ترک ادب از آداب وضو نماز چہل سالہ را قضا فرمودند"۔ [مکتوب ۲۹ ص ۳۰ جلد اوّل]

خود نماز کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"بداند کہ رتبہ نماز در رنگ مرتبہ رویت ست در آخرت نہایت قرب در دنیا نماز ست ونہایت قرب در آخرت در حین رویت است و بداند کہ سائر عبادات وسائل انداز برائے نماز ونماز از مقاصد ست۔

جان لو کہ دنیا میں نماز کا مرتبہ آخرت میں دیدار الٰہی کی طرح ہے۔ دنیا میں خداوند عالم سے انتہائی قرب نماز میں حاصل ہوتا ہے آخرت میں دیدار الٰہی کے وقت اور یہ بھی یاد رکھو کہ تمام عبادات نماز کے وسائل وذرائع ہیں اور نماز مقصود ہے۔ [مکتوب ۱۳۷ جلد اول ص ۱۴۸]

نفس کشی صرف اتباع سنت سے ہوتی ہے

انبیاءؑ کی بعثت اور تکلیفات شرعی کا مقصود اور حکمت نفس امارہ کی تمیز و تخریب ہے۔ خواہشات نفسانی کو ہٹانے اور دفع کرنے کے لئے احکام شرع وارد ہوتے ہیں۔

تقاضا شریعت پر جس قدر عمل کیا جائے، اُسی قدر خواہش نفسانی میں زوال ہوتا ہے۔ لہذا خواہش نفس کے ازالہ میں کسی ایک حکم شرعی پر عمل کرنا اُن ہزار سالہ مجاہدوں اور ریاضتوں سے بہتر ہے جو اپنی رائے سے ہوں۔ بلکہ یہ تمام مجاہدے اور ریاضتیں جو شریعت غرا کے بموجب نہ ہوں، خواہش نفسانی کے لئے موید اور مقوی ہیں۔

برہموں اور جوگیوں نے ریاضتوں اور مجاہدوں میں کمی نہیں کی۔ مگر کوئی بھی سودمند نہیں۔ اُن سے خود اُن کی نفسی اور عقلی خواہشات کی تقویت اور تربیت ہوئی ہے۔

مثلاً زکوٰۃ کی ایک کوڑی جس کی ادائیگی حکم شریعت کے بموجب ہو، اپنی رائے کے بموجب ایک ہزار اشرفی صرف کرنے سے بہتر ہے۔ حکم شریعت کے بموجب عید کے دن کھانا کھانا ہوا نفسانی کے زائل کرنے میں اپنی عقل کے بموجب سالہا سال روزے رکھنے سے زیادہ مفید ہے۔

تمام شب نماز پڑھنے سے صبح کی نماز جماعت سے ادا کرنا بہت زیادہ افضلیت کا حامل ہے۔

خلاصہ یہ کہ جب تک نفس پاک صاف نہ ہو اور اپنی سیادت کے مالیخولیا کی خباثت سے پاک نہ ہو، نجات محال ہے۔ لہذا موت ابدی سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس مرض کا ازالہ ضروری ہے۔ (۲۳۶)

(مکتوب ۵۲ ص ۶۹ و ص ۷۰ جلد اول)

خواجہ محمد ہاشم کے نام ایک مکتوب ہے جس میں خواجہ موصوف کے چند سوالات کا جواب دیا ہے۔ اسی سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

سوال دوم کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے بہت زیادہ ریاضتیں برداشت فرمائی ہیں۔ بسا اوقات گرسنہ رہے ہیں۔ مگر طریقہ نقشبندیہ میں ریاضتوں کی ممانعت ہے۔ جواب میں تحریر فرماتے ہیں۔ آپ نے کس سے سن لیا، کہ طریقہ نقشبندیہ میں ریاضت ممنوع ہے۔ طریقہ نقشبندیہ میں لازم ہے کہ ہمیشہ نسبت کو محفوظ رکھا جائے۔ (۲۳۷) رسول اللہؐ کی تمام سنتوں کی اتباع کی جائے۔ اپنے حالات کو مخفی رکھا جائے۔ کھانے پینے اور پہننے وغیرہ میں حد اعتدال کی رعایت کی جائے۔

یہ چیزیں شدید ترین ریاضتیں ہیں۔ بے شک عوام کالانعام ان کو ریاضت نہیں سمجھتے۔ ان لوگوں کے نزدیک کھانا سب سے بڑی چیز ہے لہذا یہ بہائم صفت فاقہ کو سب سے بڑی ریاضت جانتے ہیں۔ اس کا خیال کرتے ہوئے تو حضرت نقشبند پر لازم ہے کہ جس چیز کو عوام قدر و عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس سے احتیاط کریں تاکہ شہرت سے محفوظ رہیں اور اپنے حالات کو مخفی رکھ سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بھوکا رہنا بہت آسان ہے مگر

اتباعِ سنت اور خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو ہر وقت پیش نظر رکھنا اور اپنے حالات کو چھپانا اور مخفی رکھنا، شہرت در نمائش سے بچنا، خورد ونوش وغیرہ میں اعتدال قائم کرنا بہت دشوار اور بہت دشوار ہے۔

حضرت حق جل مجدہ نے حضورؐ کو فوق الفطرت قوت بخشی تھی۔ آپ کی برکت سے صحابہ کرامؓ کو بھی بے نظیر روحانی قوت عطا ہوئی تھی۔ یہ حضرات بھوکے رہ کر بھی جہاد کرتے تھے اور اپنے سے دس گنوں پر بھی غالب رہتے تھے۔ بایں ہمہ حضرت صدیق اکبرؓ نے ارادہ کیا کہ رسول اللہؐ کی طرح صوم وصال (افطار کے بغیر چند دن کا متواتر روزہ) رکھیں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ میرا خدا مجھ کو وہ طاقت بخشتا ہے جو تمہیں حاصل نہیں۔ لہٰذا تمہارے لئے یہ جائز نہیں۔

مختصر یہ کہ گرسنگی اس حد تک محمود اور بہتر ہے کہ اداءِ واجبات میں حارج نہ ہو۔ آج ایک وقت کے فاقہ سے اداءِ واجبات میں سستی پیدا ہو جاتی ہے لہٰذا یہ فاقہ کسی صورت سے بھی موجبِ برکت نہیں۔

ایک دوسرا نکتہ بھی قابل لحاظ ہے۔ فاقہ صفائی تو بے شک پیدا کرتا ہے مگر کسی کے لئے صفائی قلب اور کسی کے لئے صفائی نفس۔ اگر فاقہ سے صفائی نفس حاصل ہو تو وہ تباہ کن ہے۔ فلاسفہ یونان اور ہندوستان کے برہمنوں اور جوگیوں کو فاقہ سے صفائی نفس حاصل ہوتی ہے جس سے گمراہی میں اور اضافہ ہو گیا۔ افلاطون جیسے بے وقوف نے انبیاءؑ کے احکام ماننے سے اس لئے انکار کر دیا کہ خود کو راہنما سمجھتا تھا۔ یہ سراسر تباہی اور بربادی ہے۔ [خلاصہ مکتوب ۳۱۳ ص ۳۵۲ وص ۳۵۲ جلد اول]

درستی عقیدہ بنیادی فرض ہے

حکماء اور اطباء کے نزدیک مسلم ہے کہ جب تک مریض کا مرض زائل نہ ہو کوئی غذا مفید نہیں، بلکہ مقوی مرض ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے مرض کا ازالہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ مناسب غذا دیتے ہیں۔ اسی طرح جب تک کوئی شخص قلبی امراض میں مبتلا ہے، کوئی عبادت یا کوئی اطاعت نفع نہیں دے سکتی، بلکہ مضر ہے۔

[ص ۲۷۷ ج ا۔ مکتوب ۱۰۵]

عقل درماندہ ہے، فکر نارسا، عقلاء معرفت حق سے محروم، انبیاء در یوزہ گر ہیں اور اتباع عقل گمراہی ہے

مکتوب ۲۳ جلد سوم بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی میں مفصل اور مدلل طور پر مذکورہ بالا دعووں کو ثابت فرمایا ہے۔ خلاصہ درج ذیل ہے۔

انبیاء اہل عالم کے لئے رحمت ہیں۔ عقل انسانی تو اس جہان کے بنانے والے کو بھی نہ پہچان سکی تھی۔ چنانچہ متقدمین فلاسفہ دہریہ تھے۔ نمرود خدا کا منکر تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے وجود خدا کے متعلق اس سے مناظرہ کیا جو قرآن پاک میں منقول ہے۔

فرعون نے موسیٰؑ سے کہا۔ ''میں اپنے سوا کسی خدا کو نہیں جانتا۔'' جب ان حضرات کی تبلیغ سے وجود خدا

عام طور پر تسلیم کرلیا گیا۔ تب فلاسفہ بھی وجود خدا کے تسلیم پر مجبور ہوئے۔ مگر باری تعالیٰ کی صفات، حشر و نشر وغیرہ میں وہ کبھی بھی راہ یاب نہ ہو سکے۔ انہوں نے ان چیزوں کو اپنی عقل کے ذریعہ معلوم کرنا چاہا۔ حالانکہ یہ چیزیں رسائی عقل سے بالا ہیں۔ ہم تجربہ کرتے ہیں کہ حس ظاہری کسی چیز کو دوسری طرح معلوم کرتی ہے، عقل دوسری طرح۔ حواس ظاہری ان چیزوں کے ادراک سے قاصر رہتے ہیں جن کو عقل معلوم کر لیتی ہے۔ اسی طرح انبیاءؑ کے معارف وحقائق سے عقل انسانی عاجز رہتی ہے۔ کیونکہ ہر ایک کا طریقہ دوسرے سے جدا ہے۔ رہ گیا خداوند عالم کے احکام کو معلوم کرنا اور ان پسندیدہ چیزوں کو معلوم کرنا جو انسان کے لئے روحانی ترقی اور حقیقی فلاح کا باعث ہوتی ہیں، ان کی واقفیت حضرت حق جل مجدہ کی تعلیم کے بغیر ناممکن ہے۔ انبیاءؑ اسی لئے مبعوث کئے گئے کہ مرضیات الٰہی سے نوع انسانی کو آگاہ کر دیں۔ خداوند عالم کی عظمت اور عبادت کی جو صورت حضرت حق کی مرضی کے مطابق نہ ہو وہ تعظیم کہلانے کی مستحق نہیں۔ بلکہ بہت ممکن ہے غیر تعظیم کو تعظیم سمجھ لیا جائے۔ لہٰذا جو تعظیم و تکریم عقلی طور پر کی جائے اور وہ انبیاءؑ کی تصدیق سے محروم ہو، وہ گمراہی ہے۔ اس کے بعد فلاسفہ اور ان کے نظریات کی غلطیاں بیان فرمائی ہیں۔ آخر میں ارشاد فرماتے ہیں۔

امام غزالیؒ نے اپنے رسالہ ''المنقذ من الضلال'' میں تحریر فرمایا ہے کہ فلاسفہ نے علم طب و علم نجوم کو انبیاء سابقینؑ کی کتابوں سے سرقہ کیا ہے اور ادویہ[۲۲۷] وغیرہ کے خواص انبیاءؑ کے صحیفوں سے ماخوذ ہیں۔ علم تہذیب و اخلاق کو اہل تصوف سے (جو ہر نبی کے متبعین میں ہوتے رہے ہیں) حاصل کیا ہے [مکتوب ۲۳ جلد ۳ ص ۳۹ تا ۴۲]

درستی عقیدہ کا معیار

قرآن پاک اور احادیث رسول اللہؐ کے بموجب جس طرح علماء حق نے عقائد کو سمجھا ہے، اسی کے بموجب اپنے عقائد کو صحیح کرنا ہمارے اُوپر لازم ہے۔ ہماری اور آپ کی سمجھ درجۂ اعتبار سے ساقط ہے، جب تک ان بزرگوں کی توضیح اور تفسیر کے بموجب نہ ہو۔

ہر بدعتی اور ہر ایک گمراہ اپنے عقائد باطلہ کے لئے کتاب اور سنت ہی کی آڑ لیا کرتا ہے حالانکہ قطعاً بے سود اور بے معنی۔ لہٰذا سب سے پہلے عقائد کو صحیح کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد حلال، حرام، فرض، واجب وغیرہ شرعی احکام کا علم۔ پھر اس کے بموجب عمل، اس کے بعد تصفیہ اور تزکیہ کا نمبر ہے۔

جب تک عقائد صحیح نہ ہوں، احکام شریعت کی واقفیت فائدہ مند نہیں، اور جب تک یہ دونوں نہ ہوں صفائی قلب ناممکن۔

یہ چار رکن اور اُن کے تتمے اور تکملے یعنی سنن اور نوافل اصل اصول ہیں۔ ان کے بعد جو کچھ ہے، فضول غیر مفید اور بے کار رسول اللہؐ کا ارشاد واجب العمل ہے۔ من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه۔ یعنی اسلام کی خوبی یہ ہے کہ بے فائدہ باتوں کو چھوڑ دے۔

شریعت کیا ہے؟

شریعت کے تین جز ہیں۔ علم، عمل، اخلاص۔ جب تک یہ تین چیزیں نہ ہوں شریعت نہیں۔ جب شریعت ثابت ہوگئی، رضاء مولیٰ حاصل ہوگئی جو دنیا اور آخرت کی تمام سعادتوں سے بالا ہے "رضوان من اللہ اکبر"

پس دنیوی اور اُخروی تمام سعادتوں کی متکفل صرف شریعت ہے۔ کوئی مقصود نہیں جس کے لئے شریعت کے ماسوا کسی اور چیز کی ضرورت ہو۔

طریقت اور حقیقت صوفیاء کا طرۂ امتیاز ہے۔ مگر یہ دونوں چیزیں شریعت کے جزو سوم یعنی اخلاص کی تعمیل کے لئے شریعت کے خادم ہیں۔ لہٰذا طریقت اور حقیقت کے حاصل کرنے سے صرف شریعت کی تکمیل مقصود ہے۔

وہ احوال اور وجد، علوم اور معارف جو صوفیا کو اثناء راہ میں حاصل ہوا کرتے ہیں، مقصود نہیں بلکہ اوہام و خیالات ہیں، جن سے طریقت کے نونہالوں کو بہلایا جاتا ہے ان تمام حالات و مقالات سے گزر کر مقام رضا میں پہنچنا چاہیے۔ جو سلوک اور جذب کی انتہاء ہے۔ [مکتوب ۳۵ جلد اول ص ۵۰]

طریقت عین شریعت ہے

کچھ صوفی ایسے کشف بیان کرتے ہیں جو ظاہر شریعت کے مخالف ہیں۔ ایسے کشف، یا وسوسہ ہیں یا حالت سکر کا اثر ہوتے ہیں۔ باطن ظاہر سے قطعاً مخالف نہیں۔ درمیان راہ میں کچھ مخالفت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کامل اور "منتہی حقیقی" باطن کو ظاہر شریعت کے موافق ہی پاتا ہے۔

علماء دین اور بزرگانِ طریقت کے درمیان صرف یہ فرق ہے کہ علماء اسی چیز کو استدلال اور علم کے ذریعہ سے معلوم کرتے ہیں، اور یہ حضرات کشف اور ذوق کے ذریعہ سے۔ یہ مطابقت اور موافقت ہی بزرگانِ طریقت کے حالات کی صحت اور درستی کی سب سے بڑی دلیل ہوتی ہے۔ [مکتوب ۴۳ جلد اول ص ۱۸]

بزرگانِ طریقت تمام عقائد میں جو کتاب، سنت اور اجماع اُمت سے ثابت ہیں، علماء اہل سنت والجماعت سے متفق ہیں۔ متکلمین اور بزرگانِ طریقت کے درمیان فرق صرف یہی ہے کہ متکلمین اسی چیز کو علم و استدلال سے حاصل کرتے ہیں اور یہ حضرات کشف اور ذوق سے۔ [مکتوب ۱۶۰ جلد اول ص ۱۹۰]

صحت عقیدہ کے بغیر وجد و حال گمراہی ہے

اتباعِ فرقہ ناجیہ کی دولت جس قیمت پر بھی میسر ہو، احسان ہے اور موجب شکر۔ مجھے اگر یہی مل جائے اور حال اور وجد کا کوئی حصہ نہ ملے تو میں راضی رہوں گا اور کوئی غم نہ ہوگا۔

بعض مشائخ قدس اللہ اسرارہم سے غلبۂ حال اور وقتی سکر کے باعث کچھ ایسے علوم و معارف ظاہر ہوتے ہیں جو اہل حق کی رائے صائب کے مخالف ہیں۔ چونکہ اُن کا منشا کشف ہوتا ہے لہٰذا وہ معذور ہیں۔ اُمید ہے کہ

قیامت کو اُن سے مواخذہ نہ ہوگا۔ یہ لوگ مجتہد کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے اجتہاد میں کوئی غلطی ہو جائے۔ مجتہد کی غلطی پر بھی اجر مل جاتا ہے۔ لیکن حق وہی ہے جو علمائے حق فرماتے ہیں (شکر اللہ سعیہم) کیونکہ علماء کرام کے علوم مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہوتے ہیں اور مشکوٰۃ نبوت کو وحی قطعی سے قوت حاصل ہوتی ہے جس میں شک و شبہ کی قطعاً گنجائش نہیں۔ صوفیاء کرام کے معارف کا مدار اُن کے کشف والہام پر ہے جس میں غلطی کی بہت کچھ گنجائش ہے۔

کشف والہام کی صحت کا معیار علماء اہل سنت کے علوم و تحقیقات ہیں۔ اگر کوئی کشف ان علوم سے بال برابر مخالف ہے، وہ دائرہ صواب سے خارج ہے۔ یہی ہے علم صحیح اور حق صریح۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے گمراہی ہے۔ [مکتوب ۲۱۲ جلد اول ۱۳۴]

الہام، دین کے پوشیدہ کمالات کا مظہر ہے۔ وہ دین کے اندر کچھ زائد کمالات نہیں پیدا کر سکتا۔ الہام کی مثال اجتہاد جیسی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اجتہاد شریعت کے اُن احکام کو ظاہر کرتا ہے جو ظاہر شریعت میں ضروری ہیں مگر عام نگاہیں اُن تک نہیں پہنچ سکتیں اور الہام شریعت کے دقائق اور اسرار کو واضح کرتا ہے [ص ۱۱۰ جلد ۲ مکتوب ۵۵]

حالات سکر و وجد کے کلمات اور ان کی اصلاح

کسی بزرگ نے حالت سکر میں یہ کہہ دیا کہ ولایت نبوت سے افضل ہے۔ ایک بزرگ نے اس کی تاویل کی کہ نبی کی ولایت مراد ہے یعنی نبی میں دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک ولایت دوسری نبوت۔ لہٰذا جو ولایت نبوت سے افضل ہے وہ نبی کی ولایت ہے نہ کہ عام اولیاء کی ولایت۔ یہ تاویل اس لئے کی کہ نبی سے ولی افضل ہونے کا وہم نہ ہو، مگر حقیقت یہ ہے کہ معاملہ برعکس ہے۔ نبی کی نبوت اُس کی ولایت سے افضل ہے۔

وجہ یہ ہے کہ ولایت میں تنگی سینہ کے باعث خلقت کی طرف توجہ نہیں ہو سکتی۔ اور نبوت میں چونکہ انتہا درجہ سینہ کو وسعت اور انشراح ہوتا ہے، لہٰذا وہ حضرت سبحانہٗ کی جانب بھی متوجہ رہتا ہے اور مخلوق کی جانب بھی۔ ایک کی جانب توجہ دوسرے کی جانب توجہ میں کوئی کمی اور نقصان نہیں پیدا کرتی۔

نبوت میں صرف مخلوقات کی جانب ہی توجہ نہیں رہتی کہ ولایت کو نبوت پر ترجیح دی جا سکے۔ یہ تو عوام کالانعام کی شان ہے۔ نبوت کی شان اس سے بہت بالا ہوتی ہے۔

ارباب سکر کے لئے اس نقطہ کا سمجھنا دشوار ہے۔ یہ معرفت مستقیم الاحوال کے لئے مخصوص ہے۔

[ص ۱۳۶ جلد اول مکتوب ۱۰۸]

شیخ فرید کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ.

جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی، درحقیقت اُس نے خدا کی اطاعت کی۔

حضرت حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے رسول اللہؐ کی اطاعت کو بعینہ اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔ پس جو اطاعت خدا کے نام پر ہو، مگر رسول اللہؐ کی اطاعت کے ماسوا ہو، وہ خدا کی اطاعت نہیں۔ اسی مضمون کی تائید وتقویت کے لئے قد (درحقیقت) کا لفظ آیۂ کریمہ میں لایا گیا ہے، تاکہ کوئی بوالہوس ان دو اطاعتوں میں تفریق نہ کر سکے۔

دوسرے موقع پر حضرت حق جل مجدہ، اُس جماعت کی قباحت بیان فرماتے ہیں جو ان دو اطاعتوں میں امتیاز اور تفریق پیدا کرنے۔ ارشادِ ربانی ہے:

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کے درمیان فرق پیدا کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض سے انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس درمیان میں کوئی راستہ بنالیں یہ لوگ بلا شبہ کافر ہیں۔

بیشک کچھ مشائخ قدس اللہ اسرارہم نے غلبۂ سکر اور غلبۂ حال کے وقت کچھ ایسے کلمے کہہ دیئے ہیں جن سے بظاہر دونوں اطاعتوں میں امتیاز معلوم ہوتا ہے جیسا کہ منقول ہے کہ سلطان محمود غزنوی خرقان پہنچے تو اپنے دو وکیل شیخ ابوالحسن خرقانی کی خدمت میں بھیجے کہ شیخ سے سلطان کے پاس تشریف آوری کی درخواست کریں۔

سلطان نے اپنے وکیلوں سے کہہ دیا تھا کہ اگر شیخ کچھ تامل کریں تو اُن کے سامنے یہ آیت پڑھ دیں۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔ (اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اور اُن لوگوں کی اطاعت کرو، جو تمہارے معاملات کے ذمہ دار ہیں)۔ چنانچہ وکلاء نے جب دیکھا کہ شیخ کو سلطان کے پاس جانے میں تامل ہے، تو یہ آیت پڑھ دی۔ شیخ نے جواب دیا۔ اطیعوا اللہ (اطاعت خداوندی) کا حق ہی پورا نہیں ہوا۔ اطیعوا الرسول (رسول کی اطاعت کرو) کی تعمیل سے شرمندہ ہوں اولی الامر کی نوبت ہی نہیں آسکتی۔

حضرت شیخ نے اطاعت حق کو اطاعت رسول سے علیحدہ سمجھا۔ یہ کلمہ استقامت سے بعید ہے۔ مستقیم الاحوال مشائخ ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔

مستقیم الاحوال مشائخ، شریعت، طریقت اور حقیقت کے تمام مراتب میں رسول اللہؐ کی اطاعت ہی حضرت حق جل مجدہ کی اطاعت قرار دیتے ہیں اور حضرت حق کے نام پر اُس اطاعت کو جو اطاعت رسول اللہؐ سے ہٹ کر ہو، عین گمراہی قرار دیتے ہیں۔

نیز منقول ہے کہ شیخ امت شیخ ابوسعید ابوالخیر ایک موقع پر تشریف فرما تھے۔ سادات خراسان میں سے ایک جلیل القدر سید بھی اس مجلس میں تشریف فرما تھے۔ اتفاقاً ایک مغلوب الحال مجذوب آ پہنچا۔ حضرت شیخ نے اس مجذوب کو سید صاحب کی بہ نسبت زیادہ تعظیم سے بٹھایا۔ سید صاحب کو اس پر تعجب ہوا۔ شیخ نے فرمایا۔

آپ کی تعظیم رسول اللہ کی محبت کے واسطہ سے ہے، اور اس مجذوب کی تعظیم حضرت حق جل مجدہ کی محبت کے تعلق سے۔

مستقیم الحال بزرگ اس قسم کے امتیاز کو بھی جائز نہیں قرار دیتے۔ یہ بھی مغلوبیت حال اور وقتی سکر کا اثر ہے [مکتوب ۵۲ جلد ۱ ص ۱۵۵]

اسی طرح انا الحق وغیرہ کلمات کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ سب کلمات درمیانی عوارض کی بناء پر صادر ہوئے۔ جو شخص حضرت حق جل مجدہ کے سامنے خود کو ہر طرح ہیچ کر چکا اور فنا کے حقیقی درجہ پر پہنچ گیا، اُس کو تو اپنا وجود ہی ہیچ معلوم ہوگا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اپنی جانب نسبت کر کے کہے کہ ''میں حق ہوں''۔ ''میں'' اسی وقت تک ہے جب تک فناء کامل حاصل نہیں ہے۔

''انا الحق گفتن از عدم حصول ایں نسبت ست و سبحانی برزبان آوردن از نارسیدن بایں دولت ست''۔

اس کے بعد ہدایت فرماتے ہیں:

''ایں قسم الفاظ کہ از اکابر صادر شدہ حمل برتو سط احوال شان باید نمود و کمال شان ورائے آں گفتگو اعتبار باید فرمود۔ [ص ۱۲۲ جلد ۳ مکتوب ۷۵]

چند بدعتوں کی اصلاح قابل توجہ علماء دور حاضر

مکتوب نمبر ۲۸۸ جلد اوّل میں تحریر فرماتے ہیں:

اس زمانہ کے اکثر خواص و عوام ادا ءِ نوافل میں بہت زیادہ اہتمام کرتے ہیں اور فرائض کی ادائیگی میں سستی۔ نہ فرائض سے متعلق سنن اور مستحبات کا لحاظ رکھتے ہیں نہ فرائض کو اوقاتِ مستحبہ میں ادا کرتے ہیں اور نہ تکبیر اولیٰ کی فضیلت کا لحاظ رکھتے ہیں، بلکہ خود جماعت کی پابندی بھی برائے نام ہے۔ فرض نماز جس طرح ادا ہو جائے اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ البتہ روز عاشورا، شب براءت، ۲۷ ماہ رجب اور ماہ رجب کے پہلے جمعہ کی رات کا پورا پورا اہتمام کرتے ہیں۔ لیلۃ الرغائب ان کا نام رکھا ہے، اور پورے انتظام و اہتمام سے بڑی بڑی جماعتوں کے ساتھ ان راتوں میں نوافل ادا کرتے ہیں اور اس کو ثواب سمجھتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ یہ شیطان کا فریب ہے کہ سیئات کو حسنات کی صورت میں پیش کر کے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔

شیخ الاسلام مولانا عصام الدین ہروی، حاشیہ شرح وقایہ میں فرماتے ہیں کہ نوافل کو جماعت سے ادا کرنا اور فرائض کو چھوڑ دینا شیطان کا دام فریب ہے۔

جاننا چاہیے کہ تراویح اور صلوٰۃ الکسوف کے علاوہ نوافل کو مجمع کے ساتھ ادا کرنا مذموم و مکروہ بدعتوں میں اور انہیں بدعتوں میں داخل ہے جن کے متعلق رسول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ہمارے اس کام (اسلام) میں ایجاد کرے وہ اُسی کے اوپر رد کر دی جائے۔

جماعت کے ساتھ ادا نوافل بعض روایتوں میں مطلق مکروہ ہے۔ بعض میں کراہت کے لئے یہ شرط بتائی ہے کہ دوسرے کو بلائے۔ روایت دوم کی بنا پر اگر دو آدمی مسجد کے کنارے جماعت کے ساتھ نفلیں پڑھ لیں تو مکروہ نہیں۔ اور تین آدمیوں کے متعلق اختلاف ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ تین کی جماعت بھی مکروہ ہے، اور چار آدمیوں کی جماعت بالاتفاق مکروہ ہے۔

اس کے بعد کتب فقہ کی عبارتیں (۲۳۹) پیش کر کے محققانہ بحث فرمائی ہے۔ اس کے بعد اس قسم کی تمام جماعتوں کو مکروہ قرار دے کر فرماتے ہیں:

مکروہ کو مستحسن جاننا بہت بڑا گناہ ہے کیونکہ حرام کو مباح اور جائز جاننا کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ تو مکروہ کو ثواب سمجھنے میں ایک درجہ اور بڑھا ہوا ہے کہ جائز کے بجائے اُس کو ثواب قرار دیا جا رہا ہے۔

[خلاصہ مکتوب ۲۸۸ جلد اول ص ۲۹۴]

سلوک و طریقت کے وہ خانوادے (۲۴۰) جو ہندوستان میں ارشاد و تزکیہ کی خدمات انجام دیتے رہے، اُن میں سے اکثر کا سلسلہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا تھا۔ اس لئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اُن کو خاص نسبت ہونی چاہیے تھی۔ مگر اس کے یہ معنی کسی طرح بھی نہیں ہو سکتے کہ اہل سنت والجماعت کے اجماع کے برخلاف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو تمام صحابہ سے افضل مانا جائے۔

لیکن عام ذہن اس نکتہ سے غافل تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ہی افضل صحابہ قرار دیئے گئے تھے۔ اس عقیدہ کی اصلاح بھی حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی مجددانہ خدمات میں داخل ہے۔

مکتوب نمبر ۲۰۲ بنام سید فرید صاحب صادر ہوا تھا۔ اس میں تحریر فرماتے ہیں:

"جو شخص حضرت امیرؓ کو حضرت صدیقؓ سے افضل کہے وہ اہل سنت کی جماعت میں داخل نہیں رہتا"۔

چند سطر بعد تحریر فرماتے ہیں:

"انبیاءؑ کے بعد تمام انسانوں سے حضرت صدیق اکبرؓ کے افضل ہونے پر سلف کا اجماع ہو چکا ہے۔ احمق ہے جو اس اجماع کو توڑ دینے کا وہم کرے"۔ [ص ۲۰۲ جلد اول مکتوب ۲۰۲]۔

یہ مضمون مکاتیب شریف میں بہت جگہ مختلف عنوانات اور دلائل کے ساتھ تحریر فرمایا گیا ہے۔

بدعت (۲۴۱)

کہتے ہیں (۲۴۲) کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ بدعت حسنہ و بدعت سیئہ۔ بدعت حسنہ وہ عمل نیک ہے جو عہد رسالت اور خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد پیدا ہوا، اور اُس کے کرنے سے کوئی سنت ترک نہ ہوئی ہو۔

اور بدعت سیئہ۔ وہ ہے کہ اس کے کرنے سے سنت چھوٹی ہو۔

یہ فقیر ان بدعتوں میں کسی بدعت میں بھی حسن اور نورانیت کا مشاہدہ نہیں کرتا، اور صرف تاریکی اور کدورت ہی محسوس کرتا ہے۔
اگر بالفرض کسی بدعتی کے عمل میں آج ضعف بینائی کے باعث تری اور تازگی نظر آتی ہے تو کل جب کہ نگاہیں تیز ہوں گی، سمجھ جائیں گے کہ ان کا نتیجہ صرف خسارت اور ندامت ہے۔

بوقت صبح شود ہم چو روز معلومت — کہ با کہ باختۂ عشق در شب دیجور

سید البشر علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:

من احدث في امرنا هذا ماليس منه فهورد .

ہمارے اس کام میں (اسلام میں) جو شخص کوئی ایسی چیز ایجاد کرے جو اس میں نہیں ہے وہ مردود ہے۔
پس جو چیز مردود ہو وہ حسن کہاں سے حاصل کر سکتی ہے۔
نیز سرور دو جہاں علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:

اوصيكم بتقوى الله والسمع والطاعة وان كان عبدا حبشيا فانه من يعش منكم بعدى فسيرى اختلافا كثيرا فعليكم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدين المهديين تمسكوا بها و عضوا عليها بالنوا جذو اياكم ومحدثات الامور فان كل محدثة بدعة و كل بدعة ضلالة.

میں تم کو اللہ سے تقویٰ کرنے کی اور (احکام خلیفہ کے) سننے اور اطاعت کرنے کی وصیت کرتا ہوں، اگرچہ کوئی حبشی غلام ہی (امیر) ہو۔ جو شخص میرے بعد تم لوگوں میں سے زندہ رہے گا وہ بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا۔ تم پر لازم ہے کہ میری اور خلفاء راشدین کی سنت (پر چلو) اسی سے دلیل حاصل کرو اور داڑھوں کی کچلیوں (۳۴۳) سے اس کو پکڑ لو اور ایجاد کردہ باتوں سے بچتے رہو، کیونکہ ہر ایک ایجاد کردہ امر بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔
ہر گاہ ہر محدث بدعت باشد و ہر بدعت ضلالت پس معنی حسن در بدعت چہ بود و ایضاً آنچہ از احادیث مفہوم می گردد آنست کہ ہر بدعت رافع سنت ست تخصیص بعض ندارد پس ہر بدعت سیئہ بود۔
بہر حال جبکہ ہر نئی بات بدعت ہوئی اور ہر بدعت گمراہی تو بدعت میں حسن و خوبی کس طرح ہو سکتی ہے۔ نیز احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک بدعت سنت کو اٹھا دیتی ہے۔ اس میں کسی بدعت کے لئے کوئی تخصیص نہیں۔ لہٰذا ہر بدعت سیئہ ہی ہوگی۔

قال عليه الصلوٰة والسلام ما احدث قوم بدعة الا رفع مثله من السنة فتمسک بسنة خير من احداث بدعة وعن حسان قال ما احدث قوم بدعة في دينهم الا نزع الله من سنتهم مثلها ثم لا يعيد اليهم الى يوم القيامة.

رسول اللہ کا ارشاد ہے۔ جب بھی کوئی قوم کوئی بدعت ایجاد کرتی ہے تو اسی جیسی سنت کو اٹھائی جاتی ہے۔ لہذا سنت کو سنبھالنا اور اس سے دلیل حاصل کرنا ایجو بدعت سے بہتر ہے۔ حضرت حسانؓ سے مروی ہے کہ جو قوم اپنے دین میں کوئی بدعت ایجاد کر لیتی ہے۔ خداوند عالم اسی جیسی سنت ان سے چھین لیتا ہے۔ پھر وہ سنت ان میں قیامت تک کبھی واپس نہیں ہوتی۔

اس کے بعد ہی مکتوب میں اس کی مثالیں پیش فرمائی ہیں۔ ارشاد ہے:

کچھ علماء مشائخ نے میت کے لئے عمامہ کو بدعت حسنہ کہا ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس میں ترک سنت ہے۔ کیونکہ تین کپڑے سنت ہیں۔ ان میں عمامہ کی زیادتی تین کے عدد کو منسوخ کر دیتی ہے۔ اسی کا نام رفع سنت ہے۔

اسی طرح کچھ حضرات فرماتے ہیں کہ شملہ کو بائیں ہاتھ کی طرف ڈالے حالانکہ سنت یہ ہے کہ کمر پر دونوں مونڈھوں کے بیچ میں رہے۔ لہذا بائیں جانب ڈالنے سے وہ سنت ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کچھ فرماتے ہیں کہ نیت نماز زبان سے بھی ادا کرے تاکہ زبان اور دل میں مطابقت ہو جائے۔ زبان سے نیت کرنے کو بدعت حسنہ کہا جاتا ہے۔ فقیر کے خیال میں اس بدعت سے سنت تو درکنار، فرض ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بسا اوقات عوام الناس زبان سے تو کہہ ڈالتے ہیں مگر دل قطعاً متوجہ نہیں ہوتا، حالانکہ دل سے ارادہ کرنا فرض تھا۔ لامحالہ اس بدعت سے فرض یعنی دل سے ارادہ کرنا ختم ہو جاتا ہے اور جب نیت نہ ہوئی تو نماز نہ ہوئی۔ یہی شان ہے تمام بدعتوں کی وجہ اس کی یہ ہے کہ:

انها زيادات على السنة ولو بوجه من الوجوه، والزيادة نسخ فعليكم بالاقتصار على متابعة سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم والاكتفاء على اقتداء اصحابه الكرام فانهم كالنجوم بايهم اقتديتم اهتديتم اما القياس والاجتهاد فليس من البدعة في شئ فانه مظهر لمعنى النصوص لامثبت امر زائد.

بلاشبہ بدعتیں سنتوں پر زیادتیاں ہیں، خواہ وہ کسی حیثیت سے ہوں اور زیادتی نسخ ہے۔ لہذا تم پر لازم ہے کہ سنت رسول اللہ کی متابعت پر انحصار کر لو، اور آپ کے صحابہ کرام کی اقتداء پر اکتفا کرو۔ اس لئے کہ صحابہ کرام تاروں کی طرح ہیں، جس کی اقتداء بھی کر لو گے ہدایت پا لو گے باقی رہا قیاس اور اجتہاد، ان کو بدعت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ قیاس و اجتہاد کسی امر زائد کو ثابت نہیں کرتے۔ بلکہ وہ آیات و احادیث کی مراد کو ظاہر کرتے ہیں۔ [ص ۸۶، ص ۱۸۷ مکتوب نمبر ۱۷۶]

ملا طاہر لاہوری کو تحریر فرماتے ہیں:

کتنی بڑی نعمت ہے کہ تمام محبت و مخلص سنت رسول اللہ کے احیاء و ترویج کی طرف متوجہ ہوں اور تردید بدعت کی جدوجہد میں مشغول رہیں۔ سنت اور بدعت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک کے وجود پر دوسرے کی نفی

لازمی ہے..... چند سطر بعد:

جمیع سنن مرضی حق اللہ جل سلطانہ واضداد آنہا مرضیات شیطان۔ [ص ۸ء۲ جلد ا مکتوب ۲۵۵]

تمام سنتیں خداوند بالا و برتر کی پسند فرمودہ ہیں اور جو چیزیں سنت کے مخالف ہیں وہ شیطان کی پسندیدہ ہیں۔

سماع وغنا

سماع وغنا کے متعلق مکتوب نمبر ۲۸۵ جلد اول میں مفصل بحث کے بعد فرماتے ہیں:

"مختصر یہ کہ سماع متوسطین کے لئے نافع ہے۔ اور منتہی حضرات میں بھی ایک خاص قسم کے حضرات کے لئے"۔ (۲۴۴)

اس قسم کے لوگوں کے اوصاف کی تشریح اور تفصیل کے بعد فرماتے ہیں:

جن لوگوں کے لئے سماع نافع ہے، اس کے لئے بھی چند شرطیں ہیں۔ مثلاً ایک شرط یہ ہے کہ اپنے کامل نہ ہونے کا اعتقاد رکھے ورنہ ترقی نہیں کرسکتا بلکہ اپنی جگہ پر رکا ہوا ہے۔ اور اگر ترقی ہو بھی تو محض عارضی۔ باقی سماع کے نافع ہونے کی شرطیں عوارف المعارف یا دیگر اکابر مستقیم الاحوال کی کتابوں میں مذکور ہیں لیکن یہ دور حاضر کے لوگوں میں عموماً مفقود ہیں۔ بلکہ اس قسم کا سماع اور رقص جو آج کل رائج ہے۔ بلاشک وشبہ مضر ہے، عروج و ترقی کے منافی۔ [ص ۳۰۷۔ جلد ۱]

مکتوب نمبر ۲۶۶ میں تحریر فرماتے ہیں:

"سماع اور رقص درحقیقت لہو ولعب میں داخل ہے"۔

ممانعت سرود کے متعلق یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی ہے۔

مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ سورہ لقمان۔ ع ۱

کچھ لوگ وہ ہیں جو لہو (۲۴۵) الحدیث کو خریدتے ہیں تاکہ خدا کے راستہ سے بھٹکا دے بغیر سمجھے۔ اور ٹھہرائیں اس کو ہنسی۔ وہ جو ہیں اُن کو ذلت کا عذاب ہے۔

چنانچہ علم تفسیر کے امام حضرت مجاہد جو اکابر تابعین میں سے ہیں، اور حضرت عباسؓ کے ممتاز شاگرد ہیں۔ فرماتے ہیں کہ لہو الحدیث سے مراد غنا ہے۔

تفسیر مدارک میں ہے کہ لہو الحدیث سے مراد افسانہ (۲۴۶) اور غنا ہے۔

ابن عباس و ابن مسعودؓ قسم کھا کر فرمایا کرتے تھے کہ لہو الحدیث سے مراد غنا ہے۔ امام تفسیر حضرت مجاہد (مذکور) فرماتے ہیں کہ لایشهدون الزور کے معنی ہیں لایحضرون الغناء (یعنی محفل غنا میں نہیں حاضر

ہوتے) امام الہدیٰ ابو منصور ماتریدی (علم کلام کے امام) سے منقول ہے، کہ ہمارے زمانہ کے قاری[۲۳۸] جو گا گا کر قراءت کرتے ہیں، جو شخص ان کو شاباش دے، وہ کافر ہو گیا۔ اُس کی بیوی حرام ہو گئی۔ اس کی تمام نیکیاں خداوند عالم برباد کر دے گا۔ ابو نصیر دلوی کے حوالہ سے قاضی ظہیر الدین خوارزمی سے منقول ہے کہ جو شخص قوال یا کسی دوسرے شخص سے غنا سنے، یا کسی حرام فعل کو دیکھ کر اس کو پسند کرے (خواہ عقیدۃً یا بلا اعتقاد) وہ اُسی وقت مرتد ہو گیا۔ کیونکہ اُس نے حکم شریعت کو (معاذ اللہ) باطل گردانا۔ اور جو شخص حکم شریعت کو باطل قرار دے وہ کسی مجتہد کے نزدیک بھی مومن نہیں۔ خداوند عالم اُس کی کسی اطاعت کو قبول نہیں کرے گا اور اس کی تمام نیکیوں کو برباد کر دے گا اس کے علاوہ آیات، احادیث اور فقہاء کے اقوال حرمتِ غنا کے متعلق اتنی کثرت سے ہیں کہ ان سب کا نقل کرنا دشوار ہے۔

ان تمام شرعی تصریحات کے باوجود اگر کوئی شخص کسی منسوخ حدیث یا کسی شاذ روایت سے جواز غنا پر استدلال کرنے لگے تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔ کیونکہ کسی زمانہ میں کسی فقیہ نے بھی جواز غنا کا فتویٰ نہیں دیا، اور نہ رقص و پاکوبی کو جائز مانا۔ [ص ۳۳۴، ص ۳۳۵ جلد اول]

سلوک و طریقت کے سلسلہ میں حضرت مجدد صاحب کی تعلیم کا اندازہ کرنے کے لیے مکتوب نمبر ۲۶۱ جلد اول کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

نماز اسلام کا رکن دوم ہے اور جامع عبادات ہے۔ نماز نے اس جامعیت کے سبب سے ہی کل اور مجموعۂ عبادات کا حکم پیدا کر لیا ہے اور تمام نیک کاموں سے بلند و بالا ہے۔ دیدارِ خداوندی کی دولت، سرور کائنات کو شب معراج حاصل ہوئی۔ اس کے بعد دیدار خداوندی کی دولت اس عالم کے مناسب حضورؐ کو نماز میں میسر ہوتی ہے۔

اسی لیے حضورؐ نے فرمایا ہے الصلوۃ معراج المؤمنین یعنی نماز مسلمانوں کے لئے معراج ہے۔ نیز ارشاد فرمایا:

اقرب مایکون العبد من الرب فی الصلوۃ.

زیادہ سے زیادہ قرب جو بندے کو اپنے رب سے حاصل ہو سکتا ہے، وہ نماز ہی میں حاصل ہوتا ہے۔

رسول اللہؐ کے علاوہ دیدار خداوندی کی دولت اگرچہ اس عالم میں کسی کو نہیں ہوتی کیونکہ یہ عالم اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مگر تاہم اس نعمت عظمیٰ کا جو کچھ حصہ حضورؐ کے کامل پیروکاروں کو حاصل ہوتا ہے وہ نماز ہی میں حاصل ہوتا ہے۔ اگر نماز کا حکم نہ ہوتا تو چہرۂ مقصود کا نقاب نہ اُٹھتا۔ طالب، وصل سے محروم رہتا۔ پیر و مرشد جو قائد و ہادی طریقت ہو، وہ ہر ایک کمال اور معرفت کے باوجود اس دولت کا اسی طرح محتاج ہے، جس طرح ایک نوجوان۔ چنانچہ شریعت غرا نے ہر ایک مسلمان کے لئے نماز کو لازم قرار دیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے مقصود کی آخری حد تک پہنچ سکے۔

وہ شیخ طریقت جو اس راستہ سے منتہا مقصود تک پہنچتا ہے، اس سے کرامات کا صدور بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ بسا اوقات اس کو علم نہیں ہوتا، مگر دوسرے لوگ اس سے کرامات کا مشاہدہ کیا کرتے ہیں۔

ایسے شیخ طریقت کی ہدایت و رہنمائی کا نور اس کے مریدوں میں سرایت کرتا رہتا ہے۔ بلکہ مریدوں اور پھر ان کے مریدوں میں عرصۂ دراز تک اس نور کی کارفرمائی باقی رہتی ہے، جب تک [۲۴۹] اس کے مخصوص طریقہ کو تغیرات اور تبدیلیوں کی گندگی سے ملوث نہ کیا جائے اور بدعتوں کی آمیزش نہ ہو۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ

جو حالت کسی قوم کی ہے، خداوند عالم اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ خود ہی اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کر لیں۔

تعجب ہے کہ مشائخ زمانہ ان تبدیلیوں [۲۵۰] اور بدعتوں کو اس سلسلہ کی تکمیل تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن حکیم صفائی سے اعلان کر رہا ہے کہ دین اسلام ان بدعتوں کی ایجاد سے بہت پہلے مکمل اور رضاء حق سے مشرف ہو چکا ہے اور اس کے متبعین پر نعمت خداوندی کامل اور مکمل ہو چکی۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

آج ان بدعتوں کو کمال دین قرار دینا اس آیہ کریمہ کا سراسر انکار ہے معاذ اللہ۔

اند کے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم   کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار ست

علماء مجتہدین نے احکام دین ہی کی تفصیل کردی ہے۔ کوئی نئی چیز ایجاد نہیں کی (چنانچہ فقہ کے ہر ایک حکم کے لئے قرآن پاک یا حدیث شریف کی کوئی سند پیش کرنی ضروری ہے۔ شوافع، احناف، حنابلہ اور مالکیہ کی بحث اسی میں رہتی ہے کہ کس کے مسلک کے لئے سند واضح اور قوی ہے) لہٰذا اجتہادی مسائل ایجاد کردہ اُمور نہیں بلکہ دین کی ایک خاص اصل ہیں یعنی قیاس۔

بہرحال نماز ہی وہ دولت عظمٰی ہے جس کے متعلق سرور کائناتؐ نے ارشاد فرمایا:

قرۃ عینی فی الصلوٰۃ۔

میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

وہ تمام علوم و معارف، احوال و مقامات وغیرہ جو نماز سے خارج اور حقیقت نماز سے واقفیت کے بغیر حاصل ہوں، وہ حقیقی معارف، کمالات نہیں۔ بلکہ ان کی تصویر باطل ہے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ وہم و خیال ہیں۔

جو نمازی حقیقت نماز سے آگاہ ہوتا ہے، وہ نماز کے اندر گویا عالم دنیا سے ہی خارج ہو جاتا ہے لامحالہ معراج سے مشرف ہوتا ہے۔

بہرحال پنجگانہ معراج کی یہ بےنظیر دولت صرف اس اُمت کے لئے ہی مخصوص ہے۔ اسی اُمت کے نبی آخر الزماں کا یہ طرہ امتیاز ہے کہ شب معراج میں دنیا سے آخرت میں اور آخرت سے جنت میں پہنچ کر حضرت حق جل مجدہ کے دیدار سے مشرف ہوئے۔

وہ جماعت جس کو حقیقت نماز سے آگاہی نہیں بخشی گئی، امراض باطنی کا علاج دوسری صورت سے کرتا

جاتی ہے۔

بلکہ ایک گروہ تو وہ ہے جو نماز کو غیر اور غیریت پر محمول کر کے دوراز کار تصور کرتا ہے۔ اس تخیل کی بنیاد توحید وجودی کے مسئلہ پر ہے جس کے وہ لوگ قائل ہوتے ہیں جن کو وارفتہ اور مجذوب کہنا چاہیے۔

حقیقت نماز سے ناواقفیت ہی کے باعث ہی ایک گروہ نے سماع اور نغمہ کو اپنے اضطراب کے لئے ذریعہ سکون قرار دیا، اور نغمہ کے پردوں میں اپنے مطلوب کا دیدار کرنا چاہا۔ لامحالہ رقص و رقاصی کو دیدار تصور کرنے لگے۔ حالانکہ انہوں نے سنا ہوگا ما جعل الله في الحرام شفاءً۔ خداوند عالم نے حرام میں شفا نہیں رکھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اُن کی مثال اُس ڈوبنے والے کی ہے جو تنکے کا سہارا تلاش کیا کرتا ہے۔ اگر ان حضرات پر حقیقت نماز کا ایک شمہ بھی منکشف ہو جاتا تو کبھی بھی سماع اور نغمہ کا نام نہ لیتے اور وجد و حال میں مشغول نہ ہوتے۔ ع

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

برادر من! نماز اور نغمہ میں جس قدر فرق ہے، اتنا ہی فرق ان کمالات میں بھی سمجھو جن کی بنیاد نغمہ یا نماز پر ہوتی ہے۔ ''العاقل تکفیہ الاشارہ''۔ آج یہ کمالات پھر ایک ہزار سال کے بعد رونما ہو رہے ہیں، اور آخر اُمت پھر اولین اُمت کے رنگ میں رنگی جارہی ہے۔

رسول اللہؐ نے اس اُمت کے متعلق ارشاد فرمایا تھا:

پہلے لوگ بھی بہتر اور پچھلے بھی۔ درمیان والوں کی نسبت کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔ البتہ اس اُمت کے پچھلے لوگوں میں اگرچہ نسبت بلند ہوگی مگر کم بلکہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہوگی، اور درمیان والوں کو اگرچہ اتنی بلند نسبت حاصل نہیں تھی۔ مگر کثرت بلکہ بہت زیادہ کثرت کے ساتھ حاصل تھی۔

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے۔ الاسلام بدأ غريبا و سيعود كما بدأ فطوبى للغرباء۔

(ترجمہ) اسلام کا آغاز اس حالت میں ہوا کہ وہ اجنبی تھا۔ اور دوبارہ اسی طرح اجنبی [۲۵۱] ہو جائے گا۔ لہٰذا ایسے اجنبی لوگوں کے لئے مبارک باد۔

الفِ ثانی کا نظریہ

اس اُمت کے پچھلے حصہ کا آغاز رسول اللہؐ کی وفات کے ایک ہزار سال بعد سے ہوگا (یعنی ۱۰۱۱ء) [۲۵۲] وجہ یہ ہے کہ تغیرات اور تبدیلیوں کے سلسلہ میں ایک ہزار سال کو بہت [۲۵۳] قوی دخل ہے۔ اور چونکہ یہ اُمت نسخ و تبدیل سے محفوظ ہے تو لامحالہ وہی نسبت وہی طراوت اور رونق جو ایک ہزار سال پہلے تھی، ایک ہزار سال بعد جلوہ گر ہونے لگے گی۔ شریعت کی تائید اور ملت کی تجدید ہوگی۔ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مہدی کی آمد اس کی دلیل ہے۔

فیض روح القدس از باز مدد فرماید   دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا مے کرد

برادرمن! میری یہ باتیں بہت سے حضرات کو ناگوار ہوں گی۔ لیکن اگر انصاف سے کام لیں، ایک کا دوسرے کے علوم سے موازنہ کریں، علوم شرعیہ کو معیار قرار دے کر حالات کی صحت وخرابی کا فیصلہ کریں۔ اور اس پر غور کریں کہ شریعت غراء نے نبوت کی کس قدر تعظیم وتوقیر کی ہے، اور ان دونوں نظریوں میں کونسا نظریہ کس اصول پر مرتب ہے تو یہ ناگواری باقی نہ رہے گی۔

میں نے اپنے مکاتیب ورسائل میں بار بار لکھا ہے کہ ولایت سے نبوت کا درجہ بڑھا ہوا ہے۔ عام اولیاء کی ولایت تو درکنار خود نبی میں ولایت کی حیثیت سے نبوت کی حیثیت افضل اور اعلیٰ ہوتی ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ کمالات ولایت کی نسبت کمالات نبوت کے مقابلہ میں وہ بھی نہیں جو ایک قطرہ کو بحر محیط سے ہو سکتی ہے۔ یہ حقیقت ہے، جو میرے اوپر منکشف ہوئی، جس کی تفسیر میں نے اپنے اس مکتوب میں کی ہے جو فرزند عزیز کے نام لکھا ہے (اگرچہ شیخ ابن عربی جیسے ماہران طریقت اس مرحلہ پر آ کر لغزش کھا گئے)۔ خداوند عالم کے فضل وانعام کو بیان کرنا، اس گفتگو سے میرا مقصود ہے، اپنی فضیلت بیان کرنا مقصود نہیں۔ کیونکہ معرفت خداء عز وجل بر آنکس حرام ست کہ خود را از کافر (۲۵۴) فرنگ بہتر داند تکلیف از کا بردین۔ ابیات

ولے چوں شد مرا برداشت از خاک   سزد گر بگذرانم سر ز افلاک
من آں خاکم کہ ابر نوبہاری   کند از لطف برمن قطرہ باری
اگر بروید از تن صد زبانم   چو سوسن شکر لطفش کے توانم

[مکتوب ۲۶۱ جلد اول ص ۳۰۲ وص ۳۰۶]

تقلید ومناقب امام اعظمؒ

معلوم ہوتا ہے کہ درمیانی صدیوں کے متعلق حضرت مجدد صاحب کی یہ رائے صرف سلسلہ سلوک وطریقت کے لحاظ سے ہے۔ کیونکہ جہاں تک شریعت کا تعلق ہے تو مجدد صاحب ہر زمانہ کے علماء اور فقہاء کا یکساں شکریہ ادا کرتے ہیں، اور ان کے اقوال کو سند میں پیش کرتے ہیں۔

مجدد صاحب کو شکایت یہ ہے کہ طریقت جب کہ عین شریعت ہے تو ان درمیانی صدیوں کے مشائخ نے پابندیٔ شریعت کو ثانوی درجہ کیوں دیا۔

تعجب ہوگا کہ طریقت وحقیقت میں اس قدر بلند بالا درجہ رکھتے ہوئے حضرت مجدد صاحب کٹر حنفی ہیں۔ مکتوب نمبر ۳۱۲ جلد اول میں رفع سبابہ کے متعلق بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

مامقلداں رانمیرسد کہ بمقتضائے احادیث عمل نمودہ جراءت دراشارت نمائیم [ص ۴۳۹ مکتوب ۳۱۲]

ہم مقلدوں کو حق نہیں، کہ ظاہر احادیث پر عمل کرتے ہوئے اشارہ کی جرأت کریں۔

(مکتوب ۵۵ جلد ۲ میں) ناسخ منسوخ، اجتہاد انبیاء اور اجتہاد ائمہ مجتہدین پر مفصل اور عجیب و غریب بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

حضرت عیسیٰ دوبارہ تشریف آوری کے وقت رسول اللہؐ کی شریعت مطہرہ پر عمل کریں گے، وہ رسول اللہؐ کے کسی حکم کو منسوخ نہیں کریں گے۔ البتہ آپ کا اجتہاد اس قدر دقیق ہوگا کہ بہت سے علماء ظاہر اس کو اجتہاد نہ سمجھیں گے۔ حضرت روح اللہ کی مثال حضرت امام اعظم جیسی ہے۔

امام اعظم کوفیؒ کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی برکت اور سنت رسول اللہؐ کی کمال درجہ پابندی کے سبب سے اجتہاد اور استنباط میں وہ بلند مرتبہ عنایت ہوا تھا کہ دوسرے علماء اس کے فہم و ادراک سے قاصر تھے۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کا فکر عمیق شریعت مطہرہ کا اصل منشاء معلوم کر کے سراسر اس کی تفسیر کیا کرتا تھا۔ مگر دوسرے علماء اس کو ذاتی رائے سمجھ کر آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اصحاب الرائے کہا کرتے تھے۔ صرف اس لئے کہ آپ کے علم و درایت اور فہم و فراست کی حقیقت تک اُن کی رسائی نہ ہو سکی تھی۔

اُس دقیق و عمیق اور بلند و بالا علم و اجتہاد کے کرشمہ سے حضرت امام شافعیؒ واقف ہوگئے تھے۔ چنانچہ آپ کا مشہور مقولہ ہے:

الفقہاء کلھم عیال ابی حنیفہ.

تمام فقہاء ابو حنیفہ کے پروردہ اور وظیفہ خوار ہیں۔

افسوس! کوتاہ بین اپنی کوتاہی کا الزام دوسروں پر لگاتے ہیں۔

قاصرے گر کند ایں قافلہ لا طعن قصور ۔۔۔ حاش للہ کہ برآرم بزبان ایں گلہ را

ہمہ شیراں جہاں بستۂ ایں سلسلہ اند ۔۔۔ روبہ از حیلہ چساں بگسلد ایں سلسلہ را

خواجہ محمد پارسا "فصول ستہ" میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ نزول کے بعد حضرت امام اعظمؒ کے فقہ پر عمل کریں گے۔

غالباً اس کا منشا یہی ہے کہ اس انتہائی مناسبت کے باعث جو حضرت امام کے علم و فکر کو حضرت عیسیٰ سے ہے۔ حضرت عیسیٰ کا اجتہاد حضرت امام اعظم کے موافق ہوا کرے گا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ایک نبی کے لئے کب جائز ہے کہ ایک اُمتی کی تقلید کرے۔

تکلف اور مبالغہ کی آمیزش سے ہر طرح پاک اور بلند ہو کر عرض کرتا ہوں، کہ نظر کشف میں مذہب حنفی کی نورانیت دریاء عظیم کی طرح ہے اور دیگر ائمہ کے مذاہب حوضوں اور نالیوں کی طرح ہیں۔

مشاہدہ میں بھی ایسا ہی ہے کہ اہل اسلام کا سواد اعظم امام ابو حنیفہؒ کا مقلد ہے۔ ایک نہایت ہی عجیب معاملہ ہے کہ تقلید سنت اور اتباع اسوۂ رسول اللہؐ میں امام اعظمؒ کا قدم سب سے آگے ہے۔ حتیٰ کہ مرسل احادیث کو بھی مسند احادیث کی طرح قابل استدلال قرار دے کر اپنی رائے پر اس کو مقدم سمجھتے ہیں، اور اسی طرح قرب صحبت

خیر البشر کی فضیلت کے لحاظ سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اقوال کو اپنی رائے سے مقدم مانتے ہیں مگر اس کے باوجود مخالفان امام، امام صاحب کو اہل الرائے کہتے ہیں (یعنی اپنی رائے کو مقدم جاننے والے)۔ اور دوسرے مجتہدین، احادیث مرسلہ کو قابل استدلال ہی نہیں سمجھتے مگر پھر بھی مخالفین اُن کو ''اہل حدیث'' یا ''محدث'' کہتے ہیں۔

مخالفین امام، امام کے تقویٰ اور کمال علم کے معترف بھی ہیں، اور پھر بھی گستاخانہ کلمات سے امام کو یاد کر کے سواد اعظم کے دل کو دکھاتے ہیں۔

یُرِیۡدُوۡنَ لِیُطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ بِاَفۡوَاہِہِمۡ

چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھا دیں۔

جو لوگ اکابر دین کو اصحاب رائے کہتے ہیں۔ اگر مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ نصوص شرع کو نظر انداز کر کے اپنی رائے کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے تو (افتراء اور بہتان کے علاوہ) یہ بھی لازم آتا ہے کہ اہل اسلام کا سواد اعظم گمراہ اور مبتدع ہو بلکہ جرگۂ اہل اسلام سے خارج ہو۔ کوئی جاہل یا زندیق ہی اس قسم کا عقیدہ رکھ سکتا ہے جو دین کے ایک بڑے حصہ کو برباد کرنا چاہے۔ یہ لوگ چند حدیثیں یاد کر کے سمجھتے ہیں کہ دین کے تمام احکام انہیں میں منحصر ہیں۔ جو ان کو معلوم نہیں وہ گویا موجود ہی نہیں۔ ان تعصب پرستوں کے تعصب پر اور اُن کی نظر کوتاہ پر افسوس صد افسوس۔ بانیٔ فقہ ابو حنیفہؒ ہیں، اور تسلیم ہے کہ فقہ کے تین حصے امام اعظمؒ کے لئے مخصوص ہیں اور ایک چوتھائی میں امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ وغیرہ جملہ ائمہ شریک ہیں۔

سلسلۂ فقہ میں امام ابو حنیفہؒ گویا صاحب خانہ ہیں اور دیگر ائمہ عیال باوجودیکہ میں اسی مذہب کا پابند ہوں مگر حضرت امام شافعیؒ سے گویا مجھے ذاتی محبت ہے۔ میں اُن کو بزرگ جانتا ہوں اور بعض نفلی اعمال میں اُن کے مذہب کی تقلید کرتا ہوں مگر اس کا کیا علاج کہ کثرت علم وکمال کے باوجود دوسرے حضرات امام اعظمؒ کے مقابلہ میں طفل مکتب معلوم ہوتے ہیں۔ والامر الی اللہ [ص ۱۰۷ و ص ۱۰۸ جلد ۲ مکتوب ۵۵]

مولود شریف

مکتوب نمبر ۷۲ جلد دوم بنام خواجہ حسام الدین میں تحریر فرماتے ہیں:

مولود خوانی کے متعلق آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ ''اچھی آواز کے ساتھ قرآن شریف، نعتیہ قصائد اور مناقب وفضائل کے پڑھنے میں کیا مضائقہ ہے''۔

''حرفوں کا بدلنا، اس طرح گانا یا پڑھنا جس سے حروف میں تبدیلی ہو جائے نیز نغمہ کے طرز پر زیر وبم، آواز کا اتار چڑھاؤ وغیرہ بیشک ممنوع ہے، یہ شعر میں بھی جائز نہیں۔ لیکن اگر یہ قباحتیں نہ ہوں تو کیا خرابی ہے''؟

حضرت مجدد صاحبؒ جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

مخدوما! فقیر کا دل تو یہی کہتا ہے کہ ہرگز یہ سلسلہ نہ قائم کریں۔ بوالہوس جائز کو بھی ناجائز کرا دیتے ہیں۔ اگر اجازت کچھ بھی مل جائے، نتیجہ میں بہت کچھ ہو جائے گی۔ (۲۵۵) [مکتوب ۲۱ ص ۱۱۶ جلد ۳]

کفر شیعہ

کافر کی صحبت سے بدعتی کی صحبت کا فساد بہت بڑھا ہوا ہے تمام بدعتیوں میں سب سے بدتر بدعتی وہ جماعت ہے جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بغض رکھے۔ خداوند عالم قرآن پاک میں خود ان کو کافر فرماتے ہیں۔ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ۔ [مکتوب ۵۵ جلد ۱ ص ۷۱]

مدح صحابہؓ

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے کہ جب فتنے ظاہر ہوں بدعتیں پھیل جائیں اور میرے اصحاب کو برا کہا جائے تو عالم پر لازم ہے کہ اپنے علم پر غور کرے اس کے بموجب عمل کرے۔ جو ایسا نہ کرے اس پر خدا کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت، نہ اس کے فرض قبول ہوں گے نہ نفل۔ [ص ۲۷۵ جلد ا مکتوب ۲۵۱]

شہر سامانہ کے سادات، قاضی صاحبان اور عمائدین کرام کو لکھتے ہیں:

معلوم ہوا ہے کہ آپ کے یہاں خطیب شہر نے عید قربان میں خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ذکر مبارک چھوڑ دیا ہے۔ جب کچھ لوگوں نے امام صاحب کو توجہ دلائی تو بجائے اس کے کہ فراموشی وغیرہ کا کوئی عذر کرتا، نہایت سختی اور متمردانہ انداز میں جواب دیا اور کہا کہ اگر خلفاء راشدین کے نام نہیں لئے گئے تو کیا ہوا۔ نیز معلوم ہوا ہے کہ وہاں کے حضرات نے بھی اس معاملہ میں چشم پوشی اور نرمی اختیار کی ہے سختی کے ساتھ اس خطیب بے انصاف سے باز پرس نہیں کی۔ وائے نہ یکبار کہ صد بار وائے"۔

خلفاء راشدینؓ کا ذکر اگر چہ شرائط خطبہ میں داخل نہیں مگر اہل سنت والجماعت کا شعار ہے۔ شکر اللہ تعالیٰ سعیہم۔

خطبہ میں خلفاء راشدینؓ کا ذکر مبارک قصداً صرف وہی شخص چھوڑ سکتا ہے جس کا دل مریض ہو اور باطن خبیث ہو۔ مان لو، اس خطیب نے تعصب اور عناد سے ذکر مبارک نہیں چھوڑا۔ تاہم چھوڑنے والوں کے ساتھ مشابہت تو ہوئی۔ من تشبہ بقوم فھو منھم کا کیا جواب ہوگا۔ نیز ارشاد ہوا ہے، اتقوا مواضع التھم، تہمت کے مواقع سے بچو۔ تو اس صورت میں موقع تہمت سے کس طرح یہ خطیب نجات پا سکتا ہے۔

اگر اس خطیب کو حضرات شیخین رضوان اللہ علیہم کی افضلیت میں توقف ہے تو طریقہ اہل سنت کا تارک ہے۔ اور اگر حضرات شیخین کی محبت میں تردد ہے، تب بھی اہل حق سے خارج۔ اور چونکہ بے حقیقت خطیب کشمیری ہے تو بعید نہیں کہ کشمیر کے بدعتیوں سے یہ طریقہ اخذ کیا ہو۔

اس کو معلوم کرنا چاہیے کہ جیسا کہ اکابر ائمہ نے نقل فرمایا ہے، حضرات شیخین کی افضلیت اجماع امت سے ثابت ہے۔

اس کے بعد حضرت امام شافعی، امام ابوالحسن اشعری، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، ذہبی، بخاری وغیرہ سے نقول پیش فرمائی ہیں۔ اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

اس بے انصاف خطیب سے کہنا چاہیے کہ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی محبت کا ہم کو حکم دیا گیا ہے، اور اُن کے بغض وایذاء کی ممانعت وارد ہوئی ہے اور حضرات شیخین رضوان اللہ علیہما اکابر صحابہ میں سے ہیں، رسول اللہؐ کے رشتہ دار ہیں۔ لامحالہ محبت ومودت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔

رسول اللہؐ کو خطاب فرماتے ہوئے حضرت حق جل مجدہ ارشاد فرماتے ہیں"۔ (۲۵۶) آپ کہہ دیجئے کہ اقارب اور رشتہ داروں کے ساتھ محبت کا مطالبہ تو میں کرتا ہوں، اس کے علاوہ اپنی تبلیغ ورہنمائی پر کوئی اجر تم سے نہیں مانگتا۔

رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا: (۲۵۷)

میرے اصحاب اور دوستوں کے بارے میں خدا سے ڈرو۔ میرے بعد اُن کو نشانہ مت بنالینا۔ جو اُن سے محبت کرتا ہے، در حقیقت اس کو مجھ سے محبت ہے جس کے باعث اُن سے محبت کرتا ہے۔ اور جو اُن سے بغض رکھتا ہے، درحقیقت اس کو مجھ سے بغض ہے جس کے سبب اُن سے بغض رکھتا ہے۔ جو اُن کو تکلیف دیتا ہے وہ درحقیقت مجھے تکلیف دیتا ہے، اور جو مجھے تکلیف دیتا ہے وہ خدا کو تکلیف دیتا ہے، اور جو خدا کو تکلیف دے لامحالہ خداوند عالم اُس کو پکڑ لے گا۔

ہمیں معلوم نہیں کہ ابتداء اسلام سے اس وقت تک ہندوستان میں اس قسم کا گل کھلا ہو۔ بہت ممکن ہے کہ اس معاملہ سے تمام شہر متہم ہو جائے، بلکہ پورے ہندوستان سے اعتماد اُٹھ جائے۔ سلطان وقت سنی اور حنفی المذہب ہے۔ اس کے زمانہ میں اس قسم کی بدعت درحقیقت بہت بڑی جرأت ہے بلکہ درحقیقت سلطان وقت سے منازعت اور اولی الامر کی اطاعت سے بغاوت ہے۔

(چند سطر بعد)

اس خبر وحشت انگیز نے میرے اندر جوش پیدا کر دیا۔ میری رگ فاروقی پھڑ کنے لگی۔ چنانچہ یہ چند جملے لکھ دیئے ہیں۔ [مکتوب ۱۵ جلد ۲ ص ۲۸-۲۹]

اقتدارِ شیعہ

اس زمانہ میں اس بد اندیش جماعت نے بہت زیادہ غلبہ حاصل کر لیا ہے اور اطراف وجوانب میں پھیل پڑی ہے۔ [مکتوب ۵۴ ص ۷۲ جلد اول]

مکتوبات شریف کا بیشتر حصہ صحابہ کرامؓ کے فضائل، مشاجرات صحابہ کے متعلق عجیب وغریب مباحث اور اعتراضات روافض کی محققانہ رد وقدح سے پر ہے۔ ہر ایک مکتوب شریف کا مطالبہ ہے کہ "شاندار ماضی" کے

لئے اس کو منتخب کیا جائے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم کرشمہ دامن دل مے کشد کہ جا اینجاست

مگر تنگی اوراق اس سے زائد کی اجازت نہیں دیتی۔

ذبیحہ گاؤ

مکتوب ۸۱ جلد اول بنام لالہ بیگ میں ضمناً تحریر ہے:

ذبح بقرہ در ہندوستان از اعظم شعار اسلام ست کفار بجزیہ دادن شاید راضی شوند اما بذبح بقرہ ہرگز راضی نخواہند شد۔ (ص ۱۰۲ جلد اول)

ہندوستان میں ذبیحہ گاؤ اسلام کا ایک بہت بڑا شعار ہے۔ بہت ممکن ہے، کفار ہند جزیہ دینے پر راضی ہو جائیں مگر گائے ذبح کرانے پر ہرگز راضی نہیں ہو سکتے۔

مشرق و مغرب کی بعید ترین مسافت اور ہمت مجددانہ

تقریباً ڈیڑھ سو صفحات کے مطالعہ کی آپ زحمت برداشت کر چکے۔ اکبر کی کہانی سنی۔ دین الٰہی کی تصویر دیکھی۔ جہانگیر کی مجذوبانہ مذہبیت سامنے آئی۔ جہانگیر کے دامن رجحان و جذبات پر اکبری ماحول اور نور جہاں کی فسوں کاریوں کے دھبے بھی ملاحظہ سے گزرے اس طویل سرگزشت اور روئداد کے بعد حضرت مجدد صاحبؒ کے پاکیزہ نظریات اور کتاب اللہ وسنت رسول اللہؐ کے مقدس سانچوں میں ڈھلے ہوئے آپ کے ارشادات سے بھی آپ فیض یاب ہوئے۔

اس تفصیل و تطویل کا مقصد یہ تھا کہ مسافت کی ابتداء اور انتہا کا اندازہ ہو سکے۔

ایک طرف ملحدانہ تصورات و جذبات کی اندھیریاں ہیں، دوسری جانب حضرت مجدد صاحبؒ کے جذبات و تصورات کے مقدس انوار۔ ان دونوں میں اتنا ہی بعد ہے جتنا مغرب اور مشرق میں۔ بعد مسافت کے علاوہ ایک طرف فقر و فاقہ، بے چارگی اور بیا تنگی ہے اور دوسری جانب شاہنشاہانہ شان و شوکت اور بے پناہ عظمت و اقتدار، یہ ایسا نشیب و فراز ہے جس نے نہ صرف منزل کو بعید سے بعید تر کر دیا ہے بلکہ اتنا پر خطر بنا دیا ہے کہ ایک قدم پر اس ہمت مردانہ اور جذبۂ والہانہ کی ضرورت ہے جو ہنگ اجل کا مقابلہ خندہ پیشانی سے کر سکے اور ہنستے کھیلتے موت کی گھاٹی پھاند سکے۔ بیشک یہ بھی ایک خدمت تھی کہ نمائشی درویشوں اور علماء سوء کے مقابلہ میں اصلاحی محاذ قائم کیا جاتا۔ اس پر بھی حامی سنت، قامع بدعت، مجاہد ملت جیسے القاب حاصل ہو سکتے تھے۔ مگر جب نظریہ یہ ہو:

"بادشاہ کو عالم سے وہی نسبت ہے جو دل کو بدن سے ہے۔ اگر دل ٹھیک ہے بدن ٹھیک اور اگر دل بگڑا

ہوا ہے تو سارا بدن بگڑا ہوا۔ لہٰذا بادشاہ کی درستی میں سارے عالم کی درستی ہے، اور اُس کی خرابی میں سارے عالم کی خرابی (۲۵۸)''۔ [مکتوب ۴۷ جلد ا ص ۶۵]

اس نظریہ کے ساتھ ہمت عالی یہ ہے:

''ایک بہت بڑا کارخانہ میرے حوالہ فرمایا گیا ہے۔ پیری مریدی کے واسطے مجھ کو نہیں پیدا کیا گیا۔ تکمیل وارشاد میری پیدائش کا مقصود نہیں۔ ایک دوسرا ہی معاملہ ہے اور دوسرا کارخانہ ہے جو میرے سپرد ہوا ہے۔ اس ضمن میں جو کوئی مناسبت رکھے گا، فیض پالے گا۔ ورنہ نہیں۔ اس کارخانۂ عظیم کے مقابلہ پر تکمیل وارشاد ایسا ہے، جیسے راستہ کی گری پڑی چیز''۔

انبیاءؑ کی دعوت اُن کے باطنی معاملات کی بہ نسبت یہی حکم رکھتی ہے۔

ہر چند منصب نبوت ختم ہو گیا ہے مگر انبیاءؑ کے کامل متبعین کو وارث انبیاء ہونے کی حیثیت سے نبوت کے کمالات وخصائص میں سے حصہ مل جایا کرتا ہے''۔ [مکتوب ۹ ص ۱۸ جلد دوم]

اس کارخانۂ عظیم کے ایک حصہ کی توضیح اس ارشاد سے ہوتی ہے۔ حضرت خواجہ احرار قدس اللہ سرہ العزیز فرمایا کرتے تھے:

''اگر میں پیر ہوں تو دنیا میں کسی پیر کو مرید نہ ملیں۔ لیکن ایک دوسرے کام کا مجھے حکم دیا گیا ہے یعنی ترویج شریعت اور تائید ملت۔ چنانچہ حضرت موصوف بادشاہوں کی مجالس میں جاتے تھے اور اپنے تصرف سے اُن کو مطیع فرماتے اور ان کے ذریعہ شریعت کی ترویج کرتے تھے''۔

[مکتوب ع ۶۶ جلد اول ص ۸۳]

بہر حال جب نظر اُس پر ہو جو عالم ظاہری کے نظام میں قلب کی حیثیت رکھتا ہے جس کو شاہنشاہ، گیتی پناہ، جہاں گیر و جہاں دار کہا جاتا ہے تو صرف خانقاہوں کی اصلاح اور علماء سوء سے مجادلہ اور مناظرہ پر قناعت کس طرح ہو سکتی تھی۔ اُس ہماء بلند پرواز کے لئے تو بہت ہی بلند آشیانہ کی ضرورت تھی۔ یہی تھی کوہ استقلال واستقامت کی وہ چوٹی جس پر مجددیت کی تعمیر ہوئی۔

ترتیب عمل اور طریق کار

پہلے تحریر ہو چکا ہے کہ سترہ سال کی عمر میں آپ علوم ظاہری سے فارغ ہو کر والد ماجد سے سلسلۂ چشتیہ میں نسبت بھی حاصل کر چکے تھے۔

تحصیل علم کے بعد آپ آگرہ تشریف لے گئے۔ اور بسلسلۂ درس وتدریس چند سال آگرہ میں قیام کیا۔ وہاں آپ کے حلقۂ درس نے بہت جلد اتنی شہرت پائی کہ ابوالفضل اور فیضی جیسے اپنے زمانہ کے مشہور اور خود پسند ماہرین منطق وفلسفہ بھی آپ کی زیارت کے مشتاق ہوئے۔

اسی دوران قیام میں رد شیعہ کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ رسالہ تہلیلیہ وغیرہ اسی دوران میں تحریر فرمایا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ ملاقات میں پیش قدمی کس طرف سے ہوئی۔ ہاں اتنا معلوم ہے کہ ابوالفضل اور فیضی سے تعلقات قائم ہو گئے جو اکبری فتنہ کے ہیرو تھے۔

ابوالفضل منطق اور فلسفہ کا عاشق تھا۔ ایک مرتبہ فلاسفہ کی تعریف اس طرح کی کہ علماء ملت کی اس سے توہین ہوتی تھی۔ مجدد صاحب سے برداشت نہ ہو سکا، اور فرمایا۔ امام غزالی جو ابتداء میں اعلیٰ درجہ کے منطقی اور فلسفی تھے، اپنے رسالہ "المنقذ من الضلال" میں تحریر فرماتے ہیں:

"حکماء اور اطباء کے جسم علوم انبیاء کی تعلیمات سے سرقہ کئے گئے ہیں۔"

جواب میں سنجیدہ تردید کے بجائے ابوالفضل برہم ہو گیا اور اس نے امام غزالی کو سخت دست کہنا شروع کر دیا۔ حضرت مجدد صاحبؒ خفا ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمادیا "اگر اہل علم کی صحبت کا ذوق رکھتے ہو تو علماء کی توہین سے زبان روکو"۔ مجدد صاحبؒ اس وقت تو چلے آئے مگر بعد میں ابوالفضل نے معذرت کی، اور سلسلۂ ملاقات پھر جاری ہو گیا۔ (۱۵۴)

یہی زمانہ تھا جب کہ فیضی اپنی بے نقط تفسیر "سواطع الالہام" لکھ رہا تھا۔ مشہور ہے کہ اس تفسیر میں حضرت کی امداد بھی شریک تھی۔

ان ہی دنوں کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ عید کے چاند میں اختلاف ہو رہا تھا شرعی ثبوت سے پہلے ہی اکبر نے عید کا اعلان کر کے لوگوں کے روزے تڑوا دیے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ مجدد صاحبؒ اسی روز ابوالفضل سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔ ابوالفضل کو معلوم ہوا کہ حضرت روزے سے ہیں، اس نے وجہ دریافت کی۔ مجدد صاحبؒ نے فرمایا۔ چاند کے متعلق اب تک شرعی شہادت مہیا نہیں ہوئی ہے ابوالفضل نے کہا۔ "بادشاہ نے خود چاند دیکھا ہے"۔

مجدد صاحبؒ نے بے ساختہ فرمادیا:

بادشاہ بے دین ست اعتبارے ندارد

"بادشاہ بے دین ہے، اس کا اعتبار نہیں"

ابوالفضل خفیف سا ہو کر رہ گیا۔ پھر بھی اس نے پانی کا پیالہ اٹھا کر آپ کے منہ سے لگا دیا لیکن آپ نے ہاتھ جھٹک دیا، اور اسی وقت غصہ میں قیامگاہ پر تشریف لے آئے اور کہلا بھیجا کہ اہل علم سے ملاقات کے لئے احترام شرط ہے۔ ابوالفضل کو ندامت ہوئی اور عذر و معذرت کے بعد سلسلۂ ملاقات جاری ہو گیا۔

بہر حال یہ کہنا تو دشوار ہے کہ حضرت مجدد صاحبؒ اس وقت اسی نظریۂ اصلاح کے لئے تشریف لے گئے تھے، البتہ یہ ضرور ہے کہ آگرہ کے اس قیام سے آپ کو ان تمام سرچشموں کا علم ہو گیا جن سے اکبری فتنہ کی نہریں نکل رہی تھیں۔

یہ ممکن تھا کہ آپ ابتداء ہی سے انقلاب سلطنت کی صورتیں سوچتے، اور کامیابی کی جد وجہد کرتے۔ مگر آپ کو اپنے لئے سلطنت مطلوب نہ تھی، دوسرے کو سلطان بنانے میں وہی دشواری درپیش ہوتی۔ اس لئے انقلاب سلطنت کی بجائے نظریات سلطنت کی تبدیلی کو آپ نے زیادہ مفید تصور کیا، اور درحقیقت گورنمنٹ یا حکومت سے حقیقی تصادم یہی تھا۔

لیکن اس کے لئے بادشاہ کی اصلاح سے پیشتر کارکنان حکومت کی اصلاح ضروری تھی۔ بدقسمتی یہ تھی کہ بادشاہ اور ارکین دولت، ذاتی اغراض کے سوا کوئی نصب العین نہیں رکھتے تھے۔ اور چونکہ ذاتی اقتدار کے تحفظ کے لئے عوام کی دلجوئی ضروری سمجھتے تھے، اس لئے عامۃ الناس کے جذبات اور خیالات کے احترام میں اپنے مذہب تک کو قربان کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اکبر کی پچاس سالہ زندگی اس کی شاہد ہے۔

اور اکبر کیا، اکبر سے بہت پہلے ملک گیری کا مقصد صرف شخصی اقتدار قرار دے دیا گیا تھا۔ ورنہ ایک مذہب، ایک قوم کے افراد میں آپس میں جنگ کرنے کے کیا معنی؟

بابر نے مغل اور افغان کا سوال پیدا کر دیا اور اُس کے قابل پوتے اکبر نے اس نظریہ کا اور اضافہ کر دیا کہ مشترک بادشاہ کا مذہب بھی مشترک ہی ہونا چاہیے۔ عوام نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ جس کا کھاؤ اُس کا گاؤ، ہندو ہو یا مسلمان، مغل ہو یا افغان۔

حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کا سیاسی عقیدہ جب یہ تھا، کہ ''السلطان کالروح''۔ سلطان جان ہے تو لازمی تھا کہ اصلاح روح کے ساتھ بدن اور اعضاء بدن کی نگہداشت کا لحاظ بھی فرماتے۔ تاکہ قلب کی بڑھتی ہوئی قوت کو اعضاء برداشت کر سکیں۔ ہمیشہ مفرحات اور مقویات سے علاج نہیں ہوا کرتا بلکہ مفرحات کے استعمال سے پیشتر جسدی مرض کا ازالہ بھی ضروری ہوتا ہے۔

دنیا کی تاریخ میں سینکڑوں مثالیں ہیں کہ بادشاہ کی اصلاح پسندی سے خود غرض ارکین دولت میں برہمی پیدا ہوئی، اور تھوڑے دنوں میں وہ بادشاہت ہی ختم کر دی گئی۔

کم از کم حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی تاریخ سب کے سامنے ہے۔ آپ بہ نفس نفیس خلیفۂ راشد تھے۔ چونکہ تابعین کا دور تھا۔ آپ کی اصلاح کارگر ہوئی۔ ملک مخصوص فوراً ہی خلافت راشدہ بن گیا۔ مگر پھر کیا ہوا؟ صرف ڈھائی سال بعد ہی اغراض پرستوں کی فریب کاریوں نے سم قاتل سے خلیفۂ راشد کی مخلصانہ خدمت انجام دی۔ شام ہوئی تھی تو خلافت راشدہ کا چاند روشن تھا۔ صبح ہوئی تو آفتاب خلافت ایسا غروب ہوا کہ آج تک دوبارہ طلوع ہونے کی نوبت نہ آئی۔

چنانچہ حضرت مجدد صاحبؒ کے طریق کار کی ترتیب اس طرح تھی:

الف: غیر سرکاری سنجیدہ طبقہ کی اصلاح۔

ب: ارکان دولت کی اصلاح۔

ج: بادشاہ کی اصلاح۔

اس وقت ملک کے سامنے غلامی اور آزادی یا ملکی اور غیر ملکی اقتدار کا سوال نہیں تھا۔ بادشاہ ہندوستانی تھا۔ ہندوستان کسی ملک کا باج گزار نہ تھا۔ ہر ایک ہندوستانی خود کو آزاد سمجھتا تھا۔ خود مختار پنچایتی نظام، ہر ایک ہندوستانی کے شخصی حقوق، شخصی عزت اور حریت کا ذمہ دار تھا۔

لہٰذا مذہبی نقطۂ نظر نیز مسلم حکومت کے بقاء و تحفظ کے پیش نظر اصلاح کے معنی صرف یہ تھے کہ عوام الناس، اراکین دولت اور خود سلاطین طے کرلیں کہ انفرادی طور پر اتباع سنت اور اجتماعی طور پر ترویج شریعت، اُن کی زندگی کا نصب العین اور اُن کی تمام اجتماعی اور انفرادی جد و جہد کا محور ہے۔

آگرہ سے واپسی کے بعد سرہند شریف میں قیام رہا۔ والد ماجد حیات تھے۔ اُن کی زیر سرپرستی درس و تدریس، تلقین وارشاد کا سلسلہ جاری کردیا۔ ۱۰۰۷ھ میں والد صاحب کی وفات ہوگئی۔

اسی سال یا ۱۰۰۸ھ میں جب کہ عمر شریف تقریباً ۳۷ سال تھی۔ آپ نے حج بیت اللہ کا عزم کیا۔ سامان کچھ بھی نہیں تھا۔ محض دوریشانہ توکل اور اعتماد علی اللہ سامان ورشانہ تھا، عازم سفر حج ہوکر آپ دہلی تشریف لائے۔

دہلی میں حضرت مولانا حسن کشمیری حضرت مجدد صاحبؒ کے پرانے مخلص تھے۔ آپ نے حضرت خواجہ باقی باللہ کا ذکر خیر حضرت مجدد صاحب کے سامنے کیا، اور حضرت خواجہ کی زیارت کا مشورہ دیا۔ چنانچہ برفاقت مولانا موصوف، حضرت مجدد صاحب حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُس کی طرف شیخ کامل، اس طرف جوہر نفیس، لامحالہ پہلی ملاقات ہی میں خاص تعلق پیدا ہوگیا ع

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

اگرچہ حضرت خواجہ سلسلۂ ارادت کے شوقین نہ تھے لیکن حضرت مجدد صاحب کے جوہر نفیس نے مجدد صاحب کی طرح حضرت خواجہ کے دل میں بھی گداز پیدا کردیا۔

حضرت مجدد صاحب نے روانگی سفر کی اجازت مانگی تو حضرت خواجہ نے فرمایا۔ ابھی آئے ہو، چند روز فقراء کی خدمت میں بھی رہو۔ چند روزہ قیام نے حضرت مجدد صاحب کو حضرت خواجہ کے حالات و خصائل کے مطالعہ کا مزید موقع دے دیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ حضرت مجدد صاحب نے بیعت کی درخواست کی، اور چند ہفتوں ہی میں سلسلۂ نقشبندیہ کے شیخ کامل بن گئے (جس کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے)۔

سلسلۂ نقشبندیہ کا مدار وجد و حال پر نہیں بلکہ اتباع سنت پر ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں داخل ہونے کے بعد سفر حج کے عزم پر نظر ثانی ضروری تھی۔ شریعت مطہرہ اس وقت حج کو فرض قرار دیتی ہے جبکہ سامان سفر و نفقۂ اہل و عیال فراہم ہو اور راستہ بھی محفوظ ہو۔ اس کے بغیر وجد و حال کی بنا پر حج کرنا والہانہ عمل تو ہوگا۔ مگر شریعت غرا میں ایک نفل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھے گا اور پھر اگر نفقۂ اہل و عیال کا فرض بھی ترک ہو، یا سوال جیسا کوئی مکروہ یا حرام فعل کرنا پڑے، تو یہ نفلیت بھی ختم ہوجاتی ہے۔

حضرت مجدد صاحب جیسے بلند حوصلہ عالم کے لئے یہ سوال بھی ہو سکتا تھا کہ محض شوق یا وجد کی بنا پر یہ سفر بہتر ہے یا ہندوستان میں رہ کر تبلیغ و اصلاح کی وہ عظیم الشان خدمت جو وارثانِ انبیاء کا منصبی فرض ہے، وہ بہتر ہے۔ بظاہر اس قسم کے سوالات نے حضرت مجدد صاحب کو اس (۲۴۰) ارادہ سے باز رکھا۔ اور اب آپ تکمیل طریقہ اور پھر تلقین وارشاد میں مشغول ہو گئے۔ چونکہ مکاتیب شریف میں از اول تا آخر سلسلۂ نقشبندیہ کی تعریف و ترغیب اور صرف اسی طریقہ کی تلقین ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ سلسلۂ مکاتیب طریقہ نقشبندیہ کی تکمیل کے بعد شروع ہوا۔

ارادوں کی تکمیل قدرت کا عام قانون ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست"۔

آسمانِ تاریخ پر جو چاند تارے بن کر چمکتے ہیں، قدرتی طور پر اُن کے فکر بلند، ارادے عظیم الشان ہوتے ہیں۔ اُسی کے بموجب اُن کو توفیق الٰہی حاصل ہوتی ہے ع

ہمت بلند دار کہ پیش خدا و خلق　　　باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

قدرت اپنے دستور کے بموجب جب بلند ارادوں کی تکمیل کرتی ہے، تو نظر عوام میں وہ بالکل عجیب چیز معلوم ہوتی ہے اور اس کو امداد غیبی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اصلاح سلطنت بلند ترین نظریہ ہے۔ اسلامی اصول کے بموجب اصلاح سلطنت اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہے، اور اس بلند نظریہ کے حامل کو جس قدر توفیق الٰہی ہو، وہ کم ہے۔ من کان للہ کان اللہ لہ۔

حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے جب اس عظیم الشان مقصد کے لئے جد و جہد شروع کی تو کامیابی اُن کے ہمرکاب تھی۔

الف: غیر سرکاری سنجیدہ طبقہ کی اصلاح۔

ب: ارکانِ دولت کی اصلاح، اس عظیم الشان مقصد کی پہلی اور دوسری کڑی تھی۔

غیر سرکاری طبقہ کی ہمنوائی اور تنظیم

نمبر الف میں کامیابی کا اندازہ:

(۱) حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے ایک مکتوب سے ہوتا ہے، جو جہانگیر بادشاہ کی تخت نشینی کے فوراً بعد شیخ فرید کے نام تحریر ہوا ہے۔

آج کہ دولت اسلام کے مانع کے زوال اور بادشاہ اسلام کے جلوس کی بشارت خواص و عوام کے کانوں تک پہنچی۔ اہل اسلام نے اپنے اُوپر لازم قرار دے لیا ہے کہ بادشاہ کے مدد معاون ہوں، اور ترویج شریعت اور تقویت ملت کے لیے رہنمائی کریں۔ یہ امداد و تقویت خواہ زبان سے میسر ہو خواہ ہاتھ سے [مکتوب ۴۷ ج ا ص ۶۵]

معلوم ہوتا ہے کہ خواص و عوام کی بے شمار جماعت آپ کے ساتھ ہے جو انقلاب یا اصلاح حکومت کے لئے بے چین ہے۔ آپ جنگ و جدال کے فتنہ کو دبا کر چاہ رہے ہیں کہ ارکان دولت اور مشیران خصوصی کے

ذریعہ سے یہ مرحلہ طے ہو جائے۔

مذکورہ بالا شیخ فرید ایک رکن دولت ہیں۔ جو اکبر کے زمانہ میں میر بخشی تھے۔ تخت نشینی کے بعد سب سے پہلے جن پر انعام و اکرام کیا۔ اُن کا تذکرہ کرتے ہوئے جہانگیر لکھتا ہے:

''شیخ فرید بخاری جو میرے والد کی خدمت میں میر بخشی تھے، میں نے اُن کو خلعت، شمشیر مرصع، دوات و قلم مرصع مرحمت فرما کر اُسی خدمت پر بحال رکھا۔ اور اُن کی سربلندی کے لئے مابدولت نے فرمایا کہ مابدولت تم کو 'صاحب السیف والقلم' جانتے ہیں''۔ (۲۶۱) [توزک ص ۷]

جلوس ۲ میں جب جہانگیر کا بڑا لڑکا خسرو باغی ہو گیا۔ جس کے تعاقب میں بنفس نفیس جہانگیر کو اس قدر جدوجہد کرنا پڑی، کہ رات سے دو پہر تک برابر دوڑتا رہا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ افیون اور شراب جو بطور طلب استعمال کیا کرتا تھا، دو پہر تک اُس کا خیال بھی نہ آیا۔ اس یلغار میں شیخ فرید، ہراول کے افسر اعلیٰ تھے اور جہانگیر سے چند گھنٹے پہلے لاہور پہنچ کر خسرو کی بہت بڑی فوج کو اپنی تھوڑی فوج کے ذریعہ سے اس قدر پھرتی سے شکست دی کہ جب شیخ فرید کی فتح اور خسرو کے فرار کی خبر جہانگیر کو پہنچی تو لوگوں کو یقین نہ آیا۔ [توزک ص ۳۱]

اس کے بعد ''صاحب السیف والقلم'' یعنی شیخ فرید کی حسن خدمت پر:

''بخطاب والائے مرتضیٰ خاں سرفراز گردانیدم''۔ (ص ۲۳ توزک)

جہانگیر بادشاہ ۸ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ کو تخت نشین ہوا۔ حضرت مجدد صاحب کی عمر اس وقت ۴۳ سال ہے۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں داخل ہوئے صرف سات سال گزر رہے ہیں۔ لیکن خلق اللہ کی ایک بے شمار جماعت آپ کے ساتھ ہے جس کے جذبات کی آپ ترجمانی مکتوب بالا میں فرما رہے ہیں۔

(۲) جہانگیر کی تحریر پہلے گزر چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت باقاعدہ منظم تھی۔ وہ کہتا ہے اور اپنے نظریہ کے بموجب کہتا ہے:

''ہر شہر و دیار میں ایک ایک خلیفہ کو بھیج رکھا ہے جو اپنے کام میں بہت پختہ ہیں''۔ (۲۶۲)

بہرحال اس منظم جدوجہد سے نمبر الف کی کامیابی کا کافی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اب نمبر ب میں کامیابی ملاحظہ فرمایئے۔

ارکان حکومت کی اصلاح

مکتوبات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کے دربار کے جتنے محترم رکن تھے، آپ نے سب کو اپنا حلقہ بگوش کر لیا تھا۔ چنانچہ خانخاناں، خان جہاں، خان اعظم، خواجہ جہاں، مرزا داراب قلیج خاں، نواب سید فرید صاحب وغیرہ کے نام خطوط مکاتیب میں موجود ہیں۔

یہ تمام حضرات دولت جہانگیر کے عمائدین ہیں۔ بالخصوص (۲۶۳) عبدالرحیم خانخاناں عہد اکبر سے اتنا

اقتدار یافتہ ہے کہ گویا آدھی سلطنت کا مالک ہے۔

اور اگرچہ جہانگیر اس سے زیادہ خوش نہیں تھا حتی کہ ایک مرتبہ بغاوت کی نوبت بھی آئی، مگر اس کی عظمت و جلالت سے مرعوب بھی رہتا تھا۔ سلطنت کی حمایت میں کارہائے نمایاں اس سے ظاہر ہوئے۔ وفات کے بعد مندرجہ ذیل الفاظ میں جہانگیر نے تبصرہ کیا ہے۔

''خانخاناں در قابلیت واستعداد یکتائے روزگار بود، وزبان عربی وترکی وفارسی وہندی مے دانست واز اقسام دانش عقلی ونقلی حتیٰ علوم ہندی بہرۂ وافی داشت، ودر شجاعت وشہامت وسرداری برائیتے بل آیتے بود، وبزبان فارسی وہندی شعر نیکو گفتی وواقعات بابری را بحکم عرش آشیانی فارسی ترجمہ کردہ وگاہے بیتے واحیاناً رباعی وغزلے میگفت''۔ [توزک ص۳۲۹]

داراب خاں: خان خاناں کا لڑکا تھا۔ جو شاہجہاں کا رفیق خاص رہا۔ حتی کہ شاہجہاں کی بغاوت کے زمانہ میں شاہجہاں کی حمایت کرتا ہوا لشکر شاہی کے ہاتھ سے مارا گیا۔

اسی طرح دوسرے حضرات دولت جہانگیری کے ممتاز رکن تھے۔ جو زمانۂ اکبر سے مقتدر حیثیت رکھتے تھے۔ ایک فقیر بے نوا نے شوکت وحشمت کی اونچی چوٹیوں پر رہنے والوں کو کس طرح شکار کرلیا، ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ بالخصوص جبکہ دیکھا جاتا ہے کہ ساری عمر میں کسی ایک زمیندار کو مسخر کر لینا بھی ہمارے لئے دشوار ہے۔

حسن اتفاق یا تائید غیبی

حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے مقصد کے لئے زمانۂ اکبر میں ہی جدوجہد شروع کردی تھی، اور کیا عجب ہے کہ اکبر پر بھی کوئی نظر پڑگئی ہو۔ جیسا کہ ایک روایت ہے کہ اکبر نے آخر زمانہ میں اپنے خیالات[۲۶۳] وعقائد سے توبہ کی۔ مگر بظاہر حضرت مجدد صاحب کی جدوجہد کا سلسلہ ابھی اکبر تک نہیں پہنچ سکا تھا کہ قدرت کا ایک کرشمہ نمودار ہوا۔ یہ پچاس سالہ چٹان جس کے حرکت دینے میں بے انتہا طاقت صرف ہوتی، دفعتہً راستہ سے ہٹ گئی، اور ۱۰۱۴ھ میں اکبر نے ہمیشہ کے لئے تخت سلطنت کو رخصت کردیا۔

ابتداء سلطنت جہانگیر کے موقعہ کو حضرت مجدد صاحب نے بہت غنیمت سمجھا، اور جو عمائدین سلطنت اس وقت تک ہموار ہو چکے تھے۔ ان کے ذریعہ سے کام شروع کیا۔

ذیل میں چند مکاتیب کا خلاصہ اردو میں درج کیا جاتا ہے۔ یہ خطوط عمائدین سلطنت کے نام ہیں۔ اگرچہ مضمون میں کسی قدر طوالت ہوجائے گی مگر حضرت مجدد صاحب کے جذبات، آپ کا طریق کار، اور اس زمانہ کے حالات وغیرہ پر روشنی پڑ جائے گی۔

شیخ فرید صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

عالم کے اعتبار سے بادشاہ کی وہی نسبت ہے جو دل کو بدن سے۔ لہٰذا صلاح بادشاہ صلاح عالم ہے، اور

فسادِ بادشاہ فسادِ عالم۔

آپ خود واقف ہیں کہ قرنِ ماضی (زمانۂ اکبر) میں مسلمانوں پر کیا گزری کفار کھلم کھلا، دلیری اور جرأت کے ساتھ دار السلام (ہندوستان) میں احکامِ کفر جاری کرتے تھے اور مسلمان احکامِ اسلام کے اجراء سے عاجز تھے۔ اگر کرتے تھے، تو قتل کر دیے جاتے تھے۔ کتنی بڑی مصیبت تھی کہ محبوب رب العلمین کے ماننے والے ذلیل ہوں، اور آپ کے منکرین کی عزت ہو۔ مسلمان زخمی دلوں سے اسلام کی تعزیت کر رہے ہوں، اور مخالفین و معاندین مذاق اڑا کر جراحتِ مسلم پر نمک پاشی کرتے ہوں۔

آج جب بادشاہ اسلام کے جلوس کا مژدہ خاص و عام کے کانوں میں پہنچا، تو اہل اسلام نے اپنے اوپر لازم جان لیا کہ ترویج شریعت اور تقویت ملت کے لیے بادشاہ کے ممد و معاون ہوں اور جس قسم کی امداد مطلوب ہو، دریغ نہ کریں۔

مسائل شرعیہ کی تفصیل و توضیح اور کتاب و سنت و اجماع کے بموجب عقائد کلامیہ کا اظہار حکومت کی سب سے مقدم امداد ہے تا کہ کوئی (۴۶۵) بدعتی یا گمراہ بیچ میں کود کر بادشاہ کو راستے سے نہ بہکا دے، اور معاملہ نہ بگڑ جائے۔

اس قسم کی امداد اُن علماء حق کا مخصوص حصہ ہے جن کا نصب العین آخرت ہو۔ وہ علماء دنیا، جن کا مطمح نظر دنیاء دنی ہے، اُن کی صحبت سم قاتل ہے، اور اُن کا فساد متعدی۔

عالم کہ کامرانی و تن پروری کند ❊ او خویشتن گم ست کرا رہبری کند

گزشتہ قرن میں جو بلا آئی، وہ اسی جماعت کی نحوست کے سبب سے۔ یہی لوگ بادشاہوں کو راستہ بھٹکاتے ہیں۔ انہی کی بدولت اسلام میں بہتر ۷۲ فرقے ہوئے۔ غیر عالم اگر گمراہ ہوتا ہے تو اس کی گمراہی دوسروں کو متجاوز نہیں کرتی۔ البتہ اس زمانہ کے اکثر صوفی نما جاہل بھی یہی شان رکھتے ہیں کہ ان کی خرابی دوسروں پر اثر انداز ہوتی ہے۔

اگر کوئی شخص ہر قسم کی امداد کی طاقت کے باوجود کوتاہی کرتا ہے وہ کارخانۂ اسلام میں رخنہ ڈالتا ہے۔ لامحالہ عند اللہ معتوب ہوگا۔ اسی بنا پر یہ قلیل البضاعت بھی چاہتا ہے کہ دولت اسلام کے معاونین کے جرگہ میں اپنے آپ کو ڈال دے، اور جہاں تک ممکن ہو ہاتھ پاؤں مارے۔ من کثر سواد قوم فھو منھم (جو کسی جماعت کے حلقہ میں اضافہ کرے وہ اسی میں شمار ہوتا ہے)۔ جب حضرت یوسفؑ کی فروخت کا اعلان ہوا تھا تو ایک بڑھیا بھی تھوڑا سا سوت لے کر پہنچ گئی تھی۔ تا کہ خریداران یوسف کے زمرہ میں داخل ہو جائے۔ اُس کا کل سرمایہ یہی تھا۔ میں بھی اپنی مثال ایسی ہی سمجھتا ہوں۔

ہاں جناب والا جبکہ پورے طور پر بادشاہ سے تقرب رکھتے ہیں اور ہر قسم کی امداد بادشاہ کی کر سکتے ہیں تو توقع ہے کہ خلوت و جلوت میں ہر طرح سے ترویج شریعت کی پوری کوشش کرتے رہیں گے اور مسلمانوں کو بے بسی سے نجات دلائیں گے [مکتوب ۴۷ جلد اول ص ۶۵ تا ۶۶]

مکتوب بالا سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت مجدد صاحب کے نزدیک ارا کین دولت کی اصلاح بادشاہ کی اصلاح سے مقدم تھی کیونکہ فساد کا اصلی سبب یہی لوگ تھے۔

بظاہر حضرت مجدد صاحب کی جماعت میں نواب صاحب پیش پیش ہیں۔ حضرت مجدد صاحب متواتر ان کی حوصلہ افزائی فرماتے رہتے ہیں۔ مکتوب ۱۹۳ میں تحریر فرماتے ہیں:

یوں تو جس زمانہ اور جس شخص سے بھی ترویج دین اور تقویت ملت کی خدمت انجام پائے، بہتر ہے۔ لیکن بے بسی اسلام کے موجودہ دور میں آپ جیسے جوان مرداں اہل بیت (۲۶۶) کے لئے ترویج دین اور تائید ملت زیب دیتا ہے اور آپ جیسوں ہی کا مخصوص کام ہے کیونکہ یہ دولت آپ ہی کے خاندان مقدس کی خانہ زاد ہے۔ آپ ہی کے طفیل سے دوسروں نے یہ دولت حاصل کی ہے۔ اسی جلیل الشان خدمت کی انجام دہی رسول اللہؐ کی حقیقی اور سچی وراثت ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے، جس کے متعلق رسول اللہؐ نے صحابۂ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔

''آج وہ زمانہ ہے کہ اگر امر ونہی کا دسواں حصہ بھی چھوڑ دوگے تو تباہ ہو جاؤ گے لیکن اس کے بعد وہ زمانہ آئے گا کہ اگر دس میں سے ایک کو بھی انجام دے لیں گے تو نجات پا جائیں گے۔

گوئے توفیق و سعادت درمیان افگندہ اند ۔۔۔ کس بمیداں در نمی آید سواراں را چہ شد

آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

بادشاہ و اہل اسلام کی توجہ اہل کفر کی جانب نہیں رہی ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے، رسومات کفر کی قباحت پوری طرح بادشاہ کے ذہن نشین کرادیں، اور اگر ضرورت سمجھیں تو کسی عالم کو بلالیں۔ احکام شرعی کی تبلیغ کے لئے کرامتوں کا اظہار ضروری نہیں اگر افہام و تفہیم اور ارشاد و تبلیغ کے سلسلہ میں کوئی جماعت تکلیف بھی برداشت کرے تو اُس کی عین سعادت ہے۔ کیا انبیاءؑ نے تکالیف برداشت نہیں کیں۔ حضورؐ کا ارشاد تو یہ ہے کہ جس قدر تکلیف مجھ کو دی گئی، کسی نبی کو نہیں دی گئی''۔ (۲۶۷) [مکتوب ۱۹۳، ص ۱۹۳و۱۹۴ ج ۱]

مفتی صدر جہاں (۲۶۸) وہی بزرگ ہیں جن کو اکبر نے وفات کے وقت خاص طور سے کلمۂ شہادت پڑھوانے کے لئے بلوایا تھا۔ اور پھر اس بنا پر کہ یہ سید تھے اور اکبر کے زمانہ میں مدتوں منصب صدارت افتاء پر فائز رہے تھے۔ جہانگیر نے بدستور منصب صدارت پر فائز رکھا اور کچھ اختیارات میں مزید توسیع کر دی۔ اور پھر مذہبی احترام کی بنا پر اُن کو اور قاضی القضاۃ کو سجدۂ شاہی بجالانے سے بھی مستثنیٰ کر دیا تھا۔ حضرت مجدد صاحب اُن کو تحریر فرماتے ہیں:

مشہور ہے الناس علیٰ دین ملوکھم (آدمی اپنے بادشاہوں کے ڈھنگ پر ہوا کرتے ہیں) لہٰذا اصلاح عوام کے لئے اصلاح سلاطین ضروری ہے۔ حکومت موجودہ میں ملت اسلام سے پہلے جیسی ضد اور نفرت نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا ائمہ اسلام صدور عظام اور علماء کرام پر لازم ہے کہ اپنی تمام ہمت شریعت غرا کو رائج کرنے

میں صرف کر کے شروع ہی میں اسلام کے منہدم ارکان کو دوبارہ قائم کر دیں اور اس میں ہرگز ہرگز تاخیر نہ کریں۔ غریبوں کے دل اس تاخیر کے باعث مضطرب ہیں۔ قرن سابق کا تصور دلوں میں بیٹھا ہوا ہے۔ مبادا اُس کی تلافی نہ ہو سکے تو دین سے بیاجنبیت اور طویل ہو جائے گی۔

اگر بادشاہان گرامی ترویج شریعت پر متوجہ نہ ہوں اور اُن کے مقربین بھی خود کو معاف اور ذمہ داری سے سبکدوش سمجھیں اور حیات چند روز کو عزیز جانیں، تو لامحالہ فقراء اہل اسلام کے لئے بہت دشواری ہو جائے گی۔

آنچہ از من گم شدہ گر از سلیمان گم شدے ہم سلیمان، ہم پری، ہم اہرمن بگریستے

[مکتوب ۱۹۳ ص ۱۹۵ جلد]

خان اعظم (۲۶۹): امراء اکبری میں سے ہیں۔ عہد جہانگیری میں بھی حکومت کے عظیم الشان رکن ہیں۔ اُن کو تحریر فرماتے ہیں:

مخبر صادق کا ارشاد ہے۔ اسلام اجنبی تھا جب اُس کا آغاز ہوا، عنقریب پھر اجنبی ہو جائے گا۔ لہٰذا اُن کو مبارک باد جو اسلام کو سنبھالنے کے سبب سے سب کی نگاہوں میں غیر مانوس اور اجنبی ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی غربت اور بے بسی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ کفار کھلم کھلا اسلام پر طعن اور مسلمانوں کی مذمت کرتے ہیں۔ بے تحاشا احکام کفر جاری کرتے ہیں اور کوچہ و بازار میں اہل کفر کی تعریف و توصیف کرتے پھرتے ہیں۔ مسلمانوں کو احکام اسلام کے اجراء کی ممانعت ہے اور شرعی احکام کی بجا آوری میں مطعون اور مذموم ہیں۔

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ و ناز بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

سبحان اللہ و بحمدہ۔ کہا جاتا ہے کہ **الشرع تحت السیف** (شریعت تلوار کے سایہ میں ہے)۔ شرع شریعت کی رونق سلاطین سے وابستہ مانی جاتی ہے۔ مگر یہاں معاملہ اُلٹا ہے۔ واحسرتاہ واویلاہ۔

آج کل آپ کا وجود شریف غنیمت ہے۔ ہم لوگ جو اس معرکہ میں ضعیف وشکست خوردہ ہیں۔ صرف آپ ہی کو جانتے ہیں۔ خداوند عالم آپ کی مدد فرمائے۔

رسول اللہ کا ارشاد ہے "ایمان کامل اسی وقت ہوگا کہ لوگ مجنون کہنے لگیں"۔ (۲۷۰) وہ مبارک جنون (جس کا اصل منشا اسلامی حمیت اور کامل درجہ کی اسلامی غیرت ہے) آپ کے وجود باجود میں نظر آتا ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے جس میں تھوڑے کام کی بھی قیمت زیادہ لگائی جاتی ہے۔ اصحاب کہف نے اپنے زمانہ میں خدا کے لئے صرف ہجرت کی تھی۔ ان کی یہی خدمت خدا کے یہاں قابل وقعت مانی گئی۔ غلبۂ اعداء کے وقت اگر سپاہی تھوڑی جدوجہد بھی کرتے ہیں تو بہت زیادہ اعتبار پیدا کر لیتے ہیں۔ قلمی جہاد جس کی آپ کو توفیق ہوئی ہے وہ جہاد اکبر ہے۔ اس کو غنیمت سمجھئے اور زیادتی کی کوشش فرمایئے۔

اسی سلسلہ میں حضرت خواجہ احرار قدس اللہ سرہ العزیز کا طرز عمل تحریر فرمانے کے بعد حضرت موصوف بادشاہوں اور امراء کے پاس جا کر اُن کو اپنے اخلاق سے مسخر کر کے ان کی اصلاح فرماتے تھے۔

''ملتمس یہ ہے کہ جبکہ اس خاندان بزرگ (نقشبندیہ) کے اکابر اور بزرگوں کے ساتھ محبت رکھنے کے سبب سے خداوند عالم نے آپ کو اثر و رسوخ عطا فرمایا ہے، اور ہمعصروں اور دوستوں کی نظر میں تعظیم و تکریم مذہب آپ کی ذات سے ہی وابستہ ہے تو کوشش کیجئے کہ اہل کفر کے وہ احکام جنہوں نے اہل اسلام میں بدشوقی اور مذہب سے بے التفاتی پیدا کر دی ہے، وہ سب منسوخ نہ ہوں تو کم از کم اکثر تو منسوخ ہو جائیں، اور ان منکرات اور قباحتوں سے اہل اسلام محفوظ رہ جائیں۔ سابق سلطنت میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دین مصطفوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ضد اور عناد ہے۔ اس سلطنت میں بظاہر وہ ضد اور عناد نہیں ہے۔ اگر ہے تو وہ مسئلہ سے ناواقف ہونے کے سبب سے ہے۔ بہرحال یہ خطرہ ضرور ہے کہ رفتہ رفتہ عناد اور ضد پیدا ہو جائے اور مسلمانوں کے لیے وہی دشواری پھر پیدا ہو جائے۔ ع

چو بید بر سر ایمان خویش مے لرزم [مکتوب ۶۵۔ جلد ۱ ص ۸۲، ۸۳]

خان جہان حسین قلی خاں۔ یا حسین قلی بیگ۔ بیرام خاں کے بھانجے ہیں ولی بیگ ذوالقدر باپ کا نام تھا جو بیرام کے زمانہ میں حسن خدمات اور حسن اعتماد میں تمام اُمراء پر فوقیت رکھتا تھا۔

یہ خاں جہان بھی زمانۂ اکبر میں پنج ہزاری منصب رکھتے تھے۔ عہد جہانگیری میں سلطنت کے مقتدر رکن ہیں۔ دونوں حکومتوں کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ حضرت مجدد صاحب نے اُن کو بھی اپنے نصب العین کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ مکتوب ۵۲ جلد میں درج فرماتے ہیں:

دنیاء فانی کی لذتیں اور نعمتیں خوش گوار ہوتی ہیں، اگر ان کے ضمن میں تقاضاء شریعت پر عمل بھی ہو۔ ورنہ یہ لذتیں شکر میں ملے ہوئے زہر کی طرح ہیں۔ جس سے نادان کو دھوکا دیا جاتا ہے۔

دنیاوی لذتوں کے سم قاتل کی اصلاح اگر حکیم مطلق جل شانہ کے تریاق سے کر لی جائے، یعنی شرعی احکام کی تلخی اور شیرینی سے ان کی تلافی کی جائے، تو اس تھوڑی سی ترمیم سے جو سراسر سہل ہے، اور سہولت ہی پر مبنی ہے ملک ابدی حاصل ہو جاتا ہے۔

بہرحال عقل دوراندیش سے کام لینا چاہیے۔ بچوں کی طرح بادام اور اخروٹ کے لالچ میں شکار نہ ہونا چاہیے۔ یہی خدمت جو درپیش ہے اگر اس کو شریعت مصطفیٰؐ کی پابندی کے ساتھ جمع کر لیں تو انبیاءؑ جیسی خدمت انجام دیں گے، اور دین متین کو منور اور معمور کر دیں گے۔

ہم جیسے فقیر اگر سالہا سال جاں توڑ کوشش کرتے رہیں، تب بھی آپ جیسے شاہبازوں کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے

[مکتوب ۵۲ جلد ۳ ص ۹۱ تا ۹۲]

جلد ثانی میں مکتوب ۶۷ بنام خاں جہاں موصوف ایک مستقل رسالہ ہے۔ گیارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں اسلام کے جملہ عقائد و عبادات کو نہایت ہی سلیس اور سنجیدہ طور پر اس طرح سمجھایا گیا ہے کہ گویا تبلیغ و مناظرہ کے لئے خان جہان کو تیار کر رہے ہیں۔ اس مکتوب کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

بادشاہِ وقت سات پشت سے سنی حنفی مسلمان ہے۔ اس زمانہ میں، جو قیامت سے قرب اور نبوت سے بعد کا زمانہ ہے۔ کچھ طالب علموں نے حرص وطمع کی نحوست سے جس کا اصل منشاء خبث باطن ہے، بادشاہوں اور سید عبداللہ: نہیں معلوم کون حضرات تھے۔ البتہ جب اُن کے سردار قریب پہنچے تو میرے لئے بیٹھے رہنا ناممکن ہوگیا۔ ان کے احترام میں کھڑا ہوگیا۔ اُمراء کا تقرب حاصل کرلیا ہے۔ ان کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں۔ دین متین میں شکوک وشبہات پیدا کردیئے ہیں اور سادہ لوحوں کو راستہ سے ہٹادیا ہے۔

ایسا عظیم الشان بادشاہ جب کہ تمہاری باتوں کو دل سے سنتا ہے اور اُن کو قبول کرتا ہے تو کتنی بڑی دولت ہے کہ صریحاً یا اشارتاً حسب موقع کلمۂ حق جو اہل سنت والجماعت کے عقائد کے مطابق ہو، گوش گزار کرتے رہو۔ بلکہ ہمیشہ منتظر رہو اور جب بھی موقع ملے، اسلام کی کوئی خوبی اور کفر وکافری کی خرابی ذہن نشین کردو۔

ڈیڑھ صفحہ کے بعد:

بادشاہ روح ہے، تمام آدمی بدن۔ اصلاح سلطان کی کوشش نوع بنی آدم کی اصلاح کی کوشش ہے۔ اصلاح یہی ہے کہ جس صورت سے مناسب ہو، احکام اسلام بادشاہ کے ذہن نشین کرائے جائیں۔ اگر یہ دولت میسر ہوجاتی ہے، تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی وراثت میسر آجاتی ہے۔ آپ کو یہ دولت مفت مل رہی ہے، اس کی قدر کیجئے۔ (ص ۱۳۲-۱۳۵ جلد ۲)

اصلاح سلطنت کو مقاصد زندگی میں شامل کرلینے کی یہ ایک مدبرانہ شان ہے کہ اس مقصد کو گویا اپنا کام تصور فرمالیا ہے، اور جس طرح اپنے کسی کام کے لئے منت، سماجت، خوشامد اور ہمت افزائی کی جاتی ہے وہی تمام باتیں یہاں بھی کی جارہی ہیں۔

حالانکہ یہی امراء اور حکام ہیں جن کے نام مکتوب میں وہ خطوط بھی ہیں جو تلقین وارشاد، تزکیہ اور اصلاح یا دیگر علمی مباحث سے متعلق ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب حضرات حضرت مجدد صاحب کے حلقۂ ارادت میں شامل ہیں۔ ان تمام مکاتیب میں استغناء اور بے نیازی کی وہی شان ہے جو ایک شیخ اور مرشد کے مکتوبات میں ہونی چاہیے۔ ان مکاتیب میں انہی امراء کے اعمال پر محاسبہ بھی ہے، تنبیہات بھی ہیں اور عقائد باطلہ یا فاسد خیالات کی تردید بھی قوت اور صفائی کے ساتھ کی گئی ہے۔

حضرت مجدد صاحب کی اصلاحی اور تبلیغی شان کو پوری طرح نمایاں کرنے کے لئے اگرچہ ان مکاتیب کو پیش کرنا بھی ضروری تھا مگر بخوف طوالت اس سعادت سے محرومی کو برداشت کیا جارہا ہے۔

قلیچ خاں (۲۷۱) کے نام مکتوب نمبر ۷۶ میں تقویٰ وطہارت کے متعلق مفصل ارشادات کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

دوم آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ لاہور جیسے بڑے شہر میں آپ کے وجود سے بہت سے احکام شرعیہ نے رواج پیدا کرلیا ہے۔ دین کو تقویت اور ملت بیضاء کی تائید ہوتی ہے۔ یہ شہر فقیر کے نزدیک ہندوستان کے تمام

شہروں میں قطب ارشاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس شہر کی خیر و برکت ہندوستان کے تمام شہروں پر اثر ڈالتی ہے۔ اگر اس شہر میں دین کو رواج حاصل ہوا تو سب جگہ ایک قسم کا رواج پیدا ہو جائے گا۔ حق سبحانہ آپ کی مدد فرمائے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

میری اُمت میں ایک جماعت ہمیشہ رہے گی۔ جو غالب ہوتے ہوئے حق پر ہوگی۔ اس کی مدد چھوڑنے والے قیامت تک اس کو نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ (جلد اص ۹۶۔ مکتوب ۷۶)

لالہ بیگ: دربار جہانگیری کے امیر ہیں۔ اُن کو تحریر ہے:

تقریباً ایک قرن گزر گیا۔ اسلام کی غربت و بے بسی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ کفار اب اس پر بھی قناعت نہیں کرتے کہ بلاد اسلام میں کھلم کھلا احکام کفر جاری کریں۔ بلکہ خواہش یہ ہے کہ احکام اسلام کلیتہً زائل ہو جائیں اور اسلام و اسلامیت کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے۔

معاملہ یہاں تک بڑھ چکا ہے کہ اگر کوئی مسلمان اسلام کا کوئی شعار ظاہر کرتا ہے تو قتل کر دیا جاتا ہے۔

ابتداء بادشاہت میں اگر اسلامیت نے رواج پالیا اور مسلمانوں نے اعتبار پیدا کر لیا تو فبہا۔ ورنہ اگر کچھ توقف ہوا تو مسلمانوں کے لئے کام بہت دشوار ہو جائے گا۔ الغیاث، الغیاث، ثم الغیاث، الغیاث۔

دیکھنا ہے کہ کونسا صاحب نصیب اس سعادت کے لئے مستعد ہوتا ہے اور کونسا شاہباز اس دولت کو حاصل کرتا ہے (مکتوب ۸۱ جلد اص ۱۰۶)

یہ اُمراء دولت جن کا اُوپر تذکرہ کیا گیا ہفت ہزاری، پنج ہزاری اور پنج ہزاری ہیں، جو وزراء، دولت، گورنر اور بڑے بڑے جرنیل ہیں۔ ان کے علاوہ حکیم فتح اللہ، شیخ عبدالوہاب، سید محمود، سید احمد، خضر خاں لودھی، مرزا بدیع الزماں، جباری خان، سکندر خاں لودھی وغیرہ کتنے ہی افسران فوج، حکام اور عہدہ داران ہیں جو دو ہزاری، سہ ہزاری منصب رکھتے ہیں، دربار تک اُن کی رسائی ہے اور وہ حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے حلقہ بگوش ہیں۔ مکتوبات شریف میں اُن کے نام مکاتیب ہیں۔ جن میں اصلاح نفس، پابندی شریعت، تصحیح عقائد اور روحانی مقاصد وغیرہ وغیرہ کے متعلق گراں قدر تعلیمات و ارشادات ہیں۔ جن کی خوبی مطالعہ پر موقوف ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اکبری و جہانگیری کے تمام سنی ارکان و اعضاء حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی تحریک کے اعضاء و ارکین ہیں۔

ایک مضبوط نظام ہے جس میں اہل سنت والجماعت تعلقہ دار اور حکومت کے تمام درباری اکثر و بیشتر منصب دار منسلک ہیں، اور اس نظام کا سر رشتہ حضرت مجدد صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ آپ موقعہ بموقعہ اس نظام کو حرکت دے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں کم و بیش پانچ سو حضرات کے نام چھ سو اکیاون مکتوب ہیں جو تین جلدوں کے تقریباً ایک ہزار صفحات میں درج ہیں مکتوبات کے طرز خطاب سے معلوم ہوتا ہے، یہ پانچ سو حضرات ہندوستان کے مختلف گوشوں کے سنجیدہ اہل علم اور ذی اثر حضرات ہیں جو اپنی اور نوع انسان کی اصلاح میں مشغول اور منہمک ہیں۔

مجدد صاحب نے بغاوت کیوں نہیں کی

نص حدیث کے بموجب مسلمان بادشاہ سے بغاوت صرف اُسی وقت جائز ہے جبکہ واضح اور بیّن طور پر اُس سے ارتکاب کفر ہو۔

مشرکانہ اور کفریہ افعال کا ارتکاب اگرچہ حرام ہے لیکن کسی شخص کے کفر کا فیصلہ اسی وقت کیا جائے گا جب کہ اس کو مسلمان قرار دینے کی کوئی وجہ باقی نہ رہے۔ بہت ممکن ہے زمانہ اکبر میں حضرت مجدد صاحب کی تحریک نے اتنی قوت حاصل نہ کی ہو کہ اکبر جیسے خرانٹ شہنشاہ کی چالیس سالہ شہنشاہیت کا مقابلہ کر سکے۔ حالانکہ اعلان جہاد کے لئے اتنی قوت کا ہونا ضروری ہے کہ بظاہر اسباب کامیابی کی توقع کی جاسکے۔ اور کیا تعجب ہے حضرت مجدد صاحب کی تحریک نے اکبر تک اپنا اثر پہنچادیا ہو اور یہ قول اگرچہ مشہور نہیں مگر ممکن ہے صحیح ہو، کہ اکبر نے وفات سے کچھ پہلے توبہ کر لی تھی۔

لیکن بظاہر حضرت مجدد صاحب اکبر کو اغراض پرست اور فاسق مسلمان قرار دیتے ہیں۔ جو اغراض پرستوں کے ہجوم میں گھرا ہوا ہے۔ چنانچہ اکبر سے زیادہ علماء سوء اور اغراض پرست جماعتوں اور افراد کی آپ مذمت فرماتے ہیں اور اس کی اصلاح کے لئے ارکین حکومت کی اصلاح کو مقدم اور موقوف علیہ گردانتے ہیں۔

اس کے علاوہ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اپنے لئے حکومت کا خواہاں نہ ہو، بلکہ حکومت کی اصلاح اس کا نصب العین ہو، وہ خونریزی کو صرف اسی وقت ضروری سمجھے گا جب اس کے بغیر اور کوئی چارہ باقی نہ رہے۔ مقربین اور وزراء کی جماعت میں جو رسوخ پیدا کیا جاچکا تھا، وہ اگرچہ فوری انقلاب نہیں کر سکتا تھا، مگر انقلاب کی توقعات سے مایوسی بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہاں ضرورت تھی کہ ان اصلاح پسند مقربین کے جذبات اصلاح کو مزید تقویت پہنچائی جائے اور اپنے نصب العین کو اتنا نمایاں اور بیّن کر دیا جائے کہ اس کے ماسواء کا اُن کو شک وشبہ بھی باقی نہ رہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مسلمان بادشاہوں کی خانہ جنگی اُس وقت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز جہاد بالسیف کا اعلان فرماتے تو یہی مقربین یقین کر سکتے تھے کہ تحصیل حکومت کا ایک ڈھونگ رچایا گیا ہے اور حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے دعویٰ اصلاح کو بھی وہی اصلاح خیال کی جاتی جس کا اعلان ابراہیم لودھی کے مقابلہ پر بابر نے یا ہمایوں کے مقابلہ پر شیر شاہ سوری نے کیا تھا۔

نتیجہ کیا ہوا۔ یہی کہ ایک چیرہ دست کی جگہ دوسرے نے حاصل کر لی۔ علاوہ ازیں اکبر اپنے پچاس سالہ عہد میں ہندوؤں کے حوصلے اتنے بڑھا چکا تھا کہ اس جدوجہد اصلاح میں خود اقتدار مسلم کے زوال ہی کا خطرہ تھا۔ اس کے ماسوا شاہ عباس ایران میں شیعہ بادشاہ تھا۔ ہندوستان میں شیعہ پارٹی برسر اقتدار تھی۔ کیا کوئی شک ہوسکتا ہے کہ ملکہ نور جہاں کی امداد کے لئے ایرانی قزلباش دندناتے ہوئے ہندوستان پہنچ جاتے۔

بہرحال اس وقت مدبرانہ اور عاقلانہ لائحۂ عمل اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ مقربین اور وزراء جو آواز اصلاح پر کان دھر سکتے تھے، اس آواز کو اُن کے دلوں کی گہرائیوں میں اتنا اُتار دیا جائے کہ وہ سراسر اصلاح بن جائیں۔
دعوے بہت کچھ کئے جاتے ہیں مگر اُن کا اثر اور اُن میں قوت جاذبہ جب ہی پیدا ہوتی ہے کہ ایثار، قربانی، جانکشی اور فدا کاری سے ان کی صداقت کا یقین پیدا کر دیا جائے۔

آپ کو یاد نہیں، دنیا کے سب سے بڑے مصلح نے ساری دنیا کے مقابلہ پر اپنی اصلاح پسندی کے دعویٰ کا ثبوت کس طرح دیا تھا۔ ۲۳ سالہ عہد نبوت کے بیشتر حصہ میں صبر آزما قربانیوں، عبرت انگیز فدا کاریوں سے اپنی صداقت کا نہ صرف یقین دلایا بلکہ صداقت کی آواز انصاف پسند مقابلین کے دلوں میں اس طرح اُتار دی کہ وہ سرتاپا آواز صداقت بن گئے، اور وہی جو کافر تھے اب اشداء علی الکفار (کافروں کے مقابلہ میں شدید ترین طاقت) بن گئے۔

حضرت حمزہؓ، حضرت فاروق اعظمؓ کی سیرت پڑھو اور دیکھو کہ بدترین کافر کس طرح رشید ترین مجاہد حق بن گئے۔ اور پھر غور کرو کہ یہ انقلاب تلوار کی طاقت سے ہوا یا حق و صداقت، اخلاق و ضمیر، ایثار اور قربانیوں کی خاموش قوت سے۔

بلاشبہ یہ قوی اور نہایت مضبوط طریقہ جنگ ہے جو اس وقت تک کیا جاتا ہے جب تک اس کی کامیابی کے امکانات باقی رہیں اور اسی طرز جنگ کو مقاومت بالصبر کے مذہبی لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور آج کل کی اصطلاح میں عدم تشدد کی جنگ کہا جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس حقیقت سے ناآشنا نہ ہوں گے کہ جب مکہ معظمہ میں اس طریقہ جنگ کو آزمایا جا رہا تھا تو تلوار اور قوت سے جنگ ممنوع تھی۔ جب وہ تمام طبیعتیں جن کو انصاف پسندی کا کچھ بھی حصہ مرحمت ہوا تھا، ایک ایک کر کے حلقہ بگوش ہو چکیں، اور صرف وہی ظاہر پرست ذہنیتیں باقی رہ گئیں، جن کا اعلیٰ انصاف قوت ہی ہوتا ہے، اور تلوار کی چمک کے سوا کوئی نور اُن کی شوخ اور دلیر آنکھ کو خیرہ کر ہی نہیں سکتا، تب خاص خاص احتیاط اور شرائط کے ساتھ تلوار اُٹھانے کی اجازت دی گئی۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ جنگ کے یہ دونوں طریقے آج بھی مشروع ہیں[۲۷۲] اور شریعت غرا موقع بموقع ہر ایک کے اجراء کا حکم دے کر ایک ہی ثواب دونوں کے لئے تجویز فرماتی ہے۔ نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد تو یہ ہے:

افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر وفي رواية كلمة عدل.

کہ سلطان ظالم کے سامنے صداقت اور انصاف کا کلمہ ہر ایک جہاد سے افضل ہے۔

بہرحال اس طرز جہاد کے لئے ضرورت تھی کہ حضرت مجدد صاحب اپنی صداقت نیز سلطان اور سلطنت کی خیر خواہی کا آخری ثبوت پیش کریں۔

گرفتاری اور سزایابی

حضرت مجدد صاحب کی یہ جوڑ توڑ [۴۷۳] (جس کو قرآن پاک کی زبان میں کید کہا جا سکتا ہے) بلاشبہ کامیاب رہی۔

(۱) لیکن حضرت مجدد صاحب کی یہ کامیابی نور جہاں اور اس کی پارٹی کے لئے خطرناک تھی۔ خصوصاً جبکہ وارث تاج و تخت کا سوال بھی سامنے آ گیا تھا۔

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے نور جہاں اپنے داماد شہریار کو تخت جہانگیر پر جاگزیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اُس کے برمقابل مذہب پرستی، اور سنی مسلک ہونے نے حضرت مجدد صاحب کے پورے گروپ کو قدرتی طور پر شاہجہاں سے وابستہ کر رکھا تھا۔

(۲) رد روافض کے متعلق حضرت مجدد صاحب کی جد و جہد اور بیباکانہ جرأت نے اس پارٹی کو اور بھی زیادہ نگاہ نور جہاں میں مقہور و معتوب کر دیا تھا۔

(۳) سلسلۂ نقشبندیہ کی ترغیب و تحریص، اتباع سنت کی تاکید، سماع غنا، رقص و سرود کی مخالفت نے اس گروہ کو بھی لازمی طور پر برافروختہ کر دیا تھا جس نے رقص و سرود کی طرب انگیز صورتوں ہی میں چشتیت کو منحصر کر دیا تھا۔

اور پڑھ چکے ہو کہ جہانگیر کی مذہبیت اسی جماعت کی آبشار سے سرشار تھی حتیٰ کہ اُس نے کان چھدوا کر باطنی حلقہ بگوشی کا مظاہرہ، ظاہری حلقہ بگوشی سے بھی کر دیا تھا۔ شیخ کبیر، شیخ علاؤالدین وغیرہ اسی جماعت کے ممتاز ارکان تھے بلکہ ذمہ دار رہنما تھے، جو جہانگیر کو بہت زیادہ محبوب تھے۔

یہ تھا جہانگیر کی حکومت کا داہنا بازو جس نے حضرت مجدد صاحب اور اپنی جماعت کو آئینی طور پر شکست دینے کی کوشش شروع کر دی۔

مکتوبات کی پہلی اور دوسری جلد مرتب ہو چکی ہے۔ جس میں ان روحانی مقامات کا بیان بھی ہے جن کے سمجھنے کے لیے روحانی استعداد کی ضرورت ہے۔

ان کور باطنوں کو مقالات مجددی کے سمجھنے کی توفیق تو کیا ہوتی، ہاں معاندانہ موشگافیوں کے ذریعہ مجدد صاحب کے برخلاف سازش کرنے کا موقع بڑی ہوشیاری سے نکال لیا۔

(۴) کوئی صاحب تھے حسن خاں، افغان۔ [۴۷۴] کابل کے رہنے والے۔ وہ حضرت مجدد صاحب سے بیعت ہوئے۔ پھر حضرت مجدد صاحبؒ کے کسی متوسل سے اُن کو آزردگی پیدا ہو گئی۔

طبیعت میں کجی تھی۔ ناراضگی کسی خادم سے تھی۔ مگر وہ خود حضرت مجدد صاحب سے آزردہ ہو کر حضرت مجدد صاحب کی ایذا رسانی کے درپے ہو گیا۔

سوانح نگار حضرات کا بیان ہے کہ اُس نے خود اپنی طبیعت کی کجی سے (اور ہمارے خیال میں حکومت کے داہنے بازو کے ایماء سے) حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات میں تحریف کی۔ کفریہ اور زندیقانہ عبارتوں کا اضافہ کر کے بیس نقلیں مرتب کیں اور ہندوستان وافغانستان کے مشہور علماء مشائخ کے پاس وہ نقلیں بھیجیں اور فتاوے طلب کیے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۲۷۵) بھی اس فتنہ میں مبتلا ہو گئے اور حضرت مجدد صاحب کی تردید میں مضامین اور رسالے تحریر فرما دیئے۔

⑤ وحدت الوجود کا مسئلہ جو صوفیاء کے نزدیک عرصہ سے چلا آ رہا تھا، حضرت مجدد صاحب نے اس کی تردید فرما کر شریعت مقدسہ کے بموجب دوسری حقیقت واضح فرمائی۔

صوفیاء کہا کرتے تھے "ہمہ اوست"۔ حضرت مجدد صاحب نے اصلاح فرمائی۔ "ہمہ از وست"۔

ان تمام حالات کا نتیجہ یہ تھا کہ حضرت مجدد صاحب گرفتار کر کے جہانگیر کے سامنے پیش کئے گئے اور سزایاب ہوئے۔

مقدمہ اور وجوہات سزایابی کے متعلق جہانگیر کا پوتا داراشکوہ اپنی کتاب سفینۃ الاولیاء میں تحریر کرتا ہے:

"دراواخر حال بعضے بر شیخ تہمت کردند کہ شیخ سے گوید کہ مرتبہ من زیادہ است از خلفاء راشدینؓ۔ اما ایں محض بہتان وافتراء مخالفان ست بر شیخ۔ (۲۷۶)

خزینۃ الاصفیاء (۲۷۷)، حالات مشائخ نقشبند، (۲۷۸) مقامات (۲۷۹) وحالات مجدد الف ثانی وغیرہ کا بیان یہ ہے:

حضرت مجدد صاحب نے اپنے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں ایک طویل مکتوب کے ضمن میں تحریر فرمایا:

دوسری (۲۸۰) مرتبہ اس مقام کا مشاہدہ کرتے وقت دوسرے بہت سے مقام نظر آئے جو ایک دوسرے سے بلند تھے۔ جب اُن سے ایک بلند تر مقام پر رسائی ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ مقام حضرت ذی النورین عثمان غنیؓ کا ہے اور دوسرے خلفاء کا بھی اس مقام پر عبور ہوا ہے۔ اس مقام سے بالاتر حضرت صدیق اکبرؓ کا مقام ظاہر ہوا اور دوسرے خلفاء عظام کا بھی اس مقام پر عبور ہوا ہے۔ چنانچہ اس بلند و بالا مقام پر رسائی ہوئی۔

خواجہ بزرگ حضرت شاہ نقشبندؒ کو ہر مقام پر میں نے اپنے ہمراہ دیکھا اس طرح کہ صرف عبور کا تفاوت تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے مقام سے بلند کوئی مقام سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ البتہ مقام نبوت بیشک بلند و بالا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے مقام کے برابر ایک دوسرا نہایت ہی نفیس اور بہت نورانی مقام نظر آیا، جس سے بہتر مقام کوئی نہیں دیکھا گیا تھا۔ مقام صدیقی سے وہ صرف اسی قدر بلند تھا جیسا کہ صدر مقام زمین سے کسی قدر بلند ہوا کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ مقام محبوبیت ہے۔ یہ مقام رنگین تھا اور منقش۔ اس مقام کا عکس پڑنے سے بندہ بھی خود

کو رنگین اور منقش پا رہا تھا۔ پھر رنگینی اور نقش و نگار کی اس کیفیت کے باوجود خود کو لطیف محسوس کرنے لگا اور ہوا یا بدلی کے ٹکڑے کی طرح اپنے آپ کو آفاق میں منتشر محسوس کرنے لگا، اور اسی حالت میں کنارے پر جا لگا۔ حضرت خواجہ بزرگ مقام صدیق اکبرؓ میں رہے اور میں اپنے آپ کو اس کے برابر کے مقام میں کیفیت مذکورہ کے ساتھ دیکھتا رہا۔ (مکتوب ۱۱ جلد اص ۱۵)

(اس مکتوب میں کوئی قابل اعتراض چیز نہیں۔ تاہم اس جلد کے دیگر مکتوبات (۲۸۱) میں توضیح و تفسیر کر دی گئی ہے۔ مگر جن کو بہانہ کی جستجو تھی، اُن کو تحقیق و انصاف سے کیا واسطہ۔ محمد میاں)

چونکہ نور جہاں کے بے پناہ اختیارات کے باعث جہانگیر کے دربار میں روافض کا دخل بہت زیادہ تھا اور حضرت مجدد صاحب نے اس مذہب کی تردید میں چند رسالے اور کتابیں تصنیف فرمائی تھیں۔ جس کے باعث یہ لوگ حضرت مجدد صاحب کے جانی دشمن ہو گئے۔ لہٰذا فرصت وقت کو غنیمت جان کر یہ مکتوب بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ اور یہ سمجھایا کہ شیخ احمد خود کو حضرت صدیق اکبرؓ سے بہتر اور بالاتر جانتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا مقام صدیق اکبر کے مقام سے بلند ہے۔

بادشاہ رنجیدہ ہوا۔ شیخ کو اپنے پاس طلب کیا اور اس کے متعلق استفسار کیا۔ حضرت شیخ نے جواب دیا۔

جس طرح اہل سنت کے نزدیک وہ شخص سنی نہیں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حضرت صدیق اکبرؓ سے افضل قرار دے، جماعت صوفیہ کے نزدیک وہ شخص صوفی نہیں جو خود کو کتے سے بہتر جانے جو خبیث ترین مخلوق ہے چہ جائیکہ حضرت صدیق اکبرؓ سے افضل سمجھے۔

جو کچھ مکتوبات میں تحریر ہوا، مقامات سلوک کے سیر و عروج کا ذکر ہے۔ جو صوفیہ کو پیر و دستگیر کی توجہ سے حاصل ہوا کرتا ہے۔

صوفیہ کا یہ عروج ایسے مقامات پر تھوڑی دیر کے لئے ہوتا ہے۔

دربار شاہی میں اُمراء دربار رات دن حاضر رہتے ہیں، اور اگر کسی وقت کسی ضرورت یا کسی مصلحت سے سپاہی کو طلب کر کے بادشاہ اس کو ہم کلامی کا شرف بخشے، تو وہ محض عارضی ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد سپاہی اپنی جگہ پہنچ جاتا ہے اور درباری اپنے مقام پر بلند رہتا ہے۔ اس عارضی قرب کے سبب سے سپاہی کا درجہ مقرب سلطانی سے بلند نہیں مانا جا سکتا۔

اسی طرح ہم لوگوں کا عروج ایک وقتی کیف ہوتا ہے، اس کیفیت کے ختم ہو جانے پر سرہند کا وہی پرانا جھونپڑا اپنا مقام ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو پہچانتے ہوئے اس بلند و بالا مقام صدیقی کے مالک یعنی صدیق اکبرؓ سے افضل ہونے کا تصور بھی ناممکن ہے۔

علاوہ ازیں اس مکتوب میں یہ بھی تحریر ہے کہ اس مقام کے عکس سے میں نے خود کو رنگین پایا۔ نور آفتاب اور اس سے منور ہونے کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ آفتاب آفتاب ہی ہے۔ زمین پر اس کی روشنی پڑ جاتی ہے

روشن ہو جاتی ہے۔ مگر کیا زمین آفتاب کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتی ہے؟ ان دلائل و براہین سے حضرت مجدد صاحب نے بادشاہ کو مطمئن کر دیا۔ چنانچہ بادشاہ نے سزا دینے کے بجائے اعزاز و اکرام سے واپس کیا۔

حضرات شیعہ کے لئے یہ شکست غیر قابل برداشت تھی۔ اب انہوں نے دوسری صورت اختیار کی۔

بادشاہ سے کہا کہ شیخ احمد نے ہزاروں جاں نثار مرید اپنے گرد جمع کر لئے ہیں خطرہ ہے کہ ملک میں کوئی فتنہ کھڑا کر دے۔ وہ ایک مغرور شخص ہے۔ خرابی نیت کی تصدیق اس سے ہو سکتی ہے کہ سجدہ تحیت جو بادشاہ جہاں پناہ کے لئے جائز مانا جاتا ہے، وہ اس کا منکر ہے۔ اس نے پہلے بھی شاہی احترام سے کنارہ کیا اور آپ آئندہ بھی امتحان فرما لیجئے۔ وہ بارگاہ میں حاضر ہو کر بھی سر نہیں جھکائے گا۔

بادشاہ کے لئے یہ سیاسی خطرہ مذہبی خطرہ سے زیادہ تشویش ناک تھا۔ دوبارہ حضرت شیخ کو طلب کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ دیگر مکاتیب کی عبارتیں جو ان کوتاہ فہموں کی فہم سے بالا تھیں، توڑ مروڑ کر پیش کیں۔ کچھ علماء کے فتاویٰ نظر سلطان سے گزرے جن میں حضرت مولانا عبدالحق محدث دہلوی کے تردیدی مضامین بھی تھے۔

حضرت مجدد صاحب دوسری مرتبہ جب دربار پہنچے تو درباری ادب آموزوں نے شاہانہ آداب بجالانے کی ہدایت کی۔ جب تخت بوسی یا سجدہ (۲۸۲) کی فرمائش کی گئی تو حضرت شیخؒ نے سختی سے انکار فرمایا۔

"پس ہمہ علماء بخاطر داریٔ امراء دربار فتویٰ بر قتل شیخ نوشتند"۔

مگر بادشاہ نے پھر بھی تحمل سے کام لے کر صرف دو سال کے لئے قید خانہ میں بھیج دیا۔ (۲۸۳) شاہزادہ خرم شاہجہاں (۲۸۴) کو حضرت سے بہت زیادہ عقیدت تھی۔ اس نے اپنے خاص الخاص معتمد افضل خاں اور خواجہ عبدالرحمٰن کو حضرت مجدد صاحب کی خدمت میں بھیجا، اور فقہ کی کتابیں اُن کے ساتھ کر دیں اور عرض کیا کہ جبکہ علماء نے سجدۂ تحیت کو جائز بتایا ہے۔ اگر جناب والا بادشاہ سے ملاقات کے وقت سجدہ کر لیں تو میں ذمہ دار رہوں کہ جناب کو کوئی گزند نہ پہنچے گا۔

مگر حضرت مجدد صاحب نے فرمایا:

"ایں (۲۸۵) رخصت است و عزیمت دراں ست کہ سجدہ بہ غیر اللہ نہ کردہ شود"

سید غلام علی آزاد بلگرامی سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان" میں اس واقعہ کو نقل کر کے فرماتے ہیں

سہل باشد در رہ فقر و غنا	گر رسد جاں را تعب تن را عنا
رنج و راحت داں چوشد مطلب بزرگ	گرد گلہ توتیائے چشم گرگ
کے بود در راہ عشق آسودگی	سربسر در دست دخوں آلودگی
تانہ سازی برتو آسائش حرام	کے توانی زد براہ عشق گام
غیر ناکامی دریں رہ کام نیست	راہ عشق ست ایں رہ حمام نیست

جہانگیر نے قید و بند (۲۸۶) پر بس نہیں کی بلکہ دولت کدہ مجددی کو لوٹنے کا حکم دیا۔ مگر مجدد دانہ صبر و تسلیم یہ تھا

کہ نہ خود آپ نے بددعا کے لئے لب کشائی کی اور نہ اپنی اولاد یا خدام کو اجازت دی کہ بادشاہ اسلام کے لئے کسی قسم کی بددعا کریں۔

شنیدم کہ مردان راہ خدا　　دل دشمناں ہم نکردند تنگ

عام مؤرخین مقدمہ اور گرفتاری کی یہ روئیداد پیش کرتے ہیں مگر وہ ڈپلومیسی بھی ملاحظہ فرمایئے جس پر جہانگیر کاربند ہے۔ فارسی داں ناظرین کی دلچسپی کے لئے تزک کی عبارت بجنسہٖ نقل کی جاتی ہے۔

"دریں ایام (۲۳ خورداد ۱۴ جلوس مطابق جمادی الاخریٰ ۱۰۲۸ھ) بعرض رسید کہ شیخ احمد نام شیادے در سرہند دام زرق وسالوس فرو چیدہ وبسیارے از ظاہر پرستان بے معنی راہ صید خود کردہ وبہر شہرے ودیارے یکے از مریدان خود را کہ آئین دکان آرائی ومعرفت فروشی ومردم فریبی را از دیگراں پختہ تر داند خلیفہ نام نہادہ فرستادہ وعزخرفاتے کہ بمریداں ومعتقداں خود نوشتہ کتابے فراہم آوردہ مکتوبات نام کردہ ودراں جنگ مہملات بسا مقدمات لاطائل مرقوم گشتہ کہ بکفر وزندقہ منجرمے شود ازاں جملہ در مکتوبے نوشتہ کہ دراثناء سلوک گزارم بمقام ذی النورین افتاد۔ مقامے دیدم بغایت عالی وخوش بصفا ازانجا درگزشتم بمقام فاروق پیوستم واز مقام فاروق بمقام صدیق عبور کردم وہر کدام را تعریفے درخور آں نوشتہ واز انجا بمقام محبوبیت واصل شدہ ومقام مشاہدہ افتادہ بغایت منور وملون خود را بانواع انوار والوان منعکس یافتم یعنی استغفر اللہ از مقام خلفاء درگزشتہ بعالی مرتبت رجوع نمودم ودیگر گستاخیہا کردہ کہ نوشتن آں طولے دارد واز ادب دور ست۔ بنابریں حکم فرمودم کہ بدرگاہ عدالت آئین حاضر سازند۔ حسب الحکم بملازمت پیوست واز ہرچہ پرسیدم جواب معقول نتوانست داد وباعدم خرد ودانش بغایت مغرور وخود پسند ظاہر شد۔ صلاح حال او منحصر دریں دیدم کہ روزے چند در زندان ادب محبوس باشد تا شوریدگی مزاج وآشفتگی دماغش قدرے تسکین پذیرد وسوزش عوام نیز فرونشیند۔ لاجرم بانی رائے سنگھ دلن حوالہ شد کہ در قلعہ گوالیار مقید دارد۔"[۳۸۷] [ص ۲۷۳ و ۲۷۵ تزک جہانگیر]

ہمارے زمانہ کی ایک اصطلاح ہے "مسل کا پیٹ بھرنا"۔ اپنی اس رپورٹ سے جہانگیر اسی کی نظیر پیش کر رہا ہے۔

ایک ایسے موقعہ پر ہمارے زمانہ کے ایک شاعر نے کہا تھا...... ع

تواناؤں کے بس میں ہے سراپا حقارت سے　　ہزاروں ناتوانوں کی تمناؤں کو ٹھکرانا
دبا دینا کسی مظلوم کی آہوں کو سینہ میں　　کسی بیکس کو ساری عمر آنسو خوں کے رلوانا

حضرت مجدد صاحبؒ جیل خانہ میں

تسلیم و رضا کی مکمل تصویر

جیل خانہ سے چند ماہ پہلے حضرت مجدد صاحب اپنے احباب واصحاب سے فرمایا کرتے تھے، کہ عنقریب میرے اُوپر (۳۸۸) ایک بلا نازل ہوگی، جو میرے لئے مقامات ولایت کی ترقیات کا باعث ہوگی۔ اس بلا کے نزول کے بغیر ان ترقیات کا حصول ممکن نہیں۔

حضرت مجدد صاحب قلعہ گوالیار میں پہنچے تو وہاں کئی ہزار غیر مسلم بھی قید میں تھے۔ حضرت مجدد صاحب نے تبلیغ کی۔ ان کو مشرف بہ اسلام کیا اور سینکڑوں آدمیوں کو ارادت سے سرفراز کر کے درجات ولایت پر پہنچایا۔

حضرت مجدد صاحب نے زمانہ قید میں کبھی بھی بادشاہ کو بددعائیں کی بلکہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر بادشاہ مجھ کو جیل خانہ میں نہ بھیجتے تو اتنے ہزار نفوس دینی فوائد سے کیسے بہرہ اندوز ہوتے، اور ہمارے مراتب کی ترقی جو اسی مصیبت کے نزول پر منحصر تھی، کیسے حاصل ہوتی۔

آپ کے حلقہ بگوش صوفیاء کرام جو چاہتے تھے کہ بددعا کر کے باطنی تصرفات سے بادشاہ کو نقصان پہنچائیں، اُن کو خواب میں نیز بیداری میں منع فرماتے تھے [خزینۃ الاصفیاء ص ۶۱۲]۔

چونکہ حضرت مجدد صاحب حتی الوسع انبیاءؑ کی سنت کو نہیں چھوڑتے تھے تو تقدیر الٰہی کا تقاضا ہوا کہ جیل خانہ کے ذریعہ سے حضرت یوسفؑ کی اس سنت کو بھی ادا کرایا جائے۔

آنہا کہ پائے در رہ مولیٰ نہادہ اند	گام تخت بر سر دنیا نہادہ اند
آوردہ اند پشت بریں آشیاں بود	پس چوں فرشتہ روئے بہ عقبیٰ نہادہ اند
آں طوطیاں رہ چو قدم برگرفتہ اند	طوبےٰ ہم کہ بر سر طوبےٰ نہادہ اند
زادرہ و ذخیرۂ ایں وادیٔ مہیب	در طشت سر بریدہ چو یحییٰ نہادہ اند
اوّل بزیر پاء سگاں خوار گشتہ اند	و آخر چو باد سر بسوئے مولیٰ نہادہ اند

ذیل میں چند مکتوبات کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے جو جیل خانہ سے ارسال کئے گئے ہیں۔ مکتوبات کا ہر ایک فقرہ سلوک وطریقت، شریعت وحقیقت کا درس گراں مایہ ہے۔

مکتوبات نمبر ۴ جلد ۳ بنام فرزند گرامی خواجہ محمد معصوم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز۔ حمد ونعت کے بعد تحریر ہے۔

فرزندانِ گرامی! وقت آزمائش اگرچہ تلخ اور بے مزہ ہے، لیکن اگر توفیق ہو تو بہت غنیمت ہے۔

آج کل جب کہ آپ کو فرصت میسر ہے، خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے کام میں مشغول رہو۔ فرصت کا ایک لمحہ اور ایک لحظہ بھی بے کار مت ضائع کرو۔

تین چیزیں ہیں۔ (۱) تلاوت قرآن مجید۔ (۲) طویل قراءت کے ساتھ ادائے نماز۔ (۳) کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ کا ورد۔ ان میں سے کسی ایک کا ورد ہر وقت رکھو۔ کلمہ لا سے نفس کے معبودوں کی نفی کرو۔ اپنے مقاصد اور اپنی مرادوں کو دفع کرو۔ اپنی مراد مانگنا یہی اپنی معبودیت کا دعویٰ ہے۔ ساحت سینہ میں اپنی کوئی مراد، وہم خیال میں اپنی کوئی ہوس باقی نہ رہے، بندہ کی اصلی شان اسی وقت ظاہر ہوتی ہے، اپنی مراد مانگنے میں اپنے مولیٰ کی مراد کی تردید اور اپنے مولیٰ کے ارادہ کا مقابلہ ہے۔ گویا اپنے آقا کے حکم کو رد کر کے خود کو آقا قرار دیا جا رہا ہے۔ اس کی قباحت کو پوری طرح ذہن نشین کر کے نفسانی معبود کے دعویٰ معبودیت کی تردید کرو۔ اس ابتلاء اور آزمائش کے دور میں اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے یہ بات پوری طرح میسر ہو جائے گی۔

زمانہ ابتلاء کے سوا دیگر اوقات میں اپنی مرادیں اور خواہشات سد سکندری بنی رہتی ہیں۔ خدا خیریت رکھے، ملاقات ہو یا نہ ہو، ہماری نصیحت یہی ہے کہ اپنی مراد یا ہوس باقی نہ رہے۔ جو کچھ ہو، رضاء الٰہی اور ارادۂ خداوندی ہو۔ حتیٰ کہ میری رہائی جو آج کل تمہارا بہت بڑا مقصود بنا ہوا ہے وہ بھی مقصود و مراد نہ رہے۔ اور حضرت حق جل مجدہ کی مقرر فرمودہ تقدیر، اُس کے ارادہ اور اُس کی مرضی پر پوری طرح راضی ہو جاؤ۔

اپنی والدہ کو بھی یہ مضمون پوری طرح سمجھا دو۔

اس زندگی کے باقی حالات اس قابل ہی نہیں کی معرض تحریر میں آئیں۔

کیونکہ وہ ختم ہونے والے ہیں۔ چھوٹوں پر مہربانی کرو۔ پڑھنے کی رغبت دیتے رہو۔ جہاں تک ہو سکے، اہل حقوق کو میری طرف سے راضی رکھو۔

حویلی (۴۸۹)، سرا، کنواں، باغ اور کتابوں کا غم بہت معمولی بات ہے۔ اگر ہم مر جاتے تب بھی جاتی رہتیں۔ اب زندگی میں جاتی رہیں، کوئی فکر نہیں۔ اولیاء اللہ ان چیزوں کو خود چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ اب شکر ادا کرو کہ خدا نے اپنے اختیار سے ان چیزوں کو چھوڑا دیا۔

جہاں بیٹھے ہو اسی کو وطن سمجھو۔ چند روز زندگی جس جگہ بھی گزر رہے، یاد خدا میں گزرنی چاہیے۔ دنیا کا معاملہ آسان ہے، آخرت کی طرف متوجہ ہو اپنی والدہ کو بھی تسلی دیتے رہو اور آخرت کی طرف رغبت دلاتے رہو۔

اگر حق سبحانہ تعالیٰ چاہیں گے، آپس میں ہماری سب کی ملاقات ہو جائیگی ورنہ حکم خدا پر راضی رہو۔ اور دعا کرو کہ دار السلام (جنت) میں سب ایک جگہ ہوں اور ملاقات دنیا کی تلافی کریں۔ [مکتوب ۲ ص ۷۶، جلد سوم]۔

مکتوب نمبر ۶ ج ۳ شیخ بدیع الدین صاحب کے نام ہے۔ تحریر ہے:

شیخ فتح اللہ صاحب کے ذریعہ سے مکتوب گرامی موصول ہوا۔ مخلوق کے ظلم و تعدی کی شکایت تحریر تھی۔ یہ چیزیں درحقیقت جماعت اولیاء کا جمال ہیں۔ اور ان کے زنگ کے لئے صیقل۔ لہٰذا تنگ دلی اور کدورت کا سبب کیوں ہوں۔

اول اول جب یہ فقیر اس قلعہ میں پہنچا تو محسوس ہوتا تھا کہ لوگوں کی ملامت کے نور شہروں اور دیہات سے

بلند ہوکر نورانی بادلوں کی صورت میں میرے پاس پے در پے پہنچ رہے ہیں۔ اور میرے معاملہ کو پستی سے اُونچی بلندی پر پہنچا رہے ہیں تربیت جمالی سے سالہا اس مسافت کو طے کیا ہے۔ اب تربیت جلالی سے ان مراحل کو طے کیے جارہا ہے۔ صبر ورضا کے مقام میں رہو۔ جمالی وجلالی کو مساوی سمجھو۔

تحریر فرمایا تھا کہ ظہور فتنہ سے نہ ذوق رہا ہے نہ حال۔ حالانکہ چاہئے تو یہ تھا کہ ذوق وحال میں اور زیادتی ہوتی۔ کیونکہ وفائے محبوب سے جفائے محبوب زیادہ لذت بخش ہوا کرتی ہے۔

کیا ہوگیا؟ عوام کی طرح بات کر رہے ہو، اور محبت ذاتیہ سے بہت دور ہوگئے ہو۔ بہرحال گزشتہ کے برخلاف آئندہ وجلال کو جمال سے بڑھا ہوا سمجھو اور انعام کے مقابلہ میں تکلیف کو بہتر تصور کرو کیونکہ جمال وانعام میں محبوب کے مراد کے ساتھ اپنی مراد کی بھی آمیزش ہے۔ اور جلال وتکلیف میں صرف محبوب کی مراد سامنے ہے اور اپنی مراد کی مخالفت ہے۔ [ص ۱۲-۱۳ جلد ۳]

مکتوب نمبر ۱۵ ج ۳ ص ۱۸ حضرت میر محمد نعمان صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

معلوم ہوا کہ میری رہائی کے متعلق خیر اندیش احباب کی جدوجہد کامیاب نہیں ہوئی الخیر فیما صنع الله تعالیٰ۔ بمقتضائے بشریت کسی قدر افسوس ضرور ہوا۔ مگر تھوڑی دیر بعد خداوند عالم کے فضل وکرم سے وہ تمام حزن وافسوس مسرت اور خوشی میں بدل گیا، اور خاص طور پر اس کا یقین ہوگیا کہ یہ جماعت جو ہماری ایذاء رسانی کے درپے ہے، اس کی مراد جب کہ حضرت حق جل مجدہ کے ارادہ کے مطابق ہے، تو تنگ دل اور حزن وملال بے معنی اور دعویٰ محبت کے سراسر مخالف۔

محبوب کی ہر ایک ادا محبوب ہی ہے۔ عاشق جس طرح انعام ونوازش محبوب سے خوش ہوتا ہے، اسی طرح اس کی تکلیف وایذاء سے لذت حاصل کرتا ہے۔

بلکہ تکلیف وایذاء میں لذت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ وہ حظ نفس، اور اپنی خواہش ومراد کے شائبہ سے بھی مبرا ہے۔

حضرت حق جل سلطانہ جمیل مطلق ہیں۔ اس بندۂ ناچیز کی آزار و پریشانی منظور ہے، ان کی عنایت سے (جل جلالہ) یہ بندۂ ناچیز خوش ہے، بلکہ لذت محسوس کر رہا ہے۔ اور جب کہ اس جماعت کی مراد حضرت حق جل مجدہ کی مراد سے منطبق ہے تو لامحالہ ان کی مراد بھی نظر احقر میں پسندیدہ اور موجب لذت ہے۔

کسی شخص کا فعل جو فعل محبوب کا مظہر ہو، فعل محبوب ہی نظر آتا ہے، اور فعل محبوب کی طرح لذت بخش ہوتا ہے۔

عجیب معاملہ ہے۔ اس شخص سے ستم وجفا جس قدر زیادہ ہو، نظر عاشق میں وہ اتنا ہی بھلا اور پیارا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں غضب محبوب کی صورت کی نمائش زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ دیوانگان رہ عشق کا معاملہ ہی اُلٹا ہے۔

لہٰذا اس شخص کی برائی چاہنا، اور اس کی برائی کے درپے ہونا، منافی محبت ہے۔

یہ شخص کیا اور اس کی حقیقت کیا، وہ صرف فعل محبوب کا آئینہ دار ہے۔

جو لوگ در پے آزار ہیں، تمام مخلوق میں سب سے زیادہ پیارے معلوم ہوتے ہیں۔

احباب سے فرمایئے کہ تنگی دل دور کریں اور اس جماعت کی تکلیف دہی کا خیال بھی چھوڑ دیں، بلکہ چاہئے کہ اُن کے افعال سے لذت اندوز ہوں۔

ہاں چونکہ دعا کے لئے مامور ہیں لہٰذا حضرت حق جل سلطانہ، سے بھی عاجزی اور تضرع کے ساتھ دفعیہ بلا کی دعا کریں۔

یہ یاد رکھو۔ غضب حقیقی دشمنان خدا کا حصہ ہے۔ عاشقان خدا کے لئے صرف صورت غضب ہے جو حقیقت میں عین رحمت ہے اور اس قدر منافع کی حامل کہ ان کی تفصیل ناممکن۔ نیز اس صورت غضب میں منکروں کی خرابی مضمر ہے اور اُن کی ابتلاء کا سبب و باعث۔

شیخ محی الدین ابن عربی قدس اللہ سرہ کا قول ہے کہ عارف ہمت نہیں رکھتا یعنی وہ ہمت نہیں رکھتا جس کے ذریعہ سے دفعیۂ بلا کا قصد کر سکے۔ کیونکہ جب مصیبت عارف کے عقیدہ میں مراد محبوب اور از جانب محبوب ہے۔ یہ محبت نہ تو اس اُس کے دفع کرنے کی ہمت کس طرح کر سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ حکم دعا کی تعمیل بھی ضروری ہے مگر وہ صرف تعمیل ہی ہے، آرزوئے دل نہیں۔ کیونکہ تمناء دلی تو وہ ہے جو مراد محبوب ہو۔ [ص ۹۰۸، جلد ۳]

ان مکتوبات قدسیہ کو دیکھو، حق تعالیٰ کے ساتھ کیسا صحیح تعلق ہے، اور کیسی بے مثال محبت۔

ارشاد الٰہی ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ

ان خطوط میں جواب ہے اُن جذبات کا جو حضرت میر نعمان اور دوسرے خدام عالی مقام کے دل میں پیدا ہو رہے تھے کہ ہمت باطنی کے ساتھ دعا کر کے موذیوں کو برباد کر دیا جائے۔

بلاشبہ یہ چیز ان حضرات کے لئے مشکل نہ تھی، جن کے حق میں ارشاد نبوی ہے **لو اقسم علی اللہ لابرہ** (اگر خدا کی ذمہ داری پر قسم کھا بیٹھیں تو خدا اُن کی قسم پوری کرے) وہ چاہتے تو سلطنت تہ و بالا ہو جاتی۔

گرد ہے عمل دار عزلت نشیں قدمہائے خاکی دم آتشیں
بیک نالہ ملکے بہم برکنند بیک نالہ کوہے ز جا بر کنند
قوی بازو انند کوتاہ دست خود مند دیوانہ ہشیار مست

حضرت امام ربانی نے ان جذبات کو ٹھنڈا کر دیا، اور بجائے ان انتقامی جذبات کے دعاء خیر کے جذبات دلوں میں بھر دیئے۔

آں کشتہ ہیچ حق محبت ادا نہ کرد کز بہر دست و بازو قاتل دعا نہ کرد

خان خاناں، خان جہاں، صدر جہاں وغیرہ جو حضرت مجدد صاحب سے عقیدت مندی اور ارادت مندی

کے ساتھ حکومت کے سر اور خان بہادر بھی تھے، ان کے لئے حضرت مجدد صاحب کا یہ ابتلاء و امتحان کس قدر پیچیدہ مسئلہ تھا۔ مگر اس کو کس قدر آسانی سے حل کیا، ان کے خلوص ارادت مندی اور جوش عمل میں کتنا اضافہ کر دیا۔

جہانگیر نے مکر، فریب، غرور وغیرہ کا جو الزام لگایا تھا، اس کا کیسا عملی جواب دیا۔ یہ ہے اسلام کی سیاست جس سے باطل پرستوں کی باطل ڈپلومیسی کا جواب دیا جاتا ہے، اور یہ ہے وہ مقاومت بالصبر یا عدم تشدد کی جنگ جس کی اسلام تعلیم دیتا ہے۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ .

صبر اور نماز کے ذریعہ سے مدد حاصل کرو۔ بیشک نماز (جو توجہ الی اللہ کے لئے خدا کا بتایا ہوا طریقہ ہے) شاق ہوا کرتی ہے مگر اُن لوگوں پر جو خشوع اور خضوع کرنے والے ہیں جو اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں، اور اس کے پاس واپس ہو کر جائیں گے۔

یہ مضمون اور یہی نکتہ ہے جو دیگر احباب کے نام خطوط میں مختلف عنوان سے واضح کیا جا رہا ہے۔ تمام مکاتیب کا نقل کرنا طوالت ہے۔ البتہ آخر میں ایک مکتوب اصل عبارت کے ساتھ درج کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ حضرت مجدد صاحب نے اس قید وبند سے روحانی حیثیت سے کیا حاصل کیا۔

چونکہ اس مکتوب کا ترجمہ اور تفسیر مفصل تصنیف کا خواہاں ہے، لہٰذا بجنسہ عبارت نقل کرنے پر قناعت کی جاتی ہے۔

حاصل قید

تخلی نماند کہ تا زیانیکہ بعنایت اللہ سبحانہ، آں عنایت بصورت جلال وغضب او تعالیٰ تجلی نفرمود و محبوس قفس زنداں نگشتم۔ از تن گنا ئے شہودی بالکلیہ نرستم واز پس کو چہا ئے ظلال خیال ومثال بتمام نہ برآمدم و در شاہراہ ایمان بغیب مطلق العنان تبختری نمودم واز حضور بغیب واز عین العلم واز شہود باستدلال بر وجہ کمال نہ پیوستم۔ دیگر ہنر دیگراں عیب وعیب دیگراں راہنر بذوق کامل و وجدان بالغ نیافتم وشربتہا ئے خوش گوار بے ننگی و بے ناموسی دم بامائے مزاوار خواری ورسوائی راچشیدم واز جمال طعن وملامت خلق حظ نگرفتم۔ واز حسن بلاء وجفاء مردم محظوظ نشدم و کالمیت بین یدی الغسال گشتہ بالکل ترک ارادہ واختیار نکردم۔ ورشتہا ئے تعلق آفاق وانفس را بتمام وکمال نگسستم وحقیقت تضرع والتجاوانابت واستغفار وتذلل وانکسار رابدست نیاوردم وقسطاس رفیع المنزلت استغناء حضرت حق سبحانہ راکہ مکشوف بسر اوقات عظمت وکبریائی ست مشاہدہ نمودم وخود را بندۂ خوار وزار وذلیل وبے اعتبار و بے ہنر وبے اقتدار وباکمال احتیاج وافتقار معلوم نساختم۔

وما ابری نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء الا ما رحم ربی ان ربی لغفور رحیم.

اگر بمحض فضل تواتر فیوض و واردات الٰہی جل سلطانہ وتوالی عطیات وانعامات لاانتہائی او سبحانہ دریں محنت کدہ شامل حال ایں شکستہ بال نمے شد نزدیک بود کہ معاملہ بیاس رسد ورشتہ امید گسستہ گردد

[مکتوب نمبر۵ بنام میر محمد نعمان صاحب ص ۱۱-۱۲ جلد ۳]

قید سے رہائی اور لشکر شاہی میں حراست

حضرت مجدد صاحبؒ کو قلعہ گوالیار میں مقید کیا گیا۔ مگر بظاہر خط وکتابت اور ملاقات پر وہ پابندی نہیں تھی جو بیسویں صدی عیسوی کے مہذب قید خانوں میں ہوتی ہے۔

پرچہ نویس جو عموماً ہر ایک چیز کو بادشاہ تک پہنچا دیا کرتے تھے انہوں نے حضرت مجدد صاحب کے حالات، آپ کے خیالات، عزائم اور ارادوں کو بھی جہانگیر تک پہنچایا۔ اب جہانگیر یقیناً حیران ہوگا کہ جس شخص کو شیاد، مکار، مغرور، خود پسند، کافر اور مرتد بنایا گیا تھا، خود اس کے پرچہ نویس اُس کو پیکر صدق وصفا، مجسمہ اخلاق اور اسلامی کمالات کی جیتی جاگتی تصویر قرار دے رہے ہیں۔

جس کی قوت ایمانی نے جیل خانہ میں پہنچ کر ازلی ڈاکوؤں، چوروں اور بدمعاشوں کو بھی صداقت وہدایت کے رنگ میں رنگ دیا۔

وہ کافر بے دین جن کی عمر ظلم وجفا، ایذاء خلق اللہ اور امن عامہ کی تباہی وبربادی میں گزری تھی۔ جن کو جیل خانہ کی سخت سے سخت تکلیف بھی رام نہ کرسکی تھی۔ صرف ایک سال کے عرصہ میں وہ سب حلقہ بگوش اسلام اور راستی وراست بازی کے حریص نظر آرہے ہیں۔ ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا کہ:

> دو سال کے بعد بادشاہ اپنے فعل سے نادم ہوا اور حضرت شیخ کو اپنے پاس طلب کرکے بہت زیادہ اکرام واحترام کیا اور بہت کچھ معذرت کی، اور حضرت شیخ سے اس قدر رغبت کرنے لگا، کہ کسی وقت حضرت شیخ کی جدائی گوارا نہ کرتا تھا، اور شاہزادہ خرم کو حضرت شیخ کے حلقہ مریداں میں داخل کیا۔ چنانچہ شاہجہان وعالمگیر کے زمانہ تک بادشاہ اور جملہ علماء ووزراء سلسلۂ مجددیہ کے حلقہ بگوش ہوتے رہے۔ [خزینۃ الاصفیاء جلد اص ۶۱۳]

یہ درست ہے کہ دراز عرصہ تک حضرت مجدد صاحب کو لشکر شاہی میں حراست کی زندگی گزارنی پڑی، اور بہت ہی کم کسی جگہ نقل وحرکت کی اجازت ملی۔ مگر یہ ارادت مندی اور محبت تھی یا ڈپلومیسی اور سیاست؟ ہمارا خیال ہے کہ نور جہاں کی سیاست کو اس میں بہت بڑا دخل تھا۔ غالباً نور جہاں کو خطرہ تھا کہ حضرت مجدد صاحب کو مطلق العنان کردینے میں شاہجہاں کو قوت پہنچے گی۔

دو سال یا ایک سال

سوانح نگار متفقہ طور پر مدت قید دو سال بتاتے ہیں مگر جہانگیر ۱۲ ؍ رخورداد (سانڑھ) ۱۵ جلوس کے روزنامچہ میں لکھتا ہے:

''دریں تاریخ شیخ احمد سہرندی را کہ بجہت دکان آرائی، خود فروشی، و بے صرفہ گوئی روزے چند در زندان ادب محبوس بود، بحضور طلب داشتہ خلاص ساختم۔ خلعت و ہزار روپیہ خرچ عنایت نمودہ، در رفتن و بودن مختار گردانیدم''۔ (۴۹۰) [توزک جہانگیری ص ۳۱۲]

جہانگیر کی آئین دانی قابل داد ہے کہ حکم رہائی میں بھی ان الزامات کا لحاظ رکھتا ہے جن کو گرفتاری اور سزا کا سبب قرار دے چکا ہے۔

مسل کا پیٹ بھرنا تو ہمارے معمولی وکیل اور معمولی حکام بھی بخوبی جانتے ہیں۔ جہانگیر تو مغلیہ شہنشاہیت کا کامیاب بادشاہ تھا اور وہ اس رسم وراہ سے کس طرح ناواقف ہو سکتا تھا۔

بہرحال اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ پورے ایک سال شمسی میں بھی ابھی دو دن باقی تھے کہ رہائی کا حکم صادر کر دیا۔ بظاہر فرمان شاہی براہ راست حضرت مجدد صاحب کے پاس نہیں پہنچایا گیا۔ اور کسی دوسری سیاست کے ماتحت ایک سال تک کار پردازان دربار نے حضرت مجدد صاحب کو وطن جانے کا موقع نہیں دیا۔ کڑی پابندی و نگرانی کے ساتھ شاہی کیمپ کے ساتھ رکھا۔ اس کو مریدان حضرت مجدد صاحب نے حبس اور قید قرار دیا ہے، اگرچہ جہانگیر اس کو رہائی سمجھتا رہا۔

اس کے بعد توزک جہانگیر حضرت مجدد صاحب کے تذکرہ سے خاموش ہے۔ لیکن توزک جہانگیری سے زیادہ صحیح اور معتمد توزک یعنی مکتوبات مقدسہ (جو ڈھائی سو برس بعد کسی سرسید احمد صاحب کی کوشش سے فراہم اور طبع نہیں ہوئے، بلکہ ابتداء تحریر سے وہ سینکڑوں ہاتھوں میں پہنچتے رہے اور پھر سینکڑوں سے ہزاروں اور لاکھوں کے ہاتھ میں پہنچ کر آج تک تواتر کے طور پر محفوظ اور مستند ہیں) حضرت مجدد صاحب کی کامیابی کی مزید تفصیلات ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔

بادشاہ کو وعظ و پند

اسی سال رمضان شریف میں روزانہ بعد مغرب بادشاہ سے خاص صحبت رہتی تھی۔ جس کی کچھ حالت اپنے صاحبزادگان کو تحریر فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

یہاں کے حالات مستحق حمد ہیں۔ عجیب و غریب صحبتیں گزرتی ہیں اور الحمدللہ ان صحبتوں میں امور دینیہ اور اصول اسلامیہ کے متعلق جو گفتگو بادشاہ سے ہوتی رہتی ہے اس میں بال برابر بھی مداہنت و مسابلت، چشم پوشی اور چرب زبانی کو دخل نہیں ہوتا۔ وہی باتیں، انہیں الفاظ اور عبارتوں سے جو خلوتوں اور خصوصی مجالس میں بیان کی

جاتی تھیں، ان معرکوں میں بھی حق تعالیٰ کی توفیق سے وہی باتیں ہو رہی ہیں۔ اگر ایک مجلس کا حال بھی لکھوں تو ایک دفتر درکار ہے۔ خصوصاً آج ۲۷ رمضان المبارک کی شب میں خصوصیت سے انبیاءؑ کی بعثت اور یہ کہ جملہ مسائل حل کرنے کے لئے عقل کافی نہیں ہے، آخرت کے عذاب وثواب پر ایمان لانے، حق تعالیٰ کے دیدار اور خاتم الرسلؐ پر ختم نبوت اور ہر صدی کے مجدد اور خلفاء راشدین کی پیروی، تراویح کے مسنون ہونے، تناسخ کے باطل ہونے، جن اور جنیوں اور ان کے عذاب وثواب کے متعلق بہت زیادہ بیان کیا گیا اور خوب اچھی طرح سنا گیا۔ اقطاب، ابدال، اوتاد، ان کی خصوصیات وغیرہ کا ذکر بھی اسی ضمن میں آیا۔ الحمدللہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام تذکرہ برمحل ہو رہا ہے [مکتوب نمبر ۴۳ ص ۷۲ جلد ۳]۔

اس کے بعد صاحبزادوں کو بھی حضرت مجدد صاحب نے اپنے پاس بلالیا۔ اب یہ پورا گھرانا پورے لشکر کی تبلیغ وتلقین میں مشغول ہو گیا۔ چنانچہ مکتوب نمبر ۲۷ میں خواجہ حسام الدین کو تحریر فرماتے ہیں:

الحمدللہ کہ آپ صحت وعافیت سے ہیں اور دور افتادہ دوستوں کے حالات کی تحقیق وتفتیش سے غافل نہیں ہیں۔

یہاں کے فقراء کے حالات مستحق حمد ہیں کہ عین بلا میں عافیت سے اور پراگندگی خاطر کے موقعہ پر اطمینان اور دل جمعی حاصل ہے۔ جو فرزند اور دوست کہ ہمراہ ہیں اُن کے اوقات بھی یاد خدا میں دل جمعی کے ساتھ گزرتے ہیں اور ان کے حالات روبہ ترقی ہیں۔ لشکر کی زیادتی ان کے حق میں ایک خانقاہ بن گئی ہے کہ سپاہیوں کی رنگ برنگی کے اندر بھی سکون اور وقار ان کا حصہ ہے اور متفرق قسم کی پابندیوں اور گرفتاریوں کے دوران میں جو اس وطن کی خصوصیات ہیں، یہ لوگ صرف ایک مقصود کے گرفتار اور پابند ہیں۔ نہ کسی کو ان سے کام اور نہ ان پر کسی کا احسان۔ اس کے باجود اعتماد اور اعتبار مسلوب ہے۔ جس وقید کی دولت میں گرفتار ہیں۔ عجیب گرفتاری ہے کہ اس کے مقابلہ پر ایک جو کے عوض میں بھی رہائی نہیں خرید سکتے۔ اور عجیب قید ہے کہ اس کے مقابلہ میں رہائی کی قیمت ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ [مکتوب نمبر ۲۷ جلد ۳ ص ۱۱۵]

صاحبزادے وطن واپس چلے گئے مگر حضرت مجدد صاحب لشکر کی حراست میں ہیں۔ چنانچہ مکتوب نمبر ۸۷ جلد ۳ ص ۱۳۰ میں تحریر فرماتے ہیں۔

فرزندان گرامی جس قدر ہمیشہ ساتھ رہنے کے خواہشمند ہیں اسی قدر ہم بھی مشتاق ہیں مگر اس کا کیا علاج کہ تمام آرزوئیں میسر نہیں ہوا کرتیں۔

لشکر میں اس طرح بے اختیار اور بے بس رہنے کو بہت غنیمت جانتا ہوں۔ اس جگہ وہ میسر ہے کہ دوسری جگہ بظاہر وہ میسر نہیں آ سکتا۔ اس جگہ کے علوم ومعارف احوال ومقامات کچھ اور ہی ہیں۔ ایک رکاوٹ جو بادشاہ کی جانب سے ہے، میں اس کو حضرت حق جل مجدہٗ کی انتہائی رضامندی کا دریچہ تصور کرتا ہوں اور اس میں ہی میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔ خصوصاً ان جھگڑوں کے زمانہ میں عجیب کاروبار ہے فرزندان عزیز دل میں گزر رہے ہیں اور اس جدائی سے بے چین ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ میرا شوق ان کے شوق سے بڑھا ہوا ہے۔ اگرچہ

تقاضاء قیاس یہ ہے کہ اولاد کو ماں باپ سے زیادہ محبت ہو۔ کیونکہ اولاد شاخیں ہیں اور شاخیں جڑوں کی زیادہ محتاج ہوا کرتی ہیں۔ مگر مقررہ اصول یہی ہے کہ باپ کو اولاد سے زیادہ تعلق ہوتا ہے اسلاف سے یہی چلا آرہا ہے اور یہی تجربہ ہے (مکتوب نمبر ۸۷ ص ۱۳۰ جلد ۳)

ایک اور مکتوب میں صاحبزادگان کو تحریر فرماتے ہیں:

عام طور پر ہماری گرفتاری کو نظر تشویش سے دیکھا جاتا ہے۔ اور اس ضیق سے رہائی کی خواہش کی جاتی ہے۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ نامرادی، ناکامی اور بے اختیاری میں کس بلا کا حسن ہے۔ اس سے بڑھ کر کونسی نعمت ہوسکتی ہے کہ بندہ کو اس کے اختیار سے بے اختیار کر کے اپنے اختیار میں رکھیں اور امور اختیار کو بھی اس کے اختیار سے خارج کر کے اپنے ارادہ اختیار کے تابع کرلیں اور اس کو ایسا ہی بے اختیار کردیں جیسے "غسل دینے والوں کے ہاتھ میں مردہ" (جو اعتماد علی اللہ اور تسلیم و رضا کا اعلیٰ ترین درجہ ہے)۔

زمانۂ گرفتاری میں جب اپنی ناکامی اور نامرادی پر نظر کرتا ہوں تو عجیب لطف حاصل ہوتا ہے۔ مگر جو اس مزہ سے ناآشنا ہیں، اُن کو اس کا لطف کیا معلوم بچے سمجھتے ہیں کہ مزہ صرف شیرینی میں ہے اور جو تلخی سے مزہ لینے لگتا ہے اُس کے نزدیک شیرینی ہیچ ہے۔

"مرغ آتش خوارہ کے لذت شناسد دانہ را" (مکتوب ۸۲ ص ۱۴۲ جلد ۳)

کچھ عرصہ کے بعد حضرت مجدد صاحب کو وطن شریف جانے کی اجازت ہوگئی۔ مگر حالات سلطان کی نگہداشت آپ کا نصب العین تھا اور ہمت عالیہ مدبرانہ انداز میں سلطان کی جانب منعطف رہتی ہے۔ جلد سوم میں ایک مکتوب بنام سلطان جہانگیر ہے جس میں ظاہر کیا ہے کہ آپ کے پاس لشکر غزا ہے اور ہمارے پاس لشکر دعاء، جس کے بغیر لشکر غزا کو کومیابی نصیب نہیں ہوتی۔ اور پھر اس کو احادیث سے ثابت کیا ہے۔ بظاہر یہ مکتوب سرہند شریف سے بھیجا گیا ہے۔ اگرچہ یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت مجدد صاحب دہلی یا آگرہ میں لشکر کی حراست میں ہوں اور بادشاہ پایۂ تخت سے باہر کسی مہم کے لئے گیا ہوا ہو، اُس وقت یہ خط بھیجا گیا ہو۔

کامیابیاں

حضرت مجدد صاحبؒ کی کامیابی کا پہلا قدم وہ ہے کہ جہانگیر خصوصی مجالس میں آپ سے وعظ و نصیحت سنتا ہے۔ اس کے بعد اگرچہ خاص سیاست یا جہانگیر کی عقیدت مندی کے باعث حضرت مجدد صاحب لشکر شاہی میں زیر حراست رہے مگر اس حراست اور لشکر میں ہمہ وقت موجودگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لشکر میں ترویج شریعت کی ایک روح پیدا ہوگئی۔

قلعہ کانگڑہ کی فتح اس کے بعد اسی سال میسر ہوئی جس پر جہانگیر نے بہت زیادہ مسرت کا اظہار کیا اور سجدات شکر ادا کیے کیونکہ یہ ایسی فتح تھی جو گزشتہ ہزار سال کی طویل مدت میں کسی بادشاہ اسلام کو میسر نہ آئی تھی

باوجودیکہ ہر ایک ذی حشمت بادشاہ اس کی تمنا کرتا رہا۔ اور بقول جہانگیر ظاہر بینوں کی نظر کوتاہ میں اس کی فتح ناممکن تھی۔ لیکن یہ کس کی جدوجہد کا ثمرہ تھا؟

(۱) اس مہم کے لئے اول نواب سید فرید نامزد ہوئے تھے۔ (۲۹۱) جو حضرت مجدد صاحب کے خاص الخاص ارادت مند تھے۔ اور جن کو جہانگیر نے مرتضیٰ خاں کا خطاب دیا تھا۔

ان کی وفات ہوگئی تو یہ مہم عبدالعزیز خاں نقشبندی کے سپرد ہوئی۔ (۲۹۲) اس کے بعد قاضی، میر عدل اور دیگر علماء اسلام کو لے کر جہانگیر بنفس نفیس قلعہ کانگڑہ کی سیر کو گیا، اور وہاں اذان، نماز، خطبہ وغیرہ شعار اسلام جاری کرائے۔ مسجد بنوائی اور شعائر اسلام کے اجراء پر بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا۔ (۲۹۳)

اکبر کے بیٹے جہانگیر کی یہ مذہبیت کیا قابل تعجب نہیں؟

(۲) جہانگیر نے کشمیر جاتے آتے دو مرتبہ سرہند شریف میں قیام کیا۔ غرہ بہمن ماہ الٰہی، (۲۹۴)

روز مبارک شنبہ ظاہر بلدہ سہرند منزل اقبال گشت یک روز قیام کردہ بسیر باغ خوش وقت گشتم [توزک ص ۳۲۹]

پھر گیارہ ماہ بعد ''دی'' یعنی ماگھ ۱۹ جلوس (مطابق محرم ۱۰۳۱ھ تقریباً) کی ۳۱ کو:

باغ سہرند مسرت افزائے خاطر گشت، دو روز قیام نمودہ، از سیر و تماشائے آں محظوظ گشتم۔ (۲۹۵) [توزک ص ۳۴۲]

جہانگیر نے ان دو قیاموں کے متعلق اور کچھ نہیں لکھا۔

مگر مشہور یہ ہے کہ ''جہانگیر کے اقبال نے یہاں تک ترقی کی کہ سرہند میں حضرت امام ربانی کے مہمان بنے اور آپ کے باورچی خانہ کا کھانا کھانے کا شرف حاصل کیا۔ کھانا اگرچہ سادہ تھا۔ مگر بادشاہ نے کہا کہ میں نے ایسا لذیذ کھانا کبھی نہیں کھایا [حالات مشائخ نقشبند ص ۲۳۵]

نیز یہ کہ جہانگیر آخر عمر میں کہا کرتا تھا:

میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا کہ جس سے نجات کی اُمید ہو، البتہ میرے پاس ایک دستاویز ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کروں گا۔ وہ دستاویز یہ ہے کہ مجھ سے ایک روز شیخ احمد سرہندی نے فرمایا تھا کہ ''اگر اللہ تعالیٰ ہمیں جنت میں لے جائے گا تو تیرے بغیر نہ جائیں گے''۔

بہرحال اگر جہانگیر کے اقبال نے واقعی یہاں تک ترقی کرلی تھی تو یہ اس کی سعادت مندی ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ حضرت مجدد صاحب کی بھی عظیم الشان کامیابی ہے۔ مگر درحقیقت حضرت مجدد صاحب کی اصل کامیابی یہ ہے:

(۳) کہ ایسی فضا پیدا کردی کہ شاہجہاں اور عالمگیر اپنی کامل دین داری کے ساتھ تقریباً ایک صدی تک حکومت کرتے رہے اور یہی فضا باقی رہتی اگر عالمگیر کے جانشین فکر و ہمت سے محروم نہ ہوتے۔

اکبر ابتداء میں دین دار تھا۔ مگر پھر بے دین ہوگیا۔ جہانگیر مذہبی جذبات رکھتا تھا مگر ساری عمر بھٹکتا رہا اور

مذہبی انسان نہ بن سکا۔ کیوں؟

پہلے پڑھ چکے ہو کہ ان دونوں کی لادینی یا برگشتگی کا اصلی سبب ارکان حکومت یا وہ نام نہاد علماء تھے جو دین کے پیرایہ میں دنیا پرستی کرتے تھے۔ ان عاقبت فروشوں کو ایوان حکومت سے کس نے نکالا؟

نورجہاں کا بھائی آصف خاں اب بھی تھا اور پہلے سے زیادہ طمطراق کے ساتھ نظام حکومت کا بلکہ شاہجہاں کے تاج شاہی کا قیمتی ہیرا تھا۔(۲۹۶)

اُس کی بیٹی ممتاز محل نورجہاں سے زیادہ اپنے نامور سرتاج (شاہجہاں) کو عزیز تھی۔(۲۹۷)

(نورجہاں اور جہانگیر کی محبت اوراق تاریخ کا ایک پرانا افسانہ بن گئی۔ لیکن ممتاز محل اور شاہجہاں کی محبت کی شہادت تین سو برس کے بعد آج بھی تاج(۲۹۸) محل کی بے نظیر عمارت دے رہی ہے۔ اور درحقیقت سچی محبت یہی تھی، کہ اٹھائیس سال گزرنے کے بعد بھی اس محبوبہ کو نہیں بھولا) مگر آصف خاں کی سیاست اب بدلی ہوئی ہے۔ ممتاز محل اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر شاہجہاں کی ہم مذہب ہوگئی ہے۔

مختصر یہ کہ حکومت کا وہ داہنا بازو جو تقریباً ستر سال برسر اقتدار رہ کر حکومت کے رگ و ریشہ میں اپنا تسلط جما چکا تھا۔ آج اُس نے اس طرح شکست کھائی کہ نہ شاہجہاں کا بال بیکا کرسکا، نہ عالمگیر کا۔

کیا اب حکومت میں ہندوؤں کا حصہ نہ تھا۔(۲۹۹) کیا شیعوں کو حکومت سے خارج کردیا تھا۔ کیا اب عیسائیوں کی آمد بند ہوگئی تھی۔ اکبری فتنہ کا ہر ایک عنصر موجود تھا۔ مگر صرف ایک تریاق نے تمام زہریلے جراثیم کو ختم کردیا تھا۔ درحقیقت یہی وہ کامیابی جو مجدد صاحب کی مجددیت کی روشن دلیل ہے۔

(۴) جبکہ اکبر دنیا میں امن و آشتی کا نعرہ لگاتے ہوئے ایک مشترک دین کی تلقین کررہا تھا، اور آسمان آئین و دانش کے تارے ابوالفضل، بیربل، راجہ ٹوڈرمل، ملا مبارک وغیرہ اس کے نورتن کے ماہ پروین بنے ہوئے تھے۔ دنیا کی ہر ایک دولت قدموں پر تھی۔ ہر ایک فیروزمندی سر تسلیم خم کئے ہوئے تھی، عظمت و جلالت کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا تھا حتی کہ دین و مذہب کی لعنتوں سے بے نیاز ہو کر ہر ایک مذہب کا ہر ایک شہسوار اور سورما شاہی درشن کے وقت زمین نیاز پر سجدہ ریزی شروع کردیتا تھا۔ تو کس کو خیال تھا کہ یہ مذہب جس کی بنیادیں اس قدر مضبوط ہیں، ایسا فنا ہوگا کہ تاریخ کی کتابوں میں بھی تفتیش و تحقیق کے بعد کچھ آثار مشکل سے مل سکیں گے۔

مگر دین اکبری کو فنا کے گھاٹ کس نے اتارا؟

ہر فرعونے راموسیٰ۔ اکبر جیسے جلیل القدر شہنشاہ کے مقابلہ کے لئے شیخ احمد جیسا مجدد بھیجا گیا۔

ملت مصطفویہ پر ایک ہزار سال گزر جانے کے بہانہ اکبر نے دین الٰہی کی بنیاد رکھی تھی۔ لیکن خدا کے پاک بندے شیخ احمد مجدد نے دنیا کو بتادیا۔ کہ یہ خاتم النبیین کا مذہب ہے جس کے مقدس دامنوں کو میدان حشر کے کناروں تک پھیلا دیا گیا ہے جو ان مقدس دامنوں کو سمیٹنا چاہے گا وہ خود ہی سمٹ جائے گا۔ لاتزال طائفۃ من

امتی ظاھرین علی الحق لایضرھم من خزلھم حتی یاتی امر اللّٰہ۔

عالمگیر کے ناخلف جانشینوں نے مسلمانوں کی حکومت ختم کر دی۔ مگر الحمدللہ روح مذہبیت ختم نہ ہوئی اور حضرت مجدد صاحب کے قابل جانشینوں نے اس کے بقاء و تحفظ کی دوسری صورتیں پیدا کر لیں۔ جن کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ اوراق میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ والحمدللہ علی ذلک۔

(۵) سلوک کے سلسلہ میں کامیابیوں کا بیان کرنا ہماری حیثیت سے بالا ہے نیز موضوع تاریخ سے بھی زیادہ تعلق نہیں رکھتا۔ البتہ ایک نمایاں حقیقت سامنے ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ توضیح یہ ہے کہ اگرچہ بقول ابوالفضل ہندوستان میں اصحاب طریقت کے چودہ ۱۴ خانوادے تلقین وارشاد کی خدمت انجام دے رہے تھے لیکن سلسلۂ چشتیہ کو نمایاں رسوخ حاصل تھا۔

وصول الی اللہ بہرحال بہترین مقصد ہے وہ جس خانوادہ کے ذریعہ سے بھی حاصل ہو۔ مگر اس حقیقت کا انکار نہیں ہوسکتا کہ وجد و حال، سماع و غناء وغیرہ کے سلسلہ میں جو توسع اور گنجائش سلسلۂ چشتیہ وغیرہ میں ہے، اس کا اثر عوام پر برابر پڑتا ہے۔ مثل مشہور ہے:

بہ گنج بیضہ کہ سلطاں ستم روا دارد　　　زنند لشکر یانش ھزار مرغ بسیخ

وسیع المشربی کو ترک کر کے اتباع سنت کو اصل سلوک قرار دینا، اور اس کا جذبہ متوسط درجہ کے مسلمانوں میں پیدا کرنا حضرت مجدد صاحب کا کارنامہ ہے۔ جس کا دائرہ آج تک وسیع ہوتا جارہا ہے۔ وللہ الحمد۔ (اس کی توضیح و تفصیل کے لئے مولانا محمد طیب صاحب کا مضمون ملاحظہ ہو جو مرتبہ مجددی کی تحقیق کے سلسلہ میں اسی حصہ کے آخر میں شامل کیا گیا ہے)

وفات حسرت آیات

وفات سے چند ماہ پہلے آپ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اپنی عمر تریسٹھ برس کی معلوم ہوتی ہے۔ اتباع سنت کا شوق جس کو درجۂ فنا تک پہنچا چکا ہو، کیا عجب ہے، غیر اختیاری اُمور میں بھی اس کو مطابقت سنت کی توفیق نصیب ہو۔

اپنی عمر کے آخری شعبان میں حسب معمول پندرھویں شب کو عبادت کے لئے خلوت خانہ میں تشریف لے گئے تو بی بی صاحبہ نے فرمایا کہ معلوم نہیں، آج کس کس کا نام دفتر ہستی سے کاٹا گیا۔ یہ سن کر حضرت امام ﷫ نے فرمایا تم تو بطور شک کہہ رہی ہو کیا حال ہوگا اُس شخص کا جس نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہو کہ اس کا نام دفتر ہستی سے محو کیا گیا۔

اس کے بعد آپ نے ارشاد و ہدایت کا سب کام صاحبزادوں کے سپرد کر دیا، اور اپنا تمام وقت قرآن مجید کی تلاوت اور اذکار و اشغال طریقت میں صرف فرمانے لگے۔ سوا نماز کے خلوت سے باہر تشریف نہ لاتے تھے۔

نفل روزوں اور صدقات وخیرات کی بھی اس زمانہ میں بہت کثرت فرمائی۔

وسط ذی الحجہ میں حضرت کو ضیق النفس کی بیماری لاحق ہوئی۔ تپ محرقہ شروع ہوا۔ جو یوماً فیوماً ترقی کرتا چلا گیا۔ انہیں ایام میں ایک روز فرمایا کہ حضرت پیران پیرؒ کو میں نے دیکھا، بڑی مہربانی مجھ پر فرمائی۔

۱۲ ر محرم کو فرمایا کہ بس اب چالیس پچاس دن کے اندر مجھ کو اس عالم فانی سے سفر کرنا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور بتاریخ ۲۸ ر صفر ۱۰۳۴ھ تریسٹھ برس کی عمر میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ (۳۰۰) جس رات کی صبح کو آپ دنیا سے جانے والے تھے، حسب معمول تہجد کی نماز کے لئے اُٹھے اور بڑے اطمینان سے وضو کر کے نماز پڑھی اور خدام سے فرمایا کہ تم لوگوں نے تیمارداری میں بہت تکلیف اُٹھائی۔ اب آج یہ تکلیف ختم ہے۔ اخیر وقت میں ذکر اسم ذات کا بہت غلبہ تھا۔ ذکر کرتے کرتے روح مبارک رفیق اعلیٰ سے مل گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

نماز جنازہ حضرت کے فرزند ثانی خواجہ محمد سعیدؒ نے پڑھائی اور اپنے بڑے صاحبزادے حضرت خواجہ محمد صادقؒ کی قبر مبارک کے سامنے خاص شہر سرہند میں مدفون ہوئے۔ یہی وہ جگہ ہے جس کے متعلق آپ نے اپنے مکتوب میں لکھا ہے کہ میرے قلب کے انوار وہاں چمکتے ہیں۔

روضۂ مبارک کی تعریف میں حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجددی محدث دہلوی مہاجر مدنی نے چند اشعار نظم فرمائے ہیں جو تبرکاً درج کئے جاتے ہیں۔

اے خاک پاک روضۂ عبیری و عنبری — کہ اہل جہاں زبوئے تو مدہوش گشتہ اند
ساقی فشاند بر تو خوش آبے کہ اہل دہر — عاقل بہ پشت آمدہ مخمور رفتہ اند
سرز خاک خلد تو داری کہ اہل ارض — یک لمحہ از تو یافتہ برچرخ رفتہ اند
نے نے تراز تربت یثرب سرشتہ اند — پنہاں روم و شام بہ سرہند ہشتہ اند
ایں خاک احمدی ست بذات احد نگر — نے یک کہ صد ہزار ازیں خاک جستہ اند
اہلاً و مرحباً بچہ ز دار تو لیسے — اقبال بعد بر رخ اعدات بستہ اند
یارب مکن خلاص ازیں خاک در مرا — بدحال آں کساں کہ ازیں خاک رستہ اند
شیرے بخواب ناز بہ پہلوئے دو شبل (۳۰۱) — یارب چہ راز ہاست کہ انجا نہفتہ اند

تہ غنی نہ نغمۂ مدح تو ساز کرد
کز قدسیان عرش ہمیں گونہ گفتہ اند

باقیات صالحات

اولاد..... خلفاء..... تصانیف

حق تعالیٰ نے آپ کو سات فرزند عطا فرمائے۔ چار کی وفات حضرت مجدد صاحب کے سامنے ہوئی۔ تین فرزند آپ کے بعد مرکز فیوضات بنے۔

فرزند اوّل: حضرت خواجہ محمد صادقؒ جو حضرت مجدد صاحب کے سامنے ہی وفات پا گئے۔ آپ مادرزاد ولی تھے۔ آغاز عمر میں ہی ولایت کے اعلیٰ مدارج طے کر لیے تھے۔ آپ کی حسن اور استعداد و صلاحیت طبع پر حضرت مجدد صاحب کو ناز تھا۔ آپ کو خود حضرت مجدد صاحب اولیاء کبار میں شمار فرمایا کرتے تھے۔ وفات کے بعد سرہند شریف کی زمین کو متبرک سرزمین کہا کرتے تھے کیونکہ خواجہ محمد صادقؒ یہاں مدفون تھے اور آپ کی قبر شریف انوار و رحمت کا خزانہ تھی۔

حضرت مجدد صاحب کو آپ کی وفات کا بہت صدمہ ہوا۔ مکتوبات قدسیہ میں اس صدمہ کا اور آپ کے کمالات کا ذکر موجود ہے۔ سن ولادت ۱۰۰۰ھ، وفات ۹ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ۔ کل عمر ۲۵ سال۔

فرزند دوم: حضرت خواجہ محمد سعیدؒ (المعروف) بخازن الرحمۃ۔ ولادت ۱۰۰۵ھ۔ وفات ۲۷ جمادی الاخریٰ ۱۰۷۰ھ (ذکر آگے آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ)

فرزند سوم: حضرت خواجہ محمد معصومؒ ملقب بعروۃ الوثقیٰ۔ طریقہ کی اشاعت آپ سے بہت زیادہ ہوئی۔ دہلی کی مشہور عالم خانقاہ جو مرجع عرب و عجم تھی، آپ ہی کے سلسلہ کی ہے۔ ولادت باسعادت ۱۰۰۷ھ۔ وفات ۹ ربیع الاول ۱۰۷۹ھ۔

فرزند چہارم: حضرت خواجہ شاہ محمد یحییٰ۔ حضرت مجدد صاحب کی وفات کے وقت آپ کی عمر ۹ سال تھی۔ تحصیل علوم اور تکمیل طریقت اپنے بھائیوں سے کی۔ وفات ۱۰۹۲ھ۔

تین فرزند اور تھے:

❶ محمد اشرف

❷ محمد فرخ۔ ۱۸ سال کی عمر میں قضا کر گئے۔

❸ محمد عیسیٰ۔ ۸ سال کی عمر میں رخصت ہو گئے۔ [خزینۃ الاصفیاء ص ۶۱۰]

آپ کی ذریات طیبات کا یہ حال ہے کہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے پہلی ہی نظر میں ان کو پہچان لیا تھا، اور فرمایا تھا:

"فرزندان آں شیخ کہ اطفال اند اسرار الٰہی اند۔"

صاحب روضۃ السلام کا قول خزینۃ الاصفیاء میں نقل ہے:

"شیخ احمدؒ را دو خارق عظیم بر صفحۂ روزگار باقی اند۔ یکے کتاب مکتوبات و دیگر رسائل مصنفہ وے کہ احدے از مشائخ ایں چنیں معارف وحقائق و مکاشفات خود برملا درج تالیفات خود نہ کردہ است کہ وے فرمود۔ دوم فرزندان گرامی وے کہ بتصرف خود اینان را از روئے علم ظاہر و کمالات باطنی مثل ذات خود ساخت"

[خزینۃ الاصفیاء ص ۶۱۰ جلد ا]

خلفاء

خلفاء کی تعداد بتانی مشکل ہے۔ البتہ مکتوبات کے مطالعہ سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کے برکات مبارکہ صرف حدود ہندوستان میں محدود نہ تھے، بیرون ہند کے بہت سے حضرات ہیں جن کے نام مکتوبات ارسال فرمائے گئے ہیں۔ جہانگیر کی تحریر پہلے گزر چکی ہے کہ ہر شہر اور دیار میں آپ کے خلفاء موجود ہیں۔ چند خلفاء کرام کا ذکر اسی حصہ کے آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے (انشاء اللہ) الکلام المنجی میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسماء گرامی خلفاء کے سلسلہ میں تحریر ہیں جو اپنے زمانہ کے مشہور و معروف علماء اور اکابر اولیاء تھے۔

شیخ حمید بنگالیؒ، شیخ عبدالحیؒ، شیخ نور محمد تغتیؒ، شیخ حزل پوربیؒ، شیخ نور محمد بہاریؒ، شیخ حامد بہاریؒ، مولانا فرخ حسینؒ، سید باقر سارنگ پوریؒ، سید محب اللہ مانک پوریؒ، سید حسین مانک پوریؒ، مولانا شیخ عبدالہادی بدایونیؒ، شیخ طاہر لاہوریؒ، مولانا امان اللہ لاہوریؒ، شیخ طاہر بدخشیؒ، الحاج خضر افغانؒ، مولانا صادق کابلیؒ، مولانا محمد ہاشمؒ (خادم) خواجہ محمد ہاشم برہان پوریؒ، مرشد میرزمان بیگؒ، شیخ فضل اللہ برہان پوریؒ، مولانا حمیدالدین احمد آبادیؒ، حاجی حسینؒ، شیخ داؤد ساکیؒ، مولانا غازی نوگجراتیؒ، میر محمد نعمانؒ اکبرآبادی، خواجہ محمد صدیق کشمی دہلویؒ، شیخ بدیع الدین سہارن پوریؒ، شیخ احمد دیبیؒ (دیوبندی)، شیخ عبدالقادر ابنائیؒ، شیخ محمد مریؒ، شیخ سلیم بنوریؒ، شیخ آدم بنوریؒ، مولانا بدرالدین سرہندیؒ، شیخ خضر بہلول پوریؒ، مولانا محمد یوسف سمرقندیؒ، مولانا عبدالغفور سمرقندیؒ، مولانا محمد صالح کولابیؒ، شیخ کریم الدین باباحسنؒ، ابدالیؒ، الحاج محمد فرغیؒ، مولانا یار محمد قدیم طالقانیؒ، مولانا یار محمد جدیدؒ، صوفی قربان قدیمؒ، صوفی قربان جدید لدکنجیؒ، مولانا قاسم علیؒ، شیخ حسن ترکیؒ، شیخ یوسف برکیؒ، شیخ عبدالرحیم برکیؒ، مولانا صفیر احمد رومی حنفیؒ، شیخ عبدالعزیز نجوی مغربی مالکی یا حنبلیؒ، شیخ علی الحق مالکی مدنیؒ، شیخ زین العابدینؒ، شیخ علی طبری شافعی مکیؒ، شیخ احمد استنبولی حنفی فقیہ حنائی یمنی شافعیؒ، سید مبارک شاہ بخاریؒ، مولانا حسن بخاریؒ، قاضی تولک بخاریؒ، شیخ عیسیٰ مغربی محدثؒ، شیخ محمد مدنیؒ، صاحبزادگان گرامی وغیرہ [الکلام المنجی ص ۳]

تصانیف

(۱) مکتوبات قدسیہ جو درحقیقت علوم و معارف کا بہترین خزانہ ہیں۔ (۲) مبداء و معاد، (۳) معارف لدنیہ، (۴) مکاشفات غیبیہ، (۵) شرح رباعیات عارف باللہ خواجہ محمد باقیؒ، (۶) رسالہ تہلیلیہ، (۷) رسالہ رد روافض، (۸) رسالہ فی اثبات النبوت، (۹) رسالہ بسلسلۂ حدیث وغیرہ۔

باطنی کمالات

مندرجہ بالا عنوان ہمارے لئے بہت دشوار ہے۔ مثل مشہور ہے "قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری"۔ بد قسمتی یہ ہے کہ باطنی کمالات کے نہ ہم بادشاہ ہیں نہ جوہری۔ (۳۰۴)

سراپا ظاہرش نورست وجان ست　　　مپرس از باطنش کان بے نشان ست

مکاشفات وکرامات کو عام طور پر کمالات تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ صوفیاء کرام کی سوانح انہیں چیزوں سے بھری ہوئی ہیں۔

حضرت مجدد صاحبؒ ان چیزوں کو کمالات اصلیہ نہیں تصور فرماتے۔ بلکہ ایک جگہ تو ان کو بچوں کے کھلونے فرمایا ہے۔ ارشاد وتلقین کی کثرت یعنی مریدوں کی بہتات، حلقہ ذکر کی وسعت وفراخی بھی حضرت مجدد صاحب کے نزدیک راستہ کی پڑی ہوئی چیز ہے"۔ دریں ضمن ہر کہ مناسبت دارد فیض خواہد گرفت واللہ

[مکتوب نمبر ۶ جلد دوم ص ۱۶]

عنوان کی دشواری قلم رکھ دینے پر مجبور کر رہی ہے۔ مگر مقصود تصنیف ناتمام رہ جائے گا۔ اگر کچھ بھی ظاہر نہ کیا جائے کہ اسلام کے اس سیاسی جانباز نے روحانیت میں کس قدر بلند درجہ حاصل کیا تھا۔

اسلام سب سے پہلے اپنے پیرو سے کہلواتا ہے:

ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العلمین.

میری نماز، میری تمام قربانیاں، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العلمین کے لئے ہے۔

پھر وہ مقدس تعلیم پیش کرتا ہے جس کی روشنی میں سیاست، اقتصاد، معاشرت، امور خانہ داری، غرض نوع انسان کی زندگی کا ہر شعبہ عبادت بن جاتا ہے، اور پھر یہی شریعت عین طریقت ہوتی ہے۔

اس لئے لازم ہے کہ ایک مومن قانت، پکا اور سچا مسلمان ان جملہ شعبہ جات میں مہارت رکھتا ہو، اور پھر اس مہارت کے بموجب وہ روحانیت اور طریقت میں بھی درجہ بلند اور رتبہ عالی رکھتا ہو۔

تفصیل کرامات، خوارق عادات، تصرفات وغیرہ کو حالات مشائخ نقشبند مقامات وحالات امام ربانی، برکات احمدیہ، حضرات القدس، کنز البرکات وغیرہ کے حوالہ کرتے ہوئے چند اصولی چیزیں درج ذیل ہیں جن سے روحانیت کے سلسلہ میں مراتب حضرت مجدد صاحبؒ کی بلندی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

آیۂ مذکورہ کا حاصل تسلیم ورضا ہے۔ یہی حیات مسلم کا نصب العین ہے اور یہی عبدیت اور بندگی کی حقیقی تفسیر ہے۔ کامل بندہ وہی ہے جو اپنے عجز وقصور، اپنی بے حقیقی، اور اپنی بے بضاعتی کو سامنے رکھ کر خود کو ہیچ در ہیچ تصور کرے۔ پھر یہ تصور، تصوری نہ رہے بلکہ یقین بن جائے۔ حتی کہ اس کا ارادہ، اس کی تمنا وغیرہ ہر ایک چیز فنا ہو جائے۔ صرف ذات حق جل مجدہ اس کے سامنے ہو۔ وہ اُس کا ہو اور اس کے لئے ہو۔ حضرت حق جل مجدہ کا

ارادہ اس کی تمنا ہو۔ مشیت الٰہی اس کی آرزو ہو۔ اپنے ارادہ اور تمنا حتی کہ اپنی ہستی اور اپنے وجود سے وہ اتنا غافل ہو جائے کہ بھولے سے بھی اس کا تصور نہ آئے۔

فناء ارادہ، فناء مراد، فنا تمنا اور فناء فی اللہ کی یہ شان طبیعت پر جبر کر کے پیدا ہوگی۔ یہ تسلیم و رضا کی ابتداء ہے۔ حضرت مجدد صاحب مکتوب ۳۶ جلد اص ۵۰ پر فرماتے ہیں۔

''از جمیع انہا گزشتہ بمقام رضا بید رسید کہ نہایت مقامات سلوک ست''۔ (۳۰۳)

یہ فنائیت عادت ثانیہ بن جائے۔ طبیعت پر جبر و قہر بالکل نہ رہے۔ یہ درجہ بلند ہے، اور اس سے بلند تر درجہ یہ ہے کہ وہ اس کیفیت سے لذت اندوز ہو۔ ارادہ الٰہی کے مقابلہ پر اپنے نامراد ہونے میں اس کو لذت آئے۔ اپنی تمنا سے زیادہ مشیت الٰہی اس کو محبوب ہو۔ ہر ایک اذیت اور تکلیف اُس کو راحت و آرام معلوم ہو۔ یہ درجۂ محبت ہے۔ یہ مرتبہ سب سے بلند ہے۔

حضرت مجدد صاحب مکتوب نمبر ۳۳ جلد دوم ص ۴۸ میں تحریر فرماتے ہیں:

محبوب نظر محبّ میں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حقیقت اور واقع کے لحاظ سے ہر وقت محبوب ہی ہے۔ محبوب ہر ایک حالت میں محبوب ہے۔ اگر تکلیف پہنچائے تب بھی محبوب، راحت دے تب بھی محبوب۔

جو حضرات دولت محبت سے مشرف ہوں، اُن کے خیال میں عموماً انعام اور ایلام دونوں صورتوں میں مساوی طور پر محبت کی زیادتی ہے اور بہت تھوڑے حضرات ہیں جن کے نزدیک اس کا عکس ہے۔

دولت مندان محبت کی بہت مختصر سی جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ انعام و اکرام کے مقابلہ میں تکلیف و ایلام زیادہ محبت بخش ہے۔ بہر حال دولت مندان محبت اپنے محبوب کے متعلق ہر ایک حالت میں بہترین عقیدہ اور بہترین ظن رکھتے ہیں۔ وہ ہر صورت میں کرشمہ ہائے محبت ہی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

گلے پر چھری چلا کر بدن کا ایک ایک عضو جدا کرے، نظر محبّ میں یہ بھی لطف و کرم ہے اور اپنے حق میں عین صلاح اور بہبود۔

جب اس حسن اعتقاد کے حاصل ہو جانے سے نظر محبّ میں فعل محبوب کی کراہت اور ناگواری، لذت و راحت سے بدل جائے تو وہ اب محبت ذاتی کی دولت سے مشرف ہوا۔ جو حبیب رب العلمینؐ کا مخصوص وصف ہے اور صرف آپ کے ساتھ ہی یہ وصف مخصوص ہے۔

اس صورت میں رنج و الم، انعام و اکرام سے زیادہ لذت و فرحت کا سبب ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ یہ مرتبہ رضا سے بلند ہے کیونکہ مرتبہ رضا میں صرف یہ ہے کہ ایذاء و ایلام محبوب پر راضی ہے، یہ ضروری نہیں کہ طبیعت میں ناگواری بھی نہ ہو۔ اور اس مرتبہ میں ناگواری کا تو ذکر ہی کیا، ایذاء و ایلام محبوب میں انعام و اکرام سے بہت زیادہ لطف حاصل ہوتا ہے۔ جانب محبوب سے جس قدر جفا زیادہ ہو، جانب محبّ سے فرح اور سرور زیادہ ہوگا۔ (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اصل مکتوب شریف)

بہر حال روحانی کمالات میں مقام رضا سب سے بلند مقام ہے اور مقام محبت اس سے بھی بلند، جو رحمۃ للعالمین محبوب رب العلمین کا مخصوص وصف ہے۔ یعنی اس کا سرچشمہ صرف ذات اقدس رحمۃ للعلمینؐ ہے۔

حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے مکتوبات جو جیل خانہ سے آپ نے بھیجے ہیں، اُن پر نظر ثانی کرو۔ بالخصوص اس مکتوب شریف کو دیکھو جس کو بجنسہ اصل عبارت (۳۰۴) کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ اور حضرت مجدد صاحب کے بلند ترین مرتبہ اور مقام کا اندازہ کرلو۔

پھر اس کے بعد حضرت مجدد صاحب کا مکتوب نمبر ۶ ص ۱۹ جلد ۲ دیکھو۔ جو بجنسہ درج ذیل ہے اور جس کی شرح اور تفصیل بھی ارباب ذوق کے حوالہ ہے۔

انگارم کہ مقصود از آفرینش من آں ست کہ ولایت محمدی بولایت ابراہیمی علیہما الصلوات والتحیات منصبغ گردد وحسن ملاحت ایں ولایت با جمال صباحت آں ولایت ممتزج شود۔ ورد فی الحدیث اخی یوسف اصبح وانا املح بایں انصباغ وامتزاج مقام محبوبیت محمدیہ بدرجہ علیا رسد مانا کہ مقصود از امر باتباع ملت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام حصول ایں دولت عظمیٰ بودہ است وطلب صلوات و برکات مماثل صلوات (۳۰۵) و برکات حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام از برائے ایں غرض بودہ۔ (پھر بفاصلہ چند سطور) وآنچہ مقصود از آفرینش خودمی دانستم معلوم شد کہ بحصول پیوست ومسئول ہزار سالہ باجابت قرین گشت الحمدللہ الذی جعلنی (۳۰۶) صلۃ بین البحرین و مصلحاً بین الفئتین اکمل الحمد علی کل حال والصلوۃ والسلام علیٰ خیر الانام وعلیٰ اخوانہ المکرام من الانبیاء و الملائکۃ العظام (پھر بفاصلہ چند سطور) اے فرزند باوجود ایں معاملہ کہ تخلقت من مربوط بودہ است کارخانہ دیگر عظیم ہمن حوالہ فرمودہ اند، برائے پیری ومریدی مرانیا وردہ اند ومقصود از خلقت من تکمیل وارشاد خلق نیست، معاملہ دیگر است وکارخانہ دیگر دریں ضمن ہر کہ مناسبت دارد فیض خواہد گرفت والا لا۔ معاملہ تکمیل وارشاد نسبت بآں کارخانہ امرے است ہمچوں مطروح فی الطریق۔ دعوات انبیاء علیہم الصلوۃ والتسلیمات نسبت بمعاملات باطنیہ ایشاں ہمیں حکم دارد ہر چند منصب نبوت ختم یافتہ است، اما از کمالات نبوت و خصائص آں بطریق تبعیت ووراثت کمل تابعاں انبیاء را نصیب است۔ [مکتوب ۶ جلد ۲ ص ۱۹]

مکتوب ۷ جلد دوم ص ۱۷ و ص ۱۸ میں محبت، محبوبیت، محبیت کے فرق مراتب بیان فرمانے کے بعد فرماتے ہیں:

فوق مقام رضا قدمے نیست مگر خاتم الرسل علیہ وعلیہم الصلوۃ والتسلیمات از اں مقام خبر دادہ۔

پھر چند سطر بعد فرماتے ہیں:

جائز ست کہ دراں موطن خاص کہ فوق مقام رضا ست خادمے را از خادمان ایشاں بوراثت وتبعیت

جاد ہند و بطفیل محرم آں بارگاہ ساز نداز کریماں کار ہا دشوار نیست۔ الخ

ان بلند ترین مراتب اور مقامات کی تفصیل موضوع کتاب سے خارج ہے۔ ارباب ذوق مکتوبات شریف نیز مکتوبات حضرت خواجہ محمد معصوم، مکتوبات حضرت مرزا مظہر جان جاناں، الکلام المنجی، زبدۃ المقامات، انوار احمدیہ، ہدیہ مجددیہ، وغیرہ سے ان کی تفصیلات معلوم فرما سکتے ہیں۔

(۲) پہلے گزر چکا ہے کہ حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے طریقۂ چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، نقشبندیہ میں مختلف حضرات سے نسبت حاصل کی تھی۔ اس سلسلہ میں دو چیزیں حضرت مجدد صاحب کے روحانی کمال اور آپ کی روحانی عظمت پر خصوصیت کے ساتھ روشنی ڈالتی ہیں۔

الف: حضرت خواجہ محمد باقی باللہ اویسی نقشبندیؒ جو سلسلۂ نقشبندیہ میں حضرت مجدد صاحب کے شیخ طریقت تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے پیر مرشد حضرت خواجہ امکنکی نے مجھے حکم فرمایا کہ میں ہندوستان پہنچ کر اس سلسلہ عالیہ کو رواج دوں۔

یہ بہت بڑی خدمت تھی جس کا میں اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا تھا۔ چنانچہ میں نے معذرت کی مگر حضرت شیخ نے استخارہ کا حکم فرمایا۔

استخارہ میں مجھے محسوس ہوا کہ ایک درخت کی شاخ پر ایک خوبصورت طوطی بیٹھی ہوئی ہے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ اگر یہ طوطی ہمارے ہاتھ پر آ بیٹھے تو اس سپردشدہ خدمت میں بہت کامیابی ہو۔ اس خیال کا آنا تھا کہ وہ طوطی شاخ درخت سے پرواز کر کے میرے ہاتھ پر آ بیٹھی۔ میں نے اس طوطی کی چونچ میں اپنا لعاب دہن ڈالا، اور اس طوطی نے میرے منہ میں شکر ڈالی۔

صبح کو میں نے اپنے استخارہ کا یہ واقعہ حضرت شیخ خواجہ امکنکی کو سنایا۔ حضرت شیخ نے فرمایا۔ طوطی ہندوستان میں ہوتی ہے لہٰذا تمہیں بہت جلد ہندوستان جانا چاہیے۔ امید ہے کہ ہندوستان میں تمہارے دامن سے ایک عزیز وجود پذیر ہوگا۔ جس سے ایک عالم منور ہو جائے گا اور تمہیں بھی اس سے فائدہ پہنچے گا۔

حضرت خواجہ باقی باللہ فرماتے ہیں کہ جب میں وطن سے روانہ ہو کر ہندوستان میں سرہند پہنچا تو مجھے (نظر کشفی سے) بتایا گیا کہ "ایک قطب کے قریب تم فروکش ہوئے ہو"۔ اس قطب کے حلیہ سے بھی آگاہ کر دیا گیا۔ اگلے صبح کو اس قطب کی جستجو میں سرہند کی تمام گوشہ نشین اور درویش حضرات سے ملاقات کی۔ مگر جن جن حضرات سے ملاقات ہوئی، اُن میں سے نہ کسی کے اندر قطبیت کے آثار و حالات نظر آئے اور نہ اس حلیہ کا کوئی شخص ملا۔ بالآخر یہی خیال کیا کہ شاید اس شہر کا کوئی شخص آئندہ اس مرتبہ کو پہنچ جائے اور اس وقت وہ صرف قابلیت اور استعداد رکھتا ہو۔

اب جب آپ تشریف لائے تو جیسے ہی میں نے آپ کو دیکھا وہ حلیہ یاد آ گیا۔ آپ کو اسی حلیہ کے مطابق پایا اور اس قابلیت کی علامتیں بھی تمہارے اندر موجود ہیں۔

روایت ہے کہ حضرت خواجہ نے یہ بھی فرمایا کہ قیامِ سرہند کے زمانہ میں ہم نے یہ بھی دیکھا کہ سرہند میں ہم نے ایک بہت بڑا چراغ روشن کیا ہے۔ جس کی روشنی بڑھتی جا رہی ہے اور دوسرے آدمی اس چراغ سے بہت سے چراغ روشن کر رہے ہیں۔ یہ بھی آپ کے متعلق ہی اشارہ تھا۔ [۳۰۷] اس کے بعد حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے ایک مکتوب میں اپنے کسی دوست کو تحریر فرمایا:

شیخ احمد نام مردے ست از سرہند، کثیر العلم وقوی العمل روزے چند فقیر با او نشست و برخاست کردہ عجائب بسیار از روزگار اوقات او مشاہدہ نمود، بآں ماند کہ چراغ شود کہ عالمے ازو روشن گردد۔ [۳۰۸] الحمد للہ تعالیٰ [۳۰۹] احوالِ کاملہ او مرا یقین پیوستہ وایں شیخ مشار الیہ برادران و اقربا دارد۔ ہمہ مردم صالح و از طبقۂ علماء چندے را از ماء گوئے ملازمت کردہ۔ جواہر عالیہ دانستہ استعدادہائے عجیب دارند۔ فرزندان آں شیخ کہ اطفال اند اسرارِ الٰہی اند۔ بالجملہ شجرۂ طیبہ ست انبتہ اللہ نباتاً حسناً

اس کے بعد حضرت خواجہ فرمایا کرتے تھے:

شیخ احمد آفتاب است کہ مثل ما ہزاراں ستارہ ہا در سایۂ او گم اند۔ [۳۱۰]

(ہدیہ مجددیہ ص ۸۶ حالات مشائخ نقشبندیہ، مقاماتِ امام ربانی وغیرہ)

حضرت خواجہ نے سلسلۂ ارشاد و تلقین حضرت مجدد صاحب کے حوالہ فرما دیا تو فرمایا کرتے تھے:

امروز در زیر فلک از نیاکافۂ علیہ چوں ایشاں نیست۔ ایشاں از مکمل مراداں و محبوباں اند۔ ایشاں قطب اند۔ بعد از صحابہ مثل تابعین و مجتہدین چوں ایشاں معدودے چند از اخص الخواص منظور می آیند۔ ما دریں سہ چہار سال شیخی نہ کردیم۔ چند روز بازی کردیم۔ الحمد للہ والمنۃ کہ ایں بازی دریں دکان پردازی ما بے فائدہ نشد کہ چوں ایشانے بروئے کار آمد۔ [۳۱۱] (مقاماتِ امام ربانی ص ۳۹)

صرف یہی نہیں بلکہ:

شیخ باقی باللہ ہمہ مریداں و احباب و اصحاب خود را برائے توجہ و تکمیل حوالہ وے مے فرمود و خود ہم برائے استفادہ در محفل توجہ وے تشریف مے آوردوے فرمود کہ شیخ احمد آفتابے ست کہ ہر دو عالم از فیض افضل وے منور است [۳۱۲] (خزینۃ الاصفیاء ص ۶۰۹ ج ۱)

حضرت خواجہ نے ایک مکتوب حضرت مجدد صاحب کے نام ارسال فرمایا۔ مکتوب کے مطالعہ سے حضرت مجدد صاحب کے مرتبہ عالی کے ساتھ حضرت خواجہ کے بے نظیر اور سبق آموز انکسار و تواضع کا اندازہ ہوتا ہے۔

مکتوب گرامی کا پہلا جملہ ہے:

مدتے ست کہ عرض نیاز مندی بدرگاہ و ولایت نہ کردہ ام۔ [۳۱۳]

دو سطر میں مضمون مکتوب ہے۔ اس کے بعد آخری فقرہ یہ ہے:

دیگر چہ نویسم سخن درویشاں بحضرت شما نوشتن بغایت بے شرمی ست حکایت اوضاع صوفیہ بغایت

بے جا۔ الغرض مارا حد خود باید دانست واز فضول احتراز باید کرد (۳۱۴) [مقامات امام ربانی ص ۳۹]
شاہزادہ دارا شکوہ نے اپنے اور شاہجہاں کے استاد ملا شیخ میرک ابن فصیح الدینؒ کا ایک طویل واقعہ بیان کیا ہے۔
اس کے آخر میں ملا میرک شاہ صاحب فرماتے ہیں:
ہر چہار سوال کہ در خاطر من خطور کرد، شیخ احمد جواب آں وافی وکافی داد پس معتقد و مرید شدم (۳۱۵)
مولانا عبدالحکیم صاحب سیالکوٹیؒ (۳۱۶) جو مشہور و معروف جلیل القدر عالم ہیں ابتدا میں حضرت مجدد صاحب کے مخالف تھے۔ ایک روز حضرت مجدد صاحب کو خواب میں دیکھا کہ آپ نے مولانا عبدالحکیم صاحب کو مخاطب فرما کر یہ آیت پڑھی۔

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ . کہو اللہ پھر ان کو چھوڑ دو۔

اس آیت کے سنتے ہی حضرت شیخ کا جذب اور شوق الٰہی دل میں جگہ کر گیا اور فوراً قلب سے ذکر جاری ہو گیا۔ جب خواب سے بیدار ہوئے تو دیکھا کہ قلب ذکر میں جاری ہے۔ اس کمال وتصرف کو دیکھ کر ساری مخالفت ختم ہو گئی۔ حضرت مجدد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ باقاعدہ سلسلہ میں داخل ہوئے اور روحانی کمالات حاصل کئے۔

علماء ہندوستان میں سب سے پہلے مولانا موصوف نے ہی حضرت شیخ احمد صاحب کو مجدد الف ثانی لکھا ہے۔ [خزینۃ الاصفیاء ص ۶۱۲، الکلام المنجی وغیرہ]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب حضرت مجدد صاحب کے مناقب ومحامد تحریر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

لایحبه الا مؤمن تقی، ولا یبغضه الا منافق شقی.

مومن پرہیزگار آپ سے محبت کرتے ہیں اور بدبخت منافق آپ سے بغض رکھتے ہیں۔ (۳۱۷)
سید انکونینؐ نے آپ کو بشارت دی کہ تم علم کلام کے مجتہد ہو۔ (۳۱۸) شیخ بدرالدین صاحب خلیفہ حضرت مجدد صاحب مصنف القدس فرماتے ہیں ایک روز حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت سے میں مشرف ہوا۔ میں نے عرض کیا۔ حضرت والا! مجھے اپنی نسبت سے بہرہ مند فرمائیں۔ حضرت خواجہ نے جواب دیا تم نے ایسے شخص سے نسبت حاصل کی کہ اس کی رہنمائی تمہارے لئے بھی کافی اور سارے عالم کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ (۳۱۹)
جمع الجوامع میں علامہ سیوطیؒ نے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

یکون فی امتی رجل یقال له صلة یدخل الجنة بشفاعته کذا و کذا من الناس.

میری امت میں ایک شخص ہوگا۔ جس کو صلہ (جوڑنے والا) کہا جائے گا اس کی شفاعت سے بیشمار آدمی جنت میں داخل ہوں گے۔

شیخ بدرالدین قدس اللہ سرہ العزیز کتاب مذکور میں فرماتے ہیں کہ ہمارا خیال ہے کہ اس بشارت کے مصداق حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز ہیں۔

حضرت مجدد صاحب نے خود بھی یہ لفظ ایک مکتوب میں استعمال فرمایا ہے۔ الحمد لله الذي جعلني صلة بين البحرين ومصلحا بين الفئتين۔ (خدا کا شکر ہے جس نے مجھے دو سمندروں میں صلہ (وصل پیدا کرنے والا) اور دو جماعتوں میں صلح قائم کرنے والا بنایا ہے)۔

چنانچہ صوفیاء کرام کی دو جماعتیں یعنی علماء شریعت اور صوفیاء کرام (جو وحدت الوجود کے قائل ہیں) ان دونوں جماعتوں کے افتراق کو جو اس مسئلہ کے متعلق عرصہ سے چلا آرہا تھا، پیوند صلح سے جوڑ دیا۔[۳۴۰]

جملہ مشائخ طریقت کی جانب سے عطیۂ خلافت اور سلسلۂ قادریہ میں تکمیل کمل

حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز حلقۂ مریدین میں مراقبہ میں مشغول ہیں۔ حضرت شاہ سکندر صاحب[۳۴۱] نبیرہ حضرت شاہ کمال صاحب کیتھلی قدس اللہ سرہما[۳۴۲] حاضر ہوتے ہیں اور ایک خرقہ حضرت مجدد صاحب کے دوش مبارک پر ڈال دیتے ہیں۔

حضرت مجدد صاحب مراقبہ سے فارغ ہوئے۔ حضرت شاہ سکندر صاحب کو تشریف فرما پایا۔ کھڑے ہوئے، معانقہ کیا اور اعزاز و اکرام سے بٹھایا۔

حضرت شاہ سکندر صاحبؒ نے فرمایا۔ یہ خرقہ جو دوش مبارک پر ڈالا ہے، وہ مبارک جبہ ہے جو حضرت شیخ المشائخ حضرت شاہ عبد القادر جیلانی قدس سرہ العزیز کی یادگار ہے جو ہمارے ہاں پشتہا پشت سے چلا آرہا ہے۔ حضرت جد امجد (شاہ کمال کیتھلی) نے وفات کے وقت میرے حوالہ کر کے فرمایا تھا کہ یہ امانت ہے، اس کو اپنے پاس رکھو، جس کو ہم بتائیں گے اس کو دے دینا۔

کچھ عرصہ سے حضرت جد امجد مجھے تاکید فرما رہے تھے کہ یہ جبہ جناب کے حوالہ کر دوں۔ میری طبیعت نہیں چاہتی تھی کہ اس گراں قدر دولت کو اپنے پاس سے جدا کروں۔ مگر جب روح مبارک حضرت جد امجد قدس سرہ کا اصرار زیادہ بڑھا حتی کہ عدم تعمیل کی صورت میں مجھ کو دھمکایا بھی گیا تو چار و ناچار اس امانت کو خدمت اقدس میں پیش کر رہا ہوں۔

حضرت مجدد صاحب خرقہ مبارک زیب تن فرما کر خلوت میں تشریف لے جاتے ہیں۔ دل میں خیال گزرتا ہے کہ یہ مشائخ کرام پہلے مجھے معنوی خلیفہ بناتے، پھر خرقہ عنایت ہوتا تو موزوں تھا۔ فوراً دیکھتے ہیں کہ حضرت شیخ المشائخ شاہ عبد القادر جیلانی قدس اللہ سرہ اپنے جملہ خلفاء حتی کہ حضرت شاہ کمال کیتھلی قدس اللہ سرہ کے ساتھ رونق افروز ہیں۔ مقدس روحوں کا اجتماع عظیم ہے۔ حضرت شیخ المشائخ نے خلعت معنوی عطا فرمایا یعنی اپنی نسبت سے مالا مال کر دیا۔

حضرت مجدد صاحب کے دل میں خیال گزرتا ہے کہ میری تربیت مشائخ نقشبند نے فرمائی ہے لہذا میں انہیں بزرگوں کا ہوں۔ آج مجھے سلسلۂ قادریہ کی نسبت عطا کی جا رہی ہے۔ اس تصور کے ساتھ ہی دیکھا کہ

حضرت عبدالخالق غجدوانی قدس اللہ سرہ العزیز سے لے کر حضرت خواجہ باقی باللہ تک جملہ مشائخ نقشبند تشریف لے آئے۔ حضرت خواجہ نقشبند علیہ الرحمۃ حضرت خواجہ شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کے برابر تشریف فرما ہوئے اور اب آپس میں گفتگو شروع ہوئی۔

مشائخ نقشبند نے فرمایا۔ شیخ احمد ہماری تربیت سے کمال و تکمیل کو پہنچے۔ آپ خواہ مخواہ ان پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔

اکابر قادریہ اور حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ العزیز نے جواب دیا۔

شیخ احمد نے اول چاشنی ہمارے خوان سے چکھی ہے۔ (۳۴۳)

اس بحث میں حضرات چشتیہ، کبرویہ اور سہروردیہ بھی تشریف لے آئے اور چونکہ حضرت مجدد صاحب نے ابتداء میں اپنے والد ماجد سے ان سلسلوں میں نسبت حاصل کی تھی لہٰذا ان سب حضرات نے بھی اپنے اپنے دعوے پیش کر دیئے۔

ان تمام حضرات کی گفتگو جاری تھی کہ حضرت رسالت پناہؐ کی تشریف آوری ہوئی۔ آپ نے فیصلہ فرمایا کہ چونکہ شیخ احمد کی تکمیل سلسلہ نقشبندیہ میں ہوئی ہے لہٰذا اسی کو رواج دیں، اور باقی دیگر سلسلوں کی نسبت بھی القا کر دی جائے۔

یہ سلسلہ صبح سے جاری ہو کر ظہر کے قریب ختم ہوا۔ حضرت مجدد صاحب ظہر کے وقت تک مراقبہ میں مشغول رہے۔ (۳۴۴)

سرورِ کائنات فخرِ موجوداتؐ کی جانب سے سندِ تکمیل

درحقیقت اصل سند حضورؐ کے آداب وسنن کا مکمل اتباع ہے۔ یہ اتباع جس قدر مکمل ہو، سندِ تکمیل اتنی ہی بہتر اور بالا ہوگی۔ بقول حضرت مجدد صاحب رسول اللہؐ کی ہر ایک سنت ٹکسالی سکہ ہے جو بارگاہ رب العٰلمین میں منظور بلکہ محبوب و مقبول ہے۔

جو شخص اس ٹکسالی دولت سے بہرہ مند ہو، وہ یقیناً بارگاہ رب العزت میں اعلیٰ ترین قبولیت حاصل کرے گا، اور بجا ہوگا کہ اس کے پیروؤں اور معتقدوں کا درجہ بھی خدا کے نزدیک مقبول ہو۔ کیونکہ پیروی کا مفہوم یہی ہے کہ وہ بھی آداب وسنن رسول اللہؐ کی اتباع کو وظیفۂ زندگی بنا چکا ہو۔

اتباع سنت رسول اللہؐ کے باعث حضرت مجدد صاحب نے جو مراتب حاصل کئے ان کا کچھ تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ اب آخری شرف ملاحظہ ہو۔

شیخ محمد نعمان جو حضرت مجدد صاحب کے جلیل القدر خلیفہ ہیں۔ فرماتے ہیں۔ ایک روز رسول اللہؐ کی زیارت سے مشرف ہوا۔ حضرت صدیق اکبرؓ آپ کے ہمراہ ہیں۔

سرورِ کائنات نے صدیق اکبرؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا نعمان سے کہہ دو۔ جو شیخ احمد کے نزدیک مقبول ہے وہ ہمارے نزدیک اور حضرت حق جل مجدہ کے نزدیک مقبول ہے۔ اور جو اُن کے نزدیک مردود ہے وہ ہمارے اور حضرت باری تعالیٰ کے نزدیک بھی مردود ہے [خزینۃ الاصفیا، جلد ۲، ص ۶۱۰]

حضرت مجدد صاحب خود تحریر فرماتے ہیں:

ایک روز مراقبہ میں رسول اللہؐ کی زیارت سے مشرف ہوا سرورِ کائنات نے ارشاد فرمایا۔ میں تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں کہ تمہارے لئے ایک اجازت نامہ لکھ دوں جو آج تک کسی کے لئے نہیں لکھا۔ (۳۲۵) نیز سرورِ عالم نے ارشاد فرمایا:

''جس جنازہ پر تم نماز پڑھ دو گے، اس میت کو بخش دیا جائے گا''۔ (۳۲۶) [خزینۃ الاصفیا، ص ۲۰۸]

حقیقت یہ ہے کہ جس نے خود کو خدا اور رسول کے حوالہ کر دیا، اس کی جس قدر ناز برداری ہو کم ہے۔

من كان لله ، كان الله له . (۳۲۷)

رب اشعث اغبر لو اقسم على الله لابره (او كما قال) (۳۲۸)

یہ ہے مبارک نتیجہ اس مقدس نصب العین کا کہ:

إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ . (۳۲۹)

بہرحال اس قسم کے کمالات بہت ہیں۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں ‏ ‏ بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچنیں باقی

عمر بگذشت و حدیث درد ما آخر نشد
شب (۳۳۰) آخر شد کنوں کوتہ کنم افسانہ را

حضرت کی مجددیت (۳۳۱)

آپ سے پہلے صدی کے مجدد ہوا کرتے تھے۔ (۳۳۲) الف کا مجدد کوئی نہیں ہوا۔ الف ثانی کا آغاز ہی نہ ہوا تھا۔ اور الف اول میں خود ذات اقدس واطہر، سید البشرؐ کی سوجود تھی۔ آپ سے پہلے جس قدر مجدد صدیوں کے گزرے ہیں، کوئی مجدد دین کے تمام شعبوں کا مجدد نہیں ہوا۔ بلکہ خاص خاص شعبوں کے مجدد ہوتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایک وقت میں متعدد مجدد نظر آتے ہیں۔ (۳۳۳) کوئی علم حدیث کا، کوئی فقہ کا۔ پھر اس میں بھی کوئی فقہ حنفی کا مجدد ہے، کوئی شافعی کا۔ اور کوئی سلوک واحسان کا۔ (۳۳۴) لیکن یہ چیز اللہ تعالیٰ نے آپ ہی کے لئے مخصوص رکھی کہ آپ دین کے تمام شعبوں کے مجدد ہیں۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ آپ سے پہلے کے مجددین کو سید الانبیاءؐ کی نیابت خاص خاص چیزوں میں حاصل تھی، اور آپ کو تمام چیزوں کی نیابت عامہ تامہ حاصل تھی و شتان ما بینهما۔ اب سے پہلے مجددین کی خدمت کا اثر صرف ایک صدی کے لئے ہوتا تھا اور

آپ کی مجددیت ایک ہزار سال کے لئے ہے۔ آپ کے سوا دوسرے مجددین کی مجددیت نہ معلوم امت کے کتنے لوگوں کے علم میں نہ آئی اور نہ معلوم کتنوں کی مختلف فیہ رہی۔ جو اختلاف کہ معاندانہ یا معاصرانہ ہو، بیشک وہ قابل لحاظ نہیں، (۳۳۵) مگر جو اختلاف شرائط مجددیت کے پائے جانے یا نہ پائے جانے کی وجہ سے ہو، وہ بیشک قابل لحاظ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت امام ربانی کی مجددیت کو ان چیزوں سے بھی محفوظ رکھا، آپ کی مجددیت کا تمام اُمت کو دنیا کے ہر گوشہ میں علم ہوا، اور جو لوگ اس معاملہ میں اہل حل و عقد ہو سکتے تھے، اُن سب نے آپ کی مجددیت کو تسلیم کر لیا۔ بلکہ جو لوگ بدعات کی محبت یا اپنی سرد بازاری کے خیال سے آپ سے عناد رکھتے تھے وہ بھی مجبور ہوئے (۳۳۶) کہ زبان سے آپ کے مجدد ہونے کا اقرار کریں۔ جس طرح مذہب شیعہ کی بنیاد قرآن مجید کی عداوت پر ہے۔ کوئی شیعہ ایسا نہیں ہو سکتا جس کے دل میں قرآن مجید سے دشمنی اور نفرت نہ ہو۔ مگر قرآن مجید کا رعب یہ ہے کہ اپنے کو مسلمان کہنے کے بعد قرآن مجید سے دشمنی کا اظہار کرنے کی جرأت نہیں ہوتی بلکہ ضمیر کے خلاف زبان سے اقرار بغیر مفر نہیں۔ قریب قریب بفضلہٖ تعالیٰ وانعامہ یہی حالت حضرت امام صاحب ربانی کی ہے۔

آپ کی مجددیت کے بیان میں ایک مستقل اور بے نظیر کتاب تالیف ہو چکی ہے جس کا نام شواہد التجدید ہے۔ جس کا ایک قلمی نسخہ بھوپال کی خانقاہ عالیجاہ مجددیہ میں موجود ہے۔

مجدد کے لئے یہ کچھ ضروری نہیں کہ اس کو اپنے مجدد ہونے کا علم ہو۔ مگر حضرت امام ربانی کو اپنے مجدد ہونے کا علم علیٰ وجہ الکمال تھا۔ جیسا کہ بعض مکتوبات میں خود تحریر فرماتے ہیں۔ خصوصیت سے ملاحظہ ہو مکتوب نمبر ۴ جلد ۲ ص ۱۴۔ مجدد کی سب سے بڑی پہچان اُس کے کارنامے ہیں۔ حمایت دین، اقامت سنت اور ازالۂ بدعت میں اس کی خاص شان ہوتی ہے۔ غیر معمولی کوشش اُس سے ظہور میں آتی ہے۔ اور اس کی کوشش کا غیر معمولی نتیجہ توقع سے بہت زائد نکلتا ہے۔

حضرت امام ربانی نے کیسی کیسی کوششیں مذکورہ بالا خدمات کے لئے کیں۔ اور کیسا انہماک اور کیسا شغف آپ کو اس میں تھا۔ پھر اُن کوششوں پر کیسے غیر معمولی ثمرات توقعات سے بدرجہا زائد مرتب ہوئے۔

گزشتہ اوراق سے کسی قدر اندازہ ان تمام چیزوں کا ہوتا ہے اور آئندہ اوراق میں حضرات خلفاء کی خدمات سے مزید اندازہ ہوگا۔ انشاء اللہ۔

توضیح مجدد

حضرت مجدد صاحب کے حالات و کمالات کا تذکرہ گزر چکا۔ عقیدۂ مجدد کے متعلق بھی خطبۂ شوقیہ کا اقتباس پیش کیا جا چکا۔

اس موضوع پر حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا مضمون یقیناً اس کا مستحق ہے کہ تصنیف ہذا کو اُس سے سعادت اندوز کیا جائے لہٰذا بعینہٖ درج ہے۔ (۳۳۷)

مجدد الف ثانیؒ

حضرت مجدد صاحبؒ کی تاریخی حیثیت سے کتنی ہی طویل و عریض سوانح لکھ لی جائے لیکن ساری سوانح حیات کی وہ روح جس سے اُن کی ذات گرامی دنیا میں آفتاب بن کر چمکی اور آج بھی اپنے اندر وہی جذب مقناطیسی کا اثر رکھتی ہے۔ صرف ایک ہی صفت جمیلہ ہے جو اُن کے اس لقب مجدد سے نمایاں ہے۔ کسی ذات کا مجدد مان لینا اُس کے غیر معمولی کمالات علمیہ و عملیہ کا اقرار کر لینا ہے۔ کیونکہ تجدید دین کا منصب اصلی تو انبیاء کا ہے اور پھر اس میدان کے مرد وہ ہیں جو نبوت کے ترکہ کے وارث بن کر اُس سے کوئی غیر معمولی حصہ پائیں۔ پس جس طرح کسی ذات کو نبی مان لینے سے اُس کے لئے تمام بشری کمالات کا اقرار خود بخود لازم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کسی کو مجدد تسلیم کر لئے جانے سے اس میں وراثت نبوت کے غیر معمولی حظوظ کا اعتراف بھی خود بخود ہی لازم ہو جاتا ہے۔

منصب نبوت سے عہدۂ مجددیت کی اس نسبت کا ہی یہ اثر ہے کہ جس طرح انبیاءؑ کو یہ منصب جلیل کسی اپنی شخصی جدوجہد یا کسی اجتماعی اور جماعتی تجویز سے نہیں ملتا، اسی طرح مجددوں کو بھی عہدۂ تجدید نہ اُن کی اپنی ذاتی جانفشانی و محنت سے ہاتھ لگتا ہے نہ کسی جماعت کے کہنے سننے سے۔ بلکہ یہ محض من اللہ ایک موہبۂ عظمیٰ ہوتی ہے جس کے لئے غیبی انتخاب سے افراد چن لئے جاتے ہیں۔ اور مخلوق کے دلوں میں ان کی مقبولیت خود بخود قائم کردی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح قرآن کریم نے انبیاء کرام کے لئے بعثت من اللہ کا لفظ استعمال کیا ہے جیسے ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یا جیسے حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا یا جیسے بَعَثْنَا اِلَیْھِمْ رُسُلًا وغیرہ۔

ٹھیک اسی طرح حدیث نبوی نے مجددوں کے لئے بھی یہی بعثت من اللہ کا کلمہ اختیار کیا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا (مشکوٰۃ)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر صدی کے آغاز میں اس اُمت میں ایسے لوگوں کو مبعوث کرتا ہے جو اُمت کے لئے دین کی تجدید کریں۔

اور جیسے قرآن نے نبی کا انتخاب من اللہ بتایا ہے اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ۔ ایسے ہی اس حدیث میں مجدد کی نسبت بھی ان اللہ یبعث فرمایا گیا ہے۔ جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان دونوں منصبوں کا انتخاب من جانب اللہ ہی ہوتا ہے۔

فرق اگر ہے تو یہ کہ نبوت اصل ہے اور تجدید اس کا ظل ہے۔ وہاں الہام قطعی ہے جس کو وحی کہتے ہیں، یہاں ظنی ہے۔ اُس کا منکر خارج از اسلام ہے، اس کا منکر خارج از صلاح و تقویٰ ہے۔ بہر صورت مجددیت، نبوت کا ایک نہایت روشن اور درخشاں پرتو ہے۔ اس لئے مجدد علم و عمل کے لحاظ سے نبی کا سایہ اور اخلاق و ملکات

کے لحاظ سے نبی کا نمونہ ہوتا ہے۔ پس مجدد کہہ لینے کے بعد کسی اور منقبت کا درجہ ہی باقی نہیں رہتا کہ اس کے ذریعہ مجدد کی تعریف کی جائے۔ اور اگر کی جائے گی تو وہ اسی وصف تجدید کی ایک تفصیل ہوگی جس کا متن لفظ مجدد ہوگا۔ پس اگر حضرت مجدد صاحبؒ "مسلمہ مجدد ہیں اور ضرور ہیں تو اُن کی ہمہ منقبت یہی ہے کہ وہ مجدد ہیں اور "الف ثانی کے مجدد" ہیں۔ ہم کو الف ثانی کی تجدیدی خصوصیات کا سراغ لگانے کے لئے یہ نکتہ بطور معیار ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے کہ چونکہ منصب تجدید، منصب نبوت کا پورا پورا ظل اور اُس کے قد و قامت کا سایہ اصلی ہے۔ اس لئے شئون تجدید بھی شئون نبوت سے ملتی جلتی ہیں۔ انبیاءؑ باوجود جامع کمالات ہونے کے کمال غالب وہی لے کر آتے ہیں جس کی اس دور کو ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے تمام اصلاحی پروگرام میں غلبہ اور زور اسی اصلاحی نقطہ کا زیادہ ہوتا ہے جو اس زمانہ کے مخصوص مفاسد کے مٹانے میں مؤثر ہو۔

قوم عاد تمدن کی گہرائیوں میں پھنس کر اُونچی اُونچی بلڈنگیں اور عظیم الشان سنگین عمارتیں تیار کرنے میں ہمہ تن لگ کر دین اور دیانت کو خیرباد کہہ چکی تھی اس لئے حضرت ہودؑ نے بھی تقویٰ وغیرہ کے عام اصلاحی خطاب کے ساتھ خصوصیت سے جو خطاب کیا ہے۔ وہ وہی تھا جو اس تمدنی غلو و افراط کے استیصال کے لئے تھا۔ چنانچہ فرمایا:

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ.

کیا تم ہر اُونچے مکان پر ایک یادگار کے طور پر بے ضرورت عمارت بناتے ہو اور بڑے بڑے محل تیار کرتے ہو جیسے تم کو دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے اور جب کسی پر دار و گیر کرتے ہو تو بالکل ظالم اور جابر بن کر دارو گیر کرتے ہو۔

قوم ثمود نے اپنے اوقات، دنیا کی سرسبزیوں، چمن بندی کے نظر فریب مناظر اور پہاڑی بلڈنگوں کی دلکش سینریاں مہیا کرنے میں صرف کر رکھے تھے۔ جس سے وہ خدا اور رسول سے بے گانہ محض بن گئے تھے۔ اسی لئے صالحؑ نے اپنے پروگرام میں عنایت حصہ ان ہی امور پر نکتہ چینی کرنے اور انہیں کی اصلاح کا رکھا۔ فرمایا:

اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَا اٰمِنِيْنَ ۝ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ وَّزُرُوْعٍ وَّ نَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ۝ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ۝

کیا تم کو اسی دنیا کی چیزوں میں بے فکری سے رہنے دیا جائے گا یعنی باغوں اور چشموں میں اور کھیتوں اور ان کھجوروں میں جن کے گچھے خوب گندھے ہوئے ہیں، اور کیا تم پہاڑوں کو تراش کر اتراتے ہوئے مکان بناتے رہو گے۔

قوم لوط میں لواطت اور اغلام کے جراثیم پھیلے ہوئے تھے تو انہوں نے عام اصلاح کے ساتھ خصوصی اصلاح اس مرض کی فرمائی اور اسی پر قوم کو زیادہ للکارا۔ فرمایا:

اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ط بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ۝

کیا تمام دنیا جہان والوں میں سے تم یہ حرکت کرتے ہو، اور تمہارے پروردگار نے تمہارے لئے جو بیویاں پیدا کی ہیں ان کو نظر انداز کئے رہتے ہو۔ اصل یہ ہے کہ تم حدِ انسانیت سے نکل جانے والے ہو۔

اصحاب الایکہ ناپ تول کی خیانت میں مبتلا تھے تو حضرت شعیبؑ نے اس کی اصلاح کو اپنا غالب پروگرام قرار دیا، اور خصوصیت سے فرمایا:

وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ إِنِّيٓ أَرَىٰكُم بِخَيْرٍ وَإِنِّيٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٍ

اور تم ناپ تول میں کمی مت کرو۔ میں تو تم کو فراغت کی حالت میں دیکھ رہا ہوں۔ اور مجھ کو تم پر ایسے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے جو مصائب کا جامع ہوگا۔

قوم نوح نے خدائی طاقتیں پتھر کی سورتیوں اور مٹی کے ڈھیروں میں مان رکھی تھیں۔ حضرت نوحؑ نے زیادہ تر حصہ ان ہی معبودان باطل کی کمزوریوں کے اظہار و اثبات میں صرف فرمایا۔ اور کہا کہ:

إِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُم مَّقَامِي وَتَذْكِيرِي بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ فَعَلَى ٱللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوٓاْ أَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ ٱقْضُوٓاْ إِلَيَّ وَلَا تُنظِرُونِ

(سورہ یونس۔ آیۃ ۷۱)

تم کو نصیحت کرنا گراں معلوم ہوتا ہے تو میرا تو اللہ پر بھروسہ ہے۔ تم اپنا کام پوری قوت سے کرو، اور اپنے شرکاء کو بھی بلالو، اور جو کرنا ہو، دل کھول کے کرو اور میرے حق میں جو کر گزرنا ہو، کر گزرو، اور مجھے کوئی مہلت نہ دو۔

بہر حال قوموں میں جن روحانی مفاسد اور باطنی امراض کا غلبہ رہا ہے اسی قسم کے خصوصی معالجات لے کر انبیاء مبعوث ہوئے ہیں۔ پھر یہی وجہ ہے کہ ہر ایک نبی نے اپنی قوم کو اس کی ذہنیت کے مناسب اپنے اعجازی دلائل بھی دکھلائے ہیں قبطیان مصر میں سحر و ساحری کا زور تھا جو سانپ بچھو بنا کر لوگوں پر اپنا رعب قائم کرتے تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہ عصا دکھلایا جس نے اژدھا بن کر سارے ہی مصنوعی سانپوں کا خاتمہ کر دیا۔

قبیل میلاد عیسوی بنی اسرائیل کی بھیڑ بکریوں میں طب اور علاج کی بجوبہ سازیوں کا زور شور تھا تو حضرت عیسیٰؑ دم مسیحائی حتیٰ کہ احیاء موتیٰ لے کر تشریف لائے۔ جو سارے علاجوں کی غایت (صحت) سے بھی آگے کی چیز ہے۔

قوم ثمود میں کوہ تراشی یعنی پہاڑوں کو تراش کر عمارت بنانے اور گویا پتھروں کو موم کی طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دینے کی استعداد بہت زیادہ تھی۔ تو ایک اونٹنی کو معجزہ اور علامت عذاب کے طور پر پیدا کیا گیا مگر اس طرح کہ پتھروں کی چٹانوں سے بغیر نر و مادہ کے پتھر پھوڑ کر ایک دم نمایاں ہوگئی۔

عرب جاہلیت میں فصاحت و بلاغت کا زور شور تھا، تو حضرت خاتم النبیینؐ کو بڑا معجزہ بھی علمی معجزہ دیا گیا

جس نے سارے عالم کی فصاحت و بلاغت کو مات دے دی اور فصیحوں کو تھکا کر عاجز کر دیا۔

غرض نبیٔ وقت قوم کی ذہنیت ہی کے مناسب خوارق بھی لاتا ہے اور اسی کے امراضِ باطنی کے مناسب اصلاحی پروگرام بھی پیش کرتا ہے۔

چونکہ مجددیت، نبوت کا اصل ظل ہے، اس لئے اُمت محمدیہ کے مجددوں کو بھی وہی شان دی گئی ہے جو انبیاء سابقین کو عطا ہوئی تھی۔ اُمت میں قرون اور ادوار گزرتے رہنے سے جس جس قسم کے فتن ظہور کرتے رہے، اسی قسم کے اصلاحی طریق لے کر مجددین اُمت بھی مبعوث ہوتے رہے۔ اگر کسی وقت میں دیانت کی کمی ہوئی تو مجدد دیانت آئے جنہوں نے شعار دیانت برپا کئے۔ اگر دیانت ہوتے ہوئے نظام ملت کبھی زیادہ پراگندہ ہوگیا تو ایسے ہی مجدد آئے، جنہوں نے اپنے حلقۂ اثر کو باہم شیر و شکر کر دیا۔ اگر کبھی نفوس میں اخلاقی کدورت اور زنگ لگ گیا تو ایسے ہی مجدد آئے جنہوں نے اخلاق کا تزکیہ کر کے نفوس کو مجلی اور مصفی کر دیا۔ اگر اُمت کبھی ریاضت کشوں کے خوارق پر مفتون ہوئی تو ایسے ہی مجدد آئے جنہوں نے اپنے خوارق و کرامات سے ہر شعبدہ باز کے کرشموں کا طلسم توڑ کر رکھ (۳۴۸) دیا۔ غرض یوں سمجھنا چاہئے کہ انبیاء سابقین میں نبوت کی جس جس رنگ کی نسبتیں تھیں، اتنی ہی اور اسی رنگ میں ولایت کی نسبتیں اُمت کے مجددوں کو عطا فرمائی گئیں تا کہ اُمت کے ہر طبقہ کی اصلاح اس کے مناسب طرق سے ہو۔

الف ثانی کا آغاز اُمت کے حق میں تمام اگلے اور پچھلے فتنوں کا فتح باب تھا۔ کیونکہ نبی کریمؐ نے اُمت کی خیریت ختم ہو جانے کے متعلق دو مدتوں کی اطلاع دی تھی۔ ایک یہ کہ میری اُمت کی عمر پانچ سو سال ہے یا پانچ سو سے کم نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اُمت کی عمر ہزار سال ہے جیسا کہ ذخیرہ روایات میں دونوں حدیثیں موجود ہیں۔ پانچ صدی گزرنے پر فتنۂ تتار کا ظہور ہوا جس نے حقیقتاً اُمت کی خیریت ہی نہیں، سرے سے اُمت ہی کو ختم کر دیا تھا۔ گویا عالم سے مسلمانوں کا، اور اُن کی شوکت و قوت کا استیصال ہو چکا تھا۔ مگر حافظ حقیقی نے انجام کار خود تاتاریوں ہی کے قلوب کو اسلام قبول کرنے پر جھکا دیا۔ جنہوں نے خلافت عثمانیہ (ترکی) کی بنیاد رکھی، خود اسلام کی وکالت شروع کر دی، اور اس کے معین و مددگار بن گئے۔ اقبال نے خوب کہا تھا۔ ع

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانہ سے ۔۔۔ پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے

درحقیقت قصر خلافت ہی نہیں بلکہ قصر اُمت کا ایک نیا سنگِ بنیاد تھا۔ پس حضورؐ پر فتنۂ تتار منکشف ہوا جو پانچ صدی گزرنے پر ظاہر ہوا۔ اس لئے پہلی حدیث میں آپ نے اُمت کی عمر پانچ سو سال ارشاد فرمائی۔ چھٹی صدی سے گویا اُمت کی نئی تعمیر ہوئی، اور اس کے علوم و کمالات کے نشر و اشاعت کا ایک جدید اور بہترین دور شروع ہوا۔ عراق و خراسان میں خصوصاً اور مدرسہ ہائے اسلامی میں عموماً لاکھوں کی تعداد میں یکتائے روزگار فضلاء، فقہاء، علماء، صوفیاء اور اکابر اُمت اُٹھے، اور دین کو از سرِ نو زندہ کر کے پاکیزہ پاکیزہ لباسوں میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ علوم و کمال کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا اور دشمنانِ حق کی نگاہوں کو خیرہ کرنے لگا۔ مصر، شام،

خراسان وعراق، ادھر دوسرے عجمی ممالک اسلامی شوکتوں سے مالا مال تھے۔ کسی غیر کی مجال نہ تھی کہ اسلام کے رعب افزا چہرہ کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھ سکے۔ رفتہ رفتہ پانچ صدی کا دوسرا دور ختم ہونے لگا تو اُمت میں انحطاط کا نیا دور شروع ہوا۔ ابتداً دینی اور معنوی شوکتوں میں فتور آنا شروع ہوا، اور انجام کار ظاہری رعب وقوت اور شوکتوں کے اضمحلال کا وقت بھی آ پہنچا۔

الف اول کے اختتام اور الف ثانی کے آغاز ہی سے اسلامی ملت کے خلاف غیر مسلم اقوام کی منظم ریشہ دوانیاں شروع ہوتی ہیں۔ یوں تو ابتداء ہی سے ان اقوام کا ایک مستقل موضوع عمل مسلمانوں میں انتشار پیدا کرکے ان کی قوتوں کو ضعیف کرتا رہا ہے چنانچہ منافقین یہود نے آغاز اسلام ہی سے ایسے مفسدانہ اقدامات شروع کر دیئے تھے اور انہیں کی ناپاک مساعی سے ملت اسلامیہ میں شیعیت وخارجیت وغیرہ کے فتنوں کی بنیاد پڑی جن کی بدولت لاکھوں مسلمان قتل وغارت کی نذر ہوئے۔ لاکھوں بے وطن ہوئے۔ خلافت کی بنیادوں میں تزلزل آیا۔ بعد کی کتنی ہی خلافتیں اور سلطنتیں تہ وبالا ہو گئیں۔ پھر مذہبی رنگ میں کتنے ہی فرقے پیدا ہو گئے۔ جس سے اُمت کی طوفانی ترقی بھی ایک دم رک گئی، اور اُمت کا زوال بھی ممکن ہوتا گیا، لیکن ہزار سال کے بعد ان مفسدانہ مساعی نے منظم صورت اختیار کر لی، اور عیسائی اقوام نے اسلامی ممالک سامنے رکھ کر تدریجاً ایک تخریبی پروگرام مرتب کیا جو بالآخر ہندوستان، اسپین، عراق، شام، مصر، ریاستہائے ٹرکی وغیرہ کی تخریب میں مؤثر اور کامیاب ثابت ہوا۔

بہر حال ہزار سال کے اس دورہ کے بعد ادھر تو اغیار نے تخریب اُمت کا عزم مصمم کیا، اور ادھر خود اُمت میں دینی بے پروائی اور قلب دیانت نے نفوذ کرنا شروع کر دیا۔ بدعات ومنکرات نے عزائم کی صورت اختیار کر لی، اور رسوم شرکیہ اور محدثات شنیعہ نے اندر ہی اندر پرورش پا کر اسلام کے اصلی رنگ وروپ کو متغیر کر دیا۔ اس لئے گیارھویں صدی گویا اُمت کے لئے اندرونی اور بیرونی، مذہبی اور سیاسی فتن وآفات کا ایک پیش خیمہ تھی، اور گویا کوئی ظاہری وباطنی مرض ایسا نہ تھا جس کی تخم ریزی اُمت کے قلوب میں نہ ہو چکی ہو۔

اس لئے اس صدی کے مجدد کے متعلق ان صد انواع فتن کو دیکھ کر خود ہی رائے قائم کر لینی چاہیے کہ اس کی روحانیت کس قدر بلند پایہ اور اس کا طرز تعلیم وتلقین کس درجہ مؤثر اور ہمہ گیر ہوگا، جو ان فتن میں اُمت کے ایمانوں کی نگہبانی کرے اور ان ظاہری وباطنی آفات کے تھپیڑوں میں کشتی اسلام کو کھینچتا ہوا کنارہ پر لگائے۔

اسی الف ثانی کے مجدد حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندیؒ ہیں جن کے علوم ومعارف نے ابنائے کفر وضلال میں تہلکہ مچا دیا اور جن کی نور پاش ہدایتوں نے تاریک سینوں کو منور کر دیا۔ حضرت مجدد صاحب کی تعلیمات کو دیکھو اور سب گوشے سامنے نہ آسکیں تو ایک مکتوبات ہی پر نظر ڈالو کہ علوم ظاہر وباطن کا ایک سمندر ہے جس کی تہ کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ اگر ایک طرف قلب وروح کے مخفی مقامات کا پردہ فاش ہو رہا ہے تو دوسری طرف حقائق شرعیہ اور اسرار منصۂ شہود پر آتے جا رہے ہیں اگر ایک طرف کتاب روح کے غیر محسوس اوراق اُلٹ رہے

ہیں تو دوسری طرف ہدایہ، توضیح کے علمی مقامات حل کر رہے ہیں۔ اگر کہیں رجال غیب سے رابطہ کا ذکر ہے تو علماء و طلباء کی محبت کے جذبات بھی انہیں مکتوبات سے ہویدا ہو رہے ہیں۔ جہاں علم کی موجیں اُٹھ رہی ہیں، وہیں خوارق و کرامات کا سمندر بھی اُمنڈ رہا ہے۔

غرض ایک ایسے دورہ کے لئے جو ظاہری و باطنی آفات کا محور ہو، جیسے جامع کمالات اور عارج عرش مجدد کی ضرورت تھی۔ حق تعالیٰ نے ویسا ہی مجدد بنا کر حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کو بھیجا، جن کی بصیرت افروز تعلیمات نے کتنے ہی گمراہان بادیہ ضلالت کو راہ مستقیم پر لگایا، اور کتنے ہی تلون پذیر قلوب کو تمکین و استقامت پر جما دیا۔ کتنے ہی وہ علوم و معارف جو بارگاہ نبوت سے چلے تھے لیکن راستہ کی ناہمواریوں نے انہیں راستہ میں روک دیا تھا، حضرت مجدد صاحبؒ کی بدولت منصۂ شہود پر آگئے اور علوم نبوت کے کتنے ہی بند شدہ دروازے از سرِ نو کھل گئے۔

پھر چونکہ اس زمانہ کا سب سے گہرا اور بنیادی مرض ابتداع اور بدعت پسندی تھا، جس نے عمل و اعتقاد دونوں کو کھوکھلا اور بے مغز کر دیا تھا۔ (۳۳۹) پس حضرت مجدد صاحب کے بے انتہا مناقب میں سے صرف دو جملے ہی اداء مناقب کے لئے بس کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مجدد ہیں جس کی حقیقت ظلیت نبوت ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ الف ثانی کے مجدد ہیں۔ جو بنص حدیث شیوع فتن کے لحاظ سے خطرناک صدی تھی، اور جس کا طبعی مقتضیٰ یہ تھا کہ اس سرے پر کوئی معمولی مجدد نہیں بلکہ ایک رئیس المجددین فرد بھیجا جائے جو ایسے عظیم مہالک و فتن کی مدافعت کر سکے۔ پس میرا یہ مضمون درحقیقت صرف انہیں دو لفظوں "مجدد" اور "الف ثانی" پر دائر ہے، اور میرے خیال میں مجدد کی مناقب کا بڑے سے بڑا دفتر انہیں دو جملوں کی شرح ہوگا۔ کیونکہ ایک لفظ سے فتن و آفات کی کثرت و قوت واضح ہے اور دوسرے سے ان فتن کی زبردست مدافعت نمایاں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ خیر کی قوت شر ہی کے فروغ سے کھل سکتی ہے۔ پس جب کہ بنص حدیث اس صدی میں شرور و آفات کی برسات کی خبر دی گئی ہے تو اس سے اس صدی کے مجدد کی روحانی قوتوں، علمی برکتوں اور عملی ہمتوں کی لگاتار جھڑیوں کا اندازہ کر لینا چاہیے۔ جس نے فتنوں کی کیچڑ اور گندگی کو دھو کر اُمت کے جسم کو صاف کر دیا تھا اور عرب و عجم میں اپنی برکات کی تروتازگی پھیلا دی تھی۔

اپنے بعض بزرگوں مثل حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰنؒ کی روایت سے اس موقعہ پر یہ واقعہ نقل کر دینا بھی دلچسپی اور اظہار حقائق سے خالی نہ ہوگا کہ حضرت مجدد صاحب قدس سرہ، دیوبند سے گزرتے ہوئے جب اس زمین پر پہنچے، جہاں آج دارالعلوم کی عمارت کھڑی ہے تو ٹھٹک کر فرمایا کہ مجھے یہاں سے علم کی بو آتی ہے (بعینہٖ یہی مقولہ اپنے بزرگوں سے حضرت سید احمد صاحب رائے بریلویؒ کی نسبت بھی سنا جبکہ انہوں نے جہاد پر جاتے ہوئے دیوبند میں قیام فرمایا تھا)۔

اور سب جانتے ہیں کہ یہ دارالعلوم مشرق و مغرب کے مسلمانوں کے لئے کتاب و سنت اور ان کے متعلق علوم کی ایک عدیم النظیر درس گاہ ہے جو اس دورِ تجدید میں بھی اسلاف کی ایک امانت کو سنبھالے ہوئے ہے۔ میں

نے اپنے متعدد بزرگوں سے سنا ہے کہ یہ درس گاہ بحیثیت مجموعی خود ایک مجدد کی شان رکھتی ہے۔ جس کا غالب شعار آج کے دور میں بدعت والحاد میں اتباعِ سنت کی تلقین اور حقیقی مسالکِ صحابہ کی ترویج ہے اور وہ بحمد اللہ ان تعلیمات کے لحاظ سے ایسی ثابت و راسخ شمع ہے جس کی روشنی مسلسل اور غیر منقطع ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ دارالعلوم کا یہ اتباعِ سنت کا شعار جبکہ وہ حضرت مجدد صاحب کی پیشین گوئی کا ظہور ہے، درحقیقت حضرت مجدد صاحبؒ کے تجدیدی کارناموں میں سے ایک شہرا کارنامہ ہے، اور انہیں کے قلبِ روشن کی ہمت کا ایک مظاہرہ ہے جو اس چار دیواری کی صورت میں اتباعِ سنت کا نور پھیلا رہا ہے۔

اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت مجدد صاحبؒ کی تجدید محض وقتی تھی، بلکہ ان کے مجددانہ علوم و کمالات اِن کے وارثین نیز ان کی تعلیمات اور ان کے پیغام کے حامل اس دارالعلوم کے ذریعہ آج تک بھی دینِ متین کی تجدید کر رہے ہیں، اور جب تک منظورِ الٰہی ہے، کرتے رہیں گے۔

وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ

خلفاء وصاحبزادگان حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ

حضرت خواجہ شیخ محمد سعید (۳۴۰) صاحب قدس اللہ سرہ ملقب بہ خازن الرحمۃ

آپ حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے خلف الرشید ہیں۔ پہلے گزر چکا ہے کہ حضرت مجدد صاحب نے اپنی حیات طیبہ کے آخری ایام میں گوشہ نشینی اختیار فرما کر کارخانۂ ارشاد وتلقین صاحبزادگان کے حوالہ کر دیا۔ لہٰذا آپ حضرت مجدد صاحب کے جانشین بھی ہیں۔

ولادت باسعادت

ایک ہزار پانچ ہجری (۱۰۰۵ھ) بمقام سرہند شریف۔

عہد طفولیت

حضرت موصوف کے چھوٹے بھائی خواجہ محمد معصوم قدس اللہ سرہ العزیز نے آپ کی وفات کے بعد آپ کے فرزند حضرت شیخ خلیل اللہ قدس اللہ سرہ العزیز کو مکتوب تحریر فرمایا ہے۔ وہ حضرت موصوف کی مختصر اور جامع سیرت ہے۔ اس کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ (درمیان میں کچھ حصہ دوسری کتابوں سے ماخوذ ہے جو حوالۂ کتاب کے ساتھ قوسین میں دے دیا گیا ہے)۔

ایام طفولیت سے مقبولیت، کرامت، ولایت ونجابت کے آثار آپ کے حالات واطوار سے نمایاں تھے۔

چار پانچ سال کا سن تھا کہ آپ سخت بیمار ہو گئے۔ آپ سے دریافت کیا گیا، کس چیز کو دل چاہتا ہے؟ جواب دیا، حضرت خواجہ کو (یعنی حضرت خواجہ باقی اللہ کو) حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے اس کا تذکرہ حضرت خواجہ سے کیا۔

حضرت خواجہ نے فرمایا:

باما حریفی و رندی کرد وغائبانہ از ما بازی برد (۳۴۱)

(۲۵ جمادی الثانیہ ۱۰۱۲ھ کو حضرت خواجہ باقی باللہ کی وفات ہوئی (قدس اللہ سرہ العزیز) جب کہ حضرت شیخ محمد سعید کی عمر صرف سات سال تھی) (۳۴۲)

چنانچہ حضرت خواجہ کی زیارت نہیں حاصل ہوئی۔ مگر حضرت خواجہ آپ کے متعلق فرمایا کرتے تھے:

''محمد سعید حریف ست۔ از ما غائبانہ نسبت گرفتہ است''۔ رح

فی المھد ینطق عن سعادۃ جدہ (۳۴۳)

یہی جوہر عالی تھا جس کا لحاظ فرماتے ہوئے حضرت خواجہ باقی باللہ قدس اللہ سرہ العزیز نے تحریر فرمایا تھا:

فرزندان[۳۴۴] ایں شیخ (مجدد صاحب) کہ اطفال اند، اسرار الٰہی اند۔ استعداد ہائے عجیب دارند۔ بالجملہ شجرِ طیبہ اند انبتها الله نباتاً حسناً،[۳۴۵] نیز فرمایا کرتے تھے۔

خواجہ احمد سعید و محمد معصوم[۳۴۶] ہر دو پسران خواجہ احمد پارۂ ہائے جواہر اند کہ بے بہا اند۔ و در ایام خورد سالی بمقامات احمدیہ رسیدہ اند۔

تحصیل علوم

(والد ماجد حضرت مجدد صاحب) برادر بزرگ خواجہ محمد صادق صاحب اور حضرت شیخ طاہر صاحب لاہوری (خلیفہ حضرت مجدد صاحب) سے عقلی و نقلی علوم حاصل کئے۔ تجوید و قراءت میں اعلیٰ کمال حاصل کیا، اور صرف سترہ سال کی عمر میں تحصیل علوم سے فراغت پاکر خدمت تدریس شروع کردی، اور اسی طرح سلوک و طریقت میں بھی کمال حاصل کرلیا۔[۳۴۸]

علمی کمالات

روایت و درایت حدیث، اصول حدیث، سند اور اسماء رجال میں مہارت اور حذاقت کے مالک تھے۔ تفقہ اور فقہی بصیرت میں اعلیٰ دستگاہ حاصل تھی۔

آپ کی فقہی تحقیق و تدقیق بسا اوقات حضرت مجدد صاحب کے اشکالات کے لئے اطمینان کا باعث بنتی تھی۔ حضرت مجدد صاحب اس بے نظیر مہارت و بصیرت سے مسرور ہو کر دعائیں دیتے۔ اپنی خوش نصیبی پر ناز اور فضل ایزدی کا شکر ادا کرتے۔

زہد و تقویٰ

ابتداء شعور سے پابندئ شریعت، تقویٰ اور طہارت میں والد بزرگوار کا نمونہ تھے۔ اتباع سنت رسول اللہ کے حریص اور ہر ایک موقعہ پر عزیمت[۳۴۹] پر عمل کے عادی۔

دنیاوی تدبیر و تدبر

اُخروی معاملات میں کمالِ عقل کے ساتھ، دنیوی معاملات میں بھی تدبر اور حسن تدبیر کے مالک تھے۔ حضرت مجدد صاحب اکثر معاملات میں مشورہ فرماتے، اور ان کی رائے کو پسند فرماتے۔

روحانی کمالات

(حضرت مولانا سید غلام علی شاہ صاحب دہلوی مجدد مائۃ اثنا عشر، کی مجلس میں ذکر آیا کہ حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی فرمایا کرتے ہیں کہ مجدد صاحب کے دونوں صاحبزادے تجدید ملت اور مجددیت

میں حضرت مجدد صاحب کے شریک ہیں۔

حضرت سید غلام علی شاہ صاحب نے فرمایا:

اور تو کچھ معلوم نہیں۔ البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ حضرت مجدد صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ میرا اور میرے لڑکوں کا معاملہ ایسا ہی ہے، جیسا کہ مصنف شرح وقایہ اور اُن کے دادا کا۔ مصنف شرح وقایہ کے دادا سبقاً سبقاً اپنی مشہور تصنیف "وقایہ" تالیف فرماتے جاتے تھے اور مصنف شرح وقایہ یاد کرتے جاتے۔ اسی طرح جو علوم و معارف ہم پر منکشف ہوتے ہیں، ہمارے دونوں لڑکے "محمد سعید و محمد معصوم" خود بخود ان کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ (۳۵۰)

بہر حال اُمور باطنیہ میں حضرت مجدد صاحب کے رازدار تھے، اور علمی خدمات میں شریک کار۔ امراض ظاہری کے مریض اُن کی توجہ سے شفایاب ہوتے تھے، اور امراض باطنی کے بیمار اُن کے تصرف سے شاہراہ جمعیت خاطر پر گامزن۔ مختصر یہ کہ وہ قطب المحققین، وارث المرسلین خواجہ نقشبند قدس اللہ سرہ العزیز کے اس قول کے مصداق تھے کہ ما فضلیا نیم۔ (۳۵۱)

ان کے جلالت وعظمت کے لئے صرف ایک واقعہ کا نقل کر دینا کافی ہے۔

ایک مرتبہ مشاہدہ کیا کہ صحابۂ کرامؓ کا اجتماع ہے۔ حضورؐ صدر مجلس ہیں۔ صحابۂ کرامؓ نے ایک درخواست بارگاہ رسالت میں پیش کی۔ رسالت پناہ روحی فداہٗ نے جواب تحریر فرمایا:

ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْمِ (۳۵۲)

درخواست میں تحریر تھا:

ایشاں (۳۵۳) دمایاں در عنایات الٰہی جل سلطانہ، برابریم دمائے ہمہ محن وریاضات شاقہ کشیدہ ایم وایشاں نہ وجہش چیست۔ (۳۵۴)

حضرت مجدد صاحب فرمایا کرتے تھے:

محمد سعید علماء راسخین اور زمرہ سابقین میں سے ہے۔ خلیل خدا ہے۔ (۳۵۵)

خلعت خلت جو مجھ سے جدا ہوگا، وہ محمد سعید کو عطا ہوگا۔ عروج و نزول کے جس مقام پر میں پہنچا، محمد سعید میرے ہمراہ تھا۔ محمد سعید خازن رحمت ہے۔ قیامت کے روز خزائن (۳۵۶) رحمت کی تقسیم محمد سعید کے سپرد ہوگی۔ (۳۵۷)

مقبولیت دعا

سرہند شریف میں وبا کی کثرت ہوئی۔ لوگ حاضر خدمت ہوئے، دعا کی التجا کی۔ اُسی وقت سے وبا کافور ہو گئی۔ جتنے بیمار تھے، شفایاب ہوئے (خزینۃ الاصفیاء ص ۴۳۹)

جمالِ ظاہری

باطنی جمال و کمال کے ساتھ ظاہری جمال بھی اس درجہ کا تھا کہ دیکھنے والا فریفتہ ہو جاتا تھا۔ (۳۵۸)

حج بیت اللہ شریف

عالمگیر اور دارا شکوہ میں چشمک رہا کرتی تھی۔ حضرت موصوف حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے جا رہے تھے۔ عالمگیر حاضر خدمت ہوا اور دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا:

"جو ترویج شریعت کا عہد کرے، وہ کامیاب ہوگا"۔

عالمگیر نے عہد کیا، فرمایا: انشاء اللہ کامیاب ہو گے۔ زیارت حرمین شریف کے موقعہ پر کمالات روحانی کے اعلیٰ مدارج طے کئے۔ جب بعافیت واپسی ہوئی تو حکومت عالمگیر عروج پر تھی۔ (۳۵۹)

وفات

عالمگیر نے دہلی تشریف لانے کی درخواست کی۔ حضرت موصوف نے معذرت فرمائی۔ مگر جب عالمگیر کا اصرار زیادہ بڑھا۔ آپ دہلی تشریف لائے۔

آپ دہلی میں قیام فرماتے کہ مرض کا آغاز ہوا۔ اُمید زیست منقطع ہونے لگی تو آپ نے چاہا کہ سرہند پہنچ جائیں۔ پالکی کے ذریعہ سرہند روانہ ہوئے۔ راستہ میں "سنبھالکہ" مقام پر بتاریخ ۲۷ رجمادی الثانیہ ۱۰۷۰ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ ۶۵ سال عمر پائی۔

جنازہ مبارک سرہند پہنچایا گیا اور حضرت مجدد صاحب کے مقبرہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ ستر اسی سال بعد کثرت بارش کے باعث قبر مبارک بیٹھ گئی۔ جنازہ کھل گیا۔

لوگوں نے دیکھا کہ جسم شریف مع کفن بجنسہٖ محفوظ تھا اور خوشبو سے مہک رہا تھا۔ (۳۶۰) آپ کے پانچ فرزند اور بہت سے خلفاء آپ کے بعد آپ کے علوم و معارف کے وارث بنے۔ رحمہم اللہ

العروۃ الوثقٰی خواجہ محمد معصوم قدس اللہ سرہ العزیز

مجدد الف ثانی کے فرزند ثالث ۔ جلیل القدر خلیفہ کمالات مطہرہ کے امام

ولادت باسعادت

۱۰۰۷ھ (ایک ہزار سات) بمقام بستی متصل سرہند ۔ اسی سال حضرت مجدد صاحب خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ مجدد صاحب فرمایا کرتے تھے:

محمد معصوم کی ولادت ہمارے لئے مبارک ہوئی کہ ایسے شیخ کامل یکتا روزگار کی خدمت حاصل ہوئی (۳۶۱)

تعلیم

والد بزرگوار برادر محترم محمد صادق صاحب، اور شیخ طاہر صاحب خلیفہ حضرت مجدد صاحب سے عقلی اور نقلی علوم حاصل کئے اور جملہ علوم وفنون میں اعلیٰ دستگاہ حاصل کی ۔ ۱۶ سال کی عمر میں علوم ظاہری کی تحصیل سے فارغ ہوگئے ۔ حضرت مجدد صاحب فرمایا کرتے تھے:

بابا ہمیں تم سے بہت بڑے بڑے کام لینے ہیں ۔ جلد تحصیل علوم سے فارغ ہو جاؤ ۔ لانبا قد، پر اندام، گندمی رنگ، ابرو کشادہ، بینی بلند ۔ آنکھیں بڑی بڑی، چہرہ اور تمام اعضاء خوبصورت اور مناسب، خط بکھرا ہوا ۔ داڑی سفید ۔ (۳۶۲)

اخذ طریقت

گیارہویں سال والد ماجد سے بیعت ہوکر تعلیم طریقت شروع کردی عمر مبارک چودہ سال تھی کہ ایک خواب دیکھا ۔ میرے بدن سے ایک نور آفتاب کی مانند نکل رہا ہے ۔ سارا عالم اور عالم کا ذرہ ذرہ اس سے روشن ہے ۔ اگر یہ غروب ہو جائے تو سارا عالم تاریک ہو جائے ۔

حضرت مجدد صاحب نے تعبیر فرمائی ۔ تم قطب عالم ہوگے ۔ یہ بشارت ہے یاد رکھو اور کوشش کرو ۔

سولہ سال کی عمر میں تحصیل علوم سے فراغت پاکر سلوک طریقت کی جانب ہمہ تن متوجہ ہوگئے، اور بہت جلد اعلیٰ مدارج طے کر لئے ۔ حتیٰ کہ حضرت مجدد صاحب کی اولاد میں سب سے سبقت لے گئے ۔

پہلے گزر چکا ہے کہ ہر دو صاحبزادگان والد ماجد کے ساتھ مدارج عالیہ کو طے کرتے ہوئے مجددی خدمات میں شریک اور مددگار رہتے تھے ۔

اس رفاقت اور تعاون کے متعلق حضرت مجدد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میری اور ان بچوں کی مثال شارح وقایہ اور اُن کے دادا جیسی ہے ۔ اس مضمون کو حضرت خواجہ معصوم کے برادر زادہ اور خلیفہ حضرت خواجہ

عبدالاحد وحدت نے منظوم فرمایا ہے:

مجدد بتوصیف اولب کشاد	بفرمود کالے پور عرفان نژاد
ز عرفاں نوشتم ورق در ورق	ہمہ خواندی از من سبق در سبق
تو یک نکتہ زیں لوح نگزاشتی	ہر آنچہ نہادم تو برداشتی
تو آخر چو من قطب دوراں شوی	ز من ایں بشارت بہ یاد آوری

اخلاق

جانشین مجدد کے اخلاق کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ وہ حضرت مجددؒ کا صحیح جانشین ہے، جس کو قطبیت کی بشارت مجدد صاحب نے دی اور دنیا نے اس بشارت کو صحیح تسلیم کیا۔ یہی آپ کی تعلیم تھی اور یہی آپ کا طرز کہ:

"تم خوش دل ہو یا کسی وجہ سے تنگ دل، مگر اچھے یا برے جس سے بھی ملو، کشادہ پیشانی اور وسیع اخلاق کے ساتھ ملو۔ جو شخص جو معذرت کرے اُسے قبول کرو۔ اپنے اخلاق اچھے رکھو۔ کسی پر اعتراض مت کرو۔ نرم اور ملائم بات کہو۔ گفتگو میں سختی ہرگز مت برتو۔ نماز، روزہ، شب بیداری اسباب بندگی اور عبادت کے طریقے ہیں، درویشی نہیں۔ کسی سے رنجیدہ نہ رہنا، کسی کو رنجیدہ نہ کرنا، درویشی ہے۔ اگر یہ حاصل کرلو گے واصل ہوجاؤ گے۔ کسی نے محمد بن سالمؒ سے پوچھا۔ اولیاء اللہ کی شناخت کیا ہے؟ فرمایا گفتگو میں نرمی، اخلاق کی عمدگی، کشادہ پیشانی، سخاوت اور استغناء، دوسروں پر اعتراض نہ کرنا، معذرت کرنے والوں کے عذر قبول کرلینا۔ خدا کی ساری مخلوق پر شفقت۔

سخاوت

غیر مستطیع احباب تنگ دستوں اور مفلسوں کے لئے گویا آپ مربی تھے۔ جب ضرورت کا اظہار کیا جاتا، اس کو پورا فرماتے، ورنہ ہمدردانہ کوشش کرتے۔ بسا اوقات اظہار ضرورت سے پہلے ہی آپ کی ذکاوت اور فراست ایمانی ضرورت مند کے چہرہ بشرہ سے اس کی ضرورت معلوم کرلیتی اور حاجت روائی کردیتی۔

ایک شخص کے یہاں چھ مہمان آگئے۔ وہ خود فاقہ سے تھا، اُس پر مہمانوں کا بار۔ وہ فوراً بارگاہ معصومی میں حاضر ہوا۔ مگر فرط ادب اور حیاء کے باعث کچھ نہ کہہ سکا۔ آپ کا طریقہ تھا کہ جب آپ کے یہاں آم آتے تو فی کس دس دس آم دیتے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:

ان کو دس آم دے دو، اور دس ان کے ایک مہمان کے، دس دوسرے کے دس تیسرے کے۔ غرض ستر آم ان کو عنایت فرمائے۔ پھر کچھ اشرفیاں مرحمت فرمائیں، اور ارشاد ہوا تم خود کو اولاد کی طرح سمجھو۔ جب ضرورت ہو، ہم سے طلب کرو۔

قناعت واستغناء

والد ماجد نے فرمادیا تھا:

فرزندا! خانقاہ کی ٹوٹی چٹائی کو تخت سلطنت سمجھو۔ پرانی جھونپڑی اور سوکھی روٹی پر قناعت کرو۔ صحبت اُمراء اور مجلس بادشاہ سے پرہیز رکھو۔

حضرت معصومؒ نے اس عہد پر زندگی ختم فرمادی۔ شاہجہاں کی تمنا تھی کہ حضرت خواجہ کی رفاقت حاصل ہو مگر وہ کامیاب نہ ہوا۔ عالمگیر بارگاہ معصومی میں حاضر ہوا۔ حلقہ بگوش ارادت ہوا۔ محل سرائے شاہی میں رفاقت وہم نشینی کی تمنا کرتا رہا۔ لیکن قطب عالم کیلئے کب ممکن تھا کہ وہ جگہ سے جنبش کرے۔ جب اصرار زیادہ کیا تو حضرت نے اپنے صاحبزادہ مولانا سیف الدین صاحب کو عالمگیر کی باطنی تربیت کے لئے بھیج دیا۔

احترام اکابر

حضرت شیخ محمد سعید صاحب قدس اللہ سرہ، حضرت خواجہ محمد معصوم قدس اللہ سرہ العزیز سے صرف دو سال بڑے تھے۔ عمر کے ایسے تفاوت میں نہ خوردگی اور بزرگی کا احترام ہوتا ہے، اور نہ ادب وتعظیم کی کوئی خاص پاسداری کی جاتی ہے۔ لیکن خواجہ محمد معصوم صاحب اپنی جلالت وعظمت کے باوجود حضرت شیخ موصوف کا حد سے زیادہ احترام فرماتے۔

شام کے وقت خواجہ محمد سعید صاحب پالکی میں سوار ہوکر تفریح کے لئے جایا کرتے تھے۔ پالکی دولت سرائے معصومی کے سامنے سے گزرتی تھی۔ حضرت خواجہ پالکی دیکھتے ہی کھڑے ہوجاتے اور جب تک پالکی نظر کے سامنے رہتی، کھڑے رہتے۔ بارہا عرض کیا گیا کہ حضرت شیخ کو آپ نظر بھی نہیں آتے، وہ اکثر دوسری طرف دیکھتے رہتے ہیں، کھڑے ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ حضرت خواجہ جواب دیتے، دکھانا مقصود نہیں۔

مکان میں ایک بیری کا درخت تھا۔ اُس کے بیر پہلے حضرت شیخ کی خدمت میں بھیج دیتے۔ اس کے بعد خود کھاتے یا دوسروں کو کھلاتے۔

حلقۂ درس

سلوک وطریقت کے اوراد ومعمولات تہجد، اشراق، چاشت، زوال، اوابین وغیرہ طویل نوافل کے باوجود درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ حدیث شریف اور تفسیر قرآن سے خاص شغف تھا۔ اسی کا عموماً درس ہوتا تھا۔ سینکڑوں اور ہزاروں مشتاقان علوم بہرہ اندوز ہوتے تھے۔

تفسیر وحدیث کے علاوہ حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات کا درس بھی آپ دیتے تھے، اور اس کے دقیق مضامین کو شرح وبسط سے بیان کرتے اور شبہات کا حل فرماتے۔

حلقۂ ارشاد

اوراد و وظائف، نوافل اور تلاوت، ذکر و تسبیح، وعظ و تلقین، درس و تدریس کے مشاغل دو تین بجے شب سے شروع ہو کر بارہ بجے شب تک جاری رہتے۔ دوپہر کو تھوڑا سا وقت قیلولہ کے لئے ملتا۔

بایں ہمہ وسعت اخلاق نے آپ کو خلق اللہ کا محبوب بنا دیا تھا۔ گرویدگی اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں زیارت اور حصول طریقت کے لئے حاضر ہوتے۔

مؤرخین کا اتفاق ہے کہ حضرت مجدد صاحب کے خلفاء میں سب سے زیادہ فیض آپ کے ذریعہ سے پہنچا۔ تقریباً نو لاکھ مردوں اور عورتوں نے آپ کے ہاتھ پر توبہ کی۔ (۳۶۳) سات ہزار خلیفہ صاحب ارشاد ہوئے۔ (۳۶۴) ایک ہفتہ میں آپ کے فیض صحبت سے ایک طالب درجۂ فنا و بقاء کو پہنچ جاتا، اور ایک ماہ میں کمالات ولایت سے مشرف ہو جاتا۔

کشف مقامات الٰہیہ نہایت صحیح تھا۔ دور دراز کے مریدوں کی غائبانہ تربیت فرماتے۔ اور دور دراز مسافت کے باوجود بتا دیا کرتے تھے کہ تمہاری ولایت محمدی ہے یا موسوی یا عیسوی۔ (۳۶۵)

اورنگ زیب بادشاہ حلقہ میں حاضر ہوا کرتا، (۳۶۶) اور جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتا حضرت کا رعب عالمگیر پر اس قدر غالب تھا کہ عالمگیر زبانی گفتگو نہ کر سکتا۔ جو کچھ عرض کرنا ہوتا تحریر پیش کرتا۔

سفر حج کو جاتے ہوئے جن جن مقامات پر گزر ہوا، جوق جوق خلق خدا حاضر ہوئی اور بیعت و عقیدت کے بیش بہا موتی دامنوں میں بھر کر لے گئی۔

حجاز مقدس میں دنیاء اسلام اور بالخصوص حرمین شریفین کے طالبان مولیٰ نے ہزاروں کی تعداد میں آپ سے بیعت کی اور روحانی فوائد کی دولتیں لوٹیں۔

نظام اوقات

تھوڑے وقت میں زیادہ کام کیا جا سکتا ہے اگر اوقات میں نظم ہو۔ حضرت خواجہ کے نظام اوقات میں بھی سنت رسول اللہؐ کی اتباع نمایاں تھی۔ تمام زائرین اور متوسلین کے لئے ایک وقت مقرر ہوتا۔ عموماً عصر کے بعد وعظ و پند کی کل مجلس ہوتی۔ ظہر کے بعد درس اور تحریر خطوط کا وقت تھا۔ بسا اوقات عصر کے بعد بھی درس ہوتا۔ مغرب کے بعد تلقین ہوتی، اور اسی وقت لوگ داخل سلسلہ ہوتے۔ اشراق کی نماز کے بعد چاشت تک درس اور مریدین کی تلقین کا وقت تھا۔ مقررہ اوقات میں عورتوں کی مجلس میں زنان خانہ میں وعظ و پند نیز تلقین اور روحانی تربیت ہوتی۔ عام مجالس کے اوقات کے علاوہ باقی اوقات میں ملاقات کرانے اور نمبروار طالبین کو تربیت و ہدایات روحانی کے لئے پیش کرنے کے واسطے حاجی محمد عاشور بخاری مامور تھے۔ ہر ایک کو حاضری کی اجازت نہیں تھی۔ البتہ چند خصوصی خدام اور صاحبزادگان مستثنیٰ تھے۔ اسی طرح زنان خانہ میں صاحبزادیاں واسطہ ہوتی

تھیں۔ خانقاہ میں اس کا بھی انتظام تھا کہ جو حضرات اہل و عیال سمیت زیارت یا سلوک طریقت کے لئے حاضر ہوں، ان کو علیحدہ قیام گاہ دے دی جائے، اور ان سب کا کھانا قیام گاہ پر پہنچا دیا جائے تا کہ بال بچوں کے ساتھ مل جل کر کھانا کھائیں۔

تعلیمات و نظریات

ظاہری شریعت کی پابندی، سنت رسول اللہؐ کی اتباع، بدعتوں سے اجتناب جو حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی تعلیمات کا طرہ امتیاز بلکہ حضرت مجدد صاحب کی حیات مقدس کا نصب العین تھا۔ حضرت خواجہ محمد معصوم قدس اللہ سرہ العزیز کی پاک زندگی بھی اسی مقدس مقصد کے لئے وقف تھی۔

حضرت مجدد صاحب کے مکتوب کی طرح آپ کے مکتوبات بھی انہیں اُمور کی تعلیم سے پر ہیں۔ آپ کے ایک مکتوب کے ایک حصہ کا ترجمہ درج ذیل ہے۔ (۳۶۷)

اے برادر! ناجنس اور مخالف کی صحبت سے احتراز کرو۔ بدعتیوں کی مجالست سے دور بھاگو۔ یحییٰ معاذ رازی قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں۔ تین آدمیوں کی صحبت سے بچو عالم غافل، درویش مداہن، (۳۶۸) جاہل صوفی جو شخص شیخ طریقت کی مسند پر بیٹھتا ہے (۳۶۹) اور سنت رسول اللہؐ کا پابند اور زیور شرع سے آراستہ نہیں ہے، اُس سے دور رہو۔ ہرگز ہرگز اس کے پاس مت جاؤ، بلکہ اس شہر میں بھی نہ رہو۔ بہت ممکن ہے کچھ عرصہ بعد رفتہ رفتہ دل میں اس کی جانب میلان پیدا ہو جائے۔ جس سے مذہبی کاروبار میں رخنہ پڑ جائے۔ ایسا شخص پیشوا بننے کا اہل نہیں۔ یہ چھپا ہوا چور ہے یہ شیطان کا ایجنٹ ہے۔ اس سے کتنی ہی کرامتیں کتنے ہی خوارق عادات دیکھو، اور اس کو دنیا سے کتنا ہی بے تعلق پاؤ، مگر اس سے اور اس کی صحبت سے اتنا دور بھاگو، جتنا شیر سے۔

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں:

تمام راستے بند ہیں، صرف ایک راستہ کھلا ہے۔ وہ اس شخص کے لئے جو سنت رسول اللہؐ کی پیروی کرے۔

نیز فرماتے ہیں:

جس نے قرآن پاک کو حفظ نہیں کیا۔ احادیث رسول اللہؐ کو نہیں لکھا پڑھا، اس کی پیروی نہ کی جائے۔ کیونکہ یہ کارخانہ اسلام کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی بنیاد پر قائم ہے۔

نیز ارشاد فرماتے ہیں:

وہ سردار جو خدا کے مقرب ہیں، جو سابق کہلانے کے مستحق ہیں، وہ کتاب و سنت کے پابند ہیں۔ یہی لوگ حقیقت میں صوفی ہیں۔ یہی شریعت و طریقت کے عالم باعمل ہیں۔ یہی انبیاءؑ کے وارث ہیں۔ یہی لوگ رسول اللہؐ کے اقوال، افعال اور اخلاق کے متبع ہیں۔ خداوند عالم ان حضرات کی برکتیں ہمیں عنایت فرمائے۔

نیز حضرت جنید بغدادی ارشاد فرماتے ہیں: جو شخص آداب نبوی میں سست اور سنن مصطفوی (علی صاحبہا

الصلوٰۃ والسلام) کا تارک ہو، ہرگز ہرگز اس کو عارف مت سمجھو۔ ترک دنیا، گوشہ نشینی، خلوت گزینی اور اس کے خوارق عادات کے فریفتہ، اس کے زہد، توکل اور معارف توحید کے شیفتہ مت ہو۔ کیونکہ یہودی، نصرانی، جوگی، اور برہمن جیسے فرق باطلہ بھی ان امور میں شریک ہیں۔

حضرت ابو عمر نجید ؒ کا ارشاد ہے:

جو حالت علم صحیح کا نتیجہ نہ ہو، وہ خواہ کتنی ہی عظیم الشان ہو، مگر وہ خطرناک ہے۔ اس کے نفع سے نقصان زیادہ ہے۔

آپ سے تصوف کی حقیقت دریافت کی گئی۔ فرمایا: **الصبر تحت الامر والنھی** یعنی احکام خداوندی کے ماتحت استقلال و صبر۔

امور شریعت کا مدار اتباع شریعت پر ہے۔ معاملۂ نجات اتباع رسول اللہؐ سے وابستہ ہے۔ اتباع رسول اللہؐ کے بغیر زہد، توکل اور تجمل غیر مقبول ہے۔ اور حضرت رسالت پناہ کے توسل کے بغیر ذکر و شغل، ذوق و شوق، اکارت ہے۔ خوارق و عادات کا تعلق، گرسنگی، تہی شکمی اور اسی قسم کی مشق و ریاضت سے ہے۔ معرفت الٰہی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

حضرت عبد اللہ بن مبارک ؒ کا ارشاد ہے:

آداب نبوی (مستحبات) میں سستی کرنے والے کی سزا یہ ہے کہ سنتوں پر عمل کی توفیق اس کو نہ ہوگی۔ اور جو سنتوں سے محروم ہو، فرائض سے محرومی اس کی سزا ہوگی۔ اور جو ادائے فرائض میں سست ہو، لامحالہ معرفت الٰہی سے محروم رہے گا۔ یہی نکتہ ہے کہ رسول اللہؐ ارشاد فرماتے ہیں:

المعاصی تذید الکفر۔ گناہ کفر کو بڑھا دیتے ہیں۔

حضرت شیخ ابو سعید ابو الخیر ؒ سے بادشاہ وقت نے کہا۔ فلاں صاحب ہوا میں اڑتے ہیں۔

شیخ: کوے اور مکھی بھی ہوا میں اڑتے ہیں۔

سلطان: فلاں شخص ایک لحظہ میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں پہنچ جاتا ہے۔

شیخ: شیطان ایک سانس میں مشرق سے مغرب تک پہنچ جاتا ہے۔

بہرحال اس قسم کی چیزوں کی کوئی قیمت نہیں۔ مرد وہ ہے کہ مخلوق خدا سے مل جل کر رہے، خرید و فروخت کرے، لوگوں کے مجمع میں شریک ہو، بیوی بچوں کی پرورش کرے اور ان تمام دنیاوی علائق کے باوجود ایک لمحہ بھی خدا سے غافل نہ رہے۔

اہل اللہ کے مقتدا حضرت رودباری ؒ سے ایک ایسے شخص کے متعلق دریافت کیا گیا، جو مزامیر اور غنا سنتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ میرے لئے جائز ہے کیونکہ میں اس درجہ پر پہنچ گیا ہوں کہ اختلاف حالات سے میرے اوپر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ (۳۶۰)

حضرت موصوف نے جواب دیا۔ بیشک وہ ایسے درجہ پر پہنچ گیا ہے مگر یہ درجہ جہنم کا ہے۔

ابو سلیمان درانیؒ فرماتے ہیں۔ بسا اوقات میرے دل میں نکات ولطائف کا تصور آتا ہے۔ مگر میں ان کو اسی وقت قبول کرتا ہوں جب دو شاہد اس کی تصدیق کردیں۔ یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ۔

حدیث شریف میں ہے۔ اصحاب بدعت دوزخ کے کتے ہیں۔ نیز ارشاد ہے، بدعتی کا معبود اور مولا شیطان ہوتا ہے۔

تعلیم جہاد

حضرت مجدد صاحب نے سلاطین اور اُمراء کو پابند شرع بنایا۔ حضرت خواجہ معصوم ان کو مجاہد اسلام بناتے ہیں۔ وہ جدال وقتال جو ملک گیری کے لئے ہوگیا تھا، شاہجہان اور عالمگیر کے عہد میں وہ شعائر اسلام کے قیام کے لیے ہونے لگا ایام شاہزادگی میں شاہجہاں نے عالمگیر کو بلخ کی مہم پر مامور فرمایا تھا۔ (۳۷۱) اس موقعہ پر حضرت خواجہ نے جو مکتوب عالمگیر کو تحریر فرمایا۔ وہ ہر ایک مسلمان کے لئے سبق آموز ہے۔ ہم ذیل میں اس کا ترجمہ نقل کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اصل جہاد اپنے نفس کو مارنا ہے نفس کشی کے بعد جہاد بالسیف اُسی وقت معتبر ہوگا، جب کہ اپنی اغراض سے پاک ہوکر صرف احکام ربانی کی تعمیل کے لئے ہو۔

ارشاد ہوتا ہے۔ خوشا وقت وخوشا حال کہ اس عظیم الشان مہم کے لئے کمر ہمت چستی کے ساتھ کس لی ہے، اور شوق وحسن نیت کے ساتھ ایک دور دراز سفر اختیار کیا ہے۔ جس کا نتیجہ لامحالہ خیر وبرکت ہوگا۔

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے:

جنت میں سو درجے ہیں، سب سے اُوپر کا درجہ مجاہدین فی سبیل اللہ کے لئے ہے۔ ہر دو درجوں میں زمین سے آسمان تک کا فاصلہ ہے۔ (بخاری شریف)

ارشاد ہوا۔ راہ خدا میں ایک ساعت توقف کرنا، مکہ معظمہ میں حجر اسود کے پاس شب قدر میں بیدار رہنے سے بہتر ہے (بیہقی وابن حبان فی صحیحہ)

چونکہ حرم پاک مکہ معظمہ میں ایک شب قدر کا قیام دس لاکھ ماہ کی شب بیداریوں کی برابر ہے۔ لہٰذا علماء نے نتیجہ نکالا ہے کہ جہاد کے موقعہ پر ایک ساعت توقف دس لاکھ ماہ کی شب بیداریوں سے افضل ہے۔ حضرت انسؓ، حضورؐ سے روایت فرماتے ہیں کہ جو شخص جہاد کے موقعہ پر بوقت شب پہرہ پر جاگ رہا ہے تو اس کی حفاظت میں جس قدر لوگ روزے یا نمازیں ادا کررہے ہیں، اُن سب کے برابر اُس کو ثواب مل رہا ہے۔

(رواہ الطبرانی باسناد جید)

علماء کرام نے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ کسی حاکم کے علاقہ حکومت میں جس قدر لوگ امن اور اطمینان سے خدا کی عبادت کرتے ہیں، ان سب کے برابر اس حاکم عادل کو ثواب ملتا ہے جو اُن

سب کا محافظ بنا ہوا ہے۔

افسوس یہ فقیر ناکارہ بظاہر صورت مختلف عوائق وموانع کے باعث جہاد فی سبیل اللہ کی دولت بے پایاں سے محروم ہے۔ یالیتنی کنت معھم فافوز فوزاً عظیماً۔

لیکن باطنی طور پر دعا اور توجہ کے لحاظ سے (جو فقراء کا خاص کام ہے) اس فقیر ناکارہ کو اپنا رفیق اور اپنا مدد ومعاون تصور فرماتے رہیں۔

ہم جیسے گوشہ نشین فقراء اگر سالہا سال ریاضتیں کریں اور چلے کھینچیں تو ثواب جہاد کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ موقعہ جہاد پر جو طاعت اور عبادت ہوتی ہے، گوشہ نشینی کی طاعت وعبادت سے بدر جہا بڑھی ہوئی ہے۔ موقعہ جہاد کی ذکر وتسبیح کا ثواب دوسرا۔ نماز کا مرتبہ جدا۔ صدقات ونفقات کی شان بہت بالا۔ اور بیماریوں کی فضیلت علیحدہ۔

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے۔ وہ شخص مبارک ہے جو موقعہ جہاد پر ذکر خدا بھی کثرت سے کرے۔ اس شخص کو ہر کلمہ کے عوض میں ستر ہزار حسنات کا ثواب ملے گا۔ ہر ایک حسنہ کا دس گنا ثواب۔ اور خدا کے یہاں اس سے بھی زیادہ ثواب کا امکان ہے۔ (طبرانی) نیز ارشاد ہے میری اس مسجد (مسجد نبوی) میں نماز کا ثواب دس ہزار گناہ ہے اور مسجد حرام میں ایک لاکھ گنا، اور میدان جہاد میں بیس لاکھ گنا۔ (ابوالشیخ وابن حبان)

نیز ارشاد ہے۔ میدان جہاد کی نماز پانچ سو نماز، اور ایک دینار یا درہم کا صدقہ سات سو گنا ہوتا ہے۔

نیز ارشاد ہے کہ جو شخص مجاہد فی سبیل اللہ کی امداد کرے اور اس کے پیچھے اُس کے گھر والوں کا خیال رکھے تو قیامت کے روز وہ سایہ خداوندی میں ہوگا حالانکہ اُس دن کہیں کوئی سایہ نہ ہوگا (احمد وبیہقی)۔ اسی طرح فضائل جہاد کے متعلق چند حدیثیں پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

یہ خدمت اور یہ مہم جس کی طرف آپ متوجہ ہیں، بلا شبہ فی سبیل اللہ ہے کیونکہ اخرج ابو ذر وذھبی عن ابن عباس رضی اللہ عنھما مرفوعاً یکون فی اخرالزمان قوم یسمون الرافضیۃ یرفضون الاسلام فاقتلوھم فانھم مشرکون۔

واخرج الدار قطنی عن علی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم سیاتی من بعدی قوم لھم نبزًا یقال لھم رافضیہ فان ادرکتھم فاقتلھم فانھم مشرکون قال قلت یا رسول اللہ ما العلامۃ فیھم قال یفرطونک بمالیس فیک ویطعنون علی السلف واخرجہ عن طریق اخرنحوہ وکذلک من طریق اخروفلد فیہ ینتحلون عنا اھل البیت ولیسوا کذلک. وایۃ ذلک انھم یسبون ابابکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنھما.

جہادِ اکبر

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے۔ اپنے نفس سے دشمنی رکھو کیونکہ اُس نے تمہاری دشمنی کا بیڑا اٹھایا ہے۔

تصدیقِ قلبی اور اقرار لسانی کے باوجود انسان کا نفس امارہ کفر وا کفار پر مصر ہے۔ احکام آسمانی کی طرف مائل اور اوامر الٰہیہ کے لئے منقاد نہیں ہوتا۔ اس کی خواہش یہ ہے کہ ہر کوئی اس کا مطیع وفرمانبردار ہو۔ غرور وتکبر اس کی سرشت میں ہے اور "انا ربکم" کی آواز اس کی فطرت سے بلند ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا اس کی دشمنی پسندیدہ اور عنداللہ مقبول ہے، اور شریعت غرا کی تعمیل کرتے ہوئے نفس امارہ کی مخالفت "جہادِ اکبر" ہے۔ دنیاوی دشمنوں کے ساتھ جہاد کا اتفاق گاہے گاہے ہوتا ہے۔ مگر اس اندرونی دشمن کے ساتھ جہاد ہر وقت اور ہر ساعت رہتا ہے۔

ارحم الراحمین کی انتہائی رحمت ورافت ہے کہ سلسلۂ اعتقادات میں حصول نجات کے لئے صرف تصدیق قلبی کو کافی قرار دیا۔ اور یہ ضروری نہیں رکھا کہ یہ تصدیق جملہ وساوس وخطرات سے پاک ہوکر درجۂ یقین تک پہنچ جائے۔

چشم دارم کہ دہد اشک مرا حسن قبول   بہ آنکہ در ساختہ است قطرۂ بارانی را

البتہ خدا کے کچھ بندے بیشک اس درجۂ کمال تک پہنچ جاتے ہیں کہ اُن کا وہ سرکش اور نفس امارہ اپنی سرکشی اور امارگی سے عاجز ہو جاتا ہے۔ وہ احکام الٰہی کا مطیع ہو جاتا ہے کیونکہ مخالفت کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور وہ امر الٰہی پر راضی ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کا نام "نفس مطمئنہ" ہوتا ہے۔ یہ خدا کی بارگاہ میں درجۂ قبول و پسندیدگی حاصل کر لیتا ہے۔

آیہ کریمہ ایتھا النفس المطمئنہ[۳۷۲] (الآیۃ) میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ ایمان کامل اور اسلام حقیقی اسی مقام پر حاصل ہوتا ہے۔ یہ ایمان زوال وخلل سے محفوظ رہتا ہے۔ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا۔ خداوندا میں ایسا ایمان چاہتا ہوں جس کے بعد کفر نہ ہو۔

آیۂ کریمہ ہے:

یا ایھا الذین امنوا امنوا   اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ۔

نیز خداوند عالم کا ارشاد ہے۔ جو خدا اور اُس کے رسول پر ایمان لائے وہی ہیں خدا کی بارگاہ میں صدیق اور شہداء (قرآن حکیم)۔

نیز رسول اللہؐ کا ارشاد ہے۔ کوئی شخص ایمان نہیں لائے گا، جب تک اس کی خواہشات میرے لائے ہوئے احکام کے تابع نہ ہو جائیں۔ اس قسم کی آیات واحادیث میں یہی ایمان کامل مراد ہے۔[۳۷۳]

صوفیہ کرام کا حقیقی مطمح نظر اور اصل مقصود اسی ایمان کامل کو حاصل کرنا ہے اور اس سے پیشتر سرسری تصدیق قلبی کی بنا پر جو ایمان حاصل ہوتا ہے اس کو ایمان مجازی کہتے ہیں۔

نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد جو اس ایمان کامل سے پہلے ہوتے ہیں، وہ گویا صورت عمل (اور قالب) ہیں۔ حقیقت (اور روح) یہ ایمان ہے کیونکہ جب تک نفس امارہ اپنی سرکشی پر باقی ہے، حقیقی عمل وقوع پذیر نہیں ہوسکتا۔ اعمال کی حقیقت اس وقت ظہور پذیر ہوتی ہے جب کہ نفس امارہ اپنی سرکشی سے مجبور ہو کر درجہ اطمینان حاصل کر لیتا ہے۔ درجات جنت، دیدار الٰہی، قرب خداوندی وغیرہ کے مراتب کا تفاوت اسی ایمان کے تفاوت درجات پر موقوف ہوتا ہے۔ دریا اور قطرہ میں بہت تفاوت ہوتا ہے۔ مگر تاہم ایک جنس اور ایک حقیقت ہے۔ مگر جو تفاوت جنت اور اخروی نعمتوں کے مراتب میں ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس میں ایک دوسرے کی باہمی نسبت بہت دور کی ہے۔

ظاہر ہے کہ ایک حقیقت ہے اور ایک صورت۔ حقیقت کو صورت سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔

آخرمیں دیدار خداوندی عام مسلمانوں کو بھی حاصل ہوگا اور مقربین کو بھی۔ مگر ان دونوں میں اتنا تفاوت ہے کہ ان دونوں کے آپس میں کوئی نسبت قائم کرنی دشوار اور مشکل ہے۔

یہ صورت اور حقیقت دونوں شریعت مطہرہ کے دائرہ میں داخل ہیں۔ رسول اللہؐ کے سنن اور آپ کے معنوی انوار سے ماخوذ ہیں۔ ایک صورت شریعت ہے، دوسری حقیقت شریعت۔

لہٰذا معدن جملہ کمالات شریعت غرا ہے۔ کوئی کمال ایسا نہیں جس کے لئے شریعت حقہ کے ماسوا کسی اور کی ضرورت ہو۔

معرفت خداوندی جس پر کمالات کا مدار ہے۔ نیز معرفت خداوندی کی تکمیل اس پر موقوف ہے کہ درجۂ فنا حاصل ہو اور نفس انسانی مطمئن ہو جائے۔

پس اہل بصیرت عقلاء کا فرض ہے کہ اپنے نصب العین اور حاصل زندگی پر پوری طرح غور کریں۔ جو اس دولت سے بہرہ ور ہو جائے، اس کو مبارک باد اور ہزاروں تحسین و آفریں۔ بلاشبہ اس نے اپنی پیدائش کے مقصود کو حاصل کر لیا اور نعمت خداوندی اس پر مکمل ہوگئی۔ اور اگر یہ دولت حاصل نہیں ہوئی تو ضروری ہے کہ اس کی جستجو میں مشغول رہے۔ جہاں اس کا سراغ معلوم ہو، اس کی طرف دوڑے اور اس کو حاصل کرنے کی جدوجہد کرے۔

ترسم کہ یار با ما آشنا بماند ۔۔۔ تا دامن قیامت ایں غم بماند

(مکتوب نمبر ۹۲ مکتوبات خواجہ محمد معصوم جلد ا ص ۱۱۶)

اس مکتوب گرامی یا اس قسم کی تلقینات کا عالمگیر پر کیا اثر ہوا۔ اس کا اندازہ سلطان عالمگیرؒ کے حالات سے ہوگا جو اس حصہ کے آخر میں درج ہوں گے۔ (انشاء اللہ)

حج بیت اللہ

برادر بزرگ حضرت خواجہ احمد سعید صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے ہمراہ زیارت بیت اللہ کے لئے

تشریف لے گئے۔ اس سفر میں اور مقاماتِ مقدسہ کے قیام میں جن برکات، کرامات اور خوارق کا ظہور ہوا۔ وہ آپ کی سوانح سے متعلق کتابوں میں درج ہیں۔ یہ حقیر تصنیف ذکر کرامات وخوارق کی متحمل نہیں۔

البتہ اس مبارک سفر میں دو چیزیں خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔

(۱) شاہجہاں زندہ تھا۔ اس کی اولاد میں تختِ سلطنت کے لئے کش مکش شروع تھی۔ دارا شکوہ اس خاندان کا دشمن تھا۔ عالمگیر اس خاندان کا حلقہ بگوش۔

ہر ایک منزل پر جوق در جوق مسلمان آتے اور داخلِ سلسلہ ہوتے۔ حلقہ بگوشوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ حدودِ ہندوستان میں یہ مبارک سفر عالمگیر کی عام حمایت کا ذریعہ بھی بن گیا۔ خود عالمگیر نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا۔ کسی منزل پر خود حاضرِ خدمت ہوا، اور بارہ ہزار اشرفیاں نذر کیں۔

حالاتِ مشائخ نقشبندیہ میں تحریر ہے:

حضرت نے اس کو بشارتِ سلطنت دی۔ اس نے عرض کیا کہ مجھ کو آپ لکھ بھی دیں چنانچہ حضرت نے اُن کو لکھ بھی دیا۔ فوقع کما قال''۔

یہ معلوم نہیں کہ تحریر کے الفاظ کیا تھے۔ مگر ظاہر ہے اس قسم کی تحریر حضرت مجدد کے متوسلین کے لئے کیا اثر رکھ سکتی تھی۔ بالخصوص جبکہ عمائدین وارا کینِ دولت اور بعنوانِ دیگر حکومت کا داہنا بازو اس خاندان کا حلقہ بگوش تھا۔ اور اس کی عظیم الشان خدمات اور ان کے بہترین نتائج اپنی آنکھوں سے نہ صرف دیکھ چکا تھا بلکہ ان سے بہرہ اندوز ہو رہا تھا۔

آئندہ آپ پڑھیں گے کہ جب عالمگیر نے دارا شکوہ کے مقابلہ پر علمِ استقلال بلند کیا، تو اُمراءِ دولت، دارا شکوہ کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر عالمگیر کی حمایت کرنے لگے۔ حتیٰ کہ عالمگیر جب آگرہ پہنچا تو شاہجہاں کے تمام معتمد اُمراء نے شاہجہاں کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ اُمراءِ دولت جو ہمیشہ شاہجہاں کی وفاداری میں پیش پیش رہے۔ جب وہ آج حقِ نمک کی رعایت سے چشم پوشی کرنے لگے تو شاہجہاں نے قلعہ کی کنجیاں عالمگیر کے پاس بھیج دیں اور جو مکتوب روانہ کیا، اس کے ایک فقرہ کا ترجمہ یہ ہے:

''واقعہ حیرت افزا ہے جو مجھے نصیب ہوا۔ اقبال کس طرح یاوری نہیں کرتا۔ کار ہاتھ سے اور ہاتھ کار سے ایسا گزر گیا کہ بیان نہیں ہو سکتا''۔

عالمگیر کی بہن ''گوہر آرا''(۲۷۴) کہا کرتی تھی۔ میرے بھائی اورنگ زیب نے بارہ ہزار اشرفیوں میں سلطنت خریدی ہے۔

(۲) خواجہ معصوم مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کی دولتوں سے بہرہ اندوز ہو چکے ہیں۔ روانگی کا قصد ہے۔ سامانِ سفر تیار ہو چکا ہے۔ آخری زیارت کے لئے حرمِ اطہر میں حاضر ہوئے ہیں۔ الم مفارقت سے گریہ جاری ہے۔ انتہائی تضرع کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں اپنی تمنائیں پیش کر رہے ہیں۔ بارگاہِ رسالت سے بھی روحانی برکات

کا فیضان ہو رہا ہے۔ یکایک کوئی شخص آکر خبر دیتا ہے:

''ہندوستان میں دارا شکوہ مالک تخت و تاج ہو گیا''۔

خواجہ معصوم کا قلب مبارک متفکر ہوتا ہے کہ دارا شکوہ شریعت غرا کا دشمن ہے خانوادہ مجددی سے خاص طور پر پرخاش رکھتا ہے۔ آپ نے دوسری درخواستوں کے ساتھ اس پریشانی کو بھی بارگاہ رسالت میں پیش کیا۔ فوراً محسوس ہوا کہ رسالت پناہ رحمت عالمؐ دست مبارک میں تلوار برہنہ لئے ہوئے جلوہ فرما ہیں۔ اور ارشاد فرمارہے ہیں:

''جو اس خاندان کا دشمن وہ ہمارا دشمن۔ اور جو ہمارا دشمن اُس کے لئے قہر الٰہی کی یہ تلوار کافی ہے''۔

حضرت خواجہ مراقبہ سے فارغ ہوئے۔ خدام کو اطلاع دی کہ ''دارا شکوہ مارا گیا''۔

ہندوستان پہنچے تو دارا شکوہ قتل ہو چکا تھا، اور سلطنت عالمگیر کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔

کوئی وجہ نہیں کہ عالمگیر کو موقعہ شناس ریا کار کہا جائے۔ بلاشبہ اس کی فطرت سلیم تھی۔ مذہب پرست باپ کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔ مذہب پرست امراء اور ارکان دولت کا مجمع اس کو میسر آیا تھا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ ساری فضا حضرت مجدد صاحب کی مخلصانہ جدوجہد کا نتیجہ تھی۔ قدرتی طور پر عالمگیر کو حضرت مجدد صاحب اور ان کے جانشینوں کا معتقد ہونا چاہئے تھا۔ اُس نے مخلصانہ عقیدت قائم کی وہ حضرت خواجہ معصوم سے بیعت ہوا یہ حسن اتفاق تھا کہ اس کے مخلصانہ جذبات حصول سلطنت کے لئے بھی کار آمد ثابت ہوئے۔ لامحالہ اُس کے خلوص اور عقیدت مندی میں اضافہ ہونا ضروری تھا۔ اب اُس نے باقاعدہ مراحل سلوک طے کرنے کا قصد کیا۔ حضرت خواجہ شیخ محمد سعید صاحب کو تکلیف دی۔ اصرار کے بعد تشریف لائے مگر عمر نے وفا نہ کی۔ اس کے بعد خود حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب سے تشریف آوری کی درخواست کی۔ مگر آپ کا تخت سلطنت پرانا بوریا اور ایوان شاہی خانقاہ معلیٰ کی جھونپڑیاں تھیں آپ دہلی کے لال قلعہ کو کب پسند فرما سکتے تھے۔ ہزار درخواستیں کیں۔ بے انتہا اصرار کیا، مگر کامیاب نہ ہوا۔ بالآخر التجا کی کہ کسی خلیفہ کو مامور فرما دیا جائے، جو میرے پاس تشریف فرما ہو کر روحانیات کی تلقین و اصلاح فرمادیں۔ یہ درخواست منظور ہوئی اور حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب کے چھوٹے فرزند حضرت مولانا سیف الدین صاحب اس خدمت پر مامور ہوئے۔ (باقی حالات آئندہ ان دونوں کے حالات کے سلسلہ میں بیان کئے جائیں گے)

وفات

حضرت خواجہ محمد معصوم کو وجع المفاصل کا عارضہ تھا۔ اواخر ۱۰۷۸ھ میں اس نے شدت اختیار کی۔ بہت علاج کئے، کچھ فائدہ نہ ہوا۔ مایوس ہو کر حضرت خواجہ نے فرمایا۔ کوئی دوا کارگر نہ ہو گی۔ حکیم مطلق نے دوا کا اثر زائل فرما دیا ہے۔

مرض بڑھتا گیا۔ اُمید زیست منقطع ہونے لگی۔ آپ کے اثاثہ میں قابل قدر اور محبوب چیز آپ کا کتب خانہ تھا۔ محرم ۱۰۷۹ھ میں آپ نے جملہ احباب کو بلایا۔ کتب خانہ صاحبزادوں پر تقسیم کر دیا۔ حاضرین سے اپنی تقصیرات کی معافی چاہی اور وصیت فرمائی، قرآن شریف، حدیث، اجماع اور اقوال مجتہدین پر عمل کرو۔ اتباع سنت میں اپنی طاقت صرف کر دو۔ فقراء خلاف شرع سے پرہیز رکھو۔ آخر ماہ صفر میں ایک تقریب سے بہت بڑا مجمع ہوا۔ حضرت نے عفو تقصیرات اور اسی وصیت کا مکرر اعادہ فرمایا۔ نیز فرمایا کہ طبیعت چاہتی ہے کہ ماہ ربیع الاول میں رسالت پناہ، قبلہ رشد و ہدایت، رحمت عالم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوں۔

اس کے بعد حضرت پر مرض کا غلبہ ہوا۔ کسر نفس، خشیہ اور تواضع کا یہ عالم تھا، کہ آپ نے قرب و جوار کے تمام بزرگوں کو لکھ بھیجا:

''فقیر محمد معصوم از دنیا میرود۔ باید کہ بدعاء خیریت خاتمہ مدد و معاون باشند''

سید مرزا نامی ایک بزرگ نے جواب میں لکھا:

در ہر پیر زن مے زد پیمبر — کہ اے زن در دو عالم یاد آور

یقین میداں کہ شیراں شکاری — دریں راہ خواستند از مور یاری

۸ ربیع الاول ۱۰۷۹ھ جمعہ کا دن تھا۔ آپ نماز جمعہ کے لئے مسجد جامع میں تشریف لے گئے۔ شوق نماز کا یہ جذبہ تھا، ورنہ طاقت ختم ہو چکی تھی۔ آپ نے وہیں اندازہ کر لیا اور فرمایا: ''توقع نہیں کہ کل اس وقت تک دنیا میں رہوں گا''۔

۹ ربیع الاول کا آفتاب طلوع ہوا، تو آپ اطمینان و سکون کے ساتھ صبح کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد مصلّٰی پر مراقبہ میں مشغول تھے۔

ایک حیرت انگیز روحانی طاقت تھی جو ادائے عبادت و معمولات کے لئے انجکشنوں کا کام دیتی رہی۔ مراقبہ سے فراغت کے بعد نوافل اشراق ادا کئے۔ پھر بستر پر تشریف لائے۔ سانس ٹوٹ گیا مگر لب مبارک متحرک تھے۔ کان لگا کر سنا گیا تو سورۂ یٰسین کی تلاوت ہو رہی تھی۔

۷۲ سال دنیا میں قیام فرما کر ۹ ربیع الاول ۱۰۷۹ھ روز شنبہ بوقت دوپہر روح معصوم نے مستقر اعلیٰ کا رخ کیا۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

حضرت شاہ محمد یحییٰؒ[1]

آپ حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے سب سے چھوٹے فرزند ہیں۔ ولادت باسعادت ۱۰۲۳ھ میں ہوئی۔ ولادت سے قبل حضرت مجدد صاحب کو الہام ہوا تھا انا نبشرک بغلام اسمہ یحییٰ۔ (۲۷۵) یہی آپ کی وجہ تسمیہ ہے۔

شاہ کا خطاب

حضرت مجدد صاحب خانقاہ معلیٰ میں رونق افروز ہیں۔ حضرت شاہ سکندر صاحب قادری قدس اللہ سرہ العزیز(۳۷۶) تشریف لاتے ہیں۔ حضرت مجدد صاحب کے فرزندان گرامی کی ہمت عالی اور بہترین استعداد و قابلیت مسلم ہو چکی ہے۔ ہر صاحب کمال چاہتا ہے کہ اپنے کمالات کا حصہ ان کو دے اور سلسلۂ خیر کو اپنے سے وابستہ کرے۔

چنانچہ حضرت شاہ سکندر صاحب فرماتے ہیں۔ میاں شیخ احمد! اپنا کوئی بیٹا ہمیں بھی دے دو، جو ہماری طرح دانا اور دیوانہ ہو۔

حضرت مجدد صاحب فوراً اس صغیر سن بچہ کو پیش کر دیتے ہیں۔ حضرت شاہ سکندر صاحب نے نو عمر یحییٰ کو آغوش میں لیا۔ اپنی نسبت خاصہ عطا فرمائی، اور فرمایا۔ یہ بچہ ہمارا ہے۔ آج سے اسے ''شاہ'' کہا کرنا۔
شیخ محمد یحییٰ کو شاہ محمد یحییٰ بنا کر حضرت شاہ سکندر صاحب تشریف لے گئے اس وقت حضرت مجدد صاحب بہت مسرور تھے۔ فرماتے تھے۔ ''سبحان اللہ! محمد یحییٰ صغیر سنی سے مقبول اولیاء اللہ ہو گئے''۔

تعلیم و تربیت

شاہ محمد یحییٰؒ کی بلندی استعداد کا اندازہ لڑکپن سے ہی ہوتا تھا۔ حضرت مجدد صاحب نے بعض مقامات و کمالات کی بشارت بھی دی تھی۔ مگر آپ کو افسوس تھا کہ میں عمر کا آخری دورہ طے کر رہا ہوں۔ بظاہر محمد یحییٰ کی تعلیم و تربیت نہیں کر سکوں گا۔

چنانچہ حضرت شاہ یحییٰ نے ابھی قرآن ہی حفظ کیا تھا۔ آپ کی عمر ابھی صرف ۹ سال تھی کہ حضرت مجدد صاحب نے اس دار فانی کو وداع فرما دیا۔

حضرت مجدد صاحب کی وفات کے بعد برادران گرامی نے تعلیم و تربیت کی نگرانی فرمائی۔ بیشتر علوم نقلیہ و عقلیہ کا درس خود دیا۔ بیس سال کی عمر میں آپ تحصیل علوم سے فارغ ہوئے۔ سلوک باطن و مقامات طریقہ احمدیہ کی تحصیل کی طرف توجہ کی۔ جس کے دو بڑے بھائی اپنے وقت کے قطب اور وتد ہوں، سلوک باطن اُس کے گھر کی چیز ہے۔ چنانچہ تھوڑے عرصہ میں مراحل و مقامات سلوک طے فرما کر خود بھی شیخ وقت ہو گئے اور ارشاد و تلقین کے فرائض انجام دینے لگے۔

حضرت خواجہ محمد معصوم کو آپ سے زیادہ تعلق تھا۔ اورنگ زیب آپ سے بہت زیادہ مانوس اور آپ کا بہت زیادہ معتقد تھا۔ بہت سے دیہات اور املاک حضرت شاہ صاحب کی نذر کیے۔ چنانچہ سرہند میں مثل مشہور ہو گئی۔

اَلملکُ للہ و الملکُ لیحییٰ۔

آپ نے دو مرتبہ حج بیت اللہ ادا کیا۔ ۱۰۹۶ھ میں ۷۲ سال کی عمر پا کر اس دار ناپائیدار سے کوچ فرمایا۔
حضرت مجدد صاحب کے قبہ کے برابر جانب مغرب مدفون ہوئے۔(۳۷۷)

حضرت خواجہ سید آدم صاحب بنوری قدس اللہ سرہ العزیز

حسینی سید ہیں۔ آپ کی نانی اگرچہ سیدہ تھیں مگر چونکہ افغانستان کی رہنے والی تھیں، ان کو افغانی سمجھا جاتا تھا۔ وطن اصلی قصبہ مودہ تھا لیکن سرہند کے قریب قصبہ "بنوڑ" میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ والد ماجد نے خواب میں دیکھا کہ سرور کائنات تشریف لائے۔ سینۂ مبارک پر دست مبارک پھیرا۔ کوئی چیز نکال کر والد صاحب کو مرحمت فرمائی۔ اور حکم فرمایا کہ کھاؤ۔ والد صاحب نے کھائی۔ اسی شب استقرار حمل ہوا۔

حضرت آدم صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ میرا وجود فخر کائنات ؐ کے اسی عطیۂ مبارک سے ہے۔

آپ مادر زاد ولی تھے لیکن تعلیم ظاہری نہیں حاصل کی تھی۔ ایک روز ایک آواز سنی: "آدم تم نے قرآن شریف کیوں نہیں پڑھا"۔ حضرت آدم نے ہاتف غیبی کے جواب میں عرض کیا۔ خداوند تو قادر مطلق ہے، اگر چاہے تو اسی وقت حافظ قرآن کر سکتا ہے۔ چنانچہ فی الفور حفظ قرآن شریف کی دولت عطا ہو گئی۔ اسی کے بعد علوم ظاہری کی تکمیل کی۔

کسب معاش کے لئے ابتداء عہد شباب میں آپ فوج میں بھرتی ہو گئے۔ جب جذبۂ عشق نے متوالا کیا تو ملازمت چھوڑ دی، حضرت مجدد صاحب کے خلیفہ حضرت حاجی خضرؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلسلۂ مجددیہ میں داخل ہو گئے۔ مگر لطف الٰہی اور فضل خداوندی سے تھوڑے ہی دنوں میں وہ حالات اور مقامات پیش آئے جن کی رہنمائی شیخ کے احاطۂ تکمیل سے خارج تھی۔

حضرت شیخ حاجی خضرؒ نے ان کو حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں بھیج دیا۔ اب ایک گوہر عالی ماہر ترین جوہری کی نظر انتخاب سے سرفراز ہوا۔ تھوڑے عرصہ میں مراتب تکمیل حاصل کر کے خرقۂ خلافت زیب تن کیا۔ اور شیخ کامل کے مقصود اعظم اور نصب العین مقدس کی تکمیل میں مشغول ہو گئے۔

قادری، چشتی، سہروردی، شطاری اور مداری سلسلوں میں اجازت تلقین حاصل کی۔ دنیا نے آپ کو خلیفۃ الزمانی اور قطب الاقطاب تسلیم کیا۔ مولانا بدر الدین صاحب مصنف کتاب "الحضرات" تحریر فرماتے ہیں:

پابندیٔ سنت رسول اللہ، مخالفت بدعات، طریقۂ مجددیہ کا خاص امتیاز ہے۔ حضرت آدم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اس امتیاز مخصوص میں نرالی شان کے مالک تھے۔ آپ کی توجہ موثر کی برکت سے ہزاروں طالبان حق درجۂ ولایت پر پہنچے۔ آپ کی خانقاہ عالی جاہ میں ایک ہزار طالبان طریقت سے زیادہ کا اجتماع رہتا۔ حضرت شیخ کا لنگر ان سب کے دو وقت طعام کا متکفل تھا۔ (خزینۃ الاصفیاء)۔

حضرت شیخ کے خاص مقربین میں سے ایک صاحب شیخ محمد صاحب ہیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ

قحط ہوا۔ غلہ گراں ہوگیا۔ مصارف خانقاہ میں دشواری ہوئی۔ خدام خانقاہ نے حضرت شیخ سے ضرورت کا اظہار کیا۔ ایک مٹکا جس میں کچھ غلہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو اونچی جگہ رکھ دو، اس کا منہ بند کردو۔ اس کی تلی میں سوراخ کردو، اور بقدر ضرورت اس کی تلی کے سوراخ میں سے لیتے رہو۔ انشاء اللہ برکت ہوگی۔

چھ ۶ ماہ متواتر غلہ اسی طرح لیا جاتا رہا، اور صرف ہوتا رہا۔ چھ ۶ ماہ کے بعد زمانہ قحط ختم ہوگیا۔ غلہ کی افراط ہوگئی۔ مٹکے کا منہ کھولا گیا تو اس میں جتنا غلہ پہلے تھا اتنا ہی اب بھی تھا (تذکرہ آدمیہ بحوالہ خزینۃ الاصفیاء)۔

حضرت حق جل مجدہ نے آپ کو سلسلۂ طریقت میں ایک مخصوص طریقہ مرحمت فرمایا طریقۂ حسنیہ نقشبندیہ اس کا نام ہوا اتباع سنت کی برکت تھی کہ آپ کو بشارت دی گئی کہ جو آپ کے طریقہ میں داخل ہوگا، مرحوم و مغفور ہوگا۔ قیامت کو علم سبز اور ظل محمدی آپ کو عنایت ہوگا۔ آپ کے متوسلین اس کے زیر سایہ آرام سے ہوں گے۔

آپ کی مجلس نمائش و شہرت سے پاک، ثروت اور دولت سے بے نیاز، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی درس گاہ تھی۔ اُمراء دولت سے گفتگو اور ملاقات کے وقت آپ کی بے نیازی نمایاں طور پر کارفرما ہوتی۔ بڑے بڑے اُمراء آپ سے کلام کرتے وقت مرعوب ہوجاتے۔ آپ گفتگو بہت کم کرتے۔ آپ کا کلام ہمیشہ پند آمیز ہوتا تھا کبھی تکلفات سے قطعاً معرا اور مبرا۔ آپ کے مریدین کی تعداد چار لاکھ تک بتائی جاتی ہے۔ آپ کے کمالات و کرامات احاطۂ تحریر سے بالا ہیں۔

ملا بدرالدین صاحب سرہندی کی (جو سید آدم صاحب کے پیر بھائی تھے) مناقب اولیاء میں، حاجی محمد امین بدخشی خلیفہ حضرت مجدد صاحب کی مناقب الحضرات میں، علاوہ ازیں تذکرۂ آدمیہ، تذکرۃ الاولیاء، سفوات الاتقیاء، روضۃ السلام، تذکرۃ الاصفیاء، خزینۃ الاصفیاء وغیرہ میں آپ کے کمالات و مناقب درج ہیں۔ من شاء فلیراجع الیہا۔

شاہجہاں اور حضرت شیخ آدم قدس اللہ سرہ العزیز

شعبان ۱۰۵۲ھ میں شاہجہاں کشمیر وغیرہ کے دورہ سے فارغ ہوکر لاہور پہنچا۔ ۷ شعبان ۱۰۵۲ھ کو شالامار باغ کا معائنہ فرمایا۔ (۳۲۸)

اس سے صرف ایک سال پیشتر کا واقعہ تھا کہ وہی قلعہ کانگڑہ جس کو جہانگیر نے فتح کیا تھا، جگت سنگھ اور اس کے بیٹے راج روپ نے حیلہ حوالہ کر کے اس علاقہ کی تعلق داری حاصل کی، اور پھر بادشاہ سے بغاوت کر بیٹھے۔

تاراگڑھ کا مشہور اور نہایت مستحکم قلعہ جس کو شاہجہاں نے اسی لئے مسمار کرادیا تھا کہ باغیوں کی پناہ گاہ نہ بن سکے۔ جگت سنگھ نے اس کو دوبارہ تعمیر کر کے سامان حفاظت مستحکم کرلیا۔ آٹھ دس ماہ کی جدوجہد کے بعد جگت سنگھ کو شکست ہوئی۔ اُس نے معافی کی درخواست بارگاہ شاہجہاں میں پیش کی۔ جو منظور ہوئی اور اُس کو خلعت و منصب عطا ہوا۔ کسی دوسری جگہ کا گورنر بنادیا گیا۔

قندھار، بلخ، بخارا کا علاقہ شاہجہاں اور شاہ ایران کی فوجوں کا رزم گاہ رہا۔ ازبک اور قزلباش، شاہجہانی لشکر کو آئے دن پریشان کرتے رہتے تھے۔ محرم ۱۰۵۲ھ میں جب شاہ ایران کی طرف سے بہت زیادہ تیاری کی اطلاع پہنچی۔ تو شاہزادہ دارا شکوہ کو شاہی فوج کے تیس ہزار سوار، سات ہزار سوار توپ خانہ اور صوبائی افواج کے پچیس ہزار سوار اور تقریباً ایک لاکھ پیادہ فوج کے ساتھ شاہ ایران کے مقابلہ کے لئے بھیجا گیا۔ مقابلہ نہایت سخت تھا۔ مگر شاہجہاں کا یہ اقبال تھا کہ شاہ صفی شاہ ایران کا انتقال ہو گیا۔ اس کی جگہ شاہ عباس ثانی تخت نشین ہوا۔

یہ حادثہ نہایت مبارک تھا۔ دارا شکوہ نے درخواست بھیجی کہ اگر اجازت ہو تو خراسان کی طرف کوچ کر کے اس علاقہ کو مسخر کیا جائے۔ مگر اس بلند ہمت اور عالی حوصلہ بادشاہ نے جواب دیا:

ایک لڑکے کی سلطنت پر جس کا باپ ابھی مرا ہو، اور اس کی سلطنت نے استحکام نہ پایا ہو، مہم کرنا سلاطین نیک سیرت کے رویہ کے مخالف ہے۔ لہٰذا تم خود مع لشکر جلد حضور میں حاضر ہو۔ آں فرزند عزیز کے دیدار کی فرحت ہفت اقلیم کی تسخیر سے زیادہ ہے۔ (۲۷۹)

بہر حال اس وقت یعنی شاہجہاں کے قیام لاہور (از ۷ شعبان ۱۰۵۲ھ تا ۲۲ شعبان ۱۰۵۲ھ) میں اگرچہ جگت سنگھ اور شاہ ایران دونوں کی طرف سے اطمینان تھا۔ مگر یہ یقین تھا کہ چھپی ہوئی چنگاریاں دونوں جگہ موجود ہیں۔ بالخصوص شاہ ایران کی طرف سے اطمینان کرنے کے کوئی معنی بھی نہ تھے۔ چنانچہ پانچ چھ سال بعد اسی نوجوان بادشاہ نے قندھار پر اچانک حملہ کر کے قلعہ فتح کر لیا۔ پھر بار بار کی کوشش کے باوجود، نہ شاہجہاں اس قلعہ کو واپس لے سکا نہ عالمگیر۔

اسی دوران میں حضرت شیخ آدم قدس اللہ سرہ العزیز لاہور تشریف لے گئے۔ آپ کے ہمراہ افغانوں اور سادات کی جماعت دس ہزار کے قریب تھی۔ خانقاہ معلّی اچھا خاصا شہر بن جاتی تھی۔ پرچہ نویسوں نے اس کی اطلاع شاہجہاں کو دی۔ ارا کین دولت نے اس علاقہ میں بالخصوص مذکورہ بالا حالات کے ہوتے ہوئے اس قدر اجتماع کو تشویش کی نگاہ سے دیکھا۔ مشیران شاہی کے مشورہ سے بادشاہ نے وزیر "سعد اللہ خاں" (۲۸۰) کو حضرت شیخ کی خدمت میں بھیجا۔

وزیر اعظم خانقاہ آدمیہ میں حاضر ہوئے۔ مگر حضرت شیخ نے نہ صرف یہ کہ اپنے طرز کے بموجب استغناء اور بے نیازی سے گفتگو کی بلکہ نامناسب باتوں پر تنبیہ اور ترک دنیا کی فہمائش بھی فرمائی۔ علامہ سعد اللہ کتنے ہی نیک نفس اور پاک باز سہی، مگر بہر حال شاہجہاں جیسے کامیاب شہنشاہ کے وزیر اعظم تھے۔ اس استغناء کا ان پر اچھا اثر نہیں پڑا۔ پٹھانوں کے اس غیر معمولی ہجوم سے جو تشویش پیدا ہوئی تھی، وہ جاتی رہی اور اسی تشویش کا اظہار دربار میں پہنچ کر شاہجہاں سے کر دیا۔

شاہجہاں نے مدبرانہ طور پر حضرت شیخ کے پاس کہلا بھیجا کہ مناسب یہ ہے کہ آپ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے جائیں۔ حضرت حافظ سید عبد اللہ صاحب شیخ آدم بنوری کے خلیفہ ہیں، اور حضرت شاہ ولی اللہ

صاحب محدث دہلوی کے والد ماجد حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب کے پیرو مرشد۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کے واسطہ سے اس واقعہ کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی ہے کہ حضرت حافظ سید عبداللہ صاحب نے فرمایا کہ جب حضرت شیخ آدم کی شہرت بہت زیادہ ہوئی تو شہاجہاں نے علامہ سعد اللہ اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو بھیجا کہ حضرت شیخ آدم سے ملاقات کریں۔ جب یہ دونوں ارکان دولت، حضرت شیخ کی قیام گاہ پر پہنچے تو حضرت شیخ مراقبہ میں مشغول تھے کافی دیر دروازہ پر انتظار کرتے رہے۔ جب مراقبہ سے فارغ ہوئے تو یہ دونوں صاحب زاویہ شیخ میں داخل ہوئے۔ حضرت شیخ نے ان کی رسمی تعظیم کچھ بھی ادا نہ کی۔ علامہ سعد اللہ نے فوراً اعتراض کر دیا کہ میں دنیا دار ہوں، میری تعظیم ضروری نہیں۔ مگر مولانا عبدالحکیم صاحب ایک عالم ہیں، ان کی تعظیم تو کرنی ضروری تھی۔ حضرت شیخ نے فرمایا۔ احادیث میں ہے کہ علماء کرام دین کے امانت دار اسی وقت تک ہیں جب تک بادشاہوں سے اختلاط نہ کریں۔ اور بادشاہوں سے اختلاط کے بعد وہ ڈاکو ہو جاتے ہیں۔ پھر علامہ سعد اللہ نے دریافت کیا۔ نسب شما چیست؟ حضرت شیخ نے جواب دیا۔ سید ہوں مگر چونکہ ننہالی سلسلہ میں افغانوں سے رشتہ ہے، اس لئے افغان مشہور ہو گیا ہوں۔ علامہ سعد اللہ نے پھر دریافت کیا۔ ہم نے سنا ہے کہ آپ علم لدنی رکھتے ہیں۔ جواب ملا۔ بیشک والحمدللہ۔ اس کے بعد دونوں صاحب واپس چلے آئے اور شاہجہاں سے کہا۔ معمولی فقیر ہے مگر متکبر ہے۔ لمبے چوڑے دعوے کرتا ہے۔ افغان ہے خود کو سید کہتا ہے۔ اس کے باوجود افغانی اس کے بہت معتقد ہیں۔ خطرہ ہے کوئی فتنہ نہ کھڑا کر دے۔ شاہجہاں نے متاثر ہو کر روانگی حجاز کا حکم صادر کر دیا۔ حضرت شیخ فوراً روانہ ہو کر سورت پہنچے۔ وہاں کا حاکم حضرت شیخ کا معتقد تھا۔ اس سے فرمایا۔ تمہاری خدمت یہی ہے کہ ہمارے لئے فوراً جہاز مہیا کر دو۔ حضرت شیخ کی روانگی کے بعد شاہجہاں نے خواب دیکھا کہ حکومت شاہجہاں کا بقاء اسی وقت تک ہے، جب تک شیخ آدم ہندوستان میں ہیں۔ خواب سے متوحش ہو کر شاہجہاں نے حاکم سورت کے پاس حضرت شیخ کو روک لینے کا حکم بھیجا۔ مگر حضرت شیخ روانہ ہو چکے تھے (انفاس العارفین ص ۱۳-۱۴)

بہر حال حضرت شیخ کو خود زیارت بیت اللہ کی تمنا تھی۔ بہترین موقعہ میسر آ گیا۔

خدا شرے برانگیزد کہ در وں خیرے نہاں باشد

حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر مدینہ طیبہ حاضر ہوئے، اپنے نانا جان کی برکات کو سمیٹنا شروع کر دیا۔ زیارت روضہ سید المرسلین ﷺ کے بعد واپسی کا قصد کیا۔ اجازت کے لئے روضۂ انور پر حاضر ہوئے۔ لیکن ایک عجیب و غریب واقعہ حضرت شیخ اور آپ کے رفقاء نے مشاہدہ کیا۔

مرقد اطہر سے دو دست مبارک ظاہر ہوئے۔ حضرت شیخ نے بہزار شوق آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ بوسہ دیا۔ پھر حضرت شیخ کو بارگاہ رسالت سے بشارت دی گئی۔

یا ولدی انت فی جواری — فرزند من! تم میرے جوار میں رہو۔

حضرت شیخ نے اس مژدہ کے بعد ہندوستان کا خیال ہی ترک کر دیا۔

مصافحہ کا یہ معاملہ حاضرین نے بھی دیکھا تھا۔ بطور مکاشفہ یہ بھی بتایا گیا، کہ جو شخص شیخ آدم سے مصافحہ کرے گا وہ گویا رسول اللہؐ سے مصافحہ کرے گا۔ اور ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ سے مصافحہ کرنے والا مغفور ہوگا۔

اس بشارت یا اس قیاس نے یہاں تک شہرت پائی کہ عوام الناس کی بھیڑ کے باعث حضرت شیخ کو مصافحہ کے لئے خاص انتظام کرانا پڑا۔

وفات

قیام مدینہ طیبہ کا عزم کئے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ۱۳ شوال ۱۰۵۳ھ (تیرہ شوال سنہ دس سو ترپن ہجری) کو مدینہ طیبہ میں وفات ہوگئی جنت البقیع میں حضرت عثمان ذی النورینؓ کے روضہ مبارک کے قریب دفن کیا گیا۔ حضرت ذی النورین کے روضہ مبارک کا سایہ ہما پایہ، شیخ آدم نور اللہ مرقدہ کے مزار معدن انوار پر پڑتا رہتا ہے۔ زہے قسمت۔

اولاد

چار لڑکے، دو لڑکیاں۔

بڑے صاحبزادے سید غلام محمد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز وطن میں رہے۔ شیخ محمد اولیاء، شیخ محمد عیسیٰ اور دونوں صاحبزادیاں ہمراہ تھیں۔ چوتھے صاحبزادے سید محمد محسن ۱۰۵۲ھ میں بمقام گوالیار پیدا ہوئے۔ جب کہ حضرت شیخ آدم حج کے لئے تشریف لے جارہے تھے۔

شیخ حامد لاہوری متوفی ۱۰۵۴ھ (ایک ہزار چون)۔ شیخ نور محمد پشاوری، متوفی ۱۰۵۹ھ (ایک ہزار اُنسٹھ)۔ شیخ ابو الفتح متوفی ۱۰۶۶ھ (ایک ہزار چھیاسٹھ)۔ شیخ محمد سلطان پوری متوفی ۱۰۷۵ھ (ایک ہزار پچھتر)۔ میر سید متوفی ۱۰۸۱ھ (ایک ہزار اکیاسی)۔ شیخ محمد اقبالی متوفی ۱۰۸۶ھ (ایک ہزار چھیاسی)۔ شیخ سعدی بخاری متوفی ۱۱۰۸ھ (گیارہ سو آٹھ)۔ حضرت شیخ آدم نور اللہ مرقدہ کے مشہور خلفاء ہیں جن سے دنیا نے بہت زیادہ فیض حاصل کیا، اور جن کے اسماء گرامی صفحات تاریخ میں نمایاں ہیں۔

قطب پنجاب شیخ محمد طاہر لاہوری

قادری ونقشبندی، مجددی قدس اللہ سرہ العزیز

حضرت مجدد صاحب کے جلیل القدر خلفاء میں سے ہیں۔ تحصیل علوم کے بعد سب سے پہلے حضرت شاہ سکندر ابن حضرت شاہ کمال کیتھلی قدس اللہ سرہما سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہوئے۔ ایک عرصہ تک شیخ عبدالاحد والد ماجد حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ پھر حضرت مجدد

صاحب قدس اللہ سرہ العزیز سے درجہ تکمیل حاصل کیا۔

حضرت خواجہ احمد سعید و خواجہ محمد معصوم صاحبزادگان حضرت مجدد صاحب کی تعلیم و تدریس آپ کے سپرد ہوئی۔ آپ کی زندگی کا ایک عجیب و غریب واقعہ درج ذیل ہے۔

حضرت مجدد صاحب کے حلقہ متعلقین میں سالکان طریقت کا اجتماع ہے۔ یکایک حضرت مجدد صاحب کے چہرہ مبارک سے آثار کبیدگی ظاہر ہوتے ہیں اور نہایت افسوس کے ساتھ آپ ارشاد فرماتے ہیں:

مجھے بتایا گیا ہے کہ حاضرین میں سے ایک شخص طوق کفر اپنی گردن میں ڈالے گا۔ میں اس کی پیشانی پر ہوا لکافر لکھا ہوا دیکھ رہا ہوں۔

حاضرین مجلس لرزہ بر اندام ہو گئے۔ پانچ چھ ماہ بعد دیکھا جاتا ہے کہ یہی شیخ طاہر ایک عورت کافرہ کے عشق میں مبتلا، زنار از تداد گردن میں آوارہ و سرگرداں پھر رہے ہیں۔ صاحبزادگان اور جملہ متوسلین حضرت مجدد کو بہت افسوس ہوا۔ دعاء کے لئے حضرت مجدد صاحب سے استدعا کی گئی۔

حضرت مجدد صاحب نے جواب دیا۔

''ہر چہ شدنی بود شد کہ در لوح محفوظ بحق او ہمیں مکتوب بود''۔

لیکن متوسلین حضرت مجدد صاحب اور بالخصوص ہر دو صاحبزادگان پھر بھی استدعا اور اصرار کرتے رہے۔ چنانچہ حضرت مجدد صاحب نے مکرر دعا فرمائی۔

''الٰہی حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی فرمودہ است کہ ہیچ کس را بر قضاء مبرم (۲۸۱) دست قدرت نیست مگر مرا چوں یکے از دوستان خود را ایں مرتبہ عالی کرامت فرمودی، من ہم امید دارم کہ بواسطہ من از شیخ طاہر ایں بلاء ازلی بگردد''۔

دعاء مجددی کا اثر ہوا۔ داعیہ صداقت طلبی نے کفر عشق پر غلبہ پایا۔ گویا شیخ طاہر خواب سے بیدار ہوئے۔ چنانچہ فوراً افتاں خیزاں بارگاہ مجددی میں حاضر ہو کر تائب ہوئے۔ التائب من الذنب کمالا ذنب لہ۔ عشق مجازی کا رد عمل عشق حقیقی تھا۔ جس سے شیخ طاہر کو تھوڑے عرصہ میں یہ مرتبہ حاصل ہوا۔ بقول صاحب خزینۃ الاصفیاء،

> ''اکثر اوقات در الہام مے شد کہ اے طاہر بگو ''قدمی علی رقبۃ جمیع اولیاء اللہ تعالیٰ'' لیکن وے از فرط ادب نے گفت و عرض کرد۔ یارب ایں درجہ معلّٰی و رتبہ عالی بحضرت غوث اعظم سزاوار است۔ مرا ہمیں بس ست کہ یکے از کمترین مریداں و پیروان جناب غوثیہ باشم۔ (۲۸۲)

بہر حال مجددی انوار سے دامن پر کرنے کے بعد حضرت مجدد صاحب کا حکم ہوا کہ لاہور میں جا کر خدمات انجام دیں۔ تعمیل ارشاد کے لئے لاہور روانہ ہو گئے۔ مگر تواضع اور انکسار کا یہ عالم تھا کہ بار بار رک جاتے اور خیال کرتے کہ یہ ذمہ داری میری برداشت سے باہر ہے۔ مگر کچھ ہاتف غیبی کی بشارت اور اس سے زیادہ حضرت شیخ

کے حکم نے آپ کو لاہور پہنچا دیا۔ جہاں کچھ طالبان سلوک نے فوراً ہی آپ سے بیعت کر لی، اور اس طرح سلسلۂ تلقین جاری ہو گیا۔(۳۸۳) رفتہ رفتہ حلقۂ ارادت میں ہزاروں بندگان خدا داخل ہوئے۔(۳۸۴) مولانا محمد الدین صاحب فوق ایڈیٹر اخبار کشمیری لاہور تحریر فرماتے ہیں:

شیخ طاہر بندگی نے مزنگ کے قریب آ کر قیام کیا۔ چونکہ علوم ظاہری و باطنی میں صاحب کمال تھے، اس لئے ایک مدرسہ بھی جاری کیا جہاں فقہ، حدیث و تفسیر طلبہ کو مفت پڑھایا جاتا تھا۔ مگر افسوس آپ کی وفات کے بعد مدرسہ جاری نہ رہ سکا۔

آپ کے فقر و تصوف اور اس مدرسہ کی وجہ سے یہاں عالیشان بستی قائم ہو گئی تھی جس کا نام "میانی" اس وجہ سے مشہور ہو گیا تھا کہ پنجابی زبان میں "میانا" ملا اور مولوی کو کہتے ہیں۔ یہاں ایک قیمتی کتب خانہ بھی تھا۔ جب سکھوں نے مزنگ کو لوٹا تو میانی کو بھی تباہ کیا گیا (تاریخ لاہور مصنفہ رائے کنہیا لال لاہور) میں لکھا ہے، کہ غارت گروں نے ہزاروں کتابیں "بے کار جنس" سمجھ کر باہر پھینک دیں اور چونکہ اس محلہ سے جہاں درویش اور عالم لوگ رہتے تھے، ان کو کچھ نہ مل سکا، اس لئے غصہ کے مارے محلے کو آگ لگا دی اور بالکل خاکستر کر دیا۔

ان کے مدرسہ کی عمارت ۱۸۸۴ء تک کسی قدر موجود تھی۔ محلہ میانی کی ویرانی کے بعد لوگوں نے اس کو قبرستان بنا لیا جو آج تک بطور قبرستان ہی چلا آتا ہے۔(۳۸۵)

منجملہ دیگر سلسلوں کے سلسلہ عالیہ قادریہ کا آپ پر بہت زیادہ غلبہ تھا اور اپنے زمانہ میں اس سلسلہ کے تمام مشائخ پر فوقیت رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ جب حضرت شیخ آدم کو آپ کی برتری کا علم ہوا تو اپنے حلقۂ ارشاد کو چھوڑ کر نسبت قادریہ حاصل کرنے کے لئے پاپیادہ بنور سے حضرت شیخ طاہر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نسبت قادریہ کا فیض کامل حاصل کیا۔

شیخ طاہر بہت زیادہ مرتاض، جفاکش، صابر اور قانع تھے۔ درس و تدریس کے ساتھ ذکر و شغل، مریدوں کی تلقین اور شب بیداری میں ہمیشہ سرگرم رہتے۔ اغنیاء اور دولت مندوں کی آمد کا دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔

آپ خود ہی اپنے ہاتھ سے فقہ اور حدیث کی کتابیں لکھتے، اُن پر حاشیہ تحریر فرماتے، اور ان کو فروخت کرتے۔ یہی آپ کا ذریعۂ معاش تھا۔

خطۂ پنجاب کی قطبیت آپ کے سپرد فرمائی گئی۔ اہل پنجاب آپ کے نام کے ساتھ "بندگی" کا لفظ بھی تعظیماً لگاتے ہیں۔ بروز پنجشنبہ بوقت چاشت ۲۰ محرم الحرام ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۰ء) بعمر (چھپن سال) آپ نے رحلت فرمائی۔ تاریخ وفات لفظ غم ہے، نیز آہ معرفت مرد ۱۰۴۰۔ مزار مبارک مرجع خلائق ہے۔

حضرت میر محمد نعمان قدس اللہ سرہ العزیز

آپ کو حضرت مجدد صاحب کے خلفاء میں سب سے اعلیٰ اور ارفع مانا جاتا ہے۔ آپ کی ولادت ۹۷۷ھ (نوسو ستتر ھ) میں بمقام بدخشاں ہوئی۔ والد صاحب کا اسم گرامی سید شمس[۳۸۲] الدین یحییٰ عرف میر بزرگ۔ ولادت سے قبل والد ماجد نے حضرت نعمان بن ثابت ابوحنیفہ (ابوحنیفہ امام اعظمؒ) کو خواب میں دیکھا۔ آپ ایک لڑکے کے پیدا ہونے کی بشارت دے رہے ہیں۔ جو بہت بزرگ ہوگا، اور اس کے لئے اپنا نام عنایت فرمارہے ہیں۔ چنانچہ والد ماجد نے یہی نام تجویز کیا۔

آپ کو ابتداء سے مراحل سلوک طے کرنے کا شوق تھا اور اسی غور و فکر میں عموماً رہتے تھے۔ ایام شباب میں آپ نے حضرت عبیداللہ بلخی عشقی کے ہاتھ پر توبہ کی۔ پھر ہندوستان تشریف لاکر ایک عرصہ تک شیخ کامل کی جستجو میں مشائخ وعلماء ہند سے ملتے رہے۔ آخر میں حضرت خواجہ باقی باللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں حاضری کی نوبت آئی، اور آپ اسی بارگاہ کے ہوگئے۔

اہل وعیال آپ کے ہمراہ تھے۔ حضرت خواجہ نے آپ کے قیام کا انتظام کیا۔ ذریعہ معاش کچھ نہ تھا۔ نہایت عسرت کے ساتھ زندگی بسر کرتے۔ حضرت خواجہ ان کی پرداخت فرماتے اور شریک حال رکھتے۔ ایک مرتبہ کسی حاکم نے حضرت خواجہ سے متوطنین کے نام پوچھے جو خانقاہ میں حاضر رہتے اور فقر و فاقہ کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ منشا یہ تھا کہ ان حضرات کے لئے یومیہ وظیفہ مقرر کردیا جائے۔

حضرت خواجہ نے جملہ حاضرین خانقاہ کے نام بتادیئے مگر صاحب موصوف کا نام نہیں بتایا۔ حالانکہ یہ سب سے زیادہ عیالدار اور ضرورت مند تھے۔ حضرت خواجہ سے اس کا سبب دریافت کیا گیا۔ فرمایا۔ میر محمد نعمان میرے بدن کا جزو ہیں۔

میر محمد نعمان صاحب کو جب اس خصوصیت کا علم ہوا تو خود ہی فرماتے ہیں۔

برقصہ رقم، وامید بابستم

حضرت میر صاحب عسرت و تنگ دستی کے باوجود ہمیشہ مسرور و فرحاں رہتے رنج و راحت سے گویا تاثر مفقود تھا۔ زحمت کو رحمت جانتے اور نہایت خندہ پیشانی سے اس کا مقابلہ کرتے۔

حضرت مجدد صاحب سے رابطہ

حضرت خواجہ نے جب کارخانۂ ارشاد و تلقین حضرت مجدد صاحب کے حوالہ فرمایا تو ان کو بھی ہدایت ہوئی کہ حضرت مجدد صاحب سے استفادہ کریں۔ آپ نے عرض کیا۔ خادم کی تمنا تھی کہ حضور کی بارگاہ بے نیاز کے سوا کسی اور کا دست نگر نہ ہوتا۔

حضرت خواجہ نے کبیدہ خاطر ہوکر فرمایا۔ میاں شیخ احمد تو وہ آفتاب ہے کہ ہم جیسے ہزاروں ستارے اس کی روشنی میں گم ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد کامل عقیدت مندی کے ساتھ حضرت میر نعمانؒ، حضرت مجدد صاحب سے وابستہ ہو گئے لیکن حضرت مجدد صاحب نے آپ کو حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر رہنے ہی کی ہدایت فرمائی۔ کچھ عرصہ کے بعد جب حضرت خواجہ کی وفات ہوگئی۔ تو حضرت میر نعمان نے حضرت مجدد صاحب سے مزید توجہ کی درخواست کی اور تحریر فرمایا:

''میرے پاس اس کے سوا اور کوئی وسیلہ نہیں کہ میں آل رسول ہوں''۔

اس تحریر نے توجہات مجددیہ کے دروازے کھول دیئے۔ بالآخر حضرت مجدد صاحب کے محبوب ترین خلیفہ ہوئے۔

حضرت مجدد صاحب کے تعلق کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مکتوبات کی جلد ثالث کو میر صاحب کے اسم گرامی سے مسجّل فرمایا اور وجہ یہ فرمائی کہ ''بہتر از شما کہ خواہد بود''۔[۳۸۷] پھر تعلیم طریقہ اور اصلاح خلق اللہ کے لئے آپ کو دکن بھیجا۔

مکتوبات شریف میں بہت کافی مکاتیب آپ کے نام ہیں۔ جن میں سلوک کے دقیق ترین نکتے حل کئے گئے ہیں جن سے مکتوب الیہ کی اعلیٰ قابلیت اور استعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت مجدد صاحب کے بعد صاحبزادگان گرامی کا بھی حضرت میر صاحب سے بہت گہرا تعلق رہا۔ مکتوبات خواجہ محمد معصوم میں بیشتر مکاتیب حضرت میر صاحب کے نام ہی ہیں۔ حضرت میر صاحب کے ظرف عالی اور شوق کامل کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ آپ فرماتے ہیں:

ایک مرتبہ مجھ کو ایک مقام کے حاصل ہونے کی آرزو تھی۔ اسی اثناء میں رات کے وقت برہان پور کی جامع مسجد میں چبوترہ کے اُوپر سے گر پڑا۔ اور ہاتھ ٹوٹ گیا۔ جیسے ہی میں گرا، اُس مقام کا انکشاف ہو گیا۔ مجھے اس گرنے پر رنج کے بجائے مسرت ہوئی۔ میں نے اسی خوشی میں حلوا تقسیم کیا۔ ۱۸ صفر ۱۰۶۰ھ (دس سو ساٹھ) کو آپ کی وفات ہوئی۔ مزار مقدس آگرہ میں ہے۔[۳۸۸]

تاریخ ولادت:

میر والا جاہ نعماں حق[۳۸۹]

۱۰۵۸

حضرت خواجہ ہاشم کشمی قدس اللہ سرہ العزیز

تکمیل طریقت کے شوق میں ہندوستان آئے۔ اولاً حضرت میر محمد نعمان صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں برہان پور (جنوبی ہند) حاضر ہوکر شرف بیعت حاصل کیا۔ پھر چونکہ جوان قابل تھے، حضرت مجدد صاحب نے تربیت کے لئے انتخاب فرما کر اپنے پاس طلب فرمالیا۔ چنانچہ آپ نے درجۂ خلافت حاصل کیا اور

پھر بارگاہ مجددی سے دکن کی تبلیغ و اصلاح کے لئے مامور ہوئے۔ بے شمار خلق خدا آپ سے مستفیض ہوئی۔ زبدۃ المقامات آپ ہی کی تصنیف ہے۔ برہان پور میں آپ کی وفات ہوئی۔ وہیں آپ کی آرام گاہ ہے۔

حضرت شیخ بدیع الدین سہارنپوری قدس اللہ سرہ العزیز

آپ نے توضیح وتلویح بھی حضرت مجدد صاحب سے ہی پڑھی ہے۔ زمانہ طالب علمی میں آزاد طبع تھے۔ حضرت مجدد صاحب کی شفقت نے آپ کو سلوک کی طرف متوجہ کیا۔ تھوڑے عرصہ میں منصب خلافت حاصل کیا۔ تو وطن پہنچ کر اصلاح وارشاد میں مشغول رہنے کی ہدایت فرمائی۔

پھر آگرہ پہنچ کر اصلاح وتبلیغ کا حکم ہوا۔ وہاں آپ نے لشکریوں کی بھی اصلاح فرمائی۔ لیکن کچھ کج طبع لوگوں نے اغراض مشئومہ کے باعث حضرت پر ناجائز نکتہ چینیاں کر کے فتنہ کھڑا کر دیا۔ حضرت نے بہت کافی مقابلہ فرمایا۔ آخر میں آپ سہارنپور تشریف لے آئے۔ یہیں آپ کی وفات ہوئی۔

حضرت مولانا بدرالدین صاحب قدس اللہ سرہ العزیز

دولت خانہ سرہند۔ پندرہ سال کی عمر میں حضرت مجدد صاحب کی بیعت سے مشرف ہوئے۔ علوم ظاہری کی تعلیم کے ساتھ ملکات باطنیہ کی اصلاح وذکر وشغل بھی شروع کر دیا، اور حالات اور واردات کا ظہور ہونے لگا۔

حضرت مجدد صاحب محسن مولانا بدرالدین صاحب کو اپنے عیال میں شمار فرماتے عقیدت مندی اور اس کے برکات میں سے ایک یہ ہے کہ ایک شب میں آپ بارہ مرتبہ سرور کائنات ؐ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔

حضرات القدس آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ جس کی پہلی جلد میں سرور کائنات ؐ سے لے کر حضرت خواجہ باقی باللہ تک اکابر کے حالات ہیں۔

دوسری جلد میں حضرت مجدد صاحب اور صاحبزادگان عالی شان وخلفاء نامدار کے حالات درج ہیں۔

حاجی خضر روغانی قدس سرہ

متوفی ۱۰۵۰ھ (ایک ہزار پچاس ھ) اولاً حضرت شیخ عبدالاحد والد ماجد حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ پھر حضرت مجدد صاحب سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ آخر میں زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے اور ممالک اسلامیہ کی سیاحت کی۔ قصبہ بہلول پور کے رہنے والے تھے جو سرہند کے مضافات میں ہے۔ یہیں وفات ہوئی۔ یہیں مزار مبارک ہے۔ (۳۹۰)

شیخ عبدالحی قدس اللہ سرہ العزیز

متوفی ۱۰۷۰ھ (ایک ہزار ستر ھ)۔ خلفاء حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز میں ہیں۔ ذوق وشوق

، جذب واستغراق، اتباع سنت اور پابندی شریعت میں بے نظیر تھے۔ کرامات میں مشہور۔ مکتوبات شریف کے ایک حصہ کو جمع کرنے کا شرف حاصل کیا۔ (۳۹۱)

مولانا عبدالواحد لاہوری قدس اللہ سرہ العزیز

کثیر المراقبہ، کثیر العبادات، اور کثیر العلم تھے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کے ارشاد سے حضرت مجدد صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر تربیت حاصل کی۔ بعد تکمیل لاہور میں قیام فرما کر لوگوں کو اپنے علم و فضل سے فیض پہنچایا۔ نماز کے عاشق تھے اور سنت و شریعت کے اجراء میں کمال سرگرم۔ نماز میں ایک مرتبہ ایسا ذوق ہوا کہ حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب کشمی سے دریافت کیا۔ جنت میں نماز ہوگی؟ انہوں نے فرمایا۔ جنت دار العمل نہیں، دار الجزاء ہے، اس لئے وہاں نماز کہاں؟ آپ نے سرد آہ کھینچی اور فرمایا۔ بغیر نماز وہاں کیا لطف آئے گا۔ اس مولویانہ اور صوفیانہ زندگی کے ساتھ کسب حلال کا سلسلہ بلند پیمانہ پر جاری تھا۔ تجارت کا کاروبار کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مال تجارت لے کر بخارا تشریف لے گئے۔ کسی مسجد میں نماز عشاء کے بعد نوافل میں مشغول ہو گئے۔ خادم مسجد نے کہا۔ مسجد کا دروازہ بند ہونے والا ہے، نفل گھر جا کر پڑھو۔ آپ تشریف لے آئے۔ رات کو حضرت خواجہ نے خادم مسجد کو تنبیہ فرمائی کہ وہ ہندی سوداگر درویش صفت ہمارا دوست ہے۔ اس سے جا کر معذرت کرو چنانچہ وہ دوڑا آیا، اور معذرت چاہی۔ مکاتیب شریف میں چند مکاتیب آپ کے نام ہیں۔ (۳۹۲)

خلفاء کرام کے خلفاء اور نبیرگان حضرت مجدد صاحب قدس اللہ اسرارہم

حضرت شیخ عبدالاحد صاحب وحدت عرف شاہ گل قدس اللہ سرہ العزیز

آپ حضرت خازن الرحمۃ شیخ محمد سعید صاحب فرزند ثانی حضرت مجدد صاحب قدس اللہ اسرارہم کے فرزند ہیں۔ سن ولادت باسعادت ۱۰۴۹ھ (دس سو انچاس) تاریخی نام شیخ عبدالاحد جیو۔ مقام ولادت سرہند شریف۔

حضرت خازن الرحمۃ کو آپ سے بہت زیادہ انسیت تھی اور آپ کو "گل" کہا کرتے تھے۔ چنانچہ شاہ گل آپ کا عرف ہو گیا۔

فطری سعادت اور پھر خانوادۂ تجدید وولایت کی فرزندی کے اقتضاء کے بموجب آپ عہد طفولیت سے صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔

اپنے خاندان کے طریقہ کے مطابق سولہ سترہ سال کی عمر میں علوم ظاہری کی تکمیل سے فراغت حاصل کر لی۔ اسی عمر میں والد صاحب کی رفاقت میں سفر حج کی دولت میسر آئی۔ آپ نے حالات سفر ومکاشفات حرمین شریفین کے متعلق عربی زبان میں سفرنامہ تحریر فرمایا جس کی فصاحت وبلاغت حیرت انگیز مانی گئی۔

والد صاحب کی وفات کے وقت آپ سن مبارک کی اکیسویں گردش پوری فرما رہے تھے۔ مگر سلوک و طریقت کے مراحل آخری حد تک طے فرما چکے تھے۔

والد صاحب کی وفات کے بعد عم محترم حضرت خواجہ محمد معصوم سے استفادہ کیا۔ ان دونوں بھائیوں (خواجہ محمد سعید صاحب وخواجہ محمد معصوم صاحب) کے طریقہ تربیت اور مناسبتوں میں بہت تفاوت تھا۔ آپ ان دونوں نسبتوں کے لئے "مجمع البحرین" تھے۔

آپ کے کمالات، کرامتوں اور بشارتوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ سوانح نگار حضرات نے کافی خامہ فرسائی کی ہے۔ مگر "کرامات اولیاء حق" کے عقیدہ کے باوجود اس کتاب کا دامن اس دریائے بے پایاں کے احاطہ سے قاصر ہے۔

احترام اکابر بہت بڑی سعادت ہے اور تمام سعادتوں کا زینہ۔ حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب بڑے بھائی کی تعظیم یہاں تک کرتے تھے کہ آپ کی سواری کو دیکھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ جب تک بڑے بھائی کی خدمت میں بیر پیش نہ کر دیتے، اپنے گھر کی بیری کے بیر نہیں تناول کرتے تھے۔

حضرت شیخ عبدالاحد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اپنے عم محترم اور شیخ طریقت حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب کی خالی مسند کی جانب بھی کبھی پشت نہ کرتے تھے۔

اکل حلال کے بغیر روحانی کمالات کے دروازے نہیں کھلتے۔ مستجاب الدعاء ہونے کے لئے اکل حلال شرط اول ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت موصوف کے احتیاط کی یہ حالت تھی کہ ایک مرتبہ آپ کا ایک مرید حاضر خدمت ہوا۔ تو آپ نے فرمایا۔ تم سے بو آتی ہے شاید تم نے حرام کھایا ہے۔

مرید نے عرض کیا۔ حرام سے پورا پرہیز کرتا ہوں۔ البتہ ایک شخص کے ساتھ ایک دنیادار کے گھر دعوت میں چلا گیا۔

آپ نے فرمایا۔ تین روزے رکھو۔ اس کے بعد توجہ کے لئے آنا۔

سرہند کے حاکم نے ایک مرتبہ عوام پر کچھ زیادتی کی۔ جس سے حضرت شیخ کو ملال ہوا۔ اسی ہفتہ وہ عتاب سلطانی میں ماخوذ ہو گیا۔ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے افعال سے توبہ کی اور دعا کی التجا کی۔ حضرت نے اس کو بشارت دی کہ فلاں روز بادشاہ تمہارا قصور معاف کر دے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

حاکم مذکور نے ایک باغ اور کچھ اور تحفے خدمت شیخ میں پیش کئے۔ مگر وہ سب واپس کر دیئے گئے۔ کیونکہ مال مشکوک تھا۔ شاہزادی زیب النساء کو آپ سے خاص عقیدت تھی۔

صبر و تحمل، عفو و درگزر اور حسن اخلاق مومن کامل کے مفہوم کا جزو اعظم ہے۔ مگر ولی اللہ کا صبر، گستاخی کرنے والے کے لئے سامان ہلاکت ہے۔

ایک مرتبہ ایک عورت نے حضرت موصوف کے روبرو آپ کی شان میں ناشائستہ کلمات کہے۔ آپ نے صبر فرمایا۔ تھوڑی دیر بعد آپ نے حاضرین میں سے کسی سے فرمایا۔ اس کے طمانچہ ماردو۔ اس نے توقف کیا۔ وہ عورت دفعتہً گری اور مر گئی۔

آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ تمہاری سستی اس کی موت کا سبب بن گئی۔ جب اس عورت نے ناشائستہ کلمات کہے اور میں نے صبر کیا۔ تو میں نے دیکھا کہ غیرت الٰہی انتقام کے لئے حرکت میں آ گئی۔ میں چاہتا تھا کہ میری جانب سے بدلہ ہو جائے تاکہ غیرت الٰہی کا قہر فرو ہو جائے۔ (۳۹۳) مگر ایسا نہ ہوا۔ وہ مر گئی۔

تخلص وحدت

آپ کی طبع مبارک نہایت موزوں اور رنگین واقع ہوئی تھی۔ اشعار سے آپ شوق فرماتے تھے۔ وحدت تخلص تھا۔ آپ کا ایک شعر ہے؎

خانہ زین ست دنیا عیش او پا در رکاب　　　شہسوارست آنکہ زیں غبار دو دامن چید و رفت

وفات

۲۷ ذی الحجہ ۱۱۲۲ھ (گیارہ سو چھبیس) بروز جمعہ بعارضہ حبس بول و درد مثانہ اکہتر ۷۸ سال عمر پا کر انتقال فرمایا۔ حضرت خواجہ محمد معصومؒ کی مسجد کے مشرقی جانب میں آپ کو دفن کیا گیا۔

حضرت شیخ محمد صبغۃ اللہ قدس سرہ

فرزند اکبر حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہ۔ ولادت ۱۰۳۰ھ (ایک ہزار تیس ھ) بزمانۂ حیات مجدد صاحب قدس اللہ سرہ بمقام سرہند۔

دادا نے صبغۃ اللہ نام تجویز فرمایا، کیونکہ للّٰہیت کی بو ابتداء طفولیت میں آنے لگی تھی۔ والد ماجد سے علوم ظاہری اور باطنی کی تحصیل کی۔ ورع وتقویٰ، علم وفضل میں آپ کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ حضرت خواجہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رشتۂ پدری نہ ہوتا تو میں صبغۃ اللہ کی تعظیم کیا کرتا۔ حافظہ اس قدر تیز تھا کہ چالیس روز میں قرآن شریف حفظ کرلیا۔ تحصیل کمالات کے بعد کابل کی قطبیت آپ کے سپرد ہوئی، اور اصلاح وارشاد کے لئے والد ماجد نے آپ کو کابل بھیجا۔ جہاں بے شمار خلق خدا نے آپ سے استفاضۂ برکات کیا۔

نوے ۹۰ سال آپ نے عمر پائی۔ آٹھ ربیع اول روز جمعہ ۱۱۲۰ھ (گیارہ سو بیس ھ) تاریخ وفات ہے۔ مزار مبارک سرہند شریف۔

حضرت حجۃ اللہ محمد نقشبند قدس اللہ سرہ العزیز

فرزند ثانی اور خلیفہ جلیل القدر حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب قدس اللہ اسرارہم۔ سنہ ولادت ۱۰۳۴ھ (دس سو چونتیس ھ) بمقام سرہند شریف۔

خاندانی صلاحیت سے بہت کافی حصہ حاصل کیا تھا۔ تحصیل علوم کے بعد جب طریقت کے مراحل طے فرمانے شروع کئے تو والد ماجد اور پیر ومرشد کو اپنے حالات سے اطلاع دی۔ والد ماجد نے تحریر فرمایا:

"از علو مرتبہ ایں اسرار چہ بیان نماید کہ از حیطۂ درک عقل وتصویر خیال بیروں است"۔

جب ابتداء میں یہ حالت ہو تو انتہا میں کیا ہوگا۔ ؏

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

۹ محرم الحرام ۱۱۱۵ھ (گیارہ سو پندرہ ہجری) شب جمعہ عمر اسی ۸۰ سال آپ دار دنیا سے رخصت ہوئے۔ مزار والد ماجد کے جانب شمال میں آپ دفن ہوئے۔

حضرت خواجہ محمد عبید اللہ، مروج الشریعت قدس اللہ سرہ العزیز

فرزند سوم وخلیفہ حضرت خواجہ محمد معصوم قدس اللہ اسرارہم۔ ولادت باسعادت یکم شعبان ۱۰۳۷ھ (دس سو سینتیس ہجری) بمقام سرہند شریف۔

ایام طفولیت سے آثار ولایت وہدایت ناصیہ مبارک سے ظاہر تھے۔ والدین کو ساری اولاد میں آپ سے

بہت زیادہ انسیت تھی۔ حضرت خواجہ محمد معصومؒ آپ کو ''میاں حضرت'' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ ایک ماہ میں پورا قرآن شریف حفظ کرلیا۔

سات سال کا سن تھا کہ مولانا عبدالحکیم صاحب سیالکوٹی تشریف لائے۔ آپ نے امتحانا فرمایا۔ گویائی زبان کی صفت ہے۔ دل ایک پارچۂ گوشت ہے۔ وہ کس طرح ذکر کرسکتا ہے؟

ہفت سالہ طفل نے جواب دیا۔ زبان بھی پارچۂ گوشت ہے۔ جس قادر مطلق نے زبان کو گویائی عطا فرمائی، وہی قلب کو قوت ذکر عطا فرماتا ہے۔

مولانا نے فرمایا۔ نبیرۂ مجدد کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔

علم، عمل اور تقویٰ میں بے نظیر تھے۔ سلوک باطن والد ماجد سے حاصل کیا۔ درجہ قطبیت پر فائز ہوئے۔ عروۃ الوثقی فرمایا کرتے تھے۔ تم مراتب عروج ونزول میں میرے رفیق رہے ہو۔ انگشت شہادت اور درمیانی انگشت کی طرف اشارہ کرکے فرماتے، تم میرے پیچھے اس طرح رہے ہو جیسے انگشت شہادت بیچ کی انگلی کے پیچھے اور ساتھ ساتھ۔

آپ کی صحبت کثیر البرکت تھی۔ آپ کے حلقہ میں خلقت کا اتنا ہجوم ہوتا تھا کہ بیٹھنے کو جگہ نہ ملتی۔ اصلاح وتلقین پابندیٔ شریعت کے باعث آپ کا خطاب ''مروج الشریعت'' ہوا۔ ۱۹ ربیع الاول ۱۰۸۳ھ (دس سو تراسی ہجری) یوم جمعہ دہلی سے سرہند واپس ہوتے ہوئے بمقام سنہا لکر آپ نے دریافت فرمایا۔ کیا نماز کا وقت باقی ہے؟

وقت باقی تھا مگر علالت کے باعث وضو کی قدرت نہ تھی۔ آپ نے تیمم فرمایا۔ پھر پیشانی پر ہاتھ رکھ کر فرمایا۔ السلام علیکم یارسول اللہ۔ اس کے بعد نماز کی نیت باندھی۔ اور جب پیشانی فرش پر تھی، روح القدس نے عرش بریں کی جانب پرواز کیا۔

حضرت خواجہ محمد اشرف قدس اللہ سرہ العزیز

فرزند چہارم وخلیفہ راشد حضرت عروۃ الوثقی۔ ولادت ۱۰۴۸ھ (دس سو اڑتالیس ہجری)۔ وفات ۱۱۱۷ھ (گیارہ سو سترہ ہجری)

عالم باعمل، زاہد ومتقی۔ مجددی خصوصیات کے حامل۔ علوم ظاہری میں علوم باطنی کی طرح یکتا۔ تفسیر، حدیث، کلام اور معقولات کی بہت سی کتابوں پر حاشیہ تحریر فرمایا۔ آپ کا آخری کلام تھا:

حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ

محی السنۃ حضرت شیخ سیف الدین قدس اللہ سرہ العزیز

مرشد سلطان عالمگیرؒ

صاحبزادہ پنجم وخلیفہ ارشد حضرت عروۃ الوثقیٰ قدس اللہ سرہ العزیز۔ ولادت باسعادت ۱۰۳۹ھ (دس سو انچاس ہجری) بمقام سرہند۔

عم محترم خواجہ محمد سعید قدس اللہ سرہ العزیز "خازن الرحمۃ" نے آپ کی ولادت کے وقت ہاتف کی بشارت سنی۔

سَلَامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا

حافظہ نہایت قوی تھا۔ دماغ سنجیدہ، طبیعت سلیس، صلاحیت اور استعداد نہایت اعلیٰ، فطرت نہایت سلیم۔ انتہا یہ کہ گیارہ سال کی عمر میں والد ماجد نے "فنائے قلب" کی بشارت دے دی۔ علوم ظاہری میں کمال حاصل کیا۔ اتباع سنت اور شریعت مطہرہ کی ترویج و اشاعت میں اس قدر غلو تھا کہ دنیا نے آپ کو "محی السنۃ" کا خطاب دیا۔ (۲۹۳)

عہد شباب کا پرکیف دور محبوب بے چون و بے کیف کے عشق و محبت کی سرمستیوں سے معمور رہا۔

اتباع شریعت ان حضرات کی گھٹی میں پڑی تھی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مجاہدات ترکہ میں حاصل کیے تھے۔

پہلے گزر چکا ہے کہ سلطان عالمگیر نظامت ملتان کے زمانہ میں عروۃ الوثقیٰ کے حلقہ ارادت میں داخل ہو چکا تھا۔ ۱۰۷۰ھ میں جب کہ وہ پورے ہندوستان کا شہنشاہ ہو چکا تھا۔ اس نے خازن رحمۃ حضرت خواجہ محمد سعید صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کو دہلی تشریف لانے کی دعوت دی۔

مگر حضرت "خازن الرحمۃ" کا پیمانہ عمر لبریز ہو چکا تھا۔ آپ بیمار ہو کر دہلی سے واپس ہوئے اور راستہ ہی میں رحمت خداوندی سے ابدی پیوستگی حاصل کر لی۔

اس کے بعد سلطان موصوف حضرت عروۃ الوثقیٰ کی خدمت میں تشریف آوری کی درخواستیں اصرار کے ساتھ پیش کرتے رہے۔

مگر حضرت عروۃ الوثقیٰ نے والد، جد کی وصیت کے بموجب ٹوٹی جھونپڑی کو قصر سلطانی اور پرانی چٹائی کو تخت طاؤس قرار دے لیا تھا۔

جب سلطان کو اس درخواست میں ناکامی ہوئی تو کسی خلیفہ کے متعلق التجا کی جو دہلی رہ کر بادشاہ کی روحانی تربیت کرے۔

روحانیات کے نباض حاذق "حضرت عروۃ الوثقیٰ" نے اسی نوجوان صالح اور شیخ کامل کو سلطان کی

تربیت کے لئے مامور فرمایا۔[۳۹۵]

قلعہ معلےٰ کے پھاٹک کے دونوں طرف دو ہاتھیوں کے مجسمے تھے۔[۳۹۶] جن پر فیلبان بھی سوار تھے۔ آپ جیسے ہی قلعہ کے سامنے پہنچے، پہلی ہدایت یہ صادر فرمائی کہ ان ہاتھیوں کو توڑ دیا جائے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی، اس کے بعد داخلہ ہوا۔

ایک روز بادشاہ نے آپ کو حیات بخش باغ کی سیر کی تکلیف دی۔[۳۹۷] جواہر اور موتیوں کی آنکھوں والی سونے کی مچھلیاں اس حوض میں تیر رہی تھیں۔ حکم صادر ہوا، مچھلیوں کو توڑ دو۔ سونے کو اس کے مصرف میں صرف کرو۔ ورنہ میں باغ کی سیر نہ کروں گا۔

عالمگیر جیسے زاہد متقشف کو ایسے ہی شیخ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ وہ حضرت عروۃ الوثقی کی طرح ان کے فرستادہ خلیفہ کا بھی گرویدہ ہو گیا، اور حضرت عروۃ الوثقی کی خدمت میں اس حسن انتخاب پر شکریہ کا خط لکھا۔

عالمگیر جیسے بیدار مغز اور خوددار بادشاہ کا چوبیس پچیس سالہ نوجوان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنا بادشاہ کے کمال اخلاص اور نوجوان کے کمال استعداد کا بین ثبوت ہے۔[۳۹۸]

بادشاہ کے مکتوب شکریہ کے جواب میں حضرت عروۃ الوثقی کے مکتوب گرامی کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

> الحمد للہ والمنۃ کہ فقیر زادہ منظور نظر ہوا، اور اس کی صحبت سے مقصود حاصل ہو گیا۔ جناب نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر (جو کہ فقیر زادہ کا شیوہ ہے) شکریہ ادا فرمایا۔ میں نے حضرت حق جل مجدہ کا شکریہ ادا کیا، اور آپ کے لئے ترقی مراتب کی دعا کی۔ کیسی بڑی نعمت ہے، کہ شاہانہ طمطراق اور سلطانی حشمت و دبدبہ کے باوجود کلمۂ حق قبولیت حاصل کرے، اور ایک فقیر زادہ کی بات اثر انداز ہو۔

حضرت مولانا سیف الدین صاحب کی روحانی تربیت نے سلطان عالمگیر کو سالک طریقت بنا دیا۔ حضرت موصوف سلطان کی روحانی کیفیات سے والد ماجد کو اطلاع دیتے رہے۔ مولانا موصوف کے جواب میں حضرت عروۃ الوثقی کے مکتوب نمبر ۲۲۰ (دوسو بیس) جلد ثالث سے سلطان کی روحانی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

> لطائف روحانی (روحانی قوی اور ملکات) میں ذکر الٰہی کے اثر و سرایت سلطان ذکر اور رابطہ کا حصول، خطرات و وساوس کی کمی، کلمۂ حق کی مقبولیت، بعض منکر اور ناجائز امور کی منسوخیت اور طلب و جستجو کے لوازم کا ظہور۔ وغیرہ وغیرہ یعنی بادشاہ دین پناہ کے جو حالات آپ نے تحریر فرمائے ہیں، اُن پر خدائے بالا و برتر کا شکریہ ادا کیا۔ در حقیقت طبقۂ سلاطین میں اس قسم کے حالات عنقاء و نایاب ہیں الخ

اسی طرح مکتوب نمبر ۲۳۲ جلد ثالث، مکتوب نمبر ۲۶۲ جلد ثالث میں بادشاہ کے حالات پر مسرت کا اظہار فرمایا گیا ہے۔

جس کا مرید بادشاہ ہو، اس کی قبولیت کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اُمراء، وزراء اور محلات شاہی کے تمام

خواص سلسلۂ عالیہ میں داخل ہو گئے۔

سپردشدہ خدمت کی تکمیل کے بعد حضرت سیف الدین والد ماجد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد والد صاحب کی وفات ہو گئی۔ تب آپ کا حلقۂ تلقین وارشاد مستقل طور پر قائم ہو گیا۔

آپ پر وجد و شوق کا ایک خاص کیف ہر وقت طاری رہتا۔ مجلس عالی میں جب آپ بیٹھتے تو اس طرح کہ گویا کوئی عاشق انتظار معشوق میں بیٹھا ہے۔ جب کسی کی زبان سے محبوب حقیقی کا نام نامی اللہ صادر ہوتا تو آپ پر وجد طاری ہو جاتا۔ بسا اوقات بے اختیار ہو کر مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگتے۔

ایک شب کو حجرہ کی چھت پر آپ نماز تہجد کی تیاری کر رہے تھے کہیں سے بانسری کی آواز کانوں میں پڑ گئی۔ آپ پر وجد طاری ہو گیا۔ حتیٰ کہ سرمستی اور مدہوشی میں چھت سے نیچے گر گئے۔ دست مبارک پر بہت چوٹ آئی۔ جب ہوش آیا تو فرمانے لگے:

''بترک سماع مرا بے درد میگویند۔ بیدردا ایشاں اند کہ باستماع سماع صبر مے کنند''۔ (۲۹۹)

حضرت موصوف کے ایک مرید ایک مرتبہ کہیں محفل سماع میں پہنچ گئے۔ ایک ہی شعر کان میں پڑا تھا کہ کلیجہ تھام کر بیٹھ گئے۔ دل پھٹ گیا اور واصل بحق ہوئے۔

حضرت سیف قدس اللہ سرہ العزیز نے سنا تو فرمایا:

''سماع مہلک دردمنداں ست۔ لہٰذا علماء دین سماع را حرام تصور کردہ اند''۔ (۳۰۰)

آپ کے اسی دردِ دل کا اثر تھا کہ جو آپ کی مجلس میں ایک مرتبہ حاضر ہوتا، اگر نابکار ہوتا، تائب ہو جاتا۔ نیکوکار ہوتا تو واصل مولیٰ ہو جاتا۔

یہ آپ کے دردِ دل کا حال ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اتباع سنت، اور پابندی شریعت میں آپ کا تقشف اور زہد و تقویٰ پہلے بیان ہو چکا۔ غلام سرور چشتی فرماتے ہیں

''از صحبت اہل دنیا بغایت احتراز داشتے و با حشم و لااں نخوردے''۔ (۳۰۱)

لیکن اس احتیاط اور تقویٰ کے باوجود خدا کی دین کا یہ حال تھا کہ:

حضرت شیخ کے دسترخوان پر روزانہ اوسطاً چار سو مہمان اور درویش حاضر رہتے، اور پھر ہر ایک کی فرمائش کے بموجب مہمان خانۂ حضرت شیخ سے کھانا تیار ہوتا تھا۔

اور اس تمام تنعم و خوش خوراکی کے باوجود ''سالکان بمقامات بلند و کرامات ارجمند مے رسیدند''۔ (۳۰۲)

ایک مرتبہ کسی صاحب نے غذا میں کمی کرنی شروع کی۔ حضرت شیخ کو معلوم ہوا تو فرمایا۔ اس طریقۂ عالیہ کی بنیاد کم خوری پر نہیں۔ ہمارے بزرگوں نے پابندی شریعت، اتباع سنت اور دوام وقوف قلبی (یعنی ہر وقت قلبی طور پر یاد خدا اور اس کی عظمت و جلال کے تصور) پر اس طریقہ کی بنیاد قائم فرمائی ہے۔

گرسنگی اور چلہ کشی وغیرہ مجاہدات کا ثمرہ خرق عادات اور کشف و تصرفات ہیں۔ ہمیں یہ چیز مطلوب نہیں۔

دوامِ ذکر، دوام توجہ الی اللہ، اتباعِ سنت اور کثرتِ انوار و برکاتِ خداوندی ہمیں مطلوب ہیں۔ (۴۰۳)

بڑے بھائی مولانا حجۃ اللہ صاحب نقشبند حج کو تشریف لے جانے لگے۔ آپ نے حضرت شیخ سیف الدین صاحب سے فرمایا:

زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ میرے بچوں پر نظرِ عنایت رکھنا۔ حضرت سیف نے فرمایا۔ غالباً آپ ہی کو یہ خدمت انجام دینی پڑے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یعنی ابھی حضرت حجۃ اللہ سفر سے واپس نہ ہوئے تھے کہ حضرت سیف کی وفات ہوگئی۔

آپ کا معمول تھا کہ ظہر اور عصر کے درمیان مستورات کو احادیث سنایا کرتے تھے۔ ایک روز وقت سے پہلے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ مستورات نے عرض کیا۔ ابھی وقت باقی ہے۔ فرمایا اب محمد اعظم سے سُننا (بڑے صاحبزادے)۔ ایسا ہی ہوا کہ حضرت سیف علیل ہوگئے، اور ۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۰۹۶ھ (ایک ہزار چھیانوے) میں بعمر ۷۴ سال اس دارِ فانی سے رختِ سفر باندھ لیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

حضرت شیخ محمد صدیق صاحب قدس اللہ سرہ العزیز

فرزندِ ششم و خلیفہ حضرت عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم قدس اللہ سرہ العزیز۔ ولادت مسعود ۱۰۵۹ھ (ایک ہزار انسٹھ) بمقام سرہند شریف۔

دوسرے بھائیوں کی طرح حفظِ قرآن شریف کے بعد سولہ سترہ سال کی عمر میں علومِ ظاہری کی تحصیل سے فارغ ہوگئے۔

گیارہ سال کی عمر میں رسول اللہ کی زیارت سے "رویاء صادقہ" میں مشرف ہوئے۔ سرورِ کائناتؐ نے "ولایتِ احمدی" کی بشارت دی۔

والد ماجد کی حسنِ تربیت کا یہ نتیجہ تھا کہ ابھی عمر مبارک صرف ۱۸ سال تھی، کہ یہ بشارت صادق ہوگئی۔

بیس ۲۰ سال کی عمر میں جب کہ آپ پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے تھے، والد ماجد نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ آپ نے تمام عمر خلفِ ہونہار کی طرح باپ اور دادا کے نصب العین کی تکمیل میں صرف کر دی۔

آپ حرمین شریفین (زادہما اللہ شرفاً) کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ ایک عرصہ تک ان مقدس شہروں کی خاکِ پاک کو طوطیائے چشم بناتے رہے اور اہلِ حرمین کو اپنا گرویدہ بنا کر فیضانِ طریقت میں سرگرم رہے۔ پھر واپس تشریف لائے۔ اور خدمتِ اصلاح و ارشاد میں مشغول ہوگئے۔ فرخ سیر نے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ زمرہ مریدین میں داخل ہوا۔ مگر

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل ۔۔۔ خضر از آبِ حیوان تشنہ مے آرد سکندر را

۵ جمادی الثانیہ ۱۱۳۰ھ (گیارہ سو تیس ہجری) تاریخِ رحلت ہے۔ سرہند شریف جائے دفن۔

حضرت خواجہ کلاں اور خواجہ خورد قدس اللہ اسرارہما

خانوادۂ نقشبندیہ کے پیش رو حضرت خواجہ محمد باقی باللہ کے فرزندان ارجمند ہیں۔ خواجہ کلاں کا اسم گرامی عبیداللہ ہے۔ پیدائش یکم ربیع الاول ۱۰۱۰ھ (ایک ہزار دس ہجری)۔

۲۶ رجب ۱۰۱۰ھ کو یعنی صرف چار ماہ بعد حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی دوسری زوجہ سے حضرت خواجہ عبیداللہ عرف خواجہ خورد نے رخت ہستی سے گزر گاہ دنیا کو رونق بخشی۔

تھوڑے ہی دنوں بعد دونوں نونہالوں کے سرپرست بزرگ زندگی سے سبکدوش ہونے کا ارادہ کرنے لگے۔ چنانچہ خلیفۂ اعظم حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز سے فرمایا:

اُمید حیات کم ماند، از احوال اطفال خبردار باید بود۔

پنجم جمادی الآخری ۱۰۱۲ھ (ایک ہزار بارہ) کو سلسلۂ نقشبندیہ کے اس شجر طوبیٰ نے اپنی جگہ دوسروں کے حوالہ کی۔ دونوں بچے مجدد الف ثانی کی تربیت میں آئے جن کو وہ ایک مرتبہ حضرت خواجہ کے حکم سے اُن کی زندگی ہی میں توجہ دے چکے تھے۔ سن تمیز کو پہنچ کر دونوں صاحبزادوں نے فضائل صوری و معنوی کی دولت حاصل کی۔ خواجہ کلاں نے تذکرۂ مشائخ تالیف فرمایا۔ جس میں تقریباً ایک لاکھ بیت تھے۔ اور پھر ۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۰۷۴ھ (ایک ہزار چوہتر) کو بار تکلیف سے سبکبار ہوگئے۔

حضرت خواجہ خورد، صورت و سیرت میں پدر بزرگوار سے پوری مشابہت رکھتے تھے۔ حافظ قرآن تھے۔ پوری مستعدی سے علوم نقلی و عقلی حاصل کئے۔ درس و تدریس میں مشغول رہے۔ حضرت مجدد صاحب کے آغوش عطوفت میں رہ کر خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ چند کتابوں کے حواشی مرتب فرمائے، اور پھر بڑے بھائی سے تقریباً ایک سال بعد والد صاحب کی وفات کی تاریخ یعنی پنجم جمادی الآخریٰ ۱۰۷۵ھ (ایک ہزار پچھتر ہجری) کو جام فنا نوش جاں فرمایا۔

ہر آنکہ زاد بنا چار بایدش نوشید ز جام دہر مئے کل من علیہا فان

شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ خورد نے آخر عمر میں مجھ سے فرمایا تھا کہ رشتۂ فرزندی کا لحاظ کرکے مجھے حضرت خواجہ باقی باللہ کے مزار کے برابر نہ دفن کیا جائے بلکہ اُس جگہ دفن کیا جائے جہاں جوتے نکالے جاتے ہیں، میں اسی جگہ کے لائق ہوں۔

میں نے عرض کیا کہ دفن کرنے کے متعلق مجھے کیا اختیار، یہ کام آپ کے وارثوں کا ہوگا۔ فرمایا تم کہہ دینا۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ گفتم کہ وصیت خواجہ ایں ست، گوش نہ کردند"۔ (۲۰۴)

تحریک مہدویت

سید محمد مہدی جونپوری شیخ عبداللہ نیازی شیخ علائی

مجدد الف ثانی اور آپ کے خلفاء نے جن بکھرے ہوئے فتنوں کو دبایا جن خرابیوں کی اصلاح کی اور دین وملت کی جس پژمردگی کو شادابی سے بدلا، اُن کا ذکر کیا جاچکا ہے۔

لیکن اسی موسم خزاں کی ایک بادسموم وہ بھی تھی جس کو تحریک مہدویت یا فتنۂ مہدویت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ابتداء میں یہ تحریک ممکن ہے گلشن اسلام کی بادنسیم بھی ہو، مگر دسویں صدی کے وسط میں اہل زمانہ کی مسموم طبائع، اور زمانہ کی زہریلی فضا نے یقیناً اس کو بادسموم بنا دیا تھا۔ حضرت مجدد صاحب کی عمومی دعوت "اتباع سنت" اور تمسک بظاہر الشریعت" میں اگرچہ تمام ہی فتنوں کی اصلاح آجاتی ہے "کل الصید فی جوف الفرا"۔ مگر خصوصی طور پر اس تحریک کی مخالفت کے لئے اس اولوالعزم مجدد کی ہمت عالی بظاہر متوجہ نہیں ہوئی، اور اس کا سبب بظاہر یہ بھی تھا کہ خود اکبر اور اس کے اعوان وانصار اس تحریک مخالف تھے۔

بساط سیاست کا صرف ایک مہرہ "خان خاناں" کچھ دنوں کے لئے اس تحریک کے الجھاؤ میں پھنس گیا تھا۔ اُسی کو حضرت مجدد صاحب نے نکال لیا۔ لہٰذا حضرت مجدد صاحب کے سوانح اور حالات بیان کرتے ہوئے اس تحریک کا بیان کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ لیکن اجمالی اشارات کے بغیر دور مجددی کو ختم کر دینا بھی یقیناً ایک کوتاہی ہوگا، جس کو عمداً گوارا نہیں کیا جاسکتا۔

علاوہ ازیں دور مجددی کے سلسلہ میں جب کہ شیخ علی متقی اور شیخ محمد بن طاہر پٹنی کا ذکر ان اوراق میں بیان کیا جائے گا۔ تو ضروری ہے کہ ان کے مدمقابل فرقۂ مہدویہ کے بانی اور شیوخ کا بھی کچھ تذکرہ آجائے۔

اس تحریک کو بیان کرنے کے لئے ہمیں حضرت مجدد کے زمانۂ پیدائش سے بھی ایک سو برس پیچھے ہٹنا پڑے گا۔ مگر اس کو نظر انداز کر دینے میں جو کوتاہی ہوگی، اس کی تلافی کے لئے اس رجعت قہقری میں خرابی نہیں معلوم ہوتی۔

بانی مہدویت

یہ عجیب بات ہے کہ تحریک مہدویت کا جس کو بانی کہا جاتا ہے بقول محققین وہ اس تحریک کا ذمہ دار نہ تھا۔ سید محمد جونپوری کو مہدی کہا گیا۔ اُن کے نام پر ایک فرقہ پیدا ہوا، اور پھر اُس نے وہ عقائد اور خیالات پیش کئے، جن کو علماء ملت نے متفقہ طور پر غلط قرار دیا۔

سید محمد کے متعلق ابوالفضل کی تحریر ہے:

پور سید او یکی ست۔ از فراواں روحانیت فیض گرفتہ۔ و بر صوری و معنوی علم چیرہ دست از شوریدگی دعوائے مہدویت کرد و بسیارے مردم بر و گرویدند۔ بسا خارق از و برگزارند، و سر چشمۂ مہدویت او از جونپور بگجرات شد و سلطان محمود کلاں بہ بنالیش برخاست، و از تنگ چشمی زمانیاں بہند نیارست۔ بود و باش ایران نمود، و در فرہ در گزشتت، و ہمانجا آسود۔ (ص ۱۷۳ آئین اکبری جلد سوم)

دور حاضر کے علامہ فرید اور محقق وحید، مولانا ابوالکلام آزاد اپنی مشہور تصنیف تذکرہ میں فرماتے ہیں:

سید محمد جونپور کے رہنے والے تھے، ۸۴۷ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے اشد شدید مخالف بھی معترف ہیں کہ علوم رسمیہ کے ساتھ زہد و درویشی اور ورع و تقویٰ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

شیخ علی متقی (جو سید کے معاصر اور سخت مخالف ہیں اور ان کے رد میں رسالہ لکھا ہے) تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا ابتدائی عہد کمال زہد و تقشف اور استغراق و انہماک باطنی میں گزرا۔ سات سال تک یہ حال رہا کہ پے در پے روزہ رکھتے، اور تن تنہا ایک گوشہ میں پڑے رہتے۔ اسی اثناء میں ان پر ایک سانحہ وارد ہوا، اور معلوم ہوا کہ "انت المھدی" کی صدا آرہی ہے۔ برسوں تک متامل رہے اور جب پے در پے یہی معاملہ پیش آیا تو اپنے مہدی ہونے کا اعلان کیا۔ نویں صدی کا وہ زمانہ جو اکبر سے پہلے گزرا ہندوستان میں سخت بدامنی اور طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔ روز بادشاہتیں بنتی اور بگڑتی تھیں، اور کوئی مرکزی حکومت باقی نہیں رہی تھی جو احکام شرع کے قیام و اجراء کی ذمہ دار ہوتی۔ علماء حقانی بہت کم اور علماء دنیا ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ دنیا طلبی اور مکر و زور کی گرم بازاری تھی اور سب سے زیادہ یہ کہ جاہل صوفیوں کی بدعات و منکرات نے ایک عالم کو گمراہ کر رکھا تھا۔

یہ حال دیکھ کر سید موصوف نے احیاء شریعت اور قیام امر بالمعروف کا غلغلہ بلند کیا کہ اب نہ کسی مجاہدہ کی ضرورت ہے اور نہ ذکر و شغل کی۔

سب سے بڑا مجاہدہ یہی ہے کہ خلق اللہ کو سیدھی راہ پر لگا دو، اور احکام شرعیہ کے قیام کی راہ میں اپنی جانیں تک لڑا دو۔

عشق کی صداقت اور قلب کی پاکی نے ان کی دعوت و تذکرہ میں ایسی تاثیر بخشی تھی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہزاروں آدمی حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے اور متعدد سلاطین وقت نے ان سے بیعت کی۔

ان لوگوں کے طور و طریق کچھ عجیب عاشقانہ و والہانہ تھے، اور ایسے تھے کہ صحابۂ کرام کے خصائص ایمانی کی یاد تازہ کرتے تھے۔ عشق الٰہی کی ایک جاں سپار جماعت تھی جس نے اپنے خون کے رشتوں اور وطن و زمین کی الفتوں کو ایمان کے رشتہ پر قربان کر دیا تھا اور سب کچھ چھوڑ کر راہ حق میں ایک دوسرے کے رفیق و غم گسار بن گئے تھے۔ امیر، فقیر، اعلیٰ، ادنیٰ سب ایک ہی حال میں بستے، اور بجز خلق اللہ کی ہدایت و خدمت اور احکام شرع کے اجراء و قیام کے اور کسی سے کام نہ رکھتے تھے۔

ایک حکم یہ تھا کہ پہلی منزل ہجرت کی ہے۔ جو اس راہ میں قدم رکھے، سب سے پہلے چاہئے کہ قید وطن سے

آزاد ہو اور گھربار چھوڑ کر اپنے برادران وطن کا ساتھی بن جائے۔

دوسری منزل ترک مال کی ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ پس مال کسی ایک فرد واحد کا نہیں ہو سکتا جس کے پاس جو کچھ ہو اپنے رفیقان طریقت میں بانٹ دے۔

تیسری منزل ترک جان کی ہے فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ پس ہر وقت راہ حق میں سر بکف رہو، اور اعداء شریعت وحق، اگر فرقان ومیزان سے نہ جھکیں تو قوت حدید سے کام لو۔ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ

اور اس میں شک نہیں کہ یہ جتنی باتیں تھیں حق تھیں۔ آگے چل کر نادان معتقدوں نے اُن کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ

ترک جاں و ترک مال و ترک سر ۔۔۔ در طریق عشق اول منزل ست

یہ تمام حالات ان موافقین ومخالفین سب نے لکھے ہیں۔ مثلاً مخالفین میں شیخ علی متقی، شیخ ابن حجر مکی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شیخ اسعد مکی وغیرہم رحمہم اللہ۔

اور موافقین میں خود اُن کے معتقدین مثلاً اخوند میر، شیخ دلاور، شہاب الدین، میاں قاسم، اور صاحب شواہد ومطلع الولایہ وغیرہم۔

لیکن معتقدین نے ان امور پر قوانین شرع کا رنگ چڑھا دیا۔ مثلاً سید محمد نے تکمیل انقطاع وایثار ومحبت کے لئے مال تقسیم کر دینے کا حکم دیا تھا۔

معتقدین نے اس کو یہاں تک بڑھا دیا کہ جب مال پر سب کا حق ہے تو پھر ورثا اور ترکہ کیسا عزیز واقارب کو بھی کچھ نہیں ملنا چاہیے۔ اور پھر اس کو قانون توریث کے مقابلہ میں ایک قانون شرعی سمجھا۔ مخالفین نے اس کا رد کیا کہ یہ شریعت سے انحراف ہے۔ اور حکم توریث کو کہ نص قطعی سے ثابت ہے باطل کرتا ہے۔ اور پھر تکفیر وتضلیل کے لئے اس کو حجت ٹھیرایا۔ اس طرح موافق اور مخالف دونوں اصلیت سے دور جا پڑے۔ (تذکرہ ص ۲۴ تا ص ۲۹ جلد ۱)

الغرض اس قسم کے مسائل میں رد وقدح یہاں تک بڑھی، کہ علماء سوء اور مشائخ دنیا پرست کا تو کہنا ہی کیا، جو لوگ صداقت پسند تھے، ان میں سے بھی بعض غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر طرف سے مخالفت ہونے لگی۔ پہلے تضلیل وتکفیر کا سلسلہ چلا، پھر قتل وسلب تک نوبت پہنچی۔

مخالفت کا بڑا سبب یہ ہوا کہ یہ لوگ اعلان حق میں بڑے ہی بیباک اور سخت تھے، اور سب سے زیادہ علماء دنیا کو اُن کی ہوا پرستیوں اور غفلتوں پر سرزنش کرتے تھے۔ جب مخالفت کا بہت زور ہوا تو سید محمد صاحب گجرات چلے گئے۔ سلطان محمود کلاں صورت دیکھتے ہی معتقد ہو گیا۔ لیکن علماء نے وہاں بھی مخالفت کی۔ مجبوراً حج زدعرب کا رخ کیا۔ وہاں سے ایران گئے۔ سلطان اسمٰعیل صفوی کا زمانہ تھا۔ اُس نے ہجوم خلائق دیکھ تو نکل جانے کا حکم دیا۔ ہندوستان کی طرف دوبارہ آرہے تھے کہ فراہ میں انتقال ہو گیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی ۹۱۱ھ (نو سو گیارہ) کے واقعات لکھتے ہیں:

دریں سال میر سید محمد جونپوری قدس اللہ سرہ اعاظم اولیاء کبار کہ دعوائے مہدویت از سر بر زدہ بود۔ ہنگام مراجعت از مکہ معظمہ بہ ہند در بلدہ فراہ داعی اجل لبیک فرمود، قاضی حسین زرگر قندھاری کہ فقیر اورا دو میر را ملازمت کردہ بود۔ ایں تاریخ یافتہ:

گفتا کہ برد...... ز شیخ کن استفسار

سید صاحب موصوف کے متعلق ملا عبدالقادر جیسے نقاد کے الفاظ یہ ہیں، اور لطف یہ ہے کہ ملا صاحب کے ہم عصر مولانا عبدالحق صاحب محدث تحریر فرماتے ہیں:

در اعتقاد سید محمد جونپوری بر کمالیکہ محمد رسول اللہؐ داشت در سید محمد را نیز بود۔ فرق ہمیں ست کہ آنجا باصالت بود، وایں جا بہ تبعیت۔ وبہ تبعیت رسول بجائے رسیدہ کہ ہمچو او شد۔ (تذکرہ ص ۳۰)

مصنف تذکرہ فرماتے ہیں:

لیکن شیخ صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ سید صاحب موصوف نے یہ باتیں خود کہیں یا ان کے مریدین کا استنباط اور پیر پرستانہ منقبت سرائی ہے۔ خود سید موصوف نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ "ام العقائد" جو ان کی جانب منسوب ہے وہ بھی ان کے مریدوں کی لکھی ہوئی ہے۔ صاحب "ہدیہ مہدویہ" نے اس کی عبارتیں نقل کی ہیں۔ اور ان میں بلاشبہ اس طرح کی باتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن قطع نظر وسعت میدان تاویل کے ان کا انتساب خود سید محمد کی جانب مشکوک و محل نظر ہے (تذکرہ ص ۳۰)

بر تقدیر صحت انتساب مولانا ابوالکلام آزاد ان کلمات کو عالت سکر و جذب کے شطحیات پر محمول کرنے کی سفارش کرتے ہیں۔

نہ من تنہا دریں مے خانہ مستم	جنید و شبلی و عطار ہم مست
لالہ ساغر گیر و نرگس مست بر ما نام فسق	داوری خواہم مگر یا رب کرا داور کنم؟

مولانا آزاد نے بطور فیصلہ بڑی اچھی بات فرمائی ہے۔

بڑی وقت ان لوگوں کو معانی کی فراوانی و وسعت اور الفاظ کی تنگنائی و نامساعدت سے پیش آتی ہے۔ ناچار ہنگام تعبیر و بیان جو الفاظ سامنے آجاتے ہیں، انہیں سے کام لینا پڑتا ہے۔ نافہموں کے لئے وہ الفاظ فتنہ بن جاتے ہیں۔ مقلدین اور معتقدین ان کو حجت گردانتے ہیں، اور منکرین و متعصبین آلہ انکار و تکفیر لیکن ارباب حق و اقتصاد یا تو ان کی تاویل کرتے ہیں یا ان کے معاملہ کو عالم السرائر کے حوالہ کر دیتے ہیں۔ البتہ علم و اعتقاد ہر حال میں احکام شریعت و ظواہر نصوص کتاب و سنت پر ہے۔ اور ان کے سوا کوئی نہیں جو معیار حق و باطل اور حجت و برہان ہو۔ (تذکرہ ص ۳۳)

چنانچہ اکثر اہل اللہ اور علماء حق کی نسبت منقول ہے کہ سید محمد جونپوری اور ان کی جماعت سے حسن ظن رکھتے تھے، یا اقلاً ان کے بارے میں توقف اور سکوت کو کام میں لاتے تھے۔

حضرت شیخ داؤد جہنی وال اور مولانا جمال الدین کی رائے چند صفحات کے بعد ملاحظہ سے گزرے گی۔ شیخ وجیہ الدین گجراتی جو اس وقت کے بہت بڑے عالم تھے اور جن کا ترجمہ اخبار الاخیار اور مآثر الکرام میں موجود (۳۰۵) ہے، اُن کے سامنے جب سید موصوف اوران کے بعض اتباع کی تکفیر کا فتویٰ پیش کیا، (۳۰۶) تو دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ جو جماعت دنیا کو چھوڑ کر وقف حق پرستی ہے۔ میرا قلم اُس کی مخالفت میں نہیں اُٹھ سکتا۔ شیخ علی متقی نے اگر چہ فرقۂ مہدویہ کے غلو اور محدثات کی رد میں رسالہ لکھا، لیکن خود سید صاحب موصوف کی نسبت لکھتے ہیں کہ کف لسان اولیٰ ہے۔

شیخ بڈھا دانا پوری کہ اس عہد کے استاذ الاساتذہ تھے، اور سید رفیع الدین محدث کہ بہ یک واسطہ حافظ عسقلانی کے شاگرد تھے، شیخ عبدالقادر بدایونی ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ "با مہدویہ حسن ظن داشتند"۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا قول شاہ عبدالعزیز صاحب نے ایک مکتوب میں نقل کیا ہے کہ سید محمد "عالم حق" اور "واصل باللہ" تھے۔ بعض خواطر اور واردات اُن پر ایسے گزرے کہ اُن کے درک وفہم میں درماندہ وعاجز رہ گئے اور خود اپنے مقام کی نسبت دھوکے میں پڑ گئے۔ یہ بات نہ تھی کہ انہوں نے دانستہ غلط دعویٰ کیا ہو۔

حضرت مجدد صاحب اور مرزا مظہر جانجاناں سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔ (تذکرہ ص ۳۰ جلد ا)

صاحب تذکرہ فرماتے ہیں:

میرا خیال یہ ہے کہ سید محمد اپنے اس دعوے میں سچے تھے کہ میں مہدی ہوں، اور ملک کی جو حالت اس وقت ہو رہی تھی وہ یقیناً ایک مہدی ہی کے ظہور ہی کی مقتضی اور منتظر تھی۔ نہ کہ ایک مضل اور دجال کی۔ البتہ غلطی یہ ہوئی کہ لفظ مہدی کو انہوں نے مہدی آخر الزماں سمجھ لیا۔ کیونکہ شہرت وانتظار عام طور پر اس مہدی کی نسبت ہے، اور جب لفظ مہدی بولا جاتا ہے تو سب سے پہلے ذہن اسی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اور یہ رائے بھی اس صورت میں ہے جب کہ خود اُن کی نسبت مہدی آخر الزماں ہونے کا مدعی ہونا قطعی طور پر ثابت ہو جائے۔ ورنہ بہت ممکن ہے کہ اُن کے قلب پر جو وارد گزرا ہو، وہ صرف یہ ہو کہ "انت المھدی" یعنی تو ہدایت یافتہ ہے۔ اور اسی کا انہوں نے اظہار کیا ہو۔ اور معتقدین نے شہرت عام کی بنا پر مہدی آخر الزماں سمجھ کر تمام علامات وآثار مرد یہ کو اُن پر چسپاں کرنا شروع کر دیا ہو۔ (تذکرہ، حاشیہ ص ۴۰-۴۱)

خاکسار کاتب الحروف کے خیال میں یہ دعویٰ زلہ اور لغزش سے کسی حال میں بھی خالی نہیں۔ لغوی معنی کا لحاظ کیا جائے تو سید محمد ہی کی کیا تخصیص ہے، ہر ایک کفر ودجل گمراہی اور ضلالت کے مقابلہ میں مسلمان کا قلبی اذعان ویقین اور روحانی اطمینان وسکون یہی ہونا چاہئے کہ انا المھدی "میں ہی ہوں ہدایت یافتہ"۔

اور صرف ایک آواز غیبی نہیں، بلکہ رب العالمین اور معبود برحق کی مخلوقات کے ہر ایک ذرہ کی یہی آواز اس کے گوش دل میں پڑنی چاہیے کہ "انت المھدی" اور بلا شبہ اگر اس کا دامن عقیدت ایمان بالغیب کی دولت سے پر ہے، اقامۃ الصلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کے عملی گلدستوں سے وہ آراستہ ہے، انبیاء سابقین اور خاتم الانبیاء اور

آپ کی پیش فرمودہ کتابوں پر ایمان رکھتا ہے تو کلام الٰہی کی سب سے بڑی سورت کی سب سے پہلی آیت اس کے ہدایت یافتہ اور رستگار (مفلح) و کامیاب ہونے کی بشارت دے رہی ہے۔ اُولٰئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔

لیکن کیا اس کو یہ بھی حق پہنچتا ہے کہ اہل اسلام کے سامنے اپنی مہدویت کا اعلان کرتے ہوئے اُن کو اس کے تسلیم کرنے کی دعوت دے۔

لفظ مہدی، احادیث رسول اللہؐ میں ایک خاص اصطلاح یا خاص لقب کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ وہی حدیث جو مہدی کے متعلق پیشین گوئی ہے، خاص خاص علامتوں کو بیان کرکے اُس کی تشخیص اور تعیین کرتی ہے۔ مثلاً عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ مسلمانوں کی شدید جنگ ہوگی۔ قسطنطنیہ مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گیا ہوگا۔ یہ مہدی خزائن اور دفائن کعبہ کو تقسیم کرے گا۔ کامیاب جہاد کا علمبردار ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب کوئی سید یا شیخ ان تمام علامتوں کو نظر انداز کرکے اس پیشین گوئی کے صرف لفظ مہدی کو منتخب کرے تو کیا لَاتَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ والی مثال اس پر چسپاں نہ ہوگی؟

اور کیا کسی متبع سنت کی ہمت ہوسکتی ہے کہ فرامین نبوت (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے مقابلہ پر اس قسم کی جرأت کرے۔

اور اگر کسی غیبی بشارت کی بنا پر بھی ایسی بات کہہ رہا ہے تو مسلمانوں کو اور خود اُس کو فیصلہ کرنا ہے کہ اُس کی بشارت کا اعتبار ہوگا یا صادق و مصدوقؐ کی پیش فرمودہ بشارت کا۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ

وغیرہ جیسی ازلی اور ابدی تصدیقات، اس تہی دامان وحی والہام کے پاس ہیں، یا رب العالمین کے اُس کامل و مکمل بندے کے پاس، جس کو شاہد و مبشر بنا کر مبعوث فرمایا گیا۔

بحث کی جاتی ہے کہ لغوی معنیٰ کا لحاظ کرتے ہوئے کسی لفظ کے اطلاق میں کیا خرابی ہے؟

لیکن جب ایک رکیک ترین، اور تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور نظام حکومت میں جس میں بہتر سے بہتر خدمت اور زیادہ سے زیادہ جاں نثاری اور جاں سپاری کے معاوضہ میں چند الفاظ دیدیے جاتے ہیں۔ مثلاً ہزہائی نس، ہزایکسلینسی، نائٹ، سر، وغیرہ تو یہ جائز نہیں ہوتا کہ الفاظ کو ہر شخص استعمال کرنے لگے، اور بلاشبہ بہت بڑی مکاری، عیاری، بغاوت اور جعل سازی ہوگی کہ بارگاہ شہنشاہیت کا رانده اور خارج شدہ یا وہ گمنام حقیر اور فقیر بے نوا جو بارگاہ شہنشاہی کا رخ بھی نہ کرسکتا ہو، اپنے متعلق "ہزایکسلینسی" کا دعویٰ کرکے عام باشندگان ملک سے اسی اعزاز و توقیر، اسی اطاعت اور فرماں برداری کا خواہاں ہو، جو کسی ہزایکسلینسی کے لئے پیش کی جاتی ہے۔ تو اب آپ غور فرمائیے کہ اُس شخص کی چال بازی، مکاری اور دغابازی کس درجہ مستحق

لعنت ہوگی جو اُس مقدس، محکم، ازلی اور ابدی نظام کے کسی خطاب (۴۰۷) کو جس کے ساتھ دنیاوی اور اُخروی عظمتیں اور سعادتیں پیوست ہیں اور جس کے ہر ایک شوشہ کے ساتھ غیر فانی نعمتوں کے غیر منقطع سلسلے وابستہ کردیے گئے ہیں، خود سے اپنے لئے اختیار کرے۔ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا اَوْقَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَلَمْ یُوْحَ اِلَیْهِ شَیْءٌ (قرآن حکیم)

بلاشبہ یہ جعل، یہ تقمّص، یہ اختراع اُس اعلیٰ اور اقدس نظام کے حق میں انتہائی دیدہ دلیری، انتہائی گستاخی اور غیر قابل عفو جسارت ہے۔

یہی سبب ہے کہ احادیث نبویہ میں ہر ایسے شخص کو دجال یعنی جعلساز اور سازشی قرار دیا گیا، جو اپنے لیے لفظ نبی کا اطلاق کرے۔ اگرچہ معنی کا لحاظ کرتے ہوئے یہاں بھی گنجائش نکل سکتی تھی۔

لفظ مہدی اگرچہ لفظ نبی کے لحاظ سے بہت ادنیٰ ہے۔ لفظ نبی کا اطلاق کفر اور اسلام کا معیار بن جاتا ہے۔ کیونکہ بلاتفریق وتقسیم ہر ایک برحق نبی پر ایمان واجب ہے۔

لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ اور لفظ مہدی یہ معیاری حیثیت یقیناً نہیں رکھتا۔ مگر تاہم غیر مستحق اور غیر جائز ادعا کا ارتکاب ہے۔

حضرت مجدد صاحب کا وسیع اور فصیح ظرف اس لحاظ سے بھی قابل صد ستائش و مستحق ہزار تحسین ہے کہ ہر ایک کارخانۂ عجیب وغریب کے مشاہدہ وملاحظہ کے باوجود آپ کا پائے استقامت اس حد سے آگے نہیں بڑھا جو سنت رسول اللہ اور بشارت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے قائم فرمادی تھی۔

شیخ عبداللہ نیازی اور شیخ علائی

اس جملہ معترضہ کے بعد ہم پھر حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ (۴۰۸)

سید محمد جونپوری کے انتقال کے بعد اُن کی جماعت اور زیادہ پھلی پھولی، اور بڑے بڑے اہل اللہ اس میں داخل ہوئے۔ از انجملہ شیخ عبداللہ نیازی اور اُن کے مرید شیخ علائی تھے، جنہوں نے بیانہ میں قیام کیا، اور اپنے علم حق اور اخلاص وایثار کی تاثیر سے سینکڑوں جانبازوں اور حق پرستوں کو معتقد ومرید بنالیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ اور نجات الرشید میں اور نظام الدین ہروی نے طبقات میں ان لوگوں کے مفصل حالات لکھے ہیں۔ مگر زیادہ تفصیل تذکرۃ الواصلین میں بضمن حالات حضرت شیخ داؤد ملتی ہے۔

شیخ عبداللہ نیازی اُس زمانہ کے ایک مشہور پیر طریقت اور شیخ سلیم چشتی کے سربرآوردہ خلفاء میں سے تھے۔ لیکن بعد کو مہدوی ہوگئے اور مشیخت وزہد فروشی کا تمام کاروبار تاراج کرکے درویشی ونامرادی کی وضع اختیار کرلی۔

درخرمن صد زاہد و عاقل زند آتش   آں داغ کہ امروز بر دل دیوانہ نہادیم

بیانہ میں شہر سے باہر ایک ویران باغ تھا۔ وہیں مٹی کا جھونپڑا بنالیا اور مقیم ہو گئے۔ اپنے ہاتھ سے پانی بھرتے۔ مٹکے سر پر اُٹھا کر لے جاتے۔ پیاسوں کو پانی پلاتے اور نمازیوں کو وضو کرادیتے۔ بوڑھے آدمیوں کو دیکھتے کہ بھاری بوجھ اُٹھائے جارہے ہیں تو اُن سے چھین کر خود اُٹھا لیتے اور کوسوں دوڑتے ہوئے ساتھ چلے جاتے۔

یا سبک روحانی کن آمیزش کہ ماندی چوں تو راہ ‌ ‌ ‌ بار غم بردوش دل منزل بمنزل مے برند

نماز کا وقت آتا تو لکڑہاروں اور سقوں کو جمع کرتے اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے۔ کسی پیشہ ور کو دیکھتے کہ عذر معاش سے نماز میں شریک نہیں ہوتا، تو اپنی کمائی اس کو دے دیتے، اور منت و زاری کے ساتھ کہتے کہ جماعت میں شریک ہو کر نماز پڑھو۔ وہ پڑھ لیتا تو ایسے خوش ہوتے گویا دنیا جہاں کی بادشاہت اُس نے دے دی۔

روز بروز یہ حالت بڑھتی گئی، یہاں تک کہ عشق خالق اور خدمت خلق کے سوا اور کسی سے واسطہ نہیں رہا۔

دو عالم از اثر شعلۂ جمالش سوخت ‌ ‌ ‌ جز متاع محبت کہ در پناہ من ست

اسی زمانے میں اطراف بہار کے ایک عالی خاندان پیرزادے شیخ علائی تھے کہ علم و فضل ظاہری کے ساتھ مشیخت و طریقت کی شہرت و شوکت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اور یکتائی کے دعوے اور بے ہمتائی کے غرور میں ایسے مہیب تھے کہ علم و فضل کی بڑی بڑی سرکش گردنوں کو اُن کے سامنے بے اختیار جھک جانا پڑتا تھا۔ مدتوں طرح طرح کی سخت ریاضتیں کی تھیں۔ عوام و خواص میں اُن کے مجاہدات کی دھوم تھی۔ بایں ہمہ نفس پرستی کا یہ حال تھا کہ فقیری کے سجادے پر فرعونیت کا تاج پہن کر بیٹھے تھے، اور جس عالم و صوفی کی طرف لوگوں کو ذرا بھی مائل پاتے تھے، فوراً اپنے مریدوں کی فوج لے کر چڑھ دوڑتے تھے۔ کبھی بحث و مناظرہ کے زور سے، کبھی سوء اعتقاد کے الزام سے، کبھی اور کوئی حیلہ و بہانہ کر کے اس طرح ذلیل و رسوا کر دیتے کہ غریب شہر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا۔

ایک دنیا دار فاسق اور دنیا پرست عالم میں یہی فرق ہے کہ یہ اپنی ہوا پرستیوں کو اعتراف فسق کے ساتھ انجام دیتا ہے، اور دوسرا دین داری اور احتساب شرعی کی ظاہر فریبی سے۔

تا بغایت ما بہر چند اشتیم ‌ ‌ ‌ عاشقی ہم ننگ و عارے پردہ ست

شیخ علائی کا خاندان بھی عرصہ سے بیانہ میں مقیم تھا، قضارا ایک دن شیخ نیازی سے مڈبھیڑ ہو گئی ان کا طور طریق دیکھا تو اور ہی عالم نظر آیا اور پہلی ہی نظر میں گھائل ہو گئے اپنے مریدوں سے کہا خدا پرستی کی اصل راہ یہ ہے آج تک جو کچھ ہم کرتے رہے ہیں وہ خدا پرستی کے نام سے نفس پروری اور بت پرستی تھی میں تو اس فقیر بے نوا کا ساتھ دیتا ہوں جس کو اللہ کی طلب ہو میرا ساتھ دے۔

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں ‌ ‌ ‌ دیرینہ سال چیرے بردوش بیک نگاہے

شیخ نیازی سے پوچھا کہ طالب حق کی راہ کیا ہے۔ کہا کہ اپنا سب کچھ لٹا دو اور متاع عجز و شکستگی اور سرمایۂ نامرادی و خود فروشی کے سوا کچھ باقی نہ چھوڑو۔

دع نفسک ثم تعال

عشق بستان و خویشتن فروش   کہ ازیں خوب تر تجارت نیست

اس کے بعد شیخ کی حالت ہی کچھ اور ہو گئی۔ آباؤ اجداد کے سجادہ مشیخت و مسند علم کو مع ان کے تمام ساز و سامان، غرور و پندار کے تاراج کر کے شیخ نیازی کے ساتھ ہو لئے۔ سامان و اسباب دنیوی میں سے کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی یا خود پرستیوں کا یہ حال تھا کہ اپنے سامنے کسی کو کوئی چیز نہیں سمجھتے تھے، یا اب خاکساری اور جبہ سائی کا یہ حال ہوا کہ مسلمانوں کی جوتیاں سیدھی کرنے میں بھی عار نہ تھا۔

جن جن لوگوں سے لڑتے جھگڑتے تھے، ایک ایک کے پاس جا کر اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافیاں مانگیں۔

رفتہ رفتہ تختی بکشان عشق کی ایک بڑی جماعت شریک حال ہو گئی۔ لوگ گھر بار لٹاتے اور ان کے ساتھ آ آ کر شریک ہو جاتے۔

یہ لوگ بیانہ سے باہر اسی ویران باغ میں رہتے تھے۔ زن و فرزند، خویش و بیگانہ، خانہ و وطن کسی چیز سے لگاؤ نہ تھا۔ کچھ لوگ دن کو نکل جاتے۔ محنت مزدوری کرتے۔ جو کچھ ملتا اس میں سے دسواں حصہ راہ خدا میں صرف کر دیتے۔ باقی لے کر شام کو آتے۔ ایک گھرانے کے بھائیوں کی طرح مل جل کر کھا لیتے اور اپنے عشق میں مست رہتے۔

کچھ لوگ صبح ہوتے ہی شہر کی راہ لیتے۔ بیماروں کی تیمارداری کرتے۔ کمزوروں اور معذوروں کی روٹی پکا دیتے۔ بیوہ عورتوں کا سودا سلف بازار سے لا دیتے۔ دو شخصوں کو آپس میں لڑتے دیکھتے تو منتیں کر کے صلح صفائی کرا دیتے۔ نہ مانتے تو کہتے کہ ہم کو مار ڈالو مگر آپس میں میل ملاپ کر لو۔

استغنا اور قناعت کا یہ حال تھا کہ کئی کئی دن گزر جاتے اور کچھ میسر نہ آتا، لیکن دلوں کی بے فکری اور چہروں کی خوش حالی دیکھ کر گمان ہوتا کہ ابھی شکم سیر ہو کر اٹھے ہیں۔

یَحۡسَبُهُمُ الۡجَاهِلُ اَغۡنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ

بھوک کا بہت غلبہ ہوتا تو نماز شروع کر دیتے، اور سلام پھیر کر اٹھتے تو شہنشاہوں کی بے نیازی چہروں سے ٹپکتی۔

ساتھ ہی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا یہ حال تھا کہ ہر فرد ہمیشہ مسلح رہتا، اور جب کبھی کسی فعل منکر کو دیکھتا تو فلیغیرہ بیدہٖ پر عمل کر کے حکماً روک دیتا۔

اس پر صبر و ثبات کا یہ حال تھا کہ ملامتیں سنتے، گالیاں کھاتے، فاقے کرتے، زخمی ہوتے مگر اپنے کام سے باز نہ آتے۔ وہ کہتے کہ گالیوں میں ہمیں وہ مزا ملتا ہے جو تم کو دعاؤں میں نہیں ملتا۔

ان کی جماعت کے ایک شخص کو سات مرتبہ جلاوطن کیا گیا۔ ہر مرتبہ یہی کہتا رہا کہ ایک بار اور کر دیکھو۔

صبح و شام سب ایک جگہ جمع ہو کر بیٹھتے اور شیخ علائی قرآن حکیم کی تفسیر بیان کرتے۔ دل کے عشق اور باطن

کے سوز وگداز نے اُن کے بیان میں کچھ ایسی تاثیر پیدا کردی تھی کہ زبان سے الفاظ تیر ونشتر بن کر نکلتے اور سننے والے دل تھام کر رہ جاتے۔ کیسا ہی سیاہ باطن اور سنگ دل کیوں نہ ہوتا، لیکن اُن کی زبان سے ایک آیت قرآنی کا وعظ سن کر ایسا خود رفتہ ہو جاتا کہ وہیں کھڑے کھڑے اپنا تمام گھر بار لٹا دیتا۔

ملا بدایونی لکھتے ہیں:

شیخ علائی را نفس گیرائی مؤثر چناں بود کہ در وقت تفسیر قرآنی از وہر کسے کہ مے شنید، اکثرے خود دست از کار وبار دنیوی باز داشتہ آں صحبت اختیار مے کردند وترک خانماں واطفال نمودہ وبر شدت فقر وفاقہ صبر کردہ ودیگر پیرامون کسب وکار خویش نے گشتند۔ [جلد اول ص ۳۹۷]

اسی کے قریب طبقات اکبری میں ہے:

ہر روز وقت نماز تفسیر قرآن مجید بوعظ مے گفت کہ ہر کس کہ در مجلس او حاضر مے بود اصلاً بے کار خود نے رفت وترک اہل وعیال کردہ داخل دائرہ مہدویہ مے گشت، یا از معاصی تائب شدہ مریدے گردید واگر گشت وزراعت یا تجارت میکرد، یک دہ صرف راہ خدا مے نمود [ص ۲۱۷]۔

ملا بدایونی ایک دوسرے موقعہ پر لکھتے ہیں کہ شیخ نیازی کی صحبت اختیار کرتے ہی فہم وتدبر قرآن کی ایک نئی (۵۹) راہ اُن پر کھل گئی تھی۔

معانی قرآن ونکات ودقائق وحقائق آں بآسانی بروے مکشوف گشت۔

تھوڑے ہی عرصہ میں ہزاروں خاندان اس گروہ میں داخل ہو گئے۔ تمام گجرات ومالوہ ودکن میں ہر طرف اسی جماعت کا غلغلہ تھا۔ دین داری وپرہیزگاری کا جوش اس طرح پھیلا کہ شہروں میں نماز کے وقت سناٹا چھا جاتا اور مسجدوں کے سوا کہیں آدمی نظر نہ پڑتا۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے بچپن میں شیخ علائی کو دیکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ حج کے ارادہ سے نکلتے تو سات سو خاندان ساتھ تھے۔ میرے والد پشاور گئے اور وہاں شیخ کی زیارت کی۔ ایک ایسے گروہ کو بھلا علماء دنیا اور فقہاء سوء کب چین سے بیٹھنے دے سکتے تھے۔ چوروں اور قاتلوں کو ان لوگوں سے امن مل سکتا ہے مگر مصلحین اُمت اور عشاق حق کے لئے امن وانصاف کہاں؟

خونے نہ کردہ ایم وکسے را نہ کشتہ ایم   جرم ہمیں کہ عاشق روئے تو گشتہ ایم

۹۵۶ھ (نوسو چھپن) میں جب سلیم شاہ آگرہ میں مسند نشین ہوا اور مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری (متوفی ۹۹۰ھ) کی شیخ الاسلامی کا دور دورہ ہوا، تو ملا موصوف نے اس جماعت کے قتل واذیت پر کمر باندھی۔ عوام کو یہ کہہ کر برانگیختہ کیا کہ یہ لوگ گمراہ اور بدعقیدہ ہیں۔ (۶۰) اور سلیم شاہ کو یہ بات سوجھائی کہ جب سید محمد مہدی ہوئے، تو تمہاری حکومت کہاں باقی رہی۔ روایتوں میں آیا ہے کہ مہدی موعود تمام دنیا پر حکومت کرے گا۔ یہ لوگ مہدی کے پیرو ہیں تو کم از کم ہندوستان پر تو قبضہ کرنے کی ٹھانے ہوئے ہوں گے۔

مخدوم الملک ایں معنی باتیغ وجوہ خاطر نشیں سلیم شاہ نمودہ کہ ایں مرد دعوائے مہدویت مے کند، و

مہدی بادشاہ تمام روئے زمین خواہد شد وتمام لشکر تو باین گرویدہ است و احتمال خلل در ملک است

[طبقات اکبری ص ۲۳۸]

حالانکہ شیخ علائی اور نیازی خود مدعی مہدویت نہ تھے بلکہ سید محمد کو مہدی کہتے تھے اور اُن تمام روایات کی تاویل کرتے تھے۔ جن میں مہدی کی بادشاہت وغیرہ کا ذکر ہے۔ بنیاد اُن کے عقیدہ کی یہ تھی کہ مہدی اور اس کی جماعت اپنے علم و فعل سے احیاء شریعت کرے گی۔ حکمرانی اس کے لئے ضروری نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تاویل صحیح نہ تھی۔ روایات مشہورہ کے الفاظ اور تصریحات احادیث اس کے بالکل مخالف ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس تاویل کے اعتقاد سے وہ جماعت خود ہی حکومت سے دست بردار ہو گئی تھی۔ پھر اس کی نسبت یہ الزام کیسا صریح اتہام تھا۔ لیکن چونکہ بغیر سیاسی خطرہ کے سلیم شاہ برانگیختہ نہیں ہو سکتا تھا اس لئے مخدوم الملک وغیرہ نے اسی سنت قدیمہ علماء سوء کو اختیار کیا اور سلیم شاہ کہ ایک سادہ لوح افغان تھا فوراً آمادۂ مخالفت ہو گیا۔

منتخب التواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مخدوم الملک نے شیخ کے واجب القتل ہونے کے مقدمات یوں ترتیب دیئے تھے۔

ایں مبتدع دعوئے مہدویت میکند۔ و مہدی خود بادشاہ روئے زمین خواہد شد و چوں سر خروج دارد، واجب القتل ست [جلد اول ص ۴۰۰]

بعد کے حالات بہت طولانی ہیں۔ مختصر یہ کہ مخدوم الملک نے سلیم شاہ سے فرمان جاری کرا کے شیخ علائی کو آگرہ طلب کرایا۔ اور اکثر مشاہیر علماء عہد مثلاً سید رفیع الدین محدث، شیخ ابوالفتح تھانیسری بھی بحث و مباحثہ کے لئے طلب کئے گئے۔ شیخ علائی اپنے ساتھیوں کے ساتھ دربار میں پہنچے تو پھٹے پرانے کپڑوں اور فقیرانہ و نامرادانہ وضع و صورت میں درویشوں کی ایک شکستہ حال جماعت تھی۔ لیکن کبر و علو حق کا یہ حال تھا کہ صرف سلام مسنون کر کے ایک گوشہ میں بیٹھ گئے اور تمام دربار پر اس حقارت و بے پروائی سے نظر ڈالی گویا مغرور انسانوں کی جگہ پتھروں کا ڈھیر ہے۔ یہ خودداری سلیم شاہ پر بہت گراں گزری۔ بحث شروع ہوئی تو سب سے پہلے شیخ علائی نے قرآن حکیم کی چند آیات تلاوت کیں اور اُن کی تفسیر کا وعظ شروع کر دیا کہ:

جز نغمہ محبت ساز م نوا نہ دارد

بدایونی لکھتے ہیں کہ وعظ کا مضمون زیادہ تر مذمت دنیا، حالات آخرت، اہانت علماء دنیا اور فرائض اُمراء و سلاطین پر مشتمل تھا، اور کچھ ایسا پر تاثیر اور درد انگیز طرز بیان تھا کہ ادھر شیخ کی زبان سے الفاظ نکل رہے تھے، اُدھر تمام مجمع کی سنگ دلی موم کی طرح پگھل رہی تھی۔ خود سلیم شاہ اور اس کے اُمراء کا یہ حال ہوا کہ باوجود کمال قساوت قلبی و حق فراموشی کے ضبط نہ کر سکے اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔

سرشک گرم کی حدت کو پوچھو مرے دامن سے اپنی آستیں سے

یہ حال دیکھ کر سلیم شاہ کا خیال پلٹ گیا اور بے اختیار ہو کر شیخ کی نہایت تعظیم و تکریم بجالایا۔ پوچھا کہ باوجود ان کمالات و فضائل کے کیا سبب ہے کہ لوگ تمہارے مخالف ہیں؟ بھلا شیخ علائی اس کا کیا جواب دیتے۔

دل را کہ تو مقید زندان حسرت ست جز عرض عشق ہیچ گناہے دگر نبود

حکم دیا کہ شیخ کے لئے طعام خاصہ سے کھانا بھیجا جائے لیکن شیخ نے نہیں کھایا۔ اور فرمایا:

''طعام تو حق مسلمانان ست کہ بخلاف شرع زیادہ از حق خود متصرف شدہ''۔ (۴۱)

دوسرے دن مباحثہ ہوا۔ تمام علماء دربار ایک طرف اور یہ درویش بے نوا ایک طرف تھا۔ لیکن جو شخص زبان کھولتا تھا، چند منٹوں میں ذلیل و رسوا ہو کر لاجواب ہو جاتا تھا۔ مخدوم الملک کو تو بات تک کرنے نہ دی۔ بار بار اس کو مخاطب کر کے کہتا۔ ''تو از علماء دنیائی (۴۲) دوزد دینی و مرتکب چندیں نامشروعائی بمشابہ کہ از دائرہ عدالت خارج افتادہ، ہنوز آواز سرود و ساز (۴۳) از خانۂ تو علانیہ مے شنوند۔ [منتخب التواریخ ج اص ۴۰۱]

مباحثہ کا رنگ دیکھ کر سلیم شاہ کو یقین ہو گیا کہ تمام علماء بلا وجہ ایک درویش حق پرست کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ تاہم مجبور تھا، رعایا انہیں لوگوں کے ہاتھوں میں تھی۔ اور معاملہ مذہبی تھا جس میں خود دخل دے نہیں سکتا تھا۔

ساتھ ہی روز خبریں اُڑنے لگیں کہ آج فلاں سردار، شیخ کا مرید ہو گیا۔ اور کل فلاں امیر نے اُن کا وعظ سن کر گھربار لٹا دیا۔ آخر الامر سلیم شاہ نے صرف حکم جلاوطنی پر کفایت کی، اور شیخ کو دکن چلے جانے کا حکم دیا۔ شیخ نے اِنَّ اَرْضَ اللّٰہِ وَاسِعَۃٌ پڑھا اور دکن کی راہ لی۔

لیکن صرف اتنی ہی سزا سے علماء دنیا کی خون آشام پیاس کب بجھنے والی تھی؟ چند دنوں کے بعد موقع پا کر اُبھارا، اور طرح طرح کے اشتعال انگیز قصے سنا کر شیخ علائی کے قتل پر آمادہ کرنا چاہا۔ بڑا جرم شیخ علائی کا یہ تھا کہ جہاں جاتا ہے، ایک دنیا اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ دکن کی طرف جلاوطن کر کے بھیجا تو وہاں بھی بہار خاں حاکم ہنڈیہ اور اطراف دکن کے ہزار ہا آدمی معتقد و مرید ہو گئے۔ بالآخر شیخ علائی کو دوبارہ آگرہ طلب کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلیم شاہ نے علماء دار الحکومت خصوصاً مخدوم الملک کی خود غرضیوں اور حسد و عناد کو اس بارے میں محسوس کر لیا تھا، اور سمجھ چکا تھا کہ ان لوگوں کی رائے بے لاگ نہیں ہے۔ اس لئے اس مرتبہ شیخ کو شیخ بڈھا بہاری (۴۴) کے پاس بھجوایا کہ مشاہیر علماء وقت سے تھے اور لکھا کہ جو فیصلہ آپ کا ہو، اُسی پر عمل کیا جائے۔

بدایونی لکھتے ہیں کہ پہلے تو شیخ بڈھا نے ایک حق پرستانہ تحریر لکھی۔ جس کا مضمون یہ تھا کہ مسئلہ مہدویت موقوف علیہ ایمان و اسلام نہیں۔ تعیین علامات مہدی میں مختلف روایتیں وارد اور سخت اختلاف واقع ہے۔ صرف اتنی سی بات پر ایک عالم حق کی تکفیر و تعزیر جائز نہیں۔ لیکن افسوس کہ بعد کو دنیا پرستی مانع آئی۔ اُن کے لڑکوں نے سمجھایا کہ آج کل مخدوم الملک کی شیخ الاسلامی ہے، اس کے خلاف رائے دینا ٹھیک نہیں۔ اگر اُس نے سلیم شاہ سے کہہ کر تم کو اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے آگرہ طلب کرا لیا، تو اس بڑھاپے میں بے کار سفر کی زحمت اُٹھاؤ گے۔ یہ

بات شیخ بڈھا کے دل پر اثر کر گئی اور پہلی تحریر چاک کر کے دوسرا مراسلہ اس مضمون کا بھیج دیا:
''مخدوم الملک امروز از علماء محققین ست۔ سخن سخن او، وفتویٰ فتویٰ او ست''۔

اُسی کی سی کہنے لگے اہلِ حشر   کہیں پرسش داد خواہاں نہیں

سلیم شاہ کے دل پر شیخ علائی کی حق پرستی کا زخم لگ چکا تھا۔ مگر خود عالم نہ تھا چاہتا تھا کہ اگر ایک عالم حق گو کا سہارا بھی مل جائے تو شیخ کو علماءِ سوء کے پنجے سے چھڑا لے۔ لیکن افسوس کہ سب نفس و دنیا کے پجاری نکلے۔

جب شیخ بڈھا نے بھی مخدوم الملک کی تائید کی تو بالکل مجبور ہو گیا اور شیخ کا معاملہ مخدوم الملک کے حوالہ کر دیا۔ شیخ علائی اس وقت سخت بیمار تھے۔ گلے میں ایک بہت بڑا زخم تھا۔ اور بہار تک سفر کرنے کی زحمت نے نیم جاں کر دیا تھا۔ مخدوم الملک نے حکم دیا کہ کوڑے لگوائے جائیں۔ جلاد نے تیسری ضرب لگائی تھی کہ اس شہید حق کی روح پرواز کر گئی۔

فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ

ملا عبدالقادر بدایونی نے ذاکر اللہ اور سقاہم ربہم شراباً طہوراً سے تاریخ وفات نکالی، کہ ۹۵۷ھ (نو سو ستاون سال ہجری) ہے۔

بجرم عشق اگر کشتی مرا ممنون احسانم   گناہ زاہد بے درد یارب چیست حیرانم

افسوس مرنے کے بعد بھی ظالموں کو تسکین نہ ہوئی اور اس فنافی الحق کی نعش کے ساتھ وہ سلوک کیا گیا جو بدر واُحد کے مقتول کفار کے ساتھ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ ہاتھی کے پاؤں سے باندھ کر نعش کو چروایا گیا، اور اس کے ٹکڑوں کی تمام لشکر میں تشہیر کی۔ پھر حکم کیا کہ دفن نہ کیا جائے، اور اس غرض سے پہرہ بٹھا دیا گیا۔

شیخ عبداللہ نیازی کا سانحہ

یہ سرگزشت تو شیخ علائی کی ہے۔ اُن کے پیر حضرت شیخ عبداللہ نیازی کا واقعہ بھی اس سے کم درد انگیز اور عبرت خیز نہیں۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ جب شیخ علائی دکن کی جانب جلاوطن کر دیئے گئے تو اس کے کچھ عرصہ بعد سلیم شاہ سرحدی افغانوں کی سازش کا حال سن کر پنجاب کی جانب روانہ ہوا۔ جب بیانہ کے قریب شاہی لشکر پہنچا تو مخدوم الملک نے کہ پیوستہ و کمر بستہ خاصان حق کی اذیت و ہلاکت کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے تھے، موقع کو غنیمت سمجھا اور سلیم شاہ سے کہا:

''از فتنہ صغیر کہ عبارت از شیخ علائی باشد، خلاصی یافتیم اما فتنہ عظیم ہنوز برپاست''۔

سلیم شاہ نے پوچھا۔ وہ کون؟ کہا۔ شیخ عبداللہ نیازی کہ یہیں بیانہ میں مقیم ہے اور شیخ علائی کا پیر ہے۔

سلیم شاہ نے میاں بھیرو لوحانی، حاکم بیانہ کو حکم بھیجا کہ فوراً شیخ کو حاضر لشکر کرو۔ میاں بھیرو، شیخ کا مرید تھا۔ اُس نے شیخ کو بہت سمجھایا کہ آپ یہاں سے راتوں رات نکل جائیں۔ میں کوئی بہانہ کر دوں گا۔ لیکن شیخ نے کہا۔

"ارادۂ خداوندی در حال و استقبال و آنجا و اینجا مساوی ست، تا ہر چہ مقدر ست خواہد رسید"۔

مجبوراً شیخ کو ہمراہ لیا اور لشکر شاہی میں پہنچے۔ سلیم شاہ سوار کوچ کے لئے تیار کھڑا تھا۔ شیخ عبداللہ سامنے پہنچے تو بے باکانہ گردن اُٹھائے جا کھڑے ہوئے اور السلام علیکم کہا۔ میاں بہوہ نے کہ کسی طرح سلیم شاہ کے غیظ و غضب سے ان کو بچانا چاہتا تھا، گردن پکڑ کر جھکا دی اور کہا "بادشاہوں کو یوں نہیں، یوں سلام کرتے ہیں۔ اس پر شیخ نے گرج کر کہا۔ جو سلام کہ سنت ہے اور صحابہؓ اللہ کے رسول کے سامنے کیا کرتے تھے، یہی ہے۔ اس کے سوا میں اور کوئی سلام نہیں جانتا۔ سلیم شاہ نے غضب ناک ہو کر اشارہ کیا، اور لشکریوں نے لاٹھیوں، کوڑوں، مکوں اور لاتوں سے پیٹنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ بے ہوش ہو گئے۔ جب تک ہوش رہا یہ آیت قرآنی ورد زبان تھی۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ

سلیم شاہ نے جب شیخ کو یہ پڑھتے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔ کیا کہتا ہے مخدوم الملک نے کہا۔ "شما را و مارا کافرے گوید"۔ اس پر اس کو اور زیادہ طیش آیا اور جب تک موت کا یقین نہ ہو گیا، برابر زدوکوب کا حکم دیتا رہا۔

جائیست ہر آئینہ خواہد رفتن   اندر غم عشق تو رود او لے تر

مخدوم الملک

وہی عبداللہ انصاری ہیں جنہوں نے اسی شیخ الاسلامی کے زمانہ میں اتنا سونا جمع کیا تھا کہ کنجیوں کا شمار بھی نہ تھا۔ اور صرف گھر کے صندوق ہی نہیں بلکہ ان کے مرنے کے بعد جب حویلی کی تفتیش ہوئی تھی تو جن قبروں میں خاندان والوں کے مزارات بنائے جاتے تھے، ان میں سونے کی اینٹیں بھی مدفون تھیں۔ ادائیگی زکوٰۃ تو آپ کے لئے بہت دشوار تھی لیکن اس فرض سے سبک دوش ہونا بھی آپ کے علم و فضل کا تقاضا تھا، جس کے لئے آپ کی ذکاوت نے یہ جدت پیدا کی تھی کہ ہر گیارھویں مہینے میاں بیوی کو، اور پھر آپ کی بیوی آپ کو یہ دولت عطا کرتی تھی۔

پھر عہد اکبری میں یہی مخدوم الملک تھے جو دنیا ہی میں شکنجۂ مکافات و پاداش عمل میں جکڑے گئے۔ ابوالفضل اور فیضی کے والد ملا مبارک ناگوری بھی ان کی دست درازیوں کا شکار ہو چکے تھے۔ جب دربار اکبری میں ملا مبارک کو رسوخ حاصل ہوا تو پیشوائی اور شیخ الاسلامی تو ایک طرف عزت اور آبرو سے بڑھاپا بھی بسر نہ کر سکے۔ یا تو یہ حال تھا کہ ان کے قلم شیخ الاسلامی کی ایک گردش اہل اللہ کی زندگیوں کا فیصلہ کر دیتی تھی، یا یہ یوم العذاب دیکھنا پڑا کہ حاجی ابراہیم سرہندی اور شیخ ابوالفضل جیسے نوخیز بھری مجلس میں ان کے فسق و فجور کا فیصلہ کرنے لگے، اور عمر بھر کی بداعمالیوں کا ایک ایک کر کے حساب دینا پڑا۔

شیخ عبدالنبی دنیا پرستی میں ان کے رقیب تھے۔ آپس میں خوب خوب ایک دوسرے کے برخلاف پمفلٹ بازی ہوتی رہی۔ اکبر نے مجبور ہو کر ان دونوں کو زبردستی حج کے لئے بھیج دیا۔ تین سال تک حجاز مقدس میں رہے، وہاں بھی یہی گندگی اُچھالتے رہے۔ پھر واپس آئے تو بقول صاحب خزینۃ الاصفیاء اکبر نے اُن کو زہر دلوا کر

مروا دیا۔ لیکن سالِ وفات خزینۃ الاصفیاء میں ایک ہزار چھ تحریر کیا ہے۔ یہ غلط ہے۔ ملا عبد القادر بدایونی سنہ نو سو نوے کے حالات میں لکھتے ہیں:

> مخدوم الملک در احمد آباد در گزشت قاضی علی از فتح پور بجہت تحقیق اموال او مامور شدہ بہ لاہور آمد و چنداں خزائن و دفائن پدید گشت کہ قفل شمار آنرا بہ کلید وہم نتواں کشاد۔ از انجملہ چند صندوق خشت طلاء از گورخانۂ مخدوم الملک کہ بہ بہانۂ اموات دفن کردہ بود ظاہر شدہ آنچہ پیش مردم ماند عدد آں جز آفریدگار کس نہ داند و آں ہمہ خشتہا با کتب وے کہ نیز حکم خشت داشت داخل خزانہ عامرہ گردید
>
> [جلد دوم ص ۳۱۱]
>
> مے کشیدم مے و سجادۂ تقویٰ بردوش ۔۔۔ آہ اگر خلق شود آگاہ ازیں تزویرم

معاصرین کرام

الف: حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی اصلاحی خدمات کی ابتداء یعنی ۱۰۰۰ھ (ایک ہزار) سے حضرت محمد صدیق صاحب فرزند اصغر حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب کی وفات یعنی ۱۱۳۰ھ تک جن علماء و مشائخ ہند نے اس دارِ فانی کی کشاکش سے دامن چھوڑ کر دعوتِ اجل کو لبیک کہا۔ اُن کی تعداد دو سو سے متجاوز ہے۔

ب: بہت سی کتابیں ہیں جن سے ان حضرات کے حالات سے واقفیت حاصل کی جا سکتی ہے۔ صرف علماء اور مشائخ کے حالات موضوع کتاب نہیں۔ اُن کے شاندار کارنامے موضوعِ کتاب ہیں۔ لہٰذا اس عنوان کے ماتحت صرف انہیں حضرات کا تذکرہ ہوگا جن کا تعلق ہندوستان کی سیاست سے رہا۔ یا کم از کم درس و تدریس کے ذریعہ سے اشاعتِ علم اور اصلاحِ خلق کی کوشش کی۔

ج: بیشک بہت سے واجب الاحترام مخلص ہیں جن کی خاموش خدمتیں عظیم الشان نتائج کا تخم بنتیں مگر افسوس وہ خدمات صفحاتِ تاریخ پر نہ آ سکیں یا اُن صفحاتِ تاریخ تک ہماری رسائی نہیں ہو سکی۔ ایسے حضرات کے لئے یہ باب تکملہ کا محتاج رہے گا۔

د: بلاشبہ خانقاہوں کا قیام بھی عظیم الشان خدمت تھی۔ الفِ ثانی سے پیشتر یہی خانقاہیں اشاعتِ اسلام اور اصلاح و ارشاد کا مرکز تھیں مگر الفِ ثانی کے انقلاب نے خانقاہوں کی سعادت مدارس کو عطا کر دی۔

ہ: مولانا عبد الحکیم صاحب سیالکوٹی وغیرہ چند حضرات کے تذکرے حاشیوں میں آچکے ہیں۔ اُن کا اعادہ نہ ہوگا۔

شیخ علی متقی قدس اللہ سرہ العزیز

ابن حسام الدین، ابن عبدالملک ابن قاضی خاں [۳۱۵] ۔ المتقی، القادری، الشاذلی المدینی چشتی [۳۱۶] ۔

وطن جون پور۔ جائے ولادت برہان پور، سنہ ولادت آٹھ سو پچاسی ھ [۳۱۷]

والد صاحب شاہ باجن چشتی برہان پوریؒ سے بیعت تھے۔ صاحبزادہ کی عمر ۸ سال تھی۔ ان کو بھی شاہ صاحب سے ہی بیعت کرا دیا۔ کچھ دنوں بعد والد صاحب کی وفات ہوگئی۔

سلوک و طریقت

شیخ علی نے تحصیل علوم سے فراغت کے بعد کچھ دنوں سرکاری ملازمت انجام دی۔ مگر پھر جذبۂ طریقت نے دنیا اور سامان دنیا کو نظر شیخ میں حقیر کر دیا۔ ترک ملازمت کرکے شاہ باجن صاحب کے صاحبزادہ اور خلیفہ حضرت شیخ عبدالحکیم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ اس کے بعد شیخ حسام الدین متقی ملتانی (متوفی ۹۲۰ھ۔ نو سو ساٹھ) کی خدمت میں ملتان حاضر ہوکر فیوض و برکات حاصل کئے۔ پھر حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوکر شیخ ابوالحسن بکری [۳۱۸] کے فیوض و برکات سے دامانِ طلب پُر کیا شیخ محمد بن سخاوی سے سلسلۂ قادریہ اور شاذلیہ کا خرقۂ خلافت حاصل کیا نیز اسی طرح دیگر اکابر سے دوسرے طریقوں کے خرقہائے خلافت حاصل کئے، اور پھر مکہ معظمہ میں مستقل قیام اختیار کر لیا۔

تصنیف و تالیف

آپ کا زہد و تقویٰ علم سے، اور علم زہد و تقویٰ سے بڑھا ہوا ہے آپ کسی ایک ملک یا سلسلہ کے لحاظ سے نہیں، بلکہ پوری اُمت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے مصنفین میں بلند پایہ شمار کئے جاتے ہیں۔

شیخ جلال الدین سیوطی کی مشہور کتاب ہے "جمع الجوامع"۔ اس میں حروف تہجی کی ترتیب سے احادیث جمع کی ہیں اور اس کے متعلق شیخ جلال الدین کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تمام قولی اور فعلی احادیث اس میں جمع کر دی ہیں۔ حضرت شیخ علی نے اس کو ابواب فقہیہ کی ترتیب پر مرتب کیا۔ پھر نظر ثانی فرمائی اور مکرر احادیث حذف کرکے ان کو انتخاب کے طور پر مرتب کیا۔

شیخ ابوالحسن بکری فرمایا کرتے تھے۔ شیخ جلال الدین سیوطی [۳۱۹] کا تمام مسلمانوں پر احسان ہے اور علی متقی کا شیخ جلال الدین پر۔

شیخ متقی کی گراں قدر تصنیفات کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔

ان تصانیف پر نظر ڈالنے سے حیرت ہوتی ہے کہ ایک انسان نے کس طرح ان کو مرتب کیا۔ مکہ معظمہ کے جلیل القدر اور مشہور و معروف بلند پایہ عالم شیخ ابن حجر (مصنف صواعق محرقہ) پہلے استاد تھے، پھر شاگرد کہلانے

لگے۔ حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ ع

ان ھذا من اعاجیب الزمن

اسی طرح حجاز مقدس کے تمام علماء اور مشائخ آپ کے عقیدت مند ہوئے۔

اکلِ حلال تو کل وقناعت

قیام ملتان اور اس کے بعد سفر حجاز وغیرہ میں آپ کے پاس دو تھیلے رہتے تھے۔ ایک تھیلہ میں کتابیں، اور دوسرے تھیلہ میں آٹا، دال، نمک مرچ، تیل اور تھوڑی سی لکڑیاں (جو خود جنگل سے فراہم کی ہوئی تھیں) آپ کسی مسجد میں کبھی قیام نہیں کرتے تھے۔ بلکہ کرایہ پر مکان لے کر اس کو اقامت گاہ بناتے۔ اپنا تمام کام خود کرتے۔ حتیٰ کہ خود ہی کھانا پکاتے۔ ضرورت کے وقت کسی دوسرے سے کام کراتے تو معاوضہ دے کر۔

ذریعہ معاش کتابوں کی کتابت تھی۔ اپنے قلم سے کتابیں لکھ کر فروخت کرتے اُمراء اور اغنیاء کے نذرانوں اور ان کے تحائف سے نفرت تھی۔ اُن سے قرض لینا بھی گوارا نہ تھا۔ کبھی کبھی نذرانہ قبول فرما لیتے تھے مگر اس وقت جب کسی غریب کی جانب سے اور اس کے کسب حلال ہونے میں کوئی شبہ نہ ہوتا، اور اس رقم کو عموماً ادا قرض میں صرف کرتے تھے۔

سلاطین ترکیہ کے کسی وزیر نے بہت زیادہ اصرار کیا کہ حضرت شیخ ایک مرتبہ میرے مکان پر تشریف لاکر ماحضر تناول فرمائیں۔ حضرت شیخ امراء کے دروازوں کو اپنے لئے گویا حرام تصور فرماتے تھے۔ انکار فرماتے رہے۔ مگر جب وزیر صاحب کا اصرار بہت زیادہ بڑھا۔ اور حضرت شیخ کے مخصوص خدام نے بھی سفارش کی تو وزیر صاحب کی درخواست قبول فرمائی۔ مگر تین شرطیں طے کرلیں۔ جہاں چاہوں گا بیٹھ جاؤں گا۔ جو چاہوں گا کھاؤں گا، اور جب چاہوں گا اُٹھ کر چلا آؤں گا۔

وزیر صاحب نے تشریف آوری کو بہر صورت غنیمت سمجھا۔ شرطیں منظور کرلیں۔ حضرت شیخ تشریف لے گئے۔ تو شاہانہ قالینوں اور غالیچوں کو چھوڑ کر دروازہ کے قریب بیٹھ گئے۔ [۳۳۰] کھانا چنا گیا، تو اپنی جھولی میں سے روٹی نکال کر کھانی شروع کردی [۳۳۱] اور جب کھانے سے فراغت ہوگئی تو السلام علیکم فرمایا اور روانہ ہوگئے۔

مکہ معظمہ سے ایک مرتبہ آپ گجرات تشریف لائے۔ خلق خدا کی گرویدگی کا یہ عالم ہوا کہ پروانوں کی طرح آپ پر قربان ہوتی تھی۔ مجبوراً آپ کو دروازہ بند کرکے بیٹھنا پڑتا تھا۔ سلطان محمود والیٔ گجرات کو آپ کی زیارت کا شوق ہوا۔ حاضری کی اجازت چاہی، منظور نہ ہوئی۔

قاضی عبداللہ سندھی جو اس زمانہ میں مع اہل وعیال نقل وطن کرکے گجرات ہی چلے آئے تھے، ایک پرہیزگار عالم تھے اور حضرت شیخ سے تعلقات یگانگت رکھتے تھے، قاضی صاحب نے اصرار کیا کہ درخواست منظور فرمائی جائے۔

حضرت شیخ نے فرمایا۔ سلطان کی وضع میں کچھ خلاف شرع چیزیں داخل ہیں۔ یہ مجھ سے ممکن نہ ہوگا کہ میں خلاف شرع چیز کو دیکھوں اور خاموش رہوں۔

قاضی صاحب نے فرمایا۔ آپ اسی شرط پر اجازت دے دیں۔ سلطان نے شرط منظور کی، حاضر خدمت ہوا۔ واپس جا کر ایک کروڑ تنگہ (جو گجراتی سکہ تھا) بطور ہدیہ خدمت میں بھیجا۔ حضرت شیخ نے تمام رقم قاضی عبداللہ صاحب کو دے دی کہ یہ آپ کے واسطے سے ہی آئی ہے۔ آپ ہی کو مبارک ہو۔

اس کے بعد سلطان محمود گجراتی اکثر خدمت اقدس میں حاضر ہوتا۔ آپ جو بات خلاف شرع دیکھتے، اُس کو تنبیہ فرماتے اور یہ سعادت مند سلطان اس کو منظور کرتا۔

سلطان کو وہم کا مرض تھا۔ حضرت شیخ نے ایک مرتبہ آفتابہ میں پانی گرم کر کے اپنی ٹوپی کو تین مرتبہ دھویا۔ اُس کے بعد چوتھی مرتبہ دھو کر اُس کا دھوون بادشاہ کو دیا اور فرمایا:

بابا محمود! یہ پانی شریعت مطہرہ میں پاک ہے، اس میں وہم اور وسوسہ شیطانی فعل ہے۔ آپ اس کو پی جائیے۔ سلطان نے پی لیا۔ فوراً مرض وہم کافور ہوگیا۔

آپ کا بیشتر وقت درس و تدریس، کتابیں لکھنے اور نایاب کتابوں کے نقل کرنے اور نقل کرانے میں خرچ ہوتا۔ خدمت خلق کا یہاں تک شوق تھا کہ طلبہ کے لئے دوات اور روشنائی خود ہی تیار فرما دیتے، اور خود ہی نقل کر کر کے اُن کے لیے کتابیں فراہم کرتے۔ آپ درس کے وقت معمولاً روشنائی گھوٹتے رہتے تھے اور فرمایا کرتے۔ ہاتھ کو بھی اپنے کام سے خالی نہیں رہنا چاہیے۔ اتباع سنت کی حرص تھی۔ ہمیشہ با وضو رہتے۔ ہر مرتبہ وضو کے بعد دو رکعت تحیۃ الوضو پڑھتے۔ آخری عمر میں ضعف اور مرض کے باعث چلنا پھرنا دشوار تھا۔ مگر معمولات میں تفاوت نہ آتا تھا۔ رات کو دس بارہ مرتبہ پیشاب کی ضرورت ہوتی۔ ہر مرتبہ وضو کرتے اور کم از کم دوگانہ وضو ضرور ادا کرتے۔

آپ کا مقولہ تھا کہ مال حلال ضائع نہیں ہوتا۔ اور تمثیل میں اپنے واقعات بیان کیا کرتے۔ خیال ہوا کہ قبرستان عام مسلمانوں کی جگہ ہے، اس میں قبل از وقت تخصیص مسلمانوں پر ایک قسم کی تنگی ہے۔ لہٰذا اس انتخاب کو منسوخ کرادیا۔ وفات سے دس بارہ سال بعد لحد مبارک کھولنے کا اتفاق ہوا۔ دیکھا گیا کہ نعش مبارک بدستور ہے۔ دوم جمادی الاولیٰ ۹۷۵ھ (نوسو پچھتر) بوقت سحر راہ گزار عالم جاوید ہوئے۔

شیخ عبدالوہاب المتقی القادری الشاذلی آپ کے جلیل القدر خلیفہ ہیں۔ آپ کو ممالک اسلامیہ نے قطب وقت تسلیم کیا۔ حضرت مولانا عبدالحق صاحب محدث ؒ نے آپ سے استفادہ کیا اور آپ ہی کے واسطہ سے شیخ علی متقی قدس اللہ سرہ العزیز کے حالات جمع کئے ہیں۔ جن کو تفصیل کے ساتھ زبدۃ الاخبار میں جمع کیا۔ اور انہیں کا خلاصہ سطور بالا میں درج کیا گیا۔

شیخ داؤد چونی والؒ

یا شیخ داؤد کرمانی۔ چھنی وال لاہور سے جنوب میں تقریباً چالیس کوس کے فاصلہ پر "چونی" ایک قصبہ تھا۔ اسی کی نسبت سے آپ کو چونی وال کہتے ہیں۔ آپ کے والد ماجد سید فتح اللہ عرب سے ہندوستان تشریف لائے۔ ملتان میں قیام فرمایا۔ اور شیخ داؤد ابھی دورِ طفولیت ہی طے کر رہے تھے کہ دنیا سے رخت سفر باندھا۔ بڑے بھائی شیخ رحمت اللہ اس نونہال "داؤد" کو لاہور لے آئے۔ عارف نامی مولانا عبدالرحمٰن جامی قدس اللہ سرہ العزیز کے شاگرد رشید مولانا "اسمٰعیل آچہ" سے علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ پھر مخدوم شیخ حامد الحسنی جیلانی (عرف شیخ حامد گنج بخش متوفی ۹۷۸ھ) سے سلسلۂ قادریہ میں خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ آپ بلند پایہ، عالی حوصلہ، صاف گو شیخ و مرشد ہوئے اہل دنیا سے ہمیشہ علیحدہ رہے۔ سلیم شاہ (سالم شاہ پسر شیر شاہ سوری متوفی ۹۶۰ھ) نے آپ کو بلایا، تو آپ نے کہلا بھیجا کہ دعاء غائبانہ ہی کافی ہے۔ (خزینۃ الاصفیاء ص ۱۲۸ جلد ۱)

آپ پر حالت نماز میں خاص کیف طاری ہوتا تھا۔ بسا اوقات تمام رات سجدہ ہی میں گزار دیتے۔ کبھی ساری رات رکوع ہی میں ختم ہو جاتی اور کبھی ایک ہی رکعت کے قیام میں سپیدۂ صبح طلوع ہو جاتا۔ مجلس میں آپ ایسے بیٹھتے جیسے کسی محبوب کی آمد کا انتظار ہو۔ پھر ذوق و شوق کی حالت پیدا ہوئی اور سلسلۂ تقریر جاری ہو جاتا۔ جس میں سینکڑوں نکات اور حقائق کی گوہر افشانی ہوتی۔

مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری جن کا ذکر مبارک اوپر گزرا۔ آپ سے بھی عناد رکھتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد تحریر فرماتے تھے:

سبب اس کا یہ تھا کہ شیخ موصوف پر میر محمد جون پوریؒ کے متعلق منکشف ہوا تھا کہ وہ کبار اولیاء اللہ اور صاحبان مدارج و مقامات عالیہ میں سے ہیں اور اُن کے احوال و مقامات کے متعلق لوگوں کو بوجہ قصور فہم دھوکا ہوا ہے، جو علماء وقت ان کی تکفیر و تضلیل کے درپے ہیں، سخت غلطی کر رہے ہیں۔

یہ بات بعض علماء دربار پر سخت گراں گزری کیونکہ وہ برابر طائفہ مہدویہ کے قتل و تعزیر میں کوشاں رہتے تھے۔

جب بعہد سلیم شاہ، مخدوم الملک مولانا عبداللہ کے ایماء و سعی سے شیخ عبداللہ نیازی اور ان کی جماعت کے فقراء مبتلائے محن ہوئے تو حضرت شیخ نے فرمایا، کہ ان مظلوموں کا خون عنقریب رنگ لائے گا اور افغانیوں کی حکومت زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہے گی۔ یہ بات مشہور ہوئی تو معاندین نے حضرت شیخ کو بھی مہدویت سے متہم کیا اور بہت کلفت و تعب کا باعث ہوئے (حالانکہ پیش آئے واقعات کو دیکھتے ہوئے ایک مومن کی صحیح فراست تھی۔ جس کا ظہور صرف چار سال بعد ہو گیا۔ جبکہ ۹۶۳ھ میں ہمایوں نے دوبارہ اپنی حکومت قائم کر لی۔ سلیم شاہ ایک ایسے مرض میں مبتلا ہو گیا جس کو کوئی حکیم تشخیص نہ کر سکتا تھا۔ اسی میں اُس کا انتقال ہو گیا۔ پھر اُس کا لڑکا فیروز قتل ہوا اور ہمیشہ کے لیے یہ نسل منقطع ہو گئی)۔ آپ کے خلفاء میں مولانا جمال الدین عرف شیخ بہلول دہلوی بڑے پایہ کے عالم اور محدث تھے۔

حضرت داؤد کے متعلق جب ارباب غرض نے فتنہ برپا کرنا چاہا تو حضرت شیخ بہلول نے ایک کتاب تحریر کی اور اس میں دلائل وشواہد قاطع سے ثابت کیا کہ حضرت سید محمد جونپوری کی ولایت حق ہے لیکن ان کے مہدی موعود ہونے کا اعتقاد باطل ہے اور ہماری جماعت کو اس اعتقاد باطل سے متہم کرنا مخالفین کا عناد اور منکرین کی شقاوت ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اگرچہ ارباب حق وصلاح کو اطمینان بہم پہنچا۔ لیکن معاندین کا خلاف اور عناد اور بڑھ گیا۔ بایں ہمہ حق تعالیٰ حافظ وناصر تھے، اس لئے کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔ اور بالآخر تمام مخالفین کو شرمساری اور خواری نصیب ہوئی۔

بدایونی منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں کہ جس زمانہ میں مخدوم الملک نے بعض اکابر اہل اللہ کو طرح طرح کے فتنے اُٹھا کر قتل کرایا، تو ان کی طرف بھی مخالفانہ عزم سے متوجہ ہوئے۔ اور گوالیار سے سلیم شاہ کا پیغام بھجوا کر طلب کرایا۔ یہ تنہا ایک دو خادموں کو لے کر روانہ ہوئے۔ اور گوالیار سے باہر ملاقات ہوئی۔ لیکن شیخ کو دیکھ کر اور اُن کی باتیں سن کر بہت متاثر ہوئے، اور کہا ''ازیں روئے دروغ نیاید''۔ شیخ نے چند کلمے نصائح کے فرمائے۔ اور عزت واحترام کے ساتھ واپس کر دیئے گئے۔

بدایونی نے واضح طور پر نہیں لکھا کہ مخدوم الملک نے اُن پر بظاہر الزام کیا لگایا تھا، اور طلب کرنے کی وجہ کیا قرار دی تھی؟ ملاقات کی گفت وشنید لکھتے ہوئے صرف اس قدر لکھا ہے کہ:

''بعد از حرف وحکایت پرسیدند کہ تقریب طلب فقراء منقطع چہ بود۔ مخدوم الملک گفتند کہ مریدان شمار اشنیدیم کہ در وقت ذکر گفتن یا داؤد یا داؤد مے گویند۔''

''جواب دادند۔ مگر اشتباہ در سماع رفتہ باشد۔ والا ایں جماعت ظاہر یا وَدود، یا وَدود گفتہ باشند''۔ (۳۲۲) [جلد سوم ص ۳۲]

۹۸۲ھ (نوسو بیاسی ہجری) میں شیخ داؤد نے وفات پائی۔ شیر گڑھ متصل قصبہ چونی میں آپ کا مزار پُر انوار ہے۔

شاہ ابواسحاق قادری لاہوری متوفی ۹۸۵ھ (نوسو پچاسی)، شاہ ابوالمعالی کرمانی برادر زادہ شاہ داؤد کرمانی موصوف متوفی ۱۰۲۴ھ (ایک ہزار چوبیس) اور مولانا جمال الدین عرف شیخ بہلول دہلوی جیسے جلیل الشان مشائخ آپ کے خلفاء ہیں۔

شیخ محمد بن طاہر پٹنی قدس سرہ

وطن اصلی پٹن، علاقہ گجرات۔ بوہرہ قوم سے تھے۔ خداوند عالم نے دولت علم سے بہرہ ور فرمایا۔ تحصیل علوم کے بعد حرمین شریفین کا رخ کیا۔ وہاں کے علماء اور فضلاء سے استفادہ کیا۔ بالخصوص حضرت علی متقی قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں خصوصیت حاصل کی۔ علم وعمل، روحی وقلبی برکتوں سے دامن پُر کر کے وطن واپس

تشریف لائے اور اصلاح قوم کا بیڑہ اُٹھایا۔ انتہا یہ کہ اسی میں شہید ہو گئے۔

آپ کی مفید ترین تصانیف نے اُمت اسلامیہ کو ممنون احسان کیا۔

مجمع البحار آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ جس میں اُن لغات و محاورات کی تشریح کی ہے جو احادیث مقدسہ میں وارد ہیں۔ لغوی تشریح کے ضمن میں شرح احادیث کے متعلق بھی قابل قدر نکات بیان فرما دیے ہیں۔ بلاشبہ یہ تصنیف خدام حدیث نبوی پر احسان عظیم ہے۔ اسی طرح اسماء رجال کے سلسلہ میں ''مغنی'' نہایت مفید اور درحقیقت ''مغنی'' (بے نیاز کر دینے والی) ہے۔

میر علی آزاد بلگرامی (۴۲۳) فرماتے ہیں کہ شیخ ابن طاہر کے ہم قوم بوہرے مدعی مہدویت ''سید محمد جونپوری'' کے مقلد تھے۔

شیخ محمد بن طاہر نے اپنے اُستاد علی متقی کی طرح اس فرقہ کی اصلاح و تردید کے لئے کمر ہمت کسی۔ اور عہد کرلیا کہ جب تک اس قوم کی پیشانی سے اس بدعت کا داغ نہ مٹاؤں گا سر پر دستار نہ باندھوں گا۔ ۹۸۰ھ میں اکبر بادشاہ نے جب گجرات فتح کیا تو پٹن پہنچ کر شیخ سے ملاقات کی۔ خود اپنے ہاتھ سے شیخ کے سر پر دستار باندھی، اور کہا۔ دستار اُتار دینے کا علم ہمیں ہوا۔ آپ کے منشاء کے بموجب دین متین کی نصرت کو ہم نے ضروری سمجھا۔

اُس وقت خان اعظم ''مرزا عزیز کو'' گجرات کا گورنر بنا کر اکبر بادشاہ واپس چلا آیا۔ خان اعظم خود کٹر مذہبی مخص تھا۔ پہلے پڑھ چکے ہو کہ وہ اکبر سے بھی اس کی لامذہبی کی بنا پر بگڑ بیٹھا تھا۔ خان اعظم کی امداد سے حضرت شیخ کو اپنے مقصد میں، بہت کامیابی ہوئی۔ مگر پھر عبدالرحیم خانخانان کو گورنر بنا دیا گیا۔

عبدالرحیم خانخاناں اگرچہ بعد میں حضرت خواجہ باقی باللہ سے بیعت ہوئے اور پھر حضرت مجدد صاحب کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، مگر اس وقت وہ اس فرقہ کے حامی ہو گئے تھے۔ چنانچہ اُن کے اعتماد پر فرقہ مہدویہ نے پھر سر اُٹھایا۔ حضرت شیخ طاہر نے پھر دستار اُتار لی اور آگرہ پہنچ کر اکبر بادشاہ سے شکایت کا قصد کیا۔ شیخ وجیہ الدین علوی نے آپ کو اس ارادہ سے باز رکھنا چاہا، مگر آپ نہیں رکے، اور روانہ ہو گئے۔ اسی گمراہ فرقہ کے کچھ آدمی آپ کے پیچھے لگ گئے اور جب حضرت شیخ اُجین اور سارنگ کے درمیان تھے، آپ کو شہید کر دیا گیا۔ شہادت طاہر کا سنہ نو سو چھیاسی ہے۔ (۴۲۴)

شیخ وجیہ الدین گجراتی علوی قدس سرہ العزیز

علم ظاہر و باطن کے دانا و ماہر ''چانپانیر'' صوبہ گجرات میں پیدا ہوئے۔ وہیں علم حاصل کیا۔

بیضاوی شریف، ہدایہ، شرح وقایہ، شرح عقائد، شرح چغمینی وغیرہ کے حواشی لکھے۔ ۹۹۸ھ (نو سو اٹھانوے) میں وفات پائی۔ (۴۲۵)

لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا تاریخ وفات ہے۔ خواب گاہ احمد آباد۔ (۴۲۶)

شیخ جلال الدین تھانسیری کابلی قدس سرہ العزیز

جائے پیدائش بلخ۔ سنہ پیدائش آٹھ سو چورانوے ہجری۔ فاروقی النسل ہیں سات سال کی عمر میں حافظ ہوگئے۔ سترہ سال کی عمر میں مسند درس کو رونق بخشی۔ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز (۴۲۷) کے جلیل القدر خلیفہ اور اپنے زمانہ کے مشہور ترین عالم، زاہد، متقی اور شیخ کامل ہیں۔ پچانوے ۹۵ سال کی طویل عمر حاصل کی۔

مگر "از اول عمر تا آخر بطاعت وعبادت و درس و وعظ و ذکر و سماع و ذوق وحالت گزرانید بر حفظ آداب و نوافل و رعایت اوراد و اوقات تا آخر حیات مستقیم بود۔"

اراضی ہندوستان کے متعلق آپ کے زمانہ میں بحث چلی۔ چند علماء نے فتویٰ دیا کہ سلطان کو یہ جائز نہیں کہ کوئی قطعہ اراضی کسی شخص کو بخش دے۔ اگر سلطان نے ایسا کیا تو یہ شخص اُس کا مالک نہ ہوگا، اور نہ اس زمین کی خرید و فروخت اس شخص کے لئے جائز ہوگی۔

بہت سے اغراض پرست اس فتوے سے فائدہ اُٹھا کر حکام سے ساز باز کر کے اس قسم کی اراضی کی بیع کو باطل، اور ان کے واپس کئے جانے کا مطالبہ کرنے لگے۔

ان علماء کے پیش نظر بظاہر یہ تھا کہ مسلمان فاتحین نے ہندوستان فتح کر کے اُس کی اراضی کو مجاہدین پر تقسیم کر دیا۔ یا قدیم باشندگان ہی کو بدستور مالک قرار دے کر ان پر خراج مقرر کر دیا ہے۔ بہر حال یہ اراضی اُن مجاہدین کی ہیں جو فتح میں شریک تھے یا اُن ہندوؤں کی ہیں جو پہلے سے باشندگان ملک تھے اور اب بھی اُن کو اپنی اراضی اور املاک پر بدستور قابض اور متصرف رکھا گیا۔ سلطان کو کسی صورت میں بھی حق نہیں پہنچتا، کہ وہ کسی قسم کی اراضی کسی کو ہبہ کر دے۔

مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں فقہا احناف کے بموجب واقعی امام یا سلطان کو حق نہیں کہ بلا مرضی مالک اور بغیر عوض اُن اراضی کو کسی دوسرے شخص کو دیدے۔ مگر ہندوستان میں یہ دونوں صورتیں پایہ ثبوت کو نہیں پہنچیں۔

علاوہ ازیں حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک یہ جائز ہی نہیں کہ سلطان مفتوحہ علاقہ کو اُس کے قدیم غیر مسلم باشندوں کی ملک میں باقی رکھے اور جب کہ یہ مسئلہ احناف اور شوافع میں اختلافی ہے تو سلطان یا قاضی کے لئے جائز ہے کہ ضرورت اور مصالح کے بموجب مسلک شافعی پر حکم نافذ کرے۔

حضرت مولانا جلال الدین صاحب نے ایک فتویٰ مرتب فرمایا، اور اس میں ان تمام حالات کی تفصیل کر کے فقہاء احناف کے اقوال کی توضیح اور تفصیل فرمائی، اور آپ نے فتویٰ دیا کہ اگر کسی زمین کے متعلق واقعی طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ مسلمان فاتح نے جب اُس کو فتح کیا تو وہ فلاں شخص کے حصہ میں لگائی گئی تھی اور وہ بدستور اسی طرح اب تک باقی ہے تو لامحالہ یہ زمین اُسی شخص کے وارثوں کی ہوگی اور اس زمین پر بادشاہ کا تصرف

جائز نہ ہوگا۔ نیز اس زمین پر عشر واجب ہوگا، اگر شرائط عشر موجود ہوں۔ ورنہ خراج لیکن وہ اراضی جن کے متعلق یہ ثبوت نہیں ملتا وہ ملک حکومت ہیں۔

یہ اعتراض تھا کہ مسلمان فاتحین نے اراضی ہند فتح کر کے ان کے قدیم مالکوں ہی کو برقرار رکھا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے مولانا موصوف فرماتے ہیں کہ اگر بالفرض فاتح اول نے مفتوحہ اقوام کو ان کی اراضی واپس کر کے انہیں کو قابض اور متصرف باقی رکھا تو جب کہ اس صورت کے جواز اور عدم جواز میں شوافع اور احناف کا اختلاف ہے تو سلطان وقت کو جائز ہے کہ ضرورت اور مصلحت کے بموجب مسلک شافعی پر عمل کرتے ہوئے اس شکل کو منسوخ کر دے اور اس قسم کی اراضی کو ملک حکومت قرار دے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں انتقال اراضی کی ایسی صورتیں پیش آتی رہتی ہیں کہ کسی زمین کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فاتح اول[۳۲۸] کے وقت یہ اسی قوم کے قبضہ اور تصرف میں تھی جس کے قبضہ میں آج ہے۔ کیونکہ ہم رات دن دیکھ رہے ہیں کہ ایک قوم دوسری پر غالب آ کر اس کے املاک پر قبضہ کر لیتی ہے۔ جن ریاستوں پر آج چوہان اور ٹھاکر قابض ہیں، کچھ دنوں پہلے یہاں لوگوں کی حکومت میں تھیں جو آج رعایا ہیں لہٰذا اراضی ہند کو ان زمینوں کی حیثیت دی جائے گی جن کے اصلی مالک معلوم نہ ہو سکیں۔ ایسی اراضی ملک حکومت مانی جاتی ہیں۔ سلطان بحیثیت تولیت عمومی ان پر متصرف ہوتا ہے، اور اس کے لیے حق ہوتا ہے کہ اس قسم کی اراضی کا کسی کو مالک بنا دے۔

مولانا موصوف کا یہ مفصل فتویٰ[۳۲۹] سولہ ۱۶ صفحات میں ہے۔ تفصیل کے لئے اصل کا مطالعہ فرمایا جاوے۔ مولانا موصوف نے اپنے استاذ کا بھی یہی مسلک بتایا ہے نیز مولانا الہداد جونپوری[۳۳۰] اور شیخ طیب قدس اللہ سرہما کے فتاوے تصدیق میں پیش فرماتے ہیں۔ [ص ۹ رسالہ تحقیق اراضی ہند]۔

حضرت مولانا کے اس فتوے کو علماء نے تسلیم کیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے فتاویٰ میں دو جگہ اس فتوے کا حوالہ دیا ہے۔

نیز حضرت علامہ استاذ مولانا انور شاہ صاحب کشمیری محدث دارالعلوم دیوبند قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنی تقریر[۳۳۱] میں مولانا محمد اعلیٰ تھانوی کا فتویٰ اسی مضمون کا نقل فرمایا ہے۔

چونکہ سلسلۂ چشتیہ میں بیعت تھے لہٰذا وجد و سماع سے خاص تعلق تھا مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ جناب کے ایک صاحبزادے کی وفات ہوگئی۔ جب تک اس حادثہ کا دل پر اثر رہا، محفل سماع میں شریک نہیں ہوئے کہ اس پاک درد میں اس مادی درد کی آمیزش نہ ہو جائے۔

شیخ عبدالقدوس قدس سرہ العزیز کے اکثر مکتوب آپ ہی کے نام ہیں اور خود ان کے مکتوبات بھی ہیں۔ ۱۴ ذی الحجہ ۹۸۰ھ (نو سو اسی) میں دردِ دنیا سے نجات پا کر ہم کنار رحمت حق ہوئے۔ [اخبار الاخیار ص ۲۷۷ وغیرہ]

شیخ باباوالے کشمیری متوفی ۱۰۰۱ھ

شیخ حسین خوارزمی متوفی ۹۳۷ھ کے جلیل القدر خلیفہ ہیں۔ شیخ محمد شریف کبروی سے بھی خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ ۹۹۹ھ (نوسو ننانوے ہجری) میں خوارزم سے کشمیر میں آکر امیر کبیر سید[۲۳۴] علی ہمدانی کی خانقاہ میں قیام کیا۔ آپ کے کمالات نے چند روز میں آپ کو مرجع خواص وعوام بنادیا۔

یہی زمانہ تھا کہ مرزا یادگار گل' اکبر بادشاہ کے مقابلہ پر انقلابی تحریک پھیلا رہا تھا اکبر بادشاہ بدعقیدہ اور بد اعمال تھا مگر علماء نے اس کے کفر کا فتویٰ نہیں دیا تھا نہ اس کے مقابلہ پر بغاوت کی اجازت دی تھی۔ چنانچہ بابا موصوف نے ''مرزا یادگار گل'' کو اس ارادہ سے باز رکھنا چاہا۔ مرزا یادگار نے حضرت شیخ کو راستہ کی رکاوٹ سمجھ کر زہر دلوادیا۔ بابا جی شہید ہوکر اسی خانقاہ میں مصروف استراحت ہوگئے۔ لیکن چند دنوں بعد یادگار گل بھی بے یار ومددگار رہ گئے۔ شاہی فوج کے کچھ سپاہیوں نے اس کا بدن ایک جنگل میں سر سے جدا دیکھا اور بروایت دیگر یادگار ہی کے خواص نے یادگار کا پتہ دے دیا۔ جب کہ وہ تنہا تھا۔ سپاہیوں نے تن گل کو بار سر سے سبک بار کر کے یہ خونی تحفہ دربار اکبر میں پیش کردیا۔ حضرت بابا کی ایک عبرت آموز حکایت صفحۂ تاریخ میں زیب نگارش ہے۔

چند شیعہ ایک زندہ نوجوان کا جنازہ بنا کر حضرت بابا کے پاس نماز پڑھوانے لائے۔ اگر منصوبے کے بموجب عین نماز کی حالت میں یہ جنازہ اٹھ کر بھاگ جاتا تو یقیناً تاریخ کا ایک مذاقیہ پارٹ ہوتا۔ مگر ہوا یہ کہ جیسے ہی حضرت شیخ نے نماز جنازہ کی تکبیر کہی، ملک الموت سے مذاق کرنے والا یہ ''گستاخ نقال'' غیرت الٰہی کی گرفت میں آکر متاع زندگی فنا کر بیٹھا۔ [خزینۃ الاصفیاء ص ۳۳۸ جلد ۲]

شیخ یعقوب صوفی کشمیری

والد ماجد کا اسم گرامی خواجہ حسن عاصمی جو سلطنت کشمیر کے جلیل القدر رکن تھے۔ سال ولادت ۹۰۸ھ (نو سو آٹھ)۔ دس سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کیا۔ مولانا عبدالرحمن عارف جامی، عرف مولانا جامی کے شاگرد رشید مولانا محمد سے علوم ظاہری کی تکمیل کی، اور پیش گاہ استاذ سے جامی ثانی کا خطاب حاصل کیا۔ پھر ریاضت و عبادت میں مشغول ہوئے۔ حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کی روحانیت سے اویسی نسبت حاصل ہوئی۔ پھر شیخ کمال الدین حسینی خوارزمی کی خدمت میں ارادت وبیعت کے لئے حاضر ہوئے۔ مگر شیخ کمال نے حضرت حسین خوارزمی کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا جو سمرقند میں قیام فرماتے تھے۔ شیخ یعقوب جب سمرقند پہنچ کر خانقاہ شیخ کے دروازہ پر پہنچے تو شیخ نے دروازہ سے شیخ یعقوب کا استقبال کیا۔ پھر ارادت وبیعت سے مشرف فرما کر مطبخ کے لئے لکڑیاں چننے کی خدمت سپرد کی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں درجہ کمال حاصل کر کے خرقۂ خلافت سے فائز المرام ہوئے۔ پھر وطن اصلی کشمیر میں تشریف لاکر سلسلۂ ارشاد جاری کردیا۔ سالکین وطالبین جوق در جوق حاضر خدمت ہوکر فیوض وبرکات سے دامن بھرنے لگے۔ کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضری

کا شوق پیدا ہوا۔ سمرقند پہنچے اور حضرت شیخ کی رفاقت میں حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ واپسی میں مشہد مقدس پہنچے۔

اُس زمانہ میں شاہ طہماسپ صفوی کا دور دورہ تھا، جو کٹر شیعہ تھا، اور اگرچہ اُس نے اپنی مخصوص اغراض کی بناء پر افغانیوں کی حکومت ہندوستان سے ختم کرنے کے لئے ہمایوں کی امداد کی تھی مگر خود اپنے ملک میں اہل سنت کو تلوار کے گھاٹ اُتار رہا تھا۔

حضرت شیخ یعقوب شاہ موصوف کے پاس پہنچے۔ ظاہری افہام و تفہیم اور روحانی تاثیرات سے اس کو اتنا مرعوب کیا کہ وہ اپنی اس حرکت پر نادم ہوا، اور حضرت شیخ کا احترام دل میں بیٹھ گیا۔ مشہد پاک سے بغداد پہنچے اور شیخ المحدثین ابن حجر سے استفادہ کیا۔ شیخ سلیم چشتی بھی اُس زمانہ میں وہیں قیام فرماتے تھے۔ اُن سے سلسلۂ چشتیہ کا خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ پھر دوسرے ممالک کی سیاحت کرتے ہوئے کشمیر واپس ہوئے۔ خطۂ کشمیر اُس زمانہ میں براہ راست سلطنت مغلیہ میں شامل نہیں ہوا تھا۔ یہاں کے حکمران شیعہ تھے، اور یہ خطہ شیعہ سنی اختلافات اور تنازعات کا لالہ زار بنا ہوا تھا۔

اسی (۳۳۳) دوران کا یہ واقعہ تھا کہ یوسف ثانی شیعہ نے محض مذہبی تعصب کی بنا پر قاضی حبیب پر جو سنی اور حنفی المذہب تھے، قاتلانہ حملہ کیا۔ اگرچہ قاضی حبیب صرف زخمی ہو گئے مگر حنفیوں میں اس حرکت سے بہت زیادہ اشتعال پیدا ہو گیا۔

ملا یوسف اور ملا فیروز وغیرہ حنفی علماء اور مفتی تھے۔ سنی مسلمانوں کی زمام قیادت اُن کے ہاتھ میں تھی۔ ان حضرات نے مطالبہ کیا کہ اگرچہ قصاص کے طور پر اس شیعہ کو قتل نہیں کیا جا سکتا مگر تنبیہ اور تعزیر کے طور پر ضروری ہے کہ اُس کو قتل کرا دیا جائے۔

حسین شاہ جو اس زمانہ میں کشمیر کا بادشاہ تھا، اگرچہ شیعہ تھا۔ مگر عام شورش سے مرعوب ہو گیا اور یوسف کو سنگسار کرا دیا۔

مرزا مقیم، اکبری دربار کا امیر تھا۔ شیعی مذہب رکھتا تھا، بحیثیت سفیر کشمیر میں مقیم تھا۔ اُس کو یوسف کی سنگساری ناگوار گزری اور اُس نے حسین شاہ کو مجبور کیا کہ یوسف کے قتل ناحق کا انتقام لے۔ چنانچہ ملا یوسف، ملا فیروز اور بہت سے حنفی علماء کو بری طرح قتل کرایا۔ پھر اُن کے پیروں میں رسیاں بندھوا کر ان کی نعشیں گلیوں اور بازاروں میں گھسٹوائیں۔

جب اکبر بادشاہ کو مرزا مقیم کی اس حرکت کی اطلاع ملی تو اُس نے مفتی صاحبان کے قتل ناحق کی پاداش میں مرزا مقیم کو قتل کرا دیا۔

غرض اس قسم کی شورشیں آئے دن کشمیر میں برپا ہوتی رہتی تھیں۔ شیخ یعقوب صوفی جب کشمیر پہنچے تو انقلابی تحریک کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ اور ''بظاہر و باطن متوجہ شدہ سعی و امداد بلیغ بکار بردہ خطۂ کشمیر تفویض اکبر بادشاہ

کر دیا۔ (۴۳۴)

اس سلسلہ میں شیخ یعقوب کی جلیل الشان خدمات کا تذکرہ کتب تاریخ میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔
مختصر یہ کہ ۹۹۴ھ میں اکبری افواج نے کشمیر کو فتح کیا۔

۹۹۶ھ میں کشمیر کا آخری بادشاہ یعقوب خاں (۴۳۵) گرفتار ہو گیا جو چار پانچ سال تک روپوش رہ کر شورش کرتا رہا تھا۔

بہرحال جب شیخ یعقوب کشمیر کی مہم سے فارغ ہوئے تو پھر زیارت حرمین شریفین کے لئے روانہ ہو گئے۔ ایک سال بعد وطن واپس تشریف لائے اور حدیث، تفسیر اور فقہ کی بہت سی کتابیں اپنے ہمراہ لا کر کشمیر میں رائج کیں۔

آپ صاحب تصانیف ہیں، بخاری شریف کی شرح لکھی، توضیح وتلویح کا حاشیہ لکھا، قرآن پاک کے آخری دو پاروں کی تفسیر لکھی۔ ان کے علاوہ مختلف فنون میں بہت سی تصانیف تحریر فرمائیں۔ مگر آج ان کے نام بھی معلوم ہونے مشکل ہیں۔

بارہ ذی قعدہ شب پنج شنبہ بعد نماز عشاء ۱۰۰۳ھ (ایک ہزار تین) میں راہ گذار عالم بقاء ہوئے۔

ملا عبدالقادر بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (۴۳۶)

یہی ہیں وہ گھر کے بھیدی جنہوں نے اکبر بادشاہ کے پوست کندہ حالات طشت از بام کئے۔ جامع فنون و فضائل، امام اقران واماثل تھے۔ شیخ مبارک ناگوری (۴۳۷) اور دیگر فضلاء عصر سے کسب کمال کیا۔ علمی فضیلت کے ساتھ ذوق نظم، انشاء عربی و فارسی کا سلیقہ بہترین تھا۔ ہندی نجوم، حساب، نغمہ اور ہندی راگ وغیرہ میں بھی کافی دسترس تھی۔ قناعت، راستی اور درستی میں آپ کی زندگی ممتاز تھی۔

اپنے زمانہ کے اکثر مشائخ اور علماء سے گہرے تعلقات رکھتے تھے۔ ایک عرصہ تک دربار اکبری کے منصب دار حسین خاں (۴۳۸) کے ساتھ رہے۔ پھر جلال قورچی کے وسیلہ اور میر فتح اللہ (۴۳۹) کی سفارش اور تعریف وتوصیف کے بعد سے اکبر بادشاہ کی پیش امامی کے منصب پر معین ہوئے۔

چالیس سال تک ابوالفضل اور فیضی کے مصاحب رہے۔ لیکن جب ان دونوں کے حالات کی خرابی حد سے تجاوز کر گئی تو جام محبت بھی چکنا چور ہو گیا، اور جب قسم کھا کر اپنی تاریخ، صداقت اور دیانت کے ساتھ حالات لکھنے شروع کئے تو کوئی تعلق بھی صحیح تنقید پر اثر انداز نہ ہو سکا۔ فیضی کے حالات لکھتے وقت ایک طرف چالیس سالہ دوستانہ تعلقات تھے، اور دوسری طرف حق وصداقت۔ مجبوراً معذرت کرنی پڑتی کہ:

چہ (۴۴۰) تواں کرد حق دین وحفظ عہد آں بالاتر از ہمہ حقوق ست۔ الحب للہ والبغض للہ۔ ہر چند

سنیں اربعین تمام در مصاحبت او گزشت اما بعد تغیر اوضاع و فساد مزاج آں نسبت بہ مرور خصوص در مرض موت مرتفع شد و صحبت بہ نفاق انجامید۔ از یک دیگر خلاص یافتیم و ما ہمہ متوجہ درگاہیم کہ ہمہ داور یبا[۴۴۱] بہ آنجا بہ فضل رسد۔

"اَلْاَخِلَّاءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ"۔

آپ کی راست مزاجی کا پرشوکت شاہد یہ ہے کہ اکبر بادشاہ کے چالیس ۴۰ سالہ حالات لکھتے وقت شہنشاہی ہیبت وجلال نے راست گوئی اور تنقید پر مطلقاً کوئی اثر نہیں ڈالا اور نہ دولت وثروت کا وہ عفریت جس نے ملا مبارک، ابوالفضل، فیضی اور حضرت شیخ عبدالقدوس کے پوتے شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطانپوری جیسے علم وفضل کے پہلوانوں کو پچھاڑ دیا تھا، ملا صاحب کے زہد وتقویٰ کے قدم راسخ کو ڈگمگا نہ سکا۔ فرحمہ اللہ ورضی عنہ۔ ملا صاحب شیخ حاتم سنبھلی[۴۴۲] سے بیعت تھے۔ اور شیخ داؤد چھنی سے بھی خاص عقیدت رکھتے تھے۔ ۱۰۰۴ھ (ایک ہزار چار) میں جان عزیز جان آفریں کے حوالہ کی۔

مولانا جمال الدین دہلوی[۴۴۳]

عرف شیخ بہلول دہلوی۔ عہد اکبری کے مشاہیر علماء، اصحاب سلوک وطریقت میں سے تھے۔ سلوک و طریقت کی تکمیل شیخ محمد داؤد چھنی والؒ کی خدمت میں کی تھی، اور علوم معقول ومنقول میں سید رفیع الدین سلامی الشیرازی کے شاگرد تھے۔[۴۴۴]

مولانا جمال الدین دہلی میں رہتے تھے اور درس علوم نقلیہ میں اُستاذ وقت تسلیم کئے جاتے تھے۔ علی الخصوص علوم دینیہ کی تدریس میں اپنا عدیل نہیں رکھتے تھے۔ درس وتدریس کے ساتھ ارشاد وطریقت کا سلسلہ بھی اُن سے قائم وجاری تھا۔ دور دور سے لوگ آکر فیض یاب ہوتے۔ مولانا رفیع الدین محدثؒ کے بعد آپ ہی محدثین کے طرز پر صحاح کی تعلیم دیتے تھے۔ طلباء دوسری جگہوں سے فراغت حاصل کرکے ان کی خدمت میں پہنچتے اور علم حدیث میں استفادہ کرتے۔

آپ کے مرشد حضرت شیخ داؤد کرمانی قدس اللہ سرہ العزیز پر جب مہدویت کا الزام لگایا گیا تو آپ نے ایک رسالہ تحریر فرما کر حقیقت کو واشگاف کیا۔ (جیسا کہ شیخ داؤد کرمانی کے حالات میں حیطہ تحریر میں آچکا)

پھر جب ملا مبارک کے خاندان کو دربار اکبری میں عروج ہوا۔ اور بارگاہ شاہی کی مذہبی حالت دگرگوں نظر آئی۔ تو ہندوستان سے قطع تعلق کرکے مکہ معظمہ چلے گئے۔ اس سفر کا سبب تذکرۃ الواصلین میں یہ لکھا ہے کہ "جب ۹۸۷ھ میں بعض علماءِ عصر نے اکبر کے امامِ وقت ہونے کا محضر تیار کیا اور تمام علماء دارالحکومت نے اس پر مہریں کیں تو وہ محضر دہلی میں بھی آیا۔ مولانا جمال الدین صاحب سے بھی تصدیق وتکمیل کے لئے کہا گیا۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ جس قدر ہوچکا ہے کافی ہے ہم فقیروں اور گوشہ نشینوں کو کیوں تکلیف دی جاتی

ہے۔ اگر ایسا ہی ہے، تو تمام علماءِ ہند سے استصواب کرلیا جائے"۔

اس کے بعد جب علماءِ مشرق نے بادشاہ کے خلاف فتویٰ دیا اور لکھا کہ اکبر شریعت سے منحرف ہوگیا ہے تو بعض علماءِ دہلی کی نسبت دربارِ حکومت کو شبہ ہوا کہ علماءِ مشرق سے نامہ و پیام رکھتے ہیں۔ انہیں میں مولانا موصوف بھی تھے۔

جب حالات روز بروز مخدوش ہونے لگے تو آپ نے حج کا ارادہ کیا، اور اپنے تلامذہ و مریدین کی ایک جماعت ساتھ لے کر مکہ معظمہ چلے گئے۔

چند سال بعد خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش حج کے لیے گئے۔[۳۳۵] ان کو مولانا جمال سے نہایت درجہ حسن اعتقاد تھا۔ سخت اصرار والتجا کر کے اپنے ساتھ ہندوستان واپس لے آئے۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ دہلی پہنچنے سے چند ماہ بعد انتقال کر گئے۔ گویا قضا کو اسی کا انتظار تھا۔

آخر گلِ اپنی صرفِ درِ مے کدہ ہوئی پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

صاحب تذکرہ لکھتے ہیں کہ ناصر الملک میر محمد خاں خانخاناں اور خان اعظم کوکلتاش کو حضرت شیخ جمال الدین صاحب سے بہت عقیدت تھی۔ بارہا انہوں نے چاہا کہ مال و جاہ دنیوی میں سے کچھ قبول کریں۔ لیکن ہمیشہ انکار کیا اور فرمایا کہ گھر بناتے ہوئے ڈرتا ہوں، کہیں دل نہ ویران ہوجائے۔ عرفی نے کیا خوب کہا ہے ع

من از فریبِ عمارت گدا شدم ورنہ ہزار گنج بہ ویرانۂ دل افتادست

مولانا جمال الدین کے متعلق بدایونی کے الفاظ یہ ہیں:

علم حدیث را خوب ورزیدہ، در صحبت اہل فقر وغناء رسیدہ۔ مدت مدیدست کہ لذت آں وادی دریافتہ، و توفیق استقامت و استدامت براں رفیق اوگشتہ۔ با اہل دنیا کارے ندارد۔ و بافادہٗ وافاضۂ طلاب علم مشغول ست۔ (جلد ۳ ص ۱۱۳)

حضرت شاہ عبدالحق صاحب محدث آپ کے ہمعصر ہیں۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

جامع میانِ علم شریعت و طریقت۔ از اول فطرہ بر نشاۃ عبادت و تقویٰ و صلاح برآمدہ۔ و بر عصمت ذاتی نشو ونما یافتہ بعد تحصیل علم دینی بہ تہذیب اخلاق و تبدیل صفات موفق شد۔ الحق دریں زماں در زمرۂ علماء و فضلاء ایں چنیں مردم در سلوک ایں طریق و رسوخ قدم واتباع سنت حضرت سید المرسلینؐ نادر و عزیز الوجود اند۔ قطوبیٰ لہٗ۔[۳۳۶]

مولانا شیخ منور قدس اللہ سرہ العزیز[۳۳۷]

جائے پیدائش لاہور۔ مولانا ابو اسحاق لاہوری[۳۳۸] کے قابل اور نامور شاگردوں میں سے ہیں۔ باوجود علم کا کیڑا ہونے کے آپکی قوت حافظہ بہت مشہور تھی۔ مشارق الانوار (حدیث) اور بدیع البیان کی شرحیں

لکھیں۔ جب آپ کے علم وفضل کی شہرت ہوئی تو اکبر نے اعزاز واحترام کے ساتھ آپ کو طلب کیا، اور مجمع البلدان کے فارسی ترجمہ پر آپ کو مامور کردیا۔ جس کو آپ نے ملا احمد ٹھٹھوی اور قاسم بیگ کی مدد سے پورا کیا۔ یہ حکومت اکبر کا ابتدائی دور تھا لیکن جب اُس نے اور اُس کے مشیران کار علماء نے راہ استقامت سے انحراف کیا۔ حتیٰ کہ فیضی جیسے علماء مست شراب ہوتے، اور اکبران مفتیان کرام کو شراب میں مدہوش دیکھ کر کہا کرتا:

در دور بادشاہ خطا بخش و جرم پوش ... حافظ قرابہ کش شد و مفتی پیالہ نوش

تو مولانا منور نے اس مجلس سے انحراف کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابوالفضل کے ایماء سے دربار سے نکالے گئے اور پھر قلعہ گوالیار میں قید کردیے گئے۔ جہاں سنہ دس سو گیارہ ہجری میں آپ کا انتقال ہوگیا۔

میراں محمد شاہ بخاری عرف موج دریا (۴۴۹)

سادات بخارا میں عظیم المرتبت شیخ مقتداء وقت اور سلسلۂ سہروردیہ کے مرشد کامل تھے۔ ابتداء میں بمقام "اوچ" سکونت پذیر تھے۔ جب جلال الدین اکبر بادشاہ قلعہ چتوڑ گڑھ کی تسخیر میں معروف تھا۔ اس نے سید صاحب موصوف کو روحانی توجہات اور باطنی نصرت ودعا کے لیے چتوڑ گڑھ بلایا سید صاحب کے اقبال سے قلعہ فتح ہوگیا تو اکبر نے خوش ہوکر آپ کو پرگنہ بٹالہ اور کچھ مواضعات لاہور کے اطراف میں عطا کردیے۔ اس کے بعد سید صاحب نے لاہور میں سکونت اختیار کرلی اور حکم دیا کہ تین جگہ عام لنگر خانے جاری کردیے جائیں ایک لاہور میں جہاں سید صاحب کی خانقاہ تھی اور دو لنگر خانے جاگیر کے مناسب مقامات پر۔

مشہور ہے کہ ایک مرتبہ کسی پنجابی نے آپ کی مجلس میں کہہ دیا۔ "سید سُتی نہیں، کاٹھ دی کئی نہیں" ۔ یعنی جس طرح لکڑی کی ہنڈیا نہیں ہوسکتی، اہل سنت والجماعت میں سید بھی نہیں ہوسکتے۔ پھر کہا کہ پہلے زمانہ میں سید ایسے ہوا کرتے تھے کہ اگر آگ میں کود جاتے تو ایک بال بھی نہیں جلتا تھا، اب ایسے سید کہاں؟ سید صاحب کو یہ سن کر جلال آگیا۔ آپ نے لکڑی کی ہنڈیا منگائی، اور اپنے دونوں پیروں کو پھیلا کر اُن کا چولہا بنایا، اور ہنڈیا میں چاول ڈال کر پیروں کے چولہے پر رکھ دی اور آگ جلادی۔ حتیٰ کہ چاول پک گئے۔ منکر سادات اس زندہ کرامت کو دیکھ کر نادم ہوا۔

آپ کے دو محل تھے اور اُن سے تین فرزند تھے۔ سید صفی الدین، سید بہاؤالدین، سید شہاب الدین عرف شہاب الدین تہرا۔ یہ تینوں صاحبزادگان اپنے زمانہ میں اولیاء اللہ ہوئے۔ حضرت میراں محمد شاہ کا سن ولادت نو سو چالیس (۹۴۰ھ) اور سال وفات دس سو تیرہ (۱۰۱۳ھ) ہے۔

ملا قطب الدین شہید سہالوی نور اللہ مضجعہ (۳۵۰)

میر غلام علی آزاد بلگرامی کے الفاظ میں:

''امام اساتذہ ومقتداء جہابذہ واست معدن عقلیات ومخزن نقلیات''۔

سہالی مضافات لکھنو میں ایک قصبہ تھا۔ ملا صاحب اسی قصبہ کے انصاری شیوخ میں سے ہیں۔ ملا عبدالسلام جہہ دیوہ (۳۵۱) کے شاگرد ہیں۔

عرصہ دراز تک انجمن درس کو رونق بخشی اور ارباب تحصیل کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا علماء ہند کے سلسلۂ اساتذہ میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

قصبہ سہالی میں شیوخ کے دو خاندان عثمانی اور انصاری، زمیندار تھے، اور زمینداری کے معاملات میں آپس میں دست وگریبان رہتے تھے۔ عثمانی شیوخ نے ایک قریب کے موضع کے خان صاحبان سے موافقت کر کے ملا صاحب پر شب خون مارا۔ ملا صاحب کو شربت شہادت نوش جاں کرایا، اور آپ کے کتب خانہ کو نذر آتش کر دیا۔ اس میں آپ کی تصانیف بھی نذر آتش ہو گئیں، جن میں آپ کا وہ گراں قدر حاشیہ بھی تھا، جو علامہ دوانی کی شرح عقائد پر آپ نے تحریر فرمایا تھا۔ ۱۰۱۳ھ (دس سو تیرہ ہجری) سال شہادت ہے۔

مولانا کمال کاشمیری رحمہ اللہ (۳۵۲)

متوفی ۱۰۱۷ھ (ایک ہزار سترہ)۔ علوم ظاہری اور کمالات باطنی میں اسم بامسمیٰ تھے۔ سیالکوٹ اور لاہور میں عرصہ تک آپ کا درس جاری رہا۔ حضرت مجدد صاحب اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور علامی سعد اللہ آپ کے مشہور تلامذہ ہیں۔

شاہ شمس الدین قادری لاہوریؒ

حضرت شیخ منور کے پیر بھائی ہیں۔ یعنی حضرت شیخ ابواسحاق لاہوری کے جلیل القدر خلیفہ ہیں۔ عالم، عامل، عارف کامل، علم شریعت وطریقت میں فرد و یگانہ تھے۔ سماع اور کشف وکرامت سے قطعاً علیحدہ رہتے۔ لاہور میں آپ کا بہت اعزاز تھا، اور ہزاروں بندگان خدا نے آپ سے فیض حاصل کیا۔ جہانگیر بادشاہ آپ کا معتقد تھا۔ عاجز اور بے وسیلہ حاجت مندوں کے لئے آپ سفارش فرماتے اور جہانگیر اس کو قبول کرتا۔ سنہ ایک ہزار اکیس میں آپ کی وفات ہوئی۔ (۳۵۳)

شیخ احمد شوریانیؒ

دولت کدہ قصور (پنجاب) خویشگی اور شوریانی افغانوں میں سب سے پہلے بزرگ ہیں جو علوم ظاہری اور

کمالات باطنی کے حامل ہوئے۔ اپنے زمانہ کے جلیل القدر عالم اور عظیم المرتبت شیخ ہیں۔ جو مسائل بڑے بڑے علماء سے حل نہ ہوتے تھے، آپ اُن کا برجستہ جواب نہایت آسانی سے سمجھا دیتے تھے۔ حضرت مجدد صاحب اور شیخ عبدالحق صاحب دہلوی سے معاصرانہ تعلقات تھے۔ تالیف وتصنیف سے اجتناب کرتے تھے، کہ ہم سے پہلے بزرگوں کی تصانیف بہت کافی ہیں۔ صرف ایک رسالہ ''سوالاتِ احمدی'' رد ملاحدہ و زنادقہ میں تصنیف فرمایا۔ ۱۰۳۰ھ (ایک ہزار تیس ہجری) میں وفات پائی۔ (۴۵۴)

خواجہ نظام الدین بلخی تھانیسری ؒ(۴۵۵)

ہندوستان کے اکابر اولیاء اللہ میں سے ہیں صاحب تصرفات ظاہری و جامع کمالات صوری و معنوی۔ حنفی مذہب اور چشتی و صابری مسلک، فاروقی النسل۔ حضرت مولانا جلال الدین تھانیسری کے برادر زادہ، داماد، خلیفہ اور جانشین و صاحب سجادہ۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے رسمی طور پر تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ بلکہ لدنی علوم سے آپ کو عالم ہمہ داں کر دیا گیا تھا۔ و ما ذلک علی اللہ بعزیز۔

آپ نے بہت سی کتابیں، تفسیر، حدیث اور تصوف وغیرہ میں تصنیف کیں۔ علاوہ کیمیا، سیمیا، ہیمیا، لیمیا علوم وغیرہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ آپ سلسلۂ چشتیہ میں ایک خاص مشرب کے موجد ہیں۔ جب آپ کے تقدس اور کمالات کی شہرت ہوئی تو شاہزادہ سلیم (جو بعد میں شاہ جہانگیر ہوا) آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اُس کو سلطنت کی بشارت دی۔ بادشاہ ہونے کے بعد اُس کے بڑے لڑکے ''خسرو'' نے بغاوت کی۔

خسرو حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہو کر باطنی نصرت کا طالب ہوا۔ آپ نے اس کو ارادۂ بغاوت سے باز رہنے کی ہدایت کی مگر وہ کاربند نہ ہوا۔ اور خواجہ کی بجائے جوگی بیاس کی پناہ لی۔ خواجہ صاحب کے حاسدین نے شاہزادہ کی آمد کو خواجہ صاحب کی سازش کی دلیل گردان کر بادشاہ سے خواجہ صاحب کی شکایت کر دی، اور خواجہ صاحب کی چند سعیت بظاہر شکایت میں رنگ آمیزی کا سبب بن گئی۔ بادشاہ نے خواجہ صاحب کی جلاوطنی کا حکم صادر کر دیا۔

حضرت خواجہ ہندوستان سے حرمین شریفین کی زیارت کو روانہ ہو گئے اور وہاں چند سال قیام کر کے اپنے آبائی وطن ''بلخ'' میں تشریف لے گئے۔

قیامِ حرمین کے دوران میں آپ نے لمعات کی دو شرحیں ''مکی'' اور ''مدنی'' تحریر کیں۔ بلخ میں آپ کے ارشاد و اصلاح کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ سات سو حضرات نے آپ کی تربیت سے درجات طریقت کی تکمیل کی۔

امام قلی خاں ازبک بلخ کا حکمران تھا، وہ بھی آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گیا۔ آپ کے بڑھتے ہوئے اقتدار پر خود غرض ملانوں کو رشک ہوا۔ انہوں نے آپ کے برخلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ جمعہ کی نماز میں جامع مسجد میں حاضر نہیں ہوتے۔ اور اپنی خانقاہ میں علیحدہ جمعہ قائم کر کے ''تفریق بین المسلمین'' کا

سبب ہو رہے ہیں۔ اس پراپیگنڈے سے بادشاہ بھی متاثر ہوا، اور اس نے حضرت خواجہ سے حاضری جامع مسجد کی فرمائش کی۔ حضرت خواجہ نے فرمایا۔ جامع مسجد کا امام رافضی ہے اس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ اس الزام سے شہر میں عالم ہیجان ہو گیا۔ ہزاروں آدمیوں نے عہد کر لیا کہ حضرت خواجہ اور بادشاہ دونوں کو نذر شمشیر کر دینا چاہیے۔

بلوائیوں کا ہجوم شاہی محلات کی طرف روانہ ہو گیا۔ بادشاہ اس اچانک ہنگامہ سے گھبرا کر حضرت شیخ کی خانقاہ میں بھاگ آیا اور شیخ سے التجا کی کہ ہنگامہ فرو کرنے کی صورت پیدا کریں۔

حضرت خواجہ نے بادشاہ کو تسکین دی، اور فرمایا۔ ابھی ہنگامہ فرو ہو جائے گا۔ بادشاہ ابھی خانقاہ میں تھا کہ تقریباً دس ہزار بلوائیوں کے ہجوم نے خانقاہ کا محاصرہ کر لیا۔ امام جامع مسجد تلوار سونت کر حضرت خواجہ کے سامنے آیا اور نہایت سختی سے کہا۔ تو ہی کہتا ہے کہ امام جامع مسجد رافضی ہے۔ اب اس بہتان کی سزا چکھ۔"

حضرت خواجہ نے فرمایا بیشک تو رافضی ہے۔ اور بادشاہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ اس کے موزے نکلواؤ اور دیکھو کہ ان میں اس نے کیا رکھا ہے۔

بادشاہ اٹھا امام کے موزے اتارے، دیکھا تو کاغذ کے دو پرزے رکھے ہوئے تھے۔ جن پر سیدنا و سید المسلمین حضرت صدیق اکبر خلیفہ اوّل اور حضرت عمر فاروق خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہما کے اسماء گرامی درج ہیں۔

برافروختہ ہجوم نے جب امام کی یہ خباثت دیکھی تو حضرت خواجہ کی بجائے امام کو قتل کر ڈالا۔ بادشاہ کی عقیدت اور حضرت خواجہ کے عروج میں اور اضافہ ہوا۔ اہل شیخ نے آپ کی بہت سی کرامتوں کا مشاہدہ کیا۔

ہشتم ماہ رجب بروز جمعہ ۱۰۳۶ھ (ایک ہزار چھتیس) کو دست اجل نے کتاب زندگی کا آخری ورق پلٹ دیا۔

آپ کی اولاد امجاد میں خواجہ محمد سعید اور خواجہ عبدالحق ہندوستان تشریف لائے۔ خواجہ محمد سعید نے تھانیسر میں اور خواجہ عبدالحق نے کرنال میں سکونت اختیار کی۔ سینکڑوں خلفاء میں سے مندرجہ ذیل حضرات کے اسماء گرامی درج کتب تاریخ ہیں۔

خواجہ ابو سعید گنگوہی۔ (۳۵۶) شیخ حسین بھویری۔ شیخ ولی محمد نارنولی۔ شیخ پائندہ ہنوری۔ سید اللہ بخش ماہوری بھکروی۔ شیخ عبدالکریم لاہوری (موضع توت متصل لاہور مزار ہے)۔ شیخ الہ داد لاہوری۔ شیخ دوست محمد لاہوری۔ شیخ مصطفیٰ۔ شیخ عبدالفتاح اندری۔ شیخ عبدالرحمن کشمیری۔ سید قاسم برہانپوری۔ قاضی عبدالحی والد قاضی سالم۔ و شیخ صادق برہانپوری۔ شیخ فتحی و شیخ اسمٰعیل اکبرآبادی کے پیر و مرشد شیخ جان اللہ لاہوری۔ (مزار اندرون باغ نہال سنگھ)

شیخ عبداللہ بھٹیؒ (۳۵۷)

ابن سید عمر بن سید حسین حلبی قدس اللہ اسرارہم بارہ واسطوں سے غوث الثقلین حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند ہیں۔ والد ماجد سے ہی خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ شیخ سلیم چشتی فتح پوری

کے ہمراہ زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔ واپس ہو کر اجمیر شریف میں چند کشی کی پھر اپنے وطن بھٹ(۳۵۸) (بھٹ متصل سہارن پور) میں آ کر خدمت وارشاد خلق اللہ میں مصروف ہو گئے۔ ایک مرتبہ کسی نے جہانگیر بادشاہ سے حضرت کی شکایت کردی۔ جہانگیر نے سید صاحب کو طلب کرلیا۔ جب سید صاحب دربار میں پیش کئے گئے۔ آپ نے کچھ پڑھ کر سنگ ریزوں پر دم کیا۔ جہانگیر نے غصہ میں دریافت کیا۔ یہ کیا حرکت؟

حضرت سید صاحب: دفع بلیات کے لئے دعا پڑھی ہے۔

شیخ کے بے ساختہ جواب سے بادشاہ خوش ہو گیا۔ انعام واکرام کے ساتھ سید صاحب کو واپس کیا۔

سو سال سے زیادہ عمر ہوئی۔ دس ربیع الاول ۱۰۳۷ھ (ایک ہزار سینتیس) یوم جمعہ کو سطر زندگی پر قلم تنسیخ کھینچ دیا۔

شیخ پیر میرٹھی شطاریؒ

سلسلۂ شطاریہ کے جلیل القدر شیخ تھے نورالدین جہانگیر بادشاہ کو آپ سے بہت عقیدت تھی۔ ۱۰۴۲ھ (ایک ہزار بیالیس) میں وفات ہوئی۔(۳۵۹)

شیخ محمد میر عرف میاں میر بالا پیر قادری لاہوریؒ(۳۶۰)

والد صاحب کا نام قاضی سائندہ ابن قاضی قلندر۔ والدہ ماجدہ بی بی فاطمہ بنت قاضی قارن، فاروقی النسل ہیں۔ ۹۵۷ھ (نوسوستاون) میں سیستان میں ولادت ہوئی۔ والدہ ماجدہ (حضرت فاطمہ) سلسلۂ قادریہ میں مراتب طریقت کی تکمیل کر چکی تھیں۔ صاحب نسبت تھیں۔ شیخ محمد عمر کا ساتواں دور پورا کر رہے تھے کہ والد ماجد نے دور زندگی ختم کر دیا۔ والدہ محترمہ نے جسمانی اور روحانی تربیت کی۔ اسی کی برکت تھی کہ بارہ سال کی عمر میں علوم ظاہری کی تکمیل کر لی، اور سلوک طریقت کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئے۔

جاذبہ عشق حقیقی نے صحرا نوردی کی دعوت دی۔ والدہ ماجدہ سے اجازت حاصل کر کے ''کوہ سیوستان'' پر حضرت شیخ خضر قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں خرقۂ خلافت حاصل کر کے حضرت شیخ کے ارشاد کی تعمیل میں ارشاد خلق اللہ کے لئے لاہور روانہ ہو گئے۔

عمر مبارک(۳۶۱) اس وقت ۲۸ سال تھی۔ ۹۸۵ھ کا دور اور اکبر بادشاہ کا عہد حکومت تھا۔ لاہور پہنچ کر زہد وریاضت میں اس قدر مصروف ہو گئے کہ:

''گاہے بشب خواب نہ کردے وتمام شب در یک نفس گزرانیدے وبعد یک ہفتہ افطار ے کرد وچوں حالت استغراق زیادہ ترے شد تا یک یک ماہ اتفاق خوردن طعام نے افتاد''۔(۳۶۲)

آپ کے علم وفضل اور آپ کے زہد وتقدس کی وجہ سے ہر وقت آپ کے پاس علماء فضلاء اور صوفی منش

بزرگوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔

حضرت ملا شاہ بدخشانی، ملا خواجہ بہاری (۳۶۳) اور میاں نتھا لاہوری (۳۶۴) آپ کے مریدوں اور شاگردوں میں ممتاز تھے۔

دارا شکوہ جو ملا شاہ بدخشانی کا مرید تھا، آپ کا بہت زیادہ ادب کرتا تھا۔ اُس کی ایک خوردسال بہن آپ کو وضو کرایا کرتی تھی۔ جہانگیر اور شاہجہاں نے آپ سے ملاقاتیں کی ہیں۔ جہانگیر نے اپنی توزک' اور ملا عبدالحمید لاہوری نے اپنے شاہجہاں نامہ میں اکثر جگہ حضرت میاں میر کا ذکر کیا ہے۔ جہانگیر ایک جگہ لکھتا ہے:

شیخ محمد میر لاہوری عرف میاں میر سے ان کے علم و فضل اور اُن کی بزرگی و پرہیزگاری کی وجہ سے ملاقات کی بڑی خواہش تھی۔ لیکن میں اس زمانہ میں آگرہ میں تھا اور حالات اس قسم کے تھے کہ لاہور نہیں جاسکتا تھا لہٰذا میں نے اپنی حکومت کے چودھویں سال اُن کو آگرہ کی دعوت دی جسے انہوں نے نہایت مہربانی سے منظور کرلیا۔

جہانگیر حضرت میاں میر سے ملاقات کے بعد اُن کے اخلاق اور اُن کی وسیع معلومات کی تعریف کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے کہ "روحانی پاکیزگی اور صفاء قلب میں یہ بزرگ اپنے زمانہ میں لاثانی ہیں۔ میں اکثر اُن کے پاس جایا کرتا اور وہ مجھے دینی و دنیوی نہایت باریک نکات بتایا کرتے تھے۔ میری خواہش تھی کہ میں اُن کو نقد روپیہ بطور نذر پیش کروں چونکہ ایسی چیزوں کی انہیں خواہش نہ تھی۔ اس لئے مجھے جرأت نہ ہوسکی۔ آخر میں نے نماز پڑھنے کے لئے سفید ہرن کے چمڑے کا مصلےٰ آپ کی خدمت میں پیش کیا، اور آپ نے قبول فرمالیا۔ پھر تھوڑے دنوں بعد آپ لاہور چلے گئے۔

شاہجہاں نامہ میں لکھا ہے کہ حضرت میاں میر ایک مقدس بزرگ ہیں جہاں دیدہ، کارآزمودہ، نہایت کم گو۔ ایک مرتبہ شاہجہاں بادشاہ لاہور آکر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور چونکہ وہ جانتا تھا کہ میاں صاحب نذر و نیاز منظور نہیں کرتے۔ اس لئے ایک تسبیح اور سفید کپڑے کی ایک دستار میاں صاحب کی خدمت میں پیش کی، اور بے شمار دعائیں حاصل کیں۔

دارا شکوہ سکینۃ الاولیاء میں جہانگیر اور حضرت میاں میر کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھتا ہے۔ حضرت میاں میر کی باتوں سے جہانگیر اتنا متاثر ہوا کہ تخت چھوڑ دینے کی خواہش ظاہر کی میاں صاحب نے فرمایا۔ شاہان عالم خدا کی طرف سے مخلوق کی حفاظت کے لئے مقرر ہوتے ہیں۔ اگر تم تخت چھوڑ دوگے تو خدا کے ان احکام کی تعمیل سے قاصر سمجھے (۳۶۵) جاؤ گے جن کی ادائیگی ایک بادشاہ کی حیثیت سے تم پر واجب و فرض ہے۔ بادشاہ شیخ کے کلام سے خوش ہوا (۳۶۶) اور کہنے لگا۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو ارشاد فرمائیے۔ میں اس کی تعمیل اپنی سعادت سمجھوں گا۔ شیخ نے فرمایا۔ ایک چیز کی درخواست ہے اگر منظور ہو، اور وہ یہ کہ مجھے دوبارہ حاضری کی تکلیف نہ دی جائے۔

بادشاہ نے ان سے خط وکتابت جاری رکھی اور اپنے دستخط خاص سے اُن کی خدمت میں عریضے لکھتا رہا۔ چنانچہ وہ خطوط داراشکوہ نے سکینۃ الاولیاء میں نقل کئے ہیں۔ ایک عریضہ حسب ذیل ہے۔

بعد از عرض و نیاز مخلص حقیقی بتمام اخلاص بموقف سے رسانید کہ ع

تاب ایں جا و جاں در کوئے دوست — خلق راو ہے کہ جاں در قالب دوست

خدا آں روز آرد کہ دولت قدمبوس حاصل کنم۔

شاہجہاں نامہ میں لکھا ہے کہ شاہجہاں کہا کرتا تھا کہ میں نے صرف دو صوفی ایسے دیکھے ہیں جو علم الٰہیات کے ماہر ہیں۔ ایک میاں میر دوسرے محمد فضل اللہ بہاری۔

شاہجہاں اپنے دورانِ حکومت میں دو دفعہ حضرت میاں میر کے پاس آیا۔

ایک دفعہ کشمیر جاتے ہوئے، دوسری دفعہ کشمیر سے واپسی پر۔

ساٹھ سال تک آپ زینت افزاء لاہور رہے ۷ ربیع الاول بروز سہ شنبہ بعد نماز ظہر ۱۰۴۵ھ (ایک ہزار پینتالیس) میں اٹھاسی سال کی عمر میں دفتر ہستی کو طے کر دیا۔

آپ تمام عمر مجرد رہے۔ آپ کے پانچ بھائی اور دو بہنیں تھیں۔

میاں قاضی، قاضی عثمان، قاضی طاہر، قاضی محمد، بی بی بادی، بی بی جمال، بی بی جمال ولیہ، اپنے زمانہ کی رابعہ تھیں۔ ایک ہزار انچاس ۱۰۴۹ھ میں وفات پائی۔ ان کی اولاد ہی میاں میر کی سجادہ نشین ہوتی چلی آتی ہے۔

خواجہ خاوند عرف حضرت ایشاںؒ (۳۶۷)

ولی مادر زاد، منصب ارشاد، صاحب حال وقال، جامع کمال ظاہری و باطنی، مظہر جمال صوری و معنوی، طریقہ عالیہ نقشبندیہ میں رتبہ عالی رکھتے تھے۔ والد صاحب کا اسم گرامی میر سید محمد شریف ہے جو خواجہ علاء الدین عطار کی اولاد میں پانچویں پشت میں ہیں۔

خواجہ علاؤالدین عطار سادات خوارزم میں سے ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب ایک جانب سے خواجہ فرید الدین عطار تک پہنچتا ہے۔ خواجہ علاؤالدین عطار حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند قدس اللہ سرہم العزیز کے خلیفۂ برحق ہیں خواجہ خاوند بظاہر حضرت خواجہ ابو اسحاق کے خلفاء میں سے تھے۔ مگر آپ کو حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند سے اویسی نسبت حاصل تھی۔

سو ایام طفولیت بخارا میں گزارنے، پھر بخارا سے وخش اور وہاں سے ہمایوں بادشاہ کے زمانہ میں کابل تشریف لائے۔ کابل سے کشمیر رونق افروز ہوئے۔ اور ایک عرصہ تک کشمیر میں قیام فرما کر خلق خدا کو مستفید فرمایا۔ اور بظاہر کشمیر کے انقلاب میں اکبری افواج کی امداد اور اعانت فرمائی۔ جس کے باعث اکبر بادشاہ آپ کا

بہت اعزاز کرتا تھا۔

کشمیر سے ہندوستان تشریف لائے۔ لاہور، دہلی اور آگرہ میں اکثر قیام رہا۔ شاہی خاندان کی مستورات تک آپ کے حلقۂ ارادت سے وابستہ تھیں۔ اکبر جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانہ میں آپ کا شاہی خاندانوں میں کافی رسوخ رہا۔

بارہا آپ سے کرامتوں کا ظہور ہوا۔ بخارا، وخش، کابل، کشمیر میں اصلاحی تحریکات کے باعث آپ کو مقامی حکام سے اکثر مقابلہ کرنا پڑا، اور یہی مقابلہ ان مقدمات کا سبب ہوتا رہا۔

آپ کے چھ فرزند مشہور ہیں۔

فرزندان گرامی

(۱) خواجہ تاج الدین خاوند۔ جو جامع علم و عمل تھے اور تمام عمر کسی کبیرہ کے مرتکب نہیں ہوئے۔

(۲) خواجہ خاوند احمد، جو والد ماجد کے بعد جانشین ہوئے۔

(۳) خواجہ خاوند محمد۔

(۴) خواجہ خاوند معین الدین۔ جامع کتاب رضوانی۔ یہ تمام علوم دینیہ میں حضرت عبدالحق محدث دہلوی کے شاگرد رشید تھے۔

(۵) خواجہ خاوند قاسم۔

(۶) خواجہ بہاؤالدین خاوند۔ جو والد صاحب کی وفات کے بعد منصب شاہی سے استعفیٰ دے کر والد صاحب کے مزار پر گوشہ نشین اور مجاور ہوگئے۔ تقریباً سو سال کی عمر پا کر بارہ شعبان ۱۰۵۲ھ (ایک ہزار باون) کو رحلت کی۔

شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ(۳۶۸)

حضرت شیخ ابو سعید گنگوہی نبیرہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس اللہ اسرارہم، خلیفہ حضرت شیخ نظام الدین تھانیسری بلخی کے خلیفہ ہیں۔ علم و عمل میں شہرہ آفاق، سلسلۂ چشتیہ کے عظیم الشان شیخ۔ وطن اصلی صدر پور(۳۶۹) تھا۔ الہ آباد میں قیام فرمایا۔ وہی آپ کا مرکز ارشاد و اصلاح رہا۔ وہیں زندگی گزار کر ۹ رجب ۱۰۵۸ھ (ایک ہزار اٹھاون) کو غروب آفتاب کے وقت یہ آفتاب رشد و ہدیٰ غروب ہوگیا۔

آپ کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ فریدالدین شکر گنج کے واسطے سے سیدنا فاروق اعظمؓ تک پہنچتا ہے۔ علم تصوف میں آپ اپنے زمانہ کے امام تھے اور صاحب تذکرہ کے الفاظ میں "مے سزد کہ شیخ محی الدین بن عربی را شیخ اکبر وو ے را شیخ کبیر گویند"۔

آپ کی مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں۔

شرح فصوص عربی۔ شرح فصوص فارسی۔ رسالہ علت احکام۔ رسالہ غایۃ الغایات۔ مغالط عامہ۔ سرالخواص۔ عبادۃ الخواص۔ طریق الخواص۔ عبادہ اخص الخواص۔ مناظر اخص الخواص۔ رسالہ توبہ سہ رکنی۔ رسالہ وجود مطلق وغیرہ۔

دائرہ شاہ حجۃ اللہ الہ آباد، آپ کے سجادہ نشینوں کا اب تک مرکز ہے۔ قاضی گیاسی الہ آبادی، میر سید کبیر قنوجی، میر سید محمدی فیاضی امروہی آپ کے مشہور خلفاء ہیں۔

شیخ محمد افضل وملا محمود جونپوری (۴۷۰)

تلمیذ رشید شیخ محمد افضل جونپوری حکمت وفلسفہ کے بہترین ماہر، ۱۷سال کی عمر میں تکمیل علوم کے بعد حلقۂ درس کو رونق وزینت بخشنے لگے۔ فلسفہ میں شمس بازغہ اور بلاغت میں فرائد آپ کی مشہور اور مقبول تصانیف ہیں۔ شاہجہاں بادشاہ کے زمانہ میں آپ کا بہت اعزاز ہوا۔

آپ کو رصد بنانے کا شوق تھا۔ بادشاہ سے اس کے لئے امداد مانگی۔ مگر چونکہ اس زمانہ میں بلخ وبخارا کی جنگ درپیش تھی، بادشاہ اس طرف متوجہ نہ ہوسکا۔

شاہزادہ محمد شجاع آپ ہی کا شاگرد تھا۔

۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ (ایک ہزار باسٹھ) میں آپ کا انتقال ہوا۔ شیخ محمد افضل جونپوری ابھی زندہ تھے۔ آپ کو اپنے شاگرد رشید کی وفات کا اتنا صدمہ ہوا کہ اس کے بعد آپ کو کبھی مسکراتے ہوئے بھی نہیں دیکھا گیا۔ انتہا یہ کہ چالیسویں روز حضرت استاد کا بھی وصال ہوگیا۔ کسی نے خوب تاریخ کہی۔

زمحمود وافضل بگو آہ۔ آہ

(۱۰۶۲)ھ

قاضی محمد اسلم ومرزا زاہد ہروی کابلیؒ (۴۷۱)

مولانا خواجہ کوہی خراسان کے مشہور بزرگ اور شیخ طریقت تھے۔ قاضی محمد اسلم انہیں کی اولاد میں تھے۔ سلطنت جہانگیری کے آغاز میں تحصیل علم کے ارادہ سے لاہور پہنچے۔ یہاں حضرت شیخ بہلول قدس اللہ سرہ، کا حلقۂ درس تشنگان علوم کے لئے چشمۂ حیواں بنا ہوا تھا۔ تحصیل علوم کے بعد اکبر آباد (آگرہ) پہنچے۔ محفل جہانگیری میں باریاب ہوئے۔ اور چونکہ میر کلاں (۴۷۲) سے (جو جہانگیر کے اُستاد رہ چکے تھے) قرابت کا تعلق تھا، بارگاہ شاہی میں آپ مقبول ہوئے۔ آپ کو کابل کا قاضی بنا کر بھیج دیا گیا۔

آپ نے نہایت دیانت داری اور خوش اسلوبی سے فرائض قضا انجام دیئے اور آپ کے زہد وتقویٰ نے عام شہرت اختیار کرلی۔

ایک عرصہ کے بعد جہانگیر نے آپ کو کابل سے واپس بلا کر فوجی عدالت کا منصب قضا سپرد کر دیا۔

جہانگیر کے بعد صاحب قرآن ثانی شاہجہاں بادشاہ نے آپ کو اسی عہدہ پر بحال رکھا۔ مزید برآں ایک ہزاری منصب عطا فرمایا۔ آپ نے تیس سال تک اس منصب کی خدمات کمال دیانت سے انجام دیں اور ہمیشہ منظور نظر خسروانی رہے۔

سنہ ایک ہزار باون میں شاہجہاں نے خوش ہو کر آپ کو سونے سے تلوایا۔ ۱۰۶۰ھ (ایک ہزار ساٹھ ہجری) میں ایک روز افواج اور گھوڑوں کا شاہی معائنہ ہو رہا تھا۔ ایک چابک سوار ایک گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے قاضی صاحب کے پاس سے گزرا۔ قاضی صاحب اس سے بچنا چاہتے تھے کہ پیر پھسلا اور آپ گر گئے۔ بدن میں ضرب شدید آئی تھی تقریباً چھ ماہ تک صاحب فراش رہے اس کے بعد اگرچہ صحت اچھی ہوگئی۔ مگر ابھی کام کرنے کے قابل نہ ہوئے تھے۔ آپ نے کابل جانے کی اجازت چاہی۔

قدرشناس بادشاہ نے کابل جانے کی اجازت دی اور سابق منصب کو بحال رکھتے ہوئے کابل کی سرکاری جاگیر اور دس ہزار نقد عطا فرمایا۔ لیکن ابھی کابل نہ پہنچنے پائے تھے کہ لاہور میں اوائل ۱۰۶۱ھ (ایک ہزار اکسٹھ) میں انتقال ہوگیا۔ اور وہیں آپ مدفون ہوئے۔

مرزا زاہد آپ کے فرزند ارجمند ہیں۔ ہرات میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنے والد ماجد اور ملا محمد فاضل (۴۷۳) وغیرہ علماء عصر سے علوم مروجہ کی تکمیل کی۔ اور صرف تیرہ سال کی عمر میں سند فراغت حاصل کر لی، اور پھر اپنے علم وفن میں یکتا روزگار ہوئے۔

ابتداء رمضان ۱۰۶۴ھ (ایک ہزار چونسٹھ) میں شاہجہاں کی جانب سے کابل کی واقعہ نویسی پر مامور ہوئے۔ پھر اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۰۷۵ھ (ایک ہزار پچھتر) میں اردوئے معلیٰ (لشکر شاہی) کا محتسب بنا دیا۔ اس زمانہ میں آپ کا قیام اکبرآباد میں رہا، اور اسی زمانہ میں حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس اللہ سرہ نے آپ سے منطق وفلسفہ کی تمام کتابیں پڑھیں۔ جس زمانہ میں شاہ عبدالرحیم قدس اللہ سرہ شرح مواقف پڑھتے تھے، مرزا صاحب نے شرح مواقف کا مشہور حاشیہ تحریر فرمایا۔ شرح تہذیب علامہ دوانی اور رسالہ تصور وتصدیق ملا قطب الدین رازی کے حواشی آپ کی مشہور تصانیف ہیں جو ہندوستان، بخارا، کابل وغیرہ کے عربی مدارس میں داخل درس ہیں اور ایک عرصہ تک ان کتابوں کو اتنی اہمیت حاصل رہی کہ عالم ہی نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک مرزا زاہد کی کسی کتاب پر حاشیہ نہ رکھتا ہو۔ کتب مذکورہ کے علاوہ شرح تجرید اور اشراقیوں کی کتاب "ہیاکل النور" پر بھی مرزا صاحب کے حواشی ہیں۔

ایک عرصہ کے بعد آپ کو کابل کی صدارت تفویض ہوئی۔ پھر تمام منصبوں سے استعفا دے کر گوشہ نشینی اختیار کی، اور تدوین وترویج علوم کی خدمت اپنے ذمہ لی۔

سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں:

مرزا از مشرب صافی صوفیہ نیز بہرہ تمام داشتہ اند۔ وصحبت بسیارے از اکابر ایں طریقہ دریافتہ۔[۴۷۴]

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز مرزا صاحب کی فقہی قابلیت پر تنقید فرماتے ہیں:

مرزا زاہد را دخل در فقہ کم بود تا آنکہ شرح وقایہ ہم خواندہ بحضور جد بزرگوار (شاہ عبدالرحیمؒ) سبق نہ فرمودہ۔[۴۷۵]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے یک واقعہ نقل فرمایا ہے جس سے مرزا صاحب کی دیانتداری پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

مرزا زاہد نے رمضان شریف میں اپنے شاگرد رشید شاہ عبدالرحیم صاحب کی دعوت کی۔ شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں۔ میں مرزا صاحب کے مکان پر پہنچا۔ افطار کا وقت قریب تھا۔ ایک کتاب فروش حاضر ہوا، اور کتابوں کا پورا خوان مرزا صاحب کے سامنے رکھ دیا کہ حضور کی نیاز ہے۔ مرزا صاحب نے مسکرا کر فرمایا۔

عزیز من میں تمہارا پیر نہیں، استاد نہیں، نیاز کیسی۔ بظاہر کوئی اور غرض ہے، اس کو بیان کرو۔

کتاب فروش نے پہلے تو یہی کہا کہ کوئی غرض نہیں، مگر جب زیادہ اصرار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی دوکان لب سڑک ہے اور قاضی صاحب کے پیادے اس کو وہاں سے اٹھوانا چاہتے ہیں۔

بہر حال مرزا صاحب نے اس کی تسکین فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ کل کسی معتمد پیادہ کو بھیجوں گا جو تحقیق کر کے صحیح فیصلہ کر دے گا۔ اب آپ جائیے۔

کتاب فروش: حضور افطار کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اب میں یہ کتابیں کہاں لے جاؤں۔ فروخت کا وقت بھی نہیں رہا۔ میں نے تو یہ آپ کے لئے ہی بنائے تھے۔ آپ ہی منظور فرمائیں۔

مرزا صاحب نے اپنے بچوں کے معلم کو فرمایا کہ ان کتابوں کی قیمت طے کر کے مکان میں بھجوا دو اور قیمت ان کے حوالہ کرو۔ چنانچہ معلم صاحب نے کتاب فروش کو علیحدہ لے کر قیمت دریافت کی۔ کتاب والے نے صرف آٹھ آنے مانگے۔ معلم صاحب نے آٹھ آنے حوالہ کر دیئے۔

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں۔ میں نے معلم صاحب سے کہا کہ یہ مال بہت زیادہ کا ہے۔ آٹھ آنے میں بھی اس نے خوشامد میں دیا ہے۔ رشوت سے تو اب بھی خالی نہیں۔

میری یہ گفتگو مرزا صاحب نے سن لی اور فوراً کتاب فروش کو بلوا کر معلوم فرمایا۔ ان کتابوں پر کیا صرف ہوا ہے اور تمہاری محنت کتنی ہے۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ بہر حال جب حساب کیا گیا تو ان کتابوں کی قیمت ساڑھے تین روپے ہوئی تھی۔ مرزا صاحب نے یہی قیمت اس کو دلوائی۔ اس کے بعد معلم صاحب کو بلا کر بہت ڈانٹا اور فرمایا۔ تم چاہتے ہو ہم روزہ حرام مال سے افطار کریں۔ یہ کونسی عقل مندی ہے اور کیا خیر خواہی ہے؟[۴۷۶]

۱۱۱۱ھ (ایک ہزار ایک سو گیارہ) میں یہ قاضی زاہد منش نے دنیائے فانی سے کوچ کیا۔[۴۷۷]

میر سیّد طیب بلگرامی قدس اللہ سرہ

خلف رشید و صاحب سجادہ میر عبدالواحد بلگرامی (۴۷۸) ولادت روز یک شنبہ مقدار یک و نیم پاس نہم ربیع الاول ۹۸۶ھ (نو سو چھیاسی)

سید میر غلام علی آزاد بلگرامی کے الفاظ ہیں:

و لے ذات متقدسے ست کہ اگر ثقلین باو ناز کنندے زیبد و اگر زمین و زمان بر خود بالندے شاید۔

صاحب مرآۃ المبتدئین جو سید صاحب کے معاصر ہیں، فرماتے ہیں:

فی زمانہ قیام عالم اور برکت بنی آدم آپ کی ذات سے ہے۔ قطبیت' ابدالیت' غوثیت یا اوتادیت غرض جو مرتبہ بھی ممکن ہو، وہ ان کی ذات میں پیدائشی طور پر موجود ہے۔ عبادات کی یہ کثرت کہ گویا حضرت زین العابدینؒ سینکڑوں کراموں کو ہمراہ لے کر ظہور فرما ہیں۔ ابتداء شعور سے آخر تک بھی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ائمہ سلف کی زیارت کرنی ہو تو سید طیب کی زیارت کافی ہے وغیرہ ذلک (مرآۃ المبتدئین)۔

میر صاحب نے صوری اور معنوی کمالات اپنے والد صاحب سے حاصل کئے اور وفات کے بعد والد صاحب کی خلافت و سجادہ نشینی کا حق کما حقہ ادا فرماتے ہوئے سینکڑوں طالبانِ طریقت کو منزل مقصود تک پہنچایا۔

آپ اتباع سنت کے حریص تھے۔ تمام حرکات و سکنات میں رسول اللہؐ کے خصائل و شمائل آپ کے پیش نظر رہتے۔

معنوی تربیت کے ساتھ آپ علوم ظاہری کی تدریس پورے انہماک سے جاری رکھتے۔ آپ نے ہدایہ اور تفسیر بیضاوی جیسی فقہ اور تفسیر کی انتہائی کتابوں کے حواشی تحریر فرمائے۔ (مگر افسوس طبع نہ ہو سکے) حضرت مولانا عبدالحق صاحب محدث دہلوی حضرت میر صاحب کے مخلص دوست تھے۔ اور آپ کے علم و فضل کے اس قدر گرویدہ کہ دوستانہ بے تکلفی کے بجائے آپ کا بہت زیادہ احترام کرتے۔ سادہ نام لینے کے بجائے شیخ طیب کہا کرتے تھے۔ اپنے آخری زمانہ میں حضرت شیخ عبدالحق صاحب قدس اللہ سرہ العزیز درس دے رہے تھے۔ ایک مشکل عبارت خود حضرت کے لئے موجب تامل ہوگئی۔ آپ نے فرمایا۔ اگر اس وقت شیخ طیب ہوتے تو اس عبارت کو حل کر دیتے۔ حسن اتفاق سے سید صاحب اسی وقت بلگرام سے دہلی رونق افروز ہوئے۔ شیخ عبدالحق صاحب کے لئے اس سے زیادہ مسرت اور کیا ہو سکتی تھی۔ فوراً وہ عبارت سامنے رکھی گئی۔ میر سید طیب نے کتاب ہاتھ میں لی۔ کسی قدر تامل فرمایا اور پھر اسی عبارت کو ایسی طرح پڑھ دیا۔ کہ تقریر و بیان کے بغیر ہی اس کا مطلب صاف ہوگیا۔

مولانا نورالحق صاحب خلف مولانا عبدالحق صاحب اس زمانہ میں آگرہ میں عہدۂ قضاء پر فائز تھے۔

حضرت شیخ عبدالحق صاحب نے سید صاحب سے دریافت کیا۔ آپ کس راستے سے تشریف لائے ہیں۔

سید صاحب: براہ آگرہ۔

حضرت شیخ: کیا وہاں نورالحق سے ملاقات ہوئی؟

سید صاحب: موانع سفر کے باعث ان سے ملاقات کا موقع نہیں مل سکا۔

حضرت شیخ: غالباً ایک مانع یہ بھی تھا کہ نور الحق نے منصب قضاء قبول کر لیا ہے۔

اس کے بعد حضرت شیخ نے اپنے صاحبزادہ کی تحسین و توصیف فرمائی۔ حتی کہ ارشاد فرمایا۔

اگرچہ میرا لڑکا میرا شاگرد اور میرا مرید ہے لیکن اگر اس کو اپنے استاذ اور اپنے پیر کی عظمت دوں تب بھی بجا ہے۔

حضرت سید صاحب شیخ کے سامنے سے اس طرح اُٹھے کہ گویا کپڑے اُتارنے کے لئے جا رہے ہیں اور خاموشی کے ساتھ باہر تشریف لا کر سیدھے آگرہ پہنچے۔ مولانا نور الحق صاحب سے ملاقات کی۔ حضرت شیخ عبدالحق صاحب اس غیوبت سے متردد رہے۔ اور جب واپسی پر پورا واقعہ معلوم ہوا۔ تو حضرت سید صاحب کے عزم و ہمت، جذبہ طلب حق و جستجو اہل حق اور آپ کے حسن اخلاق سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

بہر حال حضرت سید صاحب علم و فضل، زہد و تقویٰ اور کمالات صوری و معنوی میں مقتداء زمانہ تھے۔ پنجم ماہ رجب ۱۰۶۴ھ (ایک ہزار چونسٹھ) کو جلوہ افروز انجمن قدس ہوئے۔ (۴۷۹)

شیخ عبدالرشید جونپوری عرف شمس الحق قدس اللہ سرہ

از کبار اولیاء و اعاظم ست شاگرد شیخ فضل اللہ جونپوری و مرید پدر خود شیخ مصطفیٰ قدس اللہ اسرارہم۔

ابتداء میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ اس کے بعد اس سلسلہ کو چھوڑ کو کتب تصوف کے مطالعہ میں تمام وقت صرف کرنے لگے۔ شیخ محی الدین ابن عربی کی تصنیف میں جن عبارتوں پر علماء شریعت کا اعتراض ہے اُن کی توضیح و تشریح کی۔

شاہجہاں بادشاہ نے آپ سے ملاقات کرنی چاہی۔ اپنے ایک مصاحب خاص کو منشور طلب حوالہ کر کے شیخ کی خدمت میں بھیجا۔ مگر حضرت شیخ نے گوشۂ عزلت سے باہر قدم رکھنا گوارا نہ کیا۔

فن مناظرہ میں رشیدیہ (جو عام طور پر داخل درس ہے)، تصوف میں زاد السالکین (شرح اسرار الخلوۃ مصنف شیخ ابن عربی قدس سرہ) رسالہ مکتوم (متعلق شرح بعض مواضع کلام ابن عربی) حواشی متفرقہ بر شرح مختصر عضدی۔ حواشی فارسی بر کافیہ، اور اوراد و وظائف میں مقصود الطالبین آپ کی تصانیف ہیں۔ شاعر تھے۔ شمسی تخلص تھا۔ سنت صبح پڑھ کر فرض کا تحریمہ کیا تھا کہ داعی حق کو لبیک اجابت کہہ ڈالی۔ سنہ وفات ۱۰۸۳ھ (ایک ہزار تراسی)۔

ملا شاہ بدخشانی

اصلی نام شاہ محمد کنیت اخوند لقب لسان اللہ، والد ماجد کا نام ملا عبدی، جائے ولادت موضع ارکسان، ضلع روستاق، علاقہ بدخشاں۔ طلب حق کے لئے صغر سنی میں وطن سے نکل کھڑے ہوئے۔ کشمیر پہنچے۔ تین سال رہ کر

ہندوستان کے لئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں حضرت میاں میر بالا پیر کے حالات سنے۔ اُن سے ملاقات کرنے کے لئے لاہور کا قصد کیا۔ مگر رفقاءِ سفر نے مہلت نہ دی۔ مجبوراً آگرہ پہنچ گئے۔ جستجوئے شیخ کے لئے یہ سفر تھا جو ناکامی پر ختم ہوا۔ آخر [illegible] گئے نا اُمید ہو کر لاہور واپس پہنچے۔ حضرت میاں میر کے اوصاف و کمالات نے دل میں گھر کر لیا۔ دست بیعت دراز کیا اور حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ ریاضت، مجاہدہ اور ترک دنیا میں حضرت میاں میر کے تمام مریدوں میں سب سے ممتاز تھے۔

کبھی کوئی غلام یا خدمت گار اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ کبھی مکان میں ہنڈیا نہیں پکی۔ کبھی چراغ نہیں جلایا۔ تجرد اور تفرد میں ساری زندگی گزار دی۔ حبس نفس میں کافی ملکہ حاصل کیا تھا۔ ساری رات میں صرف ایک سانس لیتے تھے۔ سات سال اسی طرح گزارے کہ پوری رات حبس دم کرتے ہوئے ذکر خفی کرتے رہتے۔ پوری رات میں صرف ایک سانس لیتے اور عشاء کے وضو سے صبح کی نماز ادا کیا کرتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے: تمام عمر گاہے چشمش بخواب آشنا نشد۔ پھر اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ گاہے حاجت غسل لاحق حال وے نگردید۔

فرمایا کرتے تھے کہ احتلام یا مجامعت سے غسل واجب ہوتا ہے۔ میرے یہاں نہ نیند ہے نہ بیوی۔

علوم ظاہری میں بھی کافی دستگاہ رکھتے۔ شعر و سخن سے بھی شوق تھا۔ چنانچہ آپ کا ایک دیوان ہے "دیوان ملا شاہ"۔

سلسلۂ قادریہ میں مراحل طریقت طے کر کے حضرت شیخ کی خدمت سے رخصت ہو کر گلگشت کشمیر کو وطن بنایا۔ آپ کے محققانہ کمالات نے بہت جلد خلق خدا کو آپ کی طرف متوجہ کر دیا۔ مریدوں کا حلقہ بہت وسیع ہوا۔ حتیٰ کہ شہزادہ دارا شکوہ بھی حلقۂ ارادت میں داخل ہوا۔

مدح صحابہؓ اور تبرا جس کو زمانۂ حاضر کی پیداوار سمجھا جاتا ہے کم از کم چار سو ۴۰۰ برس سے ہندوستان کو آماجگاہ حوادث بنائے ہوئے ہے۔

ملا صاحب کو مدح صحابہؓ سے خاص شغف تھا۔ خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مدح بر سر مجلس فرمایا کرتے تھے۔ شیعی صاحبان بحث و تکرار کے لیے آپ کے پاس آتے مگر خداوند عالم نے آپ کو تسخیر کا یہ ملکہ عنایت فرمایا تھا کہ جو رافضی آپ سے دوچار ہوتا، تائب ہو جاتا۔ اور سیدالابرار، اصحاب کبار اور حضرت غوث اعظمؒ کی زیارت حسن ظاہر سے کرتا۔ اس طرح سینکڑوں ہزاروں روافض کو تائب کر کے حلقۂ اہل سنت میں داخل کیا۔

نظریہ وحدۃ الوجود ملا صاحب کا خاص مسلک تھا۔ اسی کی دوسری تعبیر ہمہ اوست ہوتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں انا الحق اور سبحانی وغیرہ الفاظ آسانی سے کہے جا سکتے ہیں۔ شاہزادہ دارا شکوہ اور ملا صاحب کے دوسرے خلیفہ شیخ ولی [۲۸۰] عرف ولی رام ان تینوں کے دیوان، (۱) دیوان ملا شاہ، (۲) دیوان دارا شکوہ، (۳) دیوان ولی، اسی نظریہ کی تلبیس آمیز اور گمراہ کن تعبیرات سے پر ہیں۔ کفر و اسلام میں تمیز کا اُٹھ جانا غیر کو معبود سمجھ لینا احترام

معبود کے واجبی درجہ کا ساقط ہو جانا، فرائض اور واجبات سے خود کو آزاد سمجھ لینا، جو الحاد، زندقہ اور لادینی کے بنیادی اصول ہیں وہ کتنا ہی اونچا نظریہ سہی مگر عوامی سطح پر اس نظریہ کے عمومی نتائج ہیں چنانچہ دارا شکوہ کے جو عقائد و خیالات ہو گئے تھے، وہ آئندہ درج کئے جائیں گے (انشاء اللہ تعالیٰ) یہاں صرف یہ کہ ملا شاہ کے پیر میاں میر "دارا شکوہ" "باری تعالیٰ" کہا کرتا تھا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

چوں ایشاں در کوہ پایہ نواحی قصبہ باری عزلت گزیدہ بودند من ایشاں را حضرت باری تعالیٰ مے گفتم (۳۸۱) (معاذ اللہ)۔(۳۸۲)

خود ملا شاہ نے يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى کی ایسی تفسیر کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے نماز ہی معاف کر دی تفسیر کے الفاظ یہ ہیں۔

ای کسانیکہ ایمان حقیقی آوردہ آید، نزدیک نماز نشوید در حالات سکر و مستی۔ مقید سکر حالت بلند تر ست از نماز گذاراں اگر مستی مجازی ست قرب نماز ممنوع ست تا محو زلوث نشود دریں صورت عزت نماز ست و اگر سکر حقیقی ست باز ہم قرب نماز ممنوع (۳۸۳) ست، دریں صورت عزت سکر ست مصلی نماند نماز کے خواند۔(۳۸۴)

ملا شاہ کے پیر حضرت میاں میر نے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ الخ کے متعلق بتایا ہے کہ:

در حق خاصان ست۔ یعنی دلہائے ایشاں کہ در دل ایشاں غیر نیاید، و چشم ایشاں غیر نہ بیند، و گوش ایشاں غیر نشنود مر ایشاں را لذت و حلاوت بسیار ست از ایں کفر۔(۳۸۵)

ملا شاہ کا ایک مشہور شعر ہے جس پر علماء کشمیر نے کفر کا فتویٰ بھی دیا تھا اور شاہجہاں بادشاہ سے شکایت بھی کی تھی۔

پنجہ در پنجہ خدا دارم من چہ پروائے مصطفیٰ دارم (۳۸۶)

(معاذ اللہ)

شاہجہاں کے آخری دور حکومت میں ملا شاہ کا انتقال ہو گیا۔ سن وفات ۱۰۶۹ھ (ایک ہزار انہتر)۔

شیخ محمد اسمٰعیل مدرس سہروردی لاہوری (۳۸۷)

عرف میاں کلاں یا میاں وڈا قدس اللہ سرہ (۳۸۸)

خلف الرشید فتح اللہ بن سرفراز۔ قوم کھوکھر۔ ساکن موضع چھچھ۔ جولب دریا چناب پر آباد تھا۔ ۹۹۵ھ (نو سو پچانوے) میں پیدا ہوئے۔ ولادت کے بعد والد ماجد اس موضع سے منتقل ہو کر موضع لنگر مخدوم میں سکونت پذیر ہو گئے اور جب کہ اس فرزند ارجمند کی عمر پانچ سال ہوئی تو پدر مشفق نے اس بچہ کو مخدوم عبد الکریم قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں پیش کر دیا۔

مخدوم صاحب سلسلۂ سہروردیہ کے شیخ کامل تھے۔

حضرت مخدوم نے اس نونہال کی تربیت شروع فرمائی اور جب بارہ سال کی عمر ہوئی تو درویشان خانقاہ کے لئے آٹا پیسنے کی خدمت سپرد کردی۔

یہ دوازدہ سالہ بچہ وقت مقررہ پر مقررہ آٹا مطبخ میں پہنچا دیتا تھا۔ اتفاقاً ایک روز تاخیر ہوگئی۔ جب حضرت مخدوم کو معلوم ہوا تو آپ نے کسی درویش کو چکی خانہ میں دریافت حال کے لئے بھیجا۔ درویش نے دیکھا کہ میاں اسمٰعیل مشغول مراقبہ ہیں اور چکی خود بخود چل رہی ہے۔ درویش صاحب نے عجیب وغریب حالت کی اطلاع فوراً حضرت مخدوم کو پہنچائی۔ جب مخدوم صاحب نے اپنے پروردہ نونہال کی یہ حالت خود آکر مشاہدہ فرمائی تو بہت خوش ہوئے، اور میاں اسمٰعیل اور ان کی چکی کو بدستور چھوڑ کر واپس تشریف لائے۔ جب میاں اسمٰعیل نے مراقبہ سے سر اٹھایا تو گھبرا کر اُٹھے اور آٹا مطبخ میں پہنچا کر حضرت مخدوم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

مخدوم صاحب نے آج سے یہ خدمت ان سے موقوف فرمادی کہ آپ کے مشاغل عالیہ میں حرج ہوتا ہے۔ میاں اسمٰعیل مراحل سلوک طے کرنے کے بعد دوسروں کو راستہ بتانے کے لئے حضرت مخدوم کے حکم سے خدمت مخدوم سے رخصت ہوئے اور تقریباً دس کوس کے فاصلہ پر دریائے چناب کے کنارے ایک شیشم کے درخت کے نیچے قیام فرمایا۔

ایک سو چالیس سعادت مندان ازلی آپ کی خدمت میں اسی مقام پر حاضر ہوئے اور مراحل طریقت کی تکمیل کی۔ اس کے بعد جب کہ سن مبارک پینتالیس سال تھا کسی غیبی اشارہ کے بموجب اُس کٹی کو خیر باد کہہ کر لاہور محلہ تیل پورہ میں رخت اقامت افگن ہوگئے اولاً چالیس روز تک پیر علی مخدوم گنج بخش ہجویری کی خانقاہ عالیجاہ میں معتکف رہے پھر اقامت گاہ پر تشریف لائے تعلیم و تلقین اور تدریس میں مشغول ہوگئے۔

مشہور ہے کہ اس محلہ تیل پورہ کے قریب محلہ گنج پور میں ایک پرانی مسجد تھی۔ ایک ہندو جوگی اس مسجد میں رہا کرتا تھا۔ چونکہ یہ جوگی باکمال تھا۔ کسی مسلمان کو ہمت نہ ہوئی تھی کہ اس کو مسجد سے نکالے۔ جب میاں اسمٰعیل صاحب وہاں پہنچے تو آپ نے جوگی صاحب سے مسجد خالی کردینے کی فرمائش کی۔ جوگی نے کہا۔ مسجد کو مجھ سے محبت ہوگئی ہے۔ اگر میں جاؤں گا تو مسجد بھی میرے ساتھ چل لے گی۔ یہ کہہ کر مسجد سے چل دیا۔ جیسے ہی مسجد سے باہر قدم رکھا، مسجد میں جنبش پیدا ہوائی۔ (۳۸۹) حضرت میاں صاحب نے عصاء مبارک کو مسجد کی دیوار میں مارا اور فرمایا۔ "ساکن شو"۔ مسجد فوراً ساکن ہوگئی۔ جوگی نے جب یہ کرامت دیکھی، کان دبا کر چلا گیا۔ حضرت میاں اسمٰعیل صاحب نے اس مسجد کو اپنی خانقاہ اور درس گاہ بنایا اور یہیں سے رشد وہدی کے چشمے پھوٹ کر بہنے لگے۔ اور بقول مصنف تذکرۃ العلماء والمشائخ یہی مدرسہ "درس میاں وڈا" کے نام سے ساڑھے تین سو برس گزر جانے کے بعد بھی آج تک جاری ہے۔ یہاں اندھے اور اپاہج طلبہ قرآن شریف اور فقہ کی تعلیم پاتے ہیں جنہیں کل اخراجات خانقاہ سے ملتے ہیں۔ بقول مصنف خزینۃ الاصفیاء شاہجہاں بادشاہ کی کسی دایہ نے اس

مسجد کو از سرِ نو تعمیر کرا دیا۔ جو اب تک میاں صاحب کے مزار کی چار دیواری میں موجود ہے۔ پھر عالمگیرؒ نے خانقاہ اور مدرسہ کی مددِ معاش کے لئے سات مواضع مع مزروعہ اراضی عطا کئے۔

قرآن پاک کا درس میاں صاحب کا خاص مشغلہ تھا اور جس کو خود قرآن شریف پڑھاتے تھے، پانچ چھ ماہ میں حافظ ہو جاتا تھا۔

ایک لطیفہ بھی ہے اور کرامت بھی، جو اس موقعہ پر ذکر کی جاتی ہے کہ ایک شخص حاضرِ خدمت ہوا کہ میری بیوی حافظِ قرآن ہے اور میں اُمّی محض۔ مجھے بیوی مباشرت سے منع کرتی ہے کہ کلام اللہ کی بے حرمتی ہوگی۔

میاں صاحب نے فرمایا۔ چھ ماہ یہاں رہو۔ انشاء اللہ حافظ ہو جاؤ گے۔ اس شخص نے نہایت عاجزی کے ساتھ اتنے عرصہ حاضری سے معذرت کی۔ آپ نے فرمایا۔ کل صبح ہمارے ساتھ نماز پڑھو اور داہنی طرف کھڑے ہو۔ چنانچہ نمازِ صبح کے بعد جب میاں صاحب نے سلام پھیرا تو جتنے شخص داہنی طرف تھے، حافظِ قرآن ہو گئے اور جو بائیں جانب تھے وہ ناظرہ خوان۔ (۴۹۰)

یہ شخص ایک نظرِ کیمیا اثر کی برکت سے حفظِ کلام اللہ کی دولت لے کر اپنے گھر گیا۔

میاں صاحب فرمایا کرتے تھے۔ "ہماری خاک قبر سے بھی حفظِ قرآن کا فیض جاری رہے گا"۔ غلام سرور چشتی فرماتے ہیں کہ آپ کی یہ بشارت صادق ہوئی۔ چنانچہ آپ کے بعد آپ کے برادر یک جدی شیخ محمد صالح پچپن ۵۵ سال، پھر حافظ محمود صاحب بیالیس ۴۲ سال، بعد ازاں حافظ معز الدین صاحب پینتیس ۳۵ سال، اس کے بعد حافظ شرف الدین صاحب ساٹھ (۶۰) سال تک اسی جگہ حفظِ قرآن اور علومِ قرآنی کی تعلیم و تدریس میں مشغول رہے۔

حافظ شرف الدین صاحب کی وفات ۱۲۷۲ھ (بارہ سو بہتر) میں ہوئی۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند ارجمند حافظ احمد الدین صاحب اس دو صد سالہ خدمت کو ہمت و استقلال سے انجام دے رہے ہیں اور تقریباً ایک سو پچاس بینا و نابینا متعلم اس مدرسہ معلّیٰ میں علمِ قرآنی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ جن کو دو وقتہ خوراک اور دیگر ضروریات کا انتظام مدرسہ سے ہوتا ہے۔

صاحب تذکرہ فرماتے ہیں:

مہاراجہ دلیپ سنگھ کے دورِ تسلط میں سکھ فوج نے مدرسہ کی عمارت کو بہت نقصان پہنچایا۔ جس کی تلافی مرمت وغیرہ کے ذریعہ سے بعد کے مسلمانوں نے کی ہے۔ شیخ محمد صالح موصوف۔ شیخ محمد ہاشم۔ شیخ عبدالحمید و عبدالکریم قصوری۔ اخوند محمد عثمان۔ اخوند محمد مراد۔ انت خاں۔ حافظ عبداللہ ساکن کیواں۔ حافظ محمد فاضل۔ حافظ اللہ بخش۔ حافظ محمد حسین آوادن۔ حافظ فتح محمد خوشابی۔ مولوی تیمور لاہوری۔ میاں جان محمد لاہوری۔ (۴۹۱) جان محمد ثانی متوفی ۱۱۲۰ھ۔ آپ کے سینکڑوں خلفاء میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ جنہوں نے حضرت شیخ کے مسلک پر تعلیم و تدریس میں اپنی زندگیاں صرف کیں۔

مولانا شیخ اسمٰعیل نے ۹۰ سال کی عمر پاکر پنجم ماہ شوال سنہ ۱۰۸۵ھ (ایک ہزار پچاسی) کشت زار دنیا سے گلگشت جنت کی راہ لی۔ رحمہ اللہ وقدس سرہ

خواجہ معین الدین خلف خواجہ خاوند محمود نقشبندی قدس سرہ (۲۹۲)

صاحب خزینۃ الاصفیاء کے الفاظ ہیں:

از عظماء مشائخ و کبراء علماء کشمیر جنت نظیر است۔ در زہد و ورع و اتباع شریعت و ترویج نسبت و رفع بدعت ثانی نداشت در ہمہ علماء و صلحاء وقت تحریر و تقریرش مقبول و مشائخ عظام علماء کرام را رجوع تمام بخدمت وے بود۔ علماء عہد مثل ملا محمد طاہر کشمیری خلف مولانا حیدر علامہ و ملا ابوالفتح کلو و ملا یوسف مدرس و مفتی محمد طاہر و مولانا عبدالحئی و مولانا مفتی شیخ احمد وغیرہ کہ در کشمیر علم شریعت ے افراختند، سر بر خط فرمان وے داشتند و باحکام روایت و عدالت فتویٰ از وے مے جستند۔

آپ نے اپنے زمانہ کے علماء کی فرمائش سے علوم شریعت و طریقت میں فتاویٰ نقشبندیہ، کنز السعادات و رسالہ رضوانی وغیرہ تالیف و تصنیف فرمائے۔

ظاہری اور باطنی علوم اپنے والد ماجد سے حاصل کئے۔

وہی شیعہ سنی جھگڑا جو عہد اکبر میں فتح کشمیر سے پیشتر رونما ہوا تھا۔ جس کی قیادت شیخ یعقوب صوفی نے فرمائی تھی، آپ کے زمانہ میں پھر شعلہ افگن ہوا۔ معاذ اللہ تبرا کے خلاف عقل و تہذیب اور زہر یلے مرض نے فضاء کشمیر میں وباء عام پیدا کر دی، حق اور ناحق کی حمایت میں طرفین سے خوب بازار کشت و خون گرم ہوا۔ شاہجہاں بادشاہ کا عہد معدلت مہد تھا۔ مظفر خاں حاکم و ناظم کشمیر تھے۔ بمشکل بلوا فرو کیا گیا۔ قاضی محمد عارف اور قاضی ابوالقاسم کا عدالتی بورڈ تصفیہ مقدمہ کے لئے بیٹھا۔ زیادتی اہل تشیع کی ثابت ہوئی۔ مگر اہل تشیع کا زور یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ دونوں قاضیوں کی ہمت نہ پڑی کہ اہل تشیع کو سزا دیں۔

حضرت خواجہ معین الدین اور آپ کی جماعت نے جب محسوس کیا کہ مرعوبیت کے باعث یہ دونوں قاضی عدل پر کاربند ہونے میں تساہل کر رہے ہیں تو شہر کے تمام سنیوں کو لے کر ہجرت کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور مقام حضرت چنار پر آکر قیام فرمایا۔ اور وہاں سے حضرت خواجہ نے نہایت سخت و درشت تحریر ناظم کشمیر کے نام لکھی۔

ناظم شہر اور دیگر حکام پہلے ہی سے حواس باختہ تھے۔ تحریر پہنچتے ہی حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہزار منت و سماجت سے اس ہزاروں کے قافلہ کو شہر میں لے گئے اور پھر شیعوں میں سے:

مردمانیکہ زبان بہ سب و تبرا اصحاب دراز کردہ بودند۔ بسیر ریسمان رانقل رسانید۔ (۲۹۳)

یہ سب کچھ ہوا مگر حاکم کشمیر کو اپنی خفت اور سبکی بہت زیادہ احساس تھا۔ اس نے حضرت خواجہ کے متعلق بہت کچھ شکایتیں لکھ کر شاہجہاں کے پاس بھیجیں۔ شاہجہاں نے حضرت خواجہ کو لاہور طلب کیا، اور وہیں

قیام فرمانے کا حکم دیا۔

حضرت خواجہ نے بادشاہ اسلام کی اطاعت ضروری سمجھی اور اپنی جگہ اپنے صاحبزادہ کو جانشین بنا کر خانقاہ کشمیر کے فیض کو بدستور جاری رکھا۔

۱۰ محرم ۱۰۸۵ھ (ایک ہزار پچاسی) میں حضرت خواجہ نے دار عقبیٰ کو محل اقامت بنایا۔

شیخ عبدالخالق حضوری مجددی قدس سرہ

متوفی ۱۰۸۶ھ (ایک ہزار چھیاسی ہجری)

حضرت آدم بنوری کے جلیل القدر خلیفہ ہیں۔ کثرت حضوری کے باعث حضوری کا خطاب ہو گیا۔ خواجہ نصیب خاں مصنف تذکرۃ الاولیا فرماتے ہیں کہ دارا اور عالمگیر کی جنگ جاری تھی۔ میں نے حضرت شیخ سے عرض کیا کہ دعا فرمایئے کہ خداوند عالم عالمگیر کو تخت سلطنت عطا فرمائے، میں ایک گاؤں خدام کی نذر کروں گا۔ یہ سن کر تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا لشکر دارا کو شکست ہوئی اور عالمگیر تخت نشین ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایسا ہی ہوا۔ جب میں سلطان عالمگیر کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس واقعہ کا ذکر کر کے ایک گاؤں کے متعلق شاہی فرمان حاصل کر لیا، اور حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کو پیش کرنا چاہا۔ آپ نے انکار فرما دیا۔ اور ارشاد فرمایا۔ خدا کے لئے ہم نے امداد کی۔ نذرانہ قبول کرنا ہمارے مشائخ کا طریقہ نہیں۔ دولت دنیا کو پا کوب کر کے قوت لایموت پر زندگی ختم کر دی۔ رحمہ اللہ۔

میر سید عبدالفتاح العسکری احمد آبادیؒ

- از کبار اولیا، مستجمع دانش رسمی و معنوی، فیض عام و قبول تمام داشت۔ (۳۹۳)

سلطان عالمگیر نے جب آپ کے کمالات کی شہرت سنی تو احمد آباد سے دہلی طلب کیا اور خصوصی صحبتوں میں میر صاحب سے "برکات فراواں کسب نمود"۔ مگر تھوڑے ہی دنوں بعد آپ بادشاہ سے رخصت لے کر وطن پہنچے اور چوبیس ذی الحجہ ۱۰۹۰ھ (ایک ہزار نوے) نوے سال کی عمر گرامی کو حوالہ اجل کر دیا۔ خواب گاہ احمد آباد ہے۔ مثنوی مولانا روم سے شغف تھا، اس کی شرح بھی تصنیف فرمائی۔

شیخ سعدی بلخاری مجددی لاہوری قدس اللہ سرہ العزیز

حضرت شیخ آدم بنوری قدس اللہ سرہ العزیز کے چہیتے اور دلارے خلیفہ ہیں۔ لاہور کے قریب کسی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آٹھ سال تک وہیں زندگی بسر کی۔ مگر مربی اول ہی کوئی ایسا کامل تھا جس نے نماز وضو وغیرہ فرائض و ضروریات کے ساتھ سنن اور مستحبات بھی یاد کرا دیئے۔ اور انہیں کا عادی بنایا۔ حضرت شیخ سعدی اسی آٹھ سالہ عمر میں ایک روز گاؤں سے باہر ایک کنویں پر وضو کر رہے تھے۔ کنواں لب سڑک تھا۔ مولانا حاجی سعد اللہ وزیر آبادی جو حضرت شیخ آدم بنوری رحمۃ اللہ کے خلفاء میں سے تھے اور بنور تشریف لے جا رہے تھے اپنے قافلہ

کے ساتھ اس راستہ سے گزرتے ہوئے حضرت شیخ سعدی کو غور سے دیکھتے رہے۔

شیخ سعدی کے اس مکمل وضو سے جس میں سنن وآداب کا پوری طرح لحاظ رکھا گیا تھا، حضرت حاجی سعد اللہ صاحب کو بہت تعجب ہوا۔ آپ نے اپنے رفقاء سفر سے اس کی تحسین فرمائی۔

حاجی سعد اللہ کا غور سے دیکھنا اور پھر اپنے احباب سے کچھ تذکرہ کرنا ہشت سالہ سعدی کے لئے بھی ایک نئی سی بات معلوم ہوئی۔ آپ نے حاجی صاحب کے ساتھیوں سے حاجی صاحب کی تعریف پوچھی۔ بتایا گیا کہ آپ شیخ آدم بنوریؒ کے خلیفہ ہیں اور بنور تشریف لے جارہے ہیں۔ یہ سنتے ہی حضرت سعدی اس قافلہ کے پیچھے پیچھے ہو لئے، اور اس طرح کسی پر ظاہر بھی نہ کیا کہ وہ ان کے ہمراہ ہیں یا بھوکے پیاسے ہیں۔

بنور پہنچ کر حاجی سعد اللہ صاحب مع رفقاء سفر حضرت شیخ آدم قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ صاحبزادے بھی انہیں حضرات کے ہمراہ ایک کنارہ پر بیٹھ گئے۔

حضرت شیخ آدم قدس اللہ سرہ العزیز نے ہر ایک صاحب سے علیحدہ علیحدہ خیریت دریافت فرمائی۔ آخر میں جب صاحبزادہ کا نمبر آیا تو حاجی سعد اللہ صاحب نے فرمایا یہ بچہ بھی ہمارے ساتھ چلا آیا۔ اس کی حالت بھی عجیب ہے۔ حضرت شیخ آدم نے فوراً بات کاٹ کر فرمایا۔ یہ مت کہو کہ یہ بچہ بھی ہمارے ساتھ آگیا بلکہ یہ کہو کہ ہم اس بچہ کے ہمراہ آئے ہیں۔ یہ بچہ سعادت مند ازلی اور مقبول لم یزلی ہے۔

اس کے بعد حضرت شیخ آدمؒ نے صاحبزادہ کی طرف متوجہ ہو کر نام دریافت فرمایا۔ اور جب معلوم ہوا کہ سعدی نام ہے تو نہایت مسرت کے ساتھ بار بار فرمایا۔

''سعدی، ہر جا کہ باشی، سعدی، ہر جا کہ روی سعدی، در دنیا سعدی، در عقبےٰ سعدی''۔

بہر حال بہت زیادہ عنایت اور نوازش فرمائی، اور اپنے ہمراہ حرم سرا میں لے جا کر گھر والوں سے فرمایا:

''ایک نو عمر لڑکا آج آیا ہے جو بچپن ہی میں ولی کامل ہے۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدۃ النساء حضرت فاطمہ زہراؓ نے اس کو اپنی فرزندی میں داخل فرمالیا ہے۔ اپنی بیعت سے مشرف فرما کر خدمات خاص پر مامور فرمادیا ہے''۔

یہ طفل نو خیز حضرت شیخ آدمؒ کی خدمت میں جوان ہوا۔ اور مدارج روحانیت میں درجات مشائخ پر پہنچا۔

ناگاہ حضرت شیخ آدمؒ کو شاہجہاں بادشاہ کی جانب سے ہندوستان چھوڑنے کا حکم ملا۔

حضرت شیخ سعدیؒ نے بہت چاہا کہ اپنے روحانی تصرفات سے بادشاہ کو نقصان پہنچائیں۔ مگر حضرت شیخ آدم قدس اللہ سرہ العزیز ہر ایک موقع پر مانع ہوتے رہے کہ اس جیسے معاملہ میں تحمل لازمی ہے۔ مسلمانوں کا بادشاہ ہے جو مخلوق کا خیر خواہ ہے۔

حضرت شیخ آدمؒ کی روانگی کے بعد کچھ دنوں شیخ سعدی والدین کی خدمت میں حاضر رہے۔ پھر آپ بھی زیارت بیت اللہ کے ارادہ سے روانہ ہوگئے۔ میر منصور بدخشی جو پہلے شاہی امیر تھے اور اب حضرت شیخ آدم کے

خادم تھے، شیخ سعدی کے ہمراہ تھے۔ حضرت شیخ آدم کے بعد دوسرے جہاز سے یہ دونوں صاحبان حجاز پہنچے اور حج بیت اللہ ساتھ ساتھ ادا کیا۔ پھر مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور جب تک حضرت شیخ آدم زندہ رہے، شیخ سعدی انہیں کی خدمت میں حاضر رہے۔ شیخ آدم کی وصیت کے بموجب وفات کے بعد لاہور تشریف لا کر خدمت خلق اللہ شروع کردی۔ خود حضرت شیخ سعدی کے قول کے بموجب آپ کے مریدوں کی تعداد آسمان کے تاروں کی طرح حد شمار سے خارج تھی۔ بہت سے جلیل القدر خلفاء میں آپ کے چار فرزند خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ خواجہ محمد سلیم۔ خواجہ محمد غنی۔ خواجہ محمد یوسف۔ خواجہ محمد عارف۔

چہار شنبہ سوم ربیع الثانی ۱۱۰۸ھ (ایک ہزار ایک سو آٹھ) میں شبستان خاک کو ضیا بخشی۔ (۴۹۵)

حافظ سید عبداللہ قدس اللہ سرہ العزیز

زاد بوم موضع کھڑی (متصل بارہ) ضلع مظفر نگر۔ عہد طفولیت میں سایۂ والدین جدا ہوگیا۔ دنیائے ناپائیدار کی یہ پہلی بے وفائی درس عبرت ہوئی۔ داعیۂ خدا طلبی نے ترک وطن اور صحرانوردی پر آمادہ کر دیا۔

اطراف پنجاب کے ایک شاداب صحرا میں ایک خدا رسیدہ قاری صاحب نے مسجد بنا رکھی ہے۔ انسان کے شور وشغب اور دنیاوی جھگڑوں سے علیحدہ اس بیابان کی مسجد کو نشیمن بنائے ہوئے ہیں۔ رزاق حقیقی پر توکل ذریعہ معاش ہے۔ مشغلۂ بادیہ پیمائی نے جویاء حق عبداللہ کو اس مسجد تک پہنچادیا۔ یہ بیابان کی مسجد اور وہاں فرشتہ خصلت قاری صاحب گویا تارک دنیا عبداللہ کی تمنا مجسم ہو کر نمودار ہوگئی۔

سید عبداللہ قاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بیعت کی درخواست کی۔

قاری صاحب: ارشاد وتلقین دوسروں کا حصہ ہے۔ مجھے قرآن پاک یاد ہے، تم بھی یہی دولت حاصل کرلو۔

سید عبداللہ کی تمناؤں کی یہ پہلی کڑی تھی۔

کچھ دن نہ گزرے تھے کہ سید عبداللہ، حافظ قاری سید عبداللہ ہوگئے۔

صبح کا سہانا وقت ہے۔ افق آسمان کی پیشانی پر سنہری کرنوں کی سراسری، فضاء آسمان کو عروس دلربا بنائے ہوئے ہے۔ قدرت کی نیرنگیوں پر کلیاء رنگ برنگ مسکرا رہے ہیں۔ طائران خوش الحان مصروف تسبیح ہیں۔ سید استاد اور شاگرد کلام پاک کے دور میں مصروف ہیں۔ استغراق اور انہماک نے حسب عادت حضرت قاری صاحب کی آنکھوں کو خوابیدہ بنادیا ہے۔

ایک باوجاہت، باوقار، مقدس صورت سردار گویا سرتا پا نور، اس کے جلو میں عربی وضع سبز پوش، ادب اور تہذیب کے پیکر "مقدس نفوس" کی جماعت نمودار ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر قاری صاحب کی قراءت کو خاموشی سے سنتی ہے۔ نشاط ومسرت کے آثار ان بزرگوں کے مقدس چہروں سے نمایاں ہوتے ہیں۔ رئیس جماعت کی مبارک زبان سے "بارک اللہ ادیت حق القرآن"(۴۹۶) کے پیارے الفاظ ادا ہوتے ہیں۔ پھر یہ جماعت واپس ہوجاتی ہے۔

اس جماعت کی جلالت و عظمت نے سید عبداللہ پر اثر ڈالا۔ وہ کھڑے ہو گئے مگر احترامِ قرآن کا ادب گفتگو کرنے سے مانع ہوا۔

قاری صاحب کی پرکیف قراءت جاری رہی۔ یہاں تک کہ سورت ختم ہوئی۔ ختم سورت کے بعد حضرت قاری صاحب نے چشم نم سے ان کی طرف دیکھا۔ شاگرد نے خطاب فرمایا۔ یہ کون حضرات تھے جو اس وقت آئے تھے۔ ان کی عظمت و جلالت سے میرا دل کانپ گیا۔ مگر ادبِ قرآن ان کے احترام سے مانع ہوا۔

میاں عبداللہ یہ معصوم حضرات تھے۔ جب ان کے سردار قریب پہنچے تو میرے لئے بیٹھے رہنا ناممکن ہو گیا۔ ان کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔

استاد شاگرد یہی تذکرہ کر رہے تھے کہ اسی وضع قطع کے ایک اور صاحب تشریف لاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ سرورِ کائنات آج شب اپنے اصحاب سے فرما رہے تھے اس صحرا میں جو حافظ صاحب رہتے ہیں، ان کا قرآن پاک سننے کے لئے صبح کو جائیں گے۔ کیا حضرت موجودات یہاں تشریف لائے تھے؟ اب کہاں تشریف لے گئے۔

استاد و شاگرد نشۂ نشاط اور جذب اشتیاق سے بے خود ہیں۔ فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ صحرا کو چھان ڈالتے ہیں۔ مگر یہ جستجو درحقیقت سکر اور اضطراب شوق ہے ورنہ کہاں سرور کائنات اور کہاں جنگل کی جھاڑیاں۔

سیدنا ولی اللہ صاحب انفاس العارفین میں اپنے والد ماجد سے اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں میرا خیال یہ ہے کہ حضرت والد ماجد قدس اللہ سرہ العزیز نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اس واقعہ کے بعد ایک عرصہ تک یہ صحرا ایک عجیب و غریب خوشبو سے معطر رہا۔ بہرحال حافظ سید عبداللہ صاحب نے حضرت قاری صاحب کی برکت سے حفظ کلام اللہ اور قراءت و تجوید کے ساتھ تجرید و تفرید، ترک دنیا اور نفس و شیطان کی مضرتوں سے محفوظ رہنے کے آداب اور طریقے بھی سیکھ لیے۔ اس کے بعد حضرت قاری صاحب نے حافظ عبداللہ صاحب کو رخصت کیا اور فرمایا۔ جاؤ تلاش کرو جہاں کوئی صاحب ولایت مل جائے اس کی خدمت میں پوری جدوجہد کرو۔ حافظ عبداللہ صاحب اسی تلاش و جستجو میں سامانہ پہنچے، جہاں حضرت شیخ ادریس صاحب قادری فروکش تھے۔ حافظ عبداللہ صاحب نے ان کی خدمت میں حاضری کی درخواست کی۔ شیخ ادریس صاحب نے فرمایا۔ آپ کہیں اور تشریف لے جائیے۔ دنیا میں درویش بہت ہیں۔ میرے پاس تو وہی رہ سکتا ہے جو زندگی میں مردہ ہو چکا ہو، اور کھانے، پینے، لباس، پوشاک اور آمیزش خلق سے کلیتہً منقطع ہو چکا ہو۔ حافظ صاحب نے یہ تمام شرطیں منظور کیں اور حضرت شیخ سے توکل کو سرمایہ بنا کر وہیں ڈیرہ ڈال دیا۔ شیخ ادریس صاحب نے نوجوان عبداللہ کی یہ استقامت دیکھی تو دل و جان سے ان کی تربیت پر متوجہ ہو گئے۔ شیخ ادریس صاحب کے فرزند ارجمند قرآن شریف پڑھتے تھے۔ یہ خدمت حافظ عبداللہ صاحب نے اپنے ذمہ لی۔ جو شیخ کے ساتھ مزید تعلق کا سبب بن گئی۔

حافظ سید اللہ صاحب کا بیان ہے کہ میرا طریقہ تھا کہ میں آنے جانے والے حضرات کی سہولت کے لئے استنجے کے ڈھیلے توڑ کر اور پتھر پر گھس کر رکھ دیا کرتا۔ ایک مرتبہ میرے دل میں اس خدمت سے ایک قسم کا ناز پیدا ہوا۔ جب میں حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت شیخ نے فرمایا:

تم میرے بدن پر کچھ داغ زخموں کے دیکھتے ہو۔

جب میں مرید ہوا تو ایک عرصہ تک حضرت مرشد کے استنجے کے لئے ڈھیلے اپنے بدن سے رگڑا کرتا، اور اس میں مجھے لذت محسوس ہوا کرتی تھی۔ یہ داغ انہیں زخموں کے ہیں، جو ڈھیلے رگڑنے سے پیدا ہو گئے تھے۔

حافظ سید عبداللہ قدس اللہ سرہ العزیز ہر پنجشنبہ کو شیخ مرشد اور اُن کے گھر والوں کے کپڑے ندی نالے پر لے جاتے اور اُن کو دھو کر لایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ اتفاق تھا۔ جب کپڑے لے کر ندی پر پہنچے تو تمازت آفتاب کی برداشت نہ ہو سکی۔ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

حافظ صاحب کا بیان ہے کہ ایک برقعہ پوش بزرگ پہنچے اور مجھے بیدار کیا۔ گرم گرم روٹیاں نکال کر مجھے دیں۔ میں نے کھانی شروع کر دیں۔ ندی کا پانی گرم تھا۔ خیال آیا کہ ٹھنڈا پانی بھی ہو۔ اس بزرگ نے برقعہ کے اندر سے ٹھنڈے پانی کا کوزہ نکال کر مجھے دیا۔ میں نے سیر ہو کر پیا، اور خدا کا شکر ادا کیا۔ کپڑے دھونے اور سکھانے کے بعد جب حضرت شیخ کی خدمت میں واپس پہنچا تو مجھے دیکھتے ہی فرمادیا۔

سیدا! نان از دست خضر گرفتید۔ محمدیاں را باید کہ منت خضر را قبول نہ کنند۔ (۳۹۷)

شیخ ادریس حضرت مجدد صاحب کے ہمعصر تھے۔ جب حضرت مجدد صاحب کے کمالات کی شہرت ہوئی تو آپ نے حضرت مجدد صاحب کی خدمت میں کہلا کر بھیجا:

زمین، آسمان، دوزخ، جنت غرض جس پر نظر ڈالتا ہوں، اس کو معدوم پاتا ہوں حتیٰ کہ اپنے وجود کو بھی معدوم پاتا ہوں۔ صرف ایک ذات حق جل مجدہ ہے اور وہ بے پایاں۔ علماء طریقت نے اس کیفیت کو مدارج سلوک کی انتہا قرار دیا ہے جناب کا خیال کیا ہے؟

حضرت مجدد صاحب نے جواب میں تحریر فرمایا:

یہ قلب کی ایک عارضی کیفیت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص نے مقامات قلب میں سے ابھی ایک چوتھائی کو طے کیا ہے، تین درجے اور باقی ہیں (اس کے بعد مقامات قلب کی تفصیل فرمائی ہے)۔ (۳۹۸)

شیخ ادریس نے جب حضرت مجدد صاحب کا جواب مطالعہ کیا، تو احترام کے ساتھ مجدد صاحب کی زیارت کا اشتیاق پیدا ہوا، لیکن کچھ مواقع ایسے پیش آئے کہ حضرت مجدد صاحب کا دور ارشاد ختم ہو گیا، اور شیخ ادریس اپنا اشتیاق پورا نہ کر سکے۔ پھر اسی کے شوق حضرت شیخ آدم قدس اللہ سرہ العزیز سے کاہ بگاہ حل کرتے رہے۔ جب حضرت شیخ ادریس کی وفات ہو گئی تو حضرت سید حافظ عبداللہ صاحب کو جاذب سعادت نے حضرت شیخ آدم کی خدمت میں پہنچایا۔ جہاں سلسلۂ آدمیہ مجددیہ کا خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

سید عبداللہ صاحب کے چچا حضرت سید عبدالرحمٰن پہلے سے حضرت شیخ آدمؒ سے منسلک تھے۔ اب یہ چچا بھتیجے ہمراہ رہنے لگے۔ ایک سلسلہ کی شاہراہ مستقیم پر تگاپو شروع کردی۔ چنانچہ حضرت شیخ آدم کے مکتوبات میں ان دونوں کے نام ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔

سید عبداللہ صاحب روحانی کمالات کی برتری اور انتہائی بلندی کے باوجود اپنی وضع قطع اور اپنا طرز عام مسلمانوں جیسا رکھتے تھے۔ صورت دیکھ کر ان کے رتبہ عالی کو شناخت کرلینا مشکل تھا۔

خدمت خلق کے شوق کا یہ عالم تھا کہ بوڑھی عورتوں کے مکانات پر جاجا کر اُن کے لئے پانی بھر دیتے، بازار سے اُن کا سودا لا کر دیا کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ باندیوں یا غلاموں کے مالک جو کام باندیوں یا غلاموں کو بتاتے اس کو آپ اُن سے لے لیتے اور خود کردیتے، اور اُن کو ہدایت فرمادیتے کہ میرا نام نہ لینا۔ ممکن ہے تمہارے مالک تم پر خفا ہوں۔

جب حضرت شیخ آدمؒ کی خدمت میں پہنچے تو اشتیاق ہوا کہ خانقاہ معلّی کی کوئی خدمت اپنے ذمہ لیں۔ مگر وہاں تمام خدمات احباب طریقت اپنے ذمہ لئے ہوئے تھے۔ ایک عرصہ تک انتظار کیا۔ پھر دیکھا کہ جن صاحب کے ذمہ یہ تھا کہ لکڑیاں چُن کر لائیں، وہ ضعیف و کمزور ہیں۔ بڑی خوشامد کے ساتھ اُن سے التجا کی کہ یہ خدمت میرے سپرد ہو۔ بہت اصرار کے بعد انہوں نے منظور فرمالیا، چنانچہ لکڑیاں چُن کر لانے کی خدمت کے عرصہ تک آپ ہی ذمہ دار رہے۔ جب حضرت شیخ آدم شاہجہانی حکم سے حجاز مقدس تشریف لے جانے لگے تو حضرت سید عبداللہ صاحب نے رفاقت کی درخواست کی۔ مگر منظور نہ ہوئی، اور ہندوستان میں رہ کر طریقہ کی خدمت سپرد فرمائی گئی۔ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب حضرت شاہ ولی اللہ کے والد ماجد جب آپ سے بیعت ہوئے تو حضرت حافظ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ معلوم ہوا کہ حضرت شیخ نے مجھے ہندوستان میں آپ کی تربیت کے لئے ہی چھوڑا تھا۔ جس زمانہ میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب اکبرآباد (آگرہ) میں مرزا زاہد سے کتب منطق پڑھا کرتے تھے۔ حضرت سید عبداللہ صاحب نے عالم قدس کا رخ کیا۔

حضور ہونے کے باعث آپ نے شادی نہیں کی۔ خمول اور پوشیدگی کا ذوق اس قدر غالب تھا کہ وصیت فرما دی کہ گور غریباں میں دفن کیا جائے۔ پھر یہ آپ کی کرامت تھی کہ لوگوں کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ حافظ صاحب کی قبر کون سی ہے۔

چند روز بعد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ایک ایسے شخص کو اپنے ہمراہ قبرستان میں لے گئے جو حضرت سید صاحب کے دفن میں شریک تھا۔ اس کو بھی یاد نہ رہا کہ حضرت سید صاحب کی قبر کون سی ہے۔

قاضی محب اللہ بہاریؒ (۴۹۹)

بحرے است از علوم و بدرے است مبین النجوم۔ (۵۰۰) جائے ولادت محب علی پور از لواحق صوبہ بہار۔
عنفوان شباب میں دیار پورب کی سیاحت کی اور جابجا چیدہ چیدہ حضرات سے ابتدائی اور درجات وسطی کی کتابیں پڑھیں۔ آخر میں سید قطب الدین شمس آبادی (۵۰۱) کی خدمت میں پہنچے اور اس قطب والا درجات کی رہنمائی سے درجات تکمیل طے کیے زیور فضائل سے آراستہ ہوکر دکن کی جانب سفر کیا، اور بارگاہ خلد مکاں (عالمگیر بادشاہ) میں باریاب ہوکر لکھنؤ کے منصب قضاء پر فائز ہوئے۔ تھوڑے دنوں بعد اس منصب سے معزول ہوکر دوبارہ دکن کا رخ کیا اور حیدرآباد کے منصب قضاء کی خدمت پر مامور اور سرفراز ہوئے لیکن کسی خاص سبب سے معتوب ہوکر یہاں سے بھی معزول ہوگئے۔ کچھ ارکانِ دولت عالمگیری کی سفارش سے عتاب سے نجات پاکر شاہزادہ رفیع القدر (ابن شاہ عالم بن اورنگ زیب) کے اتالیق مقرر ہوئے۔

جب شاہ عالم پیش گاہ خلافت سے صوبہ قابل کی گورنری پر مامور ہوئے تو قاضی محب اللہ صاحب شاہزادہ کے ہمرکاب کابل پہنچے۔

حضرت سلطان عالمگیرؒ کی وفات کے بعد جب شاہ عالم سلطنت مغلیہ کے فرماں روا اعظم اور مختار مطلق شہنشاہ ہوکر ہندوستان واپس آئے، تو قاضی صاحب کا اختر اقبال بھی اوج جلال پر پہنچا۔ جملہ ممالک محروسہ کی صدارت اور فاضل خاں کے پرہیبت خطاب سے آپ کے فخر ومباہات میں چار چاند لگائے گئے۔ مگر عمر نے وفا نہ کی ۱۱۱۹ھ (ایک ہزار ایک سوانیس) میں شاہ عالم اکبرآباد پہنچے۔ اور قاضی صاحب منصب حیات سے ہمیشہ کے لئے معزول ہوگئے۔

سلم العلوم منطق میں، مسلم الثبوت اصول فقہ میں، رسالہ جوہر فرد مسئلہ جزولا یتجزیٰ میں آپ کی طبع وقاد کے نتائج ہیں۔

سید محمدی قدس سرہ

ابن سید بدیع الدین عرف سید نتھا بن سید تاج الدین حجرہ نشین قدس اللہ سرہ بلگرامی تحصیل علوم ظاہری و تکمیل ملکاتِ باطنی کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ ابن سلطان عالمگیرؒ کی رفاقت اختیار کی۔ شاہ عالم آپ کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔ ایک مرتبہ خلوت میں شاہ عالم بادشاہ سے باتیں ہورہی تھیں۔ آپ نے اثناء کلام میں بادشاہ کے زانو پر بے تکلفی سے ہاتھ رکھ دیا۔ ''ناظر مجلس'' جو موجود تھا، اس نے تنبیہ کی کہ بادشاہ کے ساتھ گفتگو کے وقت یہ بے تکلفی خلاف ادب ہے۔ بادشاہ نے ناظر کو منع فرمایا کہ اہل اللہ کی شان جدا ہے۔ بقول مولانا آزاد:

بسیار عالی مشرب بلند حوصلہ بود وقوت باطن بدرجہ کمال داشت۔ ہر صاحبدلے کہ با او برے خورد، مطیع و

معتقدا ے گشت۔ (۵۰۲)

۱۱۳۰ھ (ایک ہزار ایک سو تیس) میں آپ کی وفات ہوئی۔ بلگرام میں مزار ہے۔

شیخ غلام نقشبند لکھنوی قدس اللہ سرہٗ (۵۰۳)

بقول علامہ آزاد بلگرامی:

علامہ ایست جامع عجائب وغرائب علوم۔ وخدار سے ست۔ خازن اسرار معلوم ومکتوم وطن اصلی قصبہ گھوسی ضلع جونپور۔

والد ماجد شیخ عطاء اللہ نے حضرت شاہ نقشبند کے روحانی اشارہ کے بموجب غلام نقشبند نام رکھا۔

میر محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ العزیز (۵۰۵) سے کسب کمالات کیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں تحصیل علوم سے فارغ ہوگئے۔

ابتداء میں ایک مرتبہ رسول اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ دیکھا کہ سرور کائنات اپنے دست مبارک سے آپ کی اچکن کے بٹن کھول رہے ہیں۔ فوراً تعبیر ذہن میں آئی کہ علم کے دروازے کھل جائیں گے۔ اسی کی برکت تھی کہ آپ کے علم وتقویٰ کی شان اس قدر بالا ہوئی کہ خود آپ کے شیخ میر محمد شفیع آپ کا بہت احترام کرتے تھے۔ حتیٰ کہ جب حضرت میر محمد صاحب کی وفات ہوئی تو آپ کے متوسلین نے طے کرلیا کہ حضرت میر محمد شفیع صاحب کو آپ کا جانشین بنایا جائے گا۔ چنانچہ اسی غرض سے آپ کو دہلی سے لکھنؤ بلایا گیا۔ آپ لکھنؤ تشریف لائے۔ سجادہ خالی تھا۔ ایک تاریخ مقرر کی گئی۔ عمائدین لکھنؤ تشریف لائے۔ لیکن جب دستار خلافت آپ کو پیش کی گئی تو آپ نے نہایت ادب سے اس کو حضرت غلام نقشبند کے سر پر آراستہ کردیا، اور نجاجت کے ساتھ اس کی منظوری کی فرمائش کی۔ عمائدین لکھنؤ نے بھی حضرت میر صاحب کی تجویز پر عمل کیا مگر یہ ایک ایسا فعل تھا جس کی اطلاع اس سے پیشتر خود غلام نقشبند صاحب کو بھی نہ تھی۔ بہرحال شیخ غلام نقشبند اپنے شیخ کے مرشد کے جانشین تسلیم کئے گئے۔ اور پھر آپ نے اس جانشینی کا پورا حق ادا فرمایا۔ علوم ظاہری اور باطنی کے طلبہ کے لئے آپ مرجع اور ملاذ بنے۔ اور:

جہانے را بیمن تربیت کمالات جنتین گراں مایہ ساخت۔ سلسلہ اکثر فضلاء عصر بآنجناب منتہی مے شود۔

آپ کی تمام تر توجہ حفظ شریعت میں مصروف رہتی۔ الحب للہ اور البغض للہ کے بموجب جس سے بھی خلاف شریعت کوئی حرکت سرزد ہوتی، آپ اس کو تنبیہ فرماتے۔ پھر اگر اس کو توبہ کی توفیق ہوتی تو پہلے سے زیادہ مورد عنایات ہوتا۔ شاہ عالم بادشاہ نے آپ کو تشریف آوری کی تکلیف دی اور حد سے زیادہ اعزاز واکرام کیا۔

تمیں ۳۰ رجب ۱۱۲۶ھ (ایک ہزار ایک سو چھبیس) کو آپ کی وفات ہوئی۔ قرآن پاک کی متعدد سورتوں کی آپ نے علیحدہ علیحدہ تفسیر قلمبند کی۔ اس کے علاوہ تصوف وغیرہ میں بھی تصانیف یادگار چھوڑیں۔

شیخ احمد عرف ملا جیون امیٹھویؒ

بن شیخ ابو سعید، بن عبد اللہ بن عبد الرزاق، بن مخدوم خاصہ قدس اللہ سرہ العزیز۔

مخدوم خاصہ قصبہ امیٹھی (۵۰۵)مشہور بزرگوں میں سے تھے۔ آپ کا نسب شریف سیدنا صدیق اکبرؓ سے وابستہ ہے۔

ملا جیون قصبہ امیٹھی میں پیدا ہوئے۔ پورب کے متفرق قصبات میں رہ کر فضلاء عصر سے استفادہ علوم کیا۔ آخر میں ملا لطیف اللہ کوروی سے سند فراغت حاصل کی۔

کشش طالع نے آپ کو عالمگیر تک پہنچایا۔ عالمگیر نے آپ کے سامنے زانوے تلمذ طے کیا، اور پھر تمام عمر حد سے زیادہ اعزاز و احترام کرتا رہا۔ اسی طرح شاہ عالم خلف عالمگیر بھی آپ کے سامنے لوازم تکریم بجالاتا تھا۔

ملا صاحب سادہ وضع تھے۔ تکلفات رسمی سے قطعاً بیگانہ۔ مگر حافظہ نہایت قوی تھا۔ کتب درسی کی عبارتوں کے پورے پورے ورق حفظ یاد تھے۔ بڑے بڑے قصیدے ایک مرتبہ سننے سے یاد ہو جاتے۔ آپ کے تبحر علمی کے متعلق آزاد بلگرامی کے الفاظ یہ ہیں:

حاصل کلام الٰہی و در دانش عقلی و نقلی بحر لا متناہی۔

تمام زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں صرف کی۔

زیارت حرمین شریفین کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ تفسیر احمدی اور نور الانوار آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ ۱۱۳۰ھ (ایک ہزار ایک سو تیس) میں کاشانہ فردوس کو نشیمن بنایا۔ نعش مبارک دہلی سے امیٹھی لے جا کر دفن کی گئی۔ رحمۃ اللہ علیہ و قدس سرہ

تفاوتِ مراتب

مقام مجددیت خلفاء مجددی، اور معاصرین کرام

دور مجددی کے چند معاصرین کا ذکر مبارک سپرد قلم ہوا۔ بہت سے حضرات کا ذکر باقی رہ گیا۔ نہ وقت میں اتنی گنجائش ہے، نہ اوراق کتاب میں اس قدر وسعت۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

سینکڑوں کتابوں کے ہزاروں اوراق ان حضرات کے دلچسپ تذکروں سے پر ہیں۔ جن کو پڑھ کر قلب پر ایک عجیب عالم وجد و محویت طاری ہو جاتا ہے، اور بے اختیار دل چاہتا ہے کہ ساری باتوں کو چھوڑ کر صرف انہیں پاکانِ حق کا ذکر کیجئے۔

خوش دلکش ست قصہ خوبان روزگار تو یوسفی و قصہ تو احسن القصص

صدیاں گزر گئیں۔ عشاقِ حق کے ذکر میں آج بھی یہ تاثیر ہے۔ نہیں معلوم ان کی پاک صورتوں اور پاک صحیفوں کی گہرائیوں اور دل ربائیوں کا کیا حال ہوگا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت ست بر جریدہ عالم دوام ما

جن معاصرین کا ذکر کیا گیا۔ وہ نہایت اجمال کے ساتھ۔ خطرہ ہے کہ ان پاک روحوں کو اس کوتاہ نویسی کی شکایت نہ ہو۔

دور مجلسے کہ یاراں شرب مدام کردند چوں نوبت بما شد آتش بجام کردند

خیر یہ تو ایک حقیر تحریر پر بے جا ناز و تبختر ہے واقعہ تو یہ ہے:

من ہیچم و کم زہیچ ہم بسیارے وز ہیچ و کم زہیچ نیاید کارے

البتہ ناظرین کو بجا سوال پیدا ہوگا کہ جب ان پاک بازان عشقِ مولیٰ کی زندگیاں بھی ریاضت، جفاکشی، مجاہداتِ فی سبیل اللہ، اعلانِ حق، تلقین و ارشاد وغیرہ وغیرہ کے گلہائے رنگارنگ سے رشکِ چمن و گلشن بنی ہوئی ہیں۔ تو پھر حضرت مجدد صاحب کی اتنی تعریف و توصیف اور مخصوص طور پر آپ کے لئے خطابِ مجددیت کا سبب کیا ہے۔

صفحاتِ سابق میں لفظ مجدد، معنی مجدد اور ضرورتِ مجدد پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ سطورِ ذیل میں اس مقام و حیثیت کی تشریح منظور ہے جو ایک مجدد کو اپنے اقران و امثال پر ممتاز کر دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ اُمت خیر الامم جس نے افضل الانبیاء کی دعوتِ نبوت پر اجابت و قبولیت کی سعادت حاصل کی اور رب العلمین کے وہ پاک بندے جن کو کتابِ الٰہی کی وراثت کے لئے منتخب کیا گیا۔ وہ تین طبقوں پر منقسم ہے: (۵۰۶)

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُo (فاطر آیہ ۳۲)

پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے جن کو منتخب کر لیا تھا، ان کو کتاب کا وارث بنایا۔ پس کچھ تو ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں (حق انتخاب کو ادا نہیں کرتے) اور کچھ معتدل ہیں اور کچھ بندے افعالِ خیر اور اعمالِ نیک پر سبقت کرنے والے ہیں۔ اللہ کے حکم سے یہ سبقت اور جھپٹنا ہی فضلِ کبیر ہے۔

وارثینِ کتاب کے طبقاتِ ثلاثہ میں یہ تیسرا طبقہ وہ اعلیٰ اور ارفع طبقہ ہے جو وصول الی الحق ہی پر قانع نہیں ہوتا، بلکہ جادۂ حق میں سب سے آگے نکل جانا اور بڑھ جانا چاہتا ہے۔

یہی مقام ہے جو ایک دوسری تقسیم میں مرتبۂ صالحین سے مرتفع ہو کر مرتبہ شہداء یعنی شاہدینِ حق تک پہنچتا ہے اور پھر مرتبۂ صدیقیت تک پہنچ کر انسانیتِ کبریٰ کے آخری نقطۂ علو و ارتفاع و مرکز دائرہ نوعِ انسان و مبداء،

کمال وارتقاءِ بشری یعنی مقامِ نبوت سے ملحق ہو جاتا ہے۔ پس کائنات ارضی اور نوعِ انسانی میں جماعت "مَنْ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ" ان چار قسموں سے باہر نہیں۔

اَلَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ

وہ پاک بندے جن پر خداوند عالم نے انعام فرمایا۔ یعنی انبیاء صدیقین، شہداء اور صالحین۔

یوں تو عام طور پر یہ حقیقت واضح فرمادی گئی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَھُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا اَبَدًا ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْکَبِیْرُ o

جو ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان کے لئے وہ جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں چل رہی ہیں۔ یہ ہمیشہ ہمیشہ انہیں باغات میں رہیں گے۔ یہی ہے "فوز کبیر" یعنی بہت بڑی کامیابی۔

لیکن طبقات ثلاثہ کا تیسرا طبقہ جو سبقت بالخیرات میں سابقین پر بھی بازی لے جاتا ہے۔ ان کو اس فوز کبیر سے آگے تقرب حضرت حق جل مجدہ سے نوازا جاتا ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ.

سبقت کرنے والوں پر بھی سبقت کرنے والے، یہی ہیں جنات نعیم میں مقرب۔

یہی سبقت بالخیرات باذن اللہ ہے جس کو قرآن حکیم میں عزمِ امور فرمایا گیا۔

اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ.

پھر عزمِ اُمور ہی کی وہ تقسیم ہے جس نے ایک دوسرے میدان میں اصحاب عمل کو دو جماعتوں میں منقسم کر دیا، اور دوسرے نے پہلے سے اعلیٰ اور ارفع مرتبہ پایا۔

لَا یَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَالْمُجٰھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ

اہل ضرر (یعنی محتاجوں اور اپاہجوں) کے علاوہ وہ مسلمان جو جہاد میں حصہ نہیں لیتے اُن مسلمانوں کے برابر نہیں جو اپنے مال اور اپنی جانوں سے راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں۔

اور اگرچہ یہ دونوں جماعتیں مومنین اور صادقین کی ہیں، اور اللہ نے ہر ایک سے حسنیٰ کا وعدہ کیا ہے۔ کُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی۔ لیکن:

فَضَّلَ اللّٰہُ الْمُجٰھِدِیْنَ عَلَی الْقٰعِدِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا

غیر مجاہدین کے مقابلہ پر اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو بڑے اجر کی فضیلت عطا فرمائی ہے۔

اور پھر اسی عزیمت اور سابقیت بالخیرات کے بنیادی فرق نے مجاہدین فی سبیل اللہ میں سے بھی منفقون قبل الفتح (فتح مکہ سے پہلے خرچ کرنے والوں) کو منفقون بعد الفتح پر فضیلت بخشی کہ ساری بڑائی سب سے قدم

اُٹھانے والے کے لئے ہے، نہ کہ دوڑتے ہوؤں کو دیکھ کر دوڑنے والوں کے لئے۔ اگرچہ چلنے والے قدم بہرحال بیٹھے ہوؤں پر فضیلت رکھتے ہیں۔

لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ط اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَۃً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ط وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی ط

تم میں سے کوئی بھی ان کی برابری نہیں کر سکتا جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے خرچ کیا اور جنگ کی۔ یہ لوگ درجہ میں بہت بڑھے ہوئے ہیں اُن کی بہ نسبت جنہوں نے فتح مکہ کے بعد خرچ کیا اور جہاد کیا اور ہر ایک سے اللہ تعالیٰ نے بھلائی کا وعدہ فرمایا ہے۔

بہرحال پاک سرشتان نیکوکار اور وارثان کتاب اللہ کے چند طبقات قرآن حکیم کی مذکورہ بالا آیات نے ہمارے سامنے پیش فرما دیئے ہیں۔

ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ

اپنے نفس پر ظلم کرنے والے (فاسق فاجر)

خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ آخَرَ سَیِّئًا یعنی مُقْتَصِدٌ سَابِقُوْنَ بِالْخَیْرَاتِ

وہ لوگ جنہوں نے ایک نیک کام اور دوسرے برے کام کو ملا رکھا ہے۔ یعنی معمولی رفتار سے چلنے والے، اچھے کاموں پر جھپٹنے والے اور سبقت کرنے والے۔

اَلسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ

سبقت کرنے والوں پر بھی سبقت کرنے والے۔

طبقات عاملین بالخیر کی توضیح و تشریح متعدد احادیث میں فرمائی گئی ہے۔ از انجملہ مسلم شریف کی یہ حدیث ہے:

ما من نبی بعثہ اللّٰہ فی امتہ من قبلی الا کان لہ فی امتہ حواریون واصحاب یاخذون بسنتہ ویقتدون بامرہ. ثم انھا تخلف من بعد ھم خلوف یقولون مالا یفعلون ویفعلون مالا یؤمرون فمن جاھد ھم بیدہ فھو مؤمن ومن جاھد ھم بلسانہ فھو مؤمن ومن جاھد ھم بقلبہ فھو مؤمن (لیس وراء ذلک من الایمان حبۃ خردل. (او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم)

''یعنی سنت الٰہی یہی ہے کہ ہر نبی اپنے ساتھیوں اور تربیت یافتہ یاروں کی ایک جماعت اُمت میں چھوڑ جاتا ہے۔ یہ جماعت حواری یا اصحاب کے لقب سے ملقب ہوتی ہے اور درس گاہ نبوت کی سب سے پہلی تعلیم یافتہ جماعت ہوتی ہے۔ یہ لوگ نبی کی سنت کو قائم رکھتے اور ٹھیک ٹھیک اس کی پیروی کرتے ہیں۔ یعنی شریعت الٰہی کو جس حال اور جس شکل میں نبی چھوڑ گیا ہے اُس کو بعینہٖ محفوظ رکھتے ہیں اور اس میں ذرا بھی فرق آنے نہیں دیتے۔ لیکن ان کے بعد بدعات و فتن کا دور آتا ہے اور ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو اسوۂ نبوت سے منحرف ہو جاتے ہیں

۔ان کا فعل ان کے دعوے کے خلاف ہوتا ہے، اور ان کے کام ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے شریعت نے حکم نہیں دیا۔ سو ایسے لوگوں کے خلاف جس نے قیام حق وسنت کی راہ میں اپنے ہاتھ سے کام لیا وہ مومن ہے۔ جو ایسا نہ کر سکا مگر زبان سے کام لیا وہ بھی مومن ہے جس سے جہاد لسانی بھی نہ ہو سکا، صرف دل کے اعتقاد اور نیت کے ثبات کو ان کے خلاف کام میں لایا وہ بھی مومن ہے لیکن اس آخری درجہ کے بعد ایمان کا کوئی درجہ نہیں"۔

اس حدیث میں تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ اصحاب عزیمت کا۔ دوسرا اصحاب رخصت کا۔ تیسرا ضعفاء طریق کا۔ وذلک اضعف الایمان ۔ اور اس آخری درجہ پر ایمان کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔ لیس وراء ذلک حبة خردل من الایمان ۔

یہاں ذکر اگرچہ صرف مبتدعین ومحرفین شریعت کے برخلاف جہاد ید ولسان کا ہے (۵۰۷) لیکن اصل تقسیم اس میں محدود نہیں۔ مقصود نفس عزیمت اور اسبقیت بالخیرات ہے۔ اور یہ کہ ہر میدان علم وعمل میں ایک درجہ عزیمت کا، ایک رخصت کا اور ایک ضعف وانحطاط کا ہوتا ہے۔ البتہ اس تقسیم کا سب سے بڑا میدان عمل مقام دعوت وتبلیغ حق ہے۔ یعنی قیام امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔ مبتدعین فی الدین اور اعداء حق واسلام کا مقابلہ۔ احیاء سنت واخماد بدعت۔ علوم نبویہ اور اسرار حکمۃ شرعیہ کا کشف واظہار۔ یعنی وہ فضل وامتیاز کی وادی اور وہ عقبۂ آزمائش ہے جس میں اصحاب طریق کے ادبار واقدام کا فیصلہ ہوتا ہے، اور مدارج ایمانیہ اور مراتب علمیہ وعملیہ کے جوہر کھلتے اور امتیاز پاتے ہیں۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ

در مدرسہ کس را نہ رسد دعوئے توحید ... منزل گہ مردان موحد سر دار است

پس پہلا درجہ ہر حال میں السابقون السابقون اور مجاهدون بالعمل والجوارح کا ہے جو تمام جماعتوں پر شرف اور حریت رکھتے ہیں۔ اور ضعفاء طریق تو ان کے جولان کمال کی گرد وغبار بھی نہیں پا سکتے اور پھر جس طرح ہر قسم وجماعت میں حسب حال واستعداد فرق مراتب ومعارج ہوتا ہے۔ اسی طرح سابقون بالخیرات کے بھی مختلف مراتب ومقامات ہیں اور کتاب وسنت نے ان کے حالات وعلامات بیان کئے ہیں۔ از انجملہ سب سے اعلیٰ اور افضل طبقہ ان اخص الخواص مزکی کا ہے، جن کو تائید توفیق الٰہی اور سائق فیضان ربانی عزائم امور کے لئے چن لیتا ہے۔ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔

اور جن کا نور علم وعمل مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ اور جن کا قدم طریق ومنہاج نبوت پر واقع ہوتا ہے، انہیں افراد خاصہ کو حدیث بخاری میں محدث (بالفتح) کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ اور یہی مورد ومصداق حدیث مجدد کے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کا وجود فی الحقیقت نظام حق وہدایت کا مقوّم ومنظم ہے، اور انبیاء کرام کی اصلی روایت انہیں میں منتقل ہوتی ہے۔

البتہ یہ مقام از بس اعلیٰ وارفع ہے، اور ہر عہد اور دور میں صرف چند نفوس عالیہ ہی ایسے ہوتے ہیں جن

قدم ہمت امتحان گاہ مصائب ومہالک سے آگے بڑھ کر وہاں تک پہنچتا ہے، اور اپنے عہد کے سب سے بڑے عمل حق کو انجام دیتا ہے۔ اس کے لئے نہ تو تجرد علم و تدریس کتب کام آتی ہے، نہ رسوم و ہیات زہد و انقطاع۔ نہ مدارس و معاہد دینی کے غلغلہ و ہنگامۂ فضیلت کو اس میں دخل ہے، اور نہ صومعہ و خانقاہ کے گوشۂ انزوا کو۔ ان کے عہد میں علماء و اصحاب مشیخت کی کمی نہیں ہوتی اور کچھ یہ بات بھی نہیں کہ مدرسے اُجڑ جاتے ہوں اور خانقاہیں منہدم ہو جاتی ہوں۔ بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کثرت و شہرت کے لحاظ سے ان کا زمانہ علماء و مشائخ اُمت کا سب سے بڑا مجمع و ماویٰ ہوتا ہے، اور آبادیوں کی آبادیاں اصحابِ علم و پیشوائی سے بھری نظر آتی ہیں۔ تاہم مقام عزیمتِ دعوت و قیام ہدایت کی ان میں سے کسی کو توفیق نہیں ہوتی۔ کوئی دامن رخصت میں پناہ لیتا ہے، کوئی گوشہ انزوا و انقطاع میں اپنی عافیت و حفاظت ڈھونڈھتا ہے، کوئی راہ میں فتنہ و فساد کا شور سُن کر صرف اسی کو کافی سمجھتا ہے کہ اپنا دروازہ بند کر لے۔ کسی پر اضعف الایمان کا درجہ تحول تسفل اس طرح طاری ہو جاتا ہے کہ زبان کو یکسر بہ تنگ اور دست عمل کو ایک قلم شل پاتا ہے۔ اور کسی کو نفس خادع اور خاطر فاسد ضلالت جہل و نفاق میں مبتلا کر کے سرگرم دنیا پرستی و دین فروشی کر دیتا ہے۔ غرض کہ سب کے سب یا تا چار مقام رخصت ہوتے ہیں یا درماندۂ ضعف و بے چارگی یا مدہوش غفلت و ہوا پرستی۔ ان میں سے ایک حصہ غالب تو علماء سوء اور دعاۃ فتن کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور جو جماعت علماء حق کی باقی رہتی ہے وہ بھی ضعف کدہ رخصت سے قدم باہر نہیں نکالتی اور حق پرستی کی بڑی سے بڑی بات اور تقویٰ و طہارت نفس کی بڑی سے بڑی فضیلت یہ سمجھتی ہے کہ اپنے قدم کو لغزش نہ دے۔ اور جب کہ ایک دنیا امواج غفلت و فساد میں ڈوب رہی ہے تو ہم کنارۂ سلامتی پر قدم جمائے باقی رہ گئیں۔ گویا ایمان کا جو سب سے ادنیٰ اور پچھلا درجہ عامہ ناس اور ضعفاء عمل کے لئے تھا، وہی خواص اُمت اور مرشدین ملت کے لئے بلندی و عروج کا سب سے اُونچا مقام ہو جاتا ہے۔ اور سب سے بڑا متقی انسان وہ ہو جاتا ہے جس کے قدم جہاد بالقلب کی پائیں بساط سے پیچھے نہ ہٹیں لیکن کوئی نہیں ہوتا جس کا عزم ایمانی امن و سکون کی جگہ جماعت و اُمت بلکہ نوع و ارض کی نجات کا عشق رکھتا ہو جس کا حوصلۂ کار و عزم راہ صرف اتنے ہی پر قانع نہ ہو جائے کہ خود نہیں ڈوبا۔ کیونکہ یہ تو ضعف و بے چارگی کا سب سے آخری درجہ ہے، فضیلت و کرامت اس میں کیا ہوتی؟ بلکہ ہر وجود کا ڈوبنا اس کے لئے ماتم اور ہر قدم کی ٹھوکر اس کے لئے موت ہو۔ جبکہ دنیا اُس کو سب سے بڑائی سمجھتی ہو کہ خود کنارے پر پہنچ جائیں، تو وہ بتلا دے کہ خود بچنا نہیں بلکہ ڈوبتے ہوؤں کو بچانے کے لئے سمندر میں کود پڑنا بڑائی ہے۔ اور جبکہ لوگ اپنے اپنے دروازے بند کر رہے ہوں تا کہ راہ کے فتنہ و فساد سے محفوظ ہو جائیں تو وہ اپنا دروازہ کھول دے کہ بند کر کے چھپ رہنے میں فضیلت نہیں ہے بلکہ کھول کر باہر نکلنے میں اور اگر باہر امن نہیں ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دروازے کھولنے کا اصلی وقت یہی ہے، نہ کہ بند کرنے کا۔

مقام عزیمت و رخصت کا یہی وہ فرق ہے جو ایک صاحب دل نے خانقاہ کے گوشۂ عزلت سے نکل کر شیخ

شیراز کو بتایا تھا۔

گفت آں گلیم خویش بدر مے برد ز موج　　　وین سعی مے کند کہ ہر آرد غریق را

تو اس وقت ایسا ہوتا ہے کہ سنت الٰہی اپنی عادت جاریہ کے مطابق قیام حق و دفع باطل کے لئے سرگرم انبعاث وظہور ہوتی ہے اور توفیق الٰہی سے کسی اصلح و اشکل بندے کے قلب کا عزیمت و دعوت کے لئے انشراح کر دیتی ہے اور اس کے قدم طریق کو منہاج نبوت پر ثابت و مستقیم فرما دیتی ہے۔ وہ اپنے عہد کے تمام اصحاب علم وفضیلت اور ارباب صوامع و مدارس کو تنگنائے رخصت وضعف میں پیچھے چھوڑ کر منزلوں آگے نکل جاتا ہے۔ فضاء علوء ورفعت اس کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور سماء کمال وکرامت اپنی تمام بلندیوں کے ساتھ اس کے استقبال کے لئے دوڑتا ہے گویا آسمان اس کے لئے اُتر آتا ہے۔ اور زمین اس کو خود بخود اچھالنے لگتی ہے۔ اس کی ہمت رفعت طلب اس کا حوصلہ متصاعد ومتعارج کسی بلندی پر بھی نہیں رکتا اور اونچی بلندیوں کو بھی حضیض، تسفل وتنزل سمجھتا ہے۔

مقام عزیمت دعوت کی بلندی تک بڑے بڑے کارفرمایان عہد کی نظریں بھی نہیں اُٹھ سکتی تھیں، اور ضعفاء زبان وبے چارگان رخصت کے وہم وگمان کو بھی اس تک بار نہ تھا۔ اُس کا شہباز ہمت اور سیمرغ عزم اس کی چوٹیوں پر بھی پہنچ کر دم نہیں لیتا اور پیوستہ سرگرم بال افشانی و ہموارہ صفیر زنان بلند پروازی رہتا ہے۔ و لسان حالہ ینشد بھذا البیت:

بال بکشاء وصفیر از شجر طوبےٰ زن　　　حیف باشد چوں تو مرغے کہ اسیر قفسی

پس اگرچہ اس عہد میں ہزاروں مدعیان کار موجود ہوں مگر اس فضیلت مخصوص میں اس کا کوئی شریک وسہیم نہیں ہوتا۔ صرف اسی کو اس عہد کی اقلیم ہدایت کی سلطانی وفرمانروائی پہنچتی ہے، اور صرف وہی اپنے زمانے کا کلید بردار خزائن برکات وفیضان سماویہ ہوتا ہے۔ تمام اصحاب طریق ناچار ہوتے ہیں کہ اپنے اپنے چراغ اسی مصباح ہدایت سے روشن کریں، اور تمام راہروان جادۂ مقصد مجبور ہوتے ہیں، کہ اسی کے کاروان فضل وقافلۂ کرامت کی بانگ درا پر اپنے اپنے قدم اُٹھائیں۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا　　　ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

ہندوستان کے تین مجدد

حضرت مجدد الف ثانیؒ شاہ ولی اللہؒ شاہ اسمٰعیلؒ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا ابوالکلام صاحب کے ایک تبصرہ سے اس باب کو ختم کیا جائے جو تفاوت درجات کی توضیح کرتے ہوئے تحریر سابق کا خلاصہ اور آئندہ کے لئے تمہید کی حیثیت رکھے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ دعوت کا مقام دوسرا ہے اور عزیمت دعوت کا دوسرا۔ ضرور ضرور نہیں کہ ہر راہرو کی یہاں تک رسائی ہو۔ عہد "ظہور دعوت" میں ہزاروں اصحاب علم و کمال موجود ہوتے ہیں مگر دروازہ کھولنے والا صرف مجدد العصر ہی ہوتا ہے اور اس کے ظہور کے لئے ضروری نہیں کہ عامہ اصحاب علم و حق بالکل معدوم ہو گئے ہوں۔ خود ہندوستان کی تاریخ میں اس کی مثالیں دیکھ لو۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ

شہنشاہ اکبر کے عہد کے اختتام اور عہد جہانگیری کے اوائل میں کیا ہندوستان علماء و مشائخ حق سے بالکل خالی ہو گیا تھا۔ کیسے کیسے اکابر موجود تھے لیکن مفاسد وقت کی اصلاح و تجدید کا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ صرف حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کا وجود گرامی ہی تن تنہا اس کار دیار کا کفیل ہوا۔ معلوم ہوا ہے کہ اس عہد میں بڑے بڑے علماء و اصحاب خانقاہ موجود تھے۔ بدایونی، طبقات، روضۃ العلماء اور اخبار الاخیار وغیرہ دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بجز عالموں اور پیروں کے کوئی نہیں بستا۔ کوئی شہر و قریہ نہ تھا کہ خانقاہوں اور مدرسوں سے خالی ہو۔

علماء میں شیخ وجیہ گجراتی، شیخ علی متقی، شیخ جلال تھانیسری، ملا محمود جونپوری، مولانا یعقوب کشمیری، ملا قطب الدین سہالوی، شیخ عبدالحق محدث، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، مولانا الہداد جونپوری وغیرہم اپنے وقتوں کے مالک اور علم و تعلیم کے بادشاہ تھے۔ بایں ہمہ دوسرے گوشوں اور کاموں میں اپنا اپنا وقت بسر کر گئے۔ اس راہ میں تو ایک قدم بھی نہ اُٹھ سکا۔ شیخ عبدالحق محدث رحمۃ اللہ علیہ کو تو حضرت مجدد صاحب کے بارے میں سخت لغزش بھی ہوئی۔ اگرچہ آخر عمر کے اعتراف و رجوع نے تلافی کر دی۔ اصحاب طریقت میں حضرت خواجہ باقی باللہ جیسے عارف کامل خود دہلی میں بعہد اکبری مقیم رہے۔

لیکن وہ خود کہتے ہیں کہ میں چراغ نہیں ہوں۔ چقماق ہوں۔ آگ نکال دوں گا، چراغ شیخ احمد سرہندی ہے۔

جو حالت اس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام کابل، ترکستان و خراسان کی ہو رہی تھی، ان سب کے سامنے تھی۔ سب اس پر آہ و فغاں بھی کرتے ہیں۔ مگر اس کے آگے معاملہ نہیں بڑھتا۔ ہندوستان میں بڑی مصیبت یہ تھی کہ تمام عوام و خواص پر تصوف کا رنگ غالب تھا۔ یہاں تک کہ اس کے سوا علماً و عملاً کوئی بات مقبول نہ تھی۔ لیکن تصوف صالح کا جو ہر پاک جہل و بدعت کی آمیزش سے یکسر مکدر ہو چکا تھا بلکہ ایک طرح کی انانیت و مطلق العنانی تھی جس کو طریق باطن و اسرار سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ ملک کا ملک شریعت و علوم شریعت سے بے گانہ محض، اور اصل حقیقت یک قلم معدوم۔ صرف خانقاہوں اور سجادہ نشینی کے سلسلوں کے جال میں پوری اقلیم جکڑ بند تھی۔

دوسری طرف عہد اکبری کی بدعات تخت و تاج حکومت کے زور سے ہر طرف پھیل چکی تھیں، اور علماء سوء و

مشائخ دنیا پرست خود ان کے احداث و اشاعت کے نقیب تھے۔ کون تھا کہ اس وقت امن و عافیت کے مدرسوں اور سلطانی و فرمانروائی کی خانقاہوں سے نکلتا۔ اور دعوت و اصلاح کی امتحان گاہوں میں قدم رکھتا۔ اور پھر نصرتِ الٰہی کے لشکروں اور نفوسِ باطنی کے سامانوں سے ایسا مسلح ہوتا کہ نہ شہنشاہ ہند کا تاج و تخت اس کی راہ روک سکتا، اور نہ وقت کی حکمرانی و فرمانروائی اس کے سلطان حق و سطوت الٰہی پر غالب آسکتی۔

خود حضرت موصوف ایک مکتوب میں اپنے فرزند کو لکھتے ہیں:

اے فرزند ایں وقت آنست کہ در امم سابقہ دریں طور وقتے کہ پر از ظلمت ست پیغمبر اولوالعزم مبعوث مے گشت و بناء شریعت جدیدہ مے کرد۔ دریں امت کہ خیر الامم ست و پیغمبر ایشان خاتم الرسل علماء را مرتبۂ انبیاء دادہ اند و از وجودِ علماء بوجودِ انبیاء کفایت فرمودہ اند دریں وقت عارفے تام المعرفۃ ازیں امت درکارست، کہ قائم مقام انبیاء اولوالعزم باشد۔

فیض روح القدس از با مدد فرماید   دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا مے کرد

کچھ شک نہیں کہ توفیق الٰہی نے حضرت ممدوح کے وجود گرامی ہی کے لئے یہ مرتبہ خاص کر دیا تھا۔ انبیاء اولوالعزم کی نیابت و قائم مقامی یعنی مقام عزیمت دعوت کا خلعت صرف انہیں کے جسم پر چست آیا۔ باقی جس قدر تھے یا تو مدرسوں میں پڑھاتے رہے یا موٹی موٹی کتابیں اور نئی نئی شرحیں اور حاشیے لکھتے رہے، یا پھر ان کی تحلیل و تکفیر کے فتووں پر دستخط کرتے رہے۔ وقت کا جو اصلی کام تھا اس کو کوئی ہاتھ نہ لگا سکا۔

دوسری جلد کے چوتھے مکتوب میں لکھتے ہیں:

از حق الیقین و عین الیقین چہ گوید واگر گوید نہ فہم کند۔ ایں معاملات از حیطۂ ولایت نیست ارباب ولایت در رنگ علماء ظواہر در ادراک آں عاجز اند۔ ایں کار مقتبس از مشکوۃ نبوت ست کہ بعد از تجدید الف ثانی بہ تبعیت و وراثت تازہ گشتہ صاحب ایں علوم و معارف مجدد ست الخ

یہ جو بار بار کہہ رہا ہوں کہ وقت کا سلطان اور خزینہ دو نہیں ایک ہی ہوتا ہے، خواہ کوئی ہو اور کیسا ہی ہو۔ مگر اس سے الگ رہ کر کچھ نہیں پاسکتا۔ تو یہ وہی حقیقت ہے جس کو بار بار حضرت ممدوح فرماتے رہے، اور ان سے پہلے بھی تمام محرمان راہ نے اشارات کئے۔

مجدد آن ست کہ ہر چہ دراں مدت از فیوض بہ امت رسد بتوسط او رسد اگر چہ اقطاب و اوتاد آن وقت باشند۔

خاص کند بندۂ مصلحت عام را

حضرت شاہ ولی اللہؒ

پھر بارھویں صدی کا ایک عظیم ترین ظہور علوم و معارف دیکھو، زمین بنجر ہو چکی تھی۔ پھر بھی کھیتوں کی سبزی

اور چمنوں کی مالی سے کوئی گوشہ بالکل خالی نہ تھا۔ تیرھویں صدی کے تمام کاروبارِ علم وطریقت کے اکابر واساتذہ اسی صدی میں سربرآوردہ ہوئے۔ بعض بڑے بڑے سلاسلِ درس وتدریس کی بنیادیں اسی میں استوار ہوئیں جیسے بلادِ عربیہ وعثمانیہ میں اکثر مشاہیرِ علم وارشاد، جیسے شیخ ابراہیم کورانی۔ محمد ابن احمد سفارینی نجدی۔ سید عبدالقادر کوکبانی۔ شیخ عمر ناسی تیونسی۔ شیخ سالم بصری۔ امیر محمد بن اسمٰعیل یمانی۔ شیخ عبدالخالق زبیدی، شیخ محمد حیات سندھی المدنی وغیرہم کوشاہراہِ عام سے اپنی راہ الگ رکھتے تھے، اور حقیقتِ مستورہ کے شناسا وحق آگاہ تھے۔ بایں ہمہ معلوم ہے کہ وہ جو دروۂ آخر کے فاتح اور سلطان العصر ہونے کا مقام تھا وہ صرف حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہؒ کے حصے ہی تھا۔ اور لوگ بھی بیکار نہ تھے، کام کرتے رہے مگر جو کام یہاں انجام پایا، وہ صرف یہیں کے لئے تھا۔

تفہیمات میں اس معاملہ کے معارف لکھتے ہوئے کہیں تو اپنی طرف بیگانہ وار اشارہ کر جاتے ہیں۔ کہیں کہیں جوشِ قلبی کی بے اختیاریوں میں صاف صاف بھی لکھ گئے ہیں۔ اپنے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

نعمتِ عظمٰی بریں ضعیف آنست کہ اور اخلعتِ فاتحیت دادند وفتح دورہ بازپسیں بردست دے کردند۔

تفہیمات میں لکھتے ہیں:

بر سرم درد او داند کہ ایں حقیقت بردم بر ساں کہ امروز وقت وقت تست وزمان زمانِ تو، وائے بر کسے کہ زیرِ لوائے تو نہ باشد۔

اس باب میں اُن کے اشارات بے شمار ہیں۔ علی الخصوص تفہیمات میں کہ متعدد رسائل ومقالات اسی مقام کی شرح وتحقیق میں لکھے ہیں اور ان سب کے آخر میں ذوقِ باطن کے اجتناب واضطراب سے بے خود ہوکر اپنے معاملات کی طرف بھی اشارہ کر جاتے ہیں۔

حضرت شاہ اسمٰعیلؒ

اور پھر چند قدم اور آگے بڑھو۔ مقامِ عزیمت ودعوت کی کیسی کامل اور آشکار امثال سامنے آتی ہے۔ ساری مثالوں سے آنکھیں بند کرلو۔ صرف یہی ایک مثال زیرِ بحث حقیقت کے فہم وکشف کے لئے کافی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام ہر رنگ میں کس درجہ کامل اور جامع ہے۔ بایں ہمہ یہاں جو کچھ ہوا، تجدید وتدوینِ علوم ومعارف اور تعلیم وتربیتِ اصحاب استعداد تک محدود رہا، اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ مثلاً عمل ونفاذ اور ظہور وشیوع کا کام تو کسی دوسرے ہی مردِ میدان کا منتظر تھا۔ اور معلوم ہے کہ توفیقِ الٰہی نے یہ کام صرف حضرت علامہ ومجدد شہیدؒ کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ خود حضرت شاہ صاحب کا بھی اس میں حصہ نہ تھا۔

آں باغبان کہ تربیت ایں نہال کرد   میخواست رست خیز ز عالم بر آورد

اگر خود شاہ صاحب بھی اس وقت ہوتے تو اُن کے جھنڈے کے نیچے نظر آتے۔ حضرت میر انصاری کا قول یاد رہے:

''من مرید خاقانی ام لیکن اگر خاقانی دریں وقت مے بود باوجود پیر لیش مرید مے کردم''۔
شاہ صاحب نے مزاج وقت کے عدم تحمل واستعداد سے مجبور ہو کر بحکم:

بہ رمز نکتہ ادا مے کنم کہ خلوتیاں　　　　سر سبو بکشادند و در فرو بستند

دعوت واصلاح اُمت کے جو بھید پرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوٹلہ کے حجروں میں دفن کر دیئے تھے، اب اس سلطان وقت اور سکندر عزم کی بدولت شاہجہان آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان کا ہنگامہ مچ گیا اور ہندوستان کے کناروں سے بھی گزر کر نہیں معلوم کہاں کہاں تک چرچے اور افسانے پھیل گئے۔ جن باتوں کے نکلنے کی بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی، وہ اب برسر بازار کی جا رہی اور ہو رہی تھیں۔

آخر تو لائیں گے کوئی آفت فغاں سے ہم　　　　حجت تمام کرتے ہیں آج آسماں سے ہم

پھر کیا اس وقت ہندوستان علم و عمل سے خالی ہو گیا تھا یا حق پر چلنے والے اور حق کا درد رکھنے والے معدوم ہو گئے تھے؟ کون ہے جو ایسا کہہ سکے۔

خود اس خاندان عالی میں کیسے کیسے اکابر اساتذہ علم و عمل موجود تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کے درس وتدریس کی بادشاہت سمرقند و بخارا اور مصر و شام تک پھیلی ہوئی تھی۔

شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین علم و عمل کے آفتاب تھے۔ خاندان سے باہر اگر ان کے تربیت یافتوں کو دیکھا جائے تو کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں اُن کا فیضان علم کام نہ کر رہا ہو۔ بایں ہمہ یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ جو وقت کا ایک سب سے بڑا کام تھا، اس کے لئے کسی کے قدم کو جنبش نہ ہوئی۔ سب دوسرے کاموں میں رہ گئے۔ یا حجروں کا کام یا مدرسوں کا۔ لیکن میدان والا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ وہ گویا ایک خاص پہناوا تھا جو صرف ایک ہی جسم کے لئے تھا اور ایک ہی پر چست آیا دنیا اس کے لئے خلعت عظمت اور تشریف قبول کاندھے پر ڈالے منتظر کھڑی تھی۔ زمانہ اپنے سارے سامانوں کے ساتھ کب سے اس کی راہ تک رہا تھا۔ اُمیدواروں پر اُمیدوار یکے بعد دیگرے گزر رہے تھے مگر اس کا مستحق کوئی نہ نکلا۔

بار غم او عرض بہر کس کہ نمودم　　　　عاجز شدہ ایں قرعہ بنام ز سر افتاد

یہ تو وہی حقیقت ہے جو کتنی دیر سے تمہارے ذہن نشین کر رہا ہوں یعنی اس وادی کا مرد ہر صاحب علم و عمل نہیں ہو سکتا۔۔۔ع

مرد ایں راہ را نشانے دیگر است

استاذی وشاگردی، نو عمری و کہولت، خانقاہوں کی دھوم دھام اور مدرسوں کا ہنگامہ، یہ ساری باتیں یہاں کے لئے بیکار ہیں۔ ان سارے عہدوں میں دیکھوں، باعتبار علم و عمل ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر موجود تھا، اور بقدر طاقت دعوت وتذکیر وارشاد خلق میں ساعی۔ تاہم دعوت دوسری چیز ہے اور عزیمت دعوت کا مقام دوسرا ہے۔ اس کی ہمت کسی میں نہ تھی۔

نہ ہر کہ طرف کلاہ کج نہاد و تند نشست ‏ کلاہ داری و آئین سروری داند

بزدل بزدوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا، اور سرو سامان واسباب کا وفراہم نہیں۔ لیکن وقت کا عازم وفاتح اُٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا تو میں اس کو ساتھ لوں گا۔ اگر سرو سامان نہیں تو اپنے ہاتھوں سے تیار کرلوں گا۔ اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اُترنا چاہیے۔ اگر آدمی نہیں تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیے۔ اگر انسانوں کی زبانیں گونگی ہوگئی ہیں تو پتھروں کو چیخنا چاہیے۔ اگر ساتھ چلنے والے نہیں تو کیا مضائقہ، درختوں کو دوڑنا چاہیے۔ وہ زمانہ کا مخلوق نہیں ہوتا کہ زمانہ اس سے جاکر کرائے۔ وہ وقت کا خالق اور عہد کا پالنے والا ہوتا ہے۔ وہ زمانہ کے حکموں پر نہیں چلتا۔ بلکہ زمانہ آتا ہے تاکہ اس کی جنبش لب کا انتظار کرے۔ وہ دنیا پر اس لئے نظر نہیں ڈالتا کہ کیا کیا ہے جس سے دامن بھرلوں۔ وہ یہ دیکھنے کے لئے آتا ہے کہ کیا کیا نہیں ہے جس کو پورا کردوں۔ اللہ کی حکمت ور بوبیت ان کو تمام خلق اللہ میں سے چن لیتی ہے اور **واللہ یختص برحمتہ من یشاء** اپنی رحمتوں اور ربوبیتوں کے عجائب وخوارق ان کے لئے مخصوص کردیتی ہے۔ پھر ان کے معاملات میں نہ تو کسی کا ساجھا ہوتا ہے نہ کسی مدعی کی وہاں تک رسائی۔ **ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ**۔

خلفاء مجددی کا سیاسی ماحول

شاہجہاں بادشاہ، داراشکوہ اور عالمگیر!

مذہبیت اور ترویج شریعت کا دور

عمل اور ردِ عمل کی ترتیب زمانہ اکبری سے لے کر عہد عالمگیر تک حسب ذیل ہے۔

اکبر: لامذہب۔

جہانگیر: مذہبیت اور لامذہبیت میں متوسط۔

شاہجہاں: مذہبیت میں پختہ۔ چشتیت اور مجددیت میں متوسط۔

عالمگیر: مذہبیت میں پختہ اور خالص مجددی۔

گزشتہ اوراق نے ثابت کیا کہ یہ تدریجی انقلاب ثمرہ ہے حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی جدوجہد اور قربانیوں کا۔

اکبر اور جہانگیر کے خیالات واعتقاد درج کئے جا چکے ہیں۔ شاہجہاں اور عالمگیر کے متعلق یہ فریضہ باقی ہے۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس وقت ملک کے سامنے غلامی، ورآزادی یا ملکی اور غیر ملکی اقتدار کا سوال نہیں تھا۔ بادشاہ ہندوستانی تھا۔ ہندوستان کسی ملک کا باج گزار نہیں تھا۔ ہر ایک ہندوستانی خود کو آزاد سمجھتا تھا۔ خود

مختار پنچایتی نظام اس کے شخصی حقوق اور شخصی عزت و حریت کا ذمہ دار تھا۔

اس وقت اصلاح کے معنی صرف یہ تھے[508] کہ عوام الناس، ارکانِ دولت اور خود سلاطین طے کر لیں کہ انفرادی طور پر پابندیٔ مذہب، اتباعِ سنت اور اجتماعی طور پر ترویجِ شریعت ان کی زندگی کا نصب العین اور ان کی تمام انفرادی اور اجتماعی جدوجہد کا محور ہے۔

اس نظریۂ اصلاح کی کامیابی ثابت کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ شاہجہاں اور عالمگیر کے حالات پیش کئے جائیں۔

اگر یہ دونوں بادشاہ بار بار اعلان کر چکے ہوں کہ ہمارا مقصود پابندیٔ مذہب اور ترویجِ شریعت ہے تب بھی ہمارا مدعا ثابت ہو جاتا ہے۔

ہم ان کو معصوم نہیں کہتے۔ ایک مسلمان سے کچھ غلطیاں، کچھ خلافِ شرع امور کا ارتکاب ممکن ہی نہیں بلکہ غیر معصوم فطرت کا عین تقاضہ ہے۔ لیکن تاہم اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ترویجِ شریعت کا مدعی جان بوجھ کر کسی دنیاوی مقصد کے لئے، خواہ وہ حکومت اور سلطنت ہی کیوں نہ ہو، خلافِ شرع کام کرے، اور بالخصوص عالمگیر کے سوانحِ حیات میں بھائیوں کا قتل اور باپ کی نظر بندی جس پر اس کی اکیاون سالہ سلطنت کی بنیاد قائم ہوتی ہے بظاہر ایسے قابلِ نفرت افعال ہیں کہ مذہب تو کیا انسانیت بھی گوارا نہیں کرتی کہ ایسے شخص کو معمولی درجہ کا خدا پرست بھی کہا جا سکے۔

اگر عالمگیر کو خالص مجددی کہہ دیا جائے تو کیا مجدد صاحب کی تعلیم کا تقاضا یہی تھا؟ یہ ایک پیچیدہ سوال ہے جس کے حل کے لئے ہمیں کسی قدر طوالت اختیار کرنی پڑے گی۔

شاہجہاں بادشاہ

ربیع الاول کا وہ مبارک مہینہ جو سید الکونین رحمۃ للعالمینؐ کی ولادتِ مقدسہ، بعثت ہجرت اور پھر وفات کے تاریخی فضائل اور خصوصیت کا حامل ہے، ایک ہزار گردشوں[509] کے بعد اس کی آخری شب نے مخمل سیاہ کی چادر تان رکھی ہے۔

تاروں کو یہ ہزار سالہ جشن مناتے ہوئے پانچ ساعت اور بارہ دقیقے ہی گزرے ہیں کہ شاہزادہ جہانگیر کے حرم میں جودھ بائی عرف جگت گوسائیں دخترِ مہاراجہ اودے[510] سنگھ راٹھور والیٔ جودھ پور کے بطن سے شہر لاہور میں اخترِ برجِ خلافت نے طلوع کیا۔ جس کا نام دادا (جلال الدین اکبر) نے خرم رکھا۔ جو کچھ عرصہ بعد جہانگیر کی زبان سے شاہجہان بنا۔ اور پھر اس کے اسی نام نے ابدی زندگی حاصل کی۔

چھٹی کے دن اکبر دولت سرائے جہانگیر میں گیا۔ مبارکباد کے بعد ظاہر کیا کہ میری خواہش ہے کہ اس نونہال کو میں اپنی فرزندی میں پرورش کروں۔ چنانچہ پوتے کو اپنے محل سرا میں لایا اور سب سے بڑی بیوی خدیجہ

الزمانی رقیہ سلطان بیگم بنت ہندال مرزا کے سپرد کر کے کہا کہ تمہارے بطن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس بچہ کو اپنی اولاد کی طرح پرورش کرو۔

دادی نے مادری شفقت کے ساتھ اس کی تربیت کی اور اکبر کی موت تک شاہزادہ خرم اسی کی خدمت میں رہا۔ باپ جب اورنگ نشین ہوا تو اُس نے بھی اس قابل فرزند پر سب سے زیادہ نوازش کی، ہشت ہزاری و پنج ہزاری سوار، دو اسپہ و سہ اسپہ اور علم وغیرہ کے علاوہ آفتاب گیر، سرخ بارگاہ وغیرہ سے نوازا''۔ ہراوزک (۵۱۱) اس کے حوالہ کی اور حصار فیروزہ کا علاقہ جاگیر میں دیا، جو مدت سے اس خاندان میں ولی عہدوں کو ملا کرتا تھا۔

۱۰۱۹ھ میں مرزا حسین صفوی کی لڑکی سے نکاح ہوا۔ اور پھر ربیع الاوّل ۱۰۲۱ھ میں مرزا ابوالحسن آصف خاں کی لڑکی (۵۱۲) سے یہ دونوں نکاح جہانگیر نے اپنی تجویز سے کئے۔

دختر آصف خاں ایسی ادب شناس، سلیقہ مند، باوفا اور مزاج دان خاتون تھی کہ شاہجہاں کی سب سے زیادہ محبوب بیوی بنی۔ اور ''نواب ممتاز الزمانی ممتاز محل بیگم'' خطاب حاصل کیا۔

کارنامے

اکبر کی پالیسی ہر جگہ کامیاب رہا کرتی تھی۔ مگر خاندان اودھے پور نے اپنا سر نیاز اکبری دربار میں کبھی خم نہیں کیا۔ اس ریاست کے مہارانا اپنا سلسلۂ نسب نوشیرواں عادل سے ملاتے تھے۔ راجگان ہندوستان میں ان کا احترام یہ تھا کہ ریاست اودھے پور کے مہارانا ہندوستان کے مہاراجوں کی گدی نشینی کے وقت ان کی پیشانیوں پر اپنے انگوٹھا کے خون کا تلک لگایا کرتے تھے۔

اور اس کے بعد گدی نشینی کے مراسم ادا ہوتے تھے۔ یہی وہ ریاست ہے جس کے اولوالعزم فرمانروا مہا راجہ سنگرام عرف رانا سانگا نے بابری فوج کا مقابلہ موضع خانوہ (موجودہ فتح پور سیکری ضلع آگرہ) میں کیا اور خوب ہی دادِ شجاعت دی۔ اگرچہ یہ بابر کا اقبال تھا کہ میدان اسی کے ہاتھ رہا۔ اکبر کی دلی رہا پالیسی اودھے پور کو مغلوب نہ کر سکی لیکن شاہزادہ خرم نے ۱۰۲۴ھ میں رانا کرن کو شکست دے کر اودے پور کے زعفرانی علم کو جو آٹھ سو برس سے چیلوت ٹھ کروں کے قلعوں پر مغرورانہ لہرا رہا تھا نیچا کر دیا۔

اس مہم میں شاہزادہ خرم کے ساتھ ہندو راجا بھی تھے۔ رائے سندر داس کو ''سرد ہی'' کی جانب شاہجہاں نے بھیجا۔ اس نے وہاں پہنچ کر اپنی راجپوت فوج کے ساتھ بہادری کے جوہر دکھائے۔ یہ لوگ بادشاہ کی حمایت میں اس قدر سرشار تھے کہ خود اپنے دین و آئین کا بھی خیال نہ کیا اور رانا کے بت خانوں کو مسمار کیا۔ بتوں کو توڑا۔

بدلہا چناں مہر او خانہ ساخت — کہ ہندو بتخریب بتخانہ تاخت

(تاریخ ہندوستان جلد ہفتم ص ۷)

راجہ کرن امیروں کی سفارش کی مدد سے دربار جہانگیری میں حاضر ہوا اور نذر گزرانی۔ جہانگیر نے خلعت گراں بہا اور منصب عطا کر کے ملک واپس دے دیا کیوں؟ ..... اس لئے کہ:

در مغولنہ تیست کہ در انتقام نیست

اس نمایاں خدمت کے صلہ میں شاہزادہ خرم کو شاہجہاں کا خطاب مرحمت ہو کر شاہی تخت کے برابر کرسی پر بیٹھنے کی عزت دی گئی۔

شاہزادہ نے قندھار، دکن اور گجرات میں اپنی تلوار کے جوہر دکھائے اور مورد مراحم خسروانہ رہا۔

جب معاملات سلطنت میں نور جہاں کا اقتدار ہوا، حتی کہ سکہ اور خطبہ میں اس کا نام شامل کیا گیا تو شاہزادہ کی وہ خاطر اور مدارات نہ رہی۔ انتہا یہ کہ اس کی جاگیر منتقل کر دی گئی۔ شاہجہاں بغاوت پر مجبور ہوا، اور جہانگیر کی وفات تک پریشان پھرتا رہا۔

۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ کو جہانگیر نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور ۸ جمادی الثانیہ کو شاہجہاں نے تاج شاہی سر پر رکھا۔ اس بادشاہ کے زمانہ میں بیجاپور اور گولکنڈہ کی اسلامی ریاستیں دہلی کی باجگذار ہوئیں اور احمد نگر کی سلطنت مطیع ہوئی۔

ہندوستان کی دولت و ثروت نے بے انتہا عروج حاصل کیا۔ معلوم ہوتا ہے، سونے چاندی کا سیلاب تھا جو ملک کے ہر گوشہ سے اُمنڈ اُمنڈ کر باشندگان ملک کو سیراب و شاداب کر رہا تھا۔ ملک کا ہر ایک باشندہ چین اور آرام کی زندگی بسر کر رہا تھا، اور ہندوستان صحیح معنوں میں جنت نشان بنا ہوا تھا۔

بیشک ملک میں کبھی کبھی کسی صوبہ میں قحط پڑ جاتا ہے مگر جیسے ہی بادشاہ کو اطلاع ہوتی ہے، شاہی خزانوں کے تالے کھل جاتے ہیں۔ جگہ جگہ لنگر خانے قائم کر دیئے جاتے ہیں اور ضرورتمندوں کو روپیہ کی تقسیم شروع ہو جاتی تھی۔

ہر سال بادشاہ دو مرتبہ سونے، ریشم، خوشبو وغیرہ بارہ چیزوں سے بارہ بارہ مرتبہ، اور جملہ شاہزادے جو تین سال یا تین سال سے زائد ہوں نیز شاہزادیاں اور بیگمات سال میں ایک ایک مرتبہ انہیں چیزوں سے متعدد بار تولے جاتے ہیں اور یہ پچاسوں بلکہ سینکڑوں من سونا خاص انتظام سے فقراء اور محتاجوں کو بلا تفریق مذہب و ملت تقسیم ہوتا ہے۔ ایک مستقل محکمہ اس کے لئے قائم ہے۔

اس کے علاوہ بیس سالہ عہد حکومت میں ساڑھے نو کروڑ روپیہ خیرات و انعامات میں صرف کیا۔ ۱۰۵۲ھ میں ایک قندیل مرصع تیار کرا کر سید احمد سعید صاحب کے ذریعہ مدینہ طیبہ روانہ کیا۔ یہ قندیل دراصل شامہ عنبر تھا، جو قندیل کی شکل کا تھا (ستر تولہ وزن۔ قیمت دس ہزار روپیہ) اس پر سونا چڑھایا گیا اور جواہرات کے ریزوں سے مرصع کیا گیا۔ بیچ میں ایک سو دس رتی کا ایک الماس جڑا گیا، جس کی قیمت ڈیڑھ لاکھ روپیہ تھی۔ قندیل کی مجموعی لاگت ڈھائی لاکھ روپیہ ہوئی۔ گل محمدی اس کا نام تجویز ہوا۔

فوج کشی کے وقت سپاہیوں کو سال سال بھر کی پیشگی تنخواہیں دی جاتیں اور علامی سعد اللہ جیسے منصف اور رحم دل وزیر کو بھی تاکید ہوتی کہ اگر کوئی سپاہی رہ جائے گا تو قیامت کو اس کی باز پرس تم سے ہوگی۔ (۵۱۳)

بہر حال داد و دہش، انعام و اکرام، عدل و انصاف، رحم و کرم، دشمنوں سے درگزر اور اس عقیدے میں کہ

''در عفو لذتے ست کہ در انتقام نیست'' اگرچہ خاندان مغلیہ کے تمام ہی شہنشاہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ مگر شاہجہاں کو مخصوص طور پر چند خصلتوں میں خاص امتیاز حاصل تھا۔

(۱) عمارتوں کے سلسلہ میں آگرہ آباد، دہلی، لاہور اور قندھار کی خوب صورت اور سربفلک عمارتیں آج بھی اس کی نفاست پسندی اور عالی حوصلگی کی زندہ مثالیں ہیں۔

تخت طاؤس اور خیمہ دل بادل ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں مگر صفحات تاریخ اُن کی قدر و قیمت کا پتہ دیتے ہوئے شاہجہاں کی فراخ حوصلگی کی شہادت دیتے رہتے ہیں۔

(۲) ملک گیری کی ہوس تیموری خاصہ ہے۔ اس لئے شاہجہاں کو بھی یہ شوق رہا۔ مگر بلند حوصلگی کی مندرجہ ذیل مثالیں شاہجہاں کا طرۂ امتیاز ہیں۔

(۱) دشمنوں کی کمزوری سے فائدہ نہ حاصل کرنا

آغاز حکومت میں قندھار فتح کیا۔ کچھ عرصہ بعد شاہ عباس صفوی والی ایران نے موقع پا کر اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۰۵۱ھ میں شاہ عباس کا انتقال ہوگیا۔ اس کا نوجوان شاہزادہ عباس ثانی تخت نشین ہوا۔ موقعہ تھا کہ اس قدرتی انقلاب سے فائدہ اُٹھایا جاتا۔ چنانچہ داراشکوہ نے اس کی درخواست کی۔ مگر شاہجہاں کی اس بلند ہمت کی نظیر مشکل سے ملے گی کہ اس نے جواب دیا:

''ایک لڑکے کی سلطنت پر جس کے باپ کی حال ہی میں وفات ہوئی ہو، اور جس کی حکومت نے ابھی استحکام نہ حاصل کیا ہو حملہ کرنا سلاطین نیک سیرت کے رویہ کے مخالف ہے۔ (۵۱۴)

(۲) دشمن کی پریشانی میں امداد

نذر محمد خاں والی بلخ اگرچہ دوستی کا اظہار کرتا تھا مگر اس سے چند حرکتیں سلطنت مغلیہ کے خلاف سرزد ہو چکی تھیں اور اسی بنا پر شاہی فوجیں شاہزادہ مراد کی سرکردگی میں اس کے ملک پر تاخت کر رہی تھیں۔ مگر شاہجہاں کو معلوم ہوتا ہے کہ نذر محمد خاں کے ملک پر ازبکوں نے غارت شروع کر دی ہے تو باوجودیکہ ڈپلومیسی کے لحاظ سے شاہجہان کے لیے یہ بہت غنیمت ہے مگر شاہجہان شاہزادہ مراد کو حکم کرتا ہے کہ نذر محمد خاں کے مقابلہ کو چھوڑ کر ان گستاخ باغیوں کو تنبیہ کرے جنھوں نے نذر محمد خاں کے ساتھ گستاخی کی ہے۔ (۵۱۵)

(۱) اکبر کے زمانہ میں یورپ کا عیسائی مشن آیا تو اس کا اعزاز و اکرام کیا گیا۔ جہانگیر نے بھی کافی مدارت کی۔ لیکن شاہجہاں ان کا ابتداء سے مخالف تھا۔

(۲) اکبر اور جہانگیر کا تعلق ایران سے نہ صرف دوستانہ بلکہ نیازمندانہ رہا۔ لیکن شاہجہاں کے زمانہ میں یہ تعلق دوستانہ کے بجائے حریفانہ ہوگیا۔ البتہ شاہجہاں نے ترکوں سے اپنے تعلقات بڑھائے۔ چند مرتبہ ہدیے بھی بھیجے گئے۔ پھر حکومت ایران دارا کی حامی اور اورنگ زیب کی مخالف تھی۔ منشآت طاہر وحید اس کے شاہد

ہیں۔ چنانچہ عالمگیر کے زمانہ میں حریفانہ جذبات نے مزید پختگی اختیار کر لی۔ یہ سیاست کا بہت بڑا انقلاب تھا۔

(۳) یوں تو جہانگیر نے بھی قلعہ کانگڑہ کی فتح کے بعد وہاں گائے ذبح کرا کر اور اذان دلوا کر مذہبیت کا مظاہرہ کیا تھا لیکن مذہب کا مطالبہ یہ ہے کہ نیت کی اصلاح کرو۔ یعنی فوج کشی اور جنگ و جدال کا مقصد ملک گیری نہ ہو، بلکہ کلمۃ اللہ کی بلندی اور احکام الٰہی کی ترویج مقصود جنگ ہونی چاہئے۔

۱۰۴۷ھ میں مہم قندھار میں کامیابی ہوئی، تو تاریخ ہندوستان کے الفاظ یہ ہیں:

"۸ ذی قعدہ کو بلدہ قندھار کے باہر اپنا خیمہ لگایا۔ سکان قندھار بلکہ سارے اہل دیار بادشاہی لشکر کے غلبہ سے خوش ہوئے۔ جس کے سبب سے اُن کو قزلباشوں کے ظلم و تعدی سے رہائی ہوئی۔ مساجد و معابد جن کے اوراد و اذکار سوائے سب اصحاب و شتم احباب کچھ اور نہ تھے اب ان میں خلفاء راشدین کے مناقب بیان ہونے لگے" (۲۵۷ جلد ۷)

اسی طرح گولکنڈہ، بیجاپور وغیرہ کی لڑائیوں میں اس شرط پر صلح کرنا کہ صحابہ کرام پر تبرا نہ ہوگا اور خطبوں میں خلفاء راشدین کا نام لیا جاسکے گا، ان لڑائیوں کی مذہبی حیثیت واضح کر دیتا ہے۔

لیکن اصلاح نیت کے نقطہ کے ساتھ کسی طرح جائز نہیں کہ اس رواداری کو نظر انداز کر دیا جائے جس پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں شاہجہاں عمل پیرا تھا۔

اس رواداری نے اس کو ہندوؤں کا بھی ایسا ہی محبوب بادشاہ بنا دیا تھا۔ جس طرح وہ مسلمانوں کا محبوب بادشاہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو راجہ جو شاہجہاں کے حامی تھے، وہ شاہجہاں کو مسلمان سمجھتے ہوئے بھی اس کے اقتدار کو اپنی ذلت نہیں سمجھتے تھے بلکہ انہوں نے شاہ دہلی کو شمالی ہند کا مشترک بادشاہ تسلیم کر رکھا تھا، اور وہ اس کو پورے ہندوستان کا واحد شہنشاہ بنانا چاہتے تھے اور بلاشبہ شاہجہاں کا طرز قابل صد تحسین ہے کہ پابندیٔ مذہب کے باوجود اس نے جائز رواداری سے ہندو اور مسلمانوں کو ایک جان بنا رکھا تھا۔

وہ جس طرح ہندو راجاؤں اور راجپوت فوجوں کو کسی ہندو راجہ کے مقابلہ میں بھیجتا تھا، اسی طرح بیجاپور، گولکنڈہ کے فرمانرواؤں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ قندھار، بلخ اور بدخشاں کی جنگ پر بھی ان ہی فوجوں کو بھیجتا تھا، جہاں صرف مسلمانوں سے ہی مقابلہ ہوتا تھا۔

یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ شاہجہاں کے زمانہ میں بت خانے توڑے گئے، مگر اس کا کیا جواب کہ توڑنے والے ہندو اور مسلمان دونوں ہوتے تھے اور حکم دینے والا افسر بسا اوقات ہندو ہوتا تھا۔

بے شک شاہجہاں کی نظر میں جنوبی ہند کی لڑائیاں اسلامی جہاد تھیں مگر ایک مؤرخ حیران رہ جاتا ہے کہ ان لڑائیوں کو ہندو مسلم جنگ قرار دے جبکہ گولکنڈہ کا بادشاہ قطب الملک ہے اور بیجاپور کا بادشاہ عادل خاں۔

اور شیواجی مرہٹہ جو ان کا حامی ہو جاتا تھا، وہ شاہجہاں کے دربار میں پنج ہزاری منصب سے سرفراز ہوتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور جہاد کو ہیبت ناک چیز بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ عام طور پر ذہن نشین کرا دیا گیا ہے

کہ قتل و خون کی جائز وجوہات کے بغیر وحشیانہ طرز پر کا فرکشی کا نام جہاد ہے۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ اسلام جائز قرار دیتا ہے کہ نوع انسان کی مصلحت کے پیش نظر غیر مسلموں سے مل کر حکومت قائم کی جائے۔ (۵۱۶)

یہ مشترک حکومت جو اسلامی حدود کے بموجب قائم ہوگی، ایک مسلمان کے لیے واجب الاحترام ہوگی اور اس سلطان کا حکم واجب الاتباع ہوگا۔ اس مشترک حکومت کا تحفظ فریضۂ مسلم ہوگا، اور اس کے بقاء و تحفظ کے لئے قربانیوں کا پیش کرنا جہاد ہوگا۔ صرف ایک شرط ہے:

اَلدِّیْنَ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی عَلَیْہِ لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا

دین غالب ہو، مغلوب نہ ہو۔

کلمۃ اللہ ہی سربلند ہو۔

بے شک اعلان جنگ کے بعد یہی ہوگا۔

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْھُمْ

جہاں پاؤ، مشرکوں کو مارو۔

مگر یہ شرط بہرحال ملحوظ رہے گی۔

اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَھَا وَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ ۔

اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اسی طرف مائل ہو جاؤ اور خدا پر بھروسہ کرو۔

آج ہماری غلامانہ ذہنیت، بزدلی اور پست ہمتی کی نحوست ہے کہ نہ ہمیں اپنے اوپر اعتماد ہے نہ خدا پر غفور ورحیم کے تصور سے بھی ہمارے دماغ محروم ہو گئے ہیں۔ مگر ان بادشاہوں کے حیرت انگیز اعتماد کا دنیا ہمیشہ تعجب اور حیرت سے مشاہدہ کرتی رہی۔ سخت سے سخت دشمن گرفتار کر کے لایا گیا۔ جس پر قابو پانے کے لئے کروڑوں روپیہ اور لاکھوں جانیں ضائع کی جا چکی تھیں لیکن جب وہ مغلوب ہو کر سامنے آیا تو فاتح کا مستانہ نعرہ یہ ہوتا تھا:

در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست

اگر وہ دوبارہ بغاوت کرتا، اور پھر شاہی فوجوں قاہرہ سے مغلوب ہو کر ندامت کا اظہار کرتا تو نشاط فتح میں نہایت تمکنت سے کہہ دیا جاتا:

ای درگہ ما درگہ نا اُمیدی (۵۱۷) نیست

یہ بادشاہ کہا کرتے تھے کہ ہم زمین میں خدا کا سایہ ہیں۔ مگر اس کے معنی ان کے عقائد کے بموجب صرف یہ تھے کہ جس طرح خداوند عالم ارحم الراحمین ہے ہمیں دنیا میں اس کی مخلوق کے لئے پیکر رحم بن کر رہنا چاہئے۔

راجہ روپ سنگھ پسر جگت سنگھ کو کانگڑہ کا فوجدار مقرر کر دیا گیا۔ یہ وہی قلعہ تھا جس کو جہانگیر نے فتح کیا تھا۔ اُس نے وہاں پہنچ کر علم بغاوت کیا۔ اس کے باپ جگت سنگھ نے خود درخواست پیش کی کہ روپ سنگھ کی بغاوت فرو

کرنے کے لئے اس کو مامور کیا جائے۔

یہ وہاں پہنچا تو بادشاہ سے غداری کر کے روپ سنگھ کا ہمنوا ہو گیا۔ خود اپنے استقلال کا اعلان کر دیا اور پوری قوت کے ساتھ جنگی سامان فراہم کر لیا۔

شاہی افواج نے بڑی مشکل سے ان قلعوں کو دوبارہ فتح کیا۔ روپ سنگھ اور جگت سنگھ گرفتار ہوئے۔ مگر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو گویا ایک نہایت معمولی قصور تھا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد پھر ان کو گورنر بنا کر دوسرے علاقوں میں بھیج دیا گیا۔ خلعت انعام سے نوازا گیا۔ (تاریخ ہندوستان)

غداری اور مکاری پر غور کرو اور پھر عفو و کرم کو غور میں لاؤ۔ اس قسم کے واقعات سے تاریخ کے اوراق پر ہیں۔ کیا یہی تھے وحشی مسلمان، غیر مہذب مغل۔

تہذیب کی دعوے دار قوم میں کیا اس کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہیں۔ تعجب ہے جس مذہب کی مسلمہ کتاب انقلابات کی حکمت یہ بتائے:

لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۔

انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ سے ہٹانے کی خداوندی سنت اگر کارفرما نہ ہو تو روئے زمین پر بربادی اور تباہی پھیل جائے لیکن اللہ تعالیٰ تمام جہانوں پر بہت بڑا فضل کرتا رہتا ہے۔

لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ط

انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ سے ہٹانے کا خداوندی دستور اگر نہ رہے تو تمام مندر، گرجا، نمازیں اور وہ مسجدیں جن میں خدا کا نام بہت زیادہ لیا جاتا ہے، تباہ کر دیئے جائیں۔

جس کی رواداری کا یہ عالم ہو کہ انقلاب جیسی عظیم الشان حقیقت کے اغراض و مقاصد بتاتے ہوئے مساجد کا نام بھی لیا تو سب سے آخر میں، اور وہ مذہب جو اپنے ماننے والوں کو نہ صرف بے جا ظلم و ستم سے روکے، بلکہ ان کی زبان تک کو اتنا پابند کر دے کہ:

لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔

ان لوگوں کو سخت و سست مت کہو جو اللہ کے ماسوا کو پکارتے ہیں۔

تعجب ہے اسی قوم کی انقلابی جدوجہد پر دحشت اور بربریت کا الزام لگایا جائے۔

بہر حال اس مختصر تفصیل و توضیح سے یہ عقدہ تو حل ہو گیا کہ شاہجہاں پکا مسلمان ہوتے ہوئے کس طرح ہندو مسلمانوں کا مشترکہ بادشاہ بن سکتا ہے اور کس طرح راجپوت قومیں اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر مسلمانوں کے جہاد میں شرکت کر سکتی ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اسلام غالب ہو کر رہے گا۔ یعنی ان تمام حقوق اور

مراعات کے باوجود اگر کوئی باغی جماعت مسلمانوں کو اسلام کی خاطر یا مسلمانوں کے مساجد و مقابر کو نقصان پہنچائے گی، تو چونکہ نقضِ امن کی طرف خود قدم بڑھا رہی ہے، لہٰذا اس کو قرار واقعی سزا دی جائے گی۔

متھرا یا گجرات میں بت خانوں کو مسمار کر کے مسجدیں بنوانا اسی بنا پر ہوا، کہ وہاں مسجدوں کو مندر بنا کر خود فسق و کا تخم بو دیا گیا تھا (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو بادشاہ نامہ عبدالحمید جلد ۲ ص ۹۴ و ص ۱۰۶ و تاریخ ہندوستان ص ۱۸۲ و ص ۱۹۳ و ص ۱۹۸ جلد ۷، اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر وغیرہ)۔

شاہجہاں کے اخلاق

پابندئ مذہب اور اصلاحات

فہم و تدبر، رحم و کرم، عدل و انصاف، غرباء پروری، علم دوستی، متانت اور سنجیدگی وغیرہ وغیرہ شاہجہاں کے وہ اوصاف ہیں جن میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس کی تہذیب اور متانت کا یہ حال تھا کہ ناشائستہ کلمات سے اس کی زبان ہمیشہ پاک رہی۔

حلم و بردباری اور حسن اخلاق یہ کہ وہ اپنی مجلس میں خطاوار کے متعلق بھی حتی الوسع ایسے کلمات سے احتیاط کرتا جن سے اس کو شرمندگی ہو۔

وہ بہادر تھا اور بہادری میں اپنے دادا بابر کی یادگار تھا۔ مگر بے نظیر شجاعت کے باوجود حد سے زیادہ رحم دل اور نوع انسان کا ہمدرد۔

علاقہ ایران کے اوزبکوں اور قزلباشوں کے مظالم کا تذکرہ اس کے سامنے ہوتا تو اس کا دل بھر آتا، اور ہمدردانہ تاثر کے ساتھ کہتا کہ خداوند عالم نے بادشاہوں کو برتری عطا فرما کر نوع انسان کو اُن کے سامنے اس لئے مطیع کیا ہے کہ وہ مظالم کو دنیا سے ناپید کر دیں۔ مظلوموں اور بیکسوں کا سہارا بنیں۔

انسانی ہمدردی کا یہی جذبہ تھا کہ جس نے اس کو ہمیشہ بلخ، بخارا اور قندھار وغیرہ کی جنگ میں مصروف رکھا۔

شاہجہاں کہا کرتا تھا کہ شاہی خزانے صرف اس لئے ہیں کہ باشندگان ملک کی ضرورتیں پوری کی جائیں۔ بادشاہ ان کے صرف امانت دار ہیں۔

اخلاق و اوصاف شاہجہاں کے متعلق تاریخ کی مبسوط تحریروں کے بجائے سلطان عالم گیر کے صرف ایک رقعہ کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

یہ رقعات عالمگیری[۳۱۸] کا بارہواں[۳۱۹] رقعہ ہے۔ جو عالمگیر نے شاہزادہ محمد اعظم کے نام لکھا ہے:

اعلیٰ حضرت فرمایا کرتے تھے۔ شکار بے کاروں کا کام ہے۔ انسان اگر امور آخرت میں مشغول نہ ہو، تو دنیاوی کاموں کو درست کرنے ہی میں کیا خرابی ہے۔ آخر دنیا کو آخرت کی کھیتی بتایا گیا ہے۔

چار گھڑی رات رہتی تھی (۴۴۰) کہ خود بدولت بنفس نفیس خواب گاہ سے باہر نکل کر وضو کر کے اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتے تھے۔ اذان صبح کے بعد علماء اور فضلاء کی جماعت کے ساتھ نماز صبح ادا کر کے جھروکۂ درشن میں تشریف لے جاتے تھے، اور درشنیوں کو دیدارِ فیض آثار کی سعادت سے نوازتے۔

جب چار گھڑی دن چڑھ جاتا تھا۔ دیوان عام کرتے تھے۔ اس میں جملہ کارپردازانِ حکومت متعلقہ خدمات کو پیش کر کے اپنے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرتے پھر گھوڑوں اور ہاتھیوں کی معینہ تعداد کو ملاحظہ فرما کر دیوان عام اور دیوان خاص میں تشریف لے جاتے، جہاں بڑے بڑے بخشی نوسرفرازان منصب (جدید ملازموں) کو مکرر درخواست اور بادشاہ کی نظر ثانی کے بعد حکم حاصل کرتے اور ہر ایک صوبے کے چیدہ چیدہ واقعات پیش کر کے ہر ایک کے بموجب احکام اور فرامین صادر کرنے کے لئے شاہی اجازت اور حکم ناطق حاصل کرتے۔ دوپہر کے قریب تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ اس کے بعد طعام خاصہ پیش ہوتا جو تاکید کر کے وجہ حلال سے تیار ہوتا تھا۔ ذات شاہانہ، تقویت بدن اور عبادت وانصاف پروری کی طاقت حاصل کرنے کے لئے بقدر سد رمق (۴۴۱) نوش جاں فرماتے تھے اور جملہ وظیفہ خواروں اور راتبہ داروں کے کھانے پینے کی بذات خود خبر لے کر خواب گاہ خاص میں تشریف لے جاتے تھے۔

زیادہ تر وظیفہ خوار اور راتبہ دار علماء، فضلاء، طلباء علوم، مساکین غرباء یتیم بے کس اور بیمار ہوتے تھے جن میں سے اکثر سے ذات شاہانہ کو بذات خود تعارف ہوتا تھا اور نظر کیمیا اثر ان سے روشناس ہوتی تھی۔ قلب بیدار کے ساتھ ایک ساعت قیلولہ فرما کر دو پاس اور چار گھڑی دن گزرنے پر خواب گاہ سے باہر تشریف لا کر وضو فرما کر نماز خانہ میں قرآن کی تلاوت میں مشغول ہو جاتے تھے۔ پھر نماز ظہر ادا کرنے کے بعد برج اسد میں رونق افروز ہوتے، وظیفہ لب پر ہوتا اور تسبیح دست مبارک میں۔

اس وقت دیوانِ اعلیٰ حاضر خدمت ہو کر ملکی اور مالی مہمات کو پیش کر کے اکثر کاغذوں کو دستخط انور سے مشرف کرتے تھے۔ جب چہار گھڑی دن رہتا تو دوبارہ دیوان عام کرتے۔ اس وقت بخشی اور دیوان تن نوسرفرازان منصب اور خواستگاران جاگیر کو ملاحظہ عالی میں پیش کرتے۔ آنحضرت ہر ایک شخص کے حسب نسب جوہر ذاتی اور واقفیت کار کے متعلق تحقیق فرما کر پورے غور وفکر سے تعیین منصب اور تنخواہ جاگیر کے متعلق حکم فرماتے۔

شام کو دیوان عام سے اٹھ کر نماز مغرب ادا کر کے خلوت کدۂ خاص میں تشریف لے جاتے۔ وہاں مورخان شیریں زبان، قصہ خوانان فصیح بیان، قوالان خوش الحان، اور سیاحان عرصہ جہاں حاضر ہوتے۔ پردہ کے اندر خواتین ہوتیں اور باہر مرد ہوتے۔ طبع اشرف واعلیٰ کی رغبت کے موافق گزشتہ بزرگوں اور بادشاہوں کے حالات اور زمانہ کے عجائب وغرائب بیان کرتے۔ مختصر یہ کہ آنحضرت نصف شب تک تمام اوقات کو تقسیم کر کے زندگی اور فرمان دہی کا حق ادا کرتے تھے۔

سلطان عالمگیر اس مفصل مکتوب کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں۔

چونکہ آنفرزند کے حق میں شفقت پدری قلبی ہے مصنوعی نہیں۔ لہٰذا جو چیز اچھی ہو اور آنفرزندار جمند کے لئے زیبا ہو، اس کے تحریر کرنے اور اطلاع دینے میں ہم بے اختیار ہیں۔ اس وقت جو یاد آیا، زبان قلم کے حوالہ کر دیا۔ معاف دارند۔

یہ مکتوب اگر چہ انتظام الاوقات ہے مگر امور مملکت میں سرگرمی، احکام مذہبی کی پابندی، اکل حلال کی طرف کامل توجہ وغیرہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مورخین نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ ہمیشہ باوضو رہتے اور اگر جواہر جیسی چیزوں کو ہاتھ لگاتے، تو وضو کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے انسان کو با خدا اور ولی اللہ کہا جائے تو بالکل بجا ہے۔

جہاں آرا بیگم دختر شاہجہاں نے کس قدر مختصر الفاظ میں شاہجہاں اور اس کی حکومت کی تصویر کھینچی ہے۔

الحمدللہ کہ اعلیٰ حضرت عموم اوقات فرخندہ ساعات شبان روزے را بعد اداء وظائف طاعات باہتمام انتظام ملک و ملت مصروف داشتہ، ہموارہ توجہ اشرف بمعموری وامنیت مملکت ورفاہیت خلائق مبذول دارند واز مبادی احوال فرخندہ مآل تاحال پیوستہ برونق احکام کتاب وسنت حضرت خیر الانام واطاعت حضرت رب العزت پیش نمودہ شیوہ کہ شبیہ آں مشتبہ بہ بے روشی وبے طریقی باشد از ہیچ کس قبول ندارم علی الخصوص از فرزندان سعادت مند آراستہ حزایاء ادب واخلاق اند۔ (۴۴۲)

حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے مطالبات پر نظر ڈالئے، اور پھر جہاں آرا کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔ کامیابی تحریک کا کس قدر مبارک منظر سامنے آئے گا۔

مکتوب بالا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شاہجہاں کو سماع سے بھی شوق تھا اور یہ اس چشتیت کا باقی ماندہ اثر تھا جو اکبر کے زمانہ سے اس خاندان میں چلی آرہی تھی۔ بھمبر (علاقہ کشمیر) میں جگ ناتھ کلاونت نے اپنے ہندی دوہرے سنائے۔ شاہجہاں نے اس کو سونے سے تلوایا، اور چار ہزار پانچ سو روپے انعام دیئے۔ اسی طرح خاص خاص مواقع پر میلاد شریف بھی کرایا کرتا تھا۔ (۴۴۳) قبروں اور مزارات کو پختہ بنانے کا طرز اس کے آباواجداد سے چلا آرہا تھا۔ مقبرات کے متعلق اس کے حسن وذوق نے اس کے مقبرہ کو تاج محل کی شکل دیدی جو دنیا کی تعمیرات میں بے نظیر ثابت ہوئی۔

اس نے اپنے جلوس کے پہلے سال ہی سجدہ کی ممانعت کردی۔ زمین بوسی کا طریقہ رائج کیا۔ پھر ۱۰۴۶ھ میں اس کو بھی منسوخ کردیا کہ اس میں بھی انسان کے سامنے سجدہ کی مشابہت ہے۔ (۴۴۴) درشن کا دستور جو اکبر کا ایجاد کردہ تھا، بحالہ باقی رہا۔

شیعوں کے رسوخ کے باعث صحابہ کرام بالخصوص خلفاء راشدین کے ذکر خیر پر جو اثر پڑسکتا تھا محتاج بیان نہیں۔ دکن کے شیعہ فرمانرواؤں کے قلمرو میں آئے دن خطبہ میں خلفاء راشدین کے ذکر پر پابندیاں عائد ہوتی رہتی تھیں۔

شاہجہاں نے ان ریاستوں سے صلح کی پہلی شرط یہی رکھی کہ شتم صحابہ نہ کیا جائے۔ مدح صحابہ پر پابندی نہ عائد کی جائے۔

شاہجہاں نے سکہ کے ایک رخ پر تیج میں کلمہ طیبہ اور حاشیہ پر اسماء خلفاء راشدین اور دوسرے رخ پر ''ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی شاہجہاں بادشاہ غازی'' کندہ کرایا۔

۱۰۴۳ھ میں جب کہ سیر کے لئے کشمیر گیا تھا تو معلوم ہوا کہ مسلمان احکام وتعلیمات اسلام سے ناواقف ہیں۔ ہندوؤں میں بیاہ شادیاں ہوتی ہیں۔ ہندو لڑکی کو مرنے کے بعد مسلمان زمین میں گاڑتے ہیں اور مسلمان لڑکی کو ہندو جلاتے ہیں۔ شاہجہاں نے حکم دیا کہ جو مسلمان لڑکی ہندو کے گھر میں ہو، اگر اس کا شوہر مسلمان ہو جائے تو از سرِ نو نکاح کرایا جائے۔ ورنہ مسلمان لڑکی کو علیحدہ کرایا جائے۔ اس کے بعد قاضی اور معلم مقرر کر دیئے اور ان کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کر دیا۔

جب گجرات (پنجاب) کے اطراف میں پہنچا تو وہاں کے مشائخ اور سادات نے استغاثہ دائر کیا کہ کچھ ہندوؤں نے مسلمان عورتوں کو اپنے گھروں میں ڈال رکھا ہے اور کچھ مسجدیں اپنے تصرف میں کر لی ہیں۔ بادشاہ نے شیخ محمود گجراتی کو حکم دیا کہ تحقیقات کے بعد مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے تصرف سے نکالیں، اور مسجدوں کو دوبارہ آزاد کریں۔ اس طرح سات مسجدیں اور بہت سی عورتیں ہندوؤں کے قبضہ سے برآمد ہوئیں۔

نیز اس سلسلہ میں چار سو مرد اپنی مسلمان بیویوں کی خاطر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ جن کا دوبارہ نکاح انہیں عورتوں سے ہو گیا۔

اکبر اور جہانگیر کے زمانہ میں نجومیوں پر بہت زیادہ اعتماد کیا جاتا تھا۔ تمام بڑے بڑے کاموں کے لئے اوقات سعید کی تشخیص نجومی کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ کام شروع کیا جاتا تھا۔ شاہجہاں کے زمانہ میں اگرچہ اس رسم کو ختم تو نہیں کیا گیا مگر اس پر اعتماد کو ضرور ختم کر دیا گیا اور اپنا عقیدہ یہ ظاہر کیا کہ كذب المنجمون ورب الكعبة (۳۲۵)

عمر میں صرف ایک مرتبہ شراب پی جب کہ جہانگیر نے حکم کیا تھا جس کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے۔ بظاہر پان کھاتا تھا اور پان کا شوقین تھا۔ ایک دو مرتبہ خلعت کے ساتھ پاندان عطا کرنے کا تذکرہ بھی آتا ہے۔

عجائب خانہ بیجاپور کے مخطوطات میں لمبی بیاض ہے۔ اس کے اندر اہم تاریخی مسودات بھی ہیں، جن کا تعلق سلاطین بہمنیہ سے ہے۔ اسی بیاض کے ایک صفحہ پر درج ہے:

شاہجہاں وقت برآمدن بر تخت ایں رباعی خواندہ اشک ریختہ بر سے نشست۔

فاختہ بر سر سرو بلند نعرہ برآورد کہ اے ہوشمند
دولت گیتی کہ تمنا کند بابا کہ وفا کرد بابا کند (۳۲۶)

یہ تھا شاہجہاں بادشاہ جس کو ہم نے چشتیت اور مجددیت کا درمیانی واسطہ قرار دیا ہے۔ رحمہ اللہ وغفرلہ۔

شاہجہاں کی کمزوریاں

سلاطین ایشیا کا عام نظریہ یہ ہے کہ الملک عقیم یعنی بادشاہ کے اولاد نہیں ہوتی۔ جہانگیر کا مقولہ تھا کہ " بادشاہ عزیزے و قرابتے ندارد"۔ چنانچہ اپنے عزیز و اقارب سے بھی وہی احتیاط برتتا جو غیروں سے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

لیکن اس کے برخلاف شاہجہاں کی خصوصیات میں سے ہے کہ اس کو اپنی اولاد اور اپنی بیوی (۴۲۷) سے بہت زیادہ محبت تھی۔ دارا شکوہ سب سے بڑا لڑکا ہے، جو دو بہنوں کے بعد پیدا ہوا۔ سب سے بڑی بہن کا انتقال شیر خوارگی میں ہو گیا تھا۔ دارا اور اس کی بڑی بہن جہاں آرا بیگم لاڈ پیار کے پلے ہوئے تھے۔

شاہجہاں کو دارا اور جہاں آرا بیگم سے جو محبت تھی اس کو عشق کے درجہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جہاں آرا بیگم کو بھی اگرچہ باپ سے اتنی ہی محبت تھی اور واقعہ یہ ہے کہ ماں کے مرنے کے بعد جہاں آرا بیگم نے سلیقہ مند اور صاحب شعور اور باسعادت بیٹی کی حیثیت سے باپ کی اتنی خدمت کی کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔

اس نے امن اور رحم کی ملکہ بن کر خلق اللہ کو بھی اتنا فائدہ پہنچایا، کہ اس کی غرباء پروری کے قصے آج تک مشہور ہیں۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ دارا باپ کی اسی محبت کے سبب سے بدقسمتی کا شکار ہو گیا۔ باپ نے اس کو جاگیریں بڑی بڑی دیں۔ مگر انتظام کارندوں کے ہاتھ میں رہا۔ دارا ہمیشہ شاہجہاں کے ساتھ رہا۔ اپنی جاگیروں میں جانے اور نظام حکومت سنبھالنے کا اُسے موقعہ ہی نہ ملا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ حکومت کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا۔ وہ امراء کے حق میں بدخلق اور گستاخ ہو گیا (جیسا کہ آئندہ معلوم ہو گا)

جہانگیر اپنا طریقہ بیان کرتا ہے:

در کنگاش امور سلطنت و ملک گیری اکثر آنست کہ برائے و فہمید گی خود عمل مے نمائم از کنگاش ہائے دیگر کنگاش خود معتبر مے دانم (توزک)۔ (۴۲۸)

اسی کا یہ اثر تھا کہ اپنے خیال یا دوسروں کے بہکانے سے جب شاہجہاں سے وہ بدگمان ہو گیا تو پھر آخر تک وہ نفرت ہی کرتا رہا۔ ملنا بھی پسند نہ کیا۔ حتیٰ کہ وکیل شاہجہاں کو اتنا بھی موقعہ نہ دیا کہ وہ شاہجہاں کی طرف سے صفائی اور معذرت ہی پیش کر دے۔

شاہجہاں جہانگیر کا فرزند سعید تھا۔ وہ اس وصف میں باپ سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ جب عالمگیر کی برائی اس کے ذہن میں بٹھا دی گئی تو وہ دن بدن ترقی ہی کرتی رہی۔ عالمگیر نے جب بھی معذرت کی وہ عموماً نامنظور ہوئی، اور اس کے جواب میں کوئی اور نکتہ چینی کر دی گئی۔ (۴۲۹)

شاہجہاں کے حالات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بائیس سال متواتر شب و روز انتھک کام کرنے کے

باعث مزاج میں تیزی بھی پیدا ہو گئی تھی۔

بہر حال شاہجہاں کی یہی کمزوریاں تھیں جس نے آخری عمر میں اُس کی سیاست کو شکست دے کر اس کو قلعہ میں نظر بند کر دیا۔ (باقی حالات چند اوراق کے بعد تذکرۂ عالمگیر کے ضمن میں ملاحظہ فرمایئے)۔

ایک مذہبی سوال پیدا ہوتا ہے کہ نیت اور عقیدہ کی درستی کے باوجود انسانی کمزوریوں کے باعث فکر اور رائے میں جو غلطی واقع ہو، اس کے نتائج عملی دنیا میں اگرچہ وہی ہوں گے جو غلطی کے ہونے چاہئیں۔ مگر کیا یہ غلطی عنداللہ قابل مواخذہ ہے یا اس کو خطاءِ اجتہادی سمجھا جائے گا، اور عنداللہ اس کی معافی کا عقیدہ رکھا جائے گا۔ درستی نیت اور اہلیت اجتہاد کے ساتھ اگر غور و فکر میں پوری جدوجہد کی گئی اور پھر بھی غلطی ہو گئی تو اس خطاءِ اجتہادی کے متعلق نص حدیث میں یہ ہے کہ مواخذہ کے بجائے اس کو غور و فکر کا ثواب ملے گا۔

بہر حال یہ ایک بنیادی سوال ہے۔ اس کے حل ہو جانے پر شاہجہاں اور عالمگیر کے متعلق مذہبی حکم معلوم ہو سکتا ہے۔

دارا شکوہ

یہ شاہجہاں کا سب سے بڑا لڑکا ہے۔ ۲۹ صفر ۱۰۲۴ھ کو پیدا ہوا۔ ۱۰۴۳ھ میں نادرہ بانو بیگم صبیہ شاہزادہ پرویز سے نکاح ہوا۔ سلیمان شکوہ اور سعید شکوہ اسی بیگم کے بطن سے تھے۔ عربی فارسی زبان پر مثل اہل زبان کے عبور تھا۔ سنسکرت کی تعلیم بنارس میں بہترین پنڈتوں سے حاصل کی تھی۔ اس کے قیام کے لئے بنارس میں عمارت بنوادی گئی تھی۔ جو آج بھی موجود ہے اور پرانی عدالت کے نام سے مشہور ہے۔ (۲۳۰)

غلام سرور چشتی خزینۃ الاصفیاء میں تحریر فرماتے ہیں:

شاہزادہ بلند اقبال جامع اوصاف کمال بادشاہ صورت، درویش سیرت، خادمِ درویشاں، مظہر صفات ایشاں ست۔ جامہ فقر و خرقۂ خلافت از دست عارف حق آگاہ ملا شاہ پوشیدہ بخدمت حضرت میاں میر بالا پیر ہم حاضر شدہ مستفید و مستفیض مے گشت۔

در فقر شان عالی و رتبہ بلند داشت۔ صاحب تصانیف است کہ احوالِ باطنش از تصانیف وے اظہر من الشمس ست واز تصانیف مشہورۂ وے کتاب سفینۃ الاولیاء و سکینۃ الاولیاء و سر اکبر و دیوان اکسیر اعظم و رسالہ حق نما و رسالہ معارف وغیرہ ست و نقش در یائے توحید ست کہ از زبان گوہر افشان او داں گشتہ، مغزے باید کہ نقش راہفہمد و دلے باید کہ معانی آں در روے امکان پذیرد، وے تمام عمر خود در معرفت حق گزرانید۔ آخر ازیں دار ناپائیدار مردانہ رفت و شہادت یافت۔ قصۂ شہادت وے زبان زد خاص و عام ست کہ از دست اورنگ زیب عالمگیر برادر خود بقتل رسید و شاہ عالمگیر صرف بطمع فرماں ہندوستان و تخت نشینی مملکت آں گوہر دریائے وحدت را بشکست (ص ۱۷۵ جلد ۱)۔

مصنف خزینۃ الاصفیاء نے دارا کے حالات لکھتے ہوئے کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔ بظاہر خود اپنے خیالات کی شیرازہ بندی ہے۔

اس کے بعد تذکرہ آدمیہ کے حوالہ سے حضرت خواجہ محمد معصوم قدس اللہ سرہ العزیز کا وہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ جب مدینہ طیبہ میں آپ نے سنا کہ "داراشکوہ ولی عہد شاہجہاں پدر خود شدہ است" ۔ تو چونکہ عالمگیر سے دارا کو عداوت تھی، اور عالمگیر خواجہ محمد معصوم قدس اللہ سرہ العزیز کا مرید تھا، اور اس وجہ سے حضرت خواجہ اور آپ کے متوسلین سے بھی دارا کو عداوت تھی۔ لہٰذا حضرت خواجہ محمد معصوم صاحبؒ کو فکر ہوا۔ آپ نے ہندوستان پہنچنے کا ارادہ کیا، اور اجازت حاصل کرنے کے ارادہ سے حضرت سرور کائناتؐ کے روضۂ اقدس پر حاضر ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ سیدالکونین شمشیر بدست جلوہ فرما ہوئے اور فرمایا کہ:

ہر کہ دشمن شماست برائے اوایں شمشیر قہر الٰہی کافی ست

جب مراقبہ سے فارغ ہوئے تو حضرت خواجہ نے فرمایا۔ داراشکوہ ہندوستان میں مارا گیا۔

ان دونوں روایتوں کا تعارض ظاہر ہے۔ ایک فیصلہ کرنے والے کے لیے دشواری ہو جاتی ہے۔ مگر غالباً مصنف خزینۃ الاصفیاء نے داراشکوہ کی کتابیں خود نہیں پڑھیں۔ اب ہم مولانا نجیب اشرف ندوی مصنف مقدمہ رقعات عالمگیر کا بیان اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں جس سے ناظرین کے لئے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔

داراشکوہ، شاہجہاں کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ اس لئے سب سے زیادہ پیارا تھا ماں باپ کے لاڑ پیار، درباریوں کی خوشامد، غلط تعریف اور خود شاہجہاں کی انتہائی محبت نے اُسے خود سر، خود رائے اور ستائش پسند بنا دیا تھا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ تمام حکومت میں اس سے زیادہ صائب الرائے، ہوش مند، وسیع المشرب اور صاحب اقتدار کوئی نہیں ہے اس لئے جب اس کے دوسرے بھائی سن شعور کو پہنچے اور اپنے درجہ، مرتبہ اور کاموں کی وجہ سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگے تو اُسے یہ بات نہایت ناگوار معلوم ہوئی، اور چونکہ اورنگ زیب ان میں سب سے زیادہ بااثر، عقل مند، دور اندیش اور سب سے زیادہ کامیاب تھا، اس لئے دارا کو اس سے خواہ مخواہ عداوت پیدا ہوگئی، اور جوں جوں اورنگ زیب ترقی کرتا، اور لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بناتا جاتا، دارا کی دشمنی اور اس کی سازشیں، اس کے خلاف بڑھتی جاتیں۔ ذیل میں ثبوت ملاحظہ ہو۔

رقعات عالمگیری مطبوعہ کے رقعہ نمبر ۵ کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

میمنت پور[۳۳۱] خلافت پاشہزادگی کے زمانہ میں ہم اُمراء کے ساتھ ایسا سلوک کیا کرتے تھے کہ سب ہم سے راضی تھے اور ہمارے سامنے اور ہمارے پیچھے ہماری تعریف کیا کرتے تھے۔ بلکہ باوجودیکہ برادر نامہربان (داراشکوہ) کو بہت زیادہ اقتدار حاصل تھا مگر تب بھی کچھ اُمراء نے ان کی رفاقت ترک کر کے ہماری ملازمت اختیار کر لی تھی اور جن لوگوں نے برادر نامہربان کے اشارہ سے نامناسب حرکتیں کی تھیں اور ہمارے متعلق بے ادبی کے کلمات زبان پر لائے تھے، ہم نے ان سب کو اغماض و تحمل کے تازیانہ سے متنبہ کیا الخ

رقعہ نمبر ۴۷ کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

ایک روز اعلیٰ حضرت (شاہجہاں) نے خلوت میں دارا شکوہ سے ارشاد فرمایا۔ اُمراءِ بادشاہی کے حق میں بدگمان مت رہا کرو۔ ان سب کو عواطف والطاف میں شامل رکھو۔ باتیں بنانے والوں کی غرض آلود باتوں پر توجہ مت دیا کرو۔

رقعہ نمبر ۴۵ کا ترجمہ درج ذیل ہے:

فرزند عالی جاہ! ایک معتبر شخص کی زبانی یہ نقل کانوں تک پہنچی جو رشتہ تحریر میں منسلک کی جاتی ہے تاکہ آپ بھی اس سے سبق حاصل کریں۔

اعلیٰ حضرت (شاہجہاں بادشاہ) نے ایک روز علی مردان خاں اور سعد اللہ خاں کو خصوصیت کے ساتھ خلوت خاص کی عزت سے نواز کر زبان گوہر فشاں سے فرمایا:

"ملک ومال کا بندوبست فہم وانصاف پر منحصر ہے۔ معاذ اللہ اگر کوئی بادشاہ جو جوہر قابلیت سے محروم ہو، رتبہ خلافت پر فائز ہو جائے اور ایسے وزراء اور امراء کو جو حسن تدبیر سے عاری ہوں کام پر لگا دے تو نظم ونسق ممالک میں پورا خلل اور نقصان رونما ہو جائے گا۔ اس کا یہ فعل رعایا کی پریشانی، خلق اللہ کی بے سامانی، آمدنی کی کمی اور ویرانی ملک کے لئے ایک وثیقہ ہوگا۔ آپ دونوں صاحب خدا کے واسطے فقراء اور صلحاء کی خدمت میں حاضری دیتے ہوئے پانچوں نمازوں کے بعد دعا کراتے رہو، کہ ہماری سلطنت کی رونق نہ گھٹے۔ کوئی شخص (ہمارے متعلق) زبان پر بری بات نہ لائے، اور ہمارے بعد جولڑکا بھی فرماں روا ہو، اس کو اچھے کام کی توفیق ہو، بعض وقت خیال ہوتا ہے کہ مہین پور خلافت (دارا شکوہ) شان وشوکت، تجمل وصولت کے اسباب وسامان بہت کچھ رکھتا ہے لیکن نیکوں کا دشمن[۴۴۲] اور بروں کا دوست واقع ہوا ہے......؏

بابداں نیک وبد بہ نیکاں ست

شاہزادہ شجاع میں صرف ایک وصف ہے یعنی سیر چشمی۔ اس کے سوا اور کوئی وصف نہیں رکھتا۔ شاہزادہ مراد بخش مجہول الکیفیت ہے، اس کے متعلق کوئی فیصلہ ہی دشوار ہے۔ کھانے پینے کا شوقین ہے۔ ہمیشہ شراب میں مست رہتا ہے۔ مگر فلاں لڑکا (یعنی یہ عاجز فانی)[۴۴۳] صاحب عزم اور مآل اندیش نظر آتا ہے۔ غالب خیال ہے کہ وہ ریاست وسلطنت کے بارگراں کو برداشت کر سکے گا"۔

اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی افتادِ طبع کے متعلق حمید الدین خاں نیمچہ کی تحریر کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔[۴۴۴]

دارا شکوہ کسی امیر کے ساتھ عداوت اور کسی کے ساتھ غرور وتکبر کا طریقہ اختیار کرتا۔ حضرت عالمگیر ہر ایک کے ساتھ خاص تعلق رکھتے تھے۔ یہ امراء بھی حضرت عالمگیر کے پس پشت پوری محبت کے ساتھ لوازم مع دوستی پر عمل پیرا رہتے تھے۔ اعلیٰ حضرت کو دل ہی دل میں بہت گرانی ہوتی تھی۔

دارا شکوہ کے افعال واقوال کی قباحتوں پر اس کو نصیحت کرتے۔ جب دیکھا کہ دارا شکوہ پر نصیحت کا اثر نہیں ہوتا تو اعلیٰ حضرت کی خواہش ہوئی کہ محمد اورنگ زیب امراء کے ساتھ یکساں سلوک نہ رکھیں بلکہ تفاوت برتیں (کہ آنہم دست از حفظ الغیب بر دارند؟)۔ چنانچہ دستخط خاص سے ایک تحریر ارسال فرمائی۔

''بابا سلطان اور فرزندان سلطان کو چاہیے کہ بلند ہمت ہوں۔ عالی فطرتی کو کام میں لائیں۔ سنا گیا ہے کہ تم ہر ایک نوکر کے ساتھ بہت ہی پست ہو کر سلوک کرتے ہو۔ اس پست فطرتی سے مذمت کے سوا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا''۔

اورنگ زیب نے اس کا یہ جواب دیا کہ:

''براہ فضل وکرم اس غلام مستہام کے بارہ میں قلم عنایت رقم [۴۳۵] سے جو کچھ مرقوم ہوا، آسمانی وحی کی طرح نزول فرمایا۔

پیرومرشد برحق سلامت۔ عزت وذلت قادر وعباد اور خالق ارض وبلاد کے حکم کے بموجب ہے۔ جس کی شان ہے تعز من تشآء و تذل من تشاء۔ بندہ حدیث صحیح کے بموجب جس کے راوی حضرت انسؓ ہیں عمل کرتا ہوں من اذل نفسہ اعزہ اللہ۔ (جو اپنے آپ کو خدا کے لئے پست کرے خدا اس کو عزت دیتا ہے) دل شکنی کو سب سے بڑا گناہ اور سب سے زیادہ شرمناک عیب شمار کرتا ہے۔ نشان کرامت ترجمان سے جو کچھ صادر ہوا، اس پر کوئی انکار نہیں۔ لیکن یہ یقین ہے کہ وسواس خناس کے غرض کے بموجب یہ تحریر ہوا ہے۔

تعلیم

دارا شکوہ کی تعلیم کے واسطے اس وقت کے بہترین اساتذہ بلائے گئے تھے۔ ان میں مولانا عبداللطیف صاحب سلطان پوری اور ملا میرک شیخ ہروی کا عبدالحمید نے تذکرہ کیا ہے۔ خطاطی کے لئے عبدالرشید دیلمی جیسا استاد نصیب ہوا۔ شعر وشاعری کا ذوق مغلیہ شاہزادوں کو وراثت میں ملا تھا۔

تصوف سے بھی اُسے خاص ذوق تھا۔ سنسکرت اس نے بنارس میں رہ کر وہاں کے بہترین پنڈتوں سے سیکھی تھی۔

بیشک اُس کو ہر قسم کی ترقی کے لئے قدرت نے بہترین موقع عطا فرمایا تھا۔ مگر اس کی فطری خود پسندی [۴۳۶] نے اس کو غلط راستہ پر لگا کر اسلام کی جگہ الحاد کا حامی بنا دیا۔ اس کی تصانیف کی ترتیب صاف طور پر بتاتی ہے کہ وہ کس طرح آہستہ آہستہ زندقہ اور الحاد کی طرف جا رہا ہے۔

اس کی سب سے پہلی تصنیف ''سفینۃ الاولیاء'' ہے۔ اس کتاب کو اُس نے اس وقت لکھا ہے جب کہ وہ ۲۵ سال کا نوجوان تھا۔ یہ کتاب ۲۷ رمضان ۱۰۴۹ھ کو ختم ہوئی۔ [۴۳۷] اس میں چار سو گیارہ بزرگانِ دین کے مختصر حالات ہیں اور دو فصلوں پر منقسم ہے۔ اس میں اس نے اپنے نام کے ساتھ ''حنفی وقادری'' کے الفاظ بھی بڑھا دیئے ہیں۔ اس کے تین سال بعد ۲۸ برس کی عمر میں ۱۰۵۲ھ میں اُس نے ''سکینۃ الاولیاء'' لکھی۔ یہ کتاب اس

کے پیر ملا شاہ بدخشانی کے مرشد حضرت میاں میر کے حالات میں ہے۔ ان کو دارا شکوہ باری تعالیٰ کہا کرتا تھا۔

''چوں ایشاں در کوہائے نواحی قصبہ باری عزلت گزیدہ بودند من ایشاں را حضرت باری تعالیٰ مے گفتم (۵۳۸) (حسنات العارفین ص ۳۰) (۵۳۹)

اسی وقت سے اس کو الہام یا ندائے غیبی کا تجربہ ہونا بھی شروع ہو جاتا ہے۔

چنانچہ اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ اس نے ایک ندا سنی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسی چیز ملے گی جو آج تک کسی بادشاہ کو نہیں ملی، اور اس کی تعبیر یہ ہے کہ ملاطہ نے ملا بدخشانی کے ہاتھ پر بیعت کی۔

پھر اس نے رسالہ ''حق نما'' لکھا۔ اس میں واصل الی الحق ہونے کے متعلق مختلف مدارج بتائے ہیں اور لکھا ہے کہ اس رسالہ کو صرف ایسے شخص کو پڑھنا چاہیے جس کی ہدایت کے لئے ایک مرشد موجود ہو۔

پھر لکھتا ہے کہ اہل اللہ اور عارف اس رسالہ کو پڑھیں گے۔ وہ اس بات پر متحیر ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے کشف رموز و حقائق کے کیسے کیسے ابواب مجھ پر کھول دیے ہیں، اور ایک شاہزادہ ہونے کے باوجود اور کسی ریاضت و عبادت کے بغیر عرفان کا دروازہ کس طرح مجھ پر باز ہے۔ (۵۴۰)

یہ رسالہ جو چار فصلوں پر منقسم ہے، ۱۰۵۶ھ میں ختم ہوا۔ اس رسالہ میں ایک جگہ لکھتا ہے:

شبے بخواب دیدم ہاتفے آواز داد۔ (۵۴۱) چہار بار تکرار کرد کہ آنچہ ہیچ یکے از سلاطین روئے دست نداد۔ (۵۴۲) اللہ تعالیٰ بتو ارزانی داشتہ ص ۶ و ص ۷)

اسی زمانہ میں اُس نے علانیہ ایسے جملے اور الفاظ عام گفتگو میں استعمال کرنے شروع کیے جو شریعت کی نظر میں قابل الزام تھے۔ اس پر جب بعض لوگوں نے چہ میگوئیاں شروع کیں تو دارا نے ''حسنات العارفین'' (شطحیات) کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ جس میں رسول اللہ، اصحاب کبار کے بعض موضوع اقوال اور مختلف بزرگوں کی حالت جذب وغیرہ کے اس قسم کے جملے جمع کیے ہیں۔ جن سے ظاہراً منصوری دعوے کی تائید ہوتی ہے۔ یہ کتاب ۱۰۶۲ھ میں ختم ہوئی۔ اس کتاب کا مطالعہ یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ دارا شکوہ کم از کم لوگوں پر ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس درجہ و رتبہ پر پہنچ گیا، جہاں (۵۴۳) پہنچ کر (عوام کے عقائد باطلہ کے بموجب) کفر و اسلام کا سوال باقی نہیں رہتا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس نے یہ کتاب لکھ کر اپنا پردہ خود فاش کر دیا۔ یہ درست ہے کہ صوفیاء کرام مخصوص حالات میں غیب کے عجیب و غریب واردات سے متاثر ہو کر بے اختیار ان کو زبان پر لاتے ہیں مگر الفاظ ان کی مدد نہیں کرتے۔ کیونکہ الفاظ کے دامن میں ان کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ وہ لامحالہ اُن ہی عام الفاظ میں ان حقائق کو ادا کرنا چاہتے ہیں جو انسان اور اس کے حالات اور کیفیات کے لیے وضع کیے گئے تھے۔

مثلاً باری تعالیٰ سے ملنے اور بات چیت کرنے کو لامحالہ ملاقات، زیارت، بات چیت، کلام اور تکلم وغیرہ کے الفاظ سے ہی ادا کریں گے۔ حالانکہ یہ سب الفاظ انسانی کیفیات اور اعمال و حالات کے ساتھ مخصوص ہیں۔

باری تعالیٰ عز اسمہ سے ملاقات کی جو صورت ہو سکتی ہے۔ انسانی الفاظ اس کو ادا بھی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ کیفیت نہ عام انسانوں نے دیکھی، نہ اس کے لئے ان کے پاس الفاظ ہیں۔

بہر حال صوفیاء کرام سے بھی شطحیات سرزد ہوئے ہیں جن کے متعلق حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات کے کچھ اقتباسات ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان الفاظ بے خودی کو الفاظ بے خودی یا شطحیات ہی کہا جاتا ہے۔ ان کو شریعت قرار دینا سراسر زندقہ اور الحاد ہے۔

منصور کے انا الحق کو اگر شریعت کہہ دیا جائے تو پھر اسلام اور کفر میں کیا فرق رہے۔ لیکن دارا شکوہ کا یہ غرور تھا، اور اسی غرور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تمام باتیں بناوٹی تھیں کہ جب اس پر اعتراض ہونے لگے تو وہ فوراً اپنے کو حق بجانب کرنے اور ان ہی شطحیات کو عین دین، عین شریعت قرار دینے کے لئے تصنیفیں لکھنے لگا۔

چنانچہ اسی خیال کو تقویت دینے اور ہندوؤں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اس نے اپنی وہ کتاب لکھی جو مجمع البحرین کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دارا کی آخری تصنیف ہے جو اس کے عقائد و خیالات کو عریاں کر کے سامنے لاتی ہے، ۱۰۶۵ھ میں لکھی گئی۔

اس کتاب میں دارا نے یہ دکھایا ہے کہ اسلامی تصوف اور ویدانتک فلسفہ اپنے اصول، اپنی تعلیمات اور اپنی حقانیت کے لحاظ سے ایک ہیں، اور جو شخص حق کو حاصل کرنا چاہے وہ ان میں سے کسی بھی راستہ کو اختیار کرے، اس سے منزل مقصود تک پہنچ جائے گا۔ اُسے خود خطرہ تھا کہ مسلمان اس کی تصنیف کو پسند نہ کریں گے۔ اس لئے اُس نے دیباچہ میں لکھ دیا کہ اُس نے یہ کتاب ''راز درون خانہ سے واقف'' ''اہل بیت'' کے لیے لکھی ہے ''ومرا بعوام ہر دو قوم کارے نیست''۔ اسی وقت سے حنفی وفاداری کی نسبت بھی غائب ہو جاتی ہے۔

> مے گوید فقیر بے اندوہ محمد دارا شکوہ بعد از دریافت حقیقۃ الحقائق و تحقیق رموز و دقائق مذہب حق صوفیہ و فائز گشتن باین عطیہ عظمیٰ در صدد آں شد کہ درک کنہ مشرب موحدان ہند محققان ایں قوم قدیم نماید بابعضے از کاملان ایشاں کہ بنہایت ریاضت و ادراک و فہمیدگی و غایت تصوف خدایابی و سنجیدگی رسیدہ بودند، مکرر صحبتہا داشتہ و گفتگو نمودہ، جز اختلاف[۵۲۴] لفظی در یافت و شناخت تفاوتے ندیدہ۔[۵۲۵] ازیں جہت سخنان فریقین را بہم تطبیق دادہ وبعضے سخناں کہ طالبان حق را دانستن آں ناگزیر و سود مند است فراہم آوردہ۔[۵۲۶] (ص۳ ۲۰ مجمع البحرین ۳)[۵۲۷]

اس کے بعد وہ اس قسم کی کتابیں خود نہیں لکھتا بلکہ اپنے ملازمین سے بھی لکھواتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور رسالہ وہ ہے جو اس کے منشی چندر بھان نے مکالمہ دارا شکوہ و بابا لعل کے نام سے ترتیب دیا ہے۔ اس مکالمہ کی روح اسی خیال کی تائید ہے کہ حق و صداقت کسی خاص ایک مذہب کی ملکیت نہیں۔

دوسری کتاب جوگ بششٹ ہے۔ دارا کے حکم سے ۱۰۶۶ھ میں سنسکرت سے اس کا ترجمہ کیا گیا۔ اس

ترجمہ کے متعلق دارا کا بیان خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔

''اس کتاب کے انتخاب کا ترجمہ جو شیخ صوفی کے ساتھ منسوب ہے، ہم نے (دارا نے) مطالعہ کیا تو رات کو خواب میں دیکھا کہ دو بزرگ قبول صورت، ایک اونچے پر اور دوسرے کسی قدر اُن سے نیچے کھڑے ہوئے معلوم ہوئے۔ جو اونچے پر کھڑے تھے بشسٹ تھے اور دوسرے رام چندر۔ میں بے اختیار بشسٹ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بشسٹ نے نہایت مہربانی کے ساتھ اپنا ہاتھ میری پیٹھ پر رکھا اور فرمایا کہ اے رام چندر! یہ سچا طالب ہے اور سچی طلب میں تیرا بھائی ہے، اس سے بغلگیر ہو۔ رام چندر کمال محبت کے ساتھ مجھ سے ملے اس کے بعد بشسٹ نے رام چندر کے ہاتھ میں مٹھائی دی تا کہ مجھے کھلا دے میں نے وہ شیرینی کھائی۔ اس خواب کے دیکھنے پر ترجمہ کی خواہش از سرِ نو زیادہ ہوئی، اور دربار عالی کے حاضرین میں سے ایک شخص اس خدمت پر مقرر ہوا، اور ہندوستان کے پنڈتوں سے اس کتاب کے لکھنے میں اہتمام و انصرام کرایا۔ (منہاج السالکین ترجمہ جوگ بشسٹ (۵۴۸))

عالمگیر نامہ میں مفصل طور سے اس کے آخری مذہبی عقائد کو اسی طرح بیان کیا ہے: (۵۴۹)

اباحت والحاد اس کی طبیعت میں جم چکا تھا۔ اور اس کو وہ تصوف کہا کرتا تھا۔ آخری حالت میں فقط اباحت والحاد کے اظہار پر قناعت نہیں کی۔ بلکہ ہندوؤں کے دین اور ان کے رسم و رواج کا گرویدہ ہو گیا برہمنوں، جوگیوں اور سنیاسیوں کے ساتھ ہمیشہ صحبت رکھتا اور ان کو مرشدان کامل اور خدا رسیدہ و عارف سمجھتا اور وید (۵۵۰) کو کتاب آسمانی اور خطاب ربانی جانتا اور کتاب کریم کا سب سے پہلا مصحف کہتا تھا۔

عقیدہ باطل (۵۵۱) اس انتہا کو پہنچ گیا تھا کہ الماس یاقوت اور زمرد وغیرہ قیمتی جواہر کے نگینوں پر جن کو وہ پہنا کرتا تھا، خداوند عالم کے اسماء حسنیٰ کے بجائے پوری عقیدت مندی کے ساتھ ہندی خط میں ایک ہندی نام ''پربھو'' کندہ کرایا تھا، اسی کو متبرک سمجھتا اور اسی سے برکت حاصل کرتا۔ اور چونکہ اس کا عقیدہ تھا کہ عبادت کی تکلیف ناقص لوگوں کے لئے ہے، عارف کامل کو عبادت کی ضرورت نہیں اور آیہ کریمہ واعبد ربک حتی یاتیک الیقین کا مطلب ملحدوں کے خیال کے بموجب گھڑ کر اپنے ان خیالات باطلہ کی دلیل بناتا تھا۔ لہٰذا انہیں عقائد باطلہ کی بناء پر نماز، روزہ اور جملہ تکالیف شرعیہ کو خیر باد کہہ چکا تھا''۔

حسنات العارفین (۵۵۲) میں اسی طرح قرآن مجید کی دوسری آیتوں کے معنی بھی دارا نے گھڑے ہیں۔ مثلاً دارا کے پیر ملا شاہ نے یایھا الذین امنوا لاتقربوا الصلوۃ وانتم سکاری کے یہ معنی اور تفسیر بیان کی ہے۔

''اے کسانیکہ ایمان حقیقی آوردہ آید نزدیک نماز نشوید دروقتے کہ در حالت سکر و مستی باشید۔ مقرر

سکر حالت بلند تر ست از نماز گزاردن۔ اگر مستی مجازی است قرب نماز ممنوع ست تا نماز فوت نشود۔ دریں صورت عزت نماز ست و اگر سکر حقیقی ست، باز ہم قرب نماز ممنوع ست دریں صورت عزت سکر ست، مصلی نماز، نماز کہ خواند (۵۵۳) [ص ۳۲]۔

دارا شکوہ اپنے آپ کو فنافی اللہ سمجھتا تھا۔ اس لئے عبادت کی پابندی سے بھی آزاد ہے۔ اسی طرح خود ملا شاہ کے پیر میاں میر نے ختم اللہ علی قلوبھم الآیہ (۵۵۴) کے متعلق بتایا ہے کہ:

در حق خاصاں ست۔ ختم ست بر دلہا ایشاں کہ درون ایشاں غیر نہ بیند و چشم ایشاں غیر نہ بیند و گوش ایشاں غیر نشنود۔ و مرا ایشاں را لذت و حلاوت بسیار ست از ان کفر۔ (۵۵۵) ص ۳۰۸

محمد کاظم مصنف عالمگیر نامہ اگر چہ عالمگیر کا ملازم اور اس کا مورخ ہے۔ مگر حسنات العارفین کی تحریر بالا اس کے بیان کی تصدیق کر رہی ہے۔ مزید تصدیق ملاحظہ ہو۔ خود دارا کے الفاظ ہیں۔

اپنے ایک خط میں شاہ دلربا کو لکھتا ہے:

''الحمد للہ الحمد للہ کہ از برکت صحبت ایں طائفہ شریفہ مکرمہ معظمہ از دل ایں فقیر اسلام مجازی برخاست و کفر حقیقی روئے نمود..... اکنوں کہ قدرے کفر حقیقی دانستم زنار پوش و بت پرست بلکہ خود پرست (۵۵۶) و دیر نشین گشتم [رقعات عالمگیر ص ۲۲۲ رقعہ نمبر ۲۰۷ و ۴۰ ص ۷-۳۰]۔

لیکن کیا دارا واقعی درجہ فنا پر پہنچ چکا تھا۔ وہ اپنی تمام خواہشات، تمام ہوسنا کیوں، تمام حیلہ و فریب، تمام جاہ پرستی و اقتدار پسندی کو فنا کر چکا تھا؟ اس کا جواب تاریخ کے اوراق دے سکتے ہیں، جن میں چاروں بھائیوں کے جنگ کے اسباب و وجوہات درج ہیں۔ ان کا اجمالی بیان عالمگیر کے حالات میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ لہذا دارا کے باقی حالات کو اسی مقام کے حوالہ کرتے ہوئے ہم ناظرین کرام کو حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمات جلیلہ کی طرف پھر توجہ دلاتے ہیں۔

تسلیم کیا جا چکا ہے کہ دارا کی تباہی کا سبب اسی کے خیالات تھے۔ اس کے انہیں عقائد نے درپردہ سنجیدہ امراء دولت کو اس سے متنفر کر دیا تھا۔ اور یہی سبب تھا کہ جیسے ہی کسی کو موقع ملا، وہ دارا کو چھوڑ کر اورنگ زیب کی پناہ میں پہنچا اور دارا کے انہی خیالات کا مخالفانہ اثر تھا جس نے امراء دولت کے قلوب کو نہ صرف دارا سے بلکہ شاہجہاں کی جانب سے بھی جس کے وہ نمک خوار اور قدیمی معتمد علیہ تھے، ہٹا کر عالمگیر کے لئے فتح مندی اور فیروز بختی کو آسان کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ شاہجہاں نے قلعہ آگرہ جس میں وہ خود محفوظ ہو کر بیٹھا تھا اور جس کا فتح کرنا دشوار ترین امر تھا، اس کی کنجیاں خود عالمگیر کے پاس بھیج دیں کیونکہ وہ اپنی کامیابی سے مایوس ہو چکا تھا۔

اکبر اور جہانگیر کا تخت دارا کو دھکیل رہا ہے، اور زاہد خشک، پابند مذہب عالمگیر کے لئے مضطرب ہے۔ یہ انقلاب کس کی جدوجہد کا نتیجہ ہے؟ مبصرین کا فیصلہ ہے کہ اگر اس وقت عالمگیر نہ ہوتا، تو ہندوستان سے اسلام رخصت ہو گیا تھا۔

سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ (۵۵۷)

ولادت...... تعلیم...... تربیت

پروفیسر جدوناتھ سرکار اپنی مشہور تاریخ ''اورنگ زیب'' کی تمہید ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں:

''اورنگ زیب کی تاریخ عملاً ہندوستان کی شصت سالہ تاریخ ہے۔ خود اس کا عہد حکومت (۱۶۵۸ تا ۱۷۰۷ء) سترھویں صدی کے منصف آخر پر حاوی ہے اور ہمارے ملک کا اہم ترین تاریخی زمانہ ہے۔ یہ اسی بادشاہ کا ورود مسعود تھا، جب کہ حکومت مغلیہ اپنے انتہائی عروج پر پہنچی اور ابتداء عہد تاریخ سے برطانوی حکومت کے قیام تک کے زمانہ میں شاید یہ واحد حکومت ہے جس نے اتنی وسعت حاصل کی۔ غزنی سے لے کر چاٹگام تک اور کشمیر سے لے کر کرناٹک تک تمام ملک ایک ہی بادشاہ کے زیر نگین تھا، اور لادک و مالابار کے دور دراز مقامات پر بھی اسی بادشاہ کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ اسلام کی آخری سب سے بڑی ترقی کا یہی زمانہ تھا۔

اس طرح سے جو حکومت قائم ہوئی تھی، ایک سیاسی وحدت تھی۔ اس کے مختلف قطعات پر ماتحت حکمرانوں کا تسلط نہ تھا بلکہ بلا واسطہ بادشاہ کے ماتحت تھے۔ اور اس حیثیت سے اورنگ زیب کی ہندوستانی حکومت اشوک، سمدرگپت یا ہرشوردھن کی حکومت سے وسیع تر تھی۔ اس وقت تک کسی صوبہ کے گورنر نے سر نہ اُٹھایا تھا۔ اگرچہ کہیں کہیں علم بغاوت بلند ہوتا تھا لیکن کسی صوبہ میں بھی کوئی شخص ایسا پیدا نہیں ہوا، جو شہنشاہ دہلی کے احکام کی سرتابی کر سکتا۔ (۵۵۸)

ولادت

یوں تو شاہجہاں کی اولاد کی تعداد سولہ ہے لیکن اس کی محبوب ترین بیگم ممتاز محل بنت آصف خاں، اس کے چودہ بچوں کی ماں تھی اور اورنگ زیب کو باعتبار ترتیب چھٹا درجہ حاصل تھا۔ جس طرح اورنگ زیب کی تمام عمر گھر سے باہر اور دارالسلطنت سے دور گزری، اسی طرح اس کی ولادت و موت دونوں پردیس میں واقع ہوئیں۔

جہانگیر احمد نگر کے سپہ سالار ملک عنبر کو شکست دے کر آگرہ کی طرف اطمینان سے واپس آرہا تھا کہ مالوہ اور گجرات کی انتہائی سرحد پر بمقام دوحد سنیچر کا دن گزر کر رات کے وقت ۱۵ ذی قعدہ ۱۰۲۷ھ مطابق ۲۴ اکتوبر ۱۶۱۸ء کو ہندوستان کے سب سے بڑے تاجدار نے کتم عدم سے عالم وجود میں قدم رکھا۔ شاہجہاں بھی جہانگیر کے ساتھ تھا۔ اور اس نے دیرینہ رسم کے مطابق ایک ہزار اشرفی کی نذر گزرانی۔ جہانگیر نے اُسے قبول کرتے ہوئے اس مولود مسعود کا نام اورنگ زیب رکھا۔ گویا اسی وقت قضا و قدر کے کارکنوں نے خود دادا کے منہ سے اس پیشین گوئی کو ظاہر کر دیا جو چالیس سال بعد پوری ہونے والی تھی۔

چونکہ دوحد کی زمین اس قابل نہ تھی کہ "لائق جشن ضیافت باشد" اس لئے جہانگیر وہاں سے کوچ کر کے ایک تالاب کے پاس ٹھیرا۔ اور وہاں ابتدائی رسوم ادا کر کے پورا قافلہ "اوجین" پہنچا اور وہاں پہنچ کر جشن ولادت پوری شان وشوکت سے منایا گیا۔ (۵۵۹)

رضاعت

میر ابوالمعالی، خواتی خاں کی اہلیہ محترمہ کو یہ شرف حاصل ہوا۔ (۵۶۰)

تعلیم وتربیت

اساتذۂ اورنگ زیب کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسماء گرامی ذکر کیے جاتے ہیں۔

(۱) میر محمد ہاشم گیلانی۔ (۵۶۱)

(۲) ملا موہن بہاری۔ (۵۶۲)

(۳) علامی سعد اللہ وزیر اعظم شاہجہاں بادشاہ۔ (۵۶۳)

(۴) مولانا سید محمد قنوجی۔ (۵۶۴)

(۵) شیخ احمد معروف بہ ملا جیون امیٹھوی۔ (۵۶۵)

(۶) دانش مند خاں۔ (۵۶۶)

ذہانت وذکاوت

۳ ذی الحجہ ۱۰۴۵ھ (ایک ہزار پینتالیس) کو عالمگیر تمام دکنی صوبوں کا گورنر بنا دیا گیا۔ اس وقت اس کی عمر اٹھارہ سال دس روز تھی۔ اس اٹھارہ سالہ نوجوان کے متعلق عالمگیر نامہ کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے۔

"از علوم مکتسبہ وفنون متنوعہ تمام النصیب کامل التحصیل واز مبداء فیاض بمحامد صوری ومحامد معنوی بہرہ مند وکامیاب"۔

"خامہ معنی نگار آنحضرت حرف نسخ ونستعلیق بکرسی تحسین وتزئین نشاندہ"۔ (عالمگیر نامہ)

خلاصہ یہ کہ جملہ علوم وفنون کو مکمل طور پر حاصل کیا۔ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبانوں میں پوری مہارت پیدا کی اور عربی اور فارسی خط (نسخ ونستعلیق) میں کمال حاصل کیا۔ اسی کے ساتھ فنون حربیہ، ملکی آئین، طریق جہانبانی ودستور فرمانروائی کا وہ بہترین سلیقہ فراہم کیا کہ اس ننھی سی عمر میں سب سے زیادہ پرآشوب صوبوں یعنی صوبجات دکن کی وہ کامیاب گورنری کی کہ بعد کے کہنہ مشق حکام اور افسران اس کامیابی کے ساتھ حکومت نہیں کر سکے (جیسا کہ چند صفحات کے بعد معلوم ہوگا)۔ (۵۶۷)

حفظ کلام اللہ اور تجوید وقراءت

یہ تو عام طور پر معلوم ہے (۵۶۸) کہ اورنگ زیب حافظ کلام اللہ تھا مگر قابل تحسین یہ کہ یہ فخر وسعادت لڑکپن میں نہیں بلکہ عمر عزیز کی تینتالیس بہاریں گزر جانے کے بعد یہ دولت حاصل کی۔ جب برادرانہ جنگ سے نجات پاچکنے کے بعد اورنگ زیب بلاشرکت غیرے پورے ہندوستان کا شہنشاہ ہو چکا تھا۔ غالباً یہ اس کا شکریہ تھا جو اس نے اپنے معبود تاج بخش کی بارگاہ میں پیش کیا۔

ابتداء حفظ قرآن کی تاریخ آیہ کریمہ "**سنقرئک فلاتنسی**" اور اختتام کی "**لوح محفوظ**" سے نکلتی ہے۔ اورنگ زیب کے ایک مقرب شاعر حقیر نے اس موقعہ پر کہا تھا:

تو حامی شرع و حامی توشارع   تو حافظ قرآں و خدا حافظ تو

مزید برآں قابل ستائش یہ کہ:

"درعرض اندک دفتے ومختصر فرصتے مجموع کلام مجید وفرقان حمید بارعایت مراتب قراءت وشرائط تجوید وادراک شان نزول آیات بینات وتفسیر معانی وفہم اسرار ونکات آں برلوحہ، حافظ اشرف مرقوم گشت (عالمگیر نامہ)

پہلے پڑھ چکے ہو کہ ۱۰۷۰ھ میں عالمگیر کے اصرار پر حضرت خواجہ محمد سعید صاحب خلف رشید حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز دہلی تشریف لائے۔

حفظ کلام اللہ شریف آپ کی تشریف آوری کی پہلی برکت تھی۔

اس کے بعد روحانی تکمیل کے لئے حضرت شیخ سیف الدین صاحب نبیرہ حضرت مجدد صاحبؒ دہلی تشریف لائے تھے۔ غالباً زمانہ قیام ہی میں یہ دولت حاصل ہوئی۔

حفظ قرآن اور فہم کلام اللہ کے ساتھ ان دونوں بزرگوں کے فیض صحبت سے جو روحانی کمالات حاصل کئے، اُن کا اندازہ حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب کے چند جملوں سے ہوسکتا ہے۔

آنچہ دراصل احوال پادشاہ دین پناہ مرقوم نسودہ بودند، از سرایت ذکر در لطائف وحصول سلطان ذکر و رابطہ قلت خطرات وقبول کلمہ حق ودفع بعضے منکرات وظہور لوازم طلب ہمہ بوضوح پیوست۔ شکر خداوندی جل شانہ، بجا آورد۔ درطبقہ سلاطین این نوع امور حکم عنقاء مغرب دارد (مکتوب نمبر ۲۲۰ جلد سوم بنام شیخ سیف الدین صاحب قدس اللہ سرہما)۔

ہاتھی سے لڑائی

۲۹ ذی قعدہ ۱۰۴۲ھ (۲۸ مئی ۱۶۳۳ء) کی صبح کو شاہجہاں شاہان مغلیہ کی دیرینہ رسم کے مطابق مست ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشا دیکھنے کے لئے قلعہ آگرہ کے جھروکہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ دریا کے کنارے دو مست ہاتھی

لڑنے کے لیے چھوڑے گئے۔ دارا، شجاع اور چودہ سالہ اورنگ زیب اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار میدان میں کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ صورت سندر نامی ہاتھی ایک طرف کو بھاگا۔ اُس کے مقابل سدھکر نامی ہاتھی نے تعاقب کیا۔ حریف دور نکل گیا تھا۔ سدھکر نے مجمع کا رخ کیا۔ سب سے آگے اورنگ زیب کا گھوڑا تھا۔ مجمع میں انتشار پیدا ہو گیا۔ مگر اورنگ زیب نے بازوے جلاوت کشودہ پیشانی آں دونہاد۔ دیوتز دارا مجروح ساخت۔

چوٹ کھا کر ہاتھی اور غضب ناک ہوا۔ اس نے اورنگ زیب کے گھوڑے پر اپنے دانتوں سے اس زور کا حملہ کیا کہ گھوڑا لڑکھڑا کر گرا۔ مگر اورنگ زیب فوراً اچک کر کھڑا ہو گیا اور تلوار نیام سے کھینچ لی۔ دارا تو دہشت کھا کر بھاگ نکلا۔ مگر شاہزادہ شجاع اور راجہ جے سنگھ نے دوسری طرف سے ہاتھی پر حملہ کیا۔ اسی اثناء میں صورت سندر نے عقب سے آکر سدھکر پر حملہ کر دیا۔ سدھکر بھاگ نکلا۔

اورنگ زیب فیروز مندی کے ساتھ باپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شاہجہاں نے بہت کچھ انعام و اکرام کے بعد فرمایا۔ خدانخواستہ تو بے دیگرے شد چہ رسوائی بود۔

عالمگیر نے عرض کیا۔ مرنے میں کیا رسوائی ع پردہ پوش بادشاہاں مرگ است۔

رسوائی تو یہ تھی جو بھائی صاحب سے سرزد ہوئی۔ (۵۶۹)

یہ عالمگیر کے عہد طفلی کا عظیم الشان واقعہ ہے، اور یہی دارا کی رقابت کا آغاز ہے۔

عطاءِ منصب

تقریباً ایک سال بعد یعنی ۲ رجب ۱۰۴۳ھ جبکہ عالمگیر شاہجہاں کے ساتھ کشمیر جا رہا تھا، ''اس کو ''لوے بھون'' کا پرگنہ عطا ہوا۔ نیز بمنصب دو ہزاری ذات و چہار ہزاری سوار و علم و نقارہ و طومان طوغ بلند پایگی بخشیدہ فرمان داوندکہ بعد ازیں خیمہ سرخ برائے آں گوہر اکلیل سلطنت برپاے کردہ باشند۔ (۵۷۰)

ملکی مہمات اور دارا کی رقابت

عالمگیر کی پوری سوانح حیات لکھنی مقصود نہیں۔ مندرجہ ذیل نمبروں میں جنگ برادران اور معزولی شاہجہاں کے اسباب و وجوہات اجمالی طور سے بیان کئے گئے ہیں۔ تاکہ بارگاہِ مجددی کے آستانہ بوس اور اس کے مخالفین کے اعمال و مساعی پر انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جا سکے۔

(۱)

عالمگیر اپنے تمام اوصاف و کمالات، تمام سعادت مندیوں اور بلند اقبالیوں کے باوجود ایک چیز میں بدقسمت واقع ہوا تھا یعنی شفقت پدری، جو اُس کے حصہ میں بہت کم آئی تھی۔

شاہجہاں کی اولاد میں جس نے شفقت پدری سے بہت زیادہ اور بے نظیر حصہ پایا تھا، وہ اس کا لاڈلا بیٹا

دارا تھا۔ جو ایک بچہ کے انتقال کے بعد بہت زیادہ آرزوؤں اور تمناؤں کی حالت میں پیدا ہوا، جب کہ اس کے لیے اجمیر شریف حاضر ہو کر منت مانی تھی۔ دارا کی اس خصوصیت میں اگر کسی کو شرکت تھی، تو وہ شاہجہاں کی سب سے بڑی لڑکی جہاں آرا بیگم تھی۔

باوجودیکہ دارا فقط خوشامدی اور چرب زبان تھا، متانت اور سنجیدگی سے محروم، بے موقعہ ہنس دینے والا، طبیعت میں اس قدر نفاق کہ خود باپ کے ساتھ بھی اس کا رویہ مخلصانہ نہ تھا۔ مگر عیاری میں اس درجہ کمال رکھتا تھا کہ آخر تک شاہجہاں کو اپنا مقصد بنائے رکھا۔ اگر کبھی اس کا مکر وفریب شاہجہاں کے سامنے کھل جاتا تو وہ جلد ہی ظاہر پرستی اور تملق سے اس کی تلافی کر دیتا۔

عالمگیر حسن خدمات، جفاکشی، خلوص وصداقت کا یہاں تک دلدادہ تھا، کہ دارا کی عیاریوں کا جواب بھی اپنی صداقت کیشی ہی سے دینا چاہتا تھا۔

اس کا اعتقاد تھا کہ صداقت پسند شاہجہاں رفتہ رفتہ خود حق وصداقت اور عیاری وفریب کاری میں امتیاز کرے گا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ حتیٰ کہ وہ وقت آ گیا کہ عالمگیر کے لئے خاموش رہنا، اس کی ذات کے لئے نہیں بلکہ ملک وملت کے لیے ہلاکت کے مرادف ہو گیا۔ لامحالہ عالمگیر کے لئے لازم ہو گیا کہ جو پردے خود سے نہیں ہٹتے، ان کو تلوار کی نوک سے چاک کر ڈالے، اور جو تاریکی خود نہیں چھٹتی، ایک بار جلا کر اس کو روشنی سے بدل دے۔

معزول شاہجہاں سے جب اپنی جسارت اور دلیری کی معذرت کرتے ہوئے عالمگیر اسی حقیقت کو واضح کر رہا ہے، اور شاہجہاں لاجواب ہے:

''بادشاہزادۂ کلاں کہ بجز خوشامد ظاہری وچرب زبانی وخندہ بسیار نداشت ودر خدمت ولی نعمت دلش بازباں موافق نہ بود۔ از کردار ناقابل او چندیں ناشنیدہ انواع خفت مے کشید۔ چنانچہ فرامین سابقہ بداں ناطق است۔ بایں امید کہ شاید صدق عقیدت وبندگی را نتیجہ پدید آید، اصلاً طریق اطاعت وانقیاد انحراف نورزیدہ ہمیں کہ اعلیٰ حضرت ایں مرید را بعنوان رضا جوئی یاد میفرمودند خوسند مے بود۔ ہرگاہ دراں وقت اثر حسن اعتقاد وتحمل آں زیادہ نہاد بے وجہ مترتب نگشت، حق از باطل جدا نشد وصفائی جوہر رسوخ عقیدت مستور ماندہ سخن منافقاں دور واز پیش رفتہ موافق واز منافق وراست واز ناراست امتیاز نیافت وایں مرید قابل اعتماد والتفات نگردید اکنوں کہ مصدر گوناگوں گستاخی وبے ادبی شدہ پیدا است کہ اعلیٰ حضرت چگونہ توقع نیکی ازیں گنہگار خود رداشت وہر قول وفعل او چہ ساں اعتماد خواہد نمود''۔

: رقعہ نمبرا/ ۱۴۵اص ۲۱۴ رقعات عالمگیر]۔

(۴)

نظامت دکن باراوّل

۳ ذی الحجہ ۱۰۴۵ھ سے صوبجات دکن عالمگیر کے حوالہ ہوئے۔ آٹھ سال تک ان صوبوں کا گورنر رہا۔ اس عرصہ میں اس نوجوان گورنر نے نہ صرف دکن کے مغل علاقوں کو باغیوں، راہزنوں اور ڈاکوؤں سے پاک صاف کیا بلکہ اس میں بگلانہ وغیرہ کا اضافہ کردیا۔ مختصر یہ کہ:

صوبہ دکن را کہ درنہایت ویرانی و برہم خوردگی بود۔ نوے معمور ساختہ کہ بر عانسیان ظاہر ست (۵۷۱)

۲۷ محرم ۱۰۵۴ھ کو (جبکہ عالمگیر کو دکن کی گورنری کرتے ہوئے سات سال گزر چکے تھے) جہاں آرا بیگم کا جشن سالگرہ تھا۔ اتفاقاً دامن میں شمع سے آگ لگ گئی جہاں آرا بری طرح جل گئی۔ چار لونڈیاں جو ہاتھوں سے آگ بجھانے لگی تھیں، ان کے کپڑوں میں بھی آگ لگ گئی۔ ان میں سے دو مر گئیں۔ بادشاہ کو بہت پریشانی ہوئی۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد صحت ہوئی۔ بہن کی مزاج پرسی کے لئے عالمگیر آگرہ آیا۔ ابھی آگرہ آئے ہوئے تین ہفتے نہیں گزرے تھے کہ پھر ربیع الثانی ۱۰۵۴ھ کو عالمگیر نے ترک دنیا کا ارادہ کر کے خدمات سے استعفا دے دیا۔ لیکن شاہی عتاب سے معتوب ہوا۔ پھر جہاں آرا کی سفارش سے ۵ شوال ۱۰۵۴ھ کو قصور معاف ہوا۔ صوبہ گجرات کا ناظم بنایا گیا۔

عالمگیر نے ترک دنیا کا قصد کیوں کیا تھا؟ اس پر معتوب کیوں ہوا؟ اور پھر قصور معاف ہونے کا کیا مطلب؟ یہ ایک معمہ ہے۔ اس کا انکشاف دس سال بعد کے ایک خط سے ہوتا ہے جو عالمگیر نے دوسری مرتبہ نظامت دکن کے زمانہ میں اپنی بہن جہاں آرا کے نام بھیجا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

> مشفقہ من! اگرچہ فدوی مریدانِ بادشاہی اور بندگانِ مقرب کے زمرہ میں خود کو داخل نہیں سمجھتا، بلکہ اپنے تئیں ایک ذلیل غلام شمار کرتا ہے لیکن چونکہ ہمیشہ اس دولت کے زیر سایہ عزت و آرام کی زندگی بسر کی ہے اور ذات شاہانہ کے احسانات و نوازش سے پرورش پائی ہے۔ طرح طرح کے احسانات مجھ پر ہوتے رہے ہیں حتیٰ کہ ولایت دکن کی صوبہ داری بھی اس مرید کی درخواست کے بغیر میرے پیر و مرشد حقیقی نے اپنے خسروانہ لطف و کرم سے خود ہی مرحمت فرمادی ہے لیکن مجھے تعجب ہے کہ پھر یہ بے رخی اور بے التفاتی جو شان مرید پروری اور بندہ نوازی کے قطعاً مخالف، اور اس فدوی کے تذلیل و توہین اور عدم استقلال کا سبب ہے، آخر کیوں ہے۔
>
> یہ عقیدت شرست جوایز دجہان آفریں عز شانہ کے بعد قبلہ و کعبہ کی ذات والا صفات کے سوا کوئی پناہ نہیں رکھتا، بلا وجہ کیوں معتوب ہے۔
>
> اگر کسی کی خاطر یا کسی مصلحت سے طبع مبارک کی مرضی یہ ہے کہ یہ فدوی اس قسم کی ذلیل زندگی

گزارتے گزارتے آخرکار کسی نامناسب صورت سے تباہ و برباد ہوجائے، تب بھی اطاعت سے گریز نہیں۔

ہر چہ رود برسرم چوں تو پسندی رواست
حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ

لیکن چونکہ اس طرح جینا اور مرنا دشوار ہے اور قطعاً بے لطف نیز فانی اور ناپائیدار اُمور کے لئے نہ تکلیف اور مصیبت ہی برداشت کی جاسکتی ہے اور نہ خود کو دوسروں کے حوالہ کیا جاسکتا ہے لہٰذا یہی بہتر ہے کہ اعلیٰ حضرت کے حکم سے جن کی رضامندی پر تمام مریدوں کا سروجان فدا ہے، ایسی زندگی کے ننگ و عار سے رہائی پالوں تاکہ مصلحت ملکی بھی فوت نہ ہو، اور بہت سے دل بھی اس فکر و پریشانی سے آسودگی حاصل کرلیں۔

اس مرید نے دس سال پہلے ہی اس بات کو معلوم کرکے اور خود کو مخل مقصود سمجھ کر استعفا پیش کیا تھا۔ پھر محض پیرو مرشد حقیقی کی خوشنودی کے لئے جو اس فدوی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ اس کام میں مشغول ہوگیا۔ جو کچھ برداشت کرنا تھا برداشت کیا۔ بہتر یہ تھا کہ اسی وقت معاف فرمادیتے تاکہ گوشہ نشینی اختیار کرکے کسی کے لیے غبار خاطر نہ ہوتا، اور اس کش مکش میں نہ پڑتا۔ اب بھی اس کام کی تدبیر اعلیٰ حضرت کی رائے صواب نما پر موقوف ہے بہرحال جو کچھ اس مرید کے لیے مناسب ہو حکم فرمایا جاوے تاکہ مرضی مقدس سے آگاہ ہوکر اس کے لئے کوشش کرے۔ (۵۶۲)

(۳)

جنگ بلخ و بدخشاں

عالمگیر صوبہ گجرات میں ایک سال چند ماہ رہا۔ کیونکہ پھر اس کو بلخ و بدخشاں کی جنگ پر مامور کردیا گیا۔ جہاں پہلے شاہزادہ مراد کو بھیجا گیا تھا۔ اگرچہ کافی فتوحات حاصل کیں۔ مگر پھر محض علاقہ اور باشندگان بلخ وغیرہ کے غیر مانوس ہونے کے باعث بلا اجازت سلطانی اس جنگ کو ناتمام چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ مراد کی اس طفلانہ حرکت نے غنیم کی ہمت بھی بڑھادی، نیز موقع دیا کہ اس فرصت میں پراپیگنڈہ کرکے قوم و نسل کا سوال پیدا کردیا جائے۔ اوزبکوں اور دیگر جنگ جو قبائل کو پہلے سے زیادہ جنگ پر غنیم نے آمادہ کرلیا، اور اب مغلوں کی مخالفت کا جذبہ تمام ملک میں عام ہوگیا۔

عالمگیر وہاں پہنچا تو اُس کے پاس فوج بھی ناکافی تھی، اور مراد کی فوج کے مقابلہ میں ہر ایک اعتبار سے تقریباً نصف۔ بایں ہمہ کامیاب رہا۔ حتیٰ کہ ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۰۵۷ھ کو عبدالعزیز خاں والی بخارا نے صلح کی پیش کش کی۔ جس کو عالمگیر نے منظور کیا۔ تحریک صلح کا باعث عالمگیر کا مذہبی استقلال ہے یعنی میدان جنگ میں

بازارِ قتل وخون گرم ہے۔ اسی گرمی کے ہنگامہ میں نمازِ ظہر کا وقت آ جاتا ہے۔ عالمگیر فوراً جماعت ظہر کا حکم دے دیتا ہے۔ بندگانِ خیر اندیش معذرت کرتے ہیں۔ مگر یہ پیکر استقلال آگے بڑھتا ہے۔ نہایت اطمینان کے ساتھ ظہر کے فرض اور سنتیں وغیرہ حسب معمول ادا کرتا ہے۔ نہ کوئی خوف ہے نہ ہراس۔ اور نہ کوئی گزند پہنچ سکتا ہے نہ غنیم کا کوئی حملہ کارگر ہوتا ہے۔ عبدالعزیز خاں جب یہ سنتا ہے تو اس پختگی اور عزم سے مرعوب ہو کر صلح کی التجا کرتا ہے۔ مآثر عالمگیری کے الفاظ یہ ہیں:

درزمان ورود موکب معلّٰی کہ عبدالعزیز خاں متقابہ آرزہ عف کارزار گردید افواج فراواں از سور وملخ پیرامون لشکر فیروزی اثر حلقہ زدہ بجنگ پیوست۔ درعین گرمی ہنگامۂ پیکار وقت نماز ظہر دررسید۔ وآں حضرت باوجود التماس امتناع بندھاء ظاہر بیں از مرکوب خاص فرود آمدہ صف آرائی جماعت شدہ فرض وسنت ونوافل راجعد ین ارکان وکمال حضور وطمینان ادا کردند۔

عبدالعزیز خاں بمجرد استماع ایں خبر شجاعت اثر زخیراں استقلال موید من عنداللہ شدہ طرح صلح نمود وبرزبان گزرانید کہ باچنیں درافتادن رزا فتاد ست(۵۷۳)

بلخ وبدخشاں کی جنگ کامیاب رہی۔ مگر عالمگیر کے لئے مزید پریشانی کا سبب بن گئی۔ کیونکہ مصارف جنگ کے سلسلہ میں عالمگیر کا باقی مطالبہ جو شاہی خزانہ کے ذمہ باقی رہ گیا، وہ وجہ نزاع بن گیا۔ اور مخالفین کو ایک(۵۷۴) موقعہ مل گیا کہ اس پردہ میں جھوٹی سچی باتیں بنا کر شاہجہاں کو مشتعل اور برافروختہ کر دیں۔

(۴)

مہم قندھار

قندھار پر شاہجہاں نے پہلے قبضہ کر لیا تھا لیکن عین اس زمانہ میں کہ شاہجہاں اپنے شاہجہاں آباد اور قلعہ شاہجہاں آباد کے افتتاح میں مشغول تھا، اور تاریخ ہندوستان میں عیش وراحت کی بہترین گھڑیاں گزر رہی تھیں۔ شاہ عباس ثانی والی ایران نے موقع پا کر بے شمار فوجوں سے قندھار پر حملہ کر دیا، اور اس کے تمام مضبوط قلعوں پر قابض ہو گیا۔

شاہجہاں نے فوراً سعد اللہ خاں کو لاہور سے اور اورنگ زیب کو ملتان(۵۷۵) سے جوابی کارروائی کے لئے روانہ کر دیا۔ ان دونوں نے وہاں پہنچ کر بہت سی فتوحات حاصل کیں۔ مگر قلعہ کا فتح کرنا ابھی دشوار تھا۔ عنقریب وہ موسم آنے والا تھا۔ جب برفباری کے باعث تمام راستے بند ہو جاتے۔ لہٰذا شاہجہاں نے فوجوں کو واپسی کا حکم دے دیا۔

اس جوابی حملہ میں جو کامیاب لڑائیاں ہوئیں، ان کے صلہ میں شاہجہاں نے تمام شرکاء کو انعامات سے نوازا، اور اورنگ زیب کو "بعنایت خاصہ زاختصد"۔

اورنگ زیب نے واپس ہوکر آئندہ محاصرہ کے لیے فوراً ہی تیاری شروع کردی، اور پھر شاہی حکم کے بموجب ۱۶ ربیع الاول ۶۲ھ کو قندھار کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کے بعد سعد اللہ خاں کو بھی روانہ کردیا گیا۔ اس محاصرہ کی تفصیلی کارروائی درج کرنی بے کار ہے۔ البتہ اس زمانہ کے رقعات و مراسلات سے معلوم ہوتا ہے، کہ شاہجہاں نے دہلی اور لاہور رہ کر اس محاصرہ کی کمان اپنے ہاتھ میں رکھی۔

عالمگیر موقع پر موجود تھا، حالات کو دیکھ رہا تھا۔ ضرورتوں کو محسوس کررہا تھا۔ مگر جو اُس کی رائے ہوتی، شاہجہاں کی رائے اس کے مخالف ہوتی۔ اور یہ اس زمانہ میں کہ نہ ریل کا سلسلہ تھا نہ تار برقی اور ٹیلیفون۔ خط و کتاب میں عرصہ صرف ہوتا۔ اور جو جواب ہوتا وہ عالمگیر کی رائے کے برخلاف۔ تاہم عالمگیر شاہجہاں کے احکام کی پوری چستی اور مستعدی سے تعمیل کرتا۔

مگر ضرورت اور موقعہ کے برخلاف جو احکام صادر ہوں، اُن کا نتیجہ معلوم ہے حقیقت یہ ہے کہ دارا نے ابتداء ہی سے اس بات کی کوشش کی کہ کسی صورت سے بھی اورنگ زیب کامیاب نہ ہوسکے۔ ورنہ اس کی عزت میں چار چاند لگ جائیں گے۔ اور اس مقصد کے لئے اُس نے ہر وقت اورنگ زیب کی ہر رائے کے خلاف شاہجہاں کو مشورہ دیا۔ شاہجہاں خود ملتان کے راستہ سے قندھار جانا چاہتا تھا لیکن داراشکوہ نے ایسا نہ ہونے دیا۔ بادشاہزادہ دوم ''شجاع'' کو بنگال سے صرف اسی لئے بلایا گیا تھا کہ عالمگیر کے ساتھ محاصرۂ قندھار میں شرکت کرے۔ لیکن داراشکوہ نے یہ کہہ کر کہ ان کے تعلقات اچھے نہیں ہیں، اس کو بھی قندھار جانے سے روک دیا۔

اور پھر شاہجہاں کو اس درجہ بددل اور عالمگیر کی طرف سے اس قدر مایوس کردیا کہ اس نے صرف دو[(۵۷۶)] ماہ بعد اس دشوار ترمہم سے واپسی کا حکم سعد اللہ خاں کے نام روانہ کردیا۔ اور پھر اورنگ زیب پر ناکامی اور ناکارگی کا الزام لگا کر اس قدر معتوب اور ذلیل کیا کہ شاید تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر رہے۔ حالانکہ اس محاصرہ میں غریب عالمگیر کی حیثیت ایک ماتحت جنرل سے زیادہ نہ تھی۔ جو سعد اللہ خاں وزیر اعظم کی رائے کا پابند تھا اور شاہجہاں کے حکم کا منتظر۔ مہم کی کمان خود شاہجہاں کے ہاتھ میں تھی۔

مقدمہ[(۵۷۷)] رقعات عالمگیر میں اس محاصرہ کی پوری روائداد کے بعد تحریر ہے کہ:

''ابتداء محاصرہ سے لے کر آخر وقت تک اورنگ زیب کا جو طرزِ عمل رہا، اس نے ہر بات پر جس طرح بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی، اس کا اقتضاء تو یہ تھا کہ شاہجہاں اس کی اطاعت اور اس کی جانفشانی کی قدر کرتا لیکن اس کے بجائے شاہجہاں کو یہ سمجھایا گیا کہ اس ناکامی کا ذمہ دار اورنگ زیب اور صرف اورنگ زیب ہے۔ اور اسی وقت سے معمر شاہجہاں نے اورنگ زیب کے خلاف وہ معاندانہ رویہ اختیار کیا اور اس کی ہر کارروائی پر اس تکلیف دہ طرز سے تعریض اور تنقیص شروع کردی کہ شاید ہی کسی باپ نے اپنے بیٹے کو اتنے تیروں کا نشانہ بنایا ہوگا۔

اس کے ساتھ ہم اورنگ زیب کی سعادت مندی، بردباری اور اس کے تحمل کی تعریف کرنے پر مجبور

ہیں کہ اس پر طعن و تشنیع کے دل دوز تیروں کی بارش ہو رہی ہے۔ جابجا سازشوں کے جال بچھائے جارہے ہیں اور وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو بڑے سے بڑا دشمن کر سکتا تھا لیکن اس کی پیشانی پر ایک شکن بھی نہیں۔ اس کا دامن صبر ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ اس کا قدم جادۂ استقامت و اطاعت سے باہر نہیں پڑتا، اور اس کی کوئی ادا، کوئی حرکت حتی کہ کوئی لفظ بھی ایسا نہیں ہوتا جس کو خلاف تہذیب اور خلاف ادب کہا جاسکے۔ اور وہ جب دیکھتا ہے کہ شاہجہاں دشمنوں کی غیبت کا شکار ہو چکا ہے تو مایوسی کی حالت میں اپنی بہن کو بلیغ ترین اشارہ میں اس کی طرف توجہ دلاتا ہے اور صرف اس قدر لکھنے پر اکتفا کرتا ہے:

گر تو اے گل گوش برآواز بلبل سے کنی ۔۔۔ کار مشکل سے شود بر بے زبانان چمن (۵۷۸)

دارا کا خیال تھا کہ اورنگ زیب کو اس طرح ناکام کر کے خود مہم قندھار پر جائے اور اس فتح کا امتیازی تمغہ خود حاصل کرے۔ چنانچہ اس کے بعد عالمگیر کی فوج اور سامان جنگ سے بہت زیادہ فوج اور سامان جنگ لے کر قندھار گیا۔ وہاں پہنچ کر جدوجہد بھی کی۔ اور سب سے اہم کوشش یہ کی تھی کہ:

"محمد جعفر دو پشمینہ پوش، ردابردوش فقیروں کو دارا کے پاس لایا اور عرض کیا کہ دونوں مراقبہ کر کے دنیا کے حالات کی خبر دیں گے۔ داراشکوہ نے ان کو اعزاز و احترام سے باریاب کیا۔ قسم قسم کی خوشبوئیں پیش کیں۔ مراقبے کے بعد ایک نے کہا۔ میں سیر کرتا ہوا اصفہان گیا۔ وہاں دیکھا کہ شاہ ایران کے حادثہ کی واویلا مچ رہی ہے۔ دوسرے نے کہا۔ میں اصفہان گیا تو دیکھا کہ شاہ عباس کو سپرد خاک کیا جارہا ہے۔ پھر کیا تھا ان دونوں صاحبان حال کی زبانی یہ مژدہ سنتے ہی محمد جعفر اور دوسرے درباری ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے۔ خوشی کے نقارے بجنے لگے۔ اس کے بعد محمد جعفر ایک ریاضی دان نوجوان کو لایا، اور داراشکوہ سے عرض کیا کہ یہ شخص جنات کو مسخر کرنے میں کمال رکھتا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ اگر ایک لولی (بازاری عورت) اسی ایسی شکل کی اور کچھ سہ سالہ دو آتشہ شراب اور دیگر ضروری چیزیں فراہم کر دی جائیں تو وہ ایسا عمل کرے کہ جنات، بادشاہی فوج کے ساتھ مل کر زیادہ سے زیادہ چالیس روز میں قلعہ فتح کر ڈالیں گے۔ حکم ہوا کہ جملہ ضروریات فراہم کر دی جائیں عامل صاحب نے عمل کیا اور جب دیکھا کہ چالیس روز ختم ہونے والے ہیں، اور قلعہ فتح ہونے کی کوئی شکل نہیں تو چپکے سے بھاگ نکلا۔ [تاریخ ہندوستان ص ۳۴۴ جلد ۷]

دارا کی یہ تمام حماقتیں یا تو شاہجہاں کے علم میں نہیں آئیں، یا وہ محبت دارا میں اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ بری بات بھی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ حبک الشئی یعمی ویصم۔

بہرحال اوہام پرست اور ضعیف الاعتقاد شاہزادہ سے قندھار جیسی مہم نہ سر ہو سکتی تھی اور نہ ہوئی۔ اور لاکھوں روپیہ برباد ہوا۔ جانیں ضائع ہوئیں۔ مگر تعجب ہوتا ہے کہ بیدار مغز شاہجہاں، دارا اور عالمگیر کے معاملہ میں اس

قدر تمہی دماغ کیوں ہوگیا تھا۔

جب عالمگیر قندھار گیا ہوا تھا۔ اس کا صوبہ (ملتان وسندھ وغیرہ) دارا کے حوالہ کردیا گیا۔ دارا نے اپنے نائب کے حوالہ سے بادشاہ تک شکایت پہنچائی، کہ اورنگ زیب کے آدمیوں نے ملتان کا شاہی محل لوٹ لیا اور اس کے دروازوں کے چوکھٹ اور پتھر تک بیچ ڈالے۔ بادشاہ کی جانب سے تحقیقات کے لئے ایک افسر مقرر ہوتا ہے۔ وہ تحقیق کرتا ہے کہ ملازمان عالمگیر کے روانہ ہونے کے بعد داراشکوہ کے گماشتوں نے توجہ نہ کی۔ خود وہاں کے باشندوں نے موقع پاکر محل کا سامان لوٹ لیا۔ کواڑ، پتھر اور تختے جو وہ نکال سکتے تھے، نکال کرلے گئے۔ چنانچہ تلاشی کے وقت وہاں کے باشندوں کے مکانات سے وہ چیزیں برآمد ہوئیں، اُن کو سزائیں دی گئیں۔ مگر تعجب ہوگا کہ یہ تحقیقاتی رپورٹ شاہجہاں کے سامنے پیش نہیں کی گئی اور شاہجہاں کی بدگمانی کو نہایت ہوشیاری کے ساتھ بدستور باقی رکھا گیا۔

(۵)

نظامت دکن باردوم

یہی وہ پرآشوب دور ہے جس کی انتہا شاہجہاں کی معزولی اور جنگ برادران پر ہوتی ہے۔ اس دور کے تمام حالات ایک طویل افسانہ ہیں۔ ہم چند واقعات کی جانب نہایت اختصار کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے تفصیل کو اُن کے مآخذ کے حوالہ کرتے ہیں۔

الف: داراشکوہ کی خوشامد پسند، مغرور اور برخود غلط طبیعت نے خود شاہجہاں کو اس فیصلہ پر مجبور کردیا تھا کہ "بابداں نیک وبد بہ نیکاں ست۔" (۵۶۹)

چونکہ عالمگیر اوصاف حمیدہ میں تمام بھائیوں پر فوقیت لئے ہوئے تھا لہٰذا دارا کی رقابت، حسد اور بغض کا بھی سب سے زیادہ شکار تھا۔ مگر دوسرے بھائی بھی اس کے ایذاء اور شرانگیزی سے محفوظ نہ تھے۔ اپنی اپنی استعداد قابلیت اور علوِ ہمت اور بلند حوصلگی کے بموجب ہر ایک نے دارا کے اس سفرۂ عام سے حصہ پایا تھا۔

چنانچہ ہر ایک بھائی اس سے نالاں اور خائف تھا۔

مہم قندھار سے فراغت کے بعد جب عالمگیر کو دکن پہنچنے کا حکم ہوا تو اگرچہ دارا کی کوشش یہ تھی کہ قندھار سے واپسی پر شاہزادہ شجاع اور اورنگ زیب کی ملاقات نہ ہو چنانچہ ہر ایک کے کوچ کے پروگرام مرتب کرا کر اس کی پابندی کے متعلق شاہی فرمان پہنچ چکے تھے۔ لیکن پھر بھی یہ دونوں بھائی آگے پیچھے سفر کرتے ہوئے خاص اکبر آباد میں آکر مل گئے۔ تین روز تک دونوں بھائیوں میں مخلصانہ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ہر ایک کے خیال میں دارا ملحد تھا۔ دشمن مذہب اور ہر ایک بھائی کا بدخواہ۔ نظریہ کا یہ اتحاد ایک معاہدہ کا محرک ہوگیا۔

اس کے بعد دکن جاتے ہوئے راستہ میں عالمگیر کی شاہزادہ مراد سے ملاقات ہوئی۔ وہی محرک یہاں بھی

موجود تھا۔ چنانچہ تینوں بھائیوں کے درمیان طے ہوگیا کہ ہر ایک کو اپنی قوت محفوظ رکھنی چاہیے۔ اور شاہجہاں کے لئے جب امر ناگزیر آئے تو متحدہ طور پر اس دشمن دین وملت کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ اور اگر دارا کسی ایک بھائی کی طرف اقدام کرے تو دوسرے بھائیوں کو اس کی امداد کرنی چاہیے۔

ب: دس سال بعد ۱۵ ربیع الاول ۱۰۶۳ھ کو عالمگیر دوبارہ برہان پور (صوبہ دکن) میں داخل ہورہا ہے۔ اس دس سال میں خاں دوراں، راجہ جے سنگھ، اسلام خاں، شاہ نواز خاں، مراد بخش اور شائستہ خاں غرض چھ صوبہ دار یکے بعد دیگرے ''ہر کہ آمد عمارت نو ساخت'' کے بموجب نئے نئے انتظامات کر چکے ہیں۔ مگر ان کا نتیجہ ترقی کے بجائے تنزل تھا، اور آئے دن کے نئے انتظامات نے جن میں صوبہ داروں کی بدمزاجیوں یا اغراض پرستیوں کو بھی دخل تھا۔ ایک طرف تو وہاں کے افسروں کو بادشاہ کی خفگی سے مامون اور خود غرض کر دیا تھا اور دوسری طرف رعایا تباہ، زراعت برباد، ملکی انتظام تقریباً مردہ۔ انتہا یہ کہ وہی صوبہ جس کی آمدنی تین کروڑ باسٹھ لاکھ تھی ۱۰۶۲ھ میں صرف ایک کروڑ رہ گئی۔

پہلے پڑھ چکے ہو کہ بلخ وبدخشاں کی مہم کے بعد دس لاکھ کا مطالبہ خزانہ شاہی پر باقی رہ گیا تھا۔ قندھار کی دونوں مہموں کے بعد وہ مطالبہ سترہ لاکھ تک پہنچ گیا۔ اب یہ صوبہ عالمگیر کے حوالہ کیا گیا جو خود برباد تھا۔ عالمگیر کی بار بار کی درخواستوں پر جاگیریں بھی دی گئیں۔ مگر چونکہ شاہی دفتر پر دارا کا تسلط تھا، لہٰذا ان جاگیروں کی آمدنی دو چند سہ چند قرار دے کر خود شاہی خزانہ کا مطالبہ ان پر اتار کر دیا گیا جتنی ان کی اصل آمدنی ہوسکتی تھی۔ یہ معاملہ بذات خود بہت زیادہ اختلاف کا باعث بنا رہا۔ جس کے پردہ میں حریفوں کو خوب خوب موقعہ ملا کہ شاہجہاں کو اورنگ زیب سے زیادہ سے زیادہ متنفر کر سکیں حتیٰ کہ شاہجہاں نے شجاع کو بطور شکایت لکھا کہ عالمگیر دکن کا انتظام اچھی طرح نہیں کر سکا۔ (۵۸۰)

ج: دستور یہ تھا کہ ماتحت حکام کی ترقی یا آس پاس کی ریاستوں سے تعلقات کے متعلق گورنر گویا خود مختار ہوتا تھا۔ ملازموں کا تقرر اپنے اعتماد کے بموجب صوبہ دار خود کرتا تھا۔ البتہ رسمی طور پر منظوری بادشاہ سے حاصل کر لی جاتی تھی۔ کسی صوبہ دار کی سفارش کو رد کرنا گویا اس پر بداعتمادی کا اظہار تھا۔

رقعات عالمگیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر اس بداعتمادی کے تیر کا بار بار نشانہ بنایا گیا۔

قلعہ اسیر شاہزادہ مراد بخش پسر دارا شکوہ کے حوالہ تھا۔ دستور کے بموجب اس کا قلعہ دار وہاں مقرر تھا۔ لیکن اس مرتبہ جب نظامت دکن کے سلسلہ میں حسب دستور یہ قلعہ عالمگیر کے حوالہ ہوا، اور عالمگیر نے اپنے اعتماد کا قلعہ دار وہاں مقرر کرنا چاہا تو اس کی سفارش کو رد کر دیا گیا۔

عالمگیر جن پر درد الفاظ میں اس کا شکوہ اپنی بہن جہاں آرا سے کرتا ہے اُن سے عالمگیر کے تاثر کا اندازہ ہوتا ہے۔ آخری فقرہ یہ ہے کہ:

''زہے خسارت وندامت وکم طالعی ایں مرید کہ باوجود آنکہ بست سال صرف خدمت وبندگی نمودہ۔

در طریق عقیدت بجان و مال مضائقہ نہ کردہ ہنوز برابر برادرزادہ بہمال ہم شایان اعتماد نیست وقبلہ و ولی نعمت ادر اینچنیں تصور سے فرمایند۔ (۵۸۱)

د: اس زمانہ کا گورنر خود مختار نواب ہوتا تھا۔ ملکی ضرورتوں کے ساتھ فوجی محکمات کا انصرام بھی اسی سے متعلق ہوتا تھا اور وہی فوج کا کمانڈر انچیف ہوتا تھا۔ بالادست بادشاہ کی طرح اس کو بھی ضرورت ہوتی تھی کہ وہ وفادار ملازموں کی تربیت کرے تاکہ ضرورت کے وقت وہ کام آئیں۔ کسی گورنر کے معتمد آدمیوں کو اس سے لے لینے کے دوسرے معنی یہ ہوتے تھے کہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا ہے اور پھر جس طرح عالمگیر دکن کی مخالف سلطنتوں کے بیچ میں پھنسا ہوا تھا، اس کو زیادہ سے زیادہ قابل اعتماد، تجربہ کار، وفادار ملازموں کی ضرورت تھی۔ لیکن جب کہ عالمگیر کو بے بس ولاچار کرنا ہی مقصود تھا تو اس کے انہیں وفادار ملازموں کو توڑنے کی کوشش کی گئی۔ ان کو اعلیٰ عہدوں کی طمع دے کر شاہی ملازمت کے لئے طلب کیا جانے لگا۔ یہ چال اگر کامیاب ہو جاتی تو یقیناً عالمگیر کی بربادی اور تباہی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہتا۔ عالمگیر اسی مکتوب میں یہ شکوہ بھی ان الفاظ میں کرتا ہے:

"ہر گاہ ایں راہ واشود و تابینان ایں فدوی از نوکری جدا شدہ بہ بندگی درگاہ معلی سرفراز گردند و مناصب زیادہ از حالت خود بیابند معلوم ست کہ کسے پیش ایں مرید نخواہد ماند۔ وبعد ازاں ایں جماعت کہ در مدت بست سال فراہم آمدہ اند، بایں طریق متفرق شوند۔ از عہدہ خدمات چگونہ تواند برآمد۔ اگر مصلحتے دریں حکم ست حکم اعلیٰ صادر گردد تا جمیع نوکراں کار آمدنی را بتطییب خاطر روانہ حضور پرنور ساختہ آمادہ حصول مطلب عزیزاں باشد۔ (۵۸۲)

ہ: الغرض اس قسم کی سازشوں نے شاہجہاں کو اتنا برافروختہ کر دیا کہ وہ شاہانہ متانت بھی کھو بیٹھا۔ اور اب اُسی نے ایسی نکتہ چینیاں شروع کر دیں، جن کے تخیل سے بھی ہنسی آتی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ عالمگیر کا انگوٹھا کٹ گیا۔ عالمگیر اپنے ہاتھ سے شاہجہاں کو خط لکھا کرتا تھا۔ اس حالت میں بھی اُس نے اپنے ہاتھ سے ہی خط لکھا۔ مگر انگوٹھے کی تکلیف کے باعث خط میں تغیر آگیا۔ شاہجہاں کے دربار میں عالمگیر سے جس ظن کی گنجائش ہی نہ تھی۔ وہ یہ سمجھا، یا اس کو سمجھایا گیا، کہ عالمگیر کی یہ حرکت متکبرانہ اور سرکشانہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے خط نہیں لکھا۔ بس پھر کیا تھا، شاہجہاں برافروختہ ہو گیا اور باز پرس کر لی۔ (۵۸۳)

ایک (۵۸۴) اس سے بھی رکیک باز پرس تھی جو آموں کے متعلق ہوئی۔ برہان پور کے شاہی باغ میں "بادشاہ پسند" نام ایک مشہور آم تھا۔ جب اورنگ زیب دکن گیا تھا۔ اسی وقت بادشاہ نے اس سے کہا تھا کہ شاہی باغ کے آم اس کے پاس بھیجے جائیں۔ عالمگیر نے اس حکم کی یہاں تک تعمیل کی کہ بھی ایک دانہ بھی اس آم کا خود نہیں کھایا۔ لیکن اتفاق سے اس سال آم کم آئے۔ عالمگیر نے ان کی بھی کافی احتیاط کرائی۔ لیکن شاہجہاں کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ آم ضائع کئے جا رہے ہیں۔ اب بھی شکایت ہوتی ہے کہ آم کم بھیجے جا رہے ہیں۔ کبھی یہ آم خراب ہو جاتے ہیں۔ کبھی یہ کہ آم سیدھے راستہ سے نہیں بھیجے جاتے بلکہ برہان پور وغیرہ سے توڑ کر

پہلے اورنگ زیب کے پاس جاتے ہیں اور وہاں سے بادشاہ کے پاس تک آتے آتے خراب ہو جاتے ہیں۔ کبھی یہ تمام کچے توڑ لئے جاتے ہیں۔

اسی طرح کپڑوں کا قصہ چلتا رہا جو بادشاہ کے لئے برہان پور کے شاہی کارخانوں میں بنائے جاتے تھے۔

اس قسم کی رکیک رکیک نکتہ چینیاں دیکھنے کے بعد یقین ہوتا ہے کہ منصوبہ یہ تھا کہ جس طرح ممکن ہو، اورنگ زیب عالمگیر کو بغاوت پر مجبور کر دیا جائے، تاکہ شاہجہاں کے اقبال مند دور ہی میں اس کو کچل کر آئندہ کے لئے ہر ایک خرخشہ سے اطمینان حاصل کر لیا جائے۔ لیکن

دشمن چہ کند چوں مہربان باشد دوست

عالمگیر کو حیرت انگیز ضبط و تحمل، بے پایاں حلم اور قیاس سے زیادہ متانت اور فہم و فراست عطا ہوئی تھی۔ وہ ہر تلخ سے تلخ چیز کو شہد خالص اور عسل مصفیٰ سمجھ کر خورد و نوش کرتا رہا۔ اور غالباً ایسے خوش نصیب کے لئے جس کو پچاس سال تک پورے ہندوستان کی حکومت عدل و انصاف کے ساتھ کرنی تھی، ابتداء میں یہ امتحانات لازمی تھے۔

کیمیائیست عجب زندگی پیر مغاں　　خاک او گشتم چندیں درجاتم دادند
ہاتف آں روز بمن مژدۂ ایں دولت داد　　کہ بیا زار محبت صبر و ثباتم دادند

(۶)

دکن کی جنگی مہمات اور دارا شکوہ کی فتنہ انگیزیاں

الف: بیجاپور، حیدرآباد، گولکنڈہ وغیرہ مسلم حکومتوں کے علاوہ مرہٹوں کی ایک زبردست طاقت جنوبی ہند میں تھی۔

مرہٹوں کی خصوصیت یہ تھی کہ میدان میں جب جنگ ہوتی تو وہ فرار ہی کو کامیابی سمجھتے اور پہاڑوں میں جا چھپتے۔ اور جب فوج کا کوئی دستہ ان کا تعاقب کرتے کرتے پہاڑوں کے دروں میں گھستا تو وہ سب طرف سے نکل کر ایک دم حملہ کر کے دستہ کو تباہ کر دیتے۔ عالمگیر وقتاً فوقتاً شاہجہاں کے ایماء اور احکام کے بموجب ان طاقتوں سے جنگ کرتا رہا۔ کروڑوں روپیہ اور ہزاروں جانیں ختم کرنے کے بعد وہ ان طاقتوں کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کرتا رہا۔

وہ جنگ جو، مدبر اور بہادر جرنیل تھا، اس کو ان قربانیوں کا احساس بھی نہ تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دربار شاہجہاں کا رویہ اس کے لیے بہت زیادہ پریشان کن اور یاس افزا تھا۔

وہ شاہجہاں کے حکم سے ایک غنیم سے جنگ کرتا۔ روپیہ اور جانوں کی ہولی کھیل کر اس کو زیر کرتا۔ مگر اسی غنیم کے ساتھ دارا کی خفیہ ساز باز ایک طرف اس کے مغلوب غنیم کو سرکش بنا دیتی اور دوسری جانب اسی سرکشی کی کوئی علت تلاش کر کے یا ایجاد کر کے خود عالمگیر کو شاہجہاں کی جانب سے معتوب کر دیا جاتا۔ اس اجمال کی

تفصیل بہت طویل ہے۔ یہاں صرف ایک واقعہ بطور مثال پیش کیا جاتا ہے:

قطب الملک مملکت گولکنڈہ کا خود مختار فرمانروا ہے جو سلطنت مغلیہ کا باجگزار ہے۔ میر جملہ (۵۸۵) اس کا وزیر اعظم ہے۔ محمد امین پسر میر جملہ اسی ریاست کا افسر اعلیٰ ہے۔

میر جملہ مدبر، تجربہ کار اور بہادر جرنیل بھی ہے۔ قطب الملک سے اس کی مخالفت ہوتی ہے۔ وہ اور اس کا بیٹا سلطنت مغلیہ کی ملازمت میں آنا چاہتا ہے۔ شاہجہاں منظور کر لیتا ہے۔

شہنشاہ کا حکم قطب الملک کے نام پہنچتا ہے کہ یہ دونوں شاہی ملازم ہو گئے ہیں لہٰذا ان دونوں کو بھیج دیا جائے۔

اسی اثنا میں محمد امین شراب کے نشہ میں قطب الملک کے ساتھ گستاخی سے پیش آتا ہے۔ قطب الملک اس کو گرفتار کر کے سزا کر دیتا ہے۔ شاہجہاں اس کو حکم عدولی کے لئے ایک حیلہ سمجھ کر عالمگیر کو حکم کرتا ہے کہ قطب الملک کی تادیب کی جائے۔ اس سے خاص خاص شرائط کا مطالبہ کیا جائے اور نہ ماننے تو فوجی کارروائی کی جائے۔

قطب الملک مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ جنگ شروع ہو جاتی ہے عالمگیر کی فوجیں فتوحات حاصل کرتی ہوئی گولکنڈہ پہنچ جاتی ہیں اور محاصرہ کر لیتی ہیں۔

جب قطب الملک مجبور ہو جاتا ہے تو اپنی بوڑھی ماں کو عالمگیر کے پاس بھیج کر صلح کی درخواست کرتا ہے اور اپنی لڑکی محمد سلطان پسر عالمگیر کے لئے پیش کرتا ہے۔

یہ شرائط طے ہو رہی تھیں اور سلسلۂ مراسلت جاری تھا کہ اورنگ زیب کے نام شاہجہاں کا حکم صادر ہوتا ہے:

محاصرہ کو ختم اور قطب الملک کا پورا ملک اس کو واپس کر کے فوراً اپنے صوبہ کو لوٹ جاؤ۔

اس خط کا شانِ نزول یہ ہے کہ اس عرصہ میں قطب الملک کے سفیر عبدالصمد نے دارا اور اس کی جماعت کو اپنا موافق بنا کر شاہجہاں کو یقین دلا دیا کہ قطب الملک نے ہر ایک شرط منظور کر لی ہے۔ البتہ اورنگ زیب اس کو تنگ کرنے اور اس سے مزید رقم وصول کرنے کے لیے وہاں موجود ہے۔ اور حملہ کے وقت سے اس نے اس وقت تک لاتعداد جواہرات اور دوسری چیزیں تحفہ کے طور پر قبول کر لی ہیں اور ان کی بادشاہ کو اطلاع بھی نہیں دی۔

بس پھر کیا تھا، بلا تحقیق واقعات، شاہجہاں نے فوراً ہی مذکورہ بالا حکم صادر ہی نہیں کر دیا، بلکہ نامہ بروں کو ہدایت بھی کر دی کہ وہ اس کے مضمون کی تشہیر کریں، اور عالمگیر کو لکھ دیا کہ نقد و جنس جو کچھ ملا ہے، سب کا سب سرکاری خزانہ میں داخل کر دیا جائے۔

اورنگ زیب کے لیے یہ انتہائی آزمائش کا وقت تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

''از آنجا کہ ایں دنیا داران دکن از استماع خبر عدم استقلال ما و اعتبار و اطلاع برے بے توجہی اعلیٰ حضرت و تعرضات کہ از پیش گاہ خلافت سے رسد و مردم کے را ہزار ساختہ یا نہا بے رسانند از نوشتہ و گفتہ ما حساب نگرفتہ خود را از رجوع باین جانب مستغنی دانند تا کید ما در و اثر نکرد، و بمقتضائے آنچہ نوشتہ بودیم بعمل نیاورد بعد ازیں نیز ممکن نیست کہ نوشتجات ما پذیرد۔ [آداب نمبر ۱۹۱/۱/۱] (۵۸۶)

ایسی حالت میں اگر شاہجہاں کا کوئی دوسرا لڑکا ہوتا، تو اس سے یہ ذلت برداشت نہ ہوتی۔ مگر یہ اورنگ زیب کا کلیجہ تھا کہ اُس نے ایک مطیع وفرماں بردار لڑکے اور ایک اطاعت گزار، سعادت مند بھائی کی طرح، باپ اور بھائی کی ہر قسم کی چالوں کو دیکھا۔ ان کے مظالم سہے، ان کی سازشوں کا شکار ہوا۔ لیکن پھر بھی اُس نے کوئی مخالف کارروائی نہیں کی۔ اپنے فرض سے غافل نہیں رہا، اور نہ اُس نے کوئی سخت خط ہی لکھا۔ جب وہ بہت گھبرا جاتا تو اپنے ایک دوست وغم خوار کو صرف اس قدر لکھتا کہ "شاید شبے و نہم سحرے داشتہ باشد۔[۵۸۷]

اس قسم کے اور چند واقعات ہیں، جن کا اس موقعہ پر ذکر کرنا گنجائش سے باہر ہے۔

ب: بیجاپور کا والی عادل خاں تھا، جس کو شاہجہاں نے شاہ کا خطاب دے کر عادل خاں کے بجائے عادل شاہ بنا دیا تھا۔

یہ اگرچہ شاہجہاں سے صلح کیے ہوئے اور اس کے زیر پناہ تھا، لیکن اس کی خفیہ کوشش سلطنت مغلیہ کے مخالف رہتی تھی۔

قطب الملک کے ساتھ جو جنگ حال ہی میں ہوئی تھی، اس میں بھی اس نے قطب الملک کو امداد دی تھی۔

اس سے بڑھ کر عادل شاہ ایک اور چال چلا۔ اس نے اپنے ملازم[۵۸۸] ساہو جی بھوسلہ کے لڑکے شیوا جی کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ وہ مغلوں کے سرحدی مقامات پر حملہ کر کے ان کی توجہ کو تقسیم کر دے۔

اور خود ساہو جی بھوسلہ کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ وہ کرناٹک کے حصہ پر قبضہ کرے، جو میر جملہ کو ملا تھا۔

۲۶ محرم ۱۰۶۷ھ کو عادل شاہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کا کوئی لڑکا نہ تھا بیجاپوری امراء نے شاہنشاہ کی مرضی کے خلاف اس کے متبنّٰی کو "علی عادل شاہ ثانی" کے نام سے تخت پر بٹھا دیا۔

بہر حال اس قسم کے واقعات تھے جن کی بناء پر شاہجہاں نے عالمگیر کو نہایت سختی سے لکھا کہ وہ بیجاپور پر حملہ کر دے "و نتیجہ کہ مناسب داند بانجام رساند"۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ جب تک میر جملہ اورنگ زیب سے آکر مل نہ جائے وہ حملہ کے لئے روانہ نہ ہو۔ میر جملہ کے علاوہ شائستہ خاں کو یہ حکم ملا کہ وہ اپنے صوبہ سے جا کر اورنگ زیب کی عدم موجودگی میں دار السلطنت دکن میں قیام کرے۔ نیز مہابت خاں، نجابت خاں، راجہ رائے سنگھ، نصیری خاں، مرزا سلطان وغیرہ بہت سے امراء کے نام فرمان صادر فرمائے کہ وہ اپنی اپنی فوجیں لے کر دکن کو روانہ ہو جائیں۔

مہم گولکنڈہ کے تلخ نتیجہ سے عالمگیر کا متاثر ہونا لازمی امر تھا۔ لیکن ایک سعید فرزند کی حیثیت سے اس نے اپنے باپ اور اپنے بادشاہ کے حکم کی تعمیل کے لئے پوری چستی اور مستعدی سے خود کو پیش کر دیا۔

بہر حال پورے انتظام و اہتمام کے ساتھ حملہ شروع کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ شاہی افواج بیجاپوری فوجوں کو پسپا کرتی ہوئی ملک کے بڑے حصہ پر قابض ہو گئیں۔ اورنگ زیب اپنی اس فتح اور کامیابی پر مسرور تھا۔ بیجاپور کا سارا علاقہ اس کے سامنے کھلا پڑا تھا۔ اس کی ابتدائی مشکلات کا خاتمہ ہو چکا تھا اور وہ عنقریب خود بیجاپور کی طرف بڑھنے والا تھا کہ اس کے پاس اچانک بادشاہ کا حکم پہنچا کہ جنگ ختم کر دو۔ اور اس کے ساتھ ہی

دوسرے افسران کو یہ براہ راست فرمان پہنچا کہ وہ فوراً دکن سے لوٹ آئیں۔

چنانچہ مہابت خاں اور اس کی تمام فوج اور تقریباً تمام راجپوت فوجیں عالمگیر سے رسمی اجازت لئے بغیر دہلی کو روانہ ہو گئیں۔

''دریں اثناء دو قطعہ فرمان کہ حسب الالتماس دارا شکوہ بنام مہابت خاں وراؤ ستر سال از درگاہ عالم پناہ شرف اصدار پذیرفتہ بود پرتو نزول انداخت۔ در مناشیر مطاعہ حسن اندراج یافتہ بود کہ مہابت خاں با سائر مغلیہ وراؤ ستر سال باکل راجپوتیہ اصلاً برخصت شاہزادہ والا گہر مقید نشدہ، روانہ درگاہ گیتی پناہ گردند۔

ازیں راہ وہن وسستی تمام بحال اردوئے معلّٰی شاہی راہ یافتہ استقلال و بنائے ثبات وقرار جنود۔ نصرت موعود متزلزل و مختلل گردید۔ (۵۸۹)

سرکش مرہٹوں، نو مفتوح حکومت گولکنڈہ اور سرگرم پیکار بیجاپور وغیرہ وغیرہ کے بیچ میں، بتیس دانتوں میں ایک زبان کی طرح عالمگیر گھرا ہوا ہے۔

اس کی تمام جدوجہد، تمام قربانی، تمام جانفشانی پر پانی پھیر کر اس کو اس طرح ذلیل کیا جا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خون عالمگیر کا پیاسا اپنے ذلیل ترین منصوبہ کو نہایت کمینہ طور پر پورا کر رہا ہے۔

واقعہ بھی یہی تھا۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب دفعتہً شاہجہاں بیمار پڑ گیا۔ اور اگر چہ ان احکام کا شاہجہاں کو علم تھا اور دارا نے اس کو راضی بھی کر لیا تھا مگر وہ اس وقت مردہ بدست زندہ تھا۔ (۵۹۰)

اس کے علاوہ دارا نے شاہجہاں کے دستخط کی مشق کر لی تھی۔ جملہ کاروبار کا مالک بھی وہی تھا۔ اس نے متعدد فرامین اپنی مرضی کے موافق حکام کو لکھے، اور شاہجہاں کے جعلی دستخطوں سے ان کو روانہ کر دیا۔

بہرحال مذکورہ بالا فرمان کا سبب صدور بھی وہی دارا شکوہ کا علی عادل شاہ کی حکومت سے خفیہ ساز باز ہے۔

شاہجہاں کی علالت اور معزولی

۷ ذی الحجہ ۱۰۶۷ھ، ۶ دسمبر ۱۶۵۷ء تاریخ ہندوستان میں وہ دن تھا جس نے شیر بیشۂ حمیت ملی و غیرت اسلامی کو موقع دیا گیا کہ اپنے نیستاں سے نکل کر دارا شکوہ کی روباہ مزاجی کا خاتمہ نوک تلوار سے کر دے جبکہ تاریخ مذکور پر شاہجہاں دفعتہً حبس البول میں زندگی سے مایوس ہو گیا۔

الف: جیسے ہی شاہجہاں بیمار ہوا، دارا شکوہ نے بادشاہ کی خبروں پر سخت نگرانی شروع کر دی۔ بنگال، گجرات اور دکن کے راستے بند کر دیئے، کہ مسافروں کے ذریعہ سے بھی کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔ تینوں بھائیوں کے وکلاء کو جو دربار میں رہا کرتے تھے، گرفتار کر لیا۔ مزید برآں عالمگیر کے وکیل عیسیٰ بیگ کا گھر ضبط کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہئے تھا اور یہی ہوا کہ عام طور پر یقین ہو گیا کہ شاہجہاں مر گیا ہے۔ چنانچہ تمام ملک میں

اضطراب اور بے چینی پھیل گئی۔

''چوں دادا بھائی جیو در ایام عارضی مزاج مقدس، مصدر داء چندیں کہ ہمہ مخالف طرز پسندیدۂ حضرت اعلیٰ بود گشتہ راہ ہائے نوشتجات، وکلاء وآمد ورفت اخبار دربار جہاں مدار مسدود ساختہ عالم را بشورش در آوردند۔ وبا برادران...... بدسلوکی کہ باوجود ذات مقدس مبارک امکان نداشت پیش گرفتہ جگر اشتند کہ عرائض کمترین میداں...... بنظر اشرف اعلیٰ در آید تا بجواب چہ رسد''۔(۵۹۱)

جہاں آرا بیگم جو شاہجہاں اور دارا کی حمایت میں اورنگ زیب کو مکتوب موعظت لکھ کر جنگ داراشکوہ سے روکنا چاہتی ہے، اعتراف کرتی ہے کہ

''دریں وقت کہ بسبب ہرج ومرج از زیادہ سرائی فتنہ پرستان ودمن دستی بکشاد وبست امور ولایت نزدیک ودور راہ یافتہ ضرر کلی عائد حال رعایا وضعفاء گشتہ''۔ (۵۹۲)

دوسرے خط میں تحریر کرتی ہے: دمن وفتورے کہ بسبب بیماری آں برگزیدہ انفس وآفاق بحال کافہ برایا د عامہ رعایا راہ یافتہ۔(۵۹۳)

شاہزادوں نے تو اپنے علاقہ سے آگے بڑھ کر سورت پر حملہ بھی کر دیا کیونکہ ارتقاریہ جاسوساں معتمد بیقین پیوستہ کرد کہ در وآخر شہر ذی الحجہ حضرت را ہنگام موعود رسیدہ۔(۵۹۴)

شجاع کو لکھتا ہے:

وقوع واقعہ ناگزیر حضرت اعلیٰ دریست کہ ایں مخلص محقق ومتیقن شدہ۔(۵۹۵)

شاہزادہ مراد کے جاسوسوں نے یہ بھی اطلاع دی تھی کہ عوام کے ہیجان واضطراب پر قابو پانے کے لیے داراشکوہ ایک شخص کو جو شاہجہاں کے ہم شکل ہے دریچہ یا جھروکہ میں بٹھا دیتا ہے، اور شبیہ شاہجہاں لوگوں کا سلام بھی لیتا ہے۔

''مدتیست کہ سلطان داراشکوہ یکے را کہ بصورت قدسی طینت بادشاہ جہاں شباہتے تمام دارد گاہے از دریچہ دغرفہ برآوردہ، بمردم نماید وآں صورت بے معنی سلام مردم مے گیرد''۔(۵۹۶)

ب: یہ عام فتنہ اور ہیجان عالمگیر اور اس کے بھائیوں کے لئے از روئے انصاف جائز قرار دیتا ہے کہ وہ واقعات کی تحقیق کریں اور کوئی صورت دگرگوں ہو تو اپنے تحفظ نیز اپنے آباؤ اجداد کی حکومت وسلطنت کے بقاء کے لئے ہر ممکن جدوجہد کر ڈالیں۔

جاسوسوں کے ذریعہ تحقیق واقعات کی روئداد تو وہ تھی جو مراد نے اپنے مکاتیب میں شجاع اور اورنگ زیب کو لکھی۔ اب اس کے بعد خود جا کر تحقیق کرنے کا دوسرا مرحلہ تھا۔

اس کے جواز کی دلیل یہ تھی کہ جب ہمشیرۂ کلاں جہاں آرا بیگم کی علالت کے زمانہ میں مزاج پرسی اور زیارت کے لئے جایا جا سکتا ہے تو پیر ومرشد، قبلہ وکعبہ وخداوند مجازی، مربی، منعم ومحسن (بالقاب) کی مزاج پرسی

اور زیارت کے لئے جانے میں وجہ ممانعت کیا ہوسکتی ہے۔[(۵۹۷)] اور اگر بندش کی جاتی ہے تو گویا تو شاہجہاں زندہ نہیں، اور اگر بفرض محال ہست جز نامے بیش نیست۔[(۵۹۸)]

ایسی صورت میں کہ شاہجہاں کا صرف نام باقی ہو، اور جملہ اختیارات دارا کے قبضہ میں ہوں، جو تینوں بھائیوں کے عقیدہ میں دشمن دین، ملحد، زندیق، بھائیوں کا بدخواہ اور ہر ایک کی جانی دربادی کا کوشاں ہے تو شاہزادہ مراد کے الفاظ میں "عقلاً و شرعاً حفظ خود و دفع شر ضروری است۔"[(۵۹۹)]

ج: دارا کی نہایت کمینہ اور شرمناک حرکت یہ تھی کہ اُس نے شاہجہاں کے خط کی مشق کر کے شاہجہاں کے نام سے اپنے مطلب کے موافق فرامین لکھ کر تینوں بھائیوں اور اُمراء و افسران فوج کے نام بھیجنے شروع کر دیے۔ شاہزادہ مراد اورنگ زیب کو لکھتا ہے:

ملحد خود تقلید خط اقدس را بمرتبہ کمال رسانیدہ و بر فرامین دستخط خود میکند از انجملہ فرمانے ست کہ دریں ولا بہ مخلص رسیدہ۔[(۶۰۰)]

ان جعلی فرامین کے ذریعہ سے دارا نے کوشش کی تھی کہ شجاع سے مونگیر، مراد سے مالوہ اور اورنگ زیب سے برار واپس[(۶۰۱)] لے لے۔

(۷)

شاہجہاں کو کس نے معزول کیا

ہندوستان کی بدقسمتی ہے کہ عالمگیر کے جانشین ناخلف ہوئے۔ جنہوں نے اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے عالمگیر کو بدنام کرنا ضروری سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عالمگیر کی صحیح تاریخ اگر کوئی مرتب بھی ہوئی تو وہ شہرت نہیں حاصل کر سکی اور آج عالمگیر کے سوانح حیات کے روزنامچوں کے پراگندہ اوراق اور منتشر رقعات کی شیرازہ بندی ضروری ہو رہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ رقعات، روزنامچے اور ڈائریاں، کسی شخص کے حالات، سوانح اور اس کے جذبات و خیالات معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ مگر فن تاریخ کے لئے یہ کوتاہی یقیناً شرمناک ہے کہ ایسے جلیل القدر سلطان کے صحیح حالات ڈھائی سو برس بعد مرتب کیے جائیں۔

عام طور سے یہی کہا جاتا ہے اور یہی مشہور کیا جاتا ہے کہ شاہجہاں کو اورنگ زیب عالمگیر نے معزول کر کے قلعہ آگرہ میں محبوس کر دیا۔

مگر اس حقیقت کو صرف رقعات یا فارسی کی نایاب تاریخوں کے مطالعہ کرنے والے ہی جانتے ہیں کہ معزول کرنے والا عالمگیر نہیں تھا، بلکہ خود دارا تھا۔

ہر سہ برادران کے وکلاء کو بند کر دینا، خبروں کو بند کر دینا، معزول کر دینے کے مرادف ہے۔ علاوہ ازیں

شاہجہاں کے لئے آگرہ کی آب وہوا مناسب نہ تھی۔ اطباء نے شاہجہاں آباد، دہلی جانے کا مشورہ دیا۔ لیکن دارا کی مصلحت کے چونکہ مخالف تھا۔ لہٰذا اطباء کے اس مشورہ اور شاہجہاں کی خواہش کو پورا نہ ہونے دیا۔ اپنی مرضی اور رائے کے مطابق فرامین مرتب کر کے عالمگیر کو نازک ترین موقعہ پر بے دست و پا کر دینا، اور پھر بہنوں بھائیوں کی جاگیروں کو تبدیل کرنے کے فرامین مرتب کرنا، اس کے دعوائے استقلال کا بین ثبوت اور تینوں بھائیوں کو مقابلہ پر مجبور کر دینے والے امور ہیں۔ اس قسم کی متعدد حرکتوں نے تیز جاسوسوں اور بیوپاریوں نے مراد کو تو یہی یقین دلا دیا تھا کہ شاہجہاں کا انتقال ہو گیا۔ لیکن عالمگیر کی فراست نے اس کے لئے اس یقین کو فراہم نہیں کیا۔

وہ اول اول خبر مرگ کی صحت کے بارے میں متردد رہا۔ پھر اس کو یقین ہو گیا کہ خبر مرگ غلط ہے، البتہ معزول مطلق کر دیئے گئے ہیں۔

"او خود را با عدم استحقاق شائستہ فرمانروائی دانستہ مربی وولی نعمت را معزول مطلق ساختہ۔ (۶۰۲)
مہمین برادر متصدی امور سلطنت شدہ اوامر احکام بادشاہی بدون عرض اقدس بطور خود سرانجام دادہ
ویہیچ امرائے اختیار والا نگزاشتہ" (۶۰۳)

شاہزادہ مراد اول تو اپنے جاسوسوں کے اعتماد پر خبر مرگ کو صحیح سمجھ رہا تھا، اور عالمگیر کو بھی اسی کی تصدیق کی فرمائش کر رہا تھا۔ مگر اس کے بعد جب خود اس کو عالمگیر کے خیال کی تصدیق ہوئی تو داراشکوہ کے نام نہایت طنز آمیز خط لکھا کہ نہ بے خلف الصدق سعادت مند کہ پدر عالی قدر کہ جن کی توجہات اور جن کے احسانات کے طفیل میں خدمت سلطنت کے قابل ہوا، اسی کو قید میں ڈال کر جانی دشمن کی طرح عزیز ترین بھائیوں کی جاں ستانی اور ہلاکت پر کمر باندھی ہے۔ (۶۰۴)

اس کے بعد معاملہ کی نوعیت قطعاً بدل جاتی ہے اور بجائے سلطنت طلبی کے ہر ایک سعادت مند فرزند کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو قید سے رہائی دلائے۔ چنانچہ مراد اسی مکتوب میں دارا کو لکھ رہا ہے:

چونکہ پدر والا قدر کی رہائی ہمارا سب سے بڑا مقصد ہے۔ لہٰذا پنبہ غفلت کانوں سے نکال کر جملہ سامان و ذرائع فراہم کر کے آمادۂ جنگ ہو جاؤ اور ہم کو عنقریب طائر عجلت کے بازو پر سوار اپنے سر پر پہنچا ہوا سمجھو۔

(۸)

آج دارا کے مذہب میں بحث کی جاتی ہے۔ اس کو صوفی صافی مرشد باصفا گردانا جاتا ہے۔ مگر تینوں بھائی اس کو ملحد اور اس کی اولاد کو ملحد زادہ کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ دارا کی یہی بے دینی ایک دوسری وجہ ان تینوں بھائیوں کی مخالفت اور اتحاد کی پیدا کر دیتی ہے۔

مراد جیسا آزاد منش شہزادہ بھی لکھتا ہے: چوں نیت امداد و اعانت دین محمدی ست (صلی اللہ علیہ وسلم) بہ یقین مید انم کہ فتح و نصرت همیں جنود الٰہی با ماست۔ (۲۰۵)

(۹)

مؤرخین کا بیان ہے کہ جب دارا نے اورنگ زیب کے مقابلہ کے لئے فوجیں بھیجنے کا ارادہ کیا تو شاہجہاں نے سختی سے مخالفت کی مگر کارگر نہ ہوئی۔ اس کا سبب وہ معزولی تھی جس کا تمام بھائیوں کو یقین ہو چکا تھا۔ اس کے بعد جب دارا اور عالمگیر کی فوجیں مقابلہ میں صف آراء ہونے والی تھیں تو شاہجہاں کی پوری خواہش تھی اور یہی اس کو مشورہ بھی دیا جا رہا تھا کہ وہ خود جا کر دونوں فوجوں کے درمیان اپنا خیمہ نصب کر دے اور دونوں بھائیوں میں تصفیہ کرا کر قصہ کو ختم کر دے۔ (۲۰۶) اگر ایسا ہوتا تو یقیناً ہندوستان کی تاریخ جنگ و صلح کے ایک عجیب و غریب باب کی حامل ہوتی۔ مگر افسوس دارا کے اس دعویٰ استقلال نے شاہجہاں کے اس ارادہ کو جامہ عمل سے برہنہ رکھا۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دارا نے اس علالت کے دوران میں وہ خدمت انجام دی جو انتہا درجہ کے پر فریب خوشامدی سے ایسے وقت ممکن ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس خدمت پر شاہجہان نے ایک مرتبہ ڈھائی لاکھ روپیہ انعام دیا۔ پھر ۲۴ ربیع الاول ۱۰۶۸ھ کو ایک کروڑ روپیہ نقد اور ۲۴ لاکھ کے جواہرات دیئے۔ اور اس کا منصب پہلے چالیس پھر پچاس اور پھر بالآخر ساٹھ ہزاری کر دیا (جو شاہان مغلیہ کے پورے عہد میں کسی افسر یا کسی شہزادہ کا بھی نہیں ہوا)۔

اسی زمانہ میں درباری مؤرخ کے بیان کے بموجب بعض خاص امراء کو بلا کر وصیت کی۔ "اس کے بعد دارا تخت کا مالک ہوگا۔" (۲۰۷)

(۱۰)

جنگ برادران کے سلسلہ میں تینوں بھائیوں کا متفقہ طور پر دارا کو ملحد اور بے دین قرار دینا، اور مسلمان جرنیلوں اور ارکان دولت میں سے کسی کا بھی دارا کی حمایت میں فوجوں کی کمان کو منظور نہ کرنا، البتہ راجہ جسونت سنگھ اور راجہ جے سنگھ کا حمایت پر آمادہ ہونا (اگرچہ وہ بھی عارضی تھی) یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ جنگ برادران کے پردہ میں درحقیقت جنگ تھی۔ ایمان والحاد کی، صحیح شریعت اور عامیانہ طریقت کی، اور اکبری اس بے قیدی اور اس پابندی کی جس کو حضرت مجدد صاحب اور آپ کے خلفاء کی مسلسل کوششوں نے ارکان حکومت میں پیدا کیا تھا۔ چنانچہ مصنف عالمگیر نامہ لکھتا ہے:

"راجہ جسونت سنگھ ... با وجیکن ... آمد و بود چوں تیغ کج گرائے آں بے بہرہ کہ جوہر دولت دارا بدین و آئین ہندو دو اجیاء مراسم کفر و تجو د مائل مے دید از ایں جہت میل عظیم بسلطنت او داشت۔ بنا بر خوش آمد و رعایت جانب او مصدر بے ادبانہ حرکات ناہموار گشتہ۔ بخیال محال بیداد دراز کار خود را سد راہ موکب جاہ و جلال مے شمرد۔ (۲۰۸)

جنگ برادران

دارا نے اپنے استقلال کو تسلیم کرانے اور بھائیوں کے استیصال کے لئے دو ۲ فوجیں تیار کیں۔ ایک کو بسر کردگی مرزا راجہ جے سنگھ و بہمراہی شاہزادہ سلیمان شکوہ شجاع کے مقابلہ کے لئے بنارس کی طرف بھیجا۔ اور دوسری کو زیر قیادت مہاراجہ جسونت سنگھ، مراد اور اورنگ زیب کی مدافعت کے لیے روانہ کیا۔

شاہزادہ مراد نے جو اورنگ زیب عالمگیر کے ہمراہ تھا، اپنے ایک رقعہ میں اس جنگ کی روئیداد تحریر کی ہے۔ اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

''روز پنجشنبہ یکم ماہ رجب المرجب ۱۰۶۸ھ کو دیپالپور میں برادر والا قدر (اورنگ زیب) سے ہماری ملاقات ہوئی۔ جسونت سنگھ سادات، راجپوت، افغانوں اور مغلوں کی تیس ۳۰ ہزار فوج جرار کو لئے ہوئے نہایت غرور اور تمکنت کے ساتھ ''اجین'' کے قریب پہنچا۔ جمعہ کے روز ہم نے اپنی فوجوں کو آراستہ کیا، اور خداوند عالم کی عنایت اور رسول اللہؐ کی توجہات مقدسہ پر تکیہ کر کے میں نے فوج کے وسط، راست اور بھائی اورنگ زیب نے فوج کے دست چپ کی کمان کرتے ہوئے دشمن لئیم کی مدافعت میں جدوجہد شروع کر دی۔ توپ خانہ اور آتش بازی وغیرہ کی کارگزاریوں کے بعد بندگان جاں سپار نے گھوڑے ڈال دیئے اور ان کے پیچھے پیچھے یہ مخلص بھی میدان جنگ میں کود کر سرگرم قتال و جدال ہو گیا۔ طرفین سے داد مردانگی دی گئی۔ اگرچہ فتح و ظفر ہماری فوجوں کو نصیب ہوئی۔ راجہ جسونت سنگھ (۶۰۹) اور قاسم خاں فرار ہو گئے۔ مکند سنگھ ہاڈا، افتخار خاں، دیال داس، رتن راٹھور، ارجن گوڑ وغیرہ جن کے ناموں کی تفصیل بعد کو معلوم ہوگی، ہلاک ہو گئے... مختصر یہ کہ پانچ چھ ہزار آدمی طرفین کے قتل ہوئے اور بہت زیادہ خزانہ، ہاتھی، گھوڑے، خیمہ، وتوپ خانہ وغیرہ ہمارے ہاتھ آیا۔

عنایت الٰہی سے ایسی فتح نصیب ہوئی کہ گزشتہ سو سال میں اس کی کوئی نظیر نہیں۔ (۶۱۰) راجہ جسونت سنگھ میدان جنگ سے فرار ہو کر شرم کی وجہ سے دارا سے بھی نہیں ملا۔

اور سیدھا اپنی راجدھانی میں چلا گیا، جہاں سے اُس نے عالمگیر کے پاس معذرت کا خط لکھا اور عالمگیر نے بدستور سابق اس کو منصب اور خطاب سے فائز کر دیا۔ مگر اس فرار کا بغض جسونت سنگھ کے سینہ میں آخر تک رہا۔

عالمگیر نے اسی دوران میں شاہجہاں کی خدمت میں ایک طویل عرضداشت بھیجی۔ جس میں حسب دستور سابق فرزندانہ، مریدانہ اور نیازمندانہ آداب پدر بزرگوار مرشد حقیقی اور بادشاہ وقت کی خدمت میں پیش کرنے کے بعد عرض کیا:

''اس دوران میں سلطنت و مملکت کے جملہ ملکی اور مالی امور کی زمام اختیار حضرت والا کے قبضہ

www.besturdubooks.wordpress.com

قدرت سے خارج ہو کر شاہزادہ کلاں کے قبضہ میں پہنچ گئی۔ جس نے اُمورِ سلطنت کے بست و کشاد میں وہ اقتدار حاصل کرلیا جو احاطۂ تحریر و تقریر سے خارج ہے۔

یہ قدرت و تسلط پاتے ہی اُس نے اپنے بھائیوں کے استیصال کو اپنا اولین مقصود گردانا۔ جس میں اس کی جدوجہد روز بروز بڑھتی رہی چنانچہ حضرت والا کے فرزند رشید شجاع کے سر پر اپنے نو عمر لڑکے سلیمان شکوہ کو مسلط کیا۔ شاہ شجاع کی ۳۲ سالہ خدمات کی کوئی وقعت نہیں کی اور اس کو حد سے زیادہ ذلیل و رسوا کیا۔ اپنی نفسانی خواہشات اور صرف خواہشات کی بنا پر اس نیاز مند کی توہین و تذلیل کی ہمیشہ جدوجہد کرتا رہا۔ منافع اور آمدنیوں کے راستے اس نیاز مند کے لئے بند کرتا رہا، اور طرح طرح کے نقصانات پہنچاتا رہا، اور ہمیشہ وہ کام کرتا رہا جو دین و ملت کے مخالف اور بندگانِ خدا اور انسانی آبادیوں کے لئے تباہی اور بربادی کا باعث تھے''۔

اس کے بعد مہم بیجاپور میں اپنی اور اپنی فوج کی جانفشانیوں، دشمن کی لاچاری اور اپنی مکمل فتح کے عنقریب نمودار ہونے کی صورت میں شاہی فرامین بھجوا کر دشمنوں کو دلیر کر دینے، عالمگیر کے لئے ایسی مشکلات (کہ جن سے نکل جانا صرف حسن تدبیر اور فضل الٰہی کی وجہ سے تھا) کے پیدا کر دینے کا ذکر نہایت قوت کے ساتھ کیا ہے۔ اور پھر لکھتا ہے کہ:

''دارا کی اس ناعاقبت اندیشانہ حرکت کے بعد اگر فضل الٰہی شامل حال نہ ہوتا تو انہیں فرمانروایانِ دکن کے ہاتھوں آج تمام سلطنت تاراج ہو گئی ہوتی۔ یہ سب حرکت اُس نے صرف اپنی ذاتی غرض کے لئے کی۔ جس میں وہ اس قدر اندھا ہو گیا کہ خود سلطنت کی تباہی اور بربادی کا خیال بھی نہ کرسکا۔

پھر اپنی اسی مخالفت اور خصومت پر جس کی شہرت ایران اور توران تک ہو چکی ہے، قناعت نہیں کی، بلکہ مجھ جیسے وفادار سے (جس نے ساری عمر حضور والا کی اطاعت میں صرف کی اور کبھی بھی کسی معمولی حکم کی خلاف ورزی نہیں کی اور عدول حکمی کو ہمیشہ گناہ عظیم تصور کرتا رہا) صوبہ برار علیحدہ کر کے ایسے شخص کے حوالہ کرنا چاہا جو ہمیشہ حکومت کا مخالف رہا اور جس کی غداری طشت از بام ہے۔

پھر خوشامدیں کر کے راجہ جسونت سنگھ کو میری کوبی کے لئے ایک لشکر جرار کے ساتھ روانہ کر دیا۔ مقصود یہ تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، وہ مختصر سا علاقہ، جو حضور والا نے اس نیاز مند کو مرحمت فرما رکھا ہے اس نیاز مند سے چھین کر نیاز مند کو آوارہ فنا، بے کسی و غربت اور سراسیمہ صحرائے محن و کرب کر دے۔

علاوہ ازیں خوشامدوں اور غلط چاپلوسی سے حضور والا کے مزاجِ اقدس پر اتنا اثر جما لیا ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے، حضور والا بلا تحقیق و تفتیش اس کی بات کو صحیح سمجھتے ہیں، اور اس کی رائے پر عمل فرماتے ہیں

اور جملہ اختیارات ملکی اُن کے حوالہ کر دیئے ہیں۔

اس صورت حال کے بعد ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ خود حاضر خدمت ہو کر اصل واقعات کو عرض کریں اور بارگاہ سلطانی میں اپنی مظلومیت کا اظہار کر کے عدل وانصاف کے طالب ہوں۔

عدل سلطان گر نہ پرسد حال مظلومان عشق ۔۔۔ گوشہ گیراں راز آسائش طمع بے باید برید

جب یہ خیر خواہ مسافت طے کر کے "اجین" کے قریب پہنچا تو جسونت سنگھ جو شاہزادہ کلاں کے اشارہ سے اس خیر خواہ کی ایذا اور سانی کے لئے وہاں مامور تھا، سنگ راہ بن گیا، اور بلا لحاظ آداب و حقوق نہایت دلیری کے ساتھ حکم کیا کہ:

"مراجعت نمودہ بمکان خود بردوالا خواہد دید آں چہ خواہد دید"۔ نیاز مند کے سنجیدہ پیغامبروں نے اُس کو متانت اور سنجیدگی کے ساتھ بہت کچھ سمجھایا کہ صرف حضرت اعلیٰ واقدس کی زیارت کے لئے جانا مقصود ہے مگر اس مغرور کے ذہن میں ایک بات بھی نہ آئی اور وہ اپنے لشکر وقوت کے گھمنڈ میں آمادۂ جنگ ہو گیا۔ ایسی صورت میں ہر ایک ذی ہوش کا کام تھا، کہ اس سنگ راہ کو راستہ سے ہٹا کر اس کو غرور اور تکبر کا مزہ چکھائے۔

اگر خدمت اقدس میں حاضری کے علاوہ کوئی اور مقصود ہوتا تو ظاہر ہے کہ جب جسونت سنگھ اور اس کا لشکر شکست فاش کھا کر بدحواس بھاگ رہا تھا تو تعاقب کر کے ان کو قتل کر دیا جاتا ورنہ کم از کم قید کرلیے جاتا مگر یہاں صرف راستہ حاصل کرنا مقصود تھا۔

اب شاہزادہ دارا شکوہ بذات خود دھولپور تشریف لاتے ہیں، آپ نے دریائے چنبل کے تمام گھاٹوں پر توپ خانہ اور فوجی دستے مقرر کر کے میرے لئے دریا کا عبور کرنا ناممکن بنا دیا تھا۔ مگر اس ناممکن کو نیاز مند ممکن بنا چکا ہے اور دریائے چنبل سے پار ہو کر حضور والا کی قدم بوسی کا ارادہ کئے ہوئے ہے۔ سنا جا رہا ہے کہ اب بذات خود میدان معرکہ گرم کریں گے۔ یہ اُن کی بزرگانہ شان کے بھی خلاف ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مجھ جیسے کار آزمودہ جنگ جو کے مقابلہ پر اُن کا بازی لے جانا قطعاً ناممکن ہے۔ لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ اپنی بزرگی کا وہ خود احترام کریں۔ اس ارادہ کو ترک کر دیں اور اپنے علاقہ پنجاب تشریف لے جائیں اور کچھ دنوں اس نیاز مند کو حضرت اعلیٰ واقدس کی خدمت میں باریابی کا موقعہ دیں۔" (۶۱۱)

ایک دوسرے مکتوب میں جو تخت وسلطنت حاصل کرنے کے لئے شاہجہاں کو لکھا تھا، تحریر کرتا ہے:

"قبل ازیں (۶۱۲) مکرر معروض خدمت والا گردید کہ مقصود ایں مرید، از نہضت بصوب اکبر آباد ارادہ بغی وخراج با بادشاہ اسلام نبودہ عالم السر والمخفیات گواہ ست کہ ایں قصد ناصواب غیر

مشروع اصلاً وقطعاً پیدا و ضمیر من نگشتہ بلکہ چوں درآوان بیماری اختیار از دست اعلیٰ حضرت رفتہ بود و بادشاہ زادہ کلاں کہ رنگے از مسلمانی نداشت قوت و استقلال تمام پیدا کردہ امارت جہانبانی ظاہر مے ساخت و رایت کفر والحاد در ممالک محروسہ مے افراشت، دفع او را کہ عقلاً وشرعاً وعرفاً واجب شدہ بود برذمت ہمت محتّم ساختہ عزیمت ایں حدود نمودہ وجنگ اول با کفار اشرار کہ مساجد را منہدم وخراب ساختہ بت خانہاء آں بنا نہادہ بودند روئے دادہ محاربہ دیگر با ملاحدہ نکوہیدہ کردار واقع شدہ و چوں نیت بخیر بود با جمعیت قلیل در ہر معرکہ مظفر ومنصور آمدہ از جسم زخم مصون ماند۔"(۶۱۳)

یہ تھے جنگ برادران کے وجوہات، یہ تھا عالمگیر، اور یہ تھا مدعیٔ فناء وبقاء دارا شکوہ کا تصوف اور اس کا زہد و تقویٰ اور عشق مولیٰ، جو میاں میر کو باری تعالےٰ کہا کرتا تھا (معاذ اللہ) اور اسلام مجازی کو چھوڑ کر کفر اختیار کر چکا تھا، اور نماز روزہ کو ظاہر پرستوں کے حوالہ کر کے اسلام وکفر کی قیود سے آزاد ہو چکا تھا۔ اور جس کے نزدیک جوگیوں اور دانش مندان ہند کی بات بھی ایسی ہی صحیح تھی، جیسے محمد رسول اللہؐ کے ارشادات (معاذ اللہ)۔

بہر حال دارا شکوہ نے ۷ رمضان ۱۰۶۸ھ کو پورے اہتمام کے ساتھ عالمگیر کے مقابلہ کے لئے لشکر آراستہ کیے۔ مگر شام ہونے سے پہلے بدحواس ہو کر میدان سے بھاگنا پڑا۔ غروب آفتاب کے بعد آگرہ پہنچا۔ شاہجہاں کے پاس جاتے ہوئے اس کو شرم آئی۔ کیونکہ وہ اس کو پہلے ہی عالمگیر کے مقابلہ سے منع کر چکا تھا۔ لہٰذا بیوی بچوں اور مقبوضہ جواہرات کے صندوق کو لے کر آخر شب میں دہلی روانہ ہو گیا۔

اس کے بعد پنجاب، گجرات وغیرہ میں قیام کر کے ایک سال تک عالمگیر کو شکست دینے کی سعی لاحاصل کرتا رہا۔ بالآخر شوال ۱۰۶۹ھ میں گرفتار ہوا۔ وسط ذی الحجہ میں دہلی لایا گیا۔ ذی الحجہ ۱۰۶۹ھ کے آخری دن اس کو تختۂ دار کا آویزہ بنادیا گیا۔(۶۱۴)

بیان کیا جاتا ہے کہ جب دارا شکوہ مقید کر کے دہلی لایا گیا، تو اس نے عالمگیر کو لکھا:

بھائی صاحب من بادشاہ من!

خیال بادشاہے اصلاً در دل نماندہ، بشما وفرزندانِ شما مبارک فکر کشتن من بخاطر مبارک ناحق ست۔ اگر یک حویلی قابل سکونت وکنیزکہ از کنیزان مخصوص ما برائے خدمت عطا شود بگوشۂ عافیت و در دعاء آں صاحب اشتغال نمائیم۔(۶۱۵)

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے اسی کے پشت پر جواب میں یہ آیت لکھ دی۔

آٰلْاٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۶۱۶)

ایک سوال اور اس کا جواب

اعتراض کیا جاتا ہے کہ بالکل ممکن تھا کہ دارا کو کسی محفوظ مقام پر نظر بند رکھا جاتا، اور عالمگیر اس کے خون سے ہاتھ رنگین نہ کرتا۔

جواب یہ ہے کہ تیموری خاندان بلکہ تمام ایشیائی سلطنتوں میں مدعیان سلطنت قید و بند ہو کر بھی سلطنت کے منصوبوں سے دست بردار نہیں ہوتے (جیسا کہ مراد اور شجاع کے حالات سے آئندہ معلوم ہوگا) اس کے ساتھ ان کے طرف داروں کا ایک گروہ ہمیشہ موجود رہتا ہے اور اس وقت تک نچلا نہیں بیٹھتا جب تک نخل آرزو کے تمام رگ و ریشے نہ کٹ جائیں۔

عالمگیر نے اپنے ایک مکتوب میں جو اوپر نقل کیا گیا، اسی ایشیائی دستور کی طرف اشارہ کیا ہے:

سر وارث ملک تا بر تن ست　　　　تن ملک را فتنہ پیراہن ست

عالمگیر نے شاہجہاں کو کیوں معزول رکھا

اگر عالمگیر کا مقصود بغاوت نہ تھی، وہ شاہجہاں کے مقابلہ میں نبرد آزما نہ ہوا تھا، تو اس نے شاہجہاں کو معزول کیوں رکھا؟ آگرہ پہنچنے کے بعد اس کو تخت سلطنت پر متمکن کیوں نہ کیا؟

مندرجہ ذیل واقعات اس کا جواب دینے کے لئے کافی ہیں۔ عالمگیر جب اکبرآباد پہنچ چکا اور شاہجہاں نے بھی یہ دیکھ کر کہ:

"فلک در ہیچ مرتبہ از مراتب آزار ہیچ وجہ کوتاہی نہ کندو اقبال در سر ہر پلہ از دستیاری پا کشیدہ از تقدیم پامردی دست باز نمی دارد　　دست از کار رو کار از دست رفتہ"

قلعہ کی کنجیاں عالمگیر کے پاس بھجوا دیں تو پھر شاہجہاں نے مشفقانہ انداز میں خط تحریر فرما کر اورنگ زیب کو قلعہ میں ملاقات کے لئے طلب کیا۔ جس کے خاتمہ پر یہ مصرعہ تھا:

زود آئی دل تنگ مرا مونس جاں باشی (۶۱۷)

عالمگیر کے شرکاء کار اور رفقاء کار رفقاء اب بھی قلعہ میں جا کر ملاقات کرنے کو مصلحت کے خلاف سمجھتے تھے۔ لیکن عالمگیر نے حق بتقدیر شاہجہاں کی خدمت میں حاضری کا ارادہ کر ہی لیا۔ مگر جب وہ باب قلعہ کے پاس پہنچا تو شائستہ خاں امیر الامراء اور شیخ میر نے پھر لجاجت کے ساتھ اس ارادہ سے باز رہنے کی درخواست کی۔ عالمگیر ان سے سوال و جواب میں مشغول تھا کہ دفعتہً "ناہردل خاں چیلہ" شاہجہاں بادشاہ کے قلم خاص کا لکھا ہوا ایک پرزہ لئے ہوئے پہنچا، جو داراشکوہ کے نام تھا۔ اس کو دہلی بھیجا جا رہا تھا اور ہدایت یہ تھی کہ جواب جلد از جلد لے۔ مضمون خط یہ تھا:

"داراشکوہ شاہجہاں آباد میں قیام کرے۔ خزانہ اور لشکر کی وہاں کمی نہیں۔ ہرگز ہرگز دہلی سے آگے

نہ بڑھے۔ ما بدولت یہاں معاملہ ختم کئے دیتے ہیں"۔ (۶۱۸)

معلوم ہوا کہ خواجہ سراؤں، ترکی اور حبشی لونڈیوں اور غلاموں کو جو شاہی ایوانوں کی خدمت کے لئے قلعہ میں موجود تھیں، مسلح کر دیا تھا کہ جیسے موقعہ ملے ایک دم عالمگیر پر حملہ کر کے معاملہ ختم کر دیا جائے۔ (۶۱۹)

عالمگیر نے جب اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا، وہ واپس آ گیا۔ مگر یہ اُس کا ظرف تھا کہ اُس نے درجہ ابوت و پدری کا خیال کرتے ہوئے اس کا تذکرہ تک بھی مناسب نہ سمجھا، اور صرف ملاقات کے ارادہ کو ملتوی کر دیا۔

جب دہلی میں دارا نے شکست کھائی اور پنجاب کی طرف بھاگا تو مہابت خاں صوبہ دار کابل کے نام شاہجہاں کا خط پہنچا:

"دارا شکوہ من بلاہور میرسد۔ از خزانہ در لاہور کمی نیست و آدم واسپ در کابل وافر و شمل مہابت خاں کہ زمانہ از مہابت او در تزلزل، سردارے ہمچوں شاہجہاں متردی باشد غرابت دارد۔ ہمیں آں کہ شیر بیشۂ تہوری بالشکر آں عزیمت بلند و جلوریز بلاہور رسیدہ بمدد و رفاقت دارا شکوہ بابا پرداختہ۔ بمقابلہ و جزائے اعمال ہر دو نابرخوردار پردازد۔ و صاحب قرن ثانی زندانی را بایا آورد و بیند کہ نام نیک بہ از گنج قارون و مناصب و مراتب دنیائے دوں چہ قدر حاصل خواہد شد۔ ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

دیگر زندار جمند نوشتہ ام کہ خود را باو گزاشتہ بہبود حال و مآل خویش و اطاعت آں سپہ سالار داند و خلاص من ازیں شناسد۔

مکرر نوشتہ مے شود کہ دنیا جاء سہل ناپائیدار است و با ہیچ کس وفا نہ کردہ و نخواہد کرد و نیک نامی صفحۂ روزگار یادگار خواہد ماند، و مہابت خاں چگونہ خواہد پسندید کہ صاحب قران ثانی زندہ در اقسام بلا گرفتار باشد۔ و شخصے کہ بدام تزویر عالمے را رام نمودہ بکام خود ساختہ بر تخت خلافت کامرانی کند۔ و بایں حال اگر آں "عمدۃ الملک" اغماض نماید، فردا، قیامت، دست من و دامن او۔ (۶۲۰)

شاہزادہ محمد مراد جو اس وقت اورنگ زیب کے ساتھ تھا، اور اگرچہ اس سے پیشتر بھی اس کو برار کی حرص دے کر عالمگیر سے توڑنا چاہا تھا۔ مگر چونکہ دارا کے وجود کو وہ بہر حال اپنے لئے خطرناک سمجھتا تھا، لہٰذا عالمگیر کی مخالفت اور ترک رفاقت پر آمادہ نہ ہوا تھا۔ اب جبکہ آگرہ سے دارا کو ختم کر دیا گیا تو مراد کا ہموار ہو جانا آسان تھا۔ چنانچہ اس کے نام تحریر کیا گیا، کہ کل ہندوستان کی بادشاہی تم کو عطا کی گئی ہے۔ تم پر فرض ہے کہ ابھی اس کا تذکرہ نہ کرو۔ چند روز بعد بھائی اور بھتیجوں کو دعوت کے بہانہ سے اپنے یہاں بلا کر ختم کر دو، اور پھر اپنے نام سے تمام ملک میں سکہ اور خطبہ جاری کرو۔ الفاظ مکتوب حسب ذیل ہیں:

"بادشاہے کل ہندوستان بطیب نفس وطوع ضمیر باں فرزند سعادت پیوند حوالہ نمودہ ایم۔ باید کہ

دریں باب کمال آگاہی و بردباری بتقدیم رسانیدہ مطلقاً ایں راز سربستہ ہیچ کس از نزدیک و دور
ظاہر نسازد بعد از روزے چند برادر و برادر زادہ را بہ بہانۂ ضیافت بخانۂ خود طلب داشتہ، کار ہر دو
بپایاں رساند، و خطبہ ملک باسم و لقب خویش مزین گرداند کہ من رضا خاطر عہدۂ ایں امر خطیر را باں
فرزند عقیدت مند سپردہ وام ایں کار عالی را از روئے کمال آگاہی سرانجام بخشد۔ (۶۲۱)

اسی زمانہ میں یا مراد کی گرفتاری کے بعد شاہزادہ شجاع کے نام ایک خط ہندی زبان میں تحریر کیا۔ یہ حسن
اتفاق تھا اور عالمگیر کی اقبال مندی کہ عالمگیر کو ان تمام خطوط کا علم ہوتا رہا۔ اور لطیفہ یہ ہے کہ اس قسم کے خطوط کی
اطلاع پانے کے بعد جب شاہ عالمگیر نے رسل و رسائل پر پابندی عائد کی تو شاہجہاں نے عتاب آمیز خط عالمگیر کو
لکھا جس میں عذاب آخرت سے ڈرایا، باپ کے ادب و احترام کی تذکیر کی ہے۔

عالمگیر اس خط کے جواب میں ایک مفصل عریضہ شاہجہاں کی خدمت میں بھیجتا ہے جس کا بجنسہٖ ترجمہ ذیل
میں نقل کیا جاتا ہے۔ اس خط سے عالمگیر کے اصلی ارادہ اور بعد کے فیصلہ اور اس کی وجوہات پر کافی روشنی پڑتی
ہے۔

عالمگیر لکھتا ہے:

اعلیٰ حضرت دانش مند ہیں۔ زمانہ کی گرمی اور سردی، پستی اور بلندی کے تجربوں میں عمر گرامی کے
بیشتر اوقات صرف ہوئے ہیں۔ اسی بناء پر میرا عقیدہ تھا کہ جو واقعات پیش آچکے ہیں، ان کو
تقدیری امور سمجھ کر اور اس امر پر راضی ہو کر کہ قضاء و قدر کا فیصلہ یہی تھا کہ تخت و سلطنت اس جاں
نثار کے حوالہ ہو۔۔۔۔ اس مرید کی شکست اور دوسروں کے کام کی رونق اور ترقی میں کوشش نہ فرمائیں
گے۔ چنانچہ جناب والا کے ساتھ نیاز مند نے بڑی حد تک بہتر ہی سلوک کیا اور پوری خواہش تھی
کہ مخالفین کی اس شورش ختم ہونے کے بعد حضرت والا کی رضا جوئی اور خدمت گزاری کے لئے
جان و دل سے کمر ہمت کس لوں گا اور اس طرح سعادت دارین حاصل کروں گا۔ (۶۲۲)

ہر چند سنتا رہا کہ غبار فساد کی بر انگیختگی اور بندگان خدا کے معاملات کی یہ برہم خوردگی
آنحضرت کی تحریک سے ہے اور فرمان اقدس کے بموجب ہی بھائی صاحبان ہاتھ پیر مار رہے
ہیں، اور اپنی جانیں برباد کر رہے ہیں مگر میں نے کبھی لوگوں کے کہنے پر کان نہیں دھرا، اور شاہراہ
عقیدت سے انحراف کا خیال بھی نہیں آیا۔

مگر جب کہ آنحضرت کی بے توجہی کی خبریں پے در پے اور لگاتار پہنچیں (جیسا کہ اس تحریر سے
ظاہر ہے جو شاہ شجاع کے نام ہندی میں لکھی تھی اور جس کی بناء پر اس کے خان و مان کا برباد ہونا
جناب والا کو بھی معلوم ہے) تو لامحالہ یقین ہو گیا کہ معاملہ ہاتھ سے نکل چکا ہے، جناب والا اب
تک اسی جستجو میں ہیں کہ کوئی دوسرا ہی استقلال کرے اور اس فدوی کی وہ تمام کوشش جو دین

متین کی ترویج اور معاملات سلطنت کے انتظام میں خرچ ہو رہی ہے، ضائع اور برباد ہو جائے۔ نیز یہ کہ جناب والا کسی صورت سے بھی اس طرز عمل اور اس فکر سے علیحدہ نہیں ہو سکتے بلکہ اصرار کے ساتھ اسی پر کار بند رہیں گے۔ ان حالات میں مجبور ہو کر محض حزم احتیاط کے طور پر (تاکہ کوئی ایسی خرابی نہ پیدا ہو جائے جس کا تدارک ناممکن ہو) افسوس کہ اس آرزو کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا جو میرے دل میں تھی۔

میرے قول کی صداقت پر خداء توانا شاہد اور گواہ ہے۔

اس ارادت مند کو اطمینان خاطر اس وقت حاصل ہوگا جب کہ وہ دو فتنے جو بار بار بے غیرتی کو اپنے سر لے چکے ہیں، فرار ہو کر ممالک محروسہ سے باہر ہو جائیں یا توفیق الٰہی سے گرفتار ہو کر اپنے بھائی کے پہلو میں بیٹھیں۔

سر وارث ملک تا برتن ست تن ملک رانشہ پر ہمن ست

جب یہ فتنہ فرو ہو جائے گا، پھر اس احتیاط اور اس پابندی کی ضرورت ہی کیا رہے گی۔'' (۱۲۳)

شاہجہاں کی طرف سے معافی

دارا کا دوست اور عالمگیر کا دشمن ڈاکٹر برنیر جو اس زمانہ میں ہندوستان میں مقیم تھا، اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے:

''عالمگیر کا برتاؤ (۱۲۴) شاہجہاں کے ساتھ مہربانی اور ادب سے خالی نہ تھا اور حتی الامکان وہ اپنے بوڑھے باپ کی ہر طرح خاطر داری کرتا تھا۔ نہایت کثرت سے تحفے تحائف بھیجتا رہتا، اور سلطنت کے بڑے بڑے معاملات میں اس کی رائے اور مشورہ کو مثل ایک پیر و مرشد کی ہدایت کے طلب کرتا تھا اور اس کے عریضوں سے جو اکثر لکھا کرتا تھا، ادب اور فرمانبرداری ظاہر ہوتی تھی۔ پس اس طرح سے شاہجہاں کی مخالفت اور اس کا غصہ یہاں تک ٹھنڈا پڑ گیا کہ معاملاتِ سلطنت میں بیٹے کو لکھنے پڑھنے لگ گیا بلکہ باغی فرزند کی سب گستاخانہ حرکتیں معاف کر کے اس کے حق میں دعاء خیر بھی کر دی''۔

خاتمہ بحث

علامہ شبلی تحریر فرماتے ہیں۔ انصاف کرو شاہجہاں اتنی بات پر جہانگیر سے لڑتا رہا کہ اس نے شاہجہاں کی جاگیر نور جہاں کو دے دی تھی حالانکہ اور ہر طرح کی عنایتیں بحال تھیں، تاہم شاہجہاں نیک نام ہے۔ عالمگیر نے اس حالت میں کہ اس کی جاگیر چھین لی گئی۔ تنخواہ بند کر دی گئی۔ عین دشمنوں کے مقابلہ کے وقت اس کی فوج اس کے پاس سے بلا لی گئی۔ ۷۵ ہزار فوج خود اس کے مقابلہ اور مقاتلہ کے لئے بھیجی گئی۔ قلعہ میں اس کے قتل کا بندوبست کیا گیا۔ ان سب باتوں کے ساتھ وہ شاہجہاں کا نہایت ادب و احترام کرتا رہا۔ تاہم وہ بدنام ہے۔

رند و صوفی ہمہ سرمست گزشتند و گزشت قصہ ماست کہ در کوچہ و بازار بماند (۱۲۵)

قتلِ مراد

عالمگیر نے بادشاہ زادہ مراد کی درخواست پر جو تحریر بطور معاہدہ قلمبند کی تھی، آداب عالمگیر کے حوالہ سے رقعات عالمگیر ص ۲۶۴ تا ص ۲۶۷ پر وہ نقل کی گئی ہے اس کے اہم اجزاء کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

''معاہدہ کا نقطۂ نظر دین مبین سید المرسلین (علیہ من الصلوۃ اتمہا و من التحیات اعمہا) کی سربلندی اور برتری ہے۔ اور مقصود یہ ہے کہ نمازیان ظفر لواء اور مجاہدان نصرت انتماء کی مساعی سے دیار اسلام کے گلشن سدا بہار سے الحاد و زندقہ کا کانٹا نکال دیا جائے اور رئیس الملاحدہ (دارا) اپنے اتباع اور احزاب کے ساتھ نیست و نابود ہو، اور وہ ہندوستان بہشت نشان کی سرزمین جو علماء کرام کی مساعی جمیلہ سے کفر و شرک کی گندگی سے پاک ہو چکی ہے افتراق و اختلاف کے فتنوں سے محفوظ رہے۔

برادر بجان برابر کو اپنی رائے و صواب پر عمل کرتے ہوئے اس مہم میں موافقت و مرافقت کی توفیق حاصل ہوئی ہے۔ آپ نے پختہ قسموں کے ساتھ عہد کیا ہے کہ اس دشمن دین و دولت کے استیصال اور امور سلطنت کے استقرار، و انتظام کے بعد بھی وفاق و اتفاق کے جادۂ قدیم پر ثابت قدم رہ کر اسی طرح ہر وقت اور ہر جگہ ہر کام میں رفیق و شریک رہیں گے اور ہمارے دوست کے ساتھ دوست اور ہمارے دشمن کے ساتھ دشمن رہ کر کسی حال میں بھی خاطر عاطر کی رضامندی سے باہر قدم نہ رکھیں گے، اور ممالک محروسہ موروثی میں سے جو جو ملک اس درۃ التاج کے التماس کے بموجب ان کے لئے چھوڑے جائیں گے، ان پر قانع اور خوش ہو کر زیادہ کا مطالبہ نہ کریں گے۔

برادر عزیز کے اس عہد کی بناء پر ہماری جانب سے تحریر ہوتا ہے کہ جب تک اخلاص یک جہتی، یک رنگی اور حق شناسی کے خلاف برادر موصوف سے کوئی عمل سرزد نہ ہوگا، ہماری مہربانیاں روز افزوں رہیں گی۔ اور جانبین کے نفع و نقصان کو ایک سمجھ کر جملہ اوقات میں شرائط عنایت و امداد اور مراسم یگانگی و اتحاد کو زیادہ سے زیادہ ملحوظ رکھا جائے گا اور آں عزیز کی نسبت جو الطاف و مراحم آج ہیں، مقصود کے حاصل ہو جانے اور ملحد نامقبول کے سقوط کے بعد ہر طرح بلکہ توقعات سے بھی بہتر صورت پر جاری رکھے جائیں گے اور اس سلسلہ میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا جائے گا۔ اور جیسا کہ پہلے طے ہو چکا ہے، صوبہ لاہور، کابل، کشمیر، ملتان، بھکر، ٹھٹھہ تمام و کمال اور خلیج عمان تک اس طرف کا تمام علاقہ آں تاجدار والا تبار کے لئے واگزار کر دیا جائے گا، اور اس باب میں کسی قسم کی کسی دشواری اور پریشانی کا موقعہ نہ دیا جائے گا۔ اور اس ملحد کے استیصال سے فراغت کے بعد بلا توقف آں عزیز کو اپنے علاقہ میں پہنچنے کا موقع دیا جائے گا۔ اپنے اس دعوے کی سچائی پر خدا اور

رسول مجتبیٰ کو شاہد گردانتے ہیں اور آں برادر کے مزید اطمینان کے لیے یہ تحریر لکھ کر مہر اور پنجہ کے نقش سے اس کو مزین کئے دیتے ہیں۔ نیز آں برادر سے توقع ہے کہ کلام الٰہی وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا کے بموجب اس معاہدہ کی پوری پابندی کریں گے، اور کسی صورت سے بھی ان اغراض پرستوں کی بات پر جن کی آج کل کثرت ہے، توجہ نہ کریں گے۔

وفقنا الله تعالیٰ و اياكم لما يحبه و يرضاه والله يحق الحق ويهدی السبيل"۔

ترجمہ بالا میں خط کشیدہ عبارت لفظی ترجمہ ہے اور باقی حصہ خلاصہ کے طور پر تحریر کیا گیا ہے۔ اس تحریر کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ:

الف: تجویز یا آج کل کی اصطلاح میں فارمولا یا پلان عالمگیر نے مرتب کیا ہے، شاہزادہ مراد اس بلاک میں شریک ہوا ہے۔

ب: اس مہم کا قائد عالمگیر رہے گا، اور معاملات کا اختیار اس کے ہاتھ میں ہوگا۔

ج: دارا کے استیصال اور ملک میں اپنی حکومت کے استقلال تک شرکاء معاہدہ لازمی طور پر ایک دوسرے کے شریک رہیں گے اور استقلال کا دعویٰ کوئی بھی نہیں کرے گا۔

د: پورا ملک نہیں (جیسا کہ یورپین مورخ عالمگیر کو بدنام کرنے کے لیے لکھ دیتے ہیں) بلکہ ملک کا ایک حصہ مراد کو دیا جائے گا۔ اور اس کے بعد وہ اپنے علاقہ میں مستقل رہے گا، اور دونوں حکومتوں میں دوستانہ تعلقات رہیں گے۔

دھرمات پور کی جنگ (جو جسونت سنگھ سے ہوئی تھی) میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد عالمگیر نے جس طرح اپنے بیٹے محمد سلطان کو نیز دوسرے امراء اور افسران فوج کو انعامات دیئے اور ان کے منصبوں میں ترقی دی، اسی طرح شاہزادہ محمد مراد بخش کو بھی پندرہ ہزار اور چار ہاتھی عنایت کئے۔

مورخین کا یہ متفقہ بیان بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ معاہدہ میں عالمگیر کو بالادست قرار دے کر قائد اور امیر کی حیثیت دی گئی تھی۔

بہر کیف شاہزادہ مراد اکبرآباد کی فتح تک اورنگ زیب کے ساتھ حق رفاقت ادا کرتا ہے۔ اکبرآباد پہنچنے کے بعد شاہزادہ شجاع کے نام خط لکھتا ہے جس میں فتوحات کا تذکرہ کرتا ہے۔ عالمگیر کے کسی طرز عمل کی اس میں شکایت نہیں۔ (۶۲۶)

البتہ اس اثناء میں ایک خط پوشیدہ طور مراد نے شاہجہاں کو ضرور لکھا ہے جس میں وہ اپنی معصومیت ظاہر کر کے نہایت لجاجت کے ساتھ قصور کی معافی چاہتا ہے اور آخر میں لکھتا ہے:

"در باب ایں عاصی تائب ہر چہ حکم اقدس و ارفع شرف نفاذ یابد کاربند گردیدہ ازیں سرمشاری برآید (۶۲۷)

غالباً اسی خط کی بناء پر شاہجہاں کو مراد سے ایک توقع قائم ہوتی ہے چنانچہ وہ تمام ہندوستان کی بادشاہت مراد کو بخش کر ضیافت کے بہانہ سے عالمگیر اور اس کے لڑکوں کے قتل کا مراد کو مشورہ دیتا ہے۔ (۶۲۸)

بہرحال اس خط کی بناء پر یا اس لئے کہ آگرہ میں اس کو اُس کے مصاحبین نے غلط توقعات دلا دی تھیں۔ اس نے فوراً نہایت تیزی سے فوج کی بھرتی شروع کر دی۔

چونکہ جنگ دھرمات پور کے زخموں کے باعث مراد ابھی بیمار تھا۔ عالمگیر نے بیماری کی حالت میں اس سے جواب طلب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ بلکہ جب وہ دارا کے تعاقب میں دہلی روانہ ہونے لگا تو اسی علالت کے باعث مراد کو آگرہ ہی چھوڑ گیا۔ لیکن اب اس کے نادان دوستوں نے یہ سمجھایا کہ عالمگیر اس لئے چھوڑ گیا ہے کہ دہلی جا کر اپنی تخت نشینی کا باقاعدہ اعلان کر دے۔ مراد کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ اور وہ دوسرے ہی دن دہلی کی طرف چل کھڑا ہوا۔ تاکہ جونہی اُسے موقع ملے وہ اورنگ زیب پر عقب سے حملہ کر دے۔ اورنگ زیب نے اسی خیال سے کہ اس کو نقض عہد کا شبہ نہ ہو، ڈھائی سو گھوڑے اور بیس لاکھ روپیہ بھی اس کے پاس بھیج دیئے لیکن مراد کے رویہ میں سرمو فرق نہیں آیا بلکہ اُس نے خودسری سے کام لینا شروع کر دیا حتی کہ اپنے بادشاہِ ہند (۶۲۹) ہونے کا اعلان کرنے لگا، اور اپنے افسروں کو شاہی خطابات تقسیم کرنے شروع کر دیئے۔ اس وقت اورنگ زیب دفعتہ تین دشمنوں کی زد میں آ رہا تھا۔ مزید براں متھرا میں (جو ہندوؤں کی کوششوں کا بڑا مرکز تھا) عام شورش اور بدامنی پیدا کر دی گئی تھی۔ ان تمام حالات کے پیش نظر عالمگیر کے لئے اس کے سواء چارہ نہ رہا کہ سب سے قریبی دشمن یعنی مراد سے وہ اطمینان حاصل کر لے۔

چنانچہ اس سے پہلے کہ مراد ضیافت کے بہانہ سے عالمگیر کو بلا کر اُس کا کام تمام کر دے، عالمگیر نے مراد کو حسن تدبیر سے گرفتار کر لیا، اور باوجودیکہ مراد معاہدہ کی خلاف ورزی خود کر چکا تھا، تاہم عالمگیر نے گرفتاری کے بعد اس کو اطمینان دلا دیا کہ محض احتیاط کے طور پر اس شورش کے زمانہ میں یہ کارروائی کی جاتی ہے اس کے بعد بھی اگر اپنے رویہ سے معاہدہ کی پابندی کا ثبوت دے دیا جائے گا تو معاہدہ کے بموجب دارا کے معاملہ سے فراغت پا کر اور ملک میں امن بحال کرنے کے بعد آپ کو آپ کا علاقہ حوالہ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اس غرض سے عالمگیر نے مراد کو نہ صرف اس کے اہل و عیال بلکہ اس کی محبوبہ سرتی بائی کو اس کے پاس گوالیار میں رہنے کی اجازت دے دی۔ اس کے لئے معقول وظیفہ مقرر کر دیا اور ہر قسم کی محدود آزادی دے دی۔ لیکن مراد برابر اپنے بھاگنے کی کوشش میں لگا رہا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں اُس نے سب سے پہلے اپنے پاس کے ملازموں کو ملا لیا۔ ان میں مشہور مؤرخ خافی خاں کا باپ بھی تھا اس کے بعد اُس نے مغلوں کو جو درویش صورت گوالیار میں رہتے تھے، رام کیا۔ پھر مغل کاروانوں کی جو گوالیار سے گزرتے تھے، دعوتیں شروع کیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ان سب نے مل کر یہ طے کر لیا کہ مراد کو یہاں سے نکال لیا جائے۔

کمند ڈالی گئی اور مراد آخری مرتبہ اپنی محبوبہ سرتی بائی سے ملنے گیا۔ وہ پیغام وداع سن کر چلا پڑی۔ محل کے

پہرہ داروں کو شبہ ہوا۔ تلاش کے بعد کمند کا پتہ چلا۔ اور مراد اپنے ارادہ میں ناکامیاب رہا۔ اورنگ زیب اگر چاہتا تو اسی وقت مراد کو اس کی سزا دے سکتا تھا۔ مگر اس نے اس کے متعلق باز پرس تک نہ کی اور مراد تقریباً چار سال تک گوالیر میں رہا۔ اس کے بعد نظام حکومت شریعت کے مطابق چلنے لگا تو علی نقی کے چھوٹے لڑکے نے اپنے باپ کے قصاص کا مطالبہ کیا جس کو مراد نے قتل کیا تھا۔ قاضی نے خون بہا کی ترغیب دی مگر وہ اس پر راضی نہ ہوا۔ تو مجبوراً قصاص کا حکم جاری کیا۔ چنانچہ ۲۱ ربیع الثانی ۱۰۷۲ھ کو علی نقی کے خون کا بدلہ مراد کو اپنے خون سے دینا پڑا اور اورنگ زیب نے اس مقدمہ کو جس نظر سے دیکھا اس کا ثبوت خود خافی خاں کا بیان بہتر طریقہ سے دیتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ جس لڑکے نے استغاثہ داخل کیا تھا۔ وہ "مغضوب نظر بادشاہ بے گردید"

بادشاہ نامہ محمد صدیق کے بیان کے مطابق بادشاہ نے اس سے عرصہ تک گفتگو نہیں کی۔ دوسری طرف [۶۳۰] جس لڑکے نے:

از دعوے پدر اباِ نمودہ بود، بادشاہ قدر رواں از فرمودن خدمات حضور و دیگر عنایات متوجہ حال او شدند۔ [۶۳۱]

فرارِ شجاع

شاہزادہ شجاع ۳۲ سال سے بنگالہ کا صوبہ دار تھا۔ یہ علاقہ زرخیز اور دشمنوں کے خطرات سے محفوظ تھا۔ امن اور عیش کی زندگی جو اس کو نصیب تھی، اس نے شجاع کو تن آسان بنا دیا تھا۔ البتہ رقابت دارا کے تیروں سے اس کا سینہ بھی زخمی تھا۔ اسی زخم نے اس کو عالمگیر کا ہمنوا بنا دیا تھا۔

عرصہ سے شجاع کی خواہش تھی کہ صوبہ بہار ورنہ کم از کم پٹنہ اس کو دے دیا جائے تاکہ برسات کے موسم میں جب کہ بنگالہ کی آب و ہوا خراب ہو جاتی ہے، وہ اپنے اہل و عیال کو پٹنہ پہنچا دیا کرے۔ [۶۳۲] مگر چونکہ پٹنہ کے ملحق صوبے دارا کے تھے اور وہ پسند نہ کرتا تھا کہ کسی بھائی کے صوبوں سے اس کے صوبوں کی سرحد ملی ہوئی ہو، اسی وجہ سے شجاع کی یہ درخواست منظور نہ ہو سکی۔

وہ وقت آیا کہ دارا شکوہ کی بدتدبیری سے وفات شاہجہاں کی شہرت پھیل گئی۔ شاہزادہ شجاع نے بھی شاہزادہ مراد کی طرح شہرت پر اعتماد کر کے اپنے استقلال کا اعلان کر دیا۔ تخت سلطنت پر جلوس فرمایا اور خطبہ و سکہ اپنے نام کا جاری کر دیا [۶۳۳] اور اپنے علاقہ کی حدود کو بنارس تک وسیع کر لیا۔ یہ سنجیدگی اور بردباری اور سلطنت و شاہیت سے استغناء عالمگیر ہی کا حصہ تھا کہ اس نے شہرت پر تو اعتماد ہی نہ کیا۔ استقلال دارا کا وہ ابتداء سے مخالف تھا۔ مگر شاہجہاں کے سامنے اپنے مقصود اور اپنی آخری معروضات کو دلائل اور براہین کی روشنی میں صفائی سے بیان کرنے اور حجت کو ختم کر دینے سے پہلے کوئی فعل ایسا نہیں کیا، جس سے شاہجہاں کی ہمسری یا شریک کار بھائیوں سے بے مروتی کا اظہار ہو۔

دارا شکوہ نے استقلال و اقتدار حاصل کرنے کے بعد پہلا کام یہی کیا کہ سلیمان شکوہ اور مرزا راجہ جے سنگھ کو

شجاع کے اور جسونت سنگھ کو عالمگیر اور مراد کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا۔

شجاع اور عالمگیر میں زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ چنانچہ سلیمان شکوہ نے پہلے ہی حملہ میں ایسی شکست دی کہ شجاع کو بنارس سے بھاگ کر مونگیر جا کر پناہ لی اور پھر وہاں بھی نہ جم سکا۔

بہت ممکن تھا، اسی مرحلہ میں شجاع کا قصہ ختم ہو جاتا۔ مگر اورنگ زیب کی کامیابی نے دارا کو مجبور کیا کہ سلیمان شکوہ کو اپنی امداد کے لئے طلب کرے۔

فتح اکبر آباد کے بعد عالمگیر نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ شاہجہاں سے سفارش (۹۳۴) کر کے صوبہ بہار شجاع کو دلوا دیا۔

شاہجہاں اورنگ زیب کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے فرمان میں لکھتا ہے:

''الحال از روئے کمال مرحمت صوبہ بہار را بر صوبہ عمدہ بنگالہ و اڑیسہ افزودہ۔ حسب التماس فرزند عالی قدر سلطان اورنگ زیب بہادر با قطاع آں فرزند اقبال مند و بختیار مقرر و مسلم داشتیم ''۔ (۹۳۵)

اس کے ساتھ ہی عالمگیر نے اپنا خط شجاع کے نام بھیجا۔ جس میں صفائی سے لکھ دیا کہ سر دست صوبہ بہار اپنے تصرف میں لا کر فارغ البالی اور اطمینان کے ساتھ اس کی برداشت اور اپنے نقصانات کی تلافی کیجئے۔ جب ہماری فوجیں دارا کی مہم سے فارغ ہو جائیں گی، اس وقت:

''مطالب و مدعیات دیگر کہ داشتہ باشید در حصول آں نیز خواہیم کوشید و چنانچہ آئین اخوت و مقتضائے فتوت ست ہیچ چیز از مراتب ملک و مال مضائقہ نخواہیم نمود۔'' (۹۳۶)

اورنگ زیب کی سیر چشمی اور فراخ حوصلگی مستحق صد آفریں ہے، کہ شجاع کی کمزوری، معاہدہ سے لا پروائی اور اپنے مقصود سے اس کی ناکارگی کو دیکھ رہا ہے مگر پھر بھی صوبہ بہار صرف اس لئے دلواتا ہے تاکہ اپنے نقصانات کی تلافی کرے اور صرف اپنی جدوجہد کے بعد جو ملک وہ حاصل کرے، اس میں بھی اپنی رائے اور مرضی کے مطابق نہیں بلکہ شجاع کے مدعی اور مطالبہ کے بموجب دینے کا وعدہ تحریری دے رہا ہے جس پر شجاع بھی بہت خوش ہے اور احسان مندی کا اظہار کر رہا ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ شجاع کی حرص و طمع کا کاسہ اب تک پر نہیں ہوا تھا مزید برآں شاہجہاں کے رقعہ نے جو ہندی میں لکھا گیا تھا، جذبات حرص و طمع میں نئی امنگ پیدا کر دی تھی۔

چنانچہ ایک پست ہمت، بزدل، حریص اور بے مروت انسان کی طرح (جو مقابل کی کمزوری اور پریشانی ہی سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں رہا کرتے ہیں) شجاع نے بھی پست اور رذیل اخلاق کے مظاہرہ میں کمی نہیں کی۔

عالمگیر دارا کا تعاقب کرتے ہوئے ملتان پہنچ گیا تھا، مراد گرفتار ہو چکا تھا۔ آگرہ کا قلعہ ناتجربہ کار محمد سلطان کی نگرانی میں تھا۔ اس سے بہتر موقعہ شجاع کو کب مل سکتا تھا۔

چنانچہ اس نے فوراً پٹنہ سے اپنی فوجوں کے کوچ کا حکم صادر کر دیا۔ بنارس، الہ آباد اور رہتاس وغیرہ کے

قلعہ ابھی تک دارا کے ملازمین کے قبضہ میں تھے۔ دارا نے اُن کے نام خفیہ احکام جاری کر دیئے کہ وہ قلعوں کو شجاع کے حوالہ کر دیں۔ چنانچہ شجاع اپنی جرار فوجوں کے ساتھ بڑھتا ہوا الہ آباد تک پہنچ گیا۔

اورنگ زیب کو جب شجاع کے بڑھنے کی خبر پہنچی تو پہلے اُس نے محمد سلطان کو حکم دیا کہ آگرہ کی موجودہ فوج کو لے کر بڑھے۔ پھر خود بھی روانہ ہوا۔ جسونت سنگھ جو دھرمات پور میں شکست کھا کر بھاگ گیا تھا اور راجہ جے سنگھ کی وساطت سے معافی پا کر شریک فوج ہو گیا تھا، ساتھ تھا۔

اورنگ زیب نے محمد سلطان کو ہدایت کی تھی کہ وہ لڑائی میں پیش قدمی نہ کرے بلکہ اس کے آنے کا انتظار کرے کیونکہ اس کا خیال تھا کہ جب شجاع کو اورنگ زیب کے پہنچنے کا علم ہوگا، وہ خود ہی واپس چلا جائے گا۔ چنانچہ اُس نے اپنی رفتار سست کر دی۔ بارہ دن وہاں ٹھہر گیا۔ پھر سرون کی شکارگاہ میں جا کر خبروں کا انتظار کرنے لگا۔ مگر شجاع اندھا بنا ہوا تھا، وہ بڑھتے ہوئے کھجوا پہنچ گیا۔

آخر کار عالمگیر کو خود متوجہ ہو کر شجاع کے مقابلہ کے لئے آنا پڑا۔ ۷ ربیع الثانی ۱۰۶۹ھ کو رزم گاہ میں پہنچا۔ فوجوں کو ترتیب دے دی۔ جسونت سنگھ کو بھی یمین کی کمان دی گئی۔ لیکن اُس نے لڑائی سے ایک رات پہلے شجاع سے سازش کر لی اور طے کیا کہ رات کو میں عقب سے عالمگیر کی فوج پر حملہ کروں گا اور تم سامنے سے حملہ کر دینا۔ اسی طرح ہم دونوں مل کر عالمگیر کو پیس ڈالیں گے۔

رات کے دو حصے گزر چکے ہیں۔ سلطان عالمگیرؒ نماز تہجد میں مشغول ہیں۔ یکا یک لشکر میں شور ہوتا ہے۔ سلطان کے پاس پہرہ دار اور ملازمین آ کر اطلاع دیتے ہیں کہ جسونت سنگھ اپنی چودہ ہزار فوج[۲۳۷] کے ساتھ سلطانی لشکروں کو پریشان کرتا ہوا شجاع کے پاس جا رہا ہے۔

سلطان یہ خبر سنتا ہے اور ہاتھ سے اشارہ کرتا ہے کہ "اگر رفت رفتہ باشد"۔ جب اپنے وظائف اور معمولات سے فارغ ہو جاتا ہے تو میر جملہ کو طلب کر کے فرماتا ہے"۔ یہ بھی خدا کا فضل و احسان ہی ہے۔ اگر یہ منافق عین معرکہ جنگ میں یہ حرکت کرتا تو تدارک مشکل تھا۔

اس کے بعد نقارہ اور سواری کا حکم ہوتا ہے۔ باقی شب ہاتھی کی کمر پر گزار دیتا ہے۔ صبح ہوتی ہے تو سواری خاص کے فیلبان کو حکم ہوتا ہے کہ جس صورت سے بھی ممکن ہو ہمیں شجاع کے ہاتھی کے پاس پہنچا دو۔

مرشد قلی خاں یہ حکم سنتا ہے تو فوراً عرض کرتا ہے:

"ایں طور جرأت خلاف طور بادشاہاں ست"۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"ما ہیچ کدام بادشاہ نہ شدہ ایم مردم بعد ازیں طور جرأتہا بادشاہ میشوند بعد از بادشاہی ہم اگر در جرأت تفاوت شود آں سلطنت نمے ماند"

عروس ملک کسے در کنار گیرد تنگ ۔۔۔ کہ بوسہ بر لب شمشیر آبدار دہد[۲۳۸]

بہر حال بقول اورنگ زیب عالمگیر ارادہ الٰہی فیصلہ کر چکا تھا کہ عروس ملک کی ہمکناری صرف عالمگیر ہی کو

حاصل ہوئی۔ چنانچہ شجاع کو اس جنگ میں ایسی شکست ہوئی کہ اُس نے پٹنہ جا کر دم لیا۔

عالمگیر نے بذات خود اس کا تعاقب پسند نہ کیا، میر جملہ کو اور شہزادہ محمد سلطان کو تعاقب کے لئے بھیج دیا۔ میر جملہ نے شکست پر شکست دے کر جب لاچار کر دیا تو شجاع بنگال چھوڑ کر اپنے بال بچوں اور اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ "مگھ" قوم کے ملک "ارچنگ" (ارکان) چلا گیا۔ یہاں کے راجہ نے اُسے نہایت اعزاز و احترام سے رکھا لیکن اس نے وہاں کے مسلمان باشندوں کے ساتھ سازش کر کے راجہ کے تخت پر قبضہ کرنا چاہا۔ عین وقت پر اس کا پتہ چل گیا۔ راجہ نے شجاع کی گرفتاری کے لئے فوج بھیجی اور جیسا کہ پرتگالی تاجروں کا بیان ہے، وہ اسی وقت اپنے ارکان کے ساتھ شہید کر دیا گیا۔ اس طرح بدنصیب شجاع نے اپنی خام کاریوں کی بدولت غریب الوطنی کی بے کسی میں جان دی۔

اورنگ زیب کو جب معلوم ہوا تو اُس نے اپنے افسروں کو لکھا کہ وہ شجاع کے خاندان کا پتہ لگائیں۔ لیکن اس وقت تو کیا آج تک کسی کو اس بدبخت خاندان کے متعلق کوئی بھی صحیح بات نہ معلوم ہو سکی۔

عالمگیر اور ہندو

سلاطین اور ملوک کے حالات لکھنا کتاب کا مقصود نہیں۔ علماء ہند کے سیاسی ماحول کو بیان کرنے کے لئے سلاطین کے صرف رجحانات، جذبات اور خدمات و اصلاحات کو بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر کو حدیث، تفسیر اور فقہ وغیرہ کا ماہر ہونے کے باعث مولانا محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے اس تذکرہ میں دیگر سلاطین کی بہ نسبت اُس کا خاص حصہ ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ شاہجہاں خود پابند مذہب، نیک نفس، پاک باطن بادشاہ تھا۔ اس لئے ان دونوں بادشاہوں کے اختلافی معاملات کو ذرا تفصیل سے بیان کرنا پڑا۔

باپ کو قید کرنے اور بھائیوں کو قتل کرنے کے علاوہ اورنگ زیب پر ہندو راجاؤں اور ہندو عوام کے ساتھ بدسلوکی کا الزام بھی لگایا جاتا ہے۔ مگر خداوند عالم جزاء خیر دے اُن باحمیت اور غیور مصنفین کو جنہوں نے نہایت کاوش کے ساتھ ان تمام الزامات کی تنقید و تنکیر کر کے اس قسم کی تمام تاریک بدلیوں سے مطلع کو صاف کر دیا ہے، اور ہمیں اس فریضہ سے سبک دوش کر دیا ہے۔

واقعہ یہ ہے بساط تاریخ پر اگر حق و انصاف کی کوئی قیمت ہے تو نہایت بلند آہنگی اور دلیری کے ساتھ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ عالمگیر کے بعد سے آج تک (باوجودیکہ گردش لیل و نہار نے تقریباً ڈھائی صدیاں پوری کر دی ہیں) مگر عالمگیر جیسا رعایا پرور، رحم دل، انصاف پسند بادشاہ نہیں پیدا کر سکی۔

اور تاریخ ماضی میں بھی بے شمار سلاطین اور صاحب سطوت و حشمت ملوک کے زمرہ میں انگلیوں پر گن لینے کے قابل چند سلاطین کے علاوہ عالمگیر کی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی۔

غور فرمایئے وہی جسونت سنگھ جس کے چند کارنامے پہلے گزرے یعنی جس نے دارا شکوہ کی حمایت میں سب سے پہلے عالمگیر سے سختی سے مقابلہ کیا۔ عالمگیر کو گستاخانہ جوابات دیئے، شکست دارا کے بعد جب ندامت کا اظہار کرتا ہے تو عفو عالمگیر اس کے سر کا چتر بن جاتی ہے۔ ابھی شجاع اور دارا کے قصہ سے فراغت نہیں ہوئی۔ شجاع اکبر آباد پر حملہ کرنے کے لئے بڑھا چلا آرہا ہے۔ جسونت سنگھ عالمگیر کی امداد کے لئے چودہ ہزار راجپوت لے کر پہنچتا ہے لیکن معرکۂ جنگ کی شب میں اپنی ساری فوج کو لے کر شاہی خرگاہ اور خزانہ وغیرہ پر حملہ اور شاہی افواج کو پریشان اور تباہ کرتا ہوا شجاع سے جا ملتا ہے۔

فتح اور فیروز مندی، اقبال عالمگیر کے قدم چومتی ہے تو جسونت سنگھ کو اپنے وطن جا کر منہ چھپانا پڑتا ہے۔ مگر وہ اب پھر شاہی منصب کی ہوس میں مضطرب ہے۔ سامنے آتے ہوئے خود شرم آتی ہے۔ صرف درخواست بھیج دیتا ہے۔

یہ دریا دل اور پیکر رحم عالمگیر ہی ہے کہ غائبانہ اس کا قصور معاف کرتے ہوئے منصب اور شاہی اعزازات اور جاگیر وغیرہ سے بحال کر دیتا ہے اور گورنر بنا کر احمد آباد بھیج دیتا ہے۔ وقتاً فوقتاً اس کو بڑی بڑی مہمات پر مامور کرتا ہے۔ یہاں تک کہ دکن میں شیواجی کے مقابلہ پر بھیجتا ہے۔ لیکن یہ غدار یہاں بھی اپنی فطرت سے باز نہ رہا۔ الفنسٹن صاحب لکھتے ہیں:

> "راجہ جسونت سنگھ شاہزادہ معظم کی طبیعت پر حاوی اور بادشاہ کی نسبت ہندوؤں کا زیادہ خیر خواہ تھا۔ علاوہ اس کے لوگوں کو یہ بھی یقین کامل تھا کہ وہ لوبھی و لالچی ہے اور روپیہ کی بات تھوڑی بہت مانتا ہے"۔ (۲۳۹)

غرضیکہ ان دیلوں سے شیواجی نے اس کو اپنا رفیق بنایا۔ جسونت سنگھ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ راؤ بھاؤ سنگھ ہاڈا کو (جو ریاست بوندی کا راجہ اور سہ ہزاری منصب رکھتا تھا اور اس مہم میں اس کا شریک تھا) اپنے ساتھ شریک کرنا چاہا۔ اور جب اُس نے نمک حرامی سے انکار کیا تو اس کی بہن کو جو جسونت سنگھ کے عقد نکاح میں تھی، وطن سے بلوا کر بیچ میں ڈالا۔ لیکن اس وفادار نے اب بھی حق نمک کو قرابت پر مقدم رکھا۔ بالآخر جسونت سنگھ کابل کی مہم پر مامور ہوا، اور ۱۰۸۹ھ میں قضا کر گیا۔ (۲۴۰)

مرہٹوں سے جنگ

عالمگیر کے دامن رحم و انصاف پر یہ وہ مصنوعی دھبہ ہے جس کو بڑھا چڑھا کر ہندو مسلم تفرقہ کی آگ کو ہوا دی جارہی ہے لیکن جب تحقیق اور تنقید کی جاتی ہے تو اس بناوٹی داغ کے نیچے عفو اور کرم کی وہ روشنی نمایاں ہوتی ہے کہ اگر سلاطین و فرمانروان مابعد کے سینکڑوں درخشاں اور تاباں طرہائے امتیاز اس روشنی پر قربان کر دیئے جائیں جب بھی اس روشنی کا حق احترام ادا نہ ہو۔

غور فرمایئے۔ "ساہوجی" (۲۳۱) نظام شاہ والی بیجاپور سے ناراض ہو کر شاہجہان کے دربار میں حاضر ہوا، اور پنج ہزاری منصب، خلعت، اسلحہ مرصع، علم، نقارہ، اسپ، فیل اور دو لاکھ نقد انعام سے سرفراز ہوا۔ ساہوجی کے سالوں (جادو لکھی کے لڑکوں کو جن کا نام بہادر اور جگدیو تھا) پنج ہزاری اور چار ہزاری منصب ملے۔ لیکن کچھ دنوں بعد جزوی معاملات پر جن میں سراسر دکن کی مسلم ریاستوں کے ساتھ (جو سلطنت مغلیہ کے مخالفت رہا کرتی تھیں) ساز باز اور اپنی ذاتی اغراض کو دخل تھا، دولت مغلیہ سے باغی ہو گیا۔

شاہزادہ عالمگیر تنبیہ کے لیے مامور ہوا اور پھر دیگر امراء شاہی تادیب کے لیے ساہوجی کی حماقت کی پراگندگی اس کا نتیجہ ہوا اور پھر وہ انتقال کر گیا۔ سیواجی، ساہوجی کا لڑکا تھا۔ اس نے اپنی قوم میں مذہبی تنظیم کا جذبہ پیدا کر کے مغلوں کی مخالفت پر آمادہ کیا۔ اس نے آس پاس کے علاقوں پر لوٹ مار کر کے اپنی طاقت کو مضبوط کیا۔ پھر بھی دکن کی مسلم ریاستوں سے (جن کو دربار دہلی سے دلی بغض و عناد تھا) ساز باز کر کے اور جب اُن سے مخالفت ہوتی، تو دربار دہلی کی پناہ میں آ کر اپنے ملک کو بڑھاتا رہا۔

عالمگیر دوران شاہزادگی میں دکن کی مہمات میں مصروف ہے۔ سیواجی دشمنوں کا ساتھ دیتا ہے لیکن شکست کھا کر معافی مانگنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مگر جیسے ہی موقع ملتا ہے، آنکھیں بدل لیتا ہے۔ جب جوابی کارروائی کی جاتی ہے تو گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ معافی کی درخواست پیش کرتا ہے اور عادل شاہ والی بیجاپور سے سفارش چاہتا ہے۔ عادل شاہ کی سفارشی درخواست کے متعلق عالمگیر کا جواب، عالمگیر کے رحم و کرم اور اس کے بے نظیر حوصلہ کو ظاہر کرتا ہے۔

"اگرچہ بغوات و زلات او از کثرت وافزونی قابل عفو نبود لیکن از انجا کہ آں سزاوار مکرمت ارادۂ دولت و خدمت گزاری نمودہ و از تقصیرات خود نادم و پشیمان گشتہ و ایں درگہ مادرگہ نا امیدی نیست، بنابراں بشرط استقامت بر جادۂ بندگی و فرمانبرداری از روئے فضل و ذرہ پروری رقم عفو بر جرائد و جرائم او کشیدہ شد، باید کہ بدیں عاطفت نمایاں استظہار فراوان اندوختہ دراظہار مراسم صدق عقیدت مساعی موفورہ بجا آورد۔" (۶۴۲)

غور کرو وہ عالمگیر جو ڈھائی سو برس بعد تنگ نظر، متعصب، اور ہندو کش بنا دیا گیا ہے، اپنے زمانہ میں کس طرح رحم و کرم کا دریا موجزن بن کر اپنے حریف کے دفاتر جرائم پر قلم عفو کھینچ رہا ہے، اور پھر شاہان مغلیہ کے اخلاق بھی ملاحظہ ہوں کہ اس مقہور اور شکست خوردہ حریف کے لئے سزاوار مکرمت (قابل احترام) کے الفاظ بھی استعمال کر رہا ہے۔ کیا فرمانروایان مابعد کی بلند بانگ تہذیب اس کی نظیر پیش کر سکتی ہے۔ اور یہ نہیں کہ عالمگیر سیواجی کو نہیں پہچانتا۔ اسی خط میں عادل شاہ کو جو ہدایت کر رہا ہے وہ عالمگیر کی کامل بصیرت اور دور بینی کے ثبوت کے لئے بھی روشن دلیل ہے۔ تحریر کرتا ہے:

"سیوا......را کہ در بعض قلاع کوکن جریدہ وغبار فساد برانگیختہ اگر خواہد کہ......نوکر خود کنند جاگیر او را در کرناٹک تن نماید۔ تا از حدود ممالک محروسہ دور بودہ شورش افزانہ گردد (آداب نمبر ۴۹۶)

لیکن عالمگیر کے اس رحم وکرم کا بدلہ سیواجی نے کیا دیا۔ وہی جو ایک عیار، بزدل اور پست ہمت دیا کرتا ہے۔ یعنی جب عالمگیر جنگ برادران میں مصروف تھا اس نے موقعہ کو غنیمت سمجھ کر اپنی طاقت کو خوب فروغ دیا۔

اس طرح عادل شاہ کی بیماری اس کے لئے طاقت بڑھانے کا بہترین موقع تھی۔ اور جب اس کی وفات کے بعد اس کے جانشین علی عادل شاہ نے افضل خاں کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا تو مقابلہ سے پہلے ہی صلح کی درخواست بھیج کر افضل خان کو گفتگو کے لئے بلایا۔ پھر جس طرح دھوکہ دے کر اس کو قتل کیا، وہ ہندوستان کے ہر ایک خواندہ کو معلوم ہے۔

عالمگیر ابھی رقیبان سلطنت کے معرکوں سے فارغ نہیں ہوا تھا۔ تاہم اُس نے ۳ جلوس مطابق جمادی الاولی ۱۰۷۰ھ میں شائستہ خاں امیر الامراء کو بھیجا، جو سیوا کو شکست دیتا ہوا پونہ میں پہنچا۔ اور خاص اس محل میں قیام کیا جو سیواجی نے اپنے لئے تعمیر کرایا تھا، اور ہر طرف سیوا کے تعاقب کے لئے فوجیں روانہ کیں۔ سیوا پہاڑی دروں اور گھاٹیوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ اور ایک دو ہفتہ سے زیادہ کہیں قیام کا اس کو موقع نہ ملتا تھا۔ بالآخر اس نے لوٹ مار کا پرانا طریقہ اختیار کیا، اور ایک روز شب کو ایک چور دروازہ سے محل میں گھس کر شائستہ خاں پر حملہ کرنا چاہتا تھا مگر وہ تو محفوظ رہا اور دھوکے میں دوسرا شخص مارا گیا۔

چونکہ امیر الامراء کی بے احتیاطی سے سیوا کو یہ موقعہ ملا تھا، لہٰذا عالمگیر نے امیر الامراء کو اس خدمت سے معزول کر کے شاہزادہ معظم کو اس مہم پر مامور کیا۔

سیوا نے اپنا رخ دوسری طرف کیا۔ سورت کے پاس جو بندرگاہیں تھیں، اُن پر قبضہ کر لیا، اور غارت گروں کے ساتھ حجاج کے لشکروں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ عالمگیر نے راجہ جے سنگھ کو جو ریاست جے پور کا راجہ اور سپہ سالاری کا منصب رکھتا تھا۔ اس مہم پر مامور کیا اور فوج کا ہراول دلیر خاں کو مقرر کیا۔

ان بہادر سپہ سالاروں نے ہر طرف سے اس طرح گھیر لیا کہ سیوا کو نہ صرف شکست بلکہ اپنے اہل وعیال کی بربادی کا بھی یقین ہو گیا۔ مجبوراً اس نے اُس درگاہ کی طرف پھر رجوع کیا جس کے متعلق مالک درگاہ لکھ چکا تھا:

این درگہ ما درگہ نا اُمیدی نیست

چنانچہ سیوا قلعہ پورندھر (جس میں سیوا کے اہل وعیال محصور تھے) سے تنہا نکل کر اس ''درگاہ امید افزا'' کے وکیل جے سنگھ کے کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا اور چند برہمنوں کو پہلے بھیج دیا۔ جنہوں نے نہایت عجز وزاری سے قسمیں کھائیں۔

بہرحال جب راجہ جے سنگھ کو اطمینان ہو گیا کہ سیوا عاجزانہ آتا ہے تو راجہ جے سنگھ نے اپنے منشی (سیکرٹری) ''ادیب راج'' کو استقبال کے لئے بھیجا لیکن چند مسلح راجپوت بھی ساتھ کر دیے کہ ہوشیار رہیں۔ یہ بھی کہلا بھیجا کہ اگر خلوص سے آتا ہے تو بے ہتھیار آئے ورنہ واپس چلا جائے۔

۷ ذی الحجہ ۱۰۷۵ھ کو سیوا اجریدہ آیا۔ راجہ جے سنگھ نے اُٹھ کر گلے لگایا۔ سیوا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ادنے گناہ

گار غلاموں کی طرح حاضر ہوا ہوں۔ اب آپ کو اختیار ہے، ماریئے یا چھوڑ دیجئے۔

سیوا نے درخواست کی کہ تمام بڑے بڑے قلعے پیش ہیں۔ میرا بیٹا سنبھاجی ملازمان شاہی میں داخل کیا جائے، میں مطلق العنان کسی قصبہ میں بسر کروں گا لیکن جب کبھی ضرورت ہوگی فوراً حاضر ہو جاؤں گا۔ جے سنگھ نے اطمینان دلایا اور دلیر خاں کو کہلا بھیجا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے۔ چنانچہ سات ہزار زن و مرد قلعہ سے باہر نکلے اور اُن کو امان دی گئی۔

• دلیر خاں نے اپنی طرف سے تلوار، جمدھر، دو عربی گھوڑے مع ساز طلائی سیوا کو عنایت کئے اور اس کا ہاتھ جے سنگھ کے ہاتھ میں دیا۔ جے سنگھ نے خلعت، گھوڑا اور ہاتھی عطا کیا۔ دلیر خاں نے اپنے ہاتھ سے سیوا کی کمر میں تلوار باندھی لیکن سیوا نے تھوڑی دیر بعد کھول کر رکھ دی اور کہا کہ میں بغیر ہتھیار کے خدمت گزاری کروں گا۔

اس سے پہلے جے سنگھ نے معافی کے لئے دربار شاہی میں لکھ بھیجا تھا۔ چنانچہ وہاں سے فرمان خلعت صادر ہوا۔ سیوا کو پہنے خلعت اور فرمان قبول کرنے کے آداب سکھائے گئے۔ چنانچہ فرمان کے استقبال کے لئے سیوا تین میل تک پیادہ گیا اور خلعت کے سامنے آداب بجالایا۔

سیوا نے ۳۵ قلعوں سے ۲۳ قلعے خدام شاہی کے حوالہ کر دیئے۔ سیوا کے بیٹے سنبھا کے لئے راجہ جے سنگھ نے پنج ہزاری کے منصب کی سفارش کی۔ چنانچہ وہ منظور ہوئی اور سنبھا کو فرمان شاہی عنایت ہوا۔

سیوا ۲ ذی الحجہ ۱۰۷۵ھ کو جے سنگھ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اس وقت سے تلوار نہیں باندھتا تھا۔ ۲۶ ربیع الاول ۱۰۷۶ھ کو تقریباً چار ماہ بعد راجہ جے سنگھ نے اس کو ہتھیار لگانے کی اجازت دی۔ اور مرصع تلوار عنایت کی۔

۹ جلوس مطابق ۱۰۷۶ھ میں پایہ تخت (آگرہ) کو روانہ ہوا۔ جب شہر کے قریب پہنچا تو عالمگیر نے راجہ جے سنگھ کے بیٹے کو کنور رام سنگھ اور مخلص خاں کو استقبال کے لئے بھیجا سیوا دربار میں پہنچ کر آداب بجالایا اور نذر پیش کی۔ عالمگیر نے ارشاد فرمایا کہ پنج ہزاری امراء کی صف میں اس کو جگہ دی جائے۔ لیکن سیوا کی توقعات اس سے زیادہ تھیں۔ اس نے ایک گوشہ میں جا کر رام سنگھ سے اس کی شکایت کی اور درد شکم کا بہانہ کر کے وہیں فرش پر لیٹ گیا۔ عالمگیر نے حکم دیا کہ فرودگاہ کو واپس جائے۔ سیوا چند روز سرکاری نگرانی میں اکبرآباد رہا۔ پھر وہاں سے فرار ہو کر دکن پہنچ گیا۔

آج سیوا جی کو ایک قابل پرستش کی حیثیت سے عزت و احترام کے بلند آسمان پر بٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن کیا برادران وطن کے سرمایۂ فخر و مباہات میں صرف ایسے ہی بزرگ اور پیشوا ہیں؟ ورنہ پھر اس فرقہ پرستانہ تعصب اور عناد پر جس قدر ماتم کیا جائے، کم ہے۔

عالمگیر کے لطف و احسان، شرافت اور فراخ حوصلگی اور بلند ہمتی، اور سیوا جی کی خود غرضی، تنگ نظری اور پست ہمتی کا موازنہ کیا جائے تو عدل و انصاف کا فیصلہ صرف یہی ہوگا کہ عالمگیر اس لئے قابل ملامت ہے کہ وہ مسلمان تھا، اور سیوا جی اسلئے واجب الاحترام اور قابل پرستش ہے کہ وہ ہندو تھا، خواہ وہ کیسا ہی تھا۔

ایک عجیب وغریب مطالبہ یہ ہے کہ عالمگیر کو سیواجی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہیے تھا۔ مگر کیا یہ مطالبہ سراسر متعصبانہ کور باطنی کا ثبوت نہیں۔

عالمگیر استقبال کے لئے راجہ رام سنگھ کو بھیجتا ہے۔ رام سنگھ، راجہ جے سنگھ کا بیٹا تھا جو اُمراء عالمگیری میں سب سے زیادہ ممتاز اور سپہ سالار افواج تھا۔ رام سنگھ ۱۰۵۵ھ جلوس شاہجہاں کے انیسویں سال بارگاہ شاہجہاں میں پانچ سو سواروں کے ساتھ آیا۔ اس کو ہزاری منصب اور خلعت عطا ہوا۔ ۱۰۶۳ھ (۲۷ جلوس شاہجہانی) میں اس کا منصب سہ ونیم ہزاری تک پہنچا۔ عالمگیر کے زمانہ میں وہ معتمد خاص رہا۔ یہاں تک کہ سلیمان شکوہ پسر دارا کو لانے کے لئے عالمگیر نے اسی کو راجہ جے سنگھ کا قائم مقام بنا کر بھیجا۔ سیواجی کی اطاعت کی جس دن خبر آئی، عالمگیر نے اس کو زیور مرصع اور ہاتھی اور خلعت عطا کیا۔

چونکہ سیواجی، راجہ جے سنگھ کے توسط اور ضمانت سے دربار میں آیا تھا، اس لئے اس کے استقبال کے لئے رام سنگھ سے زیادہ کون موزوں ہوسکتا تھا، جو اپنے باپ کا فرزند رشید اور اس کا قائم مقام تھا۔

مخلص خاں اس کے ساتھ اس لئے بھیجا گیا تھا کہ یہ نہ خیال ہو کہ ہندوپن کے تعصب سے کوئی مسلمان درباری نہیں بھیجا گیا۔ بعض یورپین مؤرخ نہایت چالاکی سے استقبال کا اصلی ممبر مخلص خاں کو قرار دے کر کہتے ہیں کہ راجہ رام سنگھ کو اس کے ساتھ بھیج دیا گیا تھا۔ حالانکہ تمام تاریخوں میں رام سنگھ کا نام مقدم رکھا گیا ہے۔

بہر حال مجرموں کے لئے استقبال اور پھر قابل فخر استقبال، کیا شاہان مغلیہ کا طرز مخصوص نہیں، جس کی نظیر اُن کے بعد کم از کم ہندوستان سے مفقود ہے۔

اس کے بعد سیواجی کو جو منصب عطا ہوا، وہ پنج ہزاری تھا۔ جس کو یہی یورپین مؤرخ تیسرے درجہ کا منصب قرار دیتے ہیں۔ مگر ان کو یہ معلوم نہیں کہ خود راجہ جے سنگھ کا منصب اس وقت تک پنج ہزاری سے زیادہ نہ تھا۔ اس فتح عظیم کے صلہ میں جب اُس کے منصب پر دو ہزاری کا اضافہ ہوا، تب جا کر وہ ہفت ہزاری ہوا۔

اس راجہ جے سنگھ پر ہی کیا موقوف، خود وزیر اعظم افضل خاں کا منصب پانچ ہزاری سے زیادہ نہ تھا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ مہارانا اودے پور سے زیادہ کوئی ہندوستان میں معزز راجہ نہ تھا۔ لیکن اس خاندان نے دربار شاہی سے ربط پیدا کیا تو جہانگیر نے رانا کرن کو بھی پنج ہزاری منصب دیا۔ اس کے بعد ۱۰۳۸ھ میں شاہجہاں نے رانا جگت سنگھ کو یہی منصب عطا کیا۔ اس کے بعد رانا راج سنگھ کو دربار عالمگیری سے یہی منصب عطا ہوا۔ کیا سیواجی اودے پور کے مہارانوں سے بھی معزز درجہ رکھتا تھا۔ ان سب کے علاوہ خود سیواجی کے باپ ساہوجی نے جب شاہجہاں کے دربار میں ۱۰۴۶ھ (۳ جلوس) میں رسائی حاصل کی تو شاہجہاں نے اس کو بھی پنج ہزاری منصب عنایت کیا تھا۔

علامہ شبلی اس تمام بحث کے بعد فرماتے ہیں:

''سیواجی کی اطاعت کا سلطنت پر کیا احسان تھا۔ شاہی فوجوں نے اس کے تمام قلعے فتح کر لئے

تھے۔ وہ قلعہ پورندھر میں چاروں طرف سے گھر چکا تھا۔ اس کے خاص صدر نشین قلعے کے برجوں پر شاہی پرچم لہرا رہا تھا۔ ان مجبوریوں سے وہ ہتھیار رکھ کر غلاموں کی طرح آیا، اور دربار میں روانہ کیا گیا۔ تاہم اس کے استقبال کے لئے عالمگیر نے سب سے زیادہ جو شخص موزوں ہو سکتا تھا، اس کو بھیجا۔ پنج ہزاری اُمراء کی صف میں جو خود فاتح یعنی راجہ جے سنگھ کا منصب تھا، جگہ دے کر فاتح اور مفتوح کو یکساں حیثیت دی۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہتا تھا۔ کیا شہنشاہ ہند ایک مفتوح رہزن کے لئے تخت سے اتر آتا۔ (۹۴۳)

بہر حال جب سیوا جی اکبر آباد سے فرار ہو کر دکن پہنچا تو جنوبی ہند کی حکومتوں کی آپس کی مخاصمت نیز دربار مغلیہ سے جنوبی ہند کی مخالفت اور پھر سیوا جی کے پورا نہ ہونے والے دعوے اس کے لئے قوت فراہم کرنے کا ذریعہ بن گئے، اور فوراً ہی اس نے تاخت و تاراج کا پرانا شیوہ پھر اختیار کر لیا۔

ان تمام جرائم اور سرکشیوں کے باوجود عالمگیر کی سیر چشمی ملاحظہ ہو کہ جب ۱۰۷۷ھ میں عالمگیر نے شاہزادہ معظم شاہ کو بہمراہی راجہ جسونت سنگھ دکن کی صوبہ داری پر مامور کیا تو سیوا جی نے جسونت سنگھ کے پاس پیغام بھیجا کہ میں اپنے بیٹے سنبھا کو بھیجتا ہوں اس کو فوج میں کوئی عہدہ عنایت کیا جائے۔ جسونت سنگھ نے یہ درخواست منظور کی۔ سیوا جی نے سنبھا کو ایک ہزار فوج کے ساتھ شاہزادہ معظم کی خدمت میں بھیجا۔

باوجودیکہ سنبھا جی پہلے پنج ہزاری منصب پر دربار عالمگیری میں فائز تھا اور پھر باپ کے بعد خود بھی فرار ہو کر باپ کی شورش و سرکشی میں شریک ہو گیا تھا، مگر ان شاہان لطف و کرم کا تو نظریہ یہی تھا کہ "ایں درگہ ما درگہ نا امیدی نیست"۔

چنانچہ سنبھا جی کو پنج ہزاری منصب، مہاراجہ کا خطاب اور صوبہ برار بطور جاگیر عطا ہوا۔

سنبھا جی

سیوا جی ۱۰۹۱ھ مطابق ۱۶۸۰ء میں ترپن سال عمر پا کر بعارضہ تپ انتقال کر گیا۔ اس کے انتقال کے بعد سنبھا جی اس کا جانشین ہوا۔ پہلے پڑھ چکے ہو کہ پہلی مرتبہ جب راجہ جے سنگھ کے ذریعہ سے سیوا جی نے معافی مانگی تھی، تب بھی سنبھا کو پنج ہزاری منصب عطا ہوا تھا۔ اس کے بعد باپ کے فرار ہونے سے چند روز بعد باپ کے ساتھ جا ملا پھر جب راجہ جسونت سنگھ کے ذریعہ صلح ہوئی تو پھر سنبھا کو پنج ہزاری منصب، راجہ کا خطاب اور صوبہ برار عطا کیا گیا۔ لیکن سیوا جی کے انتقال کے بعد ایک طرف تو اپنی آوارگی اور تباہ کاریوں کے باعث وہ اپنی قوم کو خوش نہیں رکھ سکا۔ علاوہ ازیں اس نے استقلال حاصل کرتے ہی برہان پور پر دفعتہً حملہ کر کے نہایت سفاکی اور بے دردی سے تمام شہر کو لوٹا اور آگ لگا دی۔ علماء و مشائخ برہان پور نے ایک محضر تیار کر کے عالمگیر کے پاس بھیجا کہ یہ ملک دار الحرب ہو گیا اور اب یہاں جمعہ اور جماعت جائز نہیں۔ عالمگیر نے اب تک بذات خود مرہٹوں کی

شرارت پر توجہ نہیں کی تھی لیکن اس کے جواب میں لکھ کر میں خود آرہا ہوں۔ چنانچہ ۱۰۹۲ھ میں وہ خود دکن پہنچا۔ شاہزادہ محمد معظم کو مرہٹوں کو استیصال کے لئے روانہ کیا۔ معظم شاہ مرہٹوں کا تمام علاقہ پامال کرتے ہوئے اٹک کی حد تک پہنچ گیا۔ مگر آب و ہوا کی خرابی اور رسد کی نایابی کے باعث ہزاروں آدمی اور مویشی تباہ ہو گئے۔ بالآخر عالمگیر نے اس کو واپس بلا لیا۔ پھر وقتاً فوقتاً فوجیں متعین ہوتی رہیں۔ مگر چونکہ حیدر آباد سے ان کو خفیہ مدد ملتی رہتی تھی۔ اس وجہ سے عالمگیر نے پہلے حیدر آباد پر حملہ کر کے ممالک محروسہ میں داخل کر لیا۔ اس کے بعد ۱۱۰۱ھ میں مقرب خاں کو سنبھاجی کی سرکوبی پر مامور کیا جس نے بہت تیزی کے ساتھ حملہ کر کے سنبھا کو مع اہل و عیال گرفتار کر لیا۔

چونکہ سنبھا سخت سفاک اور ظالم تھا اور صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندو بھی اس کی سفاکیوں اور بے رحمانہ غارت گریوں سے نالاں تھے۔ جب اس کی گرفتاری کی خبر مشہور ہوئی تو تمام ملک میں خوشی کے غلغلے بلند ہوئے۔ جب وہ پابہ زنجیر عالمگیر کے دربار میں روانہ کیا گیا تو راہ میں جدھر گزر ہوتا تھا شریف عورتیں گھر سے نکل آتی تھیں اور خوشیاں کرتی تھیں۔

اس مرتبہ بھی اگر سنبھا قدیم چاپلوسی سے کام لیتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ''ایں درگہ ما درگہ نا امیدی نیست'' کا جذبہ اس وقت کار فرما نہ ہوتا۔ اور ''در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست'' کا کریمانہ لطف بے مزہ ہوتا۔ مگر افسوس اس نے دربار میں حاضر ہو کر کسی قسم کی ملائمت کے بجائے عالمگیر کو دردگالیاں دیں۔ اس صورت میں عفو و درگزر سے کام لینا وقار سلطنت کو برباد کر دینا تھا۔ مجبوراً عالمگیر کو وہ معاملہ کرنا پڑا جو اس نے اپنے پچاس سالہ دور حکومت میں کبھی بھی کسی کے ساتھ نہ کیا تھا۔ یعنی زبان اور آنکھیں نکلوا کر اس کو قتل کرا دیا۔ لیکن پھر فوراً لطف و کرم کے فطری جذبہ نے عالمگیر کو مغلوب کیا، اور اس مغلوبیت میں اس نے وہ کیا جو حزم و احتیاط کے قطعاً مخالف تھا یعنی اس سات آٹھ سالہ بچے ساہو کو جو اپنی ماں کے ساتھ گرفتار ہوا تھا ہفت ہزاری منصب اور راجہ کا خطاب دیا۔ اور اس کی سرکار قائم کر کے دیوان اور بخشی مقرر کئے۔ اور حکم دیا کہ اس کا خیمہ ہمیشہ شاہی خیموں کے ساتھ ایستادہ کیا جائے۔ اس کے چھوٹے بھائیوں یعنی مدن سنگھ اور اودھے سنگھ کی بھی اسی طرح قدر افزائی کی۔

بلاشبہ یہ بڑی فیاضی کا کام تھا۔ مگر دور اندیشی سے دور تھا۔ خافی خان نے سچ لکھا کہ یہ ''افعی کشتن و بچہ اش رانگہداشتن'' تھا۔ ہندوؤں کے مذہب میں قید کی حالت میں کھانا نہیں کھاتے۔ اس لئے ساہو صرف میوہ جات اور مٹھائی پر بسر کرتا تھا۔ عالمگیر کو یہ حال معلوم ہوا تو حمید اللہ کو کہلا بھیجا کہ ساہو سے کہہ دو کہ تم قید میں نہیں ہو، بلکہ اپنے گھر میں ہو۔ عالمگیر کا برتاؤ آخر تک ساہو کے ساتھ مربیانہ اور فیاضانہ رہا۔ ۴۷ جلوس خلعت اور سونے کی پہونچیاں جن میں الماس جڑے ہوئے تھے اور سونے کی انگوٹھیاں جڑاؤ اور جمدھر اور اسپ مع زین طلاء عطا ہوا۔ ۴۸ جلوس میں بہادر جی کی لڑکی سے نہایت دھوم دھام کے ساتھ شادی کر دی۔ سرپیچ مینا کار اور جیغہ مرصع قیمتی دس ہزار روپیہ مرحمت ہوا۔ ۱۱۱۷ھ میں اپنے اتالیق کے ساتھ قلعہ بخشندہ کی تسخیر پر مامور ہوا۔ اسی سال بادشاہ کا انتقال ہوا۔ عالمگیر کے مرنے کے بعد ساہو نے خود مختاری کا علم بلند کیا۔ لیکن عالمگیر کے احسانات کا پھر بھی اثر

لحاظ تھا کہ سب سے پہلے عالمگیر کی قبر پر جا کر زیارت کی اور کھانا پکوا کر فقیروں کو کھلایا۔

یہ ہے متعصب اور تنگ نظر عالمگیر، جس کے تعصب اور تنگ نظری پر ہزاروں بے تعصبیاں نثار کر دینی چاہئیں۔

واقعہ یہ ہے کہ عالمگیر کی دوسری بے تعصبیاں بھی جن کو آج نہایت بلند آہنگی سے بیان کیا جاتا ہے، یہی حقیقت رکھتی ہیں۔

ہم مندروں کو ڈھانے اور مسجدوں کے بنوانے کے متعلق علامہ شبلی کا نہایت دلچسپ فقرہ نقل کرنے کے بعد باقی تفصیلات کو دوسری کتابوں کے حوالہ کرتے ہیں۔

''عالمگیر پچیس برس تک دکن میں رہا۔ ان ممالک میں ہزاروں بت خانے تھے لیکن کسی تاریخ میں ایک حرف بھی نہیں مل سکتا کہ اس نے کسی بت خانہ کو ہاتھ بھی لگایا ہو۔ الورہ کے مشہور مندر میں سینکڑوں تصویریں اور بت ہیں۔ عالمگیر اسی نواح میں الورہ سے میل دو میل کے فاصلہ پر مدفون ہے۔ بڑے بڑے بزرگان دین کے یہاں مزارات جو عالمگیر سے پہلے گزرے لیکن یہ بت اور تصویریں آج تک موجود ہیں الخ''(۱۴۴)

غلطی یہ ہے کہ لوگ آج کل کی عینک سے پچھلے زمانہ پر نظر ڈالتے ہیں۔ آج کل برسر بازار عیسائیت کی تردید کی جائے، نظر حکومت میں کوئی جرم نہیں۔ لیکن اگر ڈیفنس آف انڈیا کی کسی دفعہ کے برخلاف کوئی عمل کیا جائے تو فوراً مستحق سزا ہو جائے گی۔ آج مسلمانوں کی مسجدیں اور ہندوؤں کے شوالے کوئی ملکی اثر نہیں رکھتے۔ لیکن اس زمانہ میں یہی چیزیں بغاوتوں اور ہنگاموں کے مرکز ہو جایا کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے ہندو اور مسلمان جب قابو پاتے تھے، ایک دوسرے کی پرستش گاہوں کو صدمہ پہنچاتے تھے۔ تاریخیں بھری پڑی ہیں کہ ہندو راجاؤں نے جب کبھی قوت و اقتدار حاصل کیا ہے، مسجدیں ڈھا کر برباد کر دی ہیں اور یہ بھی ہوا ہے کہ خود ہندوؤں نے مندروں کو منہدم کیا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کیونکہ ان ہندوؤں کے سیاسی مقاصد مسلمانوں کے ساتھ وابستہ ہوتے تھے (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہوں کتب تواریخ)۔

اختتام سفر

حضرت عالمگیر ۱۹ شوال ۱۱۱۷ھ (۵۰ جلوس) میں دکن کے تمام قلعے وغیرہ فتح کرکے احمد نگر تشریف لائے اور اعلان فرمایا: ''احمد نگر اختتام سفر ست'' یہ کلمات اس سچی زبان سے صادر ہوئے تھے کہ جس کی پاسداری کار پردازان قضا وقدر نے بھی کی۔

منصور خاں ناظم ''خجستہ بنیاد'' اورنگ آباد کو آرزو تھی کہ جہاں پناہ اس کے صوبہ کو رونق بخشیں۔ انہوں نے عرضداشت پیش کی کہ حضور معلے احمد نگر میں رونق افروز ہیں اور قلعہ خجستہ بنیاد قابل مرمت ہے اگر ارشاد ہو تو درست کرا لیا جائے تاکہ جہاں پناہ کی رونق افروزی کے وقت دقت نہ ہو۔ حکم ہوا:

در لحد خاک کشادہ است بغل بہر طلب | خواجہ از بے خبری رنگ سرائے ریزد
زود باشد کہ دریں غفلت وحرص وطلبش | استخوانہاش جدا گوشت جدائے ریزد

عجب از آں خانہ زاد مزاج دان! باوجود آں کہ روزے باحمد نگر رسیدم مقرر فرمودیم کہ احمد نگر را ختم السفر بنویسید پس ہرگاہ احمد نگر ختم السفر گفتہ باشیم آمدن "بخجستہ بنیاد" چہ صورت وارد۔

در چند روز حیات گزشتہ در سخن تفاوت نشدہ۔ انشاء اللہ المستعان تا روز انتقال بسرائے جاوداں در اقوال وافعال تفاوت نخواہد شد۔ [وقائع عالمگیر ص ۲۲ :۱۲۳۳]۔

وفات عالمگیرؒ

دکن کا چپہ چپہ فتح کرنے کے بعد سرزمین احمد نگر کو قیام کے لیے منتخب فرمایا۔ اور اعلان کر دیا گیا کہ "احمد نگر اختتام سفر است"۔ یہ اعلان اس بچی زبان سے صادر ہوا تھا جس کی پاسداری کارپردازان قضاوقدر نے بھی کی۔ ایک سال بعد ۱۱۱۸ھ کے اختتام میں صرف دو ماہ باقی تھے کہ بادشاہ کی طبیعت بہت زیادہ ناساز ہوگئی۔ احکام شریعت کی پابندی کچھ ایسی طرح طبیعت میں رچ گئی تھی کہ شدت مرض اور کمال نقاہت کے باوجود آج تک پنج وقتہ نمازیں جماعت کے ساتھ ادا فرماتے رہے۔

مرض خوفناک صورت اختیار کرنے لگا تو مخلص وفادار حمید الدین خاں نے درخواست پیش کی کہ ایک ہاتھی اور بیش قیمت دانہ الماس کے صدقہ کی اجازت دی جائے۔

درخواست پر قلم خاص سے تحریر ہوا:

"فیل تصدق برآوردن طریقۂ اہل ہنود واختر پرستان ست، چہار ہزار روپیہ نزد قاضی القضاۃ بفرستید کہ بمستحقاں رسانند"۔

اس عرضی پر یہ بھی تحریر فرمایا گیا:

"ایں خاکسار را زود بمنزل رسانیدہ بخاک سپارند۔ بتربیت تابوت نہ پردازند"۔

ایک مفصل وصیت نامہ بعد میں درج ہوگا۔ تجہیز و تکفین کے متعلق ایک مختصر وصیت یہ تھی:

"چار روپیہ دو آنے جو ٹوپیوں کی سلائی سے حاصل ہوئے تھے، آیہ بیگم محل دار کے پاس ہیں۔ ان میں تجہیز و تکفین ہو۔ تین سو پانچ ۳۰۵ روپیہ قرآن نویسی کی اُجرت کے "صرف خاص کے مد میں محفوظ ہیں۔ وفات کے روز مساکین میں تقسیم ہوں۔ چونکہ فرقہ شیعہ کے نزدیک کتابت قرآن کی اُجرت حرام ہے لہٰذا اس کو تجہیز و تکفین میں صرف نہ کریں۔

۲۸ ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ کو جمعہ کا دن تھا۔ نماز صبح کے بعد کلمہ توحید کا ذکر شروع کیا۔ ایک پہر دن چڑھے کشاکش دنیا سے نجات پائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ و تغمدہ بآلاءہٖ۔ مدت عمر اکیانوے سال تیرہ روز۔ ایام سلطنت پچاس سال دو ماہ ستائیس روز۔ (۲۴۵)

تاریخ وفات روح و ریحان و جنت نعیم

۱۱۱۸ھ

مدفن

قصبہ جلال آباد۔ ضلع اورنگ آباد احاطہ درگاہ حضرت زین الدین قدس اللہ سرہ العزیز۔

وصیت نامہ

سلطان مرحوم کا وصیت نامہ اصلی الفاظ میں درج ذیل کیا جاتا ہے۔ اخلاق و اوصاف، مذہبی عقائد کے علاوہ زوال مغلیہ کے اسباب پر بھی اسی وصیت نامہ کی چند دفعات سے روشنی پڑتی ہے۔

اول اینکہ ایں عاصی غرق معاصی را تکلیف و تفریش تربت مطہرہ مقدسہ حسینیہؓ نمایند کہ معترفاں بحر عصیاں را بغیر از التجا بآں درگاہ مرحمت و غفران پناہ نیست و مصالح ایں سعادت عظمیٰ نزد فرزند ارجمند بادشاہ زادۂ عالیجاہ ست بگیرند۔

دوم آنکہ۔ چہار روپیہ دو آنہ وجہ کلاہ دوزی نزد آیہ بیگم محل وارست بگیرند و صرف کفن بیچارہ نمایند۔ وسہ صد و پنج روپیہ از وجہ کتابت قرآن مجید در صرف خاص ست، روز وفات بفقراء و ہند۔ ازیں راہ زر کتابت قرآن نزد فرقۂ شیعہ حرمت دارد، بکفن و مایحتاج آں صرف نہ کنند۔

سوم آنکہ۔ باقی مایحتاج از وکیل بادشاہزادۂ عالیجاہ بگیرند کہ وارث قریب و اولٰی وایشاں اند و حلت و حرمت بر ذمہ ایشاں ست۔ بریں بیچارہ بازپرس نیست کہ مردہ بدست زندہ۔

چہارم آنکہ ایں سرگشتۂ وادیٔ گمراہی را سر برہنہ دفن کنند کہ ہر گنہگار تباہ روزگار کہ سر برہنہ نزد بادشاہ عظیم الشان بیرند البتہ محل ترحم خواہد گردید۔

پنجم آنکہ۔ بالائے صندوق تابوت پارچہ سفید گندہ کہ گزی گویند پوشش نمایند، و از شامیانہ و بدعت مغنیاں و مولودی احتراز کنند۔

ششم آنکہ۔ بروالیٔ ملک واجب باد کہ باخانہ زادان بے سروپا کہ ہمراہ ایں عاصی (دور از حیاء) در دست و صحرا گشتہ اند مدارات نمایند و اگر بتصریح تقصیری از ایشاں واقع شود بعفو جمیل و صفح جزیل مکافات فرمایند۔

ہفتم آنکہ۔ بہتر از ایرانی برائے متصدی گری دیگرے نیست و در جنگ از عہد حضرت جنت آشیانی تا حال احدے ازیں فرقہ از معرکہ رو گرداں نشدہ و پائے استقامت ایشاں لغزیدہ معہذا گاہے خودسری و حرام نمکی نہ کردہ اند لیکن چوں بسیار عزت طلب اند با ایشاں ساختن بسیار مشکل۔ بہر حال باید ساخت و بحیلہ ازمد باید کرد۔

ہشتم آنکہ۔ فرقہ تورانی سپاہی مقرر اند و برائے تاخت و تاراج و شب خوں و قید کردن خوب اند۔ از

برگشتن ودرین جنگ کہ ترجمہ "تیر بازکشی" ست وسواس وہراس وخجالت ندارند واز جہل مرکب ہندوستان ایان کہ سر برود ولیکن جازود بعد مرحلہ دوراند۔ بہرحال ایں جماعت راکمل رعایت باید داشت کہ اکثر جاہا ایں مردم بکارے آیند کہ دیگرے بکار نے آید۔

نہم آنکہ۔ باسادات لازم السعادت بارہ بموجب آیہ کریمہ "وآت ذا القربیٰ حقہ" عمل باید نمود، حد احترام ورعایت فروگزشت نباید کرد۔ ازیں راہ کہ بموجب آیہ کریمہ قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودة فی القربیٰ محبت ایں جماعت اجر نبوت ست ہرگز مقصر نباید بود کہ ثمر خیر دنیا وآخرت ست۔ لیکن باسادات بارہ کمال احتیاط باید نمود در محبت باطنی قصور نباید کرد۔ وبحسب ظاہر مرتبہ ایشاں نباید افزود کہ شریک غالب بلکہ طالب ملک اند، اگر اندک استرخاء عنان شود، ندامت خواہد شد۔

دہم آنکہ۔ تا مقدور والی ملک خود را از حرکت معاف ندارد واز نشستن در یک مکان کہ در ظاہر صورت آرام و درواقع منجر بہزار معیبت وآلام ست محترز باشد۔

یازدہم۔ بر پسران ہرگز اعتماد نکند وطور مصاحبت در زندگی نہ نماید کہ اگر اعلیٰ حضرت با دارا شکوہ چنیں سلوک نے کردند کار با نجانے رسید وکلمۃ الملک عقیمۃ ہمیشہ منظر باید داشت۔

دوازدہم۔ عمدہ رکن السلطنت اطلاع اخبار ملکی ست وغفلت یک لحظہ باعث ندامت سالہاء دراز میگردد کہ مقدمہ گریختن سیواء مقہور از غفلت شد، تا آخر عمر ہماں سرگرداں باقی بود۔

مبارک اشناء عشر اختتام بر دوازدہ وصیت کردہ شد۔

اگر دریافتی بر دانشش بوس ۔۔۔ وگر غافل شدی افسوس افسوس (۶۳۶)

اخلاق واوصاف عالمگیرؒ

گزشتہ مختصر حالات سے اخلاق واوصاف کا کافی اندازہ ہوگیا۔ بطور تکملہ وتتمہ چند سطور اس سلسلہ میں بھی سپردِ قلم ہیں۔ (۶۳۷)

عدل وانصاف

اصول تھا۔ "قیام بنیان سلطنت از عدالت نیز عقیدہ در دار الجزاء برعایت وغفلت از احوال واعمال ماخوذ خواہیم شد۔ (۶۳۸) اصول اور دستور بھی بنایا جاسکتا ہے، عقیدہ بھی تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ مگر بسا اوقات عمل ندارد ہوتا ہے لیکن سلطان عالمگیر کے عمل سے عقیدہ سمجھ میں آتا ہے۔

عموماً دوسروں کے لئے اصول وعقائد کو حجت بنایا جاتا ہے۔ اپنوں کے لئے اصول بھی نظر انداز ہوتا ہے، اور عقیدہ بھی معافی کے لئے روز جزاء کے حوالہ کردیا جاتا ہے۔ مگر سلطان عالمگیرؒ سب سے پہلے اپنے اصول و عقیدہ کو اپنی اولاد پر استعمال کرتا ہے۔

بدترین بدخواہ اور سرکش باغی کے جرم کی تحقیق ہوتی ہے۔ اس کو سزا دی جاتی ہے مگر اپنے شاہزادوں کے لئے یہ اصول ہے کہ تحقیقات کچھ نہیں۔ جیسے ہی شکایت پہنچی، فوراً سزا یا تنبیہ وعتاب۔

اس کا اصول تھا کہ شاہزادوں کی یہی سزا ہے کہ ان سے متعلق شکایتوں کی تحقیق نہ کی جائے۔

صوبہ احمد آباد شاہزادہ محمد اعظم کی جاگیر میں تھا۔ وقائع نگار نے عرضداشت بھیجی کہ "جاناجی" نے احمد آباد سے چالیس کوس کے فاصلہ پر سورت کی سڑک پر بیوپاریوں کو لوٹ لیا، اور جب شاہزادہ کو خبر ہوئی تو فرمایا کہ امانت خاں متصدی سورت کی فوجداری میں ہوا ہے، ہم کو تعلق نہیں۔

عالمگیر نے شاہزادہ کے منصب میں پانچ ہزار کی تخفیف کردی۔ اور تاجروں کے بیان کے بموجب جملہ نقصان شاہزادہ کے ذمہ ڈالا۔ چنانچہ شاہزادہ کے نام حکم صادر فرمایا:

"پنج ہزار از اصل منصب کم۔ و بموجب اظہار تاجران زر نقد از وکیل ایشاں (محمد اعظم) بگیرند۔ اگر غیر از بادشاہ زادہ مے بود، بعد تحقیقات حکم شدے برائے شاہزادہ سزا عدم تحقیق ست۔ زہے شاہزادگی کہ خود را کمتر از امانت خاں بدانند۔ ہرگاہ درحیات ما دعوئ وراثت ملک داشتہ باشند کس چرا در حیث امانت خاں را شریک میراث نگردانند۔

دردے کہ بادوانشد آں را علاج نیست آنرا کہ عقل نیست ہیچ احتیاج نیست" (۲۴۹)

مرزا کام بخش، عالمگیر کا نہایت چہیتا بیٹا تھا۔ اُس کے کوکہ پر قتل کا الزام قائم ہوا عالمگیر نے تحقیقات کا حکم دیا۔ کام بخش نے اُس کی حمایت کی۔ عالمگیر نے کام بخش کو دربار میں بلا بھیجا۔ کام بخش کوکہ کو بھی ساتھ لاتا تھا۔ کسی وقت اپنے سے جدا نہیں کرتا تھا۔ عالمگیر نے حکم دیا کہ کام بخش کو بھی کوکہ کے ساتھ قید کیا جائے۔

چھوٹے سے چھوٹے معاملہ کی اطلاع پہنچتی اور فوراً کارروائی ہو جاتی۔

اخلاق کیش واقعہ نگار حیدرآباد نے شراب پی لی، اور حالت نشہ میں حضرت خواجہ گیسو دراز کے مزار پر پہنچ گیا۔ دربار شاہی میں پرچہ گزرا۔ شاہزادہ محمد اعظم کے نام حکم جاری ہو گیا۔

"آں عالیجاہ را بایستے کہ ہرگاہ آں نابکار بایں احوال منکر دراں مقام رفتہ بود کساں خود تعین نمودہ مے فرمودند کہ قشال کردہ (دست برکتف بستہ) بیارند و جولاں کردہ ہمراہ گرز بردار بحضور میفر ستادند۔ ظاہر از غایت واقعہ نگاری بریں نیاورد۔ ازیں جا گرز بردار شدید تعین کردیم۔ آں یقین رابستہ بیارد، تا کساں کہ بر روئے کار آیند چنیں نکنند۔ مارا در چنیں مقدمات رواداری ہیچ یکے از فرزنداں نیست، تا بعنایت اللہ خاں و دیگراں چہ رسد۔ (۲۵۰)

وقائع نگاری

جاسوس اور سی آئی ڈی آج بھی موجود ہے مگر رعایا کی نگرانی کے لئے۔ لیکن عالمگیر کے جاسوس حکام کی

نگرانی کے لئے تھے۔ان وقائع نگاروں کے قلم شاہزادوں کے متعلق بھی ایسے ہی چلتے تھے جیسے دوسروں کے لئے۔

رقعات عالمگیری جو عام طور پر دیسی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے بہت سے رقعات تحریری شہادتوں کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں۔

پرچہ نویسی اور وقائع نگاری کے وسیع اور منظم انتظام کے باعث پورے ہندوستان کے چپہ چپہ کے حالات اس کے سامنے آئینہ کی طرح رہتے تھے۔ اور شکایتی رپورٹوں پر فوراً عمل ہوتا۔ ان کو بکس میں بند کر کے رکھنے کا کوئی ایک واقعہ کسی ایک شاہزادہ کے متعلق بھی پیش نہیں کیا جاسکتا۔

شاہزادہ محمد اعظم نے اطراف احمد آباد میں ایک فوج دار کا تقرر کیا۔ اس نے چند تھانوں میں اپنے رشتہ داروں کا تقرر کردیا۔ کچھ لوگوں کو شکایتیں پیدا ہوئیں۔ مگر چونکہ فوجدار شاہزادہ کا مقرر کیا ہوا تھا، لوگوں کو شاہزادہ سے اپیل کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وقائع نگار اس کی اطلاع عالمگیر کو دیتا ہے۔ عالمگیر اس کا تدارک کرتے ہوئے دیکھو، کس دل سوزی سے لکھتا ہے:

''حیرانم کہ در وقت جزاء اعمال چہ جواب خواہیم داد۔ حق سبحانہ تعالےٰ عادل ست اگر ظالم را کارفرما کنیم ہر عذابیکہ از ظالم، مامور ما، بر ما آید عدل است و بآں سزاوار یم کہ ظالم راز ور دادن و بداد خواہ نرسیدان در معنی خود مجوز ظلم بودن ست۔ بیت

گندم از گندم بروید جو زجو از مکافات عمل غافل مشو''(۶۵۱)

صرف رقعات عالمگیری کے دیکھنے سے بھی ایسے واقعات مل جاتے ہیں کہ افسر متعلقہ کو اس واقعہ کی خبر بھی نہیں اور بادشاہ تک پرچہ نویسوں نے اس کو پہنچادیا، اور افسر متعلقہ کو تنبیہ کی گئی۔

وکیل شرعی کا تقرر

سلطنت اور سلطان سے جو زیادتی ہو، اس کے تدارک کے لئے صرف بادشاہ کی ذات ہی تھی، جس تک رسائی مشکل تھی۔

جہانگیر نے زنجیر عدل آویزاں کی، مگر اس کے لئے آگرہ پہنچنا ضروری تھا۔ سلطان عالمگیر قدس اللہ سرہ العزیز نے ممالک محروسہ کی تمام عدالتوں میں بادشاہ کے نائب کی حیثیت سے وکیل مقرر کیا۔ اس کے ذریعہ سے ہر ایک عدالت میں سلطنت یا سلطان پر دعویٰ دائر کیا جاسکتا تھا۔

لیکن بایں ہمہ مستغیثین کی اہم درخواستیں سلطان عالمگیر کے پاس پہنچتی تھیں، اور سلطان بذات خود خلوت میں ان کو ملاحظہ فرما کر حاشیہ پر قلم خاص سے احکام تحریر فرماتے تھے۔(۶۵۲)

ڈاکٹر جیملی کریری نے اکہتر برس کی عمر میں عالمگیر کو دیکھا تھا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ:

''وہ صاف وسفید ململ کی پوشاک پہنے عصاء پیری کے سہارے امیروں کے جھرمٹ میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کی پگڑی میں بڑا ٹکڑا زمرد کا ٹکا ہوا تھا۔ داد خواہوں کی عرضیاں لیتا جارہا تھا اور بلا عینک پڑھ کر خاص اپنے ہاتھ سے دستخط کرتا جاتا تھا۔ اس کے ہشاش بشاش چہرہ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ

اپنی مصروفیت سے نہایت شاداں و فرحاں ہے وہ دن میں کئی مرتبہ دربار عام کرتا تھا اور مطلق کسی کی روک ٹوک نہ تھی۔ ادنیٰ سے ادنیٰ جو چاہتا تھا، کہتا تھا اور عالمگیر نہایت توجہ سے سنتا تھا۔ (۶۵۳)

عدل و انصاف میں کمال احتیاط

شیخ اشرف لاہوری، سلطان عالمگیرؒ کے بلند پایہ امیر تھے۔ قصر شاہی میں حاضر خدمت رہتے۔ ایک لڑکی کے معاملہ میں سید محمد امیر قدس اللہ سرہ العزیز پر عدالت عالمگیری میں دعویٰ دائر کردیا۔ سید محمد امیر (۶۵۴) کو دربار میں طلب کیا گیا۔ سید صاحب نے لاہور سے روانہ ہوکر دہلی کے قریب پہنچ کر دہلی سے باہر قیام کیا۔ سلطان کو جب سید صاحب کے پہنچنے کا علم ہوا تو شیخ اشرف کو حکم ہوا کہ دہلی سے نکل کر وہ بھی اتنے ہی فاصلہ پر قیام کریں، اور بلا طلب حاضر نہ ہوں۔ جب سماعت مقدمہ کے لیے طلب کیا جائے، تب حاضر ہوں کہ "در سررشتہ عدالت و حکم شرع مقدس رعایت داری احدے بہ از مصاحبان نخواہد شد۔"

جب شیخ اشرف نے شکنجہ عدالت کی یہ چستی دیکھی، سارا ناز ختم ہوگیا، اور اپنے دعوے سے دست برداری دے دی۔

ترک دنیا، مذہبی جذبات، زہد و تقویٰ

افسوس آج عالمگیر کا بڑا جرم یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ مذہبی بادشاہ تھا۔ بے شک وہ مذہبی تھا اور اس کے تمام اعمال وافعال پر مذہبیت غالب تھی۔ مگر غور طلب یہ امر ہے کہ اس کی مذہبیت نے کس قسم کے جذبات پیدا کیے اور ان کے عملی نتائج کیا تھے؟ ہمارا یقین ہے اور یہی حق ہے کہ اسلام وہ مذہب ہے جس کی پابندی ہی عدل و انصاف، رعایا پروری اور رحم گستری کے بے لوث جذبات انسان میں پیدا کردیتی ہے۔ عالمگیر کے کارنامے اس کی مثال ہیں۔ عقیدہ تھا۔ "عمل والی در انفاع و اضرار خلق اللہ اثر دارد"۔ (۶۵۵) (والی کا عمل خلق اللہ کو نفع اور نقصان پہنچانے میں اثر انداز ہوتا ہے)۔

تم پہلے پڑھ چکے ہو کہ شاہجہاں نے سرزنش کی تھی کہ شاہی دبدبہ کے خلاف ہر ایک شخص سے عجز و انکسار سے پیش آتے ہو۔ اس کا جواب بھی گزر چکا۔

> "بندہ حضرت انس رضی اللہ کی روایت کے بموجب عمل کرتا ہے کہ جو خدا کے لئے عاجزی اختیار کرلے، اللہ تعالیٰ اس کو عزت بخشتا ہے اور اسی بنا پر کسی کی دل شکنی کو سب سے بڑا گناہ اور بدترین عیب تصور کرتا ہے۔" (۶۵۶)

اسلام میں "مثلہ" کی ممانعت ہے۔ بظاہر یہ عالمگیر کی مذہبی غلطی تھی کہ سنبھاجی کی زبان نکلوادی۔ مگر پھر فوراً ہی مذہبیت نے غلبہ کیا اور اس کے یتیم لڑکے ساہو کے ساتھ وہ کیا، جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ اگرچہ اس مذہبی غلطی کا نتیجہ پھر یہی ہوا کہ ساہو کی پرورش "افعی کشتن و بچہ را نگہداشتن"۔ کی مصداق بن گئی۔

اسلامی تعلیم ہے کہ کسی مذہب کے فقیر اور تارک الدنیا کو جو جنگ میں حصہ نہیں لیتے قتل نہ کیا جائے۔ اسی تعلیم کا یہ اثر تھا کہ جنتی کا'' قلعہ جب فتح ہوا، تو ''رام راجہ'' برادر سنبھا جوگیوں کا لباس پہن کر نکل گیا۔

میاں عبداللطیف اکابر اولیاء اللہ میں سے تھے۔(۲۵۷) ان کی خدمت میں زمانہ شاہزادگی میں بھی حاضری دیا کرتے تھے۔ بادشاہ بننے کے بعد بھی حاضر خدمت ہوئے۔ ایک مرتبہ عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو علاقہ کھرگون (۲۵۸) کے کچھ دیہات مصارف خانقاہ کے لیے پیش کر دیئے جائیں۔ میاں صاحب نے ارشاد فرمایا:

شاہ ما رادہ دہد منت نہد ــــ رازق ما رزق بے منت دہد

اس کے بعد ارشاد فرمایا۔ اگر واقعی نیت بخیر ہے تو محصولوں میں نصف کی تخفیف کر دو۔ بلکہ مظلومان منت کش کے لئے اس سے بھی زیادہ معاف کر دو۔ اور وہ گوشہ نشین متوصل جو سوال سے ہاتھ کھینچ کر کوٹھریوں یا جنگلات کی جھونپڑیوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں، ان کے وظیفے مقرر کر دو۔ مظلوموں کی ایسی دادرسی کر دو کہ کسی کا کوئی حق تلف نہ ہو، اور کوئی زبردست کسی زیر دست پر ظلم نہ کر سکے (رقعات عالمگیری ص ۸)

چنانچہ عالمگیر نے دارا کی مہم سے پوری طرح فراغت بھی نہ پائی تھی کہ سال دوم جلوس میں تقریباً اسی (۸۰) ٹیکس یک قلم جملہ ممالک محروسہ میں معاف کر دیئے۔(۲۵۹) جن کی آمدنی کئی کروڑ روپیہ سالانہ تھی۔ چند ٹیکسوں کے نام درج ذیل ہیں۔

تہ بازاری۔ چنگی۔ سرشماری۔ برشماری۔ برگدی۔ چرائی بنجارہ۔ عرس و جاترہ ہنود کے بازاروں کا ٹیکس۔ مسکرات و قمار خانہ خرابات خانہ وغیرہ کے ٹیکس۔ حلوغانہ۔ جرمانہ۔ شکرانہ وغیرہ وغیرہ۔

عمال اور عہدہ داروں کو رشوت کی گنجائش دے دینے والا طریقہ نذرانہ کا تھا۔ تمام وزراء اور عمال سالانہ جشن میں نیز ملاقات وغیرہ کے وقت گراں قدر نذرانے پیش کیا کرتے تھے۔ جہانگیر ان نذرانوں کا تذکرہ اپنی تزک میں بڑے لطف اور مسرت سے کرتا ہے ان نذرانوں کی تعداد بسا اوقات لاکھوں سے بھی تجاوز کر جاتی تھی، اور نذرانہ کی چیز فراہم کرنے کے لئے ناجائز دباؤ سے عمال دریغ نہ کیا کرتے تھے۔ عالمگیر نے رسم نذرانہ کو یک قلم منسوخ کر دیا۔

زہد و تقویٰ کا بڑا حصہ خاص اپنی ذاتی اور اخراجات سے متعلق ہے۔

سلاطین سابق کے زمانہ میں بادشاہ کی جیب خرچ کے لئے کروڑوں روپیہ آمدنی کے علاقے مخصوص ہوتے تھے۔ عالمگیر نے چند گاؤں اپنے مصارف کے لئے مخصوص کر لئے تھے، باقی کو بیت المال قرار دیا۔ اس کی زندگی بالکل سادی اور زاہدانہ تھی۔ ڈاکٹر برنیر نے اس کو ۱۶۶۵ء میں دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

''نحیف و زار ہو گیا تھا، اور اس لاغری میں اس کی روزہ داری نے اور اضافہ کر دیا تھا۔''

لین پول صاحب لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب فرصت کے وقت کلاہیں بنایا کرتا تھا۔ بہر حال یہ مورخین کا متفقہ بیان ہے کہ وہ سلطنت کے بے پناہ مشاغل کے باوجود اپنی خوراک اپنے ہاتھ کی محنت سے بہم پہنچاتا تھا۔

وصیتوں کے سلسلہ میں گزر چکا ہے کہ ٹوپیوں کی اُجرت ہی سے تجہیز وتکفین کی وصیت کی تھی۔
اس پر یہ تقویٰ اور یہ احتیاط کہ کتابت قرآن حکیم کی اُجرت کو تجہیز وتکفین پر صرف نہ کرنے کی وصیت صرف اس بناء پر کی کہ فرقہ شیعہ اس کو حرام کہتا ہے یعنی تجہیز وتکفین میں وہ پیسہ استعمال ہو کہ کسی مسلمان تو درکنار کسی اسلام کی طرف خود کو منسوب کرنے والے کے نزدیک بھی اس میں کوئی کراہت نہ ہو...... یہ ہے کمال تقویٰ۔
اسی طرح اُس نے دربار کے تمام ساز وسامان کو ختم کردیا تھا۔ چاندی کے بجائے چینی کی دوات کا حکم دیا۔ زربفت وغیرہ کے خلعت موقوف کردیے۔ دربار میں خلاف ادب تھا کہ کوئی کسی کو سلام کرے، اس نے صرف سر پر ہاتھ رکھ دیتے تھے۔ ۱۰۸۰ھ میں عالمگیر نے حکم دیا کہ لوگ حسب سنت السلام علیکم کہا کریں۔

عبادت

یورپین مؤرخین کی شہادت اُوپر گزر رہی کہ نحیف وزار ہوگیا تھا اور اس لاغری میں اُس کی روزہ داری نے اور اضافہ کردیا تھا۔

پابندیٔ نماز کا اندازہ اُس کے ایام شباب کے اُس واقعہ سے ہوتا ہے کہ عبدالعزیز والی بلخ کے مقابلہ پر جنگ کرتے ہوئے نماز ظہر کا وقت آگیا تو فوراً جماعت شروع کردی۔ حریف کی جانب سے گولوں اور گولیوں کی بارش ہوتی رہی مگر اس نے اطمینان سے نماز ادا کی۔ رفقاء کار نے اس خطرناک وقت میں اداءِ نماز سے کچھ پس وپیش کیا۔ تو خود امام بنا۔ یہ خدا کا فضل تھا کہ کسی سپاہی کو بھی گزند نہ پہنچا اور عبدالعزیز کی صداقت پسندی تھی کہ اُس نے کہہ دیا۔ باچنیں درافتادن براوفتادن ست، کہ ایسے شخص سے لڑنا تباہ ہونا ہے۔
مفصل گزر چکا ہے کہ شجاع سے مقابلہ کی شب میں جب جسونت سنگھ کے فرار ہونے کی اطلاع خیمۂ شاہی میں پہنچائی گئی تو عالمگیر نماز تہجد کے بعد وظائف میں مشغول تھا۔

روحانی کمالات

روحانی کمالات کے متعلق حضرت خواجہ سیف الدین اور حضرت خواجہ محمد معصوم قدس اللہ سرہما سے بڑھ کر کس کی شہادت ہوسکتی ہے، جو پہلے گزر چکی۔
ہم اس عنوان کو مآثر عالمگیری کے بیان پر ختم کرتے ہیں۔
"باقتضاء سعادت فطری درمراتب دینی بکمال رسوخ انصاف داشتند وبمذہب امام اعظم ابوحنیفہؒ عامل وبنا خمسہ اسلام راکما ینبغی تاسیس وتشیید مے نمودند۔ وپیوستہ باوضو وبذکر کلمہ طیبہ ودیگر اذکار وادعیہ ماثورہ رطب اللسان مے بودند، وصلوٰۃ مفروضہ رااوّل وقت درمسجد وغیرہ مسجد باجماعت وجمیع سنن ونوافل ومستحبات رابخضوع وخشوع تمام مے کردند۔ ودرمشہور روزہائے بیض ودرایام ہفتہ درشنبہ وپنجشنبہ وجمعہ راصائم بودہ ونماز جمعہ درمسجد جامع بکافہ مسلمین وعامہ مؤمنین مے گزاردند و

درلیالی متبرکہ باحیاء شب مے پرداختند ...... از غایت طلبی حق شبہا در مقصورہ مسجد دولت خانہ بصحبت اہل اللہ میدا شتند ...... وزکوٰۃ شرعی ...... ہر سال بارباب استحقاق مے دادند ...... وماہ مبارک رمضان رابصوم مے گزرانیدند ...... ودر عشرۂ اخیرہ در مسجد معتکف مے بودند۔ (۲۶۰)

احتساب

اسلام کی اصطلاح میں سلطان کو "راعی" کہا جاتا ہے یعنی نگران۔

صرف جلالت وعظمت اور سریرآرائی ہی سلطان کا فرض نہیں بلکہ اصلاح خلق اللہ اور تہذیب اخلاق بھی اس کا فریضہ ہے، اور درحقیقت اسی فرض کی ادائیگی کے لئے نظام سلطنت ضروری سمجھا گیا۔

اپنی ذات کی اصلاح کے ساتھ عالمگیر نے اخلاق عوام کی اصلاح کے لئے خصوصیت سے احتساب کا محکمہ ہندوستان میں قائم کیا۔

کم تولنا، خرید وفروخت میں دھوکا، شراب خوری، رقص وسرود وغیرہ اخلاقی خرابیوں کی دیکھ بھال، ان کے انسداد کی جدوجہد محتسب کا فرض ہوتا ہے۔ مولانا مرزا زاہد جیسے بزرگ اس محکمہ کے افسر تھے۔ مرزا زاہد کے احتیاط کا اندازہ کبابوں کے واقعہ سے ہوسکتا ہے جو مرزا صاحب کے حالات میں تحریر کیا گیا تھا۔

علم وفضل

اس سلسلہ میں عالمگیر نامہ کے مندرجہ ذیل مضمون پر جملہ مؤرخین کا اتفاق ہے۔

"از کمالات کسبیہ آنحضرت کہ زینت بخش حالات قدسیہ دوبیہ گشتہ جمع علوم دینیہ از حدیث وتفسیر وفقہ شریف حنفیہ است از بس بہار است، مراتب شرعیہ واستکشاف عقائد اصلیہ ومسائل فرعیہ اشتغال ورزیدہ اند قوت حافظہ اشرف مخزن ایں حقائق شدہ وبسیارے از کتب طریقت وسلوک واخلاق چوں احیاء العلوم وکیمیاء سعادت ودیگر تصانیف عرفا واکابر ورسائل مؤلفات علماء باطن وظاہر بمطالعہ ہمایوں رسیدہ۔ حل معضلات وکشف اسرار آں فرمودہ اند، وبالفعل نیز بعد فراغ از نظم مہام سلطنت وسروری وتمہید مراسم دین پروری وعدالت گستری بایں شرائف اشغال پیوستگی وارند۔ (عالمگیر نامہ)

ابھی ایک صدی نہ گزری تھی کہ حکومت مغلیہ کے دربار سے فقہ تو درکنار حدیث وقرآن کو اتنا یہ کہ عربی زبان تک کو خارج کردیا گیا تھا۔

قدرت کا یہ حیرت انگیز کرشمہ ہے کہ اسی دربار کا سریرآرا وہ اورنگ زیب ہے جو انہیں علوم کا شیفتہ اور گرویدہ ہے جن کو اخراج کا حکم سنایا گیا تھا۔ حدیث وقرآن تو بہت بڑی دولت ہے، وہ مشائخ کرام کی تصانیف اور فقہاء عظام کے فتاویٰ کو سر پر رکھتا ہے اور اس پر ناز کرتا ہے۔

فتاویٰ ہندیہ کی تصنیف

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ فتاویٰ ہندیہ عرف فتاویٰ عالمگیریہ کو عدالتی قانون کی حیثیت سے عالمگیر نے مرتب کرایا اور ملا نظام کی سرکردگی میں علماء کی ایک جماعت کئی سال تک اس خدمت میں مشغول رہی اور باوجودیکہ مآثر الامراء کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی کا روزینہ تین روپیہ یومیہ سے زیادہ نہ تھا۔ مگر تاہم دو لاکھ روپیہ اس کی ترتیب و تدوین پر صرف ہوگیا۔ لیکن حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ العزیز کی یہ روایت عالمگیر کے تبحر علمی، حذاقت و مہارت پر بہترین شاہد ہے کہ عالمگیر بذات خود اس دینی خدمت میں کافی حصہ لیتے تھے"۔ "بجمع و تدوین آں اہتمامے عظیم بود، حتیٰ کہ ملا نظام ہر روز یک دو صفحہ پیش بادشاہ مے خواند۔" (۲۶۱)

اورنگ زیب کے انشاء اور خط کے متعلق مقدمہ عالمگیر ص ۴۷ تا ۵۰ میں بہت سی شہادتیں جمع کی گئی ہیں۔ اس کے لکھے ہوئے قرآن پاک چھ نسخوں اور ایک پنج سورہ کے پتہ بتلائے گئے ہیں جو مختلف کتب خانوں میں اب تک موجود ہیں۔ اس کے بعد تحریر ہے کہ:

"یہ واقعہ عجائبات عالم میں شمار ہوگا کہ اورنگ زیب جس کلام مجید میں تلاوت کیا کرتا تھا وہ اس وقت کولمبیا یونیورسٹی (امریکہ) کی ملکیت ہے۔" الخ

صاحب عالمگیر نامہ کا بیان ہے کہ اورنگ زیب نے عہد شاہزادگی میں ایک نسخہ خط مبارک سے لکھ کر "بمکہ مشرفہ زادہا اللہ قدرا فرستادند"۔

اور تخت نشین ہونے کے بعد تھوڑے عرصہ میں ایک دوسرا نسخہ تحریر کیا، اور ان دونسخوں کے علاوہ دو قرآن مجید لکھ کر مدینہ منورہ بھیجے۔ ان کی لوح، جدول اور جلد پر سات ہزار روپیہ صرف ہوا تھا۔ (۲۶۲)

علم پروری

عالمگیر نے درس و تدریس کو جس قدر ترقی دی تھی، ہندوستان میں کبھی کسی عہد میں تعلیمات کی اتنی ترقی نہیں ہوئی۔ ہر ہر شہر اور قصبہ میں تمام علماء اور فضلاء کے وظائف اور روزینے مقرر تھے۔ جس کی وجہ سے مطمئن ہوکر تعلیم و تعلم میں مشغول رہتے تھے۔ اس کے ساتھ ہر جگہ طالب علموں کے لیے وظائف مقرر تھے۔ مآثر عالمگیری میں ہے:

"در جمیع بلاد و قصبات ایں کشور وسیع فضلا و مدرساں را بہ وظائف لانقد از روزانہ واملاک موظف ساختہ برائے طالب علم وجود معیشت درخور حالت واستعداد مقرر فرمودہ اند۔" (۲۶۳)

ایک عجیب بات یہ ہے کہ باوجود اس دین داری اور مذہبی وارفتگی کے وہ ظاہر پرست اور سریع الاعتقاد نہ تھا۔ اس کی دین داری دیکھ کر شریف مکہ نے کئی دفعہ اپنے سفیر بھیجے۔ اس پر عالمگیر ایک رقعہ میں لکھتا ہے:

"شریف مکہ معظمہ در ہندوستان دولت بے شمار شنیدہ ہر سال برائے طلب نفع خود ایلچی مے فرستد۔

ایں سیلقان کہ مے فرستیم برائے مستحقین ست۔ بجہت وفکر بجا باید نمود کہ باں جماعت برسد دوست ایں خلف حق (یعنی شریف مکہ باں نرسدم۔(۲۶۴)

مساوات پسندی

خود پرستوں نے ہمیشہ سیاست کا یہی تقاضا سمجھا کہ خدا کے برابر یا اس سے بھی زائد اپنی پرستش کرائی جائے۔ اکبر اور جہانگیر نے اسی فرعونی سیاست کی تقلید میں اپنے آپ کو سجدہ کرایا۔ حضرت مجدد صاحب کی اصلاحی تحریک کا آغاز اسی نمرودی اور شدادی بدعت کے مقابلہ سے ہوا۔ دور شاہجہاںؒ میں مجددی تحریک نے چہرہ مقصود کو سامنے سے آتے ہوئے دیکھا، اور عالمگیرؒ کے دور نے تحریک مجددی کو عروس کامیابی سے مکمل طور پر ہمکنار کر دیا۔

شاہجہاں کے زمانہ کا انسانی مگر غیر اسلامی طرز (یعنی سلام کے بجائے سر پر ہاتھ رکھ لینا) بھی موقوف کر دیا گیا اور حکم ہوا کہ سنت اسلام کے بموجب السلام علیکم کہا جائے۔

اس کے ماسوا عالمگیر نے مختلف موقعوں پر صاف صاف اپنے طرز عمل سے جتا دیا کہ بادشاہ ایک معمولی آدمی ہے۔ اس کے حقوق عام لوگوں کے برابر ہیں۔ ۱۶ جلوس مطابق ۱۰۸۳ھ میں عالمگیر بقرعید کی نماز کو جا رہا تھا۔ واپسی میں ایک شخص نے لکڑی پھینک کر ماری جو عالمگیر کے زانو پر آ کر گی۔ گرز بردار اس کو گرفتار کر کے لائے۔ عالمگیر نے کہا۔ چھوڑ دو۔

۳۰ جلوس میں جب وہ جامع مسجد سے واپس آ رہا تھا، ایک شخص تلوار علم کئے ہوئے ایک طرف سے دوڑا۔ لوگوں نے گرفتار کر لیا اور قتل کر دینا چاہا۔ عالمگیر نے روکا۔ اور ۸ (آٹھ آنے) یومیہ اس کا روزینہ مقرر کر دیا (مآثر عالمگیری) یہ واقعہ کسی اور مہذب و متمدن بادشاہ کے ساتھ پیش آتا تو مجرم کے ٹکڑے اُڑا دیے گئے ہوتے۔

فراست اور دور اندیشی

عالمگیر کی وصیتیں پہلے گزر چکی ہیں۔ بیٹوں کے نام رقعات عالمگیری میں طبع ہو چکے ہیں۔ ان کو درج کرنا طوالت ہے۔ البتہ ایرانی تورانی امراء یا سادات بارہ کے متعلق جو وصیت ہے اس کا ایک ایک حرف صادق آیا۔ بیٹوں کو رقعات میں جو لکھا وہ گویا دیکھ کر لکھا تھا۔ یہی ہے مومن صادق کی وہ دور اندیشی جس کی تربیت ربانی نور سے ہوتی ہے۔ اتقوا فراسة المؤمن فانه یری بنور الله۔ (حدیث شریف)۔

جفاکشی عالمگیر کا نظریہ تھا

"بادشاہ ہرگز آرام طلبی و فراغت شعاری بر خود روا نہ دارد کہ بدترین اسباب خرابی ملک و انہدام دولت ایں شیوۂ نامرضیہ است ہمیشہ تا مقدور در حرکت باید بود"۔

"بادشاہ و آب را در یک مکان بودن بدست   آب مے گردد زبوں وشہ رود کاوش ز دخت

در سفر باشد شہاں را حرمت و عیش و وقار   فکر آرام و تنعم مے کند بے اختیار"

بیجاپور اور حیدرآباد فتح ہو جانے کے بعد عمدۃ الملک مدار المہام نے عرضداشت پیش کی کہ باقبال متعال (باقبال حضور کہنا عالمگیر کے یہاں جرم تھا) دکن فتح ہو چکا۔ اب ہندوستان کو رونق افروز فرما کر دنیا کو معلوم کرنے کا موقعہ دیجئے کہ خلافت پناہی کو اب ملک فتح کرنے کا کام باقی نہیں رہا۔

حضرت عالمگیر نے فوراً جواب تحریر فرمایا:

"عجب از اں خانہ زاد مزاج داں کہ ایں چنیں عرض نمودہ۔ اگر غرض آنست کہ بہ مردم معلوم شود کہ کار نماندہ است خلاف واقع ست"۔

یہ رقعہ ۱۰۹۸ھ میں لکھا گیا۔ اس وقت مرہٹوں کا استیصال باقی تھا، اور عالمگیر کو ناگوار تھا کہ خلاف واقع کہا جائے۔ دکن میں سب کام کر لئے۔

عالمگیر نے اپنے اس خیال کو بارہا ظاہر کیا ہے کہ:

"اگر اعلیٰ حضرت (شاہجہاں) بودن دار الخلافہ و مستقر الخلافہ اختیار نے کردند و ہمیشہ در سفر بودند کار باینجا نمے رسید کہ برسید۔ (وقائع عالمگیر وغیرہ)"

داد و دہش

عنایت اللہ خان بخشی نے عرض کیا کہ روزانہ منصب عطا ہوتے ہیں اور حضور کی جاگیر محدود ہے۔ غیر محصور اور محدود کا ساتھ کیسے ہو سکتا ہے۔

اس پر حکم ہوا:

"استغفر اللہ کارخانہ بادشاہی نمونہ درگاہ الٰہی ست" الخلق عيال الله والرزق على الله "ایں راتبہ رساں، بیچارہ، ذلیل (عالمگیر) زیادہ از وکیل رب جلیل نیست در بارگاہ الٰہی اعتقاد بحدود تباہی عین ضلالت و تباہی ست"۔

الحمد لله ثم الحمد لله۔

اس کے بعد تحریر ہوتا ہے کہ ارشد خاں کی عرضی کے بموجب قلعہ ستارہ کی فتح کے بعد پانچ ہفت ہزاری جاگیریں اس فانی کی ملک میں اپنی ہیں۔ سردست انہیں جاگیروں سے تنخواہیں دیں۔ جب یہ ختم ہو جائے گی بحق تعالیٰ "نو روز" میں "روزی نو" (نئے دن میں نئی روزی) عطا فرمائے گا"۔ (۲۶۵)

میر حبیب اللہ نے روپیہ خرچ کر ڈالا۔ اس کی شکایت کی گئی۔ جواب میں تحریر ہوا:

"معلوم ہوا کہ میر موصوف کے پاس جو کچھ آتا ہے، اہل استحقاق اور مصرف خیر میں خرچ کر ڈالتا ہے۔ جب کہ اس عاصی غرق معاصی کا مصرف خیر میں صرف ہو چکا۔ اعادہ بے فائدہ ہے"[۲۶۶]

شجاعت

داراشکوہ کی جنگ میں وہ پچیس تیس ہزار سے ایک لاکھ سوار اور بیس ہزار پیدل فوج کے مقابلہ میں معرکہ آرا ہوا تھا۔ اور جب گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی تو اس کے ساتھ صرف ایک ہزار آدمی رہ گئے تھے۔ اُس وقت اُس نے جو شجاعت ظاہر کی، اُس کو "لین پول" ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

"جنگ کی حالت نازک ہوگئی تھی، اور قریب تھا کہ اورنگ زیب کو ہزیمت ہو، کیونکہ اس کے چیدہ چیدہ رسالے پسپا ہو چکے تھے اور وہ تنہا کھڑا ہوا تھا، اور مشکل سے ایک ہزار آدمی اس کے گرد ہوں گے۔ اس سے زیادہ مستقل رستمانہ شجاعت کی کبھی جانچ نہ ہوئی ہوگی۔ لیکن اورنگ زیب کے بدن میں پٹھوں کے بجائے فولاد کے تار تھے۔ صرف اورنگ زیب کی شجاعت تھی، جس نے ایک ہزار کو ایک لاکھ پر فتح دی۔"

عالمگیر کی اس حیرت انگیز شجاعت اور اس تعجب خیز عزم وثبات کو کمزوری، مصائب سفر، تواتر حوادث کوئی چیز کم نہ کر سکی۔ ۱۱۱۰ھ (۱۶۹۹ء) میں جب بمقام ستارہ مرہٹوں نے ایک سرنگ اڑا دی اور فوج میں بربادی پھیلی تو یہ بیاسی ۸۲ برس کا بوڑھا شہنشاہ جھٹ گھوڑے پر چڑھ کر مقام حادثہ پر پہنچا۔ آدمیوں کی لاشوں کا ڈھیر لگوایا، اور چاہتا تھا کہ حملہ کی سرداری خود کرے لیکن بڑی دقت سے اس کو اس ارادہ سے باز رکھا گیا۔ اب بھی وہ وہی "سامان گڑھ" کا جوان تھا جس نے اپنے ہاتھی کے پاؤں میں بیڑیاں ڈلوادی تھیں۔ یہ لین پول کے الفاظ ہیں۔ خافی خاں اس واقعہ کو ان الفاظ میں لکھتا ہے:

چوں دانستند کہ مبارزان قلعہ کشا حوصلہ باختہ اند خود بدولت بر اسپ سوار شدہ بر سرکار آمدہ فرمودند کہ لاش مردہا را فراہم آوردہ راسنجارا سپر تیر بلا ساختہ قدم یورش پیش گزارند۔ چوں در مردم اثر صرف شنیدن مشاہدہ خود نار ساختند خود بذات شریف پیش قدم بہادراں جان نثار گشتند۔ ارکان سلطنت بالحاح وتضرع ازیں جراءت مانع آمدند"۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں عالمگیر کے واقعات زندگی میں مل سکتی ہیں۔ ایام شاہزادگی میں ہاتھی سے لڑنا، جنگ بلخ میں حالت جنگ میں نماز ظہر ادا کرنا اور شجاع کے مقابلہ کے وقت بے پناہ استقلال وثبات کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

فوج کے سب سے دلاور سپاہی بارہ کے سادات گنے جاتے تھے اور اس میں شبہ نہیں کہ تیموریوں کے اکثر معرکے انہیں نے سر کیے ہیں۔ ایک موقعہ پر ان سب لوگوں نے درباریوں سے خانہ جنگی کی۔ عالمگیر نے حکم دیا کہ قاضی کی عدالت میں یہ مقدمہ پیش ہو۔ سادات نے کہا کہ ہم اپنا فیصلہ خود کریں گے۔

عالمگیر نے آستین چڑھا کر کہا کہ جو لوگ میری تلوار کا مزہ چکھ چکے ہیں وہ حکم شریعت کے مقابلہ میں ایسے الفاظ نکالتے ہیں۔ کہہ دو، سب مل کر آئیں۔

یہ کہہ کر حکم دیا کہ پہرے وغیرہ پر جس قدر سادات بارہ ہیں، سب برطرف کر دیے جائیں۔ سادات کا سارا غرور جاتا رہا۔

اصلاحات وانتظامات

منکرات کی بندش، خرابات خانوں وغیرہ کی ممانعت ان کے ٹیکسوں کی موقوفی، محکمہ احتساب، وکیل شرعی کا قیام، پرچہ نویسی کی توسیع، درباری تکلفات کی منسوخی، سلام مسنون کا اجراء وغیرہ۔

یہ اصلاحات مناسب عنوانات کے تحت میں سپردِ قلم ہو چکی ہیں۔ ذیل میں چند اہم اصلاحات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) کابل سے اورنگ آباد تک آگرہ کے راستہ پر ہر ایک منزل پر سرائیں بنوائیں جن کے اخراجات خزانہ شاہی سے ملتے تھے۔ کھانا پکانے کے برتن سرکاری ہوتے تھے۔

(۲) قدیم سڑکوں اور سراؤں کی مرمت کرائی۔ ان کے انتظامات کو ٹھیک کیا۔ چھوٹے دریاؤں پر پل بندھوائے۔ بڑے دریاؤں کے ہر ایک گھاٹ پر عبور کرنے کے لئے کشتیاں تیار رکھنے کا انتظام کیا۔

(۳) سرکاری طور سے سڑک پر تین تین کوس کے فاصلہ سے ہرکاروں کی چوکیاں قائم کیں۔ ان کے ذریعہ سے ملک کے تمام حصوں میں سہولت اور عجلت کے ساتھ ڈاک پہنچ جاتی تھی۔

(۴) غریبوں اور لولے لنگڑوں کے لئے جابجا سرکاری غریب خانے اور مطب جاری کرائے۔

(۵) مساجد اور مندروں کے لئے اراضی وقف کیں۔

(۶) تعزیہ، تابوت اور تعزیوں کے جلوس کو بند کرا دیا۔ (تاریخ ہندوستان ج ۸ ص ۴۷۶)

(۷) رسم ستی کی قباحت آج اس رسم کے ماننے والے بھی تسلیم کر چکے ہیں۔ انگریزی حکومت نے اس کو قانوناً ممنوع کر دیا ہے۔ مگر چونکہ مسلمان بادشاہ کے لئے مذہباً جائز نہیں کہ کسی قوم کو اپنے عقائد[۶۶۷] پر عمل کرنے سے روکے، مسلمان بادشاہوں نے اس کو قانوناً نہیں روکا۔ البتہ سلطان عالمگیر نے یہ پابندی ضرور لگا دی کہ صوبہ دار (گورنر) کی اجازت کے بغیر کوئی ستی نہ ہو۔ پھر اس پر بھی صوبہ دار کو ہدایت تھی کہ وہ نرمی کے ساتھ باز رہنے کی فہمائش کرے اور وہ خود نہ سمجھا سکے تو اپنی مستورات کے ذریعہ سے اس پر اثر ڈالے۔

(۸) اکبر کے زمانہ سے یہ طریقہ جاری تھا کہ بادشاہ لوگوں کو مرید کیا کرتا۔ عالمگیر بھی اپنے مکاتیب میں شاہجہاں کو پیر و مرشد لکھا کرتا تھا۔ لیکن عالمگیر نے اس سیاسی تصنع کو قطعاً بند کر دیا۔

۱۱۰۰ھ (۳۳ جلوس) میں بنگالہ سے ایک شخص مرید ہونے کے لئے آیا۔ صلابت خاں میر توزک نے اس کو عالمگیر کے سامنے پیش کیا۔ عالمگیر نے کچھ سونے چاندی کے زیورات اور ایک سو روپیہ صلابت خاں کو دے کر کہا کہ اس شخص کو دے دو اور کہہ دو کہ ہم سے جس فیض کا تصور ہو سکتا ہے، وہ یہی ہے۔

جب خان نے اس کو یہ روپیہ دیا تو اس نے اس کو دریا میں پھینک دیا اور خود بھی دریا میں گر گیا۔ صلابت

خاں نے اس کو نکلوا کر ڈوبنے سے بچایا۔ (۶۶۸)

(۹) خدا کی پناہ! انسان اپنی ذات کے لئے غریب انسانوں پر کس طرح ظلم کا خوگر ہے۔ کسی مرد کو خصی کرنا شرعاً حرام ہے۔ مگر بادشاہوں نے اس کو جاری رکھا تاکہ محل سرا میں ذات شاہانہ کی حفاظت کر سکیں۔ عالمگیر نے اس ملعون طریقہ کو ممنوع قرار دیا۔

(۱) درشن کی ممانعت

شاہجہاں نے دربار میں سجدہ اور پھر زمین بوس کا طریقہ بند کر دیا تھا۔ مگر درشن کے طریقہ میں غالباً اس کو کوئی قباحت نظر نہیں آئی۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ فرقہ درشنیوں کا پیدا ہو گیا تھا۔ جو صبح کو بطور عبادت بادشاہ کا جمال مبارک دیکھنے آتے تھے اور جب تک زیارت نہیں کرتے تھے، کچھ کھاتے پیتے نہ تھے۔

اس عقیدہ کے بموجب بادشاہ ایک معبود بن جاتا ہے۔ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں بلکہ کسی انسان کو حق نہیں کہ وہ معبودیت کے کسی درجہ میں بھی اپنے آپ کو پیش کرے۔ عالمگیر کی دقیقہ رس نظر نے اس شرعی قباحت کو محسوس کیا اور ۱۰۷۹ھ میں اس کو بند کر دیا۔

(۲) درباری شعراء

اسی طرح درباری شعراء زیب دربار ہوا کرتے تھے، جو بادشاہ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے اور بڑے بڑے وظیفے اور انعامات پاتے تھے۔ ان کا ایک افسر ملک الشعراء ہوتا تھا۔ شاہجہاں نے اس مسرفانہ رسم پر متعدد بار دریا دلی کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس نے ۱۰۷۹ھ میں اس سلسلہ کو بھی ختم کر دیا۔

(۳) گانا بجانا

اگرچہ عالمگیر خود جیسا کہ مآثر عالمگیری میں بالتصریح لکھا ہے فن موسیقی کا ماہر تھا۔ لیکن مزامیر کے ساتھ گانا چونکہ شرعاً ممنوع ہے نیز دربار شاہی کی شان کے خلاف ہے لہٰذا عالمگیر نے اس صیغہ کو بھی تبدیل کر دیا۔ لوگوں نے اس پر ایک مصنوعی جنازہ نکالا عالمگیر نے دیکھ کر کہا کہ ہاں گہرا ایسا دفن کرنا کہ پھر زندہ نہ ہو۔

(۴) تبدیل سنہ

سنہ شمسی کو جو پارسیوں کی تقلید سے قائم کیا گیا تھا، قمری سے بدل دیا۔ اگرچہ بظاہر معمولی سی بات ہے۔ مگر اس قسم کی معمولی تبدیلیوں سے دنیا میں سینکڑوں قومیں بنیں اور فنا ہو گئیں۔

نوروز ایران کے آتش پرستوں کا قدیم تہوار تھا۔ عجمی بادشاہوں نے اسلام قبول کیا۔ مگر تفریحات میں زمانہ جاہلیت کی تقلید کی۔ عالمگیر کی پابند شرع طبیعت نے جشن نوروز کو جشن عید الفطر سے بدل دیا۔ (۶۶۹)

سکہ کے ایک طرف کلمہ طیبہ ہوتا تھا۔ سکہ زمین پر پھینکا جاتا تھا۔ پیروں کے تلے آجاتا تھا۔ عدالتوں میں

حاکم اُونچی جگہ پر بیٹھتا تھا۔ اور روپیہ وغیرہ جو جمع ہوتا تھا، وہ کارندوں کے پاس نیچے رہتا تھا۔ غرض مختلف صورتوں سے کلمہ طیبہ کی بے ادبی ہوتی تھی لہٰذا عالمگیر نے کلمہ طیبہ کے نقش کو سکوں سے محو کرا دیا اور اشرفی پر کندہ کرایا گیا:

سکہ زد در جہاں چوں بدر منیر ... شاہ اورنگ زیب عالمگیر

روپیہ پر نقش ہوا:

از سکہ اقبال شہ مہر نظیر ... سیم و درم ستارہ شد نقش پذیر

از سکہ او غلغلہ در چرخ اوفتاد ... گردید زر از سکۂ او عالمگیر (۱۴۰)

عالمگیر اور ہندو عہدہ دار

شاہانِ مغلیہ کے زمانہ میں ہندو مسلم تعلقات پر ہم آئندہ بحث کریں گے۔ یہاں سلطان عالمگیر کے حالات کی تقریب میں چند امور درج ذیل ہیں:

پہلے تفصیل سے بیان کیا گیا کہ جنوبی ہند میں جس قدر سلطنتیں تھیں، ان کے فرمانروا مسلمان تھے جو ہمیشہ شاہانِ دلی دہلی سے معاندانہ اور مخالفانہ سلوک کرتے رہے چنانچہ جہانگیر بادشاہ کے زمانہ سے جنوبی ہند کی لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ عالمگیر کا قصور صرف یہ ہے کہ اُس نے جنوبی ہند کے الحاق کے قدیمی نظریہ کو درجہ اختتام و تکمیل پر پہنچا دیا۔ ان لڑائیوں کو ہندو مسلم جنگ قرار دینا قطعاً غلط ہے۔ البتہ جنوبی ہند اور شمالی ہند کی کش مکش ضرور کہا جا سکتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ ان لڑائیوں کے دونوں حریفوں کے ساتھ ہندو بھی اسی طرح شریک رہتے تھے جیسے مسلمان۔

پہلے گزر چکا ہے کہ مرہٹوں کی طاقت عادل شاہ کا خود کاشتہ پودا تھا، جس کو صرف شمالی ہند کے مقابلہ کے لئے تیار کیا گیا تھا۔

جنوبی ہند میں مرہٹوں کی طاقت وہاں کے فرمانرواؤں کے ساتھ تھی، تو شمالی ہند میں راجپوتوں سے شاہانِ دہلی رشتہ ناطہ قائم کئے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ خود عالمگیر نے سال چہارم جلوس ۱۰۷۱ھ (۱۶۶۱ء) شاہزادہ محمد معظم کا نکاح راجہ روپ سنگھ کی بیٹی سے کیا۔ ایک لاکھ روپیہ کا زیور دلہن کو دیا اور کلاونتوں کو ایک ہزار روپیہ انعام ملا۔

یہ ضرور ہوا کہ جب مسلم فرمانروا ختم ہو گئے تو پھر تنہا مرہٹے میدان میں رہ گئے جن کو عالمگیر نے عمر کے آخری دور میں مفتوح کیا۔ مگر کیا اس جنگ کا سبب مرہٹوں کا ہندو ہونا تھا؟

ہم رقعات عالمگیری کے سب سے پہلے رقعہ میں پڑھتے ہیں کہ شہزادہ کلاں سلطان محمد معظم شاہ کو بلخ و بدخشاں، خراسان اور ہرات کی فتوحات کی طرف پوری تاکید کے ساتھ توجہ دلا رہا ہے۔

خود دکن میں فوج کشی کر رہے ہیں، یلغار میں شریک ہیں۔ مگر ممالک مذکورہ بالا کی فتوحات کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"نظر بایں توجیہ کہ (مصرع) "اگر پدر نتواند پسر تمام کند"۔ ایں فانی را آرزو باقی ست"۔

کیا اس تمنا کے بعد بھی دکن کی لڑائیوں کو مذہبی جنگ و جدال کا رنگ دیا جا سکتا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ عالمگیر نے احکام صادر کیے تھے کہ ہندوؤں کو ملازمت سے برطرف کر دیا جائے۔ مگر ہم جب امراء ہنود کی فہرست دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اکبر اعظم کے دور سے بھی تقریباً چہار چند ہنود حکومت عالمگیر کے ارکان ہیں۔ امراء ہنود اور وقاء عالمگیری میں تفصیل کے ساتھ ان کی فہرستیں موجود ہیں۔ ہم صرف منصبوں کی تفصیل کے ساتھ ان کی تعداد کا ذکر کرتے ہیں۔

ہفت ہزاری امراء، ۳۔ جن میں ساہو پسر مہاراجہ سیتاجی بھونسلہ بھی شامل ہے شش ہزاری، ۳۔

پنج ہزاری، ۹۔ جن میں سیواجی کا داماد اور چندرجی اور مالوجی بھونسلہ بھی شامل ہے۔

چہار ہزاری، ۱۳۔ جن میں دلپت رام بندراجی کا چچازاد بھائی اور نتھو سیواجی کا داماد بھی شامل ہے۔

دو ہزار و پانصدی، ۹۔ دو ہزاری، ۵۔ ہزار پانصدی، ۴۔ ایک ہزاری۔ ۸۔ ہفت صدی ایک۔ پانصدی، ایک۔ ایک صدی، ایک۔

ان کے علاوہ اکتالیس امراء ہنود کے نام اور تاریخ میں آئے ہیں۔ جن کو مذکورہ بالا فہرستوں میں شامل کیا گیا مگر ان کے منصب نہیں معلوم ہو سکے۔ کل ایک سو ایک۔

یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ ان امراء کی حسن خدمات پر حوصلہ افزائی نہ ہوتی تھی۔ کتب تاریخ سینکڑوں واقعات سے لبریز ہیں جن میں انعام کے طور پر امراء ہنود کو خلعتیں اور خطابات دیے گئے۔ ایک معمولی سا واقعہ تھا کہ پہاڑ سنگھ نے سرکشی کی۔ اس کی تنبیہ کے لیے دستہ فوج بھیجا گیا۔ شہزادہ محمد معظم کے پیش کار دیوان "تلوک چند" نے مقابلہ کے وقت اس کو قتل کرا دیا۔ شاہزادہ محمد معظم کے نام شاہی فرمان صادر ہوا۔

"او را بمنصب پانصدی ذات و صد سوار و خطاب رائے و عطاء خلعت و شمشیر و اسپ سربلندی بخشیدیم"۔

پھر اسی پر قناعت نہیں بلکہ شاہزادہ سے سفارش کی جاتی ہے کہ:

"آں فرزند ہم رعایتے درخور کہ موجب امتیاز او در اقران و امثال تواند بود الیتہ مع نشان تحسین و آفرین و استقلال نیابت صوبہ بفرستند"۔ (۱۷۱)

مسٹر ارنلڈ، عالمگیر کو بدنام کرنے میں کسی یورپین مورخ سے کم نہیں۔ مگر وہ تحریر کرتا ہے:

"اورنگ زیب کے فرامین اور مراسلات کے ایک قلمی مجموعہ میں جو ابھی تک طبع نہیں ہوا ہے۔ مذہبی آزادی کا وہ جامع اور مانع اصول درج ہے جو ہر ایک بادشاہ کو غیر مذہب کی رعایا کے ساتھ ضروری ہے۔ جس واقعہ کے متعلق یہ اصول بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ عالمگیر کو کسی شخص نے عرضی دی کہ دو پارسی ملازموں کو جو تنخواہ تقسیم کرنے پر مقرر تھے، اس علت میں برخاست کر دیا جائے کہ وہ

آتش پرست ہیں۔ اور ان کی جگہ کسی تجربہ کار معتبر مسلمان کو مقرر کیا جائے کیونکہ قرآن شریف میں آیا ہے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَ عَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ (اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ)۔ عالمگیر نے عرضی پر لکھا کہ مذہب کو دنیا کے کاروبار میں دخل نہیں ہے اور نہ ان معاملات میں تعصب کو جگہ مل سکتی ہے۔ اور اس قول کی تائید میں یہ آیت نقل کی۔ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ (تمہارے لئے تمہارا دین اور ہمارے لئے ہمارا دین) بادشاہ نے لکھا کہ جو آیت عرضی نویس نے نقل کی ہے اگر یہی سلطنت کا دستور العمل ہوتا تو ہم کو چاہیے تھا کہ اس ملک کے راجاؤں اور ان کی رعیت کو غارت کر دیتے۔ مگر یہ کس طرح ہو سکتا تھا۔ بادشاہی نوکریاں لوگوں کو ان کی لیاقت اور قابلیت کے موافق ملیں گی، اور کسی لحاظ سے نہیں مل سکتیں (۱۶۲)

کوئی ضلع ہندوستان بھر میں ایسا نہ ہوگا جس کی حدود میں کسی مندر کے نام شاہی زمانہ کی جاگیر نہ ہو۔ تحقیق کی جائے تو ان میں سے بیشتر جائدادیں وہ ہیں جن کو عالمگیر نے عطا فرمایا۔ بنارس اور متھرا کے ہندوؤں کے ساتھ ابتداء حکومت میں کچھ مقابلہ رہا۔ بنارس میں دارا ایک عرصہ تک رہا تھا اور اس نے وہاں کے پنڈتوں سے تعلیم پائی تھی۔ متھرا میں بھی دارا کے اثرات تھے۔ ان دونوں شہروں کے ہندوؤں نے عالمگیر کے اقتدار کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ بغاوت کی۔ مساجد کو منہدم کر کے مندر بنائے۔ جس کے نتیجہ میں عالمگیری افواج نے سختی سے شورش کو دبایا۔ ان تمام وجوہات کو کتب تاریخ میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ پھر ان ہندوؤں کے ساتھ عالمگیر کے الطاف و عنایات کا اندازہ اس کے حسب ذیل فرمان سے ہوتا ہے۔ جو وقائع عالمگیر کے حوالہ سے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"لائق العنایۃ والرحمۃ ابوالحسن بالتفات شاہانہ امیدوار بودہ بداند کہ چوں بمقتضاء مراحم ذاتی و مکارم جبلی ہمگی ہمت والا نہمت و تمامی نیت حق طویت بارفاہیت جمہور انام و انتظام احوال طبقات خواص و عوام مصروف ست واز روئے شرع شریف و ملت منیف مقرر چنیں ست کہ دیر ہاء دیرین بر انداختہ نشود و بتکدہ ہاء تازہ بنا نیابد و دریں ایام معدلت انتظام بعرض و شرف اقدس ارفع و اعلیٰ رسید کہ بعض مردم از راہ عنف و تعدی بہنود سکنہ قصبہ بنارس و برخے امکنہ دیگر کہ بنواحی آں واقع است و جماعت برہمنان آں محال کہ سدانت بت خانہاء قدیم آنجا بانہا تعلق دارد و مزاحم و متعرض مے شوند و مے خواہند کہ اختیار از سدانت آں کہ از مدت مدید بایشاں متعلق ست باز دارند و ایں معنی باعث پریشانی و تفرقہ حال ایں گروہ مے گیرد، ولہٰذا حکم والا صادر مے شود کہ بعد از ورود ایں منشور لامع النور مقرر کند کہ من بعد احدے بوجوہ بحساب تعرض و تشویش باحوال برہمناں و دیگر ہنود متوطنہ آں محال نرساند۔ تا ایشاں بدستور ایام پیشیں بجا و مقام خود بودہ بجمعیت خاطر بدعا ہائے دولت خداداد ابد مدت و ازل بنیاد قیام نمایند۔ دریں باب تاکید داند۔ بتاریخ ۱۵

شہر جمادی الثانیہ ۱۰۹۹ھ نوشتہ شدہ۔ (۹۷۳)

بنگال کے مشہور فاضل سر۔سی۔ پی رائے نے ۱۹۳۷ میں بنگال کے مسلم فیڈریشن کے جلسہ میں جدید وزارت کا استقبال کرتے ہوئے بحیثیت صدر جلسہ تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے ہندوؤں کو منصب داری اور بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں، اور بڑے بڑے زمیندار بنادیئے گئے۔ اورنگ زیب نے ہندوؤں کو گورنر بنایا۔ گورنر جنرل بنایا۔ وائسرائے بنایا۔ یہاں تک کہ اس نے خالص اسلامی صوبہ افغانستان پر بھی جو نائب السلطنت مقرر کیا تھا وہ ہندو راجپوت ہی تھا''۔

ہندوستان کے مشہور ہندو مصنف پنڈت سندر لال مصنف، بھارت میں انگریزی راج'' نے اپنے ایک مضمون میں جو اخبار استقلال دیوبند مورخہ ۴ مارچ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا تحریر فرمایا تھا۔

''اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور ان کے بعد اورنگ زیب اور اس کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلم یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں مذہب کی مساویانہ توقیر کی جاتی تھی۔ ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں۔ آج تک متعدد مندروں کے پجاریوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں جن میں خیرات اور جاگیروں کے عطا کئے جانے کا تذکرہ ہے۔ اس قسم کے دو فرمان اب تک الہ آباد میں موجود ہیں جن میں سے ایک سومیشور ناتھ کے مشہور مندر کے پجاریوں کے پاس ہے۔

جزیہ

اس میں شک نہیں کہ عالمگیر کی خواہش اور تمام تر جدوجہد یہی تھی کہ اسلامی تعلیمات کے بموجب حکومت ہو۔ اُس نے سب سے پہلے اپنی ذات کو اس نظریہ کا پابند بنایا۔ تمام شاہی تکلفات کو برطرف کر کے تخت شاہی پر فقیرانہ زندگی اختیار کرلی۔ اس نے جب محصولات کو اسلامی طرز پر لانے کے لیے اس سے زیادہ غیر شرعی ٹیکسوں کو یک قلم منسوخ کردیا، جن کی آمدنی کروڑوں روپیہ تھی، تو ان کی تلافی کے لئے ضرور تھا کہ اسلامی تعلیم کے بموجب عشر، خراج، زکوٰۃ اور جزیہ کے احکام نافذ کرے۔

عشر اور زکوٰۃ کا تعلق مسلمانوں سے ہوتا ہے، خراج اور جزیہ غیر مسلموں سے۔ عشر آمدنی کا دسواں حصہ ہوتا ہے اور زکوٰۃ زر و نقد کا چالیسواں حصہ۔ عشر کے مقابلہ پر غیر مسلموں سے خراج ہوتا ہے جس کے تعین کے وقت ادا کنندگان کی رضامندی ضروری ہے۔ ان کی مرضی کے بغیر یا اُن کی طاقت سے زیادہ خراج لگانا خلافت راشدہ کے دستور العمل کے مخالف ہے۔

جزیہ کی ایک تعداد شریعت نے مقرر کی ہے۔ یعنی اُمراء اور ارباب دولت سے تقریباً بارہ ۱۲ روپیہ سال۔ متوسط درجہ کے لوگوں سے چھ ۶ روپیہ سال اور عام برسر روزگار لوگوں سے تین روپیہ سال۔ تہ بازاری، برگدی،

برشماری، سرشماری نذرانہ رحمت ہے مگر افسوس ہندوؤں نے اس کو اپنے لئے تخت وبال سمجھا اور شکرانہ وغیرہ اتنی ٹیکسوں کے بعد یہ معمولی ٹیکس نہایت ہی آسان اور عوام کے لئے سراسر تربیت اور پھر مسلم حکومتوں کو برباد کرنے کے لئے حریفان چابک دست نے جزیہ کو ایسی بھیانک چیز بتایا کہ اس سے بچنے کے لیے ہندوؤں کے بڑے بڑے گھرانوں نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا۔

آج بھی قسم قسم کے ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ عام باشندگان ملک کا افلاس اُس زمانے سے کہیں زیادہ ہے۔ مگر کیا کسی کو سنا گیا ہے کہ اُس نے ٹیکسوں سے بچنے کی خاطر اپنے مذہب کے متعلق کبھی کسی قسم کی کوئی سستی بھی کی ہو۔

فی زمانہ مشنریوں کی بلا جا بجا ہے۔ کروڑوں روپیہ سالانہ مشنریوں پر خرچ کیا جاتا ہے جدید عیسائیوں کو خاص خاص رعایتیں بھی ملتی ہیں۔ مگر کوئی شریف ہندو یا مسلمان کبھی بھی ان کی طرف روپیہ پیسہ کے لالچ میں متوجہ نہیں ہوتا۔

شاہان اسلام کی پوری تاریخ میں کبھی کسی مشنری کا تو درکنار، کسی تبلیغی ادارہ کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ اگر بالفرض جزیہ سے بچنے کے لئے لاکھوں کروڑوں ہندو مسلمان ہوگئے، تو اُن کی بزدلی، پست ہمتی واقعی اپنے قدیم مذہب کے لئے لعنت تھی، اور ایسے بزدلوں پر اسلام بھی کوئی اعتماد نہیں کرتا۔ بلکہ اُن کے اسلام ہی کو درست قرار نہیں دیتا، جو صداقت کی بنا پر نہیں صرف لالچ یا کسی معمولی خوف کی بنا پر مذہب تبدیل کر دیں۔

بہر حال یہ الزام تو کسی سنجیدہ انسان کے لیے بھی قابل التفات نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ہندوؤں نے جزیہ اور زکوۃ کی تقسیم کو اس مساوات اور یکسانیت کے خلاف سمجھا جس کے وہ اکبر کے زمانہ سے عادی ہو چکے تھے۔ اگر یہ درست ہے تو ہمارا خیال ہے کہ اورنگ زیب نے اجتہادی غلطی کی۔

بنو تغلب عرب کا ایک قبیلہ تھا۔ وہ عیسائی مذہب رکھتا تھا۔ جب یہ قبیلہ عہد فاروقی میں محروسہ خلافت میں داخل ہوا، اور اس سے جزیہ اور خراج کا مطالبہ کیا گیا تو چونکہ وہ خلیفہ کا ہم نسل تھا، اُس نے صاف صاف کہا کہ ہم مسلمانوں سے دو چند محصول ادا کر سکتے ہیں، مگر ہمیں یہ گوارا نہیں کہ ہم سے جزیہ لیا جائے اور ہمارے ہم نسل قبائل سے زکوۃ لی جائے۔ فاروق اعظمؓ نے ان کے اس مطالبہ کو منظور فرمایا اور یہی حکم نافذ ہوا کہ اُن کے تسلیم و اقرار کے بموجب اُن سے دو چند عشر اور زکوۃ بھی لی جائے۔ اگر واقعی ہندوؤں کو لفظ جزیہ اور خراج سے ناگواری تھی تو عالمگیر کو سنت فاروقی پر عمل کرنا چاہیے تھا۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ جزیہ کا اجراء ہوا ہی نہیں، یا یہ کہا جائے کہ جس کو جزیہ کہا جاتا ہے وہ جزیہ ہی نہ تھا۔

مثلاً جودھ پور کے راجہ نے سرکشی کی۔ اس کو تنبیہ کی گئی۔ اُس نے سر اطاعت خم کیا۔ اور مؤرخ کے الفاظ میں:

''جزیہ دینا قبول کیا۔ زر جزیہ کے عوض میں اپنے ملک کے تین ۳ پر گنے دیئے اور فرزندان جسونت کی اعانت نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ (۱۷۴۳) الخ

اسی طرح اُودے پور کے رانا سے:

''ان شرائط پر صلح کر لی کہ رانا جزیہ کے عوض میں کچھ ملک دے دے'' (۶۷۵)

اسلامی تفصیلات سے معمولی واقفیت رکھنے والا بھی اس کو جزیہ نہیں کہہ سکتا۔ اس قسم کی شرطیں عام طور پر ہوتی ہیں۔ لیکن اگر اسی کا نام جزیہ ہے تو اس میں عالمگیر کو بدنام کرنا سراسر ظلم ہے۔ ہر ایک حکومت اسی قسم کے وصول کرتی رہی۔ اصطلاح شریعت میں اس کا نام خراج ہے اس کو جزیہ نہیں کہا جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ رانا اور راجہ ہر سال شاہی جشن کے موقعہ پر لاکھوں روپے کے نذرانے پیش کیا کرتے تھے۔ یہ نذرانے بادشاہ کا ذاتی حق مانے جاتے تھے اور اس بنا پر وہ بڑی حد تک رشوت کا کام بھی کرتے تھے۔

پھر نذرانے کے بہانے سے ان راجاؤں کو اپنے ماتحتوں سے بے جا وصول کرنے کا بھی موقعہ ملتا تھا۔ نیز ہر سال خود بھی نذرانے وصول کیا کرتے تھے۔ عالمگیر نے نذرانے کی رسم منسوخ کر کے اس ہمہ گیر ظلم کی جڑ ہی کاٹ ڈالی۔ یہ راجاؤں اور رانوں کے ذاتی مفاد کے لئے سخت مضر تھا۔ پھر بہبودیٔ عوام کے پردہ میں اصل واقع کو چھپا کر اپنی اغراض کے لئے غلط پراپیگنڈے کرنے کا دستور قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔

بدقسمتی سے عالمگیر کو مؤرخ شیعہ ملے اور پھر جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے ایران سے تعلق کے انقطاع نے شیعوں کی رگِ حمیت میں فطرتاً اشتعال پیدا کر دیا تھا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ عالمگیر کے بعد شیعوں کا اقتدار ہی ملک میں کمزور پڑ گیا۔

فنِ تاریخ کے متعلق آپ کی رائے کچھ بھی ہو مگر ہر ایک حقیقت پسند منصف مزاج یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ کسی شخصیت کے متعلق جب اس طرح کے عوارض اور سانحات پیش آجائیں تو تاریخ کی صاف گوئی بھی مشتبہ ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات واقعہ کی اصل مسخ ہو جاتی ہے۔

ان حالات میں مؤرخین نے غلط تعبیر کرتے ہوئے اس کو بھی جزیہ سے تعبیر کیا ہے حالانکہ اصطلاح شریعت میں اس کو جزیہ نہیں کہا جاتا، اس کا نام ''عشر'' ہے۔

اس میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان امتیاز ضرور ہوتا ہے مگر مجموعی دولت کے تناسب سے اگر دیکھا جائے تو مسلمان پر زیادہ بار پڑتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جزیہ جو مذکورۃ الصدر شرح کے ساتھ ہر غیر مسلم سے لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ غیر مسلم سے مال تجارت پر بھی کل مال کا بیسواں حصہ (۵ فیصد) سال بھر میں ایک مرتبہ لیا جاتا ہے۔ اس بیسویں حصہ کو اصطلاحاً ''عشر'' کہتے ہیں۔

یہاں یہ امتیاز ضرور ہوا کہ مسلمان سے اس کا نصف چالیسواں حصہ (ڈھائی فی صد) لیا جاتا ہے۔ اس طرح مسلمان کے حق میں تخفیف معلوم ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی دوسرا پہلو بھی پیش نظر رہے تو یہ تخفیف فریب نظر ثابت ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ بیسواں حصہ غیر مسلم سے صرف مال تجارت پر لیا جاتا ہے۔ مال تجارت کے علاوہ اس کے پاس لاکھوں کروڑوں روپیہ نقد یا زیورات وغیرہ کی شکل میں ہو، اس پر کچھ نہیں لیا جاتا۔ اس کے برعکس

مسلمان کی پوری دولت پر جو اس کے پاس نقد ہو یا دوسروں کے ذمہ قرض ہو، زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ مثلاً کسی مسلم اور کسی غیر مسلم کا سرمایہ اگر ایک ایک لاکھ روپیہ ہو، اس طرح کہ تیس ہزار روپیہ تجارت میں لگا ہوا ہے۔ پچاس ہزار روپیہ نقد جمع ہے اور بیس ہزار دوسروں کے ذمہ قرض ہے۔ تو غیر مسلم سے صرف بیس ہزار کا بیسواں حصہ یعنی ہزار لیا جائے گا اور مسلمان سے اس کے کل سرمایہ کا جس میں وہ ہزار شامل ہیں جو دوسروں کے ذمہ قرض ہیں، ایک چالیسواں لیا جائے گا جو ڈھائی ہزار روپے ہوتے ہیں۔ زکوٰۃ کے علاوہ مسلمان کے ذمہ جو دوسرے مالی واجبات ہیں، اُن پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔

(۱) جنگ کے تمام مصارف بھی مسلمانوں کے ذمہ ہوتے ہیں کیونکہ جہاں وہ حکمران ہوں، اس ملک اور باشندگانِ ملک کا تحفظ مسلمانوں پر فرض ہوتا ہے اور اس کے لیے اقدامی یا دفاعی جو جدوجہد بھی کی جائے اصطلاحِ شریعت میں وہ جہاد کہلاتی ہے۔ جہاد مسلمانوں پر فرض ہے۔ بس جس طرح نماز زکوٰۃ یا حج وغیرہ کی تمام ذمہ داریاں مسلمانوں پر ہیں، ایسے ہی سلسلۂ جہاد کی تمام ذمہ داریاں بھی مسلمانوں پر ہیں۔ غیر مسلموں پر جنگ کے مصارف ایک فریضہ کے طور پر نہیں، تعاون اور امداد باہمی کے طور پر عائد ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ ان کی ادائیگی سے انکار کر دیں تو اسلامی حکومت کے غدار یا باغی نہیں قرار دیئے جا سکتے۔

(۲) مسلمانوں کے پاس اگر مویشی یعنی گائے بیل بکریاں دنبے بھیڑ اونٹ اور گھوڑے ہوں تو اُن پر بھی زکوٰۃ فرض ہوتی ہے جس کی خاص صورتیں کتب فقہ میں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ یہ زکوٰۃ غیر مسلموں پر واجب نہیں ہے۔

(۳) مسلمانوں کے ہر نفر پر (بشرط نصاب) رمضان شریف گزرنے پر صدقۂ فطر اور بقر عید کے موقع پر قربانی بھی واجب ہوتی ہے۔

(۴) خاص خاص صورتوں میں مثلاً روزہ رمضان توڑ دینے پر یا قسم کھا کر اس کی خلاف ورزی کی صورت میں کفارہ واجب ہوتا ہے۔ یہ بھی عموماً ایک مالی فریضہ کی نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔

(۵) مسلمان شراب اور سور کی تجارت نہیں کر سکتا۔ سونے چاندی کی خرید و فروخت کے لئے خاص خاص شرطیں ضروری قرار دی گئی ہیں۔ غیر مسلم ان تمام تجارتوں میں آزاد ہیں۔

(۶) صاحب استطاعت مسلمانوں پر حج بھی فرض ہوتا ہے۔ جس کی ادائیگی میں ہزاروں روپے خرچ ہوتے ہیں۔

کیا ان تمام بندشوں، ان تمام مذہبی تاوانوں اور مالی فرائض کے باوجود یہ ممکن ہے کہ کوئی غیر مسلم ''جزیہ'' سے بچنے کے لیے اپنا مذہب ترک کر کے اسلام قبول کر لے۔

سُبْحَانَکَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ

(مولانا) سید محمد میاں (صاحب)

جمعیۃ العلماء ہند۔ دہلی

حواشی

۱۔ یعنی انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد۔ اس انقلاب میں پنجاب کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ ایک ٹکڑا پاکستان میں شامل ہوگیا۔ مگر یہ ٹکڑا جس میں سرہند ہے، ہندیونین ہی میں رہا۔ لیکن اس کی اسلامی شان ختم ہوگئی۔ یہاں کے مسلمان پاکستان پہنچے اور پاکستان کے غیر مسلم پناہ گزیں ان کی جگہ آباد ہوگئے۔ سرہند اور بستی جس کا تذکرہ اس کتاب میں بار بار آئے گا مسلمانوں سے خالی ہوگئے۔ البتہ حضرت مجدد صاحب کا روضہ اور ان کی خانقاہ خود حضرت مجدد صاحب کی کرامت سے اور بظاہر اسباب افغانستان کے احتجاج پر محفوظ رہ گیا۔ اس میں کچھ مسلمان رہتے ہیں۔ جناب مقبول حسین صاحب یہاں کے سجادہ نشین ہیں۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور جمعیۃ علماء ہند کے توجہ دلانے پر حکومت ہند اس خانقاہ کی ضروریات کا تکفل کئے ہوئے ہے۔ حکومت پنجاب پندرہ ہزار روپیہ سالانہ کی امداد خانقاہ کو دیتی ہے۔

۲۔ حضرت شاہ کمالؒ کے متعلق حضرت مجدد صاحبؒ سے منقول ہے کہ: "سلسلۂ قادریہ میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کے بعد شاہ کمال کا مثل کم نظر آتا ہے۔ ۱۲

۳۔ الخطبۃ الشوقیۃ فی تذکرۃ مؤلفہ عبدالشکور صاحب بضمن مجدد نمبر ص ۹۰۔

۴۔ مکتوب نمبر ۱۰۰ جلد اول ص ۱۳۱، مکتوب نمبر ۵ دفتر دوم ص ۲۹ ج ۲ وغیرہ۔

۵۔ آفتاب کو آدمی کسی طرح دیکھ بھی سکتا ہے مگر شاہ سکندرؒ کے منور اور مصفّٰی قلب پر نظر جمانا ناممکن (مقولہ مجدد صاحب بحوالہ خطبہ شوقیہ)۔

۶۔ آپ کی ولادت ۹۷۱ھ میں بمقام کابل ہوئی۔ یہی سال حضرت امام ربانی مجدد کی ولادت کا ہے۔ ۲۵ جمادی الاخریٰ ۱۰۱۲ھ بروز شنبہ بعمر اکتالیس سال بمقام دہلی وفات پائی۔ مزار مبارک دہلی میں واقع ہے۔ یہ پورا قبرستان خواجہ باقی باللہ کے نام سے مشہور ہے۔ مزار مبارک کے قریب ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے، جس کا فرش سنگ مرمر کا اور ستون سنگ بھری کے ہیں۔

۷۔ آپ کی ولادت ۹۱۸ھ میں ہوئی، وفات ۱۰۰۸ھ میں۔ نوے سال عمر پائی۔ اپنے والد ماجد درویش محمد صاحبؒ کے خلیفہ تھے۔ اور درویش محمد صاحبؒ حضرت خواجہ عبیداللہ احرارؒ کے خلیفہ تھے۔ حضرت خواجہ امکنگی حضرت شاہ نقشبندؒ کے قدم بقدم چلنے میں ضرب المثل تھے اور جماعت تہجد وغیرہ کی کچھ بدعتیں جو اس زمانہ میں طریقہ میں رائج تھیں ان سے اجتناب فرماتے تھے۔ ۱۲ (خطبہ شوقیہ)

۸۔ ص ۱۰۳ جلد دوم مطبوعہ نول کشور۔

۹۔ لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ ظَاهِرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ لَا یَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ۔ (صحاح)

۱۰۔ اے فرزندا با وجود ایں معاملہ کہ تعلق بمن مربوط بودہ است کار خانۂ عظیم دیگر بمن حوالہ فرمودہ اند، بہ رائے پیری و مریدی سرا نیاوردہ اند و مقصود از خلقت من تربیت وارشاد خلق نیست۔ معاملہ دیگر ست و کار خانۂ دیگر، در یں ضمن ہر کہ مناسبت دارد فیض خواہد گرفت والا لا۔ معاملہ تکمیل وارشاد نسبت بآں کار خانہ امرے ست بمنزلہ مطروح فی الطریق۔ (مکتوب نمبر ۶ جلد دوم ص ۱۷)۔

۱۱۔ ملاحظہ ہو "الفرقان" کا مجدد نمبر ص ۱۰۷۔

۱۲۔ مذہب الٰہی کہ آسائش غیر متناہی خلق دراں بود، تا عہد جہانگیری رواج داشت۔ باز از عہد شاہ جہاں تعصب شروع شدہ در عہد عالمگیر شدت پذیرفت ۱۲ (سیر المتاخرین ص ۱۴۴ جلد اول)۔

۱۳۔ ملا صاحب تحریر فرماتے ہیں: دلیری بر نوشتن آں قضایا کہ از وادی حزم و احتیاط بغایت دور بود کردم، و خدائے عزوجل گواہ است و کفی باللہ شہیدا کہ مقصود ازیں نوشتن غیر از درد دین و دل سوزی بر ملت مرحوم اسلام کہ عنقا وار روئے بغربت کشیدہ و سایہ بال ہمائے خود را از خاک نشینان کشیدہ باز گرفتہ چیزے دیگر نبودہ و از تعنت و حقد و حسد و تعصب بخدا پناہ می جویم (ص ۲۶۳)

۱۴۔ یہ مضمون مجدد نمبر میں شائع ہوا ہے۔ اگرچہ اس سلسلہ میں ہماری جماعت پر مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے جگہ جگہ نکتہ چینی کی

ہے لیکن کسی فاضل کی کسی بہتر خدمت کو نظر انداز کر دینا یا اس سے استفادہ کرتے ہوئے اس کا ذکر نہ کرنا بدترین بخل اور قابلِ نفرت خیانت ہے۔ اعاذنا اللہ من الجبن و البخل والمأثم والمغرم والحسد و البغضاء ۱۲ منہ

۱۵۔ عبادت آفتاب را روزے چہار وقت کہ سحر و شام و نیم روز و نیم شب باشد لازم گرفتند و ہزار و یک نام ہندی آفتاب را وظیفہ ساختہ نیم روز متوجہ آں شدہ بحضور دل می خواندند و ہر دو گوش گرفتہ و چرخے زدہ مشتے بر بنا گوش کوفتہ حرکاتے دیگر نیز ازیں قبیل بسیار بود و قشقہ کشیدند و نوبت و نقارہ یکے در نیم شب و یکے در وقت طلوع قرار یافت ۱۲ صفحہ ۳۲۲۔

۱۶۔ مجلس آتش و آب و سنگ و درخت و سائر مظاہر بروز گار تا گاؤ و سرگین آں و نیز قشقہ و زنار را جلوہ داد و دعا تسخیر آفتاب کہ ہندوان تعلیم دادہ بودند بطریق ورد در نیم شب و وقت طلوع خواندن گرفت ۱۲ صفحہ ۲۶۱۔

۱۷۔ آفتاب نیر اعظم و عطیہ بخش عالم و مربی بادشاہاں و بادشاہاں مروج او یند ۱۲ صفحہ ۲۶۱

۱۸۔ لباس را موافق رنگ یکے از سبع سیارہ کہ ہر روزے بیکے منسوب است ساختند ۱۲ ص ۲۶۱

۱۹۔ در مذہب تناسخ رسوخ قدم حاصل شد ۱۲ ص ۲۵۸

۲۰۔ بادلائل عقلی بر حقیقت تناسخ یافتہ ایم شیخ ابو الفضل خاطر نشان شما خواہد کرد ص ۳۰۰ ۱۲

۲۱۔ روح کامل مکملان از راہ سر کہ منفذ دماغ است خروج کند و دراں وقت آوازے مثل صاعقہ بر آید و آں دلیل سعادت و نجات بیت است از گناہاں و علامت حلول روح است بمذہب تناسخ در بدن بادشاہے ذی شوکتے صاحب اقتدارے نافذ امرے ۱۲ ص ۳۲۵۔

۲۲۔ ایں معنی را محل بر سوال و حشر و نشر و حساب و میزان و غیر آں نمودہ مخالف قرارداد خویش کہ بغیر تناسخ چیزے قائل نیستید ۱۲ ص ۳۰۰

۲۳۔ بتوحید الٰہی موسوم ساختند ۱۲ ص ۳۱۵۔

۲۴۔ قرار داد شد کہ بکلمہ لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ علانیہ تکلیف نمایند ۱۲ ص ۲۷۳۔

۲۵۔ منکہ فلاں ابن فلاں باشم بطوع و رغبت و شوق قلبی از دین اسلام مجازی و تقلیدی کہ از پدراں دیدہ و شنیدہ بودم ابا و تبرا نمودم و در دین الٰہی اکبر شاہی در آمدم و مراتب چہار گانہ اخلاص کہ ترک مال و ترک جان و ناموس و دین باشد قبول کردم ۱۲ ص ۲۷۳

۲۶۔ جماعت را کہ مریدی گرفتند الٰہیان مشہور بودند ۱۲ ص ۲۹۹

۲۷۔ اللہ اکبر عنوان نامہ ہائے قرار یافت ص ۳۲۱

۲۸۔ مریدان چوں بہم رسند یکے اللہ اکبر و دیگرے جل جلالہ گوید ص ۳۵۶

۲۹۔ ہر دو از دہ نفر نوبت بنوبت و مثل بمثل مرید شدہ موافقت در مشرب و مذہب می نمودند ۱۲

۳۰۔ بجائے شجرہ شبیہ دادہ آں را علامت اخلاص و مقدمہ رشد و دولت می دانستند و در غلافے مرصع پیچیدہ بالائے دستار می گذاشتند ۱۲ ص ۳۳۱

۳۱۔ ہر صباح بر وقت عبادت شمس جھروکہ تا طلعت مبارک نمی دیدند مسواک و طعام و آب بر ایشاں حرام بود و در ہر یکے صاحب حاجتے و نیاز مندے از ہندو و مسلم و انواع طوائف مرد و زن صبح و تقسیم را آنجا بار عام بود و کار بزرگ و طرفہ ہنگامہ گرمے و ازدحامے عظیمے و بعضے کہ از تسبیح ہزار و یک نام نیر اعظم فارغ شدہ از حجاب برمی آمدند ایں جماعت در کورنش افتادند ۱۲ ص ۳۲۶

۳۲۔ سجدہ برائے او تجویز کردہ آں را زمین بوس نامیدند و رعایت ادب بادشاہ را فرض عین شمردہ روئے او را کعبۂ مرادات و قبلۂ حاجات دانستند و بعضے روایات مرجوح و عمل مریدان مشائخ ہند را دریں باب تمسک آوردند ۱۲ ص ۲۵۹۔

۳۳۔ گردن کمر کورنش کردہ تا دیرے دست بستہ چشم پوشیدہ ایستادہ ماندند بعد ازاں تا چوں حکم نشستن فرمودند سجدہ بجا آوردہ و مانند اشتر لوک نشستند ۱۲ ص ۲۷۷۔

۳۴۔ ربو و قمار حلال شدہ و دیگر محرمات بریں قیاس باید کرد و قمار خانہ در دربار بنا کردہ و زرے بسود مقامران از خزانہ می دادند۔

۳۵۔ شراب اگر بحیثیت رفاہیت بدنی طریق اہل حکمت بخورند و فتنہ و فسادے ازاں نزاید مباح باشد بخلاف مستی مفرط و اجتماع و غوغا کہ

اگر ایں چنیں یافتہ سیاست بلیغ نمودند ۱۲

۳۶۔ دوکان شراب فروشی بردر بار باہتمام خاتون دربان کہ از نسل خمار است برپا کردہ نرخ معین نہادند ۱۲

۳۷۔ درمجالس نوروزی اکثر علماء و صلحاء بلکہ قاضی و مفتی را نیز دروادی قدح نوشی آوردند ۱۲

۳۸۔ ملک الشعراء (فیضی) میگفتہ کہ ایں پیالہ بکوری فقہاء می خوریم ۱۲

۳۹۔ ریش از صحیحیں آب می خورد لہذا ہیچ خوبیہ سرائے ریش ندار دو در نگاہ داشتن او چہ ثواب ۱۲

۴۰۔ ذی مَن گھڑت کو حدیث بھی اسی حیثیت سے کہا گیا ہے کہ بر عکس نہند نام زنگی کافور ۱۲ منہ

۴۱۔ پسر صحابی معترض در نظر آنحضرت آمد فرمودند کہ اہل بہشت بایں ہیئت خواہند بود ۱۲ ص ۲۷۸

۴۲۔ فرضیت غسل جنابت مطلقاً ساقط شد کہ تخم آفرینش نیکاں است بلکہ مناسب آں ست کہ اول غسل کنند بعد ازیں جماع ۱۲

۴۳۔ پسر را پیش تر از شانزدہ سالگی و دختر را از چہاردہ سالگی نکاح روا نباشد کہ فرزند ضعیف می شود ۱۲

۴۴۔ قصہ زفاف با صدیقہ را مطلق منکر بودند ۱۲

۴۵۔ بایں تقریب خیلے منافع و فوائد بعید دوالان خصوصاً کسان کو توال و خانوے کلال و سائر اعوانان ارزال بیروں از وہم و خیال عاید گردید ۱۲ ص ۳۹۱

۴۶۔ زنے جوانے کہ در کوچہ و بازار سے گردیدہ باشد دراں حال یا رو نپوشد یا روئے کشادہ گردد ۱۲

۴۷۔ از شہر بیروں آبادان ساختند و آں را شیطان پورا نامیدند و آنجا نیز محافظے و مشرفے و داروغہ نصب کردند تا ہر کہ باں جماعت صحبت وارد یا بخانہ بیرد اول نام و نسب خود بنویسانند آں گاہ باتفاق تمغاچیاں جماع ہر چہ خواہد کند ۱۲

۴۸۔ ختنہ پیش از دوازدہ سالگی نہ کنند بعد ازاں اختیار را و دخواہ کند یا نکند ۱۲ ص ۳۷۶

۴۹۔ پارہ از غلہ خام و خشت پختہ بر گرد نش بستہ در آب سرد ہند و بجائے کہ آب نباشد بسوزند یا بطور خطائیاں بر درختے بر بندند ۱۲

۵۰۔ سر مردہ بجانب مشرق و پائے آں بجانب مغرب دفن کنند ۱۲

۵۱۔ مقابل نیر اعظم گذاشتند تا فروغ آں کہ پاک کنندہ گناہاں است ہر صباح بر رویش افتد ۱۲

۵۲۔ برد ہانش زبانہ آتش تیز رسانیدہ بودند ۱۲ ص ۳۳۱

۵۳۔ خواب رفتن خود را نیز از جنس عبادات قرار دادند ۱۲ ص ۳۵۷

۵۴۔ برغم اسلام خنزیر و کلب را از نجس بودن باز نمودند درون حرم و زیر قصر نگاہ داشتہ ہر صباح نظر براں عبادت می شمردند ۱۲

۵۵۔ چند سگ را در سفر ہمراہ گرفتہ طعام با نہا می خوردند و بعضے شعراء زبان سگان در دہان می گرفتند ۱۲

۵۶۔ در روز عید ہشتم منبلہ بر رسم اہل ہند قشقہ کشیدہ برور دولت خانہ بر آمدند و برہمنانے جواہر دراں کشیدہ و از دست براہمہ بہ تبرک گرفتہ بر دست بستند ۱۲

۵۷۔ تحریم گوشت گاؤ و گاومیش واسپ و میش و شتر بود ۱۲

۵۸۔ اگر کسے با منغے کہ ذبح جانور پیشہ او شدہ باشد طعام بخورد دست او بریدند اگر اہل خانہ او بود انگشت اکل قطع نمایند ۱۲ ص ۳۷۶

۵۹۔ زنے ہندو بر مسلمانے فریفتہ شدہ و دین مسلمانان در آید جبراً و قہراً گرفتہ باہل او سپارند ۱۲ ص ۲۹۴

۶۰۔ کفار ہند بے تحاشا ہدم مساجدمی نمایند و آنجا تعمیر معبد ہائے خود می سازند و نیز کفار برملا مراسم کفر بجامی آرند و مسلمانان در اجرائے اکثر احکام اسلام عاجز اند ۱۲ (مکتوبات مجدد الف ثانی مکتوب ۹۲ ص ۱۶۴ جلد ۲)۔

۶۱۔ اکنوں کتاب ہائے ہندی را کہ دانایان مرتاض عہد نوشتہ اند و ہمہ صحیح و نص قاطع است و مدار دین و اعتقادات و عبادات ایں طائفہ برآنست ترجمہ از ہندی بزبان فارسی فرمودہ چہ اہتمام خود نہ سازیم کہ غیر مکرر دتاز واست و بہ ثمر سعادت دنیوی و دینی و رواج حشمت و شوکت بے زوال و مستوجب کثرت اموال و اولاد وست ۱۲ ص ۳۲۰

۶۲۔ عربی خواندن و دانستن آں عیب شدہ و فقہ و تفسیر و حدیث و خوانندہ آں مطعون و مردود۔

۶۳۔ دریں سال حکم شد کہ ہر قوم ترک علوم عربیہ نمودہ غیر از علوم غریبہ از نجوم و حساب و طب و فلسفہ نخوانند ص ۳۶۳۔

۶۴۔ مساجد و مدارس مدروس علماء اکثر جلاء وطن شدند و اولاد نا قابل ایشان کہ بماند امروز بہ پاجی گیری نام برآوردند ۱۲ ص ۲۷۳۔

۶۵۔ ترجمہ: مدرسے خالی ہوگئے جیسے ماہ رمضان میں شراب خانہ شرابیوں سے خالی ہو جاتے ہیں۔ جو تختی معلم کے پاس ادب کی تعلیم کے لئے مستعمل تھی اب وہ چوسر کا تختہ بن گئی، اور قاری کا مصحف یعنی قرآن جوئے کے سلسلہ میں گروی ہے ۱۲۔

۶۶۔ حروف خاصہ زبان عرب مثل ثاء، حاء، عین، صاد، ضاد، خاء و ظاء از تلفظ بر طرف ساختند ۱۲ ص ۳۰۷۔

۶۷۔ عبداللہ را ابداللہ، و احدی را ابدی، امثال آں دیگری گفتند و خوش می داشتند ۱۲۔

۶۸۔ درس ہدایہ و کتب مجہانہ مثلاً نہا تمیں تا صدو ہفتاد یک کم و بیش بود ۱۲۔

۶۹۔ از جملہ شعائر اسلام تعیین قضاۃ است در بلاد اسلام کہ در قرن سابق محو شدہ بود ۱۲ (مکتوب ص ۱۹۵ جلد اول)

۷۰۔ غربت اسلام نزدیک یک قرن بحدے قرار یافتہ است کہ اہل کفر بمجرد اجرائے احکام کفریہ در بلاد اسلام راضی نمی شوند میخواہند کہ احکام اسلام بالکلیہ زائل گردد و اثرے از مسلمانان و مسلمانی پیدا نشود، کار تا بآں سرحد رسانیدہ اند کہ اگر مسلمانے از شعائر اسلام اظہار نماید بہ قتل می رسد ۱۲ (مکتوب ۸۲ ص ۱۰۶ جلد اول)

۷۱۔ بادشاہے کہ جو ہر نفیس داشت و طالب حق نما عالی نفس ۱۲ ص ۲۵۵۔

۷۲۔ ہر شب وقت برائے خاطر جماعت در دربار می گفتند ۱۲ ص ۳۱۵۔

۷۳۔ بادشاہ از غایت تعظیم و احترام گاہے بجہت استماع علم حدیث بخانہ شیخ می رفتند و یک دو مرتبہ کفش پیش پائے او ہم می ماندند ۱۲ ص ۳۱۵۔

۷۴۔ از آبادی یکسو آوردہ نشستہ بمراقبہ مشغول می شدند و فیض سحری ربودند ۱۲ ص ۳۱۵۔

۷۵۔ پیوستہ کار تحقیق مسائل دین بود چہ اصول چہ فروع ۱۲

۷۶۔ جماعت مناظرین و مباحثین چہ محقق چہ مقلد از صدفز تحقیق و تزیورند ۱۲ ص ۱۸۸۔

۷۷۔ بد تفسیہا از یں جماعت ظاہر شدند۔

۷۸۔ کہ با یک دیگر تیغ زباں کشیدہ در مقام تنافی و تقابل بودند و اختلاف بجائے رسید کہ بتکفیر و تضلیل ہم دگر می نمودند ۱۲

۷۹۔ رگ گردن علماء زماں برآمدہ و آوازہائے بلند و مدمہ بسیار ظاہر شد۔

۸۰۔ و رشک انداختہ حیرت بر حیرت افزود و مقصود از میان رفت ۱۲۔

۸۱۔ چندیں خزائن و دفائن او پدید گشت کہ قفل آں را بہ کلید وہم نتواں کشاد و از آں جملہ چند صندوق طلاء از گورخانہ مخدوم الملک کہ بہ بہانہ اموات دفن کردہ بود ظاہر شد ۱۲ ص ۳۱۱۔

۸۲۔ سائر وکلاء شیخ و فراشان و دربانان و سائسان و حلال خوران تیز رشوتہائے کلی دادے و کلمہ از اں و وظائف بدر بردے ۱۲۔

۸۳۔ علماء عہد خویش بہتر از غزالی و رازی تصور نمودہ بودند کہ کہتہائے ایشاں را دیدہ قیاس غائب بر شاہد کردہ سلف را نیز منکر شدند۔

۸۴۔ اختلاف علماء کہ یکے فعلے را حرام می گفت و دیگرے بعینہ ہماں را حلال می ساخت وجہ انکار گشت ۱۲۔

۸۵۔ ورآئین مالک و شافعی و ابو حنیفہ و حنبل و امامیہ کوتا گوں دریافت اصول و فروع را بہم آوردند و بجائے رسید کہ تخت پایہ اجتہاد در شمرد اگرچہ باقتضاء نیاکان بزرگ بروش ابو حنیفہ انتساب داشتند لیکن ہموارہ کردار را بکوئے آرائش دادے و از تقلید بر کنارہ بندگی دلیل کردے۔ احوال مصنف آئین اکبری جلد سوم ص ۲۰۳ مطبوعہ نولکشور۔

۸۶۔ مرتب تجرید و بسیارے غوامض شفا و اشارات و تذکرہ مجسطی را تذکار فرمودند و سراپا بہاں حکمت را طراوت دیگر پدید آمد ۱۲ (آئین اکبری ص ۲۰۳ جلد ۳۔

۸۷۔ اسالیب اشراق و تصوف برخواندند و فراواں کتاب نظر و تالد یدہ شد ۱۲ (آئین اکبری ص ۲۰۳ جلد ۳۔

۸۸۔ شیر خاں و حلیم خاں و دیگر بزرگان در مقام آں شدند کہ از وجوہ سلطانی چیزے برگیرند ۱۲۔ آئین اکبری ص ۲۰۵ جلد ۳۔

۸۹۔ چونکہ ہمت بلند تھی اور نظر پاؤ تجار رکھتے تھے، انکار کر دیا۔۱۲

۹۰۔ آئینِ اکبری ص ۲۰۵ جلد ۳۔

۹۱۔ لفظی ترجمہ کے بجائے صحیح مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۹۲۔ اصلی محضر نامہ: مقصود از تمہید ایں مبانی و تمہید ایں معانی آں کہ چوں ہندوستان صینت عن الحدثان بمیامن معدلت سلطانی و تربیت جہانبانی مرکزِ امن و امان و دائرہ عدل و احسان شدہ و طوائف انام از خواص و عوام خصوصاً علماءِ عرفان شعار و فضلاء دقائق آثار کہ ہادیان بادیہ نجات و سالکان مسالک اوتوا العلم و امدرجات اند از عرب و عجم رو بدیں دیار نہادہ توطن اختیار نمودہ اند۔ جمہور علماء فحول کہ جامع فروع و اصول و حاوی معقول و منقول اند بدیں و دیانت و صیانت اتصاف دارند بعد از تدبر وافی و تامل کافی در غوامض معانی اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم و احادیث صحیح ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ امام عادل من یطع الامیر فقد اطاعنی من یعص الامیر فقد عصانی و غیر ذلک من الشواہد العقلیہ والدلائل النقلیہ قرار داوہ حکم نمودند کہ مرتبہ سلطان عادل عنداللہ زیادہ از مرتبہ مجتہد است و حضرت جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی اعدل و اعقل واعلم باللہ اند بنا بریں اگر دریں مسائل دین کہ بین المجتہدین مختلف فیہا است بذہن ثاقب و فکر صائب کو یک جانب را از اختلاف بہ جہت تسہیل معیشت بنی آدم و مصلحت انتظام عالم اختیار نمودہ بآں جانب حکم فرمایند متفق علیہ شود و اتباع آں بر عموم برایا لازم و متحتم است اگر بموجب رائے صواب علمائے خود حکمی را از احکام قرار دہند کہ مخالف نصے نباشد و سبب ترفیہ عالمیان بودہ باشد عمل بر آں نمودن بر ہمہ کس لازم و متحتم است و مخالفت موجب سخط اُخروی و خسران دینی و دنیوی است۔ انتہی باختصار ص ۲۷۲ جلد ۲ مطبوعہ کلکتہ۔

۹۳۔ اگر در چنیں بحث سخن مجتہدین راہی آوردندی گفت از فلاں حلوائی و فلاں کفش دوز و فلاں چرم گر بر ما حجت می آرید ۱۲ (ص ۳۰۰ جلد ۲)۔

۹۴۔ کس قدر عجیب بات ہے، کہ جو بات پوری اُمت کے نزدیک ان بزرگوں کے مناقب میں داخل ہے ابوالفضل اس کے بہانہ سے ان حضرات کی توہین کرتا ہے ان بزرگوں نے اپنے علم کو ذریعہ معیشت نہیں بنایا تھا۔ نہ اس کے ذریعہ بادشاہوں تک رسائی حاصل کر کے سیاسی اقتدار اور مالی عروج حاصل کیا تھا۔ یہ حضرات اپنی روزی دست کاری یا تجارتی کاروبار سے حاصل کرتے تھے اور بلا کسی دنیاوی معاوضہ کے خالصاً لوجہ اللہ خدمت علم کرتے تھے۔ اسی کی برکت ہے کہ ان کے نام روشن اور اُن کی تصانیف آج تک وثیقہ ہدایت بنی ہوئی ہیں۔

۹۵۔ و آنچہ در حق صحابہؓ در وقت خواندن کتب سیر مذکور می ساختند خصوصاً در خلافت خلفاء ثلاثہ و قضیہ فدک و جنگ صفین و غیرہ آں کہ گوش از استماع آں کر باد بزبان خود نتواں آورد ۱۲ ص ۳۰۸۔

۹۶۔ ملت اسلام ہمہ نا معقول و حادث و واضع آں فقراء عربان بودند کہ جملہ مفسدان و قطاع الطریق و آں دو بیت شاہنامہ کہ فردوسی طوسی بطریق نقل آوردہ متمسک می ساختند ۱۲ ص ۳۰۷۔

۹۷۔ اُونٹ کا دودھ اور گوہ کھاتے کھاتے عربوں کے حوصلے اب یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ ملکِ عجم کی آرزو کرتے ہیں اس چرخ گرداں پر تف ہے تف ہے ۱۲۔

۹۸۔ و بہر رکنے از ارکان دین و ہر عقیدہ از عقائد اسلامیہ چہ در اصول و چہ فروع مثلاً نبوت و کلام و رویت و تکلیف و تکوین و حشر و نشر شبہات گونا گوں بہ تمسخر و استہزا آوردہ ۱۲ ص ۳۰۷۔

۹۹۔ خلق را از تعلق قرآن و توغل در اصول و حی و تشکیک در نبوات و امامات امتحان کردند و وجود جن و ملک و سائر مغیبات و معجزات و کرامات را انکار صریح آوردند و تواتر قرآن و ثبوت کلامیت آں و بقائے روح بعد از اضمحلال بدن و ثواب و عقاب را و غیرہ از نتائج محال ہی شمردند ۱۲ ص ۳۰۳۔

۱۰۰۔ ایں معنی را عقل چگونہ قبول کند کہ شخصے در یک لحظہ با گرانی جسم از خواب بآسمان رود و نود ہزار سخن گو مگوئے با خدا تعالیٰ کند و بستر ش ہنوز

گرم باشند و مردم بآں دعوی بگروند و ہم چنیں شق القمر و امثال آں ۱۲۔

۱۰۱۔ ممکن نیست کہ پا پائے دیگر برجا ماند استادہ تو انیم ایں چہ حکایت ۱۲ ص ۳۱۷۔

۱۰۲۔ زدن قافلہ قریش در اوائل ہجرت و چہار دہ زن خواستن و تحریم شہد کردن برائے خوشنودی زنان ۱۲ ص ۲۰۸۔

۱۰۳۔ نام احمد و مصطفیٰ و امثال آں بجہت کافراں بیرونی و زناں اندرونی گراں آمد تا بحدے در ایام اسامی چندے از مقربان کہ بایں نام مسمّی بودند تغییر دادہ مثلاً یار محمد خاں را رحمت می خواندند و می نوشتند ۱۲ (ص ۲۱۵ جلد ۲)۔

۱۰۴۔ علماءِ سوء در تصنیفات از خطبہ تبرائی آوردند و اکتفا بتوحید کردند و القاب بادشاہی می نوشتند و مجال نبود کہ نام آنحضرت علیٰ رغم الملکذبین بہ برند ۱۲ ص ۲۲۹۔

۱۰۵۔ بد بختے چند از ہندوان و مسلمانان ہند و عراق قدح صریح بہ نبوت می کردند ۱۲۔

۱۰۶۔ در تعریف دجال ملعون این ملاعین و اوصاف او در باب حضرت خیر النبیین علیٰ رغم الدجالین فرود آوردند ۱۲ ص ۲۶۹۔

۱۰۷۔ بعضے چند متمنا از ایں بحوال ۱۲ ص ۶۹

۱۰۸۔ ہر بجوقت برائے خاطر درود باری گفتند ۱۲ ص ۲۱۵۔

۱۰۹۔ در دیوان خانہ ہیچکس یارائے آن نداشت کہ علانیہ ادائے صلوٰۃ کند ص ۲۱۵۔

۱۱۰۔ نماز روزہ و حج پیش از ایں ساقط شدہ بود ص ۲۵۱۔

۱۱۱۔ پسر ملا مبارک شاگرد ابوالفضل ز مسائل در باب قدح و تمسخر ایں عبادات بدلائل نوشتہ مقبول افتادہ باعث تربیت گشت ص ۲۵۱۔

۱۱۲۔ نماز و روزہ و جمیع نبوات را تقلیدات نام نہادند یعنی غیر معقول و مدار دین بر عقل گزاشتند نہ نقل۔ ص ۲۱۱۔

۱۱۳۔ ایں را از ملایاں بہ پرسید و چیزے کہ تعلق بہ عقل و حکمت ازمن (ص ۲۰۸)

۱۱۴۔ دانایان مرتاض ملک افرنجہ کہ ایشان را پادری و مجتہد ایشاں را پاپا می گویند انجیل آوردہ و بر ثالث ثلاثہ دلائل گذرانیدہ و حقیت نصرانیت ثابت کردہ ص ۲۰۸۔

۱۱۵۔ آتش پرستاں از شہر نوساری ولایت گجرات آمدہ بودند دین زردشت را حق نمودند و تعظیم آتش را عبادت عظیم می گفتند و بجانب خود کشیدہ از اصطلاح و راہ کیانیاں واقف ساختند ۱۲ منہ

۱۱۶۔ آتش باہتمام شیخ ابوالفضل بروش ملوک عجم کہ آتش ایشاں ہمہ برپا ئے بود دائم الاوقات چہ در شب و چہ در روز در محل نگاہ می داشتہ باشند۔ ص ۲۰۸

۱۱۷۔ مناف دانایاں از ہر دیار وارباب ادیان و مذاہب بدربار جمع شدہ بشرف ہمزبانی مخصوص بودند بعد تحقیق و تفتیش کہ شب و روز شیوہ و پیشہ برازاں داشتند ص ۲۵۶۔

۱۱۸۔ برغم اسلام ہر حکمے کہ ارباب ادیان دیگر بیان میکردند آں را نص قطعی شمردند بخلاف دین ملت (اسلام) کہ ہمہ آں نامعقول و حادث و واضع آں فقرائے عربان ص ۲۰۸۔

۱۱۹۔ ہر چہ خوش می آمد از ہر کس غیر از مسلمانان التقاط و انتخاب نمودہ از انچہ نامرضی طبع و خلاف خواہش بود احتراز و اجتناب لازم می دانستند۔ ص ۲۵۶

۱۲۰۔ بعد از پنج و شش سال اثرے از اسلام نماند و قضیہ منعکس شد ص ۲۵۵۔

۱۲۱۔ ہر کرا نہ بروفق اعتقاد خویش می یافتند کشتنی و مردود و مطرود و ابدی می دانستند ص ۳۳۹۔

۱۲۲۔ حکم کردند کہ از مقربان چہل کس یعنی چہل تن بہ نشینند و ہر کس ہر چہ داند بگوید و ہر چہ خواہد بپرسد۔ ص ۲۰۸۔

۱۲۳۔ شبہات گوناگوں بہ تمسخر و استہزا آوردہ اگر کسے در معرض جواب می شد جواب ہم منع بود ص ۲۰۷۔

۱۲۴۔ نواختن ناقوس نصاریٰ و تماشائے صورت ثالث ثلاثہ بلبلان کہ خوش گاہ ایشاں است و سائر لہو و لعب وظیفہ شد۔ ص ۲۰۸۔

۱۲۵۔ جلبان بالتحریک نام سازیکہ باشتراک لب و دست مے نوازند و بکیں سبب بہندی آنرا منہ چنگ گویند از بہار عجم و صاحب کشف

جلبان را بالفتح نوشتہ و شمار کردہ ثقہ و صحیح است جلبان را بالتحتین بمعنی الغوزہ نوشتہ ۱۲ (غیاث اللغات)۔

۱۲۶۔ آمد و رفت فرنگیاں نیز شدہ و بعضے اعتقادیات عقلی ایشاں را قرار کردند۔ ص ۳۱۲۔

۱۲۷۔ مقربان نیز در وقت افروختن شمع و چراغ قیام لازم می ساختند۔

۱۲۸۔ از مفردین بطوائف مختلف از براہمہ و بادفروشان و سائر اصناف ہندوان ربطے خاص والتفاتے تمام است ص ۱۶۱۔

۱۲۹۔ دختران راجہائے عظیم ہند کہ خیلے بتصرف آوردہ بودند تصرف در مزاج کردہ ص ۱۶۱

۱۳۰۔ تیرا گوشت میرا گوشت تیرا خون میرا خون یعنی من تو شدم تو من شدی۔۱۲

۱۳۱۔ چندگا ہے کہ دیوی برہمن کہ از معبران مہابھارت بود بر چار پائی نشاندہ بابا کشیدہ نزدیک بقصرے کہ آں را خواب گاہ ساختہ بودند معلق داشتہ از وے اسرار و افسانہائے ہندی و طریق عبادت بتے اصنام و آتش و آفتاب و تعظیم کواکب و احترام اساطین کفرہ از برہما و مہادیو و بشن و کشن و مہامائی شنیدہ وہاں جاجت گرائیدند ص ۲۸۸۔

۱۳۲۔ چون در زعم خویش ساختند کہ ہزار سال از زمان بعثت پیغمبر اسلام کہ مدت بقاء ایں بود تمام شد و ہیچ مانعے برائے اظہار دواعی خفیہ کہ در دل داشتند نماند و بساط از مشائخ و علماء کہ صلابت و مہابت داشتند و ملاحظہ تمام از انہا بایستے خالی بماند بفراغ بال در صدد ابطال احکام و ارکان اسلام و بند و بست ضوابط و قواعد توہمل و تخیل ترویج باز از اعتقاد در آمد ص ۳۰۱۔

۱۳۳۔ اول حکمے کہ فرمودند ایں بود کہ در سکہ تاریخ الف نویسند ص ۳۰۱۔

۱۳۴۔ در تنکہا و مہر ہا تاریخ الف نوشتند کہ بایں اعتبار مشعر بہ شد از انقراض دین مبین محمدؐ کہ بیش از ہزار سال نخواہد بود ص ۳۰۶۔

۱۳۵۔ و دریں سال حکم شد کہ چون ہزار سال از ہجرت تمام شدہ ہمہ جا تاریخ ہجری می نویسند حالا می باید کہ تاریخ تالیف باید کرد کہ جامع جمیع احوال پادشاہان اسلام تا امروز کہ در حقیقت ناسخ تاریخہائے دیگر باشد و نام او الفی نہند و در ذکر سنوات بجائے ہجرت لفظ رحلت نویسند ص ۳۰۶۔

۱۳۶۔ دریں سال اسافل و اراذل عالم نمائے جاہل تقاضند دلائل باطل نمودہ برائی آوردند کہ حالا صاحب زمانے کہ رافع خلاف و اختلاف ہفتاد و دو ملت از مسلم و ہندو باشد حضرت اند۔ ص ۲۷۹۔

۱۳۷۔ برہمناں شعر ہائے ہندی را از زبان داناہان سابق نقل کردہ می گذرانیدند بایں مضمون کہ پادشاہ عالمگیرے در ہند پیدا شود کہ برہمناں را احترام کند و حفاظت گاؤ نماید و گیتی را بعدل نگاہبانی کند و در کاغذ ہائے کہنہ آں خرافات را نوشتہ می نمودند و ہمہ باور افتاد (ج ۲ ص ۳۲۶)

۱۳۸۔ سنا جاتا ہے کہ آج بھی برہمنوں کی ایک بڑی جماعت پرانے کاغذات اور تانبے کے پتروں پر حسب مطلب مضامین لکھ کر زمین میں دفن کرتی ہے اور پھر کچھ دنوں کے بعد "ڈسکوری" کے نام سے آسمان و زمین کو سر پر اٹھا لیا جاتا ہے اور ان ہی وثیقوں سے آج ہندوستان کی تاریخ مرتب ہو رہی ہے۔ ایک معتبر راوی نے مجھ سے حال ہی میں بیان کیا کہ "پونہ" کے علمی حلقوں میں اس نوعیت کے تحقیقی کاموں کا زیادہ زور ہے۔ خیال گزرا تھا کہ شاید یہ وہاں کے براہمنوں کی کوئی "نئی اپج" ہے مگر ملا صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کا پرانا دستور ہے۔

۱۳۹۔ عبارتے جعلی از شیخ ابن عربی قدس سرہ در کتاب کہنہ کرم خوردہ بخط مجہول نوشتہ کہ "صاحب زمان" زناں بسیار خواہد داشت و ریش تراش خواہد بود و مثلے چند کہ در "علامات آخر زمان" بود درج کردہ۔ (ص ۲۷۹ ج ۲)

۱۴۰۔ از مکہ معظمہ رسالہ از شرفا آوردہ کہ در احادیث صحاح مدت ہزار سال کہ مدت ایام دنیاست سپری شدہ حالا وقت ظہور مہدی موعود است و خود ہم رسالہ ترتیب دادہ و گذرانیدہ ۲۸۷۔

۱۴۱۔ در سال نہ صد و نود بر دار ندگہ باطل شخصے خواہد بود و ہم تعبیر از "صاحب دین حق" تشخیص کردہ بحساب جمل نہ صد و نود است ص ۲۷۸۔

۱۴۲۔ دریں سال شیخ مبارک در خلوت بادشاہ بیربر گفت کہ چنانچہ در کتب شما تحریفات است در دین ما نیز تحریفات بسیار رفتہ و اعتماد ے نماند ص ۳۱۲۔

۱۴۳۔ مدت ہزار سال از ہجرت تمام شد۔ ص ۳۱۲۔

۱۴۴۔ عقلا در ہمہ ادیان موجود و مہیا اند و ارباب ریاضات و کشف و کرامات در کل طوائف انام پیدا، و حق ہمہ جا دائر، پس انحصار آن در یک دین و یک ملت کہ نو پیدا شدہ و ہزار سال بر نگذشتہ باشد چہ لازم، و اثبات یکے و نفی دیگرے ترجیح بلا مرجح از کجا۔ ص ۲۵۶

۱۴۵۔ این ہمہ باعث دعوی نبوت شد اما نہ بلفظ نبوت بلکہ بعبارت آخر۔ ص ۲۸۷

۱۴۶۔ ناگاہ یک بار حالتے عجیب و جذبہ عظیم بر شہنشاہی وارد گشت و تغییر فاحش در وضع ظاہر شد بمثابہ کہ تعبیر از اں ممکن نبود ہر کدام ہر چیزے حمل می کردند۔ ص ۲۵۳

۱۴۷۔ این خبر در شرق و روئے ہند شہرت یافتہ اراجیف عجیب و اکاذیب غریب در افواہ عوام افتاد۔ ص ۲۵۳

۱۴۸۔ طرح عمارت عالی و باغ وسیع در آنجا انداختہ و زر بسیار بفقراء و مساکین دادہ۔

۱۴۹۔ موئے سر را قصر کردند۔

۱۵۰۔ انسان کامل را عبارت از خلیفۃ الزمان داشتہ تعبیر آن بذات اقدس نمودہ اکثر معین واجب لا اقل و لا اکثر آں فہمانیدہ۔ (منتخب التواریخ ص ۲۵۳)۔

۱۵۱۔ موئے سر و ریش را و بروت ستردہ لباس ماتم پوشیدہ و بعد و چند یک ہزار کس از امراء و منصبداران واحدی و شاگرد پیشہ بموافقت آنحضرت رخت مصیبت اختیار کردند (دیباچہ توزک جہانگیری ص ۱۵ مطبوعہ نولکشور)۔

۱۵۲۔ تاریخ ہندوستان ص ۸۵۳ ج ۵۔

۱۵۳۔ ایک دفعہ پیادہ پا باپ کی قبر کی زیارت کو گیا اور حسرت میں رہا کہ بسر و چشم نہ جا سکا۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ میرے والد ماجد میری پیدائش کے لئے آگرہ سے اجمیر تک کی طویل مسافت پیادہ پا طے کر کے گئے تھے۔ میں اتنا بھی نہ کروں (توزک ص ۲۷)۔ ایک جگہ لکھتا ہے۔ بملازمت پدر و مرشد و قبلہ و خدائے مجازی خود رسیدم (توزک ص ۳۱/۳)۔

۱۵۴۔ اوصاف حمیدہ والد بزرگوارم از حد توصیف و اندازہ تعریف افزوں است اگر کتابہا در اخلاق پسندیدہ ایشاں تالیف یابد بے شائبہ تکلف و قطع نظر از مراتب پدری و فرزندی اندکے از بسیار آں گفتہ نیاید۔ با وجود سلطنت و خزائن و دفائن بیروں از اندازہ حساب و قیاس و فیلان جنگی و اسپان تازی یکسر مو در درگاہ الٰہی از عجز و فروتنی قدم فراتر نہادہ و خود را کمترین مخلوقے از مخلوقات میدانستند و از یاد حق لحظہ غافل نبودند۔

۱۵۵۔ و تمام ہمہ جا (ص ۱۷ توزک جہانگیری) دوسرے موقع پر تحریر کرتا ہے۔ فکر باید کرد تا در خلوت و کثرت خاطر لحظہ از فکر و اندیشہ از عالی نباشد۔ والد بزرگوارم بلکہ باین معنی بہم رسانیدہ در ہیچ وقتے از یں اوقات ازیں فکر خالی بودند (ص ۲۹ توزک)۔

۱۵۶۔ پدرم را اکثر اوقات با دانایان ہر دین و مذہب صحبت می داشتند خصوصاً با پنڈتان و دانایان ہندو با آں کہ امی بودند از کثرت مجالست با دانایان و ارباب فضل در گفتگو با چناں ظاہر مے شد کہ ہیچ کس بے امی بودن ایشاں نمی برد و بدقائق نظم و نثر چناں مے رسیدند کہ مافوقے براں متصور نبود (توزک جہانگیری ص ۱۵)۔

۱۵۷۔ ارباب ملل مختلفہ را در وسعت آباد دولت بے بدل ایشاں جا بخلاف سائر ولایات عالم کہ شیعہ را بغیر از ایران و سنی را در روم و ہندوستان و توران جا نیست چنانچہ در دائرہ وسیع الفضاء رحمت ایزدی جمیع طوائف و ارباب ملل را جا است بمقتضاء آنکہ سایہ می باید کہ پرتو ذات باشد در ممالک محروسہ شاہی کہ ہر حدے بکنار دریا شور منتہی گشتہ ارباب ملتہائے مختلف و عقیدتہائے صحیح و ناقص را جا بود و راہ تعرض بستہ گشتہ سنی یا شیعہ در یک مسجد و فرنگی با یہودی در یک کلیسا طریق عبادت مے سپردند صلح کل شیوہ مقرر ایشاں بود۔ با نیکاں و خاباں ہر طائفہ و ہر دین و آئین صحبت مے داشتند و بقدر حالت و فہمیدگی ہر کدام التفات ہائے فرمودند۔ شبہائے ایشاں بہ بیداری میگذشت و در روزہا بسیار کم خواب بودند، چنانچہ مدت خواب ایشاں در شباں روزے از یک و نیم پہر زیادہ نبود و بیداری شبہا را بر زیادتی از عمرے دانستند ۱۲ ص ۱۷ و ص ۱۸ (توزک جہانگیری)

۱۵۸۔ ایک روایت میں ہے "السلطان ظل اللہ فی الارض" سلطان ملک میں خدا کا سایہ ہے۔ غالباً "سایہ" کے لفظ نے اسی طرف اشارہ

ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۱۵۹۔ از ریاضتے کہ والد بزرگوارم سے کشیدہ اند و یکے ترک غذائے حیوانی بود کہ در تمام سال سہ ماہ گوشت میل میفرمودند و نہ ماہ دیگر بطعام صوفیانہ قناعت میکردند و مطلق بہ قتل و ذبح حیوانات راضی نبودند و در ایام فرخندہ فرجام ایشاں در بسیارے از روزہا و ماہہا کشتن حیوانات منع عام بود و تفصیل ایام و شہور ے کہ مرتکب خوردن گوشت نمی شدند در اکبر نامہ داخل است۔ (توزک جہانگیری ص ۲۲)

۱۶۰۔ اگر لاسلکی، ریڈیو، براڈ کاسٹ، کروز، آبدوز کشتیوں، ہوائی جہازوں، راکٹوں اور فضائی اسٹیشنوں کا ذکر اکبر کے سامنے ہوتا تو وہ اسی طرح ان کا مذاق اڑاتا جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ معراج کا مذاق اڑایا کرتا تھا اور بدقسمتی یہ ہے کہ انسان آج بھی اسی گمراہی میں مبتلا ہے (معاذ اللہ)۔

۱۶۱۔ انا عرضنا الامانة علی السمٰوٰت والارض والجبال (الی قولہ تعالیٰ) انہ کان ظلوما جھولا۔

۱۶۲۔ فلا وربک لایؤمنون (الی قولہ تعالیٰ) ویسلموا تسلیما ۱۲

۱۶۳۔ ما اتٰکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا ۱۲

۱۶۴۔ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول ولا تبطلوا اعمالکم (پ ۲۶ ع ۴، سورۂ محمد)۔

۱۶۵۔ یعنی ہر ایک عمل کی قبولیت کے لئے شرط یہ ہے کہ خدا اور رسول خدا کے حکم کے موافق ہو۔

۱۶۶۔ ومن یشاقق الرسول من بعد ماتبین لہ الھدیٰ ویتبع غیر سبیل المؤمنین نولہ ماتولی ونصلہ جھنم وساءت مصیرا (پ ۵۔ النساء ۱۱۵)

۱۶۷۔ جہانگیر کو خطاب ہے۔ ۱۲

۱۶۸۔ کفار ہند بے تحاشا ہدم مساجد مے نمایند و در آنجا تعمیر معبد ہائے خودی سازند۔ در تھانیسر درون حوض کرکھیت مسجدے بود و مقبرہ عزیزے آں را ہدم کردہ بجائے آں دیرہ کلاں را بس ساختہ است و نیز کفار بر ملا مراسم کفر بجائی آرند و مسلمانان در اجراء اکثر احکام اسلام عاجز اند (مکتوب ۹۲ ج ۲ ص ۱۶۲)

۱۶۹۔ تھانیسر را بزرگ معبد برشمردند و دریا و سرتی نزد او بگرد و ہندی نژاد او را فراواں گرایش بود۔ و نزدیک آں کولابے ست "کرکھیت" نام از دور دستہا بہ نیایش آیند و تن شوئی کنند و خیرات برد ہند و آویزہ صاحب بصارت درا نجا شد در آپ۔ (آئین اکبری ص ۳۵ ج ۲)۔

۱۷۰۔ تہذیب ملاحظہ ہو۔ کافر کو عزیزے سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ محمد میاں

۱۷۱۔ روز اکادشی کہ ہنود ترک اکل و شرب مے نمایند و اہتمام وارند کہ در آں روز در بلاد اسلام ہیچ مسلمانے در روز نان نپزد۔ و در ماہ مبارک رمضان بر ملا نان و طعام مے پزند و مے فروشند ہیچ کس از زبونی اسلام منع آں نمے تواند نمود۔ افسوس صد ہزار افسوس ۱۲ (مکتوب نمبر ۹۲ ج ۲ ص ۱۹۲)۔

۱۷۲۔ عالم در دریائے بدعت غرق گشتہ است و بظلمات بدعت آرام گرفتہ کرا مجال است کہ دم از رفع بدعت زند و با حیاء سنت لب کشاید اکثر علماء ایں وقت رواج دہندۂ بدعت اند و محو کنندہ سنت (مکتوب نمبر ۵۴ ج ۲ ص ۱۰۳)۔

۱۷۳۔ عزیزے شیطان لعین را دید کہ فارغ نشستہ و از تضلیل و اغواء خاطر جمع ساختہ۔ آں عزیز سبب آں را پرسید لعین گفت کہ علماء سوء ایں وقت دریں وقت با من خود مدد عظیم کردند و مرا ازیں مہم فارغ ساختند۔ الحق دریں زمان ہر سستی و مداہنتی کہ در امور شرعیہ واقع شدہ و ہر فتورے کہ در ترویج ملت و دین ظاہر گشتہ ہمہ از شومی علماء است و فساد نیات ایشاں۔ (مکتوب نمبر ۳۳ ج ۱ ص ۴۷)

۱۷۴۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ والد ماجد کی عمر ۲۸ سال کی ہوگئی تھی۔ مگر کوئی لڑکا زندہ نہ رہتا تھا۔ لڑکوں کی زندگی کے لئے ہمیشہ درویشوں اور گوشہ نشینوں کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ جن کو بارگاہ الٰہی سے روحانی قرب حاصل ہوا کرتا ہے۔ چونکہ خواجہ بزرگوار حضرت خواجہ معین الدین چشتی اکثر اولیاء ہند کا سرچشمہ ہیں تو والد صاحب کے دل میں خیال آیا کہ اس مقصود کے حاصل کرنے کے لئے ان کے آستانہ پر حاضر ہوں، اور نذر مان لی کہ اگر خداوند عالم کوئی لڑکا عنایت فرمائے گا تو آگرہ سے درگاہ روضۂ منورہ تک پاپیادہ حاضر ہوں گا۔ چہارشنبہ ۱۷ ربیع الاول ۹۷۷ھ جب کہ سات پہر گزر چکے تھے اللہ تعالیٰ مجھ کو کتم عدم سے وجود میں

لے گئے۔ انہیں ایام میں جبکہ والد ماجد جویا فرزند تھے شیخ سلیم کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے۔ یہ ایک صاحب حال بزرگ تھے جو عمر کے بہت مراحل طے کر چکے تھے۔ موضع سیکری کے پاس ایک پہاڑ میں قیام پذیر تھے۔ ایک مرتبہ توجہ اور بے خودی کے دوران میں والد بزرگوار نے حضرت شیخ سے دریافت کیا کہ میرے کتنے لڑکے ہوں گے۔ حضرت شیخ: خداوند عالم تم کو تین لڑکے بخشے گا۔ والد ماجد: میں منت مانتا ہوں کہ سب سے پہلے لڑکے کو آپ کے دامن تربیت و توجہ میں ڈال کر آپ کی شفقت اور مہربانی کو اس کا محافظ و نگہبان بناؤں گا۔ حضرت شیخ: مبارک ہو۔ "ہم نے بھی اس کو اپنا ہمنام کیا"۔ اس کے بعد جب وضع حمل کے دن قریب آئے تو والدہ کو حضرت شیخ کے مکان پر بھیج دیا تا کہ میری ولادت اسی جگہ ہو اور پیدائش کے بعد میرا نام سلطان سلیم رکھا ۱۲ (توزک جہانگیری ص ۲ و ص ۳)

۱۷۵۔ توزک ص ۳۔

۱۷۶۔ ایک سفر میں خدام شاہی کو حکم دیا کہ جس قدر دیہات اور مواضعات راستے کے کناروں پر پڑیں، ان کے غربا اور بیوہ عورتوں کو جمع کر کے میرے سامنے لائیں۔ میں خود اپنے ہاتھ سے ان کو خیرات دوں گا میرا دل بہلے گا، ان کی مرادیں پوری ہوں گی۔ تاریخ ہندوستان ص ۲۷۰ جلد ۶۔

۱۷۷۔ تاریخ ہندوستان ص ۲۶۶ جلد ۶۔

۱۷۸۔ توزک جہانگیری ص ۵۔

۱۷۹۔ خالص سونے کی یہ زنجیر تھی جس کا ایک کنارہ قلعہ آگرہ کے "شاہ برج" پر تھا۔ اور دوسرا کنارہ گنگا کے دوسرے کنارہ پر پتھر کا ایک ستون نصب کر کے اس پر آویزاں کر دیا گیا تھا۔ (توزک ص ۵)

۱۸۰۔ عموماً قاعدہ تھا کہ لشکر یا حکام سفر میں باشندگان آبادی کے مکانات خالی کرا کر ان میں قیام کیا کرتے تھے خصوصاً برسات کے موقع پر ایسا عام طور سے کیا جاتا ہے۔ اسی کو نزول کہا جاتا تھا، جس کی ممانعت کر رہے ہیں ۱۲

۱۸۱۔ خدا کا شکر ہے کہ بعد کے بادشاہوں نے اس سنت پر عمل نہیں کیا۔ ورنہ رفتہ رفتہ ہفتہ کے تمام دنوں میں ذبح ممنوع ہو جاتا ۱۲

۱۸۲۔ اکبر کے عقیدے کے مطابق آفتاب کا نام اس قدر عزت سے لیتا ہے۔

۱۸۳۔ ایک مرتبہ بہت سے آدمیوں نے معافی خراج کی درخواست دے دی۔ امراء نے عرض کیا کہ حضور کی فیاضی اسی طرح جاری رہی تو سرکاری آمدنی صفر ہو جائے گی۔ جہانگیر نے جواب دیا کہ ہم تلمیذ لشکر دعا ہیں۔ امراء سلطنت پر لازم ہے کہ لشکر دعا کو بڑھائیں (ص ۲۶۳ تاریخ ہندوستان)

۱۸۴۔ توزک جہانگیری ص ۲

۱۸۵۔ سکہ کا منشا صرف یہ ہے کہ کھرے کھوٹے کی تمیز آسانی سے ہو سکے اور وزن معلوم ہو جائے۔ ہر وقت تولنے کی ضرورت نہ رہے۔ سونے یا چاندی کے وزن کے بموجب سکہ کی قیمت ہوتی ہے۔ اس سے زیادتی یہ بھی ظلم ہے جس کو شریعت نے سود قرار دیا ہے۔ سکہ چونکہ عام رواج کی چیز ہے لہٰذا سکوں کی زیادتی سے عام خوشحالی اور دولت کی فراوانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۱۲

۱۸۶۔ تاریخ ہندوستان ج ۶ ص ۲۶۹۔

۱۸۷۔ ایضاً ص ۲۶۶

۱۸۸۔ توزک ص ۲۵۴

۱۸۹۔ تاریخ ہندوستان ص ۲۶۷ ج ۶۔

۱۹۰۔ ایضاً ص ۲۷۰۔

۱۹۱۔ توزک ص ۲۹ نمبر یا ایشیائی۔

۱۹۲۔ لکھتا ہے تیجہ طبیعت بشکار شیر بگل ست کہ تا شکار آں میسر شد بہ شکار دیگر دستوری نے (توزک ص ۲۷۵)

۱۹۳۔ جہانگیر خود اس واقعہ کو لکھتا ہے۔ چوں شیران بنظر آمد نور جہاں بیگم از من التماس نمود کہ اگر حکم شود من شیران را بہ بندوق بزنم،

فرمودم کہ چنیں باشد، دو شیر را بہ بندوق و دوئی دیگر را بہ تیر یک دو تیر زدہ انداخت تا چشم برہم زدیم قالب ایں چہار شیر را بہ شش تیر از حیات پرداخت تا حال چنیں تفنگ اندازی مشاہدہ نہ شدہ بود۔ از بالائے فیل از درون عماری شش تیر انداختہ شود کہ یکے خطا نخورد و چہار ذی روح را فرصت جستن و حرکت جہیدن نیابند بہ جلدوئے ایں کمان داری ہزار اشرفی نثار نمودہ یک جفت پہنچی الماس کہ یک لک روپیہ قیمت داشت مرحمت نمودم ۱۲ (توزک جہانگیری ص ۱۸۶ و ص ۱۸۷)

۱۹۴۔ توزک میں لکھا ہے کہ میرے روبرو ۲۸۵۳۲ شکار ہوئے جن میں سے میں نے اپنے ہاتھ سے ۱۷۱۶۷ شکار مارے ۱۲ (تاریخ ہندوستان ص ۲۶۸)

۱۹۵۔ امور سلطنت اور ملک داری کے مشورہ میں زیادہ تر یہی ہے کہ اپنی رائے اور فہم پر عمل کرتا ہوں اور دوسروں کے صلاح و مشورہ سے زیادہ اپنی صلاح اور رائے کو بہتر جانتا ہوں ۱۲۔

۱۹۶۔ ایک فتح کی خبر سننے پر لکھتا ہے۔ چوں ایں اخبار مسرت آثار در آگرہ بایں نیاز مند درگاہ الٰہی رسید سجدات شکر بتقدیم رسانیدہ دفع و رفع ایں قسم عظیمے را محض از کرم بے دریغ واجب تعالیٰ دانست ۱۲ (توزک ص ۱۰۵)

۱۹۷۔ امید ہے کہ ساری زندگی ایسے کاموں میں صرف ہوگی جو خدا کو پسند ہوں اور کوئی سانس اس کی یاد کے بغیر نہ گزرے گا (توزک ص ۲۲۵)۔

۱۹۸۔ گفتم ایں پیکرہا کے شمار وسیلہ مقصود بسعیہ دتواتند بود (ص ۱۵ توزک جہانگیری)۔

۱۹۹۔ توزک جہانگیری ص ۱۵۲

۲۰۰۔ تعظیم نیرات را کہ مظاہر نور الٰہی اند بقدر درجات ہر یک باید نمود و موثر و موجد حقیقی در جمیع ادوار و اطوار اللہ تعالیٰ را باید دانست بلکہ فکر باید کرد تا خلوت و کثرت خاطر لمحہ از فکر و اندیشہ او را خالی نباشد ۱۲ (توزک ص ۲۹)

۲۰۱۔ تاروں کو نور الٰہی کا مظہر قرار دینا خام خیالی ہے۔ نور حق ہر ایک مشابہت اور چگونگی سے منزہ ہے البتہ قدرت الٰہی کا مظہر ضرور کہنا چاہیے مگر اس میں تاروں کی کوئی تخصیص نہیں ۱۲ محمد میاں عفی عنہ

۲۰۲۔ پوستہائے آہو شکار خاصہ فرمودم کہ جانماز ہا ترتیب دادہ، در دیوان خاص و عام نگہدارند کہ مردم بر آں نماز گزاردہ باشند ۱۲ توزک جہانگیری ص ۱۰۰۔

۲۰۳۔ خدا جانے جہانگیر نے جانمازوں کے لئے ہرنوں کی کھال کیوں منتخب کی۔ البتہ ہمارے خیال میں غیر شرعی ٹیکسوں سے حاصل شدہ روپیہ سے بنائی ہوئی جانمازوں کے مقابلہ میں یہ کھالیں بہت بہتر تھیں ممکن ہے اس کو یہی خیال ہوا ہو۔

۲۰۴۔ میر عدل و قاضی کہ مدار امور شرعیہ بر ایشاں ست بجہت خاص حرمت شرع فرمودم کہ زمین بوس کہ بصورت سجدہ ست نکنند (توزک ص ۱۰۰)۔

۲۰۵۔ صورتے دیدم از سنگ سیاہ تراشیدہ از گردن بالا بہیئت سر خوک و باقی شبیہ بہ بدن آدمی، عقیدہ ناقص ہنود آنست کہ یک وقتے بنا بر مصلحتے کہ رائے حکیم علیم اقتضا فرمودہ بدیں صورت جلوہ ظہور نمودہ است ایں صورت را بدیں جہت عزیز داشتہ پرستش می نمایند۔ فرمودم کہ آں صورت کریہہ را در ہم شکستہ در تالاب انداختند ۱۲ ص ۱۴۵۔

۲۰۶۔ چوں ایں مقدمہ بمسامع جاہ و جلال میر سید و بطلان او را بوجہ اکمل دانستم امر کردم کہ او را حاضر ساختند و مساکین و منازل و فرزندان او را بمرتضیٰ خاں عنایت نمودم و اسباب و اموال او را بقید ضبط در آوردہ فرمودم کہ او را۔

۲۰۷۔ گرفتن خود خوب۔ ابادادن نعوذ باللہ۔ فرمان شد کہ بعد ازیں پیرامون ایں امور نگردند و ہر کس کہ مرتکب ایں بدعت ہا شود او را سیاست کنند ۱۲ (توزک ص ۳۴۲)۔

۲۰۸۔ سر نیاز بدرگاہ کریم کارساز فرود آوردہ کوس نشاط و شادمانی بلند آواز گردید ۱۲ (توزک ص ۳۲۳)۔

۲۰۹۔ حکم کردم کہ قاضی و میر عدل و دیگر علماء اسلام در رکاب بودہ آنچہ شعائر اسلام و شرائط دین محمدی ست در قلعہ مذکورہ بعمل آورد۔ بتوفیق ایزد سبحان بانگ نماز و خواندن خطبہ و کشتن گاؤ وغیرہ کہ از ابتداء ایں قلعہ تا حال نشدہ بود۔ ہمہ را در حضور خود بعمل آوردم

سجدات شکر ایں موقع عظمیٰ کہ ہیچ پادشاہے توفیق برایں نیافتہ بود بتقدیم رسانیدہ حکم فرمودم کہ مسجد عالی درون قلعہ بنا نہند ۱۲ (تو زک ص ۲۳۶)۔

۲۱۰۔ حکم کردم کہ جمیع مشائخ وارباب سعادت را کہ دریں شہر توطن دارند حاضر سازند کہ در ملازمت افطار نمایند و مرشب بریں وتیرہ گزشت تا آخر مجلس خود بر سر پا استادہ بزبان حال سے گفتم خداوند گار را ناخ (توزک ص ۲۴۳)

۲۱۱۔ توزک ص ۱۳۸۔

۲۱۲۔ توزک ص ۲۲۹ و ص ۲۳۰۔

۲۱۳۔ توزک ص ۴۹۔ اصل عبارت پہلے نقل کی گئی۔

۲۱۴۔ توزک ص ۴۹۔ اصل عبارت پہلے نقل کی گئی۔

۲۱۵ دروقت ارادت اوروں مریداں چند کلمہ بطریق نصیحت مذکور ے گردد۔ باید کہ وقت خود را پد شمنی ملتے از ملتہا مکدر نہ کند و با جمیع ارباب ملل طریق صلح کل مرعی دارند و ہیچ جاندار بے را بدست خود نکشند۔ وسلاخ طبیعت نباشند مگر در جنگہا و شکار ہا

مباش در پئے بے جان نمودن جاندار ــــ مگر بعرصہ پیکار یا بوقت شکار

تعظیم نیرات را کہ مظاہر نور الٰہی اند بقدر درجات ہر یک باید نمود و موثر حقیقی و زجمیع ادوار و اطوار اللہ تعالیٰ را باید دانست بلکہ فکر باید کرد تا در خلوت و کثرت خاطر مجاز فکر و اندیشہ او خالی نباشد (توزک ص ۴۹)

۲۱۶۔ ملاحظہ ہو توزک ص ۲۴ وغیرہ

۲۱۷۔ توزک ص ۱۲۱

۲۱۸۔ توزک جہانگیری ص ۱۵ (طوالت کے باعث اصل عبارت درج نہیں کی گئی)

۲۱۹۔ دستور تھا کہ سالانہ وزن کیا جاتا تھا اور اس تقریب میں شاندار جشن ہوتا تھا پھر وہ سونا فقراء کو تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

۲۲۰۔ اول مرتبہ کسے کہ بمن شیر دادہ والدہ شیخ بایزید (نبیرہ شیخ سلیم) بود اما زیادہ از یک روز نیست۔ (توزک ص ۱۵)

۲۲۱۔ تاریخ ہندوستان ص ۲۶۳۔

۲۲۲۔ ان کی روحِ پرفتوح کی برکتوں سے بڑی بڑی فتوحات اس بلند خاندان (خاندانِ مغلیہ) کو حاصل ہوئی ہیں ۱۲۔ (توزک ص ۱۲۳)

۲۲۳۔ چوں قصہ دکبارات روضہ بزرگوار ظاہر گشت قریب یک کروہ را ہ را پیادہ طے کردم ۱۲ (توزک ص ۴۲۵)

۲۲۴۔ بعد از خوردن طعام بدست خود ہر یک از ورویشاں زرہا دادہ شد (توزک ص ۱۳۶)

۲۲۵۔ توزک جہانگیری ص ۱۳۲۔

۲۲۶۔ شیخ سلیم، والد کا نام شیخ بہاؤ الدین والدہ ولی باحد حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کی اولاد سے ہیں۔ سلسلہ نسب یہ ہے۔ شیخ سلیم پسر شیخ بہاؤ الدین پسر شیخ سلطان پسر شیخ آدم پسر شیخ مودود پسر شیخ بدر الدین پسر شیخ فرید الدین گنج شکر قدس اللہ اسرار ہم۔ شیخ فرید الدین گنج شکر قدس اللہ سرہ، حضرت شیخ معین الدین حسن سنجری چشتی اجمیری قدس اللہ سرہ کے خلیفۂ اعظم حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس اللہ سرہ کے خلیفہ ہیں۔

شیخ سلیمؒ ہندوستان میں شیخ اور عرب میں شیخ الہند کے خطاب سے مشہور ہیں۔ آپ کے والد ماجد شیخ بہاؤ الدین لدھیانہ کے باشندہ تھے۔ شیخ سلیم کی ولادت سے پہلے دہلی تشریف لے آئے اور سرائے علاؤ الدین زندہ پیر میں قیام کیا۔ بقول صاحب معارج الولایت ۸۸۴ھ میں اور بقول صاحب اخبار الاخیار ۸۷۷ھ میں شیخ سلیم پیدا ہوئے۔

کچھ عرصہ بعد شیخ بہاؤ الدین اہل وعیال کو لے کر فتح پور چلے آئے مگر یہاں پہنچ کر کچھ عرصہ بعد وفات ہوگئی۔ حضرت شیخ سلیم ابھی نابالغ ہی تھے کہ والد کے سایہ سے محروم ہو گئے۔ شیخ سلیم کے بڑے بھائی شیخ موسیٰ کے کوئی بچہ نہ ہوا تھا۔ انہوں نے اولاد سے بھی زیادہ نازبرداری کے ساتھ شیخ سلیم کی پرورش شروع کر دی۔ جب حضرت شیخ سلیمؒ جوان ہوئے تو آپ نے سفر کا قصد کیا۔ شیخ موسیٰ نے فرمایا کہ میری دلبستگی کا سامان تم ہی ہو تمہاری مفارقت مجھے گوارا نہیں۔ شیخ سلیم نے عرض کیا خدا آپ کو اولاد دے گا۔

تب تو آپ مجھے رخصت دے دیں گے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد بحکم خدا شیخ موسیٰ کے فرزند تولد ہوا، اور شیخ سلیم نے رخت سفر باندھا۔ شیخ سلیم مولانا مجد الدین کی خدمت میں سرہند حاضر ہوئے اور علوم ظاہری کی تحصیل میں مشغول ہوگئے۔ مولانا مجد الدین اپنے زمانہ کے ملک العلماء مشہور تھے۔ شیخ سلیم گاہ گاہ شیخ زین الدین چشتی کے مزار پر حاضری دیا کرتے تھے جو سرہند سے ایک کوس کے فاصلہ پر قصبہ بھدالی میں واقع ہے۔ ۹۳۱ھ میں حجاز مقدس کے سفر کے لئے روانہ ہوگئے۔ عرصہ دراز تک وہاں قیام رہا۔ متعدد حج ادا کئے اور مدت دراز تک حرم نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کے مجاور رہے۔ پھر دیگر ممالک اسلامیہ کی سیاحت کی اور بزرگان دین کی خدمت میں حاضر ہوکر استفادہ کیا۔ قطب العارفین شیخ ابراہیم چشتی سے بیعت کرکے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ سید محمد لودی، شیخ محمود شامی، شیخ رجب علی متولی روضۂ منورہ حضرت رسالت پناہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور دیگر شرفاء عرب حضرت سلیمؒ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے اور خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ کم و بیش سولہ ۱۶ سال کے بعد ہندوستان تشریف لائے اور سیکری کے پہاڑ پر گوشہ نشینی اختیار فرمائی۔ لیکن اب عوام کا رجحان شیخ کی طرف بہت کافی ہوا، اور اسی پہاڑی پر اچھی خاصی آبادی ہوگئی۔ شیخ سلیمؒ نے بھی اسی اثناء میں نکاح کیا۔ بابر کا حملہ، لودھی خاندان کی سلطنت کا خاتمہ، ہمایوں کا فرار، شیر شاہ سوری اور اس کی اولاد کی سلطنت اور پھر ہندوستان پر ہمایوں کا قبضہ یہ سب حضرت سلیمؒ کی زندگی میں ہوئے۔

سوری خاندان کے آخری دور یعنی شاہ سلیم کے زمانہ میں ہیمو نام ایک بقال نے جو دھوسر تھا مگر نہایت مدبر اور بہادر تھا، بادشاہ کا تقرب حاصل کیا حتیٰ کہ وزیر مال اور پھر شاہ محمد شاہ عدلی کے دور میں وزیر اعظم ہوگیا۔

ہیمو کی وزارت ہندوؤں کی دلداری کے لئے اگرچہ مفید تھی، مگر اس کا طرز عام رعایا کے لئے اچھا نہ تھا۔ حضرت شیخ سلیم قدس اللہ سرہ کو بھی اس سے اذیت پہنچی۔ حتیٰ کہ آپ نے ۹۶۲ھ میں دوبارہ سیاحت اختیار کی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ شاہ عدلی کی حمایت میں ہیمو مغلوں سے جنگ کر رہا تھا حتیٰ کہ ۹۶۵ھ میں آگرہ اور دہلی پر قبضہ کیا۔ اکبر جو صغیر السن تھا وہ بیرام خان کی اتالیقی میں لاہور میں جاکر پناہ گزیں ہوا، جہاں ہیمو کو شکست ہوئی اور پھر اکبر کا اقتدار عروج پر آیا۔ غالب یہ ہے کہ شیخ سلیم چشتی اس زمانہ کی سیاست سے علیحدہ نہ تھے۔ غالباً وہ مغلوں کے حامی تھے، اور بظاہر اکبر کی عقیدت مندی کا راز یہی ہے۔ اولیاء اللہ کے سوانح نگار ان بزرگوں کو سیاست سے علیحدہ رکھنے کی گویا جدوجہد کرتے ہیں، تاہم کچھ اشارات ضرور مل جاتے ہیں۔ چنانچہ شیر شاہ سوری کی وفات کے بعد اگرچہ اُس کا بیٹا عادل خان اُس کا ولی عہد تھا مگر اس کے دوسرے بیٹے عبدالجلیل عرف جلال خان نے ارادہ کیا کہ تخت سلطنت حاصل کرلے۔ اُس نے اپنا ایک معتمد شیخ سلیم کے پاس دعا کے لئے بھیجا۔ اگرچہ امراء دولت اور افسران فوج عادل خان کے ساتھ تھے مگر حضرت شیخ کا یہ کشف تھا یا سیاسی تجربہ اور ذکاوت کہ آپ نے معتمد کے ذریعہ کہلوا بھیجا کہ فوراً کام شروع کردو، مخالف موافق ہوجائیں گے، کارپردازان تقدیر بادشاہت تمہارے نام پر لکھ چکے ہیں۔

چنانچہ عبدالجلیل کامیاب ہوا۔ اپنا خطاب اسلام شاہ رکھا۔ عرف میں سلیم شاہ مشہور ہوا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ عادل خان عیاش، کم ہمت، کاہل وجود تھا۔ اُس کے برعکس اسلام شاہ سمجھدار اور تجربہ کار تھا۔ سلیم شاہ کے انتقال کے بعد بادشاہ کا سالا اپنے خردسال بھتیجے فیروز شاہ کو اپنی بہن کی آنکھوں کے سامنے (بہن کی ہزاروں منتوں اور خاجتوں کو پامال کرتے ہوئے) قتل کرکے بھتیجے کے تخت پر قابض ہوا۔ اُس نے اپنا خطاب محمد شاہ عادل رکھا جو شاہ عدلی کے نام سے مشہور ہوا۔ ہیمو نے اسی کے زمانہ میں وزارت عظمیٰ حاصل کی اور اسی کے زمانہ میں حضرت شیخ سلیم کو دوبارہ سیاحت اختیار کرنی پڑی۔

آپ کے ایک خلیفہ قاضی غیاث الدین قاضی ابراہیم آباد حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں بادشاہ سے ملنے جاتا ہوں۔ جناب والا کے طویلہ خاص میں جو عراقی گھوڑا ہے اگر وہ مرحمت ہوجائے تو بادشاہ کی نذر کردوں۔ حضرت شیخ نے فرمایا۔ گھوڑا لے جاؤ مگر بادشاہ کو نذر کرتے وقت یہ بتادینا کہ وہ اپنی سواری میں اس گھوڑے کو رکھیں۔ جس روز وہ کسی دوسرے کو دیں گے اُس روز اُن کے ملک کا زوال شروع ہوجائے گا۔ قاضی صاحب نے گھوڑا نذر کرتے وقت اپنے شیخ کا یہ مقولہ بھی نقل کردیا۔ بادشاہ نے اُس وقت تو منظور کرلیا، مگر اس کے بعد ایک خاص مقرب کی درخواست پر گھوڑا اس کے حوالہ کردیا۔ اسی روز سے تنزل شروع ہوگیا۔ حتیٰ کہ ۹۶۵ھ میں اکبر سے شکست کھانے کے بعد خضر خان مخاطب بسلطان بہادر سے لڑتا ہوا مارا گیا۔

سوانح نگاروں نے ان دونوں واقعوں کو صرف کرامت کی شکل میں لکھا ہے۔ مگر کیا تعجب ہے کہ ان کی تہ میں گہری سیاست بھی ہو۔
بہرحال حضرت شیخ چودہ سال بعد ہندوستان واپس تشریف لائے۔ یہ اکبر کے عروج کا زمانہ تھا۔ ایک مرتبہ سیکری پہاڑ پر جو مکانات اور باغات حضرت شیخ کے معتقدین وغیرہ نے بنالئے تھے، ان پر نظر ڈال کر حضرت شیخ نے فرمایا۔ اس پہاڑ پر عالیشان عمارتیں بنائی جائیں گی۔ اے لوگو! جس قدر رقبہ اپنے مکانات کے لئے گھیر سکو گھیر لو، پھر جگہ نہ ملے گی۔ اس ارشاد سے چند سال بعد اکبر بادشاہ نے اس مقام کو پایہ تخت بنانے کا حکم صادر کیا۔ شاہی محلات بننے کے بعد بھی آپ نے فرمایا جس عمارت کا نقشہ مجھے دکھایا گیا ہے وہ اب بھی نہیں بنی۔ آپ نے اپنے احباب کے سامنے اس نقشہ کی تفصیل بھی بیان کی۔ کچھ عرصہ بعد اکبر بادشاہ نے حضرت شیخ کے لئے عالی شان خانقاہ اور مسجد بنوانے کا حکم دیا۔ اس وقت یہ تعمیر بے نظیر مانی گئی۔ یہ عمارت اس نقشہ کے مطابق تھی جس کا انتظار حضرت شیخ کو تھا۔ ابتداء تعمیر کی تاریخ ''ثانی المسجد الحرام'' ۹۷۹ اور تاریخ اختتام'' خانقاہ اکبر'' ۹۸۰ ہوئی۔
حضرت شیخ سلیمؒ نے زندگی کا بیشتر حصہ تجرد میں گزارا۔ آپ آخر عمر تک ہمیشہ روزے رکھتے رہے کاسر اور بارہ چھ دل سے روزہ افطار کرتے تھے۔ روزانہ صبح کو ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے کی عادت تھی۔ سردیوں میں بھی باریک کپڑے ہی استعمال کرتے تھے۔ اہل حرمین کے طرز پر ہمیشہ نماز اوّل وقت میں ادا فرماتے تھے۔ بہت سے مخالف شرع اُمور کی اصلاح فرمائی۔ خلق اللہ کے رجوع کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے امراء حتیٰ کہ اکبر بادشاہ حاضر خدمت ہوتا۔ آپ کی بہت سی کرامتیں مشہور ہیں۔ جہانگیر نے تزک میں، مولانا غلام سرور چشتی نے خزینۃ الاصفیاء میں چند کرامتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ بروایت صاحب اخبار آپ نے ۲۳ حج کیے۔

سماع و سرود سے ذوق تھا۔ مشہور گویا ''تان سین'' اکبر بادشاہ کے حکم کے بموجب حاضر ہو کر اشعار سناتا تھا۔ روز پنجشنبہ ۲۹ رمضان المبارک ۹۷۹ھ حالت اعتکاف میں رحلت فرمائی اکبر بادشاہ نے عالی شان مقبرہ بنوایا جو سیکری میں اب تک تماشا گاہ خلائق ہے۔ (خزینۃ الاصفیاء صفحہ ۴۳۳ و اخبار الاخیار ص ۲۷۶ و تاریخ ہندوستان وغیرہ)
آپ کے دو فرزند تھے۔ شیخ احمد شیخ بدرالدینؒ آپ نے شیخ بدرالدین کو اپنا جانشین بنایا اور فرمایا کہ حضرت شیخ فریدالدین گنج شکرؒ نے بھی اپنے صاحبزادے بدرالدین ہی کو جانشین بنایا تھا ۱۲ (خزینۃ الاصفیاء ج ا ص ۴۳۵)۔ ایک خاص لطیفہ قابل لحاظ ہے۔ خزینۃ الاصفیاء میں حضرت شیخ سلیم کا سن ولادت اخبار الاخیار کے حوالے سے ۸۷۷ فارسی الفاظ میں درج ہے یعنی ہشت صد ہفتاد و ہفت۔ مگر اخبار الاخیار میں ہے فی سنۃ ثمان ماۃ و سبع و تسعین یعنی ۸۹۷ بظاہر کاتب نے سبعین ۷۰ کے بجائے تسعین ۹۰ لکھ دیا ہے۔ ۱۲ محمد میاں

۴۲۷۔ بجرم رقابت شیر افگن کو قتل کرانے کا افسانہ حریفوں کی من گھڑت کہانی ہے جو عرصہ کے بعد گھڑی گئی۔ مستند مؤرخین نے اس کی تردید کی ہے ۱۲۔

۴۲۸۔ نور جہاں کے باپ کا نام مرزا غیاث تھا۔ مرزا غیاث بیگ کے والد خواجہ محمد شریف طہرانی اولاً حاکم خراسان وزیر محمد خان تکلو کے وزیر تھے۔ اُن کی وفات کے بعد شاہ طہماسپ صفوی کی جانب سے ''مرو'' کے وزیر ہو گئے۔ والد کی وفات کے بعد مرزا غیاث ہندوستان میں اکبر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہاں ان کی قابلیت کی قدر کی گئی، اور بلند عہدہ اُن کو دے دیا گیا۔ معاملہ فہم، کارگزار اور اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز تھے۔ شعر و سخن سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ سرکاری کام سے فراغت کے بعد شعر و سخن ہی میں مشغول رہتے تھے۔ سخاوت اور حاجت روائی میں طرۂ امتیاز رکھتے تھے۔ مگر اسی قدر رشوت کے لینے میں بیباک اور بہت دلیر تھے (دیباچہ تزک جہانگیری ص ۳۱ شاہ طہماسپ صفوی وہی شاہ ایران ہیں جن کے یہاں ہمایوں نے جا کر پناہ لی تھی اور یہی خواجہ محمد شریف فرائض و آداب مہمان نوازی کے لیے شاہ طہماسپ کی جانب سے مقرر تھے (کمال السعادت وغیرہ)

۴۲۹۔ رفتہ رفتہ کار بجائے کشید کہ از پادشاہی بجز نامے نماند مکرر مے فرمود ند کہ من سلطنت را بنور جہاں بیگم ارزانی داشتم بجز یک سیر شراب و نیم سیر گوشت مرا ہیچ درکار نیست (اقبال نامہ جہانگیری مصنفہ معتمد خاں بخشی جہانگیر ص ۵۷۔ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ء و ص ۴۲ دیباچہ تزک جہانگیری)۔

۲۳۰۔ چندیں دعائے خیر در حق او کردم کہ از صد یکے آں با جابت مقرون گردد بجہت برخورداری دین و دولت او کافی ست ۱۲ (توزک ص ۲۷۷)۔

۲۳۱۔ آصف خاں کی لڑکی شاہجہاں سے منسوب تھی۔ جس کا خطاب ممتاز محل تھا۔ جو اپنی قابلیت، وفاشعاری، حسن اخلاق کے باعث شاہجہاں کی محبوب ترین بیگم تھی۔ جس کی وفات کے صدمہ میں بادشاہ کی داڑھی قبل از وقت (۳۸ سن کی عمر میں) سفید ہوئی۔ تاج محل کا روضہ اسی پاک محبت کا نقش آب دار ہے جس کی نظیر سے دنیا خالی ہے۔ آصف خاں شاہجہاں کا حامی تھا۔ یہ رشتہ بھی حمایت کا سبب تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ شاہجہاں کی ذات ستودہ صفات ہر ایک بہی خواہ ملک اور مدبر کو اپنی حمایت پر مجبور کر دیتی تھی۔ ۱۲۔

۲۳۲۔ مکتوبات بحوالہ حالات نقشبند ص ۱۹۸

۲۳۳۔ شیخ احمد نام شیادے در سرہند دام زرق و سالوس فرو چیدہ بسیارے از ظاہر پرستان بے معنی را صید خود کردہ و بہر شہرے و دیارے یکے از مریدان خود را کہ آئین دکان آرائی و معرفت فروشی و مردم فریبی را از دیگراں پختہ تر داند خلیفہ نام نہادہ فرستادہ و مزخرفے چند کہ بمریدان و معتقدان خود نوشتہ کتابے فراہم آوردہ مکتوبات نام کردہ (توزک ص ۲۷۲ و ص ۲۷۳)

۲۳۴۔ جس شخص کو پورب کی طرف جانا ہے وہ پچھم کی طرف رخ کر کے خواہ کتنا ہی تیز دوڑے، منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا سنت رسول اللہ صراط مستقیم ہے اور اس کے ماسوا گمراہی۔ سنت رسول اللہ کو چھوڑ کر جو جدوجہد کی جا رہی ہے وہ گمراہی کو بد سے بدتر اور تاریک تر بنا رہی ہے ۱۲ محمد میاں عفی عنہ

۲۳۵۔ مثلاً حجر اسود (سنگ اسود) کو بوسہ دینا بظاہر کفر ہے مگر ایک کامل یعنی رسول اللہ کا حکم ہے لہٰذا فرض ہے ۱۲ اسی طرح رمل، رمی جمار بلکہ خود استقبال قبلہ وغیرہ۔

۲۳۶۔ ملاحظہ فرمائیے اکبر اور جہانگیر کے خیالات و عقائد میں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

۲۳۷۔ قلب ہر وقت یاد خدا میں مشغول رہے، اس کو نسبت کہا جاتا ہے۔ اس میں بے انتہا ترقی پذیر مدارج ہیں۔ واللہ اعلم

۲۳۸۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ انسان کو فطری الہام کے ذریعہ سے یہ چیزیں بتائی گئیں۔ (حجۃ اللہ)۔ فطری الہام اگرچہ انبیاء کے ساتھ مخصوص نہیں مگر الہام کرنے والے کا ضرور محتاج ہے ۱۲۔ محمد میاں

۲۳۹۔ اذ دو کے لئے نقل کی جاتی ہیں۔ في الفتاوى السراجية كره التطوع بالجماعة بخلاف التراويح وصلوة الكسوف، وفي الفتاوى الغياثية قال شيخ الاسلام السرخسي التطوع بالجماعة خارج رمضان انما يكره اذا كان على سبيل التداعي اما اذا اقتدى واحد او اثنان لا يكره، وفي الثلاث اختلاف وفي الاربع يكره بلا خلاف وذكر في الخلاصة التطوع بالجماعة اذا كان على سبيل التداعي يكره اما اذا صلوا بجماعة بغير اذان واقامة في ناحية المسجد فلا يكره۔ وقال شمس الائمة الحلواني اذا كان سوى الامام ثلاثة لا يكره بالاتفاق وفي الاربع اختلاف والاصح مكروه في الفتاوى الشامية ولا يصلي التطوع بالجماعة الا في شهر رمضان وذلك انما يكره اذا كان على سبيل التداعي يعني باذان واقامة اما لو اقتدى واحد او اثنان على سبيل التداعي فلا يكره واذا اقتدى ثلاثة اختلف المشائخ فيه وان اقتدى اربعة يكره اتفاقاً وامثال اين روايات بسيار ست۔ (مکتوب ۲۸۸ جلد اول)

۲۴۰۔ در ہندوستان چہاردہ سلسلہ برگزارند و آں را چہاردہ خانوادہ نامند۔ ۱: حبیبیان ۔ ۲: طیفوریان ۔ ۳: کرخیان ۔ ۴: سقطیان ۔ ۵: جنیدیان ۔ ۶: کازرونیان ۔ ۷: طوسیان ۔ ۸: فردوسیان ۔ ۹: سہروردیان ۔ ۱۰: زیدیان ۔ ۱۱: عیاضیان ۔ ۱۲: ادہمیان ۔ ۱۳: ہبیریان ۔ ۱۴: چشتیان

گویند حضرت امیر المومنین علیؓ را چہار خلیفہ بود۔ حسن۔ حسین۔ کمیل۔ حسن بصری۔ سرچشمہ سلاسل حسن بصری را دانند و او دو خلیفہ داشت حبیب عجمی کہ نہ گلشن از و جوش معرفت زدند۔ دیگر عبد الواحد بن زید (پنج سلسلہ از و سیراب دین شدند)۔ (آئین اکبری جلد

سوم ص ۱۰۵)

۴۴۱۔ بدعت کی تعریف علماء نے یہ فرمائی ہے۔ ما احدث علی خلاف الحق المتلقی من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قول وفعل بنوع شبهة او استحسان ثم جعل دینا قویما وصراطا مستقیما (شرح نقایہ وغیرہ) باب من یجوز الاقتداء بہ ومن لا یجوز بہ۔ یعنی وہ قول یا عمل جو کسی سنت کے خلاف کسی شبہ یا ظاہری خوبصورتی کی بناء پر ایجاد کر کے جزو دین بنالیا گیا ہو اور اس کو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھا گیا ہو۔ مختصر یہ کہ ہر ایسا کام بدعت ہے جو دین کا کام سمجھا جاتا ہو اور اس کا کوئی شرعی ثبوت موجود نہ ہو۔

۴۴۲۔ گفتہ اند کہ بدعت بر دو قسم است۔ حسنہ وسیئہ۔ حسنہ آں اعمال نیک را گویند کہ بعد از زمان آں سرور و خلفاء راشدین پیدا شدہ باشد و رفع سنت نہ نماید۔ وسیئہ آں کہ رافع سنت باشد۔ ایں فقیر در ہیچ بدعتے از ایں بدعتہا حسن و نورانیت مشاہدہ نمی کند و جز ظلمت و کدورت احساس نے نماید۔ اگر فرضاً عمل مبتدع را کہ امروز بواسطہ ضعف بصارت بطراوت و نضارت بیند فردا کہ حدید البصر گردند دانند کہ جز خسارت و ندامت نتیجہ نداشت

(بیت) بوقت صبح شود ہمچو روز معلومت ۔ کہ باکہ باختہ عشق در شب دیجور

سید البشر مے فرمایند علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والتسلیمات، من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهو رد۔ چیزے کہ مردود باشد حسن را از کجا پیدا کند۔

۴۴۳۔ یعنی مضبوطی سے اس پر قائم ہو جائے ۱۲

۴۴۴۔ سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اپنے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کے مکاشفات کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ایک مرتبہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار اقدس پر حاضر ہوئے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ مزار مبارک کے قریب ایک چبوترہ ہے۔ اس خیال سے کہ اس وجود ملوث کو مزار قدس کے مبارک مقام پر نہ لے جانا چاہیے، میں اسی چبوترہ پر کھڑا ہو گیا۔ وہیں حضرت شیخ کی روح پر فتوح ظہور فرما ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ چار فرشتے ایک تخت لئے ہوئے آسمان سے اترے اور حضرت شیخ کی قبر کے پاس اس کو رکھ دیا۔ اس تخت پر حضرت خواجہ نقشبند قدس اللہ سرہ رونق افروز تھے۔ دونوں بزرگوں کے درمیان راز کی باتیں ہونے لگیں، جن کو میں نہیں سن سکا۔ اس کے بعد فرشتے تخت اٹھا کر آسمان کی طرف روانہ ہو گئے۔ حضرت خواجہ قطب الدین میری طرف متوجہ ہوئے۔ اپنے قریب بلایا۔ پھر ارشاد فرمایا۔ شعر کے متعلق تم کیا کہتے ہو۔ میں نے کہا۔ کلام حسنه حسن وقبیحه قبیح۔ یعنی ایک قسم کا کلام ہے، جس طرح ایک جملہ یا فقرہ اچھا بھی ہو سکتا ہے برا بھی، اسی طرح شعر بھی اچھا بھی ہو سکتا ہے برا بھی۔ حضرت خواجہ نے فرمایا، بارک اللہ۔ اس کے بعد دریافت فرمایا۔ اچھی آواز کے متعلق کیا خیال ہے۔ میں نے کہا۔ یہ خدا کا انعام ہے وہ جس کو چاہے اپنا انعام بخش دے۔ حضرت خواجہ نے فرمایا۔ بارک اللہ۔ پھر فرمایا، اگر کسی شخص کو یہ دونوں میسر ہو جائیں۔ میں نے عرض کیا، نور علی نور یهدی الله لنوره من یشاء۔ ارشاد ہوا۔ بارک اللہ۔ اس کے بعد خواجہ نے فرمایا۔ ہمارا کام صرف یہی تھا۔ تم نے کبھی کبھی یہ شعر سن لئے ہوں گے۔ میں نے عرض کیا۔ آپ نے حضرت خواجہ کے سامنے یہ کیوں نہیں فرمایا۔ جواب دیا۔ خلاف ادب تھا۔ (انفاس العارفین مصنفہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ص ۴۴)۔

یہ واقعہ شاہد ہے کہ اختلاف صرف اس میں ہے کہ مراقبہ، ذکر، پاس انفاس وغیرہ کی طرح اچھی آواز کے ساتھ کیف آور اشعار پڑھ لینے یا اشعار سننے کو روحانی ترقی کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ باقی ان اکابر کے متعلق یہ وہم بھی سراسر گستاخی ہے کہ رقص و سرود جو بالاتفاق علماء حرام ہے۔ اس کو روحانی ترقی کا ذریعہ قرار دیتے تھے (معاذ اللہ) حضرت مرزا مظہر جان جاناں کا فیصلہ آگے آئے گا۔ محمد میاں عفی عنہ

۴۴۵۔ لہو الحدیث یعنی ایسی بات جو یاد خدا سے غافل کر دے ۱۲ منہ

۴۴۶۔ ناول یا طلسم ہوشربا جیسے افسانے اور ڈرامے وغیرہ بھی اس میں داخل ہیں ۱۲

۲۴۷۔ وہ مسلمان جو خدا کی بارگاہ میں کامیاب ہیں اُن کے اوصاف کے سلسلہ میں یہ آیت وارد ہوئی ہے۔۱۲

۲۴۸۔ خلفاء عباسیہ کے زمانہ میں تو الٹے والی باندیاں قرآن شریف کی قراءت بھی سیکھا کرتی تھیں اور جس طرح فی زمانہ خوش طبعی کی مجلس میں گراموفون پر قراءت کا ریکارڈ بھی سن لیا کرتے ہیں، یہ لوگ بھی گانے کی محفل میں قراءت سنا کرتے تھے۱۲۔ ظاہر ہے کہ خوش طبعی کی محفل میں کلام اللہ پڑھنا کلام اللہ کی توہین ہے معاذ اللہ۔ جو تجوید یا قراءت آج کل قاری صاحبان سکھاتے ہیں وہ صرف مخارج کی تصحیح اور قراءتوں کے اختلافات کے متعلق ہے، اس کو گانے سے کوئی واسطہ نہیں۔ گانا دوسری چیز ہے۔ اُس کی ادائگی کا طرز بھی جدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک طریقہ وہ ہے کہ ہم کسی اردو شعر کو اچھی آواز سے پڑھ دیں لیکن قوال یا موسیقی کا ماہر اس کو دوسری طرح خاص خاص زیروبم اور آواز کی بلندی و پستی کے ساتھ پڑھے گا یہی فرق قراءت اور گانے میں ہے۱۲ محمد میاں

۲۴۹۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں اس شیخ طریقت کی اپنی چیز کوئی نہیں۔ بلکہ رسول اللہؐ کی وہی سنت اور وہی تعلیم ہے جو جملہ خیر و برکات کا خزانہ ہے۔ یہ شیخ اس کا نمونہ تھا لہٰذا صاحب برکت ہوا۔ جو اس نمونہ کی اتباع کرے گا، اس برکت سے حصہ پائے گا۔ برکتیں خاص اس شیخ کی نہیں، بلکہ اس سنت مبارک اور ملت شریف کی برکتیں ہیں جن کی وجہ سے یہ شیخ طریقت بابرکت ہوا (واللہ اعلم بالصواب)

۲۵۰۔ شیخ کامل سنت رسول اللہؐ میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا، ورنہ وہ خود مردود ہوگا اور نص حدیث کے بموجب حوض کوثر سے محروم۔ چنانچہ (رسول اللہؐ) فرماتے ہیں کہ حوض کوثر سے کچھ آدمیوں کو ہٹایا جائے گا۔ میں کہوں گا کہ یہ تو بظاہر میرے آدمی ہیں۔ جواب دیا جائے گا۔ آپ کو خبر نہیں، ان لوگوں نے کیا کیا تبدیلیاں پیدا کردی تھیں۔ میں کہونگا، دور ہوں دور ہوں (مسلم شریف وغیرہ) البتہ کبھی کسی غلط فہمی کی بنا پر اور کبھی اتفاقی طور سے اُس سے لغزش ہو جاتی ہے۔ پابند شریعت کا فرض یہ ہے کہ لغزش کو لغزش قرار دے۔ مگر کور باطن سجادہ نشین شیخ کو انبیاء کی طرح معصوم سمجھ کر اس لغزش ہی کو اس سلسلہ کا طرۂ امتیاز گردان لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔۱۲

۲۵۱۔ غریب "پردیسی اور اجنبی کو کہتے ہیں اور اجنبی ہونے سے مطلب یہ ہے کہ اُس کے عامل اور واقف بہت کم تھے۔ چنانچہ پوری دنیا کے اربوں انسانوں میں صحابہ کرامؓ کی مختصری جماعت روح اسلام کی حامل و تعلم اسلام کی عالم و عامل تھی:۔ یہی شان پھر ہو جائے گی۔ مطلب یہی رہا کہ اگرچہ آخر میں عام مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگی مگر اسلام کی حقیقی روح کے عامل و حامل بہت کم ہوں گے۔ اور وہ اس بھیڑ میں ناجنس اور پردیسی سے معلوم ہوں گے۔ پس ایسے لوگوں کو مبارکباد جو اسلام کی خاطر نامانوس اور اجنبی بن جائیں اور دنیاداروں کی نظروں سے گر جائیں۔

۲۵۲۔ سنہ ہجری کا آغاز ہجرت کے سال سے ہوتا ہے۔ اور ہجرت سے دس سال بعد گیارہویں سال رسول اللہؐ کی وفات ہوئی (واللہ اعلم)۔

۲۵۳۔ مکتوبات شریف میں اس حقیقت کو بار بار واضح کیا ہے کہ ایک ہزار سال پیشتر شان احمدی کا ظہور تھا اور ایک ہزار سال بعد شان محمدی کا ظہور ہوا ہے، جو پہلے سے مقابلہ میں بہت زیادہ مکمل ہے۔ اگرچہ دیگر انبیاء کے مقابلہ میں ہر ایک شان کامل اور مکمل ہے۔ فرماتے ہیں عیسیٰؑ کی بشارت قرآن پاک میں احمد کے نام سے نقل کی گئی ہے یاتی من بعدی اسمہ احمد۔ کیونکہ ابتداء اسی شان کا ظہور ہوا۔ یہ مضمون نہایت دقیق ہے اور بہت سے مکاتیب میں اس کو سمجھایا گیا ہے۔ اور پھر اپنے وجود کو شان محمدی کے ظہور کا پرتو قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

۲۵۴۔ کافر فرنگستان سے اسقدر نفرت جبکہ فرنگستان سے ہندوستان کو کوئی تعلق بھی نہ تھا۔

۲۵۵۔ مخدوما! بخاطر فقیر مے رسد ایں باب مطلق نہ کنند، بوالہوساں ممنوع را میسر دہند۔ اگر اندک تجویز کردند بہ بسیار خواہد شد۔ قلیلہ یفضی الی کثیرہ قول مشہور است (مکتوب ۲۷ جلد ۱)

۲۵۶۔ قل لا اسئلکم علیہ اجراً الا المودۃ فی القربیٰ

۲۵۷۔ اللہ اللہ فی اصحابی (الحدیث)

۲۵۸۔ بادشاہ نسبت بعالم در رنگ دل ست نسبت بہ بدن۔ اگر دل صالح ست بدن صالح ست۔ واگر دل فاسد است بدن فاسد۔ بصلاح بادشاہ صلاح عالم ست وبفساد او فساد عالم (ص ۴۷ جلد اوّل ص ۶۵ نیز مکتوب نمبر ۴۷ جلد دوم ص ۱۳۵ وغیرہ میں یہی مضمون الفاظ کی معمولی تبدیلی کے ساتھ تحریر فرمایا گیا ہے ۱۲

۲۵۹۔ مقامات امام ربانی وغیرہ۔

۲۶۰۔ کوئی مستحسن فعل خواہ کتنا ہی عظیم الشان کیوں نہ معلوم ہوتا ہو، لیکن اگر اس کے لئے کسی فرض کو چھوڑا جا رہا ہے تو منکر اور وجدوجان کے پیش نظر ممکن ہے اس کو سواف رکھا جائے مگر شریعت غرا کے اصول کے بموجب وہ اتباع نفس اور ہوا پرستی ہوگا۔ مثلاً کوئی شخص جماعت چھوڑ کر گھر میں اس لئے نماز پڑھتا ہے کہ اس کا دل تنہائی میں زیادہ لگتا ہے تو اس کو وسوسہ شیطانی اور نفس پرستی کہا جائے گا۔ اس موقعہ پر اس مستحسن اور دل پسند چیز کا ترک ہی نفس کشی اور تقویٰ اور ریاضت ہوگا۔ بظاہر یہی نکتہ ہے جو فسخ ارادہ کا سبب بنا۔ البتہ اس موقعہ پر ایک خاص روایت کا پیش کرنا غیر مناسب نہ ہوگا جو حالات مشائخ نقشبندیہ سے نقل کی جاتی ہے۔
ایک مرتبہ حضرت کو زیارت بیت اللہ کا شوق حد سے زیادہ ہوا۔ ایک روز اسی بیقراری میں آپ نے دیکھا کہ تمام جنات انس نماز پڑھ رہے ہیں، اور سجدہ حضرت کی جانب کر رہے ہیں۔ حضرت اس معاملہ سے بہت زیادہ متحیر ہوئے اور کشف کے طور پر اس کی حقیقت دریافت کرنی چاہی۔ معلوم ہوا کہ کعبہ معظمہ آپ کی ملاقات کے واسطے آیا ہے اور اس نے آپ کا احاطہ کر رکھا ہے۔ لہٰذا جو شخص کعبہ کو سجدہ کرتا ہے وہ آپ کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ اسی اثناء میں الہام ہوا کہ تو ہمیشہ زیارت کعبہ کا مشتاق رہتا تھا لہٰذا ہم نے کعبہ کو تیری زیارت کے لئے بھیج دیا۔ بہرحال یہ برکت ہے اسی ایثار اور قربانی کی کہ اصول شریعت کے بموجب فرض و مستحب کا فرق قائم کر کے منشاء شریعت کی اتباع کی گئی۔ سچ ہے جس نے خود کو خداوندی مرضیات پر قربان کر دیا، ساری خدائی اس کا احترام کرتی ہے۔ من کان للہ کان اللہ لہ وقال اللہ تعالیٰ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۲۶۱۔ اکبر کے مرض وفات میں سب سے پہلے جہانگیر کی ملازمت اختیار کی اور پھر تخت نشینی کی جدوجہد میں جہانگیر کے بازوئے راست رہے اور ملازمت میں پیش دستی کے سبب سے ان کو "صاحب السیف والقلم" کا خطاب شمشیر مرصع، خلعت و دوات و قلم مرصع اور ایک لاکھ روپیہ عطا ہوا۔ (تاریخ ہندوستان ص ۲۸۵ ج ۶)

۲۶۲۔ بہر شہرے و دیارے یکے از مریدان خود را کہ آئین دکان آرائی و معرفت فروشی و مردم فریبی از دیگراں پختہ تراند خلیفہ نام نہادہ فرستادہ ۱۲ (تو زک ص ۲۷۵)۔

۲۶۳۔ اکبر بادشاہ کے مشہور اتالیق بیرم خاں کے خلف رشید تھے۔ ۷۲ سال کی عمر پا کر ۱۰۳۶ھ میں انتقال ہوا۔ سندھ اور گجرات وغیرہ کو فتح کیا۔ بیرم خاں اگرچہ امامیہ تھے مگر خانخاناں سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت تھے۔ حضرت مجدد صاحب اپنے مکاتیب میں اسی طرح تنبیہ اور ہدایت فرماتے ہیں جیسے اپنے مرید کو۔ خان خاناں نے کسی خط میں فقراء کے ساتھ اپنے حسن سلوک کا بیان اس انداز سے کیا تھا جس سے استغناء اور برتری مترشح ہوتی تھی۔ حضرت مجدد صاحب مکتوب ۶۸ جلد اول میں تنبیہ فرماتے ہیں۔ "دولت مندوں کے لئے تواضع زیبا ہے اور اہل فقر کے لئے استغناء اور بے نیازی۔ کیونکہ علاج ضد سے ہوا کرتا ہے۔ آپ کے خطوط سے استغناء مترشح ہوتا ہے اگرچہ آپ کا منشا تواضع ہے (مگر طرز تحریر مناسب نہیں)...... ایک سطر بعد تحریر فرماتے ہیں۔" بیشک فقراء کی خدمت بہت کی ہے مگر ان کے آداب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے تاکہ اس خدمت کا ثمرہ حاصل ہو سکے۔ اتقیاء امت تکلفات سے بری ہیں۔ وہ متکبرین کے مقابلہ میں تکبر کیا کرتے ہیں" (ملخصاً) مکتوب ۶۸ ص ۸۵۔ جلد اول۔ بہرحال اہل علم و تقویٰ کی بہت خدمت کرتے تھے۔ شعراء کی بھی ایسی ہی قدر کرتے تھے۔ کئی مرتبہ سونے سے تول کر کچھ شعراء کو انعام دیا۔ ایک مرتبہ جہانگیر سخت خفا ہو گیا اور خانخاناں کو بھی اپنے حالات سے مجبور ہو کر دربار میں حاضر ہونا پڑا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جہانگیر فوراً خانخاناں کو قتل کرا دے گا۔ خان خاناں نے حضرت مجدد صاحبؒ سے دعا کی درخواست کی۔ خدا کے فضل سے تمام خطرات رفع ہو گئے اور خان خاناں کو موت کے بجائے خلعت ملا ۱۲ ملخصاً

۲۶۴۔ "موت اکبر" کے ماتحت لکھا جا چکا ہے کہ وفات کے وقت اکبر نے میران صدر جہاں کو بلوا کر کلمۂ شہادت پڑھوایا اور خود بھی کلمۂ شہادت پڑھا اور پھر صدر جہان کو سرہانے بٹھا کر سورۂ یٰسین اور دعاء عدیلہ پڑھنے کی فرمائش کی۔ جن کے ختم پر بادشاہ نے جان تسلیم کی ۱۲۔

۲۶۵۔ علماء کلام بدعتی کے لفظ سے عموماً اہل شیعہ یا خوارج مراد لیتے ہیں۔

۲۶۶۔ نواب صاحب سید ہیں ۱۲

۲۶۷۔ مالاوذی نبی مثل ما اوذیت ۱۲

۲۶۸۔ ملا عبدالقادر بدایونی اُن سے ناراض ہیں فرماتے ہیں کہ اکبر کے حکم کے بموجب انہوں نے داڑھی کٹوا دی تھی (ان کا بیان پہلے گزر چکا ہے)۔ قصبہ پہانی ضلع ہردوئی میں پیدا ہوئے فرباء کو اُن سے بہت فائدہ پہنچا۔ ۱۰۲۲ھ میں ایک سو بیس برس کی عمر پا کر انتقال کیا مگر ہوش وحواس میں کوئی خرابی نہیں آئی تھی۔ ابتداء میں شعر کہتے تھے مگر متقی ہونے کے بعد شعر کہنے چھوڑ دیے۔ (ص ۴۸۹ تاریخ ہندوستان جلد ۵)۔

۲۶۹۔ خان اعظم۔ اصلی نام مرزا عزیز۔ پسر شمس الدین آتکہ۔ اکبر کا دودھ شریک بھائی تھا۔ جی جی بیگم والدہ خان اعظم کی خاطر داری بادشاہ اپنی حقیقی ماں سے بھی زیادہ کرتا تھا۔ ۱۰۰۸ھ میں جی جی بیگم کا انتقال ہوا تو اکبر نے تابوت کو کندھوں پر اُٹھایا، اور پھر سوگ میں داڑھی اور مونچھوں کے بال منڈوائے۔ بہت سے اُمراء دولت نے بھی بادشاہ کی ہمدردی میں بادشاہ کی اتباع کی۔

مرزا عزیز، اکبر کے ساتھ کھیلا تھا۔ اسی وجہ سے اکبر سے بے تکلف اور بہت زیادہ بیباک اور آداب شاہی سے نا آشنا تھا۔ اکبر کہا کرتا تھا کہ میرے اور عزیز کے درمیان "جوئے شیر" حائل ہے جس کو میں عبور نہیں کر سکتا۔

مرزا عزیز کو اکبر کی مذہبی بدعتیں ناپسند تھیں۔ چنانچہ اُس نے بادشاہ کے پاس جانا چھوڑ دیا تھا اور اپنے متعلقہ صوبہ میں ہی رہتا تھا۔ ۳۹ جلوس میں اکبر نے ملاقات کے لئے بلایا تو اُس نے صاف صاف لکھ دیا کہ عثمانؓ اور علیؓ کے بجائے آپ نے ابوالفضل اور فیضی کو مقرر کیا ہے۔ شیخین کی جگہ کس کو مقرر فرمائیں گے۔ اس کے بعد بادشاہ کی اطلاع کے بغیر حج کو روانہ ہو گیا (اس کا قصہ رقعات ابوالفضل میں ہے)۔

مشہور ہے کہ حرمین شریفین میں بہت سا روپیہ صرف کیا۔ روضۂ مبارک کا پچاس سالہ خرچ یک مشت شریف کو دیا۔ ۱۰۰۳ھ میں حج سے واپس ہوا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ واپسی حج کے بعد اکبر کا مرید ہو گیا۔ مگر اس کے باوجود اکبر کی وفات کے بعد اس کی ایک تحریر پکڑی گئی جس میں اکبر کے پوست کندہ حالات درج تھے۔ جن کے متعلق جہانگیر کہتا ہے "از خواندن دو دیدن از مو برا اعضائے من راست شد"۔ مرزا عزیز کو حکم ہوا کہ اپنی اس تحریر کو پڑھ کر سب کو سنا ئیں۔ جہانگیر کو خیال تھا کہ اس تحریر کے دیکھتے ہی خوف کے مارے مر جائے گا۔ مگر اُس نے نہایت دلیری سے تمام تحریر سنائی۔ بہر حال گفتگو میں بہت بیباک تھا۔ طبیعت ذکی پائی تھی۔ تاریخ، خط نستعلیق اور مدعا نویسی میں کمال حاصل تھا۔ رنگین سخن، شعر کا شوقین تھا۔ ۱۰۳۳ھ میں جہانگیر کی وفات سے تین سال پہلے انتقال ہوا۔ خان اعظم کی بہن خان خاناں سے منسوب تھی۔ ۱۲ (خلاصہ)

۲۷۰۔ لن یؤمن احدکم حتی یقال انہ مجنون ۱۲

۲۷۱۔ قلیج خاں اندجانی۔ اندجان ضلع فرغانہ دریائے جیحوں کے جنوب میں ہے۔ سلاطین چغتائیہ کی خدمت میں اس کے باپ دادا کارہائے نمایاں کرتے رہے ہیں۔

قلیج خاں اکبر کا بہترین جرنیل تھا۔ ۱۷ جلوس اکبری میں سورت کے مضبوط قلعہ کو (جس کی بنیاد میں لوہا اور شیشہ بھرا گیا تھا) ایک ماہ سترہ روز میں فتح کر لیا۔ بہادری اور جنگی دا ئیں تدبر کے ساتھ صالح، متقی، علم دوست اور کٹر سنی تھے۔ حضرت مجدد صاحب کے پیر بھائی تھے۔ درس وتدریس اور خدمت طلبہ کے حریص تھے۔ صوبہ داری لاہور کے زمانہ میں مدرسہ میں جا کر فقہ تفسیر وحدیث کے درس میں ایک پہر روزانہ حاضری دیتے۔ مذہبی علوم کی محبت کے ساتھ شعر وسخن سے بھی شوق تھا۔ الفتی تخلص تھا۔ ۸۰ سال کی عمر میں ۲ رمضان ۱۰۱۳ھ کو پشاور میں وفات پائی۔ تحفظ۔ زمانہ وفات میں تین ہزاری منصب اور پانچ ہزار سواروں کے افسر تھے۔

۲۷۱۔ ملاحظہ ہو الاتقان فی علوم القرآن باب الناسخ والمنسوخ۔

۲۷۲۔ حضرت علامہ سندھیؒ نے ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ اسلام ایک جماعت تیار کرتا ہے جو سیاسیات میں خاص خاص نظریات کی حامل ہوتی ہے۔ جن کی تعلیم قرآن اور سنتؐ نے دی ہے۔ ایمان اور ارکان اسلام ایسی جماعت میں داخل ہونے کے لیے اولین شرائط ہیں پھر اس جماعت کو حکم ہے کہ اگر ممکن ہو، قوت سے ورنہ جوڑ توڑ سے اعداء اللہ کی جماعتوں کو شکست دے کر اپنے نظریات کی اشاعت کرے۔ ارشاد ربانی ہے انھم یکیدون کیداً واکید کیداً۔ وہ لوگ (اعداء اسلام) جوڑ توڑ کرتے رہتے ہیں، اور میں (خداوند عالم) بھی جوڑ توڑ کرتا ہوں۔ ۱۲

خاکسار کا خیال ہے کہ اس خداوندی جوڑ توڑ سے متاثر ہو کر ہی انسان پکارا کرتا ہے "ما در چہ خیالیم وفلک در چہ خیال" ۔ تاریخ اسلام پر غور کیا جائے تو دونوں جماعتوں کے کید اور جوڑ توڑ کی تشریح سامنے آجاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۲۷۳۔ مولانا وکیل احمد صاحب نقشبندی نے ہدیہ مجددیہ میں اس واقعہ کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے کہ مصنف "مناقب العارفین" شاہ شیخ محمد فتح پوری چشتی فرماتے ہیں کہ جب مشائخ اور اکابر کے حالات تحریر کرتے ہوئے حضرت شیخ احمد کابلی سرہندی (حضرت مجدد صاحب) کے حالات کی نوبت آئی اور حضرت شیخ عبدالحق کی وہ تحریریں جو حضرت مجدد صاحب کے متعلق تھیں میری نظر سے گزریں تو مجھے بہت تعجب ہوا کہ اگر مجدد صاحب نے حضورؐ کی شان اعلیٰ وارفع میں واقعی وہ کلمات ادا کئے ہیں جو صریح کفر ہیں تو پھر شیخ آدم بنوری جیسے جلیل القدر شیخ کامل اور علماء ومحدثین وصاحب حال وقال اور شیخ ربخارا اور کابل وغیرہ ممالک کے وہ علماء جو پختگی دین میں اپنی نظیر نہیں رکھتے، کس طرح اس سلسلہ میں داخل ہیں۔

شیخ نور الحق خلف شیخ عبدالحق دہلوی نستعلیق دہلی میں موجود تھے۔ میں اس معمہ کے انکشاف کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیخ نور الحق صاحب نے حسن خاں افغان کا واقعہ بیان کیا جو اوپر ذکر کیا گیا۔ نیز یہ کہ غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے حضرت مجدد صاحب نے اپنے مکاتیب کے اصل مسودات ارسال فرمائے اور تحریر فرمایا کہ اس قسم کے کلمات مجھ سے کبھی بھی صادر نہیں ہوئے، یہ میرے ایک مرید کی شرارت ہے جس نے مجھے بدنام کیا اور خود میری بددعا میں مبتلا ہو کر بخارا میں ارتداد کی تہمت میں قتل کر دیا گیا۔ پھر شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی کا اپنے خیالات سے رجوع فرمانے اور حضرت مجدد صاحب سے صفائی کرنے کا واقعہ بیان کیا اور پھر اپنی اس غلطی پر معذرت کے لئے حضرت شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی کے قلم کی دستخطی تحریر مجھ کو دکھائی جس سے مجھے اطمینان ہوا۔

حضرت شیخ نور الحق صاحب موصوف کے متعلق تحریر ہے کہ اپنے والد ماجد سے علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ پھر سلسلۂ قادریہ میں والد ماجد سے خلافت حاصل کی۔ اس کے بعد حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے دونوں صاحبزادوں یعنی حضرت خواجہ محمد معصوم اور حضرت خواجہ احمد سعید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر دونوں سے خلافت حاصل کی۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں انتہائی کمال حاصل کیا، اور سعیدی اور معصومی دونوں نسبتوں کو جمع کیا۔ آپ صاحب تصانیف ہیں۔ صحیح بخاری کی مشہور شرح تیسیر القاری آپ کی ہی تصنیف ہے۔ ۱۰۷۳ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (ہدیہ مجددیہ ص ۱۰۴ وص ۱۰۵ ومکاتیب حضرت مرزا مظہر جانجاناں بضمن کلمات طیبات)۔

۲۷۵۔ حضرت شیخ عبدالحق صاحب اپنے زمانہ کے جلیل القدر عالم باعمل ہیں۔ متقی اور پرہیزگار۔ ۱۲ سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کیا۔ پھر زمانۂ شباب میں حرمین شریفین حاضر ہو کر مولانا عبدالوہاب صاحب متقی سے علوم ظاہری کی تحصیل کی۔

ابتداء میں حضرت شیخ سید جمال الدین ابوالحسن موسیٰ پاک شہید خلف الصدق شیخ حامد گیلانی قدس اللہ سرہ العزیز سے مرید ہو کر استفادہ کیا۔ پھر شیخ علی متقی کے خلیفہ شیخ عبدالوہاب مرصعی سے استفادہ اور تکمیل کر کے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ دہلی میں درس و تدریس تصنیف وتالیف آپ کا مشغلہ تھا۔

جہانگیر بادشاہ آپ کا احترام کرتا تھا۔ تزک میں لکھتا ہے۔ شیخ عبدالحق دہلوی کہ از اہل فضل وارباب سعادت ست، دولت ملازمت دریافت کتابے تصنیف نمودہ بود مشتمل بر احوال مشائخ ہند بنظر در آمدہ۔ خیلے زحمت کشیدہ۔ مدتہاست کہ در گوشۂ دہلی

بوضع توکل و تجرید بسرے برد۔ مرد گرامی ست۔ صحبتش بے ذوق نیست۔ بانواع مراحم دلنوازی کردہ رخصت فرمودم۔ (تزک ص ۲۸۵)

(یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اسی سفر میں جب سرہند میں تھا تو حضرت مجدد صاحب کو سزا دی تھی اور اس نے چند ہفتہ بعد دہلی پہنچ کر شیخ عبدالحق صاحب کو باریابی کا موقعہ دیا ہے)۔ اس کے بعد ایک اور ملاقات کا ذکر تزک میں ہے۔ حضرت مجدد صاحب سے معاصرت کے باعث نیز حسن خاں افغان کے اس فتنہ کے سبب سے کدورت رہی۔ مگر پھر جب حضرت مجدد صاحب نے اپنے مکتوبات کا اصل مسودہ بھیجا تو مولانا عبدالحق صاحب نے اپنے خیالات سے رجوع کیا اور حضرت مجدد صاحب کے کمالات کے معترف ہوگئے۔ حضرت شاہ غلام علی صاحب مجددی دہلوی اپنے رسالے میں تحریر فرماتے ہیں کہ اگرچہ شیخ عبدالحق نے ابتداء میں بلا تحقیق و تفتیش حضرت مجدد صاحب پر اعتراضات کئے تھے مگر انکشاف حقیقت کے بعد رجوع کیا۔ پھر حضورؐ کی زیارت سے مشرف ہوئے تو دیکھا کہ حضرت رسالت پناہؐ حضرت مجدد صاحب کی طرف اشارہ کرکے ارشاد فرماتے ہیں "جس کو ہم سے اخلاص ہوگا، ان سے بھی ہوگا"۔ جب شیخ نے حضرت رسالت پناہؐ کی یہ شفقت دیکھی تو اپنے خیالات سے تائب اور حضرت خواجہ باقی باللہ کے خلیفہ حضرت خواجہ حسام الدین احمد صاحب کی خدمت میں تحریر لکھ کر بھیج دی۔

میاں شیخ احمد سلمہ کے ساتھ میری صفائی باطن اور مخلصانہ محبت آج کل بہت بڑھی ہوئی ہے۔ بشریت کا کوئی بھی پردہ حائل نہیں رہا۔ معلوم نہیں کیا بات ہے۔ اس سے قطع نظر کہ عقل و انصاف کا تقاضا ہے کہ ایسے عزیزوں اور بزرگوں سے برائی نہ رکھنی چاہیے، غیر معمولی طور پر ذوق، وجدان اور غلبہ کے قسم کی ایک کیفیت محسوس کرتا ہوں جس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔ اللہ مقلب القلوب و مبدل الاحوال ہے۔ ظاہر بینوں کو تعجب ہوگا مگر میں نہیں جانتا کہ کیا حالت درپیش ہے اور اس کی کیا مثال پیش کروں۔ اس کے بعد اپنی اولاد کے نام ایک طویل تحریر میں ارشاد فرماتے ہیں:

آنچہ مسودات اعتراضات برکلام میاں شیخ احمد سلمہ اللہ تعالیٰ نوشتہ ام ہمہ را در آب بشویند۔ غبارے کہ بہ نسبت ایشاں بخاطر رسیدہ بود بصفا انجامید۔

حضرت مجدد صاحب کی دعا تھی: "خداوندا ایں مرد از کمالات خود ایں چنیں خبری دہد اگر صادق ست مارا دلیل صدق و حقانیت او الہام فرما۔ یا اور القصر نے در پیدا آید، کہ رفع شبہ و التباس کند"۔

شیخ عبدالحق محدثؒ ۹۵۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۵۲ھ میں ۹۴ سال کی عمر پاکر رخصت ہوئے۔ ہدیہ مجددیہ میں یہ بھی ہے کہ شیخ عبدالحق صاحب بھی حضرت مجدد صاحب کی طرح بارگاہ خواجہ باقی باللہ سے اکتساب انوار کیا کرتے تھے۔ نیز حاشیہ میں یہ بھی ہے کہ "در ۹۸۵ھ بخدمت شیخ موسیٰ قادری خرقہ قادریہ زیب تن ساختہ۔ بظاہر ان سب حضرات نے استفادہ کیا ہے۔ شیخ موصوف کی تصانیف سو ۱۰۰ سے زیادہ ہیں۔ علمی طبقہ میں آپ کی تصانیف کافی شہرت رکھتی ہیں۔ ماخوذ از خزینۃ الاصفیاء ص ۱۶۴ جلد ا۔ و ہدیہ مجددیہ ص ۱۰۱ تا ص ۱۰۵ و تزک جہانگیری وغیرہ۔

۲۷۶۔ سفینۃ الاولیاء مطبوعہ مطبع مدرسہ آگرہ ۱۸۵۳ء باہتمام مسٹر تنکل صاحب ص ۳۳۹۔

۲۷۷۔ خزینۃ الاصفیاء مصنفہ غلام سرور چشتی مطبوعہ نول کشور بزبان فارسی از ص ۶۱۱ تا ص ۶۱۳۔

۲۷۸۔ حالات مشائخ نقشبندیہ مصنفہ مولانا محمد حسن صاحب نقشبندی ساکن کوٹلہ متصل کرت پور ضلع بجنور مطبوعہ احسن المطابع مرادآباد۔

۲۷۹۔ مصنفہ مولانا عبدالاحد صاحب مالک مطبع مجتبائی دہلی۔

۲۸۰۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اپنے حالات کو اپنے شیخ سے پوشیدہ رکھنا اہل طریقت کے نزدیک کفر طریقت ہے۔ اسی طرح بھی ارشاد و تعلیم کے لئے بھی واردات و حالات کا بتانا ضروری ہوتا ہے۔ تاکہ ارباب طریقت فائدہ حاصل کرسکیں اور کبھی کیفیات و حالات کا غلبہ اظہار حقیقت پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور بسا اوقات اس کے لئے الفاظ موجود نہیں ہوتے تو عبارت مشتبہ ہوجاتی ہے۔ ۱۲

۲۸۱۔ مثلاً مکتوب ۲۰۸ جلد اول میں عروج و ترقی کی کیفیت کی مثال پیش فرماتے ہوئے تحریر ہے۔ علماء فلسفہ کا خیال ہے کہ دھوئیں میں کچھ مٹی کے اجزاء بھی ہوتے ہیں۔ بسا اوقات دھواں آسمان تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ مٹی کے اجزاء بھی آسمان تک پہنچ

جاتے ہیں۔ اس وقت وہ پانی اور ہوا کے مقام سے بلند ہیں۔ لیکن جب دھوئیں کی یہ کشش ختم ہو جائے تو لامحالہ وہ مٹی کے اجزاء زمین پر پہنچیں گے۔ کیونکہ اُن کا یہی مقام ہے۔ یہی مثال اہل اللہ کے عروج و صعود کی ہے۔ جذب وغیرہ کی کشش میں بسا اوقات ایک سالک طریقت عروج کر جاتا ہے، اور اُونچے اُونچے مقامات سے بھی آگے تجاوز کر جاتا ہے۔ مگر اس کی مثال مٹی کے ذرات کی ہوتی ہے کہ جب تک دوسرے کی کشش باقی ہے، عروج رہتا ہے اور جب وہ عارضی کیفیت ختم ہو جاتی ہے، وہ اپنے اصل مقام پر آجاتا ہے۔ بہرحال انبیاء اور صدیقین کی بارگاہیں اور مقامات معین ہیں۔ اولیاء اللہ کے مقامات کو مقامات انبیاء سے وہی نسبت ہے جو آئینہ کو آفتاب یا ماہتاب سے ہے۔ (ص ۲۰۶ و ص ۲۰۷ جلد ۱)

۲۸۲۔ مکتوب نمبر ۹۲ جلد دوم بنام میر محمد نعمان صاحب میں، غیر خدا کے لئے عموماً اور دربار شاہی کے لئے خصوصاً سجدہ کی سختی سے تردید فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۱۲۲ جلد ۲۔ یہ جلد بھی غالباً اس مقدمہ سے پہلے شائع ہو چکی ہے۔ اس صورت سے معاملہ کو پیش کرنے میں مخالفین کے لیے دو فائدے تھے۔ اگر حضرت مجدد صاحب سجدہ نہ کریں تو باغی قرار دیے جائیں اور سجدہ کر لیں تو مریدین اور عام مسلمانوں کی نگاہ میں پایۂ اعتبار سے ساقط ہوں۔ محمد میاں

۲۸۳۔ ہم نے خزینۃ الاصفیاء کی عبارت کا ترجمہ کیا ہے۔ دیگر کتابوں کا مضمون بھی یہی ہے۔ محمد میاں۔

۲۸۴۔ ماخوذ از ہدیہ مجددیہ ص ۱۰۰

۲۸۵۔ جان کے بچانے کے لئے یہ بھی جائز ہے۔ مگر اصل یہی ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ نہ کیا جائے۔ ۱۲

۲۸۶۔ ہدیہ مجددیہ ص ۱۰۰

۲۸۷۔ انہیں دنوں میں عرض پیش کی گئی کہ شیخ احمد نامی ایک مکار نے سہرند (سرہند) میں مکروفریب کا جال بچھا کر بہت سے ظاہر پرستان بے معنی کو شکار کر کے اپنے مریدوں میں سے ایک ایک کو جو دکان آرائی، معرفت فروشی اور مردم فریبی میں بمقابلہ دوسروں کے بہت پختہ ہیں، ہر ایک شہر اور قصبہ میں بھیج رکھا ہے، اور اپنے مریدوں اور معتقدوں کے نام کچھ چکنی چپڑی باتیں لکھ کر ایک کتاب مرتب کی ہے جس کا نام مکتوبات رکھا ہے۔ اور اس مہملات کی جھگڑالو کتاب میں بہت سے بیکار مقدمات لکھے ہیں، جو کفر و زندقہ کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ منجملہ اس کے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ اثناء سلوک میں حضرت ذی النورین کے مقام پر میرا گزر ہوا۔ ایک دوسرا مقام نہایت نفیس، صاف اور بلند نظر آیا۔ وہاں سے گزر کر حضرت فاروق کے مقام پر میرا عبور ہوا اور حضرت فاروق کے مقام سے گزر کر حضرت صدیق اکبر کے مقام پر عبور ہوا۔ ان مقامات میں سے ہر ایک مقام کی اس کے مناسب علیحدہ علیحدہ تعریف لکھی ہے۔ پھر لکھا ہے کہ مقام صدیقی سے گزر کر مقام محبوبیت پر واصل ہوا، اور ایک دوسرا مقام مشاہدہ میں آیا۔ نہایت منور اور رنگین۔ میں نے اس کے رنگوں اور اس کے انوار کے عکس سے خود کو منور اور رنگین محسوس کیا۔ "استغفر اللہ" مطلب یہ ہے کہ مقام خلفاء سے گزر کر ایک بلند مرتبہ پر پہنچا، اور دوسری گستاخیاں کی ہیں جن کا درج کرنا طول رکھتا ہے اور ادب سے دور ہے۔ اسی بناء پر میں نے حکم کیا کہ "درگاہ عدالت آئین" میں حاضر کریں۔ حسب الحکم حاضر خدمت ہوا، اور جو کچھ دریافت کیا، اُس کا معقول جواب نہ دے سکا۔ عقل و دانش کے فقدان کے باوجود ظاہر ہوا کہ مغرور ہے اور خود پسند۔ میں نے دیکھا کہ اس کی حالت کی اصلاح صرف اسی صورت سے ہو سکتی ہے کہ چند روز زندان میں محبوس رہے تاکہ اس کے مزاج کی شوریدگی اور اس کے دماغ کی آشفتگی کسی قدر سکون پذیر ہو اور عوام کی سوزش بھی دب جائے۔ مجبوراً "انی رائے سنگھ دلن" کے حوالہ ہوا کہ قلعہ گوالیار میں قید رکھیں۔

۲۸۸۔ معلوم ہوتا ہے کہ تحریک اصلاح، طریق کار، راستہ کی مشکلات، نتائج اور ثمرات پہلے سے حضرت مجدد صاحب کے سامنے ہیں اور یہ تمام چیزیں سوچی سمجھی ہوئی ہیں۔ یہی ہے فراست مومن جس کے متعلق ارشاد ہے یری بنور اللہ۔ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے ۱۲۔ محمد میاں عفی عنہ

۲۸۹۔ پہلے گزر چکا ہے کہ جہانگیر نے یہ تمام چیزیں ضبط کر لی تھیں ۱۲

۲۹۰۔ شیخ احمد سہرندی جن کو دکان آرائی، خود فروشی اور بے ہودہ گوئی کے سبب سے چند روز زندان ادب میں محبوس کیا تھا، اپنے سامنے

طلب کر کے رہا کر دیا۔ خلعت اور ایک ہزار روپیہ خرچ عنایت کر کے جانے اور رہنے کا ان کو اختیار دے دیا۔

۲۹۱۔ تو زک ص ۳۲۴۔

۲۹۲۔ تو زک ص ۳۲۵۔

۲۹۳۔ تو زک ص ۳۲۶

۲۹۴۔ بہمن ماہ الٰہی (پھاگن) کی کیم تاریخ ۱۵ جلوس (تقریباً محرم ۱۰۳۰ھ) روز مبارک شنبہ شہر سرہند سے باہر نزول اقبال ہوا ایک روز قیام کر کے باغ کی سیر سے مسرور ہوا۔

۲۹۵۔ باغ سرہند مسرت افزاء خاطر ہوا۔ دو روز قیام کر کے اس کے سیر و تماشا سے محظوظ ہوا۔

۲۹۶۔ نور جہاں کے تمام داؤ پیچ کو توڑ کر عین وقت پر شاہجہاں کو دکن سے پنجاب بلانا (جہاں جہانگیر کی وفات ہوئی تھی) اور تخت پر قابض کرا دینا یہ آصف خاں کا کام تھا۔ شاہجہاں تقریباً چھ سال سے شاہی افواج اور بھائیوں کی فوجوں کا مقابلہ کرتے کرتے اب بے دست و پا ہو چکا تھا۔ اگر آصف خاں کی حکمت عملی نہ ہوتی، تو قوت بازو سے تخت حاصل کرنا شاہجہاں کے لئے بہت دشوار تھا۔ اسی کے شکریہ میں شاہجہاں نے آصف خاں کو عم دانا (عقل مند چچا)، عضد الخلافۃ، یمین الدولہ کا خطاب دیا اور سلطنت کا وکیل مقرر کیا۔ ہشت ہزاری ذات ہشت ہزار سوار، دو اسپہ سہ اسپہ منصب ہوا۔ چندرو بھیری انعام میں دیا گیا وغیرہ وغیرہ۔ غرض ہر حیثیت سے اس کا منصب پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گیا۔

۲۹۷۔ نہایت ہوشیار، مدبر، سلیقہ شعار، نیک ذات عورت تھی۔ جہانگیر کی ناراضی کا زمانہ شاہجہاں کے لئے حد سے زیادہ پریشانی اور مصیبت کا زمانہ تھا لیکن یہ سلیقہ مند اس کی ہر حالت میں اس کی مونس و غمگسار رہی اور حق رفاقت ادا کیا۔ مگر افسوس اس کی عمر نے وفا نہ کی۔ ۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۰۳۷ھ کو شاہجہاں اورنگ نشین ہوا۔ اور صرف ساڑھے تین سال بعد ۱۷ ذیقعدہ ۱۰۴۰ھ کو اس سلیقہ مند بیوی نے انتقال کیا۔ ۱۹ سال نکاح میں رہی۔ ۱۴ بچے ہوئے۔ ۸ لڑکے ۶ لڑکیاں سات کا انتقال ہو گیا۔ سات زندہ چھوڑے۔ دارا، شجاع، عالمگیر، مراد چاروں شاہزادے اسی کل سے تھے۔ بادشاہ کو اس کی وفات کا بہت صدمہ ہوا۔ صرف دو بال بادشاہ کی ڈاڑھی میں سفید تھے۔ مگر اس غم میں تھوڑے دنوں میں ساری ڈاڑھی سفید ہو گئی۔ (تاریخ ہندوستان وغیرہ)

۲۹۸۔ دنیا کی بے نظیر عمارت ہے جس میں ممتاز محل اور شاہجہاں کی قبریں برابر برابر ہیں۔ یہ عمارت سنگ مرمر کی اپنی خصوصیات میں بے نظیر ہے۔ ۱۰۵۲ھ میں بارہ ۱۲ سال کے عرصہ میں پچاس لاکھ روپیہ کے صرف سے تیار ہوئی۔ پرگنہ حویلی اکبر آباد و نگر چند کے مضافات سے تیس موضع جن کی جمع چالیس لاکھ دام تھی، اور اس کے علاوہ بازار اور سرائے وغیرہ جن کی آمدنی بھی تقریباً اتنی ہی تھی غرض دو لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی کی جائداد اس روضہ کے لئے وقف ہوئی تاکہ اس روضہ کے اطراف میں جو حجرے اور مکانات بنے ہوئے ہیں، فقراء اور مساکین اور حفاظ قرآن ان میں قیام کریں اور ان کو وظیفے اس آمدنی سے دیئے جائیں (ماخوذ از تاریخ ہندوستان)۔ کاش یہ وقف اگر محفوظ ہوتا تو ہندوستان میں مصر جیسا جامع ازہر قائم کیا جا سکتا تھا۔

۲۹۹۔ راجہ ٹوڈرمل، اکبر بادشاہ کا وزیر اعظم تھا۔ اس نے ہندوؤں کو فارسی پڑھنے پر مجبور کیا۔ اس سے پہلے ہندو صرف ہندی جانتے تھے مگر راجہ ٹوڈرمل کے اصرار سے جب وہ فارسی سے بھی واقف ہو گئے تو مسلمانوں کے برابر تمام محکموں میں اعلیٰ منصب اور عہدے حاصل کرنے لگے۔ چنانچہ شاہجہاں کے زمانہ میں ہندو عہدہ داروں کی تعداد زمانہ اکبر سے دوگنی تھی۔ ہندوؤں کی فارسی دانی سے اردو کی ترقی ہوئی اور ایک جدید تہذیب نے جنم لیا۔ رگھوناتھ شاہجہاں کے وزیر اعظم سعد اللہ خاں کا معتمد علیہ تھا۔ سعد اللہ خاں نے ہی اس کی تربیت کی تھی۔ سعد اللہ خاں کے مرنے کے بعد شاہجہاں نے اس کو ایک عرصہ تک سعد اللہ خاں کی جگہ وزارت عظمیٰ پر فائز رکھا اور رائے رایان کا خطاب دیا (تاریخ ہندوستان ص ۳۶۹ جلد ۶)

چندر بھان کو رائے چندر بھان کا خطاب دیا گیا اور دار الانشاء (سیکرٹریٹ) کے افسروں میں داخل کیا۔ اس کے علاوہ بہت سے راجہ مہاراجہ ہیں جن کو بڑی بڑی مہموں میں بڑی بڑی فوجوں کا افسر اعلیٰ مقرر کیا۔ ازبکوں اور ایرانیوں نیز جنوبی ہند کے بادشاہوں اور راجاؤں کی جنگ میں راجپوت بہادر شاہجہاں کے دست راست رہے۔ وغیرہ وغیرہ

۳۰۰۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۶۱۸ جلد اول میں تاریخ وفات ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ روز سہ شنبہ بوقت صبح درج ہے ۱۲ منہ

۳۰۱۔ شبلی: بچہ شیر ۱۲

۳۰۲۔ مجموعہ کنز البرکات، حوالہ ربانی ص ۱۷۷ میں ہے:

"وآوازۂ ارشاد ایشاں بجہان جہانیاں رسید۔ و کلباتک ہدایت بلند۔ عالم و عالمیان گردید۔ کوس قطبیت بنام ایشاں زدند و نقارۂ غوثیت باسم آنجناب نواختند۔ نور ولایت و برکات و ظہور کرامت و خوارق عادت از ایشاں آں قدر ظاہر گردید کہ از تحریر و تقریر بیرون ست۔ و کشف مقامات قرب الٰہی برآنجناب بمرتبہ رسید کہ زبیان و تبیان افزوں ست۔ پھر صفحہ ۱۲۲ پر ہے۔ خوارق و کرامات ایشاں بہ نہ نوشتہ اند ۱۲ (خطبہ شوقیہ)

۳۰۳۔ وجد و حال، علوم و معارف جس کا ذکر مکتوب گرامی کی سطر بالا میں ہے، ان تمام سے گزر کر "مقام رضا" پر پہنچنا چاہیے جو مقامات سلوک کی انتہا ہے ۱۲

۳۰۴۔ جس کا عنوان ہم نے "حاصل قید" قائم کیا ہے ۱۲ محمد میاں غفر اللہ لہ۔

۳۰۵۔ اشارہ ہے اس درود کی طرف جو نماز میں پڑھا جاتا ہے۔ اس درود میں دعا ہے کہ یا اللہ حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد پر جیسی صلوات و برکات نازل ہوئیں ایسی ہی صلوات و برکات محمدؐ اور ان کی آل پر نازل کر ۱۲۔

۳۰۶۔ علامہ سیوطیؒ نے جمع الجوامع میں ایک پیش گوئی رسول اللہؐ کی نقل کی ہے کہ یکون فی امتی رجل یقال لہ صلۃ یدخل الجنۃ بشفاعتہ کذا و کذا۔ خدائی قدرت کہ یہی لفظ صلہ حضرت امام ربانی کے قلم سے اپنے لئے نکل گیا۔ اس امت مرحومہ میں آپ سے پہلے یہ لفظ اپنے لئے کسی نے نہیں استعمال کیا۔ ان فی ذلک لآیات ۱۲

۳۰۷۔ ہدیہ مجددیہ ص ۸۵ و ص ۲۸۶۔

۳۰۸۔ شیخ احمدؒ سرہند کے ایک صاحب ہیں۔ کثیر العلم، قوی العمل۔ چند روز فقیر کے ساتھ نشست و برخاست کی۔ ان کے اوقات و حالات سے بہت سے عجائبات مشاہدہ میں آئے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک چراغ ہوں گے جن سے بہت سے جہاں روشن ہوں گے۔

۳۰۹۔ الحمد للہ اس کے احوال کاملہ کا مجھ کو یقین ہو گیا ہے۔ اس شیخ کے برادر اور اقربا تمام ہی مرد صالح اور علماء ہیں۔ چند صاحبان سے شرف نیاز حاصل ہوا ہے۔ طبیعتیں بلند اور عجیب استعداد رکھتے ہیں۔ ان کے فرزند جو ابھی بچے ہیں "اسرار الٰہی" ہیں مختصر یہ کہ شجرۂ طیبہ ہے جس کو خدا نے اچھی طرح جمایا اور اگایا ہے۔

۳۱۰۔ شیخ احمد وہ آفتاب ہیں کہ ہم جیسے ہزاروں ستارے اس کے پرتو میں گم ہو جاتے ہیں۔

۳۱۱۔ دور حاضر میں اس جماعت عالیہ (جماعت درویشاں) میں آسمان کے نیچے ان کی کوئی نظیر نہیں یہ مکمل مراد اور مکمل محبوب ہیں۔ قطب ہیں۔ صحابہ، تابعین، کاملین اور آئمہ مجتہدین کے بعد ان جیسے اخص الخواص معدودے چند نظر آتے ہیں۔ ان تین چار سال میں ہم نے مرشدی نہیں کی۔ چند روز ہم نے بازی لگائی، مگر الحمد للہ والمنۃ کہ ہماری بازی اور ہماری دکان پردازی بے فائدہ نہیں رہی۔ جبکہ ان جیسا شخص بروئے کار آ گیا۔

۳۱۲۔ شیخ باقی باللہ نے اپنے تمام مریدوں اور احباب و اصحاب کو توجہ اور تکمیل کے لئے حضرت مجدد صاحب کے حوالے فرما دیا تھا اور خود بھی استفادہ کے لئے ان کی محفل توجہ میں تشریف لاتے تھے اور فرماتے تھے کہ شیخ احمد ایک ایسا آفتاب ہے کہ ان کے فیض و فضل سے دونوں عالم منور ہیں۔

۳۱۳۔ عرصے سے دربار ولایت میں عریضہ نیاز ارسال نہیں کیا۔

۳۱۴۔ اور کیا لکھوں۔ آپ کی بارگاہ میں درویشوں کی بات لکھنا انتہا درجہ بے شرمی ہے اور حالات صوفیاء کی حکایت غایت درجہ بے موقعہ الغرض ہمیں اپنی حد پیش نظر رکھنی چاہیے اور بے کار بات سے احتراز کرنا چاہیے۔

۳۱۵۔ چار سوال جو میرے دل میں آئے تھے (جن کا ذکر بھی حضرت مجدد صاحب کے سامنے نہیں ہوا تھا) مجدد صاحب نے از خود ان کا

کافی اور شافی جواب دے دیا۔ بس میں معتقد اور مرید ہو گیا۔

۳۱۶۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی مشہور و معروف عالم ہیں۔ علوم ظاہری اور باطنی کے بہترین ماہر۔ آپ کی گراں قدر تصنیفات عالم اسلامی میں خاص شہرت رکھتی ہیں۔ شاہجہاں کے مشیر خاص رہے ہیں۔ شاہجہاں نے دو مرتبہ ان کے برابر سونا تلوا کر ان کی خدمت میں پیش کیا اور بہت کچھ جاگیر و عطیات پیش خدمت کئے (مفصل تذکرہ انشاء اللہ آگے آئے گا)۔

۳۱۷۔ مکتوبات حضرت شاہ غلام علی صاحب بحوالہ خطبہ شوقیہ

۳۱۸۔ حالات مشائخ نقشبندیہ ص ۲۰۲۔

۳۱۹۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۶۱۰ جلد ا۔

۳۲۰۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۶۰۹۔

۳۲۱۔ حضرت مجدد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ آفتاب پر نظر ڈالی جا سکتی ہے مگر حضرت شاہ سکندر کے قلب مبارک کی تابانی و درخشانی اس قدر تیز ہے کہ اس پر نظر نہیں پڑ سکتی ۱۲۔

۳۲۲۔ ان کا تذکرہ پہلے بھی گزرا ہے۔ حضرت مجدد صاحب کی پیدائش کے وقت آپ بقید حیات تھے۔ حضرت مجدد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ سلسلۂ قادریہ میں حضرت شاہ عبدالقادر قدس اللہ سرہ العزیز کے بعد حضرت شاہ کمال کیتھلی کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔

۳۲۳۔ ایام شیر خوارگی میں حضرت مجدد صاحب ایک مرتبہ بیمار ہو گئے۔ انہیں ایام میں حضرت شاہ کمال صاحب کیتھلی تشریف لے آئے۔ مجدد صاحب کے والد صاحب نے دعا کے لئے اس شیر خوار بچہ کو شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ شاہ صاحب نے زبان مبارک بچے کے منہ میں دے دی۔ اس سعید بچہ نے اس کو خوب چوسا۔ حضرت شاہ کمال صاحب فرماتے رہے بچہ کچھ ہماری اولاد کے لئے بھی رہنے دو۔ تم تو چاہتے ہو کہ ہماری نسبت تم ہی حاصل کر لو۔ پھر حضرت شاہ صاحب نے ان کے والد صاحب سے فرمایا یہ آپ کا بچہ بہت سعید ہوگا۔ اس جملہ سے اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے (حالات مشائخ نقشبند)۔

۳۲۴۔ حضرات القدس مصنفہ حضرت مولانا بدرالدین صاحب خلیفہ حضرت مجدد صاحب حالات مشائخ نقشبندیہ ص ۲۰۶۔

۳۲۵۔ صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان کے مناقب و محامد تو خود حضورؐ اپنی احادیث میں ارشاد فرما چکے ہیں واللہ اعلم بالصواب۔

۳۲۶۔ نماز جنازہ میں دعاء مغفرت ہوتی ہے جو شخص مستجاب الدعوات ہو، اس کی یہ برکت لازمی ہے۔

۳۲۷۔ جو خدا کا ہوا، خدا اس کا ہو گیا۔

۳۲۸۔ بہت سے ہیں جو راہ خدا میں پراگندہ بال گرد آلود ہیں۔ خدا کے یہاں ان کا یہ درجہ ہے کہ اگر وہ خدا کی ذمہ داری پر قسم کھا بیٹھیں، تو خدا کو ان کی قسم کا احترام ہو۔ وہ اس کو ضرور پورا فرما دے ۱۲۔

۳۲۹۔ میری نماز، میری عبادت، میرا جینا، میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔

۳۳۰۔ وقت تحریر ۳ بج کر ۲۵ منٹ شب چہار شنبہ مورخہ ۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۰ھ۔ محمد میاں

۳۳۱۔ ماخوذ از خطبۂ شوقیہ۔

۳۳۲۔ چونکہ آنحضرتؐ خاتم النبیین ہیں۔ آپ کے بعد کسی کو نبوت ملنے والی نہیں۔ لہٰذا آپ کی شریعت کے قیامت تک محفوظ رہنے کے انتظامات بھی قدرت کاملہ کی طرف سے پیش از پیش کر دیئے گئے اور امت کو ان انتظامات سے بطور پیشین گوئی آگاہ کر کے مطمئن کر دیا گیا۔ بعض اہم انتظامات کی خبر قرآن مجید میں ہے اور بعض کی احادیث صحیحہ میں چنانچہ ہر صدی میں مجدد کا ہونا بھی انہیں انتظامات کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کا تذکرہ احادیث صحیحہ میں ہے۔ سنن ابی داؤد میں اس حدیث کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔ ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علی رأس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا۔ اس حدیث کی شرح میں علماء کرام نے مستقل تصانیف کی ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی کی کتاب الفوائد الجمۃ فیمن یبعثہ اللہ لھذہ الامۃ قابل مطالعہ ہے ۱۲

۳۳۳۔ بعض علماء اس بات کے قائل ہیں کہ ایک صدی میں ایک ہی مجدد ہونا چاہیے مگر یہ بات صحیح نہیں جیسا کہ تاریخی واقعات کے تتبع اور

مولانا شاہ ولی اللہؒ جیسے محققین کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے۔۱۲

٣٣٤۔ آج کل جس چیز کو تصوف کہتے ہیں احادیث نبویہ میں اس کو احسان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ۱۲

٣٣٥۔ مثلاً حضرت مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی اور ان کے مرشد حضرت سید احمد بریلوی کی مجددیت کہ حضرت مولانا عبدالحئی صاحبؒ نے اس بنا پر اختلاف کیا کہ ان دونوں بزرگوں نے صدی کا آخر نہیں پایا۔ اور مجدد کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلی صدی کے آخر میں موجود ہو۔ حضرت ممدوح تذکرہ الرشید ص ۱۴۳ میں لکھتے ہیں۔ ومن ھھنا حصحص ان مااشتھر بین العوام بل الخواص کالا علام ان مولانا اسمٰعیل الشھید الدھلوی و مرشدہ السید البریلوی کانت ولادتہ سنۃ احدی من المائۃ الثالثۃ عشر من مجددی المائۃ خال عن التحصیل لا یقربہ صاحب التکمیل ۱۲۔

٣٣٦۔ بعض منکرین کو غیب سے سزائیں بھی ملیں۔ جیسا کہ سید برزنجی مدنی کے متعلق حضرت مولانا شاہ غلام علی صاحب نے حالات حضرت شہیدؒ کے ص ۵۵ میں نقل فرمایا ہے کہ اس نے ایک رسالہ حضرت امام ربانی کی رد میں لکھا تھا۔ حضرت شیخ محمد فرخ نبیرہ حضرت امام ربانی کی بددعا سے دریا میں ڈوب گیا۔ سید برزنجی مذکور کے رسالہ کا رد مولانا عبدالحئی صاحب لکھنوی نے لکھا ہے۔ جس کا نام الکلام المسمی ہے جو مولوی وکیل احمد صاحب کے نام سے طبع ہوا ہے۔

٣٣٧۔ یہ مضمون الفرقان کے مجدد نمبر میں شائع ہوا تھا۔ محمد میاں

٣٣٨۔ پھر نفسانی فتنوں کے ساتھ آفاقی فتنے بھی جس نوع کے آئے مجدد دین وقت کو اسی کے استیصال کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت و استعداد دے کر بھیجا۔ کسی مجدد نے فتنہ شیعیت کو ختم کیا۔ کسی نے فتنہ بدعیت کو کسی نے ادعاء نبوت کے فتنوں کا تار پود بکھیرا اور کسی نے مسیحیت کی دسیسہ اندازیوں کا استیصال کیا۔ کسی نے شرک کا تانا بانا ادھیڑ دیا۔ کسی نے دہریت کے ستون ڈھائے اور کسی نے شعوبیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا۔

٣٣٩۔ اسی لئے حضرت مجدد صاحب کی تعلیمات میں بھی غالب رنگ اتباع سنت اور بدعت سے اظہار نفرت ہے مرض ظاہر باطن کی بے راہ روی اور آزادی سے بچا کر اس اتباع کی راہ پر چلانا حضرت کی تعلیم کا امتیازی شعار تھا۔

٣٤٠۔ خزینۃ الاصفیاء میں شیخ احمد سعید نام درج ہے ۱۲ محمد میاں عفی عنہ

٣٤١۔ حالات مشائخ نقشبندیہ ص ۲۷۲۔

٣٤٢۔ محمد میاں

٣٤٣۔ مکتوبات مذکورہ

٣٤٤۔ شیخ موصوف (حضرت مجدد صاحب) کے فرزند جو خورد سال ہیں، اسرار الٰہی ہیں۔ عجیب استعداد رکھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ شیخ احمد ایک مبارک درخت ہیں۔ جس کو خدا نے نہایت ہی اچھی طرح اگایا اور جمایا ہے ۱۲

٣٤٥۔ حالات مشائخ نقشبندیہ ص ۲۷۲۔

٣٤٦۔ خواجہ محمد سعید اور محمد معصوم جواہر بے بہا ہیں در ایام خورد سالی میں مقامات احمدیہ پر پہنچ چکے ہیں۔ ۱۲

٣٤٧۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۶۲۸ جلد اول

٣٤٨۔ مکتوبات خواجہ معصوم جلد ۳۔ و حالات مشائخ نقشبندیہ ص ۲۷۶ وغیرہ۔

٣٤٩۔ شریعت غرا بسا اوقات عوام کی سہولت کے لئے احکام میں گنجائش پیدا کر دیتی ہے۔ اس کو رخصت کہتے ہیں۔ جیسا کہ مجدد صاحب کے حالات میں پڑھ چکے ہو کہ ظالم بادشاہ کے ظلم سے بچنے کے لئے یہ بھی جائز ہو سکتا تھا کہ سجدۂ سلطانی کی کوئی تاویل کر لی جاتی۔ چنانچہ شاہجہاں نے اسی کا مشورہ دیا تھا مگر حضرت نے اس کو منع فرما دیا۔ ایسے موقعہ پر اصل حکم پر بلا تاویل عمل کرنا عزیمت کہلاتا ہے اور اس گنجائش کو رخصت کہتے ہیں۔

٣٥٠۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اص ۶۲۸۔

٣٥١۔ مکتوبات جلد سوم۔ یعنی فاضل اور زائد چیز ہیں۔

۳۵۲۔ یہ خدا کا انعام ہے جس کو چاہے عطا فرمائے۔ وہ بڑے انعام والا ہے۔

۳۵۳۔ یہ خواجہ محمد سعید صاحب اور ہم عنایات الٰہی جل سلطانہ، میں مساوی ہیں۔ باوجودیکہ ہم نے اس قدر محنتیں اور سخت سخت ریاضتیں برداشت کیں، انہوں نے ان کے مقابلہ میں کچھ بھی محنت نہیں برداشت کی اس مساوات کا سبب کیا ہے ۱۲۔

۳۵۴۔ مکتوب سوم مکتوبات خواجہ معصوم جلد ۳۔

۳۵۵۔ حضرت مجدد صاحب کے ایک مکتوب کے حوالہ سے پہلے گزر چکا ہے کہ روحانی کمالات کی کچھ قسمیں ہیں۔ انبیاء ان کا سرچشمہ ہیں۔ صحابہ کرام سب سے پہلے سیراب ہونے والے اور تمام اولیاء اُن کا پرتو ہیں۔ پھر طبیعت اور استعداد کے مناسب روحانی کمالات میں سے اولیاء اللہ کو حصہ ملتا ہے۔ کسی کو کسی خاص قسم میں سے، کسی کو مختلف اقسام میں سے ۱۲ محمد میاں

۳۵۶۔ یعنی سلسلۂ مجددیہ کے متوسلین کے لئے واللہ اعلم۔

۳۵۷۔ حالات مشائخ نقشبند

۳۵۸۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۶۳۹۔

۳۵۹۔ حالات مشائخ نقشبند ص ۲۷۴

۳۶۰۔ مشائخ نقشبند ص ۲۸۰۔

۳۶۱۔ تولد ایں فرزند بسیار ارجمند اس کہ بعد تولدِ دے مراحبت آنجنیں بیروشن ضمیر میسر گردید (خزینۃ الاصفیاء ص ۶۴۰ جلد اوّل)۔

۳۶۲۔ حالات مشائخ نقشبند ص ۲۳۲۔

۳۶۳۔ یہ تعداد مشکوک ہے کیونکہ اس زمانہ میں پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد کروڑوں نہیں بلکہ لاکھوں ہی کی شمار میں تھی اور تقریباً اتنی ہی ہوگی۔

۳۶۴۔ آپ کے چھ فرزند آپ کے خلفاء ہیں۔ جن کا ذکر آگے آئے گا۔ (انشاء اللہ) ان کے علاوہ حسبِ ذیل اسماء گرامی حالات مشائخ نقشبند میں درج ہیں۔ محمد باقر لاہوری۔ محمد حنیف کابلی۔ محمد صدیق پشاوری۔ مرزا امان اللہ برہانپوری۔ شیخ محمد علیم اللہ جلال آبادی۔ مرزا عبید اللہ بیگ۔ ملا حسن علی پشاوری۔ ملا موسیٰ بلخی۔ ملا بدر الدین سلطانپوری۔ حکیم حافظ عبدالحکیم توانی۔ شیخ بایزید سہارنپوری۔ حاجی حبیب اللہ حصاری۔ شیخ محمد مراد۔ شیخ آدم بلخی۔ سید یوسف گردیزی۔ میر شرف الدین حسین لاہوری۔ شیخ انور تورسرائی۔ شیخ منصور جالندھری اخوند سجاول مترجم شرح وقایہ (وغیرہ وغیرہ) ۱۲

۳۶۵۔ کشف و مراقبہ تو تحقیقی چیز ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ طبعی ذکاوت و ذہانت کے باعث طرز تحریر سے اندازہ فرما لیتے کہ ولایت کی اقسام میں سے کس قسم کے ساتھ اس کی طبعی استعداد مناسبت رکھتی ہے۔ بہرحال جو طریقہ تعلیم و تربیت میں اس درجہ ماہر ہو اور پھر مقبولیت بھی اس کو حاصل ہو تو کیا تعجب ہے کہ اس کے ہزاروں خلفاء اور لاکھوں مرید ہوں۔

۳۶۶۔ ۱۷ شعبان ۱۰۶۲ھ کو عالمگیر ملتان کا گورنر بنایا گیا اور چار سال تک اس علاقہ میں حکومت کرتا رہا۔ یہ حاضری اسی زمانہ میں ہوتی رہی۔ عالمگیر کا طرز شاہجہاں کے سامنے بھی یہی تھا وہ زبان سے کم ادا کرتا تھا۔ لحاظ کے سبب سے اپنا مافی الضمیر تحریر میں ادا کرتا تھا۔

۳۶۷۔ ماخوذ از حالات مشائخ نقشبند از ص ۲۳۰ تا ص ۲۴۲۔

۳۶۸۔ "مداہن" جو خلاف شرع معاملات میں بے پرواہی سے کام لے۔ ان کی تردید نہ کرے ۱۲۔

۳۶۹۔ عالمگیر کا بھائی دارا شکوہ اس خاندان کا دشمن تھا حضرت خواجہ معصوم کی اس تحریر کو پڑھ کر دارا شکوہ کو پہچان لو۔ تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی (محمد میاں)۔

۳۷۰۔ تعجب ہے یہ شخص کس قدر گستاخ ہے۔ کیا اس کا نفس امارہ رسول اللہ اور صحابہ کرام سے بھی زیادہ مطمئن اور اصلاح پذیر ہو چکا ہے؟ معاذ اللہ رسول اللہ حرام فرمائیں اور یہ شخص اپنے لئے حلال کہے۔ کیا یہ انتہائی گستاخی نہیں؟

۳۷۱۔ چنانچہ نظامت کے زمانہ میں دو مرتبہ قندھار وغیرہ پر حملہ کیا ۱۲

۳۷۲۔ یعنی ایسے نفس سے موت کے وقت کہا جاتا ہے کہ "اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف واپس چل درانحالیکہ تو خدا سے راضی ہے

اور خدا کے نزدیک پسندیدہ (قرآن حکیم)

۳۷۳۔ اصطلاحاً اس کو ایمان دون ایمان کہتے ہیں۔ مثلاً ارشاد ہوا جس میں امانت نہیں اس میں ایمان بھی نہیں۔ نیز ارشاد ہوا۔ وہ مومن نہیں کہ اپنا پیٹ تو بھرے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔ یا ارشاد ہوا۔ مومن وہ ہے کہ تمام آدمی اس کے خطرات سے محفوظ رہیں۔ اسی کے بموجب کفر دون کفر بھی ہے۔ یعنی ایک کفر حقیقی جو عقیدہ قلبی کے فقدان پر ہوتا ہے۔ دوسرا وہ کفر جو عملاً ہو اعتقاداً نہ ہو۔ مثلاً ارشاد نبوی ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے قتال کرنا کفر ہے یا ارشاد ہوا۔ جو شخص قصداً نماز چھوڑ دے، کافر ہو گیا۔ یعنی عملاً نہ حقیقتاً۔ واللہ اعلم بالصواب (و دونک هذا فانه احسن ما نجده و قد تلقیت من بعض اساتذتی رحمهم الله) محمد میاں۔

۳۷۴۔ عالمگیر کے تین بہنیں تھیں۔ سب سے بڑی بہن جہاں آرا جس سے شاہجہاں کو بہت زیادہ انسیت تھی۔ اس کا خطاب بادشاہ بیگم اور بیگم صاحب تھا۔ آگرہ کی جامع مسجد اسی کی بنائی ہوئی ہے۔ اس کو دارا سے بہت زیادہ انسیت تھی۔ دوسری بہن روشن آرا بیگم جو عالمگیر سے صرف ۱۳ ماہ بڑی تھی۔ اس کو عالمگیر سے بہت انسیت تھی۔ تیسری گوہر آرا بیگم جس کی ولادت میں ماں (ممتاز محل) کا انتقال ہو گیا۔ بظاہر روشن آرا بیگم کے بجائے روشن آرا لکھا گیا ہے۔ گوہر آرا عالمگیر سے ۱۳ سال چھوٹی تھی۔

۳۷۵۔ ہم تم کو ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہے۔

۳۷۶۔ ناظرین کرام حضرت شاہ سکندر صاحب کو بھولے نہ ہوں گے۔ آپ حضرت شاہ کمال کیتھلی کے پوتے ہیں۔ سلسلۂ قادریہ کے شیخ کامل ہیں۔ آپ نے ہی سلسلۂ قادریہ کا خرقہ اپنے دادا کے ایماء کے بموجب حضرت مجدد صاحب کو دیا تھا جس کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے۔

۳۷۷۔ حالات مشائخ نقشبندیہ ص ۲۹۵۔۲۹۶

۳۷۸۔ ۱۰۵۰ھ/۱۲ جلوس میں شالا مار باغ کی تیاری کا حکم ہوا، چنانچہ خلیل اللہ خاں کے اہتمام سے ایک سال چار ماہ پانچ روز میں تیار ہوا۔ چھ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اس باغ کے تین طبقے ہیں۔ اوپر کے طبقہ کا نام فرح بخش، دوسرے درجہ کا نام فیض بخش رکھا گیا۔ یہ باغ اب بھی موجود ہے۔ وسط باغ میں ایک نہر ہے۔ باغ کا پہلا طبقہ دوسرے طبقہ سے تقریباً ستر فٹ اونچا ہے۔ اسی طرح دوسرا طبقہ تیسرے طبقہ سے، پھاٹک نہایت عالیشان ہے۔ اور خاص وصف یہ ہے کہ پھاٹک کی چھت پر کھڑے ہو کر جب نہر پر نظر ڈالی جاتی ہے، تو تینوں طبقوں کی نہر کی سطح بالکل مساوی معلوم ہوتی ہے۔ ۱۲

۳۷۹۔ تاریخ ہندوستان صفحہ ۲۸۸ ج ۸ صفحہ ۳۰۲

۳۸۰۔ سعد اللہ لاہور کا باشندہ۔ علوم نقلی و عقلی میں اعلیٰ قابلیت کا مالک تھا۔ حافظ قرآن، نیک اور پرہیزگار۔ شیخ سعد اللہ لاہوری کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے بعد علامی سعد اللہ کے نام سے تاریخ میں شہرت حاصل کی۔ ابتداءً بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کچھ یومیہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ علامی سعد اللہ کی غیرت نے اس کو گوارا نہ کیا۔ واپس چلے گئے۔ پھر ۱۰۵۰ھ میں موسوی خاں صدر کو حکم ہوا کہ سعد اللہ خاں کو بھیج دیں۔ اس وقت بادشاہ نے مناسب وظیفہ مقرر کیا۔ خلعت اور اسپ عنایت فرمایا۔

بادشاہ کی مردم شناسی اور قدر دان بصیرت نے صرف تین روز بعد وظیفہ کی بجائے اس کو منصب مرحمت فرمایا۔ اور پھر جوہر شناس بادشاہ کی قدر دانی نے صرف چار سال کے عرصہ میں وزارت عظمیٰ کے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا دیا۔ ساتویں سال ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار۔ دو اسپہ وسہ اسپہ اور دو کروڑ روپیہ انعام سے سربلندی حاصل کی۔ بادشاہ کے مزاج میں اس قدر دخل پیدا کر لیا کہ نہ صرف مقدمات وزارت بلکہ امور ذاتی میں بھی بادشاہ اسی کے صلاح و مشورہ پر عمل کرتا۔ انجام یہ کہ دارا شکوہ اپنی تمام محبوبیت اور تقرب کے باوجود اس پر حسد کرنے لگا لیکن بجائے نقصان پہنچانے کے خود اپنے متعلق شاہجہاں کا یہ خیال قائم کرا دیا کہ "دارا دشمن نیکو کاران واقع شد" ۱۰۶۶ھ میں عرضہ فالج میں مبتلا ہوا۔ بادشاہ نے شاہی اطباء سے علاج کرایا۔ متعدد بار مزاج پرسی کے لئے مکان پر گیا۔ مگر افاقہ نہ ہوا۔ دو آخر ماہ جمادی الاخری ۱۰۶۶ھ (دس سو چھیاسٹھ) میں انتقال ہو گیا۔ شاہجہاں کو اس کی وفات کا بہت صدمہ ہوا (اور تاریخ ہندوستان کے الفاظ میں) بے اختیار زار زار رو دیا۔

سعد اللہ خاں عقل و فہم، تدبر اور بصیرت کے باوجود رحم دل اور انصاف پسند واقع ہوا تھا۔ وہ غرباء اور مساکین کا بہت زیادہ طرف دار تھا۔ اس کا اصول یہ تھا کہ کثرت محاصل ترقی دولت کا سبب نہیں بلکہ رعایا پروری، باشندگان ملک کی خوشنودی (خوش حالی) ترقی دولت کی بنیاد ہے۔ بادشاہ اور وزیر کی یہی حسن نیت تھی، کہ ہندوستان دولت اور خوش حالی کی معراج کو پہنچا ہوا تھا۔ اس کے رحم و کرم اور جوہر شناسی کے سامنے ہندو مسلمان کی تفریق نہیں تھی۔ رگناتھ اسی کا پروردہ تھا جس کو بادشاہ نے اس کی وفات کے بعد مدار المہام بنایا اور رائے رایان کا خطاب دیا۔ (تاریخ ہندوستان صفحہ ۲۸۸ صفحہ ۳۶۶ و ۳۶۹ جلد ۷)

مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی اور علامی سعد اللہ میں ابتداء سے یگانگت تھی۔ حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے استاد مولانا کمال کشمیری سے دونوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ایک مرتبہ حضرت استاد نے فرمایا۔ بادشاہ کے وزیر کو یہاں بلاؤ۔ طلباء کو تعجب ہوا۔ حضرت استاد نے فرمایا کہ یہی سعد اللہ جو اس وقت خستہ حالت میں ہے، وزیر اعظم ہوگا۔ شیخ آدم بھی اسی استاد کے شاگرد تھے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ علامی سعد اللہ اور شیخ آدم میں لڑکپن سے چشمک تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۳۸۱۔ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے لا یرد القضاء الا الدعاء۔ قضاء الٰہی کو صرف دعا ہی پلٹ سکتی ہے۔ حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے مکتوب نمبر ۲۱۷ جلد اص ۲۲۳ و صفحہ ۲۲۴ پر قضا کے مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے جو قابل مطالعہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ قضا کی دو قسمیں ہیں۔ مبرم اور قضاء غیر مبرم یا قضاء معلق۔ قضاء غیر مبرم میں تبدیلی اور محو و اثبات ہوتا رہتا ہے۔ یمحو اللہ ما یشاء و یثبت و عندہ ام الکتاب۔ قضاء مبرم میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ مگر جب حضرت غوث اعظم کی دعا سے اس میں بھی تبدیلی ہوئی تو حضرت غوث اعظم نے فرمایا کہ امت میں میرے سوا کسی کو یہ دسترس حاصل نہیں۔ حضرت مجدد صاحب کو ابتداء میں معلوم ہوا کہ شیخ ظاہر کا کفر قضاء مبرم ہے جس میں تبدیلی نہ ہوگی۔ چنانچہ آپ نے اپنی دعاء میں حضرت غوث اعظم کی دعا کا حوالہ دیا۔ مگر خداوند عالم کا یہ خاص فضل تھا کہ حضرت مجدد صاحب کی دعا قبول ہوئی، اور آپ پر بھی واضح کر دیا گیا کہ قضاء مبرم کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ کارپردازان قضا و قدر اس کو مبرم سمجھتے ہیں مگر علم الٰہی میں وہ معلق ہوتی ہے۔ دوم یہ کہ علم الٰہی میں مبرم ہی ہو۔ حضرت غوث اعظم یا حضرت مجدد صاحب کی دعا جس معاملہ میں قبول ہوئی وہ مبرم مشروط تھا۔ اور آخری قسم یعنی جو قضا کہ عند اللہ مبرم ہو، اس میں تبدیلی کسی صورت سے بھی نہیں ہوسکتی۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔ ما یبدل القول لدی وما انا بظلام للعبید۔ قضا کی انہی متفرق قسموں کے باعث اولیاء اللہ کے مکاشفات میں بسا اوقات غلطی ہو جاتی ہے کیونکہ عارف بھی بعض اوقات قضاء مشروط کو قضاء مبرم سمجھ لیتا ہے۔ انبیاء کے ذاتی مکاشفات میں اگرچہ اس غلطی کا احتمال ہوتا ہے۔ مگر وحی جو من جانب اللہ ہوتی ہے، اس میں غلطی نہیں ہوسکتی۔ قال اللہ تعالیٰ لا یاتیہ الباطل۔ الایۃ ۱۲۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۳۸۲۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۶۱۸ جلد ا۔

۳۸۳۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۶۱۸ جلد ا۔

۳۸۴۔ ان بزرگوں میں مندرجہ ذیل چار حضرات خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ ۱: شیخ ابو محمد قادری نقشبندی لاہوری۔ مزار مبارک بمقام لاہور۔ ۲: سید صوفی۔ آپ کا مزار دہلی میں ہے۔ ۳: شیخ محسن مست کہ "مدام سرمست جام عشق بود" اپنی خبر نہیں اور جس پر نظر توجہ ڈالی، درجہ ولایت کو پہنچ گیا۔ ان کا مدفن بھی لاہور میں بیرون موری دروازہ واقع ہے۔ ۴: شیخ ابو القاسم نقشبندی۔ آپ زیارت حرمین شریفین کے لئے تشریف لے گئے۔ واپسی پر بمقام جدہ وفات ہوگئی وہیں آپ کا مزار اقدس ہے۔ (خزینۃ الاصفیاء جلد اول)

۳۸۵۔ تذکرہ العلماء والمشائخ ص ۳۰-۳۱

۳۸۶۔ مقدمہ مکتوبات جلد سوم ص ۴

۳۸۷۔ تم سے بہتر کون ہوسکتا ہے۔ حالات مشائخ نقشبندیہ ۲۹۶

۳۸۸۔ مکتوبات جلد سوم ص ۴

۳۸۹۔ صاحب سیر آپ کی وفات ۱۰۵۸ھ میں بتاتے ہیں (خزینۃ الاصفیاء)

۳۹۰۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۶۲۹

۳۹۱۔ ایضاً ص ۱۳۷

۳۹۲۔ تذکرہ العلماء والمشائخ ص ۳۱

۳۹۳۔ صحیح السند حدیث ہے کہ مرض الوفات میں ایک مرتبہ رسول اللہؐ دوا کی طرف راغب نہ تھے۔ حاضرین نے زبردستی منہ میں دوا ڈال دی۔ آپ نے حکم فرمایا کہ حضرت عباسؓ کے سوا جتنے موجود ہیں، اُن سب کے منہ میں دوا ڈالو۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ (ترمذی وغیرہ)

عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے اپنی تصنیف ''رحلت مصطفوی'' میں اس کو رسول اللہؐ کے حالت مرض کا ہذیان قرار دیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ موقعہ شناس صحابہؓ اور صحابیات نے اس کی تعمیل کیوں کی۔ اصل وجہ اس کی یہی ہے کہ حضورؐ نے کسی خاص کیفیت کے باعث جو شان رسالت کے شایاں درپیش تھی، دوا سے انکار فرمایا تھا۔ ان حضرات نے اس کو مریض کی طبعی نفرت سمجھا لیکن یہ گستاخی تھی، جس کا انجام خطرناک ہوتا۔ حضورؐ نے انتقامی عمل فرما کر اس گستاخی کے مضرت رساں اثر کو ختم فرمایا۔ حضرت عباسؓ بھی اس واقعہ میں شریک تھے مگر چونکہ وہ چچا تھے، اس قسم کی زبردستی ان کی جانب سے گستاخی نہیں تھی (ہکذا افادنا سیدنا الاستاذ العلامہ انور شاہ کشمیری المحدث قدس اللہ سرہ العزیز)۔

۳۹۴۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۶۳۲ جلد اول۔

۳۹۵۔ اگرچہ حضرت مولانا سیف الدین صاحب کے دہلی تشریف لے جانے اور واپسی کی تاریخ کا پتہ نہیں چل سکا مگر یہ ظاہر ہے کہ ۱۰۷۹ھ سال وفات حضرت خواجہ محمد معصوم سے چند سال پیشتر آپ دہلی تشریف لے گئے۔ حضرت خواجہ کی وفات کے وقت مولانا سیف الدین صاحب کی عمر تیس ۳۰ سال تھی جبکہ آپ سلطان کی روحانی تربیت سے فارغ ہو کر والد ماجد کی خدمت میں واپس تشریف لا چکے تھے۔ اس لئے اندازہ یہ ہے کہ چوبیس پچیس سال کی عمر میں آپ کے یہ خدمت سپرد ہوئی تھی۔ ۱۲

۳۹۶۔ قلعہ کے ایک پھاٹک پر دو ہاتھی اب بھی بنے ہوئے ہیں۔ غالباً یہ دوبارہ بنوائے گئے ہیں۔

۳۹۷۔ شاہجہاں نے قلعہ کے ساتھ یہ باغ بنوایا تھا۔ اس کے وسط میں ایک حوض تھا ساٹھ گز لانبا ساٹھ گز چوڑا۔ بیچ میں ۴۹ اور کناروں پر چاروں طرف ایک سو بارہ فوارے چاندی کے لگے ہوئے تھے جو ہر وقت چلتے رہتے تھے۔ اس حوض کے چاروں طرف سنگ سرخ کی نہر چھ گز کے عرض میں بہتی تھی اور ہر ہر سمت میں تیس تیس فوارے چاندی کے ہر وقت چلتے رہتے تھے سرسید احمد صاحب اس باغ کی مذکورہ بالا تعریف و توصیف کے بعد فرماتے ہیں کہ اب ان فواروں کا نام بھی نہیں رہا۔ البتہ جس جگہ نہر تھی وہاں ایک چھیدا باقی رہ گیا ہے۔ ع

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

اس باغ میں بہادر شاہ بادشاہ حال نے ظفر محل بنایا ہے ۱۲۔ (آثار الصنادید)۔

۳۹۸۔ افسوس ہم بھول گئے۔ اسلامی تاریخ ہمارے سامنے نوجوانوں کی وہ پیش کرتی ہے جنہوں نے آغاز شباب کے لہو و لعب اور جوانی کے بے پناہ امنگوں کو اسلامی خدمت پر قربان کیا اور اسلام نے اُن کے ایثار کو لبیک کہتے ہوئے عظمت و جلالت کی بلند چوٹی پر ان کو پہنچا دیا۔ حضرت عتاب بن اسید کی عمر ۱۸ سال تھی جب کہ مفتوحہ مکہ معظمہ کا اُن کو حاکم بنایا گیا جس میں ابوسفیان اور حکیم بن حزام جیسے جرنیل آج بھی اپنی عظمت و ہیبت کا سکہ جمائے ہوئے تھے۔ سرور کائنات ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ کے جگر گوشہ حضرت اسامہ بن زیدؓ کی عمر ۱۷ سال تھی جب آپ کو سید الانبیاء نے لشکر کا افسر اعلیٰ بنایا جس کو شام پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا جا رہا تھا۔ اس میں عمر فاروقؓ بھی ایک مجاہد کی حیثیت سے شریک تھے۔ وہ ہندوستان کا فاتح اول جس نے عربی نسلوں کے لئے ہندوستان کا راستہ صاف کیا۔ یعنی محمد بن قاسم صرف ۱۸ سال کی عمر لے کر ہندوستان آیا تھا۔ جہاں ڈھائی سال حکومت میں وہ شہر آباد کر گیا اور عربی عدل و انصاف کا وہ سکہ بٹھا گیا کہ اس کے مفتوحہ ممالک میں آج بھی مسلمانوں کی ۷۵ اور ۸۰ فی صدی کی اکثریت ہے۔ اور ہمارے سن چھپے اکبر کی عمر صرف ۱۸ سال تھی جبکہ اس نے تمام مقابلین اور مخالفین کو شکست دے کر اکبر اعظم یا اکبر دی گریٹ'' کا غیر فانی لقب حاصل کیا۔ اور خود عالمگیر کی عمر سترہ سال تھی کہ دکن جیسے پرآشوب صوبہ کا اس کو گورنر بنایا گیا۔ مگر

افسوس آج ہم کیا سے کیا ہو گئے۔

۳۹۹۔ ہمیں ترک سماع کے باعث بے درد کہتے ہیں۔ بے درد وہ ہیں جو سماع سن کر صبر کرتے ہیں۔

۴۰۰۔ منشا یہ ہے کہ جو حضرات واقعی اہل دل اور دردمند ہیں، اُن کے لئے سماع مہلک ہے۔ لہٰذا خودکشی کے مرادف ہوا، جو کہ حرام ہے۔ اور جو لوگ اہل دل نہیں، اُن کے لئے لہو ولعب اور تماشہ ہے لہو ولعب اور بالخصوص مذہب کے پیرایہ میں نہ صرف حرام بلکہ مذہب کے حق میں سخت ترین توہین ہے معاذ اللہ۔

۴۰۱۔ اہل دنیا کی صحبت سے حد درجہ احتراز کرتے۔ یہاں تک کہ دولت مندوں کے ساتھ (ایک دسترخوان پر) کھانا نہ کھاتے تھے۔

۴۰۲۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۳۴۷ جلد اول۔

۴۰۳۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۳۴۷ جلد اول۔

۴۰۴۔ انفاس العارفین ص ۱۹۔

۴۰۵۔ چند صفحات بعد اس کتب میں بھی ملاحظہ فرمائیں گے۔

۴۰۶۔ یعنی وہ حضرات جو سید صاحب کی شطحیات کو جزو دین نہیں تسلیم کرتے تھے۔ البتہ جو لوگ خلاف شرع اُمور اور کلمات کو جزو دین بنالیں، اُن کے زندقہ اور کفر و الحاد میں کس کو تامل ہو سکتا ہے۔

۴۰۷۔ باری تعالیٰ عز اسمہ کے مخصوص اسماء مثلاً رحمٰن، صمد، عالم الغیب وغیرہ کی بھی یہی شان ہے اور یہی سبب ہے کہ علماء اور فقہاء شریعت نے کسی انسان کے لیے ان الفاظ کا اطلاق ناجائز حرام اور بعض صورتوں میں کفر قرار دیا ہے واللہ اعلم بالصواب محمد میاں عفی عنہ

۴۰۸۔ تذکرہ ص ۳۱ تا ۳۹ و ص ۵۳ تا ۵۶ بحذف و اختصار۔

۴۰۹۔ بالکل صحیح ہے۔ اب تک جس قدر پڑھتے پڑھاتے رہے تھے، بیضاوی اور بغوی کی ورق گردانی تھی یا غرور نفس کا بے جا دولاف و گزاف۔ اس کے لئے تو جبرئیل عشق کے فیضان اور دل دردمند کے الہام کی ضرورت ہے۔ شیخ نیازی کی صحبت نے اسی بند دروازے کو کھول دیا۔

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں ۔۔۔۔۔ دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں۔ ۱۲ منہ

۴۱۰۔ وہی عوام جو آج بھی کسی کو اپنی مزعومات باطلہ، رسومات قبیحہ اور رواجات مہلکہ کا مخالف پاتے ہیں تو وہ خود ہی یا اپنے جیسے کسی مولوی نما سے اس کے متعلق وہابیت وغیرہ کا فتویٰ صادر کرا دیتے ہیں۔ محمد میاں

۴۱۱۔ تمہارا کھانا تمام مسلمانوں کا حق ہے۔ تم اپنے واجبی حصہ سے زیادہ خلاف شرع اپنے تصرف میں لا رہے ہیں۔

۴۱۲۔ تو دنیا پرست عالم اور دین کا چور ہے۔ چند نامشروع اور ناجائز اُمور پر تیرا عمل ہے۔ حتیٰ کہ دائرہ عدالت سے تو خارج ہو چکا (یعنی تو فاسق ہو چکا ہے) اب تک گانے بجانے کی آواز علانیہ تیرے مکان سے سنی جاتی ہے۔

۴۱۳۔ یہ رقص و سرود کی بھی جس کو مشیخیت کی چادر اُڑھائی جاتی تھی اس قسم کے سینکڑوں مظلوموں کے خون ناحق کا سبب بنا۔

۴۱۴۔ شیخ بڈھن اس زمانہ کے اکابر علماء میں تسلیم کیے جاتے تھے بدایونی لکھتے ہیں کہ شیر شاہ ان کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ اور ارشاد قاضی پر ایک عمدہ شرح بھی آپ نے لکھی ہے۔ بایں ہمہ حال یہ تھا کہ جب شیخ علائی شاہی حراست میں ان کے مکان پر پہنچا تو از اندرون خانہ آواز سرود و ساز شنید و دید کہ مکارہ طبعی و شرعی و دیگر چیز کہ ذکر اینجا نہ صریح وارد در مجلس او دیدند و بے اختیار امر معروف و نہی منکر کردند (تذکرہ ص ۲۰) مولانا ابوالکلام آزاد اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔ کاش شیخ بڈھن علم نہ پڑھتے، ارشاد قاضی کی شرح نہ لکھتے۔ جنگل میں لکڑیاں کاٹتے اور سر پر اٹھا کر بازاروں میں بیچتے۔ مگر حق گوئی سے زبان نہ روکتے، تو ہزار درجہ اس مولویت و مشیخت اور شرح نویسی کی زندگی سے اللہ کے نزدیک محبوب و مقرب ہوتے۔ ۔ عشق تو قائم نہ ہوا آپ سے اور ہی کچھ پیشہ کیا چاہیے

۴۱۵۔ یوسف نام۔ زاد و بوم ظفر آباد۔ مرید و خلیفہ شیخ حسن طاہر کہ لقب وے کمال الحق ست و مرید حاجی حامد شہ کہ خلیفہ شیخ حسام الدین مانک پوری ست، علم ظاہر و باطن اندوختہ و بیا او در زندگی خلفاء خود را بدو حوالہ کردہ بود، و ہنگام فوت شدن پسر خود عبدالعزیز را بدو

بسیر و پانزدہم صفر نہصد از آشوب گاہ ہستی برکنار شد۔ (آئین اکبری جلد سوم ص ۱۷۵)

۳۱۶۔ اخبار الاخیار ص ۲۳۹۔

۳۱۷۔ اخبار الاخیار ص ۲۵۸

۳۱۸۔ بالا جماع از اولیاء زماں خود بود (اخبار الاخیار ص ۲۵۰) قطب الاقطاب وقت خود بود (خزینۃ الاصفیاء ص ۴۳۹)

۳۱۹۔ کلسیوطی منہ علی العالمین والمتقی منہ علیہ (ماثر الکرام ص ۱۹۳ ج ۱۔ اخبار الاخیار ص ۲۸۲)

۳۲۰۔ تاریخ واقدی میں ہے کہ شام کی فوجوں سے جو خیمے مال غنیمت میں صحابۂ کرام کو حاصل ہوتے تھے، یہ مجاہدین اسلام سردیوں میں بارش کے وقت اپنے ٹوٹے پھوٹے خیموں میں بسر کرتے تھے، یا بارش میں بھیگتے رہتے تھے۔ مگر ان خیموں میں سرنہ چھپاتے تھے کہ یہ ظلم کے پیسے سے بنائے گئے ہیں۔ محمد میاں عفی عنہ

۳۲۱۔ جبکہ کسی شخص کی آمدنی میں غیر طیب مال کی آمیزش ہو تو اگرچہ فتویٰ یہ ہے کہ اس کی دعوت منظور کی جا سکتی ہے اور اس کے یہاں کھانا کھایا جا سکتا ہے مگر تقویٰ یہ ہے اس سے اجتناب کرے۔ (اربعین غزالی)۔

۳۲۲۔ ادھر اُدھر کی بات چیت کے بعد شیخ داؤد نے دریافت کیا، گوشہ نشین، تارک الدنیا فقراء کو کس غرض سے طلب کیا گیا؟ مخدوم الملک نے کہا کہ تمہارے مریدوں کے متعلق سنا ہے کہ ذکر کے وقت یا داؤد یا داؤد کہتے ہیں۔ شیخ نے جواب دیا۔ سننے والے کو دھوکا ہوا ہے وہ بظاہر یا ودود یا ودود کہتے ہوں گے۔

۳۲۳۔ ماثر الکرام جلد اول ص ۱۹۵ و ص ۱۹۶۔

۳۲۴۔ ماثر الکرام جلد اول ص ۱۹۶۔ آخر میں درج ہے۔ اما شیخ محمد طاہر باتفاق جمہور از قوم بوہرہ بود و کلام شیخ عبدالحق دہلوی در اخبار الاخیار ہم تصریح میکند و صدیقی بعضے میگویند بہ اعتبار نسب از جانب مادر بود بعضے مے گویند از جہت اعتقاد بود کہ چوں شیعہ خود را حیدری مے گویند او خود را صدیقی خواند۔

۳۲۵۔ ماثر الکرام جلد اول ۱۹۶۔

۳۲۶۔ ایضاً۔

۳۲۷۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ۔ متوفی ۹۴۵ھ (نو سو پینتالیس ہجری) مشائخ چشت میں بلند پایہ اور مشہور و معروف شیخ ہیں اور حضرت شیخ احمد عبدالحق رودولوی متوفی ۸۳۶ھ (آٹھ سو چھتیس) کے پوتے حضرت شیخ محمد بن شیخ عارف سے بیعت تھے مگر براہ راست شیخ احمد عبدالحق کے معتقد اور عاشق تھے اور انہیں کی روحانیت سے فیوض و کمالات حاصل کئے۔ شیخ احمد عبدالحق رودولوی حضرت شیخ جلال الدین پانی پتی متوفی ۷۶۵ھ (سات سو پینسٹھ) کے شہرۂ آفاق خلیفہ ہیں۔ شیخ عبدالقدوس قدس اللہ سرہ العزیز کے کئی لڑکے تھے۔ بقول صاحب اخبار الاخیار ہمہ عالم صعید، مجلس جلیاس مشائخ شیخ عبدالقدوس کے ایک پوتا کا نام عبدالنبی تھا جن کا تذکرہ حالات اکبر کے سلسلہ میں گزرا۔ شیخ عبدالنبی سماع کے مخالف تھے والد نے جواز سماع پر رسالہ لکھا۔ شیخ عبدالنبی نے اس کی مخالفت میں رسالہ لکھا باپ بیٹوں میں خوب بحث چلی۔ اکبر بادشاہ ابتداء میں شیخ عبدالنبی کا یہاں تک معتقد تھا کہ شیخ کی جوتیاں سیدھی کیں۔ چنانچہ شیخ کو امور شرعیہ کا صدر اعظم بنا دیا۔ مگر شیخ عبدالنبی کو جلیل الشان منصب راس نہ آیا۔ طبیعت میں غرور پیدا ہو گیا۔ علماء اور مشائخ کی تحقیر کرنے لگے۔ حتیٰ کہ بادشاہ کی نظر سے بھی گر گئے۔ پھر گرفتار ہو کر ۹۹۲ھ (نو سو بانوے) میں انتقال کر گئے۔ لطفہ حضرت شیخ رکن الدین اور شیخ عبدالکبیر بالا پیر متوفی ۹۴۷ھ (نو سو سینتالیس) حضرت شیخ عبدالقدوس کے صاحبزادگان میں خاص مرتبہ اور شہرت کے مالک ہیں (اخبار الاخیار و خزینۃ الاصفیاء وغیرہ)

۳۲۸۔ یعنی جس فاتح نے اس ملک کو فتح کر کے دار السلام بنایا۔ واللہ اعلم

۳۲۹۔ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی کے کتب خانہ میں سے یہ رسالہ دستیاب ہو گیا ہے۔ جو ستتر سال پیشتر یعنی شعبان المعظم ۱۳۰۲ھ (تیرہ سو دو ہجری) میں احمد حسن خاں کے اہتمام سے مطبع احمدی واقع مدرسہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلی میں طبع ہوا تھا ۱۲۔ "تحقیق اراضی ہند" اس رسالہ کا نام ہے۔

۴۳۰۔ ذات والا صفات بمقتضائے اسم خود موہبت ربانی و عطیۂ یزدانی بود۔ مفتاح خزائن مقال و مصباح مجالس حال۔ تلمیذ مولانا عبداللہ تلنبی (متوفی ۹۲۲ھ نو صد و بست دو) و مرید راجی حامد شاہ مانک پوری متوفی ۹۰۱ھ نو صد و یک۔ عمر گرامی را بیشتر بہ تدریس و تصنیف صرف ساخت و در تصانیف را تقید و تالیف تا نگر پرداخت مثل شرح ہدایہ در فقہ در چند مجلد (شرح بزدوی و حواشی بر حواشی ہندیہ و حاشیہ تفسیر مدارک)۔ (مآثر الکرام ص ۱۹۲ جلد ا) عقل سال: نقال آنجناب گفت مصباح بہشت اللہ داد (نو صد و بست و سہ) ایک خاص لطیفہ یہ ہے کہ اسی صدی میں پانچ اللہ داد اور گزرے ہیں۔ ۱: مولانا الہ داد لکھنوی۔ جن کا تذکرہ ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں کیا ہے کہ نہایت ذہین و ذکی اور دانشمند تھے۔ فقہ، اصول فقہ اور عربیت میں ماہر نحو میں ایک رسالہ لکھا جس کا نام تعلیمی تھا۔ ایک اور رسالہ آپ کی تصنیف تھا جس میں جدول کی طرح چودہ سطریں طول میں تھیں اور چودہ عرض میں اور اس چودہ سطری رسالہ سے چودہ علوم کے مسائل و احکام برآمد کئے جاسکتے تھے۔ نیز ایک اور رسالہ قطبون نام تھا جو مقامات حریری کے طرز پر لکھا تھا۔ ملا عبدالقادر نے یہ دونوں رسالے دیکھے تھے۔ ۲: مولانا الہ داد سلطان پوری۔ اصلی وطن ہندوواز مضافات سندیلہ۔ اکبر بادشاہ کے زمانہ میں صوبہ پنجاب کی صدارت پر، پھر الہ آباد میں منصب قضا پر مامور ہوئے۔ کشف الغمہ اور منہاج الدین آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ سنہ ایک ہزار چہ شش وفات ہوئی۔ ۳: مولانا الہ داد لنگر خانی لاہوری۔ لنگر خان لاہور کا ایک محلہ تھا۔ آپ عالم، زاہد اور متقی تھے۔ ہمیشہ قناعت و توکل سے زندگی بسر کی۔ کسی حاکم یا امیر کے پاس نہیں گئے۔ ۴: مولانا الہ داد امروہی، جو اکبری افواج میں ملازم رہے۔ ۹۹۰ھ (نو سو نوے ہجری) میں انتقال ہوا۔ امروہہ میں دفن ہوئے (تذکرہ علماء ہند ص ۲۶)۔ ان کے علاوہ پانچویں قاضی الہ داد بلگرامی ہیں جن کی وفات ۱۰۰۱ھ (ایک ہزار ایک) میں ہوئی۔ (مآثر ص ۲۲۸ جلد ا)۔

۴۳۱۔ وذکر مولانا محمد اعلی التھانوی في رسالة له ان اراضي الهند ليست بعشرية ولا خراجية بل اراضي الحوزة اى اراضي بيت المال والمملكة۔ والله اعلم العرف الشذي ص ۲۸۶ باب ماجاء في زكوة العسل۔

۴۳۲۔ شیخ کامل، عالم باعمل، صاحب تصانیف مثل شرح فصوص الحکم وغیرہ تین مرتبہ دنیا کی سیاحت کی، اور ہزاروں مشائخ اور اولیاء اللہ سے فیوض حاصل کئے۔ ایک مرتبہ ایک ہی مجلس میں چار سو اولیاء اللہ کے اجتماع سے سعادت اندوز ہوئے۔ آخر میں کشمیر کو نزول کا وطن بنایا۔ سلطان علاؤ الدین کے نام پر محلہ علاؤ الدین پورہ تھا، وہاں قیام کیا۔ شاہ کشمیر سلطان شہاب الدین نے نذر عقیدت پیش کی۔ فسق و فجور سے تائب ہوا۔ اس کا بھائی سلطان قطب الدین بیشتر حاضر خدمت رہتا۔ کشمیر اور اطراف کشمیر میں بے شمار خلق اللہ کو ہدایت و ارشاد کی دولتوں سے مالا مال کیا۔ ۷۸۶ھ (سات سو چھیاسی) میں وفات ہوئی۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم تاریخ وفات ہے۔

۴۳۳۔ یعنی ۹۸۶ھ تاریخ ہندوستان ص ۳۱۳ جلد ۵۔

۴۳۴۔ خزینۃ الاصفیاء جلد ۲ ص ۳۴۰

۴۳۵۔ یعقوب خان چک، والی اخیر کشمیر کہ بعصب مذہب رافضیہ دشمن اہل سنت شد۔ ۱۲ (خزینۃ الاصفیاء جلد ۲ ص ۳۴۰

۴۳۶۔ ماخوذ از مآثر الکرام ص ۳۹ تا ص ۴۰ جلد ا۔

۴۳۷۔ شیخ مبارک بن شیخ خضر۔ مشہور عالم ہیں۔ فنون عقلیہ کی مہارت میں یکتاء روزگار تھے۔ پانچ پشت میں ان کے مورث یمن سے روانہ ہو کر بلاد و ممالک کی سیاحت اور عجائب قدرت کا مشاہدہ کرتے ہوئے نویں صدی میں سیوستان سندھ کے مضافات میں قصبہ ایل میں فروکش ہوئے۔ چوتھی پشت میں شیخ خضر نے سندھ سے رخت غربت باندھا اور قصبہ ناگور میں قیام کیا۔ جوانی میں احمد آباد کا رخ کیا۔ وہاں خطیب ابوالفضل گازرونی اور دیگر اکابر سے کمالات حاصل کئے۔ ۹۵۰ھ میں شہر آگرہ کی جانب مراجعت کی۔ پچاس سال تک یہاں سلسلۂ درس و تدریس جاری رکھا۔ قابل یادگار کمال یہ تھا کہ پانسو ضخیم کتابیں اپنے ہاتھ سے نقل کیں۔ آخر میں نابینا ہو گئے تھے مگر قوت حفظ میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس نابینائی کے زمانہ میں تفسیر کی کتاب منبع عیون المعانی لکھوائی۔ جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ ملا مبارک تقریر کرتے جاتے تھے اور کاتب لکھتا رہتا تھا۔ بہرحال علوم ظاہری میں باکمال

تھے۔ اگرچہ اکبری فتنہ کے بانی اوّل بھی آپ ہی تھے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ واعفا عنہ

۴۳۸۔ ملا عبدالقادر کا مربی ہے۔ ملا عبدالقادر لکھتے ہیں کہ بہت بڑا باہمت، بہادر، پابند مذہب، رحم دل اور سخی تھا۔ اس کا خزانہ ہمیشہ خالی رہتا تھا۔ جب وہ مرا ہے تو ڈیڑھ لاکھ کا مقروض تھا۔ مگر قرض خواہوں سے اس کا سلوک ایسا عمدہ رہتا تھا کہ انہوں نے تمام رقم معاف کردی اور دستاویزیں چاک کر ڈالیں۔ صفر ۹۶۵ھ میں لاہور کا گورنر بنایا گیا۔ اس کے نام کے ساتھ "ٹکریہ" کا لفظ بھی لگایا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ گورنری لاہور کے زمانہ میں ایک لمبی ڈاڑھی والا ہندو آیا۔ وہ اس کو مسلمان سمجھ کر تعظیم کے لئے کھڑا ہوگیا جب معلوم ہوا کہ ہندو ہے تو اس نے حکم دیا کہ جب کوئی ہندو ملنے آئے تو ایک ٹکری زرد کپڑے کی مونڈھے پر ڈال کر آئے۔ پھر حکم دیا کہ پالان پر سوار ہوں، زین پر سوار نہ ہوں۔ جفاکشی کی یہ حالت تھی کہ چارپائی پر نہ سوتا تھا۔ گھوڑے خریدتا اور تقسیم کر دیتا۔ عموماً اس کے اصطبل میں ایک گھوڑا رہتا۔ کبھی اس کو بھی بخش دیتا تھا۔ شب بیدار تہجد اور جماعت کا پابند تھا۔ وہ ابتداء میں بیرام خاں کا ملازم تھا۔ پھر بیرام خاں کی شکست کے بعد اکبر کا ملازم ہوگیا۔ سہ ہزاری منصب حاصل کیا مگر عموماً بادشاہ سے مخالفت رہی۔ شہادت کا شوقین تھا۔ جنگ کے وقت پہلے شہادت کی دعا کرتا پھر فتح کی۔ ایک جنگ میں ایک ہندو کی گولی سے زخمی ہوا۔ پھر شاہی عتاب میں آگرہ بھیجا گیا۔ اسی زخم کے صدمہ سے آگرہ میں ہی انتقال ہوگیا۔ اس کا بیٹا یوسف خاں حکومت جہانگیر کا رکن ہوا۔ ۱۲ منہ۔

۴۳۹۔ میر فتح اللہ شیرازی۔ حکمت عملی اور نظری میں یکتاروزگار تھے۔ خواجہ جمال الدین محمود مولانا کمال الدین شیروانی، مولانا کردا اور میر غیاث الدین منصور شیرازی وغیرہ سے علوم ظاہری میں کسب کمال کیا۔ عادل شاہ بیجاپوری نے ہزاروں التجاؤں سے آپ کو شیراز سے دکن بلایا اور اپنا وکیل مطلق بنا دیا۔ ۹۹۱ھ (نوسو اکیانوے) کے آخر میں اکبر بادشاہ نے اپنے پاس طلب کر لیا تھا۔ آپ اور حکیم ابوالفتح کو استقبال کے لئے مامور کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں شاہی اعتماد یہاں تک حاصل کیا کہ صدارت کل کا منصب تفویض ہوا۔ ۹۹۳ھ (نوسو ترانوے) میں امین الملک کا خطاب دیا گیا اور راجہ ٹوڈرمل کو حکم ہوا کہ مہمات ملکی میں میر صاحب سے مشورہ کیا کریں۔ آپ کی حسن خدمات کی بنا پر اسی سال عضد الدولہ کا خطاب مرحمت ہوا۔ حسن تدبیر اور عمدگی کی بناء پر اکبری نظر میں بہت زیادہ وقعت حاصل کی۔ ۹۹۷ھ (نوسو ستانویں) میں جب کہ اکبر بادشاہ سیر کشمیر سے واپس آرہا تھا، مانڈوجان میں میر صاحب کا انتقال ہوگیا۔

اولاً میر سید علی ہمدانی کے مکان میں دفن کیا گیا تھا۔ پھر اکبر بادشاہ نے وہاں سے منتقل کرا کر کوہ سلیمان کی چوٹی پر دفن کر دیا جو نہایت دل کشا مقام ہے۔ میر صاحب کی وفات پر بادشاہ نے کہا۔ میر، وکیل و حکیم و طبیب و منجم ما بود۔ فیضی کا شعر ہے:

شہنشاہ جہاں را دروفاتش دیدہ پر نم شد　　　سکندر اشک حسرت ریخت کافلاطوں ز عالم شد

آپ کثیر التصانیف ہیں۔ تہذیب المنطق پر علامہ دوانی کے حاشیہ کا تکملہ آپ کے خامہ کار ہین منت ہے۔ پھر اس حاشیہ پر ایک اور حاشیہ تحریر فرمایا۔ نیز علماء متاخرین مثلاً محقق دوانی، میر صدر الدین، میر غیاث الدین منصور، مرزا جان میر کی تصانیف ہندوستان میں لا کر داخل درس میں اُن کو داخل کرنا آپ کا کارنامہ ہے (مآثر الکرام ص ۲۳۷ جلد۱)۔ آپ نے ایک چکی ایجاد کی تھی جو خود بخود چلتی تھی۔ نیز ایک بندوق آپ نے ایجاد کی تھی جو بارہ فیر کرتی تھی۔ نیز ایک آئینہ ایجاد کیا تھا جس میں دور اور پاس کی عجیب عجیب چیزیں نظر آتی تھیں۔ (تذکرہ علماء ہند ص ۱۶۰)۔

۴۴۰۔ کیا کروں حقوق دین کی پاسداری تمام حقوق سے بلند وبالا ہے۔ الحب للّٰہ والبغض للّٰہ (خدا کے لئے ہے محبت اور اسی کے لئے ہے بغض)۔ ہر چند پورے چالیس سال اس کی (فیضی کی) صحبت میں گزرے مگر حالات کی تبدیلی اور اس کے مذاق کے بگڑ جانے سے (خصوصاً مرض الموت میں) وہ تمام تعلق ختم ہوگیا۔ دوستی کا انجام نفاق ہوا۔ ایک نے دوسرے سے رہائی پائی (حقیقت یہ ہے کہ) ہم سب اُس درگاہ کی طرف رخ کئے ہوئے ہیں۔ جہاں تمام حق معاملے جدا جدا ہو جائیں گے۔ اُس روز پرہیزگاروں کے سوا تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے ۱۲

۴۴۱۔ داوری۔ حکومت قصد، معاملہ، خصومت، جنگ، شکایت، محاکمہ ۱۲ غیاث اللغات۔

۴۴۲۔ شہر تلنبہ (تا مضموم لام مفتوح نون ساکن) علاقہ ملتان کے رہنے والے صاحب ارشاد و ہدایت، عالم تبحر، حضرت مولانا عزیز اللہ صاحب، سکندر لودھی کے زمانہ میں وطن اصلی سے ہجرت کر کے سنبھل تشریف لائے۔ عرصہ دراز تک سلسلہ تدریس سے تشنگان علوم کو سیراب کیا۔ نو سو تیرہ ہجری میں آپ نے وفات پائی۔ شیخ حاتم سنبھلی، مولانا عزیز اللہ صاحب کے رشید ترین شاگرد اور مرید ہیں۔ اپنے زمانہ میں علوم ظاہری میں یکتا اور بے نظیر ہونے کے باوجود اعلیٰ درجہ کے مرتاض، صالح اور متقی تھے۔ کہتے ہیں کہ شرح مفتاح اور مطول کو بسم اللہ کی ب سے تمت کی تا تک چالیس بار پڑھایا۔ دوسری کتابوں کا بھی قریب قریب یہی حال تھا۔ ۹۶۸ھ (نو سو اڑسٹھ ہجری) میں وفات پائی۔ (تذکرہ علماء ہند ردیف حاء و میمن)۔

۴۴۳۔ سیر الاصفیاء، مکتوبات حضرت شیخ عبد الحق دہلوی و تذکیر الطالبین بتذکرۃ الصلحاء الواصلین، وغیرہ بحوالہ تذکرہ مولانا ابو الکلام آزاد۔ تنبیہ: شیخ بہلول دہلوی حضرت مولانا ابو الکلام آزاد کے سلسلۂ نسب کے ایک مورث اعلیٰ ہیں۔ (تشریح کے لئے ملاحظہ ہو تذکرہ ص ۱۰)

۴۴۴۔ سید رفیع الدین شیرازی نویں صدی کے اعاظم محدثین اور کملاء روزگار سے ہیں اور بہ یک واسطہ ان کا سلسلۂ تلمذ حافظ ابن حجر عسقلانی تک پہنچتا ہے۔ وہ حافظ شمس الدین سخاوی کے شاگرد ہیں اور حافظ سخاوی حافظ عسقلانی کے۔

معقولات کی تحصیل خود علامہ جلال الدین دوانی سے کی تھی۔ اخبار الاخیار میں لکھا ہے (صفحہ ۲۴۴) کہ ان کا خاندان شیراز میں اس درجہ محترم تھا کہ علامہ دوانی خود ان کے مکان پر آ کر درس دیتے تھے۔

حافظ سخاوی نے ملاقات سے پہلے اپنی پچاس کتابوں کی تحریری اسناد بھیج دی تھیں اور لکھا تھا کہ آپ جیسے صاحب کمال کے لئے درس و تلقین ضروری نہیں۔ لیکن ان کے شوق علم نے اس پر قناعت نہ کی۔ خود قاہرہ پہنچے اور عرصہ تک حافظ موصوف کی خدمت میں رہے۔ حافظ سخاوی نے الضوء اللامع فی اعیان القرن التاسع میں ان کا مفصل ترجمہ لکھا ہے۔ اخبار الاخیار سے روضۃ العلماء، منتخب التواریخ وغیرہ میں بھی ان کے حالات ملتے ہیں۔

سکندر لودھی کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور سلطان کی عقیدت و ارادت اس طرح دامن گیر ہوئی کہ یہیں مقیم ہو گئے۔ سلطان سکندر سے لے کر سلیم شاہ تک تمام شاہان ہندان کے خدمت گزار رہے بڑے بڑے علماء وقت نے فن حدیث میں ان کی شاگردی کی۔

شاہ عبد الحق کے عہد سے پہلے ان اطراف میں فن حدیث کے درس و تدریس کا جس قدر رواج ہوا، وہ انہی کے قیام ہندوستان کا فیضان تھا۔

ہمایوں کو جب شیر شاہ سے شکست ہوئی اور آگرہ آیا تو سید موصوف کے مکان پر جا کر طالب دعا ہوا۔ تذکرۃ الواقعات میں ہے کہ ایران جانے کا مشورہ سید موصوف ہی نے دیا تھا۔ ملا مبارک اور شیخ عبد النبی کے معرکوں میں یہ ملا مبارک کے مددگار رہے اور انہیں کی اعانت اور یاری سے ملا موصوف کو آگرہ میں رہنا نصیب ہوا۔ سال وفات ۹۵۴ھ (نو سو چون ھ) ہے (تذکرہ ص ۱۱)

۴۴۵۔ خان اعظم دربار اکبری کے مذہبی تسائل سے بگڑ کر سنہ ایک ہزار ۱۰۰۰ ہجری میں مکہ معظمہ گئے اور ایک ہزار دو ۱۰۰۲ میں واپس آئے۔ شیخ کی واپسی انہیں کے ساتھ ہوئی۔ ۱۲

۴۴۶۔ تذکرہ ص ۲۸۰ جلد ۱۔

۴۴۷۔ تذکرۃ العلماء والمشائخ۔

۴۴۸۔ مولانا محمد اسحاق خلیفہ شیخ داؤد چونی وال۔ بڑے پایہ کے عالم اور شیخ وقت تھے۔ حضرت داؤد کرمانی کے برادر زادہ شاہ ابو المعالی متوفی ۱۰۲۴ھ کے ساتھ بہت زیادہ یگانگت تھی۔ ذکر و شغل، عبادت اور سلوک طریقت میں ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر الحب للہ کا نمونہ پیش کرتے۔ نو سو پچاسی ہجری میں وفات ہوئی (خزینۃ الاصفیاء ص ۴۳۳ جلد ۱)۔

۴۴۹۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۹۱ جلد دوم۔

۴۵۰۔ مآثر الکرام ص ۲۰۹ و ص ۲۱۰۔

۴۵۱۔ ایک ہی زمانہ میں دو ملا عبد السلام، صاحب کمال اور شہرہ آفاق ہیں ان دونوں کے متعلق مولانا آزاد بلگرامی کی تحریر درج ذیل ہے:

ملا عبدالسلام ساکن دیوہ

(دیوہ از مضافات صوبہ اودھ) اخذ علوم را سا عربیت در سرزمین مولد خود تحصیل کرد۔ تا کہ قسمت او را بہ لاہور آورد و در حلقِ درافت ملا عبدالسلام لاہوری رسانید ہر چہ خواندہ بود بخدمت ملا شیخ نمود و قدم بہ قدم استاد گذاشت۔ و چنانچہ اتحاد اسمی تحقق بود۔ نسبت فضیلت نیز رتبہ مساوات بہم رسانید۔ چندے بہ دانش آموزی مستفیدان گذرانید۔ آخر ملازمت صاحب قران شاہجہان دریافت و چندے بہ منصب افتاء عسکر مامور گردید و در کبر سن دست از یں منصب باز داشتہ در دارالسلطنت لاہور رنگ اثر وار یافت و تشنہ کامان علوم را بہ کوثر افادہ سیراب مے ساخت و حاشیہ بر تفسیر بیضاوی در سلک تحریر کشید۔ (مآثر ص ۳۳۶ جلد ۱)

ملا عبدالسلام لاہوری

معدن عقلیات و نقلیات بود۔ فنون ادب و فقہ و اصول را نیکوی دانست، علم از امیر شیخ اللہ شیرازی وغیرہ فرا گرفت و قریب شصت سال درس گفت و جمعے کثیر را بپایہ فضیلت برسانید و حاشیہ بر تفسیر بیضاوی تعلیق نمود۔ و قریب نود و ۹۰ سال عمر یافت۔ مؤلف مخان بسیار بر کتب متداولہ داشتم ارباب استعداد عرض کردم و در معرض قبول افتاد۔ اما از کثرت اشتغال درس فرصت تحریر نیافتم۔ الحال کہ ضعف قوی مستولی گشت و قوت حافظہ رو بہ انحطاط آورد ہمہ از خاطر بر آمد۔ بر فقدان ایں صورت تاسف مے نمود۔ درس صحیح و محدثین والف کتاب زندگانی برہم نہاد (مآثر الکرام ص ۲۳۶ جلد ۱)۔

۳۵۲۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۱۳۸

۳۵۳۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۴۵۵ جلد ۱۔

۳۵۴۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۴۵۸

۳۵۵۔ ایضاً ص ۱۶۴ جلد ۱

۳۵۶۔ خلف رشید حضرت نور الدین خلف حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز آپ کے فیوض و برکات بھی بہت زیادہ ہیں۔ شیخ محمد صادق گنگوہی اور شیخ محمد ابراہیم ساکن سید پورہ متصل گنگوہ۔ شیخ ابراہیم سہارن پوری شیخ خواجہ پانی پتی۔ شیخ محب اللہ الہ آبادی آپ کے (شیخ ابوسعید) کے جلیل القدر خلفاء ہیں (خزینہ ص ۴۲۷ جلد ۱)۔ شیخ محمد صادق خلف شیخ فتح اللہ حضرت شیخ ابو سعید قدس اللہ سرہ العزیز کے برادر زادہ ہیں۔ آپ کی وفات ۱۸ محرم ۱۰۵۸ھ (ایک ہزار اٹھاون) میں ہوئی مزار پر انوار گنگوہ میں ہے آپ کے فرزند ارجمند شیخ داؤد، فرزند دوم شیخ محمد۔ نیز شیخ ابراہیم مراد آبادی، شیخ عبدالسبحان سہارنپوری، شیخ عبدالجلیل الہ آبادی شیخ جمال کا چھو، شیخ مبارک اور شیخ یوسف کابلی، شیخ محمد صادق کے خلفاء صاحب احترام ہیں (خزینۃ الاصفیاء ص ۴۷۶ جلد ۱)

۳۵۷۔ مآثر الکرام ص ۲۷ جلد ۱

۳۵۸۔ بھٹ کھیڑا در نیز بھٹ۔ سرکار سہارن پور صوبہ دہلی۔ (آئین اکبری ص ۴۷ و ص ۲۸ جلد ۲)

۳۵۹۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۳۴۷۔

۳۶۰۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اوّل از ص ۴۵۲ تا ص ۱۶۰ و تذکرۃ العلماء والمشائخ ص ۳۸ تا ص ۴۱۔

۳۶۱۔ خزینۃ الاصفیاء میں ہے۔ در عمر بیست و پنج سالگی او لاہور رسید۔ (جلد ۱ ص ۱۵۴)

۳۶۲۔ خزینۃ الاصفیاء جلد ۱ ص ۱۵۴۔

۳۶۳۔ فقہ، حدیث و تفسیر کے بہترین عالم تھے۔ حاجی پور کے باشندہ تھے۔ ۱۰۶۰ھ (ایک ہزار ساٹھ) میں وفات پائی (خزینہ جلد ۱ ص ۱۲۸)۔ ایک مرتبہ شاہجہاں ان سے ملاقات کے لئے آیا، تو آپ خبر پاتے ہی اپنے حجرے سے غائب ہوگئے بادشاہ نے انتظار کیا۔ جب نہ آئے تو بادشاہ چلے گئے اور کہہ گئے کہ ملا صاحب سے کہہ دینا "طاقت مہماں نداشت خانہ بہ مہماں گذاشت۔" جب ملا صاحب کو یہ پیغام پہنچا تو کہا کہ میں قصداً غیر حاضر ہو گیا تھا، ورنہ عام لوگ میری داڑھی کے بال بھی نہ چھوڑتے۔ اگلے روز

بادشاہ نے دربار عام کیا۔ اس میں ملا صاحب بھی تشریف لائے۔ جب بادشاہ کو معلوم ہوا تو وہ خود اٹھ کر ملا صاحب کے پاس آیا اور دیر تک تنہائی میں باتیں کرتا رہا۔ (تذکرۃ العلماء والمشائخ ص ۳۵)

۳۶۴۔ میاں نتھا از قوم پراچہ مجید کش۔ حضرت میاں میر کے چہیتے خلیفہ۔ ۱۰۲۷ھ (ایک ہزار ستائیس) میں وفات ہوگئی۔ حضرت میاں میر نے با چشم پرنم ارشاد فرمایا۔ رونق فقیر خانہ میاں نتھا برد۔ پھر مرتے وقت حضرت میاں میر نے وصیت فرمائی کہ میاں نتھا کے برابر دفن کیا جائے (خزینۃ الاصفیاء جلد ا ص ۱۵۲)

۳۶۵۔ شرعی لحاظ سے یہ مفہوم تصدیق طلب ہے۔

۳۶۶۔ کیوں نہ ہوتا۔ مطلب کے موافق بات تھی۔ مگر مجدد صاحب ترک سجدہ پر مستحق سزا تھے۔ یہی تفاوت ہے جس نے شیخ احمد کو الف ثانی کا مجدد قرار دیا۔ آسان ہے خلاف شرع امور پر چشم پوشی کر کے اپنے تقدس کا سکہ جما لینا۔ مگر مشکل ہے اور بہت مشکل ہے کلمۂ حق ادا کر کے اصلاح کرنا۔ (محمد میاں عفی عنہ)۔ عزلت گزینی اچھی چیز ہے مگر خلق اللہ سے مل کر ان کی اصلاح اور ان کی بدخلقیوں کے مقابلہ میں صبر و تحمل وارثان انبیاء علیہم السلام کا وظیفہ ہے۔

۳۶۷۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۶۲۳ جلد ا

۳۶۸۔ تذکرہ علماء ہند صفحہ ۱۷۵ و خزینۃ الاصفیاء ص ۴۲۷ ج ا۔ ایک دوسرے بزرگ شیخ محب اللہ اکبر آبادی ہیں عجیب اتفاق ہے کہ آپ کا سنہ وفات بھی وہی ہے جو حضرت محب اللہ الہ آبادی کا یعنی ۱۰۵۸ھ۔

۳۶۹۔ وطن اصلی او قصبہ صید پور توابع خیر آباد من مضافات اودھ (تذکرہ علماء ہند ص ۱۷۵)۔

۳۷۰۔ مآثر الکرام ص ۲۰۲ جلد ا

۳۷۱۔ مآثر الکرام ص ۲۰۷ تا ص ۲۰۹۔ انفاس العارفین ص ۴۳۔

۳۷۲۔ میر کلاں حضرت خواجہ کوہی کے نواسہ تھے۔ اپنے زمانہ کے بڑے بڑے علماء اور فضلاء سے تحصیل علم کے بعد میر جمال الدین محدث اور سید میرک شاہ سے حدیث شریف کی سند حاصل کی اور حرمین شریفین کی زیارت سے سعادت اندوز ہوئے۔ سلسلۂ نقشبندیہ کے بہت سے اکابر کی زیارت و صحبت سے مشرف ہوئے۔ اس کے بعد ہندوستان تشریف لائے۔ جلال الدین اکبر بادشاہ نے آپ کا بہت اعزاز و اکرام کیا اور شاہزادہ سلیم کی تعلیم کے لئے آپ کو مامور فرمایا۔

حدیث و فقہ و قراءت کے مشہور عالم ملا علی قاری نے حدیث شریف کی سند آپ سے حاصل کی۔ چنانچہ مرقاۃ شرح مشکوۃ کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

ثم انی قرأت بعض احادیث المشکوۃ علی منبع بحر العرفان مولانا الشہیر بمیر کلاں وھو قرأ علی زبدۃ المحققین وعمدۃ المدققین میرک شاہ و ھو علی والدہ السید السند مولانا جمال الدین المحدث صاحب روضۃ الاحباب وھو علی عمہ السید اصل الدین الشیرازی رحمھم اللہ تعالی۔

ایک سو سال کی عمر پا کر ۹۸۳ھ (نو سو تراسی) میں متوجہ دار البقاء ہوئے (مآثر الکرام ج ا ص ۲۰۷)

۳۷۳۔ ملا محمد فاضل بدخشاں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائے شباب میں اول کابل پہنچے ملا محمد صادق حلوائی کی شاگردی کی۔ پھر توران میں پہنچ کر ملا مرزا جان شیرازی کے فیض صحبت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ اور مرزا جان کے تلمیذ رشید ملا یوسف سے فنون حکمت و فلسفہ کی تکمیل کی۔ پھر لاہور پہنچ کر ملا جمال لاہوری سے جو عربیت میں یگانۂ زمانہ تھے تفسیر و اصول پڑھے۔ (انفاس العارفین)۔ علوم عقلیہ و نقلیہ میں کامل و مکمل ہو کر شاہجہاں بادشاہ کے پاس پہنچے اور مطالبہ کیا "ملک العلماء" کا منصب اور خطاب مجھے مرحمت فرمایا جائے۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اس عہدہ اور منصب پر فائز تھے۔ شاہجہاں نے کہا۔ آپ دونوں صاحب مناظرہ کر لیں۔ جس کو زیادہ قابل سمجھوں گا اس کو "ملک العلماء" بنادوں گا۔ ملا محمد فاضل صاحب نے بذات خود مولانا عبدالحکیم صاحب سے مناظرہ کرنے میں اپنی ہتک سمجھی۔ فرمایا کہ میرا کوئی شاگرد مولانا سے مناظرہ کرے گا۔ یہ کہہ کر دربار شاہی سے رخصت ہوئے۔ اور سیدھے ہرات پہنچے۔ وہاں مرزا زاہد اپنے والد سے صرف پڑھا کرتے تھے۔ ملا فاضل نے ان کو ذکی اور ذہین سمجھ کر ان کے والد

صاحب سے اجازت چاہی کہ وہ خود ان کو تعلیم دیں۔ چنانچہ بہت تھوڑے عرصے میں مرزا زاہد کو عالم فاضل کر کے اپنے ہمراہ دربارِ شاہجہانی میں لائے۔ اور فرمایا۔ یہ میرا شاگرد حاضر ہے جو ملا عبدالحکیم سیالکوٹی سے مناظرہ کرے گا۔ مولانا سیالکوٹی نے پہلی نظر میں تاڑ لیا کہ مرزا زاہد صاحب صرف میں کچے ہیں۔ بادشاہ کے سامنے ہی فرمایا۔ اس بچہ سے صرف کے صیغوں کے سوا اور کیا پوچھ سکتا ہوں اور پھر شافیہ کی ایک عبارت کا مطلب پوچھ لیا۔ وہ عبارت مرزا زاہد کے ذہن میں نہ تھی۔ فرمایا کتاب دیکھ لوں۔ مولانا عبدالحکیم صاحب نے فوراً فرمایا: "ابھی تک کتاب کی ضرورت ہے"۔ الغرض ملا فاضل اس مرتبہ بھی شکست کھا کر بے نیل مرام واپس ہو گئے۔ (ملفوظات عزیزیہ ص ۸۳)

۴۷۴۔ انفاس العارفین ص ۴۴

۴۷۵۔ ملفوظات عزیزیہ ص ۸۲ بظاہر تقشف اور احتساب کے لئے یہ عہد و دستور العمل تھا جس کا محفوظ کر لینا کافی ہوتا تھا۔

۴۷۶۔ انفاس العارفین ص ۴۳

۴۷۷۔ ماثر الکرام ص ۲۰۲ جلد ا۔

۴۷۸۔ قصبہ بلگرام (مضافات لکھنؤ) گزشتہ صدیوں میں اہل علم اور ارباب فضل رہا ہے۔ میر عبدالواحد اسی قصبے کے سادات کرام میں ہیں ملا عبدالقادر بدایونی کے ہم عصر اور دوست ہیں۔ اس خاندان کا پورا تذکرہ ماثر الامراء میں میر غلام علی آزاد نے (جو اسی خطہ شریف کے ایک شاخ ہیں) کیا ہے۔ آپ ذکی الطبع عالم، پاک باطن بزرگ اور صاحب تصانیف تھے۔ سلوک و عقائد میں آپ کی ایک کتاب بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ یعنی سنابل۔ اس کتاب کے متعلق شاہ کلیم اللہ چشتی کا مکاشفہ ہے کہ یہ کتاب بارگاہِ رسالت (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں قبول ہوئی۔

آپ کو فن تصوف سے اس قدر شغف تھا کہ آپ نے نحو کی مشہور کتاب کافیہ کو بھی تصوف کی کتاب قرار دے کر ارباب تصوف کی زبان میں بحث غیر منصرف تک اس کی شرح لکھی۔ اس کی تھوڑی سی عبارت درج ذیل ہے۔

الکلمہ یعنی نقطۂ وحدت ملفوظ بہ یعنی اسم ملفوظ بہ لفظ و باد بواطن معنی کلمہ تو حید در مرتبہ اقرار برزبان ملفوظ است۔ و در مرتبہ تصدیق و لباہ ملحوظ، و در مرتبہ احوال بطنہا از وملحوظ۔ مصنفؒ اکتفا بذکر مرتبہ اقرار کرد و در معطوف محفوظ فرو گذاشت بلکہ آنکہ حکم کردن بر اسلام و سبب جریان تکالیف احکام منوط و مربوط بمرتبہ اقرار است ذکر یعنی حذف محذوف از عبارت مصنف است کہ گوید۔ وضع لمعنی مفرد بنا بر وضع شدہ است یعنی لازم گردانیدہ شدہ واست قبول آں کلمہ توحید بر ارباب ولواحق بجہت تحصیل معنی کہ فرد مجرد است، از کفر و نفاق و معاصی۔ پس لفظ مفرد قرینہ حذف ست۔ زیرا کہ افراد و مرتبہ وارد و افراد از کفر و افراد از نفاق و افراد از معاصی فلا فرد من الکفر فی مرتبۃ الاقرار والافراد من النفاق فی رتبۃ التصدیق والافراد من المعاصی فی رتبۃ الاحوال الا من تاب و یبدل اللہ سیاتہ حسنات

و آں کلمہ توحید سہ نوع ست یکے اسم چہ اقرار و تصدیق فقط اسم توحید و صورت او ست و فعل دوم فعلی توحید و عمل او ست و آں دریافت احوال ست و حرف و سیوم حرف توحید ست و ایں توحید حقیقی است کہ از استعداد انسانی بطرف ست۔ و از علامات آں ہر دو توحید مذکور بے نشاں و بے کیف کہ علامت الحرف عدم علامات الاسم والفعل انتہی

علامہ آزاد بلگرامی فرماتے ہیں۔ میں نے کافیہ کی دو شرحیں اور بھی دیکھی ہیں جو حقائق کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ ایک عربی زبان میں ہے۔ اس کے مصنف کا نام میرزا بدالبقاء ہے۔ بظاہر وہ میر عبدالواحد کے معاصر ہیں۔ اور دوسری شرح فارسی زبان میں ہے۔ اس کے مصنف ملا موہن بہاری ہیں جو میر عبدالواحد سے متأخر ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ ان حضرات نے حقائق تصوف کو ذہن میں پیوست کرنے کے لئے عجیب و غریب طرز تصنیف اختیار کیا تھا۔

بہر حال میر عبدالواحد کے علم و فضل، زہد اور تقویٰ کی شہرت جب اکبر بادشاہ تک پہنچی اس نے اپنے کسی معتمد کو بھیج کر میر صاحب کو طلب فرمایا۔ پورا پورا اعزاز و اکرام کیا اور پانچ سو بیگھہ زمین بطور سیورغال مدد معاش (انعام) میر صاحب کو عنایت کی۔ سو سال سے زیادہ عمر پا کر شب جمعہ سوم ماہ رمضان ۱۰۱۷ھ (ایک ہزار سترہ) میں انتقال فرمایا۔ انالله (ماثر جلد ا)۔

۲۷۹۔ مآثر الکرام ص ۲۰۳ جلد ا۔ مولانا غلام سرور صاحب چشتی نے سنہ وفات ۱۰۵۵ھ (ایک ہزار پچپن لکھا ہے۔ واللہ علم بالصواب۔

۳۸۰۔ بعد ترک امیر الامرائی و مصاحبت شاہان چغتائی بخدمت آنحضرت آمد۔ واندک زمانہ یگانۂ وقت گشت۔ خزینۃ الاصفیاء جلد ا ص ۱۷۴۔

۳۸۱۔ حسنات العارفین ص ۳۰ بحوالہ مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۳۵۶۔

۳۸۲۔ اگر چہ توجیہ ممکن ہے۔ کیونکہ باری سے مراد اللہ تعالیٰ نہیں بلکہ قصبہ باری مراد ہے مگر حضرت اور تعالیٰ کا اضافہ کر کے اشتباہ پیدا کر دیا کہ جس سے یہ ایک کفریہ کلمہ ہو گیا جس کو شریعت قطعاً: جائز قرار دیتی ہے۔

۳۸۳۔ ممنوع کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ سکر حقیقی کی حالت میں۔ گر مجذوبانہ کیفیت پیدا ہوگئی تو اس بنا پر کہ عقل وحواس ظاہری معطل ہو گئے ہیں نماز ساقط ہو جائے گی۔ مگر اس بنا پر نہیں کہ سکر حقیقی کا احترام ہے بلکہ اس بنا پر کہ نظر شریعت میں جنون کی کیفیت پیدا ہوگی ہے اسی لئے سالک کا مرتبہ مجذوب سے بدرجہا بلند ہے۔

۳۸۴۔ حسنات العارفین ص ۳۲ بحوالہ مقدمہ ص ۳۷۳۔

۳۸۵۔ ایضاً کفر کے معنی بھی عجیب وغریب ہیں۔ یعنی ایسی عبارت سے انکار کرنا جس میں غیر اللہ کا تصور آتا ہے۔ یہ معنی عجیب اس لئے ہیں کہ شریعت کے خلاف ایجاد بندہ ہیں۔

۳۸۶۔ تذکرۃ العلماء والمشائخ ص ۳۵۔

۳۸۷۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۱۷۴ جلد ا۔

۳۸۸۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۱۰۵۔ تذکرۃ العلماء والمشائخ ص ۴۳ میں آپ کا عرف میاں وڈا بتایا ہے۔

۳۸۹۔ جوگی جے پال جو حضرت خواجہ غریب نواز، حضرت معین الدین چشتیؒ کے زمانہ میں تھا اس کے بھی اس قسم کے واقعات زبان زد ہیں۔ اسی لئے حضرت مجدد صاحب اپنے مکتوبات میں جگہ جگہ فرماتے ہیں کہ خوارق اور اس قسم کے حیرت انگیز کارنامے دلیل بزرگی نہیں۔ انسان کی بہت سی پوشیدہ قوتیں ہیں جن کی اگر نگہداشت کی جائے تو اس قسم کے شعبدے ظاہر ہو سکتے ہیں۔ نئی زمانہ مسمریزم کے بہت سے کرتب ہمارے سامنے دکھائے جاتے ہیں ان کا تعلق بھی مشق سے ہے۔۱۲

۳۹۰۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۱۰۹۔ اس قسم کے واقعات اور بزرگوں کے بھی مشہور ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کرامات الاولیاء حق۔ واللہ اعلم

۳۹۱۔ شیخ جان محمد سہروردی لاہوری متوفی ۱۰۸۲ھ (ایک ہزار بیاسی) ابتداء میں آزادی کر اپنی زندگی بسر کیا کرتے تھے اور اس پر شاکر وقانع تھے۔ ایک روز میاں اسمٰعیل صاحب نے از راہ شفقت مرشدانہ ایک تعویذ مرحمت فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ اپنے گھر میں رکھو۔ جب دنیاوی نعمتوں سے سیر ہو جاؤ تو تعویذ واپس کر دینا۔ مسبب الاسباب نے ایک ہی دفعہ میں غیب سے بہت سا ایسا سامان کر دیا کہ ان کی پریشانیاں دور ہو گئیں۔ آپ نے تعویذ حضرت شیخ کی خدمت میں واپس کر دیا۔ البتہ اس کی عام اجازت جناب میاں صاحب سے حاصل کر لی۔ بموجب روایت مصنف خزینۃ الاصفیاء (ص ۱۰۵ جلد ۲) تعویذ حسب ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمن ۰۰۰۰۰ لی محمدمحمد

ایک شخص نے شیخ جان محمد صاحب سے تنگی رزق کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا۔ پنجگانہ نماز (باجماعت) کے بعد قبلہ رو بیٹھ کر سو مرتبہ سبحان اللہ ایک ہفتہ تک پڑھو۔ پھر آ کر اپنی حالت بیان کرو، یہ شخص ایک ہفتہ کے بعد حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ آپ کی دعاء سے دولت لازوال دستیاب ہوگئی۔ فرمایا۔ ایک ہفتہ تک اور یہی عمل کرو۔ چنانچہ وہ ایک ہفتہ کے بعد حاضر ہوا، اور عرض کیا۔ تمام دنیا کے دفینے خزانے اب میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ مگر لینے کو طبیعت نہیں چاہتی۔ اب یہی تمنا ہے کہ آپ اپنی غلامی میں منظور فرمائیں۔ چنانچہ وہ شخص مرید ہو کر کاملین طریقت کے زمرہ میں سرفراز ہو گیا۔ واللہ اعلم۔

(خزینۃ الاصفیاء ص ۱۰۵ جلد ۲)

۳۹۲۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۴۳۳۔ ۴۳۴ ج ا۔

۳۹۳۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۴۳۴۔

۴۹۴۔ مآثر الکرام ص ۱۰۱ جلد ۱۔

۴۹۵۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۶۵۲ جلد ۱۔

۴۹۶۔ اللہ برکت دے۔ آپ نے قرآن پاک کا حق ادا کر دیا۔

۴۹۷۔ سید صاحب! حضرت خضر کے ہاتھ سے روٹی لے لی۔ محمدیوں کو چاہیئے کہ خضر کا احسان اپنے سر نہ لیں۔

۴۹۸۔ ملاحظہ ہو انفاس العارفین ص ۹۔

۴۹۹۔ مآثر الکرام ص ۲۱۱۔

۵۰۰۔ ایضاً

۵۰۱۔ اصلش از سادات امیٹی (امیٹھی) من مضافات اودھ ست۔ از وطن خود نقل کردہ شمس آباد را مشرق انوار ساخت۔ شمس آباد از توابع قنوج ست۔ سید علامہ تحریر و فہامہ بے نظیر بود۔ تلمذ از فضلاء عصر نمود۔ آخر در حوزہ درس ملا قطب الدین شہید سہالوی در آمد و قسطے از علوم فرا گرفت۔ وفاتحہ فراغ خواند و در شمس آباد مسند افادہ گسترد و جم غفیر را با فاضۂ دانش و بینش مرتبہ کمال و تکمیل کرامت نمود۔ ملا قطب الدین شہید فرمود۔ کسے کہ خواہد مغز سخن را دریابد۔ سید قطب الدین را ادراک نماید۔ قریب ہشتاد سال عمر یافت۔ و در ۱۱۲۱ھ احد و عشرین و مائۃ والف ورق حیات گرداند۔ (مآثر الکرام ص ۲۱۰ جلد ۱)

۵۰۲۔ مآثر الکرام۔

۵۰۳۔ مآثر الکرام ص ۲۱۳ جلد ۱۔

۵۰۴۔ شیخ پیر محمد لکھنوی قدس اللہ سرہ العزیز کے خلیفہ ہیں۔ شیخ غلام نقشبند کے والد ماجد شیخ عطاء اللہ سے بھی کچھ استفادہ کیا تھا۔ اپنے زمانہ کے سربرآوردہ عالم اور مرشد کامل تھے۔ شاہجہان آباد میں قیام رہتا تھا۔ وہیں آپ کا مزار ہے۔ (مآثر)

۵۰۵۔ امیٹھی از توابع لکھنؤ (مآثر ص ۲۱۶ جلد ۱)

۵۰۶۔ مقتبس از تذکرہ مولانا ابو الکلام آزاد مدظلہ بحذف و تغیر و ایضاح و تفسیر۔ محمد میاں

۵۰۷۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جہاد باللسان، جہاد بالسیف سے بڑھ جاتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے، جب کہ خود احکام شریعت جہاد بالسیف کی اجازت نہ دیں۔ چنانچہ حدیث مشہور ہے۔ افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر۔ وفی روایۃ کلمۃ عدل۔ واللہ اعلم بالصواب

۵۰۸۔ سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی نے ولی اللہ نمبر میں حضرت مجدد صاحب کے ای ایک نظریہ کی تشریح مندرجہ ذیل دفعات میں کی ہے۔ ۱: بادشاہ کے لئے سجدۂ تعظیمی کی یک قلم موقوفی۔ ۲: ذبیحہ گاؤ کی اجازت۔ ۳: بادشاہ اور ارکین دولت پر باجماعت نماز کی پابندی۔ ۴: عہدہ قضا اور شرعی احتساب کے محکمہ کی تجدید۔ ۵: تمام بدعات اور شرعی منکرات کا قلع قمع۔ ۶: غیر شرعی قوانین کی منسوخی۔ ۷: شکستہ اور منہدم مساجد کی دوبارہ تعمیر۔

۵۰۹۔ توزک جہانگیری ص ۷۔ اس کے بعد تحریر ہے۔ تاریخ ولادت اشرف حامل چندیں بشارت ست۔ از انجملہ از یں کہ باحتیاط رسنت الٰہی کہ بر سر ہزار سال در عالم جہانبانی بوجود آید کہ بمعاونت توفیق ازلی رسوم قدموم بغی و جہالت از عرصہ جہاں براندازد۔ چنانچہ قبل ازیں بہ پانصد و شصت و پنج سال رموز شناس اسرار یزدانی افضل الدین حکیم خاقانی از طلوع ایں کوکب دولت ز اقبال خبر دادہ واز محرومی دریافت و حسرت نایافت آں وقت قطعہ بر صفحہ روزگار گزاشتہ۔ ابیات

گویند کہ بر ہزار سال عالم   آید بجہاں بجل کمالے محرم
آمد زین پیش و مازادہ ز عدم   آید پس ازیں و ما فرو رفتہ نعم

۵۱۰۔ (شاہ اکبر) در نہصد و نود و چہار ہجری بدختر فرخندہ اثر راجہ اودے سنگھ کہ باصالت جاہ لشکر و دستگاہ از جمیع راجہاء ہندممتاز بود نامزد ساختند راجہ اودے سنگھ پسر راجہ مالدیوست کہ راجہاء معتبر صاحب شوکت بود و شمار لشکر او بہشتاد ہزار سوار رسیدہ (ص ۶۰۷ توزک)

۵۱۱۔ بادشاہ کی عموماً دو مہریں ہوتی تھیں۔ ایک مدور یا بیضاوی جو چھوٹی ہوتی تھی۔ اس پر صرف بادشاہ کا نام ہوتا تھا اور اسے "اوزک"

کہتے تھے۔ یہ صرف خاص خاص فرامین کے لئے استعمال کی جاتی تھی، اور نہایت معتمد رکن دولت کے پاس امانت تھی۔
دوسری مہر مربع یا مدور لیکن بڑی ہوتی تھی۔ اس کے وسط میں بادشاہ کا نام ہوتا تھا، اور چاروں طرف آبا و اجداد کے نام کندہ ہوتے تھے۔ چونکہ اس سے اپنی خاندانی بزرگی کا اظہار مقصود ہوتا تھا۔ اس لئے یہ مہر عموماً دوسرے سلاطین کو خطوط بھیجتے وقت استعمال کی جاتی تھی۔ لیکن بعد میں عام فرمانوں پر بھی ثبت ہونے لگی۔ (مآثر ص ۴۳)

۵۱۲۔ اس کے نانا یعنی آصف خاں کے خسر کا خطاب بھی آصف خاں ہی تھا۔ مگر ان کا نام مرزا غیاث الدین قزوینی تھا۔

۵۱۳۔ ص ۳۲۲ تاریخ ہندوستان جلد ۷۔

۵۱۴۔ تاریخ ہندوستان ص ۳۰۲ جلد ۷۔

۵۱۵۔ تاریخ ہندوستان ص ۳۲۸ تا ص ۳۳۰

۵۱۶۔ خلافت اسلامیہ کے نظام میں غیر مسلم کی مداخلت بے شک نہ ہوگی۔ خلیفۃ المسلمین دنیا میں ایک ہی ہوگا۔ باقی دیگر ممالک کے مسلمان اگر خلافت اسلامیہ کے نہج پر حکومت قائم کر کے مرکزی خلافت سے الحاق کر لیں، تو بہت ہی بہتر ہے۔ اور اگر اسلامی قانون کو قانون ملک قرار دے کر دوسری قوموں کو بھی شریک کار کر لیں تو اس کی مخالفت شریعت میں نہیں ہے۔ البتہ ان حکومتوں کو مرکز سے الحاق کر لینا ضروری ہے۔ تاکہ نظام ملت تمام دنیا میں وحدت اور یکانگت اختیار کرے۔ محمود غزنوی وغیرہ نے اپنی حکومتوں کا تعلق خلافت عباسیہ سے اسی طرح کیا تھا۔

۵۱۷۔ جیسا کہ جب شیواجی نے دوسری مرتبہ عالمگیر کے سامنے ندامت کا اظہار کیا تو عالمگیر نے یہی جواب دیا تھا۔ ۱۲

۵۱۸۔ چونکہ یہ کتاب عموماً دینی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے، اس لئے اس کی عبارتیں نقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

۵۱۹۔ رقعہ نمبر ۱۴ بھی قابل ملاحظہ ہے جس کا ترجمہ دارا شکوہ کے تذکرہ میں آئے گا۔ انشاء اللہ

۵۲۰۔ عہد شاہجہاں میں طے کیا گیا تھا کہ ایک دن چوبیس ۲۴ پہر اور ساٹھ ۶۰ گھڑی کا ہوگا۔ یعنی ایک پہر مساوی ایک گھنٹہ اور ڈھائی گھڑی مساوی ایک پہر یا ایک گھنٹہ۔ لہٰذا چار گھڑی مساوی ڈیڑھ گھنٹہ تقریباً۔ محمد میاں

۵۲۱۔ اتنی خوراک جس سے زندگی باقی رہ سکے۔ ۱۲

۵۲۲۔ رقعہ نمبر ۱/۱۹۳ رقعات عالمگیر ص ۳۱۱ یعنی الحمدللہ کہ اعلیٰ حضرت خداوندی عبادات کے ادا کرنے کے بعد رات اور دن کے تمام اوقات نظام ملک و دولت کے اہتمام میں خرچ کرتے ہوئے سلطنت اور ملک کی آبادی و رونق اور امن و امان نیز مخلوق کی خوشحالی، عافیت و راحت کی جانب توجہ اشرف ہمیشہ ہمیشہ مبذول فرماتے رہتے ہیں۔ شروع سے اب تک ہمیشہ کتاب اور سنت حضرت خیر الانامؐ کے بموجب حضرت رب العزت کی اطاعت کو اپنا شیوہ قرار دے کر کسی شخص سے بھی اور بالخصوص اپنی اولاد سے (جو تہذیب و اخلاق کی شریف ترین خصوصیات سے مزین ہے) کوئی ایسا فعل بھی گوارا نہیں کرتے جو لاتذہبی اور بے آئینی کے مشابہ ہو یا اس کا ادنیٰ سا شبہ بھی پایا جائے۔

۵۲۳۔ غالباً تعجب ہوگا کہ میلاد شریف میں قرآن شریف کی تلاوت ہوا کرتی تھی۔ شہنشاہ اسلام پناہ دوران محفل فیض منزل گروہے از علماء و فضلاء و صلحاء و حفاظ خطہ دل پذیر کشمیر را کہ بعفاوت درجات دراں قدسی انجمن قصور نمودہ بتلاوت قرآن مجید سے پرداختند برحمت خلعت و فرجی و مدد معاش از زرمین و یومیہ سرفراز ساختہ الخ (عبدالحمید ص ۳۸ جلد ۲)۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کی اصطلاح میں قرآن شریف پڑھوا کر روح پرفتوح سرور کائنات کے لیے ایصال ثواب کا نام میلاد تھا۔ محمد میاں۔

۵۲۴۔ تاریخ ہندوستان ص ۲۳۲ جلد ۷۔

۵۲۵۔ تاریخ ہندوستان ص ۱۲۶ جلد ۷۔

۵۲۶۔ برہان ص ۲۹۳ نمبر ۴ جلد ۷۔

۵۲۷۔ ملاحظہ ہو رقعہ نمبر ۲/۱۲۵ رقعات عالمگیر۔

۵۲۸۔ معاملات سلطنت و ملک گیری کے متعلق غور و فکر میں اکثر یہی ہے کہ میں اپنی رائے اور فہم پر عمل کرتا ہوں، دوسروں کی رائے اور فہم

سے اپنی رائے کو معتبر جانتا ہوں۔ ۱۲

۵۲۹۔ تفصیل ملاحظہ ہو۔ مقدمہ رقعات عالمگیر سید نجیب اشرف صاحب ندوی۔ کسی قدر تفصیل ہم بھی انشاء اللہ چند صفحات کے بعد تذکرہ عالمگیر کے سلسلہ میں کریں گے۔

۵۳۰۔ کاتب الحروف فروری ۱۹۳۰ء میں حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب، اور حضرت مولانا عبدالحنان صاحب کے ہمراہ بنارس گیا۔ جب گیان باپی کی مسجد کو دیکھتے ہوئے ہم اس کی پشت کی جانب پہنچے تو کچھ مسلمانوں نے بتایا کہ حال ہی میں یہاں سے ایک کتبہ برآمد ہوا تھا جس پر یہ لکھا ہوا تھا کہ یہ توڑا ہوا حصہ "دین الٰہی" کا عبادت خانہ تھا۔ دارا قیام بنارس کے زمانہ میں یہاں عبادت کیا کرتا تھا اور اس کا دروازہ مغرب کی جانب تھا۔ عالمگیر نے "دین الٰہی" کے اس معبد کو مسجد بنایا ہے۔ اس شکستہ حصہ کی محرابوں میں جو ٹکڑے ہیں ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ تصویریں تھیں جن کو عالمگیر نے تڑوا دیا۔ مگر ان کی ساخت بتاتی ہے کہ یہ تصویریں نہیں بلکہ پھول دار ٹکڑے ہیں جو اب تک بدستور ہیں۔ ۱۲

۵۳۱۔ یعنی خلافت کا سب سے بڑا لڑکا۔ عالمگیر کی تحریروں میں اس لفظ سے شاہزادہ محمد معظم مراد ہوتا ہے اور شاہجہاں کی تحریروں میں دارا شکوہ۔

۵۳۲۔ کیونکہ وہ خود رائے، خود سر اور ستائش پسند ہے۔ جو اس کی خوشامد کرے، اسی سے خوش رہتا ہے اس جملہ سے یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ وہ خواجہ محمد معصوم اور مجددی حضرات کا دشمن کیوں تھا۔ واللہ اعلم

۵۳۳۔ یعنی عالمگیر جو اس خط کا لکھنے والا ہے۔

۵۳۴۔ دارا شکوہ با بعضے امراء طریق عداوت و با بعضے امراء بطور تحقیر سلوک سے کرد۔ حضرت عالمگیر با ہر کدام ربطے خاص داشتند، ہر کدام از ہیں از کمال محبت در حفظ الغیب آنچہ لازمۂ دوستی بود بعمل آوردید اعلیٰ حضرت را در خاطر بسیار گراں مے آمد۔ بدارا شکوہ نصیحت از قبائح افعال و اقوال او مے فرمودند، چوں دیدند کہ دارا شکوہ را چنداں فائدہ نہ کند، خواستند کہ محمد اورنگ زیب در سلوک خود با امراء تفاوت کنند کہ آنہا دست از حفظ الغیب بردارند برشتہ بدستخط خاص نوشتہ فرستادند کہ بابا سلطان و فرزنداں ایشاں را باید کہ بلند ہمت باشند و عالی فطرتی را کار فرمایند۔ شنیدہ شد کہ شما با ہر کدام زنو کراں سلوک مے کنند کہ نہایت پستی را بخود راہ مے دہند۔ ازیں پست فطرتی بغیر ندامت فائدہ حاصل نخواہد شد۔

۵۳۵۔ آنچہ از راہ فضل و کرم در باب غلام مستہام مرقوم قلم عنایت رقم بود دکالوحی من السماء نازل گردید۔ پیر و مرشد برحق سلامت تعرض تشاہ و تذلل من تشاء مخصص مجلد یہ قادر عباد و خالق ارض و بلا دست بندہ بموجب حدیث صحیح کہ راوی آں انس بن مالک است شد من اذل نفسہ اعزہ اللہ عمل نماید و انکسار قلوب را اذہب ذنوب و اخش عیوب مے شمارد (احکام عالمگیری ص ۲۶ مقدمہ ص ۳۵) و آنچہ بلفظان کرامت ترجمان صادر شدہ انکارے برآں ندارد لیکن بہ یقین میداند کہ بموجب غرض وسواس الخناس الذی یوسوس فی صدور الناس من الجنۃ والناس، مرقوم فرمودہ اند۔

زبان عرض ندارم بغیر عذر گناہ ۔ ببخش جرم من رو سیاہ و نامہ سیاہ (وقائع عالمگیر ص ۴)

۵۳۶۔ حالانکہ فطری قابلیت کی حالت یہ تھی جو عالمگیر نے اپنے ایک مکتوب (بنام شاہجہاں بادشاہ معزول) میں درج کی تھی۔ بجز خوشامد ظاہری و چرب زبانی و خندہ بسیار نداشت۔ در خدمت ولی نعمت دلش با زبان موافق نہ بود۔ ۱۲ (ص ۳۱۴ رقعات عالمگیر رقعہ نمبر ۲/ ۱۲۵)۔

۵۳۷۔ سفینۃ الاولیاء مطبوعہ ۱۸۵۳ھ

۵۳۸۔ صرف میاں میر ہی کی کیا تخصیص، شاہ دلربا کو بھی عین الرحمن کہہ رہا ہے۔ ایں ذرہ چہ لائق کہ آں شاہ محققاں وعین الرحمن ایں را بستایند۔ (رقعہ ا/ ۲۰۴ ص ۳۱۹ رقعات عالمگیر)۔

۵۳۹۔ مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۳۵۶ (حاشیہ)۔

۵۴۰۔ حق نما کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ ایں نیاز مند درگاہ صمدی محمد دارا شکوہ حنفی قادری از آں طائفہ ست کہ جاذبہ فضل شامل بے سبب

ریاضت و مجاہدت بتاثیر نظر کامل آنہا بسوے خود کشیدہ، ایں فقیر مراتب تجرید و تفرید و دقائق عرفان و توحید را چنانچہ حق معرفت ست یک بیک دانستہ و دریافتہ۔ ص ۳ مقدمہ (رقعات عالمگیر ص ۳۵۷)

۵۴۱۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ ہاتف آواز دے رہا ہے، اور اس نے چار مرتبہ یہ ندا دی کہ جو (نعمت) روئے زمین کے سلاطین میں سے کسی کو نہیں دی گئی اللہ تعالیٰ نے تم کو عطا فرمائی ہے۔

۵۴۲۔ اگر خلفاء راشدین کو لفظ سلاطین کے مصداق سے خارج بھی کر دیا جائے تو حضرت سلیمانؑ کے متعلق کیا جواب ہوگا جن کی مقبول دعا کے قرآنی الفاظ یہ ہیں رب هب لي ملكا لا ينبغي لاحد من بعدي ۔خداوندا مجھے ایسا ملک عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لئے سزاوار نہ ہو یعنی ایک بے نظیر حکومت مجھ کو عطا فرما۔ کیا دارا کے اس الہام کو جو نص قرآن، نیز احادیث کے مخالف ہے، وسوسہ شیطانی نہ کہا جائے؟

۵۴۳۔ ہندوستان میں آریوں کے بعد بھی ترکستانی، ایرانی، آذربائیجانی، یونانی، اسکاٹی وغیرہ وغیرہ مختلف ممالک کی مختلف قومیں اپنے اپنے عقائد اور تہذیب لے کر آئیں، اور ایک دوسرے میں مدغم ہوتی رہیں۔ علاوہ ازیں یہاں بھی کرشن، رام، بودھ وغیرہ مختلف مصلح کہ ریفارمر پیدا ہوتے رہے۔ ان سب کے مختلف عقائد کے مجموعہ کا نام ہندو مذہب ہو گیا۔ یہی سبب ہے کہ ہندو مذہب کی کوئی تعریف جامع مانع نہیں کی جا سکتی۔ سر سید نے لاہور میں تقریر کرتے ہوئے شکایت کی تھی کہ ہندو مسلمانوں کو ہندو کیوں نہیں کہتے۔ اس دلی مجبوری کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوؤں کو یہی کہنا پڑتا ہے کہ ہر ایک مذہب حق ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ وہی کہہ سکتا ہے جس کا اپنا مذہب مدون اور مرتب نہ ہو۔ لیکن مسلمان جس کے مذہب کی حدود مقرر کر دی گئی ہیں، جس کے لئے ہر ایک عقیدہ اور ہر ایک اصول کھول کھول کر بتایا گیا ہے اور جس کے لئے حضرت حق کا کلام اللہ شریف میں جگہ جگہ اعلان ہے۔ تلک حدود اللہ فلا تعتدوھا، نہیں کہہ سکتا کہ ہر ایک مذہب حق ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آسمانی مذاہب جب نازل ہوئے تو وہ حق تھے۔ لیکن اگر اسی حقانیت پر رہتے تو پھر رسول اللہؐ کی بعثت کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آپ کو تمام دنیا کے لئے ہادی، بشیر، نذیر اور رحمت بنا کر اسی لئے بھیجا گیا کہ تمام دنیا کے مذاہب اپنی صداقت اور حقانیت سے ہٹ چکے تھے۔ آپ اسی لیے آئے کہ ان کی خرابیوں سے ان کو آگاہ کریں۔ حق وصداقت کی ہدایت کریں۔ اتباع صداقت کی شکل میں ان کو بشارت دیں۔ آپ رحمۃ للعالمین اسی لئے ہیں کہ پوری دنیا کے تمام ممالک اور تمام انسانی طبقات باطل پرستی کے باعث دوزخ میں جا رہے تھے۔ آپ نے رحمت بن کر ان کو دوزخ سے بچنے کی واضح اور سیدھی راہ بتائی۔ واللہ اعلم بالصواب ۱۲..... محمد میاں عفی عنہ

۵۴۴۔ جوگیوں کے ساتھ یہ عقیدت کہ واقعی اختلاف بھی صرف لفظی اختلاف ہو گئے اور علماء و مشائخ اسلام سے یہ نفرت و بداعتقادی کہ:
مدتے کتب حال مشائخ مطالعہ میکردم، چوں اختلاف بسیار ظاہر شد مطالعہ کتب را بالکل متروک ساختم و مطالعہ دل کہ بحریست لا محدود وا ز اں بحثہ گوہر ہائے تازہ بیروں مے آید پرداختم ؎

مرا بہیچ کتاب بدگر حوالہ مکن کہ من حقیقت خود را کتاب میدانم

رقعہ دارا بنام شیخ محب اللہ الٰہ آبادی رقعات عالمگیر صفحہ ۳۳۰

۵۴۵۔ کیا جوگی رسالت رسول اللہؐ کے بھی قائل تھے؟ یہی ہے زندقہ اور الحاد۔

۵۴۶۔ فقیر بے اندوہ محمد دارا شکوہ کہتا ہے کہ حقیقت الحقائق کے معلوم کر لینے اور صوفیہ کے مذہب حق کے رموز و دقائق کی تحقیق اور اس عطیۂ عظمیٰ پر فائز ہونے کے بعد اس کے درپے ہوا کہ ہندوستان کے توحید پرستوں اور ہندو قوم کے محققین کے مشرب کی حقیقت معلوم کروں۔ ہندو قوم کے چند کاملین کے ساتھ (جو ریاضت، تحقیق، فہمیدگی اور انتہا درجہ کے تصوف، انتہا درجہ کی خداری اور سنجیدگی میں آخری درجہ پر پہنچے ہوئے تھے) بار بار ملاقات کی۔ لفظی اختلاف کے سوا یافت اور شناخت میں کوئی فرق نہیں پایا۔ اسی لئے (اس کتاب میں) فریقین کی باتوں کو ایک دوسرے پر منطبق کیا۔ اور بعض وہ باتیں کہ طالبان حق کے لئے ان کا جاننا ضروری اور فائدہ بخش ہے۔ جمع کیا۔

۵۴۷۔ متن حاشیہ ص ۳۵۹۔

۵۴۸۔ مق ص ۳۶۰

۵۴۹۔ درا واخر حال باظہار مراتب اباحت والحاد کر د وطبع اور مرکوز بود و آنرا تصوف نام مے نہاد۔ اکتفانہ نمود۔ بدیں ہندوواں وکیش و آئین ایشاں مائل شدہ بود ہموارہ برہمناں وجوگیاں وسنیاسیاں صحبت میداشت وآں گروہ را مرشدان کامل وعارفان تحقق واصل مے پنداشت وکتاب آنہارا کہ بہ بید موسوم است کتاب آسمانی وخطاب ربانی میدانست ومصحف قدیم کتاب مکنونہ۔

۵۵۰۔ اپنشد کے ترجمہ میں صاف لکھتا ہے کہ قرآن مجید اصل میں اپنشد ہے۔ اور قرآن پاک کی یہ آیت کہ انہ لقرآن کریم الآیہ اس کا مطلب یہی ہے کہ قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے، جو پوشیدہ ہے۔ اور اس کی وہی تلاوت کر سکتا ہے جس کا دل پاک ہو چکا ہو۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔ ایں خلاصہ قدیم کہ بے شک وشبہ اصل کتب سماوی وسرچشمہ توحید ست وقدیم کہ انہ لقرآن کریم فی کتاب مکنون لایمسہ الا المطہرون یعنی قرآن کریم در کتاب است کہ آں کتاب پنہاں ست اور اتلاوت نے کند مگر دے کہ مطہرہ باشد الخ

۵۵۱۔ واز کمال اعتقاد باطل بجائے اسمائے حسنائے الٰہی اسمے ہندوے کہ ہنود آں را "پربھو" مے نامند واسم اعظم مے دانند بخط ہندوی بر نگینہا الماس ویاقوت وزمرد وغیرآں از جواہر کہ مے پوشید نقش کردہ باں تبرک مے جست وچوں معتقد آں بود کہ تکلیف عبادات ناقصاں راست وعارف کامل را عبادت درکار نیست۔ آیۂ کریمہ واعبد ربک حتی یاتیک الیقین را بمشرب ملاحدہ فراگرفتہ دلیل ایں معنی مے ساخت۔ بنابریں عقیدۂ فاسدہ نماز وروزہ وسائر تکالیف شرعیہ را خیر باد گفتہ بود۔ (عالمگیر نامہ)۔

۵۵۲۔ مق ص ۳۶۳۔

۵۵۳۔ اے وہ لوگو جو ایمان حقیقی حاصل کر چکے ہو، سکر ومستی کی حالت میں نماز کے پاس مت جاؤ کیونکہ حالت سکر ادا و نماز سے بلند تر ہے۔ اگر سکر مجازی ہے تو قرب نماز ممنوع ہے تاکہ نماز آلودہ نہ ہو۔ اور اس صورت میں نماز کی عزت ہے۔ اور اگر سکر حقیقی ہے تب بھی قرب نماز ممنوع ہے۔ اس صورت میں سکر کی عزت ہے۔ نماز پڑھنے والا ہی نہ رہا، نماز کون پڑھے۔

۵۵۴۔ مہر کر دی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر۔

۵۵۵۔ یہ خاص عشاق کے حق میں ہے کہ ان کے دلوں پر مہر ہو گئی ہے کہ غیر اللہ کا ان میں دخل نہیں ہوتا۔ ان کی نگاہیں غیر کو نہیں دیکھتیں، ان کے کان غیر کو نہیں سنتے۔ ان کو بہت زیادہ لذت وحلاوت ہے اس کفر سے۔

۵۵۶۔ مدعی فنا کا یہ لفظ خود، اپنے دعوے کی خود تردید ہے۔ یہ ہندوانہ گمراہی ہے کہ آتما پرماتما بن جاتی ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ خود کو اتنا فنا کر دو کہ خود کا تصور تک بھی نہ آئے لا الہ الا اللہ (دیکھو مکتوبات حضرت مجدد صاحب کے اقتباسات جو پہلے پیش کئے گئے)۔

۵۵۷۔ اس مضمون کی ترتیب کے وقت بادشاہ نامہ عبدالحمید۔ رقعات عالمگیری، سفرنامہ کپتان ہملٹن و برنیئر منتخب۔ رقعات عالمگیر و وقائع عالمگیر۔ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر مقدمہ رقعات عالمگیر، ہمارے سامنے رہی ہیں۔ باقی کتابوں کے اقتباسات انہیں سے ماخوذ ہیں۔ مق سے مراد مقدمہ رقعات عالمگیر ہے۔

۵۵۸۔ اورنگ زیب جلد اول مقدمہ بحوالہ مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۱۱۸ جلد ا۔

۵۵۹۔ خود اورنگ زیب کو اپنے مولد سے قلبی محبت رہی ہے۔ وہ اس مقام کے رہنے والوں کی فلاح و بہبود کا ہمیشہ خواہاں رہا۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں اپنے بیٹے معظم خاں کو لکھتا ہے۔ "فرزند عالی جاہ! قصبہ دوحد از مضافات صوبہ گجرات مولد ایں عاصی پر معاصی ست، رعایت سکنۂ آنجا واجب دانند و پیرمکتی را کہ مدت فوجدار آنجاست ستمال و بحال دارند و حرف مریضان غرض کہ "نی قتو بہم مرض فزاد ہم اللہ مرضا"۔ در شان آنہاست بحق او نشنوند۔ عنایت بر ضعیفان گوشہ چشمے دیگر دارد و بمبیر کوچک خود لطف دیگر بیست شاہاں را۔ (رقعات عالمگیری) ایک اور مکتوب میں اسی بیٹے کو لکھتا ہے۔ آنچہ ضرور باعث آبادی ورفاہ متردین باشد بکنند و جزیہ وحاصل یک دو سال معاف (احکام عالمگیری۔ مق ص ۱۲۱)

۵۶۰۔ میر ابوالمعالی سید لے بود موصوف بصلاح وتقویٰ بعنوان درویشانہ مے گزرانید۔ حلیہ جلیلہ او بشرف رضاعت فیض اشاعت شاہزادہ محمد اورنگ زیب عالمگیر بہادر رسید (مآثر الامراء جلد ۱ ص ۷۹۸)۔ میر صاحب موصوف کے دو لڑکے تھے۔ ان میں

چھوٹا" میر ملک حسین" اورنگ زیب کا رضاعی بھائی تھا۔ وہ ہمیشہ اورنگ زیب کے ساتھ رہتا۔ اورنگ زیب نے بھی کبھی اس کی ترقی میں اغماض نہیں کیا۔ جس وقت وہ مرا ہے تو "خان جہاں بہادر ظفر جنگ کوکلتاش" کے پر رعب القاب سے مخاطب تھا (وقائع عالمگیر) ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۱۰۸ھ کو بمقام شولاپور انتقال کیا۔ اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ بڑے ذی رتبہ کے امیر تھے۔ تاریخ آسام ان کی تصنیف ہے۔ ان کے ایک بھائی کا نام مظفر حسین اور فدائی خاں خطاب ہے۔ دوسرے بھائی اعظم خاں کوکہ کہلاتے تھے۔

۵۶۱۔ میر محمد ہاشم خلف میر محمد قاسم گیلانی مدت دوازدہ سال در حرمین شریف بودہ منقولات را از شیخ محمد عربی محدث و شیخ عبدالرحیم حسائی و ملا علی نیرہ ملا عصام الدین مشہور و معقولات را از میر نصیر الدین حسین پسر زادہ میر غیاث الدین منصور و میرزا ابراہیم ہمدانی فرا گرفتہ بہندوستان آمد و طب و ریاضی نزد سرآمد اطبا حکیم علی گیلانی۔ در زیدہ چندے در احمد آباد گجرات بتدریس مشتغل بود چوں دانائی او در فنون فضائل خصوصا طب بعرض اقدس رسید حکم شد کہ بہمان بلدہ بخدمت صدارت و طبابت بپردازد۔ پس از انقضاء مدتے ملازم عہد و بیعت شدہ و بامر خاقانی شرف تعلیم اختر برج شاہزادہ محمد اورنگ زیب بہادر یافت و اکنوں در ملازمت آں والا گوہر کامیاب ست بہ تفسیر بیضاوی حاشیہ نگاشتہ (عبدالحمید جلد ا حصہ دوم ص ۳۳۵)۔

۵۶۲۔ نام اصلی او محی الدین ست۔ مولد قصبہ بلدہ بہار در سن دہ سالگی کلام اللہ را حفظ کردہ و بخدمت پدر خود ملا عبداللہ کسب علوم نمود۔ و در ہفدہ سالگی فاتحہ فراغ خواند۔ چندے در وطن خود بدرس و افادہ پرداخت۔ بعد ازاں بملازمت شاہجہاں بادشاہ رسید۔ و بہ تعلیم شاہزادہ محمد اورنگ زیب معین گردید (آداب عالمگیری و تحفۃ الکرام ح ق ص ۱۲۶) و بخدمت شاہ حیدر نبیرہ شیخ وجیہ الدین گجراتی بیعت کرد۔ عاقبۃ الامر از پیش گاہ خلافت رخصت گرفتہ بوطن شتافت و بریاضت و مجاہدہ کار بست۔ بعمر ہشتاد و چہار سالگی در ۱۰۶۸ھ (ہزار و شصت و ہشت) مرحلہ آخرت پیمود (ص ۸۳ مآثر الکرام جلد ۱)۔

۵۶۳۔ حضرت عالمگیر با ہر کدام رابطہ خاص داشتند۔ سعد اللہ خاں را کہ خطاب عصاء پیری وزیر با تدبیر داشت، نزد او درس خواندہ خود را شاگرد او مقرر نمود (احکام عالمگیری ص ۳ ح ق ص ۱۲۷) باقی حالات پہلے ملاحظہ سے گزر چکے۔ محمد میاں۔

۵۶۴۔ از فرقہ سادات رسول و از اساتذۂ اورنگ زیب عالمگیر ماہر علوم ریاضیہ وادبیہ بود، و حاشیہ مطول از تصانیف اوست ۱۲۔ (تذکرہ علماء ہند ص ۸۳)۔

۵۶۵۔ مقدمہ واقعات عالمگیری میں ملا جیون کا نام ملا محمود تحریر کیا ہے مگر جیسا کہ معاصرین دور مجددی کے سلسلہ میں مآثر الکرام وغیرہ سے نقل کر کے درج کیا گیا۔ ملا محمود جونپوری دوسرے بزرگ ہیں جو شیخ محمد افضل جونپوری کے شاگرد اور شمس بازغہ و فرائد کے مصنف ہیں، شاہجہاں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اعزاز پایا۔ ۱۰۶۲ھ میں وفات ہوئی، اور ملا جیون کا اصلی نام احمد ہے۔ یہ امیٹھی کے رہنے والے ہیں۔ ۱۱۳۰ھ میں وفات ہوئی۔ نور الانوار اور تفسیر احمدی آپ کی تصانیف ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ محمد میاں

۵۶۶۔ چوں اورنگ خلافت و جہانداری بجلوس عالمگیری ارتفاع یافت، خان مذکور مورد مراحم خاقانی شدہ و بادشاہ دین پناہ بعض کتب نزد خان موصوف تکرار نمودہ، خصوص احیاء العلوم غزالی از اول تا آخر تلمذ نمودہ۔ (فرحۃ الناظرین۔ ح ق ص ۱۲۷)

۵۶۷۔ مقدمہ رقعات عالمگیر وغیرہ۔ علامہ شبلی تحریر فرماتے ہیں۔ عالمگیر تیغ و قلم دونوں کا مالک تھا۔ اس کی انشاء پردازی کی داد مخالفوں تک نے دی ہے۔ اس کے رقعات باوجود اس کے کہ واقعات کا ذخیرہ، مقصد طلب جوابوں کا مجموعہ اور جغرافیانہ اطلاعات کی یادداشت ہیں۔ تاہم اداء مطلب کی قدرت و عبارت کی سادگی، فقروں کی ہمواری، مطلب کا اختصار، پہلو بہ پہلو دلنشیں ترکیبیں نہایت حیرت انگیز ہیں۔ مولانا محمد حسین کے الفاظ میں عالمگیر جس طرح سلطنت زیر قدم رکھتا تھا، اسی طرح کشور سخن اس کے زیر قلم ہے۔

۵۶۸۔ از جلائل فضائل آں خدیو یزداں پرست توفیق حفظ تمام کلام مجید ربانی ست در عین اوان سلطنت جہانبانی و زمان اشتغال بامور ملک رانی و کشور ستانی کہ ہیچ یک سلاطین اسلام و دین پروراں، باستانی را ایں خصیصہ سعادت چہرآراء دولت نگشتہ۔ اگرچہ ہم از مبادی مال و دولت و اقبال برخے از سور کریمہ قرآنی و بسیارے از آیات بینات فرقانی محفوظ خاطر اقدس بود لیکن حفظ مجموعہ کلام اللہ از اں بادشاہ خدا آگاہ بعد جلوس بر اورنگ حشمت و جاہ اتفاق افتاد۔ (عالمگیر نامہ)

۵۶۹۔ احکام عالمگیری، ح ق ص ۱۳۵۔

۵۷۰۔ عبدالحمید جلد۲ ص ۱۲۵

۵۷۱۔ رقعات عالمگیر ص ۶۹ رقعہ نمبر ۵/۳۷

۵۷۲۔ رقعہ ۲۷/۱۵۹ رقعات عالمگیری ص ۲۵۰ و ص ۲۵۱۔

۵۷۳۔ مآثر عالمگیری ص ۵۳۱ حق ص ۱۲۸۔

۵۷۴۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقدمات رقعات عالمگیر خصوصاً ص ۱۷۳ تا ص ۱۷۵۔

۵۷۵۔ اورنگ زیب بلخ و بدخشاں کی کامیاب جنگ سے واپس آ کر دریا کے ایک کنارے مقیم تھا کہ اُسے بادشاہ نے ۲۹ صفر ۱۰۵۸ھ (۱۵ مارچ ۱۶۴۸ء) کو ملتان کا صوبہ دار مقرر کیا۔ پھر ذی الحجہ ۱۰۵۹ھ میں جب کہ وہ پہلی مہم قندھار سے واپس ہو کر لاہور میں مقیم تھا بادشاہ نے اُسے سندھ کا صوبہ بھی دے دیا اور بکر و سیوستان کا علاقہ اور تیول آں کا مکار مرحمت کر دیا۔ اورنگ زیب دوسری مہم قندھار سے واپسی یعنی ۱۷ شعبان ۱۰۶۲ھ تک تقریباً چار سال ملتان اور ڈھائی سال سندھ اور ملتان دونوں کا صوبہ دار رہا۔ یہی زمانہ ہے جب کہ وہ حضرت خواجہ محمد معصوم قدس اللہ سرہ العزیز کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوتا ہے۔

۵۷۶۔ ۳ جمادی الثانیہ ۱۰۶۲ھ کو عالمگیر قندھار پہنچا۔ اور ۴ شعبان ۱۰۶۲ھ کو صرف دو ماہ ایک دن بعد "فرمان والا صادر شد کہ دور حصار برخاستہ تسخیر آں را بوقت دیگر باز گزاشتہ خورد و کلاں را ہمراہ گرفتہ بدرگاہ آسمان جاہ رسد" (وارث ص ۱۱۰)۔

۵۷۷۔ مقدمہ ص ۱۸۶۔

۵۷۸۔ رقعہ نمبر ۴/۱۳۶ ص ۱۳۹ جلد ا۔

۵۷۹۔ ملاحظہ ہو رقعہ نمبر ۴۵ رقعات عالمگیری جس کا ترجمہ دارا کے حالات میں سپرد قلم کیا گیا۔

۵۸۰۔ رقعہ نمبر ۵/۲۱۹ ص ۳۴۰ جلد ا رقعات عالمگیر۔

۵۸۱۔ رقعہ نمبر ۲۷/۱۵۹ رقعات ص ۲۵۰ جلد ا۔

۵۸۲۔ رقعہ نمبر ۲۷/۱۵۹ رقعات ص ۲۵۱ و ص ۲۵۲۔

۵۸۳۔ ملاحظہ ہو رقعہ نمبر ۱۰/۹۲ رقعات ص ۱۷۱ جلد ا۔

۵۸۴۔ ملاحظہ ہو رقعہ نمبر ۱۶/۳۸ ص ۸۳ و رقعہ نمبر ۲/۵۸ و رقعہ نمبر ۴/۶۰ ص ۱۰۸ و رقعہ ۲۰/۱۵۴ ص ۲۲۵۔

۵۸۵۔ میر جملہ اصل نام محمد سعید اردستان (اصفہان۔ ایران) کا تاجر تھا۔ وہ ۱۰۳۰ھ میں گولکنڈہ کی شیعی حکومت میں آیا اور رفتہ رفتہ ایسا رنگ جمایا کہ عبداللہ قطب شاہ نے اسے اپنا وزیر اعظم بنا دیا۔ اور جب کرناٹک کا علاقہ فتح کرنا چاہا تو اسی کو وہاں کا سردار اور سپہ سالار بھی بنا دیا۔ وہاں اس کے حسن انتظام کے باعث اس کی دولت میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ اور فوج بھی اس کی گرویدہ ہوگئی۔ اب حاسدوں نے قطب الملک کے کان بھرنے شروع کر دیئے اور قطب الملک کے ذہن نشین کر دیا کہ میر جملہ کی ترقی قطب الملک کے لئے خطرناک ہے چنانچہ قطب الملک میر جملہ کو دبانے اور اس کو گرفتار کرنے کی فکر کرنے لگا۔ میر جملہ نے یہ محسوس کر کے نجات حاصل کرنے کے لئے سلطنت مغلیہ سے تعلق قائم کرنا چاہا۔ چنانچہ عالمگیر کے ذریعہ سے وہ اس میں کامیاب ہو گیا۔ ابتداء اس کو پنج ہزاری منصب ملا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر فائز ہو گیا۔

۵۸۶۔ حق ص ۳۰۶۔

۵۸۷۔ ان تمام واقعات کو مقدمہ رقعات عالمگیر میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

۵۸۸۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹوں کا یہ زہریلا پودا خود مسلمان فرمانروایان دکن کا لگایا ہوا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی آبیاری بھی انہیں کے ہاتھوں ہوئی۔

۵۸۹۔ ظفر نامہ عالمگیری و حق ص ۳۲۷۔

۵۹۰۔ حق ص ۳۲۸

۵۹۱۔ مکتوب شاہزادہ مراد بنام شاہجہاں نمبر ۲/۲۲۳ رقعات ص ۳۳۵ نیز رقعہ نمبر ۲/۲۲۴ ص ۳۳۳ و رقعہ نمبر ۱/۲۵۵ ص ۳۷۶ بنام جعفر خان۔

۵۹۲۔ مکتوب جہاں آرا بیگم بنام اورنگ زیب نمبر ۱/ ۱۹۷ الف و ب ص ۳۱۲ و ص ۳۱۳۔

۵۹۳۔ مزید براں عالمگیر۔

۵۹۴۔ مکتوب مراد بنام اورنگ زیب بہادر نمبر ۲/۲۲۳ ص ۳۶۵۔

۵۹۵۔ مکتوب مراد بنام شاہزادہ شجاع نمبر ۲/۲۲۳ ص ۳۵۶۔

۵۹۶۔ رقعہ نمبر ۳/۲۲۳ ص ۳۳۲۔

۵۹۷۔ مکتوب ۹/ ۱۹۲۵ از مراد بنام اورنگ زیب بہادر رقعات ص ۳۶۸

۵۹۸۔ مکتوب نمبر ۱۳/ ۲۲۸

۵۹۹۔ ایضاً

۶۰۰۔ رقعہ ۲/۲۲۳ ص ۳۶۶

۶۰۱۔ ملاحظہ ہو رقعہ نمبر ۲/ ۲۲۰ رقعات ص ۳۳۲۔

۶۰۲۔ مکتوب عالمگیر بنام شاہجہاں نمبر ۱/ ۱۳۳ رقعات ص ۲۱۲۔

۶۰۳۔ ایضاً نمبر ۳/ ۱۱۸۔

۶۰۴۔ مکتوب مراد بنام دارا شکوہ ۱/ ۲۲۷ رقعات ص ۳۴۹

۶۰۵۔ رقعہ ۱/ ۲۲۸ رقعات ص ۳۷۱۔

۶۰۶۔ تاریخ ہندوستان ص ۱۷ و ص ۱۸ جلد ۸۔

۶۰۷۔ متن ص ۳۰۰

۶۰۸۔ عالمگیر نامہ ص ۲۹ متن ص ۳۳۲۔

۶۰۹۔ راجہ جسونت سنگھ نے راجپوت ہوتے ہوئے فرار اختیار کیا لیکن اس کی بیوی اور بہن نے اس کے لئے اپنے مکانوں کے دروازے بند کر کے اس عار پر خط کھینچ دیا۔

۶۱۰۔ مکتوب مراد بنام شجاع ۸/ ۲۳۵ رقعات ص ۳۵۷۔

۶۱۱۔ خلاصہ رقعہ ۲/ ۱۱۹ الف و ب ص ۱۰۸ تا ص ۲۰۵۔ رقعات عالمگیر۔

۶۱۲۔ اس سے پہلے بارہا خدمت والا میں عرض کر چکا ہوں کہ آگرہ کی طرف کوچ کرنے کا مقصود بادشاہ اسلام کے مقابلہ میں بغاوت نہیں ہے اور تمام غیب کے ارادہ اور نیتوں کے جاننے والا خدا وقدوس گواہ ہے کہ یہ نادرست ارادہ اور غلط خیال کبھی بھی میرے دل میں نہیں آیا بلکہ بیماری کے زمانہ میں چونکہ جملہ اختیارات اعلیٰ حضرت کے نکل کر شاہزادہ کے ہاتھ میں پہنچ گئے تھے جس میں اسلامی کوئی رنگت بھی نہ تھی اور اس نے اس زمانہ میں قوت واستقلال پیدا کر لیا تھا۔ بادشاہت کے تمام طریقے اختیار کر لئے تھے اور کفر والحاد کے جھنڈے ممالک محروسہ میں بلند کرنے لگا تھا۔ لہٰذا اس کا مقابلہ عقلاً، شرعاً اور عرفاً واجب ہو گیا تھا۔ اسی فریضہ کی ادائیگی کے لئے اس جانب کا قصد کیا تھا۔ پہلے ان کافروں سے جنگ تھی جو مساجد کو شہید کر کے ان کی جگہ بتخانے بناتے تھے۔ اس کے بعد ان سے جنگ ہوئی جو ملحد اور بے دین تھے۔ اور چونکہ نیت بخیر تھی تھوڑے لشکر کے ساتھ ہر معرکہ میں کامیابی حاصل ہوتی رہی اور جسم زخم سے محفوظ رہا۔

۶۱۳۔ رقعات ص ۳۲۳ رقعہ نمبر ۲/ ۱۳۰۔

۶۱۴۔ تاریخ ہندوستان جلد ۸ ص ۸۹۔

۶۱۵۔ ۱/۲۱۳ رقعات ص ۳۳۰

۶۱۶۔ ۱/۱۳۲ رقعات ص ۲۲۶۔

۶۱۷۔ رقعہ نمبر ۳/ ۱۹۰ رقعات ص ۳۰۰

۶۱۸۔ دارا شکوہ در شاہجہاں آباد قیام ورزد۔ کل خزانہ و لشکر در آنجا نیست زنہار از آنجا پیشتر نگزرد کہ باید دولت بہم رادر بجا فیصل میسر آمد (رقعہ ۱/۱۸۶ رقعات ص ۲۹۵ و مآثر الامراء و رقعات عالمگیری وغیرہ۔

۶۱۹۔ سفرنامہ ڈاکٹر برنیر ترجمہ اردو جلد اول ص ۱۱۳۔ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۳۸۔

۶۲۰۔ رقعہ نمبر ۱/۱۹۲ رقعات ص ۳۰۹ و ص ۳۱۰۔

۶۲۱۔ رقعہ نمبر ۱/۱۹۵ رقعات ص ۳۰۸۔

۶۲۲۔ عالمگیر اس کا عملی ثبوت پیش کر چکا ہے چنانچہ فتح آگرہ کے بعد اس کو موقع تھا کہ اپنے بھائی شجاع کو خود اپنی جانب سے صوبہ بہار دے دیتا۔ مگر اس نے شاہجہاں سے سفارش کی، اور بادشاہ کی حیثیت سے شاہجہاں سے فرمان لکھوا کر بھجوایا۔ (ملاحظہ ہو رقعہ نمبر ۱/۱۸۷ ص ۲۹۶ رقعات عالمگیر۔

۶۲۳۔ رقعہ نمبر ۳/۱۷۲ رقعات ص ۲۱۷ و ص ۲۱۸۔

۶۲۴۔ سفرنامہ ڈاکٹر برنیر جلد اول ص ۱۸۹ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۳۱۔

۶۲۵۔ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۳۹۔

۶۲۶۔ اس خط کا ترجمہ ہم پہلے نقل کر آئے ہیں نیز ملاحظہ ہو رقعہ نمبر ۹/۲۳۶ رقعات ص ۳۵۸۔

۶۲۷۔ رقعہ نمبر ۵/۵۲۵۔

۶۲۸۔ اس خط کو بجنسہ اوپر نقل کر آئے ہیں۔

۶۲۹۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ مراد نے صوبہ گجرات میں مرگ شاہجہاں کی غلط خبر پر ہی اعتماد کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے ملازم خاص شہباز کو لکھتا ہے۔ امروز روز شنبہ کہ نہم ربیع الاول ست یک پہر و یک گھڑی روز برآمدہ در خاص و عام بدولت و سعادت بر تخت دولت بہ مبارکی نشستہ وخطبہ وسکہ بنام نامی مشرف شد الخ رقعہ ۲/۱۳۲ ص ۲۸۷ نیز رقعہ ۱/۲۶۵ ص ۲۸۶ وغیرہ۔ مگر بایں ہمہ اورنگ زیب نے اس کو اپنے ساتھ لیا اور اس کی حماقت کا خیال نہ کیا۔۱۲

۶۳۰۔ قانون شریعت کے بموجب اگر اولیاء مقتول جو مدعیان قصاص ہوں۔ اگر ان میں سے ایک بھی دعوی قصاص سے دست بردار ہو جائے تو قصاص کا حکم نہیں دیا جاتا۔ لہذا یہ فیصلہ ورنہ محمد صدیق کا یہ بیان قابل غور ہے کیونکہ ان میں تضاد ہے۔

۶۳۱ عالمگیر نامہ عمل صالح۔ ظفر نامہ عالمگیری۔ تاریخ شجاعی وغیرہ بحوالہ حق ص ۳۶۹۔

۶۳۲ ملاحظہ ہو رقعہ نمبر ۵/۲۱۹۔

۶۳۳۔ در بعد دار بیخ گل برسریر سلطنت و تخت مملکت جلوس نمودہ خود را ابوالفوز نصیر الدین محمد صاحب قران ثالث سکندر ثانی شاہ شجاع بہادر غازی ملقب ساختہ و بالشکر ہائے ممالک شرقیہ با بہت و عظمت بسیار بعزم گرفتن دہلی از بنگالہ بصوب دار الخلافہ عنان تحسن گردید (تاریخ شاہ شجاعی ص ۳۲ بحوالہ حق ص ۳۰۳)۔

۶۳۴۔ یہ واقعہ بھی عالمگیر کی صاف دلی کا بین ثبوت ہے اور اس پر کمال احتیاط یہ کہ اپنی جانب سے نہیں دیتا بلکہ شاہجہاں کی طرف سے دیتا ہے تا کہ بد عہدی کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکے۔۱۲

۶۳۵۔ رقعہ ۱/۱۸۷ اب ص ۲۹۶

۶۳۶۔ رقعہ ۴/۱۶۵ ص ۲۵۸۔

۶۳۷۔ یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ اورنگ زیب نے مہاراجہ جسونت سے اس غداری پر کسی قسم کی باز پرس نہیں کی وراس کے متعلق اگر کسی کو لکھا تو صرف اتنا کہ یہ فعل راجپوتوں کی شان کے خلاف تھا۔ چنانچہ مرزا راجہ جے سنگھ کو لکھتا ہے۔ آنچہ جسونت سنگھ با خود کرد ہیچ دشمن نکند ..... مادر عنایات و مرحمت نسبت باوجود تقصیرات و بے اخلاصیہا کمی نکردیم۔ آنچہ او کرد ہیچ کم ذات یا چاپیے نہ کند چہ جائے راجپوت از خانوادۂ کلاں (حق ص ۳۷۷)

۶۳۸۔ احکام عالمگیری حق ص ۳۷۷۔

۶۳۹۔ بحوالہ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۲۱۔

۶۴۰۔ انتقال کے بعد بھی عالمگیر نے چاہا کہ اس کے بچوں کی پرورش دربار مغلیہ کے دستور کے بموجب شاہانہ ناز و نعم سے اپنی نگرانی میں کرے۔ مگر خود غرض اور فتنہ جو دلیاہ، اور درگادان نے جو فتنہ برپا کیا۔ حتی کہ خود عالمگیر کے لڑکے اکبر کو عالمگیر سے باغی بنا دیا۔ اس کی تفصیل کتب تاریخ میں ملاحظہ ہو۔ ۱۲ محمد میاں

۶۴۱۔ سیواجی کا خاندان دراصل مہارانا اودے پور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس خاندان میں "سورسین" نامی ایک شخص کسی وجہ سے ناتو ڑ چھوڑ کر پرگنہ "کرکب"، ضلع پرپچدہ" ریاست دکن چلا آیا۔ اس کے خاندان سے "مالوجی" اہل وطن سے ناراض ہو کر "ویلورا" میں جو دولت آباد کے قریب ہے آکر آباد ہو گیا۔ اس زمانہ میں دولت آباد نظام شاہی خاندان سے خاص تعلق رکھتا تھا، اور یہاں کا دیس مکھ یعنی تحصیلدار لکھی جادو نام ایک شخص تھا۔ مالوجی نے لکھی جادو کی سرکار میں ملازمت اختیار کی۔ مالوجی کے دو بیٹے تھے۔ چونکہ وہ شاہ شریف صاحب کا جن کی قبر احمد نگر میں ہے۔ نہایت معتقد تھا، اس لئے اس نے بیٹوں کا نام شاہ صاحب موصوف کے تعلق سے شاہ جی اور شرف جی رکھا۔ یہی "شاہ جی" آگے چل کر ساہو جی کے لقب سے مشہور ہوا۔ اور یہ ساہو جی ہے جو سیواجی کا باپ تھا لکھی جادو کے کوئی اولاد نہ تھی۔ صرف ایک لڑکی تھی۔ شاہ جی چونکہ خوش اندام اور خوش رو تھا۔ لکھی جادو نے اس کو اپنا متبنیٰ بنایا، اور چاہا کہ اپنی بیٹی کو اس سے بیاہ دے لیکن لکھی جادو کے خاندان والوں نے اس کو باز رکھا۔ بالآخر مالوجی نے ایک معزز .... اننگ پال کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ اور دباؤ ڈال کر لکھی جادو کی لڑکی سے شاہ جی کی شادی کر دی۔
ساہو جی نے سب سے پہلے نظام شاہی دربار میں توسل حاصل کیا۔ ۱۰۳۰ھ میں جب کہ نظام شاہ کی فوجوں نے نربدا اتر کر مالوہ کو غارت کیا، اور جہانگیر نے اس کے دفعیہ کے لئے لشکر کشی کی تو نظام شاہ کے فوجی سرداروں میں ساہو جی اور اس کا خسر جادو رائے بھی تھا۔ جہانگیر نے جب اس کے انتقام کے لئے شاہجہاں کو دکن بھیجا تو جادو رائے شاہجہاں کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اس کے صلہ میں اس کو پنج ہزاری منصب ملا اور تمام خاندان کو حسب مراتب عہدے ملے لیکن پھر باغی ہو کر ۱۰۴۰ھ میں نظام شاہ کے پاس واپس ہو گیا نظام شاہ نے جادو رائے کو قتل کر دیا۔ اس بنا پر ساہو جی نظام شاہ سے ناراض ہو کر دربار شاہجہاں میں دوبارہ حاضر ہوا، اور منصب و علم و نقارہ حاصل کیا۔ اس کے بعد کے حالات اصل کتاب میں ملاحظہ ہوں۔ ۱۲

۶۴۲۔ متن ص ۳۳۳ (ترجمہ) اگر چہ اس کی بیہودگیاں اور خطا کاریاں کثرت اور زیادتی کے سبب سے معافی کے قابل نہیں تھیں لیکن اس سبب سے کہ اس قابل احترام نے دولت خواہی اور خدمتگزاری کا ارادہ کیا ہے اور اپنی کوتاہیوں سے نادم اور پشیمان ہے اور ہماری یہ درگاہ درگاہ ناامیدی نہیں ہے لہٰذا بندگی اور فرمانبرداری کی سیدھی راہ پر قائم رہنے کی شرط کے ساتھ از روئے فضل و ذرہ پروری اس کے جرائم کے پرچوں پر معافی کا قلم کھینچ دیا، اور چاہیے کہ اس نمایاں مہربانی سے بہت کچھ امداد حاصل کر کے صدق و عقیدت کے اظہار مراسم میں بہت زیادہ کوشش کرتا رہے۔

۶۴۳۔ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۱۲۔

۶۴۴۔ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۳۲۔

۶۴۵۔ تاریخ ہندوستان ص ۲۶۴ و ص ۲۶۵ جلد ۸

۶۴۶۔ وقائع عالمگیر ص ۱۲۷ تا ص ۱۳۰

۶۴۷۔ رقعات عالمگیری نمبر ۲۶ ص ۹

۶۴۸۔ رقعہ نمبر ۳۷ ص ۲ رقعات عالمگیری۔

۶۴۹۔ وقائع عالمگیر۔

۶۵۰۔ رقعہ نمبر ۱۷ ص ۲۱ رقعات عالمگیر۔

۶۵۱۔ رقعہ نمبر ۳۳۷ ص ۹ رقعات عالمگیری۔

۶۵۲۔ بعد فراغ از وظائف داد طلب راد ستم دیدگان و مظلومان را در خلوت گاہ خاص طلب فرمودہ، بے واسطہ استفسار سے فرمایند و مرحمت

علاوت بر جراحت قلوب شماں سے ہندو مستعد ارقعات ارباب استغاثہ و جرم سزا بسط اعلیٰ اقدس سے رسد و آنحضرت۔ بدستخط مبارک بر ہر رقعہ مطابق دعاء واقع جواب عکسی فرسودہ اند (عالمگیر نامہ)۔

۶۵۳۔ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۵۰۔

۶۵۴۔ سید محمد امیر متوفی ۱۱۰۲ھ (گیارہ سو دو) سلسلہ قادریہ کے جلیل القدر شیخ ہیں۔ ملاحظہ ہو خزینۃ الاصفیا ص ۱۷۸ جلد ا۔

۶۵۵۔ رقعہ نمبر ۳۳ ص ۱۳۔

۶۵۶۔ وقائع عالمگیر ص ۴۔

۶۵۷۔ محلہ دولتمند شہر برہان پور میں مزار ہے۔ شاہزادگی کے زمانہ سے عالمگیر ان کا معتقد تھا۔ میاں صاحب نے اپنی کلاہ مبارک بھی تبرکاً عنایت فرمائی تھی۔ عالمگیر اس کو جان کی برابر عزیز رکھتا تھا۔ جس سال انتقال ہوا، کلاہ حمید الدین خاں بہادر کو مرحمت ہوئی (وقائع عالمگیر)۔

۶۵۸۔ صوبہ خاندیس کا پرگنہ تھا اور اب ریاست اندور کے علاقہ میں زرخیز صوبہ ہے۔ ۱۲ (وقائع عالمگیر)

۶۵۹۔ یہ حسن نیت کی برکت تھی کہ عالمگیر کے زمانہ میں محاصل سلطنت اس قدر ترقی کر گئے تھے کہ اکبر اعظم کے زمانہ سے اس وقت تک بھی نہیں ہوئے تھے، اور ظاہر ہے کہ جب انصاف کے ساتھ واجبی معاملہ باقی رکھا جائے گا، تو لوگ اس کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کریں گے چنانچہ معدلت گستری کا یہ لازمی خاصہ ہے کہ تخفیف محاصل کے باوجود سلطنت کی آمدنی میں زیادتی ہو جاتی ہے۔ محاصل کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ اکبر ایک کروڑ نوے لاکھ پونڈ شاہجہاں ۲ کروڑ ۱۷ لاکھ پچاس ہزار پونڈ عالمگیر چار کروڑ پونڈ یعنی ساٹھ کروڑ روپیہ عالمگیر کے حدود مملکت میں جو اضافہ ہوا تھا وہ حیدرآباد، بیجاپور، آسام، چاٹگام اور تبت تھا۔ لیکن ان تمام صوبوں کی آمدنی دس بارہ کروڑ روپیہ سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ باقی جو اضافہ ہے وہ صرف ہندوستان کی خوبی اور ملک کی آبادی یا عام رعایا کی خوش دلی کا نتیجہ ہے (اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر)۔

۶۶۰۔ تزک عالمگیری ص ۵۲۵ وص ۵۲۶ بحوالہ حق ص ۱۳۱

۶۶۱۔ انفاس العارفین ص ۳۳۔ مگر افسوس زمانہ کے بلند پایہ علماء مثلاً حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ العزیز کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم قدس اللہ سرہ العزیز نے اس خدمت میں شرکت سے اجتناب کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ مجموعہ عبارت کی سلاست اور جامعیت میں تو بے نظیر ہے مگر استقادہ اور وثوق میں قاضی خاں وغیرہ کی حیثیت نہیں حاصل کر سکا۔ حتیٰ کہ تنہا علامہ ابن عابدین عرف علامہ شامی کی لکھی ہوئی تصنیف ردالمحتار کا مرتبہ بھی فتاویٰ عالمگیریہ سے بالا مانا جاتا ہے۔ بہر حال سلطان کی حسن نیت میں کوئی شک نہیں اور بلاشبہ اس کتاب نے پہلی مرتبہ مفتیٰ بہ اقوال کا ایک جا مجموعہ اہل فتویٰ کے سامنے پیش کیا۔ محمد میاں عفی عنہ

۶۶۲۔ حق ص ۵۰

۶۶۳۔ اورنگ زیب عالمگیر ص ۵۲

۶۶۴۔ اورنگ زیب عالمگیر ص ۵۲

۶۶۵۔ وقائع ص ۱۰۸!

۶۶۶۔ وقائع عالمگیر ص ۱۱۸۔

۶۶۷۔ سوتیا ماں بیٹے سے نکاح کرنے کی رسم اگر کسی قوم میں ہو تو فقہاء نے تصریح کی ہے کہ قانوناً روک دیا جائے گا۔ ہمارے خیال میں رسم ستی بھی اسی قسم کی قبیح رسم ہے۔ مگر نہیں معلوم اس کو قانوناً کیوں نہیں روکا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۶۶۸۔ تاریخ ہندوستان ص ۳۹۵ جلد ۸۔

۶۶۹۔ تاریخ ہندوستان ص ۲۰۸ جلد ۸۔

۶۷۰۔ تاریخ ہندوستان ص ۸۲۔

۶۷۱۔ رقعات عالمگیری ص ۷

۶۷۲۔ دعوت اسلام ترجمہ پریچنگ آف اسلام مصنفہ ٹی ڈبلیو۔ آرنلڈ ص ۲۷۸

۶۷۳۔ لائق عنایت ورحمت ابوالحسن توجہات شاہانہ سے امیدوار ہو کر مطلع ہوں کہ مراحم ذاتی اور فطری مکارم کے بموجب چونکہ ہماری تمام توجہ اور نیت تمام مخلوقات کی خوش حالی اور خواص وعوام کے احوال کے انتظام میں مصروف ہے اور شرع شریف کی رو سے یہ ثابت ہے کہ قدیم بت کدوں کو منہدم نہ کیا جائے۔ اور نئے بت خانے نہ بنائے جائیں اور اس انصاف پرور زمانے میں بارگاہ اشرف و اقدس وارفع واعلیٰ کی پیشی میں یہ بات پہنچی، کچھ آدمی قصبہ بنارس اور اس کے قرب وجوار کے چند مقامات کے ہندوؤں اور مندروں کے پجاریوں کو (جو قدیم زمانہ سے وہاں موجود ہیں) از راہ ظلم وتعدی تنگ کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کو ان مندروں کی خدمت سے جو عرصہ سے انہی لوگوں سے متعلق ہے، ہٹا دیں اور یہ صورت حال ان لوگوں کے لئے پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے۔ لہٰذا حکم والا صدور پذیر ہوتا ہے کہ اس فرمان عالی اور اس منشور لامع النور کے صادر ہونے کے بعد کوئی شخص کسی صورت سے بھی اس اطراف کے برہمنوں اور دوسرے ہندوؤں کو پریشان اور تنگ نہ کرے تا کہ یہ لوگ بدستور سابق اپنے مقام اور اپنے منصب پر بطمینان کے ساتھ رہتے ہوئے ''دولت خداداد ابد مدت وازل بنیاد'' کے لیے دعا کرتے رہیں۔ اس باب میں پوری تاکید ملحوظ رہے۔ ۵ جمادی الثانی ۱۰۹۹ھ۔

۶۷۴۔ تاریخ ہندوستان ص ۳۰۹۔

۶۷۵۔ ایضاً ص ۳۱۸۔

مآخذ

علماء ہند کا شاندار ماضی (جلد اوّل)

جن مضامین کے متعلق حدیث، تفسیر و کتب فقہ سے استدلال کیا گیا ہے۔ ان کے حوالہ جات حاشیہ پر موجود ہیں۔ ان کے علاوہ جلد اوّل اور اس کے تتمہ کے مآخذ مندرجہ ذیل تصانیف ہیں۔

۱- مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی: حضرت مجدد صاحب الف ثانی قدس سرہ العزیز (مطبع نولکشور)

۲- آئین اکبری: شیخ ابو الفضل (مطبع نولکشور)

۳- اقبال نامہ جہانگیری: معتمد خاں بخشی جہانگیر بادشاہ (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ھ)

۴- تزک جہانگیری: جہانگیر بادشاہ معتمد خاں و میرزا محمد ہادی (تصحیح کردہ سر سید احمد صاحب مطبوعہ نولکشور)

۵- ہدیہ مجددیہ: حضرت مولانا وکیل احمد صاحب نقشبندی سکندرآبادی (مطبوعہ مجتبائی ۱۳۱۲ھ)

۶- انوار احمدیہ: حضرت مولانا وکیل احمد صاحب نقشبندی سکندرآبادی (مطبوعہ مجتبائی ۱۳۱۲ھ)

۷- الکلام المنجی: حضرت مولانا وکیل احمد صاحب نقشبندی سکندرآبادی (مطبوعہ مجتبائی ۱۳۱۲ھ)

۸- انفاس العارفین: حضرت مولانا شاہ ولی اللہ قدس سرہ العزیز (مطبع مجتبائی دہلی)

۹- اخبار الاخیار فی اسرار الابرار: حضرت مولانا شیخ عبد الحق محدث دہلوی مطبع مجتبائی دہلی)

۱۰- سعد الاخبار و تذکرۃ الابرار: جناب ولایت علی صاحب اکبرآبادی (مطبع چشتی آگرہ ۱۳۱۶ھ)

۱۱- حالات مشائخ نقشبندیہ: مولانا محمد حسن صاحب نقشبندی مجددی مظہری ساکن کونلہ کرت پور ضلع بجنور (مطبع مجتبائی ۱۳۳۳ھ)

۱۲- مقامات امام ربانی: مولوی عبد الاحد صاحب مالک مطبع مجتبائی (مطبع مجتبائی ۱۳۲۲ھ)

۱۳- کلمات طیبات: مرتبہ مولانا ابو الخیر صاحب شیخ مراد آبادی (مطبع العلوم مراد آباد)

۱۴- سفینۃ الاولیاء: دارا شکوہ پسر شاہجہاں بادشاہ (مطبع مدرسہ آگرہ باہتمام مسٹر ٹل ۱۸۵۳ء)

۱۵- خزینۃ الاصفیاء: مولانا غلام سرور صاحب چشتی (نولکشور ۱۲۹۰ھ)

۱۶- سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان: حسان الہند سید غلام علی صاحب آزاد بلگرامی (طبع کردہ مرزا محمد حیدرآباد)

۱۷- الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبد الغنی: مولانا محمد بن یحیی المحسن التیمی ثم البکری ترہتی ثم پھلوری (مطبع صدیقی)

۱۸- مکتوبات حضرت خواجہ معصوم: حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ (مطبع نظامی کانپور)

۱۹- عالمگیر نامہ محمد کاظم بن محمد امین (قلمی) از کتب خانہ جناب قاضی تسلیم حسین صاحب مراد آباد

۲۰- وقائع عالمگیر: چودھری نبی احمد صاحب سندیلوی (نیشنل پریس الہ آباد)

۲۱- رقعات عالمگیر: چودھری نبی احمد صاحب سندیلوی (نیشنل پریس الہ آباد)

۲۲- بادشاہ نامہ عبد الحمید: ملا عبد الحمید صاحب لاہوری (کالج پریس کلکتہ)

۲۳- مآثر الکرام: حسان الہند مولانا میر غلام علی آزاد بلگرامی قدس اللہ سرہ (شائع کردہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد مطبع مفید عام آگرہ

۲۴- مقدمہ رقعات عالمگیر: سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے (مطبع معارف اعظم گڑھ)

۲۵- رقعات عالمگیر: مرتبہ
۲۶- آثار الصنادید: سرسید احمد خاں صاحب مرحوم (نامی پریس لکھنؤ ۱۹۰۴ء)
۲۷- رسالہ تحقیق اراضی ہند: شیخ جلال الدین تھانیسری قدس سرہ (مطبع احمدی دہلی ۱۳۰۴ھ)
۲۸- ملفوظات عزیزیہ: شائع کردہ مولانا بشیر الدین صاحب میرٹھی (مطبع مجتبائی میرٹھ)
۲۹- تذکرۃ الصلحاء والمشائخ: محمد دین صاحب فوق ایڈیٹر اخبار کشمیری (گلزار اسٹیم پریس ۱۳۲۸ھ)
۳۰- تذکرہ: مولانا ابوالکلام صاحب آزاد۔ مرتبہ: فضل الدین احمد مرزا۔ بی ایس سی۔ ای، ایم ایف، جی، ایس (یو کے) مطبع البلاغ پریس کلکتہ ۱۹۱۹ء
۳۱- دعوت اسلام ترجمہ (دی پریچنگ آف اسلام): مصنفہ ٹی ڈبلیو آرنلڈ۔ بی اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور و محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ مترجمہ محمد عنایت اللہ صاحب ایم اے (مطبع مفید عام آگرہ)
۳۲- خطبہ دشوقیہ: حضرت مولانا عبدالشکور صاحب امام اہل سنت والجماعت (لکھنؤ) بضمن مجدد نمبر رسالہ الفرقان بریلی (لکھنؤ)
۳۳- دبستان مذاہب: مصنف عہد شاہجہان کے کوئی بزرگ ہیں۔ نام معلوم نہیں۔ سرورق پر تحریر ہے۔ "از چار آتش طبع دانا و فرزانہ کم یاسم تھم نامہ نگار اشعار رفتہ آء" (مطبع نولکشور لکھنؤ)
۳۴- سیاسی تاریخ ہند: میجر جنرل سرجان میلکم جی سی بی کے ایل ایس ایف آر ایس وغیرہ وغیرہ مترجمہ مولوی ابن حسن صاحب ایم اے۔ مددگار پروفیسر جامعہ عثمانیہ (دار الطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن)
۳۵- ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں: مولانا ابوالحسنات صاحب ندوی۔ (مطبع معارف اعظم گڑھ)
۳۶- ہند عہد اورنگ زیب میں: نواب مرزا سمیع اللہ بیگ صاحب۔ مرزا یار جنگ بہادر چیف جسٹس حیدرآباد دکن۔
۳۷- ہندوستان کی صنعت و تجارت: مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی۔ خانقاہ رحمانی مونگیر (برقی مشین پریس مراد پور بانکی پور (پٹنہ)
۳۸- تاریخ امریکہ: مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا۔ بی اے وکیل۔ غازی آباد (الناظر پریس لکھنؤ)
۳۹- روئے زمین کے مسلمان سلاطین: مسٹر شمکلی پول مترجمہ محبوب عالم صاحب
۴۰- تعلیمی ہند: مرتبہ اراکین مجلس قاسم المعارف دیوبند (محبوب المطابع برقی پریس دہلی)
۴۱- مالیات عامہ اور عامہ افلاس کے اسباب: جے سی کمار رپا۔ ایم اے۔ بی ایس سی مترجمہ قاضی محمد حسین صاحب (شائع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی)
۴۲- تاریخ دستور حکومت ہند: ڈاکٹر یوسف حسین صاحب ڈی لٹ۔ پیرس (شائع کردہ انجمن ترقی اردو۔ دہلی)

حصّہ دوم

فہرست

انتساب اور وجہِ تالیف

علماءِ ہند کا شاندار ماضی پہلی مرتبہ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ برطانوی دور تھا جنگ کا زمانہ۔ فوراً ہی ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے شکنجہ میں کس دیا گیا۔ کتاب ضبط اور مصنف گرفتار۔

اُس زمانہ کی اُمنگیں اور تھیں۔ جیسے ہی مقدمہ اور اُس کی ہلکی سی سزا سے نجات ملی۔ کتاب پر نظرِ ثانی شروع کر دی اور تھوڑے ہی دنوں میں جلد اول ۱۶۰ صفحات کے بجائے تقریباً ایک ہزار صفحات میں اور پانچویں جلد ڈیڑھ سو صفحات کے بجائے تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات میں پھیل کر پریس میں چلی گئی اور اب اُن کے نام یہ ہو گئے:

❶ علماءِ ہند کا شاندار ماضی جدید۔ جلد اول

❷ علماءِ حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے۔ (دو جلد)

پھر ۱۹۴۷ء کا انقلاب آیا۔ اُس نے عمل کا دوسرا میدان پیش کر دیا۔ شاندار ماضی کی باقی جلدوں پر نظرِ ثانی کے مسودے بھی کاغذوں کے طومار میں دب گئے اور اُن کے پورا کرنے کا تصور بھی دماغ سے نکل گیا۔

اپریل ۱۹۵۳ء اور جنگِ آزادی کی تاریخ

انقلاب ۱۹۴۷ء سے چھ سال بعد اپریل ۱۹۵۳ء میں مرکزی حکومت کے وزیر ڈاکٹر سید محمود صاحب کی زیرِ صدارت، تحریکِ آزادیِ ہند کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب ناظم عمومی جمعیۃ علماءِ ہند اور رفیق محترم حضرت الحاج مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب ناظم اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی کا اصرار ہوا کہ احقر دوبارہ قلم ہاتھ میں لے اور نیا باب لگا کر خدمہ فرمائی شروع کر دے۔ ابھی احقر سوچ وچار ہی کر رہا تھا کہ ڈاکٹر سید محمود صاحب نے یاد فرما کر اس فرمائش میں ''حکم'' کی قوت پیدا کر دی اور یہ صورت تجویز کی کہ احقر اپنے انکشافات کے نوٹ تیار کر کے ڈاکٹر صاحب کے حوالہ سے کمیٹی کو پہنچاتا رہے اور خود بھی مستقل کتاب کی شکل میں اشاعت کا انتظام کرے۔

تاریخ آزادی مرتب کرنے والی کمیٹی کا کام تو ابھی تک پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم نے اس شکستہ حال کو نہ صرف ایک جلد بلکہ اس کے بعد کی جلدوں کی ترتیب کی توفیق بھی بخش دی۔ **ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ** ۔ اس وقت یہ جلد علماء ہند کے **شاندار ماضی** کی جلد دوم کی حیثیت سے خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

انتساب

یہ حقیر تصنیف ایسے تمام حضرات کی خدمت میں نذر ہے جو صحیح تاریخ کے آرزومند ہیں تاکہ وہ تلخیاں جو برطانوی سامراج کے دور میں تاریخ کو مسخ کر کے پیدا کی گئی ہیں، ختم ہوں اور ہندوستان پھر سے پریم و محبت کا باغ ارم بنے۔ آمین۔

محمد میاں عفی عنہ
۲۷/ ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ
۲۶/ جولائی ۱۹۵۷ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی ٥

ہندوستانی مسلمان اور تحریکِ آزادی

حصہ اوّل

❀

شاہ ولی اللہ صاحبؒ دہلوی کی سیاسی تحریک

شاہ ولی اللہؒ

اٹھارویں صدی کا آغاز تھا کہ اس جلیل القدر فاضل، آزاد خیال مفکر اور انقلاب آفریں مصلح کی کتاب زندگی کا افتتاح ہوا، اور ساتویں دھائی کے پورے دو سال بھی گذرنے نہیں پائے تھے کہ ۱۷۶۲ء/۱۱۷۶ھ میں اُس نے صحیفۂ حیات کا آخری ورق پلٹ دیا۔

اٹھارویں صدی پر ایک نظر

یہ وہ انقلاب آفریں اور ہنگامہ خیز صدی تھی جس میں ایک شاہنشاہیت کا آفتاب ڈھلتے ڈھلتے غروب کے قریب پہنچ رہا تھا اور ایک دوسری شاہنشاہیت کی صبح کاذب ہندوستان کے مشرق میں صبح صادق بنتی جا رہی تھی۔

اس صدی کا آغاز ہوا تو قندھار سے آسام تک، نیپال اور تبت سے مالا بار و کھمبات تک پورے ملک کا سیاسی مرکز ایک تھا۔ مگر ابھی پہلی دھائی ختم نہیں ہوئی تھی کہ فروری[1] ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد وہ قیامت برپا ہوئی کہ شیرازۂ ملک کا ایک ایک ورق جدا ہو گیا اور یورپ کی وہی سفید فام طاقتیں جن پر عالمگیر کے دادا پر دادا نے مہربانیوں اور شاہانہ عنایات کی بارش کی تھی، جن کو عالمگیر کے باپ (شاہجہاں) نے شکنجۂ تادیب میں کسا تھا، جن کو عالمگیر نے پہلے ملک بدر کیا تھا پھر معاف کر کے تجارت کی اجازت دی تھی، ابھی سو سال پورے نہیں ہوئے تھے کہ عالمگیر کی راجدھانی پر اس کا تسلط، اور عالمگیر کا پوتا شاہ عالم اس کا وظیفہ خوار تھا۔

دوسرے الفاظ میں اس صدی کے مدوجزر کا خلاصہ یہ ہے کہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر کی شاہنشانہ عظمت سے اس کا آغاز ہوا اور خاتمہ اس فدائے ملک وملت کی شہادت پر ہوا جس کو دنیا سلطان ٹیپو کے نام سے پہچانتی

ہے۔ جس کے خونِ شہادت میں لتھڑے ہوئے جنازہ کو دیکھ کر انگریز فاتح کی زبان بے ساختہ پکار اٹھی تھی:

''آج ہندوستان ہمارا ہے''

اس صدی کے قیامت خیز ہنگاموں کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) مرکزی حکومت کے ارکان میں ایرانی، تورانی یا شیعہ سنی اختلاف و کش مکش کا مرض جو عالمگیر کی زندگی تک دبا رہا تھا، وفات کے بعد پوری شدت سے اُبھرا، اور وہ خانہ جنگی شروع ہوئی جس کے نتیجہ میں صرف پچاس سال کے عرصہ میں (۱۷۰۷ء تا ۱۷۵۷ء) تختِ دہلی پر دس تاجدار بٹھائے گئے اور اُتارے گئے۔ اُن میں صرف چار اپنی موت سے مرے۔ باقی کے سر قلم کیے گئے یا تخت سے اُتار کر آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی۔

(۲) صوبوں کے گورنر خود مختار ہو گئے اور مغل شاہنشاہ ایک دعا گو 'مرشد' بن کر رہ گیا۔

(۳) جنوبی ہند میں مرہٹوں کی طاقت ایک مستقل طاقت بن گئی۔

(۴) دہلی کے شمال مشرق میں روہیلوں کی حکومت قائم ہو گئی اور اس کے مقابل اودھ کی وزارت نے شاہنشاہیت اختیار کر لی۔

(۵) دہلی کے جنوب مغرب میں جاٹوں کی طاقت اُبھری۔ اور

(۶) شمال مغرب میں خالصہ (جو اَب تک مذہبی فرقہ رہا تھا) ایک مستقل سیاسی طاقت بن گیا۔

ان طاقتوں کے تصادم سے سرزمین وطن کا چپہ چپہ میدانِ کارزار بنا۔ بار بار اُن کے سیلاب دہلی تک پہنچے اور تین سو سالہ شاہنشاہیت کے احترام کو پامال کیا۔ ان جنگجو طاقتوں نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے باہر کی طاقتوں سے بھی ساز کیا۔ ایک گروپ نے نادر شاہ کو بلایا۔ تو دوسرے گروپ نے ابدالی کو دعوت دی۔ نوعیت میں کسی قدر فرق رہا۔ مگر وطن اور اہلِ وطن کو نقصان [۲] پہنچانے میں دونوں ایک دوسرے سے بڑھے رہے۔

یہ حال اُن طاقتوں کا تھا جن کا مرکز ہندوستان یا ایران و افغانستان تھا یا جو پایۂ تخت دہلی سے قریب کا تعلق رکھنے والی تھیں۔ باقی رہیں یورپ کی وہ سفید فام طاقتیں جو ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں قدم جما چکی تھیں۔ وہ اگرچہ آپس میں ایک دوسرے کی حریف ہو گئی تھیں مگر ہندوستان کی خانہ جنگی سے فائدہ اُٹھانے میں سب شریک تھیں۔ بالخصوص ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذمہ داروں نے تمام یورپین ساتھیوں سے آگے بڑھ کر اس خانہ جنگی سے وہ فائدہ زیادہ سے زیادہ حاصل کیا جو ایک بیدار مغز چست و چالاک حریف ایسے موقع سے حاصل کر سکتا ہے۔

اُس نے بنگال میں اپنی فوجی طاقت بڑھانی شروع کر دی۔ انتہا [۳] یہ کہ ایک طرف ابدالی کی فوجیں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کا خاتمہ کر رہی تھیں تو دوسری جانب بنگال میں انگریزی فوجیں سراج الدولہ کو موت کے گھاٹ اُتار کر غیر ملکی شاہنشاہیت کے پرچم لہرا رہی تھیں۔

شاہ ولی اللہؒ

تشخیصِ مرض اور فکرِ علاج

یہ تمام تباہ کن خونیں ڈرامے، شاہ ولی اللہ صاحب کی زندگی میں اُن کی چشمِ بینا کے سامنے ہو رہے تھے۔

ایک طرف آپ کے قلبِ حساس میں بربادیٔ وطن کا ورد تھا۔ دوسری طرف آپ کا مغزِ بیدار، اسبابِ مرض کی تلاش اور فکرِ علاج میں مشغول تھا۔

اسی اضطراب اور بے چینی میں آپ نے اصلاحی جدوجہد شروع کی جس کی شدت سے مخالفت کی گئی، یہاں تک کہ ایک مرتبہ مسجد فتح پوری سے نکلتے ہوئے آپ پر قاتلانہ حملہ بھی کیا گیا۔

اسی ادھیڑبن میں آپ نے ۱۷۲۸ء/۱۱۴۳ھ میں حجاز شریف کا سفر اختیار کیا۔ وہاں دو سال قیام کر کے علمی اور روحانی مشاغل کے ساتھ ساتھ بڑا کام یہ کیا کہ یورپ اور ایشیا کے زائرین سے ان ممالک کے متعلق پوری واقفیت حاصل کی۔ ترکی حکومت کو اگرچہ سماجی خرابیوں کا گھن لگ چکا تھا مگر پھر بھی وہ اس زمانہ میں ایشیا کی سب سے بڑی حکومت تھی۔ تمام مشرقِ وسطیٰ پر اُس کے اقتدار کا پرچم لہرا رہا تھا۔ بحرِ عرب میں عدن تک اس کا قبضہ تھا اور یورپ و افریقہ کے بھی بہت سے حصے اُس کے زیرِ اقتدار تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس سب سے بڑی حکومت کے اندرونی حالات کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ آپ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"احوالِ ہند بر ما مخفی نیست کہ خود مولد و منشا فقیر است۔ بلادِ عرب نیز دیدیم و احوالِ مردمِ ولایت از ثقات استماع شنیدیم۔" (۶)[۴]

ان تمام ممالک کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد آپ کے گہرے سوچ بچار اور اعلیٰ تدبر نے فیصلہ کیا کہ جو کچھ سماجی، معاشی یا اقتصادی تباہیاں اس وقت موجود ہیں۔ اُن کا اصلی سبب "ملوکیت" اور "شاہنشاہیت" ہے۔

اس سفرِ حجاز میں آپ کے ضمیر کی آواز نے یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ ان تباہیوں اور بربادیوں کا واحد علاج "فکّ کل نظام" ہے۔ یعنی ایسا ہمہ گیر اور مکمل انقلاب جو سماج کے معاشی، سیاسی، اقتصادی، غرض ہر ایک ڈھانچہ کو بدل ڈالے۔ کیونکہ اس وقت کا ہر ایک نظام، اس کا تعلق کسی بھی شعبہ سے ہو، شاہنشاہیت کا پروردہ ہے اور وہ امراض جو شاہنشاہیت کے ساتھ لازم ہوتے ہیں، ہر ایک نظام میں سرایت کر چکے ہیں۔ بس کوئی اصلاح اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہر ایک نظامِ کہنہ کو منہدم کر کے اس کی جگہ نظامِ نو تعمیر کیا جائے۔ یہی ہے "فکّ کل نظام"۔

انقلاب کا طریقہ

شاہ صاحبؒ فوجی انقلاب کے حامی تھے۔ مگر وہ فوجی انقلاب جو جہاد کے اصول پر ہو یعنی جس کا نصب

العین سب سے بہتر و برتر ہو اور جس کا ہر ایک مجاہد ذاتی اغراض (۷) سے یہاں تک بلند ہو کر خود اپنی شخصیت کو بھی فنا کر چکا ہو، یہاں تک کہ فنا کو بقا، اور نصب العین کے لیے قربان ہو جانے کو ابدی زندگی تصور کرے۔

ایسا انقلاب پیشہ ور سپاہیوں کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ان رضا کاروں کے ذریعہ ہو سکتا ہے جن کی تربیت خاص طور پر کی گئی ہو، جو نصب العین کو سمجھیں اور اصلاحی نظریات پر پہلے اپنے آپ کو ہموار کریں۔ اس کے بعد ان کو کامیاب بنانے کے لیے قربان ہو جانا اپنی زندگی کا آخری مقصود بنالیں۔

شاہ ولی دہلویؒ نے سب سے پہلے یہی خدمت انجام دی۔ آپ نے اصلاحی نظریات مرتب کیے۔ ساتھ ساتھ ٹریننگ کے سنٹر قائم کیے مگر آپ کی زندگی نے وفا نہ کی اور اس خدمت کی تکمیل آپ کے پس ماندگان بالخصوص خلف اکبر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے سپرد ہوئی۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ پہلے اصلاحی نظریات ملاحظہ فرمائیے۔

شاہ ولی اللہؒ کے اصلاحی نظریات

ہندوستان اس خوش قسمتی پر جس قدر فخر کرے کم ہے کہ اس دور میں کہ ابھی انقلاب فرانس ۱۷۸۹ء جس کو انقلاب پسندان عالم کے لیے نشانِ راہ کہا جاتا ہے نصف صدی بعد آنے والا تھا اور کمیونزم کے معلم اول کارل مارکس اور اس کے نفسِ ناطقہ اور رفیق عزیز ''اینگلس'' کی پیدائش میں پوری ایک صدی باقی تھی اور اس سے تقریباً چالیس سال پہلے کہ یورپ میں مشینوں اور کلوں کا آغاز ہوا، ہندوستان کے ایک سپوت نے اقتصادیات کے بارہ میں طے کیا کہ:

اقتصادی اصول

(۱) دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔ مزدور اور کاشتکار قوت کاسبہ ہیں۔ باہمی تعاون، مدنیت (شہریت) کی روح رواں ہے۔ جب تک کوئی شخص ملک اور قوم کے لیے کام نہ کرے، ملک کی دولت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ (۸)

(۲) جوا، سٹہ اور عیاشی کے اڈے ختم کیے جائیں جن کی موجودگی میں تقسیم دولت کا صحیح نظام قائم نہیں ہو سکتا اور بغیر اس کے کہ قوم اور ملک کی دولت میں اضافہ ہو، دولت بہت سی جیبوں سے نکل کر ایک طرف سمٹ آتی ہے۔ (۹)

(۳) مزدور، کاشتکار اور جو لوگ ملک اور قوم کے لیے دماغی کام کریں دولت کے اصل مستحق ہیں۔ ان کی ترقی اور خوش حالی ملک اور قوم کی ترقی اور خوش حالی ہے۔ جو نظام ان قوتوں کو دبائے وہ ملک کے لیے خطرہ ہے، اس کو ختم ہو جانا چاہیے۔ (۱۰)

(۴) جو سماج محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے۔ مزدوروں اور کاشتکاروں پر بھاری ٹیکس لگائے، قوم کا دشمن ہے، اُس کو ختم ہو جانا چاہیے۔[11]

(۵) ضرورت مند مزدور کی رضا مندی قابل اعتبار نہیں۔ جب کہ اس کی محنت کی وہ قیمت ادا نہ کی جائے جو امداد باہمی کے اصول پر لازم ہوتی ہے۔[12]

(۶) جو پیداوار یا آمدنی تعاونِ باہمی کے اُصول پر نہ ہو وہ خلاف قانون ہے۔[13]

(۷) کام کے اوقات محدود کیے جائیں۔ مزدوروں کو اتنا وقت ضرور ملنا چاہیے کہ وہ اخلاقی اور رُوحانی اصلاح کر سکیں اور اُن کے اندر مستقبل کے متعلق غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔[14]

(۸) تعاونِ باہمی کا بہت بڑا ذریعہ تجارت ہے، لہٰذا اس کو تعاون کے اُصول پر ہی جاری رہنا چاہیے۔ پس جس طرح تاجروں کے لیے جائز نہیں کہ وہ بلیک مارکیٹ یا غلط قسم کے "کمی ٹیشن" سے رُوحِ تعاون کو نقصان پہنچائیں، ایسے ہی حکومت کے لیے درست نہیں کہ بھاری ٹیکس لگا کر تجارت کے فروغ و ترقی میں رکاوٹ پیدا کرے یا رخنہ ڈالے۔[15]

(۹) وہ کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی خاص طبقہ میں منحصر کر دے، ملک کے لیے تباہ کن ہے۔[16]

(۱۰) وہ شاہانہ نظام زندگی جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کی عیش و عشرت کے سبب سے دولت کی صحیح تقسیم میں خلل واقع ہو، اس کا مستحق ہے کہ اس کو جلد از جلد ختم کر کے عوام کی مصیبت ختم کی جائے اور اُن کو مساویانہ نظامِ زندگی کا موقع دیا جائے۔[17]

سیاسیات اور نظامِ حکومت کے بنیادی اُصول

☆ زمین کا مالک حقیقی اللہ (اور ظاہری نظام کے لحاظ سے اسٹیٹ) ہے۔ باشندگانِ ملک کی حیثیت وہ ہے جو کسی مسافر خانہ میں ٹھہرنے والوں کی۔ ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ اُس کے حق انتفاع میں دوسرے کی دخل اندازی قانوناً ممنوع ہو۔[18]

☆ سارے انسان برابر ہیں۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مالک ملک، ملک الناس، مالک قوم یا انسانوں کی گردنوں کا مالک تصور کرے۔ نہ کسی کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی صاحب اقتدار کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرے۔[19]

☆ اسٹیٹ کے سربراہِ کار کی وہ حیثیت ہے جو کسی وقف کے متولی کی۔ وقف کا متولی اگر ضرورت مند ہو تو اتنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ عام باشندۂ ملک کی طرح زندگی گزار سکے۔[20]

بنیادی حقوق

حجۃ اللہ البالغہ اور البدور البازغہ وغیرہ تصانیف میں ارتفاقات (مفادات عامہ) کے عنوان سے بہت مفصل بحث کی ہے۔ ان کا حاصل یہ ہے کہ

(۱) روٹی، کپڑا، مکان اور ایسی استطاعت کہ نکاح کر سکے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کر سکے۔ بلا لحاظ مذہب و نسل ہر ایک انسان کا پیدائشی حق ہے۔

(۲) اسی طرح مذہب، نسل یا رنگ کے کسی تفاوت کے بغیر عام باشندگان ملک کے معاملات میں یکسانیت کے ساتھ عدل و انصاف، اُن کے جان و مال کی حفاظت، اُن کی عزت و ناموس کی حفاظت، حق ملکیت میں آزادی، حقوق شہریت میں یکسانیت ہر باشندۂ ملک کا بنیادی حق ہے۔

(۳) زبان اور تہذیب کو زندہ رکھنا ہر ایک فرقہ کا بنیادی حق ہے۔

بین الاقوامی تحفظات

ان حقوق کے حاصل کرنے کی شکل یہ ہے کہ خود مختار علاقے بنائے جائیں۔ یہ خود مختار اکائیاں اپنے معاملات میں آزاد ہوں گی۔ ہر ایک یونٹ میں اتنی طاقت ضرور ہونی چاہیے کہ اپنے جیسے یونٹ کے اقدام کا مقابلہ کر سکے۔ یہ تمام اکائیاں ایک ایسے بین الاقوامی نظام (بلاک) میں منسلک ہوں جو فوجی طاقت کے لحاظ سے اقتدار اعلیٰ کا مالک ہو۔ اُس کو یہ حق نہیں ہوگا کہ کسی مخصوص مذہب یا مخصوص تہذیب کو کسی یونٹ پر لاد سکے۔ البتہ اس کا یہ فرض ضرور ہوگا کہ کسی قوم یا یونٹ کو یہ موقع نہ دے کہ کسی دوسری قوم کے مذہب یا تہذیب پر حملہ کر سکے۔

مذہبیات

الف: دین اور سچائی کی اصل بنیاد ایک ہے۔ اس کے پیش کرنے والے ایک سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

ب: داعیانِ صداقت ہر ملک اور قوم میں گزرے ہیں۔ اُن سب کا احترام ضروری ہے۔

ج: سچائی اور دین کے بنیادی اصول تمام فرقوں میں تقریباً تسلیم شدہ ہیں۔ مثلاً اپنے پروردگار کی عبادت، اس کے لیے نذر و نیاز، صدقہ و خیرات، روزہ وغیرہ یہ سب کام سب کے نزدیک اچھے ہیں۔ البتہ عملی صورتوں میں اختلاف ہے۔

د: ساری مہذب دنیا کے سماجی اُصول، اور اُن کا منشا و مقصد ایک ہے مثلاً ہر ایک مذہب اور فرقہ جنسی انارکی کو ناپسند اور اخلاقی جرم قرار دیتا ہے۔ جنسی تعلقات کے لیے مرد اور عورت میں ایک معاہدہ، ہر ایک فرقہ میں ضروری ہے البتہ معاہدہ کی صورتیں مختلف ہیں۔ ایسے ہی ہر ایک فرقہ اپنے

مُردہ کو نظروں سے غائب کر دینا ضروری سمجھتا ہے۔ اختلاف اس میں ہے کہ زمین میں دفن کر کے نظروں سے اوجھل کیا جائے یا جلا کر۔ (۴۱)

جہاد۔

ایک مقدس فرض ہے۔ مگر اس کے معنی یہ ہیں کہ مقدس اصول کے لیے انسان اپنے اندر جذبۂ فدائیت پیدا کرے، یہاں تک کہ وہ اپنی ہستی ان اصول کے لیے فنا کر دے۔ (۴۲)

تشریحات و اقتباسات

جو اصول اوپر بیان کے گئے ہیں، حاشیہ میں ان کے ماخذ کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔ ان تمام کا ترجمہ پیش کرنا طوالت ہے۔ البتہ چند اقتباسات جن سے شاہ صاحب کے نظریات پر مجموعی طور سے روشنی پڑتی ہے، یہاں پیش کر دینے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ اصل عبارتیں بخوف طوالت یہاں بھی نقل نہیں کی گئیں صرف ان کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

البتہ ترجمہ سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ شاہ صاحب کے زمانہ میں وہ مشینیں اور کلیں جن کی بنا پر انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں سرمایہ داری نے خاص شکل اختیار کی اور وہ سوالات پیدا ہوئے، جنہوں نے کمیونزم کو کامیاب بنایا، بلاشبہ نہیں تھیں۔ مگر جاگیرداری اور خاص خاص منصبوں اور وظیفوں کی اجارہ داری نے اقتصادی توازن درہم برہم کر رکھا تھا۔

بادشاہ، اُمراء اور بالادست حکام وہ چھوٹے بڑے جاگیردار تھے جو شاہانہ زندگی اور عیش پرستانہ رنگ رلیوں کے لیے کاشتکاروں کا خون چوستے تھے اور خانقاہ نشین، پیشہ ور فقراء اور سجادہ نشین اور نام نہاد علماء نے گویا کلیسائی نظام کا چربہ ہندوستان میں اُتار رکھا تھا۔ یہ دونوں طبقے محنت سے ناآشنا تھے۔ ملک کی دولت میں ان کے ذریعہ کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوتا تھا، بلکہ بقول شاہ صاحبؒ یہ ملک کے لیے بارِ گراں تھے۔

چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ باب سیاست المدنیہ کے آخر میں آپ فرماتے ہیں: اس زمانہ میں بربادی ملک کا سبب زیادہ تر دو چیزیں ہیں۔

(۱) خاص خاص طبقے اس کے عادی ہو گئے ہیں کہ کچھ کیے دھرے بغیر اپنے خاص خاص امتیاز کی بناء پر، مثلاً اس لیے کہ وہ قاری یا عالم ہیں، یا اُن کا تعلق شعراء یا سجادہ نشینوں یا فقراء کے اس حلقے سے ہے جس کو بادشاہوں کی طرف سے عطیے اور وظیفے ملتے رہتے ہیں یا اسی قسم کی دریوزہ گری اور بھیک کا کوئی ڈھنگ نکال کر خزانۂ شاہی سے رقمیں وصول کرتے ہیں اور ملکی دولت کے وسیع دامن کو تنگ کرتے رہتے ہیں۔ ان کا مطمحِ نظر ملک کی کوئی خدمت نہیں بلکہ رقمیں وصول کرنا اور اپنا ذریعۂ

معیشت فراہم کرنا اُن کا نصب العین ہوتا ہے۔ ان مہذب دریوزہ گروں کا ایک گروہ جاتا ہے اور دوسرا گروہ آتا ہے۔ اس طرح باشندگانِ ملک کی زندگی تنگ کر رہے ہیں اور ملک کے لیے بارِ گراں بنتے رہتے ہیں۔

(۲) کاشتکاروں، سوداگروں اور دستکاروں پر بھاری بھاری ٹیکس مقرر کیے جاتے ہیں اور اُن کے وصول کرنے میں انتہائی سختی سے کام لیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وفادار رعایا بھی بغاوت پر اُتر آتی ہے، جس کے فرو کرنے کے لیے جبر و تشدد سے کام لینا پڑتا ہے اور بے انتہا فوجی طاقت صرف کرنی پڑتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ملک کی فلاح و بہبود اس میں ہے کہ ٹیکس کم سے کم ہوں اور دفاع پر بقدرِ ضرورت صرف کیا جائے۔"

ب: اقتصادی حالات کا اثر رُوحانی ترقی پر

ہندوستان اپنی اس خصوصیت پر ہمیشہ فخر کرتا رہا ہے کہ اس کی تہذیب و سیاست کبھی مذہب اور خدا پرستی سے بیگانہ نہیں ہوئی۔

ہندوستان کا بلند مرتبہ سپوت (شاہ ولی اللہ) جس کو تاریخ نے آج تک بھلائے رکھا ہے، اس خصوصیت کا آئینہ دار ہے۔ بے شک وہ عالمِ دین اور رُوحانیت اور فلسفۂ اخلاق کا بہترین ماہر ہے۔ یہاں تک کہ اس کے جاننے والے اس کو "شاہ" کا لقب دیتے ہیں، جو رُوحانی بزرگوں کو از راہِ عقیدت دیا جاتا ہے۔ لیکن اس عالمِ دین اور رُوحانی پیشوا کا نظریہ یہ ہے کہ وہ تباہی اور بدحالی جو مذہبی نقطۂ نظر سے سوسائٹی میں پائی جاتی ہے اس کا بڑا سبب یہی اقتصادی بحران ہے جس نے سرزمین ہند کو پُرشور بنا رکھا ہے۔

اس مذہبی رہنما کا یہ فیصلہ ہندوستان کے خاص حالات کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے، بلکہ اُس کا نظریہ یہ ہے کہ عالمِ انسانیت میں ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے کہ اقتصادی عدمِ توازن نے مذہب کے سربفلک قلعوں کو مسمار کیا ہے۔ اس لیے سوسائٹی کی اقتصادی اصلاح، مذہبی اور اخلاقی اصلاح اور رُوحانی کمالات کے لیے سب سے پہلی سیڑھی ہے۔ انتہا یہ کہ یہ مذہبی بادشاہ (شاہ ولی اللہؒ) سوسائٹی کی اقتصادی اصلاح کو انبیاءؑ کی تعلیم کا اہم جزو قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اپنی مشہور تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" میں ذرائع معیشت پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے:

"محمد رسول اللہؐ کی بعثت کے وقت دنیا کی حالت یہ تھی کہ عیش و عشرت اور حد سے بڑھے ہوئے شاہانہ تکلفات کا مرض (جس نے ملک اور قوم کو اقتصادی عدمِ توازن کی تباہیوں میں مبتلا کر رکھا تھا) ایران اور روما وغیرہ میں وبا کی طرح پھیلا ہوا تھا۔

پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے دل میں القاء کیا کہ وہ اس مرض کا ایسا علاج کرے کہ نہ صرف مرض ختم ہو بلکہ زہریلا مادہ بھی فنا ہو جائے۔ جس کی وجہ سے یہ مرض پیدا ہوا ہے۔ پس آنحضرتؐ نے

ان اسباب و وجوہات پر غور فرمایا جن سے اس مرض کے جراثیم نشو و نما پا رہے تھے۔ پھر ایک ایک مرض کی تشخیص کر کے ان کی ممانعت فرمادی۔" [ابواب ابتغاء الرزق ص ۹۸۔ ج ۲]

یہی مضمون ایک دوسرے موقع پر بھی بیان کیا گیا ہے۔ وہ اگرچہ کسی قدر طویل ہے مگر موضوع کی اہمیت اس طوالت کو جائز قرار دیتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ اٹھارہویں صدی کے مسلمان عالم کو دیکھیں گے کہ وہ بیسویں صدی کے کمیونسٹ کی زبان بول رہا ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت (یعنی ساتویں صدی عیسوی میں) ایران اور روما کی سلطنتیں عروج پر تھیں۔ مگر اقتصادی عدم تعاون نے ان کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ حضرت شاہ صاحب انہیں دو سلطنتوں کی تاریخی مثال سے اقتصادی خرابیوں کا تجزیہ کرتے ہیں اور مشاہدہ کے لیے اپنے زمانہ کے بادشاہوں کی مثال پیش کرتے ہیں۔

ہندوستان کی اقتصادی تباہ حالی اور اس کے وجوہات

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

"ایران اور روما کی سابق تاریخ ہمارے لیے روشن مثال ہے اور جو کچھ تم اپنے ملک میں دیکھ رہے ہو، اس سے ایران اور روما کی حالت کا اندازہ کر لو۔"

دولت و ثروت کے ساتھ فلسفہ اور سائنس کی تحقیقات نے ایجادات کا راستہ کھولا۔ نئی نئی صنعتیں رونما ہوئیں اور ملک اپنے دور میں تمدن کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گیا۔ لیکن بدقسمتی سے اہل ثروت اور حکمران طبقہ میں عیش، فیشن اور وجاہت یا اقتدار پرستی اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں تفاخر (بڑھ چڑھ کر رہنے) کا مرض پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس پر فخر ہونے لگا کہ کس کا تاج زیادہ قیمتی ہے اور کس کے سر پر سلطنت میں زیادہ جواہر لگے ہوئے ہیں۔

ارباب حکومت کے اس ٹھاٹھ نے سوسائٹی کا مزاج بگاڑ دیا۔ نئے نئے فیشن، امیرانہ شان و شوکت اور شاہانہ تکلفات نبھانے کے لیے ہر ایک صاحب اقتدار اپنے ماتحت کو لوٹنے لگا۔ زمیندار اور جاگیردار، کاشتکاروں کا خون چوسنے لگے، اور جو مزدوروں پر اختیار رکھتے تھے انہوں نے غریب مزدوروں کو نوچنا شروع کر دیا۔ اب اس بااقتدار طبقہ کی تمام عملی اور فکری طاقتیں ترقی ملک و دولت کے بجائے عیش و عشرت، شاہانہ تکلفات، نفع اندوزی، اور استحصال بالجبر پر صرف ہونے لگیں، اور ماتحت طبقہ اتنا گر گیا کہ اس کی زندگی کھیت جوتنے والے بیلوں اور بوجھ اٹھانے والے گدھوں، گھوڑوں کی مانند ہو گئی۔ زرکشی اور زر اندوزی کے لیے نئے نئے قانون ایجاد ہوئے۔

مزدور اور کسان طبقہ اگر ان سے سرتابی کرتا تو مجرم بن کر طرح طرح کی سزاؤں میں مبتلا ہوتا۔ اور اگر سزاؤں سے بچنا چاہتا تو لامحالہ باربردار گھوڑوں اور گدھوں کی زندگی پر مجبور ہوتا یہ دونوں طبقے اپنے اپنے حالات میں ایسے غرق ہوگئے کہ پیدائش انسان کا حقیقی مقصد کسی کے سامنے بھی نہیں رہا۔ ایک طبقہ کو حد سے بڑھے ہوئے عیش اور دولت کی چمک دمک نے اندھا کر دیا اور دوسرا طبقہ پیٹ کی فکر میں ایسا سرگرداں ہوا کہ فکر مستقبل کی صلاحیت بھی ختم کر بیٹھا۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ تمام دولت سمٹ کر چند افراد کے ساتھ مخصوص ہوگئی جن کا سربراہ بادشاہ تھا۔

اقتصادی عدم توازن اور طبقۂ اعلیٰ کی شان و شوکت اور عیش پرستی نے ایک تیسرا طبقہ پیدا کر دیا۔ یہ تن آسان، آرام طلب سرکار پرست خوشامدیوں کا طبقہ تھا جو بادشاہ اور شاہ پرستوں کے گرد جمع ہوگیا تھا اور مختلف عنوانات سے رقمیں وصول کرتا رہتا تھا ان میں بہت سے صاحب فن و اہل علم بھی ہوتے تھے۔ وہ فن اور علم کے نام پر روپیہ وصول کرتے تھے مگر ان کا مطمحِ نظر ملک کی خدمت نہیں بلکہ ذاتی اغراض، ذاتی جاہ و جلال اور ذاتی اقتدار، اُن کی جدوجہد کا نصب العین ہوتا تھا۔ کوئی اس نام سے روپیہ وصول کرتا تھا کہ وہ فنِ سپہ گری کا ماہر ہے۔ بہترین جرنیل یا کمانڈر ہے۔ کوئی اپنے علم و ہنر اور اپنی سیاست دانی کے نام پر روپیہ وصول کرتا تھا۔ خانقاہ نشینوں کی ایک جماعت تھی جو تقدس کے نام پر وظیفے حاصل کرتی تھی۔ ایک جماعت فنونِ لطیفہ و ادب و شاعری کے نام پر رقمیں اینٹھتی تھی کہ شانِ خسروانہ یہی ہے کہ فنونِ لطیفہ کے ماہرین کی قدر کرتے ہیں۔

بادشاہ یا امراء کو خوش کرنا، خوش گپیوں سے گرمیٔ مجلس پیدا کرنا ایک فن قرار دے دیا گیا تھا اور اس فن کے ماہرین طرح طرح کے ڈھونگ رچا کر روپیہ وصول کرنے لگے تھے۔ شاہانہ آداب، درباری آداب ایک خاص فن بن گیا اور ایک گروہ اسی طرح اس نام پر رقمیں وصول کرنے لگا۔ یہ تمام جماعتیں جن کو لازمہ تمدن مان لیا گیا تھا، درحقیقت مفت خوروں کے گروہ تھے جو ملک اور قوم کی خدمت کے بجائے اپنی تمام صلاحیتیں محض شاہ پرستوں کی اغراض اور اُن کی خوشنودی کے لیے صرف کرتے تھے اور ملک اور ملک کے مزدوروں اور کسانوں پر بار بنتے جا رہے تھے۔ اس طرح خدا کی تمام مخلوق دن بدن افلاس، فلاکت اور تباہ حالی میں مبتلا ہو کر روحانی فلاح و بہبود سے بھی محروم ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ پورے ملک میں بھی کوئی شخص ایسا نہیں ملتا تھا جس کو عاقبت کی فکر ہو۔ اللہ تعالیٰ جو تمام مخلوق کا پروردگار ہے، اُس نے رسول اللہ ؐ کو مبعوث فرمایا تاکہ وہ روحانی اصلاحات کے ساتھ اقتصادی تباہ حالی بھی ختم فرمائیں اور معیشت کے ایسے اُصول تلقین فرمائیں

جن سے اقتصادی امراض کے سموم جراثیم کا قلع قمع ہو جائے۔"

حضرت شاہ صاحبؒ اس مفہوم کو ذہن نشین کرانے کے لیے کہ اقتصادی حالات کا رُوحانی اصلاحات پر کیا اثر پڑتا ہے، ایک مثال پیش فرماتے ہیں۔ اس مثال سے یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ حضرت شاہ صاحب جس حکومت کی حمایت کر سکتے ہیں، اُس کا نقشہ کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

> "ایک ایسی قوم فرض کرو جس میں ملوکیت نہ ہو۔ شاہانہ شان و شوکت اور عیش پرستی کے لوازمات سے محفوظ ہو۔ ہر شخص اقتصادی طور پر آزاد ہو اور ٹیکسوں کے بوجھ سے اس کی کمر دوہری نہ ہوئی ہو۔ ایسی قوم کو یہ فراغت میسر ہوگی کہ وہ دین و ملت کے کام انجام دے سکے۔ اخلاقی اور رُوحانی ترقی حاصل کر سکے۔ لیکن اگر اس قوم کی گردن پر ملوکیت، شاہ پرستی اور سرمایہ کا بھوت سوار ہو جائے، تو اُس کے ہوش و حواس گم ہو جائیں گے اور وہ انسانی شرف و عظمت سے گر کر چوپاؤں کی زندگی پر مجبور ہو جائے گی جن کو رات دن پیٹ کا فکر رہتا ہے اور پھر بھی یہ جہنم بھرنے نہیں پاتا۔"

[حجۃ اللہ البالغہ جلد اول باب اقامۃ الارتفاقات و اصلاح الرسوم]

ج: عوام کی خوش حالی کا بنیادی اصول اور اقتصادی بدحالی کے انسداد کی پہلی شرط

خوش حالی بہت اچھی چیز ہے۔ وہ انقلابات جو گزشتہ ڈیڑھ صدی میں دنیا کے سیاسی پلیٹ فارم پر رونما ہوئے، اُن کا مقصود یہی ظاہر کیا گیا کہ ملک کے تمام باشندے آسودہ اور فارغ البال ہوں۔ عوام کی خوش حالی کے لیے بہت سے پروگرام بنائے گئے اور اُن کو تجربوں کی آماج گاہ میں لایا گیا۔ مگر کیا یہ مقصد پورا ہوا؟ بے شک انقلاب کے ان طوفانوں میں انسانی خون کی بے شمار ندیاں بہائی گئیں۔ مگر کیا گوہر مقصود کسی قوم کے ہاتھ لگا؟ اور کیا وہ فارغ البالی اور جمہور کا وہ اطمینانِ کلی جس کے لیے یہ کھیل کھیلے گئے تھے حاصل ہوا؟ ممکن ہے کہ کمیونزم کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ مگر کیا کمیونزم خود بھی اپنی اس سیر چشمی کا معترف ہے کہ وہ غیر کمیونسٹوں کے لیے بھی اطمینان اور فارغ البالی کی بخشش کر سکا؟ شاہ صاحب کے نظریات اگر سامنے رکھے جائیں تو اس ناکامی کا سبب ایک خاص نکتہ ہے جو انیسویں اور بیسویں صدی کی تمام انقلابی تحریکات میں نظر انداز ہوتا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان انقلابات میں ملوکیت اور سرمایہ داری بے شک ختم کی گئی لیکن وہ چیزیں جو انسانی دل و دماغ میں شاہ پرستی اور سرمایہ داری کے بیج بوتی ہیں، ختم نہیں کی گئیں۔ بلکہ بسا اوقات خود انقلابی رہنماؤں کا طرزِ عمل اس تخم کی آبیاری کرتا رہا۔ فکر و عمل کے اس تضاد کا یہ نتیجہ ہے کہ سرمایہ داری اور شاہ پرستی کے ختم ہونے پر بھی گوہرِ اطمینان مفقود اور جنسِ اضطراب کی فراوانی روز افزوں ہے۔

مذہب کی روشنی میں شاہ صاحبؒ کی رائے یہ ہے کہ سونے اور چاندی کے انباروں سے زیادہ خطرناک وہ طرزِ معاشرت ہے جو امیر و غریب میں امتیاز قائم کر کے غریب کے دل میں سرمایہ داری کی ہوس اور شاہ پرستی کا

شوق پیدا کرتا ہے۔ سونے چاندی کے برتن، زر بفت و زر دوز، زرق برق ریشمی لباس، وہ فیشن اور وہ تکلفات جو دولت مندوں کے دماغوں میں کبر و غرور اور تصور برتری پیدا کرتے ہیں، اور ناداروں کے دلوں میں حرص و طمع کا وہ اضطراب پیدا کرتے ہیں، جو اُن کو زیادہ ستانی رشوت، چوری، خیانت، استحصال بالجبر اور عصمت فروشی وغیرہ پر آمادہ کر دیتا ہے۔ غرض سماجی زندگی کے بیش قیمت تکلفات سرمایہ داری اور شاہ پرستی کے وہ زہریلے جراثیم ہیں کہ جب تک قانون ان کی اجازت دیتا رہے گا سرمایہ داری کی جڑیں مضبوط ہوتی رہیں گی، دوسری طرف نادار اور حریص لوگوں میں ارتکاب جرائم کا میلان بڑھتا رہے گا۔

شاہ صاحب ایک طبقہ کی ایسی خوش حالی کو جو ان تکلفات سے مرصع ہو جس سے اقتصادی توازن بگڑ جائے رفاہیت بالغہ سے تعبیر کرتے ہیں اور سوسائٹی کے لیے اس کو بدترین جرم اور اس کے خلاف جنگ کو مقدس جہاد قرار دیتے ہیں ان کی تصانیف رفاہیت بالغہ کی مذمت سے بھری ہوئی ہیں۔

جہاد

تحریک شاہ ولی اللہ کے عملی پروگرام میں ’جہاد‘ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور گزشتہ صدی میں یورپ کے ارباب صحافت اور مصنفین لفظ جہاد کو اس قدر بدنام کر چکے ہیں کہ ایک سنجیدہ دماغ بھی اس لفظ سے اُس کے اسلامی تصور تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تشریحات کے ضمن میں جہاد کے متعلق بھی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے نظریہ کی وضاحت کر دی جائے۔

لفظی معنی

لغت کے لحاظ سے جہاد کے معنی میں زیادہ سے زیادہ درجہ کی کوشش۔

یہ کوشش اگر ذاتی اغراض سے علیحدہ ہو کر صرف حق کی فتح اور صداقت کی سربلندی کے لیے ہو تو اس کے مبارک اور مسعود ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

قرآن حکیم، ذاتی اغراض تو درکنار، قومی یا نسلی اغراض کا گرد و غبار بھی دامنِ جہاد پر برداشت نہیں کرتا۔ قرآن حکیم کی رو سے ہمہ گیر حق و صداقت، انسانی شرف و عظمت اور اعلیٰ اخلاق کے نام پر جو جدوجہد ہو، وہ اُسی وقت جہاد قرار دی جا سکتی ہے جب کہ نہ قومی یا نسلی اقتدار کا تصور سامنے ہو اور نہ فرقہ پرستی اور دھڑے بندی کی کوئی شکل کسی فتنہ و فساد کی تخم ریزی کر سکے۔ (۴۳)

وہ اپنی ذاتی اغراض اور اپنے نفس کی خواہش سے یہاں تک دست بردار ہو چکا ہو کہ بہادری کی نمائش، اپنے قبیلہ یا خاندان کی عزت و شہرت، سیاسی دنیا میں نام آوری یا صفحات تاریخ میں شہرت کا تصور بھی اس کے دماغ کو منتشر نہ کر سکے۔ (۴۴)

اس جدوجہد (جہاد) کے وقت ایک فریق کو شکست دے کر ختم کر دینے کا جذبہ یقیناً کارفرما ہو گا مگر یہ جذبہ

ہر قسم کی خود غرضی اور تنگ نظری سے بالکل پاک ہوگا، اور اس وقت ہوگا جب کہ اصلاح کی تمام کوششیں ختم ہو چکی ہوں اور انسانیت کے اعلیٰ مقاصد کی حفاظت کے لیے اس آپریشن کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا ہو۔ اس بنا پر اس جذبہ کو پاک جذبہ اور اس عداوت کو مقدس عداوت کہا جائے گا۔

اصطلاحی معنیٰ

شاہ ولی اللہؒ صاحب جن مختصر اور جامع الفاظ میں "جہاد" کی تعریف کر رہے ہیں وہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ شاہ صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

الجهاد شرواق العداوة القدسية في صورة القتل والامر. [الخیر الکثیر ص ۱۰۷]

ایک مقدس عداوت (جو ذاتی اغراض اور نفسانی خواہشات سے بالکل پاک صرف عمومی مفاد اور انسانیت کے اعلیٰ مقاصد اور بلند تر مصالح کے لیے ہو) قتل کرنے یا قید کر لینے کی صورت میں اس پاک عداوت کا پرشوکت ظہور "جہاد" ہے۔

عداوت اور دشمنی کے ساتھ پاک کا لفظ بہت ہی اجنبی ہے مگر جہاد کے لیے یہی اجنبی صفت لازمی شرط ہے، کیونکہ اپنی جان دینے یا دوسرے کی جان لینے کے لیے کسی بھی ذاتی غرض یا کسی بھی نفسانی خواہش کی شمہ بھر پلیدی کی آمیزش ہوگی تو یہ جہاد نہیں بلکہ جہالت، وحشت اور ظلم ہوگا۔ (معاذ اللہ)

شاہ صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ جہاد کے وقت ایک حق پرست اپنے آپ کچھ نہیں ہوگا۔ وہ جو کچھ ہوگا، مقاصد حق کا آلۂ کار ہوگا۔ حق وصداقت کا جو تقاضا ہو وہ اُس کی عین تمنا اور آخری آرزو ہوگی اور اسی کی تکمیل کے لیے وہ اپنا سب کچھ قربان کر رہا ہوگا۔ (۲۵)

شاہ صاحب کا عقیدہ ہے کہ خود غرض انسانوں کی اغراض پرستی جب اجتماعی شکل اختیار کر کے ملک کے امن وامان، باشندگانِ ملک کے اطمینان، آزاد کاروبار، خوش حالی، آزادیٔ رائے وغیرہ حقوقِ انسانیت اور حقوقِ شہریت پر ڈاکے ڈالنے لگے تو چیرہ دست، ظالم وجابر طاقت کا ختم کر دینا حق وصداقت کا تقاضا اور عدل وانصاف کا مطالبہ ہوگا۔ (۲۶) کیونکہ یہ چیرہ دست، ظالم وجابر طاقت، سارے انسانوں (نوعِ انسان) کے لیے، بالخصوص اس ملک کے نظام کے لیے جو ایک جسم کی حیثیت رکھتا ہے، سرطان جیسا مرض ہے۔ ہر ایک ہمدردِ انسانیت کا فیصلہ یہی ہوگا کہ اُس کا آپریشن کر دیا جائے۔ ورنہ سارا ملک موت کے گھاٹ اتر جائے گا۔ (۲۷) لہٰذا ایک حق پرست کا اخلاقی اور مذہبی فرض ہوگا کہ اس سرطان کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کے لیے جان کی بازی لگا دے۔

یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

اسلام کی تعلیم اور شاہ صاحب کے عقیدہ کے مطابق جہاد کا مقدس فرض پورے تقدس کے ساتھ وہی پارٹی انجام دے سکتی ہے جس کی تربیت خاص مقاصد کے لیے خاص طور پر کی گئی ہو۔ جس کا ہر ایک فرد اپنے ذاتی

اغراض ختم کرکے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنی زندگی وقف کر چکا ہو۔[۵۸]

درکفے جام شریعت درکفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام وسندان باختن

اس موقع پر یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہے کہ جہاد کی اصل قوت ضبط نفس، صبر واستقامت، ذوق فنا اور وہ جذبہ ہے جو مصیبت کو راحت اور موت کو جام خوش گوار بنادے۔

مہاتما گاندھی نے تحریک آزادی، اہنسا اور ستیہ گرہ کے اصول پر چلائی۔ ستیہ گرہ، اہنسا اور جہاد کے الفاظ میں بہت فرق ہے مگر ایک سپرٹ سب جگہ کارفرما ہے یعنی نصب العین کے لیے قربان ہو جانے کا جذبہ۔

زیادہ تحقیق سے کام لیا جائے تو یہ فیصلہ ہوگا کہ اہنسا جہاد کی ایک شکل ہے جو خاص خاص حالت میں اختیار کرنی پڑتی ہے۔[۵۹]

آزادیٔ وطن میں مہاتما گاندھی کی ستیہ گرہ اور اہنسا کو بہت دخل ہے یہاں تک کہ انقلاب ۱۹۴۷ء کو اسی تحریک کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ گاندھی جی کی قیادت کے تیس[۶۰] سالہ دور میں کتنے نوجوان اہنسا کے اصول پر پوری طرح تربیت پا سکے۔ حالانکہ نشر واشاعت کے تمام ترقی یافتہ ذرائع مہاتما گاندھی کو حاصل تھے۔ بین الاقوامی حالات بھی بڑی حد تک مددگار تھے اور عوام میں جذبۂ آزادی بھی بہت زیادہ بڑھ چکا تھا۔

ہمارا منشا یہ ہے کہ ہمیں تعجب نہ ہونا چاہیے اگر ہم شاہ ولی اللہ صاحب کے تقریباً پچاس برس تک کوئی ایسی فوج نہ دیکھ سکیں جو شاہ ولی اللہ کے اصول پر تربیت یافتہ ہو، جب کہ اُس زمانہ میں دوسروں کو مؤثر کرنے کے وہ تمام ذرائع مفقود تھے جو بیسویں صدی میں رائج ہوئے۔

تحریک کا نصب العین

انقلاب، ہمہ گیر انقلاب، سماجی زندگی کے ہر ایک شعبہ میں انقلاب

جب کہ عقائد و جذبات یہ ہوں جس کا خلاصہ پہلے صفحات میں پیش کیا گیا تو یہ تصور سراسر ظلم ہوگا کہ حضرت شاہ صاحب اور اُن کے ساتھی سلطنت مغلیہ کے اُس ڈھانچہ کو سنبھالنا چاہتے تھے جو دن بدن بے جان ہو رہا تھا۔

اصول مذکورہ بالا کی شہادت یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب اور اُن کے ساتھی سلطنت مغلیہ کے بوسیدہ تخت پر پالش کی کوشش تو کیا کرتے۔ وہ سرے سے اس ملوکانہ نظام ہی کو دامن اسلام پر بدنما داغ سمجھتے تھے جس کا دھو ڈالنا (شاہ صاحب اور اُن کے ساتھیوں کی رائے میں) ملک وملت کی سب سے بڑی خدمت تھی۔

گزشتہ ابواب میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب نے روما اور ایران کی جابرانہ شاہنشاہیوں اور اُن کے ملوکانہ نظام کی وجہ سے عوام کی اقتصادی بدحالی کی مثال میں اپنے زمانہ کے نظام حکومت کو پیش کیا تھا اور ایسے نظام کو ختم کر دینا انبیاء علیہم السلام خصوصاً محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد قرار دیا تھا۔ یہاں آپ حضرت شاہ صاحب کی تحریر کا ایک اور مختصر اقتباس اور اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمالیجیے۔

فالمدن الفاسدة التي يغلب عليها نفوس سبعية ويكون لهم تمنع شديد. انما هو بمنزلة الاكلة في بدن الانسان لا يصلح الانسان الا بقطعه والذي يتوجه الى اصلاح مزاجه واقامة طبيعته لا بدله من القطع. والشر القليل اذا كان مفضيًا الى الخير الكثير واجب فعله۔ [ص ۱۵۷ ج ۲ باب الجبابرہ۔ حجۃ اللہ البالغہ]

تباہ حال شہر جن پر درندہ صفت انسانوں کا تسلط ہو، اور ان کو اپنی حفاظت اور دفاع کی پوری طاقت حاصل ہو۔ یہ (ظالم وجابر پارٹی) جسد انسانیت کے لیے سرطان ہے کہ انسان اس وقت تک تندرست نہیں ہوسکتا جب تک اس سرطان کو کاٹ کر نہ پھینک دیا جائے۔ جو ڈاکٹر بھی اس انسان کے مزاج کو درست کرنے اور اس کی صحت بحال کرنے کی طرف توجہ کرے گا، اس کے لیے ضروری ہوگا کہ پہلے اس سرطان کا پورا آپریشن کر ڈالے تھوڑی سے برائی کو عمل میں لانا جب کہ اس کا نتیجہ خیر کثیر (اور بہت بڑی بھلائی) ہو، واجب اور ضروری ہو جاتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تحریک کے مشہور رہنما حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب شہید نے شاہ ولی اللہ صاحب کے اس اصول کی شرح اور تفسیر میں پوری ایک کتاب لکھ دی ہے۔ جس میں ''امامت'' یعنی سیاسی قیادت (پولیٹیکل لیڈرشپ) کی قسمیں اور اسلامی اصول کے مطابق اُن کے احکام بیان کیے ہیں اور اس کی وضاحت کی

ہے کہ کس قیادت کے ساتھ عام مسلمانوں کو کیا سلوک اور کس قسم کا برتاؤ کرنا چاہیے۔(۳۱)

بدترین قیادت کی دو علامتیں بیان کی ہیں جو اُس زمانہ میں سلطنت مغلیہ کے ذمہ داروں میں پائی جاتی تھیں۔ پھر اُن کے متعلق یہ فیصلہ کیا ہے:

پس دریں صورت برافراختن اعلام قتل وقتال و برانداختن آن مبتدع ضال۔ درحق ملت واہل ملت منفعتے خواہد بخشید۔ والا بعوام وخواص بے شک مضرتے خواہد رسید۔

پس ایسی صورت میں علم بغاوت بلند کرنا اور اس گمراہ کو جو مذہب کے نام پر من مانی کر رہا ہے معزول اور برخاست کردینا ملت کے لیے بھی مفید ہوگا اور اہل ملت کے لئے بھی۔ ورنہ ملک کے تمام ہی عوام وخواص کو بہت بڑا نقصان اُٹھانا پڑے گا۔ [منصب امامت ص ۹۶ مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی]

تقریباً ایک صفحہ کے بعد فرماتے ہیں:

جہاد برایشاں از ارکانِ اسلام است واہانت ایشان اعانت سید الانام۔

اُن کے مقابلہ میں جہاد کرنا اسلام کا رکن اور فرض ہے اور اُن کو ذلیل اور کمزور کرنا رسول اللہ ؐ کی امداد واعانت ہے۔ [منصب امامت ص ۹۷]

اس کے بعد صفحہ ۹۸ پر اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ استعمال کیے ہیں۔ بہرحال یہ خیال کہ سلطنت مغلیہ کی گری ہوئی دیوار کو سنبھالنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی سیاسی تحریک کا مقصد تھا۔ نہ صرف حضرت شاہ صاحب بلکہ وطن عزیز کی شاندار تاریخ پر بہت بڑا ظلم ہے۔(۳۲) بلکہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب اصلاحی اور سیاسی جدوجہد کے آغاز ہی میں جب حجاز تشریف لے گئے تو شب جمعہ ۲۱ رذیقعدہ ۱۱۴۴ھ مطابق ۲۱ے ۱ء کو مکہ معظمہ میں آپ نے ضمیر کی یہ آواز سنی کہ ملک وملت کی فلاح صرف اسی صورت میں ہے کہ دورِ حاضر کے تمام نظاموں کی دھجیاں بکھیر دی جائیں اور ایک ہمہ گیر انقلاب(۳۳) برپا کیا جائے۔ جب آپ اس مقدس سفر سے واپس ہوئے تو آپ کا نصب العین یہی تھا۔(۳۴)

فک کل نظام

یعنی سیاسی اور سماجی زندگی کے ہر ایک شعبہ میں انقلاب

پروگرام

ممکن تھا کہ اُس زمانہ کے جنگجو سرداروں کی طرح آپ بھی تلوار ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو جاتے اور فوج بھرتی کر کے کسی شہر پر قبضہ کر لیتے، یا کسی جنگجو حکمران کے ساتھ ہو کر اس کی فوج کو تقویت دے دیتے۔ مگر اس طرح وہ ''ہمہ گیر انقلاب'' جو پارٹی کا نصب العین تھا، پورا نہ ہوتا۔ بلکہ آپ بھی کسی حکمران کا ضمیمہ بن جاتے نصب العین کی تکمیل اُسی وقت ہو سکتی تھی جب رائے عامہ آپ کے اصلاحی نظریات کو اپنا لیتی، اُس کے لیے جنگ و جہاد سے پہلے تعلیم و تربیت کی ضرورت تھی۔ لہٰذا پارٹی کا پہلا پروگرام یہی قرار دیا گیا، اور اُس کے لیے ملک میں چند مرکز قائم کیے گئے۔

جماعت (پارٹی) اور اُس کے زعماء

نمایاں ارکان

تاریخ کی بہت بڑی کوتاہی ہے کہ اس پارٹی کے تمام ارکان کی فہرست محفوظ نہیں رکھ سکی۔ البتہ آپ کی تصانیف نے چند ساتھیوں کے نام بتائے ہیں، جن کی تحریک و تاکید اور جن کے مشورہ پر یہ کتابیں تصنیف کی گئیں۔ اُن کا مختصر تعارف یہ ہے:

(۱) **مولانا محمد عاشق صاحب**: یہ قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر کے رہنے والے شاہ صاحب کے ماموں زاد بھائی تھے۔ ابتداء سے شاہ صاحب کے شریک اور ساتھی رہے۔ سفرِ حجاز میں بھی آپ کے ساتھ تھے جہاں ''مکمل اور ہمہ گیر انقلاب'' کا نصب العین طے ہوا تھا۔ خود شاہ صاحب کا اعتراف ہے کہ:

''یہ میرے راز داں ہیں۔ میری تصانیف کی لائبریری ہیں۔ ان ہی کے اصرار پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان ہی کے ذریعہ میرے بعد میرے اصول کی اشاعت ہوگی۔'' (۴۵)

چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی وفات کے بعد اُن کے حلقہ کے ارکان بالخصوص شاہ صاحب کے فرزند جانشین (حضرت شاہ عبدالعزیزؒ) کی تربیت آپ ہی نے کی۔

(۲) **مولانا نوراللہ صاحب**: ساکن بڈھانہ (ضلع میرٹھ) حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے شاگرد

ہیں۔ آپ ہی کی فرمائش پر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی مشہور تصنیف ''تفہیمات الٰہیہ'' مرتب ہوئی۔

مولانا نور اللہ صاحب، حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کے اُستاذ بھی ہیں اور خسر بھی ہیں۔ مولانا نور اللہ صاحب کے صاحبزادے مولانا ہبۃ اللہ اور پوتے مولانا عبد الحی صاحب ہیں۔

مولانا عبد الحی صاحب نے تحریک میں نمایاں اور غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ آپ کی وفات شمالی مغربی سرحد کے علاقہ میں ہوئی۔ جب آپ حضرت سید احمد شہید کے ساتھ میدانِ جہاد میں تھے۔ (تفصیل آگے آئے گی۔ انشاء اللہ)

(۳) **مولانا محمد امین صاحب کشمیری**: شاہ صاحب کے مخلص رفیق ہیں۔ شاہ صاحب کے بعد شاہ صاحب کے حلقہ (پارٹی) کی تربیت میں مشغول رہے۔

(۴) **حضرت شاہ ابو سعید صاحب**: ساکن رائے بریلی۔ آپ رائے بریلی کے مشہور بزرگ شاہ علم اللہ صاحب کے پوتے تھے۔ آپ ہی کے نواسے حضرت سید احمد صاحب شہید تھے، جنہوں نے انگریزی اقتدار کے خلاف رائے عامہ کی تنظیم کی۔ پھر شمالی مغربی سرحد میں علم جہاد بلند کیا۔ جس کا ذکر آگے آئے گا۔ سلطان ٹیپو کا خاندان آپ سے اور آپ کے صاحبزادے شاہ ابو اللیث سے بیعت تھا۔ (سیرت سید احمد شہیدؒ)

(۵) **حضرت شاہ عبد العزیز صاحب**: شاہ ولی اللہ صاحب کے صاحبزادے، جن کا مفصل تذکرہ آگے آئے گا۔

(۶) **مولانا مخدوم صاحب لکھنوی**: شاہ صاحب کے مخصوص شاگرد۔

پارٹی کے مرکز

(۱) علمی اور عملی تربیت کا سب سے بڑا مرکز دہلی [۳۶] تھا۔ جس کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے بعد آپ کے فرزند جانشین (مولانا شاہ عبد العزیز صاحبؒ) نے زندہ رکھا، اور اُس کو چار چاند لگائے۔ اس کا مفصل ذکر آگے آئے گا۔

(۲) دوسرا مرکز رائے بریلی کا وہ مشہور دائرہ تھا جو ''تکیہ شاہ علم اللہ'' [۳۷] کے نام سے مشہور تھا۔ جو اودھ کے علاقہ میں تقریباً نصف صدی پہلے سے تعلیم و تربیت کا سرچشمہ بنا ہوا تھا۔ یہی مرکز ہے جس سے سلطان ٹیپو کا روحانی تعلق تھا۔

انگریزی اقتدار کے خلاف جب دہلی کے مرکز سے جہادِ حریت کا فتویٰ صادر ہوا تو رائے بریلی کے اسی مرکز سے انقلاب کی وہ مشہور تحریک [۳۸] اٹھی، جس کو ''وہابی تحریک'' کے نام سے بدنام کیا گیا۔

اس مرکز میں کام کرنے والے نسبی لحاظ سے حضرت شاہ علم اللہ صاحب سے وابستہ تھے۔ لیکن علمی اور عملی لحاظ سے وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تربیت گاہ سے فیض پائے ہوئے تھے۔

حضرت شاہ محمد واضح، حضرت شاہ ابو سعید، حضرت سید محمد معین اور حضرت سید محمد لقمان نے (جو حضرت شاہ علم اللہ صاحب کے پوتے اور پرپوتے تھے) حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور مولانا سید قطب الہدیٰ، مولانا سید محمد اسحاق اور حضرت سید احمد صاحب نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے استفادہ کیا۔ (۳۹)

ان کے علاوہ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی نے دو مرکزوں کا اور پتہ دیا ہے۔ مدرسہ نجیب آباد، (۴۰) اور مدرسہ ملا محمد معین، ٹھٹھہ سندھ۔ ہم ایک اور مرکز کا اضافہ ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ اودھ کا دارالحکومت لکھنو تھا جہاں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے شاگرد رشید مولانا مخدوم لکھنوی (۴۱) نے تقریباً نصف صدی تک چشمہ فیض جاری رکھا۔

پھر مرزا حسن علی صغیر محدث اور مولانا حسین احمد ملیح آبادی جیسے فاضل نوجوان نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ العزیز کے حلقۂ درس سے فیض یاب ہو کر لکھنو میں عرصہ تک اس شمع کو روشن رکھا۔ (۴۲)

مشکلاتِ راہ

اٹھارھویں صدی عیسوی کے ہندوستان میں فک کل نظام یعنی مکمل اور ہمہ گیر انقلاب کا نصب العین ایک چراغ تھا جو شاہنشاہیت، شاہ پرستی اور اجارہ داری کی طوفان انگیز آندھیوں میں روشن کیا گیا تھا۔

مغل شاہنشاہ کی فوجی طاقت اگرچہ کمزور ہو گئی تھی مگر دو سو سالہ مغل شاہنشاہیت کی عظیم الشان تاریخ نے مغل بادشاہ کی تعظیم و تکریم کو مذہبی عقیدہ کی حیثیت دے دی تھی۔ یہی سبب تھا کہ وہ فتنہ پرور گستاخ طاقتیں جو مغل بادشاہ کو قتل کر دیتی تھیں، مجبور تھیں کہ اکبر اور عالمگیر کی اولاد ہی میں سے کسی کو معزول یا مقتول بادشاہ کا جانشین بنائیں۔

مغل بادشاہ ہی کو ملک کا حقیقی مالک سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ صوبوں کے گورنر باوجودیکہ خود سر اور خود مختار ہو گئے تھے، مگر اپنی حکومت کے جواز کے لیے بادشاہ کی سند ضروری سمجھتے تھے۔ برہان الملک نواب سعادت علی خان نے مغل بادشاہ کی وزارت کا لیبل لگا کر اودھ میں اپنی بادشاہت قائم کی، اور نظام الملک آصف جاہ نے امیر الامرائی کا ماٹو لے کر دکن میں اپنے استقلال کا جھنڈا لہرایا۔ اور مرہٹوں کی بغاوت کا بھی بڑا منشا یہی تھا کہ کوئی ایسا ہی طغرہ ان کے ہاتھ لگ جائے۔ چنانچہ جب باجی راؤ پیشواز اور مادھوجی سندھیا کو امیر الامرائی کا منصب مل گیا تو مسکتی ہوئی مغل شاہنشاہیت بھی اُن کے نزدیک تعظیم و تکریم اور حفاظت کی مستحق ہو گئی۔

انتہا یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے تسلط کے جواز کے لیے سند دیوانی ضروری سمجھی، اور دہلی فتح کرنے کے بعد بھی نصف صدی سے زائد تک تختِ دہلی پر مغل بادشاہ کا گڈا بٹھائے رکھا۔

علاوہ ازیں مکمل اور ہمہ گیر انقلاب کا نعرہ صرف بادشاہ اور شاہ پرستوں کے لیے پیغام فنا نہیں تھا۔ بلکہ اُن تمام طاقتوں کے لیے بھی پیغام موت تھا، جو سلطنت مغلیہ کا جانشین بننا چاہتی تھیں، یا پیشہ ور سپاہیوں کی مدد سے ملک کے چپہ چپہ پر جاگیردارانہ نظام کا جھنڈا گاڑے ہوئے تھیں۔

بادشاہ نوابوں اور اُمراء کے علاوہ حضرت شاہ صاحب نے علماء، مشائخ اور شعراء پر بھی سخت تنقید کی تھی۔ آپ کے تنقیدی مضامین ''تفہیمات الٰہیہ'' میں آج بھی چھپے ہوئے موجود ہیں۔ ہر ایک مضمون تیر و نشتر کا اثر رکھتا ہے۔ پبلک انہیں علماء، مشائخ یا شعراء کی حلقہ بگوش تھی۔ لہٰذا عوام اور برسر اقتدار طبقے سب ہی اس نصب العین کے مخالف تھے۔ ان شدید مخالفتوں کی آندھیوں میں شاہ ولی اللہ صاحب نے ہمہ گیر انقلاب کا چراغ روشن کیا۔

نشر و اشاعت کی مشکلات' پریس کی طاقت سے محرومی

مارکس، اینگلس اور لینن کی خوش نصیبی تھی کہ اُن کو پریس کی طاقت میسر آ گئی اور انہوں نے تھوڑے عرصہ میں لاکھوں کروڑوں انسانوں تک اپنے خیالات پہنچا دیئے۔ مگر شاہ صاحب کا انقلابی فکر، اعلیٰ درجہ کی انشا پردازی اور سحر آفریں قوت تحریر کے باوجود پریس کی طاقت سے محروم تھا۔ انشا اور صحافت کی جس طاقت سے آپ پریس کے ذریعہ پورے ہندوستان کو متاثر کر سکتے تھے وہ صرف اُن قلمی کتابوں میں محدود ہو کر رہ گئی جن کی اشاعت تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد ہو سکی۔ اس وقت نشر و اشاعت کا ذریعہ تقریریں تھیں یا تعلیم و تربیت کے وہ حلقے جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔

انقلابی منشور (مینی فسٹو)

طوائف الملوکی اور رات دن کے قیامت خیز ہنگامے، جن میں مرہٹوں کی دہلی پر یلغار[۴۳]، نادر شاہ کا قتل عام،[۴۴] دہلی کی بے پناہ لوٹ،[۴۵] احمد شاہ ابدالی کی جنگِ پانی پت[۴۶] بھی شامل ہے۔ ان ہلاکت بار طوفانوں نے اس کا موقع نہ دیا کہ حضرت شاہ صاحب انقلابی منشور (مینی فسٹو) کو یکجا مدون اور مرتب کر سکیں۔

آپ نے انقلابی نظریات کو کبھی ترجمہ قرآن شریف کے رنگ میں پیش کیا۔ کبھی تصوف اور اسلامی فلسفہ[۴۷] کے دامن میں چھپایا۔ کہیں نصیحت[۴۸] و موعظت کے پیرایہ میں ادا کیا، اور کہیں اس کو تاریخ اسلام[۴۹] اور خصائل صحابہؓ کا جامہ پہنایا۔

شاہ پرستوں کا عتاب

اس احتیاط کے باوجود آپ اور آپ کے جانشین قاتلانہ حملوں اور وحشیانہ سزاؤں سے نجات نہ پا سکے۔ چنانچہ جب آپ نے قرآن پاک کا فارسی ترجمہ مرتب کیا جو اصلاحی انقلاب کی طرف پہلا قدم تھا تو آپ پر قاتلانہ حملہ کرایا گیا۔ جس سے آپ معجزانہ طور پر محفوظ رہ سکے۔[۵۰]

غیر مسلموں کا اشتراک

مذکورہ بالا اصول میں ہندو اور مسلمان کی تفریق نہیں تھی اور بقول مولانا عبید اللہ سندھیؒ، ہندو نوجوانوں میں بھگوت گیتا کی تعلیم سے انہیں اصول کے مطابق انقلابی سپرٹ پیدا کی جاسکتی تھی۔ مگر اُس زمانہ کی سیاست کے لحاظ سے انقلاب کا مختصر راستہ یہی تھا کہ مسلمان نوجوانوں میں جو حضرت شاہ صاحب سے زیادہ قریب تھے، صحیح احساس اور قوت عمل پیدا کردی جائے۔ کیونکہ:

الف: پورے شمالی ہند اور جنوبی ہند کے زیادہ حصہ میں برسر اقتدار طبقہ مسلمان تھا یہ فن سپہ گری کے ماہر اور فوجی قوت کے مالک تھے۔

ب: شمالی ہند اور وسط ہند کی راجپوت ریاستیں مسلمانوں کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کیے ہوئے تھیں۔ اُن کے راجہ سلطنت مغلیہ کے منصب دار اور دربار کے ایرانی یا تورانی گروپ میں شامل تھے۔ چنانچہ اس نازک دور میں اس علاقہ کی کسی ایک ہندو ریاست نے بھی سلطنت مغلیہ کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو گل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس دور کی مرہٹی طاقتوں کے متعلق بھی یہ فیصلہ مشکل ہے کہ وہ مغل بادشاہ کو ختم کرنے کے درپے تھیں۔ یا مغل دربار میں اپنا اقتدار تسلیم کرانا چاہتی تھیں۔ پھر ۱۸۵۷ء میں تو مرہٹوں کی باقی ماندہ طاقت نے یہ تسلیم کرہی لیا کہ انقلاب کا راستہ صرف یہی ہے کہ سلطنت مغلیہ کے کسی وارث کو وارث تخت وتاج تسلیم کرلیا جائے اور اس گدی کو دوبارہ آباد کیا جائے لہٰذا اخلاق اور مذہب دونوں کا تقاضا تھا کہ انقلاب کے لیے سب سے پہلے اس کی تربیت کی جائے جس کے اقتدار اعلیٰ پر سارا ملک اعتماد کیے ہوئے تھا۔ اور جس کی گردن پر تمام وفاداروں کی ترقی اور فلاح و بہبود کی ذمہ داری کا بوجھ لدا ہوا تھا۔

ج: ایشیا میں بین الاقوامی اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ لہٰذا مسلم نوجوانوں (۵۱) کی اصلاح پورے ایشیا کی اصلاح ہوسکتی تھی۔ جو یورپ کے اُمنڈتے ہوئے سیلاب کو روک سکتی تھی۔

بہرحال یہی وجوہات ہیں کہ جو پارٹی اس عرصہ میں تربیت یافتہ ہوئی اس میں صرف مسلمانوں کے نام سامنے آتے ہیں۔

ملکی طاقت کا انحطاط

شاہ ولی اللہ صاحب جب پیدا ہوئے، ہندوستان کی طاقت عروج کے آخری نقطہ پر تھی۔ قندھار سے آسام اور مدراس تک پورا ہندوستان ایک مرکز کے ماتحت متحد تھا۔

تذکرہ شاہ ولی اللہ صاحب کا یہ آخری باب ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اُس انحطاط کا تذکرہ کر دیا جائے جو شاہ ولی اللہ صاحب کی وفات ۱۱۷۶ھ مطابق ۱۷۶۳ء تک ہندوستان کی طاقت میں آچکا تھا۔

۱۷۳۷ء، ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ کا مشہور حملہ ہوا جس نے ۲ رذی الحجہ ۱۱۵۱ھ، مارچ (۵۲) ۱۷۳۷ء دہلی میں قتل عام کر کے ہندوستان کی شہ رگ کا خون چوس لیا۔

اس قتل عام میں مرنے والوں کا اندازہ آٹھ ہزار سے ڈیڑھ لاکھ تک کیا گیا ہے۔ (۵۳) بائیس کروڑ روپیہ نقد خزانۂ شاہی سے اور تقریباً نوے کروڑ کے جواہرات اور تخت طاؤس وغیرہ قلعہ سے لوٹے گئے۔ (۵۴) اور جو دولت شہر سے لوٹی گئی اس کی تعداد بھی ستر کروڑ تک بتائی گئی ہے۔ اس مالی بربادی اور تباہی کے علاوہ سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ملکی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔ شمال مغرب میں دریائے سندھ تک کا پورا علاقہ اور پنجاب کے چند محال کا دہلی کے بجائے ایران کے ساتھ باقاعدہ الحاق کر دیا گیا۔ (۵۵) دریائے سندھ سے دہلی تک اگرچہ محمد شاہ کی حکومت رہی مگر اس افراتفری میں مرکزی حکومت کا وقار کم از کم اس علاقہ میں ختم ہو گیا۔ لہٰذا یہ اقتدار بھی بے وقار رہا۔ مشرق میں علی وردی خاں مہابت جنگ نے موقع غنیمت دیکھ کر مستقل حیثیت اختیار کر لی اور اس طرح بنگال، بہار اور اڑیسہ مرکز سے علیحدہ ہو گئے۔ (۵۶)

حملۂ نادری سے دس سال بعد ۱۱۶۱ھ، ۱۷۴۷ء سے احمد شاہ ابدالی کے حملے شروع ہوئے۔ پہلے حملہ میں بادشاہ دہلی نے صوبہ پنجاب و ملتان دے کر جان چھڑائی۔ (۵۷) دوسرے حملہ میں ابدالی ایرانی فوجوں سمیت دہلی پہنچا اور دہلی کو دو ماہ تک اس طرح لوٹا کہ نادر گردی بھی مات ہو گئی۔ (۵۸) حملہ نادر شاہ سے بیس سال بعد ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی مشہور لڑائی ہوئی جس میں علی وردی خاں کے نواسہ سراج الدولہ کا خاتمہ ہوا۔ علی وردی خاں کے غصب کردہ علاقہ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا جھنڈا لہرانے لگا اور اس طرح ایک رقیب و حریف طاقت کے قدم ہندوستان میں جم گئے۔

جنگ پلاسی سے ساڑھے چار سال بعد ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی کا ہندوستان پر تیسرا حملہ ہوا اور ۱۴ رجنوری ۱۷۶۱ء، ۲ رجمادی الآخر ۱۱۷۴ھ کو پانی پت کا مشہور معرکہ ہوا جس میں مرہٹہ طاقت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ ہاں روہیل کھنڈ میں حافظ رحمت خاں کی حکومت اور جنوبی ہند میں آصف جاہ کی سلطنت مستقل مملکتیں بن گئیں۔

بہر حال شاہ صاحب کی وفات کے وقت ملک کی وحدت پارہ پارہ اور ملکی طاقت کو بہت کافی نقصان پہنچ چکا تھا۔ مگر عوام کا ایک عقیدہ، ایک قسم کی وحدت کا تصور اب تک باقی رکھے ہوئے تھا۔ یعنی عقیدہ یہ تھا کہ ملک کا حقیقی اور جائز مالک مغل بادشاہ ہے۔ عوام کے اسی عقیدہ کا اثر یہ تھا کہ خود مختار صوبے بھی مجبور تھے کہ مغل بادشاہ کو کم از کم مربی، سرپرست اور مرشد کی حیثیت میں تسلیم کریں۔ بغاوت کرنے والوں کی بھی آخری کوشش یہ ہوتی تھی کہ مغل بادشاہ سے اپنے مقبوضہ علاقہ کے لیے سند جواز حاصل کر لیں۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ

سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی وفات (۵۹) کے بعد اُن کے بڑے فرزند شاہ عبدالعزیز صاحب (۶۰)

کو ان کا جانشین تسلیم کیا گیا۔ ہمیں سلسلۂ جانشینی سے دلچسپی نہیں لیکن اس جانشین نے جو خدمات انجام دیں وہ یقیناً تاریخ کی گراں قدر یادگار ہیں۔ (۴۱) تعلیم و تربیت اور نشر و اشاعت کا سلسلہ اس قابل و فاضل جانشین کے دور میں یہاں تک ترقی کر گیا کہ پورے ہندوستان میں کوئی علمی حلقہ ایسا نہیں رہا جس کا تعلق اس علمی مرکز سے نہ ہو۔

''فک کل نظام'' ہمہ گیر انقلاب کا تصور جو شاہ ولی اللہ صاحب کی وفات تک چند دماغوں کی مخصوص امانت تھی، شاہ عبدالعزیز صاحب کی وفات کے وقت ملک کا عام جذبہ بن چکا تھا۔ ہزاروں نوجوان اس کے لیے زندگیاں وقف کر چکے تھے۔ اور اس کی صدائے بازگشت ہندوستان سے گزر کر ایشیا کے دور دراز ملکوں تک پہنچ چکی تھی۔

مقاصد تربیت

اس تربیت گاہ سے فیض پانے والوں کے حالات فارسی اور اردو کی بہت سی کتابوں (۴۲) میں درج ہیں۔ مثال کے طور پر چند بزرگوں کے حالات اس باب کے آخر میں پیش بھی کیے جائیں گے۔ ان حالات و سوانح کی شہادت یہ ہے کہ تربیت کے مقاصد یہ تھے۔

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے نظریات کو ذہن نشین کرانا۔

(۲) خدا پرستی، خوف خدا اور پاک بازی کا سچا جذبہ پیدا کرنا۔

(۳) ملوکیت اور شاہ پرستی کے جراثیم کو دماغوں سے نکالنا۔

(۴) جذبہ فدائیت، یعنی نصب العین کے لیے قربان ہونے کا شوق پیدا کرنا۔

(۵) خدمت خلق، بالخصوص نوع انسان کی ہمدردی اور غم خواری اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچانے کا عادی بنانا۔

(۶) شاہانہ تکلفات ختم کرنا اور سادہ زندگی کا عادی بنانا۔

(۷) فوجی سپرٹ پیدا کرنا۔ جفاکشی محنت اور ہر قسم کے حالات برداشت کرنے کا عادی بنانا۔

(۸) ایسی رسومات کو بند کرانا جو سوسائٹی کو پستی کی طرف لے جا رہی تھیں۔

(۹) عیاشی کے اڈے ختم کرنا، اور ایسے تمام جراثیم کی اصلاح کرنا جو سوسائٹی کو عیش پرست، آرام طلب اور پست ہمت بنا رہے تھے۔

تربیت کے طریقے

تین تھے۔ (۱) درس و تدریس۔ (۴۳) جس کا حلقہ اتنا وسیع ہوا کہ پورے ہندوستان میں ایک عالم بھی ایسا نہیں رہا جس کا تعلق براہ راست یا بالواسطہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے نہ ہو۔ (۴۴)

(۲) روحانی تربیت: جس کے لیے صوفیا کے طریقے اختیار کیے جاتے تھے، اور اس کا سب سے زیادہ ضروری اور نمایاں پہلو یہ تھا کہ جو کچھ بتایا جاتا ہے، عملی طور پر اُس کا عادی بنایا جائے۔ خود غرضی، نفس پرستی، اقتدار پسندی جیسی صفات سے دل پاک کیا جائے۔ صبر وضبط، جفاکشی، محنت وشفقت اور ہر ایک مادی غرض سے بالا ہو کر مخلوق خدا کی خدمت اور اُس کے لیے ہر قسم کی قربانی کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ (۶۵)

(۳) پبلک جلسوں اور عام اجتماعات میں تقریریں: چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا مقررہ پروگرام تھا کہ ہفتہ میں دو مرتبہ عام اجتماع میں تقریر ضرور کیا کرتے تھے۔ دہلی اور بیرونِ دہلی کے ہزاروں آدمی ان اجتماعات میں شریک ہوتے۔ پروگرام کی پابندی یہاں تک تھی کہ مرض الموت میں بھی جب تک بولنے کی طاقت رہی اس تقریر کے پروگرام پر عمل ہوتا رہا۔ (۶۶)

تربیت یافتہ علماء

جو علماء حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی تربیت گاہ سے تربیت پاکر ہندوستان کے آفتاب و ماہتاب بنے اُن کی فہرست بہت طویل ہے چند نام یہاں (۶۷) ذکر کیے جاتے ہیں۔ (ان بزرگوں کے مفصل حالاتِ زندگی ایک مستقل جلد میں پیش کیے جائیں گے۔ (انشاء اللہ العزیز)

(۱) مولانا شاہ رفیع الدین صاحب (۲) مولانا شاہ عبدالقادر صاحب

(۳) مولانا شاہ عبدالغنی صاحب

یہ تینوں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے ان کی تربیت کی مگر یہ تینوں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی زندگی میں ہی وفات پاگئے۔

(۴) مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب، خلف جناب شیخ محمد افضل صاحب (حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے نواسے)۔

(۵) مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب۔

(۶) مولانا شاہ عبدالحی صاحب (حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے داماد)

(۷) مولانا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب۔ خلف حضرت شاہ عبدالغنی صاحب، برادر خورد حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب۔

(۸) حضرت سید احمد صاحب شہید۔ تذکرہ آگے آئے گا۔

(۹) مولانا رشید الدین صاحب دہلوی۔

(۱۰) مولانا مفتی صدرالدین صاحب دہلوی۔

(۱۱) مولانا مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی۔

(۱۲) حضرت شاہ غلام علی صاحب دہلوی

(۱۳) مولانا مخصوص اللہ صاحب (خلف مولانا رفیع الدین صاحب)

(۱۴) مولانا کریم اللہ صاحب دہلوی، خلف مولانا لطف اللہ صاحب فاروقی۔

(۱۵) مولانا میر محبوب علی صاحب دہلوی

(۱۶) مولانا عبدالخالق صاحب دہلوی

(۱۷) مولانا حسن علی صاحب لکھنوی

(۱۸) مولانا حسین احمد صاحب ملیح آبادی

کارپردازانِ حکومت کا سُلوک

مغل بادشاہ عموماً اس خاندان کا احترام کرتے رہے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ بادشاہ خود اپنے اختیار میں نہیں تھے اور جو کارپرداز بااختیار تھے اُن میں عموماً وہ تھے (۶۸) جن کو یہ اصلاحات پسند نہیں تھیں۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب اور آپ کے ساتھیوں کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ مثلاً

غنڈہ گردی

حضرت شاہ صاحب کا خود اپنا بیان ہے:

"جب میں پرانے شہر میں تھا تو خود اپنوں کے ہاتھوں مجھے بہت تکلیف پہنچائی جاتی۔ آبرو باختہ آوارہ گردوں کو اُکسا دیا جاتا تھا۔ وہ میرے مکان کے قریب چھت پر تعزیہ رکھ دیتے تھے اور تبرا وغیرہ کی ایذا رساں حرکتوں سے ناطقہ بند کر دیتے تھے۔ رمضان شریف میں مسجد میں تراویح ہو رہی تھی۔ ایک بازاری عورت کو شراب پلا کر وہاں پہنچا دیا گیا...... وہ حافظ شیرازی کا ایک (۶۹) شعر پڑھ رہی تھی اور غنڈوں کا ہجوم ڈھول بجا رہا تھا اور طرح طرح کے آوازے کس رہا تھا" (۷۰)

ان غنڈوں کا اگر جواب دیا جاتا تو بلوہ کی نوبت آتی، جو مقاصد تحریک کے لیے خطرناک تھا۔

ضبطی جائداد

غنڈہ گردی سے کامیابی نہ ہوئی تو حضرت شاہ صاحب کا مکان ضبط کر لیا گیا اور اُن کو دہلی سے نکال دیا گیا۔ حضرت شاہ فخر الدین صاحب نے اس وقت خاص طور پر امداد فرمائی اور آپ کے قیام کا انتظام کیا اور پھر اپنے تعلقات کو کام میں لا کر بادشاہ کے ذریعہ حویلی واپس دلوائی۔ (۷۱)

شہر بدر

یہ قصہ رفع دفع ہوا، تو کوئی نیا قضیہ کھڑا کیا گیا، اور آپ کو مع اہل و عیال شہر بدر کر دیا گیا۔ اس مرتبہ حضرت شاہ فخر الدین صاحب کے تعلقات بھی کام نہ آ سکے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب اور آپ کے بھائیوں کو شاہدرہ تک مع متعلقین پیدل جانا پڑا۔ شاہدرہ سے حضرت شاہ فخر الدین صاحب نے متعلقین کے لیے سواری کا انتظام کرا دیا۔ (۷۲) بسا اوقات وزراء اور اُمراء کی بدسلوکی کی داد رسی ریذیڈنٹ کر دیا کرتے تھے۔ مگر بدقسمتی سے ریذیڈنٹ خود شاہ صاحب کے مخالف تھا۔ (۷۳)

قتل کرنے کی سازش

صرف اسی پر قناعت نہیں کی گئی بلکہ دو مرتبہ آپ کو زہر بھی دیا گیا۔ خدا کے فضل و کرم سے زہر نا کام رہا۔ مگر جسمانی صحت پر اس کا برا اثر پڑا۔ یہ بھی روایت ہے کہ آپ کے بدن پر چھپکلی کا اُبٹن مل دیا گیا تھا جس سے برص ہو گیا تھا۔ (۷۴)

بہر حال ان تمام سزاؤں کے نتیجہ میں:

(۱) بینائی جاتی رہی۔ (۲) برص ہو گیا۔

(۳) خون میں حدت ہو گئی۔ (۴) مختلف امراض پیدا ہو گئے۔

سیاسی بحران اور متحارب طاقتیں

انگریزوں کے خلاف مغل بادشاہ کی دفاعی جدوجہد اور ناکامی

☆

یہ شاہ صاحب کی عالمانہ اور درویشانہ زندگی کی ایک جھلک تھی اب آیئے! اس دور کے سیاسی بحران پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے، تاکہ اُن صبر آزما حالات کا اندازہ ہو سکے، جن کے طوفانوں میں گھر کر شاہ صاحب نے سیاسی اور قومی خدمات انجام دیں۔

☆

پلاسی کے میدانِ جنگ (رمضان ۱۱۷۱ھ، مئی ۱۷۵۷ء) کے بعد سراج الدولہ کے خون سے حکومت بنگال کا پٹہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام ایسے وقت لکھا گیا کہ مغل شہنشاہیت کا تخت جاٹوں، (۷۵) مرہٹوں، (۷۶) سکھوں، (۷۷) اور احمد شاہ ابدالی (۷۸) کے بھنور میں پھنسا ہوا تھا۔ ان طوفانی حملوں کے علاوہ خود ارکانِ دولت، (۷۹) وزراء اور اُمراء کی باہمی رقابت کا سرطان سلطنت مغلیہ کی ریڑھ کی ہڈی کو گھلا رہا تھا۔ یہی سرطان

تھا جو محرم ۱۱۷۲ھ مطابق ستمبر ۱۷۵۹ء میں بادشاہ عالمگیر دوم کے قتل کی صورت میں نمودار (۸۰) ہوا۔ جس نے ابدالی کو ایک فیصلہ کن حملے پر مجبور کیا، اور مرہٹوں کی عظیم الشان طاقت کو اس کی بھینٹ چڑھنا پڑا۔

ان تمام حوادث اور طوفانوں کے باوجود مغل بادشاہ اُس فرض سے غافل نہیں رہا جو جنگ پلاسی کے بعد تاج دارِ ہند کی حیثیت سے اُس پر عائد ہوا تھا۔ مگر بدقسمتی یہ تھی کہ یہی سرطان جو جسم سلطنت کے ایک ایک عضو کو معطل کر رہا تھا، اول اس فرض کی ادائیگی میں رکاوٹیں پیدا کرتا رہا۔ پھر یہی مرض دفاعی جدوجہد کی ناکامی کا سبب بنا۔

تاریخ کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ مرہٹوں کے سیلاب کو (۸۱) دہلی تک پہنچانے والا نظام الملک آصف (۸۲) جاہ اول تھا جب کہ بنگال و بہار میں ہندوستانیوں کی حکومت ختم ہو کر انگیزی اقتدار بڑھ رہا تھا۔ جس ذات گرامی نے یہ کھیل کھیلا کر مرہٹوں کو توابانِ اودھ (۸۳) اور فرمان روایانِ (۸۴) روہیل کھنڈ پر حملہ آور کر کے اور پھر پنجاب (۸۵) کا راستہ بتا کر ابدالی کے مقابلہ میں کھڑا کیا۔ وہ انہیں نظام الملک آصف جاہ کے سب سے بڑے فرزند عماد الملک غازی الدین (۸۶) خاں تھے۔

اور موقع شناسی کی داد دیجیے کہ قیامت خیز معرکہ پانی پت (۸۷) کے وقت سیاسی دین کے یہ مفاد پرست غازی، بقول شمس (۸۸) العلماء ذکاء اللہ خاں مرحوم:

> ”خود اپنی جان بچا کر اپنے دوست مہاراجہ بھرت پور (سورج مل جاٹ) کے قلعہ میں پناہ گزین ہو گئے۔“

بہرحال واقعات کی ترتیب یہ ہے کہ جنگ پلاسی سے تقریباً چھ ماہ پہلے جمادی الاولیٰ ۱۱۷۰ھ (دسمبر ۱۷۵۶ء، جنوری ۱۷۵۷ء) میں جب احمد شاہ ابدالی پانچویں حملہ سے کامیاب واپس ہو رہا تھا، اُس نے نجیب خاں روہیلہ کو امیر الامراء کا منصب اور نجیب الدولہ کا خطاب عطا کر کے حکومت کی ذمہ داری اس کے سپرد کی۔ یعنی مغل سلطنت کو روہیلہ پٹھانوں کی نگرانی میں دے دیا۔

ابدالی کا یہ اقدام بہت مناسب تھا کہ اُس نے سلطنت ہند کی نگرانی ایک ترقی پذیر طاقت کے حوالے کی۔ مگر بدقسمتی یہ تھی کہ یہ ترقی پذیر طاقت سیاسی گٹھ جوڑ میں تنہا تھی نہ مرہٹوں اور جاٹوں سے اُس کا رابطہ تھا، نہ انگریزوں سے دید شنید تھی اور اس تنہائی کے باوجود اندرونی رقابتوں (۸۹) میں مبتلا تھی۔ چنانچہ ایک سال ہی گزرا تھا کہ غازی الدین خاں نے اپنے سیاسی گٹھ جوڑ سے نجیب الدولہ کو دہلی سے نکال باہر کیا۔ اُس نے بنگش خاندان کو جو روہیلوں کی طاقت کا ایک مضبوط رکن تھا، اپنے ساتھ ملایا اور نجیب الدولہ کو شکست دے دی۔

شمس العلماء ذکاء اللہ خان صاحب کا بیان ملاحظہ فرمایئے:

> ”دلی سے جس وقت احمد شاہ ابدالی روانہ ہوا تو غازی الدین خاں فرخ آباد میں تھا۔ اُس نے نجیب الدولہ کی مخالفت کے سبب سے احمد خاں بنگش (والیٔ فرخ آباد) کو امیر الامراء مقرر کیا اور شاہجہاں آباد (دہلی) کی طرف چلا۔ مگر وہ یہ جانتا تھا کہ نجیب الدولہ کو معطل بٹھانا بچوں کا کھیل کا کام نہیں ہے۔

آج کل مرہٹوں کے اقبال کا ستارہ چمک رہا تھا۔ اس لیے اس نے رگھوناتھ راؤ اور ملہار راؤ کو دکن سے بلایا اور شاہجہاں آباد کا محاصرہ کیا۔ عالمگیر ثانی اور نجیب الدولہ محصور ہو گئے ستائیس روز تک لڑائی توپ گولہ سے ہوتی رہی۔ آخر ''بلکر'' کو بادشاہ نے بہت کی رشوت دی۔ جب محاصرہ سے نجات ہوئی۔

عماد الملک (غازی الدین خاں) نے نہایت آسانی سے نجیب الدولہ کو شہر سے نکال دیا۔ وہ اپنی جاگیر میں (سہارن پور، چاند پور، تدینہ، موجودہ بجنور) چلا گیا۔ اور اس نے باقی افسروں کو بھی جو بادشاہ کے طرف دار تھے نظر بند رکھا۔ (۹۰)

مختصر یہ ہے کہ جنگ پلاسی کے وقت مئی ۱۷۵۷ء (رمضان وشوال ۱۱۷۱ھ) میں سلطنت مغلیہ کی اصلی ذمہ داری نجیب الدولہ کے سپرد تھی۔ نجیب الدولہ صرف اقتدار ہی کا شوقین نہیں تھا بلکہ اس کو غیرت ملی اور ملکی حمیت کا جوہر بھی عطا ہوا تھا۔ اس نے بادشاہ کے مشورہ سے ولی عہد یعنی شاہزادہ ''عالی گوہر'' کو جو بعد میں شاہ عالم کے خطاب سے مشہور ہوا، جھجر و ہانسی وغیرہ کی جاگیر عطا کر کے دہلی سے روانہ کر دیا۔ اور اس کو شاہی پروانہ دلوا دیا کہ:

شما وارث ملکید، تا جائیکہ توانید عمل خود نمائید۔ (۹۱) تم ملک کے وارث ہو جہاں تک کر سکو اپنی عمل داری قائم کر لو۔

اس غیر اطمینانی حالت میں کہ غازی الدین خاں کا خطرہ لگا ہوا تھا، جو چند ماہ بعد پیش آ گیا، نجیب الدولہ اور بادشاہ کا یہ اقدام حب وطن، ملکی غیرت اور حمیت کا نمایاں ثبوت ہے۔

بہر حال نجیب الدولہ کے دور حکومت کی یہ چاندنی چند روزہ تھی۔ پھر وہی غازی الدین خاں کی اندھیری رات شروع ہوئی۔ تو وہ کب گوارا کر سکتا تھا کہ وارث تاج و تخت یعنی مغل بادشاہ کا ولی عہد اس کے پنجۂ اقتدار سے آزاد رہے۔ اس نے بادشاہ پر زور ڈالا اور شاہزادہ کے نام دہلی واپس پہنچنے کے احکام صادر کرا دیے۔ چار و ناچار شاہزادہ دہلی واپس ہوا۔ علی مردان خاں کے قلعہ نما محل میں فروکش ہوا۔

غازی الدین خاں اس فکر میں تھا کہ شاہزادہ کو گرفتار (۹۲) کر کے جیل خانہ میں ڈال دے تا کہ اس کو پوری طرح اطمینان ہو۔ چنانچہ اس نے فوج بھیج کر محل کا محاصرہ کرا لیا۔ مگر شاہزادہ نے بڑے ہمت سے کام لیا۔ وہ اپنے چند ساتھیوں (۹۳) کی مدد سے رات کی اندھیری میں محل کے روشن دار سے کود، دیواروں کو پھاندا اور گھوڑوں کو دریا میں ڈال کر جمنا پار کی۔ مجنوں کے ٹیلہ تک پہنچا۔ جہاں ایک مرہٹہ راجہ کا لشکر پڑا ہوا تھا۔ اس نے شاہزادہ کی بڑی آؤ بھگت کی اور بڑے اعزاز و احترام سے فرخ نگر تک پہنچا دیا۔ یہاں موسیٰ خاں بلوچ پسر کامگار خاں نے کئی ہزار روپیہ کی پیش کش کی۔ یہ مرہٹہ سردار تو علیحدہ ہو گیا اور شاہزادہ سہارن پور نجیب الدولہ کے پاس پہنچ گیا۔ آٹھ مہینہ تک وہ یہاں رہا۔ اس زمانہ میں بنگال میں انقلاب عظیم برپا تھا اور میر جعفر انگریزوں کی حمایت سے بنگالہ پر قابض ہو گیا تھا۔ اس لیے نجیب الدولہ نے شاہزادہ کو سمجھایا کہ وہ بنگالہ جائے۔ (۹۴)

بادشاہ کا قتل

شاہزادہ نکل گیا اور جیسا کہ آگے آئے گا۔ وہ مراد آباد، بریلی، لکھنؤ، الہ آباد ہوتا ہوا پٹنہ پہنچا اور انگریزوں سے جنگ شروع کردی۔ مگر بادشاہ کی یہ جرأت جان لیوا ثابت ہوئی۔

غازی الدین خاں جو صرف وزارت عظمیٰ نہیں بلکہ بادشاہ گری کے شعبدے (۹۵) بھی دکھار ہا تھا وہ اس بے زبان و مجبور بادشاہ کے قتل کے درپے ہوا اور ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ (نومبر ۱۷۵۹ء) میں اپنے منصوبہ میں کامیاب ہو گیا۔ (۹۶۔الف)

ملک کا احساس

غازی الدین خاں نے بادشاہ کو قتل کرانے کے بعد اُسی روز اُس کی جگہ بادشاہ اورنگ زیب کے ایک پوتے (محی السنہ بن کام بخش بن عالمگیر) کو تخت پر بٹھا کر شاہجہاں ثانی کا خطاب دیا۔ مگر اس بادشاہ کو کسی نے بادشاہ نہیں مانا۔ شاہزادہ عالی گوہر ہی کو بادشاہ تسلیم کیا گیا (جس کی تفصیل آگے آئے گی انشاء اللہ) اس تفصیل کے بعد سلطنت مغلیہ اور ہندوستان کے عوام کی طرف سے یہ کہنے کا موقع ہے کہ ؎

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اس کے بعد تاریخ کا نیا باب شروع ہوتا ہے جس کے کچھ اشارات آگے آئیں گے مگر اس موقع پر اس طرف توجہ دلانی ضروری ہے کہ احمد شاہ ابدالی کا وہ مشہور حملہ جس میں مرہٹے تباہ ہوئے، صرف مرہٹوں کے خلاف نہیں تھا بلکہ وہ غازی الدین کے خلاف تھا جس کی چیرہ دستیاں اس حد تک بڑھ چکی تھیں، کہ امراء اور وزراء تو درکنار، خود بادشاہ محفوظ نہیں رہے تھے۔ چنانچہ اس مرتبہ صرف نجیب الدولہ یا پٹھانوں نے نہیں بلکہ "میر غلام حسین خاں طباطبائی" کی شہادت تو یہ ہے کہ ہندوستان کے راجہ بھی ابدالی کو بلانے میں شریک تھے۔ الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔

"نجیب الدولہ و جمیع افاغنہ و راجہائے ہندوستان از دست مرہٹہ و عماد الملک (غازی الدین خاں) بجاں آمدہ عرائض بخدمت احمد شاہ ابدالی نگاشتہ استدعا ورود او در حدود ہندوستان کردند۔" (سیر المتاخرین)

اسی بنا پر ہم ابدالی کے اس معرکہ کو نہ ہندو مسلم جنگ قرار دیتے ہیں نہ شیعہ سنی مناقشہ۔ بلکہ صحیح تو یہ ہے کہ شمالی ہند اور جنوبی ہند کے دو گروہوں کا تصادم جو عہد قدیم سے چلا آرہا تھا، اس وقت اس صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ (۹۶۔ب)

ہم نے تاریخ کے اس باب کو جس پر غلط بیانیوں کی تہ بتہ گرد جمی ہوئی تھی جھاڑ پونچھ کر کسی قدر صفائی سے بیان کیا۔ اب آئندہ نہ ہمارے پاس طوالت تحریر کے لیے فرصت ہے، نہ ناظرین کتاب کو اتنی مہلت ہوگی۔ لہٰذا اختصار کے ساتھ شاہ عالم کے کچھ واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔

عالی گوہر دہلی سے روانگی کے بعد

پہلے گزر چکا ہے کہ شاہزادہ عالی گوہر دہلی سے نکل کر نجیب الدولہ کے پاس سہارن پور پہنچا۔ جہاں تقریباً آٹھ ماہ قیام کیا نجیب الدولہ نے اس عرصہ میں شاہزادہ کے شایانِ شان سامانِ سفر تیار کیا اور بصد احترام اس کو بنگالہ کی طرف رخصت کیا۔ شاہزادہ سہارن پور سے چل کر نجیب آباد، مرادآباد، بریلی ہوتا ہوا لکھنؤ پہنچا۔ شجاع الدولہ نے شاہزادہ کا پورا احترام واکرام کیا۔ مگر شاہزادہ کی جدوجہد میں صرف اتنی ہی شرکت کی کہ ڈھائی تین لاکھ روپے نقد اور تحائف کی شکل میں پیش کر دیئے۔

شاہزادہ لکھنؤ سے الٰہ آباد پہنچا۔ جہاں محمد قلی (۹۷) خان گورنر تھا۔ وہ شاہزادہ کی امداد کے لیے کمربستہ (۹۸) ہو گیا۔ اُس نے شاہزادہ سے بہار و بنگال کی صوبہ داری کا پروانہ حاصل کیا اور بہت بڑی فوج لے کر شاہزادہ کے ساتھ بہار روانہ ہو گیا۔ اور عظیم آباد پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا۔ (۹۹) اسی سفر میں جب وہ بنگال جاتے ہوئے ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ، نومبر ۱۷۵۹ء، میں "کرم ناسا" سے پار اُترا۔ اُس کے والد عالمگیر ثانی کے قتل کا حادثہ پیش آیا۔ جس کی خبر اس کو ایک ماہ بعد بہار کے ایک گاؤں کاتولی (۱۰۰) میں ملی۔ شاہزادہ نے اُسی وقت تختِ سلطنت (۱۰۱) پر جلوس کیا اور شاہ عالم خطاب اختیار کیا۔ (۱۰۲)

اب شجاع الدولہ کو جو دربارِ دہلی میں وزارت کا مرتبہ رکھتا تھا اور اسی بنا پر نواب وزیر شجاع الدولہ کہا جاتا تھا۔ خطرہ ہوا کہ محمد قلی خاں شاہزادہ سے جواب شہنشاہ شاہ عالم ہو گیا تھا، قلمدانِ وزارت حاصل کر لے گا تو اُس نے محمد قلی خاں کے علاقہ میں اقدام کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور محمد قلی خاں کے اہل وعیال کو نظر بند کر دیا اور اپنے خاص دوست راجہ بینی بہادر اور راجہ جسونت سنگھ کو مامور کر دیا، کہ جیسے ہی محمد قلی خاں واپس آئے، اُس کو گرفتار کر لیا جائے۔

محمد قلی خاں اس تباہی کی خبر پاتے ہی واپس ہوا۔ "موشیر لاس" فرانسیسی جرنیل جو اس وقت اُن کے ساتھ تھا، اُس نے بہت منع کیا مگر اس نے ایک نہ سنی اور اپنے علاقہ کی طرف چلا۔ لیکن جیسے ہی اپنے قلمرو کی حدود میں داخل ہوا گرفتار کر لیا گیا۔ (۱۰۳) اور جب شجاع الدولہ، احمد شاہ ابدالی کی مدد کے لیے پانی پت جانے لگا، تو اس کے قتل کا حکم دے گیا۔ بہرحال محمد قلی خاں کے قتل کے بعد بھی شاہزادہ نے ہمت نہیں ہاری۔ اب اس کے ساتھ موشیر لاس (۱۰۴) اور کامگار خاں و دلیر خاں وغیرہ افغان سردار تھے۔ جن کی مدد سے عظیم آباد پر حملہ کیا۔ مگر حالات نے مساعدت نہیں کی۔ ناچار شکست کھا کر واپس ہوا۔ یہی وہ دور ہے کہ پانی پت میں احمد شاہ ابدالی مشہور معرکہ سر کر رہا تھا۔

بہرحال احمد شاہ درانی تو آخری نوازش کر کے شاہ عالم کو بادشاہِ ہند، شجاع الدولہ کو وزیر اور نجیب الدولہ کو امیر الامراء بنا گیا اور جب تک شاہ عالم دہلی واپس پہنچے، اُس کے بیٹے "جواں بخت" کو نائب السلطنت مقرر کر گیا۔ مگر

تہی دستانِ قسمت راچہ سود از رہبرِ کامل

بادشاہ شاہ عالم کی حالت یہ تھی کہ پے در پے شکستوں کے بعد وہ شجاع الدولہ کے سہارے کا محتاج تھا۔ اسی زمانہ میں میر قاسم (داماد میر جعفر) جو بہار کا خود مختار حاکم تھا۔ اور چونکہ انگریزوں نے بد عہدی کر کے وہ وعدے جو سراج الدولہ کو ختم کر دینے کی سازش کے وقت کیے گئے تھے، پورے نہیں کیے تھے، تو میر قاسم انگریزوں سے لڑ بیٹھا اور پھر جب ان سفید فام دوستوں نے شکست دے کر فرار پر مجبور کر دیا..... تو شجاع الدولہ کے دامن میں پناہ لینے اودھ پہنچ گیا۔

شجاع الدولہ محمد قلی خاں کو قتل کرانے کے بعد بہار پر قبضہ کرنے کا وہی خواب دیکھ رہا تھا، جو محمد قلی خاں نے دیکھے تھے۔ اُس نے میر قاسم کی امداد کے نام پر بادشاہ کو ساتھ لیا اور بہار کی طرف روانہ ہو گیا۔

شاہ عالم اور شجاع الدولہ ٹڈی دل فوج اور شاہانہ شان وشوکت کے ساتھ بہار کی طرف کوچ کر رہے تھے اور عقل ودانش ان کے منصوبوں کا مذاق اُڑا رہی تھی۔ کیونکہ نہ فوج میں نظم وضبط تھا، نہ سربراہوں میں اخلاص۔ فوج ایک بے تحاشا بھیڑ تھی۔ جدھر سے گزرتی آس پاس کے دیہات بھی تباہ کر ڈالتی۔ گاؤں والے لشکر کے دست درازیوں سے تنگ آ کر انگریزوں کے واپس آنے کی دعائیں مانگتے تھے۔[105]

خود فوج کے اندر ایک دوسرے کو قتل کر ڈالتا۔ ایک دوسرے کو لوٹ لیتا اور کوئی نہیں تھا جو شنوائی کرتا۔[106]

قائدین فوج اور رہنماؤں کا دماغی توازن مفقود تھا۔ میر قاسم احساس کمتری میں مبتلا شجاع الدولہ بادشاہ کو بارِ گراں سمجھتا تھا اور بادشاہ کو یہ تصور کہ وہ شجاع الدولہ کی حراست میں ہے۔ سازشوں کا یہ عالم کہ شجاع الدولہ کی فوج میں بنی بہادر اور راجہ بلونت انگریزوں سے ملے ہوئے۔[107]

بادشاہ کا مقرب خصوصی "نجف خاں" جو محمد قلی خاں[108] مقتول کا سالہ تھا، انگریزوں کا آلۂ کار۔ نتیجہ وہی ہوا جو قانونِ فطرت کے مطابق ایسے فریب خوردہ اقدام کا ہونا چاہیے تھا۔ یعنی ٹڈی دل فوج شکست کھا کر منتشر ہوئی۔ میر قاسم خاطر برداشتہ ہو کر شجاع الدولہ سے علیحدہ ہوا اور ابھی جنگ کا آخری فیصلہ نہیں ہونے پایا تھا کہ شاہ عالم نے شجاع الدولہ کی حراست سے تنگ آ کر شاہی اقتدار کو انگریزوں کی پناہ میں دے دیا۔

انگریزوں نے موقع سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور شجاع الدولہ سے کہیں زیادہ تیز مندی اور وفا شعاری کی نمائش کر کے ۴؍ رجب ۱۱۷۸ھ، ۲۹؍ دسمبر ۱۷۶۴ء کو بادشاہ سے بہار اور بنگال کی دیوانی کا پروانہ حاصل کر لیا۔ اب وہ برصغیر ہندوستان کے مسلمہ[109] اور مشہور قانون کے مطابق بہار اور بنگال کے جائز حکمران ہو گئے۔

شجاع الدولہ، روہیلوں اور مرہٹوں سے مدد لے کر کچھ دنوں انگریزوں سے برسرِ پیکار رہا۔ پھر اس کو اپنا فائدہ صلح ہی میں نظر آیا۔

اس آٹھ سالہ تماشا کا آخری پردہ، کوڑہ جہان آباد کی کانفرنس تھی، جو تقریباً نو ماہ بعد ۲۲؍ صفر ۱۱۷۹ھ، ۱۲؍ اگست ۱۷۶۵ء کو منعقد ہوئی۔ جس میں شجاع الدولہ کا ملک تقسیم کر کے صرف اودھ شجاع الدولہ کو دیا گیا، اور الٰہ آباد اور غازی پور کا علاقہ بادشاہ کی جاگیر قرار پایا۔ بہار، بنگالہ اور اڑیسہ جس پر انگریز کی دیوانی تسلیم کی گئی تھی

اس کی مال گزاری کے چھبیس لاکھ روپیہ سالانہ طے کیے گئے اور یہ شرط قرار پائی کہ اس میں سے دو لاکھ روپیہ نجف خاں کو دیئے جائیں گے۔ انگریزوں نے سالانہ مال گزاری (چھبیس لاکھ روپے) کی ادائیگی کے لیے مختصر راستہ تجویز کر دیا۔ یعنی نقد رقم ادا کرنے کے بجائے شجاع الدولہ کی مملکت میں سے تقسیم شدہ حصہ الہ آباد غازی پور بادشاہ کو بطور جاگیر دے دیا گیا۔ جس سے وہ اپنی مال گزاری کا چھبیس لاکھ سالانہ خود وصول کرتے رہے، اور ان اضلاع کا نظم ونسق نجف خاں کے سپرد کر دیا گیا اور یہ بھی طے کیا گیا کہ نظم ونسق کے عوض میں اسی چھبیس لاکھ کی رقم میں سے دو لاکھ نجف خاں کے ہوں گے۔

مختصر یہ کہ شاہ عالم دہلی سے چلا تھا بنگال اور بہار پر قبضہ کرنے کے لیے قبضہ تو کیا کرتا، خود اُن کا وظیفہ خوار بن گیا۔ اور ایسا وظیفہ خوار جس کے لیے انگریزوں کو بھی پھوٹی کوڑی بھی اپنے پاس سے خرچ نہیں کرنی پڑی۔ البتہ اس معاہدہ سے جس کو فائدہ پہنچا اور جس کی شخصیت قائم ہوگئی، وہ نجف خاں تھا جو بیک وقت انگریزوں کا جاسوس تھا، شجاع الدولہ کا ہوا خواہ اور شاہ عالم بادشاہ کا ایسا معتمد کہ جب شاہ عالم دہلی پہنچا تو یہی اُس کا وزیر اعظم بنا۔

یہاں یہ بھی فراموش نہ ہونا چاہیے کہ یہی نجف خاں ہے جس کے دورِ وزارت (۱۷۷۳ء تا ۱۷۸۲ء)(۱۱۰) میں شاہ عبد العزیز صاحب کو بار بار جلاوطن کیا گیا۔ طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں اور واجب الاحترام بزرگ حضرت مرزا مظہر جانجاناں کو شہید کرایا گیا۔

انگریزوں سے معاہدہ کے بعد سیاسی گروپ بندی

معاہدہ کوڑہ جہاں آباد کا دوررس نتیجہ یہ تھا کہ ہندوستانی طاقتوں کی گروپ بندی کا رُخ قطعاً بدل گیا۔ اب تک گروپ بندی ان بنیادوں پر تھی جن کا تعلق گلدستہ ہندوستان کی اندرونی رنگینیوں سے تھا۔ مثلاً مرہٹہ، مغل، پٹھان، راجپوت یا شیعہ سنی وغیرہ۔ اب گروپ بندی کی بنیاد انگریزوں کی حمایت یا مخالفت ہوگئی۔ یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کی ایک ایسی بڑی طاقت بن گئی کہ اب پورے ہندوستان کی سیاست انگریزوں کی حمایت یا مخالفت میں منقسم ہوگئی۔

الف: شجاع الدولہ اور شاہ عالم انگریزوں کے حامی تھے۔ کچھ دنوں بعد حیدر آبادی نوابوں کی حمایت بھی انگریزوں کو حاصل ہوگئی، جو ہر نازک موقع پر بہت ہی زیادہ کار آمد ثابت ہوئی۔

ب: مندرجہ ذیل طاقتیں وہ تھیں جو انگریزوں کو برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔

(۱) روہیلہ: جن کا حلقۂ اقتدار پیلی بھیت، شاہجہاں پور سے لے کر سہارن پور تک تھا۔ جس کے سربراہ کار حافظ رحمت خاں تھے۔ نجیب خاں (جو نجیب الدولہ کے خطاب سے ممتاز ہو کر مغل بادشاہ کے امیر الامراء رہے)، نواب فیض محمد خاں، محمد خاں بنگش، احمد خاں بنگش اور نواب مظفر جنگ، نوابان فرخ آباد، اسی جماعت کے ممتاز افراد تھے۔

(۲) مرہٹہ: جن کا حلقۂ اقتدار جنوبی مغربی ہند، مالوہ اور وسط ہند کا بیشتر علاقہ تھا۔

(۳) ایک اور طاقت جنوبی ہند میں نشو ونما پا رہی تھی جس کا سلسلہ شاہ ابو سعید[۴۱] صاحب اور شاہ ابو اللیث صاحب[۴۲] کے ذریعہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ سے منسلک ہوتا تھا۔ یہ "حیدر علی" کی حکومت تھی جو میسور میں روز افزوں ترقی کر رہی تھی۔ یہی حیدر علی ہیں جن کا بہادر فرزند، سلطان ٹیپو کے نام سے مشہور ہوا، جن کے نام سے یورپین بچوں کو عرصہ تک ڈرایا جاتا رہا اور ہندوستان کا بچہ بچہ[۴۳] ان کو جنگ حریت کے شہسوار کی حیثیت سے پہچانتا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ انگریزوں کی حمایت میں جو پیش پیش رہے، مثلاً میر جعفر (بنگال)، میر صادق (میسور)، شجاع الدولہ (لکھنؤ)، نجف خاں (دہلی) یہ سب شیعہ تھے۔

انگریز دشمن طاقتوں کا حسرت ناک انجام

حافظ رحمت خاں

شجاع الدولہ نے تسخیر روہیل کھنڈ کے شوق میں جنرل ہیسٹنگس کی مدد اور اس کی ترغیب[۴۴] سے ۱۷۷۴ء میں روہیل کھنڈ کی طرف کوچ کیا۔ پہلے فرخ آباد کے نواب "مظفر جنگ" کو باجگذار بنایا۔ پھر ۲۳ر اپریل ۱۷۷۴ء، ۱۱ر صفر ۱۱۸۸ھ کو کٹرہ میراں پور کی وہ مشہور لڑائی ہوئی جس میں حافظ رحمت خاں شہید ہوئے۔ روہیلوں کا قتل عام کیا گیا۔ ان کی جائدادیں ضبط اور مال و اسباب تاراج کیا گیا۔ نواب فیض اللہ خاں نے لال ڈانگ کے دشوار گزار پہاڑی جنگل میں پناہ لے کر جان بچائی۔ بچے کچھے روہیلے بھی وہیں پہنچ گئے۔ تقریباً چھ ماہ تک اس علاقہ میں محصور رہنے کے بعد انگریزوں کی مدد سے شجاع الدولہ سے صلح ہوئی اور رام پور کا علاقہ ان کی جاگیر قرار دیا گیا۔ روہیلوں کی حکومت کے باقی علاقے انگریزوں، شجاع الدولہ اور نجف خاں نے آپس میں تقسیم کر لیے۔

نجیب الدولہ

امیر الامراء نجیب الدولہ ۱۷۷۰ء میں وفات پا چکے تھے۔ ان کی جگہ ان کا بیٹا ضابطہ خاں امیر الامراء ہوا۔ یہ انگریزوں کا مخالف تھا۔ شاہ عالم نے انگریزوں کو دیوانی عطا کر کے ۱۷۷۰ء میں دہلی کی طرف کوچ کیا۔ ۲۵ر دسمبر ۱۷۷۱ء کو قلعہ میں داخل ہوئے۔ بادشاہ کا یہ سفر انگریزی فوج کے سایہ میں ہوا تھا۔ ضابطہ خاں اس سایہ سے بچ کر اپنی جاگیر میں نجیب آباد چلا گیا۔ نجف خاں امیر الامراء قرار پائے۔ مرہٹوں کو اس سے اشتعال پیدا ہوا۔ انہوں نے بادشاہی علاقہ پر حملہ کر دیا۔ صلح میں یہ طے پایا کہ ضابطہ خاں کو امیر الامراء بنایا جائے۔ چنانچہ ۱۷۷۲ء میں ضابطہ خاں دوبارہ امیر الامراء بنائے گئے۔ مگر انگریزوں اور شجاع الدولہ کی پرزور سفارش پہنچی کہ یہ عہدہ نجف خاں کو سپرد ہو۔ بادشاہ کے لیے سرتابی ممکن نہ تھی۔ چنانچہ ۱۷۷۳ء میں نجف خاں امیر الامراء مقرر ہوئے۔

اس طرح انگریزی اقتدار، لال قلعہ میں داخل ہو کر فرماں روائی کرنے لگا۔ مگر باہر کے پاسبان اب بھی مرہٹے تھے۔ اب نجف خاں اور مرہٹوں کی جنگ درپردہ انگریزوں اور مرہٹوں کی جنگ تھی۔

انگریزی اقتدار

اب شمالی ہند میں میمن سنگھ اور چاٹگام سے لے کر دہلی تک انگریزی اقتدار کا سکہ رائج ہو چکا تھا۔ جنوبی ہند میں حیدرآباد کی طرف دوستانہ نگاہیں اٹھ رہی تھیں۔ ٹیپو سلطان اور مرہٹے مخالف تھے مگر بدقسمتی سے یہ دونوں آپس میں دست و گریباں تھے۔ انگریزوں نے پہلے میسور کا رخ کیا۔ مرہٹوں کو کچھ تھپک کر خاموش کیا۔ نظام کی فوجیں ساتھ لیں۔ میر صادق وغیرہ سلطان کے غدار ساتھیوں نے خفیہ ساز باز کر لی۔ اب ایک معرکہ کی ضرورت تھی، جس میں اس شیر بیشۂ حریت کو سب طرف سے گھیر کر شہید کر دیا جائے۔

۴ مئی ۱۷۹۹ء اس منصوبہ کی کامیابی کی آخری تاریخ تھی۔ دن کا ایک بجا تھا کہ جنگ آزادی کے اس شیر دل کمانڈر نے اپنے مخصوص جاں نثاروں کے ساتھ جن میں فدائے وطن خواتین (۱۱۵) بھی تھیں انگریز حملہ آوروں کی مدافعت شروع کی۔ سب طرف سے گھر جانے کے باوجود ماہ مئی کی دہکتی ہوئی گرمی میں بھوکے پیاسے سات گھنٹے کی جنگ کے بعد غروب آفتاب کے وقت اس بہادر سلطان نے پپڑیاں جمے ہوئے ہونٹوں کو جام شہادت سے تر کیا۔ (۹۶)

اور تاریخ جبر و قہر کی پیشانی پر خون شہادت سے یہ فقرہ لکھ دیا:

''شیر کی زندگی کا ایک لمحہ گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے۔''

مگر جب ''لارڈ ہارس'' نے سلطان کی خون آلود لاش دیکھی تو اس کا نعرہ یہ تھا:

''آج ہندوستان ہمارا ہے۔'' (۱۱۶)

اٹھارہویں صدی عیسوی کا خاتمہ

اٹھارہویں صدی کی شام کو ہندوستانی عظمت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ غلامی کی شب تاریک تیزی سے پورے ملک پر چھا رہی تھی۔ انگریزی اقتدار کی صبح صادق نمودار ہو رہی تھی۔

اب آزادیٔ وطن کی سونی بزم میں صرف مرہٹی اقتدار کی ایک ٹمٹماتی شمع باقی تھی۔ لال قلعہ میں جو کچھ اُجالا تھا وہ اسی کا عکس تھا۔ ایک چراغ شمالی مغربی علاقہ میں بھبک رہا تھا۔ یہ راجہ رنجیت سنگھ کا عروج تھا۔ مسلمانوں کی تمام قابل ذکر طاقتیں ختم ہو چکی تھیں۔ جو ختم نہیں ہوئی تھی، مفلوج ہو کر انگریزی اقتدار کے سامنے سر جھکا چکی تھیں۔ ۱۸۰۰ء کے آخر میں لارڈ لیک، انگریزی فوجوں کو لے کر دہلی کی طرف بڑھا۔ سیندھیا کی فوجیں شاہی اقتدار کی محافظ تھیں، وہ سینہ سپر ہوئیں۔ مگر انگریز کی فوجی طاقت مرہٹوں کی قوت ایثار سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ مجبوراً شکست خوردہ دہلی نے انگریزوں کا استقبال کیا۔ لارڈ لیک نے دہلی پر تسلط کر کے شاہ عالم سے ایک

نیا معاہدہ کیا۔

سیندھیا پیچھے ہٹا تو ہلکر اور امیر علی خاں آگے بڑھے۔ مگر دہلی کے محاذ پر اُن کو بھی شکست ہوئی تو سکھوں کی بہادری کا صدقہ لینے کے لیے پنجاب پہنچے۔ یہاں اُن کو کچھ مالی امداد تو مل سکی مگر فوجی امداد کے لیے کوئی سکھ سردار تیار نہیں ہوا۔ بڑی اُمید مہاراجہ رنجیت سنگھ سے تھی، اس نے بھی صاف انکار کر دیا۔(۱۱۸)

اب مجبوراً اُن کو انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے، اور ۱۸۰۶ء میں لارڈ لیک سے ایک معاہدہ کر کے اپنے ملک واپس ہوئے۔ مگر انگریزوں کے خلاف غم و غصہ کی جو آگ اُن کے سینوں میں بھڑک رہی تھی وہ اب بھی کم نہیں ہوئی تھی۔ لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ پورے ہندوستان میں کوئی نہیں تھا جو اُن کی ہمنوائی کرتا۔ صرف ایک راجہ اور ایک فقیر اُن کا ہمنوا تھا۔ راجہ، مادھو جی سیندھیا اور فقیر شاہ عبد العزیز۔ ہلکر اور سیندھیا کی باہمی رقابت و عداوت تاریخ کا مشہور افسانہ ہے اس رقابت نے اُن کو آج تک الگ الگ رکھا تھا۔ لیکن انگریزوں کی مخالفت ایک مشترک مقصد تھا جس نے ان تینوں کو متحد کر دیا۔ یعنی (۱) امیر علی خاں، (۲) ہلکر اور (۳) سیندھیا۔

انگریزی اقتدار کی نوعیت اور آزادیٔ وطن کے متعلق ایک پیچیدہ سوال

۱۷۶۵ء میں جب کہ پٹنہ اور بکسر کی جنگ میں شجاع الدولہ (اودھ) اور شاہ عالم کو شکست ہو چکی تھی تو فوراً ہی دہلی پر قبضہ کر لینا بھی مشکل نہیں تھا۔ کیونکہ انگریزوں کی فوجی طاقت اتنی ترقی کر چکی تھی کہ وہ آسانی سے یہ پروگرام کامیاب کر سکتے تھے مگر انگریزوں کی پالیسی یہ تھی کہ مرنے والوں کو اپنی موت مرنے دیا جائے، اُس کو گولی کا نشانہ بنا کر بلا ضرورت کارتوس خراب نہ کیا جائے۔ چنانچہ انگریز مدبرین وہ زہریلے نسخے تو استعمال کرتے رہے جو مرض کو مہلک بنا کر موت کو یقینی کر دیں۔ مگر اس کے روادار نہیں ہوئے کہ فوجی قوت کے ذریعہ ایک سال بعد مرنے والے کو آج ہی ختم کر دیں۔ اُن کے تجارتی مقاصد کا تقاضا بھی یہی تھا کہ زر اندوزی اور ملک گیری کے وہ راستے نہ اختیار کریں جن سے عوام میں بددلی پیدا ہو۔ جب ۱۸۰۳ء میں دہلی پر قبضہ کیا تو یہاں بھی اس سوچی سمجھی اور طے شدہ پالیسی سے کام لیا گیا۔ یعنی بادشاہ کو معزول کرنے اور شاہی تخت و تاج چھیننے کے بجائے بادشاہت کا وہ نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی جو انگلستان کی آزاد پارلیمنٹ خود اپنے بادشاہ کے لیے طے کر چکی تھی اور جس پر خود انگریزوں کے وطن میں سالہا سال سے عمل ہو رہا تھا۔ یعنی بادشاہ کو تاج و تخت کے ساتھ باقی رکھتے ہوئے صرف اختیارات ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلیم کرا لیے گئے اور اس کی تعبیر یہ کی گئی کہ ”خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا اور حکم کمپنی بہادر کا۔“

غور فرمایئے کس قدر نازک پوزیشن ہے۔ خدا کی خدائی اور اس کی قدرت کاملہ تسلیم کر کے مذہب کا دامن بھی دونوں ہاتھوں سے تھام لیا گیا ہے۔ مغل بادشاہ کی بادشاہت اور آلِ تیمور کی عظمت بھی محفوظ کر دی گئی ہے۔ صرف کاروبارِ حکومت جو ہندو یا مسلمان امراء اور وزراء کے حوالہ ہوا کرتا تھا اب ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالہ کر دیا

گیا ہے۔ تہذیب اور کلچر کے لحاظ سے نہ صرف یہ کہ اُن کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے بلکہ ہندوؤں کے سماجی معاملات پنڈتوں کے اور مسلمانوں کے معاشرتی معاملات قاضیوں کے سپرد کر کے ان کو کلچرل اٹانمی (تہذیبی خود مختاری) بھی دے دی گئی ہے۔ عوام تو عوام اس زمانہ کے خواص بھی اس فرق کو نہیں سمجھ سکتے تھے جو سابق امراء اور وزراء کے اختیارات یا انگلستان کی پارلیمنٹ اور کابینہ اور ہندوستان کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے درمیان تھا۔ اُن کی نظر مذہب پر، تہذیب پر اور بادشاہ پر تھی۔ یہ سب محفوظ تھے لہٰذا ایک نہایت ہی نازک سوال تھا کہ موجودہ حالت کو آزادی کہا جائے یا غلامی۔ اسلامی قوانین کی رو سے پیچیدہ سوال یہ ہے کہ اب ہندوستان کو دارالاسلام مانا جائے جیسا کہ پہلے تھا یا دارالحرب کہا جائے۔ جہاں برسرِ اقتدار طاقت سے جنگ کرنا، ورنہ اس ملک سے نکل جانا مذہبا فرض ہے یا اس کو دارالامن مانا جائے جہاں اگرچہ حکومت غیر مسلم ہے مگر مسلمانوں کی جان و مال محفوظ ہے اور مذہبی آزادی اُن کو حاصل ہے اور اس بنا پر حکومت سے جنگ کرنا درست نہیں ہے۔

بہرحال ایک نہایت ہی پیچیدہ سوال تھا جو انیسویں صدی عیسوی کے شروع ہوتے ہی سیاسی مفکرین اور علماء کرام کے سامنے آیا۔ اس سوال کے جواب میں اختلاف رائے ہو سکتا تھا اور انگریز جیسی شاطر اور ڈپلومیٹک قوم کے لیے نہایت آسان تھا کہ اس اختلاف سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو گمراہ کرے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور کامیاب ہوئی۔ مگر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (قدس اللہ سرہ العزیز) کی سیاسی درس گاہ کے تربیت یافتہ پختہ کار ایسے شعبدوں سے مسحور ہونے والے نہیں تھے، چنانچہ اس پارٹی کے رہنما سید حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے فتویٰ صادر فرمایا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا فتویٰ

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز نے جو فتویٰ فارسی زبان میں صادر فرمایا۔(۱۹) اُس کا ترجمہ یہ ہے:

> ”یہاں رؤساء نصاریٰ (عیسائی افسران) کا حکم بلا دغدغہ اور بے دھڑک جاری ہے اور اُن کا حکم جاری اور نافذ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ملک داری، انتظامات رعیت، خراج، باج، عشر و مال گزاری، اموالِ تجارت، ڈاکوؤں اور چوروں کے انتظامات، مقدمات کا تصفیہ، جرائم کی سزاؤں وغیرہ (یعنی سول، فوج، پولیس، دیوانی اور فوج داری معاملات، کسٹم اور ڈیوٹی وغیرہ) میں یہ لوگ بطور خود حاکم اور مختارِ مطلق ہیں۔ ہندوستانیوں کو اُن کے بارے میں کوئی دخل نہیں۔ بے شک نماز جمعہ، عیدین، اذان اور ذبیحہ گاؤ جیسے اسلام کے چند احکام میں وہ رکاوٹ نہیں ڈالتے۔ لیکن جو چیز ان سب کی جڑ اور حریت کی بنیاد ہے (یعنی ضمیر اور رائے کی آزادی اور شہری آزادی) وہ قطعاً بے حقیقت اور پامال ہے۔ چنانچہ بے تکلف مسجدوں کو مسمار کر دیتے ہیں۔ عوام کی شہری آزادی ختم ہو

چکی ہے۔ انتہا یہ کہ کوئی مسلمان یا ہندو اُن کے پاسپورٹ اور پرمٹ کے بغیر اس شہر یا اُس کے اطراف وجوانب میں نہیں آسکتا۔ عام مسافروں یا تاجروں کو شہر میں آنے جانے کی اجازت دینا بھی ملکی مفاد یا عوام کی شہری آزادی کی بنا پر نہیں بلکہ خود اپنے نفع کی خاطر ہے۔ اس کے بالمقابل خاص خاص ممتاز اور نمایاں حضرات مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم ان کی اجازت کے بغیر اس ملک میں داخل نہیں ہوسکتے۔ دہلی سے کلکتہ تک انہیں کی عمل داری ہے۔ بے شک کچھ دائیں بائیں مثلاً حیدر آباد، لکھنؤ، رام پور میں چونکہ وہاں کے فرمانرواؤں نے اطاعت قبول کر لی ہے، براہِ راست نصاریٰ کے احکام جاری نہیں ہوتے۔" (مگر اس سے پورے ملک کے دارالحرب ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔) [فتاویٰ عزیزی فارسی جلد اول ص ۱۷ مطبوعہ مطبع مجتبائی]

ایک دوسرے فتویٰ میں بھی مخالفوں کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے ہندوستان کا دارالحرب ہونا ثابت کیا ہے۔ [جلد اول ص ۱۰۵ فتاویٰ عزیزی فارسی مطبوعہ مطبع مجتبائی]

فتویٰ کی زبان مذہبی ہے کہ "دارالحرب" کا اصطلاحی لفظ استعمال کیا گیا ہے مگر روح سیاسی ہے اور مطلب [۱۴۰] یہ ہے کہ چونکہ:

(۱) قانون سازی کے جملہ اختیارات عیسائیوں کے ہاتھ میں ہیں۔

(۲) مذہب کا احترام ختم ہے۔

(۳) اور شہری آزادی سلب کر لی گئی ہے۔

لہٰذا ہر محبِ وطن کا فرض ہے کہ اس اجنبی طاقت سے اعلانِ جنگ کر دے اور جب تک اس کو ملک بدر نہ کر دے، اس ملک میں زندہ رہنا اپنے لیے حرام جانے۔

اس موقع پر یہ حقیقت نظر انداز نہ ہونی چاہیے کہ نجف علی خاں کی وفات [۱۴۱] (۱۷۸۲ء) کے بعد سے یعنی تقریباً بیس سال اقتدار مرہٹوں کے ہاتھ میں تھا۔ مرہٹوں کا پیشوا (مادھو نرائن پھر باجی راؤ) امیر الامراء تھا اور مادھوجی سیندھیا نائب امیر الامراء اور جس طرح آج یہ اعلان ہو رہا تھا کہ "حکم کمپنی بہادر کا"۔ بیس سال پہلے سے دنیا دیکھ رہی تھی کہ جو کچھ حکم تھا وہ پیشوا یا سیندھیا کا تھا۔ یعنی پایۂ تخت اور اس کے گرد و نواح میں ایک غیر مسلم طاقت یعنی مرہٹوں کا تسلط تھا۔

شاہ عبدالعزیز صاحب اور اُن کی پوری پارٹی، دہلی میں موجود تھی۔ اُن کے سامنے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ اُن کے منہ میں زبان تھی اور ہاتھ میں قلم تھا۔ چنانچہ جن باتوں میں وہ مرہٹوں کے نظامِ حکومت سے ناراض تھے اُن پر سخت سے سخت تنقید کی تھی۔ آج بھی وہ عربی اور فارسی کے اشعار موجود ہیں جن میں مرہٹوں پر گہری تنقید ہے لیکن بایں ہمہ ان بیس سالوں میں نہ وطنِ عزیز کو دارالحرب قرار دیا اور نہ ہندوستانیوں کے لیے آزادی اور نہ

ترکِ وطن کا فتویٰ صادر کیا۔ بلکہ اس کے برعکس مسلمانوں کا جنگجو طبقہ جو شاہ عبدالعزیز صاحب سے گہری عقیدت رکھتا تھا یعنی روہیلہ پٹھان، اُن کے تعلقات مرہٹوں سے اور زیادہ مضبوط ہو گئے۔ یہ بھی فراموش نہ ہونا چاہیے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کو اذیتیں پہنچانے کی جو روایتیں نقل کی جاتی ہیں اُن میں جس کا نام لیا جاتا ہے، وہ نجف علی خاں ہے، جو انگریزوں کا پرانا وظیفہ خوار اور اُن کا لایا ہوا وزیر تھا۔

فتوے کا اثر

عام مسلمان جو انگریزوں کے تیز رفتار اقتدار سے حیرت میں رہ گئے تھے اور اپنے اندر ایسی صلاحیت نہیں رکھتے تھے کہ مذہب کی روشنی میں فیصلہ کر سکیں کہ اس اقتدار کے مقابلہ میں اُن کا طرزِ عمل کیا ہو۔ ان کے لیے ایک راستہ کھل گیا جس کا فوری اثر ہوا کہ باہمت جنگجو طبقہ جا بجا اُس طاقت سے وابستہ ہو گیا جو اُس وقت انگریزوں سے برسرِ پیکار تھی، یہ طاقت اُس وقت صرف مرہٹوں کی تھی۔

چنانچہ اُس دور میں مسلمانوں اور مرہٹوں کی پرانی جنگ ختم ہو گئی، اور صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ مرہٹی علاقوں کے مسلمان مرہٹوں کی فوج میں شامل ہو کر آخر تک انگریزوں سے لڑتے رہے بلکہ شمالی ہند کے بھی بہت سے مسلمان ان علاقوں میں پہنچے اور مرہٹوں کے ساتھ انگریزوں کی جنگ میں شریک ہو گئے۔ خود حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنے خاص معتقد اور مرید سید احمد صاحب کو امیر علی خاں سنبھلی کے پاس بھیجا جو جسونت راؤ ہلکر کے ساتھ عرصہ سے انگریزی طاقت پر شب خون مار رہے تھے۔

انیسویں صدی کے پہلے پچیس سال

سیاسی تبدیلیاں اور ولی اللہ پارٹی کا اقدام

لارڈ ولزلی کا سات سالہ دورِ حکومت (جو ۱۷۹۸ء سے شروع ہو کر ۱۸۰۵ء پر ختم ہوا) ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقدامات کا دور تھا۔ ۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپو کو ختم کیا گیا۔ اُس سے ڈھائی سال بعد پیشوا کو دبا کر ۱۸۰۲ء میں "بسین" کا مشہور عہد نامہ کیا گیا جس میں طے کیا گیا کہ انگریزوں کی ایک فوج پیشوا کے علاقہ میں رہا کرے گی۔ پھر سیندھیا کی فوجوں کو شکست دے کر ۱۸۰۳ء میں دہلی فتح کی گئی۔ مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر اور ان کے منہ بولے بھائی امیر علی خاں کی طاقت کو کمزور کیا گیا۔ اس وقت یہ طاقتیں پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئیں۔ مگر انگریزی حکومت کے خلاف ان کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ چند سال بعد یہ کوششیں ہیبت ناک حقیقت بن کر سامنے آ گئیں۔ جسونت راؤ ہلکر اور امیر علی خاں کی شکست خوردہ طاقت نے پھر سنبھالا لیا پیشوا نے بھی اپنی فوجیں آراستہ کیں۔ دولت راؤ سیندھیا نے نہ صرف یہ کہ اپنی فوجیں اور توپ خانہ انگریزی فوجوں کے پیمانہ پر تیار کیا بلکہ مہاراجہ نیپال سے بھی خفیہ ساز باز کر لی۔ وسط ہند میں ایک خانہ بدوش گروہ (پنڈاریوں)(۱۴۳) نے قیامت

برپا کردی۔ انگریزی علاقوں اور انگریزوں کی حلیف ریاستوں پر شب خوں مارنے شروع کیے۔ یعنی ہندوستان کی تمام طاقتیں ایک دفعہ پھر انگریزوں کے خلاف میدانِ جنگ میں آگئیں۔ (۱۴۳)

یہی زمانہ تھا کہ یورپ میں نپولین بونا پارٹ کی فتوحات کا سیلاب جاری تھا اور اُس نے ایک سفارت ایران بھیج کر یہ کوشش کی تھی کہ ایران سے ایسے تعلقات ہو جائیں کہ انگریزوں کے خلاف ہندوستان پر حملہ کرنے میں سہولت ہو۔ (۱۴۴) اسی کی پیش بندی کے لیے انگریزوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ۱۸۰۸ء میں معاہدہ کیا۔ پٹیالہ، نابھہ، کپورتھلہ وغیرہ یعنی دریائے ستلج سے اُس پار کی ریاستیں خود ہی انگریزی اقتدار کی پناہ لے کر انگریزوں کا دست و بازو بن گئیں۔ (۱۴۵) بہرحال یہ دور جو ۱۸۰۸ء سے شروع ہوا، ہندوستانی حکمرانوں اور انگریزوں کی قوت آزمائی کا آخری اور نازک ترین دور تھا۔ اس نازک موقع پر شاہ ولی اللہ پارٹی کا لیڈر (مولانا شاہ عبدالعزیز) بھی خاموش نہیں رہا۔ اُس نے اپنے آدمیوں کو اپنے خاص مرید اور معتقد سید احمد کے ساتھ جسونت راؤ ہلکر دوست نواب امیر علی خاں کی فوج میں بھرتی کرا دیا اور اس طرح اپنے فتوے کی عملی شکل مسلمانوں کے سامنے پیش کردی۔

سید احمد صاحب رائے بریلی کے رہنے والے اُس خاندان کے چشم و چراغ تھے جو اپنے تقدس اور بزرگی کے لحاظ سے پورے اودھ میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ آپ کے مورث اعلیٰ ''شاہ علم اللہ'' کی خانقاہ تکیہ شاہ علم اللہ'' کے نام سے مشہور تھی۔ جس کے فیوض کم و بیش سو سال سے اودھ کے تشنہ لبوں کو سیراب کر رہے تھے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے اسی خانقاہ کو اپنے نظریات کی تعلیم و تربیت کا مرکز بنایا تھا اور شاہ ابو سعید صاحب جن کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اس مرکز کا انچارج بنایا تھا، وہ سید احمد صاحب کے نانا تھے۔ اُن کے روحانی فیوض جنوبی ہند میں میسور اور سرنگا پٹم تک پہنچے۔ اور اُنہوں نے حیدر علی اور سلطان ٹیپو کے دل و دماغ کو متاثر کیا۔

سید احمد صاحب جواں عمری میں اپنے گھر سے چلے۔ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ چکا تھا۔ اول تلاش روزگار میں لکھنؤ پہنچے۔ مگر وہاں شاہ اودھ کے پردہ میں انگریزوں کا اقتدار ناچ رہا تھا۔ سید صاحب چند ہی روز میں لکھنؤ کی فضا سے بددل ہو گئے اور اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر تن تنہا دہلی پہنچے۔ جہاں اُن کو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور آپ کے بھائیوں کی شفقت نے ایسا گرویدہ کیا کہ سید صاحب ساری عمر کے لیے اسی در کی خاک بن گئے۔

سید صاحب باقاعدہ مولوی تو نہیں بن سکے لیکن آپ نے روحانی کمالات پوری طرح حاصل کیے۔ اور جب حالات کا تقاضا ہوا کہ ہر باشندہ ملک انگریزوں کے خلاف جنگ جو سپاہی بن جائے۔ تو آپ کی سپاہیانہ طبیعت کی مناسبت سے شاہ عبدالعزیز صاحب نے آپ کو نواب امیر علی خاں اور جسونت راؤ ہلکر کی فوج میں کام کرنے کے لیے بھیج دیا۔

یہ امیر علی خان جو جسونت راؤ ہلکر کے ساتھی تھے۔ یہ بھی کوئی خاندانی نواب یا بادشاہ نہیں تھے۔ بلکہ ایک

غریب پٹھان کے ہونہار فرزند تھے۔ محمد حیات خاں اُن کے والد کا نام تھا۔ یہ اول نواب دوندے خاں روہیلہ کے یہاں فوج میں ملازم رہے۔ اور جب انگریزوں کی مدد سے شجاع الدولہ نے روہیلہ حکومت کو ختم کر دیا تو محمد حیات خاں تارک الدنیا بن کر سنبھل میں اقامت گزیں ہو گئے اور کھیتی کے پیشہ سے بسر اوقات کرنے لگے۔ امیر علی خاں کی پر جوش طبیعت اور بلند فطرت نے آگے قدم بڑھایا اور بیس سال کی عمر تھی کہ وطن سے نکل کر مختلف شہروں کا دورہ کرتے ہوئے ایک پارٹی تیار کی پھر رفتہ رفتہ جسونت راو ہلکر کے رفیق اور دوست بن کر اس کی فوجی مہموں میں دست راست بلکہ سیاہ سپید کے مالک بن گئے۔

بہر حال آخری جدوجہد کا جو دور ۱۸۰۹ء سے شروع ہوا تھا وہ ۱۸۱۷ء و ۱۸۱۸ء میں (مارکوئس ہسٹنگز کے دور حکومت میں) ہندوستانیوں کی بدقسمتی پر آخری مہر لگا کر ختم ہوا۔ مرہٹوں کے سب سے بڑے سردار باجی راو پیشوا کو معزول کر کے کانپور کے قریب ایک چھوٹے سے قصبے بٹھور میں بھیج دیا گیا۔ سید زین عرب کی کمان میں عربوں کی فوج اور روہیلہ پٹھانوں کی فوج کا ایک دستہ جو آخر تک باجی راو کے ساتھ رہا تھا منتشر کر دیا گیا۔[۱۲۶] آپا صاحب والی ناگپور بھی اسی سال معزول کر کے گرفتار کر لیے گئے عربوں کا ایک دستہ راجہ کی معزولی کے بعد بھی کئی روز تک محل کی حفاظت کرتا رہا۔ مگر آخر کار اس کو بھی ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا گیا۔[۱۲۷] پنڈاریوں کا سردار چیتو جو کبھی مہاراجہ دولت راو سیندھیا سے اور کبھی راجہ مان سنگھ والی جودھ پور سے درخواست کرتا رہا کہ میرے بال بچوں کی پناہ کے لیے جگہ مل جائے تو میں انگریزوں کا سارا علاقہ کلکتہ سمیت لوٹ کھسوٹ کر کے تباہ و برباد کر دوں،[۱۲۸] جان بچا کر بھاگنے پر مجبور ہوا۔ اس کے ساتھی قادر بخش اپنے ہمراہیوں کے ساتھ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوا جسے گورکھ پور بھیج دیا گیا۔

مہاراجہ ہلکر جو پے در پے ناکامیوں کے بعد اپنا دماغی توازن[۱۲۹] کھو بیٹھا تھا، اندور کے چھوٹے سے علاقہ پر قانع بنا دیا گیا۔ امیر خاں کو ٹونک اور اس کے ساتھی غفور خاں کو سرونج کا علاقہ دے کر خاموش کر دیا گیا۔

اب صرف سیندھیا ایسا حکمران رہ گیا جس کے وسائل میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ البتہ بقول سر جان میلکم اس نے اپنے افعال سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اب اس کے تمام حوصلے پست ہو چکے ہیں۔[۱۳۰]

امیر علی خاں سے سید صاحب کی علیحدگی

سید صاحب کی رائے نہیں[۱۳۱] تھی کہ امیر علی خاں ہتھیار ڈال کر نوابی اختیار کر لیں، اور جب اُن کی رائے نہیں مانی گئی اور صلح کی طرف امیر علی خاں کا رجحان بڑھتا رہا تو سید صاحب نے امیر خاں کو وداع کیا اور صلح سے پہلے ہی ۱۸۱۶ء میں دہلی تشریف لے آئے۔[۱۳۲]

نواب امیر خاں جو سید صاحب کا وہی احترام کرتا تھا جو ایک شیخ اور پیر کا کیا جاتا ہے۔ اس جدائی سے بہت متاثر ہوا۔ مگر نظریوں کے فرق کے بعد سید صاحب کے لیے لشکر میں قیام ناممکن تھا۔ تاہم امیر خاں نے اظہار

عقیدت کے لیے اپنے لڑکے وزیر الدولہ کو حکم کیا کہ وہ دہلی تک سید صاحب کی رفاقت میں ہم رکاب جائیں۔ (۱۴۳)

بہر حال ۱۸۱۸ء ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ہندوستان کی تمام چھوٹی بڑی طاقتیں انگریز کے سامنے سر نیاز خم کر چکی تھیں۔ انگریزی اقتدار کا جھنڈا درہ خیبر سے راس کماری تک اور بمبئی سے لے کر آسام اور برما کے سواحل تک لہرانے لگا تھا۔ اب کوئی نہیں تھا کہ انگریزی اقتدار کے سامنے گردن ٹیڑھی کر سکے البتہ ایک طاقت تھی جو کسی طرح انگریزی اقتدار کے سامنے سر جھکانے کو تیار نہیں تھی۔ یہ وہی طاقت تھی جس کی تربیت شاہ ولی اللہ کے اُصول پر ہوئی تھی۔ جس کا نصب العین "فک کل نظام" یعنی "ہمہ گیر مکمل انقلاب" ایک عرصہ پیشتر قرار پاچکا تھا، مایوسی کے اس تاریک دور میں اس طاقت کے سوز سے امیر حضرت شاہ عبدالعزیز نے اپنے بڑھاپے، بیماریوں اور نابینائی کے باوجود ہچکچانے یا پیچھے ہٹنے کے بجائے قدم آگے بڑھایا۔ انقلاب کا ایک مکمل پروگرام بنایا اور اپنے شاگردوں اور مریدوں کی صلاحیتوں کا جائزہ لے کر ذمہ داریاں تقسیم کر دیں۔

انقلابی پروگرام کی ذمہ داریاں اور تقسیم کار

۱۔ حضرت سید احمد صاحب کے زیر قیادت ایک گروپ بنایا گیا۔ مولانا عبدالحی صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب اس گروپ کے اہم ترین رکن اور سید صاحب کے مشیر خاص قرار دیے گئے، ان تینوں حضرات کی سب کمیٹی کے سپرد کیا گیا کہ:

ا: ملک میں دورہ کر کے روح انقلاب پیدا کریں۔

ب: رضا کار بھرتی کریں۔ اُن کو فوجی ٹریننگ دیں۔

ج: مالیہ فراہم کریں۔

د: دیگر ممالک سے تعلقات پیدا کریں۔

و: فوجی کارروائی یعنی باضابطہ جنگ۔

۲۔ دوسرا گروپ جس کی زمام قیادت خود حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنے ہاتھ میں لی اور اپنے سن رسیدہ مریدوں اور شاگردوں کو اس کا رُکن بنایا۔

ا: مرکز کو سنبھالنا اس کا فرض تھا۔

ب: تعلیم و تربیت کا وہ سلسلہ جو شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانہ سے جاری تھا، اور ہمہ گیر انقلاب کو کامیاب بنانے کے لیے جس کا باقی رکھنا ضروری تھا اسی گروپ کے ذمہ تھا۔

ج: اور جب پہلا گروپ محاذ پر پہنچ جائے تو ملک کی فضا کو ہم نوا بنانا۔ نئے رضاروں کی بھرتی اور فراہمی مالیہ وغیرہ کے تمام فرائض، اس گروپ کے سپرد تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے

علاوہ اس گروپ کے خاص خاص رکن یہ تھے:

مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب	دہلوی	مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب	دہلوی
مفتی رشید الدین صاحب	دہلوی	مفتی صدر الدین صاحب	دہلوی
مولانا حسن علی صاحب	لکھنؤ	مولانا حسین احمد صاحب	ملیح آباد
مولانا شاہ عبدالغنی صاحب	دہلوی		

سید صاحب کی قیادت کی وجہ

علم و فضل (۱۴۴) تحریر و تقریر، مقبولیت اور خاندانی شہرت میں مولانا عبدالحی صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب شہید، سید صاحب سے بڑھے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ عمر میں بھی یہ دونوں بزرگ سید صاحب سے بڑے تھے۔ کیونکہ جب سید صاحب کو اس گروپ کا لیڈر بنایا تھا تو سید صاحب کی عمر تقریباً چالیس سال تھی، اور مولانا عبدالحی صاحب کی عمر تقریباً پچاس سال اور مولانا اسمٰعیل صاحب کی عمر اڑتالیس سال تھی۔ خاندانی لحاظ سے مولانا عبدالحی صاحب حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے داماد تھے اور مولانا اسمٰعیل صاحب حقیقی بھتیجے۔ مگر سید صاحب کو زعیم اور قائد اس لیے بنایا گیا کہ محاذ جنگ کا جو عملی تجربہ سید صاحب کر چکے تھے، ان دونوں بزرگوں کو اس کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہ سب سے بڑی وجہ وہ روحانی کمالات تھے جن میں سید صاحب کا درجہ پوری جماعت میں سب سے فائق اور بڑھا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ سید صاحب کے پیر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنے تمام شاگردوں اور تمام اقارب واعزہ کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ سید صاحب سے باقاعدہ بیعت ہو کر اخلاقی اور روحانی کمالات کا استفاضہ کریں۔

ہمہ گیر انقلاب جس کا منشا صرف سیاسی نہ ہو بلکہ سماجی اصلاح بھی اس کا اہم مقصد ہو، اُسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب اُس کا لیڈر صرف مدبر و مفکر یا جرنیل ہی نہ ہو، بلکہ روحانی لحاظ سے بھی یہ درجہ رکھتا ہو کہ اُس کو شیخ وقت کہا جا سکے سید صاحب کے یہی روحانی اور اخلاقی کمالات تھے جنھوں نے بڑے بڑے اہل علم کو یہاں تک گرویدہ بنا دیا کہ بقول ڈبلو۔ ڈبلو۔ ہنٹر:

اُن کے مرید اُن کی روحانی فضیلت کو تسلیم کرتے ہوئے اُن کے ادنیٰ سے ادنیٰ کام کو بخوبی سرانجام دیتے تھے اور صاحب جاہ علماء (مولانا عبدالحی صاحب، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب، مولانا عنایت علی و مولانا ولایت علی صاحب وغیرہ) عام خدمت گاروں کی طرح اُن کی پالکی کے ساتھ ننگے پاؤں دوڑنا اپنے لیے فخر سمجھتے تھے۔ (۱۴۵)

حرکتِ عمل۔ انقلاب انگیز دورے

ایک طرف عوام کے وہ جذبات تھے جن کو احساسِ شکست برانگیختہ کر رہا تھا مگر بے رحم اجنبی اقتدار کی فوجی قوت ان کو دبائے ہوئے تھی۔ اور دوسری جانب خاندان ولی اللہ کی تربیت گاہ کے وہ اثرات تھے جنہوں نے منتشر طور پر ہمہ گیر انقلاب کے بیج بہت سے دماغوں میں بو دیئے تھے۔ ان جذبات و احساسات کے ساتھ جب لوگوں کو اس پارٹی کی تشکیل کا علم ہوا تو جگہ جگہ سے دعوت نامے پہنچنے لگے۔ چنانچہ دوروں کا پروگرام بنایا گیا اور آئندہ سات سال میں اس گروپ نے ملک اور بیرون ملک کے تین دورے کئے۔ (۱۳۶)

خدا سے تعلق، قربانی اور ایثار، ہمدردی خلق اللہ، باہمی تعاون، ضبط و تحمل، حق پسندی اور فدا کاری اس جماعت کا سرمایہ تھا، اور صرف اسی سرمایہ کے بھروسہ پر کوچ شروع کیا گیا۔

سید صاحب کے قافلہ کا پہلا دورہ

از دہلی تا رائے بریلی و از رائے بریلی تا بنارس و لکھنؤ

مارکوئس ہسٹنگز کی سخت گیر پالیسی حکومتوں کے تختے اُلٹ رہی تھی۔ باجی راؤ پیشوا، اپا صاحب والی ناگپور اور پنڈاریوں پر پے در پے فوج کشی ہو رہی تھی۔ ہلکر اور نواب امیر خاں اور سیندھیا کی طاقتوں کے گرد فوجی حصار قائم کیا جا رہا (۱۴۷) تھا کہ آزادی کے پروانوں اور خلق خدا کے خادموں کا یہ چھوٹا سا قافلہ جس کی تعداد صرف پچاس تھی۔ ۱۸۱۸ء و ۱۲۳۱ھ میں دہلی سے روانہ ہو گیا۔ (۱۴۸)

ہمہ گیر سماجی اور معاشی انقلاب اس کا نصب العین تھا۔ اُس نے اپنے دورہ کا ظاہری مقصد صرف سماجی اصلاح قرار دیا۔ مارکوئس ہسٹنگز کے دور میں سیاسی فہم و تدبر اور سوجھ بوجھ کا تقاضا بھی یہی تھا۔ سید صاحب، مولانا عبدالحی صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب کے علاوہ اس قافلہ کے نمایاں افراد یہ تھے۔

مولانا محمد یوسف صاحب خلف حضرت شاہ اہل اللہ صاحب (یعنی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے بھتیجے) مولوی وجیہ الدین سہارن پوری، مولانا وحید الدین صاحب، اُن کے بھائی حافظ قطب الدین صاحب (پھلت) حکیم مغیث الدین صاحب (سہارن پور) شاہ ابوسعید صاحب دہلوی خلف حضرت شاہ غلام علی صاحب۔

آپ نے دہلی کے شمالی جانب کوچ شروع کیا۔ غازی الدین نگر (موجودہ غازی آباد) مراد نگر، میرٹھ، سردھنہ، بڑھانہ، پھلت، مظفر نگر، دیوبند، سہارن پور ہوتے ہوئے گنگوہ مکتیسر پہنچے۔ وہاں سے رام پور، بریلی شاہجہان پور تشریف لے گئے۔ تقریباً چار ماہ اس دورہ پر صرف ہوئے۔ ابھی اس دورہ کا پروگرام جاری تھا کہ رائے بریلی میں آپ کے برادر حقیقی سید اسحاق صاحب کی وفات ہو گئی۔ اب مجبوراً آپ کو وطن جانا پڑا۔ پورا قافلہ آپ کے ساتھ تھا جس کی تعداد پچاس سے بڑھ کر اسی ہو گئی تھی۔

خانگی ضرورتوں سے زیادہ مقاصد تحریک کا تقاضا یہ تھا کہ کچھ عرصہ قیام کر کے نئے ساتھیوں کی تربیت کریں۔ چنانچہ رائے بریلی کی خاندانی خانقاہ (تکیہ شاہ علم اللہ) میں چند ماہ قیام کر کے ساتھیوں میں نئی روح عمل پیدا کی گئی۔ اس عرصہ میں وہ لوگ بھی آ پہنچے جو اپنی اپنی جگہ قافلہ سے متاثر ہو چکے تھے، مگر اس وقت قافلہ کے ساتھ روانہ نہیں ہو سکے تھے۔ ان نو واردوں نے قافلہ کی تعداد اسی قیام کے زمانہ میں ایک سو ستر تک پہنچا دی۔ اس طویل قیام کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ آپ کے عجیب و غریب قافلہ کا چرچا پورے اودھ اور اضلاع کانپور و الہ آباد وغیرہ میں پھیل گیا۔ جگہ جگہ سے بلاوے آنے لگے۔ اب آپ نے رائے بریلی سے الہ آباد کا رُخ کیا۔ دیہات و قصبات میں تھوڑا تھوڑا قیام کرتے ہوئے پورے ایک مہینہ بعد الہ آباد پہنچ سکے الہ آباد سے کانپور پھر

بنارس، سلطان پور وغیرہ قیام کرتے ہوئے آپ وطن تشریف لائے، اور تقریباً دو ہفتہ رائے بریلی قیام کر کے صوبہ اودھ کے دارالسلطنت یعنی لکھنؤ تشریف لے گئے۔

سماجی اصلاحات اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تربیت

اس دورہ میں زیادہ تر سماجی اصلاحات کی گئیں۔ مثلاً سہارن پور میں معلوم ہوا کہ وہاں پسماندہ برادریوں کی حالت یہ ہے کہ پسماندہ برادری کا کوئی فرد:

❶ وہ کھانا نہیں پکا سکتا جو امراء کے یہاں خاص طور سے پکائے جاتے ہیں۔

❷ وہ کسی بڑے آدمی کی دعوت نہیں کر سکتا۔

❸ نہ اپنے بچہ کا وہ نام رکھ سکتا ہے جو کسی بڑے آدمی کا ہو۔

سید صاحب کے قافلے نے سب سے پہلے اس مرض کی اصلاح کی۔ اس کوشش میں بیس روز تو صرف ہوگئے مگر کامیابی ایسی ہوئی کہ آج اس کا تذکرہ بھی افسانہ معلوم ہوتا ہے۔

دیوبند میں شیخ حفیظ اللہ صاحب کے معزز خاندان میں السلام علیکم کی بجائے آداب اور بندگی کا رواج تھا آداب عرض یا بندگی کے لفظ سے مخاطب کی تعظیم تو ہوجاتی ہے مگر مساوات اور بھائی چارہ کی تلقین جو "السلام علیکم" کی رُوح ہے، فنا ہوجاتی ہے۔ مغرور گھرانوں کو یہ بات ناگوار ہونے لگی تھی کہ چھوٹا آدمی اُن کو "السلام علیکم" کہے۔ یہ لفظ صرف برابر کے درجہ والوں کے لیے مخصوص کردیا گیا تھا اور چھوٹے آدمیوں کا فرض قرار دیا گیا تھا کہ وہ آداب عرض، آداب یا بندگی جیسے الفاظ استعمال کریں۔ رفتہ رفتہ ہر چھوٹے آدمی نے بڑے کو "آداب عرض" کہنا شروع کردیا۔ چنانچہ بیٹا باپ کو، چھوٹا بھائی بڑے بھائی کو السلام علیکم نہیں کہہ سکتا تھا۔ بلکہ آداب عرض کہتا تھا۔ چونکہ تکلفاً ہر شخص اپنے آپ کو چھوٹا ظاہر کیا کرتا ہے لہذا بڑے لوگ بھی آداب عرض ہی کہنے لگے، اور چھوٹے لوگوں کے لیے بندگی کا لفظ مخصوص ہوگیا۔

سید صاحب کی انقلابی جماعت جس کا بنیادی مقصد تھا، کہ انسانی بھائی چارہ قائم کیا جائے اور اونچ نیچ کے جراثیم دماغوں سے نکالے جائیں، اُس نے سب سے پہلے اپنے خاندان سے اس رواج کو ختم کیا۔ پھر جہاں جہاں یہ مرض موجود تھا، اس کی اصلاح ضروری تھی۔ چنانچہ دیوبند میں شیخ صاحب کے خاندان سے بھی یہ رواج (۱۳۱) موقوف کرایا اور آج نہ صرف کوئی ایک خاندان بلکہ دیوبند کا ہر ایک خاندان السلام علیکم کے علاوہ کسی اور لفظ سے آشنا نہیں ہے۔ البتہ ہندو دوستوں کو آداب عرض کہا جاتا ہے۔

ہندو مسلم بھائی چارہ

مسلمانوں کی طرح ہندو بھی سید صاحب کے قافلہ کا اعزاز و احترام کرتے تھے۔ چنانچہ غازی الدین نگر میں جن لوگوں نے نذرانہ پیش کر کے عقیدت و محبت کا اظہار کیا، اُن میں ہری رام صاحب تحصیل دار کا نام بھی

خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے۔[۱۴۰]

سہارن پور میں قیام زیادہ رہا، تو وہاں مسلمانوں کی طرح ہندوؤں نے بھی آپ سے تعلق بڑھایا۔ آپ بھی اُن کے یہاں تشریف لے گئے اور کھانا کھایا۔ تحصیل دار دھوکل سنگھ کے یہاں دعوت کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں اس کو سیرت سید احمد شہیدؒ کے الفاظ میں یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

> "ایک روز تحصیل دار دھوکل سنگھ آئے اور کھڑے کھڑے عرض کیا کہ کل اس غلام کے یہاں جناب کی دعوت ہے۔ آپ نے فرمایا تشریف رکھیے انہوں نے کہا کہ جب تک میری دعوت قبول نہیں ہوگی، نہیں بیٹھوں گا آپ نے فرمایا قبول ہے۔ تحصیل دار بیٹھ گئے اور عرض کیا کہ کل کس وقت سواری لے کر حاضری ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ دو گھڑی دن نکلے کسی کو بھیج دیا جائے، ہم آجائیں گے۔ دوسرے روز وقت مقررہ پر اپنے عملہ کے دو سو آدمیوں کے ساتھ جن میں سے اکثر مسلمان شرفا تھے حاضر ہوئے۔ آپ سوار ہو کر اُن کے مکان پر تشریف لے گئے۔ اُن کے تمام مسلمان ہمراہی شرفِ بیعت سے مشرف ہوئے۔ تحصیل دار نے بڑی پر تکلف انواع واقسام کے کھانوں سے ضیافت کی۔ کھانے کے بعد عطریات اور پان سے تواضع کی۔ شام کے وقت پھر حاضر ہو کر تمام قافلہ کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اس وقت پلاؤ وغیرہ اور اکثر مٹھائیاں تھیں۔ تحصیلدار صاحب نے اعزاز و اکرام، تواضع اور خاطر داری میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔"[۱۴۱]

ورزش اور چاندماری

اصلاحی خدمات اور رُوحانی مشاغل کے ساتھ سپاہیانہ ورزشیں بھی جاری رہتیں۔ قصبہ پھلت چونکہ خاندان شاہ ولی اللہ کا اصلی وطن تھا وہاں دو ہفتہ سے زیادہ قیام کا موقع ملا، تو باقاعدہ مٹی کا ایک تودہ تیار کرالیا گیا۔ جس پر نشانہ کی مشق کی جاتی تھی۔ پہلے تقریباً ایک گھنٹہ ورزش ہوتی۔ بدن پر مالش کی جاتی۔ پھر نشانہ کی مشق کی جاتی۔

لکھنؤ میں تقریباً تین ماہ قیام رہا۔ قیام گاہ سے کہیں تشریف لے جاتے تو بسا اوقات ایک فوجی سپاہی کی طرح پورے ہتھیار لگا کر تشریف لے جاتے۔ ایک روز آپ قندھاریوں کی چھاؤنی میں تشریف لے جارہے تھے۔ آپ بھی پورے ہتھیار لگائے ہوئے تھے، اور آپ کے ساتھی بھی اسی طرح ہتھیار بند تھے۔ عبدالباقی خاں صاحب نے آپ کی یہ شان دیکھی تو عرض کرنے لگے۔ حضرت آپ کی تمام باتیں بہت اچھی ہیں مگر یہ تلوار بندوق وغیرہ اسباب جہالت آپ کے بدن پر زیب نہیں دیتے۔ آپ جس خاندان کے چشم وچراغ ہیں یہ اسلحہ بندی اُس کی روایات کے بھی خلاف ہے۔ آپ نے عبدالباقی خاں صاحب کے یہ الفاظ سُنے تو غصہ سے چہرہ سرخ ہوگیا۔ فرمانے لگے۔ جس چیز کو رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) نے استعمال کیا آپ اس کو اسباب جہالت

www.besturdubooks.wordpress.com

فرماتے ہیں رسول اللہ ہتھیار باندھ کر میدانِ جنگ میں تشریف لے جائیں اور آپ اسلحہ بندی کو شان بزرگانہ کے لیے عار قرار دیں۔ تف ہے اس شان بزرگانہ پر۔ (۱۴۳)

جفاکشی اور ضبط وتحمل

رائے بریلی میں چند ماہ قیام رہا۔ اس کے متعلق سوانح نگاروں کا متفقہ بیان یہ ہے۔

''یہ قیام عجیب ذوق وشوق، لذت وحلاوت اور جفاکشی کا تھا، اور مہاجرین کے قیام مدینہ منورہ سے بہت مشابہ تھا۔ سید صاحب اور رفقاء جن میں ہندوستان کے جلیل القدر علماء اور صاحب سلسلہ مشائخ بھی تھے، بڑے ذوق سے اپنے ہاتھوں سے مشقت کے کام کرتے، لکڑیاں چیرتے، گھاس چھیلتے، اینٹیں تھاپتے، مسجدیں تعمیر کرتے۔ فاقہ اور ہر حال میں خوش رہتے۔ ان میں اچھے اچھے عالی خاندان، خوش حال امیر اور رئیس زادے بھی تھے۔ بہت سے نازک طبع اور ناز پروردہ نوجوان تھے۔ اُن کے گھر میں کسی بات کی کمی نہیں تھی۔ بعضوں کے سینکڑوں ہزاروں معتقد ومرید تھے۔ مگر گھر بار، عیش وآرام، مشیخت ومخدومیت چھوڑ کر اس در پر پڑے ہوئے تھے اور ہزار درجہ خوش تھے۔ انہیں میں شاہ عبدالرحیم صاحب بھی تھے جن کے ہندوستان میں ہزار ہا مرید تھے۔ لیکن وہ یہاں مخدوم سے خادم اور مراد سے مرید بنے ہوئے تھے۔ مولانا محمد یوسف پھلتی مخدوم جہاں، اور خاندان ولی اللہی کے چشم وچراغ مولانا عبدالحی صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب بھی تھے۔'' (۱۴۴)

خود امیر قافلہ یعنی سید صاحب کی حالت یہ تھی:

''عام لوگوں کے ساتھ مشقت کے کاموں میں شریک ہوتے۔ لکڑیاں چیرتے، بوجھ اٹھاتے''۔

(سیرت ۱۱۹)

قافلہ کے لیے سوال کرنے کی سخت ممانعت تھی۔ ایسا شخص پارٹی میں شریک نہیں رہ سکتا تھا جو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ جب پارٹی کے پاس کوئی سرمایہ نہ ہو، تو یہ اصول فاقہ کشی کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اور فاقہ کی عادت وہ زینہ ہے کہ جو قدم یہاں مضبوطی سے جم جاتا ہے بڑی مصیبت بھی اس کو ڈگمگا نہیں سکتی۔

یہ خدائی فوج بھوک پیاس برداشت کرنے کی یہاں تک عادی ہوگئی تھی کہ کئی کئی وقت کا فاقہ بھی اس کی بشاشت اور زندہ دلی میں فرق نہیں پیدا کر سکتا تھا۔

مولانا محمد علیؒ صاحب، حضرت سید صاحب کے بھانجے تھے۔ آپ مخزنِ احمدی کے مصنف بھی ہیں جس میں سید صاحب کے حالات آپ نے قلمبند کیے ہیں۔ آپ بھی قافلہ میں داخل ہوئے۔ ابھی چند روز گذرے تھے کہ قافلہ میں فاقہ کی نوبت آگئی۔ اتفاق سے اُسی روز بارش کی جھڑی لگ گئی۔ اب گویا فاقہ اور جھڑی میں مقابلہ تھا۔ نہ جھڑی ختم ہونے میں آتی تھی، نہ فاقہ ٹوٹنے کی کوئی صورت نکلتی تھی۔ مولانا صاحب نو گرفتار تھے۔ یہ

بھوک سے بہت پریشان، مگر عجیب تماشا دیکھ رہے تھے کہ یہ تو بھوک اور فاقہ سے نڈھال اور سید صاحب اور اُن کے ساتھیوں کے ہنسی مذاق اور زندہ دلی کی یہ حالت کہ وہم بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ ان کو فاقہ ہے۔ (۱۴۴)

حقیقت یہ ہے کہ جو جماعت فاقہ کی عادی ہو، اُس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں کہ تہائی چوتھائی پیٹ کھا کر وقت گذار دے۔ چنانچہ آپ کی سوانح میں ایسے واقعات بکثرت ملتے ہیں کہ تھوڑا سا کھانا بہت سے آدمیوں کے لیے کافی ہوگیا۔

سوانح نگار اس کو سید صاحب کی کرامت قرار دیتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ قافلہ کے سب ہی ساتھیوں کی کرامت تھی کہ وہ لذت فاقہ سے آشنا اور بھوکے پیٹ کام کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ (۱۴۵)

اس سے بہتر دوسری توجیہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی ان بزرگوں کی عادت ثانیہ بن گئے تھے کہ مومن کے لیے چند لقمے کافی ہیں جن سے کمر سیدھی رہ سکے۔ اگر اس پر قناعت نہ ہو تو صرف ایک تہائی پیٹ کھائے۔ باقی حصہ پانی اور سانس کے لیے چھوڑ دے۔ (۱۴۶ الف)

سادگی اور ہر ایک حالت کی برداشت اس تربیت کا ایک اہم جزو تھا۔ اس کی ایک دلچسپ مثال کے لیے اسی دورے کا ایک واقعہ ملاحظہ فرمایئے۔

جب رائے بریلی سے الہ آباد کا سفر ہو رہا تھا تو راستہ میں ایک روز ایسے مقام پر ٹھہرنا ہوا، جو بے چراغ ہو چکا تھا، بڑی مشکل سے کھچڑی پکانے کا سامان فراہم ہوا۔ رکابیاں یا سینیاں ساتھ نہ تھیں۔ ایک کوئیں کی پختہ مینڈ کو دھو کر صاف کیا۔ کھچڑی اُسی پر ڈال لی اور درویشان باخدا کا یہ قافلہ خوشی خوشی کھا کر ذکر وفکر میں مشغول ہوگیا۔ (۱۴۶۔ب)

الہ آباد میں شیخ غلام علی صاحب کے بیش قیمت ہدایا میں ایک نہایت قیمتی قالین بھی سید صاحب کی خدمت میں پیش ہوا۔ تمام ہدایا ضروریات جہاد میں کام آئے۔ اس قالین پر سید صاحب ایک مرتبہ شیخ صاحب کی خاطر سے بیٹھے۔ پھر ساتھیوں میں سے ایک نے عرض کیا اُس کے پاس لحاف نہیں ہے۔ سید صاحب نے یہ قالین اُٹھا کر اُس کو دے دیا۔ (۱۴۷)

بنارس میں تیموری شاہزادے بیعت ہوئے تو اُنھوں نے بیش قیمت کپڑے نذر کیے۔ آپ نے اپنے خزانچی مولانا محمد یوسف صاحب کو حکم فرمایا کہ ان کو فروخت کر کے گاڑھے اور گزی کے تھان خرید لو اور تمام ساتھیوں میں تقسیم کر دو، تاکہ وہ ضرورت کے مطابق کپڑے بنوالیں۔ (۱۴۸)

جہاد حریت کی ترغیب

لکھنؤ میں ایک مرتبہ کچھ لوگ بیعت ہوئے اور آپ سے تبرک کی درخواست کی۔ آپ نے اُن کو کچھ روپے برکت کے لیے عطا فرمائے اور نصیحت فرمائی کہ اپنے اپنے گھر کی عورتوں کو ہمیشہ تاکید کرتے رہو کہ کسی طرح کا

شرک نہ کریں، اور جو اللہ تعالیٰ تم کو روزی کی فراغت دیوے تو نیت خالص جہاد فی سبیل اللہ کی رکھنا، خواہ جان سے خواہ مال سے۔ اور اگر نیت خالص نہ ہوگی تو تمہارے حق میں نقصان ہوگا۔ اس بات کو خوب سمجھ لو۔

اُنہوں نے عذر کیا کہ اگر ہم اپنی جان سے نیت جہاد کی کریں اور جائیں تو یہاں ہمارے اہل وعیال کی کون خبر لے گا اور کون کھانا کپڑا دے گا۔ اور جو جہاد مال کی نیت کریں تو ہمارے پاس مال کہاں؟ فرمایا جب اللہ تعالیٰ تمہیں مال ودولت دے تب تم پر یہ حکم ہے، اس کے بغیر نہیں۔ سب نے اس کا عہد کیا کہ انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی کریں گے۔ (۱۴۹)

امان اللہ خاں، سبحان خاں، مرزا ہمایوں بیگ، غلام رسول خاں، غلام حیدر خاں اور صدر خاں وغیرہ کا لکھنؤ میں ایک گینگ تھا جو چوری اور قزاقی میں کمال رکھتا تھا۔ قافلہ کی شہرت سُن کر ایک روز امان اللہ خاں اور سبحان خاں قافلہ والوں کو دیکھنے آئے۔ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سید صاحب کے نصیحت آمیز ارشادات نے پہلی ہی مجلس میں اُن کی کایا پلٹ دی۔ یہ اپنی تمام حرکتوں سے تائب ہوکر قافلہ میں شریک ہوگئے۔

اُن کی اصلاح سے اُن کے دوسرے ساتھی بھی متاثر ہوئے۔ وہ بھی سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی تمام حرکتوں سے تائب ہوگئے۔ جب سید صاحب لکھنؤ سے روانہ ہونے لگے تو اُن لوگوں نے بھی ساتھ چلنے کی درخواست کی۔ سید صاحب نے فرمایا:

''ابھی تم اپنے مکان پر رہو۔ جب ہم ہجرت کریں گے تم کو ضرور ساتھ لیں گے۔'' (۱۵۰)

فقیر محمد خاں ایک رسالہ کے رسالدار تھے جو سید صاحب سے بیعت ہو چکے تھے۔ آپ نے غلام رسول خاں وغیرہ کو اُن کے رسالہ میں بھرتی کرا دیا۔ (۱۵۱) اس طرح جائز ذریعہ معاش بھی بہم ہو گیا اور فوجی تربیت کا انتظام بھی ہو گیا۔

اسی طرح زنانوں میں اصلاح اور بیعت کا سلسلہ چلا۔ اُن کو بھی خاص خاص اصلاحی ہدایات دے کر فقیر محمد خاں صاحب کو رسالدار کے رسالہ میں بھرتی کرا دیا۔ (۱۵۲) قیامِ لکھنؤ کے زمانہ میں خود سید صاحب کی حالت یہ تھی:

''آپ اکثر اسلحہ لگاتے تاکہ دوسروں کو اس کی اہمیت معلوم ہو، اور شوق ہو۔ آپ نے ایک مرید کو تمنچہ دیا اور کہا۔ جہاد فی سبیل اللہ کی نیت سے ہتھیار لگاؤ۔ پیٹ بھر کر کھاؤ اور اسلحہ کے استعمال کی مشق کرو۔ اس سے بہتر کوئی فقیری اور درویشی نہیں''۔

مصنف وقائع احمدی کا بیان ہے:

''آپ کو سب سے زیادہ خیال جہاد کا رہتا تھا۔ جس کو مضبوط وتوانا دیکھتے، فرماتے۔ یہ ہمارے کام کا ہے۔ موراثین (ضلع اناؤ) کے شمشیر خاں، اللہ بخش، شیخ رمضان اور مہربان خاں ملاقات کو

آئے۔ چاروں بڑے ڈیل ڈول کے نوجوان تھے۔ آپ اُن کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ ایسے جوان ہمارے کام کے ہیں۔ پیرزادے لوگ ہمارے کام کے نہیں ہیں اور بہت تعریف کی۔ یہ نوجوان آپ کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئے اور آپ کے حلقہ میں داخل ہو گئے۔"(۱۵۳)

رفتہ رفتہ آپ کا کیمپ فوجی تربیت گاہ بن گیا، اور جو وقت مشاغل صوفیاء یعنی ذکر و مراقبہ میں صرف ہوتا تھا، فنون حرب اور فوجی پریڈ میں صرف ہونے لگا۔ یہ تبدیلی کچھ لوگوں کو اوپری معلوم ہوئی۔ چنانچہ ایک وفد نے خاص طور پر حضرت سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا شک وشبہ پیش کیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ سپاہیانہ کرتبوں کی مشق بظاہر مادی چیز ہے مگر اس کا مقصد نفع اندوزی یا ذاتی سربلندی نہیں۔ بلکہ اس کا مقصد ہے خدمت خلق، مظلوموں کی ہمدردی، اعلیٰ اور بلند مقاصد کے لیے اپنے آپ کو قربان کر دینا۔ تصوف، سلوک اور فقیرانہ زندگی کی اصل روح یہی ہے۔ جو تصوف اس روح سے محروم ہو وہ اکارت ہے۔ پس ان چیزوں میں مشغول رہنا، مادہ پرستی نہیں بلکہ حقیقی روحانیت اور اعلیٰ قسم کا تصوف ہے۔ آپ نے مزید تشفی کے لیے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ولایتی کا حوالہ دیا جو اس زمانہ کے بہت بلند پایہ صوفی تھے اُن کے ہزاروں مرید تھے، اور سہارن پور سے قافلہ میں شریک ہوئے تھے۔ شاہ صاحب نے جواب دیا:

"سید صاحب کو دیکھ کر میں نے اپنے تمام مریدوں سے کہہ دیا تھا کہ اب روحانی کامیابی کا راستہ صرف وہی ہے جو سید صاحب اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہی راستہ اختیار کرو اور سید صاحب سے بیعت ہو جاؤ۔ چنانچہ تم دیکھتے ہو، میں خانقاہ کی پرسکون زندگی ترک کر کے قافلہ کے ساتھ لگا ہوا ہوں۔ کہاں وہ آرام وسکون جو خانقاہ میں میسر تھا اور کہاں یہ زحمت وتکلیف کہ اینٹیں تھاپتا ہوں، دیواریں تعمیر کرتا ہوں، گھاس چھیلتا ہوں لکڑی چیرتا ہوں مگر جو خیر وبرکت اور روحانی اطمینان اس میں میسر ہے خانقاہی زندگی میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں تھا۔"(۱۵۴)

مصنف وقائع احمدی کا بیان ہے:

"چونکہ حاجی صاحب مانے ہوئے باکمال پیر تھے جو تصوف کے تمام کمالات میں اونچا درجہ رکھتے تھے۔ آپ کی تقریر سُن کر سب لوگ مطمئن ہو گئے اور پھر دل وجان سے جہاد کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ دن رات یہی مشغلہ تھا۔ بہیر ماری، تیر اندازی، چورنگ لگاتے اور فنون سپہ گری کی پوری مشق کرتے۔ (سیرت سید احمد شہید، ۱۷۰)

مقامی نقیب اور ذمہ دار کارکن

سید صاحب جہاں جہاں پہنچتے تھے، ایسا انتظام (۱۵۵) کرتے جاتے تھے کہ اس عارضی دورہ کے اثرات

ہمیشہ ہمیشہ باقی رہیں، اور جو بیج بوئے گئے ہیں وہ درخت بن کر پھلیں اور پھولیں۔ چنانچہ ہر جگہ اپنے خلیفہ مقرر کرتے جاتے تھے، جن کو ہم نقیب کے نام سے تعبیر کر رہے ہیں۔ ذیل کے نقشہ میں سید صاحب کے خلفاء اور اُن حضرات کے نام درج کئے جاتے ہیں جنہوں نے قافلہ کو اپنے یہاں دعوت دے کر بلایا یا قافلہ کے پہنچنے پر قافلہ کی خدمت میں پیش پیش رہے۔

مقام: نام

غازی الدین نگر: حافظ عبداللہ صاحب امام مسجد شیخ عبدالرحمٰن صاحب۔ شیخ رمضان صاحب عبدالشکور خان صاحب۔ امام خان صاحب جمعدار۔

مراد نگر: مولوی ابوالقاسم صاحب تھانہ دار۔ یہ اس جماعت کے مشہور اور بہت باعزت و عظمت رکن مفتی الٰہی بخش صاحبؒ کے صاحبزادے تھے۔ سرکاری ملازم تھے مگر تحریک سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔

میرٹھ: قاضی حیات بخش۔ مولوی احمد اللہ صاحب خلف قاضی صاحب مذکورہ [دس روز قیام] داروغہ محمد راحم صاحب۔ منشی محمدی انصاری بردوانی۔ مولوی محمد بخش صاحب (پندرہ متوسلین سمیت)۔ مولوی خدا بخش صاحب رئیس میرٹھ قدن خاں۔ صدرالدین صاحب اور اُن کے بھائی کریم بخش صاحب روٹی والے۔ محمد تقی صاحب قصاب (جو انگریزوں میں گوشت کے بڑے ٹھیکیدار تھے)۔ بدرالدین صاحب۔ خواجہ محمد خانساماں۔

میرٹھ سے سردھنہ جاتے ہوئے سردھنہ (ضلع میرٹھ): موضع داتل۔ موضع پانچلی موضع کبروی میں تھوڑی دیر قیام فرمایا جہاں نماز کا وقت ہو گیا، نماز پڑھی۔ شیخ بلند بخت دیوبندی۔ منشی خواجہ محمد حسن پوری۔ حافظ امان اللہ نشان بردار۔ ابوعلی بخش۔ نصراللہ۔ بچھے خاں۔ بہرخاں دوارابِ خاں پسران بچھے خاں۔ ملو خاں رسالدار۔ مراد خاں۔ مدے خاں، عظیم اللہ بیگ کمیدان۔

ان میں سے بعض نے سید صاحب کی زیر قیادت جہاد میں عظیم الشان کارنامے انجام دیے ہیں۔ سپاہیوں نے دعوت طعام پر اصرار کیا تو فرمایا۔ اس شرط پر منظور کرتا ہوں کہ جو کچھ میں کہوں پکایا جائے۔ انہوں نے مان لیا۔ فرمایا، جو کی روٹی اور ماش کی دال کھاؤں گا، ایسی دعوت میں امیر غریب سب شریک ہو سکتے ہیں۔

بڑھانہ (ضلع میرٹھ): قیام بارہ روز مولانا عبدالحی صاحب جو قافلہ کے معزز رکن اور سید صاحب کے دست راست تھے۔ بڑھانہ کے باشندے تھے۔ ان کے یہاں قافلہ کا قیام ہوا۔

میاں نظام الدین صاحب چشتی۔ شیخ علاؤ الدین صاحب۔ شیخ محمد حسن صاحب۔ شیخ ابوبکر صاحب۔ بڑھانہ کے حضرات اس علاقہ میں حضرت سید صاحب کی تحریک کے خاص کارکن تھے۔

بڑھانہ سے پھلت جاتے ہوئے: موضع ایڑنی، موضع چولی۔ موضع بہرسور میں تھوڑی دیر قیام رہا۔

پہلت (ضلع مظفر نگر): شیخ ولی محمد، اُن کے والد محمد فضیل۔ شیخ غلام محمد صاحب۔ شیخ محمد عارف صاحب۔ حافظ غلام علی صاحب۔ حافظ معین الدین صاحب

قیام سترہ روز: حافظ احمد الدین صاحب۔ عبدالعلی صاحب۔ شیخ محمد عثمان صاحب میاں عصمت اللہ صاحب۔ ان کے والد شیخ صبور اللہ میاں سعد الدین صاحب۔ حافظ محمد حسین صاحب۔ مولانا اسمٰعیل صاحب شہید کے خالہ زاد بھائی میاں جمال صاحب۔ حافظ محمد عثمان صاحب۔ برادر مولانا محمد یوسف صاحب۔ عبدالرزاق صاحب۔ حافظ قطب الدین صاحب۔ حکیم قمر الدین صاحب۔ میاں صلاح الدین صاحب۔ شیخ عبدالروف صاحب۔ شیخ عبدالحکیم صاحب۔ محسن خاں صاحب۔

پہلت سے مظفر نگر جاتے ہوئے: موضع بیوپاڑی میں ناشتہ کیا۔

مظفر نگر: قاضی نجم الدین صاحب (پندرہ آدمیوں سمیت)

دیوبند: سید مقبول صاحب۔ مولوی شمس الدین صاحب۔ شیخ حفیظ صاحب

قیام دس روز: دیوبندی۔ شیخ رجب علی صاحب۔ اُن کے فرزند منور علی صاحب۔ مولوی فرید الدین صاحب۔ مولوی بشیر اللہ صاحب۔

املیا: جب دیوبند میں آپ کا قیام تھا تو چند گھنٹوں کے لیے آپ موضوع املیا بھی تشریف لے گئے۔ حافظ عبداللہ صاحب اور اُن کے بھائی کریم الدین صاحب اور نظام الدین صاحب اور اُن کے والد امام بخش صاحب داعی اور میزبان تھے۔ حافظ عبداللہ صاحب حج اور جہاد میں شریک رہے۔

مظفر نگر سے دیوبند تک مختلف مقامات میں جن فدایانِ حق کے نام لیے جاتے ہیں، اُن میں مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ یہ اسماءِ گرامی بھی ہیں۔ کرامت حسین صاحب۔ محمد ماہ صاحب۔ شیخ چاند صاحب۔ مولوی فرید الدین صاحب مولوی بشیر اللہ صاحب۔ سید محمد حسین صاحب۔

دیوبند سے سہارن پور جاتے ہوئے۔ قصبہ شیخو پورہ اور وہاں سے موضع سوری تشریف لے گئے۔ وہاں ماحضر تناول فرمایا۔ چند گھنٹے قیام کیا۔ رات کو موضع لکھنور میں قیام کیا۔ گنگوہ میں مکے کی سرائے میں قیام فرمایا تھا۔ نانوتہ میں جامع مسجد میں ٹھہرے تھے۔ ایک ارادت مند کا بیان ہے کہ میری آنکھوں میں اب تک وہ منظر پھر رہا ہے کہ سید صاحب جامع مسجد کے بیچ کے در میں کھڑے ہیں اپنی دستار اُتار کر ایک سرا اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور باقی دستار کو دونوں جانب سے طالبان

فیض تھامے ہوئے ہیں۔ دستار کی شکل کنکھجورے کی سی معلوم ہوتی ہے۔ انبیٹھ میں میاں صابر بخش سجادہ نشین شاہ ابوالمعالیؒ کے یہاں دعوت ہوئی تھی۔ (۱۵۶)

سہارن پور مسجد ابو نبی میں قیام ہوا: ولی محمد صاحب رئیس سہارن پور مفتی شرف الدین صاحب۔ محمد یار خاں صاحب، الٰہی بخش صاحب، امام الدین صاحب، کریم الدین صاحب، محسن خاں، محمد حسین، مولوی شاہ رمضان صاحب رڑکی والے، جو بعد میں مجاہدین کا ایک قافلہ لے کر سرحد پہنچے تھے۔ یہیں بیعت ہوئے سید صاحب نے بیعت کے بعد آپ کو خلافت عطا فرمائی۔ (۱۵۷)

قصابوں کی تعداد بھی زیادہ تھی، اور یہ برادری قافلہ کی خدمت میں بھی پیش پیش رہی۔ آپ نے اس برادری کے چار افراد کو اپنا خلیفہ بنایا۔ ان کے نام یہ ہیں۔

محمد یار۔ الٰہی بخش۔ امام الدین۔ کریم الدین۔

سہارن پور میں بہت بڑی کامیابی یہ ہوئی کہ حاجی عبدالرحیم صاحب ولایتی جو خود بہت بڑے بزرگ اور شیخ تھے، جن کے ہزاروں مرید تھے، وہ خود حضرت سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہو کر سید صاحب کے قافلے میں شریک ہو گئے اور اپنے تمام مریدوں کو ہدایت کر دی کہ سید صاحب سے بیعت ہو جائیں۔ چنانچہ ہزاروں آدمی جو حاجی عبدالرحیم صاحب کی سالہا سال کی کمائی تھے وہ سب حضرت سید صاحب کے حلقہ بگوش ہو گئے۔

حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب کا مقولہ مشہور ہے:

''ہمیں نہ نماز آتی تھی نہ روزہ۔ سید صاحب کی برکت سے یہ دونوں آ گئے۔''

سید صاحب کے اسی فیض کا اثر ہے کہ تقریباً سوا سو سال گذر جانے کے بعد بھی اس علاقہ میں مذہبی اور سیاسی لحاظ سے وہ خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔ (۱۵۸)

دارالعلوم اور مظاہر العلوم جیسی مذہبی یونیورسٹیاں اسی علاقہ میں ہیں، اور مذہبی پختگی کے ساتھ تحریکات آزادی میں یہاں کے مسلمان ہمیشہ پیش پیش رہے۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے والد ماجد یعنی حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ:

''سید صاحب جن قصبات میں تشریف لے گئے، وہاں اب تک خیر و برکت ہے۔ گویا وہ ایک نور مستطیل تھے، جدھر گئے وہ پھیل گیا''۔

ایک اور بزرگ مولانا محمد حسین صاحب فرماتے تھے:

''جہاں جہاں حضرت کے قدم گئے، وہاں وہاں خیر و برکت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ (۱۵۹)

سہارن پور سے دہلی اور دہلی سے رائے بریلی

سید صاحب سہارن پور سے دہلی پہنچے۔ جہاں آپ کے شیخ و مربی اور سیاسی رہنما حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب آپ کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ چند روز قیام فرما کر شعبان (۱۴۰) ۱۲۳۴ھ (مئی یا آغاز جون ۱۸۱۹ء) میں رائے بریلی کے قصد سے رخصت ہوئے یہ حضرت شیخ یعنی شاہ عبدالعزیز صاحب سے آخری ملاقات تھی۔

سید صاحب اپنے قافلہ سمیت دہلی سے روانہ ہوئے تو اگرچہ مئی کا مہینہ تھا، مگر جیسے ہی جمنا پار کر کے آگے بڑھے، سخت آندھی اور اُس کے بعد ایسی بارش ہوئی کہ ہنڈن (۱۴۱) ندی میں سیلاب آگیا۔ رات کو ندی کے کنارے قیام کرنا پڑا۔ صبح کے وقت ندی عبور کر کے غازی آباد پہنچے۔ اپنے مرید عبداللہ صاحب امام مسجد کے یہاں قیام ہوا۔ وہیں رائے بریلی کا ''پیک غم'' بیگوان (۱۴۲) پہنچا، جو سید صاحب کے برادر محترم مولانا سید محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ کے انتقال کی خبر لایا تھا۔

> ایک عالم (۱۴۳) فاضل بھائی جو خانگی زندگی میں پشت پناہ ہو، جس کے بھروسے پر خانہ داری کے جھگڑوں سے وہ فراغت میسر ہو کہ سالہا سال تک باہر رہنے پر بھی اُمورِ خانہ داری میں کوئی فرق نہ آئے۔ اُن کی وفات فی الحقیقت زندگی کا بہت بڑا ناقابلِ تلافی المیہ تھا۔ جو بلند پروازیوں کو پابند اور ہمت عالی کو پست کر سکتا تھا۔ فطری اضطراب واضطرار نے آنکھوں سے چند آنسو ٹپکائے۔ اندوہ نہانی نے رات کے کھانے کا مزا بھی کڑوا کر دیا۔ مگر جب احباب کی گرسنگی کا خیال آیا تو اس غم کو بھی غلط کیا۔ آدھی رات کے قریب چند نوالے کھائے اور صبح سویرے سفر کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ لیکن ملک وملت کا جو درد متاعِ جان بن چکا تھا، وہ اس غم سے فزوں تھا۔ جلد سے جلد مکان پہنچنے کی ضرورت تھی۔ مگر پھر بھی راستہ کی منزلوں میں جہاں قیام ہوا، ارشاد و اصلاح کا پروگرام بدستور جاری رہا۔

منزلیں۔

غازی آباد سے روانہ ہوئے، تو پہلی منزل ہاپوڑ تھی۔ پھر گڑھ مکتیسر پہنچ کر مسجد میں قیام فرمایا۔ امروہہ اور مراد آباد میں سرائے میں ٹھہرے۔ پھر رام پور رونق افروز ہوئے اور حاجی زین العابدین صاحب کے یہاں چند روز قیام فرمایا۔

رام پور میں جن بزرگوں نے بیعت کی، اُن میں نواب احمد علی صاحب والی رام پور کا نام خاص طور پر ممتاز ہے۔

بریلی (بانس بریلی): رام پور سے بانس بریلی تک ایک جگہ قیام کیا۔ جس کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ بریلی میں نواب کو علم ہوا تو وہ آپ کو اصرار کر کے اپنے مکان پر لے گیا اور متعلقین سمیت بیعت کی۔ بریلی میں جن اصحاب نے بیعت کی، ان میں ایک صاحب "حسینی" بھی تھے۔ یہ مخنث تھے۔ سید صاحب نے ان کا نام ہدایت اللہ رکھا۔ یہ جہاد میں ساتھ رہے اور اکوڑی کی جنگ میں نمایاں کام کیا۔

بانس بریلی سے رائے بریلی تک باقی منزلوں کا علم نہیں ہو سکا۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ جس شام کو آپ دس سال بعد وطن عزیز (رائے بریلی) میں داخل ہوئے، ہلال رمضان استقبال کے لیے نمودار تھا۔ یعنی ۲۹ رشعبان ۱۲۳۴ھ۔ ۲۳ رجون ۱۸۱۹ء)۔

رائے بریلی میں تقریباً چار ماہ قیام رہا۔ دہلی سے ساتھ ہونے والوں کے علاوہ اس عرصہ میں وہ بھی آپہنچے جو گذشتہ دورے میں متاثر ہوئے تھے اور اب یہ مجمع پچاس ساٹھ سے بڑھ کر پونے دوسو کے قریب ہو گیا۔

اس قیام میں روحانیت کے علاوہ فوجی تربیت کا مشغلہ بھی پوری طرح شروع ہو گیا۔ اس اثناء میں آپ کے اس عجیب وغریب قافلہ کا چرچا آس پاس کے اضلاع میں بہت کافی ہو چکا تھا۔ چنانچہ جگہ جگہ سے نہ صرف دعوت نامے آئے بلکہ بہت سے مقامات سے آپ کے اپنے یہاں لے چلنے کے لیے دعوتی وفود بھی پہنچے۔

بالآخر آپ نے رائے بریلی سے الہ آباد کا قصد کیا۔ مسافت صرف چار روز کی تھی مگر طے ایک ماہ میں ہوئی کیونکہ طلب فیض کی بے تابیوں کا یہ عالم تھا کہ جدھر سے گذر ہوتا آس پاس کے دیہات کے لوگ جوق در جوق راستے پر آبیٹھتے اور اپنے یہاں لے چلنے کا اصرار کرتے۔ عذر معذرت میں کافی وقت صرف ہو جاتا۔ پھر کہیں صرف دعا پر اور کہیں صرف ایک وقت کی دعوت پر اُن کو راضی کر لیا جاتا، اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک دوشب قیام کے بغیر لوگوں کی شکستہ دلی دور نہ ہو سکتی تھی تو "دل بدست آور کہ حج اکبر ست" کی تعمیل بھی کی جاتی۔

بہر حال رائے بریلی سے الہ آباد تک بہت سی جگہ کسی نہ کسی صورت میں قیام کرنا پڑا۔ مگر جن مقامات کا علم آج تک ایک مورخ کو ہو سکتا ہے، وہ صرف یہ ہیں:

(۱) سلون۔ (۲) پھر اہلاد گنج۔ (۳) مانک پور۔ (۴) کڑا۔ اہلاد گنج میں مرزا کاظم بیگ وہاں کے حاکم تھے۔ وہ خود بھی بیعت ہوئے اور دوسروں کو بھی اس حلقۂ تقدیس وطہارت کا گرویدہ بنا کر بیعت کرا دیا۔

الہ آباد

یہاں جاء قیام کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے حضرت شاہ اجمل (۱۶۴) صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دائرہ میں قیام فرمایا۔ یہی دائرہ ہے جس کے متعلق ناسخ نے کہا تھا ؎

ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں

بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ قیام دوسری جگہ ہوا تھا۔ لیکن شاہ اجمل صاحب سے ملاقات بھی کی تھی اور اُن کے یہاں دعوت بھی تناول فرمائی تھی۔ یہاں بے شمار لوگوں نے بیعت کی۔ مگر شیخ غلام علی صاحب کے بے نظیر اخلاص وایثار نے شیخ صاحب کو اتنا نمایاں کر دیا ہے کہ واقعات نگاروں کی نگاہیں انہیں پر اٹک کر رہ گئیں، کسی اور طرف دیکھ ہی نہ سکیں۔ حتیٰ کہ یہ تک یاد نہ رہا کہ قیام کہاں ہوا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ شیخ غلام علی صاحب نے کام بھی وہ کیا جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

شیخ غلام علی صاحب ممتاز امراء میں شمار ہوتے تھے۔ مہاراجہ بنارس اودت نرائن کی طرف سے عمل دار تھے۔ مہرونڈہ وطن اصلی تھا۔ اُن تمام اخلاقی امراض میں مبتلا تھے، جو اُس زمانہ میں عام طور پر پھیلے ہوئے تھے۔ سید صاحب سے بیعت ہوئے تو ان تمام کاموں سے توبہ کی۔ جس قدر سامانِ تعیش تھا، توڑ وا کر دریا میں بہادیا۔ سید صاحب کی خدمت میں بیسیوں بیش قیمت ہدیے پیش کئے (ان کی خدمات کی کچھ تفصیل آگے آئے گی۔ انشاء اللہ)

بنارس

الٰہ آباد سے روانہ ہو کر مختلف مقامات پر ٹھہرتے ہوئے بنارس پہنچے۔ وہاں مولوی عبدالقادر صاحب امیروں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ سید صاحب کے دوست تھے۔ اس بناء پر ساتھیوں کا خیال تھا کہ سید صاحب وہیں قیام فرمائیں گے لیکن آپ نے فرمایا۔ وہ ہمارے ہم مشرب نہیں ہیں، اُن کے یہاں ٹھہرنا مناسب نہ ہوگا۔ لہٰذا جماعت نے سیسر کی مسجد میں قیام کیا، اور خود سید صاحب چند ساتھیوں کے ساتھ ایک شاہی مسجد میں مقیم ہو گئے جو عرصہ سے غیر آباد تھی۔ یہاں تقریباً ایک ماہ قیام ہوا۔ تقریباً پندرہ ہزار مرد اور عورتیں بیعت ہوئیں۔ بُری رسومات میں ایک یہ بھی تھی کہ اُن کے پیر چھٹے مہینے آتے تھے اور ہر گھر سے معینہ نذرانہ لے کر نماز روزے وغیرہ سے معافی کے پروانے لکھ کر دے جاتے تھے۔ حضرت مولانا عبدالحی صاحب کے مسلسل وعظوں سے خدا کے فضل سے یہ تمام بداعمالیاں ختم ہو گئیں اور لوگوں میں دین داری کا عام ذوق پیدا ہو گیا۔ بیعت کرنے والے اکابر میں شاہ عبداللہ صاحب شکرنی اور مرزا کریم اللہ بیگ صاحب رئیس بھی تھے۔ یہ بھی واقعہ نگاروں نے لکھا ہے کہ تیموری شاہزادے جو وہاں رہتے تھے، وہ بھی بیعت ہوئے۔ اور بیش قیمت خلعتیں پیش کیں۔ (مگر ان شاہزادوں کے نام نہیں معلوم ہو سکے)۔

سلطان پور:

بنارس سے روانہ ہو کر چند مقامات پر قیام فرماتے ہوئے سلطان پور قیام فرما ہوئے۔ وہاں غلام حسین، سرکار لکھنؤ کی طرف سے حاکم تھے۔ اُن کے لشکر کے بہت سے آدمی سید صاحب سے پہلے بیعت تھے۔ تقریباً دو ہفتہ سلطان پور میں قیام رہا۔ بہت سے لوگوں نے آپ سے بیعت کی۔

(سلطان پور سے آپ بریلی تشریف لائے، اور یہاں کچھ عرصہ قیام فرما کر لکھنؤ تشریف لے گئے)۔

بتایا گیا ہے کہ لکھنؤ کا یہ سفر آغا میر نائب السلطنت کی دعوت پر ہوا تھا۔ ''مخزن احمدی'' میں اس دعوت نامے کی عبارت بھی نقل کر دی گئی ہے کہ:

''آوازۂ وعظ تذکیر آں روشن ضمیر عالمگیر گردیدہ اگر بقدوم میمنت لزوم خود، اہالی لکھنؤ را ممنون وایں مشتاق مستمند را خصوصاً نواز ند بعید از مروت واخوت وفتوت نخواہد بود''۔

مگر اس کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہ بیگم، جس سے آغا میر کی چپقلش جاری تھی یہاں تک کہ بادشاہ کو بیگم سے برگشتہ کر دیا تھا، اس کے مقابلہ میں سید صاحب کی مقبولیت کے طفیل سے عوام کی حمایت حاصل ہو جائے۔ مگر جب اس کوتاہ اندیش کو اندازہ ہوا کہ سید صاحب کا ہمائے بلند پرواز، حب جاہ اور عشق اقتدار کے پست اور کمینہ حشرات الارض پر نظر ڈالنا بھی اپنی توہین سمجھتا ہے تو اشتیاق وعقیدت کی تمام ڈینگیں ختم ہو گئیں (تفصیل آگے آ رہی ہے)۔

دار الحکومت لکھنؤ

سیاسی اور سماجی حالات اور سید صاحب کا قیام

سید صاحب کا قافلہ غالباً ۱۲۳۴ھ ۱۸۱۹ء میں رائے بریلی سے لکھنؤ پہنچا۔ لکھنؤ اودھ کا دار الخلافہ تھا اور اس وقت اینگلو انڈین سیاست کا سب سے بڑا مرکز تھا۔

غازی الدین حیدر (۴۱۵) فرماں روا تھے اور معتمد الدولہ آغا میر، نائب السلطنت اور وزیر اعظم تھے۔

وزیر سے بادشاہ

آپ رفیع الدولہ، رفیع الملک، شہامت جنگ پہلے سے تھے۔ مگر خیالات کی رفعت پسندی نے ایک اور پرواز کی۔ دربار دہلی کا دیا ہوا وزیر الممالک کا آبائی منصب اور خاندان کا یہ شاہی خطاب جو محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانہ سے چلا آرہا تھا، پسند خاطر نہ رہا۔ آپ نے کمپنی بہادر کے ایماء (۴۱۶) سے یا کمپنی بہادر کی اجازت سے بادشاہت کا شوق فرمایا اور ۱۹ اکتوبر ۱۸۱۸ء، ۱۸ ذی (۴۱۷) الحجہ ۱۲۳۵ھ کو شاہانہ جلوس فرما کر "شاہ زمن" کا خطاب اختیار فرمایا۔ اب آپ کا پورا نام اور خطاب یہ ہو گیا۔ رفیع الدولہ۔ رفیع الملک، شہامت جنگ، ابوالمظفر، معز الدین، شاہ زمن، غازی الدین حیدر بادشاہ غازی۔

کفایت شعار اور سنجیدہ مزاج باپ "نواب سعادت علی خاں" (خلف شجاع الدولہ) کے جمع کردہ خزانہ میں سے دو کروڑ روپیہ شاہی تخت اور بادشاہانہ ساز و سامان پر صرف فرمایا۔

سکہ

حدود مملکت اور شاہی اختیارات پر اگرچہ انگریزی غلبہ اور اقتدار کا ٹھپہ لگ چکا تھا اور آپ کا کوئی حکم فوجی چھاونیوں کا رخ آزادی سے نہیں کر سکتا مگر شاہی ٹکسال کو مکمل آزادی عطا کردی گئی تھی اور آپ کا تجویز کردہ (۴۱۸) سکہ بازاروں میں چلا کر انداز شاہانہ کا مظاہرہ کرا دیا گیا تھا۔

انگریزی اقتدار

انگریز ریزیڈنٹ جس کی بلا "معاہدہ کوڑہ جہاں آباد ۱۷۶۵ء" سے مسلط کردی گئی تھی، وہ اپنے اختیارات دن بدن بڑھا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اب سب کچھ وہی ہو گیا تھا۔ حتی کہ مسند نشین کا عزل و نصب بھی اُسی کے اختیار میں پہنچ چکا تھا۔

سماجی حالت

غازی الدین حیدر کی (۱۶۹) اوہام پرستی مشہور ہے۔ اس بنا پر مینا و ساغر کی گردش، رقص و سرود کی طرب آفرینی، عصمت فروشوں کی اداکاری، کچھ ایسے کیف آور مشغلے تھے جن سے کسی وقت بھی فرصت نہ ملتی تھی۔

بادشاہ، وزرا اور اُمراء کے اس فیشن نے پورے شہر کو غرق ناؤ و نوش کر رکھا تھا۔ سب طرف عصمت فروشوں کا ہجوم تھا، اور نہایت رکیک جذبات سوسائٹی کے مزاج میں سرایت کر چکے تھے۔ (۱۷۰)

انقلابی صلاحیت

ان تمام خرابیوں کے باوجود لکھنؤ میں ایک بات تھی جو اودھ کے کسی اور شہر میں نہیں تھی۔ لکھنؤ جیسا بھی تھا، اودھ کا دارالسلطنت تھا۔ اس وجہ سے بہترین دل و دماغ کے مالک علماء اور فضلا بھی یہاں پہنچتے تھے اور اس مرکزی شہر کو اپنا مرکز بنا لیتے تھے۔ چنانچہ سنگ ریزوں کے اس انبار میں بہت سے قابلِ قدر جوہر بھی ڈھونڈنے سے مل جاتے تھے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

علماء کرام

فرنگی محل کے علماء شہر میں خاص اثر رکھتے تھے۔ اسی خاندان کے ایک بزرگ مولانا عبدالعلی صاحب (۱۷۱) تھے، جن کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے بحرالعلوم کا خطاب (۱۷۲) دیا تھا۔ یہ خطاب اتنا مقبول ہوا کہ اصل نام سے زیادہ یہ خطاب مشہور ہے۔ آپ اس وقت وفات پا چکے تھے لیکن آپ کے صاحبزادہ مولانا عبدالرب صاحب (۱۷۳) کے فیوض جاری تھے۔ ایک دوسرے مشہور عالم اور بزرگ مرزا حسن علی (۱۷۴) صاحب محدث تھے۔ یہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد تھے۔ آپ کا حلقۂ درس بہت وسیع تھا۔ سینکڑوں طلبا آپ سے مستفید ہوئے۔ مولانا محمد اشرف صاحب، (۱۷۵) مولانا ابوالحسن صاحب نصیرآبادی، (۱۷۶) مولانا مخدوم صاحب، شاہ یقین اللہ صاحب اور اُن کے صاحبزادے۔ مولانا عبدالوہاب صاحب بھی شہر کے مشہور علماء اور بااثر حضرات تھے۔

عمائدین

علامہ سبحان علی خاں، (۱۷۷) نائب وزیراعظم بہت بڑے فاضل، شعروسخن کے ماہر، نظم و نثر میں قادر الکلام، صاحب تصنیف (۱۷۸) و تالیف تھے۔ بادشاہ اور وزیر آپ کی اصابت رائے کے قائل تھے۔

تاج الدین حسین (۱۷۹) خاں اپنی اعلیٰ قابلیت کے سبب سے ہی شجاع الدولہ کے منظورِ نظر ہوئے تھے۔

فوجی حلقے

سلطنت اودھ کی فوج اگرچہ بہت (۱۸۰) گھٹادی گئی تھی، جو باقی بچی تھی وہ بھی محض نمائشی تھی۔ تاہم اس میں ایک عنصر اچھی صلاحیتوں کا مالک تھا مثلاً قندھاریوں (۱۸۱) کی چھاؤنی (جس میں زیادہ تر پٹھان سپاہی تھے) اپنی خاص تاریخ رکھتی تھی۔ نائب جرنیل فقیر محمد (۱۸۲) خاں بہادر ایسے افسر تھے جو شخصی طور پر بھی حضرت سید صاحب سے عقیدت رکھتے تھے۔ یہ حضرت سید صاحب کے ساتھ نواب امیر علی خاں کی فوج میں کام کر چکے تھے۔ اُسی وقت سے حضرت سید صاحب کی عظمت کا سکہ ان کے دل پر جما ہوا تھا۔ غرض فوج میں ایک جماعت موجود تھی جو سید صاحب کی تحریک سے وابستہ ہو سکتی تھی۔

یہ تھا لکھنؤ جہاں حضرت سید صاحب پورے قافلہ کے ساتھ ۱۲۳۴ھ ۱۸۱۸ء میں تشریف لے گئے۔

قیام (۱۸۳)

پہلے اکبری دروازہ کے قریب "میر مسکین" کی حویلی میں قیام فرمایا یہ حویلی اور شہر کا تنگ علاقہ ایک سو ستر کے قافلہ کے لیے تکلیف دہ تھا، تو دریائے گومتی کے کنارے ٹیلے والی مسجد (۱۸۴) کے قریب شیخ امام بخش صاحب سوداگر کی حویلی جو حال ہی میں بن کر تیار ہوئی تھی، قیام کے لیے طے کی گئی۔ آپ وہاں منتقل ہو گئے اور جب تک قافلہ لکھنؤ رہا اسی حویلی میں قیام رہا۔

قافلہ کی مقبولیت اور اس کے اثرات

وہی قابل اور صالح جوہر جن کی نشاندہی ہم سطور بالا میں کر چکے ہیں، اس قافلہ کی طرف اس طرح لپکے، جیسے وہ پہلے سے چشم براہ اور بے چینی سے منتظر تھے۔

سب سے پہلے سلطان العلماء مولانا عبدالرب صاحب نے اپنے یہاں پورے قافلہ کی شاندار ضیافت کی۔

شہر کے جلیل القدر عالم اور مشہور اُستاذ حضرت مرزا حسن علی صاحب محدثؒ نے ایک بڑے اجتماع میں جہاں شہر کے تقریباً پانچ سو عمائدین اور با اثر اشخاص موجود تھے، امیر قافلہ سید صاحب کی خدمت میں شاہانہ نذر (۱۸۵) پیش کی۔

سوداگروں کے حلقہ میں شیخ امام بخش صاحب سوداگر نے اپنی نفیس حویلی جو حال ہی میں تیار کی تھی، قافلہ کے طویل قیام کے لیے پیش کر دی۔

عمائدین شہر میں سے مرزا حسن بیگ صاحب نے اپنے یہاں دعوت کر کے حضرت سید صاحب کا تعارف کرایا۔

مرزا اسد علی بیگ پہلے ہی دن سے قافلہ کے انتظام میں مصروف تھے۔ امام بخش صاحب سوداگر نے آپ

ہی کی فرمائش پر وہی حویلی قیام کے لیے دے دی تھی۔ (۱۸۶)

تاج الدین حسین خاں، بادشاہ کے مقرب خاص اور سربرآوردہ شیعہ رئیس تھے۔ وہ ملاقات کے لیے سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کئی گھنٹہ تک تنہائی میں گفتگو کی۔

وزیر اعظم (معتمد الدولہ) کے نائب علامہ سبحان علی خاں بکمال ادب حاضر خدمت ہوئے اور کئی گھنٹہ تک شرف ہم کلامی حاصل کیا۔ ان ملاقاتوں اور دعوتوں کے ساتھ قافلہ کے جادو بیان مقررین کی تقریروں کا سلسلہ بھی شہر میں جاری تھا۔ جمعہ کے روز جہاں یہ لوگ نماز پڑھتے تھے، مسجدیں تنگ ہو جاتی تھیں۔ مسجدوں سے باہر دور تک فرش اور جانمازوں کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔

چند ہی روز کے تعارف کے بعد عقیدت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شہر کے تقریباً تمام ہی علماء (۱۸۷) اور مشائخ سلسلہ میں داخل ہو گئے۔ عوام کا مذہبی طبقہ جان چھڑکنے لگا۔

جب ہر کوچہ اور گلی میں قافلہ کا چرچا ہونے لگا تو کچھ وہ لوگ بھی جن کی زندگی آوارگی میں صرف ہوئی تھی، متوجہ ہوئے اور حلقہ بگوش ہو گئے۔

کچھ زنانوں نے بھی اس بہتی گنگا سے وضو کرنا چاہا۔ چنانچہ وہ حاضر خدمت ہوئے اور پچھلی باتوں سے توبہ کر کے قافلہ میں شامل ہو گئے۔

قافلہ کے اثرات شہر سے گذر کر چھاونی میں پہنچے۔ رسالدار مینڈو خاں اور اُن کے بھائی عبداللہ خاں نے تمام عواقب و نتائج سے بے نیاز ہو کر سید صاحب کو اپنی چھاونی میں بلایا۔ آپ سے نصیحتیں (۱۸۸) حاصل کیں۔ دعائیں لیں (۱۸۹) اور آپ کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے۔ (۱۹۰)

سرکاری حلقوں میں ردعمل

سید صاحب کے یہ اثرات ریذیڈنٹ صاحب اور اُن کے حواریوں کو کب برداشت ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اول شیعہ سنی اختلاف کی آگ بھڑکانے کی کوشش کی گئی، جس کی چنگاریاں لکھنؤ کی فضا میں پہلے سے موجود تھیں۔ مگر سید صاحب کے حسن تدبیر اور حضرات مقررین کی سنجیدہ اور موثر تقریروں کے باعث جب اس میں کامیابی نہ ہو سکی تو جبر و تشدد کے مظاہرہ کا شرمناک حربہ استعمال کیا گیا اور (۱۹۱) خاص خاص لوگوں کے ذریعہ دھمکی دی گئی کہ اگر لکھنؤ سے کوچ نہ کیا گیا تو قافلہ کا سارا قیام گاہ توپ دم کر دیا جائے گا۔ اس وقت لڑنا مقصود نہیں تھا۔ اس لیے سید صاحب نے روانگی کا پروگرام بنا لیا۔ (۱۹۲)

بادشاہ اور وزیر شیعہ بھی تھے اور انگریز دوست بھی۔ مگر یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ فوج کا سُنی عنصر اور شہر کے مسلمان جن میں سنیوں کی اکثریت تھی، برانگیختہ اور مشتعل ہوں۔ لہذا حکمت عملی سے کام لیا گیا یعنی ایک طرف بے ضابطہ طور پر دھمکیاں اور سید صاحب کو لکھنؤ سے رخصت کر دینے کی کوشش جاری تھی، دوسری جانب

سید صاحب اور قافلہ کے تمام دوستوں سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا گیا اور جب سید صاحب کی روانگی طے ہوگئی تو نواب معتمد الدولہ وزیر اعظم نے پورے قافلہ والوں کی شاندار دعوت کی۔ مولانا عبدالحیٔ صاحب کا اپنے یہاں وعظ کرایا۔ مبلغ پانچ ہزار روپے بطور نذرانہ پیش کئے اور تنہائی میں سید صاحب سے ملاقات کی درخواست کی۔ چنانچہ روانگی کے دن تقریباً دو گھنٹہ خلوت میں گفتگو ہوتی رہی۔ نواب کو سید صاحب نے نصیحتیں کیں۔ مظالم کے نتائج بد سے متنبہ کیا۔ نواب صاحب نے توبہ بھی کی۔ سید صاحب نے ایک عمدہ گھوڑی نواب صاحب کو ہدیۃً پیش کی۔ نواب صاحب نے بہت کچھ عذر معذرت کے ساتھ سید صاحب کا ہدیہ قبول کیا۔ (وغیرہ وغیرہ)

جب قافلہ روانہ ہو چکا تو بادشاہ صاحب کا بھی پیغام پہنچا کہ ملاقات کا اشتیاق ہے۔ سید صاحب خود تو دوبارہ تشریف نہیں لائے۔ البتہ مولانا عبدالحیٔ صاحب اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو بھیج دیا۔ یہ دونوں بزرگ دو ہفتہ لکھنؤ میں قیام پذیر رہے مگر اہل دربار نے اس کا پورا انتظام رکھا کہ اس عرصہ میں بادشاہ سلامت کسی وقت بھی ہوش میں نہ آئیں...... ع

من چہ سرایم و طنبورۂ من چہ سرائد

چنانچہ دو ہفتے لکھنؤ میں قیام کرنے کے بعد یہ دونوں بزرگ واپس تشریف لے گئے۔

سید صاحب اور آپ کے قافلہ کا دوسرا دورہ

سات ہزار (۷۰۰۰) میل کی انقلاب انگیز سیاحت

لکھنؤ سے واپس ہو کر چند ماہ رائے بریلی میں قیام رہا۔ پھر دوسرے دورہ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

مقصود دورہ

اس دورہ کے متعلق اعلان تو یہی تھا کہ فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے یہ دورہ ہے لیکن یہ عجیب و غریب سوال بہت زیادہ قابل توجہ ہے کہ کیا سید صاحب اور اُن کے ساتھیوں پر حج فرض تھا؟ اور جن حالات میں سید صاحب اور اُن کے رفقاء نے یہ سفر کیا، کیا وہ اس قابل تھے کہ شرعی نقطۂ نظر سے حج فرض ہو سکے؟

شرعی نقطۂ نظر سے حج اس وقت فرض ہوتا ہے جب اہل و عیال کی ضروریات سے بچا ہوا اتنا سرمایہ موجود ہو کہ سفر حج کی تمام ضرورتیں بآسانی انجام پاسکیں۔ یہاں سید صاحب اور اُن کے ساتھیوں کی بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ دو وقت کھانا بھی آسانی سے میسر نہیں ہو سکتا تھا۔ بقول شخصے ع

براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو

سوانح نگاروں نے اس سفر کا مقصد بھی ایک غلط عقیدہ کی اصلاح قرار دیا ہے۔ یعنی اُن خطرات کی بناء پر

جو اٹھارھویں صدی عیسوی (۱۹۴) میں پرتگالیوں کی بحری قزاقیوں کے باعث پیدا ہو گئے تھے۔ کچھ علماء نے فریضۂ حج کی معافی کا فتویٰ دے دیا تھا۔ جس کی بناء پر عام خیال ہو گیا تھا کہ مسلمانانِ ہند پر حج فرض نہیں۔ سید صاحب اور آپ کے ساتھیوں کا منشا یہ تھا کہ اس غلط عقیدہ کی اصلاح کریں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت مولانا عبدالحی صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب شہید رحمہما اللہ کا ایک فتویٰ اور حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی طرف سے اس فتویٰ کی پرزور تصدیق (۱۹۵) بھی نقل کی جاتی ہے۔

لیکن سوانح نگاروں کی اس رائے سے ہم مطمئن نہیں ہیں۔ کیونکہ اس غلط عقیدہ کی اصلاح کے لیے صحیح فتوے کی اشاعت کافی تھی۔ اصلاح کے لیے ایسا سفر اختیار کرنا جو فقہی نقطۂ نظر سے خود اصلاح طلب ہو، کسی طرح بھی حضرت سید صاحب اور اُن کے پاکباز ساتھیوں کے شایان نہیں۔ (رحمہم اللہ)

اس سفر کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب اور آپ کے ساتھیوں کا (جن کی تعداد بڑھتے بڑھتے آٹھ سو ہو گئی تھی) اصل سرمایہ توکل تھا یعنی وطن سے روانگی کے وقت زادِ راہ سے دامن خالی تھا۔ محض خدا کے بھروسہ پر سفر شروع کیا گیا۔ ایسی حالت میں حج فرض تو کیا (۱۹۶) ہوتا، حج کے لیے سفر کا جواز بھی مشتبہ اور مشکوک ہے۔

کچھ ساتھیوں نے ایثار سے کام لیا، اور جو زمین، جائداد اُن کے پاس تھی اُس کو فروخت کر کے وہ سفر میں شریک ہو گئے۔ یہ ایثار خواہ کتنا ہی قابلِ قدر ہو مگر شریعت نے اس کا حکم نہیں کیا اور نہ ایسی صورت میں ایثار شیوہ پر فریضۂ حج عائد ہوتا ہے۔

بہرحال ایثار اور قربانی کی تاریخ میں یہ سفر خواہ کتنا ہی واجب الاحترام ہو لیکن اگر اس کا مقصد صرف اصلاح عقیدہ تھا تو شرعی فیصلہ اس کے حق میں بہت زیادہ مشکوک ہے۔ شریعت نہ اس کا مطالبہ کرتی ہے اور نہ اس کی اجازت دیتی ہے، کہ غلط عقیدہ کی اصلاح ایسے عمل سے کی جائے جس کا جواز خود مشتبہ ہو۔ علاوہ ازیں اصلاح عقیدہ بھی اُسی وقت ہو سکتا تھا جب الگ الگ سفر کرتے۔ اس طرح ایک فوج بنا کر لے جانے میں تو وہ خطرہ خود ہی ختم ہو جاتا تھا جس کی بناء پر یہ غلط عقیدہ قائم ہوا تھا۔

ایشیائی بلاک

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے سیاسی مدبرین تقریباً پچاس سال پہلے محسوس کر چکے تھے کہ بیرونی طاقت کی امداد کے بغیر ہندوستان سے انگریزی اقتدار کا خاتمہ (۱۹۷) نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ سلطان ٹیپو فرانسیسیوں سے ساز باز کرتا رہا اور سلطان کو اگر وقت پر فرانسیسیوں کی امداد حاصل ہو جاتی تو ہندوستان کا سیاسی نقشہ دوسرا ہوتا۔ مرہٹوں نے بھی اس ضرورت کو محسوس کر لیا تھا، چنانچہ ان کی فوجوں میں فرانسیسیوں کی بہت بڑی طاقت کام کر رہی تھی۔

یہ پچاس سال پہلے کی باتیں تھیں۔ سید صاحب کے دور میں انگریزی اقتدار ترقی کی پچاس منزلیں اور آگے طے کر چکا تھا، اور ہندوستانی طاقتیں پچاس درجہ نیچے گر چکی تھیں۔ اب ہندوستان کے کسی تاجدار تخت نشین کی امداد کے بھروسہ پر کامیابی کی توقع عبث تھی۔ پھر ان اقتدار پسندوں کا تماشا سید صاحب خود دیکھ چکے تھے کہ جب انگریز کا سبز باغ سامنے آیا تو نہ (۱۹۸) ہلکر کے قدم ثابت رہے اور نہ خان (۱۹۹) کے۔ اس وقت جو ہندوستان کا سب سے بڑا اور سب سے مضبوط جنگ جو حکمران (۲۰۰) تھا، پنجاب وملتان وسندھ کی پوری طاقت جس کے زیرِ نگین تھی، اس نے بھی ان کو یہی مشورہ دیا کہ:

"صاحبانِ کمپنی سے جنگ کرنا غلط ہے۔ ریاست لو اور چین کرو"۔

بہرحال مایوسی اور عافیت کوشی کے اس دور میں کامیابی کی صرف یہی راہ تھی کہ

الف: عوام میں رُوحِ انقلاب پیدا کی جائے۔

ب: اور یورپین طاقتوں کے مقابلہ میں ایشیائی طاقتوں کو متحد کیا جائے۔

مذہبی عنوان

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے اصول کے مطابق ایشیائی طاقتوں کا یہ اتحاد اقتصادی مسائل کی بنیاد پر ہونا چاہیے تھا۔ مگر اس وقت تک اقتصادی مسائل میں اتنی کشش نہیں پیدا ہوئی تھی کہ ان کی بنیاد پر روحِ انقلاب پیدا کی جا سکتی البتہ مذہبی جذبات (۲۰۱) بیدار تھے۔ اور ان کے نام پر انقلاب کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کا مطالبہ بھی کامیاب ہو سکتا تھا، اور ایشیا کی برسرِ اقتدار طاقتیں جن سے ہندوستان کا تعلق عرصہ سے تھا، وہ سب ایک ہی مذہب رکھتی تھیں۔ لہٰذا سیاسی انقلاب اور ایشین اتحاد کے لیے مذہبی عنوان کا راستہ مختصر بھی تھا اور اس سے کامیابی کی توقع بھی زیادہ تھی۔

دورہ کا اصل مقصد

سید صاحب نے جن حالات میں سفرِ حج کا اعلان کیا، وہ فرضیتِ حج کے لیے ناکافی تھے یعنی ان حالات میں نہ سید صاحب پر حج فرض تھا نہ آپ کے ساتھیوں پر۔ البتہ فرضیتِ انقلاب کے لیے وہ حالات کافی اور وافی تھے۔ کیونکہ اسلامی تعلیم ایسے حالات میں کہ وطنِ عزیز پر اجنبی طاقت کا تسلط ہو جائے، انقلاب کو فرض قرار دیتی ہے۔ اور یہ فرض صرف اجتماعی نہیں رہتا بلکہ انفرادی طور پر بھی ہر ایک کا فرض ہو جاتا ہے کہ جہاں تک اس کی آخری مقدور ہو، وہ انقلاب کے لیے اپنی جدوجہد صرف کر دے۔ اس موقع پر جو قربانی بھی پیش کی جاتی ہے، وہ مستحقِ صد تحسین اور پسندیدہ ہوتی ہے۔

ایک مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ بال بچوں کو بھوکا پیاسا چھوڑ کر بلا کسی سروسامان کے ادائے حج کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہو۔ لیکن اگر وہ انقلابی مقصد کے لیے ایسا کر رہا ہے تو اس کا ہر ایک اقدام مبارک اور اس کی

ہر ایک قربانی باعث اجر عظیم ہے۔ اب وہ گرد بھی مقدس ہے جو اس کے پیروں پر پڑتی ہے، اور وہ غبار بھی طوطیاء چشم سعادت ہے جس سے اس کے کپڑے میلے ہوتے ہیں۔

سید صاحب کے اس دورہ کا ظاہری عنوان بے شک حج بیت اللہ تھا مگر جو معنے اس عنوان میں پوشیدہ تھے، وہ وہی تھے جو اس پارٹی کا نصب العین تھا یعنی فک کل نظام..... ''سیاسی، سماجی، ہمہ گیر انقلاب۔''

چنانچہ ابھی آپ فرائض حج سے پوری طرح فارغ نہیں ہوئے تھے کہ آپ نے ''منا'' کے مقدس قیام گاہ میں یعنی اس مقام پر جہاں تقریباً ساڑھے بارہ سو برس پہلے داعیِ حق رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے بیعت لی تھی، آپ نے ساتھیوں سے بیعتِ جہاد لی۔ (۴۲)

یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ ایشین بلاک کے لیے اس کی ضرورت نہیں تھی، کہ آٹھ سو ساتھیوں کا قافلہ حج کرنے مکہ معظمہ جائے۔ چند خاص خاص ارکان جماعت کی سفارت بھی ایشیائی قوموں کے سامنے یہ دعوت پیش کرسکتی تھی۔ چنانچہ اس دورہ کے بعد آپ سفراء کے ذریعہ یہی پیغام پہنچاتے رہے۔ مگر یہ اعتراض اُسی وقت ہوسکتا ہے جب تحریک کا پورا مقصد سامنے نہ ہو۔

تحریک کا اہم ترین مقصد یہ تھا کہ سیاسی انقلاب کے ساتھ سماجی انقلاب بھی کیا جائے تاکہ نظریہ'' فک کل نظام'' کی تکمیل ہو، اور انقلاب کے بعد حکومت ایسے ہاتھوں میں پہنچے جو اصلاح یافتہ ترقی پذیر سماج کے کامیاب معمار ثابت ہوں۔ یہ آٹھ سو ساتھیوں کا قافلہ محض سیاسی قسم کا مظاہرہ نہیں تھا، بلکہ درحقیقت اصلاح و تربیت کا نہایت کامیاب ذریعہ تھا۔ یہ گویا چلتا پھرتا اصلاحی آشرم تھا جس کا ہر ایک ممبر خود بھی تربیت پارہا تھا اور اپنے دیکھنے والوں کو بھی متاثر کررہا تھا۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''امام عبدالعزیز نے سید احمد شہید کے بورڈ کو پہلی دفعہ ۱۲۳۴ھ میں بیعت طریقت (۴۳) لینے کے لیے اور دوسری دفعہ ۱۲۳۶ھ میں بیعت جہاد لینے کے لیے دورہ پر بھیجا، اس کے بعد سارے قافلے سمیت حج پر جانے کا حکم دیا تاکہ ان کی تنظیمی قوت کا تجربہ ہوجائے۔ (۴۴)

دوسرے دورہ کے مختصر حالات

اس تمہید کے بعد دوسرے دورہ کی تھوڑی سی تفصیل ملاحظہ فرمایئے:

کان پور:

کوڑہ جہان آباد، قصبہ بھدان، کھجوہ، فتح پور اور قصبہ ڈلمو کے باشندے حضرت سید صاحب کے قافلہ کو ایک عرصہ سے دعوت دے رہے تھے، سید صاحب نے پہلے اُن کا تقاضا پورا کیا اور ان مقامات کا دورہ فرما کر اپنے

وطن رائے بریلی تشریف لے آئے۔ اس مختصر دورہ میں بڑے دورہ کے لیے رفقاء فراہم کیے گئے اور اس کے مقاصد بھی سمجھائے گئے۔

آخر شوال (۴۰۵) ۱۲۳۶ھ ۱۸۲۱ء روز دوشنبہ آپ دوسرے دورہ کے لیے اپنی خانقاہ (تکیہ شاہ علم اللہ) سے روانہ ہوئے۔ ساتھیوں کی تعداد چار سو تھی اور کل قافلہ کا خرچ آپ کے ذمہ تھا۔ تکیہ سے نکل کر سب سے پہلے ''سی'' ندی پر پوسی کے لیے حاضر تھی۔ آپ نے ندی پار کی۔ دوسرے کنارے پر پہنچے۔ جو لوگ پہنچانے گئے تھے، ان کو رخصت کیا۔ آپ کے خزانچی مولانا محمد یوسف صاحب کی تحویل میں جو کچھ تھا، اس کا جائزہ لیا۔ کچھ اوپر سو روپے تھے۔ آپ نے یہ پوری رقم اپنے ہاتھ سے رائے بریلی کے غرباء، بھنگی، دھوبی، حجام وغیرہ شاگرد پیشہ لوگوں کو تقسیم کر دی۔

اللہ پر بھروسہ کی ایک مثال

ایک میل چل کر ایک باغ میں آرام فرمایا۔ اہل قافلہ شمار کیے گئے۔ چار سو پانچ تھے۔ ان کے علاوہ اسی ۸۰ کہار تھے۔ آپ نے مولانا محمد یوسف صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ کیا اب بھی آپ کی تحویل میں کچھ باقی ہے؟ مولانا محمد یوسف صاحب نے جواب دیا۔ صرف سات روپے باقی ہیں۔

حضرت سید صاحب: سات روپیہ میں قافلہ کا ایک وقت کا خرچ بھی نہیں چل سکتا۔ لاؤ، وطن عزیز کے غرباء میں سے جو یہاں موجود ہیں۔ جن کو پہلی مرتبہ کچھ نہیں ملا۔ یہ روپے ان کو تقسیم کر دو۔

مولانا محمد یوسف جب تعمیل حکم سے فارغ ہو چکے تو سید صاحب نے برہنہ سر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور اپنے پروردگار سے عرض کیا:

> ''اے کریم کارساز! تو نے اتنی مخلوق اس بندۂ ذلیل کے سپرد فرمائی ہے۔
> خداوندا تو ہی کارساز و چارہ گر ہے۔ اپنی مہربانی سے اس پورے قافلہ کی کفالت فرما اور اس کو بخیر وخوبی منزل مقصود تک پہنچا۔''

اہل قافلہ کی کیفیت

چار سو سے زائد ساتھیوں کا یہ قافلہ گویا ایک خاندان تھا۔ نئے ساتھیوں کو کسی وقت بے سروسامانی اور تہی دستی سے پریشانی ہوتی، تو پرانے ساتھی فوراً ان کو ضبط وتحمل اور خدا پر توکل کی تلقین کرتے (بقول مصنف وقائع احمدی مخزن)

قافلہ کے ساتھی راستہ کا سرد و گرم برداشت کرنے کے لیے تیار اور تنگی و ترشی میں خدا کے ذکر و شکر سے ان کی زبانیں تر رہتی تھیں۔ کبھی سخت بارش ہوتی۔ کبھی کڑاکے کی دھوپ، دلدل اور کیچڑ، ندی نالے راستہ میں ملتے۔ اگر کسی کا پاؤں پھسلتا تو وہ ہنس کر خدا کا شکر ادا کرتا اور کہتا کہ تیرے احسان کے قربان کہ تیرے راستہ میں

گراہوں۔ پچھلی تمام لغزشوں اور بے ہودہ حرکتوں کی تلافی یہی ہے۔ کوئی خواجہ حافظ کا یہ شعر حسب حال پڑھتا۔

در بیاباں گر زشوق کعبہ خواہی زد قدم
سرزنشہا گر کند خار مغیلاں غم مخور (۴۶)

پہلا مقام

قصبہ ڈلمو میں لب دریا ایک قلعہ تھا۔ اس کی بارہ دری میں سب سے پہلا قیام ہوا۔ قرب و جوار کے باشندے ہزاروں کی تعداد میں ملاقات اور زیارت کے لیے آتے تھے۔ اور مولانا عبدالحی صاحب اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی تقریروں سے نئی زندگی حاصل کر کے واپس ہوتے تھے۔

۳ ذی قعدہ ۱۲۳۶ھ، ۳۱ اگست ۱۸۲۱ء کو ڈلمو سے سفر دریا کے راستے سے شروع ہوا۔ بنارس تک پانچ کشتیاں، (۴۷) پانچ سو روپیہ کرایہ پر لی گئیں۔ عورتوں، بچوں اور کمزور مردوں کو ان پر سوار کر دیا گیا۔ باقی مردوں کے دو گروپ کر دیئے گئے۔ ایک مولانا (۴۸) عبدالحی صاحب کی زیر قیادت دریا کے کنارہ کنارہ روانہ کیا گیا۔ ستر ۷۰ آدمیوں کا دوسرا گروپ مولانا محمد یوسف صاحب کی رہنمائی میں دوسرے راستہ سے روانہ کیا گیا۔ دونوں قافلوں کو ہدایت یہ تھی کہ راستہ کے دیہات میں وعظ و تقریر اور اپنے مقاصد کا پیغام دیتے ہوئے چلیں۔ (۴۹)

سید صاحب نے ڈلمو کے اجتماعات میں اور کشتیوں پر سوار ہوتے وقت اپنے ساتھیوں کو ہدایت فرمائی:

(۱) ایک ماں باپ کی اولاد کی طرح آپس میں محبت اور اتفاق سے رہو۔ دوسرے کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھو۔ خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاؤ۔ کمزوروں کی مدد کرو۔ خدمت کو عزت سمجھو۔ اللہ کی رضا مندی کے کام یہی ہیں۔ (۵۰)

(۲) ہم صرف اللہ کے لیے محض اللہ کے بھروسہ پر گھر سے نکلے ہیں۔ تقویٰ ہمارا خصوصی امتیاز (شعار) ہونا چاہیے۔ ہمارا زادِ راہ توکل ہے۔ ہم کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائیں گے ضرورت پڑی تو ہم مزدوری کریں گے۔ آدھا کھائیں گے اور آدھا جماعتی ضرورتوں کے لیے محفوظ کریں گے۔ (۵۱)

اس کے بعد آپ نے سید زین العابدین صاحب سے فرمایا۔ جو کچھ باقی ہو، لے آؤ۔ صرف پانچ روپے باقی تھے۔ سید صاحب نے وہ بھی ضرورت مندوں کو تقسیم کر دیئے، اور فرمایا۔ پروردگار کا خزانہ بھرا ہوا ہے۔ (۵۲)

کشتیاں روانہ ہوئیں۔ خشکی کے قافلوں نے بھی قدم بڑھایا۔ موضع ڈھٹی، موضع ڈگڈگی، پیر نگر، قصبہ کھنی، موضع کیمہ، موضع ادجھنی، موضع اسرولی، موضع چھپری، موضع برھمٹڈی، میں کہیں ایک وقت اور کہیں ایک دو دن قیام کرتے ہوئے قافلہ الہ آباد پہنچا۔ بلوہ گھاٹ پر کشتیاں لنگر انداز ہوئیں۔ ''راجہ اودت نرائن'' کی بارہ دری میں قیام ہوا۔ شیخ غلام علی صاحب رئیس اعظم الہ آباد (محلہ راجہ اودت نرائن) میزبان تھے۔ بارہ روز قافلہ مقیم رہا۔ تقریباً دو ہزار آدمیوں کا کھانا دونوں وقت تیار ہوتا تھا۔ روانگی کے وقت قافلہ کے لیے تقریباً تین ہزار روپیہ

کے اسلحہ، ایک بڑا خیمہ، بارہ چھوٹے خیمے، پانچ ہزار روپیہ نقد، قافلہ کے ہر ایک شخص کے لیے ایک جوڑا کپڑا، ایک روپیہ نقد، سید صاحب اور اُن کے اہل وعیال کے لیے عمدہ کپڑے، کچھ بیش قیمت تحفے، مبلغ پانچ صد روپے نقد پیش کیے۔ (۴۳)

اس موقع پر وقائع احمدی کی ایک معنی خیز روایت ملاحظہ فرمایئے:

"شیخ صاحب (شیخ غلام علی صاحب رئیس الہ آباد) کا یہ معمول تھا کہ جتنی مرتبہ آپ خدمت میں آتے، کوئی عمدہ بیش قیمت ہتھیار ضرور لاتے۔ دن میں ایک بار بھی، دو بار بھی۔ حضرت نے فرمایا۔ ابھی ہم حج کو جاتے ہیں۔ وہاں ہتھیار لے جانے کی کچھ ضرورت نہیں۔ آپ ہر وقت روز، روز یہ تکلیف کیوں کرتے ہیں۔ وہاں سے جب اللہ تعالیٰ ہم کو مع الخیر لائے گا، تب ہم آپ سے لے لیں گے۔ شیخ صاحب نے جواب دیا کہ اول تو مجھ کو یہ معلوم نہیں کہ آپ کہاں جہاد کریں گے۔ اس ملک میں یا کسی اور ملک میں۔ پھر مجھ کو خود اپنی زندگی کا بھروسہ نہیں۔ اگر میں مر گیا، تو میری آرزو باقی رہ جائے گی۔ آپ اس کو لے جائیں۔ پھر آپ کو اختیار ہے جہاں چاہیں رکھ دیں۔ (۴۴)

یہ تو روزمرہ کا دستور تھا۔ اور جب شیخ صاحب اسی قیام کے دوران میں سید صاحب سے بیعت ہوئے تھے تو بیش بہا (۴۵) نذرانہ کے ساتھ سترہ ۱۷ ایسے خوبصورت اور نادر ہتھیار پیش کیے تھے جو امیروں کے سلاح خانوں کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتے۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ اس قافلہ کی مہمان داری اور نذرانہ میں بیس ہزار روپے شیخ غلام علی صاحب نے خرچ کر دیئے تھے۔ (۴۶)

شیخ صاحب کے ذمہ کام

یہ شیخ صاحب کی خاطر مدارات تھی۔ سید صاحب نے اس کے صلہ میں جو عنایت فرمایا، وہ بھی ملاحظہ فرمایئے:

سید صاحب نے فرمایا۔ شیخ صاحب! پورے علاقہ کی اصلاح آپ کے ذمہ ہے۔ زمینداروں اور کاشتکاروں کے بہت سے کام سرکار سے پڑتے رہتے ہیں آپ ان میں غریب کاشتکاروں کی امداد فرمایئے۔ مال گذاری میں کمی کیجئے۔ تحصیل وصول میں نرمی سے کام لیجئے۔ آپ اُن کے دل میں گھر کر لیجئے۔ پھر یہ آپ کے ہیں۔ آپ جو کہیں گے یہ اس کے لیے جان چھڑکیں گے۔ (۴۷)

قلعہ الہ آباد

میں تقریباً تین سو مسلمان سپاہی تھے۔ اُنھوں نے سید صاحب کی دعوت کی۔ سید صاحب کو قلعہ میں لے

گئے۔ مسلمان بادشاہوں کے شہ نشین پر سید صاحب کو بٹھایا۔ سید صاحب سے بیعت ہوئے۔ چالیس روپیہ نقد، ایک پستول، ایک انگریزی کرچ، ایک فرد ناٹ نذرانہ پیش کیا۔ [۴۲۸] مولوی کرامت علی صاحب صدر امین نے سفید پارچے اور پشمینے کے تھان اور چالیس روپے نقد پیش کیے۔ شاہ اجمل صاحب [۴۲۹] رحمہ اللہ نے پچاس روپے نقد اور خوشنما رضائیاں ہدیہ کیں۔

الہ آباد سے مرزا پور

بارہ روز الہ آباد قیام کرنے کے بعد اسی شان سے قافلہ روانہ ہوا۔ عورتیں بچے اور کمزور مرد کشتیوں میں، باقی آدمی دو ٹولیوں میں تقسیم ہو کر دیہات کا گشت کرتے ہوئے مرزا پور پہنچے۔ مرزا پور کے ایک سوداگر نے قیام کا انتظام کیا۔ دل کھول کر قافلہ والوں کی مدارات کی۔ ایک ہفتہ قیام کے بعد روانگی ہوئی تو چار ہزار روپیہ نقد اور ایک پستول نذر میں پیش کی اور خود بھی بارادہ حج شریک قافلہ ہو گئے مولانا فرزند علی صاحب نے بھی مبلغ اسی ۸۰ روپیہ اور اہل قافلہ کی پوشاک کے لیے گاڑھے کے چالیس تھان پیش کیے۔

مرزا پور سے چنار گڑھ ہوتا ہوا ۸ / ذی الحجہ ۱۲۳۶ھ کو ایک ماہ ۲۶ روز میں یہ قافلہ بنارس پہنچا۔ ایک ماہ بنارس میں قیام کیا۔ یہاں سے دوسری کشتیاں کرایہ پر لی گئیں۔ ۱۰ محرم ۱۲۳۷ھ کی شام کو بنارس سے روانگی ہوئی۔ پہلا قیام زمانیہ (ضلع غازی پور) میں ہوا۔ پھر غازی پور، بارہ، بکسر، بلیا قیام کرتے ہوئے چھپرا پہنچے۔ جہاں فرحت علی صاحب کے مکان پر بہت سے لوگوں نے بیعت کی۔ چھپرے سے دانا پور پہنچ کر ایک ہفتہ قیام کیا۔

دانا پور سے روانہ ہو کر قافلہ عظیم آباد (پٹنہ) پہنچا۔ مدرسہ کے متصل کشتیاں باندھ دی گئیں۔ دو ہفتہ اس شہر میں قیام رہا۔ ہزار ہا بندگان خدا فیض یاب ہوئے۔

عظیم آباد سے قصبہ باڑھ پھر مونگیر، اس کے بعد بھاگل پور قیام کر کے مرشد آباد پہنچے۔ وہاں چند روز قیام رہا۔ پھر ہگلی میں کشتیاں لنگر انداز ہوئیں۔ جہاں ایک ہفتہ قیام رہا۔

ہگلی میں شیخ امین الدین [۴۳۰] احمد صاحب تاجر نے پیش قدمی کر کے اپنے یہاں قیام کی دعوت دی۔ شیخ صاحب آپ کے قیام کے لیے ایک باغیچہ خرید چکے تھے جس میں عظیم الشان حویلی تھی۔ جو قافلہ کا قیام گاہ بنی۔

سید صاحب کے پاس کافی اسلحہ تھا، اور کلکتہ میں اسلحہ کا داخلہ ممنوع تھا۔ شیخ امین الدین صاحب کے تعلقات کام آئے اور یہ ممنوع فعل نظر انداز ہو گیا۔ قافلہ پورے اسلحہ کے ساتھ قیام گاہ میں پہنچ گیا۔

کلکتہ میں دو ماہ قیام رہا۔ قافلہ کا چرچا بنگال سے گزر کر آسام، برما اور جاوا تک پہنچ گیا۔ پیگو (برما) سے سید حمزہ سونا فروخت کرنے کے لیے کلکتہ آئے ہوئے تھے۔ پیگو کے سرکاری حلقہ میں ان کا اثر اور رسوخ کافی تھا۔ انہوں نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اسی طرح سلہٹ، چاٹ گام وغیرہ سے بھی بہت سے لوگ آئے

اور حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔

سرزمین بنگال جو سراج الدولہ کے زمانہ سے زخم خوردہ تھی، اور مولانا شریعت اللہ صاحب [۲۴۱] جیسے جانبازوں کی قربانیاں اس زخم کو اب تک ہرا کیے ہوئے تھیں۔ سید صاحب کی تشریف آوری سے تئے جواہرا گلنے لگی۔

بنگالیوں کے ہجوم ہزاروں کی تعداد میں بنگال کے کونہ کونہ سے آتے اور شمع عزیمت کے پروانہ بن کر اپنی زندگیاں قربان کرنے کا نیا معاہدہ کرتے۔ صبح سے رات تک وعظ و نصیحت اور بیعت کا سلسلہ جاری رہتا۔ ایک ایک شخص سے بیعت لینا مشکل تھا تو کئی کئی دستاریں کھول دی جاتی تھیں۔ لوگ دستار کو ہاتھ میں تھامتے اور بیعت کے الفاظ زبان سے ادا کرتے۔ روزانہ سترہ اٹھارہ مرتبہ یہ عمل ہوتا تھا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ تقریباً ساٹھ ہزار آدمیوں نے بیعت کی۔ [۲۴۲]

اس گرویدگی کا اثر یہ تھا کہ بنگال کے قحبہ خانے سونے پڑ گئے۔ شراب اور تاڑی کی دوکانیں بند ہو گئیں۔ ٹھیکیدار ٹھیکوں کی واپسی کے نوٹس دینے لگے۔ [۲۴۳]

ڈبلو، ڈبلو، ہنٹر جو سید صاحب کو لٹیرا کہہ کر اُن کے پاک باز دامن پر دھبہ لگانا چاہتا ہے۔ اس اعتراف پر مجبور ہے کہ:

"۱۸۲۰ء میں اس مجاہد نے آہستہ آہستہ اپنا سفر جنوب کی طرف شروع کیا۔ اُن کے مرید اُن کے ادنیٰ سے ادنیٰ کام کو بخوبی سرانجام دیتے تھے، اور صاحب جاہ اور علماء عام خدمت گاروں کی طرح اُن کی پالکی کے ساتھ ننگے پاؤں دوڑنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ پٹنہ میں طویل قیام کے بعد اُن کے مریدوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ایک باقاعدہ نظام حکومت کی ضرورت پیش آ گئی۔ انہوں نے باقاعدہ اپنے ایجنٹ مقرر کیے تاکہ ہر اُس شہر سے جو اُن کے راستہ میں پڑتا ہو، تجارت کے منافع پر ٹیکس وصول کریں۔ اُس کے بعد انہوں نے چار خلیفہ مقرر کیے۔ یعنی رُوحانی نائب اور ایک قاضی القضاۃ مقرر کیا اور اُس کے لیے ایک باقاعدہ فرمان جاری کیا، جیسا کہ مسلمان بادشاہ صوبجات میں اپنے گورنر مقرر کرتے وقت فرمان جاری کیا کرتے تھے۔ [۲۴۴] چار خلفاء یہ ہیں۔ مولانا ولایت علی صاحب، مولانا عنایت علی صاحب، مولانا محرم علی صاحب، مولانا فرحت حسین صاحب، قاضی القضاۃ شاہ محمد حسین صاحب۔

اس کے بعد ہنٹر صاحب کا ارشاد ہے:

اس طرح پٹنہ میں ایک مستقل مرکز قائم کرنے کے بعد انہوں نے دریائے گنگا کے ساتھ ساتھ کلکتہ کی طرف کوچ کیا۔ راستہ میں لوگوں کو سلسلہ مریدی میں داخل کرتے جاتے اور بڑے بڑے شہروں میں اپنے نائب مقرر کرتے جاتے تھے۔ کلکتہ میں اُن کے ارد گرد اسی طرح ہجوم جمع ہو گیا تھا

کہ لوگوں کو مرید کرتے وقت اپنے ہاتھ پر بیعت کرانا اُن کے لیے مشکل تھا۔ بالآخر اُن کو پگڑی کھول کر یہ اعلان کرنا پڑتا تھا کہ ہر وہ شخص جو اُس کے کسی حصہ کو چھوئے گا، اُن کا مرید ہو جائے گا۔ (۲۲۵)

سلطان ٹیپو مرحوم کے پس ماندگان

ٹیپو سلطان مرحوم کے اہل و عیال کلکتہ میں نظر بند تھے۔ سید صاحب کے خاندان سے اُن کا پرانا تعلق تھا کیونکہ سلطان ٹیپو کے والد نواب حیدر علی بانی ریاست، سید صاحب کے نانا مولانا شاہ ابوسعید صاحب سے بیعت تھے، شاہزادوں اور بیگمات نے اس پرانے تعلق میں نئے رشتہ کا پیوند لگایا۔ سید صاحب اور آپ کے رفقاء کو مدعو کیا۔ شاندار دعوت کی اور بیش بہا نذر پیش کی۔

کلکتہ سے روانگی اور واپسی حج بیت اللہ شریف

ربیع الثانی ۱۲۳۷ھ کی آخری تاریخوں میں قافلہ جہازوں پر سوار ہو کر جدہ کی طرف روانہ ہوا۔ چار ماہ تک سمندر کی موجوں سے کھیلتے ہوئے جدہ پہنچے اور ۲۸ رشعبان ۱۲۳۷ھ کو مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ ساڑھے پانچ مہینے اس سرزمین پاک میں قیام رہا۔ فریضۂ حج سے فراغت کے بعد ۱۵ ر صفر کو مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے۔ ۲۹ ر ربیع الاول کو آپ مدینہ منورہ سے رخصت ہوئے۔ مکہ معظمہ آ کر قافلہ خیمہ زن ہوا۔ رمضان شریف گذرنے کے بعد ۱۵ ر شوال ۱۲۳۸ھ کو آپ روانہ ہوئے۔ بادبان جہازوں کے سینے قافلہ کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ چند ماہ سمندر میں زندگی گذار کر آپ ۱۲۳۹ھ کے شروع میں بمبئی پہنچے۔

بمبئی میں تشریف آوری اور قیام

جزیرہ بمبئی پرتگیزوں اور انگریزوں کا گہوارہ تھا۔ مگر پیشوایان مرہٹہ کی داستانِ الم بھی اسی گہوارہ کی آغوش میں چھپی ہوئی تھی۔ ہلکر اور امیر علی خاں کی جنگ آزادی کے نعرے ابھی تک گونج رہے تھے۔ سید صاحب کے قدم جیسے ہی ساحل بمبئی پر پہنچے، بمبئی نے اپنی داستان سُنانی شروع کر دی۔ جنگ آزادی کے پرانے نعروں نے نئی تڑپ دل میں پیدا کی اور آپ نے بمبئی کو بھی دوسرا کلکتہ بنا دیا۔ اٹھارہ روز کے قیام میں ہزاروں آدمی بیعت سے مشرف ہوئے، اور آپ سے جنگ آزادی کا سبق یاد کیا۔

سوانح نگاروں کے خیال میں یہ گرویدگی صرف اس لیے تھی کہ سید صاحب حج بیت اللہ شریف کے مقدس سفر سے واپس آئے تھے مگر برطانوی امپیریلزم کے سیاسی مبصر کی شہادت یہ ہے:

> بمبئی میں جہاں وہ سب سے پہلے جہاز سے اُترے، اُن لوگوں کی کثرت بھی جو اُن کا وعظ سننے آتے یا مرید ہونا چاہتے تھے، اُن کو زیادہ دیر تک ٹھہرنے کے لیے مجبور نہ کر سکی۔ وہ جہاں کہیں بھی

گئے، اُس سے زیادہ کامیابی حاصل کی جتنی مکہ معظمہ کے سفر سے پہلے کی تھی۔ بایں ہمہ وہ پرُ امن اصلاح میں اپنی واعظانہ سرگرمیوں کو حقارت آمیز بے صبری سے دیکھتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب اُن کی نگاہ ہر وقت سرحد کی دور دراز جنگ جو آبادی پر لگی رہتی تھی۔ (۲۲۶)

ہنٹر نے اس موقع پر اس بہتان کی بنیاد بھی رکھ دی ہے جس کا پراپیگنڈا کر کے انگریزی مشینری نے اس تحریک کو ناکام بنایا۔ وہ چند سطر پہلے کہتا ہے کہ:

سید احمد صاحب جب مکہ معظمہ میں تھے تو حکومت کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ سید صاحب کے عقائد بھی اُن صحرائی بدوؤں کی جماعت کے مطابق ہیں جن کی وجہ سے مقدس مقامات کو ایسے ایسے نقصانات اُٹھانے پڑے۔ لہٰذا مکہ معظمہ میں ان کی علانیہ بے عزتی کی گئی اور خارج البلد کر دیا گیا۔ اس سزا کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جب ہندوستان واپس آئے تو مشرکانہ بدعات کے مصلح اور مذہبی خبطی نہ تھے بلکہ عبدالوہاب کے پکے مرید تھے۔ (۲۲۷)

یہ الزام سراسر بہتان ہے اور قطعاً بے اصل۔ مکہ معظمہ میں اُن کی کوئی بے عزتی نہیں کی گئی۔ البتہ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ جاتے ہوئے کچھ بدوؤں نے ان کے قافلہ کو لوٹنا چاہا تھا، مگر ان عربوں اور بدوؤں نے جن کے اونٹوں پر قافلہ سفر کر رہا تھا۔ حملہ آور بدوؤں کو سمجھا کر واپس کر دیا۔ نہ لوٹ مار ہوئی نہ کشت و خون۔ (۲۲۸)

فارسی کی مثال ہے "دروغ گو را حافظہ نہ باشد"۔ یہ مثال یہاں چسپاں ہو رہی ہے۔ ہنٹر کا خود اقرار ہے کہ:

۱۸۱۲ء اور ۱۸۳۰ء کے درمیان کوئی وہابی مکہ معظمہ میں اپنی جان کو خطرہ میں ڈالے بغیر نہیں پھر سکتا تھا۔

پھر یہ کہنا کہ سید صاحب واپس ہوئے تو عبدالوہاب کے پکے مرید تھے، سراسر بہتان نہیں تو اور کیا ہے؟ مقصد یہ تھا کہ عام مسلمانوں کو سید صاحب سے بھی ایسا بدظن اور مشتعل کر دیا جائے جیسے اُس زمانہ میں محمد بن عبدالوہاب سے لوگ مشتعل تھے۔

ہزاروں پراپیگنڈوں اور غلط الزامات کے باوجود حقیقت اپنی جگہ حقیقت ہے۔ اور وہ مجبوراً زبان پر آ جاتی ہے۔ چنانچہ ہنٹر بھی حقیقت کے اس قدرتی عمل کے سامنے مجبور ہے اور باوجودیکہ کتاب کا منشاء مسلمانوں کو اس تحریک سے بدظن کرنا تھا، اسی بنا پر سید صاحب کو ڈاکو قزاق وغیرہ سب کچھ کہہ رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس اقرار پر بھی مجبور ہے کہ:

یہ لوگ اپنے عقیدے کے مطابق بڑے ہی پاک طینت تھے۔ انہوں نے بغاوت میں حصہ لیا تو کسی اونیٰ مقصد کے لیے نہیں لیا۔ (۲۲۹) سید صاحب کی زندگانی کا درمیانی حصہ ایسا بھی تھا کہ جس میں اُن کا دل برادرانِ وطن کی نجات کے لیے ہر وقت بے قرار رہتا تھا۔ (۲۳۰) انہوں نے برادرانِ وطن کی عملی زندگی پر وعظ کہنا شروع کیا اور ہر قسم کی اصولی بحثوں سے پرہیز کیا۔ جس کے متعلق اُن کے دشمن تو یہ کہتے ہیں کہ وہ اس قابل ہی نہ تھے، اور اُن کے مریدوں کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ اُن کی

برتری اور بزرگی کی شان کے خلاف تھا۔[۴۴۱] ان کا سیاسی اور مذہبی نصب العین انقلاب پسندوں کی اُمید وبیم کے عین مطابق ہے۔ ان میں ہزارہا اشخاص ایسے بھی موجود ہیں جو واقعی بہت بڑے متقی ہیں۔ اور نفس کشی کو اپنا فرض اولین تصور کرتے ہیں۔[۴۴۲]

اس سے بھی زیادہ مضحکہ انگیز بات یہ ہے کہ ایک طرف سید صاحب کو عبدالوہاب کا پکا مرید بتاتا ہے، پھر دوسری طرف یہ الزام بھی کہ سید صاحب کو بارہ اماموں یا چھ اماموں میں سے ایک امام مانا جاتا تھا[۴۴۳] وغیرہ۔ حالانکہ وہابیت اور عقیدہ امامت میں منافات اور تضاد ہے اتنا تضاد کہ ہر ایک دوسرے کو کافر اور خارج از اسلام قرار دیتا ہے۔

بمبئی سے کلکتہ

اٹھارہ روز بمبئی میں قیام فرما کر آپ بحری راستہ سے کلکتہ روانہ ہوگئے۔ راستہ میں دو روز ''الفی'' (ایلی) بندر پر قیام فرمایا۔ کلکتہ میں اس مرتبہ شیخ عبداللہ صاحب (خلف فخر التجار شیخ غلام حسین صاحب) پورے قافلہ کے میزبان تھے۔ چونکہ ایک جہاز جس کا نام عطیۃ الرحمٰن تھا، راستہ سے بھٹک کر پیچھے رہ گیا تھا اس کے انتظار میں تقریباً ایک ماہ قیام کرنا پڑا۔ یہ عرصہ سخت پریشانی کا گذرا ساتھیوں کی جدائی کا قلق، پھر طرح طرح کے دسوسے ہر وقت پریشان رکھتے تھے۔ دعائیں ہوتی تھیں۔ اور وظیفے پڑھے جاتے تھے۔ خدا خدا کر کے جب ایک ماہ بعد یہ جہاز بخیریت پہنچ گیا، تب رائے بریلی کی طرف سفر شروع ہوا۔ مگر تیاری جہاد کا جذبہ اب پہلے سے کہیں زیادہ تھا، اور اب یہ سفر گویا میدان جنگ کی طرف تھا۔

مقامی حضرات جنہوں نے دوسرے دورہ میں قافلہ کی خدمت کی

سید صاحب کا یہ قافلہ جس کے شرکاء ستر ۷۰ سے شروع ہو کر آٹھ سو ہو گئے تھے جہاں جہاں پہنچا، وہاں اس کی میزبانی اور مدارات میں بہت سے حوصلہ مندوں نے حصہ لیا، ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکن افسوس تاریخ ان سب کے نام محفوظ نہیں رکھ سکی۔ جو نام سوانح کی مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں، ذیل کے نقشہ میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ اس نقشہ میں چند نام غیر مسلموں کے بھی ملیں گے۔ اس سے تحریک کے عمومی اثر اور اس زمانہ کے باہمی تعلقات پر ہلکی سی روشنی پڑے گی۔

مقام اور مدت قیام:	کارکنوں اور میزبانوں کے نام اور مختصر کیفیت
ڈلمؤ۔ چار روز:	یہاں دو بھائیوں میں اس پر بحث چل رہی تھی کہ پہلے دعوت کون کرے سید صاحب کے سامنے یہ بحث شروع ہوئی تو آپ نے بڑے بھائی کے حق میں فیصلہ کیا کہ بڑے کا حق مقدم ہے۔

موضع ڈھیٹی دھمدھمہ: (ایک شب قیام رہا) شیخ مظہر علی صاحب نے قافلہ کی مدارات کی۔

موضع ڈگڈگی: شیخ محمد پناہ صاحب اور ان کے فرزند ارجمند شیخ محمد کفاہ۔ صبح کو (دن بھر) ڈگڈگی سے روانہ ہوئے۔ شام ہوگئی تو ملاحوں نے ایسی جگہ کشتیاں باندھیں جہاں آس پاس کوئی بستی نظر نہ آتی تھی۔ دریا کے کنارے کی زمین دور دور تک ایسی خراب تھی کہ کھانا پکانے کی کوئی صورت نہ تھی اس اثناء میں کالی گھٹا اٹھی۔ تیز ہوا چلنے لگی اور قطرہ افشانی شروع ہوئی۔ سب نے سمجھ لیا کہ رات کھائے بغیر گذرے گی۔ اچانک دور سے مشعلیں نظر آئیں۔ مشعلوں والے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ تیل کے انگریز تاجر نے اپنے مسلمان کارکنوں کی خاطر سے پلاؤ کی دیگیں پکوا کر بھیجی ہیں اور خود گھوڑے پر سوار آیا ہے۔ (۲۲۴)

گنگہ۔ ایک دن: آصف خاں رسالدار کے مکان پر قیام ہوا۔

جہان آباد: یہاں گھاٹ پر تین روز کشتیاں رکی رہیں۔ مہمان داری کا سارا انتظام شیخ برکت علی صاحب نے کیا۔ شیخ حسن علی کیا کے باشندے تھے جو جہان آباد کے گھاٹ سے تین کوس کے فاصلہ پر تھا روانگی کے وقت شیخ حسن علی صاحب اپنے چاروں بھائیوں اور مستورات کے ساتھ حج کے ارادہ سے ساتھ ہو لیے۔ (۲۲۵)

موضع اوجھنی ایک روز: شیخ لعل محمد صاحب زمیندار موضع اوجھنی نے دعوت کی۔ (۲۲۶)

موضع اسرولی ایک روز: شیخ محمد وزیر (شیخ لعل محمد صاحب کے خسر)۔

موضع چھپری ایک روز:

الہ آباد۔ بارہ روز: گھاٹ پر شیخ غلام علی رئیس۔ محمد تقی اور ان کے بھائی۔ عبداللہ قصاب۔ شاہ اجمل صاحب کے فرزند شاہ ابوالمعالی۔ قلعہ الہ آباد کے داروغہ بستی میاں۔ رنجیت خاں میواتی۔ مولوی کرامت علی صدر امین۔ حافظ اکرام الدین دہلوی۔ حافظ نجابت علی سوداگر۔ محمد حسین۔ عبدالقادر شیخ سازنگ وغیرہ۔

مرزاپور۔ تین روز: شیخ عبداللطیف صاحب اور شیخ شاہ محمد۔ دونوں مشہور تاجر تھے اور شیخ عبداللطیف صاحب کے متعلق تو بیان کیا گیا ہے کہ مختلف شہروں میں اُن کی ستائیس تجارتی کوٹھیاں تھیں۔ روانگی کے وقت چار ہزار روپیہ نقد پیش کئے اور اپنی والدہ کو ساتھ لے کر حج کے لیے تیار ہوگئے اور اپنے لیے ایک کشتی کرایہ کر لی۔ شیخ شاہ محمد صاحب نے پانچ سو روپیہ نقد ایک جوڑی پستول۔ بیس تھان ململ۔ تینوں مشروع وغیرہ۔ اٹھارہ تھان گاڑھے کے قافلہ کی پوشاک کے لیے پیش کئے۔

چنار گڑھ تین روز: پانچ دعوتیں ہوئیں۔ ایک تمباکو کے تاجر کی طرف سے، دوسری چاولوں کی بنڈی کے چودھری کی طرف سے تیسری شہر کے چودھری کی طرف سے، چوتھی قلعہ کے سپاہیوں کی طرف سے، اور پانچویں قلعہ کے خلاصیوں کی طرف سے۔

بنارس: ایک ماہ عید الاضحیٰ سے پہلے پہنچے اور ۱۰ محرم الحرام ۱۲۳۷ھ کو روانہ ہوئے۔ بارش کا زور تھا۔ پندرہ روز مسلسل بارش ہوتی رہی۔ مگر سلسلۂ تبلیغ و اصلاح برابر جاری رہا۔ اسی میں دعوتیں بھی ہوتی رہیں۔ ہزاروں آدمی بیعت سے مشرف ہوئے۔ خاص خاص نام یہ ہیں: شاہزادہ مرزا بلاقی۔ (۱۳۷) شاہزادہ مرزا حاجی۔ مولانا عبداللہ صاحب۔ میاں بھولا چابک سوار۔ میاں اللہ رکھو صاحب۔ میاں یار محمد صاحب۔ میاں دین محمد صاحب۔ میاں لعل محمد صاحب یارو۔ مرزا کریم اللہ بیگ صاحب۔ مولوی غلام یحییٰ صاحب۔ حکیم سلامت علی خاں صاحب۔ حیات النساء بیگم، اس خاتون نے چھ سات ہزار روپیہ کا مال پیش کیا۔ مگر چونکہ اس کا پہلے انگریز سے تعلق رہا تھا، اس لیے سید صاحب نے اس کا نذرانہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ خاتون رونے لگی کہ میں تو توبہ کر چکی ہوں۔ کیا میری توبہ قبول نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ یہ مال ناپاک ہے۔ میں صرف مال حلال کے نذرانے لیتا ہوں۔ حکیم سلامت علی خاں صاحب اس بیگم کے مختارِ عام تھے۔

زمانیہ۔ دو روز: سید صاحب کے دوستوں میں ایک صاحب رستم علی خاں تھے۔ وہ اس زمانہ میں ٹونک گئے ہوئے تھے۔ اُن کا بیٹا آپ کو اپنے گھر لے گیا۔ وہاں کے بہت سے پٹھانوں نے بیعت کی۔ قریب کے جنگل میں ایک مجذوب رہتا تھا اگر کوئی شخص اس کے پاس جاتا تھا تو پتھروں سے خبر لیتا تھا۔ سید صاحب تنہا اس کے پاس گئے۔ ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ مجذوب نے سید صاحب کو دیکھا تو بڑی خوش الحانی سے حافظ کی غزل پڑھی جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

تعالَی اللہ چہ دولت دارم امشب
کہ آمد ناگہاں دلدارم امشب

پوری غزل کیف و مستی کی حالت میں پڑھی۔ پھر خواجہ حافظ کی اور غزلیں سنائیں۔ آخر میں دریافت کیا کہاں کہاں جانے کا ارادہ ہے؟ سید صاحب نے بتایا کہ "حرمین

شریفین"۔ مجذوب بولا۔ کیا بیت المقدس بغداد، نجف اور کربلا بھی جاؤ گے؟ سید صاحب نے فرمایا "ایک کار ضروری درپیش ہے۔ بعد ادائے حج اس کی تدبیر کرنی ہے، اس لیے اور کہیں جانے کا ارادہ نہیں"۔

غازی پور تین روز: شاہ منصور عالم صاحب رئیس غازی پور۔ شیخ غلام ضامن۔ قاضی محمد حسن صاحب۔ تیغ علی خاں صاحب۔ ان سب حضرات نے دعوتیں کیں اور اہل وعیال سمیت بیعت سے بھی مشرف ہوئے۔ غازی پور کے ایک دوسرے رئیس شیخ فرزند علی صاحب، سید صاحب کے مخلص اور جان نثار دوست تھے۔ اتفاق سے وہ یہاں تشریف نہ رکھتے تھے۔ مستاجری کے کام پر گئے ہوئے تھے۔ البتہ آپ کے مختار مرزا محی الدین بیگ کشمیری یہاں مقیم تھے۔ میزبانی کے تمام فرائض مختار صاحب نے اپنے رئیس کی طرف سے انجام دیئے۔

باڑا۔ ایک روز: یہ گاؤں انہیں شیخ فرزند علی صاحب کا خریدا ہوا تھا۔ یہاں شیخ صاحب کے فرزند ارجمند محمد امیر صاحب قیام فرما تھے۔ آپ ہی نے سید صاحب کے فرائض ضیافت انجام دیئے۔ پھر گاؤں کے تمام چھوٹے بڑوں کے ساتھ شرف بیعت سے مشرف ہوئے۔ سید صاحب نے تیغ علی خاں اور سردار خاں کو خلافت نامے عطا کئے۔

موضع بلیا ایک روز: یہ گاؤں بھی شیخ فرزند علی صاحب کا تھا۔ یہاں بھی شیخ صاحب کی طرف سے فرائض مہمان داری انجام دیئے گئے۔ شیخ فرزند علی صاحب کے قابل قدر فرزندوں کا تذکرہ انشاء اللہ آگے آئے گا۔ یہ بات قابل تذکرہ ہے، کہ تحریک کانگریس کے مشہور رہنما ڈاکٹر سید محمود صاحب وزیر امور خارجہ حکومت ہند انہیں شیخ فرزند علی صاحب کے پوتے ہیں۔

بکسر: قاضی بکسر نے پلاؤ کی دیگیں پکوا کر حق میزبانی ادا کیا، اور بہت سے لوگ بیعت سے مشرف ہوئے۔

چھپرہ۔ ایک روز: فرحت علی صاحب

داناپور اور موضع ڈنکھا ایک ہفتہ: شیخ علی جان جو یہاں کے بہت بڑے دولت مند تھے، وہ آپ کو اپنے موضع ڈنکھا بھی لے گئے۔ جب سید صاحب جہاد کو تشریف لے گئے تو اطراف بہار کے عقیدتمندوں کی امدادی رقمیں انہی شیخ علی جان صاحب کے پاس جمع ہوتی تھیں ان کے نام سید صاحب کے متعدد مکتوب بھی ہیں۔ شیخ صاحب کے علاوہ داناپور کے مشہور اہل خیر صدرالدین قصاب بھی حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔

عظیم آباد۔ پٹنہ آٹھ روز: مولانا سید مظہر علی صاحب۔ مولانا الٰہی بخش صاحب صادق پوری۔ لکھی میاں رئیس۔ مولانا فتح علی صاحب۔ شاہ محمد حسین صاحب تمو میہ۔ خواجہ قمرالدین کشمیری۔ نواب زادہ قطب الدین صاحب۔ آپ نے ہدیہ میں بہت سے بہترین اور اعلیٰ قسم کے کپڑے۔ ایک پرانی اور نہایت قیمتی گجراتی تلوار۔ ایک انگریزی پستول۔ ایک بندوق دو کمانیں۔ دو ترکش اور مبلغ پانچ سو روپیہ نقد پیش کئے۔ رحیم خاں افغان تاجر چرم۔ امیر خاں (برادر زادہ و داماد رحیم خاں صاحب) عبدالرحمٰن صاحب تاجر۔ ان تاجروں نے کپڑوں کے تھان بھی پیش کئے اور نقد رقم بھی نذر گذرانی۔ یہ سب حضرات مع اہل وعیال بیعت ہوئے۔ ان کے علاوہ ہزاروں نے بیعت کی۔

باڑھ۔ دو روز: یہاں اردگرد کی بستیوں سے بہت سے آدمی آئے ہوئے تھے۔ جن میں خواجہ مولا بخش صاحب۔ خواجہ افضل علی۔ "شیخ نوپن"۔ واجد علی صاحب۔ اکرام الحق صاحب۔ شاہ گھسیٹا صاحب۔ یہ بہت بااثر اور بارسوخ تھے۔ خلافت نامہ انہیں کو دیا گیا۔

راج محل دو روز: منشی محمدی انصاری صاحب۔ سید صاحب کے ایک خاص اور مخلص مرید تھے۔ اُن کا وطن راج محل سے دس بارہ کوس تھا۔ یہ منشی صاحب، سید صاحب کو اپنے مکان پر لے گئے۔ وہاں مع اہل وعیال بیعت کی۔ آپ کے تمام اقارب بھی سلسلہ ارادت میں داخل ہوئے۔ اُن کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ منشی شاہ محمد صاحب۔ (فرزند منشی شیخ محمدی انصاری)۔ منشی رؤف الدین صاحب۔ منشی مخدوم بخش صاحب۔ منشی حسن علی صاحب۔ منشی فضل الرحمٰن صاحب۔ منشی عزیز الرحمٰن صاحب۔

کلکتہ۔ دو ماہ: منشی امین الدین صاحب۔ شیخ رمضانی صاحب۔ شیخ امام بخش صاحب تاجر۔ قادر بخش صاحب لکھنوی۔ سعید الدین صاحب ناخدا۔ منشی حسن علی صاحب۔ شیخ غلام حسین صاحب فخر التجار۔ عبداللہ صاحب خلف شیخ غلام حسین صاحب۔ نے فرائض میزبانی انجام دیئے۔ پھر یہ سب قافلہ میں شریک ہو گئے۔

پھلواری شریف ایک روز: حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب۔ مولانا احمدی صاحب یہ وہی یوسف پور محمد آباد ہے

محمد آباد یوسف پور اور چند روز: جس کی خاک پاک سے تقریباً پچاس سال بعد ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری اور حکیم عبدالرزاق صاحب جیسے نوجوان پیدا ہوئے جنہوں نے بیسویں صدی میں تحریک آزادیٔ ہند میں عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ یہاں ایک خاص واقعہ قابل یادگار ہے۔ قافلہ محمد آباد میں ٹھہرا ہوا تھا کہ سید صاحب تن تنہا ایک گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ ساتھیوں نے دریافت کیا کہ کہاں کا قصد ہے تو آپ نے فرمایا۔ "تو ئے دوست

ے آید"۔ دوست کی خوشبو آ رہی ہے۔ یہ دوست قاضی فرزند علی تھے جن کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے۔ یہ علالت کے باعث تشریف نہیں لا سکتے تھے۔ جب دوست سے ملاقات ہوئی تو آپ نے ایک لاکھ روپیہ اور ایک عمدہ گھوڑی پیش کی۔ پھر ایک بیٹا بھی قافلہ کے لیے نذر کر دیا جس کا نام سید محمد امجد تھا۔ آپ نے بڑے فخر اور ناز سے اپنے ساتھیوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ دیکھا تم نے میرے دوست کو۔

جذبات کی یہی ہم آہنگی تھی کہ اُس نے قاضی صاحب کی اولاد کو اسی رنگ میں رنگ دیا، اور اُن کے پوتے ڈاکٹر سید محمود صاحب کی نشو و نما بھی جذبہ حریت کی سرمستی کے ساتھ ہوئی۔

بنارس۔ چند روز: مرزا محمود بخت اور مرزا بلاقی جو اودھ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، خاص طور پر قافلہ کی خدمت میں پیش پیش رہے۔

مرزا پور۔ ایک روز: یہاں شیخ عبداللطیف صاحب نے فرائض میزبانی انجام دیے جو قافلہ کے ساتھی بھی بن گئے تھے۔ اور شیخ غلام حسین صاحب رئیس الہ آباد کے صاحبزادے بھی یہاں پہنچ گئے تھے۔ مرزا پور سے الہ آباد تک قافلہ کی تمام ضروریات انہیں صاحبزادے صاحب نے اپنے خرچ سے فراہم کیں۔

مہرونڈا وایلا گنج: الہ آباد سے آپ غلام حسین صاحب کے گاؤں مہرونڈا تشریف لے گئے وہاں ایک رات ٹھہرے۔ پھر ایلا و گنج میں قیام فرمایا۔ مصطفیٰ آباد وغیرہ سے بھی گذرے۔ اس سفر میں طالب علی عظیم آبادی نے گھوڑے کی رکاب تھام رکھی تھی۔ سوءِ اتفاق اُن کے پاؤں میں لیموں یا کھٹے کا کانٹا چبھ گیا۔ ایک رفیق نے اپنی سواری کا گھوڑا ان کی خدمت میں پیش کیا کہ آرام سے منزل کٹ جائے۔ لیکن وہ بولے، کوئی صاحب تخت رواں بھی دیں تو قبول نہ کروں گا۔

زراہِ عشق اگر در پا خلد خارے ۔۔۔ نباید از زدنش پرہیز کردن
کہ از خارش بسے گلہا شگوفند ۔۔۔ قدم برخار باید تیز کردن

واپسی: مختصر یہ کہ دو سال دس ماہ بعد ۲۹ شعبان المعظم ۱۲۳۹ھ، ۲۹ اپریل ۱۸۲۴ء کو آپ اپنے وطن عزیز میں نزول فرما ہوئے۔

بیت المال

جب قافلہ وطن سے روانہ ہورہا تھا تو خزانہ خالی اور صرف خدا کے بھرپور خزانہ پر بھروسہ تھا۔ اس اعتماد اور بھروسہ کا نتیجہ یہ تھا کہ دو سال دس ماہ تک شاہانہ فراخ حوصلگی سے پورے قافلہ کے مصارف، کافی تعداد میں اسلحہ، اور نہ صرف اپنے اعزہ اور اقارب بلکہ ساتھیوں کے اعزہ واقارب کے لیے بھی تحفے اور ہدیے خریدنے کے بعد، جب رائے بریلی پہنچ کر جائزہ لیا گیا تو بیت المال میں دس ہزار روپے نقد موجود تھے۔

اصلاح وتربیت

حج ایک مقدس فرض ہے اور اس کی ادائیگی اک مقدس مقصود۔ مگر جیسا کہ اُوپر عرض کیا گیا، اس دورہ کا مقصد صرف ادائے حج نہیں تھا، بلکہ وہ انقلابی تحریک جس کا نصب العین بانی تحریک (حضرت شاہ ولی اللہ صاحب) ''فک کل نظام'' معین کر چکے تھے۔ جس کی تعلیم وتبلیغ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اپنی سیاسی تربیت گاہ میں پچاس سال سے کررہے تھے۔ یہ دورہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی اور اسی زنجیر کا ایک حلقہ تھا۔ اس قافلہ کے آٹھ سو ساتھی صرف حاجی ہی نہیں تھے بلکہ وہ مجاہدین انقلاب تھے جو اپنے نفوس کو ہمہ گیر انقلاب کے لیے تیار کررہے تھے۔ یہ اپنی کایا پلٹ چکے تھے اور جن کے یہاں پہنچتے تھے، اُن کی کایا پلٹ دیتے تھے۔ یہ سیاسی انقلاب کو دامن، اور اخلاقی وسماجی انقلاب کو چولی سمجھتے تھے۔

یہ سیاسی اقتدار کے بھوکے نہیں تھے۔ بلکہ ملک کے گوشہ گوشہ میں تقریباً سو سال سے سیاسی اور فوجی انقلاب ہورہے تھے، یہ خود اُن سیاسی انقلابوں کے خالق اور فوجی معرکوں کے مرد میدان رہ چکے تھے مگر وہ ان سب خون ریز تماشوں سے اُکتا کر یہی طے کر چکے تھے کہ اصل انقلاب سماجی انقلاب ہے۔ اس کے بغیر نہ ''فک کل نظام'' کا نصب العین کامیاب ہوسکتا ہے اور نہ ملک اور قوم کو دوسروں کی غلامی سے مکمل نجات مل سکتی ہے۔

ان کو اس سے انکار نہیں تھا کہ شمشیر زنی بھی جہاد ہوا کرتا ہے مگر اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ تلوار بندوق کی لڑائی اسی وقت جہاد ہوتی ہے جب مجاہدین کی نیت درست، اُن کے اخلاق بلند اور اُن کے مقاصد اعلیٰ ہوں۔ وہ اخلاقی لحاظ سے تربیت یافتہ اور سماجی نقطۂ نظر سے اصلاح پذیر ہوں۔

وہ خوب سمجھتے تھے کہ قرآن حکیم نے جہاد بالسیف سے پہلے خود اپنی اور اپنے سماج کی اصلاح کو نہ صرف فرض بلکہ ''جہاد کبیر'' فرمایا ہے جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۔ (فرقان)

عام طور جہاد کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ دوسروں کو فنا کردینا۔ مگر یہ مجاہدین پاک باز و پاک نفس اس حقیقت کو پہچان چکے تھے کہ اسلام نے جس جہاد کو افضل ترین عبادت قرار دیا ہے وہ خود اپنے کو فنا کردینے کا نام ہے۔ یعنی مجاہد وہ ہے جو انانیت کو ختم کردے، اپنی شخصیت کو اس طرح مٹا دے کہ خود بینی وخود پرستی کا کہیں ادنیٰ شبہ بھی باقی نہ رہے۔

نیشنلزم جو آج کی سیاسی اخلاقیات میں مقدس جذبہ قرار دیا جاتا ہے، یہ بزرگ اس کو بھی ملوکیت اور اقتدار پسندی کا شاخسانہ سمجھتے تھے۔ کیونکہ اس میں اپنی ذات نہ سہی اپنی قوم اور اپنی نیشن کی برتری کا تصور سامنے رہتا ہے، اور اپنا خاندان نہ سہی اپنی وطنی برادری کو مخلوق خدا کے سینوں پر سوار کرنے کی ہوس کارفرما ہوتی ہے۔ جو لامحالہ امن عالم کو ختم کرتی ہے اور قومیت کے نام پر فتنہ فساد کا جہنم دہکاتی ہے، جس کو اسلام جاہلانہ عصبیت قرار دیتا ہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کرتا۔ ارشاد خداوندی ہے:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا۔

یعنی وہ دارِ آخرت جو مقدس ترین مقصد ہے، خالق کائنات نے اُس کو ان کا حصہ قرار دیا ہے جو دنیا میں اقتدار پرستی اور قومی برتری کو نصب العین نہیں بناتے اور فساد پیدا کرنا نہیں چاہتے۔

اس جہادِ کبیر اور سماجی اصلاح کی مثالیں پہلے دورہ کے مختصر حالات کے بعد ہم تحریر کر چکے ہیں۔ اس دورہ میں جو اصلاحات کی گئیں اُن کے چند نمونے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

خدمتِ خلق

جب قافلہ مرزاپور پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک کشتی لنگر انداز ہے۔ اُس پر روئی کی گانٹھیں لدی ہوئی ہیں۔ مالک اُن کو اُتروانا چاہتا ہے مگر مزدور نہیں مل رہے۔ قافلہ کے ساتھیوں کو مالک کی پریشانی کا احساس ہوا۔ وہ کشتی کی طرف بڑھے اور روئی کی تمام گانٹھیں اتار کر گودام پر پہنچا دیں۔ مالک بھی حیران تھا، اور شہر والے بھی تعجب کر رہے تھے کہ یہ فرشتے کہاں سے آ گئے کہ پہلے سے کوئی جان پہچان نہیں۔ شریف صورت، اجلی پوشاک اور مزدوروں کا کام محض اللہ واسطے کر رہے ہیں۔

مساوات

اسی مرزاپور کا ذکر ہے کہ وہاں سات گھر اینٹ پکانے والوں کے تھے۔ چونکہ وہ اینٹیں پہنچانے کے لیے گدھے بھی رکھتے تھے اس لیے گدھے والوں کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ شہر کے وہ خاندان جو شرفاء کہلاتے تھے، ان کو ذلیل اور کمین سمجھتے تھے، اور یہ تو بہت ہی بڑی عار کی بات سمجھی جاتی تھی کہ اُن کے یہاں جا کر کچھ کھایا پیا جائے۔

ان غریب گدھے والوں کو بھی شوق ہوا کہ سید صاحب اور آپ کے قافلہ والوں کی دعوت کریں۔ اوّل تو انہیں عرض کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی اور جب ہمت کر کے یہ درخواست پیش کی تو قافلہ کے میزبانوں نے سختی سے مسترد کرا دینا چاہا۔ مگر میزبانوں اور شہر کے تمام ہی لوگوں کو سخت حیرت ہوئی جب سید صاحب نے خندہ پیشانی سے اُن کی دعوت قبول فرمائی۔ بڑے شوق سے اُن کے محلہ میں گئے اور بڑی شفقت کے ساتھ ان کی دعوت تناول کی۔ دعوت کے بعد اُن لوگوں نے ایک خشت میں چار سو روپیہ نقد اور دوسرے طشتوں میں

کمخواب بگلبدن وغیرہ اسی قسم کے چند تھان پیش کیے۔ سید صاحب نے اس ہدیہ کے قبول کرنے سے معذرت فرمادی، اور فرمایا کہ اگر آپ کا ہدیہ قبول کرلیا گیا تو شہر والے سمجھیں گے کہ اس ہدیہ کے لالچ میں دعوت کھائی تھی۔ اس طرح اصلاح کا مقصد فوت ہوجائے گا۔

بنارس

بنارس میں چمار ذات کا ایک شخص تھا۔ ''تلوکا'' نام۔ غریب آدمی تھا۔ ایک چھوٹے سے چبوترے پر جھونپڑی ڈال رکھی تھی۔ اسی میں وہ اور اس کی بیوی رہا کرتے تھے۔ مولوی عبداللہ صاحب اور بھولا چابک سوار سے اس کا یارانہ تھا۔ سید صاحب جب قافلہ لے کر نئے انداز سے بنارس پہنچے۔ پورے شہر میں اس کا چرچا پھیلا اور لوگوں نے بڑے شوق سے خاطر مدارات اور دعوتیں کیں تو اس غریب چمار کے دل میں بھی اُمنگ پیدا ہوئی۔ مگر دل مسوس کر رہ گیا کہ غریب چمار کے گھر یہ وقت کا بادشاہ کیسے آئے گا اور کون اُس کو آنے دے گا۔ جب اس کے دوست مولوی عبداللہ اور بھولا چابک سوار بیعت ہوگئے، اور حضرت سید صاحب کی تعریف شروع کی غریب ''تلوکا'' کے دل کی حسرت سوا ہونے لگی۔ ان دونوں دوستوں نے اطمینان دلایا کہ اگر تم بلانا چاہو گے تو سید صاحب ضرور تمہاری اس جھونپڑی میں آئیں گے۔ تلوکا کو اور کیا چاہیے تھا۔ اُس نے بڑے شوق سے درخواست پیش کی۔ ان حضرات نے اس پس ماندہ مایوس کی درخواست حضرت سید صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ سید صاحب فوراً آمادہ ہوگئے۔ اس کی جھونپڑی پر پہنچے۔ یہ پھٹی دھوتی اور میلا کچیلا پھٹا ہوا کرتا پہنے ہوئے تھا۔ یہ اسی حالت میں سید صاحب کے سامنے پیش ہوا۔ سید صاحب اس کے ساتھ چارپائی پر بیٹھے اور اس کے ساتھ بے تکلف بات چیت شروع کردی۔ اس نے سات پیسے نذر میں پیش کیے۔ آپ نے بڑی خوشی سے وہ قبول فرمائے اور ساتھیوں کو دے کر ہدایت فرمائی کہ یہ تحفہ محفوظ رکھا جائے۔ اس سادگی اور بے تکلف محبت کا نتیجہ ظاہر تھا وہ اور اُس کے کنبہ کے بیس پچیس گھر سید صاحب کے جاں نثار بن گئے اور مسلمان ہوکر سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہوگئے۔ (۲۳۸)

کلکتہ

کلکتہ میں ایک پیرزادہ صاحب نے دعوت کی اور راستہ میں پگڑیاں بچھادیں کہ سید صاحب اُن پر گذر کر تشریف لائیں۔ سید صاحب نے تمام پگڑیاں اٹھوادیں اور فرمایا کہ کپڑا پہننے کے لیے ہے، پامال کرنے کے لیے نہیں۔ (۲۳۹)

کلکتہ سے گیارہ جہاز کرایہ پر لیے گئے۔ اُن میں ایک بہت بڑا جنگی جہاز تھا۔ اُس کا نام 'عطیۃ الرحمٰن' تھا۔ ساٹھ توپیں اس پر چڑھی رہتی تھیں۔ اس کا ناخدا محمد حسین ترک چالیس جہازوں کا کپتان تھا۔ سید صاحب کے جاں نثار خاص فخر التجار غلام حسین صاحب نے تجویز پیش کی کہ سید صاحب اس جہاز پر سوار ہوں۔ جب آپ

عرب پہنچیں گے، تو وہاں کے لوگ بڑی عزت کریں گے۔

یہ سُن کر سید صاحب کی پیشانی پر شکن پڑ گئی۔ چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا۔ فرمایا عزت اور ذلت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ نمائشی عزت ہمیں درکار نہیں۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو اچھے اچھے جہازوں پر سوار کرایا، اور خود ایک بوسیدہ جہاز پر سوار ہوئے جس کا نام "دریا بغی" تھا اور جس کے متعلق مشہور تھا کہ بہت کم چلتا ہے۔ (۳۴۰)

اسی سادگی اور مساوات پسندی کا تقاضا تھا کہ آپ نے کلکتہ میں شیخ محمد امین صاحب کو ہدایت کر دی تھی کہ صرف ایک قسم کا کھانا تیار کرایا کریں اور متعدد قسم کے پر تکلف کھانے جو روزانہ پیش کیے جاتے ہیں بند کر دیے جائیں۔ چنانچہ اسی پر عمل کیا گیا۔

کلکتہ کے حوصلہ مند اہلِ خیر نے قافلہ والوں کے لیے کئی کئی جوڑوں، اور کئی کئی احراموں کے لیے تھان خریدے۔ آپ کو معلوم ہوا، تو آپ نے صرف دو دو احرام منظور کیے (یعنی دو دو لنگیاں اور دو دو چادریں فی کس) باقی سب واپس کر دیے کہ ضرورت کے لیے یہ کافی ہیں۔ آئندہ جب ضرورت ہوگی، خدا خود انتظام کر دے گا۔ ابھی سے بوجھ لادنا حماقت ہے۔

دوسرے دورہ کے سلسلہ میں سب سے نمایاں اصلاح یہ ہے کہ تعزیہ داری بند کرائی۔ وہ چبوترے جو تعزیہ رکھنے کے لیے تقریباً ہر ایک حویلی میں ہوا کرتے تھے اور مسجد کی طرح اُن کا احترام کیا جاتا تھا، اُن کو خود مالکوں کی مرضی سے تڑوا دیا۔ تعزیوں کے کھپچیوں کا ایندھن بنا کر قافلہ کا کھانا تیار کرایا۔ اسی طرح قبر پرستی وغیرہ کا انسداد کیا کیونکہ اوہام پرستی کی ان رسومات نے مسلمانوں میں پست ہمتی پیدا کر دی تھی، وہ حقائق سے ناآشنا ہو گئے تھے اور اقتصادی لحاظ سے بھی یہ رسومات تباہ کن تھیں۔

بیعت ہونے والوں میں بڑی تعداد اُن عیش پسندوں کی تھی جن کی زندگیاں جام و سبو کی دلچسپیوں اور کاکل و رخسار کی دلآویزیوں میں گذری تھیں۔ شیخ امین الدین صاحب کلکتہ والے اور شیخ غلام علی صاحب الٰہ آبادی جیسے مخلص جاں نثار جن کی نظیر اخلاص اور فدائیت کی تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے، بیعت کے وقت تک رقص و سرود کے دلدادہ اور ہر قسم کی عیش پرستی کے عادی تھے، ایسے با اثر لوگوں کی توبہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں جہاں یہ قافلہ پہنچا وہاں کے زمین و آسمان بدل گئے۔ کلکتہ میں زیادہ عرصہ قیام رہا تو تاڑی فروشوں کا دیوالیہ نکل گیا اور ٹھیکیدار ٹھیکوں کی منسوخی کی کوشش کرنے لگے۔ یہ تھا سماجی انقلاب جس کے بغیر "فک کل نظام" کا نصب العین کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

عدم تشدد

اصلاح و تربیت کا بنیادی اصول یہ تھا کہ سختی اور بد خلقی سے کام نہ لیا جائے نرم گفتگو اور ضبط و تحمل کو کامیابی کا ذریعہ بنایا جائے۔ کچھ آدمیوں کو تبت کے علاقہ میں بھیجا، تو اُن کو ہدایت کر دی کہ تم کو کوئی لکڑی، پتھر، لات، گھونسا

کتنا ہی مارے تم اس پر صبر کرنا۔ اور اُن کو کچھ نہ کہنا۔ (سیرت سید احمد شہید صفحہ ۲۱۹)

آسام اور بنگال میں کام کرنے کے لیے جن کو متعین کیا، اُن کو بھی یہی ہدایت کی:

''اور جو تم کو مارے کوٹے، رنج و ایذا دے، صبر کرنا اور وعظ و نصیحت سے باز نہ رہنا۔''(۲۴۱)

سرزمین حجاز میں بدو اور ڈاکو ہم معنی لفظ بن گئے تھے۔ حاجیوں کے قافلے پر ڈاکے ڈالنا معمولی کام تھا۔ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک آنے جانے میں ڈاکوؤں کا خطرہ ایک یقینی بات تھی۔ اس لیے حاجی بھی مسلح ہو کر یہ سفر کیا کرتے تھے۔ آپ کی داد و دہش اور تقریباً آٹھ سو نفر کی تنہا ذمہ داری نے آپ کے متعلق یقین دلا دیا تھا کہ دولت کے خزانے آپ کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اس لیے آپ کے قافلہ پر ڈاکوؤں کا حملہ اتنا ہی یقینی تھا جیسے رات کے بعد دن کا آنا اور آفتاب کا روشن ہونا۔ مگر آپ نے اس یقینی خطرہ کے باوجود ساتھیوں کو ہدایت کر دی تھی کہ کسی قسم کا کوئی ہتھیار اپنے ساتھ نہ رکھیں اور بالکل نہتے ہاتھ مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہوں۔ چنانچہ یہی قافلہ ایسا تھا جس میں کسی ایک کے پاس بھی کوئی ہتھیار نہیں تھا۔

دیانت داری اور امانت

دیانت داری اور امانت اخلاقیات میں اصل اصول کی حیثیت رکھتی ہیں۔ قافلہ کا ہر ایک فرد دیانت و امانت کا پیکر بن گیا تھا اسی دیانت کا تقاضا تھا کہ قیام کلکتہ کے زمانہ میں شیخ امین الدین کے باغیچہ میں ہر قسم کے میوے بکثرت تھے اور پورا باغیچہ ان بزرگوں کی راحت رسانی کے لیے وقف تھا۔ مگر ان کی حالت یہ تھی کہ کسی پھل یا پھول کا توڑنا درکنار، گرے ہوئے پھل بھی کوئی نہیں اُٹھاتا تھا۔ تمام پھل جمع کر کے سید صاحب کے یہاں پہنچوا دیے جاتے تھے اور سید صاحب ان کو قافلہ والوں میں تقسیم فرماتے تھے۔ ایک طرف یہ دیانت داری کی بہترین مثال تھی، دوسری جانب نظم و نسق کا سبق اس سے ملتا تھا۔

آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ کٹھ ضلع مرشد آباد میں دیوان غلام مرتضٰی صاحب نے بازار کی تمام چیزیں اہل قافلہ کے لیے وقف کر دی تھیں لیکن آپ نے ترکِ دنیا، ترکِ خواہشات کا بھی یہ عجیب و غریب تماشہ دیکھا کہ قافلہ کے ایک متنفس نے بھی بازار کی کسی چیز کا رُخ نہیں کیا۔

بے شک اس طویل سفر کے بعد ضرورت تھی کہ دوست احباب کے لیے کچھ ہدیے فراہم کر لیے جاتے اور اس سے بہتر موقع کہاں مل سکتا تھا کہ بازار کھلا ہوا ہے اور وہاں کی ہر چیز آپ کے لیے وقف ہے مگر ضبطِ نفس، دیانت و امانت کی یہ بلندی بھی ملاحظہ فرمائیے کہ ہر ایک ہوس کا خون کیا جا رہا ہے اور اپنے میزبان پر اپنی طرف سے معمولی بار بھی برداشت نہیں کیا جا رہا۔

رہنمایانِ تحریک کے ذاتی اوصاف

مقاصد تربیت کے عملی نمونے

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب (قدس اللہ سرہٗ العزیز) کی تربیت گاہ کا ذکر کرتے ہوئے ہم مقاصد تربیت بیان کر چکے ہیں۔ پہلے اور دوسرے دورہ کے حالات اور اصلاحی کارگذاریوں سے تربیت کے نتائج واثرات کا بھی اندازہ ہو چکا ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کے رہنما اور رضا کاروں کے بھی کچھ حالات بیان کر دیے جائیں تا کہ تربیت کے نتائج پر دوسرے عنوان سے بھی نظر پڑ جائے، اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ شرکاء قافلہ جو اجتماعی حیثیت سے دوسروں کی اصلاح کر رہے تھے وہ شخصی اور انفرادی طور پر کہاں تک یہ اصلاح قبول کر چکے تھے اور کہاں تک اس رنگ میں رنگ چکے تھے۔

ذاتی اور شخصی رجحانات معلوم ہونے کے بعد یہ فیصلہ بھی آسانی سے کیا جا سکے گا کہ ان حضرات نے جو جہاد کیا، اس کا مقصد کیا تھا؟

حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ

سید صاحب جس خاندان کے چشم و چراغ تھے وہ پورا خاندان خدا ترسی، پاک بازی، اور خدمت خلق میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ یہی اوصاف تھے جن کی بنا پر اس خاندان کی خانقاہ جو تکیہ شاہ علم (۳۳۲) اللہ کے نام سے مشہور تھی، پورے اودھ کا علمی اور روحانی مرکز بن گئی تھی۔

آپ کے نانا شاہ ابوسعید صاحب، (۳۳۳) حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے مخصوص شاگرد، اور ماموں شاہ ابواللیث صاحب، (۳۳۴) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے مخصوص تلمیذ تھے۔ اس بنا پر ولی اللہی سلسلہ کے خصوصی اوصاف گویا آپ کی گھٹی میں پڑے تھے۔

چنانچہ سید صاحب کے محلّہ اور پڑوس والوں نے سید صاحب کو بچپن ہی سے ایسے بچہ کی حیثیت سے پہچانا، جس کے دل و دماغ پر خدمت خلق کا جذبہ چھایا ہوا تھا۔

فطرت کے صحیح رہنما نے اس بچہ کو محلّہ بھر بلکہ دوسرے محلّہ کے بھی ضعیف، اپاہج اور لاوارث خواتین سے مانوس کر دیا تھا۔ دل میں ایک درد تھا جو اس بچہ کو صبح و شام ان ضرورت مندوں کے یہاں جانے پر مجبور کرتا۔ اُن سے اُن کی ضرورتیں معلوم کرتا اور خوشی خوشی اُن کو انجام دیتا۔ بازار سے سودا سلف لا کر دیتا۔ کنوئیں سے پانی بھر کر اُن کے یہاں پہنچاتا، بیماروں کی تیمارداری کرتا، مزدوروں کو سہارا دیتا اور کمزوروں کے بوجھ اُٹھا کر اُن کے گھروں تک پہنچاتا، (۳۳۵) یہی اس بچہ کی دلبستگی کے کام تھے۔

جیسے جیسے عمر بڑھتی رہی، نوشت و خواند کا شوق تو آگے نہیں بڑھا مگر خدمت خلق کا جذبہ یہاں تک آگے

بڑھا کہ جب وہ فکرِ معاش اور تلاش روزگار میں ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ وطن سے نکل کر لکھنؤ کی طرف روانہ ہوا، تو وہ اپنے ساتھیوں کا صرف خدمت گذار ہی نہیں تھا بلکہ اُن کا بار بردار بھی تھا۔ چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ تقریباً ۱۷ سال کی عمر میں جب والد صاحب کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کی وجہ سے روزگار کی تلاش میں لکھنؤ جا رہے تھے اور ہم عمر سات نوجوان ساتھ تھے تو جیسے ہی چند میل چلے، ہر ایک کا سامان سفر اس کو بار معلوم ہونے لگا۔ سید صاحب نے ساتھیوں کی تکلیف محسوس کی اور بڑی تدبیر سے سب کے سامان کی ایک گٹھری بنا کر سر پر رکھ لی۔ یہ سب ساتھی سبک سار تھے اور یہ خادم خلق سیدزادہ بار بردار۔ رائے بریلی سے لکھنؤ تقریباً پچاس میل ہے۔ تین روز میں یہ سفر طے ہوا۔ سید صاحب کا روزانہ کا دستور یہی رہا۔ ساتھی اگر انکار بھی کرتے تو منت ساجت کر کے اُن کو راضی کر لیتے اور بڑے شوق سے یہ بار برداری کی خدمت انجام دیتے۔ لکھنؤ پہنچے تو سید صاحب کو وہاں کے ایک رئیس نے پہچان لیا۔ اُس کا اصرار تھا کہ آپ اُس کے مہمان ہوں۔ سید صاحب نے ساتھیوں کو چھوڑ کر تنہا مہمان بننا پسند نہیں کیا۔ تو رئیس صاحب نے دونوں وقت سید صاحب کی قیام گاہ پر کھانا پہنچانا شروع کر دیا۔ سید صاحب ساتھیوں کے ساتھ کھانا کھاتے اور اس بیروزگاری کے دنوں میں بسا اوقات سب ساتھیوں کا فاقہ اسی کھانے سے ٹوٹتا۔

کئی ماہ گذر گئے۔ روزگار میسر نہ آیا۔ آپ نے ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ دہلی چلیں اور شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر دین کی کمائی کریں۔ ساتھی اس پر راضی نہیں ہوئے تو آپ تنہا روانہ ہو گئے۔

اسی سفر کا واقعہ ہے کہ آپ نے ایک بوڑھے مزدور کو دیکھا کہ راب کا بھرا ہوا گھڑا سر پر رکھے ہوئے ایک سپاہی کے ساتھ جا رہا ہے۔ بوڑھے کی کمزوری چلنے کی اجازت نہیں دیتی۔ مگر مجبوراً سر پر بوجھ لادے ہوئے چل رہا ہے۔ پہلے آپ یہ سمجھے کہ اس سپاہی نے اس غریب کو بیگار میں پکڑ لیا ہے تو آپ نے سپاہی کو فہمائش شروع کی۔ مگر جب سپاہی نے جواب دیا کہ بیگار نہیں بلکہ میں نے اس سے مزدوری طے کی ہے، مزدور نے بھی اقرار کیا کہ میں نے بھوکے پیٹ کا جہنم بھرنے کے لیے اس مزدوری کو غنیمت سمجھا ہے۔ آپ مہربانی کریں اور سپاہی کو نہ بگاڑیں تو آپ نے مزدوری کے پیسے بوڑھے کو دلوائے اور سامان خود اٹھا کر سپاہی کے ساتھ ہو لیے اور جہاں اس کو جانا تھا وہاں تک سامان پہنچا دیا۔ (۴۳۶)

آپ کو اللہ تعالیٰ نے صحت و تندرستی کی دولت عطا فرمائی تھی۔ بدن ورزشی تھا۔ آپ کا معمول تھا کہ صبح کو کم از کم پانچ سو ڈنڈ لگاتے تھے۔ آپ کے مگدروں کا وزن ایک من بائیس سیر ہوتا تھا، مگر یہ تن پروری کے لیے نہیں تھا بلکہ اس لیے کہ خدا کی اس نعمت سے خلقِ خدا کی خدمت زیادہ کر سکیں۔

ایک خاص مقصد اور خاص نصب العین کے ماتحت آپ امیر علی خاں کی فوج میں بھرتی ہوئے۔ فن سپہ گری کے جوہر نے آپ کو ترقی کا موقع دیا۔ مگر اس سپاہیانہ زندگی میں بھی آپ خدا ترس، عابد شب بیدار رہے۔ کبھی کسی کو نہیں ستایا۔ کسی کا مال نہیں لوٹا۔ کھیتوں کو برباد کر دینا، گھوڑوں کو کھیتوں میں چھوڑ دینا فوج کے لیے معمولی

بات ہے۔ جو قطعاً جائز بھی جاتی تھی، مگر آپ کی پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ آپ اپنے گھوڑے کو فوج کے گھوڑوں سے الگ رکھتے۔ اُس کے دانے اور چارے میں بھی جائز و ناجائز کی پوری احتیاط برتتے۔

گھوڑا بھی کچھ ایسا سدھ گیا تھا کہ وہ بھوکا رہتا، مگر کسی کے کھیت میں منہ نہ ڈالتا تھا۔ (۱۴۷)

غریبوں کی خدمت اور مالی امداد کا سلسلہ اس زندگی میں بھی اُسی حوصلہ مندی سے جاری تھا، اور فراخ دستی کا یہ حال تھا کہ مشہور ہو گیا تھا کہ آپ کو دستِ غیب ہے۔

ملازمت کا دور ختم ہوا۔ آپ دہلی تشریف لائے۔ یہاں شاہ عبدالعزیز صاحب کے دربار سے امیرِ قافلہ بنایا گیا۔ اب سیاسی رہنما بھی ہیں اور شیخ طریقت بھی۔ مگر اصول مساوات کی پابندی یہ ہے کہ اپنا کام خود کرتے ہیں۔ ضرورت پڑتی ہے تو ساتھیوں کے ساتھ مل کر لکڑی چیرتے ہیں، گھاس چھیلتے ہیں، بوجھ اُٹھاتے ہیں۔ (۱۴۸)

رائے بریلی کو مرکز بنایا گیا تو سینکڑوں ساتھیوں کے قیام کے لیے وسیع مکان (بیرک) کی ضرورت ہوئی۔ یہ کچا مکان رفقاء قافلہ نے خود اپنے ہاتھ سے تعمیر کیا۔ سید صاحب ان ساتھیوں کے دوش بدوش کام کر رہے تھے اور دنیا کو مساوات و اشتراکیت کا صحیح درس دے رہے تھے۔ (۱۴۹)

شیخ الاسلام مولانا سید عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز

آپ کے والد صاحب کا نام ہبۃ اللہ تھا اور آپ کے دادا مولانا نوراللہ صاحب تھے جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے خاص شاگرد اور پارٹی کے ممتاز رکن تھے۔ اصل وطن بڈھانہ (ضلع میرٹھ) تھا۔ (۱۵۰)

آپ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے وہ نامور شاگرد (۱۵۱) ہیں جن کو خود استاد نے علماء محققین اور شیخ الاسلام تحریر فرمایا ہے۔ سنجیدہ مزاج، خوش اخلاق، خاموش طبیعت، کم گو، مگر تقریر کے وقت خطیب جادو بیان جو چند ہی جملوں میں دماغوں کی دنیا پلٹ دیتا تھا۔

علمی کمالات، اعلیٰ اخلاق و کردار، تدبر و اصابت رائے اور بلند پایہ خطابت نے آپ کو نہ صرف دہلی بلکہ شمالی ہند کا ممتاز رہنما بنا دیا تھا۔ چھوٹے بڑے، امیر و غریب سب ہی آپ کی عزت کرتے تھے۔ مگر جب آپ سید صاحب کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے تو ساری عظمت و شہرت سید صاحب کے قدموں پر نثار کر دی۔ اب آپ سید صاحب کی جوتیاں اُٹھایا کرتے، رکاب تھام کر چلتے اور پالکی کے ساتھ پاپیادہ دوڑتے۔ مگر صاف گوئی اور حق پسندی کا وہ بلند مقام آپ کو حاصل تھا کہ نہ کسی کا ادب و احترام اس پر غالب آسکتا تھا اور نہ کسی کا رعب و طنطنہ وہاں تک پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ سید صاحب سے معمولی سی لغزش بھی ہوتی تو یہی جاں نثار و فدا کار مرید تنبیہ فرما دیتے۔

سید صاحب نے نکاح کیا تو دو روز نماز صبح میں اتنی دیر ہو گئی کہ تکبیر اولیٰ میں شرکت نہ ہو سکی۔ مولانا عبدالحی

جیسے مرید رشید کو کب برداشت تھی۔ دوسرے ہی روز پیر و مرشد کو ٹوکا۔ اور پیر بھی وہ حق پرست تھے کہ فوراً اپنی کوتاہی تسلیم کر لی۔ اصلاحی تحریکات میں نکاح بیوگان کا مسئلہ بھی تھا۔ اسلام نے عدت گذر جانے کے بعد نکاح بیوہ کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ بعض اوقات واجب اور فرض بھی قرار دیا ہے۔ لیکن جاہلانہ تصورات ہمیشہ اس سیدھے سادے مسئلہ میں غلط جذبات برانگیختہ کرتے رہے ہیں۔ اس زمانہ میں بھی انہیں غلط جذبات کا غلبہ تھا اور بیوہ کا نکاح بہت بڑی عار سمجھا جاتا تھا۔ اتفاق سے حضرت سید صاحب کے بڑے بھائی مولانا محمد اسحاق صاحب کی وفات ہوگئی تو یہ مسئلہ خود گھر میں پیدا ہوگیا۔ سید صاحب کو طبعی تاثر کی بناء پر کسی قدر تامل ہوا تو فوراً اس صداقت پرست مرید نے تنبیہ کی "چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی"۔ چنانچہ فوراً ہی بیوہ کا نکاح کر دیا گیا۔

درحقیقت حق و صداقت ہی وہ رشتہ تھا جس نے پیر و مرید میں یہ اتحاد پیدا کیا تھا اور ہر ایک قول و فعل اسی معیار پر پرکھا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ سید صاحب نے فرمایا۔ مولانا اگر کوئی بات میری طرف سے خلاف شریعت دیکھیں تو تنبیہ فرما دیں۔

مولانا نے جواب دیا "حضرت! جب آپ کوئی خلافِ شریعت فعل کریں گے، تو عبدالحی آپ کے ساتھ ہی نہ ہوگا"۔

یہی صداقت و حق پرستی تھی جس نے اس شیدائے علم کو درس گاہ سے ہٹا کر قافلہ کے کیمپ میں پہنچایا۔ اور مسند نشینی کے بجائے صحرا نوردی پر آمادہ کیا۔

اسی کو حدیث شریف کے الفاظ میں الحب للہ اور الحب فی اللہ فرمایا گیا ہے۔ یہی ہوں گے جن کے مراتب جنت میں اتنے بلند ہوں گے کہ اُن کے اعزاز و اکرام کی کرسیاں مشک کے ٹیلوں پر سجائی جائیں گی۔

شیخ الاسلام مولانا عبدالحی صاحبؒ، سید صاحب کی تمام جد و جہد اور نقل و حرکت میں اعلیٰ مشیر کی حیثیت سے ساتھ رہے اور دستِ راست بن کر کام کرتے رہے۔ جب علاقہ سرحد میں آزاد حکومت قائم کی گئی تو آپ حکومت کے مشیر اعلیٰ اور عدالتِ عالیہ کے جج قرار دیئے گئے۔ مگر جنگ شروع ہونے سے پہلے آپ کو اسہال اور پیچش کی شکایت ہوئی اور اسی میں وفات ہوگئی۔ (انا للہ و انا الیہ راجعون)۔

حضرت شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہیدؒ

ملک و ملت کا وہ سرفروش مجاہد جس کا عمل فلسفۂ ولی اللہ کی تفسیر تھا اور جس کا ایثار، قربانی ذبیح اللہ کی زندہ تصویر۔ جس کا دل دولتِ درد سے مالا مال تھا اور جس کا جگر سوزِ محبت کا سرمایہ دار، جس کا علم ہمدوشِ عمل، اور جس کا عمل آئینہ دارِ علم بے پایاں۔ آزادیٔ فکر کا سب سے بڑا حامی، جمہوریت کا علم بردار، ملوکیت کا سب سے بڑا دشمن شاہ پرستی کے لیے فرشتۂ موت، سرمایہ داری سے بیزار، غلامی کے ناپاک تصور سے ناآشنا، اس کی زندگی سعی پیہم تھی۔ کتابِ زندگی کا آغاز بابِ جہاد سے ہوا، اور اسی جہاد پر زندگی کا آخری ورق پلٹا گیا۔

باپ مولانا شاہ عبدالغنی، دادا وہی حضرت شاہ ولی اللہ، جن کی تحریک کو لے کر میدانِ جہاد میں پہنچا، اور اسی راستہ میں شہید ہو کر حیات جاوداں حاصل کی۔

علم وعمل کے گھرانے میں پیدا ہوا۔ اسی فضا میں تربیت پائی۔ والد کی وفات لڑکپن میں ہوگئی تھی۔ قدرت نے حضرت شاہ عبدالعزیز کی آغوشِ شفقت پرورش کے لیے منتخب کی بھتیجا چچا پر ناز کرتا تھا اور چچا کو بھتیجے پر فخر تھا۔ وہ بار بار کہا کرتا تھا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَھَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ

گہوارۂ علم میں پرورش پانے والا بچہ نازک مزاج ہونا چاہیے تھا۔ مگر اس کو نزاکت سے نفرت تھی۔ شوق جہاد اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ نزاکت آفرینی کے بجائے اُس نے اپنے بدن کو شدائد ومصائب کا یہاں تک خوگر بنایا کہ سردی اور گرمی کا احساس گویا مفقود ہوگیا تھا۔

اُس نے جس طرح منطق وفلسفہ، ریاضی اور اقلیدس میں اعلیٰ کمال حاصل کیا، حدیث وفقہ کا جس طرح وہ ماہر ہوا، ویسے ہی اُس نے فنِ سپہ گری میں بھی استادانہ شان پیدا کی۔

وہ جس طرح مفسر ومحقق، فقیہ اور محدث تھا، ایسے ہی وہ بہترین شمشیرزن اور اعلیٰ درجہ کا نشانہ باز تھا۔ وہ اعلیٰ درجہ کا مدبر اور مفکر تھا، نظم ونسق کا بہترین ماہر، اور ایسے ہی میدان جنگ کا بہترین جرنیل اور فیلڈ مارشل۔

پرانے خاندانوں کے بچے کھچے لوگ آج بھی شہادت دے سکتے ہیں کہ دوپہر کے وقت جامع مسجد کے فرش سنگین پر ٹہل ٹہل کر اُس نے تمازت آفتاب کے احساس کو ختم کردیا تھا۔ اور دریائے جمنا کی پاک دھاریں آج بھی شہادت دے سکتی ہیں کہ وہ دریا کی موجوں سے کھیلتا ہوا زینت المساجد (دہلی) سے تاج محل (آگرہ) تک پہنچتا تھا، اور پھر انہیں لہروں سے باتیں کرتا ہوا زینت المساجد میں آجاتا تھا۔ وہ جس طرح مئی اور جون کی گرمی میں کمبل اوڑھ کر سفر کرسکتا تھا، ایسے ہی دسمبر اور جنوری کی سردیاں ململ وحریر میں گذار سکتا تھا۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین ''خدمت خلق'' تھا، اور خلق خدا کے مفہوم میں جس طرح افلاس کے مارے ہوئے شریف اور باعزت خاندان یا نیک نفس طلبہ داخل تھے، ایسے ہی شراب کی بھٹیوں، جوئے کے اڈوں اور قحبہ خانوں کی قباحتوں میں زندگیاں گذارنے والوں کو وہ اپنی خیر خواہانہ ہمدردیوں کا مستحق سمجھتا تھا۔ اُن کی یہ پستی اور رسوائی، اس کے بااحساس دل میں درد پیدا کرتی اور یہ اُن تباہ حالوں کی اصلاح اور اپنے دردِ دل کے علاج کے لیے ہر ایک امکانی کوشش کام میں لاتا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ بھیس بدل کر اُن کے مجمع میں پہنچتا اور اپنی صدا سنا کر اُن کے دلوں کو پلٹ دیتا۔ (۲۵۴)

وہ ہزاروں انسان جن کی صلاحیتیں مفقود نہیں ہوئی تھیں راہِ راست پر آگئے لیکن وہ کج طبع جن کی فطرت معکوس ہوچکی تھی، اس ہمدردِ انسانیت کے دشمن بن گئے۔

ایسے تندخو بدمعاشوں کی دشمنی سے خوف کھا کر کچھ دوستوں نے شاہ صاحب کو اصلاح کی خطرناک سرگرمیوں سے باز رکھنا (۱۵۳) چاہا۔ مگر نوع انسان کی خیر خواہی کا جو سوز و درد شاہ صاحب کو عطا ہوا تھا وہ کب چشم پوشی وخاموشی کی اجازت دے سکتا تھا۔ (۱۵۴)

اُن کی رسوائی ہوئی تو کیا میری رسوائی نہیں

حضرت شاہ صاحب کی جوانی تھی اور دہلی کا دور جاں کنی۔ برطانوی سامراج کا ریزیڈنٹ یہاں مقرر ہو چکا تھا۔ اور اس رواداردلی' میں جہاں سینکڑوں سال سے خیالات کی آزادی اور بین الملی بھائی چارہ کا دور دورہ تھا۔ مذہب کے نام پر جنگ شروع کرادی گئی تھی۔ یہ پہلا شخص تھا جس پر سامراجیت کے مفتی خانہ سے لامذہبیت کا فتویٰ صادر کیا گیا۔ کیونکہ یہ ان رسومات کو ختم کر دینا چاہتا تھا جو سوسائٹی کو اوہام پرست، بزدل اور پست ہمت بنائے ہوئے تھیں اور جن کی فضول خرچیوں نے سماج کا اقتصادی ڈھانچہ تباہ کر دیا تھا۔ یورپین مفتی صاحب کا جب فتویٰ کارگر نہ ہوا تو امن (۱۵۵) عامہ کا بہانہ لے کر زبان بندی کر دی گئی۔ اب اس مجاہد حق نے عوام کے بجائے ریزیڈنٹ کی کوٹھی پر پہنچ کر خود ریزیڈنٹ کو مخاطب کیا۔ نتیجہ شاہ اسمٰعیل صاحب کے حق میں تھا۔ ریزیڈنٹ کوئی معقول جواب نہ دے سکا۔ لامحالہ اس کو اپنا حکم واپس لینا پڑا۔ (۱۵۶)

سادگی

جس کا دل سوز وگداز سے بھرا ہوا تھا وہ ظاہری رکھ رکھاؤ کی طرف کب متوجہ ہو سکتا تھا۔ اُس کا دماغ بناؤ سنگھار اور آرائش وزیبائش کے تصور سے بھی آشنا نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب کی سادگی مشہور ہے۔

اُن کے علم وفضل، تحریر وتقریر اور اعلیٰ خطابت وحاضر جوابی کے جو چرچے دُور دُور پھیلے ہوئے تھے اُن کو سُن کر ایک پُرتکلف، باوضع شاندار اور صاحب جبہ ودستار شخص کا تصور دماغوں میں آتا۔ مگر جب لوگ اُن کو پاپیادہ سید صاحب کی رکاب تھامے ہوئے دوڑتے دیکھتے یا گردوغبار اَٹے ہوئے نہایت معمولی صورت میں سامنے آتے یا گھوڑوں کو کھریرا کرتے ہوئے اُن پر نظر پڑتی تو حیرت واستعجاب کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ دیوبند کے جلیل القدر مشہور عالم حضرت مولانا ذوالفقار علی (۱۵۷) صاحب کا بیان ہے۔

> ''جب حضرت سید صاحب کی تشریف آوری کی خبر مشہور ہوئی تو دیوبند کے بڑے بڑے لوگ استقبال کو نکلے۔ شہر کے باہر ایک بزرگ کا مزار ہے وہاں تک پہنچے تو سید صاحب نظر آئے۔ ایک تانگھن پر سوار تھے، اور دونوں طرف دو صاحب رکاب تھامے ہوئے چلے آرہے تھے۔ استقبال کرنے والوں نے آگے بڑھ کر سید صاحب سے ملاقات کی۔ یہ ان رکاب تھامنے والوں کو نہ سمجھ سکے کہ کون ہیں۔ سید صاحب نے فرمایا۔ ان سے ملو، یہ مولانا اسمٰعیل اور مولانا عبدالحی (۱۵۸) ہیں۔

لکھنؤ کے علم دوست آپ کے علم وفضل، حاضر جوابی اور نکتہ سنجی کی شہرت سُن کر ملاقات کے لیے آتے تو کبھی آپ سے سپاہیانہ لباس میں پریڈ کرتے ہوئے ملاقات ہوتی۔ کبھی گھوڑوں کے اصطبل میں اور کبھی یہ بتایا جاتا کہ مولانا اسمٰعیل وہ ہیں جو گھوڑے کو کھریرا کر رہے ہیں۔

جب قافلہ کلکتہ پہنچا تو قافلہ کے میزبان شیخ محمد امین نے سید صاحب سے کشتی پر ملاقات کرنے کے بعد سب سے پہلے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا مولانا موصوف دوسرے جہاز پر سوار تھے۔ آپ کو بلایا گیا۔ خانوادۂ علم کا یہ شاہزادہ جس سادہ وضع میں حاضر ہوا، وہ کچھ ایسی رقت انگیز تھی کہ شیخ امین کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ حیران تھے کہ شاہ ولی اللہ کا پوتا، شاہ عبدالغنی کا لختِ جگر، شاہ عبدالعزیز کا بھتیجا اور سلطنت فضل وکمال کا مسند نشین، اس قدر سادہ، ایسا بے تکلف اور اتنا جفاکش۔

شاہ پرستی کی مخالفت اور ملوکیت سے نفرت

شاہ اسمٰعیل صاحب کی سیرت میں شاہ پرستی کی مخالفت سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں درجہ رکھتی تھی۔ جس بات کو شاہ ولی اللہ صاحب نے اشاروں میں سمجھایا تھا جس مفہوم کو شاہ عبدالعزیز صاحب نے غیر مطبوعہ تفسیر کی عبارتوں میں سمویا تھا، آپ نے کھلے بندوں اُس کو واضح کیا اور اُس کے ہر ایک پہلو پر روشنی ڈالی۔ آپ کی عجیب وغریب تصنیف ”منصب امامت“ آج بھی موجود ہے۔ مسلمان بادشاہوں کی بادشاہت جس کو اللہ کا سایہ اور خدا کا انعام سمجھا جاتا تھا، آپ اس کو جبر وقہر کی سلطنت اور اپنے زمانہ کی سب سے بڑی لعنت قرار دیتے ہیں۔ ”منصب امامت“ کے چند اقتباسات ”تحریک کا نصب العین“ کا بیان کرتے ہوئے پیش کیے جاچکے ہیں۔ اسی کتاب کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں مُلوک اور بادشاہوں کے متعلق کس قدر سخت فیصلہ ہے:

> ”استیصال اوعین انتظام ست واہلاک اوعین اسلام واطاعت ہر متسلط از احکام شرعیہ نیست وانقیاد ہر متجبر از اوامر دینیہ نہ۔ (ص ۹۸ منصب امامت)“ ان کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا عین انتظام ہے اور اُن کو فنا کے گھاٹ اُتار دینا عین اسلام۔ ہر صاحب اقتدار کی اطاعت کرنا حکم شریعت نہیں ہے اور نہ ہر جابر وقابض کے سامنے گردن جھکا دینا دین کا حکم ہے۔“

آخر میں یہ بھی غور فرمالیجیے کہ جب مسلمان بادشاہوں کے متعلق شاہ صاحب کا یہ فیصلہ ہے تو انگریزوں کے متعلق آپ کا فیصلہ کیا ہوسکتا ہے؟

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی وفات

سید احمد صاحب کا قافلہ سفر حج سے واپس ہوکر ابھی دہلی نہیں پہنچا تھا کہ یہ بوڑھا رہنما(۲۵۹) جس نے ملک وملت کی خدمت میں مسلسل تریسٹھ سال صرف کئے تھے اور جس کے اشاروں پر سید صاحب کی خدائی فوج نے مشرق اور مغرب کے ڈانڈے ملا دیئے تھے، ۷ رشوال ۱۲۳۹ھ، ۶ رمئی ۱۸۲۴ء کی صبح کو اس تلون مزاج دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس حادثہ کی تفصیل کا نہ یہ موقع ہے نہ اس کی ضرورت ہے۔ البتہ تحریک سے متعلق چند باتیں اس باب کی تکمیل کے لیے ضروری ہیں۔

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے "ہمہ گیر انقلاب" کا جو بیج بویا تھا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی آبیاری سے وہ ایک تناور درخت بن چکا تھا۔ چنانچہ تعلیم وتربیت اور ایک مخصوص قسم کی اخلاقی ٹریننگ جو اس نصب العین اور اس منزل مقصود تک پہنچنے کا بہت ضروری پروگرام تھا، اُس کا حلقہ اتنا وسیع ہو چکا تھا کہ پورے ہندوستان میں قرآن وحدیث کا کوئی ایک قابلِ اعتماد عالم ایسا نہ تھا جس کا رشتۂ تلمذ بالواسطہ یا بلاواسطہ حضرت شاہ عبدالعزیز (قدس اللہ سرہ العزیز) کے دامنِ فیض سے وابستہ نہ ہو۔

(۲) عسکری تنظیم کے سلسلہ میں سید صاحب کی زیر قیادت تقریباً آٹھ سو مجاہدین حریت کی فوج تیار ہو چکی تھی جس کے ہر ایک رضا کار کے رجحانات وجذبات ولی اللّٰہی اصول کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے اور وہ سیاسی وسماجی انقلاب کی زندہ تصویر بن چکا تھا۔

(۳) قافلہ کے پے در پے دوروں نے لاکھوں انسانوں کے دلوں میں جذبۂ انقلاب کی وہ حرارت پیدا کردی تھی کہ جس کو ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگاموں کا خونین سیلاب بھی سرد نہ کر سکا۔

(۴) اس کی پاک باز زندگی اور مخلصانہ خدمات نے لوگوں میں وہ گرویدگی پیدا کردی تھی کہ جنازہ کی نماز جو ایک مرتبہ پڑھی جاتی ہے، اس شہنشاہِ علم وعمل کے جنازہ پر پچپن مرتبہ پڑھی گئی۔(۲۶۰)

(۵) اقتصادی سلسلہ میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا بنیادی اصول یہ ہے، کہ معیارِ معیشت مساویانہ ہو۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اس اصول کے یہاں تک پابند تھے کہ ساری عمر گاڑھے اور دھوتر کے کپڑے پہنے اور مرنے کے وقت وصیت کردی کہ اُن کا کفن بھی اسی کپڑے کا ہو جو وہ اپنی زندگی میں پہنا کرتے تھے۔(۲۶۱)

(۶) آپ نے تاکید فرمادی تھی کہ آپ کی وفات کی خبر بادشاہ کو نہ دی جائے، کیونکہ آپ نہیں چاہتے تھے کہ بادشاہ آپ کے جنازہ میں شرکت کرے۔(۲۶۲) یہ وصیت اور یہ تاکید اس وجہ سے نہیں تھی کہ بادشاہت کی ذات سے آپ کو نفرت تھی۔ یہ واقعہ(۲۶۳) ہے کہ بادشاہ آپ کا احترام کیا کرتا تھا اور آپ بھی بادشاہ کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آتے تھے بلکہ اس وصیت کا اصل سبب وہ تنفر تھا جو خدا پرست مومن کو ملوکیت اور ملوکانہ شان وشوکت سے ہونا چاہیے اور جو "ہمہ گیر انقلاب" کا ایک جزو تھا۔

جانشین اور تقسیم کار

مولانا شاہ محمد اسحاق صاحبؒ، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی زندگی ہی میں اس گروپ کے سربراہ کار اور انچارج کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے تھے جو تعلیم و تربیت اور مرکزی تنظیم کا ذمہ دار تھا۔ حضرت شاہ صاحب بھی آپ پر وہی اعتماد کرتے تھے جو صحیح جانشین پر کیا جاتا ہے۔ (۲۹۴)

لہٰذا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی وفات کے بعد حضرت شاہ اسحٰق صاحبؒ ہی جانشین قرار دیئے گئے۔ (۲۹۵)

دوسرا گروپ جس کو فوجی خدمات اور امور خارجہ سپرد تھے وہ بدستور حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کی زیر قیادت اپنے فرائض سر انجام دیتا رہا، بلکہ اپنے قائد اعظم کی وفات کے بعد پہلے سے زیادہ چست ہو گیا۔

خلاصہ اور نتائج

یہ چند سو صفحات جو حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ عبدالعزیز اور حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب اور اُن کے رفقاء اور تلامذہ رحمہم اللہ کی تصانیف سے اس طرح مرتب کیے گئے کہ پورے ہندوستان کا سیاسی نقشہ، ہندوستان کی مختلف پارٹیوں کے رجحانات اور اُن کی کوششوں کی تاریخ سامنے تھی۔ آپ نے اُن کے مطالعہ میں کافی وقت صرف کیا۔ اب ان تمام صفحات کا خلاصہ صرف چند لفظوں میں ملاحظہ فرمالیجیے۔ کیونکہ حضرت شاہ عبدالعزیز کی وفات پر آپ اس تاریخ کی ایک جلد ختم کر رہے ہیں، اور عملی اقدامات کی دوسری جلد آپ کے سامنے آرہی ہے۔

(۱) یہ تمام جدوجہد نہ مغل شہنشاہیت کی حمایت میں تھی، نہ اس لیے تھی کہ مسلم قسطائیت برپا کی جائے۔ بلکہ ایسے بلند اور اعلیٰ مقاصد کے لیے تھی اگر یہ تحریک کامیاب ہوجاتی تو دنیا کو کارل مارکس، اینگلس اور لینن کی ضرورت پیش نہ آتی۔

(۲) کمیونزم کے اقتصادی مقاصد کو زیادہ مفید اور مہذب طریقہ پر انجام دیتے ہوئے خصوصیت یہ ہوتی کہ سوسائٹی اخلاق اور روحانیت سے ناآشنا نہ ہوتی بلکہ خوف خدا، اعلیٰ اخلاق اور روحانیت کی رنگ آمیزیوں کے ساتھ ایک عجیب وغریب سوسائٹی وجود میں آتی جس سے پورا ملک درحقیقت امن وامان، خوش حالی اور اطمینان زندگی کی جنت بن جاتا اور جس میں زیردست، پامال اور ستم رسیدہ انسانوں کے لیے بھی وہ سب کچھ ہوتا جو بالادست امراء اور جاگیرداروں کے لیے تھا جو صدہا سال سے عزت وشرافت کا قشقہ اپنی پیشانیوں پر لگائے ہوئے تھے۔

(۳) کوزہ جہاں آباد کے معاہدہ ۱۷۶۵ء کے بعد انگریز دشمن مسلمانوں کا رجحان مرہٹوں کی طرف بڑھتا رہا، اور نجیب الدولہ کی وفات (۱۷۷۰ء) کے بعد شاہ ولی اللہ کے جانشین حضرت شاہ عبدالعزیز کی ہمدردیاں انگریزوں کے برخلاف مرہٹوں کے لیے مخصوص ہوگئیں۔

(۴) ۱۷۷۰ء سے ۱۸۱۸ء تک تقریباً پچاس سال ایسے گذرے کہ اس پارٹی کے حامی، انگریزوں کے برخلاف مرہٹوں کے مددگار تھے۔ جگہ جگہ مرہٹوں کے ساتھ مل کر انگریزوں سے جنگ کی، اور جب ایک ایک کر کے مرہٹہ طاقت ختم ہوگئی تو پھر علیحدہ پارٹی بنائی گئی۔

(۵) بظاہر یہی سبب ہے کہ "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" کی انگریزی پالیسی نے عالمگیر اور شیواجی کے تلخ واقعات کو زیادہ اُچھالا، اور وہ ہمدردیاں جو پچاس سال تک ایک ہی رُخ پر چلتی، اُن کے اثرات دماغوں سے محو کر کے آپس میں نفرت ونفاق اور بے اعتمادی پیدا کی۔

(۶) تحریک شاہ ولی اللہ کی قیادت بے شک علماء کے ہاتھ میں تھی مگر تحریک کو ترقی دینے اور آگے بڑھانے میں

غیر علماء بھی برابر کے شریک تھے۔ بلکہ غیر علماء کی تعداد علماء سے کہیں زیادہ تھی۔ قافلے کے آٹھ سو افراد میں باقاعدہ عالم سو سے زیادہ نہیں تھے۔ قافلے کے علاوہ جن ہزاروں مسلمانوں نے ہر قسم کی امداد دل و جان سے پیش کی، ان میں شیخ غلام حسین[۲۳۶] صاحب رئیس الہ آباد (وکیل مختار عام مہاراجہ بنارس) ایسٹ انڈیا کمپنی کے وکیل شیخ امین الدین صاحب (کلکتہ) اور نواب امیر علی خاں والی ٹونک جیسے نواب زمیندار وسوداگر بھی تھے اور قاضی فرزند علی صاحب اور مولانا فتح علی جیسے دولت مند علماء بھی تھے، جنہوں نے مال سے امداد کی اور اپنی آل و اولاد بھی تحریک کے نام پر بھینٹ چڑھادی۔

ولی اللّٰہی فوج کا انقلابی اقدام

ترکِ وطن، آزاد مرکز میں آزاد حکومت

سید صاحب حج سے واپس ہوئے تو آپ کے ارادے کیا تھے؟ اس کا جواب ڈاکٹر ہنٹر صاحب سے سنئے:

''پہلے جو چیز خواب و خیال تھی، اب اُن کو حقیقی روشنی میں نظر آنے لگی، جس میں انہوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے ہر ضلع میں اسلامی جھنڈا گاڑتے اور صلیب کو انگریزوں کی لاشوں کے نیچے دفن کرتے ہوئے دیکھا (ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۸۹)۔

امام صاحب کی اندرونی کیفیات میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان کا علم اُن کو یا صرف خدا کو ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی ظاہری عادات بالکل بدل گئیں۔ اب اُن کی زندگی کا مقصد صرف مرید بنانا ہی نہ تھا، بلکہ مقصد اصلی کو پورا کرنے کے لیے یہ محض ابتدائی ذریعہ تھا۔

بمبئی میں جہاں وہ سب سے پہلے جہاز سے اُترے اُن لوگوں کی کثرت بھی جو اُن کا وعظ سننے آتے یا مرید ہونا چاہتے تھے، اُن کو زیادہ دیر تک ٹھہرنے کے لیے مجبور کر گئی۔ وہ جہاں کہیں بھی گئے، اس سے زیادہ کامیابی حاصل کی جتنی مکہ معظمہ کے سفر سے پہلے کی تھی۔ بایں ہمہ وہ ان پُرامن اضلاع میں اپنی واعظانہ سرگرمیوں کو حقارت آمیز بے صبری سے دیکھتے رہے۔ معلوم ہوتا ہے اب اُن کی نگاہ ہر وقت سرحد کی دور دراز جنگ جو آبادی پر لگی رہتی تھی (ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۹۰)

یہ ڈاکٹر ہنٹر کا بیان ہے۔ اب آپ کے حامی اور پیرو منشی محمد جعفر تھانیسری کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

''وطن پہنچ کر کچھ عرصہ تک تو مرمت مکانات میں جو آپ کی غیر حاضری میں ٹوٹ پھوٹ گئے تھے، آپ مصروف رہے۔ اس سے فارغ ہو کر سفر جہاد کی تیاری کرنے لگے۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید اور مولانا عبدالحی صاحب وغیرہ علماء کو واسطے بیان کرنے مضامین ترغیب ہجرت و جہاد اطراف ہندوستان میں روانہ کر دیا گیا۔ اس وقت سید صاحب کے مکان پر بجائے مراقبہ و مشاہدہ اور توجہ دہی کے فضیلت ہجرت و جہاد کا بیان اور تلوار و بندوق کی صفائی اور قواعد و چاند ماری و گھوڑ دوڑ ہوا کرتی تھی۔ اب بجائے صوفی و درویش ہر شخص سپاہی بن گیا۔ تسبیح کے عوض ہاتھ میں تلوار اور فراخ و ڈھیلے جبہ کی جگہ چست الخالق اور پیچ دار سر بند لباس ہو گیا''۔

جن لوگوں نے پہلے آپ کے ہمراہیوں کو بصورت درویشانہ اور اب بلباس وضع سپاہیانہ دیکھا تھا، اُن کو سخت حیرت تھی۔ ان دنوں میں جو کوئی تحفہ تحائف آپ کے لیے لے کر آتا تھا تو اکثر ہتھیار یا گھوڑے ہوتے تھے۔ انہیں دنوں میں شیخ فرزند علی صاحب غازی پور ضلع سے دو نہایت عمدہ گھوڑے اور بہت

سے وردی کے کپڑے اور چالیس جلد قرآن مجید تحفہ لے کر آئے اور سب سے عجیب تحفہ جو شیخ صاحب موصوف لے کر آئے وہ امجد (۲۶۷) نام اُن کا ایک نوجوان بیٹا تھا جس کو انہوں نے مثل ابراہیم خلیل اللہ کے راہِ خدا میں نذر کر کے سید صاحب کے حوالے کر دیا اور عرض کیا کہ اس کو اپنے ساتھ جہاد میں لے جایئے اور تیغ اعداء سے اس کی قربانی کرایئے۔" (سوانح احمدی ص ۸۹)

بہرحال جب فوجی طاقت فراہم اور ساتھیوں کی پوری تربیت ہوگئی تو ۱۲۴۱ھ (۲۶۸) ۱۸۲۶ء میں آپ نے وطنِ عزیز کو خیرباد کہہ کر آزاد قبائل کا ارادہ کیا۔ لیکن پنجاب کے راستے سے گذرنا مشکل تھا تو آپ راجستھان ہوتے ہوئے سندھ پہنچے اور وہاں سے قندھار پھر کابل ہوتے ہوئے ہندوستان کی شمال مغربی سرحد میں داخل ہوکر وہاں اپنا مرکز قائم کیا۔

پنجاب کے بجائے راجستھان کا راستہ

پنجاب سے گذرنا بے شک دشوار تھا لیکن راجستھان کی گذرگاہ بھی سہل نہ تھی۔ وہاں مخالف حکومت کے خطرات تھے تو یہاں بے آب و گیاہ وادیوں اور خشک ریگستانوں کی حکومت بھی کم خطرناک نہیں تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ تصور خطرات سے زیادہ ایک اور داعیہ یہاں موجود تھا۔ یہ راجستھان وہی لالہ زار تھا جہاں بہت سے پرانے راجوں مہاراجوں کے داغ دار سینے موجود تھے جن میں آزاد حکمرانی کے جذبات تڑپ رہے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ سید صاحب نے نواب امیر علی خاں' والی ٹونک' کے اصرار پر پہلے ٹونک کا قصد کیا۔ مگر خدا جانے اس سے پہلی منزل کیوں فراموش کر دی گئی یا اس کا علم نہیں ہوسکا۔ یہ ''گوالیار'' کی منزل تھی۔ یہاں ''دولت راؤ سندھیا'' (۲۶۹) کامل مرض استسقاء میں مبتلا زندگی سے جید اور موت کے انتظار میں پڑا تھا لیکن آزادی کی تڑپ اب بھی دل کی دھڑکن بنی ہوئی تھی۔ یہ سب سے آخری راجہ تھا جس کو مجبور ہوکر انگریزی اقتدار کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ وہ اس خود مختاری کو نظر بندی سمجھ رہا تھا۔

اس کی رانی اس کی رفیقہ حیات، دلی جذبات میں ہم صفیر و ہم آواز تھی۔ مگر بیم و رجا کی کش مکش میں مبتلا اس کا سرتاج زندگی سے مایوس تھا تو اس کی بھی دنیا تاریک اور زندگی مایوس ہو رہی تھی۔

مہارانی کے بھائی راجہ ہندو راؤ زمامِ حکومت سنبھالے ہوئے تھے۔ یہ وہی راجہ ہندو راؤ ہے جو مدت سے سید صاحب کا ارادت مند و معتقد تھا۔ گوالیار اسٹیٹ کے ایک معتمد رکن ''غلام حیدر خاں'' ہیں۔ جو زمانہ ملازمت سے سید صاحب کے یارِ غار اور گہرے دوست ہیں، اور جب نواب امیر علی خاں کا کارخانہ درہم برہم ہوا تو جذبات و خیالات کی یگانگت اُن کو گوالیار لے آئی ہے۔ یہاں مہاراجہ نے جوہر کی قدر کرتے ہوئے اُن کو بڑے منصب پر مامور کر دیا ہے۔

یہ تمام تعلقات کب اجازت دے سکتے تھے کہ سید صاحب اپنا لشکر لے کر گذر جائیں اور گوالیار کی سرزمین اُن کے سایہ سے محروم پڑی رہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ سید صاحب ڈلمئو، فتح پور، بھوا، دوسرمنڈ، جلال پور، ایک ایک دو دو روز قیام کرتے ہوئے گوالیار پہنچے۔ جہاں آپ کو فتح علی خاں کے باغ میں ٹھہرایا گیا۔ مہاراجہ کی طرف سے مہمان داری کا پورا انتظام تھا۔ کئی مرتبہ راجہ ہندو راؤ نے دعوتیں کیں۔ ایک دعوت کی تفصیل راویوں نے یوں بیان کی ہے کہ:

> مرہٹی کھانا بھی پکوایا۔ شیرمال، پراٹھے، پلاؤ، تنجن، کلیہ فیرنی، یاقوتی، کباب پسندے، مرغ بریاں وغیرہ بھی تیار کرائے۔ سید صاحب اور بعض بلند پایہ ساتھیوں کے ہاتھ راجہ ہندو راؤ نے خود دھلوائے۔ کھانے کے بعد جو پان پیش کیے وہ سب ورق طلاء میں ملفوف تھے۔ بہت سے تحائف خوانوں میں لگا کر نذر کے لیے لائے گئے۔ اُن میں موتیوں کا بیش بہا ہار اور ایک چغہ بھی تھا۔ جس پر زری کا نہایت عمدہ کام تھا۔ (۲۷۰)

مہاراجہ سے ملاقات

دولت راؤ خود حاضر نہ ہو سکا۔ معذوری کو دستاویز بنا کر سید صاحب کو محل میں بلایا۔ جو سید صاحب کے ساتھ تھے اُن کو محل کے ایک بڑے کمرہ میں بٹھا دیا گیا۔ پھر ہندو راؤ سید صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر آپ کو مہاراجہ کے کمرے میں لے گیا۔ بڑی دیر تک باتیں ہوئیں جن کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ (۲۷۱)

مہارانی پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے عرض کیا کہ آپ ایک سال گوالیار میں قیام فرمائیں۔ آپ کے تمام ساتھیوں کی مہمان داری ہمارے ذمہ ہوگی۔ سید صاحب نے معذرت کی۔ پھر مہارانی نے کہا کہ اچھا اتنی مدت ٹھہر جائیے کہ آپ کے لشکر کے لیے پورا سامان مہیا کیا جا سکے۔ سید صاحب نے اس سے بھی معذرت کردی۔ اسی اثناء میں نمازِ عصر کا وقت آ گیا۔ شیخ باقر علی نے اذان کہی۔ ہندو راؤ کے حکم سے فوراً لوٹے آ گئے، سب نمازیوں کو وضو کرایا سید صاحب نے نماز پڑھائی۔ پھر مہاراجہ سے رخصت ہو کر چلے آئے۔ (۲۷۲)

غازیوں کی جماعتیں

غازیوں کی سرسری جماعت بندی روانگی سے پیشتر رائے بریلی میں ہو چکی تھی۔ گوالیار پہنچ کر اُن کی باقاعدہ تنظیم ہوئی۔ تمام غازیوں کو "ترتیبِ لشکر" کے اصول پر پانچ جماعتوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

(۱) جماعت خاص۔ جس کے کمانڈر (سرعسکر) مولانا محمد یوسف صاحب پھلتی تھے یہ جماعت قلبِ لشکر کہی جاتی تھی۔ خود سید صاحبؒ اسی جماعت کے ساتھ چلتے اور ٹھہرتے تھے۔

(۲) مقدمۃ الجیش۔ جس کے کمانڈر حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہیدؒ تھے۔

(۳) میسرہ۔ اس کے سرعسکر سید صاحب کے بھتیجے سید محمد یعقوب تھے۔ اور جب وہ کارخاص پر ٹونک تشریف

لے گئے تو نایب شیخ بدھن کو سرعسکر بنایا گیا۔

(۴) میمنہ۔ سرعسکر امجد خان صاحب رئیس کتنہ۔

(۵) ساقۃ الجیش۔ سرعسکر اللہ بخش صاحب موراتوی۔

سید صاحب نے گوالیار میں دو جمعہ ادا کیے۔ یعنی کم از کم دس روز قیام فرمایا۔ پھر قرولی پہنچے جہاں کسنڈی کے رئیس جلال الدین صاحب نے باصرار آپ کو ایک رات کے لیے ٹھہرا لیا اور پورے لشکر کو کھانا کھلایا۔ پھر "خوش حال گڈھ" دانتولی، ٹنڈاری جیلانی ہوتے ہوئے آپ نے ٹونک میں ورود فرمایا۔

قیام ٹونک کی تفصیلات کا ذکر بے محل ہے۔ البتہ یہ بات خاص قابل توجہ ہے، کہ مکاتیب سے ظاہر ہوتا ہے کہ روانگی کے وقت سید صاحب سے یہ اقرار لے لیا گیا تھا کہ اگر ضرورت پیش آنے پر نواب امیر علی خاں کو اطلاع نہ دی گئی تو یگانگی کا معاملہ باقی نہ رہے گا۔

ٹونک سے نکل کر دریائے بیاس کو عبور کیا اور کلو میں منزل ہوئی۔ پھر جیلانہ میں ٹھہرے۔ "وصایا" سے معلوم ہوتا ہے کہ رخصت کے وقت نواب امیر علی خاں اور نواب وزیر الدولہ چار کوس تک ساتھ گئے۔

ٹونک سے اجمیر ہوتے ہوئے پالی پہنچے۔ یہاں چار روز قیام فرمایا۔ ۱۵/۱۶ رمضان کو وہاں سے روانہ ہوئے۔ یہ دور افتادہ علاقہ جو آج نشر و اشاعت ریڈیو اور اخبارات کے زمانہ میں بھی پس ماندہ اور دنیا سے بے خبر مانا جاتا ہے، وہ اس تحریک سے اتنا باخبر تھا کہ دور و نزدیک کے ہزاروں مردوں اور عورتوں نے بیعت کی تقریباً ایک سو آدمی روزے کی حالت میں گھروں سے چل پڑے کہ پالی پہنچ کر بیعت کر لیں۔ سید صاحب روانہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے اگلی منزل پر پہنچ کر بیعت کی۔ اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز واقعہ ملاحظہ فرمایئے۔

"ایک بڑھیا اپنے گاؤں سے لمبی مسافت طے کر کے پالی پہنچی۔ سید صاحب نہ ملے تو اپنے نواسے کو ساتھ لے کر پیچھے روانہ ہوگئی۔ کٹھیا گڈھ پہنچ کر بیعت کی، اور پچاس روپے لشکر کی دعوت کے لیے پیش کیے۔" (۲۷۳)

منزل بمنزل سفر کرتے ہوئے پالی سے آپ حیدرآباد سندھ پہنچے۔ جہاں امیران سندھ کی جانب سے سید صبغۃ اللہ (۲۷۴) ولایتی نے آپ کا استقبال کیا۔ دو جمعے حیدرآباد میں گذارے۔ حکام سندھ کی درخواست پر جمعہ کی نمازیں قلعہ میں ادا کیں۔ وہ زیادہ ٹھہرانا چاہتے تھے مگر سردیوں کا موسم قریب آرہا تھا۔ موسم سرما میں برف باری کی وجہ سے راستے بند ہو جاتے تھے۔ اس لیے آپ نے زیادہ قیام سے معذرت فرمائی۔ جب روانگی طے ہوگئی تو:

"ایک ہزار روپیہ نقد، ایک بندوق اور طپنچوں کی ایک جوڑی نذر پیش کی گئی۔" (۲۷۵)

حیدرآباد سندھ سے پیرکوٹ، پھر شکارپور پہنچے۔ یہاں سید صاحب نے غازیوں کو گاڑھے کے کپڑے بنوا دیے۔ یعنی اس پاکباز لشکر کی فوجی وردی تیار کرا دی جس میں اس وقت کے تاجداران علم و فضل اور بڑے

بڑے دولت مند گھرانوں کے چشم و چراغ شریک تھے۔ شکارپور سے روانہ ہو کر جاگن، خان گڑھ اور بھاگ وغیرہ سے گذر کر ڈھادر پہنچے جہاں سے درہ بولان شروع ہوتا ہے۔ درہ کی کٹھن اور دشوار گذار منزلیں طے کرتے ہوئے کوئٹہ پہنچے۔ جہاں کے حاکم نے آپ کی بہت مدارات کی۔ روزانہ پرتکلف کھانے اور میوے بھیجتا رہا۔ بیعت بھی کی، اور ساتھ چلنے کے لیے تیار بھی ہو گیا، مگر سید صاحب نے مصلحتاً منع فرما دیا۔

کوئٹہ سے آپ قندھار، پھر غزنی اور کابل سے گذرتے ہوئے پشاور پہنچے۔ تین روز پشاور میں قیام فرما کر آپ "چارسدے" پہنچے جہاں اُس مقصد کے لیے آپ نے قیام فرمایا، جس کی تکمیل کے لیے تقریباً دس ماہ پہلے آپ نے وطن عزیز کو خیرباد کہہ کر اس وادی پر خار میں قدم رکھا تھا۔ (۲۷۶) اس سفر میں بعد کے آنے والوں کے لیے بھی قیام وغیرہ کے انتظامات مکمل کر دیے گئے۔

بہار اور بنگال کا رہنے والا اس علاقہ میں قطعاً اجنبی بھی تھا اور اُس پر ہر قسم کا شک و شبہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا ایسے انتظامات بھی کر دیے گئے کہ اس کو راستہ میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ ہر جگہ آدمی مقرر کر دیے گئے کہ شبہ سے اُس کو محفوظ رکھیں۔ جب تک اُس کا قیام ہو، اُس کی ضروریات فراہم کریں اور جب روانہ ہونے لگے تو اگلی منزل تک حفاظت سے پہنچنے کا بندوبست کریں۔

ایک مکتوب کی قلمی نقل (۲۷۷) جو شیخ غلام علی صاحب الہ آبادیؒ کے نام حاجی صابر علی صاحب کے ذریعہ بھیجا گیا تھا، اس میں راستہ کی منزلوں کے متعلق یہ ہدایت ہے:

ہر کہ خواہد کہ بلشکر سید احمد رسد ہمیں منزلہا اختیار کند انشاء اللہ تعالیٰ بآرام تمام خواہد رسید۔

اول منزل قصبہ ٹونک۔ مالپورہ ۱۲۔ بھبولہ ۹۔ کشن گڈھ ۹۔ اجمیر ۸۔ ریان ۱۲۔ میرٹھ ۸۔ کھوانہ ۱۰۔ ناگور ۱۰۔ علی ۷ از بکوشش ہ مکان چوبدار ۱۰۔ بسوکہ ۹۔ بیکانیر بر مکان ۸۔ دیدار بخش۔ کانا سرو جلال سر ۸۔ کیلتی ۸۔ چھتر گڈھ ۸۔ وسیلی ۹۔ بھوکرہ بمکان الٰہی بخش ۱۲۔ امیر گڈھ بمسجد ۸۔ مرڈہ ۸۔ جام سر غلہ بدست نمی آید۔ خیرپور ۵۔ بہاول پور ۱۲۔ از انجا ڈیرہ غازی خاں ۳ منزل۔ از انجا معلوم خواہد شد۔

نیچے لکھے ہوئے ہندسے کچھ اشارے ہیں جو واضح نہیں ہو سکے۔ ممکن ہے منزلوں کی تعداد مراد ہو۔ جیسا کہ ڈیرہ غازی خاں کے نیچے جو ہندسہ ہے وہاں منزل لکھ بھی دیا گیا ہے۔ اس طرح ٹونک سے لشکرگاہ تک پہنچنے میں تقریباً پونے سات مہینے صرف ہوتے تھے۔ ٹونک سے پہلے دہلی کی منزل تھی اور ان منزلوں کا تذکرہ کرنا بہت ہی مشکل ہے جو وطن عزیز سے دہلی یا ٹونک پہنچنے تک ہوتی تھیں۔

عارضی حکومت

قافلہ نے جیسے ہی اس آزاد مرکز میں پڑاؤ ڈالا سکھوں کی فوجوں سے تصادم شروع ہو گیا۔ اب ہنگامی

حالات میں ضبط و نظم قائم رکھنے نیز مفتوحہ علاقوں کا انتظام سنبھالنے کے لیے باقاعدہ نظام حکومت کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ لہٰذا ۱۰؍ جنوری ۱۸۲۷ء (۱۲ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۲ھ) میں عارضی حکومت قائم کی گئی۔

سول اور فوج کے محکمے اور عدل و انصاف کے لیے باقاعدہ حکومت قائم کی گئی۔ ایک اور محکمہ قائم کیا گیا جو ایسی حکومت کے لیے سب محکموں سے زیادہ ضروری اور مقدم ہے۔ جو اخلاقی اصلاح کو بھی بنیادی مقصد کی حیثیت دیتی ہو۔ یہ محکمۂ احتساب ہے۔ یعنی اخلاقی نگرانی کا محکمہ۔

سید احمد صاحب اس حکومت کے ''امیر'' سربراہ قرار دیئے گئے۔ ساتھیوں نے باضابطہ امیر کے سامنے وفاداری کا حلف اُٹھایا[۴۷۸] (بیعت کی)۔ قافلہ والوں کے علاوہ اس علاقہ کے پٹھانوں نے بھی وفاداری کا عہد و پیمان کیا۔

آرگنائزروں اور داعیان کا تقرر

(۱) آزاد حکومت کے سفیر اور آرگنائزر ایران و افغانستان کے قبائل میں پہنچے اور ہندوستان جو مالی اور فوجی امداد کا مرکز تھا، یہاں بھی آپ کے آرگنائزر پھیل گئے۔ حیدرآباد دکن اور مدراس کا علاقہ اب تک چھوٹا ہوا تھا۔ وہاں جماعت کے بلند پایہ رکن اور سرگرم مبلغ مولانا سید محمد علی صاحب رام پوری کو بھیجا گیا۔ ان کے ساتھ تین آدمی مقرر کیے گئے عنایت اللہ، عبداللہ اور مقیم خان اُن کا ایک فرض یہ بھی قرار دیا گیا تھا کہ غازیوں کے لیے ہندوستان سے سرحد پہنچنے تک کے مناسب راستے کا انتظام کردیں جس میں کسی منزل پر رکاوٹ پیش نہ آئے۔[۴۷۹]

(۲) کچھ دنوں بعد مولانا ولایت علی صاحب عظیم آبادی کو حیدرآباد کے لیے مقرر فرمایا۔ اور مولانا سید محمد علی صاحب کو مدراس پہنچنے کا حکم ہوا۔ جہاں اُن کے تبلیغی اور اصلاحی کارناموں نے ایک انقلاب برپا کیا۔ مولانا ولایت علی صاحب کو جب حیدرآباد پہنچنے کا حکم ہوا، تو یہ جدائی اُن کو گوارا نہ تھی۔ سید صاحب نے تسکین دیتے ہوئے فرمایا۔ مولانا ہم آپ کو تخم کرکے اُٹھاتے ہیں۔[۴۸۰]

چنانچہ یہی تخم تھا جو سید صاحب کی شہادت کے بعد اس عظیم الشان تحریک کا تناور درخت بن کر نمودار ہوا۔ جس کی تفصیل دوسری جلد میں پیش کی جائے گی (انشاء اللہ) اُن کے ساتھ بھی تین آدمی بھیجے گئے۔ عبدالقادر، عبدالواحد اور کرامت اللہ۔

(۳) مولانا عنایت علی صاحب عظیم آبادی کو بنگال۔

(۴) مولانا محمد قاسم صاحب پانی پتی کو بمبئی۔

(۵) مولانا سید اولاد حسن صاحب قنوجی (نواب صدیق حسن صاحب والی بھوپال کے والد ماجد) اور سید حمید الدین صاحب (خواہرزادہ سید صاحب) یوپی کے مختلف حصوں میں تبلیغ و تنظیم کے لیے بھیجے گئے۔

(۶) میاں دین محمد اور میاں پیر محمد نیز متعدد دوسرے اصحاب کا کام تھا کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں خطوط پہنچاتے اور وہاں سے روپیہ لاتے رہیں یہ انتظامات سید صاحب کے زیرِ قیادت جنگی محاذ سے متعلق تھے۔
اور

(۷) شاہ اسحاق صاحب (جانشین حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ) کی زیرِ سرپرستی دہلی کے مرکز سے ہر قسم کی امداد کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ امداد پہنچانے کا راستہ غالباً وہی تھا جس کی تفصیل سطور بالا میں پیش کی جا چکی ہے۔

اس حکومت کی مقبولیت اور عوام کے رجحانات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ابھی اس آزاد حکومت کو قائم ہوئے چند ہفتے گذرے تھے کہ جنگ سیدو کے مقام پر (جہاں سید صاحب کو زہر دیا گیا تھا) آپ کے ساتھ مجاہدین کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی۔ (۱۸۱)

عارضی حکومت کا مقصد

سید صاحب نے اگرچہ اس آزاد حکومت کی سربراہ کاری اور "امارت" منظور کر لی تھی مگر آپ نے پہلے واضح کر دیا تھا کہ اُن کو نہ حکومت و قیادت (لیڈری) کا شوق ہے اور نہ وہ "مالک ملک" بننا چاہتے ہیں۔ یہ سارا دھندا صرف اس لیے ہے کہ اجنبی اقتدار ختم ہو اور حق حقداروں کو مل جائے۔ چنانچہ آپ نے سلطان ہرات، والی کابل، شاہِ بخارا، رئیس قلات، آزاد قبائل کے سرداروں، ہندوستان کے سربرآوردہ عمائدین، علماء بعض فرماں رواؤں اور سکھ حکومت کے ذمہ داروں کو جو خطوط لکھے ہیں، اُن میں بار بار یہ مضمون دہرایا گیا ہے:

> "خدا گواہ ہے ہمارا منشا نہ دولت جمع کرنا ہے، نہ اپنی حکومت قائم کرنا ہم خدائے بالا و برتر کے ناچیز بندے ہیں۔ نہ بندگانِ خدا پر جبر و قہر کا کوئی وسوسہ ہمارے دل میں ہے اور نہ کسی کی حکومت چھین لینے کا کوئی جذبہ۔ ہمارا منشاء وطن کو آزاد کرانا ہے اور بس۔ اور یہ اس لیے کہ تقاضا مذہب یہی ہے اور اسی میں رضائے مولیٰ متصور ہے۔ (۱۸۲)

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

> سید صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلط و اقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے اس بنا پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی اور انہیں صاف صاف بتا دیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے پردیسی لوگوں کا اقتدار ختم کر دینا ہے۔ اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی، اس سے آپ کو غرض نہیں۔ جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں، وہ حکومت کریں گے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سرحد سے ریاست گوالیار (۱۸۳) کے مدارالمہام اور مہاراج دولت راؤ سندھیا کے وزیر و برادر نسبتی راجہ ہندو

راؤ کو آپ نے جو خط تحریر فرمایا ہے وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے:

برائے عالی روشن و مبرہن است کہ بیگانگاں بعید الوطن ملوک زمین و زماں گردیدہ و تاجران متاع فروش بپایہ سلطنت رسیدہ امارت امرائے کبار و ریاست رؤساء عالی مقدار برباد نمودہ اند و عزت و اعتبار ایشاں بالکل ربودہ۔

''جناب کو خوب معلوم ہے کہ وہ بیگانے اور اجنبی جو وطن عزیز سے بہت دور کے رہنے والے ہیں دنیا جہاں کے بادشاہ بن گئے ہیں اور سودا بیچنے والے دوکاندار بادشاہت کے درجہ پر پہنچ گئے ہیں بڑے بڑے امیروں کی امارت اور بلند مرتبہ روساء کی ریاست کو برباد کر دیا۔ اُن کی عزت اور اُن کا اعتماد بالکل ختم کر دیا ہے۔''

چوں اہل ریاست و سیاست در زاویہ خمول نشستہ اند ناچار چندے از اہل فقر و مسکنت کمر ہمت بستہ ایں جماعت ضعفاء ہرگز از دنیا داران جاہ طلب نیستند محض بنا بر خدمت دین رب ذوالجلال برخاستہ اند، نہ بنا بر طمع مال و منال۔

''چونکہ وہ لوگ جو ریاست و سیاست کے مالک تھے گوشہ گمنامی میں بیٹھ گئے ہیں ناچار چند بے سروسامان فقیر کمر ہمت کس کر کھڑے ہو گئے ہیں کمزوروں کی یہ جماعت محض اللہ کے دین کے تقاضے سے اس خدمت کے لیے کھڑی ہوگئی ہے یہ لوگ جاہ طلب دنیادار نہیں ہیں بلکہ ایک مذہبی اور اخلاقی فرض سمجھ کر اس خدمت کے لیے اُٹھے ہیں مال و دولت کا قطعاً کوئی لالچ نہیں ہے۔''

وقتیکہ میدان ہندوستان از بیگانگاں دشمناں خالی گردیدہ، و تیر سعی ایشاں بر ہدف مراد رسیدہ آئندہ مناصب ریاست و سیاست بطالبین آں مسلم باد و بیخ شوکت و سطوت ایشاں محکم شود۔ ایں ضعفاء را از روساء کبار و عظماء عالی مقدار ہمیں قدر مطلوب است کہ خدمت اسلام بجان و دل کنند و بر مسند مملکت خود متمکن شوند۔

''جس وقت ہندوستان کا میدان ان غیر ملکی دشمنوں سے خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششوں کا تیر مراد کے نشانے تک پہنچ جائے گا حکومت کے عہدے اور منصب اُن کے سپرد ہوں گے جو اس کے مستحق ہوں گے اور انہیں کی شوکت و عظمت کی جڑیں مضبوط کی جائیں گی ہم کمزوروں کو بڑے بڑے روساء اور بلند مرتبہ عمائدین سے صرف اتنی بات درکار ہے کہ اہل اسلام کو اُن کا دلی تعاون حاصل رہے۔ اور مسند حکومت اُن کو مبارک ہو۔''

ریاست گوالیار کے ایک مسلمان عہدہ دار غلام حیدر خاں کو تحریر فرماتے ہیں:

دریں صورت مناسب وقت چناں مے نماید کہ ریاست پیرا، سیاست آرا، عظمت نشان، راجہ ہندو راؤ را ایں معنے فہمانند کہ اکثر بلاد ہندوستان بدست بیگانگاں افتادہ و ایشاں ہر جاء بنیاد ظلم و جور

نہادہ ریاست روساء ہندوستان بر باد رفتہ۔ کسے تاب مقاومت ایشاں نمے دارد۔ بلکہ ہر کس ایشاں را آقا خود مے شمارد۔

''اس صورت میں مناسب وقت یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ سردار والا قدر راجہ ہندو رائے کو یہ بات سمجھائیں کہ ہندوستان کا بہت بڑا حصہ غیر ملکیوں کے قبضہ میں پہنچ گیا ہے۔ ان لوگوں نے ہر جگہ ظلم و جبر کی بنیاد قائم کر دی ہے۔ روساء ہند کی ریاست برباد ہو گئی ہے۔ کوئی شخص مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا۔ بلکہ ہر شخص اُن کو اپنا آقا تصور کرتا ہے۔''

وچوں روساء کبار از مقابلہ ایشاں نشستند لاچار چند کس از ضعفاء بے مقدار کمر بستند۔ پس دریں صورت روساء عالی مقدار را لازم چنانکہ بر مسند ریاست سالہا متمکن ماندہ اند بالفعل در اعانت ضعفاء مذکورین مساعی بلیغہ بجا آرند کہ آں را باعث استحکام بنیان ریاست خود شمارند۔ (۴۸۴)

''چونکہ بڑے بڑے صاحب ریاست اُن کے مقابلہ کا خیال ترک کر کے بیٹھ گئے ہیں۔ ناچار چند کمزور ناچیز کمر ہمت کس کر کھڑے ہوئے ہیں۔ پس اس صورت میں روساء عالی مرتبت پر لازم ہے کہ جس طرح وہ سالہا سال مسند حکومت پر متمکن رہے ہیں فی الحال ان کمزور فداکاروں کی امداد میں پوری کوشش کریں اور اس کو خود اپنی حکومت کی مضبوطی کا ذریعہ سمجھیں۔''

یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ یہ عارضی حکومت، اصل حکومت کی حیثیت اختیار نہ کر سکی۔ اگر اس کا موقع ملتا تو یہ تصور بہت ہی غلط ہے کہ ملوکیت کی لعنت دوبارہ زندہ کی جاتی۔ البتہ یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ شاہ ولی اللہ کی پارٹی، شاہ صاحب کے اصول پر ہی حکومت قائم کرتی۔ شاہ صاحب نے اپنی مشہور کتاب ''البدور البازغۃ'' (۴۸۵) میں ترقی پذیر متمدن حکومت کے تقاضوں اور مطالبوں کا تجزیہ کر کے اس کی بنیادی ضرورتوں کو پانچ شعبوں میں تقسیم کیا ہے۔ پھر وہ رنگ و نسل، خاندان یا فرقہ کے امتیاز سے بالا ہو کر ایسے ماہر تلاش کرتے ہیں جو اپنی صلاحیت اور قابلیت کے لحاظ ایک ایک شعبہ کے ذمہ دار ہو سکیں۔ پھر صدارت یا وزارت عظمیٰ کے لیے ایک ایسے شخص کو منتخب کرتے ہیں جس میں ان تمام شعبوں کی نگرانی کی بہترین صلاحیت موجود ہو۔ ایسا جامع شخص ہی ''الامام الحق'' (صحیح لیڈر، سچا رہنما) ہوگا۔ یہ ''الامام الحق'' ڈکٹیٹر بھی بن سکتا ہے مگر ایسا جامع اور کامل شخص عنقا ہے۔ بہت ہی مشکل سے ملتا ہے بلکہ نہیں ملتا۔ لہذا ممکن العمل متبادل صورت یہ تجویز کرتے ہیں کہ:

چند ارباب دانش، صاحب تجربہ، ماہرین، اور یہ بھی نہ ہو سکے تو پھر عوام کی مقبول اور منتخب جماعت (پارلیمنٹ اور کیبنٹ) حکومت کی ذمہ دار ہوگی۔ (۴۸۶)

عارضی حکومت کی آزاد فوج کا کردار

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ رُوحِ جہاد دوسروں کو فنا کرنا نہیں بلکہ ایک مجاہد کے حق میں جہاد کی رُوح یہ ہے

کہ وہ خود اپنی انانیت کو فنا کر دے۔ حق اور اعلاء کلمۃ الحق کے مقابلہ میں وہ اپنی تمام تمنائیں، تمام آرزوئیں، تمام جذبات اور جملہ مفادات ختم کر چکا ہو۔ وہ ایک آلہ کی حیثیت میں ہو، تقاضاءِ حق محرک ہو اور یہ اس کے اشاروں پر رقصِ بسمل کر رہا ہو۔

ایک مجاہد کی سب سے بڑی آرزو یہ ہوتی ہے کہ جس حق وصداقت کے لیے وہ اٹھا ہے، سب کچھ یہاں تک کہ جان عزیز کو بھی اس پر قربان کر دے۔

یہ جذبۂ فدائیت دل کی گہرائیوں سے اچھل کر زبان پر آ جاتا تھا جبکہ سید صاحب اکثر عالم شوق میں یہ اشعار پڑھا کرتے تھے:

اے آنکہ زنی دم از محبت　　　از ہستی خویشتن بہ پرہیز
برخیزد بہ تیغ تیز بنشیں　　　یا از سرِ راہِ دوست برخیز (۴۷)

ان مجاہدین پاک طینت میں یہ روح کس طرح کارفرما تھی۔ اس کے موازنہ کے لیے چند واقعات ملاحظہ فرمایئے۔

☆ "اکوڑہ" پر شبخون کے لیے مجاہدین کی فہرست تیار کی جا رہی تھی۔ عبدالمجید خاں آفریدی ساکن جہان آباد ضلع رائے بریلی اس لیے فہرست میں شامل نہیں کیے گئے کہ بخار میں مبتلا تھے۔ عبدالمجید خاں صاحب کو خبر ملی تو بے تاب ہو کر سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور گریہ وزاری کے ساتھ عرض کرنے لگے۔ حضرت! میں ایسا بیمار تو نہیں ہوں کہ چل نہ سکوں۔ یہ اللہ کے نام پر پہلا معرکہ ہے۔ کیا میں سبقت کی فضیلت سے محروم رہ جاؤں گا؟ سید صاحب نے جذبہ ایثار کی یہ بے تابی دیکھی تو فہرست میں نام شامل کر دیا۔ اور فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ہمت میں برکت دے۔ پھر ایسا اتفاق ہوا کہ اسی شبخون میں یہ شہید بھی ہو گئے لیکن اس طرح کہ چودہ سپاہیوں کو ختم کرنے کے بعد اُن کی تلوار ٹوٹ گئی۔ نرغہ میں گھر کر زخموں سے چور ہوئے اور جام شہادت سے شوق وذوق کی تشنہ لبی کو سیراب کیا۔ (۴۸)

جنگ پنجتار کے موقع پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بقول راوی:

تمام بھائی کمال تپاک اور اشتیاق سے ایک دوسرے سے گلے مل مل کر خطائیں معاف کرا رہے ہیں۔ دنیاوی تعلقات کا ہر ایک نقش اُن کے صفحاتِ دل سے مٹ چکا ہے۔ ایک دوسرے کو وصیت کر رہے ہیں، مگر یہ نہیں کہ ہمارے اہل وعیال کا خیال رکھنا یا جائدادوں کو سنبھالنا یا رشتہ داروں کو سلام پہنچانا یا یادگاریں قائم کرنا۔ حاشا ثم حاشا۔

یہ پاک باز رضائے مولا میں کچھ اس طرح گم ہیں کہ گویا اس دنیا کے ساتھ اُن کو کوئی رشتہ بھی باقی نہیں رہا۔ سب کی زبانوں پر صرف ایک وصیت اور صرف ایک پیام ہے، اور وہ یہ کہ بھائیو ہم شہید ہو جائیں یا زخموں سے چور ہو کر گر پڑیں، ہمیں اٹھانے یا سنبھالنے سے بے پروا ہو کر فرصت ومہلت کے ہر ایک

لمحہ کو صرف آگے بڑھنے میں صرف کرو۔ کامیابی کی یہی ایک صورت ہے۔ (۳۸۹)

دیوبند کے مجاہدین میں شیخ بلند بخت اور اُن کے بھائی محمد علی صاحب بھی تھے۔ ایک معرکہ میں بھائی شہید ہو گئے۔ شیخ بلند بخت صاحب کو بھائی کی شہادت کی خبر ملی تو فرمایا۔ الحمد للہ جو مراد لے کر آئے تھے وہ پوری ہو گئی۔ ہم سب کو اللہ تعالیٰ شہادت نصیب کرے۔ (۳۹۰)

اسی طرح ایک صاحب کا تذکرہ ہے کہ زخمی ہو کر گرے تو بے اختیار زبان سے نکلا فُزْتُ بِرَبِّ الْكَعْبَةِ رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔

صبر و استقامت

جنگ شیدو میں شکست کے بعد منتشر شدہ غازی مقام چنگلئی میں جہاں سید صاحب کو بے ہوشی کی حالت میں پہنچا دیا گیا تھا، جمع ہوئے تو آب وہوا کی ناموافقت کے باعث اکثر مجاہد بیمار پڑ گئے اور روزانہ ایک ایک دو دو وفات پانے لگے۔ دوسری طرف معاش کی تنگی انتہا کو پہنچ گئی۔ سینکڑوں میں صرف چھ سات تندرست تھے۔ وہ رات دن تیمارداری میں مصروف۔

سید رستم علی جل گانوی، اکوڑے میں زخمی ہوئے۔ دو ڈھائی مہینے تو شہرے میں صاحب فراش رہے۔ چنگلئی پہنچنے پر اُن کی صحت پوری طرح بحال نہیں ہوئی تھی، کہ تنہا چالیس بیماروں کا بوجھ اُٹھا لیا اور اس خوبی سے خدمت کی کہ کسی کو بھی ذرا سی تکلیف نہ ہونے دی۔

اس پر عسرت کا یہ عالم کہ ہر شخص کو روزانہ صرف مٹھی بھر جوار ملتی تھی۔ تندرست غازی اُسے پیس کر روٹیاں پکاتے اور بیماروں کے لیے پانی میں اُبال کر آش بنا دیتے۔ لیکن عسرت اسی پر ختم نہیں ہوئی۔ جلد ہی وہ وقت آ گیا کہ مٹھی بھر جوار بھی میسر نہ آ سکی تو یہ لوگ باہر جنگل میں نکل جاتے اور ایسی جڑی بوٹیاں یا ایسے پتے تلاش کرتے، جو کھانے میں بدمزہ نہ ہوں اور پانی میں جوش دینے سے گل جائیں۔ انہی چیزوں کو بڑی بڑی ہانڈیوں میں اُبالتے اور نمک ڈال کر خود بھی کھاتے اور بیماروں کو بھی کھلا دیتے۔ اسی طرح ایک بوٹی تھی جس کو پیس کر پانی میں پکاتے اور نمک ڈال کر مریضوں کو پلا دیتے۔

ان سختیوں اور مصیبتوں کے باوجود خوبی یہ تھی کہ راضی برضا تھے اور قدم جادۂ استقلال پر اسی طرح محکم و استوار تھے کہ گویا پہاڑ کی چٹانیں ہیں جن میں جنبش کا امکان نہیں۔

بہ درد و صاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ آنکہ ساقی ما ریخت عین الطاف است (۳۹۱)

اس حالت میں جن کی وفات ہوئی، اُن کے کفن کے لیے کپڑا میسر نہیں تھا۔ اگر اُن کے پاس چادریں ہوتیں تو انہیں کا کفن بنا دیا جاتا۔ ورنہ جاجم کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر اس کام میں لاتے۔ (۳۹۲)

امانت و دیانت اور جماعتی خیر خواہی

کی سبق آموز مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

اسی شبخون کا واقعہ ہے کہ سکھ پہرے دار نے تکبیر کی آواز سنتے ہیں بندوق سر کی۔ گولی مولانا باقر علی صاحب عظیم آبادی کے لگی۔ زخم کاری تھا۔ وہ بیٹھ گئے اور بولے:

بھائیو! میرا کام تمام ہوا۔ یہ ہتھیار لو یہ اللہ کا مال ہے...... ان الفاظ کے ساتھ ہی اُن کی رُوح پرواز کر گئی۔ (۲۹۳)

عارضی حکومت کے جو محصولات مقرر کیے گئے تھے۔ اول تو اُن کی مقدار یہ تھی کہ پیداوار اگر ہو تو اُس کا دسواں حصہ سرکاری محصول دیا جائے جس کو "عشر" کہا جاتا ہے۔ پھر اُس کی تحصیل کرنے والوں کا کردار یہ تھا کہ:

"رسالدار عبدالمجید خاں کا دستور یہ تھا کہ دورے پر نکلتے تو ہر آبادی سے نصف میل پر ٹھہر جاتے اور گاؤں کے سرداروں کو باہر ہی بلا کر حالات پوچھ لیتے۔ سواروں کو بستی میں جانے یا کوئی چیز مانگنے کی سخت ممانعت تھی۔ ایک مرتبہ ایک سوار نے موضع ڈاگی میں کسی سے چھاچھ مانگ لی۔ عبدالمجید خاں سخت ناراض ہوئے۔ گاؤں والوں نے کہا۔ یہ معمولی بات ہے لیکن رسالدار نے اس سوار سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارے ساتھ رہنا ہے تو ضابطہ کی پابندی کیجیے۔ ورنہ "امیرالمومنین" کے پاس چلے جائیے"۔

ایک مرتبہ دو سواروں نے کسی سے شکر مانگی۔ اُس نے جواب دیا کہ شکر تو نہیں گڑ موجود ہے۔ سوار غصہ میں آگئے۔ رسالدار کو اس واقعہ کا علم ہوا تو دونوں سواروں کے بیس بیس تازیانے لگوائے۔ (۲۹۴)

دفتر کے محرر بھی مجاہدین کا نمونہ تھے۔ اُن میں کوئی امتیاز نہیں تھا۔ میدان جنگ میں عام سپاہیوں کی طرح کام کرتے تھے۔ قلمدان خنجری کی طرح کمر میں لٹکا لیتے۔ جب لکھنے کی ضرورت ہوتی، بے توقف لکھنے لگتے۔

سردار پائندہ خاں کا منشی محمد غوث سردار کو چھوڑ کر سید صاحب کے پاس آ گیا تھا وہ منشی خانہ کے سامان کی سادگی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سید جعفری صاحب نقوی کے پاس بڑا قلمدان اور ایک پرانی قینچی تھی۔ منشی محمد غوث نے کہا کہ میں آپ کو نیا چاقو اور نیا قلمدان لا دوں۔ سید جعفر علی نقوی نے فرمایا۔ مجھے آپ کے چاقو کی ضرورت نہیں۔ آپ دین کی خدمت کیجیے، مجھے اس سے مسرت ہوگی۔ مجھے دنیادار حکومتوں کے کارکنوں کی طرح نہ سمجھئے...... یہاں جاروب کش اور افسر یکساں ہے۔ اخلاص کامل کی ضرورت ہے۔ جب اس قلمدان اور اس پرانی قینچی سے کام چل رہا ہے اور دوسروں کا چاقو لے کر قلم بھی بنایا جا سکتا ہے تو مجھے کسی چیز کی کیا ضرورت ہے۔ (۲۹۵)

فوجیں جب مارچ کرتی تھیں تو راستہ کے آس پاس کے کھیتوں کا تباہ کر دینا عام بات تھی۔ دیہات سے جو چاہتے لوٹ لیا کرتے تھے۔ مگر سید صاحب کے لشکر نے پشاور پر حملہ کے وقت لانبا راستہ طے کیا۔ تو احتیاط کا یہ

عالم تھا کہ لوگ پکار اٹھے:

ایں عجب لشکر ست باوجود آنکہ شش ہفت ہزار سوار و پیادہ نزول کردہ اند اما بر کسے ظلمے نمودہ۔ (۲۹۶)

یہ عجیب لشکر ہے کہ اگرچہ چھ سات ہزار سوار و پیادے اترے ہوئے ہیں مگر کسی پر ظلم نہیں۔

ایسے موقع پر جعلی سکہ بنانے میں تو کوئی خرابی ہی نہیں سمجھی جاتی۔ اگر کیمیا کے کسی نسخہ سے تانبا سونا بنا کر بیچا جائے تو اس کو بھی ایک قسم کا دستِ غیب سمجھا جائے گا۔ لیکن سید صاحب کی راست بازی اور دیانت کی یہ کیفیت تھی کہ ایک صاحب عبدالغفار خاں پشاوری کو سکہ بنانے میں کمال حاصل تھا۔ اس نے بار بار اجازت چاہی۔ آپ نے ہر دفعہ منع کر دیا۔ جب اصرار زیادہ کیا تو سید صاحب نے فرمایا۔ ہمارے ساتھ رہنا ہے تو قلب سازی چھوڑ دو، ورنہ سکھوں کے علاقہ میں چلے جاؤ۔ (۲۹۷)

ہمدردی

جب سمہ کے لوگوں نے غداری کی اور جہاں جو مجاہد تھا، اس کو شہید کرنا شروع کیا۔ تو حافظ عبدالعلی صاحب اور مولوی محمد رمضان صاحب شیوہ میں تھے۔ سید امیر علی صاحب بیت المال کا روپیہ لے کر پنجتار چلے گئے۔ حافظ عبدالعلی صاحب نے اس کو گاؤں سے باہر پہنچا دیا لیکن خود یہ کہہ کر لوٹ آئے کہ میں اس نازک وقت میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔

مولوی محمد رمضان صاحب کو شیوہ کے رئیس اپنے یہاں لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن انہوں نے بھی اپنے ساتھیوں سے علیحدگی گوارا نہیں کی، اور ان کے ساتھ شہید ہوئے۔

مینئی میں جن مجاہدوں کو قاتلانہ حملہ کا ہدف بننا پڑا، ان میں جیر کا ایک نوجوان بھی تھا۔ بلوائی بار بار اسے آوازیں دیتے تھے کہ تم ہماری قوم ہو۔ ہندوستانیوں سے الگ ہو کر ہمارے پاس چلے آؤ۔ اس نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا کہ مجاہدین کے ساتھ شہید ہو جانا ہزار درجہ بہتر ہے تمہارے ساتھ جینا منظور نہیں۔

ایثار

پہلے سید صاحب کی ہدایت ملاحظہ فرمایئے:

''مسلمانوں کو چاہیے کہ لذیذ کھانوں، شیرینی یا قسم قسم کے لذیذ میووں وغیرہ کے سلسلہ میں جن کی خواہش ہر شخص کو ہوتی ہے دوسروں کو اپنے اوپر مقدم رکھے اور خود پیچھے رہے۔ اس کے لیے جائز نہیں کہ حظوظ نفسانی میں دوسروں سے زیادہ حصہ لے جائے۔ بلکہ ایسے معاملات میں اپنے لیے کمی پسند کرنی چاہیے۔ جب محنت و مشقت یا تکلیف کا موقع پیش آئے تو اپنے کو دوسروں سے آگے رکھے اور ان پر تکلیف و بلا کا آنا پسند نہ کرے۔'' (۲۹۸)

سید صاحب کی پوری زندگی اسی اصول پر عمل کرتے ہوئے گذری تھی۔ بچپن میں کام کا بڑا شوق تھا۔ صبح صبح

ہر ایک کے یہاں ہو آتے کہ کوئی کام ہو تو کر دیں۔ جب تلاش روزگار میں گھر سے لکھنؤ جانے کے لیے نکلے تو ساتھیوں کے سامان کا بوجھ سمیٹ کر ایک گٹھر بنایا اور سر پر رکھ لیا۔ قیام لکھنؤ کے زمانے میں اپنا کھانا ساتھیوں کو کھلاتے تھے پھر بچ جاتا تو نوش فرما لیتے۔ نواب امیر علی خاں کے لشکر میں رہے تو ساتھیوں کے کپڑے خود دھو کر لاتے۔ کوچ کرنے یا قیام کے موقع پر گھٹیا سے گھٹیا کام سید صاحب خود اپنے ذمے لیتے۔ مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب کو سید صاحب نے ایک گھوڑا دے دیا تھا مگر شاہ اسمٰعیل صاحب نے اُس پر سواری کبھی گوارا نہیں کی۔ سفر میں وہ گھوڑا ساتھ جاتا تھا لیکن شاہ صاحب اس پر سوار کسی دوسرے کو کرا دیتے اور خود پاپیادہ چلتے تھے۔

عفو و درگذر، برائی کے بدلہ میں بھلائی

جنگ سیدو کے نہایت نازک موقع پر سید صاحب کو زہر دینے کا واقعہ مذہبی، سیاسی، اخلاقی اور قانونی غرض ہر لحاظ سے بے حد شرمناک اور نہایت سنگین ہے۔ زہر دینے والوں کو جو بھی سزا دی جاتی، بجا تھی۔ لیکن سید صاحب کا عفو و اغماض اور آپ کی شانِ درگذران سب سے بالا تھی۔ چنانچہ نذر محمد اور ولی محمد جو یار محمد خاں کے خانساماں تھے اور وہی کھانا لانے پر مامور تھے۔ جب ایک موقع پر مجاہدین نے اُن کو گرفتار کر کے سزا دینی چاہی تو چونکہ اس کا تعلق سید صاحب کی ذات سے تھا آپ نے حکماً رہا کرا دیا۔ وہ وطن جا رہے تھے۔ راستہ میں پٹھانوں نے دوبارہ گرفتار کر لیا اور ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک جھونپڑے میں ڈال دیا کہ اُن کا سردار آجائے تو اِن کا سر قلم کر کے دل ٹھنڈا کریں۔

اتفاق سے سید صاحب کا گذر اس طرف سے ہوا تو سید صاحب کو بھی خبر کر دی کہ جنھوں نے آپ کو زہر دیا تھا۔ ہم نے اُنہیں پکڑ لیا ہے اور اپنے خان کو بلایا ہے تاکہ اُنہیں سزا دے۔ اسی اثناء میں یہ خاں صاحب بھی پہنچ گئے اور سید صاحب سے اصرار کیا کہ آپ تشریف لے جائیں، ہم ان کو سمجھیں گے۔ سید صاحب جو پہلے حکماً رہا کرا چکے تھے، اب جب حکم کا موقع نہیں تھا تو خوشامد کر کے اُن کو خان کے پنجہ سے چھڑایا اور جب رات ہو گئی تو اندھیرے میں اُن کو باہر پہنچوا دیا۔

جب امیر اور شیخ کا کردار یہ ہو کہ اپنے قاتلوں کو نہ صرف معاف کرے بلکہ گرفتار کرنے والوں کی خوشامد کر کے چھڑائے تو پھر ماتحتوں اور پیروکاروں میں یہ جذبہ کیوں نہیں کارفرما ہوگا۔ چنانچہ کبھی کبھی بشری تقاضا ابھرتا اور کسی بات پر دو مجاہدوں میں تنازعہ ہو جاتا مگر خاتمہ اس طرح ہوتا کہ مظلوم ظالم کو بھائی کہہ کر معاف کر دیتا۔ ظالم خود پانی پانی ہو جاتا۔ ادفع بالتی هی احسن کا تقاضا یہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔

فاذا الذی بینک و بینه عداوة کانه ولی حمیم۔

یعنی تعلیم یہ ہے کہ بُرائی کے جواب کے لیے سوچ سمجھ سے کام لے کر وہ طریقہ اختیار کرو جس سے نہ صرف یہ کہ آپ کا مظلومانہ غصہ فرو ہو بلکہ ظالم آپ کا جاں نثار دوست بن جائے۔

مولانا حافظ عبدالوہاب صاحب کمزور آدمی تھے۔ اُن کو تقسیم رسد کا کام سپرد تھا۔ وہ قرآن شریف پڑھتے رہتے اور جو رسد لینے کے لیے آتا، اس کو رسد دے دیتے، اور بہت سوں کا ہجوم ہوتا تو نمبروار پہلے کو پہلے دے دیتے، بعد کے آنے والے کو بعد میں اس میں کوئی امتیاز قطعاً روا نہ رکھتے۔ ایک تو وارد مولوی امام علی عظیم آبادی رسد لینے گئے۔ تو اُن کا نمبر بعد میں آنے والا تھا۔ اُنھوں نے پہلے لینا چاہا۔ مولانا عبدالوہاب صاحب نے فرمایا کہ باری آنے دو تب رسد دوں گا۔ مولوی امام علی تندرست و توانا تھے۔ مولوی عبدالوہاب ضعیف و نحیف۔ امام علی صاحب نے مولانا عبدالوہاب صاحب کو دھکا دیا۔ وہ آنے پر گر پڑے۔ چند قندھاری اس جگہ کھڑے یہ ماجرا دیکھ رہے تھے۔ وہ مولوی امام علی صاحب کی طرف بڑھنے لگے تو مولانا عبدالوہاب صاحب نے روک دیا کہ امام علی میرا بھائی ہے۔ دھکا دیا تو مجھے دیا، آپ صاحبان جوش میں کیوں آ گئے۔

شدہ شدہ یہ خبر سید صاحب تک پہنچی۔ آپ نے مولانا عبدالوہاب صاحب کو بلا کر پوچھا۔ مولانا نے فرمایا، امام علی نیک آدمی ہیں، اتفاقاً غصہ آ گیا تھا۔ میں نے معاف کر دیا۔ قصہ ختم ہو گیا۔ یہ جواب جب امام علی صاحب نے سنا تو ندامت سے پانی پانی ہو گئے۔ خود سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی زیادتی کا اقبال کیا اور درخواست کی کہ مولانا عبدالوہاب صاحب سے میرا قصور معاف کرا دیجیے۔ **وان تعفوا وتصفحوا هو خير لكم. ولمن صبر وغفر ان ذلك لمن عزم الامور.**

اس طرح ایک عجیب وغریب واقعہ عنایت اللہ صاحب اور ایک سائیس کا ہے جو اصل باشندہ غازی پور کا تھا مگر لاہوری کہلاتا تھا۔ قاضی مدنی صاحب بنگالی کے یہاں ملازم تھا۔ شکل وصورت اچھی نہ تھی مگر اخلاق بہت بلند۔ عنایت اللہ صاحب، سید صاحب کے خاص محافظین میں تھے۔ چارپائی کے قریب اکثر انھی کا پہرہ رہتا تھا۔ ایک طشت کے بلا اجازت لے جانے پر عنایت اللہ صاحب اور اس لاہوری سائیس میں جھگڑا ہو گیا۔ عنایت اللہ صاحب نے لاہوری کے دو گھونسے مار دیے۔

لاہوری صاحب نے اس کی شکایت کی۔ یہاں تک کہ معاملہ قاضی صاحب کی عدالت تک پہنچا۔ قاضی صاحب نے مشورہ دیا کہ صلح کر کے معاملہ ختم کر دیں مگر لاہوری صاحب نے فیصلہ کا مطالبہ کیا۔ قاضی صاحب نے فیصلہ کیا کہ قانونِ شریعت کی رو سے فیصلہ یہ ہے کہ آپ بھی ان کے اتنے ہی گھونسے مار دیں۔

لاہوری صاحب اُٹھے اور فرمایا:

''جو بھائی حاضر ہیں گواہ رہیں۔ قاضی صاحب نے ہمارا عوض دلا دیا۔

لیکن ہم نے اسے رضاء الٰہی کے لیے چھوڑ دیا۔'' یہ الفاظ کہتے ہوئے آگے بڑھ کر گھونسے مارنے کے بجائے عنایت اللہ صاحب کو گلے لگا لیا۔ (۲۹۹)

ایک مرتبہ امیر المومنین سید احمد صاحب جب کھانا کھانے بیٹھے، تو گوشت میں جلے ہوئے کی بو آ رہی تھی۔ کیونکہ ہنڈیا میں داغ لگ گیا تھا۔ اتفاق سے سید صاحب کو ناگوار گزرا۔ یہاں تک کہ ہنڈیا پکانے والے

"عبداللہ" کے لیے مردود کا لفظ بیان زبان سے نکل گیا کہ اس مردود نے خبر نہ لی۔ ہنڈیا جل گئی اور گوشت کھانے کے قابل نہ رہا۔

چند ساتھی جو حاضر مجلس تھے، اس وقت تو خاموش رہے مگر تھوڑی دیر بعد آپس میں گفتگو کرنے لگے کہ سید صاحب کی زبان سے یہ لفظ نکلا، مناسب نہیں۔ سید صاحب سے عرض کرنا چاہیے۔ چنانچہ میاں جی نظام الدین چشتی، قاضی علاء الدین، مولوی وارث علی، مولوی امام الدین، حافظ صابر وغیرہ نے سید صاحب کو توجہ دلائی۔ سید صاحب فوراً متاثر ہوئے۔ عبداللہ صاحب کو بلایا اور پاس بٹھا کر ان سے معافی مانگی۔ (۳۰۰)

عفت و پاکبازی

ذیل کا واقعہ ملاحظہ فرمایئے اور اپنے زمانہ کے فوجی سپاہیوں کے کیرکٹر کا جائزہ لیجیے۔

ملا اخوندزادہ کا بیان ہے کہ گاؤں کی عورتیں آپس میں باتیں کر رہی تھیں کہ سید صاحب کے ساتھی خواہشات نفس سے محروم ہیں یا اولیاء ہیں۔ پن چکیوں پر آٹا پسوانے آتے ہیں، وہاں عورتیں بھی ہوتی ہیں لیکن کیا مجال کہ آج تک کسی غازی کی نگاہ عورت کی طرف اٹھی ہو۔ (۳۰۱)

وقائع احمدی میں ان مجاہدین کی جو شان بیان کی گئی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

"تکبر، غرور یا اونچ بڑائی کا مرض گویا ختم ہو گیا تھا۔ تعاون باہمی یہاں تک تھا کہ ہر ایک دوسرے کا کام کرنے میں سبقت کی کوشش کرتا۔ آٹا پیسنے، لکڑیاں کاٹنے اور چیرنے، گھاس چھیلنے، جاروب کشی اور گھوڑوں کی مالش سے لے کر کپڑے سینے اور کپڑے دھونے تک کے تمام کام باہمی تعاون سے خود قافلہ کے سپاہی انجام دیتے تھے۔ بڑا اور چھوٹا یکساں تھا بلکہ سب سے بڑا آدمی سب سے چھوٹا کام کرنے میں سب سے زیادہ سبقت کرتا تھا۔

نماز پڑھنے کے لیے جو جگہ تجویز کی گئی تھی وہاں کنکریاں بہت تھیں۔ سید صاحب نے کچھ ساتھیوں کو ساتھ لیا۔ گھاس چھیل کر لائے اور اس زمین پر بچھا کر اس کو نرم اور ہموار کر دیا۔ خیموں میں دھوپ کی تمازت کی شکایت محسوس کی تو سید صاحب نے خود ہی چند ساتھیوں کے ساتھ گھاس لا کر خیموں پر پھیلا دی جس سے تمازت کم ہو گئی۔

فحش گوئی، بدکلامی، حسد، بغض وغیرہ طبیعتوں سے محو ہو گیا تھا۔ سپاہیانہ زندگی کے ساتھ یاد خدا کا سلسلہ برابر جاری رہتا۔ دن کو مجاہد و شہسوار اور رات کو زاہد شب بیدار۔ معلوم ہوتا تھا کہ فرشتے زمین پر اتر آئے ہیں، یا مسلمانوں کا دور اول لوٹ آیا ہے۔ (۳۰۲)

یہ ایک حقیقت ہے کہ اخلاقی اور روحانی تربیت کے ایک ہی ماحول میں دس بارہ سال مسلسل رہنے کے بعد قافلہ کا ہر ایک فرد اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ کرداری ایک مثال بن گیا تھا۔ نواب وزیر الدولہ نے لکھا ہے:

''بہ رحمت حضرت جہاں پناہ جل ذکرہٗ آں سپاہ تقویٰ دستگاہ را اخلاص فی العمل بآں مرتبہ بود کہ اگر مجاہد للٰہی یک یک سپاہی ازاں لشکر ظفر انتباہی بہ قلم آید دفترے باید غیر متناہی کہ رقمش بانجام رسد۔ (۳۰۳)

(خدا کی رحمت سے اس تقویٰ شعار لشکر کا اخلاص اس مرتبے پر پہنچا ہوا تھا کہ اگر ایک ایک سپاہی کے اخلاص اور للٰہیت کی تعریف کی جائے تو انہیں پورا کرنے کے لیے لامتناہی دفتر درکار ہیں)۔

اُن کے بچے کھچے افراد سرحد سے واپس ہو کر جہاں پہنچے۔ وہاں کی سوسائٹی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اُن کے تذکرے پرانے لوگوں کی زبان پر آج تک ہیں۔ انہیں پاکیزہ اخلاق کے اثرات تھے کہ باوجودیکہ انگریزی پروپیگنڈے کی پوری مشنری اُن کو بدنام کرنے میں مصروف رہی۔ مگر جب تقریباً تیس سال بعد ۱۸۵۷ء کا جہاد حریت برپا ہوا تو اُن کے ماننے والوں کے وہی دم خم تھے۔

وہابیوں کی تحریک جو ایثار و قربانی، حسن انتظام اور رازداری کی بے نظیر مثال ہے جس نے ۱۸۵۸ء سے تقریباً ۱۸۷۰ء تک برطانیہ عظمیٰ کے ارباب اقتدار کو سراسیمہ بنائے رکھا۔ اسی تقویٰ شعار لشکر کے چند بچے ہوئے سپاہیوں اور سید صاحب کے آسمان تربیت کے چند ٹوٹے ہوئے تاروں کی گردش مستانہ تھی جس کی تفصیل انشاء اللہ دوسری جلد میں پیش کی جائے گی۔

عارضی حکومت کے مخالفین اور وجوہات مخالفت

سید صاحب کا اصل مقابلہ سامراج سے تھا۔ چنانچہ سامراجی طاقتیں سینہ اُبھار کر سامنے آ گئیں۔ یہ تین حصوں میں بٹی ہوئی تھیں۔

(۱) سکھ (۲) شاہ پرست مسلمان (۳) انگریز

پہلی دو طاقتوں کا مقابلہ سید صاحب نے کامیابی کے ساتھ کیا۔ مگر تیسری طاقت اگر کھلے میدان میں لڑتی تو وہ بھی مغلوب ہو جاتی۔ لیکن اُس نے ایسا حربہ استعمال کیا کہ اس کا جواب سید صاحب کے پاس شکست اور شہادت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ ایک نفرت انگیز پروپیگنڈے کا حربہ تھا جس نے انہیں پٹھانوں کو سید صاحب کا دشمن بنا دیا جن کے سہارے اس علاقے میں یہ عارضی حکومت کامیاب ہو سکتی تھی۔ اب کسی قدر تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔

سکھ

کیا ہی اچھا ہوتا کہ سکھ انگریز کو پہچان لیتے تو وہ سید صاحب سے تعاون کر کے اپنی حکومت کو لازوال بنا لیتے اور یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا کہ سید صاحب کو ختم کرنے کے بعد دس پندرہ سال کے عرصہ ہی میں اپنی حکومت بھی کھو بیٹھے۔ مگر بدقسمتی یہ تھی کہ:

(۱) مہاراجہ رنجیت سنگھ کی تمام فاتحانہ اولوالعزمیاں انگریزوں سے ہٹ کر پٹھانوں کے مقابلہ میں مرکوز ہو گئی تھیں۔ چنانچہ صرف تین سال گذرے تھے کہ ۱۸۲۴ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پشاور فتح کر کے یار محمد خاں کو اپنی طرف سے باجگذار حاکم مقرر کر دیا (۳۰۴) تھا۔ یوسف زئی کا علاقہ جہاں سید صاحب نے حکومت قائم کی تھی، اگرچہ آزاد تھا مگر پشاور فتح کرنے کے بعد مہاراجہ کی نظر اسی علاقہ پر جمی ہوئی تھی۔

(۲) ایک نظریاتی تصادم سید صاحب کے ساتھیوں اور مہاراجہ رنجیت سنگھ میں اُس وقت سے تھا جب مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر اور امیر علی خاں انگریزوں سے لڑتے ہوئے مہاراجہ رنجیت سنگھ اور سکھ سرداروں سے امداد حاصل کرنے امرتسر پہنچے اور نہ صرف یہ کہ ناکام واپس (۳۰۵) ہوئے تھے بلکہ اگر "لیپل گرفن" کی روایت صحیح ہے تو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے انگریزوں سے یہ معاہدہ بھی کر لیا تھا کہ ہلکر کو امرتسر سے تیس کوس پرے ہٹا دیں گے اور آئندہ اس سے کوئی تعلق نہ رکھیں گے۔ (۳۰۶)

(۳) سید صاحب کی نظر نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ کے مقابلہ میں پورے ایشیا کے اتحاد پر تھی، اور مہاراجہ رنجیت سنگھ وحدتِ ہند تو درکنار سکھوں کی متحدہ حکومت کے نظریہ سے بھی دست بردار ہو کر ستلج پار کے علاقہ پر (جس میں پٹیالہ، نابھ، جیند، کپورتھلہ، وغیرہ کی ریاستیں تھیں) انگریزی اقتدار تسلیم کر چکے تھے۔

(۴) اگر میجر باسو کا یہ الزام صحیح ہے کہ "انگریزوں نے سکھوں کو بڑھایا تاکہ وہ سندھیا کا مقابلہ کر سکیں، اسی لیے مہاراجہ رنجیت سنگھ انگریزوں سے ملے رہے اور اُن کے شکر گذار رہے"۔ تو سید صاحب اور رنجیت سنگھ کے نظریہ میں وہی تصادم تھا جو مہاراجہ سندھیا اور انگریزوں کے نظریہ میں۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ سید صاحب نے مہاراجہ دولت راؤ کو خاص طور پر تحریک کی طرف متوجہ کیا۔

مسلمان

بدقسمتی سے سید صاحب اور یار محمد خاں جیسے خوانین کے نظریات میں بھی تصادم تھا۔ سید صاحب ملوکیت کے دشمن، اور یار محمد خاں ان کے برعکس اس بنا پر اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یار محمد خاں اختلاف مذہب کے باوجود سید صاحب کے مقابلہ میں مہاراجہ رنجیت سنگھ سے زیادہ قریب تھا۔

چنانچہ جنگ سیدو کے مقام پر جب مجاہدین کی طاقت نقطۂ عروج پر تھی، اور سردارانِ پشاور، سردارانِ سمہ کی فوجوں اور مجاہدین کو ملا کر ایک لاکھ کے قریب لشکر سید صاحب کے زیرِ قیادت تھا۔ خوانین پشاور نے اول سید صاحب کو زہر دلوایا اور جب سید صاحب کی بے ہوشی کے باوجود جنگ نہیں ٹلی اور میدان جنگ میں مجاہدین کا پلہ بھاری ہونے لگا تو سردارانِ پشاور اپنی فوج لے کر میدانِ جنگ سے علیحدہ ہو گئے۔ اب لڑائی کا تمام زور مہاجرین پر آپڑا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہزاروں مہاجرین شہید ہوئے اس کے بعد بقول مصنف سیرت سید احمد شہید:

اب مسلمانوں کا مستقل دو حریفوں سے مقابلہ تھا۔ ایک سکھ دوسرے سردارانِ پشاور، خاوی

خاں[۳۰۷] کے تیور بھی اس گاؤں[۳۰۸] کے معاملہ کے بعد سے بدل گئے تھے اور انتقام کا موقع ڈھونڈتا تھا۔ اب یہ لوگ سید صاحب کی جماعت کے لیے دشمن اور علانیہ حریف تھے۔

ان دو حریفوں کے علاوہ تیسرا حریف بھی تھا۔ سب سے زبردست مگر سب سے ہوشیار اور سیاسی ڈپلومیسیوں کا نہ صرف ماہر استاد بلکہ موجد۔ ان دو حریفوں کی توپ وتفنگ اور لاؤ لشکر نے وہ کام نہیں کیا جو اس کے ایک لفظ نے کیا۔ تفصیل کے لیے آئندہ ابواب ملاحظہ ہوں۔

صاحبانِ انگریز کا رویہ

یہ قوم جس کی ہندوستانیوں نے یہاں تک عزت اور تعظیم کی کہ "لفظ صاحب" اُن کے لیے مخصوص کر دیا۔ وہ اپنی ٹھنڈی طبیعت اور مغز بیدار سے ہمیشہ اس پالیسی پر کاربند رہی ہے کہ دشمن کو شکست دینے میں طاقت اور دولت کم سے کم خرچ کی جائے۔ اس کا اعلیٰ تدبر ہمیشہ ایسی تدبیروں میں صرف ہوتا رہا جن سے اغراض پوری ہوں اور بدنامی قطعاً نہ ہو۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک کی قوموں اور نسلوں میں اختلاف وتفرقہ فطری امر ہے۔ ایسے موقع پر محبانِ وطن[۳۰۹] کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مختلف قوموں کے مزاج کو اس طرح اعتدال پر رکھا جائے کہ فرقہ واریت کا مرض اُبھرنے نہ پائے لیکن انگریزوں کی کوشش یہ تھی کہ فرقہ داریت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جائے۔ بابر نے ہمایوں کو وصیت کی تھی۔ جس طرح انسان کے جسم میں چار عناصر مل جل کر کام کر رہے ہیں اسی طرح ہندوستان کی مختلف المذاہب رعایا کو ملا جلا رکھو اور اُن میں اتحاد عمل پیدا کرو تا کہ جسم سلطنت مختلف امراض سے محفوظ و مامون رہے۔[۳۱۰]

اور انگریزی دور کے حکمرانوں کا نظریہ یہ تھا:

"ہندوستان میں ہماری حکومت کے ہر صیغہ کو خواہ وہ خارجی تعلقات سے واسطہ رکھتا ہو یا عدالتی اور حربی نظم ونسق سے، یہ اصول ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے کہ تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو"۔[۳۱۱]

اس تحریک کے بارہ میں انگریزوں کا جو رویہ رہا، وہ ڈپلومیسی اور شاطرانہ تدبر کی بہترین مثال ہے۔

جب تک اس تحریک کا تعلق انگریزی مقبوضات سے صرف اتنا رہا کہ رنگروٹ بھرتی کیے جائیں اور سرمایہ فراہم کیا جائے، تو انگریزی حکومت کے ذمہ داروں نے اس کی طرف کوئی التفات نہ کیا بلکہ بعض انگریزوں نے اس کی حمایت کی۔ چنانچہ سید صاحب کے قافلہ کی دعوت کرنیوالوں میں جہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کے نام ہیں وہاں ایک انگریز کا نام بھی ہے جس نے پورے قافلہ کے لیے کشتیوں پر کھانا پہنچایا تھا۔ جب حج کو جاتے ہوئے قافلہ قصبہ ڈلمئو سے الہ آباد کی طرف گنگا کے راستہ سفر کر رہا تھا کلکتہ میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے وعظ میں جہاں ہندو مسلمانوں کا اجتماع ہوتا تھا صاحبانِ انگریز اور اُن کی میم صاحبان بھی شریک ہوتی تھیں[۳۱۲] بلکہ منشی محمد جعفر صاحب تھانیسری مصنف سوانح احمدی کا بیان تو یہ ہے۔

جہاد پر جانے سے قبل سید صاحب نے براہ دور اندیشی شیخ غلام علی صاحب رئیس الہ آباد کی معرفت نواب لفٹننٹ گورنر بہادر اضلاع شمالی و مغربی کو بھی اس تیاری جہاد کی اطلاع دے دی تھی، جس کے جواب میں صاحب ممدوح نے تحریر فرمایا کہ جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو، ہم ایسی تیاری کے مانع نہیں۔ (۳۴۳)

ڈاکٹر ہنٹر اس سے بھی آگے یہاں تک فرماتے ہیں:

ایک انگریز تاجر نے جو شمال مغربی صوبہ میں تیل کی بہت بڑی تجارت کرتا تھا، مجھے بتایا کہ اس کے بہت سے دین دار مسلمان ملازمین کا یہ عام قاعدہ تھا کہ وہ اپنی تنخواہ کا معین حصہ "ستیانہ کیمپ" کے لیے علیحدہ کر دیا کرتے تھے اور جو اُن میں زیادہ جوشیلے اور بہادر تھے وہ کسی نہ کسی مدت کے لیے متعصب امام کے ماتحت خدمات انجام دینے کے لیے چلے جاتے تھے۔ جس طرح کبھی کبھی اس کے ہندو ملازم اپنے باپ کی برسی منانے کے لیے ہر سال چھٹی کی درخواست کرتے تھے اسی طرح اس کے مسلمان ملازم جو تیل کی تجارتی کوٹھی میں کام کرتے تھے ۱۸۳۰ء اور ۱۸۴۶ء کے درمیان اس عذر کی بنا پر ایک یا دو مہینے کی چھٹی کی درخواست کرنے کے عادی تھے کہ انہیں اپنے مذہبی فریضہ کی ادائیگی کے لیے ہلالی فوج میں بھرتی ہونا تھا۔ (۳۴۴)

ہندوستان کے مشہور مسلمان رہنما سر سید احمد خاں صاحب مرحوم جن کا مشہور اور نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے اُن تلخیوں کو دور کیا جو مسلمانوں اور انگریزوں میں ابتداء سے چلی آ رہی تھیں اور نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو وفادار ثابت کرنے کی کوشش کی۔ بلکہ مسلم اکثریت کی باغیانہ ذہنیت کو وفادار بنا دیا۔ ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

اس زمانہ میں علی العموم مسلمان لوگ عوام کو سکھوں پر جہاد کرنے کی ہدایت کرتے تھے۔ ہزاروں مسلح مسلمان اور بے شمار سامان جنگ کا ذخیرہ سکھوں پر جہاد کرنے کے واسطے جمع ہو گیا۔ مگر جب صاحب کمشنر اور صاحب مجسٹریٹ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے گورنمنٹ کو اطلاع دی۔ گورنمنٹ نے صاف لکھا کہ تم کو دست اندازی نہ کرنی چاہیے۔ دہلی کے ایک مہاجن نے جہادیوں کا روپیہ غبن کیا تو ولیم فریزر کمشنر دہلی نے ڈگری دی، جو وصول ہو کر سرحد بھیجی گئی۔ (۳۴۵)

اب سوال یہ ہے کہ انگریزوں نے یہ رویہ کیوں اختیار کیا۔ اس سوال کے متعلق ڈاکٹر ہنٹر کا خیال تو یہ ہے کہ:

۱۸۲۲ء تک سید احمد صاحب کی تبلیغ کی طرف انگریزی حکام نے کوئی توجہ نہ کی۔ انہوں نے اپنے جاں نثار مریدوں کی ہمراہی میں ہمارے صوبجات کا دورہ کیا اور ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو مرید بنایا۔ اور ایک باقاعدہ گدی، مذہبی ٹیکس اور ملکی حکومت کی قائم کر دی۔ اس اثناء میں ہمارے افسر، اپنے ارد گرد کی بہت بڑی مذہبی تحریک سے بے خبر ہو کر صرف مالیہ جمع کرنے۔ انصاف کے لیے عدالتیں قائم کرنے اور فوجوں کو پریڈ کرانے میں ہی مصروف رہے۔ ۱۸۳۱ء میں اپنی اس بے

خبری سے بُری طرح جھنجوڑے گئے۔ (۳۶)

دوسرے موقع پر وہابی موومنٹ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس تحریک کے نمایاں پہلو تین ہیں۔

(۱) تنظیم کی اعلیٰ قابلیت، (۲) رازداری، (۳) وفاداری۔

بہر حال ڈاکٹر ہنٹر صاحب انگریزوں کے اس رویہ کی وجہ غفلت، لاپروائی، ناواقفیت اور تحریک کی غیر معمولی رازداری قرار دیتے ہیں۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ نادانی اور لاپروائی یا غفلت کی وجہ سے یہ رویہ نہیں اختیار کیا گیا تھا بلکہ سوچی سمجھی پالیسی کی بناء پر یہ رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ کیونکہ اس طرح:

(۱) ایک مخالف عنصر انگریزی مقبوضات سے خارج ہو رہا تھا۔

(۲) اس نے جو مرکز تجویز کیا تھا وہ انگریزی مقبوضات سے بہت دور تھا۔

(۳) یہ ممکن تھا کہ میر جعفر اور میر صادق پیدا کر دیئے جائیں جو اس طاقت کو اصل مرکز میں رہتے ہوئے مفلوج کر دیں۔

(۴) یہ بھی ممکن تھا کہ زمان شاہ کی طرح سید صاحب کی طاقت بھی اندرونی بغاوت سے ختم کر دی جائے۔

(۵) انگریزی مقبوضات تک پہنچنے کے راستے میں سکھ حکومت حائل تھی، اور جس طرح روہیلوں کو شجاع الدولہ کے ذریعہ اور سلطان ٹیپو کو نظام حیدر آباد اور مرہٹوں کی امداد سے شکست دی گئی تھی، اس طاقت کو بھی سکھوں کے ذریعہ ختم کر دینا ممکن تھا۔

پس جب اتنے امکانات موجود تھے تو یہ نادانی اور ناعاقبت اندیشی نہیں، بلکہ عین تدبر تھا کہ اپنے مقبوضات میں اس تحریک کی طرف قطعاً التفات نہ کیا جائے، تاکہ رواداری اور فراخ حوصلگی کی نمائش بھی ہو جائے، ملک میں بدامنی بھی نہ پھیلے اور غیر معمولی طاقت صرف کئے بغیر دشمن کا خاتمہ ہو جائے۔

چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ انگریزی ڈپلومیسی نے وہابیت کا الزام تراش کر وہ نقصان پہنچایا کہ نہ سکھوں کی ٹڈی دل فوج وہ نقصان پہنچا سکی اور نہ یار محمد خاں وغیرہ پٹھانوں کی مسلح طاقت یہ کام کر سکی تھی جو اس پراپیگنڈے نے کیا کہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں سید صاحب کے غازیوں کے بڑے حصہ کو ایک ہی رات میں ذبح کرا دیا۔ وہابیت کی حقیقت سے نہ مہاراجہ رنجیت سنگھ واقف تھے جن کی حکومت مغربی پنجاب اور سندھ کے چند اضلاع تک محدود تھی، نہ یار محمد خاں میں یہ شعور تھا بلکہ وہابیت اور لفظ وہابی کے نفرت انگیز اثرات سے واقفیت صرف انگریزوں ہی کو تھی جن کے کچھ تجارتی جہازوں کو ۱۸۰۹ء میں وہابیوں نے خلیج فارس سے گذرتے ہوئے لوٹ لیا تھا۔ پھر انگریزوں ہی کو اندازہ تھا کہ وہابیوں کی طرف سے مشرق وسطیٰ، افریقہ اور ایران میں کتنی نفرت پھیلی ہوئی ہے۔

جنگی اقدامات اور اُن کے نتائج

سید صاحب کا پہلا حملہ ۲۰ر جمادی[۳۱۷] الاولیٰ ۱۲۴۲ھ، ۲۱ر[۳۱۸] دسمبر ۱۸۲۶ء کو ہوا۔ اس میں ۳۷ مہاجر[۳۱۹] شہید اور ۳۵ زخمی ہوئے۔ نتیجہ کے لحاظ سے یہ حملہ کامیاب رہا۔ کیونکہ مخالف، مجاہدین کی قوت اور اُن کی بہادری اور چابک دستی سے مرعوب ہوا، اور قرب وجوار کے خوانین بھی متاثر ہوئے۔ چنانچہ قلعہ ہنڈ کا رئیس "خادی خاں" پوری عقیدت مندی سے حاضر ہوا۔ مجاہدین میں اپنا نام لکھوایا اور سید صاحب اور تمام رفقاء کو اپنے قلعہ "ہنڈ" میں لے گیا۔ بہت کافی خاطر مدارات اور تعظیم وتکریم کی۔ خادی خاں کا اصرار تھا کہ حضرت سید صاحب قلعہ ہنڈ کو ہی اپنا مرکز بنائیں۔ مگر سید صاحب نے معذرت کردی اور چند روز بعد اپنے کیمپ میں تشریف لے آئے۔

اس کے بعد جھڑپیں ہوتی رہیں جن میں اکثر وبیشتر مہاجرین کو کامیابی ہوتی رہی۔ علاقہ کے پٹھان بھی آپ کے حلقہ میں شامل ہوتے رہے یہاں تک کہ ۱۲ر جمادی الاخریٰ ۱۲۴۲ھ ۱۰ر جنوری ۱۸۲۷ء کو جب آپ نے باضابطہ امارت وحکومت کا اعلان کیا تو سوات، سمہ، بنیر کے خوانین (جو بقول حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب[۳۲۰] فوج ولشکر اور توپ وشاہین کے مالک تھے) بیعت کرنے والوں میں شامل تھے۔

یار محمد خاں جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے پشاور کا گورنر تھا، اس کے بھائی سلطان محمد خاں اور پیر محمد خاں وغیرہ عمائدین پشاور نے بھی بذریعہ خط آپ کی امارت تسلیم کرلی۔

سکھ حکومت کی طرف پیش کش کی گئی کہ دریائے اباسین سے اُس پار کا علاقہ مہاراجہ کی طرف سے انعام تصور کریں اور آئندہ اقدام کا قصد نہ کریں۔[۳۲۱] مگر سید صاحب، نہ ملک کے خواہاں تھے نہ حکومت وامارت کے متمنی۔ جس بلند مقصد کے لیے آپ نے زندگی وقف کررکھی تھی، ایسے انعامات اُس کے لیے توہین تھے۔ آپ نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ تو مہاراجہ کی طرف سے باقاعدہ حملہ کا انتظام کیا گیا۔

شیدو کا میدان رزمگاہ تھا۔ سکھوں کا لشکر جرار پورے ساز وسامان کے ساتھ وہاں پہنچ گیا، اور سید صاحب کے لشکر بھی مقابلہ میں خیمہ زن ہوگئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر سید صاحب کے زیر علم تقریباً ایک لاکھ کا مجمع تھا۔ لیکن یہ بھاری جمعیت کھوکھلی تھی۔ کیونکہ:

(۱) اس مجمع میں وہ بھی تھے جن کے پندار وغرور کو محکمہ احتساب کی مساوات پسندی سے ٹھیس پہنچی تھی۔ محکمہ احتساب جو اعمال واخلاق کا نگران تھا، چھوٹے بڑے، امیر وغریب، خان اور غیر خان کی تمیز نہ اس کو کرنی چاہیے تھی، نہ اس نے کی تھی۔ یہ یکسانیت اُن کو ناگوار تھی جن کے دماغوں میں ذاتی برتری کا غرور بھرا ہوا تھا۔

(۲) خادی خاں جس نے بڑی عقیدت مندی کا اظہار کیا تھا، وہ بھی محکمہ عدلیہ کے شکنجہ میں کسا جاچکا تھا کیونکہ

موضع ماہیری کے قضیہ میں خادی خاں کے تہوک کے خلاف دوسرے فریق کو ڈگری دی گئی تھی اور اُس کا اجراء بھی کر دیا گیا تھا۔

(۳) سرداران پشاور جو اس مجمع میں شامل تھے، اگرچہ سید صاحب کی امارت تسلیم کر چکے تھے مگر وہ رنجیت سنگھ کے زیر اثر تھے اور اپنے شاہ پرست مزاج کے باعث اُن کے جذبات اور رجحانات رنجیت سنگھ کے ہی ہمنوا اور ہمدرد تھے۔

اس اندرونی کمزوری کا نتیجہ تھا کہ خاص اُس شب میں جس کی صبح کو فیصلہ کن جنگ ہونے والی تھی، سید صاحب کو زہر دے دیا گیا۔ صبح کو مولانا محمد اسمٰعیل صاحب خیمہ میں گئے تو سید صاحب کی حالت غیر تھی بے ہوشی کا غلبہ تھا اور قے برابر جاری تھی۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا، اس خبر کو بالکل مخفی رکھا۔ خود سید صاحب نے بھی اپنے مرض کو چھپانے کی کوشش کی اور اسی حالت میں ہاتھی پر سوار ہو کر میدان جنگ میں پہنچ گئے۔

میدان کارزار گرم تھا۔ مجاہدین کا پلہ بھاری تھا کہ سرداران پشاور اور خالصہ فوج کے کمانڈر میں کچھ نامہ و پیام ہوا، اور فوراً ہی سرداران پشاور اپنی فوج اور سامان جنگ لے کر میدان سے علیٰحدہ ہو گئے۔ اب جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ سرداران سمہ اور ان کی فوج کے دل ٹوٹ گئے پاؤں اکھڑ گئے۔ اب لڑائی کا سارا زور ہندوستانی مجاہدین پر آ پڑا۔ ہندوستانی مجاہدین دل توڑ کر لڑے مگر وہ اس طرح گھر گئے تھے کہ فتح کا امکان ختم ہو گیا تھا۔ باقی ماندہ طاقت کو اس گھیرے سے نکال لینا ہی کامیابی تھی۔ چنانچہ حلقہ توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اب دوسری سازش منکشف ہوئی کہ یار محمد خاں کا پیش کردہ ہاتھی جس پر سید صاحب سوار ہیں، لنگڑا ہے۔ فوراً آپ کو گھوڑے پر سوار کیا گیا اور میدان سے نکال کر ایک گاؤں میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں ایک ہفتہ کے بعد سید صاحب کو صحت نصیب ہوئی۔

بہر حال اس جنگ کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ مجاہدین کو شکست اُٹھانی پڑی، بلکہ یہ حقیقت بھی منکشف ہو گئی کہ شاہ پرستوں کا مذہب کچھ بھی ہو، اُن کا محاذ ایک ہی ہے، اور یار محمد خاں اور خادی خاں بھی وہی کر سکتے ہیں جو شیر سنگھ (ولی عہد) اور بدھ سنگھ (کمانڈر) کے رجحانات اور جذبات ہیں۔

اس کے بعد دو بار لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس مرتبہ سرداران پشاور پیش پیش تھے اور سکھ فوج اور اُس کے سردار اُن کی پشت پر۔ لیکن ان متحدہ طاقتوں کے مقابلہ میں فتح اور کامیابی سید صاحب کے قدم چومتی رہی۔

انتہا یہ کہ ۱۰ ارصفر ۱۲۴۵ھ (۱۱ اگست ۱۸۲۹ء) کو قلعہ ہنڈ پر حملہ کیا گیا۔ خادی خاں مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا۔ قلعہ مجاہدین کے قبضہ میں آ گیا۔ خادی خاں کے بھائی امیر خاں نے اپنے بھائی کے انتقام کے لیے یار محمد خاں سے مدد چاہی۔ یار محمد خاں نے مدد کے لیے ہنڈ کی طرف فوج کشی کی۔ ۱۵ ربیع الاول ۱۲۴۵ھ، ۱۴ ستمبر ۱۸۲۹ء کو مقام زیدہ میں لشکر مجاہدین سے مقابلہ ہوا۔ یار محمد خاں مقتول ہوا۔ اس کی فوج فرار ہو گئی۔ پھر امیر خاں برادر

خاوی خاں کا بھی انتقال ہو گیا۔

لشکر مجاہدین آگے بڑھا اور اواخر نومبر ۱۸۲۹ء میں بلا کسی مزاحمت کے ''پشاور'' میں داخل ہو گیا۔ اہل شہر نے پر جوش خیر مقدم کیا۔ سید صاحب نے شہر میں داخل ہوتے ہی امن کا اعلان کر دیا۔ دوکانیں کھل گئیں۔ باشندگان شہر پوری طرح مطمئن ہو گئے۔ البتہ بازاری عورتیں روپوش ہو گئیں۔ قحبہ خانے بند اور شراب کی بھٹیاں سرد پڑ گئیں۔ اعمال و اخلاق پر احتساب جاری کیا گیا اور مقدمات کے فیصلہ کے لیے عدالت قائم کر دی گئی۔ یار محمد خاں کے بھائی سلطان محمد خاں نے جب دیکھا کہ پاسہ پلٹ چکا ہے تو ''ارباب فیض اللہ خاں'' اور دوسرے باثر خوانین کو بیچ میں ڈال کر سید صاحب سے عفو تقصیر اور حکومتِ پشاور کی درخواست۔ سید صاحب کے چند زیرک ساتھیوں نے درخواست کی مخالفت کی۔ مگر سید صاحب اور آپ کے رفقاء پر ایشیائی فطرت کا غلبہ تھا ع

در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست

علاوہ ازیں ارشادِ خداوندی ہے وان جنحوا للسلم فاجنح لہا وتوکل علی اللہ. جب غیر مسلموں کے لیے یہ حکم ہے تو مسلمان تو اس سیر چشمی کا بہت زیادہ مستحق ہے۔ چنانچہ سلطان محمد خاں کو حاکم (نائب) مقرر کیا گیا۔ مولانا سید مظہر علی صاحب عظیم آبادی کو محکمہ انصاف کا جج بنا دیا گیا۔ ان انتظامات کے بعد سید صاحب اور آپ کا لشکر پشاور سے واپس ہو کر پنج تار کیمپ میں اقامت گزیں ہوا۔

فتح پشاور کے اثرات

(۱) فتح پشاور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت کے لیے ناقابلِ برداشت حادثہ تھا۔

(۲) انگریز جو شاہ زمان کے زمانہ (۱۷۹۹ء) سے ایران اور کابل کی سیاست میں دخیل ہو چکے تھے، ۱۸۰۸ء (لارڈ منٹو کے زمانہ) میں مسٹر الفنسٹن کی زیر سرکردگی انگریزی سفارت باضابطہ کابل سے تعلق قائم کر چکی تھی، اُن کے لیے بھی یہ حادثہ رنجیت سنگھ کی نسبت کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ کیونکہ اگر مہاراجہ رنجیت سنگھ کو پڑوسی ہونے کی وجہ سے خطرہ تھا تو انگریزوں کو پریشانی یہ تھی کہ فاتح پشاور سے عقیدت رکھنے والوں کا جال پورے شمالی ہند اور بنگال میں پھیلا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ ایک طرف شمال مغرب میں سید صاحب کی حکومت پشاور میں قائم ہوئی اور دوسری جانب شمال مشرق میں سید صاحب کے معتقدِ خاص نثار علی نے بنگال میں تحریک شروع کر دی جس نے چند ماہ بعد ایک منظم بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔

(۳) ان دو عظیم الشان طاقتوں کے علاوہ سلطان محمد جس کو پشاور کی حکومت سپرد کی گئی تھی، شاہ پرستی میں اپنے مقتول بھائی سے کم نہیں تھا۔ اس نے سید صاحب سے خوشامد کر کے حکومت حاصل کی اور رنجیت سنگھ سے کامل وفاداری اور اطاعت ظاہر کرنے کے لیے ''لیلیٰ'' نام کی بیش قیمت گھوڑی جو ایک عرصہ سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی منظورِ نظر تھی، اور بار بار کی فرمائشوں کے باوجود نہیں پیش کی تھی، سلطان محمد خاں نے از خود

پیش کردی۔ مزید برآں مالا ء مروارید بھی نذر کیا۔ (۳۴۲)

سکھ حکومت کے دستور کے مطابق گھوڑی پیش کرنا، اطاعت اور وفاداری کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ منظور نظر اور پسندیدہ گھوڑی اور اس کے ساتھ مالاء مروارید کی پیشکش تو وفاداری اور خوشامد کی انتہا تھی۔

اب ان تمام سامراج پرست طاقتوں کے گٹھ جوڑ سے ایک چلتا ہوا لفظ "وہابی" (۳۴۳) استعمال کیا گیا جو مسلمانوں میں نفرت پھیلانے کے لیے جادو کا اثر رکھتا تھا۔ سرحدی پٹھانوں میں غیر اسلامی رسومات کے خلاف سید صاحب کی سرگرم اصلاحی جدوجہد اس الزام کی دلیل تھی، اور پھر منظم سازش کے ذریعہ تمام علاقہ کو پوری رازداری کے ساتھ سید صاحب اور آپ کے ساتھیوں کے خلاف بھڑکا دیا گیا۔

جب مسلمان، سکھ، عیسائی (سب مل کر بین الاقوامی اتحاد کے ساتھ) فتوے صادر کریں تو بیچارے سید صاحب اور اُن کے مٹھی بھر ساتھیوں کی حقیقت ہی کیا تھی۔

مجاہدین کا قتل عام

سلطان محمد خاں نے پہلا وار قاضی مظہر علی صاحب پر کیا اور سر دربار اس الزام میں قتل کر دیا کہ اس کا بھائی یار محمد خاں قاضی صاحب کے ہاتھ سے قتل ہوا تھا۔

سلطان محمد خاں کے محسن ارباب فیض اللہ خاں مہمند نے (جن کی کوششوں سے قصور کی معافی اور پشاور کی حکومت ملی تھی) قاضی صاحب کے قتل کے خلاف احتجاج کیا تو اُن کو بھی یہی خونین انعام عطا ہوا۔

پھر سید صاحب کی حکومت کے سینکڑوں (۳۴۴) کارکنوں کو (عشر وصول کرنے والوں کو) جو علاقہ سمہ میں پھیلے ہوئے تھے، ایک ہی شب میں مقامی لوگوں نے ذبح کر دیا۔

شام کے وقت ان کارکنان حکومت نے دیکھا تھا کہ آبادیوں میں شور وغل ہے، ڈھول بجائے جا رہے ہیں اور اونچے مکانات اور پہاڑیوں پر آگ جلائی جا رہی ہے۔ ان لوگوں نے دریافت کیا تو بتایا گیا کہ پٹھانوں نے طے کیا ہے کہ رات کو خندروس کوٹ لیں تاکہ صبح ہی اسلامی حکومت کا ٹیکس ادا کر دیں۔ یہ ہندوستانی مجاہد پٹھانوں کی راہ و رسم اور ان کی اصطلاحات سے ناواقف تھے۔ یہ یہی سمجھتے تھے کہ "خندروس" جوار کو کہتے ہیں مگر جب رات کے وقت خنجر آبدار نے اُن کی شہ رگ کو بوسہ دیا، تب واضح ہوا کہ خندروس کوٹنے کا مطلب کیا تھا۔

سید صاحب کا تاثر اور تبدیلی مرکز

برسوں کی جانفشانی کے بعد جو چھوٹا سا باغ تیار ہوا تھا، برق خرمن سوز سے اس کی یہ بربادی نہ صرف سید صاحب کی زندگی بلکہ تاریخ انسانیت کا ایک وحشت انگیز اور دردناک حادثہ تھا۔ ملوکانہ انداز میں اس کا جواب یہ تھا کہ علاقہ سمہ کے حریف پٹھانوں اور باقی ماندہ ہندوستانی مجاہدین کی جمعیت سے پشاور اور پورے علاقہ سمہ پر حملہ کیا جاتا اور اینٹ سے اینٹ بجا دی جاتی۔ مگر سید صاحب کو شہید ہونے والے ساتھیوں سے زیادہ اپنے

نصب العین سے محبت تھی۔ جس کے لیے آپ اپنی زندگی وقف کیے ہوئے تھے اور شہید ہونے والوں نے بھی اپنی زندگیاں اسی کے لیے قربان کی تھیں۔ آپ نے خانہ جنگی کو کسی طرح پسند نہیں کیا۔ پنجتار وغیرہ دوسرے علاقے کے پٹھانوں نے سید صاحب کو انتقام پر آمادہ کرنا بھی چاہا۔ مگر سید صاحب آمادہ نہیں ہوئے اور آپ نے اب یہی بہتر سمجھا کہ کوئی دوسرا مرکز قائم کر کے اپنا کام شروع کیا جائے۔

رازدانوں نے بتایا ہے کہ سید صاحب کا ارادہ یہ تھا کہ سندھ کو اپنا مرکز بنائیں گے بہر حال فتح پشاور سے تقریباً سولہ ۱۶ ماہ بعد اور عارضی حکومت قائم ہونے سے چار سال چار ماہ بعد رجب ۱۲۴۶ھ میں آپ نے اس علاقہ سے کوچ کیا۔ توپوں کو ایک محفوظ جگہ دفن کیا اور بہت سا جنگی اور استعمالی سامان دینی لوگوں کے سپرد کر دیا۔ ساتھیوں کو عام اجازت دے دی کہ جو شخص واپس جانا چاہے وہ واپس چلا جائے۔ مگر سید صاحب کا ساتھ چھوڑنا کسی نے پسند نہ کیا۔

خالصہ فوج نے ایک طرف تو سید صاحب کے ہٹتے ہی پشاور اور علاقہ سمہ پر قبضہ کرلیا اور دوسری طرف خالصہ فوجیں سید صاحب کا راستہ روکنے لگیں مگر ان کو پے در پے شکست ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ مجاہدین کا لشکر بالاکوٹ پہنچ گیا۔

برف باری نے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی۔ یہیں ایک محفوظ میدان منتخب کیا گیا اور جھونپڑیاں ڈال دی گئیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا ولی عہد شیر سنگھ بھی اس علاقہ میں پہنچا ہوا تھا۔ چند میل کے فاصلہ پر اس کی تقریباً بیس ہزار فوج ڈیرے ڈالے ہوئے تھی۔ مگر سید صاحب کا لشکرگاہ پہاڑیوں کے بیچ میں ایسے مقام پر تھا جہاں غنیم کا پہنچنا ناممکن تھا۔

مئی کا مہینہ آیا۔ برف باری بند اور لشکروں میں حرکت شروع ہوئی۔ شیر سنگھ نے حملہ کرنا چاہا، مگر فوج کے گذارنے کا کوئی راستہ نہیں ملا۔ وہ مجبور ہو کر واپس ہونے والا تھا کہ کچھ غداروں نے ایک نہایت مخفی راستہ کا پتہ بتا دیا۔ شیر سنگھ یا خالصہ فوج کے لیے نہیں بلکہ سامراج کے لیے فتح و کامرانی کا نشان مل گیا۔ ابھی سید صاحب اور آپ کے ساتھیوں کو خبر بھی نہ ہونے پائی تھی کہ راستہ کی چوکی کے محافظ دستہ کو جام شہادت نوش کراتے ہوئے خالصہ کی ٹڈی دل فوج مجاہدوں کے سر پر پہنچ گئی۔ صرف ایک دلدل بیچ میں تھی جو دست بدست جنگ کے لیے آڑ تھی۔ مگر سید صاحب کی ہمت مردانہ نے آڑ کو پھاندا، مولانا اسمٰعیل صاحب شہید اور دوسرے جانباز ساتھی بھی گھوڑے پھاند کر لشکر غنیم میں گھس گئے اور دست بدست جنگ شروع کر دی۔ لیکن غنیم کا لشکر اتنا زیادہ تھا کہ نہ ہمت مردانہ کام آسکی اور نہ اپنی فوج پر کنٹرول باقی رہ سکا۔

سید صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب اور سینکڑوں ساتھی شہید ہوئے۔ جو باقی رہے وہ ایسے منتشر ہوئے کہ شہیدوں کی تجہیز و تکفین بھی نہ کر سکے۔

مگر شیر سنگھ نے ان شہیدوں کا پورا احترام کیا۔ سید صاحب کی نعش کو قیمتی دوشالہ اوڑھایا گیا۔ سکھ فوج کے

مسلمان سپاہیوں نے نماز جنازہ ادا کی۔ پھر فوجی اعزاز کے ساتھ آپ کو سپردِ خاک کیا گیا۔[۳۱۵]
تاریخ حریت کا یہ دہشت ناک حادثہ ۲۴؍ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ، ۷؍مئی ۱۸۳۱ء کو پیش آیا۔

شہادت کے بعد

حضرت مولانا عبدالحی صاحب کی وفات کے بعد سید احمد صاحب اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی شہادت سے تحریک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا مگر بقول ڈاکٹر ہنٹر:

"یہ تحریک کسی رہنما کی موت وحیات سے بالکل مستغنی ہو گئی تھی۔ خود سید صاحب کی وفات کو بھی اُن کے پُر جوش حامیوں نے اپنے مذہب کی اشاعت کے لیے ایک مقدس ذریعہ بنالیا تھا"۔[۳۲۶]

چنانچہ سید صاحب کے اہل خانہ اور کچھ مجاہدین تو نواب وزیر الدولہ (والی ریاست ٹونک) کی دعوت پر ٹونک تشریف لے آئے۔ جہاں انہوں نے باقی زندگی پوری خاموشی اور اپنے پروردگار کی عبادت میں گذاری۔ لیکن باقی مجاہدین پھر جمع ہوئے۔ اپنا نظم دوبارہ قائم کیا۔ "ستیانہ" کے سرحدی علاقہ کو اپنا مرکز بنایا اور سید صاحب کے بھانجے مولانا نصیر الدین صاحب کو امام اور امیر (لیڈر) منتخب کر کے اپنی پُرانی تحریک میں نئی رُوح پھونک دی۔[۳۲۷] خالصہ حکومت تو چند سال بعد صفحۂ ہستی سے ناپید ہو گئی۔ مگر اُس کے جانشین (انگریزوں) کے لیے یہ تحریک تقریباً نصف صدی تک وبالِ جان بنی رہی۔ تفصیلات انشاء اللہ تیسری جلد میں پیش کی جائیں گی۔

مشرقی محاذ

نثار علی عرف ٹیٹو میاں کی بغاوت

یہ مغربی محاذ کا قصہ تھا جو گذشتہ اوراق میں پیش کیا گیا۔ جس کی قیادت خود سید صاحب کر رہے تھے۔ مگر بنگال کا وہ علاقہ جہاں حضرت سید صاحب حج کو جاتے ہوئے اور حج سے واپسی پر دو ماہ قیام کر کے جذبات حریت کی تخم ریزی کر چکے تھے اس عرصہ میں سونا نہیں رہا۔ آپ کی تخم ریزی بارآور ہوئی۔ چنانچہ اس طرف شمال مغربی سرحد پر سید صاحب کی پیش قدمی شروع ہوئی تو ہندوستان کے دوسرے کنارہ پر نثار علی عرف ٹیٹو میاں نے ضلع کلکتہ کے شمال اور مشرق کی طرف دورہ شروع کر دیا، اور خاص اس زمانہ میں کہ سید صاحب نے پشاور فتح کیا، نثار علی صاحب نے بنگال میں علم جہاد بلند کر دیا۔ نثار علی صاحب اور اُن کے دستِ راست مسکین شاہ صاحب کئی ماہ تک کامیاب جہاد کرتے رہے۔ علاقہ کے تمام ہندو مسلمان کاشتکار اُن کے ساتھ ہو گئے۔ ضلع فرید پور میں انہوں نے اپنی حکومت بھی قائم کر لی۔ مگر نومبر ۱۸۳۱ء کے آخر میں انگریزی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے نثار علی شہید ہو گئے۔ مسکین شاہ گرفتار کر لیے گئے۔ جن کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا، اور باقی طاقت اس وقت منتشر ہو گئی۔

بدقسمتی یہ ہوئی کہ زمیندار طبقہ بالخصوص ہندو زمینداروں نے ساتھ نہیں دیا۔ انتہا یہ کہ ایک زمیندار نے تو

ایسے لوگوں پر ایک نیا ٹیکس لگا دیا جس کا تعلق سید صاحب سے تھا۔ اس سے بھی زیادہ اشتعال انگیز شکل یہ تھی کہ وہ اس کو "داڑھی کا ٹیکس" کہہ کر وصول کرتا تھا۔ (۳۲۸) اس سے انگریزوں کو موقع مل گیا کہ اپنی معصومیت ظاہر کرتے ہوئے یہ کہہ سکیں کہ اس بغاوت کا منشاء وہ زیادتیاں تھیں جو ہندو (۳۲۹) زمیندار کاشتکاروں پر کیا کرتے تھے۔ (۳۳۰)

جب کسی عنوان سے فرقہ واریت کا نام آیا تو ڈگر نارسی صاحب کے ساتھیوں نے کھانے کے لیے گائے ذبح کی، تو اس کے متعلق بھی یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ اس کا منشاء ہندوؤں کی توہین و تذلیل ہے۔ (۳۳۱)

بہرحال زمیندار طبقہ کی مخالفت نے انگریزوں کا کام بہت سہل کر دیا، اور مغرب میں سید صاحب کی شہادت کے ساتھ مشرق کی یہ تحریک بھی زمین دوز ہوگئی۔

لفظ وہابی کی حقیقت اور پروپیگنڈے کا مرکز

وھابی۔ یہ لفظ ہندوستانی زبان کی ڈکشنری میں انیسویں صدی ہی میں داخل کیا گیا اور اس مذہبی لفظ سے وہ عظیم الشان سیاسی مقاصد حاصل کئے گئے جو لاکھوں انسانوں کی قربانی اور کروڑوں اربوں روپیہ کے خرچ کرنے سے بھی نہیں حاصل ہو سکتے تھے۔ اس کا مطلب یہ بیان کیا گیا کہ یہ لوگ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیرو ہیں۔ محمد بن عبدالوہاب کون تھا اور اس کی پیروی کیوں جرم ہوئی۔ اس کی کسی قدر تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔

محمد بن عبدالوہاب

نجد کا ایک (۳۳۲) عالم تھا۔ اُن کے اخلاص میں شک کرنا مشکل ہے البتہ اُن کی دعوت میں شدت تھی اور اسی بناء پر جادۂ اعتدال سے کسی قدر ہٹ گئے تھے۔ نجد کا ایک امیر محمد بن سعود ان کا مرید اور اُن کی اصلاحی تحریک میں اُن کا ہمنوا بلکہ دستِ راست بن گیا۔

نجد کا غیر متمدن صوبہ طوائف الملوکی کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ایک ایک قصبہ کا علیحدہ حکمران تھا اور بعض قصبوں میں دو دو امیر تھے۔ علامہ محمد بن عبدالوہاب جو ہمہ گیر دعوتِ اصلاح لے کر اٹھے تھے، اُن کی کامیابی کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی شیرازہ بندی ہو۔ اور ایک با اختیار حکمران پورے ملک پر احتساب اور کنٹرول کر سکے۔ اس جذبہ نے اس اصلاحی تحریک میں سیاسی بحران بھی پیدا کر دیا۔

محمد بن سعود "درعیہ" کا امیر تھا جو نجد کے جنوبی حصہ کا چھوٹا سا قصبہ تھا۔ دعوت و اصلاح کے جذبہ نے اس کی حوصلہ مند فطرت میں نئی اُمنگ پیدا کی اور اب اس کی نگاہیں آس پاس کی ریاستوں پر پڑنے لگیں۔

شیخ کے مریدوں اور معتقدوں کی بیشتر جماعت اس کے جھنڈے تلے اکٹھی ہوگئی۔ جس سے امیر ابن سعود کی قوت اپنے ہمسایہ رئیسوں میں سب سے زیادہ ہوگئی۔ اقتدار کی باگ ڈور ابن سعود کے ہاتھ میں تھی مگر رہنمائی

کی مقدس حیثیت شیخ کو حاصل تھی۔ اتحاد فکر و اتحاد عمل کی برکتیں بہت جلد ظاہر ہونے لگیں۔ آس پاس کی تمام ریاستیں مسلک و سیاست دونوں لحاظ سے "درعیہ" کے زیر نگیں ہو گئیں۔ انتہا یہ کہ ۱۱۵۹ھ، ۱۷۴۶ء میں نجد کے مرکزی شہر ریاض میں متبعین شیخ کا فاتحانہ داخلہ ہوا، اور شاہی محل پر ابن سعود کا جھنڈا لہرانے لگا۔ اب غیر متمدن نجد کی طاقت یہاں تک بڑھ گئی کہ متمدن ترکی کے صوبوں پر بھی اس کے حملے ہونے لگے۔

حجاز کا مقدس صوبہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی وجہ سے جس طرح تمام دنیائے اسلام کا روحانی مرکز ہے، یہ بھی اس کو روحانی مرکز سمجھتے تھے۔ پڑوسی صوبہ ہونے کے علاوہ اس کی روحانی مرکزیت بھی ایک وجہ تھی جس نے مطوعین (۴۴۴) (مبلغین) کو اپنی طرف متوجہ کیا لیکن علمائے حرم اس کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے شریف مکہ کے آستانہ حکومت پر دستک دی اور ۱۱۶۲ھ، ۱۷۴۹ء میں شریف نے نجدیوں کا داخلہ بند کر دیا۔ اب نجدی فریضہ حج کی ادائیگی سے بھی محروم ہو گئے۔

نجدی مدبرین نے حجاز کا راستہ صاف کرنے کے لیے عراق کا رخ کیا، اور عراقی قافلوں پر لوٹ مار کر کے "شریف" کی اقتصادی ناکہ بندی کر دی۔ یعنی پاسبانِ حرم پر فولادی ضرب نامناسب تھی، اس لیے سیم وزر کی ضرب لگائی گئی۔ اس تدبیر سے شریف کو اقتصادی نقصان ضرور پہنچا۔ مگر نجدیوں کا نفع بھی نقصان سے خالی نہیں رہا۔ کیونکہ اس چھیڑ چھاڑ کی بدولت عراق سے بھی جنگ ٹھن گئی۔ لیکن نوخیز نجد، اس کے لیے تیار تھا۔ اُس نے طاقت کا جواب طاقت سے دیا اور کامیاب رہا۔

محمد بن سعود کی وفات اور عبدالعزیز کی جانشینی

محمد بن سعود کا لڑکا "عبدالعزیز" باپ سے بھی زیادہ شیخ کا معتقد تھا۔ یہ شیخ کے آغوش تربیت ہی میں سن شعور کو پہنچا تھا۔ ۱۱۷۹ھ، ۱۷۶۵ء میں محمد بن سعود کی وفات کے بعد زمام اقتدار قابل و فاضل بیٹے عبدالعزیز کے سپرد ہوئی۔ یہ جس طرح ملکی فتوحات میں باپ سے زیادہ چابکدست رہا۔ ایسے ہی عقیدت شیخ میں بھی یہاں تک سرگرم رہا کہ شیخ کی ہدایت کے بغیر ایک پیسہ نہیں خرچ کرتا تھا۔ اس نے مرکز حجاز سے مصالحانہ اور نرم رویہ اختیار کیا۔ شریف مکہ کی خدمت میں ایک وفد بھیج کر اہل نجد کے لیے اجازت چاہی۔ علماء حرم سے ارکانِ وفد کی خوب خوب بحثیں ہوئیں مگر نتیجہ اہلِ نجد کے حق میں بہتر رہا اور نجدیوں کو داخلہ حجاز اور اداء حج کی اجازت مل گئی۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب کی وفات

تقریباً نوے ۹۰ سال عمر پا کر ۱۲۰۶ھ، ۱۷۹۲ء میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نے عالم آخرت کا رخ کیا۔ لیکن دعوت و تبلیغ کے پچاس ۵۰ سال میں شیخ کا مسلک حکومت آل سعود کا مسلک بن چکا تھا۔ اور اب "حکومت آل سعود" اور "مسلک ابن عبدالوہاب" ایک ہی روح کے دو نام اور ایک ہی طاقت کے دو روپ ہو گئے تھے۔ عبدالعزیز کی علمی قابلیت، بیدار مغزی اور مسلک شیخ سے والہانہ عقیدت نے مسلک شیخ کو چار چاند لگا دیے۔

لیکن وادئ حجاز میں باسی کڑھی کو پھر اُبال آیا۔ نجدیوں کی شدت پسندی نے پھر علماء کو متوجہ کیا اور شریف حجاز نے نجدیوں کے داخلہ پر دوبارہ پابندی لگادی۔ نجدی اقتصادی ناکہ بندی کا تجربہ پہلے کر چکے تھے۔ انہوں نے اسی سمجھے سمجھائے سبق کو دہرانا شروع کردیا یعنی عراقی اور ایرانی قافلوں کو پریشان کرنے لگے۔ مگر اس مرتبہ یہ چنگاریاں وسط عراق اور ایران تک پہنچ گئیں ۱۲۱۶ھ ۱۸۰۲ء میں کربلا معلیٰ، نجف اشرف اور بلد الحسین وغیرہ پر نجدیوں کی یورش ہوئی۔ ان کو خوب لوٹا کھسوٹا۔ تمام خزانے اور جواہرات فوج کے سپاہیوں پر تقسیم کردیئے۔ متبرک مزارات کی بے حرمتی کی گئی۔

نجدیوں کے جنگ جو دستے عراق سے پلٹے تو حجاز شریف کا رُخ کیا۔ ۱۲۱۷ھ، ۱۸۰۳ء کے آخری مہینوں میں عبدالعزیز کا ولی عہد، سعود بن عبدالعزیز نجدیوں کا لشکر جرار لے کر حرم مکہ کے قریب پہنچ گیا۔ شریف مکہ اگرچہ "غالب" تھا، مگر نام کا غلبہ کام نہ آسکا۔ مجبوراً مکہ معظمہ سے فرار ہو کر طائف میں محصور ہوا۔ پھر وہاں سے جدہ پہنچ کر ترکی فوج میں پناہ لی۔

۸ رمحرم ۱۲۱۸ھ، ۳۰ راپریل ۱۸۰۳ء کو ابن عبدالعزیز مکہ معظمہ میں فاتحانہ داخل ہوا۔ کعبہ مکرمہ کا تمام قیمتی سامان اور ہیرے جواہرات کا خزانہ برآمد کیا اور فوج کو تقسیم کردیا۔ قبے مسمار کیے۔ مزارات کی بے حرمتی کی۔ مگر اہل شہر کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اُن کے ساتھ طرز عمل شریفانہ رہا۔ چنانچہ دوسرے دن بازار کھل گئے اور لوگ اپنے کاروبار میں مشغول ہوگئے۔

اگلے سال ۱۲۱۹ھ ۱۸۰۴ء میں مدینہ منورہ بھی فتح کرلیا۔ یہاں بھی وہی کیا، جو مکہ معظمہ میں کیا۔ یعنی قبہ شریف کو کھولا اور تمام سامان اور نقد و جواہر اہل لشکر پر تقسیم کردیئے۔ بہت سے مزارات شہید کردیئے۔

عبدالعزیز کی وفات

مگر فتح مدینہ سے چند ماہ پہلے عبدالعزیز کی وفات ہو چکی تھی۔ ... ۱۸ ررجب ۱۲۱۸ھ، ۴ رنومبر ۱۸۰۳ء کو امیر عبدالعزیز حسب معمول مسجد میں عصر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک درویش صورت نے جو عبدالعزیز کا مہمان بھی تھا، آگے بڑھ کر خنجر کی ضرب ناگہانی سے امیر کا کام تمام کردیا۔

یہ درویش صورت ایران کا ایک شیعہ تھا جس کے کئی لڑکے ہنگامہ کربلا میں نجدیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ عبدالعزیز کے تڑپتے ہوئے لاشے نے اس کے دل کی بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کیا۔

عبدالعزیز کی شہادت کے بعد اُن کا لڑکا "سعود" مسند نشین ہوا۔ جس کے ہاتھ پر باپ کی زندگی میں بیعت لی جاچکی تھی۔

سعود اپنے باپ دادا کا صحیح جانشین تھا۔ مذہبی مسلک پر مضبوطی سے قائم رہا اور سیاسی برتری کی کامیاب جدوجہد کرتا رہا۔ اُس کا بیٹا عبداللہ تھا بحیثیت نائب جنگی مہمات اس کے سپرد ہوئیں۔ یہ پورے حجاز کو زیر نگیں کرتے ہوئے خیبر تک پہنچ گیا۔ اور دوسری جانب بحرین، عمان اور راس الخیمہ تک اپنی سلطنت وسیع کرلی۔

جذبۂ نفرت

کربلاء معلی، نجف اشرف اور بلد الحسین میں جو کچھ کیا تھا اُس نے شیعہ دنیا کو نجدیوں سے متنفر کر دیا۔ اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی کارگذاریوں نے تمام دنیاء اسلام میں محمد بن عبدالوہاب کے ماننے والوں کے خلاف غصہ اور نفرت کی آگ بھڑکا دی۔

ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ اسی زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے بھی ایک جھڑپ ہو گئی۔ وجہ یہ ہوئی کہ خلیج فارس کے باشندوں نے جو قبیلہ "جوازم" سے تعلق رکھتے تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی جہازوں پر حملہ کر دیا۔ اس علاقہ پر اب سعودی حکومت کا سکہ چل رہا تھا۔ انگریز کی نگاہیں ایران اور عراق پر جمی ہوئی تھیں۔ نوجوان نجدی حکومت اُن کو کھٹک رہی تھی۔ اس حملہ سے اُن کو بہانہ مل گیا۔ چنانچہ حکومت بمبئی نے ستمبر ۱۸۰۹ء (رمضان ۱۲۲۴ھ) میں راس الخیمہ پر سخت حملہ کر دیا، اور نجدی بیڑہ کو تباہ کیا اور نومبر ۱۸۰۹ء (شوال ۱۲۲۴ھ) تک راس الخیمہ کو جلا کر راکھ کر دیا۔

حکومت نجد اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی آویزش کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ راس الخیمہ تباہ ہو گیا بلکہ بدترین نتیجہ یہ تھا کہ ایک ایسا گروہ مقابلہ پر آ گیا جو پروپیگنڈے کا امام تھا۔ ایشیا کی توہین و تذلیل اس کا نصب العین تھا، اور جبل الطارق اور واشنگٹن سے لے کر ہانگ کانگ اور سنگاپور تک اُس کے ذرائع وسیع تھے۔

بابِ عالی اور حکومتِ نجد

جب تک معاملہ کشیدگی حجاز و نجد تک محدود رہا، باب[۲۲۳] عالی نے توجہ نہیں کی۔ لیکن جب عراق و شام اور یمن بھی نجدی سیلاب کی زد میں آنے لگے تو بابِ عالی متوجہ ہوا۔ محمد علی پاشا خدیو مصر، ترکی قلمرو میں سب سے زیادہ طاقت ور گورنر اور نائب السلطنت تھا۔ بابِ عالی نے خدیو مصر کو نجدیوں کی گوشمالی پر مامور کیا۔ محمد علی پاشا اپنے حلقہ اقتدار کی وسعت کا خود بھی خواہاں تھا۔ وہ فوراً تعمیل حکم کے لیے تیار ہو گیا۔

مصریوں کا حملہ

محمد علی پاشا نے اپنے لڑکے اور نائب "طوسون" کو دس ہزار فوج دے کر حجاز روانہ کیا۔ اواخر ۱۲۲۶ھ، ۱۸۱۱ء میں وہ ساحل پر اُترا۔ اور باسانی ینبع پر قابض ہو گیا۔ پھر مدینہ طیبہ کی طرف اُس نے نقل و حرکت شروع کی۔ ذی قعدہ ۱۲۲۷ھ، نومبر ۱۸۱۲ء میں مدینہ منورہ پر پھر تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد (محرم ۱۲۲۸ھ، جنوری ۱۸۱۳ء) میں مکہ معظمہ پر دوبارہ ترکی جھنڈا لہرا دیا گیا۔

مکہ معظمہ فتح ہونے کے بعد نجدیوں کی مزاحمت پہلے سے زیادہ سخت ہو گئی اور مصریوں کو ایک دو میدان میں شکست ہوئی تو محمد علی پاشا خود حجاز پہنچ گیا۔

سعود بن عبد العزیز کی وفات

دونوں طرف فتح و شکست کا یہ دور جاری تھا کہ ۱۱ر جمادی الاولیٰ ۱۲۲۹ھ، یکم مئی ۱۸۱۴ء کو سلطان نجد سعود بن عبد العزیز نے زندگی کی کش مکش سے نجات پائی۔ عبد اللہ پہلے سے نائب تھا، اب مالکِ سلطنت ہو گیا۔ یہ جرنیل بہتر تھا مگر حکمران بہتر نہیں تھا۔ ایسی نازک حالت میں جس تدبر اور بیدار مغزی کی ضرورت تھی، اس سے محروم تھا۔ اُس نے مقابلہ جاری رکھا اور کہیں کہیں کامیابی بھی ہوئی، مگر صورتِ حال سے گھبرا کر صلح کی پیش کش بھی کر دی، جو قبول نہیں ہوئی۔ اس عرصہ میں "طوسون" مصر واپس آ گیا۔ ایک سال بعد اُس کا انتقال ہو گیا۔ محمد علی پاشا نے اگلے سال دوسرے لڑکے ابراہیم پاشا کو اس مہم کے لیے نامزد کیا۔ وہ ۶ ذی قعدہ ۱۲۳۱ھ (۲۸ر ستمبر ۱۸۱۶ء) کو بھاری فوج لے کر ینبع پہنچا۔ نجد کی طاقت مصر کے مقابلہ میں کمزور تھی، شکست اُن کی نظروں کے سامنے تھی مگر ناکامی کے باوجود دو سال تک مزاحمت جاری رکھی۔ بالآخر ۷ر ذی قعدہ ۱۲۳۳ھ، ۸ر ستمبر ۱۸۱۸ء کو مرکزِ حکومت "درعیہ" فتح ہوا۔ سینکڑوں آدمی قتل کیے گئے۔ محمد بن عبد الوہاب کا خاندان موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ صرف وہی بچ سکے جو درعیہ میں موجود نہیں تھے۔ عبد اللہ بن سعود ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوا۔ دو روز بعد اس کو گرفتار کر کے مصر بھیج دیا گیا۔ ۱۹ر محرم ۱۲۳۴ھ کو اسکندریہ اور وہاں سے "آستانہ" بھیج دیا گیا، جہاں موت اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ ۱۷ر دسمبر ۱۸۱۸ء، ۱۸ر صفر ۱۲۳۴ھ کو وہ اور اُس کے ساتھی "ایا صوفیا" کے صحن میں پھانسی کے تختے پر لٹکا دیے گئے۔ (۳۳۵)

مکہ معظمہ، مدینہ طیبہ کے باشندے پہلے ہی سے متنفر تھے۔ اب اُن کے مرکز کے خاتمہ کے بعد سر زمین حجاز سے اُن کا نام و نشان بھی مٹا دیا گیا۔ کوئی نجدی تو در کنار نجد کا نام لینے والا بھی باقی نہ رہا۔ اور بقول ہنٹر:

> یہ عظیم الشان سلطنت جس معجزانہ طور پر منصۂ شہود پر آئی تھی اسی معجزانہ طور پر ریت کے صحرائی ٹیلوں کی طرح غائب ہو گئی۔ (۳۳۶)

بہر حال یہ بات طے ہے اور اس میں نہ اختلاف کی گنجائش ہے اور نہ کسی کو اختلاف ہے کہ ۱۸۱۸ء کے آخر میں نجدی حکومت کا قلع قمع ہو چکا تھا اور مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں نجدیوں سے اتنی بیزاری اور نفرت تھی کہ لوگ ان کا نام لینا پسند نہیں کرتے تھے۔

یہ بھی طے ہے کہ حضرت سید احمد صاحب شہید اس سے چار سال بعد حج کے لیے تشریف لے گئے۔ خود ہنٹر بھی تسلیم کرتا ہے کہ ۲۳-۱۸۲۲ء میں آپ نے یہ سفر کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ نجدیوں سے متعلق تمام واقعات تازہ تھے، اور اس نفرت و بیزاری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ مگر اس کے باوجود سید صاحب پر جو الزام لگایا گیا، اس کے متعلق خود ہنٹر صاحب کا بیان ملاحظہ فرمایئے:

پروپیگنڈہ

ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر لکھتے ہیں:

۲۳-۱۸۲۲ء میں امام صاحب کے مکہ تشریف لے جانے پر اس عام فہم اصلاحی عقیدہ کو وسعت دی گئی، اور باقاعدہ طور پر ترتیب دیا گیا انہوں نے اس مقدس شہر میں ایک اصلاحی تحریک کا آغاز دیکھا جس کا بانی صحرا کا ایک بدو تھا اور جو ان کے عقائد کے مطابق تھا۔ (۳۳۷)

مثل مشہور ہے، دروغ گو را حافظہ نہ باشد۔ ہنٹر صاحب اسی کے مصداق ہیں۔ جس تحریک کے متعلق خود ہنٹر صاحب کا بیان ہے کہ جس طرح معجزانہ طور پر نمودار ہوئی تھی، اسی طرح ۱۸۱۹ء میں معجزانہ طور پر ریت کے صحرائی ٹیلوں کی طرح غائب ہو گئی۔ اسی کتاب میں چند صفحہ کے فرق سے اس کے متعلق یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ اس مقدس شہر میں ایک اصلاحی تحریک کا آغاز دیکھا جس کا بانی صحرا کا ایک بدو تھا۔

اس کے بعد اس تحریک کی تفسیر ایسے گھناؤنے انداز میں کی گئی ہے جو ہر ایک مسلمان کو خواہ سنی ہو یا شیعہ، سید احمد صاحب شہید سے متنفر کر دے۔ (۳۳۸)

اس سے بڑھ کر ایک اور بہتان ملاحظہ ہو:

سید احمد صاحب جب مکہ ہی میں تھے تو حکومت کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ سید احمد صاحب کے عقائد بھی ان صحرائی بدوؤں کی جماعت کے مطابق ہیں جن کی وجہ سے مقدس مقامات کو ایسے ایسے نقصانات اٹھانے پڑے۔ لہٰذا مکہ معظمہ میں ان کی علانیہ بے عزتی کی گئی اور خارج البلد کر دیا گیا۔ اس سزا کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ ہندوستان واپس آئے تو مشرکانہ بدعات کے مصلح اور مذہبی خبطی نہ تھے بلکہ عبدالوہاب کے مرید تھے۔ (۳۳۹)

الزام کتنا بڑا ہے۔ عام مسلمانوں بالخصوص فرنٹیر کے ناخواندہ مسلمانوں کے نزدیک اس سے زیادہ ملعون و مردود اور واجب القتل کون ہو سکتا ہے جس کی مکہ معظمہ میں اعلانیہ بے عزتی کی گئی ہو اور مکہ معظمہ سے نکال دیا گیا ہو۔ ان غریبوں میں نہ یہ صلاحیت تھی کہ کسی خبر کا سچ جھوٹ پرکھ سکیں۔ اور نہ ان کو ایسے ذرائع مہیا تھے کہ تحقیقات کرا سکیں لہٰذا جو ان سے کہا جاتا تھا وہ صحیح تھا۔ بالخصوص جب خود ان کے سرداروں کی طرف سے یہ بات پہنچائی گئی تو اس کی تردید کس طرح کر سکتے تھے۔

ہنٹر صاحب کی یہ کتاب اگرچہ ایک طویل عرصہ کے بعد لکھی گئی مگر اس سے یہ صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ پروپیگنڈے کی بنیادیں دو تھیں۔

(۱) سید صاحب کے وہی عقائد ہیں جو نجدیوں کے عقائد تھے جن کو مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کے علماء نے یہاں تک غلط قرار دیا کہ اول ان کا داخلہ حجاز میں بند کر دیا گیا پھر ان کے خلاف باضابطہ جہاد کر کے ان کا قتل

عام کیا گیا۔

(۲) ہماری حکومت بھی ترکی حکومت کی طرح باضابطہ حکومت ہے۔ لہٰذا جس طرح ترکوں کے خلاف بغاوت مذہبی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔ ہماری حکومت کے خلاف بھی بغاوت ایسا ہی جرم ہے۔

دوسری بات اگرچہ کھل کر نہیں کہی گئی مگر ترکی حکومت کے بار بار تذکرہ کا مقصد یہی ہے کہ ایک باضابطہ حکومت کا احترام دماغوں پر مسلط کیا جائے۔

مدِ مقابل

انگریز یا سکھ

ان تمام تفصیلات کے بعد ضرورت تو نہیں کہ ہم سید صاحب کے جہاد کا مدِ مقابل تلاش کریں۔ مگر چونکہ مطبوعہ لٹریچر میں ایسا مواد موجود ہے جس سے ایک خلجان پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس عنوان پر اطمینان بخش بحث کر لی جائے۔

(۱) شمال مغربی سرحد میں آزاد حکومت قائم کرنے کے بعد جو اعلامیہ شائع کیا گیا، اس کا ایک فقرہ یہ ہے:

نہ با کسے از اُمراءِ مسلمین منازعت داریم، ونہ با یکے از رؤسا و مومنین مخالفت۔ با کفار مقابلہ داریم نہ با مدعیانِ اسلام۔ صرف با دراز مویان مقاتلہ۔ نہ با کلمہ گویان و اسلام جویان۔ ونہ با سرکار انگریزی مخاصمت داریم۔ ونہ ہیچ راہ منازعت کہ از رعایاء او مستقیم بحمایتش از مظالم برایا۔ (۴۳۰)

ترجمہ: نہ کسی مسلمان حاکم سے ہمارا جھگڑا ہے نہ کسی مسلمان رئیس سے مخالفت نہ غیر مسلموں سے مقابلہ ہے اور نہ مدعیانِ اسلام سے۔ ہماری جنگ صرف لانبے بال والوں سے ہے، نہ کلمہ گو اور طالبانِ اسلام سے۔ اور سرکار انگریزی سے بھی ہماری مخاصمت نہیں کیونکہ ہم اس کی رعایا ہیں اور اس کی پناہ وحفاظت میں مظالم سے محفوظ ہیں۔

(۲) منشی محمد جعفر صاحب تھانیسری، سوانح احمدی میں تحریر فرماتے ہیں:

یہ بھی ایک صحیح روایت ہے کہ جب آپ سکھوں سے جہاد کرنے کو تشریف لے جاتے تھے، کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ آپ اتنی دور سکھوں سے جہاد کرنے کو جاتے ہیں، انگریز جو اس ملک پر حاکم ہے، وہ دینِ اسلام سے کیا منکر نہیں ہے۔ گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملک ہندوستان لے لو۔ یہاں لاکھوں آدمی آپ کا شریک اور مددگار ہو جائے گا۔

سید صاحب نے جواب دیا، کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے۔ سکھوں سے جہاد کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ برادرانِ اسلام پر ظلم کرتے ہیں اور اذان وغیرہ فرائض مذہبی ادا کرنے

سے مزاحم ہوتے ہیں..... اور سرکار انگریزی گو منکر اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم و تعدی نہیں کرتی، نہ اُن کو اداءِ عبادت سے روکتی ہے۔(۳۳۱) الخ

دوسرے موقع پر ایک روایت یہ پیش کی ہے کہ جب سید صاحب رام پور میں قیام فرما تھے تو چند افغانیوں نے آکر شکایت کی کہ انہوں نے پنجاب میں افغان عورتوں کو دیکھا ہے، اُن کو کسی طرح سکھ پکڑ لائے ہیں اور گھر میں ڈال لیا ہے وہ سکھوں کے پنجہ سے رہائی کے لیے بے چین ہیں۔ سید صاحب نے جواب میں فرمایا۔ میں عنقریب سکھوں سے جہاد کروں گا۔"(۳۳۲)

کسی نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ سید صاحب نے مولانا اسمٰعیل صاحب شہید کو تحقیق حالات کے لیے پنجاب بھیجا۔ آپ نے لاہور امرتسر وغیرہ میں بچشم خود حالات کا معائنہ کیا۔ الخ

مذکورہ بالا حوالوں کی بنا پر مصنف سوانح احمدی نے یہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سید صاحب کی کوششوں کے مدِ مقابل سکھ حکومت تھی۔ مصنف روشن مستقبل مولوی سید طفیل احمد صاحب مرحوم (علیگ) نے بھی مصنف سوانح احمدی کی تقلید کی اور آپ نے کسی قدر آئینی الفاظ میں فرمایا:

پنجاب میں مسلمانوں کے مذہبی اور بنیادی حق میں صریح دست اندازی ہوتی تھی جس کی مدافعت کے لیے سید صاحب نے سکھوں پر جہاد کا ارادہ کیا۔(۳۳۳)

مولوی سید طفیل احمد صاحب مرحوم نے سکھوں کے مظالم کا تذکرہ کرتے ہوئے سرلیپل گرفن کا قول نقل کیا ہے کہ:

ہزارہ کے گورنر سردار ہری سنگھ نالوہ کے سخت برتاؤ اور مسلمانوں سے سخت نفرت کی وجہ سے وہاں مذہبی بلوے ہوتے رہتے تھے۔(۳۳۴)

ڈاکٹر ہنٹر کی روایت نقل کی ہے:

سکھوں کے ہندوانہ تعصب نے شمالی ہند کے مسلمانوں کے جوش کو بھڑکا کر آگ کا ایک شعلہ اٹھا دیا تھا۔(۳۳۵)

حقیقتِ حال

لیکن واقعات کا مندرجہ ذیل تسلسل ہر ایک انصاف پسند کو اس فیصلہ پر مجبور کرتا ہے کہ سکھوں سے جو کچھ تصادم ہوا وہ محض ہنگامی حالات کا تقاضا تھا۔ سید صاحب کی پوری تحریک کا اصل مدِ مقابل انگریز تھا، اور آپ کی اس تمام جدوجہد کا منشاء صرف یہ تھا کہ وطنِ عزیز کو انگریزی اقتدار کے شکنجہ سے نجات دلائی جائے۔

واقعات یہ ہیں

(۱) سید صاحب اس تحریک کے بانی نہیں ہیں بلکہ وہ اس پارٹی کی فوجی تنظیم کے کمانڈر اور امیر ہیں جو شاہ

ولی اللہؒ کے اصول پر قائم ہوئی اور جو شاہ عبدالعزیز کی رہنمائی میں کام کرتی رہی اور اس وقت بھی اس کا اصل مرکز دہلی تھا۔

(۲) شاہ عبدالعزیز صاحب سکھوں کے خلاف نہیں بلکہ انگریزوں کے خلاف ۱۸۰۶ء میں اعلانِ جنگ کر چکے ہیں۔ جب آپ نے مذہبی الفاظ میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے ہوئے انگریزی اقتدار سے استخلاصِ وطن کی جدوجہد کو ہر مسلمان کا مذہبی فرض قرار دیا تھا۔

(۳) سکھوں کے جو مظالم رام پور میں چند پٹھانوں نے بیان کئے شاہ عبدالعزیز صاحب تقریباً بیس ۲۰ سال پہلے یہی مظالم انگریزوں کے بیان کر چکے ہیں، اور اسی بناء پر انگریزی مقبوضات کو دارالحرب قرار دے چکے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے فتویٰ شاہ عبدالعزیز صاحب جو اوراقِ سابق میں تفصیل سے گذر چکا ہے۔

(۴) خود سید صاحب، امیر علی خاں اور جسونت راؤ ہلکر کے ساتھ تقریباً چھ سال تک انگریزوں سے برسرِ پیکار رہے ہیں۔ اسی جذبۂ حریت اور انگریزوں کی مخالفت نے آپ کا تعلق انگریزوں کے تیسرے مخالف دولت راؤ سندھیا سے آخر تک قائم رکھا ہے اور ۱۸۱۶ء میں سید صاحب نواب امیر علی خاں سے اسی بنا پر علیحدہ ہوئے ہیں کہ نواب صاحب نے آپ کی رائے کے برخلاف انگریزوں سے صلح کر لی تھی۔ باوجودیکہ نواب امیر علی خاں، سید صاحب کے عقیدت مند رہے اور اُن کی آرزو رہی کہ سید صاحب اُن کے ساتھ رہیں مگر سید صاحب نے اُن کے ساتھ رہنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

(۵) سید صاحب نے راجہ ہندو راؤ وزیر ریاست گوالیار اور غلام حیدر خاں منصب دار ریاست گوالیار کو جو خطوط لکھے ہیں، وہ پہلے نقل کئے جا چکے ہیں۔ اُن میں سید صاحب نے خود اپنے قلم سے اپنے جہاد کا نصب العین بیان کر دیا ہے کہ:

> ''بیگانگاں بعید الوطن اور تاجران فروش کو نکال کر مناصب ریاست وسیاست اُن اہلِ وطن کے سپرد کئے جائیں جو اس کے مستحق ہیں''۔

(۶) کھلی ہوئی شہادت جس کی کوئی تردید نہیں کی جا سکتی وہ سید صاحب کے جانشینوں کا عمل ہے۔ سکھوں کی حکومت ۱۸۴۶ء میں ختم ہو چکی ہے اور ۱۸۴۹ء تک مکمل طور پر پنجاب کا الحاق ہو چکا ہے۔ اس وقت موقع تھا کہ سید صاحب کے جانشینوں کا کیمپ جو سرحد میں تھا بند کر دیا جاتا۔ مجاہدین خدا کا شکر ادا کرتے کہ اُن کا دشمن ختم ہوا اور انگریزوں کا پرچم لہرانے لگا۔ بقول منشی محمد جعفر صاحب ''جب سید صاحب نے اعلان کیا تھا کہ وہ انگریزوں کی رعایا اور انگریزی حکومت کے وفادار ہیں''۔ اب اس وفادار رعایا کو وفاداری کے اظہار کا بہترین موقع تھا۔ مگر اس کے برعکس یہ وفادار بے نقاب ہو کر سامنے آئے اور انگریزوں کی مخالفت میں پہلے سے زیادہ سخت ہو گئے اور اس کے باوجود کہ وہ انگریزی اقتدار کو ختم کرنے سے مایوس ہو چکے ہیں، انگریزی عمل داری میں رہنا گوارا نہیں کرتے، سرحد پار اپنا محاذ قائم کر کے انگریزی حکومت کو

پریشان کرتے رہنا اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہیں۔ ع

مختصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید ــــــ نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہیے

انگریزی فوجیں پوری قوت سے اُن کو بار بار کچل ڈالتی ہیں مگر وہ گر کر پھر اُبھرتے ہیں اور پھر انگریزی اقتدار کے راستہ میں سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک انگریز ہندوستان سے رخصت نہیں ہو جاتا۔ (جس کی تفصیل دوسری جلد میں پیش کی جائے گی۔ انشاء اللہ)۔

(۷) اگر ڈاکٹر ہنٹر کا قول قابل اعتبار ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی یہ تصریح نظر انداز کر دی جائے۔

(سفر حج سے) پہلے جو چیز اُن کی نظر میں محض خواب و خیال تھی اب وہ اُن کو حقیقی روشنی میں نظر آنے لگی، جس میں انہوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے ہر ضلع میں اسلامی جھنڈا گاڑتے اور صلیب کو انگریز کافروں کی لاش کے نیچے دفن ہوتے ہوئے دیکھا۔(۳۳۶)

(۸) سکھوں کی حکومت مشرقی پنجاب میں تھی۔ بنگال میں تو آج سے نہیں تقریباً اسی سال سے انگریزی حکومت تھی، پھر کیا وجہ تھی کہ جیسے ہی سید صاحب نے علاقہ سرحد میں پہنچ کر علم جہاد بلند کیا، سید صاحب کے مرید خاص نثار علی سفید فام خود ساختہ آقاؤں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔(۳۳۷) خود ہنٹر صاحب کا ارشاد ہے:

۱۸۳۰ء میں جب مجاہدین سرحد نے پشاور پر قبضہ کر لیا تو ٹیٹو میاں اس قدر بے دھڑک ہو گیا کہ اُس نے اپنا نقاب اُتار پھینکا اور ان معمولی سختیوں کی وجہ سے جو ہندو زمیندار اُس کے مریدوں پر کیا کرتے تھے یہ کسانوں کی پُر جوش بغاوت کا سرغنہ بن بیٹھا۔ اس کے بعد کسانوں کی بہت سی بغاوتیں ہوئیں۔ جس کے نتیجہ پر باغیوں نے اپنے آپ کو ایک مورچہ بند کیمپ میں محفوظ کر لیا۔ الخ (۳۳۸)

اس موقع پر ہندو زمینداروں کی زیادتیوں کا تذکرہ برطانوی سامراج کی وہی تفرقہ انگیز پالیسی ہے جس کی بدولت اُس نے ہندوستان فتح کیا اور تقریباً ایک صدی تک حکومت کر کے ملک کے باشندوں کو دو متحارب کیمپوں میں تقسیم کر دیا۔

بہر حال مذکورہ بالا واقعات جو آفتاب نیمروز کی طرح ظاہر ہیں یہی ثابت کرتے ہیں کہ سید صاحب کے جنگ و جہاد کا اصل مقابل انگریز تھا۔ یہ بد قسمتی تھی کہ حالات نے سکھوں سے آویزش پر مجبور کر دیا اور یہ سالہا سال کی محنت اس طرح میدان میں شکست پا گئی۔

(۹) کپتان کننگھم تاریخ سکھ میں لکھتا ہے:

"سید احمد (صاحب) کے عمل سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کافروں سے اُن کی مراد صرف سکھ تھے لیکن اُن کے صحیح مقاصد پورے طور پر نہیں سمجھے گئے۔ وہ انگریزوں پر حملہ کرنے میں ضرور محتاط تھے لیکن

ایک وسیع اور آباد ملک پر ایک دور و دراز ملک کی قوم کا اقتدار اُن کی مخالفت کے لیے کافی سبب تھا۔ (۳۴۹)

(۱۰) اس موقع پر مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کا ایک فقرہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

ایسٹ انڈیا کمپنی گذشتہ ڈیڑھ سو برس سے سیاسی اقتدار حاصل کر رہی تھی مگر اُس نے ایک تجارتی لباس میں مستور رہنا ضروری سمجھ رکھا تھا۔ واقعہ بالاکوٹ سے دو سال بعد ۱۸۳۳ء میں یک لخت تجارت کا لبادہ اُتار کر وہی حکومت کی مالک بن جاتی ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ (۳۵۰)

ترجمہ: اس واقعہ میں اہلِ بصیرت کے لیے ایک سبق ہے

(۱۱) جس زمانہ میں سید صاحب مصروف جہاد تھے، اسی زمانہ میں ایک انگریز سیاح جس کا نام ''میسن'' تھا، سرحد، افغانستان اور بلوچستان کے علاقوں میں پھر رہا تھا۔ اُس نے سید صاحب کا نصب العین یہ بتایا۔

''سکھوں کا استیصال اور پنجاب پر قبضہ۔ پھر ہندوستان اور چین پر تسلط۔''

گویا اس انگریز سیاح کو سید صاحب کے مقاصد کا اندازہ اُن مسلمانوں سے بہتر تھا جو سید صاحب کے خاص معتقدین میں شمار ہوتے تھے۔ (۳۵۱)

اب رہیں وہ عبارتیں جو سوانح احمدی یا روشن مستقبل سے نقل کی گئی ہیں تو اُن کے جواب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلم سکھ تعلقات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں چند صفحات ملاحظہ فرمایئے۔

سکھ، مسلم تعلقات

تاریخ کا یہ عنوان جس قدر تلخ ہے اُتنا ہی شیریں بھی ہے۔ یہ انگریزی ڈپلومیسی کا کمال ہے کہ اُس نے اس باب کی تلخیوں کو شد و مد سے پیش کیا کیونکہ اس کا نتیجہ انگریزی مقاصد کے حق میں خوش گوار اور شیریں تھا۔ اور سکھ مسلم تعلقات کے خوش گوار حصہ کو حرف غلط کی طرح محو کر دیا۔ کیا یہ تاریخ کا عجیب و غریب واقعہ نہیں ہے کہ عین معرکہ جنگ میں یار محمد خاں اور اُس کے ساتھی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ولی عہد (شیر سنگھ) اور اُس کے جرنیل بدھ سنگھ کے ساتھ ہیں، سید صاحب کو زہر دلوا رہے ہیں، یا اُن کے خلاف سازش کر کے مجاہدین خدا پرست کو قتل کرا رہے ہیں۔ اور دوسری طرف راجہ رام ہندو سید صاحب کے توپخانہ کا کمانڈر ہے اور سکھوں کی فوج پر گولہ باری کر رہا ہے۔

سکھوں کے جتھے جن کو ''مثل''(۳۵۲) کہا جاتا تھا، وہ جنگ جو جتھے تھے جن پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی منظم طاقت بھی عرصہ دراز کے بعد قابو پا سکی۔ ان جرگوں کو وہ دردناک تباہی فراموش نہیں ہوئی ہوگی جو فرخ سیر کے

دورِ حکومت میں برداشت کرنی پڑی۔ محض قرینِ قیاس نہیں، بلکہ واقعہ یہی ہے کہ سکھوں نے اس کے انتقام میں کسر نہیں کی۔ مگر اس کے باوجود سکھ مسلم تعلقات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ:

(۱) مہاراجہ رنجیت سنگھ کو شاہِ کابل "زمان شاہ" نے صوبہ پنجاب کی حکومت عطا کی۔

(۲) اگر بالفرض یہ صحیح نہیں ہے تو اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ لاہور پر قبضہ کی تحریک کرنے والوں میں مسلمان بھی پیش پیش تھے۔(۳۵۳) پھر مسلمانوں کی مدد سے ہی لاہور پر قبضہ آسان ہوگیا۔(۳۵۴)

(۳) غالباً یہی وجہ ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت میں مسلمان کافی دخیل رہے۔ چنانچہ:

الف: مہاراجہ کے معتمدِ خاص اور مایۂ ناز سیکریٹری اور مہاراجہ کی کیبنٹ کے خاص رکن فقیر عزیز الدین صاحب تھے۔ غیر ملکی سفارت کا نازک فرض یہی فقیر صاحب انجام دیتے تھے۔(۳۵۵)

ب: دوسرے معتمدِ خاص جن کی خفیہ رپورٹ پر مہاراجہ پورا اعتماد کرتے تھے، قاضی عبدالرحمٰن صاحب تھے۔ حملہ سے پہلے لاہور کی تحقیقِ حال کے لیے مہاراجہ نے آپ ہی کو بھیجا تھا۔(۳۵۶)

ج: فتح کشمیر کے سلسلہ میں مہاراجہ کے لیے جس نے بہت مفید خدمات انجام دیں وہ سلطان خاں والی بھمبر تھے۔(۳۵۷)

د: یار محمد خاں اور اس کے بھائی دوست محمد خاں کا ذکر بار بار آچکا ہے یہ مہاراجہ کی طرف سے پشاور کے گورنر تھے۔ ان کے علاوہ ملتان کے گورنر نواب سرفراز خاں تھے۔ قصور کے گورنر قطب الدین خاں۔ منکیرہ کے حاکمِ اعلیٰ حافظ احمد خاں، اور گجرات فتح ہوا تو اس کی نظامت فقیر نور الدین کے سپرد ہوئی۔(۳۵۸)

و: ابتداء میں مہاراجہ کے توپخانہ کا افسرِ اعلیٰ میاں غوث خاں تھا۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا سلطان محمود خاں بڑھتے بڑھتے اپنے باپ کے عہدہ پر پہنچ گیا۔(۳۵۹)

و: شیخ عباد اللہ اور روشن خاں دو دو ہزار پیدل سپاہیوں کی پلٹنوں کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ جب ۱۸۰۲ء میں مہاراجہ نے خطابات تقسیم کیے تو ان کو "کمیدان" کے خطاب دیے گئے۔(۳۶۰)

ز: فتح لاہور کے بعد شہری نظم قائم کیا گیا تو نظام الدین صاحب "قاضی" (جج) اور محمد شاہ پور اور سعد اللہ صاحب چشتی مسلمانوں کے مفتی مقرر کیے گئے۔(۳۶۱) شفاخانوں کے افسرِ اعلیٰ حکیم نور الدین قرار دیے گئے۔(۳۶۲)

ح: جب ٹکسال قائم ہوئی تو شاید کسی مسلمان ہی کی ہدایت تھی کہ سکہ کے لیے یہ شعر موزوں کیا۔

دیگ و تیغ و فتح و نصرت بیدرنگ
یافت از نانک گورو گوبند سنگھ(۳۶۳)

ط: توپیں عام طور پر مسلمان ہی بناتے تھے۔ منشی عبدالکریم صاحب مصنف تاریخ پنجاب نے ۳۸ توپوں کا تذکرہ کیا ہے جو مسلمانوں کی بنائی ہوئی تھیں۔ ایک توپ پر یہ شعر درج تھے۔

جمعدار ایں توپ شد رائے سنگھ ۔۔۔ کہ در جانفشانیست او بے درنگ
بموجب صلاح لالہ سنگھ بار ۔۔۔ غلام نبی گفت تاریخ وار

ایک توپ پر یہ عبارت کندہ تھی:

''ہذا الضرب موسومہ ''مجنون'' حسب الامر اشرف اقدس واعلیٰ حضور پرنور در سمت ۱۸۹۷ باہتمام صاحب ارسطو فطرت، فلاطون زماں موشیو موالیر جنرل کورٹ صاحب بہادر در عیدگاہ بحسن خدمت فضل علی کمیدان شاگرد صاحب ممدوح ریختہ شد۔ (۳۶۴)

(۴) ایجوکیشنل کانفرنس کی رپورٹ کی شہادت یہ ہے کہ:

سکھوں کے پچاس سالہ دورِ حکومت میں اگرچہ حکومت سکھوں کی رہی، مگر زمینداری مسلمانوں کی تھی۔ ہندو اُن کے یہاں کارندوں کی طرح کام کرتے تھے۔ (۳۶۵)

(۵) تعلیمی میدان پر بھی مسلمانوں کا قبضہ رہا۔ ہندو اور سکھ بچوں کے سرپرست مسلمان اُستادوں پر ہی اعتماد کرتے تھے۔ (۳۶۶)

(۶) ۱۸۴۳ء میں جب سکھ حکومت کا انگریزوں سے معاہدہ ہوا تو شرائط صلح کے طے کرنے اور سکھ حکومت کی طرف سے عہد ناموں پر دستخط کرنے والوں میں فقیر نور الدین کے دستخط، ایک دستاویز موجود ہیں اور بعض موقعوں پر فقیر نور الدین کے ساتھ فقیر تاج الدین فقیر چراغ الدین اور سلطان محمد خاں بھی سکھ حکومت کے نمائندوں میں شامل نظر آتے ہیں۔ (۳۶۷)

خلاصہ

سکھ مسلم تعلقات اور انگریزوں کے مسلم کش کارناموں کا موازنہ موضوعِ بحث سے خارج ہے اور اس کا معمولی جائزہ بھی اتنا طویل ہے کہ یہ اوراق اس کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اس کے دامن سمیٹیے اور آپ سوانح احمدی یا روشن مستقبل کے اُن اقتباسات پر ایک نظر ڈال لیجیے جو اس بحث کے آغاز میں نقل کیے جا چکے ہیں۔ آپ خود اُن کو بے معنی قرار دیں گے اور یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوں گے کہ سید صاحب کے جہادِ عظیم کی یہ تاویل ایک عرصہ کے بعد صرف اس لیے کی گئی ہے کہ سید صاحب سے تعلق رکھنے والے انگریزی مظالم کی دار و گیر سے نجات پا سکیں۔ اصل واقعہ یہی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت سید احمد صاحب شہید، مولانا اسمٰعیل صاحب شہید اور اُن کے ساتھیوں کی شاندار تاریخ پر پردہ ڈالنے کی کوشش غیروں کے سوا خود اپنوں نے بھی کی ہے۔

غیروں کا عمل

ہندوستان کے لاکھوں مسلمانوں کو جو گرویدگی حضرت سید صاحب اور اُن کے قافلہ سے تھی، اس کو ختم کرنے اور مسلمانوں میں جذبۂ وفاداری پیدا کرنے کے لیے انگریزی سامراج کی مشنری نے وہابیت کا الزام لگایا۔

پیرانِ خام اور نادان مولویوں کا وہ طبقہ جس کو سید صاحب کی اصلاحات سے اقتصادی نقصان پہنچ رہا تھا، اُس نے انگریزی پروپیگنڈے کی ہمنوائی کی اور جب تک انگریزی اقتدار کا آفتاب عروج پر رہا، سید صاحب اور اُن کے رفقاء کی لاذہنیت اور وہابیت کا وہ ہنگامہ برپا کیا گیا کہ صفائی پیش کرنے والوں کی آواز نقار خانہ میں طوطی کی صدا بن کر رہ گئی۔

اپنوں کا کام

دوسری طرف سید صاحب کے وہ ماننے والے جن کو وہابی کہا جاتا تھا، جب تقریباً نصف صدی تک انگریزی اقتدار سے ٹکراتے رہنے کے بعد چکنا چور ہو گئے، اور مجبوراً ان کو اپنی شکست تسلیم کرنی پڑی تو عوام کے ہنگامہ کا جواب تو انہوں نے مجالسِ مناظرہ کی ہنگامہ آرائی اور رسالوں اور پمفلٹوں کی اشاعت سے دے دیا۔ مگر انگریز کے شکنجۂ انتقام سے بچنے کے لیے لامحالہ اُن کو یہ ثابت کرنا پڑا کہ سید صاحب اور آپ کے ساتھی، انگریزی حکومت کے وفادار تھے، اور اُن کی مجاہدانہ سرگرمیاں صرف سکھ حکومت کے خلاف تھیں۔

ان حضرات نے سید صاحب کا ذکرِ خیر ضروری سمجھا۔ اس کے باقی رکھنے کے لیے سوانح اور تذکرے لکھے گئے۔ مگر پوری احتیاط سے وہ تمام حصہ خارج کر دیا جس سے انگریزوں کی مخالفت یا مرہٹوں سے تعلقات کا پتہ چلتا تھا۔ چنانچہ مصنف سوانح احمدی سید صاحب کے مکتوبات نقل کرنے سے پہلے فرماتے ہیں:

"مکتوبات کے اُس مٹھے میں سے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے بہت سے خطبے (تقریریں) روز مرہ کی کاروائی کی رپورٹیں، نیز روساء اور خوانین کے بہت سے خطوط میں نے خارج کر دیئے ہیں۔ اس تمام مجموعے میں سے میں نے صرف ساٹھ مکتوب لیے ہیں۔ (۳۶۸) الخ

دوسرے موقع پر تحریر فرماتے ہیں:

"مختلف مؤلفوں کے لکھے ہوئے تقریباً چار ہزار صفحات میرے سامنے میز پر موجود ہیں، اُردو زبان کے چھلکے میں رکھ کر سب تازی اور شیرازی پھولوں کا عطر کھینچ لیا ہے۔ (۳۶۹) الخ

اب اس چھلکے میں سے نکلے ہوئے خطوط اور بیانات میں برطانوی سامراج عداوت کی بُو کیسے آ سکتی ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ کسی ایسے سینٹ کی آمیزش کر دی جائے، جس سے وفاداری کی مہک آتی ہو۔ چنانچہ اعلام نامہ کا یہ فقرہ جو سوانح احمدی میں جلی قلم سے لکھا گیا ہے:

"نہ با سرکار انگریزی مخاصمت داریم ونہ ہیچ راہ تنازعت کہ از رعایہ او ہستیم وذمہ تمیش از مظالم برایا۔ (۳۷۰)

اس کا انداز باقی تمام فقروں سے جدا ہے۔ فارسی زبان سے معمولی مناسبت رکھنے والا بھی اس جداگانہ انداز سے اسی فیصلہ پر مجبور ہوگا کہ یہ فقرہ بڑھایا ہوا ہے۔ (۳۷۱)

دہلی کا مرکز اور اس عرصہ میں اس کی خدمات

(۱) رضا کاروں کی فراہمی اور مالی امداد اس مرکز کے ذمہ تھی۔ یہ مرکز اس عرصہ میں یہ خدمت انجام دیتا رہا۔ چنانچہ قافلہ کے ارکان جو سید صاحب کے ساتھ رہے تھے تقریباً آٹھ سو تھے۔ ان میں عورتیں بھی شامل تھیں لیکن سرحد پر سید صاحب کی فوج میں صرف ہندوستانیوں کی تعداد تقریباً آٹھ ہزار تھی۔ علاقہ سمہ اور پشاور کی خفیہ سازش میں جو تقریباً چار ہزار کارکن شہید کیے گئے وہ ہندوستانی ہی تھے۔ بہرحال یہ افزوں تعداد مرکز دہلی کی جدوجہد کا نتیجہ تھا۔

(۲) مالی امداد کا ثبوت اس واقعہ سے ہوتا ہے جس کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں گذرا کہ دہلی کے ایک مہاجن نے سندھی کی رقم روک لی تھی۔ اس کا مقدمہ دائر کیا گیا تو انگریزی جج نے وہ رقم واپس کرائی اور ڈگری شاہ محمد اسحاق صاحب کے حق میں دی۔ (۴۷۲)

(۳) فضا کو ہموار رکھنا ایک بہت بڑی خدمت تھی جو "مرکز دہلی" کے سپرد تھی۔ چنانچہ اس عرصہ میں مولانا محبوب علی صاحب دہلوی جب سید صاحب سے چند جزوی باتوں پر خفا ہو کر دہلی پہنچے اور یہاں خفگی کا اظہار شروع کیا تو بقول مصنف سوانح احمدی:

> "مولوی محبوب علی صاحب کے اغوا سے جو صدمہ کاروبار جہاد کو پہنچا ایسا صدمہ آج تک اس لشکر کو کسی سکھ یا درانی کے ہاتھ سے بھی نہیں پہنچا تھا۔ مولوی محبوب علی صاحب کے فتنہ کے بعد مدت تک ہندوستان سے قافلوں کا آنا بند ہو گیا۔ بہت سے خطوط مولوی محبوب علی صاحب کی تکذیب میں لشکر مجاہدین سے ہندوستان میں آئے تب مولانا محمد اسحاق صاحب اور مولانا محمد یعقوب صاحب معاونین جہاد کی کوشش سے یہ فتنہ محبوبی رفع ہو کر خرچ اور قافلوں کی روانگی دوبارہ شروع ہوئی۔" (۴۷۳)

مولانا محبوب علی صاحب کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ جب انگریزوں نے مولانا کی اس حرکت کو اپنے حق میں مفید سمجھ کر نو گاؤں کی جاگیر دینا چاہی تو مولانا نے صاف انکار کر دیا، کہ جو کچھ میں نے کیا وہ تمہاری وجہ سے یا تمہارے لیے نہیں کیا۔ بلکہ میں نے اپنی آزادانہ رائے سے ایک بات کو حق سمجھا اُس پر عمل کیا۔ (۴۷۴)

(۴) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے دستور کے مطابق مدرسہ کی خدمت کر کے دماغی تربیت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ چنانچہ وہ مسلمان جنہوں نے تقریباً پچیس برس بعد جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں کام کیا، اُن کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی درس گاہ سے تھا۔

(۵) واقعہ بالاکوٹ کے بعد جب یہاں نگرانی بڑھتی رہی اور کام کرنا مشکل ہو گیا تو آپ اپنے بھائی شاہ محمد

یعقوب صاحب کے ساتھ ۱۲۵۸ھ، ۱۸۴۲ء میں (یعنی واقعہ بالاکوٹ سے گیارہ سال بعد) مکہ معظمہ تشریف لے گئے تاکہ بیرونی طاقتوں کے ذریعہ ہندوستان کی اندرونی تحریک آزادی کو امداد پہنچ سکیں اور یہاں کام کرنے کے لیے اپنے خاص شاگرد مولانا مملوک العلی صاحب کی زیر صدارت ایک بورڈ بنا دیا۔ (۳۲۵)

مولانا مملوک العلی صاحب پرنسپل عربک کالج دہلی حکومت کے ملازم تھے۔ وہ سرکار کے وفادار سمجھے جاتے تھے۔ اُن کی قیادت میں جو تنظیم ہو رہی تھی وہ شک وشبہ سے محفوظ تھی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے مجاہدین زیادہ تر مولانا مملوک العلی صاحب کے شاگرد ہی تھے دوسرے خاص شاگرد جن کو مولانا محمد اسحاق صاحب نے اپنا جانشین بنا کر مدرسہ شاہ عبدالعزیز اُن کے حوالہ کیا، وہ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب تھے جن کی عمر اس وقت ۲۵ سال تھی جنہوں نے بذاتِ خود ۱۸۵۷ء کی تحریک میں حصہ لیا، اور جب تحریک کو شکست ہوگئی تو مکہ معظمہ پہنچ کر زندگی بسر کرنی پڑی۔

مختصر یہ کہ جس بورڈ نے شاہ اسحاق صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد دہلی میں نہایت رازداری کے ساتھ کام سنبھالا۔ اس کے صدر مولانا مملوک علی صاحب تھے اور خصوصی رکن مولانا شاہ عبدالغنی صاحب اور مولانا قطب الدین دہلوی (۳۲۶) تھے۔

مزید تفصیل انشاء اللہ دوسری جلدوں میں آئے گی۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

۶ رجب ۱۳۷۶ھ، ۷ رفروری ۱۹۵۷ء

۱۲/۲/۱ بجے شب۔ دہلی

اس کے بعد کی جلد میں اس تحریک کے دوسرے دور یعنی علماء صادق پور کی قربانیاں اور اُن کی تحریک کے عجیب وغریب حالات ملاحظہ فرمائیے

ضمیمہ

اس جلد میں جس کے ۱۴۰ صفحات آپ مطالعہ فرما چکے ہیں صرف تحریکات، بنیادی نظریات اور اُن کے متعلق مجاہدات کا تذکرہ کیا ہے۔ افراد و مجاہدین کے شخصی حالات نہیں لکھے۔ یہاں تک کہ حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ عبدالعزیز اور حضرت سید احمد شہید قدس اللہ اسرارہم جو تحریک کے بانی، رہنما اور امیر و امام تھے، اُن کے بھی وہی حالات لکھے ہیں جن کا تذکرہ تحریک کے سلسلہ میں ضروری تھا۔ جہاں تک مجاہدین کے شخصی حالات کا تعلق ہے، جناب غلام رسول صاحب مہرؔ اس فرض کو انجام دے چکے ہیں۔ چنانچہ آپ کی دو تصنیفیں ''جماعت مجاہدین'' اور ''سرگذشت مجاہدین'' اس سلسلہ میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے بعد کسی اور تصنیف کی ضرورت تو باقی نہیں رہی۔ تاہم اگر توفیق میسر ہوئی تو ارادہ ہے، کہ شاندار ماضی کی ایک مستقل جلد میں ان بزرگوں کے شخصی حالات درج کیے جائیں گے۔ (والامر بید اللہ)

البتہ چند حضرات جن کے نام مولانا ابوالحسن علی مدظلہ العالی نے اپنی تصنیف سیرت سید احمد شہید جلد اوّل میں تحریر فرمائے ہیں اور عجیب اتفاق ہے کہ مہر صاحب ''جماعت مجاہدین'' میں اُن کا تذکرہ نہیں کر سکے، اور اگر کسی کا ذکر آ گیا ہے تو وہ تشنہ ہے۔ ان کے متعلق جو انکشافات فراہم ہو چکے ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں پیش کر دیے جائیں۔ ان کا تذکرہ اس لیے بھی مناسب ہے کہ تحریک کے بعض پہلوؤں پر اُن سے روشنی پڑتی ہے۔

مناسب ہونے کا ایک سبب ایسا بھی ہے جس کو خود غرضی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے یعنی چند بزرگ ایسے ہیں جن سے کاتب حروف خاندانی وابستگی رکھتا ہے۔ ان انکشافات کا ذریعہ چار حضرات ہیں:

(۱) ہندوستان کے مشہور رہنما ڈاکٹر سید محمود صاحب جن کا تذکرہ کتاب میں متعدد جگہ آ چکا ہے۔

(۲) یوسف پور محمد آباد ضلع غازی پور کے ایک بزرگ مولانا حکیم محمد احسن صاحب انصاری، جن کا تعلق اس معزز خاندان سے ہے جو تحریک آزادی میں آخر تک پیش پیش رہا۔ جس کے ممتاز اور مشہور افراد حکیم نابینا صاحب انصاری، حکیم عبدالرزاق انصاری، ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری عرف ڈاکٹر انصاری، میجر عثمان اور پنڈت نہرو وزیر اعظم ہند کے خاص دوست ڈاکٹر شوکت اللہ صاحب انصاری ہیں۔

(۳) سید محسن صاحب جو غازی پور کے ایک علم دوست بزرگ ہیں۔

(۴) میرے خاندانی عزیز سید محبوب حسن صاحب رضوی انچارج شعبہ مخطوطات و مخطوطات (محافظ خانہ) دارالعلوم دیوبند و مصنف تاریخ دیوبند وغیرہ۔

قاضی فرزند علی صاحب

جن کا تذکرہ بار بار آیا ہے۔ جن سے سید صاحب کو بھی اس درجہ تعلق خاطر تھا کہ جب محمد آباد پہنچے تو قالب محمد آباد میں تھا اور قلب کسی اور طرف کھینچ رہا تھا۔ اسی اضطراب میں "بوئے دوست سے آید" فرماتے ہوئے پاپیادہ یوسف پور پہنچ گئے۔ جہاں قاضی صاحب علالت کی وجہ سے قیام فرما تھے۔ یہ قاضی صاحب جن کی عدیم المثال قربانی یہ تھی کہ عمدہ گھوڑے، اسلحہ، قرآن شریف کے متعدد نسخوں اور ایک لاکھ روپیہ نقد پر بھی جذبۂ ایثار مطمئن نہ ہوا تو اپنے فرزند ارجمند "امجد" کو راہِ خدا میں شہادت کے لیے پیش کر دیا۔ جو زندگی میں زندہ شہید کہلائے اور آخر کار جامِ شہادت نوش فرما کر زندہ جاوید ہو گئے۔ ان کے متعلق اُن کے پوتے ڈاکٹر سید محمود صاحب کی ایک تحریر (۳۷۷) کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

> قاضی فرزند علی صاحب یوسف پور کے رہنے والے نہ تھے بلکہ قصبہ سید پور بھتیری کے باشندے تھے۔ جس کا تعلق پہلے سرکار جون پور سے تھا۔ پھر غازی پور میں شامل ہو گیا۔ یوسف پور اُن کی سسرال تھی اور جب سید صاحب محمد آباد پہنچے تو قاضی صاحب اپنی سسرال میں مقیم تھے علالت کی وجہ سے سید صاحب تک نہ پہنچ سکے تھے۔ میں اپنے بزرگوں سے یہ بھی سنتا رہا ہوں کہ سید صاحب، مولانا اسمٰعیل صاحب وغیرہ قاضی صاحب کے پاس سید پور بھتیری بھی تشریف لائے تھے۔

ممکن ہے یوسف پور میں ملاقات کے بعد قاضی صاحب، سید صاحب اور مولانا شہید کو جس طرح غازی پور لے گئے، اپنے وطن اصلی یعنی بھتیری بھی لے آئے ہوں۔

قاضی صاحب کا خاندان

یہ مشائخ طریقت کا ایک خانوادہ تھا جو دولتِ علم کا سرمایہ دار رہا۔ اس کے مورث (۳۷۸) بندگی حضرت شاہ جمال صاحب اور بندگی حضرت شاہ کمال صاحب تھے۔

اکبر بادشاہ جب بنگالہ کی مہم پر گنگا کے راستہ جا رہا تھا، جب اس کی کشتیوں کا قافلہ سید پور کے قریب لنگر انداز ہوا تو اس کو معلوم ہوا کہ دو تین میل کے فاصلہ پر ایک خانقاہ ہے جس میں ایک بلند پایہ بزرگ اقامت گزیں ہیں۔ اکبر نے اُن سے ملاقات کے لیے حاضر ہونا چاہا۔ خانقاہ نشین بزرگ نے ملاقات سے معذرت کر دی البتہ چند بیر بادشاہ کے لیے بھیج دیے۔ بادشاہ نے خلوت گزیں بزرگ کی اس توجہ کو فال نیک سمجھا کہ یہ سفر بار آور ہوگا بہرحال جب اکبر بنگال و بہار کی مہم سر کر کے واپس ہوا تو بطور مدد معاش خانقاہ کے لیے جاگیر دینی چاہی۔ شاہ صاحب نے جاگیر سے بھی معذرت کر دی۔ مگر آپ کی اولاد کی مرضی پا کر بادشاہ نے چند گاؤں ان کی اولاد کو دے دیے۔ جو اس خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ چلے آ رہے تھے۔ خاتمہ زمینداری کا قانون بننے کے بعد اُن کا سلسلہ ختم ہوا۔ جب شاہ صاحب کو اس کا علم ہوا تو وہ بہت خفا ہوئے اور فرمایا کہ افسوس سلسلہ فقیری ختم ہوا۔ اب

اس خاندان میں دنیا آ گئی۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد اس خاندان کے ایک بزرگ "قاضی احمد علی صاحب" سرکار جونپور میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس طرح رفتہ رفتہ اس خاندان کے افراد نے بڑی جائداد پیدا کی اور امیر کبیر ہو گئے۔

قاضی صاحب کے اوصاف

قاضی فرزند علی صاحب بڑے دبدبہ کے بزرگ تھے۔ اور بڑے فیاض اور باخدا آدمی تھے۔ اُن کے دستر خوان پر سو پچاس آدمی ہمیشہ موجود رہتے۔ بڑے تزک اور احتشام سے ایک گروہ لے کر حج کے لیے تشریف لے گئے اور وہاں سے زر کثیر صرف کر کے عجیب و غریب تبرکات ساتھ لائے جو آج تک خاندان میں موجود ہیں مثلاً موئے مبارک اور ایک قرآن شریف جو ہرن کی جھلی پر لکھا ہوا ہے۔ یہ دو تین ہاتھ لانبا اور ایک بالشت چوڑا ہے۔ ایک کھڑاؤں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب ہے۔ ایسے ہی ایک پیراہن ہے جس پر خط کوفی میں چند آیتیں لکھی ہوئی ہیں۔ اس کو بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ غرض ایسی بہت سی چیزیں ہیں۔

قاضی صاحب کا ترکہ

قاضی صاحب نے بہت بڑی املاک ترکہ میں چھوڑی جس کا بڑا حصہ بنارس کے ایک مہاجن نے دھوکہ سے بالا بالا نیلام کرالیا۔ اُس وقت مسلمان شرفاء انگریزوں کی عدالت میں نہیں جاتے تھے، یہ بات اپنی شرافت سے بعید سمجھتے تھے۔

جب جائداد نیلام ہوئی تو میرے والد کم عمر تھے۔ بالغ ہونے پر لوگوں نے کہا کہ تم اپنے حصہ کے متعلق عدالت سے رجوع کرو۔ والد صاحب نے فرمایا۔

یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا کہ انگریزوں کی عدالت میں حاضری دوں۔ (۳۲۹)

قصبہ سید پور بھتری

یہ قصبہ بہت پرانا ہے۔ اس میں ایک بہت بڑی لاٹ ہے جس پر پالی میں عبارت کندہ ہے۔ سکندر گپت نے اس جگہ ہن کو شکست دی تھی۔ ہندوستان میں یہ شاید پہلی جگہ ہے جہاں باہر سے آنے والے شکست کھا کر فرار ہوئے۔ اُونچے اُونچے ٹیلے ہیں۔ عیدگاہ ایک بہت اُونچے ٹیلے پر ہے۔ یہاں گنج شہیداں مشہور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی بڑی لڑائی ہوئی ہوگی۔ ایک جامع مسجد ہے۔ صحیح تاریخ معلوم نہیں کہا جاتا ہے کہ فیروز شاہ نے یا اکبر بادشاہ نے بنوائی تھی۔ عیدگاہ ایک ندی کے کنارہ پر ہے۔ اس ندی پر فیروز شاہ کا بنوایا ہوا پل ہے۔

کچھ عرصہ پہلے پانی برستے پر چاندی کے چھوٹے چھوٹے سکے ملا کرتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ

میں بکثرت میں قدِ آدم زمین بغیر اجازت نہیں کھود سکتے تھے۔ ممانعت تھی، کیونکہ خزانے اکثر برآمد ہوا کرتے تھے۔ انگریزوں نے یہاں سے بہت سے دفینے نکالے ہیں۔

مشہور ہے کہ قاضی فرزند علی صاحب یا قاضی احمد علی صاحب کے زمانہ میں ایک کنوئیں میں سے ایک سونے کی تھالی نکلی تھی۔ اس پر پتھر کی کچھ مورتیاں جڑی ہوئی تھیں یہ پتھر آفتاب کے طلوع اور غروب سے رنگ بدلتا رہتا تھا۔ راجہ بنارس نے اس کو بہت کچھ دے کر حاصل کرنا چاہا۔ لیکن قاضی صاحب موصوف نے قبول نہیں کیا کہ مورتیوں کی بیع جائز نہیں۔

میرے والد صاحب کے وقت میں ایک چاندی کی تختی نکلی تھی۔ جس پر کچھ عبارت کندہ تھی۔ مشہور ہے کہ اس کو لندن بھیج دیا گیا تھا۔ پندرہ برس ہوئے ایک شخص نے خواب میں کسی بزرگ کو دیکھا کہ وہ فرمارہے ہیں ۔ مجھے نکال لو، میں فلاں جگہ مٹی کے بوجھ میں دبا ہوا ہوں۔ اس جگہ جہاں پتہ بتایا گیا تھا، ایک ٹیلہ تھا۔ ٹیلہ کھودا گیا تو اندر سے ایک پختہ قبر برآمد ہوئی۔ اس وقت سے یہ "شہید مرد کی قبر" مشہور ہے۔

قاضی فرزند علی صاحب کا مزار غازی پور میں اُن کے عالی شان محل میں ہے۔ یہ محل اب شکستہ ہو گیا ہے۔ صرف چہار دیواری اور چند بُرجیاں باقی ہیں۔ یہ کسی ہندو کے قبضہ میں ہے۔ اس عمارت کی زمین بہت زیادہ ہے۔ (۳۶۰)

شاہ منصور عالم صاحب

غازی پور کے ایک ذی علم رئیس تھے اُن کے جدِ امجد اور خاندان کے مورثِ اعلیٰ شاہ جنید صاحب مرحوم تھے۔ جن کی درگاہ غازی پور اسٹیشن کے قریب ہے۔ اب بھی یہ خاندان ذی مرتبہ اور خوش حال ہے۔ (سید محسن صاحب)۔

شاہ منصور عالم صاحب محلّہ میاں پورہ کے باشندہ تھے۔ اس خاندان کے لوگ اور یہ محلّہ اب بھی باقی ہے۔ اسد منزل میں شاہ ابوالفیض صاحب کانگریسی نوجوان اسی خاندان سے ہیں۔ ڈاکٹر شوکت اللہ صاحب انصاری کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے۔ (مولانا حکیم احسن صاحب)۔

غالباً اسی وجہ سے ڈاکٹر شوکت صاحب کو شاہ شوکت اللہ انصاری بھی کہا کرتے ہیں۔ (محمد میاں)

مولانا محمد فصیح صاحب

حضرت سید صاحب کے خلفاء میں مولانا فصیح صاحب کا نام بھی آتا ہے۔ یہ بزرگ شخصیت محلّہ روئی منڈی میں تھی۔ ان کے اخلاف نے برٹش حکومت میں بہت شہرت حاصل کی۔ شمس العلماء مولوی ابوالخیر صاحب اس حکومت کے مشہور خیر خواہ تھے۔ مولوی ابواللیث صاحب اسی خاندان کے چشم و چراغ بقیدِ حیات ہیں۔ مولانا محمد فصیح صاحب کا اب تک سالانہ عرس ہوتا ہے (مولانا حکیم احسن صاحب)۔

مولانا محمد فصیح صاحب ضلع غازی پور اور اس سے متصل ضلع شاہ آباد آرہ میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ یہ حنفی مسلک تھے۔ تحریک وہابیت کے بانی مولانا ولایت علی صاحب (صادق پوری) جن کے عظیم الشان کارناموں کا تذکرہ اس سلسلہ کی تیسری جلد میں آئے گا۔ (انشاء اللہ) اُن سے مناظرہ کی نوبت بھی آئی (ملاحظہ ہو سوانح احمدی مصنفہ منشی محمد جعفر صاحب تھانیسری)۔ مولانا محمد فصیح صاحب کے صاحبزادے مولانا نعمت اللہ صاحب تھے۔ آپ کا قائم کیا ہوا "مدرسہ حنفیہ" آرہ (شاہ آباد) میں اب تک ہے۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد احقر کی تدریسی زندگی کا آغاز اسی مدرسہ سے ہوا تھا۔ یہ ۱۹۲۶ء کی بات ہے جب استاذ الحدیث علامہ مولانا انور شاہ کشمیری ایک جلسہ میں شرکت کے لیے بہار تشریف لے گئے تھے تو مدرسہ حنفیہ کے ارباب حل وعقد نے آپ سے ایسے شخص کی فرمائش کی تھی جو مدرسہ حنفیہ میں ادبیات کا درس دے سکے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے حضرت الاستاذ الحافظ الحاج محمد اعزاز علی رحمہ اللہ کے مشورہ سے اس ناکارہ کو اس خدمت کے لیے مامور فرمایا۔[۳۸۱] چنانچہ تقریباً تین سال یہاں قیام رہا۔ پھر احقر کو انہیں بزرگوں نے جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد منتقل فرمادیا۔

عمر کا بہترین حصہ اسی مدرسہ شاہی کی خدمت میں صرف ہوا اور اسی مدرسہ کی سیر چشمی اور حریت نوازی کا طفیل تھا کہ احقر کو ۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک سیاسی تحریکات میں حصہ لے کر جنگ آزادی میں اپنی امنگیں نکالنے کا موقع میسر آیا۔

شیخ غلام ضامن صاحب

غازی پور کے ایک سربرآوردہ زمیندار تھے۔ بہت علم دوست۔ اُن کے خاندان میں اب یہاں کوئی نہیں رہ گیا۔ اُن کے پڑپوتے مولوی صدرالدین صاحب کا کئی سال ہوئے انتقال ہو گیا۔ (سید محسن صاحب)

قاضی محمد محسن صاحب

موضع چوکیا کے مشہور رئیس تھے۔ غازی پور میں بھی اُن کا مکان تھا، اور اسی مناسبت سے اس محلہ کو قاضی ٹولہ کہتے ہیں۔ اب اس خاندان میں یہاں کوئی نہیں رہ گیا۔

اب سید محبوب حسن صاحب رضوی کے مکتوب گرامی کے اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) سید مقبول احمد صاحب۔ ان کا صحیح نام حافظ سید مقبول عالم ہے۔ ابن حافظ سید محمد عالم۔ ہمارے خاندان میں حضرت سید محمد جمیل کی اولاد میں ہیں سید محمد جمیل حضرت الحاج سید محمد ابراہیم[۳۸۲] قدس اللہ سرہ العزیز کے پوتے ہیں۔

(۲) مولانا شمس الدین صاحب۔ یہ قصبہ دیوبند کے مشہور واعظ مولانا عبدالخالق صاحب کے والد ماجد تھے۔

اُن کی اولاد میں مولانا عبدالشکور صاحب مدظلہ العالی ہیں۔ جو عرصہ تک مدرسہ حسین بخش دہلی میں صدر مدرس رہے اور اب تقریباً دس سال سے مکہ معظمہ میں مقیم ہیں۔ مولانا عبدالخالق صاحب کی بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ دیوبند کی عظیم الشان جامع مسجد کے لیے جس نے گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ گشت کر کے چندہ کیا، وہ بھی بزرگ ہیں۔ مولانا شمس الدین صاحب ابتداء میں رسومات کے پابند تھے۔ حضرت سید صاحب کی تشریف آوری کی خبر سنی تو آپ کی ہجو میں ایک نظم لکھی جو دیوبند میں بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ گئی۔ جب سید صاحب تشریف لائے اور انہیں کے محلہ کے قریب قاضی کی مسجد میں فروکش ہوئے تو مولانا شمس الدین صاحب بھی ایک روز دیکھنے کے لیے آگئے اور مجلس میں ایک کنارہ پر بیٹھ گئے۔ حضرت سید صاحب اُن کی طرف متوجہ ہوئے اور اُن کی اس نظم کا تذکرہ ایسے انداز سے فرمایا کہ مولانا شمس الدین صاحب تڑپ کر اُٹھے اور سید صاحب کے قدموں میں جا پڑے۔ سید صاحب نے اُن کو سنبھالا۔ شفقت سے اپنے پاس بٹھایا۔ مولانا شمس الدین صاحب تائب ہوئے۔ پھر بیعت کی درخواست کی جو منظور ہوئی۔

(۳) شیخ رجب علی صاحب بن شیخ خردمند۔ دیوان لطف اللہ عثمانی جو اُمرائے شاہجہانی میں سے تھے، اُن کی اولاد میں ہیں۔ یہ محلہ دیوان کے رہنے والے تھے۔ یہ مولانا محمد مبین صاحب خطیب عیدگاہ دیوبند کے دادا ہوتے ہیں۔

(۴) منور علی صاحب مجھے جو نام معلوم ہوسکا، اس کی ولدیت رجب علی کے بجائے سید فضل علی ہے۔ یہ میرے دادا سید نوازش علی مرحوم کے چچا ہوتے ہیں۔ قاضی مسجد کے متصل ہی (جہاں حضرت سید صاحب فروکش ہوئے تھے) اُن کا مکان ہے۔ سلسلہ اولاد منقطع ہے۔

(۵) مولوی بشیر اللہ صاحب۔ بن شیخ غریب اللہ عثمانی حکیم صفت احمد صاحب کے پردادا ہوتے ہیں۔ یہ بھی دیوان لطف اللہ صاحب کی اولاد میں سے ہیں۔

(۶) مولوی فرید الدین صاحب بن شیخ محمود بخش۔ یہ بھی دیوان لطف اللہ صاحب کی اولاد میں سے ہیں۔ دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ کے والد ماجد تھے۔ دارالعلوم کے شمالی دروازے کے میدان میں اُن کی قبر ہے۔ مشہور ہے کہ رات میں اکثر لوگوں نے قبر سے قرآن مجید پڑھنے کی آواز سنی ہے۔ علمائے بخارا سے تحصیل علم کی تھی قصبہ راجو پور میں پڑھانے کا مشغلہ تھا۔ اپنے زمانہ کے زبردست بزرگ سمجھے جاتے تھے۔

مولانا فرید الدین کے چار بھائی اور تھے۔ محمد صابر، بلند بخت، مقصود علی اور سید احمد، مولوی سید جعفر علی صاحب بستوی نے شہدائے بالاکوٹ میں دیوبند کے دو نام لکھے ہیں۔ ایک شیخ بلند بخت اور دوسرے سلو خاں۔ میرا خیال ہے کہ سلو خاں اصل میں سید احمد ہیں۔ سلو بچپن کا نام ہے جو بعد میں بربنائے تہور و جوانمردی سلو خاں زبان زد ہوگیا۔ یہ میرا ننھیالی خاندان ہے۔ موخر الذکر تینوں حضرات بالاکوٹ میں شہید ہوئے ہیں۔ بلند بخت

شادی شدہ تھے اور مقصود علی اور سید احمد کنوارے۔ ان تینوں بھائیوں کے بارے میں یہ روایت خاندان میں مشہور ہے کہ جب مولانا فرید الدین صاحبؒ کا انتقال ہوا تو یہ تینوں شہید بھائی اُن کے جنازے میں شریک دیکھے گئے۔ اس کے بعد غائب ہو گئے۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب سے جب اُن لوگوں کا حلیہ بیان کیا گیا تو فرمایا "یہ تینوں میرے شہید چچا تھے۔"

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس موقع پر "تینوں شہید بھائی اپنے والد شیخ محمود بخش صاحب سے بھی ملے تھے۔ حال یہ تھا کہ بدن زخموں سے چور اور خون جاری تھا گویا کہ ابھی زخمی ہوئے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

اس سے بھی زیادہ عجیب اور حیرت انگیز یہ واقعہ سننے میں آیا ہے کہ شیخ بلند بخت شہادت کے بعد اکثر اپنی بیوی کے پاس آتے اور شب بھر قیام کرتے۔ گھر والوں نے جب رات کی تنہائی میں اُن کی اہلیہ سے کسی اجنبی مرد کو باتیں کرتے سنا تو اُن کو متہم کرنا شروع کیا۔ اس بات سے مجبور ہو کر اُن کو اصل واقعہ بتانا پڑا جس کے اظہار کی شوہر کی طرف سے سخت ممانعت تھی۔ واقعہ کا علم ہو جانے کے بعد کہتے ہیں کہ شیخ بلند بخت صاحب نے آنا موقوف کر دیا۔

(۷) شیخ حفیظ اللہ۔ دیوبند کے مشہور بزرگ شیخ ابوالبرکات (جن کے نام پر محلہ ابوالبرکات موسوم ہے) کی اولاد میں تھے۔ سید صاحب کی معیت میں شریک جہاد رہے مولانا غلام رسول مہر نے سید صاحبؒ کے بارے میں شیخ حفیظ اللہ صاحب کی متعدد روایتیں "سید احمد شہید" میں نقل کی ہیں۔

دیوبند میں غازی کے لقب سے ملقب تھے۔ بالاکوٹ کے واقعہ کے بعد ایک مرتبہ دیوبند سے گذر رہے تھے۔ آموں کا زمانہ تھا۔ لوگوں نے سڑک سے گزرتے ہوئے دیکھا، تو چاروں طرف سے گھیر لیا اور اصرار کیا کہ گھر چلئے، بیوی بچے آپ کی جدائی سے مغموم اور پریشان ہیں۔ غازی حفیظ اللہ صاحب پر وارفتگی کا عالم طاری تھا، بولے۔ ہمارا تو ایک ہی محبوب تھا (سید صاحبؒ)۔ وہی ہم سے بچھڑ گیا۔ ہم اُسی کی تلاش میں سرگرداں ہیں"۔ مگر لوگ باصرار گھر لے آئے۔ جب ٹونک میں سید صاحبؒ کے رفقاء جمع ہوئے تو یہ بھی ٹونک تشریف لے گئے۔

سید محبوب حسن رضوی

۱۷ر جولائی ۱۹۵۵ء

وقائع احمدی کے قلمی نسخے کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

شیخ غلام حسین صاحب

کلکتہ کے ایک تاجر تھے جن کو انگریزوں نے فخر التجار کا خطاب دے رکھا تھا۔ اوّل اوّل سید صاحب سے الگ رہے اور پھر حاضر خدمت ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کی اہلیہ محترمہ نے حاضری پر مجبور کیا۔ بہرحال ان کے

فخر التجار ہونے کی شان ملاحظہ فرمایئے۔

گوداموں کا کرایہ ماہانہ پانچ ہزار روپیہ دیتے تھے۔ مصر، یمن، عرب، شام وغیرہ بہت سے ممالک میں اُن کی کوٹھیاں یعنی برانچ آفس تھے۔ انگریزی، فرانسیسی، چینی، ترکی، کوکنی، فارسی، وغیرہ وغیرہ تیرہ ۱۳ زبانوں میں اُن کے یہاں سے خط وکتابت ہوتی تھی۔ ہر ایک ملک کی کچہری (دفتر) جدا جدا تھی۔ (وقائع احمدی)

مرزا ابلاقی اور مرزا حاجی

قیامِ بنارس کے سلسلہ میں اُن کے نام آئے ہیں۔ تمام سوانح نگار اُن کو شاہزادے لکھتے ہیں۔ ہم نے پہلے یہی لکھا ہے کہ بظاہر اُن کا تعلق اودھ کے شاہی خاندان سے تھا اور یہاں جلاوطن کی حیثیت سے نظر بندی کی زندگی گذار رہے تھے۔ وقائع احمدی میں اُن کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے۔

مرزا ابلاقی اور مرزا حاجی جو بنارس میں شاہزادے تھے انہوں نے تنہائی میں ملاقات کی درخواست کی۔ آپ نے منظور فرمائی۔ یہ کشتی پر سوار ہو کر رات کو حضرت کی کشتی کے پاس پہنچے۔ سید صاحب نے کشتی پر پہنچ کر اُن سے تقریباً دو گھنٹہ گفتگو کی۔ (صفحہ ۶۶۲ وقائع احمدی قلمی)

دوسرے موقع پر تحریر ہے:

شاہزادے محمود بخت عرف مرزا ابلاقی مقیم تیلیا نالہ، اپنے مکان میں لے گئے (بظاہر کشتی پر ملاقات کے بعد) مرزا ابلاقی، اُن کی اہلیہ اور والدہ نے اور تمام نوکروں چاکروں نے بیعت کی۔ والدہ صاحبہ صاحب کشف وکرامات اور صاحب مراقبہ ہو گئیں۔ مرزا ابلاقی نے دو وقت، اُن کی والدہ نے ایک وقت، بیوی نے ایک وقت دعوت کی پہلے پر تکلف کھانا پیش کیا گیا۔ پھر حضرت کی فرمائش پر سادہ کھانا، پلاؤ اور قورمہ روٹی پر کفایت کی گئی۔ سید صاحب مرزا ابلاقی کے مکان پر کئی بار تشریف لے گئے۔

قافلہ کا ہر شخص حافظ قرآن تھا

سلوک میں تلاوت قرآن کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ذکر واذکار سے جو کیفیت حاصل ہوتی ہے وہ اگرچہ جلد حاصل ہو جاتی ہے مگر اتنی پختہ نہیں ہوتی۔ ہر وقت اُس کے زوال کا خطرہ رہتا ہے مگر کلام اللہ شریف کے وِرد سے جو کیفیت حاصل ہوتی ہے وہ پختہ ہوتی ہے، اگرچہ دیر میں حاصل ہوتی ہے۔

حضرت سید صاحب کے یہاں ذکر ومراقبہ کے مشاغل بھی جاری رہا کرتے تھے مگر سلوک بالقرآن یعنی کلام اللہ شریف سے انتہائی شغف اور اس کی تلاوت کا بے پناہ شوق، یہ بھی آپ کے طریقہ وارشاد سلوک کا اہم جزو تھا۔ جس کی شہادت مندرجہ ذیل واقعہ سے مہیا ہوتی ہے۔

مکہ معظمہ میں جائزہ لیا گیا تو ہر ایک مرد اور عورت حافظ قرآن تھے۔ حتی کہ دس سالہ بچے بھی حافظ قرآن تھے۔ ایک مرتبہ مکہ معظمہ کے ایک صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی تو حفظ قرآن کا تذکرہ آیا۔ سید صاحب کے رفقاء

میں سے کسی صاحب نے فرمایا:

کیا کوئی مسلمان ایسا بھی ہوسکتا ہے جو حافظ قرآن نہ ہو۔ اس پر گفتگو کرنے والے کو تعجب ہوا۔ انہوں نے کہا۔ آپ کے ساتھیوں میں سب حافظ ہیں؟ جواب اثبات میں دیا گیا۔ پھر تحقیق کی گئی تو نہ صرف ہر ایک مرد بلکہ معلوم ہوا کہ عورتیں، حتیٰ کہ دس سالہ بچے بھی حافظ قرآن ہیں۔ (وقائع احمدی صفحہ ۸۲۸)

فوج میں گروپ بندی

پہلے فوج میں پچیس پچیس کے گروپ بنا دیئے گئے تھے۔ آٹا پیسنا، کھانا پکانا، لکڑیاں لانا۔ سب انہیں کے سپرد تھا جس کو وہ باری باری انجام دیتے تھے۔ حجامت بھی خود آپس میں ہی بنا لیتے تھے۔ (وقائع احمدی صفحہ ۱۲۲۵)۔

تعاون اور ہمدردی کی رُوح یہاں تک ترقی پا چکی تھی کہ کوئی ایک شخص محنت کا کوئی کام شروع کرتا تو دوسرے بغیر کہے اُس میں شریک ہوجاتے تھے۔ جن کاموں میں باری مقرر تھی، اُن میں بھی یہی رُوح کارفرما تھی۔ جو اپنی باری سے فارغ ہوچکا تھا۔ اگر موقع پاتا تو وہ باری والے کا شریک ہوجاتا۔ (صفحہ ۱۲۵۸ وقائع احمدی)۔

هذا. واخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين

محمد میاں

۳ رذی الحجہ ۱۳۷۶ھ۔ ۴ رجولائی ۱۹۵۷ء

حواشی

۱۔ ۲۸ ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ یوم جمعہ (سیر المتاخرین) ۱۹ فروری ۱۷۰۷ء (تقویم ہجری وعیسوی)

۲۔ نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء اور ۱۱۵۲ھ میں جو قتل عام کیا اس میں ہندو مسلمان کی کوئی تمیز نہیں تھی، بلکہ جانی اور مالی تباہیوں کے شکار بننے والے عموماً مسلمان تھے کیونکہ یہی مدمقابل تھے انہیں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور تھی، انہیں کے قبضہ میں ملک کے خزانے تھے اور انہیں کی غلط کاری نے نادر شاہ کو قتل عام کے لیے ابھارا تھا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو شاندار ماضی جلد دوم) ابدالی کا سب سے بڑا تصادم بیشک مرہٹوں سے ہوا مگر اس کے بار بار حملوں میں مسلمانوں کا نقصان بھی مجموعی حیثیت سے کچھ کم نہیں رہا۔ بقول شمس العلماء ذکاء اللہ خاں مرحوم، نادر شاہ کی قوت دو روز تھی اور ابدالی کی فوجیں دو ماہ تک دہلی کو اس طرح لوٹتی رہیں کہ نادر گردی کو بھی بھلا دیا۔ گو احمد شاہ ابدالی اپنی طبیعت اور مزاج سے نادر شاہ کی مانند بے رحم اور سفاک نہ تھا مگر اس کی سپاہ نادر کی سپاہ سے زیادہ اجڈ اور وحشی تھی۔ وہ اس کے کہنے میں نہ تھی۔ ۱۱ ستمبر ۱۱۷۰ھ ۱۷۵۷ء کو وہ داخل ہوا اور دو مہینے تک برابر لوٹتا رہا۔ بڑے بڑے امیروں کے گھر میں جھاڑو کا تنکا تک نہ چھوڑا (صفحہ ۲۷۰ تاریخ ہندوستان ج ۹)

۳۔ ۱۷۴۷ء اور ۱۱۶۰ھ میں نادر شاہ قتل کیا گیا۔ اس کی جگہ فوج نے احمد شاہ ابدالی کو بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اسی سن ۱۷۴۷ء سے احمد شاہ کے حملے ہندوستان پر شروع ہو گئے۔ جنگ پلاسی کے سال یعنی ۱۷۵۷ء، ۱۱۷۰ھ میں اس نے متھرا اور دہلی کو لوٹا اور واپس چلا گیا۔ پانی پت کی وہ مشہور لڑائی جس میں مرہٹوں کا غیر معمولی قتل عام ہوا جنگ پلاسی سے ساڑھے چار سال بعد ۶ جمادی الاخری ۱۱۷۴ھ مطابق ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو ہوئی۔

۴۔ ترکی حکومت کے یورپین مقبوضات۔

۵۔ کتاب التمهيد في ائمة التجديد بحوالہ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۱۴۔

۶۔ ہندوستان کے حالات پوشیدہ نہیں ہیں کیونکہ ہندوستان خود اپنا وطن ہے۔ ممالک عرب بھی دیکھے ہوئے ہیں اور ولایت والوں کے حالات وہاں کے معتمد لوگوں کے ذریعہ معلوم ہوتے ہیں۔

۷۔ مذہبی اصطلاح میں اس کا نام للہیت ہے یعنی صرف خدا کے لیے جس کی حدود یہ ہیں کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔ سب سے بہتر وہ ہے جو خدا کے کنبہ کی بھلائی اور بہتری کے لیے قربانی دے مگر اس لیے نہیں کہ خلق خدا اس کا احسان مانے یا اس کا نام بلند ہو یا اس کی تاریخ روشن ہو بلکہ اس لیے کہ خدا پرستی کا یہی تقاضا ہے، حق و صداقت کا یہی فیصلہ ہے اور ایک انسان کا بحیثیت شریف انسان کے یہی فرض ہے کہ وہ نام و نمود کا خواہاں نہ ہو، نہ قیادت و سیادت اس کے پیش نظر ہو بلکہ ان سب اغراض سے بالا ہو کر وہ خود اپنی شخصیت کو بھی فنا کر چکا ہو۔ یہاں تک کہ فنا کو بقا، اور نصب العین کے لیے قربان ہو جانے کو ابدی زندگی تصور کرے۔

اس باب میں صرف حوالے پیش کیے جا رہے ہیں اس کے بعد عبارتیں اور تشریحات واقتباسات کے زیر عنوان ملاحظہ فرمائیے۔

۸۔ ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ باب سیاسۃ المدینہ، البدور البازغہ مبحث الارتفاق الثالث اور الخیر الکثیر۔

۹۔ حجۃ اللہ البالغہ باب ابتغاء الرزق۔

۱۰۔ حجۃ اللہ البالغہ باب ابتغاء الرزق۔

۱۱۔ حجۃ اللہ البالغہ باب سیاسۃ المدینہ ایضاً باب الرسوم السائرۃ بین الناس۔

۱۲۔ ایضاً باب ابتغاء الرزق

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ حجۃ اللہ البالغہ باب اقامۃ الارتفاقات واصلاح الرسوم و باب ضبط المبہم

۱۵۔ حجۃ اللہ البالغہ باب البیوع المنہی عنہا۔

۱۶۔ حجۃ اللہ البالغہ باب الارتفاق الرابع و باب البیوع المنہی عنہا۔

۱۷۔ حجۃ اللہ البالغہ الرسوم السائرۃ بین الناس و باب سیاست المدینہ وایضاً باب ابتغاء الرزق و باب البیوع المنہی عنہا۔

۱۸۔ حجۃ اللہ البالغہ باب ابتغاء الرزق۔

۱۹۔ منصب امامت مصنفہ مولانا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب۔ (ذکر سلطنت ضالہ)

۲۰۔ ازالۃ الخفا جلد دوم عہد فاروق اعظم۔

۲۱۔ حجۃ اللہ البالغہ باب اصل الدین واحد۔ البدور البازغہ فصل حقائق الارتفاقات اور مقالہ ثالثہ وغیرہ

۲۲۔ البدور البازغہ مبحث الارتفاق الثالث وحجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۵۷۔

۲۳۔ تلک الدار الاخرۃ نجعلھا للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا والعاقبۃ للمتقین وہ گھر پچھلا ہے ہم دیں گے وہ ان کو جو نہیں چاہتے چڑھنا ملک میں اور نہ بگاڑ ڈالنا اور آخر بھلا ہے ڈر والوں کا (حضرت شاہ عبدالقادر)

۲۴۔ سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الرجل یقاتل شجاعۃ ویقاتل حمیۃ فای ذلک فی سبیل اللہ. فقال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا. (حدیث شریف)
آنحضرتؐ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص بہادری کی نمائش کے لیے جہاد میں شریک ہوتا ہے، کوئی شخص نسلی یا قبائلی حمیت وغیرت کی بنا پر جنگ کرتا ہے تو کیا اس کو فی سبیل اللہ کہا جائے گا۔ فرمایا فی سبیل اللہ اور راہ خدا میں اس شخص کا جہاد مانا جائے گا جو اس نیت سے قربانی پیش کر رہا ہے کہ اللہ کا بول بالا اور حق وصداقت کی بات اونچی ہو۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲)

۲۵۔ نفث ھذہ الداعیۃ فی القلب لایکون الا بالتشبہ بالملئکۃ الخ (ص ۱۵۷ ج ۲، حجۃ اللہ البالغہ)۔

۲۶۔ والحاجۃ الثالثۃ ان اجتماع الناس لایخلو عن التحاقد والتحاسد والشحناء الخ (البدور البازغہ صفحہ ۱۱ مبحث الارتفاق الثالث)۔

۲۷۔ فالمدن الفاسدۃ التی تغلب علیھا نفوس سبعیۃ ویکون بھم نفع شدید انما ھو بمنزلۃ الآکلۃ فی بدن الانسان لایصلح الانسان الا بقطعہ الخ (ص ۱۵۷ ج ۲ حجۃ اللہ البالغہ)

۲۸۔ لا یفوض الیہ الامن اخلص دینہ للہ وآثر الآخرۃ علی الدنیا. وصح اعتمادہ علی اللہ (ص ۱۵۷ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲)۔

۲۹۔ مکی زندگی کا پروگرام یہی تھا۔ کفوا ایدیکم واقیموا الصلوۃ. اپنے ہاتھ روکو اور نماز قائم کرو یعنی مخالفوں کی تمام ایذا رسانیوں کا جواب ضبط وتحمل سے دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط کرو اور نصب العین کو پختہ کرو۔

۳۰۔ کیونکہ گاندھی جی نے اہنسا کی تحریک ۱۹۱۹ء میں شروع کی تھی۔

۳۱۔ یہ انکشاف کس درجہ حیرت انگیز ہوگا کہ حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب شہیدؒ سلطنت مغلیہ کے اولوالعزم فرماں رواؤں کی حکومت کو بھی "سلطنت ضالہ" اور گمراہ قیادت قرار دیتے ہیں اور علماء کرام اور پاکباز مسلمانوں کے متعلق فرماتے ہیں۔ ازیں دور و دیگر یز ندو از پے قرب وجوار ی پرہیز ندو از مجالس سلاطین دست برداری شوند و از مصاحبت ایشاں بیزار۔ یعنی اکابر ملت اور بزرگان امت ان سے دور بھاگتے ہیں اور ان کے پڑوس سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ ان بادشاہوں کی ہم نشینی سے دست بردار اور ان کی مصاحبت سے بیزار رہتے ہیں (چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب کے والد ماجد حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم

صاحب کو سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے علماء کے اُس بورڈ میں شرکت کی دعوت دی جو اسلامی نظام (فتاویٰ) مرتب کرنے کے لیے عالمگیر نے بنایا تھا۔ مگر شاہ عبدالرحیم صاحب نے بورڈ کی رکنیت منظور نہیں فرمائی۔ یہ قانون مرتب ہوا جو فتاویٰ ہندیہ یا فتاویٰ عالمگیر کے نام سے آج بھی موجود ہے اور اُس کے مطابق فتاویٰ صادر کئے جاتے ہیں مگر حضرت شاہ عبدالرحیم بورڈ میں شریک نہیں رہے لیکن کبھی کبھی بورڈ کے اراکین کی رہنمائی کرتے رہے) البتہ ایسے فرمانروا جب تک رعایا پروری اور انصاف سے کام لیتے رہیں تو اس وقت حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب اُن کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا درست نہیں سمجھتے۔ (منصب امامت از ص ۹۱ تا ص ۹۴)

۳۲۔ اس سے بڑا ظلم کیا ہوسکتا ہے کہ وطن عزیز کا کوئی قابل فخر سپوت کسی غلط فہمی یا ناواقفیت کی بنا پر نظر انداز ہوجائے۔

۳۳۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے خطوط کا ایک مجموعہ حال ہی میں مولانا خلیق احمد صاحب نظامی استاذ شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے شائع کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نجیب الدولہ کو آپ کی سرپرستی حاصل تھی اور اگرچہ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ احمد شاہ ابدالی کو نظام الملک آصف جاہ اور حافظ رحمت خان اور نجیب الدولہ روہیلہ سرداروں نے ہندوستان پر حملہ کی دعوت دی تھی تاکہ اپنے سیاسی حریف شیعہ نوابوں اور مرہٹوں وغیرہ کے مقابلہ میں ان کو قوت حاصل ہو، اور سلطنت دہلی کی وزارت عظمیٰ اُن کے پلے پڑجائے۔ مگر خطوط کے اس مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابدالی کو ایک خط حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی لکھا تھا اگر یہ صحیح مان لیا جائے تو ابدالی سے امداد طلب کرنے کا مقصد صرف یہ ہوسکتا ہے کہ اس دور کی افراتفری اور رات دن کی اُن آفتوں کا جو مرہٹوں، جاٹوں، میواتیوں اور کبھی کسی اور گروپ کی طرف سے دہلی پر آتی رہتی تھیں وقتی تدارک ہوجائے کیونکہ "فک کل نظام" یعنی سیاسی اور سماجی زندگی کے ہر ایک شعبہ میں انقلاب جس کا نصب العین ہو، وہ بادشاہوں کی تبدیلی پر راضی نہیں ہوسکتا۔ اس کے یہ ایسی فتح و شکست سلسلہ کی کڑی تو بن سکتی ہے، سفر انقلاب کی آخری منزل نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ یہ وقتی ہنگامے یکے بعد دیگرے ختم ہوگئے اور شاہ صاحب کی تحریک کا انقلابی قافلہ برابر چلتا رہا۔ جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے (انشاء اللہ)۔

۳۴۔ ملاحظہ ہو فیوض الحرمین اور شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۲۶۔

۳۵۔ تفہیمات الٰہیہ صفحہ ۱۲۵ ج ا۔

۳۶۔ مولانا عبیداللہ صاحب فرماتے ہیں کہ شاہ ولی صاحب کے زمانہ کی دہلی ایسا مرکز تھی جس میں اقوام عالم کے سب نمونے ملتے ہیں۔ دہلی میں یہ استعداد ہے کہ اس کے توسط سے یہ تعلیم سارے ہند اور پھر دنیا میں پھیل سکے (شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک صفحہ ۴۰۔ نیز ملاحظہ ہو آثار الصنادید)۔

۳۷۔ شاہ علم اللہ صاحب (المتوفی ۱۰۹۶ھ تقریباً ۱۶۸۵ء) نے اس مکان کی بنیاد رکھی، جو تکیہ شاہ علم اللہ کے نام سے مشہور ہوا۔ مگر دین کی محبت کے ساتھ حب وطن کا یہ سنگم ملاحظہ ہو کہ مکہ معظمہ سے واپس ہوتے ہوئے خانہ کعبہ کا نقشہ اور اس کی صحیح پیمائش ساتھ لیتے آئے ۱۰۸۲ھ ۱۶۸۹ء میں اس نقشہ اور پیمائش کے مطابق اپنے وطن عزیز میں سئی ندی کے کنارے ایک مسجد تعمیر کی۔ جس کی بنیادوں میں آب زمزم ڈالا۔ اس خانہ خدا کی تعمیر میں بھی سنت ابراہیمی پر عمل کیا یعنی خود اپنے ہاتھ سے یہ مسجد تعمیر کی۔ آپ کی اولاد حضرت اسمٰعیل کی طرح اپنے باپ کے ساتھ کام کررہی تھی۔ (سیرت سید احمد شہید)

۳۸۔ اس تحریک کے پہلے علمبردار حضرت سید احمد صاحب شہید تھے۔ اُن کی شہادت کے بعد تحریک کا مرکز صادق پور پٹنہ ہوا، اور جب اس کو تباہ کردیا گیا تو باقی ماندہ مجاہدین نے آزاد قبائل میں اپنا محاذ قائم کیا جس کا باقی ماندہ سلسلہ انگریزوں کی روانگی یعنی جو انقلاب ۱۹۴۷ء تک انگریزی اقتدار کے لیے دردِ سر بنا رہا۔

۳۹۔ سیرۃ سید احمد شہید طبع ثالث۔

۴۰۔ یہاں نواب نجیب الدولہ نے شاہ ولی اللہ صاحب کے خاص طریقہ کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ نواب نجیب الدولہ سلطنت مغلیہ کے اس آخری دور میں وہ بیدار مغز جرنیل تھا جس نے سلطنت کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالے رکھا

اور اپنی وفات کے وقت ۱۷۶۹ء تک انگریزی اقتدار کے سیلاب کو دہلی کی طرف نہیں بڑھنے دیا۔

۴۱۔ مولانا مخدوم لکھنوی بن حافظ محمد نواز بن مولوی عبدالسمیع بن سید محی الدین مشہدی۔ آپ کے دادا سید محی الدین مشہدی، اول مشہد سے آکر دہلی میں اقامت گزیں ہوئے۔ پھر لکھنؤ تشریف لے آئے۔ مولانا مخدوم صاحب نے درسی کتابیں ملا نظام الدین صاحب خلف مولانا قطب الدین صاحب سہالوی سے پڑھی ہیں۔ حضرت مولانا عبدالعلی صاحب بحرالعلوم کے ساتھی اور ہم جماعت تھے۔ درس نظامی سے فراغت کے بعد آپ دہلی حاضر ہوئے اور حضرت شاہ ولی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز سے استفادہ کیا۔ پھر لکھنؤ پہنچ کر تمام عمر تعلیم و تربیت میں صرف کر دی۔ آخر عمر میں منطق و فلسفہ کے اسباق بند کر دیئے، صرف حدیث شریف اور کتب دینیہ کا درس دیا کرتے تھے۔ ۱۲۲۹ھ میں وفات پائی۔ شیخ امام بخش ناسخ نے تاریخ لکھی۔ (تذکرہ علماء ہند صفحہ ۲۲۳، ۱۲۲۹ھ مطبوعہ نولکشور)

سید مخدوم از جہاں رفت	گفتند بزرگ و خرد صد حیف
تاریخ وفات گفت ناسخ	مخدوم زمانہ مرد صد حیف

۱۲۲۹ھ

۴۲۔ آپ کا تذکرہ حضرت مولانا عبیداللہ صاحب کے سلسلہ میں آگے آئے گا۔ (انشاء اللہ)

۴۳۔ ۱۱۴۹ھ/۱۷۳۶ء۔

۴۴۔ ذی قعدہ ۱۱۵۱ھ فروری ۱۷۳۹ء۔ چند گھنٹوں میں یعنی صبح سے دوپہر تک شہر دہلی مردہ لاشوں سے پٹ گیا۔ مقتولین کی تعداد آٹھ ہزار سے ڈیڑھ لاکھ تک بیان کی گئی ہے۔

۴۵۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ تقریباً ستر کروڑ کی دولت لوٹی گئی۔ شاہی محل کے زیورات، جواہرات اور تخت طاؤس وغیرہ کی قیمتوں کا اندازہ مشکل ہے۔

۴۶۔ ۱۱۷۳ھ/۱۷۶۱ء۔

۴۷۔ مثلاً حجۃ اللہ البالغہ، البدور البازغہ، فیوض الحرمین وغیرہ۔

۴۸۔ مثلاً تفہیمات الٰہیہ۔

۴۹۔ مثلاً ازالۃ الخفاء۔

۵۰۔ ملاحظہ ہو حیات ولی۔ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک۔ علماء ہند کا شاندار ماضی جلد دوم وغیرہ۔

۵۱۔ کچھ عرصہ کے بعد جب ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ صاحب کی پارٹی کا نوجوان رہنما سید احمد شہیدؒ، نواب امیر خاں کے ساتھ مرہٹی راجہ جسونت سنگھ کے ساتھ انگریز کے مقابلہ میں صف آرا ہے تفصیل آگے آئے گی انشاء اللہ اور اس کے بعد اسی سلسلہ کے فیض یافتہ اور جانشین ۱۸۵۷ء میں ہندوؤں کے ساتھ انگریزی اقتدار کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں پھر جب بیسویں صدی کے آغاز میں انڈین نیشنل کانگریس نے آزادی کی تحریک شروع کی تو اسی سلسلہ کے ہزاروں علماء جو پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے، کانگریس کے مشترک پلیٹ فارم پر ہندوؤں کے دوش بدوش آزادی کی لڑائی لڑ رہے تھے۔

۵۲۔ تقویم کے حساب سے ۱۷۳۹ء ہوتا ہے۔

۵۳۔ تاریخ ہندوستان شمس العلماء جلد ۹ صفحہ ۲۵۸۔

۵۴۔ عماد السعادت صفحہ ۳۱۔

۵۵۔ تاریخ ہندوستان صفحہ ۲۵۹ و عماد السعادت صفحہ ۳۱۔

۵۶۔ عماد السعادت صفحہ ۳۲ و سیر المتاخرین۔

۵۷۔ تاریخ ہندوستان و سیر المتاخرین۔

۵۸۔ تاریخ ہندوستان و سیر المتاخرین و عماد السعادت۔

۵۹۔ ۱۱۷۶ھ مطابق ۱۷۶۳ء۔

۶۰۔ اس وقت شاہ عبدالعزیز صاحب کی عمر صرف ۱۷ سال تھی۔

۶۱۔ ان عظیم الشان خدمات نے ثابت کر دیا کہ آپ کی جانشینی اہلیت و صلاحیت کی بنا پر تھی، صاحبزادگی کی بنا پر یہ اعزاز سپرد نہیں کیا گیا تھا۔

۶۲۔ مثلاً الیانع الجنی (عربی) و ابجد العلوم (عربی) از نواب صدیق حسن صاحب بھوپالی۔ نزہۃ الخواطر ج ۷، ۶ (عربی) وقائع احمدی۔ منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء۔ آثار الصنادید۔ سرسید احمد صاحب بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ نور احمدی مصنفہ مولوی نور احمد صاحب گرامی۔ مخزن احمدی مصنفہ سید محمد علی صاحب خواہرزادہ سید احمد صاحب شہید۔ الدر المنثور فی احوال صادق پور وغیرہ وغیرہ۔

۶۳۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے والد کی وفات کے بعد مدرسہ رحیمیہ میں جس کی بنیاد شاہ عبدالرحیم صاحب ڈال گئے تھے، طلبہ کو درس دینا شروع کیا۔ یہ مدرسہ اُسی مقام پر تھا جہاں اب شاہ ولی اللہ صاحب اور اُن کی اولاد کی قبریں ہیں جو مہندیوں کے نام سے مشہور ہے (حیات ولی صفحہ ۲۲) جب شاہ صاحب کے علمی کمال کا شہرہ بڑھا اور طلبہ اطراف و اکناف سے آنے لگے اور مدرسہ رحیمیہ اُن کے لیے ناکافی ثابت ہونے لگا تو محمد شاہ بادشاہ نے ایک عالی شان مکان مدرسہ کو دیا۔ اب پرانا مدرسہ غیر آباد ہو گیا اور اس نئے مدرسہ نے یونیورسٹی کی حیثیت حاصل کر لی۔ اس کے استحکام کی حالت یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء تک یہ اپنی حالت پر قائم رہا مگر اس ہنگامہ میں یہ مدرسہ لٹ گیا۔ اس کے کڑی تختے تک اُتار لیے گئے اور زمین ضبط ہو گئی۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اب یہاں پورا محلہ آباد ہے، جو اب تک مدرسہ شاہ عبدالعزیز کے نام سے مشہور ہے۔ (دارالحکومت دہلی، از مولوی محمد بشیر صاحب ج ۲ صفحہ ۲۸۶۔ ج ۳ صفحہ ۱۶۷)۔

۶۴۔ امام عبدالعزیز صاحب سے تربیت پا کر اُن کے داعی اطراف ہند میں پھیل گئے۔ اس زمانہ کے ایک عالم نے اس لیے سیاحت کی کہ اُسے علم حدیث کا کوئی ایسا استاذ ملے جو امام عبدالعزیز صاحب کا شاگرد نہ ہو۔ مگر ہند میں اُسے ایک مدرس بھی ایسا نہیں ملا۔ (سیاسی تحریک صفحہ ۱۱۸)۔

۶۵۔ نہ صرف حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب بلکہ آپ کا پورا گھرانہ اس تربیت میں کمال رکھتا تھا۔ اُنہیں روحانی کمالات کا ایک اثر یہ تھا کہ اس خاندان نے کبھی شاہی منصب یا شاہی جاگیر منظور نہیں کی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے دادا شاہ عبدالرحیم صاحب سلطان عالمگیر کے زمانہ کے مشہور عالم تھے۔ بادشاہ نے آپ کو اس علماء کے بورڈ کا ممبر بنانا چاہا جو فقہ حنفی کے فتاویٰ مرتب کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ آپ کی والدہ کی بھی خواہش ہوئی کہ اس بورڈ میں شریک ہو جائیں تو عزت و عظمت بھی حاصل ہو، اور رات دن آنے والی کی فکر سے بھی نجات ملے۔ مگر آپ نے بادشاہ کو صاف جواب دے دیا۔ ماں سے معذرت کر دی اور اسی نانِ جویں پر خدمت خلق کرتے ہوئے زندگی گذار دی۔ البتہ وقتاً فوقتاً اُن علماء کی رہنمائی اور مفید مشورے ضرور دیتے رہے جو بورڈ میں کام کرتے تھے۔ ایک طرف حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی عظمت و عزت کا یہ عالم ہے کہ شاہزادے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور پاؤں دبانے کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں (ملفوظات صفحہ ۵۳)۔ بر سر راہ نوابوں اور اُمراء سے ملاقات ہو جاتی ہے تو وہ اپنی سواریوں سے اُتر کر مصافحہ اور مزاج پرسی کرتے ہیں (صفحہ ۱۵) بادشاہ سے بھی ملاقات ہوتی ہے تو وہ بھی مصافحہ کرنے میں پورے احترام سے پیش آتے ہیں۔ پریشانی کے اوقات میں آپ سے دعا کی استدعا کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف قناعت اور سیر چشمی کا یہ عالم ہے کہ کسی شاہی عطیہ کا قبول کرنا تو درکنار، بادشاہ اور امراء کی ہمت بھی نہیں پڑتی تھی کہ وہ کچھ پیش کریں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہماری پیش کش نظر حقارت سے مسترد کر دی جائے گی۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں   خاک بر فرق قناعت بعد ازیں (خسرو)

ملفوظات کے حوالے سے ایک واقعہ بطور مثال پیش کیا جاتا ہے

دہلی میں وبا پھیلی۔ مسلمانوں نے طے کیا کہ جامع مسجد میں جمع ہو کر وہ کلام پڑھیں اور دعا کریں۔ بادشاہ کی طرف سے اجتماع کا انتظام کرایا گیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں بادشاہ کی طرف سے خاص ایلچی نے حاضر ہو کر اس اجتماع میں شرکت کی درخواست کی۔ ۸ بجے کا وقت مقرر تھا۔ جب شاہ صاحب پہنچے، اُسی وقت بادشاہ کی سواری بھی پہنچی۔ جامع مسجد کے زینہ پر ملاقات ہوئی۔ بادشاہ نے بڑھ کر مصافحہ کیا، اور معذرت کی کہ یہاں تشریف لانے میں جناب کو تکلیف ہوئی۔ وقت عزیز صرف ہوا معاف فرمایئے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب: یہ سب کچھ خلق خدا کے نفع کے لیے ہوا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے بعد بادشاہ نے درخواست کی کہ چھوٹے بھائی مولانا رفیع الدین صاحب سے فرمایئے کہ وہ نماز پڑھائیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ یہ منصب امام جامع مسجد کا ہے اُن سے فرمایئے وہی نماز پڑھائیں گے۔ نماز کے بعد دعا اور استغفار کا وقت آیا۔ بادشاہ نے اصرار کر کے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کو اپنے پاس بلایا۔ آپ مجبوراً بادشاہ کے قریب پہنچے۔ مگر دہلی کے ایک بزرگ شاہ غلام علی صاحب کو آگے بڑھا کر خود پیچھے ہٹ گئے (ملفوظات صفحہ ۷۸، ۸۷) مختصر یہ کہ بادشاہ وقت کی نظر میں یہ احترام تھا مگر نہ بادشاہ کو یہ ہمت ہوتی تھی کہ کچھ پیش کریں اور نہ اس طرف یہ امکان تھا کہ شاہی پیش کش منظور کر سکیں جس کے حلال و پاک ہونے میں بھی شبہ تھا اور جس سے یہ بھی خطرہ ہو سکتا تھا کہ آزادیٔ رائے باقی نہ رہ سکے۔ آپ ایک دارالعلوم اور یونیورسٹی کے اعزازی پرنسپل اور صدر مدرس بھی تھے۔ دارالعلوم میں لنگر جاری رہتا مگر گھر کے آدمی فاقہ کے خوگر تھے۔ ایک مرتبہ چند وقت کے فاقہ نے بچوں تک کو نڈھال کر دیا۔ ایک خادمہ نے کہیں اس کا تذکرہ کر دیا۔ آپ نے اُس خادمہ کو علیحدہ کر دیا کہ ہمارے گھر کا راز فاش کرتی ہے (امیر الروایات) ایک دوست نے مطالعہ کے لیے کچھ کتابیں منگائیں۔ ان کی جلدیں بوسیدہ تھیں تو نئی جلدیں بندھوا دیں۔ جب حضرت شاہ صاحب کے پاس واپس پہنچیں تو چونکہ یہ دوست سرکاری وظیفہ دار تھے، شاہ صاحب نے وہ جلدیں توڑ دادیں کہ سرکاری آمدنی کا کوئی ذرہ بھی اپنے کام نہ آنے پائے۔ مولانا رحیم بخش صاحب کی روایت یہ ہے کہ وفات کے وقت شاہ عبدالعزیز صاحب نے وصیت فرمادی تھی کہ وفات کی اطلاع بادشاہ کو نہ دی جائے (حیات ولی صفحہ ۳۴۴)۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ خدمت خلق کے جذبہ نے اس خاندان کو اس پر آمادہ کیا تھا کہ طبابت کو ذریعہ معاش بنائیں۔ (ملفوظات صفحہ ۴۳)۔

۶۶۔ مولانا رحیم بخش صاحب دہلوی کا بیان ہے کہ ہفتہ میں دو بار منگل اور جمعہ کو چہ چیلان (دہلی) (پرانے مدرسہ) میں مجلس وعظ منعقد ہوتی تھی۔ جس میں خواص و عوام مور و ملخ سے زیادہ جمع ہو جاتے تھے۔ آپ کی معجزانہ تقریر میں وہ اثر ہوتا تھا کہ مخالفین گھروں سے اعتراض کا ارادہ کر کے چلتے لیکن وہاں بجز سکوت اور تسلیم کے کسی کو دم مارنے کی گنجائش نہ ہوتی۔ آپ کا طرز بیان ایسا عجیب تھا کہ ہر مذہب و ملت کا آدمی مجلس سے خوش ہو کر اٹھتا تھا اور آپ کی کوئی بات کسی پر گراں نہیں گذرتی تھی۔ آپ کو خلق خدا کی خدمت کا خیال ہر وقت رہتا تھا۔ انتہا یہ کہ زیادتی مرض کے زمانہ میں جب وعظ کا دن آیا تو آپ نے دوسروں کے سہارے بیٹھ کر وعظ شروع کیا۔ تقریر شروع ہوئی تو آپ نے سہارا دینے والوں کو بھی الگ کر دیا اور حسب معمول تقریر فرماتے رہے۔ لب و لہجہ سے کمزوری اور ناتوانی کے آثار نمایاں تھے۔ مگر استقلال ویسے ہی اپنا رنگ جمائے ہوئے تھا۔ ختم تقریر پر آپ نے دعا کی، چند وصیتیں فرمائیں۔ پھر چند روز بعد وفات ہوگئی (حیات ولی)

تقریر میں کیا ہوتا تھا

ملفوظات کے ایک فقرہ سے ان تقریروں کے مضمون کا اندازہ ہو جائے گا۔ آپ نے فرمایا۔ اگر مجھے غازی الدین حیدر (شاہ اودھ) اپنے یہاں بلائیں (بشرطیکہ جاگیر اور منصب کی کوئی پیچ کی ہوئی نہ ہو) تو میں ضرور پہنچوں اور اس انداز سے تقریر کروں کہ اُن کی آنکھیں کھل جائیں اور راہ راست پر آجائیں۔ پھر فرمایا۔ اب مجھے اپنے قتل کیے جانے کا بھی خوف نہ رہا۔ صرف یہ وسوسہ آتا ہے کہ اگر اسی حالت میں قتل کر دیا جاؤں تو جو کام پیش نظر ہے وہ ادھورا رہ جائے گا۔ (ملفوظات صفحہ ۵۱)

غازی الدین حیدر، اودھ کے نواب تھے۔ ان کے باپ دادا (سعادت علی خاں، شجاع الدولہ، صفدر جنگ وغیرہ) اس پر فخر کیا کرتے تھے کہ ان کو دربارِ دہلی سے منصبِ وزارت حاصل ہے مگر آپ نے دربارِ دہلی کا یہ تعلق منقطع کر دیا اور انگریزی گورنر جنرل کی زیرِ سرپرستی اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ (قیصر التواریخ۔ تاریخ اودھ۔ عماد السعادت وغیرہ)

۶۷۔ مولانا محمد رحیم بخش صاحب دہلوی مصنف حیاتِ ولی نے مولانا فضل حق خیر آبادی کو بھی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے تلامذہ میں شمار کرایا ہے۔ مگر مولانا خیر آبادی بلا واسطہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد نہیں تھے۔ بلکہ آپ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے شاگرد تھے۔ (سیر العلماء و تذکرۂ علماءِ ہند وغیرہ)۔

۶۸۔ یہ انگریزوں کا حامی گروپ تھا جو بدقسمتی سے مذہباً شیعہ تھے۔ نجف خاں اس کے قائد اور لیڈر تھے جن کو شجاع الدولہ اور انگریزوں کے اصرار پر "امیر الامراء" بنایا گیا تھا۔ مرہٹی راجہ اس منصب پر کسی روہیلہ سردار کو دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اول وہ نجیب الدولہ کے حامی رہے اور اس کی وفات کے بعد نجیب الدولہ کے فرزند ضابطہ خاں کو مرہٹوں کی حمایت حاصل رہی۔ کسی قدر تفصیل آگے آئے گی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نجیب الدولہ کے مداح تھے۔ ایک مرتبہ نجیب الدولہ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ نجیب الدولہ کی سرکار میں تو سو عالم تھے۔ ان کی تنخواہیں پچاس روپے سے لے کر پانچ سو تک تھیں۔ حنفی، شافعی اور مالکی مسلک کے تین علماء قاضی (عدالتِ عالیہ کے جج) مقرر کیے تھے (صفحہ ۸۱ ملفوظات)۔

۶۹۔ شعر یہ ہے۔ (ملفوظات صفحہ ۵۴)

درکوئے نیک نامی مارا گذر ندادند ۔۔۔ گر تو نمی پسندی تغییر کن قضارا

۷۰۔ ملفوظات صفحہ ۵۵۔

۷۱۔ فرزندانِ شاہ ولی اللہ مغفور را، در آنچہ مسجد زینت المساجد (زین سلطانی) از حویلی علیحدہ ساختہ و حویلی را بہ ضبط آوردہ بودند۔ آں حضرت (شاہ فخر الدین صاحب) بحویلی مبارک جا دادند، و غم خواری فرمودند و حویلی مذکور را از جناب سلطان باشان رہانیدند و با اعزاز و اکرام در آنجا رسانیدند۔ (مناقب فخریہ صفحہ ۳۱ بحوالہ تاریخ مشائخ چشت)۔

۷۲۔ امیر الروایات، ارواحِ ثلاثہ صفحہ ۲۴۔

۷۳۔ مناقب فریدی بحوالہ تاریخ مشائخ چشت۔

۷۴۔ ارواحِ ثلاثہ صفحہ ۳۴۔

۷۵۔ دہلی کے جنوب میں سوا سو، ڈیڑھ سو میل کے فاصلہ پر ڈیگ، کامہ، بیانہ قصبات آج بھی مشہور ہیں بھرت پور ان کا مرکزی مقام تھا جو ریاست کی راجدھانی رہا۔ اور ۱۹۴۷ء کے بعد جب ریاستیں ختم ہوئیں تو یہ ضلع کا صدر مقام ہو گیا ہے۔ اس علاقہ کی سرحدیں آگرہ اور متھرا سے ملتی ہیں۔ یہاں تک کہ بھرت پور آگرہ سے تقریباً چونتیس میل ہے۔ چونکہ سری کرشن جی کی پیدائش اسی علاقہ میں ہوئی۔ ان کا خاندان اسی علاقہ میں تھا۔ بھرت پور کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کرشن جی کے چچا کے نام پر آباد کیا گیا تھا اور کامہ میں سری کرشن جی کے نانا رہا کرتے تھے۔ اس لیے ہندو تاریخ کے لحاظ سے یہ علاقہ تاریخی عظمت کے علاوہ مذہبی تقدس بھی رکھتا ہے۔ مغل بادشاہوں کے دورِ عروج میں یہ علاقہ شاہی خاندان کے افراد کی جاگیر ہوا کرتا تھا۔ نور جہاں جو دورِ عروج کی ناموَر ملکہ ہے یہی علاقہ اس کی جاگیر میں عطا ہوا تھا۔ اس علاقہ میں جاٹوں کی آبادی اگرچہ تعداد میں زیادہ نہیں ہے مگر قوت میں ہمیشہ حاوی اور غالب رہی ہے۔ ان کے بہت سے خاندان مسلمان ہو کر میواتی کہلانے لگے۔ وہ مذہباً الگ ہو گئے مگر بود و باش، معاشرت، سیاسی تعلقات حتیٰ کہ جنگ و صلح میں بھی ایک دوسرے کے شریک اور معاون رہے ہیں۔ سلطنتِ مغلیہ کی مرکزی طاقت میں جب اضمحلال شروع ہوا، اور ملک میں طوائف الملوکی پھیلنے لگی تو یہاں کے جاٹوں میں بھی اپنی خود مختار حکومت کی اُمنگ پیدا ہوئی۔ ان کا سردار بدن سنگھ تھا۔ ۱۱۳۵ء میں ڈیگ مقام پر اس کو راج تلک دیا گیا۔ اب وہ ایک خود مختار راجہ کی حیثیت سے حکومت کرنے لگا۔ بھرت پور کو اپنی راجدھانی بنایا۔ اس کے ۲۲ لڑکوں میں "سورج مل" سب سے زیادہ مستعد اور ہوشیار اور سیاسی داؤ پیچ میں چاق و چوبند تھا۔ بدن سنگھ نے

اس کو ولی عہد بنا کر کاروبار حکومت اُس کے سپرد کر دیا۔ اور جب بدن سنگھ تینتیس برس دو ماہ دس دن حکومت کرکے ۱۷۵۶ء، ۱۱۷۰ھ میں اس جہان فانی سے رخصت ہوا تو سورج مل ولی عہد نے مستقل فرمانروائی حیثیت سے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ وہ ۱۷۵۵ء کے اس دور میں جاٹوں کا راجہ بھی تھا اور اُس کے بلند حوصلوں نے اس کو بساط سیاست میں ایسا مہرہ بنا دیا تھا کہ کوئی بھی سیاسی طاقت اس کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

احمد شاہ ابدالی کے مقابلہ میں مرہٹوں نے اس کو اپنانا چاہا تو اُس نے نہایت ہوش مندی سے اپنا پہلو بچا کر نہ صرف اعلیٰ تدبر کا ثبوت دیا بلکہ اپنی ریاست کو بھی محفوظ کر لیا۔ اس وقت سورج مل نے مرہٹوں کو مشورہ دیا تھا کہ بھاری ساز و سامان، شاہانہ خیمے اور حرم سرائیں اُن کے لیے کار آمد نہیں۔ یہ شاہانہ انداز اس موقع پر وبال جان ثابت ہوگا۔ وہ ہمیشہ سے گوریلا جنگ کے عادی ہیں۔ اسی جنگ سے وہ ابدالی کو شکست دے سکیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ یہ تمام ساز و سامان ریاست بھرت پور کے قلعوں میں محفوظ کر دیا جائے۔ اور جریدہ گھوڑے سوار ابدالی کا مقابلہ کیا جائے۔ مرہٹوں کے سرداروں نے اس رائے سے اتفاق کیا مگر سداشیوراؤ عرف بھاؤ جو کمانڈر انچیف اور جنگ کا انچارج تھا اس رائے سے متفق نہیں ہوا، اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ سورج مل جو ایک زمیندار کی حیثیت رکھتا ہے لڑنا کیا جانے" فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔" بہرحال سورج مل کو موقع مل گیا اور وہ شریک جنگ نہیں ہوا۔ سورج مل نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ معمولی سی بات پر اپنے پرانے دوست نجیب الدولہ کو اپنا مخالف بنا لیا اور جب کہ نجیب الدولہ بیمار تھا، اُس نے کوچ کرکے دہلی پر حملہ کر دیا مگر نتیجہ برخلاف رہا۔ نجیم کے لوگوں سے سورج مل زخمی ہو کر گرا۔ اور دشمنوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ جب سورج مل زخمی پڑا ہوا تھا تو اُس کے مخلص رفقاء جو اُس کی حفاظت کر رہے تھے، اُن میں ایک مسلمان پیرزادہ شیخ احمد بھی تھے۔ اُن کا وطن فتح پور تھا۔ مگر یہ سورج مل کے معتمد تھے۔ یہ بھی اُسی مدافعت میں کام آئے اور آخرکار سورج مل بھی یہیں قتل کر دیا گیا۔ ۱۱۷۷ھ مطابق ۱۷۶۳ء میں یہ حادثہ پیش آیا۔ صرف ۸ سال دو ماہ چودہ دن حکومت کرنے کا موقع ملا۔ (تاریخ راجستھان از کرنل ٹاڈ۔ وقائع راجستھان از حکیم محمد الغنی صاحب)

۷۶۔ نظام الملک جو دکن میں اپنی حکومت کی بنیاد ڈال رہا تھا اور دہلی کی مرکزی حکومت پر بھی اپنا اقتدار قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے سب سے پہلے مرہٹوں کو دہلی کا راستہ بتایا۔ ۱۱۴۹ھ مطابق ۱۷۳۶ء میں مرہٹے دہلی میں فاتحانہ داخل ہوئے اور چند روز قیام کرکے ایک معاہدہ کے بعد واپس ہوگئے۔ مرہٹوں کو اس یلغار میں صرف اتنا ہی فائدہ ہوا کہ چوتھ کا مطالبہ جو عالمگیر کے زمانہ سے اب تک ناکام تھا۔ اس معاہدہ میں تسلیم کر لیا گیا۔ البتہ نظام الملک کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اُس کی نو نہاد ریاست مرہٹوں کی دست برد سے محفوظ ہوگئی اور اُس کے حریف وزراء کو نیچا دیکھنا پڑا، کیونکہ بقول طباطبائی اگرچہ بادشاہ کو یقین تھا کہ مرہٹوں کی یہ مصیبت نظام الملک کی لائی ہوئی ہے مگر اس کے دفعیہ کی شکل بھی اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ نظام الملک کی دل جوئی کی جائے۔ چنانچہ مرہٹوں کی روانگی کے بعد بادشاہ نے ۱۱۵۰ھ مطابق ۱۷۳۷ء میں نظام الملک کو شفقت آمیز فرامین لکھ کر دہلی طلب کیا۔ اسی دل جوئی کے لیے "وکالت مطلق" کا سب سے بڑا عہدہ، آصف جاہ کا خطاب اور ہشت ہزاری منصب عطا کیا۔ (سیر المتاخرین وغیرہ) بہرحال اس حملہ کے بعد مرہٹوں کا نیا تعلق دہلی سے قائم ہوگیا۔ ادھر نظام الملک کی اس حرکت کے جواب میں شیعہ وزراء نے نادر شاہ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کا مشہور حملہ ہوا۔ نادر شاہ تخت دہلی تو محمد شاہ کے حوالہ کر گیا لیکن صوبہ کابل، صوبہ سندھ اور پنجاب کے کچھ محالات (اضلاع) سلطنت ایران میں داخل کر لیے۔ اس تقسیم سے ایک نئے فتنہ کا دروازہ کھل گیا کیونکہ بادشاہ ایران اس علاقہ میں اپنا نظام قائم کرنا چاہتا تھا اور ہندوستان سے اُبھرنے والی طاقتیں اس علاقہ کو اپنے قبضہ میں لانا چاہتی تھیں۔ کچھ عرصہ بعد ابدالی کے حملوں کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مرہٹوں نے اس علاقہ میں تاخت کی تھی جس کو ایران اپنا علاقہ سمجھنے لگا تھا۔

۷۷۔ "کپور تھلہ کے سکھ سردار" جسا سنگھ" نے ۱۷۴۳ء میں لاہور پر حملہ کرکے لاہور کے صوبہ دار زکریا خان کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد تصادم کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۱۷۶۱ء میں جسا سنگھ نے دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ ابدالی کو جیسے ہی خبر ہوئی،

اُس نے دہلی کا قصد کیا۔ "جسا سنگھ" ابدالی کی آمد کی خبر سن کر دہلی سے واپس ہوا اور پہاڑوں میں جا کر پناہ لی۔ اس کے بعد دہلی پر حملہ تو نہیں کیا مگر پنجاب میں اُس کی تاخت و تاراج کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۱۷۸۲ء میں اُس کا انتقال ہو گیا (تاریخ کپور تھلہ لیپل گرفن، انڈر سکریٹری گورنمنٹ پنجاب ۱۸۷۳ء)۔

۷۸۔ احمد شاہ درانی یا ابدالی، ایک افغانی سپاہی تھا۔ نادر شاہ کی فوج میں ملازم تھا۔ ترقی کر کے فوج کا افسر ہو گیا اور نادر شاہ کا اعتماد حاصل کر لیا۔ ۱۱۶۰ھ مطابق ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ اپنے ملازموں کے ہاتھ سے مارا گیا تو اس فوجی حکومت کی باگ ڈور احمد شاہ درانی کے ہاتھ میں آئی چونکہ صوبہ پنجاب میں خلفشار تھا اس لیے حکومت سنبھالتے ہی احمد شاہ کو ہندوستان کا رخ کرنا پڑا۔ اور اس طرح ابدالی کے حملوں کا آغاز ہو گیا۔ یہاں تک کہ ۱۱۷۱ھ میں رگھنا تھ راؤ اور شمشیر بہادر، برادران بالاجی راؤ اور ہولکر وغیرہ نے پنجاب پر حملہ کر کے لاہور کو فتح کر لیا اور ابدالی کے لڑکے تیمور شاہ کو فرار ہو کر کابل جانا پڑا (سیر المتاخرین) اس کے جواب میں احمد شاہ کو چھٹی مرتبہ ہندوستان آنا پڑا اور پانی پت کا وہ معرکہ کرنا پڑا جو تاریخ کا مشہور واقعہ ہے۔

۷۹۔ سلطان عالمگیر کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک سادات بارہ کا اقتدار یہاں تک بڑھا کہ حسن علی خاں اور عبداللہ خاں کو بادشاہ گر کہا جانے لگا مغلیہ تاج و تخت اُن کے پنجۂ اقتدار میں تھا جس کو چاہتے معزول کر کے کسی دوسرے کو اُس کا جانشین بنا دیتے۔ بالآخر بادشاہ اور نظام الملک آصف جاہ اول کی باہمی سازش سے اُن کا اقتدار ختم ہوا، تو ایک طرف میر محمد امین برہان الملک نواب سعادت علی خاں نے آودھ میں اپنی گدی سنبھال کر بادشاہ کو زیر نگیں رکھنا چاہا۔ دوسری طرف نظام الملک اپنے اس حق سے (جو اس بنا پر کہ اس نے بادشاہ کو حسن علی خاں اور عبداللہ خاں کے پنجۂ اقتدار سے نجات دلائی تھی) کسی طرح دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ چنانچہ برہان الملک کا اقتدار بڑھنے لگا تو نظام الملک نے مرہٹوں کو شہ دے کر دہلی کو تاراج کرا دیا۔ اس کے بعد اگرچہ وزارت برہان الملک کے حصہ میں رہی مگر وزارت سے بھی بلند مرتبہ "وکالت مطلقہ" نظام الملک کو عطا ہوا۔ اس جوابی کارروائی کے لیے برہان الملک کے پاس کوئی ہندوستانی مہرہ نہیں تھا تو اُس نے ایران کے خونخوار مہرہ "نادر شاہ" کو دعوت دی۔ نادر شاہ کے حملہ اور کامیابی کے بعد بھی نظام الملک کی چال کامیاب ہوئی تھی یعنی صرف دو کروڑ روپیہ پر نادر شاہ سے گفتگو کر کے اس کو واپس چلے جانے پر آمادہ کر لیا تھا اور حسن کارکردگی کے صلہ میں مغل دربار سے امیر الامرائی کا منصب حاصل کر لیا تھا۔ مگر برہان الملک خاموشی سے اپنی اس آخری ناکامی کو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ چنانچہ نادر شاہ کو خاص دہلی پر حملہ کرنے اور دہلی کو لوٹنے پر آمادہ کیا۔ جس کا نتیجہ وہ قتل عام ہوا۔ جس کے چرچے آج تک بچوں اور بڑوں کی زبان پر ہیں۔ مگر برہان الملک کو خبر نہ تھی کہ فرشتۂ موت اس کی تاک میں ہے ابھی بھی وہ نادر شاہ سے اپنی اس خدمت کا صلہ بھی نہیں پا سکا تھا کہ سرطان کا حملہ شدید ہوا، اور دنیا سے رخصت ہو گیا۔

اس عرصہ میں ایک تیسری طاقت، دہلی کے شمال پڑوس میں جنم لے رہی تھی۔ یہ روہیلہ پٹھانوں کی طاقت تھی جو علی محمد خاں اور ان کے نوجوان رفیق اور بعد کے جانشین حافظ رحمت خاں کی قیادت میں روز افزوں ترقی کر رہی تھی۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے تھوڑے دنوں میں ایک باحیثیت حکومت بن گئی۔ جس کو ختم کرنے کے لیے وارن ہیسٹنگس کو بھرپور غداری اور مکاری سے کام لینا پڑا۔ اسی روہیلہ طاقت کا ایک جز بنگش خاندان تھا جس کے سربراہ اس زمانہ میں نواب محمد خاں بنگش تھے۔ اسی طاقت کا ایک رکن نجیب خاں تھا جو شاہی دربار میں رسائی حاصل کر کے اس بساط کا کامیاب مہرہ بنا۔ اور نجیب الدولہ خطاب مع اس کے لوازمات کے حاصل کیا۔ روہیلوں کی یہ طاقتور حکومت اپنے محل وقوع کے لحاظ سے قدرتی طور پر برہان الملک کے جانشینوں صفدر جنگ اور شجاع الدولہ (نوابان اودھ) کے لیے خطرہ تھی۔ چنانچہ ایک نئی کشمکش پیدا ہوئی، جو نادر شاہ کے بعد ابدالی کی آمد کا سبب بنی۔

۸۰۔ پہلے گذر چکا ہے کہ ۱۱۵۰ھ مطابق ۱۷۳۷ء میں نظام الملک آصف جاہ اول کو "وکالت مطلقہ" کا منصب عالی ملا تھا۔ نظام الملک یہ عہدہ حاصل کر لینے کے بعد کچھ عرصہ دہلی رہے پھر حیدرآباد چلے گئے اور اپنے بڑے لڑکے غازی الدین خاں کو اپنا

نائب مقرر کر گئے۔ نظام الملک اور غازی الدین خاں کی یہ طاقت مرہٹوں کے سہارے تھی۔ بادشاہ پر غازی الدین خان کا قبضہ ہو گیا تو اُس نے مرہٹوں کو برہان الملک کے جانشینوں (نوابانِ اودھ) کے پیچھے لگا دیا، اور نجیب الدولہ کو زیر کرنے کے لیے بھی اسی طاقت سے کام لیا۔ لیکن بادشاہ کا رجحان نجیب الدولہ کی طرف تھا اور اتفاق ایسا ہوا کہ مرہٹوں کو نواب اودھ (شجاع الدولہ) سے شکست اٹھانی پڑی۔ پھر جب مرہٹوں نے روہیلوں پر حملہ کیا تو حافظ رحمت خاں، نجیب الدولہ اور احمد خاں بنگش نے متفق ہو کر اور شجاع الدولہ سے مدد حاصل کر کے مرہٹوں کو شکست دے دی۔ غازی الدین خاں کی جب یہ چال کارگر نہ ہوئی اور خطرہ ہوا کہ نجیب الدولہ اور شجاع الدولہ یعنی اودھ اور روہیل کھنڈ کی طاقتیں جس طرح مرہٹوں کے مقابلہ میں متحد ہو گئی تھیں اسی اتحاد سے وہ دہلی پر قبضہ کر کے بادشاہ کو اپنے قبضہ میں کر لیں گی، اور غازی الدین خاں کو آٹے کے بال کی طرح الگ نکال کر پھینک دیں گی تو غازی الدین خاں کے لیے سہل صورت یہی تھی کہ نخل آرزو ہی کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے۔ چنانچہ اُس نے بادشاہ کے قتل کی سازش کی اور اس میں کامیاب ہو گیا۔ اس تعدی اور دست درازی سے متاثر ہو کر نجیب الدولہ وغیرہ نے ابدالی سے امداد کی درخواست کی۔ سیر المتاخرین کے الفاظ یہ ہیں:

"نجیب الدولہ وجمیع افاغنہ (روہیلہ) وراجہ ہائے ہندوستان از دست مرہٹہ و عماد الملک (غازی الدین خاں) بجان آمدہ عرائض بخدمت احمد شاہ ابدالی نگاشتہ استدعا ورود او در ہندوستان کردند الخ"

اس موقع پر یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ احمد شاہ ابدالی کو بلانے والے صرف مسلمان ہی نہیں تھے راجہ ہائے ہند بھی تھے۔ اسی طرح ابدالی کے مقابلہ پر صرف مرہٹہ ہی نہیں بلکہ غازی الدین خاں نائب نظام الملک آصف جاہ والی حیدرآباد بھی تھا۔ اسی بنا پر اس کو نہ ہندو مسلم جنگ کہنا صحیح ہے، نہ شیعہ سنی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ جنوبی ہند اور شمالی ہند کے دو گروہوں کا تصادم تھا۔ محمد میاں

۸۱۔ پہلے صفحات کے حاشیہ میں گذر چکا ہے کہ برہان الملک وغیرہ کو زک دینے اور بادشاہ پر اپنا قبضہ جمانے کے لیے نظام الملک آصف جاہ اول نے مرہٹوں کو دہلی کی طرف بڑھایا اور پھر اس دباؤ میں بادشاہ سے وکالت مطلقہ کا منصب حاصل کیا۔

۸۲۔ اصل نام قمر الدین خاں۔ عرصہ تک چین قلیچ خان بہادر کے خطاب سے مخاطب رہے۔ پھر فتح جنگ، نظام الملک آصف جاہ کے شاہی خطابات سے سرفراز ہوئے اُن کے دادا عابد خاں تھے۔ سمرقند (تاتار) سے تین کوس کے فاصلہ پر موضع علی آباد میں پیدا ہوئے۔ پھر تحصیل علم کے بعد وہ درجہ پایا کہ شیخ الاسلام کہے جانے لگے۔ شاہ جہاں بادشاہ کے زمانہ میں دہلی آئے۔ منصب و جاگیر حاصل کیا۔ پھر عالمگیر کا تقرب و اعتماد حاصل کر کے ماہولی کے قلعدار رہے۔ قلعہ گولکنڈہ پر جب عالمگیر حملہ کر رہا تھا تو عابد خاں توپ کے گولے سے زخمی ہوئے اور ۲۴ ربیع الاول ۱۰۹۷ھ مطابق ۱۶۸۶ء کو وفات پا گئے۔ ان کے ضبط و تحمل اور استقلال کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ زخمی ہونے کے بعد جملۃ الملک اسد خاں مزاج پرسی کو پہنچے تو اس وقت جراح شانے میں سے ہڈی کی کرچیں نکال رہا تھا، اور وہ چار زانو بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے اور دوسرے ہاتھ سے قہوہ پی رہے تھے اور خندہ پیشانی سے کہہ رہے تھے کہ جراح اچھا کاریگر ہے مگر اس زخم سے شفایاب نہ ہو سکے۔ نظام الملک آصف جاہ کے والد میر شہاب الدین تھے۔ غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ معروف بخان فیروز جنگ آبائی وطن تاتار میں پیدا ہوئے اور جب عابد خان ہندوستان پہنچ کر شاہی منصب پر فائز ہو گئے تو انہوں نے اس فرزند دلبند کو بھی بلا لیا۔ ۱۰۷۹ھ مطابق ۱۶۶۹ء میں ہندوستان پہنچ کر شاہی ملازمت سے باریاب ہو کر ترقی کے راستہ پر گامزن ہوئے۔ ۱۱۰۰ھ میں ہندوستان میں طاعون کی وبا پھیلی تو ان پر طاعون کا یہ اثر ہوا کہ نابینا ہو گئے۔ پھر بینائی آخر عمر تک واپس نہ آ سکی لیکن شاہی منصب کے فرائض حتیٰ کہ فوجوں کی کمان آخر تک کرتے رہے۔ استسقا کے مرض میں مبتلا ہو کر احمد آباد میں ۱۷؍شوال ۱۱۲۲ھ کو اس جہان سے رخصت ہوئے۔ اپنی زندگی میں دہلی میں اجمیری دروازہ سے باہر مدرسہ تعمیر کرایا تھا، اُسی کے احاطہ میں مقبرہ بنوایا تھا۔ وفات ہوئی تو جنازہ احمد آباد سے دہلی لایا گیا اور اسی مقبرہ میں دفن کیا گیا۔ اسی کے قرب میں کہیں شاہ وجیہ الدین صاحب کا مزار بھی تھا جو اب ناپید ہے۔ یہی مدرسہ اب دلی کالج سے موسوم ہے۔

میر شہاب الدین کا نکاح شاہ جہاں بادشاہ کے مشہور وزیر علامی سعد اللہ خاں کی لڑکی سے ہوا تھا۔ نظام الملک آصف جاہ اسی کے بطن سے تھے۔ ۷۷ سال کی زندگی گذار کر ۴؍جمادی الاخری ۱۱۶۱ھ میں وفات پائی۔ مرنے کے بعد مغفرت مآب خطاب ہوا، اور خلد منزل ۱۱۶۱ھ تاریخ رحلت ہے۔

۸۳۔ نوابان اودھ جو بعد میں شاہان اودھ کہلائے۔ اُن کے مورث برہان الملک نواب سعادت خاں کا اصل نام محمد امین تھا۔ نیشا پور میں پیدا ہوئے۔ عالمگیر کے لڑکے شاہ عالم بہادر شاہ اول کے زمانہ حکومت میں دہلی پہنچ کر شاہی خدمت پر فائز ہوئے۔ پھر محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں سادات بارہ کے سرغنہ "نواب حسین علی خاں" کے قتل کی سازش میں بادشاہ کے مددگار رہے۔ پھر حسین علی خاں مقتول کے بھائی قطب الملک عبداللہ خاں سے مقابلہ اور جنگ میں مستعدی سے کام لے کر فتح حاصل کی۔ اسی صلہ میں پہلے صوبہ اکبرآباد کی حکومت پر فائز ہوئے۔ پھر صوبہ اودھ کی حکومت آپ کے سپرد ہوئی اور مرکزی حکومت کی کمزوریوں کے باعث استقلال کا موقع ملا۔ نادر شاہ کی آمد آپ کی دعوت پر اور دہلی کی لوٹ مار آپ کے مشورہ سے ہوئی اور اسی دوران میں ۹؍ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۹ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ روایت ہے کہ جب برہان الملک اودھ کی صوبہ داری سنبھالنے کے لیے جارہے تھے اور فرخ آباد سے کشتی کے ذریعہ دریائے گنگا کو عبور کررہے تھے تو سیلاب گنگا کی موجوں میں سے ایک مچھلی جست کرکے نواب کے دامن میں آپڑی۔ نواب نے اس کو نیک فال سمجھا۔ اس مچھلی کو محفوظ رکھا۔ اس کی سوکھی ہوئی ہڈیاں واجد علی شاہ کے دور تک عجائب خانہ میں محفوظ تھیں غالباً یہی تصور ہے جس کا اثر نہ صرف قیصر باغ وغیرہ کی تصویروں میں اب تک نمایاں ہے بلکہ حکومت اودھ کے سکوں اور سرکاری کاغذات میں بھی مچھلی کی تصویر نے نمایاں جگہ حاصل کی۔ برہان الملک کے بعد اس کی چار لڑکیاں وارث تھیں۔ سب سے بڑی لڑکی برہان الملک کے بھانجے مرزا محمد مقیم سے منسوب تھی۔ برہان الملک کے بعد مرزا محمد مقیم اُن کے جانشین ہوئے صفدر جنگ خطاب اور عہدہ وزارت دربار دہلی سے حاصل کیا۔ ۱۷؍ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۴ء کو وفات ہوئی۔ ان کے بعد اُن کا لڑکا شجاع الدولہ جانشین ہوا۔

۸۴۔ یعنی نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں، احمد خاں بنگش اور دوندے خاں وغیرہ۔

۸۵۔ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ابدالی کے اس حملہ کا محرک اور اصل سبب یہ تھا کہ مرہٹوں نے ابدالی کے گورنر مع اس کی سکھ فوج کے شکست دے کر مئی ۱۷۵۸ء میں دریائے اٹک تک تمام پنجاب پر قبضہ کرلیا تھا۔ ابدالی کا گورنر اس کا لڑکا تیمور شاہ تھا جس کی امداد کے لیے ابدالی نے ایک پٹھان تجربہ کار سردار جہان خاں کو مقرر کیا تھا۔ باقی یہ بات کہ مرہٹوں نے پنجاب پر حملہ کیوں کیا تھا۔ غازی الدین خاں کی تحریک کے علاوہ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ آدینہ بیگ جس کو جہان خاں نے دوآبہ کی حکومت سے معزول کردیا تھا، اُس نے بھی جہان خاں کے مقابلہ کے لیے مرہٹوں سے مدد مانگی تھی۔ چنانچہ بقول طباطبائی۔

رگھوناتھ راؤ و شمشیر بہادر برادران باجی راؤ مع ہولکر وغیرہ مرہٹہ کہ در جوار شاہجہان آباد (دہلی) رسیدہ انتظار سانحہ می کشیدند۔ آدینہ بیگ نوشتہا متواتر فرستادہ آنہارا بطرف لاہور بمدد خود طلبید۔ (سیر المتاخرین)

۸۶۔ اصل نام میر محمد پناہ، فیروز جنگ اور غازی الدین خاں خطاب تھے یعنی دادا کے خطابات پوتے کو بھی مل گئے تھے۔ یہ میر محمد پناہ، غازی خاں ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء میں یعنی جب نظام الملک آصف جاہ اول کی وفات ہوئی، دہلی میں امیر الامراء تھے۔ نظام الملک کے دوسرے فرزند میر احمد خاں ناصر جنگ باپ کی جگہ دکن میں مسند نشیں ہوئے۔ ۱۲؍محرم ۱۱۶۴ھ مطابق ۱۷۵۰ء کو ناصر جنگ میدان میں مارے گئے تو نظام الملک کی وصیت کے بموجب نظام الملک کا نواسہ سعد اللہ خاں مظفر جنگ مسند نشین ہوا۔ جو فرانسیسیوں کا دوست تھا مگر دو ماہ بعد ۱۷؍ربیع الاول ۱۱۶۴ھ (جنوری ۱۷۵۱ء) کو یہ بھی قتل کردیے گئے۔ تب نظام الملک آصف جاہ کے تیسرے لڑکے میر محمد خاں مسند نشین ہوئے۔ آصف الدولہ صلابت جنگ وغیرہ خطابات ہوئے۔ تیسرے بھائی کی مسند نشینی کے بعد غازی الدین خاں کو بھی جوش آیا اور ابدالی کے معرکہ اور مرہٹوں کی

شکست کے بعد دہلی میں کچھ امیر الامرائی کا مزہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ لہٰذا بادشاہ سے صوبہ داری دکن کی سند لے کر ، کچھ مرہٹوں کی عصائے پیری کے سہارے باپ کی ریاست پر قبضہ کرنے کے لیے دکن کا رخ کیا۔ قلعہ آسیر، برہان پور اور اورنگ آباد فتح بھی کر لیا۔ مگر ابھی فیصلہ کن جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی کہ موت کا نقارہ بج گیا۔ ۷رذی الحجہ ۱۱۶۵ھ (اکتوبر ۱۷۵۲ء) کو ہیضہ میں مبتلا ہوئے اور یکایک دامن زندگی چاک ہو گیا۔ مگر نیرنگی قسمت دیکھیے دیکھے۔ سید محمد خاں آصف الدولہ صلابت جنگ کو بھی دست قضا نے مہلت نہیں دی۔ بڑے بھائی کے حملہ سے نجات ملی تھی تو چھوٹے بھائی میر نظام علی خاں نے سازش کر کے معزول کر دیا اور قلعہ بیدر میں نظر بند کر دیا۔ جہاں زندگی کے باقی دن (ایک سال تین ماہ چھ روز) گذار کر ۲۰ ربیع الاول ۱۱۷۷ھ، ستمبر ۱۷۶۳ء میں قید زندگی سے نجات پائی۔ اب میر نظام علی کو یہ حکومت ایسی راس آئی کہ ۴۲ برس تک فرمانروائی کرتے رہے۔ سلطان ٹیپو، فرانسیسیوں اور انگریزوں کے معرکے بہت کچھ پیش آئے۔ سیاسی چالیں بھی رنگ برنگ اختیار کرنی پڑیں مگر تخت حکومت سے علیحدگی مرنے کے بعد ہی ہوئی۔ ۴۲ برس ریاست کر کے ساڑھے ستر سال کی عمر میں ۱۷ ربیع الثانی ۱۲۱۸ھ، ۷ اگست ۱۸۰۳ء کو انتقال ہوا۔ آپ کے انتقال پر نظام الملک آصف جاہ اول کے لڑکوں کا سلسلہ ختم ہوا۔

۸۷۔ ۶؍جمادی الاخریٰ ۱۱۷۴ھ (تاریخ ہندوستان ج۹) (۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء) روز شنبہ۔

۸۸۔ طباطبائی کے الفاظ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ عماد الملک (غازی الدین خاں) بر جان خود ترسیدہ نزد یک سورج مل جاٹ، جابرادرا کی انفصال قضیہ تنازعت مرہٹہ وابدالی وانتظار مشاہدہ پایان این مشاجرہ کہ تا کجا انجامد۔ رفتہ نشست وپناہ بقلاع مستحکمہ او برد (سیر المتاخرین)

۸۹۔ ان رقابتوں کے سبب سے روہیلوں کی طاقت تین حصوں میں منقسم تھی۔ ۱: حافظ رحمت خاں اور ان کے ساتھی دوندے خاں وغیرہ۔ دارالحکومت آنولہ، جو اب ضلع بریلی کا ایک قصبہ ہے اور مرکزی مقامات بریلی، بدایوں، پیلی بھیت، شاہجہان پور وغیرہ۔ ۲: نجیب الدولہ۔ دارالحکومت نجیب آباد۔ سہارن پور وغیرہ مرکزی مقامات۔ ۳: احمد خاں بنگش۔ دارالحکومت فرخ آباد۔ ایذکاس گنج وغیرہ مرکزی مقامات

۹۰۔ تاریخ ہندوستان ۲۹۸ ج۹۔

۹۱۔ طباطبائی صاحب فرماتے ہیں: ”چوں عالمگیر ثانی ونجیب الدولہ از عماد الملک (غازی الدین خاں) مطمئن نہ بودند شاہزادہ عالی گہر را کہ خلف اکبر بادشاہ مذکور وولی عہد بود، بعد رفتن شاہ ابدالی بقصد صاروقبل از ورود عماد الملک بہ شاہجہان آباد بمحالات ھانسی وغیرہ در جاگیر دادہ مرخص کردند وگفتند کہ شما وارث ملک ہستید تا جائیکہ توانید عمل خود نمائید (سیر المتاخرین)۔

۹۲۔ جیل خانہ میں ڈلوانے کے بعد وہ مروا بھی دیتا کیونکہ وہ شاہزادے یعنی عالی گوہر کے چھوٹے بھائی اس کے پاس پہلے سے تھے۔ وہ ان میں سے کسی کو ولی عہد بنا کر بادشاہ گری کا شعبدہ دکھا سکتا تھا۔

۹۳۔ جن میں ایک راجپوتانہ تھے، دوسرے جعفر اور تیسرے سید علی اعظم خاں جو شاہزادہ کی آڑ بن کر اس موقع پر شہید ہو گئے۔

۹۴۔ تاریخ ہندوستان از شمس العلماء ذکاء اللہ خاں سیر المتاخرین کی فارسی عبارت ملاحظہ فرمایئے۔ ”چوں در آں ایام انقلاب عظیم در بنگالہ روئیداد میر محمد جعفر خاں باعانت جماعت انگلشیہ تسلط یافتہ بود، شاہزادہ را دلالت تسخیر بنگالہ نمود وزادراہے گزرانیدہ مرخص نمود۔

۹۵۔ سچ بات یہ ہے کہ سادات بارہ کے زوال کے بعد یہ شعبدہ بازی نظام الملک آصف جاہ اور اُن کے نائب وفرزند غازی الدین خاں نے کی۔ چنانچہ چند سال پہلے (۱۰رشعبان ۱۱۶۷ھ، جولائی ۱۷۵۴ء میں) احمد شاہ بادشاہ کو معزول کر کے اعز الدین پسر معز الدین جہاندار شاہ کو تخت نشین کر کے عالمگیر ثانی کا خطاب دے چکا تھا۔ ایک مہینہ کے بعد معزول بادشاہ اور اس کی ماں کی آنکھیں نکلوا کر اندھا بھی کر دیا تھا کہ چشم عبرت زمانہ کی نیرنگیوں کا تماشا بھی نہ کر سکے۔

(۹۶ الف) سید الطاف علی بی اے علیگ مصنف حیات حافظ رحمت خاں کے الفاظ میں اس دردناک واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے۔
غازی الدین خاں کو خطرہ تھا کہ احمد شاہ درانی کے آنے پر بادشاہ عالمگیر ثانی میری تمام بدکرداریوں کی ان سے شکایت کریں گے اور نجیب الدولہ کو دوبارہ عروج نصیب ہوگا۔ اس لیے انتظام الدولہ خانخاناں اور بادشاہ کو قتل کرنے کی دل میں ٹھان لی۔ اس زمانہ میں بے چارہ، بیکس بادشاہ عالمگیر ثانی سلطنت کے کاموں سے ہاتھ اٹھا کر صوفیت نشینی میں بسر اوقات کر رہا تھا۔ فقراء پر اعتقاد تھا۔ ایک روز غازی الدین خاں کے شریک سازش مہدی علی خاں نے بادشاہ سے کہا کہ ایک قابل زیارت درویش کامل فیروز شاہ کے کوٹلے میں وارد ہوئے ہیں۔ ان کے کشف و کرامات کی تعریف بیان سے باہر ہے۔ بھولا بھالا بادشاہ مہدی علی خاں کی افتراپردازی سے بے خبر تھا۔ تنہا فقیر با کرامت کی زیارت کو روانہ ہوگیا جب پہلے دروازہ پر پہنچا تو مہدی علی خاں نے تلوار ہاتھ سے لے لی۔ پردہ اٹھا کر اندر لے گیا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ مرزا بابر بادشاہ کا داماد ساتھ تھا۔ اس نے تلوار کھینچ کر ایک آدمی کو زخمی کیا مگر اس کو چند آدمیوں نے مغلوب کر کے اور بادشاہ کے محافہ میں بٹھا کر قلعہ سلیم روانہ کر دیا۔ بادشاہ اندر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ موت کے فرشتوں سے مقابلہ ہے۔ چار ازبک ننگی تلواریں لے کر بادشاہ پر پل پڑے۔ سر کو تن سے جدا کر دیا اور تن بے سر کو جمنا کے ریت پر پھینک دیا۔ بدمعاشوں نے ظلم کیا کہ لاش کے کپڑے اتار کر لے گئے۔ کئی روز بعد بادشاہ کی لاش ہمایوں کے مقبرے میں دفن ہوئی۔

۹۶ ب۔ غازی الدین خاں اگرچہ مسلمان تھا مگر رئیس دکن کا نسب وخانخدہ ہونے کے سبب سے مرہٹوں کا شریک تھا۔

۹۷۔ محمد قلی خاں شجاع الدولہ کا بھائی تھا۔ شجاع الدولہ کے والد مرزا محمد مقیم جو بعد میں صفدر جنگ ہوئے اور محمد قلی خاں کے والد مرزا محمد حسن صفدر جنگ کے بڑے بھائی برہان الملک میر محمد امین ان دونوں کے ماموں تھے۔ چونکہ ان دونوں کی والدہ کا انتقال بچپن میں ہوگیا تھا تو ماموں ہی نے ان کی پرورش کی تھی۔ پھر برہان الملک نے اپنی لڑکی کا نکاح مرزا محمد مقیم سے کر دیا تھا۔ تو مرزا محمد مقیم صفدر جنگ داماد بھی ہوگئے تھے۔ (قیصر التواریخ جلد اول)

۹۸۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شجاع الدولہ نے اس کو آمادہ کیا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ محمد قلی خاں الٰہ آباد میں رہے۔ وجہ یہ تھی کہ صفدر جنگ کی وفات کے بعد ایک جماعت کی کوشش یہ تھی کہ شجاع الدولہ مسند نشین نہ ہو بلکہ محمد قلی خاں کو یہ منصب سپرد ہو۔ اسی بناء پر شجاع الدولہ محمد قلی خاں کو اپنا حریف سمجھتا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح یہ کانٹا نکل جائے۔

۹۹۔ بظاہر صحیح یہ ہے کہ فتح نہیں کیا تھا لیکن مورچے اس طرح قائم کیے گئے تھے کہ فتح یقینی تھی کہ دفعتاً اس کو اپنے ملک کے خلفشار کا علم ہوا، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ انگریزوں کی تازہ دم فوج شہر کی حفاظت کے لیے آ رہی ہے تو وہ بدحواس ہو کر واپس روانہ ہوگیا۔

۱۰۰۔ تاریخ ہندوستان اور سیر المتاخرین۔

۱۰۱۔ یہ تخت سلطنت کیا تھا؟ کھانے کی دو میزیں تھیں جن کو ملا کر ان کے اوپر قالین بچھا دیا گیا تھا۔

۱۰۲۔ اور حکم دیا کہ تاریخ انتقال سے میری تاریخ جلوس شمار ہو (تاریخ ہندوستان ج ۹)

۱۰۳۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس نے خود یہ رائے دی کہ مجھے شجاع الدولہ کے پاس لکھنؤ جانے دو۔ اس کو یہ اعتماد تھا کہ جیسے ہی شجاع الدولہ سے منہ در منہ گفتگو ہوگی ساری کدورت ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ اپنی فوج کو الٰہ آباد چھوڑا، اور چند ساتھیوں کے ساتھ لکھنؤ پہنچے۔ شجاع الدولہ نے بڑے تپاک سے معانقہ کیا۔ مگر محمد قلی خاں معانقہ کے بعد پلٹا تو وہ گرفتار تھا۔ اور جب شجاع الدولہ پورنی پت جانے لگا تو اس کے قتل کا حکم دے گیا۔ راجہ بینی بہادر نے اس کا تمام سامان و اسباب جو الٰہ آباد میں تھا لوٹ لیا۔ فوج کو بھی تباہ کر دیا۔ (تاریخ اودھ ج ۲)۔

۱۰۴۔ فرانسیسی جرنیل۔

۱۰۵۔ عماد السعادت، قیصر التواریخ و تاریخ اودھ وغیرہ۔

۱۰۶۔ قیصر التواریخ و عماد السعادت وغیرہ۔

۱۰۷۔ فرح بخش بحوالہ تاریخ اودھ ۱۲۰ و قیصر التواریخ۔

۱۰۸۔ نجف خاں ایران کے ایک شیعہ خاندان کا فرد۔ ابھی جوان ہی ہوا تھا کہ اپنی بہن کے ساتھ ہندوستان آیا۔ طبع رسا اور سازشی فطرت نے اس کا تعارف بہت جلد محمد قلی خاں سے کرا دیا۔ یہ تعارف بہت جلد قرابت بن گیا کیونکہ نجف خان کی بہن محمد قلی خاں کی بیگم بن گئی۔ محمد قلی خاں قتل ہو گیا تو نجف خاں نے شاہ عالم کا رخ کیا اور بہت جلد بادشاہ کا اعتبار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

۱۰۹۔ شخصی حکومتوں میں فاتح ہی کو مالک ملک سمجھا جاتا تھا مگر مغل بادشاہوں کے دو سو سالہ اقتدار نے (جس کے سایہ میں دس بارہ نسلیں گذر چکی تھیں) ایک طرف بادشاہ کے متعلق اوتار کا عقیدہ قائم کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ صبح کے وقت بادشاہ سلامت قلعہ آگرہ کے جھروکے میں بیٹھ کر جمنا میں اشنان کرنے والوں کو درشن دیا کرتے تھے۔ اور اشنان کرنے والے بھی اس درشن کو پوجا کی ایک ضروری رسم سمجھتے تھے۔ دوسری طرف ذہنوں میں رچ چکا تھا کہ ہندوستان کا مالک و وارث مغل بادشاہ ہے۔ جس طرح ایک عرصہ دراز تک عباسی خلیفہ کو تمام مسلمانوں کا صحیح اور جائز حکمران سمجھا جاتا تھا، یہاں تک کہ محمود غزنوی جیسے فاتح نے بھی اپنی حکومت کی تصدیق و تصویب کے لیے خلیفہ عباسی کی سند ضروری سمجھی تھی اور جب اس کو دربار خلافت سے سیف اللہ کا خطاب اور خلعت مل گیا تو وہ مسلمانوں کا صحیح بادشاہ سمجھا جانے لگا۔ ایسے ہی ہندوستان میں ہندو اور مسلمان ہر ایک باشندۂ ملک صرف اسی کو جائز حکمران سمجھتا تھا جس کے پاس مغل بادشاہ کی سند ہوتی تھی۔ چنانچہ مغل بادشاہوں کی قوت و شوکت ختم ہونے کے بعد ایک عرصہ تک اُن کی آمدنی کا بڑا ذریعہ صرف وہ نذرانہ ہوتا تھا جو کوئی شمشیر زن رئیس اپنے مقبوضہ علاقہ پر اپنی حکومت تسلیم کرانے کے مقصد سے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا کرتا تھا تاکہ سند حاصل کر لے۔ شجاع الدولہ نے سندِ وزارت حاصل کرنی چاہی تو دو کروڑ روپیہ بادشاہ کو نذر پیش کیا۔ انتہا یہ کہ مرہٹوں کی جنگ کا اصل مقصد محقق تاریخ کے نزدیک یہ تھا کہ اپنے علاقہ کی سند حاصل کر لیں جس کی بناء پر ان کی حکومت تسلیم کر لی جائے اور ان کو دیش یا خراج حاصل کرنے کا (جو ۲۵ فیصد لینا چاہتے تھے اور جس کو چوتھ کہا جاتا تھا) حق ہو جائے۔ انہیں تاریخی روایات اور عوام کے اسی تسلیم کردہ قانون کے مطابق انگریزوں نے بھی سند حاصل کرنی ضروری سمجھی۔ ورنہ جس بادشاہ کو بار بار شکست دے کر اپنا وظیفہ خوار بنا چکے تھے اس سے سند حاصل کرنے کے کوئی معنی نہیں تھے۔

۱۱۰۔ نجف خاں متوفی ۲۶؍اپریل <u>۱۷۸۲ء</u>، ۳۰؍جمادی الاولیٰ <u>۱۱۹۶ھ</u>

۱۱۱۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی مصنف سیرت سید احمد شہید، جو اس خاندان کے باعث فخر وارث ہیں۔ حضرت مولانا سید ابوسعیدؒ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں "مدراس اور چیناپٹن میں آپ کا بڑا اثر اور مقبولیت تھی (ص ۶۵)۔ حضرت شاہ ابوسعید صاحب کے جود و سخا کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک لاکھ روپیہ آیا۔ گھر کے باہر رکھ دیا اور وہیں ضرورت مندان کو تقسیم کر دیا (ص ۶۵)۔ ممکن ہے یہ نواب حیدر علی (متوفی <u>۱۱۹۶ھ</u>/<u>۱۷۸۲ء</u>) کا عطیہ ہو، جیسا کہ مولانا ابوالحسن علی نے احقر سے زبانی فرمایا تھا کہ خاندانی روایت یہی ہے کہ نواب حیدر علی کے یہاں سے ایک لاکھ روپیہ کا عطیہ آیا تھا۔

۱۱۲۔ سید ابواللیث صاحبؒ اپنے والد ماجد سید ابوسعید صاحب کے خلیفہ تھے۔ آپ حج کے بعد دکن میں رہے اور وہیں <u>۱۲۰۸ھ</u> میں انتقال ہوا۔ کوڑیالی بندر بن سمندر کے کنارے مدفون ہیں۔ از جناب ڈاکٹر عبدالعلی صاحب بحوالہ کتاب سید محمد منان صاحب عم حضرت سید صاحب شہیدؒ۔

۱۱۳۔ ہندوستان کی جدید صوبائی تنظیم کے بموجب یکم نومبر <u>۱۹۵۶ء</u> کو جب "عظیم تر میسور" کا افتتاح ہو رہا تھا تو ہندوستان کی خبر رساں ایجنسی یو۔ پی۔ آئی کی رپورٹ ہے کہ ریاست میسور کے سابق وزیر اعلیٰ مسٹر ہنومنتیا جنہوں نے اس کے قیام کے لیے زبردست جد و جہد کی تھی، حسب ذیل پیغام جاری کیا۔ تاریخی دستاویزات سے ظاہر ہوتا ہے...... کہ ٹیپو سلطان نپولین کے دوست تھے۔ ٹیپو سلطان کے دو مقاصد تھے۔ ایک یہ کہ ہندوستان کو انگریز کے غلبہ سے آزاد کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ

حکومت کو عوامی بنایا جائے۔ چنانچہ ٹیپو سلطان بعض دستاویزات پر "شہری ٹیپو" کے نام سے دستخط کیا کرتے تھے۔ ان کے ڈیڑھ سو سال بعد جو کچھ انڈین نیشنل کانگریس نے حاصل کیا اس کا خواب ٹیپو نے دیکھا تھا اور اس کی خاطر انہوں نے اپنی جان بھی قربان کی تھی۔ انہوں نے اپنے ہی جرنیلوں اور وزیروں کی غداری کی وجہ سے شہادت پائی۔ آج بھی لوگ ان غداروں پر لعنت بھیجتے ہیں جن کے نام میں ٹیپو سلطان کا جو علاقہ تھا آج عظیم تر میسور کا علاقہ بھی اتنا ہی ہے۔ یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ ٹیپو نے منگلور کے قریب ایک بندرگاہ تعمیر کرنے کا کام شروع کیا تھا اور آج پنجسالہ پلان کے تحت اسی جگہ کو ایک عظیم بندرگاہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نئی ریاست میسور کا مستقبل اور اس کے امکانات بڑے شاندار ہیں اور وہ غالباً ہندوستان میں سب سے زیادہ خوش حال بن سکتی ہے بشرطیکہ ہم اخلاص و محنت سے کام کریں۔ ہمیں غداریوں اور بے وفائیوں سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ میری دعا ہے کہ ہندو اور مسلمان اور دیگر مذاہب کے پیرو ایک خاندان کے افراد کی طرح مل جل کر رہیں اور خوشی و خوش حالی کے حصول کے لیے متحد ہو کر جدوجہد کریں۔

۱۱۴۔ تاریخ ہندوستان شمس العلماء ذکاء اللہ خاں و حیات حافظ رحمت خاں۔

۱۱۵۔ کا نسٹنفس پارس اپنی کتاب "سرنگاپٹم" کے صفحہ ۸۶ پر لکھتا ہے۔ ٹیپو سلطان کی لاش کے نزدیک بے شمار عورتوں کی لاشیں بھی پڑی ہوئی تھیں جن کے لباس اور وضع قطع سے معلوم ہوتا تھا کہ غالباً حرم سلطانی ہیں۔ اسمتھ جان کنگ کی شہادت ہے۔ عورتوں کی ان لاشوں میں ایک خوب صورت برہمن لڑکی کی لاش بھی تھی۔ (تاریخ سلطنت خداداد ص ۳۰۵)

۱۱۶۔ یہ ایک نہایت الم ناک داستان کی طرف اشارہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سلطان کے ساتھی حتیٰ کہ خادم بھی جس کے پاس پانی کی چھاگل تھا، انگریزوں کے ہاتھ بک چکے تھے۔ دربار کے ذمہ داروں نے نشان دہی کر کے انگریزی فوج کو قلعہ میں داخل کیا اور جب باڈی گارڈ کے چند ساتھیوں کو لے کر یہ بہادر جرنیل اپنے ملک کی عزت و عظمت پر قربان ہونے کے لیے فوج کے سامنے سینہ سپر ہو گیا تو باڈی گارڈ کے یہ ساتھی بھی پست ہمت یا غدار ثابت ہوئے۔ سلطان سپاہیانہ جوہر دکھا کر دشمنوں کو کھیت کر رہا تھا۔ مگر جب گرمی کی شدت اور تشنہ لبی سے پریشان ہو کر اپنے خادم سے پانی طلب کرتا تھا تو افسوس! نہ ساتی کے ہاتھ ملتے تھے نہ چھاگل انڈیلتا تھا۔ مختصر یہ کہ بہادر سلطان شدید زخمی ہوا۔ پانی مانگتا ہوا گھوڑے سے گرا۔ اس وقت بھی اس پر رحم نہیں کیا گیا۔ یہ غریب مسافر تشنہ لب ہی اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ رحمہ اللہ۔

۱۱۷۔ سلطنت خداداد میسور ص ۳۰۳ و ۳۳۹۔

۱۱۸۔ تاریخ پنجاب از پنڈت دیبی پرشاد ص ۲۳ و مہاراجہ رنجیت سنگھ از پروفیسر سیتارام کوہلی صفحہ ۹۸۔۹۹ و نواب امیر علی خاں از مولانا شاہ اکبر خاں۔

۱۱۹۔ اصل عبارت یہ ہے۔ دریں شہر حکم امام المسلمین اصلاً جاری نیست و حکم روساء نصاری بے دغدغہ جاری ست و مراد از اجراء احکام کفر اینست کہ در مقدمہ ملک داری و بندوبست رعایا و اخذ خراج و باج و عشور اموال تجارت و سیاست قطاع الطریق و سراق و فیصل خصومات و سزائے جنایات کفار بطور حاکم باشند۔ آرے اگر بعضے احکام اسلام را مثل جمعہ و عیدین و اذان و ذبح بقر تعرض نکنند نہ کردہ باشند لیکن اصل اصول این چیزہا نزد ایشاں ہباء و ہدر است۔ زیرا کہ مساجد را بے تکلف ہدم مے نمایند و ہیچ مسلمان یا ذمی بغیر استیمان ایشاں دریں شہر و دو نواح نمی تواند آمد و برائے منفعت خود از واردین و مسافرین و تجار مخالفت نمی نمایند اعیان دیگر مثل شجاع الملک و ولایتی بیگم بغیر حکم ایشاں دریں بلاد داخل نمی توانند شد و از ایں شہر تا کلکتہ عمل نصاری ممتد ست۔ آرے در چپ و راست مثل حیدرآباد و لکھنؤ و رام پور احکام خود جاری نہ کردہ اند بسبب مصالحت و اطاعت مالکان آن الخ (ص ۱۷ ج اول فتاویٰ عزیزیہ مطبوعہ مطبع مجتبائی)۔

۱۲۰۔ دور حاضر کے مشہور رہنما عالم حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند اس فتویٰ کے مضمرات پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(۱) حضرت شاہ صاحب نے انگریزوں کے خلاف جو ظلم و ستم کی شکایت کی ہے اس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کا بھی ذکر

کیا ہے۔ یہ دونوں شہر دہلی اور اس کے نواح میں امن کا پروانہ لیے بغیر نہیں آسکتے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب انگریزوں کے مظالم سے صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوؤں کی بھی گلوخلاصی چاہتے تھے۔

(۲) شاہ صاحب کسی ملک کے دارالاسلام ہونے کے لیے اس میں محض مسلمانوں کی آبادی کافی نہیں سمجھتے بلکہ اس کے لیے وہ یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمان باعزت طریقہ پر رہیں اور اُن کے شعارِ مذہبی کا احترام کیا جائے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کسی ملک میں سیاسی اقتدارِ اعلیٰ کسی غیر مسلم جماعت کے ہاتھ میں ہو لیکن مسلمان بھی بہرحال اس اقتدار میں شریک ہوں اور اُن کے مذہبی و دینی شعائر کا احترام کیا جاتا ہو تو وہ ملک حضرت شاہ صاحب کے نزدیک بے شبہ دارالاسلام ہوگا اور ازروئے شرع مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس ملک کو اپنا ملک سمجھ کر اس کے لیے ہر نوع کی خیرخواہی اور خیر اندیشی کا معاملہ کریں۔ (نقش حیات جلد دوم صفحہ ۱۱)

۱۲۱۔ ۲۶ر اپریل ۱۷۸۲ء کو مرزا نجف خاں نے انتقال کیا (تاریخ ہندوستان ص ۳۲۸ ج ۹) اس کے مرنے کے بعد دو شخص اس کے منصب کی وراثت کے لیے کھڑے ہوئے۔ ۱: افراسیاب جس کو مرزا نجف علی خاں اور اس کی بہن نے پالا تھا۔ ۲: مرزا شفیع جو نجف علی خاں کا رشتہ دار تھا۔ کافی ہنگامہ بازی کے بعد مرزا محمد شفیع نے امیر الامرائی کا عہدہ سنبھالا۔ چند روز بعد اس کو محمد بیگ نامی ایک سردار نے جو اس ہنگامہ بازی کا ایک ہیرو تھا قتل کر دیا۔ اب افراسیاب خاں امیر الامراء ہوا۔ چند روز بعد مرزا محمد شفیع کے بھائی زین العابدین نے افراسیاب کو بھی قتل کر دیا۔ اس کینہ خانہ جنگی سے بادشاہ اس قدر تنگ ہو چکا تھا کہ اس نے آس پاس کے تمام امراء کو نظر انداز کر کے مرہٹوں کی طرف دستِ تعاون بڑھایا۔ جس کو مرہٹوں نے خوش آمدید کہا۔ اب پیشوا کو عہدۂ امیر الامرائی سپرد ہوا۔ اور مادھوجی سیندھیا نائب امیر الامراء قرار پایا۔ پینسٹھ ہزار روپیہ ماہانہ بادشاہ کا نذرانہ مقرر ہوا۔ (تاریخ ہندوستان از ص ۳۲۸ تا ۳۳۱ ج ۹)۔

۱۲۲۔ یہ جتھہ جو بہادروں کا گروہ تھا۔ بے قاعدہ لشکر کی طرح لوٹ مار بھی کرتا رہا اور اس زمانہ کی طاقتوں سے ٹکراتا بھی رہا۔ اگر مہلت ملتی تو یہ گروہ روہیلوں، ازبکوں، مرہٹوں یا خالصہ کی طرح باضابطہ حکومت بھی قائم کر لیتا۔ ۱۷۹۴ء میں پنڈاروں کے دو بڑے سرداروں کو مادھوجی سیندھیا نے وادی نربدا میں جاگیریں دے دیں۔ یہ سردار فوت ہو گئے تو اُن کے بیٹوں، دوست محمد اور واصل محمد نے عنانِ قیادت سنبھال لی۔ پھر ایک سردار کریم خاں نامی نے بہت قوت جمع کر لی۔ وہ ہلکر کے ساتھ مل کر کام کرتا رہا۔ اور ۱۸۰۰ء میں گیارہ پرگنوں کا مالک بن گیا جن کی آمدنی پندرہ لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ سیندھیا نے اسے نواب کا خطاب دیا۔ وہ عام طور پر سیندھیا شاہی کے لقب سے معروف تھا۔ اُس نے بھوپال کے بھی کچھ علاقے چھین لیے تھے۔ دولت راؤ سیندھیا نے کسی بات پر بگڑ کر اُسے قید کر دیا۔ چنانچہ وہ پانچ برس گوالیار میں قید رہا۔ اس زمانہ میں چیتو نے بہت رسوخ پیدا کر لیا۔ دوست محمد اور واصل محمد کی پارٹیاں بھی چیتو کے ساتھ مل گئیں۔ کریم خاں نے چھ لاکھ روپیہ دے کر قید سے مخلصی حاصل کی۔ انگریزوں نے راجستھان کے راجاؤں سے معاہدے کر لینے کے بعد پنڈاروں کے خلاف کارروائی شروع کی۔ ایک ایک کر کے سب سردار ہتھیار ڈالتے رہے۔ نامدار خاں نے ۱۸۱۳ء میں ہتھیار ڈالے۔ کریم خاں اور واصل محمد خاں کو گورکھپور میں کچھ جاگیریں دے دی گئیں۔ چیتو آخر تک مقابلہ پر جما رہا۔ اس کے پاس پندرہ ہزار سوار تھے۔ مردانگی سے لڑا اور شکست کھا کر جنگل میں جا چھپا۔ ۱۸۱۹ء میں اُسے شیر نے پھاڑ ڈالا۔ چیتو اصلاً میواتی تھا اور بڑا غیور مسلمان تھا۔ (تاریخ وسط ہند از میجر جنرل سر جان میلکم جلد اول و تاریخ بھوپال و سید احمد شہید از جناب غلام رسول صاحب مہر)۔

۱۲۳۔ ملاحظہ ہو، سیاسی تاریخ ہند از میجر جنرل سر میلکم۔

۱۲۴۔ ایضاً لارڈ کا دورِ حکومت۔

۱۲۵۔ ملاحظہ ہو تاریخ راجگان پنجاب از سر لیپل گریفن۔

۱۲۶۔ سیاسی تاریخ ہند ضمیمہ ۵۔ بیان کارگذاری بریگیڈیر جنرل میلکم۔

۱۲۷۔ سیاسی تاریخ ہند جلد اول۔ مسٹر جنکس کی کارگزاری کا تذکرہ۔ دو بار کوئس ہسٹنگز

۱۲۸۔ مراسلہ منجانب میجر جنرل سر جان میلکم بنام مارکوئس ہسٹنگز مورخہ ۱۷ر جولائی ۱۸۱۷ء۔

۱۲۹۔ تاریخ اندور از کافی خاں۔

۱۳۰۔ سیاسی تاریخ ہند تاریخ ہند جلد اول باب ۷ فقرہ ۵۹۲۔

۱۳۱۔ سیرت سید احمد شہید جدید ایڈیشن ج اص ۸۷۔

۱۳۲۔ سوانح احمدی ص ۱۹۔

۱۳۳۔ سوانح احمدی ص ۱۹۔

۱۳۴۔ علم و فضل کی شہادت اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ خود استاذ العلماء حضرت شاہ عبد العزیز صاحب نے ایک نہایت اہم معاملہ میں اُن کے متعلق تحریر فرمایا تھا: "ایشاں در علم تفسیر و حدیث و فقہ و اصول و منطق وغیرہ از فقیر کمتر نیستند۔ مہر و حفظ ایشاں گویا دستخط فقیر ست"۔

حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کا یہ مکتوب جس میں یہ فقرہ ہے، منشی خیر الدین صاحب لکھنوی کے نام تھا۔ یہ فرضیت حج کے سلسلہ میں تھا (اس کی کسی قدر تفصیل انشاء اللہ آئندہ صفحات میں آئے گی) آپ نے اس مکتوب گرامی میں ان دونوں بزرگوں کے لیے جو الفاظ استعمال فرمائے ہیں وہ خود ان بزرگوں کی اعلیٰ قابلیت کے لیے بہترین سند ہیں۔ آپ نے مولانا عبد الحی صاحب کو شیخ الاسلام اور مولانا اسمٰعیل صاحب کو حجۃ الاسلام اور دونوں کو "تاج المفسرین فخر المحدثین، سر آمد علماء محققین جیسے القاب سے ذکر فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو سیرت سید احمد شہید ج اص ۸۹ بحوالہ مخزن احمدی۔

۱۳۵۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۲۔

۱۳۶۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

"امام عبد العزیز نے سید احمد شہید کے بورڈ کو پہلی دفعہ ۱۲۳۱ھ میں بیعت طریقت کے لیے اور دوسری دفعہ بیعت جہاد لینے کے لیے دورے پر بھیجا۔ اس کے بعد سارے قافلہ سمیت حج پر جانے کا حکم دیا۔ تاکہ ان کی تنظیمی قوت کا تجربہ ہو جائے۔ جب قافلہ ۱۲۳۹ھ میں واپس آیا تو امام عبد العزیز فوت ہو چکے تھے۔ (شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک صفحہ ۱۵۳)۔

۱۳۷۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، سیاسی تاریخ ہند باب ہفتم از سر جان میلکم۔

۱۳۸۔ روانگی کے وقت حضرت شاہ عبد العزیز صاحب (قدس اللہ سرہ العزیز) نے ایک دستار سیاہ اور ایک پیراہن سفید جو شاہ صاحب کا پہنا ہوا تھا، اپنے دست مبارک سے پہنا کر سفر کی رخصت مرحمت فرمائی۔ (سوانح احمدی صفحہ ۲۵)

۱۳۹۔ پہلی دفعہ جب شیخ حفیظ اللہ صاحب نے اپنے والد صاحب کو جا کر "السلام علیکم" کہا تو وہ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا مجھے معلوم ہے کس نے تمہیں سکھایا ہے میں اسے سمجھوں گا۔ مگر رفتہ رفتہ والد صاحب خود متاثر ہوئے اور یہاں تک بدلے کہ صاحبزادے کے ہاتھ پر جن کو سید صاحب سے خلافت ملی تھی بیعت کر کے داخل سلسلہ ہو گئے۔ (سیرت سید احمد شہید ص ۱۰۱)

۱۴۰۔ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۹۴۔

۱۴۱۔ سیرت احمد شہید صفحہ ۱۰۹ و صفحہ ۱۱۰۔

۱۴۲۔ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۶۷۔

۱۴۳۔ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۱۹ و صفحہ ۱۲۰۔

۱۴۴۔ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۱۲ و ۱۱۳۔

۱۴۵۔ آنحضرتؐ کی روایت ہے کہ مومن ایک آنت بھر کھاتا ہے اور غیر مومن سات آنت بھر۔ یعنی جو صاحب روحانی کمالات حاصل کرنا چاہتا ہے پوری خوراک کا ساتواں حصہ بھی اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے کیونکہ وہ غذا صرف اس لیے استعمال کرتا ہے کہ زندگی باقی رہ سکے اور جو شخص روحانیت سے بیگانہ اور لذتوں کا حریص ہوتا ہے اس کی حرص پوری خوراک کھا کر بھی ختم

نہیں ہوتی۔ وہ پیٹ کے ہر ایک گوشہ کو پر کرتا ہے پھر بھی نظر کھانے پر رہتی ہے۔ محمد میاں

۱۴۶ الف۔ ترمذی شریف وغیرہ۔

۱۴۶ ب۔ سید احمد شہید صفحہ ۱۵۶۔

۱۴۷۔ ایضاً صفحہ ۱۵۷۔

۱۴۸۔ ایضاً صفحہ ۱۵۸۔

۱۴۹۔ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۴۳۔

۱۵۰۔ ایضاً صفحہ ۱۵۰۔

۱۵۱۔ ایضاً صفحہ ۱۵۱۔

۱۵۲۔ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۵۲۔

۱۵۳۔ وقائع احمدی بحوالہ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۶۷۔

۱۵۴۔ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۶۸ تا صفحہ ۱۷۰ اخلاصہ۔

۱۵۵۔ انقلابی تحریک کا اگر کوئی دفتری نظام ہوتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ رازکی حیثیت رکھے۔ عام لوگوں کو اس کا علم نہیں ہونا چاہیے اور عام انجمنوں کی طرح ممبر سازی اور جمہوری قسم کا انتخاب تو یہ صلاحیت ہی نہیں رکھتا کہ کوئی انقلابی پارٹی اس کو اپنا سکے۔ سید صاحب کی اس تحریک میں بھی دفتری تنظیم کا پتہ نہیں چلتا، اور نہ اس کے باضابطہ صدر یا سکریٹری معلوم ہوتے ہیں۔ صرف یہ نقیب اور خلفاء ہی اپنی اپنی جگہ تحریک کے ذمہ دار تھے اور انہیں کے دم سے اس تحریک کی جڑیں تقریباً چالیس برس تک ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی رہیں۔

۱۵۶۔ سید احمد شہید ۱۲۷۔

۱۵۷۔ ایضاً

۱۵۸۔ انتہا یہ کہ رجعت پسندی کے اس انتہائی دور میں کہ برطانوی ڈپلومیسی نے عام طور پر مسلمانوں کو کانگریس کا مخالف اور مسلم لیگ کا گرویدہ بنا دیا تھا، یہاں کے مسلمانوں کی اکثریت کانگریس اور حریت پسند جماعتوں کے ساتھ ہی اور صرف یہی علاقہ تھا جہاں انتخابات میں مسلمانوں نے قوم پروروں (نیشنلسٹوں) کو کامیاب بنایا۔

۱۵۹۔ "ارمغان احباب" از مولانا عبدالحی صاحب بحوالہ سیرت سید احمد شہیدؒ۔

۱۶۰۔ تقویم ہجری و عیسوی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال ۲۶ رجب کو شعبان کی پہلی ہوئی تھی۔

۱۶۱۔ یہ نہری غازی آباد اور شاہدرہ کے بیچ میں ہے۔

۱۶۲۔ یہ اس قاصد کا نام ہے جو نامہ تھم لے کر آیا تھا۔

۱۶۳۔ چونکہ دہلی میں تعلیم پائی تھی اس لیے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب سے وابستہ حضرات ان سے واقف تھے اور بہت سوں سے آپ کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ (سید احمد شہید ج ۱ صفحہ ۱۳۰)

۱۶۴۔ ابوالفضل کنیت۔ ناصر الدین محمد افضل نام۔ اپنے وقت کے اکابر اہل علم اور بزرگ اولیاء اللہ میں سے تھے۔ ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷ء) میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ء) میں وفات پائی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب اور مولانا عبدالحی صاحب ملاقات کے لیے گئے تو دل میں طے کر لیا تھا کہ اگر ایک کو گڑ کا اور دوسرے کو شکر کا شربت پلائیں گے تو سمجھ لیں گے کہ اہل کشف میں سے ہیں۔ شاہ صاحب نے دونوں کو گلے لگایا۔ پھر ملازم سے کہا دو گلاس شربت لاؤ۔ ایک قند کا دوسرا شکر کا۔ کیا کروں ان کی خواہش یہی ہے (سید احمد شہید ج صفحہ ۱۵۱)۔

۱۶۵۔ غازی الدین حیدر ۱۲۲۹ھ ۱۸۱۴ء میں مسند نشین ہوئے۔ چند سال بعد ۱۲۳۴ھ ۱۸۱۸ء میں وزارت کے بجائے بادشاہت کا اعلان کیا (سوانح سلاطین اودھ) (قیصر التواریخ) وغیرہ۔ ۱۲۴۳ھ ۱۸۲۷ء میں انتقال کیا۔

۱۶۶۔ یہاں ایک تاریخی پس منظر کی نقاب کشائی بھی ضروری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دربار دہلی اگرچہ عرصہ سے کمپنی بہادر کا نمک خوار ہو گیا تھا۔ مگر اب تک آبائی شہنشاہیت کی بو دماغ سے نہیں گئی تھی۔ اس نے پہلی بیباکانہ جرأت یہ کی کہ غازی الدین حیدر کے والد نواب سعادت علی خاں کو خلعتِ وزارت عطا نہیں کیا۔ کیونکہ یہ انگریزوں کے آوردہ تھے۔ خاندانی قاعدہ کے مطابق، آصف الدولہ پسر شجاع الدولہ کے مرنے کے بعد آصف الدولہ کے بڑے لڑکے وزیر علی خان کو مسند نشین ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ آصف الدولہ کی وفات کے بعد مرزا وزیر علی خاں مسند نشین ہوئے مگر کمپنی بہادر کے اربابِ اقتدار نے چار ماہ بعد ان کو گرفتار کر کے کلکتہ بھیج دیا اور ان کے چچا نواب سعادت علی خاں پسر شجاع الدولہ کو مسند نشین کر دیا۔ سعادت علی خاں کوشش کرتے رہے کہ سند وزارت دربار دہلی سے ان کو عطا کر دی جائے۔ مگر دربار دہلی نے ان کو سند نہیں عطا کی۔ یہ کمپنی بہادر کے مقابلہ میں دربار دہلی کی پہلی جسارت تھی۔ دوسری جسارت اکبر ثانی (جلوس ۱۲۲۱ھ، ۱۸۰۶ء وفات ۱۲۵۳ھ، ۱۸۳۷ء) کے زمانہ میں ہوئی کہ گورنر جنرل دہلی آنے کے ارادہ سے فرخ آباد تک پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے دہلی پہنچنے کی منظوری دی۔ گورنر جنرل (لارڈ ماٹر) برافروختہ ہو کر فرخ آباد سے کلکتہ واپس چلے گئے اور اب کمپنی بہادر نے یہ طے کیا کہ ایک اور بادشاہ بنا کر شاہ دہلی کے اس غرور کا سر نیچا کیا جائے۔ (قیصر التواریخ)

۱۶۷۔ یوم عید غدیر بہ مذہب اثنا عشریہ (قیصر التواریخ صفحہ ۲۴۴)۔

۱۶۸۔ اودھ کے سکہ میں مچھلیوں کا نشان، بانی ریاست برہان الملک کے زمانہ سے تھا۔ جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے، کہ جب برہان الملک، بادشاہ کے یہاں سے اس صوبہ کی سند لے کر صوبہ پر قبضہ کرنے جا رہے تھے تو گنگا عبور کرتے وقت ایک مچھلی دریا سے تڑپ کر کشتی میں خاص برہان الملک کے دامن میں آ پڑی۔ برہان الملک نے اس کو فال نیک سمجھا۔ اس مچھلی کی ہڈیاں واجد علی شاہ کے زمانہ تک خزانہ میں محفوظ رہیں (قیصر التواریخ صفحہ ۲۷ وتاج السعادت وغیرہ) سکہ میں دوسری جانب شاہ دہلی کا نام اور سنہ جلوس وغیرہ ہوا کرتا تھا۔ غازی الدین حیدر نے مچھلیوں کا نشان بیچ میں اور اس کے گرد کمپنی بہادر کی خوشنودی کے لیے دو شیر اور دوسری جانب شاہ دہلی کے نام کے بجائے یہ شعر۔ سکہ زد بر سیم و زر از فضل رب ذوالمنن: غازی الدین حیدر عالی نسب شاہِ زمن۔ یہ شعر حسن علی خاں نائب وزیر اعظم نے موزوں کیا تھا۔ اس کے انعام میں اس کو پانچ ہزار روپے عطا کیے گئے۔ (قیصر التواریخ صفحہ ۲۴۵)۔

۱۶۹۔ آپ کی قوت واہمہ زندوں کو مردہ اور مردوں کو زندہ تسلیم کر لینے میں تامل نہیں کرتی تھی۔ معتمد الدولہ آغا میر وزیر اعظم تھے جن کی تمام قابلیت اسی میں صرف ہوتی تھی کہ بادشاہ کی اوہام پرستی اور بے خودی میں اضافہ ہوتا رہے۔ یہ غازی الدین حیدر ہی کی قوت واہمہ کا کمال تھا کہ اپنی طرح (معاذ اللہ) حضرات ائمہ کو بھی دوشیزگانِ عشوہ طراز کا شوقین تصور کیا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اچھوتیوں کی ایک خاص اصطلاح ایجاد کی۔ یعنی دوشیزہ لڑکی کا آپ کسی امام سے (جن کی وفات کو ایک ہزار برس سے زیادہ گذر چکے تھے) نکاح کر دیا کرتے تھے۔ یہ لڑکی اچھوتی کہلاتی تھی۔ یہ کسی سے نکاح نہیں کر سکتی تھی۔ اس کو ایک محل دیا جاتا تھا جہاں وہ ناز و انداز سے شاہانہ تکلفات کے ساتھ رہتی۔ اس کے لواحقین کے وظیفے مقرر کر دیے جاتے تھے۔ شہر کے تقریباً تمام ہی محلے ان اچھوتیوں کی برکت سے متبرک ہوتے رہتے تھے۔ ملک کی آمدنی کا بہت کافی حصہ ان اچھوتیوں کے مہر اور ان کے وظائف پر صرف ہوتا تھا۔ اسی طرح ابلہ فریبی اور اوہام پرستی کی یہ عجیب وغریب مثال تاریخ میں بہت ہی مشکل سے ملے گی کہ ایک مرتبہ غازی الدین حیدر نے ایک شخص کو طلب کیا۔ معتمد الدولہ اس کی حاضری پسند نہیں کرتے تھے لہٰذا بادشاہ کو رپورٹ کرا دی گئی کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ ابھی چند روز گذرے تھے کہ یہ بدنصیب بادشاہ کی سواری کے سامنے آ گیا۔ بادشاہ نے فوراً حکم دیا کہ اس کو حاضر کرو۔ یہ وقت معتمد الدولہ کے لیے بہت نازک تھا مگر اس کی حاضر جوابی کام آ گئی۔ اس نے فوراً عرض کیا۔ غلام اس کو چشم بشری سے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ پیر و مرشد کا کمال ہے کہ حضور عالم ارواح کو بھی دیکھتے رہتے ہیں۔ حاضرین نے بھی وزیر کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ مختصر یہ کہ بادشاہ کی زبان پر تھا "وہ ہے، وہ ہے"۔ اور سب حاضرین کی زبان پر تھا "کہاں ہے، کہاں ہے"۔ غرض بادشاہ کو یقین ہو گیا کہ یہ

صورت لباسی ہے (تاریخ اودھ صفحہ ۱۳۵ و صفحہ ۱۵۹ ج ۴)

۱۷۰۔ ملاحظہ ہو، اس زمانہ کی ادبیات جن کا کچھ تذکرہ حکیم محمد نجم الغنی صاحب نے تاریخ اودھ میں کیا ہے (ملاحظہ ہو تاریخ اودھ ج ۴ صفحہ ۱۰۲ تا صفحہ ۱۰۴)۔

۱۷۱۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے بہت جلیل القدر عالم ہیں۔ اُن کی تصانیف آج تک علماء محققین کی نظر میں خاص وقعت رکھتی ہیں۔ آپ سلسلۂ علماء فرنگی محل کے مورث مولانا قطب الدین شہید کے پوتے اور ملا نظام الدین کے فرزند تھے۔ یہی ملا نظام الدین ہیں جن کا تجویز کیا ہوا درسِ نظامی آج تک پتھر کی لکیر بنا ہوا ہے۔ مولانا عبدالعلی صاحب ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے علوم میں اعلیٰ درجہ رکھتے تھے۔ آپ کا قیام لکھنؤ میں بہت کم رہا۔ اول آپ حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے یہاں رہے۔ اُن کی شہادت کے بعد رام پور میں نواب فیض اللہ خاں صاحب بانی ریاست رام پور کے یہاں عرصہ تک قیام کیا۔ پھر منشی صدرالدین صاحب بہاری آپ کو اعزاز و اکرام کے ساتھ بہار لے گئے۔ وہاں حلقۂ درس نے بے اچھا شہرت پائی مگر کچھ عرصہ کے بعد منشی صدرالدین صاحب سے تعلقات خوش گوار نہ رہے۔ رئیس کرناٹک (نواب والا جاہ محمد علی خاں) آپ کے قدر دان تھے جیسے ہی نواب صاحب کو معلوم ہوا، مولانا عبدالعلی صاحب کے نام خط لکھ کر اپنے یہاں مدعو کر لیا۔ مولانا بحرالعلوم نے نواب والا جاہ کی دعوت منظور کر لی اور عازم مدراس ہو گئے۔ نواب نے خاندان کے معزز اراکین اور امراء ریاست کے ساتھ شاندار استقبال کیا۔ اپنے محل خاص میں آپ کے قیام کا انتظام کیا اور تدریس کے لیے عظیم الشان مدرسہ تعمیر کرا دیا۔ ملک العلماء کا خطاب دیا۔ نواب والا جاہ کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادہ عمدۃ الامراء، پھر والا جاہ کے پوتے نواب عظیم الدولہ بھی علامہ بحرالعلوم کا یہی اعزاز کرتے رہے۔ ۱۲۲۵ھ میں وفات پائی۔ ۸۲ سال عمر ہوئی۔ مدراس کی مشہور جامع مسجد والا جاہی کے شمالی جانب میں آپ کا مزار ہے (تذکرہ علماء ہند ۱۲۱)۔

۱۷۲۔ احوال علماء فرنگی محل صفحہ ۶۵۔

۱۷۳۔ مولانا عبدالرب صاحب۔ درسی کتابیں والد ماجد، (حضرت مولانا عبدالعلی) سے پڑھیں۔ والد ماجد کے ساتھ شاہجہاں پور، رام پور، بہار اور مدراس میں رہے پھر لکھنؤ آ کر سلسلۂ درس جاری رکھا۔ دوبارہ مدراس تشریف لے گئے نواب عظیم الدولہ نے سلطان العلماء کا خطاب دیا اور اُن کے والد کا مدرسہ لائق بیٹے کے سپرد کر دیا۔ مولانا عبدالرب صاحب یہ مدرسہ اپنے بھتیجے مولانا عبدالواجد صاحب (خلف مولانا عبدالاعلیٰ صاحب خلف مولانا عبدالعلی صاحب) کے سپرد کر کے لکھنؤ واپس آ گئے۔ دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی ملاقات و ضیافت سے محظوظ ہوئے۔ ۱۲۵۳ھ میں وفات پائی (نزہۃ الخواطر بحوالہ سیرت سید احمد شہید و تذکرہ علماء ہند)۔ جس وقت سید صاحب لکھنؤ تشریف لے گئے، اس وقت تک مدراس میں مولانا عبدالعلی صاحب بحرالعلوم حیات تھے۔

۱۷۴۔ مرزا حسن علی صغیر لکھنوی، ساکن محلہ یحییٰ گنج، مبرک جمال الدین لقب، مرزا عرف۔ سندِ حدیث حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی سے حاصل کی۔ سینکڑوں علماء نے آپ سے علم حدیث میں استفادہ کیا نصیرالدین حیدر کی سلطنت کے آخری دور (۱۲۶۶ھ) میں مرض استسقاء میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔ آپ شافعی مسلک رکھتے تھے (تذکرہ علماء ہند) علماء فرنگی محل نے بھی آپ سے علم حدیث میں استفادہ کیا (تراجم علماء حدیث ہند)

۱۷۵۔ مولانا محمد اشرف صاحب لکھنؤ کے اساتذہ میں سے تھے۔ والد صاحب کا اسم گرامی نعمت اللہ تھا۔ صدیقی خاندان تھا اور آبائی وطن کشمیر۔ عرصہ سے یہ خاندان لکھنؤ منتقل ہو گیا تھا۔ درسی کتابیں کچھ مولانا محمد رستم کشمیری لکھنوی سے پڑھیں اور زیادہ علامہ نورالحق فرنگی محل سے۔ پھر مسندِ درس آباد کی۔ صاحب تصانیف ہیں۔ ۷ ار صفر ۱۲۴۴ھ کو وفات ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر بحوالہ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۳۸)۔

۱۷۶۔ مولانا ابوالحسن صاحب نصیر آبادی خلیفہ مولانا نعیم اللہ صاحب بہرائچی۔ عالمے را از ظلمات شرک و بدعت نجات بخشید و با تباع سنت سنیہ کوشید۔ دوم شعبان سنہ دوازدہ صد و ہفتاد ہجری رحلت فرمودہ (تذکرہ علماء ہند صفحہ ۳)

۱۷۷۔ سبحان علی خاں، لکھنؤ۔ اودھ سرکار انگریزی میں تحصیل دار تھے۔ اُن کی مہارت کی وجہ سے نواب سعادت علی خاں نے اُن کو اپنے یہاں بلایا اور قدر افزائی کی۔ یہاں تک کہ اُن کے بیٹے غازی الدین حیدر کے زمانہ میں نائب وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز ہوئے (سیرت سید احمد شہید)۔

۱۷۸۔ الباقیات الصالحات اور شمس الضحیٰ وغیرہ آپ کی تصانیف ہیں (سیرت سید احمد شہید)

۱۷۹۔ تاج الدین حسین خاں بھی سرکار انگریزی میں تحصیل دار تھے۔ نواب سعادت علی خاں کی جوہر شناسی نے اُن کو لکھنؤ بلایا۔ عقل و دانش میں آپ ارسطو زمانہ سمجھے جاتے تھے۔ چوبیس لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی کا علاقہ "سلطان پور" آپ کی جاگیر تھا (سیرت سید احمد شہید)۔

۱۸۰۔ ۱۸۰۱ء میں جو معاہدہ نواب سعادت علی خاں (غازی الدین حیدر کے والد) سے ہوا تھا اس میں طے کر دیا گیا تھا کہ نواب سعادت علی خاں صرف چار پلٹنیں تلنگوں کی، ایک پلٹن نجیب پیادے اور میواتی اور دو ہزار سوار اور تین سو گولہ انداز رکھ کر باقی فوج برطرف کر دیں گے۔ ممالک محروسہ کی حفاظت انگریزی فوج کے ذمہ ہوگی جو بقدر ضرورت رکھی جاسکے گی (قیصر التواریخ جلد اول صفحہ ۱۶۶)۔

۱۸۱۔ اس کے بانی یوسف خاں قندھاری تھے جو حافظ رحمت خاں کی فوج میں رسالدار تھے۔ پھر حافظ صاحب کے یہاں سے نوکری چھوڑ کر شجاع الدولہ کی فوج میں پہنچ گئے اور اپنی حسن خدمات کے باعث شجاع الدولہ کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ شجاع الدولہ نے ان کو رسالدار کر دیا جو اس زمانہ میں فوج کا با اختیار افسر ہوتا تھا۔ جس کو سپاہیوں کے بھرتی کرنے اور معزول کر دینے تک کا اختیار ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ نقارہ اور نشان وغیرہ بھی رہا کرتے تھے۔ یوسف خاں کے بعد اُن کے بیٹے عبدالرحمٰن خاں رسالدار ہوئے۔ پہلے اُن کے رسالہ میں صرف پانچ سو سوار تھے اور جب انگریزی فوج کی کمک کے لیے ان کو مرہٹوں کے مقابلہ میں دکن بھیجا گیا، اور وہاں اُن کے رسالے نے نمایاں خدمات انجام دیں تو اُن کا مرتبہ بڑھا دیا گیا اور اُن کو ستر ہ سو سپاہیوں کا رسالدار بنا دیا گیا۔ سید صاحب کے زمانہ میں عبدالرحمٰن خاں کے لڑکے عبد الہادی خاں اور عبدالرحمٰن خاں کے پوتے خلیل اللہ خاں پسر حبیب اللہ خاں تھے۔

۱۸۲۔ فقیر محمد خاں، بخشی محمود خاں آفریدی مدارالمہام نواب قائم خان بنگش والی فرخ آباد کے خاندان سے تھے۔ پہلے نواب علی خاں کی فوج میں ملازم تھے جب وہ کارخانہ درہم برہم ہوا تو لکھنؤ آگئے۔ اور بہت جلد ترقی کر کے نائب جرنیل ہوگئے اور سید صاحب جب لکھنؤ سے واپس ہوئے تو فقیر محمد خاں کو وزیر اعظم کے یہاں سے خلعت ملا۔ دس ہزار روپے نقد اور ہاتھی، پالکی، شملہ مندیل، سپر، تلوار اور اس کے علاوہ بہت سامان ملا۔ ہزار روپیہ مشاہرہ ہوا، اور پندرہ سو سوار اور دو ہزار پیادہ رکھنے کا حکم ہوا، اور محمدی کا علاقہ پرگنہ ہوا۔ فقیر محمد خاں شجاع اور دلیر آدمی تھے۔ شعر و سخن سے ذوق رکھتے تھے۔ گویا تخلص تھا۔ صاحب دیوان ہیں (حاشیہ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۲۵)۔

۱۸۳۔ اگرچہ سید صاحب آغا نائب السلطنت کی دعوت پر لکھنؤ جا رہے تھے مگر آپ کی طبعی سادگی نے گوارا نہ کیا کہ پہلے سے اپنے پہنچنے کی اطلاع دے کر استقبال اور جلوس کے تکلفات برداشت کریں۔ سید صاحب کے چھوٹے بھانجے سید عبدالرحمٰن صاحب جو لکھنؤ میں کسی فوجی عہدے پر مامور اور قندھاریوں کی چھاؤنی میں اقامت گزیں تھے، وہ سید صاحب کے ہمراہ رائے بریلی سے روانہ ہوئے۔ پہلی منزل "حسن گنج" میں ہوئی۔ دوسری منزل لکھنؤ سے قریب کسی مقام پر ہوئی، جس کے بعد صبح سویرے لکھنؤ پہنچنے کا پروگرام تھا۔ سید صاحب نے رات ہی کو عشاء کے وقت سید عبدالرحمٰن صاحب کو حکم دے دیا کہ:

"کچھ رات رہے تم آگے چل کر قندھاریوں کی چھاؤنی میں اپنا مکان صاف کروا کر فرش بچھوا رکھو اور کچھ بھنے ہوئے چنے اور نمک مرچ اور کچھ گڑ بھی تیار رکھنا (وقائع احمدی صفحہ ۱۱۸)

چنانچہ سید صاحب خاموشی کے ساتھ صبح کے وقت قندھاریوں کی چھاؤنی میں پہنچ گئے۔ ضروریات سے فارغ ہو کر آپ نے اور تمام ساتھیوں نے چنے اور گڑ وغیرہ تناول کیا اور پانی پی کر آرام فرمانے لگے۔ نماز ظہر کے وقت لوگوں کو تشریف آوری کا

علم ہوا تو آمد شروع ہوئی۔ بہت سے امراء بھی حاضر خدمت ہوئے اور نذرانے پیش کئے اور پھر فوراً ہی آپ کے قیام کا سوال حل کیا گیا۔ نذرانے پیش کرنے والے امراء اور نذرانوں کی تفصیل یہ ہے:

محمد حسن خاں پانچ اشرفی خلیل اللہ خاں چار اشرفی۔ مصطفےٰ خاں بن حسن خاں تین اشرفی، عبدالرحیم خاں تین اشرفی۔ عبدالمعبود خاں دو اشرفی (سید احمد شہید صفحہ ۱۲۹)

اسد علی بیگ کیدان اور مرزا اشرف بیگ رسالدار آپ کو شہر میں لے گئے اور پہلے میر مسکین کی حویلی میں قیام کرایا گیا۔ پھر شیخ امام بخش تاجر کی حویلی قیام کے لیے منتخب کی گئی۔

۱۸۴۔ ٹیلے والی عالمگیری مسجد جس کو شاہ پیر محمد صاحب کی مسجد بھی کہتے ہیں (سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۲۵)

۱۸۵۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔ مشروع کے دو تھان۔ اعلیٰ قسم کی چکن کے دو تھان۔ بیش قیمت عطر دان۔ الائچیوں سے بھرا ہوا پان دان (سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۲۵)۔

۱۸۶۔ ایضاً صفحہ ۱۲۵

۱۸۷۔ ایک جمعہ کو وعظ میں مولانا محمد اشرف صاحب، مولانا مخدوم صاحب، مولانا امام الدین صاحب بنگالی، مولانا امام الدین صاحب لکھنوی برادر مولانا نصیر الدین صاحب بازار خانم، مولانا عبدالباسط صاحب شاگرد مولانا محمد اشرف صاحب، مولانا ابوالحسن صاحب نصیر آبادی، مولانا عبداللہ صاحب، مولانا رحیم اللہ صاحب فرنگی محلی۔ مولانا نجیب اللہ صاحب بنگالی۔ شاہ یقین اللہ صاحب اور ان کے صاحبزادہ مولوی عبدالوہاب صاحب، میر اُمید علی صاحب جو لکھنؤ میں صاحب خدمت مشہور تھے، یہ سب حضرات موجود تھے۔ وعظ کے بعد یہ سب بیعت سے مشرف ہوئے۔ اکثر نے تو اسی مسجد میں بیعت کی، اور مولوی محمد اشرف صاحب، مولوی مخدوم صاحب اور مولوی ابوالحسن صاحب وغیرہ نے اسی روز مکان پر لے جا کر بیعت کی (سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۳۸)۔ مولانا ولایت علی صاحب عظیم آبادی جو اس تحریک کے دور ثانی کے بانی ہیں (جس کو وہابیوں کی تحریک کہا جاتا ہے) جن کا مفصل تذکرہ مستقل جلد میں آئے گا (انشاء اللہ) وہ بھی اس موقع پر اپنے اُستاذ مولانا محمد اشرف صاحب کے ساتھ بیعت ہوئے (حاشیہ صفحہ ہذا)

۱۸۸۔ رسالہ کے سپاہیوں نے حضرت سید صاحب کو توجہ دلائی تھی کہ مینڈو خاں رسالدار اُن مسافروں کا خیال نہیں کرتے جو اس طرف نکل آتے ہیں۔ ہماری یہ حیثیت نہیں ہے کہ ہم خدمت کر سکیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس طرف جو مسافر آتے ہیں وہ اکثر یہاں خالی پیٹ رات گذارتے ہیں۔ سید صاحب نے مینڈو خاں کو اس طرف توجہ دلائی۔ مینڈو خاں نے وعدہ کیا کہ میں آئندہ ہر ایک مسافر کا خیال رکھوں گا اور جو میں کھاؤں گا وہی اُن کو بھی کھلاؤں گا۔

۱۸۹۔ مینڈو خاں رسالدار کی سواروں کی وردی عجیب قسم کی تھی۔ باناتی ٹوپی اور باناتی کرتی اور پاجامہ وردی میں ہوتا تھا۔ اس رسالہ کا نام بھی عجیب مضحکہ انگیز تھا۔ ان کو لولو کے سوار کہا جاتا تھا۔ سید صاحب سے مینڈو خاں صاحب نے دعا کی درخواست کی کہ یہ نام بدل جائے اور اُن کی ترقی بھی ہو جائے۔ سید صاحب لکھنؤ سے واپس ہوئے تو دو ڈھائی ماہ بعد یہ نام بھی بدل دیا گیا اور ترقی کر کے خیر آباد اور بہرائچ کا علاقہ اُن کے حوالہ کر دیا گیا۔ مصنفین سوانح نے اس کو حضرت سید صاحب کی دعا کی برکت فرمایا ہے۔ ہم دعا کی برکت کے ساتھ دوا کا شائبہ بھی یہاں پاتے ہیں۔ یعنی سید صاحب نے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کی، اور کچھ بعید نہیں کہ معتمد الدولہ سے چند گھنٹوں کی ملاقات میں یہ سفارش بھی فرما دی ہو۔

۱۹۰۔ فقیر محمد خاں نائب جرنیل اور مینڈو خاں وغیرہ جن کا تعلق سید صاحب سے ہو گیا تھا اس تعلق کے بعد حکومت نے ان کی جاگیروں اور مناصب میں اضافہ کیا۔ مگر لکھنؤ سے منتقل بھی کر دیا۔ فقیر محمد خاں صاحب کو محمدی لکھیم پور کا علاقہ عطا ہوا، اور مینڈو خاں صاحب خیر آباد پھر بہرائچ بھیجے گئے۔ جو لوگ سیاست کے داؤ پیچ بالخصوص انگریزی ڈپلومیسی کی خاموش اور نہایت نرم ریشہ دوانیوں سے واقف ہیں، وہ اس ترقی سے زیادہ انتشار کو اہمیت دیں گے۔ یعنی ان افسروں کو اس طرح منتشر کر کے ان اثرات کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی جو سید صاحب کے طویل قیام کے باعث فوجی علاقہ میں پیدا ہو گئے تھے۔

۱۹۱۔ یہی معتمد الدولہ آغا میر نائب السلطنت جنہوں نے خط لکھ کر سید صاحب کو بلایا تھا، انہیں نے سید صاحب کے خاص ارادت مند فقیر محمد خاں کی معرفت کہلا بھیجا کہ اگر سید صاحب نہیں جاتے تو دو چار توپیں بھیج کر ان کی قیام گاہ کو مسمار کرا دوں گا۔ غلام رسول صاحب مہر نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ حضرت سید صاحب سے بیعت کرنے والوں میں کچھ شیعہ بھی تھے۔ اس سے اکابر کو تشویش ہوئی اور انہوں نے سید صاحب کو منع کرا دیا کہ شیعوں کو بیعت نہ کریں۔ سید صاحب نے اس کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو پھر یہ طے کیا کہ سید صاحب کو لکھنؤ بدر کر دیا جائے۔ لیکن یہ بہت چھوٹی سی بات ہے اس پر یہ سزا کہ سید صاحب شہر بدر ہو جائیں ورنہ قیام گاہ کو توپ دم کر دیا جائے گا قطعاً غیر متوازن اور غیر معقول ہے۔ لیکن اگر اس وقت کے سیاسی حالات پر نظر رکھی جائے تو جرم و سزا میں صحیح توازن قائم ہو جاتا ہے۔ چونکہ معتمد الدولہ بادشاہ بیگم کے مقابلہ میں سید صاحب کی پناہ لے سکتا تھا مگر جب آقایان شاہ کی نظریں ترچھی ہوئیں تو پھر معتمد الدولہ کی معتمدیت کا فیصلہ لامحالہ وہی تھا جو اس نے کیا۔

در پس پردہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استاذ ازل گفت ہماں می گویم

۱۹۲۔ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۵۲، صفحہ ۱۵۴۔

۱۹۳۔ یعنی رائے بریلی سے کلکتہ، کلکتہ سے مکہ معظمہ پھر مدینہ منورہ، مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ ہوتے ہوئے بمبئی۔ بمبئی سے براستہ سمندر کلکتہ، کلکتہ سے رائے بریلی۔

۱۹۴۔ تاریخ کی کس قدر عبرت انگیز حقیقت ہے کہ وہی مسلمان جو سمندروں کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے جن کے سفینے ساتوں سمندروں کے سینوں پر رات دن دوڑتے تھے۔ جنہوں نے ساری دنیا میں بحری تجارت کی راہیں کھولی تھیں، اور آخری بات یہ کہ جو کولمبس کے بیڑے کو یورپ سے امریکہ لے گئے اور جن کی راہنمائی سے واسکوڈی گاما افریقہ کے ساحل سے ہندوستان پہنچا، پھر یہی تھے جو اپنے پروردہ پرتگالیوں سے اتنے سہمے کہ فریضۂ حج کی معافی کا فتویٰ دینے لگے۔

۱۹۵۔ ملاحظہ ہو سیرت سید احمد شہید جلد اول صفحہ ۱۷۵۔

۱۹۶۔ چنانچہ تبت کے چند مسلمان جو پٹنہ میں شریک قافلہ ہونا چاہتے تھے۔ آپ نے ان کو حج کے بجائے خود اپنے وطن میں جا کر تبلیغ و اصلاح کی ہدایت کی کیونکہ ان کے پاس مصارف نہیں تھے۔ آپ نے فرمایا چونکہ زادِ راہ تمہارے پاس کم ہے اس لیے حج تم پر فرض نہیں اور مراد بیت اللہ شریف کی زیارت سے یہ ہے کہ اللہ راضی ہو۔ اب اگر تم سب صاحب مانو تو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ تم اپنے وطن جاؤ اور تبلیغ و اصلاح کی کوشش کرو اور اس کی پابندی کرو کہ کوئی تم کو خواہ کتنی ہی ایذاء پہنچائے تمہیں مارے پیٹے یا ستائے تم صبر سے کام لو، انتقام اور بدلہ کا تصور بھی دماغ میں نہ لاؤ (سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۹۳ ج ۱)

۱۹۷۔ چنانچہ ۱۷۹۰ء میں جب جنرل میڈوز اور کرنل میکسول سلطان ٹیپو سے برسرِ پیکار تھے تو "بورنگ" کا بیان ہے:

سلطان نے پانڈیچری پہنچ کر فرنچ گورنر سے درخواست کی کہ اس کو چھ ہزار فرانسیسی سپاہیوں سے مدد دے کہ انگریزوں کو ملک سے نکال دیا جائے۔ ٹیپو نے اس وقت بھی یہ وعدہ کیا کہ انگریزی مقبوضات فرانس والوں کے سپرد کر دیئے جائیں گے۔ گورنر نے اس درخواست کو شاہ فرانس کے پاس بھیجا لیکن "لوئی شانزدہم" نے انقلاب فرانس کے ڈر سے درخواست پر اس وقت توجہ نہیں دی۔ (تاریخ سلطنت خداداد میسور صفحہ ۲۳۲)

میجر جنرل سرجان میلکم جو ٹیپو کو انگریزی حکومت کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ خطرناک دشمن قرار دیتا ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ٹیپو انگریزوں کے مقابلہ میں فرانس سے تعاون کے لیے راضی تھا (ملاحظہ ہو سیاسی تاریخ ہند)۔

۱۹۸۔ جسونت راؤ ہلکر جن کو اندور کی ریاست دے کر خاموش کر دیا گیا۔

۱۹۹۔ امیر علی خان جن کو ٹونک کی ریاست پر راضی کر لیا گیا۔

۲۰۰۔ یعنی مہاراجہ رنجیت سنگھ جن سے امداد لینے کے لیے ۱۸۰۵ء میں جسونت راؤ ہلکر اور نواب امیر علی خان پنجاب گئے تھے۔ مہاراجہ نے امداد دینے کے بجائے ان کو مشورہ دیا کہ انگریزوں سے صلح کر لیں۔ پھر کوشش کر کے صلح کرا دی (مہاراجہ رنجیت

سنگھ از پروفیسر کوہلی)۔

۲۰۱۔ سید صاحب کی اس تحریک سے تقریباً تیس سال بعد ۱۸۵۷ء میں جب قومی انقلاب کی اسکیم تیار کی گئی تو اس وقت بھی مذہبی عنوان ہی اختیار کرنا پڑا تھا۔ یعنی چربی لگے ہوئے کارتوسوں کا مسئلہ اور یہ پراپیگنڈہ کہ پن چکی کے آٹے میں ہڈی پیس کر ملا دی جاتی ہے۔ اس وقت ظفر شاہ بہادر نے جو اپیل کی تھی، اس میں بھی مذہب ہی کا واسطہ دیا تھا کہ انگریز جملہ مذاہب کو غارت کیا چاہتے ہیں..... چند مثالیں پیش کر کے آخر میں یہ تھا۔ اہل ہنود کو گنگا جی اور تلسی اور سالک رام کی قسم اور مسلمانوں کو قرآن شریف کی قسم ہے کہ وہ بالاتفاق شامل ہو کر اپنی جان اور ایمان کی حفاظت کے واسطے انگریزوں کا قتل اپنے ذمہ فرض سمجھیں (تاریخ بغاوت ہند صفحہ ۳۸۵ و ۳۸۷)۔

۲۰۲۔ سیرت سید احمد شہید کی عبارت یہ ہے۔ "مکی میں مقتبہ میں آپ نے اپنے ساتھیوں سے بیعت لی۔"

۲۰۳۔ یعنی اخلاق اور روحانی اصلاح کے لیے معاہدہ۔

۲۰۴۔ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک صفحہ ۱۵۲

۲۰۵۔ منشی محمد جعفر صاحب تھانیسری فرماتے ہیں۔ یکم شوال ۱۲۳۶ھ یعنی بروز عید الفطر بعد ادائے نماز عید مع چار سو مرد، عورتوں اور بچوں کے بارادہ حج آپ بریلی سے روانہ ہوئے۔ ایک میل چل کر ایک باغ میں ڈیرہ ہوا۔ وہاں کل اہل قافلہ کی شمار کی گئی۔ کل چار سو سات آدمی تھے (سوانح احمدی صفحہ ۵۹)

۲۰۶۔ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۵۹

۲۰۷۔ پانچ کشتیاں سو روپیہ فی کشتی کے حساب سے کرایہ پر لیں اور سو روپیہ پیشگی ادا کر دیے (سید احمد شہید صفحہ ۱۹۰)

۲۰۸۔ غلام رسول مہر صاحب کی تحقیق یہ ہے۔ "سید صاحب نے اپنے ساتھیوں میں سے مضبوط اور توانا آدمیوں کی ایک جماعت کو پیدل چلنے کا حکم دیا تھا۔ شاہ اسمٰعیل، مولانا عبدالحئی اور مولوی محمد یوسف صاحب پھلتی، باری باری اس جماعت کی قیادت فرماتے تھے۔ الہ آباد سے بنارس تک کے سفر میں شاہ اسمٰعیل نے فرض قیادت انجام دیا (سید احمد شہید صفحہ ۲۰۲)۔

۲۰۹۔ سیرت صفحہ ۱۸۳۔

۲۱۰۔ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۸۰، ۱۸۱۔

۲۱۱۔ ایضاً صفحہ ۱۸۳۔ وقائع احمدی میں یہ بھی ہے کہ آپ نے فرمایا: میں نے اہل ہند کے لیے جناب الٰہی میں بہت دعا کی۔ الٰہی! ہندوستان سے تیرے کعبہ کی راہ مسدود ہے۔ ہزاروں مال دار صاحب زکوٰۃ مر گئے مگر نفس و شیطان کے بہکانے سے اس بنا پر حج سے محروم رہ گئے کہ راستہ میں امن نہیں ہے۔ ہزاروں صاحب ثروت اب جیتے ہیں اس وسوسے میں پڑ کر حج کے لیے نہیں جاتے۔ الٰہی! اپنی رحمت سے ایسا راستہ کھول دے کہ جو ارادہ کرے، بے دغدغہ چلا جائے۔ اور اس نعمت عظمیٰ سے محروم نہ رہے۔ میری یہ دعا اس ذات پاک نے مستجاب فرمائی۔ ارشاد ہوا۔ جب تو حج کرے گا تو یہ راستہ علی العموم کھول دیں گے۔ جو مسلمان بھائی زندہ رہیں گے وہ ان شاء اللہ بچشم خود یہ سب کچھ دیکھ لیں گے (وقائع بحوالہ سید احمد شہید ج صفحہ ۱۹۳)۔ مگر یہ واضح رہے کہ اس سے عزم جہاد کی نفی نہیں ہوتی "یک کرشمہ و دو کار" کی یہ بہت ہی مقدس مثال ہے۔ محمد میاں

چنانچہ خود مہر صاحب مصنف "سید احمد شہید" بھی اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ باب حج سلطانوں اور فرماں رواؤں کا کام تھا، جنہیں اسباب و وسائل پر وسیع قدرت حاصل ہوتی ہے لیکن اس دروازے کو کھولنے اور راستے کی ساری مشکلات کو بے حقیقت ثابت کرنے کا شرف سید صاحب کو بھی ملا جن کے پاس اسلام کی بے مثل محبت کے سوا کوئی متاع نہ تھی۔ اس طرح باب جہاد بھی ارباب سلطنت و حکومت ہی کے ذریعے سے کھل سکتا تھا جو خیل و خدم اور ثروت و حشم کے مالک ہوتے ہیں لیکن اس مقدس فریضے کو بھی بارہ صدیوں کے بعد منہاج نبوت پر قائم کرنے کی برتری صرف سید صاحب ہی کو حاصل ہوئی۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں (صفحہ ۱۹۳ ج ۱)

۲۱۲۔ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۸۳

۲۱۳۔ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۹۲، ۱۹۳۔

۲۱۴۔ وقائع احمدی بحوالہ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۹۴ ج ۱۔

۲۱۵۔ نذرانہ کی تفصیل یہ بیان کی گئی ہے۔ اکیس کشتیوں میں کم خواب، مشروع کے تھان اور کئی جوڑے دوشالے، نینوں، ململ اور خاصے کے تھان اور پانچ سو روپیہ نقد۔ (سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۹۲)۔

۲۱۶۔ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۹۳۔

۲۱۷۔ سیرت سید احمد شہید۔

۲۱۸۔ الہ آباد کا دائرہ شاہ اجمل جس کے سجادہ نشین آج کل مولانا سید محمد شاہد صاحب فاخری صدر جمعیۃ علماء اتر پردیش ہیں۔ آپ ہی کے اسم گرامی اور نام نامی کی طرف منسوب ہے۔

۲۱۹۔ حضرت شاہ اجمل صاحب بیمار تھے۔ آپ خود تشریف نہیں لا سکے۔ آپ نے اپنے صاحبزادہ شاہ ابوالمعالی کو استقبال کے لیے بھیجا، اور جب قافلہ الہ آباد سے روانہ ہونے لگا تو چند نذرانے پیش فرمایا۔ (وقائع احمدی و سیرت سید احمدؒ وغیرہ)

۲۲۰۔ منشی امین الدین صاحب بنگال کے اونچے گھرانے کے فرد تھے۔ کلکتہ کے ممتاز امیروں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ انگریزی کمپنی میں انہیں وکالت کا عہدہ حاصل تھا، اور کمپنی کے پورے ہندوستانی علاقوں میں سے جتنے مقدمات کلکتہ کی مرکزی حکومت کے پاس پیش ہوتے تھے سب منشی صاحب کی وساطت سے ہی پیش ہوتے تھے۔ تنخواہ مقرر نہ تھی، مگر حق وکالت کی رقم چالیس ہزار کے قریب ماہانہ ہو جاتی تھی، جو ہاتھیوں پر لاد کر ماہانہ بھیجی جاتی تھی۔ بڑے فراخ حوصلہ مخیر تھے۔ چار سو پانچ سو طلبہ کا خرچ اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ (سید احمد شہید)

۲۲۱۔ مولانا شریعت اللہ صاحب بہادر پور ضلع فرید پور کے ایک جوان صالح جنہوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں زیارت بیت اللہ الحرام کے لیے اپنے وطن عزیز کو خیرباد کہا۔ بیس سال حجاز مقدس میں قیام کیا۔ شیخ طاہر السنبل مکی شافعی کے فیض سے دامن تحصیل پر کیا۔ ۱۸۰۲ء میں ہندوستان واپس آئے اور تبلیغ و اصلاح کے چراغ روشن کیے۔ ۱۸۰۴ء میں ایک اصلاحی جماعت قائم کی جس کا نام "فرائضی" رکھا۔ تجدید و اصلاح کا ذوق یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ پیر اور مرید کے پرانے الفاظ بھی اُستاد اور شاگرد کے الفاظ سے بدل دیئے گئے۔ پیر و مرشد کی بجائے اُستاد و شاگرد بولتے تھے۔ دودھو میاں اُن کے خلیفہ اور جانشین ہوئے۔ جنہوں نے بہادر پور کو صدر مقام قرار دے کر بالخصوص کاشتکاروں میں تبلیغ کی۔ اُن کا منشاء مذہبی تبلیغ کے علاوہ غرباء میں باہمی امداد کی روح پیدا کرنا اور انہیں زمینداروں کی دست برد سے بچانا تھا۔ (مذاہب ہند کی تحقیقات از پادری ہانجکس (انگریزی) صفحہ ۱۷۹، ۱۸۱ بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۱۰۴)

۲۲۲۔ روزانہ ایک ہزار کے قریب بیعت سے مشرف ہوتے۔ روز بروز یہ ہجوم بڑھتا رہا۔ بیعت ہونے والوں میں بنگال کے علاوہ آسام اور جاوا کے مسلمان بھی شامل تھے۔ (سیرت سید احمد شہید صفحہ ۲۳۱)۔

۲۲۳۔ سیرت سید احمد شہید۔

۲۲۴۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۲۔

۲۲۵۔ ایضاً صفحہ ۲۲۔ مگر ہنٹر کو اس موقع پر کچھ غلط فہمی ہوگئی۔ چار خلیفہ جاتے وقت نہیں بلکہ حج بیت اللہ شریف سے واپسی کے وقت مقرر کیے تھے۔ جاتے وقت تو قیام مختصر رہا کیونکہ کچھ لوگوں نے کلکٹر کو مشتعل کرنے کی کوشش کر دی تھی کہ یہ لوگ سرکار کے مخالف جہاد کے لیے تیاری کر رہے ہیں۔ کلکٹر نے اگرچہ بظاہر اس شکایت سے اثر نہیں لیا۔ تاہم سید صاحب نے زیادہ قیام کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ (وقائع احمدی)

۲۲۶۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۹۰ از ڈبلو، ڈبلو، ہنٹر۔

۲۲۷۔ ایضاً صفحہ ۸۹۔

۲۲۸۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سیرت سید احمد شہید، وقائع احمدی، مخزن احمدی اور سوانح احمدی وغیرہ۔ ہنٹر کے اس غلط الزام کی کوئی توجیہ ضروری بھی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب نیوتنوی کے واقعہ کو حضرت سید صاحب پر چسپاں کر دیا ہے اور وہ بھی رنگ آمیزی اور مبالغہ کے ساتھ۔ اس واقعہ کی حقیقت غلام رسول صاحب مہر کے الفاظ میں یہ ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب بہت تیز مزاج تھے۔ وہ بعض مروجہ غیر شرعی مراسم کے رد و ابطال میں تیزی سے کام لیتے تھے، اور چونکہ چند سال ہوئے نجدیوں سے جنگ ہو چکی تھی، حجاز کے لوگوں میں انتہائی اشتعال تھا کہ بدعت کے رد میں اگر کوئی سختی سے کام لیتا تو اس کو بھی وہابی سمجھ لیا جاتا تھا۔ اس وہم کی بنا پر مولانا عبدالحق صاحب کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ مولانا عبدالحی صاحب نے منت دے کر ان کو چھڑا لیا، اور مقدمہ کی جواب دہی کے موقع پر بھی مولانا ہی تشریف لے گئے اور عدالت سے بات چیت کر کے ان کو رہا کرایا۔ اس طرح مولوی عبدالحق صاحب رہا ہوئے۔ مکہ معظمہ تک سید صاحب کے ساتھ رہے۔ پھر صنا چلے گئے، اور قاضی شوکانی سے حدیث کی سند لے کر ہندوستان آئے۔ (سیرت سید احمد شہید صفحہ ۲۳۶ و صفحہ ۲۳۷ ج ۱)۔

۲۲۹۔ باب چہارم ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۰۶۔

۲۳۰۔ باب دوم ایضاً صفحہ ۷۶

۲۳۱۔ باب دوم ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۷۷۔

۲۳۲۔ تیسرا باب ایضاً صفحہ ۱۵۸۔

۲۳۳۔ ایضاً صفحہ ۸۷ باب ۲

۲۳۴۔ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۲۴۷ و ۲۴۸۔

۲۳۵۔ سید احمد شہید۔

۲۳۶۔ یہاں سے چلے تو راستہ میں ایک انگریز کی مسلمان عورت نے دعوت کرنی چاہی۔ سید صاحب نے انکار کر دیا۔ پھر انگریز نے آ کر اپنی طرف سے دعوت کی تو آپ نے منظور فرما لی۔ (سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۹۵)

۲۳۷۔ یہ اودھ کے شاہزادے ہیں۔ مرزا حاجی کچھ دنوں غازی الدین حیدر کے مقرب بھی رہے ہیں۔ (قیصر التواریخ صفحہ ۱۲۸ و صفحہ ۱۲۹ جلد ۱)۔

۲۳۸۔ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۲۰۷۔

۲۳۹۔ ایضاً صفحہ ۲۲۸۔

۲۴۰۔ ایضاً صفحہ ۲۵۵

۲۴۱۔ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۲۳۲

۲۴۲۔ حضرت شاہ سید علم اللہ صاحب ۱۲ ربیع الاول ۱۰۳۳ھ دوشنبہ کے روز قصبہ نصیر آباد میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا تقریباً ڈھائی مہینے پہلے اور والدہ ماجدہ کا دو تین سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ آپ کے ماموں سید ابو محمد، شاہجہاں بادشاہ کے امراء میں سے تھے۔ آپ ہی نے اس یتیم بھانجے کی پرورش کی۔ شاہ علم اللہ صاحب نے تعلیم چچازاد بھائی دیوان خواجہ احمد صاحب سے حاصل کی۔ جوان ہوئے تو ماموں نے ملازمت کی کوشش کے لیے لشکر میں طلب کر لیا۔ لیکن آپ ملازمت سے پہلے دنیا سے دل برداشتہ ہو کر خدا طلبی کی راہ اختیار کر چکے تھے۔ اسباب امارت کو وقف عام کر دیا تھا اور دوسال لشکرگاہ میں ٹھہر کر نفس کی تہذیب و تربیت کے لیے خدمات شاقہ انجام دیتے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت مجدد الف ثانی کے خلیفہ اعظم حضرت سید آدم بنوری کا آفتاب ہدایت و ارشاد پورے عروج پر تھا۔ حضرت شاہ علم اللہ صاحب، حضرت سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے بیعت کی اور تھوڑی مدت میں اس راہ کی تمام منزلیں طے کر لیں۔ حضرت سید آدمؒ نے

اپنا عمامہ اور حضرت مجددؒ صاحب کی دستار مبارک عنایت فرمائی اور وطن کی طرف رخصت کر دیا۔ شاہ صاحب نے رخصت ہوتے وقت عرض کیا کہ اودھ میں بہت سے علماء اور فضلاء اور مشائخ موجود ہیں، میری ان میں کیا حیثیت ہوگی۔ حضرت سید آدم صاحب نے کچھ دیر مراقبہ کر کے فرمایا۔ جیسے چراغوں میں شمع کی۔ پھر کچھ دیر مراقبہ کے بعد فرمایا۔ جیسے تاروں میں آفتاب کی۔ جب حضرت سید آدم بنوریؒ حج کو جانے لگے تو آپ بھی شیخ کی رفاقت میں حج کے لیے تیار ہو گئے۔ حضرت سید آدم نے اجازت دی مگر یہ بھی فرما دیا کہ کوئی مرد خدا تم کو کہیں روک کے ٹھہر جانا۔ شاہ علم اللہ صاحب اہل و عیال کو لے کر سفر حجاز کی نیت سے نصیرآباد سے رائے بریلی آئے تو یہاں ایک خدا رسیدہ بزرگ شاہ عبدالشکور صاحب مجذوب نے شیخ کا قول یاد دلا کر بہ اصرار رائے بریلی کے قیام پر آمادہ کیا اور "سی" ندی کے کنارے ایک جگہ قیام کے لیے تجویز کر دی۔ شاہ صاحب نے وہیں طرح اقامت ڈال دی۔ ۱۰۷۵ھ میں آپ نے حج کیا۔ پھر دوسری مرتبہ ۱۰۸۲ھ میں حرمین شریفین تشریف لے گئے۔ واپسی میں کعبہ مکرمہ کا نقشہ اور اس کی صحیح پیمائش ساتھ لائے۔ اور ۱۰۸۴ھ میں اس نقشہ اور پیمائش کے مطابق اپنے مسکن میں "سی" کے بالکل کنارے اپنے اور اپنی اولاد کے ہاتھ سے خدا کا گھر تعمیر کیا۔ جس کی نیو دوں میں آپ نے ۲ ذی الحجہ ۱۰۹۶ھ عہد عالمگیر میں ۶۳ سال عمر پا کر وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انتقال کی رات کو عالمگیر نے خواب میں دیکھا کہ آج کی رات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی۔ علماء نے تعبیر دی کہ اس شب میں کسی متبع سنت عالم کا انتقال ہوا ہے۔ پھر سرکاری وقائع نگار کی تحریر سے معلوم ہوا کہ حضرت موصوف نے اسی شب میں انتقال کیا تھا۔ (سیرت سید احمد شہید جلد ا صفحہ ۴۹)

۲۴۳۔ سید صاحب کے نانا حضرت سید شاہ ابو سعیدؒ (بن حضرت سید محمد ضیا بن حضرت سید آیت اللہ بن حضرت شاہ علم اللہ) اپنے زمانہ کے جلیل القدر عالم اور اکابر مشائخ میں سے تھے۔ جوانی میں اپنے عم محترم مولانا سید محمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت طریقت کی۔ اپنے آباء کرام کی نسبت اپنے والد کے خلیفہ شاہ محمد یونس سے حاصل کی۔ پھر دہلی حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سلوک کی تکمیل کی اور بشارت عظیمہ سے ممتاز ہوئے۔ آپ حضرت شاہ ولی اللہ کے مخصوص لوگوں میں سے تھے۔ جود و سخاوت، مہمان نوازی اور غرباء پروری میں اپنے زمانہ میں ممتاز تھے۔ ایک مرتبہ ایک لاکھ روپیہ آیا۔ گھر کے باہر رکھ دیا اور وہیں سے ضرورت مندوں کو تقسیم کر دیا۔ مدراس اور چیناپٹن میں آپ کا بڑا اثر اور مقبولیت تھی (سیرت سید احمد شہید صفحہ ۶۵)۔ یہ ایک لاکھ روپیہ غالباً سلطان ٹیپو کے والد نواب حیدر علی کا عطیہ تھا۔ (سیرت سید احمد شہید)

۲۴۴۔ شاہ ابو اللیث صاحب حضرت ابو سعید صاحب کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ زیادہ تر مدراس اور جنوبی ہند کے علاقے میں رہے، اور وہیں آپ کی وفات ہوئی۔ آپ سلطان ٹیپو کے معاصر تھے۔

۲۴۵۔ دیکھو صفحہ ۷ سیرت سید احمد شہید۔

۲۴۶۔ سوانح احمدی، مخزن احمدی و سیرت سید احمد شہید وغیرہ۔

۲۴۷۔ سوانح احمدی صفحہ ۱۸۔

۲۴۸۔ سیرت صفحہ ۱۱۹۔

۲۴۹۔ سوانح احمدی صفحہ ۲۸ و ۲۹۔

۲۵۰۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی سیاسی تحریک صفحہ ۴۷۔

۲۵۱۔ شاہ ولی اللہ صاحب سے آپ کا خاندانی رشتہ بھی تھا۔ حضرت شاہ صاحب آپ کے پھوپھا ہوتے تھے، پھر آپ کے خسر بھی ہو گئے۔

۲۵۲۔ مشہور واقعہ ہے کہ دہلی کی بہت بڑی دولت مند اور ممتاز ترین "موتی" کے یہاں کسی تقریب میں تمام دہلی کی طوائف کا اجتماع تھا۔ شاہ صاحب کو علم ہوا تو آپ نے جامع مسجد میں نماز عشاء پڑھی اور فقیروں کے کپڑے پہن کر بازار خانم میں

اس طوائف کے مکان پر تشریف لے گئے۔ دروازے پر کھڑے ہو کر دستک دی۔ اندر سے ایک لڑکی نکل کر آئی۔ دریافت کیا کون ہے۔ آپ نے فرمایا ایک فقیر ہے۔ لڑکی اندر گئی۔ اپنی آقا "موتی" کو خبر کی۔ موتی نے کچھ پیسے بھیج دیئے۔ لڑکی نے آ کر پیسے دینے چاہے۔ آپ نے فرمایا بی بی سے کہو فقیر کہتا ہے کہ میں ایک صدا کہا کرتا ہوں۔ بغیر صدا کہے کچھ لینے کی عادت نہیں۔ تم پہلے میری صدا سن لو۔ لڑکی نے جا کر کہا۔ موتی کو خیال ہوا کہ فقیر کی صدا اس بزم نشاط میں سرمستی پیدا کرے گی۔ اُس نے فقیر کو اجازت دے دی۔ فقیر اندر داخل ہوا۔ سارا مجمع فقیر کے گرد اکٹھا ہو گیا فقیر نے آنکھیں بند کر کے صدا کہنی شروع کی۔ یہ صدا کیا تھی۔ سورۂ والتین کی رقت انگیز تفسیر تھی۔ جو درد بھرے دل سے پُر درد لہجہ میں نکل رہی تھی، اور دلوں میں درد پیدا کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر کی تقریر نے جادو کا اثر کیا۔ دلوں کی دنیا میں انقلاب برپا ہو گیا۔ ہر طرف سے گریہ وزاری و توبہ استغفار کی صدا بلند ہونے لگی۔ موتی اور اس کی بہت سی سہیلیوں نے آوارہ زندگی سے توبہ کی اور نکاح کر کے ساری عمر پاک دامنی اور شرافت کے ساتھ گذاردی۔

(سوانح احمدی و سیرت سید احمد شہید و امیر الروایات وغیرہ)

۲۵۳۔ ایک مرتبہ کچھ بدمعاشوں نے حضرت شاہ صاحب کی اصلاحی کوششوں پر آوازے کسے۔ شاہ صاحب کے ایک دوست کو بدمعاشوں کی یہ حرکت ناگوار گذری اور ان کو صدمہ ہوا کہ یہ بدمعاش شاہ ولی اللہ کے پوتے اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے بھتیجے کے منہ آ رہے ہیں۔ مگر ساتھ ہی اُن کو شاہ صاحب پر بھی غصہ آیا کہ وہ کیوں ان بدمعاشوں کو منہ لگاتے ہیں کہ ایسے جواب سننے کی نوبت آتی ہے۔ دوست نے شاہ صاحب کو ملامت شروع کی کہ آپ ایسے معزز خاندان کے معزز رکن ہیں۔ یہ آپ کیا حرکت کرتے ہیں کہ ان بدمعاشوں کے مجمع میں کھڑے ہو کر اُن سے بحث مباحثہ کرتے ہیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ کیا یہ انسان نہیں ہیں۔ کیا یہ اصلاح کے مستحق نہیں ہیں۔ کیا یہ طائف کے اوباشوں سے بھی گئے گذرے ہیں۔ اگر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مکہ اور طائف کے بدمعاشوں سے سر بازار پتھر کھاتے ہیں جس سے جسم مبارک لہولہان ہو جاتا ہے تو اسمٰعیل کے لیے یہ ذلت نہیں بلکہ فخر ہے کہ میری طرف سے ہمدردی اور خیر خواہی ہو اور ان کی طرف سے توہین و ایذا رسانی

بجرم عشق توام مے کشند و غوغا ئیست
تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشا ئیست

۲۵۴۔ اصلاح اور پند و نصیحت کا بے پناہ جذبہ جو حضرت شاہ صاحب کو عطا ہوا تھا اس کے اندازہ کے لیے ایک مثال کافی ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے وعظ کہا۔ وعظ کہہ کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک شخص آیا۔ اُس نے حیرت سے دریافت کیا کہ کیا وعظ ہو چکا۔ لوگوں نے جواب دیا کہ وعظ ختم ہو گیا۔ اُس شخص نے افسوس کیا کہ میں گھر سے چل کر اس لیے آیا تھا کہ کچھ نصیحتیں سنوں۔ آپ نے فرمایا۔ میں تمہیں پھر سنائے دیتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے پورا وعظ اول سے آخر تک دہرایا کہ شاید اسی ایک کو ہدایت ہو جائے (سیرت سید احمد شہید)۔

۲۵۵۔ کیس کو مضبوط کرنے کے لیے دہلی کے شاہ پرستوں سے محضر نامہ مرتب کرایا گیا۔ ڈیڑھ ہزار سے زیادہ اس پر دستخط کرائے گئے۔ محضر نامہ میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ شاہ صاحب کو ان کی تقریروں سے روکا جائے۔ ایک عالم صاحب اس تمام کارروائی میں آلۂ کار تھے۔ مگر اس وقت ان عالم صاحب کا دورِ شباب تھا۔ کچھ عرصہ بعد جب ۱۸۵۷ء میں جہادِ حریت کا بازار گرم ہوا تو یہ عالم صاحب بھی وہی کر رہے تھے جو پہلے شاہ اسمٰعیل صاحب کر چکے تھے۔ فرق یہ رہا کہ شاہ صاحب بالاکوٹ میں شہید ہوئے اور اس عالمِ حق نے جزائر انڈمان میں حبسِ دوام کی سزا کاٹتے میں وفات پائی۔ رحمہما اللہ

۲۵۶۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حیاتِ ولی۔

۲۵۷۔ مولانا ذوالفقار علی صاحب قصبہ دیوبند کے مشہور عالم و فاضل اور باحیثیت بزرگ تھے۔ آپ ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ آپ کے بڑے صاحبزادے بیسویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے سب سے پہلے جنگِ آزادی کے محرک اور مجاہد

ہوئے۔ جن کو محبان وطن نے شیخ الہند کا خطاب دیا اور آج تاریخ کے صفحات میں ان کا نام اس طرح لیا جاتا ہے، شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب اسیر مالٹا بانی تحریک ریشمی رومال (مفصل ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔ انشاء اللہ)۔ مولانا ذوالفقار علی صاحب عربی فارسی کے بہت بڑے ادیب تھے۔ ان کی ادبی خدمات علوم مشرقیہ کی یونیورسٹیوں میں بہت زیادہ قدر و منزلت رکھتی ہیں۔ آپ کا شمار دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ آپ عرصہ تک انسپکٹر مدارس رہے۔

۲۵۸۔ ارمغان احباب بحوالہ سیرت سید احمد شہید۔ طبع اول صفحہ ۳۹۷۔

۲۵۹۔ پیدائش ۱۱۵۹ھ، ۱۷۴۶ء۔ وفات ۱۲۳۹ھ ۱۸۲۳ء۔ قمری حساب سے عمر ۸۰ سال۔ ۱۷ سال کی عمر میں والد صاحب کی جگہ علمی و ملی خدمات کے مسند نشین ہوئے۔ ۶۳ سال متواتر سرگرم اور جلیل القدر خدمات سے مسند کو پر رونق رکھا۔ تین عفت مآب صاحبزادیوں کے علاوہ آپ کے اولاد نہ تھی۔ صاحبزادیاں بھی صاحب اولاد ہو کر آپ کی حیات ہی میں وفات پا گئیں۔ سب سے بڑی صاحبزادی مولانا رفیع الدین صاحب کے فرزند مولانا عیسیٰ سے منسوب ہوئی تھیں۔ منجھلی صاحبزادی شیخ محمد افضل صاحب سے منسوب ہوئی تھیں جن سے مولانا محمد اسحٰق صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد یعقوب صاحب پیدا ہوئے سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت مولانا عبدالحی صاحب کے نکاح میں تھیں جو حضرت سید احمد صاحب کے رفقاء میں سب سے اونچا درجہ رکھتے تھے۔

۲۶۰۔ مقالات طریقت صفحہ ۴۰ و کمالات عزیزی وغیرہ۔

۲۶۱۔ ایضاً صفحہ ۴۰۔

۲۶۲۔ کمالات عزیزی و حیات ولی صفحہ ۳۴۴۔

۲۶۳۔ نجف علی خاں اگرچہ آپ کا مخالف تھا مگر اس کے بعد نجیب الدولہ کے دور میں حالت بدل چکی تھی خود نجیب خاں اور اسی طرح دوسرے امراء کی حالت یہ تھی کہ کہیں آپ کو دیکھ لیتے تھے تو اپنی سواری سے اتر کر قدمبوس ہوتے۔ ایک مرتبہ بادشاہ سے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ملاقات ہوگئی تو بادشاہ نے آپ سے آگے تشریف لے چلنے کی درخواست کی (ملفوظات)

۲۶۴۔ مولانا عبیداللہ صاحب فرماتے ہیں: مولانا محمد اسحٰق صاحب کو ہر معاملہ میں اپنے ساتھ شریک رکھ کر شاہ عبدالعزیز صاحب نے لوگوں کو سمجھا دیا کہ ان کا حکم میرا حکم ہے۔ (صفحہ ۱۵۳ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک)

۲۶۵۔ مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کا ارشاد ہے۔ ''جب ۱۲۳۹ھ میں امام عبدالعزیز فوت ہوئے تو آپ نے اپنا مدرسہ مولانا محمد اسحٰق کے سپرد کر دیا جو حزب ولی اللہ کی امامت کا عرفی دستور تھا۔ سید احمد صاحب شہید کا قافلہ جب حج سے واپس آیا تو انہوں نے امام عبدالعزیز کے بعد اس امامت کو تسلیم کر لیا۔ اس زمانہ میں اگر جمعیۃ کا اجلاس مدرسہ میں ہوتا تو مولانا محمد اسحٰق صدارت کرتے اور سید احمد شہید حلقے میں بیٹھتے اور جب مدرسہ سے باہر مجلس منعقد ہوتی تو سید احمد شہید صدر ہوتے اور مولانا محمد اسحٰق حلقہ میں شریک ہوتے۔ اس لیے حزب ولی اللہ کی اساسی مصلحت کی حفاظت اور رجال و اموال جمع کرنے کے لیے دعاۃ کا سلسلہ امام عبدالعزیز کے مدرسہ سے متعلق رہا اور عسکری و سیاسی سرداری سید احمد شہید کی جماعت سے وابستہ رہی۔ (شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک صفحہ ۱۵۶ بحوالہ ارواح ثلاثہ)۔

۲۶۶۔ غالباً یہ شیخ غلام علی رئیس الہ آباد ہیں جن کو غلطی سے شیخ غلام حسین لکھا گیا ہے۔ مصحح

۲۶۷۔ سید احمد صاحب جو ہر معرکہ میں پیش پیش رہے اور بہت سے معرکے ایسے انجام دیئے کہ ان میں کامیابی کا تصور بھی لرزہ خیز تھا گویا موت کے منہ میں جا کر زندہ واپس ہوئے۔ اسی وجہ سے سید صاحب کے دربار سے ان کو ''زندہ شہید'' کا خطاب ملا تھا (سیرت سید احمد شہید ج ۱ صفحہ ۲۸۶)

۲۶۸۔ ۷ رجمادی الثانیہ ۱۲۴۱ھ، ۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء دوشنبہ۔ ایک شاعر صاحب نے یہ تاریخ کہی۔

بہ عزم جہاد آں شہ ملک و دیں | کہ شد احمد عصر نامش غریب
...بر بست رخت سفر شد سوار | گرفت از پس و پیش فوج حبیب
بہ بحر لشکر شدم غوطہ زن | در سال آں تا کہ گردد نصیب
بدیدہ سر کفر و پائے عدو | بہ آہنگ راحت فزائے عجیب
سروشے ندا داد از بام چرخ | کہ نصر من اللہ فتح قریب

نصر من اللہ فتح قریب کے اعداد میں سے کفر کا سر یعنی "کاف" اور عدو کے پاؤں یعنی "و" کے اعداد نکال دیئے جائیں۔ یعنی ۱۲۶۷ میں سے ۲۶ نکال دیئے جائیں تو ۱۲۴۱ صحیح تاریخ نکل آئے گی۔

۲۶۹۔ اس موقع پر وہ سطور دوبارہ ملاحظہ فرمائیے جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے خاتمہ کے زیرِ عنوان تحریر کی گئی ہیں۔

۲۷۰۔ سید احمد شہید صفحہ ۲۸۸۔

۲۷۱۔ ایضاً۔

۲۷۲۔ یہ ملاقات فروری ۱۸۲۷ء میں ہوئی تھی۔ سید صاحب نے اپنے مرکز (سرحد) پہنچ کر پوری طرح اپنا نظام قائم بھی نہیں کیا تھا کہ مارچ ۱۸۲۷ء میں دولت راؤ سندھیا کا انتقال ہو گیا۔ اسی لیے سید صاحب کے خطوط اس کے نسبتی بھائی کے نام آئے جو بعد میں تحریر ہوں گے۔

۲۷۳۔ سید احمد شہید صفحہ ۲۹۴۔

۲۷۴۔ یہی سید صبغۃ اللہ ہیں جنہوں نے اس تنظیم کی بنیاد ڈالی جو "حر" کے نام سے مشہور ہوئی۔ جس کے سربراہ کو "پیر پگاڑہ" کہا جاتا تھا۔ جس کو تقریباً سو سال بعد ۱۹۴۳ء میں انگریزوں نے فوجی طاقت سے کچل ڈالا۔ اس وقت کے سربراہ اور امیر (جن کا نام بھی صبغۃ اللہ تھا اور اسی بناء پر آپ کو صبغۃ اللہ شاہ ثانی کہا جاتا تھا) کو پھانسی دی گئی۔ تمام جائداد منقولہ اور غیر منقولہ جس میں کئی من سونا بھی تھا ضبط کیا گیا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے سید احمد شہید صفحہ ۳۰۲ و ۳۰۸ تا ۳۱۰۔

۲۷۵۔ ایضاً ۲۹۸۔

۲۷۶۔ منزلوں کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیے۔ سید احمد شہید مصنفہ غلام رسول مہر۔

۲۷۷۔ یہ سید محمد جعفری صاحب ناظر سنی مجلس اوقاف دہلی کے ذاتی کتب خانہ سے حاصل ہوئی ہے۔

۲۷۸۔ اس بیعت کی حیثیت کیا تھی۔ یہ بیعت جہاد تھی یا بیعت امارت۔ اس بحث سے غلام رسول صاحب مہر کو دلچسپی ہے لہٰذا ان کی کتاب میں ملاحظہ فرمائی جائے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ حکومت کی قسم کا ایک نظام ۱۲ جنوری ۱۸۲۷ء سے قائم کر دیا گیا۔ محمد میاں

۲۷۹۔ سطور بالا میں جو مقامات پیش کیے گئے ہیں غالباً وہ مولانا سید محمد علی صاحب نے اس دورے کے بعد مقرر فرمائے ہیں۔

۲۸۰۔ سوانح احمدی وغیرہ۔

۲۸۱۔ سوانح احمدی وقائع وغیرہ

۲۸۲۔ مکتوب سید صاحب بنام شاہ بخارا و مکتوب بنام سردار بدھ سنگھ جرنل افواج مہاراجہ رنجیت سنگھ۔

۲۸۳۔ غالباً یہ وہ زمانہ ہے کہ مہاراجہ دولت راؤ سندھیا کا مارچ ۱۸۲۷ء میں انتقال ہو چکا ہے اور کمپنی کے ایجنٹ ایک گیارہ سالہ لڑکے موکب راؤ ملقب بہ عالی جاہ جنکو جی راؤ سندھیا کو زبردستی متبنّیٰ قرار دے کر گدی پر بٹھا چکے ہیں اور اب اختیارات کے بارہ میں کمپنی کے کارپردازان اور مہارانی دولت راؤ سندھیا کی بیوہ "بیزا بائی" کے درمیان کشمکش جاری ہے جس کے نتیجہ میں بیزا بائی کو گوالیار سے جان بچا کر فرار ہونا پڑا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ غریب ہندو راؤ کیا کر سکتا تھا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو عہد نامجات سرکار کمپنی انگریز بہادر حصہ دوم جلد چہارم ریاست سندھیا)۔

۲۸۴۔ مجموعہ خطوط قلمی صفحہ ۱۴۲ بحوالہ کتاب مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا صفحہ ۲۷۴ تا ۲۷۶۔

۲۸۵۔ صفحہ ۱۷ تا صفحہ ۳۳ مطبوعہ مدینہ پریس بجنور ۱۹۵۴ء شائع کردہ مجلس علمی ڈابھیل۔

۲۸۶۔ البدور البازغہ صفحہ ۳۷۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ، شاہ ولی اللہ صاحب کی عبارت نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں" ہم آج کی زبان میں اس کا ترجمہ کرتے ہیں:
ایک حقیقی امام کا جو ڈکٹیٹر بن سکے پیدا ہونا آسان نہیں ہے۔ اس کے نہ ملنے پر حاکم بنانے کے لیے ان تین صورتوں میں سے کسی ایک پر عمل کرنا پڑے گا۔ ۱: ایک بورڈ بنا دیا جائے ۔۲: اگر محدود سوسائٹی ہو تو اس کا ہر ایک حصہ اپنے تسلیم کردہ قانون پر اپنے تسلیم کردہ رئیس کی اطاعت میں قومی قانون کی پابندی کریگا یعنی سوسائٹی کو حکومت بنانے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ ان میں اس قسم کے اختلاف پیدا ہی نہیں ہوتے جو امام بنانے کے لیے مجبور کردیں۔ ۳: یا عقل مندوں یا عوام کے مقبول لوگوں کا اجتماع ہوگا یعنی پارلیمنٹ بن جائے گی (شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک صفحہ ۱۵۱، ۱۵۲)

۲۸۷۔ سید صاحب اسی مفہوم کو اپنے ایک مکتوب میں ان الفاظ میں ادا فرماتے ہیں۔" بندہ کہ در مقابلہ امداد مولائے خود غیرت وحمیت نے دردِ الحقیقت بندہ نیست دعجیکہ جان ومال وعزت وآبروئے خود را در تحصیل رضاء محبوب خود نگاہ دارد فی الحقیقت محجوب نے۔ (مجموعہ مکاتیب شاہ اسمٰعیل صاحب قلمی نسخہ صفحہ ۹۰۔ بحوالہ جماعت مجاہدین صفحہ ۷ سید احمد شہید صفحہ ۲۲۸۔

۲۸۸۔ سید احمد شہید صفحہ ۳۵۱، ۳۵۷

۲۸۹۔ سید احمد شہید ۹۸۔

۲۹۰۔ ایضاً صفحہ ۱۷!

۲۹۱۔ سید احمد شہید صفحہ ۲۱۰ وصفحہ ۲۱۱۔

۲۹۲۔ ایضاً صفحہ ۲۳۷۔

۲۹۳۔ ۳۵۵ ج ا۔

۲۹۴۔ جماعت المجاہدین صفحہ ۴۰۔

۲۹۵۔ منظورہ بحوالہ سید احمد شہید صفحہ ۵۰۔

۲۹۶۔ سید احمد شہید صفحہ ۸۸۔

۲۹۷۔ جماعت مجاہدین صفحہ ۸۹۔

۲۹۸۔ مسلمان را سے بیدکہ در مقام خواہش نفسانی ومشتہیات آں مثل طعام لذیذ وشیرینی وانواع فواکہ دیگراں را بر نفس خود تقدیم دہد وخود از انہا موخر شود ورد اندارد کہ زیادہ از اں بہ حظوظ نفسانی گردد بلکہ دریں امر کی بہ جانب خویش پسند نماید و در مقام رنج وتکلیف نفس خود را بر دیگراں مقدم سازد وآں بلا وتکلیف برآنہانہ پسندد (منظورہ صفحہ ۱۰۵۶ بحوالہ جماعت مجاہدین صفحہ ۲۷)

۲۹۹۔ سید احمد شہید صفحہ ۱۹۴۔

۳۰۰۔ ایضاً صفحہ ۲۳۶

۳۰۱۔ سید احمد شہید صفحہ ۳۸ ج ۲۔

۳۰۲۔ سیرت سید احمد شہید طبع اوّل صفحہ ۷۵ اور ۱۷۶

۳۰۳۔ وصایا جلد دوم صفحہ ۵۹ بحوالہ جماعت مجاہدین صفحہ ۱۷

۳۰۴۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ از پروفیسر سیتارام کوہلی ایم اے۔ گورنمنٹ کالج لاہور صفحہ ۲۰۴۔

۳۰۵۔ ایضاً صفحہ ۹۸ تا صفحہ ۱۰۰ وسیاسی تاریخ ہند از میجر جنرل سر جان میلکم لارڈ کارنوالس کا دورِ حکومت۔

۳۰۶۔ تاریخ راجگانِ پنجاب از لیپل گرفن۔

۳۰۷۔ خادی خاں قلعہ ہنڈ کا سردار تھا یہ پرانا قلعہ دریاء "اباسین" کے پر فضا کنارہ پر بادشاہی شان وشوکت کی یادگار تھا۔ خادی خاں پہلے اتنا معتقد ہوا کہ حضرت سید صاحب اور آپ کے تمام رفقاء کو قلعہ ہنڈ میں لے گیا اور اصرار کیا کہ وہیں قیام کریں

لیکن جب ایک موقع پر سید صاحب کا فیصلہ اس کی مرضی کے خلاف ہوا تو سید صاحب کے درپے آزار ہو گیا۔

۳۰۸۔ یعنی موضع مان پری۔ یہاں مالکانِ اراضی اور کاشتکاروں کے دو گروہ تھے جن میں تقریباً ایک صدی سے جنگ چل رہی تھی۔ بارہا کشت و خون کی نوبت آ چکی تھی اور بقول مصنف سوانح احمدی، فریقین کے تین چار ہزار آدمی قتل ہو چکے تھے۔ جب اس علاقہ میں سید صاحب کے احکام نافذ ہونے لگے تو یہ معاملہ بھی سید صاحب کی عدالت میں پیش ہوا تحقیق و تفتیش کے بعد سید صاحب نے مالکانِ اراضی کے دعوے کو جائز اور صحیح قرار دیا اور فریق ثانی سے جبراً تخلیہ کرا دیا۔ خادی خاں فریق ثانی کا حامی تھا۔ اس کو اس معاملہ میں زک اٹھانی پڑی اور جیسا کہ خود غرض پرستوں کا قاعدہ ہوتا ہے اس کو نہ صرف عدالت سے بلکہ سید صاحب کے پورے نظام سے ہی نفرت ہو گئی۔

۳۰۹۔ سوانح احمدی و سیرت سید احمد شہید تذکرہ قیام پکھلی۔

۳۱۰۔ یہ وصیت ڈاکٹر بال کرشن پرنسپل راجہ رام کالج کولہا پور کے قلمی مسودہ سے نقل کر کے اخبار خلافت بمبئی صفحہ ۱۱ اگست ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

۳۱۱۔ حکومت خود اختیاری صفحہ ۵۱ و ۵۲۔

۳۱۲۔ سوانح احمدی صفحہ ۸۹۔

۳۱۳۔ سوانح احمدی صفحہ ۸۹۔

۳۱۴۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۳۳

۳۱۵۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۸ دسمبر ۱۸۷۱ء بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۱۱۲۔

۳۱۶۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان باب دوم از ڈاکٹر ہنٹر ۶۷۔

۳۱۷۔ سیرت سید احمد شہید۔

۳۱۸۔ روشن مستقبل۔

۳۱۹۔ محترم غلام رسول صاحب مہر نے اپنی کتاب ''سید احمد شہید'' میں سب کے نام درج کر دیئے ہیں۔

۳۲۰۔ سیرت سید احمد شہید۔

۳۲۱۔ الدر المنثور فی احوال صادق پور

۳۲۲۔ سوانح احمدی۔

۳۲۳۔ ''شیخ'' عبدالوہاب نجدی کے پیرو کو وہابی کہا جاتا تھا۔ اس گروہ کے کچھ لوگوں نے چونکہ مسلمانوں کے عام جذبات کے خلاف مدینہ طیبہ میں گستاخیاں کی تھیں، اس لیے اسلامی ممالک میں وہابیوں سے نفرت پھیلی ہوئی تھی۔

۳۲۴۔ ان کی تعداد چار ہزار تک بیان کی گئی ہے۔ بہر حال تعداد کچھ بھی ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ منتخب بہادر تھے جو عزم کے پختہ اور نصب العین کے دھنی تھے۔ ایسا پختہ اور آزمودہ ایک بھی ہزاروں کی بھیڑ سے بھاری ہوتا ہے۔

۳۲۵۔ سوانح احمدی صفحہ ۹۷ پوری تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمایئے مہر صاحب کی کتاب سید احمد شہید۔

۳۲۶۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۴۳۔

۳۲۷۔ سوانح احمدی صفحہ ۱۸۰۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اس وقت مولانا محمد قاسم (پانی پتی) کو امیر بنایا۔ مولانا نصیر الدین صاحب دہلوی (داماد حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب) کو ان کے بعد جب وہ دہلی سے واپس پہنچے تب امیر بنایا۔

۳۲۸۔ مسٹر جیمز او کینلی افسر تحقیقات کا بیان ہے کہ جون ۱۸۳۱ء میں کشن رائے زمیندار سا کن پورنا کے مظالم نے ایک نازک حالت پیدا کر دی۔ اس نے اپنے ہر مسلمان کاشتکار پر جسے وہ وہابی کہتا تھا، ڈھائی روپیہ کا محصول لگا دیا۔ اور اشتعال میں اضافہ اس طرح کہ وہ داڑھی کا ٹیکس کہہ کر وصول کرتا تھا اپنے موضع میں تو اس نے یہ محصول بلا مقابلہ وصول کر لیا۔ مگر جب اس کے کارندے قریب کے موضع سرفراز پور میں پہنچے تو وہاں اتفاق سے نثار علی عرف تیتو میاں مع اپنے معتقدین کے موجود

تھے۔ انہوں نے ان مصلیوں اور کارندوں کو گرفتار کرلیا۔ جب کشن راؤ زمیندار کو اس کی خبر ملی تو وہ تین سو آدمی جمع کر کے بھیج دیئے۔ جن کے ساتھ مسلمانوں کا مقابلہ ہوا۔ وہ لوٹ لیے گئے اور مکانات اور مسجد جلا دی گئی جب معاملہ کی تحقیق ہوئی تو تھانیدار صاحب نے الٹا مسلمانوں پر یہ الزام لگایا کہ خود انہوں نے اپنے مکانات اور مسجد جلا دی ہے۔ دونوں طرف سے دعوے ہوئے جن کے فیصلے میں تعویق ہوئی۔ بالآخر دونوں طرف سے دعوے خارج کردیئے گئے (یعنی فریقین نے باہمی تصفیہ کرلیا اور مقدمہ عدم پیروی میں خارج کردیا گیا) مگر مسلمانوں کو داروغہ پر بہت غصہ تھا۔ اس لیے انہوں نے اسے مار ڈالا۔ اس کے بعد کشن رائے زمیندار نے اپنے مسلمان کاشتکاروں پر بقایا لگان کی وصولی میں بڑی سختیاں کیں اور گرفتاریاں کرائیں۔ یہ لوگ اپیل کے لیے کلکتہ گئے۔ وہاں جج موجود نہ تھے (کلکتہ ریویو ۱۸۷۰ء جلد ۵۱ صفحہ ۱۷۹ جولائی ۱۸۷۰ء بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۱۱۷)۔

۳۲۹۔ حالانکہ اس معاملہ میں ہندو اور مسلمان کا سوال نہیں تھا۔ چنانچہ ایک مسلمان زمیندار نے سید صاحب کے ایک معتقد کو اس بنا پر اپنی پرائیویٹ جیل میں محبوس کردیا کہ اس نے ایک تقریب کی توہین کی تھی۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۸۔

۳۳۰۔ ایضاً صفحہ ۲۸۔

۳۳۱۔ ایضاً صفحہ ۲۹۔

۳۳۲۔ پیدائش ۱۱۱۵ھ ۱۷۰۳ء۔ آبائی وطن عیینہ جو جنوبی نجد کا ایک قصبہ ہے۔ نجد کے جنوبی حصہ کو العارض کہتے ہیں۔ اس کا مشہور شہر "ریاض" ہے جو آج کل سعودی حکومت کا پایۂ تخت ہے۔ عارض کو جبل یمامہ بھی کہتے ہیں۔ اصل میں یہ ایک پہاڑی کا نام ہے اور اس کے گردونواح کی زمین وادی حنیفہ اور یمامہ کہلاتی ہے۔ محمد بن عبدالوہاب کی جائے پیدائش عیینہ اور تبلیغ دعوت کا مرکز "درعیہ" دونوں اسی وادی میں واقع ہیں جو نجد کے قلب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ "عرب" بحوالہ کتاب محمد بن عبدالوہاب)۔

خاندان: علمی تھا محمد کے والد ماجد عبدالوہاب دادا سلیمان چچازاد بھائی عبدالرحمن بن ابراہیم سب عالم اور فقیہ تھے۔ فقہ حنبلی میں ان کی تصانیف بھی ہیں جو نجد میں مقبول و مشہور ہیں۔ علم کا سلسلہ محمد بن عبدالوہاب کی اولاد میں اسی شان و شوکت سے جاری رہا اور تقریباً ڈیڑھ صدی گذرنے کے بعد آج بھی یہ خاندان علمی ہے اور اس کا علمی وقار پورے نجد پر اثر انداز ہے۔ ذہانت اور ذکاوت، جفاکشی اور ایثار، خداداد صفات تھیں۔ جنہوں نے رفتہ رفتہ پورے نجد کو متاثر کردیا تھا۔ اپنے والد ماجد سے فقہ اور حدیث و قرآن کی تعلیم حاصل کی۔ تکمیل کے لیے تقریباً ۱۱۳۵ھ ۱۷۲۳ء میں مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ اساتذہ میں شیخ عبداللہ بن ابراہیم بن سیف کا نام خاص طور پر لیا جاتا ہے جو نجد کے ایک مقام "مجمعہ" کے باشندے تھے اور عرصہ سے مدینہ طیبہ میں درس دیتے تھے۔ مدینہ طیبہ کے بعد بغرض تکمیل بصرہ (عراق) گئے اور وہاں شیخ محمد مجموعی سے حدیث و سنت کا درس لیا۔ کہا جاتا ہے کہ شام بھی تشریف لے گئے۔ مگر مولانا مسعود عالم صاحب مصنف کتاب محمد بن عبدالوہاب اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ تکمیل علم کے بعد دوسروں کی تعلیم و تربیت میں مصروف ہوئے۔ اپنے زمانہ کی خرابیوں اور قوم کی خراب رسموں کے خلاف آواز اٹھائی اپنے وطن اصلی میں پہلی بار دعوت کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ مجبوراً آپ درعیہ تشریف لے گئے۔ وہاں امیر درعیہ (محمد بن سعود) نے آپ کی دعوت قبول کی اور اصلاحی مقاصد کے لیے آپ کا دستِ راست بن گیا۔ اس کے نتیجہ میں محمد بن سعود کو سیاسی مفادات بھی حاصل ہوئے۔ محمد بن عبدالوہاب، محمد بن سعود اور اس کے بعد اس کی اولاد کی سرپرستی کرتے رہے۔ تقریباً ۹۱ سال عمر پا کر ۱۲۰۶ھ ۱۷۹۲ء میں انتقال ہوا۔ جب نجدیوں کو شکست ہوئی تو ان کے بیٹے اور پوتے جو درعیہ میں موجود تھے سب شہید کردیئے گئے۔ کسی طرح کچھ زندہ رہ گئے جن سے نسل اور علم کا سلسلہ چل رہا ہے۔

۳۳۳۔ مطوع جس کی جمع مطوعین ہے، رضا کار کو کہتے ہیں، اور اس تحریک میں مبلغین کو بھی مطوعین کہا جاتا تھا۔

۳۳۴۔ ترکوں کی مرکزی حکومت کو "باب عالی" اور قسطنطنیہ کو "آستانہ" کہا جاتا تھا۔

۳۳۵۔ نجدیوں کے متعلق یہ تمام مضمون مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کی مشہور تصنیف "محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح" سے ماخوذ ہے۔

۳۳۶۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۸۷۔

۳۳۷۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۸۶۔

۳۳۸۔ ایضاً ملاحظہ ہو صفحہ ۸۲، ۸۷

۳۳۹۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۸۹۔

۳۴۰۔ سوانح احمدی صفحہ ۲۳۶۔

۳۴۱۔ سوانح احمدی صفحہ ۱۹۔

۳۴۲۔ ایضاً صفحہ ۳۰۔

۳۴۳۔ روشن مستقبل ۱۱۱ طبع پنجم۔

۳۴۴۔ ایضاً ۱۱۰ طبع پنجم۔

۳۴۵۔ ایضاً

۳۴۶۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۸۹

۳۴۷۔ سیرت سید احمد شہید طبع اوّل صفحہ ۱۸۰۔

۳۴۸۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۸۔

۳۴۹۔ سیرت سید احمد شہید طبع اوّل صفحہ ۳۲۵۔

۳۵۰۔ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک صفحہ ۱۷۳ ، چنانچہ اس کے بعد ہی بہادر شاہ کا سکہ موقوف ہو کر ایسٹ انڈیا کمپنی کا سکہ رائج ہوتا ہے۔ محمد میاں

۳۵۱۔ سید احمد شہید صفحہ ۱۲۹

۳۵۲۔ سکھوں کے جتھے جن کے لیے فارسی بلکہ عربی لفظ "مثل" استعمال کیا گیا ہے اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ جتھے مماثلت اور مساوات کے اصول پر بنائے گئے تھے۔ یہ جتھے بارہ تھے۔ ۱: بھنگی مثل۔ بانی جھا سنگھ جاٹ..... جھا سنگھ کے بعد اس کا سردار جگت سنگھ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بھنگ بہت پیتا تھا اس لیے اس مثل کو بھنگی مثل کہا جانے لگا۔ ۲: رام گڑھیہ مثل۔ بانی خوش حال سنگھ جاٹ ساکن امرتسر۔ ۳: کنہیا مثل۔ بانی سردار امر سنگھ ساکن موضع کاہنہ ضلع لاہور۔ ۴: اہلو والیہ مثل۔ بانی سردار جسا سنگھ کلال۔ ۵۔ سکر چکیہ مثل۔ بانی سردار چڑت سنگھ۔ اس کے آباؤ اجداد موضع سر چک کے رہنے والے تھے جو گوجرانوالہ کے قریب ایک گاؤں تھا۔ ۶: نکئی مثل۔ بانی سردار ہیرا سنگھ ساکن قریہ آباد۔ تحصیل چونیاں ضلع لاہور۔ اس علاقہ کو پہلے ملک نکہ کہا جاتا تھا۔ اسی مناسبت سے اس مثل کو نکئی مثل کہتے تھے۔ ۷: ڈلی والی مثل۔ بانی گلاب سنگھ ساکن موضع ڈلی والی، متصل ڈیرہ بابا نانک۔ ۸: نشان والیہ مثل۔ بانی سردار سنت سنگھ و سردار موہن سنگھ۔ یہ دونوں سردار خالصہ کے علمبردار تھے۔ اسی بنا پر ان کے جتھے کو نشان (علم) والا کہا جاتا تھا۔ ۹: کروڑ سنگھ مثل۔ بانی کروڑا سنگھ۔ ۱۰: شہید یا نہنگ مثل۔ اس مثل کے سردار ان بہادروں کی اولاد تھے جنہوں نے گورو گوبند سنگھ کے جھنڈے تلے جان دی تھی۔ اس میں نہنگ خالصہ بھی شامل تھے جو اکثر بدن پر نیلے رنگ کے کپڑے، سر پر آہنی چکر پہنتے تھے۔ ۱۱: فضیل پوریہ مثل۔ اس مثل کا بانی نواب کپور سنگھ ساکن موضع فضیل پور ضلع امرتسر۔ ۱۲: پھلکیاں مثل۔ پھول نامی ایک شخص نے اس کی بنیاد ڈالی۔ (ماخوذ از..... "مہاراجہ رنجیت سنگھ" مصنفہ پروفیسر سیتا رام کوہلی صفحات ۳۰ تا ۳۲)

۳۵۳۔ شاہ زمان کے رخصت ہونے کے بعد لاہور پر بھنگی مثل کے سرداروں کا قبضہ ہو گیا۔ سرداران میں نااتفاقی تھی۔ اس لیے آئے دن جنگ و جدال رہتا تھا۔ اسی بنا پر نواب قصور نظام الدین خاں نے لاہور پر حملہ کیا۔ مگر لاہور کے سرکردہ اصحاب

نے رنجیت سنگھ کے پاس درخواست بھیجی کہ وہ لاہور پر حملہ کر کے قبضہ کر لیں۔ سرکردہ اصحاب یہ تھے۔ مہر محکم الدین۔ میاں عاشق محمد۔ بھائی گور بخش سنگھ۔ حکیم حاکم رائے۔ (مہاراجہ رنجیت سنگھ صفحہ ۶۹)۔

۳۵۴۔ رنجیت سنگھ نے اپنے معتبر قاضی عبدالرحمٰن کو تحقیق حال کے لیے لاہور بھیجا۔ پھر فوج لے کر لاہور کے قریب پہنچا۔ اور مہر محکم الدین وغیرہ سے سازش شروع کر دی۔ (صفحہ ۷۰ کتاب مذکور)۔ جب حملہ ہوا تو مہر محکم الدین کے حکم سے شہر پناہ کے دروازے کھول دیے گئے۔ جس سے رنجیت سنگھ کی فوجیں بلا مزاحمت شہر میں داخل ہو گئیں (صفحہ ۷۰، ۷۱ مہاراجہ رنجیت سنگھ)

۳۵۵۔ (مہاراجہ رنجیت سنگھ از پروفیسر کوہلی صفحہ ۳۱۷) ایک مرتبہ جب فقیر عزیز الدین کو دوست محمد خاں والی کابل نے نظر بند کر دیا تو مہاراجہ نے قسم کھائی کہ جب تک ایک عزیز الدین کے بدلہ میں ہزار افغانوں کا خون نہ گرا لوں گا، لاہور واپس نہ جاؤں گا۔ مگر دوست محمد خاں نے جلد ہی فقیر کو واپس کر دیا جس سے یہ قصہ رفع دفع ہو گیا (مہاراجہ رنجیت سنگھ صفحہ ۲۸۳)۔

۳۵۶۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ صفحہ ۶۹-۷۰۔

۳۵۷۔ ایضاً صفحہ ۲۲۶

۳۵۸۔ ایضاً صفحہ ۱۴۹۔

۳۵۹۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ از پروفیسر کوہلی صفحہ ۳۱۷۔

۳۶۰۔ ایضاً صفحہ ۳۱۷۔

۳۶۱۔ ایضاً صفحہ ۷۸۔

۳۶۲۔ ایضاً صفحہ ۷۹۔

۳۶۳۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ صفحہ ۷۸۔

۳۶۴۔ تاریخ پنجاب از منشی عبدالکریم صاحب از صفحہ ۱۴۱ تا ۲۵۱۔

۳۶۵۔ رپورٹ مرتب کردہ ایجوکیشنل کانفرنس مطبوعہ ۱۹۳۳ء صفحہ ۴۸۔

۳۶۶۔ حکومت خود اختیاری از سید طفیل احمد صاحب۔

۳۶۷۔ ملاحظہ ہو تاریخ پنجاب از منشی عبدالکریم صاحب۔

۳۶۸۔ صفحہ ۲۲۷ حصہ پنجم سوانح احمدی۔

۳۶۹۔ ایضاً صفحہ ۱۸۲ حصہ چہارم کی آخری سطور۔

۳۷۰۔ حصہ چہارم سوانح احمدی صفحہ ۲۳۶۔

۳۷۱۔ اس کتاب کی تسوید کے بعد جناب مہر صاحب کی کتاب "سید احمد شہید" سامنے آئی۔ اس میں موصوف نے بڑی وضاحت کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ ان عبارتوں میں تحریف کی گئی ہے۔ نہ صرف یہ عبارت بلکہ اور متعدد عبارتیں بھی پیش کی ہیں جن میں تحریف کی گئی ہے۔ جہاں نصاریٰ کا لفظ تھا وہاں سکھ یا دراز مو وغیرہ کا لفظ رکھ دیا گیا ہے (معاذ اللہ) ملاحظہ ہو سید احمد شہید از صفحہ ۲۵۹ تا صفحہ ۲۶۱۔

۳۷۲۔ سوانح احمدی صفحہ ۸۹

۳۷۳۔ سوانح احمدی صفحہ ۱۴۱۔ سیرت سید احمد شہید طبع اول صفحہ ۱۸۰ و ۱۸۱۔

۳۷۴۔ سیرت سید احمد شہید طبع اول صفحہ ۱۸۰۔

۳۷۵۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی سیاسی تحریک ۱۸۱۔

۳۷۶۔ نواب صدیق حسن صاحب نواب ریاست بھوپال کے والد ماجد۔

۳۷۷۔ یہ احقر کے نام ڈاکٹر صاحب کا ایک خط ہے مؤرخہ ۱۵؍جولائی ۱۹۵۳ء۔

۳۷۸۔ یہ لفظ ہمارے خاندان میں بھی حضرت سید ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کے لیے بولا جایا کرتا تھا جو سب سے پہلے سرزمین دیوبند

میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ بندگی فارسی کے مشہور لفظ "بندہ" سے ماخوذ ہے بندہ، غلام کو بھی کہتے ہیں اور فرماں بردار اور اطاعت گذار کو بھی۔ مثلاً بندگانِ عالی متعالی۔ بندگی کے معنی غلامی، اطاعت اور عبادت۔ ہمارے اضلاع سہارنپور، مظفرنگر اور میرٹھ وغیرہ میں ہندو مسلمان ایک دوسرے کو سلام کے بجائے "بندگی" بولا کرتے تھے جو اب تقریباً متروک ہو چکا ہے۔ بزرگوں کے لیے بندگی" کا لفظ غالباً مستحقِ تعظیم اور مطاع یعنی واجب الاطاعت کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اس کے جواز کی توجیہ اور تاویل ہو سکتی ہے مگر احتیاط یہی ہے کہ یہ لفظ اس موقع پر استعمال نہ کیا جائے کیونکہ بندگی صرف اللہ کے لیے ہے۔ محمد میاں

۳۷۹۔ اس قسم کا واقعہ احقر کے خاندان کے ایک بزرگ کے متعلق بھی مشہور ہے۔

۳۸۰۔ مکتوب ڈاکٹر سید محمود صاحب مورخہ ۱۵ر جولائی ۱۹۵۴ء از حق منزل۔ چھپرہ۔ صوبہ بہار۔

۳۸۱۔ ایک سبق آموز لطیفہ: مدرسہ کے مہتمم ایک وکیل صاحب تھے۔ اُن کا اسمِ گرامی محمد صفی صاحب تھا۔ نہایت شریف، کم سخن اور بہت سنجیدہ۔ اُن کے ایک فرزند کا نام محمد فصیح تھا۔ وکیل صاحب کی ادا جسندی قابلِ قدر اور سبق آموز ہے کہ وہ حضرت مولانا محمد فصیح کے احترام میں اپنے لڑکے کا نام نہیں لیتے تھے۔ بلکہ اس اسم گرامی کی مناسبت سے اس کو مولانا کہا کرتے تھے۔ اگرچہ وہ صاحبزادے مولانا نہیں تھے بلکہ علی گڑھ کے گریجویٹ تھے۔

۳۸۲۔ یہی وہ بزرگ ہیں جو جہانگیر بادشاہ کے دور میں دیوبند آ کر قیام فرما ہوئے۔ قصبہ دیوبند کی آبادی سے باہر شمال کی جانب محلہ پیرزادگان ہے۔ یہیں اُن کا اور اُن کے فرزند سید محمد اسمٰعیل صاحب کا پختہ مزار ہے۔ یہ جگہ اُس زمانہ میں غیر آباد تھی۔ خاندانی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں جنگل تھا۔ سید محمد ابراہیم صاحب اسی ویرانہ جنگل میں فروکش ہوئے تھے۔ اس سے مشرق کی جانب تقریباً تین فرلانگ کے فاصلہ پر ہندوؤں کی ایک مشہور تیرتھ ہے۔ جہاں ایک بہت بڑا تالاب ہے جس کو دیبی کنڈ کہا جاتا ہے۔ اس کے کنارے پر مندر بنے ہوئے ہیں۔ اس کے قریب ایک بزرگ شاہ عباس صاحب کا مزار ہے۔ عرفِ عام میں اس کو جنگل بانس کہا جاتا ہے۔ اہلِ علم بزرگوں سے سُنا ہے کہ شاہ عباس صاحبؒ علامہ ابن جوزیؒ (اُستاذ حضرت شیخ سعدیؒ) کے شاگرد تھے، حضرت شیخ سعدیؒ کے ہم سبق۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ شیخ سعدیؒ جب ہندوستان تشریف لائے تو اپنے انہیں دوست سے ملاقات کے لیے دیوبند بھی تشریف لائے تھے یہ محلہ پیرزادگان عرصہ سے قصبہ دیوبند کا محلہ مانا جاتا ہے۔ لیکن کاغذات پٹواری کے اندراجات کے لحاظ سے یہ ایک مستقل موضع ہے جس کا نام نور پور ہے ملحق دیوبند۔

حصّہ سوم

فہرست

الحمد للہ و کفیٰ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

تحریک شاہ ولی اللہؒ کا دوسرا دور

سیدنا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب (قدس اللہ سرہ العزیز) کے عہد مبارک میں حضرت سید احمد صاحب (شہید) حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب (شہید) اور حضرت مولانا عبدالحئی صاحب (قدس اللہ اسرارہم) کے دوروں نے پورے ہندوستان بالخصوص شمالی ہند میں جذبۂ انقلاب کے جو شعلے بھڑکا دیے تھے وہ خون شہادت کے چھینٹوں سے سرد ہونے والے نہ تھے۔

یہ زمزمہ لاکھوں دلوں کو گرما چکا تھا، اور بقول ولیم ولسن ہنٹر یہ تحریک کسی رہنما کی موت وحیات سے بالکل مستغنی ہو گئی تھی۔ (۳۸۳)

چنانچہ شہداء بالاکوٹ کا خون ابھی جمنے نہیں پایا تھا کہ مجاہدین سرمست وکفن بردوش کا ایک گروہ ''تھرحیازا'' (۳۸۴) میں جمع ہوا، اور اپنا (۳۸۵) امیر منتخب کر کے سرنگوں جھنڈے کو دوبارہ سربلند کر دیا، جو نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک لہراتا رہا، اور ہزاروں پاک نفوس اس کی عزت وعظمت پر قربان ہوتے رہے۔

مختصر یہ کہ ہجرت، جہاد اور شہادت کی جو رسم سید صاحب اور اُن کے ساتھیوں نے جاری کی تھی، وہ ایک لمحہ کے لیے بھی موقوف نہیں ہوئی۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن   خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ان کے علاوہ بیشمار محبان وطن اور فدا کارانِ حریت، وہ تھے جو اگرچہ ترک وطن کر کے محاذ پر نہیں جا سکے تھے مگر ان کی نیک تمنائیں اور دلی ہمدردیاں مجاہدین کی مدد ومعاون رہی تھیں۔ اُن کی امداد کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ایک بہت بڑے انگریز نے جو شمالی مغربی صوبے میں نیل کی بہت بڑی تجارت کرتا تھا، ولیم ولسن ہنٹر کو بتایا کہ اُس کے بہت سے دین دار مسلمان ملازموں کا یہ عام قاعدہ تھا کہ وہ اپنی تنخواہوں کا معین حصہ ستھانہ کیمپ کے لیے علیحدہ کر دیا کرتے تھے، اور جو اُن میں زیادہ جوشیلے اور بہادر تھے وہ کسی نہ کسی مدت کے لیے متعصب امام کے ماتحت خدمات انجام دینے کے لیے چلے جاتے تھے، جس طرح اُس کے ہندو ملازم اپنے باپ کی برسی منانے کے لیے ہر سال چھٹی کی درخواست کرتے تھے اسی طرح اس کے مسلمان ملازم جو نیل کی کوٹھی میں کام کرتے تھے ۱۸۳۰ء اور ۱۸۴۶ء کے درمیان اس عذر کی بناء پر ایک یا دو مہینے کی چھٹی کی درخواست کرنے کے عادی تھے کہ انہیں اپنے مذہبی فرض کی ادائیگی کے لیے بلالی فوج میں بھرتی ہونا ہے۔ (۳۸۶)

ایک کے بجائے دو مرکز

دہلی......اور......صادق پور

سید صاحب کی شہادت کے بعد تحریک کے دو مرکز ہو گئے۔ دہلی کا پُرانا مرکز نئے رجحانات کے ساتھ متحرک ہوا۔ اور "صادق پور پٹنہ" کے نئے مرکز نے پرانی راہ ورسم کی تقلید کی۔ (۲۸۷)

اختلاف خواہ کسی جماعت اور طبقہ میں ہو، اچھا نہیں مانا جاتا۔ مگر وہ اختلاف جو تقسیم کار کی نوعیت اختیار کرلے، رحمت بن جاتا ہے۔ یہاں یہ اختلاف اسی قسم کا ہے۔ (۲۸۸) چنانچہ انصاف پسند مورخ کو شبہ ہوسکتا ہے کہ شاید مرکزوں کی یہ تقسیم حکمت عملی کی بناء پر قصداً کی گئی تھی۔

دہلی کے مرکز نے انقلاب کے لیے وہ شاہراہ اختیار کی جو ہندو مسلمانوں کے مشترک اور متحدہ محاذ کی اساس بنی جو تقریباً پچیس سال بعد "انڈین نیشنل کانگریس" کا بنیادی مقصد (۲۸۹) قرار پائی اور جس کو بعد میں قومیت متحدہ کا عنوان دیا گیا۔ اور مرکز صادق پور کا طریق کار اور لائحہ عمل وہی رہا جو سید صاحبؒ نے قائم کیا تھا۔ یعنی ہجرت، جہاد، اور تن من دھن کی قربانی۔

سلسلہ کلام کا تقاضا ہے کہ پہلے "مرکز صادق پور" کا ذکر کیا جائے، تاکہ ایک طریق کار کی پوری تاریخ ایک ہی دفعہ سامنے آجائے۔

مرکز صادق پور (وہابی تحریک)

مرکز کے بانی، ممتاز رہنما، بیرونِ مُلک اور اندرون مُلک سرگرمیاں اور نتائج

بانی مرکز مولانا ولایت علی صاحب

اس مرکز کے بانی مولانا ولایت علی صاحب کا تذکرہ حضرت سید صاحب کے دورہ کے سلسلہ میں پہلے آچکا ہے۔ یہاں کسی قدر تفصیل کے ساتھ آپ کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

مولانا ولایت علی صاحب ایک معزز اور باا ثر خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے دادا احمد علی صاحب "ارول" کے قاضی (جج) تھے۔ (یہ اب ضلع گیا کا ایک قصبہ ہے) اس خدمت کے صلہ میں اُن کو بہت بڑی جاگیر بادشاہِ وقت کی طرف سے عطا ہوئی تھی۔ مولانا ولایت علی صاحب کے نانا جن کی آغوشِ شفقت میں آپ نے پرورش پائی تھی، رفیع الدین حسن خاں صوبہ بہار کے بہت بڑے دولت مند اور باوجاہت رئیس تھے اور بقول مولانا عبدالرحیم صوبہ بہار کے آخری ناظم (گورنر) تھے۔ (۲۹۰)

یہ ذہین وذکی اور منچلا نونہال (ولایت علی) جب دولت وثروت کے گہوارے میں پرورش پاکر سن شعور کو پہنچا تو وہ ایک پرتکلف، شوقین مزاج، بانکا نوجوان تھا۔ لباس و پوشاک ریشمین، اعلیٰ قسم کا زربفت وزردوز، عطر میں بسا ہوا، آنکھوں میں سرمہ، دانتوں میں مسی اور ہتھیلیوں پر رنگ حنا، کاکلیں آبِ تاب پشت پر پڑی ہوئی اور انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں اور چھلے، چوڑی دار پائجامہ پنڈلیوں سے چپنا ہوا، اور پیروں میں زردوز وصلی کی جوتیاں۔ (۳۹۱) غرض اس زمانہ کے لحاظ سے پوری طرح فیشن ایبل۔

تعلیم

خاندان کے دستور کے موافق (۳۹۲) اول آپ نے اپنے خاندان کے استادوں سے تعلیم پائی۔ پھر تکمیل کی غرض سے آپ لکھنؤ چلے آئے۔ اور لکھنؤ کے مشہور عالم وفاضل ماہر معقولات مولانا محمد اشرف صاحب (۳۹۳) کے حلقۂ درس میں داخل ہو کر آپ اپنے اُستاد کے مایۂ ناز شاگرد بن گئے۔

سید صاحب سے ملاقات

یہی زمانہ تھا، کہ سید صاحب کا قافلہ لکھنؤ پہنچا۔ اور زبانِ خلق نے اس عجیب وغریب جماعت کا چرچا مولانا محمد اشرف صاحب تک پہنچایا۔

مولانا محمد اشرف صاحب سنجیدہ مزاج عالم تھے۔ منطق وفلسفہ کے ذوق نے آپ کو تحقیق وتفتیش کا عادی بنا دیا تھا۔ شہرت سے متاثر ہونے کے بجائے آپ حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ سید صاحب کے تذکرہ نے آپ کو متوجہ ضرور کیا۔ مگر آپ کی پہلی کوشش یہ ہوئی کہ شخصی طور پر سید صاحب کو پرکھ لینے کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے۔ چنانچہ آپ نے سید صاحب سے تنہائی میں ملاقات کی فرمائش کی۔

سید صاحب اپنی زندگی اسی مقصد کے لیے وقف کر چکے تھے۔ آپ نے اجازت دے دی اور جب مولانا موصوف پہنچے تو فوراً تخلیہ کر لیا گیا۔

مولانا محمد اشرف صاحب نے جس قابل اعتماد شاگرد کے ذریعہ اپنا تعارف کرا کر ملاقات کا وقت مقرر کرایا تھا، وہ یہی مولوی ولایت علی صاحب تھے جو اس وقت تخلیہ میں بھی ثالث (۳۹۴) ثلاثہ تھے۔

تخلیہ میں ملاقات اور سید صاحب کے ارشادات

سید صاحب رسمی طور پر عالم نہیں تھے لیکن اس منشا اور مقصد سے پوری طرح واقف تھے، جس کی تکمیل کے لیے خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی تھی۔ اسی منشا اور مقصد کو آپ نے اپنی زندگی کا نصب العین بنایا تھا۔ جس کے لیے آپ اپنا سب کچھ قربان کر رہے تھے۔

سید صاحب نے منطقی دلائل اور فلسفیانہ موشگافیوں سے بالا ہو کر اپنے زمانہ کے حالات کا نقشہ کھینچا، اور اُن اخلاقی تباہیوں اور سماجی اور معاشی خرابیوں اور بربادیوں پر روشنی ڈالی جو اس وقت ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔

پھر اس فرض کی طرف توجہ دلائی جو رحمۃ للعالمینؐ کا سچا پیرو ہونے کی وجہ سے ایک مسلمان پر عائد ہوتا ہے آپ نے قرآن حکیم کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔ (۳۹۵)

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ہم نے آپ کو صرف اس غرض سے بھیجا ہے کہ تمام جہانوں پر رحم ہو۔

آپ نے فرمایا۔(۳۹۶) "جب رسول اللہؐ کی بعثت اس لیے ہے کہ تمام جہانوں پر رحمت ہو تو آج یہ جبر و قہر اور ظلم و تعدی کی گھٹائیں اُمنڈ اُمنڈ کر کیوں برس رہی ہیں"۔

رحمۃ للعالمینؐ نے دنیا کو وہ نظام حکومت بخشا تھا جو ہر متنفس بلکہ ہر ایک مخلوق کے لیے سراسر رحم و کرم تھا۔ ہم نے اپنی بداعمالیوں سے اس مقدس و معصوم نظام کی دھجیاں بکھیر کر ملوکیت کی مصیبت مسلط کر لی۔ آج دنیا میں جو بھی ظلم و ستم ہے، ملوکیت اور ملوکیت کے بعد اغیار کی غلامی کی جو ذلت و نحوست سامنے ہے، اُس کی ذمہ داری سب سے پہلے اُن پر ہے جو رحمۃ للعالمینؐ کا نام لیتے ہیں مگر عمل سے محروم ہیں۔

رحمۃ للعالمین کا دامن سنبھالنے والے، مظلوموں کی امداد کے لیے پیکر رحمت بن کر کیوں نہیں اُٹھتے، اور ان اسباب و وسائل کے سامنے سینہ سپر کیوں نہیں ہو جاتے جو اس ظلم و ستم اور عوام کی تباہی و بربادی کے ذمہ دار ہیں۔

یہ کیا بات ہے کہ رحم و کرم اور امن عالم کے ذمہ دار گوشہ نشیں، خلوت گزیں، یا درس گاہوں میں مصروف تدریس ہیں، اور نظام کہن کے بوڑھے دیو، متاع امن تاراج کر رہے ہیں۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ شاہ پرستی کے پرانے کھنڈروں کو پیوند زمین کر دیا جائے اور نظام حکومت کا وہ جدید ایوان تعمیر کیا جائے جو نوع انسان کے ہر طبقہ کے لیے پناہ گاہ ہو، اور جہاں مخلوق خدا اطمینان اور چین کا سانس لے سکے۔

سید صاحب کی تقریر دو گھنٹہ جاری رہی۔(۳۹۷) تقریر کا ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا شراب صداقت سے سرشار تھا۔ اُس نے صداقت پسند اُستاذ اور اُس کے نوجوان شاگرد پر جادو کا کام کیا۔ منطق و فلسفہ کی پارہ ہوا موشگافیاں ہوا ہو گئیں۔ دل و دماغ کے تمام گنجینے متاع درد کی نذر ہو گئے اور ہمدردی خلق خدا کا وہ تیر جگر میں پیوست ہوا جس نے نہ صرف ان کو بلکہ اُن کے اعزہ واقارب کو بھی ساری عمر کے لیے بسمل نیم جاں بنا دیا۔ چشم گریاں نے بھی دل مضطر کا ساتھ دیا۔ چنانچہ سیل اشک چشمہ مژگاں سے رواں ہوا، اور بقول سوانح نگار:

دونوں کی داڑھیاں روتے روتے تر ہو گئیں (۳۹۸)

افرادِ خاندان کا سید صاحب سے تعلق

مولانا ولایت علی صاحب لذت درد سے آشنا ہوئے تو اب یہ شوق ہوا کہ خاندان کے سب بڑے چھوٹے اس کا مزہ چکھیں۔ یہ آرزو اس طرح پوری ہوئی کہ تقریباً دو سال بعد جب سید صاحب کا قافلہ حج کے لیے روانہ ہونے لگا تو آپ نے اپنے والد مولانا فتح علی صاحب کو سید صاحب کے فضائل و مناقب سے مطلع کیا، اور درخواست کی کہ سید صاحب پٹنہ پہنچیں تو اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کے فیوض و برکات اور اُن کے انفاس قدسیہ سے مستفیض ہوں۔ چنانچہ مولانا فتح علی صاحب خاندان (۳۹۹) کے چند بزرگوں کو لے کر پٹنہ گئے اور سید

صاحب کی ملاقات سے مشرف ہوئے۔

اس پہلی ملاقات اور مختصر فرصت (۴۰۰) میں اگرچہ باضابطہ بیعت ہونے کا موقع نہیں مل سکا۔ مگر محبت وارادت کے کچھ نقش ایسے جم گئے، جو دن بدن ابھرتے رہے اور ابھی سید صاحب سفر حج سے واپس نہیں ہوئے تھے کہ پورے خاندان کے دلوں کی زمین جذبات فدائیت کا لالہ زار بن چکی تھی۔

پٹنہ میں تحریک کی ابتداء اور مرکز کی بنیاد

اسی زمانہ میں کہ سید صاحب حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تھے، مولانا ولایت علی صاحب درسیات سے فارغ ہو کر لکھنؤ سے پٹنہ پہنچے، اور ایک مرکز قائم کر دیا۔ بقول مصنف سوانح احمدی:

"مولانا (ولایت علی صاحب) نے اسی وقت سے جمعہ اور جماعت اپنے یہاں قائم کر کے وعظ ونصیحت شروع کر دی"۔

عوام کے جذبات نے پوری گرمجوشی سے مولانا کے وعظ اور نصیحت پر لبیک کہا، اور کچھ دنوں بعد جب سید صاحب کی واپسی کی خبر مشہور ہوئی تو مشتاقان زیارت کی ایک جماعت استقبال کے لیے مونگیر تک پہنچی۔ اس کی قیادت مولانا ولایت علی صاحب اور آپ کے ماموں مولانا قاضی شاہ احمد حسین صاحب کر رہے تھے۔

یہ وہی مونگیر ہے جو اس زمانہ میں اسلحہ سازی میں شہرت رکھتا تھا اور جہاں سے سید صاحب نے کافی اسلحہ خریدا تھا۔ (۴۰۱)

مونگیر سے قافلہ روانہ ہوا۔ سب سے پہلے قصبہ "باڑھ" میں قیام ہوا۔ جہاں مولانا ولایت علی صاحب کے والد صاحب اور دوسرے عمائدین نے کئی روز تک پورے قافلہ کی شاندار دعوتیں کیں۔ عوام کو سید صاحب اور جماعت کے مقررین کے مواعظ وخطابات سے استفادہ کا موقع ملا اور ہزاروں مسلمان گروہ در گروہ حلقہ بگوش ارادت ہوئے۔

قافلہ باڑھ سے روانہ ہو کر پٹنہ پہنچا تو اس مشک ختن کی مہک پورے علاقہ کو سرمست کر چکی تھی، اور گرویدگی اور وابستگی کا یہ عالم تھا کہ بقول ڈبلو، ڈبلو ہنٹر:

"ان کے مریدوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ایک باقاعدہ نظام (۴۰۲) حکومت کی ضرورت پیش آئی۔ انہوں نے باقاعدہ اپنے ایجنٹ مقرر کیے تاکہ ہر اُس شہر سے جو اُن کے راستہ پر پڑتا ہو، تجارت کے منافع پر ٹیکس وصول کریں۔ اس کے بعد انہوں نے چار خلیفے (۴۰۳) مقرر کیے۔ یعنی رُوحانی نائب اور ایک "قاضی القضاۃ" (۴۰۴) مقرر کیا۔ اور اس کے لیے ایک باقاعدہ فرمان جاری کیا جیسا کہ مسلمان بادشاہ صوبجات میں اپنے گورنر مقرر کرتے وقت کیا کرتے تھے۔ اس طرح پٹنہ میں ایک مستقل مرکز قائم کرنے کے بعد وہ یہاں سے روانہ ہوئے۔

ایثار و قربانی کی انتہا

اس تحریک کی یہ خصوصیت خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس کے داعی اور رہنما، ایثار و قربانی کی ابتداء خود اپنی ذات اور اپنے قریب ترین عزیزوں سے کرتے رہے ہیں۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے جہاد حریت کی رہنمائی کی، تو اپنے پورے خاندان کو وقف جہاد کر دیا۔ حضرت سید احمد صاحب کو امیر جہاد بنایا گیا تو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے خاندان کے تمام چھوٹوں بڑوں کو ہدایت کر دی کہ وہ سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ انتہا یہ کہ خاندان(۳۰۵) ولی اللہ کے چشم و چراغ برادر زادہ عزیز مولانا اسمٰعیل صاحب شہیدؒ اور اپنے عزیز داماد مولانا عبدالحئی صاحب کو سید صاحب کے حوالہ کر دیا کہ وہ سفر و حضر میں سید صاحب کی رفاقت کریں، اور اُن کے جھنڈے کے نیچے راہ حق میں قربان ہوں۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب پیرانہ سالی اور بصارت سے معذوری کے باعث خود شریک قافلہ نہیں ہو سکے۔ لڑکا بھی اتفاق سے کوئی نہیں تھا۔ مولانا اسمٰعیل صاحب شہیدؒ ہی کو اولاد(۳۰۶) کی طرح پالا تھا۔ انہیں کو راہِ خدا میں پیش کر دیا۔ خود سید احمد صاحب جہاد کے لیے روانہ ہوئے، تو خاندان کے عزیز ترین افراد ان کے ساتھ تھے۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد ساری ذمہ داری شاہ اسحاق صاحب پر آ پڑی تو آپ نے اپنے عزیز داماد مولانا نصیر الدین صاحب کو سرحد بھیج کر تحریک کو زندہ کیا۔ ایسے ہی مولانا ولایت علی صاحب نے اس وادی میں قدم رکھا تو آپ کے سامنے قربانی کے لیے سب سے پہلے اپنا خاندان تھا۔ والد صاحب اور خاندان کے بزرگوں کو دعوت دینے کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے۔ اب اُن کے منظور کرنے کی شان ملاحظہ فرمائیے۔ مولانا عبدالرحیم صاحب کا بیان ہے:

> ''(حج بیت اللہ شریف سے واپسی پر) جب سید صاحب پٹنہ سے اپنے وطن (رائے بریلی) کے لیے روانہ ہوئے تو مولانا ولایت علی صاحب اور ان کے دونوں بھائی مولانا عنایت علی صاحب اور مولانا طالب علی صاحب اور چچا زاد بھائی مولانا باقر علی صاحب(۳۰۷) دنیاء ناپائیدار کی عیش و عشرت پر لات مار کر ہمرکاب سید صاحب ہو لئے''۔

چند روز بعد مولانا ولایت علی صاحب کے حقیقی بھائی میر عثمان علی صاحب اور ماموں زاد بھائی مولانا قمر الدین صاحب،(۳۰۸) پھر کچھ دنوں بعد مولانا ولایت علی صاحب کے والد ماجد مولانا فتح علی صاحب بھی اپنے سب سے چھوٹے لڑکے مولوی فرحت حسین صاحب کو لے کر سید صاحب کی خدمت میں رائے بریلی پہنچ گئے''۔

سرمستی و وارفتگی

مولانا ولایت علی صاحب کی نزاکت طبع، نفاست پسندی اور پر تکلف زندگی کا مختصر تذکرہ پہلے گذر چکا ہے۔ اس تحریک(۳۰۹) میں شرکت کے بعد حیرت انگیز انقلاب بھی ملاحظہ فرمائیے۔ سوانح نگاروں(۳۱۰) کی

شہادت ہے کہ:

''آپ کو اُسوہ نبیؐ سے ایسا ذوق حاصل ہو چکا تھا کہ اپنے ساتھیوں کی خدمت میں آپ پیش پیش رہتے تھے۔ جنگل جا کر لکڑیاں کاٹنا، لکڑیوں کا گٹھر سر پر رکھ کر لانا، اپنے ہاتھ سے کھانا پکانا، مٹی کھودنا، گارا بنانا، یہ اُس ناز پروردہ، وضع دار بانکے نوجوان کے شوق کے کام ہو گئے تھے''۔

مختصر الفاظ میں ایک حکایت بھی سُن لیجیے:

''مولانا ولایت علی صاحب کو رائے بریلی آئے ہوئے کئی مہینے گذر چکے تو اگرچہ مطالبہ کچھ نہیں تھا، مگر شفقت پدری نے خود ہی مولانا فتح علی صاحب کو اپنے نورِ نظر کی خبر گیری پر مجبور کر دیا۔ مولانا فتح علی صاحب نے ایک خادم خاص کو خیریت معلوم کرنے کے لیے رائے بریلی بھیجا اور اپنے گوشہ جگر، نورِ نظر کی ضروریات کے لیے کچھ روپیہ نقد، کپڑوں اور جوتیوں کے جوڑے اور ضروری سامان ساتھ کر دیا۔ اس خادم کو خود بھی مولانا ولایت علی صاحب کو دیکھنے کا شوق تھا۔ کیونکہ یہ بچپن سے ساتھ رہا تھا۔ خادم نے قافلہ میں پہنچ کر پٹنہ والے مولانا ولایت علی صاحب کو دریافت کیا۔ اُن کو بتایا گیا کہ وہ ندی پر گئے ہوئے ہیں۔ اس خادم نے ندی کا رُخ کیا۔ لبِ دریا کچھ مزدور گارا بنا رہے تھے۔ یہ خادم ایک کے پاس پہنچا اور دریافت کیا کہ مولوی ولایت علی کہاں ہیں؟ اس گارا بنانے والے نے جواب دیا کہ ولایت علی میں ہی ہوں۔ خادم کے دماغ میں مولانا ولایت علی صاحب کی چند ماہ پیشتر کی وہی تصویر تھی۔ سرخ سپید تر و تازہ شاہانہ لباس میں ملبوس، ہر قسم کی زیبائش سے آراستہ یہاں ایک مزدور برہنہ سر، برہنہ پا، گارے میں گھسا ہوا، سانولا شخص کہہ رہا ہے کہ میں ولایت علی ہوں۔ خادم پہلے مذاق سمجھا۔ اس نے بار بار وضاحت کی پٹنہ والے مولانا ولایت علی جو مولانا فتح علی صاحب کے فرزند، ایک بڑے دولت مند گھرانے کے خوش رو اور خوش وضع جوان ہیں، اُن سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ اس تشریح کے بعد بھی جب اس کو یہی جواب ملا اور اُس نے غور کر کے چہرے بشرے پر نظر ڈالی تو حیران رہ گیا۔ یہ غیر معمولی تغیر دیکھ کر اُس کا دل بھر آیا، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اُس نے خطوط حوالے کئے اور قیام گاہ پر پہنچ کر والد صاحب کا ہدیہ پیش کیا۔ مولانا ولایت علی صاحب نے کپڑوں کی گٹھری اور روپیہ کی تھیلی اسی طرح سربند سید صاحب کی خدمت میں لے جا کر پیش کر دی''۔

دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی　　　دیوانۂ تو ہر دو جہاں راچہ کند

والد صاحب (مولانا فتح علی صاحب) کی پیش کش، اور آپ کے متعلق فیصلہ:

خادم نے واپس پہنچ کر والد صاحب کو پوری روئیداد سنائی۔ والد صاحب پہلے سے زخم خوردہ تھے۔ بچے کے اس ایثار نے بوڑھے باپ کے افسردہ دل میں نئی اُمنگ، اور سوکھی رگوں میں زندگی کا تازہ خون دوڑا دیا۔ چھوٹے

فرزند (مولانا) فرحت حسین کو ساتھ لیا، اور اسی خانقاہ میں آپڑے جہاں اعجاز مسیحی ملت مردہ کو قم باذن اللہ کا حکم سُنا رہا تھا۔ کہاں بہار کے تعلقہ دار اور نواب زادے اور کہاں تکیہ شاہ علم اللہ کے خرقہ پوش اور سرفروش مجاہد۔

سید صاحب نے مولانا فتح علی صاحب کی پوری مدارات کی، تعظیم و تکریم سے پیش آئے۔ مگر مولانا فتح علی صاحب کی پیرانہ سالی اور فرحت حسین کے بچپن کا خیال کر کے ہجرت کی اجازت نہیں دی بلکہ صوبہ بہار کی خدمت سپرد کر کے آپ کو پٹنہ واپس کر دیا۔ جہاں یہ عرصہ تک تحریک کے لیے نیا خون اور تازہ مواد فراہم کرتے رہے۔

ہجرت و سفارت

وطن اور اہل وطن کی گلوخلاصی کے لیے جب سید صاحب نے بیرون وطن کا قصد کیا، تو مولانا ولایت علی صاحب اور خاندان کے دوسرے مجاہد ہمرکاب تھے۔ اور جب آزاد قبائل میں مرکز قائم کر لیا تو مولانا ولایت علی صاحب سفارت کابل کے لیے نامزد کئے گئے۔ تو جوان سفیر جب کابل (۴۱) پہنچا تو جذبات تبلیغ و اصلاح بھی بے قابو ہو گئے۔ آپ نے فرائض سفارت کے علاوہ ماحول کی اصلاح و تربیت کے لیے تقریریں بھی شروع کر دیں۔ (۴۲) اور حالات سے متاثر ہو کر ایک طویل اصلاحی نظم بھی ارشاد فرمائی۔ (۴۳)

حیدرآباد میں تحریک

سید صاحب نے شمالی ہند کا دورہ کیا تھا۔ جنوبی ہند میں صرف بمبئی چند روز قیام فرمایا۔ حیدرآباد، مدراس وغیرہ کہیں نہیں جا سکے تھے۔ آزاد قبائل میں آزاد مرکز قائم کرنے کے بعد اس کمی کی تلافی کا قصد فرمایا...... چنانچہ مولانا ولایت علی صاحب کابل سے واپس ہوئے تو آپ کو حیدرآباد، اور مولانا محمد علی صاحب رام پوری کو مدراس کے لیے مامور فرمایا۔ یہ بزرگ اس جدائی سے آزردہ ہوئے تو سید صاحب نے فرمایا: "مولانا ہم آپ کو تخم کر کے اُٹھاتے ہیں"۔

تحریک کا اثر

حیدرآباد میں آپ کی تحریک کامیاب رہی۔ نواب ناصر الدولہ کا دورِ حکومت تھا۔ ناصر الدولہ کے بھائی مبارز الدولہ نے ولایت علی صاحب کی دعوت قبول کی۔ مگر ایک ایسا اسٹیٹ جس کی بنیاد وفاداری انگریز کے آب و گِل سے استوار کی گئی تھی۔ اس کا وفا پرور چنگ و رباب، یہ نوائے تلخ کیسے برداشت کر سکتا تھا جو ایک مجاہد کے کام و دہن سے سرفروشانہ جذبات کے زیر و بم کے ساتھ بلند ہو رہی تھی چنانچہ مشکل سے دو ہی سال ہوئے تھے کہ آپ کو حدود ریاست سے نکلنا پڑا۔ کچھ دنوں (۴۴) بعد آپ کے سب سے بڑے معتقد مبارز الدولہ کو نظر بندی اور پارٹی کے دوسرے سرگرم ارکان کو جلاوطنی نصیب ہوئی۔

حیدرآباد سے بمبئی

مولانا ولایت علی صاحب حیدرآباد سے بمبئی تشریف لے گئے، اور ابھی وہاں بساطِ عمل پوری طرح بچھانے

نہیں پائے تھے کہ معرکہ بالاکوٹ کے دردانگیز سانحہ نے ارادوں کی دنیا کو نئے پروگرام کی دعوت دے دی کیونکہ اب سب سے اہم (۴۵) سوال مرکز کا پیش آگیا کہ اس کو کس طرح باقی رکھا جائے اور ایثار و قربانی کی رسم کو کس طرح پروان چڑھایا جائے۔

اس عرصہ میں دوسرا حادثہ یہ پیش آیا کہ پٹنہ میں آپ کے والد ماجد مولانا شیخ علی صاحب وفات پاگئے۔ (۴۶) لہٰذا پہلے آپ نے پٹنہ کا قصد کیا۔ برہان پور، جبل پور، نرسنگھ پور، کندولی اور سیونی وغیرہ کا دورہ کرتے ہوئے آپ دو سال میں پٹنہ پہنچے اور وہاں پہنچ کر کتاب انقلاب کے منتشر اوراق کو از سر نو شیرازہ بند کیا۔

پارٹی کی دوبارہ تشکیل

مولانا ولایت علی صاحب نے پٹنہ پہنچ کر تازہ سرگرمیوں کے لیے پرانے ساتھیوں کی نئی پارٹی بنائی جس کا مرکز "صادق پور" ہوا، اور جس کے مرکزی ارکان (کابینہ کے ممبر) یہ تھے۔

(۱) مولانا سید محمد علی صاحب (رام پوری)۔

(۲) مولانا شاہ محمد حسین صاحب۔

(۳) مولانا عنایت علی صاحب برادرِ خورد۔

نشر و اشاعت اور تنظیم و تبلیغ

تحریک کو عوامی بنانے کے لیے سیدنا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ پیش نظر تھا۔ یعنی

(۱) عام مجمعوں میں تقریریں

اس کے متعلق مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری کا بیان ہے:

"مجمع اور میلوں (مثلاً بہار کا چراغاں) میں بغرض تبلیغ و پند پہنچتے، کارخانہ داروں کے کارخانوں میں اور کسانوں کے کھیتوں پر پہنچ کر وعظ و پند کرتے، اور اُن کی بدزبانیوں اور غصوں کو شربت کی طرح نوش کر جاتے۔ آپ اپنے دورہ و سیر میں، قریہ بقریہ (گاؤں گاؤں)، فروکش ہوتے اور تحریک کی باتیں پیش کرتے۔ اس لیے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچنے میں غیر معمولی دیر لگتی تھی۔" (۴۷)

نماز جمعہ کے لیے کچھ مسجدیں مقرر کرلی گئی تھیں (تفصیل آگے آتی ہے) پارٹی سے تعلق رکھنے والے خاص طور پر ان مسجدوں میں نماز جمعہ ادا کرتے، اور نماز کے بعد تقریر کی جاتی۔ ان تقریروں کا موضوع کیا ہوتا تھا۔ ہنٹر صاحب کی تحقیق یہ ہے:

"جمعہ کے یہ وعظ بڑے ولولہ انگیز تھے۔ ان میں سب سے زیادہ جہاد پر زور دیا جاتا تھا۔" (۴۸)

(۲) خاص مجمعوں میں درس

مکان پر بعد نماز ظہر تا نماز عصر قرآن وحدیث کا درس دیتے۔ مولوی عبداللہ، آپ کے خلف اکبر قاری ہوتے۔ دوسرے علماء تفسیر کی کتاب ہاتھ میں لے کر بیٹھ جاتے۔ علماء کے علاوہ مریدوں کی بڑی بھاری صف ہوتی۔ (۴۱۹)

(۳) تصنیف وتالیف

مولانا عبدالرحیم صاحب کا بیان ہے:

آپ نے جہاں جیسی ضرورت دیکھی، مختصر اور عام فہم رسالے قلم بند فرما کر لوگوں کے حوالے کیے۔ ایسے رسائل کی تعداد سو سے کم نہ ہوگی۔ اگرچہ اس وقت صرف چند رسالے دستیاب ہوسکے ہیں۔ (۴۲۰)

(۴) پریس

آپ نے حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلوی سے حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ قرآن اور مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب کے تصنیف فرمودہ رسالے طلب فرمائے۔ پہلے مطبع حسینی لکھنؤ میں ان کو طبع کرانے کی کوشش کی۔ مگر جب اس مطبع کے مالکوں نے اُن کو طبع کرنے سے انکار کردیا تو دورہ بنگال کے زمانہ میں آپ نے یہ خدمت اپنے مرید خاص مولانا بدیع الزماں صاحب بردوانی کے سپرد کی۔ مولانا موصوف نے دس ہزار روپیہ کا ایک ٹائپ پریس خرید کر ان کتابوں کو بار بار طبع کرایا۔ (۴۲۱)

یہ عجیب معمہ ہے کہ مطبع حسینی لکھنؤ نے ترجمہ قرآن شریف کی طباعت سے انکار کردیا۔ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کا اقتباس اس معمہ کا صحیح حل پیش کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ یہ سو کے قریب رسالے لاپتہ کیوں ہوگئے۔ ہنٹر صاحب فرماتے ہیں:

> "انگریزوں کے خلاف ضرورت جہاد پر اگر وہابیوں کی نظم ونثر کی مختصر سے مختصر کیفیت بھی لکھنے کی کوشش کی جائے تو اُس کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ اس جماعت نے بہت سا ادب پیدا کردیا ہے جو انگریزی حکومت کے زوال (۴۲۲) کی پیشین گوئیوں سے پر اور ضرورت (۴۲۳) جہاد کے لیے وقف ہے...... بعض کتابیں تو ان میں سے حد سے زیادہ اشتعال انگیز ہیں اور مسودات کی صورت میں رازداری کے ساتھ ایک دوسرے تک پہنچائی جاتی ہیں۔ اُن میں سے بعض کی اشاعت بہت زیادہ کی گئی ہے اور اُن کا زہریلا اثر اُن کے پڑھنے والوں تک ہی محدود نہیں بلکہ مبلغین کے اس گروہ کے ساتھ ساتھ جن میں تبلیغ دین کی مہم پر جانے سے پہلے باغیانہ رُوح پھونک دی جاتی ہے، بنگال کے ہر ضلع تک پہنچتا ہے۔ (۴۲۴)

تقسیم کار[۳۵] لائحۂ عمل، تنظیمی سرگرمیاں اور اس کے اثرات

(۱) پارٹی کے ارکان کے کام اور اُن کے علاقے معین کر دیئے گئے۔ مثلاً

مولانا ولایت علی صاحب

جو اس جماعت کے امیر کی حیثیت رکھتے تھے اور عام طور پر اُن کو "بڑے حضرت" کہا جاتا تھا۔ (۱) تحریک کی عمومی نگرانی۔ (۲) بیرونی ممالک سے رابطہ آپ کے فرائض تھے۔ (۳) اور جب آپ کا قیام پٹنہ میں ہوتا، نواب فخر الدولہ کی مسجد میں نماز جمعہ کی امامت اور نماز کے بعد تقریر آپ کے ذمہ تھی۔ اور جمعہ کے علاوہ اور باقی دنوں میں مذکورہ بالا پروگرام جاری رہتا تھا۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ آپ کا وعظ بہت پر تاثیر ہوتا تھا۔ آپ پارٹی کے خاص ارکان کے علاوہ تحریک کے دوسرے ہم نواؤں میں تبلیغ وارشاد کا سلیقہ پیدا کر کے قصبات ودیہات کے لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجتے رہتے تھے۔[۳۶]

مولانا محمد علی صاحب رام پوری

کا تعلق اُسی علاقہ سے برقرار رہا، جو آپ کے لیے سید صاحب تجویز فرما چکے تھے۔ یعنی جنوبی ہند کا علاقہ جس کا مرکز مدراس تھا۔

شاہ محمد حسین صاحب

کو صوبہ بہار سپرد ہوا۔ آپ کا ہیڈ کوارٹر پٹنہ قرار دیا گیا۔ جب آپ کا قیام پٹنہ میں ہوتا تو مسجد تموبہ کی امامت اور وہاں وعظ وتقریر بھی آپ کے ذمہ ہوتا۔

مولانا عنایت علی صاحب

کو صوبہ بنگال سپرد ہوا۔ آپ نے وطن عزیز سے رخت سفر باندھا اور بنگال ہی میں کئی برس گذار دیئے۔

اُن کی جدوجہد نے کیا رنگ پیدا کر دیا۔ اُس کی وضاحت کے لیے ایک ہی شہادت کافی ہے۔ ولیم ولسن ہنٹر کا ارشاد ہے:

> "پٹنہ کے خلفاء جو اُن تھک واعظ، خود اپنے آپ سے بے پرواہ، بے داغ زندگی بسر کرنے والے، انگریز کافروں کی حکومت کو تباہ کرنے میں ہمہ تن مصروف، روپیہ اور رنگروٹ جمع کرنے کے لیے ایک مستقل نظام قائم کرنے میں نہایت چالاک تھے۔ وہ اپنی جماعت کے اراکین کا نمونہ اور اُن کے لیے ایک مثال تھے اُن کی بہت سی تعلیم بے عیب تھی، اور یہ انہی کا کام تھا کہ انھوں نے اپنے ہزاروں ہم وطنوں کو بہترین زندگی بسر کرنے اور اللہ تعالیٰ کے متعلق بہترین تصور پیدا کرنے کی

ترغیب دی۔''(۴۱۷)

جوں جوں وقت گذرتا گیا اُن کو یہ ضرورت محسوس ہوتی گئی کہ اپنی تعلیم میں باغیانہ حصہ کو مضبوط تر کرتے رہیں۔

مرکز کی نوعیت اور اہمیت

انہوں نے پٹنہ کے دارالاشاعت کو باغیوں اور غداروں کی قیام گاہ میں تبدیل کر دیا۔ اور اُس کے اردگرد دیواروں اور حجروں کی ایک بھول بھلیاں بنائی ہوئی تھیں جو خفیہ دروازوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ غیر مشتبہ مقامات پر چھوٹے چھوٹے کمرے تیار کیے گئے۔ جہاں وہ رازداری کے ساتھ مشورہ کرتے۔ پہلے خلفاء نے تو مجسٹریٹ کے وارنٹ گرفتاری کو مسلح ہو کر مدافعت کرنے کی دھمکی دی تھی۔ لیکن اُن کے جانشینوں نے اپنی حفاظت کا طریقہ اس سے کم خطرناک پیچ دار راستوں کی شکل میں اختیار کیا۔ آخر کار جب حکومت نے اس سازشی ادارے کے خلاف کارروائی کرنے کا ارادہ کیا تو اس کو عمارت کا نقشہ حاصل کرنا پڑا۔ گویا اُسے ایک قلعہ بند شہر کے خلاف کارروائی کرنا ہے۔

''ہر ایک ضلع کے مبلغین' متعصب لوگوں کے گروہ دارالاشاعت میں بھیجتے اُن میں سے اکثر کو جن کے جوش کو پٹنہ کے لیڈر اور بھڑکا دیتے۔ چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل میں سرحدی کیمپ کی طرف روانہ کر دیا جاتا۔ اُن میں سے زیادہ ہوشیار نوجوانوں کو زیادہ دیر تک زیر تربیت رکھنے کے لیے منتخب کر لیا جاتا تھا، اور جب وہ باغیانہ اصولوں سے اچھی طرح واقف ہو جاتے تھے تو اُن کو اُن کے صوبے کی طرف ایک واعظ یا مذہبی کتب فروش کی حیثیت سے واپس کر دیا جاتا''۔(۴۱۸)

ان دونوں خلیفوں (مولانا ولایت علی صاحب اور مولانا محمد علی صاحب) نے بذات خود بنگال اور جنوبی ہند کا دورہ کیا۔ چھوٹے چھوٹے مبلغین بے شمار تھے، اور مدبرانہ تنظیم نے اُن کو اس قابل بنا دیا تھا کہ جہاں کہیں حالات اجازت دیتے، اپنا اڈا جما لیتے۔ اس طرح ہر ہر ضلع میں مجاہدین کا ایک مبلغ ہوتا اور اُن کے جذبات کو مشتعل رکھنے کے لیے وقتاً فوقتاً سفری واعظ بھی دورہ کرتے رہتے۔ پٹنہ کا مرکزی پروپیگنڈا اُن کے اقتدار کو پائیدار اور مستقل کرتا رہتا تھا۔ جنوبی ہند میں اُنہوں نے جوش و خروش کی وہ آندھی چلائی کہ عورتوں نے اپنے ہیرے جواہرات تک بیت المال میں دے دیے۔ شمال مغربی صوبوں سے اُنہوں نے رنگروٹوں کی کمپنیوں کی کمپنیاں مجاہدین کے کیمپ کی طرف روانہ کیں۔ ہر جگہ پر اُنہوں نے جوش کو انتہا تک پہنچا دیا۔

> ''پٹنہ کے مجسٹریٹ نے لکھا تھا کہ ان لوگوں نے ہمارے گنجان آباد ضلعوں کے ہر ایک گاؤں میں خود حکومت کے افسران کی زیر حفاظت اور زیر سایہ علانیہ بغاوت کی تبلیغ کی۔ مسلمان آبادی کے دلوں کو بے قرار کیا، اور فتنہ و فساد کے لیے ایسا حیرت انگیز اقتدار حاصل کیا، جیسا کہ ظاہر ہے۔''(۴۱۹)

اُن کے خلفاء نے مذہبی آتش بیانوں کی حیثیت سے سرحد میں کافی نام پیدا کر لیا تھا۔ ۱۸۴۷ء میں سرہنری لارنس کی گواہیوں کے دوران معلوم ہوا، کہ وہ پنجاب میں مجاہدین کے (باعزت) نام سے موسوم تھے۔ (۳۴۰)

تعداد

ایک انقلابی جماعت جو فرازی کے نام سے مشہور تھی اور مشرقی اضلاع میں اس کا کافی اثر تھا، جس کے سرغنہ نثار علی عرف ٹیٹو میاں (۳۴۱) نے ۱۸۳۱ء میں علمِ بغاوت بلند کیا تھا۔ مولانا یحییٰ علی صاحب نے اُن کو بھی اس تنظیم میں شامل کر لیا تھا، اور اب یہ تحریک یہاں تک ہمہ گیر ہو گئی تھی کہ ۱۸۴۷ء میں اُن کی تعداد اسی ہزار تھی۔ جو آپس میں پورا پورا بھائی چارہ رکھتے تھے اور ہر ایک دوسرے کے کام کو جماعت کا کام سمجھ کر پوری گرم جوشی سے انجام دیتا تھا۔ (۳۴۲)

ہمت و جرأت

اُن کی ہمت و جرأت، شجاعت اور بہادری کے متعلق ہنٹر صاحب کی شہادت ہے:

"درہ امبیلہ کی لڑائی میں یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی تھی، کہ ان اشخاص کو بے پروائی اور حقارت کی نظر سے دیکھنا ایک غلطی ہے۔ مزید یہ کہ بعض حالات کے تحت ایک بنگالی بھی اسی بے جگری سے لڑ سکتا ہے، جس طرح ایک افغانی۔" (۳۴۳)

وفاداری اور شریفانہ اخلاق

یہ بات خاص طور پر قابلِ یادداشت ہے کہ یہ بھیڑ محض نمائشی نہیں تھی۔ بلکہ جذبات وفاداری اس کی تہ میں پوری طرح کارفرما تھے۔ ڈاکٹر ہنٹر کی حیرت اور پریشانی ملاحظہ فرمائیے۔ بنگال کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

"یہ شرانگیزی یہاں تک پھیل چکی ہے کہ ہمارے لیے اس بات کا معلوم کرنا بہت ہی مشکل ہو گیا ہے کہ اصلاح شروع کی جائے تو کہاں سے۔ ہر ایک ضلع کا مرکز ہزاروں خاندانوں میں بے اطمینانی پھیلاتا ہے، اور ان کے خلاف صرف وہی لوگ شہادت دے سکتے ہیں جو اُن کے مرید ہوں۔ لیکن اُن کا حال یہ ہے کہ اپنے سردار سے غداری کے بجائے موت کو ترجیح دیتے ہیں (۳۴۴)

مبلغین کے اخلاق و عادات کے متعلق ہنٹر صاحب اعتراف کرتے ہیں:

"گو یہ مقامی مبلغین بعض دفعہ خطرناک آتش بیان ثابت ہوتے ہیں مگر میرے لیے ناممکن ہے کہ میں اُن کا نام ادب سے نہ لوں۔ اُن میں سے اکثر خدا ترس نوجوان کی حیثیت سے زندگی شروع کرتے ہیں۔ (۳۴۵)

یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ایک وہابی مبلغ سب سے زیادہ روحانیت رکھنے والا، بہت زیادہ

بے غرض، اور بے لوث ہوگا۔ (۳۳۶)

وہاں مبلغ کی بھی (درویشانہ) زندگی ہے جو سب سے زیادہ ان دیہاتیوں کو جو اُن کی راہ میں پڑتے، اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ سال میں کئی کئی مہینے وہ کسی کے گھر میں قدم نہیں رکھتا (آسمان کے نیچے زمین کے فرش پر زندگی گذارتا ہے) وہ دُور دراز کے صوبوں سے آتا۔ لیکن اُس کے طول طویل سفر میں اُس کا کوئی ہم سفر نہ ہوتا بجز کسی ایک وفادار مرید کے، جو اُس کو اُس کے مراقبوں سے وقتاً فوقتاً چونکا دیتا۔ اُس کی حلیم الطبعی اور اپنے گرد و پیش سے بے تعلقی اُس کو عام آدمیوں سے بظاہر مختلف بنا دیتی ہے۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ دیہاتی اُس کے ارد گرد جمع ہو جائیں اور کچھ مدت کے لیے پانی اور زمین کی حد بندی کے جھگڑوں کو فراموش کر دیں۔ (۳۳۷)

وہ نہایت دلیری کے ساتھ عوام الناس میں تبلیغ کرتے ہیں اُن کا سیاسی اور مذہبی نصب العین انقلاب پسندوں کی اُمید و بیم کے عین مطابق ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے اور اب پھر بڑی مسرت کے ساتھ اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ اُن میں ہزار ہا اشخاص ایسے بھی موجود ہیں جو واقعۃً بڑے ہی متقی ہیں اور نفس کشی کو اپنی زندگی کا نصب العین تصور کرتے ہیں یہی افراد اصل میں تمام جماعت کی برتری کا باعث ہیں اور یہ اُنہیں کی برکت ہے کہ اس جماعت کو دنیا دار لوگوں کی اکثریت بڑی عزت اور تقدس کی نظر سے دیکھتی ہے۔ بہترین وہابی وہ ہے جو نہ کسی سے ڈرے، اور نہ اُصول کے خلاف کسی کی رعایت کرے۔ اُس کی زندگی کا راستہ صاف ہے۔ کسی قسم کی تہدید یا تشدد اُس کو اپنی راہ سے منحرف نہیں کر سکتا۔ (۳۳۸) یہ لوگ اپنے عقیدہ کے مطابق بڑے ہی پاک طینت تھے اور اُنہوں نے بغاوت میں حصہ لیا تو کسی ادنیٰ مقصد کے لیے نہیں (۳۳۹) لیا۔

دورۂ بنگال، سفرِ حج اور عزمِ جہاد

یہ پروگرام پٹنہ میں دو سال جاری رہا۔ اس نے تحریک کو تازہ دم کر دیا۔ اور ایک عجیب و غریب عقیدہ سے تحریک میں ایک نئی رُوح (۳۴۰) پیدا کی گئی۔ عقیدہ یہ تھا کہ سید صاحب کی وفات نہیں ہوئی۔ وہ زندہ ہیں اور عنقریب ظاہر ہو کر دشمنوں پر غلبہ حاصل کریں گے۔ بہر حال جب صادق پور پٹنہ کی مرکزیت قابلِ اطمینان حد تک مضبوط ہو گئی تو مولانا ولایت علی صاحب بنگال تشریف لے گئے۔ جہاں آپ کے مقرر کردہ نائب یعنی آپ کے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی صاحب دو سال سے کام کر رہے تھے، اور حیرت انگیز مستعدی سے آپ نے بنگال میں تنظیم کی تھی۔

بنگال میں آپ نے شہروں اور دیہات کا دورہ کیا۔ کلکتہ پہونچ کر مولانا بدیع الزماں صاحب بردوانی کو نائب و خلیفہ کی حیثیت سے مسجد مصری گنج کا امام مقرر کیا۔ پھر آپ بحری راستہ سے بمبئی اور بمبئی سے حجاز تشریف لے گئے۔ راستہ میں جہاں بھی قیام ہوا، مجلسیں آراستہ کر کے داستانِ درد سنائی گئی اور زندہ دلوں کو متوالا بنایا گیا۔

بمبئی میں تقریباً دو ماہ قیام رہا اور حضرت سید صاحب شہید کی دبائی ہوئی چنگاریوں کو پھر سے سلگا دیا گیا۔ (۳۴۱)

چلتے وقت مولانا عنایت علی صاحب کو بمبئی میں اپنا خلیفہ اور نائب مقرر کیا، اور آپ مع اہل وعیال مکہ معظمہ تشریف (۳۴۲) لے گئے۔ حج سے فراغت کے بعد یمن (۳۴۳) نجد، ایسر، مسقط، حضرموت، مخا، حدیدہ وغیرہ کا دورہ کیا۔ یعنی وہ تار پھر سے جوڑے جو حضرت سید صاحب کی شہادت کے بعد ٹوٹ گئے تھے۔ واپسی پر مولانا عنایت علی صاحب کو بمبئی سے ساتھ لے کر کلکتہ پہنچے اور بنگال کا دورہ کرتے ہوئے، اپنے مرکز، صادق پور پٹنہ میں فروکش ہوئے۔ آپ نے پارٹی کے ارکان پر دوبارہ نظر ڈالی اور اس مرتبہ مرکزی جماعت میں چند ارکان کا اضافہ کیا۔

مولانا زین العابدین صاحب حیدرآبادی (۳۴۴) اور مولانا محمد عباس صاحب حیدرآبادی کسی طرح حیدرآباد سے فرار ہوکر اپنے چند ساتھی علماء کے ساتھ پٹنہ پہنچے تھے، اُن کو بھی مرکزی کابینہ میں شامل کیا اور تنظیم کے لیے اڑیسہ اور الہ آباد وغیرہ (یو۔پی) کا علاقہ سپرد کیا۔

مولانا الٰہی بخش (۳۴۵) صاحب کے چار فرزند، مولانا احمد اللہ صاحب، مولانا فیاض علی صاحب مولانا یحییٰ علی صاحب اور مولانا اکبر علی صاحب، جو اب تک عملاً تحریک سے غیر متعلق تھے، پارٹی میں شامل ہوئے، سب سے پہلے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہوئے تھے۔ اب مولانا ولایت علی صاحب کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی۔

اب ابتدائی منزلیں سب طے ہو چکی تھیں اور مجاہدین کی نگاہیں آزاد سرحد کی طرف اُٹھ رہی تھیں کہ سید ضامن شاہ (رئیس بالاکوٹ) کی درخواست پہنچی کہ گلاب سنگھ راجہ کشمیر کے مقابلہ پر اُس کی امداد کی جائے۔ یہ درخواست فوراً منظور ہوئی اور مولانا عنایت علی صاحب، سید ضامن شاہ کی امداد کے لیے روانہ کیے گئے۔ پھر مولانا ولایت علی صاحب خود بالاکوٹ پہنچے اور مجاہدین کی کمان ہاتھ میں لے لی۔

سید صاحب کا قائم کیا ہوا محاذ سونا تو نہیں ہوا (۳۴۶) تھا۔ مگر اس میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ وہ ''کل ہند'' تحریک چلا سکے۔ تقریباً دس سال بعد اُس کی رگوں میں تازہ خون بھرا گیا اور اُس کا رشتہ ''صادق پور'' سے جوڑ کر اس کو کل ہند تحریک بنا دیا گیا۔

یہ گلاب سنگھ کون ہیں؟ سید صاحب کی شہادت کے بعد سکھوں کی حکومت پر کیا گذری؟ پنجاب کی سیاست میں کیا تبدیلیاں ہوئیں اور اب گلاب سنگھ سے مقابلہ سکھوں سے فرقہ وارانہ جنگ تھی یا انگریزی سامراج کے خلاف جارحانہ اقدام تھا؟ اس موقع پر جب تک ان باتوں کی وضاحت نہ ہو جائے، اس تحریک کے متعلق صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ لہٰذا وضاحت موضوع کے لیے ہمیں موضوع سے ہٹنا پڑ رہا ہے کہ یہ بے ربطی بھی ایک ربط ہے۔

پنجاب کی سیاست میں تبدیلیاں

سکھ حکومت کی بربادی' گلاب سنگھ اور اُس کے بھائیوں کے کارنامے

گلاب سنگھ، جس کے تعارف کے لیے ہمیں موضوع سے ہٹنا پڑا، جمو (۴۴۷) کا رہنے والا تھا۔ اُس کے بڑے بھائی کا نام "دھیان سنگھ" تھا اور چھوٹے بھائی کا نام "سوچیت سنگھ"۔ یہ تینوں بھائی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج میں معمولی گھوڑ سواروں میں داخل ہوئے لیکن ترقی کرتے کرتے راجہ دھیان سنگھ وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوا۔ گلاب سنگھ کو عہدۂ نظامت ملا، (۴۴۸) اور سوچیت سنگھ گھوڑ چڑھا فوج میں چہار یاری ڈیرہ کا افسر اعلیٰ بنا۔ (۴۴۹)

دھیان سنگھ، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے آخر دور میں مہاراجہ کا سب سے بڑا معتمد تھا۔ وہ سرا میں جب چاہتا، بلا روک ٹوک چلا جاتا اور مہاراجہ کے مزاج میں یہاں تک دخیل تھا کہ مہاراجہ کے لڑکے بھی اُس کی اجازت کے بغیر باپ سے نہیں مل سکتے تھے۔ دھیان سنگھ سے زیادہ اُس کا لڑکا ہیرا سنگھ مہاراجہ کو محبوب اور اس کا منظورِ نظر تھا۔ مہاراجہ کو اس کی جدائی ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہیں تھی۔ (۴۵۰)

۲۷ رجون ۱۸۳۹ء کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا انتقال ہوا۔ (۴۵۱) جنگِ اقتدار کی اس سے زیادہ افسوس ناک مثال کیا ہوسکتی ہے کہ ایک منظم اور وسیع سلطنت جو ستلج سے شروع ہوکر درۂ خیبر اور بلوچستان تک پہنچی ہوئی تھی، ریگ کے تودہ کی طرح صرف دس سال کے عرصہ میں بے نام ونشان ہوگئی۔

اس جنگ کا آغاز راجہ دھیان سنگھ کی ایک سازش سے ہوا۔ اس جنگ کی پہلی زد مہاراجہ کھڑک سنگھ پر پڑی۔ جو رنجیت سنگھ کا جانشین تھا اور ابھی پانچ برس پورے نہیں ہوئے تھے کہ یکے بعد دیگرے پانچ گدی نشین اس قربان گاہ پر ذبح کردیئے گئے۔ منصب وزارت کو سنبھالنے والے بھی بھینٹ ہوتے رہے۔ اور خون کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا اُس وقت پایاب ہوا، جب سرزمین پنجاب کے چپہ چپہ پر انگریزی فوج کے قدم جم گئے۔

اس وحشت و بربریت اور نفرت انگیز جنگ وجدال کا مقدس مقصد "حب وطن" قرار دیا جاتا تھا، اور انگریزوں سے ساز باز کا الزام اتنا اشتعال انگیز تھا کہ فوجیں تو در کنار مہاراجہ کھڑک سنگھ کی بیوی کو شوہر سے، اور نونہال سنگھ، بیٹے کو اپنے باپ سے برگشتہ کرنے کے لیے جو منتر پڑھا گیا وہ یہی الزام تھا۔ (۴۵۲)

باپ اور بیٹے میں نفرت کی یہاں انتہا ہوگئی کہ مہلک مرض میں مبتلا باپ (کھڑک سنگھ) بیٹے کو یاد کرتا ہے، مگر بیٹا باپ کی صورت دیکھنی گوارا نہیں کرتا صرف ایک مرتبہ "مزاج پرسی" کے لیے گیا اور جب کھڑک سنگھ قلعہ میں محصور دم توڑ رہا تھا، تو نونہال سنگھ "شاہ بلوط" میں شکار کھیل رہا تھا۔ کھڑک سنگھ بیمار کیا ہوا اور اس کا انتقال کب ہوا؟ اس کی حقیقت پنڈت دیبی پرشاد صاحب سے دریافت کیجیے آپ کا بیان ہے:

''کھڑک سنگھ نے بسبب کھانے سفیدہ کاشغری اور اس کپور کے جو کہ دھیان سنگھ کے مقرر کیے ہوئے طبیبوں نے واسطے اُس کے مرض کے تجویز کی تھی۔ ماہ نومبر ۱۸۴۰ء میں وفات پائی''۔(۳۵۴)

مگر دستِ قدرت کا یہ خاموش انتقام بھی کس قدر عبرت ہے کہ کنور نونہال سنگھ شکارگاہ میں باپ کے مرنے کی خبر پاکر ہاتھی پر سوار واپس ہو رہا تھا کہ شہر پناہ کی پھاٹک کا شہتیر (۳۵۴) اُس کے اُوپر گر پڑا۔ اُس کا ساتھی ادتم سنگھ (پسر گلاب سنگھ و برادر زادہ دھیان سنگھ) فوراً مر گیا۔ نونہال سنگھ کو بے ہوشی کی حالت میں قلعہ لے جایا گیا۔ جہاں وہ تھوڑی دیر زندہ رہ کر باپ کے ساتھ مرگھٹ کے لیے تیار ہو گیا۔

کھڑک سنگھ کی بیوی رانی چندر کنور جس نے اپنے سر کا تاج اپنے ہاتھوں اُتارا اور جس کی آنکھوں کا نور قدرت نے چھینا، گدی نشینی کی اُمید پر زندہ رہی۔ لیکن شکنجہ انتقام کی گرفت سے وہ بھی نہ بچ سکی، اور کچھ ہی دِنوں بعد وہ بھی قتل کر دی گئی۔(۳۵۵)

بہرحال دھیان سنگھ اب پہلے سے زیادہ کامیاب تھا۔ اُس کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ اُس نے شیر سنگھ (پسر دوم رنجیت سنگھ) کو مہاراجہ بنایا اور قلمدانِ وزارت خود اپنے جھولے میں ڈالا۔

اُس کے بھائی گلاب سنگھ نے بھی موقع (۳۵۶) سے فائدہ اُٹھایا اور جمو پر مستقل فرماں روا کی حیثیت سے قابض ہو گیا۔

زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ مہاراجہ شیر سنگھ کو دھیان سنگھ کی چیرہ دستی اکھڑنے لگی۔ شیر سنگھ نے اپنے استقلال کی خاطر نیا پانسہ پھینکا۔ مگر اس میں دھیان سنگھ بعد میں پھنسا اور پہلے خود شیر سنگھ اور اس کا بچہ شکار ہو گیا...... ؏

چاہ کن را چاہ در پیش

شیر سنگھ نے دھیان سنگھ کو ختم کرنے کے لیے ایسے گروہ (۳۵۷) سے مدد چاہی، جو در پردہ شیر سنگھ کا بھی دشمن تھا۔ چنانچہ پہلے شیر سنگھ اور اُس کا چودہ سالہ بچہ قتل ہوا۔ پھر دھیان سنگھ اور اُس کے وفادار محافظ (جو غالباً مسلمان تھا اور جس نے اپنے آقا کو بچانے کے لیے مقابلہ کیا تھا) کو قتل کر کے اُن کی لاشیں قیمہ قیمہ کی گئیں اور قلعہ کی خندق میں پھینک دی گئیں۔(۳۵۸)

جیسے ہی دھیان سنگھ کے قتل کی خبر اُس کے بیٹے ہیرا سنگھ کو پہنچی، اُس نے پدرِ مقتول کے خون کا بدلہ لینے کے لیے فوج کو مشتعل کیا۔

ہیرا سنگھ کا الزام یہ تھا کہ سندھاں والا جب ہندوستان میں تھے، تو اُنہوں نے انگریزوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ غدر مچائیں گے تاکہ انگریز پنجاب پر قابض ہو سکیں اور فوج خالصہ ختم کر دی جائے۔(۳۵۹)

ہیرا سنگھ تقریباً چالیس ہزار فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا، اور اگلے ہی روز قلعہ فتح کر کے اجیت سنگھ سندھاں والہ اور لہنا سنگھ کے سر قلم کر دیئے منصب وزارت پر اپنا قدم جمایا اور رنجیت سنگھ کی گدی پر اُس کے سب سے

چھوٹے نابالغ لڑکے "دلیپ سنگھ" کو سجا دیا۔ مگر ہیرا سنگھ اور اس کے چچا گلاب سنگھ میں کدورت ہو گئی۔ دوسری جانب رانی چندا والدہ دلیپ سنگھ بھی ہیرا سنگھ کے مقابلہ میں اپنے بھائی جواہر سنگھ کو وزیر دیکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ ایک شورش برپا ہوئی جس کے نتیجہ میں ہیرا سنگھ قتل ہوا۔ لاہوری دروازہ پر اُس کا سر آویزاں کیا گیا اور جواہر سنگھ وزیر سلطنت ہوا۔

اس ہنگامہ سے لاہور کی مرکزیت کو ایک اور دھکا لگا اور گلاب سنگھ اپنی جگہ پہلے سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہو گیا۔

رنجیت سنگھ کے باقی لڑکے

ملوکیت کی خون آشامی ملاحظہ ہو۔ خون کی ندی بہ رہی ہے مگر اس کا تالاب بھی خشک ہے اور تازہ خون تلاش کر رہا ہے۔ رنجیت سنگھ کا ایک لڑکا کشمیرا سنگھ حیلے بہانے سے ہیرا سنگھ کے دورِ وزارت میں قتل کیا جا چکا تھا۔ جواہر سنگھ وزیر اعظم ہوا تو اُس نے سازش کر کے پشورا سنگھ کو بھی قتل کرا دیا۔ مگر جلد ہی راز فاش ہو گیا۔ اور فوج خالصہ نے برہم ہو کر جواہر سنگھ کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔

رانی کو اپنے بھائی کے قتل کا بہت صدمہ ہوا۔ کئی روز تک وہ بے پردہ سمادھی پر جا کر ماتم کرتی رہی۔ آخرکار صبر کرنا پڑا۔ اب وزارت لال سنگھ کے حوالے کی گئی۔ پنجاب کا سرسبز و شاداب خطہ جب اس طرح بدامنی اور طوائف الملوکی کا لالہ زار بن کر ہر ایک فاتح کے استقبال کے لیے تیار ہوا، تو انگریز جیسی شاطر اور ڈپلومیٹک قوم کے لیے کب ممکن تھا کہ خاموشی سے تماشا دیکھتی رہتی اور عدمِ مداخلت کے عہد و پیمان پر دیانت داری سے ثابت قدم رہتی۔ اُس نے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔

دربارِ لاہور خستہ حالی کے باوجود اپنی آن پر قائم رہا۔ فوج خالصہ نے شدت سے مقابلہ کیا۔ مگر اُس کے جرنیل نہ اتنے بہادر تھے اور نہ تجربہ کار۔ چنانچہ تیج سنگھ (کمانڈر انچیف بہادر) تو لاہور ہی میں پس و پیش کرتے رہے۔ وزیر اعظم لال سنگھ بہادر بیس پچیس ہزار فوج لے کر میدان میں پہنچے۔ مگر پہلے ہی معرکہ کے بعد راہِ فرار اختیار کی۔ اب فوج موجود مگر جرنیل مفقود۔ اس افراتفری کا نتیجہ شکست اور پسپائی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ (۱۸۴۰)

گلاب سنگھ راجہ جموں، بے شک اس حکومت کا رُکن نہیں تھا۔ مگر سکھوں کی طاقت کا ایک بازو ضرور تھا۔ وہ امداد کے لیے تین ہزار فوج لے کر آیا۔ مگر اس گرگِ باراں دیدہ نے پہلے ہی ایسی پالیسی اختیار کی کہ..... ع

باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

سکھوں کے لیے صلح کے سوا چارہ نہیں تھا۔ انگریزوں نے بھی اُس وقت صلح ہی کو غنیمت سمجھا۔ کیونکہ مارچ کا مہینہ تھا۔ موسم گرم ہونے لگا تھا۔ انگریزی فوج اور اُس کے مددگار گورکھا فوج کے لیے گرمیوں میں لڑنا دشوار تھا۔ اور بقول مصنف:

"پورے ہندوستان بالخصوص شمال مغربی صوبوں میں غلغلہ مچ رہا تھا اور اگر سکھوں کی لڑائی جلد ختم نہ کی جاتی تو عجب نہیں تھا کہ ملک میں سرکشی کے آثار نمایاں ہو جاتے۔" (۳۶۱)

بہرحال ۱۱ر مارچ ۱۸۴۶ء کو انگریزی گورنمنٹ اور دربار لاہور کے درمیان صلح نامہ پر دستخط ہوگئے۔

یہ صلح نامہ دربار لاہور کے لیے پیغام موت تھا کیونکہ اس پر ڈیڑھ کروڑ روپیہ تاوان جنگ ڈالا گیا۔ پچاس لاکھ روپیہ کی ادائیگی ہو سکی۔ باقی ایک کروڑ کے عوض میں کشمیر کا صوبہ ضبط کیا گیا۔ البتہ راجہ گلاب سنگھ (جس کے تعارف کے لیے یہ سلسلہ ضبط تحریر میں آیا) وہ خوش نصیب تھا جس کا ستارۂ اقبال بلند ہوا۔

وہ اپنے حلقہ کا خود مختار فرماں روا تسلیم کیا گیا۔ مہاراجہ کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۱۶ر مارچ ۱۸۴۶ء کو اس کی مستقل حیثیت تسلیم کرتے ہوئے اُس سے ایک معاہدہ کیا گیا، اور صوبہ کشمیر بھی اُسی کے سپرد کر دیا گیا۔ تاکہ کمپنی کو ایک کروڑ کی نقد رقم وصول ہو سکے۔ (۳۶۲)

دربار لاہور کے مصلحت اندیش ارکان نے گلاب سنگھ کا پلہ بھاری دیکھا تو اسی کی طرف جھک گئے اور اُس کو وزیر اعظم سلطنت پنجاب مشہور کر دیا۔ (۳۶۳)

لال سنگھ وزیر اعظم کی معزولی

شیخ امام الدین دربار لاہور کی طرف سے کشمیر کے گورنر تھے۔ جب گلاب سنگھ نے انگریزوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے کشمیر پر قبضہ کرنا چاہا تو شیخ صاحب آڑے (۳۶۴) آئے۔ کامیاب تو کیا ہوتے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوئے۔ مگر ان کی اس جرأت اور جذبۂ وفاداری نے وزیر اعظم لال سنگھ کا دامن داغ دار کر دیا۔

لال سنگھ پر الزام لگایا گیا کہ شیخ امام الدین نے اُن کے اشارہ پر مقابلہ کی یہ جرأت کی تھی۔ لہٰذا اس غریب کو نہ صرف معزول بلکہ گرفتار بھی کر لیا گیا اور پنجاب سے جلاوطن کر کے آگرہ بھیج دیا گیا۔ رانی صاحبہ کو غیرت آئی۔ اُنہوں نے لال سنگھ کی معزولی کے خلاف احتجاج کیا، اور ایک پیشکش کی کہ لال سنگھ کی برطرفی کا حکم واپس لے لیا جائے تو ہندوستان کا مشہور ہیرا "کوہ نور" نذر کر دیں گی۔ (۳۶۵)

مگر کمپنی کے زمانہ شناس ایجنٹ جو مال غنیمت میں یہ ہیرا وصول کر سکتے تھے، رانی کا احسان کیوں سر لیتے۔ چنانچہ یہ پیشکش حقارت سے ٹھکرا دی گئی۔

۱۶ر مارچ ۱۸۴۶ء کا معاہدہ جو اس وقت کی مصلحتوں کی بنا پر کیا گیا تھا، ڈیڑھ سال بعد انگریزی حرص و طمع کے لیے ناکافی معلوم ہونے لگا۔ تو نئے معاہدہ کا مسودہ تیار کیا گیا اور ۱۶ر دسمبر ۱۸۴۷ء کو اس پر دستخط کرائے گئے۔ اس معاہدہ کی رو سے ریزیڈنٹ صاحب کے اختیارات بڑھائے گئے۔ ایک کونسل مقرر کی گئی اور طے ہوا کہ ریزیڈنٹ صاحب حسب صوابدید لاہور میں انگریزی فوج رکھا کریں گے اور اس کا سالانہ خرچ ۲۲ لاکھ روپیہ

دربار کو ادا کرنا ہوگا۔ مہارانی صاحب کا وظیفہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ طے کیا گیا۔ (۴۶۶)

اس معاہدہ سے کچھ دنوں بعد ستم رسیدہ رانی کو لاہور سے شیخوپورہ بھیج دیا گیا الزام یہ تھا کہ وہ اس معاہدہ سے راضی کیوں نہیں۔ مہارانی کی جلاوطنی کا جرعہ تلخ سکھ سرداروں کے لیے اس طرح خوش گوار بنایا گیا کہ وفاداروں کو انعامات، جاگیریں، اور وظیفے عطا کر دیے گئے۔ اب کون تھا جو اس اُتری کمان کو چڑھانے کی فکر کرتا۔

شورش و ہیجان

۱۶ر دسمبر ۱۸۴۶ء کو معاہدہ پر دستخط ضرور ہو گئے، اور خود غرض سامراج پرست انعامات سے خوش بھی ہو گئے۔ مگر عوام میں اضطراب و اشتعال تھا کیونکہ:

(۱) اُن کا ملک تاراج ہوا تھا۔

(۲) مہارانی گرفتار ہوئیں۔

(۳) پرانی فوجیں منتشر کر دی گئیں جو باقی رہیں اُن کی شان و عظمت گھٹا دی گئی۔

(۴) ایک ایسی قوم کا غلبہ ہوا، جو مذہب، تہذیب، تمدن، نسل اور وطن ہر ایک لحاظ سے غیر تھی۔

چنانچہ بغاوت نمودار ہوئی۔ (۴۶۷) علاقہ ملتان کی فوجیں دیوان مول راج کی زیرِ قیادت میدان میں اتریں۔ انگریزوں کی ہندوستانی فوجوں کے کچھ دستے بھی اُن سے مل گئے، اور ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک انگریزوں سے لڑتے رہے۔ مگر جب ہر طرح سے مجبور ہو گئے تو ۲۲ جنوری ۱۸۴۹ء کو دیوان مول راج نے ہتھیار ڈال دیے یہ محبِ وطن مع اہل و عیال قلعہ لاہور میں قید کیا گیا اور پھر کالے پانی بھیج دیا گیا۔ (۴۶۸)

پٹھانوں نے زیرِ قیادت سلطان محمد خاں و دوست محمد خاں وغیرہ علمِ بغاوت بلند کیا اور عرصہ تک تہلکہ مچائے رکھا۔ (۴۶۹)

لاہور کی فوجوں میں بغاوت کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ ابھی بھڑکنے نہ پائی تھیں کہ سازش کا انکشاف ہو گیا۔ گنگا رام، کہمان سنگھ اور ایک شخص مسمی گلاب سنگھ سازش کے بانی قرار دیے گئے۔ اُن کو پھانسی کا حکم ہوا۔ لیکن جب گلاب سنگھ کی پھانسی کا وقت آیا تو اُس نے مزید انکشاف کا وعدہ کر کے پھانسی سے جان بچالی۔ اس وعدہ معاف گواہ ''گلاب سنگھ'' کی شہادت پر بہت سے سپاہی گرفتار ہوئے۔ جو فوج میں بغاوت پھیلانی چاہتے تھے۔ اس سازش کے تار مہارانی کے دامن سے بھی جوڑ دیے گئے۔ اب مہارانی صاحبہ کے لیے شیخوپورہ میں بھی گنجائش نہ رہی۔ اُن کو جلاوطن کر کے بنارس بھیجا گیا۔ (۴۷۰) پھر قلعہ چنار گڈھ میں منتقل کر دیا گیا۔ جہاں سے وہ ایک بیراگن کا بھیس بدل کر فرار ہو گئیں اور نیپال پہنچ کر پناہ لی۔ مہاراجہ نیپال کی طرف سے ایک ہزار روپیہ ماہانہ اُن کی پنشن مقرر ہو گئی۔ (۴۷۱)

۱۸ر نومبر ۱۸۴۹ء کو جب لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ہند لاہور پہنچے، تو نو ۹ سکھ گرفتار کیے گئے۔

اُن پر الزام یہ تھا کہ مہارانی چندا نے اُن کو بھیجا تھا کہ فوج میں بغاوت پھیلائیں اور راجہ دلیپ سنگھ کو نکال کر لے جائیں۔ (۴۷۲)

پنجاب کا الحاق اور دلیپ سنگھ کی معزولی

الزامات کے ان تندوتیز جھونکوں میں یہ کہاں ممکن تھا کہ دلیپ سنگھ کی راج گدی کا کمزور آشیانہ باقی رہ جاتا۔ اب اس آشیاں کے سارے تنکے بکھیر دیے گئے۔ تمام سامان واسباب ضبط، جواہرات اور پورا توشہ خانہ مال غنیمت، سکھ ریاست ختم، اور صوبہ پنجاب کا الحاق ممالک محروسہ سے کر دیا گیا۔

مہاراجہ گلاب سنگھ

اس مختصر سرگذشت کے بعد آپ راجہ گلاب سنگھ والی جموں کے کردار کا جائزہ لیجیے۔

قوم تباہ ہو رہی ہے۔ وطنِ عزیز پر غیروں کا قبضہ ہو رہا ہے۔ قومی اور وطنی خودداری اور غیرت کو چیلنج کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ سیاسی اقتدار کا بھوکا اور ذاتی وجاہت کا حریص، "گلاب سنگھ" ہر ایک کو خود غرضی کی دیوی پر بھینٹ چڑھا رہا ہے۔ یہ تو کہاں ممکن تھا کہ قومی زوال سے اُس کے بدن میں پھریری آتی، اور انگریزوں کی بلا بے درماں کو ٹالنے کی کوشش کرتا۔ چتر سنگھ اور شیر سنگھ وغیرہ رئیس موضع اٹاری نے گلاب سنگھ کو خط لکھ کر وطنِ عزیز کے کچھ فرائض یاد دلائے، تو اس وفادار مہاراجہ نے وہ خط بجنسہٖ ریزیڈنٹ بہادر کی خدمت میں پیش کر دیے۔ ریزیڈنٹ بہادر ایسے بہانوں کی تلاش میں تھے۔ انگریزی فوج حرکت میں آئی اور چتر سنگھ وغیرہ کو مع اہل وعیال گرفتار کر کے جلاوطن، اُن کی جائدادیں ضبط اور اُن کے مکانات مسمار کر دیے۔ (۴۷۳)

(حالانکہ یہ اٹاری وہ مقام ہے، جہاں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پیدائش ہوئی تھی۔ جس کا چپہ چپہ محبِ وطن سکھ کے لیے قابلِ احترام تھا)۔

اب اگر مولانا ولایت علی صاحب اور اُن کے بھائی عنایت علی صاحب بھی حالات سے متاثر ہوں اور سید ضامن شاہ رئیس بالاکوٹ کا دعوت نامہ خرمن جذبات میں چنگاری کا کام کرنے لگے اور یہ فداکاران حریت اپنے ٹوٹے پھوٹے توپ وتفنگ لے کر جان کی بازی لگا دیں اور

یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

پر آمادہ ہو جائیں، تو اگر یہ قصور ہے تو جذبہ حب وطن کا اور قلب بااحساس کے درد کا۔ ع

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں رلائے کیوں

مرکز صادق پور کے مجاہد میدان جنگ میں!

۱۸۳۹ء و ۱۸۴۶ء کا وہ زمانہ جس میں سکھ حکومت کے خلاف انگریزوں کی سازشیں کامیاب ہو رہی ہیں، گلاب سنگھ راجہ جموں کی انگریز پرستی طشت از بام ہو چکی ہے، اور مفاد پرست خود غرض عہدہ دار انگریز کے مقابلہ سے جان بچا رہے ہیں اور اسی گلاب سنگھ کو پورے پنجاب کا وزیر اعظم بنا کر سرکار کمپنی سے رشتہ جوڑ رہے ہیں۔ لیکن دوسری طرف حالت یہ ہے کہ حفاظت وطن کے لیے عوام کے جذبات بھڑک رہے ہیں۔ ایک ایک محب وطن انگریز کے مقابلہ کے لیے آتش بداماں اور سربکف اور بقول مسٹر دیبی پرشاد:

"پورے ہندوستان بالخصوص شمال مغربی صوبہ میں غلغلہ مچ رہا تھا۔" (۲۲۴)

بالاکوٹ کا رئیس سید ضامن شاہ بھی اپنے علاقہ کی حفاظت کی خاطر تیر کمان سنبھالتا ہے اور جب اپنے حریف راجہ گلاب سنگھ کے مقابلہ میں کمزوری محسوس کرتا ہے تو مولانا ولایت علی صاحب "بانی مرکز صادق پور" سے امداد کی اپیل کرتا ہے۔ یہاں پیمانۂ صبر پہلے سے لبریز تھا۔ وہ جذبات جن کی پرورش سالہا سال سے کی جا رہی تھی، چھلکنے کے لیے بے تاب تھے۔ سید ضامن شاہ کی اپیل ایک ایسا عنوان تھا جس پر لبیک کہنے کے لیے ہر ایک مجاہد سو جان سے تیار تھا۔ مولانا ولایت علی صاحب نے پانچ سو مجاہدین کا ایک دستہ تیار کیا اور مولانا عنایت علی صاحب کی زیر قیادت بالاکوٹ روانہ کر دیا۔ کچھ دنوں بعد خود بھی رخت سفر باندھا اور ۱۷ رشوال ۱۲۶۲ھ مطابق ۹ را کتوبر ۱۸۴۶ء جمعہ کے دن بالاکوٹ پہنچ کر کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔

آپ کے رفقاء میں بنگال و بہار وغیرہ کے مجاہدین کے علاوہ مرکز صادق پور کے ممتاز حضرات (۱) مولانا فیاض علی صاحب (۲) مولانا یحییٰ علی صاحب (۳) مولانا اکبر علی صاحب (ابناء مولانا الٰہی بخش صاحب و برادران مولانا احمد اللہ صاحب) اور آپ کے سب سے بڑے صاحبزادے مولانا عبداللہ صاحب بھی شامل (۲۲۵) تھے۔

صادق پور کا مرکز اپنے چھوٹے بھائی مولانا فرحت حسین کے حوالہ کیا۔ جنہوں نے پورے نظم و ضبط کے ساتھ مرکز کے ہمہ گیر نظام کو اپنی زندگی کے آخری لمحے ۱۲۷۵ھ (۱۸۵۸ء) تک قائم رکھا۔

گلاب سنگھ کی شکست اور انگریزی ڈپلومیسی کی فتح!

گلاب سنگھ کو شکست دینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ چنانچہ چند ہی حملوں نے اُس کا نشہ ڈھیلا کر دیا اور وہ صلح کی درخواست کرنے لگا۔ مگر بدقسمتی یہ تھی، کہ ان مجاہدین حریت نے جس کو اپنا سمجھا تھا، وہ اپنا نہیں تھا۔ ضامن شاہ اور گلاب سنگھ اگرچہ دو حریف تھے، دونوں کے مذہب بھی جدا، اور نعرے بھی جدا۔ مگر خود غرضی

کے مندر میں وہ شاہ اور یہ سنگھ، ایک ہی طرح کے پجاری تھے۔ یہاں نہ کفر کی پہچان تھی، نہ اسلام کا امتیاز، دونوں ایک ہی محبوبہ اقتدار کے پرستار تھے۔

گلاب سنگھ کی شکست کے بعد مولانا ولایت علی، ضامن شاہ کے آستانہ اقتدار پر پیشانی رکھ دیتے تو ضامن شاہ کو بھی عقیدت کے پھول پیش کرنے میں تامل نہ ہوتا۔ لیکن جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس لیے تھا کہ طاغوتی اقتدار کا خاتمہ کر کے عدل وانصاف اور رحم وکرم کی حکومت قائم کرے۔ خود غرضیوں کے شیطان کو جہنم رسید کر کے، خداپرستی اور بے لوث خدمتِ خلق کا بازار گرم کرے، وہ ضامن شاہ کو ''شاہ'' اور ''نواب'' مان کر اُس کے سامنے اپنی مقدس پیشانی کس طرح جھکا سکتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ گلاب سنگھ کی جیسے جیسے شکست ہوئی، ان مجاہدین حریت کی شوکت وحشمت، ضامن شاہ کو اکھرنے لگی۔

بدقسمتی کا دوسرا باب یہ تھا کہ ابھی ایک سال نہیں گذرا تھا کہ الحاق پنجاب کے منصوبہ پر عمل ہونے لگا اور انگریزی فوجیں جو ۱۸۴۶ء تک ستلج کے پار نہیں ہوئی تھیں، اب پنجاب کے چپہ چپہ پر پہنچنے لگیں۔

کمپنی کے لفٹنٹ گورنر اور گورنر، جو راجہ دلیپ سنگھ اور مہارانی چندا کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ مولانا ولایت علی صاحب اور اُن کی بے پناہ فوج کو کیسے برداشت کر سکتے تھے۔

لیکن انگریز کی ڈپلومیسی ہی کیا تھی، اگر وہ براہِ راست مولانا ولایت علی پر حملہ کر کے پورے شمالی (۲۷۶) ہند کو اپنے برخلاف برانگیختہ کر لیتا۔ لہٰذا نہایت احتیاط کے ساتھ ضامن شاہ کے اقتدار پسندانہ رجحانات سے فائدہ اٹھایا گیا، اور انہیں قبائل کو جن کی نجات کے لیے مجاہدین کا یہ لشکر خاک وخون سے کھیل رہا تھا، انہیں کو مجاہدین کے خلاف بھڑکا دیا گیا۔ نفرت انگیزی کے لیے وہابیت کا پرانا الزام کافی تھا، جس کا نتیجہ وہی ہوا، جو پہلے ہو چکا تھا۔

جماعت کے جانبازوں (۲۷۷) کی زبان سے یہ دل خراش داستان سن لیجیے۔

> فوجی افسر ونس ایگنیو اور لفٹنٹ لمسڈن تھوڑی سی فوج کے ساتھ وہاں پہنچے اور مجاہدین کے علاقہ کے قریب کیمپ قائم کر دیا یہاں سے خفیہ ریشہ دوانیاں کر کے علاقہ کے لوگوں کو مجاہدین کے خلاف بھڑکا دیا۔ سید ضامن شاہ نے بھی بے وفائی کی۔ اب پوری رازداری کے ساتھ ایک تاریخ مقرر کر کے سارے مفتوحہ علاقہ میں غدر کرا دیا۔ عمال یعنی مجاہدین کے مقامی افسر اور مجاہدین کی پولیس کے ذمہ دار قتل کر دیے گئے۔ گویا اپنی دانست میں اس تحریک کی جڑیں اُکھاڑ دی گئیں۔ افسوس صد افسوس۔

نوٹ:

غلام رسول صاحب مہر ''تذکرۂ صادقہ'' کی اس روایت کو غلط قرار دیتے ہیں۔ اُن کی تحقیق یہ ہے کہ مولانا ولایت علی صاحب جیسے ہی سرحد پہنچے، تین ماہ کے اندر اندر انگریزوں سے جنگ پیش آگئی جو درہ ڈب میں ہوئی۔

اس میں مجاہدین کو شکست ہوئی۔ ضامن شاہ کاغان چلے گئے۔ مجاہدین میں سے مولانا ولایت علی صاحب وغیرہ گرفتار ہو گئے۔ باقی مجاہدین کی کثیر تعداد بچ کر نکل گئی اور میر اولاد علی صاحب کی زیر قیادت اپنا نظام قائم کرلیا۔

(ملاحظہ ہو سرگذشت مجاہدین صفحہ ۲۵۷ و ۲۶۷)

گرفتاری اور وطن کو واپسی

سید ضامن کی ریاست اور بالاکوٹ کے علاقہ میں مجاہدین کے اس قتلِ عام کے بعد مولانا ولایت علی صاحب نے علاقہ سوات (۴۷۸) کا قصد کیا۔ راستہ میں سرکار کمپنی کا علاقہ پڑتا تھا۔ مولانا ولایت علی صاحب لشکر مجاہدین کے ساتھ جب اس علاقہ میں پہنچے تو انگریزی فوجوں نے دفعتہً محاصرہ کرلیا۔

مورخین کا بیان ہے کہ:

> آپ حضرات نے (مولانا ولایت علی صاحب وغیرہ) افسرانِ فوج سے راہ داری چاہی اور افسران نے انگریزی عملداری سے بامن وامان گذرنے کی تحریری اجازت بھی بھیج دی۔ مگر جب یہ حضرات مع مجاہدین ولشکر روہیلہ سرکاری عمل داری میں پہنچے، تو انگریزی فوجوں نے دفعتہً اُن کا محاصرہ کرلیا۔ راہ داری کے پروانے دکھائے گئے تو کہہ دیا گیا کہ سرکار کمپنی (گورنر جنرل اور اس کی کونسل) نے ان کی منظوری نہیں دی۔ یہ اُن افسروں کی ذاتی تحریریں تھیں جن کے وہ خود ذمہ دار ہو سکتے تھے۔ مگر اُن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ (۴۷۹)

بہرحال اُس وقت ہتھیار ڈالنا ہی مصلحت سمجھا گیا۔ چنانچہ آپ کے بھتیجے مولانا عبدالرحیم صاحب کا بیان ہے:

> آپ حضرات نے اطاعت قبول کرلی اور مجاہدین کے دستوں اور روہیلہ فوج کے ساتھ لاہور کی طرف روانہ کر دیئے گئے۔ راستہ میں سے مجاہدین کی کثیر تعداد فرار ہو گئی اور علاقہ سوات میں پہنچ کر زیر قیادت میر اولاد علی صاحب ستھیانہ کیمپ میں داخل ہو گئی۔ آپ دونوں بھائی باقی مجاہدین، روہیلہ لشکر اور گرفتار شدہ توپ خانہ اور سامانِ جنگ کے ساتھ لاہور پہنچے۔ جان لارنس چیف کمشنر پنجاب نے دو منزل آگے بڑھ کر گرم جوشی سے استقبال کیا۔ آپ کی شجاعت کی داد دی، اور اس موقع پر آپ نے ہتھیار ڈال کر جس تدبر سے کام لیا تھا، اس کی تحسین وآفرین کی اور آپ سے درخواست کی، کہ توپ خانہ اور سامانِ جنگ گورنمنٹ کے ہاتھ فروخت کر کے روہیلہ فوج کی تنخواہ ادا کر دی جائے اور اس کو برخاست کر دیا جائے۔ باقی پانچ سو مجاہدین کو اپنے ساتھ لے کر وطن تشریف لے جائیں مولانا ولایت علی صاحب نے اس کو بھی منظور کیا۔ اب دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ چیف کمشنر نے ایک روز حکومت کی طرف سے اور دوسرے روز خاص اپنی طرف سے آپ کی اور آپ کے ساتھی مجاہدین کی دعوت کی۔ تیسرے روز مولوی رجب علی (۴۸۰) صاحب میر منشی چیف

کمشنر پنجاب نے سب حضرات کی دعوت کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ کے خرچ سے اہتمام واکرام کے ساتھ آپ سب کو مع جملہ مجاہدین کے پٹنہ پہنچا دیا گیا۔ یہ لوگ پٹنہ پہنچ کر پہلے چیف کمشنر کی کوٹھی پر تشریف لے گئے۔ کمشنر صاحب نے بڑے تپاک وگرم جوشی سے آپ کا خیر مقدم کیا۔ اور اندر لے جا کر آپ سے فرمایا کہ گورنمنٹ آپ دونوں سے دو سال کے لیے مچلکے لینا چاہتی ہے۔ دونوں بھائیوں نے یہ بھی منظور کیا اور مچلکوں پر دستخط (۳۸۱) کر دیئے۔ پھر وہاں سے رخصت ہو کر مکان تشریف لائے۔ پورا شہر آپ کی زیارت کے لیے بے تاب تھا اور آپ کے پہنچنے سے پہلے کمشنر صاحب کی کوٹھی پر ہزاروں کا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ اس دو سال کے عرصہ میں بدستور سابق وعظ ونصیحت، مراقبہ ومشاہدہ وغیرہ میں مصروف ہو گئے، اور صوبہ جات میں تبلیغ وارشاد کے لیے دورے شروع کر دیئے۔ مختلف اضلاع اور صوبوں میں مبلغین کو روانہ کر دیا اور چند ماہ بعد مولانا عنایت علی صاحب کو بنگال روانہ کر (۳۸۲) دیا۔

مرکز ستھانہ اور مولانا ولایت علی صاحب کی دوبارہ ہجرت

ستھانہ کیمپ

مولانا ولایت علی صاحب کی آئندہ کارگزاریوں کے بیان سے پہلے ستھانہ کیمپ اور اس کے بانی کا تعارف ضروری ہے۔

ہنٹر، جو سید احمد صاحب شہیدؒ کے متعلق قزاق اور ڈاکو کے الفاظ استعمال کرتے نہیں شرماتا، وہ تو آبادی ستھانہ کے بانی "زمان شاہ" کو ایک قاتل بتاتا ہے جو جان بچانے کے لیے سندھ پار کی پہاڑیوں میں چلا گیا تھا۔ (۳۸۳) لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آبادی کے بانی زمان شاہ نہیں بلکہ "سید ضامن شاہ" ہیں۔ آپ کا آبائی وطن "تختہ بند" تھا۔ یہ دہلی آئے اور یہاں سے اُن کو توشہرہ کا علاقہ جاگیر میں ملا۔ مگر اس ہما بلند پرواز نے جاگیر کے دام زریں میں پھنسنا گوارا نہیں کیا۔ اس کی سیر چشم وآزاد فطرت نے یہ جاگیر دوسروں کے حوالے کی اور اپنے لیے "مہابن" کی ایک دشوار گذار چوٹی منتخب کر لی۔ یہاں ایک جھونپڑی ڈال کر یاد خدا کی شمع روشن کی۔ ارادت مند پروانے اس جھونپڑے کے گرد جمع ہونے لگے اور اس طرح موضع ستھانہ اور پھر ستھانہ کیمپ کی بنیاد پڑ گئی (۳۸۴) جس نے مہابن کی پرانی تاریخ میں ترک وطن اور ایثار واخلاص کی نئی تاریخ کا پیوند لگا دیا۔

سید ضامن شاہ، سخاوت، شجاعت اور خدا پرستی میں یگانہ تھے، اور بھی اوصاف تھے جن کے باعث پورا علاقہ اُن کا معتقد ہو گیا تھا۔ اُن کے پوتے سید اکبر شاہ، دادا کے نقش قدم پر دینداری، محبت، اخلاص، ہمدردی خلق اور ایثار وقربانی میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ صاف دماغ، اور صاف گو، عہد کے پابند۔

سید اکبر شاہ نے حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ سے تعلق قائم کیا۔ پھر خود بھی بیعت کی اور گھر کے سب چھوٹے

بڑے، یہاں تک کہ اُن کی والدۂ محترمہ بھی حلقۂ ارادت میں داخل ہوئیں۔ اس علاقہ میں جس نے پیمانِ وفا کو پوری طرح نبھایا، یہی سید اکبر شاہ ہیں۔ حادثہ بالاکوٹ نے اس پیمان کو کمزور کرنے کے بجائے اور زیادہ مضبوط کر دیا۔ (۳۸۵)

چنانچہ سید صاحب کی شہادت کے بعد یہی نو آبادی غازیوں کا مرکز بن گئی، اور پورے ہندوستان میں یہاں تک مشہور ہوئی کہ ایک انگریز تاجر کی روایت کے بموجب:

''شمالی ہند کے بہت سے مسلمان اپنی آمدنی کا ایک حصہ اس کیمپ کے لیے مخصوص کر لیا کرتے تھے اور جو زیادہ جوشیلے اور بہادر تھے، وہ ہر سال اس کیمپ میں پہنچتے اور ہلالی فوج میں بھرتی ہو کر فریضۂ جہاد ادا کیا کرتے تھے۔'' (۳۸۶)

دوبارہ ہجرت

ستھانہ کیمپ کا مختصر تعارف ہو چکا۔ اب مولانا ولایت علی کا قصہ سنیے۔

مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری راوی ہیں:

جناب کو (مولانا ولایت علی صاحب کو) ہندوستان میں واپسی کا نہایت رنج و ملال تھا۔ اکثر دوپہر اور رات کو آسمان کے نیچے کھڑے ہو کر اور کبھی سجدے میں سر رکھ کر نہایت بے قراری اور اضطراب کے ساتھ اس ملک سے نکلنے کی دعا کرتے رہے۔ ابھی مچلکہ کی میعاد میں کئی مہینے باقی تھے کہ آپ نے دولت خانہ کو فرش و فروش، جھاڑ و فانوس اور دیگر اشیاء و زینت سے خوب آراستہ و پیراستہ کیا اور اصطبل میں عمدہ عمدہ گھوڑے خرید کر باندھے اور عمدہ عمدہ رنگین کبوتروں سے کبوتر خانہ بھروایا۔ تا کہ لوگوں کو یقین ہو جائے کہ آپ دنیا میں خوب پھنس گئے ہیں اور اب ترکِ وطن نہ کر سکیں گے مگر میعاد پوری ہوتے ہی یک بیک چند احباب مخلصین اور مولوی یحییٰ علی صاحب کو ساتھ لے کر بارادۂ ہجرت ملک سوات روانہ ہو گئے۔ اس عرصہ میں سید اکبر شاہ کا ملک سوات سے آپ کی طلبی کا خط بھی پہنچا تھا۔

آپ نے مولانا عنایت علی صاحب کو لکھ بھیجا کہ مکان ہوتے ہوئے تم بھی چلے آؤ اور اپنے بڑے فرزند مولوی عبداللہ صاحب اور (اپنے ایک عزیز) مولوی فیاض علی صاحب کو فرما گئے کہ ایک ہفتہ کے اندر مع کل عیال و اطفال و اسباب سفر مجھ سے موضع گڑھانہ میں آکر ملو۔ اس پہلے قافلہ کا تخمینہ دو ڈھائی سو کا ہوگا۔ اب مکان پر صرف پانچ مرد رہ گئے تھے اور دو عورتیں۔

سادگی کی انتہا اور سفر کی منزلیں

راستہ میں حاجی امام علی صاحب رئیس کولور نے دعوت کی تیاری کرنی چاہی۔ آپ نے دعوت کے

اہتمام سے اُن کو روک کر فرمایا۔ آپ کے گھر میں جو ائیوں کے لیے جو ستو رہتا ہے، اسی کو لائیں۔ مجبوراً اُنھوں نے تعمیلِ ارشاد کی، اور آپ نے تمام قافلہ کو اور خود اپنے گھر کے تمام آدمیوں کو وہی ستو کھلایا۔

جب آپ آرہ پہنچے، چودھری ہدایت بشیر صاحب رئیس اعظم آرہ نے بڑی لمبی دعوت کرنی چاہی، اُن کو بھی اس سے روک کر صرف چاول دال اور ایک دیگ طلب کی اور کھچڑی پکوا کر تمام ساتھیوں کو سیر کرایا اور آرام سے سو رہے۔

وہاں سے چل کر غازی پور پہنچے۔ مولوی محمد فصیح صاحب نے آپ کا گرم جوش کے ساتھ استقبال کیا۔ قافلہ کو مسجد میں جگہ دی عورتوں کو اپنے زنان خانے میں لے گئے اور مولانا کو اپنے رہنے کے حجرے میں جگہ دی اور دونوں وقت زنان سے کھانا لاکر خود سب کے ہاتھ دھلواتے، کھانا کھلاتے اور پس خوردہ خود مع اہل وعیال تناول فرماتے اور بوقت رخصت آرزو ظاہر کی کہ آپ کا قاصد مجھ سے ملتا جایا کرے۔

یہاں سے رخصت ہوکر قریہ بقریہ اور شہر بشہر وعظ ونصیحت اور ہدایت کرتے ہوئے ڈیڑھ برس کے عرصہ کے بعد آپ دہلی پہنچے۔

دہلی میں قیام اور بادشاہ سے ملاقات

آپ نے دہلی میں تقریباً دو ماہ قیام کیا۔ جامع مسجد فتح پوری کے قریب ایک وسیع مکان میں آپ کا قیام تھا۔ جامع مسجد اور دہلی کے مختلف اطراف واکناف میں آپ کا وعظ روزانہ ہوا کرتا تھا۔ بادشاہ بیگم زینت محل کے استاد مولانا امام علی صاحب اور دہلی کے مشہور شاعر "مومن خاں" مجلس وعظ میں اکثر حاضر رہتے۔ مولانا امام علی صاحب باضابطہ بیعت بھی ہوگئے اور بادشاہ بیگم سے مولانا کے اوصاف بیان کرکے اُن کو مشتاق زیارت بنادیا۔ بادشاہ نے مولانا صاحب کی معرفت پیغام دعوت بھیجا۔ مولانا ولایت علی صاحب نے معذرت کی، اور پھر بادشاہ کے شدید اصرار سے متاثر ہوکر دعوت منظور کرلی۔ مختصر آدمیوں کے ساتھ آپ قلعہ میں تشریف لے گئے۔ بادشاہ نے تخت سے اتر کر لبِ فرش تک آپ کا استقبال کیا، اور پھر اپنے برابر آپ کو تخت پر بٹھالیا۔

اس کے بعد وعظ شروع ہوا۔ آپ نے آیۂ کریمہ انما الحیوٰة الدنیا لعب ولھو وزینته وتفاخر، تلاوت کی۔ اثنائے وعظ میں جب آپ نے "عذاب شدید" کی تفسیر شروع کی تو وزیراعظم نے جھک کر کان میں کہا کہ "بادشاہ سلامت کے سامنے عذاب کے بیان کرنے کا دستور نہیں ہے"۔ مگر آپ نے اس کی پروا نہیں کی۔

بادشاہ، بیگمات، شاہزادے اور حاضرین مجلس وعظ سے بہت متاثر ہوئے۔ اکثر کے آنسو بہنے لگے۔ جب وعظ ختم ہوا۔ تو بادشاہ نے ترک دنیا کے متعلق اپنے اشعار پیش کیے جن کو ریذیڈنٹ نے پڑھ کر سنایا پھر ریذیڈنٹ نے تمام قلعہ کی سیر کرائی۔

جب آپ قلعہ سے واپس ہوکر قیام گاہ پر پہنچے تو بادشاہ کی طرف سے مومن خاں اور مولوی امام علی صاحب کھانے کے پچاس خوان لے کر حاضر ہوئے۔ مومن خان نے آپ سے بیعت بھی کی اور فرمائش پیش کی کہ رمضان میں آپ یہاں قیام فرمائیں۔ قلعہ کے کسی محل میں فروکش ہوں۔ نماز تراویح ساتھ ساتھ ادا کریں اور وعظ ونصیحت سے مستفیض ہونے کا موقع دیں۔ لیکن مولانا عنایت علی کی نظر ریذیڈنٹ کے رویہ پر تھی۔ آپ نے زیادہ قیام مناسب نہیں سمجھا اور فوراً ہی کوچ کر کے جمنا پار ہوگئے اور وہیں رمضان کا چاند دیکھا۔

وہاں سے کوچ کر کے منزل در منزل طے کرتے ہوئے آپ لدھیانہ کے قریب پہنچے اور مولانا عنایت علی صاحب کے انتظار میں "سرائے کھنا" میں ٹھہرے رہے۔ مولانا عنایت علی صاحب کے پہنچتے ہی دونوں بھائی چند ہمراہیوں کے ساتھ سوات روانہ ہوگئے۔ مولانا عبداللہ صاحب کو ہدایت کر گئے کہ تھوڑا تھوڑا کر کے ہمراہیوں کو روانہ کرنا، اور خود مع جملہ اہل وعیال جلد جلد منزل طے کرتے ہوئے ملک یاغستان پہنچنا۔

سید اکبر شاہ نے آپ کی آمد کی خبر پا کر نہایت گرم جوشی سے مع لشکر مجاہدین آپ کی پیشوائی کی۔ جب آپ کے ہجرت کی خبر لوگوں میں مشہور ہوئی، تو اکثر مخلصین ہندوستان سے ہجرت کر کے آپ کے پاس پہنچ گئے۔

ہجرت کے بعد

آپ تبلیغ وارشاد درس وتدریس میں مشغول ہوگئے۔ بعد ظہر درس دیتے اور صبح کے وقت مراقبہ اور مشاہدہ میں لوگوں کو توجہ دلاتے، اور ایک معین وقت پر فوجی پریڈ اور فن سپہ گری کی مشق کرایا کرتے۔ (۳۸۷) کچھ عرصہ وہاں قیام رہا۔ یہ پوری مدت جہاد کی تیاریوں میں گذری۔

وفات

مگر ابھی قتال وجدال کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا کہ رحمت الٰہی نے یاد کیا۔ سرحد کی زمین پسند آئی اور وہیں رہ گئے۔ محرم ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) میں بعارضہ خناق وفات پائی۔ ۶۴ سال عمر ہوئی۔ ستھانہ میں دفن کیے گئے۔ "دخل خلد" ۱۲۶۹ تاریخ وفات ہے۔

مولانا عنایت علی غازیؒ

عمر کا تیسواں دورہ پورا کر رہے تھے کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔

بیعت، ایک باعمل انسان کے لیے سعی پیہم کا معاہدہ ہوتی ہے۔ مولانا عنایت علی غازیؒ پیکر عمل تھے۔ بیعت کے بعد سے وفات تک آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بے پناہ سرگرمیوں کا ایک سلسلہ ہے جو کسی وقت اور کسی حال میں بھی ٹوٹنے نہیں پایا۔ بیعت کے بعد حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کے قافلہ میں شریک ہو کر محاذ جنگ پر گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد دہلی کے ایک (۴۸۸) عالم نے اس تحریک کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ تو ایک مبصر و مشاہد کی حیثیت سے پروپیگنڈے کی تردید کے لیے آپ کو سید صاحبؒ نے دہلی بھیج (۴۸۹) دیا۔ ابھی آپ یہی فرض انجام دے رہے تھے کہ حادثہ بالاکوٹ نے بحث کا موضوع ہی بدل دیا۔

جب مولانا ولایت علی صاحب نے زمام قیادت سنبھالی تو آپ اُن کے سب سے بڑے معتمد اور عملی جدوجہد میں دستِ راست بلکہ رُوحِ رواں تھے۔ آپ نے تقریباً سات سال تک بنگال کا دورہ کر کے وہ نظم قائم کیا جو تقریباً چالیس سال تک مجاہدین سرحد کے لیے آدمی اور روپے فراہم کرتا رہا۔ آپ نے مولانا شریعت اللہ صاحب کے ماننے والوں کو جو ''فرازی'' کہلاتے تھے، تحریک میں شریک کیا اور اُن حضرات کو بھی تحریک کا سرگرم ممبر بنالیا جو نثار احمد صاحب عرف تیتو میاں کے ساتھیوں میں سے باقی تھے۔ ابھی آپ بنگال میں جہادِ حریت کی سرگرمیاں بکھیر رہے تھے، کہ سید ضامن شاہ کی اپیل پر ایک نیا مورچہ بالاکوٹ میں قائم کیا گیا۔ پہلا شخص جس نے اس مورچہ پر فتح و کامرانی کا جھنڈا اڑایا، یہی غازی تھا، جس کے فولادی عزم کے سامنے موت کا بھی پتہ پانی ہوتا تھا۔

مولانا ولایت علی صاحب جب گرفتار کر کے واپس کیے گئے، تو آپ بھی ساتھ تھے۔ کچھ دنوں پٹنہ میں قیام کر کے پھر بنگال پہنچے، اور جنگِ آزادی کی بھٹیوں کو دوبارہ گرم کر دیا۔ تقریباً ۱۸۵۰ء میں مولانا ولایت علی صاحب نے دوبارہ سرحد کا رُخ کیا، تو آپ بھی بنگال سے روانہ ہو کر اول والدہ محترمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اُن سے ہجرت کی اجازت (۴۹۰) چاہی۔ پھر اپنے حصہ کی تمام جائداد فروخت کر کے مع اہل وعیال روانہ ہوئے۔ مولانا ولایت علی صاحب کا قافلہ تھانیسرائے (پنجاب) فروکش تھا کہ آپ بھی پہنچ گئے۔

سوات پہنچ کر کچھ دنوں بڑے بھائی کی قیادت میں کام کیا۔ پھر آپ نے جدا ہو کر اپنا مورچہ الگ لگایا۔

اس علیحدگی کا سبب کیا تھا؟ انگریزی دور کے ایک مسلمان (۴۹۱) مورخ کا محتاط جواب ملاحظہ فرمایئے:

مولانا ولایت علی صاحب جہاد کی تیاری ہی میں وقت صرف کر رہے تھے۔ مولانا عنایت علی مزاج کے تیز تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ کچھ ہونا چاہیے۔ جہاں داد خاں والی اَنب سے اس کی شرارت کے باعث آپ نے چھیڑ چھاڑ کرنا چاہی۔ مگر مولانا ولایت علی صاحب نے بعض مصالح کے باعث اس کو منظور نہیں کیا۔ یہ بات گرم مزاج غازی کو ناگوار معلوم ہوئی، اور دو تین چار سو آدمیوں

کے ساتھ بڑے بھائی سے علیحدہ ہو کر منگل تھانہ سید عباس کے پاس جا رہے۔

اس مجمل بیان کی تفصیل کے لیے انگریزوں کی شہادت ملاحظہ فرمایئے۔

جہاں داد خاں والی اُمب ہمارا حلیف (۳۹۲) تھا۔ سید اکبر شاہ کے لڑکے مبارک شاہ نے عنایت علی کے ساتھ "مردان" کے قلعہ پر قبضہ کرنے کا پلان تیار کیا۔ لیکن اس کا منصوبہ کامیاب نہیں ہوا۔ تب عنایت علی نارنجی چلا آیا اور یوسف زئی قبائل کو ورغلانے کی کوشش کی۔ (۳۹۳)

ان مختصر شہادتوں نے واضح کر دیا کہ اختلاف صرف یہ تھا کہ "قلعہ مردان" کی مہم کی ناکامی کے بعد مولانا ولایت علی صاحب اسی محاذ کو دوبارہ مضبوط کرنے میں مصروف ہو گئے۔ مولانا عنایت علی صاحب نے صرف اتنی بات کو کافی نہیں سمجھا۔ آپ نے ایک دوسرا محاذ بھی تیار کر لیا۔ یہ یوسف زئی کا علاقہ تھا جہاں سید عباس رئیس علاقہ کے تعاون سے آپ نے منگل تھانہ میں دوسرا مورچہ کھول دیا۔

بہر حال جنگ آزادی کے یہ جرنیل اور کمانڈر جو ایک عرصہ تک حب وطن اور انگریز دشمنی کے جذبات شیر سنگھ کی مخالفت کے پردے میں چھپائے ہوئے تھے، اب کھل کر سامنے آ چکے تھے۔ انگریز اُن کا دشمن تھا، اور یہ آزاد منش محبّ وطن بہادر، عواقب و نتائج سے بے نیاز ہو کر انگریز دشمنی میں قربانیاں پیش کرنا، سب سے بڑی سعادت، اور اس راستہ میں فنا ہو جانا اعلیٰ درجہ کی شہادت سمجھتے تھے۔

اس پوری تاریخ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انگریز جس طرح مجاہدین کے حریف تھے، سکھوں کے بھی حریف تھے۔ لہٰذا مجاہدین اور سکھوں کی جنگ انگریزوں کے لیے فال نیک تھی۔ اکثر مؤرخین کے سامنے صرف یہی پہلو ہے اور چونکہ ابتداء میں انگریزوں نے مجاہدین کی کارروائیوں میں مزاحمت نہیں کی، تو اُن کو ایک دلیل بھی مل گئی ہے۔ مگر درحقیقت یہ مؤرخین کی غلطی ہے اور جن انگریزوں نے ایسا سمجھا، اُن کی خام خیالی تھی۔ کیونکہ مجاہدین کے حریف وہ سکھ تھے جو انگریزوں کے حریف نہیں بلکہ حلیف تھے۔ جیسا کہ پہلے گذشتہ صفحات میں واضح کیا جا چکا ہے۔

مستقل امارت اور انگریزوں سے جنگ

مولانا ولایت علی صاحب کے انتقال کے بعد مولانا عنایت علی صاحب غازی منگل تھانہ سے ستھانہ تشریف لے آئے جو مجاہدین کا مستقر اور ہیڈ کوارٹر تھا۔ تمام لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

آپ نے جیسے ہی زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لی، انگریزوں کے حلیف جہاں داد خاں والی اُمب پر حملہ کرنے کا منصوبہ پورا کرنا شروع کر دیا۔

آپ کا یہ حملہ کامیاب ہوا۔ جہاں داد خاں کی قوت ٹوٹ گئی۔ انگریزوں کو بار بار امداد کے لیے فوجیں بھیجنی پڑیں۔ جو ناکام رہیں۔ مگر افسوس حالات نے مساعدت نہیں کی۔

۱: ازلی وفادار اکبر شاہ کے لڑکے بے وفا ہو گئے۔

۲: ۱۸۵۷ء میں پورے ہندوستان کی عام بغاوت نے امداد کے راستے بند کر دیئے۔
۳: انگریزوں کی تازہ دم فوجوں نے جب ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت کو ناکام کر دیا تو ان مجاہدین پر تاخت کی اور ان کو پہاڑی علاقوں کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

یہی وہ دور تھا کہ پیغام اجل آ پہنچا، اور ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۸ء) کے آخر میں آپ نے سفر آخرت اختیار کیا۔ رحمہ اللہ
اب اس دور کے متعلق پہلے سوانح نگاروں کا رقت انگیز بیان ملاحظہ فرمائیے اس کے بعد انگریزی مورخین کی شکایت سنیئے:

مولانا عبدالرحیم صاحب کا ارشاد ہے:

۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے راستے پر خطر تھے۔ شہر سے باہر نکلنا دشوار تھا۔ املاک تہلکہ میں تھے، جانوں کو امن نہ تھا۔ پھر کس کو ہوش تھے۔ اور کیونکر ممکن تھا کہ سرحد کے پار فاقہ کشوں کے لیے کوئی سامان کیا جا سکتا۔ مسلسل فاقہ کشی نے حالت تباہ کر دی۔ درختوں کی کونپلوں اور پتیوں سے اصحاب صفہ کی سنت ادا ہونے لگی۔ چند ماہ مسلسل غلہ پر نظر تک نہ پڑی۔ اجابتیں خون آلود ہونے لگیں۔ آپ کے پاس جو کچھ تھا وہ مہاجرین وانصار پر صرف کر چکے تھے، اور تھا بھی کیا، اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ اب ادھر ساتھیوں کی بدگمانیاں اور طعنے شروع ہو گئے۔ زندگی تلخ تھی۔ یہ وقت تھا کہ اگلی امتیں مضطر ہو کر متیٰ نصر اللہ پکار اٹھتی تھیں۔ مگر اس صبر واستقامت کے پہاڑ نے پورے صبر وتحمل کے ساتھ راضی برضا رہتے ہوئے اللھم بالرفیق الاعلیٰ سے زبان تر کرتے ہوئے بعارضہ بخار وضیق النفس ۱۲۷۴ھ (مطابق ۱۸۵۸ء) کے آخر میں سجن المومن سے جنت مقیم کو رحلت کی۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ واحشرہ فی زمرۃ المھاجرین الذین ھاجروا وجاھدوا مع نبیک صلی اللہ علیہ وعلیٰ الہ وصحبہ اجمعین۔ (الدرالمنثور ص ۱۳۸)

یہ مولانا عبدالرحیم صاحب کا بیان ہے جو ایسے وقت لکھا گیا، کہ اس خاندان کی تباہی کے بعد باقی ماندہ افراد کو برطانوی سامراج کے غیض وغضب سے بچانا مقصود تھا۔

اس کے بعد ان مجاہدین کے خاص کرم فرما ولیم ولسن ہنٹر کا غضب آلود بیان ملاحظہ فرمائیے۔ وہ انقلابی سرگرمیوں اور خفیہ سازشوں کا شکوہ کس طرح کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"۱۸۵۳ء میں ان مجاہدین نے خیال کیا کہ اپنے طے شدہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا مناسب وقت آ گیا ہے۔ روپیہ اور آدمی ہمارے علاقوں سے ستھانہ کیمپ کو متواتر جا رہے تھے۔ اس سلسلہ میں حکومت پنجاب نے ہماری فوج کے ساتھ سازشی خط وکتابت بھی پکڑ لی تھی یعنی انہوں نے کمال عیاری کے ساتھ ہماری (۴؍۴) دیسی پیادہ فوج کے ساتھ سازش کی تھی جو اس وقت راولپنڈی میں مقیم تھی اور متعصب نو آبادی کے بہت ہی قریب تھی۔ اگر وہ ہمارے صوبے پر چڑھائی کرتے تو یہی

رجمنٹ تھی جو سب سے پہلے اُن کے مقابلے کے لیے بھیجی جاتی۔ اُن خطوط سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ بنگال سے باغی کیمپ تک روپیہ اور آدمی پہنچانے کے لیے ایک باقاعدہ نظام موجود ہے۔
انہیں دنوں پٹنہ کے مجسٹریٹ نے یہ رپورٹ دی کہ اس شہر میں باغی جماعت کے آدمیوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس انگریزی صوبہ کے دارالخلافہ کے مجاہدین شہر میں بغاوت کی علانیہ تبلیغ کر رہے ہیں۔ پولیس بھی انہیں دیوانوں کی طرفدار تھی اور اُن کے لیڈروں میں سے ایک نے اپنے مکان پر سات سو آدمی اس غرض سے جمع کر رکھے تھے کہ اگر اس سلسلہ میں کوئی مزید تفتیش ہوئی، تو اس کا مقابلہ ہتھیاروں سے کیا جائے گا۔
سرحد پر مجنونوں کے کیمپ کو روپیہ اور آدمی پہنچانے کے لیے جو باغیانہ نظام قائم تھا، اُس کی طرف سے انگریزی حکومت اب زیادہ دیر تک آنکھ بند نہ کر سکتی تھی۔... اسی سال (۱۸۵۲ء) میں انہوں نے ہمارے حلیف ریاست امب کے نواب صاحب پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے انگریزی فوج بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔
۱۸۵۲ء میں ہمارے بہت سے سپاہی غداروں کے ساتھ خط و کتابت کرنے کے جرم میں سزایاب ہوئے۔
میں اُن بے عزتیوں، حملوں اور قتل و غارت کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا جو ۱۸۵۰ء میں سرحدی جنگ کا باعث ہوئے اس دوران میں مذہبی دیوانوں نے سرحدی قبائل کو انگریزی حکومت کے خلاف متواتر اکسائے رکھا۔ ایک ہی بات سے حالات کا بڑی حد تک اندازہ ہو جائے گا۔ یعنی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک، ہم علیحدہ علیحدہ سولہ فوجی مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے۔ جس سے باقاعدہ فوج کی تعداد ۳۵ ہزار ہو گئی تھی اور ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۰ء تک ان فوجی مہموں کی گنتی بیس تک پہنچ گئی تھی اور باقاعدہ فوج کی مجموعی تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی۔
اس اثناء میں ستھانہ کیمپ جو ہر وقت ہمارے خلاف سرحد میں تعصب کے جذبات کو ابھارتا رہتا تھا۔ نہایت عقلمندی سے ہماری فوج کے ساتھ براہِ راست مقابلہ کرنے سے گریز کرتا رہا۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں اُنہوں نے ہمارے خلاف عام اتحاد کی بناڈالی جس میں قبیلہ یوسف زئی اور قبیلہ پنج تار نے خاص طور پر حصہ لیا۔ اس سال اُن لوگوں نے یہاں تک گستاخانہ دیری سے کام لیا کہ اس علاقہ میں معین سرکاری افسروں سے تخویف مجرمانہ میں مدد کرنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ انکار کرنے پر وہ اس قدر برانگیختہ ہو گئے کہ ہمارے علاقہ پر چڑھ دوڑے۔ اور لفٹننٹ ہورن کے کیمپ پر شبخون مارا، جو اس علاقہ کا اسسٹنٹ کمشنر تھا اور اس نے بڑی مشکل سے جان بچائی۔ اس کا بدلہ لینے کے لیے

اب زیادہ دیر نہیں کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ سر سڈنی کوٹن پانچ ہزار فوج کی معیت میں پہاڑی علاقہ میں داخل ہو گیا (جس کی تفصیل یہ تھی۔ توپخانہ ۴۱۹۔ سوار ۵۵۱۔ پیدل ۷۔۳۱۵ کل ۴۸۸۷ باقاعدہ فوج)......

بڑی دقت کے بعد جنرل سر سڈنی کوٹن کی فوج نے باغی اتحادیوں کے گاؤں کو جلا کر خاک کر دیا۔ اُن کے دو نہایت اہم قلعوں کو مسمار اور ستھانہ کی باغی نو آبادی کو بالکل تہ و بالا کر دیا۔ لیکن مجاہدین نے صرف یہ کیا کہ کہ مہابن پہاڑیوں کی دشوار گذار وادیوں میں پیچھے ہٹ گئے اور اپنی قوت کو ذرا بھی ضعف نہ پہنچنے پایا۔ کیونکہ فوراً ہی ہمسایہ قبیلہ نے ملکا کے مقام پر انہیں ایک نو آبادی قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ (۴۹۴)

انگریزوں نے اس فوجی مہم کے علاوہ دوسری حرکت یہ کی کہ کچھ قبائل کو ستھانہ کیمپ کے خلاف آمادۂ جنگ کر کے ستھانہ کیمپ کے رئیس (سید اکبر شاہ صاحب کے بھائی) سید عمر شاہ کو قتل کرا (۴۹۵) دیا اور مجاہدین کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کرا دیا۔

خدا برا کرے رقابت کا جوان قبائل میں ایک موروثی ترکہ ہے۔ انگریز جیسے شاطرین سیاست کے لیے اس کمزوری سے فائدہ اُٹھانا کیا مشکل تھا۔ اور جب سنہری تمناؤں کے سبز باغ بھی دکھائے جا سکتے تھے، تو بدنام وہابیوں کے خلاف ہر ایک مشکل آسان ہو سکتی تھی۔ یہاں ان سب حربوں سے کام لیا گیا اور مجاہدین حریت پر عرصۂ حیات زیادہ سے زیادہ تنگ کر دیا گیا۔

مختصر یہ کہ مولانا عنایت علی غازی نے اپنے دور میں:

(۱) براہ راست انگریزوں کے مقابلہ پر مہم جاری کی۔ جس کی مدافعت کے لیے سات سال میں ۱۶ مرتبہ برطانوی فوجیں بھیجی گئیں۔

(۲) ۱۸۵۷ء میں ایک طرف ہندوستان بالخصوص شمالی ہند انقلاب اور بغاوت کا آتش کدہ بنا ہوا تھا۔ دوسری جانب مولانا عنایت علی غازی نے علاقۂ سرحد سے انگریزوں پر حملہ کر دیا۔

(۳) مولانا عنایت علی غازی اور ستھانہ کیمپ کی طاقت یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ انگریزوں کو ایک بہت مضبوط فوجی اڈا، مقابلہ کے لیے قائم کرنا پڑا۔ جس میں باقاعدہ فوج کی تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی۔ یعنی بے قاعدہ فوج و پولیس کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی۔

(۴) اس فوجی مہم کے علاوہ ڈپلومیسی سے کام لے کر کچھ قبائل کو مجاہدین کے خلاف بھڑکایا گیا۔ ان کے خلاف ہنگامے برپا کرائے گئے، اور ستھانہ کیمپ کے رئیس سید عمر شاہ کو شہید کرا دیا گیا۔

(۵) ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے باعث شمالی ہند سے ستھانہ کیمپ کی امداد بند ہو گئی اور وہ تقریباً ایک لاکھ فوج کے نرغے میں آ گیا۔ کچھ قبائل نے بھی ہنگامے برپا کر کے عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔

(۲) انگریزوں اور اُن کے ہم نواؤں کی اس بے پناہ یورش کا اثر مجاہدین پر صرف اتنا پڑا کہ ستھانہ سے ہٹ کر اُنہوں نے مہابن میں اپنا کیمپ قائم کر لیا۔ لیکن مالی مشکلات میں وہ اس طرح گھر گئے کہ بقول مولانا عبدالرحیم صاحب ایک عرصہ تک اُن کو کونپلوں اور پتیوں پر گذارا کرنا پڑا۔ اسی حالت میں مولانا عنایت علی صاحب بیمار ہوئے اور رخصت ہو گئے۔ رحمۃ اللہ ورضی عنہ۔

مولانا عنایت علی غازی کے بعد مولانا نور اللہؒ

میر مقصود علیؒ اور مولانا عبداللہ صادق پوریؒ

مشکلات ومصائب کا مقابلہ کرتے ہوئے حضرت مولانا عنایت علی غازی رحمہ اللہ اس دارِ محن سے رخصت ہو چکے۔ مگر یہ مٹھی بھر جماعت جو کسی حال میں انگریز کی قیادت اور غیر ملکی اقتدار قائم کرنے کے لیے تیار نہیں تھی، اب بھی زندہ ہے۔

عزم وارادہ کے یہ پختہ کار بہ زور جو ناز ونعم کے گہواروں میں پل کر جوان ہوئے تھے، اپنے عشرت کدوں، عظیم الشان دیوان خانوں اور جنت نشان وطن عزیز کو چھوڑ کر کوہستان کے تاریک دروں میں اس لیے زندگی گذار رہے تھے کہ حریت اور آزادی اُن کو دنیا کی ہر ایک نعمت اور ہر ایک عزت وعظمت سے زیادہ عزیز تھی۔ اور نصب العین کے لیے مرمٹنا اُن کے نزدیک حیاتِ جاوید اور ابدی زندگانی تھا۔ یہ مردانِ با خدا مساویانہ زندگی کے عادی ہو چکے تھے۔ چھوٹے بڑے کا نشیب وفراز اُن کے یہاں ختم ہو گیا تھا مگر جماعتی زندگی کے نظم وضبط کے لیے وہ ایک امیر ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا عنایت علی غازی کی رُوح پُرفتوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی، تو فوراً ہی انتخابِ امیر کے لیے تگ ودو شروع کر دی گئی۔ مولانا نور اللہ (۴۹۶) صاحب اس منصب کے لیے سب سے بہتر نظر آئے، زمامِ قیادت انہیں کے سپرد کر دی۔

آپ کا زمانۂ امارت صرف دو سال ہے۔ اس عرصہ میں کوئی مہم پیش نہیں آئی۔ تمام سرگرمیاں اُس کمزوری کو دور کرنے میں صرف ہوتی رہیں جو "سرسٹرنی کاٹن" کے حملوں سے مجاہدین کی فوج میں پیدا ہو گئی تھیں۔ دوسری کوشش یہ ہوتی رہی کہ ان قبائل کو ہم نوا کر لیا جائے جن کو انگریزی مدبر مخالف بنا چکے تھے۔ مولانا نور اللہ صاحب کے بعد میر مقصود (۴۹۷) علی صاحب اس منصب کے لیے منتخب کیے گئے۔ آپ کے زمانہ میں انگریزی فوجوں سے چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ مگر ابھی دو سال پورے نہ ہوئے تھے کہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۲ء) میں اُنہیں بھی سفرِ آخرت پیش آ گیا۔

اب امارت کی باگ ڈور اُس کے حوالہ کی گئی جس کی پرورش بچپن ہی سے جہادِ حریت کی آب وہوا میں ہوئی تھی۔ یہ حضرت مولانا ولایت علی صاحب کے فرزندِ اکبر مولانا عبداللہ (۴۹۸) صادق پوری تھے۔ جنہوں نے

تقریباً چالیس برس برابر اس علم کو بلند کیا جس کے دور امارت میں بار بار انگریزی فوجوں کو خاک و خون سے کھیلنا پڑا۔
آپ سے خط و کتابت کے جرم میں ہزاروں محبانِ وطن گرفتار کر کے عبور دریائے شور اور نظر بند کیے گئے۔
ایک عرصہ تک پورے شمالی ہند میں گرفتاریوں اور خانہ تلاشیوں کا بازار گرم رہا اور یکے بعد دیگرے سازش کے پانچ مقدمات چلائے گئے جن کی تفصیل چند صفحات بعد ملاحظہ سے گذرے گی۔

مولانا عبداللہ صاحب کی وفات اور اُن کے جانشین

مولانا عبداللہ صادق پوری زندگی کے آخری لمحات تک اس راہ پر ثابت قدم رہے۔ اُن کی وفات شعبان ۱۳۲۰ھ (نومبر ۱۹۰۲ء) میں ہوئی۔ اُن کے بعد ان کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالکریم صاحب کو یہ خدمت سونپی گئی۔ ۵ ربیع الاوّل ۱۳۳۳ھ (تقریباً ۱۹۱۵ء) کو آپ کا انتقال ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ برطانوی سامراج کا کوکب اقبال عروج کے آخری نقطہ پر پہنچا ہوا تھا اور ہندوستان میں اس نظام کے تار بکھر چکے تھے۔ (۴۹۹)

مولانا عبدالکریم کی وفات کے بعد مولانا عبداللہ صاحب کے پوتے نعمت اللہ صاحب امیر بنائے گئے۔ جن کو کسی مسلمان ہی نے شہید کر دیا۔ پھر مولانا عبداللہ صاحب کے دوسرے پوتے رحمت اللہ غازی منصب امامت پر فائز ہوئے۔

انیسویں صدی کے آخر میں برطانوی سامراج کے کارندوں نے فارورڈ پالیسی (۵۰۰) پر عمل شروع کیا۔ جس پر تقریباً پچاس برس تک عمل ہوتا رہا۔ ہندوستان کا کروڑوں، اربوں روپیہ اس پالیسی کو کامیاب بنانے کی بناء پر صرف کیا گیا۔ لاکھوں من گولہ بارود سے ان غریب الوطن مجاہدین اور اُن کے ہم نوا قبائل کی جھونپڑیوں کو نذر آتش کیا گیا۔ آج نہ وہ پالیسی رہی اور نہ پالیسی کو طے کرنے والے۔ البتہ شہیدانِ حریت کے وارث، اور اُن کی مقدس تاریخ زندہ ہے، اور زندہ رہے گی۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خونریز معرکے اور جنگی اقدامات

ایثار و اخلاص اور قوت و دولت کا مقابلہ

شکست و فتح مقدر سے ہے و لے اے امیر مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اُمراء کے ناموں سے آپ واقف ہو گئے۔ ۱۸۵۸ء (حضرت مولانا عنایت علی صاحب غازی) کے سال وفات تک کارناموں کا ذکر بھی آ چکا۔ ۱۸۵۸ء کے بعد نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ تک انگریزی فوجوں سے جو خونریز معرکے پیش آئے، اُن کی داستان بہت طویل ہے اور اب اس کا سنانا بھی بے کار۔ البتہ فدا کارانِ حریت کی قربانیوں کا معمولی تخمینہ لگانے کے لیے کچھ تذکرہ ضروری ہے۔ جن قربان ہونے والوں نے اپنا سب

کچھ قربان کردینے میں دریغ نہیں کیا، کیا ہم اُن کے ذکر خیر کے لیے چند منٹ صرف کردینے بھی پسند نہ کریں گے؟
بے شک تاریخ کے صفحات نے اُن کو نمایاں جگہ نہیں دی۔ کیونکہ تاریخ کی یہ کمزوری بہت پرانی ہے کہ وہ صرف فاتحین کے نام ہی روشن کیا کرتی ہے۔ بالخصوص ایسے دور میں کہ قلم دشمنوں کے ہاتھ میں ہو یا اہل قلم دشمنوں سے مرعوب ہوں۔ لیکن کیا آزاد ہندوستان کے حقیقت شناس مؤرخ بھی اسی ''دشمن نوازی'' کی تقلید کریں گے۔

ہم اس تذکرہ کا آغاز مولانا محمد جعفر تھانیسری کی ایک مختصر تحریر سے کرتے ہیں۔ مولانا محمد جعفر صاحب پارٹی کے سرگرم آرگنائزر تھے۔ اسی جرم میں وہ گرفتار کیے گئے، اور عمر قید کی سزا دے کر انڈمان بھیج دیئے گئے۔ مگر قدرت نے اُن کو عمر اتنی عطا فرمائی تھی کہ سزا دینے والے اُکتا گئے۔ اُنیسویں صدی کے آخر میں رہائی نصیب ہوئی تو دبی دبی زبان میں کچھ باتیں بیان کیں۔ اُن کا ایک فقرہ ملاحظہ فرمایئے۔

''اخیر ۱۸۶۳ء مطابق ۱۲۸۰ھ میں سرحد غربی ہند پر ملک یاغستان میں خود سرکار انگریزی کی زبردستی سے ایک جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ جنرل چیمبرلین صاحب اس جنگ کے سپہ سالار تھے۔ امبیلے کی گھاٹی میں جا کر فوج سرکار کو بہت تکلیف ہوئی۔ بیگانے ملک میں سرکار کی مداخلت بے جا کے سبب سے ملاں عبدالغفور صاحب اخوند سوات بھی اپنے بہت سے مریدوں کو ساتھ لے کر آموجود ہوئے، کئی خوانین اور افغان چاروں طرف سے اپنے بچاؤ کے واسطے مقابلہ سرکار پر ٹوٹ پڑے۔ قافلہ مجاہدین جن کی سرکوبی اور نیست و نابود کرنے کو ہماری سرکار چڑھی تھی، الگ رہ گیا۔ مگر بدعوائے حفاظت خود اختیاری ہر کس و ناکس سرکار کے مقابل کھڑا ہو گیا۔ مجاہدوں نے بھی بہ تمنائے حصولِ شہادت، داد شجاعت دے کر اپنے جوہر دکھلائے۔ غرض دو تین مہینے تک خوب جنگ ہوتی رہی۔ خود جنرل چیمبرلین صاحب مجروح شدید ہوئے۔ قریب سات ہزار کے کشت و خون کی نوبت پہنچی۔ تمام پنجاب کی چھاؤنیوں سے فوج کھینچ کر سرحد بھیج دی گئی۔ (۵۰۱)

اس متن کی شرح انگریزی رپورٹوں بالخصوص ماہر وہابیت ڈاکٹر ولیم ولسن ہنٹر سے بہتر کون کر سکتا ہے۔ لہٰذا انہیں راویوں کی روایتوں کے اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں۔

(۱) یہ باغی کیمپ (۱۸۵۸ء میں) سرسڈنی کوٹن کے حملوں اور خود اپنے طرف داروں کی علیحدگی کی وجہ سے کمزور ہو گیا تھا اور اس سبب سے دو سال تک بالکل خاموش (۵۰۲) رہا۔

ہم نے ستھانہ کے علاقہ کو اُس ہمسایہ قبیلہ (اتمان زئی) کے سپرد کردیا، جس نے عشر (مجاہدین کا مقرر کردہ مذہبی ٹیکس) دینے کی مخالفت کی تھی، اور مجاہدین کے ایک امیر (سید عمر شاہ) کو قتل کردیا تھا۔

اس قبیلے (اتمان زئی) اور ایک دوسرے طاقت ور قبیلے (جادون) سے ہم نے یہ عہد لے لیا تھا کہ وہ مجاہدین کو اپنے علاقہ میں گھسنے نہ دیں گے۔ اور وہ اس تیسری قوم کی بھی مخالفت کریں گے جو

مجاہدین کو اس علاقے میں لانے کی سفارش اور تائید کرے گی۔ نیز مجاہدین اور دوسرے شریر لوگوں کو اس علاقے سے گذرنے نہ دیں گے تاکہ وہ برطانوی علاقہ میں داخل ہو کر فساد نہ پھیلا سکیں۔

مگر ابھی دو سال بھی نہ گذرے تھے کہ باغی نو آبادی نے سرحدی قبائل میں پھر اقتدار حاصل کر لیا۔ (یہ مولانا نور اللہ صاحب کا تدبر تھا کہ اس تھوڑے عرصہ میں انگریزوں کے بچھائے ہوئے جال کی ایک ایک گرہ کھول کر رکھ دی)۔

۱۸۶۱ء میں (میر مقصود علی صاحب کے زمانۂ امارت میں) ملکا سے (جو پہاڑوں کے بیچ میں اُن کی جاءِ پناہ تھا) مہابن پر حملہ کر دیا۔ جہاں سے ۱۸۵۸ء میں سر سڈنی کاٹن نے اُن کو بھگایا تھا۔ اور خاص ستھانہ کی پرانی آبادی کے اوپر قلعہ بند ہو گئے۔ اس مضبوط قلعے سے نکل کر وہ ہمارے گاؤں پر چھاپے مارتے تھے اور وہی قبیلے جنہوں نے ہم سے عہد کیا تھا (کہ گذرنے نہ دیں گے) اُن کو گذرنے کی اجازت دیتے تھے۔ گویا کھلے طور پر اس امر کا اعلان ہو گیا تھا کہ پرانی حالت پھر قائم ہو گئی ہے۔ مجاہدین راولپنڈی کے ضلع میں گھس آئے اور دن دہاڑے شاہراہ عام پر پولیس چوکی کے قریب دو قتل کر دیئے۔ اس کے تین ہفتہ بعد انہوں نے ہمارے علاقہ پر چھاپہ مارا اور تین دولت مند آدمیوں کو اٹھا کر لے گئے۔ اور اُن کی رہائی کے لیے ہمارے فوجی افسروں سے فدیہ کا مطالبہ کر دیا۔ تھوڑے عرصہ بعد اسی قسم کی ایک اور واردات ہوئی۔ حکومت سرحد نے رپورٹ کی کہ ۱۸۵۷ء کے شرم ناک حالات پھر پیدا ہو گئے ہیں...... اب ہمارے پاس بدلے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہا...... تاہم ہماری بے وفا ہندوستانی رعایا باغی کیمپ میں متواتر جمع ہوتی رہی ۱۸۶۲ء میں (یعنی جس سال میر مقصود علی صاحب کی وفات ہوئی اور مولانا عبداللہ صاحب صادق پوری امیر بنائے گئے) اُن کی تعداد یہاں تک بڑھ گئی کہ پنجاب گورنمنٹ ایک دوسری جنگ کا مشورہ دینے پر مجبور ہو گئی۔

مولانا عبداللہ صاحب صادق پوری کا دورِ امارت

اپریل ۱۸۶۳ء کے اوائل میں اُنہوں نے ہمارے علاقہ میں پھر قتل و غارت اور لوٹ مار کا سلسلہ جاری کر دیا۔ اسی سال جولائی میں وہ نہایت دلیری کے ساتھ ستھانہ کے علاقے پر پھر قابض ہو گئے۔ اور ہمارے حلیف ریاست امب کے نواب صاحب کو تہدید آمیز خطوط لکھے۔ اُن کی ہمسایہ قوموں نے ایک دفعہ پھر اپنی وفاداری کو اپنے تعصب پر قربان کر دیا۔ اور اُن وعدوں کو بالکل فراموش کر دیا جو ہمارے ساتھ کیے گئے تھے۔ چنانچہ اس باغی آبادی کو سرحد پر ایک دفعہ پھر حاکمانہ اقتدار حاصل ہو گیا۔

دسمبر ۱۸۶۳ء (۱۲۸۰ھ) میں (۵۰۳) وہ برطانوی علاقے پر چڑھ دوڑے۔ اور ہماری طلایہ گرد فوج پر شب خون مار کر گویا باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے ہمارے حلیف ریاست امب کے نواب صاحب پر بھی حملہ کر کے ''کوہ سیاہ'' پر ان کے دیہات کو جلا دیا، اور سرحدی چوکیوں پر باقاعدہ جنگ شروع کر دی۔

اسی مہینے میں انہوں نے تناول کی حلیف تحصیلوں پر بھی چھاپہ مارا، اور ایک ملکی افسر کو اس کے چند ساتھیوں کے ساتھ قتل کر دیا۔ اب ہم تقریباً انہیں حالات سے دوچار تھے جو ۱۸۲۷ء و ۱۸۳۱ء کے درمیان (حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کے زمانہ میں) پیدا ہو گئے تھے اور جس کے نتیجہ میں اس متعصب لشکر نے پنجاب پر اپنا تصرف جما لیا تھا۔ یہاں تک کہ سرحدی دارالخلافہ (پشاور) ان کے قبضہ میں آ گیا تھا...... اب میں اس متعصب نو آبادی کے خلاف چار مہموں میں سے ایک کو تفصیل سے بیان کرنے کے لیے منتخب کروں گا۔ اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ جس طرح باغی کیمپ امن کے زمانہ میں ہماری سرحد پر ہمارے لیے باعث توہین تھا، اس سے کہیں زیادہ جنگ کے زمانہ میں ہماری فوج کی تباہی کا سبب بن گیا تھا۔'' (۵۰۴)

یہ سب ہنٹر صاحب کی تمہید تھی۔ اب ۱۸۶۳ء کی جنگ امبیلا کی تفصیلات ملاحظہ فرمایئے۔

''۱۸ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو سات ہزار برطانوی فوج نے سرنیول چیمبرلین کی سرکردگی میں کوچ کیا۔ ان کے ساتھ توپ خانہ بھی تھا اور چار ہزار خچر اور بار برداری کے دوسرے جانور (جن کو جمع کرنے کے لیے پنجاب کا کونہ کونہ چھان مارا تھا) ان کے ساتھ تھے۔ دوسرے دن شام کو فوج کا ایک کالم تمام رات کوچ کرتا ہوا ایک ایسی گھاٹی پر جا پہنچا تھا جو درختوں اور جھاڑیوں سے گھری ہوئی اور زیادہ تکلیف دہ طور پر ''درۂ امبیلا'' کے نام سے مشہور ہے۔ ہمارے جنگی مرکز کی حفاظت کے لیے کافی فوج موجود رہتی تھی، اور اس کے پیچھے سرحدی مقامات پر بھی طاقت ور مورچہ بندی کی گئی تھی۔ جس میں پیادہ اور سوار فوج اور کافی توپ خانہ موجود تھا۔ کیونکہ ۲۰ تاریخ تک جرنیل کو پتہ چل گیا تھا کہ وہ قبائل جن کو وہ اپنا دوست سمجھتا تھا، اب مذبذب حالت میں ہیں اور اس کے دو ہی دن بعد اس نے گورنمنٹ کو تار دے دیا تھا کہ ''فوج کو مجبوراً رکنا پڑا ہے۔''

۲۳ اکتوبر کو قبائل نے اپنی مخالفت کا اعلان کیا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سوات کا روحانی پیشوا (ملا عبدالغفور (۵۰۵)) بھی ہمارے دشمنوں کے ساتھ جا ملا۔ اس اثناء میں گورنمنٹ کے نام سرحد سے تار پر تار چلے آ رہے تھے کہ جن میں مزید اور مزید بر مزید فوج بھیجنے کی التجا کی جاتی تھی۔

فیروز پور رجمنٹ کے ایک حصہ کو کوچ کا حکم دیا گیا۔ ایک اور رجمنٹ کو پشاور سے مغرب کی طرف کوچ کا حکم ملا۔ ۹۳ ہائی لینڈرز سیالکوٹ سے اور ۲۳، اور ۲۴ ہندوستانی پیدل فوج لاہور سے یلغار

کرتی ہوئی آگے بڑھی۔ ابھی تین ہفتے بھی نہیں گذرنے پائے تھے کہ پنجاب کے قلعے یہاں تک خالی ہو گئے کہ میاں میر کے کمانڈ افسر کے لیے مشکل ہو گیا کہ گورنر پنجاب کے لیے ۲۴ فوجیوں کی گارڈ کا انتظام کر سکے۔

اس اثناء میں قبائلی لشکر ہماری فوج کے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ اب آگے بڑھنا تو بالکل ناممکن تھا اور پیچھے ہٹنا شکست کھا جانے سے بھی بدتر۔ ہماری اس حالت نے قبائلی لشکر کو جس کے افراد بچپن ہی سے پہاڑی جنگلوں میں ماہر ہو جاتے ہیں، بہت فائدے میں رکھا۔ (۵۰۶)

ایک ایک دن کی دیر دشمنوں کے تعصبی جوش، اُن کی طاقت اور اُمیدوں کو بہت بڑھا دیتی ہے۔ کمک کے باوجود ہمارے جرنیل کے لیے آگے بڑھنا ناممکن تھا۔ ہفتوں تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برطانوی فوجیں ڈر کے مارے درے میں دبکی پڑی ہیں اور وادی ''چومالہ'' میں بڑھنے کا حوصلہ نہیں رکھتیں، جہاں ''باجوڑ'' قبائل کے مل جانے سے دشمن کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا تھا اور اس ہماری فوج کا ہراول میسرہ اور پشت کی آمد و رفت خطرہ میں پڑ گئی تھی۔

۸ر نومبر کو پنجاب گورنمنٹ نے نہایت بے صبری کے ساتھ پوچھا کہ اگر جرنیل صاحب کو ۴۰۰ افواج کی کمک بہم پہنچائی جائے تو کیا وہ ملا کی متعصب آبادی کو فنا کرنے کے لیے آگے بڑھ سکیں گے؟ ۱۲ر تاریخ کو جواب آیا کہ آگے بڑھنا اُسی وقت ممکن ہے جب دو ہزار پیادہ فوج ہو اور کچھ توپیں ہوں۔ اور ساتھ ہی یہ حوصلہ شکن پیغام بھی آیا کہ جرنیل صاحب اس وقت تک حملہ کرنے کے خلاف ہیں، جب تک کہ درمیانی قبائل کے ساتھ صلح صفائی نہ ہو جائے۔

سارے سرحدی علاقہ میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ۳ر نومبر کو پنجاب گورنمنٹ نے اپنی فوجی چوکیوں کو یہاں تک خالی پایا کہ وائسرائے کے کیمپ کی حفاظتی فوج کا ایک حصہ عاریتاً مانگنا پڑا اور ے فوسیلرز کو بہ سرعت تمام سرحد کی طرف روانہ کر دیا گیا، اور ساتھ ہی ملٹری پولیس کی ایک مضبوط جماعت جو سواروں اور پیادوں پر مشتمل تھی بھیج دی گئی۔ تاکہ ہمارے سلسلہ آمد و رفت کی حفاظت ہو سکے، جو دشمنوں کی وجہ سے خطرہ میں پڑ گیا تھا۔

بار برداری کے سامان کے لیے ۲۲۰۰ اونٹ اور ۲۱۰۰ خچر بعجلت تمام بہت زیادہ خرچ برداشت کر کے پنجاب کے مختلف اضلاع سے بھیج دیئے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مہم کی تمام تدابیر ناکام ہو چکی تھیں۔ اصل خیال یہ تھا کہ اچانک طور پر درہ سے کوچ کرتے ہوئے اس سے آگے کھلے میدان پر قبضہ کر لیا جائے۔ امپیریل گورنمنٹ نے یہ حکم دیا تھا کہ یہ تمام کام ۱۵ر نومبر تک ختم ہو جانا چاہیے مگر ۱۴ر نومبر تک یہ حالت تھی کہ ہماری فوج کے لیے آگے بڑھنا ناممکن ہو چکا تھا اور بجائے اس کے کہ کھلے میدان میں چند لڑائیاں لڑی جائیں جہاں

ترقی یافتہ آلات جنگ استعمال کیے جاسکتے تھے۔ ہمیں اُن تمام چوکیوں کی حفاظت کرنی پڑ رہی تھی جو آگے بڑھتے ہوئے پہاڑوں پر قائم کردی گئی تھیں۔ اسی دن پنجاب گورنمنٹ سے مزید ڈیڑھ ہزار فوج کی درخواست کی گئی۔

۱۸رنومبر کو دشمن نے نہایت جانفشانی سے حملہ کیا۔ ہماری ایک چوکی پر قابض ہوگیا، اور افسروں کے علاوہ ایک سو چودہ آدمیوں کو قتل یا زخمی کرتے ہوئے ہمیں پیچھے دھکیل دیا۔ دوسرے دن دشمنوں نے ایک اور چوکی پر قبضہ کرلیا۔ جسے ایک خون ریز جنگ کے بعد جس میں خود ہمارے جرنیل چیمبرلین شدید زخمی ہوئے دوبارہ حاصل کرلی گئی، اور افسروں کے علاوہ ایک سو پچیس آدمی میدان جنگ میں کام آئے اور ۲۰رکو بیمار اور مجروحین کو واپس بھیج دینا ضروری سمجھا گیا، جن کی تعداد چار سو پچیس ہوگئی تھی۔

۱۹رکو جرنیل صاحب نے ایک طویل تار دیا، جس میں موجودہ فوج کی بے کاری کا شکوہ اور تازہ دم فوج کا مطالبہ تھا۔ دوسرے دن نمبر ۲۳ دیسی پیدل فوج معہ چند یورپیوں کے کیمپ میں پہنچ گئی۔ اس فوج کے پہنچنے سے خیال ہوا کہ دشمن پر خوف طاری ہوجائے گا۔ اور اس بات سے اس خیال کی تصدیق بھی ہوئی کہ اگلے روز جمعہ کا دن تھا۔ مجاہدین جمعہ کے روز خاص طور پر حملہ آور ہوا کرتے تھے، مگر آج کوئی حملہ نہیں ہوا۔ لیکن بہت جلد یہ خیال غلط ثابت ہوگیا۔ کیونکہ جیسے ہی ہماری یہ کمک پہنچی، کوہستانی علاقہ کے تازہ دم قبائل بھی آموجود ہوئے۔ صرف ایک سردار (نصیحت لال خان باجوڑ) تین ہزار آدمی اپنے ساتھ لایا۔ اور ایک درویش (حاجی آف کنہار) نے پانچ سو مجاہدین بھیجے۔ جو یہ عہد کرکے آئے تھے، کہ یا غازی کہلائیں گے یا شہید۔

۵ردسمبر کو ہماری تمام کمک پہنچ چکی تھی۔ جسے آگے بڑھنے کی پرزور تاکید کی گئی تھی۔ اب ہمارے پاس باقاعدہ نو ہزار فوج تھی۔ جس میں بہت سی منتخب رجمنٹیں تھیں۔ مثلاً ۹۳ ہائی لینڈز، اور بے قاعدہ فوج اس کے علاوہ تھی۔ بظاہر یہ امر ناقابل تسلیم تھا، کہ طاقت ور برطانوی فوج اس طرح ہفتوں ایک ہی درہ میں دبکی بیٹھی رہے۔ دشمن اس کو تنگ کرتے رہیں اور وہ اُن کو سزا دینے کے قابل نہ ہوسکے۔ مگر مجاہدین نے سرحدی قبائل میں جو اقتدار حاصل کرلیا تھا، ہم نے اُس کا غلط اندازہ لگایا تھا...... دسمبر کے دوسرے ہفتہ میں ایک گواہ کا چشم دید بیان تھا'' جوش و خروش دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔'' (ص ۵۷)

مجاہدین کو شکست کس طرح دی گئی

جہاں تک جنگ و جدال کا تعلق ہے تو ان مجاہدین کا مقابلہ کون کرسکتا تھا جو ہزاروں میل طے کرکے خفیہ

راستوں کی بے شمار مصیبتیں جھیلتے ہوئے راہِ حق میں مر مٹنے کے لیے یہاں پہنچے تھے مگر افسوس اس بدقسمتی کا کوئی علاج نہ ہو سکا کہ سرحدی قبائل کی دوستی ناپائیدار اور اُن کے معاہدے پادر ہوا ہوا کرتے تھے۔ یہی مرض حضرت سید صاحب اور اُن کے جانشینوں کی شکست کا سبب بنا تھا۔ اور اسی مرض نے مولانا عبداللہ صادق پوری اور اُن کے ساتھی مجاہدین کو شکست کا منحوس چہرہ دکھایا۔ جنگی اقدامات اور معرکوں کے قصہ کے بعد اب شکست کی حسرت ناک داستان سنیے۔

ہنٹر صاحب فرماتے ہیں:

''کوہستانی قبائل کا اتحاد عام طور پر ناپائیدار ہوتا ہے۔ جو کام ہماری فوج سر انجام نہ دے سکی، اُسے اندرونی اختلافات اور ڈپلومیسی نے پورا کرنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے ۲۵ر نومبر کو پشاور کا کمشنر بونیر کے بعض قبائل کو اتحاد سے توڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اُس نے ایک اور گروہ کو بھی جس کی تعداد دو ہزار تھی، اپنے گھروں کو واپس جانے کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔ اور سوات کے پیشوا کو بھی آمادہ کر لیا تھا کہ اپنے خاص مریدوں کو منتشر کر دے۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے سردار اس برگشتگی کو بھانپ کر خود علیحدہ ہو گئے اور باقی ماندہ لوگوں میں بے اعتمادی کا بیج بو گئے...... دوسرے دن بونیر کے قبائل نے فیصلہ کر لیا اور کمشنروں کے پاس حاضر ہو کر احکامات کے صادر ہونے کی درخواست کرنے لگے۔ یہ علیحدگی مجاہدین کی اُمیدوں کے لیے موت کا حکم رکھتی تھی۔ ہر لحظہ کوئی نہ کوئی قبیلہ علیحدہ ہو جاتا تھا...... یہ اتحاد کوہستانی کُہر کی طرح فوراً دور ہو گیا اور بونیر کے قبائل نے جن پر مجاہدین کا بہت کچھ انحصار تھا، ہمارے ساتھ معاہدہ کر لیا کہ مجاہدین کو اُن کے رہائشی غاروں ہی میں جلا دیا جائے گا۔

پھر ایک ہفتہ کے اندر اندر انگریزی فوج کا ایک دستہ بونیریوں کی کمک اور رہنمائی میں پوری سلامتی کے ساتھ پہاڑوں سے گذرتا ہوا مجاہدین کی آبادی ملکا تک پہنچ گیا اور اس کو جلا کر راکھ کر دیا۔ ۲۳ر دسمبر کو یہ بدقسمت فوج درۂ امبیلا میں واپس آ گئی، اور ۲۵ر دسمبر کو تمام کی تمام فوج میدان میں پہنچ گئی، اور گھر کو واپس آتے ہوئے اُن پر ایک گولی بھی نہ چلائی گئی۔

نتیجہ جنگ

بہر حال جب ہم نے اس مہلک گھاٹی کو چھوڑا تو اُس کے چپہ چپہ پر برطانوی سپاہیوں کی قبریں موجود تھیں۔ ہمارا نقصان جان ۸۴۷ تک پہنچ گیا تھا۔ یعنی تمام فوج کا دسواں حصہ جو ایک وقت میں مجموعی طور پر نو ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ یہ نقصان صرف اس درہ میں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ سردی لگ جانے یا کسی بیماری سے ہلاک ہونے والوں کی غیر معمولی تعداد تھی۔ پنجاب گورنمنٹ نے اس

مہم کے نتائج بیان کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اس سے پہلے اور کسی موقع پر بھی کوہستان میں اس قدر شدید اور دیر پا جنگ نہیں ہوئی تھی۔ (۵۰۸)

قبائل مجاہدین کے ساتھ کیوں ہوئے؟

ہنٹر صاحب اور ان کے ہمنواؤں کا دو لفظی جواب ہے "مذہبی جنون"۔ وہ مجاہدین کو بھی مذہبی مجنوں قرار دیتے ہیں اور ان قبائل کو بھی جو مجاہدین کے ساتھ ہوئے "مذہبی مجنون" کہتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ایک طرف مسلمانوں کا سنجیدہ طبقہ اُن کو نظر حقارت سے دیکھے۔ دوسری جانب ہندو اکثریت ان سے متنفر اور وحشت زدہ ہو۔ مسلمان ان کی قربانیوں کو حماقت سمجھیں اور ہندو اس کو فرقہ پرستی کہیں۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو جائیں۔

مگر مولوی محمد جعفر صاحب جو صاحب واقعہ ہیں اور قبائل کے حالات و رجحانات سے ہنٹر صاحب کی بہ نسبت زیادہ واقف ہیں، اُن کا جواب یہ ہے:

"بیگانے ملک میں سرکار کی مداخلت بے جا کے سبب سے ملاں عبدالغفور صاحب اخوند سوات بھی اپنے بہت سے مریدوں کو لے کر آ موجود ہوئے۔ ملکی خوانین اور افغان چاروں طرف سے اپنے بچاؤ کے واسطے سرکار کے مقابلہ پر ٹوٹ پڑے..... بدعوائے حفاظت ہر کس و ناکس سرکار کے مقابل کھڑا ہو گیا۔" (۵۰۹)

یہی جواب قرین قیاس بھی ہے۔ کیونکہ مذہبی جنون چند روز میں ختم نہیں ہوا کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے نشیمن کی حفاظت کا مسئلہ غیور پٹھانوں کو برانگیختہ کر دیتا تھا اور جب کسی طرح اُن کو اُن کی آزادی اور حفاظت وطن کا اطمینان دلا دیا جاتا تھا تو وہ اپنے علاقہ میں واپس چلے جاتے تھے۔ کیا یہ مذہبی جنون ہے یا حفاظت وطن کا قابل قدر جذبہ؟

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد ۔۔۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

باقی رہی فرقہ واریت، تو سوال یہ ہے کہ یہ فرقہ واریت ملک کے کسی اور گوشہ میں کیوں نہیں نمایاں ہوئی تھی۔ یہ تحریک کم و بیش پچاس برس تک زندہ رہی۔ پورے ہندوستان میں اس کے اثرات تھے۔ بالخصوص شمالی ہند میں اس کا باقاعدہ نظام تھا۔ بہار اور بنگال کے چپہ چپہ میں اُن کے مرکز قائم تھے اور ایسی رازداری کے ساتھ کہ برطانوی سامراج کی چالاک سی۔ آئی۔ ڈی جو سمندر کی تہ تک کی خبر لاتی تھی، عرصہ تک اُن کا سراغ نہ لگا سکی لیکن اس کی پوری تاریخ میں کیا کوئی ایک واقعہ بھی ایسا ہوا، جس کو ہندو مسلم فرقہ واریت کا رنگ دیا جا سکے؟

ظاہر ہے کہ پارٹی کی ضروریات کے لیے لاکھوں کروڑوں روپیہ درکار تھا۔ یہ روپیہ مذہبی صدقات اور قومی چندوں کے نام پر مسلمان ہی فراہم کرتے رہے، اور بقول ہنٹر صاحب مذہبی ٹیکس کے لیے مسلمانوں پر کبھی کبھی جبر بھی کیا جاتا تھا۔ مگر کیا کوئی ایک واقعہ بھی ایسا ہے کہ کسی ہندو پر جبر کیا گیا ہو۔ انقلابی پارٹیوں کے لیے ڈاکہ

ڈالنا معمولی بات ہے۔ اگر اس پارٹی کی طرف سے پورے ملک میں کوئی ایک واقعہ بھی کسی ڈکیتی کا ہوا ہوتا تو ہنٹر صاحب! اور اُن کے بلند بانگ ساتھی آسمان سر پر اُٹھا لیتے۔ مگر اس موقع پر ہنٹر صاحب اور اُن کے ساتھیوں کی بے بسی اس بات کی کھلی ہوئی شہادت ہے کہ ان پاک باز مجاہدین حریت کا دامن فرقہ واریت کی آلائش سے پاک تھا۔ وہ اس مقدس تحریک کی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے تھے اور دیانت، سچائی، اور پاک بازی کے ساتھ اپنا فرض انجام دیتے تھے۔ اگر یہ مذہبی جنون ہے تو بہت مبارک۔

ہنٹر صاحب نے کھود کرید کر کے دو واقعات اغوا کے بیان کیے ہیں مگر ہندوستان کے کسی حصہ میں نہیں بلکہ فرنٹیئر کے علاقہ میں، جو جنگ کا علاقہ تھا، اور اگرچہ الفاظ ایسے استعمال کیے ہیں جن سے شبہ ہوسکتا ہے کہ اغوا شدہ ہندو ہیں۔ لیکن مشتبہ الفاظ کا استعمال خود اس کی دلیل ہے کہ وہ ہندو نہیں بلکہ انگریز تھے۔ کیا ہنٹر صاحب کو پریس ایکٹ کی کسی دفعہ کا خطرہ تھا، یا فرقہ وارانہ جذبات کے مشتعل ہونے سے ڈرتے تھے کہ ایسے محتاط الفاظ استعمال کیے۔ ؏

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

مجاہدین کی صحیح تعداد

ہنٹر صاحب کا ارشاد ہے:

> "۱۸۶۳ء کی لڑائی میں ہم نے کافی نقصان اُٹھانے کے بعد یہ سبق حاصل کیا تھا کہ مجاہدین کے کیمپ کے خلاف مہم روانہ کردینا دُنیا کے ترپن ہزار بہترین جنگ جو اور بہادر انسانوں کی مجموعی طاقت کے ساتھ جنگ کرنا ہے۔" (۵۱۰)

ہنٹر صاحب کا یہ بیان بہت مبالغہ آمیز ہے۔ اگر سرکار کی مخالف فوج کی یہ تعداد ہوتی اور وہ بھی بقول ہنٹر صاحب "بہترین جنگ جو اور بہادر انسانوں کی" تو نہ چیمبرلین سات ہزار کی مختصر فوج لے کر حملے کی جرأت کرسکتے تھے، اور نہ پنجاب گورنمنٹ یا مرکزی حکومت اُن کے آگے بڑھنے اور دشمن کو جلد شکست دینے کی تاکید بار بار کرسکتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مجاہدین کی یہ تعداد اور ان کی بہادری کی مدح سرائی صرف اس لیے تھی کہ امبیلا کی گھاٹی پر چیمبرلین کے حملہ کی ناکامی، خود چیمبرلین کے مجروح ہونے اور بقول ہنٹر صاحب اس مہلک گھاٹی کے چپہ چپہ پر برطانوی سپاہیوں کی قبریں بن جانے سے جو ندامت ہوسکتی تھی، اس کی کوئی باعزت تاویل کرلی جائے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ مجاہدین کی اصل تعداد بارہ سو اور چودہ سو کے درمیان تھی، جیسا کہ یوسف زئی کی جنرل رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے۔ (۵۱۱)

البتہ اگر ہنٹر صاحب کے ارشاد کو صحیح قرار دینا ضروری ہو، تو اس کے یہ معنی لیے جاسکتے ہیں کہ مجاہدین پر

جب بھی حملہ کیا جائے، تو انگریزی فوج کی تعداد ایسی ہونی چاہیے کہ پچاس ہزار کا مقابلہ بھی کر سکے۔ تا کہ جو قبیلے ہنگامی طور پر مشتعل ہو کر مجاہدین کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ جن کے جنگ جو بہادروں کی تعداد تریپن ہزار تک پہنچ جاتی ہے، اُن کا مقابلہ فوجی قوت سے کیا جا سکے۔ اور ڈپلومیسی سے کام لینے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

ڈپلومیسی کیا تھی

ہنٹر صاحب نے ڈپلومیسی کی تشریح نہیں کی۔ اس کی غمازی منشی محمد جعفر صاحب نے اپنے بیان میں کر دی ہے کہ:

"اگر لاکھوں روپیہ دے کر اُن بگڑے ہوئے افغانوں کو راضی نہ کیا جاتا تو ایک آدمی بھی فوج انگریزی کا واپس نہ آتا۔"

ہندوستان میں گرفتاریاں

سرحد پر جنگ کا یہ سلسلہ جاری تھا، کہ ہندوستان میں پولیس اور سرکاری جاسوسوں کی یورش شروع ہو گئی اور جس پر بھی شبہ ہوا مجاہدین سے ساز باز کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ یہ سلسلہ ایک دو ماہ نہیں بلکہ:

"آخر ۱۸۶۳ء سے دس برس تک برابر قیامت برپا رکھی صدہا مسلمان مارے خوف کے گھر بار چھوڑ کر عرب وغیرہ ملکوں میں جا بسے۔ خود غرضوں، خوشامدیوں اور ذاتی عداوت رکھنے والوں نے خوب دل کے چاؤ نکالے۔

دس برس تک اخباروں میں سوائے اس قصہ اور اس بحث کے کوئی دوسری بات کم ہوتی تھی۔ ایک محکمہ مع گواہ شاہدوں کے اس دارو گیر کے واسطے برسوں تیار رہا۔ جس کو چاہا پکڑ لیا اور جو چاہی رشوت لے لی اور جس نے نہ دی، اُس پر مصنوعی گواہوں سے گواہی دلا کر دائم الحبس کر دیا"(۵۱۲)

دوبارہ جنگ ۱۸۶۸ء

انگریزی فوجوں نے جو جانی اور مالی نقصان پہنچایا تھا، اور انگریزی ڈپلومیسی نے جس طرح دامن اتحاد چاک کیا تھا اُس کی بخیہ گری میں کچھ دن لگے۔ مگر ابھی چار سال پورے نہ ہوئے تھے کہ فروری ۱۸۶۸ء میں مولانا عبداللہ صاحب کی زیر کمان تازہ دم مجاہدین کا ایک دستہ پھر انگریزی فوج کے مقابلہ پر صف آرا تھا۔

انگریزوں کو ۱۸۶۳ء یاد تھا۔ انہوں نے پوری مستعدی اور چستی سے کام لیا اور پورے ہندوستان(۵۱۳) کی منتخب فوجیں مورچہ پر بھیج دیں۔ چھ ماہ تک کشت و خون ہوتا رہا۔ نتیجہ کیا ہوا؟ ہنٹر صاحب کے ارشادات ملاحظہ فرمائیے، اور مجاہدین کی سخت جانی کی داد دیجیے۔ ہنٹر صاحب فرماتے ہیں:(۵۱۴)

"پنجاب گورنمنٹ نے مہم کے نتائج بیان کرتے ہوئے افسوس ظاہر کیا کہ مہم ختم بھی ہو گئی اور ہم اس قابل نہ ہوئے کہ ہندوستانی مجاہدین کو وہاں سے نکال کر باہر کریں یا اُن کو اس بات پر آمادہ کر سکیں

کہ وہ اطاعت قبول کرلیں اور ہندوستان میں اپنے گھروں کو واپس آجائیں'۔

ہنٹر صاحب ایک دوسرے موقعہ پر فرماتے ہیں:

''یہ تین دفعہ انگریزی فوجوں کے ہاتھ سے تباہ و برباد ہو چکے ہیں لیکن باوجود اس کے یہ ابھی تک (۱۸۷۱ء زمانہ تصنیف کتاب تک) زندہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس وقت اس سرحدی نوآبادی کو ہم فوجی قوت کے بل بوتے پر تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہماری مسلمان رعایا کے متعصب عوام لاتعداد آدمیوں اور روپوں سے اُن کو مدد دے کر گویا ان چنگاریوں کو ہوا دیتے رہتے ہیں جنہیں ہم نے خاک سمجھ کر چھوڑ دیا تھا، مگر جن کی بجھی ہوئی راکھ سے ایک دفعہ پر شعلے بھڑکنے لگتے ہیں۔ (۵۱۵)

اس کے بعد یہ چنگاریاں سرحد پر اگرچہ تقریباً پچاس برس، بلکہ اگست ۱۹۴۷ء تک دھواں دیتی رہیں مگر ہندوستان میں تحریک کا نظام منتشر اور معطل ہوگیا تھا، اس کی کل ہند حیثیت ختم ہوچکی تھی۔ لہٰذا اس کا بیان کرنا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ اس لیے اس باب کو ختم کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے اندر نظامِ عمل

مرکز کے ذمہ دار

۱۸۵۰ء میں مولانا ولایت علی صاحب کا قافلہ دوبارہ عازم ہجرت ہوا، تو صادق پور کا مرکز آپ کے برادرِ خورد مولانا سید فرحت حسین (۵۱۶) صاحب کے سپرد ہوا۔ یہ سپردگی کامیاب رہی۔ تقریباً آٹھ سال تک آپ کی زیرِ نگرانی مرکز اسی شان سے سرگرمِ عمل رہا۔ ۱۸۵۸ء (۱۲۷۴ھ) اس تحریک بالخصوص اس خاندان کے لیے عام الحزن تھا۔ کیونکہ اسی سال مولانا عنایت علی غازی رحمہ اللہ نے مجاہدین کی دشوار گذار پہاڑیوں میں اپنے شکستہ ساتھیوں کے ساتھ فاقہ اور تہی دستی کی مصیبت برداشت کرتے ہوئے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اور یہی سال تھا کہ دریائے گنگا کے کنارے صادق پور کے مرکز میں چھوٹے بھائی مولانا فرحت حسین صاحب کو پیغام (۵۱۷) اجل پہنچا اور آپ رہ گرائے ملکِ عدم ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مگر جس طرح ستھانہ کیمپ کا گراہوا علم فوراً ہی مولانا نوراللہ صاحب نے بلند کردیا، پٹنہ میں مولانا یحییٰ علی صاحب نے پوری مستعدی اور بلند آہنگی سے مرکز کا نظم ونسق سنبھالا اور اس بجھنے والی چنگاری کو آتش فشاں بنادیا، جو ایک عرصہ تک برطانوی لشکروں پر آتش باری کرتا رہا۔

۱۸۶۴ء میں مولانا یحییٰ علی صاحب (۵۱۸) ایک بڑی جماعت کے ساتھ گرفتار کرکے انڈمان بھیج دیے گئے تو اُن کے بڑے بھائی مولانا احمداللہ صاحب (۵۱۹) نے کام سنبھالا۔ مگر ابھی صرف ایک سال ہی کام کرنے پائے تھے کہ ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۵ء) میں اُن پر بھی مستقل مقدمہ چلایا گیا اور وہ بھی انڈمان بھیج دیے گئے۔ ۲۸ ذی الحجہ

۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء) کو وہیں سپردِ خاک ہوئے۔

مولانا احمد اللہ صاحب کی گرفتاری کے بعد مولانا مبارک علی صاحب تنظیم کے ذمہ دار ہوئے۔ یہ صادق پور کے نہیں تھے بلکہ اطراف حاجی پور ضلع مظفر پور کے رہنے والے تھے۔ مولانا ولایت علی صاحب یا مولانا فرحت حسین صاحب سے بیعت تھے۔ جماعت کی تنظیم کے سلسلہ میں پٹنہ میں رہ پڑے تھے۔

مولانا احمد اللہ صاحب کی گرفتاری کے بعد جماعت کا نظم سنبھالنا بڑی آزمائش کا کام تھا۔ پٹنہ کی زمین خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔ ملک کے طول و عرض میں دار و گیر کا سلسلہ جاری تھا۔ قسمت برگشتہ کی طرح سرکار کی چشم التفات کیا پھری کہ عظیم آباد (پٹنہ) کے رئیسوں اور جاہ پسندوں کے تیور بھی بدل گئے۔ ایک عجیب قیامت کا سماں تھا۔ مولانا مبارک علی صاحب نے جان جوکھم میں ڈال کر تنظیم جماعت کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور ایک عرصہ تک اپنا فرض حسن و خوبی سے انجام دیتے رہے۔ مقدمات سازش کی پیروی میں بھی مولوی محمد حسن صاحب ذبیح (فرزند مولانا ولایت علی صاحب) کا ہاتھ بٹاتے رہے۔

جب آپ ضعیف ہوئے تو اپنی نیابت کے لیے مولوی محمد حسن صاحب ذبیح کو منتخب کیا اور اُن کی تربیت میں پوری کوشش کی۔ مگر یہ تنظیم کا کام اُن دنوں اتنا آسان نہیں تھا کہ مولوی مبارک علی صاحب سرکار کی نظرِ عنایت سے محروم رہ جاتے کسی حیلہ سے انہیں بھی حبس و زنداں سے نوازا گیا، اور تقریباً ۱۸۶۸ء (۱۲۸۵ھ) میں وہ بھی گرفتار کر لیے گئے۔

عبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ لیکن انہیں قید میں اتنی تکلیفیں دی گئیں کہ انڈمان جانے سے پہلے ہی وہ جاں بحق ہو گئے۔

مولوی مبارک علی صاحب پر ایک الزام یہ بھی تھا کہ انہوں نے جہاد پر ایک کتاب تالیف کی تھی۔

مولوی محمد حسن صاحب (۵۴۰) پر یہ سلسلہ جانشینی ختم ہو گیا اور انقلابی نظام درہم برہم ہو گیا۔

نظامِ عمل

پہلے گذر چکا ہے کہ:

(۱) یہ نظام دیہات و قصبات سے شروع ہوتا تھا۔ گاؤں گاؤں اور قصبے قصبے امام اور واعظ مقرر کیے جاتے تھے۔ یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ وہ باقاعدہ عالم ہوں۔ البتہ یہ ضروری ہوتا تھا کہ جماعت کے نصب العین سے پوری طرح واقف اور اُس کے مقاصد کے جاں باز و وفادار ہوں۔

(۲) کوشش کی جاتی تھی کہ جہاں ممکن ہو، ہم خیال لوگوں کی مستقل آبادی قائم کر دی جائے۔ (۵۴۱)

(۳) دیہات و قصبات کے مقامی مبلغوں اور کارکنوں کا نگران ایک بڑا امام ہوتا تھا جس کا مرکز علاقہ کا کوئی صدر مقام ہوتا تھا۔ (۵۴۲)

(۴) تبلیغی رسالے اور جہادی نظمیں بڑی تعداد میں چھاپ کر بانٹی جاتی تھیں۔

(۵) صادق پور کے بڑے مکان میں جو قافلہ کے نام سے مشہور تھا، بنگال وغیرہ سے آنے والے رضا کار کچھ دنوں قیام کرتے اور وہاں ناظم جماعت کے مواعظ سے مستفید ہوتے۔

جماعت کے ناظم ہر دور میں ایسے ہوتے رہے کہ علوم مشرقیہ کی اعلیٰ قابلیت اور مہارت نے ساتھ اعلیٰ کردار، زہد و تقویٰ اور دیانت و صداقت میں بھی نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ مسلمان ان کی علمی قابلیت اور باثر شخصیت کے علاوہ اُن کے روحانی کمالات کے بھی معتقد اور گرویدہ ہوا کرتے تھے۔

مولانا ولایت علی صاحب، اُن کے بعد مولانا فرحت حسین صاحب پھر مولانا یحییٰ علی صاحب، مولانا احمد اللہ صاحب دینی اور دنیاوی، علمی اور روحانی غرض ہر ایک لحاظ سے اعلیٰ حیثیت کے مالک رہے ہیں۔

مؤخر الذکر حضرات نے تو یہ کمال کیا کہ انگریزی حکام اور اعلیٰ افسروں سے بھی بہت گہرے تعلقات قائم کر لیے۔

چنانچہ ڈاکٹر ہنٹر لکھتے ہیں:

"یحییٰ علی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ پٹنہ میں انگریزی حاکموں کے ساتھ اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ اس کے خاندان میں سے ایک ہماری حکومت میں اعزازی عہدے پر مامور، اور دوسرا ہماری سرحد پر مجاہدین کی جماعت کی رہنمائی کر رہا تھا، جو ہماری فوجوں پر چھاپے مار رہی تھی۔" (۵۴۳)

مولانا احمد اللہ صاحب کے تذکرہ میں ہے:

آپ کی عقل و دانش کا اس قدر شہرہ تھا کہ گورنمنٹ انگریزی بھی آپ سے اکثر رفاہ عام کے کاموں میں مشورہ لیا کرتی تھی۔ آپ برابر کمیٹی کے ممبر رہا کرتے تھے۔ آپ حکام رس تھے اور جلسۂ وائسرائے بہادر میں درجہ اول میں شمار ہوتے تھے۔ اکثر وہ مقدمات جو رعایا اور گورنمنٹ کے درمیان آراضی کے متعلق ہوتے مثلاً زمین حکومت کو خریدنی ہوتی اس کی قیمت کا فیصلہ آپ کے ہی سپرد ہوتا تھا اور آپ اس خوبی سے فیصلہ فرماتے کہ حاکم اور محکوم دونوں راضی ہو جاتے۔ جب انکم ٹیکس کا نیا نیا بندوبست حکومت کی طرف سے شروع ہوا، اس وقت چار اسیسر، دو ہندو دو مسلمان نہایت دیانت دار منتخب کر کے سرکار کی طرف سے اس میں مقرر کیے گئے۔ آپ کا ان میں نمبر اول تھا۔ کسی مقدمہ میں اگر جج سے اختلاف رائے ہوتا تو مقدمہ صدر سے آپ ہی کی رائے پر فیصل ہوتے۔ کیونکہ آپ کی تحریر ایسی مدلل اور زوردار ہوتی کہ حکام بالا کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہوتا تھا۔ حکومت میں آپ کا اثر و رسوخ یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ ۱۸۵۷ء کے سلسلہ میں مسٹر ٹیلر کمشنر پٹنہ نے آپ کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا تھا۔ تین مہینے آپ نظر بند رہے مگر جب حکومت بالادست کی

توجہ اس طرف منعطف کرائی گئی، تو نہ صرف یہ کہ آپ کی رہائی کے فوری احکام صادر ہوئے، بلکہ مسٹر ٹیلر کمشنر پٹنہ کو برخاست بھی کر دیا گیا۔ (۵۱۴)

بنگال سے سرحد تک

مسٹر ہنٹر کی کتاب کا مندرجہ ذیل اقتباس ایک تاریخی سند ہے۔ اس سے آپ راستہ کے نشانات بھی معلوم کر سکتے ہیں۔

''سازشیوں کے لیے سب سے زیادہ خطرناک کام پٹنہ کے دارالاشاعت سے جس کو وہ اپنی خفیہ زبان میں چھوٹا مال گودام کہتے تھے، مجاہدین کے سرحدی کیمپ تک جس کو وہ بڑا مال گودام کہتے تھے، رنگروٹوں کا پہنچانا تھا۔ ایک بنگالی وہابی سے راستہ میں ہزاروں تکلیف دہ سوالات پوچھنے کا احتمال تھا۔ شمال مغربی صوبے اور پنجاب کے وسیع علاقے میں اس کو تقریباً دو ہزار میل کی مسافت طے کرنی پڑتی تھی۔ اس کی اجنبیت ہر گاؤں میں اپنے قد اور اپنی زبان کی وجہ سے ظاہر ہو جاتی۔ لیکن اس خطرناک کام میں انتہائی ہوش مندی سے کام لیا گیا۔ تمام راستے پر جماعت خانوں کا سلسلہ قائم کر دیا گیا۔ اور اُن کا انتظام معتبر مریدوں کے حوالے کیا گیا۔ جرنیلی (۵۱۵) سڑک کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اس طرح سرحدی کیمپ کو جانے والا ہر باغی مختلف صوبوں میں بے خطر چلا جاتا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ ہر پڑاؤ پر اُس کو ایسے دوست مل جائیں گے جو اس کے لیے چشم براہ ہیں۔ جماعت خانے جو راستے میں پڑتے، اُن کے منتظم مختلف طبقات کے لوگ تھے مگر تمام کے تمام انگریزی حکومت کا تختہ اُلٹنے میں ہمہ تن مصروف۔ ایک مقامی سازشی اُن کا صدر ہوتا تھا۔ ایسے اشخاص کے انتخاب میں بہترین مردم شناسی کا ثبوت دیا گیا تھا۔ کیونکہ اُن میں سے کسی ایک نے بھی گرفتار ہونے کے خوف یا کسی بڑے سے بڑے لالچ سے اپنے تباہ شدہ امام کے خلاف گواہی دینے پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ (۵۱۶)

مالی تنظیم

مقامی مبلغ اور امام اُن تمام مسلمانوں سے جو جماعت سے تعلق رکھتے تھے، چار قسم کے چندے (ٹیکس) وصول کرتے تھے۔

(۱) عشر یعنی مسلمان کاشتکاروں سے پیداوار کا دسواں حصہ۔

(۲) زکوٰۃ۔ صاحب نصاب سے اُس کے سرمایہ کا چالیسواں حصہ سالانہ۔

(۳) صدقۂ فطر: عید کے موقع پر ایک خاص صدقہ جس کی مقدار فی کس تقریباً پونے دو سیر گیہوں ہوتی ہے۔

(۴) متفرق امدادیں۔ چنگی۔ یعنی صبح شام ہر ایک کھانے کے وقت ایک چنگی آٹا۔

ڈاکٹر ہنٹر کا مندرجہ ذیل بیان ملاحظہ فرمایئے۔ یہ بیان اگرچہ ایک خاص شخص کی کارگذاری سے متعلق ہے، مگر اس سے پورے مالی نظم کا نمونہ سامنے آجائے گا۔ ہنٹر کا بیان ہے:

اُس نے (مولانا عبدالرحمٰن اور اُن کے بعد اُن کے فرزند مولانا امیر الدین صاحب (مالدہ) نے) دیہاتوں کو مالی علاقوں میں تقسیم کر دیا تھا، اور ہر علاقے میں ایک محصل ٹیکس مقرر کیا۔ پھر یہ افسر اپنے اعتماد پر ہر گاؤں میں ایک محصل ٹیکس مقرر کرتا اور اُن کے جمع کیے ہوئے روپیہ کا حساب بھی لیتا۔ پھر اس روپیہ کو ضلع کے مرکز میں بھیجا جاتا۔ اصولاً ہر گاؤں میں ایک محصل ٹیکس ضرور ہوتا۔ جہاں آبادی بہت زیادہ ہوتی، وہاں زیادہ آدمیوں کو ملازم رکھ لیا جاتا۔ ایسے مقامات پر ایک امام ہوتا تھا، جو نماز باجماعت پڑھاتا اور چندہ وصول کرتا۔ امام کے علاوہ ایک جنرل منیجر (ناظم مالیات) ہوتا۔ جس کے ذمے جماعت کی مالی ضروریات کی خبر گیری ہوتی تھی۔ اور ایک اور افسر ہوتا جو مالی رقوم اور خفیہ وخطرناک خطوط کو منزل مقصود تک پہنچانے کے لیے "قاصد" مہیا کرتا تھا(۵۲۷)

زکوٰۃ، صدقۂ فطر اور عشر کے علاوہ ایک اور ٹیکس بھی مقرر کیا گیا تھا جس سے کوئی غریب مسلمان بھی نہیں بچ سکتا تھا۔ اس نئے ٹیکس کی تشریح ملاحظہ ہو:

اُنہوں نے حکم دیا کہ ہر خاندان کا مالک کھانا کھاتے وقت اُس کے خاندان (۵۲۸) میں جتنے فرد ہوں، اتنے ہی مٹھی بھر چاول علیحدہ کرتا رہے اور ہر جمعہ کے روز گاؤں کے محصل ٹیکس کے حوالہ کردے۔ اس طرح غلہ کے انبار کے انبار جمع کر لیے جاتے اور اُن کو مصارف جہاد کے لیے بھیج دیا جاتا۔ ان معینہ چندوں کے علاوہ غیر معمولی چندہ بھی وقتاً فوقتاً لیا جاتا تھا۔ اور اس چندہ کے حاصل کرنے میں جادو بیان مبلغین کی پر اثر تقریریں زیادہ کارآمد ثابت ہوتی تھیں۔ تمام ٹیکس جمع کرنے والوں کا سردار ایک سالانہ دورہ بھی کرتا تھا۔ وہ عید کے موقع پر اپنے علاقے کے ہر گاؤں میں جاتا اور اس بات کی اچھی طرح جانچ پڑتال کرتا کہ ہر خاندان نے پچھلے سال کا بقایا ادا کر دیا ہے۔ بنگال کے ہر ضلع میں اس قسم کے اعلیٰ مرکز موجود تھے۔(۵۲۹)

یہ بنگال کی صورت حال ہے۔ بہار کے متعلق مسٹر ہنٹر کی رپورٹ ہے:۔

دریائے گنگا کی وادی میں پٹنہ سے لے کر سمندر تک کے مسلمان کسان مجاہدین کے کیمپ کے لیے ہفتہ وار امدادی نذرانے مخصوص کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔(۵۳۰)

ا: یوپی کے متعلق ہنٹر صاحب کی کوئی تحریر نظر سے نہیں گذری۔ البتہ ۱۹۳۰ء میں فیض آباد جیل کے ایک ساتھی نے راقم الحروف کو بتایا تھا کہ اُن کے یہاں (ضلع غازی پور صوبہ یوپی) میں بیسویں صدی کے شروع تک "قافلہ کے مجاہدین" کے لیے عشر وغیرہ جمع کرنے کا انتظام قائم تھا۔ یہ ساتھی محمد یحییٰ(۵۳۱) نام ایک خوش حال

گھرانے کے فرد، سرگرم انقلابی تھے۔ بم کے ایک کیس میں ماخوذ ہوئے اور سات سال کی سزا بھگت رہے تھے۔

محمد یحییٰ صاحب غازی پوری کی اس شہادت سے ثابت ہوتا ہے، کہ امیر المجاہدین مولانا عبداللہ صاحب صادق پوری کی وفات (۱۹۰۲ء) تک یہ نظم قائم رہا۔

۲: عشر وغیرہ کا یہ مالی نظام صرف بنگال ہی میں نہیں تھا بلکہ یو۔ پی تک پھیلا ہوا تھا۔

یہ نظام ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا کہ ریشمی رومال کی مشہور انقلابی تحریک کے سلسلہ میں مسلمانوں کے جذبۂ حریت سے اپیل کی جانے لگی اور اسی قسم کا خفیہ نظام قائم کر دیا گیا جو ۱۹۲۰ء کے قریب تک رہا۔ پھر ۱۹۳۰ء کے قریب ''فقیر ایپی'' کی مشہور تحریک علاقہ سرحد میں جاری ہوئی۔ اس تحریک کے لیے بھی پوری رازداری کے ساتھ رقمیں وصول کی جاتی رہیں۔

غرض برطانوی سامراج کے پورے دور میں عام مسلمان انقلاب پسند اور انقلابی پارٹیوں کے مدد و معاون بنے رہے۔ اگر کسی وقت جانی قربانی نہیں پیش کر سکے، تو مالی قربانی سے تو کبھی دریغ کیا ہی نہیں گیا۔

مالی امداد مجاہدین تک

پہلے ہنٹر صاحب کی شکایت سن لیجیے۔ (۵۳۲)

''بڑے بڑے ذہین اور دولت مند اشخاص اس سازش میں حصہ لے رہے ہیں اور روپیہ پہنچانے کے طریقے کو جو باغیانہ سازش کا ایک انتہائی خطرناک کام ہے، کمال ہوشیاری سے ایک بے ضرر مہاجنی کاروبار کا رنگ دے دیا گیا ہے۔''

ایک ہندوستانی مصنف (۵۳۳) کے الفاظ میں اس کی تشریح ملاحظہ فرمایئے۔

ملک کے مختلف حصوں میں دیانت دار اور خوش حال تاجروں کے پاس اس نواح کی رقم جمع ہوتی۔ وہاں سے ہنڈیوں اور دوسرے ذرائع سے پٹنہ، دہلی، تھانیسر، راولپنڈی وغیرہ تک یہ رقومات پہنچائی جاتیں۔ جہاں سے خاص ذریعوں سے منزل مقصود تک پہنچتیں۔ اس قسم کے تاجر پٹنہ (بنگال)، ڈھاکہ، کلکتہ، پٹنہ میں خاص طور پر کام کرتے تھے۔ امیر داد خاں، حشمت داد خاں (ساکنان پٹنہ) کا چمڑے کا بہت بڑا کاروبار کلکتہ اور پٹنہ میں تھا۔ جن پر اسی پاداش میں ۱۸۷۱ء میں مستقل مقدمہ چلایا گیا۔ اور لاکھوں روپیہ کا فرم تباہ کر دیا گیا۔

راونشاہ (۵۳۴) نے اپنے خاص ذرائع کی تفصیل یہ دی ہے:

(۱) مولا بخش (۵۳۵) ساکن پٹنہ۔ محمد شفیع میاں میر کیمپ لاہور میں۔

(۲) عبدالکریم۔ محمد شفیع کا ایجنٹ راولپنڈی میں۔ نبی بخش۔ محمد شفیع کا دوسرا ایجنٹ راولپنڈی میں۔

(۳) احمد علی (ساکن جگری۔ بہار) پشاور میں۔ (۵۳۶)

اچھا ہے اس موقع پر ان کا کچھ تعارف ہو جائے۔ اس بات میں یہ سب مشترک ہیں کہ یہ سرکاری آدمی تھے۔ سرکار کے خیر خواہ شمار کیے جاتے تھے۔ اس مشترک وصف کے علاوہ ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات ہنٹر صاحب کے عتاب آمیز الفاظ میں یہ ہیں۔

مولانا بخش (الٰہی بخش)۔ یہ وہی شخص ہے جس کے ذریعہ پٹنہ کے مولوی جمع شدہ سرمایہ کو تھانیسر میں جعفر کے پاس پہنچاتے تھے، تاکہ وہ ملکا اور ستھانہ کو بھیج دیا جائے۔ (۵۳۷)

محمد شفیع کے دادا پردادا معمولی چرواہے تھے۔ وارن ہسٹنگز اور لارڈ کارنوالس کے زمانہ میں جب ہندوستان کی باقی ماندہ طاقتوں سے جنگ کا سلسلہ جاری تھا تو محمد شفیع کا دادا گوشت کا ٹھیکہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ کمسریٹ کے افسر انچارج کی پوری تسلی کے ساتھ بڑے بڑے ٹھیکے پورے کرتا رہا۔ محمد شفیع کے والد نے اس سلسلہ کو مزید وسعت دی۔ والد کے بعد محمد شفیع حسن وخوبی اور پوری ذمہ داری سے اس خدمت کو انجام دیتا رہا۔ ہندوستان کے تمام شہروں میں اس کی ایجنسیاں تھیں اور جرنیلی سڑک کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی انگریزی چھاؤنیوں میں اُس نے گوشت کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ پنجاب کے بڑے بڑے تاجروں کے ساتھ اُس کے خاندانی یا تجارتی تعلقات تھے۔ وہ ہر سال انگریزی حکومت سے لاکھوں پونڈ وصول کرتا۔ وہ اپنے کام میں وقت کا بڑا پابند تھا۔ وہ افسروں کا حکم خادموں کی طرح بجالاتا تھا۔ اُس نے کمسریٹ کے افسر کو فریب دے کر اپنے ٹھیکہ کی اس حالت میں بھی تجدید کرالی، جب وہ مقدمۂ سازش میں ماخوذ تھا۔ (۵۳۸)

عبدالکریم۔ محمد شفیع کا خفیہ ایجنٹ تھا اور باغیانہ مقاصد کے لیے پٹنہ کے منی آرڈروں کا روپیہ دلواتا تھا۔ وہ اس مقصد کے لیے یحییٰ علی (امیر المجاہدین مولانا یحییٰ علی صاحب) سے خط وکتابت بھی کرتا تھا۔ (۵۳۹)

تحریک کے نمایاں پہلو

قابلیت، راز داری اور وفاداری

ثبوت کے لیے مسٹر ہنٹر سے بہتر کس کی شہادت ہو سکتی ہے

الفضل ما شهدت به الاعداء

مسٹر ہنٹر کا اعتراف ہے:

اس بغاوت کے تین نمایاں پہلو جو دورانِ مقدمہ میں ظاہر ہوئے، یہ ہیں:

(۱) وہ حیرت انگیز قابلیت جس سے دور دراز تک پھیلی ہوئی بغاوت کو منظم کیا گیا۔ (۵۴)

(۲) وہ راز داری جس کے ساتھ اس کی مختلف پیچیدہ کارروائیاں عمل میں لائی گئیں۔

(۳) وفاداری کا وہ رویہ جو اس کے ممبروں نے ایک دوسرے کے ساتھ برتا۔

راز داری کے سلسلہ میں مسٹر ہنٹر فرماتے ہیں:

''اُن کی کامیابی کا راز اُن کے فرضی ناموں کی عمدہ ترتیب اور اُن کی خفیہ زبان پر تھا''۔

ایثار و اخلاص

ایثار و اخلاص کے متعلق مسٹر ہنٹر فرماتے ہیں:

لیکن میں اس یقین کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ تمام سازشی سوائے محمد شفیع فوجی ٹھیکیدار کے اپنا کام انتہائی خلوص اور فطری جوش کے ساتھ خدا کا کام سمجھ کر کرتے تھے۔ اُن کا عہد تھا کہ مرتے دم تک اس فرض کو انجام دیں گے۔ (۵۴)

حیرت انگیز مضبوطی

تحریک کے یہی نمایاں پہلو اور کارکنانِ تحریک کے یہی ممتاز اور گراں قدر اوصاف تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامہ کے طوفانوں میں بھی اس تحریک کو صحیح سالم زندہ رکھا انقلاب ۱۸۵۷ء کے سیلاب نے سیاسی اقتدار کی بڑی بڑی چٹانوں کو نیست و نابود کر دیا۔ لیکن اس تحریک کی زمین دوز جڑوں کے کسی ایک ریشہ کو بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکا۔ تعجب ہوتا ہے کہ منشی محمد جعفر صاحب جیسے ہوشیار کارکن ۱۸۵۷ء میں شریک ہوئے اور پھر بھی وہ ۱۸۵۷ء کے نتائج سے محفوظ رہنے میں کامیاب ہو گئے۔

ہنٹر صاحب تو یہاں تک فرماتے ہیں:

''۱۸۵۷ء میں جب غدر شروع ہوا تو جعفر اپنے دس معتبر مریدوں کے ساتھ مجاہدین کے کیمپ کی

طرف روانہ ہوگیا۔ جنگ کے غیر مانوس کام میں بھی اُس کی اعلیٰ قابلیت نے اس کو نمایاں کر دیا اور اب وہ اُن لوگوں میں شمار ہونے لگا جن کے پاس باغیانہ راز محفوظ رہ سکتے ہیں۔

دہلی میں جب باغیوں کی اُمیدیں خاک میں مل گئیں تو جعفر اپنے پرانے (عرضی نویسی کے) کام پر تھانیسر واپس آگیا، اور خدا کی ان غیر معلوم مصلحتوں پر غور کرنے لگا جنہوں نے کفار کو فتح دی۔ (۵۴۲)

تادیبی مہم اور سیاسی مقدمے ناکام

ہنٹر صاحب کی کتاب کی چند سطریں اور پڑھ لیجیے اور ماضی کے اس سچے افسانے کی قدر کیجیے۔

''لیکن ۱۸۶۴ء کا سیاسی مقدمہ، غداروں کا جوش ٹھنڈا کرنے میں ایسا ہی ناکام ثابت ہوا جیسا کہ ۱۸۶۳ء کی تادیبی مہم۔ اُن کے اندرونی اختلاف نے چند سال کے لیے انہیں سرحد پر خاموش رکھا۔ مگر اس کے باوجود ہمارے علاقے میں جہاد کی تبلیغ بدستور جوش و خروش سے ہوتی رہی۔ مشرقی بنگال کے ہر ضلع میں بغاوت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ دریائے گنگا کی وادی میں پٹنہ سے لے کر سمندر تک مسلمان کسان مجاہدین کے کیمپ کے لیے امدادی نذرانے مخصوص کرنے کے عادی ہو چکے تھے (۵۴۳)

خفیہ زبان اور اصطلاحی الفاظ

کچھ نمونے خفیہ زبان کے بھی ملاحظہ فرما لیجیے، جو بقول ہنٹر اُن کی کامیابی کے راز تھے۔ (۵۴۴)

اصل	اصطلاح
پٹنہ	چھوٹا گودام
ملکا۔ستھانہ	بڑا گودام
مولانا عبدالرحیم صاحب کا گھر	قافلہ گاہ۔قافلہ
اصل	**اصطلاح**
رضا کار اور مجاہد	خدمتگار۔بیوپاری۔مسافر۔سانڈ۔جہادی۔
رضا کاروں کا جتھہ	قافلہ
جنگ	مقدمہ
ہنڈی	سفید پتھر
نقد رقم	کتابوں کی قیمت
روپے	جوتے۔کتابیں۔
مولانا عبداللہ صاحب کا ہیڈ کوارٹر	گلشن

مولانا عبداللہ صاحب امیر المجاہدین - باجو صاحب

خاص خاص حضرات کے نام بھی بدل کر استعمال کیے جاتے تھے۔ مثلاً

اصلی نام	فرضی نام
مولانا یحییٰ علی	محی الدین
مولانا فیاض علی	بشیر الدین
مولانا عبداللہ صاحب	باجو صاحب - باجو جان - میاں جان
محمد شفیع	شفاعت علی
عبدالرحیم	رحیم بیگ
محمد جعفر	پیرو خاں - پیر و خلیفہ
عبدالقادر	غلام قادر
احمد اللہ	احمد علی
محمد حسن	زوج اللہ

انتقامی کارروائیاں

انکشاف، گرفتاریاں، فراہمیٔ ثبوت اور ترتیب مقدمات

سراغ

غزن خاں کے متعلق منشی محمد جعفر صاحب تھانیسری کا ارشاد تو یہ ہے:

''غزن خاں مخبر نے تو محض ایک جھوٹا قصہ اپنے بیٹے کے قافلہ کو بھیجنے کا گھڑ کر ایک دو گاؤں جاگیر دھوکا دے کر سرکار سے لے لی۔'' (۵۲۵)

لیکن مسٹر ہنٹر اور اُن کے ہم نواؤں نے ''غزن خاں'' اور اُس کے بیٹے کو تاریخ کا ہیرو بنانے کی کوشش کی ہے۔ غزن کے متعلق ہنٹر صاحب کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:

''اُس نے ایک ایسے جان جوکھوں کے کام کی تجویز سوچی جس کی مثال سپاہ پر نہ والوں کے استقلال اور دشمن وفاداری کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔'' (۵۲۶)

اب غزن وابن غزن اور اُن کی سراغ رسانی کی دلچسپ کہانی (۵۲۷) سنیے:

۱۸۵۸ء کی سرحدی جنگ (۵۲۸) میں غزن خاں نامی پٹھان، (۵۲۹) بے قاعدہ سوار فوج میں بھرتی ہوا۔ جنگ ختم ہونے پر چناؤ کیا گیا۔ جن سپاہیوں میں صلاحیت دیکھی گئی، اُن کو رکھا گیا۔ باقی کو خارج کر دیا گیا۔ غزن خان بھی وہ خوش نصیب غلام تھا جس کو فوجی آقا نے خدمت گذاری کا شرف بخشا۔ غزن خاں کی خوش نصیبی نے ایک قدم آگے بڑھایا، وہ سارجنٹ بنا کر کرنال بھیج دیا گیا۔

۱۸۵۸ء کی جنگ میں جو مجاہد شہید ہوئے تھے۔ اُن کے چہروں کا رنگ سانولا سیاہی مائل تھا اور وہ بنگالی معلوم ہوتے تھے۔ سرحدی جنگ میں ایسے مجاہدین کی شہادت انگریزی افسروں کے لیے معمہ بن گئی۔ مگر اس وقت سراغ لگانا مشکل تھا۔

۱۸۶۳ء میں غزن خاں ایک روز علی الصبح گشت پر تھا کہ اُس نے چار اجنبیوں کو سڑک پر جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ بقول ہنٹر:

''اُن (اجنبیوں) کے پست قد، میلے کچیلے چہرے اور چھوٹی چھوٹی داڑھیوں سے غزن خاں کو وہ بنگالی غدار یاد آ گئے جو اُس نے ۱۸۵۸ء کی جنگ میں مقتولین کے درمیان دیکھے تھے، اُس نے اُن سے باتیں شروع کر دیں، اور رفتہ رفتہ اُن کے رازوں کو معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ آخر کار

اُسے معلوم ہوا کہ وہ ملکا کے بنگالی سفیر ہیں اور اپنے وطن واپس جا رہے ہیں۔ تا کہ وہاں پہنچ کر آدمی اور روپیہ مہیا کرنے کا انتظام کریں غزن خاں نے ان کو گرفتار کر لیا۔ ان غریب الوطن بنگالیوں نے رہائی کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہے۔ اُنہوں نے رشوت کا لالچ بھی دیا، اور یہاں تک کہہ دیا کہ منہ مانگی رشوت وہ یہیں تھانیسر میں منشی محمد جعفر صاحب کے یہاں سے دلوا دیں گے مگر غزن خاں کا سخت دل نہیں پسیجا۔ اور اُس نے اُن کو لے جا کر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیا۔ مجسٹریٹ نے ان غریب الوطن مسافروں کو سزا دینے کی کوئی قانونی وجہ نہیں پائی۔ لہٰذا اُن کو رہا کر دیا۔ غزن خاں کو بہت خفت ہوئی۔ اس کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ اس کی بات جھٹلا دی گئی۔ اس وفادار کو یہ بھی خدشہ تھا کہ ان مجاہدین کی طرف سے اس کے سفید فام آقاؤں کی سلطنت پر عنقریب کوئی مصیبت نازل ہونے والی ہے۔ بلا کسی رخصت کے وہ ڈیوٹی سے غیر حاضر نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس نے اپنے لڑکے کو وطن سے بلایا۔ اور یہ تمام قصہ اُس کے سامنے رکھ کر فرمائش کی کہ وہ مجاہدین کے کیمپ میں پہنچ کر سراغ لگائے۔ لڑکے نے باپ کے حکم کی تعمیل بڑی جوانمردی سے کی۔ وہ راستے کی تمام صعوبتوں اور تمام جانی اور مالی خطرات کو جھیلتا ہوا مجاہدین کے ہیڈ کوارٹر "ملکا" میں پہنچا اور مجاہدین کے لشکر میں بھرتی ہو گیا۔ ستھانہ پر حملہ کیا تو وہ اُن کے ساتھ تھا۔ وہاں سے خفیہ طور پر فرار ہو کر اپنے باپ کے پاس پہنچا اور بہت سے راز جو سینے میں چھپا کر لایا تھا، باپ کے سامنے کھول کر رکھ دیے۔ (۵۵۰)

غزن خاں نے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے حکام تک رسائی حاصل کر کے یہ تحفہ اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ انگریزی سرکار کو یہ خزانہ ہاتھ لگا تو اُس نے دل کھول کر اُس سے کام لیا۔ اصل مجرموں تک پہنچنے کے لیے اب بھی وعدہ معاف گواہوں کی ضرورت تھی۔ البتہ پولیس کی بے پناہ دست درازیوں نے ایسے سنگریزے ضرور فراہم کر لیے، جن کو گھڑ رگڑ کر کسوٹی کے کام میں لایا جا سکے۔

گرفتاریوں کی بھرمار

دست درازی پولیس کی داستان تو بہت طویل ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے اور پولیس کی سو سالہ تاریخ کی یکسانیت سے شمالی ہند کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے خوف و ہراس کا اندازہ کر لیجیے۔ مولانا محمد جعفر صاحب فرماتے ہیں:

یہ ایسا وقت تھا کہ اگر کوئی شخص ہمارے واسطے ذرا بھی کلمۂ خیر کہتا تو قید ہو جاتا تھا۔ بیسیوں آدمی ہمارے شہر کے فقط اسی قسم کے قصوروں میں قید ہو گئے تھے کہ اُن کے پاس میرا کوئی سامان نکل آیا۔ یا میرے مکانات کی ضبطی اور نیلام کے بعد میرے بال بچوں کو کسی نے اپنے گھر میں رہنے کو جگہ

دے دی۔ (۵۵۱)

پشاور سے لے کر مشرقی و شمالی کنارہ بنگال تک شاید کوئی مالدار مسلمان یا مولوی و نمازی باقی رہا ہو جس کو ایک دفعہ پولیس نے پکڑ کر اس کی وسعت کے مطابق اپنی مٹھی گرم نہ کی ہو۔ (۵۵۲)

......ہم نے دیکھا کہ بڑے بڑے صاحب لوگوں نے قانون و آئین طاق نسیاں پر رکھ دیا۔ (۵۵۳)

آخر ۱۸۶۳ء (یعنی دسمبر ۱۸۶۳ء) سے دس برس تک ہندوستان کے مسلمانوں پر قیامت برپا رہی۔ صدہا مسلمان مارے خوف کے گھر بار چھوڑ کر عرب وغیرہ ملکوں میں جا بسے۔ خود غرضوں اور خوشامدیوں اور ہمارے دشمنوں نے خوب دل کے چاؤ نکالے۔ دس برس تک اخباروں میں سوائے اس قصے اور بحث کے کوئی دوسری بات کم ہوتی تھی۔ ایک محکمہ مع گواہ شاہدوں کے اس دار و گیر کے واسطے برسوں تیار رہا۔ جس کو چاہا پکڑ لیا، اور جو چاہا رشوت لے لی۔ اور جس نے نہ دی، اُس کو معمولی گواہوں سے گواہی دلوا کر دائم الحبس کر دیا۔ (۵۵۴)

جب ان لوگوں (مولانا عبداللہ صاحب اور کے اُن مجاہد رفقاء) کی امداد و اعانت کے جرم میں مولانا یحییٰ علی وغیرہ گرفتار ہوئے تھے اُس وقت سرکاری پولیس نے صدہا آدمیوں کو از پشاور تا کلکتہ گرفتار کیا تھا۔ (۵۵۵)

ہنٹر صاحب کا قلم بھی غیر شعوری طور پر دس سال تک بے تحاشا گرفتاریوں اور پولیس کی چیرہ دستیوں کی تصدیق کر دیتا ہے۔ آپ نے اپنی کتاب ۱۸۷۱ء میں لکھی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

گذشتہ سات سال کے دوران میں ان غداروں کو یکے بعد دیگرے مجرم ثابت کر کے عمر قید عبور دریائے شور کی سزا دی گئی ہے۔ فی الحقیقت سرحد کی ہر ایک جنگ کے ساتھ ساتھ ہماری اپنی حدود میں بھی ایک سیاسی مقدمہ چلایا گیا۔ اس وقت بھی قیدیوں کی بہت بڑی تعداد جو دور دراز کے مختلف ضلعوں سے جمع کی گئی ہے۔ اپنے جرموں کی سزا بھگت رہی ہے۔ یا اپنے مقدمے کے شروع ہونے کے انتظار میں ہے۔ (۵۵۶)

ہنٹر صاحب کی اس تصنیف کے سال تک سات سال ہوئے۔ منشی محمد جعفر صاحب کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی تین سال تک گرفتاریوں کا یہ چکر چلتا رہا۔ مولانا محمد جعفر صاحب کا ارشاد ہے:

۱۸۷۴ء کے آخر تک پٹنہ اور بنگال میں سلسلۂ گرفتاری بے گناہوں کا جاری رکھا۔ (۵۵۷)

ضبطی جائداد

یہ گرفتاریوں کا سلسلہ تھا۔ جائدادوں کے سلسلہ میں مشہور بنگالی قانون دان اور انگریزی حکومت کے خاص ذمہ دار سر عبدالرحیم صاحب مرحوم سابق اسپیکر مرکزی اسمبلی کے خطبہ صدارت کا ایک فقرہ ملاحظہ فرمایئے۔

''۱۸۷۰ء میں حکومت نے وہابی تحریک کے سبب سے جو وہم وگمان پر مبنی تھی۔ بنگال کے مسلمان جاگیرداروں اور زمینداروں کی تمام املاک جو رقبہ میں پورے صوبہ بنگال کی چوتھائی تھی، ضبط کرلی جس سے ہزاروں مسلمان خاندان برباد اور پریشان ہو گئے۔ (۵۵۸)

سازش کے چاروں مقدموں میں عبور دریائے شور کی سزا کے ساتھ جائدادیں بھی ضبط کی گئیں۔ جن کی قیمت اس زمانہ میں بھی کئی کروڑ روپیہ تھی۔ صرف امیر الدین صاحب (پٹنہ) کی ضبط شدہ جائداد کی قیمت تقریباً ایک کروڑ روپیہ تھی۔''

عجلت

پھر ضبطی جائداد میں اس قدر عجلت سے کام لیا جاتا تھا کہ مولانا محمد جعفر صاحب فرماتے ہیں:

''انگریزوں نے قبل از صدور حکم اخیر مقدمہ کے میری کل جائداد پہلے ہی دن قرق کرلی تھی۔ دوسرے دن خود میرے عزیزوں کو کوئی اپنے برآمدہ میں بھی کھڑا نہیں ہونے دیتا تھا۔''

اس عجلت پسندی کے ساتھ جابرانہ تغلب اور غاصبانہ چیرہ دستی بھی ملاحظہ فرمایئے۔ مولانا موصوف فرماتے ہیں:

میرے وارثوں کو اس قدر موقع بھی نہ ملا کہ کوئی جائداد قبل از قرقی علیحدہ کرلیں اور بعد صدور حکم ضبطی جب میرے بھائی نے جو نصف کا مالک تھا، اپنے حصہ کا دعویٰ کیا۔ تو اس کو بھی فقط ایک کوٹھری دے کر کل جائداد منقولہ وغیر منقولہ ضبط کر کے نیلام کردی۔ میں نے بنظر دور اندیشی اپنے حصہ کی کل جائداد اپنی بیوی کے مہر میں مکفول کردی تھی ..... مگر مارے غصہ اور تعصب کے کسی نے بھی نہ سنا، اور میری بیوی کو مع دو نابالغ شیر خوار بچوں کے ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیا۔ (۵۵۹)

سرکاری گواہ کس طرح بنایا جاتا تھا

یہ طولانی قصہ بہت دل خراش ہے۔ نہ قلم میں لکھنے کی طاقت اور نہ سننے والوں کو سننے کا یارا۔ طبیعت پر جبر کر کے کچھ سن لیجیے مولانا محمد جعفر سے بڑھ کر سچا راوی کون ہو سکتا ہے جو دوسروں سے نقل نہیں کرتے بلکہ اپنا مشاہدہ پیش کرتے ہیں۔ اُن کا بیان ہے:

''مار پیٹ کی تو یہ حالت تھی کہ عبس نام ایک لڑکا جو مدت تک میرے گھر میں رہ کر پرورش پاتا تھا، جب مجسٹریٹی میں گواہی دیتے وقت مجھ کو دیکھ کر مارے محبت کے جھوٹا اور آموختہ (سکھایا ہوا) بیان میرے اوپر کرنے سے ہچکچایا، تو اسی روز رات کو ایسی سخت سزا دی گئی وہ بچہ اسی صدمہ سے قبل از پیشی مقدمہ سشن مرگیا۔'' (۵۶۰)

''دوسرے دن فجر کے وقت پارسن صاحب سپرنٹنڈنٹ میجر ونکفیلی صاحب ڈی، آئی، جی پولیس اور کپتان نائی صاحب ڈپٹی کمشنر انبالہ مثل یاجوج ماجوج میری کوٹھڑی میں آئے اور مجھ سے کہا کہ تم

اس مقدمہ کا سب حال بتادو، تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ میں نے کہا میں کچھ نہیں جانتا۔ اُس وقت پارسن صاحب نے مجھ کو پہلے بہت دھمکایا اور پھر مارنا شروع کردیا۔ جب میری مار حد کو پہنچی اور گر پڑا۔ تو ٹائی صاحب اور وتفیل صاحب کوٹھڑی سے باہر کھڑے ہوگئے۔ اور جب اس قدر مار پر بھی میں نے کچھ نہ بتایا۔ تو وہ سب کے سب اس دن مایوس ہوکر چلے گئے۔ میں نے جب یہ کیفیت ظلم وتعدی کی دیکھی، تو مجھ کو یقین ہوگیا کہ اب مجھ کو یہ لوگ زندہ نہ چھوڑیں گے۔ میرے ذمے کچھ رمضان کے روزے باقی تھے۔ دوسرے دن میں نے اُن کی قضا رکھنی شروع کردی۔ دوسرے دن جب میں روزے سے تھا، علی الصباح پارسن صاحب پھر آیا اور وہی کارروائی شروع کی۔ مگر تھوڑی زدوکوب کے بعد مجھ کو اپنی بگھی میں بٹھلا کر ٹائی صاحب ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ پر لے گیا۔ جہاں پر وہ دونوں یعنی ٹائی صاحب اور میجر وتفیل صاحب بھی موجود تھے۔ اُس دن اُنہوں نے میری چاپلوسی کی اور کہا کہ ہم تحریری عہد کرتے ہیں، کہ اگر تم دوسرے شرکاء اور معاونین جہاد کو بتلا دو، تو تم کو سرکاری گواہ بنا کر رہا کردینے کے علاوہ بڑا عہدہ بھی دیں گے، اور بصورت نہ بتلانے کے تم کو پھانسی ہوگی۔ میں نے اس چاپلوسی پر بھی انکار کیا۔ پھر پارسن صاحب ان دونوں سے انگریزی میں باتیں کرکے مجھ کو الگ کمرے میں لے گیا جہاں سے جاکر پھر مارنا شروع کیا۔ آٹھ بجے فجر سے آٹھ بجے رات تک مجھ پر اس قدر مار پیٹ ہوئی کہ شاید کسی پر ہوئی ہو۔ لیکن میں بفضل الٰہی سب سہ گیا، مگر اپنے رب سے ہر دم دعا کرتا رہا کہ اے رب! یہی وقت امتحان کا ہے۔ مجھے ثابت قدم رکھیو۔ جب وہ ہر طرح مایوس ہوگئے تو لاچار آٹھ بجے رات کے مجھ کو جیل خانہ واپس بھیج دیا۔ میں تمام دن روزہ سے تھا۔ بنگلہ سے باہر نکل کر درخت کے پتوں سے روزہ افطار کرلیا۔ (۵۶۱)

ظاہر ہے یہ استقلال واستقامت ہر ایک کو میسر نہ تھا۔ چنانچہ مولانا موصوف کا بیان ہے:

"اسی کارروائی سے پچاس ساٹھ آدمی..... ہمارے اوپر گواہ بنائے گئے۔ لیکن اکثر گواہی دیتے وقت بھی ہماری طرف دیکھ کر زار زار روتے جاتے تھے، مگر بے بس۔ اگر گواہی نہ دیویں تو قطع نظر مار پیٹ کے پھانسی کا سامنا تھا۔ (۵۶۲)

فراہمیٔ ثبوت

ثبوت کے ایک گواہ وہ تھے جن کو مار پیٹ کر اور پھانسی کی دھمکی دے کر گواہ بنایا گیا۔ ان میں بہت سے معزز خاندانوں کے علم دوست شرفاء بھی تھے جن کے حاشیہ خیال میں بھی اس قسم کی توہین وتذلیل کا تصور نہیں آیا ہوگا، وحشیانہ سزاؤں کا جب بھیانک منظر اُن کے سامنے آیا، تو جو کچھ سنایا گیا تھا اُس کو بیان کرنے کے لیے آمادہ ہوگئے۔ مگر برطانوی سرکار کے حق میں ناانصافی ہوگی، اگر اُس کی فیاضیوں کا پہلو بھی پیش نہ کیا جائے۔ واقعہ یہ

ہے کہ توہین و تذلیل کی وحشیانہ حرکتوں کے ساتھ سنہری روپہلی تمناؤں کا سبز باغ بھی جعلی گواہوں کے سامنے پیش کیا جاتا رہا۔

چنانچہ بقول مولانا محمد جعفر صاحب:

''سرکاری گواہوں کے عمدہ خوراک و لباس کا انتظام پولیس کی طرف سے ہوتا تھا۔ ان بے جا کارروائیوں میں حکومت کا لاکھوں روپیہ صرف ہوگیا۔ (۵۶۳)

''فلاں فلاں...... ہندو مسلمان جو نہایت ادنیٰ عہدے پر تھے، ڈپٹی کلکٹر ہوگئے۔'' (۵۶۴)

درحقیقت امتحان کا موقع وہی ہے کہ ایک طرف راحت و آرام اور ہری بھری تمناؤں کے سبز باغ ہوں، اور دوسری طرف دردناک سزاؤں کی وادی پرخار اس صورت میں لالہ زار نعم کی عیش و عشرت چھوڑ کر وادی پرخار کی جادہ نوردی اختیار کی جائے۔

پیٹنٹ گواہ

بہرحال جس طرح بھی سرکاری گواہ بنائے گئے، صرف ایک مقدمہ میں اُن کو استعمال نہیں کیا گیا۔ بلکہ جب کبھی ضرورت پیش آئی، انہیں کو پیش کر دیا گیا، تاکہ سفید فام آقاؤں کا منشاء پورا ہو جائے، اور پولیس کے سیاہ فام نمک خواروں کو زیادہ تگ و دو نہ کرنی پڑے۔

مولانا محمد جعفر صاحب شاہد ہیں:

''اس کے بعد (یعنی ان کے مقدمہ میں شہادت گذر جانے کے بعد) ۱۸۷۱ء تک جو مقدمات گرفتاری وہابیان مثل مقدمہ امیر خاں صاحب سوداگر چرم و مولوی مبارک علی صاحب و مولوی امیر الدین صاحب ساکن پٹنہ ملک بنگال اور ابراہیم منڈل ساکن اسلام پور ہوتے رہے تو یہی معمولی گواہ یا گویندہ جھوٹی گواہی کے لیے بلائے جاتے تھے۔ اور میں نے خود اُن میں سے ایک گواہ کی زبانی سنا ہے کہ جب کبھی خلاف گواہی دینے سے ہم نے انکار بھی کیا تو ہم کو یہ کہا گیا، کہ تم لوگ شرطیہ طور پر فقط اسی گواہی دینے کے واسطے بطور گویندہ رہا کیے گئے ہو۔ اگر تم گواہی نہ دو گے تو پھر تم کو وائم الحبس کر کے پہلے ہی وارنٹ پر کالے پانی بھیج دیا جائے گا۔ (۵۶۵)

مقدمات سازش، ملزمین اور سزائیں (۵۶۶)

پہلا مقدمہ سازش انبالہ ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۴ء

اس مقدمہ میں گیارہ ملزم تھے۔ نام اور اُن کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

(۱) مولانا یحییٰ علی جعفری۔ صادق پوری۔ عمر ۴۲ سال

انہیں سرغنہ کے لقب سے یاد کیا گیا، اور بجا طور پر ناظرین اوراق ان سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔

(۲) مولانا عبدالرحیم صادق پوری۔ عمر ۲۸ سال

تقریباً سولہ سال جزائر انڈمان میں رہ کر ۱۳۰۰ھ، ۱۸۸۳ء میں رہا ہوئے۔ الدر المنثور آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ آپ کا مفصل تذکرہ دوسری جگہ گذر گیا ہے۔

(۳) مولانا محمد جعفر تھانیسری۔ عمر ۲۸ سال۔ ساکن تھانیسری ضلع انبالہ۔

تمام اسیران بالا میں سب سے زیادہ ہوشیار اور معاملہ فہم تھے۔ ایک عرضی نویس کی حیثیت سے زندگی شروع کی، اور اپنے فن میں یہاں تک ترقی کی کہ خود اپنی تصنیف میں نیرنگی قسمت اور بوقلمونی روزگار کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"۱۲ دسمبر ۱۸۶۳ء کو اپنی خانہ تلاشی سے تھوڑی دیر پہلے تک میں ہزاروں روپیہ کی جائداد منقولہ وغیر منقولہ پر قابض تھا۔ بیسیوں آدمی میری رعیت رہتے تھے۔ ایسے بڑے شہر کا نمبردار گھوڑے گاڑیوں میں سوار رہوا پھرتا تھا۔ ہر کام کے لیے میرے گھر میں نوکر چاکر تھے۔[۵۶۷]

تحریک کے ذمہ دار ارکان میں آپ شمار ہوتے تھے۔ روپیہ اور رضا کار پہنچانے کے سلسلہ میں آپ کی ذمہ داری بہت وسیع تھی۔ آپ نے ۱۸۵۷ء کے جہاد میں بھی شرکت کی، اور یہ تمام خفیہ سازشیں عرائض نویسی کے پردہ میں پوشیدہ رہیں۔ آپ نے اس پیشہ سے اس انقلابی سازش کے راستہ میں بہت فائدہ اٹھایا۔ آپ نے پورے مقدمہ کے دوران میں کوئی وکیل نہیں مقرر کیا، اور بڑی قابلیت کے ساتھ گواہوں پر جرح کرتے رہے۔ مولانا عبدالرحیم صاحب کے ساتھ رہا ہوئے اور پھر چند تصانیف قلم بند فرما کر اپنا اور اپنی جماعت کا تعارف کرایا۔ آپ کو عام طور پر منشی لکھا جاتا ہے۔

(۴) میاں عبدالغفار صاحب۔ ساکن پٹنہ

"راونشا" نے ان کا نام عبدالغفور ولد منگو۔ قوم کوزی عمر ۴۵ سال ملازم ملزم نمبر ۸ (یعنی مولانا عبدالرحیم) لکھا ہے۔ وہ کیا جانے کہ روساء صادق پور اس ملازم کا آقا سے بڑھ کر احترام کیا کرتے تھے۔ یہ بزرگ امی محض تھے۔ مولانا ولایت علی صاحب کے خادمِ خاص تھے۔ مولانا فرحت حسین صاحب اور مولانا عنایت علی صاحب سے تربیت پائی۔ مولانا عبدالرحیم صاحب کے ساتھ انڈمان سے واپس ہوئے۔ تقریباً ۱۳۳۳ھ میں وفات پائی۔ صادق پور کے علماء متاخرین ان کو "سیدی میاں عبدالغفار" کہا کرتے تھے۔[۵۶۸]

(۵) قاضی میاں جان۔ ساکن کمر کلی۔ ضلع پٹنہ۔ بنگال۔ عمر ۶۰ سال۔ انبالہ جیل میں وفات پائی۔ انبالہ کے جج کے بیان کے مطابق مراسلات کا سب سے زیادہ باغیانہ حصہ انہیں کے گھر پایا گیا۔

یہ پانچ حضرات جماعت کے رکن اور تحریک کے ذمہ دار تھے۔ یہ جس طرح جہادِ آزادی میں پیش پیش تھے، مصائب شکست برداشت کرنے میں بھی جواں مرد ثابت ہوئے۔ ان کے صبر و استقلال سے دورِ صحابہ کی یاد

تازہ ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ اس مقدمہ میں چھ ملزم اور تھے۔ یہ کاروباری لوگ تھے یا ملازمت پیشہ۔ یہ تحریک کے ذمہ دار نہیں تھے۔ البتہ تحریک کا کوئی کام ان کے ذمہ کر دیا جاتا تھا۔ اسی جرم میں یہ گرفتار کیے گئے۔ یہ لوگ ایک عرصہ تک شریک مصائب رہے کسی نے سات سال اور کسی نے دس سال انہیں مصیبتوں میں گذار دیئے۔ پھر کسی قدر ان کے قدموں میں لغزش پیدا ہوئی، اور زیادہ تر حکومت نے ان کی مہمانی کو غیر ضروری سمجھا۔ لہٰذا رہا کر دیئے گئے۔ ان میں سب سے پہلے:

(۶) محمد شفیع انبالوی۔ فوجی ٹھیکیدار ہیں۔ ان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ لاکھوں روپے کے کاروبار کے مالک تھے۔ ان کا تعلق تحریک سے صرف اتنا تھا کہ اُن کے فرم کے ذریعے سرحد پار روپیہ بھیج دیا جاتا تھا۔ گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا۔ پوری ہمت اور حوصلہ سے مقدمہ لڑایا۔ تمام جائداد ضبط اور پھانسی کی سزا تجویز ہوئی۔ اس وقت قدم ڈگمگائے۔ سرکاری ایجنٹوں نے کمزوری سے فائدہ اُٹھایا۔ اُن کو سرکاری گواہ بنالیا۔ پھانسی کی سزا حبس دوام بعبور دریائے شور سے بدل گئی۔ مگر یہ سرکاری گواہ پہلے بنائے جاچکے تھے۔ سرکاری گواہ بننے کے بعد بھی رہائی ایک سال بعد ہوئی۔ ضبط شدہ جائداد پھر بھی واپس نہیں ہوئی۔ یہ قربانی کیا کم ہے کہ کروڑپتی دولت مند نانِ شبینہ کو محتاج ہو گیا۔ منشی محمد جعفر صاحب کو محمد شفیع پر نہیں بلکہ حکومت کی عیاری پر افسوس اور غصہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

> ''بملاحظہ مثل مقدمہ اور دلائل ثبوت جرم نسبت محمد شفیع واضح ہوگا کہ اول کس غیظ و غضب سے محمد شفیع کو پھانسی کا حکم دے کر پچاس لاکھ کی جائداد ضبط کی تھی۔ پھر صرف ایک برس بعد گواہی کا حیلہ کر کے اس کو رہا کر دیا۔ تاکہ جائداد منضبط واپس نہ دینی پڑے۔ اگر وہ بے چارہ جیسا کہ ایک برس بعد کی رہائی سے ثابت ہے، بے قصور تھا۔ تو پہلے اس شدومد سے اس کی پچاس لاکھ کی جائداد ضبط کر کے اس کو پھانسی کا حکم کیوں دیا گیا تھا۔ اور اگر در اصل وہ بھاری قصور وار تھا اور صاحب سیشن جج کے سب دلائل مندرجہ فیصلہ صحیح ہیں تو ایک برس بعد کس واسطے اس کی رہائی کر دی۔ (۵۷۹)

منشی صاحب کا منشا یہ ہے کہ محمد شفیع کا جرم قابل سزا تھا ہی نہیں۔ اس کو مقدمہ میں صرف اس لیے پھانسا گیا کہ پچاس لاکھ کی جائداد ہاتھ لگے اور کم از کم اس مقدمہ کا خرچ اس کی جائداد سے نکل آئے۔

(۷) عبدالکریم انبالوی عمر ۳۵ سال۔ یہ محمد شفیع کا مختار تھا۔ تین سال بعد رہا کیا گیا۔

(۸) عبدالغفور ولد شاہ علی خاں۔ ساکن ضلع شاہ آباد۔ صوبہ بہار۔ عمر ۲۵ سال ملزم نمبر ۱۱ کا ملازم تھا۔ دس سال جیل میں رکھنے کے بعد رہا کیا گیا۔

(۹) حسینی ولد محمد بخش عمر ۲۵ سال۔

جماعت کے کاموں میں منشی محمد جعفر صاحب کا معاون رہا کرتا تھا۔ سات سال بعد رہا کیا گیا۔

(۱۰) حسینی ولد میگو۔ ساکن پٹنہ۔ عمر ۳۵ سال

یہ بھی الٰہی بخش ملزم نمبر ۱۱ کا ملازم تھا۔ دس سال سزا بھگتنے کے بعد رہائی نصیب ہوئی۔

(۱۱) الٰہی بخش ولد کریم بخش عمر ۴۲ سال

مولانا احمد اللہ صاحب صادق پوری کی جائداد کا مختار عام تھا۔ خود کاروباری آدمی تھا۔ اس سلسلہ میں اس کے ذریعہ روپیہ بھیج دیا جاتا تھا۔ یہ وعدہ معاف گواہ بنایا گیا۔ مگر پانچ سال جیل کی ہوا پھر بھی کھلائی گئی۔

دوسرا مقدمہ سازش پٹنہ ۱۸۶۵ء

اس مقدمہ کے ملزم مولانا احمد اللہ صاحب صادق پوری تھے۔ آپ مولانا یحییٰ علی صاحب کے بڑے بھائی تھے۔ مولانا یحییٰ علی صاحب کی گرفتاری ۱۸۶۴ء کے بعد آپ مرکز صادق پور کے نظم وضبط کے ذمہ دار قرار دیئے گئے، اور صرف ایک سال گذرنے پایا تھا کہ آپ گرفتار کر لیے گئے۔ آپ کی ذاتی قابلیت، عظمت وشہرت، اور سرکاری حلقوں میں آپ کے اثر ورسوخ کا تذکرہ "ذمہ دار حضرت" کے زیر عنوان پہلے آچکا ہے۔ اس مقدمہ کے نتیجہ میں مولانا احمد اللہ صاحب کو پہلے پھانسی اور پھر اپیل کے بعد حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔ تمام جائداد ضبط کی گئی، اور صرف قافلہ والی حویلی ہی نہیں بلکہ احاطۂ صادق پور کے تمام مکانات مسمار کر دیئے گئے۔ قبرستان کی قبریں تک اکھاڑ کر پھینک دی گئیں۔ ایک نہایت قیمتی اور نادر کتب خانہ تھا، وہ ضبط کر کے برباد کر دیا گیا۔ یہ ضبط شدہ اور مسمار کردہ احاطہ میونسپلٹی کو عطا ہوا۔ جہاں پٹنہ سٹی میونسپلٹی کا دفتر تعمیر کیا گیا اور باہر چھوٹا سا بازار بنایا گیا۔

اور خاص بات یہ کہ تمام خانہ ویرانی ٹھیک عید کی صبح کو شروع ہوئی۔ آزمائش بر آزمائش۔ کریلا اور نیم چڑھا۔

مولانا احمد اللہ صاحب کے بڑے صاحبزادے حکیم عبدالحمید (۵۷۰) صاحب عظیم آبادی مطب کیا کرتے تھے۔ اُن کا دواخانہ بھی ضبط کر لیا گیا۔

آپ کی مشہور نظم "مثنوی شہر آشوب" اس سانحہ کی منظوم تاریخ ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔ اپنے والد ماجد مولانا احمد اللہ صاحب کی گرفتاری اور ضبطی جائداد کے متعلق فرماتے ہیں:

کنم الحال مختصر مرقوم — ماجرائے عیال آن (۵۷۱) مظلوم

چون شب عیدرا سحر کردند — ہمہ را از مکاں (۵۷۲) بدر کردند

ضبط وتاراج جملہ مال ومتاع — نقد وجنس وہمہ اثاث وضیاع

بہر ما بود آہ جرمے شنیع — بروں سوزنے زجملہ رخت

احدے را نہ بد چہ مرد وچہ زن — حکم ہمراہ بردن سوزن

ہمہ سرگشتہ بے سروسامان — نہ غم جیب نہ غم دامان

مکنا نہ تنہا کہ ہر ہم تنہا — بچگان وزنان وشیونہا

مایۂ عیش ساز ماتم شد عید ماقدہ محرم شد

کتب خانہ کی ضبطی پر حکیم صاحب کے تاثرات ملاحظہ فرمائیے۔

کتب منت مسلمانان رفت دردست حرف ناخوانان
واند دہر کہ باتمیز بود مالِ یغما کراعزیز بود
راست گوینده ایں مثل گفت است دل بے رحم و دولت مفت است

دواخانہ کی ضبطی کا مرثیہ ملاحظہ ہو:

نام ونشان قوت میرس صورت قوت لایموت میرس
حال قوت ونشان ومنزل من عالم الغیب واند ودل من
یک دواخانہ وجہ قوتم بود مایۂ قوت لایموتم بود
آمدآں خانہ ہم بعرض ضبط شد ہمہ نظم ورزیم بے ربط

ان سب چوروں کی قلبی حالت کیا تھی۔ اس کا اندازہ لگانے کے لیے مثنوی کے یہ تین شعر کافی ہیں:

صرصر فتنہ چوں وزیدے تند حسب حال ایں دوبیت دل میخواند
دل ظالم بقصد کشتن ماست دل مظلوم مابسوئے خداست
اودریں فکر تابما چہ کند مادریں فکرتا خدا چہ کند (۵۷۳)

مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری کا ذکر خیر مقدمۂ سازش انبالہ میں گذر چکا ہے۔ جب بیس سال بعد ۱۳۰۰ھ میں رہائی پاکر واپس ہوئے تو محلہ صادق پور کی تباہی اور قبرستان کی بربادی دیکھ کر آپ سے نہ رہا گیا۔ آپ کی تصنیف الدرالمنثور کے مندرجہ ذیل اقتباسات خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔

میں سپرنٹنڈنٹ صاحب کے بنگلہ سے رخصت ہوکر محلہ تمو پیہ (۵۷۴) پہنچا جہاں میرے اہل وعیال مقیم تھے۔ اس کی صبح ہو کے صادق پور گیا تو وہاں دیکھا کہ ہم لوگوں کے مکانات کل منہدم کر کے کف دست میدان بنادیا گیا ہے اور اس پر بازار اور میونسپلٹی کے مکانات بنادیئے گئے ہیں۔ میں نے چاہا کہ اپنے خاندانی مقبرہ کو جہاں چودہ پشت سے ہمارے آباؤ اجداد دفن ہوتے چلے آئے تھے، جاکر دیکھوں اور خصوصاً اپنے والدین ماجدین غفراللہ لہما کے مزار کی زیارت کروں اور اس پر دعاء مغفرت اور فاتحہ پڑھوں۔ مگر ہر چند کہ کوشش کی، پتہ نہ چلا۔ بعد تجسس وتفحص بسیار وغور وفکر کے قرینہ سے معلوم ہوا کہ حضرت والدین ماجدین کی قبریں کھود کر اس پر بنائے عمارت میونسپلٹی بنادی گئی ہے ....

اے حضرات ناظرین! اس وقت اس حرکت کا جو ہمارے اموات کے ساتھ کی گئی، جو صدمہ دل پر گذرا، وہ بیرون از حیطۂ تحریر وتقریر ہے۔ اس وقت تک اس کی یاد سے بدن تک کے

رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے جرم میں ہمارے اموات اور آباء واجداد کی قبریں کیونکر کھودی گئیں اور وہ مقبرہ کیوں معرض ضبطی میں آیا۔ ہماری عادل گورنمنٹ نے کیوں یہ کام کیا۔ بہر کیف میں نے اُسی جگہ کھڑے ہوکر جہاں اُن کی قبر میرے خیال میں آئی۔ دعاء مغفرت کر لی، اور آج تک بھی ایسا ہی کرلیا کرتا ہوں۔"(۵۷۵)

تیسرا مقدمۂ سازش مالدہ ۱۸۷۰ء

اس کی مختصر روئداد تو یہ ہے، کہ مولوی امیرالدین صاحب پر یہ مقدمہ چلایا گیا۔ ہائی کورٹ سے ضبطی جائداد اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ مولوی امیرالدین صاحب مارچ ۱۸۷۲ء میں انڈمان پہنچے۔ دس گیارہ سال سختی اور جلاوطنی کے گذار کر ۱۸۸۳ء، ۱۳۰۰ھ میں رہا ہوئے۔

مولانا امیرالدین صاحب کون تھے اور اُن کی باغیانہ سرگرمیاں کیا تھیں؟ جنرل رائل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی جلد ۱۴ص ۲۷۰ میں اختصار کے ساتھ اور ہنٹر صاحب نے اپنی کتاب میں تفصیل سے مولانا امیرالدین صاحب کا تعارف اور اُن کی سرگرمیاں بیان کی ہیں۔ ہم ہنٹر صاحب کے بیان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

مولانا امیرالدین (۵۷۶) صاحب ضلع مالدہ کے باشندہ تھے۔ اُن کے والد رفیق منڈل، مولانا عبدالرحمن صاحب کے معتقد اور اُن کی تحریک کے خاص رکن تھے۔

مولانا عبدالرحمن صاحب لکھنؤ کے باشندے اور مولانا ولایت علی صاحب کے خلیفہ تھے۔ تقریباً ۱۸۴۰ء میں جب مولانا ولایت علی صاحب کی زیر قیادت پورے ہندوستان بالخصوص بہار و بنگال میں بغاوت کے لیے زمین ہموار کی جارہی تھی، مولانا عبدالرحمن صاحب ضلع مالدہ کے ایک گاؤں میں پہنچے۔ ایک مدرسہ میں تعلیمی خدمت انجام دینے لگے اور اجنبیت ختم کرنے کے لیے وہیں ایک خاتون سے عقد کرلیا۔ آپ کی جدوجہد بارآور ہوئی۔ زمینداروں کے نوجوان لڑکے آپ کے گرد جمع ہوگئے۔ رفیق صاحب بھی اُنہیں میں سے تھے، اور چونکہ اپنے علاقہ کے چوہدری تھے، اس لیے ان کو "منڈل" کہا جاتا تھا۔ (منڈل اس نواح میں چوہدری یا پٹیل کو کہتے ہیں)۔

منڈل صاحب نے اپنے اُستاد سے بھی بڑھ کر کام کیا اور اس تنظیم کو پورے ضلع بلکہ آس پاس کے دوسرے اضلاع میں پھیلا دیا اور جماعت کے نظام کے مطابق مجاہدین کی بھرتی کرنے لگے، اور مالیہ فراہم کرکے صادق پور کے مرکز میں بھیجنے لگے۔

۱۸۵۱ء میں سرحد پر کچھ مقابلہ ہوا۔ جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ اُس وقت مقامی حکام کی نظر رفیق صاحب کی سرگرمیوں پر پڑی۔ ان کو گرفتار کیا گیا۔ مگر پھر چھوڑ دیا گیا۔ اب رفیق صاحب کے صاحبزادے مولانا امیرالدین صاحب میدان میں آئے، اور ایسی سرگرمی سے کام کیا کہ تین ضلعے اُن کے چارج میں دے دیے گئے۔

دسمبر ۱۸۶۳ء میں مقدمہ سازش انبالہ دائر ہوا، اور داروگیر کی ایک لہر ایک سرے سے دوسرے سرے تک

پورے شمالی ہند میں پھیل گئی (جس کی تفصیل پہلے گذر چکی)۔ لیکن بقول ڈاکٹر ہنٹر ۱۸۶۴ء کا سیاسی مقدمہ غداروں کا جوش ٹھنڈا کرنے میں ایسا ہی ناکام ثابت ہوا جیسا کہ ۱۸۶۳ء کی تادیبی مہم۔ (۵۷۷)

اس اثناء میں مولانا امیرالدین صاحب کی سرگرمیوں کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ بقول ہنٹر صاحب مجاہدین کی سرحدی چوکی پر جو تعداد تھی اس میں دس فیصدی رنگروٹ (مجاہد) اسی شخص کے زیر اثر علاقوں سے آئے ہوئے تھے۔ (۵۷۸)

پھر اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ ۱۸۶۸ء میں ایک طرف سرحد پر میدان کارزار گرم تھا اور دوسری جانب مولانا امیرالدین صاحب کی سرگرمی کی حالت یہ تھی کہ خلیفہ کے لڑکے کو مدد کے لیے بلا بھیجا۔ (۵۷۹)

اس کے علاوہ چونکہ ان کا مرکز جنوبی بنگال سے شمال مغرب کو جانے والی سڑک پر واقع تھا، لہٰذا ہر بغاوت پھیلانے والے مبلغ کی قیام گاہ تھا۔ دونوں خلیفہ (مولانا ولایت علی صاحب و مولانا عنایت علی صاحب) اس کے یہاں قیام کر چکے تھے، اور باغی کیمپ کے موجودہ (۱۸۵۷ء کے) سرداروں میں سے بھی ایک شخص سرحد کو جاتے ہوئے یہاں قیام کر چکا ہے۔ (۵۸۰)

پہلے گذر چکا ہے کہ مولانا یحییٰ علی صاحب نے بنگال کی انقلابی پارٹی "فرائزی" کو اس تحریک میں شریک اور بقول ہنٹر مدغم کر لیا تھا۔ یہ جماعت اسی علاقہ میں تھی۔ جو مولانا امیرالدین صاحب کے چارج میں تھا۔

ہنٹر صاحب کا ارشاد ہے۔

"۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۸ء تک جمع شدہ سرمایہ اور آدمی حسب دستور سرحد جاتے رہے۔ چنانچہ اس سازش کو قابو میں لانے کے لیے ہمیں ایک علیحدہ محکمہ قائم کرنا پڑا۔ اس وقت وہابیوں کی دیکھ بھال اور ان کو اعتدال پر رکھنے کے لیے صرف ایک ہی صوبہ کا خرچ اس قدر بڑھ گیا تھا جتنا ایک انگریزی ضلع کا جس میں اسکاٹ لینڈ کے ایک تہائی انسان بستے ہیں۔ یہ شر انگیزی اس حد تک پھیل چکی ہے کہ ہمارے لیے اس بات کا معلوم کرنا بہت ہی مشکل ہو گیا ہے کہ اصلاح شروع کی جائے تو کہاں سے۔ ہر ایک ضلع کا مرکز ہزاروں خاندانوں میں بے اطمینانی پھیلاتا ہے، اور ان کے خلاف صرف وہی لوگ شہادت دے سکتے ہیں جو ان کے مرید ہوں، لیکن ان کا یہ حال ہے کہ اپنے سردار سے غداری کے بجائے موت کو ترجیح دیتے ہیں۔" (۵۸۱)

"۱۸۶۸ء میں پولیس کی تگ و دو اور سرحد پر فوجی چوکیوں کے باوجود ان مجاہدین کی سازشوں نے حکومت ہند کو ایک اور خونریز جنگ میں دھکیل دیا۔ جس میں ہمارا بہت سا روپیہ خرچ ہوا۔ اسی سال مالدہ کے مرکز نے بے خطر ہو کر پٹنہ کے خلیفہ کے لڑکے کو دعوت دی کہ وہ بنگال کے عین وسط میں پہنچ کر بغاوت کی تبلیغ کرے۔ روزمرہ کی عدالتی کارروائیاں اس بحران کو روکنے کے لیے بالکل بیکار ثابت ہوئیں، اور حکومت کو ان اختیارات خصوصی سے کام لینا پڑا جن کے استعمال کا ایسے موقع پر

اس کو اختیار دیا گیا ہے (یعنی ریگولیشن نمبر ۱۱، ۱۸۱۸ء نمبر ۱)" (۵۸۲)

ہنٹر صاحب کی برادری کو صرف اپنے اقتدار کی فکر ہی نہ تھی، بلکہ فکر یہ بھی تھی کہ انگلستان نے بہت بڑی بازی ہندوستان میں لگا رکھی ہے۔ جب سے یہ ملک زیرِ اقتدار آیا ہے، انگریزی سرمایہ دار کروڑوں پونڈ سالانہ ریلوں، نہروں اور دیگر منفعت بخش کاموں میں لگاتے ہیں۔ اگر ہماری حکومت میں عارضی طور پر بھی فرق آ گیا تو یہ ایک عظیم الشان مصیبت ہوگی۔ (۵۸۳)

مختصر یہ کہ:

"جب سرحد پر تباہ کن لڑائیاں اور ملک کے اندر عدالتی سزائیں اس قابل نہ ہوئیں کہ مجاہدین کا اتحاد توڑ سکیں۔ تب ۱۸۶۸ء میں گورنمنٹ نے فیصلہ کیا کہ مجرموں کو گرفتار کرنے کے لیے اپنے استحقاق گرفتاری کو سختی کے ساتھ استعمال کرے۔ (۵۸۴)

اس استحقاق کی بنا پر جن مشتبہ مسلمانوں کو نظر بند کر دیا گیا، اُن کی صحیح تعداد نہیں معلوم ہو سکی۔ یہ یقینی بات ہے کہ ان کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز (۵۸۵) ہوگی۔ ہمارے سامنے مقدمات سازش کی تفصیلات ہیں۔ اُن میں سے ایک یہی زیر بحث مقدمہ ہے۔ باقی دو مقدمے وہ ہیں جو راج شاہی اور پٹنہ میں چلائے گئے۔ ان کی تفصیلات آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیے۔

چوتھا مقدمہ سازش راج محل اکتوبر ۱۸۷۰ء

راج محل، صوبہ بہار بھاگل پور کمشنری کے اندر واقع ہے۔ یہ ایک پہاڑی علاقہ ہے۔ مالدہ ضلع کو بنگال میں ہے۔ لیکن دریا کی راہ سے راج محل، اور مالدہ بالکل ملے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے راج محل، مالدہ ضلع میں تھا۔ پھر مرشد آباد میں ضم کیا گیا۔ آج کل سنتھال پرگنہ کمشنری بھاگل پور میں شامل ہے۔

راج پور کے نواح میں ایک قصبہ اسلام پور ہے۔ وہیں ایک بزرگ "ابراہیم منڈل" تھے۔ (۵۸۶)

۱۸۷۰ء میں جب وہابی تحریک کے مرکزوں پر دھاوا (۵۸۷) بولا گیا تو ابراہیم منڈل اُن میں سے تھے جن کو خاص مقدمہ سازش کے لیے منتخب کیا گیا۔ چنانچہ مولانا امیر الدین صاحب کی طرح اُن پر بھی مقدمہ چلا۔ اور یہ بھی اُسی سزا سے بہرہ اندوز ہوئے جو مولانا امیر الدین صاحب کے لیے تجویز کی جا چکی تھی۔ یعنی حبس دوام بعبور دریائے شور۔

"اس جرم و سزا کے متعلق مولانا محمد جعفر صاحب تھانیسری کو تو یہ افسوس ہے کہ:

"ایک بوڑھے اور ضعیف شخص ابراہیم منڈل کو اسلام پور میں پکڑا اور اپنے معمولی گواہوں سے جو چاہا گواہی دلوا کر بے چاروں کو کالے پانی روانہ کر دیا۔" (۵۸۸)

لیکن ہنٹر صاحب کو خفگی یہ ہے کہ:

"ان کی سازش کا جال کسی بھی کمزور حکومت کو مرعوب کرنے کے لیے کافی تھا۔ (۵۸۹)

پانچواں مقدمہ سازش پٹنہ ۱۸۷۱ء

یہ مقدمہ مارچ ۱۸۷۱ء میں پٹنہ میں دائر ہوا۔ اس مقدمہ میں ملزم کل سات تھے جن پر ثبوت کے لیے ۱۳۶ گواہ پیش کیے گئے۔ یہ گواہ شمالی ہند کے تقریباً ہر ایک حصہ کے تھے۔ پشاور، ہزارہ اور ماوراء سرحد سے لے کر مدنا پور اور باقر گنج جیسے بنگال کے مشرقی اضلاع سے یہ گواہ لائے گئے تھے۔ ملزمین کے نام اور مختصر تعارف ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) مولانا مبارک علی صاحب۔ جو مولانا احمد اللہ صاحب کی گرفتاری کے بعد مرکز صادق پور کے نگران مقرر ہوئے تھے۔ آپ نے مرکز کی تنظیم سنبھالتے ہوئے دائر شدہ مقدمات کی پیروی میں بھی کافی مدد کی۔ مقدمہ انبالہ کے سلسلہ میں ایک دفعہ انبالہ بھی تشریف لے گئے۔ پہلے ۱۸۶۸ء میں گرفتار ہوئے۔ ابھی اس سے فراغت نہیں ملی تھی کہ ۱۸۷۱ء کے آخری مقدمہ میں مبتلا کر دیئے گئے اور یہاں تک اذیت دی گئی کہ جانِ عزیز جب قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی، تب ان اذیتوں سے نجات ملی۔

(۲) مولانا تبارک علی صاحب۔ مولانا مبارک علی صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ اُن پر الزام یہ تھا کہ امبیلا کی مہم ۱۸۶۳ء میں مولانا عبداللہ صاحب کے شریک تھے اور ایک دستہ کی کمان ان کے سپرد تھی۔ حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ مارچ ۱۸۷۲ء میں مولانا امیر الدین صاحب وغیرہ کے ساتھ کالے پانی پہنچے۔ جہاں منشی محمد جعفر صاحب وغیرہ پہلے سے موجود تھے۔ صرف دس برس قید کاٹنے کے بعد لارڈ رپن کی سفارش سے رہا کر دیئے گئے۔ (۵۹۰)

(۳) حاجی دین محمد صاحب۔

(۴) حاجی امین الدین صاحب۔ ان پر باغیوں کی اعانت کا الزام تھا۔

(۵) حشم داد خاں۔ پٹنہ کے ایک سوداگر تھے۔ یہ سیشن جج کی عدالت سے رہا ہوئے۔

(۶) پیر محمد۔ ہائی کورٹ سے رہا کر دیئے گئے۔

(۷) امیر خاں۔ اس مقدمہ کے خاص ہیرو ہیں۔ یہ پٹنہ محلہ عالم گنج کے رہنے والے تھے۔ گرفتاری کے وقت ان کی عمر ۵۷ سال تھی۔ (۵۹۱) ان کا چمڑے کا کاروبار بنگال و بہار میں پھیلا ہوا تھا۔ کروڑ پتی تاجر سمجھے جاتے تھے۔ انگریز تاجر بھی اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ۱۰ر جولائی ۱۸۱۹ء کو ایک بجے بغیر کسی قانونی وارنٹ کے جائے قیام کولوٹولہ (کلکتہ) سے گرفتار کیے گئے۔ ان کو "ہوڑے" لایا گیا۔ پھر گیا (صوبہ بہار) پہنچا دیا گیا۔ جہاں ۳ر اگست ۱۸۶۹ء تک رہے۔ پھر اُن کو علی پور جیل منتقل کر دیا گیا۔ یہ عمر رسیدہ قیدی (امیر خاں صاحب) سید صاحب شہید یا مولانا ولایت علی صاحب سے بیعت تھے۔ جہاد کے کاموں میں روپے سے مدد کیا کرتے تھے۔ زکوٰۃ کی رقمیں باقاعدہ ادا کرتے تھے۔ بنگال کے مشرقی اضلاع سے جو رقمیں آتیں وہ بسا اوقات انہیں کے کلکتہ والے فرم کے ذریعہ پٹنہ اور پنجاب بھیجی جاتی

تھیں۔ مگر بایں ہمہ جو سزا اُن کو دی گئی، وہ اُن کے جرم سے کہیں زیادہ تھی اور باوجودیکہ اس مقدمہ کے ۱۳۶ سرکاری گواہوں میں ۱۱۳ خاص امیر خاں صاحب کے برخلاف پیش کیے گئے۔ مگر پھر بھی قانون دانوں کی نظر میں ثبوت ناکافی رہا۔ کیونکہ گواہوں نے قیدیوں کے بارے میں بہت کم کہا۔ (۵۹۳) ایک شریف انگریز بیرسٹر نے تو مقدمہ کی پیروی اس لیے چھوڑ دی کہ اس کی کاروائی شرمناک تھی۔ (۵۹۳) ملزم کو گرفتار کلکتہ میں کیا گیا مگر مقدمہ پٹنہ میں پیش (۵۹۴) ہوا۔ کیونکہ کلکتہ میں سرکاری حلقوں کے من مانے فیصلے کا امکان (۵۹۵) بہت کم تھا۔

سزا

انصاف پرور فاضل ججوں نے جن کا قلم خاص اشاروں کے مطابق حرکت کر رہا تھا، صرف حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا پر اکتفا نہیں کی بلکہ پوری جائداد بھی ضبط کر لی۔ جس کا تخمینہ اس زمانہ کے نرخوں کے لحاظ سے کروڑوں روپیہ تھا۔

حریف سے تاوانِ جنگ کرنا یورپ کا عام طریقہ تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں یہ جدت کی کہ صرف دشمنوں سے تاوانِ جنگ وصول نہیں کیا بلکہ اُن دوستوں سے بھی خرچہ جنگ کے نام پر بڑی بڑی رقمیں اور ملک کے بڑے بڑے حصے اینٹھ لیے جن کی مدد کے لیے اس کو کبھی فوج بھیجنی پڑی تھی۔

یہ رسوائے عالم حکومت ۱۸۵۷ء میں ختم ہو چکی تھی۔ اب ملکہ وکٹوریہ کی باضابطہ اور مہذب حکومت قائم تھی۔ مگر اس مہذب حکومت کے ایجنٹوں نے بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ کو زندہ رکھنا ضروری سمجھا اور بقول مولانا محمد جعفر صاحب اس تحریک کو ختم کرنے کی جدوجہد میں جو کچھ صرف ہوا تھا، وہ تنہا امیر خاں صاحب کی غیر معمولی جائداد سے وصول کر لیا۔ اس کے علاوہ علماء صادق پور وغیرہ کی املاک اور جائدادوں کی ضبطی سے جو کچھ وصول ہوا، وہ سود در سود اور کارکنانِ حکومت کے لیے مالِ غنیمت تھا۔

چار سال بعد امیر خاں صاحب کو رہا کر دیا گیا۔ مگر ضبط شدہ جائداد کا ایک حبہ بھی واپس نہیں کیا گیا۔ مولانا محمد جعفر صاحب نے دل کا غبار نکالنے کے لیے محمد شفیع صاحب (ملزم مقدمہ سازش انبالہ) کے معاملہ میں جو اعتراض کیا تھا وہی اعتراض امیر خاں صاحب کے معاملہ میں بھی کیا۔

"امیر خاں اگر مجرم نہیں تھے تو یہ شوراشوری اور یہ ہنگامہ محشر آفریں کیوں کیا گیا۔ اور اگر واقعی اُن کا جرم اتنا بڑا تھا تو پھر چار سال بعد اُن کو رہا کیوں کر دیا گیا۔ (۵۹۶)

مگر مولانا محمد جعفر صاحب کو شاید معلوم نہیں تھا یا تعصب میں بھول گئے تھے کہ انگریزوں کی مہذب دستمند حکومت سزا کی حالت میں کسی قیدی کا مرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ یہ سن رسیدہ بوڑھا قیدی (۵۹۷) صرف ۷، ۸ سال کی قلیل مدت میں جب جاں بلب ہو گیا تو (۱۸۷۹ء میں) اس کو رہا کرنا ضروری سمجھا گیا تا کہ برطانیہ کی

گردن نازک پر مرگِ ناحق کا بار نہ ہو، اور موت کی آخری رسومات اُس کے وارث انجام دے سکیں۔ چنانچہ رہائی کے ایک دو روز بعد انتقال ہو گیا۔ (۵۹۸)

سفینۂ حکومت کے ناخداؤں نے اس تحریک کو ختم کرنے اور گرفتاران بلا کو سزایاب کرنے کے لیے جو بے ضابطگی اور دستور و آئین کی خلاف ورزی کی اُس کی داستان دُہرانی بے سود ہے۔ کیونکہ بتانا یہ ہے کہ کیا ہوا۔ یہ بحث کہ جو بہانہ تراشا گیا۔ وہ کہاں تک قرین انصاف تھا۔ بحث سے خارج ہے۔ لہٰذا نہ ہمیں اس نقطہ پر خامہ فرسائی کی ضرورت ہے، اور نہ حضرات ناظرین کے لیے ہم یہ کاوش پسند کرتے ہیں۔

رودادِ مقدمہ ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقدمہ کی یہ خصوصیت بھی ظاہر کر دی جائے کہ اس کے متعدد ملزم صرف اسی مرتبہ نہیں، بلکہ اس سے پہلے بھی بار بار گرفتار ہو چکے تھے۔ چنانچہ

(۱) مولانا مبارک علی صاحب مشتبہ خطوط کے سلسلہ میں ۱۸۶۸ء، ۱۲۸۴ھ میں گرفتار کیے گئے۔

(۲) حاجی دین محمد، پیر محمد اور مولانا تبارک علی صاحبان ۱۸۶۸ء، ۱۸۶۹ء اور ۱۸۷۰ء میں مختلف وارنٹوں کے تحت گرفتار کیے گئے اور بار بار ممالک مغربی و شمالی کی جیلوں میں منتقل کیے گئے۔

(۳) مولانا مبارک علی، مولانا تبارک علی، امین الدین، اور حاجی دین محمد صاحبان ۱۸۶۸ء، و ۱۸۶۹ء میں شاہی قیدی کی حیثیت سے گرفتار کیے گئے۔ جنوری ۱۸۷۱ء میں رہا ہوئے اور پھر اس آخری مقدمہ سازش کے لیے پکڑ لیے گئے۔

(۴) امیر خاں صاحب پہلے پہل ۱۸۶۴ء (رمضان ۱۲۸۰ھ) میں مقدمہ انبالہ کے دوران گرفتار کیے گئے۔ پھر ضمانت پر رہا کر دیے گئے۔ پھر ۱۰ جولائی ۱۸۶۹ء (ربیع الاول ۱۲۸۶ھ) کو گرفتار کیے گئے۔ اور کیم مئی ۱۸۷۱ء تک (جب کہ ان کا مقدمہ پٹنہ میں شروع ہوا) کسی قانونی وارنٹ کے بغیر صرف گورنر جنرل کی مرضی پر قید رکھے گئے۔

مقدمات کی بحث ختم کرتے وقت دو باتیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں:

(۱) دار و گیر اور گرفتاریوں کا یہ سلسلہ ۱۸۶۳ء میں شروع کیا گیا۔ ۱۸۶۸ء تک ایک طرف گرفتاریوں اور سزاؤں کا سلسلہ جاری رہا اور دوسری جانب تحریک اپنی پوری قوت سے چلتی رہی۔ (ملاحظہ ہو ہنٹر کی کتاب کے اقتباسات جو مقدمہ سازش مالدہ کے زیر عنوان گذر چکے ہیں)۔

۱۸۵۷ء اور ۱۸۶۳ء میں صرف چھ سال کا فاصلہ تھا۔ ۱۸۵۷ء میں عام ہندوستانیوں بالخصوص حریت پسند مسلمانوں پر جس ہولناک وحشت و بربریت کا مظاہرہ کیا گیا تھا چار پانچ نسلیں گذر چکنے کے بعد آج تک بھی دماغ اُن سے متاثر اور مظالم کی داستانیں بچہ بچہ کی زبان پر ہیں۔ ۱۸۵۸ء میں اگرچہ دستوری اور آئینی طور پر حکومت بدل چکی تھی ایسٹ انڈیا کمپنی کا واسطہ ختم ہو کر براہِ راست تاج برطانیہ کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ مگر حکمران وہی تھے۔ مشین کے پرزوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ یعنی وہی سفید فام درندے اقتدار کے مالک تھے اور

وہی سیاہ فام ہندوستانی اُن کے شکار تھے۔ مگر یہ ہولناک مظالم، اس جماعت کے عزائم اور ارادوں پر فتح نمایاں نہ ہوسکے۔ تحریک کی وہی شدت باقی رہی۔ بلکہ اس کی جارحانہ کاروائی پہلے سے زیادہ ہوگئی۔[599] (600) بڑی سے بڑی کمزوری یہ ظاہر ہوئی کہ کچھ افراد وعدہ معاف گواہ بننے پر مجبور ہوگئے۔ مگر جب ان کارروائیوں کا خیال کیا جاتا ہے جو وعدہ معاف گواہ بنانے کے لیے عمل میں لائی جاتی تھیں تو غصے کے بجائے ان غریبوں کی حالت پر ترس آتا ہے۔ خدا جانے کیسی کیسی سختیوں اور دھمکیوں کے بعد یہ غریب اس گناہ پر آمادہ کیے گئے ہوں گے۔

(۲) مذکورہ بالا گرفتاران بلا وہ ہیں جن پر خاص طور سے سازش کے مقدمات چلائے گئے اور اس وجہ سے اُن کے نام محفوظ رہ گئے۔ لیکن وہ ہزاروں گرفتاران بلا جو اندھا دھند گرفتاریوں کی عام وبا میں گرفتار ہوئے، ان کے ناموں کا پتہ چلانا بھی مشکل ہے اور پتہ چل کر کسی کتاب کا جزو بنانا بھی مشکل۔ اس کے اندازے کے لیے مسٹر ہنٹر کے کچھ بیانات پیچھے گذر چکے ہیں۔ ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"بنگال جیسے دور دراز صوبے نے اپنے خرچ پر سرحدی کیمپ کے لیے رنگروٹوں کے گروہ کے گروہ تیار کیے۔ اس کے ہر گاؤں بلکہ ہر خاندان نے اُن کی مثال کی پیروی کی اور مصارف جنگ میں حصہ لیا۔ ان بدنصیب بہکائے ہوئے غداروں کے گروہ کے گروہ ہم نے قیدخانوں میں ڈال دیئے اور عدالتوں نے یکے بعد دیگرے ان کے سرغنوں کو سمندر پار کے بے آب و گیاہ جزیروں میں بھیج دیا۔ لیکن اس کے باوجود سارے ملک نے ہماری سرحد پر اسلام کی بے تحاشا اُمیدوں کی آبیاری روپیہ اور آدمیوں سے کی۔ بلکہ اب تک عیسائی حکومت کے خلاف خونی احتجاج پر مصر ہے۔"

(ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۷۶)

گرفتارانِ بلا کے مصائب

بے پناہ جذبۂ انتقام اور بے مثال صبر و استقامت

کشتگانِ خنجر تسلیم کے قصے دردناک ہیں مگر مختصر۔ کسی کو چند سیکنڈ یا منٹ لگے اور کسی کو چند گھنٹے۔ بہت سے بہت چند دن، خون آلود زخموں کی اذیت برداشت کر کے عالم بقا کی راہ لی اور دعاءِ مغفرت کے مستحق ہو گئے۔

لیکن وہ گرفتارانِ بلا جو داغِ ناکامی کے ساتھ گرفتار ہوئے۔ زندگی کا آخری نصب العین "شہادت" بھی حاصل نہ کر سکے۔ ان کی داستان زندگی طویل بھی ہے اور دلخراش اور حسرت ناک بھی۔ سننے کے لیے پتھر کا کلیجہ درکار ہے اور لکھنے کے لیے ایسا قلم چاہیے، جو نا آشناءِ درد ہو۔

دستوری حکومتوں کی اصلاحات نے جیل خانہ کی ہولناکیوں میں کچھ کمی کر دی ہے اور سیاسی قیدیوں کے لیے تو جیل خانہ صرف خلوت کدہ رہ گیا ہے مگر گفتگو اس زمانہ کی ہے جو موجودہ ترقیات سے ایک صدی پیچھے تھا۔ جس زمانہ میں سفید فام متعصب درندوں کی زبان، آئین تھی۔ اور اُن کے خود غرضانہ اور خود پرستانہ ارادوں کو قانون کی شکل دے دی جاتی تھی۔ اس وقت آہنی پنجرے، بیڑی، ڈنڈا، وغیرہ سب کچھ تھا۔ غذا اور مشقت کے بارے میں سیاسی اور اخلاقی قیدی یکساں درجہ رکھتے تھے۔ بلکہ یورپین اور اینگلو انڈین افسروں کا رویہ سیاسی قیدیوں کے ساتھ زیادہ دل آزار، توہین آمیز اور معاندانہ ہوتا تھا۔ مثال اور نمونہ کے لیے چند واقعات ملاحظہ فرمائیے۔

حوالات جو جیل خانہ نہیں، بلکہ جیل خانہ کی تمہید ہوتی ہے، اس کی سرگذشت ایک حوالاتی (مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری) کے الفاظ میں یہ ہے:

> "ہر ایک علیحدہ علیحدہ کوٹھری میں جس کو سنگین کوٹھری کہتے ہیں، بند کر دیئے گئے۔ وہ کوٹھری پانچ فٹ لانبی اور چار فٹ چوڑی ہوگی اور چھت اس کی نہایت بلند، اور اوپر چھت کے ایک چھوٹا سا روشندان تھا کہ آدمی اس میں سانس لے سکے، نہایت تنگ و تاریک تھی۔ اس کوٹھری میں تقریباً ڈھائی تین مہینے ہم لوگ رہے۔ جملہ گیارہ آدمی تھے۔ شب و روز میں ایک بار اُس کا دروازہ کھلتا تھا اور ایک جمعدار اور تین سپاہی اور اُن کے ساتھ ایک باورچی کہ جس کے ہاتھ روٹیاں اور دال ہوتی، اور ایک سقہ جس کی مشک میں پانی ہوتا اور ایک بھنگی ہاتھ میں گملا لیے ہوئے آتا اور ہر ایک کوٹھری کو کھولتا باورچی دو روٹیاں اور کچھ دال دے دیتا اور سقہ ایک کوزہ پانی دے دیتا اور بھنگی گملا صاف کر دیتا، اور پھر یہ لوگ چلے جاتے۔

جو جو تکلیفیں اس میں گذریں، اُن کا بیان طول ہے اور فضول۔ بعد تین مہینے کے جب مقدمہ ہم لوگوں کا اجلاس میں صاحب مجسٹریٹ کے شروع ہوا۔ اس وقت ہم گیارہ آدمی قیدیوں سے نکال کر

حوالات کی ایک بارک میں جمع کر دیے گئے۔ بعد تین مہینے کے ہم لوگوں نے آسمان کی صورت دیکھی اور ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی، از حد خوشی ہوئی۔ (۱۰۱)

یہ رہائش کی کیفیت تھی۔ اب خوراک ملاحظہ فرمائیے۔ ایک دوسرے حوالاتی مولانا محمد جعفر تھانیسری کی تحریر ہے:

''دو روٹی اور تھوڑا سا ساگ۔ ساگ میں موٹے موٹے ڈنٹھلوں کے سوا پتی کا نام نہ تھا۔ روٹیوں میں قریب چوتھائی کے بالو اور مٹی ہی ہوئی۔'' (۱۰۲)

ایک دفعہ جیل خانے میں وبائی بخار پھیل گیا۔ قیدیوں کو اس سے نجات ملی، تو مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری کا بیان ہے:

''اس قدر بھوک کا غلبہ ہم سب لوگوں کو رہتا کہ دو روٹیاں سرکار سے ملتی تھیں۔ اُن کے کھانے سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں۔ جیل میں جس قدر گھاس تھی مع بیخ (جڑ) اکھاڑ کر قیدی چٹ کر گئے۔ ہر طرف سے الجوع الجوع ہائے بھوک ہائے بھوک، کا شور تھا۔'' (۱۰۳)

ایک طرف مفتوح اور مغلوب مسلمانوں کو فنا کر دینے کا یہ جذبہ کہ بقول ہنٹر:

''اعلیٰ حکام اُن کی ہستی تسلیم کرنے کو بھی تیار نہ تھے۔'' (۱۰۴)

اور دوسری طرف ان فدا کارانِ حریت، محبانِ وطن کی یہ جرأت کہ ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگاموں اور لاکھوں خاندانوں کی تباہی و بربادی کے بعد بھی شمالی مغربی سرحد پر مورچہ قائم کیے ہوئے انگریزی فوجوں کا قلع قمع اور انگریزی کمانڈروں کے دانت کھٹے کر رہے ہیں۔ اگر یورپ کی کوئی سفید فام قوم اس جرأت اور اس غیرت و حمیت سے کام لیتی تو اس کے جنگی قیدیوں کا احترام کیا جاتا۔ عمدہ قسم کی غذا، پھل اور بہتر ضروریات زندگی اُن کے لیے فراہم کی جاتیں، اور اگر کوئی مشقت بھی تجویز کی جاتی تو تہذیب و انسانیت کے دائرہ سے باہر قدم نہ نکالا جاتا۔ مگر یہاں معاملہ گوروں اور کالوں، آقاؤں اور خود ساختہ غلاموں کا تھا۔ ادب و احترام یا تہذیب و انسانیت تو در کنار، صورتِ حال یہ تھی کہ بقول مولانا عبدالرحیم صاحب و مولانا محمد جعفر صاحب:

''تمام ضابطے اور قانون بالائے طاق رکھ دیے گئے تھے۔'' (۱۰۵)

''جو کارروائیاں کی گئیں، اُن کو دیکھ کر غیر جانب دار انگریز بھی انگشت بدنداں ہوتے۔'' (۱۰۶)

''امیر خاں صاحب نے اپنے مقدمہ کی پیروی کے لیے بمبئی کے مشہور بیرسٹر انسٹی کو وکیل کیا۔ وہ دو ایک پیشی پر حاضر ہوا۔ پھر بمبئی واپس چلا گیا اور معذرت کر دی کہ اس مقدمہ کی کارروائیاں ایسی شرمناک ہیں کہ کوئی شریف انسان برداشت نہیں کر سکتا۔'' (۱۰۷)

یہ بہادر اور انگریز کے حق میں دیدہ دلیر مسلمان، تہذیب کے بجائے وحشیانہ سزاؤں کے مستحق کروانے گئے۔ ہندوستانی ملازم اگر کسی قدر نرمی بھی برتتے تو یورپین افسر دل کھول کر وحشت و بربریت کا تختہ مشق بناتے۔ چنانچہ جب ان اسیران بلا کو لاہور منتقل کیا گیا اور سنٹرل جیل کے پھاٹک کے سامنے لائن لگا کر ان کو بٹھا دیا گیا تو

کشمیری بند و دار وغہ جیل نے کس قدر افسوس کیا۔ مگر جب ڈاکٹر گرے صاحب سپرنٹنڈنٹ جیل تشریف لائے تو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑے ہوئے ان قیدیوں کو غضب آلود نظر سے دیکھا۔ پھر

''بڑے غصے سے حکم دیا کہ ایک آڑا ڈنڈا بھی ان لوگوں کے پاؤں میں ڈال دو۔ چنانچہ بجرد صدور اس حکم کے لوہار ڈنڈے لے کر حاضر ہوئے۔ اور ہمارے دونوں پاؤں کے دونوں کڑوں کے درمیان ایک ایک آڑا ڈنڈا جو ایک فٹ پانچ انچ سے زیادہ لمبا نہ تھا، ڈال دیا گیا۔''(۶۰۸)

مولانا محمد جعفر صاحب فرماتے ہیں:

''یہ حکم از راہ تعصب فقط ہم لوگوں کے واسطے ہی تھا۔ تمام جیل بھر میں ہم نے کسی اور قیدی کے پاؤں میں یہ ڈنڈا نہیں دیکھا۔ چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا نہایت مشکل ہو گیا، اور رات کو پاؤں پسار کر سونا بھی محال تھا۔''(۶۰۹)

یہ لاہور جیل کا عطیہ تھا۔ انڈمان جاتے ہوئے ملتان اور کراچی کے درمیان ایک اور زنجیر کا اضافہ ہوا۔

''اور سونے بیڑی اور ہتھکڑی اور ڈنڈے کے جو پہلے سے زیب تن تھے، یہاں ایک بڑی موٹی آہنی زنجیر بھی ہماری بیڑیوں کے بیچ میں پھنسائی گئی کہ جس سے اپنی اپنی جگہ سے کوئی مل نہیں سکتا تھا جب تک ہم جہاز پر رہے، اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوئے پاخانہ پیشاب کرتے رہے۔ اس وقت قریب قریب آدھا آدھا من کے لوہا ہمارے جسم پر تھا۔ باوجود پانی کی اس کثرت کے دریائے سندھ ہمارے زیر پا تھا، ہم پڑے پڑے تیمم سے نماز پڑھتے تھے۔''(۶۱۰)

کراچی سے آگے بھی جہاز کی روئداد کچھ کم دل خراش نہیں۔ مولانا عبدالرحیم صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''جب میرا جہاز سیلون کے سمندر میں پہنچا، نہایت سخت طوفان کا سامنا ہوا۔ جملہ قیدی جہاز کے نیچے ''تو تک'' میں ایک تنگیرہ جو مانند ''پنجرہ شیر'' تھا، نہایت بے رحمی کے ساتھ بند کر دیے گئے۔ ہر ایک کو دوران سر اور دست و قے جاری تھا۔ یہ غلاظت اور پاخانہ و پیشاب مل کر ایک تالاب کی سی کیفیت اس ''تو تک'' کی ہو گئی تھی۔ اس میں شب و روز رہنا پڑتا تھا۔ میں اپنی نماز پنج وقتی اس نجس حالت میں بلا وضو و تیمم کسی طور پر ادا کر لیتا تھا۔''(۶۱۱)

آنحضرت کی سنت ''یعظم عظیم کل قوم'' (زعیم قوم کی تعظیم کیا کرتے تھے) رفتہ رفتہ مہذب حکومتوں کا دستور العمل بن گئی ہے۔ چنانچہ سیاسی رہنماؤں کو جیل خانوں میں بھی خاص خاص رعایتیں دی جاتی۔ ان کو مشقت بھی اگر دی جاتی ہے تو ایسی نرم اور سہل جو ان کی بدنی اور دماغی صحت پر برا اثر نہ ڈالے۔ مگر ان محبان وطن کے حق میں معاملہ برعکس تھا۔ ان کے واجب الاحترام رہنما مولانا یحییٰ علی صاحب جو بلاشبہ لاکھوں حریت پسندوں کے سرتاج تھا، ان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا، اس کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ آپ کے رفیق جیل کا چشم دید بیان ہے:

"(سزا کا حکم ہونے کے بعد اگلے روز) صبح کو کپتان ٹائی صاحب مجسٹریٹ ڈپٹی کمشنر انبالہ و پارسن صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس جیل میں آئے اور داروغہ کو حکم دیا کہ مولانا کو سخت تر مشقت دی جائے۔ چنانچہ خود اُس نے اپنے روبرو کھڑے ہو کر ایک بڑے کنویں پر جو رہٹ چل رہا تھا اور آٹھ دس آدمی اس رہٹ کو عین تمازت آفتاب میں چلا رہے تھے، اور وہ بمشکل چلتا تھا، آپ کو بھی اُسی میں دے دیا۔ آپ دو تین روز تک تمام روز اُسی کو چلاتے رہے۔ آپ کو باعث حرارت آفتاب خون کا پیشاب آنے لگا آپ نہایت صبر و شکر کے ساتھ اس کو انجام دیتے رہے۔ دوسرے قیدی جو نہایت قوی اور توانا تھے۔ اس رہٹ کو کھینچتے کھینچتے تھک کر بیٹھ جاتے۔ مگر آپ صبح سے شام تک اُس میں لگے ہی رہتے تھے۔"(۶۱۲)

یہ آپ کی دیانت تھی کہ مشقت میں اپنی طرف سے کوتاہی روا نہ رکھی۔ تاکہ جیل کی خوراک اکل حلال ہو، اور کسی شبہ کی گنجائش نہ رہے۔

بے نظیر صبر و استقلال اور جیل خانہ میں ان بزرگوں کے مشاغل!

یہ مصائب کے چند نمونے تھے۔ اب ان بزرگوں کے صبر و استقلال کی بھی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) مولانا محمد جعفر صاحب کو سرکاری گواہ بنانے کے شوق میں جس طرح بارہ گھنٹہ پیٹا گیا، اس کا مختصر تذکرہ پہلے گذر چکا ہے۔

مولانا محمد جعفر صاحب اپنے شہر کے نمبردار اور باوضع رئیس تھے۔ پیشہ بھی باعزت یعنی قانون دانی اور مقدمات کی پیروی و عرائض نویسی۔ خود اپنی سوانح میں تحریر فرماتے ہیں:

"بیسیوں آدمی میری رعیت تھے۔ ایسے بڑے شہر کا نمبردار گھوڑے اور گاڑیوں پر سوار ہوا پھرتا تھا۔ ہر کام کے لیے میرے گھر میں نوکر چاکر تھے۔"

ایسے باوضع، باعزت، نستعلیق رئیس کے لیے مار پیٹ کی دھمکی بھی کافی تھی۔ (۶۱۳)

مگر آفریں، صد آفریں، کہ نہ پہلے روز کی خوشامد اس بامروت و شرافت پسند رئیس کو رام کر سکی۔ اور نہ اگلے روز صبح سے رات گئے تک بوٹ کی ٹھوکروں، بید اور ڈنڈوں کی مار دھاڑ اس کوہ استقلال کے پائے استقامت میں لغزش پیدا کر سکی۔

(۲) اس صبر و استقامت کے ساتھ ذوق خدا پرستی ملاحظہ ہو:

"اول روز جب ہم لوگ اجلاس پر حاضر کیے گئے اور وقت نماز ظہر کا آیا۔ ہم لوگوں نے درخواست کی کہ ہمیں نماز پڑھنے کی اجازت ملے کہ کچہری سے باہر جا کر وضو کر کے نماز پڑھ کر اپنی جلد پر آئیں۔ صاحب مجسٹریٹ نے فرمایا۔ تم لوگوں کے لیے مقدمہ ملتوی نہیں کیا جائے گا۔ ہم لوگوں نے عرض

کیا کہ ہم لوگوں کا مطلب یہ نہیں، کہ آپ مقدمہ کو ملتوی رکھیں بلکہ آپ جس طور پر اظہار گواہان لے رہے ہیں اور کاروائی کررہے ہیں، سب اُسی طرح کرتے رہیں۔ ہماری غیر حاضری کے وقت گواہوں کا اظہار نہ سننے کی وجہ سے جو کچھ نقصان ہوگا، اُس کی ذمہ داری خود ہمارے اوپر ہوگی۔ ہم اس نقصان کو بخوشی برداشت کرتے ہیں مگر نماز قضا نہیں کرسکتے۔ اس پر صاحب نے غصہ ہوکر اور جھلا کر فرمایا کہ تم لوگ باہر نہیں جانے پاؤ گے۔ ہم نے کہا: بہت خوب! اور فی الفور زمین پر تیمم کرکے کھڑے ہوگئے۔ اور مولانا اور ہم دس آدمیوں نے جماعت سے نماز شروع کردی۔ دو سو مسلح جوان پلٹن اور پولیس کے بندوقیں بھرے ہوئے اور سنگینیں چڑھائے واسطے حفاظت ہم لوگوں کے منتظر حکم پیچھے کھڑے ہوئے تھے اور بہت سے لوگ تماشہ بین اور اخبارات کے نامہ نگار وغیرہ مقدمہ کی کیفیت دیکھنے اور سننے کے لیے جمع تھے۔

اُس وقت کا نظارہ بھی عجیب وغریب تھا۔ بجز خدائے غالب کے کسی کا خوف وخطر دل پر نہیں تھا۔ دو تین روز ہم لوگوں نے نماز ظہر اسی طرح ادا کی، اور عصر کی نماز بالکل آخر وقت میں کچہری سے واپسی کے وقت ادا کرتے تھے۔ جب مجسٹریٹ نے دیکھا کہ عین اجلاس میں سلسلۂ نماز وجماعت شروع ہوگیا۔ تو بالآخر حکم دیا کہ ایک ایک آدمی کو دو سپاہیوں اور ایک نائک کی حفاظت میں باہر لے جایا جائے اور کچہری کے متصل باغ میں نماز پڑھوا کر واپس لے آیا جائے۔ تب ہم لوگ تمام ایام دوران مقدمہ میں نماز ظہر اس طرح ادا کرتے رہے کہ ایک آدمی جاتا اور جب وہ واپس آلیتا، تب دوسرا آدمی جاتا تھا۔''(۶۶۴)

(۴) سزائے موت کا خیر مقدم اور سزا میں تبدیلی

یہ قصہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ خود صاحب قصہ سے سنیے۔ مولانا محمد جعفر صاحب تحریر فرماتے ہیں:

تم بہت عقل مند، ذی علم، قانون دان، اپنے شہر کے نمبردار اور رئیس تھے۔ تم نے اپنی ساری عقل مندی اور قانون دانی سرکار کی مخالفت میں خرچ کی۔ تمہارے ذریعہ سے آدمی اور روپیہ سرکار کے دشمنوں کو جاتا تھا۔ تم نے سوائے انکار بحث کے کچھ حیلتاً بھی خیر خواہی سرکار کا دم نہیں بھرا، اور باوجود فہمائش کے اس کے ثابت کرانے میں کچھ کوشش نہ کی، اس واسطے تم کو پھانسی دی جاوے گی۔ اور تمہاری کل جائداد ضبط سرکار ہوگی، اور تمہاری لاش بھی تمہارے وارثوں کو نہ دی جائے گی بلکہ نہایت ذلت کے ساتھ گورستان جیل میں گاڑ دی جائے گی، اور آخر میں یہ کلمہ بھی فرمایا کہ میں تم کو پھانسی پر لٹکتا ہوا (دیکھ کر) بہت خوش ہوں گا۔''

سزائے موت کا خیر مقدم کس مسرت وشادمانی سے کیا گیا۔ اس کا ذکر تو آگے آئے گا۔ بطور جملہ معترضہ

ایک گفتگو سن لیجیے۔

مولانا موصوف کا ارشاد ہے:

"یہ سارا بیان صاحب موصوف کا میں نے نہایت سکون سے سنا مگر اس آخری فقرہ کے جواب میں میں نے کہا کہ جان دینا اور لینا خدا کا کام ہے، آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ رب العزت قادر ہے کہ میرے مرنے سے پہلے تم کو ہلاک کر دے۔ لیکن اس جواب باصواب پر وہ بہت خفا ہوا۔ مگر پھانسی کے حکم سے زیادہ اور میرا کیا کر سکتا تھا۔ جس قدر سزائیں اس کے اختیار میں تھیں، سب دے چکا تھا۔ لیکن اس وقت میرے منہ سے یہ الہامی فقرہ ایسا نکلا تھا کہ میں تو اس وقت تک زندہ موجود ہوں مگر وہ اس حکم دینے کے تھوڑے عرصہ بعد ناگہانی موت سے راہی ملک عدم ہوا۔"(۶۱۵)

حاکم اور محکوم کے درمیان تبادلہ موت کے اس دلچسپ قصہ کے بعد پھانسی کے ریشمین پھندے کا بھی عجیب وغریب لطیفہ ملاحظہ فرمایئے۔ مولانا محمد جعفر صاحب کا بیان ہے:

"اس حکم کے بعد ہمارے واسطے بڑے اہتمام سے نئی پھانسیاں اور اُن کے ریشمین رسے تیار ہوئے، اور بوجہ میرے بھاری(۶۱۶) بجرم ہونے کے میرے واسطے ایک ریشمین رسہ اور پھانسی کی لکڑی خاص طور پر نہایت مضبوط تیار کی گئی۔ مگر تقدیر کی زبردستی سے میری پھانسی تو موقوف ہوگئی۔ اس اثناء میں بجرم قتل ایک خاص ولایت کے انگلش مین گورے کو پھانسی کا حکم ملا، اور وہ سب سامان پھانسی جو میرے واسطے تیار ہوا تھا، اس بے چارے یورپین ہم قوم کے نصیب ہوا۔" چاہ کندہ راچاہ درپیش"۔

جو رسہ بڑے اہتمام سے میرے گلے میں ڈالنے کے واسطے تیار ہوا تھا، اس قادر مطلق، مقلب القلوب نے ایک ذات برادری کے بھائی کے گلے میں ڈلوایا اور مجھ کو صاف بچالیا۔ اس وقوعہ عجیب کے بعد لوگ اس اسرار الٰہی کو ایک بڑی آیات الٰہی سے (قدرت کا معجزہ) سمجھتے تھے۔ اسی سبب سے بعد پھانسی اُس گورے کے وہ رسہ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تبرکاً لوگوں میں تقسیم ہوگیا۔(۶۱۷)

ان معترضہ جملوں کے بعد خیر مقدم کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے:

مولانا تھانیسری کا بیان ہے:

"مجھ کو اپنی اُس وقت کی کیفیت خوب یاد ہے کہ میں اس حکم پھانسی کو سن کر ایسا خوش ہوا تھا کہ شاید ہفت اقلیم کی سلطنت ملنے سے بھی اس قدر مسرور نہ ہوتا۔ میرے بعد مولانا یحییٰ علی صاحب کو پھانسی کا حکم سنایا گیا۔ میں نے مولانا یحییٰ علی صاحب کو بھی نہایت بشاش پایا (مقدمہ کے باقی ملزمین(۶۱۸) کو عبور دریائے شور کا حکم سنایا) اُس دن پولیس والے اور تماشہ بین مرد اور عورت بکثرت حاضر تھے ضلع انبالہ کی کچہری کا تقریباً تمام احاطہ بھرا ہوا تھا۔ پولیس کپتان "پارسن"

میرے پاس آ کر کہنے لگا: "تم کو پھانسی کا حکم ہوا ہے ہم کو رونا چاہیے تم کس واسطے اتنا خوش ہوا"۔ میں نے اس کو چلتے چلتے بولا کہ "شہادت کی امید پر جو سب سے بڑی نعمت ہے ہم اس کو کیا جانو"۔ ۲ رمئی ۱۸۶۴ء سے (پھانسی کا حکم سنانے کی تاریخ سے) ۱۶ ر ستمبر تک ہم پھانسی گھروں میں بند رہے۔ ابالیان جیل ہمارے پھانسی دینے کا سامان تیار کر رہے تھے اور ادھر ہم انگریزوں کا تماشہ بن رہے تھے۔ صدہا صاحب لوگ اور میم ہمارے دیکھنے کو پھانسی گھروں میں آتے تھے۔ مگر بخلاف دوسرے عام پھانسی والوں کے ہم کو نہایت شاداں و فرحاں پا کر یورپین زائرین بہت تعجب کرتے۔ اکثر ہم کو پوچھتے تھے کہ تم کو بہت جلدی پھانسی ہوگی، تم خوشی کس واسطے کرتے ہو؟ ہم اس کے جواب میں صرف اسی قدر کہہ دیتے کہ ہمارے مذہب میں خدا کی راہ میں ایسے ظلم سے مارے جانے پر درجہ شہادت ملتا ہے اس واسطے ہم کو خوشی ہے۔ (۶۱۹)

سزا میں تبدیلی

یہ تھا پھانسی کے حکم کا استقبال۔ اب سزا میں تبدیلی کی بھی حیرت انگیز داستان سنیے۔

مولانا محمد جعفر صاحب تھانیسری فرماتے ہیں:

"اب اس مقلب القلوب کی ظاہری کارروائی سنیے۔ جب بہت سے صاحب اور میم ہم کو پھانسی گھروں میں نہایت شاداں و فرحاں دیکھ گئے تو یہ چرچا سب صاحب لوگوں میں پھیلا۔ تب ان صاحب لوگوں نے جو ہمارے جانی دشمن تھے، یہ خیال کیا کہ ایسے دشمنوں کو منہ مانگی موت "شہادت" جس کے واسطے وہ ایسا خوش ہو رہے ہیں دینی نہیں چاہیے بلکہ ان کو کالے پانی بھیج کر وہاں کے مصائب اور سختیوں سے ہلاک کرنا چاہیے..... چنانچہ صاحب ڈپٹی کمشنر انبالہ ۱۶ ر ستمبر کو پھانسی گھروں میں آئے اور چیف کورٹ کا حکم ہم کو پڑھ کر سنایا کہ تم لوگ پھانسی کو بہت دوست رکھتے ہو اور شہادت سمجھتے ہو۔ اس واسطے سرکار تمہاری دل چاہی سزا تم کو نہیں دیو گی۔ تمہاری پھانسی سزائے دائم الحبس بعبور دریائے شور سے بدلی گئی۔" (۶۲۰)

غالباً خود مولانا تھانیسری کا شعر ہے جو حسب حال ہے ع

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا   کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی (۶۲۱)

ڈپٹی کمشنر صاحب نے تبدیلی سزا کا سبب یہ بیان فرمایا۔ مگر ڈاکٹر ہنٹر اس کی وجہ اور بیان کرتے ہیں اور انگریزی ڈپلومیسی اور اس کی شاطرانہ سیاست ہنٹر صاحب ہی کی توجیہ کو درست اور صحیح قرار دیتی ہے۔

ہنٹر صاحب اپنی کتاب کے آخری صفحات میں تحریر فرماتے ہیں:

"(۶۲۲) اب تک ہم نے میدان جنگ کے سوا کہیں بھی کسی کا خون نہیں گرایا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

شہادت کے شوق نے لوگوں کو وہابیوں کی فوج میں داخل ہونے کی بجائے بہتوں کو اُن سے منحرف کر دیا ہے۔

اگر ان ملزمین کی اصلی سزا پر عمل کیا جاتا تو ہر سال ہزاروں زائرین اُن کی خانقاہ پر زیارت کے لیے جایا کرتے۔ ہر زمانے میں مذہب کے لیے مرنا (معاذ اللہ ہنٹر کے خیال کے بموجب) بدکرداری کی زندگی کو نیک نام کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ حکومت کو ایسی سزا سے احتیاط کرنی چاہیے، جس کو اس کی مسلمان رعایا شہادت تصور کرے۔''

اس باب کو ہم مولانا یحییٰ علی صاحب کے ذکر پر ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جس طرح ان گرفتاران بلا کے قائد ورہنما تھے، اُن کا صبر واستقلال بھی سبق آموز تھا۔ اور قدرتی طور پر اُن کے لیے شدائد ومصائب کا رنگ بھی گاڑھا تھا۔ کما قال صلی اللہ علیہ وسلم:

اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالا مثل. سب سے زیادہ ابتلاء اور آزمائش انبیاء علیہم السلام کی ہوتی ہے پھر جس قدر افضل ہو، درجہ بدرجہ اُس کے امتحان وآزمائش میں شدت ہوتی رہتی ہے۔

مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری، اُن کے قرابت دار تحریک اور نتائج تحریک کے شریک ورفیق ہیں۔ قید وبند کی رفاقت، کھرے کھوٹے کی کسوٹی بھی ہوتی ہے اس رفاقت میں جب ایک دوسرے کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور عادات واطوار کو پرکھا جاتا ہے، تو بہت سے جگری دوست دشمن بن جاتے ہیں، اور فداکار معتقدوں کے دلوں سے احترام وعقیدت کی روشنی نکل ہو جاتی ہے۔ مگر مولانا یحییٰ علی صاحب کے اعلیٰ اخلاق اور بلند ترین کردار کا پہلا ثمرہ یہ ہے کہ آپ کے ساتھیوں نے جتنا آپ کو پرکھا، آپ کو اُتنا ہی زیادہ کھرا پایا۔ اور جتنے آپ کے قریب ہوئے اُتنے ہی زیادہ آپ کے عقیدت مند اور قدر دان بنے۔

سالہا سال کی جانچ اور پرکھ کے بعد مولانا عبدالرحیم صاحب کی گرویدگی یہاں تک بڑھ گئی کہ وہ آپ کا نام لینا ہی سوءِ ادب سمجھتے ہیں۔ آپ کے لیے "ہمارے حضرت" یا "جناب حضرت مولانا" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد مولانا عبدالرحیم صاحب کی تحریر کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔ پہلے گذر چکا ہے کہ گرفتاری کے بعد انبالہ جیل میں پہنچ کر ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ تنگ وتاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ مولانا عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں:

''اس وقت جناب حضرت مولانا کا صبر واستقلال قابلِ دید تھا۔ واقعی یہ ہے کہ اگر آپ کا ساتھ ہم لوگوں کو نہ ہوتا، تو قدم ہم لوگوں کے ڈگ (۶۱۳) جاتے۔ اس کے بعد جب مقدمہ کی پیشی شروع ہوئی تو اجلاس کے وقت جناب مولانا بالکل ساکت یادِ خدا میں مصروف رہتے اور

آپ کے ذمہ کے سوال کا جواب بھی میں ہی دیتا۔''(۶۶۳)

آپ کی رائے نہیں تھی کہ مقدمہ کی پیروی کی جائے یا کوئی وکیل مقرر کیا جائے۔ اور بقول مولانا محمد جعفر صاحب تھانیسری اگر دوسرے لوگ اُن کو نہ روکتے، تو وہ نیک اعمال کا اقبال کرنے کو تیار تھے۔ مگر اُن کی طبیعت کچھ ایسی سیدھی اور بے عذر تھی کہ جب اُن سے مختار نامہ پر دستخط کرنے کو کہا گیا تو بے عذر اس پر بھی دستخط کر دیئے۔ یہ مقدمہ اور اجلاس کی صورت حال تھی۔ خلوت کی کیفیت ملاحظہ فرمایئے:

''شب کو میں اور آپ ایک ہی جگہ رہتے۔ آپ پچھلی شب حسب معمول نماز اور دعا وغیرہ میں مشغول رہتے، اور اکثر اشعار عاشقانہ دیوان شاہ نیاز و حافظ وغیرہ کے پڑھتے اور ایک نہایت وجدی کیفیت آپ پر طاری ہوتی۔

ہم لوگ سب ہوش باختہ ہوتے اور آپ نہایت مسرور و خوش۔ آپ کے چہرے بشرے سے کچھ بھی آثار رنج و محن کے پائے نہ جاتے۔ ذکر اللہ سے رطب اللسان رہتے۔ آپ اکثر اس شعر سے بھی جو حضرت خبیب صحابیؓ کا ہے، مترنم ہوتے۔

ولست ابالي حين اقتل مسلما علي اي شق كان في الله مصرعي

وذلك في ذات الالہ وان يشاء يبارك علي اوصال شلو ممزعي

''جب میں اسلام کی حالت میں قتل کیا جاؤں تو مجھے پرواہ نہیں کہ راہِ خدا میں کس پہلو پر میری جان نکلتی ہے۔ یہ سب اللہ کی راہ میں ہے وہ چاہے تو پارہ پارہ جسم کے منتشر اعضا میں (زندگی کی) برکت عطا فرمادے۔''

مولانا عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں:

''میرے پاس ایسے الفاظ نہیں ہیں کہ جن سے آپ کی اس کیفیت وجدی وشکر کا ایک شمہ بھی بیان کر سکوں اور اس کی تصویر کھینچ کر ہدیۂ ناظرین کرنا تو ایک امر محال ہے۔''

پھانسی کے حکم کے بعد ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ ضبط و تحمل اور صبر و استقلال کے ساتھ ساتھ مولانا یحییٰ علی صاحب کی خصوصیت یہ تھی:

''جب کوئی پہرہ والا سپاہی یا کوئی اور سپاہی یا قیدی آپ کے سامنے آجاتا، ہندو یا مسلمان سب کو آپ توحید باری کا وعظ سناتے، اور عذاب آخرت و پاداش عمل سے ڈراتے۔ الغرض ایک عجیب طرح کا فیض آپ کا اس قید تنہائی میں بھی جاری رہا۔ سپاہی جو پہرے کے واسطے آتا، وہ سکھ ہوتا یا گورکھا، اور مسلمان نہ ہوتا، آپ اُس کو اس آیہ کریمہ کا وعظ سناتے۔

أَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ

سپاہی کھڑا روتا اور جب اُس کے پہرے کی بدلی ہوتی، تو اس صحبت کو چھوڑ کر جانا پسند نہیں کرتا تھا۔

میں کچھ لکھ نہیں سکتا کہ کس قدر فائدہ اُس وقت پہرے والوں کو پہنچا، اور کتنے موحد ہو گئے اور کتنے دینِ آبائی چھوڑ کر مسلمان ہو گئے۔ لایعلمہ الا اللہ۔ آپ کا فیض کبھی کسی حالت میں بند نہیں ہوا۔ آپ کا جسم مبارک قیدی تھا مگر آپ کے دل اور زبان آزاد تھے۔ اُس پر کسی کی حکومت نہ تھی بجز اُس حاکمِ حقیقی کے۔ اگر وہ منٹ کے واسطے بھی کوئی سامنے آجاتا، آپ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بجا لاتے۔"(۶۲۵)

بہر حال جیل خانہ اور پھر جلاوطنی کی مصیبتیں آپ نے کس طرح شاداں و فرحاں خندہ پیشانی سے برداشت کیں اور ہر موقع پر خدمتِ خلق، بندگانِ خدا کی خیر خواہی، اتباعِ شریعت اور سنتِ رسولؐ کی پیروی کے جذبات کارفرما رہے ہیں، اُن کی تفصیل ہے۔ صرف دو واقعے بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں:

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

(۱) حکمِ سزا کی تبدیلی کے بعد پھانسی گھروں سے نکال کر دوسرے قیدیوں کے ساتھ بارکوں میں ملا دیا، اور جیل خانہ کے دستور کے موافق مقراض سے ہماری مونچھ داڑھی اور سر کے بال تراش کر منڈی بھیڑ بنا دیا۔ یہ جیل خانہ کا ایک جبری قانون تھا۔ جس کی تعمیل مجبوراً کرنی پڑی۔(۶۲۶) مگر اس ترکِ سنت کا اثر مولانا یحییٰ علی صاحب پر یہ تھا کہ:

"اپنی داڑھی کے کترے ہوئے بالوں کو اُٹھا اُٹھا کر کہتے کہ افسوس نہ کر، تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اسی کے واسطے کتری گئی۔(۶۲۷)

(۲) رنج و محن کی اس زندگی میں یکے بعد دیگرے جو خبریں پہنچتی رہیں اُن پر ایک نظر ڈال لیجیے اور پھر کلیجہ پر ہاتھ رکھ کر اپنے ایمان کا جائزہ لیجیے۔

(۳) بڑے بھائی مولانا احمد اللہ صاحب جو پورے خاندان کا آخری سہارا تھے، گرفتار کر لیے گئے۔

(۴) مولانا احمد اللہ صاحب کو پھانسی اور ضبطی جائداد کا حکم سنایا گیا۔

(۵) پھانسی کی سزا حبسِ دوام بعبور دریائے شور سے بدل دی گئی۔ مگر ضبطی جائداد کا حکم بدستور باقی رہا۔

(۶) تمام جائداد قرق کر کے نیلام کی جا رہی ہے۔

(۷) مکانات خالی کرا لیے گئے۔ بچوں اور عورتوں کو گھروں سے نکال دیا گیا۔ تمام سامان و اسباب اور تمام کتابیں اور مسودات ضبط کر لیے گئے۔

(۸) تمام مکانات مسمار کرا دیے گئے۔

(۹) خاندانی قبرستان کھدوا کر پھنکوا دیا گیا۔

کس کا کلیجہ ہے کہ ایسی ہوش ربا اور لرزہ خیز خبریں سنتا رہے اور متاعِ عقل و ہوش برباد نہ کر دے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم جس کو چاہتا ہے بے پناہ ضبط و تحمل عطا فرما دیتا ہے۔ جہادِ حریت کے شیدائی اور خونِ شہادت

کے یہ آرزومند جب گھر سے نکلے تھے تو یہ مستقبل اُن کی نظروں کے سامنے تھا۔ وہ سب کچھ قربان کر دینے کا تہیہ کرکے ہی گھر سے نکلے تھے۔ صرف ایک تمنا تھی کہ اُن کی یہ قربانیاں محبوبِ حقیقی کی نظر میں شرفِ قبولیت حاصل کرلیں۔ وہ دنیا میں نہ کسی معاوضہ کے آرزومند تھے، نہ کسی کے شکریہ کے اُمیدوار تھے۔ یہ جیسے سیاسی تھے ایسے ہی پابند مذہب خدا پرست بھی تھے۔ سیاست کا تقاضہ یہ تھا کہ وطن عزیز کی خاطر قربانیاں پیش کریں۔

مذہب کا تقاضا تھا کہ یہ قربانیاں کسی دنیاوی غرض کے علیے نہ ہوں بلکہ ایک فریضہ کی حیثیت سے محض ادائے فرض کی غرض سے ہوں۔

خدا پرستی کا تقاضا تھا کہ اللہ اور اُس کے رسول کی خوشنودی ان قربانیوں کا آخری نصب العین ہو۔

بس کوئی بھی اشارہ جس سے رضائے مولیٰ کا پتہ چلے، زخمِ دل کا مرہم اور تمام بے چینیوں اور پریشانیوں کے لیے تریاقِ مسرت تھا۔

چنانچہ ان تمام حوادث کے سننے کے بعد ایک خط کے چند فقرے بھی ملاحظہ فرمائیے۔ یہ خط اس شہید وفا نے اپنی اہلیہ کو لکھا ہے۔

یحییٰ علی کی طرف سے۔ بخدمت ام حبیبہ ام محمد یوسف سلمہا اللہ تعالیٰ

ضروری لکھنا یہ ہے کہ خط سے نور چشم محمد حسن مدعمرہٗ کے حال انہدام دونوں مکانوں کا معلوم ہوا۔ البتہ دل کو قلق ہوا اور صدمہ بہت گذرا، کیونکہ مکانِ سکونت قدیم سے خصوصاً وہ مکان کہ جس میں ذکر اللہ بہت ہوا ہو، اور کاروبارِ فریضہ بہت اجراء پائے ہوں مومنین کو انس ومحبت بطور اہل وعیال کے ہوتی ہے۔

بشارت

اُسی روز شب کو روحِ انور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوا۔ تبسم کناں فرمانے لگے کہ البتہ انہدام سے مکانوں کے مالکانِ مکان کو خصوصاً نسواں کو رنج والم بہت ہوا ہے، اور ہونے کی جگہ ہے، اور ان آیات کریمہ کو زبانِ مبارک سے ارشاد فرمایا۔

وَبَشِّرِ (۶۲۸) الصّٰبِرِيْنَ. اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ. اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ. رَبَّنَآ (۶۲۹) اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ. (۶۳۰) عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ.

اور فرمایا، ان آیات کریمہ کو وردِ زبان رکھو۔ عبادت خانے اور مسجد اقصیٰ اور مکانات انبیاء علیہم السلام بخت نصر اور جالوت کے ہاتھ سے انہدام پائے تھے۔ آخر منہدم کرنے والے نسیاً منسیا

ہوگئے اور یہ اماکن متبرکہ از سر نو بنا ہوئے، اور پہلے سے زیادہ آباد ہوئے۔ (۱۳۶) تم بھی اپنے رب کے فضل سے ایسی ہی اُمید رکھو۔ ....اللہ تعالیٰ کا بہت شکر کرو کہ تم ایسے امتحان کے لائق ٹھہرے۔

بعد اس مکاشفہ کے میں نے بہت انشراح و تسکین پایا اور اپنے بڑے بھائی (مولانا احمد اللہ صاحب) کو آگاہ کیا۔

دریائے عشق خالق دونوں جہاں میں ہم ۔۔۔ نام و نشان وارفتہ کے ڈوبا چکے

کفنی گلے میں ڈال کے تسمہ کمر کے بیچ ۔۔۔ ہم جوگی ہوئے محرم اسرار کے لیے

اے خدائے من فدایت جانِ من

جملہ فرزندان و خان و مانِ من

(اقتباس از مکتوب مؤرخہ ۲۱/ جمادی الاولیٰ روز یکشنبہ ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۶ء)

محمد میاں

۲۵/ ذی الحجہ ۱۳۷۸ھ ۔ ۱۵/ اگست ۱۹۵۹ء ۔ یوم دوشنبہ

حواشی

۳۸۳۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۳۴۴۔

۳۸۴۔ سرگذشت مجاہدین صفحہ ۲۸۔

۳۸۵۔ منشی محمد جعفر صاحب تھانیسری کا بیان ہے کہ ان مجاہدین نے مولانا نصیر الدین صاحب کو اپنا امیر منتخب کیا اور سید اکبر صاحب کے پاس "ستیانہ" میں جمع ہو گئے۔ (سوانح احمدی ۱۸۰)۔ مگر مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کی تحقیق یہ ہے کہ پہلے یہ جماعت مولوی محمد قاسم صاحب کی سرکردگی میں تھی۔ اس کے بعد انہوں نے مولانا نصیر الدین صاحب دہلوی (داماد حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی) کو اپنا امیر منتخب کیا۔ مولانا نصیر الدین صاحب اس وقت دہلی میں تھے اوکنلے (O.KINFLY) لکھتا ہے۔ مشہد بالاکوٹ کے بعد قاسم صاحب کی سرکردگی میں (جو اس وقت مظفرآباد میں تھے) بچے کھچے لوگ ستیانہ پہنچے۔ مولوی نصیر الدین صاحب بعد کو دہلی سے متعدد ہو کر پہنچے (ہندوستان کی پہلی سیاسی تحریک ۲۹) بہرحال قائد کوئی بھی ہو یہ ثابت ہے، کہ تحریک کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ مزید تحقیق و تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے سرگذشت مجاہدین از غلام رسول مہر۔

۳۸۶۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان ۳۴۳ و ۳۴۴۔

۳۸۷۔ یہ ایک لطیفہ ہے کہ فقہی مسلک کے لحاظ سے معاملہ برعکس تھا۔

۳۸۸۔ کیونکہ اس طرح جدا جدا انقلاب کی ہر ایک ممکن صورت پر عمل ہو گیا۔ انگریزوں کی طاقت اس وقت اتنی بڑھ چکی تھی کہ مرکز اگر ایک رہتا تب بھی نتیجہ یہی ہوتا۔ مگر وحدت مرکز اور ایک طریق کار کی شکل میں جدوجہد کا ایک گوشہ خالی رہ جاتا اور ملت اسلامیہ کی تاریخ اس فخر سے خالی رہ جاتی کہ ع مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا۔

۳۸۹۔ بمبئی میں انڈین نیشنل کانگرس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو زیر صدارت مسٹر بنرجی وکیل کلکتہ منعقد ہوا۔ جس میں بمبئی کے مشہور تاجر مسٹر رحمت اللہ سیانی اور دوسرے مسلمان شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں کانگرس کے یہ مقاصد قرار پائے۔ ۱: ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متحد و متفق کر کے ایک قوم بنانا۔ ۲۔ اور اس طرح جو ہندوستانی قوم پیدا ہو اس کی دماغی، اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی صلاحیتوں کو دوبارہ زندہ کرنا وغیرہ (روشن مستقبل ۲۸۰ و ۲۸۱)۔

۳۹۰۔ الدر المنثور فی احوال صادق پور۔

۳۹۱۔ الدر المنثور فی احوال صادق پور صفحہ ۱۱۱

۳۹۲۔ حسب معمول شرفاء ہند چار برس کی عمر میں آپ مکتب میں بٹھائے گئے۔ ذہانت و ذکاوت وافر سے سات برس کی عمر میں آپ کی استعداد اس حد کو پہنچی کہ مقررہ معلم سے آپ کی تشفی نہیں ہونے لگی اور آخر میں آپ کے والد بزرگوار مولوی فتح علی صاحب نے آپ کا سبق اپنے ذمہ لیا۔ بارہ برس کی عمر میں جب مختصرات سے فراغت حاصل ہوئی تو ایک نہایت معروف و مشہور استاد معقول مولوی رمضان علی صاحب مجتہد مذہب امامیہ کے پاس آپ کا سبق رجوع کر دیا گیا۔ پھر بشوق تحصیل مزید علوم مولانا محمد اشرف صاحب استاد معقول و منقول کی خدمت میں لکھنؤ تشریف لے گئے اور تقریباً چار سال ان کی خدمت میں فیضیاب ہوتے رہے (الدر المنثور ۱۱۰)۔

۳۹۳۔ مولانا محمد اشرف صاحب ابن قاضی آیت اللہ خوش نویس ولد محمد معظم ولد احمد علی صدیقی بزرگے از اسلافش از لاہور آمدہ مقیم لکھنؤ شد۔ وے رحمۃ اللہ علیہ شاگرد مولانا نور الحق فرنگی محلی و مولانا سید مخدوم لکھنوی و مرید سید احمد مجاہد بریلوی بود، بتدریس و تصنیف عمر عزیزش بسر برد۔ در تالیف تاج اللغات کہ بحکم والی لکھنؤ مؤلف شد، او ہم شرکت داشت۔ اصول راسخہ و شرح

دوسہ شافیہ وقسطاس الصرف وتفسیر قرآن مجید وتاریخ علماء ومشائخ وسلاطین ہند تا تمام کہ مسودہ آن بخط شریفش بنظر مؤلف کتاب ہذا گذشتہ از تصانیف مستند، مولانا ثابت علی مرحوم ساکن موضع بھکا ضلع الہ آباد و از تلامذہ او واز اساتذہ جامع الاوراق اند۔ صاحب الترجمہ بتاریخ ہفتم ہم سنہ دوازدہ صد وچہل وچہار ہجری بمرض ہیضہ رحلت فرمودہ در حجرۂ مسجد خود واقع جھوائی ٹولہ من محلات لکھنؤ مدفون گردید۔ شرفہ اللہ تعالیٰ بتشریف المغفران۔ (۱۸۰ تذکرہ علماء ہند مولانا رحمان علی صاحب مرحوم)۔

۳۹۴۔ تحین میں سے ایک۔ محمد میاں

۳۹۵۔ الدر المنثور وسیرت سید احمد شہید وغیرہ۔

۳۹۶۔ واعظان خوش بیان میلاد شریف اور سیرت مبارکہ کے جلسوں میں اس آیت کریمہ کو پڑھ کر بسا اوقات مسلمانوں کو اطمینان دلا دیتے ہیں کہ وہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہیں لہٰذا دنیا اور آخرت کی رحمتیں اُن کے لیے مخصوص ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت اطمینان دلانے کے لیے نہیں بلکہ اُس فرض کا احساس دلانے کے لیے ہے جو ایک مسلمان پر بحیثیت مسلمان عائد ہوتا ہے۔ "نبی امی" صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں اس لیے نہیں آئے کہ کسی فرعون کو غرق کریں یا زمین پھٹے اور اس میں کوئی قارون مع اپنے پورے محل کے زمین دوز ہو جائے۔ اس قسم کی عام تباہی اور بربادی سے آپ کی اُمت محفوظ رہے گی۔ جس کی بشارت احادیث مبارکہ میں دے دی گئی ہے۔ آپ کی بعثت کا منشاء یہ ہے کہ فرعون، سلطان عادل بنے، قارون میں حاتم کی صفت پیدا ہو، اور جو قوم کفر وعصیان، تمرد اور سرکشی کے سبب غرق طوفان نوح ہونی چاہیے وہ سفینہ رشد وہدیٰ کی ناخدا بنے۔ وراثت ارض اور خلافت الٰہیہ کی مستحق ہو۔ اس ذہنی انقلاب برپا کرنے کے لیے جس صبر وتحمل، اخلاص وایثار، جفاکشی، ہمدردی، نوع انسان کی جگر سوزی اور دل گیری کی ضرورت ہے وہ وابستگان دامن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ ہے۔ کما یشیر الیہ لعلک باخع نفسک الا یکونوا مؤمنین۔

۳۹۷۔ الدر المنثور وسوانح احمدی وغیرہ۔

۳۹۸۔ الدر المنثور صفحہ ۱۱۱ وسوانح احمدی وغیرہ۔

۳۹۹۔ اس میں شاہ محمد حسین صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو مولانا ولایت علی صاحب کے ماموں تھے اور آخر تک تحریک کی سرپرستی کرتے رہے (ماخوذ از سوانح احمدی ۲۱۳)۔

۴۰۰۔ اس وقت کچھ شیعہ صاحبان نے ایک فتنہ کھڑا کر دیا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ چند سر برآوردہ شیعہ پٹنہ کے انگریز افسر کے پاس گئے اور شکایت کی کہ سید صاحب جہاد کی نیت سے یہ دورہ کر رہے ہیں۔ انگریز افسر نے جواب دیا۔ یہ پادری صاحب جن کے متعلق یہ شیعہ حضرات الزام لگاتے ہیں، بہت دین دار حقانی شخص ہیں کیونکہ جاسوس اُن کے حال کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ہم سے کسی نے یہ بات اب تک نہیں کی ہے۔ یہ پادری صاحب حج کو جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ بچے اور بوڑھے بھی ہیں۔ کوئی جنگی سامان اُن کے پاس نہیں۔ (وقائع احمدی قلمی نسخہ صفحہ ۷۶۹)

۴۰۱۔ تفصیل سید صاحب کے تذکرہ میں گذر چکی ہے۔

۴۰۲۔ بظاہر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام نظام سید صاحب نے اس وقت قائم کیا جب حج کو تشریف لے جاتے ہوئے چند روز پٹنہ میں قیام فرمایا تھا۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ سید صاحب نے حج بیت اللہ سے واپس ہوتے ہوئے یہ نظام قائم کیا۔ حج بیت اللہ شریف کے لیے جاتے وقت نہ مولانا ولایت علی صاحب وہاں موجود تھے، اور نہ آپ کا خاندان حلقۂ ارادت میں داخل ہوا تھا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جاتے وقت سید صاحب کو پٹنہ کا قیام مختصر کرنا پڑا۔ کیونکہ شیعوں نے شکایت کر دی تھی کہ سید صاحب کی یہ نقل وحرکت جہاد کی غرض سے ہے۔ اور جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، اگرچہ انگریز افسر نے باور نہیں کیا۔ مگر سید صاحب کے لیے خطرہ ضرور پیدا ہو گیا تھا کہ اگر اس وقت گرفتاری کا سلسلہ شروع ہو گیا تو تمام پروگرام ختم اور تحریک ناکام

ہو جائے گی۔ محمد میاں

۲۰۳۔ ان خلفاء کے نام نہیں لیے گئے۔ غالباً ان کے نام یہ ہیں۔ مولانا سید مظہر علی صاحب، مولانا الٰہی بخش صاحب۔ مولانا ولایت علی صاحب۔ مولانا عنایت علی صاحب۔

۲۰۴۔ مولانا شاہ قاضی احمد حسین صاحب (واللہ اعلم) محمد میاں

۲۰۵۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے بیٹے اگرچہ چار تھے مگر پوتا صرف ایک تھا یعنی مولانا محمد اسمٰعیل صاحب۔

۲۰۶۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسمٰعیل و اسحق (امیر الروایات وغیرہ)۔ اس حمد و شکر کی بنیاد یہی تھی کہ حضرت اسمٰعیل شہیدؒ سے وہی محبت فرماتے تھے جو اپنے صلبی فرزند سے کر سکتے تھے۔ حضرت مولانا شاہ اسحٰق صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے نواسے تھے۔ اُن کو بھی تحریک میں شامل کیا گیا تھا، اور جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے کہ اندرونِ ہند تحریک کا نظم قائم کرنا، اور حسبِ ضرورت مجاہدین کی امداد حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ سے متعلق تھا۔

۲۰۷۔ یہی وہ بزرگ ہیں جو سید صاحبؒ کی زیرِ قیادت سب سے پہلی جنگ میں شہید ہوئے (سید احمد شہید وغیرہ)

۲۰۸۔ سوانح احمدی ۲۰۹۔

۲۰۹۔ پٹنہ پہنچ کر مرکز قائم کر لیا۔ تب بھی تکلفات اور نزاکت پسندی کی وہی حالت رہی۔ جب سید صاحب کا قافلہ حج بیت اللہ سے واپس ہو رہا تھا تو ایک طرف شوق و ذوق کا یہ عالم کہ استقبال کے لیے پاپیادہ مونگیر پہنچے، اور دوسری جانب تکلفات کی یہ شان اطلس و کمخواب کا لباس زیبِ بدن، نازک ہتھیلیاں حنا سے رنگی ہوئی۔ اور سیرت سید احمد شہید کے الفاظ میں: "اس وقت مولوی ولایت علی صاحب کی داڑھی منڈھی ہوئی تھی۔ غیر متشرع اور آزاد لوگوں کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ سید عبدالرحمٰن صاحب نے سید صاحب سے ان کی وضع کی شکایت کی۔ فرمایا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ یہ قدیم ہمراہیوں میں شامل ہو جائیں گے اور یہ سب ظاہری صورت بدل جائے گی ۲۸۱۔ چنانچہ جب قافلہ میں شریک ہو کر رائے بریلی پہنچے تو یہ تمام رنگینیاں ختم تھیں۔

۲۱۰۔ مولانا عبدالرحیم صاحب زبیری ہاشمی۔ منشی محمد جعفر صاحب تھانیسری وغیرہ وغیرہ۔

۲۱۱۔ غلام رسول صاحب مہر کی تحقیق یہ ہے کہ سفیر بنا کر کابل بھیجنے کی روایت غلط ہے۔ دلیل یہ ہے کہ دوست محمد خاں کبھی وزیر اعظم نہیں ہوئے۔ اور زمان شاہ کا زمانہ اس سے پہلے تھا۔

۲۱۲۔ منشی محمد جعفر صاحب کا بیان ہے کہ آپ تقریباً دو مہینے کابل میں رہے۔ توحید، اتباعِ سنت اور جہاد کے متعلق روزانہ وعظ نصیحت کرتے رہتے تھے۔ سوانح احمدی ۲۱۱۔ جو بات منشی صاحب کے خیال میں قابلِ تعریف ہے، مولانا عبید اللہ سندھیؒ اس سے ناراض ہیں۔ وہ مولانا ولایت علی صاحب کی تشدد پسندی کے شاکی ہیں۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ تبلیغ و اصلاح، واعظ و مبلغ کے لیے خواہ کتنی ہی ضروری ہو، مگر ایک سفیر کے لیے بحیثیت سفیر اس کے جواز میں کلام ہے۔

۲۱۳۔ ملاحظہ ہو سوانح احمدی، تذکرہ مولانا ولایت علی صاحب۔

۲۱۴۔ مولانا محمد جعفر صاحب تھانیسری تحریر فرماتے ہیں:

انہیں دنوں (یعنی سفر حج سے واپسی کے بعد جب سفر جہاد کی تیاری ہو رہی تھی۔ نواب مبارز الدولہ حیدر آبادی اور اُن کے بھائی ناصر الدولہ میں اَن بن ہو کر سرکار انگریزی تک نوبت پہنچی، اور نواب مبارز الدولہ قید ہو گئے۔ اس سبب سے مولوی زین العابدین اور مولوی محمد عباس حیدر آبادی مع اور چند علماء کے بھاگ کر عظیم آباد پہنچے الخ (ذکر مولانا ولایت علی صاحب)۔ یہ اَن بن کیا تھی، اور کیوں ہوئی؟ مولانا محمد جعفر صاحب نے اس ابہام کی تفصیل نہیں فرمائی۔ تاریخ حیدر آباد کا مندرجہ ذیل اقتباس اس پر دھندلی سی روشنی ڈالتا ہے۔

ایک سازش کا انکشاف: بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) میں نگور کے انگریز مجسٹریٹ نے ایک سازش کا پتہ لگایا جو انگریزی سلطنت کے خلاف کی جارہی تھی۔ نواب ناصر الدولہ کے بھائی مبارز الدولہ اس میں شریک پائے گئے۔ اس فقرہ کے بعد مصنف تاریخ حیدرآباد، ریاست کی حمایت میں اس سازش کے الزام کو ہلکا کرنے کے لیے تحریر فرماتے ہیں:

جس حد تک واقعات کا تعلق ہے یہ کوئی سازش نہیں تھی۔ معاملہ صرف اتنا ہے، کہ جب مولوی ولایت علی عظیم آبادی خلیفہ سید احمد بریلوی سرغنہ وہابیان ہندوستان حیدرآباد پہنچے اور وہاں انہوں نے مسلمانوں کی دینی اصلاح کے لیے وعظ کہنے شروع کیے تو نواب مبارز الدولہ کو بھی اُن سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ مولوی ولایت علی صاحب اُن سے ملے اور پہلی ہی ملاقات میں نواب صاحب مسحور ہوگئے۔ چونکہ خود علم شناس تھے اس لیے مولوی ولایت علی صاحب کے مقام اور منصب کا پورا اندازہ کرلیا۔ اس وقت سے مبارز الدولہ اور اُن کے رفقاء نے اسلامی احکام کی پابندی بالاہتمام شروع کردی۔ چند سال بعد جب انگریزوں کو وہابیت کا خوف پیدا ہوا تو مبارز الدولہ اور اُن کے رفقاء کو بھی سازش سے متہم کردیا۔ سازش کی تحقیقات کی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مبارز الدولہ اپنے دس رفقاء سمیت ۱۳ ربیع الاول ۱۲۵۵ھ کو تیسری بار نواب صاحب بہادر کے حکم سے قلعہ گولکنڈہ کو جلاوطن ہوئے اور تمام وہابی فرداً فرداً گرفتار ہوکر قید کیے گئے۔ مبارز الدولہ نے قید ہی میں وفات پائی۔ (تاریخ حیدرآباد از حکیم نجم الغنی صاحب ۲۹۷)

آفریں ہے مبارز الدولہ کو۔ ۱: جس کی جوہر شناسی نے مولانا ولایت علی صاحب کے مقام اور منصب کا پورا اندازہ لگایا۔ ۲: جس نے احکام اسلامی کی پابندی بالاہتمام شروع کی تو انگریزی اقتدار اعلیٰ سے اپنے ملک کو آزاد کرانا بھی اپنا ایک واجب الاداء فرض سمجھا۔ ۳: جس کے جذبات حریت کو بار بار کی گرفتاری اور جلاوطنی بھی فرو نہ کرسکی۔ انجام یہ کہ قید و بند کی زندگی سے نجات حاصل کی۔

۳۱۵۔ اختلاف رائے اسی سوال کے جواب میں پیش آیا۔ حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلوی خلیفہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے خود دہلی کو مرکز بنا کر انقلاب کے لیے وہ پروگرام تجویز کیا جس کے نتیجہ میں ۱۸۵۷ء کا معرکہ پیش آیا۔ جس میں ہندو اور مسلمان دونوں انگریز کے مقابلہ میں صف آرا تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کی رائے یہ ہے، کہ مولانا محمد اسحٰق صاحب نے ترکی خلافت سے اشتراک پیدا کرنا ضروری سمجھا اور وہ اپنا مرکز مکہ معظمہ لے گئے۔ (سیاسی تحریک ۱۰۰)۔ اور دہلی میں مولانا مملوک علی کی صدارت میں مولانا قطب الدین دہلوی، مولانا مظفر حسین کاندھلوی، مولانا عبدالغنی دہلوی کو ملا کر ایک بورڈ بنایا، جو نئے پروگرام کی اشاعت کرکے نئے سرے سے جماعتی نظام پیدا کرے گا (سیاسی تحریک ۱۰۸)۔ بہرحال دہلی کا مرکز مستقل ہوا یا مکہ معظمہ کے مرکز زیر اثر ہو، یہ واضح اور مسلم ہے کہ صادق پور کے مرکز سے جدا تھا اور اس کی پالیسی وہ تھی جو ۱۸۵۷ء میں عالم آشکارا ہوئی یعنی مشترک جدوجہد اور مشترک نظام عمل۔ تفصیل ۱۸۵۷ء کے جہادِ حریت کے سلسلہ میں پیش کی جائے گی۔ ان شاء اللہ

۳۱۶۔ پیدائش ۱۲۰۳ھ۔ سفر حج سے واپسی کے وقت سید صاحب اور آپ کے پورے قافلہ کی مدارات میں نمایاں حصہ لیا اور آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ زندگی بھر تحریک کے رُکن رکین رہے۔ ۱۲۶۱ھ میں حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ اس سفر میں دو سال صرف ہوئے۔ ۱۲۷۷ھ میں چوہتر سال کی عمر میں وفات پائی۔ (الدر المنثور)

۳۱۷۔ الدر المنثور ۱۱۶ (ملخصاً)۔

۳۱۸۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان ۱۳۲۔

۳۱۹۔ ایضاً ۱۱۶ ملخصاً۔

۳۲۰۔ الدر المنثور۔

۴۲۱۔ الدر المنثور ۱۲۹ ملخصاً۔

۴۲۲۔ اس سلسلہ کے ایک منظوم رسالے کے اشعار تو آج تک لوگوں کی زبان پر ہیں۔ اس رسالہ کا نام ہے (پیشین گوئی شاہ نعمت اللہ صاحب) مختلف عنوانوں اور مختلف اسلوب سے جہاد کی ضرورت سمجھائی جاتی تھی۔ مثلاً کاشتکاروں کو بتایا جاتا تھا کہ بادشاہ جب ظالم و جابر ہوتا ہے تو بارش نہیں ہوتی اور قحط پڑتا ہے اور اس کو اتفاق کہیے یا قدرتی معجزہ کہ اس زمانے میں یکے بعد دیگرے ایسے قحط پڑے جن سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ بقول سر ولیم ہنٹر اس صدی میں اکتیس قحط پڑے اور کروڑوں ہندوستانی اس سے متاثر ہوئے اور ہلاک ہوئے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو نقش حیات جلد اول۔

۴۲۳۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان ۹۹،۱۰۰۔

۴۲۴۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۹۹،۱۰۱۔

۴۲۵۔ ماخوذ الدر المنثور وغیرہ۔

۴۲۶۔ الدر المنثور ۱۱۶۔

۴۲۷۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان باب دوم ۱۰۱۔

۴۲۸۔ باب دوم ہمارے ہندوستانی مسلمان ۱۰۳۔

۴۲۹۔ باب دوم ہمارے ہندوستانی مسلمان ۷۵۔

۴۳۰۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۳۷۔

۴۳۱۔ نثار علی عرف تیتو میاں اور ان کی بغاوت کا تذکرہ حضرت سید صاحب کے حالات میں گذر چکا۔ یہ بنگال میں سید صاحب کی تحریک کے انچارج تھے اور سید صاحب نے ۱۸۳۰ء میں پشاور فتح کیا تھا تو نثار علی صاحب نے کلکتہ کے مشرقی اضلاع میں علم بغاوت بلند کیا تھا۔

۴۳۲۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان ۱۳۵۔

۴۳۳۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان ۱۴۵۔

۴۳۴۔ ایضاً ۱۴۶۔

۴۳۵۔ ایضاً ۱۰۳۔

۴۳۶۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان ۱۰۴۔

۴۳۷۔ ایضاً ۱۰۷۔

۴۳۸۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان ۱۵۸۔

۴۳۹۔ ایضاً ۲۰۲۔

۴۴۰۔ ہنٹر صاحب کا فیصلہ تو یہی ہے کہ یہ عقیدہ جعلی اور بناوٹی تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

''وہ خلیفے جن کو امام صاحب نے پٹنہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا انہوں نے ایسے عینی شاہد پیدا کیے جنہوں نے اعلان کیا کہ جس وقت لڑائی زوروں پر تھی، ہمارے امام صاحب گرد کے بادلوں میں ہماری ظاہری آنکھوں سے اوجھل کر دیا گیا'' (۱۷ ہمارے ہندوستانی مسلمان)۔

ہنٹر صاحب نے جعلی ہونے کے اور بھی دلائل پیش کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو (باب دوم، ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۷۱ تا ۷۳)۔ مگر ہمیں ہنٹر صاحب کے فیصلہ سے اختلاف ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ پٹنہ کے ذمہ دار خلفاء کے جذبات بھی اس عقیدہ سے اتنے ہی متاثر ہیں جتنا وہ دوسروں کو متاثر کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا یحییٰ علی صاحب جنہوں نے تحریک کو منظم کرنے میں بے نظیر تدبر اور سب سے زیادہ سرگرمی سے کام کیا۔ جب وہ گرفتار ہوئے تو جیل خانوں کی سلاخوں کے پیچھے

سید صاحب کے فراق میں بڑے درد اور عشق سے یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

اتنا پیغام درد کا کہنا | جب صبا کوئے یار سے گذرے
کونسی رات آپ آئیں گے | دن بہت انتظار میں گذرے (تواریخ عجیب)

ظاہر ہے کہ جعل کرنے والا خود اپنے جعل سے اتنا متاثر نہیں ہو سکتا۔

حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی بھی اس عقیدہ کو "سیاسی جوڑ" فرماتے ہیں (شاہ ولی اللہ صاحب کی سیاسی تحریک ۱۹۵) مگر پھر یہ بھی اعتراف کرتے ہیں:

اس پارٹی (صادق پور کی پارٹی) کا مرکز فکر یہی بنایا جاتا ہے کہ امیر شہید غیر معین عرصے کے لیے غائب ہو گئے ہیں۔ اُن کے انتظار میں جہاد کی تیاری کرتے رہنا چاہیے۔ وہ ضرور آئیں گے اور انہیں کی امامت میں کام کرنے سے ہمیں نجات مل سکتی ہے (۱۹۵ شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک) یہ بات بعید از قیاس ہے کہ اہل علم کی مرکزی جماعت کا مرکزی فکر جعلی ہو۔

دوسرے موقع پر فرماتے ہیں۔ بعض اتفاقی واقعات اس کے مؤید بن گئے۔ امیر شہید بالاکوٹ کے واقعہ سے چند روز پیشتر تک اپنے اصحاب کو وصیت کرتے رہے ہیں کہ اگر بالفرض کسی ضرورت کے لیے ہم چند روز غائب ہو جائیں تو آپ لوگ مایوس نہ ہوں بلکہ اپنے کام پر مستقل طور سے قائم رہیں۔ درحقیقت وہ اس اشارے اور کنائے سے پیش آنے والے واقعات کے لیے ذہنوں کو تیار کرتے تھے مگر پریشان دماغی اس قدر سوچنے کا موقع کب دیتی ہے۔ اس طرح یہ روایت پیدا ہوئی اور مخالفوں نے سارے ہندوستان میں بھر دی تاکہ تحریک اپنے عمل کے اعتبار سے ختم ہو جائے (۱۹۳ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک)۔ ہمارے خیال میں سید صاحبؒ کے وہ جملے بھی اس روایت اور عقیدہ کی بنیاد بن گئے جو عزم بالجزم اور مقصد پر مکمل یقین واعتماد کے ماتحت آپ کی زبان سے صادر ہوئے تھے۔ اور آپ کے معتقدین کے ذہنوں میں پتھر کی لکیر بن گئے تھے۔ مثلاً جب آپ ہجرت کر رہے تھے تو آپ نے اپنی ہمشیرہ محترمہ سے فرمایا تھا کہ جب تک فلاں فلاں کام انجام نہ پا جائیں میری موت نہیں آسکتی۔ اگر کوئی قسم کھا کر بھی میرے مرنے کی خبر دے اس کا یقین نہ کرنا۔ (سوانح احمدی ملخصاً صفحہ ۹۲) اس پر سونے کا سہاگہ یہ کہ آپ کے معتقدین کا دل نہیں چاہتا تھا کہ حضرت سید صاحب حادثہ موت کے شکار ہوں اور بقول مولانا سندھی شکست فاش کا تصور مجاہدین کے فکر سے کوسوں دور تھا۔ (سیاسی تحریک ۱۹۲ بہرحال جذبات نے تمنا اور آرزو میں عقیدے کی قوت پیدا کر دی اور جیسے جیسے جذبات فرو ہوتے رہے عقیدہ بھی مضمحل ہوتا رہا، یہاں تک کہ ختم ہو گیا۔

۴۴۱۔ الدرالمنثور ۱۴۲۔

۴۴۲۔ مکہ معظمہ پہنچ کر آپ نے عبید اللہ سراج محدث سے سند حاصل کی۔ عبید اللہ سراج فرماتے تھے کہ مولانا نے حدیث کے لفظوں کی سند مجھ سے لی اور معانی کی سند میں نے مولانا سے حاصل کی (صفحہ ۱۴۲ الدرالمنثور)۔

۴۴۳۔ یمن پہنچے تو یہاں کے مشہور محدث وعالم قاضی محمد بن علی شوکانی (متوفی ۱۲۵۰ھ) سے سند حدیث حاصل کی اور الدرۃ البہیہ وغیرہ ان کی چند تصنیفات ساتھ لائے (الدرالمنثور ۱۴۲)

۴۴۴۔ یہ وہی دونوں عالم ہیں جو قیام حیدرآباد کے زمانہ میں مولانا ولایت علی صاحب کی دعوت سے سب سے پہلے متاثر ہوئے تھے اور ان کے ذریعہ نواب مبارز الدولہ سے تعلق قائم کیا گیا تھا۔ نواب مبارز الدولہ کو نظر بند کیا گیا تو ان کو گرفتار کر کے جیل خانے میں ڈال دیا گیا تھا۔ برسوں جیل میں رہے مگر جوش وخروش میں کوئی کمی نہیں آئی ؏

یہ وہ نشہ نہیں ہے جسے ترشی اتار دے

آخر کار جیل سے فرار ہوئے اور صادق پور پٹنہ کے انقلابی مرکز میں حاضر ہو گئے۔

۴۴۵۔ مولانا الٰہی بخش صاحب ولد شیخ ہدایت علی صاحب مرحوم ساکن مہدانواں، عظیم آباد پٹنہ، شہر عظیم آباد کے رؤساء عظام میں سے تھے۔ عقل و دانش فہم و فراست میں یگانۂ زمانہ۔ بڑے بڑے رؤسا اپنے نجی اور اہم معاملات میں آپ سے مشورہ لیتے

اور آپ کی رائے پر اعتماد کرتے ۔ نہایت خوش اخلاق، حلیم و مستقل مزاج صاحب مروت، برادر پرور۔ درس و تدریس کا شوق تھا۔ حاذق و ماہر طبیب تھے مگر مطب نہیں کرتے تھے۔ زود اثر اعلیٰ قسم کی دوائیں ضرور تیار رکھتے اور خدمت خلق کے جذبہ سے اُن کو مفت تقسیم کرتے۔ اقربا کی نگہداشت اور غریبوں کی ہمدردی میں خاص مقام رکھتے تھے۔ انگریزی حکومت میں بھی آپ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ حق پسندی اور ثبات و استقلال کا یہ عالم تھا کہ اگر بچہ بھی حق بات بتا دیتا تو اُس پر جم جاتے۔ پھر بڑھے ہوئے قدم کا اُکھڑنا ناممکن تھا۔

سید صاحب پٹنہ تشریف لائے تو آپ نے دعوت کی۔ مکان پر وعظ کرایا۔ لیکن طبیعت بیعت کے لیے آمادہ نہیں تھی۔ صاحبزادوں نے بیعت کرلی مگر آپ نے بیعت نہیں کی اور جب تجربہ نے تحریک کی اہمیت واضح کردی تو سید صاحب کے نائب مولانا ولایت علی صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور سب کچھ تحریک کے حوالہ کردیا۔ چاروں بیٹے تحریک میں شامل ہوئے اور اسی میں تباہ ہوگئے لاکھوں روپیہ کی جائداد سرکار کی نذر ہوئی۔ عظیم الشان حویلیاں کھدوا کر پھینک دی گئیں۔ تفصیل آئندہ اوراق میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ انشاءاللہ

۳۴۶۔ چنانچہ مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا نصیر الدین صاحب وغیرہ کی امارت میں جماعت اپنا کام کرتی رہی، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔ محمد میاں

۳۴۷۔ یہ ڈوگرہ یعنی پہاڑی تھا۔ اسی سے ڈوگروں کے راج کی بنیاد پڑی۔ جس کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا۔

۳۴۸۔ گلاب سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا خدمت گذار بن کر عہدہ وزارت تک پہنچا۔ پھر انگریزی سرکار کا مخلص و وفادار بن کر جموں و کشمیر کا مہاراجہ بنا (تفصیل کے لیے آئندہ صفحات ملاحظہ ہوں)

۳۴۹۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ از پروفیسر کوہلی صفحہ ۳۳۴۔

۳۵۰۔ گلشن پنجاب صفحہ ۳۹۔

۳۵۱۔ مہاراجہ کثیر العیال تھا۔ اس کی رانیاں سولہ تھیں۔ اُن میں سے آٹھ ایسی تھیں جن کے ساتھ باقاعدہ رسومات کے بعد شادی ہوئی تھی، اور باقی آٹھ کو مہاراجہ نے چادر ڈالنے کی رسم پوری کر کے حرم میں داخل کرلیا تھا (تاریخ رؤساء پنجاب از لیپل گرفن، و مہاراجہ رنجیت سنگھ از پروفیسر کوہلی ۲۵۵) مہاراجہ کے سات لڑکے تھے۔ کنور کھڑک سنگھ، کنور شیر سنگھ، کنور تارا سنگھ، کنور کشمیرا سنگھ، کنور پشورا سنگھ، کنور ملتانا سنگھ، کنور دلیپ سنگھ۔ مگر یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان میں سے کئی لڑکے رنجیت سنگھ کی بیویوں کے بطن سے نہیں تھے بلکہ اُن کے گود لیے ہوئے تھے (گلشن پنجاب ۲۴)۔

۳۵۲۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جب کھڑک سنگھ کو جانشین بنایا، تو اپنے بھروسہ کے وزیر دھیان سنگھ کو وصیت کی کہ وہ اس کا وفادار وزیر ثابت ہو۔ مگر بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ شرط وفاداری یہ تھی کہ کھڑک سنگھ، دھیان سنگھ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہے۔ اور جب کھڑک سنگھ اس کو برداشت نہیں کرسکا تو دھیان سنگھ نے سازش شروع کردی کہ کھڑک سنگھ در پردہ انگریزوں سے ساز باز کر رہا ہے۔ وزیر سلطنت اور اس کے بھائی (گلاب سنگھ) نے کنور نونہال سنگھ اور اس کی والدہ کو کھڑک سنگھ کی طرف سے اتنا ورغلایا کہ انہوں نے ارکینِ سلطنت کی یہ تجویز برضامندی منظور کرلی کہ مہاراجہ کو قید کرلیں یا کسی اور صورت سے اس کو کاروبارِ سلطنت سے بے دخل کردیں (تاریخ پنجاب عرف گلشن پنجاب از پنڈت دیبی پرشاد صاحب ڈپٹی کلکٹر صفحہ ۴۳)۔

۳۵۳۔ گلشن پنجاب صفحہ ۴۳۔

۳۵۴۔ منشی عبدالکریم صاحب مصنف تاریخ پنجاب تحفۂ احباب کی عبارت ملاحظہ ہو:

"طرفہ اقبالی مہاراجہ رنجیت سنگھ ایں شد کہ کنور نونہال سنگھ پسر کھڑک سنگھ متوفا کہ جوان نوخواستہ و بکلیہ فہم و فراست آراستہ و پیراستہ بود، و نقشۂ از یں جہاں سست بنیان درگذشت گویند بعد از سوختن لاش پدر خود بر کنار دریاء راوی چوں معاودت شہر

کردہ سواری از بدرِ دروازہ شہر رسید۔ بسبب ہجوم فیلان سواری امراء چنداں گنجائش دروازہ عام درمیان آں دروازہ شد کہ فیل سواری نونہال سنگھ با سنگی تمام سے رفت۔ در چنیں حال مردم توپ خانہ برائے تہنیت و سلامی بموجب حکم او یک بار گی صدمہ بجہ ضرب توپ را کہ از بیشتر قریب دروازہ مذکور جمع کردہ بودند سر دادند۔ از قضا و قدر بصدمہ صدائے توپہا سنگی آں دروازہ بروئے افتاد و وہاں ساعت طریق عدم و فنا شد۔ افسوس کہ آں نہال نو کہ ہنوز از شجر زندگانی برنخوردہ بود بہ تند باد اجل از بیخ و بن جدا شد۔ (تاریخ پنجاب۔ تحفۃ احباب)۔

۳۵۵۔ شیر سنگھ نے جو کھڑک سنگھ کے بعد گدی نشین ہوا۔ اُس کو اس کی خادمہ باندیوں سے قتل کرادیا۔ کیونکہ اُس نے شیر سنگھ سے نکاح کرنے سے انکار کر دیا تھا، اور یہ طعنہ دیا تھا کہ وہ دھوبن کے بطن سے ہے۔ جھمل سنگھ کی لڑکی دھوبن کے لڑکے سے راضی نہیں ہو سکتی (گلشن پنجاب صفحہ ۵۴)

۳۵۶۔ بیٹے اور شوہر کے بعد رانی چندر کنور ہی وارث تخت مانی جاتی تھی۔ اُس نے اپنا حق حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ایک باضابطہ جنگ کے بعد اُس کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ گلاب سنگھ نے اس جنگ زرگری میں نمایاں حصہ لیا، اور فائدہ بھی بہت اُٹھایا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ گولہ بارود کے بہانہ سے سونے چاندی کے سولہ چھکڑے لدوا کر جموں لے گیا تھا۔ نو لاکھ سالانہ آمدنی کی جاگیر جو رانی چندر کنور کو اس کی وجہ معاش کے طور پر ملی تھی اور بہت سے جواہرات جو رانی کے پاس تھے، یہ بھی گلاب سنگھ کے قبضہ میں آئے (تاریخ پنجاب از دیبی پرشاد صاحب صفحہ ۵۱)

۳۵۷۔ یہ لہنا سنگھ، سردار خاندان سندھاں والہ اور اُس کے بھائی عطر سنگھ اور اجیت سنگھ تھے۔ لہنا سنگھ نے شیر سنگھ کے جلوس کے وقت کچھ مزاحمت کی تھی۔ اس غصہ میں شیر سنگھ نے اُس کو قید کر دیا تھا۔ اور اُس کے دونوں بھائی فرار ہو کر سرکار کمپنی کے علاقہ میں چلے آئے تھے۔ کچھ دنوں بعد شیر سنگھ نے ان سب کو معاف کر دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ یہ ممنون احسان ہوں گے۔ مگر یہ اُس سے خار کھائے ہوئے تھے اور اُن کو دھیان سنگھ نے خفیہ طور پر شیر سنگھ کے خلاف بھڑکا رکھا تھا۔ (گلشن پنجاب ۵۵)۔

۳۵۸۔ گلشن پنجاب صفحہ ۵۸۔

۳۵۹۔ گلشن پنجاب صفحہ ۵۹۔

۳۶۰۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو گلشن پنجاب از پنڈت دیبی پرشاد صاحب و تحفۂ احباب از منشی عبدالکریم صاحب۔

۳۶۱۔ گلشن پنجاب صفحہ ۱۰۹۔

۳۶۲۔ گلشن پنجاب صفحہ ۱۲۲۔

۳۶۳۔ ایضاً صفحہ ۱۱۰۔

۳۶۴۔ ایک قلمی مکتوب سے معلوم ہوا کہ شیخ صاحب مولانا ولایت علی صاحب سے تعلق رکھتے تھے۔ نامہ و پیام کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ملاحظہ ہو سرگذشت مجاہدین صفحہ ۲۵۰۔

۳۶۵۔ گلشن پنجاب صفحہ ۱۲۸۔

۳۶۶۔ ایضاً صفحہ ۱۳۲۔

۳۶۷۔ ایضاً ملخصاً صفحہ ۱۴۴۔

۳۶۸۔ گلشن پنجاب صفحہ ۱۵۲۔

۳۶۹۔ ایضاً صفحہ ۱۴۷۔

۳۷۰۔ ایضاً صفحہ ۱۳۹ و ۱۴۰۔

۳۷۱۔ ایضاً صفحہ ۱۵۳۔

۴۷۲۔ ایضاً صفحہ ۱۵۳۔

۴۷۳۔ تاریخ پنجاب از دہبی پرشاد صفحہ ۵۰۰۔

۴۷۴۔ گلشن پنجاب صفحہ ۱۰۹۔

۴۷۵۔ الدر المنثور صفحہ ۲۴۱و۲۴۲۔

۴۷۶۔ بہار اس تحریک کا گہوارہ تھا۔ بنگال اور یوپی میں جس طرح دلوں کو گرمایا جا چکا تھا اس کا تذکرہ مختصر طور پر پچھلے صفحات میں گذر چکا ہے۔ سرحدی علاقہ اور پنجاب میں اس تحریک کے اثرات کا اندازہ ہنٹر صاحب کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے:

پٹنہ کی عدالت کے کاغذات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے خلفاء نے مذہبی آتش بیانوں کی حیثیت سے سرحد میں کافی نام پیدا کر لیا تھا۔ ۱۸۴۷ء میں سر ہنری لارنس کو گواہیوں کے دوران معلوم ہوا کہ وہ پنجاب میں مجاہدین کے نام سے موسوم تھے (ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۳۶)

۴۷۷۔ مولانا عبدالرحیم صادق پوری مصنف الدر المنثور و منشی محمد جعفر تھانیسری مصنف سوانح احمدی۔

۴۷۸۔ اس علاقہ کے رئیس کا نام اکبر شاہ تھا اور اس سے مجاہدین کی پرانی راہ و رسم تھی۔ ان کا مزید تعارف آگے آئے گا۔

۴۷۹۔ الدر المنثور صفحہ ۱۲۲ و سوانح احمدی۔

۴۸۰۔ غالباً یہ وہی رجب علی خاں ہیں جن کی بہن ہندی بائی بیگم تھی۔ ہندی بائی سے بہادر شاہ نے ۱۸۴۷ء میں نکاح کیا تھا۔ زینت محل کے بعد یہ دوسری بیوی تھی جو بادشاہ کی منظور نظر تھی۔ مولوی رجب علی صاحب کا مکان دہلی میں کوچہ میر عاشق میں تھا۔ یہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے حامی رہے۔ پہلے بھی باغیوں (مجاہدین حریت) کے اقتدار کے زمانہ میں یہ محلہ اس لیے محفوظ رہا کہ بادشاہ کے سالے کا مکان یہاں تھا اور انگریزوں کے تسلط کے زمانہ میں اس لیے محفوظ رہا کہ مولوی رجب علی صاحب انگریزوں کے وفادار تھے اور اس دوران مخبری کرتے رہے تھے۔ محمد میاں

۴۸۱۔ پٹنہ کی مشہور فرم امیر خاں و حشمت داد خاں کے شریک حشمت داد خاں و دلاور خاں کی ذاتی ضمانت تھی جس کی پاداش میں یہ لوگ بھی بعد میں مصیبتوں کا نشانہ بنے اور ان کی فرم ۱۸۶۵ء و ۱۸۶۷ء میں تباہ کر دی گئی۔ تاریخ مجلہ ۲۳ جولائی ۱۸۶۴ء (اسلامی سیاسی تحریک صفحہ ۵۶)

۴۸۲۔ الدر المنثور صفحہ ۱۲۳۔

۴۸۳۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۳۱۔

۴۸۴۔ آریا جو ترک وطن کر کے ہندوستان آ رہے تھے، جب ہندوکش سے گذرے تو ان کے سامنے ساڑھے سات ہزار فٹ اونچا پہاڑ اور اس پر بہت گھنا جنگل تھا۔ ایسا گھنا جنگل ان کی نظر سے نہیں گذرا تھا اس لیے وہ اس کو "مہابن" کہنے لگے۔ عجیب اتفاق ہے کہ انیسویں صدی کے تارکین وطن کا پناہ گاہ بھی یہی مہابن بنا اور جس طرح وہ کئی ہزار سال پہلے آنے والوں کے استقبال کے لیے حاضر تھا، کئی ہزار سال بعد جنگ آزادی کے مورچہ کے لیے محفوظ مقام کی ضرورت پیش آئی تو اسی پہاڑ نے دامن پھیلایا۔ محمد میاں

۴۸۵۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ سیرت سید احمد شہید از غلام رسول صاحب مہر۔

۴۸۶۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۴۳۔

۴۸۷۔ الدر المنثور صفحہ ۱۲۵ تا ۱۲۷۔

۴۸۸۔ ان کا نام مولوی محبوب علی تھا۔ یہ سرحد گئے اور آزردہ خاطر ہو کر واپس آ کر تحریک کے خلاف طوفان برپا کر دیا۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ء میں بھی یہ مخالف رہے۔ مگر جب انگریزوں نے ان کو انعام میں کئی گاؤں کی جاگیر دینی چاہی تو انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ میں نے جو کچھ کیا وہ آپ کی حمایت میں نہیں کیا بلکہ میری تحقیق میں مسئلہ اسی طرح تھا (سید احمد شہید از غلام رسول

صاحب مہر)۔

۴۸۹۔ الدر المنثور صفحہ ۱۳۳۔

۴۹۰۔ الدر المنثور صفحہ ۱۳۷۔

۴۹۱۔ مولانا مسعود عالم صاحب۔ ملاحظہ ہو ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ۱۴۲ و سوانح احمدی صفحہ ۱۴۴۔

۴۹۲۔ مسٹر ٹی۔ ای۔ راونشا (T.E.Revinshan) مجسٹریٹ پٹنہ ۱۸۶۵ء کا میمورنڈم۔ نیز ہمارے ہندوستانی مسلمان از ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۳۸۔

۴۹۳۔ جنرل رپورٹ متعلق یوسف زئی از اے۔ ڈبلیو جیلو لاہور بحوالہ اسلامی تحریک۔

۴۹۴۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان از صفحہ ۳۷ تا ۴۰۔

۴۹۵۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۴۰۔

۴۹۶۔ غلام رسول صاحب مہر ڈاکٹر بیلیو کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ مولانا عنایت علیؒ کی وفات کے بعد ان کے فرزند حافظ عبدالمجید کے بجائے تین آدمیوں کو مشترک امیر بنادیا گیا۔ ایک مولانا نصر اللہ دوسرے شاہ اکرام اللہ اور تیسرے میر تقی۔ اور حافظ عبدالمجید کو اس لیے امیر نہ بنایا گیا کہ اُن کی زبان میں لکنت تھی۔ مشترک امارت میں مولانا نور اللہ کو دوسروں پر تقدم حاصل تھا۔ گویا وہ اس بورڈ کے صدر تھے۔ انہوں نے ضلع پشاور کے مسلمانوں کو انگریزی حکومت کے خلاف برانگیختہ کرنے کی بڑی کوششیں کیں۔ لیکن حکومت نے ان کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ (سرگذشت مجاہدین صفحہ ۳۰۵)۔ ان تین امیروں میں سے شاہ اکرام اللہ "شاہ نور زئی" کی جنگ میں شہید ہوگئے۔ مولانا نور اللہ کابل جاتے ہوئے بلسر (وادی جملہ) پہنچے تو بخار آکر فوت ہوگئے۔ وہ "بلسر" ہی کی زمین میں آرام فرما ہیں۔ اسی اثناء میں مولانا مقصود علی آپہنچے جو میرٹھ میں گرفتار ہوکر ابھی رہا ہوئے تھے۔ مجاہدین نے انہیں اپنا امیر بنالیا (تقریباً ۱۸۶۰ء)۔ (سرگذشت مجاہدین صفحہ ۳۱۸)۔

۴۹۷۔ میر مقصود علی صاحب داناپور (پٹنہ) کے رہنے والے تھے اور خاندان صادق پور سے اُن کی قرابت بھی تھی۔ (ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک)۔

۴۹۸۔ مولانا عبداللہ ۱۲۴۱ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ محترمہ حیدرآباد کے ایک رئیس مرزا واحد بیگ صاحب کی صاحبزادی تھیں۔ مولانا ولایت علی صاحب کی جہادی اولوالعزمی اس رشتہ کا سبب بنی۔ یعنی مولانا عبداللہ کے والد مجاہد تھے تو نانا مجاہد نواز۔ پھر جہاد و انقلاب کی تیاریوں کے دور ہی میں آپ کی ولادت ہوئی۔ ہمیشہ سفر وحضر میں والد ماجد کے ساتھ رہے۔ ابھی پندرہ سولہ برس کی عمر تھی کہ والد ماجد کے ساتھ پکھلی اور بالاکوٹ کے جہاد و قتال میں عملی شرکت کی۔ مولانا ولایت علی صاحب نے جب دوبارہ ہجرت کی تو مولانا عبداللہ صاحب ساتھ تھے اور فوجی نظم وضبط آپ کے سپرد تھا۔ مولانا عنایت علی صاحب کے دورِ امارت ۱۸۵۲ء، ۱۲۶۹ھ تا ۱۸۵۸ء، ۱۲۷۴ھ میں بھی دو تین سال وہاں رہے۔ پھر چچا کی تیز مزاجی کے باعث اُن سے موافقت نہ ہوئی تو چھوٹے چچا مولانا فرحت حسین صاحب کے پاس پٹنہ چلے آئے لیکن اس مردِ مجاہد کو گھر میں قرار نہ آسکا اور چار پانچ سال کے بعد اپنی تمام جائداد فروخت کرکے اپنے نابالغ بھائی مولوی عبدالکریم صاحب اور تمام اہل وعیال کے ساتھ شوال ۱۸۵۹ء، ۱۲۷۵ھ میں مکہ معظمہ حاضر ہوئے۔ حج سے فراغت کے بعد اگلے سال ۱۸۶۰ء، ۱۲۷۶ھ میں سوات پہنچ گئے اور کم وبیش دو سال میر مقصود علی کی ماتحتی میں کام کرتے رہے۔ (ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک صفحہ ۳۷)

۴۹۹۔ یہ بات فراموش نہ ہونی چاہیے کہ یہ نظام بے شک بکھر گیا۔ مگر ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات مردہ نہیں ہوئے۔ انہوں نے اسی زمانہ میں ایک دوسرے خفیہ نظام کے تار پھیلا دیئے یہ وہ نظام ہے جس کو انگریزی جاسوسوں نے ریشمی رومال کی

تحریک کا نام دیا۔ جس کے قائد شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی تھے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو علماء حق جلد اوّل اور نقش حیات جلد اوّل)۔ اسی زمانہ میں ملک کی سیاسی بیداری نے ایک دوسری انجمن کو روز افزوں ترقی دی۔ یہ وہی انجمن ہے جس کو انڈین نیشنل کانگریس کے باوقار نام سے یاد کیا جاتا ہے جو کچھ عرصہ بعد الجمن عزیز کی نجات دہندہ ثابت ہوئی۔

۵۰۰۔ اس پالیسی کا منشا یہ تھا کہ آزاد قبائل کے دشوار گذار پہاڑوں کو زیر نگیں کیا جائے۔ ان علاقوں میں فوجی چوکیاں قائم کی جائیں اور سڑکیں نکال کر راستوں کی دشواریوں کو ختم کیا جائے۔ عجیب بات یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس ہمیشہ اس پالیسی کی مخالفت کرتی رہی اور مسلم لیگ اس کی موافقت میں زبان اور قلم کی طاقت صرف کرتی رہی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مسلمانوں کا روشن مستقبل از سید طفیل احمد صاحب مرحوم۔

۵۰۱۔ تواریخ عجیب عرف کالا پانی۔ مطبوعہ اقبال اکاڈمی لاہور صفحہ ۸۔

۵۰۲۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں مولانا نور اللہ صاحب پارٹی کے لیڈر اور امیر رہے۔

۵۰۳۔ یہی وہ حملہ ہے جس کی طرف منشی محمد جعفر تھانیسری نے مذکورہ بالا بیان میں اشارہ کیا ہے۔

۵۰۴۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۳۰ تا ۳۵

۵۰۵۔ ایک درویش صفت آدمی جس نے یوسف زئی قبیلہ پر حیرت انگیز اثر جما رکھا ہے۔ اس قبیلہ کے علاوہ اور پٹھان قبائل بھی ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

۵۰۶۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۴۸ تا ۵۰۔

۵۰۷۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۵۱ تا ۵۷۔

۵۰۸۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۵۸، ۵۹۔

۵۰۹۔ تواریخ عجیب صفحہ ۸۔

۵۱۰۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۴۸۔

۵۱۱۔ ملاحظہ ہو جنرل رپورٹ آن یوسف زئی (jeneral report on yusuf zai) صفحہ ۹۹ و صفحہ ۱۰۰

۵۱۲۔ تواریخ عجیب۔

۵۱۳۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۲۔

۵۱۴۔ ایضاً صفحہ ۶۶۔

۵۱۵۔ ایضاً صفحہ ۲۲۔

۵۱۶۔ مولانا فرحت حسین (برادر خورد مولانا ولایت علی صاحب متوفی ۱۲۶۹ھ، ۱۸۵۲ء، مولانا عنایت علی غازی خلف مولانا فتح علی صاحب) پیدائش ۱۸۱۱ء، ۱۲۲۶ھ۔ یہ وہی نوجوان ہیں جو اپنے والد ماجد کے ساتھ حضرت سید احمد شہیدؒ کی خدمت میں رائے بریلی میں حاضر ہوئے تھے کہ سید صاحب کے زیر سایہ ہجرت کریں اور حضرت سید صاحب نے ان کے والد کو ضعف پیری اور اس بارہ سالہ نونہال کو صغر سنی کے باعث پٹنہ واپس کر دیا تھا۔ پٹنہ واپسی ضرور ہوگئی مگر سید صاحب اور آپ کے مسلک کی محبت کا تیر نیم کش کچھ اس طرح پیوست ہوا تھا کہ زندگی کے آخری لمحہ تک اس کی خلش کم نہ ہونے پائی۔ تکمیل علم کے بعد مراحل سلوک طے کیے اور تبحر علمی کے ساتھ روحانی کمالات میں مقام اعلیٰ حاصل کیا، اور جس طرح روحانی اور علمی کمالات کے مجمع البحرین تھے، فنون سپہ گری میں بھی آپ اعلیٰ مہارت کے مالک تھے۔ بہترین شہسوار، اعلیٰ درجہ کے قدر انداز، اڑتی چڑیا پر بھی آپ کا نشانہ خالی نہ جاتا۔ بنوٹ وغیرہ میں ایسے چابکدست کہ آپ اپنے پائیں باغ میں کرسی پر بیٹھ جاتے، ہاتھ میں "گدکا" لے لیتے۔ کھلاڑی لڑکے سب طرف سے حملہ کرتے اور آپ ہر ایک کی کاٹ کر کے اس پر حملہ کر دیتے۔ کوئی

کے منہ پر ایک فٹ چوڑا تختہ رکھوا کر اس پر کھڑے ہو جاتے۔ سب طرف سے آپ پر ڈھیلے برسائے جاتے مگر آپ سب کو وار خالی دیتے۔ ایک ڈھیلہ بدن پر نہ لگنے دیتے۔ علم و تقویٰ اور شجاعت و سپہ گری کے ساتھ آپ بہترین منتظم، دوراندیش مدبر، فقیر منش، مہمان نواز، غرباء پرور، علم دوست تھے۔ تقریباً تین سو طلباء آپ کے یہاں کھانا کھاتے۔ جاگیر کی تمام آمدنی طلبہ پروری اور مہمان داری میں صرف ہو جاتی۔ مسترشدین و معتقدین کا بھی اجتماع ہوتا۔ در مولانا ولایت علی صاحب کے نظام اوقات کے مطابق ظہر بعد درس قرآن، صبح شام ذکر و مراقبے وغیرہ کے مشاغل جاری رہتے۔ آپ کی اہلیہ محترمہ بھی ایسی ہی متقی اور صاحب نسبت خدا رسیدہ تھیں ذکر و مراقبہ سے نہ صرف واقف بلکہ ماہر۔ انہوں نے سات سال کی عمر میں سید صاحب سے بیعت کی تھی اور پھر ایسی بلند پایہ پاک باطن ہوگئیں کہ بڑے بڑے علماء ان سے استفاضہ کیا کرتے تھے۔ طلبہ پر اتنی شفیق کہ وہ اپنے رشتہ داروں کو بھول جاتے تھے رحمہم اللہ ورضی عنہم۔ (الدر المنثور صفحہ ۱۴۵تا۱۴۴)

۵۱۷۔ عمر ۴۸ سال ہوئی۔

۵۱۸۔ مولانا یحییٰ علی صاحب خلف مولانا الٰہی بخش صاحب پیدائش تقریباً ۱۸۲۲ء، ۱۲۳۴ھ۔ آبائی وطن مہدانواں تھا۔ والد صاحب نے (مولانا الٰہی بخش صاحب) صادق پور میں سکونت اختیار کر لی۔ بڑے بھائی مولانا احمد اللہ صاحب سے علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ پھر مولانا ولایت علی صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور انہیں کے ہو رہے۔ عالم باعمل، عابد و زاہد، بہترین واعظ و مقرر، اعلیٰ درجہ کے منتظم۔ آپ کی حیرت انگیز تنظیم نے انگریزوں سے بھی خراج تحسین حاصل کیا۔ پیدائش کی صحیح تاریخ اور سنہ مولانا عبدالرحیم صاحب کو بھی معلوم نہ ہو سکا۔ آپ کا یہی ارشاد ہے کہ آپ کی عمر تقریباً ۴۲۔۴۷ برس کی ہوئی۔ (در منثور صفحہ ۷۶) ۱۱ جنوری ۱۸۶۷ء کو آپ انڈمان پہنچے۔ وعظ و تبلیغ کا سلسلہ وہاں بھی شروع کر دیا۔ گھر گھر پہنچ کر حسن اخلاق و صوم و صلوٰۃ کی تلقین کرتے تھے۔ اسی طرح یاد خدا، تعلیم و تلقین اور خدمت خلق اللہ میں دو سال گذارے۔ ۲۰ رفروری ۱۸۶۹ء کو داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے داخل خلد بریں ہوئے۔ تقریباً چودہ روز بخار رہا بخار و درد و ورم نے کچھ عرصہ علیل رہے۔ رحمہ اللہ ورضی عنہ۔ (در منثور صفحہ ۷۷)۔ مصائب و آلام کا مختصر تذکرہ آئندہ صفحات میں آئے گا۔ دیکھئے: دونوں کھلنے

۵۱۹۔ مولانا احمد اللہ صاحب، مولانا یحییٰ علی صاحب کے برادر بزرگ۔ پیدائش ۱۲۲۳ھ۔ مولانا ولایت علی صاحب سے ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ مولانا منور علی صاحب ساکن شاہ آباد سے تکمیل کی۔ حضرت سید احمد شہیدؒ سے شرف بیعت حاصل کیا۔ اپنی ریاست کے نظم و نسق، سرکاری سطح پر اہل شہر کی خدمت اور رفاہ عام کے مشاغل کے ساتھ درس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ۱۸۶۵ء (۱۲۸۱ھ) میں گرفتار کیے گئے۔ ۲۸ رذی الحجہ ۱۲۹۸ھ کو آپ نے تنگنائے دنیا کی قید سے رہائی پائی۔ جزیرہ انڈمن ڈنڈا ایجنٹ میں سمندر کے کنارے ایک ٹیلہ پر آرام گاہ بنایا (در منثور صفحہ ۷۵)۔

۵۲۰۔ مولوی محمد حسن صاحب، مولانا ولایت علی صاحب کے سب سے چھوٹے فرزند ۱۲۶۳ھ میں پیدا ہوئے۔ مولانا ولایت علی صاحب نے دوبارہ ہجرت کی تو آپ کی عمر تقریباً پانچ سال تھی۔ مولانا ولایت علی صاحب لال قلعہ میں بادشاہ کے مہمان ہوئے تو بہادر شاہ ظفر نے آپ کو اپنی گود میں بٹھایا۔ دریافت کیا۔ بیٹا کیا پڑھتے ہو؟ اس نونہال نے جواب دیا۔ قرآن شریف بامعنی۔ بادشاہ کو اس جواب سے تعجب ہوا۔ بہر حال اعلیٰ درجہ کے ذہین و ذکی تھے۔ اس خاندان کے آخری فرد مولانا عبدالرحیم صاحب جب گرفتار ہوئے تو آپ نے مولوی محمد حسن صاحب سے فرمایا اب میں جاتا ہوں، اب گھر بار کی خبر گیری تم کرو۔ مولانا عبدالرحیم صاحب کا بیان ہے یہ سن کر مولوی محمد حسن کا رنگ ہی دوسرا ہو گیا۔ اس وقت عمر کے صرف سترہ دور پورے کیے تھے۔ مگر اس نوعمری میں وہ کاروائیاں کر دکھائیں جو پچاس سال کی عمر رسیدہ اور تجربہ کار شخص سے ظہور میں آنی مشکل ہیں۔ خاندان کے بزرگوں کے مقدمات انبالہ، کلکتہ اور پٹنہ میں، تین جگہ چلے۔ اس سترہ سالہ نوجوان نے ان مقدمات کی پیروی میں چھ سال اس طرح گذارے کہ آج انبالہ میں ہیں تو کل پٹنہ میں، اور پرسوں کلکتہ

میں۔ پیروی میں ہزاروں روپیہ کا خرچ تھا، اس کا انتظام اور پھر ولایت سے بیرسٹروں اور کونسلروں کو بلوانے کا انتظام معمولی کام نہ تھا، اور پھر مقدمہ بھی ایسا نازک اور خطرناک، جس کی مدعی خود سرکار۔ اس کے باوجود سارے خاندان کی خبر گیری، ان کی ضروریات کی فراہمی بہر حال حیرت انگیز جدوجہد اور جانفشانی سے کام لیا۔ مگر ساتھ ساتھ اپنی پالیسی بھی بدل دی۔ زمانہ باتو نسازد تو باز مانہ بساز، پر عمل کیا۔ کہاں صادق پور کے محلات جہاد حریت کے رضاکاروں اور مجاہدین کے لیے وقف تھے اور کہاں محمڈن اینگلو عربک اسکول کی بنیاد پڑنے لگی۔ سرکار نے بھی حسن خدمات کی قدر کی۔ آپ کو جلد ہی شمس العلماء کا خطاب مل گیا۔ مگر افسوس عمر نے وفا نہ کی۔ دو ہفتہ حب محرقہ اور لرزہ میں رہ کر جوان عمری ہی میں ۷ ربیع الاول ۱۳۰۷ھ ۲ نومبر ۱۸۸۹ء کو انتقال کیا۔ تقریباً چالیس سال عمر ہوئی۔ (در منثور صفحہ ۱۵۲ تا ۱۵۸)۔

۵۲۱۔ ڈاکٹر ہنٹر کا بیان ہے: وہابیوں نے باغیانہ رجحان رکھنے والے عوام تک پہنچنے کے لیے ایک چوتھی راہ نکالی تھی۔ ابتداء ہی میں خلفاء نے اس بات کی حوصلہ افزائی کی تھی کہ جہاں کہیں بھی ان کے مریدوں کی تعداد اس بات کی اجازت دے، مبلغین کو چاہیے کہ وہاں اپنی ایک مستقل بستی قائم کرلیں۔ اس طرح بنگال کے دیہات میں متعدد غدار بستیاں قائم ہوتی گئیں۔ (ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۱۶)۔

۵۲۲۔ بغاوت کے یہ ضلع وار مرکز پٹنہ کے مرکزی دارالاشاعت سے باقاعدہ خط وکتابت رکھتے تھے۔ پھر مرکز روپیہ جمع کرنے اور آدمی بھرتی کرنے کا ایک انتظام کرتا۔ جو بذاتِ خود بالکل مکمل ہوتا تھا۔ (ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۱۶)

۵۲۳۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۴۸

۵۲۴۔ الدر المنثور صفحہ ۱۳۵ و ۱۴۷۔

۵۲۵۔ یعنی شاہراہ اعظم، جو شیر شاہ سوری کی بنوائی ہوئی کلکتہ سے پشاور تک ہے۔

۵۲۶۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۳۵ اور ۱۳۶۔

۵۲۷۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۲۰۔

۵۲۸۔ مذہبی اور تعلیمی اداروں کے لیے یہ طریقہ کبھی اب بھی رائج کردیا جاتا ہے۔ اس کو چٹکی فنڈ کہا جاتا ہے۔ مگر اس میں ہر فرد کے حساب سے نہیں بلکہ ہر چولہے کے لحاظ سے ایک چٹکی فی وقت دی جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں اس وقت بھی ہر چولہے پر ایک چٹکی رکھی گئی ہوگی۔ کیونکہ ہر فرد کے حساب سے ایک مٹھی آٹا یا چاول کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ غریب آدمی اس کو برداشت نہیں کرسکتا۔

۵۲۹۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۱۹ تا ۱۲۲۔

۵۳۰۔ ایضاً صفحہ ۱۴۴۔

۵۳۱۔ ۱۹۳۰ء میں احقر جمعیۃ علماء ہند و رکانگریس کمیٹی صوبہ یوپی کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے تحریک ستیہ گرہ میں گرفتار ہوا، اور مراد آباد سے فیض آباد جیل میں منتقل کیا گیا تو وہاں آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ یحیٰ صاحب اگرچہ سیاسی قیدی تھے اور ایک معزز اور متمول خاندان کے فرد ہونے کی حیثیت سے آپ کو کلاس بھی "بی" ملی ہوئی تھی مگر آپ کو اخلاقی قیدیوں کے ساتھ رکھا گیا تھا، اور کڑی نگرانی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے پاس قرآن شریف بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔

۵۳۲۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۸۔

۵۳۳۔ مولانا مسعود عالم صاحب رحمہ اللہ مصنف اسلامی تحریک صفحہ ۹۳۔

۵۳۴۔ راونشا (T.R.Revensha) کلکٹر پٹنہ ۱۸۶۵ء۔

۵۳۵۔ ہنٹر نے مولا بخش کے بجائے الٰہی بخش لکھا ہے۔ بظاہر ایک ہی شخص کے دونوں نام ہیں۔ ایک اصلی نام ہے دوسرا جعلی نام۔

۵۳۶۔ پہلی اسلامی تحریک صفحہ ۹۲ حاشیہ۔

۵۳۷۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۴۱۔

۵۳۸۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۳۷ تا ۱۳۹۔

۵۳۹۔ ایضاً صفحہ ۱۴۱۔

۵۴۰۔ "اور سنہ ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز دور میں بھی باقی رکھا گیا" اتنا اور اضافہ کر لینا چاہیے۔ محمد میاں۔

۵۴۱۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۴۳ و ۱۴۴۔

۵۴۲۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۴۱۔

۵۴۳۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۴۳۔

۵۴۴۔ ماخوذ از اسلامی تحریک صفحہ ۱۰۰ و صفحہ ۱۰۲ از مولانا مسعود عالم مرحوم بحوالہ کلکتہ گزٹ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء وہابی ٹرائل۔ فیصلہ مقدمہ از مسٹر ڈبلیو۔ ایشلی۔

۵۴۵۔ تواریخ عجیب صفحہ ۲۰ شائع کردہ اقبال اکاڈمی لاہور۔

۵۴۶۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۴۷۔

۵۴۷۔ ماخوذ از ہمارے ہندوستانی مسلمان۔

۵۴۸۔ جو مولانا عنایت علی صاحب اور انگریزی فوجوں میں ہوئی محمد میاں۔

۵۴۹۔ غزن خان یوسف زئی کے علاقہ کا باشندہ تھا۔ (اسلامی تحریک صفحہ ۱۰۶)۔

۵۵۰۔ ماخوذ از ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۲۵۔

۵۵۱۔ تواریخ عجیب صفحہ ۳۴۔

۵۵۲۔ تواریخ عجیب صفحہ ۱۹۔

۵۵۳۔ ایضاً صفحہ ۲۰۔

۵۵۴۔ ایضاً صفحہ ۲۰۔

۵۵۵۔ الدر المنثور صفحہ ۱۳۹۔

۵۵۶۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۴۳۔

۵۵۷۔ تواریخ عجیب صفحہ ۸۷۔

۵۵۸۔ خطبہ صدارت مسلم لیگ ۱۹۳۵ء۔

۵۵۹۔ تواریخ عجیب صفحہ ۳۸۔

۵۶۰۔ تواریخ عجیب صفحہ ۲۲۔

۵۶۱۔ تواریخ عجیب صفحہ ۱۷ و ۱۸۔

۵۶۲۔ ایضاً صفحہ ۲۲۔

۵۶۳۔ تواریخ عجیب صفحہ ۳۲۔

۵۶۴۔ ایضاً صفحہ ۳۰۔

۵۶۵۔ تواریخ عجیب صفحہ ۴۲۔

۵۶۶۔ یہ باب مولانا مسعود عالم صاحب کی تصنیف "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" سے ماخوذ ہے۔ حسب ضرورت رد و بدل اور اضافہ کیا گیا ہے۔ محمد میاں

۵۶۷۔ تواریخ عجیب صفحہ ۳۸۔

۵۶۸۔ سب سے پہلی اسلامی تحریک صفحہ ۱۱۰۔

۵۶۹۔ تواریخ عجیب صفحہ ۱۴۱۔

۵۷۰۔ جلیل القدر عالم و فاضل۔ بہت بڑے شاعر۔ بقول سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم "خاقانِ ہند" (اسلامی تحریک صفحہ ۱۳۰)۔

۵۷۱۔ یعنی مولانا احمد اللہ صاحب۔

۵۷۲۔ عید کی صبح ہوئی اور خاندان صادق پور کی تمام عورتوں اور بچوں کو گھروں سے باہر نکال دیا گیا۔ جو کچھ تھا سب ضبط کر لیا گیا۔ کسی کو ایک سوئی تک لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ یہ خانہ برباد گھر سے نکل کر حکیم ارادت حسین صاحب کے مکان میں پناہ گزیں ہوئے۔ حکیم ارادت حسین صاحب بھی اگرچہ خاندانِ صادق پور سے قریبی تعلق رکھتے تھے مگر وہ مقدمہ انبالہ کے فوراً بعد (رجب ۱۲۸۱ھ۔ نومبر ۱۸۶۴) مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے۔ اس لیے ان کا مکان دست برد اغیار سے محفوظ رہا۔ اور پورے صادق پور میں بھی ایک مکان اپنی حالت پر باقی رہ گیا تھا۔ حکیم ارادت حسین صاحب نے ۱۳ سال زندگی کے گذار کر مکہ معظمہ میں وفات پائی۔ اُن کے اہل و عیال صادق پور میں رہے۔

۵۷۳۔ مثنوی شہر آشوب مطبوعہ الہ آباد۔

۵۷۴۔ صادق پور اور موجودہ بانکی پور کے درمیان شہر پٹنہ کا ایک محلّہ۔

۵۷۵۔ الدر المنثور

۵۷۶۔ کسی صاحب نے مولانا امیر الدین صاحب کو مولانا عبدالرحمٰن صاحب کا لڑکا کہہ دیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے دیکھو ریاونشا کی یادداشت (میمورنڈم) بنام حکومت بنگال بحوالہ کلکتہ گزٹ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء۔

۵۷۷۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۴۴۔

۵۷۸۔ ایضاً صفحہ ۱۱۹۔

۵۷۹۔ ایضاً صفحہ ۱۱۹۔

۵۸۰۔ ایضاً صفحہ ۱۲۲۔

۵۸۱۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۴۹۔

۵۸۲۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۴۹۔

۵۸۳۔ ایضاً صفحہ ۱۵۱۔

۵۸۴۔ ایضاً صفحہ ۱۵۱۔

۵۸۵۔ ہنٹر صاحب کے یہ الفاظ پہلے گذر چکے ہیں کہ اس وقت بھی (یعنی جون ۱۸۷۱ء میں) قیدیوں کی بہت بڑی تعداد، جو دور دراز کے مختلف ضلعوں سے جمع کی گئی ہے، اپنے جرموں کی سزا بھگت رہی ہے یا اپنے مقدمہ کے شروع ہونے کے انتظار میں ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۶۳)

۵۸۶۔ پہلی اسلامی تحریک صفحہ ۱۲۹۔

۵۸۷۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۱۲۔

۵۸۸۔ تواریخ عجیب صفحہ ۸۷۔

۵۸۹۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۱۲۔

۵۹۰۔ تواریخ عجیب صفحہ ۸۷۔

۵۹۱۔ پہلی اسلامی تحریک صفحہ ۱۳۷۔

۵۹۲۔ مسٹر ای۔ ریسنک۔ اسلامی تحریک صفحہ ۱۳۵ و ۱۳۹۔

۵۹۳۔ مسٹر انسٹی بیرسٹر بمبئی جو امیر خاں ملزم کی طرف سے پیش ہوا تھا۔

۵۹۴۔ اسلامی تحریک صفحہ ۱۳۸۔

۵۹۵۔ ایضاً صفحہ ۱۳۹۔

۵۹۶۔ امیر خاں ۱۸۷۹ء میں رہا کیے گئے۔ رسالہ اشاعت السنہ جلد ۵/ ۱۲ میں رہائی کا ۱۸۷۷ء تحریر کیا گیا۔ بہرحال مدت سزا چار سال نہیں بلکہ ۷ یا ۸ سال ہوتی ہے۔

۵۹۷۔ بار بار اپیل اور "ہیبس کورپس" کے نتیجہ میں مہربان گورنمنٹ نے صرف یہ عنایت فرمائی کہ ان کو انڈمان نہیں بھیجا بلکہ ہندوستان ہی کے جیل خانہ میں رکھا گیا۔ اسلامی تحریک صفحہ ۱۴۰۔

۵۹۸۔ ماخوذ از اسلامی تحریک صفحہ ۱۳۹ و ۱۴۳۔

۵۹۹۔ ۱۸۷۱ء میں مسٹر ہنٹر نے لکھا تھا "سالہا سال سے سرحد کے مجاہدین کی نوآبادی ہماری سرحد پر چھاپے مار رہی ہے۔ وقتاً فوقتاً وہ متعصب لوگوں کے گروہ بھی بھیج دیتی ہے جو ہمارے کیمپ پر حملہ آور ہوتے ہیں، اور ہمارے گاؤں کو جلا کر خاکستر کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ہماری فوج اُن کے ساتھ تین تباہ کن لڑائیاں لڑ چکی ہے۔ اس مخالف نوآبادی کے لیے نہایت ہی منظم طریقہ پر بنگال میں آدمی بھرتی کیے جاتے ہیں، اور یکے بعد دیگرے مختلف سازشی مقدمات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے، کہ سازش کا یہ جال ہمارے تمام صوبوں میں پھیلا ہوا ہے۔ چنانچہ پنجاب سے پرے کا کوہستانی تیرا آباد علاقہ گرم ملک کی اُن دلدلوں سے جہاں دریائے گنگا سمندر میں جا گرتا ہے۔ اس قسم کے مسلسل سازشی اداروں سے ملا ہوا ہے ان مقدمات سے ایسے سازشی اداروں کا بھی پتہ چلا ہے جو گنگا کے دہانے سے بڑی باقاعدگی کے ساتھ روپیہ اور آدمی حاصل کرتے ہیں اور اُن کو ہر ی جرنیلی سڑک پر منزل بہ منزل گذارتے ہوئے باغی کیمپ میں پہنچا دیتے ہیں جو یہاں سے دو ہزار میل کی مسافت پر واقع ہے۔ بڑے بڑے ذہین اور دولت مند اشخاص اس سازش میں حصہ لے رہے ہیں اور روپیہ پہنچانے کے طریقے کو جو باغیانہ سازش کا ایک نہایت ہی خطرناک کام ہے۔ کمال ہوشیاری سے ایک بے ضرر مہاجنی کاروبار کا رنگ دے دیا ہے۔ (ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۷ و ۱۸)۔

۶۰۰۔ بہرحال تاریخ کی یہ بات دہرا دینا ضروری ہے کہ ۱۸۵۷ء کی ہولناک سزائیں بھی مسلمانوں کے دماغوں سے بغاوت کے جراثیم ختم نہ کر سکیں۔ ۱۸۷۱ء میں مسٹر ہنٹر نے لکھا تھا۔ اب تک یہ (مجاہدین اور اُن کا کیمپ) ہماری غیر وفادار رعایا اور ہمارے سرحد پار کے دشمنوں کی اُمید کا مرکز بنا ہوا ہے...... ہمیں ان غداروں کی اپنی ذات سے ڈر نہیں۔ اگر ہمیں ڈر ہے تو ان شورش پسند عوام سے جن کو یہ غدار (مجاہدین) ہمارے خلاف جہاد کرنے کے لیے بار بار اکٹھا کرتے ہیں (ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۶۴ و ۶۵)

۶۰۱۔ پھانسی کے مجرمین کے ساتھ انگریزی دور میں آخر تک یہی طرز عمل رہا۔ کوٹھریوں کی ساخت میں کہیں کہیں فرق کر دیا گیا۔ مثلاً یہ کہ پشت کی طرف بھی آہنی جنگلا لگا دیا گیا۔ پھانسی گھر کی کوٹھریوں میں ایک خاص بات یہ ہوتی تھی کہ دروازہ کا آہنی جنگلا ایسا رکھا جاتا تھا کہ سنتری کی نظر ہر ایک گوشہ پر پڑتی رہے۔ تاکہ ملزم کسی گوشہ میں چھپ کر خودکشی جیسے جرم کا ارتکاب نہ کر سکے۔ پاخانہ، پیشاب سب کچھ اس کوٹھری میں کرنا پڑتا۔ جس میں پردہ کا کوئی امکان نہیں ہوتا تھا۔

۶۰۲۔ تواریخ عجیب صفحہ ۱۵۔

۶۰۳۔ الدر المنثور صفحہ ۳۷۔

۶۰۴۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۴۳۔

۶۰۵۔ تواریخ عجیب صفحہ ۲۰۔

۶۰۶۔ الدر المنثور صفحہ ۷۰۔

۶۰۷۔ E. Rehstsek بحوالہ پہلی اسلامی تحریک صفحہ ۱۳۸۔

۶۰۸۔ تواریخ عجیب صفحہ ۴۴۔

۶۰۹۔ ایضاً صفحہ ۴۴۔

۶۱۰۔ تواریخ عجیب صفحہ ۴۷

۶۱۱۔ الدر المنثور صفحہ ۱۹۷۔ مولانا عبدالرحیم صاحب اگرچہ مقدمہ سازش انبالہ میں مولانا یحییٰ علی صاحب اور مولانا محمد جعفر صاحب وغیرہ کے ساتھ تھے۔ مگر جب ان ملزمین کو انبالہ جیل سے لاہور منتقل کیا جا رہا تھا تو اُن کو (مولانا عبدالرحیم صاحب کو) انبالہ جیل ہی میں روک لیا گیا تھا کہ اُن کے ذریعہ مولانا عبداللہ صاحب سے (امیر لشکر مجاہدین سے جو اُن کے چچازاد بھائی تھے) صلح کی بات چیت کی جائے اس کے علاوہ تنفس کی بھی آہنی کی بھی اتنی شدت تھی کہ ڈاکٹر نے سفر کی اجازت نہیں دی تھی۔ گفتگوئے صلح میں واسطہ بننے سے مولانا عبدالرحیم صاحب نے انکار کیا تو اُن کو بھی انڈمان بھیج دیا گیا۔ اس بہانہ سے یہ اپنے دوسرے ساتھیوں سے جدا ہو گئے اور دو سال بعد انڈمان پہنچ کر ملاقات ہو سکی۔ (ملاحظہ ہو الدر المنثور صفحہ ۴۷)

۶۱۲۔ الدر المنثور صفحہ ۲۰۷۔ اس مشقت سے نجات پانے کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔ مولانا عبدالرحیم صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ ''چونکہ اس وقت (جب یہ مشقت مولانا کو سپرد کی گئی) ڈاکٹر صاحب موجود نہ تھے مجسٹریٹ صاحب نے یہ کارروائی اپنے دل کا غصہ نکالنے کو کر لی۔ جب ڈاکٹر صاحب دو تین روز کے بعد جیل میں آئے اور نو آمد قیدیوں کا ملاحظہ کیا۔ مولانا موصوف کو رہٹ کے کام میں دیکھ کر داروغہ پر نہایت خفا ہوئے۔ ... داروغہ نے عرض کیا کہ مجسٹریٹ صاحب خود آ کر لگا گئے تھے۔ چونکہ ڈاکٹر اور مجسٹریٹ کے درمیان چشمک تھی فی الفور آپ کو وہاں سے چھڑوا کر برعکس اس کے ایک نہایت آسان کام میں لگا دیا۔ یعنی دری بافی کے کارخانہ میں سوت سلجھانے کا کام آپ کے سپرد کر دیا۔ جو سایہ میں چھت کے نیچے بیٹھ کر انجام دیتے تھے (الدر المنثور صفحہ ۲۰۷)

۶۱۳۔ تواریخ عجیب صفحہ ۲۸۔

۶۱۴۔ الدر المنثور صفحہ ۶۹۔

۶۱۵۔ تواریخ عجیب صفحہ ۲۸ و ۲۹۔

۶۱۶۔ تواریخ عجیب کا جو نسخہ ہمارے سامنے ہے اس میں ''بھاری مجرم'' کا لفظ ہے۔ بظاہر یہ غلط ہے کیونکہ مجرم سب یکساں تھے۔ ایک ہی دفعہ میں سب ماخوذ تھے۔ اس کے علاوہ جرم کی بنا پر خاص قسم کے رسّیمں پھندے کا قاعدہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے بظاہر ''مجرم کم'' کے بجائے کاتب صاحب نے ''مجرم'' لکھ دیا ہے۔

۶۱۷۔ تواریخ عجیب صفحہ ۳۵۔

۶۱۸۔ محمد شفیع صاحب سوداگر چرم کو بھی پھانسی کا حکم ہوا تھا۔ مگر وہ وعدہ معاف گواہ بن گئے تھے۔ لہٰذا اس فہرست سے خارج ہیں۔ محمد میاں

۶۱۹۔ تواریخ عجیب صفحہ ۳۲۔

۶۲۰۔ ایضاً صفحہ ۳۴، ۳۵۔

۶۲۱۔ تواریخ عجیب صفحہ ۳۰۔

۶۲۲۔ سفید جھوٹ کی بھی انتہا ہو گئی۔ ۱۸۵۷ء میں جو ہزاروں بے گناہ محض شبہ پر پھانسی پر لٹکا دیئے گئے وہ شاید خون گرانا نہیں تھا۔ یا ان بے گناہوں کے جسم میں خون ہی نہیں تھا۔

۶۲۳۔ الدر المنثور صفحہ ۷۰، ۷۸۔

۶۲۴۔ الدر المنثور صفحہ ۶۹۔

۶۲۵۔ الدرالمنثور صفحہ ۱۷۔

۶۲۶۔ اگر تعمیل نہ کرتے تو جیل خانہ کی کوئی سزا دی جاتی۔ اور داڑھی رکھنا اگرچہ واجب یا سنت مؤکدہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن غالباً مولانا موصوف کی رائے میں اس سنت کی یہ حیثیت نہیں تھی جس کے لیے سزا کی کوئی نئی مصیبت برداشت کی جاتی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۶۲۷۔ تاریخ عجیب صفحہ ۳۵۔

۶۲۸۔ اور جو لوگ ایسے ہیں کہ صبر کرنے والے ہیں، انہیں (کامیابی کی) بشارت دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کبھی اُن پر کوئی مصیبت آن پڑتی ہے تو اُن کی زبانِ حال کی صدا یہ ہوتی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون سو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اُن کے پروردگار کے الطاف وکرم ہیں اور جو اس رحمت کا مورد ہوتے ہیں، اور یہی ہیں جو اپنے مقصد میں کامیاب ہیں (ترجمان القرآن)۔

۶۲۹۔ اے ہمارے پروردگار ہمیں صبر کی نعمت سے شادکام فرما، اور ہمیں اسلام کی حالت میں اس دنیا سے اُٹھا۔

۶۳۰۔ شاید ہمارا پروردگار ہمیں اس کا اچھا بدلہ دے۔ ہم اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔

۶۳۱۔ یہ تاریخی مثالیں سب درست ہیں لیکن اس موقع پر یہ بھی مسجد اقصیٰ وغیرہ کے انہدام اور دوبارہ آبادکاری، دو چار یا دس پانچ سال میں نہیں ہوئی۔ بلکہ صدیاں گذر گئیں۔ تب یہ انقلاب عمل میں آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انقلابی طاقتیں اول تخم کی طرح نشوونما پاتی ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ ترقی کر کے زلزلہ اور طوفان بن جاتی ہیں۔ ابتدائی اور آخری منزل میں بسا اوقات صدیوں کا فرق ہوتا ہے۔ چشم ظاہر بیں ابتدائی منزلوں کو محسوس بھی نہیں کر سکتی۔ مگر درحقیقت مستقبل کا تخم یہی ابتدائی منزل ہوتی ہے اور اس منزل کی بنیاد رکھنے والے ہی عظیم الشان مستقبل کے اولین معمار ہوتے ہیں۔ پس مولانا یحییٰ علی صاحب اور اُن کے رفقاء کی جدوجہد کا کوئی ثمرہ اُس وقت ظاہر نہیں ہوا۔ مگر حب وطن اور ولولہ آزادی کا وہی تخم تھا جو دن بدن بڑھتا رہا اور یہاں تک کہ اس کا ایک ثمرہ وہ ہے جو تقریباً نوے سال بعد آزادی ہند کی شکل میں نمودار ہوا۔ جس نے انگریزوں کو پورے ہندوستان سے ملک بدر کر دیا۔ بس مولانا کی یہ خواب نظر ظاہر بیں میں وہم وخیال ہو سکتی ہے لیکن دوراندیش اور حقیقت شناس نظریں اس کو رویاء صادقہ قرار دیں گی۔ محمد میاں

حصّہ چہارم

فہرست

اسباب و وجوہات اور پس منظر (۱)

(۱) اقتصادی وجوہات

پروفیسر باری کی مشہور کتاب ''کمپنی کی حکومت'' کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''ہندوستان میں مغلوں کی حکومت جاگیری نظام کا عروج تھی۔ جاگیری عہد کی تاریخ میں اتنی بڑی سلطنت کسی دوسری جگہ دکھائی نہیں دیتی۔

سترہویں صدی عیسوی کے آخری سالوں میں مغل حکومت نے دکن کی ریاستوں کو ختم کرنا چاہا۔ چنانچہ لمبی لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان لڑائیوں نے مفتوح کو کمزور اور فاتح کو کمزور تر کردیا۔ چند سال بعد مغل سلطنت کی مرکزیت ختم ہوگئی۔ (۲) دہلی ہی کے نمونے پر ہندوستان میں کئی ایک جاگیری ریاستیں قائم ہوگئیں۔ یہ ریاستیں دہلی سے تو کٹ چکی تھیں، انہیں عام طور پر اُسی نظام کی پیروی کررہی تھیں جو صدیوں سے دہلی میں رائج ہوچکا تھا۔

ان ریاستوں نے پیدائش کی نئی نئی قوتوں کو دبائے رکھا۔ اس دباؤ سے ان ریاستوں کا جاگیری نظام بھی ٹوٹنے لگا۔ جب یہ جاگیری نظام ٹوٹ رہا تھا، تب انگریزوں نے ہندوستان کی سیاست میں دخل دیا۔

انگلستان میں جاگیری نظام ختم ہوچکا تھا۔ وہاں پیدائش کے نئے عناصر کارفرما تھے۔

انسانی تہذیب کی تاریخ میں ان عناصر نے خواہ کتنے ہی اہم نتائج پیدا کیے ہوں، وہ ہندوستان کی تسخیر میں سب سے زیادہ موثر ثابت ہوئے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں جن حکمرانوں کو آسانی سے شکستیں دیں وہ پرانے اور مٹتے ہوئے جاگیری نظام کے علم بردار تھے۔ نئی معاشی قوتوں نے نہ صرف یورپ میں بلکہ ہندوستان میں بھی جاگیری نظام کو شکست دی۔ یورپی ملکوں میں اس نظام کو وہاں کے دیسی لوگوں نے ختم کیا۔ لیکن ہندوستان میں یہ نظام اجنبی ہاتھوں سے مٹا۔ اجنبی ہاتھوں نے اس نظام کو جہاں مٹادیا اور جہاں چاہا اسے زندہ رکھا۔ اس مٹتی ہوئی جاگیر شاہی نے ۱۸۵۷ء میں انگڑائی لی۔ (۳)

اگر آپ پروفیسر صاحب کی اس فاضلانہ تحریر کا خلاصہ معلوم کرنا چاہیں تو اس کے مختصر الفاظ یہ ہوں گے:

(۱) یہ تحریک صرف ہنگامی شورش نہیں تھی جو چند شورہ پشت اور سرکش فوجی افسروں کی ناراضگی سے پیدا

ہوگئی تھی۔ بلکہ اس کی تہ میں ایسے اسباب موجود تھے جن کو نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمی حالات کا تقاضا کہا جاسکتا ہے جن کا سلسلہ پوری دنیا ورنہ کم از کم ہندوستان اور بیدار مغرب یورپ میں عرصہ سے چل رہا تھا۔

(۲) ہندوستان کے نظام کہن کو بدلنے میں انگریزوں نے عالمی حالات کی آڑ ضرور لی۔ مگر صرف مالش کی حد تک۔ ورنہ ان کا حقیقی نصب العین انگریزی شاہنشاہیت کا بقا اور تحفظ تھا۔ اسی وجہ سے سب جگہ ان کا عمل یکساں نہیں رہا۔

بلکہ بقول پروفیسر صاحب:

''جہاں چاہا اس نظام کو مٹایا اور جہاں چاہا زندہ رکھا''۔

(۳) اس ردوبدل کا لازمی نتیجہ تھا کہ بحرانی اور اضطرابی کیفیت پیدا ہو۔ چنانچہ پروفیسر صاحب کی رائے ہے:

''اس مٹتی ہوئی جاگیرشاہی نے ۱۸۵۷ء میں انگڑائی لی''۔

پروفیسر صاحب کا منشا یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کا یہ ہنگامہ محض وقتی نہیں تھا بلکہ ایک عرصہ سے اس کی چنگاریاں ہندوستانی جذبات کے خاکستر میں سلگ رہی تھیں۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''لارڈ ڈلہوزی کے مستعفی ہونے کے بعد لارڈ کیننگ (۱۸۵۶۔۱۸۶۲) کو ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا کمپنی کی مجلس نظامت نے لندن میں لارڈ کیننگ کو ایک الوداعی پارٹی دی۔ اس پارٹی میں تقریر کرتے ہوئے لارڈ کیننگ نے کہا:

''میری خواہش ہے کہ میرا عہد حکومت پر امن رہے لیکن میں اس بات کو نہیں بھول سکتا کہ ہندوستان کی فضا میں بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دکھائی دے گا، اتنا چھوٹا جتنا انسانی ہاتھ لیکن یہ ٹکڑا اتنا بڑا ہوتا جائے گا کہ خود ہمارا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا''۔

پروفیسر صاحب اس پیشین گوئی کی تصدیق ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اگلے سال بنگال آرمی کے فوجیوں نے بغاوت کردی۔ انسانی ہاتھ اتنا بڑا بادل میرٹھ سے اٹھا۔ بادل بڑا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ شمالی ہندوستان پر چھا گیا''۔ (۳)

پروفیسر صاحب نے کمیونسٹ نقطۂ نظر سے اس عظیم الشان ہنگامہ کی جو وجہ بیان کی ہے (یعنی مٹتی ہوئی جاگیرشاہی کی آخری انگڑائی) وہ ممکن ہے کسی خاص مفہوم کے ساتھ درست ہوسکے۔ لیکن توجیہ کا یہ پہلو نظر انداز نہ ہونا چاہیے کہ اس صورت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارپرداز جن کے خلاف یہ علم بغاوت بلند کیا گیا تھا ہماری ہمدردیوں کے زیادہ مستحق ہیں، جن کا احترام ہر ایک انصاف پسند کو کرنا چاہیے۔ بہت سے بہت ان پر یہی الزام لگایا جاسکتا ہے کہ وہ نمائشی لیڈر کی طرح اپنے عمل میں اخلاص نہیں رکھتے تھے۔ مگر یہ الزام ایسا ہے جس سے بہت ہی کم رہنما اور زعماء نجات پاسکتے ہیں۔ حتیٰ کہ بیسویں صدی کے وہ رہنما جن کو کامیابی کے سہرے پہنائے گئے، اگر ان کی نیتوں اور ارادوں کا ایکسرے کیا جائے تو ایسی تعداد بہت ہی کم ہوگی جن کے جذبات حریت میں نمود و

نمائش اور گندم نمائی وجو فروشی کے دھبے نظر آئیں۔

پروفیسر صاحب شاید بہادر شاہ ظفر، جنرل بخت خاں، نواب جھجر، راجہ بلب گڑھ مہارانی لکشمی بائی، کنور جگدیش سنگھ، عظیم اللہ صاحب، تانتیا ٹوپے، نواب محمد علی اور نواب خان بہادر خان وغیرہ کو صرف اس بناء پر ہمدردی کا مستحق قرار دیں کہ ان پر ظلم بہت کیے گئے اور تہذیب کی دعویدار قوم نے بربریت اور سفاکی کے وہ مظاہرے کیے کہ ہلاکو اور نادر شاہ کی روحیں بھی کانپ اٹھیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ:

(۱) اوّل تو ہر ایک جاگیردارانہ نظام کو ایک ہی حیثیت دینا، اور روس کی نفرت انگیز و تباہ کن جاگیرشاہی کی عینک سے ہر ایک جاگیردارانہ نظام کو دیکھنا، ایسی انتہا پسندی ہے کہ کوئی بھی منصف مزاج اس کی تائید وحمایت نہیں کرسکتا۔

”خدا پنج انگشت یکساں نکرد“

چنانچہ روس کے نظام جاگیر شاہی کے مظالم سے عوام یہاں تک آزردہ تھے کہ کلیسا کو جاگیرداری کا ہم نوا دیکھا تو وہ کمیونزم کی حمایت میں نہ صرف کلیسا بلکہ مذہب سے بھی دست بردار ہوگئے۔

لیکن ہندوستان میں حالت اس کے برعکس تھی۔ ہندوستانی عوام ان اصلاح پسندوں کے مقابلہ میں اپنے پرانے جاگیرداروں کے حامی تھے۔ انتہا یہ کہ وہ ان کو ختم کرنے کے لیے ہر ایک قربانی دینے کو تیار تھے جو ان کے جاگیرداروں، مکھیاؤں، مقدموں اور گاؤں کے چٹیلوں کو ختم کرنا چاہتے تھے۔

اس سلسلہ میں ایسے افسر کی شہادت سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے جو ہندوستانی نہیں بلکہ انہیں اصلاح کے دعویداروں کا ہم قوم، ہم وطن اور ہم مذہب ہے اور جو صرف تحریر یا تجویز کا شاہد نہیں بلکہ تجاویز کو عملی جامہ پہنانا اُس کے سپرد ہے۔ یہ ولیم اڈوارڈس ہیں، جو اس ہنگامہ کے وقت ضلع بدایوں کے مجسٹریٹ تھے۔ ان کی تحریری شہادت ہے:

”ضلع میں ایسے بہت لوگ میرے دوست تھے جو مجھ کو پناہ دے سکتے تھے بلکہ یہ لوگ خود اس کے آرزومند تھے۔ لیکن میرے ساتھ میرے بہت سے ساتھیوں کو بھی پناہ دے کر اپنے امن کو تذبذب میں ڈال دینا کسی طرح پسند نہیں کرتے تھے، خصوصاً اس سبب سے کہ ان میں بعض لوگوں نے ایسی زمینداریاں مول لی تھیں جو ہماری دیوانی عدالتوں کی ڈگریوں میں سختی کے ساتھ نیلام ہوئی تھیں اور اسی لیے ضلع کے لوگ اُن سے عداوت رکھتے تھے۔ پچھلے بارہ پندرہ برسوں میں ایسے نیلام بڑی کثرت سے ہوئے، اور تحصیل مال گزاری کے ایسے طریقے جاری ہوئے کہ ملک کے رئیس لوگ برباد ہوگئے اور دیہات کے جتھے ٹوٹ گئے...... اکثر ذی مرتبہ اور مقتدر خاندانوں کے علاقے فریب یا دغابازی سے چھن گئے اور اجنبی لوگوں مثلاً مہاجنوں یا سرکاری ملازموں نے جن کا پاس ولحاظ یا دباؤ رعایا پر مطلق نہیں تھا، خرید لئے۔ یہ لوگ خود بھی اپنے

خریدے ہوئے علاقوں سے علی الاکثر غیر حاضر رہا کرتے ہیں۔ یا تو وہاں رہنے سے ڈرتے ہیں یا وہاں کا رہنا ان کو خوش نہیں آتا۔ کیونکہ ان کو وہاں کے لوگ غاصب اور دخیل بے جا کی طرح دیکھتے ہیں۔ پھر ان چھنے ہوئے علاقوں کے مالکان قدیم اسی اراضی پر جو پہلے کبھی ان کی اپنی تھی کاشتکارانہ قابض ہیں اور اپنی حالت کا انقلاب ان کو نہایت رنج دہ ہوتا ہے۔ گو قبضہ مالکان اراضی اُن کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن رعایا کی محبت اور ہمدردی پر ویسا ہی مستقل موروثی قبضہ رکھتے ہیں۔ جیسا ہمیشہ سے چلا آتا ہے، اور رعیت بھی آمادہ و متمنی ہے کہ جب کبھی ان کے کھیا کھویا ہوا درجہ یا اپنے علاقوں پر قبضہ حاصل کرنے کا ارادہ کریں، ان کا ساتھ دے۔(۵) ایک برس بلکہ اس سے بھی آگے میں نے حکام اعلیٰ سے صاف صاف بیان کر دیا تھا کہ دیوانی عدالتیں اپنے اختیارات بہت بری طرح عمل میں لاتی ہیں۔ اُن کا یہ طریقہ نہایت بے ٹھور ٹھکانے ہے کہ تھوڑے تھوڑے قرضوں کے لئے منافع و مرافق اراضی نیلام کرا ڈالتی ہیں اور اس سبب سے انتظام مدن میں خطرناک رد و بدل پیدا ہوتا ہے۔ میں نے یہ بھی جتا دیا تھا کہ اگرچہ پرانے خاندان جلد بے دخل کئے جا سکتے ہیں لیکن ہم پچھلی باتوں کی یاد تو نہیں مٹا سکتے یا اُن میں اور رعایا میں جو قدیم کا تعلق ہے اس کو تو نابود نہیں کر سکتے۔ میں نے صاف صاف پوست کندہ کہہ دیا تھا کہ ہم جو ان لوگوں کے آپس کے روابط توڑ دینا چاہتے ہیں، اس کے برخلاف جب کبھی کوئی بلوہ ہو پڑا تو ہم پائیں گے کہ مالکان قدیم کا یہ بڑا اور دباؤ والا گروہ کہ اسی کے ذریعہ سے ہم لاکھوں آدمیوں کی دیہاتی جماعتوں کو زیر اور مطیع کرنے کی اُمید رکھتے ہیں، ہمارے مقابلہ میں دشمن کی طرف اپنے موروثی ہمراہیوں اور ساتھیوں کو لئے صف باندھے ڈٹا ہوگا۔ میرے جتانے پر کچھ التفات نہ ہوا اور میں ڈرپوک سمجھا گیا کہ تم نے اب تک صرف ملکی صیغے میں نوکری کی ہے، معاملات مالی میں بالکل ناآزمودہ کار ہو، اور اس باب میں رائے صائب نہیں دے سکتے''۔(۶)

تشریح کے لیے سرسید مرحوم کی مشہور یادداشت (اسباب بغاوت ہند) کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

قوانین ضبطی اراضیات لاخراج جس کا آخر قانون ۱۸۱۹ء ہے حکومت ہندوستان کو نہایت مضر تھا۔ ضبطی اراضیات نے جس قدر ناراض اور بدخواہ ہماری گورنمنٹ کا کر دیا تھا، اس سے زیادہ اور کسی چیز نے نہیں کیا تھا۔ سچ فرمایا تھا لارڈ منرو اور ڈیوک آف ولنگٹن صاحب بہادر نے کہ ضبط کرنا معافیات کا، ہندوستانیوں سے دشمنی پیدا کرنی اور اُن کو محتاج کر دینا ہے۔ میں نہیں بیان کر سکتا کہ ہندوستانیوں کو کس قدر ناراضگی اور دلی رنج اور ہماری گورنمنٹ کی بدخواہی اور نیز کتنی مصیبت اور تنگی معاش اس سبب سے اُن کو تھی۔ بہت سی معافیات صدہا سال سے چلی آتی تھیں جو اونئے اونئے حیلہ پر ضبط ہو گئیں۔ ہندوستانی صاف خیال کرتے تھے کہ سرکار نے خود تو ہماری پرورش

نہیں کی بلکہ جو جاگیر ہم کو اور ہمارے بزرگوں کو اگلے بادشاہوں نے دی تھی وہ بھی گورنمنٹ نے چھین لی۔ پھر ہم کو اور کیا توقع گورنمنٹ سے ہے''۔ (۷)

ضبطی جائداد کے ساتھ دوسرا قاعدہ نیلام زمینداری کا تھا۔ اس کے نتائج کے متعلق سید صاحب کی شہادت ہے:

''بعوض زر قرضہ نیلام حقیت کے رواج نے بہت سے فساد برپا کئے مہاجنوں اور روپیہ والوں نے دم دے کر زمینداروں کو روپے دیئے اور قصداً اُن کی زمینداری چھین لینے کو بہت فریب برپا کئے اور دیوانی میں ہر قسم کے جھوٹے سچے مقدمات لگائے۔ اور قدیم زمینداروں کو بے دخل کیا اور خود مالک بن گئے۔ ان آفات نے تمام ملک کے زمینداروں کو ہلا ڈالا۔'' (۸)

''ابتداء عملداری سے آج تک شاید کوئی گاؤں ایسا ہوگا جس میں تھوڑا بہت انتقال (ردوبدل) نہ ہوا ہو۔ ابتدا ابتدا میں ان نیلاموں نے ایسی بے ترتیبی سے کثرت پکڑی کہ تمام ملک اُلٹ پلٹ ہو گیا۔'' (۹)

مہاجنوں کا ذکر آیا ہے تو واقعہ کی صحیح تصویر نظر میں لانے کے لئے مسئلہ سود کا بھی صحیح خاکہ سامنے رکھئے۔ بے شک ہندوستان میں سود کا رواج ہمیشہ رہا۔ مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کی وحشیانہ بھوک معمولی سود سے نہیں مٹ سکتی تھی۔ اُس نے سود در سود کا قانون بنایا جس کی ''ٹھنڈی مار'' نے تھوڑے ہی دنوں میں ہندوستان کا اقتصادی ڈھانچہ درہم برہم کر دیا۔ بڑے بڑے گھرانے ختم ہو گئے۔ ان کے سایہ میں پرورش پانے والے ہزاروں لاکھوں نفوس اناج کے ایک ایک دانہ کو محتاج ہو گئے، اور دولت کے یہ انبار یورپ کے ساہوکاروں یا اُن ہندوستانی مہاجنوں کی تجوریوں میں بند ہو گئے جن کے باورچی خانہ کا دھواں بھی کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔

زمینداری کی نوعیت

آج سوشلزم اور کمیونزم کے دور میں زمینداری کا لفظ ایسا ناگوار ہو گیا ہے کہ کان اُس کے سننے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ مگر واقعات کی کھود کرید کے وقت یہ نازک مزاجی کسی طرح بھی جائز نہیں۔

مظلوم کی داستان تو سننی ہی پڑتی ہے خواہ آپ کو کتنی ہی ناگوار ہو۔ سرسید زمینداروں کے حامی نہیں ہیں۔ مگر جو بات حق ہے، اس کا اظہار وہ بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہے:

''اگر خیال کیا جائے تو ہندوستان میں ہر ایک محال زمینداری کا ''ایک چھوٹی سی سلطنت'' دکھائی دیتی ہے۔ قدیم سے (دستور ہے) کہ سب کی رضامندی سے ایک شخص سردار ہوتا ہے۔ وہ ایک بات تجویز کرتا تھا اور ہر ایک حقیت دار کو بقدر اپنے حصہ زمینداری کے بولنے کا اور دخل دینے کا اختیار ہوتا تھا۔ رعیت باشندہ دیہہ (گاؤں میں رہنے والوں کے) چودھری بھی حاضر ہو کر کچھ کچھ گفتگو کرتے تھے۔ اگر کسی مقدمہ نے زیادہ طول پکڑا، تو کسی بڑے گاؤں کے مقدم اور سردار

کے حکم سے فیصلہ ہو گیا۔"

ہندوستان کے ہر ایک گاؤں میں بہت خاصی صورت ایک چھوٹی سلطنت اور پارلیمنٹ کی موجود تھی۔" (۱۰)

زمینداری اور جاگیرداری کے دور میں عدل وانصاف اور شہری حقوق کی ادائیگی کی یہ ایک صورت تھی۔

دوسرا مسئلہ کہ خود اُن زمینداروں اور جاگیرداروں کا سلوک اُن کے ساتھ جن کو رعایا کہا جاتا تھا، کیسا ہوتا تھا۔ تو سینکڑوں تاریخی مثالوں کی شہادت یہ ہے کہ زمیندار رعایا، راجہ اور پرجا کا باہمی تعلق، محبت وخیر خواہی، پرورش اور وفاداری کا ہر دلعزیز رشتہ مانا جاتا تھا۔

بے شک یورپین نفع اندوزوں کی آمد کے بعد جب استحصال بالجبر، نفس پرستی، بے دردانہ قتل وغارت اور انسانی حقوق سے بے پروائی کے ناپاک تختے جگہ جگہ تقسیم ہونے لگے، اور بے مروتی، خود غرضی، محنت کشی نے سکہ رائج الوقت کی حیثیت اختیار کر لی، تو کچھ زمینداروں اور جاگیرداروں نے بھی وہ ظلم وتعدی اختیار کی جن کی، مثالیں پیش کر کے موجودہ نسلوں کو اپنے پیش رو بزرگوں سے نفرت دلائی جاتی ہے۔ مگر اسی گئے گزرے دور میں (جبکہ یورپین نفع اندوزوں کو قدم جمائے ہوئے ڈیڑھ سو برس گزر چکے تھے) وہ مثالیں بھی سامنے آتی ہیں جن کی شہادت یہ ہے کہ بادسموم کی تمام آتش انگیزیوں اور شعلہ افشانیوں کے باوجود رعایا پروری اور غرباء نوازی کے چمن اب بھی بالکل خشک نہیں ہوئے تھے۔ محنت کش طبقہ کسی بھی عنوان سے جب اپنے زمینداروں اور جاگیرداروں کی پناہ ڈھونڈتا تھا تو یہ خزاں رسیدہ چمن اور گلشن، تازگی اور آسودگی کی بخشش میں فراخ حوصلگی کی مردہ روایتیں زندہ کرنے میں کوتاہی نہیں کیا کرتے تھے۔ اس وقت "مشتے نمونہ از خروارے" ہندوستان کے سب سے بڑے نامور جاگیردار بہادر شاہ کی سیر چشمی اور فراخ حوصلگی کی صرف ایک روایت جو دہلی کے دیہات میں مشہور ہے، پیش کی جارہی ہے۔ ایک دہقان کی زبان سے سنیے۔

"غدر سے پہلے پرانے قلعہ کی دھرتی میں باجرا بہت اچھا پیدا ہوتا تھا۔ یہ دھرتی ہمارے پاس تھی۔ ہم پر سرکاری لگان صرف یہ تھا کہ بادشاہ سلامت کے کبوتروں کے واسطے ہل پیچھے سوا سیر باجرا دینا پڑتا تھا۔

بوڑھے دہقان نے کہا۔ گوجروں کی قوم بہت شریر ہوتی ہے۔ ایک دفعہ ہم لوگوں کے دل میں شرارت آئی۔ ہم نے سوچا کہ اس مرتبہ باجرے کو بھی گول کر جاؤ، اور بادشاہ سلامت کو کسی طرح پھسلا دو۔ بات یہ تھی کہ اس سال برکھا کچھ کم ہوئی تھی۔ اگر ہم ایسے ہی سیدھی طرح بادشاہ سلامت سے معافی مانگ لیتے تو لگان معاف ہو جاتا۔ مگر ہمیں چال سوجھی کہ ہم نے باجرے کی بالیں صفائی سے کاٹ لیں اور خالی پودے کھیتوں میں کھڑے رہنے دیئے۔ پھر سارے کسان لال قلعہ کے جھروکوں کے سامنے جمنا کی ریتی پر جا پڑے۔ اور بادشاہ سلامت کی دہائی کا شور مچانے لگے۔ شور وغل کی آواز بادشاہ تک پہنچی تو جہاں پناہ نے خود جھروکوں میں آ کر ہمیں درشن

دیئے"۔ کیا بات ہے کیسا شور ہے"۔ جہاں پناہ کے ایک نقیب نے دریافت کیا۔
"سرکار ہم لٹ گئے۔ کھاری باؤلی کے بنیوں نے بجرے کا بیج جانے کیسا دیا کہ پیڑ تو خوب اُگ آئے۔ ہرے بھرے بھی خوب ہیں لیکن بال ایک بھی نہیں آئی۔ اب ہم جہاں پناہ کے کبوتروں کا باجرا کیسے ادا کریں گے۔ اس سال لگان معاف کردیا جائے"۔ کسانوں نے کہا۔
"اچھا کل کو ہم خود موقع پر پہنچ کر ملاحظہ کریں گے۔ پھر حکم دیں گے"۔ بادشاہ نے جواب دیا۔
"چنانچہ دوسرے دن شام کے وقت بادشاہ سلامت ہوادار پر سوار ہوکر پرانے قلعے آئے۔ کھیتوں کو ملاحظہ فرمایا۔ وہاں کوئی بال چھوڑی ہوتی تو نظر بھی آتی۔ بادشاہ سلامت نے دور ہی سے کھیتوں پر نظر ڈال کر فرمایا۔ اماں![11] گوجروں کی فریاد ٹھیک ہے۔ کھاری باؤلی کے بنیوں نے بڑا دھوکا کیا۔ کل کو انہیں بلواؤ۔ اچھا جاؤ، اس سال لگان معاف"۔
دہقان کا کہنا ہے کہ گاؤں کے سمجھدار مکھیا وغیرہ اس کھیل میں شریک نہیں تھے۔ وہ بخار کا بہانہ بنا کر گھروں میں لیٹ گئے تھے۔ انہیں خیال تھا کہ بادشاہ سلامت ایسے بے وقوف نہیں ہیں۔ وہ جب پیڑ دیکھیں گے اصل بات سمجھ جائیں گے۔ پھر اُن کی خفگی جانے کیا رنگ لائے۔
بات بھی یہی تھی۔ بادشاہ سلامت ایسے بے وقوف نہیں تھے۔ مگر یہ رعایا کا ناز تھا اور وہ ناز برداری اور رعایا پروری۔ سچ ہے، آدمی آدمی انتر ہے کوئی ہیرا ہے کوئی کنکر ہے۔
اسی دہقان کی ایک روایت اور بھی ہے کہ ایک سال بارش نہیں برسی کھیت سوکھ گئے۔ غلہ مہنگا ہو گیا۔ بادشاہ سلامت کے پاس لوگ فریاد لے کر گئے۔ پہلی مرتبہ بنیوں کو بلا کر غلہ کا ایک نرخ (ایک من فی روپیہ) مقرر کردیا۔ مگر کچھ دنوں بعد بنیوں نے اپنی مجبوری اور پریشانی کا اظہار کیا تو اب بادشاہ سلامت نے نماز استسقاء کا فیصلہ کیا۔ عام اعلان ہو گیا کہ کل کو صبح کے وقت عیدگاہ پر نماز استسقاء ہوگی۔ شہر کے تمام چھوٹے بڑے، امیر غریب، ہندو مسلمان عیدگاہ پہنچے، بادشاہ اور بیگم بھی معمولی لباس میں عیدگاہ پہنچے۔ نماز پڑھی گئی۔ بادشاہ سلامت نے رونا شروع کیا تو ساری مخلوق کی آنکھوں میں آنسو برسنے لگے۔
دل کا فغاں اور آنکھوں کے آنسو ابھی ختم نہیں ہوئے کہ بقول دہقان:
"پھر جو کالی کالی، بھوری بھوری گھٹا اٹھ کر برسنی شروع ہوئی تو لوگوں کو گھر پہنچنا مشکل ہو گیا"۔[12]
بادشاہ سلامت اچھے تھے یا برے، بادشاہ بیگم کا کردار کیا تھا۔ ان سب سے قطع نظر یہ ہمدردی اور وطن کے دکھی انسانوں سے یہ میل جول وہ جوہر ہے جو اس جاگیرداری میں کمیاب نہیں تھا جس کا شکوہ کیا جارہا ہے۔
علاوہ ازیں تاریخ انسانیت کے اس یادگار حادثہ کو صرف جاگیرداروں کا رقص بسمل قرار دینا، اگر قصد وارادہ سے ہے تو تاریخ کے حق میں بہت بڑی خیانت ہے اور ایک ایسی چشم پوشی ہے جو مورخ کے لئے کبھی بھی جائز قرار نہیں دی جاسکتی۔

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے دورِ تسلط میں جاگیرداری سے کہیں زیادہ صنعت وتجارت کو برباد کر دیا تھا، اور وہ ہندوستان جو علوم وفنون میں تمام دنیا سے فائق، فراوانی دولت میں سونے کی چڑیا، خوش حالی میں رشکِ ارم، راحت وآرام میں جنت نشان مانا جاتا تھا، اس کو انتہائی بے دردی اور خود غرضی سے تباہ کاری اور غارت گری کا تختۂ مشق بنا کر اتنا برباد کر دیا تھا کہ اب وہ علم و ہنر سے تہی دامن، قحط زدہ، فاقہ مست، کاشتکاروں اور بے ہنر مزدوروں کا ویران خانہ بن کر رہ گیا تھا۔ کہیں کہیں کوئی شمع باقی رہ گئی تھی تو ہسٹنگز اور ڈلہوزی جیسے ستم ایجاد گورنروں کی پھونکیں ان کو بھی بجھا چکی تھیں یا بجھا رہی تھیں۔ تاریخ ہندوستان کی یہ الم ناک حقیقتیں اتنی واضح ہو چکی ہیں کہ تحریر کی ضرورت نہیں۔ عیاں را چہ بیاں۔

تفصیلات اگر مطلوب ہوں تو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ نے نقشِ حیات جلد اول میں اور مولوی سید طفیل احمد صاحب مرحوم علیگ نے حکومت خود اختیاری اور روشن مستقبل میں اردو خواں حضرات کے لیے کافی ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔

ہم سرسید مرحوم کے ایک دلچسپ فقرہ پر اس باب کو ختم کرتے ہیں:

''اہلِ حرفہ کا روزگار بسبب جاری اور رائج ہونے اشیاء تجارت ولایت کے بالکل جاتا رہا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں کوئی سوئی بنانے والے اور دیا سلائی بنانے والے کو بھی نہیں پوچھتا تھا۔ پارچہ بافوں کا تار تو بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ اسی وجہ سے سب سے زیادہ اس ہنگامہ میں یہی لوگ گرم جوش تھے۔'' (۱۴)

۳ مزید برآں جاگیرشاہی کا جو کچھ بھی خاتمہ ہوا تھا وہ اس لئے نہیں کہ اس نو وارد امت کو جاگیرداری سے نفرت تھی۔ شاہنشاہیت نواز اور سامراج پرست قوم جاگیرداری سے کس طرح نفرت کر سکتی ہے۔ بلکہ صرف اس لئے تھا کہ:

الف: ہر ایک جاگیر اور ریاست کے ختم کرتے وقت ان سفید درندوں کے ہاتھ جس طرح لوٹ مچاتے تھے، اس میں لاکھوں کروڑوں روپیہ کا فائدہ شخصی طور پر خود ان مہذب غارت گروں کا ہوا کرتا تھا۔

ب: پرانی جاگیرشاہی ختم کر کے نئی جاگیرشاہی اور اجارہ داری قائم کی جائے جس میں زیادہ سے زیادہ نفع ان سامراج پرستوں اور ان کے ہم وطنوں کا ہو جس کے عشرت کدوں میں دولت وثروت کے انبار لگانے کے لئے یہ تمام کھیل کھیلا جا رہا تھا اور غارت گری کی یہ مشق کی جا رہی تھی۔

انگریزوں کی تنخواہوں اور بھتوں کا جائزہ لیجئے اور یہ بھی یاد رکھئے کہ تحصیلداری یا ڈپٹی مجسٹریٹی سے آگے کسی ہندوستانی کو کوئی عہدہ نصیب نہیں ہو سکتا تھا اور جو عہدہ بھی ہندوستانیوں کو عطا کیا جا سکتا تھا، اس میں انگریزوں کی تنخواہ دس گنے تک زیادہ ہوتی تھی۔ یعنی ہندوستانی کو اگر سو ۱۰۰ روپے دیئے جاتے تھے تو اسی پوسٹ پر انگریز کی تنخواہ پانچ سو، سات سو اور کبھی ایک ہزار تک ہوتی تھی۔ اس جائزے کے بعد سرسید مرحوم کی یہ شہادت

بھی نظر انداز نہ کیجئے کہ ضبطی معافیات وغیرہ سب اس لئے تھا کہ حکومت کا یہ غیر معمولی خرچ چلایا جا سکے، جو انگریز کے لئے ''گنج بخش'' تھا۔ اور ہندوستانی کے لئے محض ''فاقہ شکن''۔

پس یہ حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کا یہ خونیں حادثہ مٹی ہوئی جاگیر شاہی کی انگڑائی نہیں بلکہ ایک قوم کی بڑھتی ہوئی جاگیر شاہی کے مقابلہ میں دوسری قوم کی حرکت مذبوحانہ تھی۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

یہ بحث طویل ہے۔ اس کا ہر ایک گوشہ ایک داستان رکھتا ہے۔ تنخواہوں کا تفاوت، مال گزاری کا اضافہ، وصولی مال گزاری کے لئے جائدادوں کا نیلام، نیلام کے دل آزار اور توہین آمیز طریقے، سود اور سود در سود کا رواج وغیرہ۔ غرض ہر ایک باب داستان الم ہے۔ اسی سلسلہ کا ایک مستقل باب، دوامی اور عارضی بندوبست بھی ہے۔

ایک مؤرخ کی حیثیت سے اگر تفصیلات تلاش کرنا چاہیں تو وہ شیخ الاسلام قدس سرہ کا نقش حیات جلد اول، مولوی سید طفیل احمد صاحب (علیگ) کی حکومت خود اختیاری اور روشن مستقبل وغیرہ ملاحظہ فرمایئے۔ یہاں بندوبست کے سلسلہ میں سرسید کا ایک تاریخی نوٹ قابل مطالعہ ہے۔ وہ اگرچہ کسی قدر طویل ہے مگر اس کو پیش نہ کرنا بھی ایک قسم کا بخل ہے جو حقیقت کے متلاشی کے لیے درست نہیں۔

سرسید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''بندوبست مال گزاری جو ہماری گورنمنٹ نے کیا، نہایت قابل تعریف ہے۔ مگر اگلے بندوبستوں کی نسبت سنگین ہے۔

اگلی عملداریوں میں بطور خام تحصیل مال گزاری لی جاتی تھی شیر شاہ[۱۴] نے پیداوار کا ایک تہائی حصہ گورنمنٹ کے لئے مقرر کیا تھا۔ کچھ شک نہیں کہ اس طریقہ میں بہت مشکلیں تھیں۔[۱۵] اور گورنمنٹ کو نقصان متصور تھا۔ مگر کاشتکار سب آباد رہتے تھے۔ کسی کو ٹوٹا دینا نہ پڑتا تھا۔ اکبر اول نے اسی بندوبست کو (یعنی پیداوار کا تہائی حصہ لینا) پسند کیا اور اسی کو جاری کیا۔ مگر بندوبست پختہ کر دیا۔ جس کا ذکر لارڈ الفنسٹن صاحب کی عمدہ تاریخ میں مندرج ہے، اور آئین اکبری میں بھی اس کا بیان ہے۔ اکبر نے اقسام زمین کے مقرر کئے۔ اول قسم کی زمین کا نام ''پولج'' تھا اور ہر سال بوئی جاتی تھی۔ برابر مال گزاری کا حصہ لیا جاتا تھا۔ دوم قسم کی زمین جس کا نام ''پڑوتی'' تھا۔ اس زمین سے انہیں سالوں کے بابت مال گزاری لی جاتی تھی جس میں وہ کاشت ہوتی تھی۔ سوم قسم کی زمین جس کا نام ''چچر'' تھا اور تین چار برس سے بے تردد ہوتی تھی اور اس کی درستی کے لئے خرچ بھی درکار ہوتا تھا۔ اول سال زراعت میں کچھ دلیا جاتا تھا اور پھر بڑھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ پانچویں میں پورا ہوتا تھا۔ چہارم قسم کی زمین جس کا نام ''بنجر'' تھا، اور پانچ برس سے

زیادہ سے بے تردد بڑی تھی اور ملائم شرطیں تھیں۔ اس خام بندوبست کا نقدی سے بدلنا اس طرح پر تھا کہ پیداوار ہر بیگھہ کی اور ہر قسم کی زمین کی اوسط کے حساب سے غلہ کے وزن پر نکالی جاتی تھی۔ مثلاً بیگھہ پیچھے نو من غلہ کی پیداوار نکالی۔ تین من غلہ اس بیگھہ کا کاشتکار سے لینا حصہ گورنمنٹ ٹھیر گیا۔ پھر اوسط نرخ ناموں سے غلہ کی قیمت قرار دی گئی۔ وہ نقدی اس بیگھہ کی ٹھیر گئی۔ پھر اس میں بڑی رفاہ یہ تھی کہ اگر کاشتکار بعوض نقدی گرانی سمجھ کر تین من غلہ دے دے تو اُس کو اختیار تھا۔ سرکاری بندوبست میں اُن میں سے بہت سی باتوں کا خیال نہیں رہا۔ اُفتادہ زمین پر برابر محصول لگ گیا۔ جن زمینوں کا زور بڑھانے کو کچھ دنوں اُفتادہ رکھتا تھا، اُن میں منہائی نہیں ہوئی، ہر سال برابر جوتے جانے سے زور کم ہو گیا، پیداوار کم ہونے لگی جو حساب بندوبست کے وقت لگایا تھا وہ نہ رہا۔ اکثر اضلاع میں ہر ایک بندوبست سخت ہوتا گیا۔ زمینداروں کاشتکاروں کو نقصان عائد ہوئے رفتہ رفتہ بے سامان ہو گئے۔ زراعت کا سامان بہت کم ہو گیا، اور اس سبب سے جو زمین کاشت کرتے تھے، وہ جیسا کہ چاہئے کمائی نہ گئی۔ اس سبب سے بھی کمی پیداوار کی ہوئی۔ ادائے مال گزاری کے لئے وہ قرض دار ہوئے۔ سود قرضہ زیادہ ہونے لگا۔ بہت سے زمین دار مال گزار جو بہت اچھا اور معقول سامان رکھتے تھے، مفلس ہو گئے۔ جن دیہات میں اُفتادہ زمین سوا تھی، وہ اور زیادہ خراب ہو گئی۔ آنریبل ٹامسن صاحب بہادر اپنے ہدایت نامہ کی دفعہ ۶۴ میں لکھتے ہیں کہ آئین نہم ۱۸۳۳ء کے بندوبست میں علی العموم یہ بات نظر آتی ہے کہ اچھی دیہات کی جمع کچھ نرم تجویز ہوئی، اور خراب دیہات کی جمع سنگین ہو گئی۔ زمینداروں کی ناجائز منفعتیں جاتی رہیں۔ اگرچہ یہ بات بہت اچھی تھی مگر بندوبست کے وقت اس کی رعایت چاہیے تھی۔ غرض کہ ان اسباب سے زمینداروں اور کاشت کاروں کو مفلسی نے گھیر لیا تھا۔ جس کے سبب باوجود اس امن و آسائش کے جو زمینداروں کو تھی، اُن کے دل سے پچھلی عملداریوں کی یاد بھولتی نہ تھی۔" (اسباب بغاوت ہند ص ۲۸ تا ص ۳۰)

خاتمہ بحث اور خلاصہ

اقتصادیات کے سلسلہ میں بحث بہت طویل ہو گئی ہے۔ اب ہم اس کو ختم کرتے ہیں، اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کے الفاظ میں اس بحث کا خلاصہ بھی پیش کر دیں۔ تاکہ اندازہ ہو سکے کہ وہ ہندوستانی جو نہ جاگیردار تھے، نہ معافی دار یا سرمایہ دار، اُن کے تاثرات کیا تھے اور وہ کس درجہ اس آنے والی بدیشی حکومت سے نالاں ہو چکے تھے۔

"ہندوستان کی رعایا روز بروز مفلس ہوتی جاتی تھی۔ ٹیکس کی زیادتی نے زمینداروں اور کاشت

کاروں کو تباہ کر دیا تھا۔ بقایا وصول کرنے کے لئے زمینداریاں نیلام کرائی جاتی تھیں۔ جو ہندوستان میں بالکل نیا دستور تھا۔ ولایتی مالک کی آمد نے اہل حرفہ کو برباد کر دیا تھا۔ بایں ہمہ حکومت نے پرامیسری نوٹ جاری کر دیئے جس پر ملک سے سود وصول کیا جاتا۔ اگلی عملداریوں میں شاہی انعام و اکرام آسودگی رعایا کا ایک مستقل ذریعہ تھا جب شاہجہاں تخت پر بیٹھا تو صرف تخت نشینی کے دن چار لاکھ بیگہ زمین اور ایک سو بیس گاؤں اور لاکھوں روپے انعام دیئے تھے۔ یہ بات ہماری گورنمنٹ میں یک قلم مسدود تھی۔ بلکہ پہلی جاگیریں بھی ضبط ہو گئی تھیں۔ اس عام افلاس کا نتیجہ تھا کہ جب باغیوں نے لوگوں کو نوکر رکھنا چاہا تو جیسے بھوکا آدمی قحط کے دنوں میں اناج پر گرتا ہے اسی طرح یہ لوگ نوکریوں پر جا گرے۔ بہت سے آدمی صرف آنہ یومیہ پر نوکر ہوئے تھے۔ اور بہت سے آدمی سیر ڈیڑھ سیر یومیہ اناج پاتے تھے۔" (۱۶)

آخر میں سر سید مرحوم نہایت جوش سے لکھتے ہیں:

"غرض کہ ملک ہر طرح سے مفلس ہو گیا تھا۔ اگلے خاندان جن کو ہزاروں کا مقدور تھا، معاش سے بھی تنگ آ گئے تھے، اور یہ اصلی سبب ناراضگی رعایا کا گورنمنٹ سے تھا۔

لوگوں کے دل جو تبدیل عملداری کو چاہتے تھے اور نئی عملداری کے لیے راغب اور دل سے اُس سے خوش تھے، میں سچ کہتا ہوں کہ اسی سبب سے تھے۔ ہم سچ کہتے ہیں اور پھر ہم سچ کہتے ہیں کہ ہم بہت سچ کہتے ہیں، کہ جب افغانستان، سرکار نے فتح کیا تو لوگوں کو بڑا غم ہوا۔ کیا سبب تھا؟ صرف یہ سبب تھا کہ اب مذہب پر اطلاعیہ دست اندازی ہو گی جب گوالیار فتح ہوا، پنجاب فتح ہوا۔ اودھ لیا گیا تو لوگوں کو کمال رنج ہوا، کیوں ہوا؟

اس لئے ہوا کہ ان پاس کی ہندوستانی عملداریوں سے ہندوستانیوں کو بہت آسودگی تھی۔ نوکریاں اکثر ہاتھ آتی تھیں۔ ہر قسم کی ہندوستانی اشیاء کی تجارت بکثرت تھی۔ ان عملداریوں کے خراب ہونے سے زیادہ سے زیادہ افلاس اور محتاجی ہوتی جاتی تھی"۔ (۱۷)

عدل و انصاف پر ٹیکس

چند قوانین برخلاف رواج اور مخالف طبیعت ہندوستانیوں کے صادر ہوئے جس کی وجہ سے رعایا ہماری گورنمنٹ کو میٹھے زہر یا شہد کی چھری یا ٹھنڈی آنچ کی مثال دیا کرتی اور سمجھتی تھی کہ ہم آج گورنمنٹ کے ہاتھ سے بچے ہوئے ہیں تو کل نہیں، اور کل ہیں تو پرسوں نہیں۔ اور پھر اس پر اضافہ یہ ہوا کہ باوجود ہندوستانیوں کی مفلسی کے عدالت کی چارہ جوئی پر اسٹامپ لگا دیا گیا جو ناقابل برداشت تھا۔ (۱۸)

درست ہے، بہادر شاہ کی خاندانی سلطنت ختم ہو رہی تھی۔ واجد علی شاہ کی ریاست چھین لی گئی تھی۔ اسی

طرح تانتیا ٹوپی، کنور سنگھ، مہارانی لکشمی بائی وغیرہ بھی غم خوردہ تھے۔ مگر کیا اُن کے دلوں کا اپریشن کر کے دیکھ لیا گیا ہے کہ اس وقت کی تمام جدوجہد صرف اپنی ریاستوں اور جاگیروں کے لئے تھی، اور اس میں کوئی بھی جزو اس ہمدردی اور غمنا کی کا نہیں تھا جس میں پورا ہندوستان مبتلا تھا۔

بہادر شاہ کے متعلق تو یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ وہ نہ اس تحریک کے بانی تھے، نہ اُن کو پہلے سے اس کی خبر تھی۔ وہ صرف نام کی بادشاہی کو غنیمت سمجھ کر کمپنی کی پنشن پر قناعت کئے ہوئے تھے، اور اپنی اولاد کے لئے اس سے بھی صبر کر چکے تھے۔ اُن کا مشہور شعر اس کی شہادت ہے ؎

اے ظفر اب ہے تجھی تک انتظام سلطنت

بعد تیرے نے ولیعہدی نے نظام سلطنت

ستم رسیدہ فوجی جب بہادر شاہ کی دہائی دیتے ہوئے اُس کے دیوان خاص میں گھس آئے تو باوجودیکہ بوڑھے بادشاہ کے اس یقین میں کوئی فرق نہیں آیا تھا کہ نتیجہ ناکامی اور خاندان تیمور کی آخری تباہی[19] ہے۔ مگر رعایا سے محبت جو اس خاندان کے خمیر میں گندھی ہوئی تھی، یہ بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ رعایا تباہ و برباد ہو اور بادشاہ آنکھ بند کئے رکھے۔[20] محبت خلق اور ہمدردی اہل وطن کے اسی جذبہ نے تیموری خون میں حرارت پیدا کی۔ رگ حمیت پھڑکنے لگی اور چار و ناچار بہادر شاہ نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

پس اگر اس ہمدردی اور فریاد رسی کا نام ''جاگیر شاہی کی انگڑائی'' ہے، تو یہ انگڑائی بہت مبارک۔ اور کمیونزم کا فیصلہ کچھ بھی ہو مگر ایشیائی فطرت تو یہ ہے کہ ایسی انگڑائیوں میں جو بربادی آئے وہ آبادی ہے اور جو موت آئے وہ سراسر زندگی ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت ست برجریدۂ عالم دوام ما

رہے واجد علی شاہ، تو اگرچہ وہ ایک سال پہلے ہی معزول کر دیئے گئے تھے، اور اس موقع پر واجد علی شاہ نے نہیں بلکہ اُن کی بیگم ''حضرت محل'' اور اُن کے سب سے چھوٹے لڑکے ''برجیس قدر'' نے تحریک میں حصہ لیا تھا (جس کا تذکرہ دوسرے موقع پر آئے گا) لیکن واجد علی شاہ کی سیاسی زندگی سے اُن کی بیگم اور لخت جگر کے ارادوں کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔ واجد علی شاہ کے متعلق خود پروفیسر باری صاحب کی شہادت یہ ہے:

''واجد علی نے ولی عہدی کا زمانہ عیش و عشرت میں صرف کیا لیکن تخت پر بیٹھتے ہی وہ ملکی انتظامات میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔ واجد علی اپنی فوج کی تربیت پر اپنا بہت سا وقت صرف کرتا تھا ایسٹ انڈیا کمپنی اسے برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ۳۲ سال کی عمر میں اُسے کلکتہ میں جلاوطن ہونا پڑا۔ جہاں اُس نے ۱۸۸۷ء میں وفات پائی۔[21]

آودھ کا آخری تاجدار واجد علی شاہ، عربی، فارسی اور اُردو کا فاضل تھا۔[22] اُس نے اُردو میں کئی

کتابیں لکھیں۔ اُسے تاریخ سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ اودھ کی فوجی طاقت کو مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے اختری پلٹن اور نادری پلٹن بنائی۔ واجد علی شاہ نے لکھنؤ میں سلطانی پریس" قائم کیا۔ دیوانی اور فوجداری مقدموں کی مزید سماعت کے لئے ہائی کورٹ قائم کیا۔ حفظان صحت کا الگ محکمہ قائم کیا تھا۔ دستورات واجدی کے نام سے ایک عدالتی رسالہ شائع ہوتا تھا۔ واجد علی شاہ کے عہد حکومت میں لکھنؤ ہندوستان کے تمام شہروں میں ترقی یافتہ اور مرفہ الحال تھا۔ شہر کے وسطی حصہ میں گھنی آبادی تھی۔ خاص سڑکوں کے مناظر بہت دلکش تھے۔ لوگ شاہانہ لباس پہن کر گھر سے نکلتے تھے۔ سارا شہر ایک تصویر نظر آتا تھا"۔ (۴۳)

مرزا معین الدین حسن خاں اپنے روزنامچے میں تحریر فرماتے ہیں:

"جب ۱۸۴۷ء میں شاہ لکھنؤ امجد علی شاہ بادشاہ کا انتقال ہوا، تو شاہ واجد علی اُن کے جانشین مقرر ہوئے۔ انہوں نے فوج کو از سر نو مرتب کرنا شروع کیا۔ احکام نافذ کیے گئے کہ لکھنؤ کی تمام پلٹنیں روزانہ صبح کے پانچ بجے پریڈ کیا کریں گی۔ بادشاہ خود پریڈ کے موقع پر کمان کرتے تھے اور جنرل کی وردی زیب تن فرماتے تھے۔ وہ روزانہ چار پانچ گھنٹے تک فوج سے ڈرل کرایا کرتے تھے۔ مزید برآں انہوں نے حکم نافذ کر رکھا تھا کہ اُمور سلطنت کی ضروریات کے سوائے اگر کبھی وہ خود غیر حاضر ہو جایا کریں گے تو وہ دو ہزار روپے جرمانہ ادا کیا کریں گے۔ جسے لکھنؤ کی فوج میں تقسیم کرایا جایا کرے گا۔ اتنا ہی جرمانہ اس پلٹن سے وصول کیا جاتا تھا جو پریڈ میں دیر سے آتی تھی۔ (ص ۴۵ غدر کے صبح وشام)۔

تہذیب برباد اور مذہب کے لئے خطرہ

"فلسفہ کارل مارکس" ہر ایک انقلاب کا محرک اقتصادی مسائل قرار دیتا ہے۔ اُسے مذہب کے چلن میں بھی اقتصادی تقاضے ہی نظر آتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذہب اور تہذیب خود ایک محرک ہے اور ایسا طاقت ور جذبہ ہے جو انسان کو ہر ایک قربانی پر آمادہ کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ موت کو حیات اور فنا کو بقا سمجھنے لگتا ہے۔

مذہب بسا اوقات ذاتی رجحانات کا نتیجہ ہوتا ہے، اور تہذیب کو انسان اپنا خاندانی اور آبائی ترکہ تصور کرتا ہے۔ جس طرح موروثی جائداد کی حفاظت کے لئے جان ہتھیلی پر لئے رہتا ہے، اسی طرح حفاظت تہذیب کے لئے بھی وہ ہمیشہ کفن بردوش رہتا ہے۔

اس ہنگامہ کے پس پردہ مذہبی اور تہذیبی تقاضے بھی اتنے شدید تھے کہ ہندوستانی اگر ۱۸۵۷ء کی یہ قیامت برپا نہ کرتے، تو فطرت انسانی کا فیصلہ ان کے خلاف نہایت سخت ہوتا۔

بے شک وہ ناکام ہوئے، مگر اُن کو معذرت کا موقع مل گیا کہ:

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

سر سید مرحوم کو مذہبی اعتبار سے وسیع المشرب کہا جاتا ہے اور تہذیب کے لحاظ سے ان کی آزادی یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ آخر عمر میں تو ایشیائی تہذیب کے بجائے یورپین تہذیب کے داعی اور منادبن گئے تھے۔ یہی سر سید اس بغاوت کے اسباب میں جو مذہبی اور تہذیبی خطرات بیان کرتے ہیں وہ یقیناً قابل مطالعہ ہیں، اور ظاہر ہے اس بارہ میں سر سید کی شہادت قطعاً غیر جانبدارانہ ہوگی۔ اور اُن کی شہادت سے زیادہ مستند کسی کی شہادت نہیں ہوسکتی۔

مداخلت مذہبی اور رسم ورواج (تہذیب) کے لئے خطرات

کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل وقابل، اعلیٰ اور ادنیٰ یقین جانتے تھے کہ ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم ورواج میں مداخلت کرے اور سب کو، کیا ہندو کیا مسلمان، عیسائی مذہب اور اپنے ملک کے رسم و رواج پر لاڈالے اور سب سے بڑا سبب اس سرکشی میں یہی ہے۔

ہر شخص دل سے جانتا تھا کہ ہماری گورنمنٹ کے احکام بہت آہستہ آہستہ ظہور میں آتے ہیں، اور جو کام کرنا ہوتا ہے، رفتہ رفتہ کیا کرتے ہیں، اس واسطے دفعتہً اور جبراً دین بدلنے کو نہیں کہتے۔ مگر جتنا جتنا قابو پاتے جائیں گے، اتنی اتنی مداخلت کرتے جائیں گے، اور جو باتیں رفتہ رفتہ ظہور میں آتی گئیں، جن کا بیان آگے آئے گا اُن کے اس غلط شبہ کو زیادہ تر مستحکم اور مضبوط کرتی گئیں۔ سب کو یقین تھا، کہ ہماری گورنمنٹ علانیہ جبر، مذہب بدلنے پر نہیں کرے گی بلکہ خفیہ تدبیریں کرکرکے مثل نابود کردینے علم عربی وسنسکرت کے، اور مفلس اور محتاج کردینے ملک کے، اور لوگوں کو جو اُن کا مذہب ہے اس کے مسائل سے ناواقف کرکر اور اپنے دین ومذہب کی کتابیں اور مسائل اور وعظ کو پھیلا کر نوکریوں کا لالچ دے کر لوگوں کو بے دین کردیں گے۔ ۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی کئے گئے، تمام اضلاع مغربی وشمالی میں ارادہ گورنمنٹ کے ایک نمونہ گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اسی طرح پر مفلس اور محتاج کرکر اپنے مذہب میں لے آئیں گے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جب سرکار آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کوئی ملک فتح کرتی تھی، ہندوستان کی رعایا کو کمال رنج ہوتا تھا۔ اور یہ بھی میں سچ کہتا ہوں کہ منشاء اس رنج کا اور کچھ نہیں ہوتا تھا، بجز اس کے کہ لوگ جانتے تھے کہ جوں جوں اختیار ہماری گورنمنٹ کا زیادہ ہوتا جائے گا اور کسی دشمن اور ہمسایہ حاکم کے مقابلہ اور فساد کا اندیشہ نہ رہے گا، ووں ووں ہمارے مذہب اور رسم ورواج میں زیادہ تر مداخلت کریں گے۔

مذہبی گفتگو بہت ہوئی

ہماری گورنمنٹ کی ابتدائی حکومت میں ہندوستان میں گفتگو مذہب کی بہت کم تھی، روز بروز زیادہ ہوتی گئی اور اس زمانہ میں بدرجہ کمال پہنچ گئی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہماری گورنمنٹ کو ان امور میں کچھ مداخلت نہیں

تھی۔ مگر ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ یہ سب معاملے بموجب حکم اور بموجب اشارے اور مرضی گورنمنٹ ہوتے ہیں۔ سب جانتے تھے کہ گورنمنٹ نے پادری صاحبوں کو ہندوستان میں مقرر کیا ہے۔ گورنمنٹ سے پادری صاحب تنخواہ پاتے ہیں۔

حکام معتمد کا مشنری طریقہ برتنا

گورنمنٹ اور حکام انگریزی جو ولایت زا اس ملک میں نوکر ہیں وہ پادری صاحبوں کو بہت سا روپیہ واسطے خرچ کے اور کتابیں بانٹنے کو دیتے ہیں اور ہر طرح اُن کے مددگار اور معاون ہیں۔ اکثر حکام معتمد اور افسران فوج نے اپنے تابعین سے مذہب کی گفتگو شروع کی تھی۔ بعضے صاحب اپنے ملازموں کو حکم دیتے تھے کہ ہماری کوٹھی پر آ کر پادری صاحب کا وعظ سنو اور ایسا ہی ہوتا تھا۔ غرضکہ اس بات نے ایسی ترقی پکڑی تھی کہ کوئی شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ گورنمنٹ کی عملداری میں ہمارا یا ہماری اولاد کا مذہب قائم رہے گا۔

پادری صاحبوں کا وعظ

پادری صاحبوں کے وعظ نے نئی صورت نکالی تھی۔ تکرار مذہب کی کتابیں بطور سوال و جواب چھپنی اور تقسیم ہونی شروع ہوئیں۔ ان کتابوں میں دوسرے مذہب کے مقدس لوگوں کی نسبت الفاظ اور مضامین رنج دہ مندرج ہوتے۔ ہندوستان میں وعظ اور کتھا کا دستور یہ ہے کہ اپنے اپنے معبد یا مکان پر بیٹھ کر کہتے ہیں۔ جس کا دل چاہے اور جس کو رغبت ہو، وہاں جا کر سنے۔ پادری صاحبوں کا طریقہ اس کے برخلاف تھا۔ وہ خود غیر مذہب کے مجمع یا تیرتھ اور میلہ میں جا کر وعظ کہتے تھے اور کوئی شخص حکام وغیرہ کے ڈر سے مانع نہ ہوتا تھا۔ بعض ضلعوں میں یہ رواج نکلا کہ پادری صاحب کے ساتھ تھانہ کا چپراسی جانے لگا۔ پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں کو اور مقدس مقاموں کو بہت برائی اور ہتک سے یاد کرتے تھے۔ جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہنچتی تھی اور ہماری گورنمنٹ سے ناراضی کا بیج لوگوں کے دلوں میں بویا جاتا تھا۔

مشنری سکول

مشنری اسکول بہت جاری ہوئے اور اُن میں مذہبی تعلیم شروع ہوئی سب لوگ کہتے تھے کہ سرکار کی طرف سے ہیں۔ بعض اضلاع میں بہت بڑے بڑے عالی قدر حکام معہدان سکول میں جاتے تھے اور لوگوں کو اس میں داخل اور شامل ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔ امتحان مذہبی کتابوں میں لیا جاتا تھا اور طالب علموں سے جو لڑکے کم عمر ہوتے تھے، پوچھا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون؟ تمہارا نجات دینے والا کون؟ اور وہ عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے۔ اس پر اُن کو انعام ملتا تھا۔ ان سب باتوں سے رعایا کا دل ہماری گورنمنٹ سے پھرتا جاتا تھا۔

یہاں ایک بڑا اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر لوگ اس تعلیم سے ناراض تھے تو اپنے لڑکوں کو کیوں داخل کرتے تھے۔ اس بات کو عدم ناراضی پر خیال نہیں کرنا چاہیے، بلکہ یہ ایک بڑی دلیل ہے ہندوستان کے کمال خراب حال اور مفلس اور نہایت تنگ اور تباہ حال ہو جانے پر یہ صرف ہندوستان کی محتاجی اور مفلسی کا باعث تھا کہ لوگ اس خیال سے کہ ان سکولوں میں داخل ہو کر ہر ری اول دو کو کچھ وجہ معیشت اور روزگار حاصل ہوگا، ایسی سخت بات کو جس سے بلاشبہ اُن کو دلی رنج اور روحانی غم تھا گوارا کرتے تھے نہ رضامندی سے۔

دیہاتی مکاتیب

دیہاتی مکتبوں کے مقرر ہونے سے سب یقین سمجھتے تھے کہ صرف عیسائی بنانے کو یہ مکتب جاری ہوئے ہیں۔ پرگنہ وزیٹر اور ڈپٹی انسپکٹر جو ہر ہر گاؤں اور قصبہ میں لوگوں کو نصیحت کرتے پھرتے تھے کہ اپنے لڑکوں کو مکتبوں میں داخل کرو۔ ہر ہر گاؤں میں اُن کا نام کالا پادری تھا۔ جس گاؤں میں پرگنہ وزیٹر یا ڈپٹی انسپکٹر پہنچا، اور گنواروں میں چرچا ہوا کہ ''کالا پادری آیا۔ عوام الناس یوں خیال کرتے تھے کہ یہ عیسائی مکتب ہیں اور کرشٹان بنانے کو بٹھاتے ہیں۔ اور فہمیدہ آدمی اگرچہ یہ نہیں سمجھتے تھے، مگر یوں جانتے تھے کہ ان مکاتب میں صرف اردو تعلیم ہوتی ہے۔ ہمارے لڑکے ان میں پڑھ کر اپنے مذہب کے احکام اور مسائل اور اعتقادات اور رسمیات سے بالکل ناواقف ہو جائیں گے، اور عیسائی بن جائیں گے۔ اور یوں سمجھتے تھے کہ گورنمنٹ کا ارادہ یہی ہے کہ ہندوستان کے مذہبی علوم کو معدوم کر دے۔ تاکہ آئندہ کو عیسائی مذہب پھیل جائے! اکثر اضلاع مشرقی ہندوستان میں ان مکتبوں کا جاری ہونا اور لڑکوں کا داخل ہونا صاف تحکماً ہوا، اور کہہ دیا کہ گورنمنٹ کا حکم ہے کہ لڑکوں کو داخل کیا جائے۔

لڑکیوں کے سکول کا اجراء

لڑکیوں کی تعلیم کا بہت چرچا ہندوستان میں تھا اور سب یقین جانتے تھے کہ سرکار کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیاں سکول میں آئیں اور تعلیم پائیں اور بے پردہ ہو جائیں کہ یہ بات حد سے زیادہ ہندوستانیوں کو ناگوار تھی۔ بعض اضلاع میں اس کا نمونہ قائم ہو گیا تھا۔ پرگنہ وزیٹر انسپکٹر یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم سعی کر کر لڑکیوں کے مکتب قائم کر دیں گے تو ہماری بڑی نیک نامی گورنمنٹ میں ہوگی۔ اس سبب سے وہ ہر طرح پر بطریق جائز و ناجائز لوگوں کو واسطے قائم کرنے لڑکیوں کے مکتبوں کی فہمائش کرتے تھے، اور اس سبب سے زیادہ تر لوگوں کے دلوں کو ناراضی اور اپنے غلط خیالات کا اُن کو یقین ہوتا جاتا۔

بڑے کالجوں میں طریقہ تعلیم کا تبدل

بڑے بڑے کالج جو شہروں میں مقرر تھے۔ اول اول گو اُن سے بھی کچھ کچھ وحشت لوگوں کو ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں شاہ عبدالعزیزؒ جو تمام ہندوستان میں نہایت نامی مولوی تھے، زندہ تھے۔ مسلمانوں نے اُن سے فتویٰ

پوچھا۔ انہوں نے صاف جواب دیا کہ کالج انگریزی میں جانا اور پڑھنا، انگریزی زبان کا سیکھنا بموجب مذہب کے سب درست ہے۔ اس پر سینکڑوں مسلمان کالجوں میں داخل ہو گئے۔ مگر اس زمانہ میں کالجوں کا حال ایسا نہ تھا بلکہ ان میں تعلیم کا سررشتہ بہت اچھا تھا۔ ہر قسم کے علوم فارسی اور عربی اور سنسکرت اور انگریزی پڑھائے جاتے تھے۔ فقہ اور حدیث اور علم ادب پڑھانے کی اجازت تھی۔ فقہ میں امتحان ہوتا تھا سندیں ملتی تھیں۔ کسی طرح کی ترغیب مذہبی نہ تھی۔ مدرس بہت ذی عزت اور معتبر اور مشہور اور ذی علم اور پرہیزگار مقرر ہوتے تھے مگر آخر کو یہ بات نہ رہی۔ قدر عربی کی بہت کم ہو گئی اور فقہ اور حدیث کی تعلیم یکسر جاتی رہی۔ فارسی بھی چنداں قابل لحاظ نہ رہی۔ تعلیم کی صورت اور کتابوں کے رواج نے بالکلیہ تغیر پکڑا۔ اردو اور انگریزی کا رواج بہت ہوا۔ جس کے سبب وہی شبہ کہ گورنمنٹ کو ہندوستان کے مذہبی علوم کا معدوم کرنا منظور ہے۔ قائم ہو گیا۔ مدرس لوگ معتبر اور ذی علم نہ رہے۔ وہی مدرسہ کے طالب علم جنہوں نے ابھی تک لوگوں کی آنکھوں میں اعتبار پیدا نہ کیا تھا، مدرس ہونے لگے۔ اس لئے ان مدرسوں کا بھی وہی حال ہو گیا۔

گورنمنٹ کا اشتہار در باب استحقاق نوکری

ادھر تو دیہاتی مکاتب اور کالجوں کا یہ حال تھا کہ اُن پر سب کو شبہ رواج دینے مذہب عیسائی کا ہو رہا تھا کہ دفعۃً پیش گاہ گورنمنٹ سے اشتہار جاری ہوا کہ جو شخص مدرسہ کا تعلیم یافتہ ہوگا اور فلاں فلاں علوم اور زبان انگریزی میں امتحان دے کر سند یافتہ ہوگا، وہ نوکری میں سب سے مقدم سمجھا جائے گا۔ چھوٹی چھوٹی نوکریاں بھی ڈپٹی انسپکٹروں کے سرٹیفکیٹ پر جن کو ابھی تک سب لوگ ''کالا پادری'' سمجھتے تھے۔ منحصر ہو گئیں اور ان غلط خیالات کے سبب لوگوں کے دل پر ایک غم کا بوجھ پڑ گیا اور سب کے دل میں ہماری گورنمنٹ سے ناراضی پیدا ہو گئی۔

لوگ یہ سمجھے کہ ہندوستان کو ہر طرح بے معاش اور محتاج کیا جاتا ہے تاکہ مجبور ہو کر رفتہ رفتہ ان لوگوں کی مذہبی باتوں میں تغیر و تبدل ہو جائے۔ [۴۳]

جیل خانوں میں اختلاط اکل و شرب

اسی زمانہ میں بعض اضلاع میں تجویز ہوئی کہ قیدی جیل خانوں میں ایک شخص کے ہاتھ کا پکا ہوا کھائیں۔ جس سے ہندوؤں کا مذہب بالکل جاتا رہتا تھا۔ مسلمانوں کے مذہب میں اگرچہ کچھ نقصان نہیں آتا تھا مگر اس کا رنج سب کے دل پر تھا کہ سرکار ہر ایک کا مذہب لینے پر آمادہ اور ہر طرح پر اس کی تدبیر میں ہے۔

پادری اے ایڈمنڈ کی چٹھیات کا اجراء

یہ سب خرابیاں لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو رہی تھیں کہ دفعۃً ۱۸۵۵ء میں پادری اے ایڈمنڈ نے دارالامارت کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز نوکروں کے پاس چٹھیات بھیجیں جن کا مطلب یہ تھا کہ:

''اب تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہو گئی۔ تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہو گئی۔ ریلوے

سڑک سے سب جگہ کی آمدورفت ایک ہوگئی۔ مذہب بھی ایک چاہئے۔ اس لئے مناسب ہے کہ
تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ''۔

میں سچ کہتا ہوں کہ ان چٹھیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آ گیا۔ پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی۔ سب کو یقین ہو گیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے وہ وقت اب آ گیا۔ اب جتنے سرکاری نوکر ہیں، اوّل اُن کو کرسٹان ہونا پڑے گا اور پھر تمام رعیت کو۔ سب لوگ بے شک سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیاں گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں۔ آپس میں ہندوستانی لوگ اہل کاران سرکاری سے پوچھتے تھے کہ تمہارے پاس بھی چٹھی آئی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تم بھی بسبب لالچ نوکری کے کرسٹان ہو گئے۔ ان چٹھیوں نے یہاں تک ہندوستانی اہل کاروں کو الزام لگایا کہ جن کے پاس چٹھیاں آئی تھیں، وہ مارے شرمندگی اور بدنامی کے چھپاتے تھے اور انکار کرتے تھے کہ ہمارے پاس تو نہیں آئی۔ لوگ جواب دیتے تھے کہ اب آ جائے گی۔ کیا تم سرکاری نوکر نہیں ہو؟ اگر سچ پوچھو تو یہ چٹھیاں تمام ہندوستانیوں کے غلط شبہات کو پکا اور مستحکم کرنے والی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے کر دیا اور اس کے مٹانے کو کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ کچھ عجب نہ تھا کہ اسی زمانہ میں کچھ برہمی اور تھوڑا بہت فساد ملک میں شروع ہو جاتا۔ چنانچہ اُس وقت کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر جناب معلی القاب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر بنگال نے بہت جلد خبر لی اور ایک اشتہار جاری کیا۔ جس سے فی الجملہ لوگوں کے دلوں میں تسلی ہوئی اور وہ اضطرار جو ہو گیا تھا، وہ دھیما ہوا۔ مگر جیسا کہ چاہیے ویسا قلع اور قمع اس کا نہ ہوا۔ لوگ سمجھے کہ بالفعل یہ بات موقوف ہو گئی۔ پھر بھی قابو پا کے وقت پر جاری ہوگی۔

مسلمانوں کو مداخلت امور مذہبی سے زیادہ رنج ہونا اور اس کا سبب

ان سب باتوں سے مسلمان بہ نسبت ہندو کے زیادہ ناراض تھے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہندو اپنے مذہب کے احکام بطور رسم و رواج کے ادا کرتے ہیں، نہ بطور احکام مذہب کے۔ ان کو اپنے مذہب کے احکام اور عقائد اور وہ دلی اور اعتقادی باتیں جن پر نجات عاقبت کی موافق اُن کے مذہب کے منحصر ہے، مطلق معلوم نہیں ہیں۔ اور نہ اُن کے برتاؤ میں ہیں۔ اس سبب سے وہ اپنے مذہب میں نہایت سست اور بجز اُن رسمی باتوں کے اور کھانے پینے کے پرہیز کے اور کسی مذہبی عقیدے میں پختہ اور متعصب نہیں ہیں۔ اُن کے سامنے اُن کے اس عقیدے کے جس کا دل میں اعتقاد چاہیے، برخلاف باتیں ہوا کریں اُن کو کچھ غصہ یا رنج نہیں آتا۔ برخلاف مسلمانوں کے وہ اپنے مذہب کے عقائد بموجب جو باتیں کہ اُن کے مذہب میں نجات دینے والی اور عذاب میں ڈالنے والی ہیں، بخوبی جانتے ہیں۔ اور ان احکام کو مذہبی احکام اور خدا کی طرف کے احکام سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس سبب سے اپنے مذہب میں پختہ اور متعصب ہیں۔ ان وجوہات سے مسلمان زیادہ تر ناراض تھے اور ہندوؤں کی بہ نسبت زیادہ تر فساد میں اُن کا شریک ہونا قرین قیاس تھا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ بلاشبہ جتنی گورنمنٹ کی مداخلت مذہب میں خلاف قواعد ملک داری ہے، ایسا ہی کسی مذہب کی تعلیم کو روکنا علی الخصوص اس مذہب کی جس کو وہ حق سمجھتی ہے،

برخلاف اور بے جا ہے۔ مگر ہمارا مطلب صرف اتنا ہے کہ باوجودیکہ ہماری گورنمنٹ ایسی ہی ہے مگر کام اس طرح پر ہوئے کہ رعایا کا یہ غلط شبہ رفع نہ ہوا۔ (۴۵)

پنڈتوں کی مخالفت

شمس العلماء ذکاء اللہ خاں مشنریوں اور انگریزی حکام کی اُن کوششوں کو جو ہندوؤں کے مذہب اور اُن کے رسم و رواج کے خلاف تھیں تفصیل سے بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''پنڈتوں نے اپنی مذہبی کتابوں میں دنیاوی علوم کی ہر شاخ کو باقاعدہ نظام کے ساتھ داخل کر رکھا ہے۔ غرض اس دنیا میں اور اس سے باہر ہندوؤں پر اقتدار پنڈتوں کو وہ حاصل ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں اب انگریزی عملداری میں ان کے سارے اقتداروں اور اختیاروں میں خلل پڑا۔ مقدمات میں رجوع انگریزی عدالتوں میں کی جاتی اور اُن کی اپیل بھی اعلیٰ عدالتوں میں ہوتی۔ پنڈتوں کی پوچھ گچھ اُن میں کمتر ہوگئی۔ اس لئے یہ سارا فرقہ انگریزی عملداری کا بدخواہ ہوگیا۔ (۴۶)

عزت، شرافت اور خودداری پر کاری ضرب

ہندوستان کی عزت وعظمت پر کاری ضرب تو سو سال پہلے مئی ۱۷۵۷ء میں لگ چکی تھی۔ جب عیاری اور مکاری سے سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال پر قبضہ کیا گیا تھا اور بقول ایک مؤرخ مصنف کے ۱۸۵۷ء میں جس کی صد سالہ یادگار منائی جارہی تھی۔ لیکن اس وقت ہندوستان کی مختلف طاقتیں اس طرح آپس میں دست و گریبان تھیں کہ سراج الدولہ کا قتل بھی ایک معمولی واقعہ تصور کیا گیا۔

ظاہر ہے کہ جب ایک طرف احمد شاہ ابدالی مرہٹوں کی عظیم الشان طاقت کو تہ و بالا کر رہا ہو، پھر شمالی ہند میں شجاع الدولہ اور حافظ رحمت خاں، جنوبی ہند میں نظام الملک اور سلطان ٹیپو۔ ایک دوسرے کی شکست پر چراغاں کر رہے ہوں احمد شاہ ابدالی کے قتل عام کے بعد بھی مرہٹوں کے آپس کے جھگڑے ختم نہ ہوئے ہوں اور نہ صرف جنوبی مغربی سرحد کے علاقوں میں بلکہ وسط ہند تک ان کے اکھاڑے جمے ہوئے ہوں تو انگریزوں کے ڈپلومیٹک اور پرفن ہاتھ جو گل کھلا رہے تھے اُن کا احساس عوام تو عوام خواص کو بھی مشکل ہی سے ہوسکتا تھا۔ اور چونکہ انگریز خود بھی اپنے مستقبل سے مطمئن نہیں تھے۔ ایک طرف یورپ میں نپولین بوناپارٹ اُن کے سینے پر سوار تھا دوسری جانب ہندوستان میں فرانسیسی فوجیں نبرد آزما تھیں۔ ہندوستان کا نپولین اعظم جس کو انگریزوں نے نہیں بلکہ خود اُس کے غدار ساتھیوں نے ناکام نپولین بنادیا۔ یعنی سلطان ٹیپو، اُس کا کروفر انگریزوں کی نیند حرام کئے ہوئے تھا۔ اُس سے فراغت ہوئی تو جسونت راؤ ہلکر، نواب امیر علی خاں اور وسط ہند میں پنڈاری عرصہ تک۔ اور اس کے بعد سید احمد شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کی غیر معمولی تنظیم ۱۸۳۱ء تک انگریزی قوت کے لئے تپ ولرزہ بنی رہی تھی۔ لہٰذا

انگریز کا ٹھنڈا دماغ بھی اس کو چاپلوسی اور خوشامدانہ سیاست پر آمادہ کیے ہوئے تھا۔ وہ نہ صرف بادشاہوں اور نوابوں کے دربار میں دست بستہ مؤدبانہ حاضری دیتا تھا بلکہ علماء فقراء اور جوگیوں کی خدمت میں بھی ہاتھ باندھ کر حاضر ہوتا تھا۔ انتہا یہ کہ سید احمد صاحب شہیدؒ کا قافلہ سفر کرتا ہے تو ہندو مسلمانوں کی طرح نیل کی کمپنیوں کے انگریز مالک بھی جگہ جگہ دعوت کرتے ہیں۔

مگر یہی انگریز جب ۱۸۳۰ء میں سید صاحب شہیدؒ اور اُن کی جماعت کو سکھوں اور سامراج پرست مسلمانوں کے ہاتھ، پھر سکھوں کو خود آپس کی خانہ جنگی کے ذریعہ قلع قمع کر دیتا ہے تو ایک طرف اپنی شہنشاہیت کا اعلان کرتے ہوئے مغل بادشاہ اور اودھ کے بادشاہ کے بجائے کمپنی بہادر کا سکہ رائج کرتا ہے۔ عدالتوں میں شاہی دستاویزوں کے بجائے کمپنی کے اسٹامپ جاری کرتا ہے اور دوسری طرف غرور اور تکبر کا پارہ یہاں تک چڑھتا ہے کہ سرسید جیسے وفاداری کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ سرسید مرحوم کا شکوہ ملاحظہ فرمایئے۔ اس مؤدب شکوے میں سرسید نے دونوں رخ پیش کر دیئے ہیں۔ فرماتے ہیں:

حال کے حکام معہد سے (اس وقت کے افسران متعلقہ کے مقابلہ میں) وہ پہلے لوگ (سابق زمانہ کے یورپین افسر) بہت عزت کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کی ہر طرح سے خاطر داری کرتے تھے۔ اُن کے دلوں کو اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے۔ دوستانہ، اُن کے رنج و راحت کے شریک ہوتے تھے۔ باوجودیکہ وہ بہت بڑی سرداری اور حکومت ہندوستان میں رکھتے تھے اور تحشم اور رعب اور دبدبہ جو شایان حکومت ہے وہ بھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ پھر ایسی محبت اور عزت ہندوستانیوں کی کرتے تھے کہ ہر ایک شخص مل کر اُن کے اخلاق کا اور اُن کی محبت کا فریفتہ ہو جاتا تھا اور تعجب سے کہتا تھا کہ یہ کیسے اچھے لوگ ہیں، کہ باوجود اس حشمت و شوکت اور حکومت کے بے غرور ہیں اور کس طرح اخلاق سے ملتے ہیں۔ ہندوستان میں جو لوگ بزرگ گنے جاتے تھے، اُن سے اسی طرح پیش آتے تھے۔ بیشک ان لوگوں نے پطرس مقدس کی پیروی کی تھی اور برادرانہ محبت پر الفت بڑھائی تھی۔ حال میں جو حکام معہد ہیں، اُن میں سے اکثروں کی طبیعتیں اس کے برعکس ہیں۔ کیا اُن کے غرور اور تکبر نے تمام ہندوستانیوں کو اُن کی آنکھوں میں ناچیز نہیں کر دیا ہے؟ کیا اُن کی بدمزاجی اور بے پروائی نے ہندوستانیوں کے دل میں بے جا وحشت نہیں ڈالی ہے؟ کیا ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم ہے کہ بڑے سے بڑا ذی عزت ہندوستانی حکام سے لرزاں اور بے عزتی کے خوف سے ترساں نہ تھا، اور کیا یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ ایک اشراف اہل کار، صاحب کے سامنے مثل پڑھ رہا ہے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر باتیں کر رہا ہے، اور صاحب کی بدمزاجی اور سخت کلامی بلکہ دشنام دہی سے دل میں روتا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے افسوس روٹی اور کہیں نہیں ملتی۔ اس نوکری سے تو گھاس کھودنی بہتر ہے۔ (۲۱۵)

بلاشبہ تمام رعایا ہندوستان کی اس بات کی شاکی ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ان کو نہایت بے قدر اور بے وقعت کر دیا ہے۔ ہندوستان کے اشراف آدمی کی ایک چھوٹے سے یورپین کے سامنے ایسی بھی قدر نہیں ہے جیسی ایک چھوٹے یورپین کی۔ ایک بہت ڈیوک کے سامنے یوں تصور کیا جاتا تھا کہ ہندوستان میں کوئی جنٹلمین نہیں ہے۔ (۲۸)

الحاق

ہم اس کے قائل نہیں ہیں کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ صرف نحتی ہوئی جاگیرشاہی کی انگڑائی تھی'۔ یہ ہنگامہ تقاضا تھا انسانی شرافت کا، عزت نفس اور ہندوستانیوں کی خودداری کا، اُن کی حمیت وغیرت کا، احساس صحیح اور جذبہ تعاون کا۔ یہ ہنگامہ اضطراب تھا دین وایمان کے ماننے والوں، دھرم اور مذہب کے پابند پاک نفوس اور پاک باطن خدا پرستوں کے پاک جذبات واحساسات کا۔ یہ ہنگامہ شور وفغاں تھا تباہ شدہ دست کاروں کی فاقہ مستیوں کا، زیادہ ستائی کی مصیبت کے مارے ہوئے کسانوں اور کاشت کاروں کے رنج وغم کا۔ لیکن اس کے باوجود یہ کہنا بھی حقیقت کے خلاف ہوگا کہ جاگیرداروں کے اضطراب اور اُن کی بے چینی کو اس کے اُبھارنے میں کوئی دخل نہیں تھا۔ بلاشبہ اُن کو بھی دخل تھا اور اس بے سروسامان ہندوستان میں اس کا بھی پورا پورا سامان موجود تھا۔ اس کی مختصری سرگزشت ملاحظہ فرمایئے:

''لارڈ ڈلہوزی نے جنگ اور فتوحات کے ذریعہ پنجاب اور برما کو کمپنی کی مملکت میں شامل کرلیا۔ پنجاب کی دوسری جنگ کے بعد کمپنی پنجاب پر بھی قابض ہوگئی۔ تین سال تک پنجاب کی عنان حکومت ایک کونسل کے ہاتھ میں رہی۔ ۱۸۵۳ء میں کونسل توڑ کر پنجاب کو ایک علیحدہ صوبہ بنادیا گیا۔ اس صوبہ کا پہلا چیف کمشنر سرجان لارنس تھا۔

برما کی دوسری جنگ کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے برطانوی مؤرخوں نے بہت تعصب سے کام لیا ہے۔ رنگون کے برمی حاکم کو برطانوی تجارت کا دشمن ظاہر کرنے میں انہوں نے واقعات کو اس انداز میں پیش کیا کہ پڑھنے والا کمپنی کو حق بجانب قرار دینے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

فتوحات کے ذریعہ لارڈ ڈلہوزی نے پنجاب اور برما کو کمپنی کی مملکت میں شامل کیا۔ لیکن ڈلہوزی کو کام میں لاکر اس نے ستارا، ناگپور، جانسی، برار، سنبھل پور، اودے پور اور اودھ پر قبضہ کیا۔

جن شہزادوں کی مدد سے کمپنی ہندوستان میں ایک وسیع سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی، اُن کے لاولد مرنے پر اُن کی ریاستوں پر قبضہ جمانے کا نام مسئلہ الحاق ہے۔

کمپنی پرتاپ سنگھ کو ستارا کا حکمران تسلیم کرچکی تھی۔ اس کے سن بلوغت تک کپتان گرانٹ ڈف ریاست کا ناظم مقرر رہا۔ شہزادہ جوان ہوا۔ بلوغت کے ساتھ ذہانت بھی آئی۔ کپتان ڈیسی

رئیسوں کی ذہانت کو کمپنی کے لئے آفت خیال کرتا تھا پرتاب سنگھ کو جلاوطن کر کے بنارس بھیج دیا گیا۔ ستارا کا جدید حکمران اُس کا بھائی مقرر ہوا۔ دونوں بھائی ۱۸۴۸ء میں لاولد مر گئے۔ اُن کے متبنوں کو وراثت کا جائز حق دار تسلیم کرتے ہوئے ڈلہوزی ستارا پر قابض ہو گیا۔'' (۲۹)
(داستان ستارا، از میجر باسو)۔

ناگپور کے راجہ رگھوجی بھونسلہ ثالث نے ۱۱ر دسمبر ۱۸۵۳ء کو وفات پائی۔ چونکہ وہ لاولد تھا، اس لیے اس کی دادی نے اُس کے بھائی کے بیٹے کو ریاست کا وارث تسلیم کرلیا۔ مرحوم کی رانیوں نے بھی اُسے راجہ تسلیم کرلیا۔ لیکن ڈلہوزی نے یشونت راؤ کو ناگپور کا راجہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ لاولدیت کا بہانہ کرتے ہوئے ڈلہوزی ناگپور پر قابض ہو گیا۔ ناگپور کے الحاق کے ساتھ متوفی راجہ کی رانیوں کے ساتھ برا سلوک کیا گیا۔ اُن کے جواہرات اور سامان آرائش نیلام کیا گیا۔ (ہندوستان میں سلطنت از میجر ایوانز بل)۔ ناگپور کے الحاق کا سبب کمپنی کا اپنا پیدا کردہ تھا۔

جھانسی کے آخری راجہ نے ۲۱ نومبر ۱۸۵۲ء کو وفات پائی۔ ڈلہوزی نے متوفی راجہ کے متبنی کو وارث تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ رانی کو پنشن دے کر جھانسی کا الحاق کردیا گیا۔ جھانسی کے الحاق نے ۱۸۵۷ء میں رانی کو انگریزوں کے خلاف صف آرا ہونے پر مجبور کردیا۔

لارڈ ڈلہوزی کے عہد حکومت میں ہندوستانی راجوں کی لاولد موت، بہت بڑا معمہ ہے۔

ڈلہوزی نے اپنی نگاہ حرص مملکت آصفیہ پر جمائی۔ ڈلہوزی نے نظام کو توہین آمیز خط لکھا۔ ڈلہوزی نے امدادی فوج کے اخراجات کے لئے نظام سے برار کا علاقہ چھین لیا۔ وہ مملکت آصفیہ پر قابض ہو جاتا، اگر سالار جنگ اس کے عزائم کو شکست نہ دیتا۔ پچاس سال بعد لارڈ کرزن نے برار پر مکمل قبضہ کرلیا۔

اودھ کا الحاق سیاسی اور اخلاقی طور پر ایک بہت بڑا گناہ تھا۔ مؤرخوں نے اس الحاق کو ۱۸۵۷ء کے حادثہ کا سب سے بڑا سبب قرار دیا ہے۔ اودھ کا آزادانہ وجود مغلیہ سلطنت کے دور انحطاط سے شروع ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ آزاد تھے لیکن انہیں مغل شہنشاہ کا وزیر خیال کیا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ نواب وزیر، مغلیہ دربار کے تاثرات سے آزاد ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ کمپنی نے انہیں دہلی کے حلقہ اثر سے آزاد ہونے میں مدد دی۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز نے اودھ کے نواب وزیر کو ''شاہ'' کا خطاب دیا۔ وزارت سے شاہیت زیادہ غلامانہ ثابت ہوئی۔ شاہان اودھ کمپنی کے زیر اثر آگئے۔ کمپنی نے حسب منشا شاہان اودھ کی طاقت کم کرنے کی حکمت عملی اختیار کی۔ ۱۸۰۱ء کے معاہدہ نے کمپنی کو مملکت اودھ کا محافظ بنادیا۔ اودھ کی تمام مصیبتوں کا سرچشمہ یہی معاہدہ تھا۔ کمپنی کی پنجاہ سالہ سرپرستی حالات اودھ کو بہتر نہ بنا سکی۔ لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ میں اودھ کے حالات بہت نازک ہو چکے تھے۔ ڈلہوزی معاملات اودھ میں مداخلت چاہتا تھا۔ ڈلہوزی کی مداخلت کا مقصد اودھ کا خاتمہ کرنا تھا۔ مدتوں سے انگریز اودھ پر آنکھ لگائے ہوئے تھے۔

اودھ کی برطانوی آبادی ڈلہوزی کو الحاق کا مشورہ دے رہی تھی۔ دربار ناصر الدین کے ایک برطانوی مصور نے شاہان اودھ کو بدنام کرنے کے لئے مشرقی بادشاہ کی خانگی زندگی لکھی۔ اسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ''کلکتہ ریویو'' کے ایک مدیر نے ایک مقالہ بعنوان ''کیا فتوحات کا زمانہ ختم ہو چکا ہے'' لکھا۔ اس مقالہ میں الحاق اودھ کا مشورہ دے دیا گیا۔ الحاق اودھ کے بعد ڈلہوزی ۱۸۵۶ء میں انگلستان چلا گیا۔ (کمپنی کی حکومت از پروفیسر باری ص ۲۲۴ تا ۲۲۶)

یہ طویل خاموشی کیوں؟

پہلے باب میں جن اسباب اور وجوہات کی طرف مختصر اشارے کیے گئے ہیں، اگرچہ اُن کے سنہ اور تاریخیں نہیں بیان کی گئیں۔ مگر اتنی بات ظاہر ہے کہ آج (۱۸۵۷ء) سے نہیں بلکہ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے کمپنی کی لوٹ مار جاری تھی۔ اس لوٹ کھسوٹ سے ہندوستان کی صنعت وتجارت برباد ہو چکی تھی، اور سو ۱۰۰ سال پیشتر یعنی جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء کے بعد تو اس نے حکومت کا روپ بھی دھارن کر لیا تھا۔ پہلے اگر ''گربہ مسکین'' بن کر خون چوستی اور گوشت نوچتی تھی تو اب ''گرگ مردم خور'' بن کر نہ صرف دستکاری کے کارخانوں اور تجارت کی ہنڈیوں کو تباہ کر رہی تھی بلکہ بڑی بڑی حکومتوں کے پرخچے اُڑا رہی تھی۔ پس سوال یہ ہے کہ اگر ہندوستانیوں کے دلوں کی سرزمین میں قومی احساس کے ذرے چمک رہے تھے۔ اگر اُن کے سینوں میں وطنی جذبات زندہ تھے، اگر خودداری اور خود اعتمادی کی حرارت سرد نہیں پڑی تھی، اگر دور اندیشی اور انجام بینی کے چراغ گل نہیں ہوئے تھے تو وہ اتنے طویل عرصہ تک کیوں خاموش رہے، اور اُن کے تن بدن میں حرکت کیوں نہیں پیدا ہوئی؟ یہ ایک نہایت معقول سوال ہے۔ اس کا جواب ہندوستان کے ایک مشہور صاحب قلم نے یہ دیا ہے:

> ''انگریز جب یہاں پہنچے تھے تو تاجروں کی حیثیت میں پہنچے تھے۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں صرف بیوپار سے دلچسپی ہے۔ ملک داری سے کوئی واسطہ نہیں اور انہوں نے جو لڑائیاں کیں، وہ ملک گیری کے لئے نہ تھیں بلکہ ملکی حکمرانوں میں سے کسی ایک کی امداد کے لئے تھیں۔ یا اُن کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے یورپی تاجروں کا مقابلہ کر سکیں۔ پھر جب باقی یورپی قومیں مقابلہ کے میدان سے ہٹ گئیں تو انگریزوں نے یا تو ملکی حکمرانوں کی حمایت کو پردہ بنائے رکھا یا ایسی چالیں چلتے رہے کہ اُن کے حقیقی مقاصد سب پر آشکارا نہ ہو سکے۔

چند مثالیں

(۱) وہ بنگال، بہار، اُڑیسہ میں جعفر کے پس پردہ پہنچے۔ پھر انہوں نے شاہ عالم ثانی سے تینوں صوبوں کے لئے دیوانی کی سند حاصل کی (۱۷۶۵ء)

(۲) اودھ میں عمل دخل حاصل کیا تو شجاع الدولہ یا آصف الدولہ یا سعادت علی خاں یا غازی

الدین حیدر وغیرہ کے حامیوں اور مددگاروں کی حیثیت میں حاصل کیا اور اسی حیثیت میں روہیلوں کو تباہ کیا۔

(۳) حیدر علی ٹیپو سلطان سے مرہٹوں اور نظام کے شریک کار، رفیق اور بہی خواہ کی حیثیت میں لڑائیاں کیں۔ جب ٹیپو سلطان نے شہادت پائی تو مرہٹوں کو بالکل مٹا دیا، اور نظام کو بے دست و پا بنا کر آخری دم تک مرقع عبرت کے طور پر قائم رکھا۔

(۴) دہلی پہنچے تو ''شاہ عالم'' کے ہمدرد اور بہی خواہ بنے۔ عجب بات یہ ہے کہ شاہ عالم کے نزدیک بھی انگریزوں کی حیثیت یہی تھی اکبر شاہ ثانی کے وقت تک یہی حالت تھی کہ انگریز جو رقم بادشاہ کو دیتے تھے، اُسے وظیفہ نہیں خراج کہا جاتا تھا۔ اکبر شاہ کا ایک خط موجود ہے جس میں خراج بڑھانے کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ جب پردے چاک ہو گئے اور انگریزوں کا اقتدار برہنہ ہو کر سامنے آ گیا تو لوگوں پر حقیقت حال آشکارا ہوئی۔ اُس وقت قومی غیرت کا جذبہ پیدا ہوا۔ پھر دوسرے اسباب اس جذبے پر برابر تازیانوں کا کام دیتے رہے''۔

یہ فاضل مقالہ نگار جو ہندو پاکستان کے جلیل القدر مصنف ہیں، جن کی تعظیم و تکریم کے لئے ہماری گردن خم ہے اور اُن کی فاضلانہ تنقید و تحقیق کے سامنے پیشانی خامہ سرنگوں۔ آپ کی تمام عظمتوں کے اعتراف کے باجود ہمیں اس جواب کی اصابت و صداقت میں تامل ہے۔ ممکن ہے خامہ نوک وریدہ کی یہ جولانی جسارت بے جا اور حد ادب سے تجاوز قرار دی جائے لیکن تحقیق و تفتیش اور نظر و فکر کی سیاحت گاہوں میں ایسی منزلیں بھی آتی ہیں جہاں مؤدبانہ نقد و تبصرہ کے لئے اجازت لینی پڑتی ہے۔

فاضل مقالہ نگار کا یہ ارشاد بالکل درست ہے کہ انگریز تاجروں کی حیثیت میں ہندوستان پہنچے اور کم از کم ابتدائی دور کے لئے یہ بھی تسلیم ہے کہ عام لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں صرف بیوپار سے دلچسپی ہے ملک داری سے کوئی تعلق نہیں''۔ اور ہم یہ بھی تسلیم کر سکتے ہیں کہ سراج الدولہ کو ختم کرنے کے لئے میر جعفر نے جو سازش کی اُس کی بنیاد بھی یہی تصور تھا کہ رد پیہ ان بیوپاریوں کا ہوگا اور سلطنت میری۔

لیکن غور و فکر کا مقام یہ ہے کہ تھوڑے ہی دنوں بعد جب جعفر کی گدی میر قاسم کو بخش کر کمپنی بہادر سودا فروش کی حیثیت میں نہیں بلکہ ''نواب گر'' کی شان میں جلوہ افروز ہوئی، تو کیا اب بھی اس تصور کے لئے کوئی گنجائش باقی رہ گئی تھی کہ ''انگریز کو صرف بیوپار سے دلچسپی ہے''۔

حافظ رحمت خاں (شہید) اور روہیلوں کی طاقت کو ختم کرنا بیشک شجاع الدولہ کا سیاسی منصوبہ تھا جس کی تکمیل کے لئے اُس نے انگریزوں سے مدد لی۔ مگر کیا بہار میں شکست پر شکست اُٹھانے اور کوڑہ جہاں آباد کے معاہدہ کی رو سے محصور اور پابند ہو جانے کے بعد بھی شجاع الدولہ یہی تصور کرتا رہا تھا کہ صرف بیوپار سے دلچسپی ہے۔

صرف یہ تین واقعات [۳۰] جو صرف سترہ سال (۱۷۵۷ء تا ۱۷۷۴ء) کی قلیل مدت میں پیش آ گئے،

سونے والوں کو بیدار کرنے اور دیدہائے بستہ کو وا کرنے کے لئے کافی تھے۔ جو قوم ان تین قیامت خیز حادثوں کے بعد بھی انگریز کو نہیں پہچان سکی تھی، اُس کے لئے ناممکن تھا کہ وہ کسی بھی وقت انگریز کو پہچان سکتی۔ کیونکہ بجلیوں کے کڑاکوں کو نہ سننا اور برق خرمن سوز کی چمک اور تڑپ کو نہ دیکھنا غفلت کی دلیل نہیں، بلکہ فقدانِ صلاحیت کی علامت ہے کہ یہاں سمع وبصر کی طاقت ہی موجود نہیں کہ گرج اور چمک کا احساس ہو۔

اسی صدی کے آخر میں سلطان ٹیپو شہید کو ختم کر کے اس کے ملک کو حصے بخرے کرنا اور صرف سات سال بعد دہلی فتح کر کے شاہ عالم کو نظر بند کر دینا، انگریزی مقاصد کی سراسر عریانی تھی۔ اب کونسا پردہ تھا جو اس نیم برہنہ قوم کی کامل برہنگی میں حائل رہ گیا تھا۔

اتنی بات قابل تسلیم ہے کہ یورپ کے سفید فام، جو دلوں کی سیاہی اور اپنی جلاد طبیعت کو چکنی چپڑی اور بھولی بھالی صورتوں میں پنہاں کئے ہوئے تھے، اپنے کردار کی وحشت و بربریت پر بھی رنگ برنگ نقاب ڈالتے رہے۔ مگر کیا ہندوستانی مدبر ایسے کوتاہ اندیش تھے کہ اُن کی نگاہیں سیاسی چال بازیوں کے پس منظر تک نہ پہنچ سکیں جن کے دعوے یہ تھے کہ......ع

من انداز قدت را مے شناسم   بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش

اور وہ رنگ برنگ نقابوں کے نظر وفریب نظاروں میں ایسے محو ہو گئے تھے کہ انداز ہ قد وقامت کے بعد بھی پری اور دیو میں فرق نہ کر سکے۔ تعجب ہے فاضل مقالہ نگار ایک طرف اپنی محققانہ تصانیف میں جماعت مجاہدین اور اُن کے قائد حضرت سید احمد شہیدؒ کی اُن بے مثال قربانیوں اور عظیم الشان مجاہدانہ خدمات کا تعارف کرا رہے ہیں جن کی نظیر کم از کم تاریخ ہندوستان میں ناپید ہے اور دوسری جانب ہندوستانیوں کی نہ صرف کوتاہ اندیشی بلکہ کور باطنی اور کور چشمی کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔

ممکن ہے یہ توجیہ کی جائے کہ "مقالہ نگار" کا جواب عام ہندوستانیوں کے لحاظ سے ہے، سید صاحب کی مخصوص جماعت اس سے مستثنیٰ ہے۔ لیکن تاریخ کی ناقابل انکار حقیقتیں اس توجیہ کو بھی جائز نہیں قرار دے سکتیں۔ کیونکہ اگر تحقیق وتفتیش کے دائرے کو صرف انگریزی کتابوں تک محدود رکھا جائے اور اپنے کسی مخصوص تصور کو جمانے کی خاطر واقعات کے تسلسل کو توڑنے کی کوشش نہ کی جائے، تو جو حقیقت روز روشن کی طرح نکھر کر سامنے آئے گی، وہ یہ ہوگی کہ ہندوستان کے ارباب حل وعقد، فرمانروا اور علماء انگریز کو اُس وقت پہچان چکے تھے جب اُنہوں نے اور اُن کے پیش رو پرتگیزیوں نے ہندوستان کے ساحلوں پر قزاقی شروع کی تھی اور حاجیوں کے جہازوں کو لوٹ کر اپنی بربریت اور وحشت کو تاریخ ہند کا ایک دل خراش باب بنا دیا تھا۔

خطرات کا احساس اور اُن کا علاج

ظاہر ہے "واسکوڈی گاما" مغل سلطنت کی بنیاد پڑنے سے بھی تقریباً ربع صدی پہلے کالی کٹ پہنچ چکا تھا۔

اسی وقت سے سوداگروں کے لباس میں ان قزاقوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی تھی اور اکبر کے زمانہ تک وہ متعدد بندرگاہوں پر قابض ہو چکے تھے۔

مغل اعظم ''اکبر'' نے ایک مرتبہ اپنے دربار میں پرتگیزی وفد کا اعزاز و اکرام کر کے بلاشبہ اپنی بلند حوصلگی، سیر چشمی اور اعلیٰ کردار کا ثبوت دیا۔ لیکن ساتھ ہی جب پرتگیزی قزاقوں کے متعلق شکائتیں پہنچیں تو گجرات وغیرہ کے گورنروں کے ذریعہ اُن کی گوشمالی بھی کرادی۔

جہانگیر کے دورِ حکومت میں انگلستان کے نمائندے ہندوستان پہنچے۔ ''سرطامس رو'' کی سفارت باریاب ہوئی۔ شاہی اعزاز و اکرام نے ان کا استقبال کیا۔ مگر شاہزادہ خرم (بعد کا شاہجہاں بادشاہ) اُن کے چہرے بشرے سے اُن کی نیتیں تاڑ رہا تھا۔ اس کی کوشش بھی یہی رہی کہ یہ سفارت ناکام ہو۔ پھر جب شاہزادہ خرم شاہجہاں ہوگیا تو اُس نے اور اُس کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے جس طرح اُن کو بار بار ہندوستان کی سرحدوں سے ہنکایا۔ پیش قدمی کرنے والوں کو گرفتار کر کے سزائیں دیں، وہ اس کا بیّن ثبوت ہیں کہ یہ بیدار مغز فرمانروا اُن کے سبز قدموں کی نحوست سے غافل نہ تھے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ شاندار ماضی جلد اول۔ شاہان مغلیہ کا نظام حکومت)۔

جہاں تک طبقہ عُلماء کا تعلق ہے تو عہد اکبر و جہانگیر کے سب سے بڑے عالم جن کو دنیائے معرفت نے ''مجدد الف ثانی'' کا خطاب دیا، اُن کا ایک عارفانہ جملہ مشہور ہے جس میں آپ نے کفر و عصیاں کے بدترین نمونہ کے طور پر ''کافر فرنگ'' کا نام لیا ہے۔

''معرفت ہر آں کس حرام است کہ خود را از کافر فرنگ بہتر داند''۔ (۳۱)

دورِ خود فراموشی

پس ان اربابِ بصیرت علماء اور فرمانرواؤں کے متعلق یہ ارشاد کہاں تک اور کس طرح صحیح ہوسکتا ہے کہ یہ انگریز کو نہیں پہچان سکتے تھے۔ البتہ سلطان عالمگیر کی وفات کے بعد وہ دور آیا جو سلطنت مغلیہ کی جان کنی کا دور تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس ملک (ہندوستان) کی عزو عظمت بھی حالت نزع میں گرفتار ہونے لگی۔ جس نے دو سو برس سے اپنی قسمت کے تار و پود مغل بادشاہت کے دامنوں سے باندھ دیئے تھے۔ یہ دور تھا جب مرکزیت فنا کے گھاٹ اُتاری جارہی تھی اور طوائف الملوکی کے عفریت ہندوستان کے چپہ چپہ پر رینگ رہے تھے۔ اس دور کے متعلق یہ تو نہیں کہا جاسکتا، کہ لوگوں نے انگریزوں کو پہچاننا چھوڑ دیا تھا، البتہ یہ درست ہے کہ وہ خود اپنے سے غافل ہوگئے تھے اور انہوں نے اپنے مستقبل کو پہچاننا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انگریز کو پہچان لینے کے باوجود وہ نہیں کیا یا نہیں کرسکے جو کرنا چاہیے تھا۔ خود پرستی نے خود غرضی اور ذاتی مفاد کی ہوسنا کی جو قومی عظمت و وقار اور حیات اجتماعی کے لئے سرطان اور پلیگ سے بھی زیادہ مہلک امراض ہیں اور جن کی بناء پر طوائف الملوکی

عروج پاتی ہے انہیں امراض نے ارباب اقتدار کی چشم کو نابینا اور گوش سخن نیوش کو اصم و مدہوش بنا دیا تھا۔

فانہا لاتعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔

یہ عجیب فلسفہ ہے کہ انسان جتنا زیادہ اپنی پرستش میں مشغول ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ خود فراموش ہو جاتا ہے ذاتی مفاد اور خود پرستی کے شوالے جو دکن، بنگال اور اودھ میں تعمیر کئے گئے تھے، اُن کی خصوصیت یہ تھی کہ اُن کے پجاری انگریزوں کو پہچاننے، سمجھنے اور بوجھنے کے باوجود اس پر مجبور تھے کہ سنی کو ان سنی اور دیدہ کو نادیدہ بنا دیں۔ کیونکہ وہ اغراض جن کے آب و گل سے یہ شوالے تعمیر ہوئے تھے، اُن کا تقاضا ہی یہ تھا۔ ورنہ یہ شوالے مسمار ہو رہے تھے...... ع

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

گذشتہ واقعات اگر اس لئے یاد دلائے جاتے ہیں کہ مستقبل کے لئے اُن سے سبق لیا جائے تو یاد دلانے والوں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی، الگ الگ کر کے دکھائیں۔ کوئی ضرورت نہیں کہ یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ جیسا فعل کر کے تاریخ کی افادیت میں ہم خلل انداز ہوں، جب آئین قدرو قضا بے لاگ ہے۔

گندم از گندم بروید جو ز جو　　از مکافات عمل غافل مشو

تو مورخ کے قلم حقیقت رقم کو بھی بے لوث اور بے باک ہونا چاہیے۔ کیوں نہیں کہہ دیا جاتا کہ میر جعفر نے وہی سبق دہرایا جو سراج الدولہ کے مکتب سیاست میں پڑھا تھا اور سراج الدولہ کے اسکول کا کورس وہی تھا جس کو علی وردی خاں کی عملی سیاست نے مرتب کیا تھا۔ پھر جب کمپنی کا دور آیا تو کمپنی بہادر کے ارباب حل و عقد نے وہی کیا جو میر جعفر اور سراج الدولہ نے سکھایا تھا۔ وقس علیٰ ھذا۔ پس ہندوستان میں انگریزی عروج کا سبب انگریز ناشناسی نہیں بلکہ اس کا سبب وہ خود پرستی، خود فراموشی اور خود ناشناسی ہے جو بنیاد تھی طوائف الملوکی کی ع

نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
(اقبال)

مختصر یہ کہ نو وارد فرنگیوں کے پہچاننے میں اگر ابتداءً غلطی ہوئی بھی تھی تو وہ بہت جلد ختم ہو گئی۔ البتہ جن اغراض مشئومہ نے جانے پہچانے پڑوسیوں سے انجان بنایا تھا وہی اغراض اب انگریزوں کے شناخت کرنے میں چشم بصیرت کے لئے باعث خیرگی بنی ہوئی تھیں۔ غور فرمایئے۔ نظام حیدر آباد نے جب اٹھارھویں صدی کے وسط میں مرہٹوں کو پایۂ تخت ”دہلی“ کا راستہ بتا کر اُن کی حوصلہ افزائی کی تھی تو کیا وہ اپنے پڑوسی مرہٹوں سے واقف نہیں تھا؟ لیکن جن اغراض کی خاطر نظام نے مرہٹوں کے ہاتھوں مرکز کو کمزور کر کے اپنے پاؤں پر کلہاڑی

ماری تھی، وہی اغراض آج ٹیپو سلطان کو دشمن، اور انگریزوں اور مرہٹوں کو دوست بنا کر پیش کر رہی تھیں۔ ان اغراض کا نتیجہ یہ ام ناک عذاب تھا، کہ بادشاہانِ ذی جاہ اور نوابانِ ذی اقتدار اپنی موت کی دستاویزوں پر خود اپنے ہاتھ سے دستخط کرتے رہے، اور اس اجنبی قوم سے واقفیت حاصل کرنے کے باوجود جتنی بھی گلوخلاصی کی کوشش کرتے تھے، طوقِ غلامی کی گرفت سخت اور مضبوط ہو جاتی تھی۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

پس انگریز کی اجنبی طاقت سے ایک لمحہ نفرت اور دوسرے لمحہ میں اس کی امداد و اعانت اور اس سے تعلق بڑھانے کی ضرورت۔ اگر یہ عملی تضاد نتیجہ تھا طوائف الملوکی کا، تو اس طویل خاموشی کا سبب یہ طوائف الملوکی قرار پائے گی جس نے ایک کو دوسرے سے اس طرح الجھائے رکھا کہ وہ خود ختم ہو گیا مگر یہ الجھاؤ ختم نہیں ہوا۔

علماء کرام کا احساس صحیح اور جہاد پیہم

البتہ اسی اغراض پرستی اور طوائف الملوکی کے دور میں تحقیق و تفتیش کی قدرت آفرینی اور تلاش و جستجو کی عجائب نوازی ہمیں ایک جماعت سے روشناس کراتی ہے جس کے جذبات مقدس، مقاصد بلند اور جس کی جدوجہد ہر قسم کے شبہ سے پاک ہے۔ بادشاہوں، شاہزادوں، نوابوں اور راجاؤں کے متعلق بجا طور پر جاگیر شاہی کی زریں تمناؤں کا شبہ کیا جا سکتا ہے، لیکن اس جماعت کا دامن ایسے تمام داغوں سے پاک ہے۔ یہ جماعت نہ اقتدار کی خواہاں، نہ حکومت و سلطنت کی آرزومند، نہ اعزاز و اکرام اور علمی خطابات کی ہوس اس کے دامنوں سے الجھی ہوئی۔ اس کے سامنے صرف وطن ہے باشندگانِ وطن ہیں، وطن عزیز کی حفاظت، اہل وطن کی ہمدردی اور اپنے ملک کی تعمیر و ترقی ہے۔ یہی اُن کا نصب العین ہے۔ ہاں اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اس دین و مذہب کی حفاظت بھی ضروری سمجھتے ہیں جس نے اُن کے پاک نفوس میں یہ پاکیزہ جذبات پیدا کیے۔ یہ "علماء ہند کی جماعت ہے"۔ وہ جماعت کہ اگر اس کے فکر سلیم اور جذبہ صادق کا اعتراف نہ کیا جائے، اور اگر تاریخی واقعات کی ترتیب اور اُن کے سلسلہ میں سے اس جماعت کی سنہری زنجیر کو نکال دیا جائے، تو نہ صرف یہ کہ با اخلاص اور ایثار شیوہ جماعت کے حق میں ناانصافی ہوگی، بلکہ حق یہ ہے کہ وطن عزیز کے حق میں خیانت اور ایثار و قربانی کی پوری تاریخ پر ایک بہت بڑا ظلم ہوگا۔ بیشک اس ستم شعار دنیا میں قوموں کی تاریخ پر ایسے ظلم بارہا ہوئے ہیں کہ صفحاتِ تاریخ سے اُن کے نام تک کھرچ دیئے گئے ہیں۔ لیکن یہاں ایک بہت بڑی قباحت یہ پیدا ہوتی ہے کہ اگر اس کڑی کو بیچ سے نکال دیا جائے تو اس دور کے بہت سے واقعات معمہ بن جاتے ہیں یعنی نتیجہ تو ناقابل انکار مگر اس کے اسباب مفقود اور ناپید۔ اور جب فلسفہ تاریخ سبب کے بغیر نتیجہ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا تو کبھی کسی واقعہ کو تاریخ کا معجزہ ماننا پڑتا ہے، کبھی ۱۸۵۷ء کی عظیم الشان اور حیرت انگیز جنگ آزادی کو "مٹتی ہوئی جاگیر شاہی کی انگڑائی" کہنا پڑتا ہے اور کبھی اس محاربہ عظیم کو "سرکش فوجیوں کی ہنگامی بغاوت" کہہ کر قصہ مختصر

کرنا پڑتا ہے۔ یہ تمام اعجوبہ کاریاں اسی وقت ہوتی ہیں جب اس جماعت (جماعت علماء) کی مدبرانہ اور پیہم کوششوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

جماعت علماء کی کارگزاری

اس جماعت نے اٹھارہویں صدی کے وسط سے رفتار زمانہ کو بھانپ کر جو نظریئے مرتب کئے، وطن عزیز کی ترقی اور کامیابی کیلئے جو تدبیریں سوچیں اور جس طرح اُن پر عمل کیا، اس کی تفصیل اسی سلسلہ کی دوسری جلد میں گزر چکی ہے، یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ البتہ موقع کی مناسبت سے کچھ اشارے ضروری ہیں جو آئندہ صفحات میں پیش کئے جارہے ہیں۔

علماء کرام کے نظریات، تجویزیں، لائحہ عمل اور عمل

(۱) اٹھارہویں صدی کا تقریباً وسط تھا۔ سلطنت مغلیہ کی کشتی ڈانواں ڈول اور انگریزی اقتدار کی گھٹائیں دن بدن گاڑھی ہو رہی تھیں۔ وطنی سیاست کے چاند تارے ان گھٹاؤں میں چھپ چکے تھے یا چھپتے جارہے تھے۔ تب حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی (قدس اللہ سرہ العزیز) نے خوش حال، ترقی پذیر متمدن اور فوجی لحاظ سے نہایت مضبوط وطن کے نقشہ کو نصب العین بنا کر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روشنی میں اقتصادی اور سیاسی نظریات مرتب کئے اور ان نظریات پر دماغوں کی تربیت کے لئے وطن عزیز میں چند مرکز قائم کر دیئے (دیکھو شاندار ماضی جلد دوم اور حضرت شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک)۔

(۲) سب سے بڑا مرکز دہلی کا مدرسہ تھا (مدرسہ شاہ عبدالعزیز)۔ جس نے استاذ العلماء حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کی زیر تربیت ہندوستان کے علمی حلقوں میں نئی زندگی پیدا کی اور حضرت سید احمد شہیدؒ، مولانا اسمٰعیل صاحب شہیدؒ، شیخ الاسلام مولانا عبدالحی، مولانا محمد یوسف پھلتی جیسے جرنیل، حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب، [۳۲] حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب، [۳۳] حضرت مفتی صدرالدین صاحب، حضرت مولانا رشید الدین صاحب دہلوی، مولانا مرزا حسن محدث لکھنوی، مولانا سید اولاد حسین صاحب قنوجی، مولانا الٰہی بخش صاحب کاندھلوی، مولانا قطب الدین صاحب دہلوی، مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی رحمہم اللہ جیسے مفکر و مدبر پیدا کئے۔ اسی مرکز کے مربی اور سرپرست (حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ) نے ۱۸۰۶ء میں دہلی پر انگریزی اقتدار کے بعد وہ مشہور فتویٰ صادر کیا جو بعد کے علماء اور تمام مذہب پرست طبقہ کے لئے نشان راہ بنا اور ابھی آپ دنیا سے رخصت نہیں ہوئے تھے کہ سینکڑوں تربیت یافتہ انقلابی نوجوانوں کی فوج حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کی زیر کمان انقلاب کے لئے قدم بڑھا چکی تھی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو شاندار ماضی جلد دوم)۔

(۳) مِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ

ترجمہ: کچھ وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے ہیں اور کچھ انتظار کر رہے ہیں۔

بے شک حضرت سید صاحب شہید جنہوں نے ہندوستان کے بہت بڑے حصہ کا دورہ کر کے عوام کے اندر روح انقلاب پیدا کی، مئی ۱۸۳۱ء میں جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ مگر وہ مرکز جو اُن کے لئے مجاہد اور مالی امداد فراہم کر رہا تھا جس کی صدارت وقیادت حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے بعد اُن کے صحیح جانشین حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے سپرد تھی۔ وہ زندہ تھا محفوظ تھا متحرک تھا چنانچہ اسی محاذ کو سرگرم عمل کرنے کے لیے حضرت شاہ اسحاق صاحب نے اپنے داماد عزیز مولانا سید نصیر الدین دہلوی قدس اللہ سرہ العزیز کو اپریل ۱۸۳۵ء میں دہلی سے روانہ کر دیا، اور جب یہ نخل آرزو بارآور ہونے سے پہلے ۱۸۴۰ء میں طبعی وفات سے پژمردہ ہو گیا تو حضرت شاہ اسحاق صاحب اور اُن کے برادر عزیز مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے وطن عزیز سے رخت سفر باندھا اور مکہ معظمہ میں جا کر ڈیرے ڈال دیئے۔

حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب اور مولانا یعقوب صاحب کا یہ سفر مایوسی کا نتیجہ تھا یا انقلاب کے لئے نئے راستہ کی تلاش؟

اس کا جواب مشہور انقلابی عالم حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے ایک فقرہ سے معلوم کیجئے:

"مولانا محمد اسحاق نے اولاً مکہ معظمہ پہنچ کر پوری آزادی سے اپنی ہندوستانی تحریک کی رہنمائی کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس پر دولت عثمانیہ کی وزارت خارجہ کو اُن کے اخراج پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی۔" (۴۴)

شاہ صاحب موصوف نے وہاں کا معاملہ تو شیخ الحرم کو بیچ میں ڈال کر ٹھیک کر لیا۔ چنانچہ بطور پناہ گزیں وہاں رہنے کی اجازت مل گئی۔[۴۵] مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب حل وعقد کے غیظ وغضب کو فرو کرنا نہ اُن کے امکان میں تھا اور نہ وہ عزائم اس کی اجازت دے سکتے جن کو وہ سینہ میں لے کر مکہ معظمہ گئے تھے۔ چنانچہ یہاں ان کی تمام املاک ضبط کر لی گئیں جن کا مقابلہ انہوں نے اُس خندہ پیشانی سے کیا، جو ایسے جلیل القدر اور اولوالعزم رہنماؤں کی شان کے مناسب تھا۔ چنانچہ جب ضبطی جائداد کی خبر ان بزرگوں کو پہنچی تو اُن پر وجد کی کیفیت طاری تھی۔ آپس میں مبارک باد دے رہے تھے اور بڑی خوشی سے یہ خبر دوستوں کو سناتے تھے۔[۳۶]

سیدنا حضرت شاہ اسحاق صاحب کو مکہ معظمہ رخصت کرنے[۳۷] کے بعد[۳۸] آپ ایک ایسے موڑ پر کھڑے ہیں جہاں سے ۱۸۵۷ء میں صرف تیرہ منزل کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء احساس حریت کا وہ روشن مینارہ ہے جس کی ضیاپاشیاں سو سال گزر جانے کے بعد (۱۹۵۷ء میں) بھی نظروں کو چکا چوند کر رہی ہیں۔

میرٹھ کی باغی فوج کے سامنے......... ریزیڈنٹ بہادر دہلی کی اُس تقریر کے بعد جس کے ایک ایک فقرہ میں اُمیدوں کے سرسبز وشاداب باغ دکھائے گئے تھے، میرٹھ سے آئے ہوئے انقلابی فوجیوں کی یہ صدا آج بھی کانوں میں گونج رہی ہے۔

''اب سرکار جو چاہے کر لے، ہم سب مرنے پر تیار ہیں اور ہم اپنے آپ کو اسی وقت مردہ تصور کر چکے ہیں جس وقت جیل خانہ توڑ کر افسروں کو برآمد کیا تھا''۔ (ص ۱۵۲، داستان غدر راز حضرت راقم الدولہ ظہیر دہلوی)

کہہ سکتے ہو، فوجوں میں یہ جوش و خروش حال کی پیداوار ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ شمالی ہند کا تقریباً دو ہزار میل لانبا وہ علاقہ جو حضرت سید صاحب اور اُن کے رفقاء اور خلفاء کا آماج گاہ رہا تھا، اسی جوش و خروش کے انگاروں میں دہک رہا ہے، کیا اس پورے علاقہ میں عوام کا جوش و خروش انہیں چند ماہ کی پیداوار ہے جب سے کارتوسوں کا معاملہ پیش آیا تھا اور خفیہ طور پر چپاتیاں تقسیم ہونی شروع ہوئی تھیں۔

عوامی تحریکوں کا جن کو تجربہ ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ عوام میں بیداری پیدا کرنا کتنا صبر آزما اور کتنا مدت طلب کام ہے۔ بالخصوص ایسی بیداری جو اُن کو اس پر آمادہ کر دے کہ ؎

یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

اگر اپنے سامنے کے تجربات اور ذاتی مشاہدات پر تاریخی واقعات کو قیاس کرنا صحیح اور درست ہے، اور اگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ اُس بیداری کے پیدا ہونے کے بعد جس کی ابتداء ۱۸۵۷ء کے ہیبت ناک دھماکہ سے ہوئی تھی۔ بیدار ہندوستان کو پورے نوے سال جدوجہد کرنی پڑی ہے، اور اگر انڈین نیشنل کانگریس کے آغاز سے شعور و احساس کی ابتداء مانی جائے تو ابتداء شعور سے کامیابی کی منزل تک پہنچنے میں پورے تریسٹھ سال صرف ہوئے ہیں۔ حالانکہ نشر و اشاعت اور پراپیگنڈے کی سہولتیں اس وقت ۱۸۵۷ء سے پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ میسر تھیں اور جیسا کہ کہا جاتا ہے فہم و فراست، سیاسی شعور اور تعلیم میں بھی پہلے سے زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ تو اگر اس نوے سالہ یا باسٹھ سالہ دور کو انگریزوں سے ناواقف نہیں قرار دیا جا سکتا تو یقیناً ۱۷۶۵ء تک بہتر سالہ دور کے ہندوستانیوں کے متعلق بھی یہ فتویٰ صادر کرنا غلط ہوگا کہ وہ انگریزوں اور اُن کی ڈپلومیسیوں سے ناواقف جھوٹے وعدوں کے سبز باغوں میں سیر کر رہے تھے۔

مولانا سید نصیر الدین دہلوی

یہ مولانا سید نصیر الدین دہلوی [۳۹] جن کا ذکر خیر فقرہ نمبر ۳ میں گزرا، کون تھے؟ اُن کی سیرت نگاری اگرچہ ایک مقدس خدمت ہے مگر اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے کیونکہ اُن کا دور ۱۸۵۷ء سے سولہ سترہ سال پہلے ختم ہو چکا تھا۔ لیکن اس دور کے وہ اثرات جو قدرتاً اور طبعاً ۱۸۵۷ء تک زندہ رہ سکتے تھے، چنانچہ زندہ رہے۔ اُن کا اجمالی تذکرہ اس موقع پر از بس ضروری ہے اور اس مناسبت سے حضرت مولانا سید نصیر الدین صاحب کا کچھ ذکر خیر بھی ضروری ہے۔

مولانا سید نصیر الدین صاحب، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (بانی نظریات انقلاب) سے ننہالی رشتہ رکھتے تھے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے بھائی حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب سے شاندار ماضی جلد دوم کے مطالعہ کرنے والے حضرات واقف ہیں۔ مولانا سید نصیر الدین صاحب انہیں حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے نواسے ہیں۔ جدید رشتہ یہ ہے کہ حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب کی صاحبزادی آپ سے منسوب ہیں۔

حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے نواسے اور مسند درس کے جانشین جو حضرت سید احمد صاحب شہید اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک جہاد کے لئے مرکز دہلی سے مجاہد اور مالی امداد فراہم کرتے رہے تھے، اُن کی اور اُن کے داماد مولانا سید نصیر الدین صاحب کی دلچسپیاں اس تحریک کے ساتھ ذمہ دارانہ تھیں۔ چنانچہ:

"۱۲۴۰ھ، ۱۸۲۵ء، (جب سید صاحب کا قافلہ سفر جہاد کی تیاری کر رہا تھا تو) حضرت شاہ اسحاق صاحب وعظ فرماتے تھے، اور مولانا نصیر الدین صاحب مدرسے کے دروازے پر فراہمی زر اعانت میں معروف رہتے تھے"۔ (۴۰)

بہر حال ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۱ء) میں جب یہ دونوں بزرگ (سید صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب) بالاکوٹ میں شہید ہو چکے تو اگرچہ جاں نثاران حق کے چھوٹے چھوٹے گروہ وقتاً فوقتاً سرحد پہنچتے رہتے تھے (اور جیسا کہ شاندار ماضی جلد دوم اور جلد سوم میں واضح کیا گیا ہے، جاں نثاران حق نے ان بزرگوں کی شہادت کے بعد بھی اُن کے بلند کئے ہوئے علم جہاد کو سر بلند رکھا) تاہم عام مسلمانوں کے جوش جہاد میں افسردگی پیدا ہو رہی تھی۔ اس لئے کہ سرحد میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام پانے کا موقع باقی نہیں رہا تھا۔ لہٰذا سید صاحب کی تحریک جہاد کے کارفرماؤں کو ضرورت محسوس ہوئی کہ دوبارہ ایک بڑی جماعت تیار کر کے آزاد علاقے میں بھیج دی جائے جس سے سید صاحب کے شروع کئے ہوئے کام میں جوش و خروش کی نئی روح پیدا ہو جائے۔

اس اہم فرض کی بجا آوری کا شرف روز ازل سے مولانا سید نصیر الدین دہلوی کے لئے مقدر ہو چکا تھا جنہوں نے سید صاحب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کیا۔ دعوت جہاد سے ایک جماعت تیار کی اور سید صاحب کی طرح وطن مالوف سے ہجرت کر کے کاروبار جہاد کی تجدید کا انتظام فرمایا۔ (۴۱)

اس کے بعد آپ نے ٹونک، اجمیر، میرٹھ، امروہہ، رام پور وغیرہ کا دورہ کیا۔ حاجی سید عبدالرحیم سورتی، مولوی بہاؤالدین چھپا پٹنی، (۴۲) احمد سادہ کار، امام الدین سوزن ساز وغیرہ آپ کے رفیق خاص تھے۔ (۴۳)

آپ کی خواہش یہ بھی تھی کہ ہجرت سے پیشتر ملک کے اور حصوں کا بھی دورہ کریں حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کے مقرر فرمائے ہوئے نقیب جا بجا دعوت و تبلیغ میں مصروف تھے۔ مثلاً مولانا ولایت علی عظیم آبادی (جو سید صاحب کی شہادت کے بعد وطن واپس آگئے تھے اور نظام از سر نو قائم فرما رہے تھے) اُن کے بھائی مولانا عنایت علی مشرقی بنگال میں سرگرم عمل تھے۔ مولانا سید محمد علی مدراس میں وعظ و نصیحت کے مرکز قائم کرنے کے بعد ملک

کے دوسرے حصوں میں مشغول تھے۔ مولانا سید اولاد حسن قنوجی[۴۴] بھی اپنے گرد و پیش کام انجام دے رہے تھے۔

مولانا سید نصیر الدین صاحب چاہتے تھے کہ دعوت و تبلیغ کی ان مساعی میں تنظیم پیدا کر کے اندازہ فرمالیں کہ کل کتنی جمعیت کا انتظام ہو سکے گا اور آئندہ کے لئے مجاہدین کی آمد کا سلسلہ کس پیمانے پر جاری رہ سکے گا۔ مگر جب سوچا کہ اس طرح آغاز کار میں بہت تاخیر ہو جائے گی تو یہی فیصلہ کیا کہ زیادہ تاخیر روا نہ رکھی جائے اور ظاہر ہے جواں مردانہ میدان جہاد میں اُتر آنا بجائے خود دعوت و تبلیغ کا ایک مؤثر پیغام تھا۔[۴۵]

مولانا نصیر الدین صاحب کی والدہ محترمہ حیات تھیں۔ اُن سے اجازت[۴۶] حاصل کی سفر کا نہایت مختصر سامان ساتھ لیا۔[۴۷] ۳ ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ (۲ اپریل ۱۸۳۵ء) کو گھر بار اہل و عیال اور اعزا و احباب سے مفارقت اختیار کر کے عرب سرائے میں جا ٹھہرے۔

۶ ذی الحجہ کو عرب سرائے سے روانہ ہوئے، اور قطب صاحب میں حوض شمسی کے کنارے مسجد اولیاء کے متصل قیام کیا۔ ۷ ذی الحجہ کو چلے تو ریواڑی پہنچے۔ عید الاضحیٰ کی نماز یہیں ادا کی۔

ریواڑی سے روانہ ہو کر جے پور قیام کیا۔ پھر ٹونک پہنچے۔ جہاں نواب وزیر الدولہ کا دور حکومت تھا۔ نواب وزیر الدولہ (سید احمد صاحب شہید کے پروردۂ خاص) مولانا سید نصیر الدین صاحب کی تشریف آوری کے لئے چشم براہ تھے۔ بڑے حوصلہ سے خاطر مدارات کی۔ مجمع کثیر کے ساتھ حلقہ بگوش ارادت[۴۸] ہوئے اور رخصت کے وقت بہت کافی سامان نذر کیا۔

مولانا سید نصیر الدین صاحب کا قافلہ ٹونک سے روانہ ہو کر اجمیر پہنچا۔ پھر جودھپور میں قیام کیا۔ جودھ پور سے جیسلمیر ہوتے ہوئے سندھ میں داخل ہوا۔ جہاں مختلف مقامات پر قیام ہوا۔ سندھ کے علماء، زعماء اور مشائخ سے تبادلۂ خیالات کیا گیا۔ جہاد کی ترغیب دی گئی۔ جس قدر میسر ہو سکا، سامان جہاد فراہم کیا گیا۔ ان مرحلوں سے گزرنے کے بعد یہ قافلہ مزاری[۴۹] بلوچوں کے علاقہ[۵۰] میں پہنچا۔ اور اسی علاقہ کو قیام کے لئے منتخب کر لیا جہاں کچھ معرکے ہوئے۔ پھر آپ ستھانہ تشریف لے گئے اور اسی کو جہاد حریت کا مرکز بنا لیا مگر ابھی پوری طرح جمنے نہ پائے تھے کہ پیغام اجل آ پہنچا۔ جس کو لبیک کہنا ناگزیر تھا۔ یہ چند سطریں جو اوپر گزریں سیرت سید نصیر الدین کا نقش ناتمام ہیں۔ رحمہ اللہ وقدس سرہ

وہ خاص بات جس کے لئے مولانا نصیر الدین صاحب کا تذکرہ یہاں پر کیا گیا ہے، یہ ہے کہ آپ کی جدوجہد چند نفوس کی جاں بازی اور سرفروشی تک محدود نہیں تھی بلکہ جذبات حریت کے جو شعلے آپ کے دل و دماغ میں مشتعل تھے، آپ نے اُن کی چنگاریاں پورے شمالی ہند میں پھیلا دی تھیں۔ وہ سینکڑوں عمائد اور اپنے اپنے علاقہ کے سربرآوردہ علماء اور زعماء جن کے پاس مولانا نصیر الدین صاحب نے اعلام نامے بھیجے اور جن سے نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رہا۔ اُن میں سے محترم غلام رسول صاحب مہر نے ایک سو چھ ۱۰۶ حضرات کے نام دریافت کر لئے ہیں۔[۵۱]

یہ بزرگ اور رہنما، دہلی، میرٹھ، پھلت، نگینہ، گنگوہ، مکینسر، امروہہ، مرادآباد، رام پور، بریلی، کانپور، لکھنؤ، فرخ آباد، باندہ، قنوج، جون پور، غازی پور، بنارس، آرہ، سہسرام، پٹنہ، مظفر پور، چھپرہ، مونگیر، کلکتہ اور نواح کلکتہ کے رہنے والے ہیں۔

ان میں سے بعض وہ ہیں جن کا تعارف حضرت سید احمد شہید قدس اللہ سرہ کی تحریک کے سلسلہ میں ہو چکا ہے۔ بہت سے وہ ہیں، جن کا تعارف خاص اسی موقع پر ہو رہا ہے۔

جہاں تک ۱۸۵۷ء کی تحریک میں ان حضرات کی شرکت کا تعلق ہے تو یہ درست ہے کہ ان میں سے بہت سے وہ ہوں گے جو ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی زندگی کے تمام مرحلے طے کر کے دار بقا کے منزل گزیں ہو چکے ہوں گے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بہت سوں کے جذبات، افسردہ ہو چکے ہوں اور اس دار فنا میں زندہ رہتے ہوئے اُن کے جذبات حریت فنا ہو چکے ہوں۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہی مقام ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں قربان گاہ ایثار وفدائیت بنے اور یہ آتش دان تھے جن کے شراروں نے شمالی ہند کے بڑے حصہ کو آتش کدہ حرب وضرب بنا دیا، تو کیا ہمیں یہ فرض کرنا ضروری ہوگا کہ جو تپش مولانا سید نصیر الدین صاحبؒ نے پیدا کی تھی، وہ سرد ہو چکی تھی، اُس کا نام ونشان باقی نہیں رہا تھا۔ یا قرین قیاس یہ ہے کہ وہی چنگاریاں جن کو مولانا نصیر الدین صاحبؒ نے اپنی پھونکوں سے جگہ جگہ سلگایا تھا، ۱۸۵۷ء کے بادِ صرصر نے دفعتہً ان کو آتش افروزاں بنا دیا تحریکات کی تدریجی رفتار اور ان کے مدوجزر سے جو واقف ہیں، اُن کا فیصلہ وہی ہوگا جن کو قرین قیاس بتایا گیا ہے۔

۱۹۱۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کا تیس ۳۰ سالہ دور ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ خلافت آل عثمان کے سقوط پر تحریک خلافت کی جو آندھی اُٹھی تھی، وہ پانچ سال بعد مدہم پڑ گئی۔ ہندو مسلم اتحاد کے بجائے منافرت و عداوت کے شعلے بھڑکنے لگے۔ یہاں تک کہ جب ۱۹۲۹ء میں کانگریس نے دوبارہ میثاق آزادی مرتب کیا تو ایک نئی نسل سامنے تھی۔ لیکن کیا کوئی بھی انصاف پسند اس سے انکار کر سکتا ہے کہ اس نئی نسل کے تازہ خون میں حرارت پیدا کرنے والے وہی انجکشن تھے جو شہیدان جلیانوالہ باغ ۱۹۱۹ء کے خون شہادت سے تیار کیے گئے تھے۔ بیشک ۱۹۱۷ء کے بہت سے تیز رو تھک کر بیٹھ گئے تھے۔ بہت سے ساتھی بچھڑ گئے تھے، بایں ہمہ جنہوں نے ۱۹۲۹ء میں زمام قیادت سنبھالی تھی وہ وہی تھے جن کو ۱۹۱۷ء کی تحریک نے پیدا کیا تھا۔ (۵۲)

پس اگر ۱۹۱۷ء کی تحریک ۱۹۲۹ء کا پہلا زینہ قرار دی جا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ حضرت سید احمد صاحب شہید اور مولانا نصیر الدینؒ کی تحریک کو ۱۸۵۷ء کی تحریک کا زینہ نہ قرار دیا جائے اور اس طوفان بے پناہ کے سرچشمے کہیں اور تلاش کیے جائیں۔

البتہ ایک سوال یہ ہو سکتا ہے کہ حضرت سید احمد صاحب اور حضرت مولانا نصیر الدین صاحب دہلی کی تحریکیں خالص اسلامی بنیادوں پر تھیں، مسلمان ہی اُن کے جاں باز تھے اور مسلمان ہی علمبردار، اور کہیں استثناء تھا تو برائے نام (۵۳) تھا۔ اس کے برخلاف ۱۸۵۷ء کی تحریک میں تفرد کے بجائے اشتراک، اور علیحدگی کے

بجائے اختلاط تھا۔ تو سوال یہ ہوسکتا ہے کہ تفرد اور علیحدگی کے بجائے یہ اختلاط کیسے پیدا ہوا، مگر اس سوال کو وہی شخص حجت بنا سکتا ہے، جو سیاسی تحریکات کے مدوجزر سے قطعاً ناآشنا ہو لیکن جس نے بارہا دیکھا ہو کہ سیلاب کے وقت دریاؤں کی دھاریں کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہیں۔ جہاں گھاس کے سوکھے ہونٹ نمی کو ترس رہے تھے، وہاں آبِ رواں کی لہریں اُچھلنے لگتی ہیں۔ اُس کی نظر میں یہ حجت سوت کا کچا دھاگا ہے جس میں مضبوطی کا نام و نشان نہیں۔ وہ صرف یہ دیکھنا چاہے گا کہ جس وادی کو سیلاب بداماں بتایا جارہا ہے کیا وہاں پہلے سے نشیب تھا جو سیلاب کا خیر مقدم کرسکے یا اس میں ایسی نرمی تھی کہ سیلاب کے لئے اپنا سینہ کھول سکے؟

آیئے اس زاویہ سے بھی سید صاحب کی تحریک پر ایک نظر ڈال لیں کہ کیا اس میں اشتراک و اختلاط کی گنجائش تھی یا نہیں؟ آئندہ صفحات کے ملاحظہ سے اندازہ ہوگا کہ سید صاحب کی تحریک کا تفرد اس بنا پر نہیں تھا کہ گل چیں کا دامن تنگ تھا بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ ابتک گلوں کو اپنی پژمردگی کا احساس نہیں ہوا تھا۔

وطن عزیز کو نجات دلانے کے لیے مشترک جدوجہد

انگریزی دور کے تاریخ نویس، نہ مہاراجہ اندور جسونت راؤ ہلکر کے مداح ہیں اور نہ نواب امیر علی خاں (بانی ریاست ٹونک) کی عزت و عظمت کے قائل ہیں لیکن ہر ایک حقیقت پسند اس اعتراف پر مجبور ہے کہ اس مرہٹی راجہ اور روہیلہ پٹھان نے مل کر جو محاذ قائم کیا تھا، اُس کا اہم ترین مقصد یہی تھا کہ وطن عزیز کو انگریزوں کی روز افزوں چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھا جائے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے خلیفہ خاص حضرت سید احمد صاحب شہید کو ۱۸۱۰ء میں اس محاذ پر کام کرنے کے لئے بھیجا تو مشترک جدوجہد پر شرعی تصدیق کی مہر بھی ثبت ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ سید صاحب نواب امیر علی خاں کی فوج میں ایک سوار کی حیثیت سے ملازم تھے۔ لیکن اگر آپ کی حیثیت صرف ملازم کی تھی تو نواب امیر علی خاں آپ کو اپنے مشوروں میں شریک اور آپ کا غیر معمولی اعزاز کیوں کرتا تھا؟ اس پر بھی شبہ کیا جاتا ہے کہ اس وقت آپ کا تشریف لے جانا اپنے شیخ اور مرشد حضرت شاہ عبدالعزیز کے ایما پر نہ تھا، بلکہ کسب معاش کے لئے آپ تشریف لے گئے تھے۔ حالانکہ یہی شبہ کرنے والے یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ سید صاحب جب تقریباً سترہ سال کی عمر میں اپنے وطن سے چند دوستوں کے ساتھ طلب روزگار کے لئے نکلے، تو رفتہ رفتہ تمام ساتھیوں کو کسی نہ کسی ملازمت میں لگا دیا اور خود ملازمت کا خیال چھوڑ کر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گئے تھے کہ کاروبارِ دنیا کی بجائے دین کا کاروبار کریں۔ یہاں پہنچ کر کسب فیض کیا۔ ولایت انبیاء کے شرف سے بہرہ اندوز ہوئے۔ خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

تعجب ہے جو شخص ابتدائے شعور میں ملازمت اور زر اندوزی کی طرف مائل نہیں ہوا، کیا زہد و تقویٰ کی منزلیں طے کرنے اور حضرت شیخ سے خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد وہ طلب روزگار کے لئے سفر کرے گا

اور سینکڑوں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک نواب کی فوج میں بھرتی ہو کر چند ٹکوں کی خاطر اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ فروخت کر ڈالے گا اور باایں ہمہ ایک مقدس پیشوا اور دینی رہنما کی حیثیت سے اس کی سوانح حیات مرتب کرنا قابل فخر دینی خدمت سمجھا جائے گا۔

بہر حال اس سفر کے متعلق حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی تحقیق ہی درست معلوم ہوتی ہے۔ عقلی اور قیاسی قرائن اسی کی تائید کرتے ہیں کہ:

ارسله الامام عبد العزيز الى النواب امير على خان لتحصيل المهارة فى العلوم العسكرية.

''امام عبدالعزیز ہی نے سید صاحب کو امیر علی خاں نواب ٹونک کے لشکر میں بھیجا تاکہ فنون جنگ میں عملی تجربہ اور مہارت حاصل کرلیں''۔ (۵۵)

جب نواب امیر خاں نے انگریزوں سے معاہدہ کر لیا تو سید صاحب خاطر برداشتہ ہو کر اپنے شیخ محترم حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس تشریف لے آئے لیکن نواب امیر خاں اور اس کی اولاد آخر تک حضرت سید صاحب کا احترام پیرو مرشد کی طرح کرتی رہی۔ اس کے بعد مرہٹی اقتدار اور اولوالعزمیوں کا آخری نشان ''دولت راؤ سندھیا'' کی راجدھانی (گوالیار) شاہد ہے کہ حضرت سید صاحب نے جب فوجی قافلہ کو لے کر سرحد کی طرف کوچ کیا تو سب سے پہلی قابل ذکر منزل جہاں چند روز قیام فرمایا، اسی سرزمین کے شاداب خطہ میں ہوئی تھی جس کو ''باغ فتح علی خاں'' کہا جاتا تھا۔ یہاں حضرت سید صاحب اور ان کے ساتھیوں کا شاہانہ احترام کیا گیا۔ امیرانہ حوصلوں کے ساتھ دعوتیں ہوئیں اور تنہائی میں مہاراجہ سے بات چیت ہوئی۔

اس وقت مہاراجہ مرض استسقاء میں مبتلا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد انتقال کر گیا۔ اس زمانہ کی برطانوی پالیسی کے مطابق جانشینی کا قضیہ چلا۔ اس دور میں دولت راؤ سندھیا کا نسبتی بھائی ''راجہ ہندو راؤ'' ریاست کا مختار اور مدارالمہام تھا۔ آپ نے اس کو اور اس کے معتمد خاص غلام حیدر کو علاقہ سرحد کے ''مرکز جہاد'' سے خط لکھا۔ امداد کی درخواست کی۔ اس کا یقین دلایا کہ کامیابی کے بعد مہاراجہ کی حکومت بدستور رہے گی بلکہ مضبوط ہو جائے گی۔ یہ پورا خط نقش حیات جلد دوم اور شاندار ماضی جلد دوم وغیرہ میں ملاحظہ فرمایا جائے۔ یہاں اس کا پہلا فقرہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے اور جذبات کا اندازہ کیجئے۔

بیگانگاں بعید الوطن ملوک زمین وزماں گردیدہ وتاجران متاع فروش بپایہ سلطنت رسیدہ۔ (نقش حیات جلد ۲ ص ۱۲)

سمندر پار کے رہنے والے پردیسی دنیا جہاں کے تاجدار اور سودا بیچنے والے وہ کا ندار سلطنت کے مالک بن گئے ہیں۔

اس سے بڑھ کر جذبۂ حریت اور حب وطن کیا ہو سکتا ہے کہ اپنے یا اپنے ساتھیوں کے لئے نہ حکومت اور سلطنت کی تلاش ہے، نہ کسی منصب اور عہدے کی خواہش نہ اس پر بحث ہے کہ مسلمانوں کا حصہ کیا ہوگا۔ بلکہ اور

وضاحت کردی گئی کہ ہمیں کچھ درکار نہیں۔

''وقتے کہ میدان ہندوستان از بیگانگاں دشمنان خالی گردیدہ و تیر سعی ایشاں بر ہدف مراد رسیدہ۔ آئندہ مناصب وسیاست بطالبین آں مسلم باد۔ و بیخ شوکت وسطوت ایشاں محکم شود''۔

(نقش حیات جلد دوم)

جب ہندوستان ان بیگانے دشمنوں سے خالی ہو جائے گا تو سیاست وریاست ارباب حکومت کو مبارک ہو، اوران کی شوکت وحشمت کی جڑ مضبوط ہو''۔

آگے اور وضاحت کردی ہے کہ ہم تو صرف اتنا چاہیں گے کہ اسلام کی خدمت آزادی سے کرتے رہیں اور آپ ہماری دل وجان سے مدد کرتے رہیں۔

بہرحال جس طرح اس مقدس جماعت نے جہاد حریت کے لئے قدم بڑھایا تھا، مشترک جدوجہد کا تصور بھی اسی نے پیدا کیا۔ جو اس وقت اگرچہ کامیاب نہیں ہوسکا لیکن چند دنوں بعد یہی تخم بارآور ہوا۔ (۵۶)

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے

الحاق، لاخراجی زمینوں کی ضبطی، جیل خانوں میں ایک کھانا، فوجی بھرتی میں سمندر پار جانے کی شرط، نکاح بیوگان، گھی میں چربی اور آٹے میں ہڈیوں کی راکھ کا پراپیگنڈہ، چپاتیوں کی تقسیم اور چربی لگے ہوئے کارتوسوں کے افسانے اوران کے اثرات، پیشگوئیاں۔ شاہ ایران اور شاہ روم سے غلط توقعات وغیرہ وغیرہ۔ (۵۷) (شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب کے الفاظ میں)

(۱)

برٹش گورنمنٹ کے کاموں کی شرحیں عجیب عجیب رنگ سے ہوتی تھیں۔ بڑی ذہانت سے قصے اور افسانے بنائے جاتے۔ جن کا مطلب یہ ہوتا کہ سپاہی کے دل میں بے چینی پیدا ہو اور وہ گورنمنٹ کی وفاداری اور جاں نثاری سے دستبردار ہو۔ گو یہ سب باتیں مختلف راگوں میں گائی جاتیں مگر سب کا سم اس پر ٹوٹتا کہ سپاہی کو یہ سمجھایا جائے کہ انگریزوں کی کل تدابیر کا مآل یہ ہے کہ جات کو بالکل غارت کردیں اور کل ملک میں عیسائی مذہب کو داخل کردیں۔

الحاق

جب کوئی صوبہ الحاق کیا جاتا تو یہ کہا جاتا کہ اسے عیسائی بنانے کے لئے آسانی ہوئی کہ بہت سے آدمی عیسائی ہو جائیں گے۔

معافیات کی ضبطی

لاخراجی زمینوں کی ضبطی کا یہ بیان کیا جاتا تھا کہ ملک میں تمام مذہبی اوقاف کا نام نہ رہے۔

سرکاری قانون

سرکاری قانون جو جاری ہوتے، اُن کا مطلب یہی بیان کیا جاتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کے مذہب تہ و بالا ہو جائیں۔

تعلیم

تعلیم کی تمام تدابیر کو کہتے تھے کہ یہ تو براہ راست ملک کے مذہب پر حملہ ہے۔

جیل خانوں میں ایک کھانا

تعزیرات کے نظام کو بتاتے تھے کہ وہ جات کے برباد کرنے کے لئے ہے۔ جیل خانوں میں دیکھ لو سب کا کھانا پینا ایک کر دیا۔

چھاؤنی کی ہر پلٹن میں اس قسم کے آدمی تھے جو سپاہیوں کو ان جھوٹی باتوں کی تعلیم کرتے تھے اور اس کے ساتھ یہ یقین دلاتے تھے کہ عنقریب وقت آنے والا ہے کہ ایک فرنگی زندہ باقی نہیں رہے گا۔ نئی سلطنت قائم ہوگی۔ سپاہ کا نیا انتظام ہوگا۔ جس میں سارے اعلیٰ عہدے، جن کا فرنگیوں نے اجارہ لے رکھا ہے وہ سب ہندوستانیوں کو ملیں گے۔ (۵۸)

(۲)

سمندر پار جانے کی شرط اور نکاح ثانی

اس زمانہ میں سپاہ کی بھرتی ہونے، سمندر پار جانے کی شرط داخل ہونا اور بیوہ عورتوں کی دوبارہ شادی کا قانون اس بات کے سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ یہ باتیں اس تدبیر کا جزو ہیں جو ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے لیے گورنمنٹ کر رہی ہے۔ (۵۹)

خوراک میں آمیزش کا پراپیگنڈہ

لارڈ کیننگ (۶۰) پر خوب ظاہر ہو گیا کہ ہندوستانی سپاہ کے دلوں میں نہایت برے شبہات نے خوب جڑ پکڑ لی ہے۔ پھر انہوں نے سپاہ کی ناراضی کے آثاروں پر بڑی توجہ کی، تو یہ معلوم ہوا کہ شبہات فقط سپاہی کے دلوں میں نہیں تھے بلکہ عموماً آدمیوں کے دل بھی بے چین ہو رہے تھے۔ صرف میرٹھ ہی میں نہیں بلکہ ملک کے اور اطراف میں بھی یہ یقین تھا کہ دونوں ہندو مسلمان کے دین کو انگریزوں نے بگاڑنے کی تجویز کی ہے کہ اُن کی

روزانہ خوراک کو ممنوع وحرام چیزوں سے ناپاک کر دیں۔ اب اس خوراک کے ناپاک کرنے کی بہت سی صورتیں بیان کی جاتی تھیں کہ برٹش گورنمنٹ نے سرکار کمپنی اور ملکہ معظمہ کے حکم سے پسی ہوئی ہڈیاں، آٹے اور نمک میں ملا دی ہیں کہ وہ بازاروں میں فروخت ہوں۔ اور گھی میں جانوروں کی چربی ملا دی ہے۔ اور شکر کو جلی ہوئی ہڈیوں سے صاف کیا ہے۔ اور کنوؤں میں سؤر اور گائے کا گوشت ڈلوا دیا ہے تاکہ پانی پینے کا نجاست آلودہ ہو جائے۔ یہ چکنے کارتوس تو فقط مذہب خراب کرنے کی تدبیر کا ایک جزو تھا جو سپاہ کے ساتھ مخصوص تھا۔ یہاں تو گورنمنٹ سب ہندو مسلمانوں کے مذہب بگاڑنے کی تجویز کر رہی ہے اور یہ کہانی بھی گھڑی گئی کہ بڑے بڑے صاحبوں نے حکم دیا ہے کہ تمام سلاطین وامراء وتعلقہ دار وزمیندار وروساء اہل تجارت واہل زراعت سب انگریزی روٹی کھائیں اور ان جھوٹ موٹ کہانیوں میں آرد آستخوان آمیز کی کہانی ہندوستانیوں کے ذہنوں میں بڑی مؤثر تھی وہ اپریل کے شروع میں بارک پور میں مشتہر ہوئی تھی۔ اس مہینے میں یہ وبا بالادہ ہند میں پھیلی۔ کانپور میں آٹا مہنگا ہوگیا تھا۔ میرٹھ کے ججوں نے گورنمنٹ سے چند کشتیاں کرایہ پر لے کر اس میں آٹا لاد کر کانپور بھیجا۔ پہلی دفعہ جب یہ آٹا کانپور میں آیا تو سستا ہونے کے سبب سے فوراً بک گیا۔ لیکن جب اور آیا تو شہرت ہوئی کہ تھرکی پن چکیوں میں یورپین کے اہتمام سے گیہوں پیسے گئے ہیں اور اس میں گائے کی ہڈیوں کی خاکستر ملا دی گئی ہے تاکہ ہندوؤں کی جات آٹے کھانے سے جاتی رہے۔ اس بات کی شہرت کانپور کی بستیوں اور بازاروں میں ایسی ہوئی کہ میرٹھ کے آٹے کا بکنا موقوف ہوگیا۔ کوئی ایک سپاہی اُس کو ہاتھ نہ لگاتا تھا اور نہ کوئی آدمی اس کو خریدتا تھا۔ اگرچہ وہ کانپور کے بازار کے آٹے سے سستا بکتا تھا۔ یہ خبر ایک چھاؤنی سے دوسری چھاؤنی میں پہنچی۔ آٹے کا وہم یہاں تک لوگوں کے دلوں پر چھایا کہ انہوں نے آٹا کھانا چھوڑ دیا۔ جو روٹیاں پکی ہوئی تھیں۔ اُن کو پھینک دیا۔ غرض لوگوں کے دلوں میں یہ نقش کالحجر ہوگیا کہ گورنمنٹ اُن کی جات اور مذہب خراب کرنے کی تدبیر کر رہی ہے۔

(۲)

چپاتیوں کی تقسیم اور اُس کی توجیہات

لارڈ کیننگ کو یہ یقین ہوگیا کہ رعایا کو بڑا خوف لگ رہا ہے کہ گورنمنٹ اُن کے مذہب بگاڑنے کے درپے ہے۔ اس لئے وہ اس سے بڑی نفرت وعداوت رکھتے ہیں۔ یہ خیال کر کے انہوں نے ایک دوسری کہانی پر جو چپاتیوں کی تقسیم سے متعلق تھی، توجہ کی۔ ممالک مغربی سے ان چپاتیوں کی تقسیم کی خبر پہنچی۔ جن کی وجہ اُن کے بڑے بڑے تجربہ کار مشیر بھی نہیں بتا سکے۔ یہ چپاتیاں دہ بدہ (گاؤں گاؤں) اس طرح بٹیں کہ ایک شخص اُن کو ایک گاؤں میں زمیندار کو دے جاتا، اور اُس سے فرمائش کر جاتا کہ تم دوسرے گاؤں میں ان کو بھیج دینا۔ بس اس طرح یہ چپاتیاں دہ بدہ گشت کرتی پھرتیں۔ ان کے بارے میں نہ کوئی سوال کرتا، نہ کوئی سمجھتا کہ وہ کہاں سے آئی ہیں اور کیوں آئی ہیں۔ بے سمجھے دوسرے گاؤں میں بھیجنے کے حکم کی اطاعت کی جاتی۔ ایک مدت کے بعد

گورنمنٹ کے عہدہ داروں کو خبر ہوئی۔ بعض نے اس پر بحث، بعض نے تھوڑا خیال کیا۔ ہر ایک نے اپنی طبیعت اور ذہانت کے موافق اس کے مختلف سبب بیان کیے۔

اوّل مسٹر فورڈ کلکٹر گوڑگانوہ نے ممالک مغربی وشمالی کے لفٹنٹ گورنر مسٹر کالون کو ان چپاتیوں کا حال لکھا۔ اُنہوں نے حکام اضلاع کے نام سرکلر جاری کیے۔

دہلی کے بادشاہ کی تحقیقات جرم میں یورپین اور ہندوستانی گواہوں کے اظہارات میں تفتیش کی گئی کہ چپاتیوں کی تقسیم کا راز کھلے مگر وہ نہ کھلا۔ بہت سے افسروں نے بیان کیا کہ وہ صرف اس بات کی نشانی ہے کہ آئندہ جو کوئی حادثۂ عظیم واقعہ ہونے والا ہے اس کے لئے عین وقت پر سب تیار رہیں۔ ایک بڑے مستند حاکم نے گورنر جنرل کو لکھا کہ مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ چپاتی آدمیوں کی خوراک کی ایک علامت ہے۔ اس کے گشت لگانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمیوں کو چونکا دے اور اُن کے دلوں پر اثر کرے کہ اُن کی خوراک حاصل کرنے کے وسائل چھن جائیں گے۔ اس لئے ان کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ سب آپس میں متفق رہیں۔ دوسرے افسروں نے اس خیال کی بڑی ہنسی اُڑائی اور بیان کیا کہ وہ کل ملک کے اوہام میں سے ہے۔

یہ بھی کہا گیا کہ یہ ہندوؤں کی عادت کے موافق ہے۔ جب کسی ہندو کے خاندان میں بیماری ہوتی ہے تو وہ چپاتیاں اس لئے تقسیم کرتا ہے کہ اس کے گھر سے بیماری کو چپاتیاں اپنے ساتھ باہر لے جائیں۔ یا جب کسی گروہ میں ہیضہ پھیلتا ہے یا وبائیں آتی ہیں۔ تو وہ بھی اس طرح کا ٹوٹکا کرتے ہیں۔ اور آدمی یہ یقین کرتے تھے کہ برٹش گورنمنٹ کے دشمنوں نے اس مطلب کے لئے تقسیم کیا ہے کہ جھوٹی باتوں کو جو انہوں نے پھیلا رکھا ہے، ان کے ساتھ یہ خوفناک دروغ بھی منسلک ہو جائے، جس کا اثر یہ ہو کہ اُن میں گائے کی پسی ہوئی ہڈیاں ہیں اور انگریزوں نے ان لوگوں کے مذہب بگاڑنے کی ترکیب کا تتمہ ان کو بنایا ہے۔

بعض لوگوں نے انکل سے یہ کہا کہ جیل خانوں میں بعض دفعہ مراسلت اس طرح کی جاتی ہے کہ جس کو "پنج گوڑی خاں" نے ظاہر کیا تھا کہ جب کوئی قیدی سپاہیوں کی سنگینوں تلے مقید ہوتا ہے تو اس کو روٹی کھانے کی اجازت دی جاتی ہے۔ روٹی پکانے والے کو رشوت دی جاتی ہے اور ایک چھوٹا سا رقعہ چپاتی میں رکھ دیتا ہے یا رکابی پر کوئی فقرہ لکھا دیا جاتا ہے۔ پس جب قیدی روٹی کھاتا ہے تو اُس کو پڑھ لیتا ہے۔ پس اس طرح ان چپاتیوں کے اندر بغاوت آمیز، فتنہ انگیز خطوط ہیں جو وہ ہندو (گاؤں گاؤں) اس طرح پہنچائے جاتے ہیں اور اُن کو گاؤں کا ایک سردار پڑھ کر اُن پر آٹا لپیٹ کر اور چپاتی بنا کر دوسرے کے پاس بھیج دیتا ہے جو اس کو کھول کر پڑھ لیتا ہے۔

کپتان کیتھ لکھتے ہیں کہ چپاتیوں کا گشت ۱۸۵۷ء کے شروع سے شروع ہوا۔ بنارس سے اس کا آغاز ہوا ہے کہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں وہ بھیجی جاتی ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ شمالی ہند میں بھی یہی حال ہوا ہے اور وہ ایک بلوہ کی علامت بتائی گئی ہے جو اس سال میں پیچھے واقع ہوگا۔ جب وہ بنارس میں نمایاں ہوئی ہیں تو

وہ سب جگہ اندور کی طرف سے آتی تھیں۔ اندور میں اس وقت ہیضے کی وبا سخت پھیل رہی تھی اور ہر روز شہر میں بہت سے آدمی مرتے تھے۔ بیمار کے آدمی یقین کرتے تھے اور اب بھی یقین کرتے ہیں کہ گیہوں کی چپاتیاں ایسے منتروں کے پڑھنے کے بعد جن سے یہ یقین ہو کہ وہ وبا کو ساتھ لے جائیں گی، باہر تقسیم ہوئی ہیں۔

چپاتیاں شمال سے جنوب کو براہ راست نہیں آتی تھیں وہ باجانگر میں بھی ۹ فروری کو آئیں جو گوالیار اور اندور کے عین وسط میں واقع ہے اور مندسور میں وہ ۱۲ جنوری ۱۸۵۷ء کو تقسیم ہوئیں۔ جب گاؤں میں سیتلا بچوں کو نکلتی ہے تو ایک مینڈھا لیتے ہیں اور اس کے گلے میں ناریل ڈالتے ہیں اور چوکیدار اس کو "من داتا" کی سڑک پر جو گاؤں اول آتا ہے، لے جاتا ہے، اور اس کو بستی کے اندر آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ پھر اسی طرح ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں مینڈھا پھرتا رہتا ہے، اس کو قرار نہیں ہوتا۔ یہ ترکیب دھرم شاستہ میں لکھی ہے۔

میجر آرسکن، کمشنر ساگر و نربدا، رپورٹ بھیجتے ہیں کہ جنوری ۱۸۵۷ء کے پیچھے تک چپاتیاں ایک راز کے طور پر اکثر اضلاع میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں گشت کرتی رہیں۔ اگرچہ اس کو کسی آنے والی بات کی نشانی جانتے ہیں لیکن کل قسمت میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا کارسازی کرتی ہیں یا کہاں سے وہ آتی ہیں اور ان کی نسبت بہت ہی کم خیال کیا جاتا ہے۔ الا ساگر کے مہاجنوں کے بازار میں کچھ تھوڑا سا اثر ہنڈویوں کے معاملہ میں کرتی ہیں۔ میں اس معاملہ کی رپورٹ گورنمنٹ کو کر رہا ہوں لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ کوئی شخص ان چپاتیوں کے اسرار سے واقف کار ہو، یا ان کو وہ آئندہ سرکشی کی طرف راجع جانتا ہو، اگرچہ اب ہماری رائے اس کی نسبت یہی ہو۔

غرض بعض ان چپاتیوں کے گشت کرنے کو بے معنی جانتے تھے۔ بعض اس کے معنی عظیم جانتے تھے۔ آئندہ زمانہ نے بھی کوئی معنی ان کے روشن نہیں کئے۔ اب تک اس کے معانی میں اختلافات چلے آرہے ہیں۔ بعض مؤرخین یہ لکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں ایک مولوی نے ان چپاتیوں کو تقسیم کیا تھا اور اس کا مطلب جہاد تھا"۔ مارا گھوٹا پھوٹی آنکھ"۔

غرض ان چپاتیوں کی بابت قیاسات تو بہت گھڑے گئے۔ مگر کوئی راز داں ایسا نہیں ملا کہ وہ تاریخ میں لکھنے کے قابل افشاءِ راز کرتا۔ اب تاریخ صرف اس یقینی امر کو بیان کرتی ہے کہ یہ عجیب چپاتیاں جہاں ایک مقام سے دوسرے مقام کو جائیں تو وہاں نئی برانگیختیاں اور فضول توقعیں (توقعات اور امیدیں) پیدا ہوتیں۔ (۶۱)

ان بہت سے خیالات میں غالباً سب سے صحیح وہ ہے جو مولوی کی طرف منسوب کیا گیا۔

چپاتیاں بٹنے کا واقعہ ہندوستان میں نیا نہیں تھا۔ سنتھالیوں کی بغاوت سے پہلے سال کے درخت کی ٹہنیاں گاؤں گاؤں بھیجی گئی تھیں۔ مرہٹوں نے جب شمالی علاقے پر حملے کئے تو اس سے پہلے روٹی پر جوار کی ٹہنی رکھ کر بانٹی گئی تھی۔

بعض جگہ ان پر بکری کے گوشت کی بوٹیاں بھی رکھ دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کے محاورات میں چپاتیاں بٹنا اور گوشت کا اس پر رکھا ہونا قلع قمع کر دینے، کچھ چبا ڈالنے اور کلی طور پر استیصال کی علامت مانی جاتی ہے۔

ساورکر کا خیال بھی ہے کہ مختلف طبقات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے یہ صورت اختیار کی گئی تھی۔ بنگال میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ ایک خاص قاصد ہر ایک چھاؤنی میں جاتا، سب سے بڑے ہندوستانی افسر سے ملتا اور اُسے سرخ کنول کا پھول دکھاتا۔ افسر وہ پھول پاس کے سپاہی کو دے دیتا۔ اور اسی طرح پھول ایک ایک سپاہی کے ہاتھ میں پہنچتا۔ یہ پھول نشان تھا صفائی، پاکیزگی، فتح اور شادابی کا۔

(۳)

پیشین گوئیاں

اخباروں میں ولیوں کی پیشین گوئیاں بھی برٹش گورنمنٹ کے ختم ہونے کی چھاپی جاتی تھیں۔

اخباروں میں سید نعمت اللہ شاہ متخلص ولی ہانسوی کے قصیدہ کے اشعار لکھے جاتے تھے۔

یہ قصیدہ بھی عجیب ہے، جو واقعات واقع ہوتے جاتے ہیں، منظوم ہو کر اس قصیدے کے دم چھلا بنتے جاتے ہیں، اور وہ ولی کی پیشین گوئیاں یقین کی جاتی ہیں۔ جن اشعار میں اس زمانہ کے لئے پیشین گوئیاں کی گئیں، وہ یہ ہیں:

قوم سکھاں چیرہ دستیہا کند بر مسلماں ——— تا چہل ایں جور و بدعت اندراں پیدا شود

بعد ازاں گیرد نصاریٰ ملک ہندوستان تمام ——— تا صدی حکمش میاں ہندوستان پیدا شود

چوں شود عہد آں با جور و بدعت را رواج ——— شاہ غربی بہر قتلش خوش عناں پیدا شود

درمیان ایں و آں گردد بسے جنگ عظیم ——— قتل عالم بے گماں در عہد شاں پیدا شود

فتح یابد شاہ درویشاں بزور تیغ جہد ——— قوم عیسیٰ را کشد او بے گماں پیدا شود

پانصد و ہفتاد و ہجری بود تا ایں گفتہ شد ——— در ہزار و در صد و ہفتاد آں پیدا شود (۶۲)

(۴)

شاہ ایران اور شاہ روم سے غلط توقعات

انگریزی کتابوں میں لکھا جاتا ہے "جب شاہ ایران سے ۱۸۵۶ء میں انگریزوں کی لڑائی ہوئی تو اُس نے اپنے ایک جاسوس شاہ دہلی کے پاس بھیجے کہ وہ انگریزوں کے ساتھ لڑائی کرے اور ہم دونوں آپس میں متحد ہو جائیں۔ جس سے اُمید ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی سلطنت قائم ہو جائے گی اس لئے ایک اشتہار تیار ہوا، اور وہ دہلی اور جامع مسجد کی دیواروں پر چسپاں ہوا اور یہ شہرت بھی ہوئی کہ خلیج فارس میں انگریزوں کو بڑی شکست فاش ہوئی ہے۔ اور یہ بات مشہور ہوئی کہ انگلش یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم نے امیر دوست محمد خاں کو دوست بنالیا۔ مگر اصل میں وہ ایران کا زیر فرمان ہے۔ انگریزوں کے ساتھ دوستی اس لئے اختیار کی ہے کہ

افغانوں کو انگریز پیش ورو کے دیں۔[۶۳]

صادق الاخبار وغیرہ میں جو خبریں شائع ہوتی رہتی تھیں جن کی حقیقت افواہ سے زیادہ کچھ نہ تھی، اُن کا خلاصہ یہ تھا کہ:

''شاہ ایران دوہ دوران سے بے عزاست کر آیا ہے، مرات تک آ گیا ہے۔

اصل لڑائی کا حال یہ ہے کہ شاہ ایران پانچ برسوں سے خزانے پر خزانے، سپاہ پر سپاہ اور اسباب پر اسباب حرب وضرب اس لئے جمع کر رہا تھا کہ ہندوستان کو فتح کرے۔ اب لڑائی کا وقت آ گیا ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ روسیوں نے بہت سا سامان جنگ شاہ ایران کے حوالہ کیا ہے اور پانچ لاکھ سپاہیوں کا لشکر جرار جس کے ساتھ بہت اچھا اسباب حرب وضرب ہے، ایران کی کمک کے لئے بھیج دیا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ اس کی یہ سپاہ تو اعدواں کافی نہ ہوگی تو بہت سی پولیس کی سپاہ کمک کے لئے اور بھیج دی جائے گی۔ شاہ ایران کے ممد و معاون شاہ فرانس و سلطان روم ہیں۔ اصل جنگ کا سرغنہ روس ہے جو ایران کی آڑ میں ہندوستان فتح کرنے کے لئے کارستانیاں کر رہا ہے۔ امیر دوست محمد خاں والیِ کابل نے انگریزوں کے ساتھ ظاہری مصالحت اس لئے کر لی ہے کہ اُن سے ہتھیار اور روپیہ لے سکے اور ایران کی حمایت میں کام میں لائے۔[۶۴]

جنوری ۱۸۵۷ء سے ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء تک

۱۸۵۷ء کا آغاز، کارتوسوں کا قصہ

دل آزار، تکلیف دہ اور ہندوستانیوں کے لئے توہین آمیز واقعات کا سلسلہ جو عرصے سے چل رہا تھا، وہ دن بدن زیادہ ہوتا رہا۔ حکومت کو بار بار آگاہ کیا لیکن اس کے سول اور ملٹری حکام نے چھتوں کی کھڑکھڑاہٹ پر کان دھرنے سے انکار کر دیا۔ انہیں اسی وقت ہوش آیا جب طوفان نے درختوں کو اکھاڑنا شروع کر دیا۔

اس بے چینی نے سب سے پہلے ۲۲ جنوری ۱۸۵۷ء کو ڈم ڈم[۶۵] میں عملی شکل اختیار کی۔ ڈم ڈم میں مقیم دیسی سپاہیوں نے اپنے انگریز افسر سے شکایت کی کہ ان فیلڈ رائفلوں کے لئے جو کارتوس بنائے جاتے ہیں، ان میں گائے اور سؤر کی چربی ہے۔ اس افسر نے حکومت ہند کو اس بات سے آگاہ کر دیا۔ حکومت نے بعض چھاؤنیوں میں دیسی سپاہیوں کو یقین دلایا کہ کارتوسوں میں ممنوعات استعمال نہیں کی جا رہی ہیں۔ لیکن یہ افواہ بارود کے ڈھیر میں چنگاری کا کام کر چکی تھی۔ بارک پور[۶۶] کے فوجیوں نے بہرام[۶۷] پور کی انیسویں رجمنٹ میں بے چینی کا بیج بو دیا۔ ۱۹ فروری کی رات کو اس رجمنٹ نے مظاہرہ شروع کر دیا۔ کرنل مچل نے فوجیوں سے اس مظاہرہ کا سبب دریافت کیا۔

فوجیوں کا جواب یہ تھا:

''سرکار ہمارا دین بگاڑ رہی ہے''۔

کرنل نے فوجیوں کے سامنے ایک تقریر کی اور یقین کرلیا کہ فوج مطمئن ہوگئی۔ اطمینان کہاں؟ جب لارڈ کیننگ کو برہام پور کے واقعہ کا پتہ چلا تو اس نے ایک دوسری رجمنٹ کو بارک پور پہنچنے کا حکم دیا۔ نیز برہام پور کی انیسویں رجمنٹ کو بھی حکم ملا کہ وہ بارک پور پہنچ جائے۔

یہ سلسلہ چل رہا تھا کہ بارک پور کی چونتیسویں رجمنٹ کے ایک فوجی نے پریڈ کے وقت ''دین دین'' کا نعرہ لگاتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو فرنگیوں کے خلاف لڑنے کے لیے اکسایا۔ سارجنٹ میجر موقع پر پہنچ گیا۔ اس فوجی نے اس پر گولی چلادی۔ وہ بال بال بچ گیا۔ بغاوت کے آثار تک جنرل ہرسی موقع پر پہنچ گیا۔ حالات پر قابو پالیا گیا۔

منگل پانڈے

یہ ''دین دین'' کا نعرہ لگانے والا ایک برہمن تھا۔ ''منگل پانڈے'' نام۔ اس کا واقعہ یہ تھا کہ فوج کے ایک خلاصی نے جو نیچ ذات کا تھا، اس سے کہا کہ اپنے لوٹے سے مجھے پانی پلادے۔ منگل پانڈے نے جواب دیا۔ تو کس ذات کا ہے۔ خلاصی نے طنزاً کہا۔ ذات کیا پوچھتے ہو اب سب ذات پات رکھی رہ جائے گی۔ وہ کارتوس آگئے ہیں جن میں سور اور گائے کی چربی لگی ہے، اُن کو دانت سے کاٹنا پڑے گا۔

بہرحال اس سے اگلے روز انیسویں رجمنٹ بھی بارک پور پہنچ گئی تھی۔ اسی شام کو انگریزی سپاہی بھی بارک پور آگئے تھے۔ اگلے دن جرنیل نے گورنر جنرل کا ایک فرمان سنایا جس میں انیسویں رجمنٹ کو توڑ دینے کا حکم تھا۔ ۶ر اپریل کو منگل پانڈے کا مقدمہ شروع ہوا۔ ۷ر کو پھانسی کی سزا تجویز کی گئی اور ۸ر کو اسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ۲۱ر اپریل کو اس کے ایک ساتھی ایشوری پانڈے کو پھانسی دے دی گئی۔ اُس کا جرم یہ تھا کہ منگل پانڈے جب فائر کی تیاری کررہا تھا اور ایشوری سے کہا گیا تھا کہ منگل پانڈے کو گرفتار کرلے تو ایشوری نے تعمیل میں لاپرواہی برتی تھی۔ جب دوبارہ اس کو حکم دیا گیا تو کہہ دیا منگل پانڈے تو پاگل ہوگیا ہے۔

ایشوری کا جواب یہ تھا کہ میں نے سب سے کہا تھا۔ منگل پانڈے سے بچو اور درخت کی اوٹ میں کھڑے ہوجاؤ، منگل پانڈے پاگل ہورہا ہے۔

چند روز بعد چونتیسویں رجمنٹ کی سات کمپنیوں سے ہتھیار چھین کر انہیں الگ کردیا گیا۔ حکومت مطمئن تھی کہ بغاوت ختم ہوچکی ہے۔ بغاوت تو ابھی ہونے والی ہے۔

بارک پور کی خبریں کسی قدر مبالغہ کے ساتھ شمالی ہند تک جا پہنچیں۔ اپریل ۱۸۵۷ء کے آخری ہفتہ میں میرٹھ میں ہندوستانی سپاہیوں نے مختلف صورتوں میں بے چینی کا اظہار کیا تھا۔ چونکہ میرٹھ میں انگریزی سپاہیوں کی ایک پوری رجمنٹ موجود تھی اور یہاں کا توپ خانہ پورے ملک میں سب سے بہتر توپ خانہ تھا۔ اس لئے یہاں کے فوجی حکام مطمئن تھے۔ غالباً اسی زعم میں یہاں پر ۲۳ر اپریل کو پریڈ کا حکم نافذ کیا گیا۔ ۲۴ر کو دیسی فوج

نے پریڈ کی۔ پریڈ کے بعد حوالدار میجر اور اُس کے اردلی نے اُن کارتوسوں کو چلایا جن کے متعلق خیال تھا کہ اُن کو چلاتے وقت دانتوں سے کاٹنا پڑتا ہے۔ پریڈ ختم ہوئی۔ دیسی سپاہی اپنی بارکوں میں چھپ گئے۔ اُسی رات اردلی کے خیمہ کو آگ لگادی گئی۔ اگلے دن دیسی سپاہیوں نے کارتوس لینے سے انکار کردیا۔ ۲۵ر اپریل کو ڈپٹی جج کے سامنے اس معاملہ کی پڑتال کی گئی۔ سپاہیوں نے کارتوسوں کو ناپاک بتایا۔ انہیں سمجھایا گیا کہ کارتوسوں میں ممنوعات استعمال نہیں کی گئیں۔ سپاہیوں نے وعدہ کرلیا کہ وہ ان کارتوسوں کو استعمال کریں گے۔

سپاہیوں کے سامنے بڑی پریشانی یہ تھی کہ کارتوسوں کے خلاف پروپیگنڈہ اتنا زیادہ کردیا گیا تھا کہ اگر فوج کے سپاہی مطمئن ہوکر کارتوسوں کے لے بھی لیتے تو فوج سے باہر اُن کی بات ماننے والا کوئی نہیں تھا۔ اُن کی ذات برادری کے آدمی بھی اُن سے نفرت کرنے لگتے۔

فوجی اس تصور سے لرز جاتے تھے۔ وہ زار زار روتے تھے کہ اگر ہم کارتوس لے لیتے ہیں تو ذات برادری سے خارج ہوتے ہیں اپنے عزیزوں سے چھوٹتے ہیں۔ جینا برباد اور ایمان کی موت اور دھرم کا خطرہ۔ اور اگر نہیں لیتے تو سرکار کے باغی ٹھہرتے ہیں۔

ادھر ہر سفید چمڑی والا اقتدار کے نشہ میں ایسا مدہوش تھا کہ غیر مشروط وفاداری کے سوا کسی بات کے ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ دلوں کی بے چینی زبانوں تک، اور زبانوں سے بڑھ کر ہاتھ پاؤں تک پہنچ چکی ہے۔ چھاؤنیوں کی بیرکوں میں آگ لگنے کا سلسلہ دن بدن بڑھ رہا تھا۔ آگ لگانے والوں کا پتہ کیسے چلتا، جب پتہ چلانے والے خود مجرم تھے اور کوئی گواہی دینے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود فتوحات کے غرور نے گردنوں کو اتنا سخت کردیا تھا کہ وہ کسی طرح خم ہونے کو تیار نہ تھیں۔

مختصر یہ کہ ۶ رمئی کو میرٹھ چھاؤنی میں پریڈ کرائی گئی۔ ہر ایک فوج سے پندرہ پندرہ آدمی منتخب کیے گئے۔ کل نوے ۹۰ آدمی پریڈ میں موجود تھے۔ کارتوسوں کی تقسیم کا حکم دیا گیا۔ پانچ کے سوا سب نے انکار کردیا۔ جن میں اونچاس ۴۹ (۴۸) مسلمان تھے، ۳۶ غیر مسلم۔

۹ رمئی فیصلہ سنانے کا دن تھا۔ پوری فوج پریڈ پر حاضر تھی سب کے سامنے بہت بلند آواز سے سزا کا حکم سنایا گیا۔ دس دس سال قید بامشقت"۔ پھر فوراً ہی فوجی نشان چھین لئے گئے۔ اُن کی وردیاں پشت کی طرف سے پھاڑ دی گئیں۔ پھر لوہار آگے بڑھے چند لمحوں میں یہ بے داغ، وفادار سپاہی بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

یہ نظارہ بہت ہی حسرت ناک اور اشتعال انگیز تھا۔ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے سپاہیوں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا وہ ساتھی جو اُن کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے کیونکہ یہ اپنی اپنی لیمن میں باعزت تھے، فوج میں نام آور رہے تھے۔ یاس انگیز نگاہوں نے اشاروں ہی اشاروں میں بغاوت کا سبق پڑھا دیا۔ مگر گرد اگرد تیار توپ خانہ کی موجودگی میں سرکشی کا تصور بھی خودکشی تھا۔

اس کے بعد ان پچاسی ۸۵ جوانوں کو پاپیادہ شہر کے جیل خانہ میں پہنچا دیا گیا۔ جدھر سے یہ سپاہی گزرتے تھے، اُن کے ناؤ ین دلوں کی سوزش ہندوستانی غیرت و حمیت کی ٹوٹی جھونپڑیوں میں چنگاریاں چھوڑتی جاتی تھی۔ عورتیں بھی بے تاب ہو کر چیختی تھیں۔ اگر مردوں میں اُن کے چھڑانے کی ہمت نہیں ہے تو چوڑیوں اور ہتھیاروں کا تبادلہ کر لیں۔ چوڑیاں وہ پہن لیں اور تلوار ہمارے ہاتھ میں دیں۔ ہم دکھا دیں گے غیرت کس چیز کا نام ہے اور حمایت کس طرح کی جاتی ہے۔

کیا آج کے آفتاب کے بعد بھی آفتاب طلوع ہوگا۔ آفتاب ضرور طلوع ہوگا، مگر اب اس کی چمکتی ہوئی دھوپ اور نوکیلی کرنیں انگریزی اقتدار کی جڑیں اُکھاڑنے کے لئے کام میں لائی جائیں گی۔ یہ تجویز دکھی دلوں کی پوری تائید کے ساتھ بلا کسی کانفرنس کے پاس ہوگئی۔

۱۰ رمئی اتوار کا دن صبح کا سہانا وقت ختم ہوا۔ جیسے جیسے درجہ حرارت بڑھنے لگا۔ جذبات کے تور دیکنے لگے۔ کہا جاتا ہے ۳۱ مئی بغاوت کے لیے متعین تھی۔ مگر جس کو شام کرنی مشکل تھی وہ ۳۱ رمئی کا انتظار کہاں تک کرتا۔

آفتاب دن بھر کی بکھری ہوئی کرنوں کو ابھی سمیٹنے نہیں پایا تھا۔ گرجا میں شام کا گھنٹہ بجنا شروع ہی ہوا تھا کہ بغاوت کا آتش فشاں انگارے اُگلنے لگا۔

ایک دستے نے بیرکوں کو آگ لگا دی، دوسرا جیل خانہ کی طرف دوڑا۔ کل جن کی مدد نہ کر سکے تھے، آج اُن کی بیڑیاں کاٹ ڈالیں۔ جیل خانے کے پھاٹک توڑ کر آٹھ سو اخلاقی قیدیوں کو بھی رہائی کا فیصلہ عملاً سنایا گیا۔

دہلی چلو

بغاوت کر دی۔ بارکیں پھونک دیں۔ قیدی چھڑا لئے۔ جو انگریز سامنے آیا۔ اُسے گولی کا نشانہ بنایا۔ اب کیا کرنا ہے؟ یہاں انگریزی فوج موجود ہے۔ اُس کے پاس بہترین توپ خانہ ہے وہ آناً فاناً سب کو توپ دم کر سکتے ہیں۔ اب کیا کیا جائے اور کس طرح کیا جائے؟ جوش اور دہشت سے لبریز دماغوں کا یہ سوال تھا۔

جواب ایک تھا، دہلی چلو، اور اتنا تیز چلو کہ انگریزوں کی تیاری سے پہلے ایک منزل طے کر لو، اور صبح کو جمنا کے پانی سے وضو کر لو اور اشنان کر لو۔ چلتے چلتے یہ باتیں طے ہوگئیں۔

دہلی میں انقلابی فوج کی آمد

باغی سپاہی جو دن چھپنے کے بعد میرٹھ سے چلے تھے، صبح سویرے دہلی پہنچ گئے۔ کہیں آرام کرنا اور سانس لینا تو درکنار، کھانے پینے سے بھی بے نیاز۔

مئی کا مہینہ، چاند کی سولھویں رات، دن گرم، رات خوشگوار، جوش جنوں نے قدموں کی رفتار بڑھا دی یا زمین کی طنابیں کھینچ دیں کہ نو گھنٹے میں پاپیادہ چوالیس میل طے کر لیے۔

غلطی اور غفلت

مثل مشہور ہے "چوں قضا آید طبیب ابلہ شود"۔ قضا اور تقدیر کو کوئی مانے یا نہ مانے، لیکن تاریخ کا یہ کس قدر عجیب و غریب سانحہ ہے کہ میرٹھ میں انگریزی سپاہیوں کی پوری رجمنٹ اور پورے ہندوستان کا سب سے بہتر توپ خانہ موجود تھا جو دنیا کے بہترین توپ خانوں میں شمار ہوتا تھا۔ ادھر دہلی میں فوج کی ایسی بڑی جمعیت جو باغیوں پر دہلی کے دروازے بند کر سکتی تھی، حاضر تھی لیکن میرٹھ چھاؤنی کے افسران کے متعلق تو کہا جاتا ہے کہ وہ حیران اور ایسے بدحواس ہو گئے کہ یہ بھی نہ معلوم کر سکے کہ انقلابی فوج کس طرف گئی۔(۶۹)

اور جب حواس ٹھکانے ہوئے تو برسبیل احتیاط یا کسی یقین کی بنا پر دہلی تار دیا تار(۷۰) فوراً پہنچ گیا مگر سائمن فریزر (ریزیڈنٹ کمشنر دہلی) جن کے نام تار تھا، نیند یا نشہ میں ایسے بے خود تھے کہ تار کو بغیر پڑھے جیب میں رکھ لیا اور سو گئے۔

انقلابی فوج دہلی میں

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء، ۱۶ رمضان ۱۲۷۳ھ دو شنبہ کے دن صبح کے سہانے وقت جمنا کے ایک کنارے لال قلعہ کی سرخ و سپید برجیاں، اور ان کے سنہرے کلس آفتاب کی کرنوں سے شوخیاں کر رہے تھے اور دوسرے کنارہ پر جوش و خروش سے وارفتہ انقلابی فوج بے چینی سے گزرگاہ تلاش کر رہی تھی۔

اسی کنارہ پر پرمٹ کی چوکی تھی۔ باغی فوج نے اس میں آگ لگائی۔ کلکٹر کو مارا۔ پھر کشتیوں کے پل پر پہنچے۔ محکمہ تار کا انگریز افسر، جس کا نام ٹاڈ تھا، سامنے آیا۔ اُس کو قتل کیا۔ کلکتہ کا دروازہ جو کشتیوں کے پل کے قریب تھا (موجودہ ریلوے لائن سے شمال کی طرف) اُس نے ان سرفروش انقلابیوں کے استقبال میں تامل کیا تو سامنے راج گھاٹ کے کھلے(۷۱) دروازے نے اپنی طرف اشارہ کر کے داخلہ کی اجازت دے دی۔ پیادہ اور سواروں کی بھیڑ قلعہ معلی کے جھروکوں کے نیچے سے گزرتی ہوئی آگے بڑھی اور راج گھاٹ کے دروازہ سے شہر میں داخل ہو گئی۔ اب داخل ہونے والی فوج کے داہنے جانب قلعہ تھا اور بائیں جانب کسی قدر فاصلہ سے دریا گنج، جہاں کچھ انگریزوں کے بنگلے تھے۔ فوج قلعہ کی طرف بڑھی۔ پھاٹک پر سنتری موجود تھے۔ مگر اشاروں ہی اشاروں میں ایسی باتیں ہوئیں کہ انقلابی فوج بلا مزاحمت قلعہ میں داخل ہو کر بادشاہ کے حضور میں پہنچ گئی۔ اب بادشاہ سے جو گفتگو ہوئی، پہلے اس کو سن لیجیے۔ راقم الدولہ ظہیر دہلوی جن کا دربار سے تعلق تھا۔ بادشاہ کے حضور میں روزانہ حاضری دیا کرتے تھے اور اس روز اگرچہ باغیوں کے پہنچنے کے وقت وہ دربار میں نہیں تھے۔ مگر تھوڑی دیر بعد ہی پہنچ گئے تھے۔ اُن کے طویل بیان کے کچھ حصے یہاں نقل کیے جا رہے ہیں۔

انقلابی سپاہی اور بادشاہ بہادر شاہ

دربار میں حاضری، سرپرستی کی درخواست، بادشاہ کا فقیرانہ جواب

راقم الدولہ ظہیر صاحب دہلوی کی روایت ہے کہ فوج کے نمائندوں نے بادشاہ سے عرض کیا:

''حضور جہاں پناہ سلامت! آپ دین و دنیا کے بادشاہ ہیں۔ تمام ہندوستان آپ کا محکوم و فرماں بردار ہے۔ آج تک مناوی میں پکارا جاتا ہے۔ ''خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی کا''۔ انگریز لوگ آپ کی طرف سے مالک و مختار ہیں۔ ہم لوگ آپ کے پاس فریادی آئے ہیں۔ اُمیدوار انصاف ہیں۔ ہم لوگ ملازم انگریزی ہیں۔ ہمیں لوگوں نے اپنی جانیں بیچ کر اور اپنے سر کٹوا کر کلکتہ سے کابل تک چودہ سو کوس میں انگریزی عملداری قائم کرادی، اور ہمیں لوگوں کی استعانت و امداد سے تمام ہندوستان پر تسلط ہوگیا۔ یہ ولایت سے کوئی فوج ہمراہ لے کر نہیں آئے تھے۔ سب ہندوستانی فوج کی کارگزاری ہے۔ شہادت کے واسطے ہمارے پاس تمغے موجود ہیں۔ اب چونکہ تمام ہندوستان پر قبضہ اور تسلط انگریزوں کا ہوگیا اور کوئی سرکش باقی نہ رہا۔ اب سرکار کی نیت میں فتور واقع ہوا، اور ہمارے دین و مذہب کے درپے تخریب ہوئی اور چاہا کہ تمام ہندوستان کو عیسائی کرلیں اور ابتداء اس کی فرقہ فوج سے ہونی چاہیے۔ چنانچہ باہم صلاح کر کے یہ تجویز قرار پائی کہ ایک قسم کی بندوق ایسی ایجاد کی گئی کہ جس میں ٹوٹا یعنی کارتوس دانتوں سے کاٹ کر بندوق کے منہ میں دینا پڑے اور اس ٹوٹے کو جانوروں کی چربی سے منڈھوایا گیا۔ اب نہ معلوم وہ چربی کس جانور کی ہے۔ وہ بندوقیں ہم لوگوں کو دی گئیں کہ تم کارتوسوں کو دانت سے کاٹ کر بندوقوں میں ڈالو۔ ہم لوگوں نے بالاتفاق ہندو اور فرقہ مسلمان نے تعمیل حکم سے انکار کیا کہ ہم ہرگز ہرگز ایسا نہ کریں گے، خواہ سرکار نوکر رکھے یا نہ رکھے۔ فرقہ ہندو کو تو گائے کی چربی کا اشتباہ ہوا، اور اہل اسلام کو سوّر کی چربی کا''۔

اس کے بعد ظہیر صاحب کی روایت کا خلاصہ یہ ہے:

''اب سرکار کو اپنی بات کی آن تھی، اور ہمیں دھرم اور ایمان کی۔ چار ماہ سے زیادہ ہوگئے یہ نزاع درپیش ہے۔ حکام کی کمیٹیاں ہو رہی ہیں، اور ہم لوگوں میں بھی سواروں اور پیادوں کی چھاؤنیوں میں جگہ جگہ چٹھیاں دوڑ گئی ہیں کہ یک قلم کل فوج انکار کردے اور زیادہ سختی برتی جائے تو ایک معین تاریخ پر تمام ہندوستان میں غدر مچادیا جائے، پھر دیکھو انگریز کیا کرسکتے ہیں۔ چنانچہ مفسدہ کا ظہور اب آکر ہوا، اور اس وقت اس کی بنا اس طرح ہوئی کہ انگریز افسران کو خیال ہوا کہ میرٹھ میں انگریزی فوج بھی کافی ہے اور ہندوستانی فوج بھی وہ ہے جو پورے ہندوستان میں سب سے

زیادہ بھرے کی اور بہت پرانی فوج مانی جاتی ہے۔ لہٰذا کارتوس کی مہم اگر یہاں کامیاب ہو جاتی ہے تو پھر پورے ہندوستان میں یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ چنانچہ پریڈ کرائی گئی"۔

اس کے بعد ظہیر صاحب نے پریڈ پر کارتوسوں کے پیش کئے جانے، ان فوجیوں کے انکار، پھر انکار کرنے والوں کی سزا وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد تحریر ہے:

باقی ماندہ تقریر سواران باغیہ

بیک گردش چرخ نیلو فری ‌ ‌ ‌ نہ نادر بجا ماند نے نادری

''جب ہم داخل جیل خانہ ہوئے تو کیمپ میرٹھ میں تہلکۂ عظیم برپا ہو گیا، اور گھر گھر کھچڑی پکنے لگی اور باہم صلاح و مشورے ہونے لگے، خصوصاً فرقۂ مستورات میں کہ ہمیشہ سے ناقص العقل اور کوتہ اندیش ہوتی آئی ہیں، اُن کو ہرگز اپنے انجام پر نظر نہیں ہوتی۔ اُن میں اکثر عورتیں تھیں، جن کے ورثاء محبوس ہوئے تھے، انہوں نے زبان طعن و تشنیع سے پنکھا جھل جھل کر نائرہ فتنہ و فساد کو بھڑکانا شروع کیا اور اُن کی چرب زبانی آتش فساد پر روغن کا کام کر گئی۔ اس موقع پر ''دیوانہ را ہوئے بس است'' کا مضمون صادق آیا۔ ان عورتوں نے مردوں کو طعنے دینے شروع کئے کہ تم لوگ مرد ہو اور سپاہ گری کا دعویٰ کرتے ہو، مگر نہایت بزدل اور بے غیرت اور بے شرم ہو۔ تم سے تو ہم عورتیں اچھی۔ تم کو شرم نہیں آتی کہ تمہارے سامنے تمہارے افسروں کے ہتھکڑیاں پڑ گئیں اور تم کھڑے دیکھا کئے اور تم سے کچھ نہ ہو سکا۔ لو یہ چوڑیاں تو تم پہن لو، اور ہتھیار ہم کو دو۔ ہم افسروں کو چھڑا کر لاتی ہیں۔ ان کلمات فتنہ انگیز نے اور اشتعال طبع پیدا کیا، اور تمام فوج کے دلوں میں جوش و خروش مردی اور مردانگی کی آگ بھڑک اُٹھی اور مرنے مارنے پر تیار ہو گئے اور باہم یہ صلاح قرار پائی کہ شب کو چل کر جیل خانہ توڑ کر افسران فوج کو چھوڑا لاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا۔ اس کے بعد انقلابی فوج کے افسروں نے کہا۔ تیس ۳۰ کوس کی مسافت طے کر کے اس وقت ہم یہاں پہنچے ہیں۔ بادشاہ سلامت ہمارے سر پر ہاتھ رکھیں اور ہمارا انصاف فرمادیں۔ ہم دین پر بگڑ کر آئے ہیں۔

جواب باصواب از جانب بادشاہ عالی جاہ

سنو بھائی! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے، میں تو فقیر ہوں۔ ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لئے بیٹھا ہوں۔ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ میرے باپ دادا بادشاہ تھے جن کے قبضہ میں ہندوستان تھا۔ سلطنت تو سو برس پہلے میرے گھر سے جا چکی تھی۔ میرے آباؤ اجداد کے نوکر چاکر

اپنے خداوندان نعمت کی اطاعت سے جداگانہ رئیس بن بیٹھے۔ میرے باپ دادا کے قبضہ سے ملک نکل گیا۔ قوت لایموت کو محتاج ہو گئے''۔

اس کے بعد بادشاہ نے شاہ عالم کا ذکر کیا کہ کس طرح انگریزوں سے وظیفہ لینا قبول کیا۔ پھر فرمایا:

''لڑائی جھگڑے سے کچھ کام نہیں۔ اس کا انسداد اور انتظام انگریز لوگ خود کریں گے۔ میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں۔ مجھے ستانے کیوں آئے ہو۔ میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دوں گا۔ میرے پاس فوج نہیں کہ میں تمہاری امداد کروں گا۔ میرے پاس ملک نہیں کہ تحصیل کر کے تمہیں نوکر رکھوں گا، میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھ سے کسی طرح کی توقع استعانت کی نہ رکھو۔ تم جانو یہ لوگ جانیں۔ ہاں ایک امر میرے اختیار میں ہے، البتہ وہ ممکن ہے کہ تمہارے درمیان میں ہو کر انگریزوں سے تمہاری صفائی کرا سکتا ہوں۔ تم ابھی یہیں ٹھہرے رہو، میں نے صاحب ریزیڈنٹ کو بلوایا ہے۔ وہ میرے پاس آنے والے ہیں۔ پہلے میں اُن سے دریافت کرلوں۔ اُن کی زبانی مجھے حال فتنہ وفساد کا معلوم ہو جائے گا اور خدا چاہے تو میں اس فساد کو رفع دفع کرادوں گا۔ غرض یہ گفتگو ہنوز ناتمام تھی کہ ساحمن فریزر صاحب ریزیڈنٹ بہمراہی قلعدار صاحب داخل دیوان خاص ہو گئے۔ خواجہ سرا نے جا کر آداب کورنش ادا کیا۔ اندر سے حکم آیا کہ دونوں صاحب محل میں حاضر ہوں۔ اس وقت صاحب ریزیڈنٹ بہادر قلعدار صاحب اور احسن اللہ خاں اور محبوب علی خاں ہر چہار اشخاص محل شاہی میں داخل ہوئے۔

حضور پرنور:

''کیوں بھئی یہ کیا فتنہ وفساد برپا ہو گیا۔ (۴۷) یہ مذہب کا جھگڑا کیسا اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ مقدمہ دین آئین کا ہے۔ تعصب مذہب بہت بری شے ہے۔ اس میں اکثر سلطنتیں معرض زوال میں آ گئی ہیں۔ لاکھوں آدمیوں کا کشت وخون ہو گیا ہے اس فتنہ کا جلد انسداد ہونا واجب ہے۔

سر چشمہ شاید گرفتن بہ میل ۔۔۔۔ چو پر شد نشاید گزشتن بہ پیل

مبادا فتنہ وفساد ہندوستان میں عالمگیر ہو جائے اور لاکھوں آدمیوں کا کشت وخون ظہور میں آئے اور انتظام مالی وملکی میں فرق واقع ہو۔ جہاں تک ممکن ہو، نرمی اور آشتی سے کام لینا چاہیے۔ یہ لوگ جاہل ہیں، فرقہ سپاہ جاہل ہوتا ہے۔ ان سے تھپک کر کام نکالنا چاہیے۔ اور ان کو ہدایت کرو کہ یہ لوگ اس فتنہ وفساد سے باز آ جائیں تعجب ہے کہ تم کو اس معاملہ کی اب تک خبر نہیں''۔

صاحب ریزیڈنٹ بہادر: حضور غلام کے پاس شب کے گیارہ بجے سوار نے چٹھی لا کر دی۔ مجھ کو چونکہ اس وقت نیند کا غلبہ تھا، میں سمجھا کوئی معمولی چٹھی ہے۔ اس وقت کچھ خیال نہ کیا، پاکٹ میں ڈال کر سو رہا۔ صبح کو جب حضوری سوار میرے پاس پہنچے، اُس وقت میں نے چٹھی پڑھی، تو حال

معلوم ہوا، حضور کچھ اندیشہ نہ فرمائیں، خاطر جمع رکھیں۔ ہوائی لوگ کیا کر سکتا ہے۔ حضور کے اقبال سے سب رفع دفع ہو جائیں گے۔ غلام ابھی جا کر ان کو فہمائش کرتا ہے، خدا چاہے تو فساد بڑھنے نہ پائے گا"۔

اس کے بعد ظہیر صاحب نے صاحب ریذیڈنٹ کی تقریر نقل کی ہے۔ تقریر میں خوب سبز باغ دکھائے اور اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ فوج کے نمائندوں کا جواب یہ تھا:

"آپ نے جن احسانات کا ذکر کیا ہے درست ہے مگر ہماری قربانیوں کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ہم نے ہر موقع پر ہر حکم کی تعمیل کی۔ یہاں تک کہ برما سے افغانستان تک پورا ملک فتح کر کے آپ کے حوالہ کر دیا۔ مگر ہماری ان تمام قربانیوں کا بدلہ ہمیں یہ ملا کہ سرکار ہمارے دین کے درپے ہے۔ چربی لگے کارتوس دانتوں سے کٹوانے کا اصرار ہے تو ہم لوگ اپنے دین آبائی کو چھوڑ کر کس طرح بے دین ہو جائیں ہم کو مرجانا قبول ہے مگر دین سے بے دین نہ ہوں گے۔ اب سرکار جو چاہے ہمارا کرے، ہم سب مرنے کو تیار ہیں، اور ہم اپنے کو اسی وقت سے مردہ تصور کر چکے ہیں، جب ہم نے جیل خانہ توڑ کر افسروں کو برآمد کیا تھا"۔

ریذیڈنٹ نے اس تقریر کا بھی جواب دیا، اور یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک گولی فریزر صاحب کے پاس سے سنسناتی ہوئی گزری۔ حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے جب دیکھا کہ معاملہ قابو سے باہر ہے تو فریزر کو پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے آئے، فریزر یہاں سے روانہ ہوا کہ فوج کو آمادہ کر کے باغیوں کا مقابلہ کرے۔ بادشاہ نے جاتے ہوئے کہا کہ شاہی باڈی گارڈ کے کچھ سپاہیوں کو ساتھ لے لیجئے تو فریزر نے بے پروائی سے مسکرا کر جواب دیا کہ:

"دربار کی سوبھا کے آدمی ہیں۔ ڈیوڑھی کی حفاظت کو رہنے دیجئے۔ حضور کا اقبال کافی ہے۔ حضور خاطر جمع رکھیں۔ (۷۳)

مگر فریزر کا یہ استغناء کام نہ آیا۔ وہ باہر نکلا تو قتل کر دیا گیا اور پھر ڈگلس قلعدار (قلعہ سے متعلق پولیس کا افسر) بھی قتل کر دیا گیا، ہچنسن کلکٹر بھی یہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ بھی ختم کر دیا گیا کپتان ڈگلس کے یہاں ایک پادری مہمان تھا، اس کی لڑکی بھی ساتھ تھی، اس افراتفری میں یہ بھی قتل کر دیئے گئے۔

اعلان آزادی۔ ہم کنار نشانات ناکامی

قلعہ میں جواب و سوال ہو چکے تو فوج نے شہر کا رخ کیا۔ ایک طرف دریا گنج میں (جہاں انگریزوں کے بنگلے تھے) انگریزوں کا قتل عام کر کے کلیجہ ٹھنڈا کیا۔ دوسری جانب قلعہ سے مغربی سمت میں چاندنی چوک کے قریب سرکاری بینک تھا، اس پر یورش کر کے روپیہ لوٹا۔ کاغذ پھاڑے، رجسٹر پھینکے۔ عمارت کو آگ لگا دی۔ منیجر بینک بیرس فورڈ بیوی بچوں کو لے کر چھت پر چڑھ گیا۔ مگر بے سود۔ باغیوں کے ہاتھوں جب بینک کی عمارت ڈھیر ہوئی تو یہ خاندان بھی ختم ہو گیا۔

دہلی گزٹ۔ پریس اور گرجا

مظلوم فوج کو انگریزی نسل ہی سے نہیں بلکہ انگریز کی ہر چیز سے نفرت تھی۔ جوش غضب انگریز کے ایک ایک نشان کو ختم کر دینا چاہ رہا تھا۔ چنانچہ کشمیری گیٹ کے قریب دہلی گزٹ کا پریس تھا، اس پر حملہ کر کے پریس کو تباہ کیا گیا۔ عیسائی کمپوزیٹر جو وہاں کام کر رہے تھے، اُن کو ختم کیا۔ پھر گرجا گھر کا رخ کیا۔ اوپر کی صلیب کو گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ گھنٹے کی رسیاں کاٹ دیں۔ دیواروں پر جو صلیبیں لگی ہوئی تھیں، اُن سب کو اُکھاڑ پھینکا۔

میگزین

قلعہ کی شمالی دیوار سے تقریباً تین فرلانگ کے فاصلہ پر کشمیری گیٹ کی جانب جہاں آج کل شہر دہلی کا بڑا ڈاک خانہ (۷۴) ہے۔ بہت بڑا میگزین تھا جس میں ہر قسم کا سامان جنگ بافراط (۷۵) موجود تھا۔ انقلابی فوج کے ہوشمند افسروں نے بادشاہ کو راضی کرنے کے بعد سب سے پہلا کام یہی کرنا چاہا کہ بادشاہ کے ذریعہ میگزین حاصل کر لیں۔ چنانچہ شاہی شقہ میگزین کے افسر کے نام بھجوا دیا گیا کہ میگزین حوالہ کر دیا جائے۔ فوج کا ایک دستہ بھی بھیج دیا گیا کہ میگزین کو اپنی تحویل میں لے لے۔

اُدھر انگریزی افسروں کی قومی غیرت پوری طرح بیدار تھی۔ لفٹنٹ ولوبی (WILLOUGHBY) میگزین کا افسر اعلیٰ اور اُس کے ساتھی انگریز افسروں (۷۶) نے طے کر لیا کہ اپنی جانیں قربان کر دیں گے مگر میگزین پر قبضہ نہیں ہونے دیں گے۔

چنانچہ میگزین کے دروازے بند کر کے اندر کی طرف ریت کے بورے چن دیے گئے۔ زمین پر گوکھرو اور بارود کی سرنگیں بچھا دی گئیں۔ دیواروں پر توپیں نصب کر دی گئیں۔ اس طرح حفاظت اور بچاؤ کا انتظام مکمل کر لیا گیا۔ انگریزوں کو یقین تھا کہ باغی فوج کے پیچھے پیچھے میرٹھ سے انگریزی فوج بھی آ رہی ہوگی۔ اُس وقت تک حفاظت کیلئے یہ انتظام کافی تھا۔

لیکن میرٹھ کی فوج کا پہنچنا تو درکنار، کئی ہفتے بعد تک اُس کو دہلی کا رخ کرنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ ادھر خود میگزین کے ہندوستانی ساتھیوں سے برگشتگی کے آثار محسوس ہونے لگے۔ اب صرف انگریز افسر ہم خیال تھے جن کی تعداد بشمول ''ولوبی'' نو ۹ تھی۔ نہایت نازک صورت جس نے انگریز افسران کو فوری کارروائی پر مجبور کر دیا۔ یہ پیش آ گئی کہ انقلابی فوج کے افسروں نے بادشاہ سے درخواست کر کے وہ بڑی سیڑھیاں حاصل کر لیں جن سے اُونچی دیوار پر چڑھا جا سکتا تھا۔ اب انگریز افسروں کے لیے آخری اقدام کے بغیر چارہ نہیں تھا یعنی میگزین کو تباہ کر دینا، جس کے ساتھ خود اُن کی ہلاکت بھی یقینی تھی۔ چنانچہ فتیلہ روشن کر دیا گیا۔ فوراً ہی شرارے بلند ہوئے۔ ایسا دھما کہ ہوا گویا سینکڑوں توپیں ایک ساتھ چلی ہیں۔ پورا شہر دہل گیا۔ میگزین کی دیواروں کے ٹکڑے اور پتھر کئی فرلانگ تک دور تک جا کر پڑے۔ حملہ آور سپاہی اور پبلک جو آس پاس تھی، وہ سب ختم ہو گئی۔ مرنے والوں

کی تعداد سات سو تک بیان کی جاتی ہے۔ تو انگریز جنہوں نے جان پر کھیل کر یہ اقدام کیا تھا، اُن میں سے پانچ ختم ہو گئے اور چار بچ کر نکل گئے۔ ولوبی بھی انہیں بچنے والوں میں سے تھا جس کا صرف چہرہ جھلس کر سیاہ ہو گیا تھا۔ مگر غازی آباد کے دیہات میں یہ پہچان لیا گیا اور وہیں ختم کر دیا گیا۔

اگرچہ میگزین کے اُڑنے سے اتنا نقصان نہیں پہنچا، جتنا پہنچانا مقصود تھا کیونکہ ہزاروں کی تعداد میں بندوقیں اور رائفلیں، اسی طرح اور سامان بہت کافی باقی رہ گیا جو انقلابی فوجیوں کے کام آیا۔ تاہم انگریزوں کی قومی غیرت، ایثار اور فدائیت کی ایک مثال سامنے آگئی جس سے انگریز کی کامیابی کے آثار نمایاں تھے۔

اور ظاہر ہے ہزاروں من بارود کا ذخیرہ جو بھک سے اُڑ گیا وہ انقلابی فوجوں کے لیے نقصان ناکافی تھا۔

لفٹنٹ ولوبی افسر اسلحہ خانہ کی طرح ٹیلیگرام[77] آفس کے دو نوجوان سگنلروں کا کارنامہ بھی وہ کارنامہ ہے جس نے انگریزوں کی شکست کو فتح سے بدلا۔ یہ دو نوجوان ولیم برنڈس[78] اور جے۔ ڈبلیو پلکنگٹن تھے۔ جنہوں نے حاضر حواسی سے کام لے کر ٹھیک وقت پر پنجاب گورنمنٹ کو بیدار کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں نہ صرف پنجاب (انگریزوں کے حق میں) محفوظ رہا، بلکہ دہلی کا فیصلہ بھی انگریزوں کے حق میں ہوا۔ تار کا ترجمہ یہ ہے:

> ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء ہمیں دفتر سے چلا جانا چاہیے۔ میرٹھ کے سپاہی سارے بنگلے جلا رہے ہیں۔ یہ لوگ آج صبح یہاں پہنچے۔ ہم جا رہے ہیں۔ آج گھنٹی نہ بجانا۔ ہمارا خیال ہے مسٹر سی ٹوڈ مر گئے۔ کیونکہ آج صبح باہر گئے تھے اور اب تک واپس نہیں آئے۔ ہم نے سنا ہے نو یورپین قتل کر دیے گئے۔ اچھا رخصت۔"

دہلی چھاؤنی

دہلی چھاؤنی میں کوئی انگریزی رجمنٹ نہیں تھی۔ ہندوستانی فوجیں تھیں جن کے افسر انگریز تھے ان فوجوں کی تیوریاں صبح ہی سے بدلی ہوئی تھیں چنانچہ جب اُن کو انقلابی فوجوں پر حملہ کرنے کے لئے کہا گیا تو اس کی تعمیل نہیں کی گئی۔ تاہم انہوں نے بغاوت کا اعلان نہیں کیا تھا۔ لیکن میگزین کے دھماکے سے ہندوستانی فوجوں کو یقین ہو گیا کہ یہ انگریزوں نے انقلابی فوجوں کو تو پ دم کیا ہے۔ اس یقین کے ساتھ انہوں نے کھلے طور پر بغاوت کا اعلان کر دیا۔ انگریز افسران کو قتل کرنے لگے۔ کچھ مارے گئے کچھ نے بھاگ کر جان بچائی۔ کسی نے انبالہ کرنال کا راستہ لیا۔ کوئی میرٹھ پہنچا اور کوئی راستہ ہی میں ختم کر دیا گیا۔

انگریزوں کا قتل

مذکورہ بالا اہم واقعات کے علاوہ آج کے دن انقلابی فوجیوں کا تمام دن انگریزوں کو تلاش کر کر کے قتل کرنے میں صرف ہوا۔ کچھ انگریز اور ان کے اہل و عیال گرفتار کر کے پہلے حرم شاہی کے ایک حصہ میں قید کیے گئے اور چند روز بعد سر پھرے فوجیوں نے ان کو بھی گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔

علماء کے فتوے بھی سنائے گئے۔ سنجیدہ رہنماؤں نے بھی سمجھایا کہ عورتوں اور بچوں کا قتل جائز نہیں۔ مگر

جنون انتقام کچھ اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ نہ فتوے کارگر ہوئے نہ نصیحتیں۔
یہ دار قتل ناکامی کا نامبارک نشان تھی جو پہلے ہی قدم پر ظاہر ہوئی۔

لوہاروں کا کارخانہ اور جیل خانہ

جب میگزین پر یورش ہو رہی تھی تو اس کے قریب لوہار خانہ پر بھی حملہ کیا گیا۔ یہاں ہلکے اوزار بنتے تھے۔ اس کو لوٹا گیا۔ جیل خانہ غالباً اسی جگہ تھا، جہاں اب ہے یعنی دہلی دروازہ سے باہر۔ اس پر حملہ کر کے قیدیوں کو رہا کرا دیا گیا اور جو خزانہ یہاں تھا وہ بادشاہ کے پاس پہنچا دیا گیا۔

اعلان آزادی

شمس العلماء ذکاء اللہ خاں کے الفاظ میں قصہ مختصر، جب ایوان خاص میں تلنگوں (۷۹) کا ہجوم ہوا، تو بادشاہ دیوان خاص میں کرسی پر آ کر بیٹھا اور ان سے پوچھا، کیا مانگتے ہو؟
تلنگوں نے عرض کی۔ ہماری زندگی کا مدار حضور کی پرورش پر ہے۔ ہماری پرورش کیجئے نہیں تو ہم آپ اپنے لئے انتظام کر لیں گے۔ پھر انہوں نے بادشاہ کے قدموں پر سر جھکا کر نذریں دیں اور عرض کیا۔ جہاں پناہ ہمارے سر پر ہاتھ رکھیں۔ بادشاہ نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا۔ انہوں نے بادشاہ کو دعائیں دیں۔

سلامی

جب رات کو سب باغی سپاہ قلعہ میں جمع ہو گئی تو انہوں نے اپنے توپ خانہ سے اکیس توپیں سر کیں۔ (۸۰)

زندہ دلان دہلی نے انقلابی فوجوں کا استقبال کس طرح کیا

۱۱ رمئی کو دہلی میں پہنچنے کے بعد:
"جب سوار جاتے تھے تو وہ دین دین پکارتے جاتے تھے۔ اس لئے ان کے ساتھ مسلمانوں کی بھیڑ ہو جاتی تھی۔ ادھر ہاتما ہنود بھی ان کو اولوں اور بتاسوں کا شربت لٹیوں میں پلاتے جاتے تھے۔
سارے شہر میں ہڑتال تھی۔ ایک سناٹے کا عالم تھا۔ اس سے ڈرتے تھے کہ دیکھئے، شہر سے انگریز کیا معاوضہ لیں گے۔
باغی سپاہی شہر کے مالک ہو گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ چھاؤنی میں جتنی پلٹنیں ہیں۔ ان میں سے ایک سپاہی بھی ایسا نہیں ہے کہ انگریزوں کی حمایت کے لئے اپنی بندوق کا گھوڑا چڑھائے گا یا تلوار چلائے یا توپ کو پلیتہ لگائے۔ (۸۱)

دہلی میں قتل و غارت اس تاریخ کی صبح ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ تینوں ہندوستانی رجمنٹیں اور توپ خانہ جو دہلی کی چھاؤنی میں تھا وہ میرٹھ کے سواروں سے ان کے پہنچنے سے پہلے مل گیا تھا۔ میگزین جس میں اسباب جنگ

بہت موجود تھے، وہ بادشاہ کے اختیار میں آ گیا تھا، اور شہر کے ڈیڑھ لاکھ باشندے فرنگیوں کے مرد وعورت اور بچوں کے قتل عام کرنے کے لئے اور ان کے مال واسباب کو لوٹنے کے واسطے مدد کرنے کو تیار تھے۔ (۸۴)

حضرت راقم الدولہ ظہیر دہلوی اپنا مشاہدہ بیان فرماتے ہیں:

''جس وقت چھوٹے دریبے کے پھاٹک سے باہر انقلابیوں کو دیکھا، کہ تین چار سوار کرتے پہنے دھوتیاں باندھے ہوئے سر سے ایک چھوٹا سا انگوچھا لپیٹا ہوا، فقط ایک کرچ داب میں اور وہ پیپل کے درخت کے سائے میں نہر کی دیوار سے لگے کھڑے ہیں اور ہندو لوگ اس کی سربراہی کر رہے ہیں۔ کوئی پوڑیاں لے آیا ہے، کوئی مٹھائی کا دونا لئے آتا ہے، کوئی لوٹا چنبل کا پانی سے بھر لا دیتا ہے۔'' (۸۴) الخ

اس کے بعد مسلمانوں میں جہاد کے ولولے تھے۔ علماء کرام مسجدوں میں جہاد کے وعظ کہتے تھے۔ لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ:

''ہندوؤں کے پنڈت مسلمانوں کے مولویوں کی نسبت انگریزوں سے عداوت کرنے میں کچھ کم نہ تھے۔ کئی دفعہ انہوں نے پتروں کو دیکھ بھال کر لڑنے کی شبھ مہورت نکال کے تلنگوں کو جتلائے اور ان کو یقین دلایا کہ اُن میں اگر لڑنے جاؤ گے تو فتح پاؤ گے۔ چنانچہ وہ ان صورتوں میں جا کر خوب لڑے۔

پنڈتوں نے تلنگوں کو یقین دلایا تھا کہ انگریزی راج پھر نہیں ہوگا ان ہی کا راج ہوگا۔

ایک عجیب تماشا چاندنی چوک اور بازاروں میں یہ دیکھنے میں آتا تھا کہ پنڈتوں کے ہاتھ میں پوتھیاں ہیں اور وہ ہندوؤں کو دھرم شاستروں کے حکم سنا رہے ہیں کہ انگریز ملکشوں سے لڑنا چاہیے۔

جب لڑائیوں میں سے تلنگوں کی لاشیں چارپائیوں پر اُن کے سامنے آئیں تو وہ ہندوؤں کو اپدیش دیتے کہ ان سرگ باشیوں کی طرح سرگ میں چلے جاؤ، جن کے لیے نہ ارتھی کی ضرورت ہے، نہ کریا کرم کی۔ مگر ہندوؤں پر ان اُپدیشوں کا ایسا اثر نہیں ہوتا تھا، جیسا کہ مسلمانوں پر جہاد کے وعظ کا ہوتا تھا۔ (۸۳)

دہلی شہر کی حالت اور اس کا نظم و نسق

زمانہ جنگ میں بادشاہ کی طرف سے شاہی اختیارات منتقل کرنے کا اعلان

چند سال پہلے تک ہندوستان پر برطانیہ کا "یونین جیک" لہرا رہا تھا، جس کی تہذیب اور تنظیم کے نام پر نہ صرف بہادر شاہ اور اُس کے دور کو بلکہ تمام ہندوستانی حکومتوں، اُن کے نظم و نسق اور آئین و دستور کو دوسروں نے تو بدنام کیا ہی تھا انہوں نے بھی بدنام کرنے میں کوئی کمی نہیں کی۔

خاص اسی مہذب اور متمدن برطانیہ کے دور کی بات ہے کہ امن وامان کے زمانہ میں جب فوجوں کے تبادلہ کا وقت آتا تھا اور کوئی فوج ایک چھاؤنی سے دوسری چھاؤنی کو کوچ (مارچ) کرتی تھی تو شاہراہ کے قریب جو قصبے اور گاؤں آباد ہوتے تھے، فوجی مارچ کی خبر اُن کے باشندوں کے لئے ایک مصیبت اور پریشانی کا اعلامیہ ہوا کرتی تھی۔ اگر مصیبت کی انتہا یہ ہوتی کہ بیل گاڑیاں اور چھکڑے بیگار میں لئے جائیں گے تب بھی پریشانی خاص افراد تک محدود رہتی۔ لیکن اصل مصیبت تو یہ ہوئی تھی کہ اس علاقے کے باشندوں کی کوئی چیز یہاں تک کہ عورتوں کی عصمت بھی محفوظ نہیں رہتی تھی۔

دیہات کی عورتیں گھروں کے دروازے بند رکھتی تھیں کیونکہ آگ لینے کے بہانہ سے فوجی گھروں کے اندر چولھوں تک پہنچ جاتے تھے۔ پھر اُن سے مقابلہ وہی کر سکتا تھا جس میں پوری فوج سے مقابلہ کی طاقت ہو۔ (۸۵)

پھر جب فوجوں کی نقل و حرکت ٹرینوں کے ذریعہ ہونے لگی، تو زمانہ جنگ میں ہم نے خود دیکھا ہے کہ فوجی اسپیشل کی آمد کی خبر خوانچوں اور اسٹال والوں پر کس طرح ہیبت طاری کر دیا کرتی تھی۔ اسٹالیں بند کر دی جاتی تھیں اور خوانچے والے اپنے خوانچے لے کر اسٹیشن سے باہر چلے جاتے تھے۔ اور بدقسمتی سے کوئی خوانچہ یا اسٹال پلیٹ فارم پر فوج والوں کی نظر پڑ جاتی، تو وہ پورا اُن کی بے تکلفی کی نظر ہو جاتا تھا۔

اس تمہید کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جن فوجوں نے علم بغاوت بلند کیا تھا، اُن کی تربیت انگریزی سامراج کے اسی ماحول میں ہوئی تھی۔

اس کے علاوہ یورپ کی وہ بڑی لڑائیاں جو اسی نصف صدی میں یعنی ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۷ء و ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء میں ہو چکی ہیں، ان لڑائیوں نے یہ مشاہدے بھی پیش کئے کہ جنگ کے وقت شریف اور امن پسند باشندے تو دہشت زدہ ہو کر اپنی جانوں کی فکر میں ہوتے تھے اور آوارہ گرد اوباش لوگوں کی بہار آ جاتی تھی۔ وہ جوٹ مار سے لے کر عصمت دری تک من مانی کارروائیاں کرتے تھے۔ اس بنا پر رضا کار (والنٹیر) بھرتی کر کے اُن کو ٹریننگ دی جاتی تھی اور اسپیشل اختیارات دے دیئے جاتے تھے کہ اسے موقع پر وہ شہریوں کی حفاظت کر سکیں۔

اس ضروری تمہید کے بعد زمانہ جنگ میں شہر دہلی کے حالات کا جائزہ لیجئے۔

''۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو جب میرٹھ کی فوجیں عوام کے ہجوم کے ساتھ بھوکی پیاسی تھکی ماندی شہر میں داخل ہوئیں اور انگریزوں کو قتل کرنا، انگریزی سامانوں کو تباہ و برباد کرنا شروع کر دیا تو کسی قدر افراتفری لازم تھی۔ اس پریشان حالی میں نزاکت اس لئے بھی پیدا ہوگئی کہ سامان رسد کہیں بھی فراہم نہیں تھا۔ اس نازک صورت حال کے باوجود جو کچھ ہوا، اس کے متعلق راقم الدولہ ظہیر دہلوی کی چشم دید شہادت ملاحظہ فرمایئے۔

راقم الدولہ کا انقلابی فوج سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ اس کے سخت مخالف تھے۔ اسی بناء پر اُن کے بیانات نہ صرف طنز آمیز بلکہ انقلابیوں کے حق میں سخت توہین آمیز ہیں۔ مگر ایک حقیقت نگار واقعہ کو طنز اور توہین کا جامہ تو پہنا سکتا ہے، اصل واقعہ کی واقعیت کا انکار نہیں کر سکتا۔

ظہیر صاحب فرماتے ہیں:

''۱۱ر مئی کو جب میرٹھ کے فوجی آئے تو دو چار دستوں کو تو بادشاہی گھوڑوں کے واتہ کے چنے دے دیئے گئے۔ ان کے بعد جب مزید فوجی آئے جن کی تعداد کئی ہزار تھی، تو بادشاہ کی طرف سے امن کا اعلان ہوا، اور ہر جگہ چوکی پہرے بٹھا دیئے گئے کہ کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ حلوائیوں اور بقالوں کو بوا کر دوکانیں کھلوائی گئیں۔ پھر حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے خود (راقم الدولہ ظہیر دہلوی صاحب) اور اُن کے ساتھ صوفی اشرف بیگ صاحب رسالدار کو بھیجا کہ جا کر دیکھیں کہ اعلان امن پر کہاں تک عمل ہو رہا ہے۔ یہ لال قلعہ سے مسجد فتحپوری تک گئے۔ ہر جگہ امن پایا۔ خال خال دکانیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ ہر دکان پر پہرہ تھا کہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکے''۔ (۸۶)

انقلاب کے ساتھ ساتھ اس طرح امن ایسے دور میں کہ نہ تیز رفتار پولیس وکیمیں ہیں نہ ریڈیو اور لاسلکی، انقلاب پسندوں کے لئے درس عبرت ہے۔

یہ گیارہ مئی کی فوری کارروائی تھی۔ اگلے روز کے متعلق ظہیر دہلوی صاحب کے ہمنوا جن کو برطانوی سامراج نے شمس العلماء کے خطاب سے بھی نوازا ہے اُن کی شہادت ملاحظہ فرمایئے:

''تلنگے (۸۷) (انقلابی فوجی) ابھی شہر و گلی کوچوں سے نابلد تھے۔ چوڑے چوڑے بڑے بڑے بازاروں کو جانتے تھے، ان میں اُن کو اپنی ضرورت کی چیزیں ملتی نہ تھیں۔ انہوں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ حضور سوار ہو کر بازار کی دوکانیں کھلوادیں۔ بادشاہ نے اُن کی درخواست کے موافق سواری کا حکم دیا۔ (۸۸)

بادشاہ عماری میں ہاتھی پر سوار تھا، اُس کے نقیب احکام سناتے جاتے تھے۔

غدر سے پہلے ڈھنڈورا اس طرح پیٹا جاتا تھا کہ نقارہ پر چوٹ لگا کے ڈھنڈورچی اول یہ کہتا کہ:

''خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم سرکار کمپنی بہادر کا''۔ پھر آگے وہ بات کہتا تھا جس کا مشتہر کرنا

منظور ہوتا تھا۔ ۱۲ مئی کو ڈھنڈورے پر سے "حکم سرکار کمپنی بہادر کا" اُڑ گیا۔ اُس کی جگہ بادشاہ کا حکم ہو گیا۔

اس اعلان کے بعد اس روز تو یہی ہوا کہ "دھر کوئی دکان کھلی اور اُدھر بند ہوئی"۔ (۸۹)

لیکن ۱۴ کے بعد کاروبار بدستور جاری ہو گیا۔ بلکہ کچھ اضافہ کے ساتھ۔ چنانچہ خود شمس العلماء کی شہادت ہے:

"جس تاریخ سپاہ آئی، دوسرے روز قلعہ میں اکابر شہر کی ایک مجلس مقرر ہوئی کہ شہر کا اور سپاہ کی رسد رسانی کا انتظام کیا جائے۔ اگر رسد کا بندوبست نہیں ہوگا تو وہ سارے شہر کو لوٹ کر کھا جائیں گے۔ اس کا اہتمام محبوب علی خاں اور میر نواب پسر سید تفضل حسین وکیل کو سپرد ہوا"۔

شہر میں انگریزوں کی طرف سے رسد آنے کا انسداد تو کسی جانب سے نہیں ہوا تھا۔ چاروں طرف سے صبح سے شام تک سب طرح کی اجناس ضرورت کے موافق آتی تھیں۔ بیلوں، گدھوں، ٹٹوؤں، خچروں، گاڑیوں، چھکڑوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ شہر میں جابجا یہ اجناس بکتی تھیں، کسی کا مقدور نہیں تھا کہ اُن پر ہاتھ ڈال سکے۔ تلنگے رسد کے قواعد سے خوب واقف تھے۔ جنس کی قیمت نرخ کے موافق خوب دیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ہم قیمت کم دیں گے تو رسد بند ہو جائے گی پھر ہم بھوکے مریں گے۔ غرض تلنگوں نے خود اپنی رسد کا انتظام ایسا رکھا کہ اُن کو بادشاہی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی کوئی جنس کم ہو جاتی تھی تو وہ بادشاہ سے اس کو بہم پہنچانے کی درخواست کرتے وہ ان کو منگا دیتا۔ ایک دفعہ افیون کا توڑا کم ہو گیا تھا تو بادشاہ نے راؤ تلارام کو لکھا کہ دو سن افیون بھیج دے۔ قیمت دے دی جائے گی جب وہ میدان جنگ میں جاتے تو بادشاہی اہل کار حلوائیوں سے مٹھائی وغیرہ بنوا کر چھکڑوں میں اُن کے پاس بھیجتے۔

کہیں ایسا اتفاق دو تین ہی دفعہ ہوا ہوگا کہ شہر میں سپاہ کو یا اہل شہر کو ضروری چیزوں کے میسر ہونے میں تکلیف ہوئی ہو۔ (۹۰)

سونے چاندی کی خرید و فروخت

عام اجناس کے علاوہ سونے چاندی اور زیورات کی خرید و فروخت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔
بعض تلنگوں[۹۱] کے پاس روپیہ اتنا تھا کہ وہ اس کو اٹھا نہیں سکتے تھے۔ وہ شہر میں سونا خریدتے پھرتے تھے۔ اُن کی خریداری کے سبب سے سونے کا بھاؤ سولہ سترہ روپے سے ستائیس اٹھائیس روپے تولہ ہو گیا۔ دلال بازاروں اور گلی کوچوں میں اُن کو لئے پھرتے تھے اور اُن کو ہندوستانیوں کے گھروں سے سونے کے زیور مول لے دیتے تھے۔ مسلمانوں نے اکثر اپنی ضرورتوں کے سبب سے اور ہندوؤں نے اپنی طمع[۹۲] کے سبب سے سونے کے زیور اُن کے ہاتھ بہت بیچ ڈالے۔

سناروں کی دکانوں پر تلنگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ وہ اُن سے کڑے ہاتھوں کے اور رانوں کے بنواتے تھے۔ بعض تلنگوں کی رانوں پر پانچ پانچ ایسے کڑے چڑھے ہوئے تھے۔ (۹۳)

نظم ونسق

بہر حال ۱۲ رمئی کو شاہی جلوس اور اعلان کے بعد رفتہ رفتہ کاروباری حالت معمول پر آگئی۔ بلکہ نفع اندوزوں کے لئے اچھے مواقع مہیا ہو گئے۔ یہاں تک کہ سونے کی قیمت دوگنی سے بھی زیادہ کر دی گئی۔

غذائی نظم ونسق کے لئے ۱۴ رمئی ہی کو قلعہ میں اکابر شہر کی ایک مجلس مقرر ہوگئی تھی۔ (۹۴) میر محبوب علی خاں اور میر نواب پسر سید تفضل حسین وکیل کو فراہمی رسد کی خدمت سپرد ہوئی یعنی فوڈ منسٹر بنائے گئے۔ ان کی کارگزاری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس غیر معمولی ہنگامی دور میں دہلی کی پوری آبادی جو پہلے سے تقریباً دوگنی ہوگئی تھی (۹۵)، غذائی بحران سے محفوظ رہی اور کبھی بھی کسی کو خوراک کے سلسلہ میں پریشانی نہیں ہوئی۔ (۹۶)

عدلیہ

قانونی کاموں کے لئے:

''بہادر شاہ نے یہ حکم جاری کیا کہ سلطنت اور عدالت کے کاموں میں شاہزادے اور سپاہ مداخلت نہ کرے۔ عدالت کے سارے کام صرف مفتی اور صدر الصدور کیا کریں۔ نہ سپاہ، نہ مال کے حکام اس عدالت میں دخل دیں۔ (۹۷)

مولوی فیض احمد (مولانا فیض احمد صاحب) آگرہ میں صدر بورڈ کا سررشتہ دار تھا۔ اور باغی ہو کر دہلی میں آیا تھا۔ اس کو اور مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان کو عدالت کا کام سپرد ہوا''۔ (۹۸)

پولیس

شہر میں پہلا کوتوال معین الدین حسن خاں مقرر ہوا جو نواب قدرت اللہ خاں کا بیٹا تھا۔ (۹۲)

یعنی پہلے یہ تھانہ پہاڑ گنج میں انچارج تھانیدار تھے۔ ۱۱ رمئی کے انقلاب کے بعد جیسے ہی بادشاہ کی طرف سے تقررات شروع ہوئے، یہ جست لگا کر آگے آگے بڑھے اور شہر کے کوتوال (یعنی سپرنٹنڈنٹ پولیس) ہو گئے۔ یہ دل سے انگریز کے حامی تھے۔ ۱۱ رمئی کے قیامت خیز ہنگامہ میں سر تھیوفلس مٹکاف مجسٹریٹ دہلی کو تھانہ میں چھپا کر انقلابی گروہ سے بچانا، پھر رقم خرچ کر کے معتبر آدمی کے ذریعہ اُن کو جھجر پہنچانا انہیں کا کام (۹۹) تھا۔ اس وقت کا کوتوال کا عہدہ سنبھالنے کا مقصد بھی یہ تھا کہ:

''انگریزوں کی خیر خواہی اس بدخواہی کے لباس میں کروں''۔ (۱۰۰)

اُن کی اس دورویہ پالیسی کے ساتھ اس کا قائم رہنا ناممکن تھا۔ چنانچہ چند روز بعد اُن کو الگ کر دیا گیا (۱۰۱)

''اس کے بعد خواجہ وحید الدین کی سفارش سے قاضی فیض اللہ، کوتوال شہر اور قاضی عبدالرحیم نائب کوتوال مقرر ہوئے۔ قاضی نے استعفیٰ[۱۰۲] دے دیا۔ اس کے بعد سید مبارک شاہ رام پور کا باشندہ کوتوال مقرر ہوا، اور آخر تک وہی کوتوال رہا۔ نجف گڑھ، مہرولی، شاہدرہ پہاڑ گنج، بدر پور اور شہر میں جہاں جہاں پہلے تھانے تھے، تھانہ دار مقرر ہوئے۔ ان کاموں میں سوائے شہزادوں کے بخت خاں بھی دخیل تھا۔ بادشاہ نے تھانہ داروں اور کوتوال کے نام حکم جاری کر دیا تھا کہ وہ بخت خاں کے حکم کی تعمیل کیا کریں۔[۱۰۳]

سکہ

قدرت اللہ خاں سو ۱۰۰ اسواروں کو لے کر اودھ کی کل سپاہ کی عرضی لایا۔ بخت خاں نے بادشاہ سے ملاقات کرائی۔ قدرت اللہ نے بادشاہ کی خدمت میں مندرجہ ذیل چیزیں نذر کیں۔

(۱) نئے سکے کی اشرفیاں جن پر نقش تھا:

بزر زد سکہ نصرت طراز   سراج الدین بہادر شاہ غازی

(۲) دو گھوڑے

(۳) دو ہاتھی

(۴) کلاہ جس میں بیش بہا موتی لگے ہوئے تھے۔

(۵) ایک جوڑی بازو بند الماس پیوند۔[۱۰۴]

بادشاہ کی طرف سے شاہی اختیارات منتقل کرنے کا اعلان۔ پارلیمنٹری حکومت اور کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی

منشی جیون لال جی، بادشاہ سے زیادہ انگریزوں کے وفادار ہیں۔ مگر اس کارروائی کی شہادت دینے پر مجبور ہیں کہ ۴ ستمبر ۱۸۵۸ء جے پور، جودھ پور، بیکانیر اور الور کے راجگان کے نام بادشاہ کی دستخطی چٹھیاں بھیجی گئیں۔ جس میں لکھا تھا کہ مجھے فوج کی ضرورت ہے اور یہ کہ میں انگریزوں کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن چونکہ اس وقت میرے امور سلطنت کا انتظام کرنے کے لئے قابل اعتماد آدمی موجود نہیں ہیں، اس لئے میں ریاستوں کی ایک مجلس بنا دینی چاہتا ہوں اور اگر وہ ریاستیں جن کے نام خط بھیجے جا رہے ہیں، اس غرض کے لئے مجلس بنالیں گی تو میں نہایت خوشی سے اپنے شاہی اختیارات اُن کے ہاتھ میں دے دوں گا۔[۱۰۵]

لوٹ مار کیوں ہوئی اور کتنی ہوئی

قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی نازیبا حرکتیں اور بادشاہ کے تاثرات

شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ خاں جو ایک طرف شکایت کرتے ہیں:

''جس وقت سے کہ انگریزی عملداری شہر سے کافور ہوئی تو چوبیس گھنٹہ کے اندر شہر میں کوئی گناہ اور پاپ ایسا نہ تھا، جو انسان کر سکتا تھا، وہ نہ ہوا ہو''۔ (۱۰۶)

لوٹ مار کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''غرض کوئی مہینہ خالی نہیں گیا کہ دو چار آدمیوں کی کم بختی اس طرح تلنگوں کے ہاتھ نہ آئی ہو''۔ (۱۰۷)

لیکن یہی شمس العلماء یہ بھی اعتراف کرتے ہیں:

''لوٹ اور شبہ میں قتل کے واقعات دس بارہ سے زیادہ نہیں (۱۰۸) ہوئے۔ غرض جیسی اس لوٹ مار کی شہر میں شہرت ہوئی تھی، اس کا دسواں حصہ بھی صحیح نہیں ہوتا تھا۔ صد ہا محلے تھے، جن میں ایک کوڑی کا مال بھی نہیں لٹا۔ (۱۰۹)

۱۱ مئی کو کھاری باؤلی، چاندنی چوک، دریبہ اور چاؤڑی میں دکانیں بند ہو گئیں۔ اگرچہ اُن میں سے بہت تھوڑی لٹیں تھیں''۔ (۱۱۰)

تھوڑی مقدار بھی ملاحظہ فرمائیے:

''دریبہ میں صراف کی ایک دکان لٹی تھی، اور صرافوں نے اپنا زر وزیور اور روپیہ گھر چلتا کر دیا تھا، اور اپنی دکانوں کے آگے واویلا مچانے کھڑے ہو گئے تھے، ہائے ہم لٹ گئے۔ اگرچہ اور گلی کوچوں میں اس لوٹ کا کچھ بھی اثر نہیں تھا۔ سب سودا سلف بدستور بک رہا تھا۔ اگر کوئی بدمعاش گلی کوچے کے دوکان دار سے ترچپش کرتا، تو اہل محلہ اس کو درست کر دیتے۔ اپنے پرائے دوکانداروں پر زور اظلم وستم نہ ہونے دیتے''۔ (۱۱۱)

مختصر یہ کہ چار ماہ کی غیر مطمئن سلطنت میں جس کو ایک لمحہ کا اطمینان بھی نصیب نہ ہوا۔ جو بیرونی دشمنوں اور اندرونی جاسوسوں سے گھری ہوئی تھی، لوٹ مار اور قتل کے واقعات دو چار ماہانہ کے اوسط سے کل دس بارہ ہوئے۔ افسوس شمس العلماء کو یہ خبر نہیں تھی کہ جس حکومت کی عظمت سے اُن کا قلم سرنگوں ہے، اُسی کے دور سطوت جبروت میں ایسا زمانہ بھی آنے والا ہے کہ امن وامان کے زمانہ میں بھی قتل وخون اور لوٹ مار کا تناسب اس سے کہیں زیادہ ہو گا۔ بہرحال ان واقعات کی کل تعداد دس بارہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ واقعات کیوں ہوتے تھے۔ اس سوال کا جواب شمس العلماء کی زبان سے ہی اچھا معلوم ہو گا۔

آپ صرف یہ غور فرمائیے کہ جن وجوہات کی بنا پر تلنگے آپے سے باہر ہو کر یہ اقدام کرتے تھے، آیا وہ ایسے ہی اشتعال انگیز تھیں کہ ایک غیور باحمیت جماعت کو ان پر مشتعل ہونا چاہیے تھا یا کسی ذاتی غرض اور مالی منفعت کے سبب سے وہ یہ حرکتیں کرتے تھے۔

اگر یہ وجوہات فی الحقیقت اشتعال انگیز ہوں، تو پھر جرم اور الزام صرف یہ رہ جاتا ہے کہ قانونی اور آئینی کارروائی کے بجائے قانون اپنے ہاتھ میں لے کر بے آئین حرکت کی۔

شمس العلماء فرماتے ہیں۔ تلنگے کئی سبب سے لوگوں کو قتل کرتے۔ مثلاً

(۱) جن کو کرشان جانتے تھے۔ اس سلسلہ میں دو واقعے پیش آئے۔ ایک سیٹھ بدری چند ڈپٹی انسپکٹر مدراس دہلی جو بڑا اکٹر سرا وگی ہندو تھا۔ مگر وہ انگریزی کپڑے پہنتا تھا۔ اس لئے لوگ اس کو کرشان جانتے تھے، اس کو ایسا زخمی کیا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔

دوسرے کشمیری پنڈت مدن موہن لال۔ جس نے مسلمان ہو کر اپنا نام آغا حسن جان رکھا تھا۔ وہ کوٹ پتلون پہنتا تھا۔ اس کو بھی کرشان سمجھ کر قتل کرنا چاہا مگر میاں نظام الدین آڑے آگئے۔ انہوں نے صفائی دی۔ جس سے اس کی جان بچ گئی۔ پھر اس کو ولی داد خاں اپنے ساتھ مالاگڑھ لے گئے۔ وہاں سے وہ میرٹھ چلا گیا۔

(۲) جس کے متعلق یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے یہاں کوئی انگریز عورت یا بچہ پوشیدہ ہے۔ اس الزام میں ۱۱ رمئی کو قاضی پنو کو قتل کر دیا گیا، اور لطف یہ ہے کہ خود قاضی صاحب کے بھانجوں نے کسی عداوت کی بنا پر قاضی کے خلاف تلنگوں کو مشتعل کیا تھا۔

شمس العلماء یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس الزام میں قاضی صاحب کے علاوہ اور کوئی قتل نہیں ہوا۔

۱۲ رمئی کو نواب حامد علی خاں کو اسی الزام میں گرفتار کر کے قلعہ میں لائے۔ وہاں محبوب علی خاں وزیر نے سفارش کر کے ان کو رہا کرایا۔ نواب صاحب کا مکان لٹنے کی بہت شہرت ہوئی۔ مگر اس شہرت کی حقیقت یہ تھی کہ بہت معمولی سا سامان خرد برد ہوا تھا۔

۱۳ مئی کو نرائن داس نہر والے کے متعلق بھی شبہ ہوا۔ یہ شبہ صحیح ثابت ہوا۔ دو انگریز اس کے مکان سے گرفتار کئے گئے۔ جو قتل کر دیئے گئے اور لالہ کا مکان لوٹ لیا۔

اس طرح شہر میں اور دو چار غریب آدمیوں کے گھروں کی کم بختی آئی۔ ایک درزی کے گھر سے تین فرنگی نکالے۔ (۱۴)

(۳) جن کے متعلق شبہ ہوتا تھا کہ وہ انگریزوں سے سازش رکھتے ہیں۔ ان سے خط و کتابت ہے یا ان کے لئے سامان رسد فراہم کرتے ہیں۔

بدنصیبی ملاحظہ کیجئے۔ جن پر جاسوسی کا شبہ سب سے زیادہ تھا۔ وہی سب سے زیادہ بادشاہ کے مقرب تھے یعنی حکیم احسن اللہ خاں صاحب۔ زینت محل (بادشاہ بیگم) اور بہادر شاہ کا وزیر محبوب علی خاں۔ چنانچہ بار بار اس

کے چرچے ہوئے حکیم احسن اللہ خاں صاحب کو دو تین مرتبہ گھیر بھی لیا۔ مگر ان سب کو وہ تقرب حاصل تھا کہ اُن کے حیلے بہانے بھی حقیقت سمجھے جاتے، اور اُن کا جھوٹ بھی سچ مان لیا جاتا تھا۔ ان میں صرف حکیم احسن اللہ خاں صاحب کو کچھ مالی نقصان اُٹھانا پڑا کہ وہ بادشاہ کے دربار میں حاضر تھے اور پیچھے مکان لٹ گیا۔ ان کے علاوہ اور کسی کو نقصان نہیں اُٹھانا پڑا۔ حالانکہ انقلابی فوج کا اس عرصہ میں بہت نقصان ہوا۔ یعنی چوڑی والان[۱۱۳] میں جو اسلحہ کا کارخانہ اور میگزین تھا، وہ اُڑا دیا گیا۔ تلنگوں کو یقین تھا کہ حکیم احسن اللہ خاں نے آگ لگوائی ہے۔[۱۱۴] اسی اشتعال میں وہ حملہ آور ہوتے تھے۔

مان سنگھ اور تراب علی کے متعلق شبہ بالکل صحیح تھا۔ اُن کو ایک مرتبہ گرفتار کر کے قلعہ میں پہنچا دیا گیا۔ مگر قلعہ کے قریب خود شاہزادے ان دشمنوں کے دوست تھے۔ انہوں نے بلا تکلف اُن کی دوستی نمایاں کر کے اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود لی اور اُن کو رہا کرا دیا۔

مہاراجہ پٹیالہ انگریزوں کا سب سے بڑا دوست، اور اگر انگریزوں میں جذبۂ احسان مندی ہوتا، تو اس وقت سب سے بڑا محسن تھا۔ اس کا چچا راجہ جیت سنگھ دہلی میں رہتا تھا۔ ایسے شخص کو نظر بند کر دینا اور حراست میں رکھنا حزم و احتیاط اور دستور و آئین کا تقاضا ہے۔ تلنگوں نے اُن کو گرفتار کیا تو بالکل بجا اور درست تھا۔ مگر وہ مغل بادشاہ جن کا عقیدہ یہ تھا:

در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست

اس گرفتاری کو کب گوارا کر سکتا تھا۔ اس کو رہا کرا دیا کہ یہ تو مہاراجہ پٹیالہ سے ناراض ہیں اور عرصہ سے یہاں رہتے تھے۔

اسی طرح رائے رام سرن داس ڈپٹی کلکٹر کے رشتہ دار دہلی میں رہتے تھے۔ اُن پر بھی جاسوسی کا الزام تھا۔ اُن پر بھی فوجیوں نے یورش کی اور سامان و اسباب لوٹ لیا۔ غالباً جنرل بخت خاں کے بعد اس پالیسی میں شدت آئی۔ چنانچہ چند آدمی جاسوسی کے الزام میں قتل کئے گئے۔ مثلاً بدیو سنگھ جو شہر میں کوڑیا پل پر رہتا تھا۔ اس کا بھائی کچھمن سنگھ علی پور میں تھانہ دار تھا۔ انگریزوں کا ساتھی تھا۔ بدیو سنگھ کو دو مرتبہ جاسوسی کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ پہلی دفعہ چھوڑ دیا گیا مگر دوسری مرتبہ معافی نہیں دی گئی بلکہ گولی مار کر اس کی لاش کو توالی کے سامنے ٹانگ دی گئی۔

پیارے لال مدرس تحصیل مظفر نگر ت دہلی میں رخصت پر آیا ہوا تھا۔ وہ اسی الزام میں گرفتار ہوا، اور توپ سے اُڑا دیا گیا۔

(۴) جن کے متعلق رسد یا سامان جنگ پہنچانے کا شبہ ہوتا تھا۔ کشمیری اور موری دروازہ کے کچھ نانبائی پہاڑی پر ڈبل روٹی پہنچایا کرتے تھے۔ وہ اسی جرم میں قتل کئے گئے۔

حکیم احسن اللہ خاں اور محبوب علی خاں وزیر اس الزام سے بھی نہیں بچے۔ ایک مرتبہ اناج کے چھکڑوں میں گولے اور بارود برآمد ہوئی۔ اس کا الزام بھی ان ہی دونوں پر لگایا گیا۔ مگر انہوں نے حلف اُٹھائے اور شبہ سے

پاک ہو گئے۔

(۵) جن کے متعلق توڑ پھوڑ اور انقلابی فوج کے سامان کو نقصان پہنچانے کا الزام ہوتا۔ جیسا کہ چوڑی والان کے میگزین کو تباہ کرنا، جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ ایسے ہی ایک مرتبہ سلیم گڑھ کی توپوں میں اینٹیں اور پتھر بھرے ہوئے نکلے۔ دوسری مرتبہ ان میں میخیں ٹھکی ہوئی نکلیں۔ ان سب کا الزام ان ہی دو بڑوں پر لگایا گیا۔ حکیم احسن اللہ خاں مشیر خاص بہادر شاہ و محبوب علی خاں وزیر۔ مگر اُن کو قسمیں کھانی خوب آتی تھیں۔ قسمیں کھا کر جان بچالی۔ لطف یہ ہے کہ محبوب علی خاں لب گور تھا۔ استسقاء کا مریض تھا۔ چنانچہ اسی اثناء میں اُس کا انتقال ہو گیا۔ مگر آخری وقت میں بھی وہ ایسا کردار اختیار نہ کر سکا جو شک و شبہ سے بالا ہوتا۔ باقی رہے حکیم احسن خاں صاحب تو اُن کی انگریز دوستی آج ضرب المثل ہے۔

مختصر یہ کہ وہ تمام اسباب اور وجوہات جن کی بناء پر لوٹ مار یا قتل کے واقعات پیش آتے تھے، وہ بلاشبہ سخت سے سخت اقدام کے مستحق تھے۔ البتہ خرابی صرف یہ تھی کہ اس سے پیشتر کہ فوجی عدالت میں معاملہ پیش ہو کر قانونی طور پر سزا کا فیصلہ ہوتیلنگے اور دوسرے فوجی قانون کو خود اپنے ہاتھ میں لے کر مجرموں کو سزا دے دیا کرتے تھے۔ ایسے ہنگامی حالات جو اس وقت درپیش تھے ممکن ہے تلنگوں کو معذور قرار دے دیا جائے، اور کہہ دیا جائے کہ شدت اشتعال میں یہ لوگ بے قابو ہو جاتے تھے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ فوجیوں کا شدت اشتعال میں بے قابو ہو جانا خود ایک کمزوری ہے۔

۰۰۰۰۰۰۰

بادشاہ کے تاثرات

اب بہادر شاہ کا ایک طویل خط ملاحظہ فرمانے کی زحمت گوارا فرمایئے۔ یہ خط مرزا مغل کے نام ہے۔ اس میں بہادر شاہ نے بدنظمی اور ہنگامہ آرائی کا شکوہ کیا ہے، جس زمانہ میں انگریزوں کے نام کی تسبیح پڑھی جاتی تھی اور برطانوی اقتدار کو سایۂ رحمت بتایا جاتا تھا تو ہندوستانی فوجوں کی جبر وتعدی اور ہندوستانیوں کی نااہلیت کے لئے سب سے بڑی دستاویز کے طور پر یہ خط پیش کیا جاتا تھا۔

مگر جبکہ مذکورہ بالا دفعات میں اس خط کا پس منظر آپ کے سامنے آچکا ہے تو خود آپ کی انصاف پسندی کا فیصلہ یہ ہوگا کہ یہ خط ہندوستانیوں کی نااہلیت کے بجائے ان کی امن پسندی، باہمی محبت اور رواداری اور ایک دوسرے کی خیر خواہی کا بین ثبوت ہے۔ اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ اہل وطن کی عافیت اور راحت و آرام کے بارے میں مغل بادشاہ کا احساس کس درجہ نازک ہے کہ اس کو وہ خلفشار بھی برداشت نہیں، جو ان حالات کا لازمی تقاضا تھا۔ رعایا کی معمولی تکلیف بھی ان کے دل کا درد اور اس کی روح کے لئے سوز و گداز ہے۔ جس سے وہ یہاں تک بے چین اور مضطرب ہے کہ چاہتا ہے کہ اقتدار کے اس جامہ زریں کو اُتار پھینکے اور شاہی کے بجائے گدائی اختیار کر لے۔ وہ مخلوق جو برائے نام رعایا تھی، اس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ اس کے سامنے مذہب کا سوال قطعاً نہیں۔ وہ ہندو اور مسلمان ہر ایک کو ایک نظر سے دیکھتا ہے دونوں کو یکساں درجہ دیتا ہے۔

اس کا عقیدہ یہ ہے کہ بادشاہ اور رعایا کا تعلق محبت، دوستی اور خیر خواہی کا تعلق ہے۔ وہ جبر و تعدی اور خلفشار کو اپنی بادشاہی کی کسرشان سمجھتا ہے اور جب اس پہلو پر بھی نظر ڈالی جائے کہ یہ خط ہنگامہ انقلاب شروع ہونے سے صرف دس روز بعد[115] کا ہے، تو یہ خط اُن تمام منظم اور باضابطہ حکومتوں کے لئے سبق بن جاتا ہے، جو ہفتے اور مہینے نہیں بلکہ پانچ سات سال گزر چکنے پر بھی عوام کے جذبات پر خاطر خواہ کنٹرول نہ کر سکیں۔

مرزا مغل کے نام بادشاہ نے یہ حکم لکھا ہے کہ:

''ہمارے فرزند کو معلوم ہو کہ جب سپاہ پیدل اور سوار، اول ہی میرے پاس آئے ہیں تو میں نے اُن سے خود اپنی زبان سے کہہ دیا تھا، کہ میرے پاس خزانہ اور مال واسباب نہیں ہے، جس سے میں اُن کی مدد کر سکوں۔ لیکن اگر میری جان اُن کے کام آئے تو اس میں مجھے دریغ نہیں۔ میرے اس کہنے سے وہ سب خوش اور راضی ہوگئے، اور انہوں نے اقرار کیا کہ وہ میری فرماں برداری و اطاعت میں اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ میں نے اُن کو ہدایت کی کہ اُن کا اوّل کام یہ ہے کہ میگزین اور خزانہ کا انتظام ایسا کریں کہ آئندہ اُن کے اور میرے کام آئے۔ اس کے بعد انہوں نے دیوان خاص و دیوان عام و مہتاب باغ میں، اور مقامات میں جہاں اُن کی خوشی میں آیا، قیام کیا میں نے اُن کی جہالت و آسائش و آرام کی خاطر سے اپنے نوکروں کو منع کر دیا وہ اس کام میں

اُن کے مزاحم نہ ہوں اگر چہ میں نے اُن سے اقرار نہیں کیا تھا، مگر روپیہ قرض لیا گیا کہ پیادہ وسوار کو روزینہ دیا جائے۔ میں نے بار بار یہ حکم دیا کہ وہ شہر میں جبر و تعدی و غارت گری نہ کریں۔ مگر اس سے کچھ کام نہ نکلا۔ آج دس روز گزرے ہیں اب تک وہی خرابیاں چلی جاتی ہیں۔ دیوان خاص و دیوان عام میں سے گھنٹیں چھی گئی ہیں۔ میں نے اُن کو حکم دیا تھا کہ وہ شہر سے باہر جا کر مقیم ہوں اور کوئی پیدل اور سوار شہر میں ہتھیار باندھ کر نہ پھرے اور شہر کے باشندوں پر زیادتی نہ کرے مگر ایک رجمنٹ دہلی دروازہ میں اور دوسری اجمیری دروازہ میں اور تیسری لاہوری دروازہ میں شہر میں فصیل کے اندر رہتی ہیں۔ اور بعض بازاروں کو انہوں نے بالکل لوٹ لیا ہے۔ مدارات کا خیال کریں نہ دن کا۔ وہ لوگوں کے گھروں میں یہ بہانہ بنا کر کہ گھر میں کوئی فرنگی ہے گھس کر لوٹ لیتے ہیں۔ دکانوں کے قفل توڑتے ہیں، کواڑ نکال لیتے ہیں اور اُن کے اندر کا اسباب بے حجاب لوٹتے ہیں۔ وہ سواروں کے گھوڑے کھول لے جاتے ہیں۔ باوجودیکہ یہ دستور چلا آتا ہے کہ جو شہر حملے و تیغ زنی سے پہلے لئے جاتے ہیں، وہ لوٹ مار سے بری کئے جاتے ہیں۔ مگر اس پر وہ کچھ خیال نہیں کرتے۔ چنگیز خاں و نادر شاہ بھی جو بڑے ظالم مشہور ہیں۔ وہ شہروں کو پناہ و امن دیتے تھے جو اپنے تئیں بغیر مقابلہ کے اُن کو سپرد کر دیتے تھے۔ اس کے علاوہ سپاہی میرے ملازموں اور اہل شہر کو ڈراتے دھمکاتے ہیں۔ باوجودیکہ میں نے پیدلوں کو فراش خانہ کے اور سواروں کو مہتاب باغ خالی کرنے کا بار بار حکم دیا ہے، مگر وہ خالی نہیں کرتے، یہ وہ مقامات ہیں جن میں نہ نادر شاہ، نہ احمد شاہ اور نہ کوئی گورنر جنرل ہند گھوڑے پر سوار ہو کر اب تک آیا تھا۔ سپاہ نے اوّل درخواست کی کہ شہزادے اُن کے افسر اعلیٰ مقرر ہوں۔ ہم سب ان کی فرماں برداری و اطاعت کریں گے۔ یہ کام اُن کی مرضی کے موافق کیا گیا۔ پھر انہوں نے اس بات پر زور ڈالا کہ اس میں ہمارا اعتبار بڑھ جائے گا، اگر ان شہزادوں کو اُن کے عہدوں کے خلعت مرحمت ہوں۔ جس سے وہ مستقل ہمارے حاکم معلوم ہوں اور تمام قیدی فرنگی ایک ہی دفعہ مارے جائیں۔ یہ کام بھی اُن کی مرضی کے موافق کیا گیا، اور اسی دن اشتہار عام دیا گیا، جس پر مہر شاہی لگی ہوئی تھی کہ شہر میں عدالت کی کچہریاں مقرر کی گئیں لیکن اہل شہر پر اُن کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ ان باتوں سے قطع نظر یہ لکھا جاتا ہے کہ جب برٹش گورنمنٹ کا کوئی اعلیٰ افسر قلعہ میں آتا تھا تو وہ دیوان عام کے دروازہ پر گھوڑے سے اُترتا تھا اور پیدل پھرتا تھا۔ لیکن یہ سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے دیوان خاص اور جلو خانے تک آتے ہیں۔ جن کا لباس نامناسب ہوتا ہے۔ سر پر دستار نہیں ہوتی۔ وہ شاہی آداب کو بجالانا جانتے نہیں۔ دربار میں سپاہ کے افسر اپنے لباس کی پرواہ نہیں کرتے۔ سروں پر ٹوپیاں بجائے پگڑی کے ہوتی ہیں۔ انگریزی عملداری میں اس کے

کسی افسر نے ایسا نہیں کیا۔

انہوں نے بے فائدہ میگزین کے کل اسباب کو خرچ کیا اور خزانہ کے روپیہ کو اڑا دیا۔ سب بڑا غل مچا مچا کے اپنا روزینہ اتنے آدمیوں کا، جتنے وہ ہیں نہیں، مانگتے ہیں۔ پھر دکان داروں پر طرح طرح کے ظلم کرتے ہیں اُن سے اجناس لے لیتے ہیں اور قیمت دیتے نہیں۔ اب شہر کے باہر کا یہ حال ہے کہ سپاہی شہر سے باہر انتظام کرنے کے لئے تو جاتے نہیں اس لئے سینکڑوں آدمی مارے جاتے ہیں اور ہزاروں آدمی لوٹے جاتے ہیں۔ ملک کے نظم ونسق کی صورت یہ ہے کہ شاہی سپاہ کافی نہیں، کہ وہ کل اضلاع کے بندوبست کو سنبھالے تحصیل دار اور پولیس افسر مقرر نہیں ہو سکتے۔ قلعہ وشہر سے باہر نہ کوئی پیدل، نہ کوئی سوار باہر قدم رکھتا ہے کہ انتظام ہو۔ ایسی حالتوں میں رسد کا آنا اور مال گزاری کا وصول ہونا سخت مصیبت ہے۔ ان سب حالتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ شہر اور ملک کے بالکل تباہ وغارت ہونے کے سوا کچھ اور اُمید نہ ہو سکے۔ ان باتوں پر یہ اور طرہ ہے کہ وہ بادشاہی ملازموں پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ ہمارے مخالف ہیں اور اپنا روزینہ اُن سے بڑی حکومت سے گستاخانہ مانگتے ہیں۔ میرے حکم کے موافق میرے یہ ملازم ان سے بہ لجاجت و خوشامد و بہ منت پیش آتے ہیں۔ مگر اس پر بھی وہ راضی نہیں ہوتے۔ ایسی صورتوں میں کب اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ یہ سپاہی ملک کی صلاح وفلاح چاہتے ہیں یا حکومت شاہی کی اطاعت کے خواستگار ہیں۔

اب ایک اور بات خیال کرنے کی ہے کہ خزانہ میں تو روپیہ نہیں ہے۔ شہر کے مہاجن وسوداگروں میں لٹ جانے اور تباہ ہونے کے سبب سے استطاعت نہیں رہی کہ وہ روپیہ قرض دیں۔ بس کس طرح سے اُن کو کسی وقت تک روزینہ تقسیم ہو سکتا ہے؟ جب اُن کا یہ روزینہ بند ہو جائے اور ملک سے جو رسد آتی تھی بند ہو جائے گی تو کیا حالت ہوگی۔ پھر تماشا یہ ہے کہ سپاہی خود یہ کرتوت کرتے ہیں جس سے ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور اس کا الزام ملازمان شاہی پر لگاتے ہیں۔ ''اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے''۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب سپاہ کا یہ حال ہو، تو ظاہر ہے کہ میری پادشاہی بالکل غارت وتباہ ہو جائے گی۔ میری بے کسی وبے چارگی کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ میں نے عہد کر لیا ہے، کہ اپنی باقی زندگی یاد الٰہی میں بسر کروں اور بادشاہی کو سلام کروں جس میں سراسر تکالیف ومصائب ہیں۔ اوّل خواجہ صاحب کے درگاہ میں جاؤں اور وہاں سے اپنا انتظام کر کے مکہ چلا جاؤں۔ یہ بھی خیال کرنا چاہیے کہ جب سپاہ آئی تو بادشاہی ملازموں نے اور اہل شہر نے اُن کا کسی طرح کا مقابلہ نہیں کیا۔ نہ کوئی کام دشمنی کا اُن کے ساتھ کیا۔ اس لئے اہل شہر مستحق نہیں ہیں کہ اُن کی جان

و مال عزت و مال و اسباب تلف ہوں۔ میں اپنی رعایا کی طرف سے قائم مقام ہو کر سپاہ کو سمجھتا ہوں کہ پھر کیوں ہم ان کے کام میں شریک ہوں۔ اپنی اولاد کو ان کے کاموں میں شریک و معاون بنائیں۔ جو ظلم و تعدی و جبر و جور ہو رہا ہے، اس کو میں اپنی بادشاہی کی کسر شان سمجھتا ہوں کہ بادشاہ ہو کر سپاہ کا رفیق بنوں، اور ان کے قتل و غارت کرنے کو پسند کروں یہ بات سوچنے کی ہے کہ ایک طرف بادشاہ اور رعیت کے مابین محبت و دوستی و نیک خواہی ہو، دوسری طرف سپاہ کے ایسے افعال ہوں کہ وہ اپنے کاموں کو جو دشمن کی سپاہ بھی نہیں کرتی، اپنی نیک کرداری جانے۔ سپاہ کیلئے قابل تعریف یہ ہوشیاری و دانائی کا کام سزاوار تھا کہ وہ رعایا کی پرورش اور محافظت کرتی اور سازمان شاہی کے ساتھ یگانگی قائم رکھتی ہے اور اپنے تئیں بادشاہ کے دل پسند بنانے کے لئے غور کرتی۔ ہم کو توقع تھی کہ اگر وہ اس طرح عمل کرتی تو امن و امان رہتا۔

میرے فرزند تم پیدل اور سواروں کے افسروں کو بلا کر اُن کے سامنے ان باتوں کو خوب توضیح کے ساتھ بیان کر دو۔ اگر وہ حقیقت میں میری سلطنت کی خدمت کرنی چاہتے ہیں تو ایک تحریری اقرار نامہ لکھیں جس کا مسودہ اُن کے پاس بھیجا جائے گا، اور ان کی دلجمعی کے لئے ہم بھی ایک تحریری اقرار نامہ لکھ دیں گے۔ اُن کو چاہیے کہ وہ اپنے جبر و تعدی و ظلم و ستم و ناسزا کاموں کو چھوڑ دیں جو اب تک کر رہے ہیں اور آج ہی پیدل سپاہ اپنے خیموں کو شہر سے باہر لے جائے۔ اگر کوئی سپاہی کسی باشندہ کو قتل کرے گا یا لوٹے گا، تو جرم ثابت ہونے کے بعد اس کو مناسب سزا دی جائے گی تاکہ اور آدمیوں کو عبرت ہو، اور وہ جانیں کہ ایسے برے کاموں کے کرنے سے سزا پانی سے وہ بچ نہیں سکتے اور ایک رجمنٹ کو یا کئی رجمنٹوں کو احکام شاہی دیئے جائیں کہ وہ جا کر ملک میں سے فسادوں کو دور کریں اور سینہ زوری کے ساتھ میگزین اور سامان رسد کی نامعقول درخواستیں نہ کریں۔ یہ رجمنٹیں اس حالت میں مراجعت کرنے کا اختیار رکھتی ہیں جب یہ امر تحقیق ہو جائے کہ انگریزی سپاہ قریب آ گئی ہے تو پھر وہ جس ترتیب و انتظام سے لڑنا چاہیں لڑیں۔ سپاہ اس امر کا فیصلہ کرے کہ کس قدر سپاہ جداگانہ مختلف مقامات میں رکھنی اور اُن کی تقسیم کس طرح ہو۔ شہر میں بھی سپاہ کے رہنے کی ضرورت ہوگی۔ لیکن بالفعل ضرورت نہیں ہے۔ شہر و ملک دونوں یکساں غارت و تباہ ہو رہے ہیں اور سپاہ شہر سے باہر نکل کر ذرا بندوبست نہیں کرتی۔ یہ ایک اور بات اُن کے سامنے اچھی طرح بیان کر دو، کہ اگر وہ بادشاہ کی ان خواہشوں اور ارادہ کے بر لانے میں خوشی و رضامندی سے سعی نہ کرے گی، تو ہم فقیر ہو کر خواجہ صاحب میں جا بیٹھیں گے ہمیں کوئی اس کام کے کرنے میں روکے نہیں۔ وہ شہر و قلعہ و ملک کے خود مالک ہو بیٹھیں۔ قدیم زمانہ کے بادشاہوں میں سے کسی نے نہ جنگ آزماؤں میں سے جو اُن کے بعد آئے، کسی نے اس زمانہ

تک اس شخص پر حملہ کیا ہے، جس نے ان سے پناہ مانگی اور امن چاہا ہو۔ انہوں نے اس کو آزادانہ اختیار دیا کہ وہ اپنا طریقہ اختیار کرے۔ تم سپاہ سے کہو کہ اوپر جو دو باتیں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے وہ ایک بات اختیار کر کے اپنی عرضی بیان کر دیں، اور اس پر افسر اپنے دستخط و مہریں کریں۔ اور وہ عرضی ہمارے پاس بھیج دو۔ تم اس بات کو خفیف معاملہ نہ جانو۔ پیرانہ سالی و ضعف جوانی کے سبب سے ہمیں ان افکار کا بار نہیں اٹھ سکتا۔ کسی قوم پر سلطنت کرنی اور سپاہ کو قابو میں رکھنا لڑکوں کا کھیل نہیں ہے''۔

ذبیحہ گاؤ

ذبیحہ گاؤ کے بارے میں مغل بادشاہوں کی پالیسی عموماً نرم رہی ہے۔ مغل بادشاہ اپنے آپ کو ہندو مسلمانوں کا مشترک بادشاہ مانا کرتے تھے۔ مذہبی تقریبات میں بھی اس اشتراک کا لحاظ رکھا کرتے تھے۔ اسی بنا پر بقرعید کو اونٹ کی قربانی سے اس فرض کی ادائیگی ہوا کرتی تھی۔ اس سال یکم اگست کو مسلمانوں کی بقرعید اور ہندوؤں کی دوج تھی۔ ہندو اور مسلمان دونوں اپنے اپنے متبرک دنوں کی برکتوں سے کامیابی مقصد کا فائدہ حاصل کرنا چاہ رہے تھے۔ چنانچہ

''برہمنوں اور مسلمانوں نے فتح کی دعائیں مانگیں اور بڑے جوش و خروش سے جلسے کئے۔ (۱۱۶)

اس اشتراک و تعاون اور یک جہتی کے موقع پر قربانی گاؤ کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ چنانچہ دنبوں اور بکریوں کی قربانی کی گئی، اور بادشاہ نے حسب معمول اونٹ کی قربانی کی۔ (۱۱۷)

یہ ہے واقعہ جس کو شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب نے متعدد بار مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ہر ایک پیرایہ میں انگریزی چشم تیلنگوں کا رنگ نمایاں ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش ۔۔۔ من انداز قدت را می شناسم

ایک جگہ ارشاد ہے: (لب و لہجہ ملاحظہ ہو)

''بادشاہ عید کو عیدگاہ میں جا کے نماز پڑھتا تھا اور اونٹ کی قربانی کرتا تھا۔ مگر آج اگر وہ وہاں جاتا تو خود اس کی قربانی ہوتی (کیونکہ یہاں انگریزوں نے ایک مورچہ بنا رکھا تھا)۔ تلنگوں نے مسلمانوں کو گائے کی قربانی نہیں کرنے دی۔ ان کو سمجھایا کہ گائے کے بجائے فرنگیوں کی قربانی کرو۔ مگر ان کی قربانی کرنے میں تو اپنی قربانی ہوتی تھی''۔ (۱۱۸) الخ

دوسرے موقع پر ارشاد ہے:

''مولوی صاحب (مولانا فضل حق خیرآبادی) نے بادشاہ کے لئے ایک دستور العمل سلطنت کا لکھا تھا۔ جس کی دفعہ اول یہ مشہور ہوئی تھی کہ گائے کہیں بادشاہی عملداری میں ذبح نہ ہو۔ (۱۱۹)

ایک اور جگہ پوری رنگ آمیزی کے ساتھ تحریر ہے اور اس میں بادشاہ کو مجبور ثابت کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ (۱۴۰)

اوّل حکم بادشاہ کا جو صادر ہوا، وہ یہ تھا کہ گائے ذبح نہیں کی جائے گی ۹؍ جولائی کو ڈھنڈورا پٹوایا کہ جو گائے ذبح کرے گا، وہ توپ کے منہ اڑایا جائے گا۔ بقرعید کو گائے کی قربانی منع کی گئی (۱۴۱)
اگر بادشاہ کو اختیار ہوتا تو وہ کیوں ہندو راجہ جیسے احکام دیتا، مگر تلنگوں کے ہاتھ سے وہ مجبور تھا۔ جو اس نے اپنی مرضی اور مذہب کے خلاف یہ حکم دیئے۔ (۱۴۲)
گائے قصاب چار مہینے تک اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے رہے اگر باہر نکلتے تو تلنگے ان کو اسی طرح ذبح کرتے تھے، جیسے وہ گائے کو ذبح کرتے تھے۔ پانچ چار مسلمان قصائی، ہندو قصائی کے ہاتھ سے ذبح ہوئے۔
پھر تلنگوں نے دوسرا حکم بادشاہ سے صادر کرایا کہ شہر کے ڈلاؤ اور کوڑا جو بیلوں پر لاد کر شہر سے باہر کھیتوں میں ڈالنے کے لئے جاتا ہے، وہ گدھوں پر لاد کر جایا کرے۔ بھنگیوں کے ہاتھ جب تک گدھے تھے، شہر میں ڈلاؤ کے ڈھیر لگے۔ مگر بہت دن نہیں لگے کہ حلال خوروں نے اپنے بیل بیچ کر گدھے مول لے لئے۔ پھر کبھی ایامِ غدر میں بیلوں کی پیٹھ پر ڈلاؤ لدا ہوا دیکھنے میں نہیں آیا۔
مسلمانوں کو یہ بادشاہی احکام ناگوار گزرے اور انہوں نے کہا یہ اسلام کی بادشاہی نہیں، یہ تو ہندوؤں کا راج ہے۔ لچے، شہدے، ذلیل مسلمانوں نے ایک دفعہ اپنا محمدی جھنڈا ہندوؤں پر جہاد کے لئے لگایا۔ دوسری دفعہ مولوی محمد سعید نے جامع مسجد میں یہ جھنڈا کھڑا کیا۔ تو بادشاہ نے اُن سے کہا۔ یہ کس کے لئے ہے، انگریز تو شہر میں باقی نہیں تو انہوں نے کہا کہ ہندوؤں کے لئے لگایا گیا ہے۔ بادشاہ نے اُن کو یہ سمجھا کر اس جھنڈے کو اکھڑوا دیا کہ سارے تلنگے ہندو (۱۴۳) ہیں، اُن سے بے چارے مسلمان کیا لڑیں گے۔

بادشاہ کی شخصیت وعظمت

ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات بادشاہ سے

ارادت وعقیدت یا مخالفت ۔ خاندان تیمور کے متعلق ہندوستانیوں کی رائے ۔

۱۸۸۷ء کی داستان میں بادشاہ کی شخصیت کا عنوان بھی بہت دلچسپ ہے ۔ اس عنوان کے ذیل میں متعدد تاریخی حقیقتیں سامنے آسکتی ہیں ۔ اس لئے اس موضوع پر بھی سیر حاصل بحث بہت ضروری ہے ۔

سر سید اور شمس العلماء ذکاء اللہ خاں کی رائے

سر سید احمد صاحب کو بادشاہ سے اختلاف ہے ۔ وہ ان کا تذکرہ کرتے وقت اپنے قابو میں نہیں رہتے ۔ زیادہ سے زیادہ رکیک الفاظ استعمال کرتے ہیں ۔ بادشاہ کے متعلق اُن کی رائے ملاحظہ فرمایئے ۔

'' دلی کے معزول بادشاہ کا یہ حال تھا کہ اگر اس سے کہا جاتا کہ پرستان میں جنوں کا بادشاہ آپ کا تابعدار ہے، تو وہ اس کو سچ سمجھتا اور ایک چھوڑ دس فرمان لکھ دیتا ۔

دلی کا معزول (بادشاہ) کہا کرتا تھا کہ میں مکھی اور مچھر بن کر اُڑ جاتا ہوں، اور لوگوں کی اور ملکوں کی خبر لے آتا ہوں، اور اس بات کو وہ اپنے خیال میں سچ سمجھتا تھا، اور درباریوں سے تصدیق چاہتا تھا اور سب تصدیق کرتے تھے ۔ '' (۱۴۴)

پھر ارشاد ہے :

'' دلی کے معزول بادشاہ کی سلطنت کا کوئی بھی آرزومند نہ تھا ۔ اس خاندان کی لغو اور بے ہودہ حرکات نے سب کی آنکھوں میں اس کی قدر و منزلت گرادی تھی ۔ ہاں بیرونجات کے لوگ جو بادشاہ کے حالات اور حرکات اور اقتدار و اختیار سے واقف نہ تھے ، بلاشبہ بادشاہ کی بڑی قدر رکھتے تھے اور اس کو ہندوستان کا بادشاہ اور آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتظم ہندوستان جانتے تھے ۔ الا خاص دلی کے اور اس کے قرب وجوار کے رہنے والے بادشاہ کی کچھ بھی وقعت خیال میں نہ لاتے تھے ۔ باوجود ان سب باتوں کے ہندوستان کے سب آدمیوں کو بادشاہ کے معدوم ہونے سے کچھ بھی رنج نہ تھا ۔ '' (۱۴۵)

اس کے بعد تحریر ہے :

'' دلی میں ایک بڑا گروہ مولویوں کا اور اُن کے تابعین کا ایسا تھا کہ وہ مذہب کی رو سے معزول بادشاہ کو دلی کا بہت برا آدمی اور بدعتی سمجھتے تھے ۔ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ دلی کی جن مسجدوں میں

بادشاہ کا قبض و دخل اور اہتمام ہے، اُن مسجدوں میں نماز درست نہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جامع مسجد میں نماز نہیں پڑھتے تھے۔ اور غدر سے بہت قبل کے چھپے ہوئے فتوے اس معاملہ میں موجود ہیں" (۱۲٦)

شمس العلماء ذکاء اللہ خاں کا ارشاد ہے:

"دہلی کے مولوی اور اکثر مسلمان خاندان تیمور کو ایسا خولہ خبط جانتے تھے کہ وہ ناممکن سمجھتے تھے کہ اس خاندان کی بادشاہی ہندوستان میں ہو۔ مگر اس کے ساتھ جاہل مسلمانوں کا یہ یقین تھا کہ انگریزی سلطنت کے بدن میں یہ ایسا پھوڑا نکلا ہے کہ وہ جانبر نہیں ہوگی"۔ (۱۲۷)

دوسرے موقع پر تحریر ہے:

"دلی میں وہابی مولویوں کا گروہ بہادر شاہ کو بڑا بدعتی جانتا تھا اور ان مسجدوں میں نماز پڑھنے کو جائز نہیں سمجھتا تھا جن میں بادشاہ کی طرف سے امام مقرر ہوتا اور اُن کا اہتمام ہوتا"۔

"بادشاہ کا میلان شیعہ مذہب کی طرف دیکھ کر وہ اس سے زیادہ متنفر ہوتے"۔

جملہ معترضہ

ان اقتباسات سے نتیجہ اخذ کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس زمانہ کی اصطلاح میں وہابی کا مطلب تھا "پابند شریعت"

خود شمس العلماء شاہزادہ مرزا فخر الدین کے تذکرہ میں فرماتے ہیں:

"مرزا فخر الدین اپنے مذہب کا بڑا پابند تھا۔ اُس نے اپنا ختنہ (۱۲۸) کرایا تھا۔ شہزادے اس کو متشرع ہونے کی وجہ سے وہابی کہتے تھے"۔ (۱۲۹)

بادشاہ کی وجہ سے علماء میں اختلاف

سر سید مرحوم اور شمس العلماء نے بہادر شاہ بادشاہ کے متعلق جو شہادتیں پیش کی ہیں۔ اُن کے متعلق مبالغہ آمیزی کا فیصلہ تو کیا جا سکتا ہے مگر اُن کو سرے سے غلط اور بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ اور خاندان تیموریہ کے انہیں اطوار کے سبب سے اس جنگ آزادی کے بارے میں بھی ایک گونہ اختلاف ہو گیا تھا۔

اوّل تو خود ملوکیت علماء کرام کے لئے ناقابل برداشت تھی، پھر ایسے خاندان کی ملوکیت جس کی حالت یہ ہو کہ:

"دہلی میں خاندان تیموریہ کی سبک اور نااہل حرکتوں کے سبب سے خواص کی نگاہ میں کچھ عزت باقی نہیں رہی تھی"۔ (۱۳۰)

"قلعہ جو بجائے خود شہر تھا سب قسم کی برائیوں کا گھر تھا۔ جس میں عورت مرد ایسی بدکاریاں کرتے تھے کہ وہ اپنے لئے اور اوروں کے لئے خدا کی طرف سے لعنت کا مستحق کرتے تھے۔ مشرق میں جس قدر برائیاں ہیں وہ سب اس قلعہ میں موجود تھیں۔ جن کا حساب سوا اللہ تعالیٰ اور

کوئی نہیں کر سکتا۔ شہر کے مقدس اور متبرک آدمی کہا کرتے تھے کہ اگر کسی مکان میں قلعہ کی اینٹ بھی لگ جائے تو اُس میں رہنا حرام ہے۔'' (۱۳۱)

جب یہ مقدس اور متبرک آدمی اپنے مکان کی کسی دیوار میں قلعہ کی ایک اینٹ کے روادار بھی نہیں تھے تو وہ اپنے اُوپر قلعہ کی حکومت کیسے برداشت کر سکتے تھے لیکن سیاسی نقطۂ نظر سے ایک دوسری قباحت بھی اس موقع پر درپیش تھی۔ جس کی تفسیر یہ ہے کہ:

''عوام الناس اس کو (بہادر شاہ کو) اپنا بادشاہ جانتے تھے، اور کیوں نہ جانتے، جب ہر روز ڈنکہ کی چوٹ، ڈھنڈ وروں میں یہ سنتے تھے، کہ ''خلقت خدا کی اور ملک بادشاہ کا حکم سرکار کمپنی کا''۔ تو بادشاہ سے مراد بہادر شاہ ہی جانتے تھے۔ اُن کا ذہن کب اس پر پہنچتا تھا کہ انگلینڈ میں ہندوستان کا بادشاہ رہتا ہے''۔

''سارے ہندوستان کے شہروں میں اُس کے نام کا خطبہ عیدین، اور جمعہ کی نمازوں میں پڑھا جاتا تھا'' جب مجسٹریٹ ضلع ایسے احکام جاری کرتا۔ جس سے کوئی فریق ناراض ہو کر اپنے پیشہ اور کام کی ہڑتال کر ڈالتا، تو وہ گروہ جھروکوں میں ریتی میں بادشاہ کے آگے فریادی ہو کر جاتا۔

دھوبیوں، بھنگیوں و قصائیوں نے یہی کیا تھا کہ اپنے کاموں کو سب نے بند کر کے بادشاہ سے فریاد کر کے اپنی داد چاہی۔ دلی میں بہت سے آدمیوں کو قلعہ سے ایسا تعلق تھا کہ جب شاہِ دلی کی شان کے خلاف گورنمنٹ انگریزی کی کوئی حرکت دیکھتے تو بہت ناخوش ہوتے تھے۔ سر طامس مٹکاف صاحب کو بادشاہ فرزند ارجمند شفقتوں میں القاب لکھا کرتا تھا۔ جب اُن کے انتقال کے بعد ہاروے صاحب ''ایجنٹ ہو کر دلی میں آئے تو انہوں نے بادشاہ کو لکھ دیا کہ ہم کو آپ کا فرزند بننا منظور نہیں''۔

پہلے بادشاہ کی سواری کے جلوس کا یہ ادب کیا جاتا تھا کہ کوئی انگریز جلوس کی قطار کو کاٹ کر اپنی سواری میں نہیں جاتا تھا۔ مگر انگریز اب اس قاعدے کے پابند نہ تھے۔ ایسی باتوں کو دیکھ کر دلی کے مسلمان ناخوش ہوتے تھے کہ اُن کے بادشاہ کی کچھ عزت باقی نہیں رہی۔ (۱۳۲)

پچاس برس سے دہلی کی لال حویلی کا مالک انگریزوں کے تخمینہ میں ایک ''جھوٹی نقل'' اور خالی ''نمائشی سانگ'' باقی تھا۔ لیکن اس جھوٹی نقل اور خالی نمائشی سانگ اور نام نے، اپنا زندہ اثر سلاطین اور رعایا ہند پر کبھی موقوف نہیں کیا تھا۔ زمانہ حال تک ہندوستان کے مغل بادشاہوں کے نام کے سکے چلتے تھے، اور ہندوستان کے سلاطین خواہ مسلمان ہو یا ہندو ہوں، اپنے جانشینوں کے لئے برائے نام شاہی فرمان مانگتے تھے۔ اور ان کو سرکاری کمپنی کے فرمان سے زیادہ باوقعت و مستحکم جانتے تھے۔ گو دہلی کے بادشاہ کا افسانہ ہی باقی تھا۔ مگر یہ افسانہ ع

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

رعایا کے دلوں میں اور زبانوں پر یہ افسانہ بڑا معزز وظیفہ تھا۔ جس کو وہ جپا کرتی تھی"۔ (۱۳۳)

مختصر یہ کہ خاندان تیموریہ اور خود بہادر شاہ ظفر کی جملہ ناکاریوں اور نااہلیوں کے باوجود عام ہندوستانیوں کو حتیٰ کہ صاحب اقتدار نوابوں اور راجاؤں (سلاطین) کو اس خاندان سے ایک خاص تعلق تھا جو صرف محبت کی حد تک نہیں بلکہ مذہبی عقیدہ کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ کیونکہ مسلسل دو سو برس تک (از بابر تا اورنگ زیب عالمگیر) ایک ہی خاندان کی پرشوکت شاہنشاہیت کے سایہ میں کم و بیش دس نسلیں سکون و اطمینان اور خوش حالی کی زندگی گزار چکی تھیں اور اس بنا پر ہر آنے والی نسل کے دل و دماغ پر اس عقیدہ کا رنگ پوری طرح جم چکا تھا کہ ہندوستان میں بادشاہت کا حق صرف مغل خاندان کو ہے۔ وہی مالک ملک ہے اور اسی کو حق پہنچتا ہے کہ کسی کو حکومت و فرمان روائی کی سند عطا کرے۔ اسی عقیدہ کی پختگی کا یہ رعب تھا، کہ سو۱۰۰ سال، بلکہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۴ء) سے لے کر آج تک (ڈیڑھ سو سال تک) روز افزوں تنزل، پستی اور لاچارگی کے باوجود ایسٹ انڈیا کمپنی کے شاطر و چالاک خداوندان بست و کشاد کو لال حویلی (لال قلعہ) میں یہ تماشگی سانگ باقی رکھنا پڑا تھا۔

بیشک آج (۱۸۵۷ء) سے تقریباً تیس ۳۰ سال پہلے انہیں علماء کی جماعت (جن کو آج وہابی کہا جا رہا ہے) حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی زیر قیادت اس ملوکیت اور شاہنشاہیت سے دامن جھاڑ کر خلافت راشدہ کے نمونہ پر شمال مغربی سرحدی علاقہ میں ایک حکومت قائم کر چکی تھی، اور آج بھی انہیں علماء کرام کا ایک دستہ مغل شہنشاہیت اور برطانوی سامراج دونوں کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ لیکن جب خود "قلب ہندوستان" میں انقلاب کی شکل پیدا ہوگئی، اور کم از کم شمالی ہند کے چپہ چپہ سے اس کی حمایت کیلئے بے نظیر و بے پناہ جذبات اُبلنے لگے، مگر اس قدر قربانیاں پیش کی جانے لگیں، اور یہ سرزمین جو ایک مدت سے انگریزی مظالم کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی، اس کا ایک ایک ذرہ ان سفید فام درندوں کے خون کا پیاسا معلوم ہونے لگا تو اب قدرتی طور پر یہ سوال ہر ایک کے سامنے تھا کہ انگریزی سامراج بہتر ہے یا مغل بادشاہت؟

خاندان تیموراور مغل بادشاہ کا تعلق عام ہندوستان سے

یہ درست ہے کہ خاندان تیمور خود نہ صرف لاپرواہ اور اثر مزاج ہو گیا تھا۔ بادشاہ مذہبی عقائد میں بہت ڈھیلا، اوہام پرست، آرام طلب اور سادہ لوح تھا، لیکن رعایا پروری جو اس خاندان کی فطرت تھی، بہادر شاہ ظفر اس سے بیگانہ نہیں تھا۔ وہ ہندوستانی تھا، ہندو اور مسلمانوں کے مزاج سے واقف، ان کی دلچسپیوں میں برابر کا شریک اور تمام بے بسی اور لاچاری کے باوجود غریبوں اور زیردستوں کا ہمدرد۔ اس کی ہمدردیوں کے بہت سے قصے آج تک مشہور ہیں۔ مثلاً

''سرکار انگریزی نے گھوسیوں کو حکم فرمایا کہ تم اپنی گائیں بھینسیں لے کر شہر سے نکلو، اور بیرون شہر پناہ جا کر آباد ہو۔ تمام شہر میں غلغلہ برپا ہوگیا۔ تمام گھوسی اپنے بال بچوں اور مویشی کو لے کر ریتی[۱۳۴] میں آپڑے اب یہ حال ہوا کہ ادھر تو مویشی حیران، پریشان، گھبرائے ہوئے، اُدھر فریادیوں کے بال بچوں کی گریہ زاری کی یہ پکار۔ یہ حال دیکھتے ہی بادشاہ رعیت پناہ کو کہاں تاب تھی۔ بمجرد سننے زارنالے اُن غریبوں کے، حکم دیا کہ ہمارا ڈیرہ خیمہ بھی ریتی میں سب دریاء جمن، ان کے برابر لگا دو۔ اور جو حال رعیت کا وہ ہمارا۔ شاگرد پیشگان نے بمجرد اصدار حکم بارگاہِ سلطانی لے جا کر لب دریا ایستادہ کر دیئے۔ یہ خبر صاحب ریزیڈنٹ بہادر کو ہوئی۔ وہ خبر سنتے ہی بادشاہ کی خدمت میں دوڑے ہوئے آئے اور حضور میں عرض کی کہ حضور یہ کیا کرتے ہیں۔ حضور کے ہمراہ تمام رعیت شہر سے نکل کھڑی ہوگی۔ بادشاہ سلامت: بھئی جہاں میری رعیت وہاں میں۔ رعیت میرے بال بچے ہیں، میں اُن کو کیونکر اپنے سے جدا کردوں۔ کہیں گوشت سے ناخن جدا ہوتے ہیں۔ آج تو گھوسیوں کو شہر بدر کرنے کا حکم ہوا ہے، کل کو کسی اور قوم کو ہوگا، پرسوں کسی اور قوم کے واسطے حکم جاری کیا جاوے گا۔ رفتہ رفتہ سب شہر خالی کرالیا جائے گا۔ اگر تم صاحبوں کو شہر خالی کرانا منظور ہے، تو صاف مجھ سے کہہ دو۔ میں شہر کی رعیت کو ہمراہ لے کر خواجہ صاحب میں جا بیٹھتا ہوں۔ شہر کا تم کو اختیار ہے جو چاہے وہ حال کرو۔

صاحب ریزیڈنٹ بہادر: حضور ہرگز ہرگز ایسا خیال نہ فرمائیں ابھی وقت ان فریادیوں کی دادرسی کرتا ہوں، اور سب کو شہر میں آباد کیے دیتا ہوں۔ حضور اپنا ڈیرہ خیمہ اٹھوا منگوائیں۔ چنانچہ فوراً گھوسیوں کو اپنے گھروں میں بسنے کی اجازت دے دی گئی اور سابق حکم منسوخ کر دیا گیا۔[۱۳۵]

ایک مرتبہ قصائیوں کے متعلق سرکاری حکم جاری ہوا کہ وہ اپنی دکانیں شہر سے باہر لے جائیں۔ اُنہوں نے فریاد کی یہی صورت اختیار کی۔ ریتی پر اپنے گھربار کو لے کر پہنچ گئے، اور بادشاہ کی دہائی دینی شروع کر دی۔ بادشاہ سلامت نے اب بھی اپنا خیمہ ریتی میں بھجوا دیا۔ جب ریزیڈنٹ کو خبر ہوئی تو وہ آیا۔ بادشاہ کی خوشامد کی اور اپنا حکم منسوخ کیا۔[۱۳۶]

بادشاہ سلامت نے ریزیڈنٹ سے گفتگو کرتے ہوئے ایک درد انگیز عبرت آموز جملہ یہ بھی فرمایا:

''دیکھو ابھی تم میری موجودگی میں رعیت کو گھر سے بے گھر نہ کرو اور بعد میرے تم کو اختیار ہے، دلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا''۔

اس کے بعد ظہیر دہلوی کا تاثر بھی ملاحظہ فرمایئے۔ وہ بھی رقت انگیز ہے۔ ظہیر صاحب فرماتے ہیں:

''چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا۔ کابلی دروازہ سے لے کر قلعہ تک، اور دریبہ سے لے کر قلعہ تک اور جامع مسجد سے لے کر دلی دروازہ تک، بلاقی بیگم کا کوچہ، خانم بازار، خاص بازار، خاں

دوران خاں کی حویلی سے دریا گنج تک ہزار ہا مکانات منہدم اور مسمار کر کے دلی کا چبوترہ بنا دیا گیا، اور چٹیل میدان کر دیا گیا''۔(۱۴۷)

اس تمام شرح وبسط کے بعد پھر اصل موضوع کی طرف رجوع فرمائیے۔ ارباب فکر اور اصحاب بصیرت علماء کے سامنے:

❶ ایک طرف مسئلہ ملوکیت کا تھا کہ کیا اس کو زندہ کیا جائے اور شاہیت کو برقرار رکھا جائے۔

❷ دوسری طرف انگریزی سامراج کا عفریت تھا۔

❸ ہندوستانی عوام اور خواص کی مغل بادشاہ سے عقیدت۔

❹ مغل بادشاہ کی وہ شفقت جس نے رعایا کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

❺ مغل بادشاہ اور رعایا کا ایسا تعلق کہ رعایا یعنی ہندوستانی بادشاہ کو اپنا سمجھتے تھے، اس کے اقتدار کو اپنا اقتدار، اور اس کی حکومت کو اپنے ملک کی حکومت سمجھتے تھے۔

ان تمام حالات کا لحاظ کرتے ہوئے عام علماء کرام اور حریت نواز ارباب فکر نے مغل خاندان، مغل بادشاہ اور ملوکیت وشاہنشاہیت کی قباحتوں کو نظر انداز کیا اور یہی ضروری سمجھا کہ موقع سے فائدہ اٹھا کر وطن عزیز کو اجنبی عنصر سے پاک کر لیا جائے۔ لیکن کچھ علماء پھر بھی ایسے رہے کہ جو ملوکیت سے انتہائی نفرت کی بنا پر یا اس بناء پر کہ اُن کو کامیابی کی توقع نہیں تھی، اس تحریک سے علیحدہ رہے اور انہوں نے خاموشی(۱۴۱) کو بہتر جانا۔

پس منظر کی مذکورہ بالا وضاحت کے بعد اس مناسبت سے کہ یہ کتاب علماء ہند کے شاندار ماضی کی چوتھی جلد ہے ایک ایسے انقلابی عالم کے چند فقرے ملاحظہ فرمالیجئے جو اپنے اعلیٰ فکر ودانش کے ساتھ اس دور کے حالات کا سب سے بڑا واقف اور ماہر تھا۔ یہ مجاہد جلیل حضرت مولانا عبید اللہ سندھی قدس اللہ سرہ العزیز کی واجب التعظیم شخصیت ہے۔ جس کی تحقیق یہ ہے:

''الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق دہلویؒ کی نئی تنظیم پر پورے(۱۴۹) تیس برس نہیں گزرے تھے کہ دہلی کے آخری بادشاہ کی انگریزی کمپنی سے لڑائی ہوگئی۔

(الف) سلطان دہلی اگرچہ بظاہر ایک وظیفہ خوار رئیس کی صورت میں نظر آتا تھا۔ مگر عام لوگوں کی نظروں میں وہ ابھی تک سارے ہندوستان کا موروثی سلطان مانا جاتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی بھی چونکہ اسی کے نام سے عوام پر حکومت کرتی تھی۔ چنانچہ ڈھنڈورے میں کہا جاتا تھا ''خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا''۔ اس لئے عوام الناس کی رائے اُسے ملک کا حقیقی مالک ماننے میں تامل نہیں کرتی تھی۔

(ب) اس داہیہ کبریٰ میں مولانا محمد اسحاق کی نئی جماعت پھر دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ الصدر الحمید (مولانا محمد اسحاقؒ) نے جس طائفہ کو نئی تنظیم میں مرکزی اختیارات دیئے تھے وہ طائفہ تو

سلطان دہلی کا طرف دار ہو گیا، اور سلطانی تحریک کی شکست کے بعد مولانا محمد اسحاق کی طرح حجاز پہنچ گیا۔ چنانچہ امیر امداد اللہ اور مولانا عبد الغنی، مولانا محمد یعقوب دہلوی کے ساتھ حجاز میں بیٹھ کر اپنی ہندوستانی تنظیمات کی رہنمائی کرتے رہے۔ اسکے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا محمد اسحاق کے متبعین کی پہلی صف میں سے علماء اور صوفیہ کا کثیر (۱۴۰) حصہ سلطان دہلی کی لڑائی میں غیر جانب دار (۱۴۱) بن گیا۔ اس کا حاصل یہ سمجھنا چاہیے کہ الصدر الحمید (مولانا محمد اسحاق) کی تنظیم کے بالمقابل اگرچہ پٹنہ (۱۴۲) میں پارٹی قائم ہو چکی تھی، تو اب خود صدر الحمید کے اپنے فرقہ میں سے ایک مخالف جماعت دہلی میں بھی پیدا ہو گئی۔ مولانا سید نظیر حسین دہلوی اور مولانا شیخ محمد تھانوی اس دوسری جماعت کے مشہور بزرگوں میں سے ہیں۔ (۱۴۳)

محاذ جنگ اور طاقتوں کا موازنہ

انگریزوں کی تیاری۔ اقدام۔ بہتر مواقع۔ امداد و تعاون کی راہیں

دہلی کا شہری ذوق۔ شہر دہلی محاذ جنگ کے لحاظ سے

میرٹھ کا واقعہ دونوں کے حق میں اچانک تھا۔ انگریز رنگ رلیوں میں مست فتوحات کے نشہ میں چور تھے۔ اور مجاہدین حریت ۳۱ رمئی سے پہلے وفاداری کی نمائش کو شک وشبہ کے ہر ایک گرد سے پاک رکھنا چاہتے تھے۔ بس جس طرح اس ہنگامہ سے انقلابی جماعت کے لئے فائدہ اٹھانا مشکل تھا، ایسے ہی انگریز کے لئے فوری تدارک بھی ناممکن تھا۔

پھر جیسے جیسے میرٹھ اور دہلی کے ہنگامہ کی خبریں پھیلتی رہیں، جذبات کے ہیزم خشک میں بغاوت کے شعلے بھڑکاتی رہیں۔ اس نے ہر جگہ کے انگریزوں کو اور بھی زیادہ حواس باختہ بنا دیا۔ وہ باغیوں کی سرکوبی کیا کرتے، اُن کو خود اپنی جانوں کے لالے پڑ گئے اور ہر جگہ نفسی نفسی کا عالم برپا ہو گیا۔ دہلی میں کچھ افسر قتل ہو گئے۔ کچھ فرار ہوئے، باقی ماندہ فوج نے ایک پہاڑی کو اپنا مرکز بنا لیا۔

ترقیات کے سو سالہ نشیب و فراز نے اگرچہ اب اس پہاڑی کو دہلی کا ایک محلہ بنا دیا ہے مگر اس وقت دشوار گزار راستہ کی وجہ سے یہ پہاڑی ایک محفوظ مقام تھی۔ جنگی نقطۂ نظر سے اس کی بلندی ایک عظیم منفعت تھی جو انگریزوں کے لئے مخصوص ہو گئی تھی۔ اس پہاڑی پر نہ خنکی ہے نہ آب رواں کی شادابی۔ مگر دہلی کی سنگین عمارتیں جب مئی جون میں گرمی کی شدت، حبس اور گھٹن کا مظاہرہ بڑھ چڑھ کر کرتی ہیں تو یہ پہاڑی اس مظاہرہ میں شریک نہیں ہوتی۔ بلکہ اُس کی اونچی چٹانیں ہلکی ہلکی ہوا کے کچھ سانس سمیٹ لیتی ہیں جو اپنے مہمانوں کی خاطر مدارات میں صرف کر دیتی ہیں۔ یہ مہمان نواز پہاڑی، آخر تک سفید فام مہمانوں کی پوری مدارات کرتی رہی۔

بار بار ان مہمانوں کو یہاں سے نکالنے کی کوشش [۱۳۳] کی گئی۔ مگر اس کی چٹانیں، گرد اگرد گھنے درخت اور جھاڑیاں سینہ سپر ہو کر سامنے آتی رہیں۔ انتہا یہ کہ اسی پہاڑی سے فتح کا پرچم لہرایا گیا۔ انگریزی دور میں اس پہاڑی کا نام فتح گڑھ تھا، اور آزاد بھارت میں اس کو جیت گڑھ کہا جانے لگا ہے۔ اس طرح کی پہاڑیوں کا سلسلہ دہلی کے تین طرف تھا، اور اس ایک پہاڑی کے سہارے ان سب پہاڑیوں پر انگریزی فوجوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ جب ہنگامہ کا شباب تھا تو سبزی منڈی کی یہ پہاڑی جاسوسی کا کام بھی کر رہی تھی۔ کیونکہ اس کی بلندی سے وہ سب کچھ نظر آ جاتا تھا جو شہر میں ہوتا تھا۔ اب بھی جب اس پہاڑی کے اوپر سے گزر ہوتا ہے تو شہر کی پانچ اور چھ منزلہ عمارتیں بھی زیر پا نظر آتی ہیں۔ حالانکہ شہر کی عمارتیں اور شہر کی سڑکیں اس پہاڑی کی بہت سی اونچی اونچی چٹانوں کو اس سو سال کے اندر ہضم کر چکی ہیں۔

اس انقلاب کے لئے ۳۱ رمئی اس لئے طے کی گئی تھی کہ یہ موسم انگریزوں کے لئے بہت سخت ہوتا ہے۔ لیکن ابھی جدوجہد انقلاب ابتدائی منزلیں طے کر رہی تھی کہ کم از کم اس علاقہ میں معاملہ برعکس ہو گیا۔ کیونکہ برسات کی بارشوں میں یہ پہاڑی تو ہر دفعہ نہا دھو کر تازہ دم ہوتی رہی اور اپنا تمام پانی سیلاب بنا کر نشیبی حصوں میں پہنچاتی رہی جہاں بعض اوقات انقلابی فوجوں کے خیمے اور مورچے ہوتے تھے۔ یہ قدرتی ذرائع تھے جو دونوں متقابل فوجوں کے لئے شکست وفتح کے اسباب بن گئے تھے۔

اس کے علاوہ لفٹنٹ ڈیولی نے جس طرح بروقت اسلحہ خانہ اڑا کر دشمن کو بہت بڑے سامان جنگ سے محروم کر دیا تھا، اسی طرح تار گھر کے دو نوجوان سگنیلروں نے انبالہ تار بھیج کر انقلاب کے پہلے ہی لمحہ میں حکومت پنجاب اور اس کے ذریعہ مرکزی حکومت اور فوجی مرکزوں کے لئے جنگ کا بگل بجا دیا تھا۔ چنانچہ انگریزی فوجوں کے کمانڈر انچیف جنرل آنسن کو (جو شملہ میں مقیم تھا) فوراً ہی گورنر جنرل لارڈ کیننگ کی ہدایت پہنچ گئی کہ وہ دہلی پر حملہ آور ہوں۔

جنرل آنسن نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر پہلا کام یہ کیا کہ پٹیالہ، نابھہ اور جیند وغیرہ ریاستوں کی وفاداری کو پختہ کیا۔ ان سے فوجیں حاصل کیں، اور پھر کالی اور گوری فوجوں کے ساتھ دہلی کی طرف مارچ شروع کر دیا۔

حالات کی نامساعدت ان کے بھی دامن گیر تھی۔ چنانچہ جگہ جگہ رکاوٹیں پیش آئیں۔ خود جنرل آنسن کی سرگزشت یہ ہے کہ وہ ۲۵ رمئی ۱۸۵۷ء کو انبالہ سے روانہ ہوا۔ اور ابھی کرنال تک ہی پہنچا تھا کہ ۲۷ رمئی ۱۸۵۷ء کو ہیضے کا شکار ہو کر راہی ملک عدم ہوا۔ لیکن اس منتظم اور باضابطہ فوج کے لئے کمانڈروں کی کیا کمی تھی۔ فوراً ہی ہنری برنارڈ نے کمان سنبھال لی۔ راستہ میں کشت وخون کرتا ہوا دہلی پہنچا۔ لیکن حالات اس درجہ تلخ اور صبر آزما تھے کہ بہت جلد اس کے جسمانی ڈھانچہ کی ایک ایک چول ہل گئی اور ابھی ایک چلہ بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ ۵ جولائی کو ہیضے کی موت سے اس کا بھی بستر گول ہو گیا۔ اب تیسرے کمانڈر جنرل ریڈ نے کمان سنبھالی۔ لیکن اس دوران میں انقلابی فوجوں کے پے در پے حملے اتنے شدید رہے کہ استعفا دے کر ذمہ داری کا جوا اتار پھینکنے ہی

میں اُس نے اپنی کامیابی بھی۔ اب یہ وقت تھا کہ انگریزی فوج کی ہمتیں پست ہو رہی تھیں۔ مگر اسی فوج میں کچھ ایسے جانباز بھی تھے، جو شکست کے مقابلہ میں موت کو پسند کر رہے تھے۔ جنرل ولسن ایسا ہی بہادر کمانڈر تھا۔ جنرل ریڈ کے ہٹتے ہی اُس نے فوج کی کمان ہاتھ میں لی۔ کہا جاتا ہے، ہمت مرداں مدد خدا۔ قدرت نے اس کی ہمت کی مدد کی، اور فوراً ہی ایک اور کمانڈر دو ہزار فوج لے کر اس کی امداد کو پہنچا۔ اس کمانڈر کا نام "نکلسن" تھا، جو تنہا دو ہزار کے برابر مانا جاتا تھا۔ جس کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ اُس نے اپنے خون کی بھینٹ چڑھا کر دلی حاصل کی۔

اسی طرح جنرل ہڈسن انگریزی فوج کو میسر آ گیا جس کی تفریح گاہ میدان جنگ اور زخمیوں کی آہ و بکا جس کے لیے باعث سرور تھی۔ جس کی پیاس صرف خون کے گھونٹوں سے بجھتی تھی۔ جس نے نہ صرف نادر شاہ کی یاد کو تازہ کیا بلکہ اُس پر پانی پھیر دیا۔

اس کے علاوہ پٹیالہ، نابھہ وغیرہ ماوراء ستلج کی ریاستیں جو انگریز دوستی کا تاریخی پس منظر رکھتی تھیں، جنہوں نے رنجیت سنگھ کے زمانہ میں بھی متحدہ سکھ یونین کے مقابلہ میں انگریز دوستی کو ترجیح دی تھی۔ جن کی پرانی دوستی کو جنرل "آنسن" نے بغاوت کی خبر پاتے ہی از سر نو تازہ اور مضبوط کر لیا تھا۔ اس مصلحت اندیش دوستی نے نہ صرف انگریزی کی کمر مضبوط کر دی تھی بلکہ انگریزی فوجوں کو رسد وغیرہ کی ضرورتوں سے مستغنی کر کے اُن کے عقب کے ہر ایک خطرہ سے محفوظ کر دیا تھا۔ پنجاب کے اس زرخیز فوجی خطہ کی مخلصانہ امداد کے علاوہ فیض محمد خاں والی رامپور اور نواب بہادر خاں کی باہمی چشمک نے روہیلوں کو خانہ جنگی میں مبتلا کر کے انگریزوں کو وہ مدد پہنچائی کہ اتنی مدد جنرل بخت خاں، بہادر شاہ کو نہیں پہنچا سکا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی جو حکومت کے ساتھ مہاجنی کاروبار بھی کرتی چلی آتی تھی اس کے بھرپور خزانوں میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ تاہم زمینداروں اور ساہوکاروں نے جس طرح دل کھول کر اس کی امداد اس موقع پر کی، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ضلع بجنور کے صرف دو گاؤں سے مبلغ دس ہزار روپے انگریز دوستی کے نذر کر دیئے گئے۔ جبکہ انقلابی فوجوں کی مالی امداد کسی اور طرف سے تو کیا ہوتی، خود انقلابی فوجیں جو روپیہ سرکاری خزانوں کو ضبط کر کے قبضہ میں لایا کرتی تھیں، وہ بھی صحیح مصرف میں صرف نہیں ہوتا تھا۔

انقلابی محاذ اور دہلی کا شہری مزاج

انگریزی محاذ کی مختصر کیفیت یہ تھی۔ اس کے بالمقابل میرٹھ کی جلد باز فوج جس شخصیت کے گرد جمع ہوئی تھی، وہ عظمت ہندوستان، ہمدردی خلق اور تاریخ رعایا پروری کی ایک تصویر ضرور تھی۔ مگر حسرت زدہ، عزم و ہمت سے خالی، تجربہ سے تہی دامن، مزید براں پیرانہ سالی نے حوصلوں اور ولولوں کی رہی سہی دیواروں کو بھی ہلا ڈالا تھا۔

دہلی، جس کو انقلاب کا مرکز بننا پڑا تھا۔ قرون وسطیٰ کے سب سے زیادہ خوش حال بادشاہ، شاہجہاں کا بسایا

ہوا وہ نازک اور خوب صورت شہر تھا، جو پہلے ہی دن سے فوجی کرختگی کے بجائے تہذیب، شائستگی، نفاست اور نازو نعم کا گہوارہ تھا۔ وہ نادر شاہ کی بربریت کے بعد بھی محمد شاہ کی راجدھانی بنا رہا تھا۔ جہاں جنگی اور فوجی رعب داب کے بجائے شعر وسخن کی بزم آرائی تھی۔ یا علمی موشگافیوں کی گرم بازاری۔ بقول مولانا عبید اللہ سندھیؒ:

''اُن [۱۳۵] کے (شاہ ولی اللہ المتوفی ۱۱۷۶ھ ۱۷۶۳ء کے) زمانہ کی دہلی ایک ایسا مرکز تھی جس میں اقوام عالم کے سب نمونے ملتے تھے۔ دہلی میں یہ استعداد تھی کہ اُس کے توسط سے یہ تعلیم سارے ہند اور پھر ساری دنیا میں پھیل سکے''۔

اسی زمانہ کی دہلی میں ایک طرف خرابی پیدا ہو گئی تھی تو اس کے ساتھ ابھی تک ایک خوبی بھی یقیناً باقی تھی۔ طبقہ اُمراء میں آصف جاہ جیسا فرزانہ اور طبقہ صوفیاء میں مرزا محمد جان جاناں اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ شہر میں مختلف کتب خانے اور باکمال اساتذہ موجود تھے۔ گویا ایک مفکر کے لئے کافی وسیع میدان موجود تھا۔

محمد شاہ کے بعد احمد شاہ رنگیلے کی طبع رنگین نے فنون لطیفہ اور مجلسی تکلفات کی رنگینیوں میں اور اضافہ ہی کیا۔ انتہا یہ کہ مرہٹوں کی چیرہ دستی اور پھر انگریزوں کی خوں آشام پالیسی کے بعد بھی بہادر شاہ کے دور حکومت میں اس نازک اور خوش مزاج شہر کی حالت یہ تھی۔

''چیزیں سستی تھیں۔ روپے کی کمی نہ تھی۔ حرفت وصنعت، فروغ پر تھی۔ لوگ خوش حال اور زندہ دل تھے۔ شہر فصیل کے اندر کھچا کھچ [۱۳۶] بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف چہل پہل نظر آتی تھی۔ خاص کر چاندنی چوک میں، جس کے بیچوں بیچ نہر بہتی تھی، وہ رونق تھی کہ نظر لگتی تھی۔ ہندو مسلمان بھائی بھائی کی طرح ایسی صلح وآشتی سے رہتے تھے کہ آج کل اس کا یقین کرنا مشکل ہے۔ ایک دوسرے کی غمی، شادی اور تہواروں میں بلاتکلف شریک ہوتے اور کسی قسم کی غیریت نہیں برتتے تھے۔ بادشاہ اگرچہ نام کے بادشاہ تھے لیکن کیا ہندو کیا مسلمان، سب اُن سے محبت کرتے اور اُن پر جان فدا کرتے تھے۔ بادشاہ کا برتاؤ بھی دونوں سے یکساں تھا۔ چنانچہ مسٹر ٹیلر (سابق) پرنسپل دہلی کالج اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ ''قلعہ معلی میں عجیب ماجرا تھا۔ وہاں مسلمانوں کے ساتھ اگرچہ قدرتاً ہمدردی تھی، لیکن اس کے باوجود جتنے ملازمین شاہی تھے (ایسی خدمات پر جہاں فارسی اردو کی ضرورت رات دن پڑتی تھی) سب کے سب ہندو تھے۔ اگرچہ تعلیم آج کل کی طرح عام نہ تھی لیکن تہذیب اور ذوق جو تعلیم کی غایت ہے، عام طور پر پایا جاتا تھا، یہاں تک کہ ان پڑھ بھی اہل ذوق کی صحبت سے صاحب ذوق نظر آتے تھے۔ خوش اطواری اور سلیقہ دلی کا جوہر تھا۔ زبان کی تو ٹکسال ہی تھی۔ جس نے ''دلی'' نہیں دیکھی، یا جو ''دلی'' نہیں رہا۔ وہ زبان داں ہی نہیں۔ گویا جامع مسجد کی سیڑھیاں 'ادبستان زبان' تھیں۔ شاعری کا گھر گھر چرچا تھا۔ خود بادشاہ شاعر تھے۔ شعر وسخن کے قدرداں تھے۔ قلعہ معلی کی زبان فصاحت کی جان تھی''۔ [۱۳۷]

ہندوستان کے مشہور، اصلاح پسند اور ہمدرد قوم شاعر مولانا الطاف حسین حالی مرحوم جنہوں نے ۱۸۵۷ء

سے پہلے اور بعد کے دونوں زمانے دیکھے ہیں۔ انہوں نے حکیم محمود علی خاں صاحب کا مرثیہ کہتے ہوئے دہلی کے متعلق بھی چند شعر کہہ دیے ہیں یہ اشعار گویا دہلی کا مرثیہ ہیں۔ ان میں انہیں خوبیوں کا ماتم کیا ہے جو اُوپر کی سطروں میں آپ نے مطالعہ فرمائیں۔ مولانا حالی فرماتے ہیں:

خاک سے اُٹھتے ہیں تیری جیسے جیسے نکتہ ور — اک جہاں شیوہ بیانی سے ہے اُن کی باخبر

راس تھی آب و ہوا تیری سخن کو جس قدر — سرد کو ہوگی نہ راس اتنی ہوائے کاشغر (۱۴۸)

حسن صورت میں اگر ضرب المثل تو شاد تھا — حسن معنی تیرا حصہ اے جہاں آباد تھا

لے کے ساتھ اسلام نکلا تھا عرب سے جو علوم — جن میں تھی اسلامیوں کی چارسو عالم میں دھوم

دولت و اقبال کا جب تک رہا تجھ پر ہجوم — کھیتوں پر تیری ابر آتے تھے اُن کے جھوم جھوم

آئی گلشن میں نہ تیرے بھول کر فصل خزاں — تیری سرحد میں رہا ہر علم و دانش کا سماں

جس طرح تھا فضل و دانش میں ترا مشہور نام — تھے تمدن میں بھی پیرو تیرے جمہور انام

آدمیت سیکھنے آتے تھے تجھ سے خاص و عام — شہری و بدوی (۱۴۹) تری تقلید کرتے تھے مدام

رسم میں، آئین میں، اوضاع میں، اطوار میں — طرز میں، انداز میں، رفتار میں، گفتار میں

رہ گیا باہر سے آکر جو کہ تجھ میں چند ساں — ڈھل گئے سانچے میں گویا اُس کے عادات وخصال

آکے بن جاتا تھا یاں نقصان انسان کا کمال — تیری بوچھاریں سے موتی بن کے جاتے تھے سفال

آتے ہی انسان کی کایا پلٹ جاتی تھی یاں — چار دن میں اور ہی صورت نکل آتی تھی یاں

تیرا معمورہ تھا اک عالم میں مرجع اور مآب — آن کر لیتے تھے یاں تھکی جہاں کے انتخاب

بستے تھے اطراف سے آ آکے تجھ میں شیخ وشاب — کر دیا تھا تیری آبادی نے ملکوں کو خراب

جھمکتا تھا تجھ میں ترک وفرس روم و زنگ کا
دستہ تھا گویا کہ تو گلہائے رنگا رنگ کا

(ماخوذ از مرثیہ حکیم محمود علی خاں مرحوم)

یہ عجیب بات ہے کہ کہ اسی سرزمین نازک کی اسی نازک فضا میں علماء کی وہ جماعت پیدا ہوئی جس کی جفا کشی، صبر آزمائی، جس کے عزم وہمت، اور جس کی ایثار وقربانی نے اس دور کی تاریخ کو انقلاب آفریں بنادیا۔ جس نے مولانا اسمٰعیل اور مولانا عبدالحی اور مولانا نصیر الدین قدس اللہ اسرارہم جیسے کوہ وقار اور پیکر استقلال پیدا کیے۔ جنہوں نے ہزاروں میل کی سیاحت ومسافت کے بعد سرحد وکشمیر کی گھاٹیوں میں پہنچ کر جام شہادت نوش کیا۔ مگر یہ حقیقت بھی ناقابل تردید ہے کہ دہلی کے ہزاروں ارادت مندوں میں سے جو اس جادۂ سرفروشی وجاں بازی پر گامزن ہوئے وہ انگلیوں کی گنتی سے بھی کم تھے۔ وجہ یہ تھی کہ مصنوعی تہذیب جس کو آج کل کی تہذیب میں "فن لطیف" کہا جاتا ہے جس کے ساتھ بہت سے اخلاقی مرض جن کو "فن کثیف" کہنا چاہیے، ساتھ ساتھ رہتے

ہیں، ان فنونِ لطیفہ اور کثیفہ نے باشندگانِ دہلی کو رزم سے ناآشنا بزم کا دلدادہ بنادیا تھا۔ (۱۵۰)

بہادر شاہ بادشاہ جو اسی دہلی کا رہنے والا تھا، اسی کی آب و ہوا میں اس کی نشو و نما ہوئی تھی۔ وہ گویا ایک آئینہ تھا جس میں دہلی کے اسی مزاج کی عکاسی ہوتی تھی۔ مزاجوں کی اس ہم آہنگی کا یہ اثر تھا کہ تمام کمزوریوں اور بے چارگیوں کے باوجود بہادر شاہ دلی والوں کا محبوب تھا اور دلی والے بہادر شاہ کی آنکھ کے تارے۔

بہرحال اس امن پسند، راحت طلب، پر تکلف، باوضع اور خوش طبع شہر دہلی پر پہلی مصیبت خود انقلابی فوجوں کی آمد تھی۔ یہ فوجیں جذباتِ انقلاب سے خواہ کتنی ہی سرشار ہوں، مگر اپنی طبیعتوں، مراسم اور معاشرت کے لحاظ سے دہلی والوں سے قطعاً اجنبی اور نامانوس اور وہ بھی ہزار دو ہزار نہیں بلکہ ساٹھ ہزار۔ اس نامانوس ہجوم کو اگر کوئی چیز مانوس بنا سکتی تھی تو وہ صرف مقصد کا متحد ہونا تھا۔

مقصد کے اس اتحاد نے بے شک تعاون پر آمادہ کیا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے دہلی والوں نے اس فوج کی آؤ بھگت خوب کی۔ مگر اول خود دہلی والوں کی طبیعت جنجھوندتی تھی جو یہ موافقت پائیدار ہوتی۔ اس پر طرہ یہ کہ انگریزوں کے خفیہ حامی اس تعاون میں رخنے پیدا کرتے رہتے تھے۔ جن کی بنا پر جان سے نہیں بلکہ صرف مال سے مدد کرنا جو اخلاقی فرض تھا بسا اوقات باشندگانِ دہلی کو جبر اور تاوان معلوم ہونے لگتا تھا۔

جہاں تک فوجی نظام کا تعلق تھا، تو سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ تمام سپاہی وہ تھے جنہوں نے دوسروں کی زیر کمان کام کیا تھا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اپنی کمان میں کام لے سکے۔

ان ناتجربہ کاروں کے خیال میں بادشاہ تمام خوبیوں کا حامل اور بادشاہ زادے افسری اور جرنیلی کے فطرتاً مستحق تھے۔ حالانکہ ان شاہزادوں میں اس کے سوا اور کوئی خوبی نہ تھی کہ وہ بہادر شاہ کے فرزند یا اس کے ہم جد تھے۔ چنانچہ پہلی مرتبہ خود فوجیوں کی خواہش کے مطابق بادشاہ زادوں کو فوجوں کی کمان سپرد ہوئی۔ ناتجربہ کار قیادت کا نتیجہ شکست کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مئی اور جون کا وہ مہینہ جو پراگندہ حال انگریزوں کو ختم کرنے کا سب سے بہتر زمانہ تھا، ناتجربہ کار، ناز پروردہ، عیش پرست شاہزادوں کی طفلانہ اور خفیف حرکتوں کی نذر ہو گیا۔ (۱۵۱)

۲/ جولائی کو جنرل بخت خاں ایک منظم اور باضابطہ فوج لے کر دہلی پہنچا۔ مگر اس وقت تک ایک طرف باشندگانِ شہر اور ڈیڑھ دو ماہ سے آئی ہوئی فوجوں میں بددلی کا مرض سرایت کر چکا تھا، اور دوسری جانب انگریز اپنی پراگندگیوں کو ختم کر کے مقابلہ کے لئے پوری طرح تیار ہو چکے تھے۔

جنگی نقطۂ نظر سے شہر دہلی کا محل وقوع بھی قطعاً غیر موزوں تھا۔ ایک طرف جمنا اور تین طرف پہاڑیاں اس کی محافظ بن سکتی تھیں جب کہ پہاڑیوں پر اپنی فوجوں کا قبضہ ہوتا۔ لیکن معاملہ برعکس تھا، اور اس بنا پر دہلی کا پورا رقبہ توپوں کی زد میں تھا۔

مالی نظام اور مالی امداد

دہلی اور قرب جوار کے رؤسا اور نواب جو ہم نوا ہو گئے تھے بادشاہ کی طرف سے اُن کو احکام بھیجے گئے کہ وہ مالیہ وصول کر کے شاہی خزانہ میں بھیجیں۔ مگر اوّل تو وہ خود ضرورت مند تھے۔ اس کے علاوہ جو حوصلے انگریزوں کی امداد کے لئے فراخ اور وسیع ہو جاتے تھے، اس مصیبت زدہ بادشاہ اور انقلابی فوجوں کے حق میں اُن کی تمام بلندیاں پست ہو جاتی تھیں۔ مثلاً دہلی کے مہاجن جن سے روپیہ وصول کرنے کا بہت شور ہے۔ جیون لال صاحب نے اپنے روزنامچہ میں اس کی تفصیل یہ لکھی ہے۔

"۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء۔ گردار سنگھ اور گرداری لال مہاجن نے دو لاکھ اور چند ہزار روپے شاہی خزانے میں جمع کئے۔

۴ رجون ۱۸۵۷ء۔ بادشاہ کے احکام کے مطابق ایک جلسہ ہوا، جس میں ایک لاکھ روپیہ جمع ہوا۔

۳۱ راگست۔ فوجی عدالت کے ممبروں نے مہاجنوں کو بلایا، اور اُن سے روپیہ مانگا (حکماً طلب نہیں کیا)۔ مہاجنوں نے جواب دیا کہ شاہزادگان ہم سے تین لاکھ ستر ہزار روپیہ لے چکے ہیں۔ اب ہم میں مزید روپیہ دینے کی طاقت نہیں"۔

دوسری جانب ان کی دراز دستی ملاحظہ فرمایئے جن کے پاس کروڑوں کے خزانے محفوظ تھے۔ پٹیالہ، کشمیر، رام پور اور حیدرآباد جیسے راجاؤں اور نوابوں کی ہر طرح کی امدادیں اُن کو حاصل تھیں۔ یہاں تک کہ پٹیالہ اور رام پور نے تو اس جنگ کو خود اپنے اسٹیٹ کی جنگ تصور کر لیا تھا۔ یہی جیون لال اپنی ڈائری میں رقم طراز ہیں:

۲ رجون ۱۸۵۷ء متھرا کے مشہور و معروف مہاجن لکشمی چند کے گماشتہ نے محل میں یہ خبر دی کہ انگریزوں نے جنگی اخراجات کے لئے سیٹھ لکشمی چند سے ۲۵ لاکھ روپے قرض مانگے ہیں۔

۶ رجون ۱۸۵۷ء انگریزوں نے پانی پت اور کرنال کے مہاجنوں سے تین لاکھ روپے وصول کئے۔

۷ رجون۔ خبر ملی، مہاراجہ پٹیالہ (نریندر سنگھ) نے جو پانچ لاکھ روپے انگریزی فوج کے لئے بھیجے تھے، وہ انگریزی لشکر میں بحفاظت تمام پہنچ گئے۔

۲۲ رجولائی۔ خبر ملی کہ لالہ چونی پرشاد نے لفٹنٹ گورنر سے وعدہ کر لیا ہے کہ جس قدر روپیہ کی ضرورت ہوگی، میں دوں گا۔ خبر ملی کہ مہاجن روزانہ ذخائر لے کر انگریزی کیمپ میں پہنچا کرتا ہے"۔

یہ رضا کارانہ امداد آگرہ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں تھی، بلکہ انگریزوں کے اور بھی بہت سے وفادار تھے، جو منہ مانگے سے زیادہ پیش کر دینا اپنے مستقبل کے لئے فال نیک سمجھتے تھے۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا، جگہ جگہ ہندو مسلم سوالات کھڑے کر کے جلب منفعت کی کامیاب کوشش کی جانے لگی۔ چنانچہ بقول سرسید صاحب مرحوم ضلع بجنور میں فرقہ وارانہ سوال پوری شدت سے اُٹھا۔ مسٹر الیگزنڈر

فیلکسپیر بجنور کے کلکٹر اور مسٹر جارج پامر، جوائنٹ مجسٹریٹ تھے۔ اُن کے فرار کے بعد نواب محمود علی[152] خاں نے زمام حکومت سنبھال لی تھی۔ ایک پرگنہ کے ہندوؤں کو جارج پامر صاحب نے اشارہ کیا اور انہوں نے دو قسطوں میں دس ہزار روپیہ ان انگریزوں کے پاس بھیج دیا، جو نینی تال میں پناہ گزیں تھے۔ ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

بادشاہ نے متعدد راجاؤں، نوابوں اور زمینداروں سے امداد کی اپیل کی۔ بہت سے راجاؤں اور نوابوں اور ذی اقتدار افراد کے نام انقلابی فوج کے افسروں کی فرمائش پر بادشاہ نے خطوط لکھے۔ مگر راجہ بلب گڑھ (ضلع گوڑ گانوہ) نواب جھجر یا نواب مالاگڑھ جیسے چند زمینداروں کے علاوہ نامور راجاؤں اور مہاراجوں نے جواب دینا بھی پسند نہیں کیا اور جنہوں نے جواب دیا انہوں نے خود امداد کی درخواست کی۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے امداد کا وعدہ کیا مگر یہ وعدہ آخر تک شرمندۂ وفا نہ ہوسکا۔

پہلے ہی روز میگزین کی تباہی انگریزوں کے لئے نشان کامرانی اور انقلابی فوجوں کے بڑے منصوبے کی ناکامی تھی۔ اس کے بعد جد و جہد کر کے چوڑی والان میں دوسرا میگزین بنایا گیا۔ جس کو انگریز کے خفیہ خیر خواہوں نے تباہ کر کے مفلوک الحال بادشاہ اور اس کے انقلابی ساتھیوں کی رہی سہی توانائی بھی ختم کردی۔ شہر کے بڑے لوگوں کی مجلس بادشاہ نے ۱۲ رمئی ہی کو بنادی تھی۔ خوراک اور رسد وغیرہ کے جملہ انتظامات اُس کے سپرد کردیے تھے۔ پھر جنگی کونسل اور فوجی عدالت بھی قائم کردی۔ پھر ۱۴ ر ستمبر کو جے پور، جودھ پور، الور اور بیکانیر کے راجاؤں کو یہ بھی لکھ دیا کہ وہ مجلس بنالیں، شاہی اختیارات اُن کے سپرد کردیے جائیں گے[153] مگر افسوس صدائے برنخاست۔

خرچہ جنگ

انقلابی فوج کی تعداد دہلی میں پچاس ہزار کے قریب تک پہنچ گئی تھی۔ اوسطاً فوج کا ماہانہ خرچ پانچ لاکھ بہتر[154] ہزار روپیہ تھا۔ اس طرح چار ماہ دور حکومت میں تقریباً تئیس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ دہلی شہر کے علاوہ متعدد فوجیں اپنے ساتھ کچھ خزانے لائی تھیں۔ بہت تھوڑی رقم محصولات کے ذریعہ وصول ہوئی۔ بہادر شاہ کے پاس جو کچھ تھا، یہاں تک کہ سامان آرائش اور فرنیچر[155] وغیرہ، وہ بھی فروخت کیا گیا تب یہ مصارف پورے ہوسکے، اور وہ شاہزادے جن کی چیرہ دستیوں اور استحصال بالجبر کے قصے آج تک بیان کئے جاتے ہیں، بقول شمس العلماء ذکاء اللہ خاں اُن پر ایسے وقت بھی گزرے کہ لوگ اُن کو مبارکباد دیتے تھے کہ بادشاہت اُن کے گھر آئی۔ وہ مبارکباد کے جواب میں کہتے کہ اس بادشاہت سے وہ غلامی بہتر تھی کہ دو وقت کھانے کو مل جاتا تھا، اب تو اس کے بھی لالے پڑے ہوئے ہیں۔

بہر حال جب حالات یہ ہوں تو شکست کے یقینی ہونے میں کس کو تامل ہوسکتا ہے۔ بس وہ شکست اور تباہی جو ماہ ستمبر میں پیش آئی، حیرت انگیز نہیں۔

البتہ حیرت انگیز یہ ہے کہ چار ماہ مسلسل ایسی شان سے مقابلہ ہوتا رہا، کہ بار بار انگریزی فوجوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ ہمتیں ٹوٹ گئیں۔ انہیں پریشانیوں اور رات دن کی گھٹن میں دو کمانڈر جان سے گئے۔ ایک نے استعفیٰ دے کر جان بچائی۔ مگر انگریزوں کا اقبال سامنے تھا۔ کچھ غیر معمولی ہمت اور حوصلے کے کمانڈر میسر آتے رہے، بلکہ آگے بڑھ کر کمان سنبھالتے رہے۔ تازہ دم فوج کی بھیڑ کے ساتھ بے شمار سامان جنگ سے پوری دہلی کا محاصرہ کر لیا گیا۔ پھر تقریباً ایک ماہ تک جس شدت سے دہلی شہر پر گولہ باری اور حملے ہوتے رہے، اُس کا اندازہ کرنے کے لئے ایک چشم دید شاہد کا بیان ملاحظہ فرمایئے۔

راقم الدولہ ظہیر دہلوی کا بیان ہے:

''ادھر پہاڑی پر فریزر کی کوٹھی سے باڑے (فلیگ اسٹاف) تک انگریزی فوج کے مورچے تھے۔ ادھر کشمیری دروازہ کے برج سے کابلی دروازہ کے سیاہ برج تک، اور لاہوری دروازہ کے برج سے فراش خانہ کی کھڑکی کے برج تک توپیں چڑھی ہوئی تھیں، اور باہم شبانہ روز گولہ باری ہوتی تھی، اور شیل اور بم کے گولے شہر پر پڑتے تھے۔ بم کا گولہ خدا پناہ میں رکھے،(۱۵۶) جس وقت پھٹتا تھا، او رصدہا ٹکڑے اُس کے اُڑ جاتے تھے، اگر سات درجے کے مکان پر پڑا تو تہ کو اُتر گیا، اور سب کا ستیاناس کر دیا۔ اگر زمین پر گرا، تو دس گز زمین میں پیوست ہو کر پھوٹا، اور تمام مکان کو اُڑا دیا۔ غرض ایک قہر خدا تھا۔ دس دس گولے برابر کاغذ کے پرچوں کی طرح رات کو اُڑتے چلے آتے تھے''۔

۱۴؍ دسمبر کو کشمیری دروازہ اُڑایا جا چکا تھا۔ انگریزی فوجیں شہر میں گھس چکی تھیں، اور چار حصوں میں تقسیم ہو کر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ مگر دہلی کے گلی کوچوں میں اس شدت سے مدافعت جاری تھی اور وطن عزیز کے ایک ایک چپہ پر محبان وطن اس طرح جانیں قربان کر رہے تھے کہ انگریزی فوج پھر ایک مرتبہ ہیبت زدہ ہو گئی۔ کیونکہ بڑے بڑے فوجی افسر کام آ چکے تھے، اور وہ بہادر جرنیل ''نکلسن'' جو تنہا دو ہزار کی برابر مانا جاتا تھا، ۱۴؍ ستمبر کو زخموں سے چور ہو کر ہسپتال میں داخل اور زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔

آج ۱۵؍ ستمبر ۱۸۵۷ء کی صبح ہے۔ انگریزی جرنیل ''ولسن'' ''ششن و پنج میں پڑا ہوا ہے کہ فوجوں کو پیش قدمی کا حکم دے یا پسپائی کا۔ مگر انگریزوں کی خوش قسمتی سے ابھی تک اپنی قوم پر قربان ہونے والے بہادر ''نکلسن'' کے بدن میں جان باقی تھی۔ اُس کے ہوش و حواس درست اور جذبات زندہ تھے۔ اُسے معلوم ہوا کہ ''ولسن'' ششش و پنج میں پڑا ہوا ہے، اور بہت ممکن ہے، فوجوں کو واپسی کا حکم دے دے۔ وہ اپنی تکلیف بھول گیا۔ زخموں سے کراہنے والی آواز غصہ اور جوش سے بھرا گئی، اور اُس نے دانت پیس کر کہا:

''ابھی مجھ میں اتنی طاقت باقی ہے کہ ''ولسن'' کو گولی سے اُڑا دوں''۔

مرنے والے کی اس گرج نے زندہ دلوں میں نئی زندگی پیدا کی۔ ششش و پنج کی بجائے نیا جوش اور ولولہ پیدا

ہوا، اور فوجوں کو پیش قدمی کا حکم دے دیا گیا۔ مگر دوسری طرف وطن عزیز کی حرمت پر قربان ہونے والوں کی حالت یہ تھی کہ اُنہوں نے دو روز تک پیش قدمی کو ناممکن بنائے رکھا۔ اور جب شہیدوں کے پشتوں پر گزرتے ہوئے انگریزی فوجوں نے لال قلعہ کی طرف بڑھنا شروع کیا تو ایک ایک قدم پر وہ خونریز لڑائی لڑنی پڑی کہ کشمیری گیٹ سے لال قلعہ تک صرف ۶ فرلانگ کا راستہ پانچ دن میں طے ہو سکا، اور وہ بھی اس لئے کہ بادشاہ لال قلعہ کو خالی کر چکا تھا۔

دیوانِ خاص پر قبضہ اور ملکہ وکٹوریہ کا جام صحت

۱۹ ستمبر کو بادشاہ قلعہ سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں پناہ گیر ہوا، تو ۲۰ ستمبر کو بعد دوپہر "ولسن" نے قلعہ میں داخل ہو کر دیوانِ خاص کو اپنا صدر مقام بنایا، اور تخت طاؤس کے چبوترے پر بیٹھ کر بادۂ نافرجام سے ملکہ وکٹوریہ کا جام صحت نوش کیا۔ (۱۵۷)

جنرل بخت خاں کی آخری کوشش اور ناکامی

ابھی بادشاہ لال قلعہ سے روانہ نہیں ہوا تھا کہ جنرل بخت خاں باریاب ہوا۔ اُس نے بادشاہ کو تسلی دی کہ یہ ناکامی فیصلہ کن نہیں ہے۔ صرف ایک شہر ہاتھ سے نکلا ہے، پورا ملک آپ کے لئے جان قربان کر رہا ہے۔ دہلی شہر جنگ کے لئے موزوں مقام نہیں تھا۔ دشمن کی فوجیں بلندی پر تھیں۔ شہر نشیب میں ٹھیک اُن کی توپوں کی زد میں تھا۔ سامان رسد اور اسلحہ کی فراہمی بھی مشکل تھی۔ اور ابتداء میں ناواقف افسروں کی ناتجربہ کاری سے جو نقصان ہو چکا تھا، اُس کی تلافی ناممکن ہو گئی تھی اور پھر مرزا مغل کی خودغرضی ضدی طبیعت کی مداخلت نے آخر تک نظام کو درست نہیں ہونے دیا تھا۔ آپ ہرگز مایوس نہ ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ بادشاہ نے جنرل بخت خاں کی کسی دلیل کی بھی تردید نہیں کی۔ بظاہر اس کا میلان بھی یہی تھا مگر اس وقت اُس نے کوئی جواب بھی نہیں دیا، اور جنرل بخت خاں کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ کل کو ہمایوں کے مقبرے میں ملاقات کریں۔ فیصلہ اس وقت ہوگا۔

ادھر "گرگ باراں دیدہ" انگریزی افسر بھی سمجھتے تھے کہ اگر بادشاہ نکل گیا تو اُن کی ساری کوششوں پر پانی پھر جائے گا اور پھر فتح اور کامیابی ناممکن نہ سہی، تو مشکل ضرور ہو جائے گی۔ لہٰذا اپنے تمام ذرائع بادشاہ کو روک لینے میں صرف کر دیئے۔

منشی رجب علی، انگریزوں کی کارروائیوں کا سب سے بہتر مہرہ تھا۔ مرزا الٰہی بخش بہادر شاہ کا سمدھی جس کے دل میں مفاد پرست جذبات کی موجوں کے ساتھ یہ خلش بھی ہمیشہ رہتی تھی کہ پہلا ولی عہد جو صحیح معنی میں ولی عہدی کے اہل تھا، اس کا قابل داماد فخر الدین فتح الملک عرف "مرزا فخرو" تھا، جس کی ناوقت موت کے بارے میں لوگوں کا گمان یہ بھی تھا کہ اس کو زہر دے دیا گیا تھا۔

غرض یہی الٰہی بخش جواس خلش کے ساتھ یہ نیک نامی بھی لئے ہوئے تھا کہ انگریزوں کا تنخواہ دار ہے، دوسرا مہرہ تھا۔ بادشاہ کی چہیتی بیگم زینت محل جس کی تمام تمنائیں اس پر منحصر ہوگئی تھیں کہ اُس کا لڑکا بخت'' جواں بخت'' ولی عہد بنادیا جائے۔

غرض جب یہ مختلف عناصر ہر طرف سے بوڑھے بادشاہ کو گھیرے ہوئے تھے، جس کو حوادث نے اب ضعیف الرائے بلکہ خفیف العقل بھی بنادیا تھا، تو ناممکن تھا کہ جنرل بخت خاں کی مخلصانہ درخواست منظور ہوتی۔

مرزا الٰہی بخش نے ایک چبھتی ہوئی بات بادشاہ کو یہ بھی بتائی کہ بخت خان روہیلہ پٹھان ہے۔ پٹھان ہمیشہ مغلوں کے مخالف رہے ہیں۔ شیر شاہ نے ہمایوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ اور ابھی ساٹھ ستر برس پہلے کی بات ہے کہ غلام قادر روہیلہ نے جہاں پناہ کے دادا خلد آشیاں شاہ عالم بادشاہ کو کس طرح ذلیل کیا تھا اور ان کی آنکھیں نکال لی تھیں۔ غرض ۲۰ ستمبر کو جنرل بخت خاں، بادشاہ سے ملا تو بادشاہ کا جواب یہ تھا۔ بیشک آپ کی رائے ٹھیک ہے، مگر میرا بڑھاپا اس پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ میں اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کرتا ہوں۔ آپ اپنا کام کرتے رہیں۔

بخت خاں بادشاہ کا جواب سن کر رخصت ہوا، اور اپنی پوری فوج کے ساتھ جمنا پار کر کے روہیل کھنڈ پہنچ گیا۔ اس بہادر جرنیل کے جنگی کمالات جو کچھ بھی ہوں اس کے تدبر اور حسن انتظام کی بہترین مثال یہ ہے کہ دو ماہ کی معرکہ آرائی کے بعد اپنی پوری فوج کو صحیح سالم نکال کر لے گیا۔ جب آیا تھا تو پوری فوج کی چھ ماہ کی تنخواہ پہلے ادا کر چکا تھا۔ مزید مصارف کے لئے مبلغ چار لاکھ روپیہ ساتھ لایا تھا۔ غرض وہ یا اس کی فوج کا کوئی فرد شاہی خزانہ یا باشندگان دہلی پر بار نہیں بنا بخت خاں کی روانگی کے بعد تاخیر کی کیا ضرورت تھی۔ اگلے ہی روز بادشاہ گرفتار کر لیا گیا۔ جواں بخت کے علاوہ جو شاہزادے آج ہاتھ لگے، وہ آج قتل کر دیے گئے۔ خاندان شاہی کے باقی افراد کی تلاش جاری رہی۔ جہاں ملے، قتل کر دیے گئے یا پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔ زینت محل کے علاوہ شاہی خاندان کی باقی خواتین جان بچانے کے لیے محلوں سے نکلیں اور خدا جانے کتنی کتنی مصیبتیں اُٹھا کر آخری انجام کو پہنچیں۔ اس داستان پارینہ سے عبرت لینی ہو تو خواجہ حسن نظامی مرحوم کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے اور ۱۹۵۷ء میں جو بہت سی تصانیف شائع ہوئی ہیں، ان میں بادشاہ کی گرفتاری سے لے کر اس کی وفات تک کے حالات تحریر کیے گئے ہیں، اُن کا مطالعہ کر لیا جائے۔ احقر کی جانب سے کسی قدر تغیر کے ساتھ یہ معذرت قبول فرمائی جائے۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث شاہ گویم ——— من بندہ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

ایک سوال اور اس کا جواب

جنرل بخت خاں کے ساتھ بادشاہ کا جانا اگر انقلابی فوجوں کے لئے حوصلہ افزائی کا سبب تھا تو انگریزوں کے حق میں دہلی کی فتح بھی کچھ کم حوصلہ افزا نہ تھی۔ کیونکہ یہ فتح انگریزوں کے حامیوں کے لئے ''راس اُمید'' تھی

جو اُن کے عہد وفا میں صرف استحکام ہی نہیں، بلکہ ولولے بھی پیدا کر رہی تھی۔ جنرل بخت خاں نے دہلی سے واپس ہو کر روہیل کھنڈ کا مورچہ سنبھالا۔ وہ غالباً بادشاہ کو بھی یہیں لاتا۔ اُس وقت لکھنؤ، کانپور اور روہیل کھنڈ کی حدود میں آزاد حکومت آسانی سے قائم ہو سکتی تھی۔ لیکن چونکہ جنوبی ہند اور پنجاب کا بیشتر حصہ انگریزوں کا ہمنوا اور مددگار تھا۔ بندرگاہوں پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ جن کے راستے سے ہر قسم کی امداد انگریزوں کو دوسرے مقبوضات اور خود انگلستان سے پہنچ سکتی تھی، اور انگریزوں کو بہترین جرنیل اور اپنے مضبوط و مستعد مرکزوں کی رہنمائی اور امداد بھی حاصل تھی، تو شمالی ہند کی اس نوخیز مملکت کے لیے کامیابی تو پھر بھی قدرت کے کسی معجزہ پر موقوف رہتی۔ البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ آپس کی مفاہمت سے خود مختار ریاستیں قائم ہو جاتیں اور وہ بے پناہ جانی و مالی نقصان جو ۱۸۵۷ء کے بعد سالہا سال تک ہندوستانیوں کو بالخصوص محبان وطن کو برداشت کرنا پڑا، اس سے پناہ مل جاتی۔

بہر حال یہ ماضی کے متعلق ایک قیاس لاحاصل ہے جس کو طویل کرنے کے بجائے مختصر کر دینا بلکہ ختم کر دینا ہی بہتر ہے۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

فتویٰ کی نوعیت اور اس کی ضرورت

جہاد، اور جب تک جہاد کی طاقت نہ ہو تو جہاد کی تیاری۔ یہ فتویٰ تو اُسی وقت سے تھا، جب نصف صدی پہلے دنیائے اسلام کے مفتیٔ اعظم حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا تھا کہ:

”اس اطراف میں اور یہاں سے لے کر کلکتہ تک نصاریٰ کا حکم جاری ہے۔ وہ بلا روک ٹوک جو کچھ چاہتے ہیں۔ عبادت گاہوں تک کو مسمار کر ڈالتے ہیں۔ مذہب کا کوئی احترام اُن کی نظر میں نہیں ہے“۔ (۱۵۸)

اس فتویٰ پر عمل کرتے ہوئے آپ کے مرید خاص اور آپ کی تحریک کے علمبردار حضرت سید احمد صاحب شہید نے مہاراجہ گوالیار سے امداد کی اپیل کی تھی اور شکوہ کیا تھا کہ:

”بیگانگاں بعید الوطن، ملوک زمین و زماں گردیدہ و تاجران متاع فروش بپایہ سلطنت رسیدہ“۔

”سات سمندر پار کے اجنبی، زمین و زمان کے بادشاہ بن گئے ہیں، اور بیچنے والے سوداگر سلطنت کے مرتبہ پر پہنچ گئے ہیں“۔ (۱۵۹)

پس اگر آج دین اور دھرم کے نام پر ہندو اور مسلمان اُٹھتے ہیں اور ان ”تاجران متاع فروش اور بیگانگان بعید الوطن“ سے اپنے وطن عزیز کو پاک کرنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دیتے ہیں، تو اس کے لیے نہ مسئلہ پوچھنے کی ضرورت ہے، نہ فتوے حاصل کرنے کی حاجت۔

چنانچہ نہ میرٹھ کے فوجیوں نے کسی سے مسئلہ پوچھا، اور نہ جب دہلی کے باشندوں نے دہلی میں اُن کا استقبال کیا تو اُن کو کسی فتوے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز کے

فتوے کے بعد انگریزی ڈپلومیسی کا دارالافتاء[190] بھی برابر کام کرتا رہا۔ اس نے پہلے حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کو وہابیت زدہ اور معاذ اللہ لادین قرار دیا۔ پھر مسئلہ کو الجھانے اور کھلی ہوئی حقیقت کے چہرہ پر نقاب ڈالنے کے لئے انوکھا پہلو یہ پیش کر دیا کہ:

"انگریز حاکم وقت ہے۔ مسلمان اس کی پناہ میں ہیں (مستامن ہیں) پس اطاعت واجب ہے اور غدر حرام"

اس نظر فریب مغالطہ کو جس طرح مفاد پرست، سرکاری ملازموں اور خود غرض اقتدار پرستوں نے اپنے بچاؤ اور اپنے کرتوتوں کے جواز کے لئے سند بنایا تھا، ایسے ہی کچھ سادہ لوح علماء اور مشائخ بھی اس فریب میں آگئے تھے۔[191]

سرسید مرحوم کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر بھی اس ڈپلومیسی کو کام میں لانے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ ایک فتویٰ مرتب کیا گیا کہ یہ ہنر بونگ اور فساد ہے، جہاد نہیں ہے۔ لہٰذا اس میں شرکت حرام ہے۔

اس فتویٰ کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کی اشاعت نہیں ہو سکی، اور اس کی اصل بھی ایسی ناپید ہو گئی کہ سرسید صاحب کو بھی دستیاب نہیں ہوئی۔ صرف اس کی نقل مل سکی، اور وہ بھی کسی قابل اعتماد، باوثوق شخص کے ذریعہ نہیں بلکہ ایسے ذریعہ سے جو خود سید صاحب کے نزدیک غیر قابل اعتبار تھا۔[192]

بہر حال فتویٰ ہو یا نہ ہو، مگر واقعہ یہ ہے کہ خود سرسید صاحب کا مسلک یہی تھا اور اسی وجہ سے وہ انگریز کی وفاداری میں یہاں تک بڑھے ہوئے تھے کہ اس کی حمایت میں اپنے ملک اور اپنی ملت کے کسی بھی بڑے آدمی کی کوئی وقعت اُن کی نظر میں نہیں تھی۔ انتہا یہ کہ مجاہدین حریت اور محبان وطن کے تذکرہ کے وقت وہ کچھ ایسے بے قابو ہو جاتے ہیں کہ دہلی کی روایتی تہذیب کا دامن بھی اُن کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور ایک ایسا انداز اختیار کر لیتے ہیں جس پر بازاری لوگوں کو بھی شرم آجاتی ہے۔

اچھا اب آپ اس انداز نگارش کو نظر انداز فرما کر سید صاحب کی تحریر ملاحظہ فرمایئے، جس سے فتوے کے مسئلہ پر روشنی پڑے گی۔ سرسید صاحب اسباب بغاوت ہند میں تحریر فرماتے ہیں:

"مسلمانوں کا بہت روزوں سے آپس میں سازش اور مشورہ کرنا اس ارادہ سے کہ ہم باہم متفق ہو کر غیر مذہب کے لوگوں پر جہاد کریں اور اُن کی حکومت سے آزاد ہو جائیں، نہایت بے بنیاد بات ہے جبکہ مسلمان ہماری گورنمنٹ کے مستامن تھے، کسی طرح گورنمنٹ کی عملداری میں جہاد نہیں کر سکتے تھے"[193]

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"اور یہ جو ہر ضلع میں پاجی[194] اور جاہلوں کی طرف سے جہاد کا نام ہوا، اگر ہم اس کو جہاد ہی فرض کریں تو بھی اس کی سازش و اصلاح قبل دسویں مئی ۱۸۵۷ء مطلق نہ تھی۔ غور کرنا چاہیے کہ اس زمانہ میں جن لوگوں نے جھنڈا جہاد کا بلند[195] کیا، ایسے خراب اور بدرویہ اور بد اطوار آدمی تھے کہ بجز شراب خوری اور تماش بینی اور ناچ و رنگ دیکھنے کے کچھ وظیفہ اُن کا نہ تھا۔ بھلا یہ کیونکر

پیشوا اور مقتدا جہاد کے گنے جا سکتے تھے۔ اس ہنگامے میں کوئی بات بھی مذہب کے مطابق نہیں ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ سرکاری خزانہ اور اسباب جو امانت تھا، اس میں خیانت کرنا، (۱۶۶) ملازمین کو نمک (۱۶۷) حرامی کرنی مذہب کی رو سے درست نہ تھی۔ صریح ظاہر ہے کہ بے گناہوں کا قتل علی الخصوص عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کا، مذہب کے بموجب گناہ عظیم تھا۔(۱۶۸) پھر کیونکر یہ ہنگامہ غدر، جہاد ہو سکتا تھا۔ ہاں البتہ چند بد ذاتوں نے دنیا کی طمع اور اپنی منفعت اور اپنے خیالات پورے کرنے اور جاہلوں کے بہکانے کو، اور اپنے ساتھ جمعیت جمع کرنے کو جہاد کا نام لے دیا۔ پھر یہ بات بھی مفسدوں کی حرامزدگیوں میں سے ایک حرامزدگی تھی، نہ واقع میں جہاد''۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

''دہلی میں جو فتویٰ جہاد کا چھپا، وہ ایک عمدہ دلیل جہاد کی سمجھی جاتی ہے، مگر میں نے تحقیق سے سنا ہے، اور اس کے اثبات پر بہت دلیلیں ہیں کہ وہ محض بے اصل ہے۔ میں نے سنا ہے کہ جب فوج نمک حرام میرٹھ سے دہلی میں گئی تو کسی نے جہاد کے باب میں فتویٰ چاہا۔ سب نے فتویٰ دیا کہ جہاد نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس پہلے فتویٰ کی میں نے نقل دیکھی ہے، مگر جبکہ وہ اصل فتویٰ معدوم ہے تو میں اس نقل کو نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں تک لائق اعتماد کے ہے۔ مگر جب بریلی کی فوج دہلی میں پہنچی اور دوبارہ فتویٰ ہوا، جو مشہور ہے اور جس میں جہاد کرنا واجب لکھا ہے بلاشبہ اصلی نہیں۔ چھاپنے والے اس فتویٰ کے نے جو ایک مفسد اور نہایت قدیمی بد ذات آدمی تھا، جاہلوں کے بہکانے اور ورغلانے کو لوگوں کے نام لکھ کر اور چھاپ کر اس کو رونق دی تھی۔ بلکہ ایک آدھ مہر ایسے شخص کی چھاپ دی تھی جو قبل غدر مر چکا تھا۔ مگر مشہور ہے کہ چند آدمیوں نے فوج باغی بریلی اور اس کے مفسد ہمراہیوں کے جبر اور ظلم سے مہریں بھی کی تھیں''۔

''دہلی (۱۶۹) میں ایک بڑا گروہ مولویوں اور اُن کے تابعین کا ایسا تھا کہ مذہب کی رو سے معزول بادشاہ دہلی کو بہت (۱۷۰) برا اور بدعتی سمجھتے تھے۔ اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ دہلی کی جن مسجدوں میں بادشاہ کا قبض و دخل اور اہتمام ہے، اُن مسجدوں میں نماز درست نہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جامع مسجد میں نماز نہیں پڑھتے تھے اور غدر سے بہت قبل کے چھپے ہوئے فتوے اس معاملہ میں موجود ہیں۔ پھر کبھی عقل قبول کر سکتی ہے کہ ان لوگوں نے جہاد کے درست ہونے میں اور بادشاہ کو سردار بنانے میں فتویٰ دیا ہو''۔

''جن لوگوں کی مہر اس فتویٰ پر چھاپی گئی ہے، اُن میں سے بعضوں نے عیسائیوں کو پناہ دی (۱۷۱) اور اُن کی جان و عزت کی حفاظت کی۔ اُن میں سے کوئی شخص (۱۷۲) لڑائی پر نہیں چڑھا۔ مقابلے پر نہیں آیا۔ اگر واقع میں وہ ایسا ہی سمجھتے، جیسا کہ مشہور ہے تو یہ باتیں کیوں کرتے''۔(۱۷۳)

سرسید صاحب کی اس طویل تحریر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے:

❶ مجاہدین حریت کے خلاف اس وقت بھی بدگمانیاں پھیلانے کی کوشش کی گئی، اور نظام حکومت درہم برہم ہونے کے وقت جو حرکتیں عام شرارت پسند اور شہر کے اوباش کیا کرتے تھے، اور جو حرکتیں شاہی خاندان کے آوارہ منش ناتجربہ کار نوجوانوں سے ہوئیں، اُن کو بااخلاص مجاہدین اور شریف الطبع محبان وطن کے سرتھوپا گیا۔ (معاذ اللہ)

❷ ابتداء میں جہاد کا فتویٰ نہیں تھا۔ جنرل بخت خاں جب دہلی آئے تب فتویٰ مرتب کیا گیا۔

سرسید کے ہم نوا شمس العلماء ذکاء اللہ خاں بھی یہی فرماتے ہیں۔ اُن کی تحریر ملاحظہ ہو:

''جب تک دہلی میں بخت خاں نہیں آیا، جہاد کے فتوے کا چرچا(۱۷۴) شہر میں بہت کم تھا۔ مساجد میں ممبروں پر جہاد کا وعظ کمتر ہوتا تھا۔ دلی کے مولوی اور اکثر مسلمان خاندان تیموریہ کو ایسا خولہ خطہ جانتے تھے کہ وہ ناممکن سمجھتے تھے کہ اس خاندان کی بادشاہی ہندوستان میں ہو مگر اس کے ساتھ جاہل مسلمانوں کو یہ یقین تھا کہ انگریزی سلطنت کے بدن میں یہ ایسا پھوڑا نکلا کہ وہ جانبر نہیں ہوگی۔

یہ کام لچے شہدے(۱۷۵) مسلمانوں کا تھا کہ وہ جہاد جہاد پکارتے پھرتے تھے۔ مگر جب ''بخت خاں'' جس کا نام اہل شہر نے ''کم بخت خاں''(۱۷۶) رکھا تھا دلی میں آیا تو اُس نے یہ فتویٰ(۱۷۷) لکھایا کہ مسلمانوں پر جہاد اس لئے فرض ہے کہ اگر کافروں کی فتح ہوگی تو وہ اُن کے بیوی بچوں کو قتل کر ڈالیں گے اُس نے جامع مسجد میں مولویوں کو جمع کر کے جہاد کے فتوے پر دستخط و مہریں اُن کی کرالیں اور مفتی صدر الدین نے بھی اُن کے جبر سے اپنی جعلی مہر کر دی۔ لیکن مولوی محبوب علی اور خواجہ ضیاء الدین نے فتویٰ پر مہریں نہیں کیں اور بے باکانہ کہہ دیا کہ شرائط جہاد موافق مذہب اہل اسلام موجود نہیں۔(۱۷۸)

اس فتویٰ کا اثر یہ تھا کہ جاہل مسلمانوں کا جوش مذہبی زیادہ ہو گیا۔ جن مولویوں نے فتویٰ پر مہریں کی تھیں وہ کبھی پہاڑی پر انگریزوں سے لڑنے نہیں گئے۔ مولانا نظیر حسین جو وہابیوں کے مقتدا اور پیشوا تھے اُن کے گھر میں ایک میم چھپی بیٹھی تھی۔ اس فتویٰ پر کچھ مہریں اصلی اور کچھ جعلی تھیں۔ ایک مولوی کی مہر تھی جو غدر سے پہلے قبر میں سو چکا تھا۔(۱۷۹)

❸ سرسید اور شمس العلماء دونوں کے بیان اس پر متفق ہیں کہ فتوے پر کچھ دستخط اور مہریں فرضی تھیں۔ کچھ نے اپنی رائے کے خلاف زور زبردستی سے دستخط کئے۔ مگر یہ نہیں فرمایا کہ ایسے بے کس و مجبور کون تھے جنہوں نے رعب میں آکر ایسے خطرناک فتوے پر جس کے نتیجہ میں موت سامنے تھی، دستخط کر ڈالے، اور جب کہ مولانا محبوب علی صاحب اور خواجہ ضیاء الدین مرعوب نہیں

ہوئے، اُنہوں نے کھلے بندوں مخالفت کی اور کوئی اُن کا بال بیکا نہیں کر سکا، تو اُن کے مرعوب اور مجبور ہونے کی کیا وجہ تھی۔

شمس العلماء نے مفتی صدر الدین صاحب کا نام لیا ہے کہ اُن کی مہر جعلی تھی اور دستخط مجبوراً ہوئے تھے، اور ایک صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ مفتی صاحب نے از راہ ذکاوت دستخط سے پہلے لکھ دیا شہدت بالجر۔ یعنی "بالجر" پر نقطے نہیں لگائے تھے، علماء نے بالخیر پڑھا۔ اور انگریزی تسلط کے بعد جب گرفتاری ہوئی تو مفتی صاحب نے اس کو بالجبر پڑھ کر فرمادیا کہ میں تو پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ دستخط جبراً کیے ہیں لیکن اوّل تو فتوے پر دستخط سے پہلے یا بعد میں یہ لفظ "شہدت بالخیر" بے معنی ہے۔ نہ یہ شہادت کا موقع ہے، اور نہ بالخیر کا لفظ موقع اور محل سے کوئی مناسبت رکھتا ہے آخر اس کے کیا معنی کہ میں نے گواہی دی خیر سے یا خیر کے ساتھ۔

اس کے علاوہ دوسری بات یہ کہ فتوے کی جو نقل صادق الاخبار میں چھپی ہے اس میں مولانا کی مہر یا دستخط کے آگے پیچھے سرے سے کوئی عبارت ہی نہیں۔

پھر "جعلی مہر" بھی وضاحت طلب ہے۔ اگر مفتی صاحب نے دستخط کیے تھے تو مہر کی کیا ضرورت۔ اور اگر دستخط کے بجائے مہر لگا دی تھی تو وہ جعلی کیسے ہوئی۔

④ مولانا سید نذیر حسین صاحب کے متعلق بیانات مختلف ہیں۔ سرسید اور شمس العلماء دونوں نے اُن کو مخالف قرار دیا۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی تحقیق بھی یہی ہے کہ:

"حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ کے شاگردوں میں سے مولانا سید نذیر حسین صاحب اور مولانا شیخ محمد تھانوی وہ بزرگ ہیں جو سلطان دہلی کی لڑائی میں غیر جانب دار رہے"۔ (۱۸۰)

منشی محمد جعفر تھانیسری نے تو ان کے متعلق بہت ہی سخت (۱۸۱) الفاظ لکھے ہیں بایں ہمہ اس موقع پر نہیں تو مقدمہ انبالہ کے سلسلہ میں راولپنڈی میں ایک سال تک یہ بھی نظر بند رہے۔ (۱۸۲)

بہر حال فتویٰ کے دستخطوں میں اس نام کے متعلق یہ بیان اہمیت اختیار کر لیتا ہے کہ کچھ دستخط جبراً ہوئے۔ اگرچہ ہمیں اب بھی اطمینان نہیں، جس کی وجہ چند سطروں کے بعد ظاہر ہوگی۔

⑤ سرسید اور شمس العلماء دونوں کی تحریروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علماء کرام بادشاہ کے حامی نہیں تھے اور شاہی خاندان کے متعلق بھی وہ اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ شمس العلماء کے الفاظ میں "وہ اُن کو خول خبط جانتے تھے"۔

⑥ ان باتوں میں اتفاق کے باوجود ایک نہایت اہم اور نازک مسئلہ میں سرسید اور شمس العلماء کی مذکورہ بالا تحریریں مختلف ہیں۔ سرسید صاحب فرماتے ہیں کہ "جب کہ مسلمان ہماری گورنمنٹ کے مستامن تھے، کسی طرح گورنمنٹ کی عملداری میں جہاد نہیں کر سکتے تھے"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان انگریزوں کو ہندوستان کا جائز حکمران تسلیم کر چکے تھے۔ لہٰذا اس کی مخالفت

غدر اور بغاوت تھی، جو جائز نہیں ہو سکتی اور نہ اس کو جہاد کہا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، انگریز ڈپلومیسی یہی سبق دے رہی تھی۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء تک کم از کم دہلی کے علماء نے اس سبق کو ذہن نشین نہیں کیا تھا۔ وہ انگریزوں کو غاصب اور متغلب ہی سمجھتے تھے۔ سر سید کی تحریر کے خلاف شمس العلماء نے ایک جگہ اختلاف کی وجہ یہ تحریر کی۔

''شرائط جہاد موافق مذہب اہل اسلام موجود نہیں''۔

شمس العلماء کے بیان کے بموجب مولانا محبوب علی صاحب اور خواجہ ضیاء الدین صاحب نے یہی وجہ بیان کی تھی۔

اس توجیہ اور استدلال کا مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کو جائز حکمران تو نہیں مانا جاتا۔ مگر چونکہ مقابلہ کی طاقت نہیں ہے، اس لئے جہاد کا فتویٰ بھی نہیں دیا جاتا۔

اصل حقیقت

● مذکورہ بالا تفصیلات کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ابتداء میں اسی نظریہ پر اتفاق رہا جو پچاس سال پہلے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے پیش کیا تھا۔ جس کی کامیابی کے لئے حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ اور اُن کے پاک باز رفقاء نے جانیں قربان کی تھیں اور جو مسلمانوں کے دماغوں میں راسخ ہو چکا تھا کہ:

> ''ہم ہندوستانی ہیں۔ ہندوستان ہمارا وطن ہے۔ سات سمندر پار سے انگریز سوداگری کی غرض سے ہندوستان آئے۔ حکومت ہند نے اُن کو تجارت کی اجازت دی۔ ان غیر ملکیوں نے غیر ملکی رہتے ہوئے رفتہ رفتہ ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ یہ قبضہ بالجبر اور یہ تسلط غاصبانہ ہے۔ باشندگان وطن کا فرض ہے کہ اس بیرونی طاقت سے وطن عزیز کو آزاد کرائیں''۔

اس نظریہ کی بنا پر جب یہ موقع آیا کہ کچھ فوجیں برگشتہ ہوئیں اور ملک کو آزاد کرانے کے لئے انہوں نے جان کی بازی لگا دی تو اب پس و پیش کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور نہ اس واضح مقصد کے لئے فتوے کی ضرورت تھی۔

لیکن آغاز تحریک (یعنی ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء) سے چند روز بعد ہی یہ صورت پیش آئی کہ ایک طرف جن کو زمام قیادت سپرد کی گئی تھی، اُن میں قیادت و سیادت کی صلاحیت نہیں تھی اور دوسری جانب انگریز کے خفیہ حامی جو نہایت خاموشی سے شہر میں کام کر رہے تھے، اُن کی طرف سے بددلی کو لگنے والا سوال اُٹھا دیا گیا کہ ہماری طاقت غیر قابل اعتماد ہے اور ممکن ہے بادشاہ کی اہلیت و صلاحیت کا سوال بھی پیدا کر دیا گیا ہو، تب لامحالہ علماء کی رائے میں اختلاف ہو گیا۔ اور مان لیجئے کہ حضرت شاہ اسحاق صاحب اور حضرت مولانا عبدالغنی صاحب رحمہما اللہ سے تعلق رکھنے والے علماء، جو بادشاہ کو بدعتی، ضعیف الرائے اور نااہل سمجھتے تھے، وہ کنارہ کش ہونے لگے۔ چند روز بعد جب ۲ رجولائی ۱۸۵۷ء کو جنرل بخت خاں فوج، اسلحہ اور نقد رقم لے کر مولانا سرفراز علی صاحب اور دوسرے علماء کے ساتھ دہلی پہنچ گیا اور بادشاہ نے کمانڈر انچیف اور نائب السلطنت کی حیثیت دے کر اختیارات اُس کے سپرد

کر دیئے۔ یہاں تک کہ بیرونِ دہلی انقلابی افواج کو بادشاہ کی جانب سے ہدایات جنرل بخت خاں ہی دینے لگے، تو جہاں تک بادشاہ کی نااہلیت وغیرہ کا سوال تھا وہ خود بخود ختم ہو گیا۔ کیونکہ جنرل بخت خاں اور اُس کے پیرو مرشد مولانا سرفراز خاں صاحب اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے جس کو بادشاہ کے متعلق اعتراض تھا۔ جنرل بخت خاں، مولانا سرفراز علی صاحب کے معتقد تھے اور مولانا سرفراز علی صاحب حضرت سید صاحب سے وابستہ تھے، اور گورکھپور کے علاقہ میں حضرت سید صاحب کے نام پر بیعت لیتے رہے تھے۔

اب صرف ایک سوال باقی رہ گیا۔ یعنی کیا ہم میں طاقت، مقاومت اور قوت مقابلہ اس درجہ کی ہے کہ ہم فتح پاسکیں یا نہیں؟ اسی پر غور کرنے کے لئے جامع مسجد میں اجتماع کیا گیا۔ مولانا محبوب علی صاحب کی رائے اس وقت بھی یہی رہی کہ ہم میں قوت مقابلہ نہیں ہے لہٰذا شرط جہاد اسلامی اصول کے مطابق نہیں پائی جاتی، اور وہ اسی رائے پر آخر تک باقی رہے۔ مگر خواجہ ضیاء الدین صاحب نے پہلے مخالفت کی۔ پھر آپ بھی متفق ہو گئے۔ چنانچہ فتوے پر آپ کے دستخط موجود ہیں۔

بہر حال دستخط کے وقت نہ مرعوبیت تھی نہ جبر و قہر۔ بلکہ سوچ سمجھ کر بحث و تحمیص کے بعد دستخط کئے گئے۔ ہاں ناکامی کے بعد جب دارو گیر کا سلسلہ شروع ہوا تو ممکن ہے کچھ علماء نے جبر کا عذر پیش کر دیا ہو۔

اب آپ وہ فتوے ملاحظہ فرمایئے جس کی تمہید کا طویل سلسلہ چند صفحات سے چل رہا ہے۔ سوال و جواب کی عبارت پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس وقت اربابِ فتوٰی اور اہلِ علم کے سامنے نہ یہ تصور ہے کہ انگریز حاکم ہے، اور ہم اس کی مستامن رعایا۔ نہ بادشاہ اور خاندان تیموریہ کی اہلیت یا نااہلیت کا مسئلہ پیش نظر ہے، اور نہ یہ بات سامنے ہے کہ انگریز اگر قابض ہو گئے تو زن و بچہ کا استیصال کر دیں گے۔ یہ سب نکتے بعد الوقوع اور اُن مصنفین کے تصنیف فرمودہ ہیں جو بارگاہ انگریز میں خطابات سے سرفراز ہوئے۔ سوال اُس وقت صرف ایک تھا کہ آیا ہم میں مقابلہ کی طاقت ہے یا نہیں؟ چنانچہ عبارت سوال یہ ہے۔

☆

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلی پر چڑھ آئے اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں، اس صورت میں اب شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟ اور اگر فرض ہے تو وہ فرض عین ہے یا نہیں؟ اور وہ لوگ جو اور شہروں اور بستیوں والے ہیں اُن کو بھی جہاد کرنا چاہیے یا نہیں۔ بیان کرو، اللہ تم کو جزاء خیر دے۔

☆

درصورت مرقومہ فرض عین ہے، اُوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے۔ چنانچہ اب اس شہر والوں کو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے بسبب کثرت اجتماع افواج کے اور مہیا اور موجود ہونے آلات حرب کے۔ تو فرض عین ہونے میں کیا شک

رہا۔ اور اطراف واحوال کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ ہاں اگر اس شہر کے لوگ باہر ہو جائیں، مقابلے سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں اُن پر بھی فرض ہو جاوے گا۔ اور اسی طرح اور اسی ترتیب سے سارے اہل زمین پر شرقاً اور غرباً فرض عین ہوگا۔ اور جو عدو اُور بستیوں پر ہجوم اور قتل وغارت کا ارادہ کریں، تو اس بستی والوں پر بھی فرض عین ہو جائے گا بشرطاً اُن کی طاقت کے۔ العبد المجیب احقر: نور جمال عفی عنہ

اس فتوے کا عکس جو سوتنتر دہلی (۱۸۳) اور نوائے آزادی (۱۸۴) میں شائع ہوا ہے اس میں اس جواب کے نیچے مندرجہ ذیل علماء کے دستخط اور مہریں بھی ہیں۔

(۱) سید محمد نذیر حسین۔ (۲) رحمت اللہ۔ (۳) مفتی محمد صدر الدین۔ (۴) مفتی اکرام الدین معروف سید رحمت علی۔ (۵) محمد ضیاء الدین (۶) عبد القادر۔ (۷) فقیر احمد سعید احمدی۔ (۸) محمد میر خاں (یا میر محمد خاں یا میر خاں محمد)۔ (۹) محمد عبد الکریم۔ (۱۰) فقیر سکندر علی۔ (۱۱) محمد کریم اللہ۔ (۱۲) مولوی عبد الغنی۔ (۱۳) خادم العلماء محمد عبد الغنی۔ (۱۴) فرید الدین۔ (۱۵) محمد سرفراز علی۔ (۱۶) سید محبوب علی جعفری۔ (۱۷) ابو احمد محمد حامی الدین۔ (۱۸) سید احمد علی۔ (۱۹) الٰہی بخش۔ (۲۰) محمد مصطفیٰ خاں ولد حیدر شاہ نقشبندی۔ (۲۱) محمد انصار علی۔ (۲۲) مولوی سعید الدین۔ (۲۳) حفیظ اللہ خاں۔ (۲۴) محمد نور الحق عفی عنہ۔ (۲۵) سراج العلماء ضیاء الفقہاء مفتی عدالت العالیہ محمد رحمت علی خاں۔ (۲۶) واللہ الغنی وانتم الفقراء۔ (۲۷) حیدر علی۔ (۲۸) سیف الرحمٰن۔ (۲۹) سید عبد الحمید عفی اللہ عنہ۔ (۳۰) محمد ہاشم۔ (۳۱) یا سید حافظ (۳۲) محمد امداد علی عفی عنہ۔ (۳۳) خادم شرع شریف رسول الثقلین قاضی القضاۃ محمد علی حسین۔

نیچے تحریر ہے: حسب فرمان واجب الاذعان شاہی در مجمع المطابع دہلی جمیل الدین خاں مہتمم طبع نمود۔

دستخطوں یا مہروں میں جو الفاظ لکھے ہوئے ہیں، وہ بجنسہٖ سطور بالا میں درج کر دیے گئے ہیں۔ لہٰذا جناب مولانا مفتی صدر الدین صاحب کے متعلق جو روایت مشہور ہے کہ آپ نے دستخط سے پہلے شہدت بالجبر بھی لکھ دیا تھا اور ناکامی تحریک کے بعد جب آپ سے باز پرس کی گئی تو آپ نے اپنی معذرت میں پیش کر دیا کہ میں نے خود ہی لکھا ہے۔ شہدت بالجبر یعنی یہ دستخط جبراً کیے ہیں۔ پس یہ معذرت قبول ہوئی اور آپ بری کر دیے گئے۔ صرف کچھ جائداد ضبط ہوئی۔

مذکورہ بالا عکس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت بے حقیقت ہے ظرافت یا کسی رقابت کی بناء پر اختراع کی گئی ہے۔

شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب نے مولانا رحمت اللہ صاحب کے متعلق تحریر فرمایا ہے:

اس دانش مند مولوی کے نزدیک "دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی، بلکہ ایک ہنگامہ فساد برپا تھا"۔

شمس العلماء کا یہ خیال بھی غلط ہے۔

حضرت مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی کے دستخط بھی اس فتوے پر نہیں ہیں کیونکہ مولانا موصوف اس فتوے کی ترتیب اور جامع مسجد کے اجتماع سے کئی ہفتہ بعد وسط اگست میں دہلی تشریف لائے تھے۔

نظم و تنظیم انقلابی جماعتیں

تحریک حضرت سید شہیدؒ کے باقیات اور وہابی مجاہدین

نظم و تنظیم

یہ حقیقت کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جو انقلابی معرکے ہوئے، اُن میں نظم نہیں رہا تھا۔ نظم وضبط سے محرومی کا پہلا نشان تو یہ ہے کہ طے شدہ وقت سے تقریباً تین ہفتہ پہلے یہ آتش فشاں میرٹھ میں پھٹ گیا۔ اس کے بعد جہاں جہاں شعلے بھڑکے، اُن کا وقت ایک نہیں تھا۔

مثلاً تحریک کے ابتداء کے لئے ۳۱ مئی کی تاریخ مقرر تھی اور یہ بھی طے تھا کہ جہاں جہاں اقدام ہوگا، ایک ہی تاریخ میں ہوگا۔ مگر جذبات اس طرح بے قابو ہوئے کہ ۳۱ مئی کا انتظار ناممکن ہو گیا۔

پھر میرٹھ میں اگر ۱۰ مئی کو یہ بے قابو جذبات برافروختہ ہو گئے تھے تو کان پور، لکھنؤ وغیرہ میں ڈیڑھ دو ماہ تک افسردہ پڑے رہے اور جب وہ شعلہ بار ہوئے تو اس طرح کہ وحدت مقصد اور غائبانہ ہمدردیوں کے علاوہ ضابطہ کا کوئی رابطہ آپس میں قطعاً نہ تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ بے ربطی اس بناء پر تھی کہ یہ تحریک ابتداء ہی سے نظم وضبط اور باہمی ربط سے نا آشنا تھی یا جذبات کی فراوانی اور ناتجربہ کاری نے نظم وضبط کے دھاگے توڑ ڈالے تھے۔ انگریز مؤرخین کا اصرار یہی ہے کہ یہ تحریک نظم وضبط سے قطعاً نا آشنا تھی۔ اُن کے نزدیک اس تحریک کی حقیقت سرکش فوجوں کی وقتی ہنگامہ آرائی سے زیادہ نہ تھی۔ اُن کو یہ اصرار اس لئے بھی ہے، کہ پہلے سے کسی تنظیم کا اعتراف انگریزی افسروں کی نااہلیت کا ثبوت بن جاتا تھا۔ اور انگریز افسروں کا تکبر وغرور اس کو گوارا نہیں کرتا تھا کہ پہلے سے کسی خفیہ تنظیم کا اعتراف کر کے اپنی نااہلیت اور غفلت کو تسلیم کریں۔ اور خود اُن کے ہم رنگ و ہم نسل ہزاروں انگریز جوان معرکوں میں ہلاک ہوئے تھے، اُن کے خون کا بار اپنی گردن پر لیں۔ اسی بناء پر وہ تمام واقعات جو تنظیم کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔ انگریز افسروں اور (اُن کی تائید کرتے ہوئے) انگریز مؤرخین نے اُن کی توجیہ کر دی۔ مثلاً:

چپاتیوں اور کنول کے پھول وغیرہ کی تقسیم کو ہندوستانیوں کی اوہام پرستی کا نتیجہ قرار دیا اور آٹے میں ہڈیوں کی راکھ ملا دینے کے الزام یا اس قسم کے اور پراپیگنڈوں کو جو بانیانِ تحریک کی طرف سے ملک میں پھیلائے گئے، اُن کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

تنظیم کا اعتراف

ونائک دامودر ساورکر غالباً سب سے پہلے مصنف ہیں جنہوں نے انگریزی اثرات سے آزاد ہو کر اس

تحریک کی تاریخ مرتب کی۔ آپ کی رائے یہی ہے کہ خفیہ تنظیمات نے اس تحریک کی پرداخت کی تھی۔ آپ نے ایک مستقل باب میں خفیہ تنظیمات کا تذکرہ کیا ہے۔ آپ کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ:

دھوندو پنت نانا اور اُن کے مشیر خاص عظیم اللہ خاں نے اس تحریک کی داغ بیل ڈالی۔

''عظیم اللہ خاں جو یورپ کا سفر کر چکے تھے اور روس پہنچ کر ایک میدان جنگ کا مشاہدہ بھی کر چکے تھے، اُنہوں نے بیرونی ممالک سے بھی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ نانا صاحب نے اپنے خاص قاصد ہندوستان بھر میں بھیجے۔ بہت سے آدمیوں کو فقیروں، پنڈتوں اور سنیاسیوں کے بھیس میں ملک کے فوجی اور غیر فوجی حلقوں میں بھیجا۔ مسلمانوں کے لئے علماء کرام کا تعاون حاصل کیا''۔

ساورکر کی یہ رائے اُن واقعات پر مبنی ہے جو اس زمانہ میں ظہور پذیر ہوئے جن کا اقرار وہ بھی کرتے ہیں جنہیں خفیہ تنظیمات سے انکار ہے۔ مثلاً لارڈ رابرٹس نے لکھا ہے کہ عظیم اللہ خاں کے متعدد خطوط میں دو خط عمر پاشا کے نام تھے جو قسطنطنیہ کا ایک فوجی افسر تھا۔ نانا صاحب واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد لکھنؤ گئے، جہاں اُن کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔

میرٹھ میں ایک فقیر پہنچا۔ اُس کے ساتھ اُس کے پیرو بھی تھے اور سفر کے لئے ہاتھی گھوڑے اور بہت سی سواریاں تھیں۔ اُس کے ساتھ فوج کے سپاہی بھی جاتے رہتے تھے۔ پولیس کو اُس کے متعلق شبہ ہوا تو اس نے میرٹھ سے چلے جانے کا حکم دیا۔ وہ میرٹھ سے چلا گیا۔ مگر اپنے اثرات چھاؤنی کے سپاہیوں میں چھوڑ گیا۔

مدراس میں ایک برہمن پکڑا گیا۔ اُس کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ کیونکہ وہ فوجوں کو اُکسا رہا تھا۔ علی گڑھ میں بغاوت کی آگ ایک برہمن کو پھانسی دینے سے بھڑکی۔ اُس کا جرم بھی یہی تھا۔ جب اُس کے پھانسی دی جاچکی۔ تو ایک سپاہی نے پکار کر کہا۔ یہ ''دین'' کی خاطر شہید ہوا۔ اس پر دوسروں کے جذبات بھڑک اُٹھے یہاں تک کہ انگریز علی گڑھ سے فرار ہونے پر مجبور ہو گئے۔

شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''ہندوؤں کے پنڈت، مسلمانوں کے مولویوں کی نسبت انگریزوں سے عداوت کرنے میں کچھ کم نہیں تھے۔ کئی دفعہ انہوں نے پتروں کو دیکھ بھال کر لڑنے کی شبھ مہورت نکال کر تلنگوں کو بتلائے اور اُن کو یقین دلایا کہ ان میں اگر لڑنے جاؤ گے تو فتح پاؤ گے۔ ایک عجیب تماشا چاندنی چوک اور بازاروں میں یہ دیکھنے میں آتا تھا کہ پنڈتوں کے ہاتھ میں پوتھیاں ہیں اور وہ ہندوؤں کو دھرم شاستروں کے احکام سنا رہے ہیں کہ انگریز ملکشوں سے لڑنا چاہیے جب لڑائیوں میں تلنگوں کی لاشیں چارپائیوں پر اُن کے سامنے آتیں تو وہ ہندوؤں کو اُپدیش دیتے کہ ان سرگ باشیوں کی طرح سرگ میں چلے جاؤ۔ جن کے لئے نہ ارتھی کی ضرورت ہے نہ کرم کریا کی۔ (تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۷۲)

شمس العلماء پنڈتوں کے اس اشتعال کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ انگریزی تعلیم اور ان قوانین سے جو متعدد رسومات کے متعلق وضع کیے جا چکے تھے پنڈتوں کے وقار اور ان کی عزت وعظمت میں کمی آرہی تھی۔ لیکن ظاہر ہے اس سے کسی تنظیم کی نفی نہیں ہو سکتی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ بانیان تنظیم نے پنڈتوں کے اس اشتعال سے فائدہ اٹھا کر ان کو آمادہ کار کر دیا ہو ان کے علاوہ آٹے میں ہڈیوں کی راکھ ملانے کا پراپیگنڈہ اور اس قسم کے اور واقعات سا ور کر کے خیال کی تصدیق کرتے ہیں کہ ایک خفیہ تنظیم کام کر رہی تھی۔

جہادی تنظیم کے اثرات

یہ ایک ایسی تنظیم کی بحث ہے جس کو ۱۸۵۷ء کی تحریک اور اس سلسلہ کے پراپیگنڈے کا ذمہ دار قرار دیا جا سکے۔ لیکن اس کے علاوہ ملک میں دو تنظیمیں اور تھیں جنہوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اس تحریک کو مدد پہنچائی۔ مگر ان دونوں کا تعلق مسلمانوں کے علماء اور مذہبی طبقہ سے تھا جس کو بدقسمتی سے اس زمانہ میں وہابی کہا جاتا تھا، اور جہاد آزادی کی مناسبت سے لفظ جہادی کا اور اضافہ کر دیا گیا تھا۔ شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب اور دوسرے مؤرخین جگہ جگہ وہابی جہادیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ مثلاً شمس العلماء کا ارشاد ہے:

(۱) سو دو سو کے قریب وہابی جہادی بن کر ٹونک سے آئے۔

(۲) جے پور، ہانسی، حصار، بھوپال سے بھی جہادی آئے۔ تین چار سو جہادیوں کا مجمع ہو گیا۔

(۳) دہلی میں جب باغی سپاہ کے افسر اعلیٰ بخت خاں وغوث محمد خاں و مولوی امام خاں رسالدار جمع ہوئے اور ان کے ساتھ مولوی عبدالغفار اور مولوی سرفراز علی آئے، تو پھر وہابیوں کا اجتماع دہلی میں شروع ہوا، اور مولوی سرفراز علی جہادیوں کے میر لشکر اور بخت خاں اس کا معاون ہوا۔ (۱۸۵)

(۴) الہ آباد سے مولوی لیاقت علی خاں جہادیوں کے سرغنہ کی عرضی آئی۔ (۱۸۶)

(۵) غلام معین الدین رسالدار نے بادشاہ کو عرضی دی کہ فدوی ٹونک سے تقریباً پانچ سو آدمیوں کے ساتھ آیا۔ ان کو سپاہ کی صورت میں مرتب کیا۔ اور پندرہ سو اور جہادی غازی یا شہید بننے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ (۱۸۷)

منشی جیون لال کے روزنامچہ میں بار بار جہادیوں کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً ۲۵ جون ۱۸۵۷ء: گوڑ گاؤں اور قرب و جوار کے دوسرے علاقوں سے چار سو مجاہدین دہلی میں آئے۔

۳۰/جون ۱۸۵۷ء: پانچ سو مجاہد انگریزوں کے پاس سے ایک ہاتھی چھین کر لائے اور اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔

۲ جولائی ۱۸۵۷ء بخت خاں نے اطلاع دی کہ شہر کے باہر میں حسب ذیل فوج کے ساتھ لڑنے کی تیاری کر رہا ہوں۔

چار پیدل فوجیں۔ سات سو سوار۔ چھ بھاری توپیں جنہیں کھینچنے کے لیے گھوڑے استعمال کئے جاتے ہیں۔ تین میدانی توپیں۔ ایک سو مجاہدین۔

۹ر جولائی ۱۸۵۷ء: جنرل بخت خاں نے سواروں اور پیدل فوج کے سپاہیوں کے ساتھ انگریزی کیمپ میں گھس کر حملہ کیا اور بہت سے افسروں اور سپاہیوں کو تہ تیغ کر دیا۔ کہتے ہیں، تو مچیوں نے جنرل بخت خاں کو پہچان لیا۔ اس معرکہ میں جہادی بھی شریک تھے۔

۲۱ جولائی ۱۸۵۷ء: ٹونک سے چھ مجاہد آئے اور آج بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ ابھی دو ہزار مجاہد اور آنے والے ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا۔ میرے پاس تم لوگوں کے رسد کا انتظام نہیں ہے۔

۲۴ر جولائی ۱۸۵۷ء: نجیب آباد سے تقریباً دو سو جہادی آئے اور شہر کے باہر قیام پذیر ہوئے۔

۳۱ر جولائی ۱۸۵۷ء جہادیوں کا ایک قائد اعظم ٹونک سے آیا اور بادشاہ کی خدمت میں نذر پیش کی۔

۳۱ر جولائی ۱۸۵۷ء: میر فیض علی نے معروضہ پیش کیا کہ جہادی بھوکے مر رہے ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا۔ انہیں کھلانے کے لیے میرے پاس روپیہ نہیں رہا۔ فیاض نے کہا۔ شہر والوں کو حکم دیجئے کہ وہ ان کے کھانے کا بندوبست کریں۔

۴ر اگست: نصیر آباد سے چند جہادیوں کا معروضہ موصول ہوا کہ چھ ہزار سپاہی ایک دل ایک جان ہو رہے ہیں۔

۵ر اگست: جہادیوں نے شکایت کی کہ صرف ہم ہی ایسے ہیں جو انگریزوں سے نہایت جوش کے ساتھ لڑتے ہیں، اور فوج کے آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔

۹ر اگست: مولوی صدر الدین خاں کے مکان پر آج پچاس سپاہیوں نے یورش کر دی لیکن یہ دیکھ کر کہ وہاں ۷۰ جہادی مقابلہ کیلئے تیار ہیں، واپس ہو گئے۔

۲۰ر اگست: محمد میر خاں کے صاحبزادے بڈھن نے آج جہادیوں میں دو ہزار روپے کی رقم تقسیم کی۔

۲ر ستمبر: خبر ملی کہ چند ہزار جہادی مولوی جلال الدین کی سرکردگی میں کھلے میدان میں لڑنے کے لیے نکلے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی اور ان کے کئی سو ساتھی مارے گئے۔

۱۴ر ستمبر: گوروں اور سکھوں کی فوج ہمت کر کے جامع مسجد پہنچ گئی۔ جامع مسجد میں پردیسی مسلمان جمع تھے۔ انہوں نے انگریزوں پر حملہ کیا اور ان کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ (اس واقعہ کی تفصیل آئندہ آئے گی۔ انشاء اللہ)۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے جن میں جہادی مجاہدین یا وہابی جہادی کے الفاظ آئے ہیں، ثابت ہوتا ہے:

(۱) دہلی کے بھی کچھ مسلمان ایسے تھے جن کو وہابی جہادی کہا جا سکتا تھا۔

(۲) باہر سے جہادیوں کی آمد ۲۵ر جون سے شروع ہوئی۔

(۳) ان کی تعداد کئی ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

(۴) بادشاہ نے ان کے مصارف کی ذمہ داری نہیں لی۔

(۵) یہ وہابی جہادی مولانا مفتی صدرالدین صاحب سے خاص تعلق رکھتے تھے، یہاں تک کہ اُن کی حمایت وحفاظت میں لڑنے کے لئے آمادہ ہوگئے۔

(۶) یہ جہادی زیادہ تر گوڑگانوہ کے قرب وجوار ہانسی، حصار نیز جے پور، بھوپال، نصیرآباد، نجیب آباد اور ٹونک سے آئے تھے۔

ان اقتباسات اوران کے نتائج ملاحظہ کرنے کے بعد دو باتیں قابلِ توجہ ہیں۔

(۷) مولانا نصیرالدین صاحب دہلی کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اب آپ اس طرف توجہ فرمایئے کہ جب مولانا موصوف ہجرت کر کے سندھ تشریف لے گئے تو آپ نے کہاں کہاں قیام فرمایا تھا۔

پہلے گزر چکا ہے کہ مکان سے روانہ ہوکر عرب سرائے میں قیام رہا۔ پھر آپ ریواڑی تشریف لے گئے۔ عیدالاضحیٰ کی نماز آپ نے ریواڑی میں ادا کی۔ ایک ہفتہ سے زیادہ قیام فرما کر ۱۵ ذی الحجہ کو یہاں سے روانہ ہوئے۔ یہی علاقہ ہے جس کو گوڑگانوہ کے قرب وجوار سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ہانسی، حصار اور رہتک بھی اسی علاقہ کے خاص خاص مقامات ہیں۔

حضرت مولانا نصیرالدین صاحب کے راستہ کی منزلوں میں جے پور، ٹونک اور اجمیر کے نام بھی خاص طور پر ذکر کئے گئے ہیں۔ جے پور میں ایک ہفتہ اور اس سے بھی زیادہ ٹونک میں قیام رہا۔ یہاں کے قیام کی مختصر روئداد یہ ہے۔

> نواب وزیرالدولہ (فرماں روائے ٹونک) نے اعلیٰ پیمانہ پر مہمان داری کی۔ ایک روز دعوت میں اپنے اعزہ واقارب، عمائدین ریاست اور بہت سے احباب کو شریک کیا۔ پھر سب نے صفیں باندھ کر مولانا سید نصیرالدین صاحب کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ اس موقع پر (والئے ٹونک) نواب وزیرالدولہ نے فرمایا۔ حضرت امیرالمؤمنین (حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ) ٹونک تشریف لائے تھے، تو میں تحصیل علوم سے فارغ نہیں ہوا تھا۔ آپ تشریف لے گئے۔ مجھے ہوش آیا تو اپنی محرومی پر حد درجہ افسوس ہوا۔ میں نے بہت سے درویشوں کو دیکھا، جو فیض سید صاحب سے پایا، وہ کسی دوسری جگہ سے حاصل نہیں ہوا۔ مولانا سید نصیرالدین صاحب میں اسی فیض کا پرتو نظر آتا ہے۔
> مولانا سید نصیرالدین صاحب ٹونک سے روانہ ہوئے تو بہت سے اسلحہ، بار برداری کی سواریاں، اُونٹ، خچر اور اعلیٰ قسم کے متعدد گھوڑے پیش کیے گئے۔

یہی ٹونک ہے جہاں سے مجاہدین کی آمد کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ اُن کی تعداد دو ہزار یا دو ہزار سے زیادہ ہوجاتی ہے۔

نصیرآباد، جہاں سے ایک فوج باغی ہوکر پہلے پہنچ چکی ہے اور چھ ہزار مجاہدین بادشاہ کی اجازت کے

منتظر بیٹھے ہیں۔

یہاں حضرت مولانا سید نصیر الدین صاحب یا اُن کے شیخ حضرت سید احمد شہیدؒ نہیں تشریف لے جاسکے، اور غالباً اس علاقہ میں جانا ممکن بھی نہیں تھا کیونکہ یہ تمام علاقہ فوجی تھا۔ البتہ اس کے مرکزی شہر "اجمیر شریف" میں حضرت مولانا سید نصیر الدین صاحب نے ایک مہینہ کے قریب قیام فرمایا تھا۔

ان تفصیلات کے بعد اس دور کی تاریخ کے دقیق النظر محقق و مبصر حضرت مولانا عبیداللہ سندھی قدس اللہ سرہ العزیز کے مختصر ارشادات ملاحظہ فرمایئے۔ اپنی مشہور تصنیف "شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک" میں فرماتے ہیں۔

"الصدر الحمید (مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب) مکہ معظمہ میں اپنے بھائی مولانا محمد یعقوب دہلوی کو اپنے ساتھ لے گئے اور دہلی میں مولانا مملوک علی صاحب کی صدارت میں مولانا قطب الدین دہلوی مولانا مظفر حسین کاندھلوی، مولانا عبدالغنی دہلوی کو ملا کر ایک بورڈ بنادیا، جو اس نئے پروگرام کی اشاعت کرکے نئے سرے سے جماعتی نظام پیدا کرے گا۔ ص ۱۸۱

مولانا مملوک علی (۱۸۸) سرکاری مدرسہ کے ملازم تھے، اُن کی نگرانی میں یہ کام شبہات سے بالا رہ کر چل سکتا تھا۔ ورنہ ریزیڈنٹ کی نظر نہایت تیز تھی۔ اب مولانا مملوک علی صاحب کو آزاد کام کرنے والے ساتھیوں کی ضرورت تھی۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت شاہ اسحاق صاحب کے مدرسہ کے پرانے طالب علم اور اُن کے (شاہ اسحاق صاحب کے) داماد مولانا سید نصیر الدین صاحب کے شاگرد تھے۔ اُن کی طبیعت عالمانہ رنگ کی نہ تھی۔ امیر شہید (حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ) سے ملتی جلتی طبیعت رکھتے تھے۔ اس لئے وہ سید صاحب کا نمونہ تھے۔ مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد اُن کے ساتھ اس طرح کام کرتے رہے جیسے امیر شہید کے ساتھ مولانا عبدالحی اور مولانا شہید (مولانا اسمٰعیل صاحب) تھے۔ ص ۱۸۲

اس جماعت کی صدارت سب سے پہلے استاذ اساتذۃ الہند مولانا مملوک علی صدر مدرس دہلی کالج کے لئے مخصوص رہی۔ اُن کے بعد مولانا محمد اسحٰق صاحب نے (جو بقول مولانا سندھی مکہ معظمہ میں بیٹھ کر ہندوستانی تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے ص ۱۸۳) مولانا امداد اللہ کو اس کام کے لئے مقرر کیا۔ ص ۱۸۳

یہ دہلوی جماعت اس وقت تک اپنے گھر میں کام کرتی رہی جب تک دہلی کا شاہی اقتدار بحال رہا۔ ص ۱۸۵

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے دیوبندی نظام کی حقیقت اور اُس کی سیاسی مصلحت پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ اشارات کیے ہیں۔ اس لئے انہوں نے صرف وہی نام یہاں ذکر کیے ہیں جو دارالعلوم دیوبند کے بانی

اور معمار تھے، اور اس بنا پر یہ واضح نہ ہو سکا کہ دوسرے مقامات کے جن علما کرام نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں حصہ لیا، اُن کا تعلق حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ یا اس نظام سے کیا تھا۔ لیکن اتنی بات واضح ہے کہ جن علماء کرام نے اس تحریک میں حصہ لیا اُن میں سے اکثر و بیشتر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز یا حضرت سید احمد شہیدؒ سے عقیدت یا تلمذ کا رابطہ رکھتے تھے۔

مثلاً مولانا سرفراز علی صاحب جن کو ذکا واللہ خاں صاحب نے بخت خاں کا سرپرست و مربی قرار دیا ہے، جو امیر جہاد بنائے گئے تھے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے داعی تھے۔ ایک عرصہ سے گورکھ پور کے اطراف میں انگریزوں کے خلاف خفیہ طور پر بیعت جہاد لے رہے تھے۔ (۱۸۹)

مولانا لیاقت علی صاحب جن کو الہ آباد کا امیر اور گورنر بنایا گیا تھا، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز سے بالواسطہ تلمذ رکھتے تھے۔

اسی طرح مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی صدر الدین صاحب، مولانا پیر محمد صاحب (پٹنہ) مولانا فیض احمد صاحب فیض اور دوسرے سربرآوردہ علماء مجاہدین حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب قدس اللہ سرہ العزیز یا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب یا حضرت سید احمد صاحب شہید یا مولانا نصیر الدین صاحبؒ سے رابطہ اور تعلق قائم کیے ہوئے تھے۔ (تفصیلات کتاب کے دوسرے جز میں ملاحظہ فرمایئے)

بہر حال یہ ایک تنظیم تھی جس کے اثرات دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت کی محرک تو نہیں تھی لیکن تحریک شروع ہونے کے بعد جان کی بازی لگا کر اس کو کامیاب بنانے کی کوشش کرتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کے اکثر افراد شہید ہو گئے جو باقی بچے وہ ہجرت پر مجبور ہوئے۔ ورنہ حبس دوام اور قید و بند کی سنت یوسفی پر عمل کرنے کے بعد ابدی سرفرازی حاصل کی۔

دوسری تنظیم

جو اس تحریک کے زمانہ میں موجود تھی، وہ تنظیم ہے جس کو وہابی تحریک کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے جس کا مرکز "صادق پور" تھا۔ یہ تنظیم بحیثیت تنظیم تحریک سے الگ رہی۔ بلکہ اگر مولانا عبدالرحیم صاحب مصنف "الدر المنثور" کا قول صحیح تسلیم کیا جائے تو یہ تنظیم ۱۸۵۷ء کی تحریک کی مخالف رہی۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس کے کچھ افراد نے انفرادی طور پر اس تحریک میں حصہ لیا اور تنظیم بہ حیثیت تنظیم ہندوستان میں نہیں تو اُس کی سرحد پر وہ سب کچھ کرتی رہی جو انقلابی فوجوں نے ہندوستان کے اندر کیا۔ تفصیلات شاندار ماضی کی تیسری جلد میں بیان کی جا چکی ہیں، جو قابل مطالعہ ہیں یہاں صرف ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ جب جانبازانِ حریت حدود ہند میں چپہ چپہ کو خونِ شہادت کا لالہ زار بنا رہے تھے تو خاص اُس وقت یا اس سے کچھ پہلے اور بہت بعد تک اس تنظیم کے سرفروش مجاہد کس طرح اپنی قربانیاں پیش کرتے رہے۔ مسلمانانِ ہند

کی سیاسیات کے ریسرچ ڈاکٹر ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر کا ارشاد ہے۔

میں اُن بے عزتیوں، حملوں اور قتل و غارت کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا جو ۱۸۵۶ء میں سرحدی جنگ کا باعث ہوئے۔ اس دوران میں مذہبی دیوانوں نے سرحدی قبائل کو انگریزی حکومت کے خلاف متواتر اُکسائے رکھا، ایک ہی بات سے حالات کا بڑی حد تک اندازہ ہو جائے گا۔ یعنی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ہم علیحدہ علیحدہ سولہ فوجی مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے۔ جس سے باقاعدہ فوج کی تعداد ۳۵ ہزار ہوگئی تھی اور ۱۸۵۶ء سے ۱۸۵۷ء تک ان فوجی مہموں کی گنتی بیس تک پہنچ گئی تھی۔ اور باقاعدہ فوج کی تعداد ساٹھ ہزار تک ہوگئی تھی بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی۔ اس اثناء میں ستیانہ کیمپ جو ہر وقت ہمارے خلاف سرحد میں تعصب کے جذبات کو اُبھارتا رہتا تھا، نہایت عقل مندی سے ہماری فوج کے ساتھ براہ راست مقابلہ کرنے سے گریز کرتا رہا۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں اُنہوں نے ہمارے خلاف عام اتحاد کی بنا ڈالی۔ جس میں قبیلہ یوسف زئی اور قبیلہ پنج تار نے خاص طور پر حصہ لیا۔ اس سال ان لوگوں نے یہاں تک گستاخانہ دلیری سے کام لیا کہ اس علاقہ میں متعین سرکاری افسران سے تخویف مجرمانہ میں مدد کرنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ انکار کرنے پر وہ اس قدر برانگیختہ ہوگئے کہ ہمارے علاقہ پر چڑھ دوڑے اور لفٹنٹ ہوان کے کیمپ پر شب خون مارا جو اس علاقہ کا اسسٹنٹ کمشنر تھا اور اُس نے بڑی مشکل سے جان بچائی۔ اب ہمارے لئے زیادہ دیر کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ سرسڈنی کوٹن پانچ ہزار فوج کی معیت میں پہاڑی علاقہ میں داخل ہوا۔ الخ۔ (ماخوذ از ہمارے ہندوستانی مسلمان تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے شاندار ماضی جلد سوم)۔

بہر حال اس تنظیم سے تعلق رکھنے والے مجاہدین نے جو کچھ قربانیاں پیش کیں وہ اپنی جگہ قابل قدر اور واجب الاحترام ہیں۔ مگر یہاں بحث ان مجاہدین سے ہے، جنہوں نے اندرون ہند تحریک میں حصہ لیا بالخصوص وہ مجاہدین ذی احترام جو محاذ دہلی پر شہید ہوئے۔ آئندہ صفحات میں اُن کے متعلق کچھ تفصیل پیش کی جارہی ہے۔

وہابی مجاہدین کا کردار، اور شان جانبازی

یاد ش بخیر، سر سید احمد خاں صاحب کا بیان ملاحظہ فرمایئے:

"اس زمانہ میں جن لوگوں نے جھنڈا جہاد کا بلند کیا، ایسے خراب اور بدرویہ اور بداطوار آدمی تھے کہ بجز شراب خوری اور تماش بینی اور ناچ ورنگ دیکھنے کے کچھ وظیفہ اُن کا نہ تھا۔ (۱۹۰)

چند بدذاتوں نے دنیا کی طمع اور اپنی منفعت اور اپنے خیالات پورے کرنے کو اور جاہلوں کو بہکانے اور اپنے ساتھ جمعیت جمع کرنے کو جہاد کا نام لے دیا۔ (۱۹۱)

پھر یہ بات بھی مفسدوں کی حرمزدگی تھی نہ واقع میں جہاد۔ (۱۹۲)

یہ دہلی کے علمبردارانِ حریت کے متعلق ارشاد ہے۔ کیونکہ دہلی کے علاوہ اور مقامات کے محبانِ آزادی کے متعلق ایک سطر اوپر یہ گوہر فشانی ہو چکی ہے:

''اور یہ جو ہر ضلع میں پاجی اور جاہلوں کی طرف سے جہاد کا نام ہوا، الخ(۱۹۳)

شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب کا ارشاد ہے:

''یہ کام لچے شہدے مسلمانوں کا تھا کہ وہ جہاد جہاد پکارتے پھرتے تھے۔(۱۹۴)

محبانِ حریت اور کشتگانِ خنجر آزادی کے لئے جو الفاظ بلا استثناء ان نامورانِ قوم نے استعمال فرمائے ہیں، ممکن ہے سر اور شمس العلماء جیسے خطابات کی تمنائیں اس کے بغیر پوری نہ ہوتی ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ طرز واند از نہ صرف ان کی عزت وعظمت کے لئے بلکہ دہلی مرحوم کی روایتی تہذیب وشرافت کے لحاظ سے بھی باعث ننگ وعار ہے۔ یہ دونوں صاحب اسی شہر دہلی کے رہنے والے ہیں جو آج کچھ بھی ہو، مگر اُس زمانہ میں ادب اردو کا قلعہ معلی تھا۔ کیا ادب اردو کی متانت وسنجیدگی اس بے ادبی کو برداشت کر سکتی ہے؟

الفاظ کی کراہت ونکارت سے قطع نظر، حقیقت کا جائزہ لیا جائے، تو واقعات کا دامن ان الزامات سے سر تا پا پاک ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا

بے شک اتنی بات صحیح ہے کہ بقول حضرت مولانا فضل حق خیر آبادیؒ اس تحریک میں ایسے ناتجربہ کار سامنے آ گئے تھے جن کی پوری زندگی عیش وعشرت میں گزری تھی۔ جن میں نہ ہمت نہ جرأت تھی، نہ استقلال و استقامت۔ غور وفکر واصابت رائے سے محروم تھے اور ہر قسم کی نااہلیت کے ساتھ سب سے بڑی اہلیت یہ رکھتے تھے کہ بادشاہ سے اُن کا کوئی رشتہ تھا، اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہی نااہل وناتجربہ کار جن کی بدکرداریوں کے باعث(۱۹۵) ہلاکت وبربادی ان کے لئے مقدر ہو چکی تھی۔ اس پوری تحریک کی ناکامی کا سبب بنے۔ مگر اُن کی طرف لفظ جہاد کا انتساب نہ صرف لفظ جہاد کی توہین ہے بلکہ حق وصداقت کی ایسی پردہ پوشی ہے جس کو فن تاریخ کی حقیقت پسندی ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہیں کر سکتی۔

یہ لوگ جہاد کا جھنڈا تو کیا بلند کرتے، جو ''علمبردارانِ جہاد'' تھے، خود سر سید صاحب اسی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں کہ وہ مجاہدین اُن کو بہت برا سمجھتے تھے۔ شمس العلماء کا ارشاد ہے کہ وہ ان کو خولہ خبط جانتے تھے۔

ستم رسیدہ فوجیں جنہوں نے اپنی اپنی چھاؤنیوں میں انقلاب برپا کر کے دہلی کا رخ کیا، یا اپنی ہی جگہ جنگ آزادی میں مصروف ہو گئیں، ان کی قربانیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اور جس بے جگری کے ساتھ عواقب و نتائج سے بے پروا ہو کر عوام نے اُن فوجیوں کا ساتھ دیا، اور جس طرح ہر قسم کی جانی اور بربادی کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا، عوامی تحریکات کی تاریخ میں وہ بھی ایک انوکھی اور نادر مثال ہے جس کی نظیر تاریخ عالم میں بہت کم ملتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن کو وہابی جہادی کہا جاتا ہے وہ ان سب سے ممتاز گروہ ہے۔

پہلے باب میں تنظیم کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ تو بتایا جا چکا ہے کہ دہلی کے اصل باشندوں کی تعداد بقول شمس العلماء تقریباً دو سو تھی۔ یہ سرفروش و جانباز زیادہ تر بیرون جات سے آئے ہوئے تھے۔ جن میں ''ٹونک'' کو یہ خاص شرف حاصل تھا کہ وہاں سے کم و بیش دو ہزار آئے تھے۔

اس باب میں اُن کے کردار پر روشنی ڈالنی مقصود ہے۔ سب سے پہلے وجہ تسمیہ معلوم کر لیجئے، وہ خود ایک روشنی ہے جس میں ان جانبازان صداقت کے نورانی چہرے صاف نظر آتے ہیں۔

وہابی

شاندار ماضی جلد دوم میں بہت تفصیل سے واضح کیا جا چکا ہے کہ یہ لفظ سب سے پہلے برطانوی پولیٹکل ایجنٹوں اور ڈپلومیٹک ایجنسیوں نے حضرت سید احمد صاحب شہید، حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب شہید اور اُن کے ساتھیوں کے لئے استعمال کیا تھا اور اسی کی غیر معمولی تاثیر سے آزاد قبائل کے سادہ لوح پٹھانوں کو مشتعل کر کے حضرت سید صاحب کے ہزاروں ساتھیوں کو ان کے ہاتھوں اچانک شہید کرا دیا تھا۔ یہ ۱۸۳۰ء کا واقعہ تھا۔ ستائیس سال کے عرصہ میں اس لفظ کی اصطلاح میں عجیب وغریب انقلاب پیدا ہو گیا۔ اب عرف عام میں اس کے معنی ہو گئے ''پابند شریعت''۔

اس بارہ میں شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب سے بڑھ کر کس کی شہادت معتبر ہو سکتی ہے۔ شاہزادہ ولی عہد سابق مرزا فخر الدین کی ولی عہدی کا قصہ بیان کرتے ہوئے شمس العلماء فرماتے ہیں:

''مرزا فخر الدین اپنے مذہب کا بڑا پابند تھا۔ اُس نے اپنا ختنہ کرایا تھا۔ شہزادے اُس کو متشرع (پابند شریعت) ہونے کے سبب سے وہابی کہتے تھے''۔ (۱۹۲)

یہ وہابی کی تشریح تھی۔ اب لفظ جہادی کی تفسیر ملاحظہ فرمایئے۔

مجاہد یا جہادی

یعنی ''رضا کار''۔ تشریح یہ ہے کہ نہ وہ پیشہ ور سپاہی تھے، نہ تنخواہ دار فوجی۔ نہ اُن کے پیش نظر ملازمت تھی نہ بادشاہی تقرب۔ وہ اس جنگ کو ایک مذہبی فرض سمجھ کر اس عزم کے ساتھ آئے تھے کہ:

یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

جیسا کہ غلام معین الدین رسالدار نے بادشاہ سے کہا تھا:

''فدوی ٹونک سے تقریباً پانچ سو آدمیوں کے ساتھ آیا ہے۔ پندرہ سو اور جہادی غازی یا شہید بننے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔'' یعنی اگر وہ زندہ رہے تو غازی فی سبیل اللہ، اور مر گئے تو شہید فی سبیل اللہ۔

اسی دور کے مجاہد جلیل حضرت مولانا لیاقت علی صاحب نے فرمایا تھا:

واسطے دین کے لڑنا نہ پئے طمع بلاد   اہل اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد

مال و اولاد کی اور گھر کی محبت چھوڑدو راہِ مولیٰ میں خوش ہو کے شتابی دوڑدو
گر پھرے جیتے تو گھر بار میں پھر آؤ گے اور گئے مارے تو جنت کو چلے (۱۹۷) جاؤ گے

اقبال نے انہیں کے متعلق کہا ہے:

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا سمٹ کر پہاڑ اُن کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت ، نہ کشور کشائی

کردار کے چند آثار و نشانات

حضرات مؤرخین معاف فرمائیں، اقتدار پرستی کو شجر ممنوع قرار دینے کے باوجود تحریر و تفصیل کے دامن اسی کی شاخوں اور کونپلوں میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ بادشاہ اور اُس کے حواریوں کی تو نقل و حرکت تک قلم بند ہے۔ مگر مجاہدین یا خلاص کے نام اور حسب نسب تو در کنار کسی مجبوری سے ان کے کردار کا تذکرہ کرنا پڑا ہے، تو اس طرح کہ گویا روشنائی خشک ہوگئی اور جنبشِ قلم پر لرزہ طاری ہوگیا ہے۔ بہر حال انہیں منتشر جملوں اور بہکے بہکے فقروں سے مطلب کی باتیں سمجھنی ہیں۔ اب غور فرمائیے۔

استحصال بالجبر سے اجتناب، فاقہ منظور

منشی جیون لال اور منشی ذکاء اللہ (شمس العلماء) دونوں مجاہدین کے مخالف ہیں۔ دونوں نے ایک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر دونوں کے انداز بیان جدا جدا ہیں۔ منشی جیون لال نے ۳۱ رجولائی کے روز نامچہ میں لکھا ہے:

میر فیاض علی نے معروضہ پیش کیا کہ جہادی بھوکے مر رہے ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا۔ انہیں کھلانے کے لئے میرے پاس روپیہ نہیں رہا۔ فیاض نے کہا کہ شہر والوں کو حکم دیجئے کہ وہ اُن کے کھانے کا بندوبست کریں۔ بادشاہ نے اس تجویز کو پسند کیا۔

اب منشی ذکاء اللہ خاں صاحب کا توہین آمیز اور دل خراش بیان ملاحظہ فرمائیے۔

اکثر جہادی بھوکے مرتے تھے۔ اُن کے بدن پر کپڑے بھی ثابت نہیں تھے۔ مگر بغل میں تلوار یا کمر میں خنجر یا کندھے پر توڑے دار بندوق ضرور تھی۔ بادشاہ سے یہ جہادی فریاد کرتے کہ بھوکے مرتے ہیں تو وہ کہہ دیتا کہ خزانہ میں روپیہ نہیں۔ مگر اُس نے اُن کے لئے یہ انتظام کرادیا کہ اہلِ شہر خیرات کی روٹیاں کھلایا کریں، اور ثواب کمایا کریں نواب محی الدین خاں عرف بڈھے خاں نے اُن کو دو ہزار روپے (۱۹۸) دیئے۔

(۱) انداز بیان کے تفاوت کے علاوہ دونوں بیانوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ منشی ذکاء اللہ خاں نے ان پاک باز و پاک طینت بزرگوں کو بادشاہ کی خدمت میں بھوک کی خاطر فریادی کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ مگر وقائع نگار منشی جیون لال کی درج روزنامچہ اطلاع یہ ہے کہ خوراک کا مطالبہ خود ان جہادیوں نے نہیں کیا تھا، بلکہ ایک صاحب خیر، میر فیاض علی صاحب نے بادشاہ کو توجہ دلائی تھی جس پر بادشاہ نے تہی دستی کی معذرت کر دی، اور پھر میر فیاض علی کی اس تجویز پر کہ "شہروالوں کو اُن کی امداد کی طرف متوجہ کیا جائے" پسندیدگی کا اظہار کیا اور بظاہر عمل بھی کرلیا۔ جس کے نتیجہ میں اہل شہر نے اُن کی امداد شروع کی۔ حتیٰ کہ نواب محی الدین عرف بڑھے خاں نے دو ہزار روپے دیے۔

(۲) بہر حال یہ تو شمس العلماء کے نزدیک بھی مسلم ہے کہ جس طرح اور فوجی تنخواہوں کے لئے طوفان برپا کرتے رہتے تھے، ان جہادیوں نے تنخواہ یا روزینہ کی فریاد نہیں کی۔ صرف "بھوکے مرنے کی فریاد کی" اور وہ بھی ۳۱ رجولائی کو جبکہ اُن کے پاس اپنا اندوختہ ختم ہوگیا تھا اور دہلی میں ایک طرح کا قحط رونما تھا۔

(۳) بادشاہ کا عذر اور میر فیاض علی صاحب کی تجویز بھی قابل توجہ ہے۔ فوجیوں کی تنخواہ کا مطالبہ ہوتا تھا تو بادشاہ جنرل بخت خاں یا مرزا مغل وغیرہ کے حوالہ کردیا کرتے تھے کہ وہ انتظام کریں۔ لیکن جہادیوں کی خوراک کا معاملہ کسی گورنر یا جرنیل کے حوالہ نہیں کیا جارہا۔

یہی ایک اہم نکتہ ہے جس سے ان مجاہدین کا کردار نمایاں ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیشہ ور فوجیوں کے سامنے حلال و حرام کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ بالخصوص زمانۂ جنگ میں وہ ہر مال کو جو اُن کے سامنے آجائے جائز سمجھتے ہیں۔

یہ تو بہت پرانی بات ہے کہ شاہ سبکتگین [۱۹۹] کے فوجیوں نے کچھ مرغیاں پکڑ لیں تو حکم دے دیا کہ اُن کے کان چھید دیے جائیں مگر جب سے مغربی تہذیب کا آفتاب سیاہ طلوع ہوا ہے، ان روایات کہنہ کی تاریکی ختم ہوگئی ہے۔ نئی روشنی نے فوجیوں کے اختیارات میں بے پناہ وسعت پیدا کردی ہے۔ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ یورپ کی اسی جنگ عظیم کے دوران میں (جو ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۴ء تک دنیا میں بموں کی بارش برساتی رہی تھی) ہم نے خود دیکھا ہے کہ اس مہذب اور متمدن زمانہ کی تربیت یافتہ فوجیں جب سفر کرتی تھیں تو اسپیشل کی آمد کی خبر سنتے ہی اسٹیشن کے تمام اسٹال بند ہوجاتے تھے اور خونچے والے اپنے خونچے لے کر باہر بھاگ جاتے تھے۔ کیونکہ فوجیوں کی بے تکلفی کے سامنے نہ اُن کے خونچے باقی رہ سکتے تھے اور نہ اسامیں محفوظ رہ سکتی تھیں۔

اور اس پہلے زمانۂ امن میں جب ایک چھاؤنی سے دوسری چھاؤنی میں تبدیل ہونے والی فوجیں پاپیادہ مارچ کیا کرتی تھیں تو دیہات کے باشندے اپنے بیل اور چھکڑے تو اس لئے چھپا دیتے تھے کہ اُن کو بیگار کا خوف رہتا تھا، جو صحیح ہوا کرتا تھا، ساتھ ہی قیمتی سامان اور جوان عورتوں کو بھی چھپا دیا کرتے تھے، کیونکہ فوجوں کے ذوق غارت گری و عصمت دری کے سامنے نہ کسی کے مال کی کوئی وقعت و حرمت ہوتی، نہ کسی کی عزت و عصمت کی۔

دہلی میں آنے والی انقلابی فوجوں کی لوٹ مار کے جو قصے بیان کیے جاتے ہیں، اُن کو مبالغہ سے پاک کر لیا جائے تب بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جس طرح انگریزی فوجوں نے قہر و جبر سے روپیہ وصول کیا۔ انقلابی فوجوں کا دامن بھی اس سے پاک نہیں رہا۔ مگر یہ جہادی صرف اس مال کو حلال اور جائز سمجھ سکتے تھے جو غنیم سے میدان جنگ میں حاصل کیا گیا ہو۔ لیکن وہ مال جو خود اپنی رعایا سے جبراً قہراً حاصل کیا گیا ہو، اُس کے مقابلہ میں فاقہ کشی اور بھوکے مر جانے کو ہزار درجہ غنیمت جانتے تھے۔

راہ خدا میں جان کھپا دینا اُن کا نصب العین تھا، وہ دشمن کی گولی سے ہو یا فاقہ اور بھوک سے۔ لیکن جن کو دشمن سے بچانے کے لیے نکلے تھے، انہیں کو نوچنا اُن کے بلند اور اعلیٰ نصب العین کے لحاظ سے خودکشی کے ہم معنی تھا۔ بادشاہ اُن سے خواہ کتنا ہی ناراض ہو کہ یہ لوگ اس کو بدعتی سمجھتے تھے اور آئندہ بھی توقع نہیں تھی کہ وہ بہادر شاہ کی ذات کے ہوا خواہ بن کر رہیں گے مگر اُن کے احساس کی نزاکتوں کو وہ سمجھتا تھا۔ اسی بنا پر اُس نے اُن کا معاملہ نہ کسی شہزادے کے سپرد کیا کہ اُن پر غبن و خیانت کے الزامات پہلے ہی سے لگے ہوئے تھے اور کسی جرنیل اور کرنیل کو بھی اُن کے لئے انتظام کا حکم نہیں دیا کیونکہ وہ استحصال بالجبر سے پرہیز نہیں کرتے تھے۔

باقی رہا شاہی خزانہ تو اس کی بھی تمام رقمیں جہادیوں کی شرائط کے بموجب قابل استعمال نہیں تھیں۔ لہٰذا بادشاہ نے بلا رو رعایت روکھا جواب دے دیا۔ ذکاء اللہ خاں صاحب اس پر طنز کر رہے ہیں۔ حالانکہ صاحب نظر کے نزدیک بھی یہ بات قابل قدر ہے۔

چشم حسود کہ برکندہ باد   عیب نمایدش ہنرم درنظر

البتہ میر فیاض علی صاحب نے جو تجویز پیش کی، وہ ان حضرات کے لئے قابل قبول تھی۔ کیونکہ بقول منشی ذکاء اللہ خاں خیرات ہی کی روٹیاں سہی، مگر برضا و رغبت اور بخوشنودی تمام ہوں تو جبر و قہر اور لوٹ مار کے پلاؤ قورے سے خیرات کی سوکھی روٹی ہزار درجہ بہتر ہے۔

مختصر یہ کہ ان غازیان دین اور مجاہدین فی سبیل اللہ نے یہ کسی طرح پسند نہیں کیا کہ کسی طرح سے جبر و قہر اور ظلم و جور سے کچھ حاصل کریں۔ البتہ یہ شکل اُن کے لئے ناقابل برداشت تھی کہ لوگ فی سبیل اللہ خود اپنی طرف سے اُن کے کھانے کا انتظام کریں۔

جنگ جو بہادروں کے لئے رسد کی یہ مثال بالکل نئی تھی۔ تاریخ میں اس کی کوئی نظیر ملنی بہت مشکل ہے مگر اس سے ان حضرات کے نظریات کی پاکیزگی اور اہل شہر کی ہمدردیاں ثابت ہوئی ہیں وہ یاد رکھنے کی بات ہے۔

جذبات ایثار کی سرمستیاں

ذوق فنا اور جذبۂ فداکاری کی یہ عجیب و غریب تاثیر ملاحظہ ہو کہ ظالمانہ انتقام کی تیز نفسی نے اعضاء بدن کو چکنا چور کیا۔ فاتحانہ رعونت کی ستم نوازیوں نے گدھوں اور چیلوں کے نوچے ہوئے ڈھانچوں کو دریا برد کیا تو

صفحاتِ تاریخ نے بھی بے سوچے سمجھے خونِ شہادت کے ان پاک دھبوں کو اپنے دامنوں سے کھرچ دیا تاکہ فنائیت مکمل ہو جائے۔

عریانیِ تن بود غبارِ رہ دوست　　　آں نیز بہ تیغ از سرِ ما وا کردند

ہاں کہیں کہیں کچھ نشانات باقی ہیں جن کو ان سطروں میں سے پھر اُجاگر کیا جارہا ہے۔

کم وبیش چار ہزار مجاہدین جو ٹونک، اجمیر، جے پور، بھوپال، ہانسی، حصار، اطراف گوڑگانوہ اور خود دہلی کے گلی کوچوں سے اکٹھے ہو گئے تھے کہاں گئے؟ دیکھو کچھ نشانات ملتے ہیں، شاید وہ انہیں کے نقش پا ہیں۔

منشی جیون لال کے روزنامچہ کے اقتباسات پہلے گزر چکے ہیں۔ اُن میں سے چند سطریں دہرائی جاتی ہیں۔

۲ جولائی۔ بخت خاں نے اطلاع دی کہ شہر کے باہر حملہ کے لئے جارہا ہوں ساتھ جانے والوں کی تفصیل میں ایک عدد یہ بھی ہے۔ ''ایک سو مجاہدین''۔

۹ر جولائی۔ جنرل بخت خاں نے انگریزی کیمپ میں گھس کر حملہ کیا۔ اس معرکہ میں جہادی بھی شریک تھے۔

۵ر اگست جہادیوں نے شکایت کی کہ حملہ کے وقت جہادی تو پورے جوش کے ساتھ لڑتے ہیں اور فوج کے آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔

حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی جہادیوں کے اس گروہ میں شامل نہیں تھے، مگر جہادیوں کے اس دعویٰ کی وہ بھی تصدیق فرماتے ہیں۔

منهم من كان يجالدو يحارب ويحاوب النصارىٰ ويضارب.

انہیں مجاہدین میں سے وہ تھے جو ہر طرح نصاریٰ پر حملہ کرتے اور اُن کا دفاع کرتے تھے۔

۲ر ستمبر خبر ملی کہ چند ہزار جہادی مولوی جلال الدین کی سرکردگی میں کھلے میدان میں لڑنے کے لئے نکلے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی اور اُن کے کئی سو ساتھی مارے گئے۔

یہ ۲ر ستمبر تک کے دھندلے سے نشانات ہیں۔ ۷ر ستمبر ۱۸۵۷ء سے انگریزوں نے مورچے تیار کر کے بڑی بڑی قلعہ شکن توپوں سے گولہ باری شروع کی اور ایک ہفتہ کی شبانہ روز گولہ باری اور آتش فشانی کے بعد ۱۴ر ستمبر کو اس قابل ہوئے کہ کشمیری گیٹ کے دراز (شگاف) سے فوج کا ایک کالم شہر کے اندر داخل کر سکیں، جہاں ۱۹ر ستمبر تک قدم قدم پر اتنا شدید مقابلہ ہوتا رہا کہ بارہا انگریزی فوجوں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ ان دو ہفتوں میں انقلابی فوجوں کے متفرق دستوں نے جس طرح دادِ شجاعت دی، وہ فراموش نہیں کی جاسکتی۔ مگر وطن عزیز کے پایۂ تخت کے ایک ایک چپہ پر جنہوں نے اپنے سر کٹوائے جانیں قربان کیں۔ شہر پناہ کی سنگین حصار میں شگاف پڑ جانے کے بعد جنہوں نے اپنے بہادر سینوں کی چٹانوں سے ان شگافوں کو بند کئے رکھا، وہ کون تھے۔ اس کے لئے شاہد عینی کی شہادت کے الفاظ ملاحظہ کیجئے جو اُس نے زندگی کے آخری لمحات میں قلم بند کئے تھے جب وہ وطن سے بہت دور انگریزوں کی نظر عنایت سے قطعاً مایوس اور اپنے خالق و مالک کی بارگاہ میں سرخ روئی کے

ساتھ حاضری کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ شہید جنا مولانا فضل حق خیرآبادی کے الفاظ میں:

فطفق النصاریٰ یحملون علی البلاد و ابوابہ و یسطون علی درابتہ و حجابہ. والمجاھدون الشھود و فریق من الجنود یعوقونھم عن البلد و یصاولون ویحولون بینھم وبین مایحاولون یتجالد الفریقان لیلاً ونھاراً رکباناً و رجالاً.

پھر نصاریٰ (انگریزی فوجیں) شہر اور اس کے پھاٹکوں پر دربانوں اور محافظوں پر حملے کرنے لگے۔ ادھر حالت یہ تھی کہ جہادی جو ہر وقت حاضر رہتے تھے اور انقلابی فوجوں کی ایک جماعت شدت سے اُن کو شہر سے روکتی بھی تھی اور اُن پر حملے بھی کرتی رہتی تھی اور نصاریٰ جو کچھ چاہ رہے تھے قدم قدم پر اُن کے آڑے آتی تھی۔ دونوں فریق کے پیدل اور سواروں کا شدید مقابلہ پوری قوت سے دن رات جاری رہتا تھا۔

یہ تو ان دو ہفتوں کی بات ہے جب فتح و شکست کا آخری مرحلہ درپیش تھا اور جب باشندگان شہر کے دو گروہ اور عناصر جو اب تک انگریزوں کی حمایت خفیہ طور سے کر رہے تھے، اب کھل کر سامنے آ گئے تھے اور بڑی تعداد شکست کے آثار دیکھ کر شہر سے نکلنے لگی تھی۔ اس سے پہلے خاص اس زمانہ میں جب شہر کا گوشہ گوشہ انقلابی فوجوں سے پٹا پڑا تھا، اور شہر کے ایک ایک کوچہ سے انگریز دشمنی کے آواز سے بلند ہو رہے تھے، اس عینی شاہد کی شہادت خاص اس دور کے متعلق یہ بھی ہے:

کانت الحرب بینھم اربعۃ اشھر سجالاً ولم یجد العدی فی تلک المدۃ مع غایۃ الشدۃ و کثرۃ العدۃ والعدۃ. الی دخول البلد سبیلا و مجالا. بل کلما ھجموا صدوا اومھما اقدموا ردوا. کان المجاھدون الغزاۃ الحماۃ الکماۃ یدافعونھم اشد دفاع ویقارعونھم اشد قراع یبیتون عند التحام الاقدام و یتقدمون علی کل مقدام. لدی الاقدام. فذاق کثیر منھم شھد الشھادۃ وسعدوا اوصعدوا معارج السعادۃ وللذین احسنوا الحسنیٰ وزیادۃ و مابقی من المجاھدین الا قلیل یبیتون جیاعاً ویصبحون الی الغزو سراعاً فیقارعون العدو قراعاً فکانوا مع جمع من الجیش یحفظون السور ویسدون الثغور.

چار ماہ تک برابر کی جنگ جاری رہی اور باوجود یکہ دشمن (انگریز) ہر طرح مضبوط تھا۔ اس کے پاس فوجیں بھی زیادہ تھیں اور سامان جنگ بھی بہت تھا مگر کسی طرح بھی وہ شہر میں داخل ہونے کا موقع نہ پا سکا۔ اس کے حملوں کو روکا جاتا اور اس کے ہر اقدام کو پسپا کر دیا جاتا تھا۔ یہ غازی غیور و باحمیت مجاہد شدت سے جوابی کارروائی کرتے اور ڈٹ کر میدان جنگ میں مقابلہ کرتے تھے

گھمسان کے وقت ثابت قدم رہتے جہاں بھی موقع ملتا پینترا بدل کر آگے بڑھتے اسی میں ایک بڑی تعداد نے شربت شہادت نوش جان کیا اور سعادت ابدی اور اعلیٰ درجات پر فائز ہوئے اور قرآن پاک کی اس بشارت سے مشرف ہوئے کہ جن کے کارنامے اچھے ہیں اُن کو اُن کے کارناموں سے بڑھ چڑھ کر اضافہ اور زیادتی کے ساتھ انعام دیا جائے گا۔ ان سرفروش مجاہدین میں بہت ہی کم زندہ بچے۔ جن کی حالت یہ تھی کہ بھوکے پیٹ رات گزارتے، اور جیسے ہی صبح ہوتی میدان جنگ کی طرف دوڑ جاتے اور بڑی شدت سے جنگ کی کارروائی شروع کر دیتے۔ کبھی باضابطہ فوج (تلنگوں) کے ساتھ شہر پناہ کی حفاظت کرتے اور کبھی اپنی حدود کی ناکہ بندی کرتے۔

بقول مولانا خیرآبادی یہ تھوڑے سے مجاہدین جو باقی رہ گئے تھے، انہوں نے اپنی جانیں کہاں قربان کیں اور بھوک پیاس کی یہ گرانی کس طرح رفع کی۔ اس کا قصہ بھی سن لیجئے:

جامع جہاں نما اور شہادت کی گرم بازاری

جامع جہاں نما یا شاہجہانی مسجد یعنی جامع مسجد دہلی جو اس پوری صدی میں وقار ملت کے قبلہ نما کی حیثیت سے نمایاں رہی ہے۔ ۱۴ر ستمبر کو اس کی سیڑھیوں کے نیچے کھلے میدان میں ایک معرکہ ہوا۔ جس کا تذکرہ تمام مؤرخین نے کیا ہے۔

ہم اس معرکہ کی تفصیل خواجہ حسن نظامی مرحوم [۲۰۰] کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ جن کا دعویٰ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بہت سے واقعات اُنہوں نے شہر کے بڑے بوڑھوں سے (جو ۱۸۵۷ء میں صاحب شعور تھے) زبانی دریافت کر کے قلمبند کئے ہیں۔ خواجہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> فوج کا ایک حصہ سر طامس منکاف کے ماتحت تھا۔ وہ شہر کے حال سے خوب واقف تھے کیونکہ وہ دہلی کے کلکٹر و مجسٹریٹ رہ چکے تھے۔ اس لئے وہ اپنی فوج کو ایسے راستوں سے لے گئے جہاں دشمنوں کی آتش باری بہت کم تھی۔ وہ جامع مسجد تک پہنچ گئے، اور جہاں آجکل ڈفرن ہسپتال ہے (یعنی جامع مسجد کے شمالی جانب کے سامنے جہاں اُس وقت میدان تھا) وہاں کھڑے ہو کر کمک کا انتظار کرنے لگے۔ اُن کو خیال تھا کہ اجمیری دروازہ، کابلی دروازہ اور سبزی منڈی کی فوجیں حسب وعدہ یہاں پہنچ جائیں گی۔ اُنہوں نے آدھ گھنٹہ ٹھہر کر انتظار کیا۔ جامع مسجد میں اُس وقت ہزار ہا مسلمان نماز کے لئے جمع تھے۔ اُن کو معلوم ہوا، کہ انگریز مسجد کو بارود سے اُڑانا چاہتے ہیں۔ اُن سب کے پاس تلواریں تھیں، بندوقیں نہ تھیں۔ اُن کا ایک آدمی مکبر پر چڑھا اور اُس نے مسلمانوں سے پکار کر کہا۔ تمہارے امتحان کا وقت آ گیا ہے۔ دشمن سامنے کھڑا ہے، جس کو مرنا ہو، وہ میرے ساتھ شمالی دروازہ کی طرف آئے اور جس کو جان پیاری ہو، وہ جنوبی دروازہ کی طرف چلا

جائے کہ ادھر دشمن کی فوج نہیں ہے۔ یہ تقریر سن کر مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اُن میں سے ایک بھی جنوبی دروازہ کی طرف نہیں گیا۔ اُن سب نے تلواریں میانوں سے کھینچ لیں۔ سب سے پہلے میانوں کو کاٹ کر پھینک دیا۔ پھر شمالی دروازہ کی طرف دوڑے۔ مٹکاف کی فوج نے بندوقوں کی ایک باڑھ ماری جس سے دو سو آدمی شہید ہو کر گر پڑے۔ مسجد کی سیڑھیاں اُن کی لاشوں سے بھر گئیں۔ مگر مسلمان تڑپتی ہوئی لاشوں کو چھوڑ کر اس پھرتی سے آگے بڑھے کہ مٹکاف صاحب کو دوسرے گراپ مارنے کی مہلت نہ مل سکی اور تلواروں کی دست بدست لڑائی ہونے لگی۔ مٹکاف صاحب اور اُن کی فوج کو ان پر جوش آدمیوں کے مقابلہ سے شکست کھا کر بھاگنا پڑا۔ مسلمانوں نے کشمیری کے گرجا تک اُن کا تعاقب کیا۔ (۲۰۱)

خواجہ صاحب کا ایک وضاحت طلب جملہ

سطور بالا میں خواجہ صاحب کا یہ ارشاد خاص طور پر وضاحت طلب ہے کہ:

''جامع مسجد میں اس وقت ہزارہا مسلمان نماز کے لئے جمع تھے''۔

خواجہ صاحب نے اس کی تصریح نہیں فرمائی کہ یہ مسلمان شہر کے باشندے تھے، یا باہر سے آئے ہوئے تھے۔ جہاں تک شہری مسلمانوں کا تعلق ہے، بیشک جمعہ کے روز وہ ہزاروں کی تعداد میں جامع مسجد میں حاضر ہوتے ہیں۔ مگر یہ جمعہ کا دن نہیں تھا۔

یہ ۱۴ر ستمبر ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے (۲۴ر محرم الحرام ۱۲۷۴ھ)۔ ۱۴ر ستمبر کو جمعہ نہیں بلکہ دو شنبہ (سوموار) تھا۔ اور جیسا کہ چند سطر بعد معلوم ہوگا۔ تقریباً ۱۲ بجے کا وقت ہے۔ یہ کسی نماز کا بھی وقت نہیں۔ پس ستمبر کی گرمی میں دوپہر کے وقت انتہائی خطرہ کی حالت میں بال بچوں اور گھر بار کو چھوڑ کر جامع مسجد میں شہری مسلمانوں کا جمع ہونا قیاس میں نہیں آتا۔ اب ایک چشم دید گواہ کی شہادت ملاحظہ فرمائیے۔

یہ راقم الدولہ ظہیر دہلوی ہیں جو ۸ بجے صبح سے حالات کا جائزہ لینے کے لئے گھوم رہے ہیں اور اس حادثہ سے تقریباً ایک گھنٹہ بعد جامع مسجد پہنچے ہیں۔ اور انہوں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ کوتوالی سے لے کر جامع مسجد تک لاشیں پڑی ہوئی ہیں اور خاص جامع مسجد کے قریب لاشوں کا ایسا انبار ہے کہ جیسے لکڑیوں کی ٹال لگی ہوئی ہے۔ (۲۰۲) اُن کا بیان یہ ہے کہ یہ ''مسافر'' تھے۔ اُن کے دلچسپ اور پر از معلومات قیمتی بیان کا خلاصہ یہ ہے:

''صبح کے پانچ بجے سے سینکڑوں توپیں جن کی صحیح تعداد اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، دونوں طرف سے آگ برسا رہی تھیں۔ شہر کی زمین دہل رہی تھی۔ مکان لرز رہے تھے۔ دس بجے تک یہی قیامت برپا رہی۔ میں (ظہیر) پانچ چھ آدمی لے کر تقریباً ۸ بجے صبح کو مکان سے نکلا۔ قلعہ کا ارادہ کیا۔ راستے بند تھے۔ بہر حال جوں توں کر کے ہم قلعہ کی حد میں پہنچے۔ دروازہ بند تھا۔ دروازہ پر ایک

آدمی کھڑا ہوا میدان جنگ کے حالات دیکھ رہا تھا اور نیچے لوگوں کو بتا رہا تھا، کہ کونسی فوج کس جگہ کیا کام کر رہی ہے۔ بہر حال قلعہ میں داخل ہونے کا موقع نہیں ملا تو ہم مکان واپس ہوئے۔ راستہ میں کوتوالی کے قریب انگریزی فوج کے ایک دستہ نے ہم پر گولیوں کی باڑ ماری مگر ہم سب محفوظ رہے۔ ایک ساتھی کے گولی لگی۔ مگر اس کے گلے میں تقریباً چار انگل لمبا چوڑا چمڑا اور ایک مڑا ہوا تعویز پڑا ہوا تھا۔ گولی اس چمڑے اور تعویز میں گھس کر اپنا زور ختم کر چکی تھی۔ تاہم اس کے پیٹ پر ایک بالشت لمبی گہری خراش آ گئی تھی۔

بہر حال خدا خدا کر کے ہم گھر پہنچے (یعنی تقریباً دس بجے) اب میں (ظہیر) گھر پہنچ کر تشویش میں پڑ گیا کہ اب انگریزی فوج قبضہ کرے گی اور باشندگان شہر کا قلع قمع کر دے گی۔ ایک ڈیڑھ گھڑی کا عرصہ گزرا کہ یکا یک بہت قریب سے توپ چلنے کی آواز آئی (یعنی تقریباً ۱۱ بجے)۔ میں چونک کر گھر سے نکلا۔ دو تین آدمیوں کو ساتھ لے کر گلی میں پہنچا۔ آمد و رفت برابر جاری تھی۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ انگریزی فوج کو مار کر بھگا دیا ہے۔ پھر میں وہاں سے چاوڑی بازار میں جا پہنچا۔ تو دیکھا کہ واقعی ہزاروں آدمی لاٹھی، پونگا، تلوار، گنڈاسا وغیرہ لئے ہوئے شہر میں پھرتے ہیں۔

غرض کہ جامع مسجد کے پیچھے ہو کر گلیوں کے بازار میں پہنچا۔ تو وہاں عجیب تماشا نظر آیا۔ لاشوں کا ایک ایسا انبار تھا، جیسے لکڑیوں کی ٹال لگی ہوئی ہے۔ اور یہ موقع ہے جہاں چار ماہ پہلے مجھے ایک مست درویش مجذوب نے بتایا تھا کہ یہاں کشت و خون ہوگا۔ وہاں سے آگے بڑھا تو اور لاشیں پڑی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے بازار کے لوگوں سے ماجرا پوچھا۔ لوگوں نے بتایا۔

ایک بزن (کالم) انگریزی فوج کا مسجد کی سیڑھیوں تک آ پہنچا تھا۔ اور کچھ لوگ فوج کے رعایا کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار کرنے لگے۔ ادھر فوجیوں نے یہ چاہا کہ جامع مسجد میں داخل ہو جائیں مسجد میں جو مسلمان مسافر جمع تھے، انہوں نے دیکھا کہ اب یہ خدا کے گھر میں آ کر کشت و خون کریں گے۔ آؤ بہتر تو یہ ہے کہ مسجد سے نیچے اتر کر ان سے سمجھ لیں۔ یہ کہہ کر وہ مسجد کے دروازہ سے باہر نکل کر سیڑھیوں سے اترنے لگے۔ فوج والوں نے ان پر بندوقیں سر کیں۔ مگر جو زندہ رہے وہ سامنے چلے اور باہم جنگ مغلوبہ دست بدست ہونے لگی۔ ایک غل شور برپا ہوا۔ لوگ گھروں میں سے لکڑیں، پلنگ کی پٹیاں، تلواریں لے لے کر دوڑ پڑے۔ اس کالم کے کچھ آدمی مارے گئے جن کی لاشیں پڑی ہیں۔ باقی بھاگ کر اپنے لشکر کو چلے گئے۔ میں یہ تماشا دیکھتا ہوا

بڑے دریبے میں ہو کر خونی دروازے سے نکل کر کوتوالی کے آگے پہنچا۔ میں نے جامع مسجد سے لگا کر کوتوالی تک لاشیں برابر پڑی دیکھیں۔ (۲۰۳)

بہرحال ظہیر صاحب کے بیان سے واضح ہوگیا کہ یہ مسلمان جس تعداد میں بھی تھے، شہر کے باشندے نہیں تھے، بلکہ مسافر تھے۔ لیکن یہ مسافر کون تھے، تازہ وارد تھے یا مہینوں سے دہلی کی مسجدوں میں پڑے ہوئے تھے۔ وہ کونسے بہادر مسافر تھے، جو اس پرآشوب زمانہ میں جب کہ شہر میں داخلہ کی بھی ممانعت تھی اور کاروبار بھی بند پڑے تھے، سیر وسیاحت یا تماشا جنگ کے لئے دہلی پہنچے اور ایک دو نہیں خواجہ صاحب کے الفاظ میں ہزاروں۔

قیاس و وجدان کا فیصلہ یہی ہے کہ یہ مسافر وہی وہابی جہادی تھے جن کا مسکن مسجد اور جن کا رصد ہر ایک مسلمان کا گھر تھا، جن پر منشی ذکاء اللہ خاں نے طنز کرتے ہوئے بتایا تھا کہ بدن پر کپڑے ثابت نہیں تھے مگر کمر میں تلوار ضرور تھی۔ جن کے کھانے کا انتظام بادشاہ نے کرادیا تھا کہ اہل شہر خیرات کی روٹیاں کھلایا کریں اور ثواب کمایا کریں۔

یہ انہیں خیرات کی روٹیوں کی برکت تھی کہ ان کے اقدام نے انگریزی فوج کے چھکے چھڑا دیئے۔ مٹکاف کو جان بچا کر بھاگنا پڑا، اور کشتوں کے پشتے پیچھے چھوڑ گیا۔

یہ اسی اکل حلال کی برکت تھی کہ جامع مسجد اس وقت محفوظ رہ گئی، اور پھر برطانوی سامراج بھی اسے محفوظ رکھنے پر مجبور ہوا۔ آج اگر اس کی بلند عمارت اور اونچے منارے ہستی مسلم کے لئے قبلہ نما ہیں، اور اگر اس کی عظمت کے آگے نہ صرف وزیر اعظم جمہوریہ ہند بلکہ دہلی میں آنے والے ہر ایک وزیر اعظم کی گردن حیرت و استعجاب سے خم ہوتی ہے تو وہ صرف شاہ جہاں کی حسن نیت اور اعلیٰ صنعت کا نتیجہ نہیں بلکہ ان مجاہدین ایثار رشیدہ کی قربانی اور ان کے اس ذبح عظیم کی تجلی ہے جس نے اس کی منزلت کو دوبالا کردیا ہے اور اس کے حسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

خاکساران جہاں را بحقارت منگر ۔۔۔ تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

مختصر یہ کہ یہ مسافر وہی وہابی جہادی تھے جو دس گیارہ بجے تک دشمن کے مقابلہ پر لڑتے رہے اور اب جب انقلابی فوج شکست کھا کر پیچھے ہٹی، بزدل سپاہیوں نے راہ فرار اختیار کی، تو یہ مجاہدین باخلاص اسی کے گھر آپڑے جس کے نام پر قربان ہونے کے لئے آئے تھے۔ یہاں تک کہ ان سے بہت سوں نے قربان ہو کر اپنی تمنائیں میں پوری کرلیں۔

سر جدا کرد از تنم شوخے کہ با ما یار بود ۔۔۔ قصہ کوتاہ کرد ورنہ درد سر بسیار بود

گر عاشق صادقی بکشتن مگریز ۔۔۔ مرد ار بود ہر آن کہ او ور انکشند

زخمی مجاہدین کا دارالشفا

یاد رکھنے کی بات ہے۔ شمس العلماء فرماتے ہیں:

انگریزی غلبہ کے بعد جن کے لئے بلا تامل قتل یا پھانسی کا عمل جاری کردیا جاتا تھا، اُن کی چند قسمیں تھیں۔

(۱) زخمی جہادی جو مسجدوں میں پڑے ہوئے ملتے تھے۔(۲۰۴) پہلے یہ زخمی ہوئے تھے، اب دار و رسن کی سنت ادا کرتے تھے۔

عمرے ست کہ آوازۂ منصور کہن شد — من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

باقی قسمیں بھی اسی وقت ملاحظہ فرمالیجئے۔

(۲) بادشاہی خاصہ بردار۔

(۳) میگزین کے ملازم۔ جن کا سردار کریم بخش تھا۔ جو میگزین پر انقلابی فوج کو قبضہ دلانے کے لئے کوشش کررہے تھے۔ پھر میگزین اُڑنے کے وقت کسی صورت سے بچ گئے تھے۔

(۴) اجمیری دروازہ کے موچی۔ کیونکہ کچھ موچیوں نے مٹکاف کا تعاقب کیا تھا۔ جب وہ ۱۱ مئی کو فرار ہورہا تھا۔

(۵) تلنگے۔ جو کہیں سے چھپے ہوئے مل جاتے تھے۔

مختصر یہ کہ مجاہدین با اخلاص جن کو خود اُن کے بھائی "وہابی" کہہ کر مطعون کرتے تھے۔ جنہوں نے نہ کسی سرکاری خزانہ پر قبضہ کیا تھا، نہ بہادر شاہ کے فوجی فنڈ سے اُن کی امداد منظور کی تھی، نہ اُن کے پاس ڈیرے خیمے تھے، نہ کسی دیوان خانے پر اُن کا قبضہ تھا۔ صرف اللہ کے نام پر گھروں سے نکلے تھے۔ اسی کے لئے بال بچوں کو چھوڑا تھا۔ اسی کے نام پر اُن کی زندگی تھی اور جب زندگی سے مایوس ہوئے تو اسی کے گھر کو اپنی پناہ گاہ بنایا۔ یہی مسجدیں اُن کی دارالشفا تھیں۔ کیا دنیا کے اسکاوٹس، رضا کار اور والنٹیر اس ایثار و قربانی، شوق فدائیت اور ولولۂ شہادت کی مثال پیش کرسکتے ہیں؟

رحمہم اللہ ورضی عنہم

اب چند سطروں میں اُن عمارتوں کی سرگزشت ملاحظہ فرمائیے جہاں یہ پناہ پکڑا کرتے تھے۔

دہلی کا تباہ شدہ علاقہ

راقم الدولہ ظہیر دہلوی

کابلی دروازہ سے لے کر قلعہ تک، اور دریبہ سے لے کر قلعہ تک اور جامع مسجد سے لے کر دلی دروازہ تک ۔ بلاقی بیگم کا کوچہ، خانم بازار، خاص بازار، خان دوران خاں کی حویلی سے دریا گنج تک، ہزارہا مکانات منہدم اور مسمار کر کے دلی کا چبوترہ بنا دیا گیا اور چٹیل میدان کر دیا گیا۔ (۲۰۵)

شمس العلماء ذکاء اللہ خاں

بلاقی بیگم کا کوچہ، خانم بازار، خان دوران خاں کی حویلی، نگلیوں کا بازار، دریا گنج کی گھاٹی، انگوری باغ، ونگوا بازی وغیرہ میں بعض بالکل بعض کے حصے منہدم کر دیے گئے۔ (۲۰۶)

قلعہ کے نیچے میدان کرنے میں ایک بڑی عالی شان مسجد اکبر آبادی بالکل منہدم ہوئی، اور بہت سی چھوٹی چھوٹی مساجد مسمار ہوئیں۔ (۲۰۷)

مسمار کرنے اور منہدم کرنے اور مسجدوں اور مندروں کو تباہ و برباد کرنے کا قصہ جتنا طویل ہے اتنا ہی دردناک بھی ۔ مگر اب اس ماتم سے کیا فائدہ؟ ہم نے یہ ذکر یہاں اس لئے چھیڑا کہ اس تباہی کی وجہ دریافت کریں۔

بے شک ایک وجہ تو کھلی ہوئی تھی کہ انقلابی فوجوں کی بود و باش زیادہ تر اسی علاقہ میں رہی جو طول میں کشمیری گیٹ سے دہلی دروازہ تک تقریباً دو میل اور شرقاً غرباً عرض میں تقریباً ایک میل ہے۔ اس علاقہ میں وہ بھی رہا کرتے تھے، جن کا تعلق بادشاہ سے رہتا تھا، اور یہی علاقہ ہے جہاں چپہ چپہ پر انگریزوں کا مقابلہ کیا گیا۔ لیکن ان سب سے زیادہ انتقامی جذبات کو مشتعل کرنے والی وجہ یہ ہے کہ ان وہابی جہادیوں کے مرکز انہیں محلوں اور یہاں کی مسجدوں میں تھے، شمس العلماء کا بیان ہے کہ:

مولوی رحمت اللہ کرانہ سے اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے۔ وہ قلعہ کے پاس مولوی محمد حیات کی مسجد میں اترے۔

سرسید مرحوم کی مشہور تصنیف "آثار الصنادید" پہلی بار اس انقلاب سے دس سال پہلے ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں شائع ہوئی تھی۔ "صنفہ سید احمد خاں مصنف" اس کی تاریخ ہے۔ سید احمد خاں صاحب اسی مسجد کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

یہ مسجد نئی آباد ہوگئی ہے کہ اب اس کو باعتبار کثرت عبادات اور وفور طاعات خیر المساجد اور افضل المساجد کہنا چاہیے۔

زینت المساجد عرف گھٹا مسجد

شہید تو نہیں کی گئی۔ البتہ بیکری اور بچن وغیرہ کے استعمال میں اس کو عرصہ تک لایا جاتا رہا۔ (۲۰۸) یہ مسجد

دریا گنج میں ہے۔ اس کی مشرقی جانب میں چند گز کے فاصلہ پر شہر پناہ کی دیوار اور ایک پھاٹک تھا۔ جس سے دریائے جمنا کے گھاٹ پر جایا کرتے تھے۔ اسی مناسبت سے اُس کو گھٹنا مسجد بھی کہتے ہیں۔ اپنے طول وعرض اور خوب صورتی میں یہ مسجد بے نظیر ہے۔ جامع جہاں نما (جامع مسجد دہلی) کے بعد اس کا نمبر ہے۔ شاہدرہ سے دہلی جاتے ہوئے صرف دو مسجدوں کے مینار نظر آتے ہیں۔ ایک جامع مسجد کے اور دوسرے اسی زینت المساجد کے۔ سرسید احمد صاحب مرحوم فرماتے ہیں، اس مسجد کو شاہزادی زیب النساء بیگم دختر اورنگ زیب عالمگیر نے بنوایا تھا۔ اس کا مدفن بھی اسی مسجد کے صحن میں شمال کی طرف ہے۔ اس کی قبر کے پاس ایک چھوٹا برج تبرکات رکھنے کا ہے۔ اس کے نیچے دو مُتحجر ہیں۔ ایک سنگ باسی کا اور دوسرا سنگ مرمر کا، جس کا فرش بھی سنگ مرمر کا ہے۔

سرسید نے جس مُتحجر کا پتہ دیا ہے، اب اس کا وجود باقی نہیں ہے۔ صرف دو پختہ قبریں ہیں، ان پر نہ کتبہ ہے نہ گنبد۔

مسجد کا قصور

① ایک قصور تو یہ ہے کہ دریا گنج میں ہے۔ (۲۰۹) شاہی محلات سے متصل اور اسی علاقہ میں سب سے پہلے انقلابی فوج نے انگریزوں کا خاتمہ کیا تھا۔

② ممکن ہے کہ اس عام شہرت نے بھی جرم وقصور کی حیثیت اختیار کرلی ہو کہ حضرت مولانا اسمٰعیل صاحب شہیدؒ جب تیراکی کی مشق کیا کرتے تھے۔ تو آپ کا فرودگاہ اور آرام گاہ یہی مسجد ہوا کرتی تھی۔

اکبری مسجد

جو مسجدیں منہدم کی گئی ہیں، اُن میں اکبری مسجد یہ خصوصیت رکھتی ہے کہ اُس کو شہید کر کے اس کی جگہ ایڈورڈ کا مجسمہ نصب کیا گیا۔ مجسمہ نصب کرنے سے پہلے جو پارک بنایا گیا، اس کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کی بنیاد جارج پنجم نے رکھی تھی۔ ایڈورڈ پارک جامع مسجد دہلی کی مشرقی جانب تقریباً دو فرلانگ کے فاصلہ پر آج بھی موجود ہے۔

جس وقت پارک میں زمین ہموار کی جانے لگی تو مسجد کا چبوترہ اور بنیادیں جوں کی توں مثل گنج نہاں زمین میں مدفون تھیں، ویسے ہی ڈھک دی گئیں۔ فیض بازار جس کا تذکرہ تباہ شدہ بازاروں کے سلسلہ میں گزرا، یہ مسجد اسی بازار میں تھی۔ شاہجہاں بادشاہ کی بیگم اعزاز النساء عرف اکبرآبادی محل نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ کر کے یہ عظیم الشان مسجد بنوائی تھی۔ مسجد کا مسقف حصہ ۶۳ گز لمبا اور سترہ گز چوڑا تھا۔ مسجد کے تین گنبد اور سات در تھے۔ دائیں بائیں خوب صورت اور بہت بلند مینار تھے۔ سامنے ۶۳ گز لمبا اور اتنا ہی چوڑا صحن تھا جو زمین سے تین گز اُونچا تھا۔ اس کے گرد تین گز اُونچا کٹہرا بنا ہوا تھا۔ صحن کے سامنے ۱۲×۱۲ گز حوض تھا جس میں نہر سے پانی آتا تھا۔

درآں حوضے بصد آب و تاب   درخشندہ چوں چشمۂ آفتاب

پوری عمارت سنگ سرخ کی تھی۔ سامنے کی طرف سنگ مرمر کی بیلیں بنی ہوئی تھیں۔ مسجد کے شمال جنوب اور مغرب میں تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر خوب کھلے اور صاف حجروں کی قطاریں تھیں حجروں کے سامنے برآمدے تھے گویا مسجد خاص طور اسی مقصد کے لیے بنائی گئی تھی کہ طلبہ حجروں میں رہیں اور مسجد میں درس دیا جائے۔ یہ مسجد کی ظاہر عمارت کی باتیں تھیں۔ اب باطنی اوصاف ملاحظہ فرمایئے۔

یہی مسجد تھی جہاں مترجم قرآن کریم حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب محدثؒ اور ان کے برادر محترم مولانا شاہ رفیع الدین صاحبؒ درس دیتے رہے تھے۔ جماعت مجاہدین کے سالار قافلہ اور جہادی دماغوں کے پیرومرشد امیرالمومنین حضرت سید احمد شہیدؒ جب عہد شباب میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی خدمت میں کسب فیض کے لئے حاضر ہوئے اور حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ العزیز نے آپ کی تربیت حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے سپرد کی، تب آپ کا قیام اسی مسجد میں رہا تھا۔ (۴۱۰) اس کے بعد جب آپ نواب امیر علی خاں کے یہاں سے رخصت ہو کر اپنے شیخ و مربی حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے، تب بھی آپ کا قیام حسب معمول اسی مسجد میں ہوا، اور یہیں سے بیعت کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے حکم سے خاندان کے تمام متعلقین داخل ہوئے۔ جن میں سے حضرت مولانا عبدالحیٔ صاحبؒ اور مولانا اسمٰعیل صاحب شہیدؒ نے مشیر خاص، وزیر اور معتمد خصوصی کی حیثیت حاصل کی۔ (۴۱۱) یعنی قافلۂ جہاد کی داغ بیل یہیں سے پڑی۔ (۴۱۲)

چند صفحات پہلے حضرت مولانا سید نصیرالدین صاحبؒ کا ذکر خیر گزر چکا ہے۔ آپ نے حضرت سید احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے بعد علم جہاد بلند کیا تھا، ۱۸۵۷ء کے مجاہدین زیادہ تر آپ سے وابستگی رکھتے تھے جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ اس میں اتنا اضافہ اور کر لیجئے کہ جب تک آپ دہلی میں رہے، آپ کا زیادہ وقت اسی مسجد میں گزرتا تھا اور یہی مسجد آپ کی دارالمشورہ تھی۔ (۴۱۳)

محترم غلام رسول صاحب مہر نے اس مسجد کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد یہ شعر تحریر کیا ہے:

آسماں سجدہ کند بر سر خاکے کہ برو — یک دوتن یک دو نفس بہر خدا بنشینند

غالباً اس کی یہی عظمت تھی کہ برطانوی حوانیت نے اپنے عروج کے وقت دہلی کے تمام مجسموں میں اس جگہ سب سے بڑا اور سب سے اونچا مجسمہ قائم کرنا ضروری سمجھا۔ حالانکہ یہ مسجد ایسے موقع پر تھی کہ اگر اس کو باقی رکھا جاتا تو وہ اس وسیع میدان کے لئے، جو مسجد اور لال قلعہ کے درمیان ہزاروں (۴۱۴) مکانوں کو منہدم کر کے بنایا گیا تھا، زینت کا کام دیتی، اور اس سے میدان کی خوب صورتی بڑھ جاتی۔

دارالبقاء اور دارالشفاء

شاہجہاں بادشاہ نے جامع مسجد تعمیر کرائی تو اس کے دائیں بائیں روحانی اور جسمانی امراض کے علاج کے

ادارے بھی قائم کر دیے یعنی ایک پہلو میں مدرسہ دار البقاء اور دوسری جانب شفا خانہ دار الشفاء۔[۲۱۵] ۱۸۵۷ء میں مدرسہ دار البقاء کے منتظم اور نگران حضرت مولانا مفتی صدر الدین صاحب تھے۔ جن کے یہاں جہادیوں کا جمگھٹ رہتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ کچھ شرارت پسند فوجیوں نے کسی غلط فہمی سے مفتی صاحب کے مکان پر یورش کر دی تو ستر جہادی جو وہاں موجود تھے، مقابلہ پر آ گئے۔ جب مکان پر یہ جمگھٹا رہتا تھا تو مدرسہ دار البقاء میں کیا ممانعت ہو سکتی تھی۔ لہٰذا اکبری مسجد کی طرح یہ مدرسہ بھی مستحق ہدم تھا۔ دست انتقام نے اس حق کو ادا کر دیا۔

لقد صدق اللہ۔ ان الملوک اذا دخلوا قریۃ فسدوھا

نامور علماء و فضلاء

۱۸۵۷ء کی پوری تاریخ تو نہیں، مگر بہت سی ضروری باتیں لکھی جا چکی ہیں کچھ ایسے پہلو بھی سامنے آ گئے ہیں جن پر اب تک ناواقفیت کی چادر پڑی ہوئی تھی۔ یا بے اتفاقی اور لا اعتنائی کے دھندلکوں میں وہ چھپے ہوئے تھے۔ اب ایک نظر مضافات دہلی پر ڈالنی ہے لیکن اس مناسبت سے کہ یہ شاندار ماضی کی ایک جلد ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے اس تذکرہ کو علماء کرام کے ذکر خیر پر ختم کیا جائے لہٰذا چند ارباب فضل و کمال کے مختصر حالات سے کتاب کے اس حصہ کو متبرک بنایا جا رہا ہے۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

حضرت مولانا مفتی صدر الدین خاں آزردہ

حضرت مولانا مفتی صدر الدین صاحب ابن مولانا لطف اللہ صاحب کشمیری یعنی وہ جامع کمالات شخصیت جس کا ذکر آیا تو سرسید کے قلم کو گویا وجد آ گیا۔ سب سے پہلے بے تحاشا یہ شعر تحریر فرمایا۔ ؎

ہزار بار بشویم دہن ز مشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

قلم کو کیا طاقت کہ ان کے اوصاف حمیدہ سے ایک حرف لکھے اور زبان کو کیا یارا کہ ان کے محامد پسندیدہ سے ایک لفظ کہے۔ قطع نظر اس کے کہ اس زبدہ جہان و جہانیاں کی صفات کا احصا (پوری شمار) محالات سے اور کمالات کا حصر مرتبہ حسرات سے ہے جس وقت قلم چاہتا ہے کہ کوئی صفت صفات میں سے لکھے یا زبان ارادہ کرتی ہے کہ کوئی مدح مدائح میں سے کہے، جو کہ ہر صفت قابلیت حال لکھنے کی اور مدح لیاقت پہلے بیان کرنے کی رکھتی ہے، مدت تک یہی عقدہ بند زبان تحریر اور گرہ لسان تقریر رہتا ہے کہ کونسی صفت سے اور کونسی مدح سے ابتداء کرے۔ شعر

مجلس تمام گشت و بپایاں رسید عمر ما ہمچناں در اوّل وصف تو ماندہ ایم

بے شائبۂ تکلف و بے آمیزش مبالغہ، ایسا فاضل اور ایسا کامل کہ جامع فنون شتّیٰ (مختلف و متعدد) اور مجمع

علوم سے ملتجا ہو اب سوائے اس "سرگروہ علماء روزگار" کے بساطِ عالم پر جلوہ گر نہیں..... (تقریباً ایک صفحہ میں آپ کے یکتا اور سرگروہ ہونے کے دلائل بیان کرنے کے بعد سرسید فرماتے ہیں)

راہِ حق میں تیز رو اور مسلکِ دنیا میں کاہل کوش۔ لیکن تونگری ظاہری درویشی معنوی کی پردہ پوش ہے۔

کسانیکہ راہ خدا داشتند چنیں خرقہ زیرِ قبا داشتند

اگر مولوی جامی زندہ ہوتے تو یہ بیت

چو فقر اندر لباسِ شاہی آمد بہ تدبیر عبید اللٰہی آمد

سوائے اُس برگزیدۂ انفس و آفاق کے اور کسی کی شان میں نہ کہتے۔ آخر میں تحریر ہے:

باوجود ان مراتبِ بلند اور اس منصبِ ارجمند کے خلقِ محمدی اختیار کیا ہے کہ افادۂ علوم اور افاضۂ مسائلِ دین کے وقت ہر ادنیٰ کو اجازتِ سخن ہے۔ (۲۱۶)

مولانا فقیر محمد صاحب جہلمی ثم الدہلوی مصنف حدائق الحنفیہ تحریر فرماتے ہیں:

مفتی صدر الدین خاں صدر الصدور تمام علوم صرف، نحو، منطق، حکمت، ریاضیات، معانی، بیان، ادب، انشاء، فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور درس دیتے تھے۔ آباو اجداد آپ کے کشمیر کے اہلِ بیت علم و صلاح تھے۔ مگر آپ کی ولادت دہلی میں ہوئی۔ علوم نقلیہ، فقہ، حدیث وغیرہ شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی اور اُن کے بھائیوں سے حاصل کئے اور ان کی سندیں لیں، اور فنونِ عقلیہ کو مولوی فضل امام خیر آبادی والد مولوی فضل حق سے اخذ کیا اور شیخ (شاہ) محمد اسحاق دہلوی نے بھی آپ کو حدیث کی اجازت لکھ کر دی۔ آپ بڑے صاحب وجاہت و ریاضت اور اپنے زمانہ میں یگانۂ روزگار اور نادرۂ عصر تھے۔ ریاست درس و تدریس خصوصاً افتاء ممالک محروسہ مغربیہ بلکہ شرقیہ و شمالیہ دہلی اور امتحان مدارس و صدارت حکومت دیوانی آپ پر منتہی ہوئی۔ بجز شاہ دہلی کے تمام اعیان و اکابر، علماء و فضلاء خاص دہلی اور اس کے نواح کے آپ کے مکان پر حاضر ہوتے تھے۔ طلباء واسطے تحصیل علم اور اہل دنیا واسطے مشورۂ معاملات اور منشی لوگ (انشاء پرداز) بغرض اصلاح انشاء اور شعراء واسطے مشاعرہ کے آتے تھے۔ اس اخیر وقت میں ایسا فاضل بایں جمعیۃ اور قوت حافظہ و حسن تحریر و متانت تقریر فصاحت بیان اور بلاغت معانی کے صاحب مروت و اخلاق اور احسان دیکھا نہیں گیا۔ طلبہ مدرسہ دار البقاء (۲۱۷) (جو جامع مسجد کے نیچے تھا) اکثر طعام و لباس و بعضے ماہوار، جناب سے پاتے۔ اور آپ سے اور دیگر علماء سے تحصیل علم کرتے تھے۔

۱۲۷۳ھ میں دہلی کے غدر میں آپ کو سخت زخم چشم پہنچا کہ تعلق روزگار بھی ہاتھ سے گیا اور تمام جائداد و املاک بھی جو تیس ۳۰ سال کی ملازمت میں پیدا کی ہوئی تھی، سرکار میں ضبط ہو گئی۔ بلکہ

فتویٰ جہاد کے اشتباہ میں چند ماہ تک نظر بند رہے۔ چونکہ اصل میں بے قصور تھے،[۲۱۸] آخر کو رہائی پا کر لاہور میں تشریف لائے اور واسطے اپنے کتب خانہ مالیتی تین لاکھ روپے کے جو دہلی کی لوٹ میں نیلام ہو گیا تھا، حضور ''لارڈ جان لارنس'' صاحب کے پاس جو اُس وقت پنجاب کے چیف کمشنر تھے اور مولانا ممدوح کے دہلی میں بڑے مہربان رہ چکے تھے، مطالبہ کیا۔ لیکن چونکہ جائداد منقولہ کے نیلام کا واپس ہونا متعذر تھا اس لئے اپنے مطلب میں کامیاب نہ ہوئے لیکن اتنا ہو گیا کہ جائداد غیر منقولہ جو سرکار میں ضبط ہو گئی تھی، واگزار ہو گئی، اور مولانا موصوف دہلی میں واپس تشریف لے جا کر چندے بستی حضرت نظام الدین اولیاء اور پھر اپنی حویلی خاص[۲۱۹] واقع دہلی میں خانہ نشین ہوئے اور اپنی حیات کے باقی ایام کو وظائف و عبادات اور تدریس علوم دینیہ میں بسر کیا۔

مشاغل

مفتی صاحب نے غالباً زمانہ اسارت میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کو ایک خط لکھا تھا جس میں پچھلی زندگی کے مشاغل کا تذکرہ تھا۔ ملاحظہ فرمایئے:

''شکر ہے اُس پروردگار عالم کا جس نے مجھے ایسی دلدل سے کہ ہمہ تن اُس میں غرق تھا، نکالا کیسے علائق میں جکڑ بند تھا کہ نکلنا اُن سے سوائے اس صورت کے جو پیش آئی ممکن نہ تھا۔ مقدمات اصلی کا فیصل کرنا، منصفوں اور صدر امینوں کے مقدمات کا مرافعہ سننا۔ رجسٹری کے وثائق پر دستخط کرنا، مقدمات کے دوران میں فتوے دینا، کمیٹیوں میں حاضر ہونا، طلبہ مدرسہ سرکاری کا امتحان ماہواری لینا، احکام آخر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا، ہزارہا کاغذات پر دستخط کرنا، پھر گھر میں آکر طالب علموں کو پڑھانا[۲۲۰] اور اطراف و جوانب کے سوالات شرعی کا جواب دینا، وہابیوں اور بدعتیوں کے جھگڑے میں حکم (ثالث) ہونا، مجلس شادی و غمی اور اعراس میں جانا، شعر و شاعری کی صحبت گرم رکھنا، باغات کی سیر اور خواجہ صاحب کی زیارت کو اکثر جانا''۔

سیاسی بصیرت اور رئیس المجاہدین کی رہبری

ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے تقریباً دس سال پہلے جب رئیس المجاہدین حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب دہلی تشریف لائے تھے (تو جیسا کہ شاہ صاحب کے تذکرہ میں تفصیل سے بیان کیا جائے گا) یہی دانش مند فرزانہ روزگار حضرت مولانا مفتی صدر الدین صاحب تھے جنہوں نے شاہ صاحب موصوف کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی جدوجہد کا مرکز دہلی کے بجائے آگرہ بنائیں۔ پھر آپ ہی نے اپنے خط کے ذریعہ شاہ صاحب کا تعارف آگرہ کے اُن زعماء اور علماء سے کرایا، جو ایک طرف سرکاری حلقوں میں باوقار تھے تو دوسری جانب قومی اور ملی کارکنوں کا

اعتماد اُن کو حاصل تھا۔

جنوبی ہند کا ایک غیر معروف نوجوان جو دہلی میں ناکام ہو چکا تھا، اُس نے اس دور بے آئین[۲۲۱] میں جو سیاسی لحاظ سے بہت ہی نازک[۲۲۲] تھا۔ پولیس اور سی آئی ڈی کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہتے ہوئے چند ہی مہینوں میں وہ غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی، جس کی نظیر بہت ہی مشکل سے کہیں کہیں ملتی ہے۔ بیشک حضرت شاہ صاحب کی غیر معمولی صلاحیت وقابلیت کی برکت ہے لیکن ایک منصف مزاج حقیقت پسند کو اس پر بھی تامل نہ ہونا چاہیے کہ حضرت مفتی صاحب کے تعارفی خط نے بھی اساس اور بنیاد کا کام کیا ہے۔ دارالحکومت آگرہ کے اعلیٰ سیاسی طبقہ میں ایک غیر معروف شخص کے لئے رسوخ اور اعتماد حاصل کرنے کی کٹھن منزل جو سالہا سال میں طے ہوتی، حضرت مفتی صاحب کا مکتوب گرامی اور سیاسی طبقہ سے مفتی صاحب کا گہرا تعلق ہی تھا جس نے اس کو نہایت آسانی سے چند لمحوں میں طے کرا دیا۔

انقلابی سرگرمی سے خاموش دلچسپی

خاص اس ہنگامہ کے دوران مفتی صاحب کسی محاذ پر پیش پیش نظر نہیں آتے۔ مگر تحریک انقلاب سے آپ کی دلچسپی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ کا دردولت جس طرح عام حالات میں مرجع رہا کرتا تھا، اس وقت بھی انقلابی عناصر کا پناہ گاہ بنا رہا۔ انگریزوں کے سب سے زیادہ خطرناک دشمن جن کو مجاہدین کہا جاتا تھا، جن کی انگریز دشمنی کسی وقتی اور ہنگامی ناگواری کی بنا پر نہیں تھی بلکہ ان کی حریت پسند فطرت نے اس کو عقیدہ کی حیثیت دے رکھی تھی۔ ان سربکف مجاہدین کا ہجوم جس کے دردولت پر رہتا تھا..... وہ مفتی صدرالدین صدرالصدور ہی تھے۔

چنانچہ ۹؍اگست ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے کہ کسی غلط فہمی کی بناء پر پچاس سپاہیوں کا ایک دستہ حضرت مفتی صاحب کے مکان پر چڑھ دوڑا۔ اس پر منشی جیون لال کا تحریری بیان ہے:

''یہ دیکھ کر وہاں ستر جہادی مقابلہ کے لئے تیار ہیں، وہ واپس آ گیا''۔[۲۲۳]

ہندوستانی حکومت سے وفاداری

بیشک مفتی صاحب صدرالصدور تھے۔ کمپنی کی حکومت کی طرف سے آپ کو تنخواہ ملتی تھی، مگر یہ صرف ایک ضابطہ کا تعلق تھا۔ آپ کے دل کا لگاؤ اور آپ کی حقیقی وفاداری سلطنت مغلیہ کے آخری نشان ''بہادر شاہ ظفر'' کے ساتھ مخصوص تھی اور اسی پر آپ کو فخر اور ناز تھا۔ جس کا اظہار آپ نے ایک مرتبہ دہلی کے کمشنر سے برملا کر دیا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ:

''بادشاہ سلامت کے خزانہ سے مفتی صاحب کے منصب کو دو روپے آٹھ آنے ملتے تھے محبوب علی خان خواجہ جب وزیر ہوا تو اس نے بند کر دیے۔ مفتی صاحب نے بادشاہ کے یہاں ڈھائی روپیہ کا مقدمہ لڑ کر پھر جاری کرائے۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے مفتی صاحب سے کہا کہ آپ کو ہماری سرکار ہزار روپیہ سے اوپر دیتی

ہے۔ آپ نے ڈھائی روپیہ کے لئے اتنی کھکیڑ کیوں اُٹھائی۔ مفتی صاحب نے فرمایا۔ آپ کے ہزار بارہ سو روپیہ سے ڈھائی روپے بھاری ہیں۔ یہ تبرک ہے اس پر ہمیں فخر ہے۔" (۲۲۴)

زمانۂ انقلاب میں دربار سے تعلق

یہ درست ہے کہ مفتی صاحب نے ابتداء میں کنارہ کشی مناسب سمجھی۔ چنانچہ انقلاب سے دو تین روز بعد ۱۴ رمئی کو جب بہادر شاہ ظفر نے آپ کو شہر کا مجسٹریٹ مقرر فرمایا، تو آپ نے عدم صحت کی بناء پر معذوری ظاہر کی۔ (۲۲۵) مگر یہ وہ وقت تھا کہ اب تک بہادر شاہ خود بھی مذبذب تھے۔ اور اس ذمہ داری کو اُٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوئے تھے جو انقلابی فوجوں نے آپ کے سر کر دی تھی۔ لیکن یہ مفتی صدر الدین صاحب ہیں جو دربار میں برابر حاضر ہوتے ہیں۔ فرائض صدارت انجام دیتے ہیں اور اس خوبی سے کہ وہی باغی جن کی سرتابی اور سرکشی سے ہر ایک ابن الوقت لرز رہا تھا، یہاں تک کہ خود بادشاہ کو اُن کی شورہ پشتی کی شکایت تھی۔ وہ شورہ پشت مفتی صاحب سے اس درجہ متاثر تھے کہ جو کام دوسرے نہیں کرا سکتے تھے، بادشاہ کو یقین تھا کہ مفتی صاحب کرا سکتے ہیں۔ چنانچہ حکیم احسن اللہ خاں کا سامان لوٹ لیا گیا تو ۱۲ راگست کو بر سر دربار:

> "بادشاہ نے مولوی صدر الدین خاں سے کہا کہ جب تک حکیم احسن اللہ خاں کا مال جسے سپاہیوں نے لوٹ لیا ہے واپس نہ کر دیا جائے گا اُس وقت تک تمہیں دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہ دی جائے گی۔ (۲۲۶)

ظاہر ہے کہ انقلابی فوج مفتی صاحب سے اس درجہ متاثر اسی وجہ سے تھی کہ مفتی صاحب کی خاموش دلچسپی انقلابی سرگرمیوں سے وابستہ تھی۔

فتویٰ جہاد

۱۱ر جولائی کو جنرل بخت خاں دہلی پہنچے اور چند روز بعد ہی علماء دہلی سے اس جدوجہد آزادی کی حیثیت مشخص کرانا چاہی، تو یہ بتانا تو مشکل ہے کہ فتویٰ مرتب کرنے میں حضرت مفتی صاحب کا کہاں تک دخل تھا۔ البتہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جن بزرگوں نے فتویٰ پر سب سے پہلے دستخط کیے، اُن میں حضرت مفتی صاحب کا اسم گرامی آج تک زیب قرطاس ہے۔ (۲۲۷)

حضرت مفتی صدر الدین صاحب اور زمانۂ دار و گیر

انگریزوں کے تعلقات حضرت مفتی صاحب سے خواہ کتنے ہی اچھے رہے ہوں مگر ۱۸۵۷ء کی قیامت خیزی کے بعد ناممکن تھا کہ مفتی صاحب کی سیاسی دلچسپیاں نظر انداز ہو جاتیں۔ چنانچہ بقول مولانا فقیر محمد صاحب آپ کو سخت زخم چشم پہنچا کہ تعلق روزگار بھی ہاتھ سے گیا، اور تمام املاک و جائداد بھی ضبط ہوئی اور چند ماہ نظر بند رہنا پڑا۔ مرزا غالب اپنے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

حضرت مولوی صدرالدین صاحب بہت دنوں حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف، جائداد ضبط۔ ناچار خستہ و تباہ حال لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے ازراہ ترحم نصف جائداد واگزاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ اگرچہ بامداد (واگذاشت جائداد کی آمدنی) اُن کے گزارے کو کافی ہے۔ اس واسطے کہ ایک آپ اور ایک آپ کی بی بی، تیس چالیس روپیہ مہینہ کی آمدنی۔ لیکن امام بخش کی اولاد اُن کی "عترت" ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں۔ فراغ بالی سے نہیں گزرتی۔ ضعف پیری نے بہت گھیر لیا ہے۔ عشرہ ثامنہ کے اواخر میں ہیں۔ یعنی اسی برس کے قریب عمر ہوگئی۔ خدا سلامت رکھے، بہت غنیمت ہیں۔ (۲۲۸)

جامع مسجد دہلی اور مفتی صاحب کا کارنامہ

جامع مسجد غدر میں انگریزی قبضہ میں آگئی تھی۔ یہ مقدس عمارت تقریباً دو سال تک فوجی استعمال میں رہی۔ مسلمانان دہلی فریضہ نماز کی ادائیگی سے محروم تھے۔ جب دہلی میں امن بحال ہوگئی تو مفتی صاحب نے عمائد شہر کی ہم نوائی میں مسجد کی واگزاشت کی سعی کی۔ آپ کے شرکاء میں شاہی خاندان کے مرزا الٰہی بخش بھی تھے۔ چنانچہ گورنمنٹ نے یہ مسجد مسلمانوں کے حوالہ کی، اور مسلمان اکابر شہر کی ایک مختصر سی جماعت کی انتظامیہ کمیٹی بنا کر مسجد اس کو تفویض کی۔ اس منتظمہ جماعت میں مفتی صاحب اور مولوی اکرام اللہ خاں وغیرہ تھے۔ (۲۲۹)

زندگی کا آخری دور اور وفات

مولانا فقیر محمد صاحب مصنف "حدائق الحنفیہ" تحریر فرماتے ہیں:

"یہ مؤلف بھی ۱۲۷۶ھ (۶۰-۱۸۵۹ء) میں جب مولانا موصوف بستی حضرت نظام الدین اولیاء میں اقامت گزیں تھے، اُن کی خدمت میں حاضر ہوا، اور تیرہ ماہ تک اُن کی خدمت میں مشرف رہ کر علوم نقلی و عقلی کا استفادہ کرتا رہا۔ اس وقت مولانا موصوف باوجودیکہ چوہتر سال کے تھے، مگر ذوق شعر و سخن میں جوانان عاشق مزاج سے زیادہ مذاق رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، اردو میں نہایت عمدہ شعر کہتے تھے۔ آزردہ تخلص تھا اور بمقتضاء اُس کے ہمیشہ فرط عشق اور ولولہ محبت سے آزردہ خاطر، افسردہ خاطر، دیدہ گریاں، سینہ بریاں رہتے تھے۔ اشعار کے پڑھنے میں نہایت دل شگاف آواز، لحن حزیں اور صورت دردانگیز رکھتے تھے۔ جس نے آپ کی زبان سے سخن موزوں سنا ہے وہی اس کی کیفیت جانتا ہے کہ کیا انشاء و شعر تھا یا سحر۔

آخر عمر میں ایک دو سال مرض فالج میں مبتلا رہ کر اکاسی ۸۱ سال کی عمر میں یوم پنجشنبہ ۲۴ ربیع الاوّل ۱۲۸۵ھ میں فوت ہوئے"۔ (۲۳۰)

مولوی ظہور علی صاحب مخاطب بہ شمس الشعراء نے آپ کی تاریخ وفات حسب ذیل لکھی ہے:

چو مولانا صدرالدین کرد عصر — امام اعظم آخر زماں بود
زہے صدرالصدور نیک محضر — بعدل و داد چوں نوشیرواں بود
بروز پنجشنبہ کرد رحلت — کہ ایں عالم نہ جاہ جاوداں بود
ربیع الاوّل و بست و چہارم — وداع او سوء دارالجناں بود
ظہور افسوس آں استاد ذی قدر — پدر دارم ہمیشہ مہرباں بود
چراغش ہست تاریخ ولادت — کنوں گفتم چراغ دوجہاں بود
۱۲۰۴۰ — ۱۲۴۹+۱۲۔۳

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

مسند آرائے جاہ وجلال، زیب دہ مکنت واقبال، عمدہ اراکین دولت، اسوۂ اساطین حشمت، صاحب مرتبہ عالی، مہبط انوار سعادت ازلی، مورد انظار مراحم لم یزلی، نبض شناس شخص سخن فہمی وسخن دانی، قانون دان پردہ نکتہ سنجی ونکتہ دانی، حاتم کرم، عطارد رقم، رستم توان، نواب محمد مصطفیٰ خاں بہادر (سرسید[۲۳۱] مرحوم)

تعارف

نواب مصطفیٰ خاں صاحب خلف نواب مرتضیٰ خاں بہادر[۲۳۲] ۱۸۰۶ء دہلی میں پیدا ہوئے۔ عظیم الدولہ، سرفراز ملک آپ کے خطابات تھے، اور شیفتہ تخلص کرتے تھے۔

شیفتہ شاعر منش نواب زادہ ہی نہیں تھے بلکہ شعر وسخن میں وگر بقول سرسید مرحوم نبض شناس وسخن دان، نکتہ سنج ونکتہ دان، اخلاق وخصائل میں مہبط انوار سعادت اور حاتم کرم، تہذیب وشائستگی میں زیب دہ مکنت واقبال، خاندانی شرف وعظمت میں مسند آرائے جاہ وجلال تھے، تو اسی طرح علمی قابلیت میں بدر منیر اور ماہ تاباں، تقویٰ طہارت اور خدا پرستی میں زاہد شب زندہ دار تھے۔

دہلی کے کامل فن اساتذہ سے عربی اور فارسی کی تکمیل کی۔ مولانا حاجی نور محمد صاحب دہلی سے حدیث وقرأت کی کتابیں پڑھیں۔ ذوق سخن کی اصلاح کے لئے مومن خاں مومن کے شاگرد بنے۔ پھر اتنی ترقی کی کہ استاد اور شاگرد کا امتیاز مشکل ہوگیا۔

حج بیت اللہ

ایک مخصوص سعادت جو اس زمانہ میں لاکھوں میں کسی کو نصیب ہوئی تھی، وہ بیت اللہ شریف کی زیارت اور مدینۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حاضری تھی۔ شیفتہ صاحب، میاں جی مالا مال[۲۳۳] کے شاگرد تھے۔ تو جس

طرح ریاست و دولت دنیا سے مالا مال تھے، ۱۲۵۵ھ میں حج بیت اللہ شریف کی دولت سے بھی مالا مال ہوئے اور اس دولت کے ساتھ ایک اور دولت سے بھی دامن پر کیا کہ وہاں کے مشہور محدثین شیخ عبداللہ سراج حنفی مکی اور شیخ محمد عابد سندھی مقیم مدینہ منورہ کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر ان سے سند حدیث حاصل کی۔

اخلاق

ان تمام سعادتوں (۲۳۴) نے آپ کو مکارم اخلاق کا پیکر بنا دیا تھا۔ آپ بے انتہا خلیق اور صاحب مروت تھے۔ نہایت مستقل مزاج، تسلیم و رضا کی دولت خصوصیت سے عطا ہوئی تھی۔ ہر حال میں خوش رہنا آپ کی زندگی کا نمایاں وصف تھا۔ طبیعت میں استغناء بہت تھا۔ مہمان نوازی اور فیاضی میں مشہور تھے۔

روحانی خصوصیات

آپ مجددی نقشبندی سلسلہ میں بیعت تھے۔ بہت پابند شرع، منہیات و منکرات سے حد درجہ مجتنب۔ آپ کے زمانہ میں نواب، اور رئیس تو کیا، مشائخ کے یہاں بھی سماع اور قوالی کا رواج تھا، مگر آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ترنم کے ساتھ اشعار سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ خود آپ کا قول ہے ع

ڈر ہے کہ نہ ہو شوقِ مزامیر شیفتہ ورنہ کبھی سماع مجرد سنا کروں

آپ ہمیشہ رات کو تین بجے سے بیدار ہو جاتے۔ نماز تہجد کے بعد سنت کے مطابق کچھ لیٹتے۔ پھر سب سے پہلے مسجد میں حاضر ہو کر نماز صبح جماعت کے ساتھ ادا کرتے۔

صبر و استقلال

شمس العلماء ذکاء اللہ صاحب کی شہادت ہے کہ نواب شیفتہ جیسا صبر و استقلال میں نے کسی انسان میں نہیں دیکھا۔

تسلیم و رضا کی ایک مثال ملاحظہ کیجئے کہ جب آپ گرفتار تھے، تو ایک دن محافظ پولیس کے دستہ میں پا پیادہ سڑک پر جا رہے تھے۔ آپ نے آسمان کی طرف دیکھا پھر آپ کی زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکلا:

''تیری شان کریمی کے قربان کہ آج ہی سزا دی۔ میں تو اس سے بہت زیادہ کا مستحق تھا''۔

مصائب سے لطف اندوز ہونا صوفیاء کی اصطلاح میں اخص الخواص (۲۳۵) کا صبر کہلاتا ہے۔ یہ تھے ۱۸۵۷ء کے دنیا دار نواب۔

تصنیف و تالیف

ترغیب السالک الی حسن المسالک، تذکرہ گلشن بے خار وغیرہ آپ کی تصانیف، آپ کی اعلیٰ قابلیت کی شہادت ہیں۔

سیاسی ذوق

اخلاص وطن کی امنگ نے آپ کو نواب ولی داد خاں، رئیس مالا گڑھ سے وابستہ کر دیا تھا۔ بادشاہ سے خط و کتابت آپ ہی کے سپرد تھی۔ لیکن یہ وابستگی انگریز کی نظر میں ایک گردن زدنی جرم تھا۔ چنانچہ ہنگامہ فرو ہوا تو آپ گرفتار کر لئے گئے۔ مگر آپ کے ساتھ خاص رعایت کی گئی کہ پھانسی کے بجائے صرف سات سال کی قید تجویز ہوئی۔ پھر نواب صدیق حسن صاحب والی بھوپال نے آپ کی رہائی کے لئے جان کی بازی لگا دی۔ نتیجہ میں کامیابی نصیب ہوئی۔ یعنی قید سے رہا کر دیئے گئے۔ لیکن وظائف سرکاری بند اور ذاتی جائداد کا بھی نصف حصہ ضبط۔

مرض الوفات اور وفات

آپ کو ذیابیطس کا عارضہ تھا۔ آخر میں سرطان بھی ہو گیا۔ ڈاکٹر آپریشن کیا کرتا تھا اور ناقص گوشت کاٹا کرتا تھا جس سے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ اوپر والوں سے دیکھا نہ جاتا تھا۔ چنانچہ ایک روز صاحبزادے محمد علی خاں، بے اختیار رونے لگے۔ آپ نے فوراً صاحبزادہ کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا۔ اس جسم فانی کے زوال پر رونا بڑی کم ہمتی کی بات ہے۔ بہرحال تریسٹھ سال کی عمر پا کر ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ حضرت شیخ سلطان المشائخ نظام الدین محبوب الٰہیؒ کی درگاہ میں اپنے جد امجد کے مزار کے پاس دفن کئے گئے۔

(ماخوذ از دارالحکومت دہلی۔ غدر کے چند علماء دہلی کی آخری شمع اور تصانیف منشی ذکاء اللہ خاں)۔

صہبائی شہید

مولانا امام بخش صہبائی خلف مولانا محمد بخش تھانیسری۔ ایک غریب گھرانے کے فرد۔ پر خانوادہ علم کے چشم و چراغ محفل علم و ادب کے گوہر شب تاب۔ داستان جور و جفا کے شہید ستودہ صفات۔ سرسید کے الفاظ میں:

> کمالات ظاہری اور جلائل باطنی، حسن خلق اور حمائد اطوار میں پسندیدۂ خالق و مقبول خلائق، خلق نوازش آپ کا آئینہ بہار، اور اوضاع حمیدہ آپ کے محسود روزگار، ایسا فرد زمان ایسی جامعیت کے ساتھ کم کوئی نظر سے گزرا ہے، اور طرفہ یہ ہے کہ فنون متعارفہ و سخن وری مثل تحقیق لغت و اصطلاحات زبان وری اور تدقیق مقامات کتابی اور تکمیل عروض و قافیہ و استکمال فن معمہ وغیرہ میں ایسا کمال بہم پہنچایا ہے کہ ہر فن میں یک فنی کہنا چاہیے۔
>
> بر یکے فتہ از ہر فنے روشنی   جداگانہ در ہر فنے یک فنی (۲۳۶)

خاندان اور نسب

مرزا قادر بخش صابر گورگانی گلستان سخن میں لکھتے ہیں:

"سلسلۂ اُن کے نسب کا اُن کے والد ماجد مرحوم و مغفور کی طرف سے تو فاروق حق و باطل حضرت فاروق بن خطاب علیہ رضوان اللہ الوہاب تک، اور والدہ کی جانب سے سید عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے"۔ (۲۳۷)

آپ کے والد ماجد مولانا محمد بخش صاحب تھانیسر سے دلی آئے اور کوچہ چیلاں میں رہ پڑے۔ (۲۳۸)

حلیہ

درمیانہ قد، کھلتا ہوا گندمی رنگ، منہ پر چیچک کے داغ، مہندی سے رنگی ہوئی سرخ داڑھی، پرانی وضع کا لباس، ایک برکا سفید پاجامہ، سفید انگرکھا، کشمیری کام کا جبہ، سر پر چھوٹا سا سفید صافہ، دبلے پتلے اور لاغر اندام۔ (۲۳۹)

ملازمت

ڈاکٹر عبدالحق صاحب دلی کالج میں آپ کے تقرر کے متعلق لکھتے ہیں:

اُن کے تقرر کا عجیب واقعہ ہے۔ ۱۸۴۰ء میں جب آنریبل مسٹر ٹامسن لفٹنٹ گورنر بہادر مدرسہ کے معائنہ کے لئے آئے تو انہوں نے یہ تجویز کی کہ ایک مستعد فارسی مدرس کا تقرر ہونا چاہیے۔ مفتی صدرالدین خاں صدرالصدور نے لفٹنٹ گورنر سے عرض کی کہ ہمارے شہر میں فارسی کے اُستاد صرف تین ہیں۔ ایک مرزا نوشہ (مرزا غالب) دوسرے حکیم مومن خاں، تیسرے امام بخش صہبائی۔

لفٹنٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلوایا۔ مرزا نوشہ بھلا یہ روگ کیوں پالنے لگے تھے۔ اُنہوں نے تو انکار کردیا۔ مومن خاں نے یہ شرط پیش کی کہ سو روپیہ ماہانہ سے کم کی قیمت قبول نہ کروں گا۔ مولوی امام بخش کا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا۔ انہوں نے یہ خدمت چالیس ۴۰ روپیہ ماہانہ کی قبول کرلی۔ بعد کو پچاس روپیہ ہوگئے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد پرنسپل بوترس کے عہد میں آپ مدرس اول کے عہدے پر سرفراز کیے گئے۔ (۲۴۰)

حادثۂ شہادت

مولانا صہبائی کے حقیقی بھانجے مولانا میر قادر علی صاحب جو مولانا صہبائی کے ساتھ مولانا ہی کے گھر میں رہا کرتے تھے، بیان کیا کرتے تھے:

میں صبح کی نماز اپنے ماموں مولانا صہبائی کے ساتھ کٹرہ مہر پرور میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دن دن کرتے آ پہنچے۔ پہلی رکعت تھی کہ امام کے صافے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں۔ شہر کی حالت نہایت خطرناک تھی اور دلی حشر کا میدان بنی ہوئی تھی۔ ہماری بابت مخبروں نے بغاوت کی اطلاعیں سرکار میں دے دی تھیں۔ اس لیے ہم سب گرفتار ہوکر دریا کے کنارے پر لائے گئے۔ ایک مسلمان افسر نے ہم سے آکر کہا کہ موت تمہارے سر پر ہے۔ گولیاں تمہارے سامنے ہیں اور دریا

تمہاری پشت پر ہے۔ تم میں سے جو لوگ تیرنا جانتے ہیں وہ دریا میں کود پڑیں۔
میں بہت اچھا تیراک تھا مگر ماموں صاحب یعنی مولانا صہبائی اور اُن کے صاحبزادے مولانا سوز تیرنا نہیں جانتے تھے۔ اس لئے دل نے گوارا نہ کیا کہ اُن کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں لیکن ماموں صاحب نے مجھے اشارہ کیا، اس لئے میں دریا میں کود پڑا۔ پچاس یا ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آوازیں میرے کان میں آئیں اور صف بستہ گر کر مر گئے۔ (۲۳۱)

وجہ شہادت

خواجہ حسن نظامی مرحوم فرماتے ہیں۔ (۲۳۲)
دہلی کے تمام محلوں سے زیادہ چیلوں کے کوچہ پر مصیبت آئی تھی۔ اسی محلہ میں بڑے بڑے شرفاء اور نامور علماء رہتے تھے۔ مولانا شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا گھرانا اسی محلہ میں آباد تھا۔ سر سید خاں کا گھر بھی اسی محلہ کے ایک حصہ میں تھا۔ مولانا صہبائی بھی اسی محلہ میں رہتے تھے۔ غرض یہ محلہ بڑے بڑے صاحب کمال لوگوں کا مخزن تھا۔ (۲۳۳) منشی ذکاء اللہ خاں بھی اسی محلہ کے باشندہ تھے"۔
منشی ذکاء اللہ خاں صاحب لکھتے ہیں:
"اس مصیبت کا خاص سبب یہ ہوا کہ نواب شمشیر جنگ کے بیٹے محمد علی خاں نے اور یا حکیم فتح اللہ خان نے کسی انگریزی سپاہی کو زخمی کر دیا تھا کیونکہ وہ اُن کے زنانہ مکان میں برے ارادہ سے جانا چاہتا تھا۔ اس کی خبر انگریزی کمان افسر کو پہنچی۔ اُس نے حکم دیا کہ اس محلہ کے تمام مردوں کو قتل کردو یا گرفتار کر کے لے آؤ۔
اس حکم کی تعمیل ایسی بے دردی سے ہوئی کہ محلہ میں کوئی مرد زندہ نہ بچا۔ یا تو سپاہیوں نے گھروں میں گھس کر مار ڈالا یا گرفتار کر کے حاکم کے سامنے لے گئے۔ حاکم نے اُن کو دیکھ کر حکم دیا کہ سب کو دریا کے کنارے لے جاؤ اور گولی مار دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

شہادت کا منظر

ان لوگوں کو رسی سے باندھا گیا۔ دریا کی ریتی میں قطار بنا کر کھڑا کیا گیا اور گولیوں کی باڑھ اُن پر چلائی گئی جس سے سب مر کر گر پڑے۔ صرف دو آدمی زندہ بچے جن کے گولی نہ لگی تھی۔ جب سپاہی گولیاں مار کر چلے گئے تو یہ دونوں اُٹھ کر بھاگے۔ ان میں ایک مرزا مصطفیٰ بیگ تھے جو بعد میں رسالہ میں نوکر ہو گئے تھے اور دوسرے مولانا صہبائی کے داماد اور بھانجے وزیر الدین نامی تھے، جو بعد میں کانپور میں ججی کے سر رشتہ دار ہو گئے تھے۔

شہداء میں آفتاب و ماہتاب

ان شہداء میں آفتاب ہند مولانا صہبائی کے علاوہ دوسرے استاذ فن سید محمد امیر عرف ''میر پنجہ کش'' بھی تھے جن کی خوشنویسی کا لوہا تمام ہندوستان مانتا تھا اور اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے حرف سونے چاندی کے عوض خریدے جاتے تھے۔ وہ بھکاری فقیروں کو ایک حرف لکھ کر دے دیتے تھے جو ایک روپیہ کے نوٹ کی طرح ہر جگہ روپیہ کو بکتا تھا۔ (افسوس کہ یہ صاحب کمال بھی دریا کی ریتی میں مارا گیا)۔

تعداد

کوچۂ چیلان کے اُن شہداء کی صحیح تعداد کا علم کسی کو نہیں مگر اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف مولانا صہبائی کے کنبہ کے اکیس آدمی اس قطار میں مارے گئے۔

راقم الدولہ ظہیر دہلوی نے انہیں دردناک حوادث کو نظم کا مختصر لباس پہنایا ہے۔

جہاں کی تشنۂ خوں تیغ آب دار ہوئی — سنان نیزہ ہر ایک سینہ سے دو چار ہوئی
رسن ہر اک بشر کے گلے کا ہار ہوئی — ہر اک سمت سے فریاد گیرو دار ہوئی
ہر ایک دشت قضا میں کشاں کشاں پہنچا — جہاں کی خاک تھی جس جس کی وہ وہاں پہنچا
ہر ایک شہر کا پیر و جواں قتل ہوا — ہر ایک قبیلہ دھر خاندان قتل ہوا
ہر ایک اہل زبان خوش بیان قتل ہوا — غرض خلاصہ یہ ہے ایک جہاں قتل ہوا
گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں — نہ گور ہے، نہ کفن ہے، نہ رونے والے ہیں

اس کے بعد ظہیر صاحب رقم طراز ہیں:

''غرض کہ جو لوگ شہر میں رہ گئے تھے، اُن میں کئی اشخاص با کمال نامور فرد روزگار مارے گئے ہیں جو دہلی کی ناک اور یگانۂ آفاق تھے، جن کی نظیر آج تک پیدا نہیں ہوا، اور نہ ہوگا۔ میاں محمد امیر پنجہ کش خوش نویس جن کا ثانی روئے زمین پر نہیں، مولوی امام بخش صہبائی اور اُن کے دو بیٹے اور میر نیاز علی واقعہ خواں اور چیلوں کے کوچے کے اور بہت سے شریف خاندان لوگ۔ سنا گیا ہے کہ اس محلّہ کے چودہ سو آدمی گرفتار کر کے راج گھاٹ کے دروازہ سے دریا پر لے جا کر بندوقوں کی باڑھیں ماردی گئیں، اور لاشیں دریا میں پھنکوا دی گئیں۔ عورات کا یہ حال ہوا کہ گھروں میں سے نکل کر بچوں سمیت کنوؤں میں جا گریں۔ چیلوں کے کوچہ کے تمام کنویں لاشوں سے پٹ گئے تھے۔ (۴۳۴)

حضرت آزردہ کا تاثر

مفتی صدر الدین صاحب آزردہ کو صہبائی کی شہادت کی خبر پہنچی تو بے اختیار زبان سے نکلا:

کیونکر آزردہ نکل جائے، نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

صہبائی کا مرثیہ:

ندانم کجا رفت آں نعش پاک ۔۔۔ فلک برد یا ماند بر روئے خاک
ندانم کسے داد او را کفن ۔۔۔ ویا ماند چوں سایہ برخاک تن
ندانم چہ کردست با او سپہر ۔۔۔ زجامہ کفن کرد یا تاب مہر
بخاکش نمودند اور ا نہاں ۔۔۔ ویا مرتفع کردند سوئے آسماں
کسے فاتحہ ہم برد خواندہ است ۔۔۔ بعطر گلابی برفشاندہ است
گدائی گل و بلبل و باد و دشت ۔۔۔ بخاکش بحسن عقیدت گزشت (۲۴۵)

الٰہی بیا مرز مظلوم را ۔۔۔ کلاہ شہی دہ بہ ملک بقا
بفردوس اعلیٰ بود جاء او ۔۔۔ بجنت بریں یار ماوام او

دہلی کا مرثیہ

دہلی مرحوم کے مرثیے بہت کچھ لکھے گئے۔ یہاں صرف مولانا حالی مرحوم کے چند اشعار پیش کر کے دہلی کا یہ جاں گداز تذکرہ ختم کیا جارہا ہے۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ ۔۔۔ غالب و شیفتہ، نیر و آزردہ و ذوق
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز ۔۔۔ اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلی ۔۔۔ مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز ۔۔۔ شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
چپہ چپہ پہ ہیں یہاں گوہر یکتا تہ خاک ۔۔۔ بزم ماتم تو نہیں، بزم سخن ہے حالی
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز ۔۔۔ یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

مضافاتِ دہلی

ضلع میرٹھ۔ مظفر نگر۔ سہارن پور۔ بلند شہر، علی گڑھ اور روہیل کھنڈ

ضلع میرٹھ

سرگزشت دہلی کا آغاز میرٹھ کے جرأت مندانہ مگر عاجلانہ اقدام سے ہوتا ہے۔ اس لئے میرٹھ واقعات ۱۸۵۷ء کا سرنامہ اور نا مکمل دیباچہ ہے۔ چنانچہ دہلی کے تذکرہ میں سب سے پہلے میرٹھ کی انقلابی فوج کا ذکر آچکا ہے۔ اس موقع پر اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ہاں مضافات میرٹھ نے میرٹھ کی امداد کس طرح کی؟ اس کے لئے یہ چند سطریں مطالعہ فرمائیے۔ ایک ریسرچ کرنے والے کے لئے بڑی قیمتی یادداشت ہے۔

(۱۰ مئی ۱۸۵۷ء) میرٹھ کی مسلح فوجوں نے اپنے فرائض کا احساس کر کے جنگ آزادی کی بسم اللہ شروع کر دی۔ میرٹھ اور اس کے مضافات کے رہنے والے عوام کی جملہ امکانی امداد نے ان آزادی پسند افواج کے حوصلے اور بلند کر دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام ضلع تحریک آزادی کا مرکز بن گیا۔ مضافات میں یہ مرکز محفوظ مقامات پر قائم تھے۔ ایک مضافاتی مرکز سکوتی نام کے موضع میں قائم کیا گیا۔ اس زمانہ میں اس موضع میں سب سے با اثر و معزز ہستی مرزا انور بیگ نے پیرانہ سالی کے باوجود اس ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر اٹھایا (اگرچہ یہ موضع آج بھی اُن کے جد امجد سخاوت مرزا جو ہمایوں کے بہنوئی مرزا اخضر خواجہ کے خالہ زاد بھائی تھے، کے نام نامی سے موسوم ہے) وطن کے حریت نواز جواں مردوں کی جماعت اُن کے گرد اکٹھا ہوگئی۔ سلاوہ کیلی، بھانیوری، سردھنہ سے شہباز خاں، کرم دین، ٹھاکر جتم سے جے سنگھ اور رنبیر سنگھ، دورالہ داوری، روہاسہ، اٹیرنہ وغیرہ سے دلیل سنگھ، کرم سنگھ، شیودت، ہزاری لال، سید احسان علی، سعادت حسین، نصیر احمد، کرمو، عارف، یہاں گروہ در گروہ پہنچے۔ تقریباً چھ سو افراد نے مرنے مارنے اور جاں نثاری کا حلف اٹھایا۔ رتیہ تین سنگھ کی شکستہ گڑھی کی مرمت کی گئی۔ فصیلوں پر پہرہ چوکیاں اور نواحی جنگلات میں حفاظتی دستے تعینات کئے گئے۔ آدھی جمعیت پنڈت شیودت، سید احسان علی، رشید مرزا، قادر بیگ، اور ٹھاکر رنبیر سنگھ کی قیادت میں باہلی، عارف پور، عابد پور اور غازی آباد کے آزادی کے دیوانوں کو ساتھ لیتی ہوئی ظل سبحانی اعلیٰ حضرت بہادر شاہ کی فوجوں سے جا ملی۔ ان تمام گمنام شہیدوں نے اپنی لاشیں خاک دہلی کے قدموں میں پیش کر دیں۔ صرف قادر مرزا زخموں سے نڈھال بصد دقت کسی طرح بچ نکلے۔ مرزا انور بیگ، سکندر مرزا، حسین بیگ، کرم سنگھ، ہزاری لال وغیرہ نے مظفر نگر اور میرٹھ کے قریباً اٹھارہ مواضعات پر پرچم آزادی بلند کر دیا۔ مرزا وزیر بیگ، نصیر احمد، ہری رام وغیرہ بڑھتے ہوئے سردھنہ کے قریب پہنچ گئے۔ اس وقت یہ عالم تھا کہ انگریز جان بچانے کے لئے گرجا گھر اور قلعے کی سرنگوں میں چھپ گئے تھے۔ سردھنہ خاص میں علماء کرام کا ایک گروہ جو کہ دہلی تحریک میں پیش پیش تھا، مقامی باشندوں کو لے کر

جنگ آزادی کے لئے برسرِ پیکار تھا۔ مولانا رحمت اللہ صاحب کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اچانک شکستوں کی خبریں آنے لگیں۔ کمزور دل بھاگ کھڑے ہوئے۔ محاصرہ ہٹالیا گیا، اور پسپائی شروع ہوگئی۔ کپتان راجسن کی سرکردگی میں انگریزی فوجوں نے سکوئی کو گھیر لیا۔ گڑھی کو آگ لگادی گئی۔ قدیر بیگ، نجم اللہ اور ہری رام وہیں جل کر راکھ ہوگئے جنم جے سنگھ، تصدق خاں اور دلاور کو پیپل کے درخت میں پھانسی دے دی گئی ان کی لاشیں تین دن تک بے گور دکفن لٹکی رہیں۔ شہباز خاں کو گولی سے اُڑادیا گیا۔ نور بیگ ناظم مرزا، دیوان اور کرموں دست بدست کی جنگ میں شہید ہوگئے۔ اس علاقہ کے ایک ''لوک گیت'' میں راجسن کے مظالم اور نور بیگ کی بہادری کی داستاں کچھ اس پیرایہ میں بیان کی گئی ہے کہ آج سو سال بعد بھی اُسے سن کر خون کھولنے لگتا ہے۔ (۲۳۶)

ضلع مظفر نگر و سہارن پور

دہلی کے شمال کی جانب تقریباً چالیس میل کے فاصلہ سے شروع ہونے والا وہ علاقہ جو کہیں (حضرت شاہ عبدالعزیز کی زبان میں) ماء جون آب جمنا سے سیراب ہوتا ہے اور کہیں اس کی سرسبز و شاداب وادیاں دریائے گنگ کی فیاضیوں سے ہم کنار ہوتی ہیں۔ جس نے کبھی تاریخ میں اپنا کوئی مستقل نام پسند نہیں کیا۔ جس کی نشان دہی آج کل ضلع مظفر نگر اور ضلع سہارن پور سے کی جاتی ہے جس طرح وہ زرعی لحاظ سے زرخیز ہے ویسے ہی انسانیت کے نقطۂ نظر سے مردم خیز اور بلحاظ سیاست انقلاب انگیز واقع ہوا ہے۔ اس علاقہ میں مسلمان اگرچہ تعداد میں کبھی بھی زیادہ نہیں ہوئے۔ مگر جہاں تک ڈھائی سو سال کی تاریخ کا تعلق ہے اخلاق، کردار اور ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے ان کا درجہ ممتاز رہا ہے۔

تھانہ بھون، کیرانہ، کاندھلہ، شاملی، پھلت، کھاتولی، جانسٹھ، جھنجھانہ، بڈھانہ، دیوبند، نانوتہ، گنگوہ، منگلور، رڑکی، انبیٹھہ، رائے پور، رام پور منہیاران، انگرہ، اس علاقے کے مشہور قصبے ہیں۔

سیدنا شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز جن کے تعمیر کردہ صراط مستقیم پر اس دور کے علماء احرار قدم بڑھاتے رہے۔ ان کی دادھیال (۲۳۷) اگرچہ سونی پت میں تھیں مگر ننھیالی رشتہ اسی علاقہ سے تھا اور قصبہ پھلت میں آج تک وہ مکان (بلکہ وہ کوٹھڑی) موجود ہے جو آپ کا مسقط راس تھا۔

حسن علی خاں اور عبداللہ خاں سے کون واقف نہیں جنہوں نے سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں وزارت ہی نہیں کی، بلکہ بادشاہ گر رہے۔ اُن کا اور اُن کے خاندان یعنی سادات بارہ کا مسکن یہی (۲۳۸) علاقہ رہا، اور پھر جب با احساس ہندوستانیوں کے سیاسی شعور نے وارد انگریزوں کے مقابلہ کے لئے تیر کمان درست کرنے شروع کئے تو یہی علاقہ تھا جس نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے مجاہدانہ اقدام کے لئے سب سے پہلے اپنی حدود کو فرش راہ بنایا۔

حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کی تحریک کا تذکرہ شاندار ماضی کی جلد دوم میں گزر چکا ہے۔ آپ کا سب سے پہلا دورہ اسی علاقہ کے رہنماؤں کی دعوت پر ہوا تھا، اور اس علاقہ سے خود سید صاحب کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ آپ

نے سرحد نہ ضلع میرٹھ سے سہارن پور تک تقریباً چالیس میل کے خطہ کو اپنے اوقات عزیز کے تین ماہ عطا فرمائے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا عبدالحیٔ صاحبؒ جو حضرت سید احمدؒ صاحب شہید کے نہ صرف مشیر خاص بلکہ اس تحریک کے لئے دماغ اور قلب کی حیثیت رکھتے تھے، اُن کا وطن اسی علاقہ کا قصبہ بڈھانہ تھا۔ اس آفتاب رشد و ہدیٰ یعنی حضرت سید صاحب کے فیوض کی کرنیں اس علاقہ کے مسلمانوں نے کس طرح سمیٹیں اور اس کے سوز و حرارت کو کس طرح قلب وجگر میں پیوست کیا، اس کے متعلق اپنے دور کے نبض شناس اور صاحب بصیرت فاضل مؤرخ مولانا سید عبدالحیٔ صاحب (۲۴۹) کا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت سید صاحب کے دورہ سے تقریباً ایک صدی (۲۵۰) بعد اس مبصر و مفکر کا احساس یہ ہے:

> اس وقت تک سہارن پور کے جس قدر قصبوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے وہاں ہر فرد و بشر کو سید صاحب کا دم بھرتے پایا ہے۔ جو ہے اُن کی محبت میں چور ہے...... میں نے اپنی عمر میں سید صاحب کا اتنا چرچا کہیں نہیں دیکھا۔ (۲۵۱)

پھر جس کو یہ معلوم ہے کہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب ''اسیر مالٹا'' جنہوں نے بیسویں صدی عیسوی کے پہلے عشرہ میں ریشمی رومال والی انقلابی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ جن کے فیض صحبت سے مولانا عبیداللہ سندھی، ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری، مفتی اعظم ہند مولانا محمد کفایت اللہ صاحب، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمہم اللہ اور رہنما سرحد خان عبدالغفار خان صاحب جیسے جنگ حریت کے سپہ سالاروں اور آسمان سیاست کے چاند تاروں نے جوش عمل اور نور بصیرت حاصل کیا۔ یہ شیخ الہند اسی علاقہ کے رہنے والے تھے۔

مولانا محمد میاں عرف مولانا منصور انصاریؒ جو اسی تحریک کے سلسلہ میں جلاوطن ہو کر افغانستان پہنچے اور تقریباً تیس سال جلاوطن رہ کر وہیں کی ڈھائی گز زمین کو ہمیشہ کے لئے آرام گاہ بنالیا۔ ان کا مولد و مسکن بھی اسی علاقہ کا مشہور قصبہ (انبہٹہ) تھا جو گیارھویں صدی ہجری میں قطب وقت حضرت شاہ ابوالمعالی (۲۵۲) کے فیوض و برکات کا مطلع اور مرکز رہا ہے۔

آزادی ہند کی وہ غیر تشددانہ (نان وائلنس) تحریک جو مقاومت بالصبر کے اصول پر ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک تیس سال متواتر چلتی رہی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اس تحریک کا مرکز یہی علاقہ تھا۔

بے شک خان عبدالغفار خاں اور اُن کے ساتھیوں ''خدائی خدمت گاروں'' کی بے شمار قربانیوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وہ جانباز تھے جن کے خون شہادت نے اضلاع صوبہ سرحد کے چپہ چپہ کو لالہ زار مظلومیت بنایا۔ مگر کون نہیں جانتا کہ ان پٹھان سرمستوں کو جس میکدہ سے بے خودی اور وارفتگی کی یہ دولت نصیب ہوئی تھی، وہ یہی دیوبند تھا جہاں علامہ انور شاہ کشمیری (۲۵۳) جیسے جہبذ وقت بادۂ حریت کو شریعت کے جام زریں میں ڈھال رہا تھا اور قطب ارشاد مولانا سید حسین احمد جیسا مجاہد جلیل و علمبردار حریت اپنے نقش پا سے جادۂ حریت کے نشانات اُبھار رہا تھا۔

کیا آپ بھول گئے ''تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو'' کی برطانوی پالیسی کا پہلا حربہ ''جداگانہ انتخاب جب تقریباً چالیس سال تک کام کرنے کے بعد کند ہونے لگا اور اُس نے ایک نئے حربہ، دو قومی نظریہ کو مقبول عام بنانے کیلئے نئے رنگروٹ بھرتی کئے۔ نئی انجمنیں اور نئی محفلیں آراستہ کیں تو جس مجاہد حق پرست نے سب سے پہلے اس سیاسی طلسم کو چیلنج کیا، جس کی صدائے حق نواز نے ان انجمنوں اور ان محفلوں میں تہلکہ ڈال کر وحشت و اضطراب کی قیامت برپا کی اُس کے دائرہ عمل کا مرکز یہی علاقہ تھا۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہ العزیز و نور مرقدہ اپنے استاذ محترم حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کے ہمراہ ریشمی رومال کی تحریک کے سلسلہ میں چار سال تک نظر بند رہنے کے بعد جب مالٹا سے رہائی پا کر ہندوستان پہنچے تو یہی علاقہ تھا جس نے اپنی عظمت و برتری کی دستار آپ کے قدموں میں ڈالی۔ ایک معزز مہمان کی طرح آپ کو سر اور آنکھوں پر بٹھایا اور آپ کی ہر ایک دعوت پر لبیک کہتے ہوئے جنگ آزادی میں آگے بڑھ کر حصہ لیا۔ ملک میں دو قومی نظریہ کی ہوا چلنے لگی تو ڈٹ کے اس کی مخالفت کی اور جب ۴۵۔۱۹۴۶ء میں تقسیم ہند کے سوال پر الیکشن ہوا تو تقریباً ہر ایک سیٹ پر اس کو شکست دی۔

مختصر یہ کہ جب اس علاقہ کی تقریباً ڈھائی سو سالہ تاریخ پر نظر ڈالی جاتی ہے تو جس طرح وہ عزم و ہمت، بلندیٔ فکر، روشن خیالی، وطن پروری اور حریت نوازی کی ایک سنہری زنجیر نظر آتی ہے، جس کی کوئی بھی کڑی کہیں سے ٹوٹی ہوئی نہیں ہے۔ تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے، ۱۸۵۷ء کے انقلابی دور میں اس علاقہ کا کردار کیا رہا، اور یہاں کے علماء و زعماء بالخصوص اُس طبقہ نے جو حضرت سید صاحب سے وابستہ تھا، کیا خدمت انجام دی۔

اس موقعہ پر تاریخ کے ایک طالب علم کی حیرانی نا قابل بیان ہو جاتی ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ صفحات تاریخ پر مالاگڑھ اور فرخ نگر جیسے گمنام مقامات کے نام موجود ہیں، لیکن اس علاقہ اور اُس کے مجاہدین کا کوئی تذکرہ نہیں۔

۱۸۵۷ء کے دہلوی مؤرخ شمس العلماء ذکاء اللہ خاں کی ایک دلچسپ تحریر

دہلی کے مشہور مؤرخ شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب نے اپنی مشہور کتاب ''تاریخ عروج عہد انگلیشیہ'' کے تقریباً آٹھ سو صفحات ۱۸۵۷ء کی نذر کر دیئے ہیں۔ تعجب ہے ان آٹھ سو صفحات میں سے کوئی ایک صفحہ تو درکنار ایک سطر بھی اس علاقہ کے مجاہدین کے حصہ میں نہیں آسکی۔ ہاں اس کتاب کے صفحہ ۶۷۵ پر ایک عبارت ملتی ہے۔ سیاق و سباق سے بے جوڑ اور خود اپنے مفہوم کے اعتبار سے بھی ایک قسم کا معمہ ہے مگر ہمارے موضوع کلام سے اس کا تعلق بہت گہرا ہے۔ لہٰذا آغاز باب میں اس عبارت کو پیش کیا جا رہا ہے۔

شمس العلماء فرماتے ہیں:

''سب سے اوّل مولوی رحمت اللہ کیرانہ سے اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے۔

وہ بڑے عالم فاضل تھے۔ عیسائی مذہب کے رد میں صاحب تصنیف تھے۔ وہ قلعہ کے پاس مولوی محمد حیات کی مسجد میں اترے۔ اس دانش مند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی۔ بلکہ ایک ہنگامۂ فساد برپا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر اپنے وطن چلا گیا۔

یہ مولانا رحمت اللہ صاحب کون ہیں؟ ان کی تشریف آوری کی کیا اہمیت تھی، اور جب وہ تحریک میں حصہ لئے بغیر واپس تشریف لے گئے تو پھر کیا بات رہ گئی تھی کہ اُن کا تذکرہ شمس العلماء نے ضروری سمجھا؟

حقیقت یہ ہے کہ مولانا رحمت اللہ مجاہدین کی ایک جلیل القدر جماعت کے نمائندے کی حیثیت سے حالات کا جائزہ لینے کے لئے تشریف لائے تھے۔ شمس العلماء نے کسی وجہ (۲۵۴) سے اس جماعت کا نام لینا (۲۵۵) یا اس کی طرف اشارہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر تاریخ کے ایک اہم واقعہ کی حیثیت سے نمائندہ جماعت کی تشریف آوری کو نظر انداز بھی نہ کر سکے۔

مجاہدین کی یہ جماعت وہی ہے جس نے شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی زیر قیادت اس علاقہ میں کام کیا جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آرہی ہے۔

بظاہر یہ صحیح ہے کہ مولانا رحمت اللہ صاحب نے اُس وقت کے حالات دیکھ کر یہی رائے قائم کی جو شمس العلماء نے تحریر فرمائی ہے۔ لیکن آخر تک مولانا رحمت اللہ اور اُن کی جماعت اس تحریک سے کنارہ کش نہیں رہی۔ جہاد کا وہ فتویٰ جس پر اسی کتابچہ میں تفصیل سے بحث ہو چکی ہے، اس پر ایک دستخط "رحمت اللہ" کے بھی ہیں۔ جانے پہچانے مولانا رحمت اللہ یہی ہیں اور اس دستخط کی شہادت یہ ہے کہ مولانا رحمت اللہ اور ان کی جماعت نے تحریک میں پوری سرگرمی سے کام کیا۔ البتہ یہ بھی صحیح ہے کہ شروع میں نہیں بلکہ اُس وقت جب جنرل بخت خان اور امیر جماعت مولانا سرفراز علی صاحب نے دہلی پہنچ کر تحریک کو منظم کرلیا اور انقلابی کارروائیوں میں باضابطہ جہاد کی شکل پیدا کردی۔ خود مولانا رحمت اللہ صاحب کے تحریک میں حصہ لینے اور شکست کے بعد ہندوستان سے ہجرت کرنے کی تفصیل مولانا موصوف کے پوتے مولانا محمد عرف الاسلام عثمانی الجلالی کے بیان سے واضح ہوگی جو بعد میں پیش کیا جائے گا۔

مولانا کے علاوہ دوسرے بزرگوں کے کارناموں کے متعلق ذیل کے اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔

تذکرۃ الرشید جلد اوّل کے اقتباسات

اس کتاب کے مؤلف و مرتب مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی ہیں آپ ۱۸۵۷ء کے مشاہدین میں سے نہیں ہیں لیکن مشاہدہ کرنے والوں کو آپ نے قریب سے دیکھا ہے اور بہت سے مردان کار کے حالات خود اُن کی زبانی سنے ہیں۔ مگر چونکہ تذکرۃ الرشید کی تصنیف و ترتیب کا وہ وقت تھا جب برطانوی سامراج کا نقطۂ عروج خط استواء پر پہنچا ہوا تھا اور نہ صرف زبان اور قلم بلکہ لوگوں کے ضمیر بھی اس کی عظمت و ہیبت سے متاثر تھے تو آپ کو بھی اپنی تحریر میں وقت کے تقاضے کی تعمیل کرنی پڑی ہے۔ انتہا یہ کہ بعض چیزوں کے اعتراف و اقرار کے لئے

بھی انکار کا پیرایہ اختیار کرنا پڑا ہے۔

امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی سوانح حیات لکھتے وقت یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ ۱۸۵۷ء اور اُس کے نتائج واثرات مابعد کا ذکر ہی نہ کریں اور شمس العلماء کی طرح دامن بچا کر نکل جائیں۔ البتہ تقاضائے وقت یا اپنے طبعی میلان کے باعث آپ نے اپنے بزرگوں کو الزام سے بچانے کی کوشش زیادہ سے زیادہ کی ہے چنانچہ اس علاقہ میں بغاوت کا اصل بانی اور علمبردار جناب قاضی عنایت علی (۴۵۶) صاحب رئیس تھانہ بھون کو قرار دیا ہے اور حضرت حاجی امداداللہ صاحب سے جو بیعت کی گئی تھی، اس کی تاویل یہ کی:

> اس بدامنی کی حالت میں عام باشندگان قصبہ (تھانہ بھون) کی حالت یہ ہوئی کہ گویا اُن کا مربی و منتظم بادشاہ سر سے اُٹھ گیا اور شرعی وطبعی ضروریات ومخصمات میں بھی کوئی خبر گیراں نہ رہا جس کی رائے پر عمل کریں۔ پس یہ لوگ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ بلا کسی حاکم کی سرپرستی کے گزران دشوار ہے کیونکہ گورنمنٹ نے باغیوں کی بغاوت کے باعث اپنا امن اُٹھالیا، اور بذریعہ اشتہار عام اطلاع دے دی ہے کہ اپنی اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہیے۔ اس لئے آپ چونکہ ہمارے دینی سردار ہیں اس لئے دنیاوی نظم حکومت کا بار بھی اپنے سر رکھیں اور امیر المومنین بن کر ہمارے باہمی قضیئے چکا دیا کریں۔ اس میں شک نہیں کہ اعلحضرت کو اُن کی درخواست کے موافق اُن کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا اور آپ نے دیوانی وفوجداری کے جملہ مقدمات شرعی فیصلہ کے موافق چند روز تک قاضی شرع بن کر فیصل بھی فرمائے۔ اسی قصہ نے مفسدوں میں شریک ہونے کی راہ چلائی اور مخبروں کو جھوٹی سچی مخبری کا موقع دیا۔ حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی) قدس سرہ دس برس ہوئے، اعلیٰ حضرت کو اپنے دین ودنیا کا سردار بنا ہی چکے تھے۔ ہمیشہ آمد ورفت رہتی ہی تھی۔ اب جب کہ ہر طرف بدامنی تھی آپ کے لئے یہاں رہنے سے زیادہ بہتر کوئی جگہ دنیا میں نہ تھی۔ ادھر اعلیٰ حضرت (حضرت حاجی امداد اللہ صاحب) کو حکومت کے فیصلے اور شرعی قضا میں مولوی کی ضرورت تھی کہ حق بات میں اعانت کرتے رہے۔ اس لئے آپ اور مولانا محمد قاسم صاحب مع دیگر خدام کے یہیں رہ پڑے۔ (۴۵۷)

مولانا عاشق الٰہی صاحب کی تاویل کی حقیقت کچھ بھی ہو، مگر اس سے یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ:

(۱) تھانہ بھون ایک مرکز بنایا گیا۔

(۲) سیدنا حضرت حاجی امداداللہ صاحبؒ امیر مقرر کیے گئے۔

(۳) اُن کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔

(۴) ایک نظام حکومت قائم کیا گیا جس میں فصل خصومات یعنی عدالت جیسے محکمے حضرت مولانا رشید احمد صاحب اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے سپرد کیئے گئے۔

تشکیل حکومت کے بعد وقت کے مناسب اور ضرورت کے عین مطابق ان بزرگوں نے جو اقدام کیا، مولانا عاشق الٰہی صاحب کے ایک انکاری بیان میں اس کا اعتراف بھی ملاحظہ فرمائیے۔ مولانا موصوف تحریر فرماتے ہیں۔

جب بغاوت وفساد کا قصہ فرو ہوا اور رحم دل گورنمنٹ نے دوبارہ غلبہ پا کر باغیوں کی سرکوبی شروع کی، تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اس کے رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی سچی تہمتوں اور مخبری کے پیشہ سے سرکاری خیر خواہ اپنے کو ظاہر کریں۔ اُنہوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات پر بھی بغاوت کا الزام لگایا اور یہ مخبری کی کہ تھانہ بھون کے فساد میں اصل اصول یہی لوگ تھے، اور شاملی کی تحصیل پر حملہ کرنے والا یہی گروہ تھا۔ بستی کی دکانوں کے چھپر تحصیل کے دروازہ پر انہوں نے جمع کیے اور اُن میں آگ لگادی۔ یہاں تک کہ جب آدھے کواڑ جل گئے تو ابھی آگ بجھنے بھی نہ پائی تھی کہ ان نڈر ملانوں نے جلتی آگ میں قدم بڑھائے، اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھس کر خزانہ سرکار کو لوٹا تھا۔ (۲۵۸)

یہ دو اقتباس مولانا عاشق الٰہی صاحب کی تصنیف سے پیش کیے گئے ہیں ان میں ضرورت سے زیادہ اجمال اور اختصار سے کام لیا گیا ہے، تب بھی یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ اس علاقہ کے سرفروشان حریت نے ''تھانہ بھون'' کو مرکز بنا کر تحریک میں حصہ لیا اور جرأت مردانہ سے وہ سب کچھ کیا جو انگریزوں کی جڑیں اکھاڑنے کے لیے دوسرے مقامات پر کیا گیا تھا۔

اب اس مجمل اور مختصر کی کسی قدر تفصیل پیش کی جارہی ہے اور ضرورت کے مطابق ذمہ دار بزرگوں کے مختصر حالات بھی لکھے جاتے ہیں۔

واقعات تھانہ بھون وشاملی اور تعارف رہنما

تعارف رہنما

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب (۲۵۹) فاروقی تھانوی جن کو امیر اور رہنما منتخب کیا گیا تھا جو بعد میں شیخ العرب والعجم اور قطب العالم تسلیم کیے گئے ۱۲۳۳ھ (۲۶۰) (۱۸۱۸ء) میں ''نانوتہ'' میں پیدا ہوئے جہاں آپ کی ننھیال تھی۔ آپ کی فطری صلاحیتوں کے متعلق مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا بیان ہے:

آپ کی طبیعت عالمانہ رنگ کی نہ تھی۔ امیر شہید (حضرت سید احمد شہیدؒ) سے ملتی جلتی طبیعت رکھتے تھے۔ اسی لیے وہ سید صاحب کا نمونہ تھے۔ (۲۶۱)

تعلیم

ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے وطن میں پائی۔ پھر آپ (۲۶۲) دہلی تشریف لے گئے۔ دہلی کے بہت سے

مکتبوں اور مدرسوں میں مولانا نصیر الدین صاحب دہلوی کی بھی ایک درس گاہ تھی جہاں علم ظاہر کے ساتھ عشق و معرفت کا درس بھی دیا جاتا تھا۔ (۲۶۳)

مولانا نصیر الدین صاحب دہلوی کا ذکر خیر ابتداء میں گزر چکا ہے۔ یہ حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کے درس گاہ معرفت وسیاست کے فاضل تھے اور اب اس جھنڈے کو بلند کرنے کی کوشش کر رہے تھے، جو حضرت سید صاحب کی شہادت کے بعد سرنگوں ہو گیا تھا۔

نوجوان امداد اللہ بھی درجہ وسطی کی کتابیں پڑھ رہا تھا کہ حضرت مولانا نصیر صاحب دہلوی کے جہادی قافلہ نے اپنا کوچ شروع کر دیا (۳ ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۲ اپریل ۱۸۳۵ء) حضرت استاد کے اس سفر نے دل ودماغ پر ایسا اثر کیا کہ کتابوں کی ورق گردانی بار معلوم ہونے لگی۔ (۲۶۴) البتہ باحساس فطرت نے حضرت استاد کے پاک اور مقدس جذبات سے جو سبق لیا، وہ عمر بھر فراموش نہ ہوا۔

مکتب عشق کا یہ دستور نرالا دیکھا | اس کو چھٹی ہی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

صرف پانچ سال ہی گزرے تھے کہ حضرت سید نصیر صاحب دہلوی ۱۸۴۰ء (۱۲۵۶ھ) میں خدا کو پیارے ہوئے اور ان کے خسر حضرت مولانا شاہ اسحٰق صاحب دہلوی نے سفر آخرت اختیار کر کے مکہ معظمہ کو تحریک کا مرکز بنالیا۔

مولانا عبید اللہ سندھی کی تحقیق کے بموجب اگرچہ اب مرکز مکہ معظمہ ہو گیا تھا جہاں ترکوں اور ان کے حلیفوں سے مدد لے کر ہندوستان کی تحریک حریت کو کامیاب بنایا جاسکتا تھا لیکن ہندوستان کے سیاسی مرکز یعنی دار السلطنت میں ایک نظام کے قائم رکھنے اور ترقی دینے کی پھر بھی ضرورت تھی۔ جس کے لئے پہلے مولانا مملوک علی صاحب کی زیر صدارت (۲۶۵) ایک بورڈ بنایا گیا، جس کے خصوصی ارکان حضرت مولانا قطب الدین صاحب دہلوی، (۲۶۶) مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی (۲۶۷) اور مولانا عبد الغنی دہلوی (۲۶۸) تھے۔ (۲۶۹)

اور جب ۱۲۶۰ھ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب پہلی بار حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے تو مولانا شاہ اسحاق صاحبؒ نے حاجی امداد اللہ صاحب کو اسی کام کے لئے مقرر فرمادیا۔ (۲۷۰) مولانا عبید اللہ سندھیؒ اپنی مشہور تصنیف ''التمہید'' میں فرماتے ہیں:

> جاء الامیر امداد الله الی الحرمین فی ۱۲۶۱ ھ و لقی الشیخ محمد اسحاق و اخذ عنه طریق الدعوة ثم عاد الی الهند فی ۱۲۶۲ ھ و قصده الناس من اطراف البلاد و اجتمع علیه الاکابر اهل العلم مثل مولانا محمد قاسم و مولانا رشید احمد و الشیخ فیض الحسن السهارنفوری و جمع کبیر من علماء الهند. (۲۷۱)

> امیر جماعت حضرت حاجی امداد اللہ صاحب (جو ۱۲۶۰ھ) میں وطن سے روانہ ہوئے تھے) ۱۲۶۱ھ میں مکہ معظمہ پہنچے۔ حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے تحریک کا لائحہ عمل اور پروگرام معلوم کیا۔ پھر ۱۲۶۲ھ میں ہندوستان واپس ہوئے۔ وہ لوگ جو

اس سلسلہ سے وابستہ تھے انہوں نے حضرت حاجی صاحب کو اپنے تعلقات کا مرکز بنالیا۔ اکابر اہل علم مثلاً حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری اور ان کے علاوہ علماء ہند کی جمع کثیر (ایک بڑی جماعت) آپ کے گرد جمع ہوگئی۔

یہ جمع کثیر اور جماعت کثیر جو حضرت حاجی صاحب کے گرد جمع ہوگئی تھی، اگر اس کے ناموں کا کوئی رجسٹر ہوگا تو ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں ضائع ہوگیا ہوگا۔ سو سال کے بعد تو اس کا کوئی پرزہ بھی دستیاب نہیں ہوسکتا، البتہ جو بیانات چند سطروں کے بعد آپ کے سامنے آنے والے ہیں، اُن کی بناء پر چار ناموں کا اور اضافہ کرلیجئے۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی، جس کا تذکرہ شمس العلماء نے دوسرے انداز سے کیا ہے۔ مولانا محمد مظہر صاحب، مولانا محمد منیر صاحب اور مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی۔

جہاد ۱۸۵۷ء

یہاں دوبارہ اس بحث کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کی ابتداء جیسے انگریزوں کے حق میں اچانک تھی، ایسے ہی انقلابی جماعتوں کے حق میں بھی دفعتہً تھی۔ پس جو لوگ کسی جماعت سے منسلک نہیں تھے، اُن کے لئے آسان تھا کہ وہ پہلی ہی فرصت میں شرکت یا علیحدگی کا فیصلہ کرلیں۔ لیکن جو اپنی زندگی کسی نظام سے وابستہ کئے ہوئے تھے، اُن کے لئے یہ جلد بازی درست نہیں تھی کہ اپنے مرکزی نظام یا جماعت کے فیصلے سے پہلے ذاتی طور پر کوئی فیصلہ کرکے کام شروع کردیں۔

پس یہ جماعت جو شاہ ولی اللہ کی جماعت کہلانے کی صحیح طور پر مستحق تھی جیسے ہی رمضان شریف کے آخر میں اس کو دہلی کے انقلاب کی خبر پہنچی تو غور و خوض کا ایک اہم موضوع اس کے سامنے آیا جس کے لئے ہنگامی اجلاس ضروری تھا۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو نانوتہ [۲۷۲] اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب کو گنگوہ [۲۷۳] سے، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ان دنوں سہارنپور میں تھے، اُن کو وہاں سے طلب کیا گیا [۲۷۴] اور اسی موقع پر حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو تحریک کی حقیقت و نوعیت معلوم کرنے کے لئے دہلی بھیجا گیا۔ مئی کے آخر یا جون کے شروع میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب دہلی پہنچے، اس وقت تک تحریک بوڑھے بادشاہ اور ناز پروردہ شہزادوں کی ناتجربہ کاریوں کے حوالہ تھی۔ انقلابی سپاہیوں نے بے شک زمام قیادت انہیں کے حوالہ کی تھی لیکن کسی سنجیدہ یا اصولی جماعت کے لئے ان پر اعتماد کرنا بہت مشکل تھا۔ اس وقت جو بدنظمی اور افراتفری پھیلی ہوئی تھی، اس کو دیکھ کر مولانا رحمت اللہ صاحب کو وہی فیصلہ کرنا چاہیے تھا جو شمس العلماء نے بیان کیا۔

تنظیم نو یا تشکیل حکومت

لیکن یہ مردانِ احرار جو سالہا سال سے حریت کاملہ اور مکمل آزادی کی تمنائیں دلوں میں لئے ہوئے تھے۔ جن کے دماغوں نے خدا جانے کتنے نقشے بنائے اور بگاڑے تھے، اُن کے لیے یہ بات بہت ہی تکلیف دہ اور افسوس ناک تھی کہ ایسے وقت جب کہ فضا اس قدر ہموار اور ماحول اتنا سازگار، وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش بیٹھے رہیں، اور موسم کی خوش گوار تبدیلی سے کچھ بھی فائدہ نہ اٹھائیں لیکن جس شریعت غرا اور جس پاک تعلیم کی روشنی میں وہ آگے قدم بڑھا سکتے تھے، اس کی پہلی شرط یہ تھی کہ جو قدم بھی بڑھایا جائے، وہ ضبط و نظم، سنجیدگی اور قانون کی پوری پابندی کے ساتھ آگے بڑھے۔ بہر حال اس پہلے اجتماع میں اتنا کام تو کر لیا گیا کہ وہ جماعتی نظم جو اب تک ایک (اصلاحی یا سیاسی) پارٹی کی حیثیت رکھتا تھا، اب اس کو نظام حکومت کی شکل دے دی گئی۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب "امیر"، اور مولانا محمد قاسم صاحب، مولانا رشید احمد صاحب، حافظ ضامن صاحب، اور مولانا محمد منیر صاحب جیسے زعماء اور اکابر کو فوج، حفاظت، فصل خصومات اور عدل و قانون وغیرہ کے شعبے سپرد کئے گئے۔ اور اس موقع پر یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ خود بادشاہ کو بھی ضبط و نظم قائم کرنے اور اس جیسے نظام میں داخل ہونے کا مشورہ دیا جائے۔

چنانچہ نواب شیر علی مراد آبادی[۴۷۵] کو جو بادشاہ کے منہ چڑھے اور بے تکلف مصاحب تھے، اسی مقصد کے لئے دہلی بھیجا گیا۔[۴۷۶]

شاہ حسن عسکری،[۴۷۷] جو بادشاہ کے پیر[۴۷۸] اور اس تحریک کے ممتاز رکن بلکہ بانی اور محرک اول کی حیثیت رکھتے تھے، اسی[۴۷۹] علاقہ کے رہنے والے تھے، اور ان بزرگوں سے خاندانی[۴۸۰] روابط بھی رکھتے تھے۔[۴۸۱] ان کے ذریعہ بھی تحریک کی باگ موڑی جا سکتی تھی۔

حضرت مولانا رحمت اللہ نے دہلی سے واپس آکر تحریک کی جو صورت حال بیان کی تھی، اُس کے پیش نظر خیر خواہی ملک و ملت کے بلند جذبات کا بھی تقاضا یہی تھا کہ جس طرح ممکن ہو، بادشاہ کو نیک مشورے دیئے جائیں اور ایسی باتوں کی فہمائش کی جائے جو غلبہ و کامیابی ورنہ کم از کم اُخروی فلاح و بہبود کا ذریعہ بن سکیں۔

بہر حال مقامی یا علاقائی حیثیت میں آئین اور دستور کے مطابق حکومت کا ایک نظام زیر قیادت حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رمضان شریف کے فوراً بعد مئی کے اواخر یا اوائل جون میں تھانہ بھون میں قائم ہو گیا۔ لیکن کوئی اقدام اس وقت مناسب نہیں سمجھا گیا، جب تک

۱: مرکز میں ایک صالح نظام وجود پذیر نہ ہو، اور

۲: اس علاقائی نظام کا رابطہ اس مرکزی صالح نظام سے منسلک نہ ہو جائے۔

ممکن ہے جلد باز اور تہور پسند جوشیلی طبیعتیں اس کو پسند نہ کریں اور یہ بھی ممکن ہے کہ جذبات کی رو میں بہہ جانے والی طبیعتیں اس کو ٹال مٹول قرار دیں مگر دستور و آئین بالخصوص قوانین شریعت کے ماہرین ان دونوں

باتوں کو اتنا ضروری اور لازمی سمجھتے ہیں کہ جب تک یہ دونوں عمل میں نہ آ جائیں کسی بھی اقدام کو مہذب اور صالح (اور شریعت کی زبان میں) جہاد نہیں قرار دے سکتے۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ وغیرہ پر برطانوی حکومت نے فساد کا الزام لگایا اور ان بزرگوں نے اس سے انکار کیا۔ ان کا انکار بالکل صحیح تھا کیونکہ انہوں نے فساد میں قطعاً حصہ نہیں لیا۔ البتہ فساد کی صورت ختم ہونے کے بعد جب منظم جہاد کی شکل پیدا ہوئی تو اس جہاد میں ضرور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ جہاد فساد نہیں ہوتا بلکہ قاطع فساد ہوتا ہے۔

مئی کا مہینہ ختم ہو کر جون کا مہینہ گزر رہا تھا اور ابھی تک یہ کوشش بار آور نہ ہوئی تھی کہ یہ سرفروشانہ تگ و دو منظم جدوجہد کی شکل اختیار کر سکے۔ اسی اثناء میں رئیس تھانہ بھون قاضی عنایت علی صاحب[۲۸۲] کے بھائی کا حادثہ پیش آ گیا، کہ وہ ہاتھی[۲۸۳] خریدنے کے لئے سہارن پور تشریف لے گئے۔ کسی نے مخبری کر دی، اور مسٹر سپنکی (Spankie) مجسٹریٹ ضلع سہارن پور نے ان کو گرفتار کر کے پھانسی پر لٹکوا دیا۔[۲۸۴]

۲؍جولائی ۱۸۵۷ء، جنرل بخت خاں اپنی منظم اور باضابطہ فوج لے کر دہلی پہنچ گئے۔ مولانا سرفراز علی صاحب امیر جماعت کی حیثیت سے ان کے ساتھ تھے۔ بلکہ جنرل مذکور کی سرپرستی اور رہنمائی فرما رہے تھے۔

جنرل بخت خاں نے صرف فوجوں کو ہی منظم نہیں کیا بلکہ ضبط و نظم کو اس معیار پر لانے کی کوشش کی جو اسلامی تعلیم کے لحاظ سے ضروری ہے۔ اور ایسے مواقع پر جو شرعی مطالبات ہو سکتے ہیں ان کو پورا کرنے کے لئے جامع مسجد دہلی میں علماء کرام کا اجتماع کیا۔ ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ ہمارے یہاں کے (ضلع مظفرنگر، سہارن پور، یعنی علاقہ تھانہ بھون کے) علماء ۱۸۵۷ء کی تحریک کے سلسلہ میں دہلی تشریف لے گئے تھے۔ وہاں جامع مسجد میں بادشاہ سے ملاقات کی اور اس سے عہد و معاہدے کئے۔ ہمیں اس کا کوئی تحریری ثبوت نہیں مل سکا۔ البتہ جو فتویٰ جامع مسجد کے اس اجتماع میں مرتب کیا گیا تھا، اس پر ایک دستخط ''رحمت اللہ'' کے بھی ہیں۔ بظاہر یہ ''رحمت اللہ'' وہی مولانا رحمت اللہ ہیں جو پہلے تحقیق حال کیلئے آئے تھے اور اب اپنی جماعت کے نمائندے کی حیثیت سے اس اجتماع میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے اور غور و فکر کے بعد فتوے پر دستخط ثبت فرمائے تھے۔

اس وقت کے حالات کے بموجب ''دہلی'' میں ایک صالح نظام قائم ہو گیا۔ علماء کرام اور رہنمایان ملت نے غور و خوض کے بعد جہاد کا فتویٰ صادر کر دیا۔ تو اب تھانہ بھون والی جماعت کے لئے بھی راستہ صاف ہو گیا، اور یہ ممکن ہو گیا کہ اس علاقہ کے امیر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اقدام کا فیصلہ صادر کر دیں تاہم عمل احتیاط کے پیش نظر یہ مناسب سمجھا گیا کہ مجلس شوریٰ کا اجلاس کر کے ان تازہ حالات پر ایک دفعہ مزید غور کر لیا جائے۔ ارشادِ خداوندی ''وشاورھم فی الامر'' کا مطالبہ بھی یہی تھا، اور اسی طرح جملہ اراکین اور اعضاء کی ہم آہنگی اور خوش دلانہ حمایت بھی پوری سرگرمی کے ساتھ میسر آ سکتی ہے۔

چنانچہ ایک اجتماع کیا گیا۔ اجتماع کا ایجنڈا مسئلہ اقدام تھا۔ بعنوان دیگر ''اعلان جہاد''۔

اور موضوع بحث بعینہ وہ تھا جس پر دہلی کے اجتماع میں بحث ہوئی تھی۔ یعنی بحالت موجودہ ہم میں انگریز

کی منظم فوجوں سے مقابلہ کی طاقت ہے یا نہیں اور اس بناء پر اقدام کے متعلق شرعی فیصلہ کیا ہے۔

اجلاس شوریٰ میں تمام حاضر ارکان نے اقدام کا فیصلہ کیا، یعنی دہلی کے فتویٰ جہاد کی تصدیق و توثیق کی۔ صرف ایک بزرگ مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی کی رائے مخالف رہی۔ اس اجتماع کی ایک دلچسپ بحث ملاحظہ ہو۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے حضرت شیخ محمد صاحب سے خطاب کرتے ہوئے نہایت ادب[۲۸۵] کے ساتھ عرض کیا:

''حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنانِ دین وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے''۔

حضرت مولانا شیخ محمد صاحب محدث: اس لئے کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں۔ ہم بالکل بے سروسامان ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب: کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے جتنا غزوۂ بدر میں تھا؟[۲۸۶]

حضرت مولانا شیخ محمد صاحب: اگر آپ کی تمام حجتیں اور باتیں مان لی جائیں، تو سب سے بڑی شرط جہاد میں نصب امام کی ہے۔ امام کہاں ہے کہ اس کی قیادت میں جہاد کیا جائے۔[۲۸۷]

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب: نصب امام میں کیا دیر لگتی ہے۔ مرشد برحق حضرت حاجی صاحب موجود ہیں، انہیں کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی جائے۔[۲۸۸]

حضرت حافظ ضامن صاحب: مولانا! بس سمجھ میں آ گیا۔[۲۸۹]

پھر سب نے حضرت حاجی صاحب کے دست حق پرست پر بیعت جہاد کی[۲۹۰] یعنی پہلے تشکیل حکومت کے لئے بیعت ہوئی تھی، اب یہ بیعت جان و دل کی قربانی کے لئے۔

اب سوال یہ تھا کہ اقدام کس طرح ہو۔ ظاہر ہے دہلی کا مرکز ہی قبلہ نما بن سکتا تھا۔ چنانچہ:

سرفروشان دین و وطن سر ہتھیلی پر رکھ کر ایک منظم طاقت سے ٹکرانے کے لئے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور تھانہ بھون سے شاملی کی طرف مارچ شروع کر دیا جس کا نصب العین دہلی تھا۔[۲۹۱]

شاملی کی طرف اقدام کا ایک دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ مہار سنگھ رئیس شاملی نے جو علم آزادی بلند کیا تھا اس کو کمک کی شدید ضرورت تھی۔[۲۹۲]

اب یہ تفصیل[۲۹۳] کہ معرکہ کہاں کہاں اور کس کس طرح ہوا، اور اس میں کس کس نے کتنا کتنا حصہ لیا، موضوع کتاب سے خارج ہے۔ اس سلسلہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے ایک بیان پر کفایت کی جاتی ہے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب، امیر جہاد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی زیارت سے مشرف اور فیض یاب ہوئے ہیں۔[۲۹۴] مکہ معظمہ میں کچھ عرصہ ان کی خدمت میں بھی رہے ہیں۔ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے (جو اس معرکہ کے رکن رکین تھے) خلیفہ مجاز ہیں۔ ایک راز

داں خادم کی حیثیت سے عرصہ تک ان کی خدمت میں باریاب رہے ہیں، اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز (جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے نہایت محبوب و مقرب شاگرد اور اپنی مجاہدانہ فطرت کی وجہ سے جہادی کاروبار کے امین و معتمد اور واقف اسرار تھے)۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کو جس درجہ آپ سے تقرب رہا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ مولانا حسین احمد صاحب نے حضرت شیخ الہند کی آغوش شفقت (۲۹۵) میں تربیت پائی، اور پھر ایک فدا کار رفیق کی حیثیت سے سفر وحضر، انتہا یہ کہ قید و بند میں بھی عرصۂ دراز تک ہمدم و ہمراز رہے۔

لہٰذا ۱۸۵۷ء کے اس معرکے کے متعلق حضرت مولانا حسین احمد صاحب کا بیان چشم دید شہادت کی حیثیت رکھتا ہے۔

مشاورتی اجتماع میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور حضرت شیخ محمد صاحب کے درمیان جو گفتگو ہوئی جس کی تفصیل پہلے دی جا چکی ہے، اس کو نقل کرنے کے بعد شیخ الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز تحریر فرماتے ہیں:

پھر جہاد کی تیاری شروع ہوگئی اور اعلان کر دیا گیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو امام (۲۹۶) مقرر کیا گیا اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کو سپہ سالار افواج قرار دیا گیا اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کو قاضی بنایا گیا اور مولانا محمد منیر (۲۹۷) صاحب نانوتوی اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی کی میمنہ اور میسرہ (داہنے بازو اور بائیں بازو) کے افسر مقرر کیے گئے۔ چونکہ اطراف و جوانب میں مذکورہ بالا حضرات کے تقویٰ، علم (تصوف اور تشریع) کا بہت زیادہ شہرہ تھا۔ ان حضرات کے اخلاص وللّٰہیت سے لوگ بہت زیادہ متاثر تھے۔ ہمیشہ سے اُن کی دینداری اور خدا ترسی دیکھتے رہے تھے، اس لئے ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ علاوہ مریدین اور تلامذہ کے عام مسلمان بھی بے حد معتقد تھے۔ اس لئے بہت تھوڑی مدت میں جوق جوق لوگوں کا اجتماع ہونے لگا۔ اس وقت تک ہتھیاروں پر پابندی نہیں تھی۔ عموماً لوگوں کے پاس ہتھیار تھے جس کو رکھنا اور سیکھنا مسلمان ضروری سمجھتے تھے۔ مگر ہتھیار پرانی قسم کے تھے۔ بندوقیں توڑے دار تھیں، کارتوسی رائفلیں نہ تھیں۔ یہ صرف انگریزی فوجوں کے پاس تھیں۔ مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے اور تھانہ بھون اور اطراف میں حکومت قائم کر لی گئی اور انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دیئے گئے۔

خبر آئی کہ توپ خانہ سہارنپور سے شاملی کو بھیجا گیا ہے، ایک پلٹن لا رہی ہے، رات کو یہاں سے گزرے گی۔ اس خبر سے لوگوں میں تشویش ہوئی۔ کیونکہ جو ہتھیار ان مجاہدین کے پاس تھے وہ تلوار، توڑے دار بندوقیں اور برچھے وغیرہ تھے، مگر توپ کسی کے پاس نہ تھی۔ توپ خانہ کا مقابلہ کس طرح کیا جائے گا۔ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا: فکر مت کرو۔

سڑک ایک باغ کے کنارے گزرتی تھی۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو تیس یا چالیس مجاہدین پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے افسر مقرر کر دیا تھا۔ آپ اپنے ماتحتوں کو لے کر باغ میں چھپ گئے، اور سب

کو حکم کیا کہ پہلے سے تیار رہو۔ جب میں حکم کروں، سب ایک دم فیر کرنا۔ چنانچہ جب پلٹن معہ توپ خانہ باغ کے سامنے پہنچی تو سب نے یک دم فیر کر دیا۔ پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی یہاں چھپے ہوئے ہیں، توپ خانہ چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔ حضرت گنگوہیؒ نے توپ خانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحب کی مسجد کے سامنے لا کر ڈال دیا۔ اس سے لوگوں میں ان حضرات کی فراست، ذکاوت، فنون حربیہ کی مہارت، معاملہ فہمی اور ہر قسم کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔ شاملی اس زمانہ میں مرکزی مقام تھا۔ ضلع سہارنپور سے متعلق تھا۔ وہاں تحصیل بھی تھی۔ کچھ فوجی طاقت وہاں بھی رہتی تھی۔ قرار[298] پایا کہ اس پر حملہ کیا جائے چنانچہ چڑھائی[299] ہوئی اور قبضہ کر لیا گیا۔[300] جو طاقت پولیس اور فوج کی وہاں تھی، وہ مغلوب ہو گئی۔ حضرت حافظ ضامن صاحب اسی ہنگامہ میں شہید ہو گئے۔[301] حضرت حافظ ضامن صاحب کا شہید ہونا تھا کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔ ان کی شہادت سے پہلے روزانہ خبر آتی تھی کہ آج فلاں مقام انگریزوں سے چھین لیا گیا۔ آج فلاں مقام پر ہندوستانیوں کا قبضہ ہوا۔ مگر حافظ صاحب کی شہادت کے بعد پہلے پہل خبر آئی کہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، اور یہی حال ہر جگہ کی خبروں کا تھا۔ اس سے پہلے گورے فوجی چھپتے پھرتے تھے۔ ایک ایک سپاہی گوروں کی جماعت کو بھگائے پھرتا تھا۔ مگر بعد میں معاملہ برعکس ہو گیا۔ پہلے کسی کھیت میں گورا چھپا ہوا تھا تو کاشتکار عورت نے اُسے کھرپے سے قتل کر ڈالا مگر بعد میں معاملات اُلٹ ہو گئے۔

حضرت شیخ الہندؒ[302] فرماتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تمام معاملہ جوش و خروش، جنگ و جدال کا حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ کی شہادت کے لئے کیا گیا تھا۔[303] بہرحال حافظ صاحب کی شہادت اور دہلی کے سقوط کی خبر سے لوگوں کی ہمتیں بالکل پست ہو گئیں اور سب اپنے اپنے اوطان کو واپس آ گئے۔

ناکامیٔ تحریک کے بعد

تھانہ بھون کی تباہی

۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ گرفتار ہوئے۔ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ مکمل ہوا تو پھر فتح مند فوجوں نے اطراف دہلی پر بھی قبضہ شروع کر دیا۔ چند روز بعد ہی تھانہ بھون کا نمبر آ گیا۔(۳۰۴) ایک شب کی تاریکی میں انگریزی فوج کی آمد کی خبر نے سنسنی پھیلا دی۔ اب تو شکست یقینی تھی۔ مگر بہادری یہ ہے کہ اس یقین کے باوجود مقابلہ کی ہمت کی گئی۔ قصبہ کے گرد فصیل تھی، اس کے دروازے بند کر دیے گئے اور وہی ایک توپ جو آغاز جنگ میں حضرت گنگوہیؒ نے انگریزوں سے چھینی تھی، اس کو ایک بلند مقام پر نصب کر دیا گیا، اور عجیب اتفاق یہ ہوا کہ اس توپ کا پہلا فائر ایسا کامیاب رہا کہ اس کا گولہ ٹھیک غنیم کی توپ کے دہانہ پر جا کر پڑا۔ انگریزی فوج کی یہ توپ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ یہاں ایک توپ تھی، اور غنیم کے پاس بہت سی۔ یہاں توڑے دار بندوقیں تھیں اور وہ بھی بہت کم، اور دوسری طرف نئی قسم کی رائفلوں کی بہتات تھی۔ دو گھنٹہ سے زیادہ مقابلہ جاری نہ رہ سکا۔ صبح صادق کے وقت مشرق کی جانب سے تھانہ بھون پر گولہ باری شروع ہوئی تھی۔ فصیل توڑ دی گئی، دروازے اُڑا دیے گئے، مٹی کا تیل ڈال کر مکانوں کو آگ لگا دی گئی، جو ملا اس کو تہ تیغ کیا گیا۔ قیمتی مال واسباب سے فوج نے اپنی جیبیں بھریں۔ جو باقی تھا، وہ آس پاس کے گاؤں والوں نے لوٹ لیا۔ تھانہ بھون ایک اُجڑا دیار بن گیا۔

یہ چاروں بزرگ جن کا تذکرہ شروع سے چل رہا ہے، باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ کسی قدر تفصیل آگے آئے گی۔ قاضی عنایت علی صاحب، بہت سے ساتھیوں کو لے کر نواب محمود علی خاں صاحب کے پاس نجیب آباد پہنچ گئے اور سرسید صاحب کی روایت ہے کہ وہاں نواب صاحب کو کافی کمک پہنچائی اور جب کامیابی نہ ہوئی تو ایسے غائب ہوئے کہ پھر کبھی پتہ ہی نہ چل سکا کہ کہاں گئے (۳۰۵) مزید تفصیل میں.......... پر ضمیمہ میں ملاحظہ فرمایئے۔

وارنٹ گرفتاری، پولیس کی ناکام دوڑ دھوپ، عزم وہمت اور حوصلہ کی فتح

دنیا کے وہ انسان جن کو تاریخ کا ہیرو مانا جاتا ہے۔ جس طرح اُن کے کارنامے حیرت انگیز ہوتے ہیں، اسی طرح بسا اوقات اُن کی حفاظت وعصمت کے وہ وسائل اور ذرائع بھی حیرت انگیز وتعجب خیز ہوتے ہیں جو قدرت اُن کے لیے وقت پر مہیا کر دیتی ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ، حضرت اسمٰعیل، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے مرتبے تو بہت بلند ہیں۔ اکبر، نور جہاں، نپولین، بونا پارٹ جیسے ناموروں کی سوانح حیات بھی ہمیں بہت سے ایسے حیرت انگیز

واقعات سے آگاہ کرتی ہے کہ عقل نارسا جب ان کی کوئی معقول وجہ پیش نہیں کر سکتی تو تسکین کے لیے اُن کو کرشمۂ قدرت قرار دیتی ہے یا تاریخ کا معجزہ بتانے لگتی ہے۔

علاقہ تھانہ بھون کے یہ دہشت جنہوں نے انگریزوں کی زبان میں بغاوت اور غدر میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا تھا، تھانہ بھون میں شیر علی کے باغ سے حملہ کر کے فوجی دستہ کو شکست دی، اس کے افسر قتل کیے، توپ خانہ چھینا، پھر شاملی کی تحصیل پر حملہ کر کے فوج کو شکست دی، سرکاری عمارت تباہ کی، سرکاری سامان ضبط کیا، سپاہیوں کو مارا، اپنی آزاد حکومت قائم کی، باغی بادشاہ سے وفاداری کا اظہار کیا وغیرہ وغیرہ۔ غرض کون سا جرم تھا جو اُن سرمستانِ حریت نے نہیں کیا تھا، اور عبور دریائے شور سے لے کر توپ دم کیے جانے یا ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا ڈالنے تک کی کونسی سزا تھی کہ اس دور بے آئین میں یہ اس کے مستحق نہیں تھے لیکن ان تمام حرکتوں کے باوجود ہر قسم کی سزا[۳۰۶] سے بچ جانا۔ ہماری زبان میں اس کے لیے کرشمہ قدرت کے علاوہ اور کوئی لفظ موزوں نہیں ہے۔

درست ہے، انگریز کا یہ احسانِ عظیم فراموش نہ ہونا چاہیے کہ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت نے عام معافی کا اعلان بھی کر دیا تھا، مگر اول تو یہ اعلان یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہوا جب کہ سقوط دہلی کی تاریخ ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء سے لے کر ساڑھے تیرہ ماہ تک بقول مرحوم بادشاہ بہادر شاہ ظفر، عام پالیسی یہ رہی تھی کہ:

"جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے"

اور اس طرح لاکھوں ہندوستانی تہ تیغ اور توپ دم کیے جا چکے تھے۔ علاوہ ازیں اس اعلان سے وہ لوگ مستثنیٰ تھے:

❶ جو انگریزی رعایا کے قتل میں بذات خود شریک ہوئے۔

❷ جنہوں نے جان بوجھ کر قاتلوں کو پناہ دی۔

❸ جو لوگ باغیوں کے سردار ہوئے۔

❹ جنہوں نے بغاوت کی ترغیب دی۔

ان کے متعلق ملکہ وکٹوریہ کے اس معافی نامہ میں یہ کہا گیا تھا کہ:

"ان کی نسبت صرف وعدہ ہو سکتا ہے کہ اُن کی جاں بخشی ہوگی لیکن ایسے لوگوں کی تجویز سزا میں ان سب احوال پر جن کے اعتبار سے اپنی طاعت سے پھر گئے، کامل غور کیا جائے گا۔" [۳۰۷]

اسی بنا پر اس نمائشی معافی نامہ کے بعد بھی عرصہ دراز تک دار و گیر کا سلسلہ جاری رہا۔[۳۰۸]

انتہا یہ کہ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی گرفتاری اس اعلان سے تقریباً سات ماہ بعد عمل میں آئی یعنی جولائی ۱۸۵۹ء میں۔

تحفظ کا حقیقی سبب

دُعاء، وظیفہ، تعویذ اور عمل کی تاثیر سے انکار نہیں مگر ہمارے خیال میں سب سے مؤثر وظیفہ عزم و ہمت اور بلند نصب العین ہے جو لامحالہ نصرت اور امدادِ خداوندی کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

ولینصرن اللہ من ینصرہ

ان بزرگوں کو اللہ تعالیٰ نے اس وظیفہ کی توفیق عطا فرمائی، جو نہ صرف ان بزرگوں کے لیے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پوری ملت کے لیے نجات دہندہ ثابت ہوئی۔

ظاہری نظر میں یہ جماعت منتشر ہوگئی، اس کے کچھ افراد ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے اور کچھ نے ہندوستان ہی میں رہ کر زندگی گذاری، مگر حقیقت یہ ہے، کہ یہ انتشار بھی ایک خاص نظم کے ماتحت خاص نصب العین کے مطابق تھا۔ مبالغہ ہوگا اگر ہم اس کو قدرت کی "تدبیرِ محکم" قرار دیں۔

مکروا و مکر اللہ واللہ خیر الماکرین۔

(وہ بھی تدبیر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی تدبیر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے)...... کسی قدر تفصیل ملاحظہ کیجیے:

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے حوالہ سے پہلے گذر چکا ہے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء سے تقریباً ۱۲ سال پہلے حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحبؒ نے ہندوستانی تحریک کا مرکز مکہ معظمہ منتقل کر دیا تھا، اور دہلی میں ایک نمائندہ بورڈ بنا دیا تھا جس کی صدارت پہلے مولانا مملوک العلی صاحب کے سپرد تھی اور پھر یہی حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ جو ۱۸۵۷ء میں علاقہ تھانہ بھون کے امیر قرار دیے گئے، اس بورڈ کے صدر بنا دیے گئے۔

تحریک ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے اسی مرکز کا رُخ فرمایا، اور غیر معمولی مشکلات[۳۰۹] اور پریشانیاں برداشت کر کے مکہ معظمہ میں بیٹھ کر آخر تک ہندوستانی تحریک کی قیادت فرماتے رہے۔

حضرت مولانا عبد الغنی صاحب محدث دہلوی جو دہلی کے حلقہ درس میں حضرت مولانا شاہ اسحٰق صاحب کے جانشین تھے، اور مولانا رحمت اللہ صاحب جن کا ذکر خیر شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب کی تحریر کے سلسلہ میں پہلے گذر چکا ہے، یہ دونوں بزرگ بھی مکہ معظمہ ہی تشریف لے گئے اور وہاں جو عظیم الشان خدمات انجام دیں، اُن کے نشانات اور باقیات صالحات آج تک مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں موجود ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی حضرت مولانا محمد منیر صاحب اور اُن کے برادر محترم مولانا محمد مظہر صاحب کو ہندوستان چھوڑنا گیا، اور ابھی شہیدوں کا خون خشک[۳۱۰] ہونے نہیں پایا تھا کہ ان بزرگوں نے تحریک کی نشاۃ ثانیہ کے لیے دار العلوم دیوبند، جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد، مظاہر العلوم سہارن پور وغیرہ کے حلقے قائم کر دیے، جنہوں نے سیاسیات سے علیحدگی کا اعلان کیا۔ مگر دین

ومذہب (جس کی تعلیم کو نصب العین بنایا تھا) اس کی ہمہ گیر تفسیر میں ان بزرگوں کے عقیدے کے مطابق وطنی سیاست اور جدوجہد آزادی ایک فرض کی حیثیت رکھتی تھی۔

اسی احساسِ فرض کا نتیجہ تھا کہ جیسے ہی ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم کی گئی، اس جماعت کے سربراہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز اور آپ کے ساتھیوں نے مسلمانوں کے لیے شرکتِ کانگریس کا فتویٰ صادر کیا، اور برطانوی سامراج کے ہاتھوں میں کھیلنے والے سروں (۳۱۱) اور خان بہادروں کے چھینکے ہوئے تمام تیر پوری جوانمردی سے اپنے سینوں پر لیے۔

پھر بیسوی صدی کے شروع میں موتمر الانصار اور جمعیۃ الانصار کے نام سے ایک نظام قائم کیا گیا، اس نظام کا اندرونی رخ یہ تھا کہ بقول شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز:

"۱۹۰۷ء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ریشمی خط کی تحریک شروع کی، اور ۱۹۱۴ء تک اُسے اس حد تک پہنچا دیا تھا کہ اگر کچھ ملک کے خائن خیانت نہ کرتے تو اُسی وقت ہندوستان آزاد ہو چکا ہوتا۔" (۳۱۲)

اس وقت اس تحریک کے ذریعہ ہندوستان آزاد نہیں ہو سکا مگر یہی تحریک حریت واستقلال افغانستان کے لیے سنگِ بنیاد ثابت ہوئی جس سے مشرق میں ایک نئی بیداری پیدا ہو گئی (تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے نقشِ حیات جلد دوم، از شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی سیاسی ڈائری نیز علماء حق جلد اول وغیرہ)۔ ۱۹۱۴ء میں ریشمی رومال کی تحریک ناکام ہوئی۔ اس کے رہنما حضرت مولانا محمود الحسن صاحب، حضرت مولانا حسین صاحب، مولانا عزیز گل صاحب، حکیم نصرت حسین صاحب رحمہم اللہ گرفتار اور مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا برکت اللہ بھوپالی، مولانا محمد میاں منصور انصاری وغیرہ جلاوطن ہوئے۔ لیکن ابھی پورے پانچ سال بھی گذرنے نہیں پائے تھے کہ انہیں بزرگوں کے ساتھیوں نے جو ہندوستان میں تھے، نئی کروٹ لی، اور ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کی باضابطہ (۳۱۳) تشکیل کر دی۔ جس نے انڈین نیشنل کانگریس کے دوش بدوش جنگِ آزادی میں حصہ لیتے ہوئے اور کانگریس سے کہیں زیادہ جانی اور مالی قربانیاں پیش کرتے ہوئے ۱۹۴۷ء میں مکمل آزادی حاصل کر لی۔ افسوس آخر میں برطانیہ کا جادو کام کر گیا اور جسم ہندوستان کے دو ٹکڑے کرکے اس کی شہ رگ کا خون کھینچ لیا گیا۔ مگر بہر حال آزادی جس عنوان سے بھی آئی اور نجات جس حد تک بھی میسر ہوئی، وہ نتیجہ ہے انہیں کوششوں کا جن کا سرِ ورق ان بزرگوں کے مبارک ناموں سے مزین ہے۔

اس جملہ معترضہ کے بعد اصل موضوع کی طرف رجوع فرمائیے اور ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی سرگذشت سن لیجیے۔

پوری داستان طویل ہے۔ ہم ہر ایک بزرگ کے جستہ جستہ واقعات بیان کرتے ہیں۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز

حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے تقریباً ڈیڑھ سال انبالہ نگری، پنجلاسہ وغیرہ ضلع مظفر نگر، سہارن پور اور ضلع انبالہ کے دیہات میں گذارا۔ ۱۲۷۶ھ (۲۴۴) میں ہجرت کی۔ تہت سے روانہ ہوئے۔ سندھ کے راستے سے کراچی پہنچے اور بحری جہاز سے مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوگئے۔

اس سفر میں چند عجیب وغریب واقعات قابل تذکرہ ہیں جن کو حضرت حاجی صاحب کے تمام سوانح نگاروں نے نقل کیا ہے۔ مثلاً

(۱) پنجلاسہ ضلع انبالہ کے رئیس راؤ عبداللہ خاں تھے۔ حکام رس، سرکار کے وفادار، اور حضرت حاجی صاحب کے ارادت مند۔ پنجلاسہ پہنچ کر حضرت حاجی صاحب نے انہیں کے یہاں قیام کیا۔ حاجی صاحب جیسے باغی کو اپنے یہاں ٹھہرانا، تباہی اور بربادی کو دعوت دینا تھا۔ مگر راؤ صاحب کا اخلاص ہر ایک خطرہ سے بے نیاز تھا۔

قدرت کی عجائب نوازی ملاحظہ ہو کہ اس قیام کے دوران میں راؤ صاحب کا اخلاص آزمائش کی کسوٹی پر کسا گیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ مخبروں نے مخبری کردی اور صبح کے وقت جیسے ہی افق مشرق سے آفتاب نے سر نکالا، مجسٹریٹ ضلع دوش لیکر، راؤ صاحب کے مکان پر پہنچ گیا۔

حاجی صاحب نے بر سبیل احتیاط ایک ویران کوٹھری میں قیام فرمایا تھا، جو گھوڑوں کے اصطبل کے پاس تھی۔ مخبر نے ایسی صحیح مخبری کی کہ اس کوٹھری تک کا پتہ بتادیا تھا۔ یہ اشراق کا وقت تھا اور حسب معمول حاجی صاحب نماز اشراق میں مشغول تھے۔ راؤ صاحب کے لیے یہ بہت ہی نازک گھڑی تھی۔ مگر توفیق خداوندی نے حوصلہ مند راؤ صاحب کی مدد فرمائی۔ راؤ صاحب آگے بڑھے۔ گرم جوشی سے کلکٹر صاحب کا استقبال کیا۔ بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔

''تشریف لایئے۔ اس وقت صبح صبح کیسے تشریف آوری ہوئی''۔ راؤ صاحب نے فرمایا:

تخن پرور مجسٹریٹ نے کہا۔ سنا ہے، آپ کے اصطبل میں کوئی گھوڑا بہت عمدہ ہے، صاحب اُسے دیکھنے آئے ہیں۔

بہت بہتر ہے۔ تشریف لایئے۔ اصطبل حاضر ہے۔ گھوڑے ملاحظہ فرمایئے۔

راؤ صاحب مجسٹریٹ بہادر کو اصطبل میں لے گئے۔ گھوڑے دکھائے۔ مجسٹریٹ بار بار راؤ صاحب کے چہرہ پر نظر ڈالتا تھا، اور حیران تھا کہ راؤ صاحب پر خوف وہراس یا گھبراہٹ کا کوئی اثر نہیں۔ وہ دل ہی دل میں خیال کررہا تھا کہ شاید مخبر نے جھوٹی خبر دی۔

اصطبل میں گھومتے ہوئے اس ویران کوٹھری کے دروازہ پر بھی پہنچ گیا، جہاں حاجی صاحب قیام فرما تھے

اور یہ کہتے ہوئے کہ کیا اس میں گھوڑوں کی گھاس بھری جاتی ہے، کواڑ کھلوا دیئے۔
کوٹھری میں چوکی پر جانماز بچھی ہوئی ہے، لوٹا چوکی کے کنارہ پر اور وضو کے پانی سے نیچے کی زمین تر ہے مگر نماز پڑھنے والا کوئی نہیں۔
کلکٹر صاحب نے کوٹھری کے کونہ کونہ پر نظر ڈالی۔ کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ تو پھر راؤ صاحب سے ہی دریافت کیا کہ یہ چوکی کیسی ہے؟
راؤ صاحب: میں یہاں نماز پڑھا کرتا ہوں۔
کلکٹر صاحب: اصطبل کے کنارہ، ویران اور بوسیدہ کوٹھری میں نماز پڑھنے کا کیا مطلب؟ نماز کے لیے تو مسجد ہوتی ہے۔
راؤ صاحب: ہمارے مذہب کی یہ تعلیم ہے کہ فرض نماز تو مسجد میں جماعت کے ساتھ کھلم کھلا سب کے سامنے ادا کریں لیکن نفلیں چھپا کر کسی پوشیدہ جگہ میں پڑھیں۔ اس لیے اشراق وغیرہ کی نفلیں میں یہاں پڑھا کرتا ہوں۔
اب کلکٹر صاحب خاموش تھے۔ رخصت ہوئے اور راؤ صاحب سے معذرت کی کہ کوئی گھوڑا ہماری مرضی کا نہیں نکلا۔ افسوس آپ کو تکلیف بھی دی اور ہمارا کام بھی نہیں ہوا۔
رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت
راؤ صاحب اس بلا کو رخصت کر کے سب سے پہلے اسی کوٹھری میں پہنچے دیکھا، حاجی صاحب چوکی پر تشریف فرما ہیں۔ [۳۶۵]

(۲) گڑھی پختہ جو اب ضلع مظفر نگر میں ہے اور اس زمانہ میں غالباً سہارن پور کے ضلع میں تھی، حضرت حاجی صاحب یہاں تشریف لے گئے اور موضع کے رئیس کے یہاں قیام فرمایا۔ مخبروں نے خبر کر دی۔ مجسٹریٹ نے پولیس کپتان کو فوراً حکم لکھ دیا۔
اس علاقہ کے تھانہ دار خواجہ احمد حسین صاحب سہارن پوری تھے۔[۳۶۶] ایس۔ پی، تھانہ میں پہنچا۔ کلکٹر کے حکم کا صرف اُوپر کا حصہ جس میں تلاشی کا آرڈر تھا، دکھا دیا۔ مگر باقی حصہ جس میں ملزم اور موضع وغیرہ کا نام تھا، نہیں دکھایا کہ شاید مسلمان ہونے کی وجہ سے کسی صورت سے اس روش کو ناکام کر دیں، اور پہلے ہی خبر بھیج کر حاجی صاحب کو اپنی جگہ سے غائب کرادیں۔ بہر حال کپتان صاحب تھانیدار کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ جب گڑھی پختہ کے قریب پہنچے تب خواجہ صاحب کو اندازہ ہوا کہ حاجی صاحب کی گرفتاری کے لیے یہ دوڑ جاری ہے۔ خواجہ صاحب کو معلوم تھا کہ حاجی صاحب کس کے یہاں قیام فرما ہیں۔ خواجہ صاحب نے گاؤں کے باہر سے ہی چلانا شروع کر دیا، اور اس زمیندار کا نام لے لے کر دھونس جمانے لگے۔ نمک حرام تو کہاں ہے، باہر آ، آج تجھے سمجھنا ہے، تو سرکار کے باغیوں کو اپنے یہاں ٹھہراتا ہے (وغیرہ وغیرہ)۔ خواجہ صاحب کی آواز بہت بلند تھی۔ رات کے

سنانے میں خواجہ صاحب کی آواز پورے گاؤں میں گونج گئی۔ زمیندار نے خواجہ صاحب کی آواز پہچان لی۔ اُس نے فوراً حاجی صاحب کو ایسی جگہ پہنچادیا کہ حاجی صاحب ہاتھ نہ لگ سکے، اور روش ناکام واپس ہوئی۔

بہرحال جہاں جہاں حاجی صاحب پہنچتے رہے پولیس آپ کا تعاقب کرتی رہی۔ مگر ''جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے''۔

اسی طرح ایک اور گاؤں کا واقعہ ہے۔ رات کے وقت پولیس فورس بالکل بے خبری میں اس مکان پر پہنچ گئی، جہاں حضرت قیام فرماتھے۔ اسی کھلے ہوئے مردانہ مکان میں جہاں حضرت حاجی صاحب تشریف فرماتھے، آپ کو لٹا کر آپ پر رضائی ڈال دی گئی۔

پولیس کو اس کا وہم بھی نہ ہوا کہ حاجی صاحب اس کھلے ہوئے مردانہ مکان میں ہوں گے۔ وہ پہلے زنانہ مکان کی طرف بڑھی۔ زمیندار بھی اس کے ساتھ مکان کے اندر گئے اور یہاں چیختے چلاتے اور باہر کے آدمیوں کو ڈانٹتے ہوئے کہہ گئے کہ اس بڈھے کو کھیت پر ڈال آو، اس نے کھانس کھانس کر بلغم سے سارا مکان گندا کردیا ہے۔

پولیس اپنے دھیان میں مست تھی۔ چودھری صاحب کی اس زبان کو نہ سمجھ سکی، اور باہر کے آدمیوں نے حاجی صاحب کی چارپائی ایسی جگہ پہنچادی جہاں پولیس نہ پہنچ سکی۔

دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست

مکہ معظمہ میں قیام اور وفات

مختصر یہ کہ غیبی امداد اور خداوندی تحفظات کے زیرسایہ آپ حجاز مقدس پہنچے۔ وہاں پہنچ کر زہد وتقویٰ، ریاضت ومجاہدہ اور توکل علی اللہ کی وہ مثال قائم کی جس نے عہد صحابہؓ کی یاد تازہ کردی۔ نہ صرف عجم بلکہ عرب نے بھی آپ کے سامنے گردنِ عقیدت خم کی۔ آج دنیائے اسلام کا ہر ذی علم آپ کو شیخ العرب والعجم کے خطاب سے یاد کرتا ہے۔ ان عزائم اور بلند حوصلوں کے مقابلہ پر آپ تذکرہ نویسوں کے اس بیان سے سبق لیجیے کہ آپ خلقۃً ضعیف ونحیف اور خفیف اللحم (دبلے پتلے) تھے۔ سچ ہے اللہ تعالیٰ جس کو روحانی قوت سے نوازے اس کو جسمانی قوت کی کیا ضرورت۔

۱۲ رجمادی الاخریٰ ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۹/۱۸۹۹ء بروز چہارشنبہ بوقت صبح واصلِ بحق ہوئے، اور مکہ معظمہ میں دفن کیے گئے۔ رحمہ اللہ ورضی عنہ۔

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب بانی قدس اللہ سرہ العزیز

دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو حاجی پروگرام کے مطابق ہندوستان میں ہی رہنا تھا اور جب تک حاجی

صاحب اس علاقہ سے بخیریت روانہ ہو جائیں، اُن کی خدمت میں حاضری اور جماعتی ضروریات کی تکمیل بھی آپ کے فرائض میں داخل تھی۔

اس سرکار کی طرف سے وارنٹ گرفتاری کے ساتھ انعام کا بھی اعلان ہو گیا تھا۔ وارنٹ کی خبر سن کر دوست، احباب اور متعلقین نے روپوش ہو جانے پر مجبور کیا اور ایک علیحدہ جگہ آپ کو پہنچا دیا۔ تین روز تک آپ اس جگہ روپوش رہے۔ چوتھا دن ہوا تو گوشۂ تنہائی کو خیر باد کہہ کر باہر تشریف لے آئے۔ مخلصین نے اصرار کیا۔ تو فرمایا:

''آنحضرتؐ غارِ ثور میں تین دن مخفی رہے تھے۔ سنت سے اتنی ہی مدت ثابت ہے۔ یہ مدت ختم ہوگئی۔ لہٰذا روپوشی بھی ختم۔'' (۳۱۷)

یہ اتباعِ سنت کے شوق کا ایک نمونہ تھا۔

اب ان خدا رسیدہ، پابندِ سنت، برگزیدہ بزرگوں کی حاضر جوابی اور ذکاوت ملاحظہ ہو:۔

ایک روز آپ مسجد (۳۱۸) میں تشریف فرما تھے۔ پولیس پہنچ گئی۔ آپ اطمینان سے اُٹھے، جوتیاں سنبھالیں اور مسجد سے باہر نکلنے لگے۔ کپتان پولیس نے خود آپ سے پوچھا۔ مولانا قاسم کہاں ہیں''۔

آپ ایک قدم اور آگے بڑھے اور پیچھے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ ابھی یہاں تھے۔ اب کپتان پولیس مولانا کی تلاش میں اندر پہنچا، اور مولانا مسجد سے باہر نکل کر جہاں آپ (۳۱۹) نے مناسب سمجھا، تشریف لے گئے۔

پولیس نئی تھی۔ اُس نے مولانا کا نام ہی سنا تھا۔ اُس کا تصور یہی ہوگا کہ اتنے بڑے مولانا جن کی اتنی شہرت ہے، بڑے جبڑے کلّے کے شاندار آدمی ہوں گے۔ وضع قطع بھی ایسی ہی شاندار ہوگی۔ اور مولانا کی سادگی کا یہ عالم کہ ''بڑے مولانا'' تو درکنار آپ کی شکل وشباہت (۳۲۰) اور وضع قطع سے (۳۲۱) آپ کو معمولی (۳۲۲) ذی علم سمجھنا بھی مشکل ہوتا تھا۔ یہ ضرور ہوا کہ آپ ایک عرصہ تک مستقل طور سے کہیں نہیں رہے۔ آپ کے برادر نسبتی شیخ نہال احمد صاحب نے اصرار کر کے کچھ دنوں کے لیے اپنے گاؤں پھلواری میں بھیج دیا جو دیوبند اور نانوتہ کے درمیان لب سڑک تھا۔

دیوبند سے چند میل کے فاصلہ پر موضع ''اہلیا'' ہے۔ کچھ دنوں وہاں بھی قیام رہا۔ اس کے علاوہ آپ کے لیے دلچسپ مشغلہ ایک اور تھا یعنی اپنے شیخ طریقت اور امیر جہاد حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضری۔ اُن کے حالات کی خبر گیری، مستقبل کے متعلق ان سے ہدایات حاصل کرنا۔ مشورہ سے راہِ عمل طے کرنا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں دن کو چھپتے چھپاتے اور رات کو سفر کرتے ہوئے گنگوہ، (۳۲۳) انبیٹھ، (۳۲۴) بوڑیہ محلہ، نگری، (۳۲۵) لاواڑہ، پنجلاسہ، (۳۲۶) وغیرہ ضلع سہارنپور اور ضلع انبالہ کے مواضعات میں تشریف لے گئے جہاں حضرت حاجی صاحبؒ پہنچتے رہے تھے۔

سفرِ حج

الزام غدر یا اس الزام کے شبہ میں لاکھوں ہندوستانی موت کے گھاٹ اُتارے جا چکے ہیں۔ ظلم وستم اور وحشت و بربریت کی جتنی بھی صورتیں ہو سکتی ہیں، ہندوستانیوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے کام میں لائی جا چکی ہیں مگر جو قدرت فرعون کے گھر میں موسیٰ کی پرورش کرا سکتی ہے وہ عجیب وغریب انداز سے ان کی حفاظت کر رہی ہے جو فرعونِ برطانیہ کے مقابلہ میں موسیٰ بن کر سامنے آنے والے ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بھی انہیں منتخب افراد میں ہیں جن کو قدرتِ خداوندی برطانوی سامراج کے مقابلہ میں نہ صرف موسیٰ بلکہ موسیٰ گر بنا کر کھڑا کرنے والی تھی۔

آپ صحیح معنٰی میں صرف تین روز روپوش رہے۔ پھر خداوند عالم کی حفاظت کے بھروسہ پر خاص خاص مقاصد کے ماتحت متعدد مواضعات وقصبات اور شہروں میں گھومتے ہوئے تقریباً دو سال گذار دیئے۔

اس عرصہ میں حاجی امداد اللہ صاحب مکہ معظمہ بخیریت پہنچ چکے ہیں۔ بظاہر تارک الدنیا مگر دنیائے سیاست کے نہایت سنجیدہ امیر کی حیثیت سے مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب کا قائم کیا ہوا مرکز سنبھال چکے ہیں۔

اب ضرورت تھی کہ جن کو اس مرکز کے ماتحت ہندوستان میں مرکزی کردار انجام دینا ہے پھر ایک مرتبہ مل کر بیٹھیں، اور اب تازہ حالات میں مستقبل کا تفصیلی لائحہ عمل طے کریں۔

اس مصلحت کے علاوہ ایک دوسری مصلحت یہ بھی ہے کہ انگریز کی متجسس نگاہوں سے جو کہ نومبر ۱۸۵۸ء کے نمائشی اعلان کے بعد بھی رہنمایانِ تحریک کی تلاش میں ہندوستان کے چپہ چپہ پر تیزی سے پڑ رہی ہیں، کچھ عرصہ تک آڑ لے لیں۔

یہی مصلحتیں سامنے تھیں جن کی بنا پر جمادی الثانیہ ۱۲۷۷ھ (دسمبر ۱۸۶۰ء) میں حج بیت اللہ کا قصد فرمایا۔ بظاہر اس سفر کے محرک حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ہیں (حضرت مولانا مملوک علی صاحب کے قابل فخر فرزند ارجمند دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر المدرسین اور تحریک دارالعلوم دیوبند کے رُکن رکین) مگر عجیب بات یہ ہے کہ ضروریاتِ سفر کا تکفل فرمانے والے یہی متوکل علی اللہ مولانا محمد قاسم صاحب ہیں۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے بیان (۲۷۲) کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے، اور اس کی بین السطور غور سے پڑھیے۔

> "آخر حضرت حاجی صاحب عرب کو روانہ ہو گئے۔ احقر کو بعد اُن کے یہی سوجھی کہ تو بھی چل۔ مولانا کی روپوشی محض عزیز واقارب کے کہنے سے تھی، ورنہ اُن کو اپنی جان کا کچھ خیال نہ تھا۔ مولانا نے بھی ارادہ کیا۔ اس روپوشی کی بلا کے سبب والدین نے بخوشی اجازت دے دی۔ احقر بے سروسامان تھا۔ قلیل ساز اوراہ بہم پہنچایا تھا۔ مگر مولوی صاحب کی بدولت وہ سب راہ بخیر وخوبی طے

ہوئی۔ ہر چند مولوی صاحب بھی بے سامان تھے مگر بدولت توکل سب راہ بخیر وخوبی پوری ہوئی، اور سب کام انجام ہو گئے۔ کشتیوں کی راہ پنجاب ہو کر سندھ کی طرف کو گئے۔ کراچی سے جہاز میں بیٹھے۔ جمادی الثانیہ ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) میں روانہ ہوئے۔ (۴۲۸) ایک سال بعد جمادی الثانیہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) میں وطن واپس پہنچے۔"

حضرت نانوتویؒ کی سوانح حیات لکھنی مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وارنٹ گرفتاری کا قصہ اعلانِ معافی پر ختم نہیں ہو گیا، بلکہ ڈھائی سال مزید گذر گئے، تب بھی وارنٹ گرفتاری اور اس کے مقابلہ میں اپنے تحفظ کا سلسلہ جاری تھا۔ نیز حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا یہ فقرہ کہ سب کام انجام ہو گئے، اپنے اندر وسیع معنی رکھتا ہے۔ سطور بالا میں اس کا مفہوم پیش کیا جا چکا ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں۔

امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ

تقریباً نو ماہ گذرے، معافی عام کا اعلان ہو چکا ہے۔ ۱۸۵۹ء کا جون جولائی گذر رہا ہے۔ اگست آنے والا ہے مگر دارو گیر کا بازار اب بھی گرم ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ کے خسر مولانا محمد تقی صاحب (۴۲۹) جھجر میں شہید کیے جا چکے ہیں اور تھانہ بھون کے واقعات کے سلسلہ میں آپ کی گرفتاری کی افواہیں گرم ہیں حضرت مولانا گنگوہی اس عرصہ میں گنگوہ میں رہے۔ صرف ایک دو مرتبہ بقول مصنف "تذکرۃ الرشید":۔

"راتوں چلتے، دنوں چھپتے، خار دار جنگل پیدل قطع کرتے۔"

نگری (۴۳۰) اور پنجلاسہ وغیرہ پہنچے، جہاں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سفر ہجرت کی منزلیں طے کرتے ہوئے قیام پذیر تھے۔

حضرت گنگوہیؒ نے اس موقعہ پر بھی یہ اصرار کیا کہ حضرت حاجی صاحب کے ساتھ مکہ معظمہ چلیں۔ مگر حاجی صاحب کا حکم یہی ہوا کہ ہندوستان میں رہو، تم سے حق تعالیٰ کو ابھی بہت سے کام لینے ہیں۔ (۴۳۱)

حضرت مولانا رشید احمد صاحب حضرت حاجی صاحب کو رخصت کر کے واپس ہوئے۔ پھر گنگوہ ہی کچھ عرصہ قیام فرمایا۔ اس کے بعد آپ رامپور منہیاران تشریف لے گئے اور وہاں حکیم ضیاء الدین صاحب مرحوم کے مکان پر قیام فرمایا۔ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ کی آخری تاریخیں یا محرم ۱۲۷۶ھ کی ابتدائی تاریخیں یعنی ۱۸۵۹ء کی جولائی کا مہینہ ہے۔ پولیس کپتان گارڈن کرنیل فرانسس پولیس فورس کے ساتھ گنگوہ پہنچتا ہے۔ مسجد کے ایک گوشہ میں ایک صاحب گردن جھکائے مراقبہ میں مشغول ہیں۔ ایک سپاہی آپ کے پاس پہنچتا ہے اور گردن پر زور سے ہاتھ مار کر کہتا ہے۔ "چل کھڑا ہو، کیا گردن جھکائے بیٹھا ہے"۔ اور پھر دھکا دے کر مار پیٹ کرتے ہوئے مسجد سے باہر لے آتا ہے۔ یہ صاحب گرفتار کر لیے جاتے ہیں۔ پھر مکان پر پہنچ کر کونہ کونہ کی تلاشی لی جاتی ہے۔

یہ صاحب خاموش ہیں۔ جانتے ہیں کہ میں بے قصور ہوں اور جو کچھ میرے ساتھ کیا جا رہا ہے وہ محض

مشابہت کے دھوکہ میں، مگر ایک لفظ زبان سے نہیں نکالتے۔ کیونکہ اُن کی آرزو یہ تھی کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب محفوظ رہ جائیں، خواہ اُن پر کچھ بھی گذر ے۔ سب کچھ کر گذرنے کے بعد فتح کے نشہ میں بدمست کرنل اور اُس کے موذی سپاہیوں کی آنکھیں کھلتی ہیں کہ یہ جن کو گرفتار کیا گیا ہے، ملزم کے ماموں زاد بھائی مولانا ابونصر صاحب ہیں۔ اصل ملزم (مولانا رشید احمد صاحب) اس وقت یہاں گنگوہ میں موجود ہی نہیں ہیں۔ وہ کچھ دنوں سے چند میل کے فاصلہ پر قصبہ رام پور منہیاراں میں مقیم ہیں۔ اس تحقیق کے بعد پولیس رام پور منہیاراں پہنچی، جہاں حضرت مولانا رشید احمد صاحب بلا مزاحمت گرفتار ہوگئے، اور چونکہ تمام غصہ نا کردہ گناہ مولانا ابونصر صاحب پر نکالا جا چکا تھا، اس لیے حضرت مولانا گنگوہیؒ کو گرفتار کرتے ہوئے کوئی توہین آمیز حرکت بھی سرزد نہیں ہوئی۔ حضرت گنگوہیؒ کو بند بہلی میں بٹھا کر مسلح پولیس کی حفاظت میں سہارن پور پہنچایا۔ چند روز وہاں حوالات میں رکھے گئے۔ پھر مظفر نگر منتقل کر دیے گئے کیونکہ یہیں[۳۴۲] کے وارنٹ پر گرفتار ہوئے تھے۔ مولانا ابونصر صاحب خود تو رہائی پا گئے مگر اپنے پھوپھی زاد بھائی مولانا رشید احمد صاحب کی گرفتاری اپنی مصیبت سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ لہذا جیسے ہی پولیس گنگوہ سے روانہ ہوئی، مولانا ابونصر صاحب اور اُن کے والد (حضرت مولانا گنگوہیؒ کے ماموں) مولانا عبدالغنی صاحب پولیس کے پیچھے پیچھے پا پیادہ سہارن پور پہنچے۔

اب اس قصہ کا باقی حصہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے حوالہ سے ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ تحریر فرماتے ہیں:

> آپ پر علاوہ شرکتِ جہادِ شاملی یہ بھی الزام تھا کہ سپاہیوں کی رائفل آپ کے پاس ہے۔ آپ نے دونوں سے بالفاظ توریہ انکار کیا۔ حاکم نے پوچھا۔ تم نے گورنمنٹ کے خلاف ہتھیار اُٹھایا۔ آپ نے فوراً جیب سے تسبیح نکالی اور فرمایا۔ "یہ میرا ہتھیار ہے"۔ اُس نے کہا۔ وہ بندوق کہاں ہے۔ آپ نے فرمایا۔ مجھے بندوق سے کیا سروکار؟ غرضکہ اس کے تمام سوالات کا جواب اسی طرح دیتے رہے۔ جب اس کی مقصد براری نہ ہوئی تو اُس نے سپاہیوں کو حکم کیا کہ ننگی تلواریں لے کر اس کے سر پر کھڑے ہو جاؤ۔
>
> آپ کے ماموں مولانا محمد شفیع صاحب گنگوہی جو کہ پنجاب میں عرصہ دراز تک ملازم گورنمنٹ رہ چکے تھے۔ ہتھکڑیوں اور انگریز حاکم کی سختیاں اور دھمکیاں دیکھ کر پہلے سے سراسیمہ ہو رہے تھے، اس حکم کو سن کر سخت پریشان ہو گئے۔ آپ کو علیحدہ لے جا کر کہنے لگے۔ بیٹا بتلا دے وہ بندوق کہاں ہے بندوق کے مل جانے پر حاکم تجھ کو چھوڑ دے گا وہ بندوق آپ کے کیا کام آئے گی۔ دیکھ ننگی تلواروں کا تجھ پر پہرہ بٹھا رہا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ماموں جان آپ گھبرایئے نہیں۔ ایک تلوار نہیں، سینکڑوں تلواروں کا بھی اگر پہرہ قائم کر دیا جائے تو کیا خوف ہے۔ بندوق کا بتانا الزام کا سر پر لینا ہے۔ اس پر وہ بھی چپکے ہو گئے الغرض جب آپ ان تمام تخویفات اور دھمکیوں سے متاثر

نہیں ہوئے اور نہایت استقلال سے جوابات دیتے رہے۔ سپاہی ننگی تلواروں سے آپ پر پہرہ دیتے رہے، تو آپ کو مظفر نگر جیل میں بھیج دیا گیا، اور شہادتوں کے حصول کے لیے پولیس اور حکومت کوشش کرتی رہی تاکہ ثبوت بہم پہنچ کر مقدمہ چلایا جائے۔ ماموں صاحب مرحوم جو کہ گنگوہ سے اسی اعلان اور ارادہ پر نکلے تھے اور ساتھ ساتھ تھے کہ مولوی رشید احمد جب تک رہا نہ ہو جائیں گے میں گنگوہ واپس نہ آؤں گا۔ انہوں نے ضمانت پر رہائی کی درخواست کی۔ حاکم نے تین ہزار کی تین سال کے لیے ضمانت طلب کی (یعنی ایک ایک ہزار کی تین ضمانتیں تین سال تک کے لیے) تین شخص ضمانت مطلوبہ کے لیے تیار ہو گئے۔ مگر حاکم نے قبول کرنے سے اس حیلہ سے انکار کر دیا کہ یہ سب گنگوہ کے باشندے نہیں ہیں اس لیے ان کی ضمانت قانوناً درست نہیں۔

صاحب امداد المشتاق صفحہ ۱۵۳ پر حضرت گنگوہیؒ کی زبانی نقل کرتے ہیں:

جب میں قید خانہ میں تھا تو میری تین سال کے لیے تین ہزار کی ضمانت طلب ہوئی تھی۔ چنانچہ تین شخص ضامن ہوئے۔ لیکن انگریز سخت مزاج تھا، اس نے یہ کہہ کر کہ تینوں گنگوہ کے باشندے نہیں ہیں ضمانت نامنظور کر دی۔ ماموں صاحب نے قسم کھائی تھی کہ جب تک اس کو نہ چھڑالوں گا، گنگوہ نہ آؤں گا۔ چنانچہ وہ ساتھ ہی تھے۔ اسی اثناء میں ہمارے حضرت (حضرت حاجی امداد اللہ صاحب) گنگوہ تشریف لائے اور یہاں خبر تھی کہ میں اب رہا ہوا، اب رہا ہوا۔ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز نے فرمایا۔ چھوٹنے میں ابھی دیر ہے، ہم اس سے مل آتے ہیں۔ انہیں ایام میں کہ میں قید خانہ میں تھا، خواب میں تشریف لائے، گویا میرے پاس تشریف رکھتے ہیں، اور تسلی فرماتے ہیں۔ پھر حضرت یہاں سے تشریف لے گئے اور میں ایک ماہ بعد چھوٹا۔ (امداد المشتاق صفحہ ۱۸۲)۔

جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا، حضرت گنگوہیؒ کی گرفتاری آخر ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ یا ابتداء محرم ۱۲۷۶ھ (جولائی ۱۸۵۹ء) میں ہوئی۔ تقریباً ۶ ماہ حوالات کی زندگی میں صرف ہوئے۔ پس آپ کی رہائی جمادی الثانیہ ۱۲۷۶ھ (جنوری ۱۸۶۰ء) میں ہوئی اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب جمادی الاولیٰ ۱۲۷۶ھ (دسمبر ۱۸۵۹ء) میں ہندوستان سے تشریف لے گئے۔ رحمہم اللہ وقدس اسرارہم۔

مولانا محمد مظہر صاحبؒ

خلف حافظ لطف علی صاحبؒ (۳۴۳) ساکن نانوتہ اپنے والد ماجد سے قرآن شریف حفظ کیا۔ مولانا مملوک علی صاحب، مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری، مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مجددی خلف الرشید حضرت شاہ ابوسعید صاحب وغیرہم سے علوم متداولہ کی تکمیل کی۔ بخاری شریف حضرت شاہ مولانا اسحاق

صاحبؒ سے پڑھی۔ اول اجمیر کالج میں پھر آگرہ میں ملازم رہے۔ پھر ملازمت ترک کردی۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک حریت میں شریک ہوئے۔ بڑی جرأت وہمت سے جہادِ شاملی میں حصہ لیا۔ پیر میں گولی لگی۔ علاج معالجے کے بعد بھی اس کا نشان باقی رہا۔ تحریک ختم ہوئی تو کسی آنے والی تحریک کے لیے عرصہ تک اپنے آپ کو محفوظ رکھا۔ روپوشی کی زندگی بسر کی۔ دارو گیر کا دور ختم ہوا تو دارالعلوم کے نمونہ پر سہارن پور میں مدرسہ "مظاہر العلوم" کی بنیاد رکھی۔ ان دونوں اداروں کے قیام میں صرف چھ ماہ کا فصل (۳۳۴) ہے۔ آپ حضرت مولانا گنگوہیؒ سے پانچ سال بڑے تھے۔ ۲۴ ذی الحجہ (۱۸۸۶ء) کی شب میں آٹھ بجے آپ نے انتقال فرمایا۔

دوسری عظیم الشان خدمت

شاندار ماضی جلد دوم اور سوم میں وضاحت کی گئی ہے کہ تصانیف کے ذریعہ علمی پیرایہ میں اپنے نظریات کی اشاعت بھی اس جماعت کے پروگرام کا اہم جزو تھی۔ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی مولانا محمد احسن (۳۳۵) صاحب کے تعاون سے پروگرام کے اس جزو میں بھی حصہ لیا۔

مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی

حضرت مولانا محمد مظہر صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں ۱۲۳۷ھ میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ دہلی کے انہیں اساتذہ کے سامنے جن کا ذکرِ خیر بار بار آچکا ہے، زانوئے تلمذ طے کیا۔ تحریک میں سرگرم شرکت کے بعد جہادِ شاملی میں مردانہ وار حصہ لیا۔ آپ کو حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے بہت زیادہ تعلق خاطر تھا۔ کسی وقت بھی اُن سے جدائی گوارا نہیں تھی۔ امیر جہاد حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے اس یگانگت اور تعلقِ قلبی کا لحاظ فرمایا۔ چنانچہ جو خدمت حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے سپرد فرمائی، اُس میں آپ کو بھی شریک فرما دیا۔ مزید براں تاکید فرمادی کہ مولانا محمد قاسم کو کبھی تنہا نہ چھوڑیں کیونکہ انہیں خود اپنی جان کا خیال نہیں تھا۔

تحریک کے خاتمہ پر جب روپوشی کا بادل چھٹا تو آپ نے بریلی پہنچ کر ۱۸۶۱ء میں بریلی کالج کی ملازمت اختیار کرلی، اور وہاں مطبع صدیقی کے کام میں اپنے بھائی مولانا محمد احسن صاحب کے شریک و مددگار رہے۔ آپ دو سال دارالعلوم دیوبند کے مہتمم بھی رہے۔

حضرت مولانا رحمت اللہ(۲۳۲) صاحب کیرانوی

اس محاذ کے مجاہدین میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کا ذکر خیر باقی رہ گیا۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کو شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب نے ''بڑا عالم فاضل اور دانش مند'' فرمایا ہے، مگر ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ تحریک میں شریک ہونے کے بجائے وطن واپس چلے گئے۔ شمس العلماء کے اس فقرہ پر گذشتہ صفحات میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے یہاں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے شرکتِ جہاد کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا محمد عارف الاسلام صاحب عثمانی الجلالی کا ایک مضمون روزنامہ الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوا تھا۔ یہاں یہ مضمون بجنسہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس مضمون سے قصبہ کیرانہ میں مقابلہ کی تفصیلات بھی معلوم ہوں گی۔ نیز دو واجب الاحترام شخصیتوں اور جہاد میں شریک ہونے والی ایک برادری کا بھی تعارف ہوگا (یعنی مولانا عبدالحلیم صاحب تھانوی اور چودھری عظیم الدین صاحب اور گوجر برادری) چند ضروری فوائد حاشیہ میں اضافہ کر دیئے گئے ہیں۔

مولانا عارف الاسلام فرماتے ہیں:

یادگار شہیدانِ غدر ۱۸۵۷ء کے سلسلہ میں، میں اپنے حقیقی پر دادا صاحب کے برادر کلاں مولانا رحمت اللہ مرحوم کیرانوی، بانی مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے مختصر حالات درج کر رہا ہوں۔

ضلع مظفر نگر کے پرگنہ شاملی میں زمین دارہ شیوخ اور گوجروں کے ہاتھ میں تھا جن میں دین داری کے ساتھ جوش بھی تھا۔ چنانچہ تھانہ بھون اور کیرانہ کا ایک محاذ قائم کیا گیا اور مجاہدین کی جماعت مدافعت اور مقابلہ کرتی رہی۔ شاملی کی تحصیل پر حملہ کیا گیا اور پرگنہ کے چاروں طرف اس مجاہدانہ تحریک کا اثر عام ہو گیا۔

تھانہ بھون میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ اور مولوی عبدالحلیم صاحبؒ تھانوی مع رفقاء (ان رفقاء میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ، امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ اور جناب حافظ ضامن صاحب شہیدؒ کے اسماء گرامی خاص طور پر یاد رکھے جائیں) اور نواح کیرانہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ گورہ فوج کا مقابلہ کر رہے تھے۔ مجاہدین کیرانہ میں چونکہ مسلمان گوجر زیادہ تھے اس لیے ان کی قیادت چودھری عظیم الدینؒ، حضرت مولاناؒ کے ساتھ کر رہے تھے (انقلاب کے بعد چودھری صاحب مذکور حضرت مولانا کے پاس مکہ معظمہ چلے گئے تھے، اور وہیں ان کا انتقال ہوا) اس زمانہ میں عصر کی نماز کے بعد مجاہدین کی تنظیم اور تربیت کے لیے کیرانہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ بجایا جاتا تھا جس کی آواز سن کر لوگ جمع ہو جاتے تھے اور اعلان ہوتا تھا:

"ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا"

اس جملہ کے بعد جو کچھ کہنا ہوتا تھا، عوام کو سنایا جاتا تھا۔ اس پرانی آواز کو سننے والوں میں سے اب کوئی نہیں رہا۔ مگر جنہوں نے اپنے بزرگوں سے اس کی صدائے بازگشت سنی ہے، وہ اب بھی موجود ہیں۔ کیرانہ کے محاذ پر بظاہر شکست کا امکان نہ تھا۔ مگر بعض ابنائے وطن کی زمانہ سازی اور مخبروں کی سازش نے حالات کا رُخ بدل دیا۔ کیرانہ میں گورہ فوج اور توپ خانہ داخل ہوا۔ محلّہ دربار کے دروازہ کے سامنے توپ خانہ نصب کیا گیا اور گورہ فوج نے دربار کا محاصرہ کرلیا۔ ہر گھر کی تلاشی لی گئی۔ عورتوں بچوں اور ہر شخص کو فرداً فرداً دربار سے باہر نکالا گیا۔ اس لیے کہ کسی مخبر نے اطلاع دی تھی کہ مولانا دربار میں روپوش ہیں۔ کیرانہ کے قریب "پنجیٹھ" مسلمان گوجروں کا ایک گاؤں ہے، وہاں مولانا اپنی باقی ماندہ جماعت کے ساتھ پہنچے۔ خود "پنجیٹھ" کے لوگ بھی مجاہدین میں شریک تھے۔ اسی دوران میں گورہ فوج کے ایک گھوڑ اسوار دستہ نے "پنجیٹھ" کا رُخ کیا۔ کیرانہ اور تمام قرب وجوار کے حالات کی اطلاع مولانا کو ملتی رہتی تھی۔ چنانچہ "پنجیٹھ" کے مکھیا کو جب فوج کی آمد کا حال معلوم ہوا تو اس نے فوراً جماعت کو منتشر کردیا اور مولانا سے خواہش کی کہ "کھرپا" لے کر کھیت میں گھاس کاٹنے چلے جائیں، چنانچہ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ گورہ فوج اسی کھیت کی پگڈنڈی سے گذری جہاں میں گھاس کاٹ رہا تھا اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو کنکریاں اُڑتی تھیں وہ میرے جسم پر لگ رہی تھیں اور میں فوج کو اپنے پاس سے گذرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ فوج نے گاؤں کا محاصرہ کرلیا۔ مکھیا کو گرفتار کرلیا گیا۔ پورے گاؤں کی تلاشی لی گئی مگر مولانا کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ مجبوراً فوجی دستہ کیرانہ واپس ہوگیا۔ حالات پر قابو پالیا گیا اور حضرت مولانا کے خلاف فوجداری مقدمہ چلایا گیا۔ وارنٹ جاری ہوا۔ آپ کو مفرور باغی قرار دیا گیا اور گرفتاری کے لیے ایک ہزار روپیہ انعام کا اعلان ہوا۔

حضرت مولانا اپنا نام مصلح الدین بدل کر پیدل دہلی روانہ ہوئے۔ آپ کے لیے یہ وقت سخت آزمائش کا تھا۔ ایمانی عزم وہمت اور استقلال کے ساتھ جے پور اور جودھ پور کے مہیب ریگستانی جنگلوں کو پاپیادہ عبور کرتے ہوئے بندرگاہ سورت پہنچے، اس زمانہ میں سورت بندرگاہ سے بھی جہاز کا سفر آسان نہ تھا۔ بادبانی جہاز سال بھر میں صرف ایک مرتبہ ہوا کی موافقت کے زمانہ میں سورت سے روانہ ہوتا، اور اسی طرح جدہ سے آتا تھا اور ایک خطوط کا محصول چار روپے (للعہ) تھا۔ جو لوگ ہجرت کے ارادہ سے ترک وطن کرتے، وہ ساتھ ہی دنیاوی تعلقات اور باہمی علائق کو زندگی ہی میں ختم کردیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا کی روانگی اور فوجداری مقدمہ کے بعد آپ کی اور آپ کے خاندان کی جائداد ضبط ہوکر نیلام ہوئی۔ خاص طور پر پانی پت میں (جو کہ مولانا کا سابقہ وطن اور اُن کے جدِ امجد حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء کی جاءِ مزار ہے) مخبر کمال الدین کی شناخت پر جو جائداد قرق کرکے نیلام کی گئی، اُس کا مختصر بیان درج ذیل ہے۔ جائداد کے نیلام کا فیصلہ ڈپٹی کمشنر کرنال نے ۳۰ رجنوری ۱۸۶۲ء میں کیا۔

❶ سرائے مجبور۔ اس کی قیمت سرکاری طور پر ڈپٹی کمشنر کے کاغذات میں پانچ سو روپیہ ہے۔

❷ سرائے چوڑ ھے ....
❸ سرائے شیخ فضل الٰہی ....
❹ سرائے قصاباں ....
❺ سرائے لوہ آباد ....
❻ سرائے مایان ....

یہ سب سرائیں اور وسیع قطعات زمین اور مکانات صرف ایک ہزار چار سو بیس روپیہ میں نیلام ہوئے جن کی قیمت لاکھوں روپے تھی۔ مزرو عہ علاقے اور سکنائی جائداد اور زراعتی زمینیں اس کے علاوہ ہیں جو بحق سرکار ضبط ہوئیں۔ مذکورہ بالا سرائیں جس قیمت پر نیلام ہوئیں، وہ بھی ملاحظہ ہوں۔

سرائے کھجور:	۴۲ روپیہ	سرائے لوہ آباد	۱۵ روپیہ
سرائے چوڑ ھے:	۵۶ روپیہ	اور سرائے قصاباں	۱۴ روپیہ

کاغذات جائداد نیلام شدہ میں اغذکس مشمولہ کا عنوان یہ ہے:

''اغذکس مشمولہ مثل فوجداری مقدمہ عرضی کمال الدین ساکن کیرانہ حال پانی پت مولوی رحمت اللہ باغی''۔

طویل سفر کے آلام و مصائب برداشت کرتے ہوئے مولانا مکہ معظمہ جا پہنچے۔ اس کے بعد وہاں کس طرح اس مجاہد حق نے دینی اور علمی کارنامے انجام دیئے، اور کس طرح عیسائی جماعتوں سے فاتحانہ مقابلہ کیا۔ پھر مدرسہ صولتیہ قائم کر کے غیر فانی کارنامہ انجام دیا سلطان ترکی عبدالحمید خاں صاحب سے شرف باریابی حاصل کیا، اور اپنے حقیقی برادر زادہ یعنی میرے والد مولانا بدرالاسلام (مرحوم) کو وہیں تعلیم و تربیت دے کر سلطان مذکور کا معتمد خاص بنوادیا۔ یہ ایک علیحدہ داستان ہے۔

بفضلہ اب تک ان کے جانشین مدرسہ مذکور سے وابستہ اور مکہ معظمہ میں شاد و آباد ہیں۔ مولانا آخری دنوں میں مدینہ منورہ میں حاضر تھے۔ ۲۲؍ رمضان ۱۳۰۸ھ (۲ مئی ۱۸۹۱ء) کو وصال ہوا۔ مدینہ منورہ کی خاک پاک ابدی آرام گاہ بنی۔

ڈاکٹر وزیر خاںؒ

اگرچہ آپ دہلی یا مضافات دہلی کے باشندہ نہیں ہیں۔ آپ کا اصل وطن بہار بتایا گیا ہے۔ مگر چونکہ عیسائیت اور عیسائیت نواز انگریزوں کے خلاف جہاد میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے شریک رہے ہیں۔ اس لیے مولانا رحمت اللہ صاحب کے تذکرہ کے ساتھ آپ کا ذکر خیر بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے اسباب بغاوت میں اُن کوششوں کا کسی قدر ذکر گذر چکا ہے جو عیسائی مشنریوں کی طرف سے ہندوستان میں جاری تھیں تاکہ مذہبی ہمنوائی حاصل کر کے برطانوی سامراج کو لازوال بنا دیا جائے۔ ان کوششوں کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ہندوستان کے مذہب پرستوں کو مناظرہ کا چیلنج دیا جاتا تھا، اور چونکہ اس وقت تک اقتدار کے وارث عام طور پر مسلمان ہی تھے، لہٰذا چیلنج کا نمایاں رُخ مسلمانوں ہی کی طرف رہتا تھا۔ ردِ عیسائیت کی خدمت حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب اور ڈاکٹر وزیر علی خاں صاحب نے اپنے ذمہ لی تھی۔

ڈاکٹر صاحب یورپ جا چکے تھے۔ انگریزی کے ساتھ یونانی اور عبرانی زبانوں میں بھی آپ کو کافی درک تھا۔ آپ نے یورپ سے واپس آکر آگرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ تاج محل کے قریب محلہ کا غذیان میں آپ کی سکونت تھی۔ یہیں حضرت مولانا رحمت اللہ سے تعارف حاصل ہوا اور علمی رجحانات کی یگانگت نے ایک جان دو قالب کی مثال صادق کر دی۔

اس دَور کی مناظرانہ تاریخ میں پادری فنڈر کی شکست خاص اہمیت رکھتی ہے جس نے ترقی پذیر عیسائیت پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ پھر آخر تک وہ پنپ نہ سکی۔

پادری فنڈر کو شکست دینے والے یہی مولانا رحمت اللہ صاحب اور اُن کے رفیق و معاون ڈاکٹر وزیر علی خاں (۲۲۷) صاحب تھے۔

فنڈر ۱۸۵۲ء میں یورپ سے آیا تھا۔ رجب ۱۲۷۰ھ (مارچ ۱۸۵۴ء) میں مناظرہ ہوا۔ اس شکست فاش کے بعد فنڈر کے لیے ہندوستان میں منہ دکھانا مشکل تھا۔ وہ یہاں سے فرار ہو۔ چند سال بعد ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں وہ قسطنطنیہ پہنچا اور وہاں بھی اسی طرح چیلنج کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب اور اُن کے دوست ڈاکٹر وزیر علی خاں صاحب بھی ہجرت کر کے مکہ معظمہ پہنچ چکے تھے۔ سلطان نے مولانا کو قسطنطنیہ طلب کیا۔ فنڈر کو وہاں بھی شکست فاش نصیب ہوئی۔

ڈاکٹر وزیر خاں صاحب ۱۸۵۷ء کے دور انقلاب میں دہلی تشریف لے آئے اور جب تک جنگ جاری رہی، دہلی میں مقیم رہے۔ بہادر شاہ اور جنرل بخت خاں کی طرف سے آپ کو خدمات بھی سپرد کی گئیں۔ جنرل بخت خاں نے آپ کو لارڈ آف آگرہ بھی بنا دیا تھا۔ پھر جنرل بخت خاں کے ساتھ ہی آپ لکھنؤ تشریف لے گئے، اور جب ہر طرح ناکامی ہوئی تو کسی طرح چھپ چھپا کر مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ یہاں آپ نے علاج معالجہ

شروع کر دیا جس سے خلقِ خدا کو بہت فائدہ پہنچا اور وہی آپ کی حفاظت کا ذریعہ بھی بن گیا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ کسی بدوی شیخ کی بیوی بیمار ہوئی۔ مرض لاعلاج تھا۔ اطباء مایوس ہو چکے تھے۔ بدوی رئیس نے سب سے مایوس ہو کر ڈاکٹر صاحب سے رجوع کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے علاج سے اللہ تعالیٰ نے مریضہ کو شفا بخشی۔ یہ بدوی شیخ ڈاکٹر صاحب کا بہت ممنون ہوا۔ کچھ عرصہ بعد حکومتِ برطانیہ نے حکومتِ ترکیہ سے گفتگو کر کے ڈاکٹر صاحب کی حوالگی کا پروانہ حاصل کر لیا۔ جب بدوی سردار کو علم ہوا تو اُس نے شریف مکہ کے پاس پیغام پہنچایا کہ ڈاکٹر وزیر خاں میری امان میں ہیں جب تک میرے قبیلے کے بیس ہزار افراد کٹ نہ جائیں گے، ڈاکٹر وزیر خاں کو حوالہ نہیں کیا جا سکتا۔ شریف مکہ نے یہ رپورٹ حکومتِ ترکیہ کو پیش کر دی۔ بابِ عالی (مرکزی حکومتِ ترکیہ) نے یہ پروانہ منسوخ کر دیا۔ (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء)۔

رڑکی[۳۴۸] (ضلع سہارن پور)

۲۱ مئی ۱۸۵۷ء کو گوجر قوم پرستوں نے رڑکی ضلع اور شہر کو آزاد کرا لیا تھا۔ لیکن ۳۰ مئی کو انگریزی فوجوں نے دوبارہ رڑکی کو اپنے قبضہ میں کر لیا اور رسد پہنچائی۔

۲ جون کو رڑکی کی فوج کے کچھ سرغنوں نے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ ان میں سے کچھ سپاہی نگینہ ہوتے ہوئے بجنور پہنچے، جہاں وہ گرفتار کر لیے گئے اور مراد آباد میں ان کو پھانسی دے دی گئی۔ ان میں سے تین سپاہی بھاگ کر رڑکی کے نزدیک ایک گاؤں "گنیش پور" پناہ گزیں ہو گئے۔ انگریزی فوجوں نے اُن کا تعاقب کیا لیکن وہ وہاں سے بھی بچ کر نکل گئے۔ اس پر قرب و جوار کے گاؤں والوں کو دھمکی دی گئی کہ کسی بھی باغی کو چھپانے کی کوشش کی گئی تو اسے بھی پھانسی دے دی جائے گی۔ اس کے بعد گاؤں والوں پر مظالم ڈھائے گئے۔ ۱۳ جون کو پھر رڑکی فوج کے ایک سوار دستے نے جس کو بجنور جانے کا حکم ہوا تھا، بغاوت کر دی۔ ان کا کورٹ مارشل کیا گیا۔

۲۳ جون کو منگلور[۳۴۹] میں نہر کے پل کے دوسری طرف قوم پرستوں کی فوج جمع ہوئی۔ جس کی تعداد دو سو تھی۔ ان کی ٹکر انگریزی فوج سے ہوئی۔ جس میں تین قوم پرست ہلاک ہوئے اور آٹھ کو گرفتار کر لیا گیا۔ جن میں سے چار کو اسی جگہ پھانسی دے دی گئی، اور لاشوں کو رسی میں باندھ کر درختوں پر لٹکا دیا گیا۔ باقی چار کو رڑکی لا کر برگد کے درخت پر لٹکا کر پھانسی دے دی گئی۔

۱۴ جون کو دہانہ گنگا کے پاس رانی مجرا گاؤں میں قوم پروروں اور انگریزی فوج کے درمیان زبردست جنگ ہوئی جو لگاتار چار دن تک جاری رہی۔ دونوں جانب سے توپوں کا استعمال ہوا۔ قوم پرور انقلابیوں نے کچھ ہٹ کر دوسرے گاؤں "منتوا" میں مورچہ لگایا۔ ڈٹ کر مقابلہ ہوا۔ چار انگریز ہلاک ہوئے۔ چھ قوم پرور شہید اور ۴۱ گرفتار ہوئے۔ ان میں سے گیارہ کو رڑکی لا کر برگد کے درخت پر پھانسی دی گئی۔ باقی ۳۰ کو بینت مار کر جوالا پور لے جا کر چھوڑ دیا گیا۔

۲۲ رجولائی کو محمود پور اور دیوبند کے درمیان انگریزی فوجوں اور قوم پرستوں کے درمیان مقابلہ زبردست ہوا۔ جس میں ۳۶ قوم پرور شہید ہوئے اور بہت سے زخمی۔ اس کے علاوہ ۳۸ گرفتار ہوئے۔ جن میں سے ۱۴ کو رڑکی میں اسی برگد کے درخت کے نیچے پھانسی دے دی گئی۔

مجاہدین کو شکست ہوگئی تو انگریزی فوجوں نے ان مواضعات پر چڑھائی شروع کر دی۔ گاؤں والوں نے بھی مقابلہ کیا۔ مگر آخر کب تک؟ بہت سے شہید ہوئے۔ ایک سو میں کو گرفتار کر کے رڑکی لایا گیا۔ برگد کا درخت جس کے سایہ میں تھکے ماندے مسافر سانس لیا کرتے تھے، ان مسافرانِ شاہراہِ آزادی کا مقتل بنایا گیا۔ ۲۴ رجولائی ۱۸۵۷ء کو ان سب کو اسی جگہ پھانسی دے دی گئی۔ جوالا پور کے ایک گوجر سردار کو یہیں لا کر پھانسی دے دی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۹۵۷ء سے پانچ سال پہلے (۱۹۵۲ء) تک اس برگد کے ٹہنے پر لوہے کا ہُک اور زنجیر کا ٹکڑا موجود تھا۔ آندھی میں یہ ٹہنا گر گیا تو یہ ہُک اور زنجیر بھی غائب ہوگئی۔

برگد کا یہ درخت رڑکی سے متصل ''سنہرا گاؤں'' کے قریب ہے۔ مشہور یہی ہے اور قرین قیاس بھی ہے کہ اس درخت کی شاخوں میں رسیوں کے پھندے ڈال کر جن کو پھانسیاں دی گئیں، ان کی تعداد ڈھائی سو ہے۔ ۱۹۵۷ء میں جب جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی سو سالہ یادگار منائی گئی تو جلسہ کے لیے اسی برگد کا سایہ تجویز کیا گیا جہاں سو سال پیشتر کے شہیدوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔

علی گڑھ

فضا میں سکون تھا۔ یکا یک ایک برہمن گرفتار کیا گیا۔ اُس پر الزام یہ تھا کہ اُس نے سپاہیوں کو ورغلایا اور یہ منصوبہ بنایا کہ ہم باہر سے بارات لائیں گے تم اُس کے ساتھ شامل ہو کر افسران کو مار ڈالنا۔ ۲۰ رمئی کو اُسے دیسی سپاہ کے روبرو پھانسی دے دی گئی۔ سپاہی چپ چاپ یہ منظر دیکھتے رہے۔ یکا یک ایک سپاہی آگے بڑھا، اور برہمن کی لٹکتی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کر کے بلند آواز سے کہا:

''بھائیو! اسے دیکھو، جس نے دھرم کی خاطر جان قربان کر دی۔''

اس آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ دلوں کی دنیا میں طوفان برپا ہوگیا۔ انہوں نے افسروں کو تو کوئی آزار نہیں پہنچایا۔ البتہ تمام فرنگیوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ جلد سے جلد علی گڑھ چھوڑ دیں۔ فرنگی رخصت ہوئے تو فوجیوں نے جیل خانہ توڑا۔ قیدی چھڑائے خزانہ قبضہ میں لیا اور دہلی روانہ ہوگئے۔ یہ فوج کا عمل تھا۔ اب شہر والوں کی کارگذاری ملاحظہ فرمایئے:

مولانا عبدالجلیل شہیدؒ

خلف مولانا ریاض الدین صاحب (شارح قصیدہ بردہ) حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب دہلوی کے شاگردِ رشید جامع مسجد علی گڑھ کے امام تھے اور وہیں آپ کا حلقۂ درس بھی قائم تھا۔ نہایت متقی، پاکباز اور باخدا بزرگ۔ شہر کے آدمی آپ سے گہری عقیدت رکھتے تھے اور عوام کے رجحان سے متاثر ہوکر دنیا ساز انگریز بھی آپ سے ملاقات کرنے آتے تھے۔ مگر آپ ان کو بہت ہی کم ملاقات کی اجازت دیتے تھے، اور اگر یہ معلوم ہوجاتا کہ انگریز بہادر کے ساتھ اس کی میم بھی ہے، تو دُور ہی سے منع کرادیا کرتے تھے۔

آپ کے پوتے قاضی محمد سفیان صاحب قاضی شہر علی گڑھ کا بیان [۳۴] ہے کہ علی گڑھ انگریزوں سے خالی ہوا تو زمامِ قیادت آپ کے حوالہ کی گئی۔ تقریباً دو ماہ تک شہر کا نظم ونسق آپ نے سنبھالے رکھا۔ جولائی یا اگست میں انگریز تازہ دم فوجیں لے کر آگرہ کی جانب سے علی گڑھ پر حملہ آور ہوئے تو مولانا اپنے ساتھیوں کے ساتھ مقابلہ کے لیے سینہ سپر ہوگئے۔

منڈراک کی سڑک پر انگریزی فوجوں سے تصادم ہوا۔ مقابل تازہ دم، اور تمام سامان سے مسلح تھا۔ اس کی فوج باضابطہ قواعد داں تھی اور اس طرف جوشِ آزادی اور ولولۂ قربانی تھا جس نے آپ کو میدانِ جنگ میں ثابت قدم رکھا۔ یہاں تک کہ بہتر ۷۲ ساتھیوں کے ساتھ آپ نے اسی میدان میں جامِ شہادت نوش کیا۔ ان بہتر ۷۲ شہداء کو جامع مسجد میں لایا گیا اور یہیں دفن کیا گیا۔ مولانا عبدالجلیل شہید کو بھی ان شہداء کے بیچ میں دفن کیا گیا۔ ان تمام شہداء کے مزارات جامع مسجد کے شمالی دروازہ کے بالکل قریب ہیں۔ مولانا کی شہادت کے بعد انگریز خونخوار درندے کی طرح سارے شہر میں گھوم رہا تھا، جہاں کوئی مسلمان صورت ملا شہید کردیا گیا۔ موتی مسجد کے سامنے پھول چوراہہ پر اور چوراہہ عبدالکریم پر پھانسیاں لٹکادی گئیں تھیں جہاں کسی دشمنِ آزادی نے چغلی کھائی کہ یہ بھی شریکِ جہاد تھا، اس کو فوراً پھانسی دے دی جاتی تھی۔

مجاہدین کے بیوی بچوں کو تلاش کرکے چن چن کر تہِ تیغ کیا جارہا تھا۔ ہماری پردادی صاحبہ اس قیامت صغریٰ میں اپنے چار بچوں کو لے کر اُن کے منہ پر پوتا مٹی مل کر جنگل کی طرف نکل کھڑی ہوئیں اور علی گڑھ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں رسول پور میں ان چاروں بچوں کو چھپا کر رکھا۔ تقریباً تین سال تک انتہائی تکلیف کے اندر اس گاؤں میں جیسے تیسے ان بچوں کی پرورش کرتی رہیں۔ تین سال کے بعد جب گرفتاریاں بند ہوسکیں اور پوری طرح اطمینان ہوگیا، تب وہ اپنے بچوں کو یہاں لے کر آئیں۔ علی گڑھ آکر معلوم ہوا کہ مولانا عبدالجلیل شہید کے تمام مکانات اور جائداد کو کھدوا کر پھینک دیا گیا ہے۔ نہ رہنے کے لیے کوئی جگہ تھی اور نہ ٹھیرنے کے لیے کوئی ٹھکانہ۔ پھر اللہ نے رفتہ رفتہ اپنی مدد سے اُن کے ٹھیرنے کا اور گذارے کا انتظام کیا۔ مولانا اسمٰعیل صاحب مرحوم جو اُن کے خلف اکبر تھے، آہستہ آہستہ پروان چڑھے۔ اور انہوں نے وہ علم وکمال حاصل کیا، جس نے مولانا عبدالجلیل شہید کے علم اور نام کو دنیا میں روشن کردیا۔ اسی دوران میں مولانا قاسم صاحب نانوتوی کا علی گڑھ آنا اور مولانا اسمٰعیل صاحب کو تعلیم دینا، ایک ایسا کارنامہ ہے جس کو تاریخ فراموش نہیں کرسکتی۔

بلند شہر

کالے آم کا میدانِ جنگ۔ عبداللطیف خاں صاحب کا ایثار

بہت کم لوگوں کو یہ تاریخی واقعہ معلوم ہے کہ بلند شہر میں کالے آم (ضلع کی کچہریوں کے متصل) کے قریب ۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے ہندوستان کے حامیانِ آزادی کی ایک خونریز جنگ ہوئی تھی۔ اگرچہ انگریز اپنی فوجی طاقت اور تنظیم کے بہتر ہونے کے باعث اس میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن ہندوستانیوں نے ایسی سختی سے جم کر مقابلہ کیا کہ اس کی مثال یوپی کے دوسرے شہروں میں مشکل سے ملے گی۔ اس لڑائی میں شروع سے ہی انگریزوں کا پلہ بھاری تھا۔ یعنی ان کی فوج ہندوستانیوں سے زیادہ تھی اور سامانِ جنگ بھی افراط سے تھا۔ اس کے علاوہ دہلی اور میرٹھ سے اُن کو برابر امداد مل رہی تھی۔ اس کے برعکس ہندوستانیوں کی تعداد کم تھی اور اُن کے پاس ہتھیار بھی کم اور پرانی قسم کے تھے۔ پرانی توڑے دار بندوقیں، بھالے اور تلواریں، میدانی توپ ایک بھی نہ تھی، اور کمک اور رسد کا کوئی انتظام نہ تھا۔ لوگ آس پاس کے دیہات سے خود ہی آ کر دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ اس معرکہ کا اصل ہیرو مالا گڑھ کا نواب ولی داد خاں تھا۔ جس کا حال بعد میں بیان کیا جائے گا۔ کالے آم کی لڑائی میں خان پور، پنڈراول، اور ملک پور کے رئیسوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ولی داد خاں کو نقد وجنس کی صورت میں جس قدر مدد دے سکتے تھے، دی۔ ان مقامات کے سینکڑوں نوجوان آزادی کی لڑائی میں حصہ لینے کے لیے میدان میں آ گئے۔ نواب ولی داد خاں کو مدد دینے والوں میں عبداللطیف خاں رئیس خان پور کا نام اس لیے خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے کہ ان کی حیثیت اور مالی حالت دوسرے رئیسوں سے زیادہ تھی۔ وہ اپنی برادری میں ممتاز ترین فرد اور پٹھانوں کی بارہ بستیوں میں سردار سمجھے جاتے تھے۔ اُن کی ریاست تقریباً ڈیڑھ سو دیہات پر مشتمل تھی۔ عبداللطیف خاں ضلع بلند شہر کے قدیم جاگیرداروں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ اس لیے مغل بادشاہ اور اس کے حامیوں کو اُن سے توقعات بھی زیادہ تھیں۔ عبداللطیف خاں کبر سن رسیدہ ہونے کے باعث بذاتِ خود کالے آم کی لڑائی میں شریک نہ ہو سکے۔ لیکن ولی داد خاں کو بیش از بیش مدد دی۔ دہلی کے لال قلعہ سے بادشاہ کے جو حامی نکل آئے تھے اُن میں سے اکثر نے قلعہ خان پور میں پناہ لی۔ عبداللطیف خاں انگریزوں کو زرِ مالگذاری ادا کرنے سے پہلے ہی انکار کر چکے تھے۔ کالے آم کی لڑائی کے بعد اُن کا نام کھلے ہوئے دشمنوں کی فہرست میں درج کر لیا گیا۔ بلند شہر کے معرکہ میں شکست کھانے کے بعد ہندوستانی لشکر منتشر ہو گیا۔ انگریزوں کے عتاب کا نزلہ پہلے عبداللطیف خاں رئیس خان پور اور اس کے بعد حرمت خاں ساکن پنڈراول اور فیض احمد خاں رئیس ملک پور پر گرا۔ حرمت خاں اور فیض احمد خاں کو وکٹوریہ کے اعلان کے تحت معافی مل گئی۔ لیکن عبداللطیف خاں رئیس خان پور کی تمام جائداد اور قلعہ ضبط کر لیا گیا اور اُن کو عمر بھر کے لیے کالے پانی بھیج دیا گیا۔ (۳۴۳)

نواب ولی داد خاں اور اُن کے دو (۳۴۴) ساتھی

قلعہ مالا گڑھ کی بربادی اور گوجر قوم کی بے نظیر بہادری پھر تباہی

نواب ولی داد خاں بہادر مالا گڑھ ولد نواب بہادر خاں ولد حق داد خاں، شاہ عالم بادشاہ کے زمانہ میں علاقہ برن کے حاکم تھے۔ بلند شہر سے ۵ میل اُتر پچھم کی سمت کالی ندی کے کنارے پر قلعہ مالا گڑھ کے نام سے قلعہ تیار

کیا۔ نواب بہادر خاں اور مرہٹوں سے بار بار جنگ ہوئی اور کبھی بھی مرہٹوں کو برن کے علاقہ میں قدم رکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ نواب بہادر خاں صاحب کا انتقال ۱۸۱۴ء میں ہو گیا۔

نواب ولی داد خاں کو کمپنی ریاست کی آمدنی کے علاوہ ایک ہزار روپیہ ماہوار دیتی تھی۔ نواب ولی داد خاں کی ایک بھانجی بہادر شاہ کے ایک شہزادے سے منسوب تھی۔ میرٹھ کی انقلابی فوجوں نے نام کے بادشاہ کو کام کا بادشاہ بنایا تو نواب ولی داد خاں، بہادر شاہ کو مبارک باد دینے کے لیے دہلی تشریف لے گئے۔ ۲۶ رمئی ۱۸۵۷ء کو نواب ولی داد خاں، بہادر شاہ سے سند صوبہ داری دوآبہ لے کر چند سپاہیوں و تلنگوں وغیرہ کے ساتھ مالاگڑھ کی طرف روانہ ہو گئے۔ غازی آباد پہنچے۔ تحصیل دار و تھانہ دار نے حاضر ہو کر نذر گذاری اور حکومتِ دوآبہ کی مبارک باد دی۔ نواب صاحب نے غازی آباد کا انتظام مکمل کر کے کچھ سپاہی سڑک اور قصبہ کی حفاظت کے لیے متعین کر دیے۔ مہربان علی خاں و مظفر علی خاں امروہی کو ساتھ لیا اور قصبہ داوری میں آ کر قیام کیا اور کئی ہزار گوجر فوج میں بھرتی ہو گئے۔ تیسرے دن نواب صاحب اپنے قلعہ مالاگڑھ میں آ گئے اور ضروری انتظامات میں لگ گئے۔

دوسرے دن سائل پور کا نمبردار سو سواروں اور دو سو پیادوں کو لے کر خدمت میں حاضر ہوا۔ نمبردار کے صاحبزادے چاند خاں کو بغیر ثبوت کلکٹر بلند شہر نے پھانسی دے دی تھی۔ نمبردار صاحب انگریز کلکٹر سے اپنے بیٹے کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ کلکٹر کو معلوم ہوا کہ سائل پور کا نمبردار نواب ولی داد خان کے پاس گیا ہوا ہے کلکٹر نے حفاظت کے انتظامات شروع کر دیے۔ ادھر نواب ولی داد خاں نے اپنی صوبہ داری دوابہ کا اعلان کر دیا اور ہر طرف احکام جاری کر دیے اور محمد اسمٰعیل خاں کو پچاس سوار اور چالیس تلنگے اور ایک توپ دے کر قصبہ بلند شہر پر قبضہ کے لیے روانہ کر دیا۔ محمد اسمٰعیل خاں نے بلند شہر پر قبضہ کر لیا۔ کلکٹر بلند شہر، شہر چھوڑ کر بابوگڑھ چھاؤنی تحصیل ہاپوڑ ضلع میرٹھ چلا گیا اور بلند شہر کے علاقہ پر نواب ولی داد خاں کی حکومت قائم ہو گئی۔ اُن کے پرچم کے تلے غلام حیدر خاں و مہدی بخش خاں سہارن پوری و قاضی وزیر علی بلند شہری، عبداللطیف خاں رئیس خانپور، اسمٰعیل خاں و اعظم خاں و نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد و حاجی یار اللہ خاں انچانوی تھانیدار قصبہ گلاوٹھی و ایمن بدھان گوجر موضع اساورہ وغیرہ جمع ہو گئے۔ اکثر ضلع بلند شہر کے جاٹ انگریزوں کے طرف دار تھے اور موضع کورلی و بھٹونہ اور موضع بینوتی جاٹوں کے گڑھ بنے ہوئے تھے۔ نواب ولی داد صاحب نے محمد اسمٰعیل خاں صاحب کو بلند شہر سے بلا کر ایمن گوجر جس کے ساتھ ایک ہزار گوجر تھے۔ اُس کی ہمراہی میں موضع کورلی اور بھٹونہ کی طرف روانہ کیا۔ یہاں کے لوگوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، جو انگریزی ہتھیاروں سے لیس تھے۔ ایمن گوجر کے ساتھ ایک توپ بھی تھی۔ نواب صاحب کے ماموں، نواب صاحب کی تمام فوج کے گولہ بارود کے مختار کل تھے جو انگریزوں سے ساز باز کر چکے تھے اور نوابی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ آخر نواب صاحب کے ماموں نے غداری کی اور اسمٰعیل خاں اور ایمن گوجر کو شکست ہوئی۔ اسمٰعیل خاں زخمی ہو کر مالاگڑھ واپس لوٹ آئے۔ ایمن گوجر اساورہ چلا گیا اور جاٹوں سے نوک جھونک ہوتی رہی۔ نواب ولی داد خاں کے پاس دس ہزار سوار اور پندرہ ہزار پیادے اور ضرورت کے لائق ہر قسم کا سامان بھی موجود تھا اور ہر جگہ کے رؤسا سوار اور پیادے لے کر نواب

صاحب کی خدمت میں حاضر ہو رہے تھے۔ امیر علی خاں، امراؤ بہادر خاں ولد مظفر علی خاں چھ سو سواروں کو لے کر خدمت میں حاضر ہوا۔ نواب ولی داد خاں کی انگریزوں سے کافی عرصہ تک جنگ ہوتی رہی۔ ۱۴/ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ مسٹر ترنیل گورے اور دیسی سوار اور پیادہ لے کر بابوگڑھ چھاؤنی ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں جما ہوا تھا۔ نواب صاحب نے محمد اسمٰعیل خاں و حاجی منیر خاں کو تین ساڑھے تین سو سوار اور پانچ سو پیادے دے کر اور مزید فوج بھیجنے کا وعدہ کر کے کرنل ترنیل پر حملہ کرنے کے لیے ہاپوڑ کی طرف روانہ کر دیا۔ قصبہ گلاؤٹھی پہنچ کر محمد اسمٰعیل خاں و حاجی منیر خاں و حاجی یاد اللہ خاں اینچانوی (تھانیدار گلاؤٹھی) نے آپس میں طے کیا کہ صبح چار بجے مسٹر ترنیل کی فوج پر فقط سواروں کے رسالہ سے حملہ کیا جائے اور پیادوں کو قصبہ گلاؤٹھی میں رکھا جائے اور وقت ضرورت طلب کیا جائے۔

یہ سوار نواب صاحب کی فوج کے جانباز سوار تھے اور اس رسالہ کا نام لانڈے سواروں کا رسالہ تھا کیونکہ اس رسالہ کے تمام گھوڑوں کی دُم کے کچھ بال کٹے ہوئے رہتے تھے۔ رسالہ شام کے وقت قصبہ گلاؤٹھی سے روانہ ہو کر موضع مرشد پور کے پاس کالی ندی کے نالے (عرف چھوئیے) کے میدان میں ٹھہر گیا اور سوار آرام کرنے کے لیے گھوڑوں کی باگوں کے ہاتھ اور پیروں میں پھندے لگا کر سو گئے۔ کیونکہ صبح چار بجے مسٹر کرنل ترنیل کی فوج پر حملہ کرنا تھا۔ یہاں سے چار میل کے فاصلہ پر مسٹر ترنیل فوج لیے پڑا ہوا تھا۔ کسی غدار نے ترنیل کو خبر کر دی کہ نواب ولی داد خاں کا رسالہ آرام سے سویا ہوا ہے۔ کرنل ترنیل نے جو گھات میں ہی بیٹھا ہوا تھا۔ ایک بجے رات کو رسالہ پر حملہ کر دیا۔ نواب صاحب کا رسالہ غفلت میں سویا ہوا تھا اور گھوڑوں کی باگیں ہاتھ اور پیروں میں پڑی ہوئی تھیں۔ فائرنگ ہوتے ہی گھوڑے بدک کر بھاگنے لگے اور تمام سوار سموں سے کچلے گئے۔ جو اُٹھ کھڑے ہوئے وہ گولیوں کا نشانہ بنا دیے گئے۔ چند سوار جان بچا کر بھاگ سکے۔ اس شکست کے بعد نواب صاحب کی ہمت نہیں ٹوٹی مگر دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ دہلی فتح ہونے کے چند دن بعد ہی انگریزی فوجوں نے مالاگڑھ پر چاروں طرف سے دھاوا بول دیا۔ مقابلہ سخت رہا۔ آخر نواب صاحب کے ماموں کی غداری رنگ لائی اور شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ مالاگڑھ کا علاقہ انگریزوں نے ضبط کر کے مالاگڑھ کے قلعہ کو کھود کر مٹی کا ڈھیر کر دیا اور بلند شہر، دادری و نکور، خورجہ، خان پور کے اکثر لوگوں کو گرفتار کر کے دار پر چڑھایا۔ ہر روز بلند شہر میں کالے آم پر لوگوں کو پھانسی دی جاتی تھی اور لاشیں لٹکی رہنے دی جاتی تھیں۔ نواب ولی داد خاں و رئیس کھلیسا وغیرہ شکست کے بعد بریلی پہنچ گئے اور نواب خان بہادر خاں وغیرہ کے ساتھ مل کر روہیل کھنڈ میں انگریزوں سے اپریل ۱۸۵۸ء تک جنگ کرتے رہے۔ نواب خان بہادر خاں گرفتار ہو گئے، اور نواب ولی داد خاں کہاں روپوش ہوئے، کچھ پتہ نہیں چلا۔ سنا گیا ہے کہ تقریباً دس برس بعد نواب ولی داد خاں نے بنجاروں کا بھیس بدل کر قلعہ مالاگڑھ کے ڈھیر کے قریب قیام کیا اور قلعہ کا خزانہ کھود کر لے گئے۔ پھر پتہ نہیں چلا، کہاں روپوش ہو گئے۔ نواب صاحب کی نسل سے بھی کوئی شخص مالاگڑھ میں نہیں رہا ورنہ بعد میں گرفتار ہوا۔

نوٹ: یہ کالا آم جس پر پھانسیاں دی گئیں، چوراہے کے بیچ میں اب تک کھڑا ہے۔

ایمن پدھان گوجر رئیس اساور ضلع بلندشہر

ایمن پدھان، نواب ولی داد خاں رئیس مالاگڑھ ضلع بلندشہر کی فوج میں افسر تھا۔ کئی ہزار گوجر سوار اور پیادے توپ خانے کے ساتھ اس کے ہمرکاب رہتے تھے۔ بڑی شان کا آدمی تھا اور بڑا بہادر آدمی تھا۔ جدوجہد آزادی ۱۸۵۷ء میں نواب ولی داد خاں (مالاگڈھ) کی ہمدردی اور وطن کی آزادی کے لیے اپنی تمام قوم کو جنگِ آزادی میں جھونک دیا۔

اساور سدھارن پور، قصبہ دادری و قصبہ وتکور جمنا کے کھادر کے آس پاس کے تمام گوجر اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے تھے۔ نواب ولی داد خاں کو گوجر فوج پر بڑا بھروسہ تھا۔ ہر حملہ میں گوجر فوج پیش پیش رہتی تھی اور آخر وقت تک بڑی بہادری سے لڑتی رہی۔ سکندر آباد پر تین دفعہ حملہ کیا۔ کورلی، بھٹونہ پر حملہ کیا جہاں کئی ہزار انگریزوں کے طرف دار موجود تھے اور مالاگڑھ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے سدھارن پور کے راوودت قبیلہ کے چار گوجر لکس، ہرد یال، گردیال وغیرہ نے بہادری کی مثال قائم کر دی۔ موضع بینوئی میں کئی ہزار جاٹ جمع تھے اور نواب صاحب کے نومفتوحہ علاقہ پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ چاروں بھائیوں نے موضع بینوئی پر حملہ کر کے ہجوم کثیر کو منتشر کیا۔ لکس کی پیشانی میں بلم لگا۔ مارنے والا کھینچ نہ سکا۔ دو میل دوڑ آ کر لکس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بلم کو پکڑ کر کھینچ لیا۔ سنا گیا ہے کہ چاروں بھائیوں کے ہتھیار کام نہیں دے رہے تھے۔ چاروں بھائی ہتھیار پھینک کر آدمیوں کو آدمیوں سے ٹکرا کر مار دیتے تھے اور تہلکہ مچائے ہوئے تھے۔ اسی مناسبت سے یہ مثال قائم ہو گئی کہ اگر کسی سے کوئی کام نہیں ہو سکتا تو کہا جاتا ہے کہ راوتوں کا سالو ہا ٹوٹ گیا۔ مگر ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ گوجر فوج میں نظم و نسق کی کمی تھی لوٹ مار پر جلد راغب ہو جاتے تھے۔ آخر کار نواب ولی داد خاں کو شکست ہوئی۔ ایمن پدھان و تمام گوجر قوم پر انگریزوں کا عتاب نازل ہوا۔ گوجر قوم کے گاؤں کے گاؤں جلا دیے گئے۔ جائدادیں نیلام کر دی گئیں اور کوشش کی گئی کہ اس پوری قوم کو من حیث القوم نیست و نابود کر دیا جائے۔ باقی رہے نام اللہ کا۔ انگریز ہندوستان سے نکل گیا۔ یہ قوم اب بھی باقی ہے مگر حالت آج تک بہتر نہیں ہوسکی۔

حاجی یاد اللہ خاں موضع اینچانہ ضلع بلندشہر

حاجی یاد اللہ خاں اینچانوی قصبہ گلاؤٹھی ضلع بلندشہر میں کمپنی سرکار کی طرف سے علاقہ قصبہ گلاؤٹھی کے تھانیدار تھے۔ بڑے رعب داب کے آدمی تھے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں نواب ولی داد خاں نے اپنی صوبیداری دوآبہ کا اعلان کر دیا۔

ایمن پدھان گوجر حاجی یاد اللہ خان کا دوست تھا۔ دونوں میں بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ ایمن پدھان کے اشارہ سے حاجی یاد اللہ خاں نے قصبہ گلاؤٹھی کا تمام علاقہ نواب ولی داد خاں کے سپرد کر دیا۔ نواب صاحب نے انعام و اکرام دے کر عزت افزائی کی اور اختیارات میں ترقی کر دی۔ حاجی صاحب نے بڑی خوبی کے ساتھ آخر وقت تک علاقہ کا نظم و نسق قائم رکھا اور کئی معرکوں میں پیش پیش رہے۔ قلعہ مالاگڑھ کی شکست کے بعد گرفتار ہوئے۔ زمین جائداد سب ضبط ہوئی اور نیلام کر دی گئی۔ بڑی کوشش سفارشوں سے جان بخشی ہو گئی۔

روہیل کھنڈ

بریلی ۔ بدیواں ۔ مرادآباد ۔ بجنور ۔ شاہجہانپور

گورنر روہیل کھنڈ نواب خان بہادر خاں شہید (بریلی)(۳۴۳)

نواب خان بہادر خاں حافظ الملک حافظ رحمت خاں والیٔ روہیل کھنڈ کے پوتے تھے۔ اُن کے والد کا نام نواب ذوالفقار خاں تھا جو بریلی کے گورنر رہ چکے تھے۔ جن کے نام پر بازار ذوالفقار گنج شہادت کے پاس اب تک بریلی میں موجود ہے۔ شعر و سخن میں کمال رکھتے تھے۔ معروف تخلص، جرأت کے شاگرد تھے۔ آپ کا ایک دیوان بھی تھا۔ مقاصد الصالحین آپ کی تصنیف ہے۔ دورِ انگریزی میں نواب خان بہادر خاں صدر امین کے عہدے پر تعینات تھے۔ تاریخ گلزاری لال قلمی کے مصنف نے ۱۸۴۷ء میں خان بہادر خاں کی تنخواہ ۲۵۵ روپیہ تحریر کی ہے۔ ہندوستانیوں کو اتنا بڑا عہدہ شاذ و نادر ہی دیا جاتا تھا۔ ذاتی اعزاز و اکرام خاندانی پنشن اور آرام و سکون کی زندگی حاصل ہونے کے باوجود خان بہادر خاں انگریزوں کی جابرانہ پالیسی، اُن کے ظلم و ستم اور ناانصافی سے سخت نالاں تھے۔ اتفاقاً بریلی چھاؤنی میں ایک اور انقلابی شخصیت جنرل بخت خاں روہیلہ کی موجودگی تھی جو انگریزی توپ خانہ کا ایک نہایت قابل اور محبِ وطن افسر تھا۔ جنرل بخت خاں نے بغاوت کی تنظیم (۳۴۴) اپنے دوست مدار علی خاں وغیرہ کے مشورہ اور اعانت سے کی، اور ۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء بروز اتوار یہ لاوا پھوٹ نکلا جس کی توقع کی جا رہی تھی۔ چنانچہ بعض ہوشیار انگریزوں نے اپنے اہل و عیال کو احتیاطاً نینی تال روانہ بھی کر دیا تھا۔ تاریخ سلیمانی قلمی میں مرقوم ہے کہ بلوہ ہونے سے قبل مسٹر الیگزینڈر کمشنر روہیل کھنڈ نے نواب بہادر خاں سے کہا کہ امروز فردا میں بلوہ ہونے والا ہے، چونکہ یہ ملک آپ کا موروثی ہے، اس کا بندوبست کیجئے۔ نواب نے تو اس وقت انکار کر دیا لیکن بعد کو جب جنرل بخت خاں روہیلہ معززین شہر اور فوج کے سربراہوں کے ہمراہ نواب کی خدمت میں تخت نشینی کا معروضہ پیش کرنے گئے تو کچھ پس و پیش کے بعد عنانِ حکومت سنبھالنے کا فیصلہ کر لیا۔ مسند نشینی کی رسم پرانی کوتوالی کے سامنے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ انجام دی گئی۔ مسند نشینی کے واسطے خان بہادر خان اپنی قیام گاہ واقع محلہ بھوڑ سے (آج کل یہ کوٹھی کھیڑہ خان بہادر کہلاتی ہے) موجودہ نینی تال روڈ سے گذرتے ہوئے پرانی کوتوالی آئے تھے۔ ایک چشم دید گواہ نے میرے عم بزرگوار اور مولوی سید الطاف علی صاحب بریلوی سے بیان کیا کہ چونکہ اتنے بڑے مجمع کو اعلیٰ درجہ کی سواریوں میں لے جانا ممکن نہیں تھا، اس لیے نواب نے پیدل چلنا پسند کیا۔ نواب آگے آگے چل رہے تھے۔ سرخ و سپید چہرہ بڑی بڑی آنکھیں، بلند و بالا قد، سفید لمبی داڑھی، دائیں بائیں جنرل بخت خاں روہیلہ، دیوان سوبھا رام، مدار علی خاں، اور دیگر معززین صف بہ

صف مسلح چل رہے تھے۔ خان بہادر خاں نے حکومت سنبھالتے ہی ایک وار کونسل قائم کی۔ اندرونی معاملات دیوان سوبھا رام کے سپرد کیے۔ سوبھا رام بڑی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ سادات نومحلہ (جن کے محلات موجودہ مسجد نومحلہ سے لے کر ڈاک خانہ موجودہ تک پھیلے ہوئے تھے)۔ اور سید معصوم پیرزادہ (جو حافظ رحمت خاں والیٔ روہیل کھنڈ کے پیر کی اولاد میں سے تھے) کسی بات پر دیوان سوبھا رام سے ناراض ہو گئے لیکن خان بہادر خاں نے اپنے بزرگوں کے پیر کے گھرانے تک کی رائے کو رد کر کے دیوان کو بحال رکھا۔ مالیہ وصول کرنے کے واسطے خان بہادر خان نے باقاعدہ تحصیل دار مقرر کیے اور شدید مشکلات کے باوجود چند روز کی جدوجہد میں پورے روہیل کھنڈ میں نمونہ کا امن وانتظام قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت جب کہ ہر طرف آگ برس رہی تھی، روہیل کھنڈ دارالامن بنا ہوا تھا۔ (۳۳۵) خان بہادر خان کو خوش قسمتی سے اپنے ابتدائی ایام میں مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کا بھی کامل اعتماد حاصل ہو گیا تھا۔ ٹھاکر جیمل سنگھ، رگھناتھ سنگھ آف بدھیلی اور ٹھاکران شیوگڑھ وغیرہ یا سادات نے کامل اتحاد عمل سے کام لیا۔ رگھناتھ سنگھ کو خان بہادر خاں نے راجہ کا خطاب دیا، اور پرگنہ فرید پور کا انچارج بنا دیا۔ ٹھاکر جیمل سنگھ کو کلکٹر کا عہدہ دیا گیا اور ایک ہزار روپیہ ان کی تنخواہ مقرر کر دی گئی۔ نواب نے تقریباً ۳۰ ہزار فوج جمع کی۔ ۴۰ توپیں مہیا کیں۔ اس فوج پر تقریباً ۲ لاکھ ۱۵ ہزار روپیہ ماہوار خرچ کیا جاتا تھا۔ نواب نے ٹکسال قائم کی۔ خان بہادر خاں کی مہر پر یہ الفاظ کندہ تھے۔ الحکم للہ والملک للہ۔

فرمانِ شاہی

نواب نے جنرل بخت خاں روہیلہ کو دہلی روانہ کیا۔ وہاں جنرل کا بڑا اعزاز کیا گیا۔ بہادر شاہ ظفر نے جنرل کو "لارڈ گورنر" کا خطاب دیا اور کل افواج شاہی کی کمان سپرد کر دی۔ یہ بہادر جنرل آخر وقت تک دادِ شجاعت دیتا ہوا مفقود الخبر ہو گیا۔

۲۱ رجون ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر شاہ دہلی نے نواب خان بہادر خاں کو اپنا نائب مقرر کیا اور خلعت سرفرازی و خطاب نواب انتظام الدولہ محافظ الملک خان بہادر خاں تہور جنگ رئیس اعظم روہیل کھنڈ عطا کیا گیا۔ مراد آباد، بدایوں، شاہ جہاں پور اور بجنور میں خان بہادر خاں کی حکومت تسلیم کر لی گئی۔ نواب مجو خاں مراد آباد میں، نواب کلن نبیرہ بخشی سردار خاں آنولہ میں، نواب غلام قادر خاں شاہ جہان پور میں اور نواب محمود علی خاں بجنور میں نیابت کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ مراد آباد میں عباس علی خاں (نبیرہ نواب دوندے خاں والی مراد آباد) بھی امیدوار نظامت تھے۔ اس لیے آپس میں سخت رسہ کشی شروع ہو گئی۔ خان بہادر خاں نے انگریزوں کے خلاف متعدد محاذ قائم کرنے کی غرض سے جنگ آزادی کے بیشتر رہنماؤں مثلاً نانا راؤ، سید احمد اللہ شاہ ولادر جنگ، فیروز شاہ، نواب تفضل حسین خاں والی فرخ آباد وغیرہم سے برابر خط و کتابت رکھی، اور دامے، درمے، قدمے معاون رہے۔

نینی تال پر چڑھائی

دہلی سے باضابطہ اجازت ملنے و تیز ابتدائی ملکی و مالی انتظام کرنے کے بعد خان بہادر خاں کی توجہ اصل دشمن کی طرف ہوئی جو نینی تال میں موقع کی تاک میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ذرا سا سکون پاتے ہی انگریز روہیل کھنڈ پر حملہ آور ہوں گے۔ چنانچہ انہوں نے بجے میر خاں اپنے پوتے کی سرکردگی میں ایک زبردست فوج روانہ کی۔ لیکن یہ فوج بھیڑی سے آگے نہ بڑھی۔ ۲۰ راکتوبر ۱۸۵۷ء میں علی خاں میواتی کے تحت ایک تازہ دم فوج بریلی سے روانہ ہوئی۔ یہ فوج یلغار کرتی اور ترائی کے جنگلات سے گزرتی ہوئی دامن کوہ میں کاٹھ گودام تک پہنچ گئی لیکن اس دوران میں ملکی غداروں کی مدد سے دیسی فوج کی نقل و حرکت کی مکمل اطلاع انگریزوں کو پہنچ گئی۔ چنانچہ اعلیٰ درجہ کی خبر رسانی، عمدہ توپ خانہ اور پہاڑی پوزیشن کی وجہ سے انگریزوں کو عارضی فتح حاصل ہوگئی۔ بریلی گزیٹر کے مصنف نے اس واقعہ کے سلسلہ میں حقیقی غداری کا اقبال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس جنگ کا نتیجہ دیکھ کر خان بہادر خاں انگریزی لکھنے اور پڑھنے والوں کو گرفتار کرنے پر مجبور ہوگئے۔ کیونکہ ان کو بجا طور پر شبہ تھا کہ کچھ لوگ نینی تال سے نامہ و پیام رکھتے ہیں۔ پانچویں کالم کی روک تھام کرنے کے بعد ایک نئی فوج چیدہ چیدہ نوجوانوں پر مشتمل حیدر خاں و فضل حق خاں کی کمان میں کاٹھ گودام گئی اور کمال دلیری اور بہادری کے ساتھ رات کی تاریکی میں نینی تال پہنچنے کے واسطے پہاڑی علاقہ طے کرنے لگی۔ ایک خطرناک موڑ پر انگریز سپاہ سے بڑے گھمسان کی جنگ ہوئی۔ ایک بہادر افسر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ لال ڈانگی پہنچ گیا لیکن شیرازہ منتشر ہوجانے کی وجہ سے یہ مہم بھی ناکام رہی۔ فروری ۱۸۵۸ء میں خان بہادر خاں نے آخری زبردست کوشش نینی تال فتح کرنے کی کی اور فضل الحق و کالے خاں اور محمود خاں کو مستقلاً اس مورچہ پر تعینات کر دیا۔ ان لوگوں نے اس قدر جانبازی سے کام کیا کہ انگریز میدان میں اُترنے کی ہمت نہ کر سکے، باوجود یہ کہ گورکھوں کی پوری پوری مدد ان کو حاصل ہو چکی تھی۔

اگست ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کو نینی تال غیر محفوظ مقام معلوم ہونے لگا، اور اُنہوں نے اپنے بال بچوں کو الموڑہ بھیج دیا۔ (بریلی گزیٹر)۔ مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی نے اس وقت کی روہیل کھنڈ کی بغاوت کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جن ضلعوں میں بغاوت ہوئی وہ روہیل کھنڈ کی بغاوت کے آگے خفیف تھی۔ اس وقت بریلی شہر میں غضب کا جوش و خروش تھا۔ ظہیر دہلوی داستان غدر میں تحریر فرماتے ہیں: "بریلی میں ہر طرف کے مفرورین کا اجتماع ہے اور سب سردار مثلاً نانا راؤ، فیروز شاہ وغیرہم جمع ہیں۔ رام پور کے تیس ہزار آدمی بریلی میں ملازم ہیں اور مرد رام پور کا یہ حال ہے کہ ایک ایک تھان دوپٹہ کا سر سے بندھا ہوا اور آدھا آدھا گھوڑے کے رکاب سے لٹکتا ہوا ہے۔ چار چار طمنچے کمر میں لگے ہوئے ہیں، دوہری تلواروں میں ڈاب رکھی ہوئی ہے، گھوڑوں پر سوار ہیں اور شہر میں گھوڑے کداتے پھرتے ہیں، پچاس ہزار کا اجتماع بریلی میں موجود ہے۔ یہ وقت خان بہادر خاں کے عروج کا تھا۔

ریاست رام پور کی مخالفت

نواب یوسف علی خاں والیٔ ریاست رام پور انگریزوں کے بڑے خیر خواہ تھے اور ایجنٹ تھے، مراد آباد پر زبردست فوج لے کر چڑھ دوڑے۔ نواب رام پور کے خاندان کو حافظ رحمت خاں کے خاندان سے پرانی کاوش تھی۔ وہ جانتے تھے کہ حافظ رحمت خاں کے خاندان کے معزز فرد "خان بہادر خان" کے سامنے اُن کا چراغ جل نہیں سکے گا۔ علاوہ ازیں انگریزوں کی غلامی رگ رگ میں سماچکی تھی۔ جب انگریز نینی تال بھاگ گئے تو نواب یوسف علی خاں نے اُن سے روہیل کھنڈ پر قبضہ کرنے کی اجازت طلب کی۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

مصنف اخبار الصنادید اس واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ نواب نے نینی تال لکھا: "یہ موقع بہت مناسب ہے اگر آپ منظور کریں تو ہم روہیل کھنڈ میں حکومت رکھیں" (انگریزوں کی طرف سے) کیونکہ جب تقویت کامل ہو جائے گی، (خان بہادر خان کی) تو پھر اجرائے حکومت میں مدتوں مشکلیں ہوں گی اور ریاست (رام پور) کو خطروں میں مبتلا ہونا پڑے گا۔

انگریز پورے یہودی ٹھہرے، ایسے نازک وقت میں اپنے یار وفادار پر بھی پورا بھروسہ نہ کر سکے اور ۱۳ رجون ۱۸۵۷ء کو پیغام دیا کہ آپ صرف ضلع مراد آباد پر حکومت کر سکتے ہیں۔ نواب یوسف علی خاں کا مراد آباد پر عارضی قبضہ ہو گیا تھا لیکن نواب مجو نے نوابی فوج کو شکست دے کر دوبارہ حکومت قائم کر لی (اخبار الصنادید میں بڑی تفصیل کے ساتھ نواب یوسف علی خاں کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے) خود رام پور کے عام ریاستی فوجیوں کی یہ حالت تھی کہ یہ علی الاعلان کہتے تھے کہ "ہم اب خان بہادر خاں کی نوکری کریں گے۔"

نواب کی طرف سے نینی تال کو بہت بڑی مقدار میں سامانِ رسد اور نقد روپیہ علی بخش خاں کی معرفت بھیجا جاتا تھا۔ خدا کی عجیب قدرت نظر آتی ہے کہ انہی علی بخش خاں کے پوتوں (مولانا محمد علی و شوکت علی مرحوم) نے آزادیٔ ہند کے واسطے عظیم الشان جدوجہد کی۔

جنرل بخت خاں کا رام پور دھاوا

دربار رام پور کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے باخبر ہو کر جنرل بخت خاں ایک مضبوط فوجی دستہ لے کر رام پور حملہ آور ہوئے۔ ساتھ ہی ساتھ خان بہادر خان نے اعلان کیا کہ شمس تاج دار بیگم بنت سید احمد علی خاں ریاست کی جائز حکمران ہیں۔ ان کو ریاست کا حکمران بنایا جائے گا۔

رام پور کے خاندانی جھگڑوں میں حکومت ایک ہی خاندان کے دوسرے فریق کو منتقل ہو گئی تھی اور جائز حکمران محروم تھے۔ نواب یوسف علی خاں نے جنرل بخت خاں کا مقابلہ نہیں کیا۔ جنرل نے شہر و قلعہ کی مضبوط ناکہ بندی کرنے کے بعد نواب کے سامنے بہت سخت شرائط رکھیں:

۱: ولی عہد ریاست جنرل کے ساتھ بمعہ فوج دہلی انگریزوں کے خلاف لڑنے چلیں گے۔
۲: ریاست رام پور حکومت روہیل کھنڈ کو وافر مالی امداد دے گی۔

حافظ احمد علی خاں شوق (مولانا محمد علی مرحوم کے چچا زاد بھائی) جنرل بخت خاں کے حملہ کا حال لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ''۹ رجون ۱۸۵۷ء کو بخت خاں کئی ہزار فوج کے ساتھ رام پور آیا۔ مولوی سرفراز علی اس کی طرف سے سفیر تھے۔ تمام شہر کو مورچہ بند کیا۔ شہر کے مفسد خود جا کر بخت خاں کو بھڑکاتے تھے۔ ان کا منشا تھا کہ روپیہ دیا جائے اور ولی عہد بہادر ریاست مع فوج کے دہلی کو ساتھ چلیں۔ یہ مرحلہ سب سے زیادہ سخت تھا۔ علی بخش خاں نے اس مرحلہ کو بلطائف الحیل طے کیا اور ۱۳ رجون کو بخت خاں رام پور سے چلا گیا۔ نواب نے از راہِ چاپلوسی جان بچانے کی خاطر جنرل بخت کو خوب رسد بھجوائی، اور مبالغہ کی حد تک مولوی سرفراز علی کی عزت افزائی کی اور اس طرح اپنے آپ کو بچا لیا۔''

لیکن جنرل بخت خاں نے رام پور کی ریاست کو ختم کرنے کی بجائے صلح کر لی۔ یہ اُن کی سیاسی غلطی تھی جس کے نتائج بعد کو ظاہر ہوئے۔

نواب یوسف علی خاں اپنی جملہ کارروائیوں کی اطلاع علی بخش کے ذریعہ انگریزوں کو بھیجتے تھے اور اُن کے جاسوس روہیل کھنڈی مجاہدوں کی فوج میں افراتفری پھیلاتے و نیز نقل و حرکت کی اطلاعات بہم پہنچاتے کا کام کرتے تھے۔ اخبار الصنادید کے مصنف نے ایک واقعہ لکھا ہے جس سے دیسی فوج کی چابکدستی کا اندازہ ہوتا ہے:

> ''ایک بار علی بخش خاں دس بارہ گاڑیاں رسد کی لے کر گئے۔ شفاخانہ (باز پور) میں صاحب کمشنر کے گارڈ کے سپرد کر کے چلے گئے۔ جب گارڈ اسباب لے کر شفاخانہ سے بڑھا تو ناگہاں خان بہادر خان کی فوج نے آ لیا اور تمام اسباب لوٹ کر لے گئی۔''

حالات کی تبدیلی، خان بہادر خاں کی شکست

خان بہادر خاں کو رام پور کی غداری، روپیہ کی کمی، اور آپس کے نفاق کی وجہ سے ہر فوجی مہم میں ناکامی ہو رہی تھی۔ مگر وہ ہمت ہارنے والے آدمی نہیں تھے۔ لیکن جب دہلی اور لکھنؤ کے زبردست مورچے انگریزوں کے قبضہ میں پہنچ گئے اور روہیل کھنڈ انگریزوں کی اُبھرتی ہوئی قوت کے مقابلہ میں واحد علاقہ رہ گیا تو نینی تال کے انگریز بھی امدادی فوجیں آ جانے پر دلیرانہ ٹوٹ پڑے۔ یہاں حوصلے پست ہو چکے تھے، تاہم خان بہادر خاں نے شاہزادہ فیروز شاہ، بندے میر خاں، ولی داد خاں وغیرہم کی سرکردگی میں شہر سے ۵ میل باہر نکلیا ندی کے کنارے مورچہ قائم کیا اور بذاتِ خود مورچہ سنبھالا۔ صبح صادق سے بہت بڑے علاقہ میں دست بدست اور توپ تفنگ کی جنگ ہوتی رہی۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ شہزادہ فیروز شاہ، ولی داد خاں، بندے میر خاں، اسمٰعیل خاں وغیرہم نے حق مردانگی ادا کر دیا۔ خان بہادر خاں کی فوج میں ۱۳۳ مجاہد بھی تھے جو بلا مبالغہ سر سے کفن

باندھ کر نکلے تھے۔ ان مجاہدین کی ایک تصویر ایک انگریز کے قلم سے جو گورا پلٹن ۹۳ میں سارجنٹ میجر تھا، قابلِ ملاحظہ ہے۔ کتاب کا نام ۱۸۵۷ء کے معرکوں کی یادداشت ہے۔ سارجنٹ میجر لکھتا ہے:

''خان بہادر خاں کی فوج میں غازیوں کی ایک جماعت بھی تھی جو بلاشبہ سر سے کفن باندھ کر جان دینے اور جان لینے کے ارادہ سے آئی تھی۔ یہ مسلمان شوقِ شہادت کے نشے میں چور تھے۔ ان کی داڑھیاں سفید تھیں۔ انگلی میں چاندی کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھے جس کے نگینہ پر اللہ کندہ تھا۔ ہر غازی کی کمر میں سبز رنگ کا پٹکا بندھا ہوا تھا۔ وہ روئی کی صدری پہنے ہوئے اور سر پر سفید پگڑیاں باندھے ہوئے تھے۔ جن پر سرخی کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں تلوار تھی اور پشت پر ڈھال۔ دین کا نعرہ لگا کر ہمارے سامنے آئے اور حملہ آور ہونے سے پہلے اُن کا سردار جو ایک بیس سال کا بے ریش و بروت نوجوان تھا جس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا، صف سے آگے بڑھ کر ہم سے یوں مخاطب ہوا۔ کیا تم کافروں میں کوئی حوصلہ مند ہے جو میرا مقابلہ کر سکے؟ اگر ہے تو سامنے آئے۔ اُس کی آواز پر ہماری صفوں میں سناٹا چھا گیا۔ کوئی نوجوان آگے نہیں بڑھا۔ ایک منٹ بعد پھر یہی چیلنج دیا اور کہا میں پانچ آدمیوں سے تنہا مقابلہ کر سکتا ہوں لیکن پھر بھی کوئی حرکت نہ ہوئی۔ آخر جھنجھلا کر اُس نے تلوار میان سے نکالی اور ہماری صفوں پر حملہ آور ہوا۔ اُس نے اس شدت سے حملہ کیا کہ چشم زدن میں اٹھارہ سپاہیوں کو زخمی کر کے ڈال دیا۔ اس کی بے نظیر شجاعت سے کمانڈنگ آفیسر اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے حکم دیا کہ اس نوجوان کو زندہ گرفتار کیا جائے۔ لیکن اُس نے کہا کہ تم زندہ شیر کو گرفتار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ زخمی ہو جانے کے باوجود جبکہ اُس کے جسم کے ہر عضو سے خون کے فوارے اُبل رہے تھے۔ اُس نے دوبارہ اسی شدت کے ساتھ حملہ کیا۔ جب کمانڈنگ آفیسر نے یہ دیکھا کہ اگر اس کو قتل نہ کیا گیا تو شاید ساری کمپنی (سو آدمیوں کی ایک کمپنی) کا صفایا کر دے۔ تو مجبوراً اُس نے حکم دیا کہ سنگینوں سے خاتمہ کر دو۔ یہ سن کر سپاہیوں نے اُسے نرغہ میں لے کر اپنی سنگینیں بیک وقت اُس کے سینہ میں پیوست کر دیں لیکن جب تک اُس کی روح جسم میں باقی رہی، وہ برابر تلوار کے جوہر دکھاتا رہا۔ اُس کا ہاتھ اُس وقت ساکن ہوا جب اُس کی روح پرواز کر گئی۔'' (۳۳۶)

خود انگریزی فوج کا کمانڈر ''سرکولن'' بھی ایک غازی کے ہاتھوں واصلِ جہنم ہوتے ہوتے رہ گیا۔ سرکولن گھوڑے پر سوار ایک کمپنی سے دوسری کمپنی میں جا رہا تھا کہ ایک غازی پر اُس کی نظر پڑی۔ زخموں سے چور، مردہ شکل گھوڑے کی ٹانگوں کے پاس تھا کہ دفعۃً کودا اور سرکولن پر تلوار سے حملہ کرنے لگا۔ اگر سرکولن کا محافظ سکھ فوراً تلوار سے غازی کی گردن نہ اُڑا دیتا تو نیم بسمل غازی نے سرکولن کا کام تمام کر دیا تھا۔

آخری لڑائی شہر سے متصل موجودہ کنٹونمنٹ کے قریب ہوئی۔ اس مرحلے پر مسلسل لڑتے لڑتے تھک

جانے والے فوجیوں کو امداد پہنچانے کی غرض سے کچھ نئے بھرتی شدہ فوجی بھیجے گئے۔ وہ جنگ کی گرما گرمی برداشت نہ کر سکے اور بھاگ نکلے۔ خان بہادر خاں نے ان کا کورٹ مارشل کیا اور سزائیں دے کر دوبارہ میدانِ جنگ میں بھیجا لیکن بزدلوں نے بہادروں کو بھی ڈرپوک بنا کر سارا کھیل بگاڑ دیا اور نواب کی فوجوں کو شکست ہوگئی۔ ۵ رمئی ۱۸۵۷ء کی شب باشندگانِ بریلی کے واسطے بڑی قیامت کی رات تھی۔ سارا شہر بھاگ رہا تھا۔ افراتفری کا عالم تھا۔ جان، مال، آبرو غرض کوئی چیز محفوظ نہیں تھی۔ خان بہادر خاں نے سخت پریشانی کے عالم میں گوریلا جنگ جاری رکھنے کا پروگرام بنایا اور راتوں رات ترائی کے جنگلات میں نکل گئے۔ ادھر انگریزی فوج اس وجہ سے شہر میں داخل نہیں ہوئی کہ اس کو گلی گلی لڑائی ہونے و اتلافِ جان کا خطرہ تھا۔ جب دوسرے دن انگریزی فوج شہر میں داخل ہوئی تو اکثر محلے کے محلے ویران تھے۔ جو مرد و زن باقی رہ گئے تھے وہ موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔ مکانات کو آگ لگادی گئی۔

انجام (۳۴۷)

۱۸۵۹ء تک نواب خان بہادر خاں انگریزوں سے گوریلا جنگ لڑتے رہے۔ ایک دفعہ دست بدست جنگ کرتے ہوئے گھوڑے سے گر پڑے۔ ابھی اُٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار کر لیے گئے اور لکھنؤ لے جا کر انگریزوں کے سپرد کر دیئے گئے۔ وہاں سے بریلی لائے گئے۔ جب چیف کمشنر کی عدالت میں پیش کیے گئے تو زمین پر بیٹھ گئے، اور کہا دتوں کرسیوں پر بیٹھے، اب قیدیوں کی جگہ بیٹھنا ہے لیکن چیف کمشنر نہیں مانا اور بغلوں میں ہاتھ ڈلوا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ جب مقدمہ شروع ہوا تو خان بہادر خاں نے بڑی دلیری اور مردانگی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک برجستہ تقریر کی اور کہا: ''چونکہ کل روہیل کھنڈ ہمارا ملک موروثی تھا، اس وجہ سے بخت خاں اور جملہ رعایا نے مجتمع ہو کر مجھ کو مسند نشین کیا۔ جس وقت آپ صاحبان نے فوج کے ظلم سے مجبور ہو کر ملک چھوڑ دیا، تب میں نے اپنا قبضہ کیا۔ باقی رہی بلوائیوں کی روک تھام، تو یہ میرے اختیار میں نہ تھی۔ انہوں نے جو چاہا کیا۔ بعد ازاں جابجا سرِ میدان لڑائیاں میری اور آپ کی فوج سے البتہ ہوئیں۔ ان میں طرفین کا کشت و خون ہوا۔ اس میں میری کیا خطا۔

عروسِ ملک کے در کنار گیرد تنگ ۔۔۔ کہ بوسہ بر لبِ شمشیر آب دار زند

اب آپ کے بس میں ہے جو چاہے حکم دیجیے۔ چنانچہ اوائل ۱۸۶۰ء میں پرانی کوتوالی کے سامنے نواب خان بہادر خاں کو پھانسی دے دی گئی۔ (۳۴۸)

حیات حافظ رحمت خاں میں سید الطاف علی بریلوی لکھتے ہیں:

''پھانسی کے بعد لاش بریلی ڈسٹرکٹ جیل میں دفن کر دی گئی۔ ایک خاندانی بزرگ جو دفن کے وقت موجود تھے۔ خان بہادر خاں کی لاش کو بغیر کفن قبر میں رکھتے ہوئے دیکھ کر اُن کے چہرہ پر اپنا رومال

ڈال دیا۔ قیصر التواریخ میں ۳۹۶ پر درج ہے کہ ورثاءِ نواب نے نعش طلب کی۔ جواب دیا گیا۔ تم اسے شہید بنا کر قبر پر میلہ کرو گے کہ ہماری تکلیف کا باعث ہوگا۔ بعد اس کے قعمہ میں تڑوا دیا۔ بعض تشنہ روایتیں یہ ہیں کہ خان بہادر خاں کی لاش ڈسٹرکٹ جیل بریلی کے دوسرے اور تیسرے پھاٹک کے درمیانی حصہ میں از راہ تحقیر دفن ہے۔ چونکہ شورش کا سخت اندیشہ تھا، اس لیے انگریزی فوج اور توپ خانہ سے شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔

بدایوں[۳۴۹] اور اس کی تاریخی عظمت

شمالی ہند کے دور اول کی فتوحات میں بدایوں[۳۵۰] ہے۔ یہ دور قطبی وشمسی میں قبۃ الاسلام کے نام سے مشہور رہا۔ اسلامی عہد کا پہلا ناظم بدایوں کا قطب الدین ایبک[۳۵۱] تھا۔ دوسرا شمس الدین التمش (۶۰۰ھ لغایت ۶۰۷ھ)۔ سید علاء الدین (۸۴۷ھ لغایت ۸۷۹ھ) شاہ دہلی نے ۸۵۲ھ (۱۴۴۸ء) میں دہلی کو خیرباد کہہ کر بدایوں کو پایۂ تخت بنایا اور وہیں دفن ہوا۔ سلطان محمود غزنوی نے ۴۰۹ھ (۱۰۱۷ء) میں جب قنوج پر حملہ کیا اور دریائے گنگا کے کنارے خیمہ زن ہوا، وہ جگہ ریاست[۳۵۲] بدایوں کی تھی۔ اس وقت دھرم پال وہاں کا راجہ تھا، اور کان سین[۳۵۳] وزیر تھا جو نہایت فرزانہ اور ہوشیار تھا از راہ دور اندیشی وہ سلطان کی خدمت میں گراں بہا تحائف و ہدایا لے کر حاضر ہوا۔[۳۵۴]

سلطان نے نذر قبول کر کے وزیر مذکور کو خلعت سے سرفراز کیا اور راجہ کے لیے تحائف دیے۔

ہندوؤں کے عہدِ حکومت میں شہر بدایوں کی آبادی سات[۳۵۵] لاکھ اکیاسی ہزار تھی۔ سلطان محمد تغلق کے زمانہ حکومت[۳۵۶] ۷۲۹ھ میں ہند کی خانہ شماری اور مردم شماری ہوئی۔ اس وقت شہر میں ستائیس ہزار پانچ سو نوے مکانات پختہ۔ تین سو اکیاسی مساجد و تین مندر،[۳۵۷] چار لاکھ اسی ہزار سات سو ایک اشخاص کی آبادی تھی۔

عہد اکبری[۳۵۸] میں شہر کی آبادی ایک لاکھ اکتیس ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ بدایوں حکومت اسلامی کی ابتداء سے دہلی کا صوبہ رہا۔ انحطاط سلطنت مغلیہ سے روہیلوں کا مرکز رہا۔ اپنی طاقت وعظمت کی بربادی[۳۵۹] پر نواب وزیر اودھ کا ماتحت ہوا۔ ۱۲ نومبر ۱۸۰۱ء سے بدایوں انگریزی حکومت کا حصہ قرار پایا۔ اودھ کی عنانِ حکومت اس وقت نواب سعادت علی خاں کے ہاتھ میں تھی۔

انگریزوں نے اپنے مقبوضہ روہیل کھنڈ کے دو ضلعے یا صدر مقام بنائے۔ ایک مرادآباد اور دوسرا بریلی۔ بدایوں کو بریلی میں شامل کیا۔ ۳۱ اکتوبر ۱۸۲۳ء کو جدید رد و بدل کر کے ایک ضلع[۳۶۰] سہسوان بنایا اور بدایوں کو سہسوان میں رکھا۔ مئی ۱۸۳۸ء میں سہسوان سے صدر مقام کو منتقل کر کے بدایوں ضلع کا صدر کیا گیا اور سہسوان تحصیل رہی۔ اُس وقت سے اس وقت تک دونوں اسی حال پر چل رہے ہیں۔

مجسٹریٹ ضلع

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے وقت بدایوں کا مجسٹریٹ ضلع مسٹر ایڈ ورڈس تھا۔ اُس نے مصائب غدر کے نام سے ایک روزنامچہ مرتب کیا ہے۔ جس کا ترجمہ اردو میں مولوی نذیر احمد نے کیا ہے جو منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ مسٹر ایڈورڈس کے پاس ضلع کا چارج ۵ رمئی ۱۸۵۵ء سے تھا۔ یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ جب کسی حکومت میں انقلاب رونما ہوتا ہے تو امن وامان، سکون واطمینان مفقود ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ بدامنی، انتشار، لوٹ مار اور خونریزی مسلط ہوتی ہے۔ انقلاب کے بعد جو حکومت برسر اقتدار ہوتی ہے، اگر اس کے عمال ہوشیار اور فرض شناس ہوتے ہیں تو جلد حالات پر قابو پالیتے ہیں، اور اگر برعکس اس کے راشی، عیاش، جاہ پرست اور باہمی رقابت وسازش کا شکار ہوتے ہیں تب دوسرے انقلاب کا انتظار ہوتا ہے۔

ابتداء

بدایوں ضلع میں سب سے پہلا ہنگامہ ۱۹ رمئی ۱۸۵۷ء کو ہوا۔ اگر چہ ملک میں سیاسی بے چینی کی ابتداء ۱۰ رمئی سنہ مذکور کو شروع ہوگئی تھی۔ موضع بھنڈ گوشائیں میں خربوزوں کی گاڑی کو روز روشن میں لوٹ لیا۔ جب پولیس تفتیش حالات کو گاؤں گئی، تب اس کو زدوکوب کیا۔ پولیس ذرگئی اور موقع پر سے بھاگ آئی۔ اسی دوران میں موضع نیورا پورا تھانہ رجپورہ کے اہیروں نے بشمول موضع عزیز پورہ وغیرہ کے موضع جناوری میں آگ لگادی۔ موضع کنور پور کے ٹھاکروں نے ایک سرکاری سوار کو قتل کر دیا۔ موضع پتریا کے اہیروں نے دو ٹھاکر زمینداروں کو جو موضع اسد پور کے باشندہ تھے، قتل کر دیا اور موضع نبادر کے ٹھاکروں نے یوسف علی خاں کو قتل کر دیا۔ ان حالات کا اثر عام طور سے سارے ضلع پر ہوا۔

اسباب بغاوت

مسٹر ایڈورڈس مجسٹریٹ ضلع نے اپنے روزنامچے میں اسباب بغاوت ان الفاظ میں دکھائے ہیں:

> "بلوے سے ایک برس بلکہ آگے میں نے حکام اعلیٰ سے صاف صاف بیان کر دیا تھا کہ دیوانی کی عدالتیں اپنے اختیارات بہت بُری طرح سے عمل میں لاتی ہیں، ان کا یہ طریقہ بے طور ٹھکانہ ہے، کہ تھوڑے تھوڑے قرضوں کے لیے منافع ومرافق اراضی نیلام کروا ڈالتے ہیں۔ اور اس سبب سے نظام مدن میں ردو بدل پیدا ہوتا ہے۔ پچھلے بارہ یا پندرہ برسوں میں ایسے نیلام بڑی کثرت سے ہوئے اور تحصیل مالگذاری کے ایسے طریقے جاری ہوئے کہ ملک کے رئیس لوگ برباد ہوگئے اور دیہات کے جتھے ٹوٹ گئے۔"

جنگ آزادی

۱۹ مئی ۱۸۵۷ء سے بدایوں کے مضافات میں لوٹ مار شروع ہوئی۔ مگر شہر میں سکون تھا، دوسری جگہوں سے خبریں آ رہی تھیں۔ ۲۵ مئی ۱۸۵۷ء کو عید الفطر تھی۔ کسی نے مجسٹریٹ ضلع کو خبر دی کہ اہل اسلام نماز عید پڑھ کر بلوہ کریں گے وہ اس خبر سے متاثر ہوا۔ شہر کے سربرآوردہ مسلمانوں کو اپنے بنگلہ پر بلا کر بٹھا لیا۔ یہاں تک کہ نماز کا وقت گذر گیا۔ اس کے ذہن نارسا میں بلوے کا انحصار نماز عید پر تھا۔ اس نے تصویر کے دوسرے رُخ کو اپنی نخوت وتکبر میں دیکھا ہی نہیں کہ اس مداخلت فی الدین سے نفرت وغصہ زیادہ ہوگا۔ غیور مسلمانوں پر اس کی احمقانہ حرکت کا وہی اثر ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ انگریز سے تنفر اور کینہ میں اضافہ ہوا۔ اگرچہ فوری انتقام کا جذبہ بربناء مصلحت رُک گیا مگر عوام میں کافی ہیجان پیدا ہوگیا۔

۲۷ مئی تک ضلع مجسٹریٹ کو انتہائی وحشت رہی۔ جس قدر انگریز شہر ومضافات میں تھے، سب خوف وہراس سے مجسٹریٹ ضلع کے بنگلہ میں جمع ہوگئے۔ ۲ رجون کو بریلی سے ایک جماعت جو انگریزوں کے خلاف تھی، آئی۔ نمبر ۶۸ جو خزانہ بدایوں پر متعین تھا، اس نے خزانہ لوٹ لیا۔ جیل خانہ ٹوٹ گیا۔ پولیس والے وردیاں پھینک کر بھاگ گئے۔ جلندھری سرائے، میران سرائے، نئی سرائے، ناہر خان سرائے، محلہ براہم پور، ٹکہ شرقی، موضع رسول پور کے لوگ بریلی سے آنے والی فوج کے ساتھ ہوگئے۔ مرزا منصور بیگ کی قیادت میں ٹکہ شرقی، محلہ براہم پور محلہ پٹھانی سرائے، نئی سرائے والوں نے منصفی اور کوتوالی کے دفتر جلا دیئے۔ مرزا منصور بیگ رسالدار تھے۔ مسٹر ایڈورڈس معہ اپنے چھ سات مہمانوں اور دو اردلیوں کے شیخوپور پہنچے۔[۳۶۱]

شیخ شرف الدین[۳۶۲] نے ایک رات ان لوگوں کو اپنی حفاظت میں رکھ کر موضع سکوڑہ[۳۶۳] جو ان کی زمینداری کا گاؤں تھا، پہنچایا۔ سکوڑہ میں غلام نبی خان اور بیچے سنگھ انگریزوں کے پناہ دہندہ تھے۔ وہاں سے وہ لوگ ایٹہ، فرخ آباد ہوتے ہوئے ہردوئی پہنچے۔

بریلی سے آنے والی فوج نے انگریزوں کو تلاش کیا۔ خالی بنگلوں کو نذر آتش کیا۔ شیخوپور میں انگریزوں کی موجودگی کی خبر پا کر وہاں پہنچے۔ گوہر مقصود کو وہاں نہ پا کر بغیر کسی مزاحمت یا نقصان کے لوٹ آئے۔

۳۱ مئی سے ایک دن قبل مسٹر الیگزینڈر کمشنر نے بریلی میں خان بہادر خان سے جو خاندان حافظ الملک کے ایک معزز رکن تھے، کہا کہ:

> "امروز وفردا میں یہاں بلوہ ہونے والا ہے۔ چونکہ یہ ملک آپ لوگوں کا موروثی ہے، آپ اس کا بندوبست کیجیے۔[۳۶۴]

خان بہادر خاں نے اس وقت انکار کیا لیکن جب واقعی بلوہ ہوگیا، اور انگریز بریلی چھوڑ کر بھاگ گئے تب عنان حکومت روہیل کھنڈ اپنے ہاتھ میں لی۔

۱۷ رجون ۱۸۵۷ء کو خان بہادر خاں نے عبد الرحمٰن خاں کو بدایوں کا ناظم مقرر کیا۔ اور شیخ فصاحت اللہ بدایونی[۳۶۵] کو نائب ناظم مقرر کیا۔

جس دن عبدالرحمٰن خاں بدایوں آئے، اُسی دن گنواروں کے ایک جم غفیر نے شیخوپوری پر حملہ کیا۔ شیخ زادوں نے قلعہ شیخوپور کے دروازے بند کر لیے۔ محلہ جالندھری (۳۶۶) سرائے (بدایوں) اور موضع گورامی (۳۶۷) کے لوگوں نے بروقت پہنچ کر لٹیروں کا زبردست مقابلہ کیا۔ کوئی سوا شخص کو قتل کیا۔ بقیۃ السیف نے راہِ فرار اختیار کی۔

عبدالرحمٰن خاں نے بدایوں آ کر ملازمانِ سابقہ کو اُن کی جگہوں پر بحال رکھا۔ بیشتر ملازمین اپنے فرائض ادا کرتے رہے۔ کچھ لوگ ملازمتیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔

مولوی تفضل حسین (۳۶۸) اور مولوی اشرف علی نفیس (۳۶۹) پنشنر تحصیلداران کو ڈپٹی کلکٹر مقرر کیا۔ منشی ذوالفقار الدین (۳۷۰) سررشتہ دار فوجداری کو ڈپٹی مجسٹریٹ مقرر کیا۔ مولوی رضی اللہ تحصیلدار بدایوں کو تحصیلدار بسولی۔ محمود حسین کے بھائی احمد حسین کو جو نائب سررشتہ دار تھے، سررشتہ داری پر ترقی دی گئی۔ سیف اللہ خاں تحصیلدار کو فوجی افسر مقرر کیا۔ یاد اللہ خاں کوتوال شہر مقرر ہوئے۔ گنور کے تحصیلدار مولوی ماجد علی نے ناظم کی اطاعت قبول کی۔ ولی داد خاں رسالدار مقرر ہوئے۔ چودھری تفضل حسین رئیس محلہ چودھری سرائے وصفت علی کمیدان مقرر ہوئے۔ کچھ اور لوگوں کا بھی تقرر کمیدانی پر ہوا۔ لچھمن سنگھ کو اوجھیانی کا تحصیلدار مقرر کیا۔ بدایوں کے سپہ سالار فوج جنرل نیاز محمد خاں مقرر ہوئے، اور عظمت اللہ خاں کو بخشی مقرر کیا گیا۔

جولائی میں وصول مالگذاری کا کام شروع ہوا۔ موضع کلنک (۳۷۱) اور موضع رفیع آباد (۳۷۲) کے ٹھاکروں نے ادائے مال گذاری میں تمرد کیا، جس کی پاداش میں اُن کو قرار واقعی سزا دی گئی۔ خان بہادر خاں نے موضع بھنولی (۳۷۳) کے امرائے سنگھ ٹھاکر کو داتا گنج (۳۷۴) کا تحصیل دار مقرر کیا مگر تحصیل کے ٹھاکروں نے خاندانی رقابت سے اُس کی حکومت تسلیم نہیں کی اور متوازی حکومت قائم کر کے ہر لال سنگھ عرف بلی سنگھ ٹھاکر ساکن موضع بکسینہ (۳۷۵) کو اپنا سردار بنایا۔ اُس نے اپنا لقب دھیچو دھام (۳۷۶) اختیار کر کے مہر پر یہ سجع کندہ کرایا۔ نیچے دھرتی اُوپر رام، مہر بکھیری دھیچو دھام۔

بلی سنگھ نے ایک بڑا جتھا ٹھاکروں کا بنا کر بدایوں پر حملہ کی تیاری کر کے چڑھائی کی۔ شہر کی سرحد پر لڑائی ہوئی اور وہ شکست کھا کر بھاگ گیا۔

دوبارہ اگست کے مہینہ میں پھر ان ٹھاکروں نے بدایوں پر حملہ کا قصد کیا۔ اب نواب کی فوج اور توپوں سے بدایوں لیس تھا۔ یہ معلوم ہو کر اُن کی ہمتیں پست ہو گئیں۔ موضع کنہک کے بھائی سنگھ ٹھاکر نے بھی شہر پر حملہ کیا۔ مگر بری طرح پسپا ہو کر بھاگے۔

اکتوبر کے مہینہ میں بالا راؤ برادر زادہ نانا راؤ جو انگریزوں سے برسرِ پیکار تھا کچھ سوار و پیادہ فوج کے ساتھ مالاگڑھ سے انوپ شہر کا گھاٹ اُتر کر بدایوں کے ضلع میں ہوتا ہوا شاہجہان پور کے ضلع چلا گیا۔

جنرل نیاز محمد خاں نے فتح گڑھ پر حملہ کی تیاریاں کیں اور اس کام کے لیے چالیس ہزار روپیہ چندہ ضلع سے کیا۔ جنرل نیاز محمد خاں تیاری مکمل کر کے فتح گڑھ کو روانہ ہوئے۔ قصبہ ککرالہ (۳۷۷) جو راستہ میں پڑتا تھا، وہاں سے کثرت سے بھی پٹھان مجاہد بن کر لڑنے کو ساتھ ہوئے۔ سورج پور کے مشہور گھاٹ پر گنگا کو عبور کر کے

ضلع فرخ آباد میں داخل ہوئے۔ ۲۷؍جنوری ۱۸۵۸ء کو اچانک بالکل بے خبری میں سرگرانٹ نے حملہ کر کے جنرل کو شکست دے دی۔

فروری اور مارچ کا زائد وقت انگریزوں کے مخبروں کی تلاش اور سزا دہی میں صرف ہوا۔ مخبروں اور دشمنوں کی پناہ دہی کے سلسلے میں قادر گنج کے اس حصہ میں آگ دینا پڑی جہاں ایسے لوگ چھپے ہوئے تھے۔

شروع اپریل میں محسن علی خاں (۳۷۸) سرگرانٹ سے شکست کھا کر بریلی کو جاتے ہوئے بدایوں سے گذرے۔ قریب قریب یہ وہی زمانہ تھا جب جنرل بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں، مولوی فیض احمد بدایونی وغیرہ بریلی سے لکھنؤ جاتے ہوئے بدایوں سے گذرے، اور اپنے مشہور فتوائے جہاد کو جو مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلوی، مولوی عبد القادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد رسوا بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی، سید مبارک شاہ رام پوری کے دستخطوں سے شائع ہوا تھا۔ بدایوں میں اشاعت کی گئی۔ جس کے نتیجہ میں ککرالہ مجاہدین کا مرکز بن گیا۔

۱۸؍اپریل ۱۸۵۸ء کو نواب نے بریلی سے تین سو فوجی ناظم بدایوں کو بھیجے۔ ۲۷؍اپریل کو جنرل پینی اور مسٹر والسن نے نولی تاتار (۳۷۹) پور کے گھاٹ پر گنگا عبور کر کے قیام کیا۔ اس کے ساتھ دو سو جوان، ڈھائی سو ملتانی سوار، ۳۵۳ جوان رجمنٹ ۶۴ کے ۳۲۰ جوان سیکنڈ پنجابی ۳۶۰۰ بلوچ بٹالین اور ڈھائی سو گیارھویں دیسی پلٹن کے چھ بھاری چھ ہلکی توپیں تھیں۔ اس نے کیپٹن گون کو حکم دیا کہ فوراً پہنچ کر ککرالہ سے چار میل پر نواب کی فوج جو وہاں پڑی ہے۔ اس کو منتشر کر دے یا گرفتار کرے۔

اوسہت میں ایک اور انگریزی فوج مع ایک توپ اور ہزار آدمی کے پڑی تھی۔ ۲۹؍اپریل کو جنرل پینی راتوں رات چندولی میں اوسیت کے قریب پہنچ گیا۔ جاسوسوں نے خبر دی کہ ناظم کی فوج کا رخ داتا گنج کی طرف ہے اوسیت خالی ہے۔ انگریزوں کا ایک جاسوس کمانڈر انچیف کے پاس شاہجہاں پور جا رہا تھا، پکڑا گیا، اس کو سزائے موت دی گئی۔

انگریزی فوج کے ککرالہ پہنچنے سے ایک دن قبل پچھم کے ایک باغ میں جہاں قصبہ کا کھلیان تھا، ایک سوار آیا۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمی پڑ رہی تھی۔ چھوٹے خاں اس وقت کھلیان میں حفاظت کو موجود تھے اور کچھ لوگ بھی تھے۔ یہ سب معمر تھے۔ اس لیے ان کو امتیازی حیثیت تھی۔ چھوٹے خاں نے سوار کی بہت ہی خاطر تواضع کی اور دوران گفتگو میں یہ معلوم ہوا کہ قصبہ کے لوگ انگریز کے مخالف ہیں اور سب آمادۂ جہاد ہیں۔ وہ سوار بہت خوش ہوا اور بہت کچھ لوگوں کی ہمت افزائی کی۔ اہل قصبہ کثرت سے جمع ہو گئے۔ سوار کے رفقاء ادھر اُدھر سے آ گئے۔ اب قصبہ والوں کو معلوم ہوا کہ وہ سوار شہزادہ فیروز (۳۸۰) ہے۔ لوگوں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ شہزادہ نے قصبہ کے حالات کا مطالعہ کر کے لوگوں سے کہا کہ اگر خداوند عالم نے ہم کو کامیاب کر دیا تو تم سب کو انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ انگریزی فوج نے آدھی رات کو ککرالہ کی طرف کوچ کیا۔ نصف مسافت طے کر کے دم لیا تاکہ پیدل فوج بھی آ کر اُن سے مل جائے۔ جب پیدل فوج آ گئی تو اس کو حکم دیا کہ وہ ٹھہر ٹھہر کر چلے۔ جلدی کی ضرورت نہیں اور اپنا کوچ توپ خانہ اور سواروں کے ساتھ جاری رکھا۔ یہاں تک کہ ککرالہ ایک

میل رہ گیا۔ یہ صبح صادق کا وقت تھا کہ مجاہدین کا ایک گروہ آتا نظر پڑا۔ جنہوں نے چار توپیں گراپ کی سرکیں مگر کوئی انگریز زخمی نہیں ہوا۔ انگریزوں نے جوابی توپوں کے فائر کیے۔ مجاہدین نے موقع پاکر انگریزی فوج کو تلواروں پر رکھ لیا اور کلا بکلا لڑنا شروع کردیا۔ انگریزی فوج نے مجاہدین کی شمشیر زنی کی تاب نہ لاکر پسپائی شروع کردی اور درختوں کی آڑ لے کر توپیں چلانے لگے۔ اس سے مجاہدین کا اتلاف جان کافی ہوا۔ اس بے ترتیبی اور بدنظمی میں بہت دیر میں معلوم ہوا کہ جنرل پینی غائب ہے۔ مقامی روایت ثقہ اشخاص کی یہ ہے کہ انگریزی فوج کی آمد پر گولہ انداز نے ایسا گولہ نشانہ پر مارا کہ جنرل پینی کا سر اڑ گیا۔ بڑی تلاش سے اُس کی نعش ملی۔ دیکھا بازو پر ایک زخم گولی کا تھا اور کسی مجاہد کی تلوار اُس کا خون پی چکی تھی۔ توپوں کی آواز سُن کر سورج نکلنے پر کرنل جانسن معہ پیادہ فوج کے موقعہ پر آیا۔ مقامی روایت یہ ہے کہ اس فوج کے آنے سے ککرالہ کے مجاہدین انگریزی فوج کے بیچ میں پھنس گئے۔ اور ایک ہزار غازی شہید ہوئے۔ شہزادہ نے کچھ سامان اور آدمی لے کر ککرالہ سے پچھم اور موضع کھوائی سے پورب ایک جھاڑی دار بیلہ کی آڑ سے مورچہ لگایا۔ پھر بھی ناکامی رہی۔ مجاہدین بدایوں کی طرف روانہ ہوگئے تھے۔ توپ خانہ نے دُور تک اُن کا تعاقب کیا۔ ڈسٹرکٹ گزیٹر بدایوں کا کہنا یہ ہے کہ یہ امر تحقیق شدہ ہوگیا کہ یہ سرفروش جماعت ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی کے رفقاء کار کی تھی۔

۲۹؍اپریل ۱۸۵۸ء کو جب ککرالہ میں معرکۂ کارزار گرم تھا، میجر گارڈن نے مرادآباد کے ایک دستہ فوج سے نواب کے آدمیوں کو بسولی پر شکست دی۔

اب بدایوں دو طرف سے انگریزی فوج کی زد میں آگیا۔ جب نواب کی سپاہ نے دفتر کو نذر آتش کردیا اور بریلی کو روانہ ہوگئی۔ قریب قریب تمام وہ لوگ جو انگریز کے خلاف تھے وہ بدایوں چھوڑ کر چلے گئے۔ رحم علی خاں ٹھیکیدار بسولی و سہسوان ایک مختصر جماعت کے ساتھ گنگا عبور کرکے گوالیار کی طرف چلا گیا۔

قصبہ اسلام[۳۸۱] نگر کے باشندہ بابو رام نرائن وکیل اور مخدوم بخش قریشی کی قیادت میں معہ اپنے رفقاء کار شہامت علی، ناصر علی، منیر خاں، ہنسا سنگھ، دہن سنگھ، کے مجتمع ہوئے۔ اس سے زیادہ اور کیا اتحاد کی مثال ہوگی۔ بابو رام نرائن ہندو ظاہر اور قریشی ایک قصاب جو گائیں ذبح کرکے گوشت فروخت کرے یہ اس کا پیشہ۔ ان لوگوں کا وقت انگریزوں کے کاسہ لیسوں سے مقابلہ میں زائد صرف ہوا۔ جن کا سرکردہ دارا سنگھ ٹھاکر ساکن پیرول تھا۔[۳۸۲] ان لوگوں نے متعدد حملے رام نرائن پر کیے مگر سب میں ناکام رہے۔ ریاست رام پور کی فوج نے بسرکردگی حکیم سعادت علی[۳۸۳] اسلام نگر پر حملہ کیا۔ لڑائی ہوئی۔ رام نرائن کے پاس توپیں تھیں۔ فریقین میں خوب گولہ باری ہوئی۔ وکیل میدان جنگ میں کام آیا۔ علاوہ اور سامان کے حکیم صاحب کے ہاتھ دو برجی توپیں بھی آگئیں۔ یہ واقعہ ۱۳؍جون ۱۸۵۸ء کا ہے۔

۲۷؍مئی کو دو ہزار سرفروشوں کا گروہ جھانسی سے[۳۸۴] جائی کے میلہ میں ہوتا ہوا اوسیت سے شاہ جہان پور ہوکر لکھنؤ پہنچا۔

اب انگریز ضلع پر چھا گیا اور اُس نے اپنے انتظامات شروع کیے۔ مسٹر ولسن نے ضلع چھوڑنے سے پہلے ٹھاکر لال سنگھ نکسینہ والے کو داتا گنج کا، بھیکم سنگھ کو اوسیت کا تحصیل دار، شیخ شرف الدین کو بدایوں کا تحصیلدار

۱۸ مئی ۱۸۵۸ء کو جیت سنگھ اور ڈال سنگھ ساکنان کوٹ کو سہوان کا تحصیل دار مقرر کیا۔

دار اسنگھ ٹھاکر پیروں کو اوجھانی، قندھاری سنگھ ٹھاکر بیلا ڈانڈی کو بدایوں اور ضلع بریلی کے چار ٹھاکر بلسی کوٹ، بسولی کے پولیس افسر مقرر کیے گئے۔ بلسی کا تھانے دار بھائی سنگھ کو مقرر کیا۔ چندن سنگھ ٹھاکر بھان پور کو بسولی اور کوٹ کی مال گذاری وصول کرنے پر مقرر کیا۔ مسٹر کارمیکل کو بدایوں کا مجسٹریٹ ضلع مقرر کیا گیا تھا۔ مگر وہ ابھی تک بریلی سے بیٹھے بیٹھے ضلع کا انتظام افسران متذکرہ صدر کی وساطت سے چلا رہا تھا جس کے ہاتھ میں ضلع کی ظاہری باگ تھی۔

۳ رجون کو بریگیڈیر سنک معہ ایک دستہ فوج کے شاہجہان پور سے اوسیت آیا۔ اور لب سڑک ان تین گاؤں کو جن کے متعلق مخالفت کا خیال تھا، ان کو آگ لگا دی۔ اسی دن نگرالہ میں آگ لگائی۔ اس آگ میں عورتیں، بچے بہت جلے اور چاروں طرف گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔ ایشری پرشاد مخبر ساتھ تھا۔ تقریباً پانچ سو اشخاص گرفتار کرلیے گئے۔ روزانہ سو آدمیوں کو سزائے موت اس طرح سے دی جاتی کہ سفید چونہ سے حوالات میں سو آدمیوں کی پشت پر نشان لگایا جاتا۔ دو گھنٹہ کے بعد نشان والے لوگوں کو ایک قطار میں کھڑا کرکے ایک طرف سے کان پر گولی کا فائر کیا جاتا۔ اس فائر سے جو لوگ بچ جاتے، اُن کو اسی طرح لائن میں کھڑا کرکے باڑ ماری جاتی اور جب تک یہ مظلوم ایک ایک کرکے ختم نہ ہو جاتے، یہ تماشا جاری رہتا تھا۔

نگرالہ کے لوگ جو گھبراہٹ اور پریشانی میں فرار ہوگئے تھے، اُن کی تلاش کرکے گرفتار کیا جاتا اور پناہ دہندوں کو گرفتار کرکے طریقہ بالا پر سزائے موت دی جاتی۔ نگرالہ بالکل ویران ہوگیا۔ تمام سامان اور اناج وغیرہ جلا دیا گیا۔ وہ برا وقت ہوگیا تھا کہ دوست آشنا اہلِ نگرالہ سے بات کرتے گھبراتے۔ کسی اعانت وامداد کو تیار نہ ہوتے۔ تین مہینے دھکے در بدر کھا کر لوگ پھر بچے کھچے جمع ہوئے۔ ایشری پرشاد مخبر کی اطلاع دہی پر پھر فوج نگرالہ دوبارہ آئی اور دار و گیر شروع ہوئی۔ کچھ لوگ اس مرتبہ ایشری کے کہنے سے چھوڑے گئے۔ کچھ مار پیٹ کرکے اور کچھ کو جان لے کر چھوڑا۔ کچھ عرصہ کے بعد پھر یہ عمل کیا۔ چوتھی مرتبہ جنرل پینی کی مہم آئی۔ اس نے نگرالہ کا نگڑہ بار کہہ کر فرمائش کی کہ پورے قصبہ کو کھدوا کر جھیل بنا دیا جائے۔ یہ فرمائش تو پوری نہیں ہوئی۔ البتہ پورا قصبہ کھنڈر ضرور کر دیا گیا۔ سنہ ۱۹۱۴ء تک نگرالہ کے آدمی کو ملازمت نہیں دی جاتی تھی۔ جنگِ عظیم میں نگرالہ سے بھرتی فوج کی بکثرت ہوئی۔

قصبہ کے سربر آوردہ اشخاص جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں نمایاں حصہ لیا۔ پہلوان منگل خاں، رستم خاں، غلامی خاں، سردار خاں، محمد خاں، مان خاں، چھادم خاں، ولاور خاں، واصل خاں، فوجدار خاں وغیرہ تھے۔

یہ حرکت بہیمانہ صرف رعب بٹھانے کو تھی کیونکہ اس زمانہ میں رحم، عفو، انصاف عنقا تھا۔ بریگیڈیر ۶ رجون کو بدیواں پہنچا۔ اہم اور نمایاں گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔ دو دن کے بعد مسٹر کارمیکل مجسٹریٹ ضلع بمعیت کرنل ولکنسن ایک دستہ فوج لیے ہوئے بریلی سے بدایوں آئے۔ اب گرفتاریاں اندھا دھند شروع ہوگئیں۔ بقول شاعر:

جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے

شہر کے تین مسلمانوں اور ایک ہندو دستار ترو تامی نے حکومت کا ہاتھ گرفتاریوں میں غیر معمولی انہماک سے بٹایا۔

دوسرے دن دو فوجی دستے مراد آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ کرنل ولکنسن نے سیدھا راستہ مراد آباد کا براہ بسولی اختیار کیا۔ راستہ میں دو گاؤں تباہ و برباد کیے گئے جنرل تک اور کارمیکل سہسوان پہنچے اور وہاں پر بہت سی گرفتاریاں کی گئیں۔ مولانا سید نیاز احمد ولد سید آل احمد مودودی جو ایک عالم و فاضل بزرگ تھے، علاوہ علم و فضل کے فنِ سپاہ گری کے ماہر تھے۔ مولانا سید احمد بریلوی کے ہاتھ پر بیعت جہاد کیے ہوئے تھے اور اُن کے ساتھ شریک جہاد رہے تھے۔ سہسوان کے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں شریک ہوئے۔ نشانہ گولی بنے۔ اس وقت ہاتھ میں تسبیح اور لب پر کلمۂ شہادت تھا۔ عمر ۳۹ کے قریب تھی۔ اسلام نگر پہنچ کر داروگیر بہت سختی سے شروع ہوئی۔ جس پر بھی بابو رام نرائن وکیل کے ساتھی ہونے کا شبہ دلایا گیا، اس کو انتہائی سخت سزائیں دی گئیں۔ اسلام نگر میں چند گھر سادات اور کنبوہوں کے ہیں۔ اول الذکر معافیدار تھے۔ ان سادات کا ایک امام باڑہ قصبہ میں تھا۔ کسی نے مخبری کردی، کہ سید محب علی متولی امام باڑہ نے مشہور فتویٰ جہاد امام باڑہ میں دفن کردیا ہے۔ امام باڑہ بیخ و بن سے کھود ڈالا۔ سید صاحب کو گولی ماردی اور معافیات ضبط کرلیں۔

مجسٹریٹ ضلع نے فوج کا ساتھ چھوڑ دیا کیونکہ اب فوج کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ضلع پر رعب بیٹھ گیا۔ سینکڑوں فرضی خیر خواہ بلا معاوضہ لوگوں کو پھانسیاں دلانے کو موجود تھے۔ اکثر و بیشتر فاسق محروم رہے۔ یہ مہینہ سہسوان اور گنور میں صرف کیا۔ اگست میں احکامات کی تعمیل باقاعدہ ہونے لگی اور مالگذاری تیزی سے داخل خزانہ ہونے لگی۔ جس کی تعداد چار لاکھ سینتالیس ہزار دو سو کیانوے روپیہ آٹھ آنہ گیارہ پائی تھی۔ اب یہ وہ وقت ہے کہ انگریز نے جذبۂ انتقام میں جو جو اور جس جس طرح سے سزائیں دیں، چنگیز خاں اور ہلاکو کی روحیں چیخ اٹھیں اور اس پر ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اپنے مظالم پر اپنے پردہ ڈالا جس کا پتہ و نشان نہیں اور دوسروں کے واقعات کو کس رنگ آمیزی سے دوہرایا جاتا ہے۔

بدایوں کے چار اشخاص کو عبور دریائے شور کی سزادی گئی۔ وہ چاروں ایک ہی گھر کے تھے۔ شیخ نصرت اللہ نائب ناظم اور شیخ سلیم اللہ وکیل، شیخ آیت اللہ وکیل تینوں بھائی، چوتھے شیخ فضل احمد بھتیجہ۔ کسی عام معافی کی بناء پر یہ لوگ واپس ہوئے۔ مگر اول الذکر کو خاکِ وطن نصیب نہ ہوئی، راستہ میں انتقال ہوگیا۔ آخر الذکر نے واپس آکر وکالت پاس کر کے کام شروع کیا اور ضلع کے چوٹی کے وکیل بنے۔ اکیس اشخاص کو گولیاں ماری گئیں۔ اُن میں مولوی تفضل حسین تحصیلدار، مولوی اشرف علی تحصیلدار، مولوی ماجد علی تحصیلدار، مولوی رضی اللہ[۳۸۵] تحصیلدار، منشی ذوالفقار الدین سررشتہ دار، بدر الاسلام عباسی المتخلص مشہور،[۳۸۶] سید محمد شاہ[۳۸۷] معہ اپنے داماد کے، شیخ بھجا پنجابی سوداگر ساکن محلہ چاہ میر۔ ایک سو سترہ اشخاص کو پھانسیاں دی گئیں۔ ایک سو پچیس اشخاص کو میعادی قید اور دو سو ستر اشخاص کو[۳۸۸] بید کی سزادی گئی۔ چوبیس مسلم مواضعات اور چار سو قطعات اراضی بحق حکومت ضبط کیے گئے۔ پانسو چھتیس مکانات اور دس ہزار پانسو روپے کا زیور ضبط کیا گیا۔

انگریزی حکومت کے قیام پر دو طرح کے اشخاص کو انعامات سے نوازا گیا۔ نمبر ایک وہ لوگ رہے جنہوں نے انگریزوں کو پناہ دے کر اُن کی حفاظت کی۔ نمبر دوم وہ لوگ تھے جنہوں نے نظم و نسق اور ضبط و امن کی بحالی میں اعانت و امداد کی۔ نمبر ایک میں کپتان گون اور اُن کے ہمراہیوں کے پناہ دہندے جیتم سنگھ اور پنجاب سنگھ

ٹھاکران ادسانواں، پرتاپ برہمن موضع سیاڈ۔[۳۸۹] اندر سنگھ ٹھاکر موضع سلیم پور اور بختاور سنگھ ٹھاکر موضع بیلا ڈنڈی،[۳۹۰] ان کو زرنقد اور زمینداری دی گئی۔ مسٹر ایڈیٹ کے پناہ دہندے ہمت سنگھ ٹھاکر موضع گدھول، جگنا تھ کوری موضع ننگلہ شرقی اور ہیرا سنگھ ٹھاکر موضع گڑگاؤں۔

مسٹر پیٹرس اور اُن کے خاندان کی نگہبانی اور حفاظت کا انعام اجیت برہمن موضع نظام آباد کو ملا۔ علاوہ بریں ترسٹھ اشخاص کو صرف زرنقد دیا گیا۔

نمبر دوم کے سلسلہ میں شیخ شرف الدین رئیس شیخو پور، ہرلال سنگھ ٹھاکر موضع بلسیہ، بیت سنگھ اور زوال سنگھ ٹھاکران موضع کوٹ، دارا سنگھ ٹھاکر موضع پیر دل، پرس رام موضع آسپور (تحصیل گنور)۔ ان سب کو ان کی خدمات کے صلہ میں زمینداریاں دی گئیں۔ وزیر سنگھ تھانے دار گنور، پربھولال پیش کار، شیخ ارشاد علی اور پانچ کس دیگر شیوخ گنور کو سرکاری دفتر کی حفاظت کی جلدو میں زمینداریاں دی گئیں۔ بیالیس دیگر اشخاص کو صرف زرنقد انعام میں دیا گیا۔ ان میں زائد تعداد گنور کے اہل کاروں کی تھی۔

انگریزوں نے ابتدائی دور میں ہر ایک قاضی کو جو جس جگہ تھا، وہاں کا منصف یا صدر الصدور مقرر کر دیا تھا۔ اس طرح سے ایک عرصہ تک صرف مسلمان علماء وفضلاء یک وتنہا بلاشرکت غیرے صوبہ متحدہ میں خصوصی طور سے ان عہدوں پر قابض رہے۔ اس سلسلہ میں ایک مشہور لطیفہ ہے۔ پہلے غیر مسلم منصف غازی پور میں منشی بنواری لال مقرر ہوئے تھے۔ اُن کے اجلاس کا پیش کار نے کاغذ کے سرنامہ پر لکھا۔ اجلاس مولوی بنواری لال صاحب۔ منصف نے یہ دیکھ کر پیش کار سے کہا میرے نام سے قبل منشی لکھا کرو، مولوی نہیں۔ پیش کار نے کہا کہ منصف اور صدر الصدور کے نام کے ساتھ مولوی ہی لکھا جاتا ہے۔ تب منصف نے پیش کار سے کہا کہ اب تک ان عہدوں پر مسلمان مقرر ہوتے تھے۔ وہ فقہ اسلامی کے ماہر ہوتے تھے اس وجہ سے لفظ مولوی ان حضرات کے نام کے ساتھ لکھنا مناسب اور درست تھا۔ اب ذرا انگریز کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو، اُس کے نقطہ نظر سے مولوی ملا کا اطلاق چھاؤنی کے پیش نماز پر رہا اور قاضی صرف نکاح رہ گیا جس کی توثیق قاضی ایکٹ ۱۸۶۴ء بنا کر کر دی۔

جب تک انگریزی داں منصف صدر الصدور ہونا لازمی نہیں کیا گیا تھا، بدایوں کے منصف اور صدر الصدور بیک وقت اس قدر تعداد میں تھے کہ کوئی دو ضلعے بھی مل کر اہل بدایوں کے برابر نہ تھے۔ انگریز کلکٹو میں برابر سلسلہ رہا۔ جوڈیشل سروس کا انحطاط دیکھ کر انگریزی تعلیم پر توجہ شروع ہوئی۔ بدایوں میں پہلا گریجوایٹ[۳۹۱] ۱۸۸۵ء میں کوئینس کالج بنارس سے ہوا۔ اور وہ کلکتہ یونیورسٹی میں نمبر دوم پر آیا۔

اس کے بعد کافی انہماک اور سرعت سے بدایوں کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا رواج ہوا۔ جس قدر مسلم گریجوایٹ بدایوں کے ہوئے، اس قدر روہیل کھنڈ کے کسی ایک ضلع کے نہ تھے۔ بدایوں کے ہندو گریجوایٹ مسلم گریجوایٹ سے کم تھے اور ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں ترقی کر رہے تھے۔ اب مشرقی علوم کے ماہر خال خال رہ گئے ہیں۔

سینکڑوں مجاہدین میں سے چند

(۱)

حضرت مولانا فیض احمد بدایونی رحمہ اللہ (۳۹۲)

پیدائش

مولانا فیض احمد ابن حکیم غلام احمد مولوی محلہ شہر بدایوں میں ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۹ء) میں پیدا ہوئے۔ خدا کی قدرت کہ آپ کی عمر قریب تین سال کے ہوئی کہ والد ماجد کا انتقال ہوگیا اور یتیمی کا داغ لگا۔ مگر آفریں آپ کی والدہ کو جنہوں نے آپ کی تربیت باحسن وجوہ فرمائی۔ کیوں نہ ہو، آخر ایک عالم و شیخ کی بیٹی تھیں۔

تعلیم و تربیت

مولانا کو قدرت نے شروع ہی سے وہ دل و دماغ بخشا تھا کہ جس پر آپ کے ہم درس طلبا کو رشک آتا تھا۔ جو چیز ایک بار پڑھ لی، یاد ہوگئی، اور ایک دفعہ نظر سے گذر گئی، دل پر نقش ہوگئی۔ تحقیق و تدقیق آپ کا حصہ تھا۔ اہلِ خاندان خیال کرتے تھے کہ مستقبل قریب میں یہ بچہ فخرِ خاندان ہوگا۔

بالائے سرش ز ہوش مندی   می تافت ستارۂ بلندی

والدہ نے اس ہونہار بچہ کو اپنے بھائی مولانا فضل رسول کے سپرد کر دیا۔ آپ نے نہایت محبت اور ناز و نعم سے پرورش فرمائی۔ مولانا فیض احمد نے تمام علوم منقول و معقول صرف چودہ سال کی عمر میں حاصل فرمائے اور پندرھویں سالگرہ سے قبل آپ کو اجازتِ درس مل گئی۔ دوسرے فنون مروجہ خطاطی و شعر و شاعری وغیرہ میں بھی آپ نے کمال حاصل کیا۔ ایک قلیل عرصہ میں آپ کا شہرہ ہوگیا اور تشنگانِ علم نے اس منبع علم و فضل کی طرف رخ کیا۔

بیعت

جب مولانا نے علوم ظاہری سے فراغت پائی تو علوم باطنی کا خیال آیا۔ حضرت اچھے میاں مارہروی رحمہ اللہ کے خلیفۂ اجل آپ کے نانا حضرت مولانا شاہ عبدالحمید رحمہ اللہ مسندِ رشد و ہدایت پر جلوہ افروز تھے۔ آپ نے سلسلۂ قادریہ برکاتیہ میں اپنے نانا صاحب سے بیعت فرما کر علوم باطنی کی تکمیل کی۔

درس و تدریس

آپ نے جب مسندِ درس کو سنبھالا تو ایک عالم مستفید ہوا۔ طلباء سے ایک خاص تعلق ہوتا تھا۔ ان کی

www.besturdubooks.wordpress.com

خبر گیری اور بسا اوقات اُن کی مدد کرنا آپ کے معمولات سے تھا۔ دورانِ ملازمت میں بھی آپ طلباء کو درس دیتے تھے اور یہ اُس دور کی خصوصیات سے تھا۔ آپ کے تلامذہ کا شمار دشوار ہے۔

ملازمت

آغازِ ملازمت کی صحیح تاریخ کا تعین مشکل ہے۔ البتہ اتنی بات ظاہر ہے کہ ایک عرصہ تک بدایوں میں درس و تدریس کے بعد آپ اس طرف متوجہ ہوئے۔ اور چونکہ آپ کے ماموں صاحب سررشتہ دار رہ چکے تھے۔ لہٰذا اسی تعلق کی بنا پر آپ نے بھی انگریزی ملازمت اختیار کی۔

آگرہ اس وقت صوبہ کا صدر مقام تھا۔ صدر نظامت آگرہ میں اوّل آپ مسل خواں پھر پیش کار ہوئے اور آخر میں بورڈ آف ریونیو میں سررشتہ دار ہو گئے۔ فرائض منصبی نہایت دیانت، محنت اور راست بازی سے انجام دیتے تھے۔ حکام بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اسی زمانہ میں ولیم میور نے جو کہ وہاں مجسٹریٹ علاقہ فوج تھا، اور بعد کو لفٹنٹ گورنر صوبہ یوپی (۱۸۶۸ءتا۱۸۷۲ء) ہوا۔ اُس نے آپ سے عربی پڑھی۔

اخلاق

مولانا فیض احمد نے اخلاق بڑے وسیع پائے تھے۔ اہالیانِ وطن کی آپ بڑی مدد کرتے تھے۔ بدایوں کا جو شخص پہنچا اور جس کام میں مدد کا خواستگار ہوا اُس کی حتی الوسع امداد کی۔ قیام و طعام کی کفالت کرتے۔ بعض اوقات ان مصارف کے لیے قرض کی ضرورت پڑتی۔ صاحب اکمل التاریخ لکھتے ہیں۔

> ”باوجود ثروت و وقار کے دل فقیرانہ، مزاج شاہانہ تھا۔ فقراء سے محبت اور غرباء سے اُلفت، طلبہ کے شائق اور علم کے شیدائی تھے شاگردوں کی تمام ضروریات کے خود متکفل ہوتے تھے۔ سلسلۂ درس و تدریس اقامت آگرہ میں برابر جاری رہا۔“

مناظرہ مابین مولوی رحمت اللہ کیرانوی اور پادری فنڈر

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے ہمدوش مذہب عیسوی نے بھی فروغ حاصل کیا، اور ہر ممکن صورت سے اس مغلوب ملک کو مذہبی حیثیت سے بھی فتح کرنے کی کوشش کی گئی۔ کمپنی کی تائید و اعانت سے مذہب مسیحی کی تنظیم اور ترقی عمل میں آئی۔ ملک کے طول و عرض میں ہر جگہ اس تنظیم کے آثار قائم کیے گئے۔ چرچ مشن سوسائٹی، بائبل سوسائٹی مشن فنڈ، مشن ہسپتال، مشن کالج اور مدارس جا بجا قائم ہوئے۔ مذہبی کتابوں اور رسائل کی اشاعت کے ذریعہ ہندوستانیوں کے رجحانات و عقائد سلب کرنے کی کوشش کی گئی غرض یہ وہ زمانہ تھا کہ عیسائیوں نے ہندوستان میں اسلام کے خلاف زبردست مہم جاری کر رکھی تھی۔ ۱۸۵۴ء میں پادری فنڈر (REVD.C. C.D.FONDER) یورپ سے ہندوستان آیا۔ یہاں اُس نے اور اُس کی جماعت نے

دل شکن تقریروں کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس کی کتاب ''میزان الحق'' نے خوف وہراس پیدا کر دیا تھا۔ پادری فنڈر نے آگرہ کو مناظرہ کا گڑھ ٹھہرایا۔ کیونکہ آگرہ ہی اس وقت علماء کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر یہاں کسی طرح فتح ہو گئی تو عیسائیت کی تبلیغ میں بڑی مدد ملے گی۔ اس نے مشاہیر علماء کو چیلنج دیا۔ مجلس علماء میں مشورہ ہوا۔ مولانا فیض احمد کے دوست ڈاکٹر وزیر خاں نے چیلنج قبول کر لیا اور مذہب عیسوی کے مشہور ماہر و مناظر مولوی رحمت اللہ کیرانوی جو کہ عرصہ سے پادری مذکور سے خط و کتابت کر رہے تھے، بلائے گئے۔ انہوں نے چھل اینٹ آگرہ میں قیام کیا۔ ضروری انتظامات کے بعد ۱۱ر رجب ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۰ر اپریل ۱۸۵۴ء بروز پیر کٹرہ عبدالمسیح آگرہ میں مناظرہ کا پہلا اجلاس ہوا۔ اہلِ اسلام کی جانب سے مناظرِ اوّل مولوی رحمت اللہ عثمانی کیرانوی اور مناظرِ دوم ڈاکٹر وزیر خاں تھے۔ جن کے معین و مددگار مولانا فیض احمد بدایونی تھے۔ عیسائیوں کی طرف سے مناظرِ اوّل پادری فنڈر اور مناظرِ دوم پادری فرنچ تھے۔ مجلسِ مناظرہ میں مسٹر اسمتھ حاکم صدر دیوانی، مسٹر کرسچین سیکنڈ صوبہ بورڈ، مسٹر ولیم میور مجسٹریٹ علاقہ فوج، مسٹر لیڈل ترجمانِ حکومت، پادری ولیم گلین، مفتی ریاض الدین، مولوی حضور احمد سہسوانی، مولوی امیر اللہ مختار راجہ بنارس، مولوی خمیر الاسلام امام جامع مسجد آگرہ، مفتی خادم علی مہتمم مطبع الاخبار، مفتی سراج الحق، مولوی کریم اللہ خان، ہتھراوتی، پنڈت جگل کشور، راجہ بلوان سنگھ (بنارس) قاضی حکیم فرزند علی گوپاموی، مولوی سراج الاسلام نیز اور بہت سے علماء عمائدین اور رؤساء شہر موجود تھے۔ شرائط مناظرہ میں یہ خاص شرط تھی کہ مغلوب کو غالب کا مذہب اختیار کرنا ہوگا۔ تین روز تک مناظرہ ہوا پادری فنڈر کو انجیل کی تحریف کا اقرار کرنا پڑا اور اس نے شکست فاش کھائی اور آگرہ سے راہِ فرار اختیار کر کے سیدھا یورپ پہنچا۔ اس مناظرہ کی پوری کیفیت (البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف) کے نام سے وزیر الدین نے مرتب کر کے حافظ عبداللہ کے اہتمام سے ۱۲۷۰ھ میں فخر المطابع شاہ جہاں آباد میں ولی عہد مرزا فخرو کے صرف و حکم سے چھپوا کر اکناف و اطراف ہند میں تقسیم کرا دی تھی اور اسی مناظرہ اکبر آباد کو چھوٹی تقطیع پر حصہ اوّل ''مباحثہ مذہبی'' اور دوسرا ''مراسلاتِ مذہبی'' کے نام سے سید عبداللہ اکبر آبادی نے منشی محمد امیر کے اہتمام سے مطبع منتصیہ اکبر آباد سے ۱۲۷۰ھ میں چھپوایا۔ پہلا حصہ فارسی میں تقریری مناظرہ کی روداد ہے اور دوسرے حصہ میں ڈاکٹر وزیر خاں اور پادری فنڈر کا تحریری مناظرہ اردو میں ہے۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ مولوی رحمت اللہ کی کتاب اظہار الحق کے حاشیہ پر مطبوعہ ہے جو کہ مطبع محمودیہ قاہرہ مصر سے ۱۳۱۶ھ میں طبع ہوا ہے۔ غرض اس تاریخی مناظرہ میں مولانا فیض احمد بدایونی نے ڈاکٹر وزیر خاں کو ہر طرح مدد دی اور ان کی کامیابی کے لیے مدد ہوئے اور یہ دورانِ ملازمت میں بڑا کام تھا۔

جامع مسجد آگرہ

یہ ہندوستان کی قابلِ فخر تاریخی جامع مسجد اس زمانہ میں عجیب حالت میں تھی۔ صرف بیچ کا حصہ خالی تھا

جس میں ستر اسی نمازی نماز پڑھ سکتے تھے۔ باقی حصہ پر کبوتر بازوں کا قبضہ تھا یا رسیاں بٹنے والے رسیاں بٹتے تھے۔ مسجد کی دکانیں بنیوں کے پاس رہن تھیں۔ مولانا نے یہ صورت دیکھی تو بے چین ہو گئے اور طویل جدوجہد کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جس کا اندازہ مقدمات کی مسلوں کے معائنہ سے ہو سکتا ہے۔ بالآخر مولانا کو کامیابی ہوئی۔ دکانیں خالی کرائی گئیں۔ مسجد کا انتظام درست کیا گیا کبوتر بازوں کو نکالا گیا۔ رسی بٹنے کی لعنت ختم کر کے مسجد کی درستی کرائی گئی اور مسجد کے انتظام کے لیے لوکل ایجنسی آگرہ کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے تحت آج تک جامع مسجد آگرہ کا انتظام ہے۔

آگرہ میں شاہ احمد اللہ کی آمد

مولانا سید احمد اللہ شاہ ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے جذبۂ انقلاب لے کر دہلی پہنچے۔ بقول مولانا عبید اللہ سندھیؒ وہاں انگریز ریذیڈنٹ کی نگاہیں بہت تیز تھیں۔ ایسی کسی کارروائی کا ہونا اور پروان چڑھنا ناممکن تھا۔ اس بنا پر حضرت مولانا صدر الدین صاحب آزردہ نے شاہ صاحب کو آگرہ جانے کا مشورہ دیا اور وہاں کے بزرگوں کے نام تعارفی خط بھی لکھ دیا حضرت شاہ صاحب وہ تعارفی خط لے کر مفتی انعام اللہ خاں بہادر وکیل سرکار کے پاس پہنچے۔ انہوں نے بڑی قدر و منزلت کی۔ یہاں علماء وفضلاء کا اجتماع تھا۔ اس پورے حلقہ میں شاہ صاحب کی بڑی عزت ہوئی۔ محفل سماع اور وعظ کا زور شروع ہوا۔ یہاں تک کہ شاہ صاحب کو یہاں اپنے خواب کی تعبیر نظر آنے لگی۔ بہت لوگ معتقد ہو گئے۔ عام گرویدگی دیکھ کر حکومت کو بھی فکر ہوئی۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب سے تعلق رکھنے والے علماء پر جو صدر نظامت میں عہدہ دار بھی تھے، مقدمہ چلایا۔ مقصد یہ تھا کہ جماعت منتشر ہو جائے مگر حکومت کو اس میں ناکامی ہوئی۔ کیونکہ تمام ملزمین بے داغ بری کر دیئے گئے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء

میرٹھ اور دہلی میں علمِ انقلاب بلند ہوا تو اُس کا فوری اثر آگرہ پڑا جو صوبائی حکومت کا مرکز تھا۔ کالون صاحب نفٹنٹ گورنر نے سب فوج ہندوستانی اور انگریزی کو جمع کر کے فہمائش کی۔ جس کا اثر چند روز رہا مگر ماہ جون میں یہاں بھی واقعات شروع ہوئے۔ جولائی میں تیزی آئی۔ مجاہدین فوج کی سرپرستی ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی نے کی۔ مگر جب حالات کا جائزہ لیا اور دہلی سے پیام وسلام کے ذریعہ طلبی ہوئی تو کچھ مسلح سپاہ کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی دہلی روانہ ہو گئے۔

مولانا فیض احمد صاحب دہلی میں

دہلی میں ایسے ذی علم، سنجیدہ اور باخلاص اصحابِ فکر کی ضرورت تھی۔ ان دونوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ڈاکٹر وزیر خان، جنرل بخت خاں کے مشیر خاص کی حیثیت سے کام کرنے لگے اور مولانا فیض احمد صاحب مرزا مغل

کے پیش کار مقرر ہوئے۔ مختلف معرکوں میں آپ نے شرکت فرمائی۔

۱۹/ستمبر ۱۸۵۷ء کو جب جنرل بخت خاں نے دہلی سے کوچ کیا تو مولانا فیض احمد صاحب اور ڈاکٹر وزیر خاں جنرل بخت خاں کے ساتھ تھے۔ اُس وقت لکھنؤ میں معرکہ کارزار گرم تھا۔ مولانا شاہ احمد اللہ صاحب دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ یہ مولانا فیض احمد صاحب اور ڈاکٹر وزیر خاں لکھنؤ پہنچے اور تمام اہم معرکوں میں شاہ صاحب کے ساتھ رہے۔

سقوطِ لکھنؤ کے بعد سب کا اجتماع شاہ جہان پور میں ہوا۔ اور یہاں چند ماہ تک انگریزوں سے سخت معرکے ہوتے رہے۔ اسی اثناء میں مولانا فیض احمد صاحب بدایوں پہنچے۔ ڈاکٹر وزیر خاں آپ کے ساتھ تھے اور شاہزادہ فیروز بھی بدایوں پہنچ چکے تھے۔ بدایوں کے معرکوں میں ان مجاہدین نے حصہ لیا۔ ککرالہ کے معرکہ میں قیادت کا فرض انجام دیا۔ پھر جب یہاں بھی ناکامی ہوئی تو قصبہ محمدی پہنچے۔ جہاں مولانا احمد اللہ شاہ صاحب نے حکومت قائم کی تھی۔ یہ دونوں بزرگ مولانا کی وزارت میں داخل ہوئے۔ مولانا شاہ احمد اللہ کی شہادت کے بعد ایسے روپوش ہوئے کہ آپ کے ماموں مولانا فضل رسول نے آپ کی تلاش میں قسطنطنیہ تک سفر کیا مگر کہیں سراغ نہ لگ سکا۔ رحمۂ اللہ۔

(۲)

منشی ذُوالفقار الدّین(۲۷۲)

صاف گوئی اور صداقت پسندی کی ناقابلِ فراموش مثال

منشی ذوالفقار الدّین ولد وہاب الدّین بدایوں کے متولیوں کے خاندان سے تھے۔ جب انگریزی تسلط کے بعد گرفتار ہو کر مسٹر کارمیکل کے سامنے بغرض جواب دہی پیش ہوئے۔ تب منشی جی نے اپنی قوتِ ایمانی کی بنا پر صاف الفاظ میں کہا۔ تمہاری حکومت جاچکی تھی، مجھ کو ملازمت کی ضرورت تھی، مَیں نے نوکری کرلی۔ منشی جی کبھی اس انگریز کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ منشی جی جُرم سے انکار کردیں۔ انہوں نے صاف جواب دیا کہ مَیں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ حق گوئی اور صداقت پسندی کی حد ہو گئی کہ آپ نے جان دے دی، مگر جھوٹی بات سے زبان کو ملوث کرنا پسند نہیں کیا۔ سچ ہے:

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر | گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

آپ کی تاریخ شہادت حسب ذیل کہی گئی ہے:

کی بغاوت ہوئے قتل آہ | شہادت کا رتبہ ملا بالیقیں
مجھے فکر تھی ان کی تاریخ کی | کہ ہاتف نے مجھ سے کہا اے قویں

یہ مظلوم بے کس کی تاریخ ہے
ہوا مسند آرائے خلدِ بریں
۱۲ھ ۷۴

(۳)

مولوی رضی اللہؒ

ایمان نہیں کھوسکتا، جان دینا آسان ہے

مولوی رضی اللہ بدایوں کے صدیقی شیخ تھے۔ مولوی صاحب سے کارمیکل نے پڑھا تھا۔ جب وہ گرفتار ہوکر اُس کے سامنے پیش ہوئے، اُس کے استفسار پر مولوی صاحب نے شرکتِ ہنگامہ کا اقبال کیا۔ اُس نے مقدمہ ملتوی کر کے دوسرے دن پر رکھا، اور چاہا کہ مولوی صاحب انکار جرم کریں۔ مگر دوسرے دن پھر پیشی کے وقت مولوی صاحب نے پچھلے بیان سے سرِ مو فرق نہیں کیا۔ سزائے موت کا حکم ہوا۔ جس وقت گولی کے نشانہ کے لیے پیش ہوئے۔ اُس وقت کارمیکل نے کہا کہ اگر آپ اس وقت بھی انکار کردیں تو آپ کی جان بچادوں۔ مولوی صاحب نے جواب دیا۔ کیا میں تمہاری وجہ سے اپنا ایمان و عاقبت خراب کرلوں؟ نہایت خندہ پیشانی سے جان، جانِ آفریں کے سپرد کردی۔

(۴)

چودھری تفضّل حسین

چودھری تفضّل حسین صاحب ولد چودھری محمد عظیم فاروقی شیخ محلّہ چودھری سرائے بدایوں۔ چودھری صاحب انگریزی تسلط ہونے پر روپوش ہوگئے۔ ایک گھوڑے پر سوار جنگلوں میں گھومتے پھرتے۔ سائیس آبادی میں جاکر کھانے کا انتظام کرلاتا۔ گھر جائداد وغیرہ سب نیلام ہوگئی۔ عام معافی میں ظاہر ہوئے ۱۸۹۲ء میں انتقال ہوا۔ اس خاندان کی بڑی ریاست تھی جو ختم ہوگئی۔

عجیب اتفاق ہے، تفضّل حسین نام کے تین بزرگ، تینوں جرم بغاوت میں ماخوذ۔ مگر نتیجے مختلف رہے۔
مولوی تفضّل حسین صاحب (قاضی ٹولہ) تحصیل دار، جرم بغاوت میں گولی کی ضرب سے شہید کیے گئے۔
حکیم تفضّل حسین صاحب (مولوی ٹولہ)۔ مقدمہ چلا اور رہائی پائی۔
چودھری تفضّل حسین۔ عام معافی کی وجہ سے بچے۔

(۴)

خسر داماد دونوں شہید

ایک دن کی بیاہی صاحبزادی بیوہ

سید محمد شاہ ولد سید حیدر محی سرائے کے سادات میں سے تھے۔ یہ محلہ بدایوں کا ایک محلہ ہے مگر حدود میونسپلٹی سے باہر ہے۔ اس کی آبادی ۱۳۱۷ ہے۔ سادات کے دو گروہ ہیں۔ ایک زیدی سید اور دوسرے خضر خانی۔ سید محمد شاہ کا تعلق آخر الذکر سادات سے ہے۔ یہ لوگ سید علاؤ الدین آخری سید بادشاہ جو بدایوں میں سکونت پذیر ہو گیا تھا، اس کی نسل سے ہیں۔ مشہور مفتی محمد عوض بریلوی (روہیل کھنڈ) کے نواسے تھے۔ مفتی صاحب کی شہرت علاوہ ان کے علم و فضل کے اپریل ۱۸۱۶ء کے ہنگامہ کی وجہ سے تھی جو ۱۸۱۶ء کے ریگولیشن ہاؤس ٹیکس پر حکومت سے ہوا تھا۔ سید صاحب کے صرف ایک لڑکی حسینہ نامی تھی۔ شام کو اس کا نکاح ہوا۔ صبح کو سید محمد شاہ معہ داماد کے گرفتار ہو کر گولی سے اڑا دیے گئے۔ سید صاحب نے عین نماز میں جان دی۔

(۵)

شیخ مسیح الدینؒ

سزائے بید اور الا اللہ پر مزید سزا

بید کی سزا میں صرف ایک نام شیخ مسیح الدین ولد شیخ غلام محمد کا معلوم ہوا ہے ہنگامہ سے قبل مختاری کرتے تھے۔ الزامِ بغاوت میں گرفتار ہوئے۔ ساٹھ بید لگے۔ آخری ضرب بید پر الا اللہ کہا۔ اس پر بدبخت نے دس بید اور لگوائے۔ بے ہوش ہو گئے۔ ۱۹۲۲ء میں انتقال کیا۔

(۶)

جنرل نیاز محمد خاں

جنرل نیاز محمد خاں نہایت بہادر اور دلیر، بات کے پکے اور غیور تھے۔ ۱۹ اپریل کی شکست کے بعد بدایوں چھوڑ کر بریلی چلے گئے۔ جنرل نے اپنے زمانہ قیام بدایوں میں ایک مقامی شخص سے ایک گھوڑا خریدا تھا۔ بیچنے والے کو خیال ہوا کہ اب انگریز آ گیا۔ خدا جانے میں دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے مصیبت میں مبتلا ہوں۔ اپنے چند اعزہ کو لے کر نکا۔ شہر پر سید راہ ہوا۔ جنرل کے ہمراہیوں نے چاہا کہ دارو گیر کریں۔ جنرل نے فوراً ہمراہیوں کو مزاحمت سے روک کر گھوڑا مالک سابق کو دے دیا اور قیمت کی بابت ایک لفظ بھی زبان پر نہ لائے۔

جنرل فرار ہو کر مکہ معظمہ گئے۔ ۱۸۷۲ء میں نواب جونا گڑھ کی ملازمت کی۔ بمبئی کسی ضرورت سے آئے تھے، انگریز کے پنجہ میں آ گئے۔ مقدمہ بدایوں میں چلا۔ اس وقت مسٹر ایم ڈبلیو سندرس کلکٹر بدایوں (۱۸۷۳ء لغایت ۱۸۸۱ء) تھا۔ منجانب حکومت پیروی مقدمہ مسٹر کار میکل نے کی (جو اس وقت بورڈ آف ریونیو کے ممبر تھے) جنرل کی طرف سے مولوی طفیل احمد صاحب وکیل پیش ہوئے (مولوی طفیل احمد صاحب انہیں مولوی رضی اللہ تحصیل دار کے فرزند ارجمند تھے جن کو بغاوت کے الزام میں گولی ماری گئی تھی) جنرل نیاز محمد خاں کو سزائے موت کا حکم ہوا۔ عدالت اپیل سے سزائے موت کا حکم حبسِ دوام بعبور دریائے شور سے مبدل کر دیا گیا۔

(۷)

بدر الاسلام عباسی

بدر الاسلام عباسی بدایوں کے عباسی خاندان سے تھے۔ دورِ حاضر کے اس خاندان کے ممتاز رکن قاضی عبدالسلام (المتوفی ۱۲۸۹ھ) جنہوں نے قرآن کریم کی نظم تفسیر زاد الآخرۃ لکھی۔ ریاست رام پور کے قاضی رہے۔ ان کے خلف الرشید قاضی شمس الاسلام (المتوفی ۱۳۰۷ھ) بے حد متجر قاضی ریاست رام پوری تھے۔ عباسی صاحب نے ایک نظم دورانِ ہنگامہ میں لکھی جس کا ایک مصرعہ تھا ؏

سر کمپنی کا کٹ کے بکا پاؤ آنے میں

یہ جرم تھا جس کی سزا موت تجویز ہوئی۔

مراد آباد(۳۴۴)

اس زمانہ میں مسٹر سی۔ بی ساندرس مجسٹریٹ، مسٹر جے۔ جے۔ کمیل جوائنٹ مجسٹریٹ، اور مسٹر جے کرا کرافٹ ولسن جج تھے۔ آخر الذکر چونکہ اس ضلع میں سترہ برس سے تعینات تھے۔ لہٰذا وہ ضلع اور باشندگانِ ضلع کے حالات سے پوری طرح باخبر تھے اور جب صورتِ حال زیادہ تشویش ناک ہوگئی تو تمام ضلع کا انتظام انہیں کے سپرد کر دیا گیا۔

مراد آباد میں قاضی عصمت اللہ صاحب فاروقی کی اولاد میں نواب مجدالدین خاں عرف نواب مجوخاں، نواب شبیر علی خاں صاحب ولد ورالملک نواب دوندے خاں کے پوتے نواب عباس علی خاں اور اسد خاں وغیرہ مولانا کفایت علی صاحب کافی اور مولانا وہاج الدین صاحب عرف مولوی منو، سرکردہ لوگوں میں سے تھے۔

دہلی کے انقلاب کی خبریں اگرچہ ۱۲رمئی ہی سے پہنچنی شروع ہوگئی تھیں مگر یہاں ایک ہفتہ بعد ۱۹رمئی کو حرکت شروع ہوئی۔

نواب رام پور بہت سختی سے انگریزوں کے حامی تھے مگر باشندگانِ رام پور کی ایک بہت بڑی جماعت انگریزوں سے متنفر اور انقلاب کے لیے بے چین تھی۔ وہ رام پور میں کوئی اقدام نہ کر سکی تو اُس کے تقریباً دو سو افراد مراد آباد پہنچے اور علمِ انقلاب بلند کر دیا۔ ۱۹رمئی کو مراد آباد کا جیل خانہ توڑا گیا۔(۳۴۵) مولوی وہاج الدین صاحب عرف مولوی منو صاحب اُن کے قائد تھے۔ ۳رجون کو پلٹن ۲۹ نے بھی بغاوت کر دی۔

قیامِ حکومت

جب انگریز مراد آباد سے بھاگ کر نینی تال اور میرٹھ چلے گئے، تو نواب مجدالدین عرف مجوخاں حاکمِ مراد آباد مقرر ہوئے۔ نواب شبیر علی خاں فوج کے جرنیل مقرر ہوئے۔ اسد علی خاں ہندی توپ خانہ کے افسر مقرر ہوئے۔ مولوی کفایت علی کافی صدرِ شریعت بنائے گئے۔ انہوں نے اور مولانا وہاج الدین صاحب عرف مولوی منو نے مسلمانوں میں جہاد کی روح پھونکی۔ شہر میں ہر جمعہ کو بعد نماز انگریز کے خلاف وعظ ہوتا تھا۔ جس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ڈسٹرکٹ گزیٹر مراد آباد میں کہا گیا ہے کہ:

> ”مسلمانوں نے من حیث القوم ضلع بھر میں برٹش گورنمنٹ سے اپنی مخالفت کو نہایت صاف اور صریح طور پر ظاہر کیا ہے۔ روہیل کھنڈ کے دوسرے اضلاع کی طرح مراد آباد کے ضلع میں بھی غیرتِ مذہبی اور انگریزوں کی ہر بات سے نفرت کے جذبات نے مسلمانوں کو عام بغاوت پر آمادہ کر دیا تھا۔“

غرض مراد آباد پوری طرح بیدار تھا۔ مولانا کفایت علی نے نشر واشاعت کے سلسلہ میں کافی کام کیا۔ فتویٰ جہاد کی نقول دوسرے مقامات پر بھجوائیں بلکہ بعض مقامات پر خود تشریف لے گئے۔ آنولہ ضلع بریلی میں خاص اسی مقصد کے لیے ہفتہ عشرہ قیام کیا تھا۔ حکیم سعید اللہ ابن عظیم اللہ کے یہاں ٹھہرے۔ مولانا کافی آنولہ سے بریلی پہنچے۔ خان بہادر خاں سے مشورہ کیا۔

نواب رام پور کا دخل

نواب رام پور یوسف علی خاں صاحب نے انگریزوں سے پورا روہیل کھنڈ فتح کر لینے کی اجازت چاہی تھی۔ مگر مجبوری اور محتاط انگریز اس وقت بھی اس سخاوت پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے صرف ضلع مراد آباد فتح کر لینے کی اجازت دی۔ چنانچہ نواب صاحب نے اپنے چچا عبدالعلی خاں اور حکیم سعادت علی خاں کو بھیج کر مراد آباد والوں کو اپنے حق میں ہموار کرنا چاہا۔ کچھ کامیابی نہ ہوئی تو ۲ رجون کو خود نواب یوسف علی صاحب مراد آباد پہنچے۔ وہاں نواب مجو خاں کے اقتدار کو ناقابل تسخیر دیکھ کر ان کے اقتدار سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی یعنی اپنی طرف سے بھی نواب مجو خاں ہی کو ناظم ضلع تسلیم کر لیا۔ ان کے علاوہ چند افسر اپنی طرف سے مقرر کیے۔ حکیم سعادت علی خاں صاحب کو جج، نیاز علی خاں کو ڈپٹی کلکٹر، موسیٰ رضا کو کوتوال اور غلام بشیر پسر موسیٰ رضا کو جیلر مقرر کیے۔

جنرل بخت خاں کا مراد آباد سے گذرنا

نواب رام پور کی مداخلت حاکم روہیل کھنڈ خان بہادر خاں کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ ان کو مولانا کافی کے ذریعہ حالات کا علم ہوا تو نواب مجو خاں کی امداد کے لیے جنرل بخت خاں کو روانہ کیا۔ یعنی یہ طے کر دیا کہ جنرل بخت خاں دہلی جاتے ہوئے مراد آباد قیام کریں۔ چنانچہ ۹ رجون کو جنرل بخت خاں اپنی فوج کے ساتھ مراد آباد پہنچے۔ نواب رام پور میں مقابلہ کی طاقت نہیں تھی، انہوں نے اپنا انتظام اٹھالیا، اپنے افسر واپس بلالیے۔ اب نواب مجو خاں کو آزادانہ انتظام کا موقع ملا۔ مجاہدین کی سرگرمیاں بھی تیز ہوگئیں۔ نواب مجو خاں نے جنرل بخت خاں کی فوجوں کے لیے بار برداری کا انتظام کیا۔ ۱۷ رجون ۱۸۵۷ء کو یہ فوج دہلی روانہ ہوگئی۔ اب نواب رام پور نے نواب مجو خاں اور عباس علی خاں نبیرہ نواب دوندے خاں میں تفرقہ ڈلوا دیا۔ عباس علی خاں نے خود حاکم بننے کا ارادہ کیا۔ مگر خان بہادر خاں نے فوراً تمام حالات سے باخبر ہوکر بریلی سے مصالحت کے لیے خاص آدمی بھیجے اور تمام نشیب و فراز سمجھائے۔ موضع بیجنا کے باشندوں نے بھی مصالحت کے لیے زور دیا۔ آخر دونوں کا اختلاف ختم ہوگیا۔

ریاست رام پور کی دوبارہ مداخلت

جنرل بخت خاں کی فوج کی روانگی کے بعد ۲۴ رجون کو دوبارہ نواب رام پور نے عبدالعلی خاں اور حکیم سعادت علی خاں کو مع فوج مراد آباد بھیجا۔ ان لوگوں نے نواب مجو خاں سے پھر مصالحت کر لی اور ان کو سنبھل کی

نظامت سپرد کردی۔ نواب مجو خاں کے حاکم سنبھل مقرر ہوتے ہی صاحب سنگھ اور چھدو لکھوری کے جاٹوں نے سنبھل اور اس کے گرد و نواح میں تحریک کو قوت دی حسن پور، ٹھاکر دوارہ میں جنگی خاں و مروان خاں اور بیلوں روز پور میں تکا سنگھ اہیر نے تحریک کو مدد دی۔

واقعہ کدو خانی

۳ / اگست ۱۸۵۷ء کو مراد آباد میں ایک واقعہ پیش آیا۔ جس کو واقعہ کدو خانی کہا جاتا ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ رام پوری فوج کا ایک ملازم کدو خرید رہا تھا۔ ایک مراد آبادی مسمی محمد عثمان سے تکرار ہوگئی جھگڑا بڑھا۔ عثمان خاں زخمی ہوا۔ بدلے میں اس کے اقربا نے فوجی کو مار ڈالا۔ حکیم سعادت علی خاں نے فساد کو روکنے کی کوشش کی اور عثمان خاں کے علاج کا حکم ہوا۔ ہنوز وہ کوتوالی نہ پہنچا تھا کہ راستہ میں فوجیوں نے حملہ کرکے اُسے قتل کردیا۔ اب تو اہالیانِ مراد آباد (مجاہدین) اور رام پوری فوج کی چل گئی۔ بہت سے رام پوری مارے گئے۔ آخر بمشکل امن قائم ہوا۔

شہزادہ فیروز شاہ کی آمد

نواب رام پور کا مراد آباد میں دخل تھا۔ عبدالعلی خاں انتظام سنبھالے ہوئے تھے۔ شہزادہ فیروز شاہ ۷/ رمضان ۱۲۷۳ھ مطابق ۲۲ / اپریل ۱۸۵۷ء کو براہ سنبھل مراد آباد میں داخل ہوا، اور قریب عیدگاہ جنگل میں قیام کیا۔ مجاہدین کی ہمتیں بلند ہوگئیں۔ تدبیریں اور منصوبے تیار ہونے لگے۔ غلام ناصر خاں۔ موسیٰ رضا خاں اور مولوی شاہ علی، فیروز شاہ کے پاس پہنچے۔ شہزادہ نے کہہ دیا کہ راستہ بھول کر آ گیا ہوں، روزہ دار ہوں، بعد افطار روانہ ہوجاؤں گا۔ اسی دوران میں شہزادہ کی فوج سے مقابلہ ہوا۔ شہزادہ کی فوج اصول و قواعدِ جنگ سے واقف اور ماہر تھی۔ نواب رام پور کی فوج نے شہزادہ سے شکست فاش کھائی۔ سب سے پہلے غالب علی رسالدار بھاگا۔ فوج کے سربراہ موسیٰ رضا اور غلام ناصر بری طرح زخمی ہوگئے۔ راستہ میں مولوی شاہ علی نے شیوخ قصابان کے چودھری سے امداد چاہی۔ اس نے دین سے روگردانی اور فرنگی کی مدد کا طعنہ دیا۔ شاہ علی خفیف ہوئے۔ شہزادہ کی فوج مراد آباد میں پھیل گئی، انگریز کے ہمدردوں کی مرمت کی گئی۔ مجاہدین میں بڑی قوت پیدا ہوگئی۔ سولہ ہزار اشخاص نے بہ قسم شرعی محضرنامہ پر شرکت کے لیے دستخط کیے۔

شہزادہ فیروز سے جنگ

نواب رام پور نے ۲۳/ اپریل ۱۸۵۸ء کو دوبارہ شہزادہ کے مقابلہ پر فوج روانہ کی۔ مگر جھیرے کے پل تک پہنچتے پہنچتے فوج میں نصف آدمی رہ گئے حکیم نجم الغنی رام پوری مؤلف اخبار الصنادید نے دیکھنے والوں کی زبانی یہ روایت قلم بند کی ہے کہ سپاہی بندوق کا کندھا درخت کے تنے پر زور سے مارتے، وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا۔ پھر بندوق پھینک کر رام پور کی طرف لوٹ جاتے۔ غرض طلوع صبح کاذب سے قبل ریاست رام پور کی

فوج نے رام گنگا کے اس طرف کنارا کرلیا۔ شہزادہ فیروز شاہ ہوشیار تھا۔ اس کا انتظام خبر رسانی نہایت درست تھا۔ فوج کو ٹھیک کیا۔ اس کو مطلق خوف و ہراس نہ تھا۔ پانچ ہزار قواعد داں فوج اس کے ہمراہ اور تمام شہر مرادآباد مدد کو تیار۔ اُس نے تین مورچے قائم کیے۔ ایک شاہ بلاقی شاہ کے مزار کے پاس، ایک قلعہ پر اور تیسرا ان دونوں کے درمیان۔ ریاست کی فوج نے بھی تین حصے کر کے تینوں متذکرہ بالا مورچوں کے مقابل مدافعت کی تیاری کی۔ قلعہ کے مقابل کاظم خاں، مزار کے پاس حکیم سعادت علی خاں اور درمیانی مورچے میں عبدالعلی خاں متعین تھے۔ ۲۴ر اپریل ۱۸۵۸ء کو کاظم علی خاں کی فوج نے حملہ کیا۔ فیروز شاہ کی فوج نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ہنگامۂ جدال وقتال گرم ہوا۔ حکیم سعادت علی خاں کی فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ حکیم سعادت علی خاں، حسین بخش، یعقوب خاں نے شہزادہ پر دوسری جانب سے حملہ کر دیا۔ اوّل ابتری ہوئی، پھر فوج سنبھل گئی۔ شہزادہ کی فوج نے مصنوعی طور سے راہِ فرار اختیار کی۔ رام پور کی فوج نے مژدہ فتح سمجھ کر تعاقب کیا۔ کچھ دور جانے کے بعد فیروز شاہ کی فوج نے پلٹ کر حملہ کر دیا۔ نوابی فوج کو شکست فاش ہوئی۔ بڑے بڑے سردار کام آئے۔ آخر میں شہزادہ نے ایک پُر اثر تقریر کی اور جہاد کی ضرورت اور انگریزوں کے کرتوتوں پر روشنی ڈالی۔ مگر نوابی فوج پر کچھ اثر نہ ہوا۔ نواب کی فوج نے مجتمع ہو کر پھر حملہ کیا۔ قریب بارہ بجے فیروز شاہ نے میدان چھوڑ دیا کیونکہ اس کو اطلاع ملی کہ جنرل جانسن تازہ دم فوج سے آپہنچا ہے۔ حکیم سعادت علی خاں و حسین بخش رسالدار وغیرہ مرادآباد میں فاتحانہ طور سے داخل ہوئے۔ جنرل جانسن گورا فوج کی بھاری جمعیت کے ساتھ نجیب آباد سے مرادآ پہنچا۔ ۲۵ر اپریل ۱۸۵۸ء کو مرادآباد پر انگریزی عمل دخل پورے طور پر ہو گیا۔ رام پوری فوج واپس چلی گئی۔ اس کے بعد مسٹر انگلس مرادآباد پہنچا۔ اور مجاہدین کی داروگیر شروع ہوئی۔ کرنل کک نے شہر کی ناکہ بندی کر کے خانہ تلاشی اور گرفتاری شروع کی۔

انجام

انگریزی حکومت کی بحالی کے بعد ضلع مرادآباد میں سخت مظالم ہوئے۔ مجاہدین کو پھانسیاں دی گئیں، توپ سے اُڑایا گیا، گولیاں ماری گئیں۔ نواب مجو خاں کے متعلق تحریر ہے کہ آخر وقت میں بھی ایک مکان کی چھت پر بندوق چلاتے ہوئے معلوم ہوئے۔ سپاہی ہتھیار بند اُن کو پکڑنے گئے۔ انھوں نے بڑی دلیری سے چند کو تمنچے سے مارا، اور باقیوں کو تہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ آخر کار مزید اضافی امداد پہنچی اور وہ گولی سے مارے گئے تھے۔ مولانا کفایت علی کافی کو پھانسی دی گئی۔ جائدادیں ضبط کی گئیں مکانوں کو آگ لگائی گئی۔ بقول سرسید احمد مرادآباد ایک بڑا غمکدہ قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا۔ چنانچہ مولانا حالی حیاتِ جاوید میں ارقام فرماتے ہیں۔ جائدادیں ادنیٰ ادنیٰ شبہ پر ضبط ہوتی تھیں اور انگریزی حکام نیچرل طور پر ہندوستانیوں کی طرف سے بدگمان اور نہایت غیظ و غضب میں بھرے ہوتے تھے۔ خصوصاً ضلع مرادآباد پر گورنمنٹ کا سخت عتاب تھا۔ اور انگریزی افسران کا یہاں اعتدال پر رہنا سخت دشوار تھا۔

واقعاتِ امروہہ

امروہہ میں میرٹھ اور دہلی کی خبریں پہنچنے کے بعد ۱۷ر مئی ۱۸۵۷ء کو خاندان دیوان محمود اور خاندان درویش علی خاں منصب شیخ ہزاری کے سربرآوردہ حضرات نے درگاہ شریف ولایت شرف الدین میں مجلس مشاورت طلب کی جس میں عمائد و اکابرین شہر علماء اور اہل الرائے حضرات شریک تھے۔ انقلاب میں حصہ لینا طے ہوا۔ ۱۹ر مئی کو جیل خانہ مراد آباد کو لوٹنے کے بعد جب سید گلزار علی[۳۴] ابن اکبر علی ایک جتھہ کے ساتھ راتوں رات مراد آباد پہنچے۔ تو ان کے پہنچنے کے بعد پھر مشورہ ہوا۔ ۲۰ر مئی کو تھانہ و تحصیل پر قبضہ کر لیا۔ اول انگریزوں کی طرف سے گورکھا فوج بھیجی گئی۔ بعض امروہہ کے لوگوں نے انگریزوں کی مدد کی۔

پھر ولسن خود مراد آباد سے امروہہ پہنچا۔ اُس نے سید گلزار علی کے مکانات منہدم و مسمار کرا دیئے۔ ولسن کے لیے اس وقت امروہہ میں ٹھہرنا ناممکن تھا۔ اس کو مجبوراً بھاگنا پڑا تو اس کی روانگی کے بعد تحریک آزادی نے بڑھنا شروع کیا۔ اب باشندگانِ امروہہ نے بادشاہ دہلی کے حضور میں عرضداشت بھیجی۔ جواب میں کچھ دیر ہوئی تو شبیر علی خاں ولد نذیر علی خاں، شیخ بشارت علی خاں ولد مہر علی خاں نبیرگان درویش علی خاں، گلزار علی ولد اکبر علی، شیخ الٰہی بخش، محمد سبحان علی معافیدار۔ شیخ بشارت علی خاں نے (دوبارہ برائے یاددہانی) عرضیاں بھیجیں۔ اُن کے جواب میں شاہی نُسخے موصول ہوئے۔ جن میں ان لوگوں کی ہمت افزائی کی گئی، اور تحریک کو کامیاب بنانے کا مشورہ دیا گیا۔ چنانچہ امروہہ میں حکومتِ خود اختیاری کا نفاذ ہوا۔ شبیر علی خاں و گلزار علی خاں سرکردہ مجاہدین تھے۔ حریت پسندوں نے اپنا رابطہ خان بہادر خاں (والی روہیل کھنڈ) سے قائم کیا۔ خان بہادر خاں نے اپنی طرف سے ایک صاحب قران خاں کو امروہہ کا نگران مقرر کیا۔ ادھر نواب رام پور اپنی کوششوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے اپنے آدمیوں کے ذریعہ سازشوں کا جال بچھا دیا ع

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم ۔۔۔ کہ بامن آنچہ کرد آں آشنا کرد

نواب رام پور کی طرف سے سید ظہور حسین (ناظم عارضی) اصغر علی خاں (ناظم مستقل) محب علی تحصیلدار، یعسوب الدین تھانے دار، اور کریم بخش عباسی (کوٹ گشت) مقرر ہوئے اور اس کے علاوہ بہت سے اشخاص نے انگریز کی مخبری کے فرائض انجام دیئے جس کے صلہ میں ان کو اعزاز و اکرام و زمینداریاں ملیں۔

گلزار علی خاں کے سپرد فوج کا انتظام کیا۔ اس لائق اور جانباز مجاہد نے فوج کی بڑی اچھی تنظیم کی۔ ماڑے خاں اُن کے شریک تھے۔ ۱۹ر نومبر ۱۸۵۷ء کو رام پور کی فوج سے (جو حکیم سعادت علی خاں کی زیر سرکردگی تھی) گلزار علی خاں کا مقابلہ ہوا۔ بڑے زور کا معرکہ ہوا۔ مجاہدین کے جذبہ و جوش سے مقابل گھبرا گئے۔ لیکن سعادت علی خاں کی فوج کامیاب ہوئی اور مراد آباد کے ساتھ ساتھ امروہہ پر پھر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ پھر تو پھانسیاں دی گئیں۔ توپوں سے اُڑائے گئے، مکانات کو آگ لگائی گئی اور بہت سے لوگوں کو عبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ شبیر علی خاں کالے پانی پہنچے۔ گلزار علی روپوش ہوئے اور ضلع بریلی کے گھنے جنگلوں میں عمر گذار دی۔

سینکڑوں میں سے چند

نواب مجوخاں (مرادآباد) اور چودہری عبدالقادر عرب

اصل نام مجدالدین احمد عرف مجو۔ والد کا نام محمد الدین احمد خاں، نبیرہ قاضی عصمت اللہ صاحب فاروقی۔ قاضی عصمت اللہ عہد عالمگیری کے ایک امیر تھے۔ مختلف صوبوں کے حاکم رہے۔ نواب مجدالدین خاں جاگیردار وسیع حوصلہ رئیس تھے۔ عمائدین مرادآباد کا آپ کے یہاں اجتماع رہتا۔ خصوصیت سے ہر ہفتہ اعلیٰ پیمانے پر دعوت ہوتی جس میں عمائدین شہر اور علماء وفضلاء خاص طور پر مدعو ہوتے تھے۔ ان کے بھائی نواب سعید الدین خاں تھے۔ مرزا غالب مرادآباد گئے تو انہیں کے یہاں قیام فرمایا۔

نواب مجوخاں کے مخلص دوست چودہری عبدالقادر عرب تھے۔ جن کی کشتی کی شہرت دُور دُور تھی۔ جنگ آزادی میں نواب مجوخاں کے ساتھ رہے۔ جب انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوا تو نواب مجوخاں تہ خانوں میں چھپ گئے۔ مگر چودہری صاحب کھلے بندوں محلہ اصالت پورہ میں مقیم رہے۔ انگریزی افسر پہنچے تو خود زنان خانہ سے نکل کر اپنے آپ کو سپرد کر دیا۔ اور نواب مجوخاں کو بھی کہلا بھیجا کہ روپوش رہنا بہادری نہیں ہے۔ چنانچہ نواب صاحب بھی باہر نکلے اور خود کو گرفتار کرادیا۔ مقدمہ چلا۔ سزاء موت تجویز ہوئی۔ تمام جائداد واملاک ضبط ہوئیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کو چونے کی بھٹی میں جلا دیا گیا اور مرادآباد میں یہ بھی مشہور ہے کہ نواب مجوخاں کو ہاتھی کے پاؤں سے باندھ دیا گیا۔ [۳۴۷]

رؤساء مرادآباد کی حویلیوں کے نشانات اب تک موجود ہیں۔ باوجود یہ کہ ایک ایک حویلی میں پورا پورا محلّہ آباد ہو گیا ہے، پھر بھی کچھ حصے باقی ہیں تو اتنے وسیع کہ عظیم الشان دیوان خانوں کے سامنے بلند چبوترے اور نیچے کے حصے میں پائیں باغ اب تک باقی ہیں۔ [۳۴۸]

مولانا کفایت علی صاحب کافی شہیدؒ [۳۴۹]

عالم وفاضل طبیب [۳۵۰] اور قادر الکلام شاعر [۳۵۱] تھے۔ خانوادۂ سادات کے ایک رکن تھے۔ مرادآباد اصل وطن تھا۔ حضرت شاہ ابوسعید صاحب مجددی [۳۵۲] رام پور سے علم حدیث کی تکمیل کی۔ اسی علم شریف سے بے حد شغف تھا۔ خاص طور پر آنحضرتؐ کی سیرت مقدسہ سے عشق تھا۔ سچ یہ ہے کہ عشق رسولؐ کے انہیں جذبات نے صورتِ شعر اختیار کرلی تھی۔

یہی آپ کی شاعری تھی۔ آپ خود فرماتے ہیں:

بس آرزو یہی دلِ حسرت زدہ کی ہے ‏ ‏ ‏ سنتا رہے شمائلِ احوالِ مصطفےٰ
ہے سیدِ دوجہاں وہ جو کوئی لیل ونہار ‏ ‏ ‏ نعتِ اوصافِ رسول اللہ کا شاغل ہوا

آپ صاحبِ تصانیف ہیں۔ مگر موضوعِ تصانیف احادیث مقدسہ ہیں۔ آپ کی مشہور (مگر آج کل نایاب) تصانیف یہ ہیں:

بہارِ خلد، ترجمہ شمائل ترمذی شریف منظوم۔ نسیم جنت۔ مجموعہ چہل حدیث مع تشریح منظوم۔ خیابانِ فردوس ترجمہ منظوم ترغیب اہل سعادت مصنفہ حضرت مولانا عبدالحق صاحب محدث دہلوی متعلق بہ فضائل درود شریف۔

حج بیت اللہ اور زیارتِ حرمِ مدینہ منورہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا بے حد شوق تھا۔ آپ کے دیوان "دیوان کافی" کی متعدد نظموں میں اس شوق کا اظہار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ تمنا پوری کی۔ تو ایک مثنوی اس سفر کے متعلق بھی لکھ دی جو "تجمل دربار رحمت بار" کے عنوان سے منشی عبدالرحمٰن صاحب شاکر مالک مطبع نظامی کانپور کی کوشش سے طبع ہوئی۔

ان کے علاوہ مولود بہاریہ۔ جذبہ عشق۔ (۴۰۳) اوقاتِ نحو وصرف، بھی آپ کی تصانیف ہیں۔

مولانا کافی کا کچھ عرصہ آگرہ میں قیام رہا ہے۔ جب ۱۸۵۷ء کی تحریک حریت مراد آباد میں نمودار ہوئی تو آپ صفِ اوّل کے مجاہدین میں پیش پیش تھے۔

انگریزی حکومت ختم ہوجانے کے بعد جب نواب مجدالدین عرف نواب مجوخاں کی زیر سرکردگی آزاد حکومت قائم کی گئی تو آپ صدرالشریعت قرار دیئے گئے۔ آپ کے یہاں مقدمات کا فیصلہ شرعی احکام کے مطابق ہوتا تھا۔

اسی اثناء میں جب مراد آباد میں نواب رام پور کو بالادستی قائم ہوئی تو آپ نے انگریزوں کے خلاف ایک فتویٰ جہاد مرتب کیا۔ اس کی نقلیں آپ نے دوسرے مقامات پر بھجوائیں بلکہ بعض مقامات پر آپ خود تشریف لے گئے۔ آنولہ (۴۰۴) ضلع بریلی مقامات میں خاص اسی مقصد کے لیے ایک ہفتہ سے زیادہ قیام فرمایا۔ حکیم سعد اللہ ولد حکیم عظیم اللہ صاحب آپ کے ہم سبق ساتھی تھے۔ انہیں کے یہاں آپ کا قیام رہا۔ حکیم صاحب آنولہ میں تحریکِ آزادی کے خاص رکن تھے۔ مولانا کافی آنولہ سے بریلی پہنچے۔ وہاں نواب خان بہادر خاں اور امام المجاہدین مولانا سرفراز علی صاحب سے مشورے ہوئے۔ جنرل بخت خاں کی ماتحتی میں جو فوج بریلی سے دہلی جارہی تھی، اسی فوج کے ساتھ آپ مراد آباد واپس ہوئے۔

گرفتاری اور پھانسی

۲۵/اپریل ۱۸۵۸ء کو مراد آباد پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوا۔ مولانا کافی کچھ دنوں محفوظ رہے۔ ۳۰/اپریل ۱۸۵۸ء/۱۶/رمضان المبارک ۱۲۷۴ھ کو مولانا گرفتار ہوئے۔ مولانا پر مختلف الزامات عائد کیے گئے

اور ضابطہ کی کارروائی کے بعد پھانسی کا حکم صادر کردیا گیا۔ مولانا کافی نے جیسے ہی حکم سنا، نہایت خوشی کا اظہار کیا اور جب مولانا کو پھانسی کے لیے لے جایا گیا تو آپ کی زبان پر ایک تازہ نظم تھی۔ جو بڑے ترنم سے بلند آواز سے پڑھ رہے تھے۔ نظم یہ ہے۔

کوئی گل باقی رہے گا، نے چمن رہ جائے گا	پر رسول اللہ کا دینِ حسن رہ جائے گا
ہم صفیرو باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا	بلبلیں اڑ جائیں گی، سونا چمن رہ جائے گا
اطلس وکمخواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو	اس تنِ بے جان پر خاکی کفن رہ جائے گا
نامِ شاہانِ جہاں مٹ جائیں گے لیکن یہاں	حشر تک نام ونشانِ پنجتن رہ جائے گا (۴۰۵)
جو پڑھے گا صاحبِ لولاک کے اوپر درود	آگ سے محفوظ اس کا تن بدن رہ جائے گا
سب فنا ہوجائیں گے کافی ولیکن حشر تک	نعتِ حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائے گا

حضرت مولانا کافیؒ کو جیل مراد آباد کے پاس مجمع عام کے سامنے پھانسی دی گئی اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔ رحمۃ اللہ ورضی عنہ

مولانا وہاج الدین صاحب مرادآبادی

مولانا حمید الدین صاحب عرف چھوٹے مولوی معافیدار حضرت مولانا وہاج الدین صاحب کے ہمشیر زاد تھے۔ مولانا حمید الدین صاحب کے نواسے عزیز احمد صاحب قادری چشتی نے اپنے نانا صاحب کی زبانی ۱۸۵۷ء کے قصے سنے تھے۔ اُن میں حضرت مولانا وہاج الدین صاحب کے مجاہدانہ کارنامے خاص اہمیت رکھتے تھے۔ عزیز احمد صاحب نے اُن کو قلمبند فرمایا جو روزنامہ الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن مؤرخہ ۲۰ رمئی ۱۹۵۷ء میں شائع کیے گئے۔ ان صفحات میں عزیز احمد صاحب کا یہی مضمون پیش کیا جارہا ہے اس میں مولانا وہاج الدین صاحب کے حالات کے علاوہ اور باتیں بھی ہیں جو ایک مؤرخ کے لیے قابلِ قدر ہیں۔

شہید ملت فدائے قوم مولوی وہاج الدین عرف مولوی منوؒ خلف مولوی جمیل الدین ابن مولوی وجیہ الدین ابن مفتی شیر محمد مرادآباد کے ممتاز، باا ثر، قوم پرور اور جلیل القدر رئیس تھے۔ نہایت ہی فیاض، سیر چشم اور مہمان نواز تھے۔ اُن کا دسترخوان فراخ تھا۔ مذہب کے معاملے میں آہنی ستون، عبادت گذار، بے مثل شجاع۔ اخلاق کی بلندی کا یہ عالم تھا کہ ہر اعلیٰ وادنےٰ کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ سب سے یکساں ملتے جلتے۔ ہر ایک کے دکھ درد میں برابر شریک رہتے تھے اور ضرورت مندوں اور غرباء کی دل کھول کر امداد کرتے اور اُن کی تقریبوں اور محفلوں میں بغیر کسی بلندی وپستی کا خیال کرتے ہوئے شریک ہوتے۔ مختصر یہ کہ بہت بڑے جتھے بند او مقتدر رئیس ابن رئیس تھے۔ لندنی سرکار سے خصوصی اعزاز بھی ملا ہوا تھا۔ شہر کے حکام نہایت عزت واحترام کرتے تھے، اور اُن سے ملنا باعث فخر وناز سمجھتے تھے۔

مولوی صاحب کو عربی، فارسی اور اردو علوم کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے انگریزی زبان اپنے حقیقی چچا مولانا محمد اسمٰعیل کی لندنی بیوی سے جو ایک یورپین مہذب خاندان سے تعلق رکھنے والی تھیں، پڑھی تھی۔

مولانا محمد اسمٰعیل لندنی کے کوئی نواسہ اور پوتہ نہ تھا۔ صرف ایک لڑکی تھی، اور ایک ہی نواسی تھی۔ نواسی کا نام شہر بانو تھا۔ چونکہ مولانا کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی، اس لیے اُن کی وفات کے بعد اُن کے بڑے بھتیجے مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو کو دولتِ انگلیشیہ سے خلعت کے ساتھ ساتھ وہ اعزازی نشان بھی عطا کیا گیا تھا جو لندن سرکار سے اُن کے چچا مولانا محمد اسمٰعیل لندنی کو ملا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب کوئی انگریز مولوی منو صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے اُن کے دولت کدہ پر حاضری دینے آتا تو سلام کے بعد بھی مؤدب کھڑا رہتا۔ جب مولوی صاحب مذکور اعزازی نشان کو تن سے جُدا کر کے الگ رکھ دیتے تو وہ بیٹھ کر گفتگو کرتا۔ غرض مولوی صاحب شہر کی ناک تھے۔

مولوی صاحب مذکور کے تین بھائی اور ایک بہن تھی جو آزادی کی جنگ میں اُن کے دوش بدوش رہے، اُن کے نام یہ ہیں: مولوی سراج الدین، مولوی منہاج الدین، مولوی عبداللہ اور فضیلت النساء۔

فضیلت النساء کی شادی مولوی افضل الدین کے ساتھ ہوئی تھی جو مفتی بہاء الدین کے پوتے تھے۔ آپس کے اتحاد اور اتفاق کی بناء پر صحرائی اور سکنائی جائداد مشترک تھی اور سب بھائی اور بہن یکجا طور پر محلہ رفعت پورہ میں رہتے تھے۔ جائے سکونت گھیر منو کے نام سے مشہور تھی۔ مقامِ سکونت کے قریب ایک مسجد بھی ہے، جو عہدِ حاضر میں مولوی مختصر صاحب کے نام سے مشہور ہے۔ اس وقت ان مقامات پر مولوی منو کے خاندان کا کوئی فرد آباد نہیں۔ عرصہ سے چونا پز اور دندان ساز وغیرہ مقام مذکور کو خریدنے کے بعد آباد ہو گئے ہیں۔ مولوی وہاج الدین صاحب کے یہاں روزانہ شہر کے شرفاء اور اہلِ علم جمع ہوا کرتے تھے۔ اُن کا حلقۂ احباب ذی علم لوگوں سے رہتا۔ جن میں سے چند کے اسماء گرامی یہ ہیں:

مولانا کافی صاحب، مولوی سرفراز علی صاحب، سید اکبر علی صاحب، سید گلزار علی صاحب اور مولوی وزیر علی صاحب۔

مولوی وجیہ الدین بھی کئی بھائی تھے۔ اُن کے ایک بھائی کے بیٹے قاضی محمد بخش صاحب شہر کے قاضی تھے۔ قاضی صاحب بھی شہر کے عمائدین میں سے تھے۔ قاضی صاحب کی اولاد میں قاضی محمد عباس، قاضی تجمل حسین، قاضی امداد حسین وغیرہ وغیرہ ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مولوی وہاج الدین عرف منو نے ایک قائد کی حیثیت سے انتہائی سرگرمی سے کام کیا اور متعلقہ اسکیم کے تحت پارٹیاں قائم کرنے کے لیے پوشیدہ طور پر بذاتِ خود اور نمائندوں کے ذریعہ سربرآوردہ لوگوں کو حصولِ آزادی کی اس تحریک میں شرکت کی دعوت دیتے رہے۔ چند روساء اُن کو اس کارِ نیک

میں پیش پیش دیکھ کر ساتھ ہو گئے اور اس طرح ایک بڑی جماعت وجود میں آ گئی۔

۱۹ رمئی کو مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو کی قیادت میں ضبط و نظم کے ساتھ حریت نوازوں کا ایک جم غفیر جیل خانہ کی طرف گیا۔ ہجوم نے مولوی منو صاحب کا اشارہ پاتے ہی جیل خانہ پاش پاش کر دیا۔ قائد نے سب سے پہلے پرچم لہرایا اور تمام قیدیوں کو آزاد کر کے اُن کے خورد و نوش اور دیگر ضروریات کا انتظام کیا۔ بعد ازاں ان کے حسب خواہش جس نے اس جماعت میں شامل ہونا چاہا شامل کیا، اور باقی لوگوں کو زادِ راہ دے کر خدا حافظ کہہ دیا۔ قائد نے شامل ہونے والے لوگوں کا ایک جتھہ بنا کر سید اکبر علی صاحب اور سید گلزار علی صاحب کی سپردگی میں اودھ کی سمت روانہ کر دیا۔ اس دوران میں جان کرافٹ ولسن حریت نوازوں کے مارچ کی خبر پاتے ہی روپوش ہو گیا۔

مراد آباد جیل خانہ ٹوٹنے کی خبر روہیل کھنڈ میں پہنچتے ہی عہدیداران کا سارا رعب و دبدبہ یخ بستہ ہو کر رہ گیا تھا۔ ان کی جس قدر بھی دہشت عوام کے دلوں پر تھی، یکسر غائب ہو گئی۔ مراد آباد سے ایک وفد قصبہ آنولہ بریلی بھیجا گیا۔ وفد کے صدر مولوی کفایت علی صاحب کافی تھے جنہوں نے اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی، جوانمردی، شجاعت اور دانش مندی سے سرانجام دیئے۔ پھر مراد آباد تشریف لے آئے۔ ریاست رام پور کی منجمد فضا میں حرکت پیدا کرنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ مگر فدائے قوم مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو ہی کی یہ قوم پروری، حب الوطنی اور شجاعت تھی کہ سر ہتھیلی پر رکھ کر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ خطرات کی اس وادی میں کود پڑے۔ وہ بے خوف ہو کر رام پور خاص اور گرد و نواح کے قصبوں اور دیہاتوں میں جلسے کرتے پمفلٹ پڑھ کر سناتے اور اس طرح اپنے سپوتوں کو بیدار کر کے جنگ آزادی کی تحریک میں شمولیت کی دعوت دیتے۔

مرزا ناظم بخت کے بیٹے اور فرخ سیرؒ بادشاہ کے نواسہ فیروز شاہ کا جب مراد آباد میں ورود ہوا تو شہر کے خواص اور عوام سب ہی نے شاندار طریقے پر استقبال کیا۔ مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو فیروز شاہ کے دست راست تھے۔ مولوی صاحب اور سید صاحب مذکور اور دیگر رؤسائے شہر ان کی ہر قسم کی معاونت کرتے رہے۔ شاہزادہ فیروز شاہ نے شہر کا گشت کیا اور فرداً فرداً اُن رؤسا کے یہاں بھی گیا جو جنگ آزادی میں شریک نہ تھے، اور اپنے دروازے مقفل کر چکے تھے۔

مراد آباد میں فیروز شاہ اور اس کی ہمراہ فوج کا پڑاؤ اس باغ میں ہوا تھا جس باغ کی کوٹھی میں کبھی آنتوں والا صاحب رہتا تھا۔ مقام مذکور اس سڑک پر واقع ہے جو سڑک گل شہید کے برف خانہ کے چوراہے سے بڑے اسٹیشن کو جاتی ہے۔

ریاست رام پور کے نواب حریت پسندوں سے الگ تھے۔ انگریزوں نے موقع کو غنیمت سمجھ کر پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ انگریزوں نے نواب رام پور کی کثیر فوج لے کر مراد آباد پر چڑھائی کر دی۔ شہزادہ فیروز شاہ کی سرپرستی میں مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو کے علم جہاد کے زیر سایہ مجاہدینِ جنگ آزادی نے نواب کی فوج

اور انگریزوں سے خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ حتیٰ کہ بعض خواتین مردانہ لباس زیب تن کر کے میدان میں آئیں اور مخالفین کے دانت کھٹے کر دیے لیکن ساز و سامان میں انگریزوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ بالآخر شکست ہوئی۔ انگریز شہر پر قابض ہو گئے۔ شاہزادہ فیروز شاہ سنبھل والی سڑک سے روانہ ہو کر کندرکی ہوتا ہوا قصبہ آنولہ سے گذر کر بریلی پہنچا۔ اگرچہ انگریزوں نے اس کا تعاقب کیا مگر فیروز شاہ کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔

انگریزوں نے برسرِ اقتدار آتے ہی شمعِ حریت کے پروانوں کی ایک طویل فہرست بنائی۔ فہرست میں اضافہ ہوتا رہا۔ گرفتاریاں شروع کر دی گئیں۔ محبانِ وطن کے لیے سزائے موت کا حکم جاری ہونے لگا۔ شہر کی مختلف سمتوں میں پھانسی گھر قائم کیے گئے۔ پھانسیوں کا مرکز سرائے پختہ کے سنبھلی گیٹ کے متصل رکھا گیا۔ جہاں جاں نثاروں کو آزادی سے پھانسیاں دی جانے لگیں۔ حریت کے پروانوں کے لیے کوئی قانون اور کوئی انصاف نہ تھا۔ جو شخص جس کا بھی نام لے دیتا، بس کو انتہائی بے رحمی سے پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا جاتا اور پھانسی کے بعد انہیں وہیں دفنا دیا جاتا تھا۔ شہدائے ملت کی یادگار میں اب بھی ایک محلہ آباد ہے جو گلِ شہید کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ ایک شخص نے جو مولوی وہاج الدین عرف مولوی منو کے دسترخوان کا نمک خوار تھا، مخبری کی خدمت انجام دی۔

رمضان المبارک کا مہینہ اور عصر و مغرب کے درمیان کا وقت تھا کہ فوجی دستہ نے مولانا کی قیام گاہ کا محاصرہ کر لیا۔ پہلے ہی نمک خوار مخبر آگے بڑھا۔ مولانا تنہا مکان میں تشریف فرما تھے۔ ان کو اپنی آمد کی خبر کرائی۔ مولانا وہاج الدین صاحب ان دنوں انتہائی محتاط تھے مگر آنے والے کا نام سنتے ہی اُن کی احتیاط اور وقت کی نزاکت، نرم دلی اور خلوص و ہمدردی کے نیچے دب گئی اور انہوں نے فوراً ہی صدر دروازہ کھول دینے کا حکم صادر فرما دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ساتھ ساتھ فوجی رسالہ بھی دیوان خانہ میں داخل ہوا، اور آزادی سے آگے بڑھا۔ اس پر ایک نمک حلال ملازم نے تیوری بدل کر مداخلت کی۔ جسے اسی وقت شہید کر دیا گیا۔ مولوی صاحب نے اپنی بندوق جو قریب ہی رکھی تھی، اُٹھائی۔ لیکن معاً اُن پر گولیاں برس پڑیں اور اُن کی روح کلمہ پڑھتی ہوئی قفسِ عنصری سے عالمِ بقا کو پرواز کر گئی۔

آقا اور ملازم کی نعش فوجی رسالہ اپنے ساتھ لے گیا، اور اُن کی تمام آبائی جائداد ضبط کر لی گئی۔

مولانا وہاج الدین صاحب اور اُن کے ملازم دونوں کی پختہ قبریں محلہ کنجری سرائے میں کچہری روڈ پر نعل بندوں کی مسجد کے قریب ایک خطیرہ میں ہیں۔ نیم کے چند درخت اُن پر سایہ فگن ہیں۔

بجنور

فدائے قوم نواب محمود خاںؒ

یہ باب زیادہ تر سرسید احمد خاں صاحب کی مشہور کتاب ''سرکشی ضلع بجنور'' سے ماخوذ ہے۔ سرسید مرحوم ۱۸۵۷ء میں ضلع بجنور میں صدر امین تھے ہنگامہ کے اس تمام دور میں انگریزوں کے نہایت مخلص وفادار رہے۔ یہ کتاب اُن کے چشم دید واقعات کا مجموعہ ہے اور اس بناء پر بہت زیادہ قابل اعتماد ہے یہ کتاب قطعاً نایاب ہے۔ ہم شکر گذار ہیں کہ محترم مولانا عبداللہ صاحب کی نوازش وعنایت سے اس نایاب کتاب کا ایک قلمی نسخہ میسر آیا۔ جس سے یہ باب مرتب کیا گیا۔ (مصنف)

اٹھارہویں صدی کے وہ نامور جنھوں نے غیرت وخودداری اور حریت پروری کی روایات زندہ رکھیں، اُن میں نجیب خاں کا نام خاص طور پر عزت واحترام کا مستحق ہے۔

نجیب خاں روہیلہ پٹھانوں کے ایک معمولی خاندان[۴۶] کا ہونہار فرد تھا۔ جس نے قابلیت، صلاحیت، عمدہ کارگذاری اور عزم وہمت کے سروسامان کے ساتھ میدان ترقی میں تیزی سے قدم بڑھایا۔ یہاں تک کہ عالمگیر ثانی کے عہد حکومت میں امیر الامرائی کا منصب جلیل اور نجیب الدولہ کا خطاب حاصل کیا۔

اس کا نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ بیرونی حملوں اور اندرونی کشمکش اور طوائف الملوکی کے اس نازک دور میں سلطنت مغلیہ کی گرتی ہوئی دیوار کو ایسا سہارا دیا کہ اس کی عمر میں کئی سال کی طویل مدت کا اضافہ ہوگیا۔ اس کی تعمیری صلاحیتیں دامنِ کوہ کے ایک ویران علاقہ کی طرف متوجہ ہوئیں جو اپنی تمام شادابیوں اور زرخیزیوں کو جنگل کی ہولناکیوں میں گم کیے ہوئے تھا۔ یہاں شہر ''نجیب آباد'' بسایا۔ اُس کے قریب ۱۷۵۵ء میں ایک مضبوط قلعہ ''پتھر گڈھ'' تعمیر کیا۔

نجیب الدولہ نجیب خاں کے جانشین فرزند کا نام ''ضابطہ خاں''[۴۷] تھا، جو باپ کی جگہ کچھ عرصہ کے لیے مغل بادشاہ کا امیر الامراء رہا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''شاندار ماضی'' جلد دوم)۔

نواب محمود خاں اسی ضابطہ خاں کے پوتے تھے۔[۴۸] چونکہ یہ علاقہ اسی خاندان کا آباد کیا ہوا تھا، اور ظاہر ہے آباد ہونے والے بھی وہی ہوں گے جو نجیب الدولہ کے رفیق اور اُس کے معتمد سپاہی یا افسر تھے۔ تو اس بنا پر نہ صرف اس پرگنہ میں بلکہ پورے ضلع بجنور میں اس خاندان کا یہ اثر تھا کہ جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا، اور بغاوت کی خبریں یہاں پہنچنے لگیں تو سرسید احمد خاں مرحوم کی شہادت یہ ہے کہ:

مجھے یقین تھا کہ جب لوگوں کو یقین ہوجائے گا کہ فوج آتی ہے اور رستے میں ہے تو جتنے لوگ یہاں ہیں کوئی بھی ہمارا ساتھ نہیں دینے کا۔ اور ہم کو ایک ایسا چوہا تک بھی میسر نہیں آئے گا جو حکام

انگریزی کی رفاقت کر کے گنگا پار کسی امن کی جگہ تک اُن کو پہنچا دیوے، اور بلاشبہ میری رائے بہت صحیح اور نہایت پکی تھی۔ (۴۰۹)

پھر ایک صفحہ بعد ارشاد ہے:

اور ہم کو ہرگز توقع نہ تھی کہ بُرے وقت میں یہ لوگ ہمارا ساتھ دیویں گے بلکہ ہم یقین جانتے تھے کہ یہ سب نامحمود خاں کے ساتھ ہو جائیں گے۔ (۴۱۰)

چند صفحوں کے بعد تحریر ہے:

"اور حقیقت میں یہ ممکن نہ تھا کہ ضلع بجنور کے آدمی نامحمود (۴۱۱) خاں کو چھوڑ کر کسی اور کی حکومت قبول کریں۔" (۴۱۲)

نواب محمود خاں کے والد

خاندان کے تذکرہ میں سرسید احمد خاں کی اس تصنیف کے دو اقتباس اور ملاحظہ فرمالیجیے۔ فرماتے ہیں:

مسٹر کولبرک صاحب بہادر ۱۸۱۲ء میں ایک بہت بڑا کانٹوں دار درخت ہو گئے یعنی بسا گئے تھے۔ اُجڑے ہوئے، جلاوطن ہوئے ہوئے نامحمود خاں کے باپ جھبو خاں کو نجیب آباد میں، جس کے سبب گویا یہ برباد ہوا ہوا خاندان پھر لوگوں کی نظروں میں سما گیا تھا اور اسی سبب سے ہر ایک شخص ضلع کا اپنے تئیں قدیم متوسل اور پرانا نمک خوار اور پشتینی تابعدار نامحمود خاں کا سمجھتا تھا، اور ایسے تزلزل کے وقت میں ہر ایک کی نگاہ اسی پر پڑتی تھی۔ (۴۱۳)

دوسرا اقتباس:

(غلام قادر خاں روہیلہ کے مشہور واقعہ کے بعد ضابطہ خاں کا دوسرا لڑکا) معین الدین خاں عرف جھبو خاں بھاگ کر پنجاب چلا گیا تھا۔ جب سرکار دولت مدار انگریزی نے اضلاع دہلی کو فتح کیا، تب جھبو خاں کو بلا کر بہت خاطر کی اور پانچ ہزار مہینے کی پنشن مقرر کر کے بریلی میں رہنے کا حکم دیا، اور پھر مسٹر کولبرک صاحب بہادر کی رپورٹ سے ۱۸۱۲ء میں نجیب آباد میں آباد ہوا۔ اس کے مرنے کے بعد سرکار دولت مدار انگریزی نے بہ نظر ترحم محمود خاں اور جلال الدین خاں اور اس کے بیٹے اور بیٹیوں کے لیے ہزار روپیہ مہینے کی پنشن مقرر کی، اور ہر ایک شخص کو اس خاندان میں سے بہت بڑے بڑے معزز عہدے عطا فرمائے کہ تمام خاندان بہ کمال عزت اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔ (۴۱۴)

سرسید صاحب مرحوم، جھبو خاں کی باز آبادکاری کو انگریزوں کی عنایت خسروانہ قرار دیتے ہیں اور اسی کتاب میں ایک جگہ یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ:

یہ ضلع (ضلع بجنور بالخصوص پرگنہ نجیب آباد) بالکل ملا ہوا ہے پہاڑ اور بہت بڑے جنگلوں سے،

جبکہ سرکار کی بخوبی عملداری تھی (یعنی ۱۸۵۷ء سے پہلے) جب بھی اکثر ڈاکو اس میں رہتے تھے۔
یعنی اس ضلع کا محل وقوع اس قسم کا ہے کہ یہاں امن قائم رکھنا بہت مشکل تھا اور پہلے اقتباسات سے واضح ہو چکا ہے کہ:

''ضلع کا ہر شخص اپنے تئیں قدیم متوسل اور پرانا نمک خوار اور پشتینی تابعدار محمود خاں کا سمجھتا تھا''۔

اور یہ بھی تاریخ کی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ۱۸۱۲ء کا دور کمپنی کی حکومت کے لیے بہت سخت تھا۔ ایک طرف پنڈاری گوریلا لڑائیاں لڑ رہے تھے۔ دوسری طرف مرہٹوں کی باضابطہ فوجیں دہلی کے قریب تک پہنچ رہی تھیں۔ مہاراجہ گوالیار انگریزوں کے برخلاف راجہ نیپال سے ساز باز کر رہا تھا۔ ایسی صورت میں عنایت خسروانہ نہیں بلکہ سامراجی اغراض کا تقاضا کہ نواب بھمبو خاں جیسے باثر کو ایسے پرخطر علاقہ میں بسایا جائے جو فوجی لحاظ سے نہایت اہم تھا۔ جہاں میدانی علاقہ کے باشندے پہاڑی قوموں کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف بغاوت کا آتش فشاں جب چاہتے، تیار کر سکتے تھے۔

انہی مصلحتوں کی خاطر بھمبو خاں کو وقتی طور پر آلۂ کار بنایا گیا اور جیسے ہی یہ مصلحتیں ختم ہوئیں اور بھمبو خاں کی عمر کا آفتاب غروب ہوا، وظیفہ کی مقدار پانچ ہزار ماہانہ کے بجائے صرف ایک ہزار ماہانہ پورے خاندان کے لیے کر دی گئی۔

جبکہ یہ پورا ضلع بھمبو خاں کے باپ دادا کا آباد کردہ تھا اور ضلع کے باشندے اپنے تئیں اس خاندان کا قدیم نمک خوار سمجھتے تھے تو حق وانصاف کا تقاضا تو یہ تھا، کہ بھمبو خاں کو پورا ضلع واپس دے دیا جاتا اور اس کی نوابی تسلیم کی جاتی۔ لیکن پورے علاقہ کو بحق سرکار کمپنی ضبط کر کے صرف پانچ ہزار ماہانہ کا وظیفہ مقرر کرنا خسروانہ عنایت نہیں بلکہ وہی غاصبانہ پالیسی ہے جو پورے ملک میں چلائی جا رہی تھی اور جس کے برخلاف بجا طور پر ریاستوں اور جاگیرداروں کے وارث چراغ پا تھے۔

بھمبو خاں کی وفات کے بعد وظیفہ میں تخفیف اسی عام پالیسی کی تکمیل تھی۔

سرسید صاحب فرماتے ہیں:

''ہر ایک شخص کو اس کے خاندان میں سے بڑے بڑے معزز عہدے عطا فرمائے''۔

ان معزز عہدوں کی تفسیر بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔ (۳۵)

احمد اللہ خاں بھانجا محمود علی خاں۔ تحصیلدار نجیب آباد ضلع بجنور۔

محمد عمر خاں۔ تحصیلدار ضلع حصار

محمد حسین خاں۔ رسالدار

عطا خاں۔ جمعدار

عنایت اللہ خاں۔ جمع خرچ نویس۔ (۳۶) وغیرہ وغیرہ

۱۸۵۷ء آغاز اور انجام

۱۰؍ مئی کو میرٹھ میں اور ۱۱؍ مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی میں جو کچھ ہوا، اس کی خبریں ۱۲؍ مئی کو بجنور پہنچیں، تو یہاں بھی حرکت شروع ہوئی۔ ۱۹؍ مئی کو مرادآباد میں جیل خانہ توڑا گیا۔ رہا شدہ قیدی بجنور پہنچے تو فضا میں تلاطم شروع ہوگیا۔

جیسا کہ سابق اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے، انگریزی حکومت سے برہمی عام تھی اور کسی تزلزل کے وقت اگر کسی کا اقتدار ضلع میں تسلیم کیا جاسکتا تھا، تو وہ نواب محمود خاں صاحب تھے۔

مسٹر الیگزینڈر شیکسپیر کلکٹر، اور مسٹر جارج پامر جوائنٹ مجسٹریٹ تھے۔ ان کے علاوہ ضلع کے اور چند افسر انگریز تھے۔ ان لوگوں نے حالات کا جائزہ لیا اور یقین کرلیا کہ اس سیلاب کے سامنے ان کے وجود نازک کے سفید تنکے ٹھہر نہیں سکتے۔ تو سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ کس طرح بیک بینی و دو گوش ضلع بجنور سے نکل کر رڑکی پہنچ سکیں، جہاں انگریزی طاقت محفوظ تھی۔ سر سید صاحب صدر امین اور ان کے رفیق خاص سید تراب علی تحصیل دار بجنور کے مشورے سے ۷ جون ۵۷ء کو نواب محمود علی خاں صاحب کو ضلع کی حکومت کا پروانہ دے دیا گیا اور اسی شریف الطبع رئیس کی شرافت کی پناہ میں سب انگریز بخیر و عافیت ضلع سے نکل کر رڑکی پہنچ گئے۔

انگریز افسران کے بخیریت نکل جانے کے بعد نواب محمود خاں نے ۸ اور ۹ جون کو درمیان شب میں اپنی حکومت کا اعلان کیا۔ امیر الدولہ، ضیاء الملک، مظفر جنگ کے خطابات اختیار کیے اور اب پورا نام مع القاب اس طرح لکھا جانے لگا:

امیر الدولہ، ضیاء الملک ذوی القدر نواب محمود خاں بہادر، مظفر جنگ۔

اعلانِ حکومت کے بعد ضلع کا انتظام سنبھالا۔ (۴۱۷) ہر یک شعبہ کے افسر مقرر کیے۔ پورے ضلع میں یہاں تک امن ہوگیا کہ بقول سر سید صاحب گنگا پار کے باغیوں نے بھی اپنے لیے بجنور سے زیادہ کوئی مامن نہ دیکھا۔ چنانچہ دلیل سنگھ اور قدم سنگھ گوجر اور رضا حسن عرف چھٹن اور عنایت علی خان قاضی تھانہ بھون مع اپنے رفیقوں اور ساتھیوں کے اس ضلع میں آئے۔ اس ضلع کے باغیوں نے ان کو امن دیا۔ ان کے سوا میر الطاف اور مرزا حاجی اور مرزا مبارک شاہ شاہزادگان مفرور دہلی اس ضلع میں آئے، اور نا محمود خاں اور ۔ ڑے خاں نے اول اول بہت عزت اور توقیر کی۔ اس کے علاوہ پیش قدمی کرکے ہرداور تک انگریزی طاقت کو ختم کرکے اپنا قبضہ کرلیا۔ (۴۱۸)

اسی کے ساتھ، مالگذاری حاصل کرنے کی کوشش شروع کردی گئی۔ احمد اللہ خاں، نواب کے بھانجے نجیب آباد کے تحصیل دار تھے۔ (۴۱۹) انہوں نے نواب محمود خاں کے مدار المہام اور مختار کل کی حیثیت اختیار کرلی اور پھر مالگذاری وصول کرنے میں کچھ ہندو زمینداروں سے ایسی سختی برتی کہ مقابلہ کی نوبت آگئی۔ اور اسی تلخی نے رفتہ رفتہ پورے ضلع میں ہندو مسلم جنگ کی شکل اختیار کرلی۔ اس وقت نتیجہ اگرچہ مسلمانوں کے حق میں رہا اور پورے ضلع میں ان کا ڈنکا بجنے لگا مگر اس تسلط و اقتدار نے ہندو زمینداروں کو انگریزوں سے نامہ و پیام پر آمادہ کردیا۔ (۴۲۰)

بہر حال تقریباً ایک سال کے بعد جب شیکسپیر اور پامر دوبارہ ضلع بجنور میں فاتحانہ (۴۲۱) داخل ہوئے تو:

(۱) نواب محمود خاں، ان کے بھائی جلال الدین خاں، عظمت اللہ خان، احمد اللہ خاں اور شفیع اللہ خاں، (خواہرزادگان نواب محمود خاں) اور مارے (۴۴۲) خاں باغی قرار دیئے گئے۔

(۲) اور ضلع کے تمام روٴساء کے نام اعلان نامہ جاری کیا گیا "جو کوئی منجملہ تمہارے یا رشتہ داران جو ملازمان یا باشندگان شہر تمہارے کے باغیان مذکور کو پناہ یا مدد دے گا، یا اس کی نوکری کرے گا، تو بجرم سرکار متصور ہو کر کل جائداد منقولہ و غیر منقولہ و زمینداری وغیرہ تمہاری ضبط سرکار ہو کر تم کو تدارک سنگین ہو گا، اور مسکن تمہارا مثل باغیان مالگذھ اور تھانہ بھون وغیرہ کے گرایا جائے گا۔ چاہیے کہ یہ آفت اوپر اپنے مت لاؤ...... الخ ص ۹۱

(۳) انگریزی فوج کی مزاحمت جگہ جگہ کی گئی۔ اس میں جو بہادر کام آئے ان کا شمار بہت مشکل ہے۔ البتہ کامیابی کے بعد دوبارہ نظم قائم کرنے اور امن بحال کرنے کے بہانے جس تہذیب اور شرافت کا مظاہرہ کیا گیا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کیجئے۔

یہ بمجرد فتح ہونے نگینہ کے جناب صاحب مجسٹریٹ بہادر اور جناب اندرسین بریگیڈ میجر مع سپاہیان پلٹن خاکی کے شہر نگینہ میں تشریف لے گئے اور سید تراب علی تحصیلدار کو واسطے انتظام شہر کے اپنے ساتھ لیا اور شہر کی ناکہ بندی کر کے جیسا کہ چاہیے تھا، انتظام شہر فرمایا اور تین سو آدمی شہر میں سے گرفتار کئے۔ ان میں ۲۵۷ آدمی اسی وقت مارے گئے۔ (۴۴۳) الخ

ایک باغ میں عنایت رسول خاں اور ان کے ساتھ کچھ آدمی چھپے ہوئے تھے۔ فوج نے ان کا محاصرہ کیا۔ عنایت رسول صاحب، ان کے ملازم جان محمد اور ان کے ساتھ پچاس ساٹھ آدمی وہیں قتل کر دیئے اور ساٹھ ستر آدمیوں کو زندہ پکڑ کر لے گئے اور گولیوں سے مار دیا اور اکثر آدمی قاضی محلّہ کے جو اس باغ میں چھپے ہوئے تھے، وہ بھی مارے گئے۔ (۴۴۴)

نجیب آباد فوج پہنچی تو شہر خالی پڑا تھا۔ قلعہ پتھر گڑھ میں کچھ سپاہی تھے، وہ فرار ہونے لگے تو ان کا تعاقب کیا گیا اور تیس سواروں کو مار دیا گیا۔ شہر نجیب آباد لٹ گیا اور تمام شہر میں آگ لگ گئی۔ جلال الدین خاں اور سعد اللہ خاں گرفتار کئے گئے۔ ۲۳۔ اپریل ۱۸۵۸ء کو ان کے گولی ماری گئی۔ (۴۴۵)

بیسویں اپریل ۱۸۵۸ء کو یہ تجویز ہوئی کہ مکانات نامحمود خاں و جلال الدین خاں جو ان کی سرداری اور حکومت کے نشان ہیں، اڑا دیئے جائیں تاکہ سرکار کی کمال ناراضی ان نمک خوار نمک حراموں سے (نقل کفر، کفر نباشد) ظاہر ہو، اور لوگوں کو بخوبی عبرت ہو۔ چنانچہ اسی تاریخ کو اس حکم کی تعمیل ہوئی اور دیوان خانہ جو بہت بڑا مکان اور حکومت کی نشانی تھی، اڑا دیئے گئے۔ (۴۴۶)

یہ دردانگیز قصہ طولانی ہے۔ چند واقعات بیان کر دیئے گئے کہ:

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

دُوسرا رُخ

وفاداری کا معیار

یہ ۱۸۵۷ء کا ایک رخ تھا۔ خونِ شہادت کی رنگینیاں اس کا غازہ ہیں۔ اب وفا شعاری اور نیاز مندی کے رخ پر ایک ہلکی سی نظر ڈال لیجیے۔

سر سید احمد خاں صاحب نے تن من کی بازی لگا کر جس طرح حق وفا ادا کیا، وہ شاید ناکافی تھا۔ اس لیے ان کو اپنی کمال نیاز مندی اور برأت کے اظہار کے لیے وہ اندازِ تحریر بھی اختیار کرنا پڑا جس کی تعبیر کے لیے وفاداری، نیاز مندی جیسے الفاظ بھی ناکافی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔ نواب محمود خاں کا نام تو انہوں نے نامحمود خاں رکھا اور پھر اس کو اس طرح نبھایا کہ کسی جگہ بھی اس مصنوعی نام کے نقل کرنے میں فروگذاشت نہیں ہوئی۔ اس کتاب میں سینکڑوں جگہ نام آیا ہے اور ہر جگہ نامحمود خاں ہی لکھا گیا ہے۔

اس عام اصطلاح کے علاوہ جگہ جگہ ان واجب الاحترام شخصیتوں کو جن کی تعظیم کے لیے پورے ضلع بجنور کی گردنیں خم ہوتی تھیں، بدذات، نمک حرام، حرام زادہ وغیرہ کے مہذب الفاظ سے یاد فرمایا ہے۔

وہی سر سید جو چند سال بعد ''تہذیب الاخلاق'' کے مصنف بنے، کیا ان کے اخلاق ایسے ہی ہونے چاہییں؟ ایک طرف اپنے بھائیوں کے ساتھ یہ سلوک، یہ زبان اور یہ ادب تہذیب۔ دوسری جانب انگریز کی ایک ادنیٰ ترین توجہ پر جن الفاظ میں اور جس طرح شکریہ ادا کیا، اس کو پڑھیے اور سبق لیجئے کہ انگریز کے دربار میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے کس درجہ فدائیت اور نیاز مندی کی ضرورت تھی۔

سر سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''میں نہایت متامل ہوتا ہوں اس اگلی بات بیان کرنے سے کہ میں اپنی نسبت آپ لکھتا ہوں، پھر مجھ کو اس کے لکھنے پر اس لئے دلیری ہوتی ہے کہ درحقیقت میں خود نہیں لکھتا بلکہ اپنے آقا کی بات بیان کرتا ہوں اور پھر مجھ کو نہایت خوشی ہوتی ہے کہ اگر میرے آقا نے میری نسبت بات کہی ہو، میں کیوں نہ اس کو کہوں اور کس لئے نہ کہوں کہ اپنے آقا کی بات سے خوش ہونا اور اس کو بیان کر کر اپنا فخر کرنا نوکر کا کام ہے۔''

> یعنی جب میں میرٹھ آیا اور بیماری نے مجھ کو کمال ستایا تو میرے آقا مسٹر جان کری کرافٹ ولسن صاحب بہادر دام اقبالہ، صاحب جج اور اسپیشل کمشنر میری عزت بڑھانے کو مجھے دیکھنے آئے اور مجھ سے یہ بات کہی کہ تم ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ تم نے اس نازک وقت میں بھی سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اور باوجودیکہ ضلع بجنور میں ہندو اور مسلمان میں کمال عداوت تھی اور ہندوؤں نے

مسلمانوں کی حکومت کو مقابلہ کر کے اٹھایا تھا اور جب ہم نے تم کو اور محمد رحمت خاں صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر کو ضلع سپرد کرنا چاہا تو تمہاری نیک خصلت اور اچھے چلن اور نہایت طرف داری سرکار کے سبب تمام ہندو اور مسلمان تمہارے حاکم بنانے پر خوش ہوئے۔ سرکار نے بھی تم کو اپنا خیرہ خواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال اعتماد سے سارے ضلع کی حکومت تم کو سپرد کی (۴۲۷) اور تم اسی طرح وفادار نمک حلال سرکار کے رہے۔ اس کے صلہ میں اگر ایک تصویر بنا کر بطور یادگار رکھی جائے تو یہ بھی کم ہے۔

میں اپنے آقا کا کمال شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھ پر ایسی مہربانی کی اور میری قدر دانی کی، خدا ان کو سلامت رکھے۔ (۴۲۸)

بجے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو — نفی حکمت مکن از بہر دل عامے چند

سرسید کی جب یہ تحریر سامنے آئی ہے جو آزادی اور جمہوریت کے موجودہ دور میں حیرت انگیز ہی نہیں بلکہ شرمناک بھی ہے، تو ناانصافی ہوگی اگر اس موقع پر ایک دوسرا اقتباس بھی پیش نہ کیا جائے۔ مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے سرسید نے فرمایا:

غدر کے بعد مجھے اپنا گھر لٹنے کا رنج نہ تھا، نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا، جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا، اس کا رنج تھا، جب ہمارے دوست مرحوم شیکسپیئر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے، بعوض اس وفاداری کے تعلقہ (۴۲۸) جہاں آباد جو سادات کے ایک نہایت نامی خاندان کی ملکیت تھا اور لاکھ روپیہ سے زیادہ کی مالیت کا تھا، مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اس کے لینے سے انکار (۴۳۰) کر دیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے اور درحقیقت یہ بالکل سچی بات تھی، میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے، اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے۔

پھر یہ خیال ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ میں اپنی قوم کی اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں! اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑی ہے، اس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے، میں نے ارادہ ہجرت موقوف (۴۳۱) اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔ (۴۳۲)

سرسید کی اس تحریر کی تصدیق کے لیے رسالہ "اسباب بغاوت ہند" پیش کیا جا سکتا ہے۔
وہی سرسید جو اس پر نازاں ہے کہ اس کے "آقا" "انگریز" نے اس کو "نمک حلال نوکر" کہا، جب وہ دیکھتا ہے کہ بغاوت کا تمام الزام مسلمانوں کے سر تھوپ کر پوری قوم کے کچلنے اور اس کی نسلیں ختم کر ڈالنے کا تہیہ کیا جا رہا ہے .... اور بقول سرسید:

کوئی آفت ایسی نہیں جو اس زمانہ میں ہوئی ہو، گو وہ رام دین اور ماتا دین نے کی ہو، اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی، کوئی بلا آسمان سے نہیں چلی جو اس نے پہنچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔ ان دنوں جو میری نگاہ سے انگریزی اخبارات کثرت سے گزرے اور جو کتابیں اس ہنگامہ کی بابت تصنیف ہوئیں وہ بھی میں نے دیکھیں اور ہر ایک میں یہی دیکھا کہ ہندوستان میں مفسد اور بد ذات کوئی نہیں۔ مگر مسلمان! مسلمان! مسلمان۔ کوئی کانٹوں دار درخت اس زمین میں نہیں اگا، جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ اس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا، اور کوئی آتشیں بگولہ نہیں اٹھا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے اٹھایا تھا۔ (۴۴۳)

تو یہی سرسید "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر بغاوت کی ذمہ داری حکمران طبقہ کے سر تھوپ دیتا ہے اور ساتھ ہی ایک ایسا مطالبہ کر دیتا ہے جس کے لیے اس وقت تک نہ کسی کے قلم نے جنبش کی تھی اور نہ کسی کی زبان متحرک ہوئی تھی۔

سرسید کہتے ہیں۔

بلاشبہ پارلیمنٹ میں ہندوستان کی رعایا کی مداخلت غیر ممکن اور بے فائدہ محض تھی۔ مگر لیجس لیٹیو کونسل میں مداخلت نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ بس یہی ایک بات ہے جو جڑ ہے تمام ہندوستان کے فسادوں کی اور جتنی باتیں جمع ہوتی گئیں وہ سب اس کی شاخیں ہیں۔ (۴۴۴)

"اسباب بغاوت ہند" سرسید کا ایسا کارنامہ ہے کہ اس کے متعلق اس وقت بھی یہی کہا گیا، اور پوری ایک صدی کے گرم و سرد حوادث کے بعد بھی یہی کہا جاتا ہے:

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

صرف انگریزی حقیقت (۴۴۵) پسندی اور نکتہ رسی تھی جس نے نوائے تلخ کو نوید جاں افزا سمجھا۔ ورنہ سرسید کے مخلص دوستوں کے خیال کے مطابق سرسید یہ کتاب لکھ کر اپنے لئے دار و رسن کا انتظام مکمل کر چکے تھے۔
بہر حال اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تامل نہ ہونا چاہیے کہ سرسید بھی بہی خواہی ملک و ملت کا وہی سوز و گداز قلب و جگر میں رکھتے تھے جو مجاہدین حریت کو نصیب ہوا تھا، البتہ اختلاف رائے نے راستے جدا جدا کر دیئے تھے۔
نقطۂ نظر میں بنیادی فرق یہ تھا کہ مجاہدین حریت انگریز کو غاصب اور ناجائز حکمران تصور کرتے تھے جس

سے نجات پانا اولین فرض تھا اور سرسید ان کو جائز حکمران اور ان کی اطاعت کو لازمی اور ضروری مان چکے تھے۔

سچائی اور خلوص کے ساتھ اختلاف رائے باعثِ ملامت تو کیا ہوتا نص حدیث نے اس کو باعثِ رحمت فرمایا ہے البتہ یہ انتہا پسندی کہ مخالف کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر کر تہذیب وشائستگی کے لازمی تقاضوں سے بھی اس کو محروم کر دیا جائے اور اس کے لیے بازاری الفاظ سے بھی گئے گذرے الفاظ استعمال کیے جائیں، یقیناً ایسی شکایت ہے جس کا ازالہ آج تک نہیں ہو سکا۔

انگریزی زبان کی تعلیم اور انگریز کی ملازمت ۱۸۵۵ء سے نہیں تقریباً پچاس سال پیشتر سے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز جائز قرار دے چکے تھے۔ مگر سرسید کی یہی انتہا پسندی تھی جس نے انگریزی زبان کی تعلیم کے ساتھ انگریزی کلچر کو بھی ضروری قرار دیا۔ اور صرف انگریزی تعلیم گاہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ انگریزی کلچر کی تربیت گاہ کی حیثیت سے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی جس کے نتیجہ میں وہ اختلافات برپا ہوئے جس کا شور آج تک کانوں میں گونج رہا ہے۔

سرسید کی یہی انتہا پسندی تھی جسے ڈپلومیٹک انگریزوں کو فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملا۔ اس نے ایک طرف اپنے پوشیدہ ذرائع سے ان اختلافات کو ہوا دی جس سے خود مسلمان ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور دوسری طرف بہت سے سیاسی مسائل میں سرسید کو آلہ کار بنا کر ہندو اور مسلمان میں وہ خلیج پیدا کر دی جس کا آخری نتیجہ تقسیم ملک کے صورت میں نمودار ہوا۔

رجوع

اس ضمنی بحث کے بعد ضلع بجنور کے حالات کو ایک بزرگ کے تذکرہ پر ختم کیا جاتا ہے۔

شاہ غلام بہولن سیوہاروی (۳۳۶)

آپ مراد آباد کے مشہور قادری بزرگ حضرت شاہ بلاقی الملقب بہ شاہ بولن (متوفی ۱۱۳۹ھ) کے پرپوتے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت شاہ بلاقی مراد آبادی تک اس طرح ہے شاہ غلام بولن ابن شاہ کریم اللہ ابن شاہ رحمت اللہ ابن حضرت شاہ بلاقی قادری رحمۃ اللہ علیہ۔

آپ نے جد امجد کا سلسلۂ طریقت اپنے ماموں شاہ غلام احمد نہٹوری خلف وخلیفہ حافظ محمد امین کاندھلوی ثم نہٹوروی سے اخذ کیا اور انہیں سے مجاز ہوئے۔ آپ کا مولد ومسکن سیوہارہ ضلع بجنور تھا۔

آپ بقول صاحب انوار العارفین، صاحب اوقات، خوش اخلاق اور قرآن خواں تھے۔ آپ کا دریائے رشد وہدایت برابر جاری رہتا تھا۔ لوگ کثیر تعداد میں آکر آپ کی خدمت میں فیض روحانی حاصل کرتے تھے۔

آپ کی سیر چشمی، سخاوت اور مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ اپنی خانقاہ واقع سیوہارہ میں ہر وارد وصادر کو کھانا

کھلاتے۔ آپ کا لنگر خانہ سفرۂ عام تھا جس پر سب دوست اور دشمن شکم سیر ہوتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں آپ کا لنگر خانہ تمام غریبوں اور مسافروں اور فقر و فاقہ کے ہاتھوں پریشان لوگوں کے لیے کھلا ہوا تھا۔ سب آتے تھے اور کھانا کھاتے تھے۔

سچ جانیے انگریز نے جہاں اپنے بہت سے "کارنامے" دکھائے ہیں وہاں یہ بھی کیا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں اپنے کیے ہوئے مظالم کی خونچکاں داستانیں صفحۂ دل و دماغ سے فراموش کرا دیں۔ اخلاف نے خود ہی ان رنج دہ حالات کو مصلحتاً بھلا دیا جو تاریخ میں جلی حروف میں لکھے جانے کے قابل تھے۔ نہ صرف بھلایا، بلکہ ان تاریخی نوشتوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہیں کی جن سے آج واقعات کی ترتیب و تدوین میں مدد ملتی۔ امروہہ میں ایک مردِ مجاہد نے انگریز کے خلاف ایک مثنوی بزبان فارسی لکھی تھی۔ اس مجاہد کے خاندان کے ایک فرد نے اس مثنوی کو ایسا پاٹ کر رکھا کہ اس کو ہوا تک نہ لگنے دی۔ اس کو یہی خوف رہتا تھا کہ کہیں انگریز کو اس مثنوی کا پتہ نہ چل جائے۔ بالآخر وہ مثنوی آج ہماری نظروں سے غائب ہے پتہ نہیں کیا ہوئی۔ اس کے چند اوراق جو کسی نے نقل کر لئے ہوں گے، راقم الحروف کو ملے۔ مگر چونکہ غیر مرتب ہیں ان سے کوئی تاریخ مرتب نہ ہو سکی۔ شاہ غلام بولن صاحب کے جو حالات یہاں لکھ رہا ہوں۔ یہ انوار العارفین مؤلفہ حافظ محمد حسین صاحب چشتی مرادآبادی سے ماخوذ ہیں۔

انگریز نے غلبہ پا کر جو دار و گیر شروع کی تو آپ کو اس الزام میں گرفتار کیا گیا کہ آپ انگریز کے دشمنوں کی مدارات کرتے ہیں اور ان کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اس گرفتاری کا باعث ایک چغل خور بدبخت تھا جو بظاہر آپ کا مرید و معتقد بنا ہوا تھا لیکن بہ باطن انگریز کا خیر خواہ تھا۔ مؤلف انوار العارفین نے لکھا ہے کہ اس نام نہاد معتقد کی چغلی کا واقعہ مشہور و معروف اور زبان زد خاص و عام ہے۔ کاش کہ وہ اس واقعہ کی وضاحت خود فرما دیتے۔ اب معلوم نہیں کہ یہ واقعہ لوگوں کو یاد بھی ہے یا نہیں؟

آپ کو گرفتار کر کے جزیرہ انڈمان بھیجا گیا اور وہیں ۳ ربیع الاول ۱۲۷۶ء کو آپ رحمت حق سے واصل ہو گئے۔ نور اللہ مرقدہ۔ حافظ محمد حسین لکھتے ہیں کہ اس قید میں آپ قیود تعلقات سے آزاد اور رضا مولا میں گرفتار رہتے تھے۔ اور یہ دو شعر ان کے حسب حال تھے۔

خونے نکردہ ایم و کسے را نکشتہ ایم	جرم ہمیں کہ عاشق روئے تو گشتہ ایم
بجرم عشق توام میکشند و غوغائیست	تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

آپ کی تاریخ وفات میں یہ قطعہ بھی انوار العارفین میں ہے:

زیں دار فنا چو رخت بربست	شد خلد بریں مقام و مسکن
تاریخ وصال او خرد گفت	ماوائے جہاں غلام بولن

۱۲۷۶ھ

صاحب انوار العارفین نے لکھا ہے کہ حضرت شاہ غلام یولن ہر سال اپنے جدِ امجد کے مزار کی زیارت کے لیے مراد آباد آتے تھے۔ میں ان کی زیارت سے مشرف ہوا ہوں۔

آپ کے فرزند حضرت محمد عاشق کے متعلق انوار العارفین میں لکھا ہے کہ جوان صالح اور صاحب ہمت مثل پدر بزرگوار ہیں اور رام پور میں سکونت رکھتے ہیں اور وہ ہیں اپنے آباؤ اجداد کے سلسلہ کو جاری کر رہے ہیں اور تعلیم و تلقین میں مشغول ہیں۔ (انوار العارفین بزبان فارسی صفحہ ۵۴۸ مطبوعہ مطبع صدیقی بریلی)۔

شاہ جہان پور

شاہ جہاں پور میں میرٹھ کی بغاوت کی خبریں ۱۵ مئی ۱۸۵۷ء کو پہنچیں۔ انتظام پر پلٹن ۲۸ مقرر ہوئی۔ مولوی سرفراز علی گورکھ پوری اس زمانہ میں شاہ جہان پور میں موجود تھے۔ پلٹن کے سپاہی بھی ان کے وعظ سے متاثر ہوئے۔ ۲۵ مئی کو عید الفطر کے دن افسروں نے خزانہ لٹنے کی افواہ سن کر اسپیشل گارڈ اور سنتری ڈبل کرنے کا حکم دیا۔ سپاہیوں نے اس کو بے اعتقادی و بے عزتی پر محمول کیا اور بددل ہو گئے۔

۳۱ مئی کو انگریز گرجا میں جمع تھے کہ انقلابی فوجوں نے ان پر یورش کر دی۔ کچھ انگریز زخمی ہوئے۔ پھر انہوں نے دروازہ بند کر لیا اور عورتوں کو گرجے کے مینار پر پہنچا دیا۔ یہاں کا شور سن کر کچھ انگریز جو قریب ہی رہتے تھے اپنے نوکروں کو ساتھ لے کر گرجا پہنچے۔ ان سب کے پاس بندوقیں اور طمنچے تھے اور یورش کرنے والے صرف تلواریں لیے ہوئے تھے۔ اب سپاہی بھی اپنی بندوقیں سنبھالنے کے لیے دوڑے۔ اس اثناء میں گرجا کے انگریزوں کو نکل جانے کا موقع مل گیا۔ ان کی سواریاں جن پر وہ گرجا آئے تھے، موجود تھیں۔ جنہوں نے کم از کم عورتوں اور بچوں کو نکال لینے میں بڑی مدد کی۔ کچھ سکھ سپاہ بھی پہنچ گئی جس نے حفاظت کا فرض انجام دیا۔ لیکن اب یہ ہنگامۂ کارزار گرجا تک محدود نہ رہا، پوری چھاؤنی میں پھیل گیا۔ چند انگریز افسر مارے گئے اور باقی کے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ شاہ جہان پور چھوڑ کر کوئی محفوظ مقام تلاش کریں۔ کچھ انگریزوں نے "راجہ پوا میں" کے یہاں پناہ لی مگر پورے علاقہ میں اتنا اشتعال پھیل چکا تھا کہ راجہ بھی حفاظت کی ذمہ داری نہ لے سکا۔ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد لوگوں نے زمامِ حکومت نواب غلام قادر خاں کے حوالہ کی۔

نواب غلام قادر خاں

نواب غلام قادر خاں ابنِ حاجی میاں نواب بہادر خاں بانیٔ شہر شاہ جہان پور کے خاندان سے تھے۔ یہ اپنے خاندان میں سب سے بڑے اور با اثر تھے۔ سب لوگ ان کا ادب کرتے تھے۔ جب شاہ جہان پور میں یہ ہنگامہ ہوا تو آپ اپنے پیر سعادت علی شاہ نبیرہ غلام علی ہانسوی کے یہاں تشریف لے گئے تھے۔ جب واپس ہوئے تو اہلِ خاندان، باشندگانِ شہر اور مجاہدین نے قیادت آپ کے سپرد کی۔ آپ کے پیرزادگان رؤف میاں و

ظہور میاں پسران شاہ سعادت علی نے بھی ہمت بڑھائی۔ نواب خان بہادر خاں نے سند نظامت دی۔ نواب قادر علی ان کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ لیکن شریک و مددگار کی حیثیت سے تحریک میں شامل رہے۔ مجاہدین نے خوب زور پکڑا۔ نواب غلام قادر خاں نے بہت اچھی طرح ریاست کا انتظام کیا۔ قریب ایک سال ان کا دور رہا۔ جنرل بخت خاں، نواب تفضل حسین، شہزادہ فیروز شاہ، نواب اسمٰعیل، ڈاکٹر وزیر خاں، مولوی فیض احمد بریلوی، شاہ احمد اللہ اور نانا راؤ وغیرہ شاہ جہاں پور جمع ہو گئے۔

معرکۂ کارزار

۲۸ اپریل ۱۸۵۸ء کو نواب غلام قادر خان نے ہنچوریا کے گھاٹ پر انگریزی فوج کے چھکے چھڑا دیے۔ کافی نقصان پہنچایا۔ شہر کے مورچوں کی کمان مولانا شاہ احمد اللہ صاحب کے سپرد تھی شاہ صاحب نے لگاتار ایسے حملے کیے کہ انگریز جیل خانہ کے تھوڑے سے علاقے میں محصور رہنے پر مجبور ہو گئے۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۸ء کو انگریز محصورین کی حالت نازک ہو چکی تھی کہ پہلے جنرل جانسن تازہ دم فوج لے کر پہنچ گیا۔ پھر بریلی پر مکمل قبضہ کے بعد ۱۸ مئی کو سر کالن کیمبل فاتحانہ حوصلہ مندیوں کے ساتھ شاہجہان پور پہنچا۔ شاہ صاحب موقع کی نزاکت محسوس کر کے اپنے تمام ہمراہیوں کے ساتھ قصبہ محمدی چلے گئے۔

محمدی میں قیام حکومت

محمدی میں ان کی حکومت قائم ہو گئی۔ جنرل بخت خاں مولوی سرفراز علی اور نانا راؤ پیشوا کابینہ میں اور کونسل میں مولوی لیاقت علی الہ آبادی، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا فیض احمد بدایوانی تھے۔ فیروز شاہ نے اول اختلاف کیا پھر شرکت کر لی۔ شاہ صاحب کا خطبہ سکہ جاری ہوا آپ کے سکہ پر شعر کندہ ہوتا تھا ؎

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ ــــ حامی دین محمد ، احمد اللہ بادشاہ

شاہ جہان پور سے بڑھ کر سر کالن کیمبل نے قصبہ محمدی پر حملہ کر دیا۔ انگریزی فوج کی طاقت زیادہ تھی۔ شاہ صاحب کو ناکامی ہوئی۔ محمدی چھوڑنا پڑا۔ کچھ لوگ نیپال کی طرف چلے گئے۔ ۵ جون کو راجہ پوائیں نے شاہ صاحب کو اپنے یہاں بلوایا اور دھوکہ سے آپ کو گولی کا نشانہ بنوایا۔ (تفصیل شاہ صاحب کے تذکرہ میں ملاحظہ فرمائی جائے)۔

دیگر قصبات کی کیفیت

باشندگان شہر تلہر نے بھی تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔ نواب بہادر خاں نے غلام محمد خاں کو ناظم تلہر اور ان کے بھائی کفایت اللہ خاں کو تحصیل دار مقرر کیا۔ میراں پور کٹرہ میں فیض محمد خاں اور غلامی خاں نے غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی پوری کوشش کی۔

جلال آباد میں احمد یار خاں تحصیل دار نے تحریک کو قوت دی۔ بعد کو ناظم ہو گئے۔ بہت سرگرمی سے انتظام کیا اور بریلی سے ایک فوج زیر کمان نواب اسمٰعیل خاں (نواب فتح گڑھ) بلا کر راجپوت نہ کھنڈر کو مطیع کیا۔ جنگ بچپوریہ میں یہ شریک تھے۔ ۲۸؍ اپریل ۱۸۵۸ء کو جب انگریز جلال آباد پر قابض ہو گئے، تو ان کو علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔

انتظامی کاروائی

اکتوبر ۱۸۵۸ء میں پورے ضلع شاہ جہان پور میں مکمل طور سے انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ انگریزی حکومت نے تمام سردار اور رؤساء اور علماء کو عبرت ناک سزائیں دیں۔ نواب غلام قادر خاں اودھ چلے گئے۔ وہیں بٹول کی پہاڑیوں میں انتقال ہو گیا۔ نواب قادر علی خاں، عبدالرؤف خاں، قاضی سرفراز علی کو حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ غلام محمد خاں اور کفایت اللہ خان تنہری بھی کالے پانی بھیجے گئے۔ جائدادیں ضبط ہوئیں۔ احمد یار خاں جلال آبادی گرفتار ہوئے، اور پھانسی دی گئی۔ وسیع مکانات، حویلیاں، محلات، قلعہ ڈھائے گئے۔ غرض کہ کوئی ایسا ظلم نہ تھا جو روا نہ رکھا گیا ہو۔

حرفِ آخر

روہیل کھنڈ نے اگرچہ دلی اور میرٹھ سے چند روز بعد جنگ آزادی میں حصہ لیا اور پھر جتنی دیر تک قربانیاں پیش کرتا رہا کہ پورے ہندوستان کا کوئی خطہ بھی اس کی نظیر نہیں پیش کر سکا۔ (ماخوذ از مضمون محترم محمد ایوب صاحب بی اے محاربہ عظیم وغیرہ)

چند نامور علماء اور جرنیل

مولانا احمد شاہ شہیدؒ

عزم وہمت، حمیت ملی اور غیرت وطن کا وہ شعلہ جوالہ جو 'چنیا پٹن'[۴۳۷] سے اٹھا، دہلی اور آگرہ میں چمکا، سرزمین اودھ میں پہنچا، روہیل کھنڈ میں شعلہ افشاں ہوا۔ پھر اسی کے ایک گوشہ میں محوسکون ہو گیا۔ اس کو ۱۸۵۷ء کی جان مضطرب کہا جائے یا شہداء ۱۸۵۷ء کا سرتاج، دونوں درست۔

اپنے تو اپنے غیر بھی[۴۳۸] اس کے علم وعمل، قوت روحانی اور جرأت ایمانی کے معترف ہیں۔

اصل نام، ولدیت اور سلسلۂ نسب

تاریخ آزادی کے ہیرو، وطن عزیز کے بہادر فرزند، فداء ملک وملت، سلطان حیدر علی عرف سلطان ٹیپو (شہیدؒ) کے ایک مصاحب، سید محمد علی نواب چنیا پٹن تھے۔ انہیں نواب محمد علی کے یہاں ۱۲۰۴ھ میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ باپ کے نام کی مناسبت سے احمد علی نام رکھا گیا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اصل نام سے شہرت بہت کم ہوئی۔ پہلے ضیاء الدین عرف رہا، دلاور جنگ خطاب اور جب یہ لڑکا عمر عزیز کی تقریباً چھ دھائیاں طے کرنے کے بعد جدوجہد آزادی کا علمبردار ہوا تو احمد اللہ شاہ کہلانے لگا۔ رحمہ اللہ۔

سید محمد علی، سید جلال الدین عادل کے فرزند ارجمند تھے۔ سید جلال الدین جو خاندان قطب شاہی (فرمانروائے گولکنڈہ) کی یادگار[۴۳۹] تھے۔ ایک طرف چنیا پٹن کے رئیس اور نواب تھے تو دوسری جانب ایک باخدا بزرگ تھے جو اپنے زمانہ کے ولی اور قطب سمجھے جاتے تھے۔

تعلیم وتربیت اور طبعی رجحانات

خاندانی عظمت کے بموجب آپ کی تعلیم وتربیت امیرانہ ہوئی اور اس زمانہ کے رواج کے مطابق علوم دینی کے ساتھ فنون حرب کا بھی ماہر بنایا گیا۔ ہوش سنبھالا تو طبیعت کا میلان اوراد ووظائف کی طرف تھا۔ نماز، روزہ اور احکام شریعت کے سخت پابند تھے۔ ہر عمل میں سنت رسول اللہ کی اتباع ضروری سمجھتے تھے۔ والدین سے ٹیپو سلطان کی شہادت اور سلطنت خداداد کی تباہی کا حال سنا تو حکومت اور مال ودولت سے دل بے زار ہو گیا۔[۴۴۰]

سیاحت وبیعت

جوانی کا آغاز تھا کہ سیاحت کا شوق ہوا۔ پہلے حیدرآباد گئے، پھر یورپ کا سفر کیا۔ انگلستان جا کر ملکہ وکٹوریہ کے مہمان ہوئے۔ وہاں سے واپس ہو کر عربی ممالک کا دورہ کیا، حج بیت اللہ شریف سے مشرف ہو کے پھر

ایران ہوکر چمن کے راستہ سے ایک عرصہ کے بعد ہندوستان پہنچے۔ یہاں "سانبھر" کے علاقے میں ڈیرے ڈال دیئے۔ (۴۴۱)

پھر مراحلِ سلوک طے کرنے اور روحانی کمالات حاصل کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی حضرت قربان علی شاہ کی شہرت سن کر جے پور گئے۔ ریاضت ومجاہدہ اور چلہ کشی کے انوار پہلے سے موجود تھے۔ بیعت نے فوراً ہی نسبت مشائخ کا کیف پیدا کردیا۔ حضرت قربان علی شاہ صاحب نے جس طرح روحانی فیوض وکمالات سے مالا مال کیا، اصلاحِ صوفیاء اور تنظیم مجاہدین کا فرض بھی آپ کے ذمہ کردیا۔ ہاں محفلِ سماع کی بھی اجازت دے دی۔ (۴۴۲)

بہر حال مولانا احمد شاہ صاحب جے پور سے ٹونک تشریف لے گئے نواب وزیر الدولہ سے مجلسیں گرم رہیں۔

ٹونک کی آب وہوا آپ کے ذوقِ سماع کے موافق نہیں (۴۴۳) تھی۔ مگر ذوقِ جہاد کے لیے سب سے موافق آب وہوا اسی ٹونک کی تھی۔ (۴۴۴) جو حضرت سید احمد شہید کے پس ماندگان کا مرکز تھا اور ابھی چند سال ہوئے، حضرت مولانا نصیر الدین صاحب دہلوی کا جہادی قافلہ، وزیر الدولہ کے دماغ کو سرشار کرتا ہوا یہاں سے گزرا تھا۔

حضرت مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب ٹونک سے رخصت ہوکر گوالیار پہنچے یہاں ایک بزرگ محراب شاہ قلندر (۴۴۵) تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے مشائخانہ اطوار نے آپ کے دل کو موہ لیا۔ یہ قلندر صاحب بھی عجیب تھے۔ دنیا ومافیہا سے بے خبر مگر راہ ورسمِ انقلاب سے باخبر ظالم فرنگی کے دشمن اور استخلاصِ وطن کے دلدادہ۔

مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب نے قلندر صاحب کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونا چاہا تو داخلہ کی شرط یہ تھی کہ جہاد کی سوکھی رگوں میں تازہ خون دوڑائیں گے۔ اور وطنِ عزیز کو انگریزوں سے نجات دلائیں گے۔ شاہ صاحب نے بسر وچشم یہ شرط منظور کی اور سلسلۂ قادریہ میں آپ سے بیعت ہوکر خرقۂ خلافت حاصل کر (۴۴۶) لیا۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ کتنے عرصہ آپ نے گوالیار میں قیام کیا۔ البتہ اس موقعہ پر یہ فراموش نہ ہونا چاہیے کہ تقریباً تیس سال پہلے جب حضرت سید احمد شہیدؒ جہاد کے لیے روانہ ہوئے تھے تو سب سے پہلے تقریباً دو ہفتہ تک آپ کا قیام یہیں رہا تھا۔ پھر راجہ ہندوراؤ اسی ریاست کے مدار المہام تھے جن کے نام پر سید صاحب نے مرکز جہاد سے خط لکھ کر ان کو جنگِ آزادی کے لیے ابھارا تھا۔

دہلی مرکزِ سیاست اور اس کی موجودہ حالت

جہادی قلندر حضرت محراب علی شاہ کے دستِ مبارک پر عہدِ جہاد کرنے کے بعد عزم وعمل کا وقت آیا تو قدرتی طور پر حضرت مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب کی نظر دہلی کی طرف اٹھی کیونکہ:

(۱) اگرچہ انگریزی اقتدار کا مرکز کلکتہ اور اس کا فورٹ ولیم تھا مگر ہندوستانیوں کی سیاست کا مرکز اب بھی دہلی تھا۔

(۲) یہاں مغل سلاطین کا جانشین موجود تھا جو سیاسی لحاظ سے مفلوج ومجبور ہونے کے باوجود ان بے شمار

ہندوستانیوں کے جذبات پر حکمران تھا جو مغل اعظم ہی کے کسی وارث کو سلطنت و حکومت کا صحیح مستحق سمجھتے تھے۔

(۳) یہی دلی تھی جس کی ولی اللہی تربیت گاہ میں "روح انقلاب" نے جنم لیا تھا۔ جہاں شاہ عبدالعزیز صاحب کی تربیت گاہ سیاسی میں وطن عزیز کو نجات دلانے کی تحریک پروان چڑھی تھی اور اس نے اپنا دور شیر خوارگی پورا کیا تھا۔ جہاں جنگ حریت کے سب سے بڑے علمبردار سید احمد شہید کو پرچم قیادت عطا ہوا تھا۔ جہاں سے چند سال پہلے مولانا نصیرالدین صاحب دہلوی کی زیر سیادت سرفروشانِ حریت کا آخری قافلہ روانہ ہوا تھا۔

(۴) یہی دلی تھی جہاں بقول مولانا عبیداللہ سندھی اب بھی ولی اللہی تحریک کی وہ مرکزی جماعت موجود تھی جس کی رہنمائی حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب اپنی ہجرت گاہ مکہ معظمہ سے فرمارہے تھے۔

اس قسم کی متعدد وجوہات تھیں جن کی بنا پر مولانا احمد شاہ صاحب کا قدم سب سے پہلے دہلی کی سمت اٹھنا ضروری تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لیکن اس وقت کی صورتِ حال نے جو نزاکتیں پیدا کر دیں تھیں ان کا احساس مولانا سید احمد شاہ صاحب کو گوالیار میں نہیں ہوسکا۔ مثلاً

(۵) گزشتہ چالیس سال میں جس طرح دہلی حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ، حضرت مولانا نصیرالدین دہلوی شہیدؒ، حضرت مولانا شاہ اسحٰق صاحبؒ وغیرہ کی تحریکات کا مرکز رہی۔ اس کا تقاضا تھا کہ بقول مولانا عبیداللہ سندھی:

"یہاں ریذیڈنٹ کی نگاہ بہت سخت ہو"

(۶) شاطرانِ انگریز یہ طے کر چکے تھے کہ بہادر شاہ پر بادشاہت کے موجودہ طمطراق کو بھی ختم کر دیا جائے۔ لال قلعہ جو عظمتِ ہندوستان کا آخری نشان سمجھا جاتا تھا، اس کو بہادر شاہ کے جانشین سے خالی کرا لیا جائے۔ اس کے لیے جو تدبیریں عمل میں لائی جارہی تھیں اور جس طرح شہزادوں سے ساز باز کا سلسلہ جاری تھا، اس کا یہی تقاضا تھا کہ ریذیڈنٹ کی نگاہیں سخت اور محتاط رہیں۔

(۷) حضرت مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب کے دہلی تشریف لانے کا سال معین نہیں ہوسکا۔ قیاس[۳۴۴] یہ ہے کہ ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء میں آپ دہلی تشریف لائے ہوں گے یعنی تقریباً ۱۲۶۳ھ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پنجاب میں سکھ حکومت کو ختم کیا جارہا تھا۔ جس سے پورے پنجاب میں بددلی پھیلی ہوئی تھی۔ علاقہ ملتان کی فوجیں زیر قیادت دیوان مول راج انگریزوں سے جنگ کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ پٹھانوں نے زیر قیادت سلطان محمد خاں و دوست محمد خاں علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ بالاکوٹ کا رئیس سید ضامن شاہ انگریزوں کے دوست گلاب سنگھ مہاراجہ کشمیر سے برسرِ پیکار تھا اور اس کی امداد کے لیے مرکز صادق پور سے مجاہدین کا ایک دستہ مولانا ولایت علی صاحب کی زیر قیادت بالاکوٹ پہنچ چکا تھا اور شہادت مجاہدانہ کی پرانی تمنائیں سرفروشی سے

پوری کر رہا تھا۔ اور جیسا کہ اسی سلسلہ کی تیسری جلد میں بیان کیا گیا ہے بقول مسٹر دیبی پرشاد مصنف گلشن پنجاب، پورے ہندوستان بالخصوص شمال مغربی صوبہ (پنجاب و فرنٹیر و کشمیر) میں غلغلہ مچ رہا تھا۔

ان نزاکتوں کے علاوہ سیاسی مصلحتوں کا بھی تقاضا یہی تھا کہ جو تحریک موجودہ حالات کے مطابق چلائی جائے، اس کا مرکز دہلی نہ ہو۔ اسلامی جہاد کی نوعیت سے جو تحریک سید احمد شہیدؒ، مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور ان کے بعد مولانا نصیر الدین صاحب دہلویؒ نے چلائی تھی، اس کی ناکامی ثابت ہو چکی تھی، اب ایک عوامی تحریک کی ضرورت تھی۔ دہلی اگرچہ مرکزِ سیاست تھی، مگر یہاں تحریکِ حریت ایک خاص حلقہ سے مخصوص تھی۔ یہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے شاگردوں اور مریدوں کا حلقہ تھا۔ بے شک اس حلقہ کے اثرات پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے مگر شاطرانِ برطانیہ نے وہابیت کے جس الزام سے حضرت سید احمد صاحب کی تحریک کو سرحد میں ناکام کیا تھا جیسا کہ شاندار ماضی کی جلد دوم میں واضح کیا جا چکا ہے وہ الزام اگرچہ قطعاً بے بنیاد تھا مگر کچھ اپنوں کی ناعاقبت اندیشی اور زیادہ کلکتہ کے سرکاری دارالافتاء نے مسلسل پراپیگنڈہ کر کے اس بیس سال کے عرصہ میں اس الزام کو اس حد تک حقیقت کا درجہ ضرور دے دیا تھا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ یا حضرت سید احمد شہید صاحبؒ سے تعلق رکھنے والا حلقہ صرف سیاسی نہیں رہا بلکہ مذہبی نقطۂ نظر سے ایک مکتبۂ خیال بن گیا تھا۔

اب تدبر اور سیاسی دور اندیشی کا مطالبہ یہ تھا کہ آئندہ تحریک کی دعوت ایسے انداز سے دی جائے کہ جو عناصر اس مکتبۂ خیال سے تعلق نہیں رکھتے وہ بھی تحریک سے وابستہ ہوں اور مکتبہ خیال کی حد بندی ان کی شرکت یا قیادت کے راستہ میں حائل نہ ہو سکے۔ اس مصلحت کے پیشِ نظر حضرت مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب بہترین شخص تھے جن کی قدرت کے پوشیدہ اشاروں نے خود بخود دہلی کے سیاسی مدبرین کے پاس پہنچا دیا تھا۔

دہلی کے بعد آگرہ

شاہ جہاں آباد (دہلی) اور اکبر آباد (آگرہ) کا پرانا رشتہ اگرچہ اب کمزور ہو چکا تھا مگر تعاون اور اعتماد باہمی کی روح ابھی فنا نہیں ہوئی تھی، اور اگرچہ چند سال پہلے آگرہ ملی رجحانات اور قومی جذبات کے لحاظ سے ایک شہر خموشاں (۲۳۸) بن چکا تھا مگر جب سے وہ برطانوی صوبہ کا دارالحکومت بنا تھا اس میں پھر چہل پہل ہو گئی تھی اور ذی استعداد و صاحب فکر علماء و فضلاء کا ایسا مجمع اس کو میسر آ گیا تھا جس کی نظیر کوئی دوسرا شہر مشکل سے پیش کر سکتا تھا۔ ان علماء میں اگرچہ زیادہ وہ تھے جو حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز سے تلمذ اور (بالواسطہ یا بلاواسطہ) شاگردی کا تعلق رکھتے تھے۔ مگر غالباً ایسا کوئی بھی نہیں تھا جو ایک مکتبۂ خیال کے پابند کی حیثیت سے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ یا حضرت سید احمد شہیدؒ سے وابستہ ہو۔

مختصر یہ کہ مختلف مکاتبِ خیال اور مختلف تلمذ کے اور فضلاء یہاں رونق افروز تھے اور آگرہ گلہائے رنگا رنگ کا گلدان بنا ہوا تھا۔ ایک عوامی تحریک کا لالہ زار ایسا ہی گلستان بن سکتا تھا۔ دہلی کے اربابِ بصیرت نے اسی

مصلحت سے آگرہ کو منتخب کیا اور حضرت مولانا سید احمد اللہ صاحب شہید کی عنانِ توجہ دہلی کے آگرہ کی طرف منعطف کی۔

لیکن آگرہ حضرت مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب کے لیے بالکل اجنبی شہر تھا اس کے لیے ایک عرصہ درکار تھا کہ مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب آگرہ پہنچ کر اعتماد حاصل کریں اور وہاں کے سربراہوں اور کلیدی حضرات تک پہنچ سکیں۔

حضرت مولانا مفتی صدر الدین صاحب جیسا اعلیٰ مدبر جس نے حضرت سید احمد اللہ شاہ صاحب کی سیاسی تگ ودو کے لیے آگرہ کا میدان منتخب فرمایا۔ آپ نے خود ہی اس کی ذمہ داری بھی لی کہ حضرت مولانا شاہ احمد اللہ صاحب جیسے ہی آگرہ پہنچیں، بلا کدوکاوش کلیدی حضرات تک ان کی رسائی ہو جائے اور یہ ان کا اعتماد حاصل کرلیں۔ چنانچہ حسبِ روایت مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی:

> مفتی انعام اللہ خان بہادر جو محکمہ شریعت کے مفتی رہ چکے تھے، اب سرکاری وکیل تھے۔ حضرت آزردہ (مفتی صدر الدین صاحب آزردہ) کے خط کے ذریعہ شاہ صاحب (مولانا احمد اللہ شاہ صاحب) ان کے یہاں آکر مقیم ہوئے۔ ان کا گھر علماء کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مفتی صاحب کے صاحبزادے مولوی اکرام اللہ صاحب "تصویر الشعراء" مرید ہوئے۔

مجلسِ علماء

علماء وفضلاء کرام کا یہ گلدستہ جس کی شیرازہ بندی اب تک علمی اور ادبی ذوق نے کر رکھی تھی، مولانا شاہ صاحب کے پہنچنے کے بعد اس میں سیاسی رنگ پیدا ہونا شروع ہوا اور مجلس کی شکل میں اس اجتماع کی تشکیل کی گئی اس کے ارکان کی مختصر فہرست ملاحظہ ہو۔

مولوی شیخ اعتقاد علی بیگ صاحب، مولوی امام بخش صاحب، سید باقر علی صاحب ناظم محکمہ دیوانی، مولوی نور الحسن صاحب، سید مراتب علی صاحب، مولوی خواجہ تراب علی صاحب، سید حسن علی صاحب، رحمت علی صاحب، مفتی ریاض الدین صاحب، مولوی غلام جیلانی صاحب، غلام مرتضیٰ صاحب، شیخ محمد شفیع صاحب، مولوی عبد الصمد صاحب، مولوی منصب علی صاحب، مولوی محمد عظیم الدین حسن صاحب، رسول بخش صاحب، باسط علی صاحب، مومن علی صاحب، محمد قاسم صاحب داناپوری، معین الدین صاحب، مولوی کریم اللہ خاں صاحب صدر الصدور، قاضی محمد کاظم علی صاحب، تاج الدین صاحب، طفیل احمد صاحب خیر آبادی، مولانا غلام امام شہید، مفتی عبد الوہاب گوپامئوی، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب، مولوی فیض احمد صاحب بدایونی، مفتی انعام اللہ صاحب۔

یہ حضرات صدارت نظامت کے مختلف عہدوں پر فائز تھے، یا وکلاء تھے، جنھوں نے اس مجلس کی رکنیت منظور کی، اور دامے درمے قدمے شاہ صاحب کی تائید واعانت شروع کردی۔

حلقۂ ارادت

حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کے حالات شاندار ماضی جلد دوم میں گزر چکے ہیں۔ انہیں کا نمونہ حضرت مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب کے حالات میں بھی نظر آتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ جو گرمی وہاں صرف ذکر اللہ سے پیدا کی جاتی تھی، شاہ احمد صاحب کے یہاں اس کے لیے "سماع" سے بھی کام لیا جاتا تھا۔(۲۴۹)

بہر حال حضرت سید احمد اللہ شاہ صاحب کے حلقۂ بیعت و ارادت نے وسعت اختیار کی۔ محفل سماع خود ایک کشش رکھتی ہے۔ یہاں علم و فضل کے ساتھ قوت خطابت کا یہ عالم تھا کہ جہاں آپ کے وعظ کا اعلان ہوتا، ہندو مسلمانوں کا بے پناہ ہجوم ہو جاتا۔ اب ایک وقت ذکر و شغل اور مراقبہ کا سلسلہ ہوتا، دوسرے وقت محفل سماع کی گرم جوشی۔(۲۵۰) کبھی عام جلسے ہوتے ہیں جن میں دس ہزار کا اجتماع ہوتا۔ سننے والے بے قرار ہو جاتے۔ ہر شخص قربان اور فدا ہونے کا عہد کرتا۔ دوسرے تیسرے روز نماز عصر کے بعد قلعہ اکبر آباد کے میدان میں فن سپہ گری کی مشق کرائی جاتی۔ خود شاہ صاحب بہترین نشانہ باز تھے۔ تلوار کے ہاتھ بھی بہت نپے تلے ہوتے تھے۔

آپ کہیں تشریف لے جاتے تو مریدین کا ہجوم ساتھ ساتھ رہتا۔ آگے آگے ڈنکا بجتا۔ اس لیے آپ کو ڈنکے والا پیر یا ڈنکا شاہ کہا جاتا۔

وہی آگرہ جس کی جامع مسجد کو جمعہ کے روز بمشکل بیس پچیس نمازی نصیب ہوتے تھے۔ اب اس کی ایک ایک مسجد میں سینکڑوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ جو مسجدیں عرصہ سے ویران تھیں، اب ان کی آبادی پر لوگ حیرت کرتے تھے۔ آگرہ شہر اس طرح مسخر ہو گیا تو آپ نے مضافات کا قصد کیا۔ جہاں آپ پہنچتے، مریدین کی جماعت ساتھ رہتی اور ایک ہی دورہ میں اس کا رنگ بدل جاتا۔ عوام کو یاد ہو یا نہ ہو، مگر انگریز کو حضرت سید احمد شہیدؒ کا دور یاد تھا۔ حضرت مولانا سید احمد اللہ شاہ کے اس دور میں وہی رنگ دیکھا تو تیس سال پہلے کی تمام تاریخ سامنے آ گئی۔

حضرت شاہ صاحب سے تعلق رکھنے والوں پر مقدمہ

انگریز بہادر نے حضرت شاہ صاحب پر ہاتھ نہیں ڈالا، یا بقول مولوی سید طفیل احمد صاحب مرحوم، پولیس نے ان کو (مجسٹریٹ کے حکم پر) گرفتار کرنے سے انکار کر دیا۔(۲۵۱) البتہ وہ جماعت جو انگریزوں سے ملازمت کا تعلق رکھتی تھی اور اب شاہ صاحب سے وابستہ ہو گئی تھی اور انہیں کے ذریعہ حضرت شاہ صاحب آگرہ میں قیام کر کے اپنا اثر جما سکے تھے، اس پر رشوت کا مقدمہ چلا دیا۔ مراد آباد کے جج مسٹر ولسن مقدمہ کی سماعت کے لیے مقرر کیے گئے۔ حضرت شاہ صاحب اس وقت قصبات و مضافات کے دورہ پر باہر تشریف لے گئے تھے۔ آپ کو سفر ہی میں اس مقدمہ کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا۔ یہ امتحان کی پہلی منزل ہے۔ گھبرائیں نہیں، انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔ کسی پر بھی کوئی آنچ نہیں آئے گی۔

بہر حال جوں ہی مقدمہ شروع ہوا۔ پولیس نے گواہ پیش کیے، مگر یہ بناوٹی گواہ بیکار ثابت ہوئے۔ خدا جانے

پولیس نے کیا کہہ کر ان کو تیار کیا ہوگا۔ مگر جب وہ اجلاس میں یہ دیکھتے کہ جس کے برخلاف وہ گواہی دینا چاہتے ہیں، وہ ایک با خدا عالم دین ہے تو گھبرا جاتے اور بقول مفتی انتظام اللہ شہابی:

''جھوٹی گواہی دینے کی جرأت نہ ہوتی۔''

بہر حال جوں توں کر کے ابتدائی عدالت میں سخت سخت سزائیں تجویز کی گئیں۔ مولوی غلام جیلانی وکیل صدر، مولوی غلام امام شہید پیش کار اور مفتی سراج الدین پیش کار کو چار چار سال کی قید بامشقت، مفتی محمد قاسم صاحب داناپوری مسل خواں کو تین سال مولوی بدر الحسن صاحب مسل خواں اور مولوی آل حسن منصف کو دو دو سال۔

ایک اخبار ''سحر الاخبار'' نے اس خبر کو شائع (۳۵۲) کرتے ہوئے لکھا:

''دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مولانا محمد قاسم داناپوری جن کا شمار اولیاء کرام میں ہے اور ان کے ہزارہا مرید صاحب ریاضت ومجاہدہ ہیں، ان کو رشوت سے متہم کیا جاتا ہے، تعجب ہے۔ دوسرے صاحب مولانا غلام امام شہید جو عاشق رسول کہلاتے ہیں، ان کے بھی ہزارہا مرید آگرہ، حیدرآباد ومراد آباد میں ہیں، ان پر بھی رشوت کا الزام ہے۔''

بہر حال فوراً ہی اپیل دائر کی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب حضرات بری کر دیئے گئے۔ بقول حضرت شاہ صاحب کسی کا بھی بال بیکا نہ ہوا۔

خان بہادر مفتی انعام اللہ صاحب (۳۵۳) وکیل صدر جن کے نام شاہ صاحب حضرت مولانا مفتی صدر الدین صاحب آزردہ کا خط لائے تھے، جو سب سے پہلے حضرت شاہ صاحب کے میزبان بنے تھے یہ بھی معطل کیے گئے، الزام یہ تھا کہ مشتبہ خطوط ان کے یہاں سے برآمد ہوئے ہیں۔ (۳۵۴)

آگرہ سے کانپور اور لکھنؤ

مولانا احمد اللہ شاہ صاحب آگرہ میں مقیم تھے کہ اودھ میں مولانا امیر علی شاہؒ کی شہادت کا ہنگامہ پیش آ گیا۔ آپ کو اس کی تفصیلات کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا: ''اب ہمارے کام کا وقت آ گیا''۔ چنانچہ آپ نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ مریدین کا بھی ایک جم غفیر ساتھ ہولیا۔ اس طرح کہ ہر ایک مرید نے توشہ ساتھ لے لیا تھا اور گھر بار کا معقول انتظام کر دیا تھا۔ ماؤں نے بیٹوں کو اجازت دی تھی، اور بیویاں شوہروں کو رخصت کر رہی تھیں۔ ہر ایک دل مطمئن تھا مرشد ساتھ ہے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ (۳۵۵)

شاہ صاحب آگرہ سے روانہ ہو کر پہلے کانپور پہنچے۔ وہاں عظیم اللہ وغیرہ سے ملاقاتیں رہیں۔ پھر آپ اناؤ ہوتے ہوتے لکھنؤ پہنچے۔ گھاس منڈی میں قیام کیا۔ وہیں مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی سے ملاقات ہوئی۔ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی تحریر فرماتے ہیں۔

"مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی جو خالص سرکاری آدمی تھے ان دنوں لکھنؤ میں صدر الصدور تھے۔ کچھ دن گزرے تھے کہ مولوی عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی کی تائید میں مولانا امیر علی شاہ صاحب (۴۵۶) کے خلاف فتوئی صادر کر چکے تھے وہ (مولانا خیر آبادی) شاہ صاحب سے ملنے آئے۔ شاہ صاحب سے ایسی گفتگو ہوئی کہ گھر جاتے ہی صدر الصدوری سے استعفیٰ دے دیا اور الور چلے گئے اور انگریزوں کے جتنے خیر خواہ تھے، اتنے (۴۵۷) ہی دشمن ہو گئے۔" (۴۵۸)

لکھنؤ نے تقریباً چالیس سال پیشتر حضرت سید احمد شہیدؒ کا استقبال بھی بڑی شان سے کیا تھا۔ وہی روح وہاں بھی کارفرما تھی، اور اہلِ لکھنؤ حضرت سید صاحب کے زمانہ کی بہ نسبت اب زیادہ زخم خوردہ ہو چکے تھے۔ انتہا یہ کہ اُن کا بادشاہ واجد علی شاہ جس کو انگریز خواہ کچھ بھی کہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ لکھنؤ والوں کی آنکھ کا تارا اور باشندگانِ اودھ کی آزادی کا آخری نشان تھا، وہ بھی انتہائی ذلت وخواری کے ساتھ اُن سے جدا کر دیا گیا، یا جدا کیا جانے والا تھا۔

بہر حال حضرت سید صاحب شہیدؒ کی طرح حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحبؒ بھی مقبول اور محبوب ہونے لگے اور باشندگانِ لکھنؤ کی والہانہ وابستگی آپ سے دن بدن بڑھنے لگی۔ مگر اس انتہائی نازک دور میں کہ بارک پور والی فوج برخواست کی گئی تھی جس کے سپاہی زیادہ تر اودھ کے رہنے والے تھے۔ ادھر واجد علی شاہ کو معزول کر کے گرفتار کر لیا گیا تھا یا گرفتار کرنے کا منصوبہ تیار کیا جا رہا تھا۔ حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب جیسے انقلابی امام کا لکھنؤ میں قیام کرنا خود شاہ صاحب کے لیے خطرناک تھا، اور تحریک کے لیے بھی تشویش ناک۔ اس لیے شاہ صاحب نے لکھنؤ کا قیام مختصر کر کے فیض آباد کا رخ کیا۔ اب شاہ صاحب نے تمام تکلفات برطرف کر دیے تھے اور بقول مولانا فتح محمد تائب لکھنوی:

نصاریٰ سے جو حکم پیکار تھا ہر ایک شخص سے اس کا اظہار تھا

اس عریانی کا نتیجہ ظاہر تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عمال نے آپ کو گرفتار کرنا چاہا۔ مگر عوام کے ہجوم اور اُن کی بے پناہ عقیدت کے باعث پولیس یہ جرأت نہ کر سکی، تو فوج سامنے آئی۔ حضرت شاہ صاحب اور آپ کے ساتھیوں نے مقابلہ شروع کر دیا۔ مگر چونکہ فوج کا یہ اقدام دفعۃً تھا شاہ صاحب اور آپ کے ساتھی پہلے سے تیار نہ تھے اس لیے یہ مقابلہ بھی ناکام ہی رہا۔ حضرت شاہ صاحب کسی فوجی کی تلوار کی ضرب سے بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ آپ کو فوراً گرفتار کر کے جیل خانہ بھیج دیا گیا۔ آپ کے ساتھی بھی گرفتار کر لیے گئے۔

تحریکِ انقلاب ۱۸۵۷ء کا آغاز

یہ ۱۸۵۶ء کے اواخر یا ۱۸۵۷ء کے شروع کا واقعہ ہے چند ماہ بعد ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کی طوفان انگیز تاریخ آئی جس نے پورے شمالی ہند کی زمین ہلا دی۔ حضرت شاہ صاحب اس وقت جیل میں تھے۔ فیض آباد میں عنان

قیادت ایک اور صاحب نے سنبھالی۔ اُن کا اسمِ گرامی مولانا سکندر شاہ صاحب فیض آبادی تھا۔ آپ نے جیل خانہ پر دھاوا بول کر حضرت شاہ صاحب کو تو چھڑا لیا لیکن خود انگریزی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ مگر مولانا احمد اللہ شاہ صاحب نے جھنڈے کو گرنے نہیں دیا۔ اپنی رہائی کے بعد پورے ہندوستان کی رہائی کے لیے پرچم لہرایا، اور جو فدایانِ وطن جمع ہوئے تھے اُن کو ساتھ لے کر لکھنؤ کا رُخ کیا۔ (۳۵۹)

بقول مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی مرحوم:

جس طرح میرٹھ وغیرہ کے باغی سمٹ کر دہلی میں جمع ہوئے تھے اور ظفر کو ہندوستان کا شہنشاہ بنایا تھا، ویسے ہی الہ آباد اور فیض آباد کے باغی بھی ۱۸۵۷ء میں جوش و خروش کے ساتھ لکھنؤ پہنچے۔ اُن کے آتے ہی یہاں کے بہت سے بے فکرے اُٹھ کھڑے ہوئے اور برجیس قدر کی بادشاہی قائم کر دی۔ تھوڑی سی انگریزی فوج اور یہاں کے تمام یورپین عہدہ دارانِ مملکت جو باغیوں کے ہاتھ سے جاں بر ہو سکے ''بیلی گارڈ'' میں قلعہ بند ہو گئے۔ (گذشتہ لکھنؤ)

بہر حال مولانا شرر کے الفاظ استعمال کیجیے یا ان کو انقلاب پسند محبانِ وطن کہیے، تاریخی حقیقت یہ ہے کہ برجیس قدر جن کی عمر صرف دس سال تھی، بادشاہ (۳۶۰) بنائے گئے ان کی والدہ حضرت محل جو ایک بہادر خاتون تھیں، ان کی ولی اور سرپرست مقرر ہوئیں۔ ناصر الدولہ علی محمد خاں عرف ممو خاں وزیر اعظم یا مدار المہام مقرر ہوئے لیکن اس قیامت خیز دور میں جس کے بل بوتے پر یہ سب کچھ ہوا، وہ مولانا احمد اللہ شاہ صاحب تھے جن پر سنی اکثریت پورا اعتماد کرتی تھی۔

مقابلہ، ناکامی اور وجوہاتِ ناکامی

بے شک حکومت کا نقشہ قائم ہو گیا۔ عام ہندو مسلمانوں نے دلوں کی گہرائیوں سے وفاداری کا عہد بھی اس حکومت سے کر لیا مگر جو مرض دہلی میں تھے، وہی بیماریاں لکھنؤ کی فضا میں بھی موجود تھیں بلکہ ان سے کسی قدر زیادہ۔

یہاں شیعہ سنی کا مسئلہ بھی موجود تھا۔ اربابِ اقتدار کی جنگی نا اہلیت بھی اپنا رنگ جمائے ہوئے تھی، اور مرزا مغل کی طرح ممو خاں کی ریشہ دوانیاں بھی احمد اللہ شاہ جیسے بہادر اور دیانت دار جرنیل کے راستہ میں ہر قدم پر رکاوٹ کے لیے موجود تھیں۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ یعنی بہادرانہ معرکوں کے باوجود ناکامی، جس کی تفصیل کے لیے مستقل جلد کی ضرورت ہے۔

مولانا احمد اللہ شاہ صاحب لکھنؤ سے ہٹ کر شاہ جہان پور پہنچے۔ شاہزادہ فیروز، جنرل بخت خاں، تجمل حسین خاں رئیس فرخ آباد، جنرل اسمٰعیل خاں (فتح گڑھ)، ناناراؤ پیشوا، غرض تمام ہی سرغنہ نے بار بار شکست اٹھانے کے بعد بھی ہمت نہیں ہاری تھی اور جو پورے عزم کے ساتھ طے کر چکے تھے کہ ؎

یا جاں رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

یہ سب جمع ہو گئے۔ شاہ جہان پور میں جو معرکے ہوئے، ان کا مختصر تذکرہ واقعات شاہ جہان پور کے سلسلہ

میں پہلے گزر چکا ہے، اور جب یہاں بھی ناکامی ہوئی تو شاہ صاحب اپنے بچے کھچے ساتھیوں کے ساتھ قصبہ محمدی پہنچے اور یہاں ازسرِ نو تنظیم کی۔ ایک عارضی حکومت بھی قائم کر لی۔ جس کی کابینہ کے ارکان یہ تھے:

جنرل بخت خاں	وزیر جنگ
مولانا سرفراز علی صاحب	قاضی القضاۃ (چیف جسٹس)
نانا راؤ پیشوا	دیوان (وزیر مال)
مولانا لیاقت علی صاحب آلہ آبادی، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب اکبر آبادی، مولانا فیض اللہ صاحب بدیوانی، شاہزادہ فیروز شاہ	......ارکان حکومت

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ حامیِ دین محمد احمد اللہ بادشاہ

پھر کیا ہوا؟ تاریخ شاہ جہان پور اور صحیفۂ زرین کے حوالہ سے مفتی انتظام اللہ شہابی تحریر فرماتے ہیں:

ابھی شاہ صاحب پوری طرح جمنے نہ پائے تھے کہ سرکالن کیمبل نے قصبہ محمدی پر حملہ کر دیا۔ خوب خوب مقابلہ رہا۔ شاہ صاحب کے ہٹتے ہی محمود خان (۴۱) معہ حضرت محل اور نانا راؤ، عظیم اللہ خاں اور بخت خاں وغیرہ نیپال کی طرف چلتے ہوئے۔

لیکن شاہ صاحب نے پوائیں کا رخ کیا جو بندیل کھنڈ اور اودھ کی سرحد پر شاہ جہان پور سے شمال مشرق میں تقریباً ۱۸ میل ہے۔ راجہ پوائیں اگر تعاون کے لیے آمادہ ہو جاتا تو شاہ صاحب کو پھر سانس لینے کا موقع مل سکتا تھا۔ مگر اس نے غداری کی۔ اول وہ آپ سے گفتگو کے لیے آمادہ ہوا۔ اور جب شاہ صاحب گفتگو کے لیے پہنچے تو راجہ نے اپنی گڑھی کا پھاٹک بند کر لیا اور اوپر سے گولیوں کی بوچھاڑ کر کے شاہ صاحب کو شہید کر دیا۔ اب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کا بیان ہے کہ:

راجہ بلدیو سنگھ نے سر مبارک جسم اطہر سے اتارا، اور صاحب کلکٹر بہادر شاہ جہان پور کے سامنے پیش کر دیا جو عرصہ تک کوتوالی پر لٹکا رہا۔ نعش کو آگ میں پھونک دیا۔ اس پر سرکار برطانیہ نے پچاس ہزار روپیہ نقد اور خلعت فاخرہ راجہ پوائیں کو عطا کیا۔ یہ واقعہ شہادت ۵ جون ۱۸۵۸ء مطابق ۱۳ ذی قعدہ ۱۲۷۵ھ کو پیش آیا۔ دریا پار محلہ جہاں آباد متصل احمد پور مسجد کے پہلو میں سر دفن کر دیا گیا۔ مولوی سید طفیل احمد صاحب (عینک مصنف روشن مستقبل و حکومت خود اختیاری) نے کتبہ تاریخ نصب کرا دیا۔ (۴۲)

شاہ صاحب کے متعلق جو لکھا گیا، اس کی تصدیق کے لیے چند انگریز مورخین کے بیانات ملاحظہ فرمایئے۔ چارلس بال لکھتا ہے:

ایک لمبا، لاغر مگر مضبوط آدمی، دبلے جبڑے، لمبے پتلے ہونٹ اونچا بانسہ، بڑی بڑی آنکھیں، تیغ نما ابرو، لمبی داڑھی، سخت کالے بالوں کی زلفیں دونوں کانوں پر پڑی رہتی تھیں۔

چارلس نان حلیہ بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے:

اودھ کے باغیوں کی تجاویز اور سازش کی تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس مولوی کو انگریزی حکام بحیثیت احمد شاہ فقیر درصوفی عرصے سے جانتے تھے۔ شمال مغربی صوبجات میں ظاہراً مذہبی تبلیغ کی خاطر دورہ کر چکے تھے۔ لیکن فرنگیوں کے لیے یہ راز ہی رہا۔

اپنے سفر کے دوران وہ ایک عرصے تک آگرہ میں مقیم رہے۔ حیرت انگیز اثر شہر کے مسلم باشندوں پر تھا۔ شہر کے مجسٹریٹ ان کی جملہ نقل و حرکت پر نظر رکھتے تھے۔ عرصہ بعد یقین ہو گیا کہ وہ برطانوی حکومت کے خلاف ایک سازش کر رہے ہیں لیکن پھر بھی ان کو کسی باغیانہ جرم میں ملوث نہ پایا گیا۔ وہ آزاد رہے۔ آخرکار جب بغاوت رونما ہوئی اور فیض آباد کے فوجیوں میں بھی یہ لوگ پہنچے تو یہ مولوی جو سابقاً غیر منظم طریقے پر اپنے مریدوں کو ابھار رہا تھا، گارد کی نگرانی میں تھا۔ ہنگامہ کرنے والوں نے ان کو چھڑا کر اپنا سردار بنالیا۔ اس طرح مولوی صاحب ایک طاقت ور فوج کے سپہ سالار بن گئے۔ اگرچہ کچھ عرصہ تک دوسرے باغی سرداروں کی طاقت چھپی رہی لیکن اس شخص کا اثر باغیوں پر بھرپور تھا لیکن یہ قابل آدمی تھا، اور ظلم کے دھبے سے پاک تھا جو نانا صاحب کے انتقامی جوش کی خصوصیت تھی، اس سے یہ بالکل پاک صاف تھا۔ اس لیے برطانیہ بھی ایک حد تک ان کو اچھا اور قابل نفرت نہیں سمجھتی تھی۔ (۶۶۳)

جنرل ٹامسن جو ایک بہادر انگریز تھا اور ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں شریک تھا، شاہ صاحب کی بابت لکھتا ہے:

مولوی احمد اللہ شاہ بڑی لیاقت و قابلیت رکھتا تھا۔ وہ ایسا شجاع تھا کہ خوف اس کے نزدیک نہیں آتا تھا۔ یہ عزم کا پکا، ارادہ کا مستقل تھا۔ باغیوں میں اس سے بہتر کوئی سپاہی نہیں تھا۔ یہ فخر اسی کو حاصل ہے کہ اس نے دو مرتبہ سر کالن کیمبل کو میدان جنگ میں ناکام رکھا۔ وہ بہ نسبت اور باغیوں کے خطاب شاہ کا زیادہ مستحق تھا۔ اگر محبِ وطن ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اپنے ملک کی آزادی کے لیے جو غلطی برپا ہوگئی ہو، سازشیں کی جائیں اور لڑائیاں لڑی جائیں، تو مولوی یقیناً اپنے ملک کا محب صادق تھا۔ اس نے کبھی تلوار کو مخفی اور سازشی قتل سے خون آلود نہیں کیا، وہ بہادرانہ اور معجزانہ طور پر ان سے معرکہ آرا ہوا جنھوں نے اس کا ملک چھین لیا تھا۔ دنیا کی ساری قومیں اس کو تعظیم وادب کے ساتھ جو شجاعت و صداقت کے لیے لازمی تھیں اور جن کا مستحق تھا، اس کو یاد کریں گی۔ (۶۶۴)

فارسٹر کا ایک اور خراجِ عقیدت ملاحظہ فرمائیے:

جن کو فیض آبادی مولوی کہا جاتا ہے اس کے متعلق یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وہ عالم باعمل ہونے کی

وجہ سے مولوی تھا۔ روحانی طاقت کی وجہ سے صوفی اور جنگی مہارت کی وجہ سے سپاہی اور سپہ سالار تھا۔ اس کی طبیعت ظلم سے پاک تھی۔ ہر انگریز اس کو قدر نگاہ سے دیکھتا ہے۔ (۴۶۵)

رفقاء

مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی نے چند اسماءِ گرامی اس عنوان کے تحت نقل کئے ہیں۔ ان فدا کارانِ حریت کے نام ہم بھی زیبِ صحیفہ کرتے ہیں:

امیر احمد، شاہ آفاق، قطب شہید، رستم علی، اسمٰعیل خاں، غلام محمد خاں، کفایت اللہ تلہری، فرقان علی، محمد شاہ خاں شہید، سعد اللہ خاں شہید، نور احمد، احمد یار خاں تحصیلدار، نواب غلام قادر خاں (بقول) عبدالرؤف خاں۔

اکثر انڈمان بھیجے گئے۔ کچھ کو دار نصیب ہوئی۔ کچھ گوشہ گیر ہوئے۔

نہ شیشہ، نہ مے، نہ ساقی رہا   فقط شکوۂ بخت باقی رہا

مولانا مفتی عنایت احمد(۲۶۶) صاحب کاکوروی

خاندان

مفتی عنایت احمد بن منشی محمد بخش بن منشی غلام محمد بن منشی لطف اللہ۔ قریشی النسل تھے۔ ان کے اجداد میں امیر حسام نامی ایک شخص بغداد سے آ کر قصبہ دیوہ ضلع بارہ بنکی میں سکونت پذیر ہوئے اور اپنے صاحبزادے ضیاء الدین کی شادی وہیں کی، وہیں کے قاضی مقرر ہوئے۔ قصبہ دیوہ میں جس محلہ میں امیر حسام نے قیام کیا، وہ حجازی محلہ مشہور ہوا، جس کو بعد میں حجاجی کہا جانے لگا۔ اسی مناسبت سے امیر حسام کی اولاد بھی حجاجی کہلائی، باقی یہ خیال غلط ہے کہ امیر حسام حجاج بن یوسف ثقفی حاکم عراق کی اولاد سے ہیں۔ حجاج قریشی نہیں ثقفی تھا۔

سکونت کاکوری

مفتی عنایت احمد صاحب کے دادا منشی غلام محمد کی سسرال کاکوری میں تھی۔ مفتی صاحب کے والد منشی محمد بخش اور چچا شیخ عبدالحبیب نے اسی ننہالی تعلق کی بنا پر کاکوری میں سکونت اختیار کر لی۔ پھر ان کے تمام قریبی اعزا بھی کاکوری آ کر سکونت پذیر ہو گئے، اور کاکوروی کہلانے لگے۔ اب بھی وہاں ان کا بڑا خاندان سکونت پذیر ہے۔

پیدائش: مفتی عنایت احمد صاحب ۹ر شوال ۱۲۲۸ھ کو بمقام دیوہ پیدا ہوئے۔

تحصیل علم

ابتدائی تعلیم کاکوری میں حاصل کی، جب ۱۳ سال کی عمر ہو گئی تو تحصیل علم کی غرض سے رام پور گئے۔ وہاں مولوی سید محمد صاحب بریلوی سے صرف و نحو، مولوی حیدر علی صاحب ٹونکی اور مولوی نور الاسلام صاحب سے دوسری درسی کتابیں پڑھیں۔ رام پور میں درسی کتابیں ختم کر کے دہلی پہنچے۔ وہاں شاہ محمد اسحاق صاحب محدث دہلویؒ (المتوفی ۱۲۶۲) سے کتب حدیث سبقاً سبقاً پڑھیں اور سند حاصل کی دہلی سے علی گڑھ آئے، جہاں مولانا بزرگ علی مارہروی (شاگرد شاہ عبدالعزیز صاحبؒ دہلوی و شاہ رفیع الدین صاحبؒ دہلوی) جامع مسجد کے مدرسہ میں دینی خدمات انجام دے رہے تھے۔ یہ مدرسہ عہد محمد شاہی میں بانی مسجد نواب ثابت خاں نے قائم کیا تھا۔ علی گڑھ میں مفتی عنایت احمد صاحب نے تمام منقولی اور معقولی کتابیں مولانا بزرگ علی سے پڑھیں اور فارغ التحصیل ہوئے۔ بعد فراغ اسی مدرسہ میں مدرس مقرر ہو گئے۔ کیونکہ ۱۲۴۲ھ میں مولانا بزرگ علی صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔

ملازمت

ایک سال تک مدرسہ میں مدرس رہے۔ اس کے بعد مفتی و منصف کے عہدہ پر علی گڑھ میں ہی تقرر ہو گیا۔ اسی زمانہ میں مولوی لطف اللہ صاحب علی گڑھ (المتوفی ۱۳۳۴ھ) کے تلمذ کا سلسلہ شروع ہوا جو کہ مفتی صاحب کے نامور شاگرد گزرے ہیں۔ مولوی سید حسین شاہ صاحب بخاری نے بھی اسی زمانہ میں پڑھا ہے۔

اجلاس میں سبق

مولوی سید حسین شاہ بخاری فرمایا کرتے تھے کہ مفتی صاحب مجھ کو ہدایہ اجلاس میں پڑھایا کرتے۔ جیسے ہی کسی مقدمہ سے فرصت ہوتی، اشارہ ہوتا، میں پڑھنا شروع کر دیتا۔ پھر کوئی سرکاری کام آ جاتا تو اس میں مصروف ہو جاتے اس دو گونہ مشغولیت کے باوجود مسائل اس طرح ذہن نشین کرا دیئے کہ کبھی فراموش نہ ہوئے۔ آپ طلباء سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ مولوی لطف اللہ صاحب کی تعلیم کے زمانہ میں ہی مفتی صاحب کا تبادلہ علی گڑھ سے بریلی ہو گیا تھا۔ مولوی لطف اللہ صاحب بریلی ساتھ گئے۔ وہاں جملہ کتب درسیہ ختم کیں۔ صبح کی نماز کے بعد مفتی عنایت احمد صاحب تلاوت فرماتے تھے۔ مولوی لطف اللہ صاحب خدمت میں حاضر رہتے۔ دوران تلاوت میں اگر کوئی مشکل صیغہ آتا تو مفتی صاحب ان کی طرف دیکھتے۔ یہ حل کرتے، حل نہ کر سکتے تو بعد تلاوت خود حل کر کے بتاتے، مفتی عنایت صاحب نے بعد فراغ مولوی لطف اللہ صاحب کو اپنے ہی اجلاس کا سر رشتہ دار مقرر کر لیا۔

قیام بریلی

بریلی کے قیام میں مفتی عنایت احمد صاحب صدر امین ہوئے۔ درس و تدریس کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ بریلی کے تلامذہ قاضی عبد الجلیل صاحب قاضی شہر، مولوی فدا حسین منصف اور نواب عبد العزیز خاں مشہور لوگ گزرے۔ آخر الذکر حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں کے پوتے تھے۔ درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

اسی زمانہ میں بریلی میں مفتی عنایت احمد صاحب کے ہم وطن مولوی رضی الدین ابن علیم الدین (المتوفی ۱۲۷۳ھ) صدر الصدور تھے ۱۲۷۳ھ میں آگرہ کے صدر مقرر ہوئے ابھی بریلی سے روانگی عمل میں نہ آئی تھی کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ شروع ہوئی۔ مفتی صاحب آگرہ نہ جا سکے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء

نواب خاں بہادر خاں نبیرہ حافظ الملک حافظ رحمت خان نے روہیل کھنڈ میں علم جہاد بلند کیا تو مفتی عنایت احمد صاحب بھی اس میں شریک ہوئے بریلی اور رام پور آپ کی سرگرمیوں کے آماج گاہ رہے۔ جب تحریک

آزادی ناکام ہوئی اور انگریزوں کا ملک پر دوبارہ تسلط ہو گیا تو مفتی عنایت احمد صاحب گرفتار ہوئے مقدمہ چلا اور عبور دریائے شور کی سزا تجویز ہوئی۔

قیام انڈمان

مفتی عنایت احمد صاحب نے جزیرہ انڈمان میں بھی درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا کام شروع کر دیا۔ جزیرہ انڈمان میں ان کے پاس کسی علم کی کوئی کتاب نہ تھی۔ محض اپنی قوتِ حافظہ پر مختلف فنون میں رسالے تصنیف کر دیئے اور وطن واپس آ کر کتابیں دیکھیں تو تمام مسائل حرف بحرف صحیح تھے۔

ایک انگریز کی فرمائش پر تقویم البلدان کا ترجمہ کیا جو دو برس میں ختم ہوا، اور وہی رہائی کا سبب بنا۔ ۱۲۷۷ھ میں رہائی پا کر کاکوری آئے۔ مولوی لطف اللہ صاحب علی گڑھی نے تاریخ رہائی لکھی اور خود کاکوری حاضر ہو کر پیش کی۔

چوں بفضل خالق ارض و سما — اوستادم شد ز قید غم رہا

بہر تاریخ خلاص آں جناب — پر نوشتم ان استاذی نجا

۱۲۷۷ھ

قیام کان پور

انڈمان سے واپس آ کر مفتی عنایت احمد صاحب نے مستقل قیام کانپور میں رکھا مدرسہ فیضِ عام قائم کیا جو کہ کان پور کی مشہور دینی درس گاہ ہے، کان پور کے مسلمان تاجر مدرسہ کے مصارف برداشت کرتے تھے۔ ان میں حافظ برخوردار خاص طور سے مشہور تھے۔ مفتی صاحب اپنے مصارف کے لیے صرف پچیس تیس روپیہ ماہانہ تنخواہ لیتے تھے بقول مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اسی مدرسہ کا فیض بالآخر ندوۃ العلماء کی شکل میں ظاہر ہوا۔

سفرِ حج

دو سال کے بعد حج کا ارادہ کیا۔ مدرسہ فیض عام کان پور میں مولوی سید حسین شاہ صاحب بخاری کو مدرس اول اور مولوی لطف اللہ صاحب کو مدرس ثانی مقرر کر کے حج کو روانہ ہو گئے۔ مفتی صاحب ہی امیر الحجاج تھے۔ اس زمانہ میں جہاز ہوا کی مدد سے چلتے تھے۔

شہادت

جدہ کے قریب جہاز پہاڑ سے ٹکرا کر ڈوب گیا۔ مفتی صاحب بحالت نماز احرام باندھے ہوئے غریق و شہید ہوئے۔ یہ واقعہ ۷ شوال ۱۲۷۹ھ کا ہے۔ ۵۲ برس کی عمر پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس سفینۂ علم کے ساتھ ایک نادر تصنیف کا مسودہ بھی غرقاب ہوا جس کی تلافی ناممکن ہے۔ مفتی عنایت احمد صاحب نے چالیس

فن کے ایک ایک مسئلہ کا انتخاب کیا تھا، اور ہر ایک مسئلہ پر چالیس ورق لکھنے کا التزام اس صفت کے ساتھ تھا کہ مسئلہ بھی بے نقطہ ہو اور اس پر پوری بحث بھی شگفتہ عبارت میں اسی التزام کے ساتھ کی جائے۔ تفسیر میں وعلم ادم الاسماء کلھا کی آیت اور حدیث میں کل مسکر حرام (رواہ مسلم) منتخب فرمائی تھی۔ بڑا حصہ مکمل ہو چکا تھا۔

تلامذہ

مفتی صاحب کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے اکثر نامور مدرس ہوئے۔ چند نام یہ ہیں:
مولوی سید حسین شاہ صاحب بخاری، مولوی امیر الدین احمد صاحب بخاری، مولوی لطف اللہ صاحب علی گڈھی، مولوی حافظ عزیز الدین صاحب عباسی، مولوی حافظ نواب عبدالعزیز خاں صاحب بریلوی، منشی مقصود احمد صاحب برادر زادہ، مولوی حکیم حبیب علی صاحب کاکوروی۔

تصانیف

مفتی عنایت احمد صاحب کی تصانیف بھی بہت ہیں جو آپ کے علم وفضل پر دال ہیں، خاص بات یہ ہے کہ آج تک کسی نے مفتی صاحب کی کتابوں پر اعتراض نہیں کیا، اور مفتی صاحب نے اردو میں جو رسالے لکھے ہیں، ان کی زبان نہایت صاف اور بامحاورہ ہے۔ مضامین اخلاقی اور اسلامی ہیں۔ ایک مختصر سا فنڈ جمع کر لیا تھا۔ اس کی مدد سے مفتی صاحب کی یہ تصانیف طبع ہو کر تقسیم وشائع ہوتی تھیں۔

شرح ہدایۃ الحکمۃ صدر شیرازی..... تصدیقات حمد اللہ اور شرح..... پر بھی حواشی لکھے ہیں۔ اب آپ کی جملہ تصانیف کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا جاتا ہے۔

علم الفرائض

نام سے مضمون ظاہر ہے ۱۲۶۲ھ میں لکھی گئی۔ نام تاریخی ہے۔ (۳۶۷)

ملخصات الحساب

فن ریاضی پر مفید رسالہ ہے۔ ریاضی کے ابتدائی اصول آسان پیرایہ میں تحریر کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب بھی ۱۲۶۲ھ میں لکھی گئی، نام تاریخی ہے۔

تصدیق المسیح ردع کلمۃ القبیح

نام سے مضمون ظاہر ہے۔ ۱۲۶۸ھ میں کتاب لکھی گئی۔ نام تاریخی ہے۔

الکلام المبین فی آیات رحمۃ للعالمین

یہ ضخیم تصنیف ہے ۱۲۷۰ھ میں یہ کتاب لکھی گئی۔ نام تاریخی ہے۔ معجزات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان نہایت شرح وبسط سے کیا ہے۔

ضمان الفردوس

۱۲۷۲ھ میں یہ رسالہ لکھا۔ نام تاریخی ہے۔ بخاری کی حدیث من یضمن لی ما بین لحییه وما بین رجلیه اضمن له الجنة کی شرح لکھی ہے۔ کتاب دو باب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں معاصی متعلقہ زبان کا بیان ہے۔ اور دوسرا باب عضوِ خاص کے گناہوں پر مشتمل ہے۔

بیان قدر شب براءۃ

یہ ایک مختصر رسالہ ہے۔ شب براءۃ کے فضائل میں ۱۲۷۲ھ میں لکھا گیا۔ نام تاریخی ہے۔

رسالہ در مذمت میلہ ہا

یہ رسالہ ۱۲۷۲ھ میں لکھا گیا۔ نام تاریخی ہے۔ مسلمان ہندوؤں کے میلوں میں شرکت کرتے ہیں۔ اس کے رد میں لکھا گیا۔

فضائل علم وعلماء دین

نام سے مضمون کتاب ظاہر ہے ۱۲۷۲ھ میں کتاب لکھی گئی۔ نام تاریخی ہے۔

محاسن العمل الافضل مع التتمات

یہ کتاب بھی ۱۲۷۲ھ میں لکھی گئی۔ نام تاریخی ہے، کتاب طبع ہو چکی ہے۔

فضائل درود وسلام

درود وسلام کے فضائل میں یہ کتاب ۱۲۷۲ھ میں لکھی۔

ہدایات الاضاحی

نام سے کتاب کا مضمون ظاہر ہے۔ تاریخی نام ہے۔ ۱۲۷۲ھ میں لکھی گئی۔

الدر الفرید فی مسائل الصیام والقیام والعید

نام سے مضمون کتاب ظاہر ہے ۱۲۷۲ھ میں مرتب ہوئی۔ نام تاریخی ہے۔

وظیفہ کریمیہ

اوراد وظائف پر مشتمل ہے ۱۲۷۶ھ میں انڈمان میں لکھی گئی۔ کتاب طبع ہو چکی ہے۔

خجستہ بہار

گلستاں کے طرز پر نثر میں یہ کتاب لکھی ہے ۱۲۷۶ھ میں انڈمان میں تالیف ہوئی۔

علم الصیغہ

عربی صرف کا نہایت جامع رسالہ، آج تک درس میں شامل ہے۔ کوئی حافظ سید وزیر علی صاحب تھے، ان کی تحریک پر لکھا گیا۔ اس کا دوسرا نام قوانین جزیلہ حافظیہ بھی ہے۔ یہ رسالہ بھی ۱۲۷۶ھ میں انڈمان میں لکھا گیا۔ نام تاریخی ہے ایک مقدمہ، چار باب اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔

احادیث الحبیب المتبر کہ

۱۲۷۵ھ میں قیامِ انڈمان کے زمانہ میں چالیس حدیثوں کا یہ مجموعہ مرتب کیا۔ رسالہ طبع ہو چکا ہے۔

تواریخ حبیب اللہ

انڈمان میں ۱۲۷۵ھ میں سرکاری ڈاکٹر محمد امیر خاں کی فرمائش پر لکھی، جس کا ذکر مفتی صاحب نے دیباچہ میں کیا ہے۔ واقعات نہایت تفصیل سے بقید تاریخ لکھے ہیں سیرت میں بہت خوب کتاب ہے۔

ترجمہ تقویم البلدان

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ ایک انگریز کی فرمائش پر انڈمان میں عربی سے ترجمہ کیا اور یہی رہائی کا سبب بنا۔

نقشہ مواقع النجوم

یہ کتاب ہیئت جدید (فیثا غورسی) پر لکھا ہے بعض انگریزوں نے اس کو پسند کیا اور مولف تذکرہ مشاہیر کاکوری نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ مسٹر طامسن لفٹنٹ گورنر مغربی شمالی نے جو علم ہیئت کے عالم تھے، اس کو خاص طور سے پسند کیا اور اسی کتاب کی وجہ سے مفتی صاحب کو "خان بہادری" کا خطاب ملا۔ مؤلف تذکرہ مشاہیر کاکوری کے بیان کا آخری جملہ غلط ہے۔ مفتی صاحب کو خان بہادری کا خطاب نہیں ملا۔

لوامع العلوم واسرار العلوم

اس کتاب کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس میں چالیس علوم کا خلاصہ لکھنا پیش نظر تھا۔ ہر علم کا نام بھی بے نقط تھا۔ مثلاً علم التفسیر کا نام علم کلام اللہ، علم حدیث کا نام علم کلام الرسول، فقہ کا نام علم الاحکام وغیرہ یہ کتاب مفتی صاحب کے ساتھ غرق ہو گئی۔ حواشی کو چھوڑ کر مفتی صاحب کی جملہ تصانیف کی تعداد بیس ہے جو معلوم ہو سکی ہیں۔

ان میں سے چھ کتابیں وظیفہ کریمہ، تحفۂ بہار، علم الصیغہ، احادیث الحبیب المتبرکہ، تواریخ حبیب الہ اور ترجمہ تقویم البلدان تو انڈمان میں لکھی گئیں اور اندازے سے معلوم ہوتا ہے کہ ضوابط الفردوس، بیان قدر شب براۃ، رسالہ درمذمت میلہ، فضائل درود وسلام اور ہدایت الاضاحی بریلی کے قیام میں لکھی گئی یہ ساتوں کتابیں ۱۲۷۴ھ میں تحریر میں آئیں اور اس وقت مفتی صاحب کا قیام بریلی میں تھا۔

تبحرِ علمی

مفتی عنایت احمد صاحب کا علم وفضل مسلم ہے۔ آپ کی تصنیفات اس پر دال ہیں۔ منقول ومعقول ہر دو علم میں تبحر حاصل تھا۔ تمام علوم پوری قوت سے پڑھاتے تھے۔ ریاضی میں خاص امتیاز حاصل تھا۔ ادب کا ذوق تھا۔ جب مفتی صاحب کانپور میں مقیم تھے۔ تو روزانہ شام کو میدان میں ہوا خوری کے لیے تشریف لے جاتے تھے مولوی سید حسین شاہ بخاری سے اکثر علمی وادبی ذکر ہوجاتے تھے۔ مفتی صاحب کو اردو اساتذہ کا اکثر کلام یاد تھا۔

مفتی صاحب کی تحریرات

مفتی عنایت احمد صاحب نے اپنے استاذ مولوی بزرگ علی صاحب مارہروی کی بعض کتب پر مقدمہ و دیگر تحریرات اپنے قلم سے لکھی ہیں۔ وہ کتابیں مولانا نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ اسی طرح مفتی عنایت احمد صاحب کی دستخطی تحریر بھی موجود ہے۔

مآخذ

مضمون بالا مندرجہ ذیل کتابوں سے اخذ کیا گیا ہے۔

❶ تذکرہ مشاہیر کاکوری مؤلفہ مولوی محمد علی حیدر مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ ۱۹۲۷ء

❷ استاذ العلماء (حالات مولانا لطف اللہ علی گڈھی) مؤلفہ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی

❸ تواریخ حبیب الہ ❹ علم الصیغہ ❺ ضمان فردوس

❻ بیان قدر شب براۃ ❼ حیاتِ حافظ رحمت خاں ❽ باغی ہندوستان

❾ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت جلد دوم

علامہ فضل حق خیرآبادیؒ

ایک فاضل وکامل جو درس وتدریس میں یکتاءِ روزگار ہے تو شعر وسخن کا استاذِ فن کار۔ محاضرہ اور مذاکرہ کے وقت میرِ مجلس ہے تو بساطِ شطرنج پر رونقِ محفل۔ اور کبھی ایک ہی وقت میں مدرس ومعلم بھی ہے اور استاذِ شطرنج بھی۔ تذکرہ علماءِ ہند کے مصنف رحمان علی خاں صاحب ۱۲۶۳ھ میں (جبکہ علامہ موصوف لکھنؤ میں قیام فرما تھے) ملاقات کے لیے حاضرِ خدمت ہوئے تو حیران رہ گئے کہ

در عین حقہ کشی وشطرنج بازی تکمیذ را سبق "الافق المبین" مے داد ومطالب کتب را باحسن بیانی دل نشین مے نمود۔

شانِ جامعیت کی یہ ندرت کس قدر حیرت انگیز ہے کہ اگر ایک وقت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے مدمقابل تھے تو دوسرے وقت اسی راہ پر گامزن۔ ایک وقت اگر انگریز کے وفادار اور انگریزی محکمہ کے سررشتہ دار تھے تو دوسرے وقت جہادِ حریت کے علمبردار اور کٹہرہ عدالت میں ایک سیاسی مجرم کی حیثیت سے حاضر، ایک طرف زندگی کا ہر ایک دور ناز ونعم، عزت وعظمت سے ہم کنار ہے تو اسی زندگی کا ایک دور پابندِ سلاسل اور دیارِ غربت میں وحشت بداماں۔

ہندوستان کے وہ قصبے جو مردم خیزی میں مشہور ہیں، ان میں ضلع سیتاپور کا قصبہ خیرآباد بھی ہے۔ اب چودھویں صدی کے ربع آخر میں اس کی حالت کچھ بھی ہو مگر حلقۂ درس وتدریس سے تعلق رکھنے والے جانتے ہیں کہ گزشتہ صدی کے آخر تک خیرآباد کو خیرالبلاد لکھا جاتا تھا۔

اس خیرآباد کے مشہور فاضل مولانا فضل امام صاحب تھے۔ سیدنا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے معاصر، درس وتدریس میں شہرۂ آفاق۔ انہیں مولانا فضل امام صاحب کے نورِ چشم ولختِ جگر یہ مولانا فضل حق صاحب ہیں جن کی جامعیت کا مختصر تذکرہ سطور بالا میں گزرا ہے۔

سلسلۂ نسب کے لحاظ سے آپ فاروقی ہیں۔ چودہ واسطوں کے بعد آپ کا سلسلۂ نسب سیدنا حضرت شاہ ولی صاحب کے شجرۂ نسب سے مل جاتا ہے۔ (۴۶۸)

ولادت اور تعلیم تربیت

مولانا فضل حق صاحب ۱۲۱۲ھ ۱۷۹۷ء میں اپنے آبائی وطن خیرآباد میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد مولانا فضل امام صاحب دہلی میں صدر الصدور تھے۔ مولانا فضل حق کی تعلیم وتربیت آپ کے ہی زیر سایہ دہلی میں ہوئی۔ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب اور حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہما کے بارگاہِ فیض پناہ سے علم حدیث کی خوشہ چینی کی۔ تیرہ سال کی عمر میں تمام عقلی ونقلی علوم کی تکمیل کر لی۔ چار ماہ اور چند روز میں قرآن مجید حفظ کیا۔ (۴۶۹)

ملازمت

والد ماجد کے انتقال کے وقت علامہ کی عمر اٹھائیس سال تھی۔ خاندانی ذمہ داریوں کا بار پڑا۔ اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا۔ دہلی میں ریزیڈنٹ رہا کرتا تھا۔ اس کے محکمہ کے سر رشتہ دار ہو گئے۔

ہر دل عزیز بزرگی اور اہل فن سے تعلقات

سلطنت مغلیہ کا چراغ سحری اگرچہ بے نور ہوتا جارہا تھا مگر علم وفن کے کتنے گوہر شب تاب تھے جن کے دم سے اس زمانہ کی دلی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ خانوادۂ ولی اللہ کے جانشین مولانا شاہ اسحاق صاحب شاہ عبدالغنی صاحب، حضرت شاہ ابوسعید صاحب مجددی، حضرت شاہ غلام علی صاحب، اور ان ارباب فضل وکمال کے علاوہ بڑے بڑے کہنہ مشق اساتذۂ شعر وسخن مولوی امام بخش صہبائی، علامہ عبداللہ خاں علوی، حکیم مومن خاں مومن، مفتی صدرالدین خاں آزردہ، مرزا اسداللہ خاں غالب، نواب ضیاء الدین خاں نیر، شاہ نصیرالدین نصیر، شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم آغا خاں عیش، حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان، میر حسن تسکین اور خدا جانے کتنے سخنوران باکمال کا جھمگٹا اسی دہلی میں تھا۔ رحمہم اللہ (۴۷)

مولانا فضل حق صاحب جیسا باکمال، ان سب کا قدردان تھا، اور یہ سب علامہ کے قدرشناس ع

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

اسی زمانہ کا ولی عہد "ابوظفر بہادر شاہ" خود بھی شعر وسخن کا شاہ تھا اور اہل علم کی قدردانی میں بھی شاہانہ شان رکھتا تھا۔ علامہ سے اس کو یہاں تک تعلق خاطر تھا کہ جب علامہ دہلی کی ملازمت ترک کر کے جھجر جانے لگے اور وداعی ملاقات کے لیے ولی عہد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بہادر شاہ نے اپنا خاص دوشالہ آپ کو اوڑھایا اور آب دیدہ ہو کر کہا:

> ہر گاہ شما مے گوئید کہ من رخصت مے شوم۔ مرا جز ایں کہ بپذیرم گریز نیست اما ایزد دانا داند کہ لفظ وداع از دل بزباں تے رسد الا بصد جر ثقیل۔ (۴۸)
>
> (ترجمہ) آپ فرما رہے ہیں کہ میں رخصت ہوتا ہوں۔ میں بھی مجبور ہوں، قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ مگر خدائے علیم خوب جانتا ہے کہ سینکڑوں جر ثقیل کام میں لائے جائیں، تب کہیں لفظ وداع دل سے زبان تک آسکتا ہے۔

دہلی سے جھجر وغیرہ

بے شک ارباب فقر اور اصحاب توکل علماء اور مشائخ کی ایک جماعت تھی جنہوں نے کمپنی کی ملازمت تو کیا مسلمان بادشاہوں کی بھی ملازمت پسند نہیں کی۔ علامہ فضل حق کا مسلک دوسرا تھا۔ آپ نے ملازمت کی مگر

اس طرح کہ آپ کی نازک مزاجی نے عزتِ نفس، خودداری اور وقارِ علم کے دامن کو کبھی میلا نہیں ہونے دیا۔ بظاہر یہی سبب تھا کہ کہیں آپ کا قیام مستقل نہیں رہا۔

ریذیڈنٹ دہلی کے یہاں جب تک سررشتہ دار رہے۔ عزت کے ساتھ رہے اور جب آبگینۂ عزت میں بال آنے لگا تو نہ صرف ملازمت ترک کی بلکہ دہلی کی بود و باش بھی ترک کر دی۔

علامہ کی قابلیت مشہور تھی۔ قدر دانوں سے دنیا خالی نہیں تھی۔ نواب فیض محمد خاں والی جھجھر نے موقع غنیمت جانا اور فوراً مبلغ پانچ سو روپیہ ماہانہ کی پیش کش کر دی۔ علامہ نے اس کو منظور کیا اور جھجھر تشریف لے گئے۔ ایک عرصہ تک جھجھر رہے۔ پھر مہاراجہ الور نے بلا لیا۔ الور سے آپ سہارن پور گئے۔ بعد ازاں آٹھ برس رامپور میں رہے۔ پھر لکھنؤ میں پہلے صدر الصدور بنائے گئے۔ جب ایک نئی کچہری "حضور تحصیل" کے نام سے بنی تو اس کے مہتمم قرار پائے۔

ہنومان گڑھی کا فساد اور مولانا امیر علی کی شہادت

مولانا لکھنؤ میں قیام فرما تھے کہ ہنومان گڑھی کے فساد، شاہ غلام حسین صاحب اور ان کے ۲۶۹ رفقاء کی شہادت پھر مولانا امیر علی صاحب کی دعوت جہاد اور چھ سو مجاہدین کے ساتھ توپ دم کیے جانے کا خوں چکاں اور دل فگار حادثہ پیش آیا۔ مولانا اس عرصہ میں حکومت کے ایک ذمہ دار افسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے، اور بقول مولانا عبدالشاہد خاں صاحب شروانی مصنف "باغی ہندوستان":

> جب مولانا امیر علی شاہ صاحب کو سمجھانے کے لیے علماء اور امراء کو بھیجا گیا تو علامہ نے بھی عہدے کی ذمہ داری اور بسہولت مطلب براری کی بنا پر گفتگو میں حصہ لیا۔[۴۷۲]

یہ گفتگو ناکام ہوئی۔ مولانا امیر علی شاہ نے اپنے عزم میں کوئی تبدیلی نہیں کی، بالآخر اپنے رفقاء کے ساتھ بڑے مزے سے جامِ شہادت نوش کیا۔ لیکن تعجب نہ کرنا چاہیے اگر اس عجیب و غریب حادثہ سے مولانا جیسے ذکی اور ذہین و فہیم نے یہ اثر لیا کہ آپ انگریزوں کی ڈپلومیسی سے متنفر ہو کر انقلاب کی تمنا کرنے لگے کیونکہ اگر بالفرض یہ صحیح نہ ہو کہ اس پورے ہنگامۂ قتل و خون اور شعبدۂ جور و جفا کے آلات و ذرائع کو پس پردہ حرکت دینے والا انگریز تھا تو اس بات کے تسلیم کرنے میں تو تامل نہ ہونا چاہیے کہ ان واقعات اور حوادث سے انگریز نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

پس منظر

تقریباً پوری ایک صدی ہو چکی تھی جب سے انگریزوں کی خفیہ تدبیریں شاہانِ اودھ کو کمزور سے کمزور کرنے میں مصروف تھیں اور اب ایک آخری فیصلہ کی تیاری ہو رہی تھی کہ واجد علی شاہ کو معزول اور پورے اودھ پر بلا شرکت غیرے مکمل قبضہ کر لیا جائے۔ باشندگانِ اودھ کے لیے اس جرعۂ تلخ کو خوش گوار اسی صورت سے بنایا جا سکتا تھا کہ ہندو اور مسلمان تمام ہی باشندے واجد علی شاہ اور اس کی حکومت سے متنفر اور برافروختہ ہو جائیں۔ اس

موقعہ پر انگریز کا یہ مقصد بہت آسانی سے پورا ہو رہا تھا۔ کیونکہ پردہ سیمیں پر واجد علی شاہ کی مورت تھی۔ چنانچہ ہندو اور مسلمانوں نے اس کو ملعون اور مردود قرار دیا۔ مگر بات کی تہ کو پہنچنے والے تو اس وقت بھی اس تماشہ کو حیرت سے دیکھ کر اس کے مضمرات کا مطالعہ کر رہے ہوں گے کہ:

ہنومان گڑھی کے حادثہ کے وقت انگریز افسر موجود تھے۔ مگر ایسے بے بس و لاچار یا ایسے بھولے کے بیراگیوں نے مسجد میں گھس کر ۲۶۹ مسلمانوں کو ذبح کر ڈالا اور ان بے چاروں کو خبر بھی نہ ہوئی۔ یہ ایک درخت کے نیچے کھڑے ہوئے باتیں ہی کرتے رہے۔ (۳۷۳)

قیصر التواریخ کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے جو انہوں نے اپنے ایک خاص دوست کے چشم دید بیان (جو اس وقت وہاں موجود تھا) لکھے ہیں:

اس عرصہ میں بارانِ رحمت نازل ہوئی۔ ایک ساعت تک جدال و قتال موقوف رہی۔ اسی وقت ایک کبڑیا ہمراہی غلام حسین کے واسطے جو دو دن سے بے آب و دانہ تھے، کھانا لایا۔ کپتان آر صاحب اور جان ہرسی نے اپنے سپاہیوں کو بھیج کر کہلا بھیجا کہ تم کمریں کھول کر بہت اطمینان سے جامع مسجد میں بیٹھو باہر نہ نکلو۔ کوئی تم سے فساد نہ کر سکے گا وہ کمریں کھول کر کھانا کھانے لگے۔ اب زبانی مرزا اعلیٰ اعلیٰ کے ہے (جو مؤلف کتاب سے وقت روانگی کربلا کہ اس شب خاص کربلا میں میرے پاس رہے تھے) بیان کرتے تھے کہ دونوں انگریز اور میں خود اور مرزا نثار حسین مع اپنی سپاہ اور توپ وہاں سے ہٹ کر بڑی دور درخت کھرنی کے نیچے جا کر کھڑے ہوئے۔ (۳۷۴) ایک ساعت نہ گذری تھی کہ بیراگی ہزاروں گول لئے نعرہ مارتے آ کر مسجد کو گھیر لیا اور رجب علی شاہ فقیر کے کوٹھے سے چڑھ کر غلام حسین کے ہمراہیوں پر گولیاں برسانا شروع کر دیا اور مسجد میں آ کر ۲۶۹ آدمیوں کو ذبح کیا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ (۳۷۵) الخ

لیکن اسی انگریز ذات کا افسر کپتان بارلو، مولانا امیر علی شاہ کے مقابلہ میں اتنا چوق و چوبند ہے کہ نماز ظہر ہونے کا بھی انتظار گوارا نہیں کیا۔ خاص نماز کے وقت گولوں کی زد پر رکھ کر ان کمزور نہتوں کے پرخچے اڑا دیئے اور جو باقی بچے، ان کو بعد میں گولیوں کا نشانہ بنا ڈالا۔ اور لطف یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ واجد علی شاہ کی حکومت کے نام پر، جو ابھی تک مولانا امیر علی کے معاملہ میں علماء سے فتوے ہی لکھوا رہا تھا۔ کیا انگریز افسروں کے اس تغافل اور اس چستی کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ہندو مسلمان میں منافرت پیدا ہو۔ واجد علی شاہ بدنام ہو اور انگریز کا بول بولا ہو۔

چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ جس روز مولانا امیر علی شاہ صاحب اودھ میں شہید کیے گئے۔ اسی روز حکومت اودھ سے واجد علی شاہ کی معزولی کا فیصلہ لندن کی پارلیمنٹ میں صادر کیا گیا۔ (۳۷۶)

بہرحال یہ واقعہ بھی ایک زیرک اور فہیم کے لیے سبق آموز تھا۔ چنانچہ مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب نے اس سے یہی سبق لیا تھا کہ باعث فتنہ نہ ہندو ہے نہ مسلمان اور نہ مجبور و مقہور واجد علی شاہ، بلکہ اس فتنہ و فساد کے بیج کار

پروازان کمپنی نے بوئے ہیں۔ وقت کا سب سے ضروری مطالبہ یہ ہے کہ ان بیج بونے والوں کو وطن سے نکالا جائے۔

اس حادثہ کے بعد ہی مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب آگرہ سے لکھنؤ پہنچے۔ مولانا فضل حق صاحب سے ملاقات کی۔

اس کے مولانا فضل حق وہ نہیں تھے جو ہمیشہ سے تھے۔ وہ اب داعی انقلاب تھے۔ لکھنؤ کو خیر باد کہا اور الور پہنچ کر نئی بساط بچھائی۔ (۴۷۷)

ہنگامہ ۱۸۵۷ء اور مولانا خیرآبادی

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا تو مولانا الور میں تھے۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ وہ علماء مجاہدین جو ایک عرصہ پہلے سے اپنا نصب العین استخلاص وطن بنا چکے تھے، ابتداء میں وہ بھی متامل رہے کیونکہ یہ ہنگامہ ان کے کسی پروگرام کا نتیجہ نہیں تھا۔ اس کی ابتداء فوجوں کی بددلی سے ہوئی تھی اور پھر اگرچہ دہلی پر انقلابی فوجوں نے قبضہ کر کے بہادر شاہ کو بادشاہ بنا دیا تھا مگر ان کارروائیوں میں کوئی ایسا ضبط ونظم نہیں تھا جو نظر شریعت میں قابل اعتماد ہو۔

جب ۲؍جولائی کو جنرل بخت خاں نے ایک لشکر جرار کے ساتھ دہلی پہنچ کر نظم وضبط قائم کر دیا تو ان اصحاب الرائے علماء کو بھی اطمینان ہوا۔ اب ایک فتویٰ بھی مرتب کیا گیا اور بقول منشی ذکاء اللہ خاں صاحب مساجد کے ممبروں پر بھی تذکرۂ جہاد ہونے لگا۔

غالباً اسی کشش وپیچ کے سبب سے مولانا فضل حق بھی اگست سے پہلے دہلی نہیں پہنچ سکے۔ جب فتویٰ کی اشاعت ہوئی، تب مولانا نے بھی دہلی کا قصد فرمایا۔ خود مولانا اپنی خودنوشت سوانح ''قید وبند، الثورۃ الہندیہ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

> ھذا وقد انتھض من بعض القری والبلاد جمع من المسلمین الجلاد للجدال والجلاد والغزو والجھاد. بعد الاستفتاء والاستشھاد من العلماء الزھاد وافتائھم بوجوب الجھاد بفتاوی ائمۃ الاجتھاد. (الثورۃ الہندیہ)
>
> (دہلی میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا) کہ کچھ دیہات وقصبات اور شہروں سے بہادر مسلمانوں کی جماعت جدال وقتال اور غزوہ وجہاد کے لیے اٹھی۔ اس سے پہلے وہ خدا ترس تارک دنیا علماء نے ائمہ اجتہاد کے فتاویٰ کی روشنی میں وجوب جہاد کا فتویٰ حاصل کر چکی تھی۔

دہلی میں مولانا کی مشغولیت

منشی جیون لال نے اپنے روزنامچہ میں لکھا ہے:

۱۶؍اگست ۱۸۵۷ء: مولوی فضل حق شریک دربار ہوئے۔ انہوں نے اشرفی نذر پیش کی اور صورت حال کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔

۱۸؍ اگست: مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ انگریزی اخبارات لکھ رہے ہیں کہ شہر پر قبضہ ہو جانے کے بعد باشندوں کا قتل عام کیا جائے گا۔ شہر کو مسمار کر دیا جائے گا، اور بادشاہ کے گھرانے میں ایک بھی آدمی ایسا نہ چھوڑا جائے گا جو بادشاہ کا نام لے یا اسے پانی کا ایک قطرہ دے سکے۔ اس کے بعد مولوی نے کہا۔ حضور کو مناسب ہے کہ سپاہیوں کو ترغیب دے کر انگریزوں کے مقابلہ سے روک دیا جائے کیونکہ کسی نوع انگریزوں پر فتح نہیں پا سکتے۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ اپنی افواج لڑانے کے لیے لے جاؤ اور انگریزوں کے خلاف لڑاؤ۔ مولوی نے جواباً کہا۔ افسوس تو اسی بات کا ہے کہ سپاہی ان کا کہنا نہیں مانتے جو ان کی تنخواہ دینے کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ اچھا تو اپنی افواج کو محاصل جمع کرنے کے کام پر لگا دو۔

۲؍ ستمبر ۱۸۵۷ء: بادشاہ دربارِ عام میں تشریف فرما ہوئے۔ مرزا الٰہی بخش، مولوی فضل حق، میر سعید علی خاں اور حکیم عبدالحق[۴۷۸] آداب بجالائے۔

۶؍ ستمبر ۱۸۵۷ء: مولوی فضل حق نے اطلاع کی کہ متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد شہر پر حملہ کر رہی ہے۔

۷؍ ستمبر ۱۸۵۷ء: بادشاہ دربارِ خاص میں رہے حکیم عبدالحق، میر سعید علی خاں، مولوی فضل حق، بدرالدین خاں اور دیگر امراء و رؤساء شریک دربار رہے۔

منشی ذکاء اللہ خاں نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ مولانا نے ایک دستورِ اساسی کا مسودہ بھی مرتب کیا تھا۔

دہلی میں حضرت مولانا فضل حق کی مصروفیتوں کے متعلق معلومات کا ذخیرہ صرف یہی ہے۔ اس کے ماسواء قیاس ہے۔ جس کا دامن بہت وسیع ہے۔ یہاں اس کی نہ ضرورت ہے نہ موقع۔

دہلی سے روانگی

۱۹؍ ستمبر کو دہلی پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہوا۔ مولانا اور ان کے اہل و عیال پانچ روز تک کسی مکان میں بھوکے پیاسے بند رہے۔ پھر رات کی تاریکی میں اہل و عیال کو ساتھ لے کر نکلے اور پا پیادہ سفر کی مصیبتیں جھیلتے ہوئے بھیکن پور ضلع علی گڈھ پہنچے۔ یہاں اٹھارہ روز چھپے رہے۔ پھر نواب صدر یار جنگ بہادر (مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی) کے عم محترم نواب عبدالشکور خاں رئیس بھیکن پور نے سانکرہ کے گھاٹ سے جو بھیکن پور سے آٹھ میل پر ہے، دریا کے پار اتار دیا۔ پھر کچھ مدت چھپے رہے۔[۴۷۹]

گرفتاری

جب ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے عفو عام کا اعلان ہو گیا تو مولانا بھی اس پر بھروسہ کر کے اپنے وطن خیرآباد پہنچ گئے۔ فرماتے ہیں:

مجھے اس کا بالکل خیال نہ رہا کہ بے ایمان کے عہد و پیمان پر بھروسہ اور بے دین کی قسم پر اعتماد کسی بھی

حالت میں درست نہیں ہے خصوصاً جبکہ وہ بے دین جزا و سزاءِ آخرت کا بھی قائل نہ ہو۔(۳۸۰)
چند روز اطمینان سے گھر پر رہے۔ پھر دو آدمیوں نے آپ کی مخبری کر دی۔ گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا۔ عبور دریائے شور کی سزا تجویز ہوئی اور تمام مال واسباب حتیٰ کہ کتابیں بھی ضبط کر لی گئیں۔ حسب ضابطہ کچھ عرصہ ہندوستان کے جیل خانہ میں رہے۔ جہاں خود مولانا کے ارشاد کے مطابق:

ہر ممکن اذیت پہنچائی گئی اور قصور صرف یہ تھا کہ وہ ایمان واسلام پر مضبوطی سے قائم رہے اور ان کا شمار علماء اعلام میں ہوتا تھا۔(۳۸۱)

جیل کی اذیتوں کا خاکہ

مولانا نے اپنی تصنیف "الثورۃ الہندیہ" میں ہندوستان کے جیل خانوں، انڈمان اور وہاں کے مصائب و تکالیف کو تفصیل سے بیان کیا ہے، چند اقتباسات کا ترجمہ درج ذیل ہے:

مکر وتلبیس سے جب نصاریٰ نے مجھے قید کر لیا تو ایک قید خانہ سے دوسرے قید خانہ، اور ایک سخت زمین سے دوسری سخت زمین میں منتقل کرنا شروع کیا۔ مصیبت اور غم پر غم پہنچایا۔ میرا جوتا اور لباس تک اتار کر موٹے اور سخت کپڑے پہنا دیئے۔ نرم بستر چھین کر خراب، سخت اور تکلیف دہ بچھونا حوالہ کر دیا۔ گویا کانٹے بچھا دیئے گئے یا دہکتی ہوئی چنگاریاں ڈال دی گئی تھیں۔ میرے پاس لوٹا، پیالہ اور کوئی برتن تک نہیں چھوڑا۔ بجز سے ماش کی دال کھلائی اور گرم پانی پلایا۔ کوئی گرمجوش دوست تو کیا ملتا، گرم جوش پانی دیا گیا۔ اس ضعیفی اور پیرانہ سالی میں ہر وقت اور ہر آن ذلت وتوہین سے کام لیا گیا۔

جزیرہ انڈمان

پھر مجھے دریائے شور کے کنارے ایک ایسے پہاڑ پر پہنچا دیا گیا۔ جس کی آب وہوا ناموافق، جہاں سورج ہمیشہ سر پر ہی رہتا ہے۔ اس کی گھاٹیاں دشوار گزار، پیچ در پیچ جنہیں دریائے شور کی موجیں دھانپ لیتی ہیں۔ اس کی نسیم صبح بھی سموم سے زیادہ گرم، غذا حنظل سے زیادہ کڑوی اور زہر ہلاہل سے زیادہ مضر، اس کا پانی سانپوں کے زہر سے زیادہ ضرر رساں، ہر کوٹھڑی پر چھپر تھا جس میں رنج و مرض بھرا ہوتا تھا۔ میری آنکھوں کی طرح ان کی چھتیں ٹپکتی رہتی تھیں اور ان سے بدبو مہکتی رہتی تھی۔ امراض کی کثرت، بیماری عام، دوا ناپید اور مشکل۔ خارش اور قوبا(۳۸۲) کا رواج عام۔ بیمار کے علاج، تندرست کے بقاء صحت اور زخم کے اندمال کی کوئی صورت نہیں۔ دنیا کی کوئی مصیبت یہاں کی مصیبتوں پر قیاس نہیں کی جا سکتی۔ یہاں کی معمولی بیماری بھی خطرناک ہے۔ بخار موت کا پیغام، مرض سرسام اور برسام۔(۳۸۳) ہلاکت کی علت تام ہے، اور کتنی ہی بیماریاں ایسی ہیں کہ طب کی

کتابوں میں ان کا نام ونشان نہیں۔ ڈاکٹروں کی یہ حالت کہ مرض کچھ اور دوا کچھ۔ مرنے والوں کے ساتھ یہ سلوک کہ مردہ خاکروب کے حوالہ کر دیا جاتا ہے جو اس کے کپڑے اتار کر ٹانگ پکڑ کر ریگ کے تودے میں دبا دیتا ہے۔ نہ غسل نہ کفن نہ دفن نہ نماز جنازہ۔ اگر میت کے ساتھ یہ سلوک نہ ہوتا تو یہاں کی مصیبتوں کے مقابلہ میں مرجانا سب سے بڑی آرزو ہوتی، اور اگر مذہباً خودکشی ممنوع نہ ہوتی تو قید و بند کی ان مصیبتوں سے نجات پالینا بہت آسان تھا۔

میں نہیں جانتا کہ ان مصیبتوں سے کس طرح چھٹکارا ہو سکے گا۔ خارش اور قوبا میں مبتلا ہو جانا مصیبت بالائے مصیبت ہے۔ صبح شام اس طرح بسر ہوتی ہے کہ تمام بدن زخموں سے چھلنی بن چکا ہے۔ روح کو تحلیل کر دینے والے درد اور تکلیف کے ساتھ زخموں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ (۳۶۴)

کسی قدر سہولت

مولانا کو پہلے صفائی کے کام پر لگایا گیا تھا۔ برہنہ پا، صرف ایک لنگی اور کمبل کا کرتہ۔ کوڑا کرکٹ صاف کرتے اور ٹوکرے میں اکٹھا کر کے پھینک آتے۔ مگر کچھ دنوں بعد آپ کو محرری کے کام پر لگا دیا گیا اور اس تبدیلی کا سبب آپ کا علمی تبحر ہوا۔ صورت یہ ہوئی کہ سپرنٹنڈنٹ کے پاس علم ہیئت کی ایک قلمی کتاب تھی۔ سپرنٹنڈنٹ کے یہاں ایک مولوی صاحب کام کرتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ نے مولوی صاحب کو دی کہ اس کی غلطیاں درست کر دیں۔ مولوی صاحب یہ کتاب مولانا کے پاس لے آئے۔ مولانا نے نہ صرف عبارتیں درست کیں بلکہ جگہ جگہ مضمون کی بھی تصحیح اور توضیح کر دی، اور کتابوں کے حوالے بھی درج کر دیئے۔ سپرنٹنڈنٹ کو جب مولانا کے علم و فضل کا احساس ہوا تو اس نے صفائی کی خدمت سے ہٹا کر محرری پر لگا دیا، اور حکومت سے رہائی کی سفارش بھی کر دی۔

پروانۂ رہائی اور وفات

علامہ کے صاحبزادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بیخبر میر منشی لفٹنٹ گورنر کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ ادھر انڈمان کے سپرنٹنڈنٹ جیل نے بھی سفارش کی تھی۔ نتیجہ میں کامیابی ہوئی یعنی رہائی کا حکم ہو گیا۔ لیکن عجیب وغریب اور نہایت تکلیف دہ اور دل خراش صورت یہ پیدا ہوئی کہ مولانا شمس الحق صاحب پروانۂ رہائی حاصل کر کے انڈمان پہنچے۔ جہاز سے اتر کر شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر پڑا اس کے ساتھ بڑا اژدھام تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل ۱۲ رصفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۲۰ راگست ۱۸۶۱ء کو علامہ فضل حق خیر آبادی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اب سپرد خاک کرنے جارہے ہیں۔ یہ بھی بصد حسرت ویاس شریک دفن ہوئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

جنرل بخت خاں

یہ تعجب خیز تو نہیں، حسرت انگیز ضرور ہے کہ بخت خاں جو دہلی کے محاذ پر شہاب ثاقب بن کر چمکا اور ایسا چمکا کہ اس داستانِ سرفروشی میں دلچسپ و دل گیر ہے تو صرف اسی کی کارگزاری اور معرکہ آرائی۔

اس کی زندگی کا آغاز اور انجام دونوں ایسے پردوں میں ہیں کہ اب تک کوئی بھی تحقیق و تفتیش اس کو بے نقاب نہ کر سکی۔ خود بخت خاں نے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے اپنے متعلق بتایا تھا۔

میں بھی آپ ہی کے خانوادہ سے ہوں۔ (۳۸۵) میں سلطان پور مضافاتِ لکھنؤ کا باشندہ ہوں اور اودھ کے شاہی خاندان سے میری رشتہ داری ہے۔ (۳۸۶)

اس مختصر سے جملہ میں نہ ولدیت اور خاندان کا تذکرہ ہے، نہ رشتہ داری کی تفصیل۔ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی نے اس اجمال کی کسی قدر تفصیل کی۔ آپ حیاتِ علامہ فضل حق خیرآبادی میں تحریر فرماتے ہیں:

> اس سلسلہ میں سب سے بڑی اہم شہادت نواب دوندے خاں کی پڑپوتی چندا بیگم کی ہے۔ ان سے معلوم ہوا کہ غلام قادر روہیلہ شہید سے ان کی قرابتِ قریبہ تھی، اور خاندان روہیلہ سے تھے، ان کے والد کا نام عبداللہ خاں تھا۔ والیٔ روہیل کھنڈ حافظ الملک رحمت خاں کا خاندان جب انگریزوں اور شجاع الدولہ کے مظالم کا شکار ہو کر برباد ہوا، تو غلام قادر خاں کا خاندان بھی اس سے محفوظ نہیں رہا۔ اس انتشار میں جس کا جدھر منہ اٹھا، چلا گیا۔ چنانچہ بخت خاں کے والد مع اہل خاندان اودھ کے موضع سلطان پور میں بس گئے نواب عبداللہ خاں روہیلہ جو خوبصورتی اور بہادری میں منفرد زمانہ تھے، شجاع الدولہ کے خاندان کی ایک شہزادی کی توجہ کا مرکز بن گئے اور اس معتوب روہیلہ سردار کی نوابانِ اودھ سے قرابت داری ہو گئی۔ (۳۸۷)

اس بیان سے کچھ تفصیل معلوم ہوئی لیکن بخت خاں کی تاریخ ولادت، شہزادی کا شاہانِ اودھ سے اور عبداللہ خاں کا غلام قادر خاں سے کیا رشتہ تھا۔ یہ سوالات پھر بھی تشنۂ تفتیش رہ گئے۔

تعلیم و تربیت کے بارے میں ہماری واقفیت کا کل اثاثہ یہ قیاس ہے کہ جس کا عمل اس درجہ بلند تھا، اس کا علم بھی لامحالہ بلند ہوگا، اور دستور بھی یہی تھا کہ اونچے گھرانوں کے سرپرست اپنی اولاد کی تعلیم اور اس زمانہ کی فوجی تربیت کا پورا اہتمام کیا کرتے تھے۔

ملازمت

تعلیم و تربیت کے دور سے گزر کر خود تکلفی کا زمانہ آیا تو بخت خاں انگریزی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ ایک سپاہی کی حیثیت سے جنگ افغانستان میں شریک ہوئے اور اس جنگ میں مسٹر سیل کے ماتحت بمقام جلال آباد

وہ کارہائے نمایاں انجام دیے، کہ "توپ خانہ باتری" کے سب سے بڑے ہندوستانی افسر ہو گئے۔ اس باتری نے اپنی کارگزاریوں میں یہاں تک شہرت حاصل کی کہ اس کو ایک اعزازی نشان دیا گیا۔ یہ پھولوں کا محراب نما تاج تھا جو اس کی توپوں پر بنایا جاتا تھا۔ (۴۸۸)

بخت خاں افغانستان سے واپس ہوئے تو تیں پھر چھاؤنی بھیج دیئے گئے۔ کچھ عرصہ وہاں رہ کر غالباً دست بردار ہو گئے۔ پھر مولانا سرفراز صاحب کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے۔ اور جس طرح مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کے مرشدِ طریقت نے بیعت کے وقت انگریزوں سے جہاد کرنے کا عہد لیا تھا۔ یہ مولانا بھی بیعتِ جہاد ہی لیا کرتے تھے۔

اس بیعتِ جہاد کی آزمائش کا وقت بھی جلد ہی آ گیا۔ چنانچہ جیسے ہی بریلی میں نواب بہادر خاں نے علم آزادی بلند کیا تو بخت خاں اس کے دست و بازو تھے۔

بریلی میں خان بہادر خاں کی حکومت قائم ہو گئی، اور وہ امن و امان میسر آیا، جس کی عرصہ سے تمنائیں کی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ بقول سیدہ انیس فاطمہ بریلوی اس زمانہ میں کثرت سے شادیاں اور تقریبات ہوئیں۔ ہر چیز کی ارزانی اور بہتات تھی۔ گرانی کا کہیں ذکر نہیں تھا۔ (۴۸۹)

مگر دہلی کا مرکز ہر طرح امداد کا محتاج تھا۔ لہٰذا بخت خاں ایک جرار فوج لے کر دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔

دہلی میں ورود

منشی جیون لال کے روزنامچہ میں یکم جولائی ۱۸۵۷ء کی روئیداد میں درج ہے:

یکم جولائی ۱۸۵۷ء: محل (لال قلعہ) میں خبر آئی کہ بریلی کی فوج جمنا کے کنارے آ پہنچی ہے۔ چونکہ پل خراب ہو چکا ہے اور اس پر گزرنے کی صورت نہ تھی، لہٰذا بادشاہ نے چار سو قلیوں اور سفر مینا کی دو کمپنیوں کو میر فتح علی خاں کی سرکردگی میں پل کی درستی کے لیے بھیج دیا۔ پھر معلوم ہوا کہ صبح تک فوج پل سے گزر سکے گی۔ بادشاہ نے احمد قلی خاں (زینت محل کے باپ) کو اس فوج کے استقبال کا حکم دیا۔

بادشاہ سے ملاقات

۲ر جولائی کو احمد قلی خاں استقبال کے لیے گئے۔ حکیم احسن اللہ خاں جرنیل صمد خان، (۴۹۰) ابراہیم علی خاں، غلام علی خاں اور دوسرے اصحاب بھی ساتھی تھے۔ احمد علی خاں اور بخت خاں نے بارگاہِ شاہی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ جہاں ارشاد ہو فوج متعین کر دی جائے۔ بادشاہ نے پہلے سے حکم جاری کر رکھا تھا کہ شہر کے باشندوں کو ہرگز نہ لوٹا جائے۔ اس موقع پر فرمایا۔ میرے احکام حاصل کرنے سے کیا ہوگا۔ ان احکام کی تعمیل تو ہوتی نہیں اور نہ یہاں کوئی ایسا آدمی ہے جو انہیں نافذ کر سکے۔ میرا فرمان یہ ہے کہ انگریزوں کے لیے یہاں رہنے کی گنجائش نہ چھوڑی جائے۔

بخت خاں نے عرض کیا کہ سپہ سالار کی حیثیت میں مَیں اپنی خدمات پیش کرتا ہوں تا کہ عام ڈسپلن بحال ہو جائے۔ بادشاہ نے بطور اظہار محبت و اعتماد بخت خاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

بخت خاں اپنی فوج میں پہنچا تو صوبیداروں کو آگاہ کیا کہ بادشاہ نے میری خدمات قبول فرمائی ہیں۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ آپ میں سے کون کون میرا حکم مانے گا۔ سب صوبیداروں نے بخت خاں کے ہاتھ پر اطاعت کے حلف اٹھائے۔

قیام گاہ

پھر اس نے دوبارہ بادشاہ سے ملاقات کی۔ عبدالرحمٰن خاں والی جھجھر کو حکم ہوا کہ کالا محل (کلاں محل) بخت خاں کی فوج کے لیے خالی کر دیا جائے۔ اس کی تعمیل ہوئی۔ پھر بخت خاں نے شاہزادہ مرزا مغل سے ملاقات کی۔ (۳۹۱)

خطابات، منصب اور مہر

محمد بخت خاں کو ایک ڈھال اور ایک تلوار کے علاوہ "جنرل" کا خطاب دیا گیا اور اسے تمام افواج کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا۔ منادی کرادی گئی کہ تمام رجمنٹوں کے افسر محمد بخت خاں سے ہدایات حاصل کریں۔ مرزا مغل کو ایڈجوائنٹ جنرل بنا دیا گیا۔

محمد بخت خاں نے عرض کیا کہ اگر شاہزادوں نے لوٹ مار کی کوشش کی، تو میں ان کے کان اور ناک کاٹ دوں گا۔ فرمایا تمہیں پورا اختیار ہے، جس کام میں بہتری نظر آئے وہی کرو۔ اس فرمان کے مطابق شہر کوتوال کو اطلاع دے دی گئی کہ اب لوٹ مار ہوئی تو لوٹنے والوں کو پھانسی دے دی جائے گی۔ (۳۹۲)

۴؍جولائی ۱۸۵۷ء: جنرل بخت خاں کو فرزند کا خطاب عطا ہوا۔ (۳۹۳)

بدرالدین خاں دہلی میں بہت اچھی مہریں بناتا تھا۔ ۷؍اگست کو اس کے نام بادشاہ کا فرمان جاری ہوا:

"ایک بہترین وضع کی مہر تیار کر کے پیش کرو۔ اس پر بخت خاں کے تمام خطابات کندہ ہوں یعنی معز الدولہ، مابدولت کا بندۂ خاص، محمد بخت خاں، لارڈ گورنر بہادر، ناظم جملہ امور فوجی و دیوانی"۔

"اور دستور کے مطابق اس پر جلوس ایکس ۲ درج ہو۔" (۳۹۴)

اس کے بعد بخت خاں کی کارگزاریوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کی تفصیل پوری کتاب میں گزر چکی ہے۔ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

دہلی سے روانگی اور زندگی کا آخری دور

دہلی میں ناکامی کے بعد جنرل بخت خاں ۱۹؍ستمبر کو دہلی سے نکلا تو مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کی روایت یہ ہے:

جنرل صاحب نے مع اپنی فوج کے لکھنؤ کا رخ کیا۔ جہاں پہنچتے پہنچتے ان کے ہمراہ صرف پانچ ہزار فوج، ۳۳ عورتیں نیز دلی، فرخ آباد کے کچھ لوگ باقی رہ گئے تھے۔

اس کے بعد جب لکھنؤ پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہوا تو بخت خاں، مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کے ہمراہ شاہ جہاں پور چلے گئے۔ مولانا احمد اللہ شاہ صاحب نے شاہ جہاں پور سے ہٹ کر "محمدی" میں محاذ قائم کیا تو یہاں پر بھی شاہ صاحب کے رفقاء خاص میں بخت خاں کا تذکرہ آتا ہے۔ اس کے بعد جنرل موصوف کے حالات نامعلوم ہیں۔ غالب یہی ہے کہ حضرت محل وغیرہ کی طرح یہ بھی نیپال چلے گئے اور وہیں زندگی کے باقی دن پورے کر دیے۔ رحمہ اللہ۔

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز — کاں سوختہ جاں شد وآواز نیامد

بخت خاں ایک مردِ مجاہد

بخت خاں ایک روہیلہ نوجوان، پھر برطانوی فوج کا ایک افسر۔ پھر جنگِ آزادی کا ہیرو اور کارزارِ حق و صداقت کا مردِ مجاہد۔

لیکن وہ برطانوی افسر سے مجاہدِ حریت کیسے بنا؟

مفتی انتظام اللہ شہابی کا بیان یہ ہے:

"سید احمد بریلویؒ کے مریدین میں سے رئیس المجاہدین مولوی سرفراز علی گورکھپور کے اضلاع میں انگریزوں کے خلاف ایک عرصہ سے خفیہ طور پر بیعتِ جہاد لے رہے تھے۔ وہ دورہ خود بھی کرتے اور اپنے خلفاء کو بھی دیہاتوں میں بھیجتے تھے۔ چنانچہ جب سلطان پور پہنچے، ایک صوبہ دار بخت خاں، نواب دوندے خاں کے خاندان سے تھا جس کے والد نے نواب شجاع الدولہ (لکھنؤ) کے خاندان میں شادی کر لی تھی، وہ مولوی سرفراز علی کا مرید ہوا، اور اس نے بیعتِ جہاد کی۔[۴۹۵]

بہر حال تبدیلی کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن ایک منصفانہ تبصرہ کے وقت یہ بات نظر انداز نہ ہونی چاہیے کہ یہ تبدیلی بہت بڑی قربانی تھی۔

بخت خاں کو توپ خانہ کا وہ منصب حاصل تھا جو اس زمانہ میں شاید ہی کسی اور ہندوستانی کو حاصل ہو، اور بشرطِ استواری اس میں اضافہ کی توقع تھی۔ جنرل بخت خاں نے یہ منصب اور یہ اعزاز ہی قربان نہیں کیا بلکہ زندگی کے تکلفات اور راحت و آسائش کے تمام اسباب و سامان بھی قربان کر دیے تھے اور غالباً شوقِ مساوات میں وہ وضع اختیار کر لی تھی جو سب سے کم درجہ کے فوجیوں کی ہوتی تھی۔

سید ظہیر دہلوی نے بریلی والے جنرل کا نام بہت کچھ سنا تھا۔ جب سامنے سے دیکھا تو وہ پہچان بھی نہ سکے۔

"سر پر انگوچھا لپٹا ہوا، کرچ گلے میں پڑی ہوئی، پیچھے حال کھلا، بریلی والا جرنیل وہی تھا۔ ظاہر تو

اس کا لباس گھس گھدوں کا تھا، میں تو سمجھا جیسے اور پوربی سپاہی ہیں یہ بھی سپاہی ہوگا۔" (۴۹۶)

نو بہار است جنوں چاک گریباں مدوے   آتش الآد بجان جنبش داماں مدوے

رحمہ اللہ وطاب ثراہ

شاہزادہ فیروز شاہ

حمیتِ تیموری کا آخری نشان

خانوادۂ بابر کے وہ سینکڑوں نوجوان جو قلعۂ معلّٰے اور اس کے قرب و جوار میں رہتے رہے تھے، جو نکبت و افلاس کے باوجود سلاطین کے نام سے خوش ہوتے تھے، ان سب میں جس نے بابر کی یاد تازہ کی، یہ جوان ہمت فیروز شاہ تھا۔

فیروز شاہ، صاحب عالم مرزا ناظم بخت خلف شاہ عالم ثانی کا لختِ جگر تھا اپنے والد بزرگوار کی زیر نگرانی علوم مروجہ اور فوجی تربیت مکمل کر چکا تھا۔ قدرت نے اس کی فطرت کو مذہبی رجحانات سے نوازا تھا۔ چنانچہ حج بیت اللہ شریف کا شوق پیدا ہوا اور غالباً شاہانِ مغلیہ اور موجودہ "سلاطین" (۴۹۷) (شاہزادوں) میں صرف یہی سلطان تھا جو حج بیت اللہ اور زیارتِ روضۂ اقدس سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوا۔ ادائے فریضہ کے بعد جب ہندوستان واپس پہنچا تو یہاں جنگِ آزادی کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ شاہزادہ بظاہر بندرگاہ سورت سے جہاز پر سوار ہوا تھا۔ اور اسی بندرگاہ پر جہاز سے اترا۔ جس سے کچھ فاصلہ پر مالوہ کا وہ علاقہ تھا جہاں جہادِ حریت نے شاہزادہ کی تگ و دو کے لیے میدان تیار کر رکھا تھا۔

مفتی انتظام اللہ شہابی تحریر فرماتے ہیں:

"حکومت کو ان کی آمد کا پتہ لگا تو ان کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا"

ایک انگریز مؤرخ لکھتا ہے:

"وسط اگست میں مالوہ کے اندر سرکشی نے خاص خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ اس کی سالاری کا منصب "فیروز شاہ" نام ایک مذہب دوست اور مجاہد شاہزدے نے سنبھال لیا۔ "مندیسور" (۴۹۸) کے مسلمانوں نے دوسرے فرقوں کو ملا کر گوالیار کی حکومت ختم کر دی اور شاہزادہ کی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔ وہاں بہت سے مواتی، مکرانی اور افغانی موجود تھے۔ وہ ساتھ ہو گئے۔ مندیسور کا حاکم اور کوتوال زخمی ہوا۔ ایک افسر مارا گیا۔ پھر حاکم کے محل پر حملہ ہوا۔ خزانہ لوٹ لیا گیا۔ دفاتر جلا دیئے گئے۔ یہاں کے قدیمی امراء میں ایک شخص "مرزا جی" تھا۔ اس کو وزیر اعظم بنا دیا گیا۔"

ایسا بہتر نظم و نسق قائم کیا گیا کہ جنوب سے تمام روابط منقطع کر دیئے گئے۔ سرکاری ڈاک کا سلسلہ

بند کر دیا گیا انگریزوں نے قاصد کے ذریعہ خبریں بھیجنے کی کوشش کی تو انہیں پکڑ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ (۴۹۹)

''دہلی چلو'' کا نعرہ (۵۰۰) اس وقت بھی بلند ہوا ہوگا۔ چنانچہ شاہزادہ گوالیار سے دہلی کی طرف بڑھا۔ اول دھول پور پہنچا۔ یہاں کے تحصیل دار سے ایک لاکھ روپیہ وصول کیا۔ افغانی ملازم رکھے۔ ابھی آگے نہیں بڑھا تھا کہ شکستِ دہلی کی خبر اس کے کانوں میں پڑی۔ لہٰذا دہلی کے بجائے آگرہ کا رخ کیا۔ انگریزی فوج نے کالی ندی پر آ کر مقابلہ کیا اور شکست پا کر قلعہ بند ہو جانے پر مجبور ہو گئی۔ خدا جانے کیا مصلحت تھی کہ شہزادہ یہاں سے سوات (۵۰۱) کی طرف سے چلا گیا۔ شیخ فضل علی رسالدار، جنرل عبدالصمد اور اس علاقہ کے میواتیوں نے ہمنوائی کی۔ (۵۰۲) دہلی کے بقیۃ السیف مجاہد بھی آ کر مل گئے۔ اب یہ خاصی جمعیت ۲۶ ستمبر ۱۸۵۷ء کو متھرا پہنچی۔ وہاں اس کے ساتھ ایک اور فوج مل گئی۔ جس میں زیادہ تر ۷۲ دیسی پیادہ فوج کے آدمی تھے اور ہیرا سنگھ اس کا صوبے دار تھا۔ اسی طرح وسط ہند (ناگپور) وغیرہ کے لوگ بھی اس فوج میں آ کر شامل ہو گئے۔ (۵۰۳)

یہ شاہزادہ اس جمعیت کے ساتھ فرخ آباد'' شاہ جہان پور'' ہوتا ہوا لکھنؤ پہنچا۔ یہاں ان کا بہت احترام کیا گیا۔ پہلے سلطان بہو صاحب کے مکان میں بسبب قرابت قریبہ اترے۔ (۵۰۴)

سلطان بہو صاحب نے حضرت محل سے کہلا بھیجا کہ میں محتاج ہوں مجھ سے ان کی خدمت کیا ہو سکے گی؟ سرکار سے دوسرا مکان ان کے رہنے کو ملے تو اچھا ہے۔ اس جہت سے ایک اور مکان علیحدہ ان کے قریب تجویز ہوا۔ مبلغ پانچ ہزار روپے دعوت کے آئے۔ (۵۰۵)

جب تک لکھنؤ میں مقابلہ جاری رہا۔ شاہزادہ فیروز شاہ اسی جگہ رہے۔ جب لکھنؤ خالی ہوا تو اپریل ۱۸۵۸ء میں مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کے پاس شاہ جہان پور پہنچا اور شاہ صاحب کے ساتھ جنگ میں شریک رہا۔

مراد آباد کے تذکرہ میں گزر چکا ہے کہ شاہزادہ فیروز شاہ اپنی فوج کے ساتھ مراد آباد بھی پہنچا تھا۔ وہاں خان بہادر خاں کا چچا ناظم تھا۔ اس نے کہلا بھیجا کہ شاہزادہ کے لیے چلا جانا ہی بہتر ہے۔ شاہزادہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ ہم تھکے ہوئے ہیں اور روزے سے ہیں۔ آج ٹھہرنے اور روزہ افطار کرنے کی اجازت دیجیے کل نجیب آباد چلے جائیں گے ناظم نے منظور نہ کیا۔ بلکہ فوج اور توپیں بھیج دیں۔ شاہزادہ نے مقابلہ کیا۔ ناظم کی فوج کو بھگا دیا اور اس کا سارا سامان ضبط کر لیا۔

نواب رام پور انگریزوں کے تحت حامی تھے۔ نواب صاحب نے فیروز شاہ کے مقابلہ کے لیے اپنے بھائی کاظم علی خاں کو ایک فوج دے کر بھیجا۔ شاہزادہ نے اس کو بھی شکست دی۔ چھٹے دن نجیب آباد اور رام پور سے سات ہزار انگریزی فوج بھاری توپ خانہ اور پورے ساز و سامان کے ساتھ پہنچی۔ شاہزادہ اس کے مقابلہ کی

طاقت نہیں رکھتا تھا، لہٰذا محصور ہونے سے پہلے مع فوج صحیح سالم نکل کر بریلی پہنچ گیا۔ جہاں نواب خان بہادر خان نے شاندار استقبال کیا۔ شاہزادہ کو اپنے ساتھ ہاتھی پر بٹھا کر جلوس کے ساتھ شہر کا گشت کیا۔(۵۰۶)

شکست بریلی کے بعد شاہزادہ، مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کے پاس شاہجہانپور پہنچا۔ محمدی میں شاہ صاحب نے اپنی طاقت کو دوبارہ منظم کر کے حکومت کی، تو شاہزادہ ان کے ساتھ ہی تھا۔ محمدی کی شکست کے بعد شاہزادہ نے نیپال کے بجائے دوبارہ اودھ کا رخ کیا۔ سندیلہ، بانگر مئو، حسنی پور، خیر آباد، باڑی وغیرہ میں قسمت آزمائی کی۔ پھر ''بلہور'' کے گھاٹ سے دریائے گنگا کو عبور کیا اور ملاحوں کو دو سو روپے انعام دیئے۔ بعد ازاں مکن پور، درگاہ مدار، جوالی، اٹاوہ وغیرہ سے ہوتے ہوئے شیر پور کے گھاٹ پر جمنا سے پار اترا۔ جگہ جگہ مقابلہ ہوا۔ بے جگری سے لڑا اور صحیح سالم نکلتا چلا گیا۔

جنوری ۱۸۵۹ء کو وہ اندر گڑھ میں تانتیا ٹوپے سے جا ملا۔ ۲۱ر جنوری ۱۸۵۹ء کو اس سے الگ ہوا۔ اپریل ۱۸۵۹ء میں وہ سرونج کے جنگلوں میں تھا۔(۵۰۷)

اس کے بعد یہ تو تسلیم ہے کہ ہندوستان سے صحیح سالم بچ کر نکل گیا۔ اس میں اختلاف ہے کہ ہندوستان سے نکل کر کہاں پہنچا۔

کمال الدین حیدر (مصنف قیصر التواریخ) لکھتے ہیں:

> آخر کار اٹک دریا اتر کر کابل سے ہو کر داخل ملک ایران ہوا وہاں سے رہبری پاکر داخل ملک روس ہوا کہتے ہیں وہاں اپنی جماعت قلیل سے بخوبی بسر کرتے ہیں۔ وہاں کی سلطنت سے بجہت نا موری کچھ کفالت ہوتی ہے۔

مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی تحریر فرماتے ہیں:

> روس ہو کر حجاز چلے گئے۔ مکہ معظمہ میں اقامت اختیار کی۔ ۱۸۹۵ء میں انتقال ہوا۔ رحمۃ اللہ ورضی عنہ۔

خاتمہ کلام اور معذرت

کئی سو صفحات سیاہ ہو گئے۔ مگر داستان ۱۸۵۷ء اب بھی ناتمام رہی۔ صرف دہلی اور روہیل کھنڈ کے جستہ جستہ واقعات اور اس علاقہ کے چند علماء اور زعماء تحریک کا تذکرہ آسکا، ان کا شمار تو ممکن ہی نہیں جو لائن میں کھڑے کر کے گولیوں سے اڑا دیئے گئے یا توپ دم کر دیئے گئے یا کسی درخت پر لٹکا کر پھانسی دے دیئے گئے۔ وہ جو نیل اور مجاہد جن کے کچھ تذکرے منتشر طور پر کتابوں میں ملتے ہیں، ان کی تعداد بھی بہت ہے، اور ان کو یکجا کرنے کے لیے ایک اور ضخیم جلد کی ضرورت ہے۔ مگر یہ ضرورت کس طرح پوری ہو؟ اس کا جواب توفیقِ ایزدی پر موقوف ہے۔

دہلی کی طرح لکھنؤ اور کانپور کے محاذ بھی تفصیل طلب ہیں۔ مالوہ کا علاقہ بھی آماجگاہ رہا ہے۔ لکشمی بائی

(مہارانی جھانسی) کنور سنگھ (جگدیش پور، ضلع آرہ، شاہ آباد بہار اسٹیٹ) ریاست دھا کے نوجوان راجہ اور راجہ بلب گڈھ جیسے فداکارانِ حریت نے جو کام کئے، یہ سب تاریخ حب وطن کے زریں باب ہیں۔

عظیم اللہ خاں، نانا راؤ پیشوا، تانتیا ٹوپے، مولانا پیر علی، نواب تفضل حسین فرخ آباد، سید اکبر زماں کے حالات جناب غلام رسول صاحب مہر اپنی تازہ تصنیف "۱۸۵۷ء کے مجاہدین" میں اس کی تفصیل سے پیش کر چکے ہیں نیز سر دست اس پر اضافہ مشکل ہے مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کی تصانیف میں بہت سے مشاہیر کا ذکر آچکا ہے۔ یہاں ان کو نقل کر کے کتاب کو گراں بار بنانا نہ ہمیں پسند ہے، نہ ناظرین کرام اس تکلف کو پسند کریں گے۔ لہٰذا سلسلۂ تحریر یہیں ختم کیا جاتا ہے۔ البتہ مسٹی گرین کا دلچسپ تذکرہ یہاں اس لئے پیش کیا جاتا ہے کہ اس سے فداکارانِ حریت کی قابلیتوں اور غیر معمولی صلاحیتوں پر ہلکی سی روشنی پڑے گی۔

یہ پورا تذکرہ "العلم" کراچی کے جنگِ آزادی نمبر (اپریل تا جون ۱۹۵۷ء) سے ماخوذ ہے۔ اس کے بعد شاندار ماضی جلد چہارم کے سب سے پہلے ایڈیشن[۵۴۸] کے چند صفحات بطور یادگار نقل کئے جائیں گے۔ یہ ان مظالم کی قلمی تصاویر ہیں جو ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں کمزور اور نہتے ہندوستانیوں پر بجرم حریت طلبی، مہذب اور شائستہ انگریز کی طرف سے روا رکھے گئے تھے۔

سرگذشت محمد علی خاں بریلوی

عرف جیمی گرین

۱۸۵۷ء کے چشم دید واقعات اور پر اثر روایتیں اکثر انگریزوں نے یادداشتوں اور سرگذشتوں کے نام سے چھاپی ہیں۔ چنانچہ ایک انگریز فوجی افسر فوربس مچل نے بھی جو کانپور اور لکھنؤ دونوں جگہ کے معرکوں میں شریک تھا اپنے روزنامچہ سے ایک کتاب مرتب کر کے شائع کی۔ یہ کتاب میسرز میکمیلن اینڈ کو کے یہاں چھپی تھی۔ اور اس کے ایک حصہ کا اردو ترجمہ جو محمد علی خاں، عرف جیمی گرین کے حالات پر مشتمل ہے۔ منشی محمد شفیع الدین خاں مرادآبادی نے جولائی ۱۸۹۶ء میں شائع کیا تھا۔ اصل انگریزی کتاب اور یہ ترجمہ اب قریب قریب ناپید ہے۔ ایک نسخہ مفتی محمد انتظام اللہ صاحب شہابی، اکبرآبادی کے پاس موجود ہے۔ اس کو اس مضمون کا ماخذ سمجھنا چاہیے۔

گوروں کی رجمنٹ ۹۳ (ترکوں اور روسیوں کی کریمیا کی لڑائی کے بعد جس میں سلطان المعظم کو فتح نصیب ہوئی تھی) انگلستان سے مئی ۱۸۵۷ء میں لارڈ الگن موجودہ وائسرائے ہند کی ماتحتی میں روانہ ہوئی۔ افریقہ پہنچنے پر ہندوستان کا غدر فرو کرنے کے لیے یہاں بھیج دی گئی۔ اور ۲۷/اکتوبر ۱۸۵۷ء کو لکھنؤ اور کانپور کے مرحلوں کے بعد نانا راؤ کا تعاقب اور بعض مفسدوں کی سرکوبی فتح گڈھ میں کر کے دوبارہ لکھنؤ جا رہی تھی۔ ۱۰/فروری کو اناؤ میں قیام تھا اور دس روز تک یہیں ٹھہرنا پڑا۔

مچل صاحب (جن کی کتاب سے ترجمہ کر کے یہ سرگزشت لکھی جاتی ہے) لکھتے ہیں کہ ایک روز میں خیمہ کے اندر بیٹھا ہوا تھا کہ سامنے سے ایک شخص کو صدا لگاتے سنا۔ پلم کیک، نہایت عمدہ پلم کیک۔ اول چکھو، بعد میں خریدو۔ چونکہ بسکٹ اور معمولی گوشت کھاتے کھاتے جی اکتا گیا تھا۔ لہٰذا اس مٹھائی کا وہاں آ نکلنا بہت اچھا معلوم ہوا، اور اسے فوراً اندر بلا کر چکھوتیاں شروع کیں۔ یہ مٹھائی فروش بڑا ہی خوبصورت جوان تھا۔ اس کے کپڑے انتہا درجہ کے سفید تھے داڑھی اور مونچھیں خوب چڑھی ہوئی تھیں دہانہ چوڑا اور ناک ذرا خم دار تھی۔ آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی، اور باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ لشکری نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ جو مزدور تھا، بڑا ہی شریر معلوم ہوتا تھا۔

میں نے (یعنی مچل نے) اس سے پوچھا تمہارے پاس، پاس ہے؟

مٹھائی فروش: جی ہاں: کیوں نہیں لیجیے۔ ملاحظہ فرمایئے۔ بریگیڈیر میجر صاحب نے نہیں۔ خود بریگیڈیر صاحب نے دیا ہے۔ میں جیمی گرین کے نام سے مشہور ہوں اور دوسرے رجمنٹ کے خانساماں کا لڑکا ہوں۔ شیر رصاحب مجسٹریٹ کانپور کی سفارشی چٹھی جنرل ہوپ صاحب کے نام لایا ہوں۔

میں نے چٹھی دیکھی تو واقعی شیر صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی اور جنرل ہوپ صاحب کے نام تھی۔ مٹھائی فروش کی ہیئت کے علاوہ جس بات پر مجھ کو سخت حیرت تھی وہ اس کی صاف ستھری انگریزی تھی جس کو وہ نہایت بے تکلفی سے بولتا تھا۔ مجھ سے انگریزی اخبار لے کر پڑھنے لگا۔ اور فوج کے متعلق ہر قسم کی بات چیت شروع کر دی۔ اس نے پوچھنا شروع کیا۔ آج کل کتنے جوان ہیں؟ آپ نے لکھنؤ کے محاصرے کے لیے کیا کیا تیاریاں کی ہیں؟ آپ لوگ تو ولایت سے ابھی ابھی آ رہے ہیں، گرمی کیسے گزار یئے گا؟

میں نے اس ضمن میں اس کی شستہ و شگفتہ انگریزی کا ذکر کیا تو کہنے لگا کہ میرا باپ مسکوت میں خانساماں ہے۔ اس نے بچپن میں مجھے انگریزی سکھلائی۔ میں نے رجمنٹ سکول میں انگلش تعلیم پائی ہے۔ عرصہ تک مسکوت کا کلرک بھی رہا ہوں وہاں سارا حساب و کتاب انگریزی میں لکھتا تھا۔ اس عرصہ میں اس شریر نوکر اور ایک گورے میں لڑائی ہونے لگی۔ میں نے اس سے کہا۔ ارے میاں تمہارا یہ نوکر تو بڑا ہی لڑاکا ہے کہنے لگا۔ حضور آپ اس کا خیال نہ فرمایئے۔ یہ بڑا ہی شریر ہے۔ آئرلینڈ کا رہنے والا ہے۔ اس کی ماں آٹھویں آئرش رجمنٹ میں رہتی ہے اور اس کا سب پر زور ہے۔ یہ پنجاب سے ابھی ابھی آگرہ کی فوج کے ہمراہ آیا ہے۔ کانپور کے کمانیر نے اسے موقوف کر دیا ہے کیونکہ اس کی میم نو عمر تھی اور تیکھی چتون پر عاشق ہو گئی تھی۔

خیر مذاق تو ہو گیا مگر مٹھائی لے کر قیمت نہ دینا آپ ہی کا کام ہے۔ ان دل کش باتوں پر سب لوگ اس قدر ریجھ گئے کہ زبردستی اس گورے سے جس نے مٹھائی اس شریر نوکر سے چھین لی تھی، دام دلوا دیے۔ اسی روز شام کو میں نے سنا، کہ جیمی گرین جو اپنے آپ کو مسکوت کے خانساماں کا بیٹا بتاتا تھا لکھنؤ کا جاسوس نکلا۔ چونکہ شام ہو گئی تھی، اس لیے اسے پھانسی نہ دی گئی۔ میری حراست میں بھیج دیا گیا، اور زائد سنتری پہرے کے لیے تعینات کر دیے گئے۔ اس وقت مجھ کو بڑا صدمہ گزرا، کیونکہ میں اس کی اول ہی ملاقات سے اس کا دم بھرنے لگا۔ اب میرا وہ تعجب بھی جاتا رہا کہ ایسا مہذب اور تعلیم یافتہ شخص لشکری بنا ہوا ہے۔

اس کا نوکر وہ جلاد بوچر تھا جس نے جولائی ۱۸۵۷ء میں خون کی ندیاں بہائی تھیں اور فسیٹ صاحب نے اپنی کتاب میں جو اس کا حلیہ لکھا تھا وہ قطعی ٹھیک تھا۔ کیونکہ وہ طویل القامت، بدصورت، سیاہ فام، چیچک رو تھا۔

جب یہ دونوں میرے پہرے میں دیئے گئے تو بعض گوروں نے کہا کہ ان کو بازاری سور کا گوشت کھلانا چاہیے لیکن میں نے صاف کہہ دیا کہ اگر کسی نے ایسی بات کا ارادہ بھی کیا تو میں فوراً حکم عدولی کے جرم میں حوالات کر دوں گا۔ میں نے یہ الفاظ جو ڈانٹ کر کہے، سب ڈر گئے اور پھر کسی نے کچھ نہ کہا۔

جیمی گرین کے چہرے سے سچے شکریہ کے آثار پائے جاتے تھے۔ کہنے لگا۔ خدائے کریم اور اس کا رسول پاک آپ کو اس کا اجر دے گا، اور اس لڑائی میں بال تک آپ کا بیکا نہ ہوگا۔

میں نے یہ سن کر کہا کہ میں حتی الوسع تمہیں آزادی دلانے کی کوشش کروں گا۔ اور اسے نماز پڑھنے کی اجازت دے دی، لیکن وہ شریر نوکر کہنے لگا۔ میں ہرگز کافروں کا احسان نہیں لوں گا۔ اس پر اس کا۔ لک جیمی گرین

بولا۔ ارے کمبخت! سارجنٹ صاحب (کیونکہ میں اس وقت سارجنٹ ہی تھا) کا ہم کو ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے ہمیں سور کی چربی سے بچا لیا۔

میں نے ارادہ کیا کہ آج تمام رات جاگوں۔ ورنہ یہ لوگ کہیں بھاگ گئے تو مفت میں بدنام ہوں گا، اور یہ تو میں خوب جانتا تھا کہ رات ان کی زندگی کی آخری رات ہے۔ لہٰذا میں نے ایک مسلمان دوکاندار کو بلا کر کہا کہ یہ جو مانگیں، انہیں لادو، اور قیمت مجھ سے لے جاؤ، وہ کہنے لگا، جب آپ عیسائی ہو کر اتنا سلوک کرتے تو تف ہے اس مسلمان پر جو ایک پائی بھی لے۔ میں نے ایک کمبل جیمس گرین کو دیا اور اسے اپنی سرگذشت سنانے پر مجبور کیا۔

میں نے اس سے کہا۔ سنو جیمس گرین! یہ تم اور میں خوب جانتے ہیں کہ آج کی رات تمہاری زندگی اور ہے اور صبح کو ضرور پھانسی لٹکو گے۔ لہٰذا اگر تم مجھے اپنی پوری اور سچی سرگذشت سناؤ تو میں بہت شکر گزار ہوں گا۔ اس نے کہا۔ صاحب آپ نے ہم پر اتنی بڑی عنایت کی ہے جس کی کچھ حد نہیں۔ میری سرگذشت آپ کان لگا کر سنئے۔

میں بیگم کی فوج کا ایک افسر ہوں اور لکھنؤ سے محض اس غرض سے آیا تھا کہ اس فوج کو جو ہمارے مقابلہ کو جا رہی ہے، حالت دیکھوں۔ میرا عہدہ فوج میں چیف انجینئر کا ہے اور خفیہ حالات دریافت کرنے نکلا ہوں۔ لیکن خدا کی مرضی میں کس کو دخل۔ لکھنؤ میں میرا انتظار ہوگا اور یہاں میں موت کے منہ میں جانا چاہتا ہوں۔ اگر نصیب یاور ہوتا، تو آج رات ہی جا پہنچتا۔ کیونکہ ضروری بات دریافت کر چکا تھا مگر اتفاقاً راہ میں پڑ جانے سبب اس لالچ میں آگیا کہ دیکھوں محاصرہ کرنے والی فوج چل دی کہ نہیں، اس ولد الزنا قصاب نے مجھ کو جاسوس کہہ کر گرفتار کرادیا۔ یہ مردود وہ ہے جس نے اول انگریزوں کو پھانسی دلوائی اور خود قتل کیا۔ اور اب خود اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے۔ میں نے ٹوک کر کہا۔ تمہارا اصلی نام کیا ہے؟ میں تمہارے حالات لکھ کر اپنے دوستوں کو اسکاٹ لینڈ اور لندن میں بھیجنے والا ہوں۔ اس نے کہا۔ آپ مجھ سے میرا نام دریافت کرنا چاہتے ہیں اور اپنے اسکاچ دوستوں کو میرا حال لکھنا چاہتے ہیں، خیر مجھے اس سے کوئی تعرض نہیں۔ انگلستان اور سکاٹ لینڈ کے لوگ منصف مزاج ہیں وہ میری سرگذشت پڑھ کر ضرور متاسف ہوں گے خود میرے بھی دوست لندن اور اڈنبرا میں موجود ہیں۔ میں وہاں دو دفعہ ہو آیا ہوں۔ میرا نام محمد علی خاں ہے۔ میں روہیل کھنڈ کے ایک بڑے شریف خاندان سے ہوں میں نے بریلی کالج میں تعلیم پائی ہے اور انگریزی زبان میں خصوصاً بڑا نام پیدا کیا ہے۔ بریلی کالج سے انجینئرنگ کالج رڑکی گیا تا کہ سرکار کمپنی کی ملازمت اختیار کروں۔ رڑکی کالج کے امتحان میں اول آیا اور تمام انگریزوں سے میں نے بہت زیادہ نمبر پائے۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کے انجینئروں میں صرف جمعدار مقرر ہوا، اور اس سارجنٹ کی ماتحتی میں دیا گیا جو سوائے جہالت اور وحشی پن کے ہر بات میں کم تھا۔ اگر ولایت میں ہوتا تو صرف بڑھئی ہوتا۔ ہم دونوں پہاڑ پر تعینات ہوئے۔ جیسے اکثر شوردماغ ہوا کرتے ہیں وہ بھی یورپین عیبوں کی مجسم تصویر تھا یعنی مغرور، خود رائے اور خود غرض انہیں باتوں سے ہم لوگ سخت نفرت کرتے ہیں۔ جب تک آپ ہم لوگوں کی زبان نہ سیکھیں اور شرفاء سے میل جول پیدا نہ کریں، اس وقت نہ آپ جان سکتے ہیں،

اور نہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسے کندہ ناتراش سے آپ کی قومی عظمت اور ناموری پر کتنا بڑا دھبہ لگتا ہے۔ ایسی ہی مثالیں آپ کے وہ دشمن اپنے دعووں کی تصدیق میں پیش کیا کرتے ہیں جو اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کو آپ کی قوم کی رعونت اور خودغرضی کا ذکر کر کے آپ کے فیاضانہ خیالات اور ہمدردی کو محض دعوئے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کمپنی کی ملازمت روپیہ کے خیال سے نہیں بلکہ معزز عہدہ حاصل کرنے کی امید پر کی تھی مگر بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ اس لیے کہ میں جس کی صورت سے متنفر تھا، اسی کی ماتحتی میں دیا گیا۔ میں نے تھوڑے دنوں کے بعد اپنے والد کو لکھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں استعفیٰ دے دوں۔ وہ راضی ہو گئے اور کہا کہ نسل ملوک سے ہو، ان صورتوں میں ہرگز نوکری مت کرو۔ میں فوراً ملازمت چھوڑ کر چلا آیا، اور ارادہ کیا کہ نصیر الدین حیدر شاہِ اودھ کی نوکری اختیار کروں۔ لکھنؤ میں پہنچتے ہی سنا کہ مہاراجہ جنگ بہادر والیٔ نیپال آج کل گورکھپور میں لکھنؤ کے خلاف تیاری کر رہے ہیں اور انگلستان جانے کے لیے ایک لائق انگریزی داں سیکرٹری چاہتے ہیں۔ میں نے درخواست دی اور بڑی سفارشوں سے اس عہدہ پر مقرر ہو گیا اور مہاراجہ صاحب بہادر کے ہمراہ اول دفعہ انگلینڈ گیا۔ ... تماشات کے ایڈنبرا بھی دیکھا جہاں آپ کی بھی رجمنٹ مہاراج کے استقبال کو آئی تھی۔ مجھے خود بخود خیال ہوا کہ یہ پلٹن کسی دن ضرور مجھے قید کرے گی۔ چنانچہ وہی ہوا۔ میں ہندوستان واپس آ کر بعض رجواڑوں میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز رہا۔ اور ۱۸۵۳ء میں عظیم اللہ خاں نے جس کا نام آپ نے غدر کے سلسلے میں بہت کچھ سنا ہوگا، مجھ سے انگلستان چلنے کو کہا۔ بعد وفات پیشوا، ناناراؤ نے عظیم اللہ خاں کو اپنا سربراہ مقرر کیا تھا۔ اس نے بھی میری طرح ماسٹر گنگادین سے گورنمنٹ سکول کانپور میں انگریزی خوب تحصیل کی تھی اور اسے قوی امید تھی کہ انگلستان پہنچ کر ضرور لارڈ ڈلہوزی کا حکم اپنے آقا پر سے منسوخ کرا لوں گا۔ جب میں ان کے پاس پہنچا تو وہ ولایت جانے کو پابرکاب تھے ان کو بہت سا روپیہ اس غرض سے دیا گیا تھا کہ حسب دل خواہ وکیل کریں اور بوقت ضرورت حکام کی مٹھی بھی گرم کریں۔ میں اس سفارت کا حال آپ کو بتانا نہیں چاہتا۔ آپ خوب واقف ہیں کہ ہم لوگوں کی آؤ بھگت تو خوب ہوئی مگر مطلب خاک بھی نہ نکلا اور ہم پانچ لاکھ روپیہ خراب کر کے وہاں سے چل دیئے۔ اور براہ قسطنطنیہ ہندوستان کو ۱۸۵۵ء میں روانہ ہوئے۔ قسطنطنیہ سے ہم کریمیا گئے اور یہیں پر سنے دیکھا کہ ۱۸؍ جون کو انگریزوں نے حملہ کیا مگر شکست کھائی۔ سباسٹپول کے سامنے دونوں فوجوں کی حالت زار دیکھ کر ہمارے دل پر بڑا اثر ہوا۔ میدان جنگ سے پھر قسطنطنیہ لوٹے۔ یہاں ہمیں کئی روسی افسر ملے۔ وہ سچے ہوں یا جھوٹے، یہ ہم نہیں جانتے مگر وہ ہم سے کہنے لگے کہ اگر تم لوگ ہندوستان میں غدر پھیلا دو تو ہم ہر طرح سے مدد کریں گے اور تمہارا بڑا فائدہ ہوگا۔ اب تو میں نے اور عظیم اللہ خاں نے ارادہ کر لیا کہ کسی طرح کمپنی کا راج سرزمینِ ہندوستان سے کھو دیں، اور خدا کا شکر ہے کہ ہم اس بارہ میں کامیاب بھی ہو گئے کیونکہ ان اخبارات سے جو آپ نے عنایت فرمائے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، اور اب ان کی لوٹ مار اور ضبطی کے لیے فرمان نہ ملے گا۔ اگرچہ ہم انگریزوں سے ملک نہ چھین سکے لیکن تب بھی ہم

سمجھتے ہیں کہ ہم نے ملک کو کچھ فائدہ ضرور پہنچایا ہے اور ہماری جانیں بے فائدہ تلف نہ ہوں گی کیونکہ میں یہ یقینی جانتا ہوں کہ پارلیمنٹ کی حکومت کمپنی کے راج سے زیادہ عادلانہ ہوگی۔ گوکہ میں اس زمانہ میں زندہ نہیں ہوں گا لیکن ہمارے مظلوم اور مصیبت زدہ ہم وطن کسی آئندہ وقت میں ضرور زیادہ امن وچین سے زندگی بسر کریں گے۔ صاحب! اس بات کو آپ خوب سمجھ لیں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ ہرگز نہ تو آپ کی خوشامد کے خیال سے ہے اور نہ اس امید پر کہ آپ مجھ پر زیادہ مہربانی کریں گے۔ اس لیے کہ یہ تو مجھے حاصل ہی ہے، اور میں خوب جانتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر آپ کر بھی نہیں سکتے اور اگر کرنی چاہیں تو آپ کو ادائے فرض منصبی کا خیال کبھی ہرگز نہیں کرنے دے گا۔ یہ تو صاف ظاہر ہی ہے کہ ہماری موت آ پہنچی ہے لیکن جو غیر مترقبہ احسان آپ نے میرے ساتھ کیا ہے اس کی وجہ سے میں دل کھول کر آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔

اس ڈیرہ کی طرف آتے ہوئے تو ضرور میں دل میں گالیاں دیتا اور برا کہتا آتا تھا مگر آپ کی دوبارہ عنایتوں کو دیکھ کر دل میں بہت خفیف اور شرمندہ ہوں اور افسوس کرتا ہوں کہ ایام غدر میں کیوں اس قدر کشت و خون ہوا۔ اول موقع وہ تھا جب کرنل جیپر صاحب انجینئر کانپور گھاٹ پر حال ہی میں کچھ ہندوؤں کے مندر گروا رہے تھے کہ چند ہندو پجاری ان کے پاس آئے اور ملتجی ہوئے کہ مندروں کو نہ تڑوائیے کرنل صاحب نے جواب دیا۔ "سنیے صاحب! جب میمیں اور بچے قتل ہوئے تو آپ سب کہاں تھے اور یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ہم بدلہ لینے کے خیال سے مندروں کو نہیں ڈھا رہے ہیں، بلکہ کشتیوں کے پل اور فوجی حفاظت کے خیال سے ایسا کر رہے ہیں لیکن اگر ایک متنفس بھی تم میں سے یہ بات ثابت کردے کہ تم نے کسی ایک بھی انگریز، بچہ میم کے ساتھ ذرا سا بھی سلوک کیا ہے، اور یہ بھی نہیں بلکہ اتنا بتلا سکو کہ ایک لفظ بھی کسی کی جان بچانے کو کہا ہے تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ جہاں ایسا شخص پوجا کیا کرتا ہے، میں اس مندر کو بجنسہ قائم رہنے دوں گا"۔ میں اس مجمع میں کرنل کے قریب ہی کھڑا تھا اور دل میں ان کی باتوں پر کہہ رہا تھا۔ ؏

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اس تقریر پر سب دم بخود ہوگئے اور سارے برہمن وہاں سے کھسک گئے کرنل صاحب نے اشارہ کیا اور مندر ٹوٹنا شروع ہوگئے۔

مجھ پر اس تقریر کا ایسا اثر ہوا کہ میں بھی فوراً وہاں سے چل دیا۔ جس وقت کانپور میں غدر ہوا، میں اپنے وطن روہیل کھنڈ میں تھا۔ سوائے میدان جنگ کے میرے ان ہاتھوں نے کبھی خون نہیں بہایا۔ میں سمجھتا تھا کہ طوفان اب آیا چاہتا ہے اور اسی سبب سے میں اپنے گاؤں میں بال بچوں کی حفاظت کرنے گیا تھا۔ میں ابھی گاؤں میں ہی تھا کہ میرٹھ اور بریلی کے غدر کی خبر آئی۔ میں فوراً بریلی کی پلٹن میں جا ملا، اور اس کے ہمراہ دہلی گیا۔ وہاں میں انجینیر اور اس کے بعد چیف انجینیر مقرر ہو گیا اور سرکار کمپنی کے انجینیروں کی مدد سے جنہوں نے رڑکی سے میرٹھ جاتے ہوئے بغاوت کی تھی قلعوں وغیرہ کی مضبوطی کرنے لگا۔ بعدہٗ میں نے اس منتشر فوج کے

آدمی جمع کر کے لکھنؤ کا راستہ لیا۔ ہم لوگ متھرا پہنچے تو وہاں مقام کرنا پڑا اور جب میں نے جمنا پر کشتیوں کا پل بنا کر فوج کو پار اُتار دیا، تب ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ اس وقت بھی فیروز شاہ اور جنرل بخت خاں کے پاس تیس ہزار فوج تھی۔ جب میں لکھنؤ پہنچا، تو چیف انجینئر مقرر کیا گیا۔ نومبر کے مہینہ میں آپ کی رجمنٹ نے رزیڈنسی کو بچایا تو میں وہیں تھا۔

سکندر باغ کا قتل میں نے بچشم خود دیکھا تھا۔ اس جگہ کی مرمت پچھلی ہی رات کو میں نے کرائی تھی، اور جب آپ کا دھاوا ہوا تو میں شاہ نجف سے دیکھ رہا تھا۔ لکھنؤ کی فوج کے کچھ اُوپر تین ہزار چیدہ جوان میں نے سکندر باغ میں تعینات کر دیئے تھے مگر وہاں سے ایک شخص بھی بچ کر نہ گیا۔ مجھے اس وقت غش آ گیا اور جب میں نے دیکھا کہ ہرا جھنڈا جو میں نے رات کو نصب کیا تھا، اُتر گیا، اس کی جگہ گھاگھرا پلٹن کے جھنڈے لہرا رہے ہیں تو میرا جگر پارا پارا ہو گیا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو توپوں کے سر کرنے کا حکم دیا۔

اس کے بعد برابر لکھنؤ اور اس کے قرب وجوار کے قلعوں وغیرہ کی مرمت کرتا رہا۔ آپ جا کر دیکھیں گے کہ سپاہی اور گولنداز اگر ان کے پیچھے قدم جمائے کھڑے رہیں تو انگریزوں کی بہت سی فوج کام آ جائے گی، تب کہیں لکھنؤ جا کر ہاتھ آئے گا۔

اتنی کہانی کہہ کر محمد علی خاں بیٹھ گیا اور پانی پی کر تھوڑا سا کھانا کھایا۔

اس کے بعد میں نے دریافت کیا کہ یہ تمہارے ساتھ والا شخص جسے تم میکی کہہ کر پکارتے ہو، درحقیقت وہی ہے جس نے نانا راؤ کے حکم سے گذشتہ مئی میں میموں اور بچوں کو ذبح کیا تھا۔

کہنے لگا۔ بیشک وہی ہے مگر جس وقت میں نے نوکر رکھا تھا یہ مجھے نہیں معلوم تھا، اور اگر یہ جانتا کہ اس نے میموں اور بچوں کو ذبح کیا ہے تو میں ہرگز اس کو ساتھ نہ لیتا۔ کیونکہ اسی کے سبب سے تو یہ مصیبت ہم پر نازل ہوئی تھی۔ کاجل کی کوٹھری میں جا کر آدمی بے داغ نہیں نکل سکتا ہے۔ اب مجھے بھی یقین ہے کہ سختیاں جھیلنا پڑیں گی۔ ایسے ہی مردودوں کے کرتوتوں نے تو یہ قہر خداوندی ہم پر نازل کر لیا ہے۔

تب میں نے کہا کہ تمہاری رائے میں یہ افواہ کہاں تک صحیح ہے کہ میمیں اوّل خراب کی گئیں اور پھر ماری گئیں۔ اس پر بولا۔ صاحب آپ اجنبی ہیں، ورنہ ایسا سوال نہ پوچھتے۔ جو شخص یہاں کے رسم ورواج اور ذات برادری کے سخت قاعدوں سے واقف ہے وہ خوب جانتا ہے کہ یہ سب محض جھوٹی کہانیاں ہیں اور طرفین کے بھڑکانے کو گھڑی گئی ہیں۔ حالانکہ اب کیا کم نفرت ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ عورتیں اور بچے نہایت بے رحمی سے مارے گئے مگر کسی کی آبروریزی نہیں کی گئی، اور یہ عبارتیں جو کانپور کے بنگلوں پر لکھی ہیں کہ "ہم وحشیوں کے ہاتھوں میں ہیں انہوں نے بوڑھی اور جوان سب عورتوں کو بے عزت کیا ہے اور اس قسم کی جو خبریں ہندوستان کے اخباروں میں شائع ہوئی ہیں اور ان سے لندن کے اخبارات نے نقل کی ہیں قطعی بناوٹ ہیں۔ اور جنرل سر ہنری

ہیولاک اور جنرل سر جیمس اوٹرام کے کان پور فتح کرنے کے بعد لکھی گئی ہیں۔ گو میں وہاں نہیں تھا مگر میں نے ان سے یہ سب باتیں سنی ہیں جو وہاں موجود تھے اور میں جانتا ہوں، یہ بالکل سچ ہے۔

پھر میں نے پوچھا کہ نانا راؤ نے کیوں اس قدر خون ریزی کی؟ کہنے لگا۔ ایشیا کے باشندے کمزور ہیں اور ان کے اقرار، بھروسے کے قابل نہیں ہوتے مگر اس کی وجہ ہمیشہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ ظلم کا ارادہ ہی کر لیتے ہیں بلکہ احسان کرنے میں بے پروائی سے کام لیتے ہیں۔ جب وہ پورا کرنا چاہتے ہیں تو اس کو پورا بھی کرتے ہیں۔ جب اس کو پورا کرنے میں انہیں کسی قسم کی تکلیف ہوتی ہے تو وہ اسے بھول جاتے ہیں۔

اور غالباً یہی حال نانا راؤ کا تھا۔ وہ عورتوں اور بچوں کو بچانا چاہتا تھا مگر اس کے حرم میں ایک عورت تھی جو غلامی سے آزاد کر کے زنانے میں داخل کر لی گئی تھی۔ وہ مجسم شیطان اور میموں کی جانی دشمن تھی۔ اس کے علاوہ خود نانا راو، عظیم اللہ خاں وغیرہ ایسے لوگوں میں گھرا ہوا تھا، جو چاہتے تھے کہ وہ ایسا غدر میں گھر جائے جس سے رہائی ناممکن ہو۔

اس طرح اس عورت کو مدد ملی اور اس نے میموں کو قتل کرنے کی زبردستی اجازت لے لی۔ مگر جب چھٹی کالی پلٹن اور نانا راؤ کے باڈی گارڈ نے انہیں قتل کرنے سے انکار کر دیا تو اس عورت نے ان بدذاتوں کو ڈھونڈ بلایا۔

یہ حالات میں نے جنرل تانتیا ٹوپے سے سنے ہیں۔ اس سے اور نانا سے اس بات میں جھگڑا بھی ہو گیا تھا۔

میں سچ کہتا ہوں کہ کانپور کی عورتوں اور بچوں کا قتل صرف اسی عورت کے سبب ہوا، اور عورت سے بڑھ کر کوئی شیطان بھی نہیں ہے۔ مگر نہ میں نے کبھی پوچھا، نہ مجھے معلوم ہے کہ وہ کیوں انگریزوں سے اس قدر جلتی تھی۔ اس چھوکری کا ذکر ہندوستان کے گواہوں نے کیا ہے جو قتل کان پور کے بارہ میں سنے گئے ہیں۔

اس کے بعد میں نے پوچھا کہ ان افواہوں کی بھی کوئی اصل ہے کہ جنرل وہیلر کی بیٹی چار یا پانچ آدمیوں کو پستول سے ٹھنڈا کر کے کان پور کے مشہور کوئیں میں کود پڑی۔

اس کے جواب میں کہا کہ یہ گپیں ہیں اور بالکل بے اصل۔ جنرل وہیلر کی بیٹی اب تک زندہ ہے۔ وہ لکھنؤ میں ہے اور مسلمان ہو گئی ہے، از روئے شرع شریف جس نے اس کی جان بچائی ہے اس سے نکاح کر لیا ہے۔ مگر میں یہ نہیں کہتا کہ وہ پھر اپنے ہم قوموں میں آ ملے گی یا نہیں۔

اس قسم کی باتوں میں میں نے آنکھوں میں رات کاٹی اور صبح کو میں نے محمد علی خاں کو اجازت دے دی کہ وضو کر کے نماز فجر ادا کرے۔ بعد فراغ نماز اس نے دعا مانگی کہ یا خدا اس شخص کو ان احسانوں کا جو تیرے مظلوم بندوں پر اس نے کئے ہیں، جزائے خیر دے۔

یہ کہہ کر اس کا دل بھر آیا۔ میں نے رونے کا سبب پوچھا۔ تو اس نے اپنی بی بی اور بچوں کا ذکر کیا اور کہنے لگا کہ انہیں مجھ بدنصیب کا کیا حال معلوم ہوگا۔ مگر فوراً ہی دل مضبوط کر کے کہنے لگا۔ میں نے فرانس اور انگلستان کی تاریخیں پڑھی ہیں۔ اور ایسا تھوڑا ہی نہیں بننا چاہیے۔ یہ کہہ کر ایک سونے کی انگوٹھی جو اس کے بالوں میں چھپی ہوئی

تھی، نکالی اور مجھ سے کہا کہ اس کو آپ میری دلی احسان مندی کی نشانی سمجھ کر رکھئے۔ میری ساری چیزیں چھین لی گئیں جب میں گرفتار ہوا تھا، اور اب سوائے اس کے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ یہ انگوٹھی ظاہراً دس بارہ کی معلوم ہوتی ہے مگر جب آپ اس کے خواص سُنیں گے تو لاکھ روپیہ سے زیادہ پائیں گے۔ یہ مجھے ایک بزرگ نے قسطنطنیہ میں حرزِ جان بنا کر دی تھی لیکن جب سے اس شریر نوکر قصائی کا ساتھ ہوا، اس کا اثر اُتر گیا ہے۔

مَیں نے اُسے قبول کر لیا، اور اُس نے دُعا دی کہ خدا تمہیں ہمیشہ امن و امان میں رکھے۔

محمد علی خاں نے یہ بھی مجھ سے کہا کہ جب آپ لکھنؤ کے قلعوں کے پاس پہنچیں تو اسے دیکھ کر مجھے یاد کر لیجئے گا، پھر آپ کو کوئی گزند نہ پہنچے گا۔ وہ بات بھی پوری نہیں کرنے پایا تھا کہ گارڈ لینے کے لیے آپہنچا اور مَیں نے بادلِ نخواستہ اُسے حوالہ کیا۔ ہماری فوج کو فوراً صبح کے وقت لکھنؤ کی طرف کوچ کرنے کا حکم ملا۔ مگر میری خاص کمپنی کو حکم تھا کہ سب سے بعد کو جائے۔ جب ہم چلے تو دن خوب چڑھ گیا تھا اور جو سڑک کان پور سے لکھنؤ جاتی تھی، اُس پر جاتے ہوئے ایک درخت کے نیچے سے گذرے۔ مَیں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو محمد علی خاں اور اُس کے نوکر بوچر کی لاشیں ٹنگی لٹکی ہوئی تھیں، اور کسی قدر اکڑ بھی گئی تھیں۔ مَیں کانپ گیا، اور میرے آنسو ٹپکنے لگے۔

۱۱ر مارچ کو بیگم کی کوٹھی پر دھاوا کرتے وقت مَیں نے محمد علی خاں والی انگوٹھی دیکھی، اور اس کو یاد کیا۔ میں سچے دل سے کہتا ہوں کہ بعد کے معرکوں میں میرے رگڑ تک نہ لگی، زخم کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

جب کبھی مجھے ان احسانات کا خیال آتا ہے جو مَیں نے اُس نامراد محمد علی خاں کے ساتھ کئے تھے، تو کیسا ہی خطرہ ہوتا، میں ذرا بھی نہ جھجکتا۔ یہ انگوٹھی میرے پاس اب تک موجود ہے، اور غدر کی لوٹ مار میں صرف یہی ایک چیز ہے جو مجھے ملی۔ جب مَیں مرتے وقت اپنے بچوں کو دوں گا، تو اُنہیں محمد علی خاں کا بھی حال بتا دوں گا۔

مترجم

محمد شفیع مراد آبادی مرحوم

۲۷ر جولائی

۱۸۹۶ء

(مصنف علی گڈھ بابت مارچ ۱۹۴۳ء)

تصویر کا دُوسرا رُخ

انتقامی جذبات کی دردانگیز داستان' انگریزی درندگی کے خونین نظارے

مذہبی، سیاسی، اقتصادی تباہی کا ایک سچا تقاضا تھا جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب انگیز ہنگامے کی شکل میں رونما ہوا۔ جس کے متعلق مسٹر لیکی کا یہ قول ہے:

''اگر دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جا سکتی ہے تو وہ ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کی بغاوت ہے''

لارڈ رابرٹس نے مسٹر اینسن کے نام ایک خط بنام لارڈ کیننگ وائسرائے ہند کا ایک آخری جملہ نقل کیا ہے:

''میرے نزدیک ان کارتوسوں کے استعمال سے سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو ناقابلِ برداشت طریقہ سے ٹھکرا دیا گیا تھا۔ (۵۰۹)

مگر اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ تہذیب و اخلاق کے دعوے داروں نے اس حق بجانب بغاوت کا کیا علاج کیا، اور مذہبی مجنوں کی اصلاح کے لیے ان ہوشیار دانش مندوں کا طرز عمل کیا تھا، جو یورپ سے خدمتِ خلق کے لیے سات سمندر پار کر کے ہندوستان آئے تھے۔

کلیجہ تھام لوگے جب سنو گے   نہ سنوائے خدا شیون کسی کا

ابتداء انتقام

کارتوسوں کے انکار پر جو انسانیت سوز سزا دی گئی تھی، ایک انگریز مورخ نے اس کا فوٹو مندرجہ ذیل الفاظ میں کھینچا ہے:

بندوقوں اور سنگینوں کے پہرہ میں ۸۵ جوانوں کو اُن کے اپنے فوجی لباس میں سپاہیوں کی حیثیت میں فوجی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا اور سزا کو بلند آواز سے سنایا گیا۔ جس کا مقصد سپاہیوں کو بدکار مجرموں کی فہرست میں داخل کرنا تھا۔ فوجی نشانات اُن سے چھین لیے گئے۔ وردیاں اُن کی پشت کی طرف سے پھاڑ دی گئیں۔ پھر لوہار زنجیریں اور اوزار لے کر آگے بڑھے، اور آناً فاناً میں وہ پچاسی جوان اپنے ساتھیوں کے اس عظیم الشان مجمع کے سامنے انتہائی بے عزتی کی تمام روشن اور ظاہر علامات کے ساتھ یعنی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنے ہوئے نظر آئے۔

یہ نہایت ہی دردناک اور ذلت آفریں نظارہ تھا۔ جس سے سپاہی بے حد متاثر ہوئے۔ بالخصوص جب انہوں نے اپنے بدقسمت ساتھیوں کی اس ناگفتہ بہ حالت اور مایوسانہ انداز کو دیکھا۔ حالانکہ بعض اُن میں سے اپنی پلٹن میں نہایت ہر دلعزیز تھے۔ اور متعدد دفعہ انہوں نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر برٹش حکومت کی ترقی اور وفاداری کا ثبوت بھی دیا تھا۔ قیدیوں نے ہاتھ اُٹھا کر بآواز بلند جرنیل سے گڑگڑا کر رحم کی التجا کی کہ ان کو

اس شدید مصیبت اور ہلاکت سے بچایا جائے پھر یہ دیکھ کر کہ اس طریقہ سے کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوسکتا، وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور اس بے عزتی کو خاموشی سے برداشت کرنے پر انہیں شرمندہ کیا اور غیرت دلائی۔ اس وقت ایک بھی سپاہی اس میدان میں ایسا موجود نہ تھا، جس نے اپنے سینہ میں اس واقعہ سے رنج اور نفرت کے جذبات اُٹھتے ہوئے محسوس نہ کیے ہوں لیکن بھری ہوئی میدانی توپوں اور بندوقوں اور سواروں کے چمکتے ہوئے خنجروں کی موجودگی میں حملہ کرنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ چنانچہ قیدیوں کو اُن کی کوٹھریوں میں لے گئے جن پر پہرہ دینے کے لیے اُنہیں کے ساتھیوں کو متعین کیا گیا۔ (۵۱)

پھانسی

یہ سزا انگریز کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ اُس نے بغاوت کی ہو۔ چنانچہ کوپر ڈپٹی کمشنر امرتسر لکھتا ہے:

مسٹر مونٹ گمری کے حکم سے پنجاب میں بھی جہاں عام طور پر لوگ ابھی تک وفادار ہیں، ایک سکھ پلٹن کے صوبیدار، سوار پولیس کے رسالدار اور ایک داروغہ جیل کو فرض کی کوتاہی کے الزام میں پھانسی پر لٹکانا ضروری سمجھا گیا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو بخوبی ذہن نشین ہوجائے کہ پنجاب کے حکام ابتداء ہی میں بلاتوقف تشددانہ کارروائی کرنے کی پالیسی سے لوگوں کے دلوں میں اپنا رعب قائم کرنا چاہتے ہیں۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے اس نیم وحشی ملک میں وقار قائم رکھا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف ایک سخت پالیسی کا مقصد یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ حکومت رعایا سے غیر مشروط اور غیر مبہم وفاداری چاہتی ہے نہ کہ رعایا کی بردباری سے بھروسہ پر، جو ایک حد تک گورنمنٹ کے استقلال کی شکست کے مرادف ہے۔ (۵۲)

کوپر ہمیں بتاتا ہے:

قیدیوں کی دائمی نجات کا راستہ نہایت آسان تھا۔ یعنی باغیوں کو دیکھ کر فی الفور نکلسن کا نعرہ بلند کیا جاتا تھا "پھانسی پر لے چلو"۔ (۵۳)

ایک پادری کی بیوہ نہایت فاتحانہ انداز میں لکھتی ہے:

جب بہت سے باغی گرفتار کرلئے گئے تو انہیں حکم دیا گیا کہ وہ گرجے کے فرش کو صاف کریں۔ مگر باوجودیکہ یہ لوگ اپنے مذہبی معتقدات کی بنا پر اس قسم کا کام خلاف سمجھتے تھے پھر بھی سنگین کی نوک سے انہیں اس حقیر کام کے لیے مجبور کیا گیا۔ ان میں سے بعض نے نہایت پھرتی کے ساتھ اس کام کو سرانجام دیا محض اس خیال سے کہ شاید پھانسی کی سزا سے بچ جائیں لیکن بے سود، کیونکہ وہ سب کے سب پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔ (۵۴)

مجینڈی لکھتا ہے:

''وہ رات ہم نے جامع مسجد پر پہرہ دیتے ہوئے بسر کی اور ہمارا زیادہ تر وقت ان قیدیوں کو گولی سے اڑا دینے یا پھانسی پر لٹکا دینے میں گزرتا تھا جن کو ہم نے صبح کے وقت گرفتار کیا تھا۔ ان میں سے بہت سے بیچارے تو اسی جگہ ختم ہو گئے لیکن آخر وقت تک ان کے چہروں سے شجاعت اور ضبط کے آثار ہویدا تھے جو اس سے کسی بڑے مقصد کے شایانِ شان علامات تھیں۔'' (۵۱۴)

پلٹن نمبر ۲۶ کا قصور اور اس کی سزا پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار ٹائمز نے لکھا ہے:

''بغاوت کے اعلان سے ۴۸ گھنٹے کے اندر پانچ سو آدمیوں کو پھانسی دی گئی۔ سوال ہوتا ہے کہ جرم کیا تھا، درآنحالیکہ خود ذمہ دار حکام کی رپورٹ سے تصدیق ہو چکی ہے کہ باغی بالکل نہتے تھے اور طوفان سے ڈر کر بھاگ نکلے تھے نیز محاصرے کے وقت بھوک مسافت کی تکلیف اور صدمے سے ان کی حالت، نیم مردہ انسانوں کی تھی۔'' (۵۱۵)

بہرحال ہندوستانیوں کو اس کثرت سے پھانسیاں دی گئیں جو بیان سے باہر ہے (الٰہ آباد سے کانپور آتے ہوئے) دو دن کے اندر بیالیس آدمیوں کو سڑک کے کنارے پھانسی دی گئی اور بارہ آدمیوں کو صرف اس جرم میں پھانسی دی گئی کہ جب فوج مارچ کرتی ہوئی ان کے سامنے سے گزری تو ان کے چہرے دوسری طرف کیوں تھے۔ (۵۱۶)

جہاں جہاں فوج نے پڑاؤ ڈالے، وہاں پر قرب وجوار کے تمام دیہات جلے ہوئے تھے۔ یہ کہنا کہ یہ سب کانپور کے مظالم کے حادثہ کا جواب تھے، صحیح نہیں ہے کیونکہ کانپور کا شیطانی واقعہ ان خوفناک حوادث کے بہت بعد پیش آیا۔

آج بھی پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں گورنمنٹ ہند کی وہ تمام یادداشتیں محفوظ ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آبادی میں سے عورتوں، مردوں، بچوں، بوڑھوں تک کو پھانسی کے تختوں پر لٹکایا گیا۔ (۵۱۷)

میں نے ایک گواہ سے کہا۔ میں تمہاری جان بخشی کر دیتا ہوں، بشرطیکہ تم اس کے عوض میں کوئی تین نام ایسے بتاؤ جن کو تمہارے عوض میں پھانسی دی جائے۔ (۵۱۸)

(دہلی میں) خون ریزی کے عادی سپاہیوں نے جوشِ انتقام کو فرو کرنے کے لیے پھانسی دینے والے جلادوں کو رشوت دے کر آمادہ کیا تھا کہ وہ پھانسی کے تختہ پر زیادہ دیر تک لٹکتے رہنے دیں، تاکہ لاش کے تڑپنے کی دردناک کیفیت دیکھ کر جسے وہ ناچ کہتے تھے، اپنی خوں خوار طبائع کے لیے دلچسپی کا سامان بنا سکیں۔ جھجھر کے نواب صاحب (۵۱۹) کو جان دینے میں بہت عرصہ لگا۔ (۵۲۰)

درختوں پر لٹکا کر پھانسی

بنارس اور الٰہ آباد میں کانپور کے واقعہ سے پہلے ایک موقع پر چند نوجوان لڑکوں کو محض اس بنا پر پھانسی دی

گئی کہ انہوں نے شوقیہ طور پر باغیوں کی جھنڈیاں اٹھا کر بازاروں میں منادی کی تھی۔ سزائے موت دینے والی عدالت کے ایک افسر نے پرنم آنکھوں سے کمانڈنگ افسر کے پاس جاکر درخواست کی کہ ان نابالغ مجرموں پر رحم کر کے پھانسی کی سزا کو تبدیل کر دیا جائے لیکن بے سود۔

اس تمام سلسلے میں بے شمار ایسے واقعات ملیں گے جن میں اس قسم کی نمائشی عدالتوں تک سے بھی گریز کیا گیا۔ اور بے گناہ انسانوں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ پھانسیاں دینے کے لیے رضا کار ٹولیاں بنائی گئیں جنہوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے دیہات کا دورہ کیا اس حالت میں کہ ان کے پاس پھانسی دینے کا سامان بھی مکمل نہیں تھا اور نہ ہی کسی کو پھانسی دینے کا طریقہ سے پوری واقفیت تھی، چنانچہ ان میں سے ایک شریف آدمی اپنی شاندار کامیابی پر اس طرح فخریہ اظہار کرتا تھا کہ ہم پھانسی دیتے وقت عام طور پر آم کے درخت اور ہاتھی استعمال کرتے تھے۔ یعنی ملزم کو ہاتھی پر بٹھا کر درخت کے نیچے لے جاتے تھے اور اوپر سے پھندا ڈال کر ہاتھی کو ہنکایا جاتا تھا یہاں تک کہ ملزم اس طرح تڑپتے اور جان کنی کی حالت میں اکثر اوقات انگریزی کے آٹھ (8) کے ہندسہ کی دلچسپ شکل بن کر رہ جاتا تھا۔ (۵۱۱)

لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے بعد قتل و غارت کا بازار گرم کیا گیا۔ چنانچہ ہر ایسے ہندوستانی کو قطع نظر اس سے کہ وہ سپاہی ہے یا اودھ کا دیہاتی، بے دریغ تہ تیغ کیا گیا، یہاں تک کہ نہ کوئی سوال ہی کیا جاتا تھا اور نہ اس قسم کا کوئی تکلف روا رکھا جاتا بلکہ محض سیاہ رنگ ہی اس کے مجرم ہونے کے لیے کافی دلیل سمجھی جاتی تھی، اور ہلاکت کے لیے ایک رسہ اور درخت کی شاخ کا استعمال کیا جاتا تھا۔ (۵۱۲)

سولی

دہلی وغیرہ میں شہر کے بلند مقام پر ایک چوگوشہ سولی نصب کی گئی تھی، جہاں پانچ اور چھ اشخاص کو روزمرہ پھانسی دی جاتی تھی جس کے قریب ہی انگریز افسران سگرٹوں کے کش پر کش اڑاتے ہوئے لاشوں کے تڑپنے کے نظاروں میں محو دکھائی دیتے تھے۔ (۵۱۳)

جلتی ہوئی سلاخوں سے داغ کر مارنا یا جلا دینا

مسٹر نکلسن مسٹر ایڈورڈز کو ایک خط میں لکھتا ہے:

دہلی میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کے خلاف ہمیں ایک ایسا قانون پاس کرنا چاہیے جس کی رو سے ہم ان کو زندہ بھی جلا سکیں یا زندہ ان کی کھال اتار سکیں یا گرم سلاخوں سے اذیت دے کر ان کو فنا کے گھاٹ اتار سکیں۔ ایسے ظالموں کو محض پھانسی کی سزا سے ہلاک کر دینے کا خیال ہی مجھے دیوانہ کیے دیتا ہے۔ میری یہ دلی خواہش ہے کہ کاش میں دنیا کے کسی ایسے گمنام گوشے میں چلا جاؤں، جہاں مجھے یہ حق حاصل ہو کہ میں تسکین انتقام لے کر دل کی بھڑاس نکال سکوں۔ (۵۱۴)

نکلسن کو اپنی آرزو کے پورا ہونے میں کچھ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ مسٹر موبری تھامسن نے اپنے بعض قیدیوں کی دردناک سرگذشت سرہنری کاٹن کو ذیل کے الفاظ میں سنائی۔

شام کے وقت ایک سکھ اردلی میرے خیمہ میں آیا اور سلام کر کے پوچھنے لگا۔ آپ غالباً یہ دیکھنا پسند کریں گے کہ قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا میں فوراً ایک کے قیدیوں کے کیمپ میں گیا۔ جہاں ان بد بخت مسلمانوں کو عالم نزع میں بے حال دیکھا۔ یعنی مشکیں ان کی بندی ہوئی تھیں اور وہ برہنہ زمین پر پڑے ہوئے تھے اور سر سے لے کر پاؤں تک تمام جسم کو گرم تانبے سے داغ دیا تھا۔ اس روح فرسا نظارہ کو دیکھ کر میں نے اپنے پستول سے ان کا خاتمہ کر دینا ہی ان کے حق میں مناسب سمجھا۔ (۵۷۵)

ایک عینی شاہد کا بیان ہے:

بدنصیب قیدی کے جلتے ہوئے گوشت سے مکروہ بدبو نکل کر آس پاس کی فضا کو مسموم بنا رہی تھی۔

انیسویں صدی میں جب کہ تہذیب اور شائستگی پر ناز کیا جاتا تھا۔ ایک ایسا دردناک نظارہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک انسان وحشیانہ طریق سے زندہ آگ میں جلایا جا رہا ہے اور سکھ اور یورپین نہایت اطمینان اور متانت سے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر ارد گرد کھڑے دیکھ رہے ہیں، گویا کہ وہ ایک تفریح کا سامان تھا۔ (۵۷۶)

ٹائمز آف انڈیا اخبار کے فوجی نامہ نگار مسٹر رسل نے بھی اس واقعہ کی تصدیق کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

چند دنوں بعد میں نے اس شخص کی جلی ہوئی ہڈیوں کو اسی میدان میں پڑا ہوا پایا۔ (۵۷۷)

ایڈورڈ تامسن لکھتا ہے:

دماغ پر سزا کا ایسا مہلک اثر پڑتا ہے کہ بعض دفعہ تو انسان نواب معین الدین حسن کے بیانات کو جن میں اس دردناک سزا کا ذکر ہے، پڑھنے یا سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا۔ لیکن گورنمنٹ بنگال کے سرکاری کاغذات میں اب بھی ایسی دستاویزات محفوظ ہیں جن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انگریز نہایت کثرت سے اس ہولناک سزا کا استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ ایک انگریز کی چٹھی ابھی تک محفوظ ہے جس میں اٹھارہویں صدی کے آخری دور کے حالات پر بحث کرتے ہوئے اس دردناک طریق سزا کی ذیل کے الفاظ میں مذمت کی ہے۔

آخر کب تک ہی بنی نوع انسان کو اس دل خراش طریق سے گرم سلاخوں پر سکڑتے اور بھنتے دیکھنے کی اذیت برداشت کرتے رہیں گے۔ (۵۷۸)

سور کی کھال میں سی کر جلانا

ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر مسٹر ڈی لین نے لکھا تھا:

زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سینا یا پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر سور کی چربی ملنا یا زندہ آگ میں جلانا یا ہندوستانیوں کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں، ایسی مکروہ اور منتقمانہ حرکات کی دنیا کی کوئی تہذیب بھی کبھی اجازت نہیں دیتی۔ ہماری گردنیں شرم و ندامت سے جھک جاتی ہیں اور یقیناً ایسی حرکات عیسائیت کے نام پر ایک بدنما دھبہ ہیں جن کا کفارہ ہمیں بھی ایک دن ادا کرنا پڑے گا۔

توپ سے باندھ کر اڑا دینا

لارڈ رابرٹس اپنی والدہ کو ایک چٹھی میں لکھتا ہے:

ہم پشاور سے جہلم تک پاپیادہ سفر کرتے ہوئے پہنچے اور راستہ میں کچھ کام بھی کرتے آئے یعنی باغیوں سے اسلحہ چھیننا اور ان کو پھانسیوں پر لٹکانا۔ چنانچہ توپ سے باندھ کر اڑا دینے کا جو طریقہ ہم نے بکثرت استعمال کیا ہے، اس کا لوگوں پر خاص اثر ہوا۔ یعنی ہماری ہیبت لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گئی۔ اگرچہ یہ طریقہ سزا نہایت دل خراش ہے۔ (۵۱۹)

لڑائی کے اختتام پر بہت سے قیدیوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا، اور یہ معلوم ہونے پر کہ اس قسم کی موت کی وہ کوئی خاص پرواہ نہیں کرتے تو ان میں سے چار آدمیوں کو فوجی عدالت کے حکم سے توپوں سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ چنانچہ ایک روز ایک توپ کے بہت بڑے دھماکے کی آواز سے ہم چونک پڑے۔ جس کے ساتھ ہی ایک ناقابل بیان دہشت ناک چیخ بھی سنائی دی۔ دریافت کرنے پر ہمیں ایک افسر نے بتایا کہ یہ نہایت ہی کرب انگیز نظارہ تھا۔ یعنی ایک توپ میں اتفاق سے بارود زیادہ بھرا ہوا تھا جس کے چلائے جانے سے بدقسمت ملزم کا گوشت ریزہ ریزہ ہو کر فضائے آسمانی میں اڑا اور تماشائیوں پر خون کے چھینٹے اور گوشت کے ٹکڑے گرے اور اس کا سر ایک راہرو پر اس زور سے گرا کہ اس کو بھی چوٹ آ گئی۔ (۵۲۰)

بھوکا رکھ کر یا دم گھونٹ کر مارنا

مسٹر کوپر لکھتا ہے: پہلی اگست کو بقرعید کا دن تھا۔ اس لیے مسلمان سواروں کو وہاں سے علیحدہ کرنے کے لیے ایک مفید عذر تھا۔ چنانچہ ان کو تیوہار منانے کے لیے امرتسر بھیج دیا گیا۔ اور صرف ایک عیسائی افسر وفادار سکھوں کی امداد سے ایک مختلف قسم کی قربانی کے لیے وہاں پر اکیلا رہ گیا جو نہایت اطمینان سے اپنا کام کرتا رہا۔

اب مشکل یہ پیش آئی، کہ لاشوں کو کس طرح دبایا جائے تا کہ ان کا تعفن نہ پھیلے۔ لیکن اتفاق سے قریب ہی ایک ویران کنواں مل گیا۔

جب دس دس کی ٹولی کو یکے بعد دیگرے گولی سے اڑاتے ہوئے ڈیڑھ سو سپاہی مارے جا چکے تو قتل کرنے والوں میں سے ایک شخص غش کھا کر گر پڑا۔ جو ہلاک کرنے والوں میں سب سے بوڑھا سپاہی تھا۔ اس لیے آرام کرنے کے لیے تھوڑا سا وقفہ دیا۔ اس کے بعد پھر قتل کی کاروائی شروع کر دی گئی ایک افسر نے اطلاع دی کہ باقی باغی برج سے باہر آنے سے انکار کرتے ہیں۔ جہاں وہ چند گھنٹے پیشتر عارضی طور پر بند کر دیئے گئے تھے۔ اس برج کے دروازے کھولے گئے تو معاً ایک دردناک نظارہ دیکھنے میں آیا جس سے ہول ولس بلیک ہال کی یاد تازہ ہوگئی۔ یعنی پینتالیس آدمیوں کی مردہ لاشیں لائی گئیں جو خوف، گرمی، سفر کی صعوبت اور دم گھٹنے کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہلاک ہو گئے تھے۔

ان مردہ اور نیم مردہ لاشوں کو گاڑی سے بھنگیوں کے ہاتھوں قریب کے ویران کنویں میں پھنکوا دیا گیا۔ (۵۴۶)

لطف یہ ہے کہ جنرل لارنس اور رابرٹ منٹگمری وغیرہ نے اس فعل کی داد دیتے ہوئے کوپر کو مبارک باد کے خط لکھے۔ ملاحظہ ہو ص/۵۷ انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ۔

نہ صرف سولی پر اکتفا کیا گیا بلکہ دیہات میں ان کو اپنے مکانوں میں بند کر کے آگ میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ (۵۴۳)

قتل عام اور بستیوں کو جلا دینا

۳۱ر جولائی ۱۸۵۷ء کو گورنر جنرل یا اجلاس کونسل کی طرف سے ہندوستان میں مفصل ہدایات جاری کی گئیں کہ غیر معین طریق سے دیہات کو آگ لگانا فی الفور بند کر دیا جائے اور مجسٹریٹوں کو حکم دیا گیا کہ وہ غیر مسلح آدمیوں کو فوج کے بھاگے ہوئے سپاہی سمجھ کر ہرگز کوئی سزا نہ دیں۔

بہت سی ایسی سول عدالتوں سے موت اور عمر قید کے اختیارات واپس لے گئے کیونکہ ان کا استعمال نہایت بے دردی سے کیا جا رہا تھا۔

۲۸ر اگست کو مسٹر جان گرانٹ کو وسط ہند کا گورنر اس لیے مقرر کیا گیا تا کہ الہ آباد اور دوسرے مقامات پر بے تحاشہ پھانسیوں کے سلسلہ کو بند کر دیں۔ باوجود اس امر کے ایک کثیر طبقہ کی طرف سے وائسرائے اور مسٹر گرانٹ کی شدید مخالفت کی گئی یہاں تک کہ تعریض کے طور پر پھانسیوں کو روکنے والا گرانٹ اور رحم دل کیننگ وغیرہ نام دے کر ان کی ہنسی بھی اڑائی گئی۔ پھر بھی اس مخالفت کی کوئی پرواہ نہ کی گئی۔ جب اگست میں انگریزی فوج ہندوستانی دیہات جلانے کی مہم سے واپس آ رہی تھی تو راستہ میں انہوں نے وفادار سپاہیوں کی ایک جماعت کو بلا وجہ گولیوں اور سنگینوں کا نشانہ بنا دیا۔ چنانچہ انتقام کے خوفناک مظاہرے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ٹائمز

آف انڈیا نے اس واقعہ کو جنگ یا وحشی انصاف سے تعبیر کیا۔ لیکن جنرل آؤٹریم کی رائے میں یہ واقعہ معصوم انسانوں کا سنگدلانہ قتل تھا۔ (۵۴۳)

میجر رینالڈ کو جنرل نیل کی طرف سے ہدایت موصول ہوئی جب کہ وہ کان پور کے محصورین کی امداد کے لیے آرہا تھا: "بعض دیہات کو ان کی مجرمانہ حرکات کی بنا پر عام تباہی کے لیے منتخب کر دیا گیا ہے جہاں کی تمام تر مرد آبادی کو قتل کر دینا ہوگا۔ باغی رجمنٹوں کے تمام ایسے سپاہی فی الفور پھانسی پر لٹکا دیئے جائیں جو اپنے چال چلن کے متعلق اطمینان بخش ثبوت بہم نہ پہنچا سکیں۔ قصبہ فتح پور کی تمام آبادی کو محاصرہ میں لے کر تہ تیغ کر دیا جائے۔ باغیوں کے تمام سرغنوں کو فی الفور پھانسی پر لٹکا دیا جائے اگر وہاں کا ڈپٹی کلکٹر قابو میں آجائے تو اس کو وہیں پھانسی دے دی جائے اور اس کا سر کاٹ کر سب سے بڑی عمارت پر لٹکا دیا جائے۔" (۵۴۴)

مسٹر رسل اپنی ایک طویل تحریر میں لکھتا ہے:

لیکن یہ تو انسانیت اور انصاف کے خلاف ہے کہ تمام اضلاع کو ہی تاخت و تاراج کیا جائے، محض اس جرم پر کہ باغیوں نے ان علاقوں میں پڑاؤ کیا تھا۔ (۵۴۵)

کچھ افسروں کی جانب سے احتجاج کیا گیا کہ اگر اسی طرح دیہات کو جلایا جاتا رہے گا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ فوج کو راستہ میں رسد اور چارہ بالکل دستیاب نہ ہو سکے گا۔ (۵۴۶)

شمالی مغربی سرحدی صوبہ اور پنجاب میں اندھا دھند پھانسیاں دی گئیں۔ جن میں مرد، عورت اور بچوں کی کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی۔ نیز بے شمار دیہات جلانے کی وجہ سے آبادی کے اس حصہ میں بھی نفرت اور وحشت پھیل گئی جو گورنمنٹ کے خلاف نہ تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فصلیں جاہ ہوگئیں۔ اس قسم کی وجوہات کی بناء پر یہ افواہ نہایت ترقی پکڑ گئی کہ گورنمنٹ کا منشاء تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کو بے دریغ قتل کر دینے کا ہے (رپورٹ گورنر جنرل با اجلاس کونسل بحوالہ تصویر کا دوسرا رخ ص ۶۷)

انگریزوں نے راستہ میں سینکڑوں میل تک سڑک کے دونوں طرف دیہاتوں کو بے دریغ قتل و غارت و برباد کر کے ملک کو صحرا کی طرح ویران اور سنسان کر دیا۔ دہلی سے باغیوں کے فرار ہو جانے کے بعد انگریز فاتحین نے باشندوں کا قتل عام کیا اور بے ضابطہ انگریزی عدالتوں کے حکم سے ہزاروں شہری پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیئے گئے۔ حالانکہ ان کو بغاوت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا (تصویر کا دوسرا رخ ص ۵۷، ص ۶۷) مختصر یہ کہ بے شمار دیہات کو ایسے وقت میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا جب کہ عورتیں، بوڑھے اور بچے گھروں کے اندر موجود تھے۔ (تصویر کا دوسرا رخ ص ۷۸)۔

دہلی میں باشندوں کے قتل عام کی منادی کی گئی حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کے متعلق ہمیں علم تھا کہ وہ ہماری فتح کے خواہش مند تھے۔ ہمارے اکثر جوان تو محض خون گرانے کی خواہش پورا کرنے کے لیے اپنی ہی فوج کے ہندوستانی اردلیوں اور پوربی گھسیاروں وغیرہ کو گولی سے اڑا دینے کی تمنا کا علانیہ طور پر اظہار کرتے تھے۔ (۵۴۷)

کان پور کے حادثہ سے بہت عرصہ پیشتر ایک طرف تو فوجی قانون کے نفاذ کا اعلان کیا گیا اور دوسری طرف مجلس وضع قانون نے مئی اور جون میں نہایت خوفناک قوانین پاس کئے جن پر پوری سرگرمی سے عمل کیا گیا اور فوجیوں اور سول افسروں نے خونی عدالتیں قائم کر کے ہندوستانیوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیا بلکہ بعض حالات میں تو بغیر کسی نام نہاد عدالت کے حکم کے پھانسیاں دی گئیں۔ جن میں مرد عورت کی کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی۔ بایں ہمہ خون ریزی کی آگ دن بدن اور بھڑکتی گئی۔ چنانچہ آج بھی پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں گورنمنٹ ہند کی وہ تمام یادداشتیں محفوظ ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آدمی میں سے مردوں، عورتوں بچوں اور بوڑھوں تک کو بھی پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا گیا۔ نہ صرف سولی پر ہی اکتفا کیا گیا بلکہ دیہات میں ان کو اپنے مکانوں میں بند کر کے آگ میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا، اور شاذ و نادر ہی کسی ایک کو گولی سے مارنے کی تکلیف گوارا کی گئی ہو۔ انگریزوں نے فخر یہ لکھا ہے کہ ہم نے حتی الامکان کسی ذی روح کی آبادی کو زندہ نہیں رہنے دیا۔ (۵۲۸)

لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے بعد قتل و غارت کا بازار گرم کیا گیا۔ چنانچہ ہر ایسے ہندوستانی کو قطع نظر اس سے کہ وہ سپاہی ہے یا اودھ کا دیہاتی، بے دریغ تہ تیغ کیا گیا۔ یہاں تک کہ نہ تو کوئی سوال ہی کیا جاتا تھا اور نہ ہی اس قسم کا تکلف روا رکھا جاتا تھا بلکہ محض سیاہ رنگت ہی اس کے مجرم ہونے کے لیے کافی دلیل سمجھی جاتی تھی اور ہلاکت کے لیے ایک رسہ اور درخت کی شاخ کا استعمال کیا جاتا تھا۔ یا اگر یہ اشیاء مہیا نہ ہوں تو بندوق کی ایک گولی بے گناہ انسان کے دماغ کو چیرتی ہوئی نکل جاتی تھی اور وہ وہیں ڈھیر ہو جاتا تھا۔ (۵۲۹)

دہلی میں ہماری فوج کے شہر میں داخل ہونے پر تمام ایسے لوگ جو چلتے پھرتے نظر آئے وہ سنگینوں سے ہی ختم کر دیئے گئے۔ ایسے بدقسمت انسانوں کی تعداد بہت کافی تھی۔ آپ اس ایک واقعہ سے کافی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک گھر میں چالیس یا پچاس ایسے اشخاص ہمارے خوف سے پناہ گزیں ہو گئے جو اگرچہ باغی نہ تھے بلکہ غریب شہری تھے اور وہ ہمارے عفو و کرم پر تکیہ لگائے ہوئے تھے جن کے متعلق میں خوشی سے ظاہر کرتا ہوں کہ وہ سخت مایوس ہوئے کیونکہ ہم نے اسی جگہ ان کو اپنی سنگینوں سے ڈھیر کر دیا۔ (۵۳۰)

بے گناہ شہریوں کو درانتیوں سے وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر رحم کی درخواست کر رہے تھے، گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ بلکہ عمر رسیدہ لوگوں کو حالانکہ ان کے جسم رعشہ سے کانپ رہے تھے، کاٹ کر رکھ دیا گیا۔ (۵۳۱)

ٹائمنر کے نامہ نگار نے لکھا تھا۔

میں نے دہلی کے بازاروں میں سیر کرنا مطلقاً چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ کل ایسا دردناک واقعہ دیکھنے میں آیا جس سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یعنی جب ایک افسر جیسی سپاہی لے کر شہر کی گشت کو جانے لگا تو میں بھی ان کے ہمراہ ہو لیا اور راستہ میں ہم نے چودہ عورتوں کی لاشوں کو شالوں میں لپٹے ہوئے بازار میں پڑا پایا جن کے سر دھڑوں سے ان کے خاوندوں نے خود جدا کر دیئے تھے۔ چنانچہ عینی شاہد سے دریافت کرنے پر معلوم

ہوا کہ ان کے خاوندوں کو شبہ تھا کہ اگر انگریز سپاہیوں کے قابو میں آ گئیں تو وہ عصمت دری کریں گے۔ لہٰذا تحفظِ ناموس کا یہی طریقہ مناسب خیال کیا گیا جس کے بعد خاوندوں نے بھی خود کشی کر لی۔ چنانچہ ان کی لاشوں کو خود ہم نے دیکھا۔ (۵۴۴)

ایڈورڈ ٹامسن لکھتا ہے:

> فوجی شرابیوں کی دکانوں کو لوٹتے اور شراب پی کر بازاروں میں گشت کرتے۔ بے دریغ قتل و غارت کرتے۔ کبھی کبھی کوئی منچلا ان میں سے کسی کو ختم کر دیتا۔ لطف یہ ہے کہ اس قاتل کو مذہبی دیوانہ کہا جاتا ہے یعنی عقل کا تقاضا یہ تھا کہ نہایت خاموشی سے ان شرابیوں کے سامنے ذبح کے لیے گردن کیوں نہیں جھکا دی۔ (۵۴۴)

باغیوں کے جرم کے مقابلہ میں ہزار گنا زیادہ سنگین پاداش دہلی کے باشندوں کو برداشت کرنی پڑی۔ ہزار ہا مرد و عورت اور بچوں کو بے گناہ خانماں برباد ہو کر جنگلوں اور ویرانوں کی خاک چھاننی پڑی اور جتنا مال و اسباب وہ پیچھے چھوڑ گئے ان سے ہمیشہ کے لیے ان کو ہاتھ دھونے پڑے کیونکہ سپاہیوں نے گھروں کے کونے کونے کھود کر تمام قیمتی اشیاء کو قبضہ میں کر لیا اور باقی سامان توڑ پھوڑ کر خراب کر دیا۔ جس کو وہ اٹھا کر نہیں لے جا سکتے تھے۔ (۵۴۴)

اسپنسر وال پول لکھتا ہے:

وحشی نادر شاہ نے بھی وہ لوٹ نہیں مچائی تھی جو فتح دہلی کے بعد انگریزی فوج نے جائز رکھی۔ شارع عام پر پھانسی گھر بنائے گئے۔ اور پانچ یا چھ چھ آدمیوں کو روزانہ سزائے موت دی جاتی تھی۔ وال پول کا بیان ہے کہ تین ہزار آدمیوں کو پھانسی دی گئی۔ جن میں سے انتیس شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مؤلف قیصر التواریخ لکھتا ہے کہ ستائیس ہزار مسلمان قتل کیے گئے اور سات دن تک برابر قتل عام برابر جاری رہا۔ (۵۴۵)

صفر ۱۲۷۴ھ کی پہلی یا دوسری تاریخ کو بادشاہ کے سمدھی الٰہی بخش کی جاسوسی سے مسٹر ہڈسن نے تین شہزادوں مرزا مغل، مرزا حضرت سلطان اور مرزا ابوبکر وغیرہ کو ہمایوں کے مقبرہ سے گرفتار کیا۔ اور تینوں کا سر قلم کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے ہنس کر فرمایا۔ تیموری خاندان کے بہادر فرزند اسی طرح سرخرو ہو کر باپ کے سامنے آیا کرتے ہیں۔ (پنڈت سندر لال)

آخری چند سطور کے علاوہ آپ نے جو کچھ واقعات پڑھے، وہ انقلاب "۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ" یعنی مسٹر ایڈورڈ ٹامسن کی کتاب "دی آدر سائڈ آف دی میڈل" سے نقل کیے گئے ہیں جن کے متعلق مصنف (ایڈورڈ ٹامسن) کا دعویٰ ہے کہ جتنے واقعات یہاں قلم بند کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک بھی کسی ہندوستانی قلم یا زبان سے نکلا ہوا نہیں ہے۔ اور میں نے شاذ و نادر ہی کوئی ایک فقرہ اینگلو انڈین اخبارات یا اس سے کم درجہ پر اپنے ملک کے اخبارات سے نقل کیا ہوگا نیز یہ کہ ان بہت سے واقعات کو چھوڑ دیا جن سے اس سے زیادہ سنگدلی

اور درندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ (۵۴۶)

نیز اس موقعہ پر آپ کو یہ فراموش نہ ہونا چاہیے کہ لارڈ رابرٹس کے نزدیک اس قسم کی تمام درندگی کا مقصد یہ تھا کہ:
ان بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کریں گے۔ (۵۴۷)

اس دہشت انگیزی، بربریت اور درندگی کا نتیجہ انگریز کے حق میں نہایت مبارک تھا۔ مسلمان اس قدر خائف ہوئے کہ کانگریسی وزارتوں کے قیام سے پیشتر تک قومی اداروں کے دستور اساسی میں بسم اللہ کے بعد پہلا جملہ یہ ہوتا تھا کہ ''اس ادارہ کا تعلق سیاست سے قطعاً نہ ہوگا''

هذا وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين

ایک بجے شب، ۶؍ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ

محمد میاں عفی عنہ۔ ۲۵؍ اپریل ۱۹۳۹ء

ختم شد اقتباس شاندار ماضی طبع قدیم حصہ چہارم

نیز ختم شد شاندار ماضی جلد چہارم طبع جدید

والله هو الباقي وهو الكافي

محمد میاں

۲۳؍ رجب ۱۳۷۸ھ ۲ فروری ۱۹۵۹ء

یوم دوشنبہ، ۱۱ بجے شب

ضمیمہ نمبر ا

قصبہ تھانہ بھون کے باقی ماندہ حالات

اور مجاہد جلیل قاضی عنایت علی صاحب کے کارنامے

اس کتاب میں آپ نے بہت سے عجیب وغریب واقعات ملاحظہ فرمائے ہیں۔ آخر میں خود اس کتاب کی ترتیب وتالیف کے متعلق ایک عجیب اتفاق ملاحظہ فرمایئے۔

ضمیمہ کے چند صفحات میں جناب رفعت صاحب تھانوی کا مضمون پیش کیا جارہا ہے یہ ۱۳؍۱۴ اکتوبر پھر ۱۵؍۱۶؍ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو روزنامہ الجمعیۃ میں شائع ہوا تھا مضمون نہایت مفید ہے۔ تھانہ بھون کے متعلق معلومات کا ذخیرہ ہے اور سب سے زیادہ خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جناب قاضی عنایت علی صاحب کے حالات جو آج تک سینہ بسینہ تھے اور کسی کتاب یا رسالہ میں شائع نہیں ہوئے تھے، بہت ہی بہتر ترتیب سے جمع کئے گئے ہیں۔

احقر نے روزنامہ الجمعیۃ کے ان اوراق کو نہایت حفاظت سے ایسی جگہ رکھ لیا تھا کہ بظاہر نظر انداز ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا مگر اس ظلوم وجہول انسان کی بے چارگی ملاحظہ ہو کہ یہ سارا اہتمام وانتظام بے کار گیا۔ سامنے رکھے ہوئے صفحات نظر انداز ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ترتیب پھر کتابت اور تصحیح وغیرہ کے تمام مراحل طے ہو چکنے کے بعد وہ وقت آ گیا کہ کاپیاں پریس میں جانے والی ہیں، ایک اور یادداشت کی تلاش میں یہ صفحات رفعتہً سامنے آ گئے تو اب جس طرح ان کو نظر انداز کرنا مشکل تھا، ایسے ہی ترتیب میں لانا بھی دشوار تھا۔ لہٰذا یہی مناسب معلوم ہوا کہ غیر ضروری اجزاء حذف کر کے مضمون کو کتاب کا ضمیمہ بنادیا جائے۔

۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون

اس وقت قصبہ کی آبادی ۳۵۰۰۰ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ اس آبادی میں سے تقریباً سات ہزار اشخاص انگریزی افواج میں ملازم تھے۔ یہاں ۳۲ تو صرف رسالدار تھے۔ دفعدار، جمعدار، حوالدار، نائک اور سپاہیوں کی علیحدہ علیحدہ تعداد کا تعین دشوار ہے۔ محکمہ فوج سے ایک لاکھ چوراسی ہزار روپے تنخواہوں اور پنشنوں کی صورت میں اہالیانِ قصبہ وصول کرتے تھے۔ قرب وجوار میں مشہور تھا کہ تھانہ بھون والوں کی کمائی خون کی کمائی ہے۔

مئی ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کے آغاز پر جب فوجیں بگڑیں تو ساکنانِ تھانہ بھی اپنی اپنی ڈیوٹیاں چھوڑ کر وطن آ گئے۔ یہاں انگریزی حکومت کی طرف سے پولیس اسٹیشن موجود تھا۔ پولیس ایسے فوجیوں کی متلاشی رہتی تھی جو جنگ آزادی میں دلچسپی لے رہے تھے۔ یہ فدایانِ وطن شروع میں روپوش رہے۔ اور عام باشندگانِ قصبہ کو جنگ آزادی میں حصہ لینے کے لیے آمادہ کرتے رہے۔ اسی دوران میں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ قاضی عنایت علی خاں کے بھائی قاضی رعایت علی خاں معروف قاضی عبدالرحیم بغرضِ خریداریِ فیل سہارنپور تشریف لے گئے۔

ہاتھی اس زمانہ میں نشان امارت وریاست تھا اور صرف اسی ضرورت سے اس کی خریداری مقصود تھی۔ لیکن قاضی صاحب کے مخالفین نے ایس پی کلکٹر سہارن پور کو یہ غلط اطلاع پہنچائی کہ قاضی صاحب معہ فوج آپ پر چڑھائی کے لیے آئے ہیں اور حربی ضرورتوں کے پیش نظر ہاتھی خرید رہے ہیں۔ سہارن پور اس وقت فوجی نقطۂ نگاہ سے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ شمالی ہند کی جنگِ آزادی کو دبانے کے لیے پنجاب سے فوجیں لائی جارہی تھیں۔ ان کے لیے سہارن پور ہی سب سے اہم ناکہ تھا۔ ایس پی روزمرہ کے نئے حملوں کی خبروں سے بے حد پریشان اور حواس باختہ تھا۔ اس عالم میں اس کے رہے سہے ہوش گم ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس نے یہ خبر ملتے ہیں قاضی عبدالرحیم کی تلاشی کرائی، اور گرفتار کرا کر بغیر تفتیش حال ان کو مع ان کے چند ساتھیوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ یہ خبر شب بھر میں تھانہ بھون پہنچی تو قاضی عنایت علی خاں کے یہاں صف ماتم بچھ گئی۔ شیدائیانِ حریت کے لیے یہ واقعہ "سمند ناز پہ اک تازیانہ اور ہوا" کے مصداق ہو گیا۔ قاضی عنایت علی خان جواب تک مذبذب تھے۔ ہمنوا بن گئے۔

جہادِ آزادی کی تنظیم

تھانہ بھون اس وقت علم وفضل کا گہوارا تھا بڑے بڑے یکتائے روزگار یہاں موجود تھے۔ ان علماء میں مرشدنا وہادینا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قبلہ مہاجر مکی اس وقت خاص طور پر سے مرجع خلائق تھے۔ قرب وجوار سے علماء کا اجتماع اس صورت حال پر غور کرنے کے لیے تھانہ بھون میں ہوا اور بڑی بحث وتمحیص کے بعد کثرت رائے سے علم جہاد بلند کرنے کی تجویز پاس ہوئی۔

پولیس اسٹیشن تھانہ بھون یہاں کے حالات کی مسلسل اطلاعات کلکٹر ضلع کو دے رہا تھا۔ ایس پی کلکٹر سہارن پور کو اپنی غلطی کا علم ہوا تو وہ اپنی بدحواسی اور جلد بازی پر پچھتایا اور وقت کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے اس نے قاضی عنایت علی خاں کو اپنے نمائندہ کے ذریعہ پیش کش کی کہ ہم پورا پرگنہ (جس میں اس وقت چوراسی گاؤں تھے) تمہاری حکومت میں دے کر تمہیں مستقل نواب تسلیم کیے لیتے ہیں۔ تم تحریک آزادی سے علیحدہ رہو۔ قاضی عنایت علی خاں نے ایس پی کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور جہادِ آزادی کا سپاہی بننا منظور کیا۔

مجاہدین کا پہلا حملہ

اعلانِ جہاد کے بعد انگریزوں کا انتظامیہ عملہ متعینہ پولیس اسٹیشن وغیرہ تھانہ بھون سے رخصت ہو گیا، ان میں جو لوگ جہادِ آزادی سے دلچسپی رکھتے تھے انہوں نے اپنی خدمات باشندگانِ قصبہ کے لیے وقف کر دیں۔ ایس پی کلکٹر سہارن پور، کلکٹری کے علاوہ اس وقت فوجی کمانڈر کے فرائض بھی سرانجام دے رہا تھا۔ تھانہ بھون کی صورتِ حال سے متاثر ہو کر اس نے قرب وجوار کے انگریزی اداروں کی حفاظت کے لیے فوجی امداد بھیجی اور ان کو وقتاً فوقتاً آلاتِ حرب اور میگزین بھیجتا رہتا تھا۔ مجاہدین تھانہ بھون نے سب سے پہلا حملہ ایسی ہی ایک پوزنی پر کیا جو سہارن پور سے شاملی میگزین لے جارہی تھی، باغ شیر علی پر جس کو اس زمانہ میں خان والا باغ اور آج

کل ماتا والا باغ کہا جاتا ہے، میگزین کی حفاظتی پارٹی پر حملہ کیا گیا۔ پوری پارٹی اسی جگہ کام آگئی۔ صرف ایک سوار سمت مشرقی جنگل کی طرف بھاگا مگر تھوڑے سے فاصلہ پر گھوڑے سے گر کر مر گیا، اور میگزین مجاہدین کے ہاتھ آیا۔

مجاہدین کا دوسرا حملہ

پہلے حملہ کے بعد اطلاع ملی کہ ایس پنکھی کلکٹر تحصیل کے حفاظتی انتظام کا معائنہ کرنے کے لیے شاملی آیا ہوا ہے۔ مجاہدین، تحریک آزادی کے اس دشمن اور قاضی عبدالرحیم اور ان کے بے گناہ ساتھیوں کے قاتل کی فکر میں تھے۔ مجاہدین کا ایک لشکر شاملی پر چڑھ دوڑا۔ اس لشکر کی قیادت حافظ ضامن علی صاحبؒ، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، اور حضرت مولانا محمد منیر صاحب نانوتویؒ فرما رہے تھے۔ ایک دستہ قاضی عنایت علی صاحب کی کمان میں بھی تھا۔ شاملی پہنچ کر انگریزی اور مسلح پولیس سے سخت مقابلہ ہوا مجاہدین کے جوش جہاد کا مقابلہ فوج کو دشوار ہوا تو وہ پسپا ہو کر قلعہ بند ہو گئی۔ تحصیل کی عمارت جو ایک مستحکم گڑھی کی صورت میں تھی، اب جنگی قلعہ کا کام دے رہی تھی۔ صدر دروازہ جو بہت مضبوط تھا، بند کر لیا گیا اور فوج و پولیس نے چہار دیواری کی آڑ لے کر گولیاں چلائیں مجاہدین کے پاس بندوقیں بہت کم تھیں۔ پھر وہ کھلے میدان میں تھے۔ اس لیے دو یوم کی جنگ میں مجاہدین کا اتلاف جان زیادہ ہوا۔ تیسرے دن حافظ ضامن علی صاحبؒ نے تحصیل کا دروازہ توڑ ڈالا اور انگریزی فوج کی گولیوں سے شہید ہو گئے۔ تحصیل کو لوٹ لیا مدافعین میں سے بعض قتل ہوئے۔ بعض نے معافی مانگ لی نہ لڑنے والے اشخاص میں سے مجاہدین نے کسی کو انگلی بھی نہ لگائی۔ تحصیل فتح ہونے کے بعد پتہ چلا کہ ایس پنکھی کی آمد کی اطلاع غلط تھی۔

انگریزی فوج کا تھانہ بھون پر پہلا حملہ

تحصیل شاملی کے لٹ جانے کی اطلاع جب سہارن پور پہنچی تو ایس پنکھی نے ایک فوج جس کے ساتھ مشہور ہے کہ تین توپیں بھی تھیں، ایک انگریز کمانڈر کے تحت تھانہ بھون پر تاخت کے لیے بھیجی، کمانڈر کے علاوہ اس فوج میں کئی انگریز افسر کام کر رہے تھے۔ توپ خانہ کا افسر مسلمان تھا اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ قبلہ کا مرید تھا۔ اس فوج نے تھانہ بھون کا محاصرہ کر کے ریتی دروازہ کے باہر پڑاؤ ڈالے پڑا پنا توپ خانہ قائم کیا اور شب بھر قصبہ پر گولہ باری ہوتی رہی۔ افسر توپ خانہ کو حضرت حاجی صاحبؒ کے قصبہ میں جلوہ افروزی کا علم تھا۔ اس نے دانستہ تمام توپوں کے منہ اوپر کو کرا دیئے۔ تمام شب کی گولہ باری میں ایک گولہ بھی قصبہ کی آبادی میں نہ گرا۔ سب باہر جنگل میں گرتے رہے۔ کمانڈر نے صبح کو حالات معلوم کئے اور قصبہ کو صحیح و سالم حالت میں پا کر آگ بگولہ ہو گیا اور اس نے فوراً تفتیش کر کے افسر توپ خانہ کو حراست میں لے لیا جس کو کورٹ مارشل کے بعد گولی سے اڑا دیا گیا۔ اس کی جگہ ایک انگریز افسر کو انچارج بنایا جس نے آبادی کا نشانہ لے کر گولہ باری شروع کرائی۔ قصبہ والوں کے پاس کوئی توپ نہ تھی۔ دو معمولی رہکلے تھے۔ ان سے شہر کے دروازہ کی حفاظت کا کام لیا جا رہا تھا۔ ابھی دو تین گولے ہی آبادی میں گرے تھے کہ مجاہدین میں سے ایک توپچی نے اسی معمولی رہکلے سے ایک

گولہ پھینکا، جو انگریزی توپ کے دہانہ پر لگا اور وہ بیکار ہوگئی۔ دوسرا گولہ دوسری توپ کے پہیے کو تاکارہ بنا گیا۔ مجاہدین کے پاس آلاتِ حرب کی بے حد کمی تھی۔ ہزاروں مجاہدین میں سے چند سو کے پاس معمولی بندوقیں تھیں۔ تلوار، تیر، کمان، نیزہ اور دوسرے معمولی ہتھیاروں اور آتش بازی سے مسلح تھے۔ اس خیال سے کہ انگریزی فوج کو کمک نہ پہنچ جائے، دوسرے روز مجاہدین نے شہر سے نکل کر محاصرین پر حملہ کردیا۔ سات گھنٹہ کی دست بدست جنگ کے بعد انگریزی فوج شکست کھا گئی مگر وہ بڑی باقاعدگی سے پسپا ہوئی۔ اور جاتے ہوئے اپنی توپیں اور سامانِ جنگ بھی ساتھ لیتی گئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس جنگ میں طرفین کے تقریباً پانچ سو آدمی کام آئے۔

انگریزی فوج کا دوسرا حملہ

اس شکست کے بعد سکھ آرمی کی مدد سے انگریزوں نے پہلے حملہ سے زیادہ بڑی فوج اور پہلے سے زیادہ توپوں کے ساتھ تھانہ بھون پر دوسرا حملہ کیا۔ قصبہ پورا خالی ہوگیا تھا۔ کچھ معذور اور کچھ فدائی یہاں رہ گئے تھے۔ فوج نے قصبہ کا محاصرہ کر کے پہلے توپوں سے گولہ باری کی۔ صدر دروازہ کو تباہ کردیا۔ جب آبادی کی طرف سے کوئی مدافعت نہ ہوئی تو حملہ آور فوج قصبہ میں داخل ہوگئی۔ لوٹ مار کا آغاز ہوا۔ قصبہ چھوڑنے والوں میں سے بہت کم لوگ اپنا اثاالبیت اس رواداری میں ساتھ لے جاسکے تھے۔ اکثر تو اپنا زیور اور نقدی بھی چھوڑ بھاگے تھے۔ حملہ آوروں نے خوب ہاتھ رنگے۔ نہ صرف مکانوں کو لوٹا بلکہ بعض پرشوکت مکانات میں آگ بھی لگادی جو متنفس نظر آیا اس کو یا تو گرفتار کر لیا یا گولیوں سے اڑا دیا۔ مولوی عبدالرحیم صاحب جو قاضی عنایت علی خاں صاحب کے پرسنل اسسٹنٹ تھے، ایسے ہی شہداء میں ہیں۔ ان کی سوتیلی ماں ان کے ساتھ ہی ان کے مکان میں شہید کردی گئی۔ قصبہ سے گرفتار ہونے والوں کی تعداد ایک سو تینتیس بتائی جاتی ہے۔ جن کو مہاجنوں والی باغیچی میں پھانسی دے دی گئی تھی۔

شکست کے بعد مجاہدین کے کارنامے

علماء کرام کے ساتھ انگریزوں کے خوف سے پھر کوئی نئی جمعیت نہ بن سکی۔ حکومت نے ان کی گرفتاری کے لیے ایڑی چوٹی کے زور لگائے۔ عوام کو بڑے بڑے لالچ دیئے اور حکام بعض اوقات ان تک پہنچ بھی گئے مگر ہر مرتبہ محیرالعقول طریقوں سے بچتے رہے اور گرفتار نہ ہو سکے۔

مرشدنا حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ دو سال تک ہندوستان کے مختلف مقامات میں فروکش رہ کر مکہ معظمہ ہجرت فرما گئے۔ صرف حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی گرفتار ہو سکے اور چھ ماہ تک جیل میں قید و بند کی سختیاں برداشت کرتے رہے۔ اس کے بعد عام معافی کے تحت رہا ہوئے۔ بقیہ حضرات سے بھی عام معافی کے بعد ارکانِ حکومت نے کوئی تعرض نہ کیا۔ قاضی عنایت علی خاں شکست خوردہ انگریزوں کی تلاش میں تحصیل جانسٹھ سے گزر کر ضلع بجنور پہنچ گئے۔ دوران سفر میں ان کو بہت سے محبانِ وطن ملے اور ان کی جمعیت میں شامل ہوتے گئے۔ بعض اہل دول نے ان کی مالی امداد بھی کی۔ انگریزی فوج ان کی تلاش میں تھی۔ چنانچہ ضلع بجنور میں کئی مرتبہ انگریزی فوج سے مڈبھیڑ ہوئی اور ان میں کئی لڑائیوں میں قاضی صاحب کو کامیابی ہوئی ان کی طاقت

روز بروز بڑھنے سے انگریز خائف تھے اور زیادہ سے زیادہ فوج ان کی گرفتاری کے لیے مامور کر رہے تھے آخر نجیب آباد کے قریب (قصبہ کے نام میں اختلاف ہے۔ ممکن ہے وہ کوئی دوسرا قصبہ ہو) انگریزوں کی ایک بڑی فوج سے جس کے پاس کافی توپیں تھیں مقابلہ ہوا۔ قاضی صاحب کی جمعیت تہائی کے قریب تھی اور توپیں تو سب سے ہی کم تھیں۔ دس گھنٹے کے سخت مقابلہ میں انگریزی فوج کے قدم اکھڑنے لگے۔ قاضی صاحب فنون حرب میں یکتائے روزگار تھے اور میدان جنگ میں دو دستہ تلوار چلاتے تھے۔ ان کے داہنے بازو پر ان کا بچپن کا ساتھی اور فدائی دوست چوہدری منجھل سنگھ راجپوت اور بائیں بازو پر ان کا جاں نثار غلام کلو لڑتا تھا۔ چوہدری منجھل سنگھ کو بیک وقت تو گولیاں لگیں اور وہ ''قاضی جی خدا حافظ'' کہتے ہوئے گھوڑے سے نیچے آ رہے۔ قاضی صاحب فوراً اپنے گھوڑے سے کودے اور چوہدری منجھل سنگھ کو گود میں اٹھا کر اپنے خیمہ میں لے آئے۔ ذمہ داران فوج نے قاضی صاحب کو توجہ دلائی، کہ یہ وقت میدان سے علیحدہ رہنے کا نہیں ہے مگر ان کو اپنے اس فدائی کا اس قدر غم ہوا کہ وہ تادیر خود پر قابو نہ پاسکے اور متوقع فتح شکست سے بدل گئی۔ قاضی صاحب معہ اپنے چند جاں نثار رفقاء سے لڑتے بھڑتے نکل بھاگے۔ ساتھی تتر بتر ہو گئے۔ سامان حرب پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔

قاضی عنایت علی خاں

قاضی صاحب تھانہ بھون کے با اختیار قاضی تھے۔ ان کا خاندان عہد شاہجہانی سے اسی عہدہ پر فائز تھا اور ان کو بائیس گاؤں جاگیر میں ملے ہوئے تھے۔ متبع شریعت اور بڑے صادق القول تھے۔ فنون حرب اور شہسواری میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ وجیہ و شکیل تھے۔ اس وقت عمر کا اندازہ تیس بتیس سال بتایا جاتا ہے۔ ضلع بجنور سے نکل کر وہ میرٹھ ہوتے ہوئے بندیل کھنڈ کے علاقہ میں پہنچے اور وہاں سے محبان وطن کو ساتھ لے کر انگریزی فوجوں پر حملے کرتے رہے۔ یہ زمانہ ان کا ؎

دن کہیں رات کہیں، صبح کہیں شام کہیں

کا مصداق گزرا ہے۔ ۱۸۵۹ء تک انگریز فوجوں نے بہت سے محبان وطن کو گرفتار کر لیا یا شہید کر دیا۔ جب ان کو اپنے ہمنوا اور ہم خیال لوگ نہ مل سکے تو بالآخر انہوں نے جنگ سے دست کشی اختیار کر لی۔ جو چند جاں نثار رہ گئے تھے، ان کو رخصت کر کے خود اپنے اعزہ کے پاس بھوپال پہنچ گئے۔ وہاں بالکل خاموش زندگی گزار رہے تھے کہ ایک دن شاہراہ پر ہز ہائی نس قدسیہ بیگم فرمانروائے بھوپال کی سواری آتی نظر پڑی۔ یہ بھی اپنے گھوڑے پر سوار تھے۔ مردم شناس بیگم نے ایک ہی نظر میں جوہر قابل کو پہچان لیا۔ مصاحب بھیج کر بلوایا۔ استفسار پر انہوں نے خود کو مسافر اور متلاشی روزگار ظاہر کیا۔ سواری ان کی شہسواری کو ظاہر کر رہی تھی۔ چند سوالات کے بعد بیگم صاحبہ نے معقول مشاہرے پر سواروں اور گھوڑوں کی تربیت و اصلاح کے لیے ان کو ملازم رکھ لیا اور ہفتہ میں دو دن ان کی ڈیوٹی مقرر کی۔ پرانے ملازمین کو ان کی اس قدر افزائی پر رشک و حسد ہوا، اور وہ گاہ بگاہ بیگم صاحبہ سے ان کے خلاف شکایت کرنے لگے۔ بیگم صاحبہ نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ ریاست کی کسی سالانہ تقریب پر ملازمین ریاست میں سے ایک شہسوار کچھ خاص کرتب دکھاتا تھا اور اس کا آخری کرتب ایک باؤلی کے

اوپر سے گھوڑا گزارنا تھا جس پر صرف ایک بالشت چوڑا تختہ بچھا ہوا تھا۔ قاضی صاحب کے علم میں اس کا یہ کرتب آ چکا تھا۔ جب وہ یہ آخری کرتب دکھانے کے لیے باؤلی کے ایک طرف سے روانہ ہوا تو قاضی صاحب نے مخالف سمت سے اس تختہ پر اپنا گھوڑا بڑھایا۔ ریاستی شہسوار چلایا۔ یہ کیا کرتے ہو، دونوں باؤلی میں ڈوب مریں گے"۔ قاضی صاحب نے جواب دیا۔ "ڈوب مرنے کی ضرورت نہیں۔ استادی کا دعویٰ ہے تو گھوڑا موڑ کر واپس ہو جاؤ۔ ورنہ شاگردی کا اقرار کر کے ہنر پیش کرو۔"

اس شہسوار نے عاجزی کا اظہار کر کے شاگردی کا اقرار کیا۔ قاضی صاحب نے اپنے گھوڑے کو چمکار کر اس کی گردن پر تھپکی دی۔ باگ کے اشارے کے ساتھ ہی گھوڑا اپنی پچھلی ٹانگوں پر الف ہو کر مڑا اور پورا گھوم کر واپس ہو گیا۔ تماشائی عش عش کر اٹھے۔ ریاستی شہسوار پار ہو کر گھوڑے سے کودا، رکاب بوس ہوا، اور ہنر پیش کر کے شاگردی کا باضابطہ اعلان کیا۔ ان کی یہ شہرت اور مقبولیت ہی ان کے احوال کے تجسس کا ذریعہ بنی، اور کچھ عرصہ کے بعد ان کو احساس ہوا کہ لوگ میرے متعلق مشکوک ہیں، تو وہ بھوپال چھوڑ کر جودھ پور چلے گئے۔ وہاں بھی ان کی شہسواری اور سپہ گری نے ان کو پوشیدہ نہ رہنے دیا۔ اور بعض عمائدین ان پر شک کرنے لگے۔ تو وہ ریاست الور میں قصبہ تجارہ کے قریب ایک موضع میں اپنے ایک شمشیر ساز دوست کے یہاں تشریف لے آئے اور دم واپسیں تک خاموشی سے وہیں مقیم رہے۔ غالباً ۱۹۱۰ء میں تراسی یا پچاسی سال کی عمر میں اس شیر بیشہ جرأت نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اسی گاؤں میں مدفون ہوئے۔ انتقال کے بعد ان کے شمشیر ساز دوست کو پتہ چلا کہ مرحوم تھانہ بھون کے مشہور مجاہد قاضی عنایت علی خاں تھے۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

قاضی صاحب کی اولاد میں سے دو لڑکے عرصہ تک میرٹھ میں مقیم رہے۔ اب نہ ان کے پہچاننے والوں میں سے کوئی صاحب رہے اور نہ ان کا کسی کو پتہ ہے۔

غدر کے بعد تھانہ بھون کی حالت

انگریزی فوج کے آخری حملہ سے قصبہ بالکل ویران ہو گیا تھا۔ باشندگان قصبہ بعض قرب و جوار میں اور بعض دور دراز مقامات پر پناہ گزین ہوئے۔ اس وقت کے گئے کچھ خاندان اب بھی حیدرآباد دکن، بھوپال، جودھپور، الور اور دوسری ریاستوں میں موجود ہیں جن کی اولاد تھانہ بھون سے بالکل بیگانہ ہے جن انگریزی ملازمین نے تحریک آزادی میں حصہ نہ لیا تھا، ان کے گھر بھی حملہ آور فوج کی دست برد سے نہ بچ سکے۔ مجاہدین میں سے جن ملازمین کو معافی دی گئی ان کی ترقیاں محدود کر دی گئیں۔ فوجی ملازمین کو بالا دست جنگی خدمات سے ہٹا کر فوج کے دوسرے شعبوں میں لگا دیا گیا۔ ان میں سے اور مجاہدین قصبہ میں سے اکثر پر بغاوت کے الزام میں مقدمات چلے اور بیشتر کو سزائے موت دی گئی۔ قاضی صاحب کے ملازمین اور متوسلین میں سے تو کوئی بھی نہ چھوڑا گیا۔ دیوان روپ سنگھ جو کایستھ خاندان کے فرد تھے اور قاضی صاحب کے مختار عام تھے۔ پھانسی دے دیئے گئے اور ان کی جائداد ضبط کر لی گئی اور مجاہدین قصبہ کی بارہ ہزار بیگھہ زمین ضبط کر کے محال باغیان بنا دیا گیا۔

قاضی صاحب کے بائیس گاؤں جوان کی مستقل اور نسلاً بعد نسل جاگیر میں تھے، ضبط کر لئے گئے۔ بڑے بڑے عالی شان مکانات اور کھیت کوڑیوں کے مول نیلام کر دیئے گئے۔ قصبہ دو سال تک بالکل غیر آباد رہا۔ فوج کی تاخت سے جو مکانات بچ رہے تھے وہ مناسب مرمت نہ ہونے کی وجہ سے منہدم ہو گئے۔ بعض مکانات کے کڑی تختے قرب و جوار کے بدمعاش اتار کر لے گئے۔ ملکہ وکٹوریہ کے اعلانِ معافی عام کے بعد جب دوبارہ قصبہ آباد ہوا تو اس وقت تک ۱۳۲ شہداء کی نعشیں درختوں پر ٹنگی ہوئی تھیں جن کو مہاجنوں والی باغیچی میں انگریزوں نے پھانسیاں دی تھیں۔ یہ دیکھ کر لوگ غرقِ حیرت ہو گئے۔ کہ ان نعشوں کو نہ گدھوں نے کھایا تھا، نہ اور کسی جانور نے چھوا تھا۔ گوشت و پوست سوکھ کر رہ گئے تھے۔ ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق   ثبت است برجریدۂ عالم دوامِ ما

ایسا کوئی ریکارڈ دستیاب نہ ہو سکا جس سے تھانہ بھون کے شہدائے جنگِ آزادی کی صحیح تعداد معلوم ہو سکتی۔ بزرگوں کے بیانات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً ایک ہزار افراد نے اس جنگ میں شہادت پائی۔ وہ لوگ اس تعداد کے علاوہ ہیں جو نقل مکانی کی بدولت حادثات کا شکار ہوئے۔

تھانہ بھون سے انگریزوں کا عناد

انگریزوں پر باشندگانِ تھانہ بھون کی حریت پسندی کی ہیبت مدت تک طاری رہی۔ تھانہ بھون برٹش حکومت کی بلیک لسٹ میں مدتوں تک رہا۔ عرصہ تک یہاں کے باشندوں کو سرکاری ملازمت نہ دی گئی۔ پولیس میں غدر کے برسوں بعد تک یہاں کوئی نیا آدمی نہ لیا گیا اور فوج میں تو پہلی جنگِ عظیم تک یہاں کا کوئی باشندہ نہ لیا جاتا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں تھانہ بھون سے ایک پلٹن گزر رہی تھی۔ اس کے انگریز کمانڈر کے دریافت کرنے پر لوگوں نے قصبہ کا نام بتایا تو وہ حیرت زدہ سا ہو کر بولا۔ "اوہ تھانہ بھون ابھی تک آباد ہے"؟

۱۹۱۷ء میں مسٹر سی مور کلکٹر مظفر نگر بسلسلہ دورہ تھانہ بھون آئے، تو انہوں نے قاضی احسان الحق صاحب سے دریافت کیا کہ "آپ کے اور قاضی عنایت علی خاں کے کیا تعلقات تھے"؟ موصوف نے واسطہ داری بتائی تو سی مور بولے۔ "وہ اب تک زندہ ہیں اور سنا ہے، کبھی کبھی یہاں آتے ہیں"۔ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ سنا ہے کہ سی مور نے تھانہ بھون دیکھنے کے بعد بایں الفاظ اپنی رائے کا اظہار کیا تھا "تھانہ بھون سے اب بھی بوئے بغاوت آتی ہے"۔

حکومت کی اس معاندانہ ذہنیت کا اثر قصبہ کی معاشیات پر بے حد برا پڑا۔ دوبارہ آبادی پندرہ ہزار نفوس پر مشتمل تھی جو اقتصادی حالات کی ابتری سے روز بروز کم ہوتی گئی اور گھٹتے گھٹتے ایک وقت تو صرف ساڑھے چھ ہزار رہ گئی تھی۔ اس حریت پسندی کی بدولت برٹش دورِ حکومت میں اہالیانِ تھانہ بھون کے حقوق جس قدر پامال کئے گئے اس کی مثال دوسری جگہ ملنی مشکل ہے۔ اتنا بڑا قصبہ ہونے کے باوجود حکومت نے یہاں مڈل سکول تک قائم نہ کیا۔ نہ کوئی شفا خانہ کھولا اور نہ کوئی دوسرا پبلک ادارہ۔ اس سے کم تر آبادی کے قصبات میں حالانکہ ایسے ادارے موجود ہیں۔

ضمیمہ نمبر ۲

آخری تبرک

حضرت حافظ صاحب شہیدؒ کا ذکر خیر

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ جاں شدو آواز نیامد

جنگ احد میں ناموسِ ملت پر قربان ہونے والا وہ فداءِ اعظم جس کو محسنِ رسالت (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) نے سید الشہداء کا خطاب دیا تھا۔ یعنی سیدنا حمزہؓ ان کو اگرچہ شہداءِ احد کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ مگر سردار دو جہاں محبوبِ رب العالمین ﷺ کا جذبہ یہی تھا کہ جسدِ مبارک یونہی "میدانِ احد" میں پڑا رہتا۔ یہ جذبہ اظہار بنا۔ آپ نے فرمایا۔ پھوپھی صفیہ (حضرت حمزہؓ کی حقیقی بہن) کا خیال آتا ہے کہ ان کو رنج ہوگا اور یہ بھی کہ لوگ اسی کو سنت قرار دے لیں گے۔ اگر یہ باتیں نہ ہوتیں تو حمزہؓ کی اس مقلوم نعش کو جس کے کان کاٹ لئے گئے ہیں پیٹ چاک کر کے جگر نکال لیا گیا ہے اور اس کو دانتوں سے چبایا گیا ہے، میں یونہی رہنے دیتا، تاکہ میدانِ حشر میں احکم الحاکمین کے سامنے جسدِ حمزہؓ کے ٹکڑے وحشی درندوں اور پرندوں کے پیٹ سے برآمد ہوتے اور داستانِ مظلومیت سناتے۔ (۵۷۹)

یعنی مظلومیت کی انتہا اور فدائیت و فنائیت کی معراج یہ ہے کہ اس دنیائے ہست و بود میں "نشانِ ہست" بھی نہ رہے۔

تھانہ بھون کے محاذ پر میدانِ شاملی میں قربان ہونے والے سیدنا حضرت حافظ ضامن صاحب شہیدؒ اسی کی ایک مثال ہیں۔

سادر کر میلی سن وغیرہ غیر مسلم مورخین کو تو ان کا نام بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب جیسے مصنفین کو نام معلوم ہوگا۔ مگر داستانِ شہادت تو کیا لکھتے، اشارہ کنایہ بھی کہیں نہیں کیا۔ ضلع سہارنپور و مظفر نگر سے تعلق رکھنے والوں کا حلقہ ذمہ داری سے بھی واقف ہے اور آپ کی شہادت کا قصہ بھی اس کو از بر ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس آخری سانحہ کے علاوہ باقی "سوانح حیات" سے ناواقف ہیں، ماجرہ کیا ہے؟ کیا یہ اس شہید وفا کے جذبہ محویت کا کرشمہ تو نہیں ہے؟

ترا خیال ہے، ترا جمال ہے، تو ہے
مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ ہوں کیا میں

اس شہید عشق کی سوانح حیات کے دو قصے بزرگوں سے سنے ہیں امیر الروایات اور ارواح ثلاثہ میں بھی انہیں کو قلم بند کر دیا گیا ہے۔ ان دونوں سے بھی اگر کچھ معلوم ہوتا ہے تو یہی ذوق فنا جو درجۂ جذب تک بڑھا ہوا ہے۔ ایک واقعہ یہ ہے۔

آپ اپنے شیخ طریقت حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ کے ہمراہ ان کی جوتیاں (۵۲۹) بغل میں لے کر اور توبرہ گردن میں ڈال کر جھنجھانے جاتے۔ آپ کے صاحبزادے کی سسرال وہیں تھی۔ لوگوں نے کہا۔ اس حالت میں جانا مناسب نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ سمدھیانے کے لوگ حقیر سمجھ کر رشتہ توڑ دیں۔ حافظ صاحب نے فرمایا:

رشتے کی پرواہ نہیں لیکن میں جس طرح جھنجھانے جاتا ہوں، اسے اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔ اپنی سعادت ہرگز نہ چھوڑوں گا۔

عشق اول، عشق آخر، عشق کل — عشق شاخ و عشق نخل و عشق گل

یہ بارگاہ شیخ میں اپنی شخصیت کو مٹا دینے کی ایک مثال ہے جس کی اصطلاحی تعبیر "فنا فی الشیخ" ہوتی ہے۔

اب دوسرا قصہ ملاحظہ فرمایئے، وہ تکمیل فنا کی ایک نادر مثال ہے یعنی جہاں تک انانیت کا تعلق ہے، اس کا گرد بھی آئینہ قلب پر باقی نہ رہے، اور جادہ پیماء طریقت اپنے آپ کو ہیچ در ہیچ سے بھی کمتر سمجھنے لگے۔ دوسرا قصہ یہ ہے:

آپ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے آستانہ پر چارپائی بچھائے بیٹھے رہتے۔ حقہ آپ کے سامنے رہتا جب کوئی شخص آپ کے پاس آتا تو فرماتے۔ اگر مسئلہ پوچھنا ہے تو مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھو۔ مرید ہونا ہے تو وہ بیٹھے ہیں حاجی صاحب، ان کے پاس جاؤ۔ حقہ پینا ہے تو یاروں کے پاس بیٹھو۔

آج کی انانیت پرست تہذیب "نمود شخصیت" کو ذاتی ترقی کی بنیاد قرار دیتی ہے جس کا نتیجہ ہوتا ہے خود پرستی، اغراض پرستی، جاہ پرستی، پھر رشک و حسد، بخل و طمع پھر باہمی رقابت، سیاسی کش مکش، جنگ و جدال، فتنہ و فساد۔

لیکن اسلام کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ نمود ختم کرو۔ للّٰہیت پیدا کرو۔ انانیت کا نام و نشان نہ رہے۔ جو کچھ رہے للّٰہیت رہے، اپنی چاہ، اپنی پسند، اپنی خواہش سب کچھ فنا۔ صرف ایک چیز باقی یعنی رضاء مولیٰ۔ پھر رضاء مولیٰ کی بقاء بھی اس شان سے ہو کہ نمود اس کی بھی نہ ہو ؎

از دروں شو آشنا و از بروں بیگانہ وش
ایں چنیں زیبا روش کمتر بود اندر جہاں

حضرت حافظ صاحب انہیں کمتر اور نایاب بزرگوں میں سے تھے جن کا باطن سوزاں و بریاں اور ظاہر شاداں و خنداں ؎

بلبل نیم کہ نعرہ زنم و دردِ سر کنم — قمری نیم کہ طوق بگردن در آوردم
پروانہ نیستم کہ بسوزم بجرم شمع — شمعم کہ جاں گدازم و دم بر نیاورم

شاندار ماضی کی سابق جلدوں میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ جہاد جو نظرِ شریعت میں محمود اور مطلوب ہے، وہی جہاد ہے جو نتیجہ ہو فنائیت کا۔

مطلب یہ ہے کہ کائنات عالم کے خلاق و پروردگار پر جس کا یقین واذعان اس درجہ پختہ ہو گیا ہو، اور ذوق خدا پرستی یہاں تک بڑھ گیا ہو کہ نماز اس کے لیے دل کا سکون اور آنکھوں کی ٹھنڈک بن جائے اور رضائے مولی کو پورا کرنے کی راہ میں جو مصیبت آئے اس کو نفسی خوشی برداشت کرنا۔ (جس کو قرآن حکیم نے "صبر" سے تعبیر کیا ہے) فطری جوہر اور ایک لازوال قوت بن جائے۔ تو قرآن حکیم ان کو زندہ جاوید قرار دیتے ہوئے ہدایت کرتا ہے کہ ان کو مردہ کہنا بھی بے ادبی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ o وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ط بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ o (سورۂ بقرہ)

اے ایمان والو! مدد حاصل کرو صبر و صلوٰۃ سے بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور مت کہو ان کو جو راہ خدا میں قتل کر دیئے جائیں "مردہ"۔ بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تمہیں ان کی زندگی کا احساس نہیں ہوتا۔

واللہ اعلم بالصواب

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

خاتمہ کتاب

درس اصلاح ○ برائی کی نقل مت کرو ○ بھلائی کا سبق دو

قانونِ جنگ میں انسانیت نوازی اور اعتدال پسندی کی بہترین مثال

سیدنا وسید الشہداء حمزہؓ کا واقعہ جو ضمیمہ نمبر ۲ کے آغاز میں پیش کیا گیا ہے، اس وقت جب کہ یہ کتاب ختم ہو رہی ہے، دل چاہتا ہے کہ اس روایت کا باقی حصہ بھی پیش کر دیا جائے کیونکہ وہ مردہ قوموں کے لیے نہیں بلکہ ترقی پذیر زندہ قوموں کے لیے انسانیت نوازی، شرافت اور اعتدال پسندی کا زریں درس ہے اور اگر ۱۸۵۷ء کی اس ہیبت انگیز تحریک میں مسلمانوں نے اسلامی جہاد تصور کر کے حصہ لیا تھا تو اس روایت سے قرآنی اصولِ جہاد کے پیشِ نظر شکست و ناکامی کا سبب بھی واضح ہو جاتا ہے۔

محمد بن جعفر بن الزبیرؓ کی روایت یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت حمزہؓ کے اس مظلوم نعش کو دیکھ کر جس طرح اپنے اس جذبہ کا اظہار فرمایا کہ (اگر یہ موانع در پیش نہ ہوتے کہ حضرت صفیہؓ کے رنج اور صدمہ میں اضافہ ہوگا اور یہ کہ مسلمان اسی کو سنت قرار دے لیں گے) تو میں اس نعش کو یونہی چھوڑ دیتا۔ درندے پرندے اس کا گوشت نوچتے اور میدانِ قیامت میں جسدِ حمزہؓ کی بوٹیاں درندوں کے پیٹ اور پرندوں کے پوٹوں سے برآمد ہوتیں۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

"کسی بھی موقع پر اللہ تعالیٰ نے قریش پر غلبہ عطا فرمایا تو میں قریش کے تیس مقتولین کے اسی طرح ناک کان کاٹوں گا" (مثلہ کروں گا)۔

آنحضرتؐ کی زبانِ مبارک سے صحابہ کرامؓ نے یہ اندوہ گیں اور غضب آلود کلمات سنے تو آپس میں عہد کر لیا کہ جب بھی ہمیں بھی کامیابی میسر آئے گی تو ہم ایسا عبرت انگیز مثلہ کریں گے کہ تاریخ عرب میں اس کی نظیر نہ ہوگی۔

اس دردناک اور توہین آمیز نظارہ کی بنا پر حاملینِ ملت کی زبانوں سے اس طرح جذبات کا اظہار ہو رہا تھا لیکن وحی الٰہی جس نے محمد رسول اللہؐ کو رحمۃ للعالمین اور آپؐ کی امت کو امتِ وسط اور نمونہ کی امت قرار دیا تھا، اس کے برخلاف نازل ہونے والی تھی۔ چنانچہ رموز شناسِ قرآن حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ اس واقعہ کے بعد سورۂ نحل کی یہ آخری آیتیں نازل ہوئیں۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ○ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ○ اِنَّ اللّٰهَ

مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَالَّذِیْنَ هُمْ مُحْسِنُوْنَ ○ (سورۂ نحل آخری آیات)

یعنی بے گناہ عورتوں اور بچوں کے قتل جیسی انسانیت سوز حرکتوں کا تو سوال ہی نہیں وہ تو مسلمان کے لیے کسی طرح بھی جائز نہیں نہ ابتداء نہ انتقاماً۔ مثلہ اور مردوں کی توہین و تذلیل جیسی حرکت کا اگر بدلہ دو تو بدلہ اسی قدر، جتنی تم کو تکلیف پہنچے (اگر زیادتی ہوئی تو خود آپ ظالم بن جائیں گے) اگر تم صبر کرو تو یہ بہت ہی اچھا ہے صابرین (۵۵) کے لیے (پھر خاص طور پر آنحضرت کو ارشاد ہے) صبر کرو اور آپ کا صبر کرنا نہیں ہے مگر اللہ کی مدد سے (اللہ تعالیٰ نے ہی آپ کو صبر کی توفیق بخشی ہے) اور ان لوگوں کے حال پر (کہ ہائے یہ کیسے ظالم ہیں اور مستقل خود اپنے ہاتھوں کس طرح برباد کر رہے ہیں) آپ غم نہ کھائیں اور نہ ان کی مخالفانہ تدبیروں سے تنگ دل ہوں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ انہیں کا ساتھی ہے جو متقی ہیں اور نیک عمل میں سرگرم رہتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ان ارشادات کے نزول کے بعد آنحضرتؐ نے قریش کی اس حرکت کو معاف فرمادیا اور صحابہ کرامؓ کو مثلہ کرنے سے منع فرمادیا۔ ابن سعد کی روایت میں ہے کہ مثلہ کرنے کی جو قسم کھائی تھی اس کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔

تسلیم ورضا اور تدارک

ایک طرف وہ جذبہ تھا۔ اب تسلیم ورضا کی شان ملاحظہ فرمایئے کس طرح سرِ تسلیم خم کیا جاتا ہے اور اس وقت جذبہ میں جو الفاظ صادر ہو گئے تھے یہ بھی غور فرمایئے کہ ان کا تدارک کس طرح کیا جاتا ہے۔

حضرت سمرہ بن جندبؓ روایت فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد جہاں بھی آنحضرتؐ کو کچھ خطاب فرمانے کا موقع ملا۔ آپ اپنے خطاب اور تقریر میں دو باتوں کا ضرور التزام فرماتے تھے۔

ہمیں صدقہ کا حکم فرماتے تھے

مثلہ کی ممانعت فرماتے تھے۔ (۵۵) کہ ہرگز ہرگز کسی مردہ یا زندہ کے ناک کان نہ کاٹے جائیں)۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی اور اپنے رسولؐ کی منشاء پر عمل کرنے اور راضی برضا رہنے کی توفیق بخشے (آمین)

محمد میاں

(رحمہ اللہ ورضی عنہ)

حواشی

۱۔ یہ ایک پامال عنوان ہے۔ ہر ایک مصنف نے تفصیل سے اسباب و وجوہات بیان کئے ہیں۔ ہم ان کا اعادہ کرنا نہیں ہے بلکہ کچھ اعتراض ہیں، ان کے جواب دینے کے لئے یہاں یہ تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔

۲۔ حقیقت اور واقعہ بھی ہے کہ یہی عالمگیر کی وفات سے چند سال بعد مرکزیت ختم ہو گئی۔ مگر سلطان عالمگیر کے حامی اس کا الزام عالمگیر کی بجائے اس کے نااہل جانشینوں پر لگاتے ہیں کہ وہ اپنے باپ دادا کی روایت کے خلاف کاہل، متلون مزاج، ناعاقبت اندیش ہوتے رہے۔ اگر ان میں صلاحیت ہوتی تو اکبر اور ہمایوں کی طرح وہ اس کمزوری کو دور کر سکتے تھے اور کون کہہ سکتا ہے کہ جب خود عالمگیر نے باپ سے بغاوت کر کے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی تو مغل شاہنشاہیت کمزور نہیں ہوئی تھی۔ مگر عالمگیر کے عزم استقلال نے کمزوری کے جراثیم ختم کر کے مغل شاہنشاہیت کی رگوں میں ہمت و جرأت کا ایسا انجکشن کیا کہ تنزل کے بجائے حدود مملکت وہ چند وسیع ہو گئیں اور ہندوستان جو ایک ہزار سال سے بہت حصوں میں بٹا ہوا تھا، ایک مرکز کے ماتحت متحد ہو گیا۔

۳۔ کمپنی کی حکومت ص ۳۵۶۔

۴۔ کمپنی کی حکومت ص ۳۵۷

۵۔ مصائب غدر ص ۹ مطبوعہ نول کشور

۶۔ مصائب غدر ص ۱۰

۷۔ اسباب بغاوت ہند ص ۲۵۔۲۶۔

۸۔ ایضاً ص ۲۸۔

۹۔ کے (KAY) نے بنگال کے ایک مقدمہ کا حوالہ دیا ہے جس میں چار روپیہ کی ڈگری کے عوض ایک جاگیر کے نیلام کا حکم دیا گیا تھا۔ (حاشیہ ص ۸۷ بحوالہ ۱۸۵۷ء از مولانا مہر)

۱۰۔ اسباب بغاوت ہند ص ۲۷

۱۱۔ بادشاہ کا تکیہ کلام تھا۔ ارے میاں کے بجائے اماں کہا کرتے تھے۔

۱۲۔ افسانۂ غم۔

۱۳۔ اسباب ہند ص ۳۶

۱۴۔ اسلام کی فیاضی اور غریب نوازی ملاحظہ فرمایئے کہ اس نے عشر اور نصف عشر کی تعلیم دی ہے یعنی بارش کی زمینوں پر پیداوار کا دسواں حصہ، اور جو زمینیں کنویں اور تالاب وغیرہ سے سیراب کی جائیں جن کی آبپاشی پر رقم خرچ کرنی پڑے، ان کی پیداوار پر بیسواں حصہ یعنی اگر سو ۱۰۰ من پیداوار ہے تو پہلی صورت میں دس من اور دوسری صورت میں صرف پانچ من غلہ واجب ہوگا۔ البتہ جو اراضی خراجی ہیں ان کا محصول آپس کے مشورہ سے طے ہوگا۔ جس میں کاشتکاروں اور مزارعین کی رائے کو پورا دخل ہوگا۔ ہندوستان کی زمین خراجی مانی گئی ہے۔ اس لئے شیر شاہ کا یہ فعل جائز قرار دیا جائے گا کہ عشر کی بجائے ثلث مقرر کیا۔ محمد میاں۔

۱۵۔ دنیاوی حکومتوں کے نزاکت مآب حکام ان مشکلات کو اپنے بجائے کاشتکاروں اور زمینداروں پر ڈال دیتے ہیں۔ مگر اسلامی تعلیم یہ ہے کہ اس قسم کی مشکلات برداشت کرنا حکومت کے کارپردازوں کا فرض ہے۔ ابتداءً اسلامی تعلیم یہ بھی ہے کہ اگر یہ فرض دیانت داری اور خوش اسلوبی سے انجام دیا جاتا رہا تو دیانت دار کارپرداز کو اللہ کے یہاں ''مجاہد'' کا درجہ ملتا ہے۔ محمد میاں

۱۶۔ اسباب بغاوت ہند ص ۲۵۔۳۶

۱۷۔ اسباب بغاوت ہند ص ۳۶ - ۳۷۔

۱۸۔ اسباب بغاوت ہند بحوالہ روشن مستقبل ص ۲۶۲

۱۹۔ ہمارے محترم شمس العلماء ذکاء اللہ خاں تحریر فرماتے ہیں۔ بادشاہ کا دم تو پہلی ہی جون کو نکلنے لگا تھا۔ اُس نے اپنے بیٹوں اور پوتوں کو بلا کر کہا۔ "میرا کہنا یاد رکھو، انگریز ایک دن آ کر تم کو پھانسی دیں گے اور میرا حال یہ ہوگا کفن پہن کر زندگی کے ایام کسی باغ میں گزاروں گا۔ (تاریخ عروج عہد انگلشیہ ص ۶۹۷)

۲۰۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ مظلوم فوجیوں نے بادشاہ کی طرف رجوع کیا۔ بلکہ انگریزی حکومت دہلی کے ذمہ دار رکن "تھیوفلس مٹکاف، جوائنٹ مجسٹریٹ دہلی کا بیان ہے کہ "جب خوفناک بلوے ظہور میں آ جاتے تھے، جیسا کہ وہ واقع ہوتے رہتے تھے تو اس وقت عوام بادشاہ کی طرف رجوع ہوتے تھے تاکہ انگریزی حکام سے انہیں بچا دلا جائے۔ ایک دفعہ بلوے کے موقع پر اسسٹنٹ ریذیڈنٹ نے لکھا تھا کہ مجھے یقین ہے کہ یہ بلوہ کبھی وقوع پذیر نہ ہوتا، اگر لوگوں کو توقع نہ ہوتی کہ بادشاہ انہیں بچا لے گا جیسا کہ انہوں نے بالآخر بچا لیا۔ (غدر کی صبح شام ص ۲۵)۔

۲۱۔ کمپنی کی حکومت ص ۲۱۷۔

۲۲۔ اسی طرح بھاکا اور سنسکرت میں بھی شعر کہتا تھا اور ان زبانوں کی مناسبت سے اپنے تخلص میں یہ تبدیلی کی تھی کہ اختر کے اکھتر لکھتا تھا۔ خود بادشاہ کا بیان ہے تخلص خود اختر میدارم۔ در تصانیف اردو و فارسی احتیاج تبدیل نبود لیکن مجبورم در تصنیف ہذا کہ مملو از زبان ہندی و بھاکا و سنسکرت است ناچاری بجائے خاء معجمہ کاف عربی را معین نمودم تا در لہجہ و زبان ہندوی و بھاکا و سنسکرت بے ربط نشود پس ہر جا کہ لفظ اکھتر با کاف عربی در اواخر اشعار یعنی مصرع دوم یافتہ شود تخلص راقم ست۔ ("ناجو" بحوالہ تاریخ اردو جلد ۵ ص ۱۱۱)

۲۳۔ کمپنی کی حکومت ص ۲۱۸

۲۴۔ لفٹنٹ کرنل ویلر جو ایک رجمنٹ کا کمانیر تھا، اس نے ۱۸۵۷ء میں بڑے فخر سے کہا تھا کہ بیس برس سے کچھ زیادہ دنوں سے میری یہ عادت رہی ہے کہ سب قسم کے آدمیوں کو بغیر کسی تمیز کے وعظ سناتا ہوں۔ مسیح کا سپاہی بن کر خدا کے احکام اور سرکار کمپنی کا سپاہی بن کر اس کے احکام سناتا ہوں (تاریخ عروج عہد انگلشیہ ص ۲۰۱)

۲۵۔ اسباب بغاوت ہند ص ۱۷ تا ص ۲۳

۲۶۔ تاریخ عروج عہد انگلشیہ ص ۱۹۷

۲۷۔ اسباب بغاوت ہند ص ۲۲ و ص ۲۳۔

۲۸۔ اسباب بغاوت ہند ص ۳۲

۲۹۔ مزید معلومات کے لیے باسو کی "داستان ستارا" نیز میجر ایونز بیل کی "ہندوستان میں سلطنت" ملاحظہ ہو۔

۳۰۔ ۱: میر جعفر اور میر قاسم میں گدی کا تبادلہ ۲: کوڑہ و جہاں آباد کا معاہدہ ۳: روہیلہ طاقت کی شکست و تخریب۔

۳۱۔ بحوالہ مکتوبات شیخ الاسلام و حیات شیخ الاسلام ص ۲۷

۳۲۔ المتوفی رجب ۱۲۶۳ھ مطابق جون ۱۸۴۷ء۔

۳۳۔ المتوفی ذیقعدہ ۱۲۸۳ھ مطابق مارچ ۱۸۶۷ء۔

۳۴۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۱۸۴۔

۳۵۔ ایضاً ص ۱۸۵۔

۳۶۔ یہ جہاد حریت ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی ہوا۔ کیونکہ ۱۸۴۷ء میں حضرت شاہ اسحاق صاحب وفات پا چکے تھے۔

۳۷۔ امیر الروایات۔

۳۸۔ امیر شہید اور مولانا شہید کی شہادت سے تقریباً گیارہ سال بعد ۱۲۶۰ھ ۱۸۴۴ء میں مولانا محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب نے

اپنے خاص خاص متوسلین سمیت ہندوستان سے ہجرت کر کے حرم محترم کو اپنا نشیمن بنالیا۔ (شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک حاشیہ ص ۱۷۷)۔

۳۹۔ مولانا سید نصیر الدین صاحب کا ودھیالی تعلق حضرت سید ناصر الدین صاحب قدہ میری سے اور ننہالی رشتہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب سے ہے (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) آپ نے دہلی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ پھر بسلسلۂ تدریس کلکتہ تشریف لے گئے۔ حضرت سید صاحب جب قدس سرہٗ حج کے لیے تشریف لے گئے، آپ کا قیام کلکتہ ہی میں تھا۔

۴۰۔ سرگزشت مجاہدین ص ۱۳۶۔

۴۱۔ سرگزشت مجاہدین ص ۱۳۵۔

۴۲۔ چھیا پٹن، مدراس کا پرانا نام ہے۔

۴۳۔ سرگزشت مجاہدین ص ۱۳۶۔

۴۴۔ والد، جد نواب صدیق حسن صاحب والی بھوپال۔

۴۵۔ سرگزشت مجاہدین ص ۱۳۸۔

۴۶۔ والدہ ماجدہ سے اجازت حاصل کرنے کا قصہ بہت ہی ولولہ انگیز اور بہت ہی دلچسپ ہے۔ آپ بھی مطالعہ فرمائیے اور یاد رکھیے (ان فی ذلک لعبرۃ لاولی الابصار)۔ دہلی کی پردہ نشین خواتین، ہمارے زمانہ میں تو جس وقت جہاں چاہتی ہیں سیر و تفریح یا ادائے نماز اور شرکت مجالس وعظ کے لیے چلی جاتی ہیں۔ صرف برقع کی ضرورت ہوتی ہے جس کا نقاب بھی اکثر نیم باز ہوتا ہے۔ مگر اس زمانہ میں یہ آزادی نہیں تھی۔ تمدن و ثقافت اور وضع قطع تو درکنار، شرم و حیا کے نازک احساسات یہ بھی گوارا نہ کرتے تھے کہ کوئی اجنبی شخص آنچل بھی دیکھ سکے۔ حضرت مولانا نصیر الدین صاحب کی والدہ ماجدہ انہیں غیور باکباز خواتین میں سے تھیں۔ مگر اس کے باوجود ان کی ایک تمنا یہ تھی کہ رمضان شریف کے مہینہ میں جامع جہاں نما (جامع مسجد دہلی) میں نماز ادا کریں۔ ۱۲۵۰ھ (جنوری ۱۸۳۵ء) کا رمضان شریف آیا۔ مولانا نصیر الدین صاحب کے قدم راہ جہاد میں خار مغیلاں کے بوس و کنار کے لیے مضطرب ہونے شروع ہوئے اور جذبہ فدائیت اپنی حسرتیں پوری کرنے کے لیے مچلنے لگے۔ اس وقت آپ کو خیال آیا، کہ اپنی تمنا پوری کرنے سے پہلے والدہ محترمہ کی دیرینہ تمنا بھی پوری کرادیں۔ چنانچہ ایک شب والدہ صاحبہ کو جامع مسجد میں لے گئے کہ اپنی آرزو پوری کرلیں۔ والدہ محترمہ جامع مسجد میں پہنچیں۔ خدا کا شکر ادا کیا پھر نماز میں مصروف ہوگئیں۔ اطمینان سے نماز پڑھی۔ اس کے بعد اپنے گوشۂ جگر کو جس نے یہ پرانی آرزو پوری کرائی تھی، بہت بہت دعائیں دیں۔ حضرت مولانا نصیر الدین صاحب نے والدہ محترمہ کو بے حد مسرور پایا تو سمجھے کہ حصول اجازت کا یہی موقع سب سے بہتر ہے۔ والدہ صاحبہ سے عرض کیا۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون (تم ہرگز "بر" نہیں حاصل نہیں کرسکتے (اور کلمہ توحید ادا کر کے ایثار للٰہیت کا جو عہد کیا ہے اس کو اس وقت تک پورا نہیں کرسکتے) جب تک تم ان چیزوں میں سے خدا کی راہ میں خرچ نہ کرو جو تمہیں محبوب ہیں) مولانا نصیر الدین صاحب نے یہ آیت پڑھ کر اپنی والدہ صاحبہ سے عرض کیا۔ "آپ کو مجھ سے محبت ہے میں راہ خدا میں جہاد کا آرزومند ہوں۔ آپ اس کار خیر کے لیے مجھے اجازت دیں اور جدائی پر صبر و سکون اور تسلیم و رضا سے کام لیں"۔ اس فرشتہ خصلت خاتون کے جذبات بھی بیٹے سے کم نہیں تھے۔ بیٹے کے درخواست کرنے کی دیر تھی، جیسے ہی یہ درخواست سامنے آئی۔ حرف اجازت والدہ محترمہ کی زبان پر تھا اور دل صبر و سکون کی دعاؤں میں مصروف (رحمہما اللہ)۔

تصور کیجیے، اکلوتے فرزند کی محبت کا، کیا حالت ہوگی، جب خیال آتا ہوگا کہ شاید اس کے بعد زندگی میں دوبارہ ملنا نصیب نہ ہوگا (جیسا کہ ہوا) مگر حضرت شاہ اسحاق صاحب کی صاحبزادی کو ایسے تمام وسوسوں سے بالاتر ہونا چاہیے تھا۔

الحمد للہ یہ سعادت ایک نہایت معمولی درجہ میں احقر کو بھی نصیب ہوئی۔ تحریک آزادی کے زمانہ (از ۱۹۲۹ء تا ۱۹۴۵ء) میں والدہ صاحبہ حیات تھیں جو اس ناکارہ کو تحریک میں شرکت کی عام اجازت دیے ہوئے تھیں۔ اگرچہ زمین و آسمان کا فرق یہ

تھا کہ مولانا نصیر الدین صاحب ایسی تحریک کے لیے اجازت مانگ رہے تھے جس میں جانبازی اور سرفروشی سب سے مقدم تھی اور احقر نے ایسی تحریک کی اجازت چاہی تھی جس کی بنیاد عدم تشدد پر تھی۔ مگر "بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس ست" رب ارحمھما کما ربیانی صغیراً۔ محمد میاں

۴۷۔ سامان کیا تھا؟ جس کی تفصیل معلوم ہو سکی، وہ چند کتابیں تھیں یعنی قرآن مجید، تفسیر جلالین، مشکوٰۃ شریف، سنن ابوداؤد شریف، الحبل المتین، حجۃ اللہ البالغہ کے چند جزو جس میں احسان سے متعلق ابواب ہیں۔ کچھ ساتھیوں نے کہا، تفسیر بیضاوی بھی ساتھ لے لیجئے۔ فرمایا ہم جس مقصد سے یہ سفر اختیار کر رہے ہیں، اس میں کتابوں کے مطالعہ کی نوبت نہیں آئے گی۔ جو کتابیں ساتھ لی گئیں وہ صرف اس لئے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں عمل کے لئے ہدایات حاصل کرسکیں۔ بیضاوی شریف میں عملی ہدایات کی تشریحات برائے نام ہیں، زیادہ تر منطقی قسم کے مباحث ہیں۔ اس سلسلہ میں دوسری بات جو معلوم ہو سکی وہ یہ کہ مولانا کی اہلیہ محترمہ نے بستر اور فرش فراہم کیا۔ کچھ برتن ساتھ کئے اور اپنے کپڑوں کی ایک جوڑی پیش کردی۔

۴۸۔ مولانا سید نصیر الدین صاحب کے متعلق آپ کا اعتقاد یہ تھا کہ آپ حضرت سید احمد شہیدؒ کے پرتو ہیں۔

۴۹۔ مزاری بلوچوں کی بہت بڑی برادری ہے۔ وجہ تسمیہ کے متعلق دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ مزار ان کے کسی مورث اعلیٰ کا نام تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ یہ قبیلہ ابتداء میں ایک ندی پر آباد تھا جس کا نام مزار تھا۔ اس لئے اس برادری کا نام مزاری ہو گیا۔

۵۰۔ یہ علاقہ خیر پور کی حدود سے متصل موجودہ ڈیرہ غازی خاں کے جنوبی حصہ پر مشتمل ہے۔

۵۱۔ دہلی و نواح دہلی: مولانا شاہ اسحاق صاحب۔ مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب۔ مولوی محبوب علی صاحب۔ مولوی نصیر الدین صاحب۔ مولوی مظفر حسین صاحب۔ مولوی شیخ محمد صاحب۔ حاجی محمد۔ حاجی عرض۔ مولوی حافظ محمد حسین۔ مولوی کرم اللہ۔ مولوی الٰہی بخش۔ مولوی جمال الدین۔ حافظ عبدالرحمٰن۔ مولوی محمد وزیر علی۔ منشی ایزد بخش۔ امیر الدین۔ امین الدین۔ حافظ عبدالرزاق۔ مولوی عبداللہ۔ مولوی علی محمد۔ مولوی بہاء الدین۔ مولوی عبدالخالق۔ مولوی امام علی۔ حافظ اکرام الدین۔ مولوی شاہ علی۔ مولوی عبداللہ خاں علوی۔ بشارت خاں۔ مولوی عبدالمجید۔ قاری احمد زمان۔ حافظ محمد بیگ۔ حافظ احمد عظیم اللہ خاں۔ مرزا ایوب بیگ۔ میاں نجابت علی۔ قاضی عبدالرحمٰن عرب سرائے والے۔ میاں غلام محی الدین۔ حافظ ولی محمد۔ میاں احمد۔ میاں رکن الدین۔ میاں الٰہی بخش آئینہ ساز۔ مولوی امداد علی۔ مولوی نذیر حسین۔

میرٹھ: مولوی بزرگ علی۔ مولوی عنایت احمد۔ مولوی محمد تقی وغیرہ۔

پھلت و گنگیرہ: مولوی وحید الدین۔ مولوی خدا بخش۔ مولوی تہور علی۔ مولوی خیر الدین۔ مولوی منیر الدین۔

امروہہ: مولوی رمضان علی۔ مولوی امانت علی۔ مولوی کریم اللہ شیخ رحمٰن بخش۔ صوفی صاحب۔ شاہ غلام علی۔ میر ہدی۔

مرادآباد: حافظ عبدالرحیم۔ میاں عثمان۔ میاں جی خلیفہ۔

گڑھ مکتیسر: حاجی صبغۃ اللہ۔ شیخ محمد حسین۔

رام پور: مولوی حیدر علی۔ مولوی نور الاسلام۔ اخوند زعفران۔ اکبر علی خاں۔ شاہ ولی خاں۔ حافظ احمد علی۔ مرتضیٰ خاں۔ اخوند امام الدین وغیرہ۔

لکھنؤ: مرزا حسن علی۔ مولوی خرم علی۔

قنوج: سید اولاد حسین۔

جون پور: مولوی سخاوت علی۔ مولوی کرامت علی۔ مولوی محمود علی۔ مولوی الٰہی بخش و مولوی مکارم خاں وغیرہ ساکنان فرخ آباد، باندہ، بریلی۔

بنارس: مولوی احمد اللہ۔ مولوی رحمت اللہ۔ حافظ صدیق۔

غازی پور: شیخ فرزند علی۔ مولوی محمد فصیح صاحب۔

عظیم آباد: شاہ محمد حسین صاحب۔ مولوی ولایت علی صاحب۔ مولوی الٰہی بخش صاحب۔

کلکتہ و نواح کلکتہ: مولوی محمد علی صاحب۔ مولوی امام الدین صاحب۔ مولوی مراد صاحب۔ قاضی عبدالباری صاحب۔ صوفی نور محمد صاحب۔ منشی غلام رحمٰن صاحب۔ مولوی کرامت اللہ صاحب۔ مولوی عبداللہ صاحب۔ مستری رجب علی صاحب۔

اجمیر شریف: مولوی محمد سراج الدین صاحب۔

ٹونک: مولوی خلیق الرحمٰن صاحب۔ مولوی بہادر علی صاحب۔ سید حمید الدین صاحب، (خواہرزادہ سید صاحب)۔ سید زین العابدین صاحب۔ سید ابوالقاسم صاحب (ابناء سید احمد علی خواہرزادہ سید صاحب)۔ سید محمد یعقوب صاحب برادرزادہ سید صاحب۔

۵۲۔ مثلاً شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ۔ حضرت علامہ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہندؒ۔ ابوالمحاسن مولانا سجاد صاحب۔ حضرت سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب۔ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری۔ رفیع احمد صاحب قدوائی۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب۔ حافظ محمد ابراہیم صاحب۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب۔ خان عبدالغفار خاں مدظلہ وغیرہ وغیرہ۔ ہندو حلقہ میں مہاتما گاندھی۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد وغیرہ وغیرہ۔

۵۳۔ مثلاً حضرت سید احمد صاحب شہید کے توپ خانہ کا افسر راجہ رام تھا۔

۵۴۔ تمہید۔ بحوالہ سیاسی تحریک ص ۱۴۷۔

۵۵۔ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۱۱۵۔

۵۶۔ ایک عجیب بات ہے کہ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک جو آزادی کی تحریک چلتی رہی اس میں جمعیۃ علماء کا نظریہ یہی رہا کہ جدوجہد آزادی ایسا فرض ہے کہ ہندو مسلم حقوق کے تصفیہ پر اس کو موقوف نہیں رکھا جا سکتا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہی سبق تھا جس کی تعلیم حضرت سید احمد صاحب کے کردار سے حاصل کی تھی۔ مسلمانوں کی بعض دوسری جماعتیں تصفیہ حقوق کو مقدم قرار دیتی رہیں اور اس بہانہ انگریزی سامراج کے ہاتھوں میں کھیلتی رہیں۔ محمد میاں۔

۵۷۔ بہت پہلے کے واقعات کا اجمالی ذکر وجوہات و اسباب کے سلسلہ میں گزر چکا ہے۔

۵۸۔ تاریخ عروج انگلیشیہ ص ۱۵۲ و ص ۱۵۳۔

۵۹۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۳۰۰۔

۶۰۔ لارڈ ڈلہوزی جسے اپنے کارناموں کی بنا پر خود یقین تھا کہ ہندوستان میں یورپین آتش فشاں پہاڑ پر بیٹھے ہیں۔ مارچ ۱۸۵۶ء میں یہاں سے واپس ہوا۔ اس کی جگہ لارڈ کیننگ وائسرائے ہو کر آیا۔ جس نے یورپ سے روانگی سے کچھ پہلے ایک وداعی پارٹی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ میری خواہش ہے کہ میرا عہد حکومت پر امن رہے لیکن اس بات کو نہیں بھول سکتا کہ ہندوستان کی فضا میں بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دکھائی دے گا، اتنا چھوٹا جتنا کہ انسانی ہاتھ لیکن یہ ٹکڑا اتنا بڑا ہوتا جائے گا کہ خود ہمارا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ (تاریخ عروج ہند انگلیشیہ ص ۲۶۷۔ کمپنی کی حکومت ص ۳۵۰)

۶۱۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۳۳۲ تا ص ۳۳۵۔

۶۲۔ تاریخ عروج انگلیشیہ ص ۳۸۵ و ص ۳۸۶۔

۶۳۔ ایضاً ص ۳۰۱۔

۶۴۔ تاریخ عروج انگلیشیہ ص ۳۰۱۔

۶۵۔ دم دم کلکتہ سے تقریباً ۱۴ میل۔ آج کل کلکتہ کا ہوائی اڈہ دم دم میں ہی ہے۔

۶۶۔ بارک پور کلکتہ سے ۱۶ میل۔

۶۷۔ بہرام پور، بارک پور سے ۱۰۰-۲۰۰ میل۔ نواب بنگال کے قدیم دارالخلافہ مرشد آباد سے چند میل۔

۶۸۔ غلام رسول مہر صاحب نے اپنی تصنیف ۱۸۵۷ء میں ان کے نام بھی نقل کر دیے ہیں۔۱۲

۶۹۔ روایت ہے کہ ہندوستانی رسالہ کا انگریز کمانڈر کرنل اسمتھ بغاوت کی خبر سنتے ہی جان بچانے کے لئے کہیں چھپ گیا اور جب توپ خانہ کے کمانڈر نے توپیں تیار کرائیں، ہندوستانی فوج دلی کے راستہ پر بہت دور نکل چکی تھی۔ انگریزی فوج کو بہانہ ہاتھ آ گیا۔ وہ بجائے تعاقب کے چھاؤنی میں پڑ کر سو گئی۔

۷۰۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ کسی ہندوستانی کو کافی رقم دے کر بھیجا گیا تھا اور صبح کے وقت محکمہ تار کا انگریز افسر ٹاڈ جو جمنا کے کنارے پر مارا گیا تھا۔ اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ یہاں اس لئے آیا تھا کہ تار کی لین خراب ہو گئی تھی، اُس کو درست کرنا تھا۔ یہ اس امر کا قرینہ ہے کہ تار باغی فوج نے کاٹ ڈالے تھے لہٰذا میرٹھ سے تار نہ ہو سکا تو کسی آدمی کو بھیجا گیا۔ مگر یہ روایت اس لئے صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ سائمن فریزر کے پاس اطلاع رات ہی کو پہنچ گئی تھی۔ پس تار کا شاگرچہ قرین قیاس ہے مگر یہ بات بعید از قیاس ہے کہ ایک دو بجے رات تک کوئی آدمی میرٹھ سے دلی گیا ہو۔ نیز اگر تار رات ہی کو کٹ گئے تھے تو انگریز افسر کو اسی وقت دیکھنا تھا صبح کا انتظار کرنا غلط تھا۔ اس بنا پر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ تار صبح کے وقت یا آخر شب میں کاٹے گئے اور اس سے پہلے میرٹھ سے تار دینا اور دہلی تار پہنچ جانا دونوں قرین قیاس ہیں حقیقت یہ ہے کہ اپنی کوتاہیوں کو چھپانے کیلئے طرح طرح کی باتیں بنائی گئیں۔ محمد میاں۔

۷۱۔ یہ دروازہ موجودہ سنہری مسجد کی سیدھ میں تھا۔ جامع مسجد کے مشرقی صدر دروازہ کے سامنے سے اگر سیدھی سڑک جمنا تک نکالی جائے تو راج گھاٹ کے دروازہ سے گزرے گی۔ اس دروازہ کے کھلنے کے متعلق مختلف روایتیں ہیں کہ کچھ سپاہیوں نے جو پہلے سے سازش میں شریک تھے۔ انہوں نے کھول دیا۔ بظاہر صحیح یہ ہے کہ اشنان کے واسطے جانے والوں کے لئے یہ کھلا ہوا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اشنان کے لئے جانے والوں نے زبردستی کھلوایا تھا۔

۷۲۔ فرقہ وارانہ مسائل اور مذہبی معاملات میں بہادر شاہ کے خیالات اس زمانہ میں خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ محمد میاں

۷۳۔ داستان غدر ص ۵۳۔

۷۴۔ بڑے ڈاک خانہ کے سامنے سڑک کی دوسری جانب ایک پھاٹک اب تک قائم ہے جو محکمہ آثار قدیمہ کی زیر نگرانی ہے۔ اس پر ایک کتبہ لگا ہوا ہے جس میں میگزین کے اُڑنے اور اُس کے افسروں کا تذکرہ ہے۔

۷۵۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو اس میگزین میں نو لاکھ کارتوس دس ہزار رائفلیں موجود تھیں۔ بہت سی توپیں تھیں۔ توپ گاڑیاں تھیں اور سینکڑوں من بارود تھی۔

۷۶۔ اُن کی تعداد آٹھ تھی اور شمول ولوبی نو۔۹

۷۷۔ کلکتہ دروازہ سے نصف میل کے فاصلہ پر جو دلی کا قدیم ڈاک بنگلہ تھا، وہیں صدر تار گھر تھا۔ اس کے سامنے ایک ستون ان عہدہ داران محکمہ تار کی یادگار میں کھڑا کیا گیا ہے جو اس ہنگامہ میں کام آئے۔ اور جس سے اُن کی دو نوجوان کم عمر سگنلروں کی یاد تازہ کرنی مقصود ہے جو اس معرکہ عظیم میں جبکہ موت سامنے کھڑی تھی، ذرا بھی ہراساں نہیں ہوئے اور انبالہ کو وہ مشہور تار برقی دوڑایا جس کی بدولت ملک پنجاب بال بال بچ گیا۔ تختی کے سامنے جو عبارت درج ہے، اُس کا ترجمہ یہ ہے:

"۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کے ہولناک دن دو نوجوان سگنلر ولیم برنڈس اور جے۔ ڈبلیو۔ پلکنگٹن جبکہ اُن کو چلے جانے کا حکم نہیں دیا گیا، اس وقت تک اپنی ڈیوٹی پر مستعد رہے۔ دہلی میں جو کچھ گزر رہا تھا، اس کی اطلاع انبالہ کو دینے سے انہوں نے پنجاب گورنمنٹ کی انمول خدمت گزاری کی۔ مسٹر رابرٹ منٹگمری کے الفاظ میں: اس تار برقی نے ہندوستان کو بچا لیا۔ یہ تار دلی سے انبالہ پہنچا۔ اسی دن دوپہر کے بعد اس کی نقل میجر جنرل سر اینچ برنارڈ۔ سی۔ بی کمانڈنگ افسر ضلع سرہند کو بھیج دی۔ پھر وہاں سے متعلقہ افسران کو اطلاع دی گئی۔ جس کے نتیجہ میں فوراً تیاری کر لی گئی۔ جس کا تذکرہ پنجاب کے سلسلہ میں آئے گا۔ انشاء اللہ۔ (بہادر شاہ ظفر ص ۲۰۷)

۷۸۔ یہ اور اُن کے ساتھی جنہوں نے غیر معمولی جرأت اور دلیری سے کام لیا پورے ہنگامہ میں محفوظ رہے۔ اور پھر ڈبلیو براندس کم

ستمبر ۱۸۹۶ء کو پنشن لے کر سبک دوش ہوا۔ اور بے ڈ بلیو۔ ٹلفلن کو اگرچہ باغیوں نے قید کر لیا تھا مگر وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور رُڑکی میں ۲۳ر مارچ ۱۸۶۷ء کو انتقال کر گیا۔

۷۹۔ یہ لفظ پہلی مرتبہ فرخ سیر کے زمانہ میں دہلی کی زبان میں داخل ہوا۔ اس سے تلنگی زبان بولنے والے مرہٹے مراد ہوتے تھے۔ پھر اس زمانہ میں مشرقی یوپی اور بہار کے رہنے والے فوجیوں کو بھی تلنگا ہی کہا گیا بس ۱۸۵۷ء کے واقعات میں تلنگوں سے بہار اور مشرقی یوپی کے سپاہی مراد ہوتے تھے۔

۸۰۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۶۱

۸۱۔ ماخوذ از تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۴۱۱

۸۲۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۴۰۵

۸۳۔ داستان غدر ص ۶۵۔

۸۴۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۷۹

۸۵۔ قصبہ دیو بند جو راقم الحروف کا وطن مالوف ہے۔ شاہراہ اعظم کے کنارے پر واقع ہے۔ قصبے کے باشندے اس آزمائش میں بارہا مبتلا ہوئے ہیں۔ ہمارا محلہ پیرزادگان فردوگاہ (دیبی کنڈ اور جنگل شاہ عباس) سے تقریباً چار فرلانگ ہے۔ احقر نے مصیبت کی یہ داستانیں اپنے بزرگوں سے سنی ہیں۔

۸۶۔ داستان غدر ص ۷۱

۸۷۔ شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب نے شاہی جلوس کا نقشہ بھی بتایا ہے جو سراسر مضحکہ خیز اور توہین آمیز ہے ہم اس کو نقل کرنا بیکار سمجھتے ہیں۔ جو صاحب ضرورت سمجھیں ص ۶۶۲ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

۸۸۔ تاریخ عہد انگلیشیہ ص ۶۶۳۔

۸۹۔ ایضاً۔

۹۰۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۷۹۔ اس موقع پر ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۵ء کا زمانہ بھی یاد رکھنا چاہیے۔ جب گیہوں کا آٹا تولوں کے حساب سے ملتا تھا۔ عجیب و غریب بات یہ تھی کہ تانبے کے پیسے اور ایک دو آنے کے سکے ناپید ہو گئے تھے۔ کہیں ڈاک خانہ کے ٹکٹ اور کہیں اور طرح کی پرچیوں سے لوگ اپنا کام نکالتے تھے۔ محمد میاں

۹۱۔ شمس العلماء تحریر فرماتے ہیں۔ دہلی میں جو سپاہ داخل ہوئی تھی وہ روپیہ کے حال سے بڑی مختلف الحال تھی۔ ان میں بعض پلٹنیں تھیں کہ خزانہ ان کو جو ہاتھ لگا تھا اس میں سے اول تو انہوں نے اپنا دامن خاطر خواہ پر کیا۔ جو بچا وہ بادشاہ کے حوالہ کیا۔ جیسا کہ علی گڑھ، بلند شہر کی رجمنٹوں نے کیا۔ بعض نے خزانہ اپنے قبضہ میں رکھا جیسا کہ بریلی بریگیڈ نے۔ بعض کو خزانہ ہاتھ ہی نہیں لگا تھا۔ جیسا کہ میرٹھ سپاہ کو۔ پس بعض تلنگوں کے پاس روپیہ اتنا تھا کہ وہ اس کو اٹھا نہیں سکتے تھے مگر مفلس بہت تھے الخ۔ (۶۶۷ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ)۔

۹۲۔ مثل مشہور ہے کہ اپنی عقل دوسرے کا مال زیادہ معلوم ہوا کرتا ہے بظاہر یہی مثل یہاں بھی صادق ہے۔ ورنہ کم از کم اس زمانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی حالت میں فرق نہیں تھا۔ ہاں اس کے بعد جب انگریزی تسلط دوبارہ بحال ہوا، تو ہندو چونکہ اصل مجرم نہیں قرار دیئے گئے، ان کے ساتھ رعایتیں ہوئیں۔ اس وقت بیشک ہندوؤں کو نیلام وغیرہ خریدنے کے مواقع میسر آئے۔ جس سے ان کی مالی حیثیت بلند ہو گئی۔

۹۳۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ۔

۹۴۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۷۹۔

۹۵۔ ایضاً ص ۶۸۷۔

۹۶۔ ایضاً ص ۶۸۹۔

۹۷۔ ایضاً ص ۶۸۷۔ شمس العلماء نے اس کے بعد یہ بھی فرمایا ہے کہ مگر بادشاہ کے اس حکم کی تعمیل کبھی نہیں ہوئی۔ شاہزادے سپاہ کے زور سے ہمیشہ ان کاموں میں دخل دیتے تھے۔ مگر اگلے اقتباس سے اس کی تردید ہو جاتی ہے کیونکہ مرزا مغل اور مرزا خضر کی سلطان کی مداخلت سپاہ کے زور سے نہیں ہوئی تھی بلکہ اس لئے کہ عدلیہ ان کے سپرد تھا۔ دیکھو ص ۶۸۸ کا اقتباس۔

۹۸۔ ایضاً ص ۶۸۸

۹۹۔ ایضاً ص ۶۸۸۔ گلی قاسم جان، جہاں آج کل جمعیۃ علماء ہند کا دفتر ہے اور اس کی مسجد آپ کے والد نواب قاسم جان کے نام سے منسوب ہے۔ اس مسجد کے متولی آج کل محترم خسرو مرزا صاحب ہیں۔ اس خاندان کی آمد اور سلسلۂ نسب کے متعلق نواب خسرو مرزا صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ سہراب جنگ نواب قاسم جان مع اپنے دو برادران حقیقی عارف خاں و عالم بیگ خاں بخارا سے ۱۷۷۰ء میں ہندوستان آئے۔ بخارا میں محلہ پستہ شکن میں ان کا مکان تھا اور وزیر بخارا کے عہدہ پر متمکن تھے۔ خواجہ عبدالرحمٰن یسوی کی اولاد میں تھے اور خواجہ عبدالرحمٰن یسوی، خواجہ احمد یسوی کے سلسلہ میں تھے یعنی اُن کی اولاد میں تھے، یہ خواجہ احمد یسوی، خواجہ یوسف ہمدانی کے خلیفہ تھے۔ اُن کا وصال ۵۶۲ھ میں ہوا۔ نواب قاسم خاں کے نام پر گلی قاسم جان آباد ہے اور مسجد موجودہ ۱۱۹۳ھ میں تعمیر کرائی۔ عارف خاں کی اولاد میں نواب احمد بخش خاں پہلے فرمانروا ریاست فیروز پور جھرکہ اور لوہارو ہوئے۔

نواب قاسم خاں

نواب محمد بخش خاں

نواب فیض محمد خاں

نواب قدرت اللہ بیگ خاں

معین الدین حسن خاں عرف بڑے مرزا۔ لاولد

محمد حسن خاں

مرزا محمد حسین خاں عرف منصور شاہ لاولد

امتیاز زمانی بیگم عرف حاجی بیگم صاحبہ پرنانی راقم خسرو اہلیہ نواب ضیاء الدین احمد خان نیر رخشاں

۱۰۰۔ ۱۸۵۷ء ص ۱۶۲ و ص ۱۷۱۔

۱۰۱۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۸۸۔

۱۰۲۔ لیکن استعفاء دینے پر بھی پھانسی سے نہیں بچے۔

۱۰۳۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۸۸۔

۱۰۴۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ۔

۱۰۵۔ غدر کی صبح و شام ص ۲۳۳ و ص ۲۴۳۔

۱۰۶۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۶۱۔

۱۰۷۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۶۵۔

۱۰۸۔ ایضاً ص ۶۶۵۔ اوسط دس سے بیس دو چار آدمی ایک ماہ میں۔

۱۰۹۔ ایضاً ص ۶۶۶۔

۱۱۰۔ ایضاً۔

۱۱۱۔ ایضاً ص ۶۶۱۔

۱۱۲۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۶۴۔

۱۱۳۔ شمرو کی بیگم کے مکان میں۔

۱۱۴۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۲۶۴۔
۱۱۵۔ جیسا کہ اسی مکتوب کے ایک جملہ سے معلوم ہوتا ہے جس پر خط کھینچ دیا گیا ہے۔
۱۱۶۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۱۳۔
۱۱۷۔ ایضاً ص ۶۱۳۔
۱۱۸۔ تاریخ عروج انگلیشیہ ص ۶۱۳۔
۱۱۹۔ ایضاً ص ۶۸۷۔
۱۲۰۔ اگرچہ شمس العلماء بادشاہ کے مخالف ہیں مگر چونکہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد مسلمانوں کے جس طبقہ نے انگریزوں کو اپنی امیدوں کا مرکز بنالیا تھا ان کی کوشش یہ بھی ہوئی کہ مسلمانوں پر جو باغی انقلاب ہونے کا الزام لگایا گیا ہے، اس کو اُٹھایا جائے۔ اس لئے وہ بہ در شاہ کو مجبور رعایت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال شمس العلماء کی یہ تحریر ہے۔
۱۲۱۔ ابھی گزر چکا ہے کہ بقرعید یکم اگست کو ہوئی۔ اب یہ سوال حل طلب ہے کہ جو اعلان ۹ جولائی اور یکم اگست کو ہوا وہ بادشاہ کا سب سے پہلا حکم کس طرح ہوسکتا ہے۔
۱۲۲۔ خود شمس العلماء بار بار فرما چکے ہیں کہ بادشاہ اونٹ کی قربانی آج سے نہیں بلکہ ہمیشہ سے کیا کرتا تھا۔ اس کے لئے کس تلنگے نے مجبور کیا تھا۔
۱۲۳۔ اس سے زیادہ کوئی جواب تعجب انگیز نہیں ہوسکتا۔ سارے تلنگے ہندو سہی مگر جو سپاہ یہاں پہنچی ہوئی تھی جس کی تعداد جولائی اور اگست میں تقریباً پچاس ہزار تھی، نہ وہ سب کی سب ہندو تھی، نہ اُن کے افسر ہندو تھے۔ اگر یہ واقع صحیح ہے تو بادشاہ نے یہ کہا ہوگا۔ ان بے چاروں سے مسلمان کیا لڑیں گے۔ شمس العلماء نے صرف لفظ "بیچارے" میں تقدیم و تاخیر کردی۔
۱۲۴۔ اسباب بغاوت ہند ص ۵۱۴
۱۲۵۔ اسباب بغاوت ہند ص ۷۔
۱۲۶۔ ایضاً ص ۹۔
۱۲۷۔ تاریخ عروج انگلیشیہ ص ۱۷۵
۱۲۸۔ اکبر کے زمانہ میں شہزادوں کی ختنہ بند ہوگئی تھی۔ اکبر کا نیا قانون یہ تھا کہ ساقط الاعضاء بادشاہ نہیں ہوسکتا۔ ختنہ کرانے سے ایک عضو ساقط ہو جاتا ہے۔ لہذا بادشاہت کے قابل نہیں رہتا۔ (معاذ اللہ)۔ (دیکھو شاندار ماضی حصہ اول)۔
۱۲۹۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۳۷۸۔
۱۳۰۔ ایضاً ص ۳۹۱۔
۱۳۱۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۳۶۹۔
۱۳۲۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۳۹۱۔
۱۳۳۔ ایضاً ص ۳۶۴۔
۱۳۴۔ یعنی وہ ریتلا میدان جو دریائے جمنا کے کنارے لال قلعہ تک تھا۔ جہاں برسات میں سیلاب کا پانی بھر جاتا تھا۔ یہ میدان اب باقی نہیں رہا۔ کیونکہ دریائے جمنا قلعہ سے فاصلہ پر پہنچ گئی ہے اور اس میدان میں کچھ عمارتیں بن گئی ہیں۔ بیلا روڈ اسی میدان میں ہوکر گزرتی ہے اور اسی میدان کے ایک کنارہ پر گاندھی جی کی سمادھی ہے۔
۱۳۵۔ داستان غدر از ظہیر دہلوی۔
۱۳۶۔ جب بادشاہ کو رعیت سے یہ تعلق ہو تو ظاہر ہے، رعایا کو بھی بادشاہ سے یہی تعلق اور ایسی ہی گرویدگی ہوگی۔ مثل ہے جزاء الاحسان الا الاحسان۔ اور مشہور ہے، الانسان عبد الاحسان۔ انسان تو در کنار ظہیر صاحب دہلوی نے ایک ہاتھی کا عجیب و غریب قصہ تحریر فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ سے خاص تعلق اور گرویدگی انسانوں ہی کو نہیں بلکہ خاص خاص جانوروں کو

بھی تھی۔ ظہیر صاحب ہی کے الفاظ میں یہ دلچسپ داستان ملاحظہ فرمایئے، اور دلی کی پرانی زبان سے لطف اندوز ہوجئے۔ ظہیر صاحب فرماتے ہیں:

مولا بخش ہاتھی کا عجیب واقعہ

مولا بخش نامی ایک قدیمی ہاتھی معمر تھا۔ کئی بادشاہوں کو سواری دی تھی۔ اس کی عادتیں بالکل انسان کی تھیں۔ قد وقامت میں ایسا بلند وبالا ہاتھی ہندوستان کی سرزمین پر نہیں تھا اور نہ اب ہے۔ یہ ہاتھی بیٹھا ہوا اور ہاتھیوں کے قد کے برابر ہوتا تھا۔ خوبصورتی میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ دوازدہ ماہ مست رہتا تھا۔ کسی آدمی کو سوائے ایک مہاوت کے پاس نہیں آنے دیتا تھا۔ جس دن بادشاہ کی سواری ہوتی تھی، اُس سے ایک دن پیشتر بادشاہی چوب دار جاکر حکم سنادیتا تھا۔ "میاں مولا بخش" کل تمہاری نوکری ہے۔ ہوشیار ہوجاؤ۔ نہادھو کر تیار ہورہو۔ بس اُسی وقت سے ہوشیار ہیں۔ فیل بان تھان سے کھول کر جمنا میں لے گئے اور لے جاکر نہلا دیا اور جھانوں سے میل چھڑانا شروع کیا پھر دوسری کروٹ لٹا کر دوسری طرف پاک صاف کرکے تھان پر لے آیا۔ نقاش نے سنگ پر نقش ونگار کھینچ دیئے۔ وقت سواری گدیلہ کس کر کارخانہ میں لے گئے۔ گہنا پہنایا۔ جھول ڈالی۔ عماری کسی۔ نقارخانہ کی ڈیوڑھی پر لاکر ایستادہ کردیا۔ برابر اور ہاتھیوں کی قطار کھڑی۔ جس وقت ہوادار سواری پر بادشاہ نقارخانہ کے دروازہ سے برآمد ہوا۔ چیخ مار کر تین سلام کئے اور خود ہی بیٹھ گیا۔ جس وقت تک بادشاہ سوار نہ ہولیں اور خواص نہ بیٹھ لے، کیا مجال کہ جنبش کرجائے۔ جب بادشاہ سوار ہولئے اور فوجدار نے اشارہ کیا، فوراً استادہ ہوگیا۔ ایک خوبی اور تھی کہ وقت سواری دو کانٹیں اس کے کانوں میں پہنائی جاتی تھیں۔ دو ترکش تیروں کے کانوں کے پیچھے آویزاں کئے جاتے تھے اور بہت بڑی سپر فولادی مستک پر نصب کی جاتی تھی۔ اور بہت بڑا حصہ چاندی کا مع چلم و چنبر تقرہ اس کے سر پر رکھا جاتا تھا اور پیچھے ان کی سنگ فوجدار خاں اپنے کندھے پر رکھتے۔ بادشاہ ٹھنڈا حقہ پیتے جاتے تھے اور سواری رواں ہوتی تھی۔ کیا مقدور ہے کہ حقہ گرنے پائے یا چلم گرے۔ ایسا سبک رفتار تھا، بڑی جھولی رفتار تھی۔ قصہ مختصر جب سواری سے فرصت ہوئی، پھر ویسا ہی مست ہے جیسے پہلے تھا۔ یہ کمال اس ہاتھی کو تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور وصف بھی تھا کہ تمام دن خورد سال بچے جو بارہ ۱۲ برس کے سن سے کم سن بچے معصوم ہوتے تھے، اس کے گرد بیٹھے رہتے تھے۔ اُن سے کھیلا کرتا تھا، اور اپنے ہاتھوں سے گنوں کی پوریاں توڑ کر صاف کرکے اُن کو دیا کرتا تھا۔ دن بھر بچے اسے گھیرے رہتے تھے بچے اُسے کہتے۔ "مولا بخش گھڑی آوے"۔ تو وہ اپنا ایک اگلا ہاتھ زمین سے اُٹھالیتا تھا اور ہلایا کرتا تھا، اور بچے جتنی دیر کی تعداد لگا دیتے کہ گھڑی بھر یا دو گھڑی، اُسی قدر ہاتھ اُٹھائے رکھتا تھا۔ جب بچے کہتے ٹھیک رو، ہاتھ ٹیک دیتا تھا۔ پھر آپ نوں کہتا۔ بچے ایک پاؤں سے کھڑے ہوجاتے۔ اگر وہ گھڑی بھر سے پیشتر کہہ دیتے کہ گھڑی ہوگئی، تو سر ہلا دیتا کہ ابھی پوری نہیں ہوئی ہے اور جب گھڑی پوری ہوجاتی، تو خود ہی نوں کہہ دیتا۔ بچے پاؤں ٹیک دیتے تھے۔ جس دن بچے نہ آتے تو چیخیں مار کر بلا لیتا۔ بچوں کو گنے کھلاتا تھا۔

حیرت انگیز واقعہ

جب فیل خانہ شاہی اور اصطبل پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو اسپ "ہدہد" اور "مولا بخش" ہاتھی نے کھانا پینا چھوڑ دیا"۔ اسپ "ہدہد" "بہت بڑا شاندار گھوڑا، ڈورکا۔ یہ نہایت خوش رنگ اور خوبصورت تھا۔ سواری میں سب کوتلوں سے آگے چلتا تھا۔ زمانہ ولی عہدی سے بادشاہ کی سواری میں تھا۔ اب اس کی عمر چالیس سال کی ہوئی تھی۔ تمام جسم اس کا منقش تھا اور چھوٹے چھوٹے گلاب کے پھول کے برابر سرخ رنگ کے پھول تھے۔ جب ان دونوں نے آب ودانہ ترک کردیا، تو مولا بخش کے فیل بان نے جاکر "سانڈرس" صاحب کو اطلاع دی کہ "ہاتھی نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے کل کلاں کو نیکی بدی ہوجائے گی تو سرکار مجھے پھانسی دے گی۔" سانڈرس صاحب کو یارا نہ آیا۔ فیلبان کو گالیاں دیں اور کہا کہ ہم چل کر خود کھلوائیں گے۔ اور پانچ روپیہ کے لڈو اور پوریاں بھرا منگوا کر ہاتھی کے تھان پر پہنچے؛ اور ٹوکرا شیرینی کا ہاتھی کے آگے رکھوا دیا۔ ہاتھی نے جھلا کر ٹوکرا کھینچ مارا۔

اگر کسی آدمی کے قتل تک کو کام تمام ہو جاتا۔ وہ چونک کر دوڑا اور جا کر پڑا اور تمام شیرینی ہضم کر لی۔ سانڈرس بولے۔ ہاتھی باقی ہے۔ اسے نیلام کر دو۔ اسی روز صدر بازار میں ڈگڈگی پٹوا دی گئی اور نیلام کی بولی بولی۔ کوئی خریدار نہ ہوا۔ "بجلی" پنساری یک چشم جس کی دکان کھاری باؤلی میں تھی، اس نے ڈھائی سو روپیہ کی بولی دی۔ یہی بولی پر صاحب نے نیلام ختم کر دیا۔ فیل بان نے ہاتھی سے کہا۔ لے بھائی! تمام عمر تو نے اور میں نے بادشاہوں کی نوکری کی، اور اب میری اور تیری تقدیر پھوٹ گئی کہ ہلدی کی گرہ بیچنے والے کے دروازہ پر چلنا پڑا۔ یہ سنتے ہی ہاتھی کھڑے قد سے دھم دینی زمین پر گر پڑا اور جاں بحق ہو گیا اور اسی دن سب ہوم کا بھی خاتمہ ہوا۔ اس کے بعد ظہیر صاحب فرماتے ہیں۔ سبحان اللہ ایسے نمک حلال جانثار رفیق کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ایسا حیوان انسان نما سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ خدا انسان کو بھی ایسی ہی توفیق عطا فرمائے۔ (ص ۲۴۳ تا ص ۲۴۶ داستان غدر)

۱۳۷۔ داستان غدر ص ۳۷

۱۳۸۔ یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نظریہ کسی بھی عالم دین اور مفتی کا نہیں تھا، جو سر سید صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ مسلمان اس حکومت کے مستامن ہیں (زیر پناہ ہیں) اور مستامن (زیر پناہ) کی حیثیت سے حکومت متسلط کا مقابلہ ناجائز ہے۔

۱۳۹۔ اس تنظیم کی وضاحت کے لئے ہم اس سلسلہ کی (علماء ہند کے شاندار ماضی کی) دوسری اور تیسری جلد کے مطالعہ کی درخواست کریں گے۔ ان جلدوں میں واضح کیا گیا ہے کہ سیدنا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سیاسی نظریات کی بنیاد پر کس طرح حضرت شاہ عبدالعزیز نے رضاکاروں کی تربیت فرمائی۔ پھر حضرت سید احمد شہیدؒ و مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی زیر قیادت اس تربیت یافتہ جماعت نے کس طرح علم جہاد بلند کیا اور بے نظیر قربانیوں کی زندہ جاوید تاریخ صفحات ہستی پر نقش کی۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کی شہادت کے بعد اس جماعت کے سربراہ حضرت مولانا اسحاق صاحب تھے جن کو مولانا سندھیؒ "الصدر الرشید" فرماتے ہیں۔ ایک جماعت کی تشکیل کی۔ نئی تنظیم سے یہی جماعت مراد ہے۔ اس کی قیادت پہلے مولانا مملوک علیؒ کے سپرد تھی۔ ان کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ العزیز اس کے امیر قرار دیے گئے۔

۱۴۰۔ اس موقع پر لفظ کثیر کا مطلب یہ ہے کہ اس جماعت میں بھی بہت سے افراد شامل تھے۔ ورنہ عددی لحاظ سے اکثریت اسی جماعت کو حاصل تھی جو سلطان دہلی کی حامی اور اس جنگ آزادی میں شریک کار تھی۔ جمہور مؤرخین تاریخ کے نزدیک یہ حقیقت ناقابل انکار ہے۔

۱۴۱۔ غیر جانبداری اس بناء پر نہیں کہ وہ انگریزوں کے حامی تھے بلکہ اس وجہ سے کہ ان کے خیال میں کامیابی ممکن نہیں تھی۔ جس کی تشریح شمس العلماء ذکاء اللہ خاں نے ان الفاظ میں کی ہے۔

"ہمیں اس وقت تک ان کافروں کی اطاعت کرنی چاہئے جب تک ان سے سرکشی میں کامیابی کی امید نہ ہو۔ (ص ۳۰۶ تاریخ عروج عہد انگلشیہ)

انہیں میں سے ایک بزرگ (مولانا محبوب علی صاحب) کا قصہ مشہور ہے کہ کامیابی کے بعد انگریزوں نے ان کو کئی گاؤں کی جاگیر دی۔ تو آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میری غیر جانبداری انگریزوں کی خوشنودی کے لئے نہیں تھی۔ بلکہ میرے نزدیک مسئلہ ہی اس طرح تھا۔

۱۴۲۔ یہ علماء صادق پور کی پارٹی ہے۔ تشریح کے لئے ملاحظہ فرمائیے، شاندار ماضی جلد سوم۔

۱۴۳۔ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۱۰۱۔

۱۴۴۔ ایک مرتبہ انقلابی فوجیں اس پہاڑی کے عقب تک پہنچ گئیں۔ مگر عین اس وقت جب وہ دشمن کے سر پر پہنچی ہوئی تھیں، گولہ بارود ختم ہو گیا۔

۱۴۵۔ سیدنا شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے زمانہ کی دہلی کا تذکرہ ایک عربی قصیدہ میں کیا ہے۔ ان کے چند اشعار ترجمہ سمیت پیش کئے جاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

ان البلاد اماء وھی سیدۃ وانھا درۃ والکل کالصدف

تمام شہر باندیاں ہیں اور دہلی ان کے مقابلہ میں ملکہ ہے۔ دہلی ایک موتی ہے، اور باقی تمام شہر گویا سیپ۔

فاقت بلاد الوریٰ عزاً ومرتبۃ   غیر الحجاز وغیر القدس والنجف

دہلی عزت و منزلت میں سب شہروں پر فوقیت رکھتی ہے، باستثناء حجاز شریف، بیت المقدس اور نجف کے

سکانھا خیر اھل الارض قاطبۃ   خلقا وخلقا بلا عجب ولا صلف

دہلی کے باشندے دنیا بھر میں سب سے بہتر ہیں۔ صورت میں، سیرت میں، اس میں نہ تعجب کی بات ہے، نہ حیرت کی بات

بھا مدارس لو طاف البصیر بھا   لم تفسح عینہ الا علی الصحف

دہلی میں بے شمار مدرسے ہیں جو تعلیمی فرائض کی انجام دہی میں ایسے منہمک رہتے ہیں کہ اگر کوئی سیاح ان مدرسوں کا چکر لگائے تو کتابوں اور صحیفوں کے علاوہ کسی اور چیز پر اس کی نظر ہی نہ پڑ سکے۔

کم مسجد زخرفت فیھا منارتہ   لو قابلتہ الشمس الضحو تنکسف

کتنی ہی حسین اور خوب صورت مسجدیں ہیں۔ ان کے مینار ایسے مزین اور بارونق کہ اگر دوپہر کے وقت آفتاب اُن کا مقابلہ کرے تو اس کو گہن لگ جائے۔

لاعزو ان زانت الدنیا بزینتھا   کم من اب قد علا بابن ذوی شرف

آج دہلی پوری دنیا کے لئے وجہ زینت ہے اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بیٹے کی عزت اور ناموری سے باپ عزت و عظمت کی بلندیوں پر بالا نشین ہو جاتا ہے۔

وماء جون جری من تحتھا لحکی   انھار۔ خلد جرت فی اسفل الغرف

دریائے جمنا دہلی کے نیچے جاری ہے وہ نمونہ پیش کر رہا ہے جنت الفردوس کی نہروں کا جو جنت کے عالیشان محلات اور بالا خانوں کے نیچے بہہ رہی ہیں۔

۱۴۶۔ قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان کا لق ودق میدان جو ۱۹۵۰ء تک تقریباً ایک میل لمبا اور میل چوڑا تھا پھر جانب شمال میں کشمیری گیٹ تک اور جانب جنوب میں دہلی دروازہ تک چوبیس پچیس برس پہلے تک سنسان علاقہ تھا۔ یہ سب فصیل شہر میں داخل تھا، جو ۹ ستمبر ۱۸۵۷ء تک کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس میں سات بازار تھے، بے شمار مسجدیں اور مندر، چوک اور مزارات۔ ۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کے بعد تقریباً دس روز تک اس علاقہ میں چپہ چپہ زمین پر خونریز جنگ ہوئی۔ ہر ایک مکان مورچہ تھا۔ جس کے نتیجہ میں وہ گولوں اور گولیوں کا نشانہ بنا اور پھر جب انگریزی قبضہ مکمل ہوا تو مسمار کر کے یہ پورا علاقہ چٹیل میدان اور بقول راقم الدولہ ظہیر دہلوی چبوترہ کر دیا گیا۔ اب دہلی کی آزاد حکومت اس علاقہ کو دوبارہ آباد کر رہی ہے۔ مگر پوری طرح آباد کرنے کے لئے اربوں روپیہ کی ضرورت ہے۔

۱۴۷۔ بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد ص ۵۰۶، تذکرہ دہلی کالج۔

۱۴۸۔ خاتغر۔ سمرقند کے قریب ایک قطعۂ زمین ہے، جہاں کا سرو خوبی و زیبائی اور راستی میں ضرب المثل ہے۔

۱۴۹۔ بدوی۔ دیہاتی۔

۱۵۰۔ چنانچہ طوائف کے بازار گرم تھے اور جال بازی کے علاوہ کوئی بھی بازی ایسی نہ تھی جس سے دہلی کے شوقین مزاجوں کو دلچسپی نہ ہو۔

۱۵۱۔ شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب فرماتے ہیں۔ اول اول جب شہر میں باغی سپاہ داخل ہوئی ہے تو وہ دین دین پکارتی تھی اور اپنی بغاوت کا سبب فقط یہی بتاتی تھی کہ انگریز اُن کو بے دین کرنا چاہتے تھے۔ مگر دو مہینے کے بعد اس بات کا ذکر سننے میں نہیں آیا تھا۔ ہر ایک رجمنٹ اور رسالہ میں تلنگے اور سوار ایسے اشراف اور بھلے مانس تھے کہ وہ کہتے تھے کہ یہ دنگا اور فساد مچانا اور افسروں کو قتل کرنا ہم میں سے صرف تھوڑے سے آدمیوں کا کام ہے ہمارا جرم یہ ہے کہ ہم نے ان کو یہ کام کرنے دیا۔ اس خیال میں وہ سب متفق تھے کہ اس جرم کے سبب سے انگریز ہم کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اُن کے افسر اکثر پژمردہ رہتے تھے۔

ان کو اپنی تنخواہوں، اپنی عزت اور آخر عمر میں اپنی پنشنوں کا خیال آتا تھا۔ سپاہی ان کے حکم نہیں مانتے تھے۔ اور ان کو ایسی باتیں سنا دیتے تھے جس سے وہ شکستہ خاطر ہوتے تھے۔ (تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۹۹)

۱۵۲۔ نواب محمود علی خاں صاحب کے حالات مضافات دہلی کے باب میں ملاحظہ فرمایئے۔

۱۵۳۔ غدر کی صبح و شام ص ۲۴۲ و ص ۲۴۳۔

۱۵۴۔ ایضاً ص ۲۴۸

۱۵۵۔ ایضاً ص ۲۴۳ وغیرہ

۱۵۶۔ مگر دلی والوں کی خوش طبعی کا یہ رنگ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس حالت میں جس سے ظہیر صاحب پناہ مانگ رہے ہیں، ان کی تفریح و خوش مزاجی ختم نہیں ہوئی تھی۔ بقول خواجہ حسن نظامی مرحوم و مغفور، انگریزی توپوں کی گولہ باری ان کے لئے شب برات کی آتش بازی کی طرح تماشا ہو گئی تھی۔ مکانوں کی چھتوں پر لوگ چڑھ جاتے اور گولوں کی سیر دیکھتے۔ جب گولہ آتا تو غل مچاتے، وہ آیا وہ آیا۔ گرتا تو شور مچاتے، وہ مارا۔ کہیں قریب میں گرتا تو سینکڑوں دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے۔ خواجہ حسن نظامی لکھتے کے والد مرحوم ہمایوں کے مقبرہ کی چھت پر چڑھ کر تماشا دیکھا کرتے تھے۔ اس تماشے ہی میں ان کو اس کا بھی احساس ہوا کہ آواز کی رفتار سے روشنی کی رفتار زیادہ تیز ہے کیونکہ گولہ چھوٹنے کے وقت روشنی پہلے نظر آتی تھی۔ پھر کچھ وقفہ کے بعد آواز کانوں میں پہنچتی تھی۔ (داستان غدر اور دہلی کی جان کنی)

۱۵۷۔ لال قلعہ ۱۶۴۸ء میں مکمل ہوا تھا۔ دو سو نو سال کے بعد اس کے درو دیوار نے پہلی مرتبہ اجنبی حکمران کا جام صحت تجویز ہونے کی صدا سنی۔ (غلام رسول مہر)

۱۵۸۔ ماخوذ از قتار کی عزیزیہ۔ ملاحظہ ہو شاندار ماضی جلد ۲

۱۵۹۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو شاندار ماضی جلد دوم۔

۱۶۰۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ہمارے ہندوستانی مسلمان (از ڈاکٹر ہنٹر) کا ضمیمہ، بالخصوص ضمیمہ نمبر ۳۔

۱۶۱۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں۔ اس واپسی کے بعد (۱۸۵۷ء کے انقلابی حوادث) میں مولانا محمد اسحاق صاحب کی جماعت پھر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ الصدر الحمید (مولانا محمد اسحاق صاحب) نے جس طائفہ کو تنظیم میں مرکزی اختیارات دیئے تھے۔ وہ طائفہ سلطان دہلی کا طرفدار ہو گیا اور سلطانی تحریک کی شکست کے بعد مولانا محمد اسحاق کی طرح حجاز پہنچ گیا۔ چنانچہ امیر امداد اللہ (حاجی امداد اللہ صاحب) اور مولانا عبد الغنی، مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی کے ساتھ حجاز میں بیٹھ کر اپنی ہندوستانی تحریک کی رہنمائی کرتے رہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا محمد اسحاق کے متبعین کی پہلی صف میں سے علماء اور صوفیہ کا کثیر حصہ سلطان دہلی کی لڑائی میں غیر جانب دار بن گیا۔ اس کا حاصل یہ سمجھنا چاہیے کہ الصدر الحمید کی تنظیم کے بالمقابل گورنمنٹ میں پارٹی قائم ہو چکی تھی تو اب خود الصدر الحمید کے اپنے فرقہ میں سے ایک مخالف جماعت دہلی میں پیدا ہو گئی۔ مولانا سید نذیر حسین دہلوی اور مولانا شیخ محمد تھانوی اس دوسری جماعت کے مشہور بزرگوں میں سے ہیں۔ (شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۳۰۰)

۱۶۲۔ کس قدر دلچسپ تماشا ہے کہ جن کو سرسید، بلکہ شہید جیسے الفاظ سے یاد کر رہے ہیں، ان کے پاس تو وہ فتویٰ موجود ہے جس پر اس دور کے پر تقدس اور متقی و پرہیزگار علماء اور مفتیان کرام کے دستخط ثبت ہیں اور سرسید صاحب کے ہمنوا جو سرسید صاحب کے ارشاد کے مطابق مقدس، پرہیزگار، باوقار اور سنجیدہ ہوں گے، وہ فتوے سے محروم یہاں تک کہ جو فتویٰ انہوں نے مرتب کرایا ہو گا، اس کو محفوظ رکھنے کے لئے بھی کوئی قابل اعتبار شخص میسر نہیں آیا۔

۱۶۳۔ حضرت سید احمد شہید بالخصوص مولانا اسمٰعیل شہید جو اہل دہلی کے رہنے والے تھے۔ سرسید صاحب نے ان کے جہاد کی تاویل یہ کر دی کہ:

"تیس برس پیشتر ایک بہت بڑے نامی گرامی مولوی محمد اسمٰعیل نے ہندوستان میں جہاد کا وعظ کہا اور آدمیوں کو جہاد کی

ترغیب دی۔ اس وقت اُس نے صاف بیان کیا کہ ہندوستان کے رہنے والے جو سرکار انگریزی کے امن میں رہتے ہیں۔ ہندوستان میں جہاد نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہزاروں آدمی جہادی ہر ایک ضلع ہندوستان میں جمع ہوئے اور سرکاری عملداری میں کسی طرح کا فساد نہیں کیا اور غربی سرحد پنجاب پر جا کر لڑائی کی" (اسباب بغاوت ہند ص ۷۰۸)

سرسید مرحوم کی اس تاویل کے متعلق محترم غلام رسول صاحب مہر کی تحقیق بھی ملاحظہ فرمالیجے۔ مہر صاحب فرماتے ہیں۔ میں جہاں تک تحقیق کر سکا ہوں، سب سے پہلے سرسید احمد خاں مرحوم نے سید صاحب شہید کے جہاد کا رخ انگریزوں سے ہٹا کر سکھوں کی طرف پھیرا (سید احمد شہید ص ۲۵۲)۔ مزید تحقیق کیلئے اصل کتاب ملاحظہ ہو۔ نیز شاندار ماضی دوم میں بھی اس پر کافی بحث گزر چکی ہے۔

۱۶۴۔ مولانا احمد اللہ شاہ، مولانا لیاقت علی، مولانا فیض احمد، مولانا کفایت علی، مولانا محمد قاسم صاحب، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی جیسے اکابر علماء کو خدا جانے سید صاحب نے ان دونوں لفظوں کا مصداق سمجھا ہے یا کسی ایک کا (تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو) ہاں سرسید صاحب کی طرف سے یہ معذرت کی جاسکتی ہے کہ ان کے پیش نظر مغل شاہزادے اور اطراف و جوانب کے وہ نواب اور راجہ ہیں جو اگرچہ اس وقت تحریک انقلاب میں پیش پیش تھے۔ مگر ان کی اخلاقی زندگی ہمیشہ خراب و خستہ رہی تھی۔

۱۶۵۔ سید صاحب نے مسلمانوں کی طرف سے صفائی دیتے ہوئے یہ کتاب لکھی ہے۔ سید صاحب صدر امین ضرور تھے مگر وکیل نہ تھے۔ اگر سید صاحب قابل وکیل ہوتے یا صفائی دینے کے لئے کسی قابل وکیل سے مشورہ ہی کر لیتے تو علمبرداران حریت پر یہ غلط الزام نہ لگاتے۔ شمس العلماء ذکاء اللہ خاں نے صرف جہادی وہابیوں پر اس بغاوت کی ذمہ داری ڈالی ہے جن کا ایک ایک فرد شہید ہو چکا تھا۔ سید صاحب بھی یہی طریقہ اختیار کرتے تو موجودہ مسلمانوں کی طرف سے صفائی ہو جاتی۔ یعنی جہادی باغی شہید ہو چکے اور جو اس وقت موجود ہیں وہ ہمیشہ وفادار رہے۔ مگر علماء اور اکابر دین کو دشنام دہی جو سید صاحب کا مخصوص ذوق تھا وہ تشنہ رہ جاتا۔ افسوس۔

۱۶۶۔ یہ سید صاحب کا قصور فہم اور ان کے نظریہ کی غلطی ہے۔ مجاہدین ان بعید الوطن بیگانوں کو حاکم اور امیر نہیں تسلیم کرتے تھے بلکہ ان کو غاصب، بدعہد اور خائن سمجھتے تھے۔ سرکاری خزانہ اور اسباب، امانت نہیں تھا بلکہ مال مغصوبہ تھا، اس کے اصل مالک ہندوستانی تھے۔ انگریزوں نے جبر و قہر سے جس کو قانون کی شکل دے دی تھی۔ ہندوستانیوں کا مال لوٹا تھا، چھینا تھا۔ لہٰذا ہندوستانیوں کو اس ملک کے واپس لینے کا حق تھا۔ انقلابی مجاہدین نے اپنا یہی حق حاصل کیا تھا۔

۱۶۷۔ یہ ملازمت وقتی اور عارضی تھی۔ اپنی معاشی ضرورتوں کے لئے ہر وقت اس ملازمت کو ختم کر دینے کا حق تھا۔ مجاہدین نے جو کچھ کیا، ملازمت ختم کرنے کے بعد کیا۔ اور نمک حرام ہندوستانی ملازم نہیں تھے بلکہ انگریز تھے، جنہوں نے شاہ عالم سے دیوانی حاصل کر کے اتنی بڑی نمک حرامی کی تھی کہ نمک حرامی کی پوری تاریخ میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

۱۶۸۔ بیشک گناہ عظیم تھا بلکہ اس سے بھی بدتر لفظ اس کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ نکتہ سبحان قضا و قدر کا انکشاف تو یہ ہے کہ یہی بے عنوانی اس تحریک کی ناکامی کا سبب بنی۔ معاذ اللہ۔ باقی یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک ایک کے بدلے میں سو سو اور کہیں اس سے بھی زیادہ کو قربان کرنا پڑا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کو قتل اس بنا پر کیا کہ یہ جاسوسی کر رہے تھے۔ البتہ اتنی کمی ضرور ہوئی کہ مصنوعی عدالت میں ان کو پیش کر کے کورٹ مارشل نہیں کرایا گیا۔

۱۶۹۔ درست ہے مگر اس سے فتویٰ جہاد پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ جہاد اس لئے نہیں تھا کہ معزول کو دوبارہ بادشاہ بنادیں بلکہ جہاد کی غرض انگریزوں کو نکالنا تھا جیسا کہ آئندہ فتوے کے سوال اور جواب سے ظاہر ہوگا۔ البتہ چونکہ اس وقت بہرحال فوج نے بہادر شاہ کو بادشاہ بنالیا تھا، اس لئے اہل علم کی رائے میں اختلاف ضرور پیدا ہو گیا۔ جیسے کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے جو پہلے حاشیہ میں گزر چکی ہے۔

۱۷۰۔ مگر انگریزوں سے بڑا کوئی بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اسی بنا پر انہیں علماء کی اکثریت نے جہاد میں حصہ لیا اور جام شہادت سے سرشار ہوئے۔

۱۷۱۔ دشمن اگر پناہ مانگے تو پناہ دینا فتویٰ جہاد کے خلاف نہیں بلکہ جس کلام پاک کی روشنی میں جہاد کا فتویٰ دیا جاتا ہے اس کا حکم ہے وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ "اگر بر سر جنگ مشرکوں میں سے کوئی تم سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دو۔ تاکہ اس کو توفیق ہو کہ اللہ کی بات سنے اور اس پر عمل کرے (سورہ توبہ) بالخصوص عورت کا معاملہ تو بہت ہی نازک ہے حدیث میں خصوصیت سے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے قتل کی ممانعت ہے۔

۱۷۲۔ غلط ہے مولانا محمد سرفراز علی صاحب جنرل بخت خاں کے پیر و مرشد جن کی سربراہی میں جنرل بخت خاں دہلی پہنچے اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی جیسے بزرگوں کے جہاد کا ہمیں علم ہے اور باقی کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ علاوہ ازیں جب ماہر جنگ سپاہ اور فوج موجود تھی، تو لازم بھی نہیں تھا کہ جو جنگ کے ماہر نہ ہوں وہ میدان میں کود پڑیں۔ ہر کسے را بہر کارے ساختند"۔

۱۷۳۔ اسباب بغاوت ہند ص ۷ تا ۱۰۔

۱۷۴۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فتویٰ پہلے سے تھا لیکن پاس کا چرچا نہیں تھا اور مسجدوں میں جہاد کے وعظ بھی کم ہوتے تھے۔

۱۷۵۔ خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد۔

۱۷۶۔ برعکس نام نہند زنگی کافور۔

۱۷۷۔ یہ شمس العلماء کا خیال ہے۔ فتوے کے الفاظ سے یہ معلوم نہیں ہوتا تفصیل آئندہ ملاحظہ فرمائیے۔

۱۷۸۔ یعنی سر سید مرحوم کی طرح انگریزوں سے جہاد کو جائز نہیں کہا، بلکہ یہ عذر کیا کہ جہاد کی شرطیں مثلاً مقابلہ کی پوری قوت وغیرہ موجود نہیں ہیں۔ یہی عذر حضرت شیخ محمد صاحب تھانوی نے بھی پیش کیا تھا۔

۱۷۹۔ ملاحظہ ہو تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۷۵۔

۱۸۰۔ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۲۰۰ ملخصاً۔

۱۸۱۔ ملاحظہ ہو تواریخ عجیب عرف کالا پانی ص ۲۰ شائع کردہ اقبال اکیڈمی لاہور۔

۱۸۲۔ تراجم علماء حدیث ہند ص ۱۳۹۔

۱۸۳۔ یہ ڈاکٹر اطہر عباس صاحب ایم اے پی ایچ ڈی کی لکھی ہوئی ہندی زبان کی کتاب ہے جس کو حکومت یوپی نے ۱۸۵۷ء کی یادگار میں شائع کیا ہے۔ اس کے آخر میں بہت اہم کاغذات کے عکس بھی چھاپ دیئے گئے ہیں۔ ان کے تحت صادق اخبار دہلی مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کا فوٹو بھی ہے۔ اس کے ایک صفحہ پر فتویٰ جہاد بھی موجود ہے۔ مدیر اخبار نے اس فتویٰ کی سرخی یہ دی ہے۔ نقل استفتاء از اخبار الظفر دہلی اردو۔

۱۸۴۔ مرتب و شائع کردہ ادبی پبلشرز شعبہ اشاعت انجمن اسلام بمبئی۔ ضمیر ص ۸

۱۸۵۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۷۵۔

۱۸۶۔ ایضاً ص ۶۷۷

۱۸۷۔ ایضاً ص ۶۸۶

۱۸۸۔ فتویٰ الشیخ ۱۲۶۷ھ مدفون فی مقبرۃ الامام ولی اللہ الدہلوی۔ سیاسی تحریک ص ۱۸۲

۱۸۹۔ ابو ظفر بہادر شاہ از مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی، ص ۳۱۔

۱۹۰۔ اسباب بغاوت ہند ص ۸۔

۱۹۱۔ ایضاً ص ۸

۱۹۲۔ ایضاً

۱۹۳۔ اسباب بغاوت ہند ص ۸۔

۱۹۴۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۷۶۔

۱۹۵۔ شاہی خاندان کی بدکرداری جو اس درجہ رسوائے عالم ہو چکی تھی کہ بقول شمس العلماء ذکاء اللہ خاں مشرق میں جس قدر برائیاں

ہیں وہ سب اس قلعہ میں موجود تھیں۔ شہر کے معتدل اور متبرک آدمی کہا کرتے تھے کہ اگر کسی مکان میں قلعہ کی اینٹ بھی لگ جائے تو اس میں رہنا حرام ہے (تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۳۷۹) جب اس بدکرداری پر نظر پڑتی ہے تو فوراً قرآن پاک کی آیت ذہن میں آجاتی ہے۔ و اذا اردنا ان نهلک قریۃ الخ

۱۹۶۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۳۷۸

۱۹۷۔ تاریخ بغاوت ہند ص ۲۰۰

۱۹۸۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۶۷۵

۱۹۹۔ سلطان محمود غزنوی کے باپ۔

۲۰۰۔ یہ اقتباس خواجہ صاحب کی مشہور تصنیف "دلی کی جان کنی" سے ماخوذ ہے جو ۱۹۲۲ء میں لکھی گئی تھی۔ ملاحظہ ہو دیباچہ ص ۲۔

۲۰۱۔ دلی کی جان کنی ص ۳۳ و ۳۴

۲۰۲۔ داستان غدر ص ۱۱۳۔

۲۰۳۔ داستان غدر ص ۱۱۰ تا ص ۱۱۳۔

۲۰۴۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۷۱۱۔

۲۰۵۔ داستان غدر ص ۳۷۔ ان کے علاوہ تباہ ہونے والے بازاروں میں فیض بازار اور اردو بازار کے نام بھی لئے گئے ہیں جو اسی علاقہ میں تھے۔

۲۰۶۔ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص ۷۲۰۔

۲۰۷۔ تاریخ عروج انگلیشیہ ص ۷۱۷۔

۲۰۸۔ چند سال تک پامال کرنے کے بعد جب انگریزی فوج کا رسالہ یہاں سے منتقل ہوا تو بیکری اور کچن وغیرہ کی حیثیت ختم کر کے پھر مسجد کی اصل صورت بحال کی گئی سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ سابق صدر جمعیۃ علماء ہند کو اس مسجد سے بے حد انس تھا۔ کیونکہ ان کے والد ماجد نے اسی مسجد کی ایک کچن چی کو اپنا نشیمن بنالیا تھا۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ کے بچپن کا ایک حصہ اسی مسجد میں گزرا تھا۔ پھر یہ مسجد آثار قدیمہ کی فہرست میں داخل ہوگئی۔

۲۰۹۔ دریا گنج میں ہونے کے سبب سے اس مسجد پر دوسری افتاد تقسیم ہند کے زمانہ (۱۹۴۷ء) میں پڑی۔ جب اس علاقہ میں مسلمانوں کے خلاف اشتعال کے شعلے بھڑکے تو اس مسجد میں شرنارتھیوں کے بہت سے خاندان آباد ہوگئے۔ تقریباً چار سال بعد مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جو سنی مجلس اوقاف کے چیئرمین بھی تھے بہت مشکل سے اس مسجد کو خالی کرا کر پھاٹک بند کرادیا اور آمد و رفت کے لئے غربی جانب ایک چھوٹا سا دروازہ باقی رکھا۔ لیکن چونکہ آس پاس کئی کئی فرلانگ تک کوئی مسلمان اس علاقہ میں نہیں تھا، کچھ دنوں میں یہ مسجد ویران پڑی رہی۔ پھر جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے یہاں دینی تربیتی مرکز قائم کیا گیا۔ محلہ چوڑی والان کے ایک مشہور صاحب خیر حاجی زین العابدین نے کئی سو روپیہ صرف کر کے بجلی کی فٹنگ کرائی اور بیت الخلاء تیار کرائے۔ مراد آباد کے مشہور بزرگ حضرت مولانا مظفر الدین صاحب کی مدد سے کئی ہزار روپیہ صرف کر کے اس کی ایک جانب کی گیلریاں درست کرائی گئیں۔ الحمدللہ اب یہ مسجد آباد ہے۔

۲۱۰۔ سیرت سید احمد شہید ص ۸۷۔

۲۱۱۔ ایضاً ص ۸۹

۲۱۲۔ محترم غلام رسول صاحب مہر کا ارشاد ہے۔ تنظیم جہاد کا کاروبار اسی مسجد میں بیٹھ کر شروع کیا تھا۔ سرگزشت مجاہدین ص ۱۳۷۔

۲۱۳۔ ایضاً۔

۲۱۴۔ ایڈورڈ کا یہ جلسہ ۱۹۱۱ء میں قائم کیا گیا مگر اس کی تیاریاں بہت پہلے سے تھیں (ملاحظہ فرمایئے واقعات دارالحکومت دہلی جلد ۲)۔ ایک روایت یہ ہے کہ ایک لاکھ مکان منہدم کئے گئے (دہلی کی سزا ص ۳۷)۔

۲۱۵۔ آثار الصنادید از سرسید مرحوم و واقعات دار الحکومت دہلی از بشیر الدین احمد صاحب۔

۲۱۶۔ تذکرہ اہل دہلی ص ۵۹

۲۱۷۔ سرسید آثار الصنادید میں تحریر فرماتے ہیں۔ شاہجہانی عہد سے زیر جامع مسجد مدرسہ دار البقاء چلا آرہا تھا۔ وہ سلطنت کی تباہی کے ساتھ برباد ہوا۔ مفتی صاحب نے اپنے روپے سے دوبارہ بنوادیا۔ عمارت درست کرائی۔ درس و تدریس کا اہتمام کیا۔ اساتذہ اور طلبہ کو اپنے پاس سے تنخواہ اور وظیفہ دیتے۔ مفتی طلباء کو عدالت کے کام سے فارغ ہو کر اسباق خود پڑھاتے۔ اور تعطیل کے دن سب کو لے کر باغات کی سیر کراتے اور لذیذ کھانے کھلاتے تھے۔

۲۱۸۔ محض خدا کا فضل یا سفارشوں کا اثر کہئے کہ پھانسی سے محفوظ رہے ورنہ ہزاروں بے قصور معمولی شبہ پر اور بہت سے محض تفریحاً تختۂ دار پر لٹکا دیئے گئے۔

۲۱۹۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے اپنی عجیب و غریب تصنیف ''دلی کی آخری شمع'' میں تحریر کیا ہے۔ چتلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے مفتی صدر الدین صاحب کا مکان تھا۔ اس کے نزدیک مٹیا محل میں نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ رہتے تھے۔ مکان کوٹھی کے نمونہ کا ہے۔ انگریزی اور ہندوستانی دونوں وضع کو ملا کر بنایا گیا۔ صحن بہت بڑا نہیں۔ اس میں مختصر سی نہر ہے۔ سامنے دالان در دالان اور پہلو میں انگریزی وضع کے کمرے ہیں۔ دالانوں سے ملا ہوا اونچا صحن چبوترہ ہے۔ چبوترہ کے اوپر تخت بچھے ہوئے تھے۔ ان پر چاندنی کا فرش اور دو طرف گاؤ تکیے لگے ہوتے تھے۔ مفتی صاحب کی عمر کوئی ۵۶ سال کی تھی۔ گداز جسم، سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں ذرا اندر دھنسی ہوئی، بھری ہوئی داڑھی بہت سیدھی سادی وضع کے آدمی تھے۔ ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں بدن میں سفید ایک برکا انگرکھا، سفید پاجامہ، سفید کرتا اور سفید ہی عمامہ تھا (حاشیہ میں تحریر ہے) پرانے زمانے میں شرفاء گھر پر بھی پورا لباس پہنے رہتے تھے۔ زنانے میں جانے کے خاص خاص وقت تھے۔ ورنہ سارا وقت مردانے میں ہی گزرتا تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ملنے جلنے والا پاس بیٹھا رہتا تھا۔ عالم ہوتے تو درس کا حلقہ ہوتا۔ شاعر ہوتے تو شعر کا چرچا ہوتا۔ غرض کوئی وقت بیکار نہ گزرتا۔ خاص خاص دوستوں سے مذاق کی گفتگو ہوتی، ورنہ عام طور پر اپنے کو بہت سمیٹے رہتے تھے۔ جہاں جاؤ یہی معلوم ہوتا تھا کہ دربار لگا ہوا ہے۔ ہر شخص دو زانو مودب بیٹھا ہے۔ بے ضرورت نہ بات کی جاتی ہے نہ جواب دیا جاتا ہے۔ کوئی ہنسی کی بات ہوئی، ذرا مسکرا دیئے۔ کھلکھلا کر ہنسنا معیوب اور بڑھ بڑھ کر بولنا یا اونچی آواز میں بات کرنا خلاف ادب سمجھا جاتا تھا۔ (ص ۳۹، ۴۰ دہلی کی آخری شمع)۔

۲۲۰۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مفتی صاحب محکمۂ نزول کے کام میں اتنے مشغول ہوئے کہ درس کے لئے کوئی وقت نہ نکال سکے۔ کئی دن تک درس بند رہا۔ ایک منچلے طالب علم نے ایک نظم لکھ کر مفتی صاحب کے پاس بھیج دی۔ نظم کا آخری شعر یہ تھا ع

ہاتف بہ مست جیب سرِ بیخودی فشرد و گفت ——— بیماری نزول بہ صدر الصدور شد

(غدر کے چند علماء ص ۳۹)

۲۲۱۔ اس دور کو کمپنی کی نادرگردی کا دور کہنا چاہیے کہ نہ کوئی آئین تھا نہ آئین ساز مجلس۔ اظہار رائے کی معمولی آزادی بھی سلب کی جا چکی تھی۔

۲۲۲۔ مولانا شاہ احمد اللہ صاحب کے حالات میں ان غداریوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

۲۲۳۔ روزنامچہ منشی جیون لال اردو ص ۲۱۲۔

۲۲۴۔ لال قلعہ کی ایک جھلک از ناصر نذیر فراق ص ۳۷ بحوالہ ''بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد''

۲۲۵۔ روزنامچہ منشی جیون لال۔

۲۲۶۔ ایضاً روئداد ۱۲ اگست

۲۲۷۔ لوگوں کا قاعدہ ہے کہ اہل کمال کے متعلق کچھ قصے کہانیاں گھڑ لیا کرتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب اس دردِ تحریک سے وابستہ رہتے ہوئے سزائے موت یا سزائے عبور دریائے شور سے محفوظ رہے۔ یہ بہت ہی عجیب و غریب واقعہ ہے۔ مؤرخین کو اس

پر حیرت ہے۔ غالباً اسی بناء پر ایک افسانہ گھڑ لیا گیا کہ حضرت مفتی صاحب کی ذکاوت و ذہانت نے دستخط کے وقت بھی تاریک پہلو سامنے رکھ کر تحفظ کی صورت پیدا کر لی تھی کہ آپ نے فتوے پر دستخط کئے تو یہ بھی لکھ دیا کہ ''شہدت بالجبر''۔ فتویٰ لینے والوں نے تو یہ سمجھا کہ آپ نے ''شہدت بالخیر'' لکھا ہے (یعنی میں نے خیر کے ساتھ گواہی دی) اور اسی کو ''بالجبر'' پڑھا جاتا تو اس کا مفہوم یہ ہوتا کہ میں نے مجبوراً شہادت دی۔ چنانچہ جب مقدمہ چلا تو مفتی صاحب نے بتایا کہ ''شہدت بالجبر'' لکھا ہے، اور مطلب یہ ہے کہ جبر و قہر کی بناء پر اس فتویٰ کی تصدیق کر دی ہے۔ ظاہر ہے یہ افسانہ سراسر غلط ہے۔ کیونکہ دستخطوں کے متعلق بالفرض عذر مان بھی لیا جاتا، تو اس کا کیا جواب تھا کہ مفتی صاحب بہادر شاہ کی حکومت کے ایک رکن اور اعلیٰ عہدہ دار رہے تھے۔ ان کا دیوان خانہ مجاہدین کی پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔ علاوہ ازیں افسانوی طور پر تو یہ ممکن ہے کہ فتویٰ کی تصدیق و تائید کے لئے ''شہدت بالخیر'' لکھ دیا جائے۔ مگر جہاں تک ادبی ذوق اور اصحاب فتویٰ کے محاورات و اصطلاحات کا تعلق ہے، یہ لفظ قطعاً بے محل اور بے ربط ہے۔ مفتی صاحب جیسا ماہر ایک زبان کا ادیب اس بے محل اور بے موقع لفظ کو استعمال نہیں کر سکتا تھا، اور نہ فتوے پر دستخط کرنے والوں کا ذوق اس قدر ناقص اور معدوم تھا کہ وہ اس لفظ کو برداشت کر لیتے اور مفتی صاحب سے اس کی تصحیح کا مطالبہ نہ کرتے۔ پھر کسی تاویل و توجیہ سے ''شہدت بالجبر'' مان بھی لیا جائے تو شہادت بالجبر کا وہاں موقع کہاں تھا؟ متعدد علماء وہ تھے جنہوں نے اس فتوے پر دستخط نہیں کئے تھے اور وہ اس قیامت خیز دور میں بھی تحریک کے مخالف ہوتے ہوئے دہلی میں رہے۔ انہوں نے فتوے پر دستخط نہیں کئے، اور نہ اُن کو مجبور کیا گیا۔

بے شک سرسید اور شمس العلماء نے ضرور لکھا ہے کہ کچھ علماء سے جبراً دستخط لئے گئے مگر ان دونوں کی تصنیفیں اس وقت کی ہیں، جب ۱۸۵۷ء کو ختم ہوئے کئی سال گزر چکے تھے، اور اب ہمدردان ملت کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کو انگریزوں کا وفادار ثابت کریں، اور یہ ظاہر کریں کہ جو کچھ ہوا، اُس کی ذمہ دار انقلابی فوج تھی، جو ختم ہو چکی ہے اور جس کے افسر اور راہنما مارے جا چکے ہیں یا فرار ہو گئے ہیں۔ ان سب کے علاوہ نہایت ہی واضح بات یہ ہے کہ یہ فتویٰ جس اخبار میں پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا، اُس کا عکس شائع ہو چکا ہے۔ اس میں مفتی صاحب کا صرف نام لکھا ہوا ہے۔ اس مفروضہ عبارت کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔

۲۲۸۔ غدر کے چند علماء۔ از مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی۔

۲۲۹۔ ایضاً ص ۸۲

۲۳۰۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۸۱

۲۳۱۔ آثار الصنادید۔

۲۳۲۔ نواب مرتضیٰ خاں، نواب محمد خاں بنگش رئیس فرخ آباد کے نبیرہ تھے۔ پہلے فرخ آباد ہی میں رہتے تھے۔ عرصہ تک مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر کی فوج میں ممتاز عہدہ پر فائز رہے۔ مہاراجہ جسونت راؤ اور نواب امیر علی خاں والیٔ ٹونک کا جب ''لارڈ لیک'' سے مقابلہ ہو رہا تھا تو نواب مرتضیٰ خاں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور پھر آپ ہی کی موقع شناسی اور اصابت رائے کی بدولت صلح ہوئی۔ اس اثناء میں لارڈ لیک کو نواب مرتضیٰ خاں کے جوہر قابل ہونے کا تجربہ ہوا۔ تو پلول (جو دہلی سے ۳۵ میل گوڑگانوہ ضلع کی تحصیل ہے) کا علاقہ نواب صاحب کے حوالہ کر دیا۔ جس کا سالانہ محصول تین لاکھ روپیہ تھا۔ ۱۸۱۴ء میں آپ نے جہانگیر آباد کا علاقہ جو پہلے راجہ گھودس رائے کی ملکیت تھا، اور مال گزاری ادا نہ ہو سکنے کے باعث نیلام ہو رہا تھا، نواب مصطفیٰ خاں صاحب کے نام پر خرید لیا۔ نواب صاحب کی رحلت کے بعد پلول کا علاقہ گورنمنٹ نے واپس لے لیا، اور اس کے عوض اراکین خاندان کی پنشن کر دی، جو ہنگامہ ۱۸۵۷ء تک جاری رہی۔ (بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد ص ۳۸۱)۔

۲۳۳۔ میاں جی الا مالی، دہلی کے مشہور استاد تھے۔ شیفتہ صاحب نے فارسی، عربی انہیں سے پڑھی۔

۲۳۴۔ باطنی خوبیوں کے ساتھ ظاہری خوبیوں میں بھی آپ کو فوقیت نصیب ہوئی۔ بقول مرزا فرحت اللہ بیگ (مصنف دہلی کی آخری شمع) جامہ زیبی میں حکیم مومن خاں کے بعد دہلی میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ہی کا نمبر تھا۔ ان کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ لیکن ناک ونقشہ غضب کا پایا تھا۔ اس پر چھوٹی سیاہ گول داڑھی بہت ہی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جسم کسی قدر بھاری اور قد متوسط

تھا۔ لباس میں بھی زیادہ تکلف نہیں تھا۔ تنگ مہری کا سفید پاجامہ، سفید کرتہ، نیچی چولی کا سفید انگرکھا اور قبہ نما چوگوشہ ٹوپی۔ یہ آپ کا حلیہ اور آپ کی وضع قطع تھی۔

۲۳۵۔ مصیبت پر جزع فزع نہ کرنا عوام کا صبر ہے۔ راضی برضا رہنا خواص کا صبر، اور مصیبت سے لطف اندوز ہونا اخص الخواص کا صبر ہے۔

۲۳۶۔ آثار الصنادید ص ۹۸۔

۲۳۷۔ بحوالہ دلی کالج اردو میگزین نمبر۔ قدیم دلی کالج نمبر ۱۸۵۳ء ص ۶۸

۲۳۸۔ اگر غلہ کے نرخ کو معیار قرار دیا جائے تو اُس وقت کے سو روپیہ آج کل کے سولہ سو روپے ہوں گے کیونکہ اس وقت ایک روپیہ من گیہوں تھا اور آج کل سرکاری نرخ سے سولہ روپے من اور غیر سرکاری دکانوں پر چھتیس روپیہ من تک گیہوں مل رہا ہے۔

۲۳۹۔ مرحوم دلی کالج ص ۱۳۹۔

۲۴۰۔ دلی کالج اردو میگزین۔

۲۴۱۔ دلی کی آخری بہار ص ۷۸ و ۹۷

۲۴۲۔ ملاحظہ ہو "دلی کی جان کنی" مصنفہ خواجہ حسن نظامی مرحوم۔

۲۴۳۔ استاذ العلماء مولانا مملوک علی صاحب نے بھی اسی محلہ میں مکان لیا تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند زمانہ طالب علمی اور اس کے بعد جب تک دہلی میں رہے اسی محلہ میں قیام فرما رہے۔ مفتی اعظم ہند حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب نے بھی اسی محلے میں مکان بنایا تھا اور دور حاضر کے مشہور عالم سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب سابق صدر جمعیت علماء ہند کا مکان بھی اسی محلہ کے ایک کوچہ (کوچہ ناہرخاں) میں ہے۔ ؁

۲۴۴۔ داستان غدر ص ۱۲۸

۲۴۵۔ مفتی انتظام اللہ شہابی

۲۴۶۔ اختر چغتائی ۲۱-احمد نگر جلی کوٹھی میرٹھ بحوالہ سنڈے ایڈیشن الجمعیۃ

۲۴۷۔ انفاس العارفین و شاندار ماضی جلد دوم

۲۴۸۔ قصبہ جانسٹھ ضلع مظفر نگر آج کل بھی سادات بارہ کا مرکزی قصبہ سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ اس وقت ایک پس ماندہ قصبہ ہے جس کو ریلوے لائن بھی نصیب نہیں۔

۲۴۹۔ مولانا سید عبدالحی صاحب مصنف ارمغان احباب و نزہۃ الخواطر وغیرہ ہمارے زمانے کے مشہور عالم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب کے والد ماجد

۲۵۰۔ ۱۳۱۴ھ میں۔

۲۵۱۔ ارمغان احباب بحوالہ سید احمد شہید مصنفہ سید ابوالحسن علی ص ۱۱۱۔

۲۵۲۔ متوفی ۱۱۱۲ھ شاہ بھیک متوطن گھیکہ میران جی ضلع انبالہ جو محمد شاہ بادشاہ کے وزیر روشن الدولہ کے پیر تھے۔ وہ انہیں حضرت شاہ ابوالمعالی کے خلیفہ تھے۔ دوسرے مشہور خلیفہ حضرت شاہ مدار صاحب تھے جو حضرت شاہ ابوالمعالی کے جانشین ہوئے اور انبیٹھ ہی میں ساری عمر گزاری اور یہیں ان کا مزار ہے۔ (تذکرۃ الکلیل ص ۶۰۵)

۲۵۳۔ ۱۹۲۸ء میں ہندوستان میں سائمن کمشن آیا تھا۔ اس کے بائیکاٹ سے کانگریس کی تحریک آزادی میں جو ۱۹۲۲ء کے بعد سرد پڑ گئی تھی، دوبارہ گرمی آئی اور ۱۹۲۹ء میں لاہور میں انڈین نیشنل کانگریس نے مکمل آزادی کی تجویز پاس کی۔ جس کی حمایت کرتے ہوئے ۱۹۳۱ء میں بازار قصہ خوانی کا مشہور واقعہ پیش آیا۔ جس میں تقریباً ایک ہزار سرحدی پٹھان (خدائی خدمت گار) بیک وقت برطانوی فوج اور پولیس کی فائرنگ سے شہید ہوئے۔ سائمن کمشن سے کچھ پہلے ۲ دسمبر ۱۹۲۷ء، ۶ جمادی

الاول ۱۹۳۶ء پشاور میں جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس حضرت علامہ مولانا سید انور شاہ صاحب کی زیر صدارت ہوا تھا۔ آپ نے اس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمایا تھا۔ "آزادی عطا نہیں کی جاتی بلکہ وہ طاقت و ہمت سے حاصل کی جاتی ہے ص ۳۳۔ اگر ہندوستان اپنی زندگی اور موت کا فیصلہ دوسروں سے کرانا چاہتا ہے۔۔۔ تو ابھی اس نے آزادی اور غلامی کے مفہوم ہی کو نہیں سمجھا۔ (ص ۳۵ و ۳۶)

۲۵۴۔ منشی ذکاء اللہ خاں صاحب نے ۱۸۵۷ء کے بعد اگرچہ وہ پالیسی اختیار کی جس کے نتیجہ میں اُن کو انگریزی سرکار نے شمس العلماء کا خطاب دیا۔ مگر اس علاقہ کی جماعت سے جو ہمدردی ان کو شروع میں تھی غالباً وہ آخر تک اس کو ختم نہیں کر سکے۔ منشی ذکاء اللہ خاں صاحب دلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ جہاں حضرت مولانا مملوک علی صاحب نے مدرس اور صدر مدرس کی حیثیت سے اپنی زندگی ختم کی تھی۔ تھانہ بھون کی اس جماعت کے تمام بزرگ اور رہنما مولانا مملوک علی صاحب کے شاگرد اور ان کے عزیز و قریب تھے۔ یعنی شمس العلماء کے ہم سبق و شریک جماعت اور دوست احباب شمس العلماء کی یہ کتاب اگرچہ ۱۸۵۷ء سے تقریباً پندرہ سال بعد طبع ہوئی ہے جب کہ ۱۸۵۷ء کے مقدمات کی مسلیں داخل دفتر ہو چکی ہوں گی۔ مگر دوسری تحریک یعنی علمائے صادق پور کی زیر قیادت وہابی تحریک کے اثرات شد و مد سے پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے شکوک و شبہات کا دور باقی تھا۔ اس علاقہ کے بزرگ خاص مقاصد کے پیش نظر ایک عظیم الشان ادارہ دیوبند میں قائم کر چکے تھے۔ اور دوسری طرف انہیں حضرات نے حجاز مقدس میں بساط سیاست بچھا رکھی تھی۔ اور یہیں مولانا رحمت اللہ قسطنطنیہ پہنچ کر ترکی سلطان کے یہاں اعتماد حاصل کر چکے تھے۔ ان وجوہات کی بناء پر شمس العلماء نے اس پوری جماعت کے تذکرہ کو قصداً نظر انداز کیا اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے متعلق بھی جو باتیں لکھیں، وہ ان واقعات کے خلاف تھی جو بعد میں نمودار ہوئے۔ اس طرح تاریخ کے حق میں ایک کوتاہی ضرور ہوئی مگر جماعتی مفاد کے پیش نظر اس کوتاہی کا ارتکاب قرین مصلحت اور نہایت ضروری تھا۔ محمد میاں

۲۵۵۔ جو صاحب حالات سے ذاتی طور پر واقفیت رکھتے ہیں انہیں اس بات کو تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہوگا کہ شمس العلماء ذکاء اللہ خاں اور اسی طرح دوسرے مؤرخین نے صرف انہیں کے نام لئے ہیں جو مر چکے تھے یا کسی طرح گرفت میں آ چکے تھے۔ اور جو لوگ محفوظ رہ گئے تھے ان کو قصداً یا لاعلمی کی بناء پر نظر انداز کر دیا۔ اور تحقیق کی جائے تو صرف تھانہ بھون کے بزرگ ہی نہیں، بلکہ ایسے افراد کی تعداد بہت زیادہ ملے گی جن کے نام نہیں لئے۔

۲۵۶۔ قاضی صاحب کے حالات ص ۵۴۳ پر ضمیمہ میں ملاحظہ فرمایئے۔

۲۵۷۔ تذکرۃ الرشید جلد اول ص ۷۴

۲۵۸۔ تذکرۃ الرشید جلد اول ص ۷۶۔ اس کے بعد مولانا عاشق الٰہی صاحب ان بزرگوں کی صفائی میں رقم طراز ہیں۔ "حالانکہ یہ کمل پوش، فاقہ کش، نفس کش حضرات فسادوں سے کوسوں دور رہتے تھے۔ ملک و مال کے جھگڑے اگر سر رکھتے تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی۔ کوئی کہیں کا ڈپٹی ہوتا اور کوئی کہیں کا صدر الصدور۔ کچہری کے عالی شان کمرے اور عدالت کے وسیع اور اونچی چھتوں والے مکانات کو چھوڑ کر قبر کی تنگی یاد دلانے والے حجروں اور کھرے بوریے کے فرش والے تاریک گوشوں میں کیوں پڑتے۔ مگر

کون سنتا ہے کہانی میری　　　اور پھر وہ بھی زبانی میری

(تذکرۃ الرشید جلد اول ص ۷۶)

۲۵۹۔ والدین کا رکھا ہوا نام امداد حسین تھا اور جب آپ ۱۲۶۰ھ میں جب کہ عمر تقریباً ۲۷ سال تھی، حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے تو حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحبؒ نے آپ کا نام بدل کر امداد اللہ رکھ دیا۔ (التمہید بحوالہ سیاسی تحریک ص ۱۸۳)

۲۶۰۔ روز چہار شنبہ ۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۷ھ تاریخ وفات ہے۔ عمر ۸۴ سال تین ماہ بیس دن (ضمیمہ جدیدہ کرامات امدادیہ از حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ) اس حساب سے تاریخ ولادت ۲۲ صفر ۱۲۳۳ھ (۲ جنوری ۱۸۱۸ء) ہوگی۔ دو سال پہلے ۱۲۳۱ھ میں حضرت سید احمد شہیدؒ اس علاقہ کا دورہ فرما چکے تھے۔

۲۶۱۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے آپ کے اساتذہ شیخ محمد قلندر اور شیخ الٰہی بخش کاندھلویؒ کا نام بھی لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں اخذ عن الشیخ محمد قلندر والشیخ الٰہی بخش الکاندھلوی واخذ عن الشیخ نصیر الدین الدھلوی (التمہید بحوالہ سیاسی تحریک ص ۱۸۳)

۲۶۲۔ خود حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے۔ ہم نے ایک باب اور دیباچہ گلستان کا اور ایک باب بوستاں کا اور کچھ مفید نامہ اور کچھ دستور المبتدی اور چند ورق زلیخا کے پڑھے تھے۔ اور حصن حصین حضرت قلندر صاحب سے پڑھی۔ بعد میں شوق ورد و وظائف کا ہوا، اور دہلی میں آ کر حضرت شاہ نصیر الدین دہلوی سے بیعت کی۔ بعد ان کے وصال کے پھر کسی کامل کی جستجو ہوئی (کرامات امدادیہ ص ۸)۔

۲۶۳۔ چنانچہ نوجوان امداد اللہ نے جس طرح مولانا نصیر الدین صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا، ہی پارہ دل کے اوراق بھی اسی اُستاد کے سامنے کھول کر رکھ دیئے۔ یہ تلمذ اور یہ بیعت جس جذبہ اور اخلاص کے ساتھ ہوئی تھی، اس کا اندازہ خود آپ کے ایک بیان سے ہوتا ہے، جس کے راوی حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی ہیں۔ مولانا تھانوی اپنے رسالہ کرامات امدادیہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ آپ نے (حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے) فرمایا کہ ظاہر میں اول بیعت میری طریقہ نقشبندیہ میں حضرت نصیر الدین صاحب دہلوی خلیفہ حضرت شاہ محمد آفاق صاحب سے ہوئی اور باطن میں بلا واسطہ خود رسول اللہؐ سے اس طرح ہوئی کہ میں نے دیکھا کہ حضورؐ ایک بلند جگہ پر رونق افروز ہیں اور حضرت سید احمد شہیدؒ کا ہاتھ آپ کے دست مبارک میں ہے، اور میں بھی اسی مکان میں بوجہ ادب کے دور کھڑا ہوں۔ حضرت سید صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر حضورؐ کے ہاتھ میں دے دیا۔

ایک اور روایت بھی ملاحظہ فرمالیجیے تاکہ حضرت حاجی صاحب کے سلسلۂ بیعت کی پوری پوری تفصیل سامنے آ جائے۔ حضرت مولانا تھانویؒ، مولانا عبدالغنی صاحب "عظیم آبادیؒ" کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت حاجی صاحبؒ نے خواب میں دیکھا کہ مجلس اعلیٰ واقدس سرور عالم مرشد اعظمؐ میں حاضر ہوں۔ غایت رعب سے قدم آگے نہیں بڑھتا ہے کہ ناگاہ میرے جد امجد حضرت حاجی حافظ بلاقی صاحبؒ تشریف لائے اور میرا ہاتھ پکڑ کر حضور نبویؐ میں پہنچا دیا اور آنحضرتؐ نے میرا ہاتھ پکڑ کر حوالہ ایک بزرگ کے کر دیا اور اس وقت تک بعالم ظاہر حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی سے ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی اور کسی طرح کا تعارف بھی نہیں تھا۔ حاجی صاحب بیان فرماتے ہیں کہ جب میں بیدار ہوا، عجیب انتشار و حیرت میں مبتلا ہوا کہ یا رب یہ کون بزرگوار ہیں، کہ آنحضرتؐ نے میرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا اور خود مجھ کو ان کے سپرد فرما دیا اسی طرح کئی سال گزر گئے۔ ایک دن حضرت اُستاذی مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی، نے میرے اضطرار کو دیکھ کر بکمال شفقت و عنایت فرمایا کہ تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ موضع لوہاری یہاں سے قریب ہے، وہاں جاؤ اور حضرت میاں نور محمد صاحب سے ملاقات کرو شاید مقصود دلی کو پہنچو اور اس حیص بیص سے نجات پاؤ۔ چنانچہ میں نے فوراً پیادہ لوہاری کی راہ لی۔ آستانہ شریف پر حاضر ہوا، اور جیسے ہی جمال باکمال جناب شان (حضرت میاں نور محمد صاحب) ملاحظہ کیا۔ صورت انور کو خواب میں دیکھا تھا، بخوبی پہچانا۔ اور محو و از خود رفتہ ہو کر قدموں میں گر پڑا۔ حضرت میاں جی صاحب نے میرا سر اُٹھایا اور سینہ نور گنجینہ سے لگا لیا اور بکمال رحمت و عنایت فرمایا کہ تم کو اپنی خواب پر کامل وثوق و یقین ہے یہ حضرت میاں جی صاحب کی پہلی کرامت تھی جس نے میرے دل میں ان کی محبت مستحکم کر دی۔ (ص ۲۵، ۲۴ کرامات امدادیہ) کرامت یہ ہے کہ ملاقات ہوتے ہی خواب پر تبصرہ فرما دیا حالانکہ اس سے پہلے اس کا کوئی تذکرہ نہیں آیا تھا۔ مختصر یہ کہ حضرت حاجی صاحب نے پہلے بیعت حضرت سید نصیر الدین صاحب سے کی تھی۔ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد حضرت میاں جی نور محمد صاحب سے طریقہ چشتیہ میں بیعت کی۔ آپ کی زیر تربیت مراحل سلوک طے کر کے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

۲۶۴۔ آپ نے رواج کے مطابق درسی کتابوں کی تکمیل نہیں کی تھی۔ مگر مطالعہ سے آپ نے وسیع معلومات حاصل کر لی تھیں۔ احادیث پر آپ کی نظر بہت وسیع تھی۔ اور اسرار شریعت و طریقت کے ماہر تھے۔ جیسا کہ آپ کی تصانیف اور آپ کے ارشادات سے جو کمالات امدادیہ وغیرہ میں نقل کیے گئے ہیں، معلوم ہوتا ہے۔ (ملاحظہ ہو کرامات امدادیہ کرامت ص ۳۸)

۲۶۵۔ مولانا مملوک علی جن کے متعلق سر سید صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ آپ کو علم معقول و منقول میں استعداد کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینۂ عالم خالی ہو جائے تو اُن کے لوح حافظہ سے پھر اُن کی نقل ممکن ہے (آثار الصنادید) ان کا اصل وطن قصبہ نانوتہ (ضلع سہارن پور) ہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت قاسم بن محمد ابن ابی بکر صدیقؓ سے وابستہ ہے۔ آپ سے چار پشت اوپر آپ کے مورث جناب شیخ محمد ہاشم صاحب رحمہ اللہ نانوتہ تشریف لائے تھے۔ سلطان عالمگیرؒ کی طرف سے آپ کو یہاں جاگیر بھی دے دی گئی تھی۔ آپ کے اساتذہ میں حضرت مولانا رشید الدین صاحب، (شاگرد رشید حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہم) کا اسم گرامی خاص طور پر مستحق تذکرہ ہے۔ عرصہ دراز تک دہلی کی عربی یونیورسٹی میں جو اُس وقت مدرسہ شاہجہان آباد یا مدرسہ غازی الدین کہلاتا تھا عربی علوم و فنون کا درس دیتے رہے۔ پھر یہاں شعبۂ عربی کے صدر بنا دیئے گئے۔ اس دور کے بلند پایہ فضلاء اور علماء زیادہ تر آپ ہی کے شاگرد تھے۔ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی۔ امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سر سید احمد صاحب، (بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب دہلی (صاحب ترجمہ)۔ شمس العلماء ذکاء اللہ خاں صاحب اور آپ کے فرزند رشید حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جو دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس بنائے گئے جو اپنے والد ماجد کی طرح علوم عقلیہ و نقلیہ کے بہترین فاضل اور جامع ترین شخصیت تسلیم کئے جاتے تھے۔ تقویٰ، طہارت اور تزکیۂ باطن میں بھی آپ کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ چنانچہ آپ جس طرح فقیہ شریعت تھے ایسے ہی شیخ طریقت بھی تھے۔ یہ سب آپ کے شاگرد تھے۔ مولانا مملوک علی صاحب کا چونکہ مستقل قیام دہلی میں رہتا تھا، اس لئے آپ نے کوچہ چیلاں میں مکان بھی خرید لیا تھا۔ سرکاری درسگاہ میں سالہا سال ملازم رہنے کے باوجود انگریز سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ ریذیڈنٹ بہادر مدرسے کے معائنہ کو آئے تو آپ کے علم اور رتبے کے خیال سے ہاتھ ملایا۔ جب تک صاحب بہادر وہاں رہے تو مولانا نے ہاتھ کو جسم سے اس طرح الگ رکھا جیسے کوئی نجس چیز کو دور رکھتا ہے۔ صاحب کے جاتے ہی بہت احتیاط سے جسم کو بچا کر ہاتھ دھویا۔ (دہلی کی آخری شمع از مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب فرحت دہلوی) ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۰ء) میں آپ نے دہلی میں وفات پائی اور مہدیوں میں (جہاں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور اُن کے فرزندان گرامی کے مزارات ہیں) آپ دفن کئے گئے۔ (سوانح قاسمی، جلد اوّل۔ سیاسی تحریک۔ آثار الصنادید۔ دہلی کی آخری شمع وغیرہ)۔

۲۶۶۔ مولانا قطب الدین صاحب خلف نواب غلام محی الدین خاں بہادر ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۳ء) میں پیدا ہوئے۔ ۹ نومبر ۱۸۴۲ء، ذی الحجہ ۱۲۶۲ھ کو والد کی جگہ آپ کو بہادر شاہ بادشاہ نے خلعت اور خطاب عطا فرمایا۔ اب پورا نام یہ ہو گیا۔ فخر الاسلام نواب محمد قطب الدین خاں بہادر۔ آپ کے متعلق سر سیدؒ تحریر فرماتے ہیں۔ تحصیل علم و فضل خصوصاً فقہ و حدیث خدمت بابرکت مولانا اسحاق صاحب مرحوم و مغفور سے کی۔ اتباع شریعت میں سب پیش روان مسلک دین سے آپ کا قدم آگے بڑھا ہوا ہے۔ وضع اور لباس میں اپنے استاد عالی نہاد سے ایسے مشابہ ہیں کہ جس نے اُن کو نہ دیکھا ہو ان کو دیکھ لے۔ اخلاق و علم کے علاوہ فضل و کمال علمی ایسا آپ کی ذات میں جمع ہے کہ اوروں میں بہت کم پایا گیا۔ تقویٰ اور ورع (پرہیزگاری) کا تو حساب ہی نہیں۔ آپ کے اجداد والا تبار عالی خاندان والا دودمان ہمیشہ پیش گاہ سلطنت سے مناصب جلیلہ رکھتے تھے۔ اب اس جزو زمان میں بھی آپ کو تقرب حضرت سلطانی سے وہ عزت و جاہ حاصل ہے جو چاہیے۔ چوتھے دن اپنے اُستاد کی پیروی اور خلق کی رہنمائی کے لئے مجلس وعظ منعقد فرماتے ہیں۔ اکثر رسائل زبان ریختہ میں (اُردو میں) فوائد عوام کے لئے تحریر کئے اور ان میں مسائل ضروریہ ہر طرح کے مندرج فرمائے۔ اور حق یہ ہے کہ ان رسالوں سے خلق کو بہت فائدہ ہوا کہ ضروریات دین سے ہر شخص مطلع اور آگاہ ہو گیا السلھم زد فزد۔ اب جو شخص راہ خدا پر چلے گا ثواب اس کا انہیں کے جریدۂ اعمال میں درج ہو گا (تذکرہ اہل دہلی از سر سید ص ۸۳)۔ آپ کے تراجم اور تصنیفات میں چند مشہور کتابیں جو آج تک مقبول ہیں یہ ہیں۔ مظاہر حق ترجمہ اردو مشکوٰۃ شریف۔ ظفر جلیل ترجمہ اُردو حصن حصین۔ جامع التفاسیر خلاصہ جامع صغیر وغیرہ وغیرہ تقریباً ۲۵ تصانیف (ملاحظہ ہو حدائق حنفیہ ص ۴۸۸) بہرحال قدرت کی فیاضیوں نے جس طرح آپ کو دین اور دنیا کی دولتیں عطا

فرمائی تھیں، تاریخ میں اس کی نظیریں بہت کم ہیں۔ آپ چوتھے پانچویں سال زیارت بیت اللہ شریف کے لئے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء سے پندرہ سال بعد ۱۸۷۲ء (۱۲۸۹ھ) میں مکہ معظمہ میں انتقال کیا۔ مروج احکام شریعت تاریخ وفات ہے (حدائق الحنفیہ ص ۴۸۸)

۲۶۷۔ مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی۔ مولانا محمد بخش صاحب کے فرزند رشید اور اس دور کے مشہور عالم مفتی اور مجاہد حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش صاحب کے برادر زادہ ہیں۔ (مولانا محمود بخش صاحب اور مفتی الٰہی بخش صاحب دونوں حقیقی بھائی ہیں)۔ مفتی الٰہی بخش صاحب کا ذکر خیر شاندار ماضی جلد دوم میں گزرا۔ آپ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے مشہور تلامذہ میں سے تھے۔ حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کی تحریک کے بہت بڑے حامی اور مددگار۔ علم و فضل اور تقویٰ طہارت، غرض ہر لحاظ سے آپ کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ مثنوی مولانا روم کے دفتر ہفتم کی تکمیل آپ نے ہی کی۔ مولانا مظفر حسین صاحب نے ابتدائی تعلیم انہیں مفتی صاحب سے حاصل کی۔ ان کی وفات کے بعد آپ دہلی آئے اور حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحبؒ کے حلقہ درس میں داخل ہو کر آپ نے تکمیل کی اور شاہ صاحب کے بھائی مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے بیعت ہو کر مراحل سلوک طے کئے۔

سادہ زندگی کے عادی تھے۔ گاڑھے کا کرتہ پاجامہ اور نیلی لنگی، آپ کا لباس تھا۔ ایک مرتبہ آپ کی صاحبزادی نے سوتی ململ کا کرتا بنا دیا۔ آپ نے جمعہ کے روز باصرار پہنا اور نماز کے بعد اتار کر واپس کر دیا کہ اس سے طبیعت میں تکبر پیدا ہوتا ہے۔ آپ ہمیشہ پیدل سفر کرتے۔ سواری پر کبھی سوار نہ ہوتے تھے۔ لوٹا، لنگی، چھڑی اور ایک مشکیزہ رخت سفر ہوتا تھا۔ جہاں رات ہو جاتی، وہیں قیام فرما لیتے۔ آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ نہیں رکھا۔ اصلاحی وعظ آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ آپ نے بہت سی اصلاحی خدمات بھی انجام دیں۔ وہ تبلیغی سلسلہ جس کی آج کل پورے ہندوستان بلکہ بیرون ہند میں بھی دھوم ہے، اس کے بانی حضرت مولانا الیاس صاحبؒ انہیں مولانا مظفر حسین صاحب کی صاحبزادی کے نواسہ تھے۔ چھ مرتبہ آپ نے حج بیت اللہ کیا۔ جب ساتویں مرتبہ آپ حج کے لئے تشریف لے گئے تو ۱۰ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ، ۲۵ مئی ۱۸۶۶ء کو مدینہ منورہ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ جنت البقیع میں خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کے مزار شریف کے قریب آپ کو خواب گاہ میسر ہوئی۔ کرتا، پاجامہ، لنگی، لوٹا اور مشکیزہ آپ کا کل ترکہ تھا۔ حسب وصیت لوٹا اور مشکیزہ بیت المال میں داخل کر دیا گیا۔ لنگی مریدین میں تقسیم کر دی گئی۔ کرتا، پاجامہ صاحبزادوں کے پاس بھیج دیا گیا۔ جس میں سے پاجامہ معتقدین میں تقسیم کر دیا گیا۔ کرتا بطور تبرک صاحبزادوں کے پاس رہا۔ (ملاحظہ ہو تذکرۃ الخلیل مصنفہ مولانا عاشق الٰہی صاحب از ص ۵۱ تا ص ۵۶)۔

۲۶۸۔ مولانا شاہ عبدالغنی صاحب محدث خلف شاہ ابو سعید صاحب جلیل القدر عالم حضرت مولانا شاہ اسحٰق صاحبؒ کے شاگرد رشید اور آپ کے جانشین۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد آپ نے ہجرت فرمائی اور تقریباً ۱۹ سال حجاز مقدس میں قیام کرنے کے بعد ۱۲۹۵ھ میں آپ نے مدینہ طیبہ میں وفات پائی۔

۲۶۹ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۱۸۱ و ص ۱۸۲۔

۲۷۰۔ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۱۸۱ و ص ۱۸۳۔

۲۷۱۔ ایضاً ص ۱۸۳ حاشیہ۔

۲۷۲۔ سوانح قاسمی ص ۱۰۵ جلد ۲

۲۷۳۔ تذکرۃ الرشید جلد ۱ ص ۷۴۔

۲۷۴۔ سوانح عمری مولانا محمد قاسم صاحب از مولانا محمد یعقوب صاحب۔

۲۷۵۔ ان کے صاحبزادے نواب محی الدین صاحب جو عرصہ تک بھوپال میں عہدہ قضا پر فائز رہے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ تقریباً ۱۹۳۰ء میں آپ کی وفات ہوئی۔ ان کی زیارت کا شرف احقر کو بھی حاصل ہوا ہے۔ ان کے اخلاف اب بھی مراد آباد میں موجود ہیں مگر پریشان اور خستہ حال۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنا فضل و کرم فرمائے۔ محمد میاں

۲۷۶۔ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے حضرت مولانا محمد طیب صاحب کے حوالے سے (سوانح قاسمی جلد دوم ص ۱۳۷ پر) ایک روایت نقل کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ نواب شیر علی صاحب کو اس لئے بھیجا گیا تھا کہ بادشاہ کو (جہاد اور استخلاص وطن وملت کی جنگ پر) آمادہ کریں۔ مولانا محمد طیب صاحب کے حوالے سے ایک دوسری روایت اسی صفحہ پر یہ بھی نقل کی گئی ہے کہ مولانا شیر علی صاحب کو بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہ دہلی سے شمالی کی طرف یلغار کریں اور یہ حضرات اس طرف سے تو یہ پورا خطہ اس عنصر خبیث سے پاک ہوجائے گا۔ احقر کے خیال میں یہ دوسری روایت ہی قابل اعتماد ہوسکتی ہے کیونکہ جہاں تک آمادگی بلکہ شرکت کا تعلق ہے تو بادشاہ استخلاص ملک وملت کی اس جنگ میں آج سے کئی ہفتہ پہلے شریک ہوچکے تھے۔ جب ۱۲ رمئی کو انقلابی فوجوں کی قیادت کرتے ہوئے شاہانہ جلوس کے ساتھ بادشاہ نے شہر کا دورہ کیا تھا۔ بڑے بڑے بازار کھلوائے تھے اور عوام کو امن وامان کا اطمینان دلایا تھا۔

۲۷۷۔ بہادر شاہ کے مقدمہ کے سلسلہ میں جاٹ مل سابق اخبار نویس لفٹنٹ گورنر آگرہ نے ان کے متعلق یہ بیان دیا تھا کہ حیدر حسین خاں کمانڈر توپ خانہ بادشاہ اور حسن عسکری نے مل کر چند خطوط شیدی قنبر کے ذریعے ایران روانہ کئے (بہادر شاہ کا مقدمہ ص ۲۴) عدالت نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ شاہ حسن عسکری ایران سے ساز باز کرکے ہندوستان پر حملہ کرانا چاہتے تھے۔

۲۷۸۔ بادشاہ ان کے معتقد تھے۔ ان سے تعویذ لیا کرتے تھے۔ خوابوں کی تعبیر پوچھا کرتے تھے۔ اور دعائیں پڑھوایا کرتے تھے۔ شاہی خاندان کی ایک خاتون ان کی بہت معتقد ہوگئی تھی۔ پھر اس سے نکاح بھی کرلیا۔ اس نے شاہ صاحب کی پاکبازی کی بادشاہ سے تعریفیں کیں جس سے بادشاہ، شاہ حسن عسکری سے عقیدت رکھنے لگے۔ (بہادر شاہ کا مقدمہ وغیرہ)

۲۷۹۔ شاہ حسن عسکری کا آبائی وطن قصبہ رام پور منیہاران ضلع سہارن پور تھا۔ یہی رامپور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کا بھی دادھیالی وطن ہے (تذکرۃ الرشید۔ جلد ا ص ۵)

۲۸۰۔ شاہ مجید علی اور شاہ حبیب محمد قصبہ انبیٹھہ ضلع سہارن پور کے رہنے والے حقیقی بھائی والد ماجد کا نام شاہ احمد علی صاحب تھا۔ ان دونوں بھائیوں میں سے شاہ مجید علی صاحب حضرت مولانا مملوک علی صاحب کے داماد تھے اور شاہ حبیب محمد صاحب شاہ حسن عسکریؒ کے داماد تھے وہ دو بزرگ جن کے علمی فیض سے اس صدی کی پیشانی روشن ہوئی یعنی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب صدر مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور اور حضرت مولانا صدیق احمد صاحب صدر مدرس ومفتی ریاست مالیر کوٹلہ ان دونوں بزرگوں کے نواسے تھے یعنی مولانا خلیل احمد صاحب حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ کے نواسے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے بھانجے اور مولانا صدیق احمد صاحب شاہ حسن عسکری شہید کے نواسے۔ خود شاہ حسن عسکری کی شادی بھی قصبہ انبیٹھہ میں ہوئی تھی۔ ان کی وفات کے بعد ہی آپ نے دہلی میں مغل شاہزادی سے نکاح کیا۔

۲۸۱۔ یہی خاندانی رابطہ کی بناء پر ۱۸۵۷ء کے بعد شاہ حسن عسکری دہلی سے انبیٹھہ آکر روپوش ہوئے کہ ان کی بیوی کا اگرچہ انتقال ہوچکا تھا مگر ان کی صاحبزادی امۃ اللہ اور داماد شاہ حبیب محمد صاحب زندہ تھے۔ داماد اور ان کے پانچوں بھائیوں نے شرافت ومروت اور وفا پروری کا پورا ثبوت دیا۔ جب پولیس آئی تو خود گرفتار ہوگئے اور پناہ پکڑنے والے پر آنچ نہ آنے دی مگر پناہ لینے والے شاہ حسن کو خود احساس ہوا کہ میری وجہ سے عزیزوں پر مصیبت آپڑی ہے تو خفیہ طور پر انبیٹھہ سے نکل کر سہارن پور پہنچے اور عدالت میں حاضر ہوگئے۔ داماد اور ان کے بھائی تو رہا کردیے گئے اور شاہ حسن عسکری کو پھانسی دے کر شہید کردیا گیا (تذکرۃ الخلیل ص ۱۰ و ص ۱۱)

۲۸۲۔ آپ کا اسم گرامی عبدالرحیم تھا۔ قاضی سعادت علی خاں پسر نجابت علی خاں کے یہ دونوں فرزند (قاضی عنایت علی و قاضی عبدالرحیم صاحبان) بہت سعید، شریف النفس پابند مذہب تھے۔ دونوں بھائیوں میں غیر معمولی محبت تھی اور بے حد اتحاد تھا۔ قاضی عبدالرحیم صاحب کے بارے میں "سپہ کشی" نے جو فیصلہ کیا، ہمارے جذبات اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ الزام جو لگایا گیا تھا وہ صحیح تھا۔

۲۸۳۔ زمانہ اگرچہ ترقی کر رہا تھا ہاتھی کی قدر اس وقت تک کم نہیں ہوئی تھی، سامان جنگ میں اس وقت تک ہاتھی کو وہی حیثیت

حاصل تھی جو ہمارے زمانہ میں ٹینک، بکتر بند گاڑی یا فوجی ٹرک کو حاصل ہے۔ ۱۹۴۲ء میں جب گاندھی جی کی زیر قیادت کانگریس نے "کوئٹ انڈیا" ہندوستان خالی کرو" کا نعرہ انگریزوں کے برخلاف لگایا اور کارپردازان تحریک نے ایک قدم آگے بڑھا کر بجلی اور ٹیلیفون کے تار کاٹنے اور کھمبے اکھاڑنے اور ریلوے لائنوں کی توڑ پھوڑ شروع کی تو ایک معمولی اوزار جس کو پلاس کہتے ہیں، جس سے پیچ کھولے جاتے ہیں، اس کی فروخت ممنوع ہوگئی تھی۔ اگر تلاشی میں کسی کے پاس "پلاس" یا پیچ کس" برآمد ہو جاتا تو وہ توڑ پھوڑ کا مجرم مان لیا جاتا تھا۔

۱۸۶۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب نے قاضی صاحب کو علمبردار بغاوت قرار دیا ہے اور حاجی صاحب اور ان کے رفقاء کرام کا کوئی اقدام تسلیم ہی نہیں کیا۔ اس کی وجہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس زمانہ کے حالات کا بھی کچھ ایسا ہی تقاضا تھا اور خود مولانا عاشق الٰہی صاحب کے فطری ذوق اپنے زمانہ میں انگریزوں کا حامی واقع ہوا تھا۔ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی بلند پایہ فاضل اور بہت بڑے مصنف اور اہل قلم تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے صدر دینیات کی حیثیت سے زندگی بسر کی۔ تصنیف و تالیف اور وعظ و پند کے سلسلہ میں آپ کی خدمات قابل قدر ہیں۔ مگر سیاسیات سے ہمیشہ کنارہ کش اور سیاسی تحریکات سے متنفر رہے۔ یہ بات غالباً آپ کو بھی اچھی نہیں معلوم ہوئی کہ علماء کرام کی اس مقدس جماعت کو ایک سیاسی انقلابی تحریک کا علمبردار قرار دیں۔ مگر روایات کا جو ذخیرہ آپ کے سامنے جمع ہو گیا تھا اس کو نظر انداز کرنا بھی آپ کے لئے ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ آپ نے ایک نئی توجیہ فرمائی کہ ان حضرات نے مظلوم قاضی عنایت علی صاحب کی اعانت و حمایت کیلئے شرکت فرمائی تھی (ملاحظہ ہو سوانح قاسمی جلد دوم ص ۱۸ و ص ۱۱۹ و ص ۱۲۲)۔

بیشک اغاثۃ الملہوف، اعانت مظلوم اور ستم رسیدہ بھائی کی امداد بھی ایک مقدس فرض ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کو صرف قاضی عنایت علی اور ان کے شہید بھائی کے واقعہ نے متاثر نہیں کیا تھا بلکہ اس قسم کے ہزاروں واقعات جو انگریز کی آمد کے بعد سے اس وقت تک سرزمین ہند میں پیش آ چکے تھے، ان سب نے ان بزرگوں کو متاثر کر کے اس بغاوت پر آمادہ کیا تھا، جو سراسر اعلاء کلمۃ اللہ اور اعانت حق تھا۔ ان حضرات کی مقدس تاریخ پر اس سے بڑا کوئی ظلم نہیں ہو سکتا کہ اس جہاد عظیم کا محرک صرف قاضی عنایت علی صاحب کے جزوی واقعہ کو قرار دے کر قاضی عنایت علی صاحب کو اصل اور ان بزرگوں کو تابع ظاہر کیا جائے۔ اس بارہ میں ان بزرگوں کی رائے اور تحقیق معتبر ہوگی جنہوں نے اس زمانہ کی تاریخ پر محققانہ نظر ڈالی۔ تحریکات اور ان کے اسباب کو سمجھا اور ان کے تقاضوں کو پورا کرنے میں پوری پوری زندگیاں صرف کر دیں۔ مثلاً مفکر مشرق مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا محمد میاں صاحب عرف مولانا منصور انصاریؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہ العزیز۔

حضرت مولانا سندھیؒ کی تحریک کے چند اقتباسات اس سلسلہ میں پہلے پیش کئے جا چکے ہیں۔ یہاں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کی تحریر مبارک کی چند سطریں ملاحظہ کیجئے۔ نقش حیات میں حضرت شیخ الاسلام نے عنوان قائم کیا ہے "ہمارے اکابر کا ۱۸۵۷ء کی تحریک میں حصہ لینا"۔ اس عنوان کے تحت میں تحریر فرماتے ہیں

ہمارے تمام اکابر (علماء دیوبند وسہارنپور و مظفر نگر) حضرت شاہ عبد العزیز صاحب اور ان کے تلامیذ کے شاگرد اور خوشہ چیں رہے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ حضرت شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے مسلک اور حکم کے خلاف چلیں۔ چنانچہ جب سید صاحب کی تحریک جہاد شروع ہوئی تو حضرت حاجی عبد الرحیم صاحب شہید ولایتی (دادا پیر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی) اور حضرت شاہ نصیر الدین صاحب دہلوی سابق پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور بہت سے حضرات (اطراف سہارنپور و مظفر نگر وغیرہ کے) شریک تحریک ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ سرحد میں جا کر شہید ہوئے۔ حضرت سید صاحب مجددؒ اور ان کے عملی جذبات حریت و جہاد اور ان کی تعلیمات روحانیہ سے ان حضرات کو انتہائی شغف اور حسن اعتقاد رہتا تھا۔ سرحد کی ناکامی اور سکھوں کی غداریوں سے ان حضرات کے قلب میں انتہائی قلق اور اضطراب ہمیشہ محسوس ہوتا رہتا تھا۔ جب انقلاب ۱۸۵۷ء کی تحریک اطراف و جوانب ہند خصوصاً اطراف دہلی میں چلی شروع ہوئی تو ان حضرات کے جوش

حریت میں نئی حرکت پیدا ہوئی۔ ان بزرگوں نے محسوس کیا کہ اس انقلاب میں حصہ لینا فرض اور لازم ہے۔ انگریزوں کے افعال شنیعہ اور احوال حاضرہ پر بخوبی مطلع تھے۔ اس تمام جماعت میں حضرت حافظ ضامن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز زیادہ پیش پیش تھے الخ (نقش حیات جلد دوم ص ۴۱ و ص ۴۲)

۲۸۵۔ اس لیے کہ وہ چچا پیر تھے کیونکہ حضرت شیخ محمد صاحب محدث اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب دونوں قطب العالم حضرت میاں جی نور محمد صاحبؒ کے خلیفہ تھے۔

۲۸۶۔ نقش حیات ص ۴۳ جلد ۲۔

۲۸۷۔ سوانح قاسمی جلد ۲ ص ۱۲۳۔

۲۸۸۔ ایضاً ص ۱۲۵۔

۲۸۹۔ نقش حیات جلد دوم ص ۴۳۔

۲۹۰۔ سوانح قاسمی جلد دوم ص ۱۳۱۔

۲۹۱۔ ایضاً ص ۱۲۹

۲۹۲۔ انگریز مصنف ''میلی سن'' اپنی تاریخ کی جلد ششم ص ۱۴۳ پر تحریر کرتا ہے:

شاملی میں ایک ہندو زمیندار مہار سنگھ نے ہنگامہ برپا کیا تھا اور خط و کتابت کر کے دربار دہلی سے تعلقات قائم کر لئے تھے۔ انگریز اس کو دبا نہ سکتے تھے۔ البتہ شاملی کو کھلم کھلا بغاوت سے محفوظ رکھا۔ شاملی جو آج کل ضلع مظفر نگر کی ایک سب ڈویژن (تحصیل) کا ہیڈ کوارٹر ہے، اُس زمانہ میں سہارن پور سے متعلق تھا۔ حاکم سہارنپور اسپنکی (Spankee) صاحب نے اس کی پوزیشن مضبوط رکھنے کے لئے گورکھا فوج کا ایک دستہ بھیج دیا۔ ایڈورڈز (اس مقام کے فوجی کمانڈر) نے گورکھوں کی مدد سے شاملی میں مکمل قبضہ کر لیا۔ ایک وفادار مسلمان ابراہیم خان کے ماتحت تھوڑی سی فوج شاملی چھوڑی اور ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ کو خود آگے روانہ ہو گیا۔ قاضی عنایت علی صاحب اور ان کے ساتھیوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر شاملی پر حملہ بول دیا تقریباً ایک سو تیرہ فوجیوں کے نقصان کے بعد ''ابراہیم خاں'' ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ ایڈورڈز واپس ہوا تو شاملی کی حالت دیکھ کر جب ۱۱۳ فوجی کام آ چکے تھے بہت غصہ آیا مگر اس وقت مظفر نگر کی حالت بہت خراب تھی، وہ وہاں چلا گیا۔ پھر کپتان اسمتھ اور لفٹنٹ کیول روس کی زیر کمان سکھوں اور گورکھوں کی فوج تھانہ بھون بھیجی۔ مجاہدین نے اسے مار بھگایا، تو دوبارہ کرنل ڈلاپ کی سرکردگی میں پوری فوج بھیجی گئی جس نے پہلے تھانہ بھون پھر شاملی پر قبضہ کر کے ان کو تباہ و برباد کیا (۱۸۵۷ء کے مجاہد ص ۱۶۷)۔

۲۹۳۔ سوانح قاسمی جلد دوم میں کسی قدر تفصیل دی گئی ہے ضرورت ہو تو مراجعت فرمائی جاوے۔

۲۹۴۔ ملاحظہ ہو نقش حیات جلد اول۔

۲۹۵۔ یعنی حضرت شیخ الہندؒ سے

۲۸۹۔ امام یعنی امیر یا صدر۔

۲۹۷۔ مولانا محمد طیب صاحب نے مولانا منصور انصاری صاحب کے حوالہ سے یہ روایت کی ہے کہ مولانا محمد منیر صاحب کو حضرت نانوتویؒ کی حفاظت کی ذمہ داری سپرد کی گئی تھی اور حضرت حاجی صاحب نے مولانا محمد منیر صاحب کو خطاب کرتے ہوئے خاص طور پر فرمایا تھا کہ مولانا محمد قاسم بالکل آزاد اور جری ہیں، ہر صف میں بے محابہ گھس جاتے ہیں، آپ کسی وقت ان کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو مولانا محمد منیر صاحب، حضرت نانوتوی کے اے ڈی سی ہوئے۔ البتہ یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ معرکہ کے وقت کے لئے مولانا محمد منیر کو میسرہ کی کمان سپرد کی گئی اور عام حالات میں مولانا محمد قاسمؒ کے ساتھ رہنے اور ان کی نگرانی کی ہدایت کی گئی کیونکہ مولانا محمد منیر صاحب حضرت نانوتویؒ کے قریبی عزیز اور ان کے فدائی تھے اور مولانا نانوتوی کے بغیر خود ان کو بھی قرار نہیں آتا تھا۔ (سوانح قاسمی ص ۱۳۱ و ص ۱۳۷ وغیرہ)

۲۹۸۔ اس قرارداد کا پس منظر چند صفحات پہلے گزر چکا ہے۔

۲۹۹۔ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند نے مولانا محمد میاں صاحب منصور انصاریؒ سے نقل کر کے اس کی تفصیل یہ بیان کی ہے۔ انگریزی فوج جو شاملی میں موجود تھی، وہ مجاہدین کے ہجوم کو دیکھ کر تحصیل کی چہار دیواری میں محصور ہو گئی اور اندر سے فائر شروع کر دیے۔ مجاہدین کا ہجوم باہر میدان میں تھا، جہاں کوئی آڑ نہیں تھی۔ اس طرح مجاہدین کا جانی نقصان کافی ہوا۔ اتفاق سے تحصیل کے قریب ایک چھپر تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی نظر چھپر پر پڑی۔ چھپر اٹھوا کر تحصیل کے صدر دروازہ پر ڈالا گیا اور اس میں آگ لگا دی گئی۔ جس سے پھاٹک جل گیا اور اندر گھسنے کا راستہ نکل گیا۔ اب فوج میں مقابلہ کی طاقت نہیں تھی۔ اس کے کچھ سپاہی کسی طرح بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ کچھ مقتول ہوئے اور باقی گرفتار ہو گئے اور شاملی پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا۔ (سوانح قاسمی جلد دوم)

۳۰۰۔ سرسید احمد خاں صاحب مرحوم نے وفادار مسلمانان ہند (لائل محمڈنس آف انڈیا) میں محمد ابراہیم خان کا نام بھی شمار کرایا ہے۔ جو اس ہنگامہ کے وقت شاملی کے تحصیل دار تھے اور نہ صرف یہ کہ خود مقابلہ کیا بلکہ حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے اپنے بھائی اکبر خاں اور خاندان کے دوسرے افراد کو بھی اپنے وطن رام پور منہیاراں ضلع سہارنپور سے بلا لیا جن کی تعداد پچاس تھی۔ جب مقابلہ ہوا تو اس وقت تحصیل شاملی میں تقریباً دس سوار پنجابی رسالہ کے اٹھائیس سپاہی جیل خانہ کے اور پچاس سے زائد سپاہی متعینہ تھانہ و تحصیل اور پچاس سے زائد آدمی خود تحصیل دار کے خاندان کے تھے سرسید صاحب فرماتے ہیں یہ افسر (تحصیل دار) معہ اکثر آدمیوں اپنے خاندان کے کام آیا اور شرط نمک حلالی کو پورا کر دیا۔ (لائل محمڈنس آف انڈیا بحوالہ العلم کراچی بابت اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۸ء)۔

۳۰۱۔ اس معرکہ میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے متعلق آپ کے استاذ زادہ سبق کے ساتھی اور نہایت مخلص عزیز مولانا محمد یعقوب صاحب ابن حضرت مولانا مملوک العلی صاحبؒ کی عینی شہادت ملاحظہ فرمایئے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب اپنی لکھی ہوئی سوانح عمری میں تحریر فرماتے ہیں:

چند بار مفسدوں سے نوبت مقابلہ کی آئی۔ اللہ رے مولوی صاحب ایسے ثابت قدم تلوار ہاتھ میں اور بندوقچیوں کا مقابلہ۔ ایک بار گولی چل رہی تھی، یکایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ جس نے دیکھا، جانا گولی لگی۔ ایک بھائی دوڑے۔ پوچھا کیا ہوا۔ فرمایا: کہ سر میں گولی لگی۔ عمامہ اُتار کر دیکھا تو کہیں گولی کا نشان تک نہ ملا، اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر۔ انہیں دنوں ایک نے منہ در منہ بندوق ماری جس کے ستھے سے ایک مونچھ اور کچھ داڑھی جل گئی اور کچھ قدرے آنکھ کو صدمہ پہنچا، اور خدا جانے گولی کہاں گئی، اور اگر گولی بچی تو اتنے پاس سے سطوہ بھی بس تھا۔ مگر حفاظت الٰہی بر سر تھی، کچھ اثر نہ ہوا۔ (۱۱۳ سوانح عمری مولانا محمد قاسم صاحب از مولانا محمد یعقوب)۔

۳۰۲۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز جس طرح ایک مرد مجاہد، میدان سیاست کے شاہسوار تھے۔ ایسے ہی حلقہ طریقت کے مرشد کامل اور ارباب باطن کے امام و مقتدا بھی تھے۔ آپ کے اس ارشاد میں اسی باطنی ذوق کی شان نمایاں ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں ارباب ظاہر کو سپر ڈال دینی پڑتی ہے اور ماننا پڑتا ہے۔ ع

غیب را ابرے و آبے دیگر است
آفتابے ماہتابے دیگر است

اس سے عجیب واقعہ وہ ہے جس کو مولانا مناظر احسن گیلانی نے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی صدر الصدور سرکار آصفیہ قدس اللہ سرہ العزیز سے نقل کیا ہے۔ نواب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ انگریزوں کے مقابلہ میں جو لوگ لڑ رہے تھے، ان میں شاملی ہند کے مشہور شیخ طریقت حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی بھی تھے اچانک ایک روز مولانا کو دیکھا کہ خود بھاگے جا رہے ہیں اور باغیوں کے افسر کا نام لے کر کہہ رہے ہیں کہ لڑنے سے کیا فائدہ، خضر کو تو میں انگریزوں کی صف میں پا رہا ہوں"۔ نواب صاحب ایک دوسرا واقعہ بھی بیان کرتے تھے کہ حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب اس ہنگامہ کے بعد ایک ویران مسجد میں جا کر مقیم ہو گئے ایک روز ایک انگریزی فوج ادھر سے گزر رہی تھی۔ مولانا

مسجد میں بیٹھے ہوئے اس فوج کو دیکھ رہے تھے کہ یکایک دفعتہً اُٹھے مسجد کی سیڑھیوں سے اُتر کر فوج کے پاس گئے اور ایک شکستہ حال شخص جو بظاہر سائیس معلوم ہوتا تھا، اس سے کچھ باتیں کیں اور واپس آ گئے۔ آپ سے پوچھا گیا کہ یہ کون تھے جن سے آپ نے باتیں کیں، تو فرمایا۔ خضر تھے۔ (سوانح قاسمی ص ۱۰۳ حاشیہ)

۳۰۳۔ سرسید احمد صاحب مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ یہ قتل و خونریزی شاملی میں ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو ہوئی جو دن فتح دہلی کا تھا۔ (لائل محمڈنس آف انڈیا)

۳۰۴۔ میلی سن سے پہلے حاشیہ میں نقل کیا جا چکا ہے کہ پہلی بار کپتان اسمتھ اور لفٹنٹ کیولر اس کی زیرکمان سکھوں اور گورکھوں کی فوج بھیجی گئی تھی۔ مجاہدین تھانہ بھون نے اس کو مار کر بھگا دیا تھا۔ اس کے بعد جنرل ڈکاپ ایک بڑی بھاری فوج اور توپخانہ کے ساتھ تھانہ بھون پہنچا۔ مجاہدین کو شکست دے کر تھانہ بھون کو تباہ کر دیا۔ یہاں اسی فوج کی تباہ کاری کا تذکرہ ہے۔

۳۰۵۔ سرکار کو پتہ بے شک نہیں چلا لیکن حقیقت یہ ہے کہ نجیب آباد سے نکل کر دیوبند پہنچے چند روز یہاں قیام کر کے بھوپال تشریف لے گئے، اور جب وہاں اپنے تعارف کا خطرہ ہوا تو جودھ پور، پھر الور تشریف لے گئے، اور ریاست الور کے قصبہ "تجارہ" کے قریب ایک گاؤں میں قیام کیا۔ پھر یہیں وفات پائی (از قاضی احسان اللہ صاحب تھانوی) مشہور و معروف شاعر انقلاب علامہ انور صابری سینہ بسینہ سند کے ذریعہ یہ روایت بھی بیان فرماتے ہیں کہ قیام دیوبند کے زمانہ میں خاکسار مؤلف (محمد میاں) کے کسی بزرگ کی رفاقت میں بھوپال تشریف لے گئے۔ مگر کسی اور ذریعہ سے اس کی تائید نہیں ہوئی۔

۳۰۶۔ صرف امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ گرفتار ضرور کیے گئے چھ مہینے حوالات میں بھی رہے مگر سزا ان کو بھی نہیں ہوئی۔ مقدمہ میں صاف بری ہو گئے تفصیل آگے آئے گی۔ انشاء اللہ

۳۰۷۔ ترجمہ از معافی نامہ انگریزی جو اس زمانہ میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔

۳۰۸۔ حضرت مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی تو گرفتار بھی اس معافی نامہ عام کے بعد ۱۸۵۹ء میں ہوئے تھے (ملاحظہ ہو الثورۃ الہندیہ یا باغی ہندوستان)۔ اور جب کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک کا سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں ۱۸۵۸ء کے اکتوبر تک چلتا رہا۔ تانتیا ٹوپی ۱۸۵۸ء کے آخر تک مقابلہ کرتے رہے۔ تو انگریز بہادر کو یہ رحم دلی کہاں نصیب ہوئی تھی کہ وہ بلا استثناء ہر ایک کو معاف کر دیتا۔ یہ حوصلہ ایشیا کے سیاہ فاموں کو نصیب ہوا ہے کہ:

در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست

یورپ کے سفید فام سنگ دل تو سزا و انتقام میں بھی "سود در سود" کے عادی ہیں (معاذ اللہ)۔

۳۰۹۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں: مولانا محمد اسحاقؒ اور ان کے بعد امیر حاجی امداد اللہؒ کو مکہ معظمہ میں بیٹھ کر اپنی تحریک جاری رکھنے میں جس قدر مشکلات پیش آئی ہیں، ان پر غالب آنا ان کے جرم اور علم کی روشن دلیل ہے اور ہم اسے امام عبدالعزیزؒ کی تربیت مسلسلہ کی برکات میں شمار کرتے ہیں۔ اگر یہ حضرات امام عبدالعزیزؒ کے تربیت یافتہ نہ ہوتے تو کبھی اپنا کام جاری نہ رکھ سکتے تھے۔ اگر ہم مکہ معظمہ میں اس قسم کی زندگی کا خود تجربہ نہ کرتے، اور حضرت مولانا شیخ الہندؒ کے واقعات ہمارے سامنے نہ ہوتے تو ہم ان اکابر کی محنت کی قدر نہ کر سکتے تھے۔

"دل من داند و من دانم و داند دل من"۔ سیاسی تحریک ص ۲۰۳، ۲۰۴

یہ مشکلات اور پریشانیاں خود ان دوستوں کی طرف سے پیش آتی رہیں جو معتقدانہ حاضر باشی کے ساتھ اپنی زندگی سادگی یا ہوش مندی سے جاسوسی کی خدمت بھی انجام دیتے رہے۔ اس کی تفصیل طویل بھی ہے اور تلخ بھی اور اسی بناء پر ان حضرات کو ضرورت پیش آئی کہ سیاسی تربیت کے لیے ادارہ حربیہ کی بجائے "دارالعلوم" کی بنیاد ڈالیں۔

۳۱۰۔ یعنی ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے صرف آٹھ سال بعد ۱۸۶۶ء ۱۲۸۳ھ میں "کتاب التمہید" میں حضرت مولانا سندھیؒ نے ایک فقرہ لکھا ہے، وہ ہمیشہ حضرت علماء کے پیش نظر رہنا چاہیے مولانا فرماتے ہیں: دار العلوم دیوبند اسس فی ۱۲۸۳ھ

فاقتدی الناس فی تاسیس الفروع فاول فرع تاسس بعد ستة اشهر فی سهارن پور حتی وصلت الی

اربعين فرعا لكن نظامها على اللا مركزيه وكنت اول زمان تنظيم جمعية الانصار احب ان اعير نظام الفروع بلمذكور الى المركزيه ولكن شيخنا شيخ الهند ما كان يلتفت الى ذالك الا قليلا وبعد ثلاث سنين تبينت لي حكمة اللا مركزيه بالتجارب فان الحكومة لا تسهل لها ان تتحكم و تغلب على ذالك النظام وحفظ الحرية مقدم على تحسين الصورة (ص ۱۵۵ بحواله سیاسی تحریک ص ۲۰۵ حاشیہ)

۳۱۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مسلمانوں کا روشن مستقبل از سید طفیل احمد صاحب (علیگ) مرحوم و علماء حق جلد اول از راقم الحروف محمد میاں عفی عنہ۔

۳۱۲۔ خطبۂ صدارت جمعیۃ علماء کانفرنس ناگپور منعقدہ نومبر ۱۹۳۹ء (الجمعیۃ مورخہ ۳۰ رنومبر ۱۹۳۹ء)۔

۳۱۳۔ ۱۹۱۹ء میں صرف یہی ہوا کہ اس کی تشکیل باضابطہ کردی گئی اور اس کے صدر اور سیکرٹری منتخب ہوئے۔ دستور اساسی مرتب ہوا۔ باقی اس جماعت کی اصل بنیاد بقول شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی ۱۸۰۳ء میں قائم ہوگئی تھی۔ جب حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے فتویٰ دیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی ختم ہوچکی ہے ہم سب کا فرض ہے کہ متحد ہوکر جلد بدیشی حکومت کو ہندوستان سے نکال دیں۔ (خطبۂ صدارت جمعیۃ علماء کانفرنس ناگپور۔ بحوالہ الجمعیۃ مورخہ ۳۰ رنومبر ۱۹۳۹ء بحوالہ ارشادات)۔

۳۱۴۔ کرامات امدادیہ ص ۲۸ کرامت ۵۴۔ روانگی کے وقت آپ گنگوہ بھی تشریف لے گئے مگر مولانا رشید احمد صاحب سے ملاقات نہ ہوسکی۔ آپ حوالات میں بند تھے۔ حضرت کی روانگی سے ایک ماہ بعد رہا ہوئے۔ (امداد المشتاق ص ۲۶۹ بحوالہ نقش حیات جلد ۲ ص ۱۰)۔

۳۱۵۔ تذکرۃ الرشید جلد اص ۷۷۔۷۸

۳۱۶۔ خواجہ اطہر حسن صاحب سہارنپور کے مشہور قومی کارکن ان کے پوتے ہیں۔

۳۱۷۔ نقش حیات جلد دوم ص ۵۸۔

۳۱۸۔ یہ اس مسجد کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جو چھتے کی مسجد کے نام سے مشہور ہے جو اس وقت ارباب باطن اہل اللہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

۳۱۹۔ سوانح قاسمی میں ہے کہ شاہ رمز الدین کی مسجد میں تشریف لے گئے۔ (ص ۱۷۷ جلد دوم) سوانح قاسمی میں یہ بھی ہے کہ کپتان پولیس مسجد سے باہر نکلا اور حضرت کو جاتے ہوئے دیکھ کر بولا۔ مولانا تو یہی معلوم ہوتے ہیں جو جارہے ہیں۔ پولیس ادھر چلی اور مسجد شاہ رمز الدین کا محاصرہ کرلیا۔ حضرت وہاں (مسجد شاہ رمز الدین) سے نکلے اور پولیس کے جتھے میں گزرتے ہوئے کسی اور مسجد میں پہنچ گئے (ص ۱۷۷) مگر ہم نے متعدد بزرگوں سے وہی سنا ہے جو سطور بالا میں درج کردیا۔ ہم کرامات اولیاء کے معترف ہیں مگر شرط یہ ہے کہ اس کا ثبوت بھی اتنا ہی قوی اور مضبوط ہو۔ یہاں قطع نظر ثبوت کے اس روایت میں ایک قسم کا تضاد بھی ہے کیونکہ اگر پولیس کپتان نے مولانا کو جاتے ہوئے راستہ ہی میں دیکھ لیا تھا تو پھر فوراً ہی گرفتار کیوں نہیں کرلیا۔ اتنا موقع کیوں دیا کہ آپ مسجد میں پہنچے، اور پولیس کو محاصرہ کرنا پڑا۔

۳۲۰۔ سنا گیا ہے، سیاہی مائل گندمی رنگ تھا اور چہرہ پر چیچک کے نشان تھے (تفصیل سوانح قاسمی جلد اول میں ملاحظہ ہو)۔

۳۲۱۔ گاڑھے کا معمولی کرتا پاجامہ یا لنگی آپ کی عام پوشاک تھی۔

۳۲۲۔ ایک لطیفہ اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ آپ کسی گاؤں کی مسجد میں تشریف لے گئے۔ نماز کا وقت آگیا۔ آپ کو کسی طرح یہ معلوم تھا کہ امام صاحب قرآن شریف صحیح نہیں پڑھتے تو آپ نے نمازیوں سے فرمایا ''کہ آپ کہیں تو میں نماز پڑھا دوں''۔ گاؤں کے نمازیوں نے آپ پر نظر ڈالی اور کہنے لگے۔ واہ تجھ سے تو ہمارا امام ہی اچھا ہے۔ ہم تیرے پیچھے کیوں نماز پڑھیں؟

۳۲۳۔ کرامات امدادیہ ص ۲۸۔

۳۲۴۔ ایضاً

۳۲۵۔ سوانح قاسمی ص ۱۸۲ جلد ۲۔

۳۲۶۔ تذکرۃ الرشید امداد المشتاق نقش حیات و کرامات امدادیہ وغیرہ۔

۳۲۷۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی وفات کے بعد ان کی سوانح حیات لکھی تھی جو مختصر ہے مگر نہایت جامع۔ اس کا نام جس سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی تاریخ وفات بھی معلوم ہوتی، یہ ہے:

حالات جناب طیب	مولوی محمد قاسم صاحب	مرحوم
۸۱۷	۳۸۶	۲۹۴

۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ

یہ رسالہ اسی سال مطبع صادق الانوار میں باہتمام حافظ عبدالقدوس صاحب طبع ہو چکا تھا۔ تاریخ طباعت ۷؍ شوال ۱۲۹۷ھ۔ پھر مولوی سید احمد صاحب مالک کتب خانہ اعزازیہ نے اس رسالہ کو اپنے رسالہ ماہنامہ خالدین میں قسط وار شائع کیا اور اس کا نیا نام "سوانح عمری" رکھا۔ یہ اقتباس اسی سوانح عمری مطبوعہ انوری پریس دیوبند سے ماخوذ ہے۔

۳۲۸۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اس سفر کی ڈائری لکھتے رہے ہیں۔ جو حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ کی حسن توجہ سے بیاض یعقوبی کے نام سے ۱۹۲۹ء میں شائع کی گئی۔ اس ڈائری میں سہارنپور سے تاریخ روانگی ۱۸؍ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۶ھ مطابق ۲؍ دسمبر ۱۸۶۹ء یکشنبہ ہے۔ اس ڈائری میں ان تمام مقامات کا تذکرہ ہے جہاں قیام ہوا مقامات وہی ہیں جہاں حضرت حاجی صاحب نے سفر ہجرت کے وقت قیام فرمایا تھا۔ اس ڈائری سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حاجی حافظ عابد حسین صاحب بھی رفیق سفر ہیں اور یہ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے دیوبند میں ایک مدرسہ کے قیام کی تجویز پیش کی اور اپنے چند رفقاء کے ساتھ اس کی بنیاد رکھی۔ اس مدرسہ نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی حسن توجہ سے دارالعلوم کی عظمت اختیار کی۔

۳۲۹۔ مولانا محمد تقی صاحب حضرت مولانا گنگوہیؒ کے ماموں بھی تھے۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ کی عمر ابھی سات سال کی تھی کہ والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ نے اپنے دادا قاضی پیر بخش صاحب اور اپنے ماموں صاحبان کی زیر سرپرستی پرورش پائی۔ مولانا محمد تقی صاحب کے علاوہ تین ماموں اور تھے مولانا تقی صاحب، مولانا عبدالغنی صاحب، مولانا محمد شفیع صاحب۔ مولانا ابو نصر صاحب جن کا تذکرہ سطور بالا میں آئے گا مولانا عبدالغنی صاحب کے فرزند ارجمند تھے۔ عمر میں صرف دو سال چھوٹے تعلیم و تربیت میں ہمیشہ ساتھ رہے۔ مولانا محمد تقی صاحب عالم و فاضل صاحب نسبت بزرگ تھے۔ سلسلۂ قادریہ میں حضرت شاہ سیف اللہ صاحبؒ سے بیعت اور مجاز تھے۔ اتباع سنت کا عشق یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ رفتار و گفتار اور خورد و نوش میں بھی اتباع سنت معمول تھا۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ آپ کا مزار دہلی میں قلعہ کے میدان میں پرانی سنہری مسجد کے شمالی جانب بیلوں میں ہے (ص ۳۸ تذکرۃ الرشید حصہ اول)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جھجر میں نہیں بلکہ دہلی کے کسی معرکہ میں شہید ہوئے۔

۳۳۰۔ گمری کے خوش حال زمیندار راؤ اشرف علی خان صاحب تھے۔ جن کے خلف رشید اپنے زمانہ کے بلند پایہ مشہور عالم اور شیخ طریقت حضرت مولانا عبدالرحیم تھے جنہوں نے رائے پور ضلع سہارنپور کو تلقین و ارشاد کا مرکز بنایا اور آج اسی مرکز سے مرشد وقت حضرت مولانا عبدالقادر صاحب کا آفتاب ارشاد، ضیا پاشیاں کر رہا ہے۔ حضرت گنگوہیؒ گمری میں راؤ اشرف علی خاں صاحب کے یہاں ہی مقیم ہوئے تھے۔ اس وقت حضرت مولانا عبدالرحیم صاحبؒ کی عمر تقریباً تین سال تھی۔ راؤ اشرف علی خاں صاحب حضرت گنگوہیؒ سے اتنے متاثر ہوئے کہ آپ سے بیعت ہونے کی درخواست کی۔ مگر حضرت گنگوہی نے مشورہ دیا کہ قطب وقت حضرت حاجی صاحب ہندوستان میں موجود ہیں ان سے بیعت ہو جیئے۔ چنانچہ اس سفر میں راؤ اشرف علی خاں صاحب کو اپنے ساتھ تھانہ بھون لے گئے اور وہاں حضرت حاجی صاحب سے بیعت کرا دی۔ (تذکرۃ الرشید جلد ۱ ص ۸۱)۔

۳۳۱۔ ایضاً

۳۳۲۔ کیونکہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں ہے۔

۳۳۳۔ حافظ لطف علی صاحب حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے ہم جد ہیں۔ ایک بزرگ شیخ ابوالفتح تک حافظ لطف علی صاحب کا یہ سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔ حافظ لطف علی صاحب خلف حافظ محمد حسن خلف حکیم غلام اشرف صاحب خلف حکیم عبداللہ صاحب خلف شیخ ابوالفتح صاحب، اور مولانا محمد قاسم صاحب کا سلسلہ اس طرح ہے۔ مولانا محمد قاسم صاحب خلف شیخ اسد علی صاحب خلف شیخ غلام شاہ صاحب خلف شیخ محمد بخش صاحب خلف شیخ علاء الدین صاحب خلف ابوالفتح صاحب (العلم کراچی بابت ماہ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۸ء)

۳۳۴۔ تذکرۃ الخلیل ص ۱۵۔ دارالعلوم دیوبند کی ابتداء ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ اور مظاہر العلوم سہارن پور کی ابتداء ماہ رجب ۱۲۸۳ھ میں ہوئی۔ تذکرۃ الخلیل ص ۱۰ و ص ۳۲

۳۳۵۔ مولانا محمد احسن صاحب نے دہلی پہنچ کر حضرت مولانا مملوک علی صاحب سے تکمیل کی۔ مولوی محمد حسین صاحب مراد آبادی اپنی تصنیف انوار العارفین میں تحریر فرماتے ہیں:۔ مولوی محمد احسن حافظ قرآن و واعظ خوش بیان، عالم فروع و اصول، دانندہ براہین و دلائل معقول و مدرس علم معانی و کلام و درس کنندہ صحاح ستہ و بلاغت تا مفسر کلام اللہ و محدث حدیث رسول اللہ و جامع جمیع علوم مترجم احیاء العلوم و متصف باخلاق حسن مستند۔ دہلی کالج سے عربی کی تکمیل کے بعد آپ ۱۸۴۷ء/۱۲۶۳ھ میں بنارس کالج میں فارسی کے مدرس اول مقرر ہوئے۔ وہاں آپ نے ایک بیوہ خاتون مسماۃ زینب سے نکاح کر کے عقد بیوگان کی سنت زندہ کی۔ اس بیوہ کے ساتھ ایک شیر خوار بچہ بھی آپ کی تولیت میں آیا۔ جس نے جوان ہو کر دہلی میں ''مطبع مجتبائی'' قائم کی جو بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں سب سے زیادہ مشہور مطبع تھا۔ جس نے بے شمار نادر تصنیفات پوری صحیح اور خوبی کے ساتھ شائع کر کے علم کے قدر دانوں سے خراج تحسین حاصل کیا۔

مولانا محمد احسن صاحب کا قیام بنارس میں تقریباً چار سال رہا۔ پھر آپ بریلی تشریف لے آئے اور بریلی کالج میں شعبۂ فارسی و عربی کے ہیڈ مقرر کر دیئے گئے۔ آپ نے مستقل قیام کے لیے بریلی ہی منتخب کر لی۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب انگیز طوفان آیا تو آپ نے اپنے بھائیوں اور دوسرے بزرگوں اور ساتھیوں کے خلاف اس انقلابی طوفان کے سامنے سینہ تان لیا۔ ابھی یہ سیلاب بریلی میں داخل نہیں ہوا تھا کہ آپ نے وعظ اور تقریروں کے ذریعہ مسلمانوں کو شرکت سے روکنے کی کوشش کی لیکن زمانہ کی رو کے مقابلہ پر سینہ تان لینا غلط تھا۔ چنانچہ آپ پر عوام کی یورش یہاں تک بڑھی کہ آپ بریلی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ جب یہ سیلاب پایاب ہو گیا تو آپ دوبارہ بریلی واپس آئے یہاں مطبع صدیقی قائم کیا جس کو آپ کے برادر محترم مولانا محمد مظہر صاحب اور مولانا محمد منیر صاحب کا تعاون حاصل رہا، اور اسی تعاون کی بنا پر اس مطبع کو سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ کی تصانیف شائع کرنے کی سعادت میسر آئی۔ حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفا جیسی اہم ترین تصانیف سب سے پہلے ۱۲۸۶ھ، ۱۸۶۹ء میں اسی مطبع سے شائع ہوئیں۔ بریلی میں آپ نے عربی مدرسہ بھی قائم کیا۔ جس کا نام مصباح التہذیب رکھا۔ اس کے بعد اس کو مصباح العلوم کہا جانے لگا۔ اب اسی نام سے مشہور ہے۔ تقریباً نوے سال عمر پا کر ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء میں آپ نے وفات پائی۔

۳۳۶۔ مولانا رحمت اللہ صاحب کے والد صاحب کا اسم گرامی مولانا نجیب اللہ صاحب تھا۔ جو میرٹھ میں میر منشی رہے تھے۔ اجداد کا اصلی وطن پانی پت تھا۔ (جو جمنا کی دوسری جانب تقریباً بارہ میل کے فاصلہ پر ہے) جد اعلیٰ کا نام شیخ عبدالرحمن عثمانی گازرونی بتایا گیا ہے۔ آپ ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کیرانہ میں حاصل کر کے دہلی تشریف لے گئے۔ لال قلعہ کے پاس مولانا محمد حیات کے مدرسہ میں داخل ہوئے۔ اس درسگاہ میں مدرسین اور دہلی کے دوسرے اساتذہ سے استفادہ کیا۔

۳۳۷۔ حضرت مولانا فیض احمد صاحب بدایونیؒ بھی اس مناظرہ میں معاون تھے۔

۳۳۸۔ محمد احمد صاحب نامہ نگار روزنامہ الجمعیۃ کی رپورٹ روزنامہ الجمعیۃ (مئی ۱۹۵۶ء) میں شائع ہوئی تھی۔ یہ مضمون اسی سے

ماخوذ ہے۔

۳۳۹۔ منگلور، رڑکی سے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر مشہور قصبہ ہے۔ حضرت مولانا قاضی اسمٰعیل صاحب جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے معاصر اور بلند پایہ شیخ طریقت تھے۔ ان کے صاحبزادے قاضی عبدالغنی صاحب اور ہندوستان کے مشہور قوم پرور و خوش رہنما مولوی سید طفیل احمد صاحب (علیگ) مصنف حکومت خود اختیاری اور مسلمانوں کا روشن مستقبل و رسالہ "جواز سود" وغیرہ ان کے خلف رشید مولوی محمد احمد صاحب کاظمی ایڈووکیٹ، ان سب کا وطن مالوف یہی قصبہ منگلور (ضلع سہارن پور) ہے۔

۳۴۰۔ یہ بھی بیان محفوظ ہے جو الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع بھی ہو چکا ہے۔

۳۴۱۔ از عزیز حسن خاں صاحب حسن پوری، بحوالہ سنڈے ایڈیشن "الجمعیۃ" مورخہ ۲۴ شعبان ۱۳۷۲ھ ۱۰ مئی ۱۹۵۳ء۔

۳۴۲۔ ماسٹر ریاض الدین صاحب کا یہ مضمون روزنامہ "الجمعیۃ" کے سنڈے ایڈیشن میں شائع کیا جا چکا ہے۔ ماسٹر ریاض الدین صاحب موضع اونچا نہ ضلع بلند شہر کے رہنے والے ہیں۔ نواب ولی داد خاں کے ایک ساتھی حاجی یاد اللہ خاں صاحب جن کا ذکر اسی مضمون کے آخر میں آ رہا ہے۔ وہ ماسٹر ریاض الدین صاحب کے دادا کے بھائی تھے۔ ماسٹر صاحب نے یہ واقعات اپنے خاندان کے ان بزرگوں سے سنے ہیں۔ جو ۱۸۵۷ء میں جوان تھے۔ ماسٹر ریاض الدین صاحب کے موضع اونچا نہ سے قلعہ مالاگڑھ پورب دکھن کی سمت ۸ میل کے فاصلہ پر تھا اور موضع اسوڑہ صرف ایک میل اتر پورب میں۔

۳۴۳۔ سید مصطفیٰ علی صاحب بریلوی کا مضمون جو روزنامہ الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کا ماخذ ہے۔

۳۴۴۔ روہیلکھنڈ میں بغاوت کی ابتدائی تنظیم جن کے ہاتھوں ہوئی ان میں جنرل بخت خاں اور امداد علی خاں کے علاوہ محمد شفیع رسالدار (سواروں کی رجمنٹ ۸) جنرل نیاز محمد خاں، ظفر یار خاں اور سادات محمد خاں اہمیت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے تنظیم اس ہوشیاری اور قابلیت سے کی کہ انگریز افسروں کو انقلاب کے وقت تک حقیقت حال کا پورا اندازہ نہ ہو سکا (اعظم جنگ آزادی نمبر کراچی)

۳۴۵۔

۳۴۶۔ بدایوں کا جہادِ حریت از مولوی محمد سلیمان صاحب بدایوں مطبوعہ العلم بابت جولائی ستمبر ۱۹۵۵ء۔ ایضاً میکی من جلد چہارم ص ۳۶۸۔

۳۴۷۔ پوائیں میں ظہور: محترم غلام رسول مہر صاحب میکی من جلد پنجم ص ۱۴۱ و ۱۴۲ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں: مولانا احمد اللہ کی شہادت کے بعد مجاہدوں اور آس پاس کے زمینداروں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ راجہ پوائیں کو اس غداری کی کہ اس نے مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کو دھوکے سے شہید کرا دیا، عبرت ناک سزا دیں گے۔ اس موقع پر جہاں نظام علی خاں، نواب تفضل حسین خاں، مولا بیت شاہ، علی خاں میواتی اور بعض دوسرے مجاہد فوج کے گرد جمع ہوئے۔ وہاں خان بہادر خان بھی چار ہزار جانباز وں کے ساتھ ان کے ہمراہ تھا۔ نظام علی خاں اور علی خاں میواتی نے اس سلسلے میں پہلی بیعت پر بھی حملہ کیا۔

۳۴۸۔ آخری وقت میں ان سے کہا گیا کہ کچھ نصیحت وصیت کرنی ہو تو کیجئے۔ آپ نے فرمایا مجھے کچھ نہیں کہنا۔ پھر آبدیدہ ہو کر یہ شعر پڑھا۔ یہ جرم عشق حق ہے کشندہ غوغائیست   ز مرگ زندہ گم ہے شور و غوغائیست

۳۴۹۔ یہ پورا مضمون جو ص پر ختم ہوتا ہے محترم ایوب صاحب بی۔ اے کا مرتب (غلام رسول مہر) فرمودہ ہے۔

۳۵۰۔ بدایونی کی تاریخ منتخب التواریخ ۱۹۱ ھ فرشتہ ۵۹۹ ھ۔

۳۵۱۔ قطب الدین خود ایک سال بدایوں رہا پھر اپنا نائب سپہ سالار ہزبر الدین رجب کو کیا۔ (کنز التاریخ)

۳۵۲۔ عمدۃ التاریخ جغرافیہ بدایوں کے جنوب مشرقی سرحد پر قنوج کا ضلع فرخ آباد ہے۔ دریائے گنگا ہر دو اضلاع کے درمیان ہے اس وقت فرخ آباد تھا۔ قنوج تھا۔ سورج پور کا گھاٹ برسوں سے مشہور چلا آ رہا ہے۔

۳۵۳۔ کان سین کا محلہ اس وقت تک بدایوں میں ہے اور قصبہ اوجہت ضلع بدایوں میں کان سین کی چھتری ہے۔

۳۵۴۔ عمدۃ التاریخ مؤلفہ مولوی عبدالحی مرحوم۔

۳۵۵۔ عمدۃ التاریخ

۳۵۶۔ ایضاً

۳۵۷۔ کنز التاریخ مطبوعہ ۱۹۰۷ء اب بدایوں میں اٹھائیس مندر اور اٹھانوے مساجد ہیں۔

۳۵۸۔ آئین اکبری۔ اس وقت آبادی ۵۲۹۲۶ (۱۹۵۱ء)۔

۳۵۹۔ ۱۷۷۴ء میں نواب شجاع الدولہ اور حافظ رحمت خاں میں لڑائی کٹرہ میراں پور میں ہوئی۔ روہیلوں کو شکست ہوئی۔ حافظ اس لڑائی میں کام آئے۔

۳۔ سہسوان بدایوں سے غرب میں ۲۵ میل کے فاصلہ پر ہے۔ سہراب ڈ نام کے راجہ نے آباد کیا تھا اور قلعہ بھی بنایا تھا۔ ذھند نام کی بہت بڑی جھیل اس میں ہے۔ قصبہ گنجان آباد نہیں ہے۔ کیوڑہ کی کاشت خصوصی چیز ہے۔ محمد شاہ تغلق کے زمانہ کی ایک مسجد آثار الصنادید میں ہے۔ یہ خطہ بہت مردم خیز ہے۔ بڑے بڑے علماء فضلاء کا مسکن رہا ہے۔ چند حضرات کے نام درج ذیل ہیں۔ شمس العلماء مولوی امیر احمد جو غالباً دور انگریزی کی پہلی کھیپ کے شمس العلماء ہیں یہ خطاب ان کو ۱۳۰۵ھ میں ان کی ادبیت کی بنا پر ملا تھا۔ اگلے سال ۱۳۰۶ھ میں آپ کی وفات ہوگئی۔ شمس العلماء مولوی محمد امین جج جبل پور المتوفی ۱۹۲۹ء۔ علامہ مولوی امیر حسن مولوی عبدالباری، مشہور مناظر جن سے پادری لوگ مقابل آتے گھبراتے تھے المتوفی ۱۳۰۲ھ۔ مولوی محمد بشیر کی بابت صرف اس قدر بتا دینا کافی ہے کہ اسحاق بن عبدالرحمن بن حسن بن محمد النجدی کو مولوی صاحب سے شرف تلمذ تھا۔ المتوفی ۱۳۲۳ھ۔ آبادی میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ کل آبادی ۲۱۴۲۲۔

۳۶۱۔ شیخوپورہ تین میل کے بعد پر بدایوں سے سوت ندی کے کنارے پر آباد ہے۔ نواب فرید خاں نے عہد عالمگیر میں آباد کیا اور ایک قلعہ تعمیر کیا اور معہ اپنے اہل خاندان کے بدایوں سے سکونت ترک کر کے توطن اختیار کیا۔ آبادی قصبہ کی ۳۸۴۳۔

۳۶۲۔ شیخ شرف الدین نسباً فاروقی ہیں حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کی اولاد میں۔ ان کے مورث اعلیٰ شیخ اعظم شہید (۶۹۱ھ) بعہد اکبر موضع منور میں شہید ہوئے۔ داماد حضرت خواجہ سلیم چشتی المتوفی ۹۸۰ھ کے تھے۔ ان کا بیٹا نواب قطب الدین خاں تھا جو جہانگیر کا رضاعی بھائی تھا (المقتول ۱۶۰۷ء) گورنر بنگال کا رہا۔ اس کے تین لڑکے شیخ ابراہیم الملقب بہ نواب کشور خاں (المتوفی ۱۰۲۱ھ، ۱۶۱۲ء) نواب فرید خاں (المتوفی ۱۰۷۵ھ، ۱۶۶۴ء) اول الذکر اور آخر الذکر یکے بعد دیگرے بدایوں کے گورنر رہے۔ ثانی الذکر کا لڑکا نواب اخلاق خاں گورنر دکن رہا۔ شیخ شرف الدین بڑے زمیندار تھے۔ انگریزوں کی وفاداری کے صلہ میں بڑی زمینداری ملی اور سی آئی ای کا خطاب اس خاندان کے ایک رکن نواب عبدالغفار (المتوفی ۱۹۳۰ء) اس طرح سے پانچ مغلئی نواب اور ایک انگریزی خاندان شیخوپور کے نواب ہوئے۔

۳۶۳۔ موضع ککوڑہ پرگنہ اوجھانی میں بدایوں سے چودہ میل جنوب مغرب میں گنگا کے کنارے آباد ہے۔ یہاں پر کاتکی اشنان پر میلہ جمع ہوتا ہے۔ تقریباً تین لاکھ کا مجمع ہو جاتا ہے۔ یہ میلہ نواب عبداللہ خاں خلف نواب علی محمد خاں (المتوفی ۱۱۸۰ھ) نے اپنے ایک بریلی کے ہندو دوست کی وجہ سے لگایا تھا۔ ایک عرصہ تک رؤسائے شیخوپور اس میلہ کی آمدنی وصول کرتے رہے پھر کسی مصلحت سے وہ آمدنی ڈسٹرکٹ بورڈ بدایوں کو منتقل کر دی۔ اب میلہ پر مستقل اقتدار و قبضہ ڈسٹرکٹ بورڈ کا ہے۔ آبادی ۱۸۰۲۔

۳۶۴۔ حیات حافظ رحمت خاں ص ۳۶۲۔

۳۶۵۔ شیخ فصاحت اللہ بدایوں کے صدیقی شیخ بریلی میں وکالت کرتے تھے۔

۳۶۶۔ جلندھری سرائے بدایوں کا جنوبی محلہ ہے۔ شیخوپور سے ایک میل سے کچھ زائد فاصلہ پر ہے معزز اور بہادر پٹھانوں کی بستی ہے۔ مرفہ الحال لوگ ہیں۔

۳۶۷۔ موضع گورائی شیخوپورہ سے تین میل پر ہے۔ سربرآوردہ لوگ تعلیم یافتہ پٹھان ہیں۔ آبادی ۱۵۷۸ افراد پر مشتمل ہے۔

۳۶۸۔ مولوی تفضل حسین بدایوں کے صدیقی شیخ ان کے نام کا اس وقت تک بدایوں میں مولوی گنج بازار ہے جو ان کی ملکیت تھا،

ضبط ہو کر نیلام ہو گیا۔ نام باقی ہے۔ زیادہ تر بسولی اور آنولہ میں تحصیلدار رہے۔

۳۶۹۔ مولوی اشرف علی تحصیلدار ولد مولوی نجف علی ممتاز (المتوفی ۱۸۵۲ء) باپ اور بیٹے دونوں تحصیلدار تھے۔ نسباً بدایوں کے صدیقی شیخ۔ اول الذکر نواب گنج ضلع بریلی میں تحصیلدار رہے۔

۳۷۰۔ منشی ذوالفقار الدین ولد وہاب الدین موجد بدایوں کے متولیوں کے خاندان سے تھے۔ آپ کی شہادت کا تذکرہ آگے آئے گا۔ آپ کے والد مولوی وہاب الدین موجد تخلص کرتے تھے۔ سلیم پور ضلع بدایوں میں تحصیلدار نواب وزیر آف اودھ کے زمانہ میں تھے۔ جب انگریزوں کے پاس ۱۸۰۱ء میں بدایوں آیا تو انگریزوں نے موجد کو بدستور اسکے عہدہ اور جائے تعیناتی پر رکھا۔ "نظامی بدایونی" (مولوی نظام الدین حسین ایڈیٹر ذوالقرنین کی سوانح عمری مرتبہ مولوی محمد احمد کاظمی مطبوعہ ۱۹۲۹ء) کے صفحہ ۶ پر لکھا ہے۔ اس وقت روہیلوں کی عملداری تھی اور وہ (موجد) داتا گنج ضلع بدایوں میں تحصیلدار تھے۔ انہیں کے وقت میں سلطنت کی کایا پلٹ ہوئی۔ انگریزی سکہ جاری ہوا۔ برٹش حکام نے بھی اس عزت کو قائم رکھا اور بدستور اپنے عہدہ پر مامور رہے موجد کے زمانہ میں تحصیل داتا گنج میں نہ تھی بلکہ سلیم پور میں تھی۔ ۱۸۳۳ء میں انگریز نے سلیم پور سے تحصیل داتا گنج کو منتقل کی۔ اس وقت موجد کا انتقال ہو چکا تھا۔ روہیلوں کی عملداری بدایوں سے ۱۷۷۴ء میں ختم ہو کر نواب وزیر کو پہنچی۔ موجد کے دوسرے دو بیٹوں کا ذکر کاظمی صاحب نے کیا۔ مگر منشی ذوالفقار الدین کا عمداً ذکر کرنے سے گریز کیا ہے۔

۳۷۱۔ موضع کہانک بدایوں سے جانب شمال ۵ میل کے فاصلہ پر ہے۔ سے ۱۹۰۱ء سے شب تیرس کا میلہ لگتا ہے۔ آبادی ۹۰۷ ہے۔

۳۷۲۔ موضع رفیع آباد موضع بناور کے ملحق ہے۔ ۱۵۹۲ اشخاص آباد ہیں۔

۳۷۳۔ موضع بھٹولی دو میل سے کم داتا گنج سے ہے۔ ٹھاکروں کی آبادی ہے۔ زائد تعلیم یافتہ لوگ ہیں ٹھاکر روشن سنگھ ڈپٹی کلکٹر (المتوفی ۱۹۱۲ء) مؤلف "گل محسن" ٹھاکر تاریخ ٹھاکران یہاں کے رہنے والے تھے۔ آبادی چودہ سو باون ہے۔

۳۷۴۔ داتا گنج ۱۰ میل پر بدایوں سے مشرق میں ہے۔ ۱۸۳۳ء میں تحصیل کا صدر مقام ہوا ہے۔ ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ مہاجن اور ویش زائد ہیں۔ پٹھانوں کی آبادی اگرچہ مختصر ہے۔ مگر باثر ہیں۔ آبادی ۳۸۷۴۔ ہنگامہ کے زمانہ میں منشی چیت سنگھ داتا گنج میں تحصیلدار تھے۔

۳۷۵۔ موضع بکسینہ جانب جنوب داتا گنج سے چار میل کے فاصلہ پر سوت ندی آباد ہے۔ موضع کی آبادی ۱۷۹۹ ہے۔

۳۷۶۔ دھپور دھام نام کا راجہ چند صدی قبل گزرا ہے۔

۳۷۷۔ گکرالہ، بدایوں سے گیارہ میل مشرق میں ہے۔ نواب وزیر اودھ (۱۷۷۳ء لغایت ۱۸۰۱ء) نے یوسف علی خاں کو جاگیر میں دیا تھا۔ ۱۸۰۵ء میں نواب جنگی خاں روہیلہ کی جاگیر میں گکرالہ آیا۔ اس نے جنگ مرہٹہ ۱۸۰۳ء میں خاصی شہرت پائی تھی۔ اس کا انتقال ۱۸۱۹ء میں ہوا۔ کمپنی نے ان کے ورثاء بجائے جاگیر کے پنشن کر دی۔ جنگی خاں کے والد عمر خاں تھے۔ جن کو آصف الدولہ (۱۷۷۵ء لغایت ۱۷۹۷ء) اپنے ساتھ لکھنؤ لے گیا۔ عمر خاں کا انتقال لکھنؤ میں ہوا۔ نوٹیفائڈ ایریا ہے۔ مسلم آبادی کی اکثریت ہے۔ قصبہ کی آبادی ۹۹۶۲ ہے۔ تعلیم پر مسلمانوں کو بہت توجہ ہے۔ قصبہ ہذا کے مسلم مدرس بکثرت ہیں۔

۳۷۸۔ محسن علی خاں فرخ آباد کے پٹھان نواب بنگش کے ساتھ انگریزوں سے لڑے۔ ان کے ایک بھانجے منو خاں قائم گنج کے رئیس اور بڑے بہادر تھے۔ ۱۹۲۸ء کی ایک مقامی لڑائی میں نہایت بہادری سے جان دی۔ مولوی فضل الرحمن بدایونی وکیل قائم گنج نے اس سانحہ کی ایک درد انگیز مثنوی لکھی ہے۔

۳۷۹۔ موضع نولی تاتارپور تحصیل داتا گنج پرگنہ اوسیت کا شاداب موضع ہے۔ آبادی ۱۶۲۵ اشخاص کی ہے۔

۳۸۰۔ شہزادہ فیروز خلف بہادر شاہ شاہ دہلی نے ۱۸ فروری ۱۸۵۸ء کو ایک اعلان ہندوستان کے ہندو مسلم کے نام انگریزوں کے خلاف جاری کیا تھا۔ جو بہادر پریس بریلی سے شائع ہوا تھا مولوی قطب شاہ ناشر تھے۔ شاہزادہ فیروز کا انتقال نہایت غربت و عسرت میں مکہ معظمہ میں ۱۸۷۷ء میں ہوا۔ (ٹائمز آف کراچی ۱۴ مارچ ۱۹۵۴ء)

۳۸۱۔ اسلام نگر، اس کا پہلا نام بیدھنا تھا۔ التمش کے زمانہ میں رستم خاں نے اسلام نگر رکھا۔ ایک روایت یہ ہے کہ رستم خاں دکھنی

سنبھل کا گورنر عہد شاہجہاں میں تھا۔ اس نے اپنے لڑکے اسلام خاں کے نام سے اسلام نگر نام رکھا۔ یہ قصبہ تابع سرکار سنبھل مغل عہد میں تھا۔ بدایوں سے ۳۳ میل پر ہے۔ تحصیل بسولی کا تھانہ ہے۔ مسلم آبادی نصف سے کم ہے قصبہ کی آبادی ۷۰۶۱ ہے۔

۳۸۲۔ موضع بیرول پرگنہ اوجھانی میں گنگا کے کنارے آباد ہے۔ ایک ہزار ایک سو انتیس مردم شماری ہے۔

۳۸۳۔ حکیم سعادت علی خاں قصبہ آنولہ (جو نواب علی محمد خاں کا دار الحکومت تھا) ضلع بریلی کے بڑے رؤسا سے تھے ۱۸۳۰ء میں بدایوں کے تحصیل دار تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ نواب محمد سعید خاں بھی بدایوں میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ نواب صاحب بدایوں سے ہی مریر آرائے مسند ریاست رام پور ہوئے تھے اس وقت نواب صاحب حکیم سعادت علی خاں کو اپنے ساتھ رام پور لے گئے۔ اپنی فوج کا افسر اعلیٰ اور مشیر ریاست مقرر کیا۔ نواب محمد علی خاں کا قلعہ اور محلات جب نیلام ہوئے۔ حکیم سعادت علی خاں نے خرید لئے جو اس وقت تک ان کی اولاد کے قبضہ میں ہیں۔ حکیم صاحب نے قصبہ آنولہ میں انگریزی شفاخانہ بے نظیر رفاہ عام کھولا جو اس وقت تک جاری ہے۔ حکیم صاحب ایک غیر معمولی قابلیت کے حامل تھے۔ انہوں نے زمینداری میں بہت سے اصلاح کے کام کئے۔ موضع بکرین تحصیل بسولی تھانہ وزیر گنج میں ان کا یہ موضع ہے۔ اس گاؤں میں جو سڑکیں آبادی میں نکالی ہیں، اس قدر چوڑی جس کی مثال مشکل سے بہت سے شہروں میں نہ ہوگی۔

۳۸۴۔ موضع جائی پرگنہ اوسیت تحصیل داتا گنج میں لب گنگا آباد ہے۔ ۱۲۵ عاقلوں کی آبادی ہے۔

۳۸۵۔ مفصل حالات دوسرے مقامات میں ملاحظہ فرمایئے۔

۳۸۶۔ مفصل حالات دوسرے موقع پر ملاحظہ فرمایئے۔

۳۸۷۔ دوسرے موقع پر حالات ملاحظہ فرمایئے۔

۳۸۸۔ بیدکی سزا میں صرف ایک نام شیخ مسیح الدین ولد شیخ غلام محمد کا معلوم ہوا ہے۔ ہنگامہ سے قبل مختاری کرتے تھے۔ الزام بغاوت میں گرفتار ہوئے۔ ساٹھ بید لگے۔ آخری ضرب بید پر اللہ کہا۔ اس پر بدبخت نے دس بید زور لگوائے۔ بے ہوش ہوگئے۔ ۱۹۲۲ء میں انتقال کیا۔

۳۸۹۔ موضع میاؤ، اوسیت سے داتا گنج جانے والی سڑک پر ہے۔ آبادی ۳۰۳۰ ہے۔ مسلم آبادی کافی ہے۔ موضع کا رقبہ ۲۹۱۲ ایکڑ ہے۔ بڑا حصہ بدایوں کے مسلمانوں کی زمینداریوں کا تھا۔ غالب حصہ کے مالک بدایوں کے محلہ جالندھری سرائے کے لودھی پٹھان تھے۔

۳۹۰۔ موضع بیلا ڈانڈی تقریباً تین میل پر داتا گنج سے گنگا کے کنارے پر آباد تھے۔ آبادی دریا سے کٹ گئی۔ لوگ باقی میں رہ رہے تھے۔ اس وقت تین سو اشخاص کی آبادی ہوگی۔ بختاور سنگھ وقند ھری پسران اجیت سنگھ میں اسوقت ارکار سنگھ پسر نرائن سنگھ صوبہ کی اسمبلی کا ممبر ہے۔

۳۹۱۔ مولوی وزیر احمد ولد مولوی محمد حسین (المتوفی ۱۹۳۳ء) ٹونک والے۔ مولوی صاحب کے والد اور چچا حافظ احمد حسین ریاست ٹونک میں بہت ممتاز عہدوں پر متمکن تھے۔ نواب محمد علی خاں رئیس ٹونک ایک ہنگامہ کے سلسلہ میں معزول ہوئے اور بنارس رہنے کا حکم ہوا۔ یہ دونوں بھائی بھی نواب کے ساتھ بنارس آ گئے۔ حافظ صاحب نے نواب کے معاملہ کا مرافعہ لندن جا کر پیش کیا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب سر سید احمد خاں (اپریل ۱۸۶۹ء تا اکتوبر ۱۸۷۰ء) معہ اپنے دونوں لڑکوں کے لندن گئے ہوئے تھے۔ حافظ صاحب اور سید صاحب کی وہاں ملاقاتیں رہیں۔ حافظ صاحب نے اپنے بھتیجہ کو جو دونوں بھائیوں میں اس وقت اولاد اکبر تھے اور عربی اور فارسی کے منتہی تھے، انگریزی پڑھا کر بدایوں کا پہلا گریجوایٹ کرایا۔

۳۹۲۔ یہ تمام مضمون جناب محمد ایوب صاحب قادری بی اے بدایونی کا مرتب فرمودہ ہے۔ جو الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہو چکا ہے۔

۳۹۳۔ از ۳۲۱ تا ۳۸۱ ماخوذ از مضمون محترم سلیمان صاحب شائع شدہ الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن۔

۳۹۴۔ جناب محترم محمد ایوب صاحب قادری بی اے بدایونی کا ایک بہت ہی قابل قدر مقالہ روزنامہ الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن

مورخہ ۱۹ ر نومبر ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون اسی سے ماخوذ ہے۔

۳۹۵۔ سر سید احمد خاں مرحوم نے اپنی کتاب سرکشی اہل بجنور میں تحریر فرمایا ہے کہ مراد آباد جیل ۱۹ ر مئی کو توڑ دی گئی تھی۔ بظاہر یہی صحیح ہے۔

۳۹۶۔ سید گلزار علی صاحب، درویش علی خاں کے اخلاف میں سے تھے۔ درویش علی خاں صاحب کسی زمانہ میں مغل بادشاہ کی طرف سے پنج ہزاری منصب وار رہے تھے۔ اس موروثی نمک خواری نے اس وقت مغل بادشاہ سے وفاداری پر آمادہ کیا۔ آپ نے بادشاہ کے نام درخواست بھیجی۔ سنبھل، امروہہ اور مراد آباد سے انگریزوں اور ان کی حکومت ختم کر دینے کی بشارت دیتے ہوئے خاندانی منصب کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ درخواست میں یہ بھی ظاہر کیا کہ امروہہ کا نظم ونسق بڑے بھائی شیخ بشارت علی کے سپرد ہے جن کے ماتحت پانچ سو نوجوان کام کر رہے ہیں اور میں غازی آباد پہنچ کر نواب ولی داد خاں کی مدد کر رہا ہوں۔ (تاریخ سادات امروہہ اور باغی علماء ص ۷۸)

۳۹۷۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ نواب مجو خاں گرفتار کرنے والوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے مگر زیادہ مشہور آخری روایت ہے۔

۳۹۸۔ ماخوذ از مشاہیر جنگ آزادی مصنفہ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی ص ۲۶۲، ص ۲۶۳۔

۳۹۹۔ حضرت مولانا کفایت علی صاحب کافی شہید کے متعلق معلومات کا یہ تمام ذخیرہ جس سے یہ باب مرتب کیا گیا ہے۔ محترم محمد ایوب صاحب، قادری، بی اے کے مضمون سے ماخوذ ہے۔ جو "العلم" جنگ آزادی نمبر (اپریل تا جون ۱۹۵۷ء) کراچی میں شائع ہوا تھا۔

۴۰۰۔ مولانا کافی نے علم طب حکیم شیر علی صاحب سے حاصل کیا۔ حکیم شیر علی صاحب مولانا رحمان علی صاحب مؤلف "تذکرہ علماء ہند" کے والد ماجد تھے۔

۴۰۱۔ شیخ مہدی علی خاں ذکی مراد آبادی شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ اور رام پور کے درباروں سے متعلق رہے۔ لکھنؤ سے ملک الشعراء کا خطاب تھا۔ اپنے دور کے نامور شعراء میں سے تھے۔ مراد آباد میں آپ کے چار شاگرد مولانا کفایت علی کافی، مولوی محمد حسین تمنا، مولوی معین الدین نزہت اور مولوی شبیر علی خاں تنہا۔ چو یار باصفا مشہور تھے۔ ۷۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ سال وفات ۱۲۸۱ھ، ۱۸۶۴ء۔

۴۰۲۔ شاہ ابو سعید بن شاہ صفی القدر ۲ ر ذیقعدہ ۱۱۹۶ھ، ۱۷۸۲ء کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ قرآن شریف حفظ کیا۔ علوم عقلی و نقلی مفتی شرف الدین صاحب رام پوری و شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی سے حاصل کئے۔ حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ دہلوی سے سند حدیث حاصل کی اپنے والد سے مرید ہوئے۔ پھر شاہ درگاہی رامپوری (المتوفی ۱۲۲۶ھ، ۱۸۱۱ء) سے اجازت بیعت و ارشاد حاصل کی۔ شاہ غلام علی صاحب دہلوی سے نقشبندی سلسلہ میں اجازت حاصل کی۔ دہلی میں آپ سے بڑا فیض جاری ہوا۔ بروز عید الفطر ۱۲۴۹ھ، ۱۸۳۱ء ٹونک میں انتقال ہوا۔ جنازہ دہلی لایا گیا۔

۴۰۳۔ اس میں سفر حج مع محمد علی... اس میں حسن مناسبت کا واقعہ نظم کیا ہے۔ حلیہ شریف اور وفات نامہ بھی آپ کے منظوم رسالے ہیں مگر یہ دونوں بہار خلد سے ماخوذ ہیں۔

۴۰۴۔ آگرہ میں نواب کلن خاں (بیرہ بخشی سردار خاں) نواب خان بہادر خاں کی طرف سے حاکم مقرر تھے۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب (شاگرد حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی) نواب جان محمد، نواب حسن، شیخ خیر اللہ اور حکیم سعد اللہ ان کے خاص رفقاء اور مشیر تھے۔

۴۰۵۔ پنجتن کی تفسیر کے لیے مولانا کافی کے دیوان کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے

السلام اے چار یار باصفاء ارکان دین — مجمع جود و حیاء صدق و عدالت السلام
ثنا خوان نبی ہوں اور اصحاب نبی کافی — ابو بکرؓ عمرؓ و عثمانؓ علیؓ سے مجھ کو الفت ہے
مجھے الفت ہے یاران نبی سے — ابو بکرؓ عمرؓ و عثمانؓ علیؓ سے

محبت ان کی ہے ایمان میرا میں ان کا مدح خواں ہوں جان و دل سے

۴۰۶۔ نجیب خاں، احمد شاہ کے وقت میں یعنی ۱۷۴۹ء میں دوندے خاں کا ملازم تھا اور اس کی طرف سے پرگنہ دارانگر کی تحصیل کرتا تھا۔ اس نے بہت سے لوگ اپنے ساتھ جمع کئے اور ان پرگنہ جات پر جواب ضلع بجنور میں ہیں قبضہ کر لیا۔ پھر دوندے خاں کی بیٹی سے اس کی شادی ہوئی۔ اس سبب سے مستقل ملک اس کا ہو گیا اور بادشاہ کے دربار تک بھی رسائی کر لی (تاریخ سرکشی ضلع بجنور سرسید احمد مرحوم) نجیب خاں یوسف زئی عمر خیل روہیلہ پٹھان تھے۔

۴۰۷۔ ضابطہ خاں کے ایک لڑکے کا نام غلام قادر خاں تھا جس نے طوائف الملوکی کے دور میں دہلی پر چڑھائی کی۔ قلعہ میں گھسا اور انگریزوں کے کٹھ پتلی بادشاہ (شاہ عالم) کو معزول کر کے اس کی شان میں وہ گستاخی کی جس نے اس کے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا اور نیک نامی کے بجائے بدنامی اس کے گلے کا طوق بن گئی یعنی اس نے بادشاہ کو اندھا کر دیا۔ بادشاہ کی درد مندانہ اپیل پر مرہٹی رجہ مہاراجہ سندھیا نے غلام قادر خاں کا تعاقب کر کے گرفتار کیا۔ لوہے کے پنجرے میں قید کیا۔ پھر ایک ایک عضو جدا کر کے اس کو مار ڈالا۔ ضابطہ خاں کے دوسرے بیٹے کا نام معین الدین خاں عرف بھمبو خاں تھا جو مہاراجہ سندھیا کے حملے کے وقت جان بچا کر پنجاب بھاگ گیا تھا۔ نواب محمود خاں انہیں معین الدین خاں کے فرزند ہیں۔

۴۰۸۔ پسر نواب معین الدین خاں عرف بھمبو خاں پسر ضابطہ خاں، عالی شان کوٹھی مبارک محل نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔

۴۰۹۔ تاریخ سرکشی ضلع بجنور قلمی ص ۱۸۔

۴۱۰۔ ایضاً ص ۱۷۔ خاندانی اثر کے علاوہ خود نواب محمود خاں کے ذاتی اوصاف نے ان کو ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ محمد ایوب صاحب بی اے نواب کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں۔ تعلیم و تربیت معقول طریقہ سے ہوئی۔ ریاست کا انتظام سنبھالا تو داد و دہش کے باعث قرض سے گراں بار رہے۔ خوش طبع، یار باش اور مہمان نواز تھے۔ شکار کا بہت شوق تھا۔ نشانہ خوب لگاتے تھے۔ (الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن مورخہ ۱۹ر نومبر ۱۹۵۶ء) نواب کی فراخ حوصلگی اور وسیع القلبی کا نتیجہ تھا کہ باوجود سرسید کی خفیہ خط و کتابت مراد آباد کے جج سے کر کراف وسن سے تھی مگر نواب محمود خاں نے اس کو نظر انداز کیا۔ (محمد ایوب صاحب سنڈے ایڈیشن ۹ر نومبر ۱۹۵۶ء)۔

۴۱۱۔ یہ تہذیب الاخلاق کے مصنف سرسید احمد خاں صاحب مرحوم کے اخلاق ہیں کہ نواب محمود خاں کو ہر جگہ نا محمود خاں لکھا ہے اور صرف اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ خاتمہ کتاب میں مسلمانوں کو وفاداری کا سبق دیتے ہوئے اس غریب محمود خاں کو بدذات بھی فرما دیا ہے تاہم غنیمت ہے کہ جس طرح امام بخش عرف بڑے خاں شیرکوٹی اور عنایت رسول صاحب وغیرہ کو حرامزادہ کہا ہے نواب محمود خاں صاحب کو اس خطاب سے معاف رکھا۔

۴۱۲۔ سرکشی ضلع بجنور ص ۲، قلمی

۴۱۳۔ ایضاً ص ۱۶۔

۴۱۴۔ سرکشی ضلع بجنور ص ۳۰ (مطبوعہ)

۴۱۵۔ سید صاحب کی یہ قناعت پسندی قابل تعریف ہے کہ نہ عہد مغلیہ کے منصب پنج ہزاری ہفت ہزاری وغیرہ پر نظر ہے اور نہ انگریزی دور کی گورنری یا کم از کم کلکٹری کا اعزاز و اکرام سامنے ہے خاندان کے سینکڑوں افراد اور خاص اس گھر سے تقریباً ۵۰ افراد میں سے دو ایک کو تحصیلداری کا شرف حاصل ہے۔ چند افراد جمعداری اور رسالداری کے عہدے پر فائز ہیں مگر سید صاحب اسی پر نازاں اور مراحم خسروانہ کے شکر کے لیے سجدہ ریز ہیں اور خمیدہ کمر۔

۴۱۶۔ سرکشی ضلع بجنور ص ۳۰

۴۱۷۔ محمد ایوب صاحب تحریر فرماتے ہیں ۱۳ر جون کو شاہ دہلی کی خدمت میں عرضداشت بھیجی گئی۔ جواب سے نوازا گیا۔ انتظام کی درستی کو بہ نظر استحسان دیکھا گیا۔ مغل شاہزادے دہلی سے نجیب آباد پہنچے (الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن، ۱۹ر نومبر ۱۹۵۶ء)۔

۴۱۸۔ سرکشی ضلع بجنور ص ۹۳۔

۴۱۹۔ ایضاً ص ۱۲ مطبوعہ۔

۴۲۰۔ انگریز سو قع سے کب چوک سکتا تھا، جیسے ہی پاسا پلٹا چودھری صاحبان کا رخ دیکھا مبلغ دس ہزار کی فرمائش کر دی کہ یہ نقد بھیج دیئے جائیں، جہاں صاحب لوگوں کو ضرورت ہے، چنانچہ چودھری پرتاپ سنگھ نے دو قسطوں میں اس فرمائش کی تکمیل کر دی۔ (سرکشی اہل بجنور)۔

۴۲۱۔ مولانا عبداللہ خاں صاحب کرتپوری کے پردادا قلندر بخش خاں اور ان کے خلف رشید حسن رضا خاں، ساکنان بستی کوٹلہ نواب محمود خاں کے رشتہ دار بھی تھے اور شریک جہاد بھی۔ مولانا عبداللہ خاں صاحب اس معرکہ کی (جس میں نواب محمود خاں کو وہ شکست ہوئی جو تمام شکستوں کی بنیاد تھی۔ جس کی تلافی وہ آخر تک نہیں کر سکے، اس معرکہ کی) تفصیل جو اپنے والد الحاج محمد ہدایت اللہ خاں صاحب سے سنی تھی، اس طرح بیان کرتے ہیں:

جنوری ۱۸۵۸ء میں نواب نے ایک بڑی جمعیت کے ساتھ ضلع سہارن پور پر حملہ کی تیاری کی۔ وہ چیدہ نوجوان جو اس معرکہ کے لیے منتخب کیے گئے، ان میں مولانا عبداللہ صاحب کے دادا حسن رضا خاں صاحب بھی تھے۔ مولانا عبداللہ صاحب فرماتے ہیں کہ ضلع بجنور کی شمالی حد پر کوہ ہمالیہ کا بن (وسیع جنگل) واقع ہے اور مغربی حد پر دریائے گنگا۔ نواب کے لشکر نے ضلع سہارنپور پر چڑھائی کا جو راستہ اختیار کیا وہ بہت مناسب تھا۔ نواب نے بن (جنگل) اور پہاڑ کا لحاظ رکھتے ہوئے شمال مغربی حد سے حملہ کی تجویز کی۔ چنانچہ لشکر کا کوچ ہوا۔ بن طے کرنے کے بعد قصبہ "کن کھل" کا رخ کیا۔ سرما کا موسم جنوری کا مہینہ تھا۔ ان ایام میں دریا پایاب ہوتا ہے، اس لیے دریا کو پار کرنا مشکل نہ تھا۔ ابھی یہ پروگرام صیغۂ راز میں تھا کہ شاطر انگریز نے اس کو ناکام بنانے کا بہت گہرا منصوبہ تیار کر لیا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ جیسے ہی لشکر گنگا کے وسط میں پہنچا، گنگا کا وہ بند جہاں سے پانی نہر گنگ میں پہنچتا ہے، توڑ دیا گیا۔ فوراً ایک سیلاب موجزن ہوا اور تقریباً آدھے لشکر کو بہا لے گیا۔ بقول سرسید نواب کے لشکر کا آبِ شمشیر کے بجائے موجِ آب سے کام تمام ہوا انگریز کی چاق و چوبند فوج نے اس تباہ شدہ لشکر کا تعاقب کر کے ایک ایک کو ختم کر دینے کی کوشش کی۔

دادا حسن رضا ہاتھی پر سوار تھے۔ زخمی ہو کر گرے اور ایک درخت سے سہارا لگا کر بیٹھ گئے۔ آدمی شکیل اور وجیہ تھے۔ دشمن کے سپاہیوں نے آپ کو نواب محمود خاں سمجھا اور سر قلم کر لیا (آزادی نمبر روزنامہ الجمعیۃ مورخہ ۱۵ / اگست ۱۹۵۸ء)۔ محمد ایوب صاحب بی اے تحریر فرماتے ہیں کہ نوابی فوج کو غیر متوقع شکست ہوئی۔ انگریزی فوج نے مختلف علاقوں پر قبضہ شروع کر دیا۔ محمود خاں نے حالات کا جائزہ لیا۔ مجلس مشاورت منعقد ہوئی۔ سربرآوردہ حضرات میں سعد اللہ خاں منصف اور احمد اللہ خاں موجود تھے۔ اس کے ماڑے خاں، شفیع اللہ خاں، نتھو خاں، اور مولوی عنایت علی وغیرہ نے نگینہ کے باغوں میں مورچے قائم کیے۔ مقابلے ہوئے مگر انگریز کامیاب ہوا۔ (سنڈے ایڈیشن الجمعیۃ مورخہ ۱۹ / نومبر ۱۹۵۷ء)

۴۲۲۔ ماڑے خاں اصل نام امام بخش۔ شیر کوٹ کے رہنے والے تھے۔ ایک معمولی خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ مگر ہمت و جرأت خداداد تھی۔ جماعتی نظم و نسق کا بھی اچھا سلیقہ تھا۔ جب نظامِ حکومت ختم ہو گیا تو قصبہ کے سربرآوردہ صاحبان نے قصبہ کی حفاظت ان کے ذمہ کی۔ امام بخش صاحب نے رضا کاروں کا دستہ تیار کیا جس نے چند ہی روز میں ایک باضابطہ فوج کی شکل اختیار کر لی اور نہ صرف قصبہ شیر کوٹ میں بلکہ پورے ضلع میں ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ جب نواب محمود خاں کی حکومت قائم ہوئی اور ان کی طرف سے ان کے بھانجے احمد اللہ خاں، نالگذاری وغیرہ کے لیے پہنچے تو ماڑے خاں نے اپنے ہتھیار کھول کر محمود خاں صاحب کے سامنے رکھ دیئے۔ احمد اللہ خاں صاحب نے اسلحہ ان کو واپس کیے اور ضلع کی فوجوں کا کمانڈر بنا دیا۔ یہ آخر تک پوری ہمت و جرأت اور نہایت پامردی سے فرائض متعلقہ انجام دیتے رہے ("حالات قلمی ماڑے خاں" جو مولانا وحید الدین صاحب قاسمی شیرکوٹی انچارج دفتر جمعیۃ علماء ہند کے پاس محفوظ ہیں)۔

۴۲۳۔ سرکشی اہل بجنور ص ۱۰۸ قلمی

۴۲۴۔ ایضاً ص ۱۰۹۔

۴۲۵۔ سرکشی اہل بجنور ص ۱۰۶۔

۴۲۶۔ ایضاً۔

۴۲۷۔ ضلع کا نظم و نسق انہیں دو مسلمان افسروں کے سپرد ہوا تھا۔ مگر انتظام تو کیا کر سکتے بجان کے لالے پڑ گئے۔ بمشکل جان بچا کر نکل سکے۔

۴۲۸۔ سرکشی اہل بجنور ص ۶۷۔

۴۲۹۔ میر صادق اور میر رستم علی چاند پور ضلع بجنور کے رئیس تھے انہوں نے ایک عرضداشت بہادر شاہ کے پاس بھیجی تھی۔ بعد فتح دہلی عرضداشت کا غذات دفتر شاہی میں مل گئی۔ بس صرف اس بناء پر ان کا تعلقہ ضبط کر لیا گیا۔ یہی تعلقہ تھا جسے دوسری جائداد کے علاوہ بجنور کے ڈپٹی کمشنر نے سرسید کو دینا چاہا تھا۔ حیات جاوید ص ۷۹ تا ص ۸۱ بحوالہ غلام رسول مہر ص ۲۰۵۔

۴۳۰۔ اختلاف رائے کے باوجود یہ حقیقت پسندی اور مظلوموں کے ساتھ یہ ہمدردی قابل قدر ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ ۱۸۵۷ء کی تاریخ میں ایسے حقیقت پسندوں کی کمی نہیں ہے۔ مولانا میر محبوب علی صاحب کا ذکر خیر آگے آئے گا کہ آپ نے سرکاری انعامات واپس کر دیئے۔ کاتب حروف کے ایک خاندانی بزرگ سید محمد انور صاحب اس زمانہ میں جھانسی کی طرف اور سیر تھے۔ آپ بھی وفادار رہے اور جب آپ کا انگریز افسر فرار ہوا تو آپ نے اس کی کوٹھی اور تمام املاک کی پوری حفاظت کی۔ اس کے صلہ میں سرکار نے آپ کے نام کئی مواضعات کا پروانہ بھیجا مگر آپ نے اس پروانہ کو نذر آتش کر دیا اور جب تحقیق ہوئی تو جواب دیا کہ میں نے جو کچھ کیا اپنی دیانت اور احساس فرض کے تقاضے سے کیا میں اس کا کوئی معاوضہ قبول نہیں کر سکتا۔ آپ کے متعلق ایک لطیفہ بھی احقر نے اپنے والد ماجدؒ سے سنا ہے کہ عرصہ تک سلسلۂ مراسلت بند رہنے کے بعد جب ڈاک خانوں میں نظام بحال ہوا تو آپ نے خانگی مصارف کے لیے رقم بھیجی۔ مگر منی آرڈر سے رقم بھیجنا اس وقت بھی خلاف احتیاط تھا تو ایک کتاب میں اشرفیاں رکھ کر کتاب کا پارسل والد صاحب کے نام کر دیا۔ والد صاحب کو روپیہ کی ضرورت تھی، روپیہ کی بجائے کتاب کا پارسل پہنچا تو خفا ہو کر پھینک دیا کہ ''بوڑھے طوطے کو پڑھانے کے لیے کتاب بھیجی ہے''۔ جب غصہ فرو ہوا تو پارسل کھولا تو اشرفیاں دیکھ کر دعائیں دیں۔ اسی بناء پر ارشاد ربانی ہے ''خلق الانسان من عجل''۔ یہ سید محمد انور صاحب شد اتری، پاک باز، صاحب تقویٰ و طہارت تھے۔ حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی کے رفیق خاص حضرت حاجی محمد عابد صاحب سے بیعت تھے۔ آپ نے خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا تھا۔ رحمہم اللہ

۴۳۱۔ یہ صرف سرسید صاحب مرحوم کی تخصیص نہیں ہے پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور آپ کے رفقاء نے بھی یہی کیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ علماء کرام کے پیش نظر تحفظ دین تھا اور یہ کہ آزاد فکر صاحب دیانت اہل علم پیدا ہوں۔ اور سید صاحب کے پیش نظر مسلمانوں کی وجاہت دنیاوی اور وفاداری حکومت متسلطہ۔ ابھی آدھی صدی بھی نہ گزری تھی کہ دونوں کے نتائج سامنے آ گئے۔

۴۳۲۔ العلم کراچی جنگ آزادی نمبر ص ۲۹ و حیات جاوید از ص ۹۰ تا ص ۸۱ جلد اول۔

۴۳۳۔ العلم کراچی جنگ آزادی نمبر۔

۴۳۴۔ اسباب بغاوت ہند ص ۲۰۔

۴۳۵۔ اس کے علاوہ خود انگلستان کے سیاسی حالات بھی سرسید کے مساعد ہو گئے کیونکہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم کر کے ہندوستان کو براہ راست ملکہ وکٹوریہ کے زیر حکومت کیا گیا تو لامحالہ ایسے الزامات کی ضرورت تھی جن سے کمپنی کی اس برطرفی کو جائز اور تقاضاء عدل و انصاف قرار دیا جا سکے۔ اسباب بغاوت ہند ایسے الزامات کی بہت ہی معقول دستاویز تھی۔ جس کو ارکان پارلیمنٹ نے غنیمت سمجھا۔ چنانچہ انگریزی میں اس کا ترجمہ بکثرت تقسیم کیا گیا۔

۴۳۶۔ مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہوی کا ایک مضمون روزنامہ الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوا تھا۔ شاہ صاحب کے حالات اسی سے ماخوذ ہیں۔

۴۲۷۔ واقعات ۱۸۵۷ء کے ممتاز مؤرخ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی جن کی مشہور اور مسلم تصنیفات سے اس مضمون میں خوشہ چینی کی گئی ہے، چیناپٹن کی تاریخ اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"پامان گھونت" کے راجہ راؤل کے زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندوں نے کاسری کے زمیندار اور اس کے دیوان سے اتحاد و اتفاق کر کے دریائے شور کے کنارے تجارت گاہ تعمیر کرنے کے لیے ایک موضع "مدراس کویم" حاصل کیا۔ جو تعلقہ "پونالی" سے متعلق تھا۔ راجہ نے اس کی سند طلائی لوح پر کندہ کرا کے کارندوں کے حوالہ کی اور ایک ہزار دو سو "ہون" سالانہ اس کا پیش کش مقرر کیا، اور موضع کی مناسبت سے اس کا نام "مدراس" رکھا۔ کچھ دنوں بعد چند مواضع اور حاصل کر لئے گئے۔ چم، ناپیک، کویم، ارپوکم، اور ویلی پچہ۔ یہ بھی تعلقہ پونالی سے متعلق تھے۔ چم، ناپیک، کویم چونکہ مدارس کی آبادی میں شامل کر لئے گئے تھے، اس لیے قدیم نام کی مناسبت سے اس کا نام "چیناپٹن" رکھا گیا۔

۴۲۸۔ جی، ڈبلیو، فاسٹر کی شہادت ملاحظہ فرمایئے:

وہ عالم باعمل ہونے کی وجہ سے مولوی تھا۔ روحانی طاقت کی وجہ سے صوفی تھا اور جنگی مہارت کی وجہ سے سپاہی اور سپہ سالار تھا۔ احمد شاہ نام تھا۔ ظلم طبیعت میں نہیں تھا۔ ہر انگریز اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ (ہسٹری دی انڈین میوٹنی)۔

۴۲۹۔ ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر نے "گولکنڈہ" پر قبضہ کر کے قطب شاہی خاندان کا خاتمہ کیا۔ آخری بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ تھے جو عبداللہ قطب شاہ کے داماد تھے۔ جب اس خاندان میں حکومت نہ رہی تو ابوالحسن کے پوتے "چیناپٹن" جا بسے اور وہاں کے نواب کہلائے۔ اس خاندان کے نامور بزرگ سید جلال الدین عادل تھے۔ (مفتی انتظام اللہ شہابی)۔

۴۳۰۔ مولوی احمد اللہ شاہ اور پہلی جنگ آزادی از مفتی انتظام اللہ شہابی۔

۴۳۱۔ ایضاً ص ۱۰۔

۴۳۲۔ ایضاً ص ۱۰۔

۴۳۳۔ نواب وزیر الدولہ نے حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسمٰعیل صاحب شہیدؒ سے تربیت پائی تھی۔ یہ بزرگ سماع کے سخت مخالف تھے۔ پھر نواب صاحب موصوف حضرت مولانا سید نصیر الدین صاحب دہلویؒ سے بیعت ہوئے تھے۔ مولانا نصیر الدین صاحب بھی حضرت سید صاحب شہید سے تربیت یافتہ اور ان کے تقدیم میں سے تھے۔ جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

۴۳۴۔ منشی ذکاء اللہ صاحب کی شہادت پہلے گزر چکی ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں شریک ہونے والے وہابی مجاہدین سب سے زیادہ ٹونک سے آئے تھے جن کی تعداد دو ہزار تھی۔

۴۳۵۔ آپ گوالیار کے ایک رئیس کے یہاں پیادوں میں ملازم تھے۔ رئیس کا نام سردار ستوے تھا۔ (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۹)۔

۴۳۶۔ مولوی احمد شاہ اور مفتی انتظام اللہ صاحب۔

۴۳۷۔ چند صفحات بعد آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ آگرہ میں مولانا سید احمد اللہ شاہ کے ہم نواؤں پر ایک مقدمہ چلایا گیا تھا۔ مارچ ۱۸۵۷ء میں ابتدائی عدالت سے اس کا فیصلہ سنایا گیا۔ مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب دہلی سے آگرہ تشریف لے گئے تھے۔ آگرہ پہنچ کر حلقۂ اثر قائم کرتے اور اس درجہ رسوخ حاصل کرتے میں (کہ حکومت کے ان ہمنواؤں پر جو حکومت کے اعلیٰ منصبوں پر فائز تھے مقدمہ چلانے پر مجبور ہوئی) تین چار سال یقیناً صرف ہوئے ہوں گے۔

۴۳۸۔ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی آگرہ کے قدیم باشندے تھے۔ آپ سے زیادہ آگرہ کے حالات اور ماضی قریب کی تاریخ سے کون واقف ہو سکتا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں۔

۔ جاٹوں اور مرہٹوں کے زمانہ میں آگرہ کی حالت بے حد زبوں ہو چکی تھی (۱) ملا ولی محمد شاہ کی درس گاہ محلہ بالو گنج میں تھی۔ مولوی شمس الضحیٰ اور مولوی بدر الدجیٰ اور میر اعظم علی اعظم اسی درس گاہ کے فارغ التحصیل عالم تھے۔ (۲) مولوی محمد معظم جن کے مکتب میں مرزا غالب نے پڑھا۔ (۳) میاں نظیر کا مکتب محلہ تاج گنج میں تھا۔ یہاں ہندوؤں کے چند بچے تعلیم پاتے تھے۔ حکیم غلام قطب الدین خاں باطن (صاحب نغمۂ عندلیب) و خلیفہ گلزار علی اسیر یہ ان کی درس گاہ کے تعلیم یافتہ تھے۔

(۴) مولوی امجد علی اصغر کا مدرسہ محلہ تاج گنج میں تھا۔ یہ تھی کل کائنات اکبرآباد کے درس و تدریس کی۔ گنتی کے چند لوگ پڑھے لکھے تھے قاضی سید باسط علی خاں ہمدانی آگرہ کے قاضی القضاۃ تھے۔ مرہٹوں نے ان کو معزول کر کے للو بھٹ کو قاضی القضاۃ بنا دیا۔ باسط علی خاں مرافعہ کرنے شاہ عالم ثانی کے پاس دلی پہنچے۔ البتہ مرہٹوں نے کچھ خانقاہوں کو جاگیریں ضرور دیں۔ بہر حال حکمران طبقہ کا اثر یہ تھا کہ مسلمان شعائر اسلامی سے دور ہٹ گئے تھے۔ نماز روزہ کی طرف سے تغافل برتا جاتا تھا۔ متولیان مسجد جامع اکبری نے مسجد کی زیریں دکانیں ہندوؤں کے ہاتھ رہن رکھ دی تھیں۔ جامع مسجد کا مصرف صرف یہ رہ گیا تھا کہ اس کے صحن میں کبوتروں کی قلابیں کھڑی کی جاتی تھیں۔ دو سوتی دری بچھنے کے کر گھے لگے ہوئے تھے۔ بیچ کے در میں چند چٹائیاں پڑی رہتی تھیں۔ گنتی کے لوگ نماز پڑھتے تھے۔ جمعہ کی نماز میں بیس پچیس مسلمان شریک ہوتے تھے۔ امیر الامراء ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے زمانے سے البتہ تعزیہ داری کا رواج بڑھ گیا تھا۔ تعزیوں پر عرضیاں چڑھتیں۔ چڑھاوے صد ہا روپیہ کا چڑھتا۔ تعزیہ کا ساتویں اور نویں کی شب میں "ناف شہر" کا گشت کرایا جاتا تھا۔ عمائد شہر ہاتھ باندھ کر ساتھ ساتھ تعزیہ کے پیچھے اور کاندھا دیتے۔ دسویں کی صبح الوداع پڑھی جاتی۔ ہزاروں مسلمان عورت مرد جمع ہوتے تھے حتیٰ کہ مولانا غلام امام شہید الوداع پڑھتے تھے۔ بچوں کو تعزیہ پر رہن رکھا جاتا وغیرہ وغیرہ۔ مسلمانوں میں عام طور سے ہندوانی رسوم کی گرم بازاری تھی۔ دیوالی اور ہولی میں برابر ہندوؤں کے شریک ہوتے۔ اس کیفیت کا پورا نقشہ میاں نظیر نے اپنی نظمیات میں کھینچا ہے۔ ان کے پوتے سوانگ بھرتے تھے۔ اور شہر کا گشت لگاتے۔ سیتلا کے مندر کے ہندو اور مسلمان اور دو مجاور اور مہنت چڑھاوے کے برابر کے حصہ دار ہوتے تھے۔ یہی حال کمال خاں کے کنویں کا تھا۔ یہ تھی عام حالت مسلمانوں کی۔ صدر نظامت ۱۸۲۵ء میں الٰہ آباد سے آگرہ آیا تو علماء جو ابتکاپ صدر تھے وہ بھی ساتھ آئے۔ تب یہاں علماء کی صورتیں نظر آنے لگیں۔ پہلے جمعہ میں مولوی سراج الاسلام پیشکار نے نماز جمعہ پڑھائی تو اسی (۸۰) آدمی اس میں شریک تھے۔ تمام شہر میں یہ شہرہ تھا کہ عظیم الشان جمعہ ہوا (مولوی احمد اللہ شاہ از مفتی انتظام اللہ شہابی ص ۱۲ تا ۱۴)۔

۴۴۹۔ مولوی احمد اللہ شاہ از مفتی انتظام اللہ شہابی ص ۱۵۔

۴۵۰۔ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی راوی ہیں کہ شاہ صاحب کے یہاں محفل سماع کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ مریدین پر توجہ ڈالی جاتی۔ ادھر لوہے کے کڑاہوں میں کوئلہ کے انگارے بھرے رہتے تھے۔ وہ مجلس میں پھیلا دیے جاتے تھے۔ ان پر مریدین لوٹتے تھے۔ آگ ان پر بالکل اثر نہ کرتی تھی۔ میری پھوپھی محترمہ عمدۃ النساء زوجہ خواجہ غلام غوث خاں بہادر وزیر الملک الٰہ آبادی فرمایا کرتی تھیں کہ ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر الہام اللہ مرحوم پر شاہ صاحب کی خاص توجہ تھی اور وہ ان کے مرید تھے۔ وہ بھی شریک محفل سماع ہوتے اور دہکتے ہوئے کوئلوں پر مثل ماہی بے آب تڑپتے مگر جسم پر نشان تک نہ پڑتا۔ (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ص ۴۳)۔

۴۵۱۔ روشن مستقبل ص ۱۸۰ (بار چہارم)

۴۵۲۔ سعد الاخبار ص ۱۴۸ جلد اول مورخہ ۱۷ جمادی الاول ۱۲۶۶ھ مطابق مارچ ۱۸۵۰ء۔

۴۵۳۔ خان بہادر مفتی انعام اللہ ابن مفتی محمد اسحاق سہروردی ابن مفتی محمد ولی نبیرہ ملا وجیہ الدین (یکے از مرتبین و مدونگان فتاویٰ عالمگیری) ۱۲۰۶ھ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد سے علوم عربی کی تحصیل کی۔ فراغت کے بعد لکھنؤ گئے۔ عرصہ تک نظامت کی تمنا میں رہے۔ ناکامی پر مرشد آباد گئے۔ پھر کلکتہ پہنچے۔ وہاں سر ایڈورڈ کولبرک سے تعلق ہو گیا۔ ان کا لڑکا مسٹر شیر ان سے فارسی پڑھتا تھا۔ کولبرک دلی کے ریذیڈنٹ مقرر ہوئے تو مفتی صاحب اس کے ہمراہ دلی آئے۔ اس نے اپنے محکمہ کا سر رشتہ کر دیا عرصہ تک وہاں رہے۔ محکمہ قضا میں بعہدہ وکالت (مفتی) مقرر ہوئے۔ جس زمانہ میں صدر نظامت الٰہ آباد میں قائم ہوا محکمہ قضا شکست ہو گیا۔ آپ الٰہ آباد آئے اور محکمہ صدر میں وکیل مقرر ہوئے۔ صدر آگرہ آیا تو آپ بھی اس کے ہمراہ آگرہ آ گئے۔ ۱۲۶۱ھ عہدہ داران صدر پر رشوت کا مقدمہ چلایا گیا، تو آپ کو بھی اس الزام میں معطل کر دیا گیا کہ آپ کے یہاں سے کچھ خطوط برآمد ہوئے تھے۔ اپیل میں آپ بحال کر دیے گئے۔ لیکن آپ اس تعلق سے خاطر برداشتہ ہو چکے تھے۔ بحالی

کے بعد آپ نے استعفیٰ دے دیا۔ پھر آپ وزیر الدولہ کے پاس ٹونک چلے گئے۔ وہاں آپ کو بندوبست کا مہتمم بنا دیا گیا۔ وہیں سے آپ حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کو امداد پہنچاتے رہے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ۲۱ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ، ۱۸۵۹ء کو آپ کا انتقال ہوا۔ (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۲۷، ۲۸)۔

۴۵۴۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۲۷۔

۴۵۵۔ ایضاً ص ۳۳۔

۴۵۶۔ مولانا رحمان علی صاحب مصنف تذکرہ علماء ہند نے آپ کا پورا نام امیر الدین علی لکھا ہے، وطن عزیز امیٹھی تھا۔ یہی اجودھیا جہاں سن ۱۹۵۰ء سے بابری مسجد کا قضیہ چل رہا ہے کہ ہندوؤں نے اس بنا پر کہ اس مسجد کے ایک حصہ کو وہ رام چندر جی کا رسوئی گھر کہتے ہیں، اس پر قبضہ کر کے اس میں مورتی رکھ دی ہے، مسلمان اس کے خلاف قانونی کارروائی کرنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ مقدمہ چل رہا ہے۔ اسی اجودھیا میں ایک قلعہ کا نام ہنومان گڑھی ہے جہاں عالمگیری بنوائی ہوئی ایک قناتی مسجد تھی۔ سو سال پیشتر ۱۸۵۵ء میں یہاں بھی شورش ہوئی تھی۔ چنانچہ اس قناتی مسجد پر اور ساتھ ہی بابری مسجد پر ہندوؤں نے قبضہ کر لیا تھا۔ واجد علی شاہ کا دور حکومت تھا۔ وہ بذات خود کمزور، ہوا مضبوط، مگر اس کی حکومت کے ساتھ انگریزی ریزیڈنٹ کے غیر معمولی اقتدار اور جا بے جا مداخلت نے جو دو عملی کر رکھی تھی، اس کا قدرتی اور لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نظام حکومت معطل اور مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ اجودھیا اور اس کے قرب وجوار کے ہندوؤں نے نہ بذعم خود یا کسی کے ایما سے اس کمزوری کا فائدہ اٹھایا اور من مانی کارروائی کر لی۔ واجد علی شاہ کے عمال نے اس دست درازی کو ختم کرنا چاہا تو آس پاس کے زمیندار اور باثر ہندو مقابلہ پر آ گئے۔ واجد علی شاہ کے افسروں کے پاس مصالحت کے سوا چارہ کار نہ تھا لیکن مسلمان ایسی صلح پر راضی نہ تھے جس کے نتیجہ میں ان کو مسجد سے دستبردار ہونا پڑے۔ چنانچہ غلام حسین شاہ کی زیر قیادت مسلمانوں کی ایک جماعت خانہ خدا کو دوبارہ اذان و نماز سے آباد کرنے کے لیے وہاں پہنچی۔ ان کے رفقاء اور معاونین میں مولوی محمد صالح، حسن علی خاں بن احسان علی خان رسالدار، رستم علی خان و بہادر علی خاں کسی قدر ذی حیثیت اور نمایاں تھے۔ باقی ساتھی وجاہت دنیا سے بے نیاز، شوق شہادت سے سرشار تھے۔ انگریز اور ہندوستانی افسر بھی پولیس اور فوج کی جمعیت کے ساتھ وہاں پہنچے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان سب کی موجودگی میں ان تمام مسلمانوں کو جو مسجد میں دو تین روز سے بھوکے پیاسے پڑے تھے ذبح کر دیا گیا۔ ان کی تعداد ۲۶۹ بتائی جاتی ہے (قیصر التواریخ جلد دوم ص ۱۱۲ و تاریخ اودھ جلد ۵ ص ۲۰۶) عذر یہ کیا گیا کہ حملہ آور ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی جس پر پولیس اور فوج کی موجودہ تعداد قابو نہیں پا سکتی تھی۔ یہ حادثہ ۱۳ ذیقعدہ ۱۲۷۱ھ، ۲۸ جولائی ۱۸۵۵ء کو پیش آیا۔ بلغ العلی بکماله (۱۲۷۱ھ) سے اس کی تاریخ نکالی گئی۔ بہر حال اس ہنگامہ سے پورے ہندوستان میں بے چینی پھیل گئی۔ واجد علی شاہ کی حکومت نے کچھ ہندوؤں سے معذرت کرا کر اور کچھ تحقیقات کا سلسلہ شروع کرا کر اس قصہ کو رفع دفع کرانا چاہا۔ مگر دوسری طرف عام اضطراب جو دن بدن بڑھ رہا تھا۔ بقول سید کمال الدین حیدر حسنی الحسینی مصنف قیصر التواریخ، جب فساد و ہنگامہ اجودھیا ہوا اور بظاہر ثابت و محقق ہوا کہ رعایت و پاسداری ہنود مطمع دنیا دار ارکان دولت کو منظور ہے۔ مولوی سید امیر علی بندگی میاں کے پوتے ساکن قصبہ امیٹھی نسبتی بھائی شیخ حسین علی کارندہ راجہ نواب علی خاں رئیس محمود آباد، بہ سبب جوش حرارت اہل اسلام چاہا کہ دفع توہین اسلام کریں۔ چنانچہ پہلے سندیلہ میں اہل اسلام نے مولویوں کی تحریک سے بعد مشورہ اجماع کر جہاد پر باندھی۔ (قیصر التواریخ ص ۱۲۰)۔ بہر حال یہ پس منظر تھا مولوی امیر علی شہید کے جہاد کا۔ مولانا امیر علی نے جب علم جہاد بلند کیا تو مولانا رحمن علی کے الفاظ میں علماء سنی و شیعہ بہ پس و پیش افتادند کہ بعقد ان شرائط فرضیت جہاد لب کشادہ و دیگرے شرط امامت پیش نہادہ۔ علماء کی یہ پس و پیش اور واجد علی کی طفل تسلی اور لیت و لعل جاری رہی۔ مگر جو موت کو زندگی پر ترجیح دے چکا تھا۔ جس کو مولانا رحمن علی صاحب امیر المجاہدین فرماتے ہیں وہ "عزم بالجزم بسوئے مقصود کردہ روانہ شد"۔ واجد علی شاہ اب بھی پس و پیش ہی میں تھے۔ ریزیڈنٹ نے کپتان بارلو کو حکم دیا وہ لشکر جرار اور توپ خانہ لے کر پہنچا۔ شجاع گنج میں تمام مجاہدین کا محاصرہ کر کے توپ دم کر دیا۔ مجاہدین کی تعداد چھ سو تھی۔ سب ہی

شہید ہو گئے۔ مگر مقابلہ بھی ایسا کیا کہ توپوں کی زد میں ہونے کے باوجود، پچ سے دو چند (۱۲۰۰) کو مقتول و مجروح کر دیا۔ خاص معرکہ کے وقت کسی ارادت مند نے حضرت شاہ امیر علیؒ سے عرض کیا۔ حالات اچھے نہیں۔ کسی محفوظ مقام پر نکل چلئے۔ شہید کی زبان حق ترجمان نے فوراً جواب دیا۔ "سر میدان کفن بر دوش دارم"۔ عجیب اتفاق، شہادت کے بعد تاریخ کی جستجو ہوئی تو یہی مصرعہ موزوں ہوا منشی ظہیر الدین خلف منشی مسعود بلگرامی نے اس کی تضمین کر کے یہ قطعہ بنا دیا۔

بتاریخ شہیداں کفن پوچھی ۔۔۔ چہ حاجت تا سنش من برنگارم
کہ خود فرمود آں میر شہیداں ۔۔۔ سر میداں کفن بر دوش دارم

(تذکرہ علماء ہند ص ۱۳۰-۱۲۷ اھ)

۳۵۷۔ بے شک یہ حضرت شاہ صاحب کی گفتگو اور ان کی قوت ارادی کا اثر ہے کہ حضرت مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی کی زندگی میں انقلاب برپا ہو گیا۔ لیکن یہاں حضرت مولانا صدر الدین صاحب آزردہ کی فرزانگی اور دوراندیشی کی بھی داد دینی چاہیے کیونکہ اگر زمام قیادت حضرت مولانا اسمٰعیل شہید کے کسی جانشین کے ہاتھ میں ہوتی۔ اور مرکز دہلی ہوتا تو شاید مولانا خیر آبادی میں یہ انقلاب اب بھی برپا نہ ہوتا۔

۳۵۸۔ باغی علماء ص ۳۸۔

۳۵۹۔ لکھنؤ میں مولانا احمد سعید سبط شاہ غلام علی نے علم محمدی اٹھا رکھا تھا اور عوام میں عام بے چینی پیدا ہو گئی تھی مگر کرتا دھرتا کوئی نہیں تھا۔ حضرت احمد اللہ شاہ کے پہنچتے ہی ہر ایک ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا اور تمام منتشر مجاہدین آپ کے پاس آ جمع ہوئے۔ سر ہنری لارنس چیف کمشنر لکھنؤ نے حتی الوسع بغاوت کو فرو کرنا چاہا مگر سعی بے نتیجہ رہی (باغی علماء ص ۳۸)۔

۳۶۰۔ جولائی ۱۸۵۷ء کو رسالدار سید برکات احمد اور راجہ نال سنگھ اور شہاب الدین وغیرہ نے شہزادہ مرزا برجیس قدر خلف واجد علی شاہ کو اودھ کا بادشاہ بنا کر تخت پر بٹھا دیا۔ مسند نشینی کے وقت جہانگیر بخش صوبہ دار توپ خانہ فیض آباد نے ۲۱ ضرب توپ کی سلامی دی۔ شرف الدولہ محمد ابراہیم علی خاں کو خلعت وزارت عطا ہوا۔ جرنیلی کا خلعت حسام الدولہ کو ملا۔ مگر کل وجزو کے اختیارات ناصر الدولہ ممو خان عرف محمد خان کے ہاتھ میں تھے۔ (باغی علماء ص ۳۸)۔

۳۶۱۔ ممو خاں، اصل نام علی محمد خاں، داروغہ دیوان خاص۔ برجیس قدر کو مسند حکومت تک پہنچانے میں ان کی کوشش کو خاص دخل تھا۔ حضرت محل کے خاص معتمد تھے۔ مگر اس عارضی شوکت واقتدار کے دور میں بھی زیادہ ستانی اور خویش پروری کی شکایت رفع نہیں ہوئی، بلکہ زیادہ ہو گئی جس کی بناء پر حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب کو بار بار مداخلت کرنی پڑی۔ جس کی وجہ سے ممو خاں حضرت شاہ صاحب سے بھی برگشتہ ہو گیا تھا۔ حضرت محل کے ساتھ لکھنؤ سے نکلا اور جب حضرت محل اور برجیس قدر نیپال روانہ ہوئے تو یہ بھی ان کے ہمراہ تھا۔ دونوں ماں بیٹوں کو نیپال کے افسروں نے یہاں اپنے رہنے کی اجازت دی۔ ان کے لیے بطور مدد معاش ایک ہزار روپیہ ماہانہ جاری کر دیا۔ مگر ممو خاں کی آشفتہ مزاجی اور تندخوئی اس نازک موقع پر بھی ختم نہ ہوئی۔ اس نے نیپالی افسروں سے ایسا انداز اختیار کیا۔ کہ انہوں نے ممو خاں کو اجازت نہیں دی۔ دوسرے سپاہیوں کی طرح یہ بھی انگریزوں کی گرفت میں آ گیا۔ گرفتار ہوا۔ مقدمہ چلا۔ ممو خاں نے انگریزوں کی وفاداری کے ثبوت میں بہت سی چٹھیاں بھی جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ملی تھیں۔ پیش کیں۔ بڑے شد ومد سے دعویٰ کیا کہ میر واجد علی جس کو کمپنی نے دس لاکھ روپیہ عطا کیا ہے میرا نائب تھا۔ اس نے کو جو کچھ انگریزوں کی وفاداری میں کاروائیاں کیں وہ سب میرے مشورہ سے کیں۔ بہر حال تمام صفائیوں کا نتیجہ اتنا ہی برآمد ہوا کہ پھانسی کی سزا منسوخ ہوئی۔ چند سال کی قید تجویز کی گئی۔ آپ نے فرار ہونے کی کوشش کی۔ کوشش ناکام رہی۔ دوبارہ گرفتار ہوئے اور انڈمان بھیج دیئے گئے۔ تقریباً پانچ سال جزیرہ انڈمان میں گزارے۔ پھر سرا وک بھیج دیئے گئے۔ وہیں انتقال ہوا۔ (قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۶۷، ۳۶۸ و تواریخ عجیب ص ۴۳، ۴۴)۔

۳۶۲۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۳۹۔

۳۶۳۔ انڈین میونٹی۔ از جی۔ ڈبلیو فارسٹ کوالہ ص ۴۳ (باغی علماء ص ۴۳)۔

۴۶۴۔ تاریخ شاہ جہان پور بحوالہ باغی علماء ص ۴۹ و ۵۰۔

۴۶۵۔ ہسٹری دی انڈین میوٹنی۔

۴۶۶۔ یہ پورا مضمون جناب محمد ایوب صاحب کی کاوش علمی اور عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں قطع و برید مناسب نہیں معلوم ہوئی۔ قدر شناسی کا بھی یہی تقاضا تھا کہ پوری دستاویز جوں کی توں رکھی جائے۔

۴۶۷۔ اگر کتابوں کے نام تاریخی ہیں تو یہ سنہ جو لکھے ہیں صحیح نہیں ہیں۔ سنہ دیئے جائیں جو ناموں سے تخریج ہوں۔

۴۶۸۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے اجداد میں ایک بزرگ شیر الملک ہیں (ملاحظہ ہو شاندار ماضی جلد دوم) شیر الملک تک علامہ خیر آبادی کا سلسلہ نسب یہ ہے۔
علامہ فضل حق ابن علامہ فضل امام ابن شیخ محمد ارشد بن حافظ محمد صالح بن ملا عبد الواجد بن عبد الماجد بن قاضی صدر الدین بن قاضی اسمٰعیل ہرگامی بن قاضی عماد بداؤنی بن شیخ ارزانی بداؤنی بن شیخ منور بن شیخ خطیر الملک بن شیخ سالار شام بن شیخ وجیہ الملک بن شیخ بہاء الدین بن شیر الملک، باغی ہندوستان ص ۱۲۔

۴۶۹۔ سیر العصار۔

۴۷۰۔ باغی ہندوستان ص ۳۹۔

۴۷۱۔ یادگار غالب وکلیات نثر غالب، فارسی۔

۴۷۲۔ باغی ہندوستان ص ۱۳۵۔ حکیم نجم الغنی صاحب مصنف تاریخ اودھ اور مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی مصنف ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء نے بھی یہ ذکر کیا ہے کہ مولانا امیر علی شاہ صاحب کے خلاف جو فتوے مرتب کیا گیا تھا اس میں مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی نے بھی دستخط کئے تھے لیکن اسی واقعہ کے متعلق سوال اور شیعہ سنی علماء کے فتاویٰ قیصر التواریخ جلد دوم میں موجود ہیں اور حکیم صاحب نے بھی اپنی تاریخ میں نقل کئے ہیں۔ ان میں مولانا خیر آبادی کا نام نہ بحیثیت مجیب ہے، نہ تائید و تصویب کرنے والوں میں آپ کا نام ہے۔

۴۷۳۔ مرزا علی اعلیٰ منصرم مجمم راث ۔۔۔۔۔۔ آگے اصل کتاب سے

۴۷۴۔ کیوں کیا وجہ تھی؟ ان کو کیا خوف تھا؟

۴۷۵۔ قیصر التواریخ ص ۱۱۱، ۱۱۲۔

۴۷۶۔ باغی ہندوستان ص ۱۴۹۔

۴۷۷۔ خود مولانا فضل حق صاحب نے بھی ''الثورۃ الہندیہ'' میں اپنے اس فکری تبدیلی کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اس کے اسباب میں اگرچہ اس واقعہ کا نام نہیں لیا لیکن جو سبب بیان کئے ہیں ان کے دلائل و شواہد اسی قسم کے واقعات ہو سکتے ہیں۔ مثلاً سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ نصاریٰ کی کوشش ہے کہ تمام مذہب بدل کر صرف ایک مذہب نصرانیت و عیسویت باقی رکھا جائے۔ دوسرا سبب یہ کہ جملہ ذرائع پیداوار پر قبضہ کر کے وہ ہندوستانیوں کے خورد و نوش کو بھی اپنے قبضہ میں کرنا چاہتے ہیں۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں سے ان کے مذہبی مراسم مثلاً ختنہ وغیرہ ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

۴۷۸۔ حکیم عبد الحق محمد حسن بخش دہلی کے رہنے والے مدت تک راجہ ناہر سنگھ والیِ بلب گڈھ کے ایجنٹ رہے۔ پھر مستعفی ہو کر دہلی آ گئے۔ پھانسی کی سزا سے شہید کئے گئے۔

۴۷۹۔ باغی ہندوستان ص ۱۵۸۔

۴۸۰۔ الثورۃ الہندیہ ص ۳۱۶۔

۴۸۱۔ ایضاً ص ۳۱۷۔

۴۸۲۔ قوبا مرض کا نام ہے جس میں بدن کی کھال چھلنے اور پھٹنے لگتی ہے۔

۴۸۳۔ دماغ کے پردوں کا ورم

۴۸۴۔ الثورۃ الہندیہ ص ۴۲۱ تا ۴۲۲۔

۴۸۵۔ منشی جیون لال کے روزنامچہ میں ۲ر جولائی کی روئیداد میں درج ہے۔
بادشاہ نے جنرل کو رخ میں باریابی دی جنرل نے کہا میں بھی آپ کے خانوادہ سے ہوں۔ اطمینان کی غرض سے آپ تحقیقات فرما سکتے ہیں۔ بادشاہ نے کہا۔ تحقیقات کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس وقت جنرل میں سے اور کوئی بڑا بہادر موجود نہیں ہے جنرل نے جواب میں عرض کیا۔ میں بہادر کے خطاب کا مستحق ہو جاؤں گا اگر میں دہلی اور میرٹھ سے انگریزوں کو نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔

۴۸۶۔ منشی جیون لال نے ۱۱ر جولائی ۱۸۵۷ء کے روزنامچہ میں لکھا ہے کہ بخت خاں نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں سلطان پور علاقہ لکھنؤ کا باشندہ ہوں اور اودھ کے شاہی خاندان سے میری رشتہ داری ہے۔ میری درخواست ہے کہ اس بیان کی تصدیق فرمائی جائے بادشاہ نے فرمایا کہ تصدیق کی ضرورت نہیں۔ آپ یقیناً شریف و نجیب خاندان سے ہیں۔ جنرل نے پھر عرض کیا۔ میں تصدیق پر اس وجہ سے زور دے رہا ہوں کہ جب انگریزوں کو دہلی آگرہ اور میرٹھ سے نکال دیا جائے گا تو اعزاز کے امتیازی نشان کے لیے استدعا کروں گا۔

۴۸۷۔ بحوالہ ۱۸۵۷ء کے ہیرو۔ مصنفہ سید انیس فاطمہ بریلوی ص ۹۵، ۹۶۔

۴۸۸۔ غدر کی صبح و شام ص ۱۵۲۔

۴۸۹۔ ۱۸۵۷ء کے ہیرو۔

۴۹۰۔

۴۹۱۔

۴۹۲۔

۴۹۳۔

۴۹۴۔ بہادر شاہ کا مقدمہ (انگریزی) ص ۳۱ و ۶۸ بحوالہ مہر۔

۴۹۵۔ ابو ظفر بہادر شاہ ص ۳۱۔

۴۹۶۔ داستان غدر

۴۹۷۔ شاہی خاندان کے افراد کو سلاطین کہا جاتا تھا۔ یہی محاورہ تھا۔

۴۹۸۔ مندسور۔ ریاست گوالیار کا مشہور مقام ہے جو اجین سے تقریباً اسی میل شمال میں واقع ہے یہاں جولائی ۱۸۵۷ء میں ریاست گوالیار کی بعض سرکش افواج قابض ہو چکی تھیں۔ آہستہ آہستہ ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ پورے مغربی مالوہ میں انگریزوں کے خلاف آگ بھڑک اٹھی۔ اس مقام پر ادھر ادھر سے بہت سی فوج جمع ہو گئی تھی جس نے شاہزادہ فیروز شاہ کو اپنا قائد و سپہ سالار بنا لیا تھا۔ مندسور کے آس پاس متعدد مقامات تھے جہاں ساز باز کے رشتے قائم ہو چکے تھے۔ ریاست دھار کا نوجوان راجہ اور اس کا وزیر رام چندر بابو جی، نیز راجہ کی والدہ اور چچا انگریزوں کے خلاف بڑی سرگرمی دکھا رہے تھے۔ نیمچ بھی اسی علاقہ میں ہے جہاں بغاوت کی آگ سلگ رہی تھی۔ مہر ص ۱۲۲۔

۴۹۹۔ غدر ہند کا بھولا ہوا باب از شاوز (Shaways) (۱۸۵۷ء کے مجاہدین ص ۱۲۲)۔

۵۰۰۔ جیسا کہ ۱۹۴۳ء میں نیتاجی سوبھاش چندر بوس کی زیر قیادت آزاد ہند فوج کا یہ ایک طے کردہ نعرہ تھا۔

۵۰۱۔ غالباً بھرت پور کا علاقہ مراد ہے۔ یہاں سے میوات علاقہ شروع ہوتا ہے۔

۵۰۲۔ قیصر التواریخ جلد دوم ص ۳۹۵۔

۵۰۳۔ ایضاً ص۔

۵۰۴۔ قیصر التواریخ ص ۳۹۵۔

۵۰۵۔ ایضاً ص ۳۱۲، ۳۱۳۔

۵۰۶۔ قیصر التواریخ وغیرہ۔

۵۰۷۔ میل من جلد پنجم بحوالہ مہر۔

۵۰۸۔ یہ وہی ایڈیشن ہے جو ۱۹۳۹ء میں ضبط کیا گیا تھا۔

۵۰۹۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ ص ۲۸۔

۵۱۰۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ایک عرصہ تک تو ظالم نے اپنے ظلم کا اعتراف ہی نہ کیا اور مظلوم اتنا تباہ ہو چکا تھا کہ اس کو بھی چارونا چار سکوت اور خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مگر دلوں کی دبی ہوئی چنگاریاں جن کو ظالم کے آئے دن کے نئے نئے ظلم ہوا دیتے ہیں آخر کب تک چھپی اور دبی ہوئی رہ سکتی ہیں۔ انہوں نے اہل ہند کے جگر اور دل کو اندر ہی اندر جلانا اور پکارنا شروع کیا۔ تب کچھ انگریزوں نے محسوس کیا کہ ان کو بھی ہندوستانیوں کا ہمنوا ہو کر ان چنگاریوں کو بجھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دبی ہوئی چنگاریاں برطانیہ کے خرمن شہنشاہیت کے لیے برق سوزاں بن جائیں۔ اس نظریہ کے بموجب مسٹر ایڈورڈ ٹامسن نے ساٹھ سال گزرنے کے بعد اعتراف ظلم کرتے ہوئے جدید ڈپلومیسی سے ان چنگاریوں کو بجھانا چاہا۔ چنانچہ ایک کتاب "دور سائڈ آف دی میڈل" جس کا ترجمہ شیخ حسام الدین صاحب بی اے نے اردو میں کیا، اور اس کا نام "انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ" رکھا۔ یہ اسی کتاب کا اقتباس ہے۔

۱۱۵۔ تصویر کا دوسرا رخ ص ۳۰۔

۵۱۲۔ تصویر کا دوسرا رخ ص ۴۰۔

۵۱۳۔ ایضاً ص ۳۵۔

۵۱۴۔ ایضاً ص ۳۶۔

۵۱۵۔ تصویر کا دوسرا رخ ص ۵۹۔

۵۱۶۔ ایضاً ص ۶۰۔

۵۱۷۔ ایضاً ص ۶۳۔

۵۱۸۔ ایضاً ص ۶۴۔

۵۱۹۔ عبدالرحمٰن خاں شہید۔

۵۲۰۔ تصویر کا دوسرا رخ ص ۶۵۔

۵۲۱۔ ایضاً ص ۶۴۔

۵۲۲۔ ایضاً ص ۶۸۔

۵۲۳۔ تصویر کا دوسرا رخ ص ۶۹۔

۵۲۴۔ ایضاً ص ۳۸۔

۵۲۵۔ ایضاً ص ۴۰۔

۵۲۶۔ تصویر کا دوسرا رخ ص ۴۱۔

۵۲۷۔ ایضاً ص ۴۳۔

۵۲۸۔ تصویر کا دوسرا رخ ص ۴۷۔

۵۲۹۔ ایضاً ص ۴۴۔

۵۳۰۔ تصویر کا دوسرا رخ ص ۳۶۔

۵۳۱۔ تصویر کا دوسرا رخ ص ۵۵۔

۵۳۲۔ ایضاً ص ۲۳۔

۵۳۳۔ ایضاً ص ۳۴۔

۵۳۴۔ تصویر کا دوسرا رخ ص ۳۹۔

۵۳۵۔ ایضاً ص ۵۱۔

۵۳۶۔ ایضاً ص ۶۰۔

۵۳۷۔ تصویر کا دوسرا رخ ص ۶۱۔

۵۳۸۔ تصویر کا دوسرا رخ ص ۶۴۔

۵۳۹۔ ایضاً ص ۶۸۔

۵۴۰۔ ایضاً ص ۶۸۔

۵۴۱۔ ایضاً ص ۶۸۔

۵۴۲۔ تصویر کا دوسرا رخ ص ۶۸۔

۵۴۳۔ ایضاً ص ۷۰۔

۵۴۴۔ ایضاً ص ۷۱۔

۵۴۵۔ افسانۂ غم ص ۲۸، ۲۹۔

۵۴۶۔ تصویر کا دوسرا رخ ص ۷۸، ۷۹۔

۵۴۷۔ ایضاً ص ۳۴۔

۵۴۸۔ سیرۃ ابن ہشام جلد دوم ص ۸۷، طبقات ابن سعد قسم اول ج ۲ حالات ص ۷۔

۵۴۹۔ دیہات و قصبات میں پیدل مسافت طے کرنے والے جوتیاں نکال لیتے ہیں اور برہنہ پا چلتے ہیں کہ اس طرح قدم ہلکا ہو کر تیزی سے اٹھتا ہے۔

۵۵۰۔ جن کو بشارت دی گئی ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔

۵۵۱۔ سیرۃ ابن ہشام جلد دوم ص ۹۷۔

www.besturdubooks.wordpress.com